جلد ٦

اصلاحی مجالس

بسلسلہ تہذیبِ اخلاق و تربیتِ باطن

- ماضی کا گناہ یاد آنے پر دوبارہ استغفار
- عبادات میں ذوق وشوق مطلوب نہیں
- اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے اسباب
- کثرت ذکر اللہ محبت پیدا کرنے کا ذریعہ
- ادعیہ ماثورہ۔ کثرت ذکر اللہ کا بہترین طریقہ
- اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ کریں
- حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ
- اعمال کے دنیاوی ثمرات
- اللہ سے اللہ کی محبت مانگی
- محبت طبعی یا عقلی
- ہر چیز اللہ کی عطا ہے
- خوف اور رجا
- مخلوق کا ڈر
- اللہ کی محبت

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

اصلاحی مجالس

(٦)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب	حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم
ضبط و ترتیب	محمد عبداللہ میمن صاحب
تاریخ اشاعت	جنوری ٢٠٠٦ء
مقام	جامع مسجد دارالعلوم کراچی
باہتمام	ولی اللہ میمن صاحب
ناشر	میمن اسلامک پبلشرز
کمپوزنگ	خلیل اللہ فراز (cell:0321-2606274)
قیمت	=/ روپے

ملنے کے پتے

- میمن اسلامک پبلشرز، ١٨٨/١، لیاقت آباد کراچی ١٩
- دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی
- مکتبہ دارالعلوم کراچی ١٤
- کتب خانہ مظہری، گلشن اقبال، کراچی
- اقبال بک سینٹر، صدر، کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ،وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ،وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم،وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔اَمَّا بَعْدُ!

اللہ جل شانہ کے فضل وکرم سے ''اصلاحی مجالس'' کی جلد ششم آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ جلد ''انفاس عیسیٰ'' کے باب دوم تحقیقات کے عنوان ''توبہ'' کے بعض ملفوظات اور عنوان ''عشق وتعلق مع اللہ'' کے مکمل ملفوظات اور عنوان ''خوف ورجا'' کے بعض ملفوظات کی تشریح پر مشتمل ہے،اللہ تعالیٰ استاذ مکرم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی عمر میں برکت عطا فرمائے، اور انفاس عیسیٰ کی تشریح کی تکمیل فرمادے،اور احقر مرتب اور ناشر کو صدق واخلاص کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کام کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے،آمین۔

محمد عبداللہ میمن

۱۸،ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ

اجمالی فہرست مجالس

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر
خلاصہ	۶۳
گناہ کا تقاضہ گناہ نہیں	۶۴
غصہ کا علاج سب سے مقدم	۶۵
غصہ اور شہوت کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے	۶۵
حسد کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے	۶۶
حسد کے دو علاج	۶۶
طبعی ناگواری سے مغلوب ہو کر زبان سے نکلنے والے کلمات	۶۸
ایک صحابی کو غصہ نہ کرنے کی نصیحت	۶۸
ابتداءً بالکل غصہ کرنا چھوڑ دو	۶۹
معافی مانگنے سے شرم مت کرو	۷۰
مجلس نمبر ۸۳	
اللہ تعالیٰ کی محبت اور اسکے اسباب	۷۳
محبت کے اسباب اختیاری ہیں	۷۳
محبت مشکل کام کو آسان کر دیتی ہے	۷۴
ماں کو بچے سے محبت کا نتیجہ	۷۵
تنخواہ سے محبت کا نتیجہ	۷۵
قلندری راستہ دکھادیں	۷۶

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
بیت اللہ پر پہلی نظر کے وقت دعا	۱۹۱
اسباب محبت کا خلاصہ	۱۹۲
محبت کا کوئی درجہ طلب مت کرو	۱۹۲
محبت اس کے ظرف کے مطابق دی جاتی ہے	۱۹۳
ناشکری اور مایوسی کا شکار ہو جاؤ گے	۱۹۴
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے	۱۹۵
ایک خط اور حضرت والا کا جواب	۱۹۵
خلاصہ	۱۹۶
مجلس نمبر ۸۹	
عبادات میں ذوق شوق مطلوب نہیں	۱۹۹
محبت میں بے چین رہوں	۱۹۹
جواب کچھ اور ہونا چاہئے تھا	۱۹۹
ہر مریض کیلئے علیحدہ نسخہ	۲۰۰
''وارِد'' اللہ کا مہمان ہوتا ہے	۲۰۱
شریعت میں تو ''چین'' مطلوب ہے	۲۰۲
عجیب وغریب جواب	۲۰۳
''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بٹتی	۲۰۴

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ۹۲

عنوان	صفحہ نمبر

خوف اور رجا

مجلس نمبر ۹۳

عنوان	صفحہ نمبر
مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ	۲۸۹

عنوان	صفحہ نمبر

ماضی کا گناہ یاد آنے پر دوبارہ استغفار

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

ماضی کا گناہ یاد آنے

پر دوبارہ استغفار

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا ۔ أَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''توبۃ النصوح کے بعد اگر از خود پُرانا گناہ یاد آجائے تو
تجدید توبہ کر کے پھر کام میں لگ جائے، اس سے زیادہ
کاوش کرنا غلو ہے اور یہ قصد کرنا کہ ذرا بھی کوتاہی نہ
ہونے پائے، یہ ایک قسم کا دعویٰ اور غلو ہے، گو عقلاً محال
نہیں لیکن عادۃً محال ہے، چنانچہ حدیث شریف میں
ہے: سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا

(انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۷)

گناہ یاد آنے پر دوبارہ استغفار کرلو

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ایک بات تو وہ ہے جو تقریباً ہر آدمی کو پیش آتی ہے کہ ایک مرتبہ گناہ سے توبہ کرنے کی توفیق ہوگئی اور توبہ بھی ''توبۃ النصوح'' یعنی مکمل توبہ کرلی، اب توبہ کرنے کے بعد وہ گناہ جس سے توبہ کی تھی، وہ بار بار یاد آتا رہتا ہے اور بار بار ذہن میں اس کا تصور آتا رہتا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ اپنی طرف سے قصد کر کے اور جان بوجھ کر گناہ کو یاد کرنا تو غلط بات ہے، لہٰذا قصداً تو اس گناہ کو یاد نہ کرے اور نہ توبہ کرنے کی غرض سے یاد کرے، کیونکہ ایک مرتبہ اس گناہ سے توبہ کر چکا، اور اگر اس وجہ سے گناہ کو یاد کر رہا ہے کہ اس گناہ کو کرتے وقت نفس کو بڑی لذت حاصل ہوئی تھی، اس وجہ سے گناہ کو یاد کرنا بہت زیادہ خطرناک ہے، لیکن اگر غیر اختیاری طور پر اس گناہ کا خیال آجائے تو اس موقع پر پھر استغفار اور توبہ کی تجدید کرلے اور یہ کہے:

''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ
اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ''

توبہ کرنے کی ایک وجہ

اب سوال یہ ہے کہ دوبارہ توبہ کی تجدید کیوں کر رہا ہے؟ دوبارہ استغفار کیوں کر رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس وجہ سے توبہ کی تجدید کر رہا ہے کہ اس نے سوچا کہ میرے دل میں دوبارہ اس گناہ کا جو تصور اور خیال آ رہا ہے، کہیں اس کے آنے میں میرے اختیار کو کوئی دخل نہ ہو، کیونکہ اگر وہ تصور بے اختیار آ رہا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی مواخذہ نہیں۔ لیکن اگر اس گناہ کے تصور کے آنے میں کچھ اختیار کو بھی دخل ہو تو وہ قابل مواخذہ ہے، اس وجہ سے دوبارہ استغفار اور توبہ کی تجدید کر رہا ہے۔ اس وجہ سے دوبارہ توبہ نہیں کر رہا ہے کہ سابق توبہ کے قبول ہونے کا یقین نہیں ہے، کیونکہ آدمی جب توبہ اور استغفار کرے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی امید رکھنی چاہئے کہ ان شاء اللہ میری توبہ قبول ہوگئی اور اس شک وشبہ کا شکار نہ ہو۔

توبہ کرنے کی دوسری وجہ

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس گناہ کے خیال اور تصور کا بار بار دل میں آنا، یہ کہیں دوبارہ مجھے گناہ کے اندر مبتلا نہ کر دے، اس وجہ سے بھی دوبارہ استغفار اور توبہ کی تجدید کر رہا ہے، کیونکہ استغفار اور توبہ کر لینے سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان شاء اللہ حفاظت رہے گی۔

گناہ ایک بڑی مصیبت ہے

جیسے بزرگ فرماتے ہیں کہ جب مصیبت آئی تھی، اس وقت تو ''إِنَّالِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھ لیا تھا لیکن بعد میں جب کبھی وہ مصیبت دوبارہ یاد آئے تو اس وقت پھر ''إِنَّالِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' کہہ لو۔ اسی طرح گناہ بھی ایک مصیبت ہے اور یہ دنیاوی مصیبتوں سے زیادہ بڑی مصیبت ہے، اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا

یعنی اے اللہ! ہماری مصیبت ہمارے دین میں نہ آئے۔ اگر وہ مصیبت ہماری دنیا پر گزر جائے تو اتنی بڑی مصیبت نہیں، اگرچہ ہم آپ سے اس کی بھی عافیت مانگتے ہیں، لیکن دین پر مصیبت نہ آئے اور گناہ اور معصیت کا ارتکاب دین پر مصیبت ہیں۔ لہٰذا جس طرح مصیبت کے یاد آنے پر ''إِنَّالِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھنے کا حکم ہے، اسی طرح جب گناہ یاد آئے تو دوبارہ توبہ و استغفار کرلو اور کہو:

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ''

گناہ یاد آنے پر پناہ مانگو

ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ استغفار کے ساتھ ساتھ اس گناہ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ بھی مانگو اور کہو کہ یا اللہ! مجھے یہ گناہ کا خیال آ رہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے پھر پھسلا دے اور گناہ کے اندر مبتلا کر دے، یا اللہ! میں آپ

کی پناہ مانگتا ہوں اور یہ کہو:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ

اے اللہ! میں اپنے نفس کے شر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی کیسی دعائیں تلقین فرمادیں کہ دنیا و آخرت کی حاجتوں کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگا نہ ہو۔ ایک دعا میں آپ نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ الشَّیْطٰنِ وَشِرْکِہٖ

اے اللہ! شیطان کے شر سے اور اس کے شرک سے پناہ مانگتا ہوں۔ لہٰذا جب بھی کسی گزشتہ گناہ کا خیال آئے تو اس وقت دوبارہ استغفار کرلو اور پھر ان دعاؤں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لو۔

توبہ پر قائم رہنے کیلئے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو

بندے کا کام یہ ہے کہ اپنی طرف سے قدم بڑھائے اور جتنا اس کے بس میں ہے اتنا کرگزرے، پھر آگے اللہ تعالیٰ کے حوالے کرکے ان سے مدد مانگ لے اور کہے کہ یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا، اب آگے اس کی تکمیل اور اس پر ثابت قدم رکھنا آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے، آپ ہی مجھے اس کی طاقت عطا فرمادیجئے، میں نے تو اپنی طرف سے توبہ کرلی، لیکن اے اللہ! اس توبہ کی تکمیل اور اس توبہ پر قائم رکھنا آپ کی قدرت میں ہے، اپنی رحمت سے مجھے اس پر قائم رکھئے، یہ دو کام کرلو تو بس پھر تم کامیاب ہو۔

دوبارہ توبہ کر کے کام میں لگ جاؤ

اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ ''تجدید توبہ کر کے پھر کام میں لگ جائے، اس سے زیادہ کاوش کرنا غلو ہے''۔ یعنی گناہ کا خیال آنے پر ''استغفر اللہ'' پڑھ کر اپنے کام میں لگ جائے، اس کے بعد یہ کاوش کرنا کہ یہ خیال مجھے کیوں آیا؟ یہ خیال بار بار کیوں آ رہا ہے؟ کہیں میں خبیث تو نہیں ہوگیا ہوں، یا شاید میرے اوپر شیطان کا ایسا داؤ چلا ہوا ہے کہ میں اس کے آگے مغلوب ہوگیا ہوں اور اب میری اصلاح کی کوئی توقع باقی نہیں رہی۔ اس قسم کے خیالات دل میں لانا غلو ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ توبہ کرلو، ہم نے توبہ کرلی، اور جو غیر اختیاری خیالات آ رہے تھے، ان سے بھی توبہ کرلی، اب خواہ مخواہ اس گناہ کو وظیفہ مت بناؤ بلکہ اپنے کام میں لگو، اس سے زیادہ کاوش کرنا غلو ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ:

اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوْا عَلَیْهِ

یعنی اپنے کرنے کا کام اجمالی طور پر کرلو اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔

کمال کے حصول کی فکر مت کرو

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ ''یہ قصد کرنا کہ ذرا بھی کوتاہی نہ ہونے پائے، یہ بھی ایک قسم کا دعویٰ اور غلو ہے۔'' یعنی یہ سمجھنا کہ میں ایسا کامل اور مکمل بن جاؤں کہ ذرا سی بھی اوچھ نہ ہو، ذرا سی بھی کہیں کسر نہ ہو، عبادت ہو تو وہ کامل اور مکمل ہو، اخلاق بھی کامل اور مکمل ہوں،

دین کے ہر معیار پر سو فیصد پورا اتروں۔ یہ فکر بھی اس بات کا دعویٰ ہے کہ میں بڑا اونچا آدمی ہوں کہ اس درجے کے کمال کا طالب ہوں، یہ بھی ایک قسم کا دعویٰ ہے۔ ارے بھائی! سیدھے سادے طریقے سے کام کرو، سو فیصد کمال کی فکر چھوڑو، اس لئے کہ یہ درجہ حاصل ہونا گو عقلاً محال نہیں لیکن عادۃً محال ہے، کیونکہ عقلاً یہ محال نہیں کہ کوئی آدمی پیغمبر جیسا عمل کرنے لگے یا وہ صحابی جیسا عمل کرنے لگے، یہ بات عقلاً محال نہیں لیکن عادۃً محال ہے، اس لئے کہ عادۃً ایسا ہوتا نہیں کہ اس جیسا کمال حاصل ہو جائے۔

سیدھے ہونے کے قریب ہو جاؤ

پھر اس کی دلیل میں یہ حدیث پیش کی کہ حدیث شریف میں فرمایا کہ:

سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا

(بخاری شریف)

اس حدیث میں سب سے پہلے فرمایا: "سَدِّدُوْا" سیدھے ہو جاؤ، یعنی دین کے تمام تقاضوں پر پورے اترو، تب جا کر سیدھے ہو گے ورنہ سیدھے نہیں ہو گے۔ لیکن ساتھ دوسرا لفظ ارشاد فرمایا "وَقَارِبُوْا" یعنی پورا سیدھا ہونا تو بڑا مشکل ہے، لہٰذا قریب آ جاؤ۔ پھر ارشاد فرمایا: "وَاسْتَقِیْمُوْا" یعنی دوبارہ فرمایا کہ سیدھے ہو جاؤ، لیکن یہ بھی فرمایا کہ "وَلَنْ تُحْصُوْا" یعنی پورا سیدھا ہونا تو کبھی نہیں کر سکو گے بلکہ کچھ نہ کچھ کسر رہے گی، لہٰذا جب کسر رہ جائے تو اس پر استغفار کرتے رہو اور توبہ کرتے رہو۔

عبادات کوتاہیوں سے بھری ہوئی ہیں

اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، اعتکاف کرنے، قرآن کریم کی تلاوت کرنے، ذکر کرنے اور تسبیح کرنے کی توفیق عطا فرما دی، لیکن ان عبادتوں میں سے جس عبادت کو بھی دیکھو، وہ کوتاہیوں سے بھری ہوئی نظر آئے گی، کیا ہم نے نماز اسی طرح پڑھی جیسے پڑھنی چاہئے تھی؟ کیا نماز میں جیسا خشوع ہونا چاہئے تھا، ویسا خشوع حاصل ہوا؟ جیسا دھیان نماز میں ہونا چاہئے تھا، ویسا دھیان حاصل ہوا؟ نماز میں اعضاء اور جوارح کو جیسا خضوع حاصل ہونا چاہئے تھا، ویسا خضوع حاصل ہوا؟ جب نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری نماز کوتاہیوں سے بھری ہوئی ہے۔ یا روزہ تو رکھ لیا لیکن جیسا روزہ رکھنا چاہئے ویسا روزہ رکھا؟ جس کمال کا روزہ ہونا چاہئے وہ ہوا؟ جب تلاوت کی تو کیا تلاوت کا حق ادا ہوا؟ حروف کی جیسی ادائیگی ہونی چاہئے تھی، ویسی ادائیگی ہوئی؟ الفاظ کی طرف جیسا دھیان ہونا چاہئے تھا، ویسا دھیان ہوا؟ معانی کی طرف جیسا دھیان ہونا چاہئے تھا، ویسا دھیان ہوا؟ جب نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری عبادات کوتاہیوں سے بھری ہوئی ہیں۔

کوتاہیوں کی وجہ سے مایوس مت ہو جاؤ

اب ایک راستہ تو یہ ہے کہ مایوس ہو کر بیٹھ جاؤ کہ عبادت کا حق ادا کرنا ہمارے بس کا کام نہیں، نہ ہماری نماز اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کے قابل ہے اور نہ روزہ اور نہ تلاوت پیش کرنے کے قابل ہے۔ لیکن حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مایوس ہوکر مت بیٹھ جاؤ، کیونکہ تم مکمل سیدھے نہیں ہوسکوگے، اس لئے جتنا ہوسکے قریب آجاؤ۔

عربی زبان کی وسعت

یہ عربی زبان بھی بڑی عجیب وغریب زبان ہے، اس میں ذرا سے فرق سے معانی تبدیل ہوجاتے ہیں، چنانچہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "قَارِبُوْا" فرمایا جو باب مفاعلہ سے امر کا صیغہ ہے۔ "اُقْرُبُوْا" نہیں فرمایا، اسی طرح "اِقْتَرِبُوْا" نہیں فرمایا۔ دیکھئے: ایک ہوتا ہے "قَرُبَ۔ یَقْرُبُ" جو باب کرم سے ہوتا ہے اور ایک ہوتا ہے "اِقْتَرَبَ یَقْتَرِبُ" جو باب افتعال سے ہوتا ہے، ان کے معنی ہیں، مطلق قریب آنا۔ اور ایک ہے باب مفاعلہ سے "قَارِبُوْا" اس کے معنی میں تدریج کی خاصیت پائی جاتی ہے، لہٰذا ایک مرتبہ قریب آجانے کو "قَارِبُوْا" نہیں کہتے بلکہ اس کے معنی ہیں قریب آجانے کی کوشش کرتے رہنا اور تھوڑا تھوڑا کر کے قرب آنا، مثلاً آج ایک قدم بڑھایا، کل کو دوسرا قدم بڑھایا، پرسوں تیسرا قدم بڑھایا، یہ پورا عمل "مقاربت" کہلاتا ہے۔

زندگی بھر قریب آنے کی کوشش کرتے رہو

لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قَارِبُوْا" یعنی تدریجاً قریب آنے کی کوشش شروع کردو اور قدم بڑھانا شروع کردو یہاں تک کہ ہمارے قریب پہنچ جاؤ۔ اس لفظ میں درحقیقت ایک اشکال کا جواب ہے، وہ

اشکال یہ ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ ہم چاہے جتنی کوشش کر لیں پھر بھی سیدھے نہیں ہو سکتے اور جب سیدھے نہیں ہو سکتے تو پھر سیدھا ہونے کی فکر ہی چھوڑ دیں۔ اس کا جواب اس لفظ سے دیدیا کہ ساری عمر قریب آنے کی کوشش کرتے رہو اور سیدھے ہونے کی کوشش کرتے رہو، پورے سیدھے تو نہیں ہوسکو گے لیکن قریب آ جاؤ گے، لہٰذا اس کوشش کو مت چھوڑنا، تم سے مطالبہ کوشش کرنے کا ہے، تم سے نتیجہ کا مطالبہ نہیں کہ نتیجہ حاصل ہوا یا نہیں؟ کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاؤ۔

ساری عمر تراش خراش کرنی ہے

اس بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

اندریں راہ می تراش و می خراش
تادم آخر دمے فارغ مباش

یعنی اس راستے میں تو ساری عمر تراش خراش کرنی ہی ہے، ہر وقت دھیان اور فکر لگی رہے کہ کہاں غلطی ہو رہی ہے اور پھر ان غلطیوں کو درست کرتا رہے، آخری دم تک ایک لمحہ کے لئے بھی فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا، لہٰذا کوئی یہ نہ سوچے کہ جب بالکل سیدھے نہیں ہو سکتے تو بس جیسے زندگی گزر رہی ہے، گزرنے دو، زیادہ اصلاح کی فکر ہی فضول ہے۔ اس حدیث میں اس سوچ کی تردید فرمادی کہ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ مکمل سیدھے نہیں ہو سکتے، وہ نتیجے کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ نتیجے میں مکمل سو فیصد سیدھے نہیں ہو سکتے لیکن اس کے باوجود کوشش

میں کمی نہیں آنی چاہئے۔

منزل مقصود نہیں کوشش کرنا مقصود ہے

کیونکہ اس راستے میں منزل مقصود نہیں بلکہ کوشش بذات خود مقصود ہے، لگا رہنا مقصود ہے، یہی منزل ہے، لہٰذا نتائج کی پرواہ نہیں کرو بلکہ کوشش میں لگے رہو۔ میں بھی کبھی شعر کہہ دیتا تھا، ایک شعر کہا تھا جو حضرت والا کو بہت پسند تھا، اس میں یہی مضمون ہے:

قدم ہیں راہِ اُلفت میں تو منزل کی ہوس کیسی
یہاں تو عین منزل ہے تھکن سے چور ہو جانا

یہاں تو مقصود ہی یہ ہے کہ آدمی چلتا رہے اور چلتے چلتے تھکن سے چور ہو جائے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (سورۃ الم نشرح)

اس آیت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ جب آپ دوسرے کاموں سے فارغ ہو جائیں تو عبادت کے اندر اپنے آپ کو تھکائیں۔ بہرحال! نتائج حاصل کرنا نہ تمہارے بس کا کام ہے اور نہ ہی تمہارے سوچنے کی چیز ہے بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ منزل کی طرف چلتے رہو، یہ چلنا بذات خود مقصود ہے۔

قدم بڑھاتے چلے جاؤ

لہٰذا فکر نہیں چھوڑنی بلکہ فکر بھی جاری رکھو، کوشش بھی جاری رکھو، البتہ

نتائج سے بے نیاز ہو جاؤ۔ جو طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا اور آپ کے وارثوں نے بتادیا، اس طریقہ پر قدم رکھ کر چلتے جاؤ، منزل پر کب پہنچو گے اور کہاں پہنچو گے؟ اس کی فکر چھوڑ دو۔

بر صراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

جب ''صراطِ مستقیم'' پر قدم رکھ دیا تو اب انشاء اللہ گمراہ نہیں ہو گے۔ لہٰذا جو کام ہو اس کو سنت کے مطابق کرتے جاؤ۔

نماز کی توفیق پر شکر ادا کرو

یہ جو دلوں میں خیالات آتے ہیں کہ میری نماز صحیح نہیں ہے، میرا روزہ صحیح نہیں ہے، یہ سب خیالات اس حد تک تو مفید ہیں کہ ان خیالات کے نتیجے میں تم اپنی نماز کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرو، لیکن ان خیالات کی وجہ سے ان عبادات کی ناقدری مت کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان عبادات کو ادا کرنے کی جو توفیق عطا فرمائی ہے، یہ بھی ان کا کرم ہے، اگر یہ توفیق نہ ملتی تو تم کیا کر لیتے؟ لہٰذا اس توفیق ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور کہو کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے اس عبادت کو انجام دینے کی توفیق عطا فرمادی۔ اے اللہ! آپ کا مجھ پر بڑا شکر اور احسان ہے۔ قرآن کریم کی یہ جو آیت ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ۔ (سورۃ الاعراف: آیت ۴۳)

یعنی تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اس کی ہدایت اور رہنمائی فرمائی، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نہ ملتی تو ہم ہدایت پانے والے نہیں تھے۔ لہٰذا ان نیک اعمال کی توفیق ملنے پر شکر ادا کرو۔

نماز کی کوتاہیوں پر استغفار کرلو

البتہ ہماری عبادات میں، نماز میں، روزے میں بیشک کوتاہیاں بھی ہیں، ان کوتاہیوں کا علاج استغفار ہے۔ لہٰذا جب ان کوتاہیوں پر استغفار کرلو گے تو اس کے نتیجے میں کوتاہیاں مٹ جائیں گی اور صرف عبادت اور نیکی ہی نیکی باقی رہ جائے گی، کیونکہ استغفار نے اس عبادت پر پالش کردی اور اس عبادت پر کوتاہیوں کی جو گندگی لگ گئی تھی، استغفار نے اس کو صاف کردیا۔ قرآنِ کریم میں نیک بندوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَانُوْا قَلِيْلاً مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَ
بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (سورۃ الذاریات: ۱۷۔۱۸)

یعنی رات کو بہت کم سوتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوکر عبادت کرتے تھے اور پھر سحری کے وقت استغفار کرتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا رات کو کوئی گناہ کیا تھا جس سے وہ استغفار کرتے تھے، نہیں، تو پھر وہ استغفار کیوں کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس بات پر استغفار کرتے تھے کہ اے اللہ! رات کے وقت ہم نے عبادت تو کرلی لیکن وہ عبادت آپ کی شایانِ شان نہ ہوئی اور اس عبادت میں بیشمار کوتاہیاں ہوگئیں، بے شمار

غلطیاں ہوگئیں، اے اللہ! ان کوتاہیوں اور غلطیوں کی طرف سے آپ کے حضور استغفار کرتے ہیں۔ اس استغفار کا نتیجہ یہ ہوا کہ رات بھر جو عبادت کی تھی، اس عبادت میں جو مختلف کوتاہیاں اور خرابیاں ہوگئی تھیں اور ان کوتاہیوں کی وجہ سے اس عبادت پر جو میل کچیل آ گیا تھا، آخر میں استغفار کر کے اس میل کچیل کو دور کر دیا اور اس کی فنیشنگ کر دی اور پالش کر دی، اب وہ عمل اس قابل ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں انشاء اللہ قبول ہوگا۔ لہٰذا ہر عمل کے بعد اس عمل کی توفیق ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اس عمل میں کوتاہی ہو جانے پر استغفار کرو، جب یہ دو کام کر لوگے تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو جائے گا۔

عبادت کی توفیق قبولیت کی علامت ہے

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ معلوم نہیں ہماری نماز قبول بھی ہے یا نہیں؟ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ دل میں یہ کھٹکا رہنا چاہئے اور ڈر رہنا چاہئے، اس لئے کہ ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ کرتا رہے اور ڈرتا رہے، لیکن ہمارے بزرگوں نے یہ فرمایا کہ جب ایک عمل کرنے کے بعد اسی عمل کو دوبارہ کرنے کی توفیق مل جائے تو سمجھ لو کہ پہلا عمل اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا، اگر پہلا عمل قبول نہ ہوتا تو دوسری بار اس عمل کی توفیق نہ ملتی، مثلاً ایک نماز ادا کی اور اس کے بعد دوبارہ نماز پڑھنے کی توفیق مل گئی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ پہلی نماز اللہ تعالیٰ کے

یہاں قبول ہوگئی۔ یا ایک روزہ رکھنے کے بعد دوسرا روزہ رکھنے کی توفیق ہوگئی تو یہ پہلے روزے کی قبولیت کی علامت ہے، لیکن ہر عمل کے بعد اس کے عدم قبولیت سے ڈرو اور ہر عمل کے بعد یہ کہو: الحمدللہ، استغفراللہ، اس کے نتیجے میں مزید عبادت کی توفیق مل جائے گی۔ بس ساری عمر یہ کرنا ہے کہ اپنی سی کوشش کئے جاؤ، کوشش میں کمی نہ کرو اور جو کوتاہیاں ہوں ان پر استغفار کئے جاؤ، انشاء اللہ منزل تک پہنچ جاؤ گے۔

آگے ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

> جب تک صاحبِ عمل کو اس سے اندیشہ ہوتا رہے کہ مبادا کہیں نفس کا شائبہ نہ ہوگیا ہو، حفاظت خداوندی اس کی رفیق رہتی ہے لیکن تدارک بالاستغفار کرتے رہنا چاہئے۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۸)

دین دونوں کے درمیان ہے

وہی بات بیان فرما رہے ہیں جو میں نے ابھی عرض کی کہ یہ راستہ بھی عجیب وغریب قسم کا ہے کہ بظاہر اس میں بعض باتیں متضاد معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں متضاد نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک طرف یہ حکم ہے کہ عمل کرتے رہو اور عمل سے مایوسی نہ ہو بلکہ عمل پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ ان کی توفیق سے یہ عمل میں نے انجام دیدیا اور اس عمل کی تحقیر مت کرو کہ یہ عمل کیا ہے یہ تو ٹکریں مارنا ہے وغیرہ۔ دوسری طرف یہ بھی حکم ہے کہ اس عمل پر عجب بھی نہ ہو اور عمل کے بعد دماغ میں یہ گھمنڈ نہ ہو کہ ہم نے تو بڑا کام کرلیا اور اس کے نتیجے میں عجب

کے اندر مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اللہ والا سمجھنے لگے وغیرہ۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کو ان دونوں باتوں کے درمیان رہنا چاہئے۔

عمل کے بعد ڈرتے رہو

لہٰذا ایک طرف عمل بھی کرو اور دوسری طرف دل میں یہ اندیشہ بھی رہے کہ میرے کسی نفسانی شائبہ سے کہیں یہ عمل خراب نہ ہو گیا ہو۔ اسی بات کو ہمارے بزرگوں نے دو لفظوں میں بیان فرما دیا کہ عمل کرتا رہے اور ڈرتا رہے، جب تک یہ فکر اور اندیشہ رہے گا، اس وقت تک حفاظت خداوندی اس کی رفیق رہے گی، اور ساتھ میں اس اندیشے کا تدارک بالاستغفار کرتے رہنا چاہئے کہ اے اللہ! میں نے یہ عمل تو کر لیا لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میرے کسی نفسانی شائبہ سے کہیں یہ عمل خراب نہ ہو گیا ہو، اے اللہ! اس نفسانی شائبہ سے استغفار کرتا ہوں۔ لہٰذا نہ تو اس عمل سے مایوس ہو اور نہ گھمنڈ میں مبتلا ہو، دونوں باتیں غلط ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب بات ارشاد فرمائی جو یاد رکھنے کے قابل ہے، فرمایا کہ جو شخص عمل کر کے یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کا یہ عمل اس کو جنّت میں لے جائے گا تو وہ فضول محنت کر رہا ہے، اور جو شخص عمل کئے بغیر یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جنّت میں چلا جائے گا تو وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ

انسان عمل تو کرے لیکن اس عمل پر بھروسہ نہ ہو بلکہ بھروسہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو کھینچنے اور دعوت دینے والا یہی عمل ہے، لہٰذا اس عمل کو تو بیکار نہ سمجھے بلکہ عمل کرے، لیکن ساتھ ساتھ اس عمل پر یہ بھروسہ نہ ہو کہ یہ عمل اس کو جنّت میں لے جائے گا جب تک اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال نہ ہو۔

کوئی عبادت اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں

اس لئے کہ تم وہ عمل چاہے کتنا ہی اچھے سے اچھا کرلو لیکن پھر بھی وہ عمل اللہ تعالیٰ کی شایانِ شان نہیں ہوسکتا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ماعبدناك حق عبادتك ماعرفناك حق معرفتك

ہم تیری عبادت نہ کرسکے کہ تیری عبادت کا حق ہے اور
ہم تجھے نہ پہچان سکے جیسا کہ تجھے پہچاننے کا حق ہے۔

لہٰذا کسی عمل میں بذات خود یہ صلاحیت نہیں کہ وہ انسان کو جنّت کا مستحق بنادے، کیونکہ جو تم نے عمل کیا ہے، کیا وہ عمل اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کے لائق ہے؟ چاہے وہ عمل کتنا ہی بنا سنوار کر کرلو، سو فیصد خشوع خضوع کے ساتھ کرلو، پھر بھی وہ عمل اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کے لائق نہیں۔

عبادت کی توفیق اور اعضاء کس نے دیے؟

کیونکہ یہ دیکھو کہ اس عمل کے کرنے کی توفیق کس نے دی؟ جس ہاتھ

پاؤں کے ذریعہ تم نے وہ عمل کیا، وہ ہاتھ پاؤں کس نے دیے؟ وہ اعضاء و جوارح کس نے دیے؟ اگر تم نے ذکر کا عمل کیا تو جس زبان کے ذریعہ تم نے ذکر کیا وہ زبان کس نے عطا فرمائی؟ اس زبان میں گویائی کس نے بخشی؟ یہ سب تو انہیں کا دیا ہوا ہے، پھر کیا ان کی بارگاہ میں پیش کر رہے ہو؟ بلکہ ان ہی کی دی ہوئی چیز ان کی بارگاہ میں پیش کر رہے ہو۔

ایک دیہاتی کا واقعہ

ہمارے اعمال کی مثال تو دیہاتی کے پانی کے مٹکے کی طرح ہے کہ ایک دیہاتی نے بادشاہ سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا، اس نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا کہ بادشاہ کے لئے کیا تحفہ لے جاؤں؟ بیوی نے مشورہ دیا کہ ہمارے گاؤں سے جو نہر جارہی ہے، اس کا پانی بہت میٹھا اور صاف شفاف ہے، بادشاہ کو شہر میں ایسا پانی کہاں نصیب ہوگا، اس لئے تم ایک مٹکا پانی کا بھر کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرو۔ اس دیہاتی کو یہ بات سمجھ میں آگئی، اس نے ایک مٹکا لیا اور اس کو پانی سے بھر کر سر پر اٹھایا اور بغداد کی طرف پیدل سفر شروع کر دیا۔ اب راستے میں دھول مٹی اس مٹکے کے اندر اور باہر پڑتی رہی، جب کئی دن کے سفر کے بعد وہ بغداد پہنچا تو اس پانی کے اوپر مٹی کی تہہ جم گئی، چنانچہ وہ بادشاہ کے محل پر پہنچا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور جب ملاقات ہوئی تو اس دیہاتی نے پانی کا مٹکا پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضور! یہ میرے گاؤں کی نہر کا صاف اور میٹھا پانی ہے جو میں آپ کے لئے تحفہ لایا ہوں، بادشاہ نے جب وہ

پانی دیکھا تو اس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اور اس میں سے بدبو اٹھ رہی تھی۔

لیکن بادشاہ نے یہ سوچا کہ اگر میں نے اس کو لوٹا دیا تو اس کا دل ٹوٹے گا، یہ بیچارہ اتنی دور سے محنت مشقت برداشت کر کے لایا ہے، اس لئے بادشاہ نے اس کی تعریف کی اور کہا کہ تم بہت اچھا تحفہ لائے ہو، چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کا مٹکا سونے اور چاندی سے بھر کر واپس کیا جائے، پھر بادشاہ نے حکم دیا کہ اس دیہاتی کو دریا دجلہ کے پاس سے واپس لے جانا تاکہ اس کو پتہ چلے کہ یہاں پر اس سے اچھا پانی میسّر ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں ہے، جب اس دیہاتی کو دریائے دجلہ کے پاس سے گزارا گیا تو اس دریا کو اور اس کے پانی کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہاں تو بادشاہ کے بالکل قریب اتنا شیریں اور صاف شفاف پانی موجود ہے، اس کے باوجود بادشاہ نے محض اپنی عنایت سے میرا مٹکا نہ صرف قبول کر لیا بلکہ اس کے بدلے سونا چاندی بھی عطا کیا۔

خلوص ومحبّت کا جواب

یہ واقعہ بیان کر کے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حقیقت میں وہ دیہاتی سزا کے لائق تھا کہ اتنی دور سے پانی لایا اور وہ بھی گدلا اور مٹی سے اٹا ہوا کیا وہ پانی اس لائق تھا کہ بادشاہ کو پینے کے لئے پیش کیا جائے؟ لیکن بادشاہ نے اس پانی کے گدلے اور خراب ہونے کو نہ دیکھا بلکہ اس دیہاتی کے دل کے اخلاص کو دیکھا کہ یہ دیہاتی اگرچہ فضول چیز لایا ہے لیکن خلوص کے ساتھ لایا ہے، محبّت سے لایا ہے، اس کے اس خلوص اور محبّت کا جواب یہ ہے کہ

اس کے مٹکے کو سونے چاندی سے بھر کر واپس کیا جائے۔

ہماری عبادات کے جواب میں مغفرت

جب دنیا کا ایک معمولی بادشاہ ایک انسان کے اخلاص کی قدر کرتا ہے تو بادشاہوں کے بادشاہ اور احکم الحاکمین کے دربار میں ہم جو عبادات پیش کرتے ہیں، وہ اس دیہاتی کے پانی کے مٹکے سے زیادہ بے حقیقت ہیں، ان عبادات کی حقیقت تو یہ تھی کہ اس پر الٹی سزا دی جاتی کہ تو ہمارے دربار میں جو عبادت پیش کر رہا ہے، وہ ہمارے دربار کے لائق نہیں ہے، لیکن اللہ جل شانہ اپنے فضل وکرم سے یہ دیکھتے ہیں کہ اس بندے نے خلوص کے ساتھ جو عبادت اس کے بس میں تھی وہ اس نے انجام دیدی، اب ہم اس کے مٹکے کو سونے سے بھر کر واپس کریں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ (سورۃ الفرقان: آیت ۷۰)

یعنی اللہ تعالیٰ ان کی سیئات کو بھی حسنات سے تبدیل فرمادیں گے۔

خلاصہ

بہر حال! خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو اپنے عمل پر ناز ہو اور نہ ہی اپنے عمل سے بے نیازی ہو بلکہ عمل کرتا بھی رہے اور ساتھ میں ڈرتا بھی رہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی مغفرت بھی طلب کرتا رہے، بس یہ کام کرتا رہے تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس کو منزل تک پہنچا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اور اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ٦

مجلس نمبر : ۸۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَ نُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا ۔ مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشۡھَدُاَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَأَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُہٗ وَ رَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا ۔ أَمَّا بَعۡدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

اعمال صالحہ یا توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر حقوق معاف نہیں ہوتے، پس جس قدر ہو سکے ادا

کرے اور سب کے ادا کا عزم رکھے۔ اگر کچھ باقی رہ گئے اور مرگیا تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس کو بری الذمہ کردیں گے یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کو خوش کرکے ظالم کی مغفرت فرمادیں گے۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۸)

گناہ صغیرہ سے معافی کا طریقہ

اس ملفوظ میں حضرت والا نے پہلی بات تو یہ بیان فرمائی کہ اعمال صالحہ یعنی نیک اعمال سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور توبہ سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ نیک اعمال سے صرف گناہ صغیرہ معاف ہوتے ہیں اور توبہ سے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ گناہ صغیرہ کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکیوں کی بدولت خود بخود ان کو معاف فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی وضو کرتا ہے تو وضو کے دوران جب وہ ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھ سے کئے ہوئے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جب چہرہ دھوتا ہے تو آنکھوں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں سے چل کر جس گناہ کی طرف گیا تھا، وہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان احادیث میں گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اس طرح معاف فرماتے رہتے ہیں۔

عبادات سے گناہ صغیرہ معاف ہو جاتے ہیں

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آدمی نماز کے لئے مسجد کی طرف

چلتا ہے تو ہر ہر قدم پر اللہ تعالیٰ گناہ معاف فرماتے ہیں۔ اس سے بھی مراد صغیرہ گناہ ہیں، اسی طرح نماز پڑھنے سے بھی صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ سے بڑی سخت غلطی ہوگئی ہے، پھر ایک گناہ صغیرہ کو بیان کیا کہ مجھ سے یہ گناہ ہوگیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ کیا تم نے اس گناہ کے بعد ہمارے ساتھ مسجد میں نماز نہیں پڑھی؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! نماز تو پڑھی ہے، فرمایا کہ بس تمہارا وہ گناہ اس نماز پڑھنے سے معاف ہوگیا۔ پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۔ (سورۃ الهود: آیت ۱۱۴)

یعنی نیکیاں بُرائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ جب انسان کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے صغیرہ گناہ معاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا یہ خودکار نظام بنا دیا ہے کہ صغیرہ گناہ خود بخود معاف ہوتے چلے جاتے ہیں، مگر یہ سب صغیرہ گناہوں کے بارے میں ہے۔

گناہ کبیرہ کیلئے توبہ ضروری ہے

کبیرہ گناہ کے بارے میں قانون یہ ہے کہ وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، یوں اللہ تعالیٰ کسی پر اپنا فضل فرما دیں اور بغیر توبہ کے معاف فرما دیں تو ان کو کون روکنے والا ہے لیکن قانون اور اصول یہ ہے کہ کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے

معاف نہیں ہوتے۔ اس ملفوظ میں حضرت والا نے یہ جو فرمایا کہ اعمال صالحہ یا توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمال صالحہ سے صغیرہ گناہ اور توبہ سے کبیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

حقوق العباد اور بعض حقوق اللہ محض توبہ سے معاف نہیں ہوتے

آگے فرمایا کہ ''مگر حقوق معاف نہیں ہوتے'' حقوق سے ایک تو حقوق العباد مراد ہیں اور دوسرے وہ حقوق اللہ مراد ہیں جن کی تلافی ممکن ہو، مثلاً نمازیں چھوٹ گئی ہیں اور آدمی تندرست ہے، ان نمازوں کی قضا کر سکتا ہے، لہٰذا نمازیں معاف نہیں ہوں گی۔ یا مثلاً زکوٰۃ واجب ہوئی اور اب تک زکوٰۃ ادا نہیں کی تو وہ زکوٰۃ معاف نہیں ہوگی، حج واجب ہوگیا تھا، ادا نہیں کیا تو وہ حج معاف نہیں ہوگا، روزے واجب ہو گئے تھے ادا نہیں کیے، وہ معاف نہیں ہوں گے۔ بہرحال! توبہ کے ذریعہ وہ حقوق اللہ جن کی تلافی ممکن ہے وہ معاف نہیں ہوتے اور توبہ کے ذریعہ حقوق العباد معاف نہیں ہوتے جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے یا اس کا حق ادا نہ کر دیا جائے۔

تمام سابقہ حقوق واجبہ کی ادائیگی شروع کردیں

حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اگر آدمی توبہ کر لینے کے بعد یہ سمجھ لے کہ بس، میرا مقصد حاصل ہوگیا، اب مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ خیال بالکل غلط اور دھوکہ ہے، بلکہ توبہ کر لینے کے بعد یہ دیکھو کہ کیا کیا حقوق میرے ذمے واجب ہیں، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ہوں یا بندوں کے حقوق ہوں،

توبہ کر لینے کے بعد ان حقوق کو ادا کرنے کی فکر شروع کرو۔ جس کا طریقہ میں نے توبہ کا بیان شروع کرتے وقت عرض کیا تھا کہ آدمی ایک کاپی بنالے اور اس کاپی کے اندر یہ لکھے کہ میرے ذمے فلاں فلاں حقوق ہیں، میرے ذمے اتنی نمازیں باقی ہیں، اتنے روزے باقی ہیں، اتنی زکوٰۃ باقی ہے، فلاں فلاں لوگوں کے قرضے باقی ہیں، آج سے میں ان کی ادائیگی شروع کر رہا ہوں، اگر مکمل ادائیگی سے پہلے میرا انتقال ہو جائے تو میرے ترکہ سے ان عبادات کا فدیہ اور قرضہ ادا کر دیا ہے۔

اگر تمام حقوق کی ادائیگی سے پہلے موت آ گئی

اب اگر اس شخص نے ان نمازوں کو ادا کرنا شروع کر دیا، روزوں کو اور زکوٰۃ کو ادا کرنا شروع کر دیا، لوگوں کے جو حقوق واجب تھے ان کی ادائیگی کی فکر شروع کر دی اور کوشش شروع کر دی تو اس شخص کے بارے میں حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اگر وہ شخص اس کوشش کے دوران مر گیا یعنی ابھی ساری عباداتِ سابقہ ادا نہیں ہوئی تھیں ابھی تمام حقوق کی ادائیگی کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ اس سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دیں گے اور معاف کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ جن بندوں کے حقوق اس کے ذمے واجب تھے، ان بندوں سے فرمائیں گے کہ یہ میرا بندہ ہے، اس نے حقوق ادا کرنے شروع کر دیے تھے اور اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی لیکن اس کی عمر ختم ہو گئی تھی جس کی وجہ سے پورے حقوق ادا

نہیں کر سکا، لیکن چونکہ اس نے اخلاص کے ساتھ ادائیگی شروع کر دی تھی، اس لئے اب ہم اور بڑی نعمتیں دے کر تمہیں راضی کر دیتے ہیں، لہٰذا اس کے حقوق معاف کر دو۔

حقوق کی معافی کا راستہ

حضرت والا نے یہاں اس ملفوظ میں یہ بات اختصار کے ساتھ بیان فرمائی ہے، لیکن ایک وعظ میں حضرت والا نے یہ بات تفصیل سے بیان فرمائی ہے، چنانچہ آپ نے وہاں پر یہ بیان فرمایا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حقوق العباد کی معافی کا کوئی راستہ نہیں جب تک ان حقوق کو یا تو ادا نہ کر دیا جائے یا صاحب حق سے معاف نہ کرالیا جائے۔ اس غلط فہمی کے نتیجے میں بعض اوقات لوگوں میں مایوسی پیدا ہو جاتی ہے کہ میرے ذمے اتنے سارے لوگوں کے حقوق واجب ہیں، اگر آج سے میں نے ان حقوق کو ادا کرنا شروع بھی کر دیا تو بھی ساری عمر کھپا دوں گا، تب بھی تمام حقوق ادا نہیں کر سکوں گا، اور جب دل میں مایوسی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر جو کچھ تھوڑے بہت حقوق ادا کر سکتا تھا، اس سے بھی رک جاتا ہے۔

مایوس ہونا ٹھیک نہیں

اس لئے ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق تو یہ تھا کہ:

سوئے نو امیدی مرو امید ھاست

سوئے تاریکی مرو خورشید ھاست

یعنی نا امیدی اور ظلمت و تاریکی کا کوئی راستہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے امید کے راستے رکھے ہیں۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ حقوق العباد کی معافی کا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ جب اللہ کا ایک بندہ حقوق العباد ادا کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا اور حقوق ادا کرنے شروع کر دیے، اپنی سی کوشش صرف کر دی، اس دوران اس کا انتقال ہوگیا تو اللہ تعالیٰ اصحاب حقوق کو راضی فرما دیں گے۔

سو انسانوں کے قاتل کا واقعہ

اس بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مشہور واقعہ سے استدلال فرمایا جو حدیث شریف میں آتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت میں ایک شخص قاتل تھا، اس شخص نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا، ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا کہ یا اللہ! میں نے یہ کیا کر دیا، ایک انسان کی جان لینا ایسا ہے جیسے پورے عالم انسانیت کی جان لے لینا اور قتل نفس کی جو سزا قرآن کریم نے بیان کی ہے، دوسرے کسی گناہ کے لئے ایسی سزا بیان نہیں فرمائی، چنانچہ فرمایا:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّداً فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ○ (سورۃ النسا: آیت ۹۳)

یعنی جو شخص جان بوجھ کر کسی مؤمن کو قتل کرے، تو اس کی سزا جہنم ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی

اوراس کے لئے اللہ تعالیٰ نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہ الفاظ کفر کے علاوہ اور قتل نفس کے علاوہ کسی اور گناہ کے لئے بیان نہیں فرمائے۔

سو کا عدد پورا کر دیا

بہر حال ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد اس کو فکر ہوئی کہ اب میں کیا کروں، چنانچہ وہ ایک عیسائی پادری کے پاس چلا گیا اور اس سے جا کر کہا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں، میری نجات کا کوئی راستہ بتاؤ۔ پادری نے کہا کہ تیری نجات کا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ ایک آدمی کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے، تو نے تو ننانوے انسانوں کو قتل کر دیا، لہٰذا تیری نجات کا تو کوئی راستہ نہیں، تو تو جہنمی ہے۔ اس شخص کو بڑا غصہ آیا کہ میں تو نجات کا راستہ پوچھنے آیا اور یہ کہتا ہے کہ کوئی راستہ نہیں، اس نے سوچا کہ ننانوے قتل تو کر دیے ہیں، ایک اور سہی تاکہ سو کا عدد پورا ہو جائے، چنانچہ اس نے اس پادری کو بھی قتل کر دیا۔

پھر کسی اور راہب کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں نے سو انسانوں کو قتل کر دیا ہے، میری نجات کا کوئی راستہ بتاؤ۔ اس راہب نے کہا کہ تم توبہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور ایسا کرو کہ فلاں بستی کے لوگ بہت نیک ہیں، تم اس بستی میں جا کر رہو۔ اس راہب کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ شخص اس بستی میں رہے گا تو نیک لوگوں کی صحبت حاصل ہوگی، اس کے ذریعہ اس کے حالات درست ہو جائیں گے اور جو گناہ اس نے کئے ہیں، اس کی تلافی کی کوشش کرے گا، چنانچہ یہ شخص اس بستی کی طرف چل پڑا۔

رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا

ابھی راستے میں یہ تھا کہ اس کی موت آ گئی اور اس کا انتقال ہو گیا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس کے بارے میں ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے درمیان جھگڑا ہو گیا، ملائکہ عذاب نے کہا کہ یہ شخص سو قتل کر کے آیا ہے، لہٰذا یہ ہمارا آدمی ہے، اس کو ہم جہنم میں لے جائیں گے۔ ملائکہ رحمت نے کہا کہ یہ شخص توبہ کر کے نیک بننے کے لئے چل پڑا تھا، لہٰذا یہ ہمارا آدمی ہے، ہم اس کو جنت میں لے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

جب یہ دونوں جھگڑنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ جہاں سے یہ شخص چلا تھا، اس کی پیائش کرو اور جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس کی پیائش کرو اور یہ دیکھو کہ موت کے وقت کونسی جگہ سے قریب تھا؟ جس بستی سے روانہ ہوا، اس سے قریب تھا یا جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس سے قریب تھا؟ پھر جس بستی سے یہ شخص قریب ہو، اسی کا معاملہ کرو۔

چنانچہ دونوں طرف کے راستوں کی پیائش کی گئی تو وہ جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس طرف ایک گز زیادہ قریب تھا، گویا کہ آدھے راستے سے ایک گز آگے بڑھ گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اس شخص کو رحمت والے فرشتوں کے حوالے کر دیا جائے۔

اس واقعہ سے حضرت تھانویؒ کا استدلال

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے استدلال فرمایا کہ اس شخص نے جو سو قتل کئے تھے، وہ حقوق العباد سے متعلق تھے، لیکن چونکہ وہ شخص حقوق العباد کی ادائیگی کا عزم کرکے چل پڑا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ اس نے شخص کی توبہ قبول فرمالی اور اس کو بخش دیا۔اور جہاں تک تعلق ہے ان بندوں کا جن کو قتل کیا تھا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان مقتولین کے درجات بلند کرکے ان کو راضی کر دیں گے۔

پیمائش کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ جو حکم فرمایا کہ دونوں طرف کے راستوں کی پیمائش کرو اور دیکھو کہ کونسی بستی زیادہ قریب ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا تو پیمائش کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ فرض کرو کہ اگر اس شخص کی موت ایک دو گز پہلے آجاتی تب بھی تو اس نے توبہ کا ارادہ کر ہی لیا تھا اور اپنی سی کوشش شروع کر دی تھی، لہٰذا پیمائش کرانے اور قریب اور دور ہونے کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ اشکال میرے ذہن میں بہت عرصے سے تھا اور میں اس تلاش میں تھا کہ اس کا جواب کہیں مل جائے۔

حقوق العباد کی ادائیگی کیلئے اپنی طرف سے قدم بڑھانا شرط ہے

بعد میں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اس کا یہ جواب ڈالا کہ اللہ تعالیٰ کے پیائش کرانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ پیائش کرانے کے بعد فیصلہ فرمائیں گے، بلکہ اس کی معافی کا فیصلہ تو پہلے ہی فرما چکے تھے، اس پر نوازش ہو چکی تھی، لیکن بندوں کو یہ بتانے کے لئے پیائش کی گئی کہ یہ معافی کا معاملہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی اصلاح کے راستے پر معتد بہ راستہ چل پڑا ہو، یہ نہیں کہ کسی نے اپنی اصلاح کا اور تبدیلی لانے کا چھوٹا موٹا ارادہ کرلیا، پھر سستی کے عالم میں پڑا رہا، اس کے ساتھ معافی کا معاملہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس واقعہ کے ذریعہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اصلاح کا ارادہ کرنے کے بعد معتد بہ قدم اٹھنے چاہئیں، معتد بہ راستہ قطع ہونا چاہئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت آئیگی۔ یہ نہ ہو کہ کسی کے وعظ و تقریر میں نصیحت کی بات سن لی اور ارادہ کرلیا کہ اس نصیحت پر ضرور عمل کریں گے، لیکن کیا کچھ نہیں، تو ایسے ارادے کا کوئی اعتبار نہیں۔ لہٰذا بندوں پر یہ بات ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اس زمین کی پیائش کرو اور یہ دیکھو کہ اس نے معتد بہ راستہ قطع کرلیا تھا یا نہیں؟ جب پیائش کے بعد پتہ چل گیا کہ اس شخص نے معتد بہ راستہ طے کرلیا تھا، تب اس کی معافی کا فیصلہ فرمایا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ گناہ صغیرہ کی معافی کا راستہ اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ کو بنا

دیا ہے اور وہ گناہ کبیرہ جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور جن کی تلافی ممکن نہیں، ان کی معافی کے لئے توبہ ہے اور وہ گناہ کبیرہ جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے یا ان حقوق اللہ سے ہے جن کی تلافی ممکن ہے، ان کی معافی کا راستہ یہ ہے کہ اہتمام کرکے ان کی ادائیگی شروع کر دے اور ساتھ میں وصیّت بھی کر دے کہ اگر میں ان کو مکمل نہ کرسکا تو میرے ترکہ میں سے ان عبادات کا فدیہ اور قرضہ ادا کر دیا جائے۔ جب یہ سب کرلیا تو بندے نے اپنے حصّے کا کام کرلیا، اب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اس کا بیڑہ پار کر دیں گے۔

گناہ کا تقاضہ گناہ نہیں

آگے ایک ملفوظ میں حضرت والاؒ نے ارشاد فرمایا:

> امور طبعیہ پر مؤاخذہ نہیں بلکہ ان کے مقتضاء پر عمل کرنے سے مؤاخذہ ہوتا ہے، وہ بھی اس وقت جبکہ عمداً اس پر عمل کیا جائے، اور اگر طبعی ناگواری سے مغلوب ہوکر کسی وقت کوئی کلمہ بیجا زبان سے نکل جائے اور بعد میں اس سے معذرت کرلی جائے تو حق تعالیٰ اس کو معاف فرمائیں گے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۹۸)

اس ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بہت اہم اصول بیان فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ گناہوں کا صدور یا تو طبعی داعیہ اور محرکات کے ذریعہ ہوتا ہے یا انسان کے اندر جو اخلاق رذیلہ ہوتے ہیں وہ انسان کو گناہ پر

آمادہ کرتے ہیں۔ اب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف گناہ کے داعیے اور تقاضے کا دل میں پیدا ہو جانا ہی گناہ ہے۔ حضرت والا اس غلط فہمی کو دور فرما رہے ہیں کہ محض تقاضہ کا دل میں پیدا ہو جانا گناہ نہیں جب تک انسان اس تقاضے پر عمل نہ کرے۔

غصّہ کا علاج سب سے مقدم

مثلاً غصہ کرنا بُرا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہے کہ تصوّف اور طریقت میں سب سے پہلے اس کا علاج کیا جاتا ہے، یہ غصہ انسان کے باطن کو بالکل تباہ کرنے والا ہے، اس لئے جب کوئی اللہ کا بندہ اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو پہلے قدم کے طور پر اس کے غصّے کی اصلاح کی جاتی ہے تا کہ اس کا غصہ قابو میں آجائے۔

غصّہ اور شہوت کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے

اب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غصّے کا دل میں پیدا ہونا ہی گناہ ہے۔ حضرت والا فرما رہے ہیں کہ محض غصہ کا دل میں پیدا ہو جانا گناہ نہیں بلکہ گناہ اس وقت ہوگا جب اس غصہ کے تقاضے پر عمل کر کے کسی کے ساتھ زیادتی کرو گے۔ اسی طرح شہوت ہے، شہوت کے خیال کا دل میں خود بخود پیدا ہو جانا گناہ نہیں، لیکن اگر اس خیال کو جان بوجھ کر پیدا کرے گا یا اس خیال کو جان بوجھ کر باقی رکھے گا یا اس شہوت کے تقاضے پر کوئی ایسا عمل کر گزرے گا جو شرعاً ناجائز ہے تو گناہ گار ہوگا، مثلاً شہوت کا خیال آنے کے نتیجے میں نگاہ غلط جگہ پر ڈال

دی تو اب وہ گناہ گار ہوگا۔ سارے امراض باطنہ اور رذائل کا یہی معاملہ ہے۔

حسد کے تقاضے پر عمل کا گناہ ہے

مثلاً ''حسد'' ہے، آپ کے دل میں کسی شخص کی طرف سے حسد ہے، اب اس کے بارے میں کسی اچھائی کی خبر سن کر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ کیوں آگے بڑھ گیا؟ اس کے پاس پیسے کیوں زیادہ آگئے؟ اس کے پاس دولت کیوں زیادہ ہوگئی؟ اس کی شہرت کیوں زیادہ ہوگئی؟ لوگ اس کو کیوں زیادہ ماننے لگے؟ وغیرہ۔ صرف دل میں اس خیال کا پیدا ہوجانا یہ گناہ نہیں، کیونکہ یہ خیال غیر اختیاری طور پر دل میں پیدا ہوا ہے، یہ خیال اس وقت گناہ بنے گا جب تم اس خیال کے آنے کے نتیجے میں اس شخص کے ساتھ کوئی بدسلوکی کروگے، مثلاً آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ فلاں شخص مجھ سے آگے بڑھ گیا، یہ تو بہت بُرا ہوا، اب تم نے سوچا کہ کوئی ایسا کام کرو کہ اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے، مثلاً اس کی چغلی کرو، لوگوں کے سامنے اس کی بُرائی بیان کرو، اس کی غیبت کرو، تو ان کاموں کے کرنے کے نتیجے میں وہ حسد گناہ بن جائے گا، محض دل میں خیال آجانے سے گناہ نہیں بنتا۔

حسد کے دو علاج

البتہ ''حسد'' کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے دل میں دوسرے کی بُرائی کا خیال آرہا ہو، اس کو فوراً دو کام کرنے

چاہئیں ورنہ وہ حسد کے نتیجے میں گناہ کے اندر مبتلا ہو جائے گا۔ ایک کام یہ کرے کہ اس خیال کو دل میں بُرا سمجھے کہ میرے دل میں یہ جو خیال آ رہا ہے، یہ بہت برا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرے کہ یا اللہ! یہ بُرا خیال میرے دل سے نکال دیجئے۔ دوسرا کام یہ کرے کہ جس شخص کی طرف سے یہ بُرا خیال آ رہا ہے، اس کے حق میں دعائے خیر کرے، مثلاً آپ کے دل میں اس بات کا دکھ ہو رہا ہے کہ فلاں شخص مجھ سے آگے کیوں نکل گیا، اس کے لئے یہ دعا کرے کہ یا اللہ! اس کو اور ترقی عطا فرما۔ جب تم یہ دعا کرو گے تو دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ آرے چلانے مقصود ہیں تاکہ اس بیماری کا علاج ہو۔ اگر اس کی دولت کی وجہ سے اس پر حسد ہو رہا تھا تو اس کے لئے یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور دولت عطا فرما۔ اگر اس کے منصب کی وجہ سے حسد ہو رہا تھا تو یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور بڑا منصب عطا فرما۔ اس کو اور زیادہ ترقی عطا فرما، لہٰذا جس چیز کی وجہ سے حسد ہو رہا تھا، اس کی زیادتی کی دعا کرے، جب حسد پیدا ہو تو فوراً یہ دو کام کرے ورنہ یہ حسد کسی نہ کسی وقت آدمی کو تباہ کر دے گا۔

بہرحال! جتنے بھی بُرے اخلاق ہیں، ان سب کا اصول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں بیان فرمایا کہ "محض امور طبعیہ پر مؤاخذہ نہیں، بلکہ ان کے مقتضاء پر عمل کرنے سے مؤاخذہ ہوتا ہے"۔ پھر فرمایا کہ "وہ بھی اس وقت جب کہ عمداً اس پر عمل کیا جائے۔

طبعی ناگواری سے مغلوب ہو کر زبان سے نکلنے والے کلمات

آگے بڑی چھوٹ والی بات ارشاد فرمادی کہ "اگر طبعی ناگواری سے مغلوب ہو کر کسی وقت کوئی کلمہ بیجا زبان سے نکل جائے اور بعد میں اس سے معذرت کرلی جائے تو حق تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے"۔ یعنی ویسے تو غصہ قابو میں آگیا ہے اور کسی شخص کی صحبت کے نتیجے میں اور اس کے آگے رگڑے کھانے کے نتیجے میں طبیعت میں ایک اعتدال پیدا ہونے لگا اور غصہ قابو میں آنے لگا، لیکن پھر بھی کسی کسی وقت وہ غصہ بے قابو ہو جاتا ہے، جیسے کسی بات پر ناگواری پیدا ہوئی، اس کے نتیجے میں ایک دم سے بھڑک اٹھا اور اس کی وجہ سے زبان سے کوئی نازیبا کلمہ نکل گیا تو ایسا ہو جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی غیر معمولی اور ناقابل اصلاح بات ہوگئی۔ البتہ جب ایسا ہو جائے تو جس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ ہوا تھا، اس سے معذرت کرلے لیکن یہ نہ سمجھے کہ اب میرا غصہ قابل اصلاح نہیں بلکہ اپنے غصہ کی اصلاح کی فکر کرے۔

ایک صحابی کو غصہ نہ کرنے کی نصیحت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے نصیحت فرمائیے اور مختصر نصیحت فرمائیے۔ ایک تو نصیحت کی درخواست کی اور ساتھ مختصر

نصیحت کی درخواست کی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برا نہیں مانا کہ تم نصیحت بھی طلب کرتے ہو اور ساتھ میں شرطیں بھی لگاتے ہو اور نہ اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا بلکہ آپ نے اس کی اس فرمائش کی تعمیل فرمائی۔ اس سے پتہ چلا کہ اگر کوئی شخص مختصر نصیحت طلب کرے تو اس کو مختصر نصیحت کر دو، اس لئے کہ اس کے پاس وقت کم ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک منٹ میں مجھے کوئی دین کی بات حاصل ہو جائے، اس کی اس فرمائش کو پورا کر دو، اس لئے کہ دین کی باتیں ایسی بھی ہیں جو ایک منٹ یا دو منٹ میں بھی ہو سکتی ہیں۔ بہرحال! ان صحابی کی فرمائش پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نصیحت فرمائی کہ:

لَا تَغْضَبْ

غصہ مت کرنا۔ اس سے پتہ چلا کہ غصہ ان چیزوں میں سے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اس کی اتنی اہمیت تھی کہ مختصر نصیحت کے وقت آپ نے اسی کا انتخاب فرمایا۔

ابتداءً بالکل غصہ کرنا چھوڑ دو

اسی لئے ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق میں غصہ ان چیزوں میں سے ہے جس کا سب سے پہلے علاج کیا جاتا ہے، جب کوئی شخص کسی شیخ کی خدمت میں اپنی اصلاح کے لئے جاتا ہے تو شروع میں اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم غصہ بالکل مت کرو، نہ غصہ کے صحیح محل پر غصہ کرو اور نہ ہی بے محل غصہ کرو، جہاں غصہ کرنے کا حق ہے وہاں بھی

غصہ نہ کرو تا کہ تمہاری طبیعت اعتدال پر آجائے۔ لیکن اس کے باوجود کسی وقت غیر اختیاری طور پر منہ سے نازیبا کلمات نکل جائیں تو جس کے خلاف وہ کلمات نکلے ہیں، اس سے معافی مانگ لو، معذرت کرلو کہ بھائی! میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے، غلطی ہوگئی، معاف کردو، جب یہ کرلو گے تو انشاء اللہ آئندہ کے لئے راستہ کھل جائے گا۔

معافی مانگنے سے شرم مت کرو

معافی مانگ لینے میں کوئی ذلت نہیں ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جان جائے مگر ناک نہ جائے، کسی طرح ناک نیچی نہ کرنی پڑے۔ یہ تصور اور خیال بہت خراب ہے، کیونکہ تکبر پر مبنی ہے، اس لئے جب کبھی ایسا ہو جائے، معافی مانگ لو، معافی مانگنے میں کیا رکھا ہے، اگر دنیا میں معافی مانگ لی تو یہاں معافی ہو جائے گی، اگر خدانخواستہ یہاں معاف نہیں کرایا اور آخرت میں جا کر حساب کتاب دینا پڑا تو اس کا بڑا خطرناک انجام ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ یہاں پر توبہ کا بیان ختم ہوگیا، اب آگے دوسرا باب شروع ہو رہا ہے، جس کا عنوان ہے "تعلق مع اللہ" انشاء اللہ کل اس کو شروع کریں گے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اللہ تعالیٰ کی محبت

اور اس کے اسباب

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۳

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ تعالیٰ کی محبت

اور

اس کے اسباب

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین و العاقبة للمتقین و الصلوٰة و السلام علی رسوله الکریم وعلی آله واصحابه اجمعین أمابعد!

محبت کے اسباب اختیاری ہیں

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چند ارشادات اللہ تعالیٰ کے محبت اور تعلق مع اللہ سے متعلق ہیں، پہلے ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا:

''خدا کی محبت اگر چہ امر غیر اختیاری ہے، لیکن اس کے اسباب بندے کے اختیار میں ہیں، وہ یہ ہیں (۱) کثرت ذکر اللہ (۲) اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنا (۳) کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا (۴) طاعت پر مواظبت کرنا (۵) حق تعالیٰ سے دعا کرنا، اس تدبیر میں تو کوئی غلطی نہیں، صرف ایک غلطی علمی محتمل

ہے، وہ قابل تنبیہ ہے، وہ یہ کہ اپنے ذہن سے کوئی درجہ محبت کا تراش کر اس کا منتظر رہنا، یہ غلطی ہوگی، بلکہ اس تدبیر کی مداومت سے جو درجہ محبت کا حاصل ہوتا ہے، وہی اس درجہ میں مطلوب ہے، پھر خواہ اس میں مزعوم ترقی ہو، خواہ ایک حالت پر رہ جائے، البتہ رسوخ میں ترقی لازم ہے، صرف لون محبت میں تفاوت ہوتا رہتا ہے"

(انفاس عیسیٰ: ص۱۹۹)

ان چند جملوں میں بڑے بڑے مضامین ارشاد فرمادئے ہیں، ان سے مقصود یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی محبت اور اللہ جل شانہ سے تعلق حصول دین کی تمام جدوجہد کا مغز ہے، یہ جو آپ سنتے ہیں کہ حضرات اولیاء کرام اور صوفیاء کرام کی خدمت میں لوگ جاتے تھے اور وہاں مجاھدے اور ریاضتیں کرتے تھے، ان سب کا مقصود یہی تھا کہ تعلق مع اللہ پیدا ہو جائے، اور یہ تعلق مضبوط ہو جائے، بس جس دن یہ چیزیں حاصل ہو گئیں، اس دن پورا دین حاصل ہو گیا، کیونکہ محبت وہ چیز ہے جو مشکل سے مشکل کام کو آسان بنادیتی ہے۔

محبت مشکل کام کو آسان کر دیتی ہے

اگر جائزہ لے کر دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین پر عمل کرنا بڑا مشکل کام ہے، اتنی نمازیں پڑھو، اتنے روزے رکھو، اتنی زکوٰۃ دو، حج کرو، اور ان سب سے مشکل یہ ہے کہ فلاں گناہ سے بچو، فلاں گناہ سے بچو، آنکھوں کو بچاؤ، اپنے کانوں کو

بچاؤ، زبان کو بچاؤ، ان سب کو بچانا آدمی کو مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن جس دن اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہوگیا، اس دن یہ سب کام آسان ہوجائیں گے، مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ع : از محبت تلخہا شیریں شود

''یعنی جب محبت پیدا ہوجاتی ہے تو کڑوی چیزیں بھی میٹھی لگتی ہیں''

ماں کو بچے سے محبت کا نتیجہ

ایک ماں کو دیکھو کہ سردی کا موسم ہے، کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے، اب رات کو بچے نے بستر پر پیشاب پاخانہ کردیا، اب سخت سردی میں بستر سے اٹھنا اور جا کر بستر وغیرہ دھونا، اس کے کپڑے دھونا کتنا مشکل کام ہے، لیکن چونکہ ماں کو بچے کے ساتھ محبت ہے، اس لئے وہ سب کام خوشی کے ساتھ آسانی کے ساتھ کررہی ہے، اگر اس ماں سے کوئی شخص کہے کہ اس بچے کی وجہ سے تمہیں رات کو تکلیف ہوتی ہے، سردی میں تمہیں اٹھنا پڑتا ہے، اس کا بستر صاف کرنا پڑتا ہے، یہ بچہ مرجائے تو اچھا ہے، تو وہ ماں اس شخص کو اپنا دشمن سمجھے گی اور یہ کہے گی کہ میں اس طرح کی ہزاروں تکلیفیں برداشت کرنے کو تیار ہوں، لیکن کسی طرح میرا یہ جگر کا ٹکڑا مجھ سے جدا نہ ہو، چونکہ اس بچے سے ماں کو محبت ہوگئی ہے، اس لئے وہ ساری تکلیفیں اس کے لئے آسان ہوگئیں۔

تنخواہ سے محبت کا نتیجہ

ایک شخص رمضان کی رات میں عبادت کرتا ہے، سحری کے لئے بیدار ہوتا

ہے، پھر صبح سویرے اٹھ کر دفتر کی طرف بھاگتا ہے، اب بھری بس کے اندر ڈنڈا پکڑا بس کے دروازے پر لٹک کر سفر کر رہا ہے، دفتر پہنچ کر آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دے رہا ہے، اور شام کو تھکا ماندہ چلا آرہا ہے، وہ یہ ساری مشقتیں برداشت کر رہا ہے، لیکن یہ ساری مشقتیں اس کے لئے آسان ہوگئیں، کیونکہ اس کو اس تنخواہ سے محبت ہوگئی ہے جو مہینے کے آخر میں ملنے والی ہے، اگر کوئی شخص اس سے یہ کہے کہ تمہیں رمضان کے مہینے میں بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے، صبح ہی صبح دفتر کی طرف بسوں میں لٹک کر جانا پڑتا ہے، وہاں پر آٹھ گھنٹے کی مشقت والی نوکری کرنی پڑتی ہے، چلو میں تمہاری یہ نوکری چھڑوا دیتا ہوں، وہ اس شخص کو دشمن سمجھے گا کہ میری اچھی بھلی نوکری لگی ہوئی ہے، یہ اس کو چھڑوا رہا ہے، اس کے لئے اس تنخواہ سے محبت ہونے کی وجہ سے صبح سویرے اٹھنا اور بسوں میں لٹک کر سفر کرنا اور آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دینا یہ سب کام محبوب ہوگئے، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ از محبت تلخہا شیریں شود، یعنی محبت سے کڑوی چیزیں بھی میٹھی ہو جاتی ہیں۔

قلندری راستہ دکھادیں

اسی طرح دین کے جتنے کام مشکل نظر آرہے ہیں، اس کو آسان بنانے کا راستہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی محبت دل میں پیدا ہو جائے، تعلق پیدا ہو جائے تو اس محبت کے نتیجے میں یہ سارے کام آسان ہو جائیں گے، اسی بات کو کسی نے دوسرے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:

صنمارہ قلندر سزاوار بمن نمائی

درازو دور دیدم راہ ورسم و پارسائی

یعنی مرید اپنے شیخ سے کہہ رہا ہے کہ مجھے تو قلندری راستہ دکھا دیجئے، کیونکہ نیکی اور پارسائی کا راستہ تو مجھے لمبا چوڑا نظر آرہا ہے کہ نمازیں پڑھو، تہجد پڑھو، اشراق پڑھو، چاشت کی نماز پڑھو، ذکر کرو، نگاہ کی حفاظت کرو، زبان کی حفاظت کرو، کان کی حفاظت کرو، ہر چیز کو بچاؤ، یہ کام تو میرے لئے بڑا مشکل ہے، مجھے تو کوئی قلندری راستہ بتا دیجئے۔

اس شعر کا صحیح مطلب

بعض لوگوں نے اس شعر کا بڑا غلط مطلب نکالا ہے، اور وہ یہ کہ شاعر کا کہنا یہ ہے کہ نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ جو ظاہری اعمال ہیں ان کو انجام دینا تو بڑا مشکل ہے، ان کے بجائے مجھے شورٹ کٹ (مختصر راستہ) بتا دو، جیسے آج کل کے جاہل پیر بتاتے ہیں، جس کے ذریعہ میں آسانی سے سیدھا جنت میں پہنچ جاؤں۔ ان جاہلوں نے شعر کا یہ مطلب نکالا ہے، حالانکہ یہ مطلب درست نہیں، بلکہ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ یہ ''راہ ورسم و پارسائی'' کا یہ راستہ مجھے بڑا لمبا نظر آرہا ہے، اس لئے مجھے ایسا راہ قلندری بتا دیجئے جس سے میرے لئے یہ راستہ آسان اور مختصر ہو جائے، اگرچہ مجھے جانا اسی راستے ہے، نماز، روزہ بھی کرنا ہے، زکوۃ اور حج بھی ادا کرنے ہیں، لیکن مجھے کوئی ایسا طریقہ بتا دیجئے جس سے یہ اعمال میرے لئے آسان ہو جائیں، اسی کا نام ''طریق القلندر'' ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وعظ ہے جس کا نام ہی ''طریق القلندر'' ہے، وہ وعظ اسی شعر کی تشریح پر ہے،

وہ بڑا عجیب وغریب وعظ ہے، ہر ایک کو پڑھنا چاہئے۔

’’طریق القلندر‘‘ اللہ کی محبت پیدا کرنا ہے

وہ ’’طریق القلندر‘‘ محبت کا پیدا کر دینا ہے، اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق کا پیدا ہو جانا، جس دن اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہو گئی اور اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو گیا، اس کے بعد یہ راستہ لمبا نہیں رہے گا، بلکہ یہ راستہ مختصر اور آسان ہو جائے گا، اس کی مثال یہ سمجھو کہ ایک شخص سفر سے بہت گھبراتا ہے، اس سے سفر نہیں کیا جاتا، کوئی شخص اس سے کہے کہ میرے ساتھ لاہور چلو، وہاں لاہور میں تمہارے دوست ہیں، احباب ہیں، وہ کہتا ہے کہ یہ میرے بس کا کام نہیں، میں نہیں جاتا، اس شخص کو لاہور جانا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔

لاہور کا سفر آسان ہو گیا

اب اس شخص کو لاہور لے جانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے لاہور میں کوئی ایسی محبت کی چیز پیدا کر دو کہ پھر اس کے لئے یہ سفر آسان ہو جائے، مثلاً اس سے یہ کہا جائے کہ اگر تم لاہور جاؤ گے تو وہاں کا بادشاہ تمہیں اپنا مقرب بنالے گا اور تم اس کے مصاحب بن جاؤ گے، اور تمہاری اتنی تنخواہ ہو گی، اور یہ سہولتیں تم کو ملیں گی، اب اس سے کہا جائے کہ لاہور چلو تو وہی آدمی جو یہ کہہ رہا تھا کہ میرے لئے سفر کرنا مشکل ہے، ریل میں کیسے سوار ہوں، کیسے ۲۴ گھنٹے کا سفر کروں، اسی کو جب آپ نے ذرا سی لالچ دیدی تو چونکہ وہ لالچ ایسی ہے کہ اس کا تعلق دل سے ہے،

اس وجہ سے وہ سفر اس کے لئے آسان ہوگیا، اور وہی شخص اب کہتا ہے کہ مجھے دس مرتبہ لاہور کا سفر کرادو، میں سفر کرنے کے لئے تیار ہوں، اس لئے کہ محبت پیدا ہوگئی۔

سارا کھیل محبت کا ہے

بہر حال، یہ سارا کھیل محبت کا ہے، اگر اللہ تعالیٰ سے دل میں محبت پیدا ہو جائے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو جائے تو یہی راستہ جس کو لمبا سمجھ رہا تھا، لمحوں میں طے ہو جاتا ہے، پھر اس میں کوئی دشواری اور پریشانی باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا یہ جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر بزرگوں کے پاس جائیں گے تو کیا ملے گا؟ اس بزرگ کے پاس دین کا کوئی ایسا علم ہے نہیں جو دوسروں کے پاس نہ ہو، کتابوں کے اندر بھی دین کی باتیں موجود ہیں اور اس بزرگ کے پاس کوئی ایسا عمل اور جادو منتر بھی نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ وہ تمہیں عمل کے راستے پر ڈال دے گا، بزرگ کے پاس جا کر کیا ملتا ہے؟

اللہ والوں سے اللہ کی محبت ملتی ہے

اصل بات یہ ہے کہ ان کے پاس جانے سے اللہ کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے اور تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، جو کامیابی کی کنجی ہے، اگر یہ دو چیزیں حاصل ہوگئیں تو سب کچھ حاصل ہوگیا، جو لوگ بزرگوں کے پاس اور مشائخ کے پاس جاتے ہیں، وہ یہی چیزیں لینے جاتے ہیں، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے:

زہد زاہد را و دیں دیندار را

اِک ذرۂ دردِ دلِ عطّار را

یہ شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے، اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ آپ زاہد کو زہد دیتے رہیں، اور دیندار کو دین دیتے رہیں، عطّار کو تو بس دردِ دل کا ایک ذرہ عطا فرما دیجئے۔ اب بظاہر تو ان دونوں باتوں میں تضاد نظر آ رہا ہے، کیونکہ ایک طرف تو یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے نہ دین چاہئے اور نہ مجھے زہد چاہئے دوسری طرف یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے دردِ دل کا ذرہ چاہئے، لیکن حقیقت میں وہ دونوں باتوں میں تضاد کا اظہار نہیں کر رہے ہیں، بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لوگ دوسرے راستے سے دین کی طرف جا رہے ہیں، مجھے تو وہ چیز چاہئے کہ اس کے حاصل ہونے بعد زہد اور دینداری وغیرہ یہ سب خود بخود اس کے پیچھے چلی آئیں، وہ چیز ہے ''دردِ دل'' جس دن یہ مل گیا اس دن یہ زہد اور دینداری اس کے پیچھے خود بخود چلی آئیں گی، چنانچہ سارے مجاہدات اور ساری ریاضتوں سے مقصود اللہ جل شانہ کی ''محبت'' کا حصول ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا مضبوط ہونا ہے، مشائخ کی صحبت اور ان کی تعلیم و تربیت سے بھی ان دو چیزوں کا حصول مقصود ہوتا ہے۔

تھانہ بھون میں اقطاب ثلاثہ

تھانہ بھون کی خانقاہ میں ایک زمانہ میں تین بزرگ رہتے تھے، جن کو ''اقطاب ثلاثہ'' کہا جاتا تھا، ایک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ، دوسرے حضرت شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، اور تیسرے حضرت حافظ ضامن

شہید رحمۃ اللہ علیہ، یہ تینوں اپنے وقت کے ''قطب'' تھے، اور ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے عجیب کمالات عطا فرمائے تھے، خانقاہ میں ان کے کمروں کی ترتیب یہ تھی کہ خانقاہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، اس کے بعد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، اس کے بعد حضرت شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ عالم بھی تھے اور باکمال صوفی بھی تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا مناظرے کا ارادہ

حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی فقہی موضوع پر ایک رسالہ لکھ دیا، اس زمانے میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نئے نئے دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تھے، اس لئے ان کا علم تازہ تھا، جب مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ رسالہ پڑھا تو ان کو اس سے کچھ اختلاف ہوگیا کہ اس میں فلاں بات صحیح نہیں لکھی۔ جب طالب علم نیا نیا دورۂ حدیث سے فارغ ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ ''ہم چوں دیگر نیست'' وہ سمجھتا ہے کہ ساری دنیا کا علم میرے پاس آگیا ہے اور ساری دنیا جاہل ہے۔ چنانچہ ان کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ جس شخص نے یہ رسالہ لکھا ہے اس سے مناظرہ کروں گا، لوگوں سے پوچھا کہ یہ مولانا شیخ محمد تھانوی کہاں رہتے ہیں، لوگوں نے بتایا کہ تھانہ بھون میں رہتے ہیں، چنانچہ تھانہ بھون گئے اور تلاش کرتے ہوئے خانقاہ میں پہنچ گئے۔

مناظرہ کرنا بھول کر اشغال میں مشغول ہوگئے

جب خانقاہ میں داخل ہوئے تو چونکہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو پہلے سے جانتے تھے، اس سے پہلے کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں، حضرت حاجی صاحب کا کمرہ خانقاہ میں پہلے پڑتا تھا، جب حاجی صاحبؒ نے حضرت گنگوہیؒ کو جاتے ہوئے دیکھا تو ان کو بلا لیا اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ حضرت! شیخ محمد تھانوی صاحب نے بڑی بات کتاب میں لکھ دی ہے، اس پر ان سے مناظرہ کرنے جا رہا ہوں، حضرت حاجی صاحب نے ان کو اپنے پاس بٹھا لیا، اور فرمایا توبہ، توبہ، ایسی بات نہیں کرتے، وہ بزرگ آدمی ہیں، اتنے بڑے آدمی ہیں، تم ایک طالبعلم ہو کر ان سے مناظرہ کرو گے؟ یہ بڑی بے ادبی کی بات ہے، پھر حضرت حاجی صاحب نے ان کو ایسا مصروف کر دیا کہ وہ مناظرہ کرنا تو بھول گئے اور حضرت حاجی صاحب کے پاس رہ پڑے اور ان سے بیعت ہو گئے اور بیعت ہونے کے بعد ذکر و اذکار اور تعلیمات و اشغال کے اندر مشغول ہو گئے۔

جو کچھ دینا تھا وہ دے چکے

۔ تھانہ بھون تو اس خیال سے آئے تھے کہ مناظرہ کر کے شام کو یا آئندہ کل واپس چلے جائیں گے، اس لئے کپڑے کے ایک ہی جوڑے میں آئے تھے، اور دوسرے جوڑے نہیں لائے تھے، لیکن حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت ہونے کے بعد وہیں رہ گئے، اور چالیس دن وہیں قیام کیا، اور جو کپڑے پہن کر آئے تھے، اسی

کو دھو کر دوبارہ پہن لیتے، اس طرح چالیس دن گزار دیے، چالیس دن کے بعد حضرت حاجی صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ:

''میاں رشید احمد! ہمیں تم کو جو کچھ دینا تھا وہ دے چکے، اب اللہ کا نام لے کر واپس جاؤ، اور وہاں جا کر اپنا کام کرو، اگر کوئی خاص حالت طاری ہو تو کسی اور سے ذکر نہ کرنا، بلکہ مجھے ہی لکھنا''

اللہ کی محبت دیدی

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا کہ ''میاں جو کچھ ہمیں تم کو دینا تھا وہ دیدیا'' اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ بڑے میاں نے چالیس دن میں کیا دیدیا، بارہ سال کے بعد سمجھ میں آیا کہ کیا دیدیا، وہ یہ کہ اللہ کی محبت دیدی، اور تعلق مع اللہ پیدا کر دیا، اس صحبت کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کی محبت اور وہ تعلق مع اللہ دل میں پیدا فرمادیا جو صلاح وفلاح کی کنجی تھی۔

اولیاء کی صحبت کی قیمت

یہ جو شعر مشہور ہے کہ:

یک زمانہ صحبت باولیاء

بہتر است از صد سالہ طاعتِ بے ریا

یعنی تھوڑی دیر کے لئے اولیاء اللہ کی صحبت کا حاصل ہو جانا یہ سو سال کی بے ریا طاعت سے بہتر ہے، بے ریا کی بھی قید لگی ہوئی ہے، یعنی طاعت بھی ہو اور

بے ریا بھی ہو، اس سے بھی بہتر وہ صحبت ہے، کسی نے اس شعر پر اعتراض کیا کہ اس کے اندر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، کیونکہ جو طاعت اخلاص کے ساتھ کی گئی ہو اور سو سال تک کی گئی ہو، پھر بھی ایک ساعت کی صحبت اس طاعت سے بہتر کیسے ہوگی؟

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے، بلکہ اگر شاعر ''صد لاکھ سال'' کہتا، یعنی ایک ساعت کی صحبت سو لاکھ سال کی عبادت سے بہتر ہے تو بھی مبالغہ نہ ہوتا، اس لئے اگر کوئی شخص سو لاکھ سال تک غلط رخ پر عبادت کرتا رہے، اگرچہ وہ اخلاص کے ساتھ کرتا رہے، لیکن عبادت کے اندر صرف اخلاص ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس عبادت کا طریقہ بھی درست ہونا چاہئے، لہٰذا اگر طریقہ صحیح نہیں تھا تو وہ سو لاکھ سال کی عبادت بے کار ہوگئی، اس کا کچھ حاصل نہیں۔

صحبت سے محبت، محبت سے نور

لہٰذا اولیاء اللہ کی صحبت سے جو چیز حاصل ہوتی ہے، وہ یہ کہ ایک تو عبادت اور طاعت کا صحیح طریقہ معلوم ہوتا ہے، اور دوسرے محبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص سو سال تک عبادت بغیر محبت کے کرے گا تو ایک طرف اس کی عبادت میں نور نہیں ہوگا، دوسرے یہ کہ وہ عبادت آسان نہیں ہوگی، لیکن صحبت کے بعد اس عبادت میں نور بھی پیدا ہو جائے گا، اور وہ عبادت آسان بھی ہو جائے گی۔ اس لئے تعلق مع اللہ پیدا کرنا ہے، جب کوئی آدمی اس طریق پر چلتا ہے تو اس کا پہلا مطلوب تعلق مع اللہ ہونا چاہئے۔

اسباب محبت اختیار میں ہیں

اب اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ اللہ کی محبت دل میں کیسے پیدا کریں؟ کیونکہ یہ محبت انسان کے اختیار میں نہیں، بلکہ یہ تو انسان کے اختیار سے باہر ہے، اس سوال کا جواب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں دیا ہے کہ:

> خدا کی محبت اگرچہ غیر اختیاری چیز ہے، لیکن اس کے اسباب اختیار میں ہیں، وہ یہ ہیں (۱) کثرت ذکر اللہ (۲) اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنا (۳) کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا (۴) طاعت پر مواظبت کرنا (۵) حق تعالیٰ سے دعا کرنا، اس تدبیر میں تو کوئی غلطی نہیں............

ان اسباب میں پہلا سبب یہ بیان فرمایا ''کثرت ذکر اللہ'' جب آدمی کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں خود بخود اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ سب سے پہلا سبب ہے، آج کا ہمارا سبق یہی ہے، اس پر عمل آج ہی سے شروع کر دیں، اب وقت ختم ہو گیا، باقی اسباب کے بارے میں زندگی رہی تو انشاء اللہ کل عرض کر دوں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

کثرت ذکر اللہ

محبت پیدا کرنے کا ذریعہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۴

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

کثرتِ ذکر اللہ
محبت پیدا کرنے کا ذریعہ

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین والعاقبة للمتقین والصلوٰة والسلام علیٰ رسولہ الکریم و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ أجمعین، امّا بعد!

تمہید

گذشتہ کل حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ آپ حضرات کو سنایا تھا، اور اس کی تشریح شروع کی تھی، اس ملفوظ میں حضرت والا نے جو باتیں بیان فرمائی ہیں وہ سارے تصوف سارے جدوجہد کا مطلوب اور مقصود ہے۔

کیا ''تصوف'' اور ''شریعت'' الگ الگ ہیں؟

آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ''تصوف'' کوئی اور چیز ہے اور ''شریعت'' کوئی اور چیز ہے، حالانکہ جس معنی کے اعتبار سے ان کو الگ الگ سمجھا جاتا ہے وہ بات درست نہیں، اس اعتبار سے تو بے شک ان دونوں کے درمیان فرق ہے کہ

''تصوف'' کے احکام کسی اور چیز سے متعلق ہیں اور ''شریعت'' کے احکام کسی اور چیز سے متعلق ہیں، لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ''تکملہ'' ہیں، ''شریعت'' طریقت کے بغیر بے روح ہے اور ''طریقت'' شریعت کے بغیر گمراہی ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص صرف ''تصوف'' اور ''طریقت'' کو لے کر بیٹھ جائے اور شریعت کے احکام کو نظر انداز کر دے تو زندقہ اور گمراہی ہے، اور اگر کوئی شخص شریعت کے احکام پر تو عمل کرے لیکن طریقت کے احکام کو نظر انداز کر دے اور اس کی اہمیت نہ سمجھے تو وہ شریعت بے روح ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں

مثلاً ایک شخص نماز روزہ ادا کر رہا ہے جو شریعت کا حکم ہے لیکن اس نماز روزے میں اخلاص نہیں ہے، تو وہ بے جان ہے، بے روح ہے، لہٰذا شریعت اور طریقت دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم اور ملزوم ہیں، لہٰذا دونوں کو بیک وقت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ ''طریقت'' شریعت کے احکام میں قوت پیدا کرتی ہے۔

ایک ایک عمل کی اصلاح مشکل ہے

لیکن اگر شریعت کے تمام احکام کی ایک ایک کر کے مشق کرے اور ایک ایک کو لے کر اس کے اندر اخلاص پیدا کرے، اس کی اصلاح کرے، مثلاً پہلے نماز کو درست کرنے کی مشق کر رہا ہے، پھر روزے کی مشق کر رہا ہے، پھر زکوٰۃ کی، پھر حج کی مشق کر رہا ہے، پھر اپنی آنکھ کی حفاظت کی مشق کر رہا ہے، پھر اپنے کان کی

حفاظت کی مشق کر رہا ہے، اسی طرح اگر ایک ایک چیز کو لے کر اس کی مشق کرے گا تو زندگی ختم ہو جائے گی لیکن یہ فہرست ختم نہ ہوگی۔ لہٰذا ایک ایسی چیز کا حاصل کرنا ضروری ہے جس کے بعد تمام چیزوں کا حاصل کرنا آسان ہو جائے وہ چیز ''تعلق مع اللہ'' ہے۔

عقل مند باندی کا واقعہ

ہمارے حضرت والا نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بادشاہ کا دربار لگا ہوا تھا، اس وقت بادشاہ فیاضی کے جوش میں آگیا، اور اس نے درباریوں سے کہا کہ اس وقت دربار میں جو کچھ تمہیں نظر آرہا ہے، سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات، فانوس وغیرہ، میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ جو شخص جس چیز پر ہاتھ رکھ دے گا، وہ چیز اس کی ہو جائے گی، بس اعلان سنتے ہی پورے دربار میں بھگدڑ مچ گئی، کوئی سونے کی طرف بھاگ رہا ہے، کوئی چاندی کی طرف بھاگ رہا ہے، کوئی ہیرے کی طرف کوئی جواہرات کی طرف بھاگ رہا ہے، کوئی فانوس اٹھا رہا ہے، ایک باندی بادشاہ کے قریب کھڑی تھی، جب سب لوگ دوسری چیزوں کی طرف دوڑے تو اس نے جلدی سے بادشاہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا، اس باندی نے یہ سوچا کہ یہ سب بے وقوف لوگ ہیں جو سونا چاندی کی طرف بھاگ رہے ہیں، میں تو جڑ اور اصل پر ہاتھ رکھ دیتی ہوں، اگر یہ مل گیا تو پھر سونا بھی میرا، چاندی بھی میری، اور ساری نعمتیں پھر میری ہیں، بس ایک یہ مل جائے۔ بادشاہ نے اس باندی سے کہا کہ سب لوگ سونا چاندی کی طرف بھاگ رہے ہیں، تو نہیں بھاگ رہی ہے؟ اس

باندی نے کہا کہ آپ نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص جس پر ہاتھ رکھ دے گا وہ اس کا ہو جائے گا، لہٰذا میں نے تو آپ پر ہاتھ رکھ دیا، اب آپ میرے ہو گئے، اب آپ کے پاس جو سلطنت ہے، مال و دولت ہے، جاہ ہے، عزت ہے وغیرہ ان سب میں میرا حصہ بھی ہے۔

اللہ کی محبت کے بعد سب آسان ہو جائے گا

حضرات صوفیاء کرام بھی یہی کام کرتے ہیں کہ بادشاہ کے سر پر ہاتھ رکھنا سکھاتے ہیں، وہ یہ کہ ''تعلق مع اللہ'' پیدا کرو، اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا کرلو، جب یہ پیدا کرلو گے تو سب کچھ مل جائے گا، کیونکہ ''حب اللہ'' اور ''تعلق مع اللہ'' تمام عبادات کی بنیاد ہے، اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، یہ چیز اگرچہ دیکھنے میں غیر اختیاری ہے، لیکن اس کے پیدا کرنے کے اسباب اختیار میں ہیں، اگر وہ اسباب اختیار کرلو گے تو انشاء اللہ وہ محبت پیدا ہو جائے گی، اس محبت کے پیدا کرنے کے بہت سے اسباب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اس ملفوظ میں ذکر فرمائے ہیں، ان میں سے ایک ایک کے بارے میں کچھ تفصیل عرض کروں گا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ محبت اور تعلق مع اللہ کی دولت عطا فرما دے، آمین۔ ان میں سے ہر سبب کو بیک وقت اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جب یہ تمام اسباب اختیار کئے جائیں گے تو انشاء اللہ وہ ''محبت'' ہمارے اپنے ظرف کے مطابق حاصل ہوگی، جب وہ حاصل ہو جائے گی تو سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔

ذکر کی کثرت کا حکم

پہلی چیز جو تعلق مع اللہ اور اللہ کی محبت دل میں پیدا ہونے کا سبب بنتی ہے وہ "کثرت ذکر اللہ" ہے، ذکر اللہ کی جتنی کثرت ہوگی، اتنا ہی محبت میں اضافہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَآاَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوْا اذْكُرُوْا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا،

اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو، اور صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کیا کرو۔

ذکر سے اللہ کا فائدہ ہے؟

اللہ تعالیٰ یہ جو فرما رہے ہیں کہ میرا ذکر کثرت سے کیا کرو، کیا اللہ تعالیٰ کو اپنا ذکر کرانے میں مزہ آتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو ذکر سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے؟ جس شخص کا اللہ جل شانہ پر ایمان ہے، اس کا اس پر بھی ایمان ہے کہ وہ ذات بے نیاز ہے، ساری مخلوق ساری عمر صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی کرتی رہے، کوئی اور کام نہ کرے، سجدے میں پڑی رہے، تب بھی اس کی عظمت وجلال میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوگا، اور اگر ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر کمر باندھ لے، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جائے بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان میں _ نعوذ باللہ _ گستاخیاں بھی کرے تب بھی اس کی عظمت وجلال میں اور کبریائی میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوگی۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں : لا الہ الا اللہ

یعنی جو بھی حالت ہو، لاالہ الااللہ کا کلمہ اپنی جگہ پر قائم ہے، وہ ذات بے نیاز ہے۔

جامع مسجد قرطبہ

میری اندلس کی جامع مسجد قرطبہ میں حاضری ہوئی یہ مسجد کسی زمانے میں سجدہ کرنے والوں کی جبینوں سے بسی ہوئی تھی، یہ مسجد، مسجد نبوی میں جدید اضافے سے پہلے تک دنیا کی سب سے بڑی مسقّف مسجد تھی، اس مسجد میں صرف ایک رات میں شمعوں کو جلانے کے لئے سیکڑوں قنطار تیل خرچ ہوتا تھا، سارے اندلس کے لوگ وہاں آکر نمازیں ادا کرتے تھے اور سجدے کیا کرتے تھے، جو علم کا مرکز تھا، علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بڑے بڑے علماء اس مسجد میں درس دیا کرتے تھے، سیکڑوں سال تک وہ مسجد سجدہ کرنے والوں سے آباد رہی۔

آج اس مسجد کا حال

آج جا کر دیکھو تو وہ مسجد کلیسا بنی ہوئی ہے، اور اس میں موسیقی کی آوازیں آرہی ہیں، اور ایک چھوٹی سی جگہ مسلمانوں کے لئے مخصوص کردی گئی ہے کہ وہاں جا کر مسجد کی زیارت کرلیں، وہاں بھی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، جب میرا وہاں جانا ہوا تو میرے ایک دوست بھی ساتھ تھے، ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، یہاں نماز ضرور پڑھیں گے، چنانچہ ہمارے دوست نے اذان دی، عصر

کی نماز کا وقت تھا، ہم نے جماعت سے عصر کی نماز ادا کرلی، جب مسجد میں جا کر ''سبحان ربی الاعلیٰ، سبحان ربی الاعلیٰ'' کی تسبیح پڑھی تو عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے کہا کہ ایک وقت وہ تھا جب یہاں ہزاروں انسان سجدے میں پڑے ہوتے تھے، اور ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کی آوازیں گونجتی تھیں، اور اس مسجد کے میناروں سے اذانوں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں، اس کا چپہ چپہ علم کے نور سے منور تھا۔ آج یہ حال ہے کہ جب ہم نے اذان دی تو چھپ چھپ کر ڈرتے ہوئے اذان دی کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے، اور چھپ چھپ کر نماز ادا کی، لیکن وہ ذات اُس وقت بھی ''اعلیٰ'' تھی اور اِس وقت بھی ''اعلیٰ'' ہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند

بہار ہو کہ خزاں : لا الہ الا اللّٰہ

اس کے نزدیک نہ کوئی بہار ہے، نہ کوئی خزاں ہے، جب لاکھوں انسان سجدے کر رہے تھے تب بھی وہ ''لا الہ الا اللّٰہ'' تھا، اور ''سبحان ربی الاعلیٰ'' تھا، اور آج جبکہ اس آواز پر ایک قدم بھی نہیں بڑھا، وہ آج بھی ''سبحان ربی الاعلیٰ'' ہے۔

ذکر سے ہمارا ہی فائدہ ہے

لہٰذا جب اس ذات کو ذکر کرنے والے کے ذکر سے، عبادت کرنے والے کی عبادت سے، تسبیح کرنے والے کی تسبیح سے، اس کی عظمت میں، اس کے جلال میں، اس کی کبریائی میں، اس کی صمدیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو پھر وہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ مجھے کثرت سے یاد کرو، کثرت سے میرا ذکر کیا کرو، اور صبح شام ہماری

پاکی بیان کیا کرو۔ دراصل بندوں کے فائدے کے لئے یہ حکم دے رہے ہیں کہ مجھے کثرت سے یاد کیا کرو، اس لئے کہ جب بندہ کثرت سے ہم کو یاد کرے گا، اور اس کے دل میں ہماری یاد سمائے گی تو اس کو ہم سے محبت پیدا ہوگی، ہم سے اس کا تعلق قائم ہوگا، اور جب ہم سے تعلق مضبوط ہوگا تو وہ تعلق اس کو گناہوں سے بچائے گا، اس کو بدعنوانیوں سے، ظلم سے، حق تلفیوں سے بچائے گا، اور اس کو جہنم سے بچائے گا، اس لئے یہ حکم دیا جارہا ہے کہ کثرت سے ہمارا ذکر کرو۔

کثرتِ ذکر کا ایک طریقہ

اب سوال یہ ہے کہ کثرت ذکر کے لئے کیا طریقہ اختیار کریں؟ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ صبح شام ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہو، کوئی دوسرا کام ہی نہ کرو، ''اللہ اللہ'' کرو، ''سبحان اللہ سبحان اللہ'' کی تسبیح پڑھتے رہو، ''الحمدللہ الحمدللہ'' پڑھتے رہو، ''لا الہ الا اللہ'' پڑھتے رہو۔ چنانچہ پرانے زمانے میں جب لوگ بزرگوں کے پاس اپنی اصلاح کرانے کے لئے جایا کرتے تھے تو وہ بزرگ یہی طریقہ اختیار کرتے تھے کہ ان لوگوں کو ذکر کی بڑی بڑی تعداد بتادیتے، اور ان سے کہتے کہ اور سب کام دھندے چھوڑ دو، بس یہ کام کرو، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانے کے اللہ والوں کے جو معمولات ہوتے تھے وہ اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ آج ہم ان کے بارے میں سن کر حیران رہ جاتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ ایک راستے سے گزر رہے تھے

کہ ان کو دیکھ کر ایک بڑھیا نے یہ کہہ دیا کہ یہ وہ شخص ہے جو عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتا ہے، حالانکہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھنے کا آپ کا معمول نہیں تھا، بلکہ رات کو آخیری شب میں اٹھ کر تہجد پڑھنے کا معمول تھا۔ لیکن اس بڑھیا کی یہ بات سن کر آپ کو غیرت آگئی کہ ایک بڑھیا میرے بارے میں یہ حسن ظن رکھتی ہے کہ ساری رات عبادت کرتا ہوں۔ تو بس میں آج سے ایسا ہی کروں گا، چنانچہ اس دن کے بعد سے مرتے دم تک یہی معمول رہا کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔ یہ درحقیقت ''اُذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا'' پر عمل ہو رہا تھا۔

روزانہ سوا لاکھ اسم ذات

جو حضرات اپنی اصلاح کے لئے مشائخ کے پاس جاتے تو وہ مشائخ ان کو ''اسم ذات'' کے ذکر کی تلقین کرتے کہ روزانہ سوا لاکھ مرتبہ اسم ذات پڑھنا ہے، اس زمانے میں یہ عام معمول ہوتا تھا۔

جس کو ہو جان و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں

جب اس گلی میں آیا ہے تو اب محنت کرے۔

مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داری

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ دار العلوم دیوبند کے جو مہتمم تھے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، وہ بڑے منظم قسم کے بزرگ تھے، اس زمانے میں دار العلوم دیوبند کا انتظام

چلانا آسان کام نہیں تھا، حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ وہ ایسے منظم تھے کہ ''وزیر اعظم'' بننے کے لائق تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی انتظامی صلاحیت عطا فرمائی تھی، ہر وقت انتظام کے اندر مشغول رہتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی مدرسہ کا اہتمام بڑی خراب چیز ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ''اہتمام'' ''ھَمٌّ'' سے مشتق ہے، جس کے معنی ''فکر'' کے ہیں، اس لئے کہ مہتمم ہر وقت فکر اور تشویش میں مبتلا رہتا ہے، ہر وقت گھر کے دروازے پر کوئی نہ کوئی آرہا ہے، اور گھنٹی بجا رہا ہے، ہر وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے، نماز پڑھ کر مسجد سے نکلو تو گھر تک پہنچنا مشکل ہے، کوئی نہ کوئی آکر اپنا قصہ بیان کرنا شروع کر دیتا ہے، اس لئے یہ مدرسہ کا اہتمام بہت مشکل کام ہے۔

دیوبند کے مہتمم اور ذکر اللہ کی مقدار

یہ اہتمام ایسی چیز ہے کہ اس کے ساتھ دو چیزیں بہت مشکل سے جمع ہوتی ہیں، ایک تصنیف و تألیف کا کام، دوسرے ذکر اللہ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، لیکن روزانہ کا بلا ناغہ یہ معمول تھا کہ سوا لاکھ مرتبہ اسم ذات کا ورد کیا کرتے تھے، کبھی یہ معمول قضا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ جب اس راستے کو اختیار کرنا ہے تو تھوڑی سے محنت کرنے پڑے گی، لہٰذا جب ذکر کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آئے گی۔

اللہ کی رحمت کمزوروں پر بھی ہے

لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت جس طرح اقویاء پر ہے، بلند ہمت لوگوں پر ہے،

اسی طرح ہم جیسے کمزور اور کم ہمت لوگوں پر بھی ہے، اگر ہم جیسے کمزوروں کو بھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب والا نسخہ اور وظائف بتادیتے، یا اقویاء اور بلند ہمت والے لوگوں کا نسخہ بتادیتے تو ہم جیسے کمزوروں کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، اس لئے ہر زمانے میں اسی مقصد کے لئے ''مجدّد'' بھیجا جاتا ہے، وہ دین کی تجدید کرتا ہے اور مردہ سنتوں کو زندہ کرتا ہے اور لوگوں کے لئے ان کے مزاج و مذاق اور ان کی مناسبت اور ان کی صلاحیت کے مطابق نسخے تجویز کرتا ہے۔

کمزوروں والے نسخہ پر عمل کرلو

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس فن کا مجدّد بنایا تھا، اگر وہ یہ کہتے کہ وہ مجاہدات اور ذکر کرو جو پہلے زمانے کے لوگ کیا کرتے تھے تو سب لوگ اس سے بھاگ جاتے، کوئی بھی اس راستے پر نہ آتا، اس لئے آپ نے فرمایا کہ تم لوگ کمزور ہو، اس لئے کمزوروں والا نسخہ لکھ دیتے ہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا بیعت کا واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ابتداء میں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی، جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا تو والد صاحبؒ نے سوچا کہ اب کس سے تعلق قائم کریں؟ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے کا خیال ہورہا تھا، مگر وہاں کے قواعد وضوابط اور مجاہدات کی وجہ سے ہمت نہیں ہورہی تھی کہ کیا کریں؟ ہمارے دادا

حضرت مولانا یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہ حضرت تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے، میرے دادا جان حضرت والد صاحبؒ کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھانہ بھون لے گئے، وہاں جا کر والد صاحبؒ سے فرمایا کہ تم حضرت تھانوی صاحبؒ سے بیعت ہو جاؤ، والد صاحب فرماتے تھے کہ میں نے حضرت تھانوی صاحبؒ سے عرض کیا کہ حضرت! طبیعت میں بیعت ہونے کا تقاضا بھی بہت ہے اور اپنی اصلاح کی فکر بھی ہے، لیکن میں بیعت ہونے سے اس لئے ڈرتا ہوں کہ میں بہت کمزور ہمت والا ہوں، مجھ سے کچھ ہوتا نہیں ہے، نہ مجھ سے ذکر زیادہ ہوتا ہے، نہ مجھ سے عبادت زیادہ ہوتی ہے، نہ مجھ سے مجاہدے اور ریاضتیں ہوتی ہیں، اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ اگر بیعت ہو گیا اور کام کچھ نہ کیا تو پھر بیعت ہونے کا کیا فائدہ؟

یہ دین سب کے لئے ہے

دوسرے یہ کہ میں مصروف بہت رہتا ہوں، پڑھنے پڑھانے کا معمول ہے (اس زمانے میں حضرت والد صاحبؒ اٹھارہ سبق پڑھایا کرتے تھے) تدریس میں مصروف رہتا ہوں، کچھ فتوے لکھنے کا کام بھی ہے۔ حضرت تھانوی صاحبؒ نے حضرت والد صاحبؒ کی یہ باتیں سن کر فرمایا، ارے بھائی! تم کس فکر میں پڑ گئے، کیا دین صرف اقویاء کے لئے ہے، ضعفاء کے لئے نہیں ہے؟ کیا دین صرف طاقتور لوگوں کے لئے ہے، کمزور لوگوں کے لئے نہیں ہے؟ اور یہ جو آپ فرما رہے ہیں کہ میں بہت مصروف رہتا ہوں تو کیا دین صرف فارغ لوگوں کے

لئے ہے؟ مصروف لوگوں کے لئے نہیں ہے؟ (حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت والا نے یہ دو جملے ایسے فرمادئے کہ اس سے دل میں ٹھنڈک پڑگئی) ہم آپ کو ایسا طریقہ بتائیں گے جس میں نہ تو زیادہ محنت کرنی پڑے گی اور نہ ہی زیادہ وقت صَرف کرنا پڑے گا، البتہ ایک بات بتاتا ہوں کہ گناہوں سے بچنے کا اہتمام کریں اور گناہوں سے بچنے کے اہتمام میں قوت کی ضرورت نہیں، صرف قوت ارادہ کی ضرورت ہے، قوت جسمانی کی ضرورت نہیں، بلکہ گناہ کرنے کے لئے قوت جسمانی کی ضرورت ہوتی ہے، اور گناہوں سے بچنے میں وقت بھی صرف نہیں ہوتا، بلکہ گناہ کا ارتکاب کرنے میں وقت صرف ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ فضول کاموں سے بچو، کیونکہ فضول کاموں سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور طاقت بھی بے کار صرف ہوتی ہے، اور اگر کچھ موقع مل جائے تو معمولات مقرر کرلو۔

ذاکر کون؟ ذکر کا وسیع مفہوم

اب یہ دیکھئے کہ پرانے حضرات صوفیاء فرماتے تھے کہ سوا لاکھ مرتبہ اسم ذات پڑھو، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ تلقین فرما رہے ہیں کہ اگر موقع مل جائے تو کچھ معمولات مقرر کرلو، یہ فرق ہے کیوں ہوگیا؟ بات دراصل یہ ہے کہ کرنے کے لئے جو کام بتایا وہ ''طریق القلندری'' ہے، وہ یہ کہ چاہے زبان سے ذکر ہو یا نہ ہو، لیکن ہر وقت اللہ تعالیٰ سے تمہارا تعلق جڑا ہوا ہو، اس لئے کہ ذکر صرف اس کا نام نہیں کہ زبان سے ''سبحان اللہ، الحمدللہ'' پڑھ لیا، بلکہ حقیقت میں ذکر اس کو کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کو کسی بھی عنوان سے یاد کرنا، یہ ذکر ہے، مثلاً اگر

آپ شکر کر رہے ہیں تو وہ ذکر ہے، صبر کر رہے ہیں اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ رہیں ہیں تو یہ ذکر ہے، اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ رہے ہیں تو یہ ذکر ہے، کوئی دعا کر رہے ہیں کہ یا اللہ! میرا فلاں کام کر دیجئے، یہ ذکر ہے، یہ سب ذکر ہیں، بلکہ بزرگوں نے تو یہاں تک فرما دیا ''کل مطیع للّٰہ فھو ذاکر'' جو شخص اللہ کی اطاعت کا جو کام بھی کر رہا ہے، وہ ذاکر ہے، اگر نیت صحیح کر لو، اخلاص پیدا کر لو، اپنا قبلہ درست کر لو تو جو سبق پڑھا رہے ہو وہ بھی ذکر ہے، جو مطالعہ کر رہے ہو، وہ بھی ذکر ہے، اگر کوئی شخص اللہ کی مخلوق کی خدمت کی نیت سے ڈاکٹری کر رہا ہے، وہ بھی ذکر ہے، اگر تجارت کر رہے ہو، دکان پر بیٹھے ہو اور اللہ کے لئے، اخلاص کے ساتھ، شریعت کے دائرے میں رہ کر، اپنے حقوق کی ادائیگی کی خاطر، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق تجارت کر رہے ہو، تو وہ بھی ذکر ہے، کیونکہ ''کل مطیع للّٰہ فھو ذاکر'' میں داخل ہے۔

زمانہ ماضی پر استغفار کرو

چنانچہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ میں تمہیں چار اعمال بتاتا ہوں (حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر، اس سے آسان اور اس سے مفید نسخہ کون بتائے گا) وہ یہ کہ جب ماضی کا اور گزرے ہوئے زمانے کا تصور آئے تو اس کے نتیجے میں تمہیں گناہ یاد آئیں گے کہ میں نے فلاں وقت میں یہ گناہ کیا تھا، فلاں جگہ یہ غلطی کی تھی، لہٰذا ماضی کا تصور آنے پر استغفار پڑھو اور یہ کہو ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ'' اس لئے کہ اگر واقعۃً کوئی گناہ کیا تھا اور اب یاد آ رہا ہے تو اس کی

طرف سے توبہ کرنی ہی ہے، یا بعض کام اگرچہ گناہ تھے، لیکن تمہیں پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ گناہ ہیں، اس لئے اب تک تم نے ان کی طرف سے استغفار بھی نہیں کیا تھا، لہٰذا اب ان کی طرف سے استغفار کرلو، اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استغفار کے اندر یہ دعا فرمائی کہ:

وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ، فَإِنَّكَ تَعْلَمُ مَالَا نَعْلَمُ

یعنی اے اللہ! ہمارے ان گناہوں کی مغفرت فرما دیجئے جو آپ کے علم میں ہیں کیونکہ بہت سے گناہ ایسے ہیں جو آپ جانتے ہیں، ہم نہیں جانتے۔ اس لئے ماضی کا تصور آنے پر استغفار کرو۔

زمانہ حال پر شکر یا صبر

جو زمانہ حال ہے، جو اس وقت گزر رہا ہے، یہ زمانہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو اس زمانے میں کوئی ایسا واقعہ پیش آرہا ہے جس سے تمہیں راحت اور خوشی حاصل ہو رہی ہے، یا ایسا واقعہ پیش آرہا ہے جو طبیعت کے لئے ناگوار ہے اور اس پر تمہیں تکلیف ہو رہی ہے۔ اگر خوشی اور راحت کا واقعہ پیش آرہا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو "اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ" مثلاً اس وقت ہم آرام سے مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں، پنکھے چل رہے ہیں، گرمی کی تکلیف نہیں ہے، اور دین کی طلب میں اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھے ہوئے ہیں، اس پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرو، اور کہو اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ۔ اگر اس وقت بجلی چلی جائے، اور پنکھے بند ہو جائیں، اور گرمی کی تکلیف ہو جائے تو اس پر صبر کرو، اور کہو

''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کلمات کسی کے مرنے پر ہی پڑھے جاتے ہیں، یہ خیال غلط ہے، بلکہ ہر تکلیف پہنچنے پر اور ناگواری کا واقعہ پیش آنے پر ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھو، اور یہ دعا کرو یا اللہ! اس پریشانی کو دور فرمادیں، اس گرمی کو دور فرمادیں۔

دل ہی دل میں شکر

بہر حال! حال کے زمانے میں یا تو کوئی خوشگوار حالت پیش آرہی ہوگی یا ناخوشگوار حالت پیش آرہی ہوگی، اگر خوشگوار حالت ہے تو اس پر دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، زبان سے بھی شکر ادا کرلیں تو بہت اچھا ہے، '' اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ'' ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کردیا تو جانے تم نے کیا سے کیا کردیا، اس لئے کہ کسی کو پتہ نہیں کہ اندر ہی اندر تم نے کیا عبادت انجام دیدی۔ کیونکہ اگر تم وضو کر کے دو رکعت نفل ادا کرو گے تو ہزاروں لوگ تمہیں دیکھ لیں گے، جس کی وجہ سے ریا کا بھی اندیشہ ہے، اور نام و نمود کا خطرہ بھی ہے، لیکن یہاں تو جب دل ہی دل میں یہ کہہ دیا کہ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ تو تم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

''شکر''، عظیم عبادت ہے

یہ شکر کی عبادت کوئی معمولی عبادت ہے؟ یہ تو اتنی بڑی عبادت ہے کہ حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الطَّاعِمُ الشَّاكِرُ بِمَنْزِلَةِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ

یعنی جو آدمی کھانا کھا کر شکر ادا کرے، اس کو اتنا اجر ملے گا جتنا روزہ رکھ کر صبر کرنے والے کو ملتا ہے۔ اور یہ شکر ایسی عبادت ہے جو انسان کو شیطان کے حملوں سے بچاتی ہے، لہٰذا باریک سے باریک اور چھوٹی سے چھوٹی نعمت جس کی طرف آدمی کا دھیان بھی نہیں جاتا، اس کی طرف دھیان لے جاؤ، اور پھر اس پر شکر ادا کرو۔

ناشکری کے کلمات مت نکالو

اللہ تعالیٰ بچائے (آمین) بعض لوگوں کی ایسی طبیعت ہوتی ہے کہ ہمیشہ برائی کی طرف ان کا دھیان جاتا ہے مثلاً کسی واقعہ کے دو پہلو ہیں، تو تاریک پہلو کی طرف ان کا دھیان جائے گا، اچھے پہلو کی طرف ان کا دھیان نہیں جائے گا، چنانچہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب ان سے پوچھا جائے کہ کیسے مزاج ہیں؟ تو جواب میں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور بتائیں گے، ورنہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جب بھی کسی مسلمان کی خیریت پوچھی جاتی تو وہ جواب میں کہتا کہ ''اللہ کا شکر ہے، الحمد للہ'' لیکن آج کل اچھے بھلے چلتے پھرتے انسان سے پوچھا جائے کہ کیا حال ہے؟ تو جواب

میں کہتے ہیں کہ کیا بتاؤں، کیسی گزر رہی ہے، بعض لوگ یہ جواب دیتے ہیں کہ ''ٹائم پاس ہورہا ہے'' جس کا مطلب یہ ہے کہ میں تکلیف اور مصیبتوں کا شکار ہوں، بس میری ہمت ہے کہ میں وقت گزار رہا ہوں اور ٹائم پاس کررہا ہوں، اس کے جواب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکلیف دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ العیاذ باللہ العظیم۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ میں ٹائم پاس کررہا ہوں۔ ایسی ناشکری کے کلمات زبان سے نکالتے ہیں، خدا کے لئے ان کلمات سے بچو، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرو۔

شکر کی عادت ڈالو اور نعمتوں کا دھیان کرو

ہر آن اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی جو بارش ہے اور جو اَن گنت اور بے شمار نعمتیں ہر وقت حاصل ہیں، ان کے سامنے اس ذرا سی تکلیف کی کوئی حقیقت نہیں، آج ہم ان نعمتوں کو تو نہیں دیکھتے، اور ذرا سی تکلیف آجائے تو اس پر شور مچانا شروع کر دیتے ہیں، لہٰذا اُن نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، جب شکر کی عادت پڑ جائے گی تو پھر نعمتوں کی طرف نظر جانے لگے گی کہ کون سی چیز ایسی ہے جس پر میں شکر ادا کروں، جب سوچنے کی عادت پڑ جائے گی، اور نعمتوں کی طرف نظر جانے لگے گی تو اس وقت یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَاتُحْصُوْهَا

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو شمار نہیں کرسکو گے، لہٰذا نعمتوں کا تصور کرکے اور سامنے رکھ کر ان کی طرف سے شکر ادا کرو۔ بہرحال! زمانہ

حال کے اندر شکر ادا کرنا ہے، یا صبر کرنا ہے۔

تکلیف شاذ و نادر ہی آتی ہے

ہمیشہ اس بات کی کوشش کرو کہ ''شکر'' ''صبر'' پر غالب رہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تکلیف دہ امور پر غالب ہیں، تکلیف دہ امور تو شاذ و نادر کبھی پیش آجاتے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ

اس آیت میں ''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِالْخَوْفِ'' نہیں فرمایا، بلکہ ''بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ'' تنوین تنکیر کے ساتھ لائے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمہیں تھوڑا سا خوف دے کر آزمائیں گے، تھوڑی سے بھوک دے کر، اور تمہارے اموال میں، تمہاری جانوں اور ثمرات میں تھوڑی سی کمی کر کے آزمائیں گے، اور پھر اس آزمائش پر صبر کرنے والوں کو اتنی بڑی بشارت عطا فرمادی۔

''شکر'' صبر پر غالب رہنا چاہئے

لہٰذا تکلیف دہ امور تو تھوڑے سے ہیں، زیادہ تر نعمتیں ہی نعمتیں ہیں، نعمتیں ہی غالب ہیں، لہٰذا شکر صبر پر غالب ہونا چاہئے، وہ اس طرح کہ تمہاری زبان اکثر و بیشتر اللہ کے شکر سے تر رہے، تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر جاگزیں رہے، چلتے، پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے شکر جاری رہے، مثلاً کہیں جانا چاہتے تھے، سواری آرام دہ مل گئی، کہو: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، گاڑی میں بیٹھنے کی جگہ مل گئی، کہو:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، منظر اچھا سامنے نظر آرہا ہے، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، ہوا کا جھونکا آیا، اچھا لگا، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، گھر میں داخل ہوئے، بچہ کو کھیلتا دیکھ کر خوشی ہوئی، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، کھانا سامنے آیا، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، بھوک لگ رہی ہے، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، کھانا ذائقہ دار ہے، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ۔ ہر وقت زبان سے ان کلمات شکر کی رٹ لگاؤ۔ اب بتاؤ، کیا ان الفاظ کو ادا کرنے میں کوئی محنت ہو رہی ہے؟ کیا کوئی مشقت ہو رہی ہے؟ کیا زیادہ وقت صرف ہو رہا ہے؟ نہ زیادہ محنت صرف ہو رہی ہے، نہ زیادہ وقت صرف ہو رہا ہے، لیکن زبان سے مسلسل ذکر جاری ہے، اور کسی کو پتہ بھی نہیں کہ یہ بندہ اللہ کا ذکر کر رہا ہے، جس ذات کو پتہ لگنا چاہئے بس اس ذات کو پتہ ہے کہ میرا بندہ میرا شکر ادا کر رہا ہے، میرا ذکر کر رہا ہے اور جس وقت یہ ذکر کر رہا ہے تو ہر ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہو رہا ہے۔

”تعلق مع اللہ“ حاصل ہو رہا ہے

اور جب ایک بندہ ہر لمحے یا تو نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کر رہا ہے یا مصائب پر صبر کر رہا ہے یا اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہو رہا ہے اور اسی مضبوط تعلق کا نام ”تعلق مع اللہ“ ہے۔

وہ تو دل میں ہی مل گئے

حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ:

وہ اتنے تھے قریب کہ دل ہی میں مل گئے
میں جا رہا تھا دور کا ساماں کئے ہوئے

یعنی میں تو کبھی اِدھر بھاگ رہا تھا اور کبھی اُدھر بھاگ رہا تھا، لیکن جب صاحبِ نظر نے راستہ دکھا دیا، اور یہ بتا دیا کہ اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں، وہ تو اپنے دل ہی میں مل گئے۔ لہٰذا جب تم ہر وقت شکر ادا کر رہے ہو، اور ہر وقت دعا کر رہے ہو، اور ہر وقت ان کے ساتھ رابطہ قائم ہے، تو وہ دل ہی میں مل گئے، یہ تو زمانہ حال میں کرنے کا کام تھا۔

مستقبل کے بارے میں پناہ مانگو

اب باقی رہا مستقبل کا مسئلہ۔ تو مستقبل کے بارے میں انسان کے دل میں اندیشے پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ کہیں یہ نہ ہو جائے، وہ نہ ہو جائے، کہیں کاروبار میں نقصان نہ ہو جائے، میرا امتحان قریب ہے، کہیں امتحان میں فیل نہ ہو جاؤں، اب میں فارغ ہو رہا ہوں، فارغ ہونے کے بعد پتہ نہیں کہیں ملازمت ملے گی یا نہیں؟ کہیں پریشانی میں مبتلا نہ ہو جاؤں، کسی سے قرض نہ لینا پڑ جائے، اس قسم کے ہزاروں اندیشے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان کا علاج یہ ہے کہ جب دل میں کوئی اندیشہ پیدا ہو، اس وقت کہو "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ" اے اللہ میرے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے، میں اس اندیشے سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں اور میں نے اپنے کو آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ اس طرح ہر اندیشہ پر اللہ سے پناہ مانگو۔

وہ بندہ ذاکرین میں سے ہے

اب جو بندہ ہر لمحے ماضی پر استغفار کر رہا ہے اور حال پر کبھی شکر ادا کر رہا ہے، کبھی صبر کر رہا ہے اور مستقبل پر اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ رہا ہے تو اس بندے کا تو کوئی لمحہ اللہ کے ذکر سے خالی ہی نہیں ہے، وہ تو ہر وقت اللہ کے ذکر میں لگا ہوا ہے، اسی کا نام ذکر قلبی ہے اور اس کے ذریعے وہ ''تعلق مع اللہ'' جو بڑی بڑی ریاضتوں اور بڑے بڑے مجاہدات کے بعد حاصل ہوتا تھا، آسانی کے ساتھ حاصل ہو جائے گا، بس اس کو اختیار کرنے کی دیر ہے، بہر حال یہ ''کثرت ذکر اللہ'' کا ایک آسان اور مفید اور انتہائی مؤثر طریقہ ہے، جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں بتا دیا۔

نعمتوں کو سوچا کرو

لیکن کوئی بھی کام محض کہنے سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کام کی مشق کرنی پڑتی ہے، اس کی عادت ڈالنی پڑتی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرنے کی عادت ڈالو۔ مثلاً جیسے اس وقت ہم یہاں بیٹھے ہیں، اس وقت ہمیں اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمتیں حاصل ہیں؟ اس طرف ہمارا ذہن نہیں جاتا، لیکن سوچ سوچ کر یاد کرو کہ سر سے لے کر پاؤں تک ہمیں کیا کیا نعمتیں اس وقت میسر ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی کثرت کا پہلا قدم ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ذکر کی کثرت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

ادعیہ ماثورہ

کثرت ذکر اللہ کا بہترین طریقہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۸۵

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

ادعیہ ماثورہ

کثرتِ ذکر اللہ کا بہترین طریقہ

الحمد للّٰہ رب العلمین، والعاقبة للمتقین، والصلوٰة والسلام علی رسوله الکریم، و علی آله و اصحابه اجمعین، أما بعد!

تمہید

گذشتہ دوروز سے یہ بات چل رہی تھی کہ سارے طریقت، تصوف اور سلوک کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی محبت دل میں جاگزیں ہو جائے، اور اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق اتنا مضبوط ہو جائے کہ ہر وقت اللہ جل شانہ کا دھیان رہے۔ اگر یہ چیز حاصل ہو جائے تو دین کے سارے احکام پر عمل آسان ہو جائے۔

اصطلاحات کی فکر میں مت پڑو

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اصطلاحات کی فکر میں مت پڑو، چنانچہ تصوف میں بہت سی اصطلاحات ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے

ساتھ اس درجہ کا تعلق قائم ہو جائے تو اس کا یہ نام ہے، اس سے زیادہ ہو جائے تو اس کا یہ نام ہے، سب سے آخری اور انتہائی درجہ کو "ملکہ یادداشت" کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت دل میں اللہ جل شانہ کا دھیان رہے۔ لیکن حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اصطلاحات کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں، بہت سے لوگ اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت میں جس حالت سے گزر رہا ہوں، یہ حالت کس قسم کی ہے؟ اور اس کا کیا نام ہے؟ حضرت والا فرماتے تھے کہ تمہیں آم کھانے کی فکر ہونی چاہئے، پیڑ گننے سے کیا مطلب؟ اگر تمہیں وہ چیز حاصل ہو رہی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ جیسے ایک آدمی ریل گاڑی کے ذریعے لاہور جا رہا ہے، اب سفر کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہر اسٹیشن کا نام یاد کرے کہ فلاں فلاں اسٹیشن راستے میں آئے، فلاں فلاں اسٹیشن پر گاڑی رکی، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ پڑا سوتا رہے، صبح جب بیدار ہوگا تو انشاء اللہ لاہور پہنچ جائے گا۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ راستے میں کون کون سے اسٹیشن آئے تو وہ اسٹیشن کے نام تو نہیں بتا سکتا، لیکن لاہور پہنچ گیا۔

اصل مقصد اللہ کی یاد کا دل میں بس جانا

اسی طرح تصوف وسلوک کی اصطلاحات کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں، لیکن تصوف کا حاصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں بس جائے، اللہ جل شانہ کی محبت دل میں قائم ہو جائے، اور تعلق مضبوط ہو جائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اس ملفوظ میں اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے اسباب بتلا رہے تھے، پہلا سبب بیان فرمایا "کثرت ذکر اللہ" یعنی اللہ جل شانہ کے ذکر کی کثرت، اس کا بیان گذشتہ کل شروع کیا تھا۔

ادعیہ ماثورہ کا اہتمام کریں

کثرت "ذکر اللہ" کا مقصد جن طریقوں سے حاصل ہوتا ہے، ان میں سے ایک طریقہ "ادعیہ ماثورہ" کا اہتمام ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عجیب طریقہ تلقین فرمایا، وہ یہ کہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی میں ہم جن مراحل سے گزرتے ہیں، ان میں سے ہر ہر مرحلے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا تجویز فرمادی کہ جب صبح کو سو کر بیدار ہو تو یہ دعا پڑھو، جب غسل خانے میں داخل ہونے لگو تو یہ دعا پڑھو اور جب باہر نکلو تو یہ دعا پڑھو، جب وضو کرنا شروع کرو تو یہ دعا پڑھو، جب وضو سے فارغ ہو جاؤ تو یہ دعا پڑھو، مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھو، مسجد سے باہر نکلتے وقت یہ دعا پڑھو، کھانا سامنے آئے تو یہ دعا پڑھو، کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو یہ دعا پڑھو، جب دستر خوان اٹھاؤ تو یہ دعا پڑھو، وغیرہ، اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مراحل میں مختلف دعائیں تجویز فرمادیں۔

ان دعاؤں کو معمولی مت سمجھو

لوگ ان دعاؤں کے پڑھنے کو معمولی سمجھتے ہیں کہ کسی موقع پر دعا پڑھ لی تو کیا نہیں پڑھی تو کیا! خاص طور پر مولوی صاحبان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دعائیں پڑھنا مستحب ہے، اور مستحب کی تعریف یہ ہے کہ پڑھو تو ثواب، نہ پڑھو تو کوئی گناہ نہیں۔

لہٰذا دعائیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ وہ دعائیں پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتے، حالانکہ ہر موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگی ہوئی دعا کو مانگنا اتنی عجیب وغریب چیز ہے کہ اس کے منافع اور فوائد کی کوئی حد ونہایت ہی نہیں۔

یہ الہامی دعائیں ہیں

اوّل تو ان میں سے ایک ایک دعا ایسی ہے کہ اگر ان میں سے ایک دعا بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف قبول پالے تو ہمارا بیڑا پار ہو جائے، اس کے علاوہ یہ کہ ان دعاؤں کے الفاظ میں نور ہے، ان کے معنی میں نور ہے، ان کے فوائد میں نور ہے، گویا کہ ان دعاؤں میں نور ہی نور بھرا ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دعائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے "دلائل النبوۃ" میں سے ہیں، کسی انسان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ ایسی چیزیں اللہ تعالیٰ سے مانگے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مانگنا سکھا گئے، اور جن الفاظ سے مانگنا سکھا گئے، وہ حاجتیں جو ہمارے اور آپ کے تصور میں نہیں آسکتیں، ایسی حاجتیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مانگ گئے، دنیا وآخرت کی کوئی بہتری ایسی نہیں جو ان دعاؤں کے اندر موجود نہ ہو۔ اس لئے میں تو کہتا ہوں کہ یہ دعائیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے "دلائل النبوۃ" میں سے ہیں، کیونکہ یہ دعائیں ایسی ہیں کہ انسان وحی کی روشنی کے بغیر نہیں مانگ سکتا، ایسے ایسے جامع کلمات ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ ان دعاؤں کی شرح کی جائے، چنانچہ جامع مسجد بیت المکرّم کے جمعہ کے بیانات میں ان دعاؤں کی تشریح شروع کی ہے، اللہ تعالیٰ آسانی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچادے۔ آمین، (اب

الحمدللہ وہ تشریح مکمل ہو چکی ہے اور تحریر میں بھی آچکی ہے اور اصلاحی خطبات کی جلد (۱۳) انہی دعاؤں کی تشریحات پر مشتمل ہے۔ مرتب)

ہر کام کے وقت اللہ سے تعلق

یہ دعائیں اپنے پیچھے معنی کی بڑی کائنات رکھتی ہیں، لہٰذا ایک طرف تو یہ دعائیں بڑی مؤثر ہیں، دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے مختلف مراحل پر یہ دعائیں تجویز فرمادیں۔ اس لئے کہ اگر تم ایک مرتبہ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہو گے تو کتنا ذکر کرو گے؟ ہزار مرتبہ، پانچ ہزار مرتبہ، یا زیادہ سے زیادہ دس ہزار مرتبہ کرلو گے، لیکن فارغ ہونے کے بعد پھر اپنے کاموں میں مشغول ہو کر غافل ہو جاؤ گے، ہم تمہیں ذکر کا ایسا طریقہ بتا دیتے ہیں کہ تم جس کام میں لگے ہوئے ہو، اس کام کے اندر ہی تمہارا ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، یہاں تک کہ اگر تم بیت الخلاء جا رہے ہو، وہاں بھی ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، اگر وہاں سے نکل رہے ہو تو بھی ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، گویا کہ ہر کام میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی فضیلت عطا کی جا رہی ہے، اور تمہارا تعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑا جا رہا ہے۔

خدائی پاور ہاؤس سے تعلق جڑ جائے گا

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تمہارے گھر کے اندر بجلی آرہی ہے، تم نے جیسے ہی بٹن دبایا، تمہارے گھر کا تعلق پاور ہاؤس سے سے جڑ گیا، اور پاور ہاؤس سے یہاں تک بجلی آنے میں بے شمار تار ہیں، بے شمار کھمبے ہیں، بے شمار ٹرانسفارمر ہیں، ان کے ذریعے سینکڑوں میل سے بجلی تمہارے

گھر میں آ رہی ہے، جیسے ہی تم نے سوئچ آن کیا، اس بجلی نے سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کرلیا، اور تمہارا تعلق پاور ہاؤس سے جڑ گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ادعیہ ماثورہ تلقین فرما کر گویا کہ یوں فرما دیا کہ بار بار اپنا سوئچ آن کرتے رہو اور جس جس وقت تم ان دعاؤں کا سوئچ آن کرو گے، تمہارا تعلق خدائی پاور ہاؤس سے جڑتا رہے گا۔

اللہ کا دروازہ بار بار کھٹکھٹاؤ

دنیا کے دوسرے تعلقات کا تو یہ حال ہے کہ اگر تمہارا کسی سے تعلق ہو جائے اور تم اس کو بار بار پکارو، بار بار اس کے گھر جا کر اس کے دروازے پر دستک دو، تو وہ ایک مرتبہ برداشت کرلے گا، دو مرتبہ برداشت کرلے گا، تین مرتبہ برداشت کرلے گا، چوتھی مرتبہ دستک دینے پر پٹائی کرے گا، یا مثلاً آپ نے کسی کو ایک مرتبہ ٹیلیفون کیا، تھوڑی دیر بعد دوبارہ ٹیلیفون کیا، تو وہ اس سے ناراض اور غصہ ہو جائے گا کہ بار بار مجھے فون پر پریشان کر رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھ سے جتنی مرتبہ چاہو، تعلق قائم کرلو، اور جس وقت چاہو، جس لمحے چاہو، جس کام کے لئے چاہو، تعلق قائم کرلو، میرے پاس آجاؤ، میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ، اور مجھ سے تعلق قائم کرنے کے لئے سوئچ آن کرتے رہو۔ یہ ادعیہ ماثورہ دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق جوڑ رہی ہیں، اور جتنی مرتبہ دعا کرو گے، اتنا ہی اس تعلق میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اتنی ہی اللہ تعالیٰ سے محبت بڑھے گی، لہٰذا یہ ادعیہ ماثورہ معمولی چیز نہیں، ان کو خوب یاد کرو، اور بروقت ان دعاؤں کے پڑھنے کی عادت ڈالو۔

زندگی کے ہر موڑ کے لئے دعائیں موجود ہیں

مسنون دعاؤں کی بے شمار کتابیں چھپی ہوئی ہیں، مناجات مقبول ہے، حصن حصین ہے، میں نے بھی ایک رسالہ "پُر نور دعائیں" کے نام سے لکھا ہے، جس میں ساری دعائیں جمع کردی ہیں، ان کتابوں کو پڑھو، اور دیکھو کہ کہاں کہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا دعائیں مانگی ہیں، اگر کوئی شخص ان دعاؤں کے پڑھنے کی پابندی کرلے تو صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کا کوئی موڑ ایسا نہیں ہے جس میں وہ اپنے اللہ سے رجوع نہ کر رہا ہو، اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کا ایک نایاب طریقہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تلقین فرمادیا۔

زباں بھی ذاکر اور تعلق بھی قائم

تجربہ یہ ہے کہ جو شخص ان دعاؤں کے پڑھنے کا عادی بن جاتا ہے، اس کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ سے جڑ جاتا ہے، البتہ بعد میں ایسا لگتا ہے کہ چونکہ الفاظ یاد ہو گئے ہیں اور پڑھنے کی عادت ہوگئی ہے، اس لئے اس دعا کو پڑھتے وقت معنی اور مفہوم کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ اس وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح دعا پڑھنے سے کیا فائدہ؟ آٹومیٹک مشین چل پڑی، اور زبان سے خود بخود الفاظ ادا ہو گئے، حالانکہ دل کہیں ہے، اور دماغ کہیں ہے، اس لئے اس طرح دعا پڑھنا بے فائدہ ہے۔ یہ خیال غلط ہے، کیونکہ اس طرح دعا پڑھنا بھی فائدہ سے خالی نہیں، کم از کم تمہاری زبان تو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہے، تمہارا ایک عضو تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگا ہوا ہے، اس لئے یہ بھی کوئی کم نعمت نہیں، لیکن اگر ان دعاؤں کو ان کے

معنی کی طرف دھیان کر کے توجہ سے پڑھو گے تو اس کے نتیجے میں جو فائدہ ہوگا، اور جو تعلق مع اللہ حاصل ہوگا، وہ عظیم الشان ہے۔ بہر حال، یہ ادعیہ ماثورہ کا پڑھنا کثرت ذکر اللہ کا دوسرا طریقہ ہے۔

ہر وقت مانگتے رہو

کثرت ذکر اللہ کا تیسرا طریقہ "کثرت دعا" ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی کثرت، کثرتِ دعا کی اتنی مشق کی جائے کہ ہر وقت تمہارا دل اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہو، چاہے زبان پر دعا ہو یا نہ ہو، لیکن دل میں اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہو، مثلاً چلتے، پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے کام میں لگے ہوئے مانگتے رہو، اب سوال یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کیا چیز مانگیں؟

انسان حاجتوں کا پتلہ

اگر غور کر کے دیکھو تو یہ نظر آئے گا کہ انسان حاجتوں کا پتلہ ہے، ہر لمحہ اس کو کوئی نہ کوئی حاجت اور ضرورت ہے، کوئی لمحہ اس کا احتیاج سے خالی نہیں، مثلاً اس وقت ہم یہاں مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں، بظاہر تو کوئی حاجت نہیں، لیکن بے شمار حاجتیں اس وقت بھی ہمارے ساتھ لگی ہوئی ہیں، مثلاً اگر گرمی لگ رہی ہے تو پنکھے اور ہوا کی حاجت ہے، اگر دھوپ آرہی ہے تو سائے کی حاجت ہے، اگر سردی زیادہ لگ رہی ہے تو گرمائش کی حاجت ہے، کیونکہ انسان کو کسی ایک حال پر قرار نہیں، ذراسی ٹھنڈ زیادہ ہو جائے تو پریشان ہو جاتا ہے، اگر گرمی زیادہ ہو جائے تو پریشان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہر وقت اس کو کوئی نہ کوئی حاجت ہے، لہٰذا ہر ہر لمحے جو

حاجتیں تم کو پیش آ رہی ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو۔

اس طرح مانگو

مثلاً اگر گرمی لگ رہی ہے تو یہ کہو یا اللہ! گرمی دور فرما دیجئے، اگر سردی لگ رہی ہے تو کہو: یا اللہ! یہ سردی دور فرما دیجئے، کسی آدمی کی تلاش ہے، دعا کرو کہ: یا اللہ! فلاں آدمی سے ملاقات ہو جائے، کہیں جانا ہے، اور بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑے ہو، کہو: یا اللہ! آسانی سے بس مل جائے، ٹیکسی کی تلاش ہے، کہو: یا اللہ! آسانی سے ٹیکسی مل جائے، جب سواری میں بیٹھ گئے، کہو: یا اللہ! سگنل کھلا مل جائے، یا اللہ! ٹریفک جام نہ ہو۔ لہٰذا جو حاجت جس وقت پیش آ رہی ہے، اسی وقت وہ حاجت اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ اگر تمہارے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

یقینی طور پر حاصل ہونے والی چیز بھی اللہ سے مانگو

ایک اور باریک بات جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی، وہ یہ کہ جو چیز آنکھوں سے نظر آ رہی ہے کہ یہ چیز یقینی طور پر ابھی مجھے حاصل ہونے والی ہے، وہ بھی اللہ سے مانگو۔ مثلاً آپ روزہ افطار کرنے بیٹھے، سامنے دستر خوان پر افطاری کا سامان موجود ہے، اب بظاہر یہ بات یقینی ہے کہ ہاتھ بڑھا کر افطاری کھا لیں گے۔ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ اس وقت بھی اللہ سے مانگو کہ: یا اللہ! مجھے یہ چیز کھانی نصیب ہو جائے، اور اس چیز کی لذت مجھے عطا فرما دیجئے، اس کے ذریعے مجھے طاقت اور صحت عطا فرما دیجئے، اور اس کے ذریعے

مجھے بدہضمی نہ ہو، میرا پیٹ خراب نہ ہو، بلکہ صحت و عافیت کے ساتھ مجھے کھلا دیجئے۔

اعلیٰ درجہ کا "توکل" یہ ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو عجیب علوم عطا فرمائے تھے، انسان کی عقل حیران رہ جاتی ہے، فرماتے ہیں کہ جہاں آدمی کے سامنے اسباب موجود نہیں ہیں، اگر اس جگہ پر "توکل" کیا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، کیونکہ وہاں اسباب موجود ہی نہیں، اور "توکل" کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ "توکل" کا مزہ تو اس جگہ پر ہے جہاں اسباب سو فیصد موجود ہیں، جیسے ابھی میں نے مثال دی کہ کھانا سامنے موجود ہے، کھانے کے لئے صرف ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے، اس موقع پر بھی نظر ان اسباب پر نہ ہو، بلکہ اس وقت بھی نظر مسبب الاسباب پر ہو، اور اس وقت یہ کہو کہ: اے اللہ! یہ کھانا سامنے موجود تو ہے، لیکن تیری توفیق کے بغیر نہ میں کھا سکتا ہوں اور نہ ہی اس کھانے سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں، یہ "توکل" اعلیٰ درجے کا ہے، کیونکہ سو فیصد اسباب موجود ہونے کے باوجود نگاہ ان اسباب کی طرف نہیں ہے۔ اس "توکل" کی بھی مشق کرنی چاہئے۔

اسباب کی موجودگی میں "توکل" کی ضرورت کیوں؟

تمام اسباب موجود ہونے کے موقع پر "توکل" کی ضرورت اس لئے ہے کہ بے شمار واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ سو فیصد اسباب موجود ہونے کے باوجود اور کھانا سامنے ہونے کے باوجود وہ کھانا منہ تک نہیں پہنچ سکا، مثلاً یہ کہ عین اس وقت کسی

بیماری کا حملہ ہوگیا، فالج ہوگیا، موت واقع ہوگئی، بے ہوشی طاری ہوگئی، تو اب وہ کھانا تو سامنے موجود ہے، لیکن کھانے کی توفیق نہیں ہوئی۔

کھانا الگ نعمت، کھلانا الگ نعمت

کھانے کے بعد جو دعا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے، اس کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ رَزَقَنَا وَ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَاوَ جَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ''میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس میں دو الفاظ الگ الگ ارشاد فرمائے ہیں، ایک ''رَزَقَنَا'' اور دوسرا ''اَطْعَمَنَا'' یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہمیں غذا عطا فرمائی، ہمیں رزق دیا، اور ہمیں کھلایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رزق دینا الگ نعمت ہے اور رزق کھلانا الگ نعمت ہے، کیونکہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ رزق کی نعمت تو موجود ہوتی، لیکن معدہ خراب ہوتا، بدہضمی ہورہی ہوتی، تو اس صورت میں ''رَزَقَنَا'' تو ہے، لیکن ''اَطْعَمَنَا'' نہیں ہے، کیونکہ کھلانے کی نعمت حاصل نہیں ہوئی۔ ایسے واقعات زندگی میں بہت پیش آتے ہیں کہ چیز تو موجود ہے، لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہ موقع اللہ تعالیٰ پر "توکل" اور بھروسا کرنے کا ہے کہ اے اللہ! آپ کی مشیت پر اس سے فائدہ اٹھانا موقوف ہے، آپ کی مشیت ہوگی تو میں اس سے فائدہ اٹھاؤں گا، آپ کی مشیت نہیں ہوگی تو فائدہ نہیں اٹھا سکوں گا، لہٰذا میں آپ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ آپ مجھے یہ چیز کھلا بھی دیجئے، اور اس کا نفع بھی پہنچا دیجئے۔

مانگنے سے محبوب بن جاؤ گے

بہر حال، انسان حاجتوں کا پتلا ہے، جو بھی حاجت پیش آئے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش کرے۔ اور دعا کی قبولیت کے جو اوقات ہیں، نمازوں کے بعد اور دوسرے اوقات میں، ان اوقات میں ذرا اہتمام کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ لو۔ دنیا کے اندر تو یہ معاملہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی سخی داتا ہو، اگر تم اس کے پاس جا کر ایک مرتبہ مانگو گے، دیدے گا، دوسری مرتبہ بھی دیدے گا، تیسری مرتبہ بھی دیدے گا، اس کے بعد مانگو گے تو اس شخص کو تمہارے چہرے سے نفرت ہو جائے گی کہ یہ شخص اب مانگنے کے لئے پھر آ گیا ہے۔ لیکن اللہ جل شانہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، تو یہ اصول ہے کہ "من لم يسئل الله يغضب عليه" یعنی جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم سے جب چاہو، مانگو، جتنا چاہو، مانگو، جتنی مرتبہ چاہو، مانگو، اور تم جتنا زیادہ مانگو گے، اتنا ہی تم ہمارے یہاں محبوب ہو گے، اگر نہیں مانگو گے تو ہم ناراض ہوں گے کہ تم نے کیوں نہیں مانگا۔ لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو، منگتے بنے رہو، یہ ایسا دربار ہے تو اس دربار سے فائدہ اٹھاؤ، اور مانگو، اور دعا کرو۔ اس دعا کی کثرت کا فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو رہا ہے، اور کثرت ذکر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

عجیب وغریب دعا

بہر حال، کثرت ذکر کے تین طریقے ہوئے، ایک یہ کہ ان چار اعمال کا

اہتمام کرنا (جن کا بیان گذشتہ مجلس میں تفصیل سے ہو چکا) دوسرے یہ کہ "ادعیہ ماثورہ" پڑھنے کا اہتمام کرنا، تیسرے یہ کہ "دعا کی کثرت" کرنا۔ یہاں تک کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری دعائیں کرلیں، اور دنیا وآخرت کی کوئی حاجت نہیں چھوڑی تو آخر میں پھر ایک عجیب وغریب دعا فرمائی، وہ یہ کہ:

اَیُّمَا عَبْدٍ اَوْ اَمَةٍ مِنْ اَھْلِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَقَبَّلْتَ
دَعْوَتَھُمْ وَ اسْتَجَبْتَ دُعَائَھُمْ، فَاِنَّا نَسْئَلُكَ
اَنْ تُشْرِكْنَا فِیْ صَالِحِ مَا یَدْعُوْنَكَ فِیْهِ ، وَاَنْ
تُشْرِكَھُمْ فِیْ صَالِحِ مَا نَدْعُوْكَ فِیْهِ وَاَنْ
تُعَافِیَنَا وَاِیَّاھُمْ وَاَنْ تَجَاوَزَ عَنَّا وَ عَنْھُمْ۔

یہ ایسی عجیب دعا ہے کہ کسی دوسرے انسان کے تصور میں بھی یہ الفاظ نہیں آسکتے، فرمایا کہ اے اللہ! خشکی اور سمندر میں آپ کے کسی بندے نے اور کسی بندی نے ساری زندگی میں جو بھی دعا مانگی ہو، اے اللہ! ہمیں بھی اس دعا میں شامل کرلیجیے، اور اُن کو ہماری دعاؤں میں شامل کرلیجیے، اور اُن کی مغفرت فرمادیجیے، اور ہماری بھی مغفرت فرمادیجیے۔

دل دل میں مانگ لو

اور صرف زبان سے نہیں، بلکہ دل دل میں ذکر کرتے رہو، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الحمد للہ، کبھی اس سے تخلف نہیں ہوتا کہ ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ حضرت! ایک مسئلہ پوچھنا ہے، اسی وقت فوراً اللہ تعالیٰ سے یہ دعا

کرلیتا ہوں کہ یا اللہ! یہ شخص پتہ نہیں کیا سوال کرے گا، اس کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجئے، اس طرح دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے۔ لہٰذا جو آدمی ماضی پر استغفار کررہا ہے، حال میں صبر کررہا ہے یا شکر کررہا ہے، اور مستقبل کے لئے استعاذہ کررہا ہے، اور مختلف مراحل زندگی میں ادعیہ ماثورہ کا پابند ہے، اوراس کا دل ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہے، اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ضرور قائم ہو جائے گا، لہٰذا کثرت ذکر اللہ، اللہ تعالیٰ کی محبت اور تعلق قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ان تسبیحات کا معمول بنالو

پھر ہمارے بزرگوں نے یہ بھی فرمادیا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے تھوڑا وقت ایسا مخصوص کرلو جس میں ذکر ہی مقصود ہو، اور بہتر یہ ہے کہ فجر سے پہلے کا وقت یا فجر کے بعد کا متصل وقت اس کے لئے مخصوص کرلو، لیکن اگر اس وقت عذر ہو تو دوسرے اوقات میں کوئی وقت ذکر کے لئے مختص کرلو، اوراس وقت میں یکسوئی کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو، تلاوت کرو، تسبیحات پڑھو، مثلاً "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ" ایک تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" کی ایک تسبیح اور استغفار کی ایک تسبیح، درود شریف کی ایک تسبیح، اور لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ کی ایک تسبیح، اور لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ کی ایک تسبیح۔ ان اذکار کے پڑھنے کا اہتمام کرو، ان سب اذکار کی ایک ایک تسبیح پڑھنے کا معمول بنالو، اگر زیادہ

وقت نہیں تو ایک تہائی تسبیح کا معمول بنالو، اور ۳۳۔ ۳۳ مرتبہ تمام اذکار پڑھ لیا کرو، لیکن جب ذکر کے لئے وقت مقرر کرلو تو پھر اس وقت کو اسی کام میں صَرف کرو، اور پہلے یہ دیکھو کہ میں چوبیس گھنٹے میں سے کتنا وقت اس کام کے لئے نکال سکتا ہوں، پھر اس کے حساب سے معمولات مقرر کرلو، چاہے آدھا گھنٹہ ہو یا پندرہ منٹ ہوں، یا دس منٹ ہوں، لیکن پھر اس کی پابندی کرو، اور اس وقت کے اعتبار سے اذکار کی تعداد میں کمی کرلو، اگر اس وقت میں سو کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو ٦٦ کی تعداد مقرر کرلو، ٦٦ کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو ۳۳ کی تعداد مقرر کرلو، ۳۳ کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو ۱۱ کی تعداد مقرر کرلو۔

پابندی والا عمل پسندیدہ ہے

لیکن جو مقرر کرو پھر اس کی پابندی بھی کرو، ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

قلیل تدوم علیه ارجی من کثیر مملول

یعنی وہ تھوڑا سا عمل جس پر تم مداومت کرو، اس میں اللہ تعالیٰ یہاں اجر وثواب اور قبولیت کی زیادہ امید ہے بنسبت اس کثیر عمل کے جس کو آج کیا اور کل چھوڑ دیا، ایک اور حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خیر العمل مادیم علیه و ان قلّ

یعنی "بہترین عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو" مداومت کے اندر برکت ہوتی ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اذکار کا وقت بھی مقرر ہو،

اور جگہ بھی مقرر ہو، اور تعداد بھی مقرر ہو، کیونکہ ایک جگہ پر بیٹھ کر جب آدمی ذکر کرتا ہے تو اس کا فائدہ بھی زیادہ ہوتا ہے، بنسبت اس کے کہ آدمی چلتے پھرتے ذکر کرے، جگہ اور وقت مقرر کرنے میں زیادہ فائدہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس ذکر کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس زمان و مکان کو ذکر اللہ کے نور سے منور کر دیتے ہیں۔

کائنات کی ہر چیز کا ذکر کرنا

یہ جو قرآن کریم میں ہے کہ:

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ (سورۂ ص:۱۸)

یعنی جب حضرت داؤد علیہ السلام ذکر کرتے تھے تو ان کے ساتھ پہاڑ بھی ذکر کرتے تھے، اور پرندے بھی ذکر کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو انعام کے طور پر ذکر فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام پر ہمارا یہ انعام تھا جب وہ ذکر کرتے تو ان کے ساتھ پہاڑ بھی ذکر و تسبیح کیا کرتے تھے۔

ذکر میں دلجمعی پیدا ہوتی ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پہاڑ ذکر و تسبیح کرتے تھے تو حضرت داؤد علیہ السلام پر کیا احسان اور انعام ہوا؟ اگر وہ تسبیح کر رہے ہیں تو کرنے دو، ان کا حضرت داؤد علیہ السلام سے کیا تعلق؟ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ پہاڑوں کا ذکر کرنا حضرت داؤد علیہ السلام پر انعام اس طرح ہے کہ جب ذاکر ذکر کرتا ہے، اور اس کے ساتھ کائنات کے دوسرے عناصر بھی ذکر کرنے میں مشغول ہوتے ہیں تو اس کے ذکر میں دلجمعی اور لطف زیادہ پیدا

ہوتا ہے۔

ذکر کے وقت یہ تصور کیا کرو

اسی وجہ سے صوفیاء کرام نے ذکر کا ایک طریقہ ایسا تجویز فرمایا ہے جس میں ذاکر ذکر کرتے وقت یہ تصور کرتا ہے کہ میرے ساتھ پوری کائنات ذکر کر رہی ہے، یہ چاند بھی ذکر کر رہا ہے، یہ سورج بھی ذکر کر رہا ہے، یہ آسمان بھی ذکر کر رہا ہے، یہ پہاڑ وغیرہ سب میرے ساتھ ذکر کر رہے ہیں، اس تصور کا بڑا عظیم فائدہ خود ذاکر کو محسوس ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جب آدمی ذکر کے لئے کوئی جگہ اور وقت مقرر کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذکر سے اس جگہ اور وقت کو منور فرما دیتے ہیں، اور اب وہ وقت اور جگہ بھی اس کے ساتھ ذکر میں شریک ہو جاتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے ذکر کی برکت کا انعکاس ایک دوسرے پر ہوتا ہے، اس لئے ایک جگہ اور ایک وقت مقرر کر کے ذکر کرنے میں زیادہ فائدہ ہے، اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے کرو، مگر پابندی سے کرو۔

خلاصہ

بہرحال؛ کثرت ذکر کا چوتھا طریقہ یہ ہے کہ تھوڑا سا وقت مقرر کر کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو، اگر یہ کام کر لیا تو انشاء اللہ کثرت ذکر کا مقصود حاصل ہوگا، اور اس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کے ساتھ محبت پیدا ہوگی، اور تعلق مضبوط ہوگا، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ کریں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۶

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ کریں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَ الصَّلوٰةُ
وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ أَجْمَعِیْنَ
وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ۔أَمَّا بَعْدُ!

تمہید

پچھلے کئی روز سے حضرت والا کے ایک ملفوظ کا بیان چل رہا ہے، جس کا موضوع یہ ہے کہ دین پر چلنے کا جب کوئی شخص ارادہ کرے تو اس کے لئے اس کو کچھ محنت کرنی پڑتی ہے، اس ''محنت'' کو حضرات صوفیاء کرام ''مجاہدہ'' اور ''ریاضت'' کہتے ہیں، لیکن ان تمام مجاہدات اور ریاضتوں کا جو اصل مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے ساتھ مضبوط تعلق قائم ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سما جائے، جب یہ تعلق قائم اور مضبوط ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سما جاتی ہے تو پھر دین کے تمام احکام پر عمل آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ''محبت'' کے نتیجے میں مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتے ہیں، لہٰذا اصل چیز یہ ہے کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت مطلوب درجے میں پیدا ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس مطلوب

درجے میں تعلق قائم ہو جائے، جب یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے تو باقی سارے کام خود بخود ہوتے رہتے ہیں۔

بیویوں کے درمیان مساوات

حضرت والا فرمارہے ہیں کہ ویسے تو محبت غیر اختیاری چیز ہے، کسی سے محبت ہے، کسی سے محبت نہیں ہے، یا ایک سے محبت زیادہ ہے، اور دوسرے سے محبت کم ہے، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے درمیان ہر طرح سے مثالی مساوات قائم فرمائی، اور ہر ایک کے ساتھ برابری کا سلوک فرمایا، لیکن اس سب کے باوجود آپ نے یہ دعا فرمائی کہ:

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِكُ ، وَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا لَا اَمْلِكُ

اے اللہ! جو میں نے تقسیم کیا ہے وہ اپنے اختیاری معاملات میں تقسیم کیا ہے کہ جتنے پیسے ایک بیوی کو دیئے، اتنے ہی پیسے دوسری بیویوں کو دیئے، جیسا کھانا ایک بیوی کو دیا، ویسا ہی کھانا دوسری بیویوں کو دیا، جیسے کپڑے ایک بیوی کو دیئے، ویسے ہی کپڑے دوسری بیویوں کو دیئے، جیسا برتاؤ ایک بیوی کے ساتھ کیا، ویسا ہی برتاؤ دوسری بیویوں کے ساتھ کیا، لہٰذا اختیاری معاملات میں تو میں نے ''عدل'' اور مساوات کی کوشش کرلی، لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جو میرے اختیار میں نہیں ہیں، اے اللہ! ان غیر اختیاری چیزوں پر مجھ سے مؤاخذہ مت فرمایئے گا۔

محبت اختیار میں نہیں

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا چیز آپ کے اختیار میں نہیں تھی؟ حضرات علماء

کرام نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ وہ "محبت" ہے کہ یہ اختیار میں نہیں کہ تمام ازواج مطہرات سے محبت بھی برابر ہو، بلکہ محبت کسی سے زیادہ ہے، اور کسی سے کم ہے۔ یہ چیز انسان کے اختیار سے باہر ہے، انسان وہ پیمانہ کہاں سے لائے، جس سے وہ یہ ناپے کہ میں جتنی محبت اس سے کرتا ہوں، دوسرے سے بھی اتنی محبت کروں۔ اس سے معلوم ہوا کہ "محبت" انسان کے اختیار میں نہیں، اور جب اختیار میں نہیں تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ محبت کس طرح قائم ہو؟ اس کے جواب میں حضرت والا فرمارہے ہیں کہ اگرچہ "محبت" اختیار میں نہیں، لیکن اس کے "اسباب" اختیار میں ہیں، جب ان اسباب کو اختیار کروگے تو وہ "محبت" دل میں پیدا ہوگی، اس ملفوظ میں حضرت والا ان "اسباب" کو بیان فرمارہے ہیں، ان میں سے پہلا سبب یہ بیان فرمایا کہ "کثرت ذکر اللہ" جتنا انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے گا اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں پیدا ہوگی، اور "کثرت ذکر اللہ" کے کچھ طریقے میں نے بتائے تھے کہ ادعیہ مأثورہ کا اہتمام کرے، اور دعا کی کثرت کرے، اور ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگے، اور تھوڑا سا وقت مخصوص کرکے اس میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام کرے، ان سب کا بیان تفصیل سے ہوگیا۔

اللہ کے انعامات اور اپنے برتاؤ کو سوچنا

آگے حضرت والا "محبت" پیدا ہونے کا دوسرا "سبب" بیان فرمارہے ہیں، چنانچہ فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنا" اس میں حضرت والا نے دو چیزیں بیان فرمائیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو سوچنا، دوسری

یہ کہ پھر اپنے برتاؤ کو سوچنا، ان دونوں چیزوں کو سوچنا اللہ تعالیٰ کی ''محبت'' پیدا کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط کرنے کے لئے بڑا اکسیر ہے، ہر وقت ہم پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں مبذول ہیں، ہر وقت نعمتوں کی جو بارش برس رہی ہے، اس کا دھیان کرو، اس کو سوچو، ان نعمتوں کا ''مراقبہ'' کرو، ''مراقبہ'' اور ''دھیان'' کرنے سے سمجھ میں آئے گا، اس کے بغیر سمجھ میں بھی نہیں آئے گا۔

نعمتوں کا مراقبہ اور دھیان کرو

انسان صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں پل رہا ہے، ہر ہر فرد بشر پر ہر آن اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کی بارش ہورہی ہے، لیکن اس طرف دھیان اور خیال بھی نہیں جاتا کہ یہ بھی کوئی نعمت ہے جو ہمیں حاصل ہے، اس کے نتیجے میں انسان غفلت کا شکار رہتا ہے، لیکن جب انسان اہتمام اور دھیان کے ساتھ ان نعمتوں کی طرف توجہ کرتا ہے تو پھر ان نعمتوں کا استحضار ہوجاتا ہے، اور ان کی طرف نگاہ جانے لگتی ہے، اور اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، جو مجھے ہر وقت ہر آن حاصل ہیں۔

اللہ والوں کی صحبت سے دھیان اور استحضار حاصل ہوتا ہے

یہ دھیان اور احساس اور استحضار اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان کسی اللہ والے کی صحبت میں بیٹھتا ہے، جب تک اللہ والے کی صحبت نصیب نہیں تھی تو اس وقت تو غفلت میں وقت گزر رہا تھا، اس وقت اس طرف دھیان ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیا کیا نعمتیں میری طرف مبذول ہیں، بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت کو لے

کر روتا ہی رہتا تھا، ذرا سی کوئی تکلیف آگئی، ذرا سی پریشانی آگئی تو بس اسی کو لئے بیٹھا ہے، اس کو لے کر رو رہا ہے۔ لیکن جب اللہ جل شانہ کسی اللہ والے کے ساتھ تعلق قائم فرمادیتے ہیں، اور انسان کسی اللہ والے کا دامن پکڑ لیتا ہے تو پھر یہ فہم اور سمجھ آتی ہے کہ ارے تو کس ذرا سی مصیبت کو لے کر بیٹھا تھا، تیرے اوپر تو صبح سے لے کر شام تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش برس رہی ہے۔

قرآن کریم میں تدبر اور تفکر کی دعوت

اور قرآن کریم بھی تمہیں یہی دعوت دے رہا ہے کہ ذرا سوچا کرو، ذرا غور و فکر کیا کرو، جگہ جگہ قرآن کریم میں تدبر اور تفکر کا حکم دیا گیا ہے، اب لوگ اس تدبر اور تفکر کا غلط مطلب سمجھ بیٹھے، چنانچہ آج کل لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم بار بار تدبر اور تفکر کی دعوت دے رہا ہے، اس کا مطلب یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں خوب ترقی کرو، یہ مطلب درست نہیں۔ ویسے تو سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کرنا کوئی بری بات نہیں، بلکہ جائز اور مستحب ہے، اور بعض حالات میں واجب ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جس تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں، بلکہ قرآن کریم کے تدبر اور تفکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی نعمتوں کا، اور اس کی تخلیق کی حکمتوں کا، اور اس کی قدرت کاملہ کا، اور کی حکمت بالغہ کا انسان دھیان کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے، اور یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ
الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیَاتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ o الَّذِیْنَ
یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ
وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

یعنی ان آسمانوں کی تخلیق میں، اور زمینوں کی تخلیق میں، اور دن رات کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں، عقل والے کون لوگ ہیں؟ اس کی تفصیل آگے اللہ تعالیٰ نے خود فرمادی کہ عقل والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہونے کی حالت میں، اور بیٹھنے کی حالت میں، اور لیٹنے کی حالت میں، اور وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ آسمان، زمین، یہ ستارے اور کائنات کی تمام اشیاء بے فائدہ پیدا نہیں کیں، بلکہ ہمارے فائدے کے لئے اور ہماری مصلحت کے لئے پیدا فرمائی ہیں، ان میں سے ہر چیز ہمارے لئے ایک نعمت ہے، اے اللہ! جب آپ نے اس دنیا میں ہمیں یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں تو اے پروردگار! ہمیں اپنی رحمت سے جہنم کے عذاب سے بھی نجات عطا فرما۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے وقت یہ آیات تلاوت کیا کرتے تھے۔

یہ زمین میرے لئے، یہ آسمان میرے لئے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نظم ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ:

یہ زمیں میرے لئے، یہ آسماں میرے لئے

چل رہا ہے دیر سے یہ کارواں میرے لئے

یہ سب کارواں اللہ تعالیٰ نے میرے لئے پیدا فرمایا ہے، یعنی میری مصلحت کے لئے، میرے فائدے کے لئے۔ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ یہ سورج تمہاری خدمت کر رہا ہے، یہ چاند تمہاری خدمت کر رہا ہے، یہ ستارے تمہاری خدمت کر رہے ہیں، یہ ہوائیں تمہاری خدمت کر رہی ہیں، یہ سمندر، یہ دریا، یہ پہاڑ، یہ جنگل، غرض ہر چیز تمہارے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے، چنانچہ فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا

یعنی جو کچھ اس نے زمین میں پیدا کیا ہے، وہ تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔

یہ سورج میرے لئے ہے

روزانہ صبح کے وقت سورج نکلتا ہے، اور اپنی کرنیں پھیلاتا ہے، اور دھوپ ڈالتا ہے، اور شام کو غروب ہوتا ہے، یہ سب کیوں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے انسان! یہ سورج جو اتنی بڑی مخلوق ہے، یہ میں نے تیرے لئے پیدا کی ہے، تاکہ تجھے روشنی حاصل ہو، تجھے گرمی حاصل ہو، اور اس کی روشنی میں تو اپنی زندگی کے مقاصد پورے کرے، اور اس سورج کو اتنے فاصلے پر رکھا کہ اس کا فائدہ تو تمہیں حاصل ہو جائے، لیکن اس کے نقصان سے تم محفوظ رہو۔ پھر اس سورج کی کرنوں میں مفید اجزاء بھی ہیں، اور مضر اجزاء بھی ہیں، اب مضر اجزاء سے انسان کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کے اردگرد ایک ''چھلنی'' لگا دی ہے، جس کو آج کل ''اوزون'' *ozone* کہا جاتا ہے، یہ چھلنی بڑی مہین اور لطیف ہے، اس چھلنی سے

سورج کی کرنیں چھن کر اس کے صرف مفید اجزاء انسان تک پہنچتے ہیں، اور مضر اجزاء روک دیئے جاتے ہیں، آج کے دور میں مدتوں کے بعد، صدیوں کے بعد یہ ''اوزون'' دریافت ہوا، ورنہ انسان کو پتہ بھی نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت ہی وہ چھلنی لگادی تھی، ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ہمارے فائدے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں کیا کچھ نظام مقرر فرمارکھا ہے، ایک ایک چیز کی ماہیت اور حقیقت پر غور کروگے تو یہ نظر آئے گا کہ صرف ایک چیز کے اندر اللہ تعالیٰ کی لاکھوں نعمتیں موجود ہیں۔

اپنے جسم کے اندر غور کرلو

یہ تو ''آفاق'' کی باتیں ہیں، ارے تم جسم پر غور کرلو، سر سے لے کر پاؤں تک، اور بال سے لے کر ناخن تک، تمہارے جسم کا ایک ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ، اس کی حکمت بالغہ، اس کی رحمت واسعہ کا کرشمہ ہے، تمہیں تو بھی پتہ نہیں کہ تمہارے جسم میں کیا ہورہا ہے، آج تک تم اپنے جسم کو بھی پوری طرح دریافت نہیں کرسکے، تمہارے جسم کا کون سا حصہ کیا عمل کررہا ہے؟ جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا، اس وقت سے لے کر آج تک اپنے وجود کی تحقیق میں مصروف ہے، چنانچہ طب اور میڈیکل سائنس کا شعبہ اسی تحقیق میں مصروف ہے کہ اس چھ فٹ کے وجود میں اللہ تعالیٰ نے کیا کارخانہ لگارکھا ہے، لیکن آج تک یہ کارخانہ کلی طور پر دریافت نہیں ہوسکا، اور جو کچھ دریافت ہوا، اس سے پتہ چلا کہ یہ عجیب و غریب کارخانہ ہے، دنیا کا کوئی کارخانہ، کوئی فیکٹری، کوئی مل ایسی عجیب وغریب

نہیں ہے، جیسے انسان کے جسم کی فیکٹری ہے، جو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے، انسان اس فیکٹری کو اِدھر سے اُدھر لئے پھر رہا ہے، اس کو استعمال کر رہا ہے، اس کے ایک ایک عضو سے فائدہ اٹھا رہا ہے، لیکن خود اس کو پتہ نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

بھوک کب لگتی ہے؟

انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے، پھر بھوک مٹانے کے لئے کھانا کھا رہا ہے، ذائقہ اور لذت حاصل کرنے کے لئے کھانا کھا رہا ہے، اس بیوقوف کو یہ پتہ نہیں کہ اس وقت اس سرکاری مشین کو تیل کی ضرورت ہے، اس کو ایندھن کی ضرورت ہے، یہ تیل کب ختم ہو رہا ہے، اور کتنا باقی ہے؟ اس کو جاننے کے لئے کوئی میٹر تو لگا ہوا نہیں ہے، گاڑی کے اندر تو تم نے میٹر لگا دیا ہے، جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ اب اس گاڑی کا پیٹرول ختم ہونے والا ہے، اس لئے اس میں پیٹرول ڈلوا دو۔ اس جسم کے اندر اللہ تعالیٰ نے اتنا مزیدار میٹر لگا دیا ہے کہ جب اس جسم کو ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کو بھوک لگ جاتی ہے، خود بخود کھانا کھانے کو دل چاہتا ہے۔ یہ بیوقوف انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ میں بھوک مٹانے کے لئے کھانا کھا رہا ہوں، اور لذت حاصل کرنے کے لئے کھانا کھا رہا ہوں۔

''ذائقہ'' ایک عظیم نعمت

پھر اللہ تعالیٰ نے اس منہ کے اندر ایک ذائقہ رکھ دیا، تا کہ اس ذائقے کو حاصل کرنے کے لئے خود انسان کھانے کی طرف مائل ہو، اور اس ذائقے کی تسکین کے لئے کھانا کھائے، اب یہ انسان سمجھ رہا ہے کہ میں ذائقے کی تسکین کے لئے

کھانا کھا رہا ہوں، لیکن حقیقت میں اس کے جسم کو ''غذا'' کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ ذائقہ تمہاری چھوٹی سی زبان میں رکھ دیا، اگر یہ مزیدار کھانا تم ناک میں رکھ لو، یا جسم کے کسی اور حصہ میں لگاؤ تو کیا کوئی ذائقہ محسوس ہوگا؟ کیا یہ پتہ چلے گا کہ یہ کھٹا ہے یا میٹھا ہے؟ کچھ بھی نہیں، لیکن اس چھوٹی سی زبان میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لعاب پیدا فرمادئے، کہ اس لعاب کے نتیجے میں ذائقہ معلوم ہوتا ہے، اور کھانے میں مزہ آتا ہے، اگر وہ ذائقہ خراب ہو جائے تو اچھی خاصی میٹھی چیز بھی کڑوی معلوم ہوتی ہے۔

اگر یہ ''ذائقہ'' خراب ہو جائے تو

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مجھے شاید نزلہ ہو گیا تھا، اس کے نتیجے میں ذائقہ بالکل رخصت ہو گیا، چنانچہ میں ایک جگہ دعوت میں گیا، کسی نے مجھے مرچوں والا قیمہ لاکر دیا، اور اس کے بعد میٹھی کھیر لاکر دی، میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ قیمہ کھانے میں اور کھیر کھانے میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا، نہ مرچیں محسوس ہوئیں، اور نہ مٹھاس محسوس ہوئی، بس ویسے ہی حلق سے اتار لیا۔ عام حالات میں اللہ تعالیٰ نے اس زبان کے اندر ایسا ذائقہ رکھ دیا کہ کھانے میں لذت آرہی ہے، مزہ آرہا ہے، اسی ذائقے کے حصول کی خاطر انسان متنوع اور مختلف قسم کی اشیاء بنا رہا ہے، ایک بڑی مخلوق صرف تمہارے اس ذائقے کی تسکین کے لئے لگی ہوئی ہے، اور اشیاء میں چٹخارہ پیدا کرنے کے لئے لگی ہوئی ہے، اب آدمی تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں چٹخارے کی تسکین کر رہا ہوں، حقیقت میں اس کے نتیجے میں اس کے بدن کو غذا مل

رہی ہے، اس کے بدن کو ایندھن مل رہا ہے۔

''معدہ'' میں خودکار مشین لگی ہوئی ہے

اور پھر تم نے تو ذائقہ حاصل کرنے کی خاطر ہر چیز کو منہ میں ڈال کر اس کو حلق سے اتار لیا، افطار کے وقت دیکھیں کہ آپ کیا کرتے ہیں، ابھی میٹھی چیز کھائی، ابھی کھٹی چیز کھائی، اب پھلکیاں کھالیں، اب پکوڑے کھالئے، اب کھجور کھالی، الم غلم سب کچھ اندر بھر لیا، اس کی کوئی فکر نہیں کی کہ اندر کیا ہوگا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے جسم کے اندر ایک کارخانہ لگا دیا ہے، جو ہر ہر چیز کو الگ کر رہا ہے، اور چھانٹی کر رہا ہے، یہ میرا بندہ اپنے ذائقے کے حصول کے لئے الم غلم سب کچھ کھا گیا ہے، اس لئے ہم نے اندر ایک خودکار مشین لگا دی ہے، جو ہر چیز کو الگ کر رہی ہے، جس چیز سے خون بننا چاہئے، اس سے خون بن رہا ہے، جس چیز سے جسم کو توانائی ملنی چاہئے، اس سے توانائی مل رہی ہے، جو فضلہ اور بے کار ہے، وہ خارج ہو رہا ہے، ایک طرف سے غذا آرہی ہے، اور دوسری طرف سے خارج ہو رہی ہے، ایک مکمل نظام قائم ہے، جو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے۔

بغیر طلب کے یہ سب کچھ دیدیا

اگر اس نظام کی ایک کل ذرا سی ڈھیلی ہو جائے تو آدمی بے چین اور پریشان ہو جاتا ہے، اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے، اور اب ڈاکٹروں کے پیچھے پھر رہا ہے۔ کیا تم نے اللہ میاں سے کہا تھا کہ ہم کھانا کھائیں گے تو اس کھانے کے نظام کو ٹھیک کر دیجئے گا؟ ہمارے جسم کے اندر ایسا جگر بنا دیجئے گا، ایسا گردہ اور ایسا معدہ

بنا دیجئے گا، کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے ان چیزوں کے بنانے کی فرمائش کی تھی؟ نہیں، بلکہ اسی نے محض اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے یہ سارا کارخانہ تمہارے لئے بنادیا، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ما نبودیم و تقاضۂ ما نبود
لطف او ناگفتہء ما می شنود

یعنی نہ ہم موجود تھے، اور نہ ہماری طرف سے کوئی فرمائش اور تقاضا تھا، اسی کے کرم نے ہماری وہ بات سن لی جو ہم نے کہی نہیں تھی۔ ہماری نہ کہی ہوئی بات سن کر ہمارے لئے یہ کارخانہ بنادیا۔

''آنکھیں'' عظیم نعمت ہیں

یہ ایسا عجیب وغریب کارخانہ ہے کہ دنیا کا کوئی کارخانہ اس کی نظیر نہیں ہے، نہ اس کی نظیر مل سکتی ہے، اگر کوئی انسان یہ کارخانہ بنانا چاہے تو اربوں کھربوں میں بھی یہ کارخانہ نہیں بن سکتا۔ اب جو صاحب نظر ہے وہ ان نعمتوں کو دیکھتا ہے، ان کا استحضار کرتا ہے، ان کے بارے میں وہ سوچتا ہے کہ یا اللہ! آپ نے ہمیں یہ آنکھ عطا فرمائی ہے کہ جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں، اس وقت سے لے کر آج تک حسین مناظر اس آنکھ سے دیکھ رہے ہیں، اور اس آنکھ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، کبھی تمہارے ذھن میں اس کے نعمت ہونے کا خیال آیا؟ کبھی تم نے اس نعمت کا شکر ادا کیا؟ اور یہ کہا یا اللہ! آپ نے یہ آنکھ دی، اس میں بینائی اور روشنی عطا کی، ہم نے شکر نہیں ادا کیا، بلکہ غفلت کے عالم میں اس عظیم نعمت کو استعمال کر رہے ہیں، بے

پروائی کے عالم میں اس کو استعمال کر رہے ہیں۔ ہاں! خدانہ کرے کبھی یہ بینائی چلی جائے، یا اس میں کمی واقع ہو جائے، تب پتہ چلے گا کہ یہ کتنی بڑی نعمت تھی جو ہم سے چھن گئی، لیکن اس وقت لاپروائی سے استعمال کر رہے ہیں، پھر اس کے استعمال میں حلال وحرام سب ایک کر رکھا ہے۔ لہٰذا کبھی سوچا کرو کہ یہ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے، کیا ہمارے بس میں تھا کہ ایسی بینائی والی چیز کسی طرح حاصل کر لیتے؟ جب چلی جاتی ہے تو لاکھوں کروڑوں خرچ کرنے کے بعد بھی واپس نہیں آتی، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کے لئے دو پہرے دار بٹھا دیئے، یہ دو پلکیں پہرے دار ہیں، جب کوئی چیز آنکھ کی طرف آتی ہے تو یہ پلکیں اس کو روک لیتی ہیں، تا کہ براہ راست آنکھ پر ضرب نہ لگے، اس لئے کہ یہ آنکھیں اتنی نازک ہیں کہ اگر ذرا سی بھی کوئی چیز لگ جائے گی تو خراب ہو جائیں گی، ایسی نعمت کے بارے میں بیٹھ کر غور کیا کرو، سوچا کرو، اور اس پر شکر ادا کیا کرو۔

''کان'' اور ''زبان'' عظیم نعمتیں ہیں

یہ کان اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم نعمت ہے، ان لوگوں سے اس کی قدر پوچھو جو سننے کی قوت سے محروم ہیں، یہ زبان اور قوت گویائی عطا فرمائی، اپنے دل کی بات کہنے کا ذریعہ عطا فرمایا، ورنہ تمہارے دل میں جذبات اٹدتے رہتے، اور زبان سے کچھ نہ کہہ سکتے، اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھو جن کی زبان پر فالج گر جاتا ہے، وہ لوگ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں، اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، لیکن اظہار نہیں کر پاتے۔ آپ کو یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے مفت میں عطا فرما رکھی ہے، بہر

حال! سر سے لے کر پاؤں تک اپنے وجود ہی میں غور کرلو کہ اللہ تعالیٰ نے کیا کیا نعمتیں عطا فرما رکھی ہیں۔

رات کو سونے سے پہلے یہ عمل کرلو

ان نعمتوں کا مراقبہ کیا کرو، اس مراقبہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس ذات نے یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں، اس کی محبت دل میں پیدا ہوگی۔ اس مراقبہ کا بہترین طریقہ جو حضرت والا نے بیان فرمایا: یہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے پانچ دس منٹ اس مراقبہ کے لئے مختص کرلو، اور اس مراقبہ میں ان نعمتوں کا دھیان کرو جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہوئی ہیں، ایک ایک نعمت کا دھیان کرکے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جاؤ، اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے آنکھ عطا فرمائی ہے، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے میری آنکھ میں صحت اور بینائی عطا فرمائی ہے، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے کان عطا فرمائے ہیں، اور اس میں شنوائی کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے زبان عطا فرمائی، اور اس میں گویائی کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے یہ دانت عطا فرمائے، جو صحیح سالم ہیں، اور یہ کھانے کا کام دے رہے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے یہ ہاتھ عطا فرمائے ہیں، جن کے ذریعے میں اپنے کام انجام دیتا ہوں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے پاؤں عطا فرمائے، اس میں چلنے کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ

وَلَكَ الشُّكْرُ، اس طرح ایک ایک عضو کا تصور کر کے اور ان کے اندر جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہیں، ان کا تصور کرو، اور پھر ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

گرد و پیش کی نعمتوں پر شکر

پھر اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالو اور یہ کہو کہ: اے اللہ! آپ نے مجھے گھر عطا فرمایا، جو عافیت کا گھر ہے، اور نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو گھر کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اے اللہ! آپ نے آرام دہ بستر عطا فرمایا، اَللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے بیوی بچے عطا فرمائے جو محبت کرنے والے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، ایک ایک چیز کی طرف دھیان لے جاؤ، اور پھر ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

پریشانی کے وقت نعمتوں کا استحضار

انسان پر کوئی نہ کوئی تکلیف اور پریشانی بعض اوقات آجاتی ہے، لیکن انسان کا کام یہ نہیں ان پریشانیوں کو لے کر بیٹھ جائے، اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بھول جائے، بلکہ عین پریشانی اور عین تکلیف کے وقت بھی اگر غور کرو گے تو اس وقت میں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس مصیبت اور تکلیف کے مقابلے میں ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ نظر آئیں گی، مگر چونکہ انسان بے صبرا ہے، جب کوئی تکلیف آتی ہے تو اسی کو لے کر بیٹھ جاتا ہے، اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔

میاں صاحب پیدائشی ولی تھے

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک استاذ تھے، حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو ''میاں صاحب'' کے نام سے مشہور تھے، بڑے عجیب بزرگ تھے، اور پیدائشی ولی تھے، میرے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، میرے دادا فرمایا کرتے تھے کہ یہ پیدائشی ولی ہیں، اس لئے کہ یہ بچپن سے میرے پاس پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے، اس وقت سے لے کر آج تک کبھی انہوں نے جھوٹ نہیں بولا، جب میں بچوں کو پڑھا رہا ہوتا، کوئی بچہ کوئی شرارت کر لیتا، تو میں ڈانٹ کر پوچھتا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ سب بچے خاموش دم بخود ہو جاتے، لیکن یہ کھڑے ہو جاتے اور کہتے کہ استاد جی! مجھ سے یہ غلطی ہو گئی، اس وقت بھی کبھی ان کی زبان پر جھوٹ نہیں آیا۔

بیماری میں شکر کا انداز

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ مجھے اطلاع ملی کہ وہ بیمار ہیں، میں ان کی عیادت کے لئے گیا، جا کر دیکھا تو شدید بخار کے اندر تپ رہے ہیں، شدید بے چینی کے اندر ہیں، میں نے پوچھا کہ حضرت کیسی طبیعت ہے؟ فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری آنکھیں صحیح کام کر رہی ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے کان بہت اچھی طرح کام کر رہے ہیں، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اللہ کا شکر ہے کہ گویائی کی قوت بحال ہے، الحمد للہ جگر، دل اور معدہ ٹھیک ہے، بس بخار ہو رہا ہے، دعا کر دیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرما دیں۔ دیکھئے! جو

تکلیفیں نہیں تھیں، ان کا ذکر کر کے پہلے ان پر شکر ادا فرمایا، پھر آخر میں بخار کا ذکر کیا۔ یہ وہ لوگ تھے کہ عین تکلیف کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں مبذول ہیں، ان کی طرف دھیان جا رہا ہے، اور ان پر شکر ادا ہو رہا ہے، اس کے بعد تکلیف کا بھی تھوڑا سا تذکرہ کر دیا، اور اس کو بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر دیا، یہ ہے ایک شکر گزار بندے کا طرزِ عمل۔

نعمتوں پر شکر ادا کرو

ہم جیسوں کا تو یہ حال ہے کہ جب ذرا سی تکلیف آ جائے تو اس وقت ہم ساری نعمتیں بھلا بیٹھتے ہیں، اور اس تکلیف کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اسی پر شکوہ شکایت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ

یعنی میرے بندوں میں شکر گزار بندے بہت کم ہیں، جو نعمتیں میں نے ان پر ہر وقت مبذول کر رکھی ہیں، ان کا احساس ہی نہیں ہے، ان نعمتوں کا دھیان ہی نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ نعمتوں کو یاد کرو، اور ان پر شکر ادا کرو، جو تکلیفیں تم پر آ رہی ہیں، بے شک ان کو بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرو، اور کہو کہ: اے اللہ! میں کمزور ہوں، مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہو رہی ہے، آپ اپنے فضل و کرم سے میری اس تکلیف کو دور کر دیجئے، آپ نے جہاں اتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، اس تکلیف کے دور ہونے کی نعمت بھی عطا فرما دیں، لیکن خدا کے لئے ان موجودہ نعمتوں کی ناشکری نہ کریں۔

’’دانت‘‘ ایک عظیم نعمت ہے

ہماری ایک بہن کی جب عمر زیادہ ہوگئی، اور ان کے دانت ٹوٹنے لگے، ایک مرتبہ وہ اپنا دانت نکلوا کر واپس آئیں تو وہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہنے لگیں کہ ابا جی! یہ دانت بھی عجیب چیز ہیں کہ یہ آتے وقت بھی تکلیف دیتے ہیں اور جاتے وقت بھی تکلیف دیتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ جب بچپن میں دانت نکلتے ہیں تو اس کے نتیجے میں بچے کو دست آرہے ہیں، کبھی بخار آرہا ہے، اور بڑی عمر میں جب یہ ٹوٹتے ہیں تو اس وقت بھی یہ بہت تکلیف دیتے ہیں، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی بات سن کر ایک آہ بھری، اور فرمایا: خدا کی بندی! تمہیں ان دانتوں کی دو ہی چیزیں یاد رہیں کہ انہوں نے آتے وقت بھی تکلیف دی، اور جاتے وقت بھی تکلیف دے رہے ہیں، اور پچاس ساٹھ سال کی درمیانی مدت میں ان سے جو مزہ لیا ہے، ان سے جو راحت حاصل کی ہے، جو ذائقہ حاصل کیا ہے، اس کا کبھی دھیان اور خیال نہیں آیا؟ ٹھیک ہے کہ آتے وقت بھی تکلیف ہوئی، اور جاتے وقت بھی تھوڑی سی تکلیف ہورہی ہے، لیکن سالہا سال تک اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس چکی سے منوں اور ٹنوں خوراک کو پیسا ہے، اور اس کو اپنے جسم کا جز بنایا ہے، اس کی طرف دھیان نہیں۔ بس ذرا سی تکلیف آجاتی ہے تو ہم اس کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔

اللہ والوں کی صحبت کا فائدہ

اللہ والوں کی صحبت سے یہی بات حاصل ہوتی ہے کہ وہ انسان کا زاویہ نگاہ

درست کر دیتے ہیں، اب تک نگاہ تکلیفوں پر، مصیبتوں پر اور پریشانیوں پر جارہی تھی، اللہ والے کی صحبت کے نتیجے میں نعمت پر جانے لگتی ہے۔ٹھیک ہے جو تکلیفیں ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کردیں، اور کہہ دیں کہ: یا اللہ! میں کمزور ہوں، میں اس تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا، اے اللہ! اپنی رحمت سے اس کو دور فرما دیجئے، لیکن جو تمہیں نعمتیں دی ہیں، کم از کم ان کو تو مت بھولو۔

کیا محسن سے محبت نہیں ہوگی؟

لہٰذا رات کو سونے سے پہلے تھوڑی دیر بیٹھ کر نعمتوں کا جائزہ لو، اپنے جسم پر ہونے والی نعمتوں کا، اپنے گردو پیش پر ہونے والی نعمتوں کا، اپنے گھر والوں پر ہونے والی نعمتوں کا جائزہ لو، اور ان میں سے ایک ایک پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اسی کا نام ''مراقبہ'' ہے، یہ مراقبہ بڑا اکسیر ہے، روزانہ کرکے دیکھو، اس لئے کہ جب روزانہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مراقبہ کروگے تو اس کے نتیجے میں خود بخود اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی۔ فرض کرو کہ کوئی شخص تمہارے دروازے پر روزانہ پیسے پھینک کر چلا جاتا ہے، تم اس کو اٹھا کر اپنی ضروریات پوری کر لیتے ہو، اور اس طرح تمہارا کام چل رہا ہے، اب خود بخود تمہارے دل میں اس شخص کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا کہ یہ شخص جو روزانہ پیسے ڈال کر جارہا ہے، اور میری حاجتیں پوری کر رہا ہے، اس کو دیکھوں تو سہی، پھر اس کو دیکھنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لیکن اس کی محبت دل میں ضرور پیدا ہوگی۔ وہ ایک انسان جو دن میں صرف ایک مرتبہ تمہارے دروازے پر پیسے ڈال گیا، اور اس کے ذریعے تمہاری حاجتیں پوری ہوگئیں، جب

اس کا تصور کر کے تمہارے دل میں اس کی محبت پیدا ہو رہی ہے، تو وہ ذات جو ہر وقت تمہارے اوپر نعمتوں کا گھن نچھاور کر رہی ہے، وہ ذات اگرچہ نظر نہیں آرہی ہے، لیکن کیا تم اس سے محبت نہیں کرو گے؟ کیا اس کی نعتوں کے تصور سے اس کے ساتھ محبت پیدا نہیں ہوگی؟ اس لئے روزانہ رات کو دس منٹ کے لئے نعمتوں کے استحضار کا مراقبہ کیا کرو، اور ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرو۔

شکر ادا کرنے کا عجیب وغریب واقعہ

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ چیز اپنے ایک عزیز سے سیکھی، وہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے بستر پر بیٹھے ان الفاظ کی رٹ لگاتے، اور بار بار فرماتے، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ آپ رات کو سونے سے پہلے یہ کیا کرتے ہیں؟ جواب میں فرمایا: ہاں بھائی، سارے دن تو نعمتوں پر شکر ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا، اس لئے میں رات کو سونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرتا ہوں، اور ایک ایک نعمت کا دھیان کر کے اس پر اللہ تعالیٰ شکر ادا کرتا ہوں۔ حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے شکر ادا کرنے کا عجیب طریقہ بیان فرما دیا۔ بہر حال، رات کو سونے سے پہلے صرف دس منٹ اس کام کے لئے نکال لو، اور اس وقت چھوٹی چھوٹی نعمتوں کا بھی تصور کرو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، یہ عمل تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات سے

محبت اور تعلق پیدا ہو جائے گا تو پھر سب کچھ آسان ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اللہ کی محبت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ٦

مجلس نمبر : ٨٧

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ کی محبت

پیدا کرنے کے اسباب اور طریقے

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین ، والعاقبۃ للمتقین ،
والصّلوٰۃ والسّلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ
و اصحابہ اجمعین ، امّا بعد !

دوسرا طریقہ: انعامات کو سوچنا

یہ مضمون کئی روز سے چل رہا ہے، اس کا موضوع ہے "تعلق مع اللہ کی اہمیت اور اس کو پیدا کرنے کا طریقہ" اللہ جل شانہ کی محبت سارے دین کی بنیاد ہے، حضرت والا نے اللہ کی محبت پیدا کرنے کے طریقوں میں پہلا طریقہ بیان فرمایا "کثرت ذکر اللہ" اس کی تھوڑی سی تفصیل پچھلے بیانات میں عرض کر دی۔ دوسری چیز جس کا گذشتہ کل تھوڑا سا ذکر ہوا تھا، وہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اپنے برتاؤ کو سوچنا" اللہ جل شانہ کی وہ نعمتیں جو ہر وقت ہر انسان پر مبذول ہیں، ان کا تصور اور دھیان کرنے کے نتیجے میں اپنے محسن حقیقی کی محبت

دل میں پیدا ہوگی، ظاہر ہے کہ جو شخص ہر وقت دوسرے کا زیر بار احسان ہو، اور دوسرا شخص اس پر بے مانگے بھی احسان کر رہا ہے تو طبعی بات یہ ہے کہ اس شخص سے محبت پیدا ہوگی۔

ان کے انعامات سب پر عام ہیں

اللہ تعالیٰ جن کے انعامات کا سلسلہ غیر متناہی ہے، جب ان انعامات کا بار بار تصور کیا جائے گا، تو ان کی محبت دل میں پیدا ہوگی، بات صرف دھیان کی ہے، ان کے انعامات تو مسلسل جاری ہیں، تم شکر کرو، یا ناشکری کرو، ان کے انعامات میں تو کمی نہیں ہے، ان کی نعمتوں میں کمی نہیں آرہی ہے، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ادیم زمین سفرۂ عام اوست
بری خوانِ نعمت چہ دشمن چہ دوست

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پوری زمین کو ایسا عام دسترخوان بنا رکھا ہے کہ ساری مخلوق اس کی نعمتوں سے مستفید ہو رہی ہے، اور اس دسترخوان پر دشمن اور دوست کی کوئی تفریق نہیں، دشمن کو بھی اسی طرح دے رہے ہیں، جس طرح دوست کو دے رہے ہیں، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ظاہری نعمتیں مسلمان اور کافر سب پر جاری ہیں، بلکہ بعض اوقات کافروں پر زیادہ ہو رہی ہیں، وہ مسلمانوں سے زیادہ خوشحال ہیں، زیادہ ترقی کر رہے ہیں، ان کے پاس زیادہ پیسہ ہے، ان کے پاس دولت زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں کہ فلاں دشمن مجھے جھٹلا رہا

ہے، میری توہین کر رہا ہے، میری گستاخی کر رہا ہے، میرے وجود کا بھی منکر ہے، پھر بھی اللہ تعالیٰ اس کو نعمتیں دے رہے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

دوستوں کو تنگی اور دشمنوں کو فراخی

بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں اپنے پیارے محبوب بندوں کو اس دنیا میں تنگی کا شکار کیا جاتا ہے، اور دشمنوں کو نوازا جاتا ہے، چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ماپروریم دشمن ومامی کشیم دوست
کس را چرا و چوں نہ رسد در قضاء ما

یعنی بعض اوقات ہم دشمن کو پالیتے ہیں، اور اپنے دوست کو مارتے ہیں، قتل کرادیتے ہیں، جیسے سامری جادوگر کو جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ پالا جارہا ہے، اور دوسری طرف حضرت الیاس علیہ السلام کو آروں سے چروادیا گیا۔ لہٰذا دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دوست، دشمن، مسلم اور کافر سب پر جاری ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اندر تو کوئی کمی واقع نہیں ہورہی ہے۔

ان نعمتوں کی طرف دھیان نہیں

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

وہ تو ہر وقت جاری ہیں، بات صرف دھیان کی ہے کہ ہم اس کی ان نعمتوں کی طرف سے غافل ہیں، اس کا دھیان نہیں کرتے، اس کا استحضار نہیں

کرتے، اس کی وجہ سے ان نعمتوں کا خیال نہیں کرتے، اگر اللہ تعالیٰ ان کا دھیان کرنے کی توفیق عطا فرمادے، اور ان کو یاد کرنے کی توفیق عطا فرمادے، تو پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی ان نعمتوں کو سوچے، اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا نہ ہو۔ اس لئے کل میں نے عرض کیا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے نعمتوں کا استحضار کر کے اس پر شکر ادا کیا کرو۔ بہرحال! محبت پیدا کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو سوچنا۔

تیسرا طریقہ: اپنے برتاؤ کو سوچنا

اس کے بعد حضرت فرماتے ہیں کہ ساتھ میں اپنے برتاؤ کو بھی سوچے، یعنی یہ سوچے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یہ عالم ہے کہ بارش کی طرح ہر لمحے برس رہی ہیں، اور دوسری طرف میرا برتاؤ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذرا سی عبادت کا حکم دیا ہے، اسی میں سستی کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جس گناہ سے بچنے کا حکم دیا تھا، اس سے بچنے میں سستی کر رہا ہوں، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ:

کارسازِ ما بسازِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

یعنی ہمارا کارساز تو دن رات ہمارے کام میں لگا ہوا ہے، ہماری حاجتوں کو پورا کر رہا ہے، ہم پر اپنی نعمتوں کا نازل فرما رہا ہے، لیکن جو کام ہمارے سپرد کیا گیا تھا، وہ کام ہمارے لئے آزار بنا ہوا ہے، ہم اس کو اپنے لئے

مصیبت سمجھ رہے ہیں کہ یہ نماز پڑھنا، یہ روزے رکھنا اور گناہوں سے بچنا، ان کو مصیبت سمجھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے جواب میں بندے کا طرز عمل کتنی ناشکری والا طرز عمل ہے، اگر انسان یہ سوچے کہ میرے اس طرز عمل کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے اوپر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہوگی۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور پھر اپنے برتاؤ کو سوچو۔

اپنی حیثیت میں غور کرو

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت کا ایک اور مطلب بھی ہو سکتا ہے جو حضرت والا نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے، جیسا کہ ہمارے بھائی کلیم صاحب نے بتایا کہ انہوں نے حضرت کے وعظ میں یہ پڑھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنے سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اپنی حیثیت میں غور کرنے سے بھی دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ اپنی حیثیت میں غور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی عظمت، اس کا جلال، اس کی کبریائی، اس کی رحمتیں، اس کی قدرت کاملہ، اس کی حکمت بالغہ میں غور کرے، اور دوسری طرف اپنی کم حیثیتی کا تصور کرے کہ میری تو کوئی حقیقت نہیں، میں تو کسی کام پر قادر نہیں، میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب ان کی عطا ہے، ورنہ میرے پاس تو کچھ نہیں تھا، نہ میں اپنے وجود کو خود سے وجود میں لا سکتا تھا، نہ میں اپنے آپ زندہ رکھ سکتا تھا، نہ یہ شکل وصورت، نہ یہ صحت، نہ یہ

علم حاصل کر سکتا تھا، ان میں سے کچھ بھی میرے پاس نہیں تھا، یہ سب کچھ انہی کی عطا ہے، اور وہ جب چاہیں چھین لیں، واپس لے لیں۔

اس سے اللہ کا شکر اور محبت بڑھتی ہے

اور جب سب کچھ انہی کی عطا ہے تو پھر میں کس بات پر تکبر کروں، کس بات پر اتراؤں، کس بات پر عجب اور خود پسندی کے اندر مبتلا ہوں، اس لئے کہ اپنی ذات میں تو میرے پاس کچھ بھی نہیں، یہ ہے "اپنی حیثیت کو سوچنا" اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ جتنا اپنی کم حیثیتی کا احساس ہوگا، اتنا ہی اللہ جل جلالہ کی نعمتوں کی عظمت کا احساس ہوگا۔ اگر انسان اپنے آپ کو ان نعمتوں کا مستحق سمجھے تو وہ سوچے گا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ کام میرے ساتھ کرنا ہی چاہئے تھا، اللہ تعالیٰ کو یہ نعمتیں مجھے دینی تھیں، ایسا انسان اللہ تعالیٰ کا کیا شکر ادا کرے گا، اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کہاں سے پیدا ہوگی؟ لیکن اگر انسان یہ سوچتا ہے کہ میں بے حیثیت ہوں، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نعمتیں میرے اوپر نازل ہو رہی ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ کے شکر کا اور اس کی محبت کا احساس دل میں پیدا ہوگا۔

ایک بزرگ اور متکبر کا واقعہ

جب دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم بڑے آدمی ہیں، ہمیں شان و شوکت حاصل ہے، تکبر کے احساسات دل میں پیدا ہو رہے ہیں، اس وقت انسان دوسرے سے کہتا ہے کہ: جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ چنانچہ ایک شخص سے

ایک بزرگ نے کوئی اصلاح کی بات کہی تو اس نے پلٹ کر کہا کہ: جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ یعنی ہم تو اتنے بڑے آدمی ہیں، تم ہماری اصلاح کرتے ہو؟ جواب میں ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاں! میں جانتا ہوں تم کون ہو، تمہاری حقیقت یہ ہے کہ:

انسان کی حقیقت

اَوَّلُكَ نُطْفَةٌ مَذِرَةٌ وَآخِرُكَ جِيفَةٌ قَذِرَةٌ،

وَأَنْتَ فِيمَا بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ

یعنی تمہاری ابتداء ایک گندہ اور ناپاک نطفہ اور منی کا قطرہ تھا، اصل تو تمہاری یہ ہے، اور آخری انجام تمہارا یہ ہے کہ تم بدبودار مردار بننے والے ہو، ایسے بدبودار کہ تمہارے گھر والے بھی چوبیس گھنٹے تمہیں اپنے گھر میں رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، وہ تمہارے مرنے پر روئیں گے، لیکن رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے، وہ یہ کہیں گے کہ اس میں سے جو بدبو اٹھے گی اس کو برداشت کرنا ہمارے بس میں نہیں، لہٰذا فوراً قبرستان لے جا کر قبر میں ڈال دیں گے، اور پیدائش سے لے کر وفات تک جو درمیان کا زمانہ ہے، اس زمانے میں تو ہر وقت نجاست کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے، یہ کوئی مبالغہ نہیں، بلکہ حقیقت ہے، کیونکہ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ انسان سر سے لے کر پاؤں تک نجاستوں کا پلندا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کھال کے ذریعہ ہماری پردہ پوشی کر رکھی ہے، عیب چھپے ہوئے ہیں، گندگی چھپی ہوئی ہے، ورنہ اس خوبصورت چہرے

پر ذرا سا چیرا لگاؤ، تو اندر سے گندگی نکل آئے گی، کہیں خون بھرا ہوا ہے، کہیں پیپ بھری ہوئی ہے، کہیں پیشاب اور کہیں پاخانہ بھرا ہوا ہے، اس وقت تو سب لوگ محبت کر رہے ہیں، اپنے پاس بٹھا رہے ہیں، لیکن اگر چہرے سے کھال اتر جائے تو کوئی پاس بیٹھنے کو بھی تیار نہ ہو، بلکہ نفرت کریں، اور دیکھنے کو بھی تیار نہ ہو، وہی خوبصورت چہرہ خوفناک بن جائے گا، اور دیکھ کر ڈر لگے گا۔ لہٰذا تیری ابتداء گندے نطفے سے ہوئی، اور تیری انتہاء ایک بدبودار مردار پر ہوگی، اور درمیان کے زمانے میں تو گندگی اٹھائے پھر رہا ہے، یہ تیری حقیقت ہے، اور پھر بھی یہ کہتا ہے کہ "جانتا نہیں میں کون ہوں؟

شکستگی مطلوب ہے

جب تک انسان کو اپنی اس حقیقت کا ادراک اور احساس نہ ہو، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی نہ تو نعمتوں کا ادراک ہوسکتا ہے، اور نہ ہی اللہ جل شانہ کی محبت کما حقہ پیدا ہوسکتی ہے، اسی لئے حضرت فرماتے ہیں کہ "اپنی حیثیت کو پہچانو" اور اس طریق میں اول و آخر سبق یہی ہے کہ "اپنی حقیقت کو پہچاننا اور اپنے آپ کو مٹانا اور فنا کرنا" جس میں دعویٰ ہو، جس میں تعلّی ہو، جو شان و شوکت بنائے، اور جو تکبر کرے، اس کو اس طریق کی ہوا بھی نہیں لگی، یہاں شکستگی مطلوب ہے، اپنی حیثیت کا احساس ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے شکستگی ہو۔

اپنی نظر میں چھوٹا دوسروں کی نظر میں بڑا

اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ

فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا ، اے اللہ! مجھے اپنی آنکھ میں چھوٹا بنا دیجئے، یعنی جب میں اپنے آپ کو دیکھوں تو اپنے آپ کو چھوٹا سمجھوں، تاکہ میرے اندر تواضع پیدا ہو، البتہ لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا دیجئے، اس لئے کہ اگر لوگ بھی مجھے چھوٹا سمجھنے لگیں گے تو وہ مجھ پر ظلم اور زیادتی کریں گے، کسی نے خوب کہا ہے کہ:

سگ باش ، و برادر خورد مباش

کتے بن جاؤ، لیکن چھوٹے بھائی مت بنو۔ مطلب یہ ہے کہ ساری بلائیں چھوٹے بھائی پر نازل ہوتی ہیں، اس لئے کہ اگر دوسرے یہ سمجھنے لگیں کہ یہ چھوٹا ہے تو لوگ اس پر ظلم کریں گے، اس کو بھون کر ہی کھا جائیں گے، چونکہ یہ چھوٹا ہے اس لئے جو سلوک چاہو، اس کے ساتھ کرو۔ لہٰذا اپنے دفاع کے لئے اور اپنے بچاؤ کے لئے لوگوں کی نگاہ میں اے اللہ! مجھے بڑا بنا دیجئے، لیکن میں اپنے آپ کو چھوٹا ہی سمجھتا رہوں۔

اول و آخر "فنا ہی فنا"

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں تو پہلا و آخری سبق "فنا ہی فنا" ہے، یعنی اپنے آپ کو مٹانا، فرماتے ہیں کہ جو شخص مشیخت، پیری اور شان و شوکت کا راستہ اپنائے، اس کو ہمارے راستے کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اسلئے عام آدمی کی طرح رہو، کوئی شان و شوکت بنانے کی ضرورت نہیں، شان بنانے سے پرہیز کرو، اور اپنی

حیثیت کو پیش نظر رکھو، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ادراک ہوگا، اور پھر شکر کی توفیق ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی۔

چوتھا طریقہ: اللہ والوں کی صحبت

آگے حضرت والا نے محبت پیدا کرنے والے اسباب میں سے چوتھا سبب یہ بیان فرمایا کہ "کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا" یہ بھی محبت پیدا کرنے کا بڑا قوی ذریعہ ہے، بلکہ شاید سب سے قوی ذریعہ ہو، اس لئے کہ اللہ والوں سے جتنی محبت ہوگی، اور اللہ والوں سے تعلق ہوگا، ان کی صحبت اٹھاؤ گے، ان کے ساتھ رہو گے، اتنی ہی اللہ جل جلالہ کی محبت دل میں بڑھے گی۔ ہمارے حضرت ایک شعر پڑھا کرتے تھے:

ان سے ملنے کی ہے یہی اک راہ
ملنے والوں سے راہ پیدا کر

ان سے ملنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے جو ملنے والے ہیں، ان سے راہ پیدا کر، ان سے تعلق جوڑ لے، تو پھر انشاء اللہ وہ بھی مل جائیں گے۔ لہٰذا جو اللہ والے ہیں، جن کے دلوں میں اللہ کی محبت سمائی ہوئی ہے، ان کی صحبت اختیار کرنا، ان کے قریب رہنا، ان سے تعلق پیدا کرنا، ان سے محبت کرنا، ان کاموں سے اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دل میں بھی پیدا ہوگی۔

اللہ کی محبت بھر رہا ہوں

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر بیان فرمار ہے تھے، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ بھی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، دوران بیان حضرت مجذوب صاحب نے فرمایا کہ حضرت! خدا کے واسطے کچھ ہمارے دل میں بھی بھر دیجئے، حضرت نے فرمایا میں اور کیا کر رہا ہوں، یعنی یہ جو بیان ہو رہا ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دلوں میں بھری جارہی ہے، اور کیا کر رہا ہوں۔ بہر حال! جب آدمی اللہ والوں کے پاس بیٹھتا ہے، ان کی باتیں سنتا ہے، ان کے ملفوظات کو سنتا ہے، ان کی اداؤں کو دیکھتا ہے، تو ان سب کاموں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے رابطہ جڑتا ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں قوت پیدا ہوتی ہے، اسی لئے حضرت والا نے اسباب محبت میں یہ بیان فرمایا کہ: کسی اللہ والے سے تعلق رکھنا۔

پانچواں طریقہ: طاعت پر مواظبت

اسباب محبت میں پانچواں سبب یہ بیان فرمایا کہ "طاعت پر مواظبت کرنا" یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنا، جتنی زیادہ اطاعت کرو گے اتنی ہی محبت بڑھے گی۔ اللہ تعالیٰ نے "محبت" اور "اطاعت" کے درمیان عجیب رشتہ رکھا ہے، وہ یہ کہ "اطاعت" سے محبت پیدا ہوتی ہے، اور پھر "محبت" سے مزید اطاعت ہوتی ہے، پھر اس "اطاعت" سے مزید "محبت" پیدا ہوتی ہے، پھر اس "محبت" سے مزید "اطاعت" انجام پاتی ہے، یہ سلسلہ ایک لامتناہی حد تک چلا جاتا ہے۔

یہ تو ''دور'' لازم آرہا ہے؟

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ یہ کہا جاتا ہے اللہ کے حکم کی اطاعت کرنے اور دین کے حکم پر چلنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا کرلی جائے، جب یہ پوچھا گیا کہ ''محبت'' کیسے پیدا کریں؟ تو یہ کہا گیا کہ محبت پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، یہ تو ''دور'' لازم آگیا، یعنی یہ کہا جارہا ہے کہ دین پر چلنا ہے تو محبت کرو، اور محبت پیدا کرنے کے لئے دین پر چلو، یہ تو ''دور'' لازم آرہا ہے کہ جن دو چیزوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے پر موقوف ہورہی ہے۔ اس کے جواب کو غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

شروع میں تھوڑی سے محنت اور ہمت

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ جو بندہ بھی ابتداء میں تھوڑی سے محنت کرکے اطاعت کرے گا تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کو ''محبت'' کا ایک خاص درجہ عطا فرمائیں گے، پھر ''محبت'' کے اس درجہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مزید ''اطاعت'' کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ شروع میں بغیر کسی محنت اور عمل کے خود بخود محبت پیدا نہیں ہوگی، اور نہ ہی خود بخود اطاعت کرنا آسان ہوگا، بلکہ دین شروع میں تھوڑی سے قربانی مانگے گا، تھوڑی سے محنت اور ہمت مانگے گا، اس ہمت اور محنت کے بغیر یہ دولت نہیں ملتی، لہٰذا شروع میں آدمی کو یہ کرنا پڑے گا کہ اپنی خواہشات کے خلاف، اور

اپنے دنیاوی اور بشری تقاضوں کے خلاف تھوڑی سے محنت کرنی پڑے گی، اور جب ایک مرتبہ انسان وہ محنت کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایک نورِ محبت پیدا فرما دیتے ہیں۔

ریل بھاپ کے ذریعہ تیز چلتی ہے

اس بات کو حضرت والا نے دوسری جگہ پر ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے، فرمایا کہ جیسے ریل کے انجن میں اگر بھاپ بھری ہوئی ہو (اُس زمانے میں ریل بھاپ کے ذریعہ چلائی جاتی تھی، پٹرول اور ڈیزل دستیاب نہیں تھا) تو وہ ریل بہت تیز بھاگتی ہے، لیکن اگر ریل میں سب چیزیں موجود ہیں، پہیے بھی لگے ہیں، لیکن انجن کے اندر بھاپ نہیں ہے، اب اگر کوئی شخص دھکا لگا کر اس ریل کو چلانا چاہے گا تو وہ ریل پورے دن میں بمشکل ایک دو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرے گی، لیکن اگر انجن میں بھاپ بھری ہوئی ہے، اور اس بھاپ کے ذریعہ اس ریل کو چلایا جائے گا تو وہ دن بھر میں چار پانچ سو میل کا فاصلہ طے کرے گی۔

"محبت" بمنزلہ "بھاپ" کے ہے

حضرت فرماتے ہیں کہ ٹرین کے تیز رفتار چلنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک بھاپ کی، دوسرا پہیوں کی، اگر انجن اور بھاپ نہ ہو، صرف پہیے ہوں تو وہ ٹرین تیز نہیں چل سکتی، اور اگر بھاپ ہو، لیکن پہیے نہ ہوں، تو وہ بھاپ اس ٹرین کو تباہ کر دے گا، اور وہ ٹرین زمین کے اندر دھنس جائے گی۔ لہٰذا بھاپ کی بھی ضرورت ہے، اور پہیوں کی بھی ضرورت ہے۔ حضرت

فرماتے ہیں کہ اسی طرح انسان کے اندر "محبت" بمنزلہ "بھاپ" کے ہے، اور "عمل" بمنزلہ "پہیے" کے ہیں، اس لئے پہلے تھوڑا سا "عمل" تو کرنا پڑے گا، پھر اس "عمل" کے نتیجے میں جب "محبت" کی بھاپ پیدا ہوگی، تو پھر تیز رفتاری سے ترقی ہوگی، اور تیز رفتاری سے "عمل" ہوگا۔

اڑنے سے پہلے زمین پر جہاز کا چلنا

آج کل کی مثال سے یوں سمجھ لیں، جیسے یہ ہوائی جہاز ہے، یہ ہوا میں اُڑتا ہے، اور ہوا میں پانچ سومیل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتا ہے، لیکن اُڑنے سے پہلے ہوائی جہاز کو زمین پر "ٹیکسی" کرنے پڑتی ہے، کوئی جہاز ایسا نہیں ہے جو کھڑا کھڑا سیدھا اُڑ جائے، بلکہ تھوڑی دیر اس کو زمین پر چلنا پڑتا ہے، یہ وقت مجھ جیسے مسافر کے لئے بڑا صبر آزما وقت ہوتا ہے، اس لئے کہ جب جہاز اُڑ جاتا ہے تو میں اپنے لکھنے کے کام میں مشغول ہو جاتا ہوں، اور جب تک زمین پر چل رہا ہوتا ہے اس وقت تک کوئی کام نہیں کرسکتا، بہرحال! ہر جہاز اُڑنے سے پہلے زمین پر آہستہ چلتا ہے، پھر اُڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح "محبت" پیدا کرنے کے لئے تھوڑی محنت کرنے پڑے گی، اور تھوڑا سا "عمل" کرنا پڑے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں اپنی خواہشات کے خلاف عمل کرنا شروع کرو گے تو پھر "محبت" کی بھاپ تمہارے اندر پیدا ہو جائے گی، اور پھر تیز رفتاری سے ترقی ہوگی۔

ایمان کی لذت حاصل کرلو

یہی معنی اس حدیث کے ہیں جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی نامحرم پر لذت لینے کے لئے نگاہ ڈالنے کو دل چاہ رہا ہے، اور بہت شدید تقاضا ہو رہا ہے کہ میں اس پر نگاہ ڈال کر لذت حاصل کرلوں، لیکن اگر تم نے اللہ کے حکم کا خیال کر کیا اللہ کے ڈر سے اس نگاہ کو بچالیا، اور نظر نہیں ڈالی، اور نظر ہٹانے کے تکلیف اپنے نفس پر برداشت کر لی تو اللہ تعالیٰ تمہیں ایمان کی ایسی لذت عطا فرمائیں گے کہ گناہوں کی لذت اس کے سامنے ہیچ در ہیچ ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ بندے سے فرماتے ہیں کے اے بندے! میں نے تیرے اوپر صبح سے لے کر شام تک کتنے انعامات کر رکھے ہیں، تیرے اوپر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، تجھ سے صرف یہ مطالبہ ہے کہ میری خاطر ناجائز خواہشات سے اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے بچالے، اور جب تو اپنے آپ کو اس سے بچائے گا تو میں تجھ سے یہ وعدہ کر رہا ہوں کہ:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (سورۃ الروم:۶۹)

یعنی جو لوگ ہمارے راستے میں تھوڑی سی کوشش کریں گے تو ہم ضرور بالضرور ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستوں پر لے جائیں گے۔

خواہشات کو روکنے کے لئے یہ تصور مفید ہے

لہٰذا تھوڑی سی قربانی دینی ہوگی، یہ جنت اتنی سستی نہیں ہے، اور یہ محبت اتنی سستی نہیں ہے، اور وہ قربانی یہ ہے کہ نفس کو ناجائز خواہشات سے روکنے کی

عادت ڈالو، اور اس کام میں آسانی پیدا کرنے کے لئے یہ تصور کرو کہ یہ دنیا ہے، یہ جنت نہیں ہے، اور اس دنیا کے اندر بڑے سے بڑا انسان چاہے وہ بڑے سے بڑا حاکم ہو، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ہو، اور دولت مند ہو، کیا وہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ میری مرضی کے موافق ہو رہا ہے، بلکہ اس دنیا میں ہر انسان پر اس کی مرضی کے خلاف حالات پیش آتے ہیں، اور آتے رہیں گے، اس سے بچنا ممکن نہیں۔ آج جن کے ہاتھ میں پوری دنیا کی کمان ہے، جن کے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں، نوکر چاکر ہیں، حشم خدم موجود ہیں، اور دنیا بھر کے تمام وسائل ان کو میسر ہیں ان سے جا کر پوچھو کیا تمہاری طبیعت کے خلاف کوئی واقعہ ہوا یا نہیں؟ بسا اوقات ان کی طبیعت کے خلاف اتنی زیادہ باتیں ہوتی ہیں، جتنی ہماری اور آپ کی طبیعت کے خلاف نہیں ہوتیں۔ لہٰذا یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں ہمیشہ خوش رہوں، اور مجھے کبھی کوئی غم اور تکلیف نہ آئے، کبھی کوئی صدمہ نہ پہنچے، اور کبھی کوئی خلاف طبع بات نہ ہو۔ لہٰذا طبیعت کے خلاف تو حالات پیش آئیں گے۔

دو راستے

اب دو راستے ہیں، ایک راستہ تو یہ ہے کہ طبیعت کے خلاف کرنے کے لئے ایسے کاموں کو اختیار کرلو جس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ راضی ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ فرمائیں کہ دیکھو! یہ ہے میرا بندہ، جس نے میری خاطر اپنی طبیعت کے تقاضے کو پامال کر دیا۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو پورا کرتے رہو،

اس کی کوشش کرتے رہو، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ساری زندگی خواہشات کو پورا کرنے میں لگے رہو گے، اور اللہ تعالیٰ سے دور ہوتے چلے جاؤ گے۔ لہٰذا جب خواہشات کے خلاف کام ہونے ہی ہیں، چاہے تم کچھ بھی کرلو، تو پھر اللہ کے حکم کی خاطر خواہشات کے خلاف کام کیوں نہ کرلو۔

یہ تکلیف لذیذ بن جائے گی

اور جب تم ایک مرتبہ یہ تصور کرو گے کہ میں طبیعت کے خلاف یہ کام اللہ جل شانہ کی اطاعت میں کررہا ہوں، تو اس صورت میں وہ تکلیف بھی بالآخر لذیذ بن جائے گی، کیوں؟ اس لئے کہ جب یہ تصور آئے گا کہ میں نے الحمدللہ اپنے محبوب حقیقی کی خاطر اپنے نفس کو پامال کیا ہے تو اس سے طبیعت کو جو انشراح نصیب ہوگا، اور اس سے جو نور پیدا ہوگا، اس سے جو فرحت اور انبساط پیدا ہوگا، اس کے سامنے دنیا کی ہزاروں لذتیں قربان ہیں۔

اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ہے

اللہ تعالیٰ تم سے یہ چاہتے ہیں کہ کبھی کبھی میرا بندہ اپنے دل پر چوٹ مارا کرے، مثلاً ایک کام کرنے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن اپنے دل پر چوٹ کار کر رک گیا، اور جب اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے دل پر چوٹ مار لی تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس دل میں آکر بیٹھوں گا، یہ دل میری تجلی گاہ ہوگا، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ

یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اب دل کا ٹوٹنا دو طرح سے ہوتا ہے، ۱۔ یا تو غیر اختیاری طور پر دل ٹوٹے ہوئے ہیں، اس لئے کہ ان کے ساتھ مصائب پیش آئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کے ساتھ ہوں، ۲۔ دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ دل میں گناہ کرنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی، لیکن انہوں نے اپنی خواہشات کو پامال کر کے اپنا دل توڑا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

یہ دل ان کی تجلی گاہ ہے

اس بات کو کہنے کے لئے اقبال مرحوم نے بڑا خوبصورت شعر کہا ہے کہ:

تو بچا بچا کہ نہ رکھ اسے کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

یعنی ایسا نہ کر کہ تیرا دل بچا رہے، اور اس میں جو خواہش پیدا ہو رہی ہے تو اس کو ہمیشہ پورا کرتا رہے، تو ایسا نہ کر، اس لئے کہ جس ذات نے یہ دل کا آئینہ بنایا ہے، اس ذات کا کہنا یہ ہے کہ جتنا یہ دل کا آئینہ ٹوٹے گا اتنا ہی یہ محبوب ہوگا، اتنا ہی میں اس دل کا ساتھی بنوں گا۔ یہ "دل" اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بنایا ہے، یہ "دل" انہی کی تجلی گاہ ہے، اس میں کسی دوسری چیز کی شمولیت اللہ تعالیٰ کو گوارہ نہیں ہے، اور یہ "دل" اللہ تعالیٰ کے لئے اس وقت بنتا ہے جب خواہشات کے شیشے توڑے جاتے ہیں۔

ہم اس گھر میں رہیں گے جسے برباد کیا

میں نے بھی ایک شعر کہا تھا، ہمارے بزرگ حضرت حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم اس شعر کو بہت پسند کرتے ہیں، اور اپنی مجلسوں میں سنایا کرتے ہیں، وہ یہ کہ:

دردِ دل دے کے مجھے اس نے ارشاد کیا
ہم اسی گھر میں رہیں گے جسے برباد کیا

دل کو برباد کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ خواہشات کو اللہ کے لئے پامال کریں، دل میں گناہوں کے تقاضے اٹھ رہے ہیں، دل میں گناہوں کے داعیے پیدا ہو رہے ہیں، اور چاروں طرف سے گناہ کے محرکات گناہ کی طرف بلا رہے ہیں، لیکن میں نے اپنے اللہ کی خاطر اس دل کو توڑ کر برباد کیا، تو پھر اللہ تعالیٰ اس دل میں مقیم ہوتے ہیں، پھر وہ دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بنتا ہے۔

محبت سے طاعت، طاعت سے محبت کا نتیجہ

اسی بات کو حضرت والا یہاں فرما رہے ہیں کہ جب پہلے اطاعت کرنے کے لئے تھوڑی سی قربانی دو گے، تھوڑا سا آگے بڑھو گے، اور خواہشات کو پامال کرنے کی کوشش کرو گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی "محبت" عطا فرمائیں گے، یہ ان کا وعدہ ہے، ممکن نہیں ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا نہ ہو، اور جب "محبت" پیدا ہو جائے گی تو اس "محبت" کے نتیجے میں جو کام پہلے بھاری اور مشکل معلوم ہو رہے تھے، وہ آسان نظر آئیں گے، اور مزید "طاعت"

ہوگی اور جب مزید "طاعت" ہوگی تو "محبت" اور بڑھے گی، اور "محبت" میں اضافہ ہوگا، اور جب "محبت" میں اضافہ ہوگا تو اور "طاعت" آئے گی، اور یہ سلسلہ مرتے دم تک چلتا رہے گا، یہاں تک کہ موت کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام آجائے گا کہ:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ ارْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ ٥وَ ادْخُلِيْ جَنَّتِيْ

(سورۃ الفجر: ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰)

اے اطمینان والی جان: آج اپنے پروردگار کی طرف آجا، جس کی محبت میں تو نے زندگی کے دن رات گزارے ہیں، آج آکر میرے بندوں میں شامل ہوجا، اور میری جنت میں داخل ہوجا۔ یہ ہے انجام اس سارے تسلسل کا، یعنی طاعت سے محبت، اور محبت سے طاعت، پھر طاعت سے محبت، پھر محبت سے طاعت، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس مقام تک پہنچادیتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس راستے پر لگادے، آمین۔

اطاعت کا آسان نسخہ، اتباع رسول

اسی طاعت کا سب سے آسان اور مختصر نسخہ وہ ہے جو قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کا بتایا ہے، وہ یہ ہے کہ فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(سورۃ آل عمران: ۱۳)

اللہ تعالیٰ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمارہے ہیں کہ ان سے کہہ

دو، یعنی تمام ایمان والوں سے کہہ دو کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو۔ اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو، تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ تم میری اتباع کرو، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔

حضور کی اتباع کرو، اللہ تعالیٰ محبت کریں گے

بظاہر تو یوں کہنا چاہئے تھا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دل میں پیدا ہو جائے گی، اور تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے لگو گے۔ لیکن اس طرح نہیں فرمایا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کا ارادہ ہے تو میری اتباع کرو، تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ اس طرح کیوں فرمایا؟ دراصل اس سے اشارہ اس طرف فرما دیا کہ ارے تم کیا اللہ تعالیٰ سے محبت کرو گے، تم کہاں، اللہ میاں کہاں، اس لئے کہ تمہارا وجود ناقص، تمہاری ذات ناقص، تمہاری ذات متناہی، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات واجب الوجود، غیر متناہی، تم کیسے اللہ تعالیٰ سے محبت کرو گے؟ اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت اور اس کے اندر کمال کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ البتہ جب تم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو گے تو پھر اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا، اور پھر اس کی محبت کا عکس تمہارے دلوں پر پڑے گا، اس عکس کو اللہ تعالیٰ کی محبت کہیں گے۔

محبت پہلے محبوب کے دل میں پیدا ہوتی ہے

کسی فارسی شاعر نے اسی بات کو شعر میں کہا ہے کہ:

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

یعنی پہلے محبوب اور معشوق کے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے، اور پھر محبوب کی محبت کا عکس محب کے دل پر پڑتا ہے، اس طرح محبت محبّ کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا ہے، کیونکہ جس ذات کو دیکھا نہ ہو، جس کی معرفت کاملہ حاصل نہ ہو تو اس ذات سے انسان کیسے محبت کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے تصور اور خیال سے ماوراء ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پہلے میں تم سے محبت کروں گا، اور جب میں محبت کروں گا تو میری محبت کا عکس تمہارے دل میں آئے گا، اور پھر تم اللہ سے محبت کرو گے۔

ہر کام میں حضور کی اتباع

بہر حال! قرآن کریم نے یہ حقیقت بتادی کہ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا بہترین اور آسان ترین راستہ ''اتباع سنت'' ہے، ہر کام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع ہے، اپنی چال ڈھال میں، اپنی وضع قطع میں، اپنی بول چال میں، اپنی صورت وسیرت میں، اپنی کردار میں، اٹھنے بیٹھنے میں، کھانے پینے میں، معاملات میں، معاشرت میں، ایک دوسرے کے ساتھ میل جول میں، اخلاق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سنت'' اختیار کرلو، جوں جوں ''سنت'' کی اتباع کرتے جاؤ گے، اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی جائے گی۔

کوئی ''سنت'' چھوٹی نہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ جس کسی وقت بھی کسی سنت پر عمل کر رہا ہوتا ہے، چاہے وہ سنت دیکھنے میں چھوٹی نظر آرہی ہو، ویسے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت چھوٹی نہیں، ہر سنت عظیم الشان ہے۔ اس وقت وہ بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوتا ہے، مثلاً مسجد میں داخل ہوتے ہوئے تم نے دایاں پاؤں پہلے اندر رکھا یہ سوچتے ہوئے کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور مسجد میں داخل ہوتے وقت وہ دعا پڑھی جو مسنون ہے، "اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ" اگرچہ یہ چھوٹا سا عمل ہے، لیکن جب اتباع سنت کی خاطر تم یہ عمل کر رہے ہو تو جس وقت یہ عمل کر رہے ہو اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو۔

اس وقت تم اللہ کے محبوب بن رہے ہو

یا مثلاً تم بیت الخلاء میں داخل ہو رہے ہو، داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں اس نیت سے داخل کیا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور داخل ہونے سے پہلے مسنون دعا پڑھ لی تو اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو، بیت الخلاء سے باہر نکلتے وقت دایاں پاؤں اس نیت سے باہر نکالا کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور باہر نکل کر مسنون دعا پڑھ لی تو تم اس وقت اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو، اس لئے کہ تم اللہ کے محبوب کی سنت پر عمل کر رہے ہو۔ لہٰذا جتنا جتنا تم اتباع سنت میں بڑھتے چلے جاؤ گے، اللہ تعالیٰ کی محبت

بڑھتی چلی جائے گی، اور اس کے نتیجے میں دین پر عمل کرنا مزید آسان ہوتا چلا جائے گا۔

وہ سنتیں جس میں کوئی مشقت نہیں

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں تو بے شمار ہیں، اور ہر شعبہ زندگی میں ہیں، لیکن بہت سی سنتیں ایسی ہیں کہ ان کو اختیار کرنے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا، نہ وقت لگتا ہے، نہ پیسے لگتے ہیں، نہ محنت صرف ہوتی ہے، صرف دھیان کی بات ہے، جیسے ابھی بتایا کہ سنت یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں داخل کرو، اور نکلتے وقت بایاں پاؤں نکالو، بتاؤ! اس پر عمل میں کیا تکلیف ہے؟ کتنا وقت صرف ہوتا ہے؟ کتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں؟ کتنی محنت لگتی ہے؟ ارے بھائی! پاؤں تو نکالنا ہی ہے، صرف دھیان کرنے کی بات ہے، دھیان نہ کرنے کے نتیجے میں سنت کی برکت اور رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں، کوئی اگر یہ سوال کرے کہ کیا دایاں پاؤں مسجد سے نکالنا گناہ ہے؟ یہی جواب دیا جائے کہ گناہ نہیں، کیا فرض و واجب ہے کہ بایاں پاؤں ہی پہلے نکالو؟ نہیں، فرض و واجب بھی نہیں، لیکن اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں ایک بڑی رحمت سے محرومی ہے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے نتیجے میں جو رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت حاصل ہوتی ہے، اس نعمت سے محرومی ہے۔ اسی طرح کھانا کھاتے وقت کی سنت یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے کھانا کھاؤ، اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرو، اور جب کھانا کھا چکو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو،

اور دعا پڑھو، کیا ایسا کرنا فرض و واجب ہے؟ نہیں، ایسا نہ کرنا گناہ ہے؟ نہیں، گناہ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ کرنے پر کوئی پکڑ بھی نہیں، لیکن نہ کرنے کے نتیجے میں انسان اپنے آپ کو ایک عظیم نعمت سے محروم کر رہا ہے، جو نعمت مفت میں حاصل ہو رہی تھی۔

سنتوں کی ڈائری

لہٰذا ہر انسان اپنی زندگی کا ذرا جائزہ لے، اور یہ دیکھے کہ میں کہاں کہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو چھوڑے ہوئے ہوں، ہمارے حضرت والا کی کتاب ہے "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تمہارے لئے ڈائری بنادی ہے، اس کتاب کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لیتے رہو کہ کہاں کہاں میں سنت پر عمل کر رہا ہوں، اور کہاں کہاں چھوڑے ہوئے ہوں، بس، جہاں عمل چھوڑے ہوئے ہو، وہاں عمل کرنا شروع کردو، بے شمار سنتیں ایسی ہیں جو صرف تمہارے دھیان کی منتظر ہیں، اس میں نہ محنت، نہ مشقت، نہ پیسہ، نہ وقت کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا، البتہ کچھ سنتیں ایسی ہیں جو کچھ وقت اور محنت کا تقاضا کرتی ہیں، تھوڑی سے محنت کرلو گے تو ان پر بھی عمل ہو جائے گا۔

جب تک بازار میں لوکی ملے ضرور لاؤ

ہمارے حضرت والا یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے گھر میں دیکھا کہ دستر خوان پر لوکی کی ترکاری یا سالم

ضرور ہوتا تھا، کئی دن تک دیکھتا رہا کہ روزانہ لوکی کی ترکاری ضرور ہوتی ہے، میں ایک دن اہلیہ سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے آپ کئی روز سے لوکی کی ترکاری مسلسل پکا رہی ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ میں ایک کتاب میں پڑھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو لوکی بہت پسند تھی، اس لئے میں نے سودالانے والے سے کہہ دیا ہے کہ جب تک بازار میں لوکی ملے تو ضرور لوکی لایا کرو، تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کی کچھ اتباع نصیب ہو جائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنی اہلیہ کی یہ بات سنی تو مجھے لرزہ سا آ گیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنت جو نہ فرض ہے، نہ واجب ہے، بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محض ایک عادت ہے، اس عورت کو تو اس سنت کا اتنا اہتمام ہے، اور ہم اپنے آپ کو عالم کہلاتے ہیں، لوگ ہمیں عالم کہتے ہیں، سمجھتے ہیں، لیکن ہمیں حضور کی سنت کا اتنا اہتمام نہیں۔

تین دن تک زندگی کا جائزہ

اس کے بعد میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ جب تک میں اپنی ساری زندگی کا جائزہ لے کر نہیں دیکھوں گا کہ میں کہاں کہاں حضور کی سنت پر عمل نہیں کر رہا ہوں، اس وقت تک آگے نہیں بڑھوں گا، چنانچہ زندگی کا جائزہ لینے میں تین دن لگائے، اور یہ دیکھا کہ کہاں کہاں میں اتباع سنت سے محروم ہوں، اور پھر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے راہِ عمل واضح ہو گیا، اور جو سنتیں چھوٹی ہوئی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما دی۔ بہر حال! یہ اتباع سنت ایسی چیز

ہے کہ جتنا بھی آپ اس کی طرف بڑھیں گے، اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سمائے گی۔

یہ طعنے گلے کا ہار ہیں

بسا اوقات جب آدمی اتباع سنت کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اس کو طعنے بھی دیے جاتے ہیں، اس پر فقرے بھی کسے جاتے ہیں، بعض اوقات اس کا مذاق بھی اُڑایا جاتا ہے، ان فقروں اور طعنوں کی وجہ سے بعض لوگ کمزور پڑ جاتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے کہ:

یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ

(سورۃ المآئدۃ:۵۴)

یعنی یہ لوگ اللہ کے راستے میں محنت کرتے ہیں، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے، دنیا والے لوگ جو چاہیں کہا کریں، چاہے وہ ہمیں "دقیانوس" کہیں، یا ہمیں "رجعت پسند" کہیں، یا "جاہلانہ اسلام والے" کہیں، ارے یہ طعنے تو اللہ کے راستے پر چلنے والے کا ہار ہے، یہ طعنے تو انبیاء علیہم السلام کو دیے گئے، ان کو "بے وقوف" کہا گیا، اور ان انبیاء کے متبعین سے کہا گیا کہ:

اَنُؤْمِنُ کَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ (سورۃ البقرۃ:۱۳)

کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح یہ بے وقوف ایمان لائے، یہ سارے طعنے انبیاء علیہم السلام کو بھی ملے ہیں، اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو بھی ملے ہیں، ان کو "پاگل" کہا گیا، ان کو "گمراہ" کہا گیا، لیکن

درحقیقت جب اللہ تعالیٰ کے راستے میں یہ طعنے پڑتے ہیں تو ایک مؤمن کے لئے تمغہ ہے، کہاں تک دنیا والوں کی زبانیں روکو گے؟ کب تک ان کی پرواہ کرو گے۔

قیامت کے روز ایمان والے ان پر ہنسیں گے

لہٰذا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے راستے میں چلو تو طعنوں سے بے نیاز ہو جاؤ، کمر کس کر تیار ہو جاؤ، اور یہ سوچو کہ جو طعنہ ہمیں اس راستے میں ملے گا وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے باعث اعزاز ہے، لیکن قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ:

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ

(سورة التطفيف:۳۴)

کہ آج وہ وقت آ گیا کہ آج ایمان والے ان منکرین پر ہنسیں گے، وہ وقت آ کر رہے گا، اس کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ لہٰذا دنیا والوں کے طعنوں سے بے نیاز ہو جاؤ، اگر تم اللہ کے راستے پر چلنا چاہتے ہو۔

جس کو ہو جان و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں

جب اس راستے پر چلے ہو تو ان طعنوں کو برداشت کرنا پڑے گا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل کرم سے اور اپنی رحمت سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

اللہ سے اللہ کی محبت مانگیے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۸

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ سے اللہ کی محبت مانگیے

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین و العاقبۃ للمتقین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہ الکریم و علی آلہٖ و اصحابہٖ أجمعین،امّا بعد !

محبت حاصل کرنے کا پانچواں سبب

گذشتہ چند دنوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے اسباب کا بیان چل رہا ہے، اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے پانچ اسباب بیان فرمائے ہیں، ان میں سے چار اسباب کا بیان الحمد للہ تفصیل سے ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

آگے پانچواں سبب یہ بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ سے دعا کرنا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک مطلب تو وہ ہے جو کل عرض کیا تھا کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگتے رہو، دل ہی دل میں چلتے پھرتے مانگتے رہو، اٹھتے بیٹھتے مانگتے رہو۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ''محبت بھی انہی سے مانگو'' اور کہو کہ یا

اللہ! ہم آپ کی محبت کے محتاج ہیں، آپ ہی اپنی محبت ہمیں دیدیجئے۔ چنانچہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَ حُبَّ مَنْ يَنْفَعُنِیْ حُبُّهٗ عِنْدَكَ

اے اللہ! میں آپ سے آپ کی محبت مانگتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو، اور جس کی محبت آپ کے نزدیک مجھے فائدہ پہنچانے والی ہو، اس کی محبت عطا فرما۔ ایک اور دعا میں آپ نے فرما:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْيَاءِ اِلَیَّ

اے اللہ! اپنی محبت کو دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب بنادیجئے۔

اللہ کی محبت ان تین چیزوں سے زیادہ

ایک اور دعا میں آپ نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَ اَهْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ

اے اللہ! اپنی محبت کو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز بنادیجئے، اپنے گھر والوں سے زیادہ عزیز بنادیجئے، اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دیجئے۔ اس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹھنڈے پانی سے محبت اور شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

ٹھنڈا پانی بہت مرغوب تھا

چنانچہ آپ کو ٹھنڈا پانی اتنا مرغوب تھا کہ ''بئر غرس'' جو مدینہ منورہ سے دو میل کے فاصلے پر کنواں تھا، وہاں سے آپ کے لئے پانی لایا جاتا تھا، چنانچہ کسی

اور چیز کے بارے میں احادیث میں یہ منقول نہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو فلاں غذا زیادہ مرغوب تھی، اور وہ غذا فلاں جگہ سے لائی جاتی تھی، صرف پانی کے بارے میں یہ منقول ہے کہ ''بئر غرس'' سے آپ کے لئے لایا جاتا تھا، اس لئے کہ اس کا پانی دوسرے کنوؤں کے مقابلے میں زیادہ ٹھنڈا اور شاید زیادہ میٹھا ہوتا تھا، اور آپ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ وفات کے بعد مجھے غسل بھی اس ''بئر غرس'' کے پانی سے دیا جائے، چنانچہ ''بئر غرس'' کے پانی سے آپ کو غسل کو دیا گیا۔ آپ کو ٹھنڈا پانی اتنا زیادہ پسند تھا اس لئے آپ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! اپنی ذات کو میری جان سے زیادہ محبوب بنا دیجئے، میرے گھر والوں سے زیادہ محبوب بنا دیجئے، اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دیجئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! اپنی محبت عطا فرما، اور اپنی محبت کو تمام محبتوں پر غالب فرما۔

جھولی اور پیالہ بھی انہی سے مانگو

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجلس میں یہ مضمون بیان فرما رہے تھے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہئے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں دینے میں کوئی کمی نہیں۔ وہی بات جو کسی نے کہی ہے کہ:

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

حضرت نے فرمایا کہ مانگنے میں نقص رہ جاتا ہے، ورنہ اگر انسان مانگے تو

اللہ تعالیٰ کے یہاں دینے میں کوئی کمی نہیں۔ بس میاں! اللہ تعالیٰ کے سامنے جھولی پھیلانے والا چاہئے، پھر اللہ تعالیٰ اس جھولی کو بھر کر ہی بھیجتے ہیں، حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوال کیا کہ حضرت! اگر کسی کے پاس جھولی ہی نہ ہو تو پھر کیا کرے؟ حضرت نے فرمایا کہ جھولی بھی انہی سے مانگے، اور یہ کہے کہ یا اللہ! میرے پاس تو جھولی بھی نہیں ہے، اپنی رحمت سے مجھے جھولی بھی عطا فرما دیجئے، میرے اندر مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے، مانگنے کا سلیقہ بھی عطا فرما دیجئے۔

مانگنے کا طریقہ بھی انہی سے مانگو

چنانچہ ایک دعا میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح مانگا:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ خَیْرَ الْمَسْئَلَةِ وَخَیْرَ الدُّعَاءِ وَخَیْرَ الْاِجَابَةِ

اے اللہ! میں آپ سے بہترین سوال کرنے کا سوال کرتا ہوں، یعنی میں آپ سے اچھے سوال کروں، اور اچھی باتیں مانگوں، اے اللہ! میں آپ سے یہ مانگتا ہوں کہ مجھے اچھی دعا کرنے کی توفیق ہو، اور اچھی طرح قبول بھی ہو۔ لہٰذا جھولی بھی انہی سے مانگو۔

اچھی دعا مانگنے کی توفیق انہی سے مانگو

جب آپ کسی قبولیتِ دعا کے مواقع میں جائیں، یا قبولیتِ دعا کا موقع آپ کو مل جائے، جس میں دعا کی قبولیت کی امید زیادہ ہوتی ہے، مثلاً افطار کا وقت ہے، یا سحری کا وقت، یا تہجد کا وقت، یا جمعہ کا دن ہے، یا بیت اللہ شریف پر

پہلی نظر پڑنے کا موقع ہے، یا آپ طواف کر رہے ہیں وغیرہ، ایسے مواقع پر دعا کرنے سے پہلے یہ مانگو کہ یا اللہ! مجھے اچھی دعا کرنے کی توفیق دیدے، یعنی ایسی دعا کروں جو میرے دین و دنیا کے لئے فائدہ مند ہو، اور پھر اے اللہ! اس کو میرے حق میں قبول بھی فرمالیجئے۔ لہٰذا ان تمام مواقع قبولیت میں دعا کرنے کی توفیق بھی اللہ ہی سے مانگو۔

بیت اللہ پر پہلی نظر کے وقت دعا

جب آدمی پہلی مرتبہ بیت اللہ شریف کو دیکھتا ہے تو آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ موقع آرہا ہے، اس موقع پر کیا مانگوں؟ اللہ کے بندوں کے عجیب عجیب مدارک ہوتے ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ اس موقع پر کیا مانگوں؟ امام صاحب نے فرمایا کہ میاں دعا مانگ لینا کہ میں ''مستجاب الدعوات'' بن جاؤں کہ ساری عمر میری ساری دعائیں قبول ہوا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کے دل میں یہ بات ڈال دی۔ بہرحال! مانگنا بھی ایک ہنر اور ایک فن ہے، جو ہر ایک کو نہیں آتا۔ میرا جب حرمین جانا ہوا، اور بیت اللہ پر نظر پڑی تو میں نے کہا: یا اللہ! میری سمجھ میں تو نہیں آرہا ہے، یا اللہ! جو دعا آپ کے نزدیک میرے حق میں بہتر ہو، وہ دعا میرے دل میں ڈال دیجئے، اور اس طرح دعا کے کرنے کی توفیق دیدیجئے۔ وہی بات جو حضرت والا نے بیان فرمائی کہ جھولی بھی انہی سے مانگو۔ اسی طرح محبت بھی انہی سے مانگو کہ یا اللہ! اپنی محبت میرے دل میں پیدا فرمادیجئے، اور اس محبت کو ساری

محبتوں پر غالب فرمادیجئے۔

اسباب محبت کا خلاصہ

بہر حال! حضرت والا نے اسباب محبت میں چھ باتیں ذکر فرمائیں، (۱) کثرتِ ذکر اللہ (۲) اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرنا (۳) اپنے برتاؤ کو اور حقیقت کو سوچنا (۴) کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا (۵) طاعت پر مواظبت کرنا (۶) اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا۔ ان چھ باتوں سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں راسخ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان سب باتوں ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

محبت کا کوئی خاص درجہ طلب مت کرو

آگے حضرت والا کی مجددانہ باتیں سنئے، فرمایا کہ:

> اس تدبیر میں تو کوئی غلطی نہیں، صرف ایک غلطی علمی محتمل ہے، وہ قابل تنبیہ ہے، وہ یہ کہ اپنے ذہن سے محبت کا کوئی درجہ تراش کر اس کا منتظر رہے، یہ غلطی ہوگی۔

(انفاس عیسیٰ : ۱۹۴)

یعنی یہ باتیں اور محبت پیدا کرنے کے جو اسباب بتائے ہیں، ان کے اندر تو کوئی غلطی نہیں ہے، یہ انشاء اللہ بالکل صحیح ہیں، مستند اور معتبر ہیں، اور انشاء اللہ انہی کے ذریعہ محبت پیدا ہوگی۔ لیکن غلطی اس طرح لگتی ہے کہ ''محبت'' کا کوئی

خاص درجہ اپنی طرف سے تراش کر اس کے انتظار میں آدمی بیٹھ جاتا ہے کہ مجھے محبت کا یہ درجہ حاصل ہونا چاہئے، مثلاً دماغ میں یہ تصور لئے بیٹھا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے حاصل ہو جائے، یا حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے حاصل ہو جائے، اور حضرت شاہ عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے بھی حاصل ہو جائے، گویا کہ ''محبت'' کا ایک درجہ اپنے ذہن سے تراش کر اپنے لئے اس کو تجویز کر لیا کہ مجھے ''محبت'' کا یہ درجہ ملنا چاہئے، اب اس درجے کے انتظار میں بیٹھا ہے، اور پھر جب وہ درجہ محبت کا حاصل نہیں ہوتا تو پھر وہ شخص یا تو اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا ہے، یا محبت پیدا کرنے کی تدبیروں کے صحیح ہونے پر شک کرتا ہے، یا پھر مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

محبت اس کے ظرف کے مطابق دی جاتی ہے

اس لئے یہ فیصلہ کہ کس درجہ کی ''محبت'' تمہیں حاصل ہو؟ تمہیں یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں، یہ فیصلہ وہی ذات کرے گی جو ''محبت'' دینے والی ہے کہ تمہیں کس درجہ کی محبت دینی ہے، اور جس درجہ کی محبت تمہیں دینی ہے، وہی ''محبت'' تمہارے حق میں مفید بھی ہے۔

وہ دیتے ہیں بادۂ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

''ظرف'' کے حساب سے چیز دی جاتی ہے، تمہارا ''ظرف'' جتنا ہے، اتنی ''محبت'' تمہیں ملے گی، باقی تم اپنی طرف سے محبت کا ایک درجہ تراش کر یہ کہو

کہ یہ درجہ محبت کا مجھے ملنا چاہئے، اس کے مطالبے کا تمہیں کوئی حق نہیں، لیکن محبت کا جو درجہ تمہیں ملے گا، انشاء اللہ تمہارے حق میں وہ کافی ہوگا، بشرطیکہ ان تدبیروں پر عمل کرلیا۔

ناشکری اور مایوسی کا شکار ہو جاؤ گے

ہوتا یہ ہے کہ ہم لوگ ایک طرف تو بزرگوں کی بتائی ہوئی تدبیروں پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور دوسری طرف اپنے لئے کوئی اعلیٰ درجہ تجویز کر لیتے ہیں کہ یہ میری منزل ہے، اور مجھے اس منزل پر پہنچنا ہے، ان تدبیروں پر عمل شروع کرنے کے بعد جب وہ مطلوب منزل بہت دور نظر آتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب تک جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کی ناقدری اور ناشکری شروع کر دیتے ہیں، اور چونکہ وہ مطلوب منزل حاصل نہیں ہو رہی ہے، اس لئے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں، اور پھر اس مایوسی کے نتیجے میں ان تدابیر کو چھوڑ دیتے ہیں، اور عمل کرنا ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی درجہ تجویز مت کرو، اگر تدبیریں صحیح ہیں تو انشاء اللہ ان سے نتیجہ ضرور حاصل ہوگا، چاہے اس درجہ کا نتیجہ نہ ہو جو تم نے اپنے لئے تجویز کر رکھا ہے، البتہ تمہارے حق میں جتنا مفید ہے اتنا ضرور حاصل ہوگا، کسی نے خوب کہا ہے کہ:

بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

جب اس راستے پر آگئے تو انشاء اللہ ضرور کامیابی ہوگی، بس اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت نہیں، جو کچھ تمہیں ملا ہے، اس پر شکر ادا کرو، اور تدبیروں میں

لگے رہو، تمہارے لئے اتنا کافی ہے۔

میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر بڑا عجیب وغریب ہے، کوئی دوسرا شخص اس شعر کو اس وقت تک سمجھ ہی نہیں سکتا جب تک یہ مضمون اس کے سامنے نہ ہو جو میں بیان کر رہا ہوں، فرماتے ہیں کہ:

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مئے
میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

یعنی مجھ کو اس سے کیا غرض کہ دوسرے لوگوں کو کیا ملا، اور کیا نہیں ملا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے جو کچھ عطا فرمایا ہے، میرے لئے تو مناسب وہی ہے، اور حاصل بھی وہی ہے۔ لہٰذا اپنے لئے کوئی درجہ تجویز کرنا، اور پھر نہ ملنے پر شکایت پیدا ہونا، مایوس ہونا، یہ سب غلط ہے، جب تدبیریں سب صحیح ہیں تو انشاء اللہ اس کا نتیجہ بھی یقیناً ظاہر ہو رہا ہے۔

ایک خط اور حضرت والا کا جواب

ایک مرتبہ میں نے حضرت والا کو خط میں لکھا کہ فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، اور جس آدمی سے یہی کام نہیں ہوتے، وہ دنیا میں اور کیا کام کرے گا؟ حضرت والا نے اس آخری عبارت پر لکیر کھینچ کر اس کے سامنے یہ جواب لکھا کہ:

کیا اپنی ذات سے جلیل القدر امور متوقع ہیں؟

یعنی تمہارا یہ فقرہ کہ جس سے یہ کام نہیں ہو سکتے، اس سے کیا کام ہوگا، گویا کہ اپنی ذات سے بہت جلیل القدر امور کی توقع لگائے بیٹھے ہیں کہ ہم تو اس مقام کے آدمی ہیں، لہٰذا اس بلند مقام کے امور ہم سے سرزد ہونے چاہئیں، وہ امور چونکہ نہیں ہو رہے ہیں لہٰذا مایوسی ہو رہی ہے۔

دراصل اس جواب کے ذریعہ یہ تنبیہ فرمادی کہ درحقیقت دل میں اس خیال کے پیدا ہونے کا منشاء کبر ہے، یعنی اپنے لئے بہت جلیل القدر امور تجویز کر رکھے ہیں کہ یہ ہونے چاہئیں، اور جب وہ نہیں ہو رہے ہیں تو اب مایوس ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اس کا منشاء حقیقت میں کبر ہے۔

خلاصہ

بہرحال! خلاصہ یہ ہے کہ ''محبت'' کے حصول کی جو تدبیریں بتائی گئی ہیں، ان پر عمل کرو، اور اپنے لئے ''محبت'' کا کوئی درجہ تجویز مت کرو کہ ''محبت'' کے فلاں درجے تک ہمیں پہنچنا ہے، ان تدبیروں کے نتیجے میں ''محبت'' کا جو درجہ تمہیں ملے گا، وہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا، تم اسی کے مستحق ہو گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان تدبیروں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین

عبادات میں ذوق وشوق مطلوب نہیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۸۹

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

عبادات میں ذوق و شوق مطلوب نہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَ عَلٰی آلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ، اَمَّا بَعْدُ !

محبت میں بے چین رہوں

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ:

"مجھے اس کا بڑا شوق ہے کہ کسی طرح ہو، اللہ تعالیٰ کی محبت میں "بے چین" رہوں"

اس خط کے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملہ تحریر فرمایا کہ:

"مگر اس کے ساتھ یہ بھی دعا کرو کہ اس "بے چینی" میں چین رہے"

(انفاس عیسیٰ : ۱۹۴)

جواب کچھ اور ہونا چاہئے تھا

یہ جواب جو حضرت والا نے تحریر فرمایا اگر غور کریں تو بڑا عجیب و غریب

جواب ہے، اگر کسی نے یہ جواب نہ پڑھا ہو، اور صرف سوال اس کے سامنے آئے تو جن حضرات نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات پڑھے ہوئے ہیں، اور جو لوگ حضرت کے مزاج سے کچھ واقف ہیں، ان کا گمان یہ ہوگا کہ حضرت والا جواب میں یہ فرمائیں گے کہ: یہ کیا تمہیں ''بے چینی'' کا شوق پیدا ہوگیا؟ اس لئے کہ ''بے چینی'' تو ایک غیر اختیاری کیفیت ہے، وہ حاصل ہو کہ نہ ہو، اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہو؟ کیونکہ حضرت والا کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا اصول یہ ہے کہ آدمی ''اختیاری'' امور کا اہتمام کرے، اور ''غیر اختیاری'' کی فکر میں نہ پڑے، یہ بڑا زرین اصول ہے، اس لئے کہ یہ غیر اختیاری کیفیات کہ کسی وقت عبادت کا ذوق و شوق ہو رہا ہے، کسی وقت ذوق و شوق نہیں ہو رہا، کسی وقت عبادت میں دل لگ رہا ہے، کسی وقت دل نہیں لگ رہا، یہ سب کیفیات آنی جانی ہیں، ان کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں، اصل مقصود ''عمل'' ہے، یہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اس لئے جو لوگ ''کیفیات'' کے بہت پیچھے پڑتے ہیں، حضرت والا عام طور پر ان کی ہمت افزائی نہیں کیا کرتے۔

ہر مریض کے لئے علیحدہ نسخہ

بہر حال، اگر حضرت والا کا یہ جواب نہ پڑھا ہوتا تو ذہن اس طرف جاتا کہ حضرت والا جواب میں یہ تحریر فرمائیں گے کہ شرعاً یہ کوئی مطلوب بات نہیں کہ آدمی ''بے چین'' رہے۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پر ان صاحب کو یہ جواب نہیں دیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ طبیب کا کام ہوتا ہے کہ وہ آنے والے

مریض کی حالت کے مناسب نسخہ تجویز کرے، یہ نہیں کہ بس ایک ہی نسخہ سب مریضوں کو گھوٹ کر پلا رہا ہے، اس لئے کہ مریض کے حالات کے مناسب ہر مریض کی دوا اور علاج میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مرشد کامل کا کام بھی یہی ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس آدمی کے موجودہ حالات میں یہ بات اس کے مناسب ہوگی یا نہیں؟ یہی ملکہ اللہ تعالیٰ مرشد کامل کو عطا فرماتے ہیں، اور ہم جب اس مرشد کامل کے پاس جاتے ہیں تو وہ ہمارے حالات کے لحاظ سے جواب دیتا ہے۔

"وارد" اللہ کا مہمان ہوتا ہے

یہاں پر حضرت والا نے اس خط کے جواب میں یہ نہیں لکھا کہ "تمہیں یہ بے چین ہونے کا شوق کیوں پیدا ہوا؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟" یہ جواب کیوں نہیں لکھا؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے- واللہ سبحانہ اعلم- کہ حضرت والا نے یہ محسوس فرمایا کہ اس آدمی کے دل میں جو یہ شوق پیدا ہوا ہے، یہ بھی اس شخص کے حق میں ایک "وارد قلبی" ہے، اور حضرات صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم یہ فرماتے ہیں کہ من جانب اللہ قلب پر جو "واردات" ہوتے ہیں، ان "واردات" کی ناقدری نہ کرو، اس لئے کہ یہ "واردات" اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے مہمان ہوتے ہیں، اگر اس مہمان کی خاطر تواضع کرو گے تو یہ مہمان بار بار آئے گا، اور اگر تم نے اس مہمان کی خاطر تواضع نہ کی، بلکہ ناقدری کردی تو یہ مہمان روٹھ کر بھاگ جائے گا، پھر نہیں آئے گا۔

شریعت میں تو ''چین'' مطلوب ہے

اب اگر اس شخص کو جواب میں یہ لکھ دیتے کہ تیرا اس بے چین رہنے کا خیال درست نہیں ہے، تو اس صورت میں یہ ''وارد'' جو اس کے قلب پر وارد ہو رہا ہے، اس کی مخالفت کرنے سے اس کا نقصان ہوتا، اور آئندہ یہ ''واردات'' بند ہو جاتے، اور اگر جواب میں اس کی ہمت افزائی فرماتے کہ یہ ''بے چینی'' کا حاصل ہونا تو بڑی اچھی بات ہے، ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں یہ ''بے چینی'' عطا فرما دے، تو یہ جواب شریعت کے خلاف ہوتا، اس لئے کہ شریعت میں ''بے چینی'' مطلوب نہیں، شریعت میں تو ''چین'' اور ''اطمینان'' کا حصول مطلوب ہے، قرآن کریم میں ہے کہ:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

(:   )

یعنی اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا شریعت میں یہ مطلوب نہیں کہ کوئی آدمی ''بے چینی'' کو اپنا مقصود بنالے، بلکہ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ''اطمینان'' اور ''چین'' کو مقصود بنائے، اسی لئے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

'' اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِكَ تَجْمَعُ بِهَا اَمْرِیْ وَتَلُمُّ بِهَا شَعْثِیْ ''

یعنی اے اللہ! میں آپ سے آپ کی رحمت کا سوال کرتا ہوں، جس کے نتیجے میں مجھے جمعیت خاطر اور سکونِ حاصل ہو جائے، اور میری پراگندگی کو جمعیت سے

بدل دیجئے۔ معلوم ہوا کہ شریعت میں اطمینان اور چین مقصود ہے، بذات خود ''بے چینی'' مقصود نہیں۔

عجیب وغریب جواب

بہر حال، اگر اس خط کے جواب میں پہلی بات لکھ دیتے تو ''طریقت'' کی خلاف ورزی لازم آتی، اور اگر دوسری بات لکھ دیتے تو ''شریعت'' کی خلاف ورزی لازم آتی، اس لئے حضرت والا نے بڑا عجیب جواب یہ دیا کہ ''مگر اس کے ساتھ یہ بھی دعا کرو کہ اس ''بے چینی'' میں چین رہے''۔ اس لئے کہ ''بے چینی'' بذات خود مطلوب نہیں، بلکہ ''چین'' مطلوب ہے، لیکن وہ ''چین'' اللہ تعالیٰ کی محبت کی ''بے چینی'' کے ذریعہ حاصل ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضطراب ہو، اور اس اضطراب ہی میں اسے ''چین'' مل جائے۔

ہم اضطراب سے حاصل ''قرار'' کرلیں گے
یہ ''جبر'' ہے تو اسے اختیار کرلیں گے

یہ ''اضطراب'' بذات خود مقصود نہیں، لیکن یہ اضطراب بعض اوقات ''قرار'' پر منتج ہوتا ہے، اور جو آدمی اس راستے سے گزرا نہ ہو، اس کو پوری طرح اس کا ادراک اور احساس اور فہم نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ابتداء محبت میں تو جوش وخروش، اُبال اور بے چینی ہوتی ہے، پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اس بے چینی کے اندر ''چین'' آجاتا ہے، اس لئے حضرت والا نے یہ جواب تحریر فرمایا۔

''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بٹتی

اس سے پتہ چلا کہ دوسروں کی اصلاح کا کام ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ بس چند اصطلاحات یاد کرلیں، اورلوگوں کی اصلاح کرنی شروع کردی:

هزار نکتهء باریك تر زمو ایں جاست

نه هر که سر بتراشد قلندری داند

اس لئے یہ بڑا نازک کام ہے، کسی شخص کے لئے یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے کیا بات اس وقت فائدہ مند ہوگی، بڑا مشکل کام ہے۔ اسی واسطے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں یہ ''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بٹتی تھی، جیسا کہ بعض مشائخ کے یہاں رواج ہے کہ جو آرہا ہے، اس کو ''خلافت'' دے رہے ہیں، جو آرہا ہے، اس کو ''خلافت'' دے رہے ہیں، کسی کو دیکھا کہ وہ نماز وغیرہ پڑھنے لگا ہے، اور اس کے اندر کچھ خشوع وخضوع پیدا ہوگیا ہے، اور کچھ ذکرواذکار کرنے لگا ہے، بس جا تو بھی ''خلیفہ'' ہمارے حضرات کا یہ مزاج نہیں تھا۔

ڈاکٹر بننے کے لئے صحت مند ہونا کافی نہیں

یہ مزاج کیوں نہیں تھا؟ اس لئے کہ خود درست ہوجانا اور بات ہے، اور دوسرے کا علاج کرنا اور بات ہے، ہر صحت مند شخص ''ڈاکٹر'' نہیں ہوتا، صحت مند شخص کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس کے اندر کوئی بیماری نہیں ہے، کوئی خرابی نہیں ہے، بہت تندرست ہے، لیکن وہ صحت مند دوسرے بیمار کا علاج کردے، یہ ضروری نہیں۔ اس لئے کہ ''ڈاکٹر'' بننے کے لئے بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے، پاپڑ بیلنے

پڑتے ہیں، اب تک جا کر اس کو ''مطب'' کھولنے کی اجازت ملتی ہے، اب کوئی شخص یہ کہے کہ میں تو بالکل تندرست ہوں، میری ساری رپوٹیں درست ہیں، میرا سارا جسمانی نظام درست ہے، لہٰذا میں ''ڈاکٹر'' بننے کے لائق ہوں، یا کوئی شخص ڈاکٹر کے پاس علاج کے لئے آئے، ڈاکٹر اس کا علاج کرے، اور جب وہ شخص سو فیصد بالکل تندرست ہو جائے تو ڈاکٹر اس کو سرٹیفکیٹ دیدیں کہ تم بھی ڈاکٹر بن جاؤ، اس لئے کہ تم اب تندرست ہو گئے ہو۔

''خلافت'' ایک شہادت اور گواہی ہے

یہی حال یہاں ہے کہ شیخ کے پاس ایک آدمی اپنی اصلاح کے لئے آیا، شیخ نے اس کے حالات کی اصلاح کی، وہ اتباع سنت کی طرف آگیا، اس کی نماز درست ہوگئی، اس کا روزہ درست ہوگیا، تو محض ان اعمال کے درست ہونے سے وہ ''خلافت'' کا اہل نہیں بن جاتا، اور ''خلافت'' کا مطلب ہے دوسرے کے علاج کرنے کی صلاحیت پیدا ہونا، اور دوسروں کا علاج کرنا، یہ ہر ایک کی بس کی بات نہیں۔

اس لئے ہمارے حضرات کے یہاں ''خلافت'' بہت دیکھ بھال کے بعد جب پورا اطمینان ہو جائے اس وقت دی جاتی ہے، اس لئے کہ ''خلافت'' دینے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق خدا کے سامنے یہ شہادت اور سرٹیفکیٹ دینا ہے کہ ''ہم نے اس کو اچھی طرح پرکھ لیا ہے، اور جانچ لیا ہے، اور اب یہ شخص تمہارا روحانی علاج یعنی تمہارے امراض باطنی کا علاج کرنے کا اہل ہے'' یہ ''خلافت'' اس بات کا سرٹیفکیٹ دینا نہیں ہے کہ یہ ''تندرست'' ہے، یا متبع سنت ہے، لہٰذا جب تک یہ

اطمینان نہ ہو جائے کہ یہ شخص دوسروں کے علاج کے لائق ہے اور یہ شخص طالبین اور اصلاح کے لئے آنے والوں کو ان کے مزاج اور ان کی ضرورت کے مطابق اس کی حاجت کے مطابق نسخہ تجویز کر سکتا ہے، اس وقت تک یہ ''شہادت'' دینا جائز نہیں۔

ہمارے حضرات یہ خطرہ مول نہیں لیتے

بزرگوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، بعض بزرگوں کا یہ رنگ اور مزاج ہوتا ہے کہ جب اس شخص کو ہم ''خلافت'' دیدیں گے تو اللہ تعالیٰ اس کو قابل بھی بنادیں گے، لیکن ہمارے حضرات یہ خطرہ مول نہیں لیتے، ہمارے حضرات یہ کہتے ہیں کہ جب تک یہ اطمینان نہیں ہو جائے گا، اس وقت تک یہ خطرہ مول نہیں لیتے، اس لئے کہ اگر کسی نے یہ اصول تو یاد کر لیا کہ ''فلاں چیز محمود ہے، اور فلاں چیز مذموم ہے'' تو بس وہ ہر جگہ یہ اصول چلائے گا، حالانکہ اتنی بات کافی نہیں، بلکہ ایک آنے والے کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے لئے کیا مناسب ہے؟ اور کیا مناسب نہیں۔ لہٰذا دوسروں کی اصلاح کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

''خلافت'' کا خیال بدترین حجاب ہے

حضرت والا نے یہ بھی فرمایا کہ جب کسی شیخ کے پاس علاج کے لئے جاؤ تو بس اپنے علاج کی طرف متوجہ رہو، اس فکر میں مت رہو کہ فلاں درجہ مجھے حاصل ہو جائے، فلاں مقام حاصل ہو جائے، بلکہ شیخ کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی نگرانی میں نتائج اور ثمرات سے بے فکر ہو کر عمل کرتے رہو۔ بعض لوگ جب کسی شیخ کے پاس اپنی اصلاح کے لئے جاتے ہیں تو ان کے حاشیہ خیال میں یہ بات رہتی ہے کہ یہ شیخ

مجھے کسی وقت ''خلافت'' دیدے گا، یہ ''خیال'' اصلاح کے راستے میں بدترین حجاب ہے، اس خیال کے ہوتے ہوئے کبھی اصلاح مکمل ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ ''اصلاح'' کا امکان ہی نہیں۔ اس لئے کہ اس صورت میں اپنی اصلاح کرانے کی نیت میں اخلاص ہی نہیں، بلکہ نیت یہ ہے کہ خاص منصب حاصل ہو جائے، گویا کہ اللہ کے لئے شیخ سے تعلق قائم نہیں کیا، اور اپنی اصلاح میں طلب صادق نہیں تھی، اور جب طلب صادق نہیں ہوتی اور اللہ کے لئے شیخ سے تعلق قائم نہیں کرتا تو شیخ کے پاس جانے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

لہٰذا جب کبھی شیخ کے پاس جاؤ تو اس خیال سے ذہن کو خالی کر کے جاؤ، صرف اپنی اصلاح کی غرض سے جاؤ، نہ کوئی خاص درجہ حاصل کرنا مقصود ہو، اور نہ کوئی مقام حاصل کرنا مقصود ہو۔

عبادت میں شوق، ولولہ، لذت مطلوب نہیں

آگے حضرت والا ایک اور ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''شوق'' بمعنی ''ولولہ'' نہ بالذات مطلوب ہے، نہ شرائط قبول سے ہے، اخلاص کے ساتھ عمل ہونا کافی ہے، گو ''ولولہ'' نہ ہو، بلکہ طبعاً گرانی ہو، حدیث: اسباغ الوضوء علی المکارہ، اس کی نقلی دلیل ہے، جس سے دعاء مذکورہ سے زائد یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایسے ''مکارہ'' سے اجر و فضل

بڑھ جاتا ہے، اور عقلی حقیقت اس کی یہ ہے کہ طاعات بعض کے لئے مثل ''غذا'' کے ہیں، اور بعض کے لئے مثل ''دوا'' کے، اور ظاہر ہے کہ ''دوا'' کا نافع ہونا اس کی رغبت پر موقوف نہیں ہے، نیز ایسی حالت میں اس کا استعمال اور زیادہ ہمت اور مجاہدہ ہے، اور اس میں حکمتیں بھی ہوتی ہیں، جیسے عجب سے حفاظت، اور اپنے نقص کا مشاہدہ ونحوہما، پس عبد کامل کا مذہب یہ ہونا چاہئے''

بدرد و صاف تراحکم نیست دم درکش
که آنچه ساقی ماریخت عین الطاف ست

(انفاس عیسیٰ : ۱۹۵)

ذوق وشوق محمود ہیں، اخلاص مطلوب ہے

اس ملفوظ میں حضرت والا نے بڑا عجیب اصول بیان فرمادیا ہے، اس میں بہت سے لوگ گمراہ اور پریشان ہوجاتے ہیں، وہ یہ کہ: عبادت میں ذوق وشوق اور ولولہ، یہ نہ تو مطلوب ہے کہ آدمی اس کو اپنا مقصود بنالے کہ میرے اندر شوق اور ولولہ پیدا ہوجائے، اور جوش پیدا ہوجائے، اور نہ ہی اعمال کی قبولیت کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ جب تم جوش کے ساتھ، شوق کے ساتھ عمل کروگے تب یہ عمل قبول

ہوگا، ورنہ قبول نہیں ہوگا۔ شوق کا مطلب یہ کہ نماز کے اندر آپ کو مزہ آنے لگے، اور یہ شوق پیدا ہو جائے کہ جلدی جا کر نماز پڑھوں، اگر یہ شوق و ذوق پیدا ہو جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اور اچھی بات ہے، اور محمود ہے، لیکن یہ شوق مقصود بالذات نہیں، اور نہ ہی عمل کی قبولیت کے لئے شرط ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمائیں گے کہ تو نے جو نماز پڑھی تھی وہ ذوق وشوق کے بغیر پڑھی تھی، لہٰذا تیری نماز قبول نہیں۔ اس لئے کہ نماز کی قبولیت کے لئے ''اخلاص'' شرط ہے، لہٰذا اگر عمل ''اخلاص'' کے ساتھ ہو، اور سنت کے مطابق ہو، بس یہ دو چیزیں اگر عمل کے اندر پائی جائیں گی تو مقصود حاصل ہو جائے گا، اور انشاء اللہ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوگا، چاہے وہ عمل کتنی ہی مشقت کے ساتھ کیا تھا، اور اس عمل کے کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، سستی ہو رہی تھی، لیکن آپ نے یہ سوچا نماز تو فرض ہے، جو مجھے پڑھنی ہے۔ یہ سوچ کر بلا شوق اور ذوق کے زبردستی اپنے اوپر جبر کر کے نماز سنت کے مطابق پڑھ لی، چونکہ ''اخلاص'' تھا، اور سنت کے مطابق وہ نماز تھی، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوگی۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمائیں گے کہ چونکہ تم نے طبیعت کی گرانی اور بدشوقی کے ساتھ نماز پڑھی، اس لئے تمہیں سزا ملنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ چیز نہ مقصود ہے، اور نہ ہی شرائط قبول میں سے ہے۔

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے

البتہ نماز کے اندر ذوق وشوق اور ولولہ محمود ہے، اور اس کی دلیل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے کہ جس میں آپ نے فرمایا:

جُعِلَتْ قُرَّةُ عِيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ

یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے اندر وہ لطف اور وہ کیف محسوس ہوتا تھا جو دنیا کی کسی اور چیز میں محسوس نہیں ہوتا تھا، یہ بات آپ کو حاصل نہیں تھی، لیکن آپ نے دوسروں سے یہ نہیں فرمایا کہ جب تک نماز کے اندر تمہیں وہ کیفیت حاصل نہیں ہوگی جو کیفیت مجھے حاصل ہوتی ہے، اس وقت تک تمہاری نماز قبول نہیں ہوگی، بلکہ آپ نے دوسروں سے فرمایا کہ:

"صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ"

جس طرح تم مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھتے ہو اس طرح نماز پڑھ لو، بس تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

بلا شوق والا عمل ثواب میں بڑھ جاتا ہے

بعض لوگ اس فکر میں بہت زیادہ پڑے رہتے ہیں کہ نماز میں مزہ نہیں آتا، ذوق وشوق پیدا نہیں ہوتا۔ تو بھائی! مزہ مطلوب ہی کہاں ہے؟ مطلوب اور مقصود تو اللہ کی رضا ہے، اگر وہ حاصل ہو رہی ہے تو پھر مطمئن ہو جاؤ، بلکہ حضرت فرماتے ہیں کہ: بعض اوقات اجر کے اعتبار سے وہ شخص بڑھا جاتا ہے جس نے عبادت کا کوئی عمل ناگواری اور مشقت کے ساتھ کیا، اور اس کو اس عمل میں مزہ بالکل نہیں آیا، دوسرے شخص کے مقابلے میں جس کو عبادت میں بہت مزہ آیا، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِسْبَاغُ الْوَضُوْءِ عَلَى الْمَكَارِهِ ......فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ

یعنی جو شخص اس وقت پورا اچھی طرح وضو کرے جس وقت وضو کرنا طبیعت پر بہت شاق اور گراں ہو رہا ہو، اس کو جہاد کا ثواب ملتا ہے، مثلاً سخت سردی اور جاڑے کا موسم ہے، برف گر رہی ہے، پانی بہت ٹھنڈا ہے، گرم پانی کا کوئی انتظام نہیں، نماز کا وقت آچکا ہے، اس وقت میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن جو شخص اس مشکل کے باوجود اللہ کا حکم سمجھ کر وضو کرے تو یہ ایسا عمل ہے جیسے جہاد میں رات کو سرحد پر پہرا دینا۔ اب بتایئے! اس وضو کے اندر اس کو کب مزہ آیا؟ معلوم ہوا کہ دل کی گرانی کے ساتھ عمل کرنے میں بعض اوقات ثواب بڑھ جاتا ہے، اس عمل کے مقابل میں جس کو شوق اور ذوق کے کے ساتھ کیا ہو، اس لئے کہ ذوق وشوق والے عمل میں تکلیف اور مشقت نہیں ہوتی۔

جس کو نماز میں مزہ نہ آئے اس کو مبارک باد

اسی لئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ’’میں اس شخص کو مبارک باد دیتا ہوں جس کو ساری عمر نماز پڑھنے میں مزہ نہیں آیا، لیکن پھر بھی اللہ کا حکم بجالانے کی خاطر نماز پڑھتا رہا‘‘ اس لئے کہ اگر نماز میں مزہ آجائے، یہ اچھی بات تو ہے، لیکن اس میں خطرہ بھی ہے، وہ یہ کہ ہوسکتا ہے کہ وہ مزہ کی خاطر نماز پڑھ رہا ہو، اللہ کی رضا کے لئے نماز نہ پڑھ رہا ہو۔ لہٰذا اس بات کا اندیشہ ہے کہ ’’اخلاص‘‘ مفقود ہو جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب نماز کے اندر مزہ زیادہ آنے لگتا ہے تو آدمی کے اندر عجب پیدا ہونے لگتا ہے، اور یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ

''میں تو اس مقام تک پہنچ گیا'' اور خود پسندی کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں تو اب بزرگی کے اعلیٰ مقام تک پہنچ گیا ہوں، اور اللہ والا بن گیا ہوں کہ یہ عبادات اب میری طبیعت ثانیہ بن گئی ہیں۔ یہ برائیاں انسان کے اندر اس مزہ کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں، اور جس بیچارے کو نماز میں مزہ ہی نہیں آرہا ہے اس کے دل میں یہ خیالات کہاں سے آئیں گے، اس کو تو یہ فکر ہو گی کہ کہیں میری نماز میرے منہ پر نہ ماردی جائے۔

ریٹائرڈ شخص کی نماز

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑی پیاری مثال دیا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ لوگ ''کیفیات'' کو ''روحانیت'' سمجھتے ہیں، یعنی عبادت میں شوق، ذوق، لطف اور مزہ آرہا ہو تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ''روحانیت'' زیادہ ہے۔ یہ سب باتیں غلط ہیں، بلکہ جس عبادت میں جتنی زیادہ سنت کی اتباع ہو گی، اتنی ہی روحانیت زیادہ ہو گی۔ ان کیفیات کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر ایک مثال دیتے ہوئے فرماتے تھے کہ دو آدمی ہیں، ان میں سے ایک ریٹائرڈ ہے، اور ملازمت سے بالکل فارغ ہے، فارغ زندگی گزار رہا ہے، اور پنشن جاری ہے، اور اس پنشن سے اچھی طرح گزارا ہو رہا ہے، اولاد بھی کما رہی ہے، بچوں اور بچیوں کی شادی کر کے فارغ ہو گیا ہے، اب اس کو کسی چیز کی کوئی فکر نہیں ہے، آرام سے گھر میں فراغت کی زندگی گزار رہا ہے، وہ شخص یہ کرتا ہے کہ اذان سے پہلے ہی وضو کر کے تیار ہو گیا، اور اذان ہوتے ہی مسجد کی طرف روانہ ہو گیا، اور صف اول میں پہنچ

گیا، اور وہاں پہنچ کر اس نے تحیۃ المسجد کی نوافل ادا کیے، اور پھر سنتیں ادا کیں، اور نماز کے انتظار میں بیٹھا ذکر کرتا رہا، اور جب جماعت کھڑی ہوئی تو بڑے اطمینان کے ساتھ خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کی، اور پھر اطمینان سے گھر واپس آ گیا، اور دوسری نماز کے انتظار اور اس کی تیاری میں لگ گیا۔

ٹھیلے پر سامان بیچنے والے کی نماز

دوسرا آدمی ٹھیلے پر اپنا سامان بیچ کر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے، سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر آواز لگا کر اپنا سامان فروخت کرتا رہتا ہے، گھر میں دس افراد کھانے والے ہیں، ہر وقت اسی فکر میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح میرا سامان فروخت ہو جائے تو کچھ پیسے کما کر بچوں کی روٹی کا بندوبست کروں۔ اسی حالت اذان ہو گئی، اب گاہک اس سے سامان خرید رہے ہیں، ایک کو کچھ دے رہا ہے، دوسرے کو کچھ دے رہا ہے، لیکن اس کا دماغ اس طرف لگا ہوا ہے کہ اذان ہو چکی ہے، اور مجھے نماز پڑھنی ہے، اب وہ اپنے گاہکوں کو جلدی جلدی نمٹا رہا ہے، جب بالکل عین جماعت کا وقت ہو گیا تو اس وقت اس نے جلدی سے ٹھیلے کو ایک طرف کھڑا کیا، اور اس کے اوپر کپڑا ڈالا، اور بھاگتا ہوا مسجد میں پہنچا، اور جلدی جلدی وضو کیا، اور جماعت میں شامل ہو گیا، اب اس وقت اس کا دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے، اور یہ خیال آ رہا ہے کہ کہیں کوئی چور ٹھیلا نہ لے جائے، کوئی سامان چوری نہ کر لے، اب اپنی طرف سے اس نے نماز کے اندر دل لگانے کی کوشش کر لی، لیکن ایسے حالات میں نماز پڑھ رہا ہے کہ ان خیالات کی طرف سے دماغ کو

خالی کرنا مشکل ہے، لیکن بہرصورت، اس نے سنت کے مطابق نماز پڑھ لی، اور پھر جلدی سے سنتیں ادا کیں، اور سلام پھیر کر سیدھا اپنے ٹھیلے پر پہنچ گیا، اور کپڑا ہٹایا، اور پھر آوازیں لگانا شروع کر دیں، اور سامان بیچنا شروع کر دیا۔

روحانیت کس کی نماز میں زیادہ ہے؟

حضرت فرماتے ہیں کہ بتاؤ! ان دونوں میں سے کس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے؟ بظاہر تو یہ نظر آ رہا ہے کہ پہلا آدمی جو ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہے، جس نے بڑے اطمنان اور سکون سے نماز ادا کی تھی، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے، لیکن حقیقت میں دوسرا آدمی جو ٹھیلا لگا کر اپنا سامان فروخت کرتا تھا، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے۔ اس لئے کہ پہلے آدمی کو تو کوئی کام ہی نہیں تھا، اس لئے اس نے اپنے آپ کو نماز کے لئے اور عبادت کے لئے فارغ کر لیا تھا، لہٰذا نماز پڑھنا اس کا کوئی کمال نہیں تھا، بلکہ کمال تو اس ٹھیلے والے کا ہے کہ اس کے گھر میں دس افراد کھانے والے تھے، ان کے لئے روزی کمانی تھی، اور ٹھیلے پر گاہک سامان خریدنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے، ایسی حالت میں اذان کی آواز سن کر ٹھیلے کو ایک طرف کر کے مسجد کی طرف نماز کے لئے چلا گیا، اس کی نماز میں زیادہ روحانیت ہے، اس لئے کہ اس نے نماز کے لئے جسمانی اور ذہنی مشقت زیادہ اٹھائی، اس مشقت کی وجہ سے اس کے عمل میں روحانیت زیادہ ہے، اور اس پر اس کو اجر بھی زیادہ ملے گا۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ اگر ذوق وشوق وولولہ اور جذبہ ہوگا تب عبادت قبول ہوگی، ورنہ نہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔

وہاں تعمیل حکم کا جذبہ دیکھا جاتا ہے

اللہ تعالیٰ کے یہاں اصل چیز جو دیکھی جاتی ہے، وہ تعمیل حکم کا جذبہ ہے کہ ہم نے بندے کو عبادت کا حکم دیا تھا، یہ بندہ عبادت ادا کرنے کے لئے ہمارے حکم کی تعمیل میں آ گیا، اگر چہ حالات نے اس کے دل و دماغ کو منتشر کر رکھا ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاص کے ساتھ آ گیا، اور اس نے ہمارے حبیب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عبادت انجام دے لی، بس اس کی عبادت قبول ہے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ اس ذوق وشوق کے حصول کی فکر میں مت پڑو۔

ساقی جیسے پلا دے وہ اس کی مہربانی ہے

ہاں! اگر کسی کو ذوق وشوق کی یہ نعمت میسر آ جائے تو اس پر بھی وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ یا اللہ! آپ نے میری اس عبادت کو آسان فرما دیا، اور مجھے عبادت میں لطف اور مزہ بھی آنے لگا، لیکن اس لطف اور مزہ کی طلب میں بہت زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں، چنانچہ آخر میں حضرت والا نے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر لکھا ہے کہ:

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم در کش

کہ آنچہ ساقیء ما ریخت عین الطاف ست

یعنی تجھ کو یہ حق نہیں کہ تو ساقی سے یہ مطالبہ کرے کہ مجھے صاف صاف شراب دینا، اور تلچھٹ مت دینا، بلکہ ساقی جیسی شراب بھی تجھ کو دیدے، یہ اس کی عین مہربانی ہے، اب چاہے وہ صاف صاف شراب دیدے، یا تلچھٹ دیدے،

لیکن دیدے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ سے "عمل" کی توفیق مانگتے رہو، جب ان کی طرف سے "عمل" کی توفیق ہو جائے تو یہ ان کا کرم ہے، چاہے اس "عمل" میں مزہ آئے یا نہ آئے، لطف آئے یا نہ آئے، بس! اس پر راضی رہو کہ عمل کی توفیق ہو رہی ہے، اس سے آگے بڑھنے کی فکر مت کرو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ عبادت کے اندر شوق، ولولہ اور مزہ کا آنا مطلوب نہیں، اور عبادت کی قبولیت کی شرائط میں سے نہیں، لہٰذا اس فکر میں پڑے بغیر عبادت کو اخلاص کے ساتھ اور سنت کے مطابق کرنے کی فکر کرو، پھر اگر وہ حاصل ہو جائے تو بہت اچھا، نہ ملے تو کوئی غم نہیں۔ آج بہت بڑی مخلوق اس فکر میں پریشان رہتی ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں، مگر نماز میں مزہ ہی نہیں آتا۔ اس کی وجہ سے پھر اپنے اعمال کی اور اپنی عبادات کی ناقدری شروع کر دیتے ہیں، ایسا نہیں کرنا چاہئے، عبادت کے اندر دو باتوں کا ہونا کافی ہے، ایک یہ کہ اخلاص ہو، دوسرے یہ کہ سنت کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

محبت طبعی یا عقلی

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۹۰

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

محبت طبعی یا محبت عقلی

الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین، و العاقبة للمتقین، و الصّلوٰة والسّلام علی رسوله الکریم وعلی آله و اصحابه اجمعین امابعد !

وہ آدمی مؤمن نہیں

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''محبت عقلی یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت کو شریعت پر عمل کرنے کی طرف متوجہ کرے'' (انفاس عیسیٰ: ۱۹۵)

ایک حدیث میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو اس کے مال سے، اس کی جان سے، اس کی اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ یعنی جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی محبت انسان کے دل میں اس کے مال و اولاد سے بھی زیادہ نہ ہو جائے، یہاں تک کہ اس کی جان سے بھی زیادہ نہ ہو جائے، اس وقت تک آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی بڑی بات ارشاد فرمادی۔

ایمان کے بارے میں خطرہ

جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی تو فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنا جائزہ لیا تو آپ بیشک مجھے اپنے مال سے بھی زیادہ محبوب ہیں، اپنی اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہیں، لیکن اپنی جان سے زیادہ محبوب معلوم نہیں ہوتے، اس لئے مجھے اپنے ایمان کے بارے میں بڑا خطرہ ہوگیا ہے۔ اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے پر مارا، اور فرمایا کہ کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو اس کی جان، مال اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یا رسول اللہ! اَلآن، یعنی اب آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہوگئے۔

مدار ایمان اللہ کی محبت یا رسول اللہ کی محبت

یہ بڑی مشکل حدیث ہے، اور ہم اور آپ کے لئے اس مقام کو سمجھنا آسان نہیں ہے، اس لئے کہ جس مقام سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ

بات ارشاد فرمائی، اور جس مقام سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشکال کیا، اور جس مقام سے پھر وہ اشکال دور ہوا، یہ سب اتنی اونچی باتیں ہیں کہ ہماری اور آپ کی پرواز وہاں تک مشکل ہے۔ اس حدیث پر پہلا اشکال یہ ہے کہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی محبت کو "مدار ایمان" قرار دیا، اللہ کی محبت کو "مدار ایمان" قرار نہیں دیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی محبت کو "مدار ایمان" قرار دینا چاہئے تھا۔ اس اشکال کا جواب تو آسان ہے، وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اللہ تعالیٰ کی محبت لازم اور ملزوم ہیں، دونوں محبتیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتیں، جب کسی کے دل میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہوگی تو لازماً اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ہوگی، کیونکہ اگر کسی کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو وہ محبت اللہ ہی کے لئے ہے، کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر ہمارے پاس تشریف لائے، آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکام ہم تک پہنچائے، آپ نے ہمیں اللہ تعالیٰ سے روشناس کرایا، آپ نے ہمارا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم فرمایا۔ لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی وجہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی محبت ہے۔

ایک کی محبت دوسرے کی محبت کو مستلزم ہے

یہی وجہ ہے کہ کسی کے دل میں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبت ہے، اور کسی کے دل میں یہ احساس ہوتا ہے کہ مجھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت ہے۔ لیکن حقیقت میں جب ایک کی محبت

ہوگی تو دوسرے کی محبت ضرور ہوگی، چنانچہ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ذکر ہے، وہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا بھی ذکر ہے، فرمایا: وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (سورۃ الاحزاب: ۷۱) لہٰذا اللہ تعالیٰ کی محبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو مستلزم ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کو مستلزم ہے۔

حضرت رابعہ بصریہؒ اور اللہ کی محبت

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا بڑے اونچے درجے کی تابعہ ہیں، خواتین میں جو اولیاء اللہ گزری ہیں، ان میں ان کا بڑا اونچا مقام ہے، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی تو اس موقع پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے معاف فرمایئے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت میرے دل میں اتنی زیادہ پیوست ہے اور میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں اتنی زیادہ مستغرق رہتی ہوں کہ اس کی وجہ سے اکثر و بیشتر اوقات میں میرا آپ کی طرف دھیان نہیں جاتا، اور آپ کی محبت مجھے اپنے دل میں زیادہ محسوس نہیں ہوتی، جتنی محبت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ تم جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں مستغرق رہتی ہو، وہ بھی میری ہی محبت ہے، لہٰذا اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

دونوں کی محبت کا حاصل ایک ہی ہے

پریشانی کی کوئی بات اس لئے نہیں کہ محبت کے الوان جدا جدا ہوتے ہیں،

کسی وقت اللہ تعالیٰ کی محبت کا جوش، جذبہ اور ولولہ زیادہ محسوس ہوتا ہے، اور کسی وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا جوش، جذبہ اور ولولہ زیادہ محسوس ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں ایک کی محبت دوسرے کی محبت کو مستلزم ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ میں سب سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں اس وقت تک تم مؤمن نہیں ہو سکتے، درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ یا میں محبوب ہو جاؤں یا اللہ تعالیٰ محبوب ہو جائیں، یا دونوں محبوب ہو جائیں، اس لئے کہ دونوں کی محبت کا حاصل ایک ہی ہے۔ پہلے اشکال کا تو یہ جواب ہو گیا۔

کیا ایمان غیر اختیاری ہے؟

اس حدیث پر دوسرا اشکال وہ ہوتا ہے جس میں علماء کرام بڑے حیران رہے، وہ یہ کہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک میں تمہاری جان، مال اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں اس وقت تک تم مؤمن نہیں، اور محبت ایسی چیز ہے جو اپنے اختیار میں نہیں، اب اگر کسی کے دل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس درجے کی نہیں تو اس کا ایمان بھی نہیں، اور جب ایمان نہیں رہا تو وہ ''کافر'' ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان بھی اختیاری نہ رہا، اس لئے کہ جب ''محبت'' غیر اختیاری چیز ہے اور ایمان اس ''محبت'' پر موقوف ہے تو پھر ایمان بھی اختیاری نہ رہا۔

ایک لمحہ میں یہ انقلاب کیسے آ گیا؟

تیسرا اشکال یہ پیدا ہو رہا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے آدمی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان قربان کرنے والے تھے، وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ مجھے اپنی جان سے زیادہ محبوب نظر نہیں آتے۔ پھر دوسرے لمحے میں جب آپ نے اپنا دست مبارک ان کے سینے پر مار کر دوبارہ وہ بات دہرائی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ "اَلآن" اب آپ سے اپنی جان سے زیادہ محبت ہو گئی، سوال یہ ہے کہ ایک لمحہ میں یہ زبردست انقلاب کیسے آ گیا؟

محبت طبعی

علماء کرام نے ان دونوں اشکالات کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں، لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی جو توجیہ بیان فرمائی ہے، وہ بڑی عجیب و غریب ہے، فرمایا کہ محبت کی دو قسمیں ہیں، ایک محبت طبعی اور دوسری محبت عقلی۔ عام طور پر ہم لوگ جس کو "محبت" کہتے ہیں وہ "محبت طبعی" ہوتی ہے، یعنی طبیعت میں کسی چیز کے ساتھ ایسی محبت ہو جائے کہ اس کی یاد میں آدمی بے چین ہو رہا ہے، اس کا تصور لگائے بیٹھا ہے، ہر وقت اس کو یاد کر رہا ہے، اور جب اس کا تصور آتا ہے تو دل میں ایک جوش اور اُبال پیدا ہوتا ہے، یہ "طبعی محبت" ہے، جیسے باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، اگر بیٹا کہیں دور ہے تو اس کی بار بار یاد آتی ہے، اور اس سے ملنے کو دل چاہتا ہے، تو یہ جو یاد

آرہی ہے، اور ملنے کو دل چاہ رہا ہے، اور طبیعت اس کی طرف تڑپ رہی ہے، بس یہی ''محبت طبعی'' ہے، یہ ''محبت طبعی'' غیر اختیاری چیز ہے، اس کا کوئی درجہ کسی کو حاصل ہوتا ہے، کسی کو حاصل نہیں ہوتا، کسی کو زیادہ محبت ہوتی ہے، کسی کو کم ہوتی ہے۔

محبت عقلی

دوسری قسم ہے ''محبت عقلی'' اور محبت عقلی کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ دل میں محبت کا جوش اور اُبال تو پیدا نہیں ہو رہا، لیکن جب میں سوچتا ہوں تو دماغ میں یہ بات آتی ہے کہ یہ ذات محبت کے لائق ہے، اور اس ذات سے ضرور محبت ہونی چاہئے، پھر اس محبت عقلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے حکم کی اطاعت کرتا ہے، اس کے اشاروں کو دیکھتا ہے، اور اس کی ہدایات پر چلتا ہے، اور اس کے کہنے پر عمل کرتا ہے، اسی کا نام ''محبت عقلی'' ہے۔

محبت عقلی کا نتیجہ

اسی لئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ:

> ''محبت عقلی یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت کو شریعت پر عمل کرنے کی طرف متوجہ کرے''

کیونکہ یہ شریعت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے، جب میں عقل سے غور کرتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی شریعت واجب الاتباع ہے، اور اپنی زندگی کو اسی کے مطابق

ڈھالنا چاہئے، اور یہی شریعت میری صلاح و فلاح کی ضامن ہے۔ جب یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تو بس ''محبت عقلی'' دل میں پیدا ہو گئی۔

محبت عقلی کی مثال

اس ''محبت عقلی'' کی مثال بلاتشبیہ یہ ہے کہ جیسے ایک آدمی بیمار ہو گیا، اب ڈاکٹر نے اس کے لئے ایک کڑوی دوا تجویز کر دی، یا انجکشن لگانا تجویز کر دیا، ظاہر ہے کہ کڑوی دوا پینے کو یا انجکشن لگوانے کو دل نہیں چاہتا، بلکہ دل یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس انجکشن سے بچ جاؤں تو بہتر ہے، لیکن دل نہ چاہنے کے باوجود وہ شخص اس دوا کو پئے گا، البتہ اس دوا سے اس کو محبت نہیں ہے، چنانچہ جس دن ڈاکٹر اس سے یہ کہہ دے گا کہ اب اس دوا کو پینے کی ضرورت نہیں، اس دن وہ اس دوا کو پھینک دے گا، لیکن جب تک ڈاکٹر نے یہ کہہ رکھا ہے کہ تیری شفاء اس کڑوی دوا میں ہے، ورنہ تجھے شفاء نہیں ہو گی، اس وقت تک وہ بیمار اس دوا کو پیتا رہے گا۔ اب دوا سے اس بیمار کو ''محبت طبعی'' نہیں، لیکن ''محبت عقلی'' ہے، لہٰذا طبیعت میں گرانی کے باوجود اس دوا کو پی لے گا۔

یہ مثال ''محبت طبعی'' کی بلاتشبیہ کے بیان کر دی ہے، اس لئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دوا کی محبت کی طرح نہیں ہوا کرتی، صرف محبت عقلی اور محبت طبعی کا فرق سمجھانے کے لئے یہ مثال بیان کر دی، ورنہ کہاں دوا کی محبت اور کہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، دونوں کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں۔

غور و فکر کے نتیجے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

بہر حال! جب آدمی یہ سوچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا خالق ہے، میرا مالک ہے، اس نے اپنے محبوب پیغمبر کو میری ہدایت اور رہنمائی کے لئے بھیجا، آپ نے ہماری ہدایت کے لئے کتنی مصیبتیں جھیلیں، اور کتنی پریشانیاں اٹھائیں، میرے لئے یہ شریعت لے کر آئے، میرے لئے ہدایت کا سامان فرمایا۔ تو اس غور و فکر کے نتیجے میں عقلی طور پر انسان حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے، چاہے اس محبت میں وہ جوش اور ولولہ نہ ہو، جو جوش اور ولولہ اپنے بچے سے محبت میں ہوتا ہے، لیکن عقلی طور پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ آپ کی ذات تمام چیزوں سے زیادہ قابل محبت ہے۔

محبت عقلی مطلوب ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محبت کا جو درجہ مطلوب ہے اور جس کو ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے وہ ''محبت عقلی'' ہے کہ یہ ''محبت عقلی'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام چیزوں کے مقابلے میں غالب ہونی چاہئے۔ پھر حضرت والا نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کی توجیہ اس طرح فرمائی کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حدیث سنی کہ ''جب تک میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، اس وقت تک وہ مؤمن نہیں'' تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شروع میں یہ سمجھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ''محبت طبعی'' کا ذکر فرما رہے ہیں، اور محبت طبعی اس درجے کی حاصل نہیں تھی،

اس لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے اپنا اشکال پیش کیا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے سینے پر مار کر دوبارہ وہ بات دہرائی، تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بات سمجھ میں آئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ''محبت طبعی'' کے بارے میں نہیں فرما رہے ہیں، بلکہ ''محبت عقلی'' کے بارے میں فرما رہے ہیں، اور وہ ''محبت عقلی'' مجھے حاصل ہے، اس لئے انہوں نے فرمایا ''اَلْآنَ'' یعنی اب بات سمجھ میں آگئی، اور الحمدللہ اس ''محبت عقلی'' کا وہ درجہ مجھے حاصل ہے۔ یہ وہ توجیہ ہے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی، حاصل یہ کہ مطلوب ''محبت عقلی'' ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہ

البتہ ایک توجیہ وہ ہے جو حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جس محبت کا ذکر ہے اس کو ''محبت عقلی'' پر محمول کرنا اس حدیث کے زور کو گھٹا دیتا ہے، اس لئے کہ ''محبت عقلی'' تو یہ ہے کہ دل میں تو اس ذات سے کوئی خاص محبت نہیں ہے، لیکن دلائل سے سوچنے کے نتیجے میں محبت زبردستی کی جاتی ہے، اس لئے اس حدیث میں ''محبت طبعی'' ہی مراد ہے ''محبت عقلی'' مراد نہیں، لیکن وہ ''محبت طبعی'' مراد ہے جو نتیجہ ہوتی ہے ''محبت عقلی'' کا۔

طبعی محبت صغریٰ و کبریٰ کی محتاج نہیں

دیکھئے! ایک ''محبت طبعی'' وہ ہوتی ہے جو کسی تصنع اور تکلف کے بغیر، کسی

دلیل کے بغیر اور غور وفکر کے بغیر طبعاً انسان کے دل میں موجود ہوتی ہے، جیسے بچے سے باپ کو محبت طبعی ہوتی ہے، کیا ایسا ہوتا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو باپ صغریٰ وکبریٰ نکال کر منطقی طور پر نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ بچہ میرا ہے، اور ہر باپ کو اپنے بچے سے محبت کرنی چاہئے، لہٰذا مجھے اس سے محبت ہے، ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی بچہ پیدا ہوتا ہے، اس سے محبت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، یہ محبت خالصۃ محبت طبعی ہے۔

محبت عقلی کے نتیجے میں محبت طبعی

دوسری ''محبت طبعی'' وہ ہوتی ہے جو ''محبت عقلی'' کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، یعنی پہلے ذرا سوچتا ہے، غور وفکر کرتا ہے، پھر جوں جوں وہ غور کرتا ہے تو اس غور کرنے کے نتیجے میں محبت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جس محبت کا ذکر ہے، وہ ''محبت طبعیہ'' ہی ہے، البتہ اس تک پہنچنے کا راستہ ''محبت عقلیہ'' ہے۔ اس لئے اگر کسی کے دل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ''محبت طبعیہ'' پیدا نہیں ہو رہی ہے تو وہ یہ سوچے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس امت کے ایک ایک فرد پر کیا کیا احسانات ہیں، اور محبت کے اسباب پر غور کرے۔

حضور کے اندر محبت کے چاروں اسباب موجود ہیں

چنانچہ ''نشر الطیب'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ محبت کے چار اسباب ہوتے ہیں، اگر کسی سے محبت ہوتی ہے تو انہی اسباب میں سے

کسی سبب کے نتیجے میں محبت ہوتی ہے، (۱) یا تو اس کے جمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے، (۲) یا اس کے کمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے، (۳) یا اس کے نوال (جود وسخاوت) کی وجہ سے محبت ہوتی ہے، (۴) یا اس کے مال کی وجہ سے اس سے محبت ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں یہ چاروں اسباب موجود ہیں، اور اس درجے میں موجود ہیں کہ کائنات میں کسی کے اندر بھی اس درجے میں موجود نہیں ہو سکتے، آپ کا جمال تو ایسا تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرما رہی ہیں کہ زلیخا کی سہیلیوں نے تو حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوہ جہاں آراء دیکھ لیا ہوتا تو ہاتھ کے بجائے اپنے سینے چیر ڈالتیں۔ اس درجہ کا آپ کا جمال تھا۔ آپ کا کمال اس درجہ کا تھا کہ اس کائنات میں کسی بھی مخلوق کے لئے کمال کا وہ درجہ متصور ہو ہی نہیں سکتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔ اور نوال یعنی جود وسخاوت ایسی کہ پیسے کی جود وسخاوت، اموال کی جود وسخاوت، علم کی جود وسخاوت، دین کی جود وسخاوت، پوری امت چودہ سو سال سے آپ کی جود وسخاوت سے سیراب ہو رہی ہے، اور قیامت تک ہوتی رہے گی، اس لئے جب انسان ان اسباب میں غور وفکر کرے گا تو پھر وہ محبت عقلی نہیں رہے گی، بلکہ ''محبت عقلی'' رفتہ رفتہ ''محبت طبعی'' میں تبدیل ہوتی چلی جائے گی۔

ہر مسلمان کے دل میں حضور کی محبت

سچی بات یہ ہے کہ ایک مسلمان چاہے وہ کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو،

فاسق ہو، فاجر ہو، گناہوں کے اندر مبتلا ہو، غنڈہ ہو، آوارہ ہو، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کے قلب کے اندر اس درجہ میں جاگزیں ہوتی ہے کہ چاہے وہ نماز نہ پڑھے، روزے نہ رکھے، فرائض سے غافل رہے، لیکن اگر کوئی شخص اس کے سامنے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کردے تو وہ لڑنے مرنے کو تیار ہو جائے گا، اور اپنی جان دیدے گا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے جان دیدی، مثلاً غازی علم الدین ابھی کچھ عرصہ پہلے گزرا ہے، اس کے سامنے ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تو اس نے اس کو قتل کر دیا، جب اس کے خلاف مقدمہ چلا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ تم ایک مرتبہ اتنا کہہ دو کہ میں نے قتل نہیں کیا، یا کچھ تاویل کردو، اس نے جواب دیا کہ میں کیسے تاویل کروں، ساری زندگی میں ایک ہی تو عمل کیا، میرے اعمال نامہ میں تو صرف یہی ایک عمل ہے، کوئی اور عمل ہی ہے نہیں، چنانچہ اس کے خلاف مقدمہ ہوا، اور اس کو پھانسی دیدی گئی، بہر حال! اس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنی جان دیدی۔

اختر شیرانی کا واقعہ

اختر شیرانی جو مشہور شاعر ہے، اور بہت آزاد قسم کا شاعر تھا، اور پینے پلانے کا عادی تھا، چونکہ اس کی شاعری مقبول تھی، اس لئے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، ایک مرتبہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا، پینے پلانے کا شغل جاری تھا، لوگ اس کو چھیڑتے تھے، اور نشے کی حالت میں اس سے مختلف

لوگوں کے بارے میں سوال کر کے اس سے بات کہلواتے تھے، چنانچہ لوگ اس سے مختلف لوگوں کے بارے میں پوچھتے رہے کہ تمہارا فلاں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے جواب میں اس پر کوئی فقرہ کس دیا، فلاں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے اس پر کوئی فقرہ کس دیا، کبھی کسی سیاسی لیڈر کے بارے میں، کبھی کسی شاعر کے بارے میں، کبھی کسی ادیب کے بارے میں اس سے سوال کرتے رہے، وہ ہر ایک پر فقرہ کستا چلا گیا، اسی دوران کسی کمبخت نے اس سے یہ سوال پوچھ لیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اب ایک طرف تو وہ شراب کے نشے میں ہے، اور دوسری طرف ماحول ایسا بنا ہوا ہے کہ وہ ہر ایک پر فقرے کس رہا ہے، یہ سوال سنتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ایک دم سے اس کو کرنٹ لگ گیا، اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا، وہ گلاس اس سوال کرنے والے کے منہ پر پھینک کر مارا، اور کہا: کمبخت! تو مجھ سے میری زندگی کا آخری سہارا بھی چھیننا چاہتا ہے؟ میں بہت گناہ گار سہی، بہت گیا گزرا سہی، لیکن اس ذات اقدس کے بارے میں میرے لئے کوئی کلمہ قابل برداشت نہیں۔ بہر حال! ایک مسلمان کا یہ عالم ہوتا ہے، وہ چاہے کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کے دل میں جاگزیں ہوتی ہے، یہ ''محبت'' نری ''محبت عقلی'' نہیں ہوتی، بلکہ یہ ''محبت طبعی'' ہے، لیکن ''محبت عقلی'' کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے، اس حدیث میں یہی محبت مراد ہے۔

محبت اور چیز ہے، جوش و خروش اور

اور پھر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''محبت'' اور چیز ہے، اور اس کا جوش و خروش اور چیز ہے، بعض اوقات کسی کے ساتھ محبت کا جوش و خروش زیادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقی ''محبت'' دوسرے کی زیادہ ہوتی ہے، جیسے اولاد سے باپ کو محبت ہوتی ہے، اس محبت میں جوش و خروش زیادہ ہوتا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کو پیار کروں، اس کو گود میں لوں، اس کو چمٹاؤں، اس سے باتیں کروں۔ اس کے مقابلے میں باپ سے جو محبت ہوتی ہے، اس میں جوش و خروش نہیں ہوتا، کیا باپ کو چمٹانے، اس کو گود لینے اور اس کو پیار کرنے کا جوش ہوتا ہے؟ نہیں۔ معلوم ہوا کہ باپ سے جوش و خروش کا وہ انداز نہیں ہو سکتا جو بیٹے سے ہوتا ہے، لہٰذا باپ کے ساتھ جوش و خروش تو نہیں، لیکن باپ کی محبت میں بھی کمی نہیں، بلکہ بعض اوقات ماں باپ سے محبت اولاد کی محبت سے زیادہ ہوتی ہے، چنانچہ اگر کبھی دونوں محبتوں میں تعارض ہو جائے تو آدمی ماں باپ کو ترجیح دیتا ہے۔ تو محبت ماں باپ کی زیادہ ہے، اور جوش و خروش اولاد سے زیادہ ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت زیادہ ہونی چاہئے، البتہ جوش و خروش کی زیادتی مطلوب نہیں،۔ بہر حال! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ''محبت طبعی'' ہی مطلوب ہے، جو محبت عقلی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔

دونوں کا مقصود ایک ہی ہے

یہ وہ تفصیل ہے جو میں نے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی

عبارت سے سمجھی، واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ نے بہت باریک اور بہت اونچی بات بیان فرمائی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد حضرت شاہ صاحبؒ کی بات سے معارض نہیں ہے، بلکہ شاید دونوں کا مقصود ایک ہی ہے، اس لئے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جس کو ''محبت عقلی'' فرما رہے ہیں، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ وہ محبت عقل و استدلال سے حاصل ہوتی ہے، لیکن وہ محبت بھی دل ہی سے ہوتی ہے، اس لئے کہ ''محبت'' کا محل ''دل'' ہی ہے، اور ''عقل'' کا محل ''دماغ'' ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت ہے وہ اگرچہ عقل کے غور وفکر کے نتیجے میں حاصل ہوئی، لیکن ہے تو وہ ''محبت'' اور جب ''محبت'' ہے تو وہ دل سے ہوگی، اس لئے دونوں حضرات کی بات میں فرق نہیں، البتہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس محبت کی تعبیر ایسی فرمائی جو بات کو اقرب الی الفہم کر دیتی ہے، اور اس کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، اور اس میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

اہل محبت کا کلام پڑھیئے

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

> ''محبت، درد اور دل جمعی پیدا ہونے کے لئے مثنوی معنوی و دیوان حافظ کے دو دو صفحے کا روزانہ مطالعہ کیا جائے تو نافع ہوگا'' (انفاس عیسیٰ: ۱۹۵)

بات دراصل یہ ہے کہ یہ ''محبت'' اور ''عشق'' کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس

پر کوئی لکچر دیدیا جائے، اور وہ حاصل ہو جائے، بلکہ یہ تو ایک کیفیت ہے جو دل میں پیدا ہوتی ہے، اس کیفیت کے پیدا ہونے کے جو اسباب پیچھے بیان کئے گئے، ان میں سے ایک سبب تھا ''اہل اللہ سے تعلق'' تو جس طرح اہل اللہ سے تعلق اس کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے، اسی طرح جو اہل محبت گزر چکے ہیں، ان کے حالات، ان کی سوانح، ان کے ملفوظات اور تعلیمات کا مطالعہ بھی انسان کے اندر محبت کے اضافے کا سبب بنتا ہے، یہ دونوں حضرات یعنی مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ مثنوی اور حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ دیوانِ حافظ یہ دونوں ایسے اہل محبت ہیں کہ ان کے سینوں میں محبت کی آگ کی بھٹی کی سلگی ہوئی تھی، ان کا جب کلام پڑھو گے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی، انشاء اللہ۔

حضرت خواجہ شمس الدین تبریزیؒ کی دعا

یہ محبت کیوں پیدا نہ ہو؟ اس لئے کہ یہ مثنوی جو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے، یہ بڑی عجیب وغریب چیز ہے، اور یہ الہامی کتاب ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے جو شیخ تھے حضرت خواجہ شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ، یہ بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، مگر اُمّی تھے، یعنی پڑھنے لکھنے کا سلسلہ نہیں تھا، ان کے دِل پر عجیب وغریب علوم وارد ہوتے تھے، اور وہ علوم مجالس میں بیان بھی کردیتے تھے، لیکن وہ علوم مجلس کی حد تک محدود رہتے تھے، ایک دن انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! آپ میرے قلب پر ایسے ایسے مضامین القاء فرماتے ہیں، لیکن وہ مضامین اس مجلس کی حد تک محدود رہتے ہیں، میں بالکل بے

زبان آدمی ہوں، نہ مجھ سے تصنیف ہوتی ہے، نہ تألیف ہوسکتی ہے، نہ کوئی شعر مجھ سے کہا جا سکتا ہے، اس لئے یا اللہ! مجھے ایک زبان عطا فرمادیں، جو میرے ان علوم کو لوگوں تک پہنچادے۔

شمس الدین تبریزؒ کی دعا کا نتیجہ

چنانچہ اس دعا کے نتیجے میں مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ تبریزؒ سے بیعت ہوگئے، یہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پہلے ساری عمر کوئی شعر نہیں کہا تھا، جب یہ شیخؒ کی خدمت میں اصلاح کے لئے حاضر ہوئے، اور پھر بیعت ہوگئے، اسی پر انہوں نے بعد میں یہ شعر کہا:

مولوی ہر گز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمسِ تبریزیؒ نہ شد

بہر حال! شیخ کی غلامی اختیار کی، اور ان سے بیعت ہوگئے، اور اس کے نتیجے میں حضرت کی دعا قبول ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے مولانا رومی رحمۃ اللہ کو شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی زبان بنادیا۔ وہ اس طرح کہ بیٹھے بیٹھے اچانک مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان پر اشعار جاری ہوگئے، حالانکہ اس سے پہلے کبھی شعر نہیں کہا تھا، بس اچانک اشعار وارد ہونا شروع ہوگئے، اور ان اشعار میں عجیب وغریب علوم، معارف، قصے، کہانیاں، اسرار ورموز بیان ہونا شروع ہوگئے، یہاں تک کہ چھ دفتر اشعار سے بھر گئے، ان اشعار میں زیادہ تر حکایات اور کہانیاں بیان کی ہیں، لیکن ہر حکایت سے عجیب وغریب معانی اور معارف نکالتے ہیں، آخر

میں ایک حکایت بیان کرنا شروع کی وہ حکایت ابھی درمیان میں چل رہی تھی، بس اچانک اشعار کی آمد بند ہوگئی، آگے لکھ دیا کہ اس حکایت کو مکمل کرنا میرے بس میں نہیں، میرے اختیار میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کسی بندے کو پیدا فرمائیں گے جو اس حکایت کو مکمل کرے گا۔

مثنوی کی تکمیل کس طرح ہوئی؟

اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا کہ جو کچھ اشعار وجود میں آرہے تھے، یہ ہمارے القاء اور الہام سے آرہے تھے، چنانچہ اس کے بعد صدیاں گزر گئیں، کسی نے اس حکایت کو پورا نہیں کیا، آخر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائی، اور ان کی زبان پر اشعار جاری ہوگئے، اور جہاں پر مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ ادھوری حکایت چھوڑی تھی، وہیں سے انہوں نے وہ حکایت شروع کر کے ''مثنوی'' کی تکمیل فرمائی، اسی لئے وہ ''خاتم المثنوی'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ کتاب ''مثنوی'' الہامی کتاب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے الہام کے ذریعہ ان حضرات کے دلوں پر القاء فرمائی، اب جو شخص اس کو پڑھتا ہے، اس کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اس کتاب کو پڑھا کریں، جن لوگوں کو فارسی نہیں آتی، ان کے لئے اردو میں اس کا ترجمہ چھپا ہوا ہے، اور اردو میں اس کی شروحات بھی موجود ہیں۔

دیوان حافظ اور مثنوی کی شرح

دوسری کتاب جس کو پڑھنے کے بارے میں حضرت نے فرمایا، وہ ہے ''دیوان حافظ'' یہ بھی عجیب وغریب کتاب ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ جن دو کتابوں کا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مطالعہ کرنے کو فرمارہے ہیں، ان دونوں کی شرح بھی حضرت نے اردو میں تحریر فرمائی ہے، ''مثنوی'' کی شرح ''کلیدِ مثنوی'' کے نام سے کئی جلدوں میں تحریر فرمائی ہے، اور ''دیوانِ حافظ'' کی شرح ''عرفانِ حافظ'' کے نام سے لکھی ہے۔ اب عقل حیران ہوتی ہے کہ حضرت والا کو کہاں فرصت تھی، اس کے باوجود دیوان حافظ کی شرح لکھ دی، جو شعروشاعری کا مجموعہ ہے، اور اس کے اندر اکثر غزلیں ہیں، اور شراب کا اس میں تذکرہ ہے، لیکن اس سے مراد وہ شراب نہیں جو مٹکوں اور بھٹیوں میں کشید کی جاتی ہے، بلکہ اس سے مراد ''شراب محبت'' اور ''شراب معرفت'' ہے، اور اس کے ایک ایک شعر میں محبت اور معرفت بھری ہوئی ہے، آپ جانتے تھے کہ یہ کتاب پڑھنے والے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرے گی، اس لئے آپ نے اس کتاب کی شرح لکھی۔

حافظ شیرازیؒ کا ایک واقعہ

اور حافظ شیرازیؒ کا معاملہ بھی عجیب تھا، اور یہ بھی اَللّٰہُ یَجْتَبِیْ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ میں داخل تھے۔ ان کے والد صاحب کے کئی بیٹے تھے، تمام بیٹے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے، کوئی تعلیم حاصل کررہا تھا، کوئی تجارت کررہا

تھا، کوئی ملازمت کررہا تھا، لیکن حافظ شیرازیؒ آوارہ جنگل میں گھومتے پھرتے رہتے تھے، نہ کوئی تعلیم، نہ تربیت، نہ کام کاج، نہ روزی اور نہ روزگار، ان کے والد صاحب کو ان کی طرف سے فکر رہتی تھی، اور پریشان رہتے تھے، ان کے والد حضرت خواجہ شیخ بہاؤ الدین رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، ایک مرتبہ وہ ان کے گھر تشریف لائے تو انہوں نے اپنے تمام بچوں کو اپنے شیخ کے سامنے پیش کیا، اور دعا کرائی، حضرت شیخ نے سب بچوں کو دعائیں دیں، پھر پوچھا تمہارا ایک اور بیٹا بھی تو ہے، وہ کہاں ہے؟ والد صاحب نے جواب دیا وہ تو فضول آوارہ ہے، اس کا کوئی پتہ نہیں، کہیں جنگل میں ہوگا، شیخ نے کہا اس کو تو بلواؤ، ان کے والد صاحب نے ایک آدمی کو ان کے بلانے کے لئے جنگل کی طرف بھیج دیا، اور اس نے جا کر کہا کہ شیخ گھر میں آئے ہوئے ہیں، ان سے آکر مل لو، اور دعائیں کرالو۔ چنانچہ یہ آئے، جب گھر میں داخل ہوئے اور شیخ پر نظر پڑی تو وہیں کھڑے ہو کر ایک شعر پڑھا کہ:

آنا کہ خاک را بنظر کیمیا کنند

آیا بود کہ گوشۂ چشم بما کنند

یعنی وہ لوگ جو خاک کو ایک نظر میں کیمیا بنانے والے ہیں، مراد تھے حضرت خواجہ بہاؤ الدین رحمۃ اللہ علیہ۔ کیا کبھی ایسا ہوگا کہ وہ اپنی آنکھ کا ذرا اشارہ ہمارے اوپر بھی کریں، مجذوبیت کے عالم میں یہ شعر پڑھا، یہ شعر سن کر حضرت شیخ بہاؤ الدین رحمۃ اللہ کھڑے ہو گئے، اور ان کو اپنے قریب بلایا، اور

ان کے سر پر ہاتھ رکھا، اور کہا:

نظر کردم، نظر کردم، نظر کردم

یعنی جس نظر کو ڈالنے کے لئے تم کہہ رہے تھے، میں نے وہ نظر ڈال دی، اس دن کے بعد وہ آوارگی ختم کر دی، اور شیخ کی خدمت میں پڑ گئے، ان کے غلام بن گئے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مقام بخشا کہ بڑے بڑے لوگ ان پر رشک کرتے ہیں۔

دیوان حافظ کا ایک شعر

اس کے بعد انہوں نے دیوان حافظ لکھی، یہ "دیوان حافظ" عشق اور محبت سے بھری ہوئی بھٹی ہے، اگر کوئی اس کو سمجھنے والا ہو، چونکہ اس کو سمجھنے والے کم تھے، اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح لکھ دی، تاکہ اگر براہِ راست سمجھ میں نہ آئے تو شرح کی مدد سے سمجھ لو کہ انہوں نے اس دیوان میں کیا کہا ہے، بظاہر تو دیکھنے میں شعر و شاعری ہے، چنانچہ ایک شعر میں وہ کہتے ہیں کہ:

بِدِہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواھی یافت
کنارِ آب رکن آباد و گلگشتَ مصلا را

اب بظاہر تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ آوارگی کا شعر ہے، اس لئے کہ اس شعر میں وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ساقی! جو شراب باقی رہ گئی ہے وہ بھی مجھے دیدے، کیونکہ جنت میں یہ شراب نہیں ملے گی، اور وہاں جنت میں نہ رکن آباد

کے دریا کے کنارے کا حسن نظر آئے گا، اور نہ گلگشت مصلا نظر آئے گا، اور نہ یہ شراب نظر آئے گی، لہٰذا جو کچھ دینا ہے، مجھے یہیں دنیا میں دیدو۔ اب بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دنیا والی شراب اور دنیا کے دریا کا کنارا مراد ہے۔

اس شعر کا صحیح مطلب

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ اس شعر کے ذریعہ حافظ صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جنت میں اور ساری نعمتیں ملیں گی، لیکن جستجو اور طلب کی لذت وہاں نہیں ملے گی۔ اس لئے کہ وہاں پہنچنے کے بعد ساری لذتیں، نعمتیں حاصل ہو جائیں گی، اور محبوب کی جستجو اور طلب کی جو لذت اسی دنیا میں ہے، لہٰذا جب تک تو زندہ ہے، اس جستجو اور طلب کی لذت سے فائدہ اُٹھاتا جا، یہ کہیں نہیں ملے گی۔ حافظ شیرازیؒ اس شعر میں یہی کہنا چاہتے ہیں۔

نہ سمجھنے والا اعتراض کرے گا

بہر حال! اس طرح کے اشعار حافظ شیرزیؒ نے کہے، اب جو نادان لوگ ہیں، جو ان اشعار کو نہیں سمجھ سکے، انہوں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر تنقید بھی کی کہ انہوں نے ایسی کتاب کی شرح لکھ دی جس میں شراب کا ذکر ہے، اس لئے کہ انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ جو شراب جنت میں نہیں ملے گی، اب اس سے یہی دنیاوی شراب کے علاوہ اور کون سی شراب مراد ہوگی؟ ورنہ اصل شراب تو جنت میں ملے گی۔ لیکن حضرت نے اس شعر کو بھی تصوف کے معنی

پہنا دے، بات در اصل یہ ہے کہ جو آدمی نہیں سمجھتا وہ ضرور اعتراض کرے گا۔ بہر حال! یہ کتاب ایسی ہے کہ جب آدمی اس کو پڑھتا ہے، اور اس کے مضامین پر غور کرتا ہے تو اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اس لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ روزانہ دو صفحے مثنوی کے اور دیوانِ حافظ کے پڑھ لیا کرو، اس سے انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی محبت مں ترقی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں بھی اپنی محبت کا کوئی ذرہ عطا فرمادے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

ہر چیز اللہ کی عطا ہے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۹۱

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

ہر چیز اللہ کی عطا ہے

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین، والعاقبۃ للمتقین، والصّلوٰۃ والسّلام علی رسولہ الکریم، و علی آلہ و اصحابہ اجمعین۔امّا بعد!

یہ اعضاء اللہ کی نعمت ہیں

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''سالک جس وقت دیکھتا ہے کہ ہمارے اعضاء نے قربِ حق میں ہماری اعانت کی ہے تو وہ اس حیثیت سے ان سے محبت کرتا ہے، اور اپنی آنکھ کی بھی رعایت کرتا ہے، اپنے دماغ کی بھی حفاظت کرتا ہے، نہ اس واسطے کہ وہ اپنی چیزیں ہیں، بلکہ اس واسطے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی چیزیں ہیں'' (انفاس عیسیٰ: ۱۹۷)

اللہ جل جلالہ کی محبت اور تعلق مع اللہ کا بیان چل رہا ہے، اس ملفوظ میں حضرت والا بیان فرما رہے ہیں کہ جب انسان کی نظر درست ہو جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ زاویہ نگاہ صحیح فرما دیتے ہیں تو اسے کائنات کی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آتا ہے، اور جس چیز سے بھی محبت ہوتی ہے وہ درحقیقت اللہ جل شانہ ہی کی محبت کی بناء پر ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا کہ ہمارے اعضاء جو اللہ جل شانہ نے ہمیں عطا فرمائے ہیں، یہ آنکھ ہے، یہ کان ہے، یہ ناک ہے، یہ ہاتھ پاؤں ہیں، محبت کرنے والے بندے کو ان اعضاء سے جو محبت ہوتی ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ یہ میری چیزیں ہیں، بلکہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ یہ اللہ جل شانہ کی عطا ہے، اس کی دی ہوئی نعمت ہے، اور ان کے ذریعہ مجھے اللہ جل جلالہ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس لئے ان اعضاء سے محبت ہوتی ہے۔

اپنے اعضاء سے محبت کریں، لیکن

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے:

نازم بچشم خود که جمال تو دیده است
اُفتم بپائے خود که بکویت رسیده است

یعنی مجھے اپنی آنکھ پر ناز ہے کہ اس نے تیرا جمال دیکھا ہے، تیرا حسن دیکھا ہے، اور میں اپنے پاؤں پر ناز کرتا ہوں، اس بناء پر کہ وہ چل کر تیری گلی تک گیا ہے، اور مجھے تیری گلی تک پہنچایا ہے، اس وجہ سے مجھے ان سے محبت ہے۔ لہٰذا جو سالک اللہ جل شانہ کے راستے پر چل رہا ہو، اللہ جل شانہ کی محبت

اور اس کے ساتھ تعلق اس کے دل میں پیدا ہو رہا ہو، وہ اپنے اعضاء سے بھی محبت کرتا ہے، لیکن محبت کا عنوان مختلف ہوتا ہے، ہم اور آپ ان اعضاء سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ یہ ہمارے ہیں، یہ ہماری آنکھ ہے، ہماری ناک ہے، ہمارے کان ہیں، ہمارے ہاتھ ہیں، ہمارے پاؤں ہیں، اور ان اعضاء سے ہمیں فائدہ پہنچ رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو اپنی معرفت عطا فرمائی ہو، وہ بھی اپنے ان اعضاء سے محبت کرتا ہے، لیکن درحقیقت وہ اس لئے محبت کرتا ہے کہ ان اعضاء کے ذریعہ مجھے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوا، اور یہ اعضاء اللہ جل شانہ کی عطا ہے، اس لئے محبت کرتا ہے۔

غور کرو، یہ چیز کہاں سے آئی؟

ایک اور موقع پر حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت اور تعلق بڑھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کائنات کی جو چیز تمہیں اچھی نظر آئے، جس سے تمہیں راحت پہنچے، جس سے تمہیں لطف حاصل ہو، اس کے بارے میں سوچا کرو کہ یہ چیز کہاں سے آئی؟ کس نے یہ چیز بنائی؟ کس نے یہ چیز مجھے دی؟ جتنا سوچو گے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہوگا، اس لئے کہ اس صورت میں کائنات کی ہر شئی میں تمہیں اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آئے گا، مثلاً کھانا سامنے آیا، وہ کھانا مزے دار ہے، تمہیں اچھا لگ رہا ہے، اس سے تمہیں راحت مل رہی ہے، اب تم ذرا یہ سوچو کہ یہ کھانا کہاں سے آیا؟ اور کس نے عطا کیا؟ اگر نظر تنگ ہوگی تو بس آدمی اس حد تک سوچے گا کہ گھر والوں نے یہ کھانا پکایا، اور اچھا پکایا،

بس اس حد پر آکر ذہن بند ہو جائے گا۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ زاویہ نگاہ درست فرما دیں، اور عقل وسمجھ عطا فرمادیں تو وہ سوچے گا کہ گھر والوں میں یا باورچی میں کہاں طاقت تھی کہ وہ اتنا اچھا کھانا پکا سکتے، اور بظاہر کھانے کے اندر جو اجزاء نظر آرہے ہیں، چاہے وہ کسی جانور کا گوشت ہو، چاہے وہ سبزی اور ترکاری ہو، یا مسالے ہوں، یہ سب کہاں سے آئے؟ جب ان چیزوں میں گہری نظر ڈالو گے تو یہ نظر آئے گا کہ ہر چیز بالآخر اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس کی عطا ہے، ورنہ کسی انسان کی مجال نہیں کہ وہ ان چیزوں کو پیدا کر لیتا، یا ان چیزوں کو حاصل کر لیتا۔

یہ گوشت کہاں سے آیا؟

یہ گوشت جو تم مزے حاصل کرنے کے لئے کھا گئے، یہ گوشت کہاں سے آیا؟ کس نے پیدا کیا؟ اگر تم یہ جواب دو کہ پیسے دے کر بازار سے خریدا تھا، لہٰذا میں ہی اس کا سبب بنا ہوں، اور میں نے پیسے دے کر خریدا ہے، اور بازار سے لایا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا بھی تو ہو سکتا تھا کہ تم جیب میں پیسے لئے پھرتے، اور بازار میں تمہیں گوشت نہ ملتا، اور نہ کوئی جانور ملتا، پھر کیا کرتے؟ ذرا سوچو کہ یہ جانور کہاں سے آیا؟ کس نے پیدا کیا؟ کیا کسی نے پیسے دے کر پیدا کروایا تھا؟ بلکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور حکم کے نتیجے میں یہ جانور وجود میں آیا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس جانور کو تمہارے لئے حلال کر دیا، ورنہ حقیقت میں جاندار ہونے کے اعتبار سے تم اور وہ برابر تھے، تمہارے اندر بھی جان ہے، اس کے اندر بھی جان ہے، اگر تم اس کو کھانے کا حق رکھتے ہو تو وہ جانور تمہیں کھانے

کا حق کیوں نہیں رکھتا؟ اس کے اندر بھی طاقت اور قوت ہے، بلکہ بعض جانوروں میں تم سے زیادہ طاقت موجود ہے۔ اللہ جل شانہ نے اس جانور کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، اور ایسا مسخر کر دیا کہ تم اس کی نسلوں کی نسلیں نگل گئے، لیکن وہ جانور کبھی تمہارے خلاف احتجاج نہیں کرتے کہ تم نے ہماری نسلوں کی نسلیں تباہ کر دیں، ہلاک کر دیں۔ اور پھر ان جانوروں کو ہر جگہ اس طرح پھیلا دیا کہ تم جس جگہ بھی پیسے دے کر گوشت حاصل کرنا چاہو تو بآسانی تمہیں وہاں گوشت مل جاتا ہے۔

یہ ترکاریاں اور پھل کہاں سے آئے؟

دوسری طرف نباتات اور ترکاریوں کو دیکھو، تم نے زیادہ سے زیادہ یہ کام کیا کہ ان کو حاصل کرنے کے لئے زمین میں بیج ڈالا، لیکن کیا تمہارے اندر اس کی طاقت تھی کہ اس بیج کو کونپل بنا دو؟ اور پھر اس کونپل سے پودا بناؤ؟ اور اس پودے میں ترکاریاں اُگاؤ؟ اس چھوٹے سے بیج سے کونپل پھوٹتی ہے، وہ کونپل اتنی نازک اور کمزور ہوتی ہے کہ اگر ایک بچہ بھی اس کو انگلی لگا دے تو وہ کونپل ختم ہو جائے، لیکن وہ نازک کونپل اتنی سخت زمین کا پیٹ پھاڑ کر باہر نکل رہی ہے، اللہ تعالیٰ ہی اپنی قدرت کاملہ سے اس کونپل سے زمین کا پیٹ چاک کرا رہے ہیں، اور پھر وہ کونپل پودا بن رہی ہے، اور پھر اس پودے پر کائنات کی ساری طاقتیں نچھاور ہو رہی ہیں، اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہوائیں چل رہی ہیں، اس کے اوپر سورج اپنی کرنیں نچھاور کر رہا ہے، چاند اس کے اوپر

اپنی روشنی ڈال رہا ہے، اور اس کے ذریعہ اس کی نشو ونما ہورہی ہے، پھر اس پودے پر ترکاریاں اور پھل آتے ہیں، پھر ان کو کاٹ کے بازار لایا جاتا ہے، اور بازار سے پھر وہ تم تک پہنچتے ہیں، لہٰذا کھانے کا ایک نوالہ جو تم کھارہے ہو، اس نوالے کو تمہارے حلق تک پہنچانے کے لئے کائنات کی ساری طاقتیں گردش کررہی ہیں، اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ابرو باد و مہ و خورشید و فلک درکار نند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت بخوری

یعنی روٹی کا ٹکڑا جو ٹکڑا تم کھارہے ہو، اگر غور کروگے تو یہ نظر آئے گا کہ اس میں بادل، ہوا، چاند، سورج ساری کائنات کی طاقتیں صرف ہوئی ہیں، تب جاکر یہ لقمہ تمہارے ہاتھ میں پہنچا ہے۔

کھانے میں ذائقہ کہاں سے آیا؟

جب کھانا سامنے آیا تو تم نے کہا کہ یہ اچھا باورچی ہے، اس نے بڑا اچھا کھانا پکایا، اس کو کھانا پکانے کا بڑا اچھا ڈھنگ آتا ہے۔ لیکن ذرا یہ سوچو کہ باورچی کھانا پکانے کا وہ ڈھنگ ماں کے پیٹ سے لے کر آیا تھا؟ اس باورچی کو یہ ڈھنگ کس نے سکھایا؟ ایک ہی چیز ہے، وہ ایک ملک میں ایک طریقے سے پک رہی ہے، اور دوسرے ملک میں دوسری طرح پک رہی ہے، ایک آدمی اس چیز کے اندر ایک ذائقہ پیدا کررہا ہے، دوسرا آدمی دوسرا ذائقہ پیدا کررہا ہے، وہ کون سی ذات ہے جو انسانوں کے دماغوں میں کھانے پکانے کی مختلف ترکیبیں

ڈال رہا ہے کہ اس طرح پکاؤ گے تو لذت زیاد حاصل ہوگی۔ کھانا کھاتے وقت اگر یہ باتیں سوچا کریں تو اس کھانے کے اندر بھی اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آئے گا، اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہوگا۔

یہ گلاس کا پانی کہاں سے آیا؟

جب پانی پیو تو یہ غور کرو کہ یہ پانی کا بھرا گلاس میرے پاس کہاں سے آیا؟ کس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے سمندر سے مون سون اٹھایا، جب تک یہ سمندر میں تھا، اس وقت تک وہ پانی کھارا اور کڑوا تھا، پینا چاہتے تو پی نہیں سکتے تھے۔ اور سمندر کے پانی کو کھارا رکھنے میں یہ حکمت ہے کہ بے شمار جانور سمندر کے اندر مر رہے ہیں، اگر سمندر کے پانی میں یہ نمکیات نہ ہوتیں تو اس پانی میں بدبو پیدا ہو جاتی، اس لئے اللہ تعالیٰ سمندر کے پانی کو کھارا رکھا، لیکن تمہیں پلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے سمندر سے مون سون بادل اٹھائے، اور اس مون سون بادلوں میں ایسی خودکار مشین لگی ہوئی ہے کہ پانی کی ساری نمکیات اور کڑواہٹ سمندر کے اندر رہ گئی، اور وہ پانی میٹھا بن گیا۔

تم پانی کا ذخیرہ کر سکتے تھے؟

پھر اگر اللہ تعالیٰ ہم سے یہ کہہ دیتے کہ دیکھو! ہم سمندر سے بادل اٹھا رہے ہیں، اور تمہارے لئے بارش برسا رہے ہیں، لہٰذا تم چھ مہینے کے لئے پانی کا ذخیرہ کر کے رکھ لو، چھ مہینے کے بعد دوبارہ برسائیں گے، اور تم خود اس پانی کی حفاظت کرو، کیا انسان کے بس میں یہ بات تھی کہ چھ مہینے کا پانی ذخیرہ کر کے رکھ

لیتا؟ نہیں۔ چونکہ یہ بات انسان کے بس میں نہیں تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس پانی کو خود ہی محفوظ کر دیا، چنانچہ فرمایا:

فَاَسۡكَنّٰهُ فِى الۡاَرۡضِ (المؤمنون:۱۸)

یعنی یہ پانی بادل کی ''کارگوسروس'' کے ذریعہ سمندر سے اٹھ کر پہاڑوں تک جا رہا ہے، اور جب پہاڑوں پر پانی برستا ہے تو وہاں پر خودکار ''فریزر'' اللہ تعالیٰ نے قائم کر دیے ہیں، چنانچہ وہ پانی ''برف'' کی شکل میں پہاڑوں پر جمع ہے، تمہیں یہ تکلیف نہیں دی کہ تم خود اس اپنے پاس ذخیرہ کر کے رکھ لو۔

اور تم نے سوچا بھی نہیں

اس کے بعد پھر اگر تم سے یہ کہتے کہ ہم نے پہاڑوں پر تمہارے لئے پانی ذخیرہ کر دیا ہے، تم وہاں سے جا کر اٹھا لاؤ۔ تم میں سے کسی کے بس میں نہیں تھا کہ پہاڑوں سے پانی لا کر استعمال کرتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے سورج کی گرمی سے اس کو پگھلایا، اور پھر دریا کی شکل بنائی، اور دریاؤں کے ذریعہ اس پانی کو ساری مخلوق تک پہنچایا، اور پھر زمین کے اندر رگوں میں پانی چلایا، تاکہ تم جہاں کہیں زمین کو کھودو، وہیں سے تمہارے لئے پانی نکل آئے، اتنے واسطوں سے تمہارے پاس یہ پانی کا ایک گلاس آیا، اور تم نے غٹا غٹ کر کے ایک دم سے پی لیا، اور اپنی پیاس بجھالی، اور کبھی تم نے سوچا تک نہیں کہ یہ پانی کہاں سے آیا تھا۔

یہ رنگارنگ پھول کہاں سے آئے؟

اگر تم غور کرو گے تو تمہیں اللہ جل شانہ کا جلوہ اس پانی میں بھی نظر آئے

گا، اس کھانے میں بھی نظر آئے گا، بلکہ کائنات کی ہر چیز میں اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آئے گا، مثلاً تم باغ میں گئے، وہاں تمہیں خوبصورت اور خوشنما پھول اچھا لگا، وہ پھول دل کو بھا رہا ہے، آنکھوں کو اچھا لگ رہا ہے، بس اسی حد پر آکر رک گئے، ارے آگے بھی غور کرو، اور یہ دیکھو یہ پھول کہاں سے آیا؟ کس ذات نے اس پھول کے اندر یہ حسن پیدا کیا؟ کس ذات نے اس کے اندر جمال پیدا کیا؟ اور یہ غور کرو کہ یہ کھاد ایک ہی ہے، پانی ایک ہی ہے، اور بیج ایک طرح کے ہیں، لیکن جب ان بیجوں کو زمین کے اندر ڈالو تو ایک بیج سے ایک طرح کا پھول نکل رہا ہے، دوسرے بیج سے دوسری طرح کا پھول نکل رہا ہے، اس طرح ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ نے انواع واقسام کے پھول پھیلا دئے، کون ذات ہے جو یہ پھول بوٹے پیدا کر رہا ہے؟ اور پھر اس میں غور کرو کہ وہ خود کتنا خوبصورت ہوگا جس نے یہ ساری خوبصورتیاں پیدا فرمائیں، بہر حال! جو چیز بھی اس کائنات میں ہے، وہ اسی ذات نے پیدا کی ہے، اسی نے اس کے اندر حسن و جمال ڈالا، اسی نے اس کو خوشنما بنایا، اور یہ سب کچھ اس کی عطا ہے۔

ایک دیہاتی کا قصہ

ہمارے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا کرتے تھے کہ ایک دیہاتی تھا، اس نے کبھی ریل گاڑی نہیں دیکھی تھی، جب پہلی مرتبہ اس نے ریل گاڑی دیکھی تو اس کو بڑا تعجب ہوا کہ اتنے بڑے جسم کو کون حرکت دے رہا ہے، کون چلا رہا ہے؟ جو اس کو

حرکت دے رہا ہے اس کے اندر بڑی طاقت ہے، چنانچہ وہ اسٹیشن پہنچا، وہاں ریل گاڑی کھڑی ہوئی تھی، اس نے دیکھا کہ ریل کا گارڈ ہاتھ میں سبز جھنڈی لئے کھڑا ہے، جب اس نے اس جھنڈی کو ہلایا تو ریل چلنی شروع ہوگئی، دیہاتی سمجھا کہ اتنی بڑی ریل کو چلانے والی سبز جھنڈی ہے، اس میں بڑی طاقت ہے، چنانچہ اس دیہاتی نے اس جھنڈی کے پاس جاکر اس کی ''ڈنڈوت'' اور پوجا شروع کردی کہ تیرے اندر بڑی طاقت ہے، تو نے اتنی بڑی ریل کو چلا دیا (''ڈنڈوت'' ہندوؤں کے ہاں عبادت کا ایک طریقہ ہے کہ جس کی عبادت کرتے ہیں اس کے پاس جاکر ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہوجاتے ہیں، اور اس کے آگے بار بار سر جھکاتے ہیں)

ڈرائیور کی ڈنڈوت

کسی نے اس سے کہا کہ یہ تو کیا حرکت کر رہا ہے کہ ایک جھنڈی کو ''ڈنڈوت'' کرنا شروع کردی؟ اس دیہاتی نے جواب دیا کہ یہ جھنڈی بڑی طاقتور ہے کہ اتنی بڑی ریل گاڑی کو چلا دیتی ہے، اس لئے میں اس کو ''ڈنڈوت'' کر رہا ہوں، کسی نے اس سے کہا کہ جھنڈی تو کچھ بھی نہیں ہے، یہ تو محض ایک ''علامت'' ہے، دراصل گاڑی کو چلانے والا تو ڈرائیور ہے، جو گاڑی کے اندر بیٹھ کر اس کو چلا رہا ہے، وہاں انجن کے اندر جاکر اس کو دیکھ لے۔ چنانچہ یہ انجن کے پاس گیا، اور اندر گیا تو واقعۃً ایک ڈرائیور بیٹھا تھا، اس دیہاتی نے اس سے پوچھا کہ یہ گاڑی تم چلاتے ہو؟ ڈرائیور نے کہا کہ ہاں میں چلاتا ہوں، دیہاتی نے کہا

کہ تم اتنی بڑی ریل کو چلاتے ہو تو درحقیقت تم ''ڈنڈوت'' کے لائق ہو، چنانچہ اس دیہاتی نے ڈرائیور کے آگے ''ڈنڈوت'' کرنی شروع کردی، اس ڈرائیور نے کہا کہ بھائی میں تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں، اور میرے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ اتنی بڑی ریل کو چلا سکوں، بلکہ انجن میں جو بھاپ نظر آرہی ہے، اس کے اندر طاقت ہے اور یہ بھاپ ریل کو چلاتی ہے، اس کے اندر طاقت ہے، اس دیہاتی نے جاکر بھاپ کی ''ڈنڈوت'' شروع کردی، اور یہاں تک پہنچ کر ساری داستان ختم ہوگئی۔

بھاپ کو پیدا کرنے والا کون؟

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''بھاپ'' تک پہنچ کر ساری داستان اس لئے ختم ہوگئی کہ وہ ''جھنڈی'' بھی آنکھ سے نظر آرہی تھی، اور وہ ''ڈرائیور'' بھی آنکھ سے نظر آرہا تھا، اور وہ ''بھاپ'' بھی آنکھ سے نظر آرہی تھی، اس وجہ سے انہی چیزوں کو سب کچھ سمجھ کر ان کی پرستش شروع کردی۔ لیکن اس دیہاتی نے یہ نہیں سوچا کہ اس بھاپ میں طاقت کہاں سے آگئی، جو اتنی بڑی ریل کو چلارہی ہے، اس کی عقل ''بھاپ'' سے آگے نہ بڑھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ان ظاہری اسباب کو اپنا سب کچھ سمجھ کر اسی کو اپنا مائی باپ سمجھ لیا، اگر حقیقت دیکھنے والی نگاہ ہوتی تو وہ ایک قدم اور آگے بڑھتا، اور یہ سوچتا کہ اس بھاپ کو پیدا کرنے والا کون ہے؟ پھر اس کو اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آتا۔ بہرحال! کائنات کی کسی چیز کو بھی جب حقیقت بین نگاہ سے دیکھو گے تو اس میں

اللہ جل شانہ کا جلوہ ضرور نظر آئے گا، بس دیکھنے والی آنکھ چاہئے، اور سوچنے والا دل چاہئے۔

عمارت میں اللہ کا جلوہ

مثلاً تم نے ایک بہت شاندار بنی ہوئی عمارت دیکھی، اب تم اس کی بہت تعریف کر رہے ہو کہ یہ بہت شاندار، بہت اعلیٰ اور بہت خوبصورت عمارت ہے، لیکن یہ سوچو کہ یہ عمارت کیسے وجود میں آئی؟ اگر یہ سلسلہ آگے چلاؤ گے تو ابتداءً دیکھنے میں یہ نظر آئے گا کہ یہ ''معمار'' نے بنائی ہے، اور پھر سوچو کہ یہ معمار ایسی شاندار عمارت کیسے بنا سکتا ہے، ضرور کسی ''آرکیٹیکٹ'' نے اس عمارت کا نقشہ بنایا ہوگا، اب زیادہ سے زیادہ ''آرکیٹیکٹ'' پر نگاہ رک جائے گی۔ لیکن آگے قدم بڑھاؤ، اور یہ سوچو کہ اس ''آرکیٹیکٹ'' کے دل میں یہ خیال اور تجویز کس نے ڈالی؟ جب یہ سوچو گے تو تمہیں اس عمارت میں اللہ جل شانہ کا جلوہ کارفرما نظر آئے گا۔

سالک کو ہر قدم پر اللہ کا جلوہ

اک شاعر گزرے ہیں بہزاد لکھنوی مرحوم، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ بڑی اچھی نعتیں کہا کرتے تھے، ان کی غزل کا ایک شعر ہے کہ:

وہ کہاں کا راہرو ہے، اسے کیا ملے گی منزل
جسے ہر قدم پہ ہر سو تو ہی تو نظر نہ آئے

یعنی جس مسافر کو ہر قدم پر ہر سو، اے اللہ! تیرا جلوہ نظر نہ آئے، وہ کیسا

مسافر ہے، وہ کیسا راہ رو ہے، وہ کیسا سالک ہے، حقیقت میں تو ''سالک'' وہ ہے کہ جسے ہر قدم پر ہر سو اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔

تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

جب یہ سوچ بہت آگے بڑھ جاتی ہے تو پھر یہ نظر آنے لگتا ہے کہ اس پوری کائنات میں حقیقی اور اصل وجود تو صرف اللہ جل شانہ کا ہے، باقی سب وجود تو اس کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اس کے تابع ہیں، اور اس پر موقوف ہیں، اسی کو ''وحدۃ الوجود'' کہہ دیتے ہیں، آپ حضرات نے ''وحدۃ الوجود'' کا لفظ سنا ہوگا، اس کی غلط تفسیریں بھی کی گئیں، اور اس کی وجہ سے لوگ گمراہیوں میں بھی مبتلا ہوئے، لیکن ''وحدۃ الوجود'' کے صحیح معنیٰ یہ ہیں کہ کائنات میں وجود حقیقی اللہ جل شانہ کے علاوہ کسی کا نہیں ہے، سارے وجود اس کے وجود کے سامنے ماند اور کالعدم ہیں، ہمارے حضرت مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے ''وحدۃ الوجود'' کا سارا فلسفہ ایک شعر میں بیان فرمادیا، فرمایا کہ:

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

آسمان پر ساری رات تاروں کی محفل جمی رہتی ہے، ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تارے چمک رہے ہیں، ستارہ اپنا حسن اور جلوہ دکھا رہا ہے، پورے آسمان کو گھیرا ہوا ہے، اور اس پر اپنی بزم سجائی ہوئی ہے، لیکن جب صبح کو سورج نمودار ہوا، ابھی نمودار بھی نہیں ہوا تھا بلکہ ابھی اُفق کے نیچے ہی تھا، اور

نیچے سے ہی اس نے صبح کا اُجالا پھیلایا، تو بس سارے ستارے ماند پڑ گئے، کیا وہ ستارے کہیں چلے جاتے ہیں؟ نہیں۔ موجود ہی رہتے ہیں، لیکن جب سورج کی روشنی آئی تو اس نے سارے ستاروں کو ماند کر دیا۔

صبح دم خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

اسی بات کو غالبؔ مرحوم نے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا کہ:

ہر ستارہ رات کو محفل میں محوِلاپ تھا
صبح دم خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

یعنی رات کے وقت ہر ستارہ بڑی ڈینگیں مار رہا تھا کہ میری روشنی اتنی تیز ہے، میری روشنی اتنی تیز ہے، لیکن صبح کو جب سورج نکلا تو مطلع صاف تھا، سارے ڈینگیں مارنے والے ستارے محو ہو گئے، اور مٹ گئے، کسی کا نشان باقی نہیں رہا، بس ایک سورج ہی تھا جو نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کے جلوے کا سورج نکلتا ہے تو سارے وجودوں کے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں، بس یہی ''وحدۃ الوجود'' ہے۔

ہر چیز اللہ کی تابع فرمان ہے

بہرحال! آدمی ذرا یہ سوچنے کی عادت ڈالے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، اس کے پیچھے کسی اور کا جلوہ نظر آ رہا ہے، اور وہ اللہ جل شانہ کا جلوہ ہے، چاہے کوئی عمارت دیکھے، کوئی پہاڑ دیکھے، سمندر دیکھے، دریا دیکھے، اور یا انسان کی بنائی ہوئی چیزیں دیکھے، مثلاً گاڑیاں دیکھے، ہر چیز کے پیچھے اللہ جل شانہ کا

جلوہ کارفرما نظر آئے گا، دیکھئے! اگر آپ کے سامنے ہوائی جہاز اُڑ رہا ہو، تو اب دیکھنے میں صرف ہوائی جہاز نظر آرہا ہے، نہ اس کے اندر بیٹھے مسافر نظر آتے ہیں اور نہ جہاز کو چلانے والا پائیلیٹ نظر آتا ہے، لیکن کوئی بھی اس جہاز کو دیکھ کر یہ نہیں کہتا کہ یہ جہاز خود بخود اڑا جارہا ہے، بلکہ ہر انسان پورے یقین کے ساتھ یہ کہے گا کہ کوئی پائیلیٹ اس جہاز کو اڑا رہا ہے، اور اس جہاز میں مسافر سوار ہیں۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ حقیقت بین نگاہ عطا فرمادیں، تو یہ نظر آئے گا کہ کائنات میں جو چیز بھی جہاں بھی اور جس حیثیت میں بھی اپنا جلوہ دکھا رہی ہے درحقیقت وہ چیز اللہ تعالیٰ کی تابع فرمان ہو کر اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔

حقیقت بین نگاہ کس طرح پیدا ہوتی ہے؟

اور یہ حقیقت بین نگاہ پیدا ہوتی ہے اللہ والوں کی صحبت سے، اچھی مجلسوں میں بیٹھنے سے، جن کے دلوں میں اللہ جل شانہ کی محبت ہے، جن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہے، ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے سے، ان کی باتیں سننے سے، ایسی نظر پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک عام آدمی ایک چیز کو دیکھتا ہے، اور دیکھ کر گزر جاتا ہے، لیکن جس کو اللہ والوں کی صحبت نصیب ہو، وہ جب اس چیز کو دیکھتا ہے، تو اس کے دیکھنے سے اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ سالک کا پہلا سبق یہ ہے کہ جو چیز بھی دیکھو، اور جو نعمت بھی تمہارے سامنے آئے، اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی صناعی کا مراقبہ کرو، پھر انشاء اللہ تعالیٰ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آنے لگے گا۔ اور یہ چیز مشق سے حاصل

ہوتی ہے، جتنی مشق کرو گے، اتنی ہی اللہ تعالیٰ ایسی نگاہ عطا فرمادیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو یہ صفت عطا فرمادے، آمین۔

وہ ذات کیسی باکمال ہوگی؟

آگے حضرت والا نے ایک ملفوظ میں ارشاد فرمایا کہ:

''جس چیز سے کسی کو محبت ہو، اس میں یہ غور کرے کہ یہ کمال اس میں کہاں سے آیا؟ (ظاہر ہے کہ جس چیز سے محبت ہوتی ہے وہ کسی کمال کی وجہ سے ہوتی ہے) مسلمان کا دل فوراً جواب دے گا کہ حق تعالیٰ نے (یہ کمال) پیدا کیا تو اب دل کو یہ سمجھانا چاہئے کہ:

چه باشد آں نگار خود که بند آں نگار ها

کہ جس نے ایسی ایسی چیزیں پیدا کی ہیں، وہ خود کیا کچھ ہوگا، اور اس کے ساتھ ہی محبوب مجازی کی فنا و نیست ہونے کو بھی ذہن میں حاضر کیا جائے'' (انفاس عیسیٰ:۲۰۰)

ہمیشہ رہنے والی ذات سے محبت کرو

یعنی دنیا میں جس شخص سے یا جس چیز سے محبت ہو رہی ہے تو یہ سوچے کہ بظاہر تو یہ چیز بڑی اچھی لگ رہی ہے، لیکن ایک وقت آنے والا ہے کہ اس کا حسن، اس کا جمال، اس کا کمال سب فنا اور ختم ہو جائے گا، لیکن وہ ذات جس کا کمال ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، یہ وہ ذات ہے جس نے اس میں کمال پیدا

کیا، لہٰذا محبت کی حق دار یہ عارضی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ محبت کا اصل اور حقیقی حق دار تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جس نے یہ سارے کمالات پیدا کیے۔ اقبال مرحوم نے کہا کہ:

وہ عشق جس کی آگ بجھادے اجل کی پھونک
اس میں مزہ نہیں تپشِ انتظار کا

یعنی جس عشق کی آگ موت کی پھونک کی وجہ سے ختم ہو جائے کہ اِدھر موت آئی اور اُدھر سارا عشق ڈھیلا پڑ گیا، اس عشق میں تپشِ انتظار کا مزہ نہیں، ہاں وہ عشق جس کی آگ کبھی بھی نہ بجھے، موت کی پھونک سے بھی نہ بجھے، جس کو موت چھوئے بھی نہیں، وہ ہے اللہ تعالیٰ کی محبت، وہ ہی عشق ہر مؤمن سے اور ہر انسان سے مطلوب ہے۔

مردہ کے ساتھ عشق مت کرو

آگے فرمایا کہ اس کے ساتھ ہی محبوب مجازی کے فنا و نیست ہونے کو بھی ذہن میں حاضر کیا جائے کہ یہ چند روز میں فنا ہو کر خاک ہو جائے گا، اس کا کمال وحسن عارضی ہے، اور حق تعالیٰ کا کمال ذاتی اور باقی:

عشق بامردہ نہ شد پائیدار
عشق را باحیّ و قیوم دار

یعنی کسی مردہ کے ساتھ عشق پائیدار نہیں ہوسکتا، ہاں حی و قیوم کے ساتھ جو عشق ومحبت ہوگی، وہ درحقیقت لازوال ہے، کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

اللہ کی محبت سے مصائب آسان ہو جاتے ہیں

ایک ملفوظ میں حضرت نے فرمایا کہ:

''اہل اللہ کا خدا کی محبت میں یہ حال ہوتا ہے کہ تمام مصائب ان کو آسان ہو جاتے ہیں، نہ قید خانے سے ان کو تکلیف ہوتی ہے، نہ فاقے سے کلفت، ان کی تو شان یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے، مگر خوش ہیں، کیونکہ ایک چیز ان کے پاس ایسی ہے کہ اس کے پاس ہوتے ہوئے ان کو کسی چیز کی پرواہ نہیں، وہ آغوش محبوب ہے، رضاء محبوب ہے، لذت طاعات ہے، لذت مناجات ہے، لذت قرب ہے''

(انفاس عیسیٰ: ۲۰۱)

یعنی اللہ تعالیٰ جس کو اپنی محبت کا ذوق عطا فرما دیں تو پھر اگر اس کے اوپر دنیا کے مصائب اور پریشانیاں بھی آتی ہیں تو اس کے لئے یہ سب آسان ہو جاتی ہیں، ان کی وجہ سے ان کو پریشانی لاحق نہیں ہوتی، وہ اپنی جگہ مگن ہوتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں اپنی محبت کی شمع روشن کو دی ہے، اس کے نتیجے میں سارے مصائب آسان ہو جاتے ہیں، بظاہر وہ کتنی تکلیف میں نظر آ رہا ہو، لیکن چونکہ اللہ جل شانہ کے ساتھ اس کا تعلق جڑا ہوا ہے، اس لئے اس کو کبھی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور آزمائش

حضرت ایوب علیہ السلام کیسی بیماری میں مبتلا ہوئے، اور اس بیماری میں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی مانگیں، چنانچہ فرمایا:

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء:۸۳)

اے اللہ! مجھے سخت تکلیف پہنچ گئی ہے، آپ بڑے رحم فرمانے والے ہیں، مجھ پر رحم کر کے مجھ سے یہ تکلیف دور کر دیجئے۔ لیکن اس بیماری میں بھی ان کو پریشانی لاحق نہیں ہوئی، ان کا ایک صحیفہ "صحیفہ ایوبی" کے نام سے بائیبل میں موجود ہے، اس صحیفے میں ان کے عجیب حالات اور مکالمے موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی آزمائش میں مبتلا کیا کہ ایک طرف تو ان کی بیماری شدید تھی جو بذات خود ایک آزمائش تھی۔ پھر ان کی مزید آزمائش کے لئے بیماری کے دوران اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس دو فرشتے انسانوں کی شکل میں بھیجے، وہ فرشتے روزانہ ان کے پاس آجاتے، اور ان سے گفتگو کرتے، اور ان سے یہ کہتے کہ تمہیں یہ جو تکلیف پہنچی ہے یہ تکلیف تمہارے اللہ تعالیٰ کی طرف سے راندہ درگاہ ہونے کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے، اس کی وجہ سے یہ تکلیف تمہیں لاحق ہوئی ہے۔

یہ بھی میرے مولیٰ کی طرف سے ہے

ان کے ہر مکالمے کے جواب میں حضرت ایوب علیہ السلام فرماتے کہ یہ بات نہیں، بلکہ جب تک میں عافیت میں تھا، وہ بھی ان کا کرم تھا، اور اب جس

حالت میں ہوں، یہ بھی ان کا کرم ہے، بس کرم کا عنوان مختلف ہے، وہ خوشی کا عنوان تھا، یہ تکلیف کا عنوان ہے، وہ خوشی بھی میرے مولیٰ کی دی ہوئی تھی، اور یہ تکلیف بھی میرے مولیٰ کی دی ہوئی ہے، وہ پورا صحیفہ اس مکالمے سے بھرا ہوا ہے، اس صحیفے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو اس حالت میں بھی کیسی سکینت اور طمانیت عطا فرمائی تھی کہ جبکہ درد اور تکلیف میں بے چین معلوم ہو رہے تھے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور محبت کا جو رشتہ ہے، وہ اس حالت میں مزید مستحکم ہو رہا ہے، اور فرماتے کہ میں چونکہ کمزور ہوں، اس لئے اس کرم کا متحمل نہیں ہوں، اس لئے دعا کر رہا ہوں کہ اے اللہ! مجھ سے یہ تکلیف دور کر دیجئے، لیکن حقیقت میں یہ بھی ان کے کرم کا عنوان ہے۔ اور اس تکلیف کے نتیجے میں وہ میرے کتنے درجات بلند کر رہے ہوں گے، اور اس کے عوض وہ مجھے کیا انعام عطا کرنے والے ہیں، مجھے یہ معلوم نہیں۔

یہ بھی رحمت کا عنوان ہے

اسی بات کو حضرت والا اس طرح فرما رہے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہوگی، اور اس کو یہ محسوس ہوگا کہ میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی آغوش محبت میں ہوں، تو پھر تکلیف میں بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کا بہت ہی عزیز دوست ہو، اور اچانک تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے، اور وہ تم سے گلے ملتے وقت تمہیں خوب دبانا شروع کر دے، اب اس کے دبانے کے نتیجے میں تمہیں تکلیف تو ہوگی، لیکن وہ تکلیف لذیذ تکلیف ہوگی، اس لئے کہ

وہ تکلیف میرے محبوب کی طرف سے آرہی ہے، میرے دوست کی طرف سے آرہی ہے۔ یہی حالت اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی ہوتی ہے کہ جب ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی آزمائش آجاتی ہے تو وہ پریشان نہیں ہوتے، بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی میرے مولیٰ کی رحمت کا ایک عنوان ہے، لیکن چونکہ ہم کمزور ہیں، اس وجہ سے ہم اس رحمت کا تحمل نہیں کر پا رہے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! اس تکلیف کو دور فرما دیجئے، اور رحمت کا دوسرا عنوان راحت کی شکل میں ہمیں عطا فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس محبت کا کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرما دے، آمین۔

ایک صاحب کا خط اور پریشانی کا اظہار

ایک صاحب جو بیچارے تکلیفوں کے اندر مبتلا تھے، مختلف قسم کی پریشانیاں ان کو لاحق تھیں۔ اس قسم کے حالات ہر انسان کے ساتھ کبھی نہ کبھی پیش آتے ہی ہیں، کبھی بیماری آگئی، کبھی مالی تنگی پیش آگئی، کبھی بے روزگاری ہوگئی، کبھی گھر والے بیمار ہوگئے وغیرہ، اس طرح کی تکلیفیں ایک صاحب کو لاحق ہوئیں تو انہوں نے حضرتِ والا کو خط میں لکھا کہ حضرت! مجھے اس طرح کی مختلف تکلیفیں آج کل پیش آرہی ہیں، اور ان تکلیفوں کی وجہ سے بعض اوقات دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں کمی ہوگئی ہے، جب تک نعمتیں اور راحت و آرام میسر تھا، اس وقت تک دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت محسوس ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی ساری نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے، لیکن جب سے تکلیفیں آئی

ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور تعلق میں کمی محسوس ہوتی ہے، ہم جیسے کمزور لوگوں کے دلوں میں ان تکلیفوں کی وجہ سے بعض اوقات شکوہ بھی پیدا ہونے لگتا ہے، اور بعض اوقات ناشکری کے کلمات بھی زبان سے نکل جاتے ہیں کہ کیا میں ہی رہ گیا تھا ان پریشانیوں کے لئے؟ مجھ پر ہی اتنی تکلیفیں کیوں آرہی ہیں؟ وغیرہ، اللہ تعالیٰ اس قسم کی ناشکری سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے، آمین۔

تکالیف کے وقت چند تدابیر

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان صاحب کے خط میں چند تدبیریں لکھی ہیں، جو ہم سب کے لئے فائدہ مند ہیں، اور یہ تدبیریں ہر اس حالت کے لئے فائدہ مند ہیں، جب کسی شخص کو کوئی تکلیف پہنچی ہو، یا پریشانی لاحق ہو، یا کوئی صدمہ لاحق ہو، یا کوئی تشویش لاحق ہو، وہ کیا تدبیریں ہیں؟ چنانچہ حضرت نے لکھا ہے کہ:

> ''توبہ و استغفار کرو، اور ہر روز پانچ سو مرتبہ کم از کم ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' کا وظیفہ مقرر کرلو، ایک ہفتہ میں یہ مصیبت دور ہوجائے گی، کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' كَنْزٌ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ، وَدَوَاءٌ تِسْعِيْنَ دَاءً اَيْسَرُهَا الْهَمَّ، یعنی یہ کلمہ ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے، اور یہ نوے بیماریوں کی دوا ہے، جس

میں سے ادنیٰ بیماری غم اور حزن ہے، غرضیکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرو، اس کو علاوہ سب سے قطع نظر کرو، کیونکہ راحت وکلفت سب اس کے ہاتھ میں ہے، اس کو راضی کرو، انشاء اللہ وہ تمام مصائب کا انتظام فرمادیں گے، اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یَکْشِفُ السُّوْءَ وَ یَجْعَلُکُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ (النمل:٦٢)

(انفاس عیسیٰ:۲۰۲)

پہلی تدبیر: توبہ واستغفار

ا۔ پہلی تدبیر اس ملفوظ میں یہ بتائی کہ ”توبہ واستغفار کرو“ یعنی جب انسان پر کوئی مصیبت، کوئی پریشانی آئے تو اس وقت انسان کو توبہ و استغفار کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، کیوں؟ اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

ما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر (الشوریٰ:۳۰)

یعنی تمہیں دنیا میں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، تو وہ تمہارے اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچتی ہے، کوئی نہ کوئی عمل میں کوتاہی ہوتی ہے، کوئی گناہ ہوا ہے، کوئی معصیت ہوئی ہے، جس کی وجہ سے دنیا کے اندر تکلیف آجاتی ہے، لہٰذا جب بھی کوئی تکلیف آئے تو یہ سمجھو کہ شاید میرے کسی گناہ کا نتیجہ ہو، اس لئے پہلا کام توبہ

واستغفار کا کرو کہ یا اللہ! میں توبہ واستغفار کرتا ہوں، جو کچھ مجھ سے گناہ ہوئے ہیں، جو میری سمجھ میں آرہے ہیں، اور سمجھ میں نہیں آرہے، ان سے بھی آپ کے حضور معافی مانگتا ہوں، یہ پہلی تدبیر ہوئی۔

دوسری تدبیر: لاحول ولاقوۃ کا وِرد

۲۔دوسری تدبیر یہ بیان فرمائی کہ روزانہ کم از کم پانچ سو مرتبہ ''لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ '' کا وظیفہ مقرر کرلو، کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ یہ کلمہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔اور دوسری چیز حدیث میں یہ بیان فرمائی کہ یہ کلمہ ''نوے'' بیماریوں کا علاج ہے، جن میں سے سب سے ہلکی بیماری فکر اور تشویش ہے، یعنی اگر کسی کو کوئی فکر اور ہر یشانی لاحق ہو، تشویش ہو تو یہ ان سب سے ہلکی بیماری ہے، جس کا یہ کلمہ ''لَا حَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ '' علاج ہے، لہٰذا اگر کسی کو پریشانی اور فکر لاحق ہو وہ اس کلمہ کو پانچ سو مرتبہ روزانہ پڑھنے کا معمول بنالے۔

''لَا حَوْلَ'' جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے

لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کلمہ ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' شیطان کو دور کرنے کا طریقہ ہے، اور اس کے نتیجے میں اس کلمہ کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے، اور اس کلمہ کی قدر و قیمت کا اندازہ کون کرسکتا ہے جبکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے، اور جب جنت ناقابل تصور ہے تو اس کے خزانے کا تصور کیسے کرسکتے ہیں،

لیکن اس کلمہ کی بڑی عظیم صفات ہیں، اسی وجہ سے جب مبتدی کو تسبیحات پڑھنے کو بتائی جاتی ہیں تو ایک تسبیح اس کلمہ کی بھی بتائی جاتی ہے۔

اس کلمہ کا مطلب و معنی

اس کلمہ کے معنی کیا ہیں؟ اس کلمہ کے دو ترجمے اور دو مطلب ہو سکتے ہیں، اور دونوں ہی صحیح ہیں، ایک ترجمہ یہ کہ ''اللہ کے سوا کسی میں کوئی طاقت نہیں، اور کوئی قوت نہیں، جو بلند ہے، جس سے زیادہ بلند کوئی ذات نہیں، اور جو عظیم ہے، جس سے زیادہ عظیم کوئی نہیں'' یعنی جو طاقت و قوت ہے وہ علی و عظیم کے اندر ہے۔ اس ترجمہ کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص پریشانی کے عالم میں یہ کلمات پڑھے وہ یہ سوچتے ہوئے پڑھے کہ جو کچھ مجھے پریشانی لاحق ہوئی ہے یہ اللہ ہی کی مشیت سے لاحق ہوئی ہے، اس کائنات میں کسی کے اندر یہ طاقت اور یہ قوت نہیں تھی کہ وہ مجھے اس پریشانی میں مبتلا کرتا۔ اور پھر دوسری مرتبہ یہ سوچتے ہوئے یہ کلمات پڑھو کہ جب اس کی مشیت سے یہ تکلیف پہنچی ہے تو پھر یہ تکلیف اس کی مشیت کے بغیر دور بھی نہیں ہوگی، وہی دور کرے گا، کائنات میں کسی اور چیز کے اندر یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اس تکلیف کو مجھ سے دور کر سکے، اگر یہ طاقت ہے تو صرف اللہ میں ہے، جو علی و عظیم ہے۔

تبصرہ کے بجائے اللہ کی طرف رجوع

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل جب کسی کو پریشانی لاحق ہوتی ہے، خواہ اجتماعی ہو، یا انفرادی ہو، عام

طور پر لوگ بیٹھ کر اس تکلیف پر تبصرے تو بہت کرتے ہیں کہ فلاں جگہ یہ ہو گیا، فلاں نے اتنا ظلم کیا، فلاں نے اتنا ظلم کیا، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جتنی دیر تک تم آپس میں بیٹھ کر تبصرے کرتے ہو، اس تبصرے میں وقت صرف کرنے کے بجائے وہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے میں صرف کرلو، اور یہ کہو کہ اے اللہ! یہ پریشانی ہے، جو ہم سے برداشت نہیں ہو رہی ہے، آپ اپنے فضل وکرم سے اس پریشانی کو دور فرما دیجئے، اور اس پریشانی کے آنے میں ہماری جن غلطیوں کو دخل ہو، اے اللہ! ہمیں ان غلطیوں کی اصلاح کی توفیق عطا فرما دیجئے۔ جب یہ عمل کرو گے تو کم از کم دعا کرنے کا ثواب تو ملے گا اور کچھ پتہ نہیں اللہ کے کسی بندے کے دل سے نکلی ہوئی کون سی دعا کس وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے، اور اس کے نتیجے میں ساری پریشانیاں دور ہو جائیں۔ اس لئے تبصرے کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔

اضطراب اور بے چینی دور ہو جائے گی

اگر یہ کلمہ ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ'' کثرت سے پڑھا جائے، اور اس نیت سے پڑھا جائے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اللہ کی مشیت سے ہو رہا ہے، اور اللہ کے سوا کون ہے، جو اس کو دور کر سکے؟ کوئی نہیں ہے، جب اس اعتراف کے ساتھ پڑھو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس پریشانی کے نتیجے میں دل میں جو اضطراب اور بے چینی ہے، وہ دور ہو گی۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ روزانہ پانچ سو مرتبہ یہ کلمات پڑھا کرو۔

دوسرا مطلب اور معنی

ان کلمات کے دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ کسی کے اندر کوئی طاقت کوئی قوت اللہ کے دیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، لہٰذا اے اللہ! اس پریشانی کو برداشت کرنے کی طاقت اور قوت آپ عطا فرمائیں گے تب مجھے حاصل ہوگی، آپ اپنی رحمت سے مجھے یہ طاقت اور قوت عطا فرمادیں۔ جب یہ سوچ کر ان کلمات کو پڑھو گے تو انشاء اللہ ہر پریشانی زائل ہو جائے گی۔ آخر میں حضرت والا نے فرمایا:

> ''غرضیکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرو، اس کے سوا سب سے قطع نظر کرو، کیونکہ راحت و کلفت سب اس کے ہاتھ میں ہے، اس کو راضی کرو، انشاء اللہ وہ تمام مصائب کا انتظام فرمادیں گے''

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ پریشانی کے موقع پر حضرت والا نے تین باتیں ارشاد فرمائیں (۱) توبہ واستغفار کی کثرت (۲) اور ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ'' کا کثرت سے ورد، کم از کم دن میں پانچ سو مرتبہ (۳) اللہ تبارک و تعالیٰ سے تعلق اور اس کی اطاعت کا اہتمام، یہ تین کام کرنے کے نتیجے میں انشاء اللہ پریشانی اور بے چینی جاتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

خوف اور رجا

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

خوف اور رجا

دونوں مطلوب ہیں

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین ، والعاقبة للمتقین ،
والصّلوٰة والسّلام علی رسوله الکریم ،
وعلی آله و اصحابه اجمعین ، امّا بعد!

گذشتہ رمضان ۱۴۲۱ھ میں ”انفاس عیسیٰ“ کے جس حصے کی تشریح کی تھی، وہ ”تعلق مع اللہ اور محبت خداوندی“ سے متعلق تھا، الحمد للہ بقدر ضرورت اس کی تشریح ہوگئی تھی، آگے ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے، جس کا عنوان ہے ”خوف و رجا“ اس کے بارے میں حضرت والا کے ملفوظات یہاں پر مذکور ہیں، اللہ کے نام پر اس رمضان ۱۴۲۲ھ میں یہ باب شروع کرتے ہیں۔

ایمان ”خوف“ اور ”رجا“ کے درمیان ہے

جن باطنی اخلاق اور اعمال کا حصول انسان کے لئے ضروری اور مطلوب

ہے،ان میں "خوف ورجا" بھی ہیں، "خوف" کے معنی ہیں، "اللہ کا ڈر" کیونکہ اگر انسان کو اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہوتو آدمی غفلت میں گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور "رجا" کے معنی ہیں "امید" یعنی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا ڈر بھی ہو، اور اللہ جل شانہ کی ذات سے اور اس کی رحمت سے امید بھی ہو، دونوں چیزیں جب ساتھ ساتھ ہوں تب ایمان کامل ہوتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ "الایمان بین الخوف و الرجاء" یعنی ایمان خوف ورجا کے درمیان ہے، اگر ان دونوں میں توازن صحیح ہو جائے تو ایمان کامل ہو جائے، جتنا انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا چاہئے، اتنا ہی خوف ہو، اس سے کم زیادہ نہیں ہو، اسی طرح جتنی "رجا" ہونی چاہئے، اتنی ہی رجا ہو، اس سے کم زیادہ نہیں ہو، تو اس انسان کا ایمان کامل ہے۔

خوف اور رجا دونوں کا ہونا ضروری ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "خوف اور رجا" دو پَر ہیں، جن کے ذریعہ صالحین اس دنیا سے جنت کی طرف پرواز کرتے ہیں، جس طرح پرندہ اپنے پروں کے ذریعہ پرواز کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کو حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ اس کے ضروری ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ خوف کے بارے میں فرمایا:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا

(السجدہ:۱۶)

یعنی جو اللہ کے نیک بندے ہیں، ان کے پہلو رات کے وقت اپنے بستر سے جدا رہتے ہیں، اور اپنے پروردگار کو اس حالت میں پکارتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈر بھی رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے امید بھی رکھے ہوتے ہیں۔

رحمت کی امید اور جہنم کا خوف

پورے قرآن کریم میں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کا ذکر علیحدہ اور جہنم کا ذکر علیحدہ کہیں نہیں کیا، بلکہ جہاں کہیں جنت کا ذکر فرمایا وہیں جہنم کا ذکر بھی فرمایا، اور جہاں جہنم کا ذکر فرمایا وہیں جنت کا بھی ذکر فرمایا، مجھے اس میں کہیں استثناء نظر نہیں آیا۔ یہ اس لئے کیا تا کہ ایک مرتبہ جنت کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنی رحمت سے امید پیدا کریں، اور دوسری طرف جہنم کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف پیدا کریں۔ چنانچہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ

(الحجر: ۴۹، ۵۰)

یعنی میرے بندوں کو بتادو کہ میں بڑا غفور رحیم ہوں، بڑی مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہوں، اور ساتھ میں یہ بھی بتادو کہ میرا عذاب بھی بڑا دردناک ہے، دیکھئے! دونوں باتیں ساتھ ساتھ بتادیں۔ اب رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید باندھے، اور اس کے عذاب کا

تقاضہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے ڈرے، جب انسان دونوں چیزیں ساتھ ساتھ لے کر چلے گا تو اپنا ایمان کامل کرے گا۔

کتنا خوف ہونا چاہئے؟

اگر انسان پر تنہا "خوف" طاری ہو جائے تو وہ بھی خطرناک چیز ہے، جب خوف ہی خوف طاری ہو گیا، اور "امید" بالکل نہیں ہے تو اس کے نتیجے میں ایک طرف تو زندگی اجیرن ہو جائے گی، اور دوسری "یاس" اور "ناامیدی" پیدا ہو جائے گی، وہ یہ سوچے گا کہ میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں، اور یہ "ناامیدی" بڑی خطرناک چیز ہے، یہ انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے، اس لئے اگر اللہ کی عظمت کا، اس کے جلال کا، اس کے عذاب کے خوف کا استحضار اس قدر ہو جائے کہ ہر وقت وہی دماغ پر چھا جائے تو آدمی کھانے سے، پینے سے رک جائے، اور دنیا کے کام بھی نہ کر سکے، اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ تعالیٰ سے خوف مانگا، لیکن کتنا مانگا؟ فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ مَعَاصِیْكَ

مطلق یہ نہیں کہا کہ مجھے اپنا ڈر دیجئے، بلکہ فرمایا کہ یا اللہ! اتنا خوف دیدے جو میرے اور آپ کی معصیت کے درمیان حائل ہو جائے۔ مطلق ڈر نہیں مانگا، اس لئے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا مطلق ڈر طاری ہو جاتا ہے، اور خوف کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس سے ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، دوسری دعا میں آپ نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مَخَافَۃً تَحْجِزُنِیْ عَنْ مَعَاصِیْکَ

اے اللہ! میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھے آپ کی معصیت سے روک دے، اس میں آپ نے قید لگا کر خوف مانگا کہ اس سے زیادہ نہیں مانگا، اس لئے کہ اگر خوف کی زیادتی کے نتیجے میں مایوسی پیدا ہو جائے تو انسان کی زندگی اجیرن ہو جائے۔

"خوف" اور "تقویٰ" میں فرق ہے

یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ قرآن کریم میں بعض جگہوں پر "تقوی" کا لفظ بھی آیا ہے، اور بعض جگہوں پر "خوف" کا لفظ بھی آیا ہے۔ "تقوی" کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (آل عمران:۱۰۲)

یعنی اے ایمان والو! اللہ کا تقوی اختیار کرو جیسا کہ اللہ کا حق ہے۔ جبکہ "خوف" کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اتنا خوف کرو جتنا کہ اللہ کا حق ہے، اس لئے کہ "تقویٰ" اور "خوف" میں فرق ہے، "خوف" کے معنی ہیں مطلق ڈر جس سے آدمی مرعوب ہو جائے، اور دل و دماغ پر اس کا ڈر مسلط ہو جائے، یہ ہے "خوف" جبکہ "تقوی" مطلق "ڈر" کا نام نہیں، بلکہ تقوی اس کیفیت کا نام ہے جو "خوف" کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، یعنی یہ فکر کہ جس سے مجھے خوف ہو رہا ہے، میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں، اس کیفیت کا نام "تقوی" ہے، لہٰذا "خوف" نام ہے ڈر کا، اور اس ڈر کی وجہ سے گناہ سے بچنے کا نام "تقوی"

ہے، چنانچہ یہ ڈر کہ اللہ تعالیٰ زبردست طاقت والے ہیں، بدلہ لینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا شدید ہے، اس نے ایسی جہنم تیار کر رکھی ہے، اس تصور کے بعد جو ڈر پیدا ہو رہا ہے اس کا نام ہے ''خوف'' اور اس ڈر کی وجہ سے اگر تم جھوٹ بولنے سے بچ گئے تو اس کا نام ''تقویٰ'' ہے، اگر اس ڈر کے نتیجے میں تم غیبت سے بچ گئے بدنظری سے بچ گئے تو اس کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

ناسخ اور منسوخ

بعض حضرات علماء یہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ جو آیت ہے کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (آل عمران: ۱۰۲) یہ آیۃ منسوخ ہوگئی ہے، اور اس آیۃ کا ناسخ دوسری آیۃ ہے، فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَااسْتَطَعْتُمْ (التغابن: ۱۶) یعنی پہلے یہ حکم آیا تھا کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا حق ہے ویسا تقویٰ اختیار کرو، یہ حکم سن کر صحابہ کرام کو بڑی پریشانی ہوگئی کہ یا اللہ! ہم تقویٰ کا حق کیسے ادا کر سکتے ہیں؟ ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہم اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کریں، صحابہ کرام کی اس پریشانی کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا، اور پھر یہ آیۃ نازل ہوئی فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا سْتَطَعْتُمْ (التغابن: ۱۶) یعنی اتنا تقویٰ اختیار کرو، جتنا تمہاری استطاعت میں ہو۔ لہٰذا اب ''حَقَّ تُقٰتِہٖ'' کا مطالبہ باقی نہیں رہا۔

پہلی آیۃ دوسری آیۃ کی تفسیر ہے

لیکن دوسرے اہل علم یہ کہتے ہیں کہ ان آیات کو ناسخ اور منسوخ کہنے کی

ضرورت نہیں، بلکہ درحقیقت پہلی آیۃ دوسری آیۃ کی تفسیر ہے، یعنی جب یہ کہا گیا کہ جیسا اللہ کا حق ہے ویسا تقوی اختیار کرو، اس وقت صحابہ کرام ڈر گئے کہ تقوی کا حق ہم سے کہاں ادا ہوگا؟ تو ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ نازل فرمائی کہ تقوی کا حق اتنا ہی ہے جتنی تمہارے اندر طاقت ہے، ہم نے تم سے تقوی کا بہت اونچا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ ''حَقَّ تُقٰتِہٖ'' سے مراد ''مَا اسْتَطَعْتُمْ'' ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی استطاعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا'' لہٰذا یہ دوسری آیۃ پہلی آیۃ کی تفسیر ہے۔

''احیاء العلوم'' کا باب الخوف

خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اتنا ''خوف'' مطلوب نہیں جس کے نتیجے میں آدمی کے اندر ''مایوسی'' پیدا ہو جائے، اور ''تقوی'' اتنا مطلوب ہے جو استطاعت کے مطابق ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احیاء العلوم'' بڑی زبردست کتاب ہے، ہر چیز کے اندر اس کی عجیب شان ہے، لیکن میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ اس کتاب کا باب الخوف ایک مجلس میں پورا نہیں پڑھنا چاہئے، بلکہ مختلف مجلسوں میں تھوڑا تھوڑا پڑھنا چاہئے، اس لئے کہ اگر کوئی شخص پورے باب کو ایک مجلس میں پڑھے گا تو بعض اوقات پڑھنے والے پر ''خوف'' کا اتنا غلبہ ہو جائے گا جو مطلوبہ خوف سے بڑھ جائے گا، چنانچہ اس باب کو پڑھنے کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے حالات خراب ہو گئے، ان کے ذہن اُلٹ گئے، اور وہ مایوسی کی طرف چل پڑے، یہ

تفصیل تو ''خوف'' کے بارے میں تھی۔

''امید'' میں حدِ اعتدال مطلوب ہے

دوسری چیز ''رجا'' ہے، جس کے معنی ہیں ''امید''۔ یہ ''امید'' بھی مطلوب ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھنا مطلوب ہے، لیکن یہ ''امید'' بھی اعتدال کے اندر ہو، اگر ''امید'' اعتدال سے بڑھ جائے تو اس کا نام ''دھوکہ'' اور ''غرور'' ہے، ''امید'' اعتدال سے کس طرح بڑھ جاتی ہے؟ اس کے بارے میں ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْعَاجِزُ مَنْ اِتَّبَعَ نَفْسَهٗ هَوٰ یٰهَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ

یعنی ''عاجز'' وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو ''خواہشات'' کے پیچھے لگائے ہوئے ہے، اس کی نفسانی خواہشات اس کو جہاں لے جا رہی ہیں، وہ جا رہا ہے، گناہ کرنے میں کبھی کوئی کھٹک نہیں ہوتی، گناہوں سے بچنے کا کوئی اہتمام نہیں، دل میں جو خواہش پیدا ہو رہی ہے، اس کو پورا کر رہا ہے، حلال حرام ایک کر رہا ہے، ساتھ میں اللہ تعالیٰ پر آرزو باندھے بیٹھا ہے، چنانچہ جب اس کو یہ کہا جائے کہ یہ کام ناجائز ہے تو جواب میں کہتا ہے کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے، اس شخص کو ''غفور رحیم'' ہونے کا دھوکہ ہو گیا ہے، یہ ''رجا'' نہیں، اس لئے کہ جب ''امید'' اپنی حد سے آگے بڑھ جائے تو وہ غرور اور دھوکہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا ''رجا'' کو اپنی حد پر رکھنا چاہئے، تاکہ یہ دھوکہ نہ بنے، اور ''خوف'' کو اپنی حد میں رکھنا چاہئے، تاکہ وہ ''یاس'' اور ''ناامیدی'' میں تبدیل نہ ہو جائے، دونوں کو اپنی

اپنی حد پر رکھ کر چلنا چاہئے۔

دونوں کی حد اعتدال کس طرح معلوم ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ انسان ان دونوں کو اپنی اپنی حد پر رکھ کر کس طرح چلے؟ کون شخص یہ بتائے گا کہ یہ "خوف" اپنی حد کے اندر ہے، اور یہ "رجا" اپنی حد کے اندر ہے؟ اور کون بتائے گا کہ تمہیں "خوف" کا مطلوبہ درجہ حاصل ہے، اور "رجا" کا بھی مطلوبہ درجہ حاصل ہے؟ یہ پتہ لگانے ہی کے لئے "فن تصوف" ہے، اور یہ پیری مریدی اس کام کے لئے ہے، اور شیخ سے رجوع اسی مقصد کے لئے کیا جاتا ہے، وہ شیخ بتاتا ہے کہ "خوف" کا وہ درجہ جو مطلوب ہے وہ الحمدللہ تمہیں حاصل ہو چکا ہے، اور جتنی "رجا" مطلوب تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ تمہیں عطا فرمادی، اور تم اعتدال کے اندر ہو، اور اگر کوئی شخص اعتدال کی حد کے اندر نہیں ہے تو شیخ اس کی اصلاح کر کے اس کو اعتدال کی حد کے اندر لاتا ہے، تصوف کا اور کسی شیخ سے رجوع کرنے کا اصل مقصود یہی ہے۔ آج کل لوگوں نے "تصوف" کا مقصد یہ سمجھ لیا ہے کہ شیخ کچھ تسبیحات پڑھنے کو بتادے گا کہ صبح یہ پڑھا کرو، اور شام کو یہ پڑھا کرو، یاد رکھئے! یہ تسبیحات اصلاح کے اندر معاون ضرور ہیں، لیکن اصل مقصود نہیں، تسبیح تو آپ شیخ کے بغیر گھر میں بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تصوف کا اور شیخ سے تعلق کا اصل مقصود یہ ہے کہ جو اعمال باطنہ مقصود ہیں وہ انسان کے اندر پیدا ہو جائیں، اور جن اعمال سے بچنا ضروری ہے انسان ان سے بچ جائے۔ بہر حال! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں "خوف"

اور ''رجا'' دونوں بیان کو بیان کیا ہے، تاکہ ہم دونوں کے درمیان رہتے ہوئے زندگی گزاریں۔

مایوس اور ناامید ہونا جائز نہیں

چنانچہ ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''ناامیدی عقلی مذموم ہے، یعنی اگر یہ اعتقاد ہو جائے کہ مجھ پر ہرگز رحمت نہ ہوگی، اور میری موجودہ حالت ایسی نہیں کہ اس پر رحمت ہو'' (انفاس عیسیٰ: ۲۰۴)

اگر کسی کے دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کبھی نہیں ہوگی، تو یہ ''یاس'' ہے، اسی کا نام ''ناامیدی'' ہے، یہ مذموم ہے، اور کسی مؤمن کے لئے یہ ''یاس'' جائز نہیں، ہرگز نہیں ہونی چاہئے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰـا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ،اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا

(الزمر: ۵۳)

اے میرے بندوں! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہے، اور زیادتیاں کر بیٹھے ہو، تم اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا، بیشک اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف فرمانے والے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، چاہے انسان نے کتنا ہی بڑے سے بڑا گناہ کر لیا ہو، اور برے سے برا گناہ

کر بیٹھا ہو، تب بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کسی حال میں مایوس نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسی ہے کہ تم نے چاہے کیسا ہی بڑے سے بڑا گناہ کرلیا ہو، ایک مرتبہ جب تم سچے دل سے توبہ کرلوگے، اور یہ کہوگے " اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْهِ " تو انشاء اللہ اسی لمحے اللہ تعالیٰ تمہیں سارے گناہوں سے پاک صاف کردیں گے، اس میں کوئی شبہ اور شک نہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کے دل میں مایوسی کا کہاں گزر ہوسکتا ہے۔

جس کا اللہ ہو اس کو پریشانی کیسی؟

مایوسی تو اس شخص کو ہو جس کے ساتھ یہ وعدے نہ کئے گئے ہوں، جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ راستے نہ بتائے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ میں نے تمہارے لئے توبہ کا دروازہ کھولا ہوا ہے، اور مرتے دم تک کھلا رہے گا، پھر مایوسی کیوں؟ میرے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ:

جس کا اللہ ہو، اس کو پریشانی کیسی؟

لہٰذا جب جب اللہ تعالیٰ نے یہ وعدے فرما رکھے ہیں، اور طریقے بھی بتا رکھے ہیں، پھر کہاں کی پریشانی؟ کیسی مایوسی؟ جب گناہ کر کے پریشان ہو تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، توبہ کرو، استغفار کرو، اور آئندہ اس گناہ سے بچنے کی فکر کرو، باقی اپنے گناہ کا مراقبہ کبھی مت کرو کہ میں نے فلاں گناہ کیا، میں نے فلاں گناہ کیا، فلاں گناہ کیا، ارے جتنا وقت تم اس مراقبہ میں گزار رہے ہو، وہ وقت "اللہ کے ذکر" میں، اور "سبحان اللہ" پڑھنے میں گزار دو، اور توبہ کرو کہ یا

اللہ! میں نے جو کچھ گناہ کئے، میں ان پر اقراری مجرم ہوں، گناہوں کا اقرار کرتا ہوں، لیکن یا اللہ! آپ کی رحمت بڑی وسیع ہے، آپ کی رحمت سے توبہ کرتا ہوں، اور استغفار کرتا ہوں۔ لہٰذا اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یہ خیال کہ میں تو راندہ درگاہ ہوں، اور میں تو اللہ کی رحمت سے دور ہوں، اللہ کی رحمت مجھ پر ہو ہی نہیں سکتی، یہ سب شیطانی خیالات ہیں۔

ناامیدی کے غلبہ کا نتیجہ

بعض اوقات غلبہ حال کے نتیجے میں ''خوف'' کا یا ''یاس'' کا انسان پر غلبہ ہو جاتا ہے، یہ غلبہ بڑی خراب چیز ہے، اس لئے کہ اس کے نتیجے میں انسان پر قبض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، عبادت میں دل نہیں لگتا، توبہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اور دماغ میں یہی خیال سوار ہو جاتا ہے کہ میں اللہ کی رحمت سے دور ہوں۔ ایسے موقع پر شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، اور حکمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا ایک مرید تھا، اس پر ''قبض'' کی کیفیت طاری ہو گئی، اور اس کے دماغ پر یہ خیال مسلط ہو گیا کہ میں شیطان ہوں، اور شیطان کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ جہنمی ہے، اس لئے اپنے جہنمی ہونے کا یقین ہو گیا، جس سے ملاقات ہوتی تو اس سے یہ کہتا کہ میں شیطان ہوں۔ جب ان کے شیخ کو پتہ چلا تو ان کو بلایا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ میں تو شیطان ہو گیا ہوں، اور میں اللہ کی رحمت سے دور ہو گیا ہوں، اور اب سوائے جہنم کے میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، شیخ نے اس سے کہا کہ یہ بتاؤ شیطان کس کی مخلوق ہے؟ ارے شیطان

بھی انہی کی مخلوق ہے، انہوں نے ہی تو شیطان کو پیدا کیا ہے، پھر کیوں ڈرتا ہے؟ بس یہ سن کر اس کی گرہ کھل گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی کیفیت زائل کردی۔ بہر حال! علاج کے لئے بھی شیخ کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس وقت اس کے لئے کیا مفید ہوگا؟ اسی لئے حضرت والا فرمارہے ہیں کہ یہ اعتقاد کہ مجھ پر ہرگز اللہ کی رحمت نہ ہوگی، یہ ناامیدی ہے، اور مذموم ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

ناامیدی کس طرح پیدا ہوتی ہے؟

یہ ناامیدی کی کیفیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ جو اعمال کرنے کی اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمارہے ہیں، ان کی ناقدری کرنے سے رفتہ رفتہ یہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، اکثر و بیشتر ہماری زبانوں پہ یہ رہتا ہے کہ ہماری نمازیں کیا ہیں؟ یہ تو ٹکریں مارنا ہے، یہ وقت گزاری کررہے ہیں، یہ سب ناقدری کی باتیں ہیں، یہ ناقدری نہیں کرنی چاہئے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ارے بھائی! اس عبادت کی ادائیگی کی توفیق پر پہلے شکر ادا کرلو، کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو ایسی عبادت کرنے کی بھی توفیق میسر نہیں، اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس عبادت کو انجام دینے کی توفیق دیدی تو پہلے اس پر شکر ادا کرلو، اور یہ کہو: یا اللہ! آپ کی توفیق اور آپ کے فضل و کرم سے مجھے یہ توفیق ملی، آپ مجھے مسجد میں لے آئے، مجھ سے نماز پڑھوادی، اے اللہ! اس پر آپ کا شکر ہے۔

نماز کے بعد استغفار کرلو

شکر ادا کرنے کے بعد یہ کہو کہ یا اللہ! مجھ سے یہ نماز صحیح طور پر نہیں پڑھی

گئی، اور اس نماز کے اندر کمی کوتاہی ہوگئی، اس پر میں استغفار کرتا ہوں، لہٰذا نماز پڑھنے کے بعد "الحمدللہ" بھی کہو، اور "استغفراللہ" بھی کہو، اس کے بعد پھر اپنی نماز کی ناقدری مت کرو، اس لئے کہ یہ ناقدری رفتہ رفتہ انسان کو "مایوسی" کی طرف لے جاتی ہے، اور یہ خیال ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی عبادت کرلوں، لیکن وہ قابل قبول نہیں ہوگی، اس مایوسی سے بچو، اور جو عبادت کرنے کی توفیق ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَ لَكَ الشُّكْرُ، لہٰذا توفیق پر "شکر" اور کوتاہی پر "استغفار" کرتے رہو، ساری عمر یہ کرتے رہو، انشاء اللہ پھر "مایوسی" پیدا نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

مخلوق کا ڈر

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۹۳

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

مخلوق کا ڈر
خالق کے ڈر سے زیادہ ہونا

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین ، والعاقبۃ للمتقین،
والصّلوٰۃ والسّلام علی رسولہ الکریم، وعلی آلہ
واصحابہ اجمعین ۔ اما بعد!

مخلوق سے زیادہ ڈرنا

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل میں مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ ہے" یہ حالت اکثر و بیشتر پیش آتی ہے، شاید سب کو پیش آتی ہوگی، مثلاً کسی شخص سے ایک گناہ سرزد ہوگیا، اب اس شخص کو یہ ڈر ہے کہ اگر مخلوق میں سے کسی کو اس گناہ عظیم کا علم ہو جائے گا تو بڑی بدنامی ہوگی، بڑی رسوائی ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہے ہی کہ اس سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے، اب طبعی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

اس وقت مخلوق کا ڈر اللہ تعالیٰ کے ڈر کے مقابلے میں زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

مخلوق کا ڈر زیادہ ہونے کی مثال

مثلاً دنیا میں انسان کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ مجھے کوئی درندہ نہ کھالے، کوئی ظالم مجھے نقصان نہ پہنچادے، یا پولیس کا خوف ہے، جیل میں جانے کا خوف ہے، یا افسر بالا کا خوف ہے، یا دشمن کا خوف ہے، اس قسم کا خوف جب انسان پر طاری ہوتا ہے تو ایک دم سے اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ لیکن یہ خوف کہ اگر مجھ سے گناہ ہو گیا تو مجھے جہنم سے سابقہ پیش آئے گا، یا اللہ جل جلالہ کی ناراضگی کا سامنا ہو گا، یہ خوف دل و دماغ پر چھاتا نہیں ہے۔ مثلاً اگر گھر کے اندر ڈاکو گھس جائیں، اور گردن پر پستول رکھ کر کہیں کہ پیسے نکالو، تو اس ڈاکو سے جتنا ڈر لگے گا، گناہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس درجے کا یہ ڈر نہیں لگتا کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیسے پیش ہوں گا، کہیں اللہ تعالیٰ مجھے عذاب نہ دیدیں، کہیں مجھے جہنم میں نہ ڈال دیں، اس کا ڈر اتنا نہیں ہوتا۔ بہرحال! ان صاحب نے حضرت والا کو یہ لکھا کہ مجھے مخلوق کا خوف خالق کے خوف سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ حالت بڑی خطرناک ہے، کیونکہ قرآن کریم میں تو یہ حکم ہے کہ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ (الاحزاب: ۳۷) یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ انسان اللہ سے زیادہ ڈرے۔ اور مجھے مخلوق سے زیادہ ڈر لگتا ہے، واقعۃً ان صاحب نے بڑا اہم سوال کیا، اس لئے کہ مخلوق کا زیادہ ڈر کہیں ایمان کی کمزوری کی علامت تو نہیں ہے؟

طبعاً مخلوق کا ڈر زیادہ ہونا مذموم نہیں

اب حضرت والا کا جواب سنئے! آپ نے جواب میں فرمایا کہ:

"مخلوق کا ڈر خالق سے طبعاً زیادہ ہونا مذموم نہیں کہ غیر اختیاری ہے، اور عقلاً واعتقاداً زیادہ ہونا البتہ مذموم ہے، لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِنَ اللّٰهِ (الحشر:۱۳) کا بھی محمل ہے" (انفاس عیسیٰ:۲۰۴)

یعنی یہ جو طبعی طور پر ایک آدمی کو مخلوق سے زیادہ ڈر محسوس ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈر کم محسوس ہو رہا ہے، یہ کم اور زیادہ ہونا طبعی معاملہ ہے، اور انسان کے اختیار سے باہر ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر گرفت نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کا خوف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ

چنانچہ حدیث شریف میں یہ واقعہ آیا ہے کہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھیں، اور بے تکلفی کی باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کر رہی تھیں، اتنے میں یہ اطلاع ملی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ رہے ہیں، اس وقت تک پردے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے آنے کی اطلاع کا سن کر تمام ازواج مطہرات وہ بے تکلفانہ انداز ختم کر کے سب ادب سے بیٹھ گئیں، جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجلس میں آ گئے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ یہ عجیب معاملہ ہے کہ تمہارے آنے سے پہلے یہ

سب بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں، اور تمہارے آنے پر یہ ڈر گئیں، اور مؤدب ہو کر بیٹھ گئیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ازواج مطہرات سے کہا کہ:

اَیْ عَدُوَّاتِ اَنْفُسِهِنَّ ،اَتَهَبْنَنِیْ وَلَا تَهَبْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

یعنی اے جانوں پر ظلم کرنے والیو! تم مجھ سے ڈرتی ہو، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتی ہو؟ ازواج مطہرات نے جواب دیا:

نَعَمْ ،اَنْتَ اَفَظُّ وَاَغْلَظُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جی ہاں! اس لئے کہ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں سخت کلام اور سخت مزاج والے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ازواج مطہرات کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے طبعی خوف زیادہ تھا، اس لئے کہ یہ غیر اختیاری معاملہ ہے۔

شیطان کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ڈرنا

ایک حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس راستے سے عمر گزرتے ہیں، شیطان ڈر کے مارے اس راستے سے نہیں گزرتا۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ جس راستے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرتے ہیں، اس

راستے سے شیطان نہیں گزرتا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا، اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ نہیں آیا کہ جس راستے سے آپ گزریں اس راستے سے شیطان نہیں گزرتا، کیا شیطان حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ڈرتا ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہیں ڈرتا ہے؟ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا معمول یہ تھا کہ پہلے ظرافت کا جواب دیا کرتے تھے، اور پھر تحقیقی جواب دیا کرتے تھے، اس لئے جب اس شخص نے یہ سوال کیا تو پہلے آپ نے اس شخص سے فرمایا: پوچھو اس بیوقوف سے وہ ایسا کیوں کرتا تھا؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کیوں نہیں ڈرتا، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیوں ڈرتا ہے؟

کسی سے زیادہ ڈر اس کی عظمت کی دلیل نہیں

پھر تحقیقی جواب دیا کہ دراصل یہ ڈر اور خوف طبعی کیفیت ہے، اور اس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، لہٰذا کسی شخص سے ڈر زیادہ ہونا اس کے اعظم ہونے کی دلیل نہیں کہ اس کی عظمت دل میں زیادہ ہے، یا اس کی محبت زیادہ ہے، بلکہ اس شخص کی ایک خاص طبیعت ہے، اس طبیعت کی وجہ سے آدمی کے دل میں رکاوٹ اور ڈر پیدا ہوتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی ہے، جو پہلے والے شخص سے افضل اور اعظم ہے، لیکن اس کے دل میں نرمی ہے، جس کی وجہ سے لوگ اس سے بے تکلف ہو جاتے ہیں، اور اس سے اپنے دل کی بات کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے، اس وجہ سے اس سے ڈر محسوس نہیں ہوتا، لہٰذا کسی سے ڈر کا زیادہ

ہونا اس کے اعظم ہونے کی دلیل نہیں، اگر شیطان حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ ڈرتا ہے تو یہ ان کا طبعی معاملہ ہے، اور اس بات کی دلیل نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل ہو گئے، اسی لئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ "مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے طبعاً زیادہ ہونا مذموم نہیں کہ غیر اختیاری ہے"

عقلاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونا چاہئے

آگے فرمایا کہ "اور عقلاً اور اعتقاداً زیادہ ہونا البتہ مذموم ہے" یعنی عقلاً اللہ کا ڈر مخلوق کے ڈر سے زیادہ ہونا چاہئے، طبعاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونا کوئی ضروری نہیں، اب سوال یہ ہے کہ عقلاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عقلاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی دل میں یہ سوچے کہ مجھے مخلوق سے زیادہ تکلیف پہنچ سکتی ہے یا اللہ کے عذاب سے زیادہ تکلیف پہنچ سکتی ہے؟ جب ان دونوں میں موازنہ کرے گا تو اس وقت ظاہر ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ اللہ کے عذاب سے زیادہ تکلیف ہوگی، لہٰذا عقلی طور پر اللہ کے عذاب سے بچنے کی فکر زیادہ کرنی چاہئے، جب یہ بات دل میں ہے تو بس انشاء اللہ مقصود حاصل ہے۔ اس کے بعد طبعی طور پر خوف کی جو کیفیت ہوتی ہے، مثلاً ڈر جانا، سہم جانا، دہل جانا، فکر طاری ہو جانا، دماغ پر خوف کا مسلط ہو جانا، یہ سب غیر اختیاری کیفیات ہیں، لہٰذا اگر یہ غیر اختیاری کیفیات

مخلوق سے زیادہ ہوگئیں ہیں تو اس میں گھبرانے کی بات نہیں۔ کیسی عجیب بات حضرت والا نے بیان فرمادی، اور کتنا بڑا خلجان دور کردیا، اس لئے کہ بعض اوقات جب آدمی یہ سوچتا ہے کہ میں خالق کے مقابلے میں مخلوق سے زیادہ ڈرتا ہوں، تو دماغ میں یہ خیال آئے گا کہ میرا تو ایمان ہی جاتا رہا، حضرت والا نے اس خلجان اور خیال کو دور فرمادیا۔

مخلوق محسوس ہیں، اللہ محسوس نہیں

پھر آگے عجیب بات ارشاد فرمائی کہ قرآن کریم کی آیۃ "لَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ رَهۡبَةً فِىۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنَ اللّٰهِ" کا بھی یہی محمل ہے، یعنی مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ ہونا اعتقاداً مذموم ہے، طبعاً مذموم نہیں، اور طبعاً مذموم نہ ہونے کی تین وجوہ ہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ مخلوق محسوس ہے، اللہ تعالیٰ محسوس نہیں، یعنی مخلوق نظر آرہی ہے، مثلاً ایک شخص پستول تانے کھڑا ہے تو وہ شخص بھی نظر آرہا ہے، اور پستول بھی نظر آرہا ہے، اور یہ بھی نظر آرہا ہے کہ اگر پستول سے گولی چل گئی تو میں مرجاؤں گا۔ جبکہ اللہ جل شانہ بذات خود محسوس نہیں، اللہ تعالیٰ کو نہ آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے، نہ ہاتھوں سے چھوا جاسکتا ہے، اور نہ جہنم کا عذاب نظر آرہا ہے، اور انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ اس چیز کا اثر زیادہ لیتا ہے جو چیز محسوس ہورہی ہو، بنسبت اس چیز کے اثر کے جو محسوس نہ ہو، اگرچہ عقلاً اس کے وجود کو مانتا ہے، لیکن طبیعت پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا محسوس چیز کا ہوتا ہے۔

غائب کے مقابلے میں حاضر سے ڈر زیادہ ہوتا ہے

یا مثلاً کسی شخص کو اس بات کا خطرہ لگا ہوا ہے کہ کل کو یہ واقعہ پیش آجائے گا، لیکن ایک واقعہ ابھی آنکھوں کے سامنے پیش آرہا ہے، تو اس واقعہ کا ڈر، خوف اور اس سے بچنے کی فکر اور اس کی گھبراہٹ زیادہ ہوگی، بنسبت اس واقعہ کے خوف کے جو کل آنے والا ہے، اس لئے جو وقعہ ابھی پیش آرہا ہے، وہ محسوس ہورہا ہے، اور جو واقعہ کل پیش آئے گا وہ محسوس نہیں ہے۔ یہ انسان کی طبعی بات ہے۔ اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر مؤاخذہ بھی نہیں ہوگا کہ تمہارے اندر مخلوق کے خوف کی زیادتی کیوں ہے؟ اس لئے کہ "طبعاً حاضر کا اثر زیادہ ہوتا ہے غائب سے" جو شخص سامنے بیٹھا ہے اس کا جو اثر ہوگا وہ غائب کا نہیں ہوگا، چاہے غائب کی عظمت دل میں زیادہ ہو۔

مخلوق سے معافی کی امید کم ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ "مخلوق سے تسامح کی توقع کم ہے اور خالق سے زیادہ ہے" یہ بہت بڑی بات بیان فرمادی، اس لئے کہ مخلوق بڑی خراب چیز ہے، یہ کسی کو نہیں بخشتی، اگر مخلوق کے سامنے یہ بات آجائے کہ فلاں نے یہ گناہ کیا ہے، تو یہ مخلوق اس کو نہیں بخشے گی، بلکہ اس کو بدنام اور رسوا کرے گی، اس کو سزا دلوائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ ایسا ہے کہ بندہ گناہ بھی کر رہا ہے، لیکن ساتھ میں شرمندہ بھی ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ میرا معاملہ میرے اللہ سے ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ شاید مجھے معاف فرمادیں۔ تو وہاں معافی کی توقع زیادہ ہے، بنسبت مخلوق

کے، اس لئے بندوں کے سامنے گناہ ظاہر ہونے کے خیال سے انسان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

جہنم میں جانا گوارا کر لے گا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ذرا تصور کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوئے، اور تم نے درخواست کی کہ یا اللہ! مجھ سے جو گناہ سرزد ہوئے ہیں، اپنی رحمت سے مجھے معاف فرما۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ ہم تمہارے گناہ معاف تو کر دیں گے، اور تمہیں جہنم کا عذاب نہیں دیں گے، لیکن ایک شرط ہے، وہ شرط یہ ہے کہ تمہارے اعمال نامہ کی ایک فلم لوگوں کے سامنے چلائیں گے، اور اس فلم کو دیکھنے والوں میں تمہارا باپ ہوگا، تمہاری ماں ہوگی، تمہارے بہن بھائی ہوں گے، تمہارے بیوی بچے ہوں گے، تمہارے دوست احباب ہوں گے، تمہارے شاگرد ہوں گے، تمہارے مرید بھی ہوں گے، اور فلم چلانے کے بعد ہم تمہیں معاف فرما دیں گے، اور تمہیں جنت میں بھیج دیں گے، اگر اللہ تعالیٰ معاف کرنے پر یہ شرط لگا دیں تو کوئی آدمی ایسا بھی ہوگا جو کہے گا کہ یا اللہ! آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے جہنم میں بھیج دیں، یہ بہتر ہے اس سے کہ آپ ان لوگوں کے سامنے میری فلم چلائیں، اس لئے کہ مخلوق کے سامنے رسوائی سے زیادہ خوف ہوتا ہے، اور یہ خوف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ مخلوق بڑی سنگ دل ہے، اگر اس کے علم میں میری کوئی کمزوری آگئی تو یہ مجھے نہیں بخشے گی، اور اللہ جل جلالہ میرے خالق و

مالک ہیں، اصل عظمت انہی کو حاصل ہے، لیکن ان کے بارے میں مجھے یہ امید ہے کہ وہ مجھے معاف فرمادیں گے، ان سے کیا چھپانا، جو کچھ ہے ان کے سامنے ہے۔

مخلوق کی نظر میں ذلت ناگوار ہے

تیسری وجہ یہ ہے کہ مخلوق کی نظر میں ذلت ناگوار ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں ذلیل ہونا گوارا ہے، اس لئے کہ مخلوق کے سامنے کوئی گناہ آگیا تو ذلت ہوگی، وہ مخلوق یہ کہے گی کہ یہ بڑا بدعمل آدمی ہے، بڑا فاسق و فاجر آدمی ہے، بڑا گناہ گار، بڑا مکار ہے، بڑا منافق ہے، اور مخلوق کی نظر میں ذلت بڑی ناگوار بات ہے۔ دوسری طرف اگر اللہ جل شانہ کی نظر میں یہ بات آجائے کہ بندہ بڑا فاسق و فاجر ہے، یہ بڑا گناہ گار اور خطا کار ہے، تو یہ بھی ذلت ہے، لیکن یہ ذلت مطلوب ہے، اس لئے بندہ خود ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے اقرار کرتا ہے کہ یا اللہ! میں بڑا گناہ گار ہوں، بڑا خطا کار ہوں، مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی، اقراری مجرم ہوں، مجھے معاف فرمائیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سامنے ذلیل ہونا مطلوب ہے، اور مخلوق کے سامنے ذلیل ہونا ناگوار ہے، اور شرعاً بھی ذلت مطلوب نہیں، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگی:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَ فِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا

اے اللہ! مجھے اپنی نگاہ میں تو چھوٹا بنا، اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا۔ اس لئے کہ لوگوں کی نگاہ میں عزت مطلوب ہے، ذلت مطلوب نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ

کے سامنے ذلت عین مطلوب ہے، اسی لئے حضرت والا نے فرمایا کہ مخلوق کا ڈر زیادہ ہوتا ہے خالق کے ڈر کے مقابلے میں، اور یہ ایمان کی کمزوری کی علامت نہیں، اور نہ گھبرانے کی بات ہے۔

شیخ کامل ہی صحیح علاج بتا سکتا ہے

یہ باتیں شیخ کامل ہی بتا سکتا ہے، ورنہ اگر کسی معمولی آدمی کے سامنے یہ بات کہی جائے کہ مجھے مخلوق سے زیادہ ڈر لگتا ہے خالق کے مقابلے میں، تو وہ جواب میں یہ کہے گا کہ تو کافر ہو گیا، یہاں سے بھاگ جا، تو اللہ سے نہیں ڈرتا؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (الاحزاب: ۳۷) لیکن جو شخص نفس کی باریکیوں سے واقف ہے، اور جو یہ جانتا ہے کہ یہ انسان ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی طبیعت کے اندر کیا کیا باتیں رکھی ہیں، اور حقیقت حال کیا ہے؟ اس نے چند لفظوں میں یہ سارا مسئلہ حل کر دیا، اور سارا شک وشبہ دور کر دیا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، یہ ایک ایسا مقام ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی رہنمائی غلط ہو جائے تو آدمی کفر اور نفاق تک پہنچ جاتا ہے، مایوسی تک پہنچ جاتا ہے، اس کے اوپر یاس طاری ہو جاتی ہے، اور شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ لیکن شیخ کامل نے کانٹا بدل دیا کہ سارے شکوک وشبہات کافور ہو گئے، اور جو حقیقت حال ہے وہ بیان کر دی۔

علاج کا ایک طریقہ "تصورِ شیخ"

اسی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے علاج کا جو ایک طریقہ تجویز فرمایا ہے،

اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو لوگوں کے لئے غلط فہمی کی وجہ سے اعتراض کا سبب بن گئیں، چنانچہ "تصور شیخ" کا لفظ آپ نے سنا ہوگا، یہ علاج کا ایک طریقہ تھا، جو مشائخ اپنے مریدین سے بطور علاج کرایا کرتے تھے، اور مشائخ اپنے مریدین سے کہتے کہ جس وقت تم ذکر کرو تو ذکر کے وقت اپنے شیخ کا تصور کرو، اگر کسی گناہ کا تقاضہ دل میں پیدا ہو رہا ہے تو اس وقت بھی اپنے شیخ کا تصور کرو۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ ذکر کے وقت تصور شیخ تو "شرک" ہے، اس لئے کہ ذکر تو اللہ کے لئے کیا جاتا ہے، لہٰذا تصور بھی اللہ کا کرنا چاہئے، نہ کہ شیخ کا تصور۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور تصور شیخ

یہاں تک نوبت آئی کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ حضرت شاہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرید شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کو یہ تجویز کیا کہ آپ "تصور شیخ" کیا کریں، جواب میں حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت! اگر آپ مجھے کسی گناہ کے کرنے کا حکم دیتے تو میں اس خیال سے وہ گناہ کر لیتا کہ بعد میں توبہ کر لوں گا، لیکن اس عمل میں مجھے شرک کی بو آتی ہے، اس لئے یہ کام میں نہیں کر سکتا۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ چلو تم اس سے مستثنیٰ ہو۔ اب دیکھئے! ان کو اس کے اندر شرک کی بو آئی، حالانکہ حقیقت میں اس کے اندر کوئی شرک نہیں ہے، لیکن چونکہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر توحید کا غلبہ تھا، اور اللہ تعالیٰ نے توحید پر استقامت عطا فرمائی تھی، اس وجہ سے انہوں نے یہ کہا۔

"تصورِ شیخ" کا مقصد یکسوئی حاصل کرنا

لیکن بعض لوگوں نے "تصورِ شیخ" پر اعتراض کرتے ہوئے باقاعدہ یہ کہہ دیا کہ یہ شرک ہے، اور جو لوگ "تصوف" پر اعتراض کرنے والے ہیں، وہ "تصورِ شیخ" ہی کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ یہ "تصوف" شرک کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ "تصورِ شیخ" کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ دماغ کو ذکر اللہ کے وقت یکسو کیا جائے، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا خیال دل ودماغ میں اس لئے نہیں جمتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات "محسوس" نہیں، کسی محسوس چیز کا تصور انسان کرے گا تو وہ تصور جم جائے گا، غیر محسوس چیز کا تصور نہیں جمے گا، مبتدی شخص جس کے دل ودماغ پر اللہ کا ذکر اور فکر چھایا نہیں ہے، اس کے لئے صوفیاء نے ایک محسوس تجویز کردی کہ اپنے شیخ کا تصور کیا کرو، اور پھر جو حضرات اس تصور کو تجویز کرتے تھے، وہ صرف اس حد پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، بلکہ تصورِ شیخ کے ذریعہ جب ایک مرتبہ یکسوئی حاصل ہوگئی تو بعد میں اس یکسوئی کا رُخ اللہ تعالیٰ کی جانب پھیر دیتے تھے، اور پھر وہ ذاکر اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو جاتا تھا۔

"تصورِ بھینس" سے علاج

جیسے میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک بزرگ کے پاس ایک دیہاتی اپنی اصلاح کرانے اور مرید ہونے کے لئے گیا، اس نے جاکر کہا کہ حضرت! مجھے مرید کرلو، ان بزرگ نے اس کو مرید کرلیا، اس کے بعد اس نے کہا کہ میں کیا کروں، میرا نہ ذکر میں دل لگتا ہے، نہ نماز میں دل لگتا ہے، میں

تو بس نماز میں اٹھک بیٹھک کرتا رہتا ہوں۔ ان بزرگ نے اس سے پوچھا کہ ساری دنیا میں تجھے کس چیز سے زیادہ محبت ہے؟ اس دیہاتی نے جواب دیا کہ میری ایک بھینس ہے، مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہے، ان بزرگ نے اس سے کہا کہ تو روزانہ رات کو اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک گھنٹہ تک بھینس کا تصور کیا کر۔ اس دیہاتی نے کہا کہ میں تو اللہ میاں کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ میں جو کہہ رہا ہوں تو وہ کر، چنانچہ وہ کمرے میں بیٹھ گیا، اور بھینس کا تصور کرنے لگا، چنانچہ چند دنوں کے بعد اس کے دل و دماغ پر بھینس مسلط ہوگئی کہ بھینس آرہی ہے، بھینس جا رہی ہے، بھینس دودھ دے رہی ہے، بھینس چر رہی ہے، بھینس نہا رہی ہے، یہاں تک نوبت آگئی کہ جب شیخ اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اپنے شیخ سے کہنے لگا کہ نہیں، ابھی یہاں نہ آنا، یہاں بھینس آرہی ہے، جب اس حد تک بھینس اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوگئی تو شیخ نے کہا کہ بس، اب کام بن گیا، چنانچہ بھینس کے تصور کے رخ کو اللہ کے تصور کی طرف پلٹ دیا۔ یہ سب اس لئے کیا کہ ابتداءً اللہ جل شانہ کی طرف دھیان لے جانا اس کے لئے ممکن نہیں تھا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ محسوس نہیں ہیں، اس لئے پہلے اس کے ذہن کو تمام خیالات سے فارغ کر کے یکسو کر دیا، تو اب اس کا رخ موڑنا آسان ہوگیا۔

یکسوئی کے بعد رخ موڑ دو

یہ "تصور شیخ" بھی اسی لئے کرایا جاتا ہے کہ تمام خیالات سے فارغ

کر کے ذہن کو یکسو کر دیا جائے، پھر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف موڑ دیا جائے، لیکن اعتراض کرنے والوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ "بھینس" کا تصور بھی شرک ہے، اور "شیخ" کا تصور بھی شرک ہے، حالانکہ یہ ذہن کو فارغ کرنے اور اس کو یکسو کرنے کا ایک علاج تھا، اور جب ذہن یکسو ہو گیا تو اس کا رخ موڑ دیا، اس کے اندر یہ بات نہیں ہے کہ مخلوق کو خالق کے برابر ٹھہرا دیا، بلکہ یہ ایک علاج ہے۔

بدنظری کا ایک علاج

چنانچہ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی دل میں بدنظری کا داعیہ پیدا ہو تو اس وقت یہ تصور کر لیا کرو کہ اگر اس وقت میرے استاذ میرے سامنے آجائیں، یا میرے والد آجائیں، یا میری اولاد آجائے، اور وہ مجھے اس حالت میں دیکھ لیں کہ میں غیر محرم کو دیکھ کر لذت لے رہا ہوں، تو اس وقت وہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ جب تم یہ سوچو گے تو انشاء اللہ اس گناہ کرنے کا داعیہ کمزور ہو جائے گا۔

اللہ کے دیکھنے کا تصور کیوں نہ کرے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نے یہ تو فرمایا کہ اس گناہ کے وقت یہ سوچے کہ میرا استاذ دیکھ رہا ہے، میرا باپ دیکھ رہا ہے۔ یہ کیوں نہیں فرمایا کہ وہ یہ سوچے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ علم تو ہمیں حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت ہمیں دیکھ رہے ہیں، لیکن چونکہ اللہ جل شانہ کی ذات محسوس نہیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا تصور قائم کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس

لئے مبتدی کے لئے آسانی اس میں ہے کہ وہ کسی ایسی شخصیت کا تصور کرلے جو محسوس ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ استاذ اور باپ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں زیادہ عظمت والے ہیں، اور ان حضرات کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ان کے علم میں آنے سے زیادہ بدنامی اور زیادہ رسوائی ہے، اور یہ لوگ اس طرح سے معاف نہیں کرسکتے جس طرح سے اللہ تعالیٰ معاف کرسکتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے درمیان مکالمہ

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھانا کھارہے تھے، اتنے میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے پاس پہنچ گئے، یہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوست بھی تھے، اور ان دونوں کے رمیان لطیفے بھی ہوا کرتے تھے، جب وہاں پہنچے تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

اُدْنُ فَکُلْ۔ آؤ کھانا کھالو،

انہوں نے جواب دیا:

قَدْ اَکَلْتُ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اے امیرالمؤمنین! میں کھانا کھاچکا ہوں،

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

اِنَّ مِنْ شَحَاحَةِ الْمَرْءِ اَنْ لَّا یَدَعَ الْمَرْءُ فِیْ بَطْنِہٖ مُسْتَزَادًا لِلْمُسْتَزِیْدِ۔

یہ بلیغ جملہ کہا کہ یہ بڑی طمع اور حرص کی بات ہے کہ آدمی جب کھانا کھائے تو اتنی گنجائش بھی نہ چھوڑے کہ دوسرا آدمی کھانا کھلانا چاہے تو اس کی فرمائش بھی قبول نہ کرے۔ اس طرح کھانا تو بری بات ہے۔

انہوں نے جواب دیا: چونکہ وہ حاضر جواب تو تھے،

قَدْ فَعَلْتُ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ!

امیر المؤمنین، میں نے ایسا ہی کیا ہے، یعنی میں نے یہ نہیں کیا کہ پورا پیٹ بھر لیا ہو، اور جگہ نہ چھوڑی ہو، بلکہ پیٹ میں جگہ چھوڑی ہے،

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا:

اَلِمَنْ هُوَ اَوْجَبُ حَقًّا مِنْ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ

یعنی یہ جو تم نے جگہ چھوڑی ہے کسی ایسے شخص کے لئے چھوڑی ہے جس کی فرمائش پوری کرنا امیر المؤمنین کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہو؟ یعنی جب میں نے تمہیں کھانے کے لئے بلایا تو تم نے انکار کر دیا، اب یہ جو جگہ تم نے چھوڑی ہے وہ کس کے لئے چھوڑی ہے؟ اس طرح حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو پھانس دیا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا:

لَا، وَلٰکِنْ لِمَنْ لَا یَعْذُرُ عُذْرَ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ

یعنی میں نے یہ جگہ اس شخص کے لئے چھوڑی ہے جو امیر المؤمنین کی طرح معذرت قبول نہ کرے، اور معاف نہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ تو معاف کردیں گے، اور معذرت قبول کرلیں گے، لیکن بعض لوگ ایسے ضدی ہوتے ہیں جو معذرت قبول نہیں کرتے، ان کی وجہ سے یہ جگہ چھوڑی ہے، آپ کی وجہ سے نہیں چھوڑی ہے۔

خلاصہ

بہر حال! آدمی بعض اوقات کسی دوسرے سے اس وجہ سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کو پتہ چل گیا تو یہ مجھے نہیں چھوڑے گا، معاف نہیں کرے گا، لیکن دوسرا شخص جو پہلے کے مقابلے میں کتنے ہی بڑے درجے کا کیوں نہ ہو، اس سے اس لئے نہیں ڈرتا کہ اگر اس کو پتہ لگ گیا تو اس سے معافی مانگ لوں گا، اس کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑلوں گا، تو وہ مجھے معاف کردے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے والے شخص کی عظمت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمارے دلوں میں اپنا خوف اور اپنی رجا دونوں پیدا فرمادے، اور دونوں میں اعتدال بھی عطا فرمادے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

اعمال کے دنیاوی اثرات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اعمال کے دنیاوی ثمرات

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین ، والعاقبة للمتقین ،

والصّلوٰة والسّلام علی رسوله الکریم وعلی آله

اصحابه اجمعین ۔ امابعد!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

''اعمال صالحہ میں نفع نقد بھی ہے، صرف اُدھار ہی نہیں، ہاں! ایک اُدھار بھی ہے، یعنی ثواب، اور اس کے ساتھ ایک چیز نقد بھی ہے، یعنی رجا اور امید، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا وابستہ ہو جانا، جو بدون اعمال صالحہ کے حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح اعمال سیۂ کا ایک ثمرہ ادھار ہے، اور ایک نقد ہے، ادھار تو عذاب جہنم ہے، اور نقد وہ وحشت، ظلمت اور بے چینی ہے، جو گناہوں کو لازم ہے'' (انفاس عیسیٰ: ۲۰۵)

اعمال کا ثمرہ نقد بھی، اُدھار بھی

اس ارشاد کا مقصود ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے، وہ یہ کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ اعمال اس دنیا میں کرتے ہیں، چاہے وہ نیک اعمال ہوں یا برے اعمال ہوں، ان کا نتیجہ اور ثمرہ، اور ان کا فائدہ اور نقصان آخرت میں ظاہر ہوگا۔ اگر اعمال اچھے ہیں تو ثواب ملے گا انشاء اللہ، اگر اعمال خراب ہیں تو عذاب ہوگا۔ گویا کہ جو کچھ بھی ہے وہ ادھار ہے، یہاں دنیا

میں نقد کچھ نہیں، حضرت والا اس ملفوظ میں اُس غلط فہمی کی تردید فرما رہے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے کہ اعمال کے تمام ثمرات اور ان کے تمام نفع نقصان اوھار ہی ہوں، بلکہ اعمال کے کچھ ثمرات انسان کو اس دنیا میں بھی مل جاتے ہیں۔

نیک عمل کا پہلا نقد فائدہ

وہ نقد ثمرات کیا ہیں؟ اس پر فرمایا کہ نیک اعمال کا سب سے پہلا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ نیک عمل کرنے کے بعد انسان کو یہ امید ہو جاتی ہے کہ شاید اللہ تبارک وتعالیٰ اس عمل کی بدولت اپنے فضل و کرم سے اس عمل کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرما کر مجھے نواز دیں، اس کا نام "رجا" اور "امید" ہے، یہ نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو انسان کو حاصل ہوتا ہے۔

اپنے عمل پر نظر خود پسندی ہے

یہاں ایک باریک بات کا سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نیک عمل کرنے کی توفیق دی ہے، اگر انسان کی نگاہ اس عمل کی طرف ہو جائے، اور وہ یہ سوچے کہ مجھ سے یہ بڑا اچھا کام ہو گیا، اور اس کے نتیجے میں آدمی عجب کے اندر مبتلا ہو جائے، یا یہ سمجھے کہ بس یہ میرا نیک عمل مجھے نجات دلائے گا، اور مجھے جنت میں لے جائے گا تو یہ بڑی خطرناک بات ہے، اور اسی کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں "رؤیت عمل" اور "خود پسندی" کہا جاتا ہے، مثلاً ایک شخص نماز پڑھے، اور یہ سوچے کہ میں بڑی اچھی نماز پڑھتا ہوں، اور چونکہ میں اچھی نماز پڑھتا ہوں، اس لئے میں بڑا اچھا ہوں، یا یہ سوچے کہ میری یہ نماز مجھے جنت میں لے جائے گی، یہ سوچ بڑی خطرناک ہے۔ اب ایک طرف تو حضرت والا یہ فرما رہے ہیں کہ عمل کا نقد ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ اس نیک عمل سے امید پیدا ہو جاتی ہے، اور دوسری طرف صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ "رؤیت عمل" اور "خود پسندی" ناجائز ہے، بقول کسی کے:

هزار نکتهٔ باریک تر ز مو ایں جاست
نه هر که سر بتراشد قلندری داند

یہ بہت خطرناک وادیاں اور گھاٹیاں ہیں، جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے۔

خود پسندی اور رجا میں فرق

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق کس طرح کیا جائے؟ آیا کہ یہ سوچ ''خود پسندی'' میں داخل ہے یا یہ ''رجا'' اور ''امید'' میں داخل ہے؟ دونوں کے درمیان فرق اس طرح ہے کہ اگر کسی عمل کے کرنے کے بعد طبیعت میں بشاشت اور خوشی پیدا ہوئی، اور اس بشاشت کے نتیجے میں شکر ادا کیا کہ الحمدللہ مجھے اس نیک عمل کی توفیق ہوگئی، اور یہ امید بندھ گئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اس عمل کی توفیق دی ہے کہ اس بات کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے نواز دیں گے، بس اس حد تک تو یہ ''رجا'' ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ

جب تمہیں اپنے اچھے عمل سے خوشی ہو، اور برے کام سے رنج اور تکلیف ہو، تو یہ تمہارے ایمان کی علامت ہے۔ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات میں کوئی اچھا عمل کرتا ہوں، تو عمل کرنے کے بعد مجھے خوشی ہوتی ہے کہ الحمدللہ میں نے ایک اچھا عمل کیا، کیا یہ خوشی ''عجب'' اور ''تکبر'' تو نہیں ہے؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ

یعنی نیک عمل کرکے تمہیں جو خوشی حاصل ہوئی، یہ مؤمن کے لئے نقد خوشخبری ہے، لہٰذا گھبرانے کی بات نہیں۔

جنت فضل پر ملے گی، عمل پر نہیں

صوفیاء کرام جس کو ''رؤیت عمل'' اور ''خود پسندی'' کہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ آدمی کو نیک عمل کرنے کے بعد اپنے عمل پر یہ گھمنڈ ہو جائے کہ یہ میرا عمل اتنا اچھا ہے کہ یہ مجھے سیدھا جنت میں لے جائے گا۔ اور میرا جنت میں جانا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بنیاد پر نہیں، بلکہ میرے عمل کی ذاتی خاصیت کی بنیاد پر میں اس بات کا مستحق ہو چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر دیں۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ارے استحقاق کوئی چیز نہیں، تم کتنا ہی عمل کرتے رہو، مگر جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جنت کی نعمتیں غیر متناہی ہیں، اس کے آگے تمہارے عمل کی کیا حقیقت ہے؟ تم نے تو دو منٹ میں ایک عمل کر لیا، یا پانچ منٹ میں ایک عمل انجام دیدیا، اور پھر کہنے لگے کہ مجھے اس عمل کے بدلے جنت چاہیئے، وہ جنت جو غیر متناہی ہے، اور جس کی نعمتیں ابدی ہیں، جن کی کوئی حد و نہایت نہیں، چار رکعات کے بدلے ایسی جنت مانگتے ہو؟ تم کتنا ہی عمل کرتے رہو پھر بھی جنت کا استحقاق نہیں ہوگا، فرض کرو کہ تم کو اسی سال کی زندگی ملی، اور تم نے اپنی پوری زندگی سجدے میں پڑے پڑے گزار دی، تو اس کا مطلب یہ ہوا تم نے زیادہ سے زیادہ اسی سال عبادت کی، اور دوسری طرف جنت کی نعمتیں، نہ سو سال، نہ ہزار سال، نہ لاکھ سال، بلکہ دائمی اور ابدی ہیں، اگر انسان ساری عمر بھی عبادت کرتا رہے تو جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوگا، لہٰذا انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں جو انسان کو جنت کا مستحق بنا دے، یہ ان کا کرم ہے کہ بعض مرتبہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ اے بندے! تو نے چونکہ یہ عمل کیا تھا، اس لئے ہم تمہیں جنت کا مستحق بنا دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی بعض آیات میں استحقاق کی طرف اشارہ بھی فرمایا، مگر وہ استحقاق بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے پیدا کیا ہوا ہے، ورنہ عمل کے اندر اپنی ذات میں یہ طاقت نہیں کہ

وہ جنت کا مستحق بناتا، ساری زندگی روزے میں گزاردو، ساری زندگی عبادت میں ذکر و تسبیح میں گزاردو، تب بھی استحقاق پیدا نہیں ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور جنت

اسی لئے حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی انسان کا کوئی عمل اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سوال کیا کہ آپ کا بھی عمل آپ کو جنت میں نہیں لے جائے گا؟ آپ نے جواب میں فرمایا:

لَا، اِلَّا اَنْ یَتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ

نہیں، میرا عمل بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ نہ لیں۔ آپ دیکھیں کہ ساری کائنات میں کسی کا بھی عمل کما اور کیفاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے برابر تو کجا اس کا پاسنگ بھی نہیں ہوسکتا، آپ یہ فرمارہے ہیں کہ میرا عمل بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ نہ لے، اس سے پتہ چلا کہ عمل سے جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا۔

نیک اعمال فضل کی علامت ہیں

البتہ اللہ تعالیٰ نے ان نیک اعمال کو اپنے فضل و کرم کی علامت بنایا ہے، یعنی اگر کوئی شخص یہ اعمال کررہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ انشاء اللہ، اللہ کا فضل اس شخص پر ہوگا، اور اس نیک عمل کے انجام پانے پر خوشی اس بات کی ہے کہ جب مجھے اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تو الحمد للہ میرے اندر وہ علامت پائی گئی جس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے نواز دیں گے۔ لہٰذا یہ مسرت، علامت پائے جانے کی مسرت ہے، یہ اس بات کی مسرت نہیں کہ مجھ سے کوئی بہت بڑا کام انجام پاگیا ہے، جو مجھے

جنت کا مستحق بنادے گا۔ یہ باریک بات ہے، جو ذہن میں رہنی چاہئے۔

عمل سے جنت کا مستحق نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی بندہ نیک عمل کرتا ہے تو اس کو نواز دیتے ہیں، اور اس کو اپنے فضل و کرم کا مورد بنادیتے ہیں، اور بغیر عمل کے عادۃً فضل و کرم کا مورد نہیں بناتے، اب اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ جب میرا عمل مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا تو پھر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ عمل سے جنت کا استحقاق تو پیدا ہوتا نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ سے بیٹھ کر مانگتے رہو کہ یا اللہ! مجھے اپنی رحمت کا مورد بنادیجئے۔ یاد رکھیں کہ اللہ کی رحمت کا مورد بننے کے لئے اور جنت کا مستحق بننے کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی شخص عمل کرے گا تو اس کو نوازا جائے گا، لہٰذا عمل ضروری بھی ہے، اور جنت میں جانے کے لئے علت تامہ بھی نہیں، اور جنت کے استحقاق کے لئے بھی علت تامہ نہیں، بلکہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کے فضل کی ایک علامت ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا حکیمانہ ارشاد

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی حکیمانہ بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ جو شخص عمل کرتا ہے اور اس عمل کی بنیاد پر جنت کی آس لگائے بیٹھا ہے کہ اس کا یہ عمل اس کو جنت میں لے جائے گا تو وہ شخص خواہ مخواہ فضول محنت کر رہا ہے، اور جو شخص یہ آرزو کر رہا ہے کہ میں عمل کے بغیر جنت میں چلا جاؤں گا تو وہ شخص اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے، اس لئے کہ دونوں باتیں غلط ہیں، کیونکہ کوئی بھی شخص عمل کے بغیر جنت میں نہیں جائے گا، اور تنہا عمل بھی اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک اس عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت شامل نہ ہو۔ لہٰذا عمل بھی کرنا ہے اور اس عمل کو علامت نجات بھی سمجھنا ہے،

لیکن اس عمل کو جنت کے استحقاق کا سبب نہیں سمجھنا ہے، لہٰذا جب اللہ جل شانہ کی طرف سے نیک عمل کی توفیق ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو کہ اے اللہ! آپ کا فضل و کرم ہے کہ آپ نے مجھے اس عمل کی توفیق عطا فرما دی۔ اور یہ امید رکھو کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی ہے تو اس نے ہمیں نوازنے کا ارادہ فرمایا ہے، اگر نوازنا نہ ہوتا تو نیک عمل کی توفیق نہ دیتے۔

نیک عمل کی توفیق ان کی طرف سے جواب ہے

حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں اللہ میاں کو اتنا پکارتا ہوں لیکن ان کی طرف سے کبھی جواب ہی نہیں آتا، کبھی تو جواب آتا، ہم دعا کر رہے ہیں تو انہیں پکار رہے ہیں، کبھی ذکر کے ذریعہ انہیں پکار رہے ہیں، کبھی نماز کے ذریعہ، کبھی تلاوت کے ذریعہ انہیں پکار رہے ہیں، لیکن کبھی جواب ہی نہیں آتا، یک طرفہ کاروبار ہو رہا ہے، یہ احمقانہ خیال بعض اوقات دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس خیال کا جواب دے رہے ہیں کہ:

گفت اے اللہ تو لبیک ما است

یعنی تجھے ہمارا نام لینے کی جو توفیق ہو رہی ہے، یہی ہماری طرف سے جواب ہے، جب تم نے ایک مرتبہ ہمارا ذکر کیا، اس کے بعد دوبارہ تمہیں ہمارا نام لینے کی توفیق ہو گئی تو یہ خود ہماری طرف سے جواب اور لبیک ہے، اگر یہ جواب نہ ہوتا تو پھر دوبارہ تمہیں ہماری بارگاہ میں آنے کی توفیق ہی نہ ہوتی، تیرا "اللہ" کہنا ہی ہماری طرف سے "لبیک" ہے، اور تمہارے پہلے ذکر کی قبولیت کی علامت ہے۔

ایک نیک عمل کے بعد دوسرے نیک عمل کی توفیق

اسی لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ایک نیک

عمل کے بعد دوبارہ اسی نیک عمل کی توفیق ہو جائے تو سمجھ لو کہ پہلا عمل قبول ہو گیا، اگر پہلا عمل قبول نہ ہوتا دوسری بار عمل کی توفیق نہ ملتی۔ مثلاً ظہر کی نماز آپ نے پڑھی، اور پھر عصر کی نماز پڑھنے کی توفیق ہو گئی تو سمجھ لو کہ ظہر کی نماز قبول ہو گئی، اگر ظہر کی نماز قبول نہ ہوتی تو عصر کی نماز پڑھنے کی توفیق نہ ملتی۔ گذشتہ کل آپ نے روزہ رکھا تھا، آج پھر رکھ لیا تو سمجھ لو کہ گذشتہ کل کا روزہ قبول ہو گیا، اگر وہ روزہ قبول نہ ہوتا تو دوبارہ روزہ رکھنے کی توفیق نہ ملتی۔ بہر حال! انسان عمل کرتا رہے، عمل کرنا نہ چھوڑے، اور عمل کر کے اس بات پر خوش ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی، اور جب توفیق عطا فرمائی ہے تو انشاء اللہ نوازنے کا ارادہ بھی فرمایا ہے، بس اس سے آگے مت بڑھنا، اور یہ مت سوچنا کہ مجھ سے یہ بہت بڑا عمل ہو گیا، میں نے بڑا تیر مار لیا، اور اب میں جنت کا مستحق ہو گیا ہوں، اس لئے کہ یہ سوچنا ''رؤیت عمل'' اور'' خود پسندی'' ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔ بہر حال! نیک عمل کا ایک نقد فائدہ تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے ''رجا'' اور ''امید'' بندھ جاتی ہے۔

نیک عمل کا دوسرا نقد فائدہ

نیک عمل کا دوسرا نقد فائدہ ''تعلق مع اللہ'' کا پیدا ہونا ہے، تم جو بھی نیک عمل کرو گے، وہ نیک عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ کرے گا، اور اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھائے گا، اور تمام کامیابیوں کی جڑ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا مضبوط ہونا ہے۔ مثلاً آپ نے فجر کی نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہو گیا، پھر ظہر کی نماز پڑھی تو اب تعلق میں اضافہ ہو گیا، پھر عصر کی نماز پڑھی، پھر مغرب اور عشاء پڑھی، تو ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر ایک انسان دوسرے انسان

سے ملاقات کرے تو ایک حد تک تو ملاقات کرنے سے محبت بڑھتی ہے، اور تعلق میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن ایک حد ایسی آجاتی ہے کہ انسان زیادہ ملاقات کرنے سے زچ ہو جاتا ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ یہ شخص تو ہر وقت سر پر کھڑا رہتا ہے، آخر کار اس کو جھڑک دے گا کہ تو نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ لہٰذا زیادہ ملنے سے بعض اوقات ملال پیدا ہو جاتا ہے، اور اکتاہٹ ہو جاتی ہے، اور آدمی زچ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا" یعنی ایک دن کے وقفے سے ملاقات کرو تو محبت میں اضافہ ہوگا۔

تم ہی اکتا جاؤ گے

لیکن اللہ جل شانہ کا معاملہ یہ ہے کہ جتنی مرتبہ ملاقات کرو گے، اتنا ہی تعلق میں اضافہ ہوگا، ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "إِنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوا" اللہ تعالیٰ تمہاری بار بار ملاقات کرنے سے نہیں اکتاتے، حتیٰ کہ تم خود ہی اکتا جاؤ۔ لہٰذا جتنی عبادت چاہو کرو، جتنا چاہو اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھاؤ، وہ تعلق بڑھتا چلا جائے گا، اس میں ملال پیدا نہیں ہوگا، لہٰذا ہر نیک عمل اللہ تعالیٰ سے تعلق میں اضافہ کا سبب ہے، اور جتنا اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھتا جائے گا، اتنا ہی سرور اور کیف حاصل ہوگا، اتنا ہی سکون حاصل ہوگا، اور اتنا ہی گناہوں سے بچنے کی قوت پیدا ہوگی، اتنی ہی شیطان کے حملوں سے حفاظت ہوگی۔ نفس و شیطان اس وقت حملہ آور ہوتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ سے تعلق میں کمی ہوتی ہے، ایسی صورت میں کبھی نفس بہکا دیتا ہے، اور کبھی شیطان بہکا دیتا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو گیا تو اب شیطان کمزور ہو جائے گا، اور وہ حملہ آور نہیں ہوگا۔ لہٰذا ہر نیک عمل کا نقد فائدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ کرتا ہے، دو نقد فائدے تو یہ ہوئے۔

نیک عمل کا تیسرا نقد فائدہ

تیسرے نقد فائدے کا حضرت والا نے یہاں ذکر نہیں فرمایا، لیکن دوسری جگہوں پر

اس کا ذکر آیا ہے، اور خود قرآن کریم نے اس فائدے کا ذکر کیا ہے، وہ یہ کہ نیک عمل انسان کے قلب کو اطمینان، سکون اور طمانیت عطا کرتا ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

یعنی اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اطمینان اور سکون ایسی متاع ہے کہ لاکھوں، کروڑوں خرچ کرنے سے بھی حاصل نہیں ہوتی، کہیں بازار میں یہ نہیں ملتی۔ البتہ نیک اعمال کی یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کے قلب کو سکون و طمانیت عطا کرتے ہیں، اور یہ طمانیت وہ دولت ہے کہ شاید دنیا میں اس کے برابر کوئی دولت نہ ہو۔ ایک آدمی کے پاس مال و دولت ہے، کوٹھی ہے، بنگلے ہیں، نوکر چاکر ہیں، لیکن دل میں سکون و طمانیت نہیں تو اس کے لئے یہ سب دولتیں بے کار ہیں۔ لیکن ایک دوسرا شخص ہے اس کے پاس مٹی کا گھر ہے، جھونپڑی ہے، لیکن دل میں اطمینان اور سکون ہے، تو یہ دوسرا شخص پہلے والے شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر میں اپنی عبادت میں سکون کی خاصیت رکھی ہے، اور یہ نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو اس دنیا میں حاصل ہوتا ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کا مقولہ

چنانچہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا کے بادشاہوں کو پتہ لگ جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی لذت اور سکون والی زندگی عطا فرما رکھی ہے تو وہ بادشاہ تلواریں سونت کر ہم سے یہ دولت چھیننے کے لئے آجائیں کہ یہ ہمیں دو، لیکن ان بے وقوفوں کو یہ پتہ نہیں کہ یہ دولت اس طرح تلواروں کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ دولت تو اللہ جل شانہ کی بارگاہ سے حاصل ہوتی ہے، اس کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے حاصل ہوتی

ہے۔ بہر حال! یہ سکون کا حاصل ہونا نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو دنیا ہی میں حاصل ہو جاتا ہے۔

نیک عمل کا چوتھا فائدہ

نیک عمل کا چوتھا فائدہ یہ ہے کہ ایک نیک عمل دوسرے نیک عمل کا ذریعہ بنتا ہے، جب تم ایک نیک عمل کرو گے تو وہ تمہیں دوسرے نیک عمل کی طرف کھینچے گا۔ گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کی طرف کھینچتا ہے، اسی طرح جب تم نے ایک نیک عمل کیا تو تمہیں دوسرے نیک عمل کی توفیق ہو جائے گی۔ بہر حال! نیک عمل کے یہ چار نقد فائدے ہیں، جو انسان کو دنیا ہی میں مل جاتے ہیں۔

گناہوں کا پہلا نقصان

آگے فرمایا کہ اسی طرح اعمال سیئہ کا ایک ثمرہ ادھار ہے، اور ایک نقد۔ یعنی گناہوں کا ایک نتیجہ تو ادھار ہے، جو آخرت میں ملے گا، وہ ہے عذاب جہنم، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔ اور گناہوں کا نقد نتیجہ وحشت، ظلمت اور بے چینی ہے، جو گناہوں کو لازم ہے، یعنی گناہوں کے اندر بے چینی اور ظلمت اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہے، کسی کا مذاق ہی بگڑ جائے، اور ذائقہ ہی خراب ہو جائے تو اس کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ ظلمت ہے اور بے چینی ہے، بلکہ وہ اس کو مزیدار سمجھتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ ظلمت اور بے چینی ہے، اور اس کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

گناہوں کی لذت کی مثال

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے گناہوں کی لذت کی ایک بہترین مثال بیان فرمائی کہ

گناہوں کی لذت ایسی ہے جیسے کسی کو خارش کی بیماری ہو تو اس کو کھجانے میں مزہ آئے گا، یہاں تک کہ لوگوں نے کہہ دیا کہ دنیا میں دو ہی چیزوں میں مزہ ہے، یا کھاج میں، یا راج میں، یعنی یا تو کھجانے میں مزہ آتا ہے، یا راج اور حکومت کرنے میں مزہ آتا ہے، کھجانے میں اتنی لذت ہے کہ اس کو حکومت کے ساتھ ملا کر ذکر کیا، اور واقعۃً جب انسان کو خارش ہو تو کھجانے میں اتنا مزہ آتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں، اس سے بچنا مشکل ہوتا ہے، لیکن جب کھجانا چھوڑا تو اب اس جگہ پر مرچیں لگنی شروع ہو گئیں، اور وہ بیماری اور بڑھ گئی، پھر دوبارہ کھجایا تو پھر مزہ آیا، لیکن بیماری اور بڑھ گئی، اس طرح کھجانے کے نتیجے میں بیماری بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہی معاملہ گناہوں کا ہے کہ گناہ کرنے سے لذت آتی تو ہے لیکن وہ لذت بالآخر ٹیسیں، ظلمت اور بے چینی چھوڑ جاتی ہے۔

مذاق ہی بگڑ جائے تو

ہاں! اگر کسی کا مذاق ہی بگڑ جائے تو پھر اس کو گناہ کے بعد بے چینی اور ظلمت محسوس نہیں ہوتی، جیسے اگر کسی کو بدبو کا احساس ہی ختم ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بدبو کے اندر کھڑا ہونے میں مزہ آتا ہے، میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک جگہ پر کوڑے کا ڈھیر تھا، اور اس کوڑے میں سے شدید بدبو اٹھ رہی تھی، کہ قریب سے گزرنا مشکل تھا۔ لیکن ایک آدمی جو پاگل تھا، وہ اس کوڑے کے ڈھیر کے درمیان میں کھڑا ہے، اور ایک کتا جو ایک بوٹی اٹھا کر لے جا رہا تھا، اس شخص نے اس کتے سے وہ بوٹی چھین لی، اور اس پر فاتحانہ خوشی کا اظہار کر رہا تھا کہ میں کامیاب ہو گیا، اور فاتحانہ انداز میں قہقہے لگا رہا تھا، اس شخص کو کوئی بدبو نہیں آ رہی تھی، کیوں؟ اس لئے کہ اس کی حس مٹ چکی تھی، اور اس کی حس خراب ہو گئی تھی، اس نتیجے میں یہ مردار اور یہ گندگی اس کو دولت معلوم ہو رہی تھی۔

جب تقوی کی حِس مٹ جائے تو

اسی طرح جب انسان کے اندر سے ایمان کی اور تقوی کی حِس مٹ جاتی ہے تو مذاق خراب ہو جاتا ہے، اور پھر آدمی گناہوں کو بھی لذت کی چیز سمجھتا ہے، اور پھر اس کو گناہوں کے اندر نہ ظلمت محسوس ہوتی ہے اور نہ وحشت محسوس ہوتی ہے، اور اللہ بچائے، یہ بڑی خطرناک بات ہے، اس لئے کہ حقیقت یہ ہے کہ گناہوں کے اندر ظلمت اور بے چینی ہے، اور وحشت ہے، لہٰذا گناہوں کا نقد نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہ کرنے کے بعد سکون قلب حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان لوگوں کو دیکھو جن کو دنیا کے اندر دولت، عزت، شہرت اور آرام کے اسباب میسر ہیں، اس کے باوجود وہ خودکشی کر رہے ہیں، کیوں خودکشی کر رہے ہیں؟ اگر پیسے نہ ہوتے اور پھر خودکشی کرتے تو ایک بات تھی، سب کچھ ہونے کے باوجود جو خودکشی کر رہے ہیں، وہ اس لئے کہ دل میں سکون میسر نہیں۔

گناہوں کا دوسرا نقد نقصان

گناہوں کا دوسرا نقد نقصان یہ ہے کہ یہ انسان کی عقل خراب کر دیتا ہے، گناہ انسان کے سامنے اچھائی کو برائی، اور برائی کو اچھائی بنا کر پیش کرتا ہے، یہ بھی ظلمت ہی کا ایک حصہ ہے، اور یہ بھی گناہ کا نقد نقصان ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں گناہوں سے بھی اور گناہوں کے نقصانات سے بھی محفوظ فرمائے، آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

جلد ۷

اصلاحی مجالس

بسلسلہ تہذیبِ اخلاق و تربیتِ باطن

- ''صبر'' ایک عظیم عبادت
- ایک تکلیف اور تین ثواب
- تکالیف ترقی درجات کا سبب ہیں
- مصیبت میں نورانیت
- راحت حاصل کرنے کا طریقہ
- تفویض کی حقیقت
- توکل کی حقیقت

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

اصلاحی مجالس

۷

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

میمن اسلامک پبلشرز

مجالس ❁ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب ❁ محمد عبداللہ میمن استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

مقام خطاب ❁ جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب ❁ رمضان المبارک / بعد نماز ظہر

اشاعت اول ❁ 2011ء

ناشر ❁ میمن اسلامک پبلشرز

باہتمام ❁ محمد مشہود الحق کلیانوی : 0313-920 54 97

کمپوزنگ ❁ عبدالماجد پراچہ

قیمت ❁ =/ روپے

حکومت پاکستان کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر:

ملنے کے پتے

☆ میمن اسلامک پبلشرز، کراچی۔:20 88 241-0322

☆ مکتبہ دارالعلوم، کراچی ۱۴۔ ☆ مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار، لاہور۔

☆ دارالاشاعت، اُردو بازار، کراچی۔

☆ ادارۃ المعارف، دارالعلوم، کراچی ۱۴۔

☆ مکتبہ معارف القرآن، دارالعلوم، کراچی ۱۴۔

☆ کتب خانہ اشرفیہ، قاسم سینٹر، اُردو بازار، کراچی۔

☆ مکتبۃ العلوم، سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔

☆ مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، نزد جامعہ فاروقیہ، کراچی۔

عرضِ مرتب

استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، اللہ جل شانہ نے علم ظاہری و باطنی دونوں سے نوازا ہے، ایک طرف آپ شیخ الحدیث ہیں تو دوسری طرف آپ پیر طریقت بھی ہیں، جس طرح طبیب جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں، اسی طرح آپ روحانی بیماریوں کا علاج فرماتے ہیں، اور اس وقت سینکڑوں روحانی مریض آپ کے زیر علاج ہیں۔

''رمضان المبارک'' کو اصلاحِ باطن کے لئے خاص مناسبت حاصل ہے، اس لئے حضرت والا مدظلہم نے اصلاح باطن کی مجالس کے لئے اس مہینے کو منتخب فرمایا، چنانچہ کئی سالوں سے رمضان المبارک میں بعد نماز ظہر اصلاحی مجالس کا سلسلہ جاری ہے، اور سینکڑوں طالبین اصلاح اس مجلس سے فیضیاب ہورہے ہیں۔

احقر کو اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کی صحبت اور آپ کے قرب کی عظیم نعمت سے محض اپنے فضل و کرم سے نوازا ہے، چنانچہ اس قرب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احقر نے وہ مجالس ریکارڈ کرلیں، اور اب ان حضرات تک ان مجالس کو پہنچانے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جو دور ہونے کی وجہ سے براہ راست ان مجالس سے فیضیاب نہیں ہوئے، اب ان مجالس سے اٹھانا، اور ان پر عمل کرکے اپنی زندگیوں میں تبدیلی لانا آپ کا کام ہے، اللہ تعالیٰ حضرت والا کے درجات بلند فرمائے، آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے، اور مجھے اور آپ سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

محمد عبداللہ میمن

دارالعلوم کراچی۱۴، ۹ر شعبان ۱۴۲۱ھ

اجمالی فہرست

اصلاحی مجالس　　جلد نمبر : ۷

فہرستِ مضامین (تفصیلی فہرست)

عنوان	صفحہ نمبر

خوف کے درجات

مجلس نمبر ۱

عنوان	صفحہ نمبر

''صبر'' ایک عظیم عبادت

مجلس نمبر ۳

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

راحت حاصل کرنے کا طریقہ

مجلس نمبر ۹

عنوان	صفحہ نمبر

اسباب کی موجودگی میں ''توکل'' مطلوب ہے

مجلس نمبر 107

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خوف کے درجات

مجلس نمبر 95

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی.

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 95

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

خوف کے درجات

مجلس نمبر95

الحمد لله ربّ العلمين ، والعاقبة للمتقين ، والصّلاة والسّلام على رسوله الكريم ، و على آله اصحابه اجمعين ، اما بعد!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

''ایک ''خوف'' تو بمعنی عقلی عذاب ہے، یہ تو شرط ایمان ہے، اور ایک درجہ خوف کا یہ ہے کہ تقاضائے معصیت کے وقت آیات اور عذاب خداوندی کو یاد کر کے سوچ سوچ کے گناہوں سے بچا جائے، یہ درجہ فرض ہے، اس کے فقدان سے کفر نہ ہوگا، ہاں! گناہ ہوگا۔ اور ایک درجہ خوف کا یہ ہے کہ مراقبات واشغال سے آیات وعید اور عظمت وجلال حق کو ہر دم متحضر اور پیش نظر رکھا جائے، یہ درجہ مستحب ہے، اور سب درجات مکتسب ہیں، جو کسب سے حاصل ہو جاتے ہیں، اور ان سے آگے ایک اور درجہ

ہے، جو اختیار سے باہر ہے، وہ یہ کہ آثار خوف اس قدر غالب ہو جائیں کہ اگر ان کو کم کرنا یا بھلانا بھی چاہے تو اختیار و قدرت سے باہر ہو، یہ محض وہبی ہے، جو درجات سابقہ مکتسبہ کے حاصل کرنے کے بعد محض عطاءِ حق سے بعض کو حاصل ہو جاتا ہے، ایسا ہی اس کے مقابلے میں "رجا" کے بھی درجات ہیں، ایک درجہ شرط ایمان بمعنی احتمال نجات، اور ایک درجہ فرض ہے، اور ایک درجہ مستحب ہے، اور ایک درجہ محض وہبی ہے" (انفاس عیسی، ص:۲۰۶)

اللہ کا خوف مطلوب ہے

اس چھوٹی سی عبارت میں حضرت تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "خوف" اور "رجا" کے سارے درجات کا بیان فرمادیا۔ پہلے "خوف" کے درجات بیان فرمائے ہیں، اور پھر "رجا" کے درجات بیان فرمائے ہیں، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ایک مؤمن کے اندر یہ دونوں چیزیں ہونی ضروری ہیں "الایمان بین الخوف الرجاء" قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ سے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے کا ذکر ہے، اس لئے یہ "ڈرنا" مطلوب ہے، قرآن کریم میں ہے کہ:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ، فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى (النزعٰت: ۴۰، ۴۱)

لہٰذا انسان اس بات سے ڈرے کہ مجھے ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور اپنے اعمال کا جواب دینا ہے، یہ "ڈر" مطلوب ہے۔

خوف کا پہلا درجہ شرط ایمان ہے

لیکن اس ''ڈر'' کے درجات مختلف ہیں، ''ڈر'' اور خوف کا ایک درجہ تو وہ ہے جو شرط ایمان ہے، اگر ''خوف'' کا یہ درجہ حاصل نہ ہو تو وہ آدمی مؤمن ہی نہیں، بلکہ کافر ہے، وہ خوف کیا ہے؟ وہ ''خوف'' یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اس بات کا احتمال ہو کہ شاید مجھے کہیں اللہ تعالیٰ میری بدعملی پر عذاب نہ دیدے، اور میرے کسی گناہ اور ناجائز عمل کی بنا پر مجھے موردِ غضب نہ بنالے۔ یا یوں کہا جائے کہ اس بات پر ایمان ہونا کہ اگر کوئی شخص کفر کرے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ہوگا، لہٰذا خدا نہ کرے اگر میں بھی کفر میں مبتلا ہوا تو مجھ کو بھی عذاب ہوگا، اس بات پر اعتقاد ''شرط ایمان'' ہے، اگر کسی کو یہ اعتقاد حاصل نہ ہو تو وہ مؤمن ہی نہیں، گویا کفر پر عذاب کا ترتب ہونا اور یہ احتمال دل میں رہنا کہ کہیں میں موردِ عذاب نہ بن جاؤں، یہ احتمال دل میں رہنا ''شرط ایمان'' ہے، اگر یہ اعتقاد نہیں تو ایمان ہی نہیں، بہر حال! یہ ''خوف'' کا ادنیٰ درجہ ہے، جو مدارِ ایمان ہے۔

خوف کا دوسرا درجہ فرض ہے

''خوف'' کا دوسرا درجہ حضرت والا نے جو بیان فرمایا، وہ یہ ہے کہ جب دل میں گناہ کا تقاضہ اور داعیہ پیدا ہو، یا گناہ کا کوئی موقع سامنے آجائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر اپنے آپ کو اس گناہ سے بچانا۔ مثلاً دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ میں جھوٹ بولوں، اب اس وقت یہ تصور کرنا کہ جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہے، اور اگر میں جھوٹ بولوں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دیں گے، اس

عذاب کا تصور اور استحضار کر کے اپنے آپ کو اس جھوٹ سے بچانا "خوف" کا یہ درجہ فرض ہے، اگر "خوف" کا یہ درجہ کسی انسان کو حاصل نہ ہو تو وہ کافر تو نہیں ہوگا، لیکن فرض کا تارک کہلائے گا، گویا کہ وہ شخص ایسا ہے جیسے اس نے فرض نماز چھوڑ دی، فرض روزہ چھوڑ دیا، یا مثلاً دل میں بدنظری کا تقاضا پیدا ہوا، اس وقت اپنے دل میں بدنظری کے عذاب کا استحضار کر کے اس عذاب سے ڈر کر اپنے آپ کو اس "بدنظری" سے بچانا فرض ہے، اب اگر اس نے اس وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب کا استحضار نہ کیا، اور وہ گناہ کر گزرا تو وہ شخص فرض کا تارک ہوا، جیسے فرض نماز اور فرض روزے کا تارک۔

خوف کا نتیجہ مقصود ہے

یہی وہ بات ہے جس کو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى، فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى (النزعت: ۴۰، ۴۱)

یعنی جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا، اور اس ڈر کے نتیجے میں اپنے نفس کو خواہشات نفسانی کے پیچھے چلنے سے روک دے تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ "خوف" بذات خود مقصود نہیں، بلکہ "خوف" کا نتیجہ مقصود ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف ہو، اور اس کے نتیجے میں انسان اپنے نفس کو خواہشات کے پیچھے چلنے سے روک دے، یہاں یہ ہی بتایا جا رہا ہے کہ وہ "خوف" جو انسان کو نفسانی

خواہشات کے پیچھے چلنے سے روک دے، خوف کا یہ درجہ فرض ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ خوف کا یہ درجہ حاصل کرے، اگر کسی کو خوف کا یہ درجہ حاصل نہیں ہے تو وہ فرض کا تارک ہے۔

گناہ ہونا جیسے پہاڑ کا ٹوٹ پڑنا

جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں، اگر ان سے شریعت کے خلاف کوئی عمل ہو جائے تو ان پر ایسا گراں ہوتا ہے، جیسے ان کے اوپر پہاڑ ٹوٹ پڑا،

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

یعنی سالک کے دل پر ہزاروں غم طاری ہو جاتے ہیں، اگر اس کے دل کے باغ میں سے ایک خلال بھی کم ہو جائے، اور ایک گناہ بھی سرزد ہو جائے۔ اور جو شخص فاسق و فاجر ہے، اس سے اگر گناہ ہو جائے تو وہ اس کی نظر میں ایسا ہے جیسے کوئی مکھی اس کی ناک پر بیٹھی اور اس نے اس کو اُڑا دیا، اس کو اس گناہ کی کوئی پرواہ بھی نہیں ہوتی، یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے، لہٰذا یہ ڈر کہ میں گناہ کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے کیسے کھڑا ہوں گا، کیا منہ لے کر جاؤں گا، ڈر کا یہ درجہ فرض ہے، اس کی تحصیل ضروری ہے، اگر حاصل نہیں ہے تو اس کو حاصل کرو۔

خوف کو حاصل کرنے کا طریقہ

اب ڈر کا یہ درجہ کیسے حاصل ہو؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی وہ آیات تلاوت کرو جس میں جہنم کے عذاب کا ذکر ہے، وہ احادیث پڑھو جس میں

اللہ کے عذاب کا تذکرہ ہے، اس کا استحضار کرو، اس کا تصور کرو، اس کے نتیجے میں دل کے اندر یہ "خوف" پیدا ہوگا۔

خوف کا تیسرا درجہ مستحب ہے

خوف کا تیسرا درجہ وہ ہے جس پر نہ تو ایمان موقوف ہے، اور نہ وہ فرض ہے، بلکہ وہ درجہ مستحب ہے، وہ یہ کہ ابھی گناہ کا تقاضا دل میں نہیں ہے، نہ گناہ کا داعیہ ہے، اور نہ موقع ہے، لیکن اس کے باوجود دل و دماغ میں یہ دھیان اور فکر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا پاؤں پھسل جائے، اور میں گناہ کے اندر مبتلا نہ ہو جاؤں، اور پھر مجھے عذاب کا سامنا کرنا پڑے، لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کھٹکا دل میں رہے، اور اس کے نتیجے میں گناہ کا موقع آنے سے پہلے ہی گناہ سے بچ جائے، یہ خوف مستحب ہے۔

مستحب خوف کی مثال

اس کی مثال یہ سمجھیں جیسے ایک بچہ ہے، جو بڑا شریر ہے، اب ایک صورت تو یہ ہے کہ استاذ ڈنڈا لے کر اس بچے کے سر پر کھڑا ہو، اور اس سے کہے تو شرارت سے باز آجا، چنانچہ وہ بچہ مار کے ڈر اور خوف کے نتیجے میں شرارت سے باز آگیا۔ دوسرے یہ کہ استاذ اس کے اوپر ڈنڈا لے کر کھڑا نہ ہو، لیکن اس بچے کے دماغ میں ہر وقت یہ تصور ہو کہ میں استاذ کی نگرانی میں ہوں، اگرچہ اس وقت تو استاذ مجھے نہیں دیکھ رہے ہیں، لیکن کسی بھی وقت استاذ مجھے شرارت کرتے ہوئے دیکھ لیں گے، اور مجھے سزا دیں گے، تو یہ کھٹکا جو اس بچے کے دماغ پر چھایا

ہوا ہے، یہ خوف کا تیسرا درجہ ہے،

اس کا نام ''خلش'' اور ''تقویٰ'' ہے

لہٰذا یہ کھٹکا کہ مجھ سے کہیں گناہ نہ ہو جائے، کہیں میں پھسل نہ جاؤں، کہیں غلطی نہ ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے، یہ خوف کا تیسرا درجہ ہے، جس کو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ''خلش'' سے تعبیر کیا کرتے تھے، اور حضرت فرماتے تھے کہ ''تقویٰ'' کا ترجمہ ہے ''خلش'' یعنی کھٹک دل میں ہے کہ کہیں مجھ سے گناہ نہ ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے محروم فرمادیں، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اللہ کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے۔

انبیاء ہر وقت اللہ سے ڈرتے ہیں

دیکھئے! انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ سے ڈر رہے ہیں، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رو رہے ہیں، گڑگڑا رہے ہیں، وہ کس بات پر رو رہے ہیں؟ جبکہ گناہوں سے معصوم ہیں، گناہ تو ان سے سرزد ہی نہیں ہوسکتا، اس کے باوجود رو رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے ڈر رہے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو میری آنکھ کھلی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہیں پایا، اندھیرا تھا، اس لئے میں نے ہاتھ سے ٹٹولا کہ آپ کہاں ہیں، تو میرا ہاتھ آپ کے پائے مبارک کے انگوٹھے پر پڑا، اس وقت آپ سجدے میں پڑے ہوئے تھے، اور یہ دعا فرمارہے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ، وَاَعُوْذُبِكَ مِنْكَ، لَااُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ، اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ۔

اے اللہ! میں آپ کی رضا مندی کی پناہ مانگتا ہوں آپ کی ناراضگی سے، اے اللہ! آپ سے معافی کی پناہ مانگتا ہوں آپ کے عذاب سے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ کس چیز کی پناہ مانگ رہے ہیں؟ جبکہ آپ کے بارے میں یہ اعلان ہو چکا ہے کہ:

لِیَغْفِرَلَكَ اللّٰهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَاتَأَخَّرَ (الفتح: ۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے۔ اولاً تو آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا، اور اگر کوئی بھول چوک ہوئی بھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ ہم نے سب معاف کر دیے، اس کے باوجود رات کو سجدے میں پڑے ہوئے رضا مندی طلب کر رہے ہیں، اور ناراضگی سے پناہ چاہ رہے ہیں۔

انبیاء کو ڈر کیوں؟

یہ سب کیوں ہے؟ دراصل وہی کھٹک ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا استحضار ایسا ہے کہ ہر وقت یہ خطرہ لگا ہوا ہے کہ کہیں کوئی فعل اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کے خلاف مجھ سے سرزد نہ ہو جائے، جو اس کے شایان شان نہ ہو، اس لئے کہ "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ" جو عمل ان کی شان کے خلاف ہوگا تو وہ میرے لئے گناہ ہی ہے، یہ "خلش" ہے، اور ڈر کا وہ درجہ ہے جو مستحب

ہے، اور جس کو حاصل کرنا چاہئے، اس لئے کہ جب تک یہ درجہ حاصل نہ ہو، اس وقت تک ''خوف'' کا فرض درجہ حاصل کرنا بھی مشکل ہے، اس لئے یہ ''کھٹک'' حاصل کرنی ہے۔

تعمیر کعبہ کے وقت اللہ سے ڈر

حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ شریف کی تعمیر فرمارہے ہیں، اتنا بڑا عمل انجام دے رہے ہیں کہ قیام قیامت تک جتنے لوگ اس بیت اللہ میں عبادت کریں گے سب کا اجر وثواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نامہ اعمال میں لکھا جا رہا ہے، لیکن بیت اللہ کی تعمیر کے وقت زبان پر یہ دعا جاری ہے:

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

(البقرة:۱۲۸)

اے اللہ ہمیں مناسک حج کا علم عطا فرما دیجئے، اور ہماری توبہ کو قبول فرما لیجئے، آپ توبہ قبول کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ توبہ تو کسی گناہ سے کی جاتی ہے، جبکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کر رہے ہیں، ساری دنیا کے انسانوں کے لئے ایک معبد تعمیر کر رہے ہیں، لیکن اس وقت بھی دعا یہ کر رہے ہیں کہ یا اللہ! مجھے معاف کر دیجئے، ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اس لئے کہ دل میں کھٹکا لگا ہوا ہے کہ میں یہ عمل کر تو رہا ہوں، مگر میرا یہ عمل اللہ جل شانہ کے شایان شان ہے یا نہیں؟ کوئی کام ایسا نہ ہو جائے جو اس کی شان کے خلاف ہو، اور اس کے نتیجے میں کہیں اللہ کے غضب کا مورد نہ بن جاؤں، سارے انبیاء علیہم

السلام مغفرت مانگ رہے ہیں، کیوں؟ دراصل یہ کھٹک ہے جس کو حضرت والا ''خلش'' سے تعبیر کر رہے ہیں، اسی خلش کا نام ''تقویٰ'' ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عطا فرمائے، آمین۔

مستحب درجہ فرض درجے کے حصول کا ذریعہ

''خوف'' کا یہ درجہ مستحب ہے کہ انسان کے دل میں ہر وقت یہ کھٹک اور خلش رہے، یہ فرض نہیں، اس لئے کہ اگر فرض کہہ دیں گے تو پھر اگر ایک لمحہ کے لئے بھی ''خوف'' جاتا رہا تو ہم فرض کے تارک ہو جائیں گے، لہٰذا اس کو فرض تو نہیں کہیں گے، لیکن یہ ایسا مستحب ہے کہ اگر اس کا اہتمام نہ کیا جائے تو فرض کی ادائیگی بھی مشکل ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے ہماری آسانی کے لئے اس کو فرض قرار نہیں دیا کہ یہ لوگ کمزور ہیں، اور ہر وقت خوف کا استحضار نہ رکھ سکیں گے۔ البتہ اس کو مستحب قرار دیدیا، کیونکہ اگر ہر وقت اللہ کا خوف مستحضر نہ ہو تو گناہ کے تقاضے کے وقت خوف کو مستحضر کرنا مشکل ہوگا۔

ہر وقت جہنم کا استحضار کرو

اس لئے کہ ایک طرف گناہ کا تقاضہ اور داعیہ پیدا ہو رہا ہے، اور دوسری طرف تم عذاب کا استحضار لانا چاہ رہے ہو، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں میں سے جو قوی ہوگا وہ جیت جائے گا، اگر گناہ کا داعیہ قوی ہوگا تو وہ انسان کو گرادے گا، اور تم عذاب کا استحضار اپنے ذہن میں لانے کی فکر میں ہی رہو گے، اور وہ اپنا کام کر جائے گا۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ہر وقت دل میں جہنم

کے عذاب کا استحضار رہے، اگر وہ دل میں رہے گا تو اس کے اندر پائیداری ہوگی، اور پائیداری کے نتیجے میں اس کے اندر قوت زیادہ ہوگی، اور اس قوت کے نتیجے میں وہ گناہ کے تقاضے پر غالب آجائے گا، اور اس تقاضے کو دبا دے گا۔ بہرحال! خوف کے اس درجہ کا نام تو "مستحب" ہے، لیکن یہ "مستحب" ایسا ہے کہ اس کے بغیر فرض کی ادائیگی بھی مشکل ہے، لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا تصور کیا کرو۔

اپنی موت کا مراقبہ کیا کرو

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ وقت نکال کر یہ تصور کیا کرو کہ میری روح پرواز کرگئی ہے، اور مجھے موت آگئی ہے، اور میں قبر میں چلا گیا، اور پھر وہاں میرے ساتھ یہ معاملات پیش آئے، قبر میں فرشتے آئے، انہوں نے مجھ سے سوالات کئے، میں نے جواب دیئے، پھر حشر کے میدان میں مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کردیا گیا، میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں، اور میرے اعمال میرے سامنے آرہے ہیں، اور جنت بھی میرے سامنے ہے، اور جہنم بھی میرے سامنے ہے۔ روزانہ تھوڑی دیر بیٹھ کر ان باتوں کا تصور کیا کرو۔ حدیث شریف میں ہے کہ

"حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا"

وہ حساب تو اپنے وقت پر ہوگا، اس سے پہلے اپنا حساب خود کرلیا کرو۔ اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ دل میں وہ خلش اور کھٹک پیدا ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ

اپنے فضل سے ہم سب کے دل میں یہ خلش پیدا فرما دے، آمین۔

یہ تینوں درجات کسبی ہیں

آگے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ "خوف" کے یہ تینوں درجات جو میں نے بیان کئے، ان میں پہلا شرط ایمان ہے، دوسرا فرض ہے، تیسرا مستحب ہے، یہ تینوں درجات کسبی ہیں، اور اختیاری ہیں، ان کو حاصل کرنا اختیار سے باہر نہیں، بلکہ انسان اپنی محنت سے، کوشش سے اور مشق سے یہ تینوں درجات حاصل کرسکتا ہے، البتہ "مستحب" درجے سے شروع کرو، اس لئے کہ سیڑھی یہی ہے، اس کے نتیجے میں فرض کا درجہ اور شرط ایمان والا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔

خوف کا چوتھا درجہ جو وہبی ہے

آگے حضرت والا فرماتے ہیں کہ خوف کا ایک چوتھا درجہ ہے، جو وہبی اور غیر اختیاری ہے، اور کسب سے باہر ہے، اس لئے وہ درجہ مأمور بہ بھی نہیں ہے۔ اگر خوف کا یہ درجہ کسی کو حاصل نہ ہو تو کوئی مضائقہ بھی نہیں، اگر حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، وہ درجہ یہ ہے کہ انسان پر خوف کے آثار اس حد تک غالب ہو جائیں کہ اگر وہ بھلانا بھی چاہے تو نہ بھلا سکے، مثلاً یہ کہ ہر وقت سامنے جہنم نظر آ رہی ہے، ہر وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب کا استحضار ہے، اور اس حد تک ہے کہ اگر انسان اس کو اپنے دماغ سے نکالنا چاہے تو نہ نکال سکے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت

حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ جو آتا

ہے کہ ''كَانَ دَائِمَ الْفِكْرَةِ مُتَوَاصِلَ الْاَحْزَانِ '' یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت کسی سوچ میں رہتے تھے، اور ایک غم کے بعد دوسرا غم آپ کے دل ودماغ پر چھایا رہتا تھا، یہ فکر کس چیز کی تھی؟ یہ امت کی فکر تھی، اللہ جل شانہ کی رضا حاصل کرنے کی فکر تھی، امت کو عذاب سے بچانے کی فکر تھی، یہ سارے افکار تھے، اوران افکار کو بھلانے کے باوجود وہ نہیں بھولتے تھے، حتی کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء:۳)

کیا آپ اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے اس وجہ سے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دل ودماغ پر امت کی فکر اس درجہ غالب تھی کہ گویا جان ہلاک ہونے والی نظر آتی تھی، اور بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی کے باوجود وہ فکر دماغ سے نہیں نکلتی تھی، یہ دراصل غیر اختیاری فکر تھی، جس طرح یہ فکر انبیاء علیہم السلام کو ہوتی ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا پیغام پھیلانے والوں کو بھی ہوتی ہے، اور یہ فکر ایسی ہوتی ہے کہ اگر انسان کسی وقت اپنے آپ کو اس سے فارغ کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کیفیت

حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں دعوت کا جذبہ اس طرح رکھ دیا تھا، جیسے انسان کے اندر حوائج طبعیہ ہوتے ہیں، جیسے بھوک لگ رہی ہو تو انسان کو کھائے بغیر چین نہیں آتا، پیاس لگ رہی ہو تو پانی پیے بغیر چین نہیں

آتا، اسی طرح حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دیئے بغیر چین نہیں آتا تھا، ہر وقت دل و دماغ پر دعوت کی فکر مسلط رہتی تھی کہ فلاں تک کس طرح حق بات پہنچادوں، فلاں کو کس طرح گمراہی سے نکال دوں، فلاں کو کس طرح راہ راست پر لے آؤں۔ بہر حال! انبیاء علیہم السلام کے وارثوں کو بھی یہ فکر ہو جاتی ہے، اگر انسان اس کو اپنے ذہن سے نکالنا بھی چاہے تو نہیں نکال سکتا، اس لئے یہ حالت غیر اختیاری اور وہبی ہے، اگر حاصل ہو جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور نعمت ہے، لیکن اگر حاصل نہ ہو تو کوئی نقص بھی نہیں، اس لئے اس کو حاصل کرنے کی فکر میں زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں، البتہ "خوف" کے جو پہلے تین درجے ہیں، ان کو حاصل کرنا ضروری ہے۔

خوف حاصل کرنے کا طریقہ

اور خوف کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر بیٹھ کر یہ تصور کیا کرو کہ میری روح نکل گئی ہے، اب مجھے غسل دیا جارہا ہے، اب کفن پہنایا جارہا ہے، اب میری نماز جنازہ ہو رہی ہے، اب قبر کی طرف مجھے لے جارہے ہیں، اب مجھے قبر کے اندر لٹا دیا گیا، قبر بند کر کے لوگ چلے گئے، اب فرشتے آگئے، اب سوال و جواب شروع ہو گیا، پھر عالم برزخ شروع ہو گیا، پھر قیامت قائم ہو گئی، اب میزان عمل قائم ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہیں، اعمال کا وزن ہو رہا ہے۔ یہ تصور کیا کرو، اور دنیا کی بے ثباتی کا تصور کیا کرو۔

یہ کتاب بار بار پڑھو

ہمارے حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب جس سے سب سے زیادہ

فائدہ پہنچا، وہ ہے "مرنے کے بعد کیا ہوگا؟" یہ بڑی اچھی کتاب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا میں اس کتاب کا فیض پھیلا دیا، لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔ اس کتاب کا مقصد یہی ہے کہ اس کو پڑھ کر ذرا سوچو کہ یہ زندگی جو صبح سے شام تک گزر رہی ہے، بس یہی زندگی نہیں ہے، بلکہ ایک اور زندگی مرنے کے بعد آنے والی ہے، جب آنکھ بند ہوگی تو پھر کیا ہوگا؟ اس کتاب کو بار بار پڑھو، اس کے نتیجے میں موت اور بعد الموت کے مناظر تمہارے سامنے آئیں گے، اس سے "خوف" کا استحضار پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔

وطن کا شوق پیدا کرو

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ہے، جس کا نام ہے "شوقِ وطن" وطن سے مراد آخرت ہے، یعنی ہر مسلمان کے دل میں یہ بات رہنی چاہیے کہ یہ دنیا تو میرا مسافر خانہ ہے، اصل وطن تو آخرت ہے، اس کا شوق ہونا چاہیے، اس شوق کو پیدا کرنے کے لئے حضرت والا نے یہ رسالہ لکھا ہے، اس رسالہ کو پڑھو، اس کے پڑنے سے "خوف" کا استحضار ہوگا۔ اور اگر روزانہ عشا کی نماز کے بعد دو تین منٹ کا وقت مقرر کر کے موت کا مراقبہ کرلو یا سونے سے پہلے کرلو، تو اس کے نتیجے میں انشاء اللہ تعالیٰ خوف کا مطلوب درجہ حاصل ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا و الاٰخرۃ خیر و ابقیٰ "
(سورۃ الاعلیٰ: ۱۶، ۱۷)

لیکن تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو
جبکہ آخرت کی زندگی بہت بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امید کے درجات

مجلس نمبر 96

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط وترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی.

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 96

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امید کے درجات

مجلس نمبر 96

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبۃ للمتقین، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہ وأصحابہ اجمعین۔ امابعد:

تمہید

گزشتہ کل یہ بیان ہوا تھا کہ ''خوف'' کے چار درجات ہیں، جن میں سے پہلا درجہ ایمان کی شرط ہے۔ اسکے بغیر آدمی مسلمان ہی نہیں ہوتا، دوسرا درجہ ایمان کی شرط تو نہیں، لیکن فرض ہے، اور تیسرا درجہ مستحب ہے، اور یہ تینوں درجات کسبی ہیں، یعنی اختیار سے کوشش کر کے محنت کر کے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ چوتھا درجہ خوف کا وہبی ہے اور غیر اختیاری ہے۔ لہٰذا وہ مقصود نہیں۔ اسلئے اسکو حاصل کرنے کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو گزشتہ کل کے بیان کا خلاصہ تھا۔

امید کے چار درجات

اس ملفوظ کے آخر میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''ایسا ہی اسکے مقابلے میں ''رجا'' کے بھی درجات ہیں۔
ایک درجہ شرط ایمان بمعنٰی احتمال نجات اور ایک درجہ فرض ہے،
ایک درجہ مستحب ہے اور ایک درجہ محض وہبی ہے۔''

(انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۶)

جس طرح ''خوف'' کے چار درجات تھے، اسی طرح ''رجا'' یعنی ''امید'' کے بھی چار درجات ہیں۔ پہلا درجہ جو شرط ایمان ہے، اسکے بغیر ایمان ہی کامل نہیں ہوتا۔ وہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اس بات کا اعتقاد ہو کہ عین ممکن ہے کہ اللہ جل شانہ مجھے کسی سزا کے دیئے بغیر یونہی بخش دے۔ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت عطا فرمادی ہے۔ تو ایمان کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ شاید میری ساری بداعمالیوں پر خط نسخ پھیر کر اللہ تعالیٰ مجھے یونہی بے حساب جنت میں داخل فرمادے۔ اس اعتقاد کا دل میں ہونا کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں، یہ اعتقاد ''شرط ایمان'' ہے۔ لہٰذا اگر کسی کے دل میں یہ اعتقاد نہیں تو وہ شخص ایمان ہی سے محروم ہے۔

امید کا پہلا درجہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ اعلان فرمادیا کہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (سورۃ نساء)

یعنی شرک کی اللہ تعالیٰ کے یہاں معافی نہیں ہے۔ اور یہاں جس معافی کا ذکر ہو رہا ہے، وہ توبہ والی معافی کا نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ ''توبہ'' کے

ذریعے تو ''شرک'' بھی معاف ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص ''مشرک'' تھا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کو توبہ کی توفیق دیدی۔ اور وہ مسلمان ہو گیا تو اسکا یہ ''شرک'' کا گناہ معاف ہو جائے گا۔ اس آیت میں بغیر توبہ کے معافی کا ذکر ہو رہا ہے، جو اللہ جل شانہ محض اپنے فضل و کرم سے کسی کو معافی سے نواز دیں۔ بہرحال ہم نے یہ قاعدہ مقرر کر رکھا ہے کہ جو شرک کرے تو بغیر توبہ کے شرک کی معافی ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم اسکو توبہ کے بغیر کبھی بھی معاف نہیں کریں گے۔ لیکن شرک کے علاوہ جتنے مچلے درجہ کے گناہ ہیں، جس کو چاہیں گے معاف فرما دیں گے۔ نہ تو اللہ تعالیٰ پر کوئی زبردستی کرنیوالا ہے کہ آپ ضرور معاف کریں، اور نہ کوئی شخص آپ کی مشیت میں رکاوٹ ڈالنے والا ہے کہ آپ کسی کو معاف کر دیں تو کوئی یہ اعتراض کرے کہ آپ نے اسکو کیوں معاف کر دیا؟ ان کے فیصلے میں کسی کو چوں و چرا کی مجال نہیں۔ لہٰذا یہ احتمال بدرجہ اعتقاد دل میں ہونا کہ کیا پتہ میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہو جاؤں جن کے بارے میں یہ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بلا حساب جنت میں داخل فرما دیں گے۔ یہ احتمال اور اعتقاد دل میں ہونا ''رجا'' کا پہلا درجہ ہے اور شرط ایمان ہے۔

امید کا دوسرا درجہ

''رجا'' کا دوسرا درجہ جو ''فرض'' ہے وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا اللہ تعالیٰ کی شریعت کی طرف سے کسی کام کا حکم متوجہ ہو، مثلاً نماز کا وقت ہو گیا، اذان ہو گئی، تو اب اللہ تعالیٰ کا حکم متوجہ ہو گیا کہ جاؤ، نماز ادا کرو۔ لہٰذا جب نماز کا حکم متوجہ ہوا، اگر اس وقت دل سستی کرے اور طبیعت میں سستی ہو تو

اس سستی کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے دل سے کہے کہ جب اس حکم کی تعمیل کرنے کے لئے جاؤں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے ثواب عطا فرمائیں گے۔ اب ثواب کا تصور کر کے اس سستی کو دور کرے اور مامور بہ کو بجالائے ایسا کرنا فرض ہے۔

امید کی ایک مثال

دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ اگر وہ دل میں ثواب کا تصور نہ لاتا اور جنت کا تصور نہ لانا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا دھیان نہ کرتا تو اس فریضہ کی ادائیگی سے محروم رہ جاتا۔ کیونکہ سستی نے اسکے دل پر غلبہ پالیا تھا۔ نفس وشیطان نے اسکو دبالیا تھا۔ جس کے نتیجے میں یہ اس بات پر آمادہ ہوگیا تھا کہ آج کی نماز چھوڑ دی جائے، لیکن جب اس بات کا تصور کیا کہ میں کیا کر رہا ہوں، اگر میں نفس کے تقاضے کی مخالفت کر کے نماز ادا کرنے کے لئے چلا جاؤنگا تو اللہ تعالیٰ مجھے نواز دیں گے۔ تو اس تصور نے ہمت پیدا کر دی۔ اور نماز کے لئے چلا گیا۔ تو یہ جو "رجا" پیدا ہوئی کہ اس نماز کے پڑھنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مجھے ثواب عطا فرمائیں گے۔ یہ "رجا" کا درجہ فرض ہے۔ اگر یہ رجا نہ ہوتی تو ایک فریضہ چھوٹ جاتا۔ لہٰذا جتنے فرائض شرعیہ ہیں۔ جیسے، نماز، روزہ، زکاۃ، حج وغیرہ ان سب میں یہ امید رکھنا کہ جب ان کو بجا لاؤں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے نواز دیں گے انشاء اللہ، "رجا" کا یہ درجہ فرض ہے۔

اعمال صالحہ پر ثواب کی امید

یہی وہ بات ہے جس کی طرف نبی کریم ﷺ نے احادیث میں کئی جگہوں پر اشارہ فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ جس نیک عمل کی اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق دے

رہے ہیں۔ مثلاً وضو ہے، نماز ہے، روزہ ہے، زکاۃ ہے، حج ہے، تلاوت ہے، تسبیح ہے، ذکرواذکار ہیں وغیرہ جتنے بھی اعمال وافعال صالحہ ہیں۔ ان میں اس بات کا تصور کیا کرو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید کر رہا ہوں کہ میرے اس عمل کو اللہ تعالیٰ قبول فرما کر اپنے فضل وکرم سے مجھے نواز دیں گے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَا نًا وَ احْتِسَا بًا

یعنی جو شخص رمضان المبارک کے روزے رکھے، کس طرح رکھے؟ ایمان کی بنیاد پر کہ دل میں ایمان موجود ہے، وہ ایمان روزے رکھوا رہا ہے، اور احتساب کی بنیاد پر، یعنی ثواب حاصل کرنے کی غرض سے روزہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل وکرم سے نواز کر ثواب عطا فرمائیں گے۔ یہ ''احتساب'' کیا چیز ہے؟ یہ وہی ''رجا'' ہے، یہ ثواب حاصل کرنے کی طلب ہے، اسکی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب عطا فرمائیں گے، یہ امید رکھنا ''فرض'' ہے۔

''عبادت'' عادت بن گئی ہے

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک بات سنی، انہوں نے بڑی اچھی بات ارشاد فرمائی۔ فرمایا کہ ہم لوگ عبادات انجام دیتے رہتے ہیں، مثلاً وضوء کرلیا، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، تلاوت کرلی وغیرہ، اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ روزانہ یہ عبادات انجام دے رہے ہیں، اور روزانہ ہونے کے نتیجے میں ان کی عادت بن گئی ہے، اور عادت بن جانے کی وجہ سے اس طرف خاص دھیان بھی نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہا ہوں، کیا نہیں کر رہا ہوں۔ بس ایک روٹین

بن گئی ہے، اس کے تحت عبادت ہورہی ہے، اور عادت بن جانے کی وجہ سے عبادت میں کیف اور لذت محسوس نہیں ہوتی، اور لذت سے اور کیف سے محرومی ہوجاتی ہے۔ اسلئے حضرت والا نے فرمایا کہ عبادت اس اہتمام سے ادا کرنی چاہیے کہ اس عبادت پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حدیث میں اجر وثواب کے جتنے وعدے فرمائے ہیں، ان اجر وثواب کا دھیان کرے۔

اس دھیان کے ساتھ وضو کرو

مثلاً آپ وضو کر رہے ہیں۔ اور دن میں آپ کئی مرتبہ وضو کرتے ہیں، لیکن وضو کرتے وقت یہ کیفیت ہوتی ہے کہ دل کہیں، دماغ کہیں، دھیان کہیں، اور وضو کر کے ختم کرلیا۔ ایک عادت اور روٹین بن گئی ہے۔ لہٰذا وضو کرتے وقت جب چہرہ دھوتو یہ دھیان کرو کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب انسان وضو کرتے وقت چہرہ دھوتا ہے تو آنکھ سے کئے ہوئے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔ لہٰذا میرے وضو کرنے کے نتیجے میں میرے گناہ دھل رہے ہیں۔ اور جب ہاتھ دھوتو یہ تصور کرو کہ ہاتھ سے کئے ہوئے گناہ دھل رہے ہیں۔ جب پاؤں دھوتو یہ تصور کرو کہ پاؤں کے گناہ دھل رہے ہیں۔ جب اس تصور کے ساتھ وضو کروگے تو اس وضو کی لذت اور کیف ہی اور ہوگا۔ اور عبادت کی حقیقی روح حاصل ہوگی۔

مسجد کی طرف اس دھیان کے ساتھ جاؤ

جب نماز کے لئے مسجد کی طرف جارہے ہوتو یہ سوچو کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آدمی مسجد کی طرف جاتا ہے تو ایک قدم پر ایک گناہ معاف ہوتا ہے، اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ لہٰذا چلتے وقت یہ تصور کرو کہ ایک ایک قدم پر

میرے گناہ معاف ہو رہے ہیں۔ اور ایک ایک قدم پر مجھے نیکی مل رہی ہے۔ اس تصور سے چلو گے تو اس چلنے میں بھی ایک لطف اور مزا آئیگا۔ اور عبادت کی روح حاصل ہوگی۔

اس دھیان سے تلاوت کرو

مثلاً تلاوت قرآن کریم کر رہے ہو تو یہ سوچو کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک حرف کی تلاوت پر اللہ تعالیٰ دس نیکیاں دیتے ہیں۔ ''الٓمٓ'' کی تلاوت کی تو تیس نیکیاں لکھی گئیں۔ لہٰذا تلاوت کے وقت یہ تصور کرو کہ میں جو تلاوت کر رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ میری نیکیوں میں اضافہ فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ تصور کرو، نہ کہ اپنے عمل پر بھروسہ کرتے ہوئے۔ اسلئے کہ عمل محض علامت ہے، علّت تامّہ نہیں ہے۔ بہر حال ہر عبادت پر اللہ تعالیٰ نے جو وعدے فرمائے ہیں، عبادت انجام دیتے وقت ان وعدوں کا دھیان کرنا اس عبادت کی تکمیل میں معاون مفید ہوتا ہے۔ یہ ''رجا'' کا دوسرا درجہ تھا، جو فرض ہے۔

''رجا'' کا تیسرا درجہ

''رجا'' کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی پر اکثر و بیشتر اوقات میں اللہ تعالیٰ کی جنت کا خیال دل میں رہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا خیال رہے، اور اکثر و بیشتر وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے تصور میں زندگی گزارے، جیسا کہ ''خوف'' کے بیان میں کہا تھا کہ اکثر و بیشتر خوف دل میں رہے، یہ ''رجا'' کا تیسرا درجہ ہے۔

''رجا'' کا چوتھا درجہ

''رجا'' کا چوتھا درجہ جو غیر اختیاری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور جنت کی نعمتوں کا تصور دل و دماغ پر اتنا چھا جائے کہ کوشش کے باوجود یہ تصور زائل نہ ہو، اور آدمی ہر وقت ان رحمتوں اور نعمتوں کے تصور کے اندر مست ہو، یہ ''رجا'' کا غیر اختیاری درجہ ہے۔ فرائض اور واجبات کی ادائیگی میں اس کو کوئی رکاوٹ اور سستی پیدا نہیں ہو رہی ہے کہ اسکے لئے ان چیزوں کا تصور کرنا پڑ رہا ہو۔ بلکہ یہ فرائض اور واجبات کی ادائیگی تو اس کے لئے طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ لیکن اسکے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے تصور میں مست ہے۔ یہ ''رجا'' کا چوتھا درجہ ہے، یہ چوتھا درجہ مقصود نہیں۔ البتہ ابتدائی تین درجات مقصود ہیں، ان کے حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

خوف و رجا کے حاصل کرنے کا طریقہ

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ خوف کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ موت کا اور موت کے بعد کے حالات کا، اور جہنم کا مراقبہ کرنا چاہیے۔ اور رجا کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جنت کا تصور کرے، اور یہ قرآن کریم کے طرز کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں جہاں جہنم کا ذکر آیا ہے وہاں جنت کا ذکر ضرور فرمایا ہے۔ بہرحال ''رجا'' کے چار درجات ہیں، ایک شرط ایمان، دوسرا درجہ فرض، تیسرا درجہ مستحب، اور چوتھا درجہ غیر اختیاری ہے۔

امید کا پانچواں درجہ جو حرام ہے

ایک درجہ ''رجا'' کا وہ ہے جو ناجائز اور حرام ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی اپنی اصلاح سے تو غافل ہے، حرام اور حلال کی تمیز ہی نہیں۔ خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ جہاں نفس لیجا رہا ہے، اسی طرف جا رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ پر امیدیں باندھے بیٹھا ہے کہ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ اس کے بارے میں حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

اَلْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ......

فرمایا کہ عاجز بندہ وہ ہے کہ اپنے نفس کو تو خواہشات کے پیچھے لگا لے۔ جیسی خواہش پیدا ہو رہی ہے، اسی کے مطابق کرتا جا رہا ہے۔ بے دھڑک گناہ کر رہا ہے۔ کوئی رکاوٹ دل میں نہیں ہے۔ اس سے کہو کہ یہ کام گناہ ہے تو کہتا ہے کہ ارے اللہ میاں بڑا غفور و رحیم ہے۔ رجا اور امید کا یہ درجہ حرام ہے۔ جو آدمی کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔

یہ شیطان دھوکہ میں ڈالتا ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔

(سورۃ الفاطر: ۵)

یعنی یہ دنیاوی زندگی تمہیں دھوکہ میں نہ ڈالے۔ اور وہ دھوکہ باز یعنی شیطان تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکے میں نہ ڈالے۔ شیطان یہی دھوکہ دیتا ہے کہ ارے گناہ کرتے جاؤ، ابھی تو جوانی ہے، جب بڑھاپا آئے گا تو دیکھا

جائے گا۔ اللہ میاں بڑا غفور و رحیم ہے۔ سب معاف کر دے گا۔

امید کے درجات

یاد رکھیئے، جو ''امید'' انسان کو گناہ پر آمادہ کرے وہ ''رجا'' نہیں ہے۔ بلکہ وہ دھوکہ ہے، وہ غرور ہے، رجا کا یہ درجہ حرام ہے۔ بہر حال ''رجا'' میں ایک درجہ شرط ایمان، دوسرا درجہ فرض، تیسرا درجہ مستحب، چوتھا درجہ غیر اختیاری، پانچواں درجہ حرام، پہلے چار درجے حاصل کرنے ہیں۔ اور پانچویں درجے سے بچنا ہے، احتراز کرنا ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے بچائے۔ آمین.

خوف کا حرام درجہ

اسی طرح خوف کا ایک درجہ ''فرض'' ہے، ایک درجہ ''واجب''، ایک درجہ ''مستحب''، ایک درجہ ''غیر اختیاری''، اور ایک درجہ ''حرام'' بھی ہے۔ حرام درجہ وہ ہے جو انسان کو مایوسی میں مبتلا کر دے، یاس پیدا کر دے۔ وہ خوف حرام ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ خوف اور رجا کے اندر کتنی باریکیاں ہیں اب کون شخص ان کے درمیان امتیاز کر کے بتائے کہ تمہیں ''خوف'' کا جو درجہ حاصل ہے وہ صحیح ہے۔ اسی طرح کون یہ بتائے کہ تمہیں ''رجا'' کا جو درجہ حاصل ہے وہ صحیح ہے۔ اس کام کے لئے شیخ کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو متعین کر کے بتاتا ہے کہ اس درجے تک کا خوف صحیح ہے، اس سے آگے غلط ہے۔ شیخ کا کام ہی یہ ہے۔ بہر حال اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دونوں چیزیں مطلوب ہیں۔ خوف بھی اور رجا بھی، تنہا ایک سے کام نہیں چلتا۔

دونوں میں برابری ضروری نہیں

البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں کے درمیان توازن ہمیشہ برابر ہی رہے کہ ترازو کے ایک پلّہ میں ''خوف'' رکھا، اور دوسرے میں ''رجا'' رکھی، اور دونوں کو برابر کر دیا، ایسا ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ بعض اوقات خوف کا رجا پر غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات رجا کا خوف پر غلبہ ہو جاتا ہے۔ خوف کے غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ خوف زیادہ ہے، لیکن امید ختم نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ جن بندوں کو کمال عطا فرماتے ہیں، ان کے ترازو کے دونوں پلّے برابر ہوتے ہیں۔ نہ ایک پلّہ جھکا ہوتا ہے، نہ دوسرا پلّہ جھکا ہوتا ہے۔ جیسے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا خوف اور امید

چنانچہ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہو جائے کہ میرے سارے بندے جہنم میں جائیں گے، صرف ایک بندہ جنت میں جائے گا تو مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہوگی کہ وہ ایک بندہ میں ہونگا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہو جائے کہ میرے سارے بندے جنت میں جائیں گے، صرف ایک بندہ جہنم میں جائے گا تو مجھے یہ ڈر ہوگا کہ وہ جہنم میں جانے والا میں ہونگا۔ تو خوف بھی کامل، اور امید بھی کامل۔ دونوں پلّے برابر تھے۔ یہ تو ان کا مقام تھا۔ لیکن ایک عام آدمی ان دونوں کے درمیان کہاں تک توازن برقرار رکھے گا، کہاں ان کے پلّے برابر رکھے گا۔ اسلئے شریعت نے ان کے درمیان برابری کرنے کا مکلّف نہیں بنایا۔ بلکہ کبھی

خوف کا غلبہ ہو گیا تو کبھی امید کا غلبہ ہو گیا۔ جب تک دوسرے کا خاتمہ نہ ہو۔ تو پھر ایک کے غلبہ ہونے سے نقصان نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات فائدہ ہو جاتا ہے۔

امید کا غلبہ زیادہ نافع ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسکا بھی ایک اصول بیان فرمادیا کہ:

> ''جن لوگوں میں اعمال صالحہ کا غلبہ ہو کہ وہ زیادہ تر اعمال صالحہ میں مشغول ہیں۔ اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ گو کبھی کبھی ابتلا بھی ہو جاتا ہے۔ ان پر غلبہ رجا انفع ہے۔'' (انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۵)

یعنی وہ لوگ جن پر عام طور پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اعمال صالحہ ان کی زندگی پر غالب ہوں، مثلاً عبادت کر رہے ہیں، اللہ کے ذکر میں اور طاعات میں مشغول ہیں۔ نمازی ہیں اور ساتھ میں گناہوں سے بچنے کا بھی اہتمام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی غفلت بھی ہو جاتی ہے۔ کبھی گناہ میں ابتلا بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان پر ''امید'' کا غلبہ ہو تو انفع ہے۔ کیوں؟ اس واسطے کہ اگر ایسے لوگوں پر خوف کا غلبہ ہو جائے تو بعض اوقات وہ مضر ہو جائے گا۔ اسلئے کہ پھر شیطان ان کو بہکاتا ہے کہ ارے میاں، سب کچھ تو کر کے دیکھ لیا، نماز بھی پڑھ لی، روزہ بھی رکھ لیا، تلاوت بھی کر لی، ذکر بھی کر لیا۔ پھر بھی ایک جگہ جا کر شیطان راستہ مار گیا، پھر بھی گناہ میں مبتلا ہو گئے۔ لہٰذا تمہاری اصلاح ممکن نہیں۔ تم ناقابل اصلاح ہو۔ لہٰذا یہ سب دھندا چھوڑ و۔ بہر حال جب خوف کا غلبہ ایسے شخص کو ہو جائے تو شیطان اس کا راستہ اس طرح مار دیتا ہے۔

اور جتنا کچھ وہ کر رہا تھا اس سے بھی اسکو محروم کر دیتا ہے۔

امید کے غلبہ کا نتیجہ

اسکے برخلاف اگر ایسے شخص پر ''امید'' کا غلبہ ہوگا تو جب اس شخص سے گناہ ہوگا، غلطی ہوگی تو وہ کہے گا کہ: یا اللہ، غلطی ہوگئی آپ کی رحمت سے امید ہے، آپ مجھے معاف فرمادیں۔ امید کی مشعل جلتی رہتی ہے، اس مشعل کے جلنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص سے جو غلطیاں ہوتی رہتی ہیں، ان غلطیوں پر تنبہ بھی ہوتا رہتا ہے، اور توبہ کی توفیق بھی ہوتی رہتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید بھی رہتی ہے، اس لئے ایسے لوگوں کے لئے غلبہ امید انفع ہے۔ آگے ارشاد فرمایا:

غلبہ خوف زیادہ فائدہ مند ہے

> ''اور جن میں اعمال سیئہ کا غلبہ ہے کہ وہ زیادہ تر اعمال سیئہ میں مبتلا ہیں، اور اعمال صالحہ قلیل ہیں، ان کے لئے غلبہ خوف انفع ہے، جب تک کہ اعمال صالحہ کا غلبہ نہ ہو، پس جب تک اعمال صالحہ کا غلبہ نہ ہو اس وقت تک غلبہ خوف ہی میں ان کو رکھا جائے گا۔'' (انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۵)

یعنی ایسے لوگ جو گناہوں کے اندر مبتلا ہیں۔ نیک اعمال بہت کم کرتے ہیں، ان کے اندر غلبہ خوف انفع ہے، لہٰذا جب ایسے لوگوں کو دعوت دی جائے، ان سے دین کی باتیں کی جائیں تو اس میں ان کو اللہ کا خوف دلایا جائے، انبیاء علیہم السلام کو ''نذیر'' کہا گیا۔ یعنی ڈرانے والا، ان لوگوں کو جنہوں نے کفر اور شرک میں پوری زندگی گزار دی، ان کو ڈراتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار اور مشرکین کو ڈرایا

چنانچہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلم کھلا دعوت وتبلیغ کا حکم ہوا تو آپ نے سب کو جمع فرمایا۔ تو پھر فرمایا:

اِنِّیْ نَذِیْرٌلَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ۔ (القران)

ان سب کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا، اسلئے کہ کفر کا، شرک کا اور اعمال سیئہ کا غلبہ تھا۔ اسلئے وہاں ڈرانے کی ضرورت تھی۔ جب آدمی دین کی طرف آجائے، اور اعمال صالحہ کرنے لگے اور اسکے اعمال میں بہتری پیدا ہوجائے تو اس وقت ''بشیر'' (خوشخبری دینے والا) کی صفت آئیگی۔ بہرحال، حضرت نے یہ اصول بیان فرمایا کہ اگر غلبہ اعمال صالحہ کا ہے تو ''امید'' کا غلبہ انفع ہے۔ اور اگر خدانخواستہ اعمال سیئہ کا غلبہ ہے تو ''خوف'' کا غلبہ انفع ہے۔ اسلئے جتنا ڈریگا، اتنا اعمال سیئہ کو چھوڑے گا۔ اور نیکی کے قریب آئیگا۔

جوانی میں خوف، بڑھاپے میں رجا

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا وہ فرمایا کرتے تھے کہ جوانی میں ''خوف'' کا غلبہ انفع ہے۔ اور بڑھاپے میں ''رجا'' کا غلبہ انفع ہے۔ کیونکہ جوانی کے زمانے میں گناہوں کے داعیے زیادہ ہوتے ہیں۔ اور قوت والے ہوتے ہیں۔ اسلئے گناہوں سے بچنے کے لئے خوف کا غلبہ زیادہ فائدہ مند ہے۔ اور بڑھاپے میں پہنچنے کے بعد گناہوں کے داعیے مضمحل ہوجاتے ہیں، اور عمر گزارنے کے نتیجے میں کچھ عقل آجاتی ہے۔ اگر اس وقت خوف کا غلبہ ہوجائے تو وہ انسان کو مایوسی کی طرف لے جاتی ہے۔ اسلئے اس

وقت انفع یہ ہے کہ رجا کا غلبہ ہو۔ لیکن بہر حال، دونوں چیزیں اپنے اپنے وقت پر ہونی ضروری ہیں۔

آج کے دور میں رجا زیادہ نافع ہے

لیکن ہمارے شیخ حضرت عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ کی دعوت میں اور اصلاح میں اور طرزِ عمل میں ''امید'' کا غلبہ تھا۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کے دور میں لوگوں کو قریب لانے کے لئے امید زیادہ نافع ہے....

سوئے نا امیدی مرو امید ھاست
سوئے تاریکی مرو خورشید ھاست

یعنی نا امیدی کے راستے پر مت چلو، اور تاریکی کے راستے پر مت چلو، بلکہ امید اور خورشید کا راستہ اختیار کرو، لہٰذا دین کو آسان بنا کر اور سہل بنا کر پیش کرنا چاہیے۔ کیونکہ آج کل لوگوں کے دماغوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ دین پر عمل بہت مشکل ہے، اگر ہم دین پر چلیں گے تو پہاڑ ڈھونے پڑیں گے۔ اور قیامت آجائے گی، آسمان ٹوٹ جائے گا، یہ سب شیطان نے ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیالات ڈالے ہوئے ہیں۔ اسکے نتیجے میں لوگ دین پر ایک قدم چلنے سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

لوگوں کو پہلے قریب لاؤ

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے دانہ ڈال کر لوگوں کو قریب لاؤ، اسکے لئے آسان راستہ سے کام شروع کرو، ایک دم سے اس پر بوجھ مت ڈالدو۔ اسکے نتیجے میں اسکے اندر دین کی طرف آنے کا شوق پیدا

ہوگا، رغبت پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ نے نیکی کی یہ خاصیت رکھی ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچتی ہے۔ لہٰذا جب ایک نیکی کرنے کی توفیق ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ دوسری نیکی کرنے کی بھی توفیق دیدیں گے۔ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ تھا۔

آسانی کا راستہ بتاؤ

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ''خوف'' کا تذکرہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جب مجلس میں بیان ہوتا تو اس میں خوف کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ لیکن غلبہ ''امید'' اور ''رجا'' کا رہتا تھا۔ اور لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرنے کا غلبہ رہتا تھا۔ تاکہ لوگ قریب آئیں۔ ہر ایک کے اپنے اپنے اصلاح کرنے کے طریقے ہیں۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر رست

لیکن ہم نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے طریقے میں فائدہ دیکھا، اس میں کوئی شک نہیں، وہ یہ کہ لوگ کھنچ کھنچ کر آتے تھے۔ جو ایک مرتبہ جال میں آگیا، وہ پھر نکلتا نہیں تھا۔ اسلئے لوگوں کو اپنے قریب کرنے کے لئے آسانی کا راستہ بتادیتے تھے۔

دو دن برابر نہ ہونے چاہئیں

ایک ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''آج کل عملی خرابی عام طور پر پھیلی ہوئی ہے کہ جو شخص عمل کے اعتبار سے جس حالت میں ہے، وہ اس پر قناعت کئے

ہوئے ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ میرے اندر کوئی نقص نہیں، تغیر اور تبدل کی حاجت نہیں، یہ خشیت وفکر اور ذہن کی کمی ہے۔"

(انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۷)

یہ بڑی بات بیان فرمائی ہے، اور ہمارا بہت بڑا مرض پکڑا ہے کہ جو شخص جس حالت میں ہے وہ اس پر قناعت کئے ہوئے ہے، اصل معاملہ تو وہ ہے جو کسی نے کہا کہ

"مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ۔"

یعنی جس کے دو دن کل اور آج برابر ہو گئے یعنی آج کا دن بھی ویسا ہی گزرا جس طرح کل کا دن گزرا تھا۔ اور آج کے دن میں کوئی ترقی نہ ہوئی تو ایسا شخص خسارہ میں ہے، اسلئے کہ آج کا دن کل کے مقابلے میں ترقی پایا ہوا ہونا چاہیے تھا۔ آج کی میری حالت گزشتہ کل کے مقابلے میں بہتر ہونی چاہیے تھی۔ اگر آج بھی وہی حالت رہی جو کل تھی تو خسارہ میں ہوں۔

خوبصورت دعا

اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگی ہوئی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی ہے کہ:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ يَوْمَنَا خَيْرًا مِنْ اَمْسِنَا، وَاجْعَلْ غَدَنَا خَيْرًا مِنْ يَوْمِنَا

یا اللہ؛ ہمارے آج کو گزشتہ کل سے بہتر بنا، اور آئندہ کل کو آج سے بہتر بنا، یعنی ہر دم ترقی ہو رہی ہو۔ روزانہ ترقی ہو رہی ہو۔ یہ نہیں کہ سالہا سال سے

ایک ہی حالت پر قانع ہیں۔ اور اطمینان ہے کہ اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں، اس کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ خشیت کی کمی اسکا سبب ہے۔ اور خشیت کی وجہ سے آدمی کے اندر آگے بڑھنے کی فکر پیدا ہوتی ہے۔

ایک اور خوبصورت دعا

ایک اور دعا میں آپ نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلِ الْحَیَاۃَ زِیَادَۃً لِّی فِیْ کُلِّ خَیْرٍ۔

اے اللہ: میری زندگی کو ہر بھلائی میں اضافے کا ذریعہ بنا۔ یعنی میری عمر جتنی بڑھتی جائے، خیر میں اضافہ ہوتا چلا جائے، جتنے دن بڑھیں، اتنی ہی نیکیوں میں اضافہ ہو، اور نیکیوں میں ترقی ہو۔

نیکیوں میں حریص اور دنیا میں قانع بن جاؤ

اب ہمارا معاملہ الٹا ہے کہ جہاں ''قناعت'' مطلوب تھی، یعنی دنیا کمانے میں، مال حاصل کرنے میں، وہاں تو ہمارے اندر حرص بڑھی ہوئی ہے، اور دنیا حاصل ہو جائے، اور مال حاصل ہو جائے، اور دنیا کما لوں۔ اور جہاں حرص مطلوب تھی، مثلاً علم میں، وہاں ہمارے اندر قناعت ہے۔ یہ الٹا معاملہ ہو رہا ہے، ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بھائی معاملہ سیدھا کرو۔ اور دنیا کے معاملے میں یہ دعا کرو کہ:

اَللّٰھُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ

اے اللہ: جو کچھ آپ نے مجھے رزق عطا فرمایا ہے اس کے اندر مجھے قناعت بھی عطا فرما۔ اور آخرت کے معاملے میں حریص بنو کہ میں کس طرح اپنی

آخرت کو بہتر سے بہتر بنالوں۔ اور نیکی کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو کرنے کی حرص کرو، خشیت کا یہی تقاضہ اور یہی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين



بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

(سورہ شوریٰ، آیت ۴۳)

یعنی جو صبر کرے اور معاف کردے تو یہ بڑی عزیمت کی بات ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''صبر'' ایک عظیم عبادت

مجلس نمبر 97

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقامِ خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی۔
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	97

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''صبر'' ایک عظیم عبادت

مجلس نمبر 97

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رسولہ الکریم، وعلٰی آلہ وأصحابہ اجمعین۔ امابعد:

''صبر'' ایک عظیم عبادت

پچھلی نشستوں میں ''خوف'' اور ''رجا'' کا بیان تھا، اسکی بقدر ضرورت تفصیل اور تشریح آپ حضرات کی خدمت میں عرض کردی گئی ہے۔ آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ ارشادات ''صبر'' سے متعلق ہیں، یہ ''صبر'' بھی ایک عظیم عبادت ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ اسکا حکم دیا گیا ہے۔ اور اسکی تاکید بھی فرمائی گئی ہے۔ اسکے فضائل اور اسکے اجر وثواب کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک جگہ قرآن کریم میں فرمایا:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ

(الزمر: ۱۰)

یعنی صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ جو اجر عطا فرمائیں گے وہ بے حساب ہوگا۔ اسکی کوئی گنتی نہیں ہوگی۔ جبکہ دوسرے بہت سے اعمال ایسے ہیں کہ ان کے

اجر وثواب کا ایک پیمانہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ فلاں عمل کا دس گنا ثواب، فلاں عمل کا ستر گنا ثواب، فلاں عمل کا سات سو گنا ثواب ملیگا وغیرہ، لیکن صبر کے بارے میں فرمایا کہ اسکا اجر وثواب بے حساب ہے، کوئی گنتی نہیں۔ اللہ جل شانہ اپنے فضل وکرم سے اتنا عطا فرمائیں گے کہ کوئی حد وحساب نہیں۔ اس وجہ سے ''صبر'' مطلوب ہے۔

ہر وقت صبر کی ضرورت

اور یہ ''صبر'' ایسی چیز ہے کہ جسکی ضرورت سے کوئی مسلمان کسی دن بھی فارغ نہیں۔ لوگ عام طور پر ''صبر'' کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ جب کوئی بڑا صدمہ پیش آیا، مثلاً کسی قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا، تو اس پر صبر کر لیا۔ یا کوئی بڑی تکلیف یا حادثہ پیش آجائے تو اس پر ''صبر'' کر لیا۔ لیکن حقیقت میں صبر ان مواقع کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ صبر کی ضرورت ہر مسلمان کو ہر دن، بلکہ ہر وقت ہے۔ اسلئے کہ قرآن کریم میں جس کو صبر کہا جا رہا ہے وہ یہ اردو والا صبر نہیں ہے۔ جس کو ہم اردو میں صبر کہتے ہیں۔ مثلاً کسی تکلیف پر صبر کرنا۔ یا کسی کی موت پر صبر کرنا۔ یا کسی حادثہ پر صبر کرنا۔

''صبر'' کے معنیٰ نفس کو روکنا

بلکہ عربی زبان میں صبر کے معنیٰ ہیں ''روکنا''، اور یہ رمضان کا مہینہ جو آج کل چل رہا ہے، اسکو بھی ''شهر الصبر'' کہا گیا ہے کہ یہ صبر کا مہینہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو اس بات سے روکے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عائد کئے ہوئے فرائض، واجبات اور طاعات جن سے ہمارا نفس بھاگنا چاہتا ہے،

اس نفس کو بھاگنے سے روکے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، حج کرو۔ اور جتنی طاعات وعبادات ہیں ان کو بجالاؤ۔ اب انسان کا نفس ان چیزوں سے بھاگتا ہے۔ نماز پڑھنے سے بھاگتا ہے، روزہ رکھنے سے بھاگتا ہے، زکوٰۃ ادا کرنے سے بھاگتا ہے کہ اس میں پیسے خرچ ہونگے، حج ادا کرنے سے بھاگتا ہے کہ اسکی ادائیگی میں تکلیف ہوگی۔ لہٰذا انسان کا نفس یہ نہیں چاہتا کہ وہ ان طاعات کو بجالائے۔ بلکہ وہ نفس تو آرام کا خوگر ہوگیا ہے۔ اسکو تو سونے میں مزہ آرہا ہے۔ اسکو کھانے پینے میں مزہ آرہا ہے۔ اسکو اس میں مزہ ہے کہ وہ بالکل آزاد ہو۔ اسکے اوپر کوئی روک ٹوک نہ ہو۔ لہٰذا وہ عبادات اور طاعات جو انسان پر روک ٹوک عائد کرے، نفس ان عبادات سے بھاگتا ہے۔

صبر کی پہلی قسم ”صبر علی الطاعة“

اب آپ نے اس نفس کو بھاگنے سے قید کردیا۔ اور اس سے کہا کہ تمہیں یہ نماز پڑھنی ہوگی۔ اللہ کا حکم آگیا ہے، وقت آگیا ہے، اللہ کا منادی نماز کے لئے پکار رہا ہے، لہٰذا یہ نماز تمہیں پڑھنی پڑیگی، چاہے تیرا دل چاہے یا نہ چاہے۔ اب آپ نے اس نفس کو بھاگنے سے روک دیا، اسی کا نام ”صبر“ ہے۔ اور یہ ”صبر علی الطاعة“ کہلاتا ہے۔ اسی طرح نفس تو یہ چاہ رہا تھا کہ میں ہر وقت کھاؤں پیوں، میرے اوپر کوئی روک ٹوک نہ ہو، دن میں بھی کھاؤں، رات میں بھی کھاؤں، لیکن تم نے اس سے کہا کہ نہیں، یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، روزہ رکھنا ہوگا اور اب صبح سے لیکر شام تک کچھ نہیں کھانا۔ اب نفس کو جو اس عبادت سے بھاگنا چاہ رہا تھا، تم نے اسکو روک دیا۔ یہ ”صبر“ ہوگیا۔ اسلئے فرمایا گیا کہ یہ رمضان کا مہینہ ”صبر کا مہینہ“ ہے۔

صبر کی دوسری قسم ''صبر عن المعصیة''

اسی طرح انسان کا نفس طرح طرح کے گناہوں کے تقاضے اور داعیے دل میں پیدا کرتا رہتا ہے کہ فلاں گناہ کرلو، یہ گناہ کرلو، وہ گناہ کرلو، آنکھ کو غلط جگہ پر استعمال کرلو۔ کان کو غلط جگہ پر استعمال کرلو۔ زبان سے جھوٹ بول دو۔ زبان سے غیبت کرلو۔ یہ تقاضے اور داعیے جو گناہوں کے پیدا ہو رہے ہیں، اور انسان کا نفس یہ چاہتا ہے کہ میں یہ گناہ کرلوں۔ اب آپ نے اس نفس کو روک دیا۔ اور اس سے کہا کہ میں تجھے یہ گناہ نہیں کرنے دونگا۔ یہ گناہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ یہ جہنم کا راستہ ہے۔ اس طرح آپ نے اس نفس کو اس گناہ کے ارتکاب سے روک دیا۔ یہ روکنا ''صبر عن المعصیة'' ہے۔

صبر میں بڑی طاقت ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اس ''صبر'' میں بڑی طاقت رکھی ہے۔ یہ ''صبر'' ایسی چیز ہے کہ اس کو جتنا چاہو کھینچ لو، اور جتنا بڑے سے بڑا کام اس کے ذریعے لے لو۔ شروع شروع میں ''صبر'' کرنا انسان کو مشکل لگتا ہے۔ لیکن جب انسان اپنے نفس کو ''صبر'' کا عادی بنا دیتا ہے تو بڑے سے بڑا اور سخت سے سخت کام بھی اس صبر کے ذریعہ انجام پا جاتا ہے۔ جیسے ''ربر'' دیکھنے میں چھوٹی ہوتی ہے۔ لیکن اسکو کھینچتے ہیں تو بڑی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے کی جو ہمت اور طاقت دی ہے، اس سے جتنا چاہو کام لے لو۔

صبر کو ترک کرنے کا نتیجہ

جب آدمی نفس وشیطان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے، اور اس کا مقابلہ نہیں کرتا تو یہ نفس وشیطان اسکے اوپر شیر ہو جاتے ہیں۔ اور اسکو زیر کر کے چھوڑتے ہیں۔ اب یہ ہوتا ہے کہ گناہ کا ذرا سا تقاضہ پیدا ہوا تو اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اس گناہ کو کرلیا۔ اب وہ نفس وشیطان اس پر شیر ہو گیا کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ یہ جلدی قابو آجاتا ہے۔ اب یہ ہوگا کہ آج ایک گناہ میں مبتلا کر دیا تو کل دوسرے گناہ میں مبتلا کر دیگا۔ پرسوں تیسرے گناہ میں مبتلا کر دیگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صبر اور ہمت کی جو طاقت تھی وہ کمزور پڑتے پڑتے بہت معمولی رہ جاتی ہے۔ اب بے دھڑک گناہ ہو رہے ہیں۔ بے دھڑک معصیتیں ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین.

صبر کرتے ہوئے نفس کے سامنے ڈٹ جاؤ

لیکن جب یہ تہیہ کرلیا کہ اللہ جل شانہ نے مجھے صبر کی طاقت دی ہے۔ اور اس نفس وشیطان کا مقابلہ کرونگا۔ خواہ کچھ ہو جائے میں یہ گناہ نہیں کرونگا۔ اور گناہ سے بچوں گا۔ جب ایک مرتبہ اس نفس وشیطان کے آگے ڈٹ گئے تو تم نے اس صبر اور ہمت کو استعمال کیا۔ تو اس کے نتیجے میں اس صبر کے اندر مزید طاقت پیدا ہوگئی۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو استعمال کرنے سے کم ہوتی ہیں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو استعمال کرنے سے بڑھتی ہیں۔ مثلاً قوت حافظہ ایسی چیز ہے کہ اسکو جتنا استعمال کرو گے یہ اتنا ہی بڑھے گا۔ اسی طرح یہ ''صبر'' کی اور ہمت کی طاقت ہے، اسکو جتنا استعمال کرو گے اس میں

اتنی ہی طاقت آئے گی۔ جب تم ایک مرتبہ نفس وشیطان کے آگے ڈٹ گئے۔ اور اس سے یہ کہہ دیا کہ ہمیں تیری بات منظور نہیں تو یہ نفس وشیطان پھٹک سے اڑ جائیگا۔

شیطان کا مکر کمزور ہے

اس لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطَانِ کَانَ ضَعِیۡفاً (سورۃ النساء، آیت ۷۶)

ارے تم کس سے ڈر رہے ہو۔ اس شیطان کا مکر تو بڑا ہی کمزور ہے۔ ذرا اس کے سامنے ڈٹ کر دیکھو، یہ تمہارے سامنے ھوا ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ دل میں یہ بات بٹھا لو کہ چاہے میرے دل پر آرے چل جائیں۔ چاہے میرے اوپر قیامت ٹوٹ پڑے۔ لیکن میں اس گناہ کے قریب نہیں جاؤنگا۔ اور یہ گناہ نہیں ہونے دونگا۔ جب ایک مرتبہ تم نے پکا ارادہ کرلیا تو شیطان بھی رفو چکر ہو جائیگا انشاء اللہ۔ اور تمہارا نفس بھی قابو میں آجائیگا۔ اور جتنا اسکو استعمال کروگے، اتنی قوت بڑھتی جائیگی۔

مصیبت اور پریشانی پر صبر کرو

اور گناہوں کے تقاضے کے وقت یہ تصور کرلیا کرو کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے "صبر" پر عمل کر رہا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوۡنَ اَجۡرَھُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ۔ (سورۃ الزمر: ۱۰)

کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے۔ بہرحال، صبر کے معنی ہیں "روکنا" یعنی جو نفس طاعات اور عبادات سے بھاگ

رہا ہے، اس سے روکنا، اور معصیتوں کی طرف جو نفس جا رہا ہے اسکو اس سے روکنا۔ جو تکلیف آئی ہے، اس پر صبر کرنا، یعنی جب تکلیف پہنچے، پریشانی ہو، صدمہ ہو، تو اس وقت نفس آدمی کو ناشکری پر آمادہ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے دل میں شکوہ پیدا کرتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے میرے حق میں جو فیصلہ کیا۔ وہ انصاف کا فیصلہ نہیں کیا، العیاذ باللہ یہ باتیں شیطان دل میں پیدا کرتا ہے۔

موت کے وقت صبر سے کام لو

اسی طرح کسی کے انتقال کے وقت ہم لوگ زبان سے جو کلمات کہہ دیتے ہیں کہ اس آدمی کی بے وقت موت ہوگئی۔ العیاذ باللہ۔ یہ بڑا خطرناک کلمہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں کو اسکی موت کا صحیح وقت معلوم نہیں تھا۔ تم اسکی موت کا صحیح وقت جانتے ہو۔ یہ ناشکری ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہے، اور شکوہ ہے، یہ الفاظ زبان سے ادا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اب موت کے وقت انسان کا نفس یہ چاہتا ہے کہ وہ واویلا کرے، شور مچائے، اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرے، لیکن ایسے موقع پر ایک مؤمن یہ کہتا ہے کہ مجھے اپنے اللہ سے کوئی شکوہ نہیں، میں اللہ کے فیصلے پر راضی ہوں، چاہے میرا دل جل رہا ہے، چاہے میری زبان سے آہیں نکل رہی ہیں، میری آنکھوں سے آنسوں نکل رہے ہیں، لیکن میں اللہ تعالیٰ کی اس مشیت اور اس فیصلے پر راضی ہوں، اور اس فیصلے پر سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ بس اسکا نام "صبر" ہے۔ یہ "صبر علی المصیبة" ہے۔ اس لئے کہ اس میں آپ نے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرنے سے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض کرنے سے روک لیا۔

ہر وقت آپ سے ایک مطالبہ

بہر حال، صبر کی ضرورت ہر مؤمن کو، ہر روز، ہر وقت ہے، کیوں؟ اسلئے کہ مسلمان سے بحیثیت مسلمان کے ہر وقت اللہ جل شانہ کے دین کا کچھ مطالبہ ہے، مثلاً جب نماز کا وقت آ گیا تو اب یہ مطالبہ ہے کہ نماز ادا کرو، روزہ کا وقت آ گیا تو اب مطالبہ یہ ہے کہ روزہ رکھو، اگر کوئی اچھا واقعہ پیش آ گیا تو اب مطالبہ یہ ہے کہ اس پر شکر ادا کرو، اگر کوئی ناگوار واقعہ پیش آ گیا تو اب مطالبہ یہ ہے کہ صبر کرو۔ لہٰذا کونسا لمحہ انسان پر ایسا گزرتا ہے جو یا تو اچھا نہ ہو، یا برا نہ ہو، جو نہ نعمت ہے، نہ تکلیف ہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھو تو زیادہ تر نعمتیں ہی نعمتیں ہیں، کبھی کبھار ان کے ساتھ کوئی تکلیف آ کر لگ جاتی ہے۔

ہر وقت صبر مطلوب ہے

مثلاً اس وقت ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ اور ہمارا سانس عافیت سے چل رہا ہے۔ اس پر کہو ''الحمدللہ'' اگر یہ سانس نہ چلتا، بلکہ رک جاتا تو ہماری قیامت آ جاتی، موت آ جاتی۔ اسلئے سانس چلنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ اسی طرح ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، بینائی موجود ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ اگر یہ بینائی چلی جائے تو ہمارا کیا انجام ہو جائے۔ لہٰذا مطالبہ یہ ہے کہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ اگر گرمی لگ رہی ہے، یہ تھوڑی سی تکلیف ہے، اب مطالبہ ہے کہ اس پر صبر کرو۔ اور کہو: انا للہ وانا الیہ راجعون'' اور اس تکلیف پر راضی رہو۔ اور صبر کرو۔ بہر حال کونسا وقت ایسا ہے جس میں دین کا اور شریعت کا انسان سے کوئی مطالبہ نہ ہو۔ جب تم اپنے نفس کے تقاضے کے برخلاف اس

تقاضے کو پورا کرو گے تو اسی کا نام ''صبر'' ہے۔ اس لئے یہ کہا جائے تو کوئی بعید نہیں کہ ہم سے ہر لمحہ ''صبر'' مطلوب ہے۔ یا تو ''صبر علی الطاعة'' مطلوب ہے۔ یا ''صبر علی المعصية'' مطلوب ہے یا ''صبر علی المصيبة'' مطلوب ہے۔ لہٰذا کوئی لمحہ ''صبر'' سے خالی نہیں۔

فکر اور تشویش پر صبر کرو

یہاں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''انفاس عیسیٰ'' میں جو ارشادات بیان فرمائے ہیں۔ وہ زیادہ تر ''مصیبت پر صبر'' کرنے سے متعلق ہیں۔ اور صبر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جب کوئی بڑی مصیبت ہو، اس پر صبر کرے، بلکہ ہلکی اور معمولی تکلیف بھی جو انسان کی طبیعت کے خلاف ہو، اس پر بھی صبر مطلوب ہے۔ جیسے گرمی لگ رہی ہے، اس پر بھی صبر کرو، کانٹا لگ گیا، اس پر بھی صبر کرو، یا ذہن میں کوئی تشویش اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، یہ بھی صبر کا موقع ہے، اسلئے کہ حدیث شریف میں فرمایا کہ ''حَتّٰی الْهَمَّ يَهُمُّهُ'' یعنی یہاں تک کہ کوئی فکر اور تشویش جس میں بندہ مبتلا ہوتا ہو، اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اور یہ کفارہ سیئات بن جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ فکر اور تشویش بھی محل صبر ہیں۔

چراغ گل ہونے پر صبر

جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چراغ کے گل ہونے پر ''انا للّٰہ وانا الیه راجعون'' پڑھا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی تکلیف ہے۔ اور یہ بھی صبر کا محل ہے۔ لہٰذا ذرا سی بھی تکلیف ہو، یا پریشانی ہو۔ یا

کوئی بھی ایسی بات لاحق ہو جائے تو اس پر ''صبر'' کرو، اور ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون'' پڑھو۔

رونا صبر کے خلاف نہیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

آنسو بہنا، آہ آہ منہ سے نکلنا، خلاف صبر نہیں، بلکہ رو لینے سے صبر حقیقی زیادہ آسان ہو جاتا ہے، کیونکہ دل کا غبار نکل جاتا ہے۔ (انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۵)

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کے مرنے پر رونا صبر کے خلاف ہے، اسلئے کہ صبر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بالکل نہ روئے، بلکہ چپکا بیٹھا رہے۔ حضرت والا نے اسکی تردید فرمادی کہ صبر کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی کے آنسوں نہ بہیں، روئے نہیں۔ آہ نہ نکلے۔ یہ مطلب نہیں۔ بلکہ صبر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے فیصلے پر راضی ہونا، اسکے خلاف کوئی شکایت، کوئی اعتراض، کوئی گلہ نہ ہو، بلکہ یہ کہو کہ اے اللہ ہم کمزور ہیں، چونکہ ہمیں صدمہ ہوا ہے اس صدمہ پر ہم روتے ہیں۔ آنسوں بھی بہہ رہے ہیں، دل میں آگ بھی لگی ہوئی ہے، لیکن سب کچھ ہماری کمزوری کی وجہ سے ہے، ہم جانتے ہیں کہ اے اللہ، آپ کی مشیت کا فیصلہ برحق ہے، یہ معنیٰ ہیں ''صبر'' کے۔

رونے سے غبار نکل جاتا ہے

اسلئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رو لینے سے بعض اوقات حقیقی صبر میں اور زیادہ آسانی پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ دل کا غبار نکل

جاتا ہے، کیونکہ جب تک دل کا غبار نہیں نکلا ہوتا، صدمہ کی شدت اور غصہ کی شدت ہوتی ہے تو اس میں بعض اوقات عقل خراب ہو جاتی ہے، اور عقل خراب ہو جانے کی وجہ سے انسان اول فول بکنے لگتا ہے، اور فضول باتیں اس کے دماغ میں آنے لگتی ہیں۔ لیکن جب دل سے غبار نکل گیا، تو اب عقل معمول پر آجائیگی، اور عقل معمول پر آجانے سے انشاء اللہ خطرہ نہیں رہیگا کہ وہ بے صبری کریگا۔ یا اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض کریگا۔

رونے میں کوئی حرج نہیں

یہ دیکھو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے کہ جتنی غیر اختیاری چیزیں ہیں، ان میں سے کسی کا ہمیں مکلف نہیں بنایا، اگر غیر اختیاری طور پر رونا آرہا ہے تو رولو۔ ہاں جان بوجھ کر مصنوعی طور پر مت رو، حتی الامکان کوشش کرو کہ رونے میں آوازیں بلند نہ ہوں۔ اور بلا وجہ بین کا انداز نہ ہو، جب تک تمہارے دل میں اس بات پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ درست ہے، اور میں اس فیصلے پر سر تسلیم خم کرتا ہوں تو پھر رونے میں کوئی گھاٹا نہیں۔ خود حضور اقدس ﷺ نے اپنے بیٹے کے انتقال پر رو کر دکھایا۔ اپنے نواسے کے انتقال پر روئے، اور فرمایا کہ یہ ایک رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں پیدا کی ہے۔ اسلئے یہ گھبرانے کی بات نہیں۔

تکلیف اور رضامندی جمع ہو سکتی ہیں

بعض لوگوں کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ صدمہ کا اظہار کرنا اور عقل سے اس فیصلے پر راضی ہونا، یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟ ہمارے حضرت

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بڑی اچھی مثال بیان فرمائی ہے کہ جب ڈاکٹر سے آپریشن کرواتے ہو تو اس وقت تمہارا کیا حال ہوتا ہے؟ اب آپریشن کے وقت تکلیف بھی ہو رہی ہے۔ اسلئے کہ جسم کو کاٹا جا رہا ہے، اور دوا لگانے کی وجہ سے ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں، لیکن ساتھ میں اس بات کا اطمینان ہے کہ یہ ڈاکٹر میرا ہمدرد ہے، بلکہ ڈاکٹر کی خوشامد کریگا اور اس کی فیس بھی دیگا کہ میرا جلدی سے آپریشن کردو۔ اسلئے کہ وہ شخص جانتا ہے کہ یہ آپریشن کے ذریعہ ڈاکٹر جو تکلیف مجھے دے رہا ہے، اسی میں میرا فائدہ ہے، اور اس کے نتیجے میں مجھے صحت حاصل ہو جائے گی، اب دیکھئے، تکلیف بھی ہو رہی ہے لیکن ساتھ میں اس تکلیف پر راضی بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت پر راضی رہو

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب تکلیفیں پہنچتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے پہنچتی ہیں۔ اسلئے کہ کوئی کام کائنات میں ایسا نہیں ہے جو اسکی مشیت کے بغیر ہو جائے، بس اس وقت انسان یہ سوچے کہ میرے حق میں یہی بہتر تھا، اور یہ سوچ کر اس تکلیف پر راضی ہو جائے، بس اسی کا نام ''صبر'' ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر اور ہر مشیت پر راضی ہونا کہ اس کا ہر فیصلہ برحق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض نہ ہو

آجکل پوری امت مسلمہ افغانستان پر امریکی حملے کے صدمہ سے دوچار ہے، مشرق و مغرب کے تمام مسلمان اس صدمہ کی وجہ سے تکلیف میں ہیں۔ بعض اوقات ان تکالیف اور صدمات کے مواقع پر پاؤں پھسل جاتے ہیں۔ اور مایوسی کی

طرف جانے لگتے ہیں۔ زبانوں پر اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ آنے لگتا ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ____ ایک صاحب جو اچھے پکے نمازی، مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے والے، انہوں نے اس موقع پر زبان سے یہ الفاظ کہہ دیئے کہ یہ اللہ میاں نے اچھا نہیں کیا۔ العیاذ باللہ۔ یہ کلمہ زبان سے نکال دیا، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس قسم کے خیال سے محفوظ رکھے، آمین۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض کرنا، یہ بڑی خطرناک چیز ہے، ارے تم کیا، تمہاری عقل کیا، تمہاری خواہشات کیا، تمہاری عقل محدود، تمہاری خواہشات محدود، تمہارے خیالات محدود، تم اس محدود عقل اور خواہشات کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہو۔ اس پوری کائنات کا نظام اسکے قبضہ قدرت میں ہے۔ اسکی قدرت کاملہ اور اسکی حکمت بالغہ اس نظام میں کارفرما ہے۔ اگر تمہاری خواہشات کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کا نظام چلاتے تو آسمان اور زمین کا نظام کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَائَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ۔ (سورۃ المومنون: ۷۱)

اللہ تعالیٰ کی حکمت جاری ہے

کیا اللہ تعالیٰ تمہاری خواہشات کے پابند ہیں؟ تمہاری آرزوؤں کے پابند ہیں؟ تم جیسا چاہو، کائنات میں ویسا ہونا چاہیئے؟ یا وہ قادر مطلق ہیں۔ وہ حکیم مطلق ہیں، اور فیصلہ اسکے ہاتھ میں ہے، حکمت اسکی چل رہی ہے یا تمہاری چل رہی ہے؟ سمجھ اسکی ہے یا تمہاری ہے؟ خدائی اسکی، فیصلہ اسکا۔ حکمت اسکی، مصلحت اسکی، تمہاری سمجھ میں آئے تو، نہ آئے تو۔ اس کا حکم بالا ہے، اس کا فیصلہ بالا ہے۔

بعض واقعات تازیانے ہوتے ہیں

اگر کسی بات پر کسی واقعہ پر صدمہ ہوا، چلا ہوگیا۔ لیکن ساتھ ہی اس بات پر ایمان ہونا چاہیئے کہ جو کچھ ہوا وہ اللہ جل شانہ کی مشیت سے ہوا۔ جو کچھ ہوا، وہ اسکی حکمت کے عین مطابق ہوا، چاہے اسکی حکمت ہماری سمجھ میں آرہی ہو، یا نہ آرہی ہو۔ بہت سی باتیں، بہت سے واقعات اللہ جل شانہ کی طرف سے تازیانہ ہوتے ہیں۔ یہ واقعات جگانے والے اور تنبیہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ اسلئے ہوتے ہیں تاکہ اللہ کے بندے اپنا جائزہ لیکر دیکھیں کہ ہمارے طرز عمل میں کوئی غلطی تو نہیں تھی؟ اس غلطی کو متعین کریں۔ اور آئندہ اس غلطی سے بچنے کی کوشش کریں۔

حضور ﷺ کی موجودگی میں مسلمانوں کو شکست

تاریخ اسلام میں اور خود حضور اقدس ﷺ کے عہد مبارک میں بھی اور آپ کے صحابہ کے عہد مبارک میں بھی جہاں فتوحات بے شمار ہیں۔ وہاں شکستیں بھی ہیں ہزیمتیں بھی ہیں، غزوہ احد کے موقع پر اگرچہ عارضی طور پر مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ ستر صحابہ کرام شہید ہوئے، غزوہ حنین کے موقع پر جب صحابہ کرام کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس وقت بھی مسلمانوں کو شکست ہوئی اور یہ شکست حضور اقدس ﷺ کی معیت میں ہوئی، کیوں؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان شکستوں کا ذکر کر کے اس طرف متوجہ کیا، تاکہ تمہارے دماغ میں یہ بات نہ آجائے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ ٹھیک کر رہے ہیں۔ بلکہ اسکے ذریعے تمہاری غلطیوں کی طرف توجہ کرائی، غزوہ احد کی شکست کے اسباب بھی بتائے، اور غزوہ حنین کی شکست کے اسباب بھی بتائے کہ کیا اسباب تھے؟ لہٰذا ان اسباب کو سوچو،

اور آئندہ کیلئے پرہیز کرو۔

تم سے بھی غلطی ہو سکتی ہے

اب ہوتا یہ ہے کہ اپنی غلطی کی طرف تو ذہن جاتا نہیں۔ بلکہ یہ طے کرلیا ہے کہ ہم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، نہ غلطی ہو سکتی ہے، اور شکوہ اللہ تعالیٰ سے ہے، اسلئے کہ جب ہماری غلطی نہیں ہے تو -نعوذ باللہ- اللہ میاں کی غلطی ہوگی، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ یہ سب فضول خیالات شیطان دل میں پیدا کرتا ہے، ایسے موقع پر سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے آگے سر جھکانا، اور یہ کہنا کہ اے اللہ، ہم آپکے ہر فیصلے پر راضی ہیں۔ چاہے صدمہ ہو، چاہے غم ہو، چاہے تکلیف ہو، اسی کا نام صبر ہے، اور دوسرا کام یہ ہے کہ اپنا جائزہ لو، کہ ہم سے کہاں کہاں غلطی ہوئی، پھر ان غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرنا، تأویل اور توجیہ کے چکر میں نہ پڑنا، اور آئندہ اس غلطی سے پرہیز کرنا، بس ایسے موقع پر ایک مسلمان کا طرز عمل یہ ہونا چاہئے۔

یہ دنیا ہے، جنت نہیں

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ''دنیا'' بنایا ہے، یہ جنت نہیں ہے، لہٰذا اس دنیا میں اچھا بھی پیش آئیگا، اور برا بھی پیش آئیگا۔ نفع بھی ہوگا، نقصان بھی ہوگا، فتح بھی ہوگی، شکست بھی ہوگی، راحت بھی ملیگی، تکلیف بھی پہنچے گی۔ اگر اس دنیا میں راحت ہی راحت ہو، تکلیف نہ ہو، پھر تو یہ دنیا نہیں، پھر تو یہ جنت ہو جائیگی۔ لہٰذا جنت جیسی راحت یہاں کسی کو نہیں مل سکتی، لہٰذا اس دنیا میں اچھا اور برا، سرد اور گرم، میٹھا اور تلخ، ہر طرح کا واقعہ پیش آئیگا۔ اگر اس طرح تم مایوس ہو کر بیٹھ جاؤ گے تو پھر تو تم نے زندگی گزار لی۔

کوئی سورج نکلنے والا ہے

اس کائنات میں رات کی تاریکی بھی آتی ہے، اور رات کے بعد دن بھی آتا ہے۔ اور پھر سورج نکلتا ہے، گرمی بھی آتی ہے۔ پھر سردی بھی آتی ہے۔ اللہ تبارک نے یہ دنیا ایسی ہی بنائی ہے۔

ظلمتوں کا جو بول بالا ہے
کوئی سورج نکلنے والا ہے

سورج تو جبھی نکلتا ہے جب تاریکیاں آتی ہیں۔ تاریکیوں کے بعد جب سورج نکلتا ہے تو اسکی روشنی کی قدر بھی ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا ہوتا ہے کہ اے اللہ، تاریکی کے بعد آپ نے ہمیں یہ روشنی بھی عطا فرمائی۔

مایوس مت ہو جاؤ

لہذا کبھی ہمت ہار کر مت بیٹھو کہ حالات میں تاریکی ہو گئی ہے۔ اور مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ ارے کہاں کی مایوسی، یہ تو رات کی تاریکی ہے۔ اسکے بعد انشاء اللہ صبح بھی آنے والی ہے۔ سورج بھی نکلنے والا ہے۔ بس فکر اس بات کی کرو کہ اس صبح کے نکلنے میں تمہارا بھی حصہ لگ جائے۔ اور تم اپنی غلطیوں کی تلافی کرلو۔ نہ یہ کہ مایوس ہو کر بیٹھ جاؤ۔ بلکہ اپنا جائزہ لیکر عزم و ہمت کو تازہ کرلو، اور اپنا سفر از سر نو شروع کرو۔

قید خانہ میں تو تکلیف ہوگی

حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلدُّنیَا سِجنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّتُ الْکَافِرِ

یہ دنیا مؤمن کیلئے قید خانہ ہے، اور کافر کیلئے جنت ہے۔ اور جب یہ قید خانہ ہے تو کیا قید خانہ میں تمہیں عیش و آرام ملیگا؟ قید خانہ میں تو تکلیف ہی پہنچتی ہے۔ تو اس دنیا کے اندر اصل تو "تکلیف" ہے۔ اگر کبھی عیش و آرام مل جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ جو استحقاق کے بغیر آپ کو عطا ہوگئی۔ ورنہ اصلاً تو دنیا میں تکلیف ہی ملنی چاہئے۔ اگر تکلیف ہو رہی ہے تو یہ اصل کے مطابق ہے۔ اس پر نہ تو مایوسی کی بات ہے، نہ تعجب اور پریشانی کی بات ہے۔ بس اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہو۔

اپنی غلطی کو سوچو

بہر حال، صبر کا حاصل یہ ہوا کہ جب بھی کوئی تکلیف پہنچے، کوئی صدمہ آئے، کوئی پریشانی پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر پہلے راضی ہو جاؤ۔ اور راضی ہو کر اپنی غلطی کو سوچو، اگر غلطی سمجھ میں آئے تو اسکی تلافی کرلو۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو کسی اور سے پوچھ لو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ، جس غلطی کی یہ سزا ہے، اس پر مجھے متنبہ فرما دیجئے۔ اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما دیجئے۔ اسلئے کہ جو مصیبت ہمیں پیش آئی ہے، وہ کسی غلطی کا نتیجہ ہے۔ اس غلطی کو معاف فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں صبر کی تینوں قسموں پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔
(سورۃ الزمر: ۱۰)

کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک تکلیف اور تین ثواب

مجلس نمبر 98

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی.

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 98

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک تکلیف اور تین ثواب

مجلس نمبر 98

الحمدللّٰہ رب العالمین، والعاقبة للمتقین، والصّلاۃ والسّلام علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہ وأصحابہ اجمعین۔ امابعد:

''صبر'' کا ثواب کس صورت میں ملے گا

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے صبر کے بارے میں بڑا اہم سوال کیا، اور حضرت والا نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس کا جواب دیا۔ اور اس جواب میں بڑے علوم ہیں، وہ سوال یہ کیا کہ:

> صبر پر جو وعدہ ثواب کا ہے، وہ کس صورت میں ہے؟ یعنی کوئی شخص کسی انتقام یا تکلیف کے دور کرنے پر قادر ہے، اور نہ کرے، تب اجر ملے گا؟ یا قادر نہ ہو۔ پھر صبر کرے اس پر اجر ملے گا؟ (انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۹)

سوال کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے کوئی تکلیف پہنچی، اب وہ شخص اس ظالم تکلیف پہنچانے والے شخص سے انتقام لینے پر قادر نہیں۔ اگر

انتقام لینا بھی چاہے تو نہیں لے سکتا، اس صورت میں انتقام نہ لینے کی وجہ سے ''صبر'' کرنے کا اجر اس کو ملے گا یا نہیں؟

ایک تکلیف پر تین ثواب

یہاں میں وضاحت کر دوں کہ جب بھی کسی انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس تکلیف پر اللہ تعالیٰ نے اجر و ثواب کے تین مختلف راستے رکھے ہیں۔ ایک تو مطلق تکلیف پہنچنے سے ہی ثواب مل جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس تکلیف پر کوئی شرط عائد نہیں ہے، مثلاً پاؤں میں کانٹا لگا، تکلیف ہوئی اور ثواب لکھا گیا۔

دوسرا ثواب ''صبر'' بمعنی ''رضا بالقضاء'' کا، یعنی آدمی نے تکلیف پر صبر کیا اس معنی میں کہ میں اللہ جل شانہٗ کے فیصلے پر راضی ہوں۔ اس کی مشیت پر راضی ہوں۔ مجھے اس پر کوئی گلہ اور شکوہ، کوئی اعتراض نہیں۔ دوسرا ثواب اس صبر پر ملے گا۔

بدلہ نہ لینے پر ثواب

تیسرا ثواب اس پر ملتا ہے کہ یہ شخص تکلیف پہنچانے والے سے بدلہ نہ لے، مثلاً کسی آدمی کی طرف سے تکلیف پہنچی اور اس کو انتقام لینے کا حق تھا، لیکن اس نے انتقام نہیں لیا، اس پر یہ تیسرا ثواب اس کو ملے گا، مثلاً ایک آدمی نے آ کر آپ کو مکہ مار دیا، اس ایک مکے پر تین ثواب ملیں گے، ایک ثواب اس مکے سے پہنچنے والی تکلیف پر، دوسرا ثواب اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کا اور تیسرا ثواب انتقام نہ لینے کا، یہ تین الگ الگ ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو

ایک تکلیف پر ملتے ہیں۔ اس ذات کی رحمت تو دیکھو کہ ایک تکلیف پہنچائی تو ثواب کے تین دروازے کھول دیئے۔

بے صبری کی متعدد صورتیں

ثواب کی یہ جو تیسری قسم ہے، یعنی انتقام اور بدلہ نہ لینا، اس کے بارے میں سوال کرنے والے سوال کر رہے ہیں کہ بدلہ نہ لینے پر جو ثواب ملتا ہے، آیا یہ ثواب اس وقت ملتا ہے جب انسان بدلہ لینے پر قادر ہو، اور پھر بدلہ نہ لے، یا اس وقت بھی ملتا ہے جب کہ بدلہ لینے پر قادر نہ ہو______ اس سوال کا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑا تفصیلی جواب دیا، چنانچہ فرمایا:

''بے صبری کی متعدد صورتیں ہیں''

یہاں ''صبر'' سے ثواب کی تیسری قسم مراد ہے، یعنی انتقام اور بدلہ نہ لینا، اس لئے کہ ''بدلہ لینا'' بے صبری ہے، اور بدلہ نہ لینا صبر ہے، حضرت نے فرمایا کہ اس بے صبری کی بھی متعدد صورتیں ہیں۔

① انتقام بالمثل لینا، اس کا ترک کرنا صبر ہے۔

یہ مشروط ہے قدرت کے ساتھ'' (ایضاً)

انتقام بالمثل کے ترک پر ثواب

مثلاً ایک شخص نے آپ کو مکا مارا، آپ نے بھی اتنی ہی زور کا مکہ مار دیا، اب جیسی تکلیف اس نے پہنچائی تھی، ویسی ہی تکلیف آپ نے پہنچا دی۔ یہ انتقام بالمثل ہے۔ یہ انتقام لینا صبر کے خلاف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تیسری قسم کا

ثواب نہیں ملے گا، اور البتہ انتقام لینے کے باوجود پہلی دو قسموں کا ثواب اس کو ملے گا، لہٰذا جو تکلیف پہنچی۔ اس کا ثواب اس کو ملا، اور اس تکلیف کے فیصلے پر اور اللہ کی مشیت پر راضی رہا، اس ''رضا بالقضاء'' کا ثواب بھی ملے گا۔ البتہ بدلہ نہ لینے پر جو ثواب ملنا تھا۔ وہ نہیں ملے گا۔ لہٰذا انتقام بالمثل لینا بے صبری کی ایک صورت ہوئی، اور انتقام نہ لینا صبر ہے، یہ صبر تیسرے معنی اور تیسرے ثواب کے لحاظ سے ہے، اس لئے کہ جب دوسرے شخص نے مکہ مارا تو یہ بھی مکہ مارنے پر قادر تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے سوچا کہ چلو چھوڑو۔

صبر کا اعلیٰ درجہ

قرآن کریم نے تو کہہ دیا کہ جس نے کسی دوسرے کو تکلیف پہنچائی ہو، اتنی ہی تکلیف دوسرے کو پہنچانے کا حق حاصل ہے، لیکن قرآن کریم نے یہ بھی فرمایا کہ:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

(سورہ شوریٰ، آیت ۴۳)

یعنی جو صبر کرے اور معاف کر دے تو یہ بڑی عزیمت کی بات ہے۔ اس پر بڑا اجر و ثواب ہے، لہٰذا باوجود قدرت کے اگر انتقام نہ لیا، اور معاف کر دیا تو یہ صبر کا اعلیٰ درجہ ہے، اور اس پر انشاء اللہ تیسرا ثواب بھی مرتب ہوگا۔

یہ ثواب قدرت ہونے پر موقوف ہے

البتہ یہ ثواب قدرت کی شرط کے ساتھ مشروط ہے، یعنی یہ ثواب اس وقت ملے گا جب مکہ مارنے پر قدرت تھی، اور چاہتا تو مار دیتا، لیکن پھر بھی اللہ کی

خاطر اور اللہ کو راضی کرنے کے لئے مکہ نہیں مارا تو اس پر تیسرا ثواب ملے گا، لیکن اگر انتقام لینے کی قدرت نہیں تھی، مثلاً ایک حاکم مکہ مار گیا، جس سے بدلہ لینا اپنے اختیار میں نہیں تھا، تو اب سوائے خون کے گھونٹ پینے کے کوئی چارہ نہیں، اب جو انتقام نہیں لیا، اس پر تیسری قسم کا ثواب اس کو نہیں ملے گا، البتہ پہلی دو قسموں کا ثواب اس کو ملے گا، تیسری قسم کا ثواب اس لئے نہیں ملے گا کہ اس نے اللہ کے لئے انتقام نہیں لیا، بلکہ قدرت نہ ہونے کی وجہ سے انتقام نہیں لیا۔

بے صبری کی دوسری صورت

آگے حضرت والا بے صبری کی دوسری صورت بیان فرما رہے ہیں کہ:

> ② دوسری صورت زبان سے برا بھلا کہنا، سامنے یا پسِ پشت بددعا دینا، غیر قادر علی الانتقام بھی اس پر قادر ہے، اس کے لئے ترک کرنا صبر ہے (ایضاً)

یعنی جس آدمی کو زیادتی کا انتقام اور بدلہ لینے کی قدرت نہیں تو کیا ایسا شخص تیسرے ثواب سے محروم رہے گا؟ کیونکہ تیسری قسم کا ثواب تو اس شخص کو ملتا ہے، جس کو انتقام پر قدرت ہو، اور پھر انتقام نہ لے، حضرت والا ایسے شخص کے لئے فرما رہے ہیں کہ تم بھی تیسری قسم کا ثواب حاصل کر سکتے ہو۔ وہ اس طرح کہ اگرچہ تم جسمانی طور پر اس شخص سے بدلہ لینے پر قادر نہیں تھے، لیکن تم اس بات پر تو قادر تھے کہ جب وہ شخص سامنے سے چلا جائے تو پیٹھ پیچھے اس کی برائی بیان کرتے، یا اس کی غیبت کرتے، اور لوگوں سے کہتے کہ یہ بڑا ظالم اور جابر ہے، برا خراب آدمی ہے، یا اس کے لئے تم بددعا تو کر سکتے تھے کہ یا اللہ! اس کو ہلاک

کردے، کیونکہ اس نے مجھے پریشان کیا، اور ستایا، کم از کم اس پر تو تم کو قدرت حاصل تھی، لیکن قدرت کے باوجود تم نے یہ کام نہیں کئے، نہ تو تم نے اس کی غیبت کی، نہ برا بھلا کہا، نہ بددعا دی۔ بلکہ تم نے اس کو یہ دعا دی کہ یا اللہ! اس کو ہدایت دیدے، تو اب تمہیں تیسری قسم کا ثواب بھی مل جائے گا۔

کسی کے انتقال پر ثواب کب ملیگا؟

آگے ارشاد فرمایا:

> اسی طرح اہل میت گو مدافعت پر قادر نہیں، لیکن نوحہ کرنے اور شکایت کرنے پر تو قادر ہیں۔ ان کی یہ بے صبری ہے، اور اس کا ترک کرنا صبر ہے (ایضاً)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے قریبی عزیز کا انتقال ہوگیا، والد کا، یا بھائی کا، یا بیٹے کا، یا بیوی کا انتقال ہوگیا، اب یہ شخص مدافعت پر قادر نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے نعوذ باللہ انتقام لے، یا بدلہ لے، لہٰذا عدم قدرت کے نتیجے میں اس شخص کو صبر کرنے پر تیسری قسم کا ثواب نہ ملنا چاہئے، کیونکہ یہ اصول بتا دیا کہ جب انتقام لینے پر قدرت ہو، اور پھر انتقام نہ لینے پر یہ ثواب ملتا ہے اور کسی کے انتقال ہو جانے پر آدمی صبر کرنے پر مجبور ہے، انتقام کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

تسلیم و رضا کے بغیر چارہ نہیں

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

در پنجۂ شیر نر خونخوارے
جز بتسلیم و رضا چوں چارے

یعنی اگر کوئی خونخوار شیر کسی انسان کو اپنے پنجوں میں لے لے، تو اس انسان کے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اب سوائے تسلیم و رضا کے کوئی چارہ کار نہیں۔ اب بچنے کا کوئی راستہ نہیں، جو شیر کی مرضی ہوگی، کرے گا، پھاڑنا چاہے گا، پھاڑ دے گا، کھالے گا_____ اب یہاں تسلیم و رضا مجبوری کی وجہ سے ہوتی ہے۔

نوحہ اور شکوہ نہ کرنے پر ثواب

اس طرح اللہ تعالیٰ نے جب ہمارے کسی عزیز کو موت دیدی تو اب ہم مجبور ہیں، بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، اب یہاں جو تسلیم و رضا ہو رہی ہے، وہ مجبوری کی وجہ سے ہو رہی ہے، لہٰذا اس پر ثواب نہیں ملنا چاہئے، اس سوال کا جواب حضرت والا یہاں سے دینا چاہتے ہیں کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ انسان اپنے عزیز کی موت دفع کرنے پر تو قادر نہیں ہے، لیکن اس پر قادر ہے کہ موت کے نتیجے میں نوحہ کرسکتا تھا، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر شکوہ کرنے پر تو قادر تھا۔ لیکن اس شخص نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہ تو نوحہ کیا، نہ ہی اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر شکوہ کیا۔ تو اس پر بھی صبر کی تیسری قسم کا ثواب بھی اس کو حاصل ہو جائے گا، کیونکہ یہ اصول بتادیا کہ جب انتقام لینے پر قدرت ہو تو اس کے ترک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔

آگے حضرت والا فرماتے ہیں کہ:

"اور جو کسی فعل پر بھی قادر نہ ہو، جیسے اندھا کہ دیکھنے پر تو بالکل قادر نہیں، مگر تصور یا عزم بصورت ابصار، یا تمنائے

ابصار للابصار پر تو قادر ہے، اس کی بے صبری یہ ہے، اور
اس کا ترک صبر ہے، لہٰذا ہر شخص کو اس کے مناسب صبر پر اجر
ملتا ہے۔" (ایضاً)

آنکھ والے کو بدنگاہی سے بچنے پر ثواب

جس شخص کی آنکھیں درست ہوں، اس کے دل میں کسی نامحرم کو دیکھ کر لذت لینے کا تقاضہ پیدا ہوا، لیکن اس نے اللہ جل شانہ کے خوف اور ڈر سے اور اللہ کو راضی کرنے کے لئے اس نے سوچا کہ اگرچہ میرا دل نامحرم کو دیکھنے کا تقاضہ کر رہا ہے، لیکن میں اپنے آپ کو روکتا ہوں اور اپنی نظر کو غلط جگہ پر نہیں ڈالوں گا، چنانچہ اس نے اپنی نظر کو روک دیا، اس پر اس کو صبر کا ثواب ملا، کیونکہ اس کے دل میں دیکھنے کا تقاضہ پیدا ہوا تھا، اور اس کا نفس اس کو گناہ کی طرف لے جا رہا تھا، لیکن اللہ کی خاطر اس نے یہ گناہ نہیں کیا، اور نفس کو روک لیا، لہٰذا اس پر اس کو صبر کا ثواب ملے گا۔

اندھے غیر قادر کو ثواب نہیں ملے گا

لیکن ایک آدمی اندھا ہے، وہ دیکھ ہی نہیں سکتا، ایسے شخص کے دل میں اولاً تو بدنظری کی خواہش پیدا ہی نہیں ہوگی، اگر خواہش پیدا ہو بھی، اور پھر بدنظری سے بچ جائے تو اس پر ثواب بھی نہیں ملے گا، کیونکہ وہ بدنظری سے اس لئے نہیں بچا کہ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا، بلکہ وہ اس لئے بچا کہ اس کے اندر دیکھنے کی قدرت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا بدنظری سے بچنے پر اس اندھے کو کوئی ثواب نہیں ملے گا، اسی طرح اگر کوئی نامرد آدمی زنا کاری سے بچے تو اس پر کوئی ثواب نہیں۔

اسی طرح ایک اپاہج آدمی چوری کرنے سے بچے، اس پر کوئی ثواب نہیں، اسی طرح گونگا آدمی غیبت کرنے اور جھوٹ بولنے سے بچے تو اس پر کوئی ثواب نہیں، کیونکہ اس کو اس گناہ کے کرنے پر قدرت ہی نہیں تھی، اگر جھوٹ بولنا چاہتا بھی تو نہیں بول سکتا تھا، نہ غیبت کر سکتا تھا، لہٰذا اس کو ان گناہوں کے ترک پر کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

اندھے کو تمنا نہ کرنے کا ثواب ملے گا

آگے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ وہ اندھا شخص اگرچہ دیکھنے پر تو قادر نہیں تھا، لیکن دیکھنے کی تمنا پر تو قادر تھا، یعنی یہ تمنا تو کر سکتا تھا کہ کاش میری آنکھ ہوتی تو یہ لذت لیتا، یا فلاں گناہ کرتا، گونگا بول نہیں سکتا، لیکن یہ تمنا کر سکتا تھا کہ کاش میری زبان ہوتی تو یہ جھوٹ بولتا، یا فلاں کی غیبت کرتا، اب تمنا بھی کر رہا ہے، اور قصد بھی ہو رہا ہے، اور اپنے اختیار سے گناہ کی تمنا کرنا بھی گناہ ہے، اب اگر اس شخص کے دل میں گناہ کی تمنا کرنے کا داعیہ اور تقاضہ پیدا ہوا تھا، لیکن اس نے تمنا نہیں کی، اللہ کے ڈر اور خوف سے تمنا کرنے سے رک گیا تو پھر اس کو صبر کی تیسری قسم کا ثواب بھی ملے گا۔

تکلیف کا اجر تو ضرور ملے گا

آگے ارشاد فرمایا کہ:

> یہ تفصیل تو اجر صبر میں ہے، اور ایک اجر خود تکلیف پر بھی ہوتا ہے، اس میں صبر کی قید نہیں، اگر صبر کیا تو دو اجر ملیں گے، ایک صبر کا، دوسرے تکلیف کا، اور اگر صبر نہ کیا تو تکلیف کا اجر

ملے گا، اور بے صبری کا گناہ ہوگا، جیسے ایک شخص نماز پڑھے،
اور روزہ نہ رکھے تو نماز کا ثواب ملے گا اور روزہ نہ رکھنے کا
گناہ ہوگا (ایضاً)

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بے صبری کا مظاہرہ کرے، مثلاً نوحہ کرے، یا ماتم کرے، یا دل میں اللہ جل شانہ کے فیصلے پر شکوہ ہو، یہ بے صبری ہے تو بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس بے صبری کے نتیجے میں تکلیف پر جو ثواب ملتا، وہ چلا گیا، حضرت والا فرمارہے ہیں کہ یہ سمجھنا غلط ہے، کیونکہ دونوں ثواب الگ الگ ہیں، ایک ثواب تو تکلیف پہنچتے ہی مل گیا، چاہے صبر کرو، یا صبر نہ کرو، وہ ثواب صبر کرنے پر موقوف نہیں، اگر کوئی شخص بے صبری کرے تو بے صبری کا گناہ ہوگا، لیکن تکلیف پہنچنے کا ثواب بھی ملے گا۔

نماز کا ثواب، گناہ کا عذاب

یہ بالکل ایسا ہے جیسے ایک شخص نماز پڑھے، ساتھ میں کوئی گناہ بھی کرے، تو اب نماز کا ثواب بھی اس کو ملے گا، اور گناہ پر عذاب بھی ملے گا، دونوں اپنی اپنی جگہ پر ہونگے، ایسا نہیں ہوگا کہ چونکہ گناہ کیا تھا، لہٰذا نماز کا ثواب بھی ضائع ہوگیا۔

ہر چیز کا حساب الگ مقرر ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں قاعدہ یہ ہے کہ جو ثواب کا کام ہے، اس پر ثواب ملے گا، جو عذاب کا کام ہے، اس پر عذاب، یہ نہیں کہ عذاب کے کام کی وجہ سے ثواب کا کام بھی جاتا رہا، ایسا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر ایک چیز کا

حساب الگ مقرر ہے، یہ اور بات ہے کہ بعض گناہوں کی بے برکتی ایسی ہوتی ہے کہ آدمی بعض اوقات نیک کام سے محروم ہو جاتا ہے، وہ الگ بات ہے، لیکن جہاں تک ثواب کا تعلق ہے، ثواب ضرور ملے گا، ایک شخص نے نماز پڑھی، اس کو نماز کا ثواب مل گیا، اب مسجد سے باہر نکل کر اس نے جھوٹ بول دیا، اب اس کو جھوٹ کا گناہ بھی ہوگا۔ لیکن جھوٹ بولنے کی وجہ سے نماز کا ثواب ضائع نہیں ہوگا۔

ایک تکلیف پر تین رحمتیں

اسی بات کو حضرت والا فرما رہے ہیں کہ جو تکلیف پہنچی، اس تکلیف کے نتیجے میں انسان کو جو صدمہ ہوا، اس پر براہ راست ثواب اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادیا، قطع نظر اس سے کہ تم اس تکلیف صبر کرتے ہو یا نہیں اور اگر تم نے صبر بھی کیا تو دوسرا ثواب عطا فرمادیا، اور اگر صبر نہیں کیا، بلکہ بے صبری کی تو اس پر گناہ ہوگا ----- یہ بڑی دقیق باتیں ہیں جو حضرت والا نے یہاں بیان فرمائی ہیں ----- خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک تکلیف کے اوپر تین ثواب رکھے ہیں۔ ایک تکلیف کا ثواب، دوسرے اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنے کا ثواب، تیسرے قدرت کے باوجود انتقام نہ لینے کا ثواب، میرے مولیٰ کا کرم دیکھو کہ ایک تکلیف دی، اور اس پر رحمت کے تین دروازے کھول دیئے۔

زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام دین ہے

اسی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہیں، تکلیف کے وقت ان کی نظر ان رحمتوں کی طرف ہوتی ہے، دیکھنے میں یہ تکلیف اور پریشانی لگ رہی ہے،

لیکن حقیقت میں اس کے ذریعے درجات بلند ہو رہے ہیں، بس تھوڑا سا دھیان دینے کی بات ہے ــــــ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں: دین تو زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، وہی کام تم پہلے بھی کر رہے تھے، اب ذرا زاویہ نگاہ بدل دو، اور دوسرے زاویہ سے کرنا شروع کر دو، پہلے وہ دنیا تھی، اور اب دین ہو گیا۔

تکلیف کو راحت بنانے کا آسان طریقہ

دنیا میں کوئی آدمی ایسا ہے جس کو تکلیف نہ پہنچے؟ اس دنیا میں تو تکلیف ضرور پہنچے گی، بڑے سے بڑا بادشاہ، بڑے سے بڑا صاحب اقتدار، بڑے سے بڑا فلسفی، بڑے سے بڑا دانشور، بڑے سے بڑا صاحب دولت ایسا نہیں ہے، جس کو کبھی تکلیف نہ پہنچی ہو، اب ایک طریقہ یہ ہے کہ تم اس تکلیف کو تکلیف بنائے رکھو، اور اس تکلیف کو اپنے لئے وبال جان بنالو، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ اس تکلیف کا ایسا علاج کرو کہ تکلیف تمہارے لئے راحتوں کا اور رحمتوں کا ذریعہ بن جائے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب تکلیف پہنچے تو اس وقت یہ تصور کرو کہ بیشک یہ تکلیف پہنچی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو میرے لئے ثواب کا ذریعہ بنایا ہے:

اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر

دوسرے یہ سوچو کہ میں اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی ہوں، چاہے صدمہ ہو، چاہے تکلیف ہو، چاہے رنج ہو، لیکن میں اس پر راضی ہوں، تو اللہ تعالیٰ مجھے رضا بالقضا کا ثواب بھی عطا فرمائیں گے، تیسرے یہ سوچو کہ میں انتقام لے کر کیا کروں گا، مجھے جو تکلیف پہنچی ہے، اگر میں ویسی تکلیف دوسرے کو پہنچا دوں گا،

شریعت نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن اس سے مجھے کیا ملے گا؟ لیکن اگر معاف کردوں گا تو مجھے بہت کچھ ملے گا، اس لئے میں بدلہ نہیں لیتا، میں معاف کرتا ہوں ـــــــ لہٰذا میں کیوں ایک تکلیف پر تین ثواب نہ کمالوں، جب یہ سوچوگے تو اس سے زاویہ نگاہ بدل جائے گا، اور زاویہ نگاہ کے بدلنے سے وہ تکلیف راحت اور عافیت اور رحمت بن جائے گی۔

یہ رحمت دشمنوں کو کیوں ملے

اسی بات کو ایک شعر میں کہا گیا ہے، یہ شعر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بہت پسند تھا، اور آپ کے تقریباً ہر وعظ میں یہ شعر موجود ہے:

نہ شود نصیب دشمن کہ بود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اس شعر کا مصداق بڑا خطرناک ہے، ہمارے بس کی بات نہیں، اس لئے کہ ہم کمزور ہیں، لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ: تیری تلوار سے ہلاکت میرے دشمنوں کا مقدر کیوں ہو؟ دوستوں کا سر سلامت ہے تو اس پر اپنا خنجر آزما، یعنی ہمیں تو تیرے خنجر آزمانے میں لذت ہے، یہ لذت ہمارے دشمنوں کو کیوں ملیں، یعنی تیری طرف سے جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں، ان تکلیفوں پر ان ثوابوں کا تصور کریں جو ان پر ملنے والے ہیں، یا اس تکلیف کا رونا روئیں، کیونکہ جو تکلیف آپ کی طرف سے پہنچتی ہے وہ حقیقت میں رحمت ہوتی ہے، اور جب وہ رحمت ہوتی ہے تو وہ رحمت میرے دشمن کے پاس کیوں جائے، میرے پاس کیوں نہ آئے ـــــ ہم جیسے کمزوروں کو یہ بات نہیں کہنی چاہئے۔ یہ اونچے لوگ ہیں جو

یہ بات کہتے ہیں، ہمارے بس کی بات نہیں، ہمیں تو اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگنی چاہئے۔

بزرگوں کی صحبت زاویہ نگاہ بدل دیتی ہے

لیکن حضرت والا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے تکلیف مت مانگو، لیکن جب تکلیف آجائے تو اس وقت یہ تصور کرو کہ میاں، یہ تو دینے والے کی عطا ہے، یہ عنوان اگرچہ تکلیف کا ہے، لیکن حقیقت میں رحمت ہے، اس کے ذریعہ کتنے اجر وثواب کے دروازے کھول دیے ____ یہ چیز زاویہ نگاہ کے تبدیل کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اور بزرگوں کی صحبت سے یہی چیز حاصل ہوتی ہے کہ ان باتوں کی طرف نگاہ جانے لگتی ہے، پہلے تو غفلت کے عالم میں تھے، خوشی آگئی تو آنے دو، تکلیف آگئی تو آنے دو، نہ خوشی پر کوئی شکر ہے، نہ تکلیف پر کوئی صبر ہے، اس طرح کی زندگی گزر رہی تھی، لیکن جب کسی اللہ والے سے تعلق قائم کیا، اور اس کے پاس اٹھنا بیٹھنا شروع کیا تو اس نے زاویہ نگاہ کو بدل دیا۔ اس کے نتیجے میں خوشی بھی وہی رہے گی جو پہلے ہوا کرتی تھی، لیکن اب اس خوشی پر زاویہ نگاہ بدل جائے گا کہ خوشی آنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو گے، تو وہ خوشی تمہارے لئے باعث اجر وثواب بن جائے گی، اور تکلیف جیسے پہلے آتی تھی، اب بھی آئے گی، شیخ کے پاس آنے سے تکلیفیں رفع نہیں ہوتیں، لیکن پہلے تکلیف اس طرح آتی تھی کہ تکلیف ہی تکلیف ہوتی تھی، اب ہم نے تمہارا زاویہ نگاہ تبدیل کر دیا، اب یہ تکلیف تمہارے لئے رحمت بن کر آئے گی، بزرگوں کے پاس جانے سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کے پاس

کوئی جنتر منتر ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ تمہیں گناہوں سے بچالیں گے، تمہیں جنت میں پہنچادیں گے، ایسا کچھ نہیں ہوتا، بلکہ جو کچھ کرنا ہوتا ہے، آدمی کو خود کرنا ہوتا ہے، لیکن ان کے پاس جاؤ گے تو وہ تمہارا زاویہ نگاہ تبدیل کردیں گے۔

صحبت اولیاء سوسالہ عبادت سے بہتر

اسی واسطے فرماتے ہیں:

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء
بہتر است از صد سالہ طاعتِ بے ریا

یعنی اللہ والے کی ذرا دیر کی صحبت سو سال کی بے ریا طاعت سے بہتر ہے، کیوں؟ اس لئے کہ جب اس کے پاس نہیں گئے تھے اور اس کی صحبت حاصل نہیں کی تھی تو زاویہ نگاہ درست نہیں ہوا تھا، اور اس نے ایک لمحہ میں زاویہ نگاہ تبدیل کردیا، جو باتیں پہلے سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اب سمجھ میں آنے لگیں، جن باتوں کی طرف پہلے دھیان نہیں ہوتا تھا، اب ہونے لگا، جس چیز کی طرف پہلے نگاہ نہیں جاتی تھی، اب جانے لگی، یہ چیزیں بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہیں، جو صد سالہ طاعت بے ریا سے بہتر ہے۔

راحت اور تکلیف دونوں پر اجروثواب

بہرحال! اس دنیا میں خوشی بھی آئے گی، اور تکلیف بھی آئے گی، جب خوشی آئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور جب تکلیف آئے تو اس وقت ان تین باتوں کا تصور کرو کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ نے اجروثواب کے تین راستے عطا فرمادیے ہیں، اور میرا زاویہ نگاہ بھی درست ہوگیا، اب الحمدللہ وہ حدیث صادق

آ گئی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مؤمن کا کسی حال میں گھاٹا نہیں، اگر اس کو راحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے، وہ اس پر شکر ادا کرتا ہے، اس پر اسکو ثواب ملتا ہے، اگر تکلیف پہنچتی ہے، اس پر صبر کرتا ہے تو اس پر اس کو ثواب ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''تکالیف'' ترقی درجات کا سبب ہیں

مجلس نمبر 99

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی.

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 99

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''تکالیف'' ترقی درجات کا سبب ہیں

مجلس نمبر 99

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رسوله الکریم، وعلی آله واصحابه اجمعین۔ امابعد:

افلاطون کا سوال، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب

گزشتہ چند روز سے صبر کا بیان چل رہا ہے، انہی ملفوظات میں ایک ملفوظ یہ ہے کہ:

افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر حوادث تیر ہوں، اور آسمان کمان ہو، تیر انداز حق تعالیٰ ہوں، تو بچنے کی کیا صورت ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تیر انداز کے پہلو میں جا کھڑا ہو، پھر تیر سے بچ جائے گا، کیونکہ تیر اسی کو ہلاک کرتا ہے جو اس کی زد پر ہو، اور جو تیر انداز کے پہلو میں کھڑا ہو، اس پر تیر نہیں پہنچتا، یعنی تعلق مع اللہ ایک ایسی چیز

ہے جس سے حوادث ضرر نہیں پہنچا سکتے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۲۱۱)

ایسے تیروں سے بچنے کا کیا راستہ؟

یہ ایک روایت ہے، اس زمانے کی روایات کوئی بہت زیادہ مضبوط سند والی نہیں ہوتیں، لیکن جس طرح اور تاریخی روایات ہیں، اسی طرح کی یہ بھی ایک روایت ہے ــــــ اس میں افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر حوادث تیر ہوں، یعنی حوادث زمانہ کو تیر تصور کریں، اور آسمان کو کمان، جس طرح کمان سے تیر چلتا ہے، اسی طرح آسمان سے حوادثِ روزگار انسانوں کو پہنچ رہے ہیں، اور حق تعالیٰ تیر انداز ہیں، یعنی وہ حوادث زمانہ کے تیر چلا رہے ہیں، تو ایسی صورت میں ان تیروں سے بچنے کا کیا راستہ ہے؟ کیونکہ پورا آسمان کمان بنی ہوئی ہے تو ساری دنیا اس کی زد میں ہے، اور تیر انداز بھی کوئی اناڑی نہیں ہے، جس کا نشانہ خطا ہو جائے، بلکہ تیر انداز حق تعالیٰ ہیں، تو اب بچنے کا کیا راستہ ہے؟

تیر انداز کے پہلو میں کھڑے ہو جاؤ

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تیر انداز کے پہلو میں جا کر کھڑا ہو جائے، وہاں تیر نہیں آئے گا، کیونکہ تیر اسی کو ہلاک کرتا ہے جو اس کی زد پر ہو، اور جو شخص تیر انداز کے پہلو میں کھڑا ہوگا، اس پر تیر نہیں پہنچتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ اگر ان تیروں سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا واحد راستہ یہ ہے کہ تعلق مع اللہ پیدا کرو، اللہ جل شانہ سے تعلق پیدا کرو، جب اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہو جائے گا، تو پھر یا تو تیر لگے گا نہیں، یعنی حادثہ پیش نہیں آئے گا، یا اگر حادثہ پیش آئے گا تو اس

پیش آنے والے حادثہ پر غم، صدمہ اور پریشانی اس درجہ کی نہیں ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جڑا ہوا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جڑا ہوا ہوتا ہے تو پھر تکلیف اور پریشانی بھی پریشانی نہیں رہتی، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے یہ جو کچوکے لگ رہے ہیں، یہ جو مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت سے پہنچ رہی ہے اور میرے حق میں بالآخر فائدہ مند ہے، اور مجھے اس پر اجر ملنے والا ہے، اس کے ذریعہ میرے درجات بلند ہونے والے ہیں۔

یہ تکلیف میرے فائدے کیلئے ہے

جیسے کل میں نے ایک مثال دی تھی کہ کوئی شخص ڈاکٹر سے آپریشن کرا رہا ہے، تو اس آپریشن کے نتیجے میں تکلیف بھی ہورہی ہے، آہ آہ بھی کر رہا ہے، لیکن دل میں یہ یقین ہے کہ ڈاکٹر میرا ہمدرد ہے، یہ میرا خیرخواہ ہے، تو جب انسان کا اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق قائم ہو جاتا ہے تو اگر اس کے بعد کوئی پریشانی اور تکلیف بھی آتی ہے تو آدمی کے دل میں یہ ایمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے فائدے کے لئے یہ تکلیف دی ہے، اگرچہ مجھے اس سے تکلیف ہورہی ہے---- جب یہ اطمینان ہے تو ٹیسیں بھی اٹھیں گی، آہیں بھی نکلیں گی، آنسو بھی نکلیں گے، لیکن دل میں شکوہ نہیں ہوگا، بلکہ دل میں اطمینان ہوگا کہ انجام کار بہتر ہے، اور انشاء اللہ اس سے مجھے فائدہ پہنچے گا۔

یہ تکالیف ''اضطراری مجاہدہ'' ہیں

اور جب تعلق مع اللہ کے ساتھ تکلیفیں ا ں ہیں، یا مصائب آتے ہیں، تو ایک طرف تو یہ فائدہ ہے کہ آدمی کو پریشانی نہیں ہوتی، اور پریشانی کا مطلب ہے

کہ گھبراہٹ ہے، چین نہیں آرہا ہے، اور بے چینی ہے، بلکہ تکلیف کے باوجود اللہ جل شانہ کے فیصلے پر راضی ہے ____ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب تعلق مع اللہ کے ساتھ مصائب آتے ہیں تو یہ "مجاہدہ اضطراری" ہوتا ہے، یعنی یہ "غیر اختیاری مجاہدہ" ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر آرہا ہے، اور بزرگوں کا تجربہ یہ ہے کہ غیر اختیاری مجاہدے میں انسان کے درجات بہت تیزی سے بڑھتے ہیں۔

پہلے صوفیاء اختیاری مجاہدے کراتے تھے

آپ نے سنا ہوگا کہ پہلے زمانے میں لوگ جب اولیاء کرام اور صوفیاء کرام کے پاس اصلاح کے لئے جاتے تھے تو وہ صوفیاء مجاہدے کرایا کرتے تھے، اور مجاہدوں کا مطلب یہ ہے کہ مشقتوں اور ریاضتوں کا کام کرایا کرتے تھے، مثلاً کسی کو اس کام پر لگا دیا کہ تم مسجد کے حمام کے چولہے جھونکا کرو، کسی کو اس کام پر لگا دیا کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو، کسی کو لگا دیا کہ تم وضو کے لئے پانی بھر کے لایا کرو، یہ سب مشقت کے کام کرا رہے ہیں، تاکہ جو نفس گناہوں کا عادی ہوگیا ہے، اس کو ذرا مشقت سہنے کا عادی بنا دیا جائے، اور بالآخر وہ گناہوں سے بچے، اس کام کے لئے مجاہدے کرائے جاتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں مجاہدے کرائے گئے

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے ساتھ یہ ہوا کہ مکہ مکرمہ میں مجاہدے ہو رہے ہیں، مشرکین مکہ نے ظلم وستم ڈھانے کا کوئی طریقہ ان پر نہیں چھوڑا، مارنا، پیٹنا، دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹانا، پتھروں کی سلیں سینوں پر رکھنا، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا جا رہا تھا کہ صبر

کرو، اور جواب مت دو، وہ اگر تھپڑ مار رہے ہیں تو ایک تھپڑ بھی تم ان کو نہ مارو، یہ سب مجاہدہ ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ مجاہدات کے ذریعہ انسان کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کے درجات میں ترقی ہوتی ہے۔

غیر اختیاری مجاہدات سے ترقی تیزی سے ہوتی ہے

لیکن ایک مجاہدہ اختیاری ہوتا ہے، جو بندہ اپنے اختیار سے کرتا ہے، جیسے صوفیاء کرام اپنے مریدوں سے کراتے ہیں ـــــــ اور ایک مجاہدہ غیر اختیاری اور اضطراری ہوتا ہے۔ یعنی من جانب اللہ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ اس کی وجہ سے مشقتوں سے گزر رہا ہے، صدمے اور تکلیفیں آ رہی ہیں، اگر تعلق مع اللہ کے ساتھ ساتھ راستہ صحیح ہو تو پھر ان غیر اختیاری مجاہدات میں روحانی ترقی بڑی تیز رفتاری سے ہوتی ہے ـــــــ لہٰذا اگر ایک سال تک کسی خانقاہ میں رہ کر جو مجاہدات کرو گے، ان کا وہ فائدہ نہیں ہوگا جو ایک مہینہ تک غیر اختیاری طور پر مصائب اور مشکلات سے فائدہ ہوگا، تو مجاہدہ اضطراری کے نتیجے میں ایک مہینے میں وہ فاصلہ طے ہو جائے گا جو سال بھر میں طے نہیں ہوا تھا۔ بہر حال! مجاہدہ اضطراریہ میں یہ فائدہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ تکالیف جو آتی ہیں، یہ بالآخر ایک مؤمن کے لئے فائدہ مند ہوتی ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں ترقی درجات کا باعث ہوتی ہیں، روحانی مدارج طے ہو جاتے ہیں، اور آخرت میں اس پر اجر و ثواب ملتا ہے۔

تکلیف نہیں، عافیت مانگو

یہ اور بات ہے کہ تکالیف مانگنے کی چیز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت

مانگو، کہ یا اللہ! ہم کمزور ہیں، معلوم نہیں کہ ہم ان تکالیف کا تحمل کرسکیں، یا نہ کرسکیں، ہم اپنی بہادری کا دعویٰ نہیں کرتے، اس لئے یا اللہ! ہم آپ سے عافیت مانگتے ہیں، لیکن جب تکلیف آئے گی تو اس پر صبر و تحمل کی بھی توفیق آپ سے مانگتے ہیں، البتہ ان تکالیف کے دور کرنے کا علاج بھی کرو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ یقین رکھو کہ یہ تکالیف بالآخر میرے لئے انشاء اللہ فائدہ مند ہیں۔

سقوط ڈھاکہ کا واقعہ

یہ ''تعلق مع اللہ'' تکالیف کے وقت پریشانی کو دور کر دیتا ہے، کیونکہ ''تعلق مع اللہ'' کے بعد جو مصیبتیں آئیں گی، یا پریشانیاں آئیں گی، اس کے نتیجے میں گھبراہٹ اور بے چینی نہیں ہوگی، جس وقت ''مشرقی پاکستان'' کے الگ ہونے کا واقعہ پیش آیا، اس وقت پاکستان کے نوے ہزار فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیے، تو اس موقع پر اتنا صدمہ ہوا کہ کسی طرح قرار نہیں آتا تھا، ہر وقت دماغ پر وہی صدمہ مسلط ہوگیا، نہ نماز میں دل لگ رہا تھا، نہ تلاوت قرآن کریم میں دل لگ رہا تھا، کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا، ہر وقت پریشانی دل پر چھائی رہتی کہ یا اللہ! یہ کیا ہوگیا، تاریخ میں کبھی بھی اتنی بڑی تعداد میں مسلمان فوجیوں نے کافروں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے، جیسے وہاں ڈال دیے______

چنانچہ میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ حضرت! مجھے یہ صدمہ ہے، اور اس صدمہ کی وجہ سے کسی پل قرار نہیں آرہا ہے، پریشانی ہے کہ آئندہ کیا ہوگا، اور اس کی وجہ سے نہ نماز میں دل لگ رہا ہے، نہ کسی اور کام میں دل لگ رہا ہے، جواب میں حضرت والا نے ایک جملہ تحریر فرمایا، اس جملہ نے دروازہ کھول دیا کہ الحمدللہ آج تک اس کی ٹھنڈک دل میں محسوس ہوتی

ہے، اور جب کبھی اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو حضرت والا کا یہ جملہ یاد آجاتا ہے جس کی وجہ سے پریشانی نہیں ہوتی، وہ جملہ یہ تھا کہ:

غیر اختیار امر پر اتنا تأثر قابل اصلاح

''غیر اختیاری امور پر اتنا تأثر لینا قابل اصلاح ہے''

یعنی جو بات انسان کے اختیار میں نہیں، اور غیر اختیاری طور پر ہوگئی، اور منجانب اللہ ہوگئی، کیا تمہارے اختیار میں ہے اس کا مداوا کرنا؟ اس کا علاج تمہارے اختیار میں ہے؟ نہیں، تو غیر اختیاری طور پر جو بات پیش آگئی ہے، اس پر اتنا تأثر لینا کہ آدمی بے چین اور بے حد پریشان ہو جائے، یہ خود قابل اصلاح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ رضا بالقضا میں کمی ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل میں کمی ہے، جس شخص کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت پر بھروسہ ہوگا، وہ کبھی کسی غیر اختیاری حادثے اور واقعہ پر اتنا تأثر نہیں لے گا، کہ پریشانی لاحق ہو جائے۔

جس کا اللہ ہو، اس کو کیسی پریشانی

ایک مرتبہ میرے دوسرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین) کو ایک بات لکھی، اس کے جواب میں حضرت والا نے ایک جملہ ارشاد فرمایا وہ جملہ بھی بڑا عجیب وغریب تھا، وہ جملہ یہ تھا کہ:

''میاں! جس کا اللہ ہو، اس کا پریشانی سے کیا تعلق''

یعنی جتنا بھی بڑے سے بڑا حادثہ پیش آجائے، کتنا بڑے سے بڑا

صدمہ آ جائے، یا تکلیف آ جائے، لیکن جب اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق قائم ہے تو پھر کیسی پریشانی؟ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر جب تک اپنی خواہشات کو فنا نہ کردے گا، اس وقت تک وہ اللہ کا صحیح بندہ نہیں بنے گا، لہٰذا اپنی خواہشات کو اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے میں فنا کردو۔

کوئی کام میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتا

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کیا حال ہے؟ کیسی گزر رہی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں بڑے عیش اور بڑی راحت میں ہوں، پھر فرمایا کہ میاں! اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو جس کا حال یہ ہے کہ کائنات میں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا، جب کوئی کام میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتا تو اس سے میری راحت کا اندازہ لگالو ـــــــ سوال کرنے والے نے کہا کہ حضرت: یہ مقام تو کسی نبی کو بھی حاصل نہیں ہوا کہ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہوا ہو، اور کائنات کے سارے کام اس کی مرضی کے مطابق ہوتے ہوں، انبیاء کو بھی تکلیفیں پیش آئیں، ان کی مرضی کے خلاف بھی واقعات پیش آئے۔ جواب میں حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تو اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں فنا ہی کردیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی مرضی، وہ میری مرضی، اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ بخار آ جائے تو میری مرضی بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ میری پٹائی ہو، میری مرضی بھی یہی ہے کہ میری پٹائی ہو، اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ مجھے تکلیف پہنچے، میری مرضی یہ ہے کہ مجھے تکلیف پہنچے، لہٰذا میں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع بنادیا ہے، اور جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہو رہا ہے، گویا کہ وہ میری مرضی

سے ہو رہا ہے، کیونکہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔

تکلیفیں آئیں گی، لیکن پریشانی نہیں آئیگی

بہرحال! جب ''تعلق مع اللہ'' پیدا ہو جاتا ہے تو پھر کیسی تکلیف! کیسی پریشانی، اس لئے ہمارے حضرت نے فرمایا کہ میاں! جس کا اللہ ہو، اس کا پریشانی سے کیا تعلق؟ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اس کی طرف سے ہو رہا ہے، لہٰذا اس پر اس کو مطمئن ہونا چاہئے، مطمئن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونا چاہئے، اور اگر صدمہ ہو رہا ہے تو ہونے دو، آنسو بہہ رہے ہیں تو بہنے دو، لیکن دل مطمئن ہونا چاہئے، یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمائی کہ حوادث سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ تیرانداز کے پہلو میں جا کر کھڑے ہو جاؤ، یعنی اس کے ساتھ تعلق پیدا کرلو، البتہ اس تعلق کے بعد بھی حادثات پیش آئیں گے، کیونکہ یہ دنیا ہے، یہ جنت نہیں ہے، اور تکلیفیں بھی آئیں گی، پریشانیوں کے اسباب بھی پیدا ہوں گے، جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہو گیا تو وہ مصیبت کے اسباب پریشانی کا سبب نہیں بنیں گے۔

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ

کتنے کام کی بات بتا دی کہ کیسی ہی پریشانی آجائے، کیسی ہی تکلیف آجائے، بس اس وقت آدمی یہ سوچ لے کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے، اور جب میرے اختیار میں نہیں ہے تو یہ منجانب اللہ ہے، اور جب یہ منجانب اللہ ہے تو میں اس پر راضی ہوں، بس اتنی سی مختصر بات ہے ــــــ یہ جو افغانستان میں جو کچھ ہوا، کیا اس کو دفع کرنا تمہارے اختیار میں تھا؟ نہیں، جب یہ غیر اختیاری ہے،

تو منجانب اللہ ہے اور جب منجانب اللہ ہے تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ، اور ان کے حوالے کر دو۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ○

(سورہ مومن، آیت ۴۴)

میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہی بندوں کو دیکھنے والا ہے، تم بندوں کو دیکھنے والے نہیں ہو کہ فلاں بندے کے ساتھ یہ ہونا چاہیے تھا، یہ کیوں ہو گیا؟ اللہ تعالیٰ بندوں کو دیکھنے والے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے جو فیصلہ کیا ہے، وہی فیصلہ برحق ہے، اس پر راضی ہو جاؤ، صدمہ ہو رہا ہے تو ہونے دو، اس صدمہ پر تمہیں انشاء اللہ ثواب ملے گا، اور اللہ تعالیٰ سے مانگو، یا اللہ! تنگی ہو رہی ہے، فراخی پیدا فرما دیجئے، لیکن فیصلے پر راضی رہو۔

کیا اپنے دشمنوں کے خلاف بددعا نہ کی جائے؟

ایک صاحب نے یہ سوال کیا ہے کہ ''کل آپ نے صبر پر بیان فرمایا تھا، اس میں یہ فرمایا تھا کہ کوئی شخص انتقام لینے پر تو قادر نہیں، مگر اس کے لئے بددعا کرنے پر قادر ہے، اگر وہ بددعا نہ کرے تو اس کو بھی صبر کرنے کا ثواب ملے گا، آج کل کے حالات کے پیش نظر جبکہ امریکہ اور اس کے اتحادی مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں، وہ ان سے انتقام لینے پر قادر نہیں، لیکن مسلمان ان کے لئے بددعائیں کر رہے ہیں، تو کیا مسلمان بددعا نہ کریں؟ اور قنوت نازلہ نہ پڑھیں؟

اجتماعی مسئلہ کی صورت میں نہ صبر، نہ معافی

اس کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ میں نے بیان کیا تھا، وہ اس بارے میں تھا

جہاں انسان کو اپنی ذاتی تکلیف کا انتقام کسی شخص سے لینا ہو، وہاں بددعا دینا اچھا نہیں، اور انتقام لینا بھی اچھا نہیں، لیکن جہاں کوئی اجتماعی مسئلہ ہو، جیسے جہاد ہے کہ جہاد کے اندر کافر تم پر حملہ کر رہا ہے، اور تم بیٹھ کر صبر کرو، اور یہ کہو کہ میں معاف کرتا ہوں، اس صورت میں نہ تو صبر کا موقع ہے، نہ معافی کا موقع، بلکہ یہ اقدام کا موقع ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ جتنا تمہاری طاقت میں ہے، اتنا انتقام لو، اگر تلوار اور اسلحہ کے ذریعہ جواب دینا طاقت میں نہیں ہے، تو پھر دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو مجھ سے دور کر دیجئے، یہ صبر کا موقع نہیں، صبر کا موقع وہ ہوتا ہے جہاں انسان کا ذاتی مسئلہ ہو، یا ذاتی تکلیف ہو، اس ذاتی تکلیف کو رفع کرنے کے لئے دوسرے آدمی کو حق ہے، چاہے وہ انتقام لے، چاہے انتقام نہ لے، دعا کرے، چاہے تو نہ کرے، بہر حال! جہاد والی صورت پر یہ بات صادق نہیں آتی۔

اعمال شرعیہ میں ہمت کی ضرورت

ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''اعمال شرعیہ کو اللہ تعالیٰ نے ''صبر'' کے عنوان سے بیان فرمایا ہے: اِصْبِرُوا وَ صَابِرُوْا وَرَابِطُوْا تاکہ سنتے ہی مخاطب کو معلوم ہو جائے کہ اس میں ہمت کی ضرورت ہوگی، پس اب سالکین کو جی نہ لگنے کی شکایت کرنا فضول ہے، کیونکہ تم کو تو صبر ہی کرنے کا امر ہے۔ اور ہر عمل کی حقیقت صبر ہی ہے، اور صبر میں جی نہ لگنا کیسا؟ بلکہ جی نہ لگنے کی صورت میں زیادہ خوش ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ثواب زیادہ دینا چاہتے ہیں'' (انفاس عیسی ص ۲۱۲)

تقویٰ کا مقام صبر سے حاصل ہوگا

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ''صبر'' کا مفہوم بڑا وسیع ہے، طاعات پر صبر، معصیتوں سے صبر، مصیبت پر صبر، سارے اعمال شرعیہ اس میں آجاتے ہیں، تو قرآن کریم میں سورۃ آل عمران کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ O (سورہ آل عمران، آیت ۲۰۰)

اس آیت میں اللہ جل شانہ نے تقویٰ کا حکم سب سے آخر میں دیا، اور اس سے پہلے فرمایا کہ صبر کرو، اور ایک دوسرے کو صبر کرنے کی تلقین بھی کرو، یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو صبر کی تلقین کرے، اور اپنے نفس کو باندھ کر رکھے، یہ تینوں لفظ درحقیقت صبر ہی کے بارے میں بیان فرمائے ہیں، پھر آخر میں فرمایا کہ: ''واتقوا اللہ'' تقویٰ اختیار کرو ___ اسی سے اشارہ اس طرف فرمادیا کہ تقویٰ کا مقام حاصل کرنے کے لئے پہلے صبر کی ضرورت ہوگی، اس نفس کو روکنا بھی پڑے گا، اس کو باندھنا بھی پڑے گا، طبیعت کے خلاف اور مزاج کے خلاف باتوں پر صبر بھی کرنا پڑے گا، تب جا کر تقویٰ حاصل ہوگا، اور اس میں نفس کو تھوڑا سا کچلنا بھی پڑے گا، مارنا بھی پڑے گا، یہ تقویٰ ویسے ہی حاصل نہیں ہوگا۔

آزمائشوں سے گزرنا ہوگا

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا آمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ O (سورۃ العنکبوت، آیت ۲)

کیا لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس جب یہ کہہ دیں گے ہم ایمان لے آئے، بس اتنا کہنا کافی ہوگا، کیا ان پر آزمائش نہیں آئے گی؟ ہرگز نہیں، بلکہ جب تم ایمان لائے ہو، اور جنت کی خواہش ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی خواہش ہے تو پھر تمہیں آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا، ان آزمائشوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شریعت نے جس کام کے کرنے کو کہا ہے، وہ کام کرنا پڑے گا، یا تمہارا دل ایک کام کے کرنے کو چاہ رہا ہوگا، لیکن شریعت کے حکم کی وجہ سے اس کام سے رکنا پڑے گا، طبیعت کے خلاف یہ سب کام کرنے ہوں گے، اس کے بغیر تقویٰ کی منزل حاصل نہیں ہوگی۔

تھوڑی سی ہمت کرنی ہوگی

حضرت والا رحمہ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ جس راستے پر تم چلے ہو، اس راستے میں تمہیں تھوڑی سی ہمت کرنی ہوگی، لہٰذا کمر کس لو، یہ نہیں ہوگا کہ جیسی زندگی پہلے گزر رہی تھی، ویسی زندگی گزرتی چلی جائے گی، اور تقویٰ بھی حاصل ہو جائے گا، اور جنت بھی مل جائے گی ـــــ رِند کے رِند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی ـــــ ایسا نہیں ہوگا، بلکہ تھوڑی سی محنت کرنی ہوگی۔

کیا نماز لذت اور مزہ کیلئے پڑھتے ہو؟

دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جو لوگوں کو اکثر و بیشتر شکایت ہوتی ہے کہ نماز میں

دل نہیں لگتا، نماز میں مزہ نہیں آتا۔ نماز میں کیف وسرور نہیں محسوس ہوتا، اسی طرح ذکر میں عبادت میں کیف وسرور اور لطف محسوس نہیں ہوتا۔ بس ایک عادت ہے، اس عادت کے مطابق نماز پڑھتے رہتے ہیں، لیکن نماز میں نہ کیف ہے، نہ لطف ہے، نہ رقت ہے، نہ خشوع وخضوع ہے، ذکر واذکار اور معمولات بھی ہو رہے ہیں، لیکن ان میں بھی دل نہیں لگتا، نہ مزہ آتا ہے، بس رسم کے مطابق انجام دے رہے ہیں، سالکین کو جو یہ شکایت ہوتی ہے، اس کے بارے میں حضرت والا فرما رہے ہیں کہ یہ سوچو کہ یہ جو نماز پڑھتے ہو، یا ذکر واذکار کرتے ہو، کیا اس کا مقصد مزہ اور لطف لینا ہے؟ کیا کیف وسرور کا حصول مقصود ہے؟ اگر لذت اور مزہ لینے کے لئے یہ عمل کر رہے ہو، پھر تو اخلاص ہی نہ ہوا۔ کیونکہ جس راستے پر تم چلے ہو۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کا راستہ ہے، اور حکم کی اطاعت میں تو نفس کے خلاف کرنا پڑے گا۔

طاعات میں لگا رہے

لہٰذا اگر عبادات وطاعات میں لذت نہیں آ رہی ہے تو اصل تقاضہ یہ ہے کہ لذت نہ آئے، مزہ نہ آئے، اور طاعات کی ادائیگی میں صبر کرنا پڑ رہا ہے، لہٰذا مزہ لذت نہ آنے کی صورت میں گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہاں! دل نہ لگنے کے باوجود، مزہ نہ آنے کے باوجود پھر بھی طاعات میں لگا رہا اور یہ سوچا کہ میں یہ کام کروں گا، کیونکہ میرے اللہ کا حکم ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اجر وثواب زیادہ ملتا ہے۔

دل لگنا ضروری نہیں، لگانا ضروری ہے

کسی شخص نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ حضرت! کیا کروں؟ ساری عبادات کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، ذکر کرتا ہوں، مگر دل لگتا ہی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو حال پہلے دن تھا، وہی حال آج ہے، کوئی ترقی ہی نہیں ہوئی، حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ:

''دل لگنا ضروری نہیں، لگانا ضروری ہے''

یعنی اپنی طرف سے تم کوشش کرو کہ دل لگ جائے، توجہ ہو جائے، کوشش کرنا فرض ہے، کوشش کرنے کے بعد واقعی دل لگ بھی جائے اور سارے خیالات دور ہو جائیں، یہ کوئی ضروری نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ اگر چاہیں گے تو دل لگے گا، وہ نہیں چاہیں گے تو دل نہیں لگے گا، اپنی طرف سے کوشش دل لگانے کی جاری رہے، مثلاً نماز پڑھتے وقت جو الفاظ زبان سے نکل رہے ہیں، ان کی طرف دھیان دو، جب تم

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

پڑھو تو تمہیں معلوم ہو کہ میں

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

پڑھ رہا ہوں، بس اتنا کر لینا کافی ہے، جب یہ کام کر لیا تو بس خشوع حاصل ہو گیا، اب اگر غیر اختیاری طور پر خیالات آ گئے، وہ غیر اختیاری ہیں، لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف ہیں، اس پر گرفت نہیں، اس لئے کہ دل کا لگانا ضروری ہے، تمہاری کوشش کے بعد دل کا لگنا ضروری نہیں۔

میں ایسے شخص کو مبارکباد دیتا ہوں

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

''جس شخص کو ساری عمر کبھی نماز میں مزہ نہ آیا، نہ کوئی کیفیت محسوس ہوئی، لیکن اس نے نماز چھوڑی نہیں، بلکہ پڑھتا رہا، میں اس کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس کا یہ عمل مقبول ہے''

کیونکہ اگر اس کو نماز میں لذت آرہی ہوتی تو اس میں اس بات کا شائبہ تھا کہ یہ لذت کے لئے اور مزہ کے لئے نماز پڑھ رہا ہے، لیکن جس کو ساری عمر لذت نہ آئی، وہ تو اپنے دل پر آرے چلاتا رہا، اور اللہ کے لئے چلاتا رہا، اس کا عمل زیادہ اخلاص پر مبنی ہے۔ انشاء اللہ

حکم بجالاتے رہو

لہٰذا ہمارے دلوں میں اکثر و بیشتر یہ خیال پیدا ہوتا رہتا ہے کہ نماز میں دل نہیں لگتا، مزہ نہیں آتا، لذت نہیں آتی، ارے نہ ہوا کرے، ان چیزوں کا حاصل ہونا کہاں مطلوب و مقصود ہے، حاصل نہ ہو ـــــ اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ تمہارا قدم صحیح راستے پر ہے یا نہیں؟ جو حکم تمہیں دیا گیا تھا، اس کو بجالا رہے ہو یا نہیں؟ اگر بجالا رہے ہو تو کہو

''اَلْحَمْدُلِلّٰہ'' اَللّٰھُمَّ لک الحمد و لک الشکر

برصراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

جب صراط مستقیم پر قدم ہیں تو پھر کوئی گمراہ نہیں، البتہ کوشش میں لگے رہو:

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا

(سورہ عنکبوت، آیت ٦٩)

جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کریں گے، مجاہدہ کریں گے، ہم ضرور بالضرور ان کو اپنے راستوں پر لے چلیں گے ____ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں، ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلیں گے۔

تم آگے ایک دو قدم بڑھاؤ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی یہ مثال بیان فرمائی کہ جب بچہ چلنا سیکھتا ہے تو ماں باپ اس بچے کو دور کھڑا کر دیتے ہیں، پھر بچے کو اپنے پاس بلاتے ہیں کہ بیٹا قریب آؤ، اب اگر وہ بچہ قریب آنے کے لئے قدم نہ بڑھائے تو باپ اس کو نہیں اٹھاتا، لیکن جب بچہ ایک دو قدم بڑھاتا ہے اور اس کے نتیجے میں گرنے لگتا ہے تو باپ اس کو گرنے نہیں دیتا، بلکہ آگے بڑھ کر اس کو گود میں اٹھا لیتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم قدم بڑھائیں۔ لہٰذا ایک قدم بڑھاؤ، دو قدم بڑھاؤ، تمہارے بس میں جتنے قدم بڑھانا ہے، اتنے قدم بڑھاؤ، اور جب تم گرنے لگو گے تو ہم گرنے نہیں دیں گے، بلکہ آگے بڑھ کر تمہیں پکڑ لیں گے، اور تمہیں گود میں اٹھا لیں گے۔

اصل فکر عمل کی ہونی چاہئے

اس لئے اس فکر میں مت پڑو کہ عبادت میں لذت نہیں آرہی ہے، مزہ اور کیف اور سرور حاصل نہیں ہو رہا ہے، اگر یہ لذت اور کیف آجائے تو اس کی عطا

ہے، ان کا کرم ہے، ایک اضافی نعمت تمہیں عطا فرمادی، اس پر شکر ادا کرو کہ دنیا ہی میں عبادت کی کیف اور لذت دیدی، ان کا کام ہے، لیکن اگر کبھی لذت نہ آئے تو نہ پریشان ہو، نہ شکوہ کرو، نہ مایوس ہو جاؤ، اس لئے کہ یہ سب کیفیات آنی جانی ہیں، ان کے پیچھے نہیں پڑنا، ان کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں، اصل فکر عمل کی ہونی چاہئے کہ وہ عمل اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اور سنت کے مطابق ادا ہو جائے، چاہے کیف اور لذت کے ساتھ ہو، یا بے کیفی اور بے لذتی کے ساتھ ہو، لیکن عمل چھوڑے نہیں۔ عمل کا چھوٹ جانا عذاب اور مصیبت ہے، اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے، آمین۔

لذت آنے سے جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام نہیں ملیگا

دیکھئے، عبادت میں اور نماز میں لذت کا آنا مقرب ہونے کی علامت نہیں، اور لذت کا نہ آنا مردود ہونے کی علامت نہیں، اگر کسی کو نماز میں لذت آجائے تو وہ یہ نہ سمجھے کہ میں جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے مقام پر پہنچ گیا، بلکہ جب لذت آئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، یہ صورت نہ ہو کہ:

صَلّٰی الْحَائِكُ رَكْعَتَيْنِ وَانْتَظَرَ الْوَحْيَ

کہ ایک جولاہے نے ایک مرتبہ دو رکعت نماز پڑھی تو اس کے بعد وحی کے انتظار میں بیٹھ گیا کہ چونکہ میں نے دو رکعت نماز پڑھی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے اوپر وحی نازل ہونی چاہیے ______ بہرحال! اگر لذت حاصل ہو جائے تو اس کی وجہ سے تکبر اور عجب میں مبتلا نہ ہو، بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور اگر لذت نہیں آرہی ہے تو یہ مت سمجھو کہ میں مردود ہو گیا، شیطان

ہو گیا ہوں، کیونکہ یہ کیفیات تو آنی جانی ہیں، کبھی آئیں، کبھی نہیں آئیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ عمل ہو، اور وہ عمل اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، اور استقامت کے ساتھ ہو، اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

دل نہ لگنے کی شکایت فضول ہے

بہر حال! اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی کام کی بات فرما دی کہ سالکین کو جی نہ لگنے کی شکایت کرنا فضول ہے، کیونکہ تم کو تو صبر ہی کا امر ہے، حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ صبر کرو، عبادت میں دل نہیں لگ رہا ہے، پھر بھی صبر کرتے ہوئے عبادت کرتے رہو، اور ہر عمل کی حقیقت صبر ہی ہے، اور صبر میں جی نہ لگنا کیسا ہے؟ اس لئے کہ صبر تو اسی کا نام ہے کہ جو تکلیف ہو رہی ہے، اس کو برداشت کرو، بلکہ جی نہ لگنے کی صورت میں زیادہ خوش ہونا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہیں ثواب زیادہ دینا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العالمین

نیم جاں بستاند وصد جاں دھند
آ در وہمت نیاید آن دھند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصیبت میں نورانیت

مجلس نمبر 100

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن
استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی.

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 100

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
mEmonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصیبت میں نورانیت

مجلس نمبر 100

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین، امابعد

اختیاری اور غیر اختیاری پریشانی

صبر کے بارے میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کے ملفوظات کا بیان چل رہا ہے۔ ایک اور ملفوظ میں حضرت والا رحمہ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''جس مصیبت کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ اس کی مدافعت پر بھی قادر نہ ہو، سو یہ واقعی مجاہدہ ہے، اور اب اس پریشانی سے کچھ ضرر نہ ہوگا۔ بلکہ اس میں نورانیت ہوتی ہے، اور جو پریشانی اختیار سے لائی جاتی ہے، اس میں نور نہیں ہوتا، بلکہ ظلمت ہوتی ہے، جیسے کسی کا بچہ بیمار ہے، اور وہ اس کا علاج نہیں کرتا، اس میں پریشان ہے تو اس میں نور نہ ہوگا اور ایک صورت یہ ہے کہ بچہ بیمار تھا، اس کا علاج کیا گیا اور علاج کے بعد وہ مر

گیا تو اس سے پریشانی نہ ہوگی، عارف کا ایسی مصیبت میں دل
شاد ہوتا ہے اور ظاہر میں مغموم۔'' (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۴)

مصیبت اور تکالیف کی دو قسمیں

فرمایا کہ بعض مصیبتیں اور تکلیفیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے اندر نورانیت ہوتی ہے، تکلیف، صدمہ اور غم کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کے نتیجے میں قلب کے اندر ایک نورانیت ہوتی ہے اور اس سے درجات بھی بلند ہوتے ہیں، اور ترقی بھی ہوتی ہے، اور بعض مصائب ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں نورانیت نہیں ہوتی۔ بلکہ ظلمت ہوتی ہے، اور اس ظلمت کے نتیجے میں کوئی روحانی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ آدمی اور پیچھے چلا جاتا ہے۔ ان دونوں میں فرق کس طرح کریں؟ کب مصیبت کے نتیجے میں نورانیت پیدا ہوگی؟ اور کب نورانیت پیدا نہیں ہوگی؟ اس کا ایک اصول حضرت والا رحمہ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں بیان فرمایا ہے۔

غیر اختیاری میں نورانیت

وہ اصول یہ ہے کہ جو مصیبت یا تکلیف اپنے کسی اختیار کے بغیر آ گئی، اور اس کی مدافعت پر بھی انسان قادر نہیں، اگر اس پر صبر کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے گا تو اس میں نورانیت پیدا ہوگی، اور اس سے دنیا کے اندر درجات میں ترقی ہوگی، اور آخرت کا ثواب بھی ملے گا، اور ایک مصیبت وہ ہے جو انسان خود اپنے اختیار سے لے کر آیا، اس مصیبت کو دفع کرنا اختیار میں تھا۔ لیکن اس مصیبت کو دفع نہیں کیا، بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہا، ایسی مصیبت میں نورانیت نہیں ہوگی، بلکہ اس میں ظلمت ہوگی۔

اختیاری مصیبت کی ایک مثال

اس کی مثال حضرت والا نے یہ دی کہ مثلاً ایک شخص کا بچہ بیمار ہو گیا، اب بچے کا علاج کرنا اختیار میں ہے کہ ڈاکٹر کے پاس جائے، اور جا کر اس کا حال بتائے، اور وہ جو دوا کہے وہ پلائے، اب اس شخص کے پاس دوا خریدنے کے لئے پیسے بھی تھے، ڈاکٹر کو ادا کرنے کے لئے بھی پیسے موجود تھے، لیکن وہ شخص سستی کے مارے بیٹھا رہا اور بچے کا علاج نہیں کیا، اب علاج نہ کرنے کے نتیجے میں اگر اس بچے کا مرض بڑھ گیا، یا وہ بچہ مر گیا تو یہ جو مصیبت آئی، صدمہ آیا، اس کا سبب اپنے اختیار میں تھا، لہٰذا وہ یہ مصیبت اپنے ہاتھ سے لایا۔ اس میں نورانیت نہیں ہوگی۔ بلکہ ظلمت ہوگی، کیونکہ یہ بھی مامور بہ ہے کہ مصیبت دور کرنے کے لئے جائز اسباب کو اختیار کرو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا عالم اسباب بنائی ہے، لہٰذا اسباب کو ترک کرنا یہ کوئی بزرگی نہیں، بلکہ اسباب اختیار کرو اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو، یہ بزرگی کی بات ہے۔ لہٰذا اس شخص نے جب اس بچے کا علاج نہیں کیا، بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہا تو اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آیا، لہٰذا اس مصیبت اور تکلیف پر جو نورانیت حاصل ہونی تھی، درجات میں جو ترقی ہونی تھی، وہ نہیں ہوگی۔ بلکہ ظلمت ہوگی، کیونکہ اپنے اختیار سے وہ مصیبت لے کر آیا ہے۔

ایسی تکلیف میں ظلمت ہوگی

اسی طرح اگر کوئی مصیبت غیر اختیاری طور پر آئی تھی، لیکن اس کو دفع کرنا اختیار میں تھا۔ لیکن اس کو دفع نہیں کیا تو اس مصیبت میں بھی ظلمت ہوگی، نورانیت نہیں ہوگی، مثلاً ایک شخص آپ کے اوپر حملہ آور ہو گیا، اور آپ کو جسمانی تکلیف

پہنچانے لگا، آپ کے اختیار میں تھا کہ آپ اس کی مدافعت کریں، آپ کے پاس جو اسباب ہوں ان کو استعمال کر کے اس کو دفع کرنے کی کوشش کریں، لیکن آپ نے کوئی مدافعت نہیں کی، اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے، اس صورت میں جو صدمہ اور تکلیف آئے گی، وہ اختیاری ہوگی، ایسی تکلیف میں ظلمت ہوگی۔

اس مصیبت پر اجر وثواب ملے گا

لہٰذا جب کوئی تکلیف یا صدمہ پیش آنے لگے، یا کوئی مصیبت پیش آنے لگے تو حتی الامکان انسان اس کو دفع کرنے کی کوشش کرے، یہ نہ سوچے کہ مصیبت آنے پر بڑے فوائد ہیں۔ بڑے اجر وثواب ملتے ہیں۔ لہٰذا یہ تکلیف آنے دو، نہیں، بلکہ جب تکلیف یا مصیبت آنے لگے تو اس کا مداوا کرو، اس کی مدافعت کرو، البتہ پوری کوشش کرنے کے باوجود اور اسباب مدافعت اختیار کرنے کے باوجود وہ مصیبت آ گئی، اب اگر اس پر صبر کرو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس پر اجر و ثواب مرتب ہوگا۔

مصیبت کا خیر مقدم کرنا خطرناک ہے

لیکن اگر انسان پر جب مصیبت آئے تو وہ اس کے دفع کی کوشش ہی نہ کرے، بلکہ اس مصیبت کا خیر مقدم کرے، اس کو اچھا سمجھے تو یہ دو لحاظ سے خطرناک بات ہے۔ ایک اس لحاظ سے خطرناک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا تھا، لیکن تم نے نہیں کیے، یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ دوسرے اس لحاظ سے خطرناک ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری کا دعویٰ ہے کہ ہم تو بڑے بہادر ہیں، یہ بڑا خطرناک ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے

محفوظ رکھے آمین۔ ارے وہاں تو شکستگی اور درماندگی چاہیے، اپنی کمزوری کا اظہار چاہئے، یا اللہ میں کمزور ہوں، میں اس تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا، یا اللہ! اس تکلیف کو مجھ سے دور کر دیجئے۔

سبق آموز واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک بزرگ تھے، ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذکر میں مشغول رہتے تھے، اس ذکر میں ان کو کیف محسوس ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ غلبہ حال میں ان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ:

وَلَيْسَ لِىْ فِىْ سِوَاكَ حَظٌّ
فَكَيْفَ مَاشِئْتَ فَاخْتَبِرْنِىْ

یعنی اے اللہ! مجھے آپ کے سوا کسی چیز میں مزہ نہیں، جس طرح چاہیں آپ مجھے آزما کر دیکھ لیں۔ العیاذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ کو آزمانے کی دعوت دیدی۔ بس اس کے بعد ان کا پیشاب بند ہو گیا۔ اب مثانہ پیشاب سے بھرا ہوا ہے، تکلیف ہو رہی ہے، لیکن پیشاب خارج نہیں ہو رہا ہے، علاج ہر طرح کا کر لیا، دوا لیلیں، لیکن پیشاب نہیں ہوتا۔ بالآخر ان کو تنبہ ہوا کہ میں نے کیسی غلط بات کہہ دی کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو دعوت دیدی کہ آپ جس طرح چاہیں، مجھے آزمالیں، یہ میں نے کتنی غلط بات کہہ دی، چنانچہ اپنی غلطی سے توبہ کی، ان کے پاس چھوٹے بچے پڑھنے کے لئے آتے تھے، ان بچوں سے دعا کے لئے کہا کہ:

اُدْعُوْا لِعَمِّكُمُ الْكَذَّابِ

یعنی اپنے جھوٹے چچا کے لئے دعا کرو، اس لئے کہ میں نے یہ جھوٹا دعویٰ کر دیا کہ مجھے کسی چیز میں حظّ اور مزہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پکڑ بھی بڑی سخت ہوتی ہے، چنانچہ کئی دن اس حالت میں گزر گئے۔ دکھانا دراصل یہ تھا کہ تم تو کہہ رہے تھے کہ مجھے کسی چیز میں حظ نہیں، ارے تمہیں تو پیشاب اور پاخانہ میں حظ اور مزہ ہے۔

اللہ کے سامنے کمزوری کا مظاہرہ کرو، بہادری کا نہیں

لہٰذا یہ بات کہ مصیبت آرہی ہے۔ لیکن اس مصیبت کو دفع نہیں کر رہے ہیں، اور مصیبت دفع کرنے کے جو ذرائع اور اسباب ہیں، ان ذرائع کو استعمال نہیں کرتے، یہ ایک طرح سے بہادری کا دعویٰ ہے کہ ہم بڑے بہادر ہیں۔ العیاذ باللہ۔ کبھی اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری مت دکھاؤ، وہاں تو کمزوری اور شکستگی چاہئے، وہاں تو یہ کہنا چاہئے اے اللہ! ہمارے بس میں نہیں:

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَتَ لَنَا بِهٖ

اے اللہ! ہم پر ایسا بوجھ مت ڈالئے گا، ہمارے اندر جس کے سہنے کی طاقت نہیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ضَعِیْفٌ فَقَوِّ فِیْ رِضَاكَ ضُعْفِیْ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ! میں تو کمزور ہوں، کون یہ دعا مانگ رہا ہے؟ جس سے زیادہ طاقت ور کوئی نہیں ہوسکتا، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اے اللہ میں کمزور ہوں، مجھے اپنے رضا کے کاموں میں تقویت عطا فرما۔ اے اللہ! میری کمزوری کو قوت سے تبدیل فرما دیجئے، اپنی کمزوری کا اظہار اللہ تعالیٰ کے سامنے فرما رہے ہیں۔

دشمن سے مقابلہ طلب مت کرو

ایک اور دعا میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں:

اَللّٰهُمَّ لَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَرْحَمُنَا

اے اللہ! ہم پر ایسے دشمن کو مسلط مت کیجئے، جو ہم پر رحم نہ کریں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعویٰ نہیں کر رہے ہیں کہ جیسا بھی دشمن آجائے، ہم مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں، نہیں، بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم پر مسلط نہ فرمایئے، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ:

لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ، وَاسْئَلُوْا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ، فَاِذَا لَقِيْتُمْ فَاثْبُتُوْا

یعنی دشمن سے مقابلے کی تمنا مت کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، ہاں جب دشمن سے مقابلہ پیش آجائے، تو پھر ثابت قدمی کا اظہار کرو۔ پہلے سے تمنا نہ کرو، مانگو نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، بلکہ اگر مصیبت آرہی ہو تو اس کو مسنون طریقے سے دفع کرنے کی کوشش کرو۔

مصیبت کو دور کرنے کیلئے اسباب اختیار کرو

بہرحال! نہ تو مصیبت کو دعوت دینی ہے، اور نہ ہی اس کی مدافعت پر قدرت ہونے کے باوجود مدافعت میں کوتاہی کرنی ہے، بلکہ جتنی مدافعت کرنا تمہارے بس میں ہو، اتنی مدافعت کرو، پھر جب سارے اسباب اختیار کرنے کے باوجود مدافعت اختیار کرنے کے باوجود، دعائیں کرنے کے باوجود

غیر اختیاری طور پر کوئی مصیبت آ گئی تو اب صبر کرو، کیونکہ اب جو صبر کرو گے تو اس صبر کی وجہ سے اس مصیبت میں نورانیت ہوگی، اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ تمہارے درجات دنیا و آخرت میں بلند فرمائیں گے، لیکن اگر اسباب اختیار نہ کیے، تو اس مصیبت میں ظلمت ہوگی، تاریکی ہوگی، نور نہیں ہوگا۔

مصیبت کے وقت رجوع الی اللہ کی توفیق

ایک اور بات جو حضرت والا نے بیان فرمائی ہے، وہ اگرچہ یہاں مذکور نہیں ہے، لیکن بہرحال ہے، وہ یہ کہ بعض اوقات ''مصیبت'' انسان کی بدعملی کا نتیجہ اور عذاب ہوتا ہے، سزا ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ عذاب اور سزا کے اندر نور نہیں ہوتا، اور جو مصیبت سزا نہیں ہوتی، اس کے اندر نور ہوتا ہے، پھر اس کے اوپر صبر کرنے سے اجر ملتا ہے، اب کون سی ''مصیبت'' عذاب اور سزا ہے؟ اور کونسی مصیبت عذاب اور سزا نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے درجات بلند کرنے کے لئے بھیجی ہے؟ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جب بھی مصیبت اور تکلیف کے آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع میں اضافہ ہو جائے، مثلاً مصیبت آئی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی توفیق ہو رہی ہے کہ یا اللہ! اس مصیبت کو دور فرما دیجئے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ مصیبت عذاب نہیں۔ بلکہ یہ مصیبت انشاء اللہ تمہارے درجات کی بلندی کے لئے آئی ہے، کیونکہ اگر یہ عذاب ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق نہ ہوتی۔

مصیبت کے عذاب من اللہ ہونے کی علامت

اور وہ مصیبت اور تکلیف جس میں اللہ جل شانہ کی طرف رجوع کم ہو جائے، اور آدمی اپنے فرائض و واجبات سے غافل ہو جائے، اور رجوع کے بجائے دل میں اللہ تعالیٰ سے شکوے اور شکایتیں پیدا ہونے لگے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ مصیبت تمہاری کسی بدعملی کی سزا ہے، ایسی مصیبت میں آدمی غفلت سے نمازیں چھوڑ دے، اور معمولات کو ترک کر دے اور عبادات چھوٹ گئیں، اور یہ عبادات اور نمازوں کا چھوٹنا اس وجہ سے نہیں ہوا کہ وقت نہیں ملا، بلکہ اس وجہ سے کہ مصیبت کے آنے کے بعد طبیعت میں ایک مایوسی اور بے حسی طاری ہوگئی، سستی طاری ہوگئی، نماز کے لئے وقت مل رہا ہے، لیکن نماز کے لئے نہیں جاتا، اور اللہ تعالیٰ کی کی طرف رجوع نہیں کرتا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ جو مصیبت آئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا اور عذاب ہے۔

مصیبت کے وقت مجبوری کی وجہ سے معمولات کا ترک

بعض اوقات مصیبت کے وقت نمازیں ترک ہو جاتی ہیں، معمولات چھوٹ جاتے ہیں، اگر یہ چھوٹ جانا غفلت کی وجہ سے نہ ہو، بلکہ مجبوری کی وجہ سے چھوٹ جاتی ہیں کہ کیا کریں، مصیبت آ گئی تھی، مثلاً دشمن کا مقابلہ تھا، اب اگر وہاں سے اٹھ کر نماز کے لئے جاتے تو جان چلی جاتی، یہ مجبوری پیش آ گئی، اس مجبوری کی وجہ سے چھوٹنے میں کوئی نقصان نہیں، نہ اس سے نورانیت میں کمی آتی ہے، نہ اس سے مصیبت کے عذاب ہونے کا تأثر ملتا ہے۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی نمازیں دشمن کے مقابلے کے دوران قضا

ہوئیں۔ یا مثلاً بیمار ہوئے، اور بیماری کی وجہ سے آپریشن ہوا، اور اب آپ آپریشن تھیٹر میں بے ہوش پڑے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے نمازیں چھوٹ گئیں، تو اس کی وجہ سے نورانیت میں کمی نہیں آئے گی، اس لئے کہ مجبوری کی وجہ سے جو فرائض اور معمولات چھوٹ جائیں، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس کا یہاں ذکر نہیں ہو رہا ہے۔

بے حسی اور غفلت کی وجہ سے نماز کا ترک

یہاں ان نمازوں اور معمولات کا ذکر ہو رہا ہے جو کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں چھوٹیں، بلکہ اس وجہ سے چھوٹیں کہ مصیبت کے آنے کے بعد طبیعت پر ایک بے حسی اور غفلت طاری ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا جذبہ سرد پڑ گیا، جس کی وجہ سے نماز کا وقت اور موقع ہونے کے باوجود نماز پڑھنے نہیں گیا، بلکہ پڑا رہا، جب غم اور صدمہ کا عالم ہوتا ہے تو بعض اوقات یہ کیفیت آجاتی ہے کہ آدمی اچھا خاصا صحت مند ہے، لیکن نماز کے لئے نہیں جا رہا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ مصیبت عذاب اور سزا ہے۔

مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو

اور جب اس مصیبت کے عذاب ہونے کا احساس ہو جائے تو اس کا علاج بھی یہی ہے کہ دل چاہے، یا نہ چاہے، دل پر آرے چل رہے ہوں۔ لیکن نماز کی طرف اور عبادات کی طرف اور معمولات کی طرف متوجہ ہو جائے، اور اللہ جل شانہ کی طرف رجوع کرنا شروع کردے، لہٰذا مصیبت، غم اور صدمہ کے موقع پر اپنا جائزہ لے کر دیکھو، اگر یہ محسوس ہو کہ عبادات سے غفلت ہو رہی ہے اور اللہ

تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں ہو رہا ہے، اور اس سے یہ خطرہ محسوس ہو کہ کہیں میرے لئے یہ عذاب نہ ہو تو فوراً اس کا علاج کرو، اور وہ فوری علاج بھی یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع شروع کر دو، اور جو معمولات چھوٹ رہے ہیں، ان کی ادائیگی شروع کر دو، چاہے صدمہ ہو، چاہے تکلیف ہو، چاہے دل پر آرے چل جائیں، نمازیں پڑھنا شروع کر دو۔ جب یہ عمل کرو گے تو انشاء اللہ اس مصیبت کے عذاب اور سزا ہونے کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔ وہ مصیبت تمہارے لئے باعث اجر و ثواب بن جائے گی۔

ساری عمر تراش خراش چلتی رہیگی

بس اس راستے یہی تراش و خراش چلتی رہتی ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

اندریں راہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

یعنی تصوف و سلوک کی راہ میں تراش خراش چلتی رہتی ہے، یہ مت سمجھنا کہ کسی وقت تم کامل اور مکمل ہو جاؤ گے تو اس وقت کسی اضافے اور ترمیم کی ضرورت نہیں ہوگی، ایسا نہیں ہوگا، بلکہ ساری عمر یہ تراش و خراش چلتی رہے گی، یہ تو جنم روگ ہے، لہٰذا آخری سانس تک ایک لمحے کے لئے بھی فارغ ہو کر مت بیٹھنا، لہٰذا اپنے حالات میں ہر وقت غور کرتے رہو کہ جب مصیبت آتی ہے تو میں کیا کرتا ہوں، جب خوشی آتی ہے، تو اس وقت کیا کرتا ہوں۔

مصیبت کے وقت دل شاد ہوگا

جب تمہیں یہ بات حاصل ہوگئی، یعنی مصیبت میں نورانیت پیدا ہوگئی، کیوں پیدا ہوئی؟ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونے کے نتیجے میں نورانیت پیدا ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے مصیبت پر جو اجر رکھا ہے، اس اجر وثواب کے تصور سے نورانیت پیدا ہوگئی، ایسی صورت کے بارے میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ ''عارف ایسی مصیبت کے وقت دل میں شاد ہوتا ہے اور ظاہر میں مغموم'' یعنی ظاہری اعتبار سے تو اس مصیبت پر صدمہ ہو رہا ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ آہیں نکل رہی ہے، لیکن عقلاً اس بات پر مطمئن ہے کہ فیصلہ انہی کا برحق ہے، مشیت انہی کی ہے، حکمت انہی کی ہے، مصلحت انہی کی ہے، وہ جو فیصلہ کریں گے، میرا فائدہ اسی میں ہے، میں کیا، میری عقل وفہم کیا، جب یہ سمجھ لے گا تو پھر چاہے آنسو بہہ رہے ہوں، چاہے دل میں کچھ ہو رہا ہو، لیکن جب ان کے فیصلے پر راضی ہوگا تو دل شاد ہوگا۔

اللہ کی مشیت کو سوچنے سے صدمہ ختم ہو جائیگا

دیکھئے: ایک صدمہ وہ ہوتا ہے کہ آدمی کو تکلیف تو پہنچی، مثلاً جان ضائع ہوئی تو صدمہ اور تکلیف پہنچنی چاہئے تھی، یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، یا مثلاً آپ ڈاکٹر کے پاس گئے، اس نے انجکشن لگایا، اس کے نتیجے سوئی چبھی، تکلیف ہوئی، لیکن یہ تکلیف ہونی ہی تھی، یا کوئی زخم تھا، مرہم پٹی کرانے گئے تو اس سے تکلیف ہوگی، لیکن ساتھ میں دل مطمئن ہے کہ یہ تکلیف تو ہونی تھی، اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ ایک وہ تکلیف ہے کہ کسی شخص نے آکر خنجر مار دیا، اور ناحق مارا،

ناانصافی سے مارا، اس کی تکلیف زیادہ ہوگی، کیونکہ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے مار دیا۔ جب کہ کوئی قصور نہیں تھا۔ اور صدمہ بھی ہوگا۔ لیکن جب یہ سوچے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہو رہا ہے، اس کے حکم سے اس کے فیصلے سے ہو رہا ہے، اس لئے یہ عمل ہونا ہی تھا، کیونکہ ان کی مشیت اور ان کا فیصلہ تھا۔ چاہے ہماری سمجھ میں آ رہی ہو، یا نہ آ رہی ہو۔ اس سوچ کے نتیجے میں یہ دوسری قسم بھی پہلی قسم کی طرح ہو جائے گی۔ جیسے کسی ڈاکٹر کے پاس گئے، اور اس نے انجکشن لگایا اور اس سے تکلیف ہوئی، کیونکہ دل مطمئن ہے۔ اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عارف کا ایسی مصیبت میں دل شاد ہوتا ہے ''شاد'' ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مطمئن ہے کہ یہ کام ہونا ہی تھا۔ البتہ ظاہر میں عارف مغموم ہوتا ہے۔

یہ مصیبت تجارت میں داخل ہے

ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''یہ واقعاتِ مصائب درحقیقت سب تجارت میں داخل ہیں کہ ایک چیز ہم سے لی جاتی ہے اور اس کے عوض دوسری چیز دے دی جاتی ہے اور تجارت بھی ایسی کہ:

نیم جان بستاند و صدجاں دھند
آنچہ در وہمت نیاید آں دھند

علاوہ اس کے مصیبت حالاً تو مصیبت ہے، مگر مآلاً نعمت ہے، کیونکہ اس سے منافع ومصالح دینیہ ودنیویہ حاصل ہوتی ہیں، ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ''برسوں کے مجاہدات سے باطن کو

وہ نفع نہیں ہوتا جو ایک ساعت کے حزن سے ہوتا ہے، خاص کر
ایمان کو پختگی ہوتی ہے۔ جو امور باطنہ میں سب سے افضل
ہے۔" (انفاس عیسیٰ، ص ۲۱۵)

راحت لیکر اجر وثواب اور جنت دیتے ہیں

دیکھئے: تجارت میں یہ ہوتا ہے کہ دوکاندار نے ہم سے پیسے لئے، اور ہمیں اپنی مطلوبہ چیز دیدی، اسی طرح اللہ تعالیٰ مصائب کے موقع پر ایک چیز لیتے ہیں، اور دوسری چیز اس کے بدلے میں دیتے ہیں، لیتے کیا ہیں؟ مثلاً راحت کہ وہ راحت تکلیف میں بدل گئی، یا خوشی تھی، غم میں بدل گئی اور وہ راحت بھی عارضی طور پر لیتے ہیں، ہمیشہ کے لئے نہیں لیتے، اگر ہمیشہ کے لئے راحت لیلیں تو پھر تو ہم زندہ ہی نہیں رہ سکتے، بہرحال! ہم سے خوشی اور راحت لی، اور اس کے بدلے ہمیں نعمتیں دیں، جنت کی، آخرت کی نعمتیں دیں، ہمیں اجر عطا فرمایا اور دنیا میں بھی درجات بلند کئے، یہ سب تجارت میں داخل ہے۔ کہ ایک چیز ہم سے لی جاتی ہے اور اس کے عوض دوسری چیز دی جاتی ہے۔

آدھی جان لے کر سو جانیں دیتے ہیں

یہ تجارت بھی ایسی ہے جس کے بارے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

نیم جاں بستاند وصد جاں دھند
آنچہ در وہمت نیاید آن دھند

یعنی وہ آدھی جان لیتے ہیں اور اس کے عوض سو جانیں دیتے ہیں، ان کی

رحمت کو دیکھئے کہ وہ تھوڑی سی چیز لیتے ہیں اور دیتے بہت زیادہ ہیں، تھوڑی سی راحت اور وہ بھی عارضی طور پر لیتے ہیں، ہمیشہ کے لئے نہیں لیتے، اور اس کے عوض جو نعمتیں دیتے ہیں، وہ ابدی دیتے ہیں، اور نہ ختم ہونے والی نعمتیں دیتے ہیں، اور وہ چیزیں دیتے ہیں جو تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں آتیں۔

حالاً مصیبت مآلاً نعمت

آگے حضرت نے وہی بات ارشاد فرمائی ہے جو میں نے پہلے عرض کی تھی کہ ''علاوہ اس کے مصیبت حالاً تو مصیبت ہے، مگر مآلاً نعمت ہے، کیونکہ اس سے منافع دینیہ ودنیویہ حاصل ہوتے ہیں، ایک بزرگ کا ارشاد ہے'' یہ وہی بات ہے جو میں نے آپ کو پہلے سنائی تھی، اب وہ بات ان بزرگ کے لفظوں میں آ گئی کہ: ''برسوں کے مجاہدات سے باطن کو وہ نفع نہیں ہوتا، جو ایک ساعت کے ''حزن'' سے ہو جاتا ہے''۔ یعنی برسوں تک کسی خانقاہ میں جا کر مجاہدے اور ریاضتیں کرتے رہو، اس سے اتنا فائدہ نہیں ہوگا، جتنا ایک ساعت کے غم سے ہو جاتا ہے، اور وہ غم بھی غیر اختیاری ہو، آگے فرمایا ''اور خاص کر ایمان کو پختگی ہوتی ہے، جو امور باطنہ میں سب سے افضل چیز ہے''۔

وہ نعمت بتاؤ جسکے مانگنے کی اجازت نہیں

یہ ایک ''معمہ'' ہے کہ ایسی نعمت بتاؤ جس کو مانگنے کی اجازت نہیں، یہ غم اور حزن اور مصیبت کی نعمت ہے کہ اس نعمت کے مانگنے کی بھی اجازت نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، مصیبت مت مانگو، بلکہ یہ نعمت آنے والی ہو تو اس کو دفع کرنے کی کوشش بھی کرو، اور اگر دفع نہیں کرو گے تو بھی تمہاری پکڑ

ہو جائے گی، دفع کرنا بھی اپنی حد تک ضروری ہے، اس کے دفع کرنے اور ٹلانے کے اسباب اختیار کرنا بھی ضروری ہے، ورنہ پکڑ ہو جائے گی، لیکن جب آ جائے تو یہ تمہارے لئے نعمت ہے اور رحمت ہے اور دنیا میں بھی رحمت ہے اور آخرت میں بھی رحمت ہے، دنیا میں اس کی وجہ سے درجات کی ترقی ہو رہی ہے، باطن کی ترقی ہو رہی ہے۔ باطن میں فضائل حاصل ہو رہے ہیں۔ اور رزائل فنا ہو رہے ہیں اور آخرت میں درجات بلند ہو رہے ہیں۔ ثواب کا ذخیرہ جمع ہو رہا ہے۔

اس نعمت کے دور کرنے کی کوشش کرو

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیا بات ہوئی کہ اس نعمت کو مانگنے کی اجازت نہیں، اور جب یہ نعمت مل جائے تو اس کو دور کرنے کی پوری کوشش کرو۔ لیکن وہ ہے نعمت اور رحمت۔ بات دراصل یہ ہے کہ دراصل یہ مصیبت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک ایسا عنوان ہے، ایک ایسا کرشمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو نوازنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اس کی ناگواری کو اس کی تکلیف کو بھی اس کے واسطے جنت کا ذریعہ بنا دوں، اس وجہ سے یہ مصائب اور تکالیف آتی ہیں، اس لئے ان تکالیف پر صبر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نعمتوں پر شکر ادا کریں

مجلس نمبر 101

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن
استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی.
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	101

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَاصَلَّيْتَ عَلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَابَارَكْتَ عَلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نعمتوں پر شکر ادا کریں

مجلس نمبر 101

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم، وعلی آلہ وأصحابہ اجمعین۔ امابعد:

تمہید

پچھلے چند روز سے ''صبر'' کا بیان چل رہا تھا، الحمدللہ بقدر ضرورت ہوگیا، اب آگے اس کتاب ''انفاس عیسیٰ'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ ارشادات ''شکر'' کے بارے میں منقول ہیں، جیسا کہ ''خوف'' اور ''رجا'' کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ سالک کے دو پر ہیں، جس کے ذریعہ وہ جنت کی طرف پرواز کرتا ہے۔ اسی طرح ''صبر اور شکر'' یہ دو عبادتیں ایسی ہیں کہ ایک مؤمن کے لئے اس کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو باعثِ اجر وثواب بنا دیتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لمحے لمحے پر اس کو ثواب کی امید ہو جاتی ہے، کیونکہ صبر اس وقت مشروع ہے، جب طبیعت کے خلاف کوئی کام پیش آئے، چاہے وہ کام چھوٹا ہو، یا

بڑا ہو، اس پر جب آدمی صبر کرے گا تو ایک صبر پر تین ثواب حاصل ہونگے، جس کی تفصیل میں نے پچھلے بیانات میں عرض کر دی اور اگر طبیعت کے موافق کوئی کام پیش آیا، یا حالات خوشی کے ہیں تو اس پر "شکر" کی عبادت انجام دینی ہے۔

ہوا چلنے پر شکر ادا کرو

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ایسی عبادت ہے کہ دل ہی دل میں تم نے یہ عبادت انجام دے لی اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کیا کر لیا، مثلاً آپ کو گرمی لگ رہی تھی۔ اس وقت ہوا کا جھونکا چل گیا، جس سے جسم نہال ہو گیا، گرمی کا احساس جاتا رہا۔ گرمی کی شدت میں کمی آ گئی، اس وقت تمہارے جسم کے روئیں روئیں نے اس ہوا سے فائدہ اٹھایا، اس لئے تمہارے روئیں روئیں سے شکر نکلا، اور تم نے کہا **اَللّٰھُمَّ لک الحمد و لک الشکر**، اور دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ یا اللہ! آپ نے کیسی نعمت عطا فرمائی کہ ہوا چلا دی، اگر ہوا نہ چلتی تو میں گرمی کی تکلیف میں مبتلا رہتا، آپ نے یہ نعمت عطا فرمائی۔ اے اللہ آپ کا شکر ہے، آپ کا فضل ہے، آپ کا کرم ہے، اب یہ ایسی عبادت انجام پا گئی کہ کسی کو کان و کان خبر بھی نہ ہوئی، اگر تم نماز پڑھتے تو دیکھنے والے دیکھ لیتے کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں، اس نماز کی عبادت میں دکھاوے کا اور نام و نمود کا شائبہ ہو سکتا تھا، لیکن شکر کی عبادت میں نام و نمود کا کوئی شائبہ نہیں، دل ہی دل میں یہ عبادت انجام دی جا رہی ہے۔

میان عاشق و معشوق رمز یست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

شکر کی حقیقت

پہلے تو اس ''شکر'' کی حقیقت سمجھنی چاہئے کہ شکر کیا ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''شکر کی حقیقت یہ ہے کہ جو حالت طبیعت کے موافق ہو، خواہ اختیاری ہو، یا غیر اختیاری ہو، اس حالت کو دل سے خدا تعالیٰ کی نعمت سمجھنا، اور اس پر خوش ہونا اور اپنی لیاقت سے اس کو زیادہ سمجھنا، اور زبان سے خدا تعالیٰ کی تعریف کرنا، اور اس نعمت کا گناہوں میں استعمال نہ کرنا شکر ہے۔''

(انفاس عیسیٰ، ص ۲۱۶)

اس تعریف سے پتہ چلا کہ شکر بہت ساری باتوں کا مجموعہ ہے، سب سے پہلے تو یہ کہ طبیعت کے موافق کوئی حالت یا واقعہ پیش آیا، خواہ اپنے اختیار سے آیا ہو، یا غیر اختیاری آیا ہو، مثلاً ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا، اور دل خوش ہوا، اور جسم ٹھنڈا ہوگیا، یہ غیر اختیاری نعمت تھی، یا بعض مرتبہ اختیاری طور پر نعمت حاصل ہو جاتی ہے، مثلاً آپ نے اپنے اختیار سے کہیں ملازمت کی، اور اس کے نتیجے میں آپ کو تنخواہ ملی، یا اپنے اختیار سے تجارت کی، اور اس تجارت کے نتیجے میں منافع حاصل ہوا، یہ بھی نعمت ہے، تو یہ دونوں نعمتیں واجب الشکر ہیں، غیر اختیاری نعمت پر تو شکر واجب ہونا بالکل واضح ہے، کیونکہ اس میں بندے کا کوئی دخل ہی نہیں، محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا کرم ہی کرم ہے کہ اس نے یہ گرمی دور کر دی، اور ٹھنڈک عطا فرما دی، یا بارش نہیں ہو رہی تھی، اللہ تعالیٰ نے بارش بھیج دی۔ یہ سب غیر اختیاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا بالکل واضح ہے۔

یہ قارونی فکر اور سوچ ہے

البتہ جو اعمال اختیاری ہیں، ان کے بارے میں انسان کے دماغ میں یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس میں شکر ادا کرنے کی کیا بات ہے، کیونکہ میں نے خود مہینہ بھر محنت کی، اس کے نتیجے میں مجھے تنخواہ ملی، یا دکان کھولی اور اس کے کھولنے میں پیسے خرچ کئے، دن رات ایک کئے، محنت کی، دکان پر بیٹھا، سرمایہ لگایا، اس کے بعد مجھے اس دکان سے منافع حاصل ہوا، لہٰذا یہ تو میری قوت بازو کا کرشمہ ہے، جیسے قارون نے کہا تھا کہ مجھے یہ جو دولت ملی ہے، یہ میرے علم کی بنیاد پر ملی ہے۔ یہ شبہ دماغ میں آ جاتا ہے۔

مؤمن اور کافر کی سوچ میں فرق

یہی فرق ہے، ایک مؤمن اور کافر میں، کافر اور غیر صاحب ایمان یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ میری محنت اور میری قوت بازو، میرے عمل کا نتیجہ ہے، لیکن ایک صاحب ایمان اور اللہ کا بندہ اس حقیقت کو خوب اچھی طرح جانتا ہے، جو کافر نہیں جانتا، میرا کام اس سارے عمل میں بس اتنا تھا کہ میں نے موانع دور کر دیئے، اور کچھ اسباب جمع کر دیئے، لیکن ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنا، اور ان اسباب کو نافع بنانا، یہ میرے بس میں نہیں تھا، میرا کام بس اتنا تھا کہ دکان کھول کر بیٹھ جاؤں، گاھک بھیجنا کسی اور ہی کا کام ہے، اگر وہ گاھک نہ بھیجتا تو میں صبح سے لے کر شام تک دکان پر بیٹھا رہتا اور مکھیاں مارا کرتا، اس لئے کہ کوئی گاھک نہیں آتا، تم کیا کر لیتے، یہ کون ہے جو تمہارے پاس گاھک بھیج رہا ہے؟ وہ کون ہے جو گاھک کے دل میں یہ خیال ڈال رہا ہے کہ جا کر فلاں دکان سے مال خریدو، وہ

کون ہے جو گاھک کے دل میں یہ خیال ڈال رہا ہے کہ جو قیمت تم بتا رہے ہو، اس قیمت پر خریدلو، ورنہ وہ بھی کہہ سکتا تھا کہ مجھے اس قیمت پر نہیں چاہئے، لہٰذا انسان کا کام صرف یہ ہے کہ اسباب کو جمع کر لے، البتہ ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنا اللہ جل شانہ کا کام ہے۔

اختیاری نعمتوں پر بھی شکر واجب ہے

لہٰذا جن نعمتوں کو ''اختیاری'' نعمتیں کہا جا رہا ہے، وہ بھی حقیقت میں اختیاری نہیں، بلکہ وہ بھی کسی اور ذات کی تاثیر کے نتیجے میں پیدا ہو رہی ہیں، مثلاً ڈگریاں تم نے بہت حاصل کرلیں، ایم اے کرلیا، پی ایچ ڈی کرلیا، ڈاکٹر بن گئے، لیکن ڈگریاں اٹھا کر اور درخواست لے کر پھر رہے ہو کہ کہیں ملازمت مل جائے، لیکن نہیں ملتی، کتنے لوگ ایسے ہیں جو بہترین ڈگریوں کے حامل ہیں، لیکن ملازمت نہیں ملتی، اور جب وہ چاہتے ہیں تو گھر میں پیغام آ جاتا ہے کہ آپ کی ضرورت ہے، آپ آ جائیے، اس سے پتہ چلا کہ اسباب کو اختیار کرنا تو انسان کے بس میں ہے، لیکن ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنا تو کسی اور ہی کا کام ہے، انسان کے بس میں نہیں، لہٰذا جو چیزیں تمہیں اختیاری نظر آ رہی ہیں، وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے شکر کو واجب کرنے والی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ چیزیں عطا فرمائیں۔

یہ اعضاء وجوارح، عقل، سمجھ کس نے دی ہے؟

اور جو تمہارا اپنا عمل ہے جس پر تم اترا رہے ہو کہ میں نے پیسے جمع کئے، میں نے دکان کھولی، میں نے تعلیم حاصل کی، اور میں نے ڈگریاں حاصل کیں، میں نے ملازمت حاصل کر لی، تو یہ سوچو کہ تمہارے اعضا و جوارح کے اندر یہ

طاقت کہاں سے آ گئی؟ یہ سمجھ تم کو کس نے دی؟ یہ دماغ یہ عقل تم کو کس نے دی؟ یہ ہاتھ پاؤں کس نے دیئے؟ ہاتھ پاؤں میں چلنے کی طاقت کس نے دی؟ اور ان کے ذریعہ کام کرنے کی قوت کس نے دی؟ یہ سب کچھ انہی کی عطا ہے، تمہاری کیا چیز ہے؟ اس لئے جو اختیاری نعمتیں ہیں، وہ بھی واجب الشکر ہیں۔ ان کے اوپر بھی شکر ادا کرنا ہے۔

نعمت ملنے پر خوشی کا اظہار ہونا چاہئے

حضرت والا فرماتے ہیں کہ ''اس حالت کو دل سے یہ سمجھنا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے'' ان باتوں کا تصور کر کے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے عرض کیں، ان کو دیکھ کر بظاہر یہ نعمتیں اختیاری لگ رہی ہیں، لیکن حقیقت میں اگر غور کرو تو انسان کے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ اگر توفیق نہ دے تو انسان [illegible] بس کا کام نہیں، انسان دنیا کے اندر کوئی کام نہیں کرسکتا، ان باتوں کا تصور کر کے [illegible] چیزوں کو دل سے اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھنا اور کہنا کہ یا اللہ، یہ آپ کا کام ہے کہ آپ نے یہ نعمت عطا فرمادی، ورنہ میرے بس میں یہ کام نہیں تھا۔ دل میں یہ تصور جمانا چاہئے، اور اس نعمت پر خوش ہونا چاہئے، جب کوئی نعمت ملے تو اس پر [illegible] کا اظہار کرنا اور فرحت کا اظہار کرنا، یہ اس نعمت پر شکر کرنے کا حصہ ہے، ایسا [illegible] جب نعمت ملی تو اس نعمت کے ملنے سے پہلے جو حالت تھی وہی حالت تمہاری [illegible] ہے، نعمت ملنے سے پہلے جیسے منہ بنائے بیٹھے تھے، نعمت ملنے کے بعد بھی ویسے ہی منہ بنائے رہے، اس نعمت کا کوئی اثر آپ کے چہرے پر ظاہر نہیں ہوا، حالانکہ نعمت کا اثر آپ کے چہرے سے ظاہر ہونا چاہئے، خوش ہونا چاہئے، کیونکہ یہ خوشی اس نعمت کا حق بھی ہے اور اس منعم کا حق بھی ہے، نعمت دینے والے کا حق ہے، آپ

اگر یہ کہیں کہ آپ مجھے کوئی نعمت دیتے رہیں، میں تو ویسے ہی رنجیدہ اور پریشان اور مغموم بیٹھا رہوں گا، اور چہرے سے ذرا بھی نعمت ملنے کا اظہار نہ کروں گا اور یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں سرکشی ہے، لہٰذا تمہارے کردار، تمہاری رفتار، تمہاری گفتار پر اس نعمت کا اثر ظاہر ہونا چاہئے۔

نعمت کا اثر جسم پر ہونا چاہئے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ یُریٰ اَثَرَ نِعْمَتِہٖ عَلٰی عَبْدِہٖ

یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ اپنے بندے کو جو نعمت دی ہے، اس کے آثار اس بندے پر نظر آئیں، اس کی تفصیل میں علماء کرام نے فرمایا کہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے اور کھاتا پیتا انسان ہے، لیکن وہ شخص فقیروں کی طرح رہتا ہے، دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی فقیر ہے، اور اس کو پیسے دینے کو دل چاہتا ہے، یہ صورت حال نعمت کی ناشکری میں داخل ہے، کیونکہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے دی ہے، اس کے آثار تمہارے اوپر ظاہر ہونے چاہئیں، اور ان آثار کا ایک حصہ یہ ہے کہ اس نعمت کے ملنے پر خوش ہو کر کہے کہ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے یہ نعمت عطا فرمادی۔

عید الفطر کے موقع پر بشاشت کا اظہار

اسی وجہ سے علماء کرام نے فرمایا کہ عید الفطر کے آداب میں سے ہے کہ اس موقع پر بشاشت کا اظہار آپ کے چہرے مہرے سے، آپ کے انداز و ادا سے،

آپ کی رفتار و گفتار سے معلوم ہو کہ آپ خوش ہیں، اس لئے جب دوسرے سے ملے تو بشاشت کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ ملے، اور یہ چیز عید الفطر کے آداب کے اندر داخل ہے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ عید الفطر اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اس نعمت پر خوشی کا اظہار بھی نعمت پر شکر کا ایک حصہ ہے۔

کسی غریب کو ایک لاکھ روپے مل جانے پر خوشی

آپ ذرا تصور کریں کہ کوئی آپ کا چھوٹا یا ماتحت ہے۔ ضرورت مند ہے، کھانے کو مشکل سے ملتا ہے، فاقے ہو رہے ہیں، آپ نے اس کو اپنے پاس بلایا، اور اس کو ایک لاکھ روپے دیدیئے، اتنی بڑی رقم شاید اس کے لئے ایک سال یا دو سال کے لئے کافی ہو جائیں۔ اب اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی بڑی رقم مجھے مل جائے گی۔ لیکن وہ شخص جیسا رنجیدہ شکل میں آپ کے پاس آیا تھا، ویسا ہی رنجیدہ شکل میں واپس چلا گیا، اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی تأثر پیدا نہیں ہوا، اب ظاہر ہے کہ اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ کیسا بے حس آدمی ہے کہ ایسے فاقہ کی حالت میں اس کو ایک لاکھ روپے مل گئے، مگر اس کی پیشانی کے بل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس سے یہی معلوم ہوگا یہ بالکل بے حس آدمی ہے۔

ایسے ہی وہ شخص ہے جس کو اللہ جل شانہ کی نعمتیں پہنچ رہی ہیں۔ پھر بھی اس کے ماتھے کے بل پر فرق نہیں آتا، پھر بھی اس کے چہرے پر بشاشت ظاہر نہیں ہوتی۔ پھر بھی اس کے دل میں خوشی پیدا نہیں ہوتی، یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہے، اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نعمت ملنے پر خوش ہونا بھی شکر کا ایک حصہ ہے۔

اللہ والے ہمیشہ خوش وخرم دکھائی دیتے ہیں

چنانچہ آپ حضرات نے ہمارے بزرگوں کو دیکھا ہوگا کہ ہر وقت ایک خوشی کی حالت میں رہتے تھے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہم جب جاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ہر وقت ایک نشاط کا عالم ہے، خوشی کا عالم ہے، ایسا کیوں؟ اس واسطے کہ ہر وقت ان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار رہتا تھا۔ جب نعمتوں کا استحضار ہے تو اس کا حق یہ ہے کہ خوشی کا اظہار ہو۔

ہر نعمت کو اپنی لیاقت سے زیادہ تصور کرنا چاہئے

بہرحال! یہ خوش ہونا بڑی کانٹے کی بات ہے، لیکن یہ خوش ہونا بھی یہ سوچ کر ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے یہ نعمت دیدی، چنانچہ اگلے جملے میں حضرت والا نے فرمایا کہ ''خوش ہونا اور اس نعمت کو اپنی لیاقت سے زیادہ سمجھنا''، یعنی یہ سمجھنا کہ یا اللہ! یہ نعمت تو آپ نے مجھے دیدی، لیکن میں تو اس لائق تھا نہیں، میں اس قابل کہاں تھا؟ نہ میرے اندر یہ صلاحیت تھی۔ نہ میرا کوئی قرضہ آپ کے اوپر آتا تھا۔ نہ میرا کوئی حق آپ پر واجب تھا کہ آپ مجھے یہ نعمت عطا فرماتے، آپ نے محض اپنے فضل وکرم سے عطا فرمادی، میں اس لائق نہ تھا۔ یہ بات شکر کا لازمی رکن اعظم ہے، وہ یہ کہ جو نعمت ملی ہوئی ہے، اس کو یہ سمجھنا کہ میں تو اس نعمت کا مستحق نہیں تھا۔ آپ نے اپنے فضل وکرم سے عطا فرمائی۔ تو یہ شکر عجب اور تکبر کی جڑیں کاٹتا رہے گا، جو آدمی یہ سمجھتا ہے کہ جو کھانا اللہ تعالیٰ مجھے دے رہے ہیں۔ میں تو اس قابل نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے اتنا اچھا کھانا عطا فرمایا۔ کیا ایسے شخص کو کبھی کھانا ملنے پر تکبر ہوگا؟ کبھی نہیں ہوگا، کپڑ

عالیشان پہنا ہوا ہے، لیکن دل میں یہ اعتراف موجود ہے کہ میں تو اس قابل نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمادیا۔ یہ ان کی عطا ہے، وہ جب چاہیں واپس لیلیں۔ اس اعتراف کے نتیجے میں تکبر کی جڑ کٹ جائے گی۔

نعمتوں پر اترانا اچھی بات نہیں

یہی فرق ہے ایک اس شخص کے خوش ہونے میں جس پر اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا ہو، اور جس کا تزکیہ نفس ہو چکا ہو اور دوسرا وہ شخص جو رزائل اور گناہوں کے اندر مبتلا ہے، اس کو نعمت ملنے پر خوش ہونے میں، کیونکہ جو شخص گناہوں کے اندر مبتلا ہے، وہ بھی نعمتوں پر خوش ہوتا ہے، لیکن وہ خوشی کے ساتھ اتراتا ہے کہ میری قوت بازو کا کرشمہ دیکھو کہ مجھے یہ نعمت ملی، اور میں اتنا بڑا دولت مند ہوگیا، میری دنیا میں اتنی شہرت ہوگئی، اتنے لوگ میرے معتقد ہوگئے، اور وہ نہیں سوچتا کہ میں اس لائق نہیں تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے یہ نعمتیں عطا فرمادیں، بلکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ میرے اندر ایسی صلاحیت اور لیاقت ہے، اس کی وجہ سے میں اتنا اونچا پہنچ گیا، اور اس پر وہ خوش ہو رہا ہے۔

قارون کی طرح نعمت کو اپنی محنت کا نتیجہ تصور کرنا

جیسا کہ قارون نے کہا تھا کہ:

اِنَّمَا اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ

میں کیوں شکرادا کروں، میں نے جو سارا خزانہ جمع کیا ہے، یہ اپنے علم کے نتیجے میں جمع کیا ہے۔ وہ قارون بھی اس نعمت پر خوش ہو رہا تھا، لیکن اس کو کہا گیا کہ:

لَا تَفۡرَحۡ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡفَرِحِیۡنَ

یعنی ایسی خوشی کا اظہار مت کرو، اس لئے کہ یہ حقیقت میں خوشی نہیں، بلکہ ''اتراہٹ'' ہے۔ اتراہٹ سے مقصد یہ ہے کہ میں خود اس قابل تھا کہ مجھے یہ دولت ملے، اس لئے مجھے یہ دولت مل گئی، لہٰذا اس دولت پر شکر ادا کرنے کے بجائے فخر کرتا پھر رہا ہے اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھ رہا ہے، اور اپنے کو بڑا سمجھ رہا ہے۔ بہرحال! خوش ہونے میں فرق ہے، دونوں کو خوش ہونا کہا جائے گا، لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ایک خوش ہونا عبادت ہے۔ دوسرا خوش ہونا معصیت اور گناہ ہے۔ اگر اپنی لیاقت اور صلاحیت کی بنیاد پر خوش ہو رہا ہے تو معصیت ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کے فضل، اس کی نعمت ملنے پر خوش ہو رہا ہے تو یہ عبادت ہے۔

ہر نعمت پر شکر کی عادت ڈالو

اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شکر کی عبادت بڑی عجیب چیز ہے، اس لئے ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے، اور ہر نعمت پر انسان کہاں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرسکتا ہے، یہ اس کے بس میں نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر لمحے بے شمار نعمتیں حاصل ہو رہی ہیں، لیکن انسان عادت ڈالے کہ وہ ہر نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرتا رہے تو یہ ایسی چیز ہے کہ انسان کو بہت سی باطنی بیماریوں سے بچانے والی ہے، چنانچہ اس شکر سے تکبر کی جڑ کٹتی ہے۔

اللہ کا شکر شیطان کے داؤ سے بچاتا ہے

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑے نکتے کی بات بیان فرمائی کہ شیطان کو جب راندہ درگاہ کیا گیا تو اس نے اپنا باقاعدہ پورا پلان اللہ میاں کو بتادیا کہ آپ نے تو مجھے نکال دیا، اب میرا پلان یہ ہے کہ یہ آدم جس کی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنا پڑا، میں اس کی اولاد کو چھوڑوں گا نہیں۔ میں اس کے داہنی طرف سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا، چاروں طرف سے اس پر حملہ آور ہوں گا، اور اس کے بعد آخر میں یہ جملہ کہا کہ:

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَ هُمْ شَاكِرِيْنَ (القران)

کہ آپ ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر کرنے والا نہیں پائیں گے، یعنی میں ایسا داؤ چلاؤں گا کہ ان کو شکر سے محروم کردوں گا، اور شکر سے محروم کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ میرے جال میں آسانی سے پھنس جائیں گے، اور میرا داؤ ان پر آسانی سے چلے گا، اس سے پتہ چلا کہ شیطان کے داؤ سے بچنے کا بہترین طریقہ شکر کی کثرت ہے، اس لئے خوب اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرو، تم جتنا شکر ادا کرو گے، اتنا ہی انشاء اللہ تعالیٰ شیطان کے حملوں سے محفوظ رہو گے۔

زبان سے شکر کا طریقہ

آگے فرمایا کہ: ''زبان سے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا'' اور یہ کہنا ''الحمد للہ''

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

یعنی ایک طرف تو اس نعمت پر دل سے خوش ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اعتراف کیا، اور اپنی نالائقی کا اعتراف کیا، اور پھر زبان سے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی، اور کہا:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

رات سونے سے پہلے یہ عمل کرلو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمہ اللہ علیہ اپنے ایک بزرگ کا واقعہ بیان کیا کرتے تھے، کہ میں رات کو ان کو دیکھتا کہ جب وہ اپنے بستر پر لیٹنے کے لئے جاتے تو سونے سے پہلے عجیب والہانہ انداز میں پڑھتے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

بار بار پڑھتے، اور مسلسل بے تحاشہ ۵۔۷ منٹ تک اسی کی رٹ لگاتے، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت، یہ رات کو سونے سے پہلے آپ یہ بار بار کیوں پڑھتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ سارا دن اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں زندگی گزر رہی ہے، اور جو نعمت حاصل ہوتی ہے اس وقت پر اس پر شکر ادا کرنے کی طرف دھیان نہیں جاتا، اور انسان کے بس میں بھی نہیں ہے، وہ کہاں تک ان نعمتوں پر شکر ادا کرے گا، اس لئے میں رات کو یہ عمل کرتا ہوں کہ ایک ہی مرتبہ میں بیٹھ کر دن کی ساری نعمتوں کا ایک ایک کر کے تصور کرتا ہوں، اور پھر ایک ایک نعمت پر شکر ادا کرتا ہوں، مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رزق دیا،

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

اللہ تعالیٰ نے مجھے اچھا کھانا دیا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

اللہ تعالیٰ نے مجھے اچھا لباس دیا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

اللہ تعالیٰ نے گھر کا ماحول اچھا رکھا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

اللہ تعالیٰ نے مجھے راحت والا مکان عطا فرمایا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

اس طرح ہر ہر نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں، تا کہ کچھ تو شکر ادا ہو جائے۔ لہٰذا رات کو سونے سے پہلے ہم لوگ بھی اس طرح شکر ادا کرنے کا معمول بنالیں۔

حمد اور شکر کے بہترین کلمات

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حمد کے ایسے ایسے کلمات تلقین فرما دیئے کہ اگرچہ حق شکر تو ادا نہیں ہوسکتا، لیکن آدمی ان کلمات کے ذریعہ اپنی سی کوشش کرلے، مثلاً فرمایا:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حمدًا دَائِماً مَعَ دَوَامِكَ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا خَالِدًا مَعَ خُلُوْدِكَ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَا مُنْتَھٰی لَهٗ دُوْنَ مَشِیَّتِكَ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَا یُرِیْدُ قَائِلُهٗ اِلَّا رِضَاكَ، وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا عِنْدَ طَرْفَةِ كُلِّ عَیْنٍ، وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا عِنْد تَنَفُّس

كُلِّ نَفَسٍ۔

یعنی اے اللہ! آپ کی تعریف ہے، ایسی تعریف کہ جب تک آپ باقی ہیں، وہ تعریف بھی باقی ہے، اے اللہ! آپ کی تعریف ہے ایسی تعریف جو آپ کے ہمیشگی کے ساتھ وہ تعریف بھی ہمیشہ باقی رہے، اور اے اللہ! آپ کی ایسی تعریف کہ وہ تعریف کرنے والا آپ کی رضا کے علاوہ کوئی ارادہ نہیں رکھتا، اور اے اللہ! ہر پلک کے جھپکنے پر آپ کا ایک شکر، اور اے اللہ، ہر سانس کے آنے پر آپ کا ایک شکر۔

حمد و تعریف کے عمدہ کلمات

ایک اور موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی تعریف ایسے الفاظ سے فرمائی کہ ایک پیغمبر ہی ایسے الفاظ لاسکتا ہے، عام انسان کے بس کی بات نہیں کہ ایسا شکر ادا کرے، چنانچہ فرمایا:

اَللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ زِنَةَ عَرْشِكَ۔

اے اللہ! آپ کے عرش کے وزن کے برابر آپ کی تعریف کرتا ہوں۔ کیا کوئی بندہ ان الفاظ سے تعریف کرے گا؟

اَللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ مِدَادَ كَلِمَاتِكَ

اے اللہ! آپ کے کلمات کو لکھنے کے لئے جتنی سیاہی درکار ہوسکتی ہے۔ اس کے برابر آپ کی تعریف ہے۔ جبکہ قرآن کریم نے یہ کہہ دیا کہ:

لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّیْ (القرآن)

اگر دنیا کے سارے سمندر سیاہی بن جائیں، اور اللہ تعالیٰ کے کلمات لکھنا شروع کریں تو سارے سمندر ختم ہو جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہ ہوں، جب یہ سارے سمندر مل کر بھی آپ کے کلمات کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ تو اے اللہ! جتنی بھی سیاہی آپ کے کلمات کے لئے کافی ہو جائے اس سیاہی کے برابر آپ کا شکر۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ عَدَدَ خَلْقِکَ

اے اللہ! آپ کی جتنی مخلوقات ہیں۔ ان کی گنتی کے برابر آپ کا شکر، صرف انسان نہیں۔ صرف حیوان نہیں، جانور نہیں، بلکہ تمام مخلوقات، جس میں انسان بھی، حیوانات بھی، نباتات بھی، جمادات بھی آ گئے، ساری مخلوق اس میں آ گئی۔ پھر اس سے بھی آگے یہ جملہ ارشاد فرمایا:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ رِضَا نَفْسِکَ

اے اللہ! آپ کا اتنا شکر جس سے آپ راضی ہو جائیں۔ اب اس کی کوئی انتہاء ہی نہیں۔ شکر کا حق تو بندہ کیا ادا کرے گا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کلمات تلقین فرمائے۔ ان کو یاد کر لیں اور رات کو سونے سے پہلے ان کلمات کو کہہ لیا کریں۔

نعمت کو گناہوں میں استعمال مت کرو

پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نعمت پر شکر کا آخری طریقہ یہ بیان فرمایا کہ:

''اس نعمت کو گناہوں میں استعمال نہ کرنا''

یہ بڑی اہم بات ہے کہ جس نعمت پر تم شکرادا کر رہے ہو، اس کا سب سے بڑا شکر یہ ہے کہ وہ نعمت جس نے عطا کی ہے، اس کی مرضی کے خلاف اس نعمت کو استعمال نہ کرو، اس کے حکم کے بغیر استعمال نہ کرو۔ اس کی معصیت میں، اس کی نافرمانی میں استعمال نہ کرو، مثلاً کسی شخص نے آپ کو پچاس ہزار روپے ہدیہ دے، جبکہ آپ کے تصور میں بھی زندگی میں اتنے پیسے ملنے کی امید نہیں تھی۔ جب آپ کے جیب میں وہ پیسے آگئے تو آپ نے ایک آدمی کو بلایا اور اس سے کہا کہ ایسا کرو کہ ان پیسوں سے ایک پستول خریدو اور اس آدمی کو ماردو، قتل کردو۔ گویا کہ اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کے خلاف استعمال کر رہے ہو، اس سے بڑی ناشکری، اور اس سے بڑی بغاوت اور کیا ہوگی؟

یہ آنکھ کی نعمت کی ناشکری ہے

اسی طرح اللہ جل شانہ نے جو نعمت عطا فرمائی ہے، اس نعمت کو ان کی معصیت میں استعمال مت کرو۔ اب اللہ میاں نے فرمایا تھا کہ یہ جو پیسے ہم نے تمہیں دیئے ہیں، اس کو حلال کاموں میں اور حلال مقاصد میں استعمال کرنا، کسی حرام اور معصیت کے کام میں استعمال مت کرنا۔ لیکن تم نے ان پیسوں کو معصیت اور حرام کام میں استعمال کیا تو اس سے بڑی ناشکری کیا ہوگی؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آنکھ کی نعمت عطا فرمائی، یہ بھی عظیم نعمت ہے، ایسی نعمت ہے کہ اگر ساری دنیا کی دولت خرچ کر کے بھی اس کو حاصل کرنا چاہو تو بھی نہ ملے، لیکن اللہ جل شانہ نے مفت میں یہ نعمت عطا فرمادی، اور پیدائش سے لے کر مرتے دم تک تمہارا ساتھ دے رہی ہے، نہ اس کی سروس کی ضرورت نہ اس کو گریس کی ضرورت، نہ اس کو پیٹرول اور ڈیزل کی ضرورت، نہ اس کی اوور ہالنگ کی ضرورت، لیکن یہ مسلسل

اپنا کام کر رہی ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ دیا، اس کو خوب استعمال کرو، اس سے مزہ لو، اسی سے راحت حاصل کرو، بس چند چیزوں میں اس کا استعمال مت کرنا۔ وہ یہ کہ کسی نامحرم کو لذت کی نگاہ سے مت دیکھنا، اسی طرح اس کے ذریعہ میرے کسی بندے کو تحقیر کی نگاہ سے مت دیکھنا، بس یہ دو چار کام ہیں ان کو مت کرنا، باقی اس کے ذریعہ ساری دنیا کو دیکھو، لیکن بندہ یہ کہتا ہے کہ نہیں، میں تو اس آنکھ کو اسی جگہ استعمال کروں گا، جس جگہ سے آپ نے منع کیا ہے۔ نامحرم عورتوں کو دیکھوں گا، لوگوں کو حقارت سے دیکھوں گا، اب بتایئے، اس سے بڑی ناشکری اور کیا ہوگی؟

خلاصہ:

لہٰذا جو نعمت اللہ جل شانہ نے عطا فرمائی ہے، اس نعمت کو اس کی معصیت میں نافرمانی میں، گناہوں میں استعمال کرنے سے بچو، یہ بھی شکر کا آخری مطالبہ ہے، بہرحال یہ ''شکر'' بے شمار عبادتوں کا مجموعہ ہے، اور بہت سے روحانی امراض کا علاج ہے، اور انسان کے لئے گھر بیٹھے آسانی کے ساتھ ثواب کے ذخیرے لگانے کا بڑا آسان طریقہ ہے اور اسی طرح رزائل سے محفوظ رہنے اور باطنی امراض سے بچنے کا اور ان کے علاج کا بڑا آسان طریقہ ہے، یہ ''شکر'' اتنی بڑی نعمت ہے۔ اللہ جل شانہ ہم سب کو اس ''شکر'' کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کونسا ہدیہ اللہ کی نعمت ہے؟

مجلس نمبر 102

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط وترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی.
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	102

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کونسا ہدیہ اللہ کی نعمت ہے؟

مجلس نمبر 102

الحمدللہِ ربّ العالمین، والصلاۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم، وعلی آلہ وأصحابہ اجمعین۔ امابعد:

تمہید

حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کا اصلاح کا یہ طریقہ تھا کہ جو لوگ حضرت والا سے اصلاحی تعلق قائم کرتے، یا بیعت ہوتے، وہ لوگ خط کے ذریعہ حضرت والا کو اپنے حالات سے مطلع کرتے رہا کرتے تھے، حضرت والا ان کے حالات کے مناسب ان کے خطوط کا جواب بھی دیا کرتے تھے، یہ اسی قسم کا ایک خط ہے جو ایک طالب اصلاح نے حضرت والا کو لکھا کہ:

ایک طالب اصلاح کا خط:

''احقر کے استاذ جو طبیب ہیں، اچھے مالدار ہیں، وہ خرچ کے متعلق بہت کچھ اعانت کرتے رہتے ہیں، احقر نے عرض بھی کیا کہ گرانی ہوتی ہے، لیکن انہوں نے تسلیم نہیں کیا، ڈر لگتا ہے کہ شاید اس کا منشا مرض ہو۔ (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۶)

دوسرے کے احسان کی وجہ سے گرانی:

ان کو یہ شبہ ہوا کہ میرے استاذ جو طبیب ہیں، بظاہر حکیم ہوں گے اور مالدار بھی ہیں، وہ اکثر پیسے دیتے ہیں اور میری مدد کرتے ہیں، اور کثرت سے ان کے پیسے دینے سے طبیعت پر گرانی اور بوجھ ہوتا ہے، کہ ایک آدمی مسلسل پیسے دئے چلا جا رہا ہے، ان کا احسان بڑھتا ہے اور شریف آدمی دوسرے کا احسان لینا گوارہ نہیں کرتا، اور میں نے ان سے کہا بھی کہ آپ مجھے بار بار پیسے دیتے ہیں، میری طبیعت پر بوجھ ہوتا ہے، براہ کرم آپ ایسا نہ کریں، لیکن وہ نہیں مانے۔ تو اب اس کے باوجود مجھے جو گرانی ہو رہی ہے، یہ کوئی بیماری تو نہیں؟ اور شرعاً اور اخلاقاً یہ گرانی ہونا درست ہے یا نہیں؟

آج کل شیخ سے یہ کام لئے جاتے ہیں:

یہی باتیں شیخ سے پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ آج کل لوگ شیخ سے تعویذ مانگتے ہیں کہ فلاں چیز کا تعویذ دیدو، فلاں چیز کا کوئی وظیفہ بتادو، مثلاً قرض اتارنے کا کیا وظیفہ ہے؟ آمدنی میں اضافہ کرنے کا کیا وظیفہ ہے؟ تعلقات درست کرنے کا کیا وظیفہ ہے؟ دن رات اسی طرح کے سوالات پوچھے جاتے ہیں، اور انہی چیزوں میں دھیان لگا ہوا ہے، آج کل شیخ سے تعویذ لکھوانے کا کام لیتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ خواب کی تعبیر پوچھ لی کہ میں نے فلاں خواب دیکھا ہے، اس کی کیا تعبیر ہے؟ بس شیخ اسی کام کے لئے رہ گیا ہے۔

کہیں یہ ناشکری تو نہیں ہے؟

حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ انسان اپنی ایک ایک نقل و حرکت کا جائزہ

لے، جائزہ لے کر پھر شیخ سے پوچھے کہ مجھے یہ بات پیش آئی تھی، یہ درست تھی یا غلط تھی؟ یہ کوئی بیماری تو نہیں تھی۔ اب اس خط کے اندر دیکھیں کہ ان صاحب کو یہ شبہ ہو رہا ہے کہ پیسے لینے سے جو میں انکار کر رہا ہوں اور بار بار اپنی گرانی کا اظہار کر رہا ہوں، کہیں یہ تکبر کے اندر داخل تو نہیں؟ کہیں یہ ناشکری تو نہیں ہے؟ کیونکہ ایک چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ رہی ہے، اور میں نے اپنی طرف سے منع بھی کر دیا، پھر وہ مجھے دے رہے ہیں، اس کے باوجود ان کے دینے سے مجھے گرانی اور تکلیف ہو رہی ہے۔ کہیں یہ گرانی اور تکلیف ناشکری میں تو داخل نہیں؟ کہیں یہ تکبر میں تو داخل نہیں؟ کہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھ رہا ہوں، اس لئے لینے سے گریز کر رہا ہوں، یہ سوال ان کے دل میں پیدا ہوا۔

شیخ ان کاموں کیلئے نہیں:

یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ شیخ سے تعلق کا مقصد نہ تو خواب کی تعبیر پوچھنا ہے، اور نہ تعویذ گنڈے لینا ہے، اور نہ ذاتی امور میں مشورہ لینا ہے۔ لوگ شیخ سے پوچھتے ہیں کہ فلاں چیز کی تجارت کروں یا نہ کروں؟ اس کا تعلق شیخ سے نہیں، یہ اور بات ہے کہ شیخ تبرعاً مشورہ دیدے، لیکن فی نفسہ شیخ اس کام کے لئے نہیں ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ شیخ سے معمولات پوچھ لئے کہ کس وقت کونسی تسبیح پڑھا کروں؟ اور کس مقدار میں پڑھا کروں؟ بس شیخ اسی کام کا رہ گیا ہے۔ حقیقت میں یہ بات نہیں۔

ہر وقت دل میں یہ خیال لگا رہنا چاہئے:

اصل بات یہ ہے کہ ہر وقت دل میں ایک کانٹا لگا ہوا ہو کہ فلاں وقت

میں مجھ سے یہ کام سرزد ہوا تھا۔ کہیں کسی بیماری کی وجہ سے تو سرزد نہیں ہوا تھا؟ کہیں تکبر کی وجہ سے، یا حسد کی وجہ سے، یا ناشکری کی وجہ سے تو نہیں ہوا؟ بے صبری کی وجہ سے تو نہیں ہوا، ہر وقت دل میں یہ خیال لگا رہنا چاہئے۔ اور پھر وہ واقعہ بتا کر شیخ سے رجوع کرنا چاہئے...... چونکہ میں لوگوں سے بار بار کہتا رہتا ہوں کہ شیخ سے تعلق کا مقصد باطنی امراض کا ازالہ، اور اخلاق کا تزکیہ کرنا ہے، اور اسی بارے میں شیخ سے پوچھنا چاہئے نہ یہ کہ خواب کی تعبیر اور تعویذ گنڈے پوچھے جائیں۔ بار بار کہنے کے نتیجے میں لوگوں کی سمجھ میں بات تو آ گئی۔ لیکن اب لوگ اس طرح سے سوال کرتے ہیں کہ ''مجھے یہ شبہ ہے کہ میرے اندر تکبر کی بیماری ہے، میرے اندر حسد ہے، میرے اندر بغض ہے، میرا علاج فرمائیں'' ......

شیخ عالم الغیب نہیں:

ذرا سوچو تو سہی کہ جس کو خط لکھ رہے ہو، کیا وہ عالم الغیب ہے؟ کہ اس کو پتہ ہے کہ تمہیں جس بیماری کا شبہ ہو رہا ہے وہ شبہ درست ہے، یا غلط ہے، کہاں تکبر کا مظاہرہ ہوتا ہے؟ کہاں بغض کا مظاہرہ ہوتا ہے؟ کہاں حسد کا مظاہرہ ہوتا ہے؟ آپ نے شیخ کو کوئی واقعہ نہیں لکھا، بلکہ یہ لکھ دیا کہ میرے اندر یہ یہ امراض ہیں۔ آپ علاج تجویز فرما دیں۔......

یاد رکھئے! اس لکھنے کا کچھ حاصل نہیں۔ شیخ کو جب تم لکھو، اور تمہیں کسی بیماری کا شبہ ہو، مثلاً تکبر کا، حسد کا، بغض کا، ریاکاری کا، حُبّ جاہ کا، حُبّ مال کا شبہ ہو، تو شیخ کو وہ واقعات بھی لکھو جن کی وجہ سے وہ شبہ پیدا ہوا، نہ یہ کہ صرف یہ لکھ دیا کہ میرے اندر ''حُبّ مال'' ہے، میرے اندر ''حُب جاہ'' ہے۔ اس کا علاج کریں، اس کا مطلب یہ ہے کہ خود ہی اپنی طرف سے اپنے مرض کی تشخیص کر لی اور حالات

بتائے نہیں، اور شیخ سے کہا کہ اس کا علاج کر دو۔

ڈاکٹر کے پاس جا کر آپ کیا کرتے ہیں:

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص ڈاکٹر کے پاس جائے اور ڈاکٹر سے کہے کہ میرا جگر خراب ہے، مجھے جگر کی دوا دیدو، خود ہی فیصلہ کر لیا کہ میرا جگر خراب ہے، حالانکہ یہ فیصلہ کرنا ہر ایک آدمی کے بس کا کام نہیں، آدمی کو خود فیصلہ نہیں کرنا چاہئے کہ میرا جگر خراب ہے، یا دل خراب ہے، کیونکہ جو شخص اپنی بیماری خود تشخیص کر لے، اس کی کوئی اور چیز خراب ہو یا نہ ہو، لیکن دماغ ضرور خراب ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے جا کر ڈاکٹر کو وہ وجہ بتاؤ جس کی بنیاد پر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تمہارا ''جگر'' خراب ہے، اپنی تکلیف اور اپنی پریشانی ڈاکٹر کو بتاؤ، عوارض بتاؤ، جب تم تکلیف اور عوارض بتاؤ گے تو پھر ڈاکٹر ان عوارض کی روشنی میں تشخیص کرے گا کہ تمہارا جگر خراب ہے، یا گردہ خراب ہے۔ چونکہ ہر بیماری کے علاج بھی مختلف ہوتے ہیں، اس لئے کہ جگر کی خرابی کی بہت سی قسمیں ہیں، ہر قسم کی خرابی کے لئے ایک طرح کا علاج تو کارآمد نہیں ہوگا، لہٰذا جب تک تم ڈاکٹر کو عوارض نہیں بتاؤ گے کہ فلاں جگہ تکلیف ہے، فلاں جگہ درد ہے، اس وقت تک ڈاکٹر نہ تو صحیح تشخیص کر سکے گا، اور نہ ہی اس کی صحیح دوا تجویز کر سکے گا۔

پیش آمدہ واقعات شیخ کو لکھو:

بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے شیخ کو یہ لکھدے کہ میرے اندر ''تکبر'' ہے، یا میرے اندر ''حسد'' ہے، یا میرے اندر ''بغض'' ہے، آپ اس کا علاج فرما دیں۔ اس طرح لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ واقعہ لکھو جس کی بنا پر تمہارے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ شاید میرے اندر ''تکبر'' ہے۔ وہ

واقعہ لکھو جس کی وجہ سے تمہیں یہ خیال ہوا کہ شاید میرے اندر ''حسد'' ہے، یا شاید میرے اندر ''بغض ہے، جب تم واقعہ لکھو گے تو اس کے ذریعہ شیخ پہچانے گا کہ واقعی تمہارے اندر تکبر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر اس قسم کے ''تکبر'' کا کیا علاج ہے؟ پھر وہ علاج شیخ بتائیے گا، لہٰذا صرف اجمالی طور پر بیماری لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

ان صاحب نے پورا واقعہ لکھا:

اب دیکھئے: اوپر جس خط کا ذکر آیا، اس میں آپ نے دیکھا کہ ان صاحب کو شبہ پیدا ہوا، اور قاعدہ کے مطابق انہوں نے پورا واقعہ لکھا، یہ نہیں لکھا کہ میرے اندر یہ بیماری ہے، اس کا علاج بتائیے۔ بلکہ تفصیل سے پورا واقعہ لکھا کہ وہ میرے استاذ ہیں، طبیب ہیں، مالدار ہیں، میری مالی اعانت کرتے رہتے ہیں، میرے منع کرنے کے باوجود نہیں مانتے، اور اس سے مجھے گرانی ہوتی ہے، آیا یہ گرانی ہونا بیماری ہے اور ناشکری میں داخل ہے یا نہیں؟ پوری بات لکھدی۔ بات سمجھ میں آ گئی، اب شیخ اس کا جواب دے گا، اور اس کے نتیجے میں اگر ان صاحب کی غلطی ہے تو اصلاح ہو جائے گی، اور اگر غلطی نہیں ہے، بلکہ یہ طرزِ عمل درست ہے تو توثیق ہو جائے گی، اور آئندہ کے لئے راہِ عمل کھل جائے گا۔

حضرت والا کا جواب:

اب حضرت والا کا جواب سنیئے: فرمایا کہ:

''ڈرنا تو بہت اچھی بات ہے، ڈر ہی سے امن ہے، لیکن جب اپنی طرف سے نہ طلب ہے، نہ اشراف، بلکہ انقباض کو بھی ظاہر کر دیا، پھر بھی وہ خدمت کرتے ہیں تو یہ نعمت ہے،

اس پر گو طبعاً انقباض ہو، مگر عقلاً انبساط ہونا چاہئے، اور اوّلاً خدا تعالیٰ کا کہ منعم حقیقی ہیں، اور ثانیاً ان صاحب کا کہ منعم مجازی ہیں، یعنی واسطہ نعمت ہیں، شکر ادا کرنا چاہئے، اور وہ شکر حق تعالیٰ کا تو اطاعت ہے اور ان صاحب کا ان کے لئے دعا کرنا ہے"۔ (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۶)

ڈر ہی سے امن ہے:

ان صاحب نے لکھا تھا کہ "ڈر لگتا ہے کہ شاید اس کا منشاء مرض ہو" تو جواب میں حضرت نے فرمایا کہ "ڈرنا تو بہت اچھی بات ہے، ڈر ہی سے امن ہے" کیا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا: کیونکہ "ڈر" اور "امن"، حقیقت میں یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ اس لئے کہ "امن" کا مطلب ہے "بے خوفی" اور ڈر ہے "خوف"، دونوں متضاد ہیں، لیکن فرمایا کہ "ڈر ہی سے امن ہے" یعنی جو آدمی اپنی زندگی میں ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے، میرا کام اللہ کی رضا کے خلاف نہ ہو جائے، مجھ سے گناہ سرزد نہ ہو جائے، ایسے شخص کو انشاء اللہ آخرت میں امن ملے گا، اور اگر دل سے ڈر نکل جائے۔ تو اللہ بچائے، پھر غفلت طاری ہو جاتی ہے، اور غفلت کا انجام بہت برا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ "ڈرنے سے مت گھبراؤ، اگر تمہیں یہ ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں یہ کوئی بیماری تو نہیں ہے تو یہ ڈرنا بہت اچھی بات ہے، اس لئے کہ ڈر ہی سے امن ہے۔

بغیر اشراف کے آنے والی چیز نعمت ہے:

آگے پھر اصل سوال کا جواب دیا کہ: لیکن جب اپنی طرف سے نہ طلب ہے نہ اشراف، بلکہ انقباض کو بھی ظاہر کر دیا اور پھر بھی وہ خدمت کرتے ہیں، تو یہ

نعمت ہے''، یعنی نہ طلب ہے کہ جا کر ان سے مانگا ہو کہ مجھے اتنے پیسے دیدو، اور اشراف بھی نہیں، ''اشراف'' کا مطلب ہے کہ انتظار لگا ہوا ہے کہ یہ صاحب مجھے ہر مرتبہ دیتے ہیں، اب کی مرتبہ بھی مجھے کچھ دیں گے، اس انتظار کا نام ہے ''اشراف''۔

دراصل عربی زبان میں ''اشراف'' کے معنی ہیں اُچک اُچک کر دیکھنا، یعنی منہ اٹھا کر اچک کر دیکھنا کہ اس جگہ کیا ہو رہا ہے، مقصد یہ ہے کہ دوسروں کی چیز کو انسان اچک اچک کر دیکھے کہ یہ چیز مجھے مل جائے، یا وہ شخص مجھے یہ چیز دیدے، چاہے جائز طریقے سے دیدے، لیکن دل میں اس چیز کی لالچ اور انتظار لگا ہوا ہے، اصول یہ ہے کہ جو چیز انتظار اور ''اشراف'' کے بعد ملے اس میں برکت نہیں ہوتی، برکت اس میں ہوتی ہے جس چیز کی نہ تو طلب تھی، اور نہ اشراف تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے غیب سے وہ چیز بھیج دی تو اس چیز میں برکت ہوگی۔

ایسے ہدیہ میں برکت نہیں ہوتی

مثلاً ایک شخص ہر رمضان میں مجھے ہدیہ دیا کرتا ہے، اب رمضان شروع ہوتے ہی انتظار لگ گیا کہ فلاں شخص ہدیہ لائے گا، اب ہدیہ کا انتظار بھی لگا ہوا ہے، اور اشتیاق بھی لگا ہوا ہے، اور امید بھی ہے، اس کے بعد وہ شخص ہدیہ لے آیا۔ یہ ہدیہ ''اشراف'' کے بعد آیا، اس ہدیہ کو لینا فقہی اعتبار سے کوئی حرام نہیں، ناجائز نہیں، گناہ نہیں، بلکہ جائز ہے، اور حلال ہے، لیکن صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ایسے ہدیہ میں برکت نہیں ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مخلوق کی طرف امید کی نگاہ سے کیوں دیکھا؟ امید باندھتے تو اللہ تعالیٰ سے باندھتے، انتظار لگتا تو اللہ کی عطا کا لگتا، مخلوق کی عطا کا انتظار کیوں لگا؟ اس لئے اس ہدیہ میں بے برکتی

ہوگی۔ اس کی تائید ایک روایت سے بھی ہوتی ہے، اگرچہ وہ روایت اتنی پکی نہیں کہ اشراف نفس کے بعد جو چیز ملے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اس لئے صوفیاء کرام اس کا اہتمام فرماتے ہیں کہ کوئی چیز اشراف نفس کے ساتھ نہ آئے، اور جو چیز اشراف نفس کے ساتھ آئے، اس کو واپس کر دیں۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ علیہ پر فاقے بہت گزرتے تھے، مجاہدات بھی بہت کرتے تھے، ایک مرتبہ فاقوں سے گزر رہے تھے، ایک مرید نے دیکھا کہ آپ کے چہرے پر کمزوری کے آثار ہیں اور بھوک کے آثار ہیں۔ جس کی وجہ سے بولنے میں دقت ہو رہی تھی، مرید نے محسوس کیا کہ شیخ پر فاقے اور بھوک کا عالم ہے، اس لئے شیخ کے لئے میں کچھ کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ مرید عین مجلس سے اٹھ کر چلا گیا، اور جا کر کھانے کا انتظام کیا، اور ایک تھال مین کھانا رکھ کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ جب شیخ کے سامنے کھانا پیش کیا تو شیخ نے کھانے سے انکار کر دیا، فرمایا کہ میں نہیں کھاؤں گا، مرید نے ان سے کوئی حجت نہیں کی، بلکہ کھانا اٹھایا اور واپس لے گیا۔ کیونکہ وہ مرید سمجھ گیا کہ شیخ کھانا کھانے سے اس لئے منع کر رہے ہیں کہ جب میں مجلس سے اٹھ کر گیا تھا اس وقت انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ میں مجلس سے اس لئے اٹھ کر گیا ہوں، تا کہ شیخ کے لئے کھانے کا انتظام کروں، چونکہ شیخ کو "اشراف" ہو گیا تھا، اس وجہ سے شیخ کھانا کھانے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس لئے مرید نے کوئی حجت نہیں کی، اور کھانا اٹھا کر واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی تھال واپس لے کر آ گیا، اور آ کر کہا حضرت! اب قبول فرمالیں، کیونکہ جب مرید وہ کھانے کا تھال واپس لے کر

چلا گیا تو جو اشراف اور انتظار تھا۔ وہ ختم ہو گیا، چنانچہ شیخ نے وہ کھانا قبول کر لیا اور کھانا کھا لیا۔ بہرحال! صوفیاء کرام ''اشراف'' سے بھی بچتے ہیں، تاکہ بے برکتی نہ ہو۔

اللہ کی نعمت سمجھ کر لیلو:

اس لئے حضرت فرما رہے ہیں کہ ''اگر کوئی شخص آپ کو کوئی چیز اس طرح دے رہا ہے کہ نہ تو آپ کو اس چیز کی طلب ہے اور نہ اشراف ہے۔ اس لئے کہ طلب کر کے مانگ کر کسی سے کوئی ہدیہ لینا بہت گھٹیا حرکت ہے۔ اس لئے کہ اس شخص کے لئے سوال کرنا حرام ہے، جس کے پاس ایک دن ایک رات کے کھانے کا انتظام موجود ہو۔ بلکہ انقباض ہوتا ہے، اور پیسے لینے میں طبیعت پر بوجھ ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ استاد صاحب آپ کی خدمت کرتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔

چیزے کہ بے طلب رسد آں دادۂ خداست
اورا تو رد مکن کہ فرستادۂ خداست

جب اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بغیر طلب کے عطا فرمائی تو یہ اس کی نعمت ہے۔ اس کی عطا ہے، اس کو رد نہیں کرنا، کیونکہ وہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہے۔ لہٰذا جب طلب نہیں تھی، اشراف نہیں تھا، بلکہ لینے میں تھوڑا سا طبیعت پر بوجھ بھی ہے کہ دوسروں کا احسان کیوں لوں، جب یہ سب باتیں موجود ہیں، اس کے باوجود اللہ میاں دے رہے ہیں، کیا اب استغناء برتو گے؟ کہ میں نہیں لیتا۔...... العیاذ باللہ...... یہ بڑی گستاخی کی بات ہے۔ اب استغناء نہیں، جب وہ دے رہے ہیں تو پھر محتاج بن کر لے لو۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ:

جیسے حضرت ایوب علیہ السلام نے لیا۔ ایک مرتبہ حضرت ایوب علیہ السلام غسل خانے میں غسل فرما رہے تھے، اس دوران آپ کے اوپر سونے کی تتلیاں گرنی شروع ہوگئیں، اب حضرت ایوب علیہ السلام نے غسل کرنا چھوڑ دیا، اور سونے کی تتلیاں پکڑنے لگے، اور جمع کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ایوب! کیا ہم نے تمہیں بہت کچھ مال و دولت نہیں دے رکھا ہے؟ حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا: اے اللہ! آپ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے، لیکن

لَا غِنًى بِی عَنْ بَرَكَتِكَ

اے اللہ! میں آپ کی برکت سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

جب آپ مجھے میری طلب اور انتظار کے بغیر دے رہے ہیں تو کیا میں پھر بھی بے نیازی کا مظاہرہ کروں کہ مجھے یہ نہیں چاہئے؟ میں تو پھر محتاج بن کر اس کی طرف دوڑوں گا، اور اس کو حاصل کروں گا۔ یہ دراصل حضرت ایوب علیہ السلام کا امتحان تھا، کہ دیکھیں کہ آیا وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں، یا محتاج بن کر اس کو قبول کرتے ہیں، چنانچہ آپ نے اس کو آگے بڑھ کر لے لیا، اور قبول کرلیا۔

محتاج بن کر لو

بہر حال! جب اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں تو پھر بے نیازی کیسی؟ پھر تو محتاج بن کر لو، بلکہ ان سے مانگو، اور کہو یا اللہ، یہ جو آپ نے دیا ہے، آپ کی عطا ہے، آپ کا شکر ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین

خاک برفرقِ قناعت بعد ازیں

جب سلطانِ دین مجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ میں لالچ کا مظاہرہ کروں، میں طمع کا مظاہرہ کروں، تو پھر ایسی حالت میں قناعت کے سر پر خاک ہو، پھر قناعت مطلوب نہیں۔ پھر طمع ہی مطلوب ہے، جب وہ چاہ رہے ہیں کہ ہم طمع کا اظہار کریں تو پھر قناعت نہیں چاہئے، پھر طمع ہی چاہئے۔

ایسی طمع کرنا جائز ہے:

لہٰذا یہ موقع بھی طمع کا ہے۔ اس لئے کہ نہ طلب تھی، نہ اشراف تھا، نہ انتظار تھا، لیکن اللہ جل شانہ نے اپنے فضل و کرم سے عطا فرمایا۔ یہ عطاءِ حق ہے جب عطاءِ حق ہے تو پھر طمع ہی مطلوب ہے، ''طمع'' اس وقت ناپسندیدہ ہوتی ہے، جب دنیا کی طلب کے ساتھ ہو، اور مخلوق سے ہو، لیکن اللہ میاں سے طلب کرنے میں طمع مطلوب ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جس کے پاس ایک دن ایک رات کا کھانا موجود ہو، اس کے لئے مخلوق سے سوال کرنا منع ہے، لیکن اللہ میاں سے مانگنا منع نہیں، آدمی چاہئے کتنا ہی کروڑ پتی ہو جائے، ارب پتی ہو جائے، اس کے لئے بھی اللہ میاں سے مانگنا جائز ہے کہ یا اللہ اور دیدے، یہ طمع نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی احتیاج کا اظہار ہے، ہاں دنیا والوں سے مانگنا بری بات ہے۔

اس نعمت کو محتاج بن کر لو

اس لئے حضرت والا نے ان صاحب کو لکھا کہ ''وہ جو خدمت کر رہے ہیں، یہ نعمت ہے، اور اس پر گو طبعاً انقباض ہو، مگر عقلاً انبساط ہونا چاہئے'' یعنی اگرچہ طبعی طور پر گرانی ہو رہی ہے کہ میں ان کا بہت احسان مند ہوتا جا رہا ہوں،

اور طبیعت پر بار ہو رہا ہے، لیکن عقلاً انبساط ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کی عطا ہے، ارے وہ دینے والا شخص تو ایک آلہ ہے، حقیقت میں دینے والا تو کوئی اور ہے، وہ تم کو دینا چاہتا ہے، البتہ ان صاحب کو واسطہ بنا دیا ہے، تمہاری طرف سے طلب نہیں تھی، تمہارے دل میں اشراف اور انتظار نہیں تھا۔ اس کے باوجود تمہیں دے رہے ہیں، تو یہ اس کی نعمت ہے۔

چیزے کہ بے طلب رسد آں دادۂ خداست
اورا تو رد مکن کہ فرستادۂ خداست

لہٰذا اس نعمت کو رد مت کرو، بلکہ اس نعمت کو چومتے ہوئے لے لو، اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر لو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حال:

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی ہدیہ پیش کرتا، خاص طور پر ایسا شخص جس کی مالی حیثیت زیادہ نہ ہوتی، لیکن اس نے اپنی بساط کے مطابق مثلاً ۸ آنے بطور ہدیہ کے دیدئے، یا ایک روپیہ دیدیا تو والد صاحب اس کو بڑی قدر سے لیتے، محسوس ہوتا تھا کہ آپ اس ہدیہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور اس پر خوشی کا اظہار بھی فرماتے، یہ اور بات ہے کہ بعد میں اس کی مکافات اور بدلہ بھی دیتے، لیکن اس کو بڑی قدر و منزلت سے لیتے۔

سب سے زیادہ طیب اور پاکیزہ مال

ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ اس معمولی سے ہدیہ کی اتنی قدر فرماتے ہیں؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ انسان کے جتنے ذرائع آمدنی

ہیں، ان سب ذرائع میں سے اس سے زیادہ طیب اور پاکیزہ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں، جتنا ایک مسلمان کا ہدیہ محبت ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اور جتنے ذرائع آمدنی ہیں، مثلاً تجارت ہے، زراعت ہے، ملازمت ہے، ان سب میں یہ شبہ ہے کہ پتہ نہیں ہم نے اس کا صحیح حق ادا کیا تھا، یا نہیں کیا تھا؟ وہ مال ہمارے لئے پوری طرح حلال ہوا؟ یا نہیں ہوا؟ مثلاً مدرسہ میں ہم نے اسباق پڑھائے، اور اس کی تنخواہ لی، لیکن کیا پتہ کہ جو فرائض مدرسہ کی طرف سے ہمارے ذمے تھے، اور وہ فرائض ادا کئے یا نہیں؟ اور جتنا وقت دینا چاہئے تھا، اتنا وقت دیا؟ اس کا سو فیصد یقین ہے؟ اور اگر وقت تو دیا، لیکن جتنی محنت کے ساتھ، جس توجہ کے ساتھ، جس قابلیت کے ساتھ درس دینا چاہئے تھا۔ وہ قابلیت، وہ محنت موجود تھی؟ کیا اس کا سو فیصد یقین ہے؟ ہوسکتا ہے کہ وقت میں کمی رہ گئی ہو، ہوسکتا ہے کہ توجہ میں کمی رہ گئی ہو، ہوسکتا ہے کہ قابلیت اتنی نہ ہو، اور خواہ مخواہ پڑھانے بیٹھ گئے، یہ سارے احتمالات موجود ہیں۔ لہٰذا تنخواہ پر بھی ان شبہات کے سائے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ تنخواہ میرے لئے حلال اور طیب ہے یا نہیں؟

تجارت کی آمدنی میں بھی شبہ:

یا مثلاً تجارت کے ذریعہ جو پیسے کمائے، کیا وہ پیسے حلال ہیں؟ مفتی صاحب سے فتویٰ لوگے تو وہ کہیں گے کہ یہ پیسے حلال ہیں، لیکن کیا پتہ کہ تجارت کے دوران کس وقت کس حکم شرعی کی خلاف ورزی ہوگئی ہو، جس کی وجہ سے اس کا اثر اس آمدنی پر پڑ گیا ہو۔ لہٰذا ہر جگہ یہ شبہات موجود ہیں۔ لیکن ایک مسلمان محبت اور خلوص کے ساتھ آپ کے پاس کوئی ہدیہ لے کر آیا، اور اس نے آ کر پیش کیا، اور اس کا مقصد اللہ کی وجہ سے محبت کے علاوہ کچھ اور نہیں، اخلاص کے ساتھ اس

نے ہدیہ دیا، وہ ہدیہ تو ایسا ہے جیسے آسمان سے ابھی کوثر سے دھل کر آ رہا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کے دل میں ڈالا ہے، دینے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں، واسطہ بنا دیں، جب ان کی طرف سے آ رہا ہے تو اس کے حلال طیب ہونے میں کوئی شائبہ نہیں، اس لئے کہ یہ کسی خدمت کے معاوضہ میں تو نہیں دیا جا رہا ہے۔ نہ کسی اور چیز کے معاوضہ میں ہے، جس کی وجہ سے یہ اندیشہ ہو معلوم نہیں کہ یہ معاوضہ درست ہوا، یا نہیں؟ بلکہ یہ تو ان کی خالص عطا ہے۔ جو حلال وطیب ہے۔

غریب کے ہدیہ میں اخلاص ہوتا ہے:

فرمایا کرتے تھے کہ خاص طور پر مجھے ان غریب لوگوں کے ہدیہ سے بہت خوش ہوتی ہے، اس لئے کہ ان کے دینے میں اخلاص کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہوتا، اس لئے اگر کسی غریب نے ہدیہ کے طور پر ایک آنہ دیا تو وہ میرے لئے ہزار روپے سے بہتر ہے، اس لئے کہ وہ اخلاص کے ساتھ دے رہا ہے، دولت مند اور مالدار لوگ دکھاوے کے طور پر بھی ہدیہ دے سکتے ہیں، اور دوسرے مقاصد بھی ان کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن غریب کے ہدیہ میں یہ چیز نہیں، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

وہ ہدیہ ہو، رشوت نہ ہو:

البتہ یہ سمجھ لیں کہ وہ ہدیہ واقعتہً ہدیہ ہی ہو، رشوت نہ ہو، آج کل ہمارے معاشرے میں ہدیہ کے نام سے رشوت کا بہت رواج ہو چکا ہے، نام ہدیہ ہے کہ یہ آپ کے لئے تحفہ ہے، جبکہ حقیقت میں وہ آگ کا انگارہ ہے، جس ہدیہ میں رشوت کا شائبہ ہو، اس سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں۔ ایسے ہدیہ سے

بھاگو۔ اسی لئے فرمایا کہ قاضی ان لوگوں کا ہدیہ قبول نہ کرے، جن کے مقدمات اس کے پاس آتے ہوں، اگرچہ فقہی مسئلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ شخص پہلے سے ہدیہ دیا کرتا تھا تو اس کا ھدیہ قبول کرنا جائز ہے، اور اگر قاضی بننے کے بعد دینا شروع کیا تو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں۔ لیکن محتاط حضرات نے فرمایا کہ اس چکر میں نہیں پڑنا چاہئے، بس قاضی ہدیہ قبول ہی نہ کرے، اس لئے کہ اندیشہ ہے کہ وہ رشوت ہوگی۔

تقریبات میں دیا جانے والا ہدیہ

اسی طرح ایسا ہدیہ جو سماج اور معاشرے کے دباؤ سے دیا جائے، وہ اگرچہ رشوت نہ سہی، لیکن زبردستی کا ہدیہ ہے، مثلاً شادی کے موقع پر تحفہ دینا ضروری سمجھ لیا گیا ہے، چاہے دل نہیں چاہ رہا ہو، کیونکہ اگر تحفہ نہیں دیں گے، تو معاشرے میں ناک کٹ جائے گی، اس وجہ سے دینا ضروری ہے، اب اس ناک کٹنے سے بچنے کے لئے وہ تحفہ دیا جارہا ہے، لہٰذا نہ دینے والے کے لئے برکت، اور نہ لینے والے کے لئے برکت، نہ دینے والے کے لئے جائز، اور نہ لینے والے کے لئے جائز، کیونکہ کسی مسلمان کا مال طیب نفس اور خوش دلی کے بغیر حلال نہیں، ہاں! جو ہدیہ اللہ کے لئے کسی مسلمان کو دیا جائے اور تَھَادَوْتَحابُّوْا والی حدیث پر عمل کرتے ہوئے دیا جائے تو اس ہدیہ میں بڑی برکت ہے۔

بندوں کا شکر بھی ادا کرو

آخر میں ان صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ ’’اوّلاً اللہ تعالیٰ جو منعم حقیقی ہیں‘‘ ان کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور ثانیاً ان صاحب کا کہ منعم مجازی

ہیں۔ یعنی جنہوں نے وہ ہدیہ دیا۔ وہ حقیقتاً تو دینے والے نہیں ہیں، دینے والے تو اللہ تعالیٰ تھے۔ لیکن مجازی طور پر، یا ظاہری طور پر انہی کے ذریعہ وہ ہدیہ ملا، لہٰذا وہ واسطہ نعمت ہیں، یعنی وہ اس نعمت کا واسطہ بن گئے، اس لئے ان کا بھی شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور شکر حق تعالیٰ کا تو اطاعت ہے، اور ان صاحب کا شکر ان کے لئے دعا کرنا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر تو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بغیر طلب کے عطا فرمایا تو اس کا حق یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اور جو ظاہری دینے والا ہے، اس کا حق یہ ہے کہ اس کے حق میں دعا کی جائے۔ لہٰذا زبانی شکر بھی ادا کرو، اور کہو کہ آپ کا شکریہ: جَزَاکَ اللّٰہُ خَیْرَ الْجَزَاء اور بہترین شکریہ "جزاک اللہ" کہنا ہے۔ کیونکہ اس میں شکر بھی ادا ہوگیا، اور اس کے حق میں دعا بھی ہوگئی۔

ہدیہ حلال آمدنی کا ہو:

لیکن ہدیہ قبول کرنے کی بہت سی شرائط اور آداب ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ہدیہ حلال آمدنی سے دیا گیا ہو۔ حرام آمدنی کا ہدیہ قبول کرنا اور اس کو استعمال کرنا جائز نہیں، اگر کبھی حرام آمدنی کا ہدیہ آجائے تو بغیر نیت ثواب کے کسی فقیر کو دیدو۔ البتہ یہ اس وقت ہے جب کہ اس شخص کی غالب آمدنی، اکثر آمدنی حرام ہو، لیکن اگر غالب آمدنی حلال ہو، اور کچھ آمدنی حرام ہو تو اس کا ہدیہ قبول کرنے کی گنجائش ہے، لیکن جہاں غالب آمدنی حرام ہو تو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں، اگر لے لیا تو صدقہ کرنا واجب ہے۔

ہدیہ رشوت نہ ہو:

دوسری شرط یہ ہے کہ جہاں یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہدیہ اخلاص کے ساتھ نہیں

آ رہا ہے، بلکہ اس میں دینے والے کے کس مقصد کا شائبہ ہے، مثلاً رشوت کا شائبہ ہے تو ایسا ہدیہ قبول کرنا کوئی ضروری نہیں، احتیاط یہ ہے کہ اس کو قبول نہ کرے۔ لیکن اگر رشوت ہونے کا یقین ہو تو پھر تو قبول کرنا جائز بھی نہیں۔

اپنی حیثیت سے زائد ہدیہ دینا:

ہدیہ کا ایک ادب یہ ہے کہ جہاں ھدیہ دینے میں اخلاص کے اندر تو کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن یہ پتہ ہے کہ یہ ہدیہ دینے والا ہدیہ دینے کے بعد تکلیف میں مبتلا ہو جائے گا، مثلاً ایک غریب آدمی جس کی ماہانہ آمدنی تین ہزار روپے ہے، اب وہ شخص تین ہزار روپے بطور ہدیہ کے لے آیا تو اس میں اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ شخص اگرچہ اخلاص کے ساتھ ہدیہ لایا ہے، لیکن بعد میں تکلیف میں مبتلا ہوگا تو اس شخص کو تکلیف سے بچانے کی خاطر ہدیہ قبول کرنے سے انکار کر سکتے ہیں۔

ہدیہ واپس کرنا:

ایک ادب یہ ہے کہ بعض اوقات ہدیہ دینے والے کی اخلاقی تربیت مقصود ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ہدیہ واپس کر دیا جاتا ہے، مثلاً حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ علیہ کا اصول یہ تھا کہ اگر کسی شخص سے پہلے سے کوئی واقفیت نہیں، اس سے ہدیہ قبول نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ کس غرض سے لایا ہے۔ اسی طرح ہدیہ دینے والے کو چاہئے کہ ہدیہ اس طرح دے کہ لینے والے پر بار نہ ہو۔ مثلاً ہدیہ میں کوئی بڑی چیز دیدی تو اب لینے والے پر بار ہوگا کہ اس نے اتنا بڑا ہدیہ دیدیا، یہ بھی مناسب نہیں۔

خلاصہ:

بہرحال! یہ سب ہدیہ کے آداب ہیں، اگران سب آداب اور شرائط کے ساتھ کوئی ہدیہ اللہ تعالیٰ کی طرف آجائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر قبول کرلے، اور اللہ کا شکرادا کرے، اور دینے والے کا بھی شکرادا کرے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں شکر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلِلّٰہ ربّ العالمین

بسم الله الرحمن الرحيم

ألا بذكر الله تطمئن القلوب

صدق الله العظيم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

راحت حاصل کرنے کا طریقہ

مجلس نمبر 103

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دار العلوم کراچی۔
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	103

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

راحت حاصل کرنے کا طریقہ

مجلس نمبر 103

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلاة والسلام علیٰ رسوله الکریم، وعلی آله وأصحابه اجمعین۔ امابعد:

تمہید

پچھلے دنوں میں تین باتوں کا بیان الحمدللہ بقدر ضرورت ہوگیا، ایک خوف ورجا کا، دوسرے صبر کا، تیسرے شکر کا...... اب شاید یہ آخری دن ہو، آگے حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے جو بیان فرمایا ہے وہ تفویض اور توکل سے متعلق ہے اور یہ بھی انہی صفات باطنہ میں سے ہے جن کی تحصیل ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے، مسلمان کے دل میں تفویض بھی اللہ تعالیٰ کی طرف کامل ہونی چاہئے اور توکل بھی کامل ہونا چاہئے۔

تفویض اور توکل کے معنی:

''تفویض'' کے معنی ہیں کہ اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا کہ جو کچھ اللہ جل شانہ میرے حق میں فیصلہ فرمائیں گے، میں اس پر راضی رہوں گا، اور وہ فیصلہ ہی برحق ہوگا، چاہے مجھے اس سے تکلیف پہنچ رہی ہو۔ چاہے مجھے اس سے رنج ہو

رہا ہو، یہ مطلب ہے ''تفویض'' کا، اور توکل کے معنی یہ ہیں کہ اللہ جل شانہ پر بھروسہ رکھنا کہ جو کچھ اس کائنات میں ہوگا، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت سے ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ہوگا، اور میرے حق میں بالآخر بہتر ہوگا۔ یہ مطلب ہے ''توکل'' کا، یہ دونوں چیزیں حاصل کرنے کی ہیں، دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے، زیادہ فرق نہیں ہے۔

''تفویض'' حاصل کرنے کا طریقہ:

''تفویض'' کو حاصل کرنے کا طریقہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ کے اندر بیان فرمارہے ہیں کہ:

> ''خدا کی تجویز میں اپنی تجویز کو فنا کردو، ابتداء میں تو اہلِ اللہ کو یہ حالت تکلف کے ساتھ حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کو سوچ سوچ کر اپنے ارادے اور تجویز کو فنا کرنا پڑتا ہے، پھر یہ حالت ان کے لئے امر طبعی بن جاتی ہے۔''

ایک اور ملفوظ میں ارشاد فرمایا کہ:

> ''اپنے ارادے کو خدا کے ارادے کا تابع کردے، جو کچھ ہوگا، ہم اس پر راضی ہیں، اس پر عمل شروع کردیجئے اور برابر کرتے رہیئے، انشاء اللہ ایک دن ملکۂ راسخہ پیدا ہوجائے گا، اور اسی سے راحت حاصل ہوگی، بدون اس کے راحت نہیں مل سکتی، اور یہ کچھ مشکل نہیں، کیونکہ کثرت تکرار سے سب کام آسان ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے جو لوگ آج کل پختہ

حافظ ہیں، وہ پہلے دن سے پختہ نہیں ہوئے، بلکہ کثرت تکرار سے پختہ بنے ہیں، یا جو آج خوشنویس ہے، وہ کثرت مشق سے ہی خوش نویس ہوا ہے، اسی طرح کثرت تکرار سے ''تفویض'' حاصل ہو جائے گا، یہی عین عبدیت ہے، اور بندگی ہے، اور غلام کو ایسا ہی ہونا چاہئے''

(انفاس عیسیٰ، ص ۲۱۷)

یعنی یہ مقام کہ انسان اپنا ہر معاملہ اللہ کے حوالے کر دے، اللہ کے سپرد کر دے، اور اس پر بھروسہ رکھے کہ جو کچھ وہ کریں گے، وہی برحق ہوگا اور حکمت اور مصلحت کے مطابق ہوگا، یہ مقام مشق سے حاصل ہوتا ہے۔

تدبیر کرنا ''تفویض'' کے منافی نہیں:

پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ ''تفویض'' یعنی اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دینا، یہ ''تدبیر'' کے منافی نہیں ہے، بلکہ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ تدبیر کرنے کے بعد پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے کہ میرے بس میں جو کچھ تھا، وہ میں نے کر لیا، میرے بس میں اتنا ہی تھا، اس کے بعد اب اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائیں گے، وہ برحق ہوگا اور حکمت کے مطابق ہوگا، میں اس فیصلے پر راضی ہوں...... مثلاً ایک بیماری آگئی، تو آپ نے پہلے تدبیر کی، وہ یہ کہ اپنے خیال میں جو بہتر معالج ہو سکتا تھا، اس سے رجوع کیا، اس معالج نے جو دوا بتائی، بازار سے جا کر وہ دوا خریدی، اور جس وقت میں کھانے کے لئے کہا تھا، اس کے مطابق دوا کھائی، یہ ساری تدبیر کر لی، تدبیر کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے کہ یا اللہ، میرے بس میں یہی تھا کہ معالج کے پاس چلا جاؤں، اور پھر اس کے کہنے کے مطابق بازار

سے دوا لاکر کھانا شروع کردوں، اور پھر آپ سے دعا کروں کہ اے اللہ! مجھے شفا عطا فرما دیجئے، اب میں نے اپنے آپ کو آپ کے سپرد کردیا، اب آپ جو کچھ فیصلہ کریں گے، میں اس پر راضی ہوں وہ فیصلہ آپ کی حکمت کے عین مطابق ہوگا۔

اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِO

(سورۃ المومن، آیت ۴۴)

یعنی میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں، اللہ کے سپرد کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خود دیکھنے والا ہے، یہ ہے تفویض، جو تدبیر کے منافی نہیں۔

تدبیر کے بغیر ''تفویض'' کرنا غلط ہے:

بعض لوگ وہ ہیں جو ''تدبیر'' کے بغیر ''تفویض'' پر عمل کرنا چاہتے ہیں، یاد رکھئے، یہ شریعت کا تقاضہ نہیں۔ مثلاً بیماری آگئی، اب وہ شخص کہتا ہے کہ میں علاج نہیں کرتا، اور میں نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کردیا، اب نہ کسی معالج کے پاس جاتا ہے، نہ علاج کرتا ہے، نہ دوا کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں نے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کردیا، یہ ''تفویض'' مطلوب نہیں، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسباب کو اختیار کرو...... یا مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میں نہ تو ملازمت کروں گا، نہ زراعت کروں گا، بس میں تو گھر میں بیٹھا ہوں اور میں تو اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں، یہ تفویض مطلوب نہیں، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ رزق حلال کی تلاش میں نکلو، اور اس کے لئے جو اسباب اور تدابیر ہوسکتی ہیں، ان کو اختیار کرو، اور کوشش کرو، اس کے بعد پھر اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو کہ یا اللہ، میرے کرنے کا جو کام تھا، وہ میں نے کرلیا، اب آگے کا معاملہ آپ کے حوالے

کرتا ہوں، آپ جو فیصلہ کریں گے میں اسی پر راضی ہوں۔ یہ مطلب ہے، ''تفویض'' اور ''توکل'' کا، لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تدبیر کے بغیر توکل کرلو، وہ لوگ اس کا صحیح مطلب نہیں سمجھتے۔

اونٹ کی پنڈلی باندھو، پھر توکل کرو:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ یا رسول اللہ! میں سفر میں جاتا ہوں، اور میں اونٹنی پر سفر کرتا ہوں، سفر کے دوران کہیں رکنے کی ضرورت پیش آتی ہے، مثلاً مجھے نماز پڑھنی ہے، چنانچہ میں اس اونٹنی سے اتر کر نماز پڑھتا ہوں، اب کیا اس وقت میں اس اونٹنی کو باندھ دیا کروں، تاکہ یہ کہیں نماز پڑھنے کے دوران بھاگ نہ جائے، یا میں اللہ تعالیٰ پر توکل کروں کہ جب میں اللہ کی عبادت کر رہا ہوں تو وہی میری اونٹنی کی حفاظت کرے گا اور دیکھ بھال بھی کرے گا اور اس کو بھاگنے نہیں دے گا...... جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکیمانہ جملہ ارشاد فرمایا:

اِعْقِلْ سَاقَهَا وَ تَوَكَّلْ

پہلے اس اونٹ کی پنڈلی باندھو، اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔ یعنی تمہارے اختیار میں یہ ہے کہ تم اس کو رسی سے باندھ دو، اور باندھنے کے بعد پھر اللہ پر بھروسہ کرو کہ میرے کرنے کا جو کام تھا وہ میں نے کرلیا، اب دل میں جو مختلف قسم کے خیالات آرہے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ میرے نماز پڑھنے کے دوران وہ اونٹ کہیں رسی توڑ کر نہ بھاگ جائے، ہوسکتا ہے کہ کوئی چور یا ڈاکو اس کی رسی کاٹ کر اس کو لے جائے، ایسے خیالات کو دل میں جگہ نہ دو، اور یہ کہو کہ میرے کرنے کا جو کام تھا وہ میں نے کرلیا، اب میں اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت

فرمائیں گے، اور اگر بالفرض یہ اونٹنی چلی بھی گئی تو میں اس پر بھی راضی ہوں۔

برتوکل پایہ اشتر ببند:

اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

برتوکل پایۂ اشتر ببند

کہ توکل کے اوپر اونٹ کا پاؤں باندھ دو۔ لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسباب کو اختیار نہ کرو، اور تدبیریں چھوڑ دو۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو، وہ لوگ توکل کی صحیح تشریح نہیں کرتے اور خود بھی مغالطے میں مبتلا ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی مغالطے میں مبتلا کرتے ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ وہ سارے اسباب اختیار کرنے کے بعد جو اپنے بس میں ہیں اور تدبیر کر لینے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جائے۔

اسباب میں تاثیر اللہ تعالیٰ ڈالتے ہیں:

یہ بات یاد رکھو کہ توکل کی حقیقت یہ ہے کہ تدبیر کرنے کے بعد اور اسباب اختیار کرنے کے بعد اس بات کا اعتقاد کامل دل میں بیٹھا ہوا ہو کہ یہ اسباب اپنی ذات میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اور ان اسباب میں تاثیر اللہ جل شانہ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی، وہ اگر چاہیں گے تو ہوگی، نہیں چاہیں گے، تو نہیں ہوگی...... مثلاً میں اس بیماری کی دوا بیشک لے رہا ہوں، لیکن جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں آجائے گا، اس وقت تک یہ دوا اثر نہیں کرے گی، اور ان کی اذن اور مشیت کے بغیر یہ دوا فائدہ مند نہیں ہوگی، یہ اعتقاد دل میں مکمل ہونا چاہئے، اس کا نام توکل ہے کہ بھروسہ اللہ پر ہے، اور اس دوا پر بھروسہ نہیں، البتہ اسباب اس لئے اختیار کر رہا ہوں کہ مجھے اس کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے،

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو عالم اسباب بنایا ہے، اس لئے یہ اسباب اختیار کر رہا ہوں۔

ایک مؤمن اور کافر میں فرق:

بس یہی فرق ہے ایک کافر میں اور ایک مومن میں، اور ایک غافل میں اور ایک سالک میں، کافر اور غافل کی نگاہ مکمل طور پر اسباب پر ہوتی ہے، مثلاً یہ دوا اچھی ہے، اور یہ دوا خراب ہے، اس دوا سے فائدہ ہوتا ہے اور اس دوا سے فائدہ نہیں ہوتا، یہ تدبیر کارآمد ہے، یہ تدبیر کارآمد نہیں، سارا بھروسہ ان تدبیروں پر اور اسباب پر ہوتا ہے، جبکہ ایک مومن اور ایک سالک اسباب تو اختیار کرتا ہے، لیکن بھروسہ ان اسباب پر نہیں کرتا، اس لئے کہا جاتا ہے کہ ''عارف'' جامع اضداد ہوتا ہے کہ اسباب اختیار بھی کرتا ہے، لیکن اختیار کرنے کے بعد ان پر بھروسہ بھی نہیں کرتا، بلکہ بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ بات سمجھے ہوئے ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک وقت میں فائدہ مند ہو جاتی ہے، اور دوسرے وقت میں نقصان دہ ہو جاتی ہے۔

فائدہ کروں یا نقصان:

وہی دوا ہے، وہی مریض ہے، وہی مرض ہے، جب پہلے اس مریض کو اس مرض میں وہ دوا دی تھی، اس وقت اس کو فائدہ ہو گیا تھا، جب بعد میں کچھ عرصہ کے بعد وہی بیماری اسی مریض کو پیدا ہوئی، وہی دوا دی گئی، وہ دوا الٹی پڑ گئی، اور ئدہ نہیں ہوا۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معالج ایک ڈاکٹر صاحب تھے، ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی صاحب بوڑھے ہو گئے تھے،

۷۵ سال تقریباً عمر تھی، وہ کہا کرتے تھے کہ میری ساری زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ جب دوا مریض کے جسم میں داخل ہوتی ہے تو پہلے وہ اللہ تعالیٰ سے پوچھتی کہ کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ فائدہ کروں؟ یا نقصان کر جاؤں؟ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جو حکم مل جاتا ہے، اس کے مطابق وہ عمل کر گزرتی ہے، بہرحال! کسی تدبیر پر کوئی بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے، تدبیر کرنے کا چونکہ حکم ہے، اس لئے تدبیر کر رہے ہیں، اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عالم اسباب بنایا ہے، اس لئے اسباب اختیار کر رہے ہیں، لیکن بھروسہ اسی ذات پر ہے۔

ہمارا ذہن اسباب میں الجھا ہوا ہے:

مومن کا ان تمام باتوں پر اعتقاد تو ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والا ہے، اللہ کے سوا کوئی بھی تاثیر پیدا نہیں کرسکتا، لیکن اس طریق میں آنے کے بعد وہ اعتقاد انسان کا حال اور مقام بن جاتا ہے، یعنی ایک تو یہ ہے کہ آپ اس پر ایمان بھی لائے، اور دل میں اعتقاد بھی ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ حکم سے ہوتا ہے، اسی کی حکمت جاری ہے، لیکن اس اعتقاد کے ساتھ جب کاروبار زندگی میں داخل ہوتا ہے تو وہ اعتقاد ذہن کے کسی کونے میں پڑا ہوتا ہے، اس اعتقاد کا دھیان اور استحضار نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعتقاد ہونے کے باوجود ذہن اسباب ہی میں الجھا رہتا ہے، ان اسباب سے آگے کی وہ سوچتا ہی نہیں۔

سالک کو یہ اعتقاد کامل ہو جاتا ہے:

لیکن جس سالک کی تربیت اللہ والوں کے ذریعہ ہو جاتی ہے، تو پھر وہ

اعتقاد جو اس کے دماغ کے کسی کونے میں پڑا ہوا تھا، وہ اعتقاد اس سالک کی رگ و پے میں سرائیت کر جاتا ہے، لہٰذا جب کبھی وہ کوئی کام کرے گا، اس وقت اس اعتقاد کا دھیان اس کے دل و دماغ میں ہوگا، اور اس دھیان اور استحضار کے ساتھ اس کام کو کرے گا، یہ فرق ہوتا ہے ایک سالک اور غیر سالک کے درمیان کہ اعتقاد کے درجے میں اور چیز ہے اور عمل کے درجے میں اور چیز ہے، اللہ والوں کے پاس جاکر ان کی صحبت سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہی ہے، دیکھئے کہ اعتقاد تو اس کو پہلے سے حاصل تھا، لیکن وہ دماغ کے کسی کونے میں پڑا ہوا تھا، اور اب اللہ والوں کی صحبت کے نتیجے میں اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا، اب دماغ جانتا ہے کہ یہ اسباب سب بے حقیقت چیز ہیں، اللہ تعالیٰ ہی ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ تاثیر پیدا کریں گے تو فائدہ ہوگا، تاثیر پیدا نہیں کریں گے تو فائدہ نہیں ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ جو بھی فیصلہ تاثیر یا عدم تاثیر کا کریں گے وہ فیصلہ برحق ہوگا، یہ سب باتیں اس سالک کا ''حال'' بن جاتی ہیں، اور اس کے رگ و پے میں سرائیت کر جاتی ہیں۔

اسباب میں ناکامی توکل کا موقع نہیں:

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ''توکل'' ہونے یا نہ ہونے کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب کسی مقصد کے حاصل کرنے میں ظاہری اسباب ناکام ہو رہے ہوں، مثلاً ایک آدمی بیمار ہے، وہ اپنا علاج کرا رہا ہے، دوا کھا رہا ہے، لیکن فائدہ نہیں ہو رہا ہے، ایسے موقع پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ''توکل'' کے امتحان کا موقع ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ توکل کے امتحان کا موقع نہیں ہے، اس لئے کہ جن اسباب کو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان اسباب سے فائدہ

نہیں ہورہا ہے، تو اس وقت آپ لامحالہ یہی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو ان اسباب سے فائدہ پہنچانا منظور نہیں ہے، اس لئے فائدہ نہیں ہورہا ہے، یہاں توتوکل کے امتحان کا موقع نہیں ہے۔ کیونکہ اس موقع پر خودبخود دل و دماغ میں توکل پیدا ہو جائے گا، اس لئے کہ ظاہری اسباب خراب ہورہے ہیں، اور ان سے فائدہ نہیں ہو رہا ہے تو اب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف ذہن جائے گا۔

اسباب موجود ہونے کے وقت توکل کرو:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''توکل کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب کہ اسباب پوری طرح سو فیصد کارآمد ہورہے ہیں، اور یہ یقین ہے کہ بظاہر ان اسباب سے یہ نتیجہ نکل آئے گا، جیسے مثلاً آپ کو بھوک لگی ہے، اور گھر میں کھانا پکا ہوا تیار ہے، آپ نے گھر والوں سے کہا کہ کھانا نکالدو، تاکہ کھانا کھائیں، گھر والوں نے دسترخوان پر کھانا لگالیا، آپ ہاتھ دھوکر کھانا کھانے بیٹھ گئے، اب کیا کسر رہ گئی کھانے میں؟ کچھ نہیں، بس ہاتھ بڑھائیں گے اور کھانا کھالیں گے اور بھوک دور ہو جائے گی، کیونکہ بھوک دور کرنے کے سارے اسباب سو فیصد مہیا ہیں اور اس بات کا آپ کو پورا یقین ہے کہ اب ہماری بھوک مٹنے کا وقت آ گیا ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ توکل کے امتحان کا موقع ہے کہ آیا اس وقت بھوک مٹنے کے لئے نگاہ اس کھانے کی طرف جارہی ہے، یا کھانے کے پیدا کرنے والے کی طرف جارہی ہے؟ یہ ہے توکل کا امتحان...... اب اگر اس وقت نگاہ اللہ تعالیٰ کی طرف جارہی ہے اور آدمی یہ سوچ رہا ہے کہ اگرچہ یہ سارے اسباب بھوک مٹانے کے موجود ہیں، لیکن جب تک ان کا حکم نہیں ہوگا، اس وقت تک یہ کھانا نہ حلق سے اترے گا، نہ یہ کھانا میری بھوک دور کرے گا، اور نہ یہ کھانا

میری صحت کا سبب بنے گا۔

سب کام اللہ کی مشیت پر موقوف ہیں:

اس وقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان جانا کہ اگر چہ سب اسباب مہیا ہیں، کھانا سامنے چنا ہوا ہے، ہاتھ بھی موجود ہیں، صحت مند ہوں، جب چاہوں گا، نوالہ اٹھا کر کھالوں گا، لیکن اللہ تعالیٰ اگر نہ چاہیں تو ان تمام اسباب کے موجود ہوتے ہوئے بھی میں کھانا نہ کھا سکوں گا، مثلاً یہ کہ میرا ہاتھ شل ہو جائے، اور میں وہ کھانا نہ کھا سکوں، یا کھانے میں کتا آ کر منہ ڈال دے، اور میں یہ کھانا نہ کھا سکوں، یا کوئی اور آفت آ جائے، جس کی وجہ سے مجھے ہڑ، بڑا کر بھاگنا پڑے، اور میں یہ کھانا نہ کھا سکوں، اور اگر کھا بھی لوں، تب بھی اس کھانیکا حلق سے اتر کر میرے لئے جز و بدن بنانا اور میرے لئے صحت کا سبب بننا، یہ صرف اللہ کا کام ہے، ورنہ کیا معلوم کہ کھانا کھا کر ہیضہ میں مبتلا ہو جاؤں، اور یا بدہضمی ہو جائے، یا فوڈ پائزننگ ہو جائے، یہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ میرے بھوک مٹنے کا اور بھوک دور ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اور بدن کو قوت حاصل ہونے کا وقت آ گیا؟ نہیں، بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، اس کی مشیت ہوگی تو یہ سب کچھ ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا۔

بسم اللہ پڑھنے کا حکم:

لہٰذا ''توکل'' کا امتحان اس وقت ہے جب سارے اسباب پوری طرح مہیا ہوں، کہ اس وقت نگاہ کہاں جا رہی ہے؟ اللہ والوں کی صحبت سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے کہ اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف نگاہ جانے لگتی ہے، اور یہ جو

ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب کھانا شروع کرو تو پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھو، یہ حکم درحقیقت اسی طرف دھیان کو لے جانے کے لئے ہے کہ بظاہر تم یہ سوچ رہے ہو کہ کھانا سامنے موجود ہے اور میں اس کو کھالوں گا، اور اس سے میری بھوک مٹ جائے گی، لیکن یہ بات کبھی بھی دماغ میں مت لانا کہ یہ کھانے کا وجود تمہاری قوت بازو کا کرشمہ ہے۔ کیونکہ اگر یہ کھانا کسی دینے والے کی دین نہ ہوتی تو تمہاری مجال نہیں تھی کہ اس کھانے کو مہیا کر پاتے۔

دھیان اللہ کی طرف کرلو:

دوسرے یہ خیال کبھی بھی ذہن میں نہ لانا کہ اب یہ کھانا میرے سامنے آ گیا، اب میرا مقصد حاصل ہوگیا۔ اب لازماً اس کھانے کے ذریعہ مجھے قوت حاصل ہو جائے گی، اور مجھے صحت حاصل ہو جائے گی، یاد رکھئے، جب تک ان کا حکم نہیں ہوگا، اس وقت تک کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ لہٰذا کھانا کھاؤ تو پہلے اس کا نام لو اور کہو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اس اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے، جو رحیم ہے، جس نے اپنی رحمت سے یہ کھانا دیا ہے اور اپنی رحمت ہی سے یہ کھانا کھلائے گا اور اپنی رحمت ہی سے اس کھانے کو میرے لئے مفید بنائے گا، اس دھیان کو متوجہ کرنے کے لئے بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے، یہ کوئی منتر نہیں ہے جو تم سے پڑھوایا جا رہا ہے کہ کھانے سے پہلے یہ منتر پڑھ کر پھونک مارلیا کرو، بلکہ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان لانے کے لئے پڑھوایا جا رہا ہے۔

کھانا سامنے آنے پر دعا

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ علیہ فرمایا کرتے

تھے کہ دیکھو، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا سامنے آنے پر دو دعائیں تلقین فرمائیں، جب کھانا سامنے آئے تو آپ نے یہ دعا تلقین فرمائی کہ:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ بِمَا رَزَقْتَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّی وَلَا قُوَّۃ

ابھی کھانا شروع نہیں کیا، ابھی بسم اللہ نہیں پڑھی، بلکہ ابھی آپ دستر خوان پر بیٹھے اور کھانا سامنے آ گیا تو اس وقت یہ دعا پڑھو کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ رزق میری کسی طاقت اور قوت کے بغیر عطا فرمایا، یہ رزق میری قوت بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ آپ کی عطا ہے۔

کھانا کھلانا علیحدہ نعمت ہے:

پھر جب کھانا شروع کرو تو یہ دعا پڑھو: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اور جب کھانا کھا چکے تو اب کہو:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ہ

اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہمیں یہ کھانا کھلایا، اور پلایا اور ہمیں مسلمانوں کے اندر پیدا کیا۔ میرے والد ماجد رحمہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو ''رَزَقْنَا'' پر الگ شکر ادا کیا اور ''اَطْعَمَنَا'' پر الگ شکر ادا کیا، کیونکہ ''رَزَقْنَا'' پر شکر یہ ہے کہ اے اللہ، آپ کا شکر ہے آپ نے مجھے یہ کھانا دیا، کیونکہ رزق دینا یہ ایک مستقل نعمت ہے اور دوسرے شکر یہ ہے کہ مجھے وہ کھانا کھلایا، کیونکہ یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رزق تو دیا ہوتا، لیکن کوئی ایسی بیماری ہوتی کہ ڈاکٹر نے کھانے سے منع کر دیا ہے، اب یہ صورت ہے کہ انواع واقسام کی تمام نعمتیں موجود ہیں، کھانے بھی موجود ہیں، پھل بھی موجود ہیں، میوے بھی موجود ہیں، ساری دنیا

کی نعمتیں ہیں، لیکن فرج میں موجود ہیں، اور ڈاکٹر نے کہہ رکھا ہے کہ خبردار کسی کو استعمال مت کرنا، اب ''رَزَقْنَا'' تو پایا جارہا ہے، لیکن ''اَطْعَمَنَا'' نہیں پایا جارہا ہے۔

بھوک لگنا علیحدہ نعمت ہے:

یا کھانا دستر خوان پر چن دیا گیا، اور کھانے کے لئے بیٹھے، عین اس وقت کوئی پریشانی کی خبر آگئی جس کے نتیجے میں اس کھانے کی لذت ہی نہیں آئی۔ سب کھانا پینا چھوڑ کر بھاگنا پڑا، تو اس صورت میں ''رَزَقْنَا'' تو پایا گیا، لیکن ''اَطْعَمَنَا'' نہیں پایا گیا، یا گھر میں انواع واقسام کے کھانے موجود ہیں، لیکن بھوک غائب ہے، بھوک نہیں لگتی، ''رَزَقْنَا'' تو ہے، لیکن ''اَطْعَمَنَا'' نہیں ہے، اس لئے یہ دونوں نعمتیں الگ الگ ہیں، اللہ تعالیٰ کا تمہیں رزق دینا ایک مستقل نعمت ہے اور کھلانا ایک مستقل نعمت، اس لئے یہ حکم دیا کہ جب کھانا سامنے آئے تو یہ دعا پڑھو،

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ بِمَا رَزَقْتَنِيهِ مِن غَيرِ حَوْلٍ مِنِّي وَلَا قُوَّه۔

ایک مرتبہ ضرور پڑھ لو، اور جب کھانا کھا چکو تو پھر یہ دعا پڑھو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ٥

تمہارے جسم میں خودکار مشین لگا دی:

اور آگے بڑھیے، جب آپ نے کھانا کھایا تو اس وقت لذت لینے کی

خاطر جو سامنے آیا بس کھاتے چلے گئے، جیسے افطاری کے وقت خاص طور پر ہوتا ہے کہ کبھی پکوڑا کھایا، کبھی پھل کھایا، کبھی کباب کھایا، کبھی دھی بڑے کھا لئے، جو ہاتھ آیا، کھاتے چلے گئے، کھاتے وقت آپ نے یہ نہیں سوچا کہ یہ سب کچھ پیٹ کے اندر جا کر کیا فساد مچائیں گے؟ اور اندر جا کر کیا ملغوبہ تیار ہوگا؟ اور کیا تاثیر پیدا کرے گا؟ اور پیٹ کا کیا حشر بنائے گا؟ اس کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا، بس زبان کے چٹخارے کے لئے آپ کھاتے چلے گئے......کون ہے جو اس سارے ملغوبے کو جو تم نے اندر ڈال دیا ہے، اس کو چھانٹ رہا ہے؟ کہ اس میں کونسا حصہ تمہارے جسم کے لئے فائدہ مند ہے، اس کو اندر باقی رکھوں، کس جز سے خون بناؤں؟ کونسا حصہ ناکارہ ہے؟ اس کو پیشاب اور پاخانہ کی شکل میں باہر پھینک دوں، کس سے گوشت بناؤں؟ کس جز سے تمہاری ہڈیوں کو فائدہ پہنچے، کس جز سے تمہارے گوشت کو طاقت ملے، کس سے تمہاری بینائی کو قوت حاصل ہو؟ اور کس جز سے تمہاری سماعت کو قوت ملے؟ تمہارے پیٹ کے اندر چھانٹی کا ایک کاروبار چل رہا ہے، اس غذا کا تجزیہ کر کے تمہارے جسم کے ایک ایک حصے میں پھیلایا جا رہا ہے اور تمہیں اس کا فائدہ پہنچایا جا رہا ہے، اگر یہ عمل تمہارے سپرد کر دیا جاتا کہ بھائی تم نے خود ہی کھایا، تم نے کھانے کے مزے لئے، لہٰذا اب یہ کام بھی تم ہی کرو، اور اس کے اندر چھانٹی کرو، اور یہ دیکھو کہ ان میں سے کونسے اجزاء فائدہ مند ہیں، ان کو اپنے پاس رکھو۔ اور باقی فضول اجزاء کو باہر پھینک دو۔ کیا تم میں سے کسی کے بس میں یہ عمل تھا؟ نہیں، بلکہ وہی ذات ہے جو یہ عمل کر رہی ہے، اس طرح کر رہی ہے کہ:

مانبودیم و تقاضہ ما نبود
لطفِ او نا نگفتۂ مامی شنود

نہ ہم نے کہا تھا، نہ ہمارے بس میں تھا، نہ ہم نے مطالبہ کیا تھا، لیکن وہ اپنے لطف وکرم سے یہ سب کام کر رہے ہیں کہ یہ میرا بندہ ہے، جو زبان کے چٹخارے کا خوگر ہے، اس کو جو ذائقہ پسند ہے، چلو کھانے دو، ہم سب اندر جا کر ٹھیک کر دیں گے۔ اب اندر جانے کے بعد اس غذا کو اس کے مناسب خانوں میں بٹھایا جاتا ہے کہ یہ حصہ جگر میں جائے گا، یہ گردے میں جائے گا۔ اس سے خون بنے گا، سر کے بالوں سے لیکر پاؤں کے ناخن تک جسم کے ایک ایک حصے کو وہ غذا پہنچ رہی ہے۔

یہ شکر ادا کرنے کا موقع ہے:

جب سارے مراحل طے ہوگئے، اور اب آپ بیت الخلاء چلے گئے، اب پیٹ کے اندر جو فضلہ اور بیکار چیزیں تھیں، اللہ تعالیٰ نے سب باہر نکلوا دیں۔ اس موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذَاقَنِیْ لَذَّتَه وَاَبْقٰی فِیَّ قُوَّتَهٗ وَدَفَعَ عَنِّیْ اَذَاهُ۔

ایک پیغمبر ہی ایسے کلمات ادا کر سکتے ہیں کہ شکر اس اللہ کا جس نے مجھے اس کھانے کی لذت چکھادی، اور اس کھانے میں جتنے قوت والے اجزاء تھے، ان کو میرے جسم کے اندر باقی رکھا، اور اس غذا کے اندر جو تکلیف دہ اور گندی چیزیں تھیں، ان کو باہر پھینک دیا۔

انسان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں:

یہ سب حقائق ہیں، کون ان حقائق کا انکار کرسکتا ہے، لیکن انسان کی آنکھوں پر پردے پڑے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ان حقائق کی طرف دھیان نہیں جاتا، اس وجہ سے انسان اللہ پر بھروسہ کرنے کے بجائے اسباب کے چکر میں پڑا رہتا ہے، ہر وقت اسباب کا دھیان رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا، اللہ کی حکمت کا تصور اور دھیان نہیں بنتا، اور جب وہ انسان اللہ والوں کی صحبت میں جاتا ہے تو وہ اعتقاد جو اس کے ذہن اور دماغ کے کسی کونے میں پڑا ہوا تھا، وہ اعتقاد ان کی صحبت سے زندہ اور پائندہ ہو جاتا ہے، اور ہر وقت وہ اعتقاد سامنے موجود رہتا ہے، وہ ہر چیز کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ سب کچھ نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ آ جائے۔

میں کس معطی کا آلہ کار ہوں:

میں اس وقت بول رہا ہوں، لیکن اللہ والوں کی صحبت کی برکت سے عین بولتے وقت بھی دماغ میں دھیان رہتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں، زبان سے جو کلمات نکال رہا ہوں، اس کی کوئی حقیقت نہیں، نہ میرے اندر یہ طاقت ہے کہ میں بول سکوں، نہ میرے پاس علم ہے جو ان باتوں کا ادراک کر سکے۔ میری حیثیت تو ایسی ہے جیسے لکھنے والے کے ہاتھ میں قلم، اب دیکھنے میں بظاہر وہ قلم لکھ رہا ہے، لیکن اس قلم کی کوئی حقیقت نہیں، وہ تو بے جان ہے۔ نہ اس میں شعور ہے، نہ اس میں عقل ہے۔ نہ اس میں طاقت ہے، وہ ہاتھ لکھوانے والا اس قلم سے لکھوا رہا ہے...... ایسے ہی میرے بولنے کا معاملہ ہے، نہ میری طاقت، نہ میری قوت، نہ

میرے پاس علم، اور نہ میرے پاس ادراک، بلکہ میں کسی معطیٔ حقیقی کا آلہ کار بنا ہوں، وہ میرے دل میں باتیں ڈال رہے ہیں، اور میری زبان سے کہلوا رہے ہیں، میں تو ایک پرزہ ہوں، میری کوئی حقیقت نہیں، میری کوئی حیثیت نہیں، اللہ والوں کی صحبت میں جا کر یہ تصور بندھنے لگتا ہے اور ہر کام میں یہ تصور رہتا ہے، اور اسی کا نام ہے ''توکل'' اور اسی کا نام اللہ پر بھروسہ ہے، بزرگوں کی صحبت سے یہی چیز حاصل ہوتی ہے۔

اپنے ارادے کو فنا کرو

اگر لوگوں سے یہ کہا جائے کہ بھائی ہر کام اللہ کے حکم سے ہوتا ہے، اس کا جواب یہی دیا جاتا ہے کہ ہم اس بات کو تو پہلے ہی سے مانتے ہیں، ہمارا تو اس پر اعتقاد ہے...... تو بیشک یہ اعتقاد موجود ہے، لیکن یہ اعتقاد تمہارے دماغ کے کسی کونے میں پڑا ہوا ہے، اب جب تم اللہ والوں کے پاس جاؤ گے تو اللہ والے اس اعتقاد کو تمہارے رگ وپے میں سرائیت کرادیں گے، اور پھر ہر وقت اس اعتقاد کا دھیان مستحضر رہے گا، اب سوال یہ ہے کہ یہ حاصل کیسے ہوگا؟ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ یہ مشق کرنے سے حاصل ہوگا، ویسے ہی بیٹھے بیٹھے حاصل نہ ہوگا، بلکہ یہ عمل کرو کہ ''اپنے ارادے کو اللہ کے ارادے کا تابع کردو، کہ میں نے اپنی طرف سے تدبیریں اختیار تو کی ہیں، لیکن اب جو کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور منشاء ہوگی، میں اس پر راضی ہوں، وہ اگر مجھے کوئی تکلیف بھی پہنچائیں گے تو مجھے منظور ہے، میں ان کے فیصلے پر راضی ہوں، ہاں تکلیف آنے کی صورت میں ہائے ہائے بھی کرونگا اور دعا بھی کروں گا کہ یا اللہ، اس تکلیف کو دور کردے، لیکن پھر بھی اس کے فیصلے پر راضی رہوں گا۔

پریشانی ایسی سوچ سے ہوتی ہے

شروع شروع میں ذرا تکلف سے یہ عمل کرنا پڑے گا، لیکن رفتہ رفتہ پھر یہ اعتقاد انسان کا ''حال'' بن جاتا ہے، اور پھر ''حال'' سے آگے ''مقام'' بن جاتا ہے، اس کے بعد انسان کو جو راحت حاصل ہوتی ہے کہ اس راحت تک کوئی دوسرا شخص نہیں پہنچ سکتا، اس لئے کہ انسان کو جتنی بے چینی، پریشانی، اور تکلیف ہوتی ہے وہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ انسان یہ سوچتا ہے کہ ''ہونا یوں چاہئے تھا، لیکن یوں ہوگیا'' اس سوچ سے تکلیف ہوتی ہے، مثلاً مجھے صحت ہونی چاہئے تھی، لیکن ہوگئی بیماری، تو اب تکلیف ہو رہی ہے، یا مثلاً مجھے پیسے ملنے چاہئے تھے۔ مگر نہیں ملے، اب تکلیف ہو رہی ہے، ساری تکلیف کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ جو کام ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہوا، اور جو کام نہیں ہونا چاہئے تھا، وہ ہوگیا۔

میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع بنا دیا

لیکن جب تم نے ایک مرتبہ یہ اعتقاد دل میں بٹھالیا، اور اس کو اپنا ''حال'' اور ''مقام'' بنالیا کہ جو کچھ ہوا، وہی ہونا چاہئے۔ اللہ کی مشیت یہ تھی، وہی ہونا چاہئے تھا، اب کہاں کی تکلیف؟ پھر تو راحت ہی راحت ہے، جیسا کہ حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ میں تو ہر وقت آرام اور راحت میں ہوں، اس لئے کہ اس کائنات میں جو کچھ کام ہوتا ہے، وہ میری مرضی کے خلاف ہوتا ہی نہیں، اس لئے کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع بنالیا ہے، اس سے بڑی راحت کی چیز اور کیا ہوگی کہ جو کچھ ہونا چاہئے تھا، وہی ہوا، اور جو نہیں ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہوا، پھر کیسی تکلیف؟ پھر کیسا صدمہ؟ بہرحال! راحت

حاصل کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں۔

گھر بیٹھے راحت حاصل کرلو

آج ساری دنیا راحت حاصل کرنے کے لئے دوڑ رہی ہے، راحت حاصل کرنی مقصود ہے، انسان یہ چاہتا ہے اس کے پاس پیسہ ہو، کوٹھیاں ہوں، بنگلے ہوں، کاریں ہوں، ساز و سامان ہو، ان سب سے مقصود کیا ہے؟ راحت حاصل کرنا، لیکن ان سب چیزوں کے مل جانے کے بعد بھی راحت حاصل نہیں ہوتی، کہیں نہ کہیں کوئی پریشانی لاحق ہو جاتی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کی خواہشات بے پناہ ہیں، اور وہ خواہشات پوری نہیں ہوتیں، لہٰذا راحت نہیں ملتی، وہ راحت نایاب ہے، لیکن جس دن تم اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی اور اللہ کی مشیت میں فنا کر دو گے کہ بس جو ہونا تھا، وہی ہوا تو بس پھر گھر بیٹھے راحت حاصل ہو جائے گی، اس کے ذریعہ راحت کی منزل ایک لمحہ میں حاصل ہو جائے گی۔

سکون ترکِ تمنا میں پالیا میں نے

ہمارے بڑے بھائی، بھائی ذکی کیفی مرحوم، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے آمین، انہوں نے ایک بڑا خوبصورت شعر کہا تھا کہ:

سکون ترک تمنا میں پالیا میں نے
قدم رکے تھے کہ منزل کو جالیا میں نے

جب تمنّی اور آرزوئیں ترک کردیں کہ ارے جو کچھ اللہ تعالیٰ کریں گے، وہ درست ہوگا، تو اس سے بڑا سکون اور کیا ہوگا؟ اور اس بات کو دوسرے مصرعہ میں اس طرح تعبیر کیا کہ ’’قدم رکے تھے کہ منزل کو جالیا میں نے‘‘ یعنی جب تک

قدم آگے بڑھ رہے تھے، اور تمنائیں اور آرزوئیں کی جارہی تھیں، اور یہ کوشش جاری تھی کہ یہ تمنائیں حاصل کرلوں، اس وقت تک منزل ہاتھ میں نہیں آرہی تھی، لیکن جب اپنی تمناؤں کو روک دیا، جب اپنی تجویز کو فنا کردیا اور قدم روک لئے تو اب منزل کو جالیا میں نے، اب منزل پر پہنچ گئے، یعنی سکون اور اطمینان حاصل ہوگیا۔

مرکب کوئی بہتر نہ ملا ترک طلب سے

یہی بات میں نے بھی ایک شعر میں کہی تھی کہ

دو گام چلے تھے کہ نظر آگئی منزل
مرکب کوئی بہتر نہ ملا ترکِ طلب سے

یعنی دو قدم چلے تھے کہ منزل پر پہنچ گئے، "طلب" کو ترک کرنے سے بہتر کوئی سواری نہیں...... لہٰذا اگر راحت حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی مرضی کو اللہ کی مشیت میں فنا کردو بس، پھر دیکھو کیا عیش ہی عیش ہوجائیں گے۔

مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَالَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ

جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں، وہ ہوتا ہے، جو نہیں چاہتے نہیں ہوتا، اس کے علاوہ راحت کسی اور چیز میں نہیں، ہزار کوشش کرلو، جتنے چاہو، اسباب اختیار کرلو، راحت کے پیچھے بھاگتے رہو، یہ کبھی نہیں ملے گی، ہاں اگر راحت ملے گی تو اللہ کے اوپر تفویض اور توکل ہی سے ملے گی، اللہ کے سپرد کرو، اور اللہ پر بھروسہ کرو۔

طلب میں زیادہ انہماک نہ ہو

حدیث شریف میں ہے کہ:

اَجۡمِلُوۡا فِی الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوۡا عَلَیۡهِ

یعنی طلب میں اجمال سے کام لو، طلب میں بھی بہت زیادہ انہماک نہیں ہونا چاہئے، بہت جزرسی نہیں ہونی چاہئے کہ انتہا درجے کے اسباب اختیار کرلو، نہیں، بلکہ سامنے سامنے کے جو اسباب واضح نظر آرہے ہیں، ان کو اختیار کرو، اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو، یہ ہے ایک مؤمن کا کام، اور یہ ایسی بات ہے کہ اگر اس بات پر عمل کی توفیق ہوجائے، اور ہمارے دلوں میں یہ بات اتر جائے تو یقین جانو یہ دنیا جنت بن جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ عطا فرمادے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو یہ دولت عطا فرمادے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مفوض کامل کی پہچان

مجلس نمبر 104

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دار العلوم کراچی.
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	104

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مفوض کامل کی پہچان

مجلس نمبر 104

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ رسوله الکریم، وعلیٰ آله وأصحابه اجمعین۔ امابعد:

تمہید:

گزشتہ کل مختصراً ''تفویض اور توکل'' کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی گئی تھیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ''تفویض'' کے معنی ہیں کہ اپنا تمام تر معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا جائے کہ جو کچھ وہ کریں گے، وہ ٹھیک ہوگا، اس کے مقابل میں ہے ''تجویز'' تجویز کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خود اپنی طرف سے یہ تجویز کرے کہ فلاں کام اس طرح ہونا چاہئے، اور بعد میں اگر وہ کام اس طرح نہ ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ سے شکوہ ہو کہ ایسا کیوں نہیں ہوا؟

تفویض کا مطلب:

مثلاً آپ نے ایک دوا استعمال کی، اور یہ تجویز کیا کہ اس دوا سے مجھے

ہر حال میں صحت ہونی چاہئے، چاہے کچھ ہو جائے، خدا نہ کرے اگر اس دوا سے فائدہ نہ ہوتو اللہ تعالیٰ سے شکوہ ہو جائے کہ یا اللہ: فائدہ کیوں نہیں ہوا؟ ایسی ''تجویز'' گناہ ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف شکوہ ہو جائے، اور ''تفویض'' یہ ہے کہ آپ نے یہ کہا کہ یا اللہ: میں ''تدبیر'' تو کر رہا ہوں، کیونکہ آپ نے تدبیر کرنے کا حکم دیا ہے، دعا بھی کر رہا ہوں کہ اے اللہ! اس تدبیر کو کامیاب بنا دیجئے۔ لیکن میں ہر اس فیصلے پر راضی ہوں، جو آپ میرے حق میں فیصلہ فرمائیں گے، یہ ہے ''تفویض''۔ اور توکل بھی اس سے ملتی جلتی چیز ہے کہ آدمی اللہ پر یہ بھروسہ رکھے کہ جو کچھ وہ کریں گے وہ میرے حق میں بہتر ہوگا، یہ توکل ہے۔ آگے حضرت والا یہ فرما رہے ہیں کہ:

مفوض کامل کون؟

> مفوّض کامل وہ ہے کہ اگر عمر بھر اس کے کان میں یہ آواز آئے کہ "اِنَّکَ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ" یا یہ آواز آتی رہے کہ "اِنَّکَ مِنْ اَھْلِ النَّارِ" تو کسی وقت بھی عمل میں ذرہ برابر بھی کمی نہ کرے، بدستور کام میں لگا رہے، نہ پہلی آواز سے بے فکر ہو، نہ دوسری آواز سے دل برداشتہ ہو۔
>
> (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۸)

یعنی ساری عمر عمل کر رہا ہے، اور یہ آواز ساری عمر میں آ رہی ہے کہ تو جنتی ہے، جنت میں جائے گا، تب بھی یہ سوچ کر عمل میں کمی نہ کرے کہ جب جنت میں جانا ہی ہے تو عمل کرنے کی کیا ضرورت؟ اور اگر یہ آواز آ جائے کہ تو دوزخی ہے، دوزخ میں جائے گا، تب بھی یہ سوچ کر عمل میں کمی نہ کرے کہ دوزخ

میں جانا تو ہے، اب محنت کر کے کیا کرنا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرتا رہے، اور معاملہ اللہ کے حوالے کر دے کہ یا اللہ! فیصلہ آپ کا ہے، چاہے جنت میں بھیجیں، یا جہنم میں بھیجیں، جو آپ کا فیصلہ ہوگا آپ کے سپرد کرتا ہوں،

اُفَوِّضُ اَمرِیٓ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیرٌ بِالْعِبَادِ

ایسا شخص مفوض کامل ہے۔

صحابہ کرام مفوض کامل تھے

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھیں کہ کتنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ بشارت عطا فرما دی تھی کہ یہ جنتی ہیں، ان میں عشرہ مبشرہ دس صحابہ رضی اللہ عنہم تو مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جن کے جنتی ہونے کی پیشنگوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی تھی، لیکن پھر بھی ساری عمر عمل کرتے رہے، اور اپنے عمل میں ذرہ برابر کمی نہیں کی، بلکہ ساتھ میں ڈرتے بھی رہے، مثلاً حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن چکے ہیں کہ عمر جنتی ہے، لیکن اس کے باوجود حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھ رہے ہیں کہ خدا کے لئے مجھے یہ بتا دو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کی جو فہرست تمہیں بتائی تھی، اس میں کہیں میرا نام تو نہیں ہے؟ یہ ڈر لگا ہوا ہے-- کیوں؟ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ جو فرمایا تھا کہ یہ جنتی ہے، یہ میرے اس وقت کے حالات کے مطابق فرمایا ہو، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ بعد میں میرے حالات میں کوئی تبدیلی واقع ہوگئی ہو۔ بہر حال! نہ صرف یہ کہ عمل کر رہے ہیں، بلکہ ڈر بھی لگا ہوا ہے۔ اسی لئے ہمارے

بزرگ فرماتے ہیں کہ انسان عمل کرتا رہے اور ڈرتا رہے، عمل چھوڑے بھی نہیں، عمل کرنے میں لگا بھی رہے، لیکن ساتھ میں ڈرتا بھی رہے کہ پتہ نہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ عمل مقبول ہے یا نہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ روزانہ تہجد کی نماز کے لئے اٹھا کرتے تھے، روزانہ کا معمول تھا، ایک مرتبہ تہجد کی نماز کے لئے اٹھے، وضو کے لئے لوٹا اٹھایا، لوٹے میں پانی بھرا تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی کہ ''نہ تیرا وضو قبول، نہ تیرا اٹھنا قبول، نہ تیری نماز قبول، نہ تیری تہجد قبول، ان بزرگ نے وہ آواز اپنے کانوں سے سنی اور لوٹا اٹھا کر وضو کیا، نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، اور معمول کے مطابق نماز تہجد ادا کی، اگلی رات جب نماز تہجد کے لئے اٹھے، اور تیاری شروع کی تو پھر وہی آواز آئی کہ نہ تیرا اٹھنا قبول، نہ وضو قبول، نہ نماز قبول، نہ تہجد قبول، یہ آواز سنی، پھر وضو کیا اور اطمینان سے حسب معمول نماز ادا کی، تین دن تک یہ آواز سنی، ان کے شاگرد جوان کے ساتھ ہی خدمت کے لئے رہتے تھے، وہ بھی یہ آواز سنتے تھے۔ بالآخر شاگرد نے کہا کہ حضرت: یہ آواز روزانہ آ رہی ہے کہ نہ تیری نماز قبول، نہ تیرا وضو قبول، نہ تیری تہجد قبول، کچھ بھی قبول نہیں تو پھر کیوں آپ اتنی محنت اور مشقت برداشت کر رہے ہیں کہ راتوں کو اٹھ رہے ہیں، نماز ادا کر رہے ہیں؟ اس کے جواب میں ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر چہ ان کی طرف سے یہ کہہ دیا گیا کہ تمہاری کوئی عبادت قبول نہیں۔ لیکن کوئی اور در ہو تو بتاؤ، وہاں چلا جاؤں، میرے پاس تو ایک ہی دروازہ ہے، وہ اگر کہیں گے، تب بھی وہیں جاؤں گا، لہٰذا قبول کریں تو، قبول نہ

کریں تو، میں تو وہی دروازہ کھٹکھٹاتا رہوں گا، جب یہ بات ان بزرگ نے کہی تو پھر غیب سے یہ آئی کہ

قبول است گرچہ ہنر نیست
کہ جز ماپناہ دگر نیست

اب تیرا سب کچھ قبول ہے، تیرا وضو بھی قبول، تیری نماز بھی قبول، تیرا تہجد بھی قبول، اگرچہ تیری اس نماز اور وضو میں کوئی ہنر نہیں، یعنی کوئی خاص خصوصیت نہیں، لیکن اس کے باوجود سب قبول ہے، کیونکہ ہمارے سوا تیری کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے۔

میرا کام حکم بجالانا ہے:

یہی بات حضرت والا اس ملفوظ میں بیان فرمارہے ہیں کہ اگر ساری عمر یہ آواز آتی رہے کہ تو جہنمی ہے، تب بھی عمل نہ چھوڑے اور اگر ساری عمر یہ آواز آتی رہے کہ تو جنتی ہے، تب بھی عمل نہ چھوڑے، کیوں؟ اس واسطے کہ میرا کام یہ ہے کہ مجھے جو حکم دیا گیا ہے، میں اس کو بجالاتا رہوں، میں کسی کا بندہ ہوں، اور بندہ ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ جو مجھ سے کہا جارہا ہے، میں وہ کئے جاؤں، جب وہ روک دیں گے تو رک جاؤں گا، لیکن جب تک کرنے کو کہا جارہا ہے تو میں کروں گا، اس لئے کہ یہ عمل جو میں کررہا ہوں، بحیثیت بندہ ہونے کے کررہا ہوں، یہ عمل ثواب اور عذاب کی شرط پر نہیں ہورہا ہے کہ پہلے اللہ میاں سے شرط لگاؤں کہ یا اللہ! اگر ثواب دیں گے تو عبادت کروں گا، ورنہ نہیں کروں گا، اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ شرط لگالی تو پھر یہ بندگی کیا ہوئی؟ بندگی تو یہ ہے کہ بندہ یہ کہدے کہ یا اللہ! آپ میرے خالق ہیں، آپ میرے مالک ہیں، لہٰذا آپ کا جو حکم ہے، وہ

مجھے ہر حالت میں بجالانا ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ یہ تو آپ کا کرم ہے کہ آپ نے حکم بجالانے پر جنت کے وعدے کئے ہوئے ہیں، لیکن کیا جنت میرے عمل کا بدلہ ہے؟ کیا میرا عمل اس لائق ہے کہ اس کے بدلے جنت مل جائے؟ لہٰذا مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اللہ میاں کے ساتھ شرط لگاؤں کہ اگر جنت ملے گی تو عمل کروں گا ورنہ نہیں کروں گا، اگر نہیں ملے گی تو عمل نہیں کروں گا، مولانا رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ؂

تو بندگی چوں گدایا بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

کیا مزدوری کی شرط لگا کر اللہ کی بندگی کرو گے؟ اتنی مزدوری لوں گا تو تہجد پڑھوں گا، اتنی مزدوری لوں گا تو روزہ رکھوں گا، یہ کیا ہے؟ یہ تو تجارت ہوئی، بندگی نہ ہوئی، لہٰذا شرط لگا لگا کر بندگی ہرگز مت کرو۔ اس لئے کہ جس کی عبادت کر رہے ہو، اس کو خود بندہ پروری آتی ہے، وہ بندہ پروری اپنے فضل و کرم سے کرے گا۔

لہٰذا اگر یہ آواز آ جائے کہ تو جہنمی ہے، جہنم میں جائے گا، تب بھی عمل نہیں چھوڑنا، کیونکہ بندہ اسی کا ہے، کسی اور کا تو نہیں ہے، اور جب اسی کا بندہ ہے تو اس کی بندگی کرنی ہے، اور اگر یہ آواز آ جائے تو جنت میں جائے گا، تب تو خیر بطریق اولی اس کی بندگی کرے گا، ایک وجہ تو یہ ہے۔

کشف، الہام، خواب حجت نہیں

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ آواز کا آنا ہماری شریعت میں کوئی حجت نہیں،

اسی طرح اگر کسی شخص کو کشف یا الہام ہو تو شریعت میں کوئی حجت نہیں، ایسا الہام جو شرعاً حجت ہو، وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم ہو گیا، انبیاء کرام پر جو وحی آتی ہے وہ حجت ہوتی ہے، اور الہام اور وحی میں یہی فرق ہے کہ وحی حجت ہوتی ہے اور الہام حجت نہیں ہوتا، اسی طرح کشف بھی حجت نہیں ہوتا۔

آج کل اچھے خاصے پڑھے لکھے دیندار لوگوں میں یہ وبا چل پڑی ہے کہ انہوں نے کشف، الہام اور خواب کو حجت سمجھنا شروع کر دیا ہے، کہ ہم نے فلاں خواب دیکھا تھا، اب اس خواب کی بنیاد پر وہ کام کرلیا۔ کچھ عرصہ پہلے ایک صاحب دیندار حلقے کے ایک بڑے سربراہ کے بارے میں بتا رہے تھے کہ جہاں ان سے کسی نے پوچھا کہ یہ کام کروں یا نہ کروں؟ وہ کہتے کہ میں ذرا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لوں، پھر بتاتا ہوں، استغفر اللہ، فوراً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس طرح پوچھتے تھے؟ اگر اس کو کشف اور الہام بھی کہا جائے تو بھی اس کا یہ کہنا کہ میں ہر کام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر کرتا ہوں، اور لوگوں کے سامنے اس کا اعلان کرنا، اور اس کو حجت سمجھنا، یہ سب فتنہ ہے۔

مریدین اڑاتے ہیں

جب ہم قندھار گئے تھے اور وہاں ملا عمر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ بے شمار لوگوں نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ انہوں نے آپ سے یہ کہا تھا کہ آپ ہمیں تو یہ تلقین کر رہے ہیں کہ جنگ بند کریں، اور صلح کرلیں۔ ہم آپ کی بات مانیں، یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانیں؟ ہمیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ خواب میں یہ فرمایا کہ تم آگے بڑھو اور مقابلہ

کرو، چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرما دیا ہے، لہٰذا ہم آپ کی بات مانیں، یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانیں؟...... اب اس بارے میں بے شمار لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ایسی باتیں ان سے ہوئی تھیں؟ حالانکہ ان باتوں کا کوئی ذکر فکر نہیں ہوا، نہ انہوں نے مجھ سے ایسی کوئی بات کی۔ بات وہی ہے کہ

پیراں نمی پرند، مریدان می پرانند

یعنی پیر نہیں اڑتے، بلکہ ان کے مریدین اڑاتے ہیں۔

شیطانی الہام:

بہر حال! ہماری قوم کی حالت عجیب وغریب ہوگئی ہے کہ کشف و کرامت میں اور خوابوں میں بڑی دلچسپی لینے لگی ہے، حالانکہ شریعت نے کشف و کرامت اور خواب میں سے کسی کو بھی حجت نہیں بنایا۔ چاہے کتنی ہی مرتبہ خواب آئے، کتنی ہی مرتبہ کشف ہو، کتنی ہی مرتبہ الہام ہو، لیکن شرعی اعتبار سے وہ کوئی دلیل نہیں، بلکہ بعض اوقات آدمی کو دھوکہ ہو جاتا ہے، آدمی یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ مجھے کشف ہو رہا ہے، مجھے الہام ہو رہا ہے، جبکہ حقیقت میں شیطانی الہام ہوتا ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں، اور اولیاء کرام کے بارے میں جو قصے لوگوں میں مشہور ہو جاتے ہیں، وہ بھی بعض بے سروپا ہوتے ہیں، اور ان کی سند وغیرہ نہیں ہوتی، لیکن

بعض واقعات وہ ہیں جو مستند طریقے سے ثابت ہیں، شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ علیہ بڑے مستند بزرگ ہیں، یہ جس طرح صوفی اور ولی اللہ ہیں۔ اسی طرح یہ بڑے عالم بھی ہیں اور عالم شریعت کے بھی بڑے امام ہیں۔ اس لئے یہ کوئی کچی بات نہیں کہتے، بلکہ مستند اور پکی بات کہتے ہیں۔ بہر حال! یہ اپنی کتاب "المیزان الکبری" میں لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، اچانک ایک نور چمکا، اور اس نور میں سے آواز آئی کہ اے عبدالقادر، تو نے ہماری عبادت کا حق ادا کر دیا، اس لئے حق ادا کرنے کے صلہ میں ہم تمہیں یہ انعام دیتے ہیں کہ اب تیرے اوپر نماز فرض نہیں، روزے بھی فرض نہیں، اور جتنے فرائض ہیں، وہ سب تمہارے اوپر سے ساقط کرتے ہیں۔ گویا کہ عبادت کی قبولیت کا اعلان اور آئندہ کے لئے تمام فرائض شرعیہ سے چھٹی دیدی گئی۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ علیہ نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ دور ہو جا کمبخت، مجھے دھوکہ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کبھی فرائض معاف کئے نہیں، آپ سے زیادہ کون عبادت کر سکتا ہے، آپ سے زیادہ کون بندگی کا حق ادا کر سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود آپ سے تو فرائض معاف کئے نہیں، مجھ سے کیسے معاف کر دیں گے؟ مجھے دھوکہ دیتا ہے۔ آپ سمجھ گئے کہ یہ شیطان ہے۔ چنانچہ وہ نور ایک دم سے غائب ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک نور چمکا اور اس نور میں سے آواز آئی کہ اے عبدالقادر! آج تجھے تیرے علم نے بچا لیا، ورنہ یہ وہ داؤ ہے جس کے ذریعہ میں نے بے شمار لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا، شیخ عبدالقادر رحمہ اللہ علیہ نے جب یہ آواز سنی تو فرمایا: کمبخت، دوبارہ مجھے دھوکہ

دیتا ہے کہ میرے علم نے مجھے بچالیا، ارے میرا علم کیا بچاتا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل تھا جس نے مجھے بچالیا۔

دوسرا وار زیادہ سخت تھا:

علماء کرام نے فرمایا کہ یہ دوسرا وار زیادہ خطرناک تھا، اس لئے پہلا وار تو ایسا تھا کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ نمازیں معاف نہیں ہوسکتیں، اور دوسرے وار میں ان کو علم کے گھمنڈ اور تکبر میں مبتلا کرنا مقصود تھا کہ دیکھو، آج تمہارا علم تھا، جس نے تمہیں بچالیا، تو اس علم پر بھروسہ، اس پر ناز، اس پر فخر، اور تکبر میں مبتلا کرنا تھا، اس لئے یہ بڑا خطرناک داؤ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ علیہ کو فہم عطا فرمائی، اور اس داؤ کو سمجھ گئے اور اس کو دھتکار دیا۔

یہ چیزیں حجت نہیں:

بہرحال! یہ آوازیں، یہ خواب، یہ روشنیاں، یہ رنگ، یہ مختلف نظارے جو نظر آتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز حجت نہیں، اور عافیت کا راستہ یہ ہے کہ اس فکر ہی میں مت پڑو۔ بہت سے لوگ مجھے اپنے اصلاحی خطوں کے اندر اپنے خواب لکھتے رہتے ہیں، میں نے ان کو منع کر دیا کہ خبردار، آئندہ مجھے خواب لکھ کر مت بھیجنا، اس لئے کہ رفتہ رفتہ یہ ہوگا کہ یہ کوئی بڑی فضیلت کی چیز ہے، جو ہمیں حاصل ہورہی ہے، ہر روز ایک نیا خواب آتا ہے، اور اس میں کوئی نہ کوئی بشارت ہوتی ہے، رفتہ رفتہ اس کے نتیجے میں آدمی غلط راستے پر پڑ جاتا ہے۔

مجنون کو بھی کشف ہو جاتا ہے:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کشف ہونے کے لئے ایمان بھی شرط نہیں۔ کافر کو بھی کشف ہو جاتا ہے اور کشف کے لئے عاقل ہونے کی بھی شرط نہیں، مجنون کو بھی صحیح کشف ہو جاتا ہے، اور یہ میرا خود ذاتی تجربہ ہے، میری ایک ہمشیرہ تھیں، ان کو کچھ ذہنی تکلیف ہو گئی تھی، اور جس کے نتیجے میں نفسیاتی بیمار ہو گئی تھیں، اس حالت میں وہ ہوش میں نہیں تھیں، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی تھیں۔ جس وقت میں اپنے گھر سے ان کی عیادت کے لئے نکلتا تو وہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو بتا دیتی تھیں کہ "تقی" میرے پاس آنے کے لئے گھر سے نکلا ہے، اب دیکھئے کہ ان کو کشف ہو رہا تھا، اور صحیح کشف ہو رہا تھا، اس سے پتہ چلا مجنون کو بھی کشف صحیح ہو جاتا ہے، اس لئے کہ کشف تقرب کی علامت نہیں اور اگر کسی کو کشف نہیں ہوتا تو یہ کوئی نقص بھی نہیں۔ اگر ساری عمر کوئی بھی کشف نہ ہو تو اس کی دینداری میں، اس کے تدین میں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، لہٰذا جب یہ بات ہے تو اس کے پیچھے پڑنے اور اس کو حاصل کرنے کی حاجت نہیں۔ بلکہ اس کشف و کرامت کے راستے میں پڑنے سے آدمی کے گمراہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، جب تک کسی شیخ کی رہنمائی نہ ہو، آدمی اس کے نتیجے میں گمراہ ہو جاتا ہے۔

کشف میں کسب کو بھی دخل ہے:

میرے والد ماجد صاحب رحمہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ "کشف" اصلاً تو وہبی ہے، لیکن اس کے اندر کسب کو بھی کچھ دخل ہے، پھر خود فرمانے لگے کہ

ایک دن میں نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت: الحمدللہ آپ کی تربیت اور تعلیم کی برکت سے کشف وکرامت کی حقیقت تو بالکل واضح ہوچکی ہے کہ یہ نہ کوئی حجت ہیں، نہ یہ مطلوب ہیں اور نہ ان کے پیچھے پڑنا چاہئے، لیکن کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اس وادی کی بھی کچھ سیر کرلیں۔ پہلے تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ارے بھائی چھوڑو، اس میں کیا رکھا ہے، پھر فرمایا کہ اگر تمہارا دل سیر کرنے کو چاہتا ہے، تو تمہیں بتا دیتے ہیں، چنانچہ حضرت والا نے ایک طریقہ بتایا، میں نے اس طریقے کو استعمال کیا تو مجھے عجیب وغریب مناظر نظر آئے اور میں نے اس میں گاندھی کا کٹا ہوا سر دیکھا۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے کہ جب گاندھی کا طوطی بول رہا تھا، اس کے علاوہ اور بہت کچھ دیکھا۔ جب صبح حضرت والا سے ملاقات ہوئی تو پوچھا کہ ہاں! بھائی سیر کرلی؟ اب اس کو چھوڑ دو، اور آئندہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ مت ہونا۔

کشف معیارِ فضیلت نہیں:

بہرحال! جتنا وقت آدمی کشف حاصل کرنے کی مشق میں خرچ کرے گا، اگر اتنا وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں لگائے تو اس کو کتنا فائدہ پہنچے گا، اور اگر اس کام میں وقت صرف کرے گا تو کچھ حاصل نہ ہوگا، لہٰذا یہ کشف وکرامت نہ معیار فضیلت ہے، اور نہ یہ حجت ہے، نہ یہ مطلوب ہے، نہ یہ مقصود ہے، ہاں! اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی کو عطا فرمادے تو یہ نعمت ہے، اگر کسی کو یہ حاصل نہیں ہے تو اس کے لئے کوئی نقص کی بات نہیں۔

اس کا نام تفویض کامل ہے:

لہٰذا جب یہ بات ہے تو اگر تمہیں عبادت کے دوران یہ آواز آجائے کہ تو جنّتی ہے، تو کیا اس آواز کے نتیجے میں جنتی ہونے کی گارنٹی مل گئی؟ نہیں، اس لئے کہ یہ آواز کوئی حجت نہیں۔ اس لئے کہ کچھ پتہ نہیں کہ یہ آواز کہاں سے آئی، اسی طرح اگر یہ آواز آجائے تو دوزخی ہے تو بھی کوئی حجت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ سوچو اللہ اور اللہ کے رسول صلی علیہ وسلم کی طرف سے جو حکم آجائے، میں اس حکم کی تعمیل کروں، اور سنت کی اتباع کروں، بس، اس سے آگے کا میں مکلّف نہیں۔ اور جب میں اللہ کے حکم کی اتباع کر رہا ہوں تو اس کے بعد میرا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، ''اُفَوِّضُ اَمرِیُ اِلَی اللّٰہِ، اِنَّ اللّٰہَ بَصِیرٌ بِالعِبَادِ'' وہ جو فیصلہ کریں گے، وہ فیصلہ میرے لئے برحق ہوگا اور میں اس فیصلے پر مکمل طور پر راضی ہوں، یہ ہے ''تفویض کامل''

یہ خیال غلط ہے:

ابھی میں نے جو بات کہی تھی کہ اللہ کی عبادت بندگی کی وجہ سے کرو، ثواب کی شرط پر نہ کرو، اس لئے کہ:

ہزار نکتۂ باریک ز مو این جاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

لیکن اس بات کے نتیجے میں کوئی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے، کیونکہ بعض اس نکتۂ کو غلط سمجھنے کی وجہ سے گمراہی میں پڑ گئے، چنانچہ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمیں جنت نہیں چاہئے۔ یا یہ کہد یا کہ ہمیں تو جنت کی خواہش اور دعا بھی نہیں کرنی

چاہئے، اس لئے کہ ہم تو اللہ کے بندے ہیں، ہمیں جنت مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم تو بندہ ہونے کی وجہ سے اللہ کی عبادت کریں گے، یاد رکھئے، یہ خیال بھی غلط ہے۔

جنت سے استغناء غلط ہے:

یعنی ایک طرف تو بندگی کی شرط کے طور پر جنت کا مطالبہ کرنا کہ اگر جنت دو گے تو بندگی کروں گا، ورنہ نہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ اس کے برخلاف جنت سے استغناء، یا جنت مانگنے سے استغفناء برتنا، یہ بھی غلط ہے۔ جیسا کہ غالب کا بیہودہ شعر مشہور ہے کہ:

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبین کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

یعنی طاعت کے اندر یہ شائبہ نہ رہے کہ میں یہ عبادت اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے جنت ملے گی، اور جنت کی نعمتیں ملیں گی، جنت کے محلات ملیں گے وغیرہ، اس لئے اس بہشت کو دوزخ میں ڈال دو، اس لئے کہ یہ بہشت میری طاعت کو جنت کی نعمتوں کی لالچ کے ساتھ ملوث کر رہی ہے، اور میں جنت کی لالچ کے ساتھ عبادت کرنا نہیں چاہتا۔ یہ ہے اس شعر کا مطلب۔

ہم جنت کے محتاج ہیں:

لیکن یہ بالکل بیہودہ شعر ہے، اس لئے کہ اگرچہ جنت کی شرط پر بندگی کرنا اور عبادت کرنا تو ٹھیک نہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جنت سے بے نیازی بھی ٹھیک نہیں، کیونکہ ہم جنت کے محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ سے جنت مانگنی ہے کہ یا

اللہ ہمیں جنت دیدے۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں آپ کی بندگی کرتا ہوں، بلکہ اس وجہ سے کہ میں آپ کا بندہ ہوں، اور آپ میرے آقا ہیں، میرے مولیٰ ہیں، آپ میرے داتا ہیں، لہٰذا آپ تو مجھ پر کرم ہی فرمایئے، اور مجھے جنت دید یجئے۔

ایک بزرگ کا واقعہ:

ایک بزرگ کا جو واقعہ مشہور ہے، اس کو بھی بعض لوگ حجت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ ایک بزرگ تھے جب ان کے مرنے کا وقت آیا تو ان کو جنت کی نعمتیں دکھائی گئیں کہ تمہارے لئے جنت میں یہ باغات ہیں، یہ محلات ہیں، جنت کے مناظر ان کے سامنے پیش کئے گئے، اور ان سے کہا گیا اب تم یہاں آنے والے ہو، ان بزرگ نے جنت کے مناظر سے منہ موڑ لیا، اور دوسری طرف کروٹ لے لی، اور یہ شعر پڑھا کہ:

اِنْ كَانَ مَنْزِلَتِی بِالْحُبِّ عِنْدَ كُمْ
مَا قَدْ رَأَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ اَيَّامِیْ

کہ اگر میری محبت کا درجہ آپ کے نزدیک یہی جنت تھی تو میں نے پھر اپنی ساری زندگی ضائع کر دی، اس لئے کہ میری محبت جو آپ کے ساتھ تھی، وہ اس جنت کی خاطر نہیں تھی۔ اس واقعہ سے لوگ استدلال کرتے ہیں کہ دیکھو، ان بزرگ نے کتنا اچھا کام کیا کہ جنت کو بھی ٹھکرا دیا کہ میری محبت تو خالص محبت تھی، اس میں جنت کی لالچ کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

یہ طرزِ عمل قابل تقلید نہیں:

خوب سمجھ لیں کہ ان بزرگ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، وہ قابل تقلید نہیں،

کیونکہ غلبہء حال میں ان سے یہ عمل سرزد ہوا، اور ''غلبۂ حال'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص کیفیت کا ان پر ایسا غلبۂ ہو جاتا ہے کہ وہ اس میں ایک طرح سے معذور ہو جاتے ہیں اور بزرگوں سے جو کام غلبۂ حال میں صادر ہوتے ہیں، وہ قابل تقلید نہیں ہوتے، اس لئے ان کی تقلید کی تمہیں اجازت نہیں ہوگی کہ تم بھی جنت سے منہ موڑ لو، اور جنت سے بے نیاز ہو جاؤ، اس لئے کہ ہم سے اور آپ سے جو بات مطلوب ہے، وہ اتباع سنت ہے، اور اس کائنات میں اتباع سنت سے کوئی اونچا درجہ پیدا نہیں ہوا، بڑے سے بڑا ولی، بڑے سے بڑا صوفی، بڑے سے بڑا بزرگ اتباع سنت سے آگے کا کوئی درجہ لا نہیں سکتا، اور اتباع سنت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چیز مانگی ہے، تم بھی مانگو، آپ نے یہ دعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ رِضَاكَ وَالْجَنَّةَ

اے اللہ! میں آپ سے آپ کی رضامندی بھی چاہتا ہوں،
اور جنت بھی چاہتا ہوں۔

سنت کا مقام بلند ہے:

یہی مقام بلند ہے، کیونکہ یہ عبدیت کاملہ کا مقام ہے، وہ مقام بلند نہیں ہے، جس میں جنت سے استغنائیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اگرچہ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ زیادہ اونچی بات ہے، لیکن حقیقت میں وہ کوئی اونچی بات نہیں، اونچی بات وہی ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو، وہ یہ کہ اے اللہ! میں آپ سے جنت طلب کرتا ہوں، ایک اور دعا میں

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اَدْخِلْنِی الْجَنَّۃَ بِمَنِّكَ وَ كَرَمِكَ

اے اللہ! اپنے احسان اور کرم کے ذریعہ مجھے جنت میں داخلہ نصیب فرمایا۔

لہٰذا جو لوگ جنت سے بے نیازی برتتے ہیں، وہ غلبۂ حال ہے، قابل تقلید نہیں، بندے کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جنت مانگے۔

فقیر بن کر جنت مانگو:

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ سے جنت ضرور مانگے، لیکن اپنے عمل کی مزدوری کے طور پر نہیں۔ بلکہ اپنے مالک کو کریم آقا، رحمٰن، اور رحیم سمجھ کر مانگے، ایک ہوتا ہے مزدور، جب وہ اپنا کام پورا کر لیتا ہے تو کہتا ہے کہ لاؤ پیسے؟ اس لئے کہ میں نے جو کام کیا تھا، اس کا تقاضہ ہی یہ تھا، لہٰذا اگر تم پیسے دو گے تو یہ تمہارا کوئی احسان نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں نے کام کیا، لہٰذا تم پیسے لاؤ۔ اور ایک ہوتا ہے بھکاری، وہ بھی پیسے مانگتا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ میرا حق تو تمہارے اوپر کچھ نہیں ہے، لیکن میں ضرورت مند ہوں، مجھ پر احسان کرتے ہوئے مجھے کچھ دیدو۔ تو دونوں کے مانگنے میں فرق ہوا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ سے جنت کو کام کی مزدوری کے طور پر مت مانگو، بلکہ فقیر بن کر مانگو کہ یا اللہ! میرا حق تو آپ کے اوپر کوئی نہیں آتا، لیکن اپنے فضل و کرم سے مجھے جنت دیدیجئے۔ میں اس کا محتاج ہوں۔ لہٰذا نہ تو یہ بات درست ہے کہ اس جنت کو اپنے عمل کی مزدوری سمجھو، اور نہ یہ بات درست ہے کہ اس جنت سے

آدمی استغناء برتے، اور بے نیازی برتے کہ مجھے جنت نہیں چاہئے۔

نذر ماننا پسندیدہ نہیں

لوگوں میں نذر ماننے اور منت ماننے کا رواج ہے مثلاً میرا بیٹا اچھا ہوگیا تو میں اتنی رکعت نفل پڑھوں گا، میں اگر امتحان میں کامیاب ہوگیا تو اتنے روزے رکھوں گا، میرا فلاں کام ہوگیا تو اتنے روپے صدقہ کروں گا، یا حج کروں گا، یا عمرہ کروں گا، حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ نذر مت مانو۔ اس سے منع کیوں فرمایا؟ مجھے ایسا لگتا ہے (واللہ سبحانہٗ اعلم) کہ منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ نذر ماننا اللہ تعالیٰ سے سودہ بازی کرنا ہے کہ اللہ میاں آپ میرا یہ کام کردیں، میں آپ کا یہ کام کردوں گا، اور دوسری طرف یہ بات ہورہی ہے کہ اے اللہ، آپ مجھے فائدہ پہنچادیں، میں آپ کو فائدہ پہنچادوں گا، اور اس کے نتیجے میں وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں جو عبادت کروں گا، اس سے اللہ تعالیٰ کا فائدہ ہوگا۔ اس لئے نذر کا معاملہ اللہ جل شانہٗ کے شایان شان نہیں۔ اور بندے کا یہ کام نہیں، البتہ اگر کوئی نذر مان لے گا تو وہ نذر درست ہوجائے گی، اور وہ عبادت اس کے ذمے لازم ہوجائے گی، لیکن یہ نذر ماننا پسندیدہ نہیں۔

کنجوس سے پیسے نکلوانے کا ذریعہ

ایک حدیث میں نذر کے بارے میں ایک جملہ یہ آتا ہے کہ:

اِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِيْلِ

البتہ کنجوس آدمی سے پیسے نکلوانے کا ایک ذریعہ ہے۔ یعنی آدمی ایسا کنجوس تھا کہ کسی اور صورت میں تو پیسے خرچ نہ کرتا، اب اس کے دماغ میں یہ بات آگئی کہ

میں اگر نذر مان لوں گا تو میرا یہ کام بن جائے گا، تو اس طرح اللہ میاں کنجوس سے مال نکلوا کر غریب تک پہنچا دیتے ہیں۔ ایک معنی تو اس جملے کے یہ ہوئے، اس جملے کے اندر دوسرے معنی کا بھی احتمال ہے کہ شاید یہ مراد ہو، وہ یہ کہ تم جو یہ نذر مان رہے ہو کہ اگر میرا یہ کام ہو جائے گا تو فلاں عبادت کروں گا، یہ طریقہ تو کسی بخیل سے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ کوئی بخیل آدمی ہو تو اس سے کہو کہ تم مجھے اتنے پیسے دیدو، تو کنجوس ہونے کی وجہ سے وہ پیسے نہیں دے گا، لہٰذا تم اس کو لالچ دیتے ہو کہ میں تمہارا فلاں کام کر دوں گا، تم مجھے اتنے پیسے دیدو۔ لہٰذا یہ نذر ماننا تو کسی بخیل سے مال نکلوانے کا طریقہ ہے۔

جنت کی شرط پر عبادت مت کرو:

یہاں یہ دیکھو کہ تم کس سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہو؟ تم کس سے مانگ رہے ہو؟ کیا اس ذات کو تم لالچ دو گے کہ مجھے فلاں چیز دیدیجئے تو میں آپ کے لئے فلاں عبادت انجام دوں گا، ہاں! بغیر شرط کے ہم ہر وقت اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، اس سے ہم رزق بھی مانگیں گے، اس سے ہم صحت بھی مانگیں گے، اس سے ہم خوشحالی بھی مانگیں گے، اس سے ہم جنت بھی مانگیں گے، لیکن ہم یہ سب چیزیں فقیر کی طرح مانگیں گے، نہ کہ مزدور کی طرح۔ بس یہ مثال یاد رکھو کہ مزدور کی طرح مانگنا درست نہیں، فقیر کی طرح مانگنا چاہئے کہ یا اللہ ہمارا حق تو آپ پر کوئی نہیں آتا، لیکن آپ اپنے فضل و کرم سے عطا فرما دیجئے اور اس طرح مانگنا ''تفویض'' کے خلاف نہیں۔

یہ وضاحت میں نے اس لئے کر دی کہ جو شروع میں بات کہی تھی کہ جو

کچھ عبادت کرو، وہ جنت کی شرط پر مت کرو، بلکہ بندگی کی وجہ سے کرو۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ، فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ

(سورۃ الحج: آیت ۱۱)

یعنی بعض لوگ وہ ہیں جو کنارے پر کھڑے ہوکر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، یعنی عبادت کرنے کے نتیجے میں اگر دنیا کا کوئی فائدہ حاصل ہوگیا تو مطمئن ہوگیا کہ یہ عبادت موافق آگئی ہے، اور اس سے ہمارے کاروبار میں ترقی ہوئی، اور اس سے ہمارے پیسوں میں اضافہ ہوا، اس سے ہماری صحت اچھی ہوگئی، اس سے ہماری اولاد بہتر ہوئی۔ لہٰذا بہت اچھی بات ہے۔ اور اگر کبھی آزمائش آگئی تو عبادت کو چھوڑ کر واپس بھاگ جاتا ہے کہ یہ نماز مجھے موافق نہیں آئی۔

ایک لطیفہ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ ایک مولوی صاحب ایک مرتبہ ایک گاؤں میں چلے گئے، وہاں جاکر گاؤں والوں کو نصیحت کی کہ تم مسلمان ہو، پھر بھی نماز نہیں پڑھتے، وہ لوگ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ گاؤں والوں نے پوچھا کہ ہمیں نماز پڑھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟ مولوی صاحب نے سوچا کہ اگر میں ان کو جنت کے بارے میں بتاؤں گا تو یہ لوگ نہیں سمجھیں گے، اس لئے مولوی صاحب نے کہا کہ نماز پڑھنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ برکت دیں گے۔

انہوں نے پوچھا کہ برکت کیا ہے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ تمہارے کاروبار میں برکت ہوگی، تمہارے مال میں برکت ہوگی، اور خوشحالی حاصل ہوگی۔ چنانچہ گاؤں والوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور نماز شروع کر دی۔ جب نماز شروع کی تو ایک دیہاتی کی ایک بھینس مر گئی، اس نے جا کر مولوی صاحب سے کہا کہ آپ نے تو کہا کہ برکت ہوگی، یہاں تو نماز پڑھنے سے میری بھینس مر گئی، مولوی صاحب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے، گھبراؤ نہیں اور نماز مت چھوڑنا، چنانچہ وہ نماز پڑھتا رہا، اگلے دن اس کی گائے مر گئی، اب پھر مولوی صاحب کے پاس پہنچ گئے، انہوں نے پھر اطمینان دلا کر رخصت کر دیا، اس دیہاتی کے پاس ایک بکری بھی تھی، اگلے دن وہ میں میں کرنے لگی تو اس دیہاتی نے اس بکری سے کہا کہ خاموش ہو جا، ورنہ ابھی میں وضو کے لئے لوٹا اٹھاتا ہوں۔ اور ان دیہاتیوں نے کہا کہ یہ مولوی دھوکے باز ہے، اس کی بات نہ مانو۔ چنانچہ انہوں نے نماز چھوڑ دی اور پھر جب کسی کو دھمکی دینی ہوتی تو وہ کہتا کہ تو میرا یہ کام کرتا ہے یا نہیں؟ ورنہ اٹھاؤں لوٹا؟ پڑھوں نماز؟ ....

بہر حال! ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ ایک کنارے پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اگر اس عبادت کے ذریعہ کوئی دنیاوی فائدہ پہنچ گیا، تب تو ٹھیک ہے، نماز بڑی اچھی ہے، اور اگر کوئی فتنہ اور آزمائش آ گئی تو الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ العیاذ باللہ۔ فرمایا کہ ایسے لوگ دنیا و آخرت دونوں میں خسارے میں ہیں، اس لئے کہ وہ بندگی دنیا کے فائدے کے لئے کر رہا ہے، یہ کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔ بندگی خالص اللہ کیلئے کرو۔

قرآنی آیات اور دنیاوی مقاصد:

اسی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ آج کل لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ قرض کی ادائیگی کے لئے کونسی سورت پڑھوں؟ اور ملازمت حاصل کرنے کے لئے کونسی آیت پڑھوں؟ اور فقر و فاقہ دور کرنے کے لئے کونسی آیت پڑھوں؟ اور صحت حاصل کرنے کے لئے کونسی آیت پڑھوں؟ اور عام طور پر اس کو روحانی علاج کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کو روحانی علاج کہنا بالکل غلط ہے، اور اگر کوئی مولوی صاحب ان مقاصد کے لئے کوئی وظیفہ نہ بتائے تو کہتے ہیں کہ اس کو کچھ نہیں آتا، کیونکہ ان کے نزدیک اصل علم یہ ہے کہ مولوی صاحب کو تعویذ گنڈے کرنا آتا ہو، اور اس کو عملیات آتے ہوں اور وہ یہ بتا سکے کہ کونسی سورت کا اور کونسی آیت کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اور ہر سورت کا فائدہ ہوتا ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے ''اعمال قرآنی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں یہ لکھا ہے کہ کس آیت سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔

تلاوت کا ثواب نہیں ملیگا

لیکن خوب سمجھ لو کہ قرآن کریم کی جو آیت بھی کسی دنیاوی مقصد کے لئے پڑھی جائے گی اس آیت کے پڑھنے سے تلاوت کا ثواب نہیں ملتا، لہٰذا یہ جو حدیث شریف میں آتا ہے کہ قرآن کریم کے ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، یہ نیکیاں اس نیت سے پڑھنے پر نہیں ملیں گی، کیوں؟ اس لئے کہ تم قرآن کریم کی تلاوت اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طور پر نہیں کر رہے ہو، بلکہ تم ایک ذاتی اور دنیاوی مقصد کے لئے تلاوت کر رہے ہو، اگرچہ اس طرح تلاوت جائز ہے،

گناہ نہیں، لیکن اس پر تلاوت کرنے کا ثواب نہیں ملے گا، عبادت تو وہ ہے جس کے پیچھے کوئی دنیاوی مقصد نہ ہو، بلکہ عبادت تو محض اس لئے ہو کہ اس کی بندگی کروں، اس کے آگے سر جھکاؤں، تب تو وہ عبادت معتبر ہے، اور دنیاوی مفاد کے لئے عبادت کرنا اخلاص کے خلاف ہے، یہ عبادت نہیں، بلکہ یہ تو سودہ بازی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخر دعوانا ان الحمد لِلّٰہِ ربِّ العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (القرآن)

آج کس کی بادشاہت ہے؟......

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (القرآن)

"اللہ ہی کی بادشاہت ہے، جو ایک ہے اور سب پر غالب ہے"

صدق اللہ العظیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفویض کی حقیقت

مجلس نمبر 105

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی.
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	105

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَاصَلَّيْتَ عَلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ
اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَابَارَكْتَ عَلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفویض کی حقیقت

مجلس نمبر 105

الحمدللهِ ربّ العالمين، والعاقبة للمتقين، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلىٰ رسوله الكريم، وعلى آله وأصحابه اجمعين۔ امابعد:

تمہید

گزشتہ کئی سالوں سے رمضان المبارک میں یہ معمول ہے کہ ظہر کی نماز کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ علیہ کے ملفوظات کا یہ مجموعہ ''انفاسِ عیسیٰ'' پڑھا کرتے ہیں اور اس کی جو تشریح اللہ تعالیٰ دل میں ڈالتے ہیں، وہ عرض کر دیتا ہوں۔ آج سے یہ سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔

مگر پہلے دو باتیں سمجھ لیں، ایک یہ کہ مجھے رمضان المبارک میں حرمین شریفین کا ایک سفر درپیش ہوا کرتا ہے، شاید اسی ہفتہ میں کسی دن جانا ہو جائے، اس سفر کے دوران یہ سلسلہ موقوف رہے گا۔

کسی دن ناغہ ہوسکتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے اور اس کا

اعلاج کیا جاتا ہے کہ فلاں وقت میں فلاں آدمی بیان کیا کرے گا تو سارے مجمع میں صرف ایک آدمی ہوتا ہے جو اس اعلان کے بعد پابند ہو جاتا ہے، مثلاً جب میں نے کہہ دیا کہ ظہر کی نماز کے بعد بیان ہوگا تو آپ میں سے کوئی شخص آنے کا پابند نہیں، چاہیں آئیں، چاہیں نہ آئیں، مرضی کے مالک ہیں، نہ آنے کی صورت میں اطلاع دینے کی ضرورت بھی نہیں، لیکن ایک آدمی آنے کا پابند ہے، اس کو ہر حال میں آنا ہے، اور نہ آنے کی صورت میں پہلے سے اطلاع کرنی ہوگی، اطلاع نہ کرنے کی صورت میں لوگوں کو شکایت ہوگی کہ ہم تو اتنی دور سے آئے تھے، لیکن وہ نہیں آیا۔ یہ اس لئے بتادیا کہ میں آپ سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ جب اعلان کردیا تو الحمدللہ اس کی کوشش کرتا ہوں کہ پابندی کروں، لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیش آجاتے ہیں کہ کسی سابق اطلاع کے بغیر بھی غیر حاضری کرنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے میں آپ حضرات سے پیشگی معذرت لینا چاہتا ہوں کہ اگر کبھی اچانک بغیر اطلاع کے غیر حاضری ہو جائے تو آپ حضرات اس کو بعید نہ سمجھیں، کیونکہ پورے مہینہ کے لئے پابند ہونا بعض اوقات ناقابل عمل ہوسکتا ہے، کیونکہ بعض اوقات مجھے اچانک کہیں جانا پڑ جاتا ہے، لہٰذا جو حضرات دور سے تشریف لاتے ہیں ان کے ذہن میں یہ بات رہے کہ کبھی ناغہ بھی ہوسکتا ہے۔

اپنے اندر طلب اور پیاس پیدا کرو:

دوسرے یہ بھی ذہن میں رہے کہ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو اپنی آمد کو اور آنے کی مشقت اٹھانے کو بیکار نہ سمجھیں، انشاء اللہ، اللہ تبارک وتعالیٰ آنے کی برکت سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور عطا فرمائیں گے، اس لئے کہ فائدہ کوئی آدمی

دوسرے کو نہیں دے سکتا، میرے بس میں کیا ہے جو میں کسی کو فائدہ پہنچادوں، فائدہ پہنچانے والا تو کوئی اور ہی ہے، عطا کرنے والا تو وہ ہے، وہ جب چاہتا ہے کسی کو عطا فرما دیتا ہے، لہٰذا جب کسی بندے میں خالص طلب صادق ہو تو ان کی سنت یہ ہے کہ ضرور عطا فرما دیتے ہیں، مولانا رومی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

آب کم جو تشنگی آور بدست
تابجوشد آب از بالا و پست

یعنی پانی کم تلاش کرو، پیاس زیادہ پیدا کرو، پھر دیکھو گے کہ اوپر نیچے ہر طرف سے پانی اُبلے گا، لہٰذا اگر طلب صادق ہے اور تشنگی موجود ہے تو اللہ جل شانہٗ اپنے فضل و کرم سے کرم فرما ہی دیتے ہیں۔ جب یہ بات ہے تو کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ انشاء اللہ کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا۔

تصوف کی حقیقت:

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ ''انفاس عیسیٰ'' جو حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، یہ تصوف سے متعلق ہے، تصوف کے حقائق، دقائق اور معارف حضرت والا نے اس میں بیان فرمائے ہیں، تصوف کے بارے میں لوگوں نے خدا جانے کیا کیا تصورات اپنے ذہن میں قائم کئے ہوئے ہیں، تصوف کی حقیقت اگر دیکھو تو وہ ''تزکیہ'' ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں جن چیزوں کو بیان کیا گیا ہے، وہ یہی ''تزکیہ'' ہے، یعنی اخلاق کو پاک صاف کردینا، گویا کہ ''تصوف'' نام ہے اخلاق کو پاک صاف کرنے کا۔

سارے تصوف کا خلاصہ:

اخلاق کیا ہیں؟ ''اخلاق'' دل کے اندر پیدا ہونے والی صفاتِ باطنی میں کچھ صفات ایسی ہیں جو حاصل کرنے کی ہیں۔ جن کا حاصل کرنا ہر بندے کے لئے ضروری ہے، مثلاً شکر کے موقع پر شکر کرنا ضروری ہے، صبر کے موقع پر صبر کرنا ضروری ہے، تواضع اختیار کرنا ضروری ہے، اخلاص اختیار کرنا ضروری ہے، یہ سب دل کے اعمال ہیں، ان کا حاصل کرنا ضروری ہے، ان کو ''اخلاقِ فاضلہ'' اور ''اخلاقِ حسنہ'' اور فضائل کہا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف بعض صفات باطنی وہ ہیں، جن سے بچنا ضروری ہے، مثلاً تکبر سے بچنا ضروری ہے، ریاکاری سے بچنا ضروری ہے، حسد سے بچنا ضروری ہے، بغض سے بچنا ضروری ہے، یہ سب صفات حرام ہیں۔ ان کو ''اخلاق رذیلہ'' اخلاق سیئہ اور ''رذائل'' کہا جاتا ہے، فضائل کا حصول اور رذائل سے اجتناب کرنا، بس یہ سارے تصوف کا خلاصہ ہے۔

شیخ سے تعلق کا مقصد:

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی پیر صاحب کے پاس جائیں گے اور وہ پھر ہمیں کوئی وظیفہ پڑھنے کے لئے بتائیں گے، وہ وظیفہ پڑھتے رہیں گے، اس کے نتیجے میں اچھے خواب آنے لگیں گے، اس کے بعد کشف ہونے لگیں گے، اور الہام ہونے لگے گا۔ حالانکہ ان سب چیزوں کا تصوف کی حقیقت میں کوئی دخل نہیں، اصل چیز یہ ہے کہ اچھے اخلاق پیدا ہو جائیں اور برے اخلاق دور ہو جائیں۔ اور کسی پیر کے پاس جانے کا مقصد بھی یہ ہے کہ وہ اچھے اخلاق حاصل کرنے کی مشق کرائے اور برے اخلاق سے بچنے کی مشق

کرائے، اور ساری باتیں تو اس عمل کے لئے مدد اور معاون ہیں۔ مثلاً پیر صاحب نے کوئی وظیفہ بتادیا کہ یہ ذکر کیا کرو، تو ذکر کرنے سے طبیعت میں ایک صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اصل مقصد فضائل کا حصول اور رذائل سے بچنا ہے، جب یہ مقصود ٹھہرا تو سب سے پہلے ''فضائل'' کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ فضائل کیا ہیں، جن کو حاصل کرنا ہے، اور وہ رذائل کیا ہیں جن سے بچنا ہے۔

گزشتہ سال کے بیانات:

گزشتہ سال رمضان المبارک میں ''فضائل'' کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی تھیں، اور ان فضائل میں سے پورے مہینے میں جن کا بیان ہوا تھا۔ وہ خوف ورجا کا بیان، صبر کا بیان، تقویٰ کا بیان، اور صبر کی حقیقت، اس کے مدارج اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ، پھر شکر کا بیان، اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ اور پھر اس کے بعد ''تفویض اور توکل'' کا بیان شروع ہوا تھا، جو درمیان میں رہ گیا تھا، یہاں تک کہ رمضان المبارک کا مہینہ ختم ہو گیا تھا۔

تفویض کے معنی:

''تفویض'' اور ''توکل'' یہ دو لفظ ہیں، اور یہ دونوں ملتے جلتے الفاظ ہیں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے، اور دونوں مطلوب ہیں، اور دونوں کو حاصل کرنا چاہئے، ''تفویض'' کے معنی ہیں سونپ دینا اور سپرد کر دینا، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے اپنے اختیارات فلاں شخص کے سپرد کر دیئے، یعنی اس کے حوالے کر دیئے، اسی طرح کسی شخص کو اپنا نمائندہ بنا دینا، آپ نے کسی شخص سے کہا کہ یہ سامان لے جا کر بازار میں فروخت کر دو، گویا کہ

آپ نے اس کو اپنا وکیل بنا دیا، اور یہ کام اس کے سپرد کر دیا۔

اپنا ہر معاملہ اللہ کے سپرد کر دے:

''تصوف'' کی اصطلاح میں ''تفویض'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے سارے معاملات اللہ جل شانہٗ کے سپرد کر دے، اور یہ کہے کہ یا اللہ! میں نہیں جانتا کہ کیا چیز میرے حق میں بہتر ہے، آپ ہی بہتر جانتے ہیں، آپ ہی میرے لئے فیصلہ فرمائیے، اس کو ''تفویض'' کہتے ہیں:

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ و کم و بیش را

اے اللہ! میں نے اپنا سب معاملہ آپ کے سپرد کر دیا، آپ اچھا برا، کم زیادہ، یہ سب آپ بہتر سمجھتے ہیں، میں نہیں سمجھتا، یہ ہے ''تفویض''۔ اور یہ مقصود اور مطلوب ہے، ہر انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تفویض کا معاملہ رکھے، اور اپنا ہر معاملہ اللہ کے سپرد کر دے۔

''تفویض'' کی ضد ہے ''تجویز''۔ یعنی اپنی طرف سے انسان یہ فیصلہ کر لے کہ یہ معاملہ اس طرح ہونا چاہئے، یہ ہے ''تجویز'' اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنی تجویز چلانا اچھی بات نہیں۔ مثلاً ایک شخص روزی کمانے کے لئے گھر سے نکلا، اب ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی اللہ سے دعا کرے اور اسباب تلاش کرے کہ کونسی روزی میرے لئے بہتر ہے، اور تلاش کے بعد دس جگہوں پر ملازمت کے لئے درخواست دیدی، اور پھر اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا کہ جہاں اللہ تعالیٰ میرے لئے بہتر سمجھیں گے وہاں میری ملازمت لگ جائے گی، اور دعا کر لی کہ یا اللہ ان میں سے جو ملازمت میرے حق میں بہتر ہو، اس کو میرے لئے

مقرر فرما دیجئے، میں نہیں جانتا کہ کونسی ملازمت میرے لئے بہتر ہے، یہ ''تفویض'' ہوئی۔

اپنی طرف سے تجویز کرنا اچھا نہیں:

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے خود ہی یہ فیصلہ کرلیا اور طے کرلیا کہ ان دس ملازمتوں میں سے یہ ملازمت مجھے ہر حال میں لینی ہے اور کوئی ملازمت نہیں لینی، اگر مل جائے تو بڑے خوش، کہ اپنے مطلب کی ملازمت مل گئی اور اگر وہ ملازمت نہیں ملی تو اس پر بڑا رنج اور بڑا صدمہ اور بڑی پریشانی ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ سے شکوہ ہو رہا ہے کہ یا اللہ، میں آپ سے یہ ملازمت مانگ رہا تھا، آپ نے یہ ملازمت نہیں دی، یہ ہے ''تجویز'' اور تجویز بری بات ہے، اور اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہئے، اور تفویض اچھی بات ہے، اس کو حاصل کرنا چاہئے۔

تفویض کا واجب درجہ:

''تفویض'' کا ایک درجہ تو واجب ہے، اور اس کی ضد حرام ہے، اور ایک درجہ مستحسن اور مستحب ہے، کہ اگر حاصل ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے، انسان اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے، اگر حاصل نہ ہو تو اس سے آدمی گناہ گار نہیں ہوتا، ''تفویض'' کا واجب درجہ یہ ہے کہ آدمی کو اس حد تک تفویض کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض اور شکوہ پیدا نہ ہو، جیسا کہ میں نے ابھی مثال دی کہ ایک آدمی نے یہ فیصلہ کرلیا کہ مجھے تو یہ ملازمت ملنی ہی چاہئے تھی، جب وہ نہیں ملی تو اب شکوہ ہو رہا ہے کہ یا اللہ! میں نے تو آپ سے یہ ملازمت مانگی تھی، لیکن آپ نے مجھے نہیں دی۔ اب اعتراض ہو رہا ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے میری مرضی کے مطابق کام نہیں کیا، اور جب اعتراض اور شکوہ پیدا ہو جائے تو یہ ''تفویض'' کے واجب درجہ کی خلاف ورزی ہے، اور گناہ کے اندر داخل ہے۔

تفویض کا مستحب درجہ:

ایک درجہ ''تفویض'' کا اس سے آگے کا ہے، وہ درجہ واجب تو نہیں، لیکن اگر حاصل ہو جائے تو نعمت ہے، وہ یہ کہ اپنی طرف سے دل میں کسی چیز کی تجویز نہ ہو، اور بلکہ اپنی تجویز بالکل فنا کر دے۔ یعنی اپنا نہ کوئی مطالبہ ہے، نہ کوئی ارادہ ہے، نہ کوئی خواہش ہے، چاہے یہ ملازمت مل جائے، یا دوسری ملازمت مل جائے، میری طرف سے کوئی خواہش نہیں۔ بلکہ جو ملازمت آپ دلوا دیں، وہی میرے لئے بہتر ہے، یا بیمار ہو جائے تو اب سنت کے مطابق علاج شروع کر دیا، اب اگر آپ مجھے شفاء دیدیں تو وہ آپ کی نعمت، اگر شفاء نہ دیں تو کوئی شکوہ نہیں، کیونکہ اپنی طرف سے میری کوئی خواہش ہی نہیں، ''تفویض'' کا یہ درجہ واجب نہیں، اور ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں، لیکن اگر یہ درجہ حاصل ہو جائے تو نعمت ہے۔

حضرت ذوالنون مصری کا خوبصورت جواب:

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کیسے مزاج ہیں؟ کیا حال ہے؟ فرمایا کہ اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو کہ کائنات میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس شخص کی زندگی کے لطف کا کیا عالم ہوگا کہ کائنات

میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے، ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے، کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہی نہیں۔...... لوگوں نے کہا کہ حضرت! یہ کیسے ہوگیا؟ یہ بات تو پیغمبروں کو بھی حاصل نہیں ہوئی کہ جو چاہا، وہ ہو جائے، جواب میں حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ اس طرح ہوگیا کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی مرضی، وہ میری مرضی ہے، اور کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے، گویا کہ میری مرضی سے ہو رہا ہے۔ اگر میں صحت مند ہوں تو اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوں، لہٰذا میری مرضی بھی یہی ہے، اگر میں بیمار ہوں تو اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوں، اس بیماری میں بھی میں خوش ہوں، اور راضی ہوں۔ اگر ان کی مرضی یہ ہے کہ میں بھوکا رہوں، میں بھی اس پر راضی ہوں۔ اس لئے کہ میں نے اپنی تجویز فنا کر دی ہے۔

ترکِ تمنا میں سکون ہے:

میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی صاحب مرحوم کا ایک خوبصورت شعر ہے کہ:

سکون ترک تمنا میں پالیا میں نے
قدم رکے تھے کہ منزل کو جالیا میں نے

پریشانی کہاں سے پیدا ہو رہی ہے؟ تمناؤں سے، آرزوؤں سے، دل میں تمنائیں اور آرزوئیں بھری ہوئی ہیں کہ مجھے یہ مل جائے، مجھے دولت مل جائے، مجھے فلاں چیز مل جائے، مجھے عزت مل جائے، مجھے شہرت مل جائے۔ مجھے عہدہ مل جائے، مجھے منصب مل جائے، یہ سب آرزوئیں پیدا ہو رہی ہیں، اور

جب یہ چیزیں نہیں مل رہی ہیں تو اس پر تکلیف ہو رہی ہے، رنج اور صدمہ ہو رہا ہے، پریشانی ہو رہی ہے۔ اگر انسان تمنا ہی ترک کر دے کہ دل میں کسی چیز کی کوئی تمنا ہی نہیں۔ نہ دولت کی تمنا، نہ شہرت کی تمنا، نہ مقبولیت کی تمنا، نہ پیسوں کی تمنا، نہ عہدہ اور منصب کی تمنا، ساری تمنائیں ختم کر دیں، اور جب تمنائیں ہی ختم کر دیں تو اب کس بات پر رونا؟ رونا ختم ہو گیا، اور سکون حاصل ہو گیا۔

سکون، ترک تمنا میں پالیا میں نے
قدم رُکے تھے کہ منزل کو جالیا میں نے

یعنی تمنا کرنے سے جہاں قدم روک دیے وہیں منزل مل گئی۔

نہ خواہش، نہ پریشانی:

یہ بات اللہ کے بندوں میں پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کے دل میں کوئی خواہش نہیں ہوتی، کیونکہ اپنی ساری خواہشوں کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا، جب کوئی خواہش نہیں، تو صدمہ بھی کوئی نہیں۔ کیونکہ صدمہ تو خواہش کے پورا نہ ہونے سے ہوتا ہے، جب خواہش ہی کوئی نہیں تو صدمہ کس چیز کا؟ اس لئے کوئی پریشانی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے بندے پیدا فرمائے ہیں اور ان کو یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ! آپ کے فیصلے اور آپ کی رضا میں اپنی ہر خواہش مٹادی ہے۔

نتیجہ اللہ کے حوالے کر دو:

یہ جو مقام ہے کہ خواہشات ہی ختم ہو جائیں، خواہشات فنا کر دے، تو بات دراصل یہ ہے کہ خواہشات دل میں پیدا تو ہوتی ہیں، اس لئے کہ انسان ہے،

اور انسان ہونے کے ناطے خواہش پیدا ہوگی، لیکن اس خواہش کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا، اس وجہ سے وہ خواہش کالعدم ہوگئی، ''تفویض'' کا یہ درجہ حاصل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو واجب بھی نہیں فرمایا، البتہ واجب یہ ہے کہ جو کوئی کام کرو، اس کا نتیجہ اللہ کے حوالے کر دیا کرو، اور یہ دعا کیا کرو کہ:

اَللّٰھُمَّ ھٰذَا الْجُھْدُ وَ عَلَیْكَ التُّكْلَان

اے اللہ! میں نے اپنی سی کوشش کر لی، باقی معاملہ آپ کے حوالے ہے۔ اب آپ پر بھروسہ ہے، آپ جو فیصلہ فرمائیں گے میں اس پر راضی ہوں۔

دعا کی قبولیت اللہ کے حوالے کر دو:

یہاں تک کہ دعا کرنے میں بھی یہی تفویض اختیار کرو، اور کاموں میں تو ''تفویض'' کرتے ہی ہو، مثلاً بیماری کے اندر علاج شروع کیا، اور دوا استعمال کی، لیکن نتیجہ اللہ کے حوالے کر دیا، اسی طرح ملازمت تلاش کی، درخواست دیدی، اور نتیجہ اللہ کے حوالے کر دیا، اسی طرح دعا کرنے میں بھی ''تفویض'' اختیار کرو، اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اور اس کے قبول ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو، اور دعا ہی کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ ھٰذَا الْجُھْدُ وَ عَلَیْكَ التُّكْلَان

یا اللہ! میں جتنا آپ سے مانگ سکتا تھا، اتنا مانگ لیا، آپ کی بارگاہ میں اپنا قضیہ پیش کر دیا، اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ جو فیصلہ کریں گے مجھے

وہ فیصلہ منظور ہوگا، چاہے وہ فیصلہ میری خواہش کے مطابق ہو، چاہے وہ فیصلہ میری خواہش کے خلاف ہو، لیکن مجھے منظور ہے، اسی کا نام ''تفویض'' ہے۔ دوسرا لفظ جو یہاں لائے ہیں وہ ہے ''توکل'' توکل کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کر رہے ہیں، اسباب کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ یہ سب کام انجام دے سکے، بہرحال! تفویض اور ''توکل'' میں تھوڑا سا فرق ہے، اس کی تفصیل ان شاء اللہ کل عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخردعوانا ان الحمد لِلّٰهِ ربِّ العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کثرت تکرار سے عمل آسان ہو جاتا ہے

مجلس نمبر 106

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی۔
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	106

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کثرت تکرار سے عمل آسان ہو جاتا ہے

مجلس نمبر 106

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ رسوله الکریم، وعلیٰ کل من تبعهم باحسان الیٰ یوم الدین۔ امابعد:

تمہید

گزشتہ کل ''تفویض'' کا بیان شروع کیا تھا کہ ''تفویض'' کے معنی ہیں کہ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینا اور دوسری چیز ''توکل'' یعنی اللہ جل شانہ پر بھروسہ کرنا، یعنی یہ سمجھنا کہ اس کائنات میں جو کچھ ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہوگا، اس کی اجازت سے ہوگا، اور وہی سب کچھ کرنے والا ہے، اسباب کے اندر اپنی ذات میں کوئی طاقت نہیں، یہ اعتقاد ''توکل'' کہلاتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے پہلے ملفوظ میں یہ ارشاد فرمایا کہ:

''خدا کی تجویز میں اپنی تجویز کو فنا کر دو، ابتداء میں تو اہل اللہ کی یہ حالت تکلف کے ساتھ حاصل ہوتی ہے، خدا تعالیٰ کی

حکمت اور قدرت کو سوچ سوچ کر اپنے ارادہ و تجویز کو فنا کرنا
پڑتا ہے، پھر یہ حالت ان کے لئے امر طبعی بن جاتی ہے۔"

(انفاس عیسیٰ ص ۲۱۷)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ "تفویض" کے معنی ہی یہ ہیں کہ اپنی تجویز کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر فنا کر دیا۔ میں کچھ نہیں جانتا کہ میرے کے لئے کیا بہتر ہے، کیا بہتر نہیں، میں تو اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر چکا ہوں، وہ جس میں میرے لئے بہتری قرار دیں گے، وہی میرے لئے بہتر ہوگا، میں اسی پر راضی ہوں، اور اسی پر مطمئن ہوں، اس کا نام "تفویض" ہے۔

یہ جو فرمایا کہ اپنے سارے معاملات اللہ کے حوالے کر دو، اور یہ یقین رکھو کہ جو کچھ فیصلہ ہوگا، وہی میرے حق میں بہتر ہے، اور اسی پر میں مطمئن ہوں۔ اس حالت کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی قدرت اور اس کے علم کا مراقبہ کرو اور یہ مراقبہ کرو کہ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہونے والا ہے، آئندہ کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ اللہ جل شانہ عالم الغیب ہیں، اللہ جل شانہ کو سب کچھ پتہ ہے، جب آدمی اس بات کا مراقبہ کرے گا کہ مجھے تو کچھ پتہ ہے نہیں، اے اللہ! آپ کو سب پتہ ہے، اور ظاہر ہے کہ کام اسی کے حوالے کرنے چاہئیں، جس کو پتہ ہے کہ کس کام میں خیر ہے، اور کس کام میں خیر نہیں، چنانچہ استخارہ کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا بتائی، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ، وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ،
اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ، اَللّٰهُمَّ اَنْتَ تَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ، وَاَنْتَ

تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ۔

یعنی اے اللہ! آپ کو علم ہے، مجھے علم نہیں، آپ کو قدرت حاصل ہے، مجھے قدرت حاصل نہیں، آپ ہی علام الغیوب ہیں۔ اس کا مراقبہ کرو، جب تم اس کا مراقبہ کرو گے تو خود بخود ''تفویض'' کی طرف طبیعت چلے گی، یہ ہے ''تفویض'' حاصل کرنے کا طریقہ۔

حصول تفویض کا دوسرا طریقہ:

حضرت والا نے فرمایا کہ:

اپنے ارادے کو خدا کے ارادے کے تابع کر دیں کہ جو کچھ ہوگا ہم اس پر راضی ہیں، اس پر عمل شروع کر دیجئے، اور برابر کرتے رہیے، انشاء اللہ ایک دن ملکۂ راسخہ پیدا ہو جائے گا، اور اسی سے راحت حاصل ہوگی، بدون اس کے راحت نہیں مل سکتی، اور یہ کچھ مشکل نہیں، کیونکہ کثرت تکرار سے سب کام آسان ہو جاتے ہیں، دیکھئے، آج کل جو لوگ پختہ حافظ ہیں، وہ پہلے ہی دن سے پختہ نہیں ہوئے، بلکہ کثرت تکرار سے پختہ بنے ہیں، یا آج جو خوش نویس ہے، وہ کثرت مشق ہی سے خوش نویس ہوا ہے۔ اسی طرح کثرت تکرار سے تفویض حاصل ہو جائے گی، یہی عین عبدیت ہے، اور بندگی ہے، غلام کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۷)

یعنی ''تفویض'' حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بار بار یہ بات علم میں لاتے رہو کہ جو کچھ ہوگا وہ اللہ کی مرضی سے ہوگا اور میں اللہ کی مرضی پر راضی ہوں، بار بار یہ بات دل میں لاتے رہو، لاتے رہو، رفتہ رفتہ یہ چیز حالت ''تفویض'' بن جائے گی، اور پھر یہ حالت آگے چل کر ''مقام'' میں تبدیل ہو جائے گی۔ یعنی پھر اس کو مستقل طور پر یہ استحضار رہے گا کہ میں نے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر رکھا ہے، جو کچھ ان کی طرف سے فیصلہ ہوگا، وہی حق ہے اور میں اس پر راضی ہوں۔

کثرت تکرار کا فائدہ:

پھر فرمایا کہ یہ کثرت تکرار، یعنی اس بات کو بار بار دل میں لانا، اور اس کی طرف دھیان کرنا، یہ چیز ''مقام'' پیدا کر دے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تکرار کے اندر بڑی عجیب خاصیت رکھی ہے۔ دیکھئے قرآن کریم میں ایک ہی بات بار بار آئی ہے۔ مثلاً "اَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ" کا لفظ ۶۲ مرتبہ آیا ہے، حالانکہ صرف ایک مرتبہ ہی کہنا کافی تھا کہ ''نماز قائم کرو'' اور ایک مرتبہ کہنے کی وجہ سے بھی نماز ہمارے اوپر اسی طرح فرض ہو جاتی جس طرح اب ۶۲ مرتبہ کے بعد فرض ہے، ۶۲ مرتبہ کہنے کی وجہ سے کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ایک جگہ قرآن کریم میں بیان کر دیتے، بس وہ کافی تھا، لیکن کئی مرتبہ ان کا قصہ بیان فرمایا۔ تو قرآن کریم میں مختلف باتوں کا تکرار ہے، ایک ہی بات کو بار بار بیان کیا گیا ہے، ایسا کیوں کیا؟ اس لئے انسان کی خاصیت یہ ہے کہ جو چیز اس کے کان میں بار بار پڑتی رہتی ہے، وہ بات دل میں راسخ ہو جاتی ہے، قرآن کریم میں تکرار کا یہی راز ہے۔

آج پبلیسٹی کا دور ہے:

آج ''پبلسٹی'' ایک مستقل فن بن گیا ہے، گوبلز کہتا تھا کہ ''جھوٹ اتنی کثرت سے بولو کہ دنیا اس کو سچ سمجھنے لگے'' یعنی جھوٹ اتنے دھڑلے سے، اتنے اعتماد سے بولو اور بار بار بولو کہ لوگ اس کو سچ سمجھنے لگیں کہ یہ بات سچ ہے۔ یہ ہمارے ہاں جو چائے پی جاتی ہے، یہ ابتداء انگریزوں نے چلائی تھی، ابتداء انگریزوں نے یہ کیا کہ مختلف راستوں میں چوراہوں پر ریڑھیاں لگوائیں، اور ان ریڑھیوں پر چائے پکنے لگی، اور لوگوں کو مفت پلانی شروع کر دی، اور اس زمانے میں یہ جملہ جاری کر دیا کہ:

''گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے''

ہر جگہ یہ جملہ لکھ دیا، دیواروں پر، مکانات پر، اخبارات میں، اشتہارات میں یہ جملہ جاری کر دیا، یہ بالکل جھوٹی بات تھی، اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی، لیکن اس جملے کو اتنی کثرت سے پھیلایا کہ وہ ایک حقیقت بن گئی، اور لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ واقعتہً گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ رفتہ رفتہ لوگ چائے کے عادی ہو گئے، اب چائے کے بغیر گزارہ نہیں۔ اگر چائے نہیں پی تو کچھ بھی نہیں پیا، بلکہ سر میں درد ہوگا۔ طبیعت خراب ہو گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ کثرت سے بار بار پینے سے اس کے عادی ہو گئے۔

انسان عادی کیسے بنتا ہے؟

جتنی بھی چیزوں کے لوگ عادی ہوتے ہیں، اگر غور کرو تو یہ نظر آئے گا وہ بالکل بے مزہ چیزیں ہیں۔ جیسے لوگ تمباکو کے عادی ہیں، اور یہ ایسا بدمزہ ہوتا

ہے کہ جس نے کبھی تمبا کو نہ کھایا ہو، اس کو تمبا کو کھلاؤ تو اس کو قے ہو جائے گی۔ لیکن جب تمبا کو کی عادت پڑ گئی تو اب اسی میں مزہ آنے لگا، اور اب اس کے بغیر گزارہ نہیں۔ اسی طرح لوگ ''قہوہ'' کے عادی بن جاتے ہیں۔ میں نے سب سے پہلے زندگی میں جب قہوہ پیا تو بہت کڑوا لگا، واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ کراچی میں قطر کے کوئی شیخ آ گئے، انہوں نے دارالعلوم کے کچھ طلباء کی دعوت کی تو ہم لوگ اس دعوت میں گئے تو سب سے پہلے ہمارے سامنے ایک چھوٹے سے فنجان میں قہوہ لایا گیا، جو مقدار میں بہت تھوڑا سا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اس کا پہلا گھونٹ منہ میں لیا تو فوراً سر میں درد شروع ہو گیا، وہ اتنا کڑوا لگا کہ اس ایک گھونٹ کو حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا، میں سوچنے لگا کہ یا اللہ، یہ لوگ کس طرح اس کو مزے لے کر پیتے ہیں۔ لیکن بعد میں جب عربوں کے ساتھ زیادہ اٹھنا بیٹھنا ہوا تو اب ہر دعوت میں سامنے قہوہ آ رہا ہے، رفتہ رفتہ اس کو پینا شروع کیا تو اب پیتے پیتے اچھا لگنے لگا، اور اب اس کو پینے میں بڑا لطف محسوس ہوتا ہے۔

نفس کو عبادت کا عادی بناؤ:

اسی طرح جتنی عبادات ہیں، جتنی طاعات ہیں، یا اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنے اخلاق فاضلہ پیدا فرمائے ہیں، وہ بھی درحقیقت اس طرح حاصل ہوتے ہیں کہ شروع میں یہ کڑوے لگتے ہیں، بدمزہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن جب انسان بار بار ان اعمال کو کرتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کا عادی بن جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ان اعمال واخلاق کی ایسی محبت پیدا فرما دیتے ہیں کہ پھر اس انسان کو اس عمل کے بغیر چین نہیں آتا۔......... مثلاً ایک آدمی بے نمازی ہے، اگر اس سے کہا جائے تو نماز پڑھ تو اس کے لئے نماز پڑھنے سے زیادہ بھاری کام کوئی اور نہیں

ہوگا۔ لیکن ایک شخص سے بار بار نماز پڑھوائی، یہاں تک اس کی عادت بن گئی، اب اگر وہ نماز نہ پڑھے تو اس کو چین نہیں آتا۔ اگر عشاء کی نماز نہیں پڑھی تو رات کو نیند نہیں آئے گی، اس لئے کہ اس کو عبادت کی عادت ہوگئی ہے۔

مشق سے تفویض حاصل ہو جائیگی:

یہی بات حضرت والا بیان فرما رہے ہیں اور یہ تصوف کا بڑا عجیب راز ہے، کہ جو کام حاصل ہوتا ہے وہ کثرت تکرار سے حاصل ہوتا ہے، بار بار کرنے سے حاصل ہوتا ہے، مشق کرنے سے ہوتا ہے، اسی طرح یہ ''تفویض'' بھی اگر حاصل ہوگی تو وہ مشق سے حاصل ہوگی، وہ یہ کہ بار بار ہر معاملے میں یہ کہو کہ:

اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ

میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھنے والے ہیں۔

بار بار دل میں یہ خیال لاؤ کہ میں نہیں جانتا ہوں، اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں، میری قدرت میں کچھ نہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سب کچھ ہے اور مجھے پتہ نہیں کہ کس کام میں خیر ہے، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس کام میں خیر ہے، لہٰذا میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، وہ جو فیصلہ کریں گے، وہ میرے حق میں بہتر ہوگا۔ جب بار بار یہ خیال دل میں لاؤ گے تو کثرت تکرار سے ''تفویض'' حاصل ہو جائے گی۔

بے حقیقت بندہ کیا تجویز کرے:

''یہی عین عبدیت ہے اور بندگی ہے، غلام کو ایسا ہی ہونا چاہئے'' یعنی

انسان تو "بندہ" ہے، اور بندہ اپنے آقا سے کیا تجویز کرے؟ بلکہ دنیا کے اندر تو غلام اور آقا دونوں انسان ہوتے ہیں، جیسی غلام کی عقل ہے، ویسی ہی آقا کی عقل ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ غلام کے اندر عقل آقا کے مقابلے میں زیادہ ہو، لیکن یہاں تو وہ نسبت بھی نہیں، بلکہ یہاں تو بندہ اور خدا کی نسبت ہے، اب یہ بے حقیقت، بے علم، چھوٹا سا بندہ، جس کے پاس نہ علم ہے، نہ قدرت ہے، وہ کیا اللہ میاں کو تجویز پیش کرے کہ اللہ میاں آپ ایسا کر دینا۔ لہٰذا تجویز تو اللہ ہی کی ہے، اور فیصلہ انہی کا ہے، مشیت انہی کی کارفرما ہے۔ ہاں! بے علمی کی وجہ سے ہم صدمہ بھی کرتے ہیں، کوئی واقعہ پیش آیا، اس پر صدمہ ہو رہا ہے، یہ صدمہ بے علمی کی وجہ سے ہو رہا ہے، اگر حقیقی علم ہمیں ہوتا تو پھر صدمہ نہ ہوتا۔

مفوّض کامل کی پہچان:

آگے ایک اور ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

> ''مفوّض کامل وہ ہے کہ اگر عمر بھر اس کے کان میں یہ آواز آئے کہ "اِنَّكَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ" یا یہ آواز آئے کہ "اِنَّكَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ" تو کسی وقت بھی عمل میں ذرہ برابر بھی کمی نہ کرے، بلکہ بدستور کام میں لگا رہے، نہ پہلی آواز سے بے فکر ہو، نہ دوسری آواز سے دل برداشتہ ہو۔
>
> (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۸)

فرمایا کہ ایک شخص کے کان میں مسلسل یہ آواز آ رہی ہے، یعنی اس کو الہام ہو رہا ہے کہ تو جنتی ہے، تو یہ آواز سن کر عمل میں کوئی فرق نہیں واقع ہونا

چاہئے ـــــ یہ نہیں کہ جب میں جنتی ہوگیا تو اب مجھے عمل کرنے کی کیا ضرورت ہےاور یہ سوچ کر عمل چھوڑ دے ـــــ یا خدانہ کرے یہ آواز آجائے تو جہنمی ہے، تو اس وقت بھی اپنے عمل کو نہ چھوڑے، اور یہ نہ سوچے کہ جب جہنم ہی میں جانا ٹھہرا تو اب کیا نماز پڑھوں، کیا روزے رکھوں ـــــ حضرت والا فرمارہے ہیں کہ اگر مسلسل یہ آواز آتی رہے تب بھی عمل میں کوئی فرق واقع نہ ہو۔ بلکہ عمل میں لگا رہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

مولانا رومی رحمہ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ ایک بزرگ روزانہ تہجد میں اٹھا کرتے تھے، ایک مرتبہ معمول کے مطابق تہجد کی نماز کے لئے اٹھے، وضو کے لئے لوٹا اٹھایا، اس میں پانی بھرا، جب وضو کے لئے بیٹھنے لگے تو کان میں ایک آواز آئی کہ ”نہ تیرا اٹھنا قبول ہے، نہ تیرا وضو قبول ہے، نہ تیری نماز قبول ہے، نہ تیرا تہجد قبول ہے“ ـــــ شاگرد بھی ساتھ تھا، اس نے بھی یہ آواز سنی ـــــ اس کے بعد انہوں نے اطمینان سے وضو کیا، تہجد ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے، اور روزانہ کا جو معمول تھا، وہ پورا کیا ـــــ اگلی رات کو جب اٹھے تو پھر وہی آواز آئی کہ نہ تیرا اٹھنا قبول، نہ تیرا وضو قبول، نہ تیری نماز قبول، نہ تیرا تہجد قبول، کچھ قبول نہیں۔ سننے کے بعد اطمینان سے وضو کیا، نماز پڑھی، اور اسی شان سے تہجد کی نماز ادا کی جس شان سے روزانہ پڑھا کرتے تھے، تیسری رات کو جب تہجد کے لئے اٹھے تو پھر وہی آواز آئی تو شاگرد جو روزانہ یہ آواز سن رہا تھا، اس نے کہا کہ حضرت! آپ یہ آواز روزانہ سن رہے ہیں کہ آپ کی کوئی عبادت قبول نہیں، تو اب خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے اور محنت کرنے کا کیا فائدہ؟ جواب

میں ان بزرگ نے فرمایا کہ میاں! ٹھیک ہے کہ وہ فرمار ہے ہیں کہ یہ عبادت قبول نہیں، لیکن اور کوئی دروازہ ہوتو بتادو، وہ قبول کریں تو، نہ قبول کریں تو، مجھے وہیں جانا ہے۔ جانے کے لئے میرے پاس کوئی اور جگہ نہیں ہے، اسی دروازہ پر پیشانی ٹیکنی ہے، اسی کے سامنے رونا ہے، اسی سے مانگنا ہے _____ جب ان بزرگ نے یہ کہا تو پھر آواز آئی:۔

قبول ست قبول ست گرچہ ہنر نیست
کہ جز ما پناہ دگر نیست

اگرچہ تیرے پاس ہنر تو نہیں تھا، لیکن اب سب کچھ تیرا قبول ہے، تیرا وضو بھی قبول، تیری نماز بھی قبول، تیری تہجد بھی قبول۔ چونکہ تم نے اس بات کا اقرار کرلیا کہ ہمارے علاوہ کوئی پناہ کی جگہ میرے پاس نہیں ہے۔

بندگی کی شان یہی ہے:

حضرت والا فرمارہے ہیں کہ اگر تمہیں یہ پتہ چل جائے کہ تم جنتی ہوتو تمہارے عمل میں کوئی فرق نہ ہونا چاہئے، اور اگر تمہیں یہ پتہ چل جائے کہ تم جہنمی ہوتو عمل میں کوئی کمی نہ ہونی چاہئے۔ اگر یہ پتہ چل جائے کہ عبادت قبول نہیں ہو رہی ہے تو بھی عمل میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے، بلکہ جیسے پہلے عبادت میں لگے ہوئے تھے، ویسے ہی لگے رہنا چاہئے ____ اور درحقیقت بندگی کی شان یہی ہے، میں اس کے در پر پڑا رہوں گا، اس کے در کا غلام ہوں، چاہیں قبول کریں، یا قبول نہ کریں۔

ایک عجیب سوال:

ایک بہت بڑے جلیل القدر محدث گزرے ہیں، حضرت عبدالرحمٰن بن

اُبی نعم رحمۃ اللہ علیہ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں ایک شخص کو یہ شوق پیدا ہوا کہ میں اللہ والوں کے پاس اور علماء کے پاس جاؤں، اور ان سے یہ سوال کروں کہ اگر آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ آئندہ ۲۴ گھنٹے کے بعد آپ کا انتقال ہونے والا ہے تو یہ ۲۴ گھنٹے آپ کس طرح گزاریں گے؟ اور ان ۲۴ گھنٹوں میں آپ کیا نیک اعمال کریں گے؟ اب ظاہر ہے کہ جب آدمی کو یہ پتہ چل جائے کہ میں ۲۴ گھنٹے بعد دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں تو وہ اس وقت وہی کام کرے گا جو اس کے نزدیک سب سے افضل کام ہوں گے، اس لئے اس نے یہ سوال بنایا۔

میرے پاس اضافہ کیلئے کچھ نہیں:

چنانچہ وہ شخص بڑے بڑے علماء اور محدثین کے پاس گیا، کسی نے کچھ اعمال بتائے، کسی نے کچھ اعمال بتائے۔ مختلف عبادات، اذکار اور تسبیحات بیان کیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن اُبی نعیم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب وہ شخص پہنچا اور اس نے یہ سوال ان سے بھی کیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں وہی اعمال کروں گا، جو آج کر رہا ہوں، یعنی میں اس وقت جو اعمال کر رہا ہوں، میرے پاس ان میں اضافہ کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے، اس لئے کہ میں نے اپنی ساری زندگی اسی نظم پر ڈھال رکھی ہے کہ شاید اگلے چوبیس گھنٹے میں میرا انتقال ہو جائے گا، اس لئے جو اعمال میں روز کرتا ہوں، وہی اعمال میں آج بھی کرونگا ——— بہرحال! کوئی بھی حالت ہو، آدمی کے معمول میں، اس کے طریق کار میں، اللہ جلّ شانہ کے ساتھ تعلق میں، عبادات میں، طاعات میں، کوئی فرق واقع نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ اگر یہ آواز آجائے کہ تو جنتی ہے، یا یہ آواز آجائے تو جہنمی ہے۔ العیاذ باللہ۔ تب بھی اس کے عمل میں کوئی فرق نہیں

ہونا چاہئے، کسی حالت میں بھی عمل کو نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

استقامت کیلئے ہمت کو کام میں لانا ہوگا:

اسی کو ''استقامت'' کہتے ہیں، اور یہ استقامت مشق سے حاصل ہوتی ہے، لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ معمولات کی پابندی نہیں ہوتی، ناغہ ہو جاتا ہے ـــــ یہ ناغہ کیوں ہو جاتا ہے؟ اس ـــــ لئے ناغہ ہو جاتا ہے کہ اس کی مشق نہیں کی، یاد رکھو کہ اختیاری امور کو اپنی زندگی کے معمول میں داخل کرنے کا سوائے زبردستی کے اور کوئی اس کا طریقہ نہیں، تم اگر سمجھتے ہو کہ تمہیں کوئی تعویذ گھول کر پلا دیا جائے گا۔ یا تمہارے اوپر کوئی جھاڑ پھونک کر دے گا، اور اس کے نتیجے میں تم معمولات کے پابند ہو جاؤ گے، یہ سب خام خیالی ہے، اس کو دل سے نکال دو، ایسا نہیں ہوسکتا ـــــ بلکہ اپنے ارادے سے اور اپنی ہمت کو استعمال کرنے سے، اور زبردستی اپنے آپ کو کام میں لگا کر یہ چیز حاصل ہوگی، جب تک تم اپنے اوپر زبردستی نہیں کرو گے، اس وقت تک کسی چیز کی مشق نہیں ہوگی، اور کسی کام پر استقامت حاصل نہیں ہوگی۔

فضول کاموں میں مشق:

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمت میں بڑی طاقت رکھی ہے، یہ ہمت ربر کی طرح ہے، اس کو جتنا چاہو کھینچ لو، چاہے اس کو غلط کام میں استعمال کرو، چاہے اچھے کام میں اس کو استعمال کرلو، اب لوگ اس ہمت کو غلط کاموں میں استعمال کرتے ہیں ـــــ ابھی چند روز پہلے میں اٹلی گیا تھا، وہاں پر ایک سڑک پر سے جب گزرا تو وہاں دیکھا کہ وہاں دو دیواریں ڈھلوان والی بنی ہوئی تھیں۔ اس

کے اوپر پہیے رکھے ہوتے تھے، اب لوگ ان پہیوں کے ذریعہ ان دیواروں پر اوپر کی طرف جاتے، اور پھر ہوا میں قلا بازیاں کھا کر دوبارہ اس دیوار پر آ جاتے ــــــ لوگ بر سر عام یہ کرتب دکھا رہے تھے، دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ یہ کیسے انسان ہیں۔ جو یہ عمل کر رہے ہیں، لیکن انہوں نے مشق کی، اور مشق کر کے اس فضول کام میں مہارت پیدا کر لی، میں نے اپنے دوست سے کہا کہ دیکھو، اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمت میں کتنی طاقت دی ہے کہ یہ آدمی مشق کر کے ایسے کام کرنے پر قادر ہو گئے کہ ہمیں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ ایسا کام بھی انسان کر سکتا ہے۔ جب ایک فضول کام میں مشق کرنے سے اللہ تعالیٰ ہمت میں یہ برکت دیتے ہیں تو اگر ہم طاعات، عبادات اور گناہوں سے بچنے میں اپنی ہمت کو استعمال کریں تو اللہ تعالیٰ کیوں مدد نہیں فرمائیں گے۔

نفس کو زبردستی طاعات میں لگاؤ:

اس لئے اپنے نفس کو زبردستی طاعات میں لگاؤ۔ وہ غالب نے خوب کہا ہے کہ:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں جاتی

اگر طبیعت ادھر نہیں جاتی تو اس کو زبردستی کر کے لاؤ، جب اس طبیعت کے ساتھ زبردستی کرو گے تو کچھ دن تو زبردستی کرنی ہوگی، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کی عادت بن جائے گی، جب عادت بن جائے گی تو اس کام کی طبیعت ثانیہ بن جائے گی ــــ کوئی کام زبردستی کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔

حاصلِ تصوف:

ہمارے حضرت حکیم الامت، مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ علیہ ساری عمر تصوف کے کوچوں کی خاک چھاننے کے بعد تصوف کا حاصل بیان فرمارہے ہیں کہ:

> وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جب کسی طاعت کے کرنے میں سستی محسوس ہو، اس سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کر گزرے اور جب کسی گناہ کے کرنے کا تقاضہ ہو، اس تقاضے کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے، بس اسی سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، اس سے ترقی کرتا ہے، اور اسی سے تعلق باقی رہتا ہے۔

بہرحال! نفس کے ساتھ زبردستی کر کے اس کو طاعت کی طرف لاؤ، اور گناہوں سے زبردستی کر کے اس کو دور رکھو، اگر یہ چیز حاصل ہوگئی تو بس تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

توکل مطلوب:

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

> ''توکل مطلوب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر اعتقاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا، جو وہ چاہیں گے، وہی ہوگا اور خلاف شرع تدبیر نہ کرو، واللہ تم متوکل ہو''

(انفاس عیسیٰ: ص ۲۱۸)

یعنی یہ اعتقاد اس بات کا کہ اللہ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا اور دوسرے کہ جو تدبیر اختیار کرو، وہ خلاف شرع نہ ہو، تدبیر توکل کے خلاف نہیں، مثلاً بیمار ہو گئے تو اس بیماری کا علاج کرنا تدبیر ہے، جائز تدبیر ہے، لہٰذا یہ تدبیر توکل کے خلاف نہیں ___ البتہ خلاف شرع تدبیر نہ ہو، مثلاً یہ کہ بیماری کے علاج کے لئے کسی جادوگر کے پاس چلے گئے، اور اس سے سفلی عمل کرانا شروع کر دے تو یہ ناجائز تدبیر ہے۔ حرام ہے، اور توکل کے خلاف ہے، لہٰذا تدبیر ضرور کرے، مگر وہ تدبیر شریعت کے مطابق ہو۔

آج کی مجلس کا خلاصہ:

بہرحال! آج کی مجلس کا خلاصہ یہ ہے کہ تفویض کے حصول کے لئے اس مراقبہ کی ضرورت ہے کہ اللہ جل شانہ جانتے ہیں، میں نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ قادر ہیں، اور میں اپنے سارے معاملات اللہ کے حوالے کرتا ہوں، ان کے فیصلے پر راضی ہوں، چاہے وہ فیصلہ بظاہر دیکھنے میں ناگوار معلوم ہوتا ہو۔ لیکن حقیقت میں وہی فیصلہ میرے حق میں بہتر ہوگا، اس کا بار بار مراقبہ کرنے سے یہ حالت پیدا فرما دیتے ہیں اور پھر وہ حالت مقام میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو تفویض کامل اور توکل عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد لِلّٰہِ ربِّ العالمین

✓ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

✓ السلام علیکم
تم پر سلامتی ہو۔

✗ اسام علیکم
تم کو موت آئے۔

✗ اسا علیکم
تم خوشی کو ترسو۔

✗ سلالیکم
تم پر لعنت ہو۔

✗ سام علیکم
تم برباد ہو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسباب کی موجودگی میں "توکل" مطلوب ہے

مجلس نمبر 107

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن
استاد جامعہ دارالعلوم کراچی

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی۔
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	107

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسباب کی موجودگی میں ''توکل'' مطلوب ہے

مجلس نمبر 107

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ رسوله الکریم، وعلی آله وأصحابه اجمعین۔ امابعد:

جب تمام تدبیریں ختم ہو جائیں

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

''بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں جن میں تمام تدبیریں ختم ہو جاتی ہیں، اور کام نہیں ہوتا، بس گرہ اس وقت کھلتی ہے جب بندہ یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! آپ ہی اس کام کو پورا کریں گے تو پورا ہوگا، میں تو عاجز و درماندہ ہوں''

(انفاس عیسیٰ، ص ۲۱۸)

مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں ایسے واقعات بکثرت پیش

آتے ہیں کہ انسان تدبیریں کرتا ہے، لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ یہ نظارے بندوں کو دکھاتے رہتے ہیں کہ ایک وقت میں وہی تدبیریں کارگر ہوگئی تھیں، اور ان سے فائدہ پہنچ گیا تھا۔ لیکن دوسرے وقت میں وہی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ لیکن کچھ بھی فائدہ نہ ہوا ______

دوا کس سے پوچھتی ہے

اللہ تعالیٰ یہ چیزیں بندوں کو دکھاتے رہتے ہیں ______ ہمارے ایک ڈاکٹر تھے، ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے خاص معالج تھے، بڑے تجربہ کار ڈاکٹر تھے، تقریباً ۸۰ سال کی عمر ہوگئی تھی۔ وہ ایک جملہ فرمایا کرتے تھے کہ میری ساری زندگی کے تجربہ کا نچوڑ یہ ہے کہ جب کوئی دوا کسی مریض کے لئے تجویز کی جاتی ہے تو وہ دوا جسم میں جانے کے بعد کسی سے پوچھتی ہے کہ کیا عمل کروں؟ فائدہ کروں؟ یا الٹی پڑ جاؤں؟ جب وہاں سے اشارہ مل جاتا ہے تب وہ دوا کام کرتی ہے ______ فرماتے تھے کہ وہی دوا، وہی مریض، وہی حالت، وہی مرض تھا کل فائدہ کر گئی تھی، آج جب وہی دوا دی تو الٹی پڑ گئی، یہ نظارے نظر آتے رہتے ہیں۔

پھر بھی انسان غافل ہے

فرماتے تھے کہ جس بیمار کے بارے میں ہمیں پکا یقین تھا کہ کل کو یہ بیمار اسپتال سے ڈسچارج ہو جائے گا اور دوسرے مریض کے بارے میں یہ یقین تھا کہ یہ آج رات دنیا سے چلا جائے گا۔ لیکن جب صبح آ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ جو مریض ڈسچارج ہونے والا تھا، وہ قبرستان پہنچ گیا، اور جس کے بارے میں یہ سوچا تھا کہ زد

کل کو مر جائے گا وہ تندرست ہو کر ڈسچارج ہو گیا ــــــــ تو ساری تدبیریں، ساری دوائیں، سارے علاج، سب کہیں پوچھتے ہیں کہ کیا کروں؟ اللہ تعالیٰ یہ مناظر آنکھوں سے دکھاتے رہتے ہیں، پھر بھی انسان غافل ہے، اور اپنی نگاہ انہی تدبیروں پر جمائے رکھتا ہے کہ اس تدبیر سے یہ فائدہ ہو جائے گا، اس تدبیر سے یہ فائدہ ہو جائے گا، حالانکہ ان نظاروں کو دیکھ کر یہ اعتقاد جازم پیدا ہو جائے کہ یہ تدبیریں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، اصل تو مسبب الاسباب ہیں۔ وہ جس تدبیر میں تاثیر پیدا فرمادیں تو تاثیر ہوگی، ورنہ نہیں ہوگی۔

اس وقت گرہ کھلتی ہے

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ساری تدبیریں کرلیں۔ سارے جوڑ توڑ کرلئے اور ساری کوششیں بروئے کار لے آئے، لیکن نتیجہ نکل کر نہیں آیا۔ اس وقت انسان جب تمام تدبیروں سے مایوس ہو چکا ہوتا ہے، یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! بس آپ ہی کا سہارا ہے، آپ کے سوا کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ اگر آپ کریں گے تو یہ کام ہو جائے گا، آپ نہیں کریں گے تو یہ کام نہیں ہوگا، اس وقت بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے دروازہ کھل جاتا ہے، اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ: ''اس وقت گرہ کھلتی ہے جب یوں کہتا ہے کہ اے اللہ، آپ اس کام کو پورا کریں گے، میں تو عاجز اور درماندہ ہوں۔'' ساری تدبیریں اختیار کر کے آخر میں اعتراف کرلے کہ میں تو کچھ نہیں کرسکتا، جب تک آپ کی توفیق نہ ہو۔

ایک سبق آموز واقعہ

انسان کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں ــــــــ ۱۹۶۷ھ

کی بات ہے، آج سے تقریباً ۳۵ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مجھے پہلی مرتبہ حرمین شریفین کے سفر پر پانی کے جہاز سے جانا ہوا، میرے ساتھ میرے بڑے بھائی مولانا ولی رازی صاحب تھے، ہم دونوں اس سفر پر روانہ ہوئے، راستے میں پانی کا جہاز عدن کے ساحل پر ایک رات کے لئے رکتا تھا، اور پھر وہاں سے اگلے دن روانہ ہوتا تھا، چنانچہ جب جہاز عدن پر پہنچا تو ہم دونوں جہاز سے اتر گئے۔ وہاں یکے بعد دیگرے تین شہر ہیں، چنانچہ وہاں اتر کر گھومے پھرے، کچھ چیزیں سستی مل رہی تھیں، وہ خرید لیں، کچھ کھایا پیا، اور پھر ایک ٹیکسی لی، اور ساحل پر پہنچے، جب اس ٹیکسی والے کو پیسے دینے کی نوبت آئی تو پتہ چلا کہ وہ ہمارا تھیلا جس میں ساری رقم، جہاز کا ٹکٹ، اور پاسپورٹ وغیرہ تھا، وہ تھیلا غائب ہے۔ اور جہاز سمندر کے درمیان کھڑا ہوا تھا، اور ساحل سے جہاز تک کشتی کے ذریعہ جانا تھا، رات کے ۱۱ بج گئے تھے، آخری کشتی جانے والی تھی اور صبح سویرے جہاز روانہ ہو جائے گا، اور رات کو ایک بجے کے بعد جہاز سے سیڑھی ہٹا دی جائے گی۔

مایوسی کے بعد مسجد کی طرف

اب ٹیکسی والے کو بھی دینے کے لئے پیسے نہیں تھے ______ اور ہم دونوں نے اپنے ٹکٹ، پاسپورٹ، پیسے سب کچھ ایک ہی تھیلے میں رکھے تھے۔ اگر الگ الگ ہوتے تو کم از کم یہ ہوتا کہ ایک کے پیسے غائب ہو جاتے، دوسرے کے موجود ہوتے، اب ٹیکسی ڈرائیور سے ساری صورت حال بتائی کہ یہ صورت پیش آ گئی ہے، اب ایسا کرو کہ تم ہمیں دوبارہ اسی جگہ لے چلو جہاں سے ہم سوار ہوئے تھے، وہاں پر وہ تھیلا تلاش کریں گے، اس لئے کہ وہیں کسی دکان پر وہ تھیلا ہم چھوڑ کر آئے ہیں۔ جب تھیلا مل جائے گا تو تمہیں واپسی کا کرایہ بھی دیدیں گے، وہ ٹیکسی والا

راضی ہو گیا، اور ہمیں دوبارہ اس بازار میں لے گیا۔ جب وہاں پہنچے تو رات کے ۱۲/ بج چکے تھے، اور جن دکانوں پر ہم گئے تھے، وہ سب دکانیں بند ہو گئیں، ایک ایک جگہ جا کر تلاش کیا، لیکن کوئی دکان کھلی نہیں تھی، اور جہاز کے جانے کا وقت قریب آ رہا تھا، اجنبی شہر جہاں نہ کوئی جان پہچان۔ جب تلاش کر کے مایوس ہو گئے تو میں نے کہا کہ چلو مسجد قریب ہے۔ وہاں چلتے ہیں اور صلاۃ الحاجۃ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں ــــــ چنانچہ مسجد میں جا کر صلاۃ الحاجۃ پڑھی، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی، یا اللہ! اب ہمارے لئے کوئی راستہ نہیں، اگر رات یہاں رہ گئے تو نہ ہمارے پاس پیسے ہیں۔ نہ رہنے کی کوئی جگہ ہے، نہ کوئی جاننے والا ہے، یا اللہ، آپ ہی ہمارے لئے کوئی راستہ نکال دیجئے۔

تھیلا مل گیا

ابھی ہم دعا کر کے فارغ ہوئے تھے کہ ایک آدمی گلی میں سے دوڑتا ہوا آیا، اور آ کر پوچھا کیا بات ہے؟ کیوں بیٹھے ہو؟ ہم نے بتایا کہ اس طرح ہمارا تھیلا گم ہو گیا ہے، اور ہم اس کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اس نے پوچھا کہ وہ تھیلا کیسا تھا؟ ہم نے اس کی علامتیں بتا دیں، اس نے کہا کہ اس طرح کوئی تھیلا ملا کرتا ہے جس طرح تم تلاش کر رہے ہو ــــــ اس کے بعد وہ چلا اور ہم اس کے پیچھے پیچھے چلے، اور ہم نے سوچا کہ یہ شخص اس طرح یہاں آیا ہے تو ضرور کوئی بات ہوگی ــــــ چلتے چلتے آگے گئے تو گلی میں ایک کیبن کے اندر ایک دیا ٹمٹما رہا تھا، وہ شخص اندر گیا، اور ہمیں کہا کہ ذرا تم لوگ یہاں ٹھہرو، پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ تھیلا لا کر دیدیا، اور کہا کہ تم یہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے، اور آئندہ ہرگز ایسی حرکت مت کرنا ــــــ اب ہمیں یہ بھی یاد نہیں آیا کہ ہم اس دکان پر گئے

بھی تھے یا نہیں؟

جب ساری تدبیریں ناکام ہوگئیں

جب ساری تدبیریں فیل ہوگئیں، سارے اسباب ختم ہوگئے، اس وقت جب بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا اور اپنے کرم کا نظارہ دکھاتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ جب تم یہ نظارے دیکھتے رہتے ہو کہ یہ تمام تدبیریں محض اسباب کا درجہ رکھتی ہیں، ان تدبیروں میں تاثیر پیدا کرنے والا کوئی اور ہے، تو جب آخر میں ان تدبیروں سے نگاہ ہٹ گئی، اور مسبب الاسباب کی طرف نگاہ چلی گئی، اور کسی اور طرف نہیں گئی اور یہ کہا کہ اے اللہ! میری ساری تدبیریں ناکام ہوگئیں، اب صرف آپ ہی کا سہارا ہے، آپ ہی یہ کام کریں گے ــــــ یہی بات پہلے دن کہہ دی ہوتی، جبکہ اسباب بھی موجود تھے، تدبیریں نظر آرہی تھیں کہ یا اللہ: یہ تدبیریں یہ اسباب ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں، ان میں تاثیر آپ ڈالیں گے تو کام ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا ــــــ اگر پہلے دن ہی یہ بات کہہ دو گے تو اس کا نام ''توکل'' ہے، اور اسی کا نام ''تفویض'' ہے۔

توکل کا حقیقی موقع

جو واقعہ میں نے بیان کیا اس میں تو سب کچھ ہاتھ سے نکلنے کے بعد ''تفویض'' اختیار کی ــــــ لیکن اگر ہاتھ میں پیسے موجود ہوتے، اور ٹکٹ ہاتھ میں ہوتا، پاسپورٹ ہاتھ میں ہوتا، اس وقت ''تفویض'' اور ''توکل'' اختیار کرنے کا اصل موقع تھا، اور اس وقت یہ سوچتے کہ نہ اس ٹکٹ میں کچھ رکھا ہے، نہ

ان پیسوں میں کچھ رکھا ہے، نہ اس پاسپورٹ میں کچھ رکھا ہے، بلکہ جو کچھ ہے، وہ اللہ کی عطا ہے، وہ اگر چاہیں گے تو مجھے پہنچادیں گے، وہ اگر نہیں چاہیں گے تو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی نہیں پہنچ پاؤں گا، لہٰذا جب آنکھوں سے اسباب نظر آرہے ہوں، اس وقت ''تفویض'' اور ''توکل'' کا حقیقی موقع ہے۔

اسباب کی موجودگی میں توکل کرو

چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل ''توکل'' اس وقت ہوتا ہے جب انسان کو کسی کام کو کرنے کے سارے اسباب سامنے موجود نظر آرہے ہوں ____ مثلاً گھر میں کھانا پک رہا ہے، آپ نے اپنی آنکھوں سے کھانا پکتا ہوا دیکھ لیا، اور کیا پک رہا ہے؟ یہ بھی معلوم ہے، کون پکا رہا ہے؟ یہ بھی معلوم ہے، اس بارے میں کوئی شبہ ہے کہ شام کو یہ کھانا ملے گا؟ ____ کوئی شبہ نہیں، بلکہ یقین ہے کہ شام کو افطاری کے وقت یہ کھانا ملے گا، اب اسباب سارے موجود ہیں، اس وقت ''توکل'' مطلوب ہے کہ اس وقت نگاہ ان اسباب پر نہ ہو، بلکہ اس وقت بھی نگاہ اللہ جل شانہ کی طرف ہو کہ حقیقت میں معطی وہ ہیں، اگر وہ نہ چاہیں تو ہانڈی الٹ جائے، وہ اگر نہ چاہیں تو چولہے کو آگ لگ جائے، یا کوئی اور مانع کھڑا ہو جائے، اور پتہ چلے کہ ساری محنت اکارت گئی، حاصل کچھ بھی نہ ہوا ____ بہر حال! جس وقت سارے اسباب موجود ہوں، اس وقت یہ دھیان کرنا کہ وہ اگر چاہیں گے، ملے گا، اور وہ اگر نہیں چاہیں گے، نہیں ملے گا، یہ ہے حقیقی ''توکل'' اور حقیقی ''تفویض''۔

سنت کی اتباع کیلئے تدبیر کرو

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آگے ایک ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''صاحب تفویض تو ہر امر میں ابتداء ہی سے ''تفویض'' کرتا ہے اور تدبیر جو کچھ کرتا ہے، وہ محض سنت و اطاعت سمجھ کر کرتا ہے، اس کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ تدبیر ضرور کامیاب ہی ہوگی، بلکہ وہ کامیابی اور ناکامی کو حق تعالیٰ کے سپرد کر کے کوشش کرتا ہے اور دونوں حالت میں راضی رہتا ہے''

(انفاس عیسیٰ، ص ۲۱۸)

یعنی وہ تدبیر اس لئے اختیار کر رہا ہے کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، یا مثلاً بیمار ہوا تو علاج کر رہا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور اطاعت ہے، چونکہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اسباب کو اختیار کرو، اس لئے اسباب اختیار کر رہا ہوں ـــــــ لیکن کامیابی ہوگی یا نہیں ہوگی؟ یہ میرے دائرہ اختیار سے باہر ہے ـــــــ

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جنگ صفین

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، جب جنگ صفین کے لئے روانہ ہو رہے تھے ـــــــ تو چونکہ صاحب کشف تھے ـــــــ اس لئے کسی نے آپ سے پوچھا کہ حضرت! آپ جنگ کے لئے جا رہے ہیں۔ آپ کو فتح بھی ہوگی یا نہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ فتح

نہیں ہوگی، ان صاحب نے کہا کہ پھر آپ جنگ کے لئے کیوں جا رہے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ اللہ کا حکم ہے ــــــــ دیکھئے کہ پہلے سے پتہ ہے کہ فتح نہیں ہوگی، بلکہ شکست ہوگی، لیکن پھر بھی جنگ کے لئے جا رہے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ جانے کا حکم ہے، بہرحال! تدبیر اس لئے اختیار کی جا رہی ہے کہ اللہ کا حکم ہے اور اس حکم کی تعمیل میں تدبیر ہو رہی ہے۔

حضرت میاں صاحب کا عجیب واقعہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سنایا جو بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، دارالعلوم دیوبند کے اونچے درجے کے اساتذہ میں سے تھے، مادرزاد ولی اللہ تھے ــــــــ میرے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں صاحب کے استاذ تھے، وہ فرماتے تھے کہ جب میاں صاحب میرے پاس پڑھتے تھے، اس وقت یہ بچے تھے اور میں اس وقت ان کو مادرزاد ولی اللہ کہا کرتا تھا، اس لئے کہ میں نے کبھی ان سے کوئی خلاف اولیٰ کام ہوتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

ایک مرتبہ درس گاہ میں کسی بچے سے دری پر سیاہی گر گئی، استاذ ناراض ہوئے اور بچوں سے پوچھا کہ کس نے یہ سیاہی گرائی ہے اور دری خراب کر دی؟ اب تمام بچے خاموش، کسی نے اقرار نہیں کیا۔ یہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ حضرت: مجھ سے غلطی ہوگئی، حالانکہ وہ سیاہی کسی اور بچے نے گرائی تھی، لیکن ان کا بھی ہاتھ لگ گیا تھا، جس بچے نے گرائی تھی، وہ تو نہیں بولا، لیکن یہ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ بہرحال! بچپن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو مادرزاد ولی اللہ بنایا تھا۔ ایسے بزرگ تھے۔

حضرت میاں صاحب پاکستان کے حامی تھے

حضرت میاں صاحب کا تعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے سے تھا، اگرچہ ان کے شیخ تو کوئی اور تھے، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے شیخ کی جگہ تصور کرتے تھے ــــــ جس وقت پاکستان بنانے کی تحریک چل رہی تھی تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ پاکستان بننے کے حق میں تھے، جبکہ دوسری طرف حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء پاکستان بننے کے حق میں نہیں تھے، اس اختلاف کے وقت کچھ علماء مسلم لیگ کے حق میں تھے، اور کچھ علماء کانگریس کے حق میں تھے، اس اختلاف کے وقت حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تھے۔ یعنی پاکستان بننے کے حق میں تھے اور پاکستان کے لئے کوشش کرنے والوں کے ساتھ تھے۔

نماز استسقاء کا عجیب واقعہ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ اسی زمانے میں ایک مرتبہ دیوبند میں بارش رک گئی اور کافی دنوں تک بارش نہیں ہوئی، دارالعلوم دیوبند کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ چونکہ بارش نہیں ہو رہی ہے۔ اس لئے فلاں وقت میں نماز استسقاء پڑھی جائے گی اور تین روز تک نماز پڑھی جائے گی ــــــ چنانچہ پہلے دن تمام طلباء اور اساتذہ نماز استسقاء کے لئے میدان کی طرف چلے تو حضرت میاں صاحب بھی تشریف لے جانے لگے، چونکہ صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے، اس لئے میرے والد صاحب نے ان سے پوچھا کہ حضرت بارش ہوگی بھی یا نہیں؟ فرمایا: بارش وارش تو نہیں ہوگی، بس سنت کا ثواب حاصل کرنے

کے لئے جارہا ہوں، خیر: نماز کے لئے گئے، نماز پڑھی، اور واپس آ گئے، کوئی بارش نہیں ہوئی ________

اگلے دن صبح پھر نماز استسقاء کے لئے روانہ ہوگئے، میں نے کہا حضرت: آج پھر جارہے ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ دیکھو: میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ثواب حاصل کرنے کے لئے اور سنت پر عمل کرنے کے لئے چلو، بارش وارش نہیں ہونی ________ گئے، نماز پڑھی، اور واپس آ گئے ________

تیسرے دن پھر نماز استسقاء کے لئے روانہ ہوگئے۔ لیکن جب تیسرے دن نماز کے لئے میدان میں پہنچے تو صفیں بن رہی تھیں اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا انتظار ہو رہا تھا، کہ آپ تشریف لائیں گے اور نماز پڑھائیں گے۔ جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو حضرت میاں صاحب نے ان سے فرمایا کہ حضرت! اجازت ہو تو آج میں نماز پڑھا دوں؟ اب لوگ ان کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ میاں صاحب آج نماز پڑھانے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ جبکہ آج تک آپ نے پنج وقتہ نماز بھی کبھی نہیں پڑھائی، چہ جائیکہ فرمائش کر کے امامت کریں ________ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے اچھی کیا بات ہے، آپ ضرور نماز پڑھائیں۔ چنانچہ تیسرے دن آپ نے نماز پڑھائی، اور واپس تشریف لے آئے، اور بارش نہیں ہوئی۔

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ میں بڑا حیران ہوا کہ تین دن سے یہ فرما رہے تھے کہ بارش وارش نہیں ہوگی، اور کبھی ساری عمر امامت نہیں کی، لیکن آج باقاعدہ فرمائش کر کے امامت کرائی، ایسا کیوں کیا؟ بعد میں میں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا قصہ ہے؟ آپ نے تو کبھی نماز نہیں پڑھائی،

لیکن آج آپ نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمائش کی کہ آج میں نماز پڑھاؤں؟ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کو نماز پڑھانے کا بڑا شوق ہے ـــــ جواب میں فرمایا: ارے میاں چھوڑو ان باتوں کو ـــــ یہ کہہ کر بات ٹلا دی، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بے تکلفی بہت تھی، اس لئے حضرت والد صاحب نے اصرار کیا کہ نہیں حضرت! آپ بتائیں، کیا قصہ ہے؟

اللہ والوں کی نرالی شان

فرمانے لگے کہ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر یہ منکشف فرما دیا تھا کہ بارش وارش تو ہونی نہیں، اور تین دن سے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نماز پڑھا رہے تھے، تم جانتے ہو کہ یہ مسلم لیگ والے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں، اگر حضرت مدنی تین دن تک نماز پڑھاتے اور پھر بھی بارش نہ ہوتی تو لوگ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں گستاخیاں کرتے، اور یہ کہتے کہ دیکھو، حضرت مدنی نے چونکہ نماز پڑھائی اس لئے بارش نہیں ہوئی ـــــ اس لئے مجھے خیال آیا کہ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاؤں، اور یہ الزام تنہا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر نہ آئے، اس وجہ سے تیسرے دن میں نے کہا کہ میں نماز پڑھاؤں گا۔ اب یہ ایسی بات تھی جو نہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم تھی اور نہ کسی اور کو معلوم تھی۔

پہلے اونٹ کو بیماری کہاں سے لگی؟

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے آکر کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ تو فرماتے ہیں کہ

"لَاعَــــدْوٰی" یعنی ایک کی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک اونٹ خارش زدہ ہوتا ہے، جب وہ دوسرے اونٹ کے پاس جاتا ہے تو اس کو بھی خارش ہو جاتی ہے، تیسرے کے پاس جاتا ہے تو تیسرے کو بھی خارش ہو جاتی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ایک کی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی ـــــــ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ سب سے پہلے اونٹ کو خارش کہاں سے لگی؟ اب وہ خاموش ہو گئے ـــــــ مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ سمجھ رہے ہو کہ جب بھی بیماری ہو گی، وہ عدویٰ کی وجہ سے ہو گی، یا ایک کو بیماری ہو گی تو وہ ضرور دوسرے کو لگے گی، یہ جو تم نے دل میں ملازمہ قائم کر رکھا ہے کہ یہ اس بات سے ٹوٹ جاتا ہے کہ پہلے اونٹ کو بیماری کہاں سے لگی؟ معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم "لَاعَـدْوٰی" کے ذریعہ اس عقیدے کی نفی فرما رہے ہیں جس کو تم نے علت تامہ قرار دیدیا ہے۔

احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں

لیکن اگر سبب محض کا درجہ دیدیا ہو کہ جس طرح بیماری کے دوسرے اسباب ہوتے ہیں، یہ بھی ایک سبب ہے، ایک کے جراثیم دوسرے کی طرف منتقل ہو گئے، یہ بات اس حدیث کے منافی نہیں۔ اسی بنا پر ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فِرَّمِنَ الْمَجْذُوْمِ فِرَارَكَ مِنَ الْاَسَدِ

کوڑھی کی بیماری والے سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو، یا ایک دوسری حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بیمار اونٹ کسی صحت منداونٹ کے

پاس لاکر نہ اتارا جائے ـــــــ یا ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ جہاں طاعون پھیل جائے، وہاں سے نکلو نہیں، اور باہر والا آدمی اندر جائے نہیں ـــــــ یہ سب احتیاطی تدابیر ہیں کہ اسباب کے درجہ میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، جب تک اس سبب کو انسان ''علت حقیقیہ'' نہ سمجھے، اور جب تک یہ بات نہ ہو کہ یہی سبب کام بنانے والا ہے۔

نگاہ مسبب الاسباب پر ہو

اگر اسباب کے ساتھ نگاہ مسبب کی طرف بھی ہے، تو پھر کوئی بھی تدبیر اختیار کرو، مضائقہ نہیں، چاہے علاج کرو، چاہے حفظ ماتقدم کی تدبیریں کرو، چاہے کوئی اور سبب اختیار کرو، کوئی چیز مضر نہیں، اور نہ ہی توکل کے خلاف ہے۔ جب تک دل میں یہ بات ہو کہ اصل تاثیر دینے والا ''اللہ'' ہے، اس کی تاثیر کے بغیر کوئی سبب مؤثر نہیں ہوسکتا ـــــــ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ ایسا شخص تدبیر سنت سمجھ کر کرتا ہے۔ اور اس کی نگاہ اس تدبیر کی طرف نہیں ہوتی، بلکہ اس کی نگاہ مسبب الاسباب کی طرف ہوتی ہے، یہ ہے ''توکل'' اور بعد میں انجام کیا ہوتا ہے؟ تدبیر کامیاب ہوتی ہے، یا ناکام ہوتی ہے، اس بارے میں وہ معاملہ اللہ کے حوالے کردے کہ جو مانگا تھا، وہ ملتا ہے، یا نہیں ملتا، دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ جو فیصلہ کریں گے، میں اس پر راضی ہوں یہ ہے ''تفویض''

منزل سے بے نیاز ہو جاؤ

بنا کر بے نیازِ راہ و منزل
کوئی لے جا رہا ہے جا رہا ہوں

یعنی مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ منزل ملے گی یا نہیں ملے گی؟ میں نے اپنی دانست میں جو صحیح راستہ تھا، وہ اختیار کرلیا ہے، اس کے بعد مجھے منزل ملتی ہے یا نہیں؟ اس کی مجھے پرواہ نہیں

یا بم اورا نیابم جستجوئے می کنم

مجھے وہ ملیں یا نہ ملیں، میں جستجو کر رہا ہوں ـــــــ یہ جستجو کرنا اور تدبیر اختیار کرنا بذات خود مقصود ہے، اور انسان کامیابی اور ناکامی سے قطع نظر کرلے، یہ ''تفویض'' ہے، اور جس دن ''تفویض'' حاصل ہوگئی، بس اس دن راحت حاصل ہوگئی، دنیا میں راحت حاصل کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ کوئی نہیں ـــــــ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں تفویض عطا فرمادے اور توکل بھی عطا فرمادے۔ آمین

و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

❁❁❁
❁

لا إله إلا الله محمد رسول الله

الله

ادخلوها بسلام آمنين

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا حکم سمجھ کر تفویض اختیار کرو

مجلس نمبر 108

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی.
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	108

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا حکم سمجھ کر تفویض اختیار کرو

مجلس نمبر 108

الحمدللہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رسولہ الکریم، وعلٰی آلہ وأصحابہ اجمعین۔ امابعد:

تفویض

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

"تفویض سے بڑھ کر راحت کا ذریعہ دنیا میں کوئی نہیں، مگر راحت کی نیت سے تفویض کرنا دین نہیں، بلکہ دنیا ہے، حقیقی تفویض وہ ہے جس میں یہ بھی قصد نہ ہو کہ اس سے چین ملے گا، بلکہ محض رضا حق کا ارادہ ہو"۔ (انفاس عیسی، ص ۲۱۹)

کئی دن سے تفویض کا بیان چل رہا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے سارے معاملات اللہ کے حوالے کر دینا کہ اے اللہ! آپ ہی اس بات کو جاننے والے ہیں کہ کونسی چیز میرے حق میں بہتر ہے اور کونسی چیز میرے حق میں بہتر نہیں۔ میں اپنی طرف سے تدبیر کرنے کے بعد اور دعا کرنے کے بعد اپنا معاملہ آپ کے حوالے کرتا ہوں، آپ جو فیصلہ کریں گے، وہ فیصلہ مجھے منظور ہوگا۔ اور

میں اس پر راضی رہوں گا، یہ ہے حاصل تفویض کا۔

تجویز کے نتیجے میں تکلیف ہوگی:

چنانچہ اس ملفوظ میں حضرت والا فرمار ہے ہیں کہ: ''تفویض سے بڑھ کر راحت کا ذریعہ دنیا میں کوئی اور نہیں کہ آدمی تفویض اختیار کرے، یعنی اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کردے کہ جو کچھ وہ میرے حق میں فیصلہ کریں گے وہ بہتر ہوگا، کیونکہ اگر تم تفویض اختیار نہیں کرو گے تو اس کی ضد ''تجویز'' ہے، اور تجویز کا مطلب یہ ہے کہ اپنی طرف سے آدمی یہ طے کرلے یہ معاملہ اس طرح ہونا چاہئے، فلاں معاملہ اس طرح ہونا چاہئے۔ فلاں ملازمت ملنی چاہئے، اور اتنی تنخواہ ملنی چاہئے، میرا گھر ایسا ہونا چاہئے، میری گاڑی ایسی ہونی چاہئے، ایسے اسباب راحت ہونے چاہئیں، دل میں اپنی طرف سے تجویز کر رکھا ہے، اب جو تجویز خود سے کر رکھی ہے، کیا اس تجویز کے مطابق ہر چیز مل جائے گی؟ نہیں ملے گی، کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ، بڑے سے بڑا صاحب اقتدار، بڑے سے بڑا سرمایہ دار، کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ جو میں چاہتا ہوں، وہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ تم جو اپنے لئے تجویز کرو گے کہ مجھے فلاں چیز مل جائے۔ فلاں چیز مل جائے۔ تو اس میں سے کچھ تو مل جائے گا، اور کچھ نہیں ملے گا، اور اب جبکہ دل میں تو یہ خواہش ہے کہ فلاں چیز مل جائے، اور وہ چیز نہیں ملی، تو اس کے نتیجے میں صدمہ اور غم اور تکلیف ہوگی۔

پھر تو راحت ہی راحت ہے:

یاد رکھو! یہ صدمہ، غم اور تکلیف اس وقت ہوتی ہے جب انسان کی

خواہش پوری نہ ہو، اور جب خواہش ہی کوئی نہیں، بلکہ معاملہ اللہ کے حوالے کر رکھا ہے کہ یا اللہ، آپ جو میرے حق میں کریں گے، وہ میرے لئے بہتر ہوگا اور میں اس پر راضی ہوں، پھر صدمہ اور تکلیف نہیں ہوگی ___ پھر تو راحت ہی راحت ہے۔ مثلاً کسی کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ اس ماہ مجھے ایک لاکھ روپے ملنے چاہئے، اب ایک لاکھ روپے حاصل کرنے کی کوشش کی، تدبیر بھی کی، اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کی، لیکن ساتھ ہی دل میں یہ اعتقاد ہے کہ یا اللہ! میرے حق میں خیر ہوگا تو آپ دلوادیں گے، اور اگر میرے حق میں خیر نہیں ہوگا، تو نہیں دلوائیں گے، اور میں آپ کے فیصلے پر راضی ہوں، جو آپ فیصلہ کریں گے، وہی بہتر ہے ___ اب وہ ایک لاکھ روپے نہیں ملے، تو اب صدمہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ پہلے ہی سے یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر نہیں ملیں گے تو بھی میں اس پر راضی ہوں گا۔

ہر خواہش پوری نہیں ہوسکتی:

لیکن اگر ''تفویض'' کی صفت حاصل ہے، تو اس وقت یہ ہوگا کہ بیشک میری یہ خواہشات ہیں۔ لیکن یا اللہ! فیصلہ آپ ہی کا برحق ہے۔ آپ جو فیصلہ کریں گے وہ خیر ہوگا، میں اس پر راضی ہوں۔ جب یہ بات ہوگی تو پھر اگر کوئی خواہش پوری نہیں ہوگی تو اس پر کوئی صدمہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم نے تو پہلے ہی یہ معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا تھا، اب اس صورت میں تکلیف نہیں ہوگی۔ معمولی سا صدمہ ہوسکتا ہے، کہ میری یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ لیکن وہ تکلیف کے درجہ میں نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ تفویض کر رکھی ہے۔ اس لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اس

کائنات میں تفویض سے بڑھ کر کوئی نسخہ راحت حاصل کرنے کا نہیں۔ اس لئے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دو۔ بس۔ وہ جانے، ان کا کام جانے۔

جبری تفویض کو اختیاری تفویض بنالو:

حقیقت تو یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی تو جبری طور پر تفویض کرنا ہی پڑتا ہے، کیونکہ تفویض کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ لیکن آپ اس ''جبری تفویض'' کو ''اختیاری تفویض'' بنالو، اور اللہ سے یوں کہو کہ اے اللہ! جو بھی آپ فیصلہ کریں گے۔ میں اس پر راضی ہوں۔ آپ کا فیصلہ برحق ہے، بس! اس سے آپ کو راحت حاصل ہو جائے گی۔

تجویز میں تکلیف ہے:

اس لئے کہ ساری تکلیف اپنی طرف سے تجویز کرنے کی وجہ سے ہوتی ہیں کہ فلاں کام اس طرح ہو جائے۔ فلاں کام یوں ہو جائے اور ضرور ہو جائے۔ پھر جب اس کے خلاف ہوتا ہے تو صدمہ اور تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن جب معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا تو اب کوئی تکلیف نہیں۔ بہرحال! راحت تفویض ہی میں ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ

چنانچہ پرسوں میں نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنایا تھا کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ کہا کہ اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہی نہیں ـــــــ لوگوں نے

اعتراض کیا کہ یہ کیسے ہوگیا۔ یہ چیز تو بڑے بڑے پیغمبروں کو حاصل نہیں ہوتی کہ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو، انہوں نے جواب دیا کہ دراصل میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو اللہ کی مرضی، وہی میری مرضی۔ وہ اگر یہ چاہ رہے ہیں کہ مجھے زخم لگے تو میری مرضی بھی یہی ہے۔ وہ اگر چاہ رہے ہیں کہ مجھے صدمہ ہو۔ میری مرضی بھی یہی ہے۔ اس لئے سب کام میری مرضی سے ہو رہے ہیں۔ بہر حال! راحت اسی سے حاصل ہوتی ہے۔

راحت کی نیت سے تفویض مت کرو:

لیکن ایک باریک نکتہ حضرت والا آگے بیان فرما رہے ہیں کہ: وہ یہ کہ تفویض جو کرو، وہ راحت حاصل کرنے کی نیت سے مت کرو، بلکہ اللہ کے لئے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کی نیت سے تفویض کرو، کیونکہ اگر راحت حاصل کرنے کی نیت سے تفویض کرو گے تو یہ دنیا داری ہوگئی، دین داری نہ ہوئی، اللہ کی رضا مقصود نہ ہوئی۔ مزہ اور لذت حاصل کرنی مقصود ہوگئی۔

نماز سے مقصود اللہ کی رضا ہے:

اسی سے وہ بات بھی واضح ہوگئی کہ یہ جو نماز اور دوسری عبادات ہیں، ان سے مقصود اللہ کو راضی کرنا ہے، لہٰذا اس فکر میں مت پڑو کہ نماز میں مزہ آتا ہے یا نہیں؟ بہت سے لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہم نماز پڑھتے ہیں، مگر مزہ ہی نہیں آتا۔ ارے بھائی! کیا مزہ حاصل کرنے کی خاطر نماز پڑھ رہے تھے؟ نماز تو اللہ کو راضی کرنے کے لئے پڑھ رہے تھے۔ لہٰذا اس فکر میں نہ رہو کہ اس میں مزہ آ رہا ہے، یا نہیں آ رہا ہے۔ بلکہ اگر مزہ نہیں آ رہا ہوگا۔ مگر تم پھر بھی اللہ کو راضی کرنے

کے لئے نماز پڑھتے رہو گے تو اس میں اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا۔ وہ نماز اتنی ہی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوگی۔ اس لئے کہ باوجود یکہ نماز پڑھنا اس کو مشکل لگ رہا تھا۔ نماز میں مشقت محسوس ہو رہی تھی، اور اس کو مزہ نہیں آرہا تھا، اس کے باوجود یہ بندہ میرے حکم کی اطاعت میں کھڑا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کو اجر و ثواب بھی زیادہ دوں گا۔

قابل مبارک باد شخص:

اس وجہ سے نماز کے اندر مزہ حاصل ہونے کی فکر مت کرو۔ ہاں، اگر کبھی مزہ آجائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا انعام تصور کرو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، لیکن اگر نماز کے اندر مزہ نہیں آیا تو اس کی وجہ سے یہ مت سمجھو کہ میری نماز بیکار ہوگئی، کیونکہ نماز پڑھنے سے مقصود مزہ حاصل کرنا تھا ہی نہیں ______ سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

> ''جس شخص کو ساری عمر نماز میں مزہ نہ آیا، پھر بھی وہ ساری زندگی نماز پڑھتا رہا، میں اس کو دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی عبادت مکمل اخلاص والی عبادت ہے''۔

کیونکہ جس شخص کو نماز میں مزہ آرہا ہو، اس کے بارے میں خطرہ ہوسکتا ہے کہ یہ شخص جو نماز پڑھ رہا ہے، یہ مزہ حاصل کرنے کے لئے پڑھ رہا ہے۔ اگر مزہ کے لئے پڑھ رہا ہے تو پھر اخلاص نہ ہوا۔ وہ نماز اللہ کے لئے نہ ہوئی۔ لیکن جس شخص کو نماز میں مزہ نہیں آرہا ہے۔ اس کے باوجود وہ پابندی سے نماز پڑھا جا

رہا ہے، اس کے اندر اخلاص کے سوا اور کیا ہوگا؟

مزہ کی خاطر نماز نہ پڑھے:

لہٰذا اگر کبھی نماز کے دوران خشوع خضوع طاری ہو جائے۔ اور لطف آ جائے، یا کیفیت طاری ہو جائے، یا رونا آ جائے، تو یہ بہت اچھا ہے، نعمت ہے، اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، لیکن اگر کبھی ایسا نہ ہو تو یہ مت سمجھو کہ میری نماز قبول نہیں ہو رہی ہے۔ اور میری یہ نماز بیکار جا رہی ہے، اور جو میرا مقصد حاصل ہو رہا تھا، وہ اب حاصل نہیں ہو رہا ہے، اور شاید اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت میں کمی آ گئی ہے بہت سے لوگ مجھے خط کے اندر یہی باتیں لکھتے ہیں ـــــ خوب سمجھ لیں کہ اس کے نتیجے میں نہ مقبولیت میں کمی آتی ہے، اور نہ ہی انسان راندہ درگاہ ہوتا ہے، اگر مزہ نہیں آ رہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، بس شرط یہ ہے کہ انسان کام نہ چھوڑے، نماز نہ چھوڑے، بلکہ یہ عزم کرے کہ نماز میں مزہ آئے تو بھی پڑھوں گا، مزہ نہ آئے تو بھی پڑھوں گا، کیونکہ مقصود تو اللہ کو راضی کرنا ہے، اور اللہ کے حکم کی اطاعت ہے ـــــ بس یہ کرتے رہو، بیڑہ پار ہو جائے گا۔

ایک لطیفہ:

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ بعض اوقات ہنسی مذاق کی بات بھی کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک صاحب آئے، اور کہا کہ حضرت! میں کیا کروں، نماز میں مزہ ہی نہیں آتا۔ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ مزہ تو مذی میں ہے ـــــ نماز میں کہاں مزہ تلاش کر رہے ہو ـــــ مطلب یہ تھا کہ نماز اس لئے پڑھنا کہ نماز میں لطف اور مزہ آئے، ارے اللہ تعالیٰ نے نماز لطف اور مزہ کے لئے

نہیں رکھی، بلکہ نماز تو اللہ کی اطاعت کے لئے ہے، جب تک تم اطاعت کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں مقصود حاصل ہے۔

مزہ کی خاطر دوبارہ نماز پڑھنا:

بہر حال! جس طرح نماز میں مزہ آنے لگے، اور سرور طاری ہو جائے، اور کیف آنے لگے تو یہ اللہ کی نعمت ہے۔ لہٰذا اس پر شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت دیدی۔ لیکن اگر مزہ نہ آئے، سرور طاری نہ ہو تو اس کی وجہ سے نماز کو بیکار مت سمجھو، نماز پھر بھی نماز ہے ــــــ اب اگر کسی کو نماز میں مزہ آیا، اور اس نے سوچا کہ آج دوبارہ اس مزہ کو حاصل کرنے کی خاطر نماز پڑھتے ہیں، تو اب نماز پڑھنے کا مقصود ''مزہ'' حاصل کرنا ہو گیا، اب اخلاص نہ رہا، اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا مقصود نہ رہا ــــــ تو جس طرح نماز کے اندر مزہ کو مقصود بنانا، نماز کو غارت کر دیتا ہے، اسی طرح اگر چہ ''تفویض'' سے راحت حاصل ہوتی ہے، لیکن تفویض کا مقصود ہی راحت کو قرار دیدینا کہ میں اس لئے تفویض کر رہا ہوں، تاکہ مجھے راحت ملے، تاکہ آرام ملے تو یہ غلط ہے، بلکہ تفویض صرف اللہ کی رضا کے لئے ہونی چاہئے، ہاں، اگر اس تفویض کے نتیجے میں راحت حاصل ہو جائے تو یہ بہت اچھی بات ہے، اس پر شکر ادا کرو، لیکن راحت کی خاطر تفویض مت کرو۔

بڑھ گئی اور خلش ترکِ تمنا کر کے:

میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی صاحب مرحوم، شاعر تھے، اور شعر میں تصوف کی باتیں بھی کہا کرتے تھے۔ اسی مضمون پر ان کا ایک شعر ہے کہ:

حسرتِ ترکِ تمنا بھی تمنا نکلی

بڑھ گئی اور خلش ترکِ تمنا کر کے

یعنی تفویض کے معنی ہیں ''تمنا کو ترک کر دینا'' تو اس تفویض کو حاصل کرنے کی تمنا کرنا، تاکہ مجھے تفویض حاصل ہو جائے، یہ بھی ایک تمنا ہے، اب جو میں نے تمنا کو ترک تو کیا، لیکن اللہ کی خاطر نہیں کیا۔ بلکہ مزہ حاصل کرنے کے لئے کیا تو اس کے نتیجے میں بجائے راحت حاصل ہونے کے اور خلش بڑھ گئی۔

تین ترک:

صوفیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے بڑی باریک بین نگاہ عطا فرمائی ہے، چنانچہ صوفیاء کے یہاں تین ''ترک'' مشہور ہیں: ① ترک دنیا ② ترک عقبیٰ ③ ترکِ ترک، ایک تو دنیا کو ترک کرنا۔ اور دنیا کو ترک کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے پاس جو مال و دولت ہے، اس کو ختم کر دو ــــــ نہیں، بلکہ ترک دنیا کا مطلب ہے، دنیا کی محبت دل سے نکال دینا ــــــ پھر فرمایا ترکِ عقبیٰ، ترک عقبیٰ کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو عبادت کرے وہ اس نیت سے نہ کرے کہ مجھے اس کے بدلے میں جنت کے اندر پھل ملیں گے، اور اس میں بڑا مزہ آئے گا ــــــ بلکہ عبادت صرف اللہ کی رضا کے لئے کرے، ترکِ عقبیٰ کے یہ معنی ہیں۔

ترکِ ترک کی حقیقت:

تیسری چیز ہے ''ترکِ ترک'' یعنی یہ جو دنیا کی محبت چھوڑی ہے، اسے چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ کہ میں نے یہ چیز ترک کر دی ہے۔ اسی کو ''ترکِ ترک'' کہا جاتا ہے، کیونکہ اگر اس ترک کا خیال دل میں آ گیا تو وہ بھی طلب دینا ہو جائے گی ــــــ اب سوال یہ ہے کہ یہ بہت باریک بات کیسے

حاصل ہو؟ کہ دنیا بھی چھوڑی، دنیا کی محبت بھی چھوڑی، اور عقبیٰ کو بھی چھوڑا، اور اب اسے چھوڑنے کے خیال کو بھی چھوڑ دیں؟ یہ کیسے حاصل ہوگا؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ یہ کیسے حاصل ہوسکتی ہے، فرمایا کہ جب تم سو جاتے ہو، تو اس وقت تم دنیا سے بے خبر ہو جاتے ہو، اور تمہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ تمہارے آس پاس کیا ہو رہا ہے، لیکن اگر تمہیں اس وقت یہ پتہ ہو کہ میں سو رہا ہوں، یہ سونا ہوگا؟ نہیں، بلکہ وہ کچی نیند ہے، کیونکہ آپ کو پتہ ہے کہ میں سو رہا ہوں، اصلی نیند اس وقت ہوگی جب آدمی کو یہ بھی پتہ نہ ہو کہ میں سو رہا ہوں۔ سونے کا احساس بھی ختم ہو جائے، تب حقیقت میں پکی نیند اور پکا سونا ہوگا۔ اس کا نام ''ترکِ ترک'' ہے، یعنی محبت دنیا بھی چھوڑی، اور محبت دنیا چھوڑنے کا احساس اور خیال بھی چھوڑ و، تب حقیقت میں ''ترکِ دنیا'' ہوگی، ورنہ اگر تمہارے دل میں یہ احساس ہے کہ میں بڑا زاہد ہوں، میں نے دنیا چھوڑ رکھی ہے، یہ تو ''ترک دنیا'' کا دھوکہ ہے، حقیقت میں ''ترکِ دنیا'' نہ ہوئی۔

تمام صفات میں ترکِ ترک ہونی چاہئے:

جیسے ''تواضع'' کی صفت ہے، تواضع کے معنی ہیں کہ اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھنا، یہ اس وقت صحیح ہوتی ہے جب آدمی واقعۃً اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھ رہا ہو، اور اس کو یہ خیال بھی نہ ہو کہ میں تواضع اختیار کر رہا ہوں، اگر کوئی شخص یہ سوچ کر تواضع کرے کہ میں تواضع اختیار کر رہا ہوں، تو وہ حقیقت میں تواضع نہ ہوئی۔ بلکہ تواضع کا دھوکہ ہوگیا ــــــ اسی کا نام ''ترکِ ترک'' ہے ــــــ اسی طرح انسان ''تفویض'' اختیار کرے، اور اس کو یہ خیال بھی نہ ہو کہ اس کے

ذریعے مجھے راحت حاصل ہو جائے گی، اسی طرح ترکِ دنیا ہو، لیکن ترکِ دنیا ہونے کا بھی احساس نہ ہو ـــــ یہ صوفیاء کرام کی باریک باتیں ہیں ـــــ یہ حضرات نفسیات کی بڑی گہری باتیں بتاتے ہیں۔

ہر کام اللہ کیلئے کرو:

خلاصہ یہ ہے کہ ''تفویض'' اختیار کرو، لیکن راحت حاصل کرنے کی نیت سے ''تفویض'' مت کرو ـــــ یہ بات تمام عبادات پر عائد ہوتی ہے۔ مثلاً نماز پڑھو تو صرف اللہ کی رضا کے لئے پڑھو، روزہ رکھو تو محض اللہ کی رضا کے لئے رکھو، مزہ حاصل کرنے اور لذت حاصل کرنے کی غرض سے نہ رکھو، مثلاً اگر کوئی شخص یہ سوچ کر روزہ رکھے کہ روزہ رکھنے سے صحت اچھی ہو جائے گی، پیٹ درست ہو جائے گا، اور شام کو افطاری کے وقت بڑی لذت حاصل ہو جائے گی، تو اس صورت میں وہ روزہ نہ ہوا، روزہ وہ ہے جو اللہ کے لئے رکھا جائے، چاہے اس سے پیٹ درست ہو جائے، اور افطاری میں لذت حاصل ہو جائے، لیکن یہ مقصود نہ ہو ـــــ یہی بات حضرت والا اس ملفوظ میں بیان فرما رہے ہیں کہ ''راحت کی نیت سے تفویض کرنا دین نہیں، بلکہ دنیا ہے۔ حقیقی ''تفویض'' وہ ہے جس میں یہ بھی قصد نہ ہو کہ اس سے چین ملے گا۔ بلکہ محض رضاءِ حق کا قصد ہو''

اسلام کی حقیقت:

آگے ایک اور ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

''اسلام کی حقیقت ''تفویض'' ہے، جو تمام حالات کو شامل ہے، خواہ حالات آفاقیہ ہوں، خواہ حالات انفسیہ ہوں، پھر

انفسیہ میں خواہ حسیہ ہوں، جیسے مرض وصحت اور قوت وضعف،
خواہ باطنیہ ہوں، جیسے قبض وبسط، ہیبت وانس، اور محبت وشوق
وامثالہا، سب کو اپنے سر آنکھوں پر رکھے''

(انفاس عیسیٰ ص ۲۲۰)

فرمایا کہ: ''اسلام کی حقیقت تفویض ہے'' یعنی اسلام کے عربی زبان میں تقریباً وہی معنی ہیں جو تفویض کے ہیں، اس لئے کہ اسلام کے معنی ہیں'' اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا:

اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ لِلّٰہِ ربّ الْعَالَمِیْنَ

میں نے اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے سپرد کر دیا۔

یہ ہے اسلام، لہٰذا جو معنی تفویض کے ہیں، وہی معنی اسلام کے ہیں۔

آفاقی حالات میں تفویض:

آگے فرمایا کہ ''جو تمام حالات کو شامل ہے'' یعنی ہر حالت میں تفویض اختیار کرے، ہر معاملہ اللہ کے حوالے کرے، اور تقدیر پر راضی رہے، ''خواہ حالات آفاقیہ ہوں''، آفاقی حالت جیسے گرمی لگ رہی ہے، تو اس وقت تفویض اختیار کرو کہ اللہ کو ایسا ہی منظور ہے، اس لئے گرمی ہو رہی ہے، اور میں اس پر راضی ہوں، سخت سردی پڑ گئی تو اللہ کی مرضی ایسی ہی ہے، میں اس پر راضی ہوں'' البتہ دعا مانگنا تفویض کے خلاف نہیں۔ مثلاً یہ دعا کی کہ یا اللہ! گرمی بہت لگ رہی ہے، اپنی رحمت سے گرمی کو دور فرما دیجئے، یا اللہ! بارش نہیں ہوئی، بارش عطا فرما دیجئے ____ یا اللہ! سردی بہت ہوگئی ہے۔ اس میں کمی کر دیجئے ____ لہٰذا دعا

مانگنا تفویض کے خلاف نہیں۔ لیکن دعا کرنے کے بعد جو کچھ پیش آئے، اس کو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کے مطابق قرار دینا اور اُسی میں بہتری سمجھنا تفویض ہے۔

نفسی حالات میں تفویض:

خواہ ''نفسی'' حالات ہوں، یعنی انسان کے اپنے جسم میں پیدا ہونے والے حالات، جیسے کہ کبھی کوئی بیماری آ گئی، کبھی صحت آ گئی، اور کبھی قوت آ گئی، اور کبھی ضعف آ گیا، ان حالات میں علاج ضرور کرے، تدبیر ضرور کرے، لیکن اگر شفا حاصل ہونے میں دیر لگ جائے تو پھر اس کو اللہ کے حوالے کرے کہ میرے لئے اسی میں خیر ہے ــــــ خواہ ''باطنی'' حالات ہوں، جیسے قبض و بسط، یعنی کبھی تو خوب نماز کا، عبادتوں کا ذوق اور شوق پیدا ہو رہا ہے، اور کبھی انقباض ہو رہا ہے، اور طبیعت عبادات کی طرف نہیں چل رہی ہے، اور پانچ وقت نماز پڑھنا مشکل ہو رہا ہے، مسجد تک جانا مشکل ہو رہا ہے، یہ سب ''قبض'' کے نتیجے میں پیش آ رہے ہیں ــــــ اور ''بسط'' کے معنی یہ ہیں کہ نماز کی طرف خوب رغبت ہے، اور بڑی خوشی سے مسجد کی طرف جا رہا ہے، یہ سب حالات انسان پر آتے جاتے رہتے ہیں ــــــ ان سب حالات میں ''تفویض'' مطلوب ہے۔

مسجد جانا نہ چھوڑے

لہٰذا اگر کبھی طبیعت عبادت کی طرف نہیں چل رہی ہے اور نماز کے لئے مسجد کی طرف جانے کا شوق نہیں ہو رہا ہے تو اس کو بھی اللہ کے حوالے کر دو کہ یا اللہ! یہ کیفیت بھی آپ کی پیدا کردہ ہے، آپ ہی کا فیصلہ ہے، اور میں تو آپ کے

اس فیصلے پر راضی ہوں ____ لیکن اصل بنیادی بات یہ ہے کہ نماز کے لئے مسجد جانا نہ چھوڑے، چاہے قبض ہو، یا بسط ہو، طبیعت میں انقباض ہو، یا بشاشت ہو، مسجد کی طرف جانے کا دل نہیں چاہ رہا ہے، اور طبیعت پر گرانی ہو رہی ہے، اس وقت یہ کہو کہ میں ضرور مسجد جاؤں گا، چاہے میرے دل پر آرے چل جائیں۔ چاہے میرے سر پر پہاڑ ٹوٹ جائے، لیکن مسجد ضرور جاؤں گا ____ اگر یہ کام کرلیا تو پھر قبض کی وہ کیفیت جو تمہارے لئے نقصان دہ ہو رہی تھی، وہ کیفیت تمہارے لئے مزید اجر و ثواب کا باعث بن جائے گی۔ انشاء اللہ

بہار ہو کہ خزاں لا اِلٰہ الا اللہ

اقبال بعض اوقات بڑی حکیمانہ بات کہتے ہیں، ان کا ایک شعر ہے کہ:

یہ نغمہ فصل گلِ و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

چاہے موسم کیسا بھی ہو، ہر وقت لا الٰہ الا اللہ پڑھنا ہے، یہ نہیں کہ جب پھولوں کا اور بہار کا موسم آئے گا تو لا الٰہ اِلا اللہ پڑھیں گے، جب خزاں کا موسم آئے گا تو نہیں پڑھیں گے، نہیں۔ بلکہ ہر حالت میں، ہر موسم میں کلمہ لا الٰہ الا اللہ'' پڑھیں گے، چاہے پڑھنے میں مزہ آ رہا ہو، چاہے پڑھنے میں تکلیف ہو رہی ہو، چاہے ایسے حالات ہوں، جس میں اللہ کا نام لینے کی آزادی ہو، چاہے ایسے حالات ہوں، جس میں اللہ کا نام لینے میں خطرات ہوں، لیکن ہر حالت میں اللہ کا نام ''لا الٰہ الا اللہ'' لیتے رہو اور اللہ کی عبادت کرتے رہو۔

اللہ کے بندے بنو:

لہٰذا یہ نہ ہو کہ جب دل چاہا، تب تو نماز پڑھ لی، اور جب دل نماز پڑھنے کو نہیں چاہا تو نماز چھوڑ بیٹھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دل کے بندے بن گئے، اللہ کے بندے تو نہ ہوئے ـــــ لہٰذا چاہے دل چاہ رہا ہو، یا نہ چاہ رہا ہو، مشقت ہو رہی ہو، یا تکلیف ہو رہی ہو، ہر حالت میں اللہ کی طرف متوجہ رہو، اس وقت تمہارا امتحان ہے کہ تمہارے دل پر آرے چل رہے ہیں، بستر سے اٹھا نہیں جا رہا ہے، اور طبیعت کسمسا رہی ہے، طبیعت کسل مند ہو رہی ہے۔ لیکن کان میں ”حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح“ کی آواز آ گئی اور آواز سن کر مسجد کی طرف چل پڑے تو بس تم کامیاب ہو گئے، چاہے بے دلی کے ساتھ نیند کی حالت میں نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، تب بھی تم کامیاب گئے۔

شیطان نے تمہیں چت کر دیا:

لیکن اگر تم نے اس وقت مسجد کی طرف جانے کو ترک کر دیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان نے تمہیں چت کر دیا، اس لئے کہ تم نے اس کی بات مان لی ـــــ بہر حال! قبض ہو کہ بسط ہو، دل چاہے، یا نہ چاہے، نماز میں مزہ آئے، یا نہ آئے، لیکن ہر حال میں اللہ کے حکم کی اطاعت کرنی ہے، بس، یہی سارے دین کا خلاصہ ہے، اگر یہ بات ہمارے ذہن میں بیٹھ جائے تو انشاء اللہ، سارے دین پر عمل آسان ہو جائے، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

و آخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العالمین

الله أكبر الله أكبر

لا إله إلا الله

والله أكبر

الله أكبر

ولله الحمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توکل کی حقیقت

مجلس نمبر 109

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن
استاد جامعہ دار العلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی۔
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	109

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

توکل کی حقیقت

مجلس نمبر 109

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ رسوله الکریم، وعلی آله وأصحابه اجمعین۔ وعلی کل من تبعهم باحسان الی یوم الدین۔ امابعد:

ترک اسباب کی حقیقت:

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''ترکِ اسباب کی حقیقت یہ ہے''ترکِ اسباب مظنونہ غیر مامور بہا، یعنی جن اسباب پر مسبب کا ترتب عادۃً یقینی اور قطعی نہ ہو، اور شرعاً وہ واجب بھی نہ ہو، ان کو ترک کر دینا جائز ہے، باقی جن اسباب پر عادۃً مسببات کا ترتب یقینی ہے، ان کا ترک جائز نہیں، مثلاً عادۃً کھانا کھانے پر شبع کا ترتب، اور پانی پینے پر سیرابی کا ترتب، اور اسباب مظنونہ کا ترک بھی اس شخص کو جائز ہے جو خود بھی قوی الہمت ہو، اور

اس کے اہل وعیال بھی، یا اس کے اہل وعیال ہی نہ ہوں،
اسی طرح اسباب ماموربہا کا ترک توکل نہیں، کیونکہ وہ سب
اسباب قطعیہ یقینیہ ہیں۔ (انفاس عیسیٰ ص۲۲۱)

یہ چند مختصر جملوں نے حضرت والا قدس اللہ سرہ نے ''توکل'' کی حقیقت، اور صوفیاء کرام سے توکل کے بارے میں جو واقعات منقول ہیں، ان کی حقیقت بیان فرمادی۔

توکل معنی:

پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ توکل کے معنی ہیں: ''اللہ پر بھروسہ کرنا'' یعنی یہ یقین رکھنا کہ جتنے بھی اسباب ہیں، ان اسباب میں کچھ بھی نہیں رکھا، ان اسباب میں اللہ تعالیٰ جب تاثیر پیدا فرمائیں گے تو تاثیر ہوگی، ورنہ نہیں ہوگی، لہٰذا بھروسہ اس سبب نہیں، بلکہ بھروسہ مسبب الاسباب یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ پر ہے، جیسے ایک آدمی روزگار تلاش کررہا ہے، تو اب اس لئے اسباب بھی اختیار کررہا ہے، وہ یہ کہ مختلف جگہوں پر ملازمت کے لئے درخواستیں دے رہا ہے، لیکن ان درخواستوں پر بھروسہ نہیں ہے، بلکہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ درخواست بھیجنا تو ایک سبب ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے اس میں تاثیر ڈال دی تو فائدہ ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا، اور بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہے۔

میں دوا کرتا ہوں، شفا اللہ دیگا:

یا مثلاً ایک شخص بیمار ہوا، اور علاج کے لئے ایک اچھے ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا، اس ڈاکٹر نے نسخہ لکھا اور آپ نے دوا منگوائی، اور دوا استعمال کرلی، یہ

سب تدابیر اور اسباب ہیں۔ لیکن ان اسباب پر بھروسہ نہیں، بلکہ بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہے کہ نہ ڈاکٹر کے اندر کچھ رکھا ہے، نہ دوا میں کچھ رکھا ہے، نہ کسی نسخہ میں کچھ رکھا ہے، بلکہ اصل میں شفا دینے والا وہ ہے ____ ہمارے ڈاکٹر نذیر صاحب یہاں بیٹھے ہیں، انہوں نے اپنے مطب میں ایک خوبصورت جملہ لکھوا رکھا ہے، مجھے بہت پسند آیا، وہ یہ کہ:

''میں دوا کرتا ہوں، آپ دعا کرو، اللہ شفاء دے گا''

یعنی میرا کام ہے دوا کرنا، تمہارا کام ہے دعا کرنا، اور شفاء دینے والی ذات اللہ ہے، بس یہ ہے ''توکل'' یعنی تدبیر تو کرلی، لیکن اس تدبیر پر بھروسہ نہیں، بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر ہے۔

اسباب کا ترک کرنا توکل نہیں:

لہٰذا توکل کے اندر یہ نہیں ہوتا کہ آدمی اسباب کو چھوڑ کر بیٹھ جائے، یعنی نہ ڈاکٹر کے پاس جائے اور اگر جائے اور وہ ڈاکٹر نسخہ لکھ دے تو دوا نہ منگوائے، اور اگر دوا آجائے تو آدمی دوا نہ کھائے، اور پھر یہ کہے کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے، وہ مجھے شفاء دے گا۔ یہ توکل نہیں، یا ملازمت کے لئے نہ تو درخواست دی، نہ ملازمت کی تلاش میں بھاگ دوڑ کی، بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھ گئے اور یہ سوچا کہ اللہ میاں خود ہی رزق بھیج دے گا، یہ ترکِ اسباب توکل کا حصہ نہیں۔

اونٹ کو رسی سے باندھ کر پھر توکل کرو:

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حقیقت بیان فرمادی، وہ یہ کہ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات میں

اونٹنی پر سفر کرتا ہوں، سفر کے دوران مجھے کہیں نماز کے لئے یا دوسری ضرورت کے لئے رکنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس وقت مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں نماز کے لئے کھڑا ہو جاؤں، اور اونٹنی بھاگ جائے، تو کیا اس وقت میں اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اونٹنی کو ویسے ہی چھوڑ دوں؟ کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے نماز پڑھ رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ میری اونٹنی کی حفاظت کریں گے، یا اس اونٹ کی پنڈلی کو رسی سے باندھ دوں، تاکہ وہ بھاگ نہ جائے؟ جواب میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِعْقِلْ سَاقَهَا وَتَوَكَّلْ

پہلے اس اونٹنی کی پنڈلی کو رسی سے باندھو، اور پھر اللہ پر توکل کرو

اپنے حصے کا کام تم کرو:

اس حدیث شریف کے ذریعہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا کہ اسباب کو اختیار کرنا بھی تمہارا کام ہے۔ اپنے حصے کا کام تم کرو، اور باقی کو اللہ کے حوالے کر کے اس پر بھروسہ کرو، مثلاً اونٹ کی پنڈلی کو اچھی طرح رسی سے باندھ دیا، اب باندھنے کے بعد یہ وہم نہ کرو کہ اگر اونٹنی رسی توڑ کر بھاگ جائے گی تو کیا ہوگا؟ کوئی چور آ کر رسی کاٹ کر اونٹنی کو لے جائے گا تو کیا ہوگا؟ ان اوہام کے اندر نہ پڑو۔ بلکہ تمہارے اختیار میں جو سبب ہے، وہ اختیار کر کے پھر اللہ پر بھروسہ کرو، کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد جو کچھ کریں گے اس میں خیر ہوگی ---- بہر حال! اسباب اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ توکل کے منافی نہیں، بلکہ اسباب اختیار کرنا توکل کا ایک حصہ ہے۔

بعض صوفیاء کا ترک اسباب کرنا:

البتہ بعض صوفیاء اکرام سے منقول ہے کہ انہوں نے اسباب کو بالکل ترک کر دیا، مثلاً نہ انہوں نے روزگار تلاش کیا، نہ محنت کی، بلکہ اطمینان سے بیٹھے اللہ اللہ کر رہے ہیں، اور اللہ پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رزق بھیج دے گا، اس طرح انہوں نے اسباب کو بالکل ترک کر دیا، کیا ان صوفیاء کا یہ طرز عمل شریعت کے خلاف ہے؟ ـــــــ اس کے جواب کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اسباب کو ترک کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں اسی کو بیان فرمایا ہے۔

اسباب یقینیہ کا ترک جائز نہیں:

فرمایا کہ: اسباب دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک اسباب وہ ہوتے ہیں جس پر نتیجہ کا ترتب تقریباً قطعی اور یقینی ہوتا ہے، مثلاً بھوک لگ رہی ہے، اور کھانا سامنے موجود ہے، اب کھانا کھاؤ گے تو اس کے نتیجے میں بھوک مٹ جائے گی، لہٰذا کھانا کھانا سبب ہے، اور بھوک مٹنا اس کا نتیجہ ہے۔ جس کو اصطلاح میں مسبب کہا جاتا ہے۔ اب یہاں سبب اختیار کرنے کے بعد نتیجہ کا حصول یقینی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ـــــــ یا مثلاً پیاس لگ رہی ہے اور پانی موجود ہے، اور پانی پینا پیاس بجھنے کا یقینی سبب ہے، ان کو اسباب یقینیہ کہا جاتا ہے، حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اسباب یقینیہ کو ترک کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں، لہٰذا اگر کھانا موجود ہے اور بھوک لگ رہی ہے، لیکن پھر بھی کھانا نہ کھائے کہ میں تو اللہ تعالیٰ پر توکل کر رہا ہوں، کھانا کھائے بغیر اللہ تعالیٰ ویسے ہی میری بھوک مٹا دے گا۔ ایسا توکل

کرنا حرام ہے، گناہ ہے۔ اگر اس حالت میں بھوک کی وجہ سے مر جائے گا تو حرام موت مرے گا ـــــ پانی موجود ہونے کے باوجود نہیں پی رہا ہے، اگر مر جائے گا تو حرام موت مرے گا، کیونکہ یقینی اسباب کے موجود ہوتے ہوئے ان کو ترک کرنا حرام ہے، کسی بھی حالت میں جائز نہیں۔

اسباب ظنّیہ:

اسباب کی دوسری قسم وہ ہے جن کو ''اسباب ظنیہ'' کہا جاتا ہے، یعنی گمان اس بات کا ہے کہ اگر یہ سبب اختیار کریں گے تو اس پر یہ نتیجہ مرتب ہوگا۔ اس نتیجہ کا صرف گمان اور خیال ہے، یقین نہیں۔ مثلاً اگر میں فلاں جگہ ملازمت کے لئے درخواست دوں گا تو ملازمت ملنے کا گمان ہے، یقین نہیں۔ اس کا احتمال ہے کہ ملازمت مل جائے، اور یہ احتمال بھی ہے کہ درخواست رد ہو جائے، یا مثلاً بیماری میں دوا کھاؤں گا، تو اس میں اس کا بھی احتمال ہے کہ شفا ہو جائے، اور لیکن ساتھ میں یہ بھی احتمال ہے کہ فائدہ نہ ہو۔ لہٰذا یہ اسباب ایسے ہیں کہ ان کا نتیجہ ظاہر ہونا یقینی نہیں، بلکہ صرف گمان ہیں، یہ اسباب کی دوسری قسم میں داخل ہیں۔

اسباب ظنّیہ کے ترک کا حکم:

اسباب کی دوسری قسم کا حکم یہ ہے کہ اس کو ترک کرنا بھی عام آدمی کے لئے اور کمزوروں کے لئے جائز نہیں۔ اور اس شخص کے لئے بھی ان اسباب کو ترک کرنا جائز نہیں جس کے ذمے دوسروں کے حقوق ہوں، مثلاً روزی کی تلاش، ملازمت کی تلاش اور اس کے درخواست دینا وغیرہ یہ اسباب ایسے ہیں کہ ان کے نتیجے میں روزگار کا مل جانا یقینی نہیں۔ بلکہ گمان ہے۔ مثلاً اگر میں ٹھیلا لے کر

سامان لے کر بازار جاؤں گا تو مجھے امید ہے کہ میری بکری ہو جائے گی، اور میری آمدنی ہو جائے گی، یا مثلاً دکان کھول کر بیٹھوں گا تو آمدنی ہو جائے گی۔ یہ سب اسباب ظنی ہیں، یقینی نہیں ـــــ ان اسباب کا ترک کرنا ہم جیسے کمزوروں کے لئے جائز نہیں، اور ہم سب اس کے اندر داخل ہیں ـــــ اسی طرح جس شخص کے ذمے دوسروں کے حقوق واجبہ ہیں، اس کے لئے ان اسباب کا ترک جائز نہیں۔ مثلاً ایک شخص بڑا طاقت ور ہے، قوی ہیکل ہے، بڑا صحت مند ہے۔ اگر اس پر دس دن کے فاقے آ جائیں گے تو اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا ـــــ لیکن اس کے بیوی بچے بھی ہیں، تم تو فاقہ برداشت کر لو گے، لیکن بیوی بچے کھانا مانگیں گے تو کیا ان کو یہ جواب دو گے کہ میں توکل کئے بیٹھا ہوں، لہٰذا تم بھی توکل کرو، اور کھانا نہیں ملے گا ـــــ یہ درست نہیں، کیونکہ ان بیوی بچوں کے حقوق تمہارے ذمے واجب ہیں۔ اس لئے اگر تم نے روزگار کی تلاش نہ کی تو گناہ گار ہو گے ـــــ کیونکہ تم نے بیوی بچوں کا حق فوت کر دیا۔

ایسے شخص کیلئے توکل مستحب ہے:

ہاں! ایک شخص بالکل تن تنہا ہے، اکیلا ہے، نہ اس کی بیوی ہے، نہ بچے ہیں، اور نہ اس کے والدین، اور نہ اس کے ذمے حقوق واجبہ ہیں، اور صحت کے اعتبار سے وہ قوی ہے، وہ یہ سوچتا ہے کہ میں کہاں ملازمتیں تلاش کروں، اور ملازمت کے چکر میں پڑوں، یا تجارت کروں، بس اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے، جب اللہ تعالیٰ دیں گے، شکر کر کے کھا لوں گا، نہیں دیں گے تو صبر کروں گا، اور اگر کئی دنوں تک فاقے بھی آ جائیں تو میں شکوہ نہیں کروں گا، نہ مطالبہ کروں گا۔ ایسا

شخص جو قوی الہمت ہے، اور یہ اگر توکل کرے اور اسباب مظنونہ، کو بھی ترک کردے تو اس کے لئے ایسا توکل کرنا نہ صرف جائز، بلکہ مستحب ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا توکل:

مستحب ہونے کی دلیل یہ ہے کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ شروع کے دور میں بکریاں بھی چرائیں، تجارت بھی فرمائی، زراعت بھی فرمائی، یہ سارے اسباب اختیار کئے۔ لیکن مدینہ منورہ میں ایک زمانہ ایسا آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام اسباب کو ترک کر دیا، نہ زراعت، نہ تجارت، نہ ملازمت، اور گھر میں تین تین مہینے تک آگ نہیں جل رہی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم تین تین چاند دیکھ لیتے تھے اور ہمارے گھر کے چولہے ٹھنڈے ہوتے تھے۔ اور ان میں آگ نہیں جلتی تھی ____ ان سے کسی نے پوچھا کہ پھر آپ کا گزارہ کیسے ہوتا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ دو چیزوں پر ہمارا گزر بسر تھا، ایک کھجور اور ایک پانی۔ دو وقت پیٹ بھر کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا تناول نہیں فرمایا، اور ساری عمر گندم کی روٹی تناول نہیں فرمائی۔ بلکہ جو کی روٹی تناول فرمائی۔ ان سب حالات کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاش کی تلاش نہیں فرمائی ____ لیکن لوگوں کو آپ نے یہی حکم دیا کہ معاش کو تلاش کرو۔ لہٰذا یہ توکل سنت کے خلاف نہیں۔ بلکہ مستحب ہے۔

ایسے شخص کیلئے اسباب مظنونہ کا ترک جائز ہے:

بہر حال! اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ اس کے ذمے دوسروں کے حقوق بھی نہیں، یا دوسروں کے حقوق تو ہیں، لیکن جن کے حقوق ہیں وہ بھی اسی جیسے قوی

الہمت ہوں، یعنی بیوی بچے بھی اسی کی طرح ہوں، جیسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں، وہ فرماتی ہیں کہ تین تین مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، لیکن زبان پر شکوہ کا ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا، کسی تکلیف کا اظہار نہیں ہو رہا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ ہے، اور یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی زندگی گزار رہے ہیں، ہم بھی ویسی ہی زندگی گزاریں گے، ایسے لوگوں کے لئے اسباب مظنونہ کو ترک کرنا اور توکل اختیار کرنا مستحب ہے۔

صوفیاء کرام اور اسباب ظنّیہ کا ترک:

لہٰذا جتنے صوفیاء اکرام سے یہ بات منقول ہے، جیسے حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ معاش کے لئے کوئی کام نہیں کرتے تھے، کئی کئی دنوں تک فاقوں پر فاقے ہو رہے ہیں، لیکن بڑے اطمینان سے زندگی گزار رہے ہیں ــــــ اب بعض لوگ ایسے بزرگوں پر اعتراض شروع کر دیتے ہیں کہ یہ صوفیاء کرام خلاف فطرت اور خلاف شریعت کام کر رہے ہیں، ایسا کرنا جائز نہیں ــــــ حالانکہ ایسے صوفیاء کرام اعتراض کا محل نہیں۔ کیونکہ یہ بھی سنت کا طریقہ ہے، البتہ قوی الہمت انسان کے لئے ہے، ہم جیسے لوگوں کے لئے نہیں، بلکہ ہم جیسے لوگ سبب معاش اختیار کریں اور پھر اللہ پر بھروسہ کریں، لیکن جن حضرات نے قوی الہمت ہونے کی وجہ سے اسباب کو ترک کر دیا ہے ان پر اعتراض بھی نہ کریں۔ اسی بات کو حضرت والا نے اس ملفوظ میں بیان فرمایا ہے:

"توکل مستحب کے لئے ضرورت ہے فطرۃً قوتِ قلب، اور
حقوق واجبہ کا ذمہ نہ ہونا، یا اہل حقوق کا بھی ایسا ہی ہونا"

(انفاس عیسیٰ ص ۲۱۹)

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں تم جو بھی کام کرو تو جو کام تمہارے کرنے کے ہیں، یعنی اسباب اختیار کرنا، ان کو ضرور اختیار کرو، لیکن بھروسہ ان اسباب پر نہ کرو، بھروسہ صرف اللہ جل شانہ کی ذات پر کرو، اگر ایسا کرو گے تو یہ توکل کے خلاف نہیں ____ توکل کے خلاف یہ ہے کہ صبح سے لے کر شام تک نگاہ صرف سبب پر لگی ہوئی ہے، مسبب الاسباب یعنی اللہ جل شانہ کی طرف دھیان نہیں، مثلاً ملازمت کے لئے کبھی ایک دفتر میں درخواست دے رہا ہے، کبھی دوسرے دفتر میں درخواست دے رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتا، کہ یا اللہ! میں یہ تدبیر تو کر رہا ہوں، لیکن دینے والی ذات تو آپ کی ہے، آپ عطا فرما دیجئے، یہ بات توکل کے خلاف ہے۔

اسباب میں غلو اور انہماک درست نہیں:

دوسری بات توکل کے خلاف یہ ہے کہ اسباب کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم کے اسباب وہ ہیں جو ظاہری اسباب ہیں، اور دوسری قسم کے اسباب وہ ہیں جس میں تعمق اور انہماک ہے ____ مثلاً آپ کو کہیں سفر پر جانا ہے، تو اب ایک سبب یہ ہے کہ اچھی سواری کا بندوبست کرلو، لیکن اسباب میں انہماک اور تعمق کرنا، مثلاً یہ کہ فلاں وقت میں گاڑی آتی ہے، مجھے فلاں وقت میں اسٹیشن پہنچنا ہے، لیکن راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آئے، اب ہر ہر مرحلہ کے لئے الگ الگ اسباب اختیار کر رہا ہے یہ غلو فی الاسباب ہے اور توکل کے خلاف ہے، حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اَجۡمِلُوۡا فِی الطَّلَبِ وَتَوَكَّلُوۡا عَلَيۡهِ

یعنی طلب میں اجمال سے کام لو، اور معمول کے جو اسباب ہیں، بس ان کو اختیار کرو، اسباب اختیار کرنے میں بہت زیادہ کنج کاؤ میں نہ پڑو، بہت زیادہ انہماک میں مبتلا نہ ہو ____

داغنے کا علاج غلو فی الاسباب ہے:

اسی لئے ایک طرف تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے علاج کا حکم دیا کہ جب تم بیمار ہو جاؤ تو اپنا علاج کرو، دوا استعمال کرو، اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی بیماریوں کی دوائیں بھی بتائیں، لیکن بعض علاج کے ذرائع کو آپ نے ناپسند فرمایا، مثلاً ''کئی'' کے ذریعہ علاج کرنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا، اس زمانے میں جب کوئی دوسرا علاج کارگر نہ ہوتا تو اہل عرب ''کئی'' یعنی داغنے کے ذریعے علاج کیا کرتے تھے، لوہے کی سلاخ کو آگ پر گرم کر کے اس کے ذریعہ جسم کے کسی حصے کو داغتے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا اس لئے کہ یہ طریقہ علاج تدبیر میں انہماک کرنے میں داخل ہے، اس انتہا تک پہنچنا کسی طرح مناسب نہیں۔

دل کو حرکت دینے والی مشین:

آج کل لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ بعض اوقات مریض کے اوپر کئی مشینیں لگا دی جاتی ہیں، اب مشین کے ذریعہ دل کی حرکت چل رہی ہے، مشین کے ذریعہ سانس آرہا ہے، اور غالب گمان یہ ہے کہ اگر مشین ہٹا دیں گے تو دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ سانس بند ہو جائے گا، اور آدمی مر جائے گا ____ ایسے موقع پر لوگ سوال کرتے ہیں کہ مشین ہٹانا جائز ہے یا نہیں؟ اس موضوع پر محققین

نے طبّی نقطہ نظر سے بھی اور شرعی نقطہ نظر سے بھی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں، میرے پاس پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب ہے، جس میں یہ بحث کی ہے کہ وہ مشین ہٹانا جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا موت دل کے بند ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے یا دماغ کے فیل ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے؟ ـــــ

ایسی مشین کو ہٹانا جائز ہے:

یہ ساری بحثیں اس غلط فہمی پر مبنی ہیں کہ وہ لوگ مشین لگانا ضروری سمجھ رہے ہیں--- یاد رکھئے، اگر زندگی کسی مشین پر موقوف ہو جائے تو مشین لگانا واجب نہیں ہوتا، بلکہ اس مشین سے پرہیز کیا جائے تو بہتر ہے، اس لئے کہ مشین لگانا غلو فی الاسباب میں داخل ہے، لہٰذا مشین جس کے استعمال پر لاکھوں روپیہ کا خرچہ آ رہا ہے اور اس کے بغیر زندگی باقی نہیں رہ سکتی، ایسی مشین لگانا کوئی ضروری نہیں۔ اگر کوئی شخص اس مشین کو نہ لگائے، یا لگا کر پھر ہٹا دے تو اس پر نہ صرف یہ کہ گناہ نہیں ہوگا۔ بلکہ شاید عدم غلو فی الاسباب کا ثواب مل جائے گا۔ لہٰذا اس مشین کے ہٹانے کے نتیجے میں اس شخص کی جان جاتی ہے تو جانے دے ـــــ اس لئے کہ یہ مشین ان اسباب میں سے نہیں ہے جن کو اختیار کرنا ضروری ہے، بلکہ اس کا استعمال غلو فی الاسباب کے اندر داخل ہے۔

خلاصہ:

بہر حال! توکل کے خلاف دو باتیں ہوئیں، ایک یہ کہ آدمی کی نگاہ صرف اسباب کی طرف ہو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف نگاہ نہ ہو ـــــ دوسرے یہ کہ اسباب میں بھی اتنا انہماک اور غلو ہو کہ آدمی آخری درجہ تک چلا جائے، اس کی

بھی ضرورت نہیں، بلکہ فرمایا کہ:

اجملوا فی الطلب و توکلوا علیه

بس، سامنے سامنے کی جو سادہ تدبیریں ہیں ان کو اختیار کرو۔ اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو ـــــــــــ یہ ہے توکل کا حاصل، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے یہ توکل عطا فرمادیں۔ آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین

اصلاحی مواعظ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

مقصد حیات دنیا نہیں۔۔۔ آخرت
محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم
لیلۃ القدر کی برکات
فضائل اعتکاف
عظمت قرآن
توبہ کیسے کریں؟
حسد کا علاج
غیبت ایک اخلاقی برائی
دنیا کی حقیقت
صبر کے درجات

جلد اوّل

مکتبہ لدھیانوی

اِصلاحی مواعظ

جلد اوّل

❁❁

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

❁❁

مکتبہ لدھیانوی

اشاعت اول .... اگست ۱۹۹۹ء

تعداد .... گیارہ سو

قیمت ....

ناشر .... مکتبہ لدھیانوی

برائے رابطہ : جامع مسجد باب رحمت پرانی نمائش ایم اے جناح روڈ، کراچی

فون : ۷۷۸۰۳۳۷ ـــــــ ۷۷۸۰۳۴۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کالاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں اپنے فضل بے پایاں کا مورد بنایا اور ہمیں اپنے والد گرامی! داعی کبیر اور حکیم العصر حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی دامت برکاتہم کے علوم و معارف تشنگانِ علم و معرفت کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت عطا فرمائی۔

میرے مرشد و مربی حضرت ابا جان کو اللہ تعالیٰ نے جو محبوبیت و مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کی تحریر و بیان میں جو لذت و مٹھاس ہے اس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو اس میخانۂ محبت سے لطف اندوز ہو چکا ہے۔

ہمارے ایک مخدوم و محسن اور حضرت والد صاحب کے سچے محب و دوست ایک دن حضرت ابا جان سے فرمانے لگے حضرت! معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کو ہیروئن کا نشہ پلاتے ہیں۔ حضرت ابا جان نے ان کا یہ جملہ سنا تو خفگی کے انداز میں فرمایا "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کیا میں لوگوں کو ہیروئن پلاتا ہوں؟ یہ کیونکر ممکن ہے؟ اس پر انہوں نے ہنستے ہوئے وضاحت کی کہ حضرت آپ ہیروئن ہی تو پلاتے ہیں کہ جو شخص آپ کا بیان سن لیتا ہے اس کے بعد اسے کسی کا بیان اچھا نہیں لگتا! ایسا عشق تو لوگوں کو ہیروئن ہی سے ہوتا ہے۔

سچ ہے جو شخص حضرت کا بیان سن لیتا ہے اس کی نظر کسی اور جگہ نہیں ٹکتی۔ چنانچہ حضرت کے متعلقین، محبین اور عوام الناس کا حضرت کی تالیفات کی اشاعت کے بعد ہم پر مسلسل دباؤ تھا کہ حضرت کے مواعظ بھی شائع کئے جائیں چنانچہ پیش نظر کتاب اصلاحی مواعظ کے نام سے دس مواعظ پر مشتمل اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کو مزید جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کتاب کو ہم سب اور پوری امت کے لئے نافع بنائے۔ آمین

(مولانا) محمد طیب لدھیانوی

فہرست مضامین

محبت رسول ﷺ اور اس کے تقاضے

صفحہ	عنوان

لیلۃ القدر کی برکات اور اُس کے حصول کا طریقہ

عنوان	صفحہ
* توبہ کے کیا معنی ہیں؟	۱۱۷
* توبہ قبول ہونے کے لئے شرط	۱۱۸
* حقوق العباد کے معاملے میں توبہ	۱۱۹
* ایک حدیث قدسی	۱۲۰
* والدین کا نافرمان	۱۲۲
* والدین کو دیکھنے پر حج کا ثواب	۱۲۳
* والدین کی نافرمانی کا دنیا میں وبال	۱۲۴
* اولاد کی نافرمانی اور والدین کا قصور	۱۲۴
* گناہ کے کام میں والدین کی فرماں برداری جائز نہیں	۱۲۵
* قطع رحمی کا گناہ	۱۲۷
* کینہ پروری کا گناہ	۱۲۷
* جنت میں صرف پاک لوگ جائیں گے	۱۲۷
* اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے شفقت	۱۲۹
* ایک جامع دعا	۱۳۰
* اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ معاملہ	۱۳۳

اعتکاف فضائل ومسائل

* اعتکاف کی فضیلت	۱۴۰
* اعتکاف کی قسمیں	۱۴۱
* اعتکاف کے لئے اخلاص شرط ہے	۱۴۴

صفحہ	عنوان

صفحہ	عنوان
۲۱۳	* سچوں اور جھوٹوں کے درمیان امتیاز
۲۱۳	* مخلوق کے ساتھ انصاف کرو
۲۱۶	* اللہ کے دشمنوں سے دشمنی رکھو
۲۱۸	* اللہ کے راستے میں جہاد کرو
۲۱۹	* اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی جان ومال کو خرید چکا ہے
۲۲۲	* اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے لوگ
۲۲۳	* مسلمان اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہوتا ہے
۲۲۳	* لاؤڈ اسپیکر پر درود وسلام پڑھنا ریاکاری ہے
۲۲۸	* دین کی بنیادی باتیں
۲۲۹	* ذکر کا مفہوم
۲۳۰	* ذکر کی کثرت مطلوب ہے
۲۳۱	* ذکر الٰہی سے دلوں کی زندگی ہے
۲۳۱	* نفس کی ریاضت ضروری ہے
۲۳۳	* نفس سے شرائط طے کر کے پھر اس کی نگرانی کی جائے
۲۳۴	* نفس کی فہمائش کرو
۲۳۶	* اصلاح کے لئے نعمتوں کا مراقبہ
۲۳۷	* اپنی کوتاہیوں کا مراقبہ اور استغفار
۲۳۸	* اپنی حاجتیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرو
۲۳۹	* خطبہ شریفہ کا دوسرا مضمون
۲۳۹	* کل کی تیاری آج کرو
۲۴۰	* اپنے اور اللہ کے درمیان کا معاملہ درست کرو

صفحہ	عنوان

غیبت ایک اخلاقی بُرائی — ایک گناہِ کبیرہ

صفحہ	عنوان

توبہ کیسے کریں؟

صفحہ	عنوان

حسد کی بیماری اور اس کا علاج

صفحہ	عنوان

دنیا کی محبت کے بُرے اثرات

صفحہ	عنوان

صبر کے درجات

مقصدِ حیات

دنیا نہیں - بلکہ آخرت

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان
	* دنیا امتحان گاہ ہے
	* دنیا کی مثال نقش و نگار والے سانپ کی ہے
	* زندگی کے پانچ دور
	* دنیا کی ڈگریوں کا انجام
	* دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں
	* دنیا سے آخرت کا توشہ حاصل کرو
	* عورتوں کا فتنہ
	* خاتمہ کے لحاظ سے لوگوں کی چار قسمیں
	* شیخ ابو عبداللہ مغربیؒ کا عبرتناک واقعہ
	* اپنے آپ کو سب سے بدتر سمجھو
	* ایک جنتی جس نے ایک بھی نماز نہیں پڑھی
	* غصہ کے اعتبار سے لوگوں کی چار قسمیں
	* غصہ کا سبب اور اس کا علاج
	* ادائے قرض میں لوگوں کی چار قسمیں
	* دنیا کی عمر ختم ہو چکی ہے
	* بیان کا منظوم خلاصہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد للّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره و نؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سيٰات اعمالنا، من يهده اللّٰه فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له، ونشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لاشريك له، ونشهد ان سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وعلى أله واصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيرًا كثيرًا - امابعد!

عن ابى سعيد الخدرى رضى اللّٰه تعالىٰ عنه قال قام فينا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم خطيبا بعد العصر، فلم يدع شيئا يكون الى قيام الساعة الاذكره، حفظه من حفظه ونسيه من نسيه، وكان فيما قال: ان الدنيا حلوة خضرة وان اللّٰه مستخلفكم فيها فناظر كيف تعملون، الا فاتقوا الدنيا

واتقوا النساء- وذكر ان لكل غادر لواء يوم القيمة بقدر غدرته في الدنيا، ولا غدر اكبر من غدر امير العامة، يغرزلواء ه عند استه، قال ولا يمنعن احدامنكم هيبة الناس ان يقول بحق اذا علمه، وفي رواية ان راى منكرا ان يغيره، فبكى ابوسعيد وقال قد رايناه فمنعتنا هيبة الناس ان نتكلم فيه، ثم قال الا ان بني ادم خلقوا على طبقات شتى، فمنهم من يولد مومنا ويحيى مومنا ويموت مومنا، ومنهم من يولد كافرا ويحيى كافرا ويموت كافرا، ومنهم من يولد مومنا ويحيى مومنا ويموت كافرا ومنهم من يولد كافرا ويحيى كافرا ويموت مومنا قال وذكر الغضب فمنهم من يكون سريع الغضب سريع الفئى فاحداهما با لاخرى ومنهم من يكون بطى الغضب بطى الفى فاحدا هما بالاخرى وخياركم من يكون بطى الغضب سريع الفى، وشرار كم من يكون سريع الغضب بطى الفى قال اتقوا الغضب فانه جمرة على قلب ابن ادم الا ترون الى انتفاخ اوداجه وحمرة عينيه، فمن احس بشى من

ذلک فلیضطجع ولیتلبد بالارض قال وذکر الدین فقال منکم من یکون حسن القضاء واذا کان له افحش فی الطلب فاحدا هما بالاخری، ومنهم من یکون سیی القضاء، وان کان له اجمل فی الطلب فاحداهما بالاخری، وخیارکم من اذا کان علیه الدین احسن القضاء وان کان له اجمل فی الطلب وشرارکم من اذا کان علیه الدین اساء القضاء وان کان له افحش فی الطلب حتی اذا کانت الشمس علی روس النخل واطراف الحیطان فقال اما انه لم یبق من الدنیا فیما مضی منها الا کما بقی من یومکم هذا فیما مضی منه۔ (رواہ الترمذی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ شریفہ، مشکوٰۃ شریف باب الامر بالمعروف (صفحہ۴۳۷) میں منقول ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھائی اور نماز کے بعد منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ ارشاد فرمایا، قیامت تک جتنے اہم واقعات رونما ہونے والے تھے، سب کے سب بیان کردیئے، کچھ بھی نہیں چھوڑا، جن کو یاد رہا ان کو یاد رہا اور جنہوں نے بھلا دیا انہوں نے بھلا دیا۔ اور جو

باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ دنیا میٹھی ہے (لذیذ ہے، خوشنما) اور سرسبز ہے، اور اللہ تعالیٰ تم کو اس دنیا میں دوسروں کے جانشین بنا رہے ہیں، پس دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟ سنو! پس دنیا سے بچو! اور عورتوں سے بچو!

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ذکر فرمایا کہ قیامت کے دن ہر عہد شکنی کرنے والے کے لئے ایک جھنڈا ہوگا جو دنیا میں اس کی عہد شکنی کے بقدر ہوگا، اور کسی کی عہد شکنی اتنی بڑی نہیں جتنی کہ مسلمانوں کے حاکم کی عہد شکنی بڑی ہے، اس کی عہد شکنی کا جھنڈا اس کی سرین کے پاس گاڑا جائے گا۔ اور تم میں کسی کو لوگوں کی ہیبت حق بات کہنے سے نہ روکے، جب کہ اس کو حق کا علم ہو ــــ اور ایک روایت میں ہے کہ کسی برائی کو دیکھے تو اس کو بدلنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہئے ــــ یہ بیان کرکے حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونے لگے اور فرمایا کہ ہم نے برائی کو دیکھا، مگر لوگوں کی ہیبت اس سلسلہ میں بات کرنے سے ہمیں مانع ہوئی۔

پھر فرمایا کہ سنو! بے شک لوگ مختلف طبقوں پر پیدا کئے گئے ہیں، چنانچہ (۱) بعض مؤمن پیدا ہوتے ہیں، مؤمن جیتے ہیں اور مؤمن مرتے ہیں۔ (۲) اور بعض کافر پیدا ہوتے ہیں، کافر جیتے ہیں اور کافر مرتے ہیں۔ (۳) بعض

مؤمن پیدا ہوتے ہیں، مؤمن جیتے ہیں، اور کافر مرتے ہیں۔
④ اور بعض کافر پیدا ہوتے ہیں کافر جیتے ہیں، اور مؤمن مرتے ہیں۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کا ذکر فرمایا کہ بعض کو بہت جلدی غصہ آتا، اور جلدی ہی اتر بھی جاتا ہے، پس یہ ایک خصلت دوسری کے بدلے میں ہوئی۔ اور بعض کو دیر سے غصہ آتا ہے اور دیر سے اترتا ہے، پس یہ بھی ایک خصلت دوسری کے بدلے میں ہوئی۔ اور تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جن کو دیر سے غصہ آئے۔ اور تم میں بدترین لوگ وہ ہیں جن کو جلدی غصہ آئے، اور دیر سے اُترے۔

پھر فرمایا غصہ سے بچو! کیونکہ یہ آگ کا انگارہ ہے جو اِبن آدم کے دل پر رکھ دیا جاتا ہے، کیا تم دیکھتے نہیں کہ اس کی رگیں پھول جاتی ہیں، اور آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں، پس جو شخص کچھ غصہ محسوس کرے تو لیٹ جائے اور زمین سے چپک جائے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض کا ذکر فرمایا، پس ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بعض قرض ادا کرنے میں بہت اچھا رویہ اختیار کرتے ہیں، اور جب کسی سے قرض وصول کرنا ہو تو بد گوئی کرتے ہیں، پس یہ ایک بری خصلت دوسری اچھی خصلت کے بدلے میں ہوگئی۔

اور بعض بری طرح قرض ادا کرتے ہیں، اور اگر کسی کے ذمہ ہو تو اس کے وصول کرنے میں نرمی کرتے ہیں، پس یہ بھی ایک بری خصلت ایک اچھی خصلت کے بدلے میں ہوگئی۔ اور تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے ذمہ قرض ہو تو خوبی سے ادا کردیں، اور جب ان کا کسی کے ذمہ ہو تو مطالبہ میں نرمی کریں۔ اور تم میں سے بدتر وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے ذمہ قرض ہو تو ادا کرنے میں برے ہوں اور ان کا کسی کے ذمہ ہو تو مطالبہ کرتے ہوئے بدگوئی کریں۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ جاری رہا، یہاں تک کہ دھوپ کھجوروں کی چوٹیوں اور دیواروں کے کناروں تک پہنچ گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خوب یاد رکھو کہ دنیا کی جتنی عمر گزر چکی ہے اس کے مقابلہ میں اس کی صرف اتنی عمر باقی رہ گئی ہے جتنا کہ تمہارے آج کے دن کے گزرے ہوئے وقت کے مقابلہ میں دن کا باقی حصہ"۔

دنیا امتحان گاہ ہے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"دنیا بڑی میٹھی اور بڑی سرسبز ہے اور اللہ تمہیں اس میں خلیفہ بنا رہے ہیں یعنی پہلے لوگوں کا جانشین بنا رہے ہیں کہ

ایک نسل چلی گئی، دوسری نسل اس کی جگہ آگئی، پس اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم یہاں رہ کر کیا عمل کرتے ہو"۔

واقعی دنیا بڑی میٹھی اور سرسبز ہے، کہ ہر شخص کو اس کی رغبت ہے، یہاں کا مال ودولت، یہاں کی لذتیں اور راحتیں، یہاں کا ساز وسامان ہر شخص کو مرغوب ہے اور وہ اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یوں ارشاد فرمایا ہے کہ برسات کے موسم میں زمین میں خوب سبزہ اگتا ہے اور زمین خوب سرسبز ہوجاتی ہے۔ نرم اور سرسبز چارہ جانوروں، مویشیوں کو بہت بھاتا ہے۔ اب جانور نے یہ سبزہ دیکھا تو اس کو کھانا شروع کردیا، چونکہ بہت میٹھا، سرسبز اور لذیذ تھا لہٰذا مسلسل کھاتا رہا، یہاں تک کہ بدہضمی ہوگئی اور پیٹ پھول گیا اور تخمہ سے جانور مر گیا، اور ایک اور جانور وہ تھا جس نے ضرورت کے بقدر کھایا، اور بقدر ضرورت کھانے کے بعد دھوپ میں چلا گیا، جگالی کی اور اس کو ہضم کرلیا، ہضم کرنے کے بعد پھر اسی طرح کھانا شروع کردیا یعنی بقدر ضرورت کھایا، پھر ارشاد فرمایا کہ دنیا میٹھی اور سرسبز ہے، پس جو شخص حرص کے ساتھ دنیا کماتا چلا جائے گا اور سمیٹتا ہی چلا جائے گا، اس کو "جوع البقر" کی بیماری لاحق ہوجاتی ہے کہ کھاتا رہے اور پیٹ نہ بھرے، یہ شخص اس جانور کی طرح ہلاک ہوجائے گا، اس کا پیٹ پھٹ جائے گا، اور اسے تخمہ ہوجائے گا۔ اور جو شخص کہ اس کو حق کے ساتھ لے اور حق کے ساتھ رکھے، یعنی شریعت کے قواعد کے مطابق دنیا حاصل کرے اور جہاں اللہ نے اس کو خرچ کرنے کا حکم فرمایا ہے وہاں خرچ کرے تو وہ البتہ محفوظ رہے گا۔

یہ دنیا ایسی سرسبز ہے اور آنکھوں کو ایسی بھاتی ہے کہ اس سے کسی کا جی نہیں بھرتا اور اس کو چھوڑنے کا کسی کا جی نہیں چاہتا، بھئی! بڑی عمر ہوگئی ہے، بڑھاپا آگیا ہے، اعضاً وقویٰ کمزور ہوگئے ہیں، دماغ اب سوچتا نہیں، آنکھیں دیکھتی نہیں، ٹانگیں چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی ہیں، معدہ ہضم نہیں کرتا، گردے کام نہیں کرتے، مثانہ کام نہیں کرتا، ظاہری اور باطنی قویٰ میں اختلال پیدا ہوگیا ہے، چلو اب چھوڑو اس قصے کو، اس مصیبت کے گھر کو چھوڑو اور اب آخرت کی فکر کرو، لیکن نہیں! کسی کا جی نہیں چاہے گا کہ اس کو چھوڑوں، پتا نہیں کہ اس میں کیا مٹھاس رکھی ہوئی ہے، حالانکہ یہاں مصائب پر مصائب ہیں، آفات ہیں، پریشانیاں ہیں، دکھ ہی دکھ ہیں، یہاں کی خوشی کم اور یہاں کا رنج زیادہ ہے۔ راحت کم، تکلیف زیادہ۔ اور جو راحتیں ہیں وہ ظاہری وباطنی مشقتوں اور تکلیفوں میں لپٹی ہوئی ہیں، خالص راحت جس کو کہنا چاہیئے وہ کہیں نہیں ہے، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود ہے بہت میٹھی، بڑی سرسبز ہے، دل کو بھاتی ہے بلکہ لبھاتی ہے۔

دنیا کی مثال نقش و نگار والے سانپ کی ہے

شیخ عطارؒ فرماتے ہیں ؎

زہر دار در دروں دنیا چوں مار
گرچہ بینی ظاہرش نقش و نگار
زہر ایں مار منقش قاتل است
باشد ازوے دور ہر کو عاقل است

یعنی دنیا کی مثال منقش سانپ کی سی ہے، اوپر سے اس کی جلد بہت

خوبصورت نظر آرہی ہے، نقش و نگار نظر آتے ہیں، عقلمند آدمی اس کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ یہ سانپ ہے، بہت زہریلا سانپ۔ لیکن ایک نادان بچہ، جس کو اس کی حقیقت کا پتہ نہیں، وہ اس کے نقش و نگار کو دیکھ کر اس کو پکڑنے کی کوشش کرے گا، اسی لئے فرمایا کہ یہ دنیا ظاہر میں منقش ہے لیکن اندر زہر بھرا ہوا ہے۔ ظاہر میں نادان اس کے نقش و نگار پر ریجھ رہے ہیں، لیکن جو دانا اس کی حقیقت سے باخبر ہیں وہ اس کے زہر سے خوف زدہ ہیں، کہ:

"یہ منقش سانپ ہے، ڈس جائے گا"

امام غزالیؒ فرماتے ہیں دنیا اور دنیا والوں کی مثال سانپ اور سپیرے کی ہے، جو اس کے دانت توڑ دیتا ہو، اس کا تریاق جانتا ہو، کہ اول تو وہ اس سانپ کے دانت توڑ دیتا ہے اور اس کو اس لائق ہی نہیں چھوڑتا کہ اسے کاٹ کھائے، علاوہ ازیں اس کو معلوم ہے کہ اگر سانپ کاٹ لے تو اس کا یہ توڑ ہے اور اس کا یہ علاج ہے، چنانچہ وہ سانپ کو کندھے پر اٹھائے پھرتا ہے، سانپ اس کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ وہ اس کا تریاق جانتا ہے، اور جو بیچارہ سانپ کا تریاق نہیں جانتا، وہ اگر سانپ کو ہاتھ لگائے گا تو وہ اس کو کاٹ کھائے گا۔ یہی مثال ہے دنیا کی اور دنیا والوں کی، جو لوگ اس کے دانت توڑ دیتے ہیں اور اس کا علاج جانتے ہیں ان کو یہ سانپ ضرر نہیں پہنچاتا، لیکن جن لوگوں نے اس کا منتر نہیں سیکھا، اس کے دانت نہیں توڑے اور اس کے کاٹے کا علاج نہیں سیکھا وہ ان کو کاٹ کھائے گا۔ چنانچہ ہماری یہی حالت ہے، نہ مال کمانے کے احکام سیکھے، نہ اس کو رکھنے کے آداب کا علم حاصل کیا، یہ بھی نہیں معلوم کہ مال کو کہاں اور کس طرح خرچ کیا جائے، کہاں خرچ نہ کیا جائے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس دنیا نے

ہمیں کاٹ کھایا، اور ہماری زندگی کے تمام اعضأ میں اس کا زہر پھیل چکا ہے، اس کا زہر کیا ہے؟ آخرت سے غفلت، ہمیں بس ایک ہی بات یاد ہے کہ جی! بچوں کے لئے کمانا بھی تو فرض ہے! ہمیں بس یہی ایک فرض یاد رہا باقی سب کچھ بھول گئے۔

حضرت جی مولانا محمد یوسف ؒ (امیر تبلیغ) ایک بار بیان فرما رہے تھے، جوش میں آگئے، فرمانے لگے تمہیں کس نے کہا تھا کمانے کو؟ کہ دکانیں کھولو اور روٹی کماؤ؟ تم نے غلط سمجھا کہ کمانا بھی فرض ہے، جس طرح تم اندھا دھند کماتے ہو یہ فرض نہیں بلکہ حرام ہے، پہلے کمانے کا ڈھنگ سیکھو، پھر روٹی کماؤ۔ حلال وحرام اور جائز وناجائز کو پہچانو، پھر کماؤ۔ حلال اور حرام کی تم کو تمیز نہیں، جائز اور ناجائز کی تم کو پروا نہیں، تو تمہارے لئے کمانا حلال ہی نہیں۔ کہتے ہو کہ کمانا بھی تو فرض ہے!

بہرحال، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا میٹھی ہے۔ اللہ جل شانہ پہلے لوگوں کو لے گئے، اور تمہیں ان کی جگہ لے آئے ہیں۔ یہاں تمہیں عیش اڑانے کے لئے نہیں لائے ہیں، کہ یہ بچے ذرا یہاں کھا پی لیں اور عیش اڑا لیں، نہیں! بلکہ اس لئے لائے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہاں سے تم نے اگلے سفر کے لئے اعمال کا کیا توشہ لیا؟ اور تم نے یہاں رہ کر اپنے سے پہلے لوگوں کی حالت سے بھی عبرت حاصل کی ہے کہ نہیں؟ لیکن ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے اپنے سے پہلے لوگوں کے حال سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ اللہ جل شانہ ہمیں معاف فرمائیں، ہماری اس غفلت کو معاف فرمائیں۔

زندگی کے پانچ دور

میرے بھائیو! یہ دنیا کی زندگی بہت مختصر سا وقفہ ہے جو تمہیں دیا گیا ہے، آج کے اخبار میں آپ نے پڑھا ہوگا، میں نے گورنر پنجاب کے نام خط لکھا ہے۔ جس میں دنیا کی حقیقت کو ذکر کیا ہے کہ ماں کے پیٹ کا وقفہ، اس کے بعد دنیا کی زندگی کا وقفہ، پھر قبر میں رہنے کا وقفہ، پھر حشر کے میدان کا وقفہ، پھر اس کے بعد ابدی زندگی جنت یا جہنم۔ یہ پانچ وقفے یا یوں کہو کہ تمہاری زندگی کی پانچ منزلیں ہیں۔ ماں کے پیٹ میں آئے تھے تو چار مہینوں تک تو پہلے پانی کی شکل میں رہے، پھر جمے ہوئے خون کی شکل میں، پھر گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں، پھر بے جان دھڑ کی شکل میں رہے جس کی کوئی قیمت ہی نہیں تھی، چار مہینے بعد روح ڈال دی گئی، اب تم انسان بن گئے، یہاں سے تمہاری زندگی شروع ہوئی، لیکن ماں کے پیٹ کی یہ زندگی ایسی زندگی تھی کہ عقلاً اس کو زندگی ہی نہیں سمجھتے، کیسی تنگی اور تاریکی کی زندگی تھی؟ لیکن یہ نادان اسی زندگی پر مطمئن تھا، چنانچہ وہاں سے آتے ہوئے بھی یہ رو رہا تھا اور یوں سمجھ رہا تھا کہ میرا جہان مجھ سے چھڑا رہے ہیں، میری زندگی مجھ سے چھین رہے ہیں۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ چیونٹی کے انڈے کے اندر جو بچہ ہے اس کے لئے انڈے کا خول ہی زمین و آسمان ہے، اور وہ یوں سمجھتا ہے کہ اس سے بڑا آسمان اور زمین اس دنیا میں ہے ہی نہیں، اور نہ ہو سکتا ہے۔ بالکل یہی حال ہمارا یہاں دنیا کی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد ہوا، ہم نے یہاں آکر زمین و آسمان کو دیکھا تو سمجھ لیا کہ اس سے بڑی دنیا ہو ہی نہیں سکتی، چنانچہ زندگی کے اگلے ادوار، یعنی عالم برزخ، عالم حشر اور جنت و دوزخ کو بھول بھال گئے، انبیاءؑ کرام علیہم السلام نے اور ان کے سچے جانشینوں نے ہمیں یاد دلایا کہ اس "بیضۂ مور" (چیونٹی کے انڈے) میں دل نہ

لگاؤ، اس زندگی کو زندگی سمجھ کر اگلی زندگی کو نہ بھول جاؤ۔ لیکن ہم نے اس زندگی کی ترقیات کو کمال سمجھ لیا، اور جو حضرات اس زندگی سے منہ موڑ کر آخرت کی زندگی کی طرف متوجہ ہونے کی تعلیم دیتے ہیں ان کا مذاق اُڑانا شروع کردیا۔ اچھی بات ہے، کھاؤ، کماؤ، مُلّاؤں کا مذاق اُڑاو، کہ یہ کچھ نہیں کماتے کھاتے، ڈگریاں حاصل نہیں کرتے، دنیا کی ترقیات سے روکتے ہیں۔ بہت جلد تم کو معلوم ہوجائے گا کہ یہ مُلّا مذاق اڑانے کے لائق تھے، یا تم خود بدولت اس لائق تھے کہ تمہارا مذاق اڑایا جائے؟ شب وروز ہمارے سامنے عبرت کے نمونے ظاہر ہوتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں عبرت نہیں ہوتی۔

دنیا کی ڈگریوں کا انجام

میرے پاس پرسوں ایک صاحب آئے، کہنے لگے کہ امریکا سے چھ لاشیں آرہی ہیں، تابوتوں کی شکل میں۔ تو کیا ان تابوتوں کو کھول کر دفن کیا جائے یا ایسے ہی یعنی بغیر کھولے دفن کیا جائے؟ میں نے کہا کہ اگر لاشیں کچھ اچھی حالت میں ہوں تو کھول کر دفن کیا جائے؟ اور اگر اچھی حالت میں نہیں تو پھر ایسے ہی تابوت سمیت ہی دفن کردی جائیں۔ لیکن لاش کی بے حرمتی نہ کرو۔ وہ کہنے لگے ان چھ میں سے دو لاشیں سگے بھائیوں کی ہیں، ایک بھائی انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے لئے امریکا گیا تھا، اور دوسرے نے "میڈیکل" کی سب سے بڑی ڈگری حاصل کرلی تھی۔ اور انگلستان کی حکومت نے اسے وہاں پر ملازمت دے دی تھی۔ (یہ بھائی اس انجینئرنگ کرنے والے بھائی کو ملنے امریکا گیا تھا) بڑی اونچی تنخواہ تھی، بڑا اونچا عہدہ تھا، بڑی اعلیٰ تعلیم اور بڑی اونچی ڈگری تھی، بھائی سے ملنے امریکا گیا تھا، دونوں بھائی کہیں گھومنے گئے، وہیں ختم

ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بس یہی قیمت تھی ان ڈگریوں کی جن پر ناز کررہے تھے؟ اس زندگی کی یہی قیمت تھی جس پر ناز کررہے ہو؟ اور یہ بیچارے تو ابھی نوجوان ہی تھے کہ دھر لئے گئے، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہم میں سے ہرایک کی زندگی کا یہی نقشہ نہیں ہے؟

دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں

کسی کی پچاس سال کی زندگی تھی، کسی کی ساٹھ سال کی، کسی کی اسّی سال کی۔ اور ماں کے پیٹ میں وہ پانچ مہینے کی زندگی تھی، اس زندگی کو ذرا اسّی سال کی زندگی پر تقسیم کرو تو یہ ماں کے پیٹ والی زندگی اس پچاس، ساٹھ اور اسّی سالہ زندگی کے مقابلے میں کتنی مختصر نظر آئے گی؟ اور ہم میں سے ہر شخص اس پیٹ والی زندگی کے بارے میں کہے گا کہ بھلا وہ زندگی بھی کوئی زندگی تھی؟ اچھا اب آگے چلئے، یہاں اسّی برس گزار کر ہم قبر میں پہنچ گئے، وہاں آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت سے آج تک لوگ قبروں میں پڑے ہوئے ہیں، اور ابھی خدا جانے کب تک پڑے رہیں گے۔ اب اس دنیا کی زندگی کو اس "قبر کی طویل زندگی" پر تقسیم کرو تو ہماری یہ دنیا کی زندگی اس برزخی زندگی کے مقابلہ میں کتنی مختصر معلوم ہوگی؟ اور وہ برزخ کی زندگی بھی، خواہ دنیا کی زندگی کے مقابلہ میں کتنی ہی طویل نظر آئے لیکن وہ دائمی نہیں۔ بلکہ ایک دن وہ بھی کٹ جائے گی، اس کے بعد ایک دن آنے والا ہے حشر کا، جس کا ایک دن پورے پچاس ہزار سال کا ہے۔ اب برزخ کی زندگی کو (قبر والی زندگی کو) اس روز حشر کے پچاس ہزار سال پر تقسیم کرو تو برزخ کی زندگی کالعدم نظر آئے گی، پھر اس پچاس ہزار سال والے دن کے بعد اصل زندگی اب شروع ہونے والی ہے۔

قیامت کا دن ختم ہو گا تو وہ زندگی شروع ہوگی جو دائمی اور ابدی ہے، جس کا کوئی سرا ہی نہیں، کوئی انتہاً ہی نہیں، تمہاری سوچ و فکر سوچتے سوچتے تھک جائے گی لیکن وہ زندگی ختم نہیں ہوگی۔ انبیاً کرام علیہم السلام ہمیں اس زندگی کی دعوت دیتے ہیں، جو لازوال ہے، جو ابدی ہے، جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ اس زندگی کی کامیابی کی دعوت دیتے ہیں، اور وہاں کی ناکامی سے ڈراتے ہیں۔ یعنی ان اعمال سے تم وہاں کی زندگی میں کامیاب ہو جاؤ گے اور ان اعمال سے تم وہاں ناکام ہو جاؤ گے، یہ حضرات ہمیں اس زندگی کی کامیابی اور ناکامی سے بچنے کی دعوت دیتے ہیں، اور ہماری اس دنیا کی زندگی کو زندگی نہ سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں، چونکہ لوگوں کو ان حضرات کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اس لئے کفار کہتے تھے کہ یہ پاگل ہے، مجنون ہے، دیوانہ ہے، اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ انبیاً کرام علیہم السلام کے وقت کی بات تھی، آج تم نے، ہاں! مسلمان کہلانے والوں نے کہا کہ یہ مُلّا ہے، یہ صوفی ہے، یہ دور حاضر کے تقاضوں سے بے خبر ہے، اس کو کچھ پتہ نہیں کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، یہ صوفی و مُلّا آج تک بسم اللہ کے گنبد میں بند ہے، مسجد کے مینڈھے، قل اعوذیئے، اور نہ جانے کیا کیا خطاب تم غریب مُلّا کے لئے تجویز کرتے ہو، جس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ آج وہی بات کہہ رہا ہے جو اپنے وقت میں انبیاً کرام علیہم السلام کہتے آئے ہیں۔

دنیا سے آخرت کا توشہ حاصل کرو

تو یہ دنیا میٹھی ہے، سرسبز ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں یہاں اس لئے لا رہے ہیں اور تمہیں پہلوں کا جانشین بنا رہے ہیں کہ تم کچھ عبرت حاصل کرو اور دیکھو کہ

یہاں سے کیا توشہ لے کر جارہے ہو؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تھا:

"اے ابوذر! توشہ لے لینا! کیونکہ سفر بہت لمبا ہے، اور ذرا بوجھ ہلکا رکھنا کیونکہ گھاٹی بڑی دشوار گزار ہے، جس پر چڑھنا ہے۔ کمر پر سارا بوجھ لاد کر چڑھنا پڑے گا۔ قرآن کریم میں ہے "اور وہ لادے ہوئے ہوں گے بوجھ اپنی کمروں پر"۔

مشکوٰۃ شریف (صفحہ ۴۴۳) میں حدیث ہے کہ حضرت اُم درداءؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اپنے شوہر ابوالدرداءؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ آپ کیوں روزی نہیں کماتے، جیسا کہ فلاں شخص کماتا ہے؟ کہنے لگے، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ:

"تمہارے آگے ایک گھاٹی ہے، بہت دشوار گزار، جن کا بوجھ بھاری ہوگا وہ اس گھاٹی کو عبور نہیں کرسکیں گے"۔

اس لئے میں اس گھاٹی کی خاطر اپنا بوجھ ذرا ہلکا رکھنا چاہتا ہوں، اور حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ:

"عمل ذرا خالص لے کر جانا اس لئے کہ پرکھنے والا بڑا باریک بین ہے"۔

وہاں کھوٹ نہیں چلے گا۔ اس دفعہ دوران طواف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا بہت یاد آئی اور میں اکثر اسی کو پڑھتا رہا:

"واسئلک نفسا بک مطمئنة تومن بلقائک، وترضی بقضائک، وتقنع

بعطائک۔"

ترجمہ: "یا اللہ! میں آپ سے مانگتا ہوں ایسا نفس جو آپ پر مطمئن ہو جائے، جو آپ کی ملاقات پر ایمان رکھتا ہو، اور جو آپ کے قضا اور قدر کے فیصلوں پر راضی ہو، اور جو آپ کی عطا پر قناعت کرلے، (کہ جتنا میرے مالک نے دیا ہے وہ میرے لئے بہت کافی ہے۔ بس اس سے زیادہ نہیں چاہئے، بس یہی بہت ہے)"۔

عورتوں کا فتنہ

جس خطبہ کو میں نے شروع میں ذکر کیا تھا اس میں دنیا کی بے ثباتی ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

"خبردار! پس دنیا سے ڈرو اور عورتوں سے ڈرو"۔

یعنی ان کے فتنے سے بچو کیونکہ بنی اسرائیل کا پہلا فتنہ عورتوں سے ہوا، مشہور ہے کہ تین چیزیں فساد کی جڑ ہیں۔ زن، زر اور زمین۔ دنیا میں جتنے بھی فتنے ہو رہے ہیں ان تین چیزوں کی وجہ سے ہیں یا عورت کا چکر ہے یا زر کا یا زمین کا۔

یہ بھی دنیا کی ایک مثال ہے کہ ان چیزوں سے آدمی جیسا دھوکا کھاتا ہے، ویسا ہی دنیا سے دھوکا کھاتا ہے۔ خاص طور سے عورتوں کا فتنہ بڑا سخت ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں صحیح بخاری و مسلم کے حوالے سے حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"میں نے اپنے بعد کوئی ایسا فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں کے

حق میں عورتوں سے زیادہ مضر ہو"۔

یعنی مردوں کے حق میں سب سے زیادہ نقصان وہ فتنہ عورتوں کا ہے، پس دنیا پر فریفتہ ہوکر اللہ تعالیٰ کو اور اپنی عاقبت کو نہ بھول جاؤ، راہ حق سے برگشتہ نہ ہوجاؤ اور زر، زمین اور عورتوں کے فتنہ میں مبتلا ہوکر دین سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو!

خاتمہ کے لحاظ سے لوگوں کی چار قسمیں

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ:

"لوگ چار قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک آدمی مؤمن پیدا ہوتا ہے، مؤمن جیتا ہے اور مؤمن مرتا ہے"۔

(اللہ جل شانہ ہم سب کو ان میں سے کردے، آمین۔ پیدا بھی مسلمانوں کے گھر میں ہوا، الحمدللہ زندگی بھی مسلمانوں والی گزاری، اور الحمد للہ موت بھی مسلمانوں والی آئی۔ اللہ جل شانہ یہ بھی نصیب فرمائے، یہ سب سے بڑا خوش قسمت ہے)۔

"دوسرا شخص وہ جو کافر پیدا ہوا، کافر جیا، اور کافر مرا"۔ (نعوذ باللہ۔ یہ سب سے بدتر شخص ہے)۔ "تیسرا وہ شخص جو کافر پیدا ہوا، کافر جیا، لیکن مؤمن مرا"۔ (اس کی خوش قسمتی کہ خاتمہ ایمان پر ہوا) "اور چوتھا آدمی اس کے برعکس کہ مؤمن پیدا ہوا، مؤمن جیا، لیکن کافر مرا"۔ (نعوذ باللہ)

برے خاتمہ سے اللہ جل شانہ پناہ میں رکھے، عملوں کا مدار خاتموں پر ہے، اگر خاتمہ اچھا ہو تو آدمی اچھا رہا، اور اگر نعوذ باللہ خاتمہ برا ہوا تو پہلے کی اچھائی کا کوئی اعتبار نہیں۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے ایسا شخص تو مارا گیا، اگر خدانخواستہ خاتمہ

اچھا نہیں ہوا تو اس کے نماز اور روزے کا، حج اور زکوٰۃ کا کوئی اعتبار نہیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تھے:

"اللھم اجعل اوسع رزقک علی عند کبر سنی وانقطاع عمری، واجعل خیر عمری آخرہ وخیر عملی خواتیمہ وخیر ایامی یوم القاک فیہ۔"

ترجمہ: "یا اللہ! اپنا سب سے زیادہ وسیع رزق مجھے اس وقت عطا فرمانا جب میری عمر زیادہ ہو جائے (میں بڑھا ہو جاؤں، اور زندگی ختم ہونے والی ہو) یا اللہ! میری عمر کا سب سے اچھا حصہ اس کو بنا جو میری عمر کا سب سے آخری حصہ ہو، یا اللہ! میرے اعمال میں سب سے بہتر عمل اس عمل کو بنا جس پر میرا خاتمہ ہو، اور میرا سب سے بہتر دن اس دن کو بنا جس دن میں آپ سے ملاقات کروں، یعنی موت آئے"۔ (آمین! یارب العالمین)

بہرحال اعتبار خاتمے کا ہے اور یہ وہ بات ہے جس نے عارفین کی کمر توڑ رکھی ہے، اور وہ سوءِ خاتمہ سے ترساں ولرزاں رہتے ہیں، کہ خدا جانے کس حالت میں خاتمہ ہو۔ (یا اللہ! ہمیں حسن خاتمہ نصیب فرما، اور سوءِ خاتمہ سے پناہ عطا فرما) اس لئے فرماتے ہیں کہ اپنی اطاعت وعبادت پر ناز نہ کرو، اور کسی گناہ گار کو دیکھ کر اسے نظرِ حقارت سے نہ دیکھو اور اسے حقیر نہ جانو۔ اگر تم اچھے راستہ پر لگ گئے ہو تو یہ تمہارا کمال نہیں، میرے مالک کا کرم ہے، اس کی عنایت ہے، اس کا لطف ہے۔

شیخ ابو عبد اللہ مغربیؒ کا عبرتناک واقعہ

حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے کسی زمانہ میں ایک رسالہ شائع کیا تھا، اب شاید کم چھپتا ہے، کہیں کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس میں اس قصہ کو بڑی تفصیل سے لکھا تھا، اور ہمارے شیخ نوّر اللہ مرقدہ نے بھی اس واقعہ کو لکھا ہے مگر مختصر۔ حضرت حکیم الامتؒ نے بھی لکھا ہے مگر مختصر۔ اور میں مختصر کا بھی مختصر سنا دیتا ہوں۔ شیخ ابو عبد اللہ مغربیؒ ایک بزرگ تھے، بہت بڑے عالم، بہت بڑے محدث، بہت بڑے شیخ۔ ہزاروں لوگ ان کے حلقہ درس میں ہوتے تھے، اور لاکھوں ان کے مرید تھے، ایک بار اپنے مریدوں کے ساتھ کہیں جارہے تھے، ایک بستی میں پہنچے، یہ عیسائیوں کی بستی تھی، لڑکیاں کنوئیں پر پانی بھر رہی تھیں۔ ایک لڑکی پر شیخؒ کا دل آگیا، اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ تم لوگ تو جاؤ، میں تو یہیں رہوں گا، مریدوں میں کہرام مچ گیا، شیخ بھی رو رہے تھے، لیکن کہہ رہے تھے کہ قضا وقدر کا وقت ہے، اس لڑکی کی محبت میرے دل میں گھر کر گئی ہے، جب تک اس لڑکی کو حاصل نہیں کروں گا یہاں سے قدم آگے نہیں بڑھاؤں گا، تم جاؤ ـــــ لڑکی کے والد کو پیغام دیا۔ وہ کہنے لگا دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ عیسائی ہو جاؤ، زنار پہن لو۔ اور دوسری یہ کہ ایک سال تک جنگل میں سور چراؤ۔ شیخ نے کہا مجھے منظور ہے۔ نعوذ باللہ عیسائی ہو گئے، اور جنگل میں خنزیر چرانے لگے، کچھ عرصہ بعد ایک شاگرد، مرید اور خلیفہ کو خیال آیا کہ شیخؒ کو دیکھنا تو چاہئے کہ کس حالت میں ہیں؟ جنگل میں پہنچے تو دیکھا کہ خنزیر چرا رہے ہیں، وہی عصا جس کو ہاتھ میں لے کر شیخ خطبہ پڑھا کرتے تھے اسی پر ٹیک لگا کر سور چرا رہے ہیں۔ اس مرید نے سلام کیا، انہوں نے "وعلیکم السلام" سے جواب دیا۔ مرید نے کہا کہ حضور! قرآن کے حافظ تھے، کوئی آیت یاد ہے؟ کہا کچھ یاد

نہیں، سورۃ الفاتحہ سے والناس تک سب بھول گیا ہوں، کچھ بھی یاد نہیں رہا، بس ایک آیت کا ٹکڑا یاد ہے: ومن یضلل اللّٰہ فلا ھادی لہ۔

یعنی ”جس کو اللہ جل شانہ گمراہ کردے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا“۔

پوچھا کہ آپ احادیث کے بھی حافظ تھے، کوئی حدیث یاد ہے؟ کہا کچھ یاد نہیں، صرف ایک حدیث یاد ہے: من بدل دینہ فاقتلوہ۔

یعنی ”جو شخص اپنے دین کو تبدیل کرکے مرتد ہوجائے اس کو قتل کردو“۔

پوچھا کہ حضرت! کیا بات ہوئی کہ ایمان سلب ہوگیا؟ فرمایا، جب ہم بستی میں داخل ہوئے اور ان لوگوں کو دیکھا تو میرے دل میں خیال آیا کہ کیسے گندے لوگ ہیں؟ احمق لوگ ہیں، کیسا گندا مذہب ان لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے، ان کو اتنی بھی عقل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایک بندے کو خدا بنا رکھا ہے؟ فوراً غیرت الٰہی جوش میں آئی اور فرمایا کہ تم نے اس ہدایت کو اپنا کمال سمجھا ہے؟ ایمان کو اپنا کمال سمجھا ہے؟ یہ تمہارا کمال نہیں، ہماری عطا ہے، اور جب اس لڑکی پر نظر پڑی تو ایسا لگا کہ دل سے ایک پرندہ اڑ کر نکل گیا، اور وہ ایمان تھا، اب میں خالی ہوں۔ یہ رو دھو کر واپس آگئے۔ ان کے مریدوں نے گڑگڑا کر دعا کی، اُدھر شیخ بھی اتنا روئے کہ ان کی گریہ وزاری کو دیکھ کر خنزیر بھی رونے لگے، اللہ تعالیٰ نے ان کی گریہ وزاری سن لی اور دوبارہ نور ایمان عطا فرما دیا، یہ وہیں جنگل سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ آگے ایک دریا پڑتا تھا، مرید وہاں پہنچے، تو دیکھا کہ شیخؒ دریا میں غسل فرما رہے ہیں۔ یہ قریب آئے تو شیخؒ نے کہا کہ مجھے کوئی چادر لنگی پاک کپڑا دو۔ بہرحال لمبا قصہ ہے۔ وہ لڑکی بھی مسلمان ہوکر

آگئی۔ شیخؒ نے ان کو اپنی خانقاہ کے ایک حجرہ میں ٹھہرا دیا اور کہا کہ دنیا میں ملاقات نہیں ہوسکتی، آخرت میں ہوگی۔

اپنے آپ کو سب سے بدتر سمجھو

الغرض! اپنی اچھی حالت پر ناز نہ کرو، اور دوسروں کو اپنے سے اچھا جانو، اسی بنأ پر امام ربانی مجدد الف ثانیؒ فرماتے تھے کہ:

"بندہ حقیقت تقویٰ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اپنے آپ کو کافر فرنگ سے بھی بدتر نہ سمجھے"۔

جس کو تم فرنگی کافر سمجھتے ہو کیا پتہ اس کا خاتمہ کس طرح ہوتا ہے؟ اور کیا معلوم کہ تمہارا خاتمہ کیسا ہو؟ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور ایمان کی سلامتی کی دعا مانگتے رہنا چاہئے۔ ناز کرنے کا کوئی مقام نہیں ہے۔ ایمان کی سلامتی میسر آجائے اور ایمان پر خاتمہ نصیب ہوجائے تو بڑی دولت ہے۔ ورنہ سب کچھ ہیچ اور لغو ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ جارہا تھا، راستے میں ایک درویش ملے، جو اپنی کٹیا سے باہر بیٹھے تھے، پاس ان کا کتا تھا، بادشاہ نے درویش کو چھیڑنے کے لئے کہا کہ میاں درویش! تم اچھے ہو یا تمہارا کتا؟ درویش کہنے لگے کہ بادشاہ سلامت! میرے سامنے ایک گھاٹی ہے، جس کو موت کہتے ہیں، اگر میں اس گھاٹی سے ایمان سلامت لے گیا تو انشأ اللہ میں کتے سے اچھا ہوں۔ ورنہ کتا مجھ سے اچھا ہے۔

الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ جل شانہ نے لوگوں کو چار قسم کا پیدا کیا ہے، ایک مؤمن پیدا ہوا، مؤمن جیا، اور مؤمن مرا، اور

ایک کافر پیدا ہوا، کافر جیا، اور کافر ہی مرا، نعوذ باللہ۔ اور ایک کافر پیدا ہوا، کافر جیا، لیکن مؤمن ہو کر مرا، اور ایک مؤمن پیدا ہوا، مؤمن جیا، لیکن کافر ہو کر مرا، نعوذ باللہ۔

ایک جنتی، جس نے ایک بھی نماز نہیں پڑھی

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کسی جہاد میں تشریف لے گئے تھے، وہاں ایک صاحب آئے کہنے لگے میں بھی مسلمان ہونا چاہتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مسلمان کرلیا۔ جہاد ہو ہی رہا تھا جہاد میں شریک ہوا اور شہید ہو گیا، ایک بھی نماز نہیں پڑھی، ایک بھی نماز اس پر فرض نہیں ہوئی، مسلمان ہوا شہید ہو گیا، نہ معلوم کتنی زندگی کفر میں گزاری ہو گی۔

غصہ کے اعتبار سے لوگوں کی چار قسمیں

اس کے بعد فرمایا کہ:

> ”غصہ کے اعتبار سے لوگوں کی چار قسمیں ہیں۔ ایک وہ آدمی ہے جس کو بڑی دیر سے غصہ آتا ہے اور فوراً ہی اُتر جاتا ہے۔ فرمایا، یہ شخص سب سے افضل ہے“۔

مجھے ایسے لوگوں پر بڑا رشک آتا ہے کہ ان کو کبھی غصہ ہی نہیں آتا ہے، اور آئے بھی تو وہ بھی بس وقتی غصہ ہوتا ہے کہ دوسرے وقت میں اس کا کوئی اثر نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ سب سے بہتر ہے، سب سے اچھا آدمی ہے۔ جس کو بہت دیر سے غصہ آئے اور فوراً ہی اُتر جائے۔

> ”دوسرا وہ ہے جس کو بہت جلدی غصہ آتا ہے اور جب آتا

ہے تو اُترتا بھی نہیں، بہت دیر کے بعد غصہ جاتا ہے"۔

اس غریب کی ہر ایک کے ساتھ لڑائی رہتی ہے کیونکہ ہر آدمی کے مزاج کے خلاف تو کوئی نہ کوئی بات پیش آئے گی، اس غریب کی مصیبت یہ ہے کہ جس سے ایک دفعہ غصہ ہوگیا پھر مان جانے کی کوئی صورت نہیں، ناراضگی دور نہیں ہوتی، فرمایا:

> "یہ بدترین آدمی ہے جس کو غصہ فوراً آئے اور غصہ آنے کے بعد جانے کا نام نہ لے، ایک وہ آدمی ہے جس کو دیر سے غصہ آتا ہے اور اُترتا بھی دیر سے ہے، ایک وہ ہے جس کو جلدی غصہ آتا ہے اور اُترتا بھی جلدی ہے۔ یہ دونوں برابر ہیں کہ ان میں ایک اچھائی ہے اور ایک عیب"۔

غصہ کا سبب اور اس کا علاج

ارشاد فرمایا کہ:

> "غصہ دراصل آگ کا انگارہ ہے، جو آدمی کے دل پر رکھ دیا جاتا ہے۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس کی رگیں کیسی پھول جاتی ہیں اور اس کی آنکھیں کیسے سرخ ہوجاتی ہیں؟ سو اگر کسی شخص کو غصہ کی کیفیت پیش آئے تو اسے چاہئے کہ لیٹ جائے اور زمین سے چپک جائے"۔

گویا غصے کا علاج یہ ہے کہ کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ، بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ۔ ہوتا اس کے الٹ ہے کہ غصہ میں لیٹا ہوا آدمی اُٹھ بیٹھتا ہے، بیٹھا ہو تو کھڑا ہوجاتا ہے، کھڑا ہو تو آستین چڑھا کر لڑنے کے لئے آگے بڑھتا ہے، ہر چیز کا علاج بالضد

ہوتا ہے۔ غصہ کا علاج بھی یہ ہے کہ اس کے مقتضا کی ضد پر عمل کرے۔ یعنی کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ، بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ، آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب دو آدمی لڑتے ہیں تو لوگ جب کسی کو پکڑتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ چھوڑ دو مجھے۔ لوگ پکڑ رہے ہیں مگر وہ کہتا ہے چھوڑو مجھے، ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے۔ یہ غصہ کا اثر ہے۔ تو غصہ کا علاج یہ ہے کہ زمین پر لیٹ جاؤ، اور اس کو لازم پکڑو اس کی ایک تو ظاہری خاصیت ہے، اور ایک باطنی خاصیت ہے۔ ظاہری خاصیت تو یہ ہے کہ تجربہ ایسا ہے، کہ اگر آدمی لیٹ جائے گا تو غصہ پر عمل نہیں ہوسکے گا۔ کھڑا ہے تو بیٹھ جائے گا تو بھی غصہ پر عمل نہیں ہوسکے گا، اور یوں غصہ کا علاج اس کی ضد پر عمل کرنا ہوا۔ اور باطنی خاصیت یہ ہے کہ زمین ہماری ماں ہے، اور یہ ہمارے سارے بوجھ کو برداشت کرتی ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

ترجمہ: ''کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو سمیٹنے والی، تمہارے زندوں کو بھی مردوں کو بھی''۔

یہ زمین سب کو سمیٹتی ہے، لوگ نہ جانے اس پر کیا کیا مارتے ہیں، مگر برداشت کرتی ہے۔ تو مٹی کے اندر سکون ہے، وقار ہے، تواضع ہے اور پھر ہماری ماں بھی ہے، تو جتنا ماں کی گود کے قریب آؤ گے، اتنے زیادہ اس شر سے محفوظ رہو گے، اور اتنا ہی تم میں حلم اور وقار پیدا ہوگا۔ تواضع پیدا ہوگی۔ اب اس تفصیل کا موقع نہیں کسی دوسرے وقت میں انشاءاللہ بیان کروں گا کہ غصہ کی اصل کبر ہے، جس کی وجہ سے غصہ آتا ہے، لہٰذا اپنے سے چھوٹے پر غصہ آتا ہے بڑے پر نہیں آتا، تو اگر آدمی کے اندر عجز اور تواضع پیدا ہوجائے، مسکنت پیدا ہوجائے، سکون پیدا ہوجائے، وقار پیدا ہوجائے، تواضع پیدا ہوجائے، تو پھر غصہ کا علاج ہوجائے گا، یہاں یہ بات بھی یاد رہنی چاہئے کہ ایک

تو غصہ کی کیفیت طبعی ہے کہ غصہ آدمی کے اندر اُبھرتا ہے اور جوش مارتا ہے، یہ تو ایک طبعی بات ہے، چونکہ یہ غیر اختیاری چیز ہے اس لئے اس پر تو مؤاخذہ نہیں ہے، پکڑ نہیں ہے، اور ایک ہے اپنے غصے پر عمل کرنا، چاہے زبان سے ہو، یا ہاتھ پاؤں سے، اس پر مواخذہ ہے، اور اسی لئے اسے رفع کرنے کی تدبیر بتانے کی ضرورت پیش آئی۔ غصہ کو رفع کرنے کی تدبیر پیش کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جب آدمی غصہ میں ہوتا ہے تو ایک جنون کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، آدمی آپے میں نہیں رہتا، اس سے ناشائستہ حرکات صادر ہوجاتی ہیں، اور اس کی زبان سے ناشائستہ الفاظ نکل جاتے ہیں، بے قابو ہوجاتا ہے، اس لئے غصہ کا علاج ضروری ہے، اور غصہ کا علاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین کے قریب ہوجاؤ، جس سے تم میں مسکنت پیدا ہوگی، اور اس رذیلہ کی اصلاح ہوجائے گی۔ حافظ ابن قیمؒ نے لمبی فہرست دی ہے غصہ کے علاج کی۔ انہی میں سے ایک یہ ہے کہ ٹھنڈا پانی پی لو۔ اور یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ ٹھنڈا پانی پی لوگے تو تم میں خنکی پیدا ہوجائے گی اور اندر جو غصہ کی آگ بھڑک رہی ہے وہ بجھ جائے گی۔ اور ایک علاج یہ ہے کہ لاحول پڑھو، لیکن لاحول کا پڑھنا صرف لفظوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ معنی کا تصور کرتے ہوئے، اس لئے کہ غصہ شیطان کے اُبھارنے اور چوکا دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو "نزغۂ شیطان" فرمایا گیا ہے۔ تو لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھو تاکہ شیطانی اثرات دور ہوجائیں۔

ادائے قرض میں لوگوں کی چار قسمیں

پھر فرمایا کہ:

"قرض کے ادا کرنے اور وصول کرنے کے لحاظ سے بھی لوگوں کی چار قسمیں ہیں، ایک وہ شخص ہے کہ اگر کسی کا قرض دینا ہو تو بہت اچھے طریقہ سے ادا کرتا ہے، کہ سامنے والے سے بار بار چکر نہیں لگواتا، بلکہ خود ہی بروقت ادا کردیتا ہے، لیکن کسی سے وصول کرنا ہو تو اس میں ذرا بھی رواداری نہیں کرتا، بلکہ بری طرح تقاضا کرتا ہے، فرمایا کہ اس کی تو ایک اچھی عادت بری عادت کے مقابلہ میں ہوگئی، کہ بروقت قرض ادا کرنا بڑی اچھی بات ہے، جب کہ سختی سے وصول کرنا بری بات ہے، تو اس شخص میں ایک اچھی بات پائی گئی اور ایک بری، یوں اس کا معاملہ برابر کا رہا۔ اور دوسرا آدمی وہ ہے کہ کسی کو قرضہ دینا ہو تو بری طرح دیتا ہے، دوسرے کو پریشان کرکے دیتا ہے۔ لیکن کسی سے لینا ہو تب بھی سختی نہیں کرتا، یہاں بھی ایک اچھی عادت ایک بری عادت کے ساتھ مل کر معاملہ برابر کا ہوگیا۔ اور تم میں سب سے بہتر اور سب سے اچھا آدمی وہ ہے کہ اگر کسی کا دینا ہو تو فوراً دے، بروقت دے، بغیر مانگے کے دے، اور کسی سے لینا ہو تو سختی سے تقاضا نہ کرے۔ یہ تیسرے نمبر کا آدمی ہوا جو سب سے بہتر اور سب سے اچھا ہے، کہ اس میں دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں، ادا کرنے کی خوبی یہ کہ بروقت ادا کرے۔ اور وصول کرنے کی خوبی یہ کہ اس میں سختی نہ کرے، اور تم میں سب سے بدتر آدمی وہ ہے کہ اگر کسی کا قرض ادا کرنا ہو تو دینے کا نام نہ لے، اور اگر کسی سے لینا ہو تو سختی بلکہ فحش کلامی کے ساتھ تقاضا کرے اور اس معاملہ میں ذرا بھی رو رعایت نہ کرے، یہ چوتھا آدمی سب سے بدتر ہے کہ اس نے دونوں برائیاں جمع کرلیں۔ قرض لے کر واپس نہ کرنے کی برائی بھی، کہ واپس کرنے کا نام ہی نہیں لیتا، اور کسی سے قرض وصول کرنے کی برائی بھی کہ نرمی اور خوش اخلاقی کے ساتھ قرض کا تقاضا نہیں کرتا، بلکہ سختی اور بدکلامی کے

ساتھ تقاضا کرتا ہے۔

دنیا کی عمر ختم ہو چکی ہے

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطبہ اتنا طویل فرمایا کہ دھوپ درختوں کے سروں اور دیواروں کے کناروں تک پہنچ گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی عمر بس اتنی باقی رہ گئی ہے جس قدر پورے دن کے مقابلے میں اب دن کا حصہ باقی رہ گیا ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ ایک تو آدمی کی زندگی ناپائیدار ہے، کوئی بھروسہ نہیں کہ کب وقت موعود آجائے، علاوہ ازیں خود دنیا بھی بوڑھی ہو چکی ہے، اور اب پورے عالم کی موت کا وقت بھی کچھ زیادہ دور نہیں، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نام "نبی الساعہ" ہے، یعنی "قیامت کا نبی"۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری بجائے خود قرب قیامت کا اعلان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی نہیں ہوگا، بس اب قیامت ہے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری گویا فنائے عالم کے آثار شروع ہونے کی علامت ہے، حق تعالیٰ شانہ ہمیں آخرت کی تیاری کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بیان کا منظوم خلاصہ

حضرت نے یوں بیان کیا مقصد حیات
خوش رنگ ایک سانپ ہے دنیائے بے ثبات
جو اس کے حسن ظاہری سے دھوکا کھا گیا
وہ اپنے جسم وروح کو خود ہی ڈسا گیا
دنیا تو درحقیقت ہے اک امتحان گاہ
وہ آخرت میں فیل ہے، کی جس نے اس کی چاہ
دنیا کی ڈگریوں کی حقیقت بھی کچھ نہیں
عقبیٰ میں ایسے علم کی وقعت بھی کچھ نہیں
دنیاسے آخرت کیلئے توشہ لے کے چل
دنیائے بے ثبات کے دھوکے سے تو نکل
ہرگز نہ اپنے آپ کو بہتر قیاس کر
سارے جہاں سے خود کو ہی بدتر قیاس کر
غصہ نہ کر کہ غصہ علامت ہے کبر کی
غصہ کسی قوی پہ تو آتا نہیں کبھی
اور اب ذرا سی بات ہو دنیا کی عمر کی
دنیا دراصل دوستو! اب بوڑھی ہوچکی
بعثت رسول پاک کی خود اس کی ہے دلیل
دنیا کی عمر رہ گئی ہے اب بہت ہی قلیل
ختم الرسل کی دہر میں تشریف آوری
پہلی نشانی قرب قیامت کی ہے یہی
آخر میں التجا ہے ہماری کہ یامجیب
تیاری آخرت کی ہمیں بھی ہو اب نصیب

شاہین اقبال اثر جونپوری

محبتِ رسول ﷺ

اور اس کے تقاضے

فہرستِ مضامین

صفحہ	عنوان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی، واشھدان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، واشھدان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا، اما بعد:

آج کی مجلس میں ان شاء اللہ چند باتیں ذکر کرنے کا خیال ہے۔

دستار بندی

سب سے پہلے تو یہ کہ ستائیسویں شب کو یہاں مدرسہ کے ان بچوں کی دستار بندی ہوئی تھی، جنہوں نے قاری مقبول احمد صاحب کے پاس قرآن مجید کا حفظ مکمل کیا تھا، کسی کی گردان ہو گئی، کسی کی نہیں ہوئی ہوگی، لیکن اس سال کے حفظ مکمل کرنے والے سب حفاظ کی دستار بندی ہوئی۔ میرے دوست مولانا

سعید احمد جلال پوری بھی ہمارے ساتھ اعتکاف میں ہیں، یہ میرے بہت پرانے رفیق ہیں، انہوں نے ایک عرصہ تک میری سردی گرمی، کو اور میری کڑوی، کسیلی باتوں کو برداشت کیا ہے، اور میرے عیوب سے جتنا یہ واقف ہیں شاید دوسرے رفقاء میں کوئی واقف نہیں ہوگا، میں چاہتا تھا کہ ان حفاظ کے ساتھ ان کی دستار بندی بھی کردوں، مگر اس دن یہ مجھے نظر نہیں آئے، اس لئے سب سے پہلے تو آج ان کی دستار بندی کرتا ہوں۔ یہ ان کے لئے دستار خلافت ہے۔ (اس کے بعد مولانا سعید احمد جلال پوری صاحب مدظلہ العالی کی دستار بندی کی گئی)۔

خدمت میں کوتاہی پر معذرت

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ آپ حضرات اللہ تعالیٰ کے گھر میں اعتکاف کرنے کے لئے یہاں تشریف لائے، ہمارے خدمت والے ساتھیوں نے کوشش کی ہے کہ آپ کو راحت پہنچائی جائے، لیکن مجمع زیادہ ہوتا ہے تو ہر آدمی کی راحت کا پورا خیال بھی نہیں رکھا جاسکتا، ہر شخص کے مزاج کی رعایت مشکل ہوجاتی ہے، اعتکاف شروع ہونے سے پہلے مجھے بہت تشویش تھی کہ اتنے مہمانوں کا نظم کیسے ہوگا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنے لطف سے اس کو اتنا آسان فرمادیا کہ پتہ بھی نہیں چلا، بہرکیف کسی صاحب کو کسی قسم کی کوئی تکلیف اعتکاف کے دوران پہنچی ہو، یا ہمارے منتظمین اور خدمت والے ساتھیوں میں سے کسی سے خدمت میں کوتاہی ہوئی ہو تو آپ ازراہ للہ معاف فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو بہت ہی برکتیں عطا فرمائیں اور حق تعالیٰ شانہ، ہم سب کو صحت کے ساتھ، عمر کے ساتھ عافیت کے ساتھ اس کی آئندہ

بھی توفیق عطا فرمائیں۔

ہمارا اعتکاف قبول ہو گیا یا نہیں؟

ایک بات یہ ذکر کرنی ہے کہ ابھی نماز کے بعد ایک صاحب نے پرچہ دیا کہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہمارا اعتکاف قبول ہو گیا؟ اس پر اس وقت تو میں نے ان صاحب کو یہ لطیفہ سنا دیا تھا کہ عربی کا ایک مقولہ ہے کہ:

"الحائک اذا صلی رکعتین انتظر الوحی"

یعنی جولاہا جب دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اب وحی آنے والی ہے، وحی کا منتظر ہو جاتا ہے۔ ارے میاں! کیا ہم؟ اور کیا ہمارا اعتکاف؟ اور کہاں کی قبولیت؟ بس یہ شکر کرو کہ حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے مواخذہ نہ ہو۔ کیونکہ ہم اس کے گھر کا صحیح ادب اور صحیح حق ادا نہیں کر سکے، اور جو حقوق اعتکاف کے ہمیں بجالانے چاہئے تھے، بجا نہیں لائے، تو بس یہی بہت ہے کہ ہم پر مواخذہ نہ ہو۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ایک عارف کو میں نے دیکھا کہ کعبے کا غلاف پکڑے ہوئے ہیں، ملتزم پر رو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ:

من نہ گویم کہ طاعتم بہ پذیر
قلم عفو برگناہم کش

ترجمہ: "یہ تو میرا منہ نہیں کہ میں کہوں کہ میری عبادت قبول کر لیجئے اتنی درخواست کرتا ہوں کہ معافی کا قلم میرے گناہوں پر پھیر دیجئے"۔

اعمال پر مواخذہ نہ ہو، یہی غنیمت ہے

قبولیت کے امیدوار تو آپ حضرات ہوں گے، بڑے لوگ ہوں گے، جہاں

تک ہمارا تعلق ہے ہم تو اسی کو بہت غنیمت سمجھتے ہیں کہ ہمارے اعمال پر مؤاخذہ نہ ہو۔ واللہ العظیم! قسم کھا کر کہتا ہوں، اللہ کے گھر میں بیٹھا ہوں، کہ نماز پڑھنے کے بعد کبھی خیال نہیں آتا کہ میری نماز قبول ہوگئی ہوگی یا یہ کہ نماز قابل قبول ہے، بس یہی سمجھتا ہوں کہ اللہ کرے اس پر مؤاخذہ نہ ہو کہ او نالائق! ایسی نماز پڑھا کرتے ہیں؟ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ دل میں قبولیت کا وسوسہ آگیا ہو، بس یہی خیال ہوتا ہے کہ لپیٹ کر منہ پر نہ مار دی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے طاعات کی قبولیت کو مخفی رکھا ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی قدس سرہ عارف تھے، اپنے وقت کے قطب تھے، حضرتؒ ارشاد فرماتے تھے کہ "بھائی! اللہ تعالیٰ کا ایک نام ستار ہے، ستار کے معنی ہیں پردہ پوشی کرنے والا، ستار العیوب، عیوب کو ڈھانکنے والا، اللہ تعالیٰ نے میری بھی اور آپ کی بھی سب کی پردہ پوشی کر رکھی ہے"۔ ہمارے حضرتؒ اس کی مثال دیتے تھے کہ آدمی کا پورا وجود نجاست سے بھرا ہوا ہے، یہاں ذرا سی خراش لگادو خون نکل آئے گا، خون پاک ہے کہ ناپاک؟ کیوں بھئی خون ناپاک ہے نا! پس ہمارے پورے وجود میں نجاست بھری ہوئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ستاری دیکھو کہ اوپر سے اللہ تعالیٰ نے کیسا نفیس چمڑا چڑھا دیا ہے، اندر خون ہی خون، نجاست ہی نجاست، لیکن اوپر حسین چمڑے کا غلاف۔ اسی طرح پیٹ کے اندر سیروں غلاظت لئے پھر رہے ہیں، اور یہ میرے اللہ کا کرم ہے کہ اوپر اس کا کوئی نام ونشان تک نہیں، باہر اس کی بدبو بھی نہیں آنے دیتے، بعض بے چارے ایسے ہوتے ہیں جن کا آپریشن ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، اور ڈاکٹر اطباء لوگ نجاست کے نکلنے کے لئے تھیلی لگادیتے

ہیں،اب اس میں سے بدبو آتی ہے، آپریشن کے دوران پیشاب کے لئے تھیلی لگادیتے ہیں، میرا جب آپریشن ہوا تھا تو میرے بھی پیشاب کے لئے تھیلی لگادی تھی، تیسرے دن میں نے کہا اتارو بھئی اس کو، یہ مجھ سے نہیں چلتی۔ تو اتنی غلاظت ہم پیٹ میں لئے پھرتے ہیں، اسی حالت میں نماز پڑھتے ہیں، اسی حالت میں تلاوت بھی کرتے ہیں، اسی حالت میں محفلوں میں بھی جاتے ہیں، میرے مالک کی ستاری ہے کہ اس کو کیسا چھپا رکھا ہے اگر اللہ تعالیٰ ہمارے ظاہری عیوب کی اور باطنی عیوب کی ستاری نہ فرماتے تو خود سوچو کیا حال ہوتا؟ مثلاً ستر پوشی کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ لباس عطا فرمادیا، اگر ننگے ہوتے تو کیا ہوتا؟ اللہ تعالیٰ کسی کا پردہ نہ ہٹائے، اللہ تعالیٰ کسی کی پردہ دری نہ کرے، ہم لوگ کم ظرف ہیں کسی کا عیب معلوم ہوجائے تو جب تک دوچار آدمیوں کے پاس گائیں نہیں ہماری روٹی ہضم نہیں ہوتی، پیٹ پھول جاتا ہے، لیکن میرا مالک بڑا حلیم ہے، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول: ؏

"گناہ بیند و پردہ پوشد ہمی"

گناہوں کو دیکھتے ہیں، ہماری ایک حالت کو جانتے ہیں لیکن پھر بھی پردہ ڈال دیتے ہیں، پردہ پوشی فرماتے ہیں، رسوا نہیں کرتے، کسی کا پردہ ہٹادیا جائے، تو یہ اس کی رسوائی ہے، تو خیر میں عرض کررہا تھا کہ ہمارے حضرتؒ فرماتے تھے کہ بھئی!لوگ ستار کے معنی سمجھتے ہیں:

"عیوب کو ڈھانکنے والا پردہ پوشی کرنے والا"

لیکن میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس معنی کی رو سے تو ستار ہے ہی، لیکن ہماری نیکیوں کی بھی پردہ پوشی کرنے والے ہیں، اس معنی میں بھی اللہ تعالیٰ ستار ہیں کہ ہماری نیکیوں کو ڈھانک دیتے ہیں، اور ان کی پردہ پوشی فرماتے ہیں، کسی نے کتنا

کمایا ہے؟ کسی کو اس کا پتہ نہیں چلنے دیتے، نیکیوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں، ان کو چھپا کر رکھتے ہیں اور قیامت کے دن حق تعالیٰ شانہ پردہ ہٹا دیں گے تو نیکیوں کے پہاڑ نظر آئیں گے، لیکن یہاں کچھ پتہ نہیں چلتا۔

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ تم نے نماز پڑھی، تمہیں کیا ملا؟ تم نے اعتکاف کیا تمہیں کیا ملا؟ تم نے روزہ رکھا تمہیں کیا ملا؟ ارے! بہت کچھ ملا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس اجر وثواب پر پردہ ڈال دیا ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ کیا کچھ ملا ہے؟ بات یہ ہے کہ ہم لوگ دو چیزوں کو چھپا کر رکھا کرتے ہیں ایک تو کوئی عیب کی چیز ہو تو اس کو چھپایا کرتے ہیں، کیونکہ آدمی نہیں چاہتا کہ اس کا عیب لوگوں کے سامنے ظاہر ہو۔ دوسرے، کوئی قیمتی چیز ہوتی ہے تو اس کو چھپایا کرتے ہیں، گھر میں پیسے وغیرہ ہوں تو ان کو بے پروائی سے یوں ہی نہیں بکھیر دیا کرتے بلکہ محفوظ رکھتے ہیں، اگر کوئی زیور وغیرہ ہو تو اس کو برتنوں کی طرح یوں ہی سب کے سامنے نہیں پھینک دیتے، بلکہ اس کو حفاظت کے ساتھ چھپا کر رکھتے ہیں، تو ایک تو بندوں کے عیب قابل ستر ہیں، چھپانے کے قابل ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی ستاری فرماتے ہیں، اور لوگوں کے سامنے اپنے بندوں کے عیوب ظاہر نہیں فرماتے، دوسرے اگر بندوں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کچھ نیکیاں کمائی ہیں، کچھ اچھے کام کئے ہیں، تو وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں بڑے قیمتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کو چھپا کے رکھتے ہیں، تاکہ ڈاکوؤں کو پتہ نہ چلے، ورنہ یہ ساری نیکیاں لوٹ کر لے جائیں گے نفس اور شیطان دونوں انسان کے دشمن ہیں، دونوں ڈاکو ہیں، ان کو پتہ چلا تو یہ لوٹ کر لے جائیں گے، کبھی اس کا نفس عُجب میں مبتلا ہو جائے گا، عُجب کہتے ہیں خود پسندی کو، اپنی حالت کو اچھا سمجھنے لگے گا، کبھی کبر میں مبتلا ہو جائے گا اور دوسروں کو نظر حقارت سے دیکھنے لگے گا،

کبھی اپنی نیکیوں پر مغرور ہوجائے گا اور اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بے خوف ہوجائے گا، یہ وہ بلائیں ہیں جن سے نیکی برباد اور گناہ لازم آتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے نیکیوں کو بندے کی نظر سے بھی چھپا کے رکھتے ہیں۔

کاملین کو عُجب نہیں ہوتا

ہاں! جب آدمی اس مرتبے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کو اپنی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی بھی آجائے کہ تو مقبول ہے تب بھی اس کو گھمنڈ پیدا نہیں ہوتا، میری بات کو آپ حضرات نے سمجھا نہیں ہوگا۔ کسی شخص کے بارے میں وحی الٰہی آجائے، آسمان سے جبرئیل علیہ السلام نازل ہوجائیں اور آکے کہیں کہ یہ شخص مقبول ہے تب بھی اس کے دل میں گھمنڈ پیدا نہیں ہوگا۔ آپ حضرات جانتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرات عشرہ مبشرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو جنت کی بشارتیں دی تھیں، کیا اس بشارت سے ان میں گھمنڈ پیدا ہوگیا تھا؟ نہیں! بلکہ اس کے باوجود ان حضرات پر کتنا خوف طاری رہتا تھا؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے زیادہ کس کی زبان سچی اور پاک ہوسکتی ہے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بشارتیں دی تھیں وہ وحی الٰہی سے دی تھیں، لیکن ان قطعی بشارتوں کے باوجود ان حضرات میں عُجب پیدا نہیں ہوا، بلکہ جلال الٰہی سے ہمیشہ ترساں ولرزاں رہتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خوف

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خوف کا عالم یہ تھا کہ کہا کرتے تھے:

"یالیتنی شجرۃ تعضد ثم توکل۔"

(صفۃ الصفوۃ صفحہ ۱۰۴ جلد ۱)

ترجمہ: "اے کاش میں کوئی درخت ہوتا جس کو کاٹ کر پھینک دیا جاتا، اور پھر جانور اس کو چر لیتے"۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خوف

اور حضرت فاروق اعظم عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ حال تھا کہ زمین سے تنکا اٹھا کر فرماتے تھے:

"اے کاش! میں یہ تنکا ہوتا، اے کاش! میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا، اے کاش! میری ماں نے مجھ کو جنم نہ دیا ہوتا، اے کاش! میں کوئی چیز نہ ہوتا، اے کاش! میں بھولا بسرا ہوتا"۔

(صفۃ الصفوۃ صفحہ ا جلد ا)

الغرض حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، دوسرے اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور حضرات اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے خوف کے واقعات سے حدیث وسیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں، اور یہ اس لئے تھا کہ وہ حقیقت تک پہنچ گئے تھے، ان کو بشارت اس وقت ملی جب وہ حقیقت تک

پہنچ گئے، اور حقیقت تک پہنچنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت آئی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بشارت آئی تب بھی ان میں گھمنڈ پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ان کے عجز میں اور ان کے خوف میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا

قرآن کریم ان حضرات سے اللہ کے راضی ہونے کا اعلان کرتا ہے:

"لقد رضی اللّٰہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم۔" (الفتح: ۱۸)

ترجمہ: "راضی ہوگیا اللہ تعالیٰ مؤمنین سے جب کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کررہے تھے درخت کے نیچے، پس اللہ کو معلوم تھا جو کچھ ان کے دلوں میں ہے"۔

یعنی ان کے دلوں کو جانچ کر پرکھ کر اللہ تعالیٰ نے رضی اللہ عن المؤمنین کا اعلان فرمایا اور منبر و محراب پر قیامت تک یہ اعلان گونجتا رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دلوں میں گھمنڈ پیدا نہیں ہوا، اس لئے کہ ان کی رسائی حقیقت تک ہوگئی تھی، تو ایسے لوگوں کے سامنے سے اگر پردہ ہٹادیا جائے اور ان کی قبولیت عند اللہ ان کو جتا بھی دی جائے، اللہ تعالیٰ خود وحی کے ذریعے سے اس کا اعلان فرمادیں تب بھی ان میں عُجب اور گھمنڈ پیدا نہیں ہوتا ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ محض مولائے کریم کی عنایت ہے، اس کا فضل ہے، اور بغیر استحقاق کے اس کی عطا ہے، ورنہ ہمارے پاس کیا ہے؟ وہ ان عنایاتِ ربانی کو

اپنی طرف منسوب نہیں کرتے، بلکہ مالک کے فضل سے اس کی عنایت اور اس کے لطف کی طرف منسوب کرتے ہیں،

قبولیت اعتکاف کی علامت

تو میاں! قطعی قبولیت کا تو خیال چھوڑ دو، اور یہ بھی کہ کیسے معلوم کیا جائے کہ ہمارا اعتکاف قبول ہوگیا؟ کیونکہ وحی تو میرے پاس بھی نہیں آتی، اور تمہارے پاس بھی نہیں آتی، جس کے ذریعہ قبولیت کا قطعی فیصلہ ہوجائے، البتہ ایک علامت ہے، اس سے کچھ کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ کہ دس دن تک آپ حضرات مسجد میں جم کر بیٹھے تو کیا اس اعتکاف کے نتیجہ میں مسجد سے بھی تعلق پیدا ہوا؟ تم تو مسجد میں بیٹھے کیا مسجد بھی تمہارے دل میں بیٹھی؟ تم نے قرآن کریم کی تلاوت کی، کیا وہ تلاوت بھی تمہارے دل میں آئی؟ تم نے اللہ پاک کا نام لیا، کیا اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی سے اور اس کے پاک نام سے کچھ تعلق بھی پیدا ہوا؟ کچھ دل میں چاشنی بھی آئی؟ کچھ دل کو ذکر سے رغبت بھی ہوئی؟ تم مسجد کے اس نورانی ماحول میں کچھ وقت گزار کر واپس جارہے ہو اپنے ماحول کا اور اس نورانی ماحول کا کچھ فرق بھی محسوس ہوا؟ اور اس ماحول کی رغبت بھی پیدا ہوئی؟ اور اس ماحول کے اثرات بھی ساتھ لے جارہے ہو، یا سب کچھ یہیں چھوڑ کر جارہے ہو؟ اور کیا آئندہ کے لئے اپنی زندگی کی لائن بدلنے کا بھی فیصلہ ہوا؟ اور کیا رضائے الٰہی کے لئے اپنی ہویٰ یعنی خواہش کو چھوڑنے کا بھی جذبہ اور داعیہ پیدا ہوا؟ اگر یہ چیزیں تم میں پیدا ہوگئی ہیں تو جس درجہ کی پیدا ہوئی ہیں۔ اس درجہ کی قبولیت ان شاء اللہ تمہیں حاصل ہوگئی، اور اگر یہ نہیں ہوا تو پھر جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے۔

حج مبرور کی فضیلت

حدیث شریف میں فرمایا ہے:

"والحج المبرور لیس له جزاء الا الجنة۔"

(متفق علیہ من حدیث ابی ہریرةؓ، مشکوۃ صفحہ۲۲۱)

ترجمہ: "حج مبرور کی جزا جنت کے سوا کچھ نہیں"۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"من حج لله فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدته امه۔" (متفق علیہ عن حدیث ابی ہریرۃ۔ مشکوۃ صفحہ۲۲۱)

ترجمہ: "جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے حج کیا، پھر اس نے نہ کسی قسم کی فحش کلامی کی اور نہ گناہ کا ارتکاب کیا تو وہ اس حالت میں واپس ہوگا گویا آج اس کی ماں نے اس کو جنا ہے، یعنی پاک صاف ہوکر واپس آئے گا، اور ایسا حج، "حج مبرور" کہلاتا ہے"۔

حج مبرور کی علامت

اکابرؒ فرماتے ہیں کہ "حج مبرور" کی علامت یہ ہے کہ حج کے بعد حاجی کی زندگی کی لائن بدل جائے، معاصی سے فرماں برداری کی طرف آجائے، غفلت سے ذکر کی طرف آجائے، بے پروائی سے اہتمام کی طرف آجائے، پہلے نمازوں کا کوئی اہتمام نہیں کرتا تھا، قضا ہوگئی تو ہوگئی، کوئی افسوس نہیں، کوئی رنج وصدمہ نہیں، اسی طرح دوسری چیزوں کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ لیکن حج کرنے

کے بعد اس کی زندگی کی کایا پلٹ گئی کہ اب فرائض شرعیہ کا اہتمام ہونے لگا، حقوق اللہ وحقوق العباد کے ادا کرنے کی فکر پیدا ہوگئی، اور زندگی میں ایک روحانی انقلاب برپا ہوگیا، تو سمجھو کہ اس کا یہ حج "حج مبرور" ہے۔

حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کا ذکر خیر

ہمارے بزرگ مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے بزرگ استاذ حدیث تھے، اور جامعہ سے شائع ہونے والے ماہنامہ "بینات" کے مدیر تھے۔ اور وہ میرے خاص محسن تھے کہ مجھے کراچی لانے کا سبب بنے، میں ضلع فیصل آباد کے ایک چھوٹے سے قصبہ ماموں کانجن میں مدرس تھا۔ ایوب خاں کے زمانے میں جب ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا فتنہ اٹھا تو میں نے اس کے خلاف مضامین لکھنا شروع کئے، ایک مضمون میں نے مولانا مرحوم کو بھیج دیا، اس مضمون کو پڑھ کر انہوں نے میرے حضرت بنوریؒ سے کہا تھا کہ اس کو کراچی بلوا لو، وہ مجھے جانتے نہیں تھے، نہ حضرت بنوریؒ سے میرا تعارف تھا، لیکن مرحوم نے میرا وہ مضمون پڑھا تو بغیر کسی سابقہ تعارف کے مجھے حاضری کا خط لکھ دیا، اور میں حضرتؒ کی دعوت پر ان کی خدمت میں حاضر ہوگیا، اس طرح حضرتؒ سے اور ان کے مدرسہ سے میرا تعلق ہوگیا۔ پس میرے کراچی آنے کا سبب حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ بنے تھے، ماہنامہ "بینات" جس کا میں اڈیٹر ہوں، اس کے پہلے مدیر مولانا مرحوم تھے، اور اب میں ان کا جانشین ہوں، اس لئے ان کو اپنا محسن سمجھتا ہوں۔ مولانا مرحوم شروع میں کسی سے بیعت نہیں تھے (بعد میں حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کے خلیفہ اعظم حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ رائے پوری سے بیعت ہوگئے

تھے) لیکن اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی محبت و عظمت ان کے دل میں ڈال دی تھی، حج و عمرہ سے ان کو والہانہ عشق تھا۔ جتنا پیسہ کماتے سب حج و عمرہ کے لئے جمع کرتے رہتے تھے اور سال میں دو مرتبہ ایک مرتبہ عمرہ پر اور ایک مرتبہ حج پر جانا گویا اپنے اوپر لازم کر رکھا تھا۔

میرا مرشد تو بیت اللہ ہے

مرحوم فرمایا کرتے کہ میرا مرشد تو بیت اللہ ہے، میں تو اپنے مرشد کی زیارت کے لئے جاتا ہوں، لوگ تو حج و عمرہ کرنے کو جاتے ہوں گے، مگر میں تو اپنے مرشد کی زیارت کے لئے جاتا ہوں۔ اور واقعی انہوں نے اپنے مرشد سے عجیب فیض اٹھایا تھا۔ یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ان کے مرشد (بیت اللہ شریف) نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کردیا تھا۔

مولانا مرحوم کی نماز کی کیفیت

اتنی اچھی اور نفیس نماز پڑھتے تھے کہ ان کے پاس کھڑا ہونے والا بھی اس کی لذت وحلاوت محسوس کرتا تھا۔ نماز کے سجدہ میں ماثور دعائیں بڑے درد اور سوز سے کرتے تھے، ایک دن مجھ سے کہنے لگے حنفیہ سجدہ میں دعائیں کیوں نہیں کرتے؟ (ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ امام سجدہ میں بس تسبیحات پڑھے، لمبی دعائیں نہ پڑھے، تاکہ مقتدیوں کو تشویش نہ ہو۔ جب کہ دوسرے ائمہ فرماتے ہیں کہ جو دعائیں حدیث میں منقول ہیں وہ بھی پڑھے) میں نے حضرت مولانا کے اس سوال کے جواب میں کہ "حنفیہ سجدہ میں دعا کیوں نہیں کرتے؟" ان کی خدمت میں اپنے اکابر کی توجیہ عرض کی، اس توجیہ کو وہ بھی جانتے تھے۔ لیکن

ان کا ذوق تھا کہ سجدہ میں خوب دعا کی جائے، اس لئے جھنجلا کر کہنے لگے، ”نہیں جی! چھوڑو!“ وہ خوب مزے کے ساتھ سجدہ کرتے تھے، اور اس میں دعائیں مانگتے رہتے تھے، ایک دفعہ کچھ بیمار ہوگئے تھے فرمانے لگے، ”اب میں ٹھیک ہوجاؤں گا اس لئے کہ میں نے سجدہ میں یہ دعا کی ہے:

”انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین۔“

(الانبیاء: ۸۳)

یہ حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

”(اے میرے پروردگار!) مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے، اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں“۔

یعنی آپ ارحم الراحمین ہیں، آپ کی رحمت بھی کامل، قدرت بھی کامل، اپنی رحمت کے صدقے میری تکلیف کو دور فرمادیجئے۔

مولانا مرحوم کی وفات کا عجیب وغریب واقعہ

مدرسہ میں تفسیر جلالین شریف کا بھی سبق پڑھایا کرتے تھے۔ اور ظہر کے بعد اس کا وقت تھا، لیکن وفات کے دن صبح گیارہ بجے درس گاہ میں تشریف لائے، یہ گھنٹہ دوسرے استاذ کا تھا، اور وہ اپنا سبق پڑھا رہے تھے۔ ان استاد کو یہ کہہ کر اٹھادیا کہ اٹھو! مجھے سبق پڑھانا ہے، مدرسہ کے اکثر اساتذہ چونکہ حضرت مولانا مرحوم کے شاگرد تھے۔ یوں بھی آپ مدرسہ میں سب سے معمر بزرگ تھے۔ اس لئے سبق پڑھانے والے استاذ، حضرت مولانا کا حکم سن کر فوراً اپنا سبق چھوڑ کر اٹھ گئے، حضرت سبق پڑھانے لگے، سورۃ المطففین چل رہی تھی، اور آج کا سبق یہ تھا:

"کلا ان کتب الابرار لفی علیین ۞ وما ادرٰک ما علیون ۞ کتب مرقوم ۞ یشهده المقربون ۞ ان الابرار لفی نعیم ۞ علی الارآئک ینظرون ۞ تعرف فی وجوههم نضرة النعیم ۞ یسقون من رحیق مختوم ۞ ختمه مسک وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون ۞ ومزاجه من تسنیم ۞ عینا یشرب بها المقربون۔"

(المطففین ۱۸۔ ۲۸)

ترجمہ: "ہرگز نہیں! بے شک اعمال نامہ نیک لوگوں کا علیین میں ہے، اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے علیین؟ ایک دفتر ہے لکھا ہوا، اسے دیکھتے ہیں مقرب فرشتے، بے شک نیک لوگ ہیں آرام میں، تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے، پہچان لے تو ان کے منہ پر تازگی آرام کی، ان کو پلائی جاتی ہے شراب خالص مہر لگی ہوئی، جس کی مہر جمتی ہے مشک پر، اس پر چاہئے کہ حرص کریں حرص کرنے والے، اور اس کی ملونی تسنیم سے ہے، وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں نزدیک والے (مقرب حضرات)"۔ (ترجمہ شیخ الہند بتصرف یسیر)

یہاں تک سبق پڑھایا، پڑھا کرکے اوپر چلے گئے، بستر پر لیٹے اور انتقال ہوگیا، گیارہ بجے کے بعد سبق پڑھا رہے تھے، وفات کے وقت ہمارے رفیق حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر ان کے پاس بیٹھے تھے، ان کے سامنے انتقال ہوا۔

وفات کے بعد ان کی کرامت

وفات کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی، ظہر کے بعد دارالحدیث میں ان کی میت زیارت کے لئے رکھی گئی، آخری دیدار کے لئے میں گیا تو دیکھ کر میں نے دوستوں سے کہا بڑے میاں کو اتنا پاؤڈر کیوں لگادیا ہے؟ اتنا سفید چہرہ تھا کہ سبحان اللہ! چہرے پر نور برس رہا تھا۔ حالانکہ حضرتؒ کا رنگ ذرا سانولا تھا، لیکن وفات کے بعد چہرہ اتنا سفید اور ایسا نورانی تھا کہ واقعتاً پاؤڈر لگانے کا شبہ ہوتا تھا، اس لئے میں نے کہا کہ بڑے میاں کو اتنا پوڈر کیوں لگادیا؟ چہرے کا اتنا سفید ہونا ان کی کرامت تھی۔

الغرض جن کو حج مقبول نصیب ہوجاتا ہے، حج سے یوں ان کی زندگیاں بدلتی ہیں، حج کرنے والے یوں حج کرتے ہیں کہ بیت اللہ ان کا مرشد بن جاتا ہے۔ تو میرے بھائی! تم نے جو اعتکاف کیا ہے اگر اس سے یہ چیزیں تمہیں حاصل ہوگئیں، اور قبولیت کے یہ آثار تمہیں نصیب ہوگئے تو توقع رکھو کہ ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ لے کر گئے۔ بس یہ مضمون ختم ہوا۔

اعتکاف کی سوغات لے کر جاؤ

اب اصل بات جو مجھے آپ سے کہنی تھی وہ عرض کرتا ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ آج میں آپ حضرات سے درخواست کروں کہ یہاں سے جاتے ہوئے اس اعتکاف کی سوغات لے کر جاؤ۔ اور اعتکاف کی سوغات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے، یہاں سے جاتے ہوئے یہ سوغات لے کر جاؤ، اس لئے جی چاہا کہ آپ حضرات کو آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تقسیم کروں۔

"حکایات صحابہؓ" میں عشق نبوی ﷺ کا بیان

اور یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ہمارے ڈاکٹر وسیم احمد صاحب نے عشاء کے بعد جب "حکایات صحابہؓ" سنائی۔ تو اس میں بھی وہی مضمون نکل آیا جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ماشاء اللہ ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہ نے یہ مضمون بہت والہانہ انداز میں لکھا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عشق و محبت کے واقعات ذکر کئے ہیں۔

محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا صلہ

اور یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ ایک شخص حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا:

"یارسول اللّٰہ! متی الساعۃ؟۔"

"یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قیامت کب آئے گی؟"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ویلک! وما اعددت لھا؟۔"

"تیرا ناس ہوجائے، تو نے اس کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے؟"۔

وہ شخص نہایت سادگی سے کہنے لگا:

"ما اعددت لھا کثیر صلوۃ ولا صیام الا انی

احب اللّٰہ ورسولہ۔"

"میں نے اس کے لئے زیادہ نماز روزے کی تیاری تو نہیں کی، مگر یہ بات ضرور ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت رکھتا ہوں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"انت مع من احببت۔"

"قیامت کے دن تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے"۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اس حدیث کے راوی ہیں، ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"اللہ کی قسم! اسلام لانے کے بعد صحابہ کرامؓ کو کبھی کسی بات سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوئی کہ "آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے"۔ (متفق علیہ، مشکوۃ صفحہ۴۲۶)

اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے کا یہ عظیم صلہ ہے کہ ان حضرات کو جنت میں معیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نصیب ہوگی۔

خوب یاد رکھو! جن لوگوں سے محبت رکھتے ہو، تمہارا حشر انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا، اگر اہل اللہ سے محبت رکھتے ہو تو ان شاء اللہ ان کے ساتھ حشر ہوگا، اور اگر فاسقوں بدکاروں سے محبت رکھتے ہو تو (نعوذ باللہ) ان کے ساتھ حشر ہوگا۔ قادیانیوں مرزائیوں سے دوستی اور محبت کا تعلق رکھتے ہو تو انہی کے ساتھ

اٹھائے جاؤ گے۔

دنیا میں محبت کا صلہ

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں بہت سے حضرات جاہلیت کے زمانے میں شراب کے عادی تھے، اور جب تک شراب کی حرمت کا اعلان نہیں ہوا اسلام لانے کے بعد بھی پیتے تھے، پھر یکایک اعلان ہوگیا تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جس طرح چھوڑ دی تھی وہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ شراب کے برتن توڑ دیئے گئے، اور شراب مدینہ کے گلی کوچوں میں سیلاب کی طرح بہنے لگی، لیکن انسان آخر انسان ہے اس سے کبھی ایسی غلطی سرزد ہوجاتی ہے، صحیح بخاری میں یہ قصہ مذکور ہے کہ ایک صحابی جن کا نام عبداللہ اور ان کا لقب حمار تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی خوش طبعی کی باتوں سے ہنسایا کرتے تھے، ان سے یہ غلطی ہوئی کہ شراب کے حرام ہوجانے کے بعد انہوں نے شراب پی لی، اور اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر حد جاری کرنے کا حکم فرمایا، ایک دن دوبارہ لائے گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر حد جاری کرنے کا حکم فرمایا، تو ایک شخص کے منہ سے یہ نکل گیا:

"اللھم العنہ، ما اکثر مایوتی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم؟"

ترجمہ: "اس پر اللہ کی پھٹکار ہو! اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کتنی کثرت سے بار بار لایا جاتا ہے؟"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا:

"لاتلعنوه فو اللّٰہ ماعلمت انہ یحب اللّٰہ ورسولہ" (صحیح بخاری صفحہ ۱۰۰۲ جلد ۲، مشکوٰۃ صفحہ ۳۱۶)

ترجمہ: "اس پر لعنت نہ کرو! کیونکہ اللہ کی قسم! جہاں تک مجھے معلوم ہے، یہ صاحب اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت رکھتے ہیں"۔

اس حدیث شریف میں ان صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے بڑی بشارت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلفاً ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ثابت فرمائی۔ اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی سے گناہ سرزد ہوجائے تو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ لعنت کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوجانا۔ اور ایک مسلمان کو اپنے گناہ گار بھائی کے لئے یہ دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت فرمائیں، یہ دعا نہیں کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے محروم کردیں۔

کیونکہ جب کوئی شخص نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوگا تو شیطان خوش ہوگا کہ میں نے اس شخص کو تو اپنے جیسا بنالیا—— اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر نفس وشیطان کے بہکانے سے کسی شخص سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے اور پھر فوراً ہی اس کو اپنے کئے پر ندامت اور شرمندگی لاحق ہوجائے، اور وہ اپنے آپ کو سزائے شرعی کے لئے پیش کردے (جیسا کہ اس صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی کیا) تو اس سے اللہ تعالیٰ کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا رشتہ نہیں ٹوٹتا۔ ہاں! کامل ترین محبت یہ ہے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے۔ اس حدیث سے

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ ان سے اگر کوئی غلطی سرزد ہوجاتی تھی تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ تو آپ کے اور ہمارے اعتکاف کی سوغات یہ ہے کہ ہم اور آپ مسجد سے جاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل محبت لے کر جائیں۔ ایسی محبت جو ہمارے رگ وریشے میں سرایت کر جائے، اور وہ محبت ہمیں محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں ڈھال دے۔

محبت کے تقاضے

محبت کے کچھ تقاضے ہیں، بزرگوں کا ارشاد ہے کہ جب قلب میں محبت آتی ہے تو آدمی آداب محبت بھی سیکھ لیتا ہے۔ ؏

"محبت تجھ کو آداب محبت خود سکھادے گی"

ذرا ہمت کرکے میدان محبت میں قدم تو رکھو، محبت کرکے پھر دیکھو کہ یہ تمہیں آداب کس طرح سکھاتی ہے۔ ان شاء اللہ! حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے محبت کے آداب ولوازم بھی عطا کردئے جائیں گے، اور محبت کا سلیقہ بھی دے دیا جائے گا۔

محبت کے آداب ولوازم

اب میں مختصر طور پر محبت کے چند آداب واوصاف ذکر کرتا ہوں۔

محبت کا سب سے پہلا ادب ہے محبوب کی رضا کو اپنی خواہش پر ترجیح دینا۔ محبوب، عاشق کو حکم نہیں دیا کرتے، بلکہ عاشق ان کے اشارہ چشم و ابرو سے ان کا منشا پہچان لیتے ہیں، اور محبوب کے اشارہ چشم وابرو پر جان قربان کردیتے ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمائیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو ہم اپنی خواہش پر ترجیح دینے لگیں، اور اپنی خواہشات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشائے مبارک پر قربان کردیں۔

ہماری محبت خواہشات کی راکھ میں دبی ہوئی ہے

میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمانوں کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں ہے، بلاشبہ مسلمانوں کو آنحضرت سے محبت ہے، لیکن ہماری محبت خواہشات کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ہے، اس لئے جب ہماری خواہشات کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وارشادات سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو محبت کی چنگاری بھڑکتی نہیں، اور ہماری خواہشات کے خس وخاشاک کو جلاکر بھسم نہیں کرتی۔

ایک خان صاحب کا شبہ اور حضرت حکیم الامتؒ کا جواب

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوئے اور کہنے لگے حضرت ایک اشکال ہے، فرمایا کیا؟ کہنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ ولدہ والناس اجمعین۔"

(متفق علیہ، مشکوٰۃ ص ۱۲)

ترجمہ: "تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا یہاں

تک کہ میں اس کے لئے زیادہ محبوب بن جاؤں اس کے
باپ سے بھی، اس کی اولاد سے بھی، اور تمام انسانوں سے
بھی"۔

اور شبہ یہ ہے کہ مجھے اپنے والد سے زیادہ محبت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت نہیں جتنی اپنے باپ سے ہے، تو میں مؤمن نہ ہوا۔ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا نہیں! خان صاحب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آپ کے دل میں اپنے والد سے زیادہ ہے۔ کہنے لگا، اجی! میں تو اپنے والد میں محبت زیادہ محسوس کرتا ہوں، فرمایا، نہیں! خیر بات ختم ہوئی، اسی مجلس میں حضرت حکیم الامتؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل شریفہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت ودل ربائی کا تذکرہ فرمایا، اور ایسے انداز سے تذکرہ فرمایا کہ بقول حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے:

کسی کا ذکر ہے اور اہل محفل مست وبے خود ہیں
بظاہر یاں نہ ساقی ہے، نہ صہبا ہے، نہ پیمانہ

حضرت حکیم الامتؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر فرما رہے تھے اور اہل محفل پر ایک مستی کا عالم طاری تھا، بقول کسی کے ع

"ذکر اس پرلوش کا اور پھر بیاں اپنا"

اور یہ خان صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر خیر سے سب سے زیادہ جھوم رہے تھے، حضرتؒ نے چلتے چلتے ارشاد فرمایا کہ خان صاحب! خیر اس کو تو چھوڑیئے! آپ کے والد ماجد بہت اچھے تھے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ تو اس وقت رہنے دیجئے۔ آپ کے والد ماجد بہت اچھے آدمی تھے

کچھ ان کا ذکر خیر بھی ہو جائے۔ خان صاحب کہنے لگے کہ حضرت! یہ آپ نے کیا غضب ڈھایا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ مقدس ہو رہا تھا اور آپ میرے والد کا قصہ لے بیٹھے۔ حضرتؒ نے مسکرا کر فرمایا، کیوں خان صاحب! آپ تو کہہ رہے تھے کہ مجھے اپنے باپ سے زیادہ محبت ہے، اگر آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ باپ سے محبت ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے بجائے اپنے باپ کا تذکرہ شروع ہونے سے آپ کو غیرت کیوں آئی؟

آنحضرت ﷺ کی محبت ہر مؤمن کے دل میں ہے

تو میں عرض کر رہا تھا کہ الحمد للہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہر مؤمن کے قلب میں ہے، خواہ کتنا ہی گناہ گار ہو، کتنا ہی لتھڑا ہوا ہو، جو شخص سچے دل سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھتا ہے، اس کے دل میں اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ضرور ہے، اور محبت بھی ایسی جو تمام انسانوں کی محبت سے بڑھ کر ہے، نہ ماں باپ سے ایسی محبت ہو سکتی ہے، نہ اولاد سے، نہ بیوی سے، نہ کسی اور سے۔ کسی سے ایسی محبت نہیں ہو سکتی ہے جیسی کہ مؤمن کے دل میں اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔

لیکن محبت کی یہ چنگاری راکھ میں دبی ہوئی ہے، نظر نہیں آتی، اور یہ اپنا اثر نہیں دکھاتی، اور وہ راکھ کیا ہے؟ خواہشات کی راکھ، نفسانی لذتوں کی راکھ، مادی تعلقات کی راکھ، آخرت سے غفلت کی راکھ، اور دنیاوی مفادات کی خاطر اپنی من مانیاں کرنے کی راکھ، میرا کہنا یہ ہے کہ محبت کی اس چنگاری کو اس راکھ کے

ڈھیر سے باہر نکالو! اور ذرا اس کو ذکر الٰہی کی ہوا دو، پھر اس کی تپش دیکھو۔ بقول مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ کے "عشق وہ شعلہ ہے کہ جب بھڑک اٹھتا ہے تو سارے جہان کو پھونک ڈالتا ہے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دل میں پیدا کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت کا عزم کرکے اس کو خواہشات کی راکھ میں سے نکالو! تمہارے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو محبت دبی ہوئی ہے وہ تمہارے چہروں پر نظر آئے، تمہارے لباس میں نظر آئے، تمہاری چلت پھرت میں نظر آئے، تمہارے اعمال میں نظر آئے، اخلاق میں نظر آئے، گفتگو میں نظر آئے، تمہارے معاملات میں نظر آئے، تمہارے بازار میں نظر آئے، تمہارے دفتر میں نظر آئے، تمہارے گھر میں نظر آئے۔

آپ ﷺ کی محبت کی خوشبو آنی چاہئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی خوشبو وہ کستوری ہے کہ اگر اس کو بند نہ رکھا جائے اور اس کو خواہشات کی راکھ کے نیچے دبا نہ دیا جائے تو ہر جگہ مہکتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک سراپا معطر تھا، تم نے سنا نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرف سے گزر جاتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو سے گلی کوچے مہک جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ مبارک ایسا معطر تھا کہ عنبر و کستوری کی خوشبو اس کے مقابلہ میں ہیچ تھی۔ تم نے سنا نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا تھا۔ اور جب مسکراتے تھے تو دندان مبارک سے نور کی شعائیں نکلتی نظر آتی تھیں، تاریک اور اندھیری رات میں گھر کے اندر روشنی ہو جاتی تھی، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہا فرماتی ہیں کہ میں مسکراہٹ کے وقت دندان مبارک سے نکلنے والے نور کی روشنی سے سوئی میں دھاگا ڈال لیتی تھی۔ بہت سے اکابر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی تو کمرہ منور اور معطر ہوگیا اور بیدار ہونے کے بعد بھی کمرے سے خوشبو آتی رہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جمال جہاں آراء اگر ہمارے دل میں بس جائے تو اس کی شعائیں ہمارے چہرے سے پھوٹنے لگیں، اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے دل ودماغ میں رچ بس جائے تو اس کی خوشبو ہمارے وجود میں سے آنے لگے، اور ہماری اس خوشبو سے بازار مہک اٹھیں، اس سے ہمارے دفاتر مہک اٹھیں، اس سے ہمارے گھر مہک اٹھیں، ایسی محبت کا رنگ اور ایسی محبت کی جھلک تمہیں ہر جگہ نظر آئے، ہماری ہر نشست وبرخاست میں نظر آئے۔

درود شریف کی خوشبو

بہت سے اکابر کے واقعات ہیں کہ وہ کثرت سے درود شریف پڑھتے تھے تو ان کے بدن سے خوشبو آتی تھی۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں کہ مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ شب جمعہ کو سوتے نہیں تھے، بلکہ ساری رات درود شریف پڑھتے رہتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے کمرے سے خوشبو آتی تھی۔ تو میں انکار نہیں کرتا کہ تم میں محبت نہیں، محبت ہے، لیکن دبی ہوئی ہے، میری گزارش یہ ہے کہ خدا کے لئے خواہشات کی راکھ میں سے اس محبت کو نکالو اور ذرا اس کو پھونک لگاؤ، ہوا دو، محبت کی یہ چنگاری بھڑک اٹھے گی۔ الغرض محبت کی سب سے بڑی علامت تو یہ ہے کہ اپنی خواہشوں پر محبوب کی رضا کو ترجیح دی جائے۔

محبوب کے تعلق والوں سے محبت

اور دوسری علامت یہ ہے کہ محبوب کے تعلق والوں سے محبت ہو، مشہور ہے کہ مجنوں لیلیٰ کی گلی کے کتے کے پاؤں چومتا تھا کہ یہ لیلیٰ کی گلی سے گزرا ہے، بس اتنا تعلق تھا کتے کو لیلیٰ سے، لیکن عاشق کی نظر میں اتنا سا تعلق بھی اس کے پاؤں چومنے کو کافی تھا۔ اگر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحیح تعلق ہو، سچی محبت ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق رکھنے والے درجہ بدرجہ ہمارے محبوب بن جائیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کی وجہ سے ان حضرات کی عزت وحرمت ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے، اور جزو ایمان بن جائے۔ آخر کیا بات تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تعلق والے حضرات کے بار بار فضائل بیان فرمائے؟ کبھی عام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے، کبھی خاص خاص حضرات کے، کبھی مہاجرین کے، کبھی انصار کے، کبھی اصحاب بدر کے، کبھی اصحاب حدیبیہ کے؟ اس لئے کہ ان حضرات نے اللہ ورسول کی راہ میں محض رضائے الٰہی کی خاطر قربانی وجاں نثاری کے بے مثال نمونے پیش کئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور تعلق ومحبت کا حق ادا کردیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ان کی عزت وحرمت ہمارے لئے جزو ایمان بن گئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام خدام و متعلقین ہمارے لئے محبوب و معظم بن گئے۔ صحابہ کرام بھی، اہل بیت عظام بھی۔

حضرت ابوبکر و عمرؓ تمام صحابہؓ سے افضل ہیں

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سب کے سرتاج تھے، اس لئے

وہ سب سے آگے نکل گئے۔ پوری امت میں ان کے برابر کا کوئی نہیں، حق تعالیٰ شانہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت ابتدائے نبوت سے عطا فرمائی، اور آج تک روضہ "مطہرہ" میں بھی یہ رفاقت حاصل ہے۔ انشاء اللہ! حشر میں بھی حاصل ہوگی، اور جنت میں بھی——

میں نے اپنی کتاب "شیعہ سنی اختلافات اور صراط مستقیم" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قسمت کے کیا کہنے، جو آج بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں آسودہ راحت ہیں، ان حضرات کو ساری عمر رفاقت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حاصل رہی، اور رفاقت کا یہ سلسلہ اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی منقطع نہیں ہوا، یہ رفاقت آج بھی باقی ہے، اس موقع پر میں نے فارسی کے مشہور شاعر صائب کا یہ فارسی شعر نقل کیا ہے کہ:

از پاک داماں نہ کند حسن احتراز
با آفتاب خفتہ بیک بستر آئنہ

یعنی: "حسن، پاک دامنوں سے احتراز نہیں کیا کرتا، بلکہ پاک دامنوں کو حسن اپنا جلوہ دکھاتا ہے، تم دیکھتے نہیں ہو کہ آفتاب جو مظہر حسن ہے، آئینہ اس کے ساتھ ایک ہی بستر پر سویا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ پاک وصاف ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ آئینہ آفتاب کے سامنے کردو تو وہ آفتاب کو آغوش میں لے لیتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب حسن ہیں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما آئینہ کی طرح پاک صاف ہیں، وہ جمال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے آج بھی ہم آغوش ہیں، اور قیامت تک رہیں گے، اور جب قیامت کے دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو یہ دونوں بزرگ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑے ہوئے اٹھیں گے۔ گویا حشر کے دن بھی ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت حاصل رہے گی، اور پھر جنت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق ہوں گے۔ یہ ایک ایسی سعادت ہے جو ان دونوں بزرگوں کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آل، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب، بزرگانِ دین، اولیاءً عظام اور اللہ تعالیٰ کے وہ تمام بندے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کے منظورِ نظر ہیں اور جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایات والطاف ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کی وجہ سے ان سے محبت رکھنا لازم ہے۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ بھی کرتے ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیاروں سے دشمنی بھی رکھتے ہو؟ بھئی، یہ تو آئینِ وفا کے خلاف ہے۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایک تقاضا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیاروں سے محبت رکھو۔

آنحضرت ﷺ کے دشمنوں سے بغض

اور آئینِ وفا کا ایک تقاضا یہ ہے کہ محبوب کے دشمنوں سے بغض اور نفرت رکھو۔ ہمارا جذبہ محبت یہ ہونا چاہئے کہ جو لوگ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں وہ میرے دشمن ہیں۔ تمہیں کتے اور خنزیر سے اتنی نفرت نہ ہو جتنی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے ہو، تمہیں کسی گندگی اور غلاظت سے اتنی بدبو نہ آئے جتنی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے بدبو آتی ہو، یہ قادیانی ٹولہ اور اسی طرح کے دوسرے لوگ، رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں، موذی ہیں، گستاخ ہیں، لیکن تم ان کے ساتھ ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہو، اور دعویٰ محبت بھی رکھتے ہو؟ غلط! بالکل غلط! اگر تمہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہوتا، محبت ہوتی تو تمہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے بغض ہوتا، ان سے نفرت ہوتی۔

قادیانی دوست؟

بعض لوگ مجھے خط لکھتے ہیں تو یوں لکھتے ہیں کہ "میرا ایک قادیانی دوست ہے" ــــ "میرا ایک عیسائی دوست ہے" ــــ "میرا ایک ہندو دوست ہے"۔ مجھے اس لفظ سے بہت تعجب ہوتا ہے، کہ کیا تمہاری ہر قادیانی سے، ہر عیسائی سے، ہر ہندو سے دوستی ہے؟ اگر تم واقعی مسلمان ہو تو کیا کوئی قادیانی، کوئی ملحد و زندیق، کوئی بددین، بے ایمان، کوئی عیسائی اور چوہڑا تمہارا دوست ہو سکتا ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا کسی غیرت مند کی اپنے باپ کے قاتلوں سے بھی دوستی ہو سکتی ہے؟ کیا تم نے اپنے باپ کے قاتل کے بارے میں بھی کبھی کہا کہ "میرا ایک دوست میرے باپ کا قاتل ہے؟" تم بلاتکلّف لکھ دیتے ہو کہ "میرا ایک قادیانی دوست ہے"۔ اور یہ سوچتے نہیں کہ کیا ایک قادیانی مرتد بھی کبھی کسی مسلمان کا دوست ہو سکتا ہے؟ کیا تمہیں الفاظ کے استعمال کرنے کی بھی تمیز نہیں؟ جو لوگ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تاج ختم نبوت پر ہاتھ ڈالتے ہیں، جو لوگ کہ ملعون قادیانی کو "مسیح موعود" اور "محمد رسول اللہ" کہتے ہیں، تم ان کو اپنا دوست کہتے ہو؟ اس لئے میں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایک تقاضا یہ ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوبوں سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیاروں سے محبت ہو، اسی طرح ایک

تقاضائے محبت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے ایسی نفرت ہو، ان سے ایسا بغض ہو کہ ایسی نفرت اور ایسا بغض پلید سے پلید چیزوں سے بھی نہ ہو۔

امیر شریعتؒ کی قادیانیوں اور انگریزوں سے نفرت

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ "مجھے اپنی زندگی میں صرف دو چیزوں سے نفرت ہے، ایک قادیانی، دوسرے انگریز، باقی کسی سے ایسی نفرت نہیں"۔ اور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ "میں ان سؤروں کے ریوڑ کو چرانے کے لئے تیار ہوں جو انگریز کی کھیتی کو نقصان پہنچائے"۔ اور ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں فرماتے تھے کہ "خواجہ ناظم الدین صاحب! مرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ کردیجئے! میں اس کی شکر گزاری میں ہر خدمت اور ہر نوکری بجالانے کو تیار ہوں"۔ یہ قادیانیوں اور انگریزوں کے ساتھ انتہائی نفرت کا اظہار تھا، اب اس سے زیادہ نفرت کا اظہار کیسے کریں؟ اور پھر اس کا صلہ بھی دیکھا؟ جو حضرت امیر شریعتؒ کو بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے عطا ہوا؟ حضرت مولانا عبداللہ درخواستی رحمہ اللہ فوت ہوگئے ہیں، ان کے صاحبزادے موجود ہیں، ان سے پوچھ لو، حضرت درخواستیؒ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، اور وہاں پہنچ کر ہجرت کا ارادہ کرلیا، کہ باقی زندگی بس یہیں رہنا ہے، پاکستان واپس نہیں جانا۔ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، حکم فرمایا کہ "یہاں رہنے کی اجازت نہیں، واپس پاکستان جاؤ، وہاں تمہاری ضرورت ہے، وہاں رہ کر دین کا کام کرو، اور میرے بیٹے عطاء اللہ شاہ بخاری کو میرا سلام کہہ دینا"۔

محبت والوں کو بارگاہ عالی سے نوازا جاتا ہے

تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کر کے تو دیکھو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الطاف وعنایات کا لطف دیکھو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر محبت رکھنے والے کو اس کی محبت کا صلہ محبت سے دیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے وفادار ہیں، ہماری پنجابی میں اس کو "لج پال" کہتے ہیں، یعنی لاج رکھنے والے ـــ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ اپنے محبین کی لاج رکھنے والے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے آداب و شرائط کو بجالاؤ۔ میں نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے مواعظ میں کہیں یہ واقعہ پڑھا تھا کہ ایک بزرگ غالباً حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے یہاں ایک کتا تھا، ایک دن اس کو دیکھا کہ کتیوں کے پیچھے پھر رہا ہے، فرمایا کہ اس کو نکال دو یہاں سے، یہ ہمارے دروازے پر رہنے کے لائق نہیں ہے۔ تم کتیوں کے پیچھے پھرتے ہو، اور چاہتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کے لائق بن جاؤ؟ کتوں اور کتیوں کے پیچھے پھرنے والے یہ چاہتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں محبوب ہو جائیں؟ اور ہم مقبول بن جائیں؟

عاشق کی نظر محبوب کے سوا کسی پر نہیں جاتی

کہتے ہیں کہ "جی! بد نظری ہو جاتی ہے"۔ ارے اگر تمہاری ایک پر نظر ہوتی تو دوسرے پر تمہاری نظر جاتی ہی نہیں، یوں کہتے ہیں کہ ایک حسینہ جا رہی تھی کوئی لونڈا اس کے پیچھے لگ گیا، وہ اس سے کہنے لگی کہ "تم میرے پیچھے کیوں لگ گئے ہو؟" اس نے کہا "مجھے تم سے محبت ہے"۔ حسینہ نے کہا "ارے تم مجھ سے محبت کر کے کیا لوگے؟ پیچھے میری بہن آرہی ہے، اگر تم اس کو دیکھ لو تو

اس پر ایسے فریفتہ ہو جاؤ کہ مجھے بھول جاؤ، میں تو حسن و جمال میں اس کی پاسنگ بھی نہیں ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا حسن و جمال دیا ہے کہ بس دیکھتے ہی رہو۔ وہ دیکھو! پیچھے میری بہن آرہی ہے"۔ اس نوجوان نے پیچھے مڑکر دیکھا تو اس حسینہ نے نوجوان کو زور سے ایک تھپڑ رسید کیا، اور کہنے لگی کہ "او بوالہوس! دعویٰ عشق کا؟ اور دوسروں کو دیکھنا؟" عشق اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے محبت ہو بس اسی کے ہو رہو، اس کے علاوہ کسی کو دیکھو ہی نہیں۔ عارف کہتے ہیں:

دل آرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

ترجمہ: "تمہارا جو محبوب ہے بس اسی میں دل لگاؤ، اس کے سوا سارے عالم سے آنکھیں بند کرلو"۔

سنو!! مسجد میں بیٹھا ہوں، اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین اور صاحب جمال دلربا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں پیدا ہی نہیں کیا، محبت کرنی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرو، تم کن چیزوں کے پیچھے لگ گئے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر تم کن سفید چمڑیوں کے پیچھے لگے ہو؟ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

واحسن منک لم ترقط عینی
واجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرا من کل عیب
کانک قدخلقت کما تشاء

ترجمہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین کبھی

کوئی شخص میری آنکھ نے نہیں دیکھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ صاحب جمال کسی ماں نے بچہ نہیں جنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر عیب سے مبرا پیدا کئے گئے ہیں گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا چاہتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ویسے بنادیئے گئے"۔

اور میری اماں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں "زنان مصر نے زلیخا کے یوسف کو دیکھا تھا تو اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے"۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے کہ جب زنان مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو جمال یوسفی سے ایسی مبہوت ومدہوش ہوئیں کہ ہوش وحواس کھو بیٹھیں، اور پھلوں کے بجائے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ ام المؤمنین فرماتی تھیں کہ "زنان مصر نے زلیخا کے یوسف کو دیکھ کر ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ اگر وہ میرے یوسف کو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو) دیکھ لیتیں تو چھریاں ہاتھوں پر نہ چلتیں بلکہ دلوں پر چلتیں اور اپنی گردنیں کاٹ لیتیں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین وجمیل دنیا میں نہ کوئی ہوا، نہ ہوگا۔

آپ ﷺ کی وضع اور شکل وشباہت اختیار کرو

اللہ کے بندو! تم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل وشباہت کو چھوڑ کر غیروں کی شکل وشباہت اپناتے ہو؟ تمہیں گمراہ اور ملعون قوموں کی شکل وشباہت اور طور وطریق بھاتے ہیں؟ ہائے! تمہاری نظریں کدھر بھٹک گئیں؟ آؤ! جمال محمدی کو دیکھو! (صلی اللہ علیہ وسلم) محبوب رب العالمین کے طریقوں کو اپناؤ!!

آنحضرت ﷺ محبوب رب العالمین ہیں

دیکھو! تم کسی سے محبت کرتے ہو تو اس کو حسین دیکھ کر اس سے محبت کرتے ہو، اب سوچو کہ جس مقدس ہستی سے رب العالمین محبت کرتا ہے اور جو ہستی حبیب کبریاء ہے اس کے حسن و جمال کا کیا عالم ہوگا؟ گویا اللہ تعالیٰ کے حسن انتخاب نے پوری کائنات میں سے حسین ترین ہستی کو چن کر اپنا محبوب بنایا ہے۔ باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق سے محبت فرما رہے ہیں جن کو خود پیدا کیا ہے، اس سے کچھ اندازہ کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتنے حسین و جمیل ہوں گے جن سے اللہ تعالیٰ خود محبت فرما رہے ہیں؟ الغرض محبوب رب العالمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسروں کے طور وطریق سے نظریں ہٹادو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن وجمال پر اپنی نظریں گاڑ دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت تو ایسی ہے کہ ہم اس کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کو اپنی سعادت سمجھیں۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے تھے کہ فارسی کی ایک غزل ہے اس کے دو شعر بالکل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب حال ہیں، اس کا ایک شعر تو یہ ہے:

ہمہ آہواں صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

ترجمہ: ”جنگل کے سارے ہرن اپنے سر ہتھیلیوں پر لئے
پھر رہے ہیں، اس امید پر کہ کسی دن آپ صلی اللہ علیہ

وسلم شکار کے لئے تشریف لائیں"۔

یہ حجۃ الوداع کے قصہ کی طرف اشارہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں سو اونٹ قربان کئے تھے، سات اونٹوں کے بارے میں آتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لپک رہا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے بسم اللہ فرمائیں۔

اور فرماتے تھے کہ دوسرا شعر ہے ؎

عشقے کہ بتو دارم نہ گزاردت بدیں ساں
بہ جنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی آمد

ترجمہ: "مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عشق و محبت ہے وہ آپ کو ایسے تو چھوڑے گی نہیں، اگر جنازے پر نہیں، تشریف لائیں گے تو مزار پر آئیں گے"۔

اس کی شرح یہ ہے کہ قبر میں مردہ سے تین سوال کئے جاتے ہیں۔
① تیرا رب کون ہے۔ ② تیرا دین کیا ہے۔ ③ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے کہ: "تو ان کے بارے میں کیا کہتا ہے؟"

بعض اکابر فرماتے ہیں کہ قبر میں مردہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرا کر یہ سوال کیا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ کسی روایت میں یہ مضمون نظر سے نہیں گزرا، اگر یہ ثابت ہو تو مؤمن کے لئے بڑی بشارت ہے۔

سُنّت سے طبعی رغبت ہونا

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایک تقاضہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت سے ہمیں طبعی رغبت ہو جائے، آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کو لوکی پسند تھی، میں سات سال تک لوکی کھاتا رہا ہوں۔ دو وقت روزانہ لوکی کا سالن کھاتا تھا، کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغوب تھی، مجھے اس پورے عرصے میں کبھی اس سے اکتاہٹ نہیں ہوئی، ایک دفعہ بیمار ہوا تو ڈاکٹر حکیموں نے یہ کہہ کرکے چھڑادی کہ مسلسل لوکی کھانے سے اس کا معدہ ٹھنڈا ہوگیا ہے اس کی لوکی چھڑاؤ، تب سے یہ چھوٹ گئی، ورنہ سات سال تک بغیر اکتاہٹ کے دو وقت کھاتا رہا ہوں۔ اس لئے کہ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھی۔ الغرض تقاضائے محبت یہ ہے کہ ہماری رغبتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رغبت میں فنا ہوجائیں اور ہمارا یہ ذوق اور مزاج بن جائے کہ جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب ہے وہ ہمیں محبوب ہے۔ مجھے بہت تعجب ہوتا ہے کہ عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کرنے والے سے داڑھی کے بال نہیں رکھے جاتے، عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ، اور یہ معمولی سا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا۔ میرے بھائیو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے؟ تم یہود ونصاریٰ کے طور طریقے اختیار کرتے ہو لیکن محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کے طور طریقے تمہیں بھول گئے ہیں، اور بعض تو اللہ کے نیک بندے ایسے ہیں کہ ان کو ان چیزوں سے نفرت ہوگئی ہے، ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل وشباہت سے نفرت ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل واخلاق سے نفرت ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ غور کرو اور انصاف کرو کہ کیا کسی اُمتی کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طور وطریق اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل وشباہت سے نفرت ہوسکتی ہے؟ اور جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وضع قطع اور شکل وشباہت سے نفرت ہوجائے اس کو مسلمان کہنا صحیح ہے؟

ایک حدیث

اب آخر میں ایک حدیث نقل کرکے ختم کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"احبوا اللّٰہ لما یغذوکم من نعمہ، واحبونی لحب اللّٰہ، واحبوا اھل بیتی لحبی۔"

(مشکوٰۃ صفحہ ۵۷۳)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ سے محبت رکھو اس لئے کہ وہ تمہیں غذا دیتا ہے اپنی نعمتوں سے، اور مجھ سے محبت کرو اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے، اور میرے اہل بیت سے محبت رکھو، میری محبت کی وجہ سے"۔

حق تعالیٰ محبوب مطلق ہیں اور اللہ تعالیٰ شانہ کی محبت ان کی ذات عالی کی وجہ سے بھی لازم ہے، ان کی صفات کمال اور جلال وجمال کی وجہ سے بھی، اور ان کی عطاء ونوال کی وجہ سے بھی۔ چونکہ انعامات واحسانات کا استحضار عام لوگوں کے لئے محبت کا قوی ترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: "الانسان عبدالانسان۔" "انسان احسان کا غلام ہے"۔

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انعامات الٰہیہ کو پیش نظر رکھنے کا حکم فرمایا، کہ چونکہ اللہ تعالیٰ تمہیں غذائیں دیتا ہے، روزی عطا کرتا ہے، وہ تمہارا خالق بھی ہے مالک بھی ہے، مربی بھی ہے، رب العالمین بھی ہے، اس لئے اس سے محبت رکھنا لازمۂ عبدیت ہے۔ اور سچ پوچھو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی بھی اللہ کی عطاؤں میں سے ایک عطاء ہے، اصل معطی حقیقی

وہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، ان کی زندگی تمہارے سامنے گزری ہے۔ جب تم نے اس انسان کامل کو نہیں پہچانا تو رب العالمین کو کیسے پہچانو گے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو تمہیں چلتے پھرتے نظر آتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وشمائل کو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، جب تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی نہیں پہچان سکے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر فریفتہ نہیں ہوسکے تو پروردگار عالم جل شانہ تو ان مادی آنکھوں سے کبھی نظر بھی نہیں آتے ان سے تم کیا محبت کروگے؟ درحقیت اللہ تعالیٰ ہی محبوب حقیقی ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی محبوب ہیں تمام انبیاؑ کرام کے محبوب ہیں، اللہ تعالیٰ کی شان محبوبیت کا مخلوق کیا ادراک کرسکتی ہے؟ سبحان اللہ! ہمارے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ پنجابی میں حسین اور خوبصورت کو "سوہنا" کہتے ہیں۔ شاہ جی فرماتے تھے کہ دوسرے حسین تو "سوہنے" ہیں، یعنی صاحب حسن وجمال ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کو "سوہنا" نہیں بلکہ "سناہپ" کہنا چاہئے۔ یعنی "عین حسن وجمال" اس کا جمال اپنی آخری انتہا کو پہنچا ہوا ہے کہ اس پر اضافہ ممکن نہیں، وہ صاحب جمال نہیں بلکہ "عین جمال" ہیں۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھو! اس لئے کہ وہ تم کو غذا دیتا ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کی ذات بے چون وچگون تک تمہاری نظر نہیں جاتی، اگر اللہ تعالیٰ کی صفات جلال وجمال تک بھی تمہاری نظر نہیں پہنچتی تو اتنی بات تو سب جانتے ہیں کہ تمام انعامات ظاہری وباطنی اسی کی عطا ہیں، اور اس کے انعامات کسی ایک شخص تک محدود نہیں، بلکہ پورے کا پورا

جہان اس کے انعامات و احسانات کے دریا میں غرق ہے۔

ایک جامع دعائے شکر

میں نے یہاں مسجد میں ایک دعا لکھوا کے لگائی تھی، اب شاید اتار دی گئی ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص صبح اور شام تین تین مرتبہ یہ دعا پڑھا کرے:

"اللھم ما اصبح بی من نعمة او باحد من خلقک فمنک وحدک لا شریک لک فلک الحمد ولک الشکر۔"

ترجمہ: "یا اللہ! آج کے دن مجھ پر یا آپ کی مخلوق میں سے کسی پر جو کوئی بھی احسان ہے اور جو کوئی بھی نعمت ہے وہ محض اور صرف ایک آپ ہی کی جانب سے ہے، اس کی عطا میں اور کسی کا دخل نہیں، سو آپ ہی کے لئے حمد ہے اور آپ ہی کے لئے شکر ہے"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ دعا صبح کو تین مرتبہ پڑھے اس نے سارے دن کی نعمتوں کا شکر ادا کردیا، اور جو شخص شام کو یہ دعا تین مرتبہ پڑھے اس نے رات بھر کی ساری نعمتوں کا شکر ادا کردیا۔ سبحان اللہ! کیسی جامع دعا کی تلقین فرمائی۔ اس دعا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت سے آگاہ فرمایا ہے کہ تمام انعامات کا منبع اور تمام فیوضات وبرکات کا سر چشمہ حق تعالیٰ شانہ کی ذات عالی ہے، وہی پاک ذات لائق حمد ہے، اور وہی لائق شکر ہے۔ اللھم لک الحمد ولک الشکر۔ اس لئے اگر تم کو

حق تعالیٰ کے جلال و جمال کا ادراک نہیں تو کم سے کم اس کے بے پایاں احسانات کی وجہ سے اس سے محبت رکھو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

"اور مجھ سے محبت رکھو اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے"۔

"اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے" کے دو مطلب ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے محبت رکھتے ہیں تو تم کو بھی بدرجہ اولیٰ مجھ سے محبت رکھنی چاہئے۔ دوسرا یہ کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے اس کے احسانات کی بنا پر محبت رکھتے ہو تو مجھ سے بھی محبت رکھو، اس لئے کہ میں اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سب سے بڑا انعام ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری تعلیم و تربیت کے لئے مجھے رسول بناکر بھیجا ہے، تمہیں محبوب حقیقی کا راستہ بتاتا ہوں، آداب عبدیت، آداب انسانیت تم کو سکھاتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے تمہاری دنیا و آخرت کی خیر میری پیروی میں رکھی ہے، اس لئے تمہارا اولین فرض ہے کہ مجھ سے محبت کا تعلق رکھو۔ اور فرمایا کہ:

"میری محبت کی وجہ سے میرے اہل بیت سے محبت رکھو"۔

گویا جس شخص کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور محبت ہوگی، اور جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اس کو لازماً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے محبت ہوگی، اور جس شخص کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی، ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کی، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی، آل و اولاد کی محبت نہیں اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی محبت نہیں، اس کا دعوائے محبت ہی نہیں بلکہ دعوائے ایمان بھی مشکوک ہے۔

اب دعا کیجئے

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی سچی محبت نصیب فرمائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت نصیب فرمائیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کبار اور اہل بیت عظام کی سچی محبت نصیب فرمائیں، اور اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو اس محبت کے لئے مستعد فرمادیں، اور ہمارے دلوں پر جو خواہشات کا زنگ ہے، گرد و غبار ہے، سیاہی و تاریکی ہے اور نامعلوم کیا کیا گند بلا ہمارے دلوں میں بھرا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو ہمارے دلوں سے نکال کر اپنے لطف وکرم سے ان کو پاک صاف فرمادیں، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے ہمارے دلوں کو بھردیں، اور محبت کی خوشبو ہمیں نصیب فرمائیں۔ یااللہ! ہم محتاج ہیں، یااللہ! ہمارے احتیاج پر، ہمارے فقر پر، ہماری بے کسی و بے بسی پر رحم فرما، یا اللہ! ہمیں اپنی اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت نصیب فرما۔

صلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا
محمد النبی الامی والہ واصحابہ وازواجہ
واھل بیتہ اجمعین، برحمتک یا ارحم
الراحمین۔
وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

لیلۃ القدر

کی برکات اور اس کے حصول کا طریقہ

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان
	* حقوق العباد کے معاملے میں توبہ
	* ایک حدیث قدسی
	* والدین کا نافرمان
	* والدین کو دیکھنے پر حج کا ثواب
	* والدین کی نافرمانی کا دنیا میں وبال
	* اولاد کی نافرمانی اور والدین کا قصور
	* گناہ کے کام میں والدین کی فرماں برداری جائز نہیں
	* قطع رحمی کا گناہ
	* کینہ پروری کا گناہ
	* جنت میں صرف پاک لوگ جائیں گے
	* اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے شفقت
	* ایک جامع دعا
	* اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ معاملہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد:

فضائل رمضان میں ایک جامع حدیث

حضرت شیخ نوّر اللہ مرقدہ نے اپنے رسالہ "فضائل رمضان" کے خاتمہ میں ایک لمبی حدیث نقل کی ہے۔ حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ خاتمے میں ایک طویل حدیث، جس میں کئی نوع کے فضائل ارشاد فرمائے ہیں، ذکر کرکے اس رسالے کو ختم کیا جاتا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

> "حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جنت کو رمضان شریف کے لئے خوشبوؤں کی دھونی دی جاتی ہے اور شروع سال سے آخر سال تک رمضان المبارک کے لئے جنت کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ پس جب رمضان المبارک کی پہلی رات ہوتی ہے تو عرش کے

نیچے سے ایک ہوا چلتی ہے، جس کا نام "مثیرہ" ہے، (جس کے جھونکوں کی وجہ سے) جنت کے درختوں کے پتے اور کواڑوں کے حلقے بجنے لگتے ہیں، جس سے ایسی دل آویز سریلی آواز نکلتی ہے کہ سننے والوں نے اس سے اچھی آواز کبھی نہیں سنی، پس خوشنما آنکھوں والی حوریں اپنے مکانوں سے نکل کر جنت کے بالا خانوں کے درمیان کھڑی ہو کر آواز دیتی ہیں کہ "کوئی ہے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہم سے منگنی کرنے والا، تاکہ اللہ تعالیٰ شانہ اس کو ہم سے جوڑ دیں؟" پھر وہی حوریں جنت کے داروغہ "رضوان" سے پوچھتی ہیں کہ یہ کیسی رات ہے؟ وہ لبیک کہہ کر جواب دیتے ہیں کہ "رمضان المبارک کی پہلی رات ہے، جنت کے دروازے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے روزہ داروں کے لئے آج کھول دیئے گئے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ رضوان سے فرمادیتے ہیں کہ جنت کے دروازے کھول دے، اور "مالک" یعنی جہنم کے داروغہ سے فرما دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے روزہ داروں پر جہنم کے دروازے بند کردے، اور حضرت جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم ہوتا ہے کہ زمین پر جاؤ اور "سرکش شیاطین" کو قید کرو، اور ان کے گلے میں طوق ڈال کر دریا میں پھینک دو کہ میرے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے روزوں کو خراب نہ کریں۔" نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "حق تعالیٰ شانہ رمضان المبارک کی ہر رات میں ایک "منادی" کو حکم فرماتے ہیں کہ تین مرتبہ یہ آواز دے کہ "ہے کوئی مانگنے والا کہ جس کو میں عطا کروں؟ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں؟ ہے کوئی مغفرت چاہنے والا کہ میں اس کی مغفرت کروں؟ کون ہے جو غنی کو قرض دے؟ ایسا غنی جو نادار نہیں، اور ایسا پورا پورا ادا کرنے والا جو ذرا بھی کمی نہیں کرتا۔" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ رمضان المبارک میں روزانہ افطار کے وقت ایسے دس لاکھ آدمیوں کو جہنم سے خلاصی مرحمت فرماتے ہیں جو جہنم کے مستحق ہو چکے تھے۔ اور جب رمضان المبارک کا آخری دن ہوتا ہے تو یکم رمضان سے آج تک جس قدر لوگ جہنم سے آزاد کئے گئے تھے، ان کے برابر اس ایک دن میں آزاد فرماتے ہیں۔ اور جس رات شب قدر ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم فرماتے ہیں، وہ فرشتوں کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں، ان کے ساتھ ایک سبز جھنڈا ہوتا ہے جس کو بیت اللہ شریف کے اوپر کھڑا کر دیتے ہیں، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سو بازو ہیں، جن میں سے دو بازوؤں کو صرف اسی رات میں کھولتے ہیں، جن کو مشرق سے مغرب تک پھیلا دیتے ہیں، پھر جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کو

تقاضا (حکم) فرماتے ہیں کہ جو مسلمان آج کی رات کھڑا ہو، یا بیٹھا ہو، نماز پڑھ رہا ہو یا ذکر کر رہا ہو، اس کو سلام کریں، اور اس سے مصافحہ کریں اور ان کی دعاؤں پر آمین کہیں، صبح تک یہی حالت رہتی ہے، جب صبح ہو جاتی ہے تو جبرئیل علیہ السلام آواز دیتے ہیں کہ اے فرشتوں کی جماعت! اب کوچ کرو اور چلو۔ فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی حاجتوں اور مؤمنوں کی ضرورتوں کے بارے میں کیا معاملہ فرمایا؟ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر عنایت اور توجہ فرمائی اور چار شخصوں کے علاوہ سب کو معاف فرمادیا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پوچھا کہ یارسول اللہ! وہ چار شخص کون ہیں؟ ارشاد فرمایا ایک وہ شخص جو شراب کا عادی ہو (اور اس سے توبہ نہ کرے) دوسرا وہ شخص جو والدین کی نافرمانی کرنے والا ہو، تیسرا وہ شخص جو قطع رحمی کرنے والا ہو، اور ناتا توڑنے والا ہو، چوتھا وہ شخص جو کینہ رکھنے والا ہو اور آپس میں قطع تعلق کرنے والا ہو، جب عید الفطر کی رات ہوتی ہے تو (اس کا نام آسمانوں) پر "لیلۃ الجائزہ" یعنی "انعام والی رات" سے لیا جاتا ہے۔ اور جب عید کی صبح ہوتی ہے تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں کو تمام شہروں میں بھیج دیتے ہیں، وہ زمین پر اتر کر تمام گلیوں اور راستوں کے سروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں،

اور ایسی آواز سے، جس کو انسان اور جنات کے سوا ہر مخلوق سنتی ہے، پکارتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت! اس کریم رب کی بارگاہ کی طرف چلو، جو بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے، اور بڑے سے بڑے قصور کو معاف کرنے والا ہے۔ پھر جب لوگ عید گاہ کی طرف نکلتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا بدلہ ہے اس مزدور کا جو اپنا پورا کام کرچکا ہو؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے معبود! اور اے ہمارے مالک! اس کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی مزدوری پوری پوری دے دی جائے۔ حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے فرشتو! میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کو رمضان المبارک کے روزوں اور تراویح کے بدلے میں اپنی رضا اور مغفرت عطا کردی۔ اور بندوں سے خطاب فرماکر ارشاد ہوتا ہے کہ اے میرے بندو! مجھ سے مانگو! میری عزت کی قسم! میرے جلال کی قسم! آج کے دن اپنے اس اجتماع میں مجھ سے اپنی آخرت کے بارے میں جو سوال کروگے عطا کروں گا، اور دنیا کے بارے میں جو سوال کروگے اس میں تمہاری مصلحت پر نظر کروں گا۔ میری عزت کی قسم! جب تک تم میرا خیال رکھو گے، میں تمہاری لغزشوں پر ستاری کرتا رہوں گا (اور ان کو چھپاتا رہوں گا)، میری عزت کی قسم! اور میرے جلال کی قسم! میں تمہیں مجرموں (اور کافروں) کے سامنے رسوا اور فضیحت

نہیں کروں گا۔ پس اب بخشے بخشائے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ، تم نے مجھے راضی کردیا، میں تم سے راضی ہو گیا۔ پس فرشتے اس اجر وثواب کو دیکھ کر جو ان کو عید الفطر کے دن ملتا ہے، خوشیاں مناتے ہیں اور کھل جاتے ہیں۔ "اللھم اجعلنا منھم" "یا اللہ! ہمیں بھی ان میں شامل فرما۔ آمین" (فضائل رمضان صفحہ ۶۰)

شب قدر رحمت خداوندی کی رات

میں نے حدیث کا صرف ترجمہ پڑھا ہے۔ اس پر شیخ نوّر اللہ مرقدہ نے کچھ فوائد بھی لکھے ہیں، ان کو چھوڑ دیتا ہوں۔

رمضان المبارک کی رحمتوں اور برکتوں کا ایک مختصر سا نقشہ اس حدیث شریف میں آیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے حال پر کتنی عنایت اور کتنی رحمت ہے، اور کریم آقا نے اپنے بندوں کو بخشنے کے لئے کیا کیا سامان تیار کر رکھے ہیں۔ یہ ستائیسویں رات عام طور پر شب قدر کی رات کہلاتی ہے، یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ شب قدر کی رات کون سی ہے، کون سی طاق رات میں ہوتی ہے، کیونکہ اس میں علما کے بہت سے اقوال ہیں، عام علما کرام کا رجحان یہ ہے کہ ستائیسویں کی رات شب قدر ہوتی ہے۔ بہرحال شب قدر خواہ کوئی سی رات میں ہو، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کی برکتیں ہمیں نصیب فرمائے۔ اب اس سلسلے میں کوشش کروں گا کہ مختصراً چند باتیں عرض کروں۔

حضرت عائشہؓ کی برأت کا واقعہ

پہلی بات یہ ہے کہ سورہ نور میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر منافقوں کے بہتان لگانے کے قصہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ منافقوں کی اس لب تراشی سے متأثر ہوکر ایک دو مخلص مسلمان بھی اس میں ملوث ہوگئے تھے، وہ بھی باتیں کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سخت الفاظ میں ان کو تنبیہ فرمائی ہے:

"یعظکم اللہ ان تعودوا لمثلہ ابدا۔ الایۃ"

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ خبردار! آئندہ ایسی حرکت نہیں ہونی چاہئے۔"

کسی مسلمان پر تہمت لگانا، اور مسلمان بھی کون؟ مسلمانوں کی ماں اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، ان پر کسی مسلمان کی طرف سے گندگی کا منسوب کیا جانا کوئی چھوٹی بات ہے؟ حضرت مسطح ابن اثاثہ مہاجرین میں سے تھے اور نادار فقیر تھے، یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عزیز تھے، ان کے تمام خرچ اخراجات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھاتے تھے، یہ بھی منافقوں کی باتوں سے متأثر ہوکر اُم المؤمنینؓ کے بارے میں ایسی باتیں کرنے لگے، جب حضرت عائشہؓ کی برأت کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، اولئک مبرء ون مما یقولون الخ یعنی منافق لوگ جو بدزبانی کررہے ہیں، یہ حضرات اس سے بری ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے رنج کا واقعہ

پس جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی برأت کا اعلان

فرمایا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غصہ تو آنا ہی چاہئے تھا، چنانچہ انہوں نے غصے میں قسم کھالی کہ آئندہ مسطح ابن اثاثہ کو خرچ نہیں دوں گا۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ غصہ اللہ کی خاطر تھا، کسی کی بیٹی پر ایسی تہمت لگائی گئی ہو تو خود سوچئے کہ پھر ہمارا معاملہ اس تہمت لگانے والے کے ساتھ کیا ہوگا؟ بیٹی پر بدکاری کی تہمت کون برداشت کرتا ہے؟ پھر یہ بیٹی بھی تو عام بیٹیوں جیسی نہیں تھی، بلکہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ تھیں۔ الغرض حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غصہ آگیا اور غصہ میں قسم کھالی کہ آئندہ مسطح کو خرچ نہیں دیں گے۔ حق تعالیٰ شانہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی اس قسم سے باز رکھنے کے لئے سفارش فرمائی، گویا مسطح کی سفارش کی کہ ان کا خرچ بند نہ کیا جائے۔ "ولا یاتل اولی الفضل منکم والسعة الخ" یعنی تم میں سے جو صاحب فضیلت اور صاحب گنجائش ہیں، جو صاحب خیر ہیں، وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں "ان یوتوا اولی القربی والمساکین والمهاجرین فی سبیل الله" کہ وہ اپنے قرابت والوں کو جو کہ فقیر ہیں اور مہاجر فی سبیل اللہ ہیں، ان پر خرچ نہیں کریں گے، اور ان کو آئندہ خرچ نہیں دیں گے۔ "ولیعفوا ولیصفحوا" یعنی ان کو چاہئے کہ معاف کردیں اور درگزر سے کام لیں۔ "الاتحبون ان یغفر الله لکم" یعنی کیا تم یہ نہیں چاہتے ہو کہ اللہ تمہیں بخش دے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تمہیں بخش دے تو تم بھی ان لوگوں کو بخش دو اور درگزر سے کام لو، تم اللہ کے قصوروار ہو اور اس کی مغفرت کی امید رکھتے ہو تو لازم ہے کہ تم قصور والوں کو معاف کردو۔ "ان الله غفور رحیم" بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔ واقعی

اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا اور بے حد رحم کرنے والا ہے، کیونکہ تمہارا مجرم کوئی ایک آدھ آدمی ہوگا اور اس کے مجرم بے شمار ہیں۔ تمہارا قصور کسی نے کوئی ایک آدھ کیا ہوگا، اس کے بندوں نے بے شمار جرم اور بے شمار قصور کئے ہیں، جب ان تمام جرائم کے باوجود اور ان تمام قصوروں کے باوجود بندے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو بخش دے، ان کی مغفرت فرمائے اور ان پر رحم فرمائے تو اگر کسی نے تمہارا ایک آدھ قصور کردیا تو تم بھی معاف کردو۔

"ولا یاتل اولی الفضل منکم والسعة" یعنی تم میں سے جو صاحب فضیلت اور گنجائش والے ہیں۔ صاحب فضیلت اس شخص کو کہتے ہیں، جس کو بڑائی حاصل ہوتی ہے، اور صاحب گنجائش وہ شخص ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کی نسبت مال زیادہ عطا فرمایا۔ اس آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صاحب فضیلت اور صاحب گنجائش فرمایا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس آیت کی تفسیر میں تقریباً پندرہ وجوہ سے، پندرہ دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے افضل تھے، اس لئے کہ اللہ رب العزت نے ان کو "اولو الفضل" فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سفارش کہ قصوروار کو معاف کردیا جائے

اور اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ، جن کی ہستی سے بڑی

کوئی ہستی نہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک قصور وار کا قصور معاف کروانے کے لئے اور ایک مجرم کو درگزر کرنے کے لئے سفارش فرمارہے ہیں، اور سفارش کا انداز بھی عجیب وغریب اختیار فرمایا کہ پہلے ان کی فضیلت بیان فرمائی اور پھران کی فضیلت کے حوالے سے فرمایا کہ ہاں، ہاں، آپ جیسے آدمی کو ایسی قسم نہیں کھانی چاہئے۔ گویا ان کو فرمایا کہ تم اتنے بڑے آدمی ہو، اور پھراتنی چھوٹی بات پر قسم کھاتے ہو؟ نہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ: "ولیعفوا ولیصفحوا" معاف کر دو اور درگزر سے کام لو، اور پھر آخری بات فرمادی: "الاتحبون ان یغفر اللہ لکم" کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تم کو بخش دے؟ ظاہر ہے کہ کون نہیں چاہے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرمادیں، جب تم اللہ تعالیٰ سے بخشش چاہتے ہو تو خود بھی لوگوں کے ساتھ بخشش کا معاملہ کرو۔

بخشش چاہتے ہو تو تم دوسروں کو معاف کردو

میں نے یہ جو قصہ ذکر کیا ہے، اور قرآن کریم کی اس آیت شریفہ کا حوالہ دیا ہے، میرا مدعا صرف اتنا ہے کہ ہم سب کے سب اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، ٹھیک ہے بھائی! ہم اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتے ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا بھی کسی نے کوئی قصور کیا ہوگا، کیا ہم نے اس کو معاف کردیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگنے کے لئے لازم ہے کہ ہم رضائے الٰہی کے لئے اپنے تمام قصور واروں کو معاف کردیں۔ آج کے دن تک اور آج کی رات تک ہمارا جس شخص نے بھی جو بھی قصور کیا ہو، ہمیں صدمہ پہنچایا ہو، ہمیں رنج پہنچایا ہو، کوئی نازیبا حرکت اس نے کی ہو، سب کو معاف کردیں، اور

ہم اپنے دل میں یہ فیصلہ کرلیں کہ ہماری طرف سے سب کو تمام قصور معاف ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ خود ہماری معافی کا مقدمہ بارگاہ الٰہی میں پیش ہے، ہم معاف کردیں گے تو ہمارے لئے بھی معافی کا حکم ہوجائے گا۔ جب ہم سب کو معاف کرکے بارگاہ الٰہی میں معافی طلب کرنے کے لئے آئیں گے تو انشاء اللہ ہمیں بھی معافی کا پروانہ مل جائے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے: "الراحمون یرحمھم الرحمن" "رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے۔"

"ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء"

ترجمہ: "تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔" (مشکوٰۃ شریف: ۴۲۳)

تو ایک گزارش تو میری یہ ہے کہ اپنے عزیزوں کے ساتھ، اپنے ہمسایوں کے ساتھ، اپنے تعلق والوں کے ساتھ، ہماری کوئی نہ کوئی لڑائی چلتی رہتی ہے، کون آدمی ہے جس کی کسی کے ساتھ لڑائی نہ ہو؟ بندہ، بندہ ہے، کمزور ہے، کبھی کسی کی حالت سے رنج ہوتا ہے، کبھی کسی کی بات سے آدمی کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے، اور بعض لوگ تو رنجیدہ ہوکر قسم کھالیا کرتے ہیں کہ میں تو بالکل معاف نہیں کروں گا۔ اچھا بھائی! تم معاف نہیں کروگے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا یہ چاہو گے کہ اللہ تعالیٰ بھی قسم کھالیں کہ وہ تمہیں معاف نہیں کریں گے؟ نہیں! ہم تو کمزور بندے ہیں، ہم تو یہ چاہیں گے کہ اللہ کریم ہمیں معاف کردیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کردیں تو خود سوچو کہ پھر ہمیں ایسی قسم کھانے کا کیا حق ہے؟ اور اس کا کیا جواز ہے؟

شب قدر کی دعا

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں شب قدر کو پاؤں تو کیا مانگوں؟ فرمایا کہ اللہ رب العزت سے یہ کہنا کہ:

"اللھم انک عفو کریم تحب العفو فاعف عنی"

ترجمہ: "یا اللہ! آپ بہت معاف کرنے والے ہیں اور معاف کرنے کو پسند فرماتے ہیں، یا اللہ مجھے بھی معاف کر دیجئے۔" (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۱۸۲)

یہ تو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ تو معلوم نہیں کہ آج کی رات ہی "شب قدر" ہے یا کوئی اور رات شب قدر ہے۔ بہرحال وہ ہم پر گزرے گی اور رحمتیں وبرکتیں بکھیر کر جائے گی۔ ہمیں پتہ چلے یا نہ چلے۔ ہمیں پتہ ہونا ضروری نہیں۔ پتہ چلے گا اس دن، جس دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہم پر اس شب مبارک کی وجہ سے انعامات ہوں گے۔ بہرحال اس شب قدر کی دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلقین فرمائی۔ "اللھم انک عفو" "یا اللہ! آپ بہت معاف کرنے والے ہیں۔" "تحب العفو" "آپ معاف کرنے کو پسند فرماتے ہیں۔" مخلوق انتقام لینا چاہتی ہے اور انتقام کو پسند کرتی ہے، لیکن یا اللہ! آپ انتقام لینے کے بجائے معاف کرنے کو پسند فرماتے ہیں۔ "فاعف عنی" "پس مجھے بھی معاف فرما دیجئے۔" اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائے، حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ: "تخلقوا باخلاق اللہ" "اللہ تعالیٰ کے

اخلاق کو اپناؤ۔"

اگر ہم اللہ سے معافی کے طالب ہیں تو لازم ہے کہ ہم بھی تمام لوگوں کو معاف کردیں۔ آج سے لوگوں کے تمام کھاتے بے باق کردیں۔

چار آدمی جن کی بخشش نہیں ہوتی

اب دوسری بات، حدیث شریف جو میں نے آپ کو سنائی، اس میں ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ چار آدمیوں کی بخشش اس رات میں بھی نہیں فرماتے۔ رمضان المبارک میں جیسا کہ آپ نے سنا، ہر رات دس لاکھ ایسے آدمیوں کی بخشش کی جاتی ہے کہ جن پر جہنم واجب ہوچکی تھی، اور ان سے فرمادیا جاتا ہے کہ جاؤ آزاد کیا، اور رمضان المبارک کی آخری رات میں اتنے لوگوں کو معاف کیا جاتا ہے، جتنے لوگوں کو یکم رمضان سے آخری رات تک معاف کیا گیا تھا۔ اللہ اکبر! اتنے لوگوں کو آزاد کیا جاتا ہے۔ رمضان المبارک میں رحمت الٰہی کا گویا سیلاب ہے، جو بندوں کے گناہوں کو بہاکر لے جاتا ہے۔ لیکن چار آدمیوں کی بخشش رمضان المبارک کی عام راتوں میں تو کیا، شب قدر میں بھی نہیں ہوتی۔ بھئی ان سے بڑھ کر بد قسمت کون ہوگا۔ شب قدر میں جب کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے معافی کا اعلان کیا جارہا ہے، ان کی بخشش نہیں ہورہی۔ وہ چار کون ہیں؟ ایک تو شراب کا عادی، ایسا بلانوش کہ جس نے شراب سے توبہ نہ کی ہو، اور اس گناہ سے توبہ کرنے کی اس کو توفیق نہ ہوئی ہو۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفیؒ کی ایک کرامت

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی نوّر اللہ مرقدہ کا جس دن انتقال ہوا، اس

دن ہم لوگ حضرت کے مکان پر جمع تھے، حضرتؒ کے صاحبزادے نے ایک قصہ سنایا، کہنے لگے کہ ایک شخص مطب میں آیا، مجھ سے کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب ٹھیک ہیں؟ اس وقت حضرتؒ کی رہائش بھی اسی احاطے میں تھی جہاں پاپوش میں حضرتؒ کا مطب تھا، اور عصر کے بعد حضرتؒ کی مجلس لگتی تھی۔ میں نے کہا بیٹھے ہیں، مجلس لگی ہوئی ہے۔ مطب کا جو دروازہ احاطے کی طرف کھلتا تھا، اس نے وہ دروازہ کھولا اور دونوں کواڑ پکڑ کر کھڑا ہوا کچھ دیر حضرتؒ کو دیکھتا رہا، اور واپس آکر دوبارہ بیٹھ گیا، اور کہنے لگا کہ تم کو ایک قصہ سناتا ہوں، میں نہ ان کا شاگرد ہوں، نہ مرید، اور میں نے ان کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا، مجھے شراب پینے کی عادت تھی، میری بیوی بچے، دوست احباب سب نے اس کو چھڑانے کی ہر چند کوشش کی، لیکن:

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ایک شادی کی تقریب میں، میں مدعو تھا، حضرت ڈاکٹر صاحبؒ بھی وہاں تشریف لے گئے، اور میرے جانے سے پہلے حضرتؒ وہاں بیٹھک میں تشریف فرما تھے، اور جس طرح اس وقت محفل گرم ہے، اسی طرح لوگ حضرتؒ کے اردگرد جمع تھے، حضرتؒ اپنے ملفوظات بیان فرمارہے تھے، میں دروازے میں داخل ہوا تو حضرتؒ اپنی بات چھوڑ کر میری طرف دیکھنے لگے، اور جب تک میں بیٹھ نہیں گیا، برابر میری طرف دیکھتے رہے، جب میں بیٹھ گیا تو حضرتؒ نے پھر اپنی بات شروع کردی، وہ دن ہے اور آج کا دن، میں نے دوبارہ نہیں پی۔ ایک نظر کافی ہوگئی۔ یہ ہمارے حضرتؒ کی کرامت تھی، حضرتؒ کا شعر ہے ؎

جسے پینا ہو آنکھوں سے وہ میری بزم میں آئے
مرا دل چشم مست ناز ساقی کا ہے میخانہ

حضرتؒ کی ایک اور کرامت

ایک قصہ اور یاد آیا جو ایک بزرگ نے سنایا تھا، ستّر (۷۰) سال کے بڑے میاں تھے، حضرتؒ سے تعلق تھا، کسی لڑکی کو ٹیوشن پڑھانے لگے اور وہ بدبخت ان کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب ستّر سال کا بوڑھا ایک چھوکری کو دل دے بیٹھا۔

بوڑھوں سے بھی پردہ کیا جائے

بھئی! بڑے بوڑھوں سے بھی پردہ کرنا چاہئے، لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ضعیف العمر باباجی ہیں، ان سے کیا پردہ؟ حالانکہ لوگ نہیں جانتے کہ پرانا سانپ زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔ الغرض یہ بڑے صاحب تین چار مہینے پریشان رہے کہ کیا کروں، کسی کو کیسے بتاؤں؟ جب پریشانی حد سے سوا ہوئی تو آخر فیصلہ کرلیا کہ آج حضرتؒ کی خدمت میں جاکر عرض کرتا ہوں، وہ اس بلا سے نجات کی کوئی تدبیر بتلائیں گے، وہ صاحب کہتے ہیں کہ میں حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مسئلہ بتایا کہ حضرت کیا کروں؟ آپ کوئی تدبیر بتلایئے؟ حضرت نے سن لیا، جواب میں ایک لفظ نہیں فرمایا، بس سن لیا اور خاموش رہے، اس کے بعد دوسرے لوگ آگئے، حسب معمول حضرت کے ملفوظات شروع ہوئے، کافی دیر تک مجلس جاری رہی، جب میں حضرتؒ کی مجلس سے اٹھا تو دل بالکل صاف تھا، اس میں کوئی کوڑا کرکٹ باقی نہیں رہا تھا۔ یہ ہمارے حضرتؒ کی کرامت تھی۔

شراب خانہ خراب کی بربادیاں

شراب اتنی گندی چیز ہے کہ دل کو گندہ کردیتی ہے، جس طرح پیشاب نجاست غلیظہ ہے، اسی طرح شراب بھی نجاست غلیظہ ہے، لوگ اُس سے تو گھن

کرتے ہیں، مگر اس ''شراب خانۂ خراب'' سے گھن نہیں کرتے، حالانکہ یہ اُم الخبائث ہے، کہتے ہیں ایک بزرگ کسی بدمعاشوں کے ٹولے میں پھنس گیا تھا۔ اس کو مجبور کیا گیا کہ یہ بچہ ہے، اس کو قتل کرو، یا یہ عورت ہے، اس کے ساتھ بدکاری کرو، یا کم سے کم درجہ میں یہ شراب ہے، یہ پی لو، ورنہ تمہیں قتل کرتے ہیں۔ یہ پریشان ہوئے کہ یا اللہ! جان بچانے کے لئے کیا صورت اختیار کروں؟ انہوں نے سوچا کہ ان تینوں کاموں میں شراب پینا سب سے ہلکا کام ہے اور شریعت کا قاعدہ ہے کہ جو شخص دو بُرائیوں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے پر مجبور کردیا جائے، اسے چاہئے کہ سب سے کم درجہ کی بُرائی کو اختیار کرے، یہ سوچ کر انہوں نے اس کو اختیار کرلیا۔ شراب بڑی تیز تھی، شراب پینے کے بعد مدہوش ہوگئے، مدہوشی کے عالم میں بچے کو بھی قتل کیا، زنا کا بھی ارتکاب کیا، تینوں کام مکمل ہوگئے، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھیں، واقعی یہ اُم الخبائث ہے، عقل وخرد اور ہوش و حواس کی دشمن ہے۔ تو جو لوگ کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ سے بخشش کے طالب ہوں، وہ اس اُم الخبائث سے توبہ کرلیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ شراب پینے سے چالیس دن تک نماز قبول نہیں ہوتی۔

(مشکوٰۃ شریف)

مغفرت مانگنے والوں کو توبہ لازم ہے؟

اور میں نے ابھی کہا کہ اس بزرگ نے سمجھا کہ یہ ہلکا کام ہے، قتل اور زنا اس سے بدتر کام ہیں، لہٰذا ہلکا کام کرلو۔ آپ خود سوچ لیں کہ جو لوگ شراب کے عادی ہیں، جب شب قدر میں ان کی بخشش نہیں ہوتی تو اس سے بڑے گناہوں میں جو لوگ مبتلا ہیں ان کی بخشش کیسے ہوگی، اس لئے بخشش مانگنے کے

لئے شرط ہے کہ ہم تمام گناہوں سے توبہ کرلیں، جن کو ہم جانتے ہیں ان سے بھی، اور جن کو ہم نہیں جانتے ان سے بھی، جو گناہ اعلانیہ کرتے ہیں ان سے بھی، اور جو چھپ کر کرتے ہیں ان سے بھی، اس لئے کہ کبیرہ گناہوں میں مبتلاً ہونے کی وجہ سے یہ شخص اللہ کی لعنت کا مستحق ہے، لعنت اور رحمت دونوں جمع نہیں ہوسکتیں، جب تک کہ آدمی توبہ نہ کرلے، رحمت خداوندی کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی رحمت کا مستحق اسی وقت ہوسکتا ہے، جب کہ آدمی کبیرہ گناہ سے توبہ کرلے تاکہ لعنت اس کا پیچھا چھوڑ دے اور رحمت خداوندی اس کی طرف متوجہ ہوجائے۔

توبہ کے کیا معنی ہیں؟

اور "توبہ" کے معنی محض زبان سے توبہ کا لفظ بولنا نہیں ہے۔ صرف زبان سے کہہ دو یا اللہ میری توبہ، یااللہ میری توبہ، یا اللہ میری توبہ۔ یہ حقیقی توبہ نہیں ہے، بلکہ توبہ کے ظاہری الفاظ ہیں۔ ایک عارف کا شعر ہے:

سبحہ درکف، توبہ برلب، دل پر از ذوق گناہ
معصیت راخندہ می آید بر استغفار ما

یعنی ہاتھ میں تسبیح ہے، زبان پر توبہ ہے، لیکن دل گناہ کے ذوق سے بھرے ہوئے ہیں، گناہوں کو چھوڑنے کی نیت نہیں۔ ہم سب ایسا ہی استغفار کرتے ہیں، یااللہ توبہ، یااللہ معاف کردے، تو گناہ کو ہماری ایسی توبہ پر ہنسی آتی ہے کہ دل کو تو گناہ کی گندگی سے دھونے اور صاف کرنے کا ارادہ نہیں کرتا، لیکن زبان سے توبہ کررہا ہے۔ توبہ کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ ظاہر اور باطن کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے طالب بنیں، گناہ کو ترک کردینے کا عزم اور ارادہ کرلیں، اور

گناہ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے دین وایمان کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی کرنے کا بھی عزم کریں، مثلاً بے نمازی ہے، نماز نہیں پڑھتا، یا گنڈے دار پڑھتا ہے، جب پوچھا جائے کہ بھئی! نماز بھی پڑھتے ہو؟ تو کہتا ہے کہ کبھی کبھی پڑھ لیتے ہیں، جب فرصت ہوتی ہے۔ نہ بھائی! نماز تو ایسی چیز نہیں ہے جو کبھی کبھی پڑھی جائے، یہ تو ایمان کی غذا ہے، جس طرح بدن کی غذا ہوتی ہے۔ کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ کھانا کھایا کرتے ہیں؟ تو کیا آپ یہ جواب دیں گے کہ کبھی کبھی کھالیا کرتے ہیں؟

توبہ کے قبول ہونے کے لئے شرط

توبہ کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ گناہوں کو چھوڑنے کا عزم کرلیا جائے، پختہ ارادہ کرو کہ آئندہ ٹی وی نہیں دیکھیں گے، نامحرموں کو نہیں دیکھیں گے، کسی کی غیبت، یا چغلی نہیں کریں گے، عورتیں بے پردہ نہیں نکلیں گی، اسی طرح دوسرے جتنے بھی گناہوں میں مبتلا ہیں، ان کو چھوڑنے کا عزم کرو، میں نے مثال کے طور پر دو تین چیزیں بتائی ہیں، ورنہ ہم بہت سے کبیرہ گناہوں میں مبتلا ہیں، اور ان سب سے توبہ کرنا ضروری ہے۔ اب ہماری حالت تو یہ ہے کہ اگر کوئی ہم کو نصیحت کرے کہ یہ کام نہ کیا کرو تو ہم اس کے ساتھ لڑ پڑتے ہیں، اس کو برا بھلا کہتے ہیں، اب تم ہی بتاؤ جب دل سے سچی توبہ ہی نہ ہوئی ہو تو صرف زبان سے توبہ توبہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ جب دل تائب نہ ہو اور دل نے عزم نہ کیا ہو گناہ کو چھوڑنے کا، گناہ کی لذت، گناہ کی لعنت، گناہ کی نحوست اور گناہ کی سیاہی ہمارے قلب پر چھائی ہوئی ہے، تو پھر زبان سے توبہ کرنے کے کیا معنی ہوئے؟ اور اس پر توبہ کا ثمرہ کیا مرتب ہوگا؟ میری بہنیں اور بیٹیاں اگر

بے پردگی نہ چھوڑیں اور ہزار بار روزانہ استغفار پڑھا کریں تو اس کا کوئی نفع نہیں ہے، عزم کرو گناہوں کو چھوڑنے کا، جو گناہ ہمیں معلوم ہیں اور جن گناہوں میں ہم ملوث ہیں اور جن کی وجہ سے ہمارا دامن ایمان نجس ہو رہا ہے، ان کو چھوڑنے کا عزم کریں، گناہوں کو چھوڑنے کا عزم کرکے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آئیں اور صرف ایک دفعہ کہہ دیں کہ یا اللہ! میں نے گناہوں کو چھوڑنے کا سچے دل سے ارادہ کرلیا ہے، مجھے معاف کردیجئے، اللہ تعالیٰ فوراً معاف کردیتے ہیں، اسی (۸۰) سال کے گناہ کو بھی معاف کردیتے ہیں۔

حقوق العباد کے معاملے میں توبہ

اگر حقوق العباد کا معاملہ ہے تو ان حقوق کو ادا کریں۔ کسی کے پیسے دینے ہیں، اور وہ مانگتا ہے، تم نہیں دیتے، کسی کے مکان پر قبضہ کیا ہوا ہے، وہ شریف آدمی کہتا ہے کہ چھوڑ دو، تم نہیں چھوڑتے۔ یہاں قانون تمہیں سہارا دے دے گا لیکن اللہ کی بارگاہ میں تمہارا کوئی سہارا نہیں ہوگا، بلکہ تنہا ہوگے، اور وہاں تمہیں یہ حقوق ادا کرنے پڑیں گے۔ لہٰذا بندوں کے جتنے حقوق تمہارے ذمہ ہیں، ان سب کو ادا کرو، یا معاف کرالو، اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی۔ تو پہلی بات تو یہ ہوئی کہ کبیرہ گناہوں کو ترک کرنا، اور اس کا عزم کرنا مغفرت کے لئے شرط ہے، وگرنہ مغفرت نہیں ہوتی، اس بابرکت رات میں بھی نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ شانہ کی رحمت بہت وسیع ہے، کیا ہم، کیا ہمارے گناہ، اللہ کی رحمت کے مقابلے میں یہ کیا چیز ہیں؟ ساری دنیا کی ساری مخلوق کے گناہ بھی جمع کرلئے جائیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک چھینٹا ساری مخلوق کے سارے گناہوں کے دھونے کے لئے کافی ہے، مگر سچے دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے

بخشش مانگیں تو سہی، اور سچے دل کے ساتھ اپنے گناہوں، اپنی نافرمانیوں اور اپنی خباثتوں کو چھوڑنے کا تہیہ کرکے تو آئیں۔

ایک حدیث قدسی

حدیث قدسی میں آتا ہے (حدیث قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بات کی روایت کریں کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں، جیسے صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو وہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہلاتی ہے، اور جس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، تو وہ حدیث قدسی کہلاتی ہے) تو ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کے بادلوں اور اس کی بلندی تک پہنچ جائیں، یعنی ان سے آسمان اور زمین کا خلا بھر جائے اور تو سچے دل سے تائب ہوکر میرے پاس آئے اور مجھ سے بخشش کی درخواست کرے تو میں تیری مغفرت کردوں گا۔ "ولا ابالی" اور میں تیرے گناہوں کی کثرت کی کوئی پرواہ نہیں کروں گا، اور نہ ان سے میرا کچھ بگڑے گا۔

(مشکوٰۃ صفحہ ۲۰۴)

مناجات مقبول میں ہمارے حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے قرآن و حدیث کی دعائیں جمع فرمائی ہیں، اس میں ایک دعا یہ نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں یہ الفاظ کہا کرتے تھے:

"یامن لا تضره الذنوب ولا تنقصه المغفرة،
اغفرلی مالا یضرک وهب لی مالا ینقصک"

ترجمہ: ”اے وہ ذات جس کو نقصان نہیں دیتے گناہ اور مغفرت کرنا اس کے خزانوں میں کمی نہیں کرتا، جس چیز سے آپ کی کمی نہیں ہوتی وہ مجھے عطا فرمادیجئے اور جو چیز آپ کو نقصان نہیں دیتی وہ مجھے معاف فرمادیجئے۔“

الغرض ہمارے گناہوں سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا، ہمارے حضرت حکیم الامت تھانویؒ ارشاد فرماتے تھے کہ بعض لوگ اپنے گناہوں کی کثرت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوجاتے ہیں، اور یوں سمجھنے لگتے ہیں کہ میرے گناہ بہت ہیں، بہت ہیں، بہت ہیں، واقعی بہت ہیں، اب یہ بے چارہ نادان بچہ سمجھتا ہے کہ اتنے گناہ کیسے معاف ہوں گے؟ فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی سر سے پاؤں تک گندگی میں ملوث تھا، گندگی اور نجاست میں اس کو پورا بدن لت پت تھا، اب وہ دریا کے کنارے کھڑا ہے اور دریا کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ میں کس منہ سے تجھ میں اتروں، میں تو اتنا گندا ہوں، اتنا گندا ہوں، اگر میں تجھ میں اتر گیا تو میری گندگی تجھ کو بھی گندا کردے گی، اور میری نجاست کی وجہ سے تو بھی نجس ہوجائے گا، ناپاک ہوجائے گا۔ اس کے جواب میں دریا کہتا ہے کہ ارے تیرے جیسی گندگیاں ہزاروں یہاں چلتی ہیں، تو آکر تو دیکھ! تیری گندگی بھی صاف ہوجائے گی اور میرا بھی کچھ نہیں بگڑے گا۔ ایک آدمی کے نہانے سے کیا سمندر گندا ہوجاتا ہے؟ دریا گندا ہوجاتا ہے؟ حضرتؒ فرماتے تھے کہ ہماری یہی مثال ہے۔ سمندر تو ایک مخلوق ہے، اس میں دنیا بھر کی گندگیاں ڈال دی جائیں تب بھی وہ ناپاک نہیں ہوتا، بلکہ ساری غلاظتوں کو ختم کردیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ہمارے گناہوں سے کیا بگڑتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک چھینٹا ساری دنیا کے گناہوں کی گندگی دھونے کے لئے کافی ہے،

اس لئے یہ نادانی کی بات ہے کہ آدمی اپنے گناہوں کی کثرت کو دیکھ کر رحمت خداوندی سے مایوس ہوجائے۔ غرض یہ کہ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے طالب ہیں اور اس سے بخشش مانگنے کے لئے آئے ہیں، لیکن بھائی اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم سچے دل سے تائب ہوکر آئیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں، (آمین)۔ آپس کے جو حقوق ہیں، وہ بھی ادا کردیں، آپس میں ایک دوسرے سے معافی تلافی بھی کرلیں۔

والدین کا نافرمان

دوسرا آدمی جس کی مغفرت نہیں ہوتی، وہ والدین کا نافرمان ہے۔ یہ والدین کی نافرمانی بھی بڑی عجیب چیز ہے، آدمی کو اتنا تو سوچنا چاہئے کہ میرے والدین اگر نہ ہوتے تو میرا وجود نہ ہوتا، میرے وجود کا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے والدین کو بنایا، اب جن والدین کے وجود کو ہمارے وجود کا ذریعہ بنایا گیا، یہ انہی والدین کا مخالف ہے، انہی کا دشمن ہے، انہی کا نافرمان ہے۔ ماں نے ۹ مہینہ کم و بیش اس کو پیٹ میں رکھا، جس حالت میں رکھا، اور پھر جس حالت میں اس کو جنم دیا، وہ اس کی ماں سے پوچھو، پھر دو سال تک اسے اپنے جگر کا خون پلایا، جس کو دودھ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے خون جگر کو دودھ میں تبدیل فرمادیتے ہیں، پھر اس کی سردی وگرمی کا، اس کی ضروریات کا احساس کیا، اس کو سوکھے میں لٹایا، خود گیلے میں لیٹی، صاحب بہادر بیمار ہوگئے تو ماں باپ دونوں نے اس کو ہاتھوں میں لے کر رات آنکھوں پر کاٹی، والدین کا اتنا حق ہے کہ اولاد کسی صورت میں اس حق کو ادا نہیں کرسکتی۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے والد کا حق کس طرح ادا کرسکتا

ہوں؟ ارشاد فرمایا، نہیں! والد کا حق ادا نہیں ہو سکتا، صرف ایک صورت ہے کہ وہ غلام ہو تو اس کو خرید کر آزاد کردے تو کسی درجہ میں والد کا حق ادا ہو جائے گا۔ والدین کے اتنے احسانات ہیں اولاد پر کہ ان کا بدلہ چکانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایک صاحب نے پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! والدین کا اولاد کے ذمہ کیا حق ہے؟ فرمایا وہ تیری جنت ہیں یا تیری دوزخ ہیں۔

(مشکوٰۃ صفحہ۴۲۱)

والدین کو دیکھنے پر حج کا ثواب

ایک حدیث میں ہے کہ جو فرمانبردار اولاد نظر رحمت کے ساتھ والدین کے چہرے پر نظر ڈالے تو ہر بار نظر ڈالنے پر اس کے لئے حج مبرور کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا، یارسول اللہ! اگر دن میں سو مرتبہ دیکھے تو سو حج کا ثواب لکھا جائے گا؟ فرمایا، اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ بڑا ہے، اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ (مشکوٰۃ صفحہ۴۲۱)

یعنی حق تعالیٰ شانہ کی عنایتیں اور رحمتیں ہمارے پیمانۂ عقل وفہم سے بالاتر ہیں، روزانہ سو حج کا ثواب لکھا جانا کون سی بڑی بات ہے کہ اس پر تعجب کا اظہار کیا جائے۔ پس جب والدین کا یہ درجہ ہے کہ ان کے چہرے پر ایک بار نظر رحمت ڈالنا حج مبرور کا ثواب رکھتا ہے تو والدین کی نافرمانی وگستاخی کا وبال بھی اسی سے قیاس کیا جاسکتا ہے، تو والدین کے نافرمان کی اس رات میں بھی اگر بخشش نہ ہو تو کوئی بعید نہیں، اس لئے کہ جرم ہی اتنا بڑا اور سخت ہے۔ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر خدمت ہوا اور کہا یارسول اللہ! میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کے لئے

حاضر ہوا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تیری ماں زندہ ہے؟ عرض کیا جی ہاں! فرمایا پھر اس کو لازم پکڑ، کیونکہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔ اور یہ تو بہت ہی مشہور حدیث ہے کہ: "الجنة تحت اقدام الامهات" (حاشیہ مشکوٰۃ صفحہ۴۲۱) یعنی "جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔" ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جس گناہ کو چاہیں بخش دیں، سوائے والدین کی نافرمانی کے کہ اس کی سزا اللہ تعالیٰ اس شخص کو مرنے سے پہلے زندگی میں دیتے ہیں۔

والدین کی نافرمانی کا دنیا میں وبال

میں نے اپنی مختصر سی زندگی میں اس حدیث کی تفسیر اپنی آنکھوں سے دیکھی، چنانچہ فرماں برداروں کو پنپتے دیکھا اور والدین کے نافرمانوں کو ہلاک اور ذلیل وخوار ہوتے دیکھا۔ دراصل دنیا دارالجزا نہیں، جزا وسزا کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے قیامت کا دن رکھا ہے۔ جرائم کی سزائیں اللہ تعالیٰ نے قیامت پر اٹھا رکھی ہیں، یہاں جرم کی سزا نہیں دیتے، ہاں! تھوڑی سی گوشمالی کردیتے ہیں، ورنہ پوری سزا آگے قیامت کے دن ملے گی، لیکن ظلم، قطع رحمی اور والدین کی نافرمانی یہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی "سزا" دنیا میں نقد ملتی ہے، اور ظالم، قطع رحمی کرنے والا اور والدین کا نافرمان اپنے کئے کی پاداش سے بچ نہیں سکتے۔

اولاد کی نافرمانی میں والدین کا قصور

اس زمانے میں تو والدین کی عزت وآبرو کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اور اس میں قصور اکیلا صرف اولاد کا نہیں، بلکہ تھوڑا سا قصور والدین کا بھی ہے۔ مرحوم اکبر الٰہ آبادی کے بقول:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ہمارے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم مادیت کی تعلیم ہے، یہ انسانیت کی تعلیم نہیں، بلکہ حیوانیت کی تعلیم ہے۔ پس جب انسانیت مفقود ہو اور انسانیت کی تعلیم مفقود ہو تو والدین کی قدر کیا ہوگی؟ یہ تو خاصۂ انسانیت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس بلا سے محفوظ فرمائے (آمین)۔

غلط کام میں والدین کی فرمانبرداری جائز نہیں

میں اپنے عزیز بچوں اور نوجوانوں کو بطور خاص نصیحت کرتا ہوں کہ والدین کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں۔ اگر وہ ظلم کریں، ستائیں، زیادتی کریں، تب بھی تم خاموش رہو، تم کوئی گستاخی کا لفظ نہ کہو، بلکہ صبر و تحمل سے کام لو، وہ گالی نکالیں، بُرا بھلا کہیں، تب بھی پلٹ کر جواب نہ دو، بلکہ سر جھکائے خاموش رہو، لیکن اگر وہ اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کا حکم دیں تو ان کی بات ہرگز نہ مانو۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وان جاھداک علی ان تشرک بی ما لیس لک به علم فلا تطعھما" (لقمان: ۱۵)

ترجمہ: "اگر وہ (تیرے والدین) تجھ کو مجبور کریں اس بات پر کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے ایسی شخصیت کو جس کا تجھ کو علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مانو۔"

اور حدیث شریف میں ہے کہ: "لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق" "یعنی اللہ کی نافرمانی کرکے کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔"

شوہر بیوی کو کسی غلط کام کا حکم کرتا ہے تو ہرگز نہ مانے۔ والدین اولاد کو غلط بات کا حکم کرتے ہیں تو ہرگز نہ مانے، لیکن ان کی گستاخی و بے ادبی بھی نہ کرے۔ یہ وہ پل صراط ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ بعض لوگوں کو بزرگی کا "ہیضہ" ہوجاتا ہے۔ ماں باپ گناہ گار ہیں، نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے، اور یہ پکّا صوفی ہے، اَب والدین کو نظر حقارت سے دیکھے گا۔ ایسا ہرگز نہ کرو، یہ غلط بات ہے، ان کی خیر خواہی کی کوشش کرتے رہو، ادب و احترام کے ساتھ ان کو سمجھاؤ، اگر تمہارا کسی طرح بس نہیں چلتا تو اتنا تو بس چل سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے گڑگڑا کر دعا کرو۔ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے افضل نہیں اور تمہارے والدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ آزر سے زیادہ برے نہیں ہیں۔ وہ دھکے دے کر ابراہیم علیہ السلام کو گھر سے باہر نکال رہا ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ نکل جا یہاں سے، میرے گھر سے، دفع ہوجا، جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کو صرف اتنا فرما رہے ہیں:

"ساستغفر لک ربی انه کان بی حفیا"

(مریم: ۴۷)

ترجمہ: "میں اپنے رب سے تیرے لئے بخشش کی دعا کروں گا، وہ مجھ پر بڑا شفیق ہے۔"

تمہیں گھر سے نکال دیں، اُف نہ کرو۔ باقی اتنی بات ضرور ہے کہ یہ ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو میں نے ذکر نہیں کیا، وہ یہ کہ والدین کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ تمہارے ماں باپ تو جہنم کے راستے پر چل ہی رہے ہیں، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ وہ اکیلے نہ جائیں، بلکہ تم کو بھی ساتھ لے کر جائیں، اگر ان کی گستاخی کروگے، یا ناجائز کام میں ان کی بات پر عمل کروگے تو ان شاء اللہ دونوں

سیدھے جہنم میں پہنچو گے۔ اگر والدین اولاد پر ظلم کرتے ہیں، ان کو ناجائز بات کا حکم کرتے ہیں تو ان شاء اللہ سیدھے جہنم میں جائیں گے، لیکن اگر اولاد والدین کی گستاخی کرتی ہے، بے ادبی کرتی ہے، ان پر ہاتھ اٹھالیتی ہے، تو یہ والدین سے بھی پہلے جہنم میں جائیں گے۔ اس لئے والدین کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) والدین کی نافرمانی بہت بڑا گناہ ہے، اتنا بڑا گناہ ہے کہ شب قدر میں بھی معاف نہیں ہوتا۔

قطع رحمی کا گناہ

اور تیسرا شخص "قطع رحمی" کرنے والا، جس نے اپنے عزیز رشتہ داروں سے قطع تعلق کر رکھا ہو۔ قطع رحمی کا وبال اوپر ذکر کرچکا ہوں کہ ایسا شخص دنیا میں ہی سزا پاتا ہے، اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا ہے کہ: "لایدخل الجنة قاطع" "قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔"

یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ جنت سے بھی محروم کردیتا ہے، دنیا کے آرام اور چین سے بھی اور شب قدر میں بخشش سے بھی۔ نعوذ باللہ۔

کینہ پروری کا گناہ

اور چوتھا وہ آدمی، جس کے دل میں کسی مسلمان کی جانب سے کینہ ہو۔ ان لوگوں کی مغفرت اس رات میں بھی نہیں ہوتی۔

جنت میں صرف پاک لوگ جائیں گے

خلاصہ یہ ہے کہ جنت میں ناپاک لوگ نہیں جائیں گے، صرف پاک لوگ

جائیں گے، اور پاک ہونے کی آسان صورت یہ ہے کہ توبہ کرلو۔ میں نے ابھی کہا کہ اسّی (۸۰) سال کا کافر و مشرک و بے ایمان سچے دل سے تائب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہوں کو بخش دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے انتظار میں ہیں کہ بندہ آئے، آکر توبہ کرے، اور میں اس کے گناہ معاف کروں۔ حق تعالیٰ شانہ کو بندے کی توبہ سے اتنی خوشی ہوتی ہے، جس کا ہم تصور نہیں کرسکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک مسافر سفر پر جارہا تھا، صحرا کا سفر تھا، اس کی سواری کے اونٹ پر اس کا توشہ لدا ہوا تھا، کھانا پانی۔ دوپہر کا وقت ہوا تو سواری کو باندھ کر ایک درخت کے سائے میں ذرا ستانے کے لئے لیٹ گیا۔ آنکھ کھلی تو اونٹ غائب۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہیں اس کا سراغ نہیں مل رہا۔ اب بیاباں ہے، جنگل ہے، صحرا ہے، ریگستان ہے، اس میں سفر کرنا ممکن نہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر باہر نکل کر ریگستان کے صحرا میں چلوں گا تو تڑپ تڑپ کر بھوک پیاس سے مروں گا۔ بہتر ہے کہ درخت کے سائے میں ہی مرجاؤں۔ مرنے کی نیت سے اسی درخت کے نیچے آکر پھر لیٹ گیا۔ اب تو موت سامنے آگئی۔ ذرا سی اس کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہی اونٹ اس کے سامنے موجود ہے، اوپر توشہ اور سامان سارا موجود ہے، اس کو اتنی مسرت ہوئی، اتنی خوشی ہوئی کہ بے اختیار کہنے لگا کہ: "اللھم انت عبدی وانا ربک" یعنی اے اللہ تو میرا بندہ اور میں تیرا رب ہوں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اخطاء من شدة الفرح" کہ اس کو اتنی خوشی ہوئی کہ اس غریب کو یہ بھی خیال نہ رہا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، اُلٹ معاملہ کردیا، کہنا تو یہ تھا کہ یااللہ! میں تیرا بندہ ہوں، تو میرا رب ہے۔ آپ نے مہربانی فرمائی کہ میرا اونٹ واپس فرمادیا۔

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آدمی کو اتنی خوشی ہوئی کہ خوشی سے پاگل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی توبہ سے اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے شفقت

ایک جہاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے، دریافت فرمایا، کون لوگ ہو؟ عرض کیا، ہم مسلمان ہیں، ایک خاتون آگ جلا رہی تھی، آگ بھڑکتی تو بچے کو ہٹا دیتی، وہی خاتون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی، عرض کیا، آپ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا، ہاں! عرض کیا، میرے ماں باپ آپ پر قربان! کیا اللہ تعالیٰ الرحم الراحمین نہیں؟ فرمایا، بلاشبہ! عرض کیا، کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے بڑھ کر شفیق نہیں جتنی کہ ماں اپنے بچے پر شفیق ہوتی ہے؟ فرمایا، بے شک! عرض کیا، میں تو اپنے بچے کو اپنے ہاتھ سے آگ میں نہیں ڈال سکتی، اس خاتون کی بات سن تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سر جھکا کر رونے لگے، پھر سر اٹھا کر اس سے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں عذاب دیتے مگر ایسے سرکش کو، جو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں سرکشی کرے، اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرنے (لا الہ الاّ اللہ کہنے) سے انکار کردے۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۲۰۸)

الغرض تمام ماؤں کی ممتا جمع کرلی جائے تو اللہ تعالیٰ کی شفقت کو نہیں پہنچ سکتی، جتنی بندوں سے اللہ تعالیٰ کو شفقت ہے، اب اگر بندے اپنی حماقت سے خود دوزخ میں چھلانگیں لگائیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ماننے سے انکار کردیں تو اس کا کیا علاج ہے۔ وگرنہ اللہ اپنے

بندوں کو دوزخ میں نہیں ڈالنا چاہتے، اللہ تعالیٰ تو تمہیں بخشنا چاہتے ہیں، تمہیں جنت میں داخل کرنا چاہتے ہیں، اسی لئے رمضان المبارک میں جنت کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، اور جہنم کے دروازے بند کردیئے گئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منادی اعلان کررہا ہے: "ھل من مستغفر فاغفرلہ" کوئی بخشش مانگنے والا ہے کہ میں اس کی بخشش کروں؟ آؤ اس سے بخشش مانگو تاکہ تم کو بخش دیا جائے، لیکن بخشش مانگنے کے لئے لازم ہے کہ توبہ صحیح کرو، سچی توبہ کرو۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"یا ایھا الذین امنوا توبوا الی اللّٰہ توبۃ نصوحا" (التحریم: ۸)

یعنی "اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی بارگاہ میں خالص اور سچی توبہ۔"

اگر سچی توبہ کے بغیر مرگئے تو جہنم میں ڈال کر پاک کئے جاؤ گے، قبر میں پاک کئے جاؤ گے، قبر اور دوزخ کا عذاب جھیل کر پاک ہوگے، اس سے بہتر یہ ہے اور بہت آسان نسخہ ہے کہ سچی توبہ کرکے یہیں پاک ہوجاؤ، کیونکہ جنت میں تو جس کو بھی لے جائیں گے پاک کرکے لے جائیں گے، تو کیا ہی اچھا ہو کہ ہم سچی توبہ کرکے یہیں سے پاک ہوکر جائیں۔ پوری ندامت کے ساتھ، دل کی ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرلیں۔

ایک جامع دعا

ایک حدیث سناتا ہوں، ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اُم

المؤمنین عشاء کی نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھیں، دعا لمبی ہوگئی اور وہ مسلسل مانگ رہی تھیں۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگئے، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خلوت میں کوئی بات کرنی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، عائشہؓ! تم ایک طرف ہوجاؤ، دعا چھوڑ دو، ہم تمہیں ایک دعا بتائیں گے، وہ مانگ لینا، وہ تم کو کافی ہوجائے گی، انہوں نے اپنی دعا ختم کی اور ایک طرف ہوگئیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خلوت میں مشورہ کیا، جب وہ رخصت ہوکر چلے گئے تو حضرت عائشہؓ آئیں اور کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے مجھے دعا سکھانے کا وعدہ فرمایا تھا۔ فرمایا، ہاں! تمہیں دعا سکھا دیتے ہیں، تم یہ دعا کرو:

> "اللھم انی اسئلک من خیر ما سالک منہ نبیک محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم واعوذ بک من شر ما استعاذک منہ نبیک محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔"
>
> ترجمہ: "یااللہ آپ کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے جتنی خیر کی چیزیں مانگی ہیں، میں بھی مانگتی ہوں، اور آپ کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے جن جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے، میں بھی ان سے پناہ مانگتی ہوں۔"

بس دعا مکمل ہوگئی، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں جتنی دعائیں کیں، وہ پرچہ بنا کر دے دیا اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ

تم اس دعاؤں کے پرچے کے نیچے دستخط کردو۔ پرچہ پہلے سے چھپا ہوا ہے، نیچے تمہارے دستخط ہوگئے، تو وہ ساری دعائیں تمہاری طرف سے ہوگئیں، اور اللہ تعالیٰ ان کو منظور فرمائیں گے۔ تو جامع ترین دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگا کرو، اور خیر کی چیزیں مانگا کرو، اور خیر بھی وہ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگی ہے، اور تمام شرور وفتن سے پناہ مانگا کرو، خاص طور پر وہ فتن وشرور کی چیزیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے، بے شک اللہ تعالیٰ سے دنیا بھی مانگو، لیکن صرف دنیا ہی نہ مانگا کرو، اللہ تعالیٰ ہماری آخرت درست فرمادیں تو اس کے طفیل میں دنیا خود بخود درست ہوجائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمالیا ہے، لہٰذا اس سے آخرت مانگو، آخرت کی نعمتیں مانگو، آخرت کی دولتیں مانگو، اللہ تعالیٰ سے جنت مانگو، اللہ تعالیٰ سے اس کی رضا مانگو، اللہ تعالیٰ سے خود اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کو مانگو، وہ جب تم سے راضی ہوجائے گا تو تمہیں دنیا میں بھی رسوا نہیں فرمائے گا۔ وہ جو میں نے قرآن کریم کی آیت کی تلاوت کی تھی، اس میں یہ وعدہ موجود ہے:

"یاایھا الذین آمنوا توبوا الی اللّٰہ توبۃ نصوحا" (التحریم: ۸)

ترجمہ: "اے ایمان والو! اس کی بارگاہ میں خالص توبہ کرو۔"

"عسی ربکم ان یکفر عنکم سیاتکم"

ترجمہ: "تمہارے رب سے یہ توقع ہے کہ تمہاری سیئات دور کردے گا۔"

"ویدخلکم جنت تجری من تحتھا الانھار"

ترجمہ: ”اور تم کو داخل کرے گا ایسی جنتوں میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔“

”یوم لایخزی اللہ النبی والذین آمنوا معہ“

(التحریم:۸)

ترجمہ: ”جس دن کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور جو لوگ کہ آپ کے ساتھ ایمان لائے ہیں، ان کو رسوا نہیں فرمائے گا۔“

یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو رسوا نہیں فرمائے گا۔ اصل مقصود اہل ایمان کے رسوا نہ ہونے کو ذکر کرنا ہے، مگر اس بلاغت کے قربان جائیے کہ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرمایا، پھر آپ کی معیت میں اہل ایمان کا، گویا تنبیہ فرمادی کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیامت کے دن رسوا نہ ہونا یقینی ہے، اسی طرح آپ کے طفیل میں اہل ایمان بھی یقیناً رسوا نہ ہوں گے، اس لئے ضروری ہے کہ سچی توبہ کرلو، اور اللہ سے بخشش مانگ لو۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ معاملہ

حدیث شریف میں یوں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کا حساب لیں گے، تو اس کے اوپر اپنا پردہ ڈال دیں گے۔ اس کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا، قیامت کے دن کی بھری محفل ہے، حشر کا میدان ہے، اولین و آخرین جمع ہیں، لیکن اس بندے کے ساتھ کیا معاملہ ہورہا ہے؟ کسی کو معلوم نہیں اور اللہ تعالیٰ اس بندے سے فرمائیں گے: ”اذکر یوم کذا وکذا“

یعنی یاد کر تو نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں گناہ کئے، بندہ اقرار کرتا جائے گا، اقرار کئے بغیر چارہ بھی تو نہیں ہوگا، اور سمجھے گا کہ میں تو ہلاک ہوگیا، مارا گیا، آخر میں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

"انی سترتھا علیک فی الدنیا انا اغفر ھالک الیوم"

ترجمہ: "میں نے دنیا میں تیرے لئے ان گناہوں کا پردہ رکھا تھا کہ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیئے تھے، اور آج تیرے ان گناہوں کی مغفرت کرتا ہوں۔"

جاؤ! کسی کو پتہ ہی نہیں چلا، یہ ہے تفسیر اس کی کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن رسوا نہ فرمائیں گے۔ ہم نے تو معاملہ اللہ کے ساتھ بگاڑا ہوا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ معاملہ نہیں بگاڑا۔ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق قائم کرلیا جائے۔ گناہوں سے توبہ کرلی جائے۔ گناہ تو ہم سے پھر بھی ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے سرکشی نہ کرو، خدا نخواستہ غلطی ہوجائے تو فوراً توبہ کرلو، گناہوں کے میل پر توبہ کا صابن لگاتے رہو، تاکہ بارگاہ الٰہی میں ایمان کا دامن داغدار نہ لے جاؤ۔ حق تعالیٰ شانہ توفیق عطا فرمائیں (آمین)۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اعتکاف

فضائل و مسائل

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
* اعتکاف کی سوغات	
* اعتکاف کے مسائل	
* اعتکاف کی اقسام	
* اعتکاف کی شرائط	
* اعتکاف کی خوبیاں	
* اعتکاف کے آداب و مستحبات	
* جن چیزوں سے اعتکاف فاسد ہوتا ہے اور جن سے نہیں	
* وہ چیزیں جو اعتکاف میں حرام یا مکروہ ہیں اور جو مکروہ نہیں	
* اعتکاف کے متفرق مسائل	

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و
نؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور
انفسنا ومن سیأت اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ
فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد
ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھد ان
سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ،
صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلی اٰلہ واصحابہ
وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا۔ اما بعد:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اعتکاف کی نیت سے اپنے گھر میں جمع ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ اس کا بڑا انعام عظیم ہے۔ آپ حضرات دور ونزدیک سے تشریف لائے ہیں اور یہ آنا محض اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہے، اور اس کے پاک گھر میں جمع ہونے کے جو فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں ان فضائل کو حاصل کرنے کے لئے ہے۔ حق تعالیٰ شانہ ہم سب کی حاضری کو قبول فرمائے۔

ایک دن ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی نور اللہ مرقدہ فرمانے لگے کہ بھئی! مولانا رومیؒ کا ایک شعر ہے:

یک زمانہ صحبت با اولیاؒ
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

ترجمہ: "تھوڑے سے وقت کے لئے کسی اللہ کے مقبول بندے کے پاس بیٹھ جانا سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔"

یہ شعر پڑھ کر حضرتؒ فرمانے لگے کہ تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے آئے ہو، محض اللہ تعالیٰ کے لئے میرے پاس جمع ہوئے ہو، اس وقت تم سب کے سب اولیاؒ ہو، اور میں تمہاری صحبت میں بیٹھا ہوں۔ اللہ اکبر۔ بہت اچھی بات فرمائی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے۔ بھائی! کوئی کسی دشمن کے گھر تو نہیں جایا کرتا، دوست کے گھر جایا کرتا ہے۔ آپ حضرات اللہ کے گھر میں حاضر ہوئے ہیں تو محض اللہ تعالیٰ کی دوستی کی وجہ سے حاضر ہوئے ہیں، اس لئے اس وقت آپ لوگ ولی اللہ ہیں، اللہ کے دوست ہیں۔ اللہ ہمیں بھی اپنے مقبول بندوں کے ساتھ ملحق فرمادے۔

اعتکاف کی فضیلت

یہ اعتکاف کی عبادت بہت اونچی عبادت ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"واذ بوانا لا براھیم مکان البیت ان لاتشرك بی شیئا وطھر بیتی للطائفین والقائمین والرکع السجود"

ترجمہ: "اور جب ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کا ٹھکانا بتلایا، بیت اللہ کی جگہ بتلائی، (تو ہم نے ان کو چند حکم دیئے، ایک تو یہ) کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرانا، (یہ سنایا مکہ کے مشرکین کو کہ انہوں نے اللہ کے گھر کو بت پرستی کا اڈہ بنا رکھا تھا) اور (ایک حکم ہم نے یہ دیا کہ) میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے اور (نماز میں) قیام کرنے والوں کے لئے، اور رکوع سجدہ کرنے والون کے لئے (تمام ظاہری اور معنوی نجاستوں سے) پاک رکھئے۔"

یہ طواف تو مخصوص ہے بیت اللہ شریف کے لئے، جہاں تک اعتکاف کا تعلق ہے یہ تمام مساجد میں ہوتا ہے۔ کعبہ والی مسجد جو کعبہ کے اردگرد ہے اور جس کو مسجد حرام کہتے ہیں، اس میں اعتکاف کرنا سب سے افضل ہے، دوسرے نمبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں، تیسرے نمبر پر بیت المقدس کی مسجد میں، اور اس کے بعد تمام مساجد برابر ہیں، البتہ جس مسجد میں نماز پنج گانہ ہوتی ہو، اس میں اعتکاف افضل ہے، اور پھر ترجیح کی وجوہ اور بھی ہوسکتی ہیں، کسی مسجد میں وعظ اور درس ہوتا ہے، اصلاح وارشاد کا سلسلہ جاری ہے، وہاں اس نیت سے کہ ہمیں فائدہ پہنچے گا اعتکاف کرنا افضل ہوگا۔

اعتکاف کی قسمیں

اعتکاف ایک تو مسنون ہے، اور وہ ہے آخری عشرے کا اعتکاف (رمضان کے آخری دس دن کا اعتکاف) یہ مسنون ہے بطور سُنّت مؤکدہ علی الکفایہ، یعنی

سُنّت مؤکدہ ہے بطور کفایہ کے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آدمی محلے میں اعتکاف بیٹھ جائے تو مسجد کا حق ادا ہو جائے گا، اور محلے والے ترک اعتکاف کی وجہ سے گناہ گار نہ ہوں گے، لیکن اگر وہاں پر کوئی شخص بھی اعتکاف میں نہ بیٹھے، جیسا کہ بہت سی مساجد ایسی ہیں کہ وہاں اللہ کا کوئی بندہ اعتکاف نہیں بیٹھتا تو پورا محلّہ مسجد کی حق تلفی کرنے والا شمار ہوگا۔ بہت سے دیہات ایسے ہیں جن میں مسجد اعتکاف سے محروم رہتی ہے، بلکہ بہت سے قصبات ایسے ہیں کہ وہاں بعض مساجد میں کوئی بھی اعتکاف میں بیٹھنے والا نہیں۔ میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا کہ کسی ایسے جاہل آدمی کو پکڑ کر اعتکاف میں بٹھا دیتے ہیں جو کچھ بھی نہیں جانتا اور اس کو کہتے ہیں کہ میاں تمہاری روٹی پانی کا انتظام ہم کر دیں گے تم مسجد میں اعتکاف بیٹھ جاؤ۔ وہ غریب سمجھتا تھا کہ مجھے دس دن کے لئے قید کر رہے ہیں، لیکن یوں سوچ کر کہ روٹی ملے گی، اعتکاف میں بیٹھ جاتا تھا۔

بہرحال رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف تو مسنون ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ آنے کے بعد حتی الوسع کبھی بھی اس میں ناغہ نہیں فرمایا، ایک سال کسی عذر کی وجہ سے ناغہ ہو گیا تھا تو دوسرے سال ۲۰ دن کا اعتکاف فرمایا، گویا گزشتہ سال کے دس دن کی قضا بھی کی، اور رمضان المبارک کے آخری عشرہ کے علاوہ دوسرا اعتکاف مستحب ہے، اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جب بھی آپ مسجد میں قدم رکھیں تو اعتکاف کی نیت کرلیں کہ میں جب تک اس مسجد میں ہوں اعتکاف کی نیت کرتا ہوں، اور اگر کوئی شخص منت مان لے کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو اتنے دن کا اعتکاف کروں گا تو کام ہو جانے کی صورت میں اتنے دنوں کا اعتکاف اس کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے، اور یہ اعتکاف واجب کہلاتا ہے۔

یہ تو میں نے اعتکاف کا مسئلہ بیان کیا۔ ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہ نے اپنے رسالہ "فضائل رمضان" میں اعتکاف کی فضیلت میں یہ حدیث نقل کی ہے، اور یہ حدیث مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ "حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک مرتبہ مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں معتکف تھے، آپ کے پاس ایک شخص آیا اور سلام کرکے چپ چاپ بیٹھ گیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس سے فرمایا کہ میں تمہیں غمزدہ اور پریشان دیکھ رہا ہوں، کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے! میں بے شک پریشان ہوں، کیونکہ فلاں کا مجھ پر حق (قرض) ہے، اور (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ) اس قبر والے کی عزت کی قسم! میں اس حق کے ادا کرنے پر قادر نہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اچھا کیا میں اس سے تیری سفارش کروں؟ اس نے عرض کیا جیسے آپ مناسب سمجھیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ سن کر جوتا پہن کر مسجد سے باہر تشریف لائے، اس شخص نے عرض کیا کہ آپ اپنا اعتکاف بھول گئے؟ فرمایا، بھولا نہیں ہوں، بلکہ میں نے اس قبر والے صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے "اور ابھی زمانہ کچھ زیادہ بھی نہیں گزرا" یہ الفاظ کہتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے کہ: جو شخص اپنے بھائی کے کسی کام میں جائے اور کوشش کرے، یہ اس کے لئے دس برس کے اعتکاف سے افضل ہے، اور جو شخص ایک دن کا اعتکاف بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقیں آڑ بنا دیتے ہیں جن کی چوڑائی آسمان اور زمین کی درمیانی مسافت سے بھی زیادہ ہے۔

اعتکاف کے لئے اخلاص شرط ہے

اور جب ایک دن کے نفل اعتکاف کا ثواب یہ ہے تو رمضان المبارک کے آخری عشرے کے اعتکاف کا کتنا ثواب ہوگا؟ ہم اس کا اندازہ نہیں کرسکتے ہیں۔ ہم کیا اندازہ کریں گے، اندازہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہمارے قیاس اور اندازہ سے باہر ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو، کوئی اور مقصد درمیان میں نہ ہو، اور یہ نیت کرلینا کچھ مشکل نہیں ہے، اگر پہلے اس نیت کا استحضار نہیں تھا تو اب کرلو، بہت آسان ہے۔ بھئی نیت تو اپنے قبضے کی چیز ہے اگر کسی شخص کی نیت میں کسی اور چیز کی ملاوٹ تھی، تو اس ملاوٹ کو ہٹادے، اور اب نیت کرلے کہ یا اللہ! میں نے صرف آپ کی رضا کے لئے یہ کام کیا ہے، اور کررہا ہوں، اگر اس میں میرے نفس کی کوئی شرارت شامل ہے، اگر اس میں کوئی دنیاوی مفاد شامل ہے، اگر اس میں کوئی عزت وجاہ کا مسئلہ شامل ہے تو یا اللہ! میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں، بس نیت صحیح ہوگئی۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ سے عرض کردیا جائے کہ میں یہاں آپ کے گھر میں بس آپ کی رضا کے لئے بیٹھنا چاہتا ہوں اور بیٹھا ہوں، اس میں میری اور کوئی غرض شامل نہیں، اگر کوئی اور غرض شامل ہو تو میں اس سے توبہ کرتا ہوں۔ ایک تو یہ شرط ہوئی۔

مسجد کا ادب بجالایا جائے

اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کے گھر بیٹھے، اللہ کا گھر سمجھتے ہوئے، اور اس کی عظمت کا حق بجالاتے ہوئے، عام حالات میں بھی مسجد کے اندر شور وشغب یا ہلڑبازی جیسی کوئی چیز، جو وقار کے خلاف ہو، نہیں ہونی چاہئے۔

مسجد کے بارے میں بار بار ہم ایک ہی لفظ بول رہے ہیں "اللہ کا گھر" اس

میں کوئی شک تو نہیں ہے کہ مسجد واقعی اللہ کا گھر ہے، اللہ کی بارگاہ عالی ہے، اور کسی معمولی حاکم کے دربار میں جاکے بھی آپ نہ بلند آواز سے باتیں کریں گے، نہ وہاں چیخیں گے، نہ وہاں کوئی بات وقار کے خلاف کریں گے، بلکہ جتنی دیر آپ وہاں اس کی بارگاہ میں رہیں گے اپنی وسعت کی حد تک نہایت ہی ادب اور احترام کے ساتھ رہیں گے، اسی طرح جب مساجد میں آؤ تو نہایت تقویٰ کے ساتھ آؤ، اور سکون ووقار کے ساتھ رہو، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"اور جو شخص کہ تعظیم کرے شعائر اللہ کی تو یہ بات ہے دلوں کے تقویٰ کی وجہ سے۔"

جس قدر دل میں تقویٰ ہوگا، اسی قدر اللہ کی نشانیاں، اللہ کے شعائر، جن میں مسجد سب سے پہلے شامل ہے، ان کا ادب ہوگا، اور جتنا ادب ہوگا اتنا دل میں تقویٰ آئے گا۔ ایک صاحب مکہ مکرمہ میں میرے ساتھ تراویح کی نماز میں کھڑے تھے وہ کبھی ایک طرف جھک جاتے کبھی دوسری طرف، ان صاحب نے میرا کندھا تھکادیا، اور ہاتھ کو کبھی کہیں لے جاتے اور کبھی کہیں لے جاتے (ہم میں سے اکثر کا یہی حال ہے)۔

دل میں خشوع ہو تو اعضا میں بھی خشوع ہوگا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا کہ نماز پڑھتے ہوئے اسی طرح اس کے ہاتھ چل رہے تھے کبھی اِدھر کبھی اُدھر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس کے دل میں، اس کے قلب میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضا میں بھی اس کے اثرات ہوتے۔ آپ کتنے ادب، کتنے سکون اور کتنے وقار کے ساتھ پڑھتے ہیں؟ اسی سے اندازہ ہوگا کہ آپ کے دل میں کتنا خشوع ہے

اور کتنا تقویٰ ہے۔

ہم سب فقیر ہیں

دوسری بات یہ کہ فارسی کی ضرب المثل ہے:

"سلامے روستائے بے غرض نیست"

اگر دیہاتی بدو کسی کو سلام کرتا ہے تو یہ سلام بھی بے غرض نہیں ہوتا، اس میں بھی کوئی مطلب پوشیدہ ہوتا ہے، بھئی! ہمارے تو سارے کام غرض کے لئے ہیں، ساری عبادتیں غرض کے لئے ہیں، اور ہم ہیں فقیر، فقیر کا کام مانگنا ہے، اور یہ کوئی عار کی بات نہیں ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گداگر تواضع کند خوئے اوست

تو فقیر کا تواضع کرنا درحقیقت تواضع کی بات نہیں ہے، اور ہم سب کے سب حق تعالیٰ شانہ کی بارگاہ عالی کے فقیر ہیں، کوئی بڑا ہو یا چھوٹا، عالم ہو یا جاہل، کوئی نیک ہو یا بد، کوئی نبی ہو یا ولی، سارے کے سارے اس کی بارگاہ عالی میں ناک رگڑ رہے ہیں، سب فقیر ہیں، سب منگتے ہیں، سب بھکاری ہیں، ایک وہ داتا ہے، باقی سب فقیر ہیں قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللّٰہ واللّٰہ ھو الغنی الحمید۞"

ترجمہ: "اے لوگو! تم سب فقیر ہو اللہ کی طرف اور اللہ غنی اور حمید ہے۔"

تم لوگ کھانے کے محتاج ہو، پینے کے محتاج ہو، بیوی کے محتاج ہو، بچے کے محتاج ہو، گھر کے محتاج ہو، کپڑوں کے محتاج ہو، الغرض ہر چیز کے محتاج ہو، ایک ایک چیز کے محتاج ہو، کوئی حد ہے تمہاری محتاجی کی؟ سینکڑوں بلکہ ہزاروں ضروریات تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ تمہاری بے شمار حاجتیں پوری فرماتے ہیں، لیکن اس کے باوجود تم محتاج کے محتاج ہی رہے۔ سیٹھ جی کو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا ہے، مگر رہے کنگال کے کنگال۔ کیونکہ یہ اپنی ذات ہی سے محتاج ہے، اندر سے فقیر ہے، یہ غنی ہو ہی نہیں سکتا، اس کا پیٹ کبھی نہیں بھر سکتا۔

عوام کے درمیان اور اللہ والوں کے درمیان فرق

البتہ اللہ والوں کے درمیان اور دوسروں کے درمیان یہ فرق ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے محتاج بنتے ہیں اور اپنی تمام حاجتیں بارگاہ الٰہی میں پیش کرتے ہیں، اور جو لوگ اللہ سے کٹ جاتے ہیں وہ اللہ کی مخلوق کے در پر جاتے ہیں، وہ مخلوق سے مانگتے ہیں جو بے چارے خود فقیر ہیں۔ ایک فقیر نے چند ٹکڑے جمع کئے، بھیک مانگ کر، اور دوسرا فقیر اس سے مانگ رہا ہے۔ یہ تو اس سے بھی زیادہ رذیل ہے، اس سے کہا جائے کہ بھئی! بھکاری سے مانگتے ہو، کچھ شرم تو کرو، اس غریب نے تو اپنا کشکول خود مانگ مانگ کر بھرا ہے، کوئی ٹکڑا ادھر سے لیا، کوئی ٹکڑا ادھر سے، کسی نے کچھ دیا کسی نے کچھ، اس غریب کے پاس جو بھیک کا سامان تھوڑا بہت آیا تو وہ اس سے مانگتا ہے؟ بڑے شرم کی بات ہے، تو اللہ تعالیٰ کے سوا سب فقیر ہیں، ان سے مانگتے ہو؟ اللہ تعالیٰ سے مانگو، پرانے زمانے میں مولانا خرم علی مرحوم کی ایک نظم بہت چلا کرتی تھی، میں نے بچپن میں اپنے استاد

سے سنی تھی، پہلے تو یاد تھی مگر اب تو صرف ایک دو شعر یاد رہے کہ:

خدا فرماچکا قرآن کے اندر
مرے محتاج ہیں پیر وپیغمبر
جو خود محتاج ہووے دوسرے کا
بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا

ہم نے بچپن میں ایک لطیفہ سنا تھا کہ کوئی بادشاہ جارہا تھا، اس کو ایک عورت مل گئی جو بے چاری بھیک مانگ رہی تھی، لیکن حسین وجمیل ایسی جیسے چاند کا ٹکڑا، رشک حور، رشک پری، بادشاہ کی اس پر نظر پڑی تو عاشق ہوگیا، اور دل میں ٹھان لی کہ اس کو ملکہ بنایا جائے، بادشاہ نے اس سے کہا کہ تم اس گداگری کی وجہ سے کیسی ذلت میں مبتلا ہو، در در کی بھیک مانگتی ہو۔ کیا بہتر نہیں ہوگا کہ میں تمہیں لے جاؤں اور تم سے نکاح کرلوں، اور تمہیں شاہی محلات کی رانی بنادوں، اس نے کہا ٹھیک ہے، یہ بادشاہ کے ساتھ چلی گئی۔ اب بہترین پوشاکیں، بہترین کھانے اور ہر قسم کی عیش اسے میسر تھی، جو کچھ بھی بادشاہوں کے پاس ہوتا ہے، سب اسے حاصل تھا، کس چیز کی کمی تھی؟ بادشاہ نے کچھ عرصہ کے بعد پوچھا کہ بتاؤ یہ حالت اچھی ہے یا وہ حالت اچھی تھی؟ کہنے لگی اس حالت میں مزہ نہیں آرہا۔ وہ جو قسم قسم کے کھانے ملتے تھے یہاں وہ مزہ نہیں، وہ ذائقہ نہیں ملتا۔ بادشاہ نے کہا کہ اللہ رب العزت نے اس کو شاہی محلات تو دے دیئے مگر طبیعت کی رذالت نہیں گئی، اپنی طبعی رذالت کی وجہ سے شاہی محلات میں آکر بھی رذیل کی رذیل ہی رہی۔ تو میں عرض کررہا ہوں کہ بھئی! تم کتنے ہی بڑے بن جاؤ، اونچے چلے جاؤ، علم وفضل کی لائن میں، دنیاوی وجاہت کی لائن میں، کسی بھی لائن میں اونچے سے اونچے چلے جاؤ، تمہارے اندر کا فقر،

محتاجی اور ذلت ورزالت تو تم سے جدا ہونے کی نہیں، کیونکہ وہ تمہاری اصل ہے، اور تم اصل کے اعتبار سے ایسے ہی رہو گے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو، اپنی اصل کے اعتبار سے تم فقیر ہو، بھکاری ہو۔

نظر جتنی بلند ہو مقصد اتنا ہی اونچا ہو گا

باقی ایک بات ضرور ہے کہ جس قدر آدمی کی نظر اونچی ہوجاتی ہے اسی قدر اس کا مقصد اور اس کی غرض بھی بلند ہوجاتی ہے، آدمی اپنی غرض سے تو کبھی جدا ہو ہی نہیں سکتا، ہاں! کسی کی غرض گھٹیا ہوگی، کسی کی اونچی، بقول مولانا رومیؒ تم بچے کے ہاتھ سے سو روپے کا نوٹ صرف ٹافی کے بدلے لے سکتے ہو، اگر بچے کے ہاتھ میں ایک قیمتی ہیرا ہو، تم اس کو ایک ٹافی دو، اس کے بدلے میں وہ تمہیں بڑی آسانی سے ہیرا دے دے گا، کیونکہ اس کی نظر پست ہے، گھٹیا ہے، بس ٹافی تک محدود ہے، ہم لوگ دنیادار ہیں جن کے سامنے دنیا سجی ہوئی ہے، اور ہمیں اپنے عشوۂ ناز سے لبھا رہی ہے، اپنے جلوے دکھا رہی ہے، ہم اس پر ریجھ رہے ہیں، یا اپنی غرض دنیا سے وابستہ کررہے ہیں، یہ وہ ٹافیاں ہیں جو شیطان نے ہم کو دے رکھی ہیں، اور ان ٹافیوں کے بدلے وہ ہم سے ایمان کا ہیرا اڑا لیتا ہے۔

شیطان کے بہکانے کا سامان

تفسیروں میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مردود کیا تو شیطان نے کہا کہ میں انسان کو گمراہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا شوق سے کر، کہنے لگا کہ پھر ان کو بہکانے کے لئے مجھے سامان بھی تو دیا جائے، ایسا تو نہیں کہ کسی کے

ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں ڈال دو، اور کہو کہ شاباش! اب تیر کر دکھاؤ، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، مجھے آپ نے لوگوں کو گمراہ کرنے پر لگایا ہے تو اس کا کچھ سامان بھی دیجئے۔ فرمایا ایک تو تجھے جال دیتا ہوں شکار کرنے کے لئے، اور وہ عورت ہے، ایک تجھے نشہ دیتا ہوں لوگوں کو مسحور کرنے کے لئے، اور یہ شراب ہے، اور ایک تجھے نغمہ دیتا ہوں، لوگوں کو اس جال میں پھانسنے کے لئے اور یہ گانے ہیں، اور شیطان ان چیزوں کو لے کر خوش ہوگیا، اور کہنے لگا اب کسی کو جانے نہیں دوں گا، کسی نہ کسی جال میں پھنسا کے چھوڑوں گا۔

دنیا کے نابالغ

تو کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جن کا مقصد دنیا ہے، ان کی نظر میں دنیا ہی بڑی چیز ہے، جیسے بچے کی نظر میں ٹافی ہیرے سے زیادہ مرغوب ہے، ہیرا اس کی نظر میں بے وقعت ہے، کیونکہ وہ اس کی قدر و قیمت سے ناواقف ہے، وہ اس کی قیمت نہیں جانتا۔ اسی طرح عام لوگ جن کی چشم بصیرت بالغ نہیں ہوئی، جن کی عقل سلیم بالغ نہیں ہوئی، اور جن کو ایمانی بصیرت اور وحی کی روشنی میسر نہیں وہ اس دنیا کی مٹھائی پر ریجھ گئے۔ اور ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جنہوں نے دنیا کی غرض کو چھوڑ کر آخرت کی غرض کو اپنالیا۔ کیونکہ ان کی نظر میں یہ دنیا بے وقعت تھی بہ مقابلہ آخرت کی نعمتوں کے۔ یہ حضرات ان دنیاداروں سے بلند نظر نکلے۔ یہاں کی جتنی چیزیں ہیں یہ ان کے نزدیک مقصود نہیں بلکہ سامان زیست ہے، مقصود ان سے بالاتر ہے اور وہ ہے آخرت، جنت اور رضائے الٰہی۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی بلند نظری

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جب امیر المؤمنین بنے اور خلافت کے منصب پر پہنچے تو ان کی کیفیت یکسر بدل گئی، چہرے کا رنگ بدل گیا، ناز و نعمت کی زندگی بدل گئی، کسی نے کہا کہ امیر المؤمنین! آپ خلیفہ بننے سے پہلے بہت خوش پوش تھے، بہترین لباس پہنتے تھے، خلیفہ بن جانے کے بعد کیا ہوگیا کہ یکسر حالت بدل گئی؟ ان دونوں حالتوں کا فرق صرف ایک مثال سے واضح ہو جائے گا۔ ان کے خادم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ بازار سے چادر خرید لاؤ، (یہ ان کی خلافت کے زمانے کا قصہ ہے)۔ میں لے آیا، پوچھا کتنے کی لائے ہو؟ میں نے کہا پانچ درہم کی، ناراض ہو کر کہنے لگے تم نے اتنے پیسے برباد کرنے تھے؟ اتنی مہنگی چادر خرید کر لائے ہو؟ پانچ درہم کی چادر لائے ہو؟ وہ بگڑ رہے تھے اور میں ہنس رہا تھا۔ جب وہ خوب بگڑ چکے اور مجھ پر اظہار ناراضی کر چکے، اور میں خوب ہنس چکا تو کہنے لگے کہ ہنستا کیوں ہے؟ ایک تو کام خراب کر کے آیا، اُوپر سے ہنستا بھی ہے، میں نے کہا حضور مجھے ایک قصہ یاد آگیا، جن دنوں آپ مدینہ کے گورنر ہوتے تھے، آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ کوئی چادر لاؤ، میں بازار گیا، اور ایک نفیس ترین شال لایا، اس کی قیمت تھی پانچ سو درہم، حضور نے پوچھا کتنی قیمت ہے؟ میں نے کہا پانچ سو درہم ہے۔ ہاتھ میں لے کر کہنے لگے اتنی نکمی اور ایسی کھردری لائی تھی، تمہیں کوئی اچھی چادر نہیں ملی، ایسی گھٹیا چادر اٹھا لائے؟ میں یوں ہنستا ہوں کہ ایک وہ وقت تھا کہ پانچ سو درہم کی شال آپ کو کھردری لگ رہی تھی اور اس کو گھٹیا فرما رہے تھے، اور ایک آج یہ وقت ہے کہ پانچ درہم کی معمولی سی چادر لایا ہوں، یہ آپ کو بہت مہنگی لگ رہی ہے، یہ ایک مثال ہے کہ خلافت کے بعد ان کی زندگی میں ایک انقلاب آگیا تھا، خلافت

سے پہلے ایسا نفیس لباس پہنتے تھے کہ پورے مدینہ میں ایسا بہترین لباس کسی کے پاس نہیں ہوتا تھا، اور ایسی بانکی چال چلتے تھے کہ دو شیزائیں (کنواری لڑکیاں) اس چال کی نقل اتارنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ عمری چال کہلاتی تھی۔ یا تو خلافت سے پہلے ناز و نعمت کا یہ عالم، یا خلافت کے بعد یہ تقشف۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا ایک اور واقعہ

ایک دن جمعہ کا خطبہ دینے دیر سے پہنچے، پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی، منبر پر تشریف لائے اور فرمایا کہ میں آپ حضرات سے معافی چاہتا ہوں، میرے پاس ایک ہی کرتہ ہے جو صبح دھویا تھا، اور اس کے سوکھنے میں دیر ہو گئی۔ مسلمانوں کا امیر المؤمنین جس کی سلطنت چین سے لے کر افریقہ تک تھی، وہ مسلمانوں سے معافی مانگ رہا ہے کہ ذرا کپڑے کے سوکھنے میں دیر ہو گئی تھی، میرے پاس اس کا کوئی متبادل کپڑا نہیں تھا جس کو پہن کر آجاتا۔ کسی نے پوچھا کہ خلافت کے بعد آپ کو کیا ہو گیا؟ گورنر پہلے بھی رہے، شاہی خاندان میں پھلے پھولے، مگر خلافت سے پہلے وہ ناز و نعمت، اور خلافت کے بعد یہ تقشف اور دنیا کی لذتوں سے بے زاری؟ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ فرمایا کہ میرا نفس اللہ تعالیٰ نے ایسا بنادیا ہے کہ یہ کبھی چھوٹی چیز پر راضی نہیں ہوا، جب بھی مجھے کوئی مرتبہ اور کوئی منصب ملا، میرا نفس اس سے بالاتر مرتبہ و منصب کا خواستگار رہا، اور دنیا میں خلافت سے اوپر کوئی مرتبہ نہیں رہا، کسی شخص کے لئے سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا خلیفہ ہو، جب اس مرتبہ پر میرا قدم پہنچا تو ساری دنیا میرے سامنے بے وقعت ہو گئی، اور اب میرا نفس آخرت کا طالب ہو گیا۔ اب دنیا کی کوئی چیز کیا حاصل کرنی ہے؟ ساری دنیا تو قدموں کے نیچے آگئی، مجھے تو

آگے جانا ہے۔

تو کچھ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے ہیں کہ ساری دنیا تو قدموں کے نیچے ہے، اور ان کی نظر پوری دنیا سے بالاتر ہے۔ انہوں نے دنیا کی ٹافیوں کو مقصد نہیں بنایا، آخرت کے ہیرے اور جواہرات دے کر انہوں نے دنیا کی لذتوں کو نہیں خریدا، اس لئے ان کی محنت سب سے بلند اور ان کی نظر سب سے اونچی نکلی، اور کچھ حضرات ان سے بھی اوپر چلے گئے، ان کی نظر میں دنیا مطلوب نہ آخرت۔ صرف اللہ کی رضا مطلوب ہے، ان میں آخرت کی اور جنت کی طلب بھی صرف اس لئے ہے کہ وہ رضائے الٰہی کا مقام ہے، اصل مطلوب صرف ذات الٰہی ہے۔ غرض ہر انسان اپنی زندگی کی کوئی غرض وغایت رکھتا ہے، گویا ہر شخص صاحب غرض ہے، باقی یہ اپنی اپنی نظر ہے کہ کسی کی غرض چھوٹی، کسی کی بڑی، کسی کی اس سے بھی بڑی۔ جس قدر کسی کی نظر بلند ہوگی، اسی قدر اس کی غرض بھی اونچی ہوگی، اور اسی قدر اس کا مقصد بھی اونچا ہوگا۔ اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ ہم تو ہیں فقیر، ہمارا کوئی کام غرض کے بغیر ہوتا ہی نہیں۔

اپنی ہمت کو اونچا رکھو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحیؒ عارفی نوّر اللہ مرقدہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

ہمت بلند دار کہ پیش خدا وخلق
باشد بہ قدر ہمت تو اعتبار تو

یعنی ”اپنی ہمت کو ذرا اونچا کرو، اس لئے کہ جتنی تمہاری ہمت اونچی ہوگی، اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اور مخلوق کے

نزدیک بھی تمہاری قدر اتنی ہی بلند ہوگی۔"

اگر تم ایک ٹافی پر اپنا ایمان دے سکتے ہو تو تمہاری قیمت چار آنے نکلی۔ اگر دنیا کی کسی بڑی سے بڑی دولت پر تم اپنا ایمان بیچ سکتے ہو تو تمہاری قیمت اتنی ہی نکلی، اور اگر تم اس سے بھی اُونچے چلے گئے اور یہ کہا کہ کیا یہ دنیا میری قیمت ہے؟ لاحول ولا قوۃ الاّ باللہ۔ کیونکہ دنیا کی قیمت تو مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔

طالب علمی کا واقعہ

اپنی خود ثنائی تو نہیں کرنی چاہئے۔ مگر تمہیں سمجھانے کے لئے بتاتا ہوں، میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ حدیث شریف سے میں فارغ ہوچکا تھا، اگلی پچھلی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ تو میرے دوستوں نے مولوی فاضل کے لئے یونیورسٹی میں داخلے لے لئے کہ اپنی ذاتی تیاری کر کے امتحان دے دیں گے، مولوی فاضل بن جائیں گے، اس کے ذریعہ کوئی سرکاری ملازمت مل جائے گی۔ میرے دو ساتھی تھے، انہوں نے مولوی فاضل میں داخلہ لے لیا تھا، اور اس کی تیاری کر رہے تھے، جب بھی تکرار کے لئے بیٹھتا، مجھ سے کہتے کہ تم بھی امتحان دے لو، میں کہتا میں غریب آدمی ہوں، ۸۰ روپے داخلہ کی فیس ہے، اتنی میں کہاں سے ادا کروں گا؟ ایک دن ان میں سے ایک ساتھی کہنے لگا کہ تمہاری فیس میں بھر دوں گا، تم داخلے کے لئے آمادہ ہو جاؤ، میں نے کہا سچ کہتے ہو؟ کہنے لگا بالکل؟ میں نے کہا کہ میں پہلے تو تمہیں ٹالتا تھا، مگر اب اصل جواب سنو، وہ یہ کہ اگر یونیورسٹی کی جانب سے میرے نام خط آئے اور اس میں یہ لکھا ہو کہ آپ کا داخلہ بغیر فیس کے منظور کیا جاتا ہے، آپ ازراہ کرم فلاں تاریخ کو ہماری امتحان گاہ تشریف

لے آئیں، آکر بیٹھ جائیں، کچھ نہ لکھیں، سادہ کاغذ چھوڑ کر چلے جائیں، ایک سطر بھی نہ لکھیں، آپ پر کوئی پابندی نہیں، اور آپ سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ اس کے باوجود آپ کو یونیورسٹی میں سب سے اول نمبر قرار دیا جائے گا، بس آپ امتحان گاہ میں قدم رکھنے کی زحمت فرمائیں، میں نے کہا کہ اگر بالفرض یونیورسٹی کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا خط بھی آجائے تب بھی میں یونیورسٹی کی امتحان گاہ میں قدم رکھنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ مولوی فاضل کے امتحان میں کامیابی کیا چیز ہے، یہ عہدے اور یہ ڈگریاں کیا چیز ہیں۔ مجھے اپنی نالائقی کے باوجود اس بات پر فخر ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام پڑھا ہے، اس کے بعد مجھے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں، وہ میرے بچپن کا لاشعوری زمانہ تھا، شعور تو اب بھی نہیں ہے۔ بچپن میں خیالات بڑے عجیب ہوتے ہیں، میرا بھائی! تم لوگ مہمان ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہو۔ دنیا تمہارے مقابلے میں کیا چیز ہے؟ اس کی کیا قیمت ہے؟ تو بھئی ہمارا تو سارا کاروبار ہی غرض پر مبنی ہے۔ باقی غرض کا پیمانہ آدمی کی ہمت سے طے ہوتا ہے۔ کتنی اونچی ہمت کا ہے؟ کتنا قد آور ہے؟ جس شخص کا مقصود ذات عالی بن جائے، آسمان اس کے سامنے پست ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کو مقصد بناؤ

اگر تم اللہ کے طالب بن جاؤ تو یہاں کی زمین کی چیزیں تو کیا تم تو آسمان سے اونچے ہو۔ میرے حضرت ڈاکٹر صاحب نوّر اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ "بھئی ایک دفعہ ہم دعا مانگ رہے تھے، دعا مانگتے مانگتے خیال آیا، ارے! کس سے مانگ

رہے ہو؟ رب العرش سے مانگ رہے ہو، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ مجھے ایسا لگا کہ آسمان میرے ہاتھوں کے نیچے آگیا، اور میرے ہاتھ عرش سے اوپر چلے گئے"، تم جو دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہو، کہاں اٹھاتے ہو؟ کس داتا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہو؟ ہاں تم بارگاہ رب العزت کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہو، غور کرو کہ عرش کی بلندیاں اس کے سامنے کیا چیز ہیں؟ اور جب تم اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہو تو کیا تم چھوٹے ہو؟ نہیں! تمہاری یہ گردن جو اس ذات عالی کے سامنے جھکے گی کیا کسی اور کے سامنے جھک سکتی ہے؟ اور یہ ہاتھ جو اس ذات عالی کے سامنے اٹھتے ہیں، کسی اور کے سامنے اٹھ سکتے ہیں؟ دراصل ہمیں اپنی قیمت معلوم نہیں۔ تو بھئی ہمارا سارا کام غرض پر مبنی ہے۔

اعتکاف کا مقصد کیا ہونا چاہئے؟

یہ اعتکاف میں بیٹھنا یہ بھی غرض پر مبنی ہے، نماز پڑھنا یہ بھی غرض پر مبنی ہے، روزہ رکھنا یہ بھی غرض پر مبنی ہے۔ لیکن کسی کی غرض کچھ ہے، کسی کی غرض کچھ ہے، ہماری ایک ہی غرض ہونی چاہئے ہمارا ایک ہی مقصد ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوجائے۔ کہتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی نے ایک مرتبہ امتحان لیا، اس کے امراء و وزراء اعتراض کرتے تھے کہ بادشاہ کو اپنے غلام (ایاز) سے بڑا تعلق خاطر ہے، اس کی بڑی عزت کیا کرتا ہے، اس کے ساتھ بڑی محبت ہے۔ حالانکہ ہم ایسے ہیں، ویسے ہیں، لیکن بادشاہ کی نظر میں ہماری اتنی عزت نہیں، ایک دن بادشاہ نے امتحان لیا کہ دربار میں ایک بازار لگایا محل میں قیمتی سے قیمتی چیزیں جمع کردیں اور سب کو جمع کرکے بادشاہ نے کہا آپ حضرات میں سے جس کو جو چیز پسند آئے وہ لے جائے، وہ ہماری طرف سے ہدیہ ہے۔ ہر

آدمی یہ سن کر اپنی پسند کی چیزوں کی طرف لپکا، جیسے بھوکا روٹی پر ٹوٹتا ہے، ایاز کھڑے کا کھڑا رہا، اس نے کسی چیز کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، سلطان نے کہا کہ تم بھی اٹھالو۔ ایاز نے کہا حضور! کیا اجازت ہے کہ میں جو چیز چاہوں پسند کرلوں؟ بادشاہ نے کہا کہ ہاں اجازت ہے جو چیز چاہو پسند کرلو، ایاز نے سلطان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور کہا کہ مجھے تو یہ پسند ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ تم لوگوں کا امتحان لینا مقصود تھا، اور اس امتحان کا نتیجہ سب کے سامنے آگیا، دیکھ لو یہ تم ہو اور یہ ایاز ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی یہ دنیا کا بازار سجا کر ہمارا امتحان لے رہے ہیں۔ اے کاش! کہ ہم بھی کہیں کہ یا اللہ! ہمیں تو آپ پسند ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ ہمارا ہوگیا تو سب کچھ ہی ہمارا ہوگیا۔ تو تمام عبادات سے مقصود محض رضائے الٰہی ہے۔ اور یہاں جمع ہونا صرف اسی رضائے الٰہی کی مشق کے لئے ہے۔

اعتکاف کی سوغات

اب یہاں سے اعتکاف کی کچھ سوغات لے کر جاؤ تب تو لطف ہے، اگر خالی برتن لے کر آئے اور خالی برتن لے کر چلے گئے پھر یہاں بیٹھنے کا کیا فائدہ؟

رہا یہ کہ یہاں سے آپ کو کیا لے کر جانا چاہئے؟ تو خوب سمجھ لو کہ یہ مسجد اللہ کا بازار ہے، اور یہ اعتکاف کے دن نیکیوں کی منڈی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ کے پاس وقت کی پونجی موجود ہے، اعضاً آپ کے صحیح ہیں، زبان چلتی ہے، ہاتھ پاؤں چلتے ہیں، جتنی زیادہ سے زیادہ نیکیاں لوٹ سکتے ہو لوٹ لو، اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو، اخلاق، آداب، معاشرت، عبادات، عقائد، ان تمام سے اپنی جھولی بھر کرلے جاؤ۔ اعتکاف کے دنوں میں چند چیزوں کی مشق کرو،

اول: ایک فضول لایعنی کا ترک۔ جتنا چاہو کھاؤ جتنا چاہو سوؤ، لیکن التزام

کرلو کہ فضول باتیں نہیں کریں گے۔ فضول کاموں میں مشغول ہونا وقت کا ضیاع ہے، اس سے پرہیز کرو۔

دوم: ذکر و تلاوت کا اہتمام کرو، تاکہ اعتکاف سے فارغ ہونے کے بعد بھی تمہیں ذکر و تلاوت سے مناسبت پیدا ہو جائے۔

سوم: اپنے رفقاء کا اکرام کرنا سیکھو، اور کھانے میں، آرام میں، اور باقی چیزوں میں دوسرے معتکفین کا خیال کرو، اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینے کی مشق کرو۔

چہارم: رمضان مبارک کا آخری عشرہ خصوصاً طاق راتیں بہت مبارک ہیں، جہاں تک اپنی صحت و قوت اجازت دے ان قیمتی لمحات کی قدر کرو، اور ان کو عبادت، ذکر و تلاوت، تسبیحات، درود شریف اور صلوٰۃ التسبیح سے معمور کرو۔ لیکن بھئی! اپنی صحت و قوت کا لحاظ ضرور رکھو، ایسا نہ ہو کہ اپنی ہمت سے زیادہ بوجھ اٹھاؤ اور پھر ہمت ہار دو۔

پنجم: میں نے بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ ہمارا اصل سرمایہ التجاء الی اللہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی میں اپنی حاجات پیش کرنا، اسی سے بھیک مانگنے کے لئے ہم نے اعتکاف کیا ہے، اور اس کریم داتا کے دروازے پر جمع ہوئے ہیں، اس لئے پوری دنیا سے یکسو اور بے نیاز ہو کر اس کریم داتا سے مانگتے رہو، جو جی میں آئے مانگو، خوب جم کر مانگو، گڑگڑا کر مانگو، اور اس طرح آہ وزاری کے ساتھ مانگو کہ اس کریم داتا کو ہماری عاجزی، ہماری بے کسی و بے بسی پر رحم آجائے۔

ششم: یہاں جو اصلاحی حلقے قائم ہوتے ہیں ان کی پابندی کرو، اور اپنے عیوب و نقائص کا مطالعہ کرو، اور حق تعالیٰ کے سامنے توبہ و استغفار کرو۔ اللہ

تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں اور اپنے دروازے سے کسی کو خالی ہاتھ نہ لوٹائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

اعتکاف کے مسائل کا بیان

ذیل میں مولانا زوار حسین شاہ صاحبؒ کی کتاب "زبدۃ الفقہ" سے اعتکاف کے مسائل درج کئے جاتے ہیں۔

اعتکاف کی تعریف:

شرع میں اعتکاف کے معنی مرد کا ایسی مسجد میں اعتکاف کی نیت سے ٹھہرنا ہے جس کا امام و مؤذن مقرر ہو یعنی اس میں پانچ وقت نماز جماعت کے ساتھ ادا ہوتی ہو، اور عورت کا اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی جگہ میں اعتکاف کی نیت سے ٹھہرنا ہے۔

اعتکاف کی اقسام:

اعتکاف تین قسم کا ہوتا ہے:

(۱) واجب، اور وہ نذر کا اعتکاف ہے خواہ وہ نذر کسی شرط پر موقوف ہو یا موقوف نہ ہو، کسی شرط پر موقوف نہ ہونے کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے میرے ذمہ واجب ہے کہ میں اتنے دن کا اعتکاف کروں اور کسی شرط پر موقوف ہونے کی مثال یہ ہے کہ یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے فلاں بیمار کو شفا دی تو میں اتنے دن کا اعتکاف کروں گا۔ واجب اعتکاف کی کم سے کم مدت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک دن ہے کیونکہ اعتکاف واجب میں روزہ شرط ہے اور ایک دن سے کم کا روزہ مشروع نہیں ہے، اگر کسی

نے کہا کہ مجھ پر اللہ کے واسطے اعتکاف کرنا واجب ہے اور اس کی مدت متعیّن نہیں کی تو اس پر ایک دن کا اعتکاف واجب ہو گا، اعتکاف واجب کے لئے زیادہ مدت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے پس اگر تمام عمر کے اعتکاف کی نذر کرے تو جائز ہے۔

(۲) سنت مؤکدہ: اور وہ ہر سال میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا اعتکاف ہے۔ اس کے لئے بھی روزہ شرط ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ سُنّت علی الکفایہ ہے پس اگر بستی والوں میں سے کسی ایک آدمی نے یا بعض لوگوں نے اس سُنّت کو ادا کرلیا تو باقی لوگوں سے اس کا مطالبہ ساقط ہوجائے گا، اگر بستی کے سب ہی لوگ اس کو ترک کردیں گے اور کوئی ایک شخص بھی اس سُنّت کو ادا نہیں کرے گا تو سب گنہگار ہوں گے۔

(۳) مستحب: یعنی سُنّت غیر مؤکدہ یا نفلی اعتکاف، اور وہ مذکورہ بالا دونوں قسموں کے علاوہ ہے پس جو شخص جس وقت چاہے مستحب اعتکاف ادا کرسکتا ہے۔ مستحب یعنی نفلی اعتکاف کی کم سے کم مدت ایک ساعت یعنی تھوڑی دیر ہے، خواہ وہ رات کے وقت میں ہو یا دن کے وقت میں اور یہ سال کے تمام دنوں میں جائز ہے۔ پس اعتکاف کی نیت سے مسجد میں داخل ہونے سے ہی مستحب اعتکاف حاصل ہوجاتا ہے، خواہ وہ مسجد میں سے گزرتے ہوئے ہی اعتکاف کی نیت کرلے اور مسجد میں بیٹھے نہیں اور خواہ رات کے وقت میں ایسا کرے، اس لئے کہ اس اعتکاف میں اس کا صرف مسجد میں ٹھہرنا ضروری ہے خواہ وہ اتنا تھوڑا ہو جتنا کہ قدموں کے رکھنے میں وقت لگتا ہے، جب کوئی شخص مسجد میں اعتکاف کی نیت سے داخل ہوا تو جب تک وہ مسجد میں رہے گا اعتکاف کی حالت میں ہو گا اور جب مسجد سے باہر آجائے گا تو اس کا اعتکاف ختم ہوجائے

گا۔ جو شخص مسجد کے ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے دروازے سے نکلنے کا ارادہ کرے تو چونکہ مسجد کو راستہ بنانا جائز نہیں ہے اس لئے اس کے واسطے حیلہ یہ ہے کہ وہ مسجد میں اعتکاف کی نیت سے داخل ہو تاکہ وہ مسجد کو راستہ بنانے والا نہ بنے۔

فائدہ: جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو اس کو اعتکاف کی نیت کرلینی چاہئے تاکہ وہ جب تک مسجد میں رہے اس کے لئے اعتکاف کا ثواب ملتا رہے اور اس کو مسجد میں کھانا پینا اور سونا وغیرہ جائز ہو جائے، اس طرح اس کو روزانہ بہت دفعہ اعتکاف کرنے کا ثواب مل جائے گا۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت مسجد میں داخل ہونے کی دعا کے ساتھ اعتکاف کی نیت کے لئے یہ الفاظ کہہ لیا کرے،
"نویت الاعتکاف مادمت فی ھذا المسجد" یا یوں کہے
"نویت سنة الاعتکاف"

اعتکاف کا حکم:

اس کا حکم یہ ہے کہ واجب اعتکاف میں یہ واجب اس کے ذمہ سے ادا ہو جاتا اور ثواب حاصل ہوتا ہے اور نفلی اعتکاف میں اس کو صرف ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اعتکاف کا رکن:

اس کا رکن مسجد میں مخصوص طریقے پر ٹھہرنا ہے۔

اعتکاف کی شرائط:

اعتکاف کے صحیح ہونے کی شرطیں یہ ہیں:

(۱) نیت: خواہ اعتکاف واجب ہو یا سُنت یا نفل ہو اس کی صحت کے لئے نیت کا ہونا شرط ہے، نیت کے بغیر اعتکاف کرنا جائز نہیں ہے، یعنی واجب اعتکاف نیت کے بغیر کرنے سے اس کے ذمہ سے ادا نہیں ہوگا اور نفلی اعتکاف نیت کے بغیر کرنے سے اس کا ثواب حاصل نہیں ہوگا، جب کسی ایسے کام کے لئے مسجد سے باہر جائے جس کے لئے جانا اعتکاف والے کے لئے جائز ہے تو مسجد میں واپس آنے پر اس کو نئے سرے سے نیت کرنا ضروری نہیں ہے۔

(۲) مسجد میں اعتکاف کرنا: جس مسجد میں اذان و اقامت ہوتی ہو وہاں اعتکاف کرنا درست ہے اور اس مسجد میں اعتکاف کرنا درست نہیں ہے جس میں پانچوں وقت کی نماز کے لئے جماعت قائم نہ ہوتی ہو، جامع مسجد میں مطلقاً اعتکاف جائز ہے خواہ وہاں پانچوں وقت کی جماعت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔ سب سے افضل یہ ہے کہ مسجد الحرام میں اعتکاف کرے، پھر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں افضل ہے، پھر مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس میں، پھر ان تینوں مساجد کے علاوہ کسی جامع مسجد میں افضل ہے اور یہ حکم اس وقت ہے جب کہ جامع مسجد میں پانچ وقت نماز جماعت سے ہوتی ہو ورنہ اپنے محلّہ کی مسجد میں جس میں پانچ وقت نماز جماعت سے ہوتی ہو افضل ہے تاکہ نماز باجماعت کے لئے اس کو دوسری جگہ جانے کی ضرورت نہ پڑے، پھر جس مسجد میں نمازی زیادہ ہوں اور وہاں جماعت بڑی ہوتی ہو، وہ افضل ہے۔ عورت اپنے گھر میں اس جگہ اعتکاف کرے جو اس نے پانچ وقت نماز یا اعتکاف کے لئے مقرر کی ہو، اگر عورت نے اس مقررہ جگہ کے علاوہ گھر میں کسی اور جگہ اعتکاف کیا تو اس کا اعتکاف درست نہیں ہے، اگر اس نے پہلے سے گھر میں کوئی جگہ نماز کے لئے مقرر نہ کی ہو تو اب مقرر کر لے اور اس میں اعتکاف کرے۔ ہر عورت کے لئے

مستحب ہے کہ اپنی نماز کے لئے اپنے گھر کے اندر ایک جگہ مقرر کرلے اور اس کو ہر طرح کی آلائش سے پاک صاف رکھے اگرچہ اس جگہ کے لئے مسجد کے احکام ثابت نہیں ہوتے لیکن عورت کے حق میں یہ جگہ مسجد جماعت کے حکم میں ہوجائے گی۔ مردوں کے لئے بھی نماز نوافل کے لئے اپنے گھر میں جگہ مخصوص کرنا مستحب ہے۔ عورت کو خاوند کی اجازت کے بغیر اعتکاف نہیں کرنا چاہئے۔

(۳) روزہ: واجب یعنی نذر کے اعتکاف میں روزہ شرط ہے یہاں تک کہ اگر کسی نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے میرے ذمہ واجب ہے کہ ایک مہینہ کا اعتکاف کروں تو اس پر لازم ہے کہ ایک مہینے کا اعتکاف کرے اور روزے بھی رکھے۔ اگر کسی نے رات کے اعتکاف کی نذر کی تو درست نہیں ہے کیونکہ رات کے وقت روزہ نہیں ہوتا اور اگر رات کے ساتھ دن کے اعتکاف کی بھی نیت کرے تب بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس نے نذر میں دن کو رات کے تابع کیا ہے، پس جب متبوع میں نذر باطل ہوگئی تو تابع میں بھی باطل ہوجائے گی، لیکن اگر دن کے اعتکاف کی نذر کی اور اس کے ساتھ رات کے اعتکاف کی بھی نیت کی تو دونوں کا اعتکاف لازم ہوگا۔ اگر کسی نے یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے میرے ذمہ واجب ہے کہ میں رات اور دن کا اعتکاف کروں تو اس پر لازم ہے کہ رات اور دن کا اعتکاف کرے اگرچہ رات کا روزہ نہیں ہوتا، لیکن رات اس میں داخل ہوجائے گی۔ نفلی اعتکاف میں روزہ شرط نہیں ہے اور مسنون اعتکاف یعنی رمضان المبارک کے آخری عشرہ کے اعتکاف کے لئے روزہ شرط ہے پس اگر کسی نے، مثلاً مرض یا سفر وغیرہ عذر کی وجہ سے، رمضان کے اخیر عشرہ کے روزے نہیں رکھے اور اس عشرہ کا اعتکاف کیا تو یہ

اعتکاف سُنّت مؤکدہ علی الکفایہ کی جگہ ادا نہیں ہوگا بلکہ نفلی ہوگا۔ اگر کسی نے رمضان کے مہینے کے اعتکاف کی نذر کی تو اس کی نذر صحیح ہے، یعنی یہ نذر اس پر لازم ہوجائے گی اور رمضان کے روزے اعتکاف کے روزوں کی بجائے کافی ہوجائیں گے۔ لیکن اگر اس شخص نے رمضان کے روزے رکھے اور اعتکاف نہ کیا تو اس پر لازم ہے کہ اس اعتکاف کی قضا کے لئے کسی اور مہینے کا اعتکاف لگاتار کرے اور اس میں روزے رکھے اور اگر کسی نے ماہ رمضان میں اعتکاف کی نذر کی اور اس نے ماہ رمضان کے روزے نہیں رکھے پھر لگاتار ایک مہینے کے روزے مع اعتکاف کے قضا کیئے تو جائز ہے۔

(۴) **مسلمان ہونا:** کیونکہ کافر عبادت کی اہلیت نہیں رکھتا۔

(۵) **عاقل ہونا:** کیونکہ مجنون نیت کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اصل میں یہ دونوں امر نیت کے لئے شرط ہیں کیونکہ نیت اسلام اور عقل کے بغیر درست نہیں ہوتی، اور اعتکاف میں نیت شرط ہے۔

(۶) **جنابت اور حیض ونفاس سے پاک ہونا،** کیونکہ جنابت اور حیض ونفاس کی حالت میں مسجد میں آنا منع ہے اور اعتکاف کی عبادت مسجد کے بغیر ادا نہیں ہوتی۔ بالغ ہونا اعتکاف کی صحت کے لئے شرط نہیں ہے۔ پس سمجھ والے لڑکے کا اعتکاف صحیح ہوگا جیسا کہ اس کا نفلی روزہ درست ہوجاتا ہے۔ مرد ہونا اور آزاد ہونا بھی شرط نہیں ہے۔ پس عورت کا اعتکاف خاوند کی اجازت سے جائز ہے اور غلام کا اعتکاف اس کے مالک کی اجازت سے صحیح ہے اگرچہ وہ اعتکاف واجب ہی ہو، اور جب عورت کو اسکے خاوند نے اعتکاف کی اجازت دے دی تو اب اس کو منع کرنے کا اختیار نہیں ہے اور اس کا منع کرنا صحیح نہیں

ہے۔

اعتکاف کی خوبیاں

اعتکاف کی بہت سے خوبیاں ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

① اپنے قلب کو دنیاوی امور سے فارغ کرنے کا ذریعہ ہے۔ اعتکاف کرنے والا اپنے آپ کو پوری طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگا دیتا ہے اور دنیا کے اشغال سے اپنے آپ کو الگ کردیتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے ساتھ اس کی طرف التجا کرنے کے لئے اس کا تقرب حاصل کرے۔

② اعتکاف کرنے والے کے تمام اوقات نماز میں صرف ہوتے ہیں خواہ حقیقتاً ہوں یا حکماً کیونکہ وہ ہر وقت نماز باجماعت کے انتظار میں رہتا ہے۔

③ اعتکاف کرنے والا اپنے اندر فرشتوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتا اور نافرمانی سے بچتا اور کھانا پینا بقدر امکان ترک کرتا ہے۔

④ اعتکاف کرنے والا روزہ دار ہوتا ہے اور روزہ دار اللہ تعالیٰ کا مہمان ہوتا ہے۔

⑤ اعتکاف کرنے والا شیطان اور دنیا کے مکروغلبہ سے محفوظ ہوتا ہے گویا کہ مضبوط قلعہ میں محفوظ ہوجاتا ہے۔

⑥ اعتکاف کرنے والا اپنے پروردگار کے گھر کو لازم پکڑتا ہے تاکہ وہ اس کی حاجت پوری کرے اور اس کو بخش دے۔

⑦ اعتکاف اخلاص کے ساتھ کیا جائے تو اشرف الاعمال ہے۔

⑧ اعتکاف کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

⑨ اعتکاف عبادت ہے کیونکہ اس حالت میں بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی وعاجزی کا اظہار کرتا اور بقدر امکان ہر وقت عبادات میں مشغول رہتا ہے۔

اعتکاف کے آداب ومستحبات

① نیک باتوں کے سوا اور کوئی کلام کرنا مکروہ ہے، اعتکاف کے علاوہ بھی مسجد میں اور باتوں کے بارے میں یہی حکم ہے اور اعتکاف والے کے لئے بدرجۂ اولیٰ ہے۔ نیک باتوں سے مراد وہ باتیں ہیں جن میں گناہ نہ ہو، مباح کلام کرنا ضرورت کے وقت نیک کام میں شامل ہے اور بلا ضرورت نیک کام میں شامل نہیں۔ اگر مباح کلام تقرب کے قصد سے ہو تو اس میں ثواب ملے گا۔

② اعتکاف میں اکثر اوقات قرآن پاک کی تلاوت کرنا، ذکر کرنا، درود شریف پڑھنا، نوافل پڑھنا، حدیث شریف اور دینی علم پڑھنا اور پڑھانا اور درس دینا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاؑ علیہم السلام کی سیرت وحالات اور نیک لوگوں کے حالات وحکایات کا پڑھنا اور بیان کرنا اور دینی امور کے لکھنے میں مشغول ہونا اختیار کرے۔

③ رمضان کے اخیر عشرہ کے اعتکاف کا التزام کرے۔

④ اعتکاف کے واسطے افضل مسجد کو اختیار کرے مثلاً مسجد الحرام یا مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یا مسجد اقصیٰ یا جامع مسجد کو اختیار کرے۔

⑤ رمضان المبارک کے اخیر عشرہ کا اعتکاف کرے تو اکیسویں شب کو یعنی

بیس رمضان کا سورج غروب ہونے سے قدرے پہلے مسجد میں داخل ہوجائے اور رمضان المبارک کے آخری دن سورج غروب ہونے کے بعد مسجد سے باہر آجائے۔

جن چیزوں سے اعتکاف فاسد ہوجاتا ہے اور جن چیزوں سے فاسد نہیں ہوتا

اعتکاف کو فاسد کرنے والی چیزیں یہ ہیں:

مسجد سے باہر نکلنا: اعتکاف کرنے والے کو چاہئے کہ اعتکاف والی مسجد سے بلا عذر نہ دن میں باہر نکلے اور نہ رات میں، اگر عذر کے بغیر تھوڑی دیر کے لئے بھی مسجد سے نکل گیا تو اس کا اعتکاف فاسد ہوجائے گا خواہ وہ جان بوجھ کر نکلا ہو یا بھول کر۔ اگر کسی عذر سے باہر نکلنے پر ضرورت سے زیادہ باہر ٹھہرا رہا تب بھی اس کا واجب اعتکاف فاسد ہوجائے گا اور نفلی اعتکاف ختم ہوجائے گا۔ عذر کی وجہ سے نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

وہ عذرات جن کی وجہ سے اعتکاف والے کا مسجد سے نکلنا جائز ہے یہ ہیں:

اول طبعی حاجت: یعنی پیشاب، پاخانہ، استنجا، وضو اور فرض غسل کے لئے یعنی اگر احتلام ہوجائے تو غسل کرنے کے لئے مسجد سے باہر جانا جائز ہے۔ پس جب پیشاب یا پاخانہ کے لئے مسجد سے نکلے تو اس کو گھر میں داخل ہونے کا کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن قضائے حاجت کے بعد طہارت یعنی استنجا و وضو سے فارغ ہوتے ہی مسجد میں آجائے اگر طہارت کے بعد وہ اپنے گھر میں تھوڑی دیر بھی ٹھہرا رہا تو اس کا اعتکاف فاسد ہوجائے گا۔ اگر اعتکاف کرنے والے کے دو

گھر ہوں جن میں سے ایک نزدیک اور دوسرا دور ہو تو بعض کے نزدیک دور والے گھر میں قضائے حاجت کے لئے جانا جائز ہے اور اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہو گا اور بعض کے نزدیک جائز نہیں ہے اور اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔ اگر مسجد کے ساتھ بیت الخلاء ہو جو گھر کی بہ نسبت قریب ہے تو اس صورت میں وہی اختلاف ہے جو دو گھروں کے بارے میں بیان ہوا۔ اس لئے احتیاطاً قریب والے بیت الخلاء کو استعمال کرے، لیکن اگر وہ شخص مسجد کے بیت الخلاء سے یا اپنے دو گھروں میں سے ایک گھر والے بیت الخلاء سے مانوس نہ ہو اور وہاں اس کو آسانی سے رفع حاجت نہ ہوتی ہو تو اپنے مانوس بیت الخلاء میں رفع حاجت کے لئے جانا بلا اختلاف جائز ہے، اگرچہ وہ دور ہو۔ جب حاجت طبعی کے لئے نکلے تو اس کے لئے وقار و سکون کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنا جائز ہے۔ کھانا پینا اور سونا اپنی اعتکاف کی جگہ میں کرنا چاہئے، اس کے لئے باہر نکلنا جائز نہیں ہے۔ اگر اعتکاف والے کے لئے گھر سے کھانا لانے والا کوئی شخص نہ ہو تو اس کو گھر سے کھانا لے آنا جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ پیشاب پاخانہ کی طرح طبعی حاجت میں داخل ہے (لیکن اس کو چاہئے کہ کھانا لے کر فوراً مسجد میں آجائے اور وہیں آکر کھائے)۔

دوم شرعی حاجت: مثلاً اذان دینے یا جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے باہر نکلنا جائز ہے۔ پس اگر اذان کے لئے مسجد سے باہر نکلا اور اذان کے مینارہ کا دروازہ مسجد سے باہر ہو تو اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہو گا خواہ وہ مؤذن ہو یا نہ ہو، اور اگر اذان کا مینارہ اندر ہو تو بدرجۂ اولیٰ اس پر چڑھنے سے اعتکاف فاسد نہیں ہو گا۔ مستحب یہ ہے کہ جمعہ کی نماز کے لئے تحری (اٹکل) کر کے اندازاً ایسے وقت نکلے کہ جامع مسجد میں پہنچ کر خطبہ کی اذان سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد اور چار

رکعتیں سُنت جمعہ قبلیہ پڑھ لے۔ اس کا اندازہ اعتکاف کرنے والے کی رائے پر موقوف ہے۔ اگر اندازہ غلط ہوجائے یعنی کچھ پہلے پہنچ جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، اور نماز فرض جمعہ ادا کرنے کے بعد اس قدر ٹھہرے کہ چار یا چھ رکعتیں پڑھ لے۔ فرض جمعہ سے پہلے کی چار رکعتیں اور بعد کی چار یا چھ رکعتیں اعتکاف والی مسجد میں بھی ادا کرسکتا ہے لیکن افضل یہ ہے کہ جامع مسجد میں ادا کرے، اگر زیادہ دیر جامع مسجد میں ٹھہرا رہا، مثلاً ایک دن رات وہاں ٹھہرا رہا یا باقی اعتکاف وہیں پورا کیا۔ تو اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہوگا، مگر ایسا کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔ اگر کسی عذر، مثلاً مسجد کے گرجانے یا زبردستی کسی کے نکال دینے کی وجہ سے یا اپنی جان ومال کے خوف سے مسجد سے نکلا اور اسی وقت اعتکاف کی نیت سے دوسری مسجد میں داخل ہوگیا کسی اور کام میں مشغول نہیں ہوا، تو اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہوگا۔ مذکورہ دو قسم کے عذرات کے علاوہ کسی اور عذر سے مسجد سے باہر نکلنے سے اعتکاف فاسد ہوجائے گا۔ پس اگر بیماری یا خوف کی وجہ سے یا مریض کی عیادت یا نماز جنازہ کے لئے مسجد سے نکلے گا تو اس کا اعتکاف فاسد ہوجائے گا لیکن اگر بشری حاجت پیشاب پاخانہ وغیرہ کے لئے مسجد سے باہر نکلا پھر اسی ضمن میں مریض کی عیادت یا نماز جنازہ کے لئے چلا گیا تو جائز ہے، جب کہ اس کا مسجد سے نکلنا خاص اس مقصد کے لئے نہ ہو اور وہ راستہ سے نہ پھرے اور نماز جنازہ یا مریض کی مزاج پرسی سے زیادہ وہاں نہ ٹھہرے ورنہ اعتکاف فاسد ہوجائے گا۔ اگر نذر کرتے وقت شرط کرلی ہو کہ وہ عیادت مریض یا نماز جنازہ یا مجلس علم میں حاضر ہوگا تو اب امور کی وجہ سے مسجد سے باہر نکلنے پر اعتکاف فاسد نہیں ہوگا۔ مسجد سے نکلنے کا مطلب قدموں کا مسجد سے باہر نکالنا ہے۔ پس اگر اپنا سر مسجد سے باہر نکالے تو اس کا اعتکاف فاسد نہیں ہوگا۔ یہ

سب احکام واجب اور سُنّت مؤکدہ اعتکاف کے ہیں، اگر نفلی اعتکاف میں عذر سے یا بلا عذر مسجد سے نکلے، تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ اگر نفلی اعتکاف شروع کیا پھر توڑ دیا تو اس کی قضا لازم نہیں ہے کیونکہ یہ اس اعتکاف کو ختم کرنا ہے توڑنا نہیں ہے اور سُنّت مؤکدہ یعنی رمضان المبارک کے اخیر عشرہ کا اعتکاف بھی شروع کر کے توڑ دینے سے ختم ہو جائے گا سُنّت مؤکدہ کی بجائے ادا نہیں ہو گا کیونکہ وہ تو پورے عشرہ کا ہی ہوتا ہے اس سے کم کیا ہوا اعتکاف نفلی بن جائے گا اور اس پر اس دن کے اعتکاف کی قضا واجب ہو گی جس دن کا اعتکاف فاسد کیا ہے۔

(۲) اعتکاف توڑنے والی چیز جماع اور اس کے لوازم ہیں۔ اعتکاف والے پر جماع اور اس کے لوازم حرام ہیں۔ پس پیشاب پاخانہ کے مقام میں دخول سے اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے، خواہ انزال ہو یا نہ ہو، اور لوازم جماع مثلاً مباشرت (بدن سے بدن ملانا) بوسہ، مساس، معانقہ اور پیشاب و پاخانہ کے مقام کے علاوہ کسی اور جگہ مثلاً ران یا پیٹ وغیرہ میں جماع کرنا، ان سب صورتوں میں اگر انزال ہو جائے تو اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے اور اگر انزال نہ ہو تو اعتکاف فاسد نہیں ہوتا، خواہ جماع ولوازم جماع دن میں واقع ہوں یا رات میں اور جان بوجھ کر ہوں یا بھول کر اور خواہ رضامندی کی حالت ہوں یا اکراہ کی حالت ہر حال میں اعتکاف فاسد ہونے کا حکم یکساں ہے، خواہ جماع مسجد سے باہر واقع ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ جماع ولوازم جماع کی جن صورتوں میں روزہ فاسد ہو جاتا ہے ان سب صورتوں میں اعتکاف بھی ہو جاتا ہے اور جن صورتوں میں روزہ فاسد نہیں ہوتا ان صورتوں میں اعتکاف بھی فاسد نہیں ہوتا، فرق صرف یہ ہے کہ اعتکاف کے لئے دن رات اس حکم میں برابر ہیں اور روزے میں صرف دن کے وقت یعنی

روزہ کے حالت میں یہ چیزیں روزہ کو فاسد کردیتی ہیں، جماع اور اس کے لوازم کے علاوہ روزہ کو توڑنے والی دوسری چیزوں سے واجب و سنت مؤکدہ اعتکاف اس وقت ٹوٹ جائے گا جب کہ روزہ کو توڑنے والی چیز دن میں یعنی روزہ کی حالت میں پائی جائے کیونکہ روزہ اعتکاف کے لئے شرط ہے اس لئے جب روزہ ٹوٹ گیا تو اعتکاف بھی ٹوٹ گیا۔

(۳) اعتکاف کو توڑنے والی تیسری چیز بے ہوشی اور جنون ہے۔ بے ہوشی یا جنون سے اعتکاف اس وقت باطل ہوتا ہے جب کہ وہ دو یا زیادہ دن تک رہے، کیونکہ ان دنوں میں نیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کا روزہ فوت ہوجائے گا لیکن پہلے دن کا اعتکاف باطل نہیں ہوگا جب کہ اس نے وہ دن مسجد ہی میں پورا کیا ہو کیونکہ نیت پائی گئی ہے، لیکن اگر وہ مسجد سے باہر نکل گیا تو جنون یا بے ہوشی دور ہونے کے بعد اس پر اس دن کی قضا لازم ہوگی اوراس دن کے علاوہ بے ہوشی یا جنون کے باقی دنوں کا اعتکاف بھی جنون و بے ہوشی دور ہونے کے بعد قضا کرے، اگرچہ وہ جنون بہت طویل ہوگیا ہو اور جب اس واجب (یعنی نذر کے) اعتکاف کی قضا پر قادر ہو تو اس کو روزہ کے ساتھ قضا کرے۔

فائدہ: اگر وہ واجب (یعنی نذر کا) اعتکاف کسی معین مہینے کا ہو تو جس قدر دن باقی رہ گئے ہوں صرف اتنے ہی دن کا اعتکاف قضا کرے، اس کے سوا اور کچھ نہیں اور اگر وہ واجب اعتکاف غیر معین مہینے کا ہو تو فاسد کردینے کے بعد اس کو نئے سرے سے شروع کرنا لازم ہوگا کیونکہ وہ لگاتار ادا کرنا لازم ہوا ہے، خواہ اس اعتکاف کو اپنے فعل سے کسی عذر کے بغیر فاسد کیا ہو یا اپنے فعل سے کسی عذر کی وجہ سے فاسد کیا ہو یا اس کے فعل کے بغیر ہی فاسد ہوا ہو۔

وہ چیزیں جو اعتکاف میں حرام یا مکروہ ہیں اور جو مکروہ نہیں

① خاموش رہنا: اگر اعتکاف میں عبادت سمجھ کر خاموش رہے تو مکروہ تحریمی ہے اور اگر اس کو عبادت نہ سمجھتا ہو تو مکروہ نہیں ہے۔ بری باتوں سے خاموشی اختیار کرنا فرض و واجب ہے کیونکہ بات کرنا کبھی حرام ہوتا ہے، مثلاً غیبت کرنا، اور کبھی مکروہ ہوتا ہے جیسے برے شعر پڑھنا یا سامان تجارت بیچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا، اس لئے پہلی قسم سے چپ رہنا فرض ہے اور دوسری قسم سے چپ رہنا واجب ہے۔ غیر مفید باتیں کرنے سے اپنی زبان کو بچانے کے لئے خاموش رہنا مکروہ نہیں ہے لیکن زیادہ تر وقت تلاوت قرآن پاک وذکر وغیرہ عبادت میں گزارے۔ خاموش رہنے کے یہ احکام مسجد سے باہر اور اندر والے اور جو شخص اعتکاف میں نہ ہو سب کے لئے یکساں ہیں، مسجد میں اور اعتکاف والے کے لئے بدرجۂ اولیٰ یہ احکام ہیں۔

② اگر اعتکاف والے شخص نے دن میں (روزہ کی حالت میں) بھول کر کچھ کھا پی لیا تو چونکہ اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا اس لئے اس کا اعتکاف بھی فاسد نہیں ہوگا۔

③ اگر اعتکاف والا شخص کھانا اور اپنی ضرورت کی چیزیں مسجد میں بیچے یا خریدے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اگر خرید و فروخت تجارت کے ارادہ سے کرے تو مکروہ ہے۔ اعتکاف کی حالت میں نکاح کرنا، طلاق سے رجعت کرنا، لباس پہننا، خوشبو او تیل لگانا جائز ہے۔

④ اعتکاف کرنے والے کو مسجد میں تجارت کے قصد سے خرید وفروخت

کی بات کرنا مکروہ ہے، خواہ سامان تجارت وہاں حاضر کیا جائے یا نہ کیا جائے، اور بغیر اعتکاف والے کے لئے مسجد میں خرید و فروخت کرنا مطلقاً مکروہ ہے، خواہ تجارت کے لئے یا بغیر تجارت کے ہو۔ اور خواہ سامان تجارت حاضر ہو یا نہ ہو، اور خواہ اپنے لئے یا اپنے اہل و عیال کے لئے اس کا محتاج ہو یا نہ ہو۔

۵ سامان تجارت کو مسجد میں موجود کرنا مکروہ تحریمی ہے اور جو کھانا اعتکاف والے نے خریدا اس کو مسجد میں لانے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

۶ مسجد میں وطی (جماع) اور اس کے لوازم یعنی بوسہ لینا اور چھونا اور معانقہ کرنا وغیرہ حرام ہے۔

۷ گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑے سے اعتکاف فاسد نہیں ہوتا لیکن یہ افعال مسجد میں اور مسجد سے باہر ممنوع و حرام ہیں۔ پس اعتکاف کی حالت میں بدرجۂ اولیٰ ممنوع و حرام ہیں اس لئے ان سے بچنا ہر وقت ضروری ہے۔

اعتکاف کے متفرق مسائل

۱ جب کوئی شخص اپنے اوپر اعتکاف واجب کرنے کا یعنی اعتکاف کی نذر ماننے کا ارادہ کرے تو اس کو چاہئے کہ زبان سے بھی کہے صرف دل سے نیت کرنا اعتکاف واجب ہونے کے لئے کافی نہیں ہے اور اس سے اس پر کوئی چیز لازم نہیں ہوگی۔

۲ اگر تثنیہ یا جمع کے صیغہ کے ساتھ یعنی دو دن یا تین یا زیادہ دنوں کے اعتکاف کی نذر کی یا دو راتوں یا تین یا زیادہ راتوں کے اعتکاف کی نذر کی تو ان دنوں کے ساتھ ان کی راتوں کا اور ان راتوں کے ساتھ ان کے دنوں کا اعتکاف بھی لازم ہو جائے گا، اور یہ حکم اس وقت ہے جب کہ کچھ نیت نہ کی ہو یا دن

اور رات دونوں مراد لئے ہوں، لیکن اگر دنوں کی نذر میں خالص دنوں کی اور راتوں کی نذر میں خالص اعتکاف لازم ہوگا اور اس کو متفرق طور پر ادا کرنے کا اختیار ہے اس پر راتوں کا اعتکاف واجب نہیں ہوگا اور صرف راتوں کے اعتکاف کی نذر میں اس پر کچھ واجب نہیں ہوگا کیونکہ راتیں روزے کا محل نہیں ہیں اور اگر صرف ایک ہی دن کے اعتکاف کی نذر کرے تو پھر رات ضمناً داخل نہیں ہوگی اسی طرح صرف ایک رات کے اعتکاف کی نذر کرنے میں دن ضمناً شامل نہیں ہوگا اور چونکہ رات کو روزہ نہیں ہوتا اس لئے وہ نذر لغو ہوجائے گی۔

۳ جب اعتکاف کے واجب ہونے میں رات داخل نہیں ہے تو اعتکاف کرنے والے کو اختیار ہے کہ متفرق طور پر ادا کرے یا لگاتار ادا کرے اور جب رات اور دن دونوں شامل ہوں تو اس کو لگاتار اعتکاف کرنا واجب ہوگا، متفرق طور پر ادا کرنے سے ادا نہیں ہوگا۔

۴ جب اعتکاف میں رات اور دن دونوں شامل ہوں تو اعتکاف کی ابتداء رات سے ہوگی۔ پس وہ اپنی نذر کے پہلے دن سورج غروب ہونے سے پہلے مسجد میں داخل ہوجائے اور اپنی نذر کے آخری دن سورج غروب ہونے کے بعد مسجد سے نکلے، اور جب صرف دنوں کے اعتکاف کی نذر کی تو دن سے اعتکاف شروع کرے اور طلوع فجر سے پہلے مسجد میں داخل ہوجائے اور غروب آفتاب کے بعد مسجد سے باہر نکلے۔

۵ اگر ایک معین دن یا ایک معین مہینہ کے اعتکاف کی نذر کی اور اس دن سے ایک دن پہلے یا اس مہینہ سے ایک مہینہ پہلے اعتکاف کرلیا یا مسجد حرام میں اعتکاف کرنے کی نذر کی اور کسی اور مسجد میں اعتکاف کرلیا تو جائز ہے، اسی

طرح معین وقت کے بعد بھی ادا کر سکتا ہے۔

(۶) اگر گزرے ہوئے مہینے کے اعتکاف کی نذر کی تو اس کی نذر صحیح نہیں ہوگی۔

(۷) اگر کسی نے ایک مہینہ کے اعتکاف کی نذر کی پھر وہ ادا کرنے سے پہلے مر گیا تو اگر اس نے فدیہ کی وصیت کی ہو تو ہر روزہ کے اعتکاف کے بدلہ میں صدقہ فطر کی مقدار گیہوں یا جو وغیرہ سے دیئے جائیں اور اگر اس نے وصیت نہیں کی تو وارثوں پر جبر نہیں کیا جائے گا، لیکن اگر وارثوں نے اجازت دے دی تو اس کا فدیہ دینا جائز ہے۔ اگر کسی نے مرض کی حالت میں ایک مہینہ کے اعتکاف کی نذر کی اور وہ تندرست نہ ہوا یہاں تک کہ مرض کی حالت میں ہی مر گیا تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا اور اگر ایک دن کے لئے اچھا ہو گیا پھر مر گیا تو سارے مہینہ کے عوض فدیہ دیا جائے گا۔

(۸) جب واجب اعتکاف فاسد ہو جائے تو اس کی قضا واجب ہے۔ پس اگر کسی معین مہینے کے اعتکاف کی نذر کی تھی اور اس نے ایک دن یا زیادہ دنوں کا روزہ توڑ دیا تو اتنے ہی دن قضا کرے جن کا روزہ توڑا ہے، اور اگر غیر معین مہینے کے اعتکاف کی نذر کی اور اس کے کسی دن کا روزہ توڑ دیا تو نئے سرے سے اعتکاف کرے، اس لئے کہ اس کا لگاتار ادا کرنا واجب ہے، خواہ اس نے اپنے فعل سے عذر کے بغیر فاسد کیا ہو یا عذر کے ساتھ لیکن اگر معتبر عذر کے بغیر فاسد کردے گا تو گنہگار ہوگا۔ واللہ اعلم

س...... ایک شخص جس نے قرآن شریف مکمل نہیں کیا یعنی چند پارے پڑھ کر چھوڑ دیئے مجبوری کے تحت کیا وہ شخص اعتکاف میں بیٹھ سکتا ہے؟

ج...... ضرور بیٹھ سکتا ہے' اس کو قرآن مجید بھی ضرور مکمل کرنا چاہئے۔ اعتکاف میں اس کا بھی موقع ملے گا۔

س...... کیا ایک مسجد میں صرف ایک اعتکاف ہو سکتا ہے یا ایک سے زائد بھی؟

ج...... ایک مسجد میں جتنے لوگ چاہیں اعتکاف بیٹھیں اگر سارے محلے والے بھی بیٹھنا چاہیں تو بیٹھ سکتے ہیں۔

س...... حالت اعتکاف میں جس مخصوص کونہ میں پردہ لگا کر بیٹھا جاتا ہے کیا دن کو یا رات کو وہاں سے نکل کر مسجد کے کسی پنکھے کے نیچے ہو سکتا ہے یا نہیں؟ معتکف کسے کہتے ہیں اس مخصوص کونہ کو جس میں بیٹھا جاتا ہے یا پوری مسجد کو معتکف کہا جاتا ہے؟ اور بعض علماً سے سنا ہے کہ دوران اعتکاف بلا ضرورت گرمی دور کرنے کے لئے غسل کرنا بھی درست نہیں' کیا یہ صحیح ہے؟ اور اگر بحالت ضرورت مسجد سے نکل کر جائے' اور کسی شخص سے باتوں میں لگ جائے' تو کیا ایسی حالت میں اعتکاف ٹوٹے گا یا نہیں؟

ج...... مسجد کی خاص جگہ جو اعتکاف کے لئے تجویز کی گئی ہو اس میں مقید رہنا کوئی ضروری نہیں' بلکہ پوری مسجد میں جہاں چاہے دن کو یا رات کو بیٹھ سکتا ہے اور سو سکتا ہے ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے غسل کی نیت سے مسجد سے نکلنا جائز نہیں' البتہ اس کی گنجائش ہے کہ کبھی استنجا وغیرہ کے تقاضے سے باہر جائے تو وضو کے بجائے دو چار لوٹے پانی کے بدن پر ڈال لے' معتکف کو ضروری تقاضوں کے علاوہ مسجد سے باہر نہیں ٹھہرنا چاہئے' بغیر ضرورت کے اگر گھڑی بھر بھی باہر رہا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اعتکاف ٹوٹ جائے گا' اور صاحبینؒ کے نزدیک نہیں ٹوٹتا' حضرت امامؒ کے قول میں احتیاط ہے اور صاحبینؒ کے قول میں وسعت اور گنجائش ہے۔

س...... کیا اعتکاف میں بیٹھنے کے لئے جو چاروں طرف چادریں لگا کر ایک حجرہ بنایا جاتا ہے۔ ضروری ہے یا اس کے بغیر بھی اعتکاف ہو جاتا ہے؟

ج...... چادریں معتکف کی تنہائی و یکسوئی اور آرام وغیرہ کے لئے لگائی جاتی ہیں ورنہ اعتکاف ان کے بغیر بھی ہو جاتا ہے۔

س...... اعتکاف کے دوران گفتگو کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر کی جاسکتی ہے تو گفتگو کی نوعیت بتائیں؟

ج...... اعتکاف میں دینی گفتگو کی جاسکتی ہے اور بقدر دنیوی بھی۔

س...... دوران اعتکاف تلاوت کلام پاک کے علاوہ سیرت اور فقہ سے متعلق کتب کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے؟

ج...... تمام دینی علوم کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

س...... مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کے مسجد جو کہ مہران شوگر ملز ٹنڈوالہ یار ضلع حیدر آباد کی کالونی میں واقع ہے، اس مسجد میں ہر سال رمضان شریف میں ہماری مل کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر صاحب (جو کہ ظاہری طور پر انتہائی دیندار آدمی ہیں) اعتکاف میں بیٹھتے ہیں۔ لیکن ان کے اعتکاف کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جس گوشہ میں بیٹھتے ہیں وہاں گاؤ تکیہ اور قالین کے ساتھ ٹیلیفون بھی لگوالیتے ہیں جو کہ اعتکاف مکمل ہونے تک وہیں رہتا ہے اور موصوف سارا دن اعتکاف کے دوران اسی ٹیلیفون کے ذریعہ تمام کاروبار اور مل کے معاملات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام دفتری کارروائی، فائلیں وغیرہ مسجد میں منگواکر ان پر نوٹ وغیرہ لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف ٹیپ ریکارڈ لگواکر مسجد میں ہی قوالیوں کے کیسٹ سنتے ہیں جبکہ قوالیوں میں ساز بھی شامل ہوتے ہیں۔ کیا مسجد میں اس کی اجازت ہے کہ قوالی سنی جائے؟ اس کے علاوہ موصوف مسجد میں ٹیلی ویژن سیٹ بھی رکھواکر ٹیلی کاسٹ ہونے والے تمام دینی پروگرام بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں۔ اور موصوف کے ساتھ ان کے نوکر وغیرہ بھی خدمت کے لئے موجود رہتے ہیں۔ ہماری کالونی کے متعدد نمازی موصوف کی ان حرکتوں کی وجہ سے مسجد میں نماز پڑھنے نہیں آتے۔ کیا ان نمازیوں کا یہ فعل صحیح ہے؟

ج...... اعتکاف کی اصل روح یہ ہے کہ اتنے دنوں کو خاص انقطاع الی اللہ میں گزاریں

اور حتی الوسع تمام دنیوی مشاغل بند کردیئے جائیں۔ تاہم جن کاموں کے بغیر چارہ نہ ہو ان کا کرنا جائز ہے۔ لیکن مسجد کو اتنے دنوں کے لئے دفتر میں تبدیل کردینا بے جا بات ہے اور مسجد میں گانے بجانے کے آلات بجانا یا ٹیلی ویژن دیکھنا حرام ہے جو نیکی برباد گناہ لازم کے مصداق ہے۔ آپ کے ڈائریکٹر صاحب کو چاہئے کہ اگر اعتکاف کریں تو شاہانہ نہیں فقیرانہ کریں اور محرمات سے احتراز کریں ورنہ اعتکاف ان کے لئے کوئی فرض نہیں۔ خدا کے گھر کو معاف کریں اس کے تقدس کو پامال نہ کریں۔

س...... کیا حالت اعتکاف میں معتکف (مسجد کے کنارے پر بیٹھ کر) حالت پاکی میں صرف سستی اور جسم کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لئے غسل کر سکتا ہے' اور کیا اس سے اعتکاف سنت ٹوٹ جاتا ہے' جبکہ یہ غسل مسجد کے حدود کے اندر ہو' اور کیا اس سے مسجد کی بے ادبی تو نہیں ہوتی؟

ج...... غسل اور وضو سے مسجد کو ملوث کرنا جائز نہیں' اگر صحن پختہ ہے' اور وہاں سے پانی باہر نکل جاتا ہے تو گنجائش ہے کہ کونے میں بیٹھ کر نہالے' اور پھر جگہ کو صاف کردے۔

س...... ہمارے محلہ کی مسجد میں دو آدمی اعتکاف میں بیٹھے تھے زیادہ گرمی ہونے کی وجہ سے وہ مسجد کے غسل خانہ میں غسل کرتے تھے۔ ایک صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ اس طرح غسل کرنے سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے؟

ج...... ٹھنڈک کے لئے غسل کی نیت سے جانا معتکف کے لئے جائز نہیں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ جب پیشاب کا تقاضا ہو تو پیشاب سے فارغ ہو کر غسل خانے میں دو چار لوٹے بدن پر ڈال لیا کریں' جتنی دیر میں وضو ہوتا ہے اس سے بھی کم وقت میں بدن پر پانی ڈال کر آجایا کریں الغرض غسل کی نیت سے مسجد سے باہر جانا جائز نہیں' طبعی

ضرورت کے لئے جائیں تو بدن پر پانی ڈال سکتے ہیں۔ اور کپڑے بھی مسجد میں اتار کر جائے تاکہ غسل خانے میں کپڑے اتارنے کی مقدار بھی ٹھہرنا نہ پڑے۔

س...... میں نے ایک منت مانی تھی کہ اگر میری مراد پوری ہو گئی تو میں اعتکاف میں بیٹھوں گا مگر میں اس طرح نہ کر سکا۔ تو مجھے بتایئے کہ میں اس کے بدلے میں کیا کروں؟ کہ میری یہ منت پوری ہو جائے۔ باقی دو روزے نہ رکھنے کے لئے بتایئے کہ کتنے فقیروں کو کھانا کھلانا ہو گا؟

ج...... آپ نے جتنے دن کے اعتکاف کی منت مانی تھی اتنے دن اعتکاف میں بیٹھنا آپ پر واجب ہے۔ اور اعتکاف روزے کے بغیر نہیں ہوتا اس لئے ساتھ روزے رکھنا بھی واجب ہیں۔ جب تک آپ یہ واجب ادا نہیں کریں گے آپ کے ذمہ رہے گا اور اگر اسی طرح بغیر کئے مر گئے تو قدرت کے باوجود واجب روزوں کے ادا نہ کرنے کی سزا بھگتنا ہو گی۔ اور آپ کے ذمہ روزوں کا فدیہ ادا کرنے کی وصیت بھی لازم ہو گی۔

۲ :...... جتنے دن کے روزوں کی منت مانی تھی اتنے دن کا روزہ رکھنا ضروری ہے اس کا فدیہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر آپ اتنے بوڑھے ہو گئے ہوں کہ روزہ نہیں رکھا جا سکتا یا ایسے دائمی مریض ہوں کہ شفا کی امید ختم ہو چکی ہے تو آپ ہر روزے کے عوض کسی محتاج کو دو وقتہ کھانا کھلا دیجئے یا صدقہ فطر کی مقدار غلہ یا نقد روپے دے دیجئے۔

عظمتِ قرآن

اور اس کی تلاوت کے فوائد و ثمرات

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان
	* قرآن کے ایک حرف پر دس نیکیاں
	* قرآن کریم سے محبت
	* تلاوت قرآن کی مقدار
	* بچوں کی تعلیم کی ضرورت واہمیت
	* تلاوت قرآن کا ثواب
	* کشف قبور کا سبق آموز واقعہ
	* خوش قسمت لوگ
	* دعا ختم قرآن
	* تلاوت قرآن کی عادت ڈالنے کا طریقہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد!

یہاں آپ حضرات کی مسجد میں مدرسہ حفظ قرآن شروع ہوا ہے، اس کے سلسلہ میں حاضری ہوئی ہے، اس لئے دو چار باتیں اسی کے بارے میں عرض کرتا ہوں۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور جیسی کلام والے کی عظمت ہوتی ہے ویسی ہی کلام کی عظمت ہوتی ہے۔ ایک چھوٹا آدمی بات کرتا ہے تو اس کی قدر وقیمت اس شخص کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے، وہی بات اگر کوئی بڑا آدمی کہتا ہے تو اس کی عظمت اور ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ سب سے زیادہ عظمت والے ہیں تو ان کے کلام کی بھی عظمت سب سے زیادہ ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی جتنی عظمت ہے اتنی اور کسی کلام کی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرایتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ" (الحشر:۲۱)

ترجمہ: "اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو

(اے مخاطب) اس کو دیکھتا کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا
اور پھٹ جاتا"۔

پہاڑ بھی اس کلام پاک کی عظمت کو برداشت نہ کرسکتا، یہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسی دولت اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل عطا فرمادی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قلب پر قرآن کریم نازل ہوا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوا، اور پھر لوگوں کے کان کے ذریعہ سے ان کے دلوں تک پہنچا۔ اتنے واسطے بیچ میں آئے۔ پہلا جبرائیل علیہ السلام کا واسطہ، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کا واسطہ، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کا واسطہ، پھر انسانوں کے کانوں کا واسطہ۔ تو اتنے واسطوں سے چھن چھن کر قرآن کریم ہم تک پہنچا اس لئے ہمیں اس کا تحمل ہوسکا۔ براہ راست اگر یہ کسی پر نازل ہوجاتا تو وہ اس کا تحمل نہیں کرسکتا تھا، اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا۔ یہ تو اس کلام پاک کی عظمت ہے۔ اور جتنی عظمت ہے اتنی ہی اس کی فضیلت بھی ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب پڑھو اگر اچھی بات ہے تو اس کو پڑھنے کا ثواب ہوگا اور نیکی ملے گی، ہدایت ملے گی۔ لیکن دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے۔ جس کے ایک حرف کو پڑھنے پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔ یقیناً ایسی کوئی کتاب نہیں۔

قرآن کے ایک حرف پر دس نیکیاں

یہ کلام پاک ایسا ہے کہ اس کے ایک ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔ بطور لطیفہ عرض کرتا ہوں کہ شیطان کا نام اچھا ہے کہ برا؟ برے کا نام برا ہوتا ہے، لیکن قرآن کریم میں بھی شیطان کا نام آتا ہے۔ ش ی ط ا ن، شیطان کا نام

ملنے پر پچاس نیکیاں ملتی ہیں۔ تو جب قرآن کریم میں یہ نام آتا ہے تو اس کے ادا کرنے پر پچاس نیکیاں ہیں۔ "فرعون" کے نام کے پانچ حرف ہیں۔ ف ر ع و ن۔ قرآن کریم میں یہ نام آتا ہے تو اس کے ادا کرنے سے پچاس نیکیاں ہیں۔ فرعون اپنی جگہ بدبخت ہے، شیطان اپنی جگہ بدبخت ہے، مگر جب اس پاک کلام میں نام آگیا تو اس کو پڑھتے ہوئے جب کوئی فرعون کا لفظ بولے گا تو اس کو پچاس نیکیاں ملیں گی۔ تو میں نے کہا کہ کتنی بڑی اس کی عظمت ہے؟ کتنی بڑی اس کی قیمت ہے؟

قرآن کریم سے محبت

اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اپنے بندوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی۔ قرآن کریم سے مسلمانوں کو جتنی محبت ہے ایسی کسی اور کتاب سے نہیں اور نہ ایسی کسی قوم کو اپنی کتاب سے ہے۔ گھروں میں قرآن کریم ہوتے ہیں، اچھے سے اچھے غلاف میں ان کو لپیٹ کر رکھتے ہیں، ادب کی جگہ رکھتے ہیں، اونچی جگہ رکھتے ہیں، ان کی طرف پیٹھ نہیں کرتے۔ ہمارے ایک عزیز ہیں، بزرگ ہیں، وہ حافظ قرآن کی طرف پیٹھ نہیں کرتے کہ اس کے سینے میں قرآن ہے، مسلمانوں کو قرآن کریم سے ایسی محبت ہے کہ اس کی کوئی مثال نہیں اور یہ محبت اللہ تعالیٰ نے ڈالی ہے، پھر اس محبت کے بھی درجات مختلف ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ کی ذات عالی سے کسی کو تعلق ہوگا اتنا ہی اس کے کلام سے تعلق ہوگا، جتنا ایمان قوی ہوگا، جتنا یقین قوی ہوگا اتنی ہی حق تعالیٰ شانہ سے محبت زیادہ ہوگی، اور اتنا ہی کلام پاک سے تعلق ہوگا، کلام پاک سے محبت ہوگی۔ چنانچہ ہر مسلمان تھوڑا بہت قرآن تو پڑھ ہی لیتا ہے اور نہ ہو تو قل ھو اللہ ہی سہی۔

سورۃ الفاتحہ اور قل ھو اللہ شریف تو ہر مسلمان کو یاد ہوتی ہے۔ بھئی! ایک مسئلہ یاد رکھو، وہ یہ کہ چار سنتیں ہم پڑھتے ہیں تو ان چار سنتوں میں الگ الگ سورۃ پڑھنی چاہئے اس لئے کہ کم سے کم چھوٹی چار سورتیں تو یاد ہوں۔ ہمارے مسلمان بھائی بڑی کوتاہی کرتے ہیں۔ صرف قل ھو اللہ یاد رہتی ہے وہ بھی صحیح یاد نہیں ہوتی۔ اس کی بھی تصحیح نہیں کرتے۔ اوّل تو مسلمان کو آخری پاؤ یاد ہونا چاہئے جس میں چھوٹی سورتیں ہیں۔ اتنا تو ہر مسلمان کو یاد ہونا چاہئے اور اتنا نہ ہو تو چلو دس سورتیں یاد ہوں۔ الم ترکیف سے والناس تک۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"ان الذی لیس فی جو فہ شئی من القرآن کالبیت الخرب" (مشکوٰۃ: ۱۸۶۔ بحوالہ ترمذی ودارمی)

ترجمہ: "وہ شخص جس کے دل میں قرآن کریم کا کچھ حصہ نہ ہو وہ ایسا ہے جیسے ویران گھر"۔

گویا جس طرح مکان بغیر مکین کے بے آباد ہے اسی طرح آدمی کا دل بغیر قرآن کے ویران ہے۔ مشہور ہے کہ جس گھر میں کوئی نہ رہتا ہو بند پڑا ہوا ہو، وہاں جن بھوت رہنے لگتے ہیں۔ تو جس مؤمن کے دل میں قرآن کریم نہ ہو تو اس میں جن بھوت رہیں گے، وہاں پھر شیاطین کا ڈیرہ ہوگا۔ تو میں نے کہا کہ کچھ نہ کچھ حصہ تو ہر مسلمان کو یاد ہوتا ہے اور ہونا چاہئے۔

تلاوت قرآن کی مقدار

قرآن کریم کی تلاوت کے معاملے میں بھی لوگوں کے درجات مختلف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بہت سے بندے ایسے ہوئے ہیں (بے شمار) جن کا معمول دس

پارے روزانہ قرآن کریم کی تلاوت تھا، تین دن میں ان کا قرآن کریم ختم ہوتا تھا۔ اور اس سے زیادہ تعداد ان حضرات کی جو فمی بشوق پڑھتے تھے۔ قرآن کریم کی سات منزلیں ہوتی ہیں، آپ نے دیکھی ہوں گی۔ پہلی منزل سورۃ الفاتحہ سے، دوسری منزل سورۃ المائدہ سے، تیسری منزل سورۃ یونس سے، چوتھی منزل بنی اسرائیل سے، اور پانچویں منزل شعرآء سے، چھٹی منزل والصافات سے، اور ساتویں منزل سورۃ ق سے۔ ان ساتوں کا مجموعہ ہوگیا فمی بشوق۔ تو بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہوتے تھے جو فمی بشوق کے ساتھ تلاوت کرتے تھے، یعنی روز کی ایک منزل، سات یوم میں ایک قرآن ختم۔ جمعہ کو شروع کیا تو جمعرات کو ختم، ہفتہ کو شروع کیا تو جمعہ کو ختم۔ اور اس سے نیچے یہ کہ دس دن میں قرآن کریم ختم ہو کہ تین پارے روزانہ پڑھیں، یہ حافظوں کی منزل ہے، عام کمزور حافظوں کی، ساتویں دن قرآن ختم نہ ہو تو دس دن میں تو ہو کہ ایک مہینے کے تین قرآن ہوجائیں۔ اور اس سے کم درجہ یہ ہے کہ ایک پارہ روزانہ پڑھیں، یہ عام مسلمانوں کے لئے ہے کہ روزانہ کا ایک پارہ قرآن کریم کا معمول ہو۔ جس طرح کھانا کھانا روزانہ کا معمول ہے، اسی طرح روزانہ ایک پارہ قرآن کریم کی تلاوت بھی معمول ہونا چاہئے۔ ایک مہینے کے بعد قرآن کریم ختم۔ اس طرح اکابر فرماتے تھے کہ چاند کی جو تاریخ ہو وہی تمہارے پارے کی تلاوت ہو، کہ تم سے کوئی پوچھے کہ آج تم نے کون سا پارہ پڑھا ہے تو تم کہو کہ میں نے ۲۲ واں پارہ پڑھا ہے آج ۲۲ تاریخ ہے، اگر ۲۹ کا چاند ہوگیا تو مہینے کے ختم پر آخری دن ایک پارہ اور پڑھ لو۔ پہلی تاریخ کو پہلا پارہ شروع کرو، اس سے کم درجہ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن کچھ لوگ وہ بھی ہیں جن کا اس سے بھی کم درجہ ہے کہ کبھی پڑھ لیا اور کبھی نہیں پڑھا، کبھی آدھا پاؤ، کبھی ایک پاؤ، کبھی

ایک رکوع۔ البتہ رمضان المبارک میں کچھ لوگ زیادہ پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن بعض ایسے نیک بخت ہیں کہ رمضان المبارک میں بھی قرآن کریم ختم نہیں کرتے۔ تھوڑا بہت پڑھ لیتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ قرآن کریم کے ساتھ سب مسلمانوں کو محبت تو ہے، کوئی مسلمان ایسا نہیں کہ جس کے دل میں قرآن کریم کی عظمت نہ ہو، کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کے دل میں قرآن کریم کی محبت نہ ہو، قرآن کریم سے تعلق نہ ہو۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کو کچھ تھوڑا بہت بھی یاد نہیں۔ لیکن پھر محبت کی مختلف منزلیں ہیں۔ ہمارے امام ابو حنیفہؒ رمضان المبارک میں ۶۱ قرآن پڑھتے تھے۔ ایک قرآن دن کا ایک رات کا اور ایک تراویح کا، اور یہی معمول امام شافعیؒ سے نقل کیا گیا ہے۔ اور یہی معمول امام بخاریؒ سے منقول ہے، سالہا سال تک یہی معمول ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہ کا تھا، لیکن ۶۱ کا نہیں بلکہ تیس قرآن کا، ایک قرآن روزانہ۔ اور یہ معمول تو بہت سے اکابر کا رہا ہے کہ رمضان میں روزانہ کا ایک قرآن۔ میرے بھائی! قیامت کے دن تمہارے درجے اسی سے متعیّن ہوں گے۔ جن کے اندر جو محبت چھپی ہوئی ہے۔ سو چھپی ہوئی ہے، اس کا تو کسی کو پتہ چلتا نہیں۔ لیکن کتنی طاقتور محبت ہے۔ کتنے درجہ کی محبت ہے، بھائی اس کا اندازہ تو ان کے اعمال سے ہوگا۔ یوں کسی کو تعلق نہ ہو اور کہے کہ مجھے بہت محبت ہے۔ اب محبت کا کوئی پتہ نشان نہیں ہوتا، وہ تو دل میں چھپی ہوتی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس محبت کا مظاہرہ کیسے ہوتا ہے۔

بچوں کی تعلیم قرآن کی ضرورت و اہمیت

اور اسی محبت کا ایک پہلو یہ ہے کہ کیا تم اپنے بچوں کو قرآن کریم پڑھاتے

ہو؟ ماں باپ جاہل سے جاہل بھی ہوں، ان پڑھ ہوں، ان کی کم سے کم یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ ہمارا بیٹا اتنا پڑھ لکھ جائے کہ ڈپٹی کمشنر بن جائے۔ تعلیم دلانے میں ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے پڑھ لکھ جائیں، اس لئے پڑھنے والوں کی تعداد کافی بڑھ رہی ہے۔ لیکن قرآن پڑھنے والوں کی تعداد اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والوں کے مقابلہ میں کتنی ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لو کہ ماں باپ اپنے بچوں کو دوسری تعلیم کے بجائے قرآن کریم کتنا پڑھاتے ہیں؟ اس میں لوگوں کے کئی درجات ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو بچوں کو باقاعدہ قاری صاحب سے صحیح قرآن کریم پڑھواتے ہیں، بعض وہ ہیں جن کے بچوں کو گھر میں عورتیں تھوڑا بہت پڑھا دیتی ہیں، اور بس۔ اور یہ جو بڑے اونچے خاندان کے لوگ ہیں ان میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن کریم پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے آپ ہی آجاتا ہے۔ یہ تمہارے یہاں اس وقت جتنے بڑے بڑے جج ہیں، بڑے بڑے وکلاء ہیں اللہ مجھے بدگمانی سے بچائے ان میں سے شاید ایک بھی صحیح قرآن نہیں پڑھ سکتا ہوگا، نہ پڑھتا ہوگا۔ مشکل ہے کہ جج صاحب کا روزانہ کا معمول قرآن کریم کی تلاوت ہو، جج صاحب نے صحیح قرآن پڑھا ہو، مشکل ہے، ہاں! کوئی غریب خاندان کا لڑکا ہو، اس کے والدین نے اس کو پڑھا دیا تو وہ دوسری بات ہے، وہ بھی بڑا آدمی بن سکتا ہے۔ لیکن یہ جو لوگ اونچے اونچے گھرانوں والے یا یہ بڑی بڑی کوٹھیوں والے۔ الّاماشاء اللہ۔ اس طرف سے غافل ہیں۔ البتہ اب کچھ رواج دیکھا کراچی میں کہ اِدھر اُدھر سے کسی موذن وغیرہ کو ٹیوشن پر رکھ لیتے ہیں کہ وہ بچوں کو ایک گھنٹہ آدھ گھنٹہ روزانہ پڑھایا کرے۔ ان کے بچے جاکر مسجد کی پرانی چٹائیوں پر بیٹھیں، یہ ان کے لئے عار کی بات ہے، عزت کی بات نہیں۔ اس لئے بچوں کو

مسجد بھیجنا گوارا نہیں کرتے۔ امراء کی نسبت جو نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو قرآن کریم سے زیادہ تعلق ہے، لیکن اتنا تعلق پھر بھی نہیں جتنا ہونا چاہئے۔ یہ بچوں کو بس اتنا کر دیتے ہیں کہ مسجد میں بٹھادیا تھوڑا بہت انہوں نے پڑھ لیا باقی اسکول کی تعلیم، اور اگر کہا جائے کہ قرآن کریم کے حفظ کے لئے اپنے بچوں کو فارغ کر دو تو ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اتنے سال بچے کے ضائع ہو جائیں گے۔ حالانکہ ضائع ہوتے نہیں، اگر قاری صاحب ٹھیک پڑھانے والے ہوں تو ذہین بچہ ۲، ۳ سال میں قرآن یاد کر لیتا ہے اور میرے جیسا کوئی کمزور ہو تو وہ ۵، ۶ سال لے ڈوبتا ہے۔ اور ادھر تم جو پرائمری تک پڑھاتے ہو اس میں بھی اتنا ہی وقت لگتا ہے۔ قرآن کریم جس بچے نے حفظ کر لیا اس کو لے جاکر چھٹی جماعت میں داخل کر دو، بڑی آسانی کے ساتھ چلے گا۔ وقت تو ضائع نہ ہوا۔ کیوں بھئی! چھٹی جماعت تک پہنچنے کے لئے پانچ جماعتوں میں پانچ سال تو اس کو لگیں گے نا۔ اب ۵ سال کے لئے تم نے بچے کو قاری صاحب کے حوالے کر دیا اور بچے نے قرآن کریم حفظ کر لیا تو چھٹی میں اس کو داخل کرادو اس کا کیا ضائع ہوا؟ اور اگر اس سے آدھے سال کا فرق پڑ بھی جائے تو قرآن کریم جس بچے نے حفظ کیا ہوگا وہ ایسا چلے گا کہ دوسرے بچے اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ پھر بھی خسارہ نہ ہوا۔ لیکن بہت سے نیک بخت ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ بچے نے اگر قرآن کریم پڑھ لیا تو اس کے اتنے سال ضائع ہو گئے۔

تلاوت قرآن کا ثواب

اور بہت سے لوگوں نے دل میں یہ بٹھالیا ہے کہ قرآن کریم سمجھا نہ جائے تو طوطے کی طرح رٹنے سے کیا فائدہ؟ قرآن کو سمجھ کر پڑھنا چاہئے۔ میرا بھائی

قرآن کریم کے الفاظ کو زبان سے ادا کرنا مستقل عبادت ہے۔ میں نے ابھی کہا کہ قرآن کریم میں فرعون "یا شیطان" کا لفظ آیا اس کے پڑھنے پر پچاس (۵۰) نیکیاں ملتی ہیں تو قرآن کریم کے "الفاظ کو دہرانا" اپنی زبان سے ادا کرنا یہ ایک مستقل عبادت ہے۔ قرآن کریم کا صحیح مطلب سمجھنا یہ ایک مستقل عبادت ہے۔ اور سمجھ کر اس پر عمل کرنا یہ ایک مستقل عبادت ہے۔ یہ تین عبادتیں الگ الگ ہیں۔ ان لوگوں کے دل میں چونکہ قرآن کریم کی پوری عظمت نہیں بیٹھی، اس لئے انہوں نے اس کو بھی انگریزی کی کتاب کی طرح سمجھ لیا کہ جس طرح اس کو سمجھ کر نہ پڑھے رٹتا رہے تو کیا فائدہ؟ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ انگریزی قانون کی کتاب تو اس نے رٹ لی مگر جب تک معنی نہ سمجھے گا قانون کو نہیں جان سکتا۔ جب قانون ہی نہ جان سکا تو نہ وکیل بن سکتا ہے اور نہ کسی عدالت کا جج۔ کتاب کا رٹنا محض بیکار اور ضائع گیا، کیونکہ انگریزی کی کتاب کے الفاظ سے کوئی عبادت متعلّق نہیں۔ یہاں الفاظ مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود معنی ہیں۔ ادھر قرآن کریم کے معنی بھی مقصود ہیں، الفاظ بھی مقصود۔ معنی کو سمجھنا بھی عبادت اور الفاظ کو زبان پر جاری کرنا بھی عبادت، اس کو یاد کرنا بھی مستقل عبادت۔ تو ان غریبوں نے قرآن کریم کو بھی انگریزی کی کتاب پر قیاس کرلیا۔ یہ کہتے ہیں کہ طوطے کی طرح رٹنے سے کیا فائدہ؟ میں تمہیں ایک مثال سمجھاتا ہوں۔ ایک بچہ تم نے قاری صاحب کے پاس بٹھایا قرآن کریم حفظ کرنے کے لئے۔ اب وہ ایک آیت کو سو مرتبہ تو ضرور پڑھے گا اور یہ بات یاد رکھو کہ جتنی بار پڑھے گا اتنا ہی ایک ایک حرف پر دس نیکیاں اس کو ملیں گی۔ الحمدللہ رب العالمین کوئی شخص اگر اس آیت کو پڑھتا ہے بار بار رٹتا ہے تو الحمدللہ رب العالمین میں جتنے حرف ہیں اس کی مقدار اس کو دس دس نیکیاں بھی ملیں گی، اور

جتنی مرتبہ دہرائے گا اتنی ہی نیکیاں ملیں گی۔ اور ایک مسئلہ اور یاد رکھو وہ یہ کہ جب تک بچہ نابالغ ہوتا ہے اس کے عمل کا کھاتا الگ نہیں کھلتا، اس کا نامۂ عمل شروع نہیں ہوتا۔ ہر ایک کا نامۂ عمل ہوتا ہے نا؟ جب تک بچہ نابالغ ہے تو اس کا نامۂ عمل اپنا شروع نہیں ہوتا، کیونکہ گناہ اس کے ذمہ لکھے نہیں جاتے اور جو نیک کام کرتا ہے ساری کی ساری نیکیاں اس کے والدین کے کھاتے میں لکھی جاتی ہیں۔ تمہارے بچے نے پندرہ سال کی عمر تک (یعنی بالغ ہونے تک) جتنے الفاظ قرآن کریم کے پڑھے جتنی مرتبہ پڑھا وہ ساری کی ساری نیکیاں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔ تم ہمیں بتاتے ہو کہ طوطے کی طرح رٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

کشف قبور کا سبق آموز واقعہ

حافظ سیوطیؒ نے شرح الصدور میں یہ قصہ نقل کیا ہے اور میں نے بہت سے دوستوں کو سنایا، قصہ یوں ہے کہ ایک بزرگ چلے جا رہے تھے۔ قبرستان کے پاس سے گزرے تو ان کو کشف ہوا۔ کشف کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے سامنے یہ دیوار ہے اگر دیوار ہٹادی جائے تو ادھر اس طرف کی چیز ہمیں نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس عالم اور دوسرے عالم کے درمیان میں ایک آڑ بنا رکھی ہے۔ کبھی کبھی پردہ ہٹا کر دکھادیتے ہیں۔ قبر میں میت کا حال نظر آجاتا ہے تو اس کو کشف کہتے ہیں۔ اور یہ برحق ہے۔ تو وہ بزرگ چلے جا رہے تھے، ان کو کشف ہوا یعنی قبرستان والوں کی حالت ان پر کھلی۔ تو ایسا محسوس ہوا کہ قبرستان میں بہت ساری کھیلیں (مکئی جب بھونتے ہیں تو کھیلیں بن جاتی ہیں) بکھری ہوئی ہیں، اور مردے ان کو چن رہے ہیں۔

یعنی قبرستان والے ان کو چن رہے ہیں، اور ان میں ایک آدمی کرسی کے اوپر بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھا ہے۔ یہ بزرگ اس کرسی نشین سے پوچھتے ہیں کہ بھائی یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ لوگ کیا چن رہے ہیں؟ تو اس شخص نے جواب دیا کہ مسلمان اپنے بزرگوں کے لئے جو ایصال ثواب کرتے ہیں، دعا واستغفار کرتے ہیں وہ ساری کی ساری تقسیم ہو جاتی ہے اور یہ کھیلوں کی شکل میں اس سے اپنا اپنا حصہ لے لیتے ہیں۔ التحیات میں پڑھتے ہو نا؟

"رب اجعلنی مقیم الصلوة ومن ذریتی ربنا وتقبل دعاء ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب"

ترجمہ: "اے پروردگار میری بخشش کردے اور میرے والدین کی بخشش فرمادے، اور تمام ایمان والوں کی بخشش فرمادے، جس دن قیامت قائم ہو اور جس دن حساب قائم ہو"۔

تو ہر ایک مسلمان کو اس کا حصہ ملتا ہے۔ یہ ایک مثال میں نے دی ہے۔ تو یہ وہ دعا اور استغفار ہے جو مسلمان اپنے مرحومین کے لئے مسلمان بھائیوں کے لئے کرتے رہتے ہیں، ہر ایک کو حصہ تقسیم کردیا جاتا ہے اور وہ اپنا اپنا حصہ لے لیتے ہیں۔ گویا کہ یہ مٹھائی کی ڈلیاں ہیں جو یہ لوگ چن رہے ہیں، اس بزرگ نے پوچھا کہ بھائی تم کیوں نہیں چن رہے ہو؟ تو وہ شخص کہنے لگا کہ بات یہ ہے کہ میں دولت مند ہوں، اور یہ بیچارے فقیر ہیں، مجھے ضرورت نہیں ہے، میں سیٹھ ہوں، بزرگ نے پوچھا کہ بھائی کیسے سیٹھ ہو؟ کہا کہ میرا بیٹا حافظ قرآن ہے۔ روزانہ ایک قرآن پڑھ کر مجھے ایصال ثواب کرتا ہے، لہٰذا مجھے ان

صدقات وخیرات کی کیا ضرورت ہے، میرا تو وظیفہ لگا ہوا ہے۔ بزرگ نے پوچھا کہ تمہارا بیٹا کون ہے، کیا نام ہے؟ کہا فلاں شہر میں اس کی دکان ہے۔ اس کا نام یہ ہے۔ تم دیکھو گے کہ وہ لوگوں کو سودا تول تول کر دے رہا ہے۔ مگر زبان اس کی چلتی رہتی ہے، ہر وقت قرآن مجید پڑھتا رہتا ہے، کسی سے بات نہیں کرتا، یہ بزرگ فرماتے ہیں کہ میں وہاں گیا، اس دکان پر پہنچا، واقعی دیکھا کہ ایک صاحب ہیں، زبان ان کی مسلسل چل رہی ہے، قرآن شریف پڑھ رہے ہیں، جب کوئی شخص کچھ سودا مانگتا ہے تو وہ تول کر اسے دے دیتے ہیں جو پیسے لینے یا دینے ہوتے ہیں یا لیتے دیتے ہیں، شاید درمیان میں بات بھی کر لیتے ہوں گے۔ میں نے قریب جا کر پوچھا کہ کیا آپ کا یہ نام ہے؟ کہنے لگے ہاں! میں نے پوچھا کہ آپ اپنے والد کو روزانہ ایک قرآن پڑھ کر بخشتے ہیں؟ کہنے لگے ہاں! پھر پوچھنے لگے آپ کو کیسے پتہ لگا؟ میں نے کہا کہ تمہارے والد نے بتلایا ہے اور وہ کشف کا واقعہ ذکر کیا۔ اس نے کہا صحیح ہے، یہی میرا نام ہے، اور میں حافظ قرآن ہوں، اور روزانہ ایک قرآن ختم کرتا ہوں۔ اتنا پکا تھا حافظ قرآن کا۔ کچھ عرصہ کے بعد یعنی سال دو سال کے بعد وہ بزرگ پھر وہیں سے جا رہے تھے۔ پھر وہی منظر سامنے آگیا۔ اب دیکھا کہ وہ کرسی والا شخص بھی دوسروں کے ساتھ چننے میں مصروف ہے۔ بزرگ نے پوچھا اب آپ بھی ان کے ساتھ چن رہے ہیں؟ تو وہ کہنے لگا کہ میرا وظیفہ ختم ہو گیا ہے۔ میری پنشن بند ہو گئی۔ اس لئے کہ میرے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔

تو ایک تمہارے بچے جو حفظ کریں گے جب تک وہ نابالغ ہیں ان کا اپنا نامۂ عمل نہیں، ان کا اپنا کھاتہ نہیں۔ وہ تمہارے کھاتے میں لکھا جائے گا۔ اور پھر تمہارے مرنے کے بعد وہ پڑھیں گے وہ تمہاری پنشن بن جائے گی۔ لیکن

مسلمانوں کے دل میں اس کی قیمت نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں بھی لوگ مختلف ہیں۔ کسی نے ناظرہ قرآن پڑھوایا وہ بہت ہے، کسی نے تھوڑا بہت پڑھوایا، اور کچھ اللہ کے بندے ایسے ہیں جو حفظ میں ڈال دیتے ہیں۔ یوں کہہ لو کہ کچھ لڑکوں کو تم نے دنیا کے لئے پڑھایا اور ایک کو اپنی آخرت اور اپنی قبر کے لئے پڑھادو۔

خوش قسمت لوگ

اور کچھ اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ ان کا ہر ایک بیٹا حافظ قرآن ہے، یہ ہمارے ہاں صدیقی صاحب انگلینڈ سے آتے ہیں، احسن صاحب کے ماموں ہیں۔ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ بتلاتے ہیں کہ ہم سات بھائی ہیں۔ ساتوں کو ہمارے والد صاحب نے حافظ بننے کے لئے بٹھایا، پھر ساتوں کو دارالعلوم دیوبند میں عالم بننے کے لئے بٹھایا۔ ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ ہمارے کاندھلے میں (حضرت شیخ کا قصبہ کاندھلہ تھا)۔ ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ جن کی تبلیغی کتابیں ہر مسجد میں پڑھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ کاندھلے کی ہماری آبائی مسجد میں پوری صف حافظوں کی ہوتی تھی، ایک بے چارہ موذن تھا جس کو قرآن مجید یاد نہیں تھا۔اس کو ہم کہا کرتے تھے کہ تو نے گنوادیا حفظ نہیں کیا۔ نہیں تو ساری کی ساری حافظوں کی صف تھی۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائے (آمین)۔

ان کو رمضان المبارک میں قرآن مجید سننے کا اہتمام تھا ادھر گھر میں تو کیا اردگرد میں بھی کوئی حافظ نہیں تھا رمضان المبارک آتا تو ہم لوگ حافظوں کو

ڈھونڈنے کے لئے نکلتے، کسی کی ڈاڑھی نہیں ہے، کوئی پیسے لیتا ہے، کوئی غلط پڑھتا ہے، یعنی مجہول پڑھتا ہے، بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ میرے والد ماجدؒ ہمیشہ فرماتے مولوی صاحب! تم نے ہی یاد کرلیا ہوتا، اللہ نے ان کی دعا کی برکت سے مجھے بھی یاد کرادیا اور ان کی توجہ کی برکت سے خاندان میں الحمدللہ ان کی اولاد میں ۲۵ حافظ ہیں۔ تھوڑا تھوڑا بھی بخشیں تو ان کا کام بن جائے گا۔ الحمدللہ۔ الحمدللہ۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ تقریر میں فرمایا کرتے تھے کہ میرے اتنے دوست ہیں، اگر کسی کی ماں کے ۴ بیٹے ہوں ہر ایک تھوڑا تھوڑا ٹکڑا چھوڑ دے تو ماں کا پیٹ بھر جاتا ہے، تم میرے اتنے دوست ہو تھوڑا تھوڑا بھی بخش دو گے تو ان شاء اللہ کام چل جائے گا۔ یہ امام الاولیاءؒ فرماتے تھے، ہاں امام الاولیاءؒ! یہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں آخرت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں جاکر پتہ چلے گا کہ اس کی کتنی ضرورت ہے۔ دنیا سے زیادہ ضرورت تھی یہاں کی۔ تو بھئی اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔ اپنی کتاب کا تعلق نصیب فرمائے۔ اپنی کتاب کی محبت نصیب فرمائے۔ اپنی کتاب کی عظمت نصیب فرمائے۔ اس کی تلاوت ہمیں نصیب فرمائے اور اس کا فہم ہمیں نصیب فرمائے۔

دعا ختم قرآن

آخر میں ختم قرآن کی دعا کا ترجمہ کرتا ہوں، یہ دعا قرآن کے آخر میں سورۃ الناس کے بعد لکھی ہوئی ہوتی ہے، وہ دعا یہ ہے۔

"اللھم آنس وحشتی فی قبری"

"اے اللہ میری قبر میں وحشت کو انس سے تبدیل کردے"۔

وحشت کہتے ہیں کہ کوئی پاس نہیں ہے، اکیلا تنہا ہے، اکیلا حیران پریشان ہے۔ یا اللہ قبر کی تنہائی کو اور وحشت کو انس سے بدل دے، کہ کوئی دوست احباب وہاں بھی بات چیت کرنے والے ہوں۔ یہاں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ اللہ والے وہاں اکیلے نہیں رہتے، وہاں بھی ان کے ساتھ بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔

"اللھم ارحمنی بالقرآن العظیم"

"یا اللہ مجھ پر رحم فرما عظمت والے قرآن کریم کے ذریعہ سے"۔

"واجعلہ لی اماما ونورا وھدی ورحمۃ"

"یا اللہ بنادے اس کو میرے لئے امام۔ امام آگے ہوتا ہے مقتدی پیچھے ہوتے ہیں۔ قرآن آگے آگے چلے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ اور اس کو ہمارے لئے نور بنادے اور اس کو ہمارے لئے ہدایت کا ذریعہ بنادے اور اس کو ہمارے لئے رحمت بنادے"۔

"اللھم ذکرنی منہ مانسیت وعلمنی منہ ماجھلت"

"یا اللہ یاد کرادے مجھے اس میں سے جو کچھ میں بھول گیا ہوں اور سکھادے مجھے اس میں سے جو کچھ میں نہیں جانتا"۔

"وارزقنی تلاوتہ آناء الیل وانا ء النھار وجعلہ

لی حجة یارب العالمین"

ترجمہ: "اور مجھ کو نصیب فرما اس کی تلاوت دن کی گھڑیوں میں اور رات کی گھڑیوں میں، دن اور رات تلاوت کیا کروں یہ نصیب فرما اور بنادے اس کو میرے لئے حجت قیامت کے دن"۔

حدیث میں ہے کہ:

"والقرآن حجة لک اوعلیک" (مشکوٰۃ صفحہ ۳۸)

"یعنی قرآن حجت ہوگا تیرے لئے، یا تیرے خلاف"۔

یہ حدیث شریف کا ایک ٹکڑا ہے، پوری حدیث یہ ہے کہ:

"عن ابی مالک الاشعری رضی اللہ عنه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم، الطہور شطر الایمان، والحمد للہ تملاء المیزان، وسبحان اللہ والحمدللہ تملان اوتملاء مابین السموات والارض، والصلوة نور، والصدقة برهان، والصبر ضیاء، و القرآن حجة لک اوعلیک، کل الناس یغدو، فبائع نفسه، فمعتقها اوموبقها"

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ صفحہ ۳۸)

ترجمہ: "حضرت ابومالک اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

پاک رہنا آدھا ایمان ہے، اور الحمد للہ کہنا اعمال کی ترازو کو بھر دیتا ہے، اور سبحان اللہ والحمد للہ بھر دیتے ہیں۔ یا فرمایا کہ ہر کلمہ بھر دیتا ہے۔ آسمان وزمین کے درمیان کے خلاء کو، اور نماز نور ہے، اور صدقہ (ایمان کی) دلیل ہے، اور صبر کرنا روشنی ہے، اور قرآن حجت ہے تیرے لئے یا تیرے اوپر، ہر ایک شخص صبح کرتا ہے، پس بیچتا ہے اپنی جان کو، پس اس کو آزاد کرتا ہے یا اس کو ہلاک کرتا ہے"۔ (ماخوذ از مظاہر حق صفحہ ۱۱۰ جلد ۱)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ قرآن کریم تیرے لئے حجت بنے گا قیامت کے دن یا تیرے خلاف حجت بنے گا۔ اب دعا کرو کہ حق تعالیٰ شانہ اس دعا کو ہم سب کے حق میں قبول فرمائے۔

تلاوت قرآن کی عادت ڈالنے کا طریقہ

دیکھو قرآن کریم کی تلاوت کیا کرو۔ میں نے درجے بیان کردئے ہیں قرآن پاک کی تلاوت کے، اور میں نے کہا کہ سب سے آخری درجہ کم سے کم یہ ہے کہ روزانہ ایک پارہ کی تلاوت کی جائے تو آخری درجہ پر تو آجاؤ۔ پرائمری پاس ہو تو اس کو تعلیم یافتہ نہیں کہتے۔ تعلیم یافتہ کا لفظ بولا جاتا ہے میٹرک کے بعد۔ یعنی میٹرک کے بعد اس کو تعلیم یافتہ کہتے ہیں۔ جس نے دو چار جماعتیں پڑھی ہوں اس کو تعلیم یافتہ نہیں کہتے۔ ایک دو رکوع اگر پڑھو گے تو قرآن کریم کی تلاوت کرنے والوں میں نام آئے گا، اپنا نام تبدیل کرواؤ، کم سے کم آخری درجے پر تو آجاؤ۔ شروع شروع میں چلو پرائمری ہی سہی۔ پرائمری کروگے تو

میٹرک بھی کرلو گے۔ پہلے پرائمری کرو گے پھر مڈل کرو گے پھر میٹرک ہو گا، تو بھئی شروع شروع میں اگر زبان نہیں چلتی تو تھوڑا پڑھو، پاؤ آدھ پاؤ، لیکن پڑھتے جاؤ۔

تم دنیا کے معاملات میں تو ترقی پر ترقی چاہتے ہو، لیکن آخرت کے معاملے میں، دین کے معاملے میں، قبر کے معاملے میں، حشر کے معاملے میں، اتنی تو ترقی کرو کہ پہلی جماعت سے ہی شروع کرو، یعنی ایک دو رکوع سے ہی شروع کرو، لیکن اس کو معمول بنالو۔ روزانہ کا۔ اپنی خوراک بنالو، قرآن کریم تمہاری خوراک بن جائے اور پھر اس پر ترقی کرتے کرتے تمہارا نمبر یہاں تک آجائے کہ ایک پارے کی تلاوت تمہاری خوراک بن جائے۔ اور پھر اس سے آگے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمادے۔ میرے والد ماجدؒ (اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے) حج کے لئے تشریف لے گئے تھے، مجھے بھی ساتھ لے گئے، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ہمیں کافی روز ٹھہرنا پڑا، الحمدللہ پورے سفر میں چار مہینے لگ گئے۔ والد صاحب کا پورے سفر میں ۱۵ پارے کا معمول تھا، ایک دن مجھے کہنے لگے کہ مولوی صاحب کچھ سر میں درد رہتا ہے، میں نے کہا جی ذرا تلاوت تھوڑی کم کردیجئے۔ حفظ نہیں تھا، اور ایسے ہی پرانے زمانے میں میاں جی سے پڑھا تھا، پورا صحیح بھی نہیں تھا لیکن پندرہ پارے روزانہ کا معمول تھا۔ دوسرے دن قرآن کریم ختم کرتے تھے۔ میرے کہنے پر پانچ پارے کم کردئے اور روزانہ دس پارے کا معمول بنالیا تھا، یہ تو سفر حج کا معمول رہا اور رمضان المبارک میں روزانہ کا دس پارے کا معمول تھا۔

لہٰذا تم چاہو تو ترقی کرسکتے ہو مگر تھوڑی ہمت کرو۔ دل میں شوق پیدا کرو۔ اور جب یہ چاٹ لگ جائے گی تو ان شاء اللہ چھوٹے گی نہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق

عطا فرمائے۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد

وآلہ واصحابہ اجمعین

حقوق اللہ

اور ذکر اللہ کی فضیلت

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ

فہرست ذکر اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حقوق اللہ

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیاٰت اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھدان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا، امابعد!

فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الخطبۃ التی خطبھا فی اول جمعۃ صلاھا بالمدینۃ فی سالم بن عوف: "خذوا بحظکم ولا تفرطوا فی جنب اللّٰہ ، قد علمکم اللّٰہ کتابہ، ونھج لکم سبیلہ، لیعلم الذین صدقوا ویعلم الکاذبین، فاحسنوا کما احسن اللّٰہ الیکم، وعادوا

اعدائه، وجاهدوا فی اللّٰه حق جهاده، هو اجتباکم وسماکم المسلمین........"

(حیات الصحابہ جلد۳ صفحہ۲۹۶، بدایہ والنہایہ جلد۳ صفحہ ۲۱۳)

ترجمہ: "اپنا حصہ لے لو، اور اللہ تعالیٰ کے معاملے میں کوتاہی نہ کرو، اس نے تمہیں اپنی کتاب کی تعلیم فرمادی ہے، اور تمہارے لئے اپنا راستہ واضح کردیا ہے، تاکہ وہ جان لے کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں، پس تم احسان کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا ہے، اور اس کے دشمنوں سے دشمنی رکھو، اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرو جیسا کہ اس کے راستے میں جہاد کا حق ہے، اس نے تم کو چن لیا ہے، اور تمہارا نام مسلمان رکھا ہے، تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہے وہ دلیل کے واضح ہونے کے بعد ہلاک ہو، اور جس کو زندگی حاصل کرنی ہے وہ دلیل کے واضح ہونے کے بعد جئے، اور نہیں ہے کوئی قوت مگر اللہ تعالیٰ (کی توفیق) کے ساتھ"۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا خطبہ جمعہ ہے، اس خطبہ میں پہلے ارشاد فرمایا تھا کہ "اللہ کا تقویٰ (اللہ سے ڈرنا) اس کی ناراضگی سے بچاتا ہے، اس کے غصہ سے بچاتا ہے، اس کی سزا سے بچاتا ہے، اور اللہ سے ڈرنا چہروں کو سفید کرتا ہے، رب کو راضی کرتا ہے، اور درجے کو بلند کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ جملے ہیں جو میں نے اس وقت پڑھے ہیں ان میں ارشاد فرمایا: "اپنا حصہ لے لو، اور اللہ کے معاملہ میں کوتاہی نہ کرو"۔ "اپنا حصہ لے لو" یعنی

اعمال کا حصہ یہاں سے حاصل کر کے جاؤ، دنیوی زندگی میں تمہارا حصہ، جو تمہیں مرنے کے بعد کام آئے گا یہی اعمال صالحہ ہیں، اسی طرح جو مال تم نے رضائے الٰہی کے لئے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کر دیا وہ تمہارا حصہ ہے، لہٰذا جب دنیا سے جاؤ تو یہاں سے اپنا حصہ وصول کر کے جاؤ۔

اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کوتاہی نہ کرو

"اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کوتاہی نہ کرو"۔ قیامت کے دن کافر کہیں گے کہ:

"یحسرتی علی ما فرطت فی جنب اللّٰہ وان کنت لمن السخرین" (الزمر:٥٦)

ترجمہ: "ہائے میری حسرت! اس پر جو کوتاہی کی میں نے اللہ کے معاملہ میں، اور بے شک میں تھا ہنسی کرنے والوں میں سے"۔

پس اللہ کے معاملہ میں کوتاہی نہ کی جائے، اور اس کے معاملہ میں کسل یعنی سستی سے کام نہ لیا جائے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں اور چیزوں سے پناہ مانگتے تھے، وہاں اس چیز سے بھی پناہ مانگتے تھے کہ یا اللہ میں کسل سے تیری پناہ چاہتا ہوں، کسل کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرنے کے معاملے میں سستی کا برتاؤ کرنا، سستی سے کام لینا۔

ایمان و یقین لانے میں کوتاہی

اللہ تعالیٰ کے معاملے میں سستی کرنا، اس کی ایک صورت تو سب سے بڑی

کفار میں پائی جاتی ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائے، اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر، اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر، اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر، اللہ تعالیٰ کے احکام پر ایمان نہیں لائے، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ چیز اللہ تعالیٰ نے ہمیں نصیب فرمادی، یعنی ایمان، یہ بہت بڑی دولت ہے اور اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے، لیکن ایمان کے بھی مختلف درجات ہیں، ایمان، ایمان میں بھی فرق ہے، تو کوشش کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کے درجات میں ترقی عطا فرمائے اور ہمیں کامل ترین ایمان نصیب فرمائے آمین۔ محنت بھی کرنی چاہئے، دعا بھی کرنی چاہئے۔

فرائض میں کوتاہی

ایمان کے بعد دوسرا درجہ اعمال کا ہے، اور اعمال میں سے سب سے اول فرائض کا درجہ ہے، نماز فرض ہے، روزہ فرض ہے، زکوٰۃ فرض ہے، اگر مالی و بدنی استطاعت ہے تو حج فرض ہے، اسی طرح جو حقوق واجبہ ہیں، ان کے ادا کرنے میں سستی نہ کی جائے۔

ہم سے جو فرائض و واجبات ادا کرنے میں غفلت ہو جاتی ہے، کوتاہی ہو جاتی ہے، یہ اس لئے ہوتی ہے کہ ہمیں ان فرائض و واجبا کی اہمیت کا اندازہ نہیں، اور ان کو ترک کرنے کے وبال کا احساس نہیں، اگر ہمیں معلوم ہو کہ ان فرائض میں کوتاہی کرنے سے ہمارا کتنا نقصان ہو رہا ہے تو ہم ان کے بجالانے میں کبھی سستی نہ کریں، کبھی سستی نام کو بھی نہ آئے، اور برا ماحول بھی سستی پیدا کرتا ہے، اچھا خاصہ دین دار آدمی اگر بے دین لوگوں میں چلا جائے، جن کو دین کی پرواہ نہیں، تو یہ بھی ڈھیلا ہو جائے گا، اور ایک آدمی جو دین کے اعتبار

سے سُست ہے، اگر اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے اور وہ کسی اچھی محفل میں چلا جائے، اچھے ماحول میں چلا جائے، وہاں اس کو کچھ وقت گزارنے کا موقع ملے تو اس کی سستی بھی کافور ہو جائے گی، ہمارے وہ نوجوان جو پانچ وقت کی نماز بھی نہیں پڑھتے، جب تبلیغ میں نکلتے ہیں تو تہجد بھی پڑھنے لگتے ہیں، اور چند دن میں تہجد گزار بن جاتے ہیں، اس لئے کہ ان کو مسجد کا پاکیزہ ماحول ملا ہے، اور معاشرے کے گندے ماحول سے ان کو نکلنے کا موقع ملا ہے، اس وقت تو ان کا ماحول محدود ہوتا ہے، شب و روز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سننا سنانا ہوتا ہے، ذکر ہے، تسبیح ہے، نماز ہے، دعوت ہے، الغرض تبلیغ میں نکلنے کے بعد آدمی کو سراپا خیر کا ماحول مل جاتا ہے، اور آدمی کے مزاج پر اس ماحول کے اثرات پڑتے ہیں، اس لئے میں اپنے عزیز نوجوانوں کے لئے تبلیغ میں نکلنے کو ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ یہاں کے زہریلے ماحول نے ان کے مزاج میں جو زہریلے اثرات پیدا کردیئے ہیں تبلیغ میں نکل کر ان کے مزاج کی اصلاح ہو جائے، اور اس زہر کا تریاق مہیا ہو جائے۔

نیک اعمال میں کوتاہی

اور تیسری قسم کی سستی یہ ہے کہ ان چیزوں میں کوتاہی جو فرض نہیں ہیں، واجب نہیں ہیں، فرائض اور واجبات کو تو آدمی ادا کرتا ہے، لیکن دوسری جو عبادتیں ہیں نفلی، ان میں نفس کہتا ہے، چلو یہ چیز کوئی فرض تو نہیں، نہ کرو، لیکن قیامت کے دن معلوم ہوگا کہ ہم نے کتنی دولت کھودی، اور ہمارے نفس نے تساہل پسندی اور سستی سے کام لے کر کتنا خسارہ اٹھایا، اس لئے اس معاملے میں بھی جہاں تک اپنے امکان میں ہو سستی نہ کی جائے، فرائض کے بعد نوافل

ادا کرنے میں اور دوسرے نیک کام کرنے میں، اگرچہ یہ چیز فرائض میں شامل نہیں، مگر آخرت کا ذخیرہ جمع کرنے کے لئے ضروری ہے۔

مرنے والے کی حسرت

ایک حدیث میں ہے:

"قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مامن احد یموت الا ندم قالوا وما ندامتہ یا رسول اللّٰہ ! قال ان کان محسنا ندم ان لایکون ازداد وان کان سیئا ندم ان لایکون نزع۔ رواہ الترمذی" (مشکوٰۃ: ۴۸۴)

ترجمہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بھی مرتا ہے اس کو ندامت ضرور ہوتی ہے، چاہے نیک ہو، چاہے بد ہو، اچھا ہو، یا برا ہو، پھر اس کی تشریح فرمائی کہ نیک آدمی کو یہ حسرت ہوتی ہے کہ اس نے زیادہ سے زیادہ نیکیاں کیوں نہ جمع کرلیں، اور برے آدمی کو حسرت ہوتی ہے کہ وہ برائیوں سے کیوں باز نہ آیا، اور اس نے توبہ و استغفار سے تدارک کیوں نہ کرلیا۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۴۸۴)

الغرض نیک آدمی کو بھی یہ حسرت ہوتی ہے، کیونکہ وہاں نیکیوں کا سکہ چلے گا، اب جس کی جیب میں جتنے پیسے ہیں وہ اتنی ہی چیزیں خرید سکتا ہے، اور وہاں چیزیں بہت سستی ہیں، بہت سستی ملتی ہیں، لیکن جیب میں پیسے بھی تو ہوں، تو اس وقت آدمی للچائے گا اور اس کو یہ حسرت ہوگی کہ اے کاش! میں زیادہ سے

زیادہ نیکیاں لے کر آتا، تو آج زیادہ سے زیادہ یہاں کی چیزیں خرید سکتا، وہاں کی چیزیں کیا ہیں؟ جنت کے درجات، وہاں نیکیوں کے حساب سے درجات ملیں گے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نصیحت فرماتے ہیں کہ دنیا سے اپنا نیکیوں کا حصہ لے کر جاؤ، اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں سستی اور کوتاہی نہ کرو۔

سچوں اور جھوٹوں کے درمیان امتیاز

اس کے بعد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب تم کو سکھادی ہے، اور اپنے تک پہنچنے کا راستہ تمہارے سامنے کھول دیا ہے، ہدایت کو واضح کردیا ہے" اب چلنا تمہارا کام ہے، اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے رہو، اور چلتے رہو اور یہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے کیا ہے "تاکہ اللہ تعالیٰ ظاہر کردے ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور ظاہر کردے جھوٹوں کو"۔ سچے اور جھوٹے الگ الگ ہوجائیں۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ سچے اور جھوٹے کے درمیان فیصلہ کردیتے ہیں، لیکن اصل فیصلہ قیامت کے دن ہوگا، جب یہ اعلان ہوگا: "وامتازوا الیوم ایھا المجرمون" (سورۃ یٰسین)
"اے مجرمو! تم الگ ہوجاؤ"۔

نعوذ باللہ، ثم نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھیں۔ جب حکم ہوگا کہ اے مجرمو الگ ہوجاؤ! مجرم فرماں برداروں سے الگ ہوجائیں گے، تو اس وقت سچے اور جھوٹے کے درمیان پورا امتیاز ہوجائے گا۔ حق تعالیٰ شانہ ہماری پردہ دری نہ فرمائے اور ہماری حالت پر رحم فرمائے آمین۔

مخلوق کے ساتھ انصاف کرو

آگے فرمایا "تو تم بھی احسان کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے احسان کیا تم پر"

قرآن کریم میں قارون کی قوم کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ قارون کو نصیحت کرتے ہوئے لوگوں نے یہ کہا "اس خزانے پر اتراؤ نہیں، اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں فرماتے، تم اپنے اس خزانے اور مال و دولت کے ذریعہ آخرت کا گھر تلاش کرو، اور دنیا میں جتنا تمہارا حصہ ہے اس کو نہ بھولو"۔ دنیا میں تمہارا اتنا حصہ ہے، دو روٹیاں کھالیں، کپڑا پہن لیا، رہنے کا مکان ہو ٹوٹا پھوٹا، تمہاری جو بنیادی ضروریات ہیں، جن پر زندگی کا مدار ہے یہی تمہاری ہیں اور بس، اس سے زیادہ تمہارا کچھ نہیں"۔ حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ:

"یقول ابن آدم مالی، مالی قال وهل لك یا بن آدم الا یا اکلت فافنیت اولبست فابلیت اوتصدقت فامضیت" (مشکوۃ صفحہ ۴۴۰)

"آدم کا بیٹا کہتا ہے میرا مال، میرا مال، آدم کے بیٹے! تیرا مال نہیں مگر وہ جو تو نے کھالیا، کھاکر ختم کردیا، پہن لیا، پہن کر بوسیدہ کردیا، یا صدقہ کرکے آگے بھیج دیا اور اپنے لئے ذخیرہ کردیا، اس کے علاوہ جتنا مال ہے وہ تیرا نہیں ہے تجھے غلط فہمی ہے یہ تو دوسروں کا ہے"۔

تو قارون کی قوم اسے نصیحت کررہی ہے کہ جو مال اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمایا ہے، اس سے آخرت خریدو، ایک بات، دوسری بات یہ کہ دنیا میں جتنا تمہارا حصہ ہے اس کو نہ بھولو کہ تمہارا حصہ بس اتنا ہی ہے، اس سے زیادہ نہیں ہے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا ہے تم بھی دوسروں پر احسان کرو، اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے تم دوسروں کو دو، اور یہ نہ سمجھو کہ دوسروں کو دوں گا تو میرے پاس کیا رہ جائے گا۔ اپنی ضرورت رکھ کر باقی دوسروں کو دے

دو، حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحب زادی ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ خرچ کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا کہ میں گھر میں صدقہ وغیرہ کر سکتی ہوں؟ فرمایا ہاں کر سکتی ہو اور پھر فرمایا:

"ولا تحصی فیحصی اللّٰہ علیک ولا توعی فیوعی اللّٰہ علیک"۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۱۲۴)

ترجمہ: "اور گن گن کر نہ دیا کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ بھی گن گن کر دیا کرے گا اور بند کر کے نہ رکھا کر، ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر بند کر دے گا"۔

اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان گنت دیا ہے، تم بھی ان گنت دو، اللہ تعالیٰ نے تم کو فیاضی سے دیا ہے تم بھی فیاضی سے دو، اللہ تعالیٰ نے تم کو طاقت دی ہے، اس طاقت کو لوگوں کی بھلائی پر خرچ کرو، مال دیا ہے مال کو خرچ کرو اللہ تعالیٰ کے بندوں کی بھلائی کے لئے۔ اسی طرح جتنی صلاحیتیں اور قوتیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہیں ان کو خلق خدا پر خرچ کرو اور ان پر رحم کرو۔ مشہور حدیث ہے:

"الخلق عیال اللّٰہ فاحب الخلق الی اللّٰہ من احسن الی عیالہ"۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۴۲۵)

ترجمہ: "مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے، پس اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سے سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کنبے کے ساتھ سب سے زیادہ حسن سلوک کرنے والا ہو"۔

ایک اور حدیث میں ہے:

"الراحمون یرحمھم الرحمن، ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء" (مشکوٰۃ صفحہ ۴۲۳)

ترجمہ: "رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا"۔

تم زمین والوں کے ساتھ حسن سلوک کرو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ حسن سلوک کرے گا۔

اللہ کے دشمنوں سے دشمنی رکھو

اس کے بعد فرمایا: وعادوا اعدائہ "اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے دشمنی رکھو"۔ اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے محبت رکھو، اگر اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی نہیں تو تمہیں پاس محبت نہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے دشمنی نہیں تو پاس غیرت نہیں ہے، اور یہ دونوں علامتیں ہیں ضعف ایمان کی اور اللہ تعالیٰ سے کمزور تعلق کی۔ ایک حدیث میں ہے:

"من احب للّٰہ، وابغض للّٰہ، واعطی للّٰہ، ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان"۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۱۴)

ترجمہ: "جس نے محبت کی اللہ کے لئے، اور دشمنی کی اللہ کے لئے، اور جس نے دیا اللہ کے لئے اور نہ دیا اللہ کے لئے، اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا"۔

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ:

"ان احب الاعمال الی اللّٰہ تعالٰی الحب فی اللّٰہ والبغض فی اللّٰہ۔ رواہ احمد" (مشکوٰۃ: ۴۲۷)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کو سب اعمال میں سے سب سے زیادہ محبوب عمل ہے اللہ کی خاطر کسی سے محبت رکھنا اور اللہ تعالیٰ کی خاطر کسی سے بغض رکھنا"۔

افسوس ہے کہ ہمارے یہاں یہ چیز مفقود ہے، کیونکہ ہمارا رابطہ اللہ تعالیٰ سے مفقود ہے یا کمزور ہے، جب کہا جاتا ہے، کہ فلاں قسم کے لوگوں کے ساتھ لین دین نہ کرو، تو کہتے ہیں کہ کافروں کے ساتھ بھی تو لین دین کی اجازت ہے، جب کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو جو دین اسلام کے باغی ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں مثلاً مرزائی، ان کو اپنی تقریبات میں نہ بلاؤ اور خود ان کی تقریبات میں نہ جاؤ، تو آپ لوگ بہانہ بنالیتے ہیں، اور میں ویسے بھی آپ لوگوں کو جیل تو نہیں بھجوادوں گا، (میرے سامنے بہانے بنانے کی کیا ضرورت ہے؟) لیکن اگر کل اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کرلیا کہ میرے دشمنوں سے کیوں تعلق رکھا تھا تو پھر کیا جواب ہوگا؟ وہ جواب سوچ کر لے جائیے۔

غرضیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: "عادوا اعدائہ" "اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے دشمنی رکھو"۔

اللہ کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ دشمن سے دوستی رکھنے والا دشمن ہوتا ہے، اور دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے، گویا تم اللہ کے دشمنوں سے دوستی کرکے اللہ تعالیٰ سے اپنی دشمنی کا اعلان کرتے ہو، تم اپنے دنیاوی تعلقات میں ایسے لوگوں سے تو قطع تعلق کرلیتے ہو جو تمہارے

دشمنوں سے دوستی رکھتے ہوں، تم ان کے یہاں نہیں جاتے، کیونکہ وہ فلاں فلاں آدمی سے تعلق رکھتا ہے جس کے ساتھ تمہارے تعلقات کشیدہ ہیں، تمہاری انا اس کو برداشت نہیں کرتی کہ تم اپنے دشمنوں کے ساتھ تعلق رکھنے والوں سے تعلق رکھو، تو ذرا سوچو کہ اللہ تعالیٰ کی غیرت اس چیز کو کیسے برداشت کرے گی کہ تم اس کے دشمنوں سے تعلق رکھو۔

اللہ کے راستہ میں جہاد کرو

آگے ارشاد فرمایا کہ: "وجاھدوا فی اللّٰہ حق جھادہ" "اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو جیسا کہ حق ہے اس کے راستے میں جہاد کرنے کا"۔

اس کے راستے میں جہاد کرنے کا کیا حق ہے؟ کہ جان کا نذرانہ پیش کرنے کی ضرورت ہو تو جان ہتھیلی پر رکھ کر پیش کردو۔ اور کہو کہ ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ایک جہاد میں دو صحابیؓ گئے، ایک کہنے لگے کہ میں دعا کرتا ہوں تم آمین کہو اور تم دعا کرو تو میں آمین کہوں گا۔ ایک نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ یا اللہ! کل کافروں سے مقابلہ ہونے والا ہے، میرے مقابلہ میں بڑا سا کافر آئے، جو اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت دشمن ہو، میرا اس سے سخت مقابلہ ہو، پھر مجھے اس پر فتح نصیب فرمائیں اس کو قتل کردوں، دوسرے نے کہا آمین، اب دوسرے نے ہاتھ اٹھائے اور کہا کہ یا اللہ! کل مقابلہ ہونے والا ہے، پہلے میں کافروں کو قتل کردں، اس کے بعد مجھ کو جام شہادت نصیب فرما، میں تیرے راستے میں شہید ہوجاؤں، جب آپ قیامت کے دن مجھ سے پوچھیں کہ

تجھے کیوں زخمی کیا گیا، کیوں قتل کیا گیا، کیوں تیرے تلوار ماری گئی، کیوں تجھے نیزہ لگایا گیا؟ تو میں کہوں یا اللہ یہ آپ کی خاطر کیا گیا ہے، صرف آپ کی خاطر آپ کے نام کے لئے۔ جیسے حضرت مرزا جان جاناں قدس سرہ نے اپنے احباب سے فرمایا تھا کہ ہماری قبر پر یہ شعر لکھ دینا ؎

بہ لوح تربت ما یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول راجز بے گناہی نیست تقصیرے

"ہماری تربت کی لوح پر لوگوں کو غیب سے یہ تحریر لکھی ہوئی ملی کہ یہ جو اس قبر میں مقتول پڑا ہوا ہے بے گناہی کے سوا اس کا اور کوئی گناہ نہیں تھا"۔

حضرت قدس سرہ کو شیعوں نے شہید کر دیا تھا، مغرب کے بعد گھر میں گھس گئے اور ذبح کر دیا، شہید فی سبیل اللہ ہو گئے۔

غرضیکہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا یہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں جان و مال پیش کر دو۔ جان مانگے تو جان حاضر، مال کا نذرانہ مانگے تو مال حاضر، قوتوں اور صلاحیتوں وغیرہ کا نذرانہ مانگیں وہ حاضر، وقت مانگیں وہ حاضر، جو مانگیں وہ حاضر، کیونکہ جو کچھ بھی مانگا ہے انہی کی امانت ہے۔

اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی جان و مال کو خرید چکا ہے

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"ان اللّٰہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ، یقاتلون فی سبیل اللّٰہ فیقتلون ویقتلون"

ترجمہ: "بے شک اللہ نے خرید لیا ہے ایمان والوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بدلے میں کہ ان کے لئے جنت ہے، جہاد کرتے ہیں اللہ کے راستے میں اپنے مالوں کے ساتھ بھی، اپنی جانوں کے ساتھ بھی، قتل کرتے ہیں اور خود بھی قتل ہوجاتے ہیں"۔

دوسرے لوگوں میں سے کوئی برادری کے لئے قتل ہوتا ہے، کوئی جاہ و منصب کے لئے قتل ہوتا ہے، اور مومن محض اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے قتل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی جان و مال کو خرید لیا اور ان کی قیمت ادا کی جاچکی ہے، یعنی جنت۔

آگے فرمایا:

"وعدا علیہ حقا فی التوراۃ والانجیل والقرآن ومن اوفی بعھدہ من اللّٰہ فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہ وذلک ھو الفوز العظیم" (التوبہ: ۱۱۱)

ترجمہ: "یہ اللہ کے ذمہ سچا وعدہ رہا، تورات میں بھی، انجیل میں بھی، اور قرآن میں بھی، اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ سو تمہیں خوش ہوجانا چاہئے اللہ کے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے۔ اور یہ ہے بڑی کامیابی"۔

جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو صحابہؓ نے کہا واہ! واہ! واہ! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا واہ، واہ؟ صحابہ کرامؓ نے کہا کہ یا رسول

اللہ! اللہ تعالیٰ خود ہی فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے ہماری جان و مال کا سودا کرلیا ہے، اللہ کی قسم نہ ہم اس سودے کو خود توڑیں گے، نہ توڑنے دیں گے، اب وہ سودا ہوچکا، پکا رہے گا، جو چیز اللہ تعالیٰ نے خریدی ہم اس کو پیش کرنے کے لئے حاضر ہیں، اللہ اس سودے کو کیوں توڑیں گے؟ بھئی یہ مطلب ہے اس ارشاد کا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو جیسا کہ حق ہے اس کے راستے میں جہاد کرنے کا" مالک کی طرف سے جس چیز کا مطالبہ ہو اس کے لئے تیار ہوجاؤ، کسی تردد اور پریشانی کی ضرورت نہیں، آگے پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہیں، کوئی جان، مال، عزت، آبرو سے محبت کی ضرورت نہیں، بیوی بچوں سے محبت کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے، اور وہ ہم سے خرید بھی چکا ہے، اور اس کی قیمت بھی ادا کرچکا ہے۔ صحابہ کرامؓ ایسے ہی کیا کرتے تھے، صحابہ کرامؓ کو جو اللہ نے چمکایا اسی بات پر چمکایا، حضرت جی مولانا محمد یوسفؒ فرماتے تھے کہ ہم لوگ جب مسجد میں جاتے ہیں تو گھر والوں سے کہہ کر جاتے ہیں کہ چائے بنا کر رکھنا، میں واپس آکر پیئوں گا، اور صحابہ کرامؓ جب مسجد میں جاتے، تو گھر کہہ کر جاتے کہ مسجد میں جارہے ہیں اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کام سے نہ بھیجا تو واپس آجائیں گے، ورنہ انتظار نہ کرنا، تیار ہوکر جاتے تھے۔ اللہ ہمیں بھی اس کا کوئی شمہ نصیب فرمائے۔ اللہ کے دشمنوں سے عداوت ہو، اللہ سے تعلق ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی دل میں عظمت ہو، اور اس محنت پر جو کچھ ملنے والا ہے، اس کی قدر و قیمت دل میں ہو، تو پھر آدمی محض رضائے الٰہی کے لئے ہر قربانی دے سکتا ہے، اور میاں فتویٰ دماغ سے نہیں دل سے لیا جاتا ہے، کسی جگہ دل کا اور کسی جگہ دماغ کا فتویٰ چلتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات آجائے تو

دماغ سے فتویٰ نہ لو، سوچوں میں نہ پڑو، دل سے فتویٰ لو۔

اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے لوگ

اس خطبہ میں آگے ارشاد ہے:

"ھو اجتباکم" "اس نے تمہیں چن لیا ہے"۔

یہ قرآن کی آیت ہے۔ غور کرو اللہ کی مخلوق کتنی پھیلی ہوئی ہے؟ پانچ ارب انسانی مخلوق بتائی جاتی ہے، لیکن ساری مخلوق میں سے اللہ نے تم کو اپنے لئے چن لیا ہے، باقی سب کو چھوڑ دیا، تم اللہ کے چنے ہوئے ہو، اور اس چناؤ پر اس کا جتنا بھی شکر بجالاؤ کم ہے۔ بہت سے لوگ ملازمت کے امیدوار بیٹھے ہوں اور گورنر ہاؤس کی نوکری کے لئے ان میں چند نوجوانوں کو چن لیا جائے اور نگاہ انتخاب خود ہی ان پر پڑجائے، نہ درخواست دی، نہ کسی کی سفارش، نہ رشوت دی۔ مالک نے تمہاری درخواست کے بغیر، سفارش کے بغیر اپنے کام کے لئے تم کو چن لیا، اپنے دین کے لئے تم کو چن لیا، تم اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے ہو، یہ کتنا بڑا اعزاز ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب بھی مجتبیٰ ہے، مصطفیٰ بھی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسولوں کی جماعت میں سے چنے ہوئے ہیں اور تم عام انسانوں کی جماعت میں سے چنے ہوئے ہو۔ اور صحابہ کرامؓ انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعتوں میں سے چنے ہوئے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی رسول نہیں، صحابہ کرامؓ سے بہتر دوسرے رسولوں کے صحابہ نہیں، اور تم سے بہتر دوسرے نبیوں کی امتیں نہیں۔ مجتبیٰ ہیں، یعنی چنے ہوئے ہیں۔

مسلمان: اللہ کا فرمانبردار ہوتا ہے

آگے فرمایا:

"وسماکم المسلمین" "اسی نے تمہارا نام رکھا ہے مسلمان"۔

مسلم کی جمع ہے مسلمین، ہم مسلم ہیں، مسلم کہتے ہیں فرمانبردار کو، اسی لئے لغت کی کتابوں میں اسلام کے معنی ہیں، گردن ڈال دینا، جو کسی کے آگے اپنی گردن ڈال دے، اس کو مسلم کہتے ہیں، اور اللہ نے ہم کو مسلم کہہ دیا، ہماری سعادت ہے، ہماری خوش قسمتی ہے کہ مالک کی طرف سے ہمیں مسلمین کا خطاب دیا جارہا ہے، کہ یہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، یہ تم پر عنایت ہے، نوازش ہے، تم بھی کچھ ان کا لحاظ کرو۔ آگے فرمایا:

"لیھلک من ھلک عن بینة ویحیا من حی عن بینة ولا قوة الا باللہ"

ترجمہ: "یہ اللہ نے اس لئے کیا ہے تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہو وہ حجت اور دلیل قائم ہونے کے بعد ہلاک ہو، اور جس کو زندگی حاصل کرنی ہو وہ بھی دلیل اور حجت کے ساتھ زندگی حاصل کرے اور کوئی طاقت نہیں اللہ کے بغیر"۔

لاؤڈ اسپیکر پر درود و سلام پڑھنا ریاکاری ہے

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہم سفر میں تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور لوگ جوش میں بلند آواز سے تکبیر پڑھ رہے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "لوگو! تم کسی بہرے یا غائب کو

نہیں پکار رہے" آج کل لاؤڈ اسپیکر پر صلوٰۃ و سلام پڑھنے کا رواج چل نکلا ہے، بھئی! صلوٰۃ و سلام پڑھنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ آخر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ کس کو سنانا چاہتے ہو؟ اگر مخلوق کو سناتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم کو ذرہ برابر بھی ثواب نہیں ملے گا؟ بلکہ الٹا موجب وبال ہے، ریاکاری ہے کہ مخلوق کو سنانے کے لئے کرتے ہو؟ اور اگر اللہ کو سنانا چاہتے ہو تو وہ لاؤڈ اسپیکر کا محتاج نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ لاؤڈ اسپیکر تم نے شیطان کے کہنے پر لگایا ہے، اس نے تم کو پٹی پڑھائی ہے تاکہ وہ ریاکاری کے ذریعہ تمہارا ثواب غارت کرے، تمام بدعات کی یہی حالت ہے، میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ سنت میں نور ہوتا ہے اور بدعت میں شور ہوتا ہے، یہ جو گا گا کر صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں ساری زندگی ان کے چہرے پر ڈاڑھی نہیں آتی، ان کو سنت سے کوئی شغف نہیں، ان کو کبھی شرم نہیں آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک نام لے رہے ہیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل بھی بنالیں، "میرے مولا مدینہ بلالو مجھے" یوں ہی گارہے ہیں، یہ تو کنجری بھی گاتی تھی ریڈیو پر، وہ نعت خواں بن گئی، تو ارشاد فرمایا "اے لوگو تم کسی بہرے کو یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو تم اس کو پکار رہے ہو جو سمیع وبصیر ہے، اور جو تمہارے ساتھ ہے، اور جس کو تم پکار رہے ہو وہ تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے"۔ ایک بار صحابہؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا پروردگار ہمارے قریب ہے کہ اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے کہ ہم اس کو پکار کر کہیں اس پر قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی:

"واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب
دعوۃ الداع اذا دعان"

ترجمہ: ''کہ جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو میں قریب ہوں، پکارنے والا جب بھی پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا ہوں''۔

اسی طرح مشکوٰۃ شریف میں ہے:

''قال ابوموسی وانا خلفه اقول لاحول ولا قوۃ الا بالله فی نفسی فقال یا عبد الله بن قیس الا ادلک علی کنز من کنوز الجنة فقلت بلی یا رسول الله! قال: لا حول ولا قوۃ الا بالله''۔

(مشکوٰۃ: ۲۰۱)

ترجمہ: ''حضرت ابو موسیٰ ؓ کہتے ہیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا، اور زیر لب پڑھ رہا تھا لا حول ولا قوۃ الا بالله مجھ سے ارشاد فرمایا ''یا عبد اللہ بن قیس! (ابو موسیٰ اشعریؓ کا نام عبد اللہ بن قیس ہے) تم کو جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ بتاؤں؟'' میں نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور بتائیے! فرمایا لا حول ولا قوۃ الا بالله جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے''۔

''لاحول'' نہیں ہے غلطی اور گناہ سے پھرنے کی طاقت، ''ولا قوۃ'' اور نہ نیکی اور بھلائی پر جما رہنے کی طاقت، ''الا بالله'' مگر اللہ کی توفیق سے'' جو کچھ ہو رہا ہے مالک کی قدرت سے ہو رہا ہے، کوئی گناہ سے بچتا ہے تو اس کی رحمت سے بچتا ہے، کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کی رحمت سے کرتا ہے یہ

معنی ہیں۔ اس کلمہ کے "لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذکر اللہ کی فضیلت

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیٔات اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھدان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا، اما بعد!

"فاکثروا ذکر اللّٰہ واعملوا لما بعد الیوم، فانہ من یصلح مابینہ وبین اللّٰہ یکفیہ اللہ ما بینہ وبین الناس، ذالک بان اللّٰہ یقضی علی الناس ولا یقضون علیہ، ویملک من الناس ولا یملکون منہ، اللّٰہ اکبر ولا قوۃ الا باللہ العظیم"۔

(حیات الصحابہ ج:۳ ص:۳۹۷، بدایہ والنہایہ ج:۳ ص:۲۱۳)

ترجمہ: ”پس تم زیادہ کرو اللہ کا ذکر، اللہ کا ذکر کثرت سے کرو اور آج کے دن کے مابعد کے لئے عمل کرو، اس لئے کہ جو شخص اپنے درمیان کا اور اللہ کے درمیان کا معاملہ درست کرلیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے درمیان اور لوگوں کے درمیان کے معاملے کے لئے کافی ہوجاتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر فیصلہ فرماتے ہیں اور لوگ اس پر فیصلہ نہیں کرتے۔ اور وہ لوگوں پر اختیار رکھتے ہیں، لوگ اس کے مقابلے میں اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔ اور نہیں قوت مگر اللہ عظمت والے کے ساتھ“۔

دین کی بنیادی باتیں

یہ آخری جملے اس خطبہ شریفہ کے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے جمعہ میں دیا تھا۔ اس خطبہ میں چند ضروری اور بنیادی باتوں کی طرف امت کو متوجہ فرمایا، ان میں سے ایک یہ کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو، اللہ کو بہت کثرت سے یاد کیا کرو، اللہ کا ذکر اتنی کثرت سے کیا کرو کہ ذکر الٰہی تمہارے دلوں کی صفت بن جائے، ذکر الٰہی تمہارے دلوں میں پیوست ہوجائے، اور اس کے نور سے تمہارے دل منور ہوجائیں، اور تمہاری روح اس کی لذت وحلاوت سے سرشار اور مست ہوجائے۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا ہے ”حتی یقال انہ مجنون“ یہاں تک کہا جائے کہ یہ تو دیوانہ آدمی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد میں مست اور

دیوانے ہو جاؤ، جیسے آدمی کسی کی محبت میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔ تو کثرت ذکر الٰہی کو اپنا وظیفہ بناؤ، حتی الوسع تمہارا کوئی لمحہ اللہ کے ذکر کے بغیر ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ ذکر زبان سے بھی کرو، دل سے بھی کرو، تنہائی میں بھی کرو، مجلس میں بھی کرو، ہمہ وقت اللہ کا ذکر کرو۔

ذکر کا مفہوم

ذکر کہتے ہیں یاد کرنے کو یا تذکرہ کرنے کو۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی آپ کا ذکر کر رہا تھا یعنی آپ کا تذکرہ کر رہا تھا۔ ذکر کے اصل معنی یاد کے ہیں۔ زبان سے یاد کرنا یہ ہے کہ تمہاری زبان پر اللہ کا نام جاری رہے۔ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کوئی نصیحت کیجئے، مگر نصیحت مختصر سی ہو، بات لمبی نہ ہو کہ لمبی بات بھول جاتی ہے۔

فرمایا: "لا یزال لسانک رطبا من ذکر اللّٰہ" "تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہئے"۔

اگر تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہتی ہے تو بس تمہارا کام ہو گیا۔ پس اپنی زبان کو ذکر الٰہی کا عادی بناؤ، جب بھی تمہیں کوئی موقع ملے فوراً اللہ کو یاد کرو تمہاری زبان پر فوراً اللہ کا ذکر جاری ہو جانا چاہئے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہ کا شعر ہے ؎

اب یہ عالم ہے ذرا بھی جب کبھی خلوت ہوئی
پھر وہی جان تصور، پھر حدیث دل وہی

ذرا سی فرصت مل جائے، کوئی لمحہ مل جائے بس اللہ کے ذکر میں مشغول

ہو جاؤ، یہ ہے کثرت ذکر۔

ذکر کی کثرت مطلوب ہے

قرآن کریم میں بھی اور حدیث شریف میں بھی جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کا حکم فرمایا ہے، مگر اس کے ساتھ کثرت ذکر کی قید بھی لگائی ہے:
"اذکروا اللّٰہ ذکرا کثیرا" "یعنی اللہ کو کثرت سے یاد کرو"۔

ایک جگہ بھی یہ نہیں فرمایا کہ نماز کثرت سے پڑھا کرو، اور دوسری عبادتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ قید نہیں لگائی کہ کثرت سے کیا کرو، لیکن ذکر کے لئے فرمایا "اذکروا اللّٰہ ذکرا کثیرا" "کثرت سے اللہ کا ذکر کرو" یہاں پر بھی فرمایا "اللہ کو کثرت سے یاد کرو" اور اس کثرت کی کوئی حد بیان نہیں فرمائی، گویا اپنی ہمت اور اپنی طاقت کے مطابق جتنا بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرسکتے ہو کرو، اللہ تعالیٰ کو اتنا یاد کرو اتنا یاد کرو کہ اللہ کی یاد تمہارے دل کی صفت بن جائے، اور ذکر الٰہی تمہارے دل کی ایک کیفیت بن جانی چاہیئے۔ اور اللہ تعالیٰ کو اتنا یاد کرو کہ اللہ کا ذکر دوسری تمام چیزوں اور کیفیتوں پر غالب آجائے، جب اس کا غلبہ اتنا ہوجائے تب اس کے اثرات ظاہر ہوں گے، کیونکہ آدمی کے دل کی جو کیفیت غالب ہوتی ہے وہ دوسری کیفیتوں کو مغلوب کرلیتی ہے۔ اب اگر دن بھر تو ہم دوسرے تذکرے کریں لیکن پھر تھوڑا سا اللہ کا ذکر بھی کرلیا کریں، اس سے تو کچھ کام نہیں چلتا، کیونکہ ذکر الٰہی سے قلب کی غالب کیفیت نہیں بنی۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر کو غالب ہوجانا چاہیئے تب قلب کی دوسری کیفیتیں مغلوب اور کمزور ہوں گی۔

ذکر الٰہی سے دلوں کی زندگی ہے

اللہ کے ذکر سے دل زندہ ہوتا ہے، اور ذکر الٰہی کے بغیر دل مردہ ہے، حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ:

"قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مثل الذی یذکرابہ والذی لایذکر مثل الحی والمیت، متفق علیہ"۔ (مشکوٰۃ:۱۹۶)

"مثال اس شخص کی جو اللہ کا ذکر کرتا ہے اور جو شخص کہ اللہ کا ذکر نہیں کرتا، زندہ اور مردہ کی مثال ہے"۔

ذکر الٰہی کرنے والا زندہ ہے، اور جو شخص ذکر الٰہی سے محروم ہے وہ مردہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے کہ "یا اللہ! میں آپ سے سوال کرتا ہوں شکر کرنے والی زبان کا، اور یاد کرنے والے دل کا"۔ کہ اپنے لطف واحسان سے زبان شاکر عطا فرمادے اور دل ذاکر عطا فرمادے جو صرف اس اللہ کو یاد کرے۔ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے ہم سب کو بھی یہ دولت نصیب فرمائیں۔

نفس کی ریاضت ضروری ہے

اور ایک بات خاص تجربہ کی عرض کرتا ہوں کہ آدمی کا نفس شتر بے مہار ہے، یہ جلدی سے قابو میں نہیں آتا، یہ اپنی مرضی کا مالک ہے، کبھی اس کی موج ہوئی اور اس کو نشاط ہوا تو سارے کام اس سے کروالو، اور کبھی نشاط نہیں ہوتا تو یہ فرض بھی ادا کرکے نہیں دیتا۔ البیلا قسم کا مزاج ہے نفس کا، کبھی کسی

طرف کبھی کسی طرف، اس میں پختگی اور مستقل مزاجی نہیں۔ جیسے انجان گھوڑا جو سوار کے قابو میں نہیں آتا اور صحیح رفتار نہیں پکڑتا ہے۔ تو یہی حال نفس کا بھی ہے کہ یہ بھی بغیر ریاضت اور سدھانے کے صحیح کام نہیں کرتا۔ اس سے کام لینے کا طریقہ یہ ہے کہ اس پر روزانہ کا کام لگادو اور اس سے کہہ دو کہ برخوردار اتنا کام تو تم سے کروانا ہے۔ تم چاہے میں کرو چاہے چیں کرو، اتنے دانے تو تجھ سے پسوا کے چھوڑنا ہے۔ تم نوکر ہو، مزدور ہو، اتنی نوکری تو تم سے لینی ہے۔ بھئی ملازم رکھتے ہو تو اس سے وقت پر ڈیوٹی لیتے ہو اور پوری ڈیوٹی لیتے ہو۔ اگر کبھی دیر سے آتا ہے تو تنبیہ کرتے ہو کہ میاں وقت پر آیا کرو، اسی طرح ہم بھی بارگاہ الٰہی کے نوکر ہیں، ملازم ہیں، بندے ہیں، ہمیں بے شمار نعمتیں دے کر طاعت وبندگی کی ڈیوٹی پر لگایا ہے۔ تو اللہ کے بندے نفس کے ساتھ طے کرلیتے ہیں کہ بھئی اتنا کام تو تم سے کروانا ہے، اتنی تلاوت روزانہ کروانی ہے، اتنی نماز تم سے روزانہ پڑھوانی ہے۔ (ایک تو فرض نمازیں ہیں، کچھ نفل نمازیں بھی اس کے ساتھ رکھو، تھوڑی بہت کام دیں گی)۔ اتنا ذکر وتسبیحات تم سے کروانا ہے، اور اسی طرح جن حضرات کو مال عطا فرمایا ہے، وہ نفس کے ساتھ طے کرلیں کہ اتنا صدقہ تجھ سے دلوانا ہے، اسی طرح آگے چلے جایئے کہ نفس سے کہا جائے کہ محلے کے اندر ایک شخص کی اعانت بھی تجھ سے کروانی ہے، ہمارے دعوت و تبلیغ والے حضرات یہ کچھ آگے نکل جاتے ہیں، نیکی میں آدمی جتنا آگے نکل جائے اچھا ہے، اتنا کام تم سے دعوت و تبلیغ کا لینا ہے، مسجد میں آتے ہو تو اعتکاف کی نیت سے بیٹھو، اس سے یہ بھی طے کروالو کہ اتنی دیر تمہیں مسجد میں بٹھانا ہے۔

نفس سے شرائط طے کر کے پھر اس کی نگرانی کی جائے

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ نفس کے ساتھ اس طرح باتیں طے کرنے کو "مشارطہ" کہا جاتا ہے۔ یعنی نفس سے ملازمت کی شرائط طے کرنا کہ یہ یہ کام تم نے کرنے ہیں اور جس طرح ملازمین پر ایک نگراں مقرر کردیا جاتا ہے، کہ ملازم صحیح کام بھی کررہے ہیں یا نہیں؟ اسی طرح جب تم نے نفس کے ساتھ "مشارطہ" کرلیا اور شرائط طے کر کے اب اس کو کام میں لگادیا تو اس کی نگرانی بھی کرو، اور یہ دیکھتے رہو کہ جتنا کام اس کے ذمہ لگایا تھا وہ ٹھیک سے کر بھی رہا ہے یا نہیں؟ اس کو مراقبہ کہتے ہیں، اور پھر سارے دن کے اعمال پر نظر ڈالتے ہوئے رات کو سونے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرو۔ جس طرح دکاندار اپنے ملازمین سے شام کو پورا حساب لیتا ہے۔ اور پھر اگر اس نے اپنے ذمہ کے کاموں میں سستی یا کوتاہی کی تھی اس پر اسے مناسب سزا بھی دو۔ الغرض اپنے نفس کو سدھانے اور رام کرنے کے لئے تمہیں اس کو چار مراحل سے گزارنا ہوگا۔

پہلے مشارطہ کرو، پھر مراقبہ کرو، پھر محاسبہ کرو، اگر کوئی صحیح عذر پیش کرتا ہے تو اس کو قبول کرلو اور اگر بے جا تاویل کرتا ہے تو اس کے ساتھ "معاقبہ" کرو (یعنی مناسب سزا دینا) اگر اس کو ریاضت کے ان چار مراحل سے گزاروگے تو یہ گھوڑا صحیح چلے گا اور رفتہ رفتہ سیدھا چلنے کا عادی ہوجائے گا۔ ورنہ یہ ہمیشہ شتر بے مہار رہے گا، کہ جدھر منہ اٹھا چل دیا، جی میں آیا تو کچھ کرلیا، ورنہ اڑیل ٹٹو بن گیا، لہٰذا اپنے نفس کو کبھی شتر بے مہار نہ چھوڑو، بلکہ اس پر پابندیاں لگاؤ، اور اس کو مجاہدے کا عادی بناؤ بعض اکابر ایسے ہیں کہ بارہ سال تک اپنے نفس کو پانی نہیں دیا۔ چنانچہ مولانا الیاسؒ کا قصہ ہے کہ طبیب نے پانی منع کردیا تھا تو بارہ سال نہیں پیا۔

تو بات یہاں سے چلی تھی کہ آپ نے ذکر اللہ کے فضائل سن لئے، اور سن کر گھر چلے گئے اور بس اتنا کہہ دیا کہ مولوی صاحب نے بڑی اچھی حدیث بیان فرمائی تھی، لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں، سب کچھ سنا مگر اپنے نفس کو عمل کی لائن پر نہیں ڈالا، اگر تم اپنے نفس پر قابو نہیں پاسکتے اور اس کو سدھانے سے عاجز ہو تو اس کو کسی شیخ کے سپرد کردو، اور اس کی ہدایت کے مطابق اس کو چلاؤ، گھوڑے کو سدھانے اور اس کو رفتار سکھانے کے لئے سائیس کے حوالے کردیا کرتے ہیں، اور وہ چند دن اس کی ریاضت کراتا ہے، جس طرح گھوڑے کو سدھانے کا ایک مستقل فن ہے اسی طرح نفس کو سدھانے کا بھی فن ہے، اس کو کسی ماہر کے سپرد کرو گے تو وہ اس کے سارے کس بل نکال دے گا، اس لئے عارف فرماتے ہیں کہ ؎

نفس ناتواں کشت الاظل پیر

نفس کی فہمائش کرو

اپنے نفس کی فہمائش کرو، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت تنہائی کا مقرر کرلو، اور اپنے نفس کو خطاب کرو، پہلے اسے اللہ تعالیٰ کے انعام واحسانات یاد دلاؤ کہ اے نفس! دیکھ کہ اللہ نے تجھے صحت عطا فرمائی ہے، قوت عطا فرمائی ہے اور تجھ پر بے شمار احسانات فرمائے ہیں، تیرے لئے خیر اور بھلائی کے تمام اسباب مہیا فرمائے ہیں، پھر اس کو قبر وحشر یاد دلاؤ کہ تجھے دنیا کو چھوڑ کر قبر میں جانا ہے، اگر تو نیک بن کر گیا تو تیرے لئے راحت ہی راحت ہے، ورنہ قبر کی تنہائی کا، وہاں کی سختیوں کا، وہاں کے سانپ اور بچھوؤں کا تجھے سامنا کرنا ہوگا۔ الغرض جو کچھ آدمی کو مرنے کے بعد پیش آنے والا ہے اس کو یاد دلاؤ، پھر اس سے کہو کہ

تو کچھ کمالے، دنیا سے خالی ہاتھ نہ جا، جب وہ کام کرنے پر آمادہ ہوجائے تو اس سے پوچھو کہ کتنا کام کیا کرے گا؟ وہ کام اس کے ذمہ لگادو، اگر خود فیصلہ نہیں کرسکتے تو شیخ سے مشورہ کرلو، اور استاد کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ بچے بیٹھے پڑھ رہے ہوتے ہیں، اگر میاں جی نہ ہوں تو یہ بچے نہیں پڑھیں گے، استاد سر پر ڈنڈا لے کر کھڑا رہے تو پڑھتے ہیں۔ تو یہ نفس بھی بچہ ہے۔ امام بصیریؒ فرماتے ہیں کہ "نفس مثل بچہ ہے اگر زبردستی اس کا دودھ چھڑاؤ گے تو چھوڑ گا، ورنہ بوڑھے ہونے تک نہیں چھوڑے گا" بچہ کتنا ہی بڑا ہوجائے ماں جب تک اس سے زبردستی دودھ نہیں چھڑاتی، نہیں چھوڑتا، جب اس کا دودھ چھڑایا جاتا ہے تو دو چار دن ضد کرتا ہے، روتا ہے، چلاّتا ہے، پھر آخر چھوڑ دیتا ہے۔ پھر اس کی عادت بھی ختم ہوجاتی ہے، تو بھئی تجربہ یہ ہے کہ آپ اپنے ذمہ ایک مناسب مقدار مقرر کرلیں، کہ اتنا تو درود پڑھا کرو، اتنا استغفار پڑھا کرو، اتنی تسبیحات پڑھا کرو، یہ زبان جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہے، واللہ العظیم یہ ہمیں سونے کی کان عطا فرمائی ہے، جتنا چاہو نکالتے رہو سونا، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو سونا نکلتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہمیں اس کی قدر ہی نہیں کہ یہ زبان کتنی بڑی نعمت ہے؟ اگر اس کو ذکر کا عادی بنالیا جائے تو ہم اس کے ذریعہ کتنا ذخیرہ جمع کرسکتے ہیں۔ سونے کے کتنے ڈھیر اکٹھے کرسکتے ہیں، لیکن ہم سونا بنانے کے بجائے سونے میں وقت گزارتے ہیں، بس سو گئے اور جاگ گئے، اللہ ہم پر رحم فرمائے۔ اکابر فرماتے ہیں کہ اپنے نفس کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ شانہ سے التجا بھی کیا کرو۔

اصلاح کے لئے نعمتوں کا مراقبہ

کسی وقت تنہائی میں بیٹھ جاؤ، زبان کو تالو کے ساتھ لگالو، آنکھیں بند کرلو، اور پھر یوں تصور کرو کہ میں بارگاہ رب العزت میں پیش ہوں اور اس سے ہم کلام ہوں، پھر اللہ کے ساتھ دل سے باتیں کرو، باتیں کیا کرو گے؟

شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو
عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

ترجمہ: یا اللہ جتنی تیری نعمتیں اتنا ہی تیرا شکر، اور جتنی ہماری کوتاہیاں اتنی ہی ہماری طرف سے معذرت، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں، ان پر شکر بھی بے شمار ہونا چاہئے، اور ہمارے گناہ بھی شمار سے باہر ہیں ان پر توبہ بھی اتنی کثرت سے ہونی چاہئے۔ اللہ کے انعامات سوچتے رہو اور شکر بجالاؤ، یا اللہ! آپ نے ہمیں بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں، یہ انعامات فرمائے مجھ سے ان میں سے ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہیں ہوسکتا، یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ ایک حدیث میں یہ دعا سکھائی گئی:

"اللھم ما اصبح بی من نعمۃ اوباحد من خلقک فمنک وحدک لاشریک لک، فلک الحمد ولک الشکر"۔ (مشکوٰۃ: صفحہ۲۱۱)

ترجمہ: "یا اللہ! مجھ پر یا تیری مخلوق میں سے کسی پر جتنی نعمتیں ہیں یہ سب تیری جانب سے ہیں، آپ کا کوئی شریک نہیں، پس آپ ہی کے لئے حمد ہے، آپ ہی کے لئے شکر ہے"۔

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص تین مرتبہ یہ دعا صبح کو پڑھے اس نے شام تک کی تمام نعمتوں کا حق ادا کردیا، شکر ادا کردیا، اور جو شخص رات کو پڑھے مغرب کے بعد، اس نے رات کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کردیا، لیجئے شکر و نعمت کی کیسی مختصر سی تدبیر ارشاد فرمادی۔ الغرض اللہ تعالیٰ کے انعامات کو سوچو، تفصیلاً سوچو اور اس سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی، کیونکہ جس شخص کا احسان ہمارے ذمہ ہو فطرتاً اس کی محبت دل میں پیدا ہوجاتی ہے، اور اس کے احسان سے آدمی دب جاتا ہے، جب تم اللہ تعالیٰ کے انعامات کو سوچو گے تو تمہیں اللہ تعالیٰ سے محبت پیدا ہوگی، اور جب تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو اللہ کو تم سے محبت ہوجائے گی۔

اپنی کوتاہیوں کا مراقبہ اور استغفار

دوسرا مضمون سوچنے کا اپنی کوتاہیاں اور اپنی لغزشیں۔ شیخ عطارؒ کی مناجات کا یہ شعر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ پند نامہ میں فرماتے ہیں ؎

بے گناہ نہ گزشت برما ساعتے
باحضور دل نہ کردم طاعتے

ترجمہ: ”بغیر گناہ کے ہم پر ایک گھڑی بھی نہیں گزری، اور دل کی حاضری کے ساتھ میں نے آپ کی ایک بندگی بھی تو نہیں کی“۔

اپنی زندگی کی ایک نماز بتادو کہ جس میں پورے حضور قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوئے ہو، اور اس حاضری میں اردگرد کی کوئی قصہ کہانی نہ ہوئی ہو۔ ایک بھی نہیں۔ اس طرح اپنی کوتاہیاں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرو

اور پیش کر کے اس کی مغفرت چاہو۔

اپنی حاجتیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرو

ایک تیسری چیز ہے وہ تمہارے مطلب کی ہے۔ اپنی حاجتیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرو، بس یہ تین مضمون ہیں۔ تنہائی میں بیٹھ جاؤ، زبان تالو سے لگالو، آنکھیں بند کرلو، اور اللہ تعالیٰ سے باتیں کرو۔ اللہ کے انعامات کا استحضار کرو، ان پر شکر بجالاؤ، اپنی کوتاہیوں کا استحضار کرو اور ان پر معافی مانگو، اور تیسرا اپنی حاجات اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھو، اور ان حاجات کے لئے بارگاہ الٰہی میں التجا کرو، اپنی درخواست پیش کرو، یا اللہ میرا یہ کام کردیجئے۔ اس التجا اور دعا میں اپنے نفس کی اصلاح کی بھی التجا کرو۔ چلو بیڑا پار ہوگیا۔ یہ میں نے تمہیں کیمیا کا نسخہ بتایا ہے، لیکن اس کی قدر کون کرے گا؟ کوئی نہیں، بے وقت بے ضرورت چیز مل جاتی ہے، مفت میں مل جاتی ہے، لوگ قدر نہیں کرتے۔ کوئی شخص دو روپے کے جوتے کو سو روپے کی شال سے صاف کررہا تھا، کسی نے کہا کہ تو بڑا احمق ہے، اتنی قیمتی شال کے ساتھ ٹوٹا ہوا جوتا صاف کررہا ہے، کہنے لگا جوتا میں نے خود خریدا ہے، شال باپ کی وراثت میں ملی ہے۔ یہ کیمیا کا نسخہ تمہیں بہت سا خرچہ کر کے معلوم کرنا پڑتا تو تمہیں قدر ہوتی۔ بیٹھے بٹھائے مل گیا، کوئی بھی اس کی قدر نہیں کرے گا، سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے، بڑی بات ہے پانچ منٹ نکالو، دس منٹ نکالو، اللہ تعالیٰ سے مناجات کیا کرو، پھر دیکھو دل کو کیسی راحت نصیب ہوتی ہے، کیسا سکون نصیب ہوتا ہے، اور باطن کی ترقی کتنی ہوتی ہے، پھر اندازہ کرو گے۔

خطبہ شریفہ کا دوسرا مضمون

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ شریفہ کا جو حصہ پڑھا اس میں دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا: "واعملوا لما بعد الیوم" "یعنی اللہ کو کثرت سے یاد کرو، اور آج کے دن کے بعد کے لئے عمل کرو"۔

کل کی تیاری آج کرو

آج کے دن کے بعد سے مراد ہے اس زندگی کے بعد والی زندگی، جو موت سے شروع ہوگی، پھر قبر کی زندگی، پھر حشر کے طویل دن کی زندگی، پھر جنت کی دائمی اور ابدی زندگی۔ اس کے لئے عمل کرو، اور اس زندگی سے ہمیشہ کی زندگی کے لئے کما کر لے جاؤ۔ دنیا کے تمام عقلاء پس انداز کرنے کے قائل ہیں کہ جتنا آج کمایا جائے وہ سارے کا سارا آج ہی ختم نہ کر دیا جائے، بلکہ اپنی کمائی کا کچھ حصہ آڑے وقت کے لئے جمع کر کے رکھا جائے، ہاں! کوئی قلندر قسم کا آدمی ہو، وہ تو پس انداز کرنے کا خیال نہیں رکھتا۔ وہ تو یوں سمجھتا ہے کہ بچا کر رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب ہم کو ضرورت ہوگی اللہ تعالیٰ دے دیں گے ؏

خدا خود میر ساماں ہست ارباب توکل را

یہاں ان جیسے لوگوں کی بات نہیں، ہمارے جن لوگوں کو عقلمند سمجھا جاتا ہے، ان کی بات کرتا ہوں کہ عقلمند لوگ پس انداز کیا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سرکاری ملازمین سے گورنمنٹ ان کا (G.P) فنڈ کاٹ لیتی ہے۔ (گویا یہ جبری پس انداز کرنا ہے) کہ اگر ان کو پوری تنخواہ دے دی تو یہ تو خرچ کرلیں گے، بعد میں جب ریٹائر ہو جائیں گے تو ان کے پاس کچھ رہے گا نہیں۔ بعد میں جب ان

کے پاس کام نہیں رہے گا اس وقت ان کو دے دیں گے، اس لئے اس تنخواہ کا کچھ حصہ کاٹ لیتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ اصول تمام عقلاء کا مسلّمہ ہے کہ آج کما کر آج ہی نہ کھالو، بلکہ کچھ پس انداز بھی کرو، کچھ بچا کے رکھو، عقلاء کا یہی اصول ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ارشاد فرما رہے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ عقلائے زمانہ کی عقل صرف دنیا تک محدود ہے، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر دنیا و آخرت دونوں کو محیط ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "تمہاری پوری دنیا کی زندگی وہ آج کا دن ہے۔ اور آخرت کی زندگی یا یوں کہئے کہ مرنے کے بعد کی زندگی "کل کا دن" ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اعملوالما بعد الیوم" یعنی کل کے لئے عمل کرو۔ اگر دنیا ہی میں کما کھا کر خالی ہاتھ چلے گئے، تو یہ عقلمندی کی بات نہیں، یہ بڑے بڑے عقلاء جو ہمیں مشورہ دے رہے ہیں پس انداز کرنے کا، بچت کرنے کا، وہ خود دنیا میں کھاپی کر چلے گئے، کل کے لئے کچھ بھی پس انداز نہیں کیا، جو یہاں کمایا تھا یہیں کھاپی لیا، نہیں بھائی! ایسا نہیں کرنا چاہئے، یہ بے عقلی کی بات ہے، آج کے بعد کے لئے عمل کرو۔ یہ کھانا کمانا تو زندگی کے لئے ہے، اور زندگی کا مقصد کچھ اور ہے، پس اعمال کا اتنا ذخیرہ جمع کرو، جو ہمیں کل کام دے۔

اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کا معاملہ درست کرو

آگے یہ فرمایا کہ "بات یہ ہے کہ جو شخص اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کا معاملہ درست کرلیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے درمیان کے معاملہ میں اس کی کفایت فرمادیتے ہیں"۔ گویا جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ کرے گا

اللہ تعالیٰ اس سے سودا کرلیتے ہیں کہ تم ہمارا کام کرو، تمہارا کام ہمارے ذمہ۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خط لکھا کہ "مجھے کوئی مختصر سی نصیحت کیجئے، بات لمبی نہ ہو، مختصر ہو تاکہ اسے حرز جان بناؤں"۔ اکابر کا ہمیشہ یہ بھی معمول رہا ہے کہ بزرگوں سے نصیحت طلب کرتے تھے۔ علامہ شعرانیؒ نے اپنی کتاب "تنبیہ المغترین" میں اس پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے کہ جب بڑوں کی خدمت میں جاؤ تو ان سے نصیحت طلب کرو۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ باوجودیکہ خود بھی صحابی ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات خود بھی سنے ہیں، لیکن جن کو اپنا بڑا سمجھتے تھے، ان کی خدمت میں لکھتے رہتے تھے، اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں خط لکھا، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کاتب کو بلایا اور کہا کہ لکھو:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ خط ہے عائشہ ام المؤمنینؓ کی جانب سے معاویہؓ کے نام! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص اللہ کو راضی کرنے کی خاطر انسانوں کو ناراض کرلیتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے انسانوں کی ناراضگی کی خود کفایت فرماتے ہیں۔ (کہ ان کی پرواہ نہ کرو ان کو راضی کرنا ہمارا ذمہ رہا)، اور جو شخص لوگوں کی رضامندی کی خاطر اللہ کو ناراض کردیتا ہے اللہ تعالیٰ اس شخص کو ان لوگوں کے سپرد کردیتے ہیں (کہ کرو ان کو راضی، میں دیکھتا ہوں تم کتنے لوگوں کو راضی کرلیتے ہو)۔ (مشکوٰۃ: صفحہ ۴۳۵)

اور یہی مضمون اس خطبہ شریفہ میں ارشاد فرمارہے ہیں کہ جو شخص اپنے درمیان کا اور اللہ کے درمیان کا معاملہ صحیح کرلے اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے درمیان کے معاملے کی خود کفایت فرماتے ہیں کہ وہ ہمارے ذمہ رہا۔ ہم سے

تم معاملہ درست رکھو، تمہارے اور لوگوں کے درمیان جو معاملہ ہے اس کو ہم پر چھوڑدو، وہ میں درست کرلوں گا، تم اس کی پرواہ نہ کرو کہ کوئی ناراض ہوتا ہے، لوگ ناراض ہوجائیں گے تو ہم ان کو بھی راضی کردیں گے، بھئی یہ بھی بڑے امتحان کی بات ہے، آزمائش کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو آزمائش میں نہ ڈالے، بسا اوقات ایسا ہوجاتا ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ہے، دوسری طرف لوگوں کی رضامندی ہے، اگر اس کام کو کرلے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوجاتے ہیں اور نہ کرے تو لوگ ناراض ہوتے ہیں، بہت سے لوگ ایسے دوراہے پر کھڑے ہوجاتے ہیں اور پھر ہم میں سے اکثریت ان لوگوں کی ہے کہ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو معاف کردے گا۔ مخلوق کو راضی کرلو، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود راضی ہوجائے گا، بڑا غفور اور رحیم ہے۔ اور یہیں سے لوگوں نے ایک فقرہ تصنیف کرلیا ہے، اللہ کو راضی کرنا آسان ہے لوگوں کو راضی کرنا مشکل ہے، تو آسان کام کیوں نہیں کرتے؟ مشکل کام کیوں کرتے ہو؟ واقعی بڑا امتحان ہے، اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے، یہ سب سے مشکل مرحلہ ہے، پہلے تو بیوی بچے ناراض ہوجاتے ہیں، پہلے اپنے گھر سے مسئلہ شروع ہوتا ہے۔ میری عادت ہے کہ لوگوں کو داڑھی رکھنے کا کہتا ہوں تو اس کے جواب میں بہت سے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ بیوی نہیں مانتی۔ اور یہ بیوی کی اجازت کے بغیر اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے سے قاصر، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا آسان، اور بیوی کو ناراض کرنا مشکل۔ یہ جو میں لوگوں کو داڑھی کے لئے کہتا رہتا ہوں، میں نے اپنے بزرگوں سے اس کی اجازت لے رکھی ہے، بغیر اجازت کے کچھ نہیں کہتا۔ بلکہ میں نے اس کی سند لے رکھی ہے، میرے حضرت ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہ پر محبت کے رنگ کا بڑا غلبہ تھا۔ اور میرے

اکابر مجھ جیسے بے مروت نہیں تھے، اکابر اور ولی اللہ لوگوں پر مروت کا بڑا غلبہ ہوتا ہے۔ کسی پر روک ٹوک کرنا، یہ تو حضرت کے مذہب ہی میں نہیں تھا، میں نے جتنی زندگی حضرت کی خدمت میں گزاری، کسی پر ناراض ہوتے نہیں دیکھا، سراپا محبت و شفقت تھے، سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو کتنا بڑا حوصلہ عطا فرمایا تھا۔ تو میں نے ایک مرتبہ حضرت ڈاکٹر صاحب سے علیحدگی میں عرض کیا کہ مجھ سے لوگوں کا داڑھی منڈوانا برداشت نہیں ہوتا، میں لوگوں کو داڑھی کے لئے کہہ دیتا ہوں۔ عادت مبارکہ تھی کہ بات سن کر تھوڑی دیر کے لئے سر جھکا لیتے اور سوچ کر بات کرتے تھے، فوراً نہیں، تو حضرتؒ نے میری بات سن کر سر جھکا لیا، اور تھوڑی دیر بعد فرمایا کہ مولوی صاحب ضرور کہا کریں، تو حضرتؒ کے یہ الفاظ ہیں، تو میں نے کہا کہ الحمدللہ ہم کو تو شیخ کی سند مل گئی، اس لئے ہم کہتے ہیں اور الحمدللہ نفع بھی ہوتا ہے، اور بہت سے لوگوں کو فائدہ بھی ہوتا ہے، بات یہ ہے کہ تنبیہ ہوجاتی ہے تو لوگ مان جاتے ہیں، اور اگر کوئی توجہ نہ دلائے تو خود بھی توجہ نہیں ہوتی۔ کبھی خود اتفاقاً توجہ ہوجائے تو الگ بات ہے۔ تو کہتے ہیں کہ بیوی نہیں مانتی، بعض نوجوان سختی سے شکایت کرتے ہیں کہ اماں نہیں مانتی، ابا نہیں مانتے، کہتے ہیں کہ اگر تم نے داڑھی نہ منڈوائی تو میں تمہیں عاق کردوں گا۔ الغرض بڑا امتحان ہے، خصوصاً نوجوانوں کے لئے اور بھی مشکل ہوجاتی ہے کیونکہ وہ خود مختار نہیں ہوتے، والدین کے ماتحت ہوتے ہیں، اور والدین ہیں بے دین، ان کو دین کی قدر نہیں، اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی قدر ان کے دل میں نہیں، تو یہ نوجوان دین پر عمل کرنا چاہتے ہیں، مگر والدین نہیں مانتے، ایسے نوجوان بے چارے کشمکش میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ اور گھر سے نجات ملے

تو دوست احباب کا حلقہ شروع ہوجاتا ہے کہ ارے تم مُلّا بن گئے ہو۔ اس کے بعد برادری پھر معاشرے کا مسئلہ آجاتا ہے۔ اور آپ چاہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ چلیں، لوگوں کو راضی کرکے چلیں اور وہ راضی ہوتے نہیں، "نہ نومن تیل ہو نہ رادھاناچے" نہ مخلوق راضی ہو نہ تم اللہ تعالیٰ کا کام کرو، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساٹھ سال بعد تم وہیں کے وہیں ہو اور معاشرہ بھی وہیں کا وہیں ہے، تم اگر مخلوق کو راضی کرکے چلنا چاہو تو ایک قدم بھی نہیں اٹھاسکتے، اس خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اشکال کا حل فرمارہے ہیں، وہ یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کے اور اپنے درمیان کے معاملے کو درست کرلو، اللہ تعالیٰ تمہارے اور لوگوں کے درمیان کے معاملے کو خود ہی درست فرمالیں گے، انشاء اللہ۔ تم کسی کی پرواہ کئے بغیر اللہ تعالیٰ کا حکم مانو، لوگ جھک مار کر خود ہی تمہارے ساتھ چلنے لگیں گے، ساری دنیا راضی ہوجائے گی، سارے راضی ہوجائیں گے، تم ایک کو راضی کرلو، ساری دنیا کو ناراض کردو، وہ ایک، ساری دنیا کو راضی کردے گا، اور اگر تم دنیا کو راضی کرکے اللہ تعالیٰ کو ناراض کرلوگے تو وہ تم سے سب کو ناراض کردے گا، جیسا کہ اس نے آج کل تمہارے درمیان فتنہ وفساد ڈالا ہوا ہے، بیوی، میاں کی نہیں بنتی، بھائی، بھائی کی نہیں بنتی، دوست احباب کی نہیں بنتی، اور آپس میں دو آدمی جس کام میں شریک ہیں، ان دونوں کی نہیں بنتی، کیونکہ تم نے کبھی اللہ تعالیٰ سے نہیں بنائی، وہ تمہاری نہیں بننے دے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر فیصلے کرتے ہیں، لوگ اللہ پر فیصلہ نہیں کرتے، اور اللہ لوگوں پر مکمل اختیار رکھتے ہیں اور تم لوگ اللہ پر اختیار نہیں رکھتے، ہم یہ آیۃ الکرسی میں پڑھتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ لوگوں کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے" اللہ تعالیٰ تمام انسانوں

کے اور اس کائنات کے ماضی و مستقبل کے ذرے ذرے سے واقف ہے، اور بندوں کو اس کا کچھ بھی علم نہیں، سوائے اسکے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بتادے، بندوں کو اس کے علم میں سے کسی شئے کا علم نہیں ہے۔ بالکل یہی قصہ ہے قدرت کا بھی، اللہ تعالیٰ کو تمام انسانوں پر قدرت کاملہ ہے، کافروں کو مومن بنادے، اس کو قدرت ہے، مسلمانوں کو کافر بنادے اس کو قدرت ہے، غنیوں کو فقیر بنادے اس کو قدرت ہے، فقیروں کو غنی بنادے اس کو قدرت ہے۔ وہ قادر مطلق ہے، دوستوں کو دشمن بنادے، دشمن کو دوست بنادے اس کو قدرت ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں پر پورا اختیار رکھتے ہیں، اور انسان اللہ پر کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ کی تقدیر کو کون بدل سکتا ہے؟ تمام حکومتیں مل جائیں، تمام لوگ مل جائیں، اللہ تعالیٰ کے قضا وقدر کے فیصلوں کو نہیں بدل سکتے اس کا فیصلہ تو چل کے رہے گا، جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے وہ تو ہو کے رہے گا، تو عقل مندی کی بات یہ ہوگی کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا معاملہ صحیح کرلو، مخلوق کے ساتھ بگڑتا ہے تو بگڑنے دو، پرواہ نہ کرو ؎

بابا رشتہ سب سے توڑ
بابا رشتہ حق سے جوڑ

چند دن میں معاملہ صحیح ہو جائے گا، یہی لوگ جو بگڑے ہوئے ہیں سر جھکا کر آئیں گے، چنانچہ اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ سب پر چلتا ہے، پر اس پر کسی کا فیصلہ نہیں چلتا، وہ سب کا مالک ہے مگر اس پر کسی چیز کا کسی کو اختیار نہیں، لہٰذا اس پر کامل یقین اور توکل رکھو، اس کی خاطر سب کو چھوڑ دو، مگر کسی کی خاطر اس کو نہ چھوڑو۔

آخر میں ارشاد فرمایا کہ:

"اللّٰه اکبر، ولا قوۃ الا باللّٰه العظیم" "اللہ اکبر" کا کلمہ تکبیر کہلاتا ہے، یعنی اللہ سب سے بڑا ہے، ہر بڑے سے بڑا ہے، اس سے بڑا کوئی نہیں، کوئی نہیں، لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے یعنی اللہ کے سوا جتنی مخلوق ہے وہ ان سب سے بڑا ہے، مگر عارفین کہتے ہیں کہ اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری حد تصور سے بھی بڑا ہے، جہاں تک تمہاری حد تصور جاسکتی ہے اس سے بھی بڑا ہے، مخلوق کے ہر قیاس اور پیمانے سے بڑا ہے، اس کی بڑائی تک کسی کے وہم وخیال کی رسائی نہیں، اس کی عظمت اور بڑائی تمہارے کسی پیمانے میں نہیں آسکتی، کیونکہ اس کی ذات بھی لامحدود، اور صفات بھی لامحدود، ہم کیا چیز ہیں؟ آسمان و زمین کی ساری مخلوق بھی اس کی بڑائی کا تصور کرنے سے عاجز ہے، وہاں جبرئیل (فرشتہ) کو پر مارنے کی جگہ نہیں، ہماری تمہاری کیا وقعت ہے؟ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

> "اللہ تعالیٰ کے چہرے پر ۷۰ پردے نور کے ہیں، اگر ان میں سے ایک پردے کو ہٹادیا جائے تو جہاں جہاں تک اللہ تعالیٰ کی نظر پہنچتی ہے وہاں وہاں تک اس کے پاک چہرے کی شعاعیں دنیا کو جلاکر راکھ کر ڈالیں گی"۔ (مسلم)

ہم نے اللہ تعالیٰ کی عظمت کو پہچانا نہیں، اور سچ یہ ہے کہ پہچان بھی نہیں سکتے، نطفے سے پیدا ہونے والی مخلوق اللہ تعالیٰ کو کیا پہچانے گی۔

> "عن زرارة بن اونی ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال لجبرئیل هل رایت ربک فانتفض جبرئیل وقال یا محمد ان بینی

وبینہ سبعین ھجابا من نور وکودنوت من بعضھا لاحترقت......" (مشکوٰۃ: صفحہ ۵۱۰)

"ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ کبھی اللہ تعالیٰ کی زیارت کی؟ تو جبرئیل علیہ السلام کانپ گئے اور کہنے لگے توبہ اتنی طاقت جبرئیل کی آنکھوں میں کہاں، میرے اور اس کے درمیان نور کے ستر پردے ہیں، اگر میں ان میں سے ایک کے بھی قریب جاؤں تو جل کر راکھ ہو جاؤں"۔

اللہ تعالیٰ ایسی عظمت والا ہے، اور ہم اس کے مقابلے میں مخلوق کو ترجیح دیتے، اس کو ناراض کر کے مخلوق کو راضی کرنے میں لگے ہوئے ہیں، کیسی حماقت اور بے وقوفی ہے؟ نعوذ باللہ، استغفر اللہ، ہمیں ہر نماز کے ہر انتقال میں اللہ اکبر کی تعلیم دی گئی ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت ہمارے اوپر کھل جائے، اور مخلوق کی عظمت ہمارے دل سے نکل جائے، اللہ کا رنگ ہم پر غالب آجائے، اور مخلوق کا رنگ اتر جائے، یہ اللہ کی رنگت ہے اور اللہ کی رنگت سے بہتر کس کی رنگت ہو سکتی ہے؟ آخر میں ارشاد فرمایا: کہ "جو کچھ کہا گیا ہے اس پر عمل کی طاقت اللہ عظمت والے کی طرف سے ہو سکتی ہے"۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے، طاقت نصیب فرمائے، اپنے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

غیبت

ایک اخلاقی برائی۔ ایک گناہِ کبیرہ

فہرستِ مضامین

عنوان	صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و
نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور
انفسنا ومن سیاٰت اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ
فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد
ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھدان
سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ
صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلی اٰلہ واصحابہ
وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا۔ اما بعد!
”وقد اخرج ابو یعلی عن البراء رضی اللہ
تعالی عنہ قال خطبنا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم حتی اسمع العواتق فی بیوتھا۔
او قال: فی خدورھا۔ فقال: یا معشر من آمن
بلسانہ ولم یدخل الایمان قلبہ، لا تغتابوا

المسلمين ولا تتبعوا عوراتهم، فانه من يتبع عورة اخيه؟ الله عورته، ومن يتبع الله عورته يفضحه في جوف بيته۔ قال الهيثمي۔ (جلد ۸ صفحہ ۹۳): ورجاله ثقات۔

واخرجه الطبراني عن ابن عباس رضي الله عنهما نحوه، الا ان في روايته لا توذوا المسلمين ولا تتبعوا عوراتهم، فانه من يتبع عورة اخيه المسلم هتك الله ستره۔ قال الهيثمي۔ (جلد ۸ صفحہ ۹۴) ورجاله ثقات۔

واخرجه البيهقي عن البراء نحوه۔ كما في الكنز (جلد ۸ صفحہ ۲۰۰)

ترجمہ: "حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا دیا کنواری لڑکیوں کو ان کے گھروں میں، یا (یہ کہا کہ ان کے پردوں میں) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے جماعت ان لوگوں کی، جو اپنی زبان سے ایمان لائے ہیں اور ایمان ان کے دل میں داخل نہیں ہوا، مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور ان کے عیوب تلاش نہ کرو، اس لئے کہ جو اپنے مسلمان بھائی کے عیوب تلاش کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے عیب کو تلاش کریں گے، اور جس شخص کے عیب اللہ تعالیٰ تلاش کریں گے، اس کو

اس کے گھر بیٹھے رسوا کردیں گے۔ یہ ہی خطبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے طبرانی نے روایت کیا، اور ان کے الفاظ یہ ہیں کہ اہل ایمان کو ایذا نہ پہنچاؤ، اور ان کے عیوب کو تلاش نہ کرو، کیونکہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیب تلاش کرے گا اللہ اس کا پردہ چاک کردیں گے"۔

غیبت کے بارے میں حضور ﷺ کا خطبہ

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ ہے، اور اس میں مسلمانوں کی معاشرت کے بارے میں بطور خاص دو چیزوں کا ذکر فرمایا ہے، ایک یہ کہ مسلمانوں کی غیبتیں نہ کرو، اور دوسرے یہ کہ ان کے عیوب کو تلاش نہ کرو، اور اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں اس عنوان سے ذکر فرمایا ہے کہ:

"اے وہ گروہ جو اپنی زبان سے تو مسلمان ہوگئے ہیں، لیکن ایمان ان کے دل میں داخل نہیں ہوا"۔

غیبت اور تجسس منافقین کی عادت تھی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسے لوگ منافق تھے، جو ظاہر میں کلمہ پڑھتے تھے، اور اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کرتے تھے، لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ گویا مسلمانوں کی غیبت کرنا، ان کے عیوب کو تلاش کرنا، اور ان کو رسوا کرنے کی کوشش کرنا یہ منافقین کا وطیرہ تھا مسلمانوں کا نہیں۔

غیبت کی مذمت قرآن کریم میں

سورۃ حجرات میں اللہ تعالیٰ نے ان دو آیتوں میں اس کا ذکر فرمایا:

"یا ایها الذین امنوا لا یسخر قوم من قوم عسی ان یکونوا خیرا منهم ولا نساء من نساء عسی ان یکن خیرا منهن، ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب، بئس الاسم الفسوق بعد الایمان، ومن لم یتب فاولئک هم الظالمون۞ یاایها الذین امنوا اجتنبوا کثیرا من الظن، ان بعض الظن اثم، ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا، ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیه میتا فکرهتموه، واتقوا الله، ان الله تواب الرحیم۞"

ترجمہ: "اے ایمان والو! نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے۔ اور جو باز نہ آویں گے تو وہ ظلم کرنے والے ہیں۔ اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچا کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، اور سراغ مت لگایا کرو، اور کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرو، کیا تم میں سے کوئی یہ

پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟
اس کو تو ناگوار سمجھتے ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک
اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے"۔ (بیان القرآن)

ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرنا، کسی کا ٹھٹھا کرنا یہ بھی ناجائز ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی جڑ اس طرح کاٹی ہے کہ جس کا تم مذاق اڑا رہے ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے بہتر ہو، ایک آدمی باہر سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اندر والے کو کچھ معلوم نہیں کہ باہر کون ہے، لیکن دروازے کھولنے کے بجائے اندر بیٹھا ہوا دروازہ کھٹکھٹانے والے کو بُرے بُرے الفاظ کہتا ہے، اور جب دروازہ کھولتا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ وہ بڑا آدمی تھا (دین یا دنیا کے لحاظ سے) یا اس کا کوئی افسر تھا یا استاذ تھا، ذی وجاہت آدمی تھا، اب دروازہ کھولنے کے بعد اپنے الفاظ پر اس کو کتنی شرمندگی ہوگی؟ یہ میں نے ایک مثال پیش کی ہے، جب تک دروازہ بند ہے تم کو معلوم نہیں کون ہے، یا تو وہ باہر سے بتادے کہ میں فلاں آدمی ہوں۔ یا تم تمیز کے ساتھ بات کرو کیونکہ تمہیں معلوم نہیں کہ دروازہ کھٹکھٹانے والا کون ہے، لیکن جانے بوجھے بغیر تم اس کو تحقیر و توہین آمیز جملے کہتے ہو، جب دروازہ کھلے گا اور تمہیں اس شخص کی حقیقت معلوم ہوگی تو تمہیں اس پر شرمندگی ہوگی۔

"میں" کہنے کے بجائے اپنا نام بتانا چاہیئے

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے در دولت پر حاضر خدمت ہوا، دروازہ کھٹکھٹایا، اندر سے فرمایا، کون ہے؟ میں نے کہا کہ میں ہوں، فرمایا "میں، میں" گویا آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نے اس جملے کو ناپسند فرمایا، کہ میں، میں کیا ہوتا ہے؟ نام بتاؤ۔ اپنا تعارف کراؤ کہ فلاں آدمی ہوں۔ ایک میں کا لفظ ہر ایک کے لئے بولا جاسکتا ہے، ہوسکتا ہے کہ اندر کا آدمی تمہاری آواز کو نہ پہچان سکے، تو جس طرح اندر بیٹھا ہوا آدمی دروازہ کھٹکھٹانے والے کو کوئی بدتمیزی کا لفظ بولے تو بعد میں اس کو شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس کا تم مذاق اڑاتے ہو، ہوسکتا ہے کہ وہ تم سے بہتر ہو۔ ابھی تو غیب کا پردہ لٹکا ہوا ہے، کچھ معلوم نہیں کہ کون کس مرتبہ کا ہے؟ قیامت کے دن جب یہ پردہ ہٹایا جائے گا اور ہر ایک کا مرتبہ ظاہر کردیا جائے گا، اس وقت کتنی شرمندگی ہوگی، اگر تم نے کسی اچھے آدمی کا مذاق اڑایا ہوگا تو کس قدر ندامت کا سامنا ہوگا لہٰذا کسی کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔

مذاق اور مزاح میں فرق

میں نے حدیث شریف کے بیان میں کہا تھا کہ ایک چیز ہے مذاق اڑانا، اور ایک ہے مزاح کرنا۔ دونوں کے درمیان فرق ہے، مذاق اڑانے سے دوسرے کی تخفیف مراد ہوتی ہے، یعنی دوسرے کی عزت کو ہلکا کرنا اور جس شخص کا مذاق اڑایا جائے، اس سے ہنسی اور تمسخر کیا جائے وہ بے چارا سبکی محسوس کرتا ہے۔ اور مزاح سے مراد اس کو مانوس کرنا ہوتا ہے، یعنی کوئی ایسی بات کہی کہ جس سے خوش طبعی پیدا ہوجائے اور دوسرا آدمی مانوس ہوجائے۔ دل توڑنے کا نام خوش طبعی نہیں۔ یہ ہماری بدمذاقی ہے کہ کہتے ہیں کہ میں تو ویسے ہی مذاق کررہا تھا، اس میں ایک تو مذاق اڑانے کا گناہ ہوا، دوسرا جھوٹ بولنے کا۔

خوش طبعی میں بھی جھوٹ بولنا جائز نہیں

حالانکہ خوش طبعی کی بات میں جھوٹ بولنا بھی جائز نہیں، خلاف واقعہ بات بیان کرنا بھی جائز نہیں، اس معاملے میں ہمارے ہاں بڑی گڑبڑ ہوتی ہے، کسی کو پریشان کرنے کے لئے فرضی کہانی سنادی، بعد میں کہہ دیا کہ میں تو مذاق کررہا تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ کسی مردوں کی جماعت کو مردوں کا اور کسی عورتوں کی جماعت کو عورتوں کا مذاق نہیں اڑانا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے افراد کو ذکر نہیں فرمایا۔ مراد فرد ہے یعنی مردوں کی جماعت میں سے کوئی فرد کسی فرد کا مذاق نہ اڑائے، اور عورتوں کی جماعت میں سے کوئی عورت کسی عورت کا مذاق نہ اڑائے۔ ان دونوں جنسوں کو اللہ تعالیٰ نے الگ الگ بیان فرمایا ہے، اس لئے کہ اگر مردوں کی جماعت عورتوں کا مذاق اڑائے تو یہ مروت کے خلاف ہے، اور اگر کوئی عورت کسی مرد کا مذاق اڑائے تو یہ خلاف حیا ہے۔ تو گویا کہ فرمایا جارہا ہے کہ یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی مرد کسی عورت کا مذاق اڑائے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی عورت کسی مرد کا مذاق اڑائے، اس لئے دو صورتوں کو بیان فرمایا ہے، اور دو کو حذف کردیا، واللہ اعلم۔

بڑے آدمی کا مذاق اڑانا رذالت ہے

اور یہاں سے ایک اور بات بھی معلوم ہوگئی کہ چھوٹا آدمی کسی بڑے کا مذاق اڑائے تو یہ اس کے چھوٹے پن اور رذالت کی دلیل ہے، ہاں کبھی برابر والا برابر والے کا مذاق اڑائے تو خیال ہوسکتا ہے کہ شاید یہ درست ہو، لیکن حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ تم سے بہتر ہو، مطلب یہ کہ بظاہر تو وہ

تمہارے برابر کا ہے، لیکن احتمال ہے کہ مرتبہ کے اعتبار سے تم سے بڑا ہو، اگرچہ تمہارا ہم عمر ہے، ہم عصر ہے، ظاہر میں تمہاری طرح کا آدمی ہے، لیکن رتبے کے اعتبار سے تم سے بہتر ہے، اور اگر مرتبہ کے اعتبار سے بہتر ہے تو تم کو مذاق نہیں اڑانا چاہئے، کیونکہ یہ اسی طرح ناروا ہوگا جس طرح کہ کوئی ماتحت انجانے میں اپنے افسر اعلیٰ کا مذاق اڑائے۔ پہلے چونکہ پہچانا نہیں تھا، اس لئے مذاق اڑالیا، بعد میں جب پتہ چلا تو معذرت کرنے لگا۔ تو ایک تو یہ ہدایت فرمائی۔

کسی پر طعن کرنا

دوسری ہدایت یہ فرمائی کہ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کیا کرو۔ سورۃ الھمزہ میں ایسے شخص کے لئے "ویل" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ "ویل لکل ھمزۃ لمزۃ" (بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کے لئے جو پس پشت عیب نکالنے والا ہو، اور رو در رو طعنہ دینے والا ہو)۔

کسی کی عیب جوئی کرنا اور کسی کو اس کے عیب کا طعنہ دینا بڑا گناہ ہے۔ بعض لوگوں کا ہاضمہ ایسا خراب ہوتا ہے کہ کسی کا عیب معلوم ہوجائے تو جب تک وہ لوگوں کے سامنے اچھالے نہیں، گائے نہیں، اس غریب کی روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ تو ایسے لوگوں کو اگر کسی کا عیب معلوم ہوجائے اور وہ اس کو لوگوں کے پاس گائیں نہیں تو ان کا پیٹ پھول جاتا ہے۔ کسی کا عیب کسی کے سامنے بیان کرنا کم ظرفی کی علامت ہے۔ اکابر فرماتے ہیں "صدور الاحرار قبور الاسرار" یعنی آزاد اور شریف لوگوں کے سینے لوگوں کے بھیدوں کی قبریں ہیں۔

لوگوں کے راز کی باتیں ان کے سینوں میں اتنی محفوظ ہیں کہ کسی کو خبر نہیں۔ تو شریف لوگ تو وہ ہیں جن کو لوگوں کی باتیں اور ان کے عیوب معلوم ہیں، مگر کبھی کسی کے سامنے ان کا اظہار نہیں کیا۔ الغرض کسی کا عیب اس کی غیر موجودگی میں بیان کرنا غیبت کہلاتا ہے اور اس کے منہ پر بیان کرنا طعن کہلاتا ہے، اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نہ کسی کی غیبت کرو اور نہ ایک دوسرے کو طعن کرو۔

طعنے دینا عورتوں کی خصلت ہے

عورتیں بیچاری اس معاملے میں بہت زیادہ کمزور ہوتی ہیں، ان کی یہ خاص بیماری ہے۔ خصوصاً اگر عورتوں کے درمیان لڑائی ہو جائے تو خوب طعن و تشنیع کرتی ہیں، اور ایک دوسری کی غیبتیں کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایک تھانیدار تھے وہ کہتے تھے کہ میں نے بہت سارے خفیہ قتل عورتوں کے ذریعے معلوم کئے ہیں، دیہاتی عورتیں جب رات کو رفع حاجت کے لئے جاتی ہیں تو دنیا جہاں کی کہانیاں بیان کرتی ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ میں بھیس بدل کر زنانہ لباس میں چلا جاتا تھا، رات کا اندھیرا ہوتا تھا، عورتیں قصہ کہانیاں بیان کرتی تھیں اور ان کی باتوں سے قتل کا سراغ لگالیتا۔ تو ایک دوسرے کو طعن نہیں کرنا چاہئے۔

بُرے القاب سے پکارنا

ایک ہدایت یہ فرمائی کہ ایک دوسرے کو بُرے القاب اور بُرے ناموں سے نہ پکارو۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو زمانۂ جاہلیت میں ہم میں سے ہر ایک کے دو، دو، چار، چار نام

تھے۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو اس کا نام لے کر بلایا، تو عرض کیا گیا کہ وہ شخص اس نام سے بلائے جانے کو پسند نہیں کرتا۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان عام فرمادیا، اور ممانعت فرمادی کہ کسی شخص کا ایک سے زیادہ نام نہ رکھا جائے، اور یہ جو بُرے بُرے لقب لوگوں نے تجویز کرر کھے ہیں، ان القاب کو استعمال نہ کیا جائے، اصل نام کو چھوڑ کر یہ جو اور نام رکھے جاتے ہیں وہ کسی نہ کسی عیب کو ظاہر کرتے ہیں، اس لئے اللہ نے بُرے القاب سے پکارنے کی ممانعت فرمادی۔

بدگمانی اور تجسّس

دوسری آیت میں بدگمانی اور تجسّس سے منع فرمایا۔ بدگمانی یہ ہے کہ کسی شخص نے بڑی خیر خواہی کے طور پر کوئی بات کہی، اس کی بات خیر خواہانہ تھی اور اس کا مقصد اچھا تھا، مگر ہم نے اپنے پاس سے اس کا برا مقصد تصنیف کرلیا کہ اس مقصد کے لئے اس نے یہ بات کہی ہے، اچھا مقصد ذہن میں نہیں آتا۔ اور یہ بھی خاص عورتوں کی بیماری ہے، چونکہ ذہن میں کجی ہوتی ہے اس لئے بدگمانی کے طور پر اپنی طرف سے وجہ تصنیف کرلیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسی بدگمانی ناجائز ہے، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"ایاکم والظن، فان الظن أکذب۔ الحدیث"

(مشکوٰۃ:)

ترجمہ: "یعنی بدگمانی سے بچا کرو، اس لئے کہ بدگمانی سب سے بدتر جھوٹی بات ہے"۔

بدگمانی کی فتنہ سامانی

جس گھر میں بدگمانی داخل ہوجائے وہ گھر اجڑ جاتا ہے اور جس معاشرے میں بدگمانی کا دور دورہ ہوجائے وہ معاشرہ تباہ و برباد ہوجاتا ہے۔ کیونکہ جب ہر آدمی دوسرے کی بات کا الٹا مطلب لے گا اور ہر شخص دوسرے سے بدگمان رہے گا تو باہمی اعتماد کیسے پیدا ہوگا؟ اور معاشرہ صحیح نہج پر کیسے قائم رہے گا؟ آج کل تمہارے ہاں بڑے لوگ کیا کررہے ہیں، تمہیں معلوم ہی ہے، یہ عورتوں کی لگائی بجھائی کی ہوئی ہے۔ عورتیں بیچاری اس لگائی بجھائی کے معاملے میں ماہر ہوتی ہیں۔

دوزخ میں عورتوں کی کثرت

عید کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے مجمع میں تشریف لے گئے، ان سے فرمایا:

"یمعشر النساء تصدقن ولومن حلیکن، فانی اریتکن اکثر اهل النار" (مشکوٰۃ شریف)

ترجمہ: "اے عورتوں کی جماعت تم صدقہ کیا کرو، چاہے تم کو اپنا زیور دینا پڑے، اس لئے کہ مجھے دکھایا گیا ہے کہ جہنم میں اکثریت تمہاری ہوگی"۔

دوسری حدیث میں فرمایا کہ میں نے جنت کی سیر کی تھی، میں نے دیکھا کہ وہاں اکثریت کمزوروں کی تھی، جن بے چاروں کو یہاں کوئی پوچھتا نہیں، ٹوٹے پھوٹے لوگ، گرے پڑے لوگ، اور میں نے دوزخ کو دیکھا تو وہاں اکثریت

عورتوں کی تھی، اس لئے فرمایا کہ تم دوزخ سے بچنے کے لئے صدقہ زیادہ کیا کرو، عورتوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری اکثریت وہاں کیوں ہوگی؟ اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ ایک عورت جو بڑی دانا تھی اس نے کہا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ "تم اپنے شوہر کی ناشکری کرتی ہو، کبھی خوش نہیں ہوتیں"۔

عورتوں کی ناشکری

یہ بے چاری عورتوں کی کمزوری ہے، گھر میں اللہ تعالیٰ نے کتنا ہی راحت کا سامان عطا کر رکھا ہو، کھانے کو موجود ہے، پہننے کو موجود ہے، ہر قسم کی راحت ہے، اللہ نے عزت بھی دے رکھی ہے، رزق بھی دے رکھا ہے، لیکن خاتون خانہ کو ذرا چھیڑ کر دیکھئے، ایسا لگے گا کہ دنیا میں اس سے زیادہ دکھوں کی ماری کوئی نہیں ہے، "الحمد للہ! حق تعالیٰ شانہ، کا لاکھ لاکھ شکر ہے" یہ کلمہ ان کی زبان سے کبھی نہیں نکلتا۔ الاّ ماشاء اللہ۔

حضرت مولانا عزیر گلؒ کا واقعہ

"الحمد للہ" پر مجھے قصہ یاد آیا، میں اور مفتی احمد الرحمٰن مرحوم، حضرت مولانا عزیر گلؒ جو کہ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور خادم تھے، ان کی زیارت کو گئے تھے، حضرت ان دنوں صاحب فراش تھے، چند دنوں بعد انتقال ہوگیا تھا، پیشاب پاخانہ بھی دوسرے لوگ کرواتے تھے، اور ایک عرصہ سے آنکھیں بھی ضائع ہوگئیں تھیں، کھا نہیں سکتے تھے، پی نہیں سکتے تھے، نظر کچھ نہیں آتا، پیشاب پاخانہ کے لئے دوسروں کے محتاج تھے۔ ہم دونوں گئے تو ان کو اطلاع کی

گئی کہ فلاں فلاں آئے ہیں، فرمایا، بلالو۔ بلالیا۔ سلام کیا، جواب دیا۔ مفتی احمد الرحمٰن رحمہ اللہ نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ اتنے مزے سے "الحمد للہ" کہا کہ آج تک اس کی مٹھاس کانوں میں ہے، "الحمد للہ" ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ رواں رواں ان کا الحمد للہ کہہ رہا ہے۔

نعمتوں پر شکر کرو

الغرض ہم لوگوں کو جو نعمتیں، اور جو چیزیں حاصل ہیں، ان پر کبھی الحمد للہ نہیں کہتے، اور جو چیزیں حاصل نہیں ہمیشہ ان پر کڑھتے رہتے ہیں، حالانکہ دنیا کی ساری چیزیں ایک آدمی کو تو حاصل نہیں ہو سکتیں، یہ تو حکمت کے خلاف ہے، آپ یہ چاہیں کہ دنیا میں آپ کو کوئی رنج و پریشانی نہ ہو، کوئی مراد ایسی نہ رہے جو پوری نہ ہو، کسی قسم کی کوئی الجھن نہ ہو، یہ تو اس دنیا میں ناممکن ہے۔ پھر یہ دنیا دنیا کیوں ہوگی، جنت ہوگی:

دریں دنیا کسے بے غم نہ باشد
اگر باشد بنی آدم نہ باشد

دنیا میں ایسا کون ہے جس کا کوئی پہلو کمزور نہ ہو؟ میرے مولا کی حکمت کارفرما ہے کہ کسی کو کچھ دے رکھا ہے، کسی کو کچھ دے رکھا ہے۔ ہمیں تو حکم ہے کہ ہر حال میں مالک کا شکر بجالاؤ، لیکن عورتیں بے چاری بہت کمزور ہوتی ہیں اس معاملے میں، ان کے منہ سے کلمۂ شکر بہت کم نکلتا ہے۔

ایک شکر گزار عورت کا واقعہ

آپ کو یاد ہوگا ایک مرتبہ میں سکھر گیا تھا، وہاں میرے ایک عزیز کرنل

صاحب تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ ہم دونوں میاں بیوی چار بجے اٹھتے ہیں، گرمیوں کے موسم میں چار بجے تہجد پڑھی، اس کے بعد فجر کی نماز پڑھ کر میں تو لیٹ جاتا ہوں، اور کوئی آٹھ بجے اٹھتا ہوں، تو میں دیکھتا ہوں کہ گھر والی مصلے پر بیٹھی ہے، چار بجے سے دعائیں مانگ رہی ہے، یہ ہمیشہ کا معمول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اس سے کہا کہ تو کیا مانگتی رہتی ہے، چار گھنٹے ہو گئے۔ کہتی ہے کچھ بھی نہیں مانگتی رہتی۔ بس اللہ کا شکر ادا کرتی رہتی ہوں۔ یا اللہ! آپ نے ہم پر کتنے انعامات فرمائے ہیں، بس یہی شکر کرتی رہتی ہوں، سبحان اللہ! کیسی شکر گزار بی بی ہیں۔

اکثر لوگ ناشکرے ہوتے ہیں

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وقلیل من عبادی الشکور" (اور بہت کم ہیں میرے بندوں میں شکر ادا کرنے والے)۔

اکثر ناشکرے ہیں کہ کھاپی کر بھی کفران نعمت کرتے ہیں، مالک نے سب کچھ دے بھی رکھا ہے، پھر بھی ان کے منہ سے کلمۂ شکر نہیں نکلتا، اگر منہ سے نکل جائے تو دل سے نہیں نکلتا، اور اگر رسمی طور پر الحمد للہ کہہ بھی دیں تو ایسا نہیں کہ دل کی گہرائیوں سے شکر نکلے۔ الغرض عورتیں شوہر کی ناشکری بہت کرتی ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا، وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔ تو گھروں میں ساری لڑائی اسی وجہ سے ہے کہ مجھے یہ نہیں دیا، وہ نہیں دیا، مطالبات کی ایک طویل فہرست ہے، جو پی ڈی اے (پاکستان ڈیموکریٹک الائنس یعنی پی پی اور اس کی حلیف جماعتوں کے

اتحاد) کے مطالبات سے بھی زیادہ لمبی ہے۔ ہر روز ایک مطالبہ، ایک نیا اضافہ، اب مطالبات کے اس جنگل کو کاٹنا، اس کو سر کرنا غریب مرد کے بس کی بات نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر تم ان میں سے کسی کے ساتھ ساری عمر بھلائی کرتے رہو، اگر ایک دن کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہو جائے تم سے، تو کہیں گی: "مارایت منک خیر قط" کہ میں نے تجھ سے کبھی بھلائی نہیں دیکھی۔ یہ تھی وہ بات جس پر فرمایا کہ تم اپنے شوہر کی ناشکری بہت کرتی ہو، اور دوسری بات یہ کہ تم لعنت ملامت بہت کرتی ہو، اور تم اچھے خاصے سمجھدار ہوشیار عقلمند آدمی کی عقل کو ایسا چکر دیتی ہو کہ وہ بے چارہ پریشان ہو کر رہ جاتا ہے، ایسی الجھنیں، اور ایسی گرہیں ڈال دیتی ہیں کہ عقل کے ناخن ان گرہوں کو کھولنے سے عاجز آجاتے ہیں۔

لوگوں کے عیوب کی ٹوہ لگانا

الغرض، کسی کے عیب کی ٹوہ لگانا ایک گناہ ہے، پھر اگر کسی کا عیب معلوم ہو گیا تو اس کو بیان کرنا دوسرا گناہ، اور یہ بیان کرنا اگر اس کے سامنے ہو گا، تو اس کو طعن کہتے ہیں، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "ویل لکل همزة لمزة" (خرابی ہے طعن کرنے والے عیب چین کے لئے)۔

فرمایا کہ ایک دوسرے کو طعن مت کیا کرو، ہم میں سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے، کیا مرد، کیا عورتیں جو اس بیماری میں مبتلا ہے۔ جس طرح حجاج بن یوسف کی تلوار سے کوئی محفوظ نہیں تھا، اسی طرح شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ ہماری زبان کی تلوار سے محفوظ رہا ہو۔ یہ چوڑھے کا چھرا ہے جو نہ حلال دیکھتا ہے نہ حرام کو، نہ بڑے کو دیکھتا ہے نہ چھوٹے کو۔ نہ بُرے کو دیکھتا ہے نہ اچھے کو، کسی

شخص کو ہماری زبان سے امان نہیں، ہماری زبان کترنی کی طرح ہر ایک کو کاٹتی چلی جاتی ہے۔

اور اگر کبھی کسی کا عیب معلوم ہوگیا، اور اس کے سامنے بیان کرنے کی جرأت نہیں، اب عیب معلوم کرنے کے بعد ہم موقع تلاش کرتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے بیان کریں گے۔ اس کے سامنے بیان نہ ہو، اس کو غیبت کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غیبت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کا ایسی بات کے ساتھ تذکرہ کرو، کہ اگر اس کے سامنے تذکرہ کیا جاتا تو اس کو برا لگتا۔ پیٹھ پیچھے اس لئے تذکرہ کرتے ہیں کہ اگر سامنے تذکرہ کریں تو اس کو برا لگے گا، اور وہ ناراض ہوگا۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ یہ فرمایئے کہ اگر میرے بھائی میں وہ بات موجود ہو جو میں بیان کرتا ہوں، یعنی سچی بات کہوں تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ بات اس میں پائی جاتی ہے تو تم نے اس کی غیبت کی۔ اور اگر وہ اس میں نہیں پائی جاتی بلکہ اپنے پاس سے تصنیف کرکے اس سے منسوب کی تو پھر تم نے اس پر بہتان باندھا۔ پھر یہ غیبت نہیں بلکہ بہتان ہے۔ جب تم کسی آدمی کی بُرائی کروگے، اس کی پیٹھ پیچھے، تو دو ہی شکلیں ہیں، یا تو واقعتاً اس میں وہ پائی جاتی ہے تو یہ غیبت ہوگی اور غیبت، زنا سے بدتر ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اور اگر وہ بات اس میں پائی نہ جاتی ہو بلکہ جناب کے اپنے ذہن کی تصنیف ہو تو پھر یہ بہتان ہے، خالص تہمت۔ غیبت کو اللہ تعالیٰ نے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ دو صحابی کسی تیسرے آدمی کا تذکرہ کررہے تھے، ظاہر ہے کہ تذکرہ ایسا ہوگا۔ ہمارے حضرت حکیم الامت تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ غیبت سے بچنے کا یہی طریقہ

ہے کہ کسی آدمی کا تذکرہ اس کی پیٹھ پیچھے مت کیا کرو۔ جب بھی تذکرہ کرو گے تو بات کھینچ کر قدرتی طور پر غیبت پر آجائے گی۔ اور ہمارے لئے تو دلچسپ موضوع ہی یہی ہے۔ تو دو صحابیؓ تذکرہ کررہے تھے کسی تیسرے شخص کا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جارہے تھے آگے دیکھا کہ ایک مرے ہوئے گدھے کی لاش پڑی ہے۔ دونوں کو بلوالیا اور فرمایا کہ اس مردار کی لاش میں سے کھاؤ۔ انہوں نے فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گدھا اور اس کی لاش اس کو کون کھاسکتا ہے۔ فرمایا کہ یہ جو تم دونوں نے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھایا یعنی اس کی غیبت کی وہ اس لاش سے زیادہ بدتر ہے۔ تو اس خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے ان لوگوں کی جماعت جن کی زبانوں نے تو اسلام کا اقرار کرلیا ہے لیکن ان کے دل میں ایمان نہیں اترا۔ مسلمانوں کی غیبتیں نہ کرو اور ان کے عیوب کو تلاش نہ کرو۔ عیوب تلاش کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ٹوہ لگائی جائے، کسی کا غیب معلوم کرنے کے لئے۔ بعض لوگوں کو یہ بھی خاص بیماری ہوتی ہے تحقیقات کی۔ اور اس تحقیقات کا مقصد ہوتا ہے ان لوگوں کے عیوب کو اچھالنا اور ان کی کمزوریوں کو بیان کرنا۔ اور ان کی عزت کو پامال کرنا اور لوگوں کے سامنے ان کی بُرائیاں کرنا۔

مسلمانوں کے عیوب تلاش کرنے والے کی سزا

فرمایا: مسلمانوں کی کمزوریوں اور ان کے عیوب تلاش کرکے بیان نہ کرو، اس لئے کہ بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہوتی ہے۔ تم مسلمانوں کے عیوب تلاش کروگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے عیوب تلاش کریں گے، اللہ تعالیٰ معاف

کرے، اگر اللہ تعالیٰ کسی کے عیوب تلاش کرنے لگیں تو اس کو گھر بیٹھے رسوا کردیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو سب کچھ معلوم ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی پر پردہ ڈالے گا، کہ تمہیں کسی کا عیب معلوم ہوگیا مگر تم نے اس پر پردہ ڈال دیا اور کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تو قیامت کے دن اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے عیوب پر پردہ ڈالیں گے۔ جیسا معاملہ تم مسلمانوں کے ساتھ کروگے، ویسا معاملہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ کریں گے۔

دعا

یا اللہ! ہم تیرے گناہ گار بندے ہیں، یا اللہ! ہمیں قیامت میں رسوا نہ کیجئے، ہمارے عیوب پر پردہ ڈال دیجئے، اور ہمارے گناہوں کی مغفرت فرمادیجئے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ضمیمہ
از
"تبلیغ دین" امام غزالیؒ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وعظ کے آخر میں امام غزالیؒ
کے رسالہ "تبلیغ دین" سے غیبت کا بیان نقل کر دیا جائے،
تاکہ یہ رسالہ اس موضوع پر کسی حد تک جامع ہو جائے۔

غیبت کی حقیقت

کسی مسلمان کی پیٹھ پیچھے اس کے متعلق کوئی واقعی بات ایسی ذکر کرنا کہ اگر وہ سنے تو اس کو ناگوار گزرے، غیبت کہلاتی ہے۔ مثلاً کسی کو بے وقوف یا کم عقل کہنا، یا کسی کے حسب و نسب میں نقص نکالنا، یا کسی کی حرکت یا مکان یا مویشی یا لباس، غرض جس شے سے بھی اس کو تعلق ہو اس کا کوئی عیب ایسا بیان کرنا جس کا سننا اسے ناگوار گزرے، خواہ زبان سے ظاہر کی جائے یا رمز و کنایہ سے یا ہاتھ سے۔ اور آنکھ کے اشارے سے یا نقل اتاری جائے یہ سب غیبت میں داخل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موقع پر کسی عورت کا ٹھگنا ہونا ہاتھ کے اشارے سے ظاہر کیا اور یوں کہا تھا کہ یارسول اللہ! وہ عورت جو اتنی سی ہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا "اے عائشہ! تم نے اس کی غیبت کی ہے"۔

مولویوں کا اندازِ غیبت

سب سے بدتر غیبت وہ ہے جس کا رواج مقتدا اور دیندار لوگوں میں ہو رہا ہے کیونکہ وہ غیبتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو نیک سمجھتے ہیں۔ ان کی غیبتیں بھی نرالے انداز کی ہوتی ہیں۔ مثلاً مجمع میں کہنے لگے کہ "اللہ کا شکر ہے اس نے ہم کو امیروں کے دروازوں پر جانے سے بچا رکھا ہے۔ ایسی بے حیائی سے خدا پناہ میں رکھے"۔ اس کلمہ سے جو کچھ ان کا مقصود ہے وہ ظاہر ہے کہ امرا کے پاس بیٹھنے والے مولویوں پر طعن کرنا اور ان کو بے حیا کہنا منظور ہے، اور ساتھ ہی اپنی صلاحیت تقویٰ جتا رہے ہیں اور ریا کاری کا گناہ کما رہے ہیں۔ اسی طرح مثلاً کہنے لگے کہ "فلاں شخص کی بڑی اچھی حالت ہے اگر اس میں حرص دنیا کا شائبہ نہ ہوتا جس میں ہم مولوی لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں"۔ اس فقرہ سے بھی جو کچھ مقصود ہے وہ ذرا سے تامل سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس کا بے صبرا ہونا ظاہر کرتے ہیں، اور اپنی طرف حرص کی نسبت اس نیت سے کرتے ہیں کہ سننے والا ان کو متواضع سمجھے، اور یہی غیبت ہے، ساتھ ہی ریاکاری بھی ہے۔ زیادہ تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ یہ حضرات غیبت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو غیبت سے محفوظ اور پارسا سمجھتے ہیں۔ یا مثلاً یوں بول اٹھے "سبحان اللہ بڑے تعجب کی بات ہے" اور جب اتنا کہنے پر لوگوں نے اس بات کے سننے کے شوق کی جانب کان لگائے تو کہنے لگے "کچھ نہیں" فلاں شخص کا خیال آگیا تھا، حق تعالیٰ ہمارے اور اس کے حال پر رحم فرمائے اور توبہ کی توفیق دے، اس فقرہ کا جو کچھ منشا ہے وہ عقلمند پر مخفی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا یہ کلمہ ترحم و شفقت یا دعا کی نیت سے نہیں ہوتا، جیسا کہ ظاہری الفاظ سے فہم پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اگر دعا کرنی مقصود ہوتی تو دل ہی دل میں کیوں نہ کر لیتے، سبحان اللہ کہہ کر لوگوں کو

متوجہ کرنا اور معصیت کا اشارہ کرنا ہی کیا ضروری تھا؟ یا کسی شخص کا عیب ظاہر کرنا بھی کوئی شفقت یا خیر خواہی کی بات ہے؟ اسی طرح بعض لوگوں کی عادت ہے کہ غیبت سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی غیبت مت کیا کرو مگر دل ان کا غیبت کو مکروہ نہیں سمجھتا بلکہ اس نصیحت کرنے سے محض اپنی دینداری اور تقویٰ کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی مجمع میں غیبت ہوتی ہے تو ناصح اور پارسا بن کر کہنے لگتے ہیں کہ ”میاں غیبت کرنا گناہ ہے اس سے ہم سننے والے بھی گناہ گار ہوتے ہیں“۔

یہ لوگ کہنے کو تو کہہ جاتے ہیں مگر دل ان کا مشتاق رہتا ہے کہ کاش یہ شخص ہماری نصیحت پر عمل نہ کرے جو کچھ کہہ رہا ہے کہے جائے اور ہمیں سنائے جائے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ غیبت سننے کا انتظار بھی ہے اور پھر یوں بھی سمجھتے ہو کہ ہم منع کرکے گناہ سے سبکدوش ہو گئے۔ یاد رکھو کہ جب تک غیبت کرنے اور سننے کو دل سے برا نہ سمجھو گے تو اس وقت تک غیبت کے گناہ سے ہرگز نہ بچو گے۔ کیونکہ غیبت کرنے والا اور سننے والا دونوں برابر ہیں اور جس طرح زبان سے غیبت کرنا حرام ہے اسی طرح دل سے غیبت کرنا بھی حرام ہے۔ البتہ چند صورتوں میں خاص لوگوں کی غیبت کرنا جائز ہے، جس کی تفصیل ہم بیان کرتے ہیں:

مظلوم کو ظالم کی غیبت کرنا جائز ہے

اول: مظلوم شخص ظالم کی شکایت اگر افسرِ اعلیٰ تک پہنچائے اور اپنے اوپر سے ظلم رفع کرنے کی نیت سے اس کے مظالم بیان کرے تو گناہ نہیں ہے۔ البتہ ظالم کے عیوب کا ایسے لوگوں سے بیان کرنا جنہیں اس کو سزا دینے یا مظلوم کے

اوپر ظلم رفع کرنے کی طاقت نہ ہو بدستور غیبت میں داخل اور حرام ہے۔ ایک بزرگ کی مجلس میں حجاج بن یوسف کا ذکر آگیا تھا تو انہوں نے یوں فرمایا کہ حق تعالیٰ انصاف کے دن مظلوموں کا بدلہ حجاج سے لے گا اور حجاج کا بدلہ اس کی غیبت کرنے والوں سے لے گا۔ اس لئے کہ بہتیرے آدمی حجاج کے مظالم ایسے آدمیوں کے سامنے بیان کرتے ہیں جن کو حجاج کے کئے ہوئے ظلم رفع کرنے کی طاقت نہیں تو ایسے لوگوں کے سامنے حجاج کی غیبت کس طرح جائز ہو سکتی ہے؟۔

بدعتی کی غیبت کرنا جائز ہے

دوم: کسی شخص سے کوئی بدعت یا خلاف امر کے رفع کرنے میں مدد لینی ہو یا کسی کو اس کے فتنہ سے بچانا ہو تو اس سے بھی بدعتی لوگوں کا حال بیان کرنا اگرچہ ان کی غیبت کرنا ہے، مگر جائز ہے۔

فتویٰ کی مدد سے کسی کی غیبت کرنا جائز ہے

سوم: مفتی سے فتویٰ لینے کے لئے استفتا میں امر واقعی کا اظہار کرنا بھی جائز ہے اگرچہ اس اظہار حال میں کسی کی غیبت ہوتی ہو۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میرا خاوند ابوسفیان اتنا بخیل ہے کہ بقدر کفایت بھی مجھ کو خرچ نہیں دیتا" اور ظاہر ہے کہ یہ ابوسفیانؓ کی شکایت اور غیبت تھی مگر چونکہ مفتیٔ شریعت سے استفسار کیا جارہا ہے کہ اس صورت میں میرے لئے شریعت کیا حکم دیتی ہے؟ لہٰذا اس غیبت میں کچھ حرج نہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ اس صورت میں بھی یہ غیبت

اسی وقت جائز ہے کہ جب اس میں اپنا یا کسی مسلمان کا فائدہ مقصود ہو۔

دوسرے کو نقصان سے بچانے کے لئے غیبت کرنا

چہارم: اگر کوئی شخص کسی سے نکاح یا خرید و فروخت کا معاملہ کرتا ہے اور تم کو علم ہو کہ اس معاملہ میں ناواقفیت کی وجہ سے اس کا نقصان ہے تو اس کو نقصان سے بچانے کے لئے اس کا حال بیان کر دینا جائز ہے۔ اسی طرح قاضی کی عدالت میں کسی گواہ کا کوئی عیب اس نیت سے ظاہر کرنا کہ صاحب حق کو اس مقدمہ میں میرے خاموش رہنے سے نقصان نہ پہنچے جائز ہے، البتہ صرف اسی شخص سے ذکر کرنا جائز ہے جس کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا جس پر فیصلہ اور حکم کا مدار ہو۔

پنجم: اگر کوئی شخص ایسے نام ہی سے مشہور ہو جس میں عیب ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً اعمش (چندھا) اعرج (لنگڑا) تو اس نام سے اس کا پتہ بتلانا غیبت میں داخل نہیں ہے، پھر بھی اگر دوسرا پتہ بتلادو تو بہتر ہے تاکہ غیبت کی صورت بھی پیدا نہ ہو۔

ششم: اگر کسی شخص میں کوئی عیب ایسا کھلا ہوا پایا جاتا ہے کہ لوگ اس کا یہ عیب ظاہر کرتے ہیں تو اسے ناگوار نہیں گزرتا مثلاً مخنث یا ہیجڑا کہ ان کے اس فعل کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ان کو خیال بھی نہیں ہوتا تو یہ تذکرہ بھی غیبت سے خالی ہے۔ البتہ اگر اس کو ناگوار گزرے تو حرام ہے کیونکہ فاسق کے بھی کسی ایسے گناہ کا ذکر کرنا جو اسے ناگوار گزرے بلا عذر خاص جائز نہیں ہے۔

غیبت کا علاج

نفس کو غیبت سے روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ غیبت کی سزا اور نقصان میں غور کرو۔ حدیث میں آیا ہے کہ ”آگ جو گھاس میں اثر کرتی ہے غیبت اس سے جلد اور زیادہ اثر مسلمان کی نیکیوں میں کرتی ہے“ یعنی غیبت کرنے سے نیک اعمال جل جاتے ہیں۔ اب ذرا سوچو کہ جب کوئی نیکو کار شخص جس نے دنیا میں مشقتیں اٹھا اٹھا کر نیکیاں جمع کی تھیں جب قیامت کے دن اپنے نامۂ اعمال کورے دیکھے گا اور اس کو معلوم ہوگا کہ غیبت کی وجہ سے اس کی نیکیاں اس شخص کے نامۂ اعمال میں لکھ دی گئی ہیں، جس کی وہ غیبت کیا کرتا تھا تو کس قدر حسرت و افسوس کرے گا۔

مسلمان کو سوچنے کے لئے اپنے نفس کے عیوب بہتیرے ہیں، اس لئے مناسب ہے کہ جب فرصت ملے اپنی حالت پر نظر ڈالو اور جو عیب پاؤ اس کے رفع کرنے میں مصروف ہو جاؤ کہ دوسروں کے عیوب دیکھنے کا موقع ہی نہ آئے، اور یوں سمجھو کہ تمہارا ذرا سا عیب جتنا تم کو نقصان پہنچائے گا دوسرے کا بڑا عیب بھی تم کو اس قدر نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اور اگر تمہیں اپنا عیب نظر نہ آئے تو یہ خود ایسا عیب ہے جس کے برابر کوئی عیب نہیں۔ کیونکہ کوئی انسان عیب سے خالی نہیں ہے۔ پس اپنے آپ کو بے عیب سمجھنا تو بڑا سخت عیب ہے۔ اس لئے اول اس کا علاج کرو اور اس کے بعد جو عیب نظر آتے جائیں ان کی تدبیر کرتے رہو۔ اور اگر اتفاقاً اس پر بھی کسی شخص کی غیبت ہو جائے تو اللہ

سے توبہ جدا کرو، اور اس شخص کے پاس جاکر غیبت کی خطا جدا معاف کراؤ، اور اگر اس سے نہ مل سکو تو اس کے لئے دعائے مغفرت کرو اور خیرات کرکے اس کی روح کو ایصال ثواب کرو۔ غرض چونکہ تم نے غیبت کرکے اپنے مسلمان بھائی پر ظلم کیا ہے اس لئے جس طرح ممکن ہو اس ظلم کی جلد تلافی کرو۔

توبہ

کیسے کریں؟

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

اما بعد:

اس دن ایک دوست نے پرچہ دیا تھا کہ توبہ کیسے کی جائے تو آج مختصر طور پر توبہ کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائیں۔ یوں کہتے ہیں کہ توبہ سالکین کی منازل میں سب سے پہلی منزل ہے۔ یعنی سالک جو اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کا قصد رکھتا ہو، اس کا سب سے پہلا کام اور پہلا قدم سچی توبہ کرنا ہے۔

توبہ کی حقیقت

توبہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے چند باتیں ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہیں۔ اول یہ کہ توبہ کے معنی لوٹ کے آنے کے ہیں۔ بندہ جب گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے دور جاپڑتا ہے اور جب توبہ کرتا ہے تو گویا لوٹ کر واپس آجاتا ہے۔

توبہ کی شرائط

توبہ کے لئے سب سے پہلی بات تو یہ ضروری ہے کہ آدمی کے دل میں یہ مضمون پیدا ہوجائے کہ گناہ کرکے میں اللہ تعالیٰ سے دور ہوگیا ہوں، اور میں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی میں جرم کا ارتکاب کیا ہے، میں مجرم ہوں، اس احساس کے ساتھ اس کے دل میں ندامت پیدا ہوگی اور اس کی علامت دل میں شرمسار اور شرمندہ ہوجانا اور آنکھیں اوپر نہ اٹھا سکنا، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جب خطا کا صدور ہوا تھا، اور ان کو حکم دیا گیا تھا کہ زمین پر اتر جاؤ، تو یوں کہتے ہیں کہ سو سال تک انہوں نے نظر اوپر اٹھا کر نہیں دیکھا، اپنے آپ کو قصوروار سمجھتے تھے اور قرآن کریم میں ان کی توبہ کی دعا نقل کی ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما الصلوٰۃ والسلام دونوں نے کہا:

"ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین" (اعراف: ۲۳)

ترجمہ: "اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے، اپنا نقصان کرلیا ہے اور اگر آپ ہماری بخشش نہیں فرمائیں گے، اور ہم پر رحم نہیں فرمائیں گے تو کوئی شبہ نہیں کہ ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہوجائیں گے"۔

تو پہلی چیز یہ کہ ہمیں واقعتاً احساس ہوجائے کہ ہم گناہ کرکے مجرم کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں اور ہمارے دل میں ندامت پیدا ہوجائے کہ واقعی ہم سے قصور ہوا ہے، حدیث شریف میں فرمایا ہے۔ التوبۃ الندم توبہ ندامت کا نام ہے۔ کسی شخص کے دل میں ندامت ہی پیدا نہ ہو، اور زبان سے توبہ کرتا رہے،

یہ توبہ نہیں تو جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ توبہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی کے دل میں ندامت پیدا ہو، اور وہ اپنے آپ کو قصور وار سمجھے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ گناہوں کا علم ہو، جو آدمی گناہ کو گناہ نہیں سمجھتا، اس کے دل میں ندامت پیدا نہیں ہوگی، وہ یہ کہے گا کہ میں نے کونسا قصور کیا ہے کہ توبہ کروں؟ بے شمار لوگ ایسے ہیں، جو گناہ سے واقف ہی نہیں، یعنی یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم گناہ کر رہے ہیں، اسی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو بیان کرنے کا اہتمام فرمایا ہے تاکہ امت کو معلوم ہو جائے کہ یہ چیزیں گناہ ہیں۔

صغیرہ گناہوں کو تو ضبط کرنا ہی مشکل ہے، لیکن کبیرہ گناہوں کی بعض اکابر نے فہرست مرتب کردی ہے، اور اس کے لئے مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں شیخ ابن حجر مکی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب "الزواجر عن الکبائر" اچھی کتاب ہے، اس موضوع پر حافظ شمس الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی ایک مختصر سا رسالہ ہے، اس میں بھی کبیرہ گناہوں کی فہرست جمع ہے، حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے بھی کبیرہ گناہوں پر "جزاالاعمال" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی ایک رسالہ ہے "گناہ بے لذت" اس میں بھی کبیرہ گناہوں کو جمع کیا ہے، حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک رسالہ ہے "دوزخ کا کھٹکا" اس میں بھی اچھا مجموعہ گناہ کبیرہ کا جمع کردیا گیا ہے۔

کبیرہ گناہ بہت سے ایسے ہیں، جو انسان کے دل سے تعلق رکھتے ہیں، بہت سے ایسے ہیں جو زبان سے تعلق رکھتے ہیں، بہت سے ایسے ہیں جو کان سے تعلق رکھتے ہیں، بہت سے ہاتھ سے تعلق رکھتے ہیں، بہت سے پیٹ سے تعلق رکھتے

ہیں، بہت سے شرمگاہ سے تعلق رکھتے ہیں، تو ان گناہوں کا ہمیں علم ہو اور اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان گناہوں پر جو وعیدیں سنائی ہیں کہ ایسا کرنے والے کو یہ سزا ملے گی، وہ بھی ہمارے سامنے ہوں اور اس بات کا یقین ہو کہ یہ سزائیں جو ذکر فرمائی گئی ہیں، اگر اللہ تعالیٰ نے معافی عطا نہ فرمائی تو پھر ان سزاؤں کا ہم سے تحمل نہیں ہوسکے گا تو یہ دوسری چیز ہوئی یعنی ہم کو گناہوں کا اور ان پر ملنے والی سزاؤں کا علم ہو تاکہ اس پر ندامت کا مضمون پیدا ہو۔

(۳) اور تیسری چیز کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ میں مجرم ہوں، اور مجھ سے قصور ہوا ہے تو دل کے ساتھ اور زبان کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہو، صرف زبان سے نہیں بلکہ یوں سمجھے کہ مجرم کو حاکم کے سامنے پکڑ کر لایا گیا ہے یا کسی بھگوڑے غلام کو آقا کے سامنے لایا گیا ہے، اس وقت وہ دل سے بھی شرمندہ ہوگا اور زبان سے بھی معافی کا خواستگار ہوگا، اگر کوئی غلام یا کوئی مجرم حاکم کے سامنے لایا جائے اور وہ زبان سے کچھ نہ کہے، لوگ اس کو کہا کرتے ہیں کہ ارے معافی مانگ لے، کہہ دے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، معاف کردیجئے لیکن اگر وہ نہیں بولتا اور اپنے قصور کا اقرار کرکے معافی کا طالب نہیں ہوتا تو حاکم کو غصہ آنا ہی چاہئے لیکن اس پر دیکھنے والوں کو بھی غصہ آتا ہے کہ بدبخت کے منہ سے اتنا بھی نہیں نکلتا ہے کہ مجھے معاف کردو، بھول ہوگئی ہے، غلطی ہوگئی ہے معاف کردیں تو تیسری چیز ہے زبان اور دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ سچے دل سے توبہ کرتے ہوئے اس بات کا بھی یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ توّاب ہیں، توبہ قبول کرنے والے ہیں ضرور قبول فرمائیں گے میری توبہ، اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو بڑے سے بڑے گناہ گار کو معاف کرسکتے ہیں اور

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معاف کرنے والا نہیں ہے، یہاں پر آکر شیطان دھوکہ دیتا ہے اور وہ بندے سے کہتا ہے کہ تو نے اتنے گناہ کئے ہیں، اتنے گناہ کئے ہیں اب تو معافی کے لائق نہیں رہا، تیرے گناہوں کو کیسے معاف کیا جاسکتا ہے؟ دیکھ تو سہی کہ تو نے کتنے جرائم کئے ہیں؟ شیطان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ رحمت سے مایوس ہوجائے، توبہ نہ کرے اسی مقصد کے لئے شیطان اس کے گناہوں کو اتنا بڑا کر کے پیش کرتا ہے کہ اس کو یقین ہوجائے کہ میری کسی طرح بھی معافی نہیں ہوسکتی، میں ایسا گناہ گار ہوں کہ لائق رحمت ہی نہیں رہا، اس کو کہتے ہیں کہ مایوسی کفر ہے، شیطان گناہ کو بڑا دکھا کر مایوس کرنا چاہتا ہے تاکہ بندہ اللہ تعالیٰ سے معافی نہ مانگے، نعوذ باللہ۔ تو چوتھی چیز یہ ہے کہ آدمی شیطان کے اس مکر کو سمجھے، وہ گناہ کرتے وقت تو کہتا ہے کہ گناہ کرلے، اللہ بڑا غفور و رحیم ہے، معافی مانگ لینا اور جب بندہ نے حماقت سے گناہ کرلیا تو اس کو رحمت سے مایوس کرتا ہے کہ تیری بخشش نہیں ہوسکتی، بندے کو شیطان کے اس مکر میں نہیں آنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ چاہیں تو معاف کردیں اور وہ سچے دل سے توبہ کرنے والوں کو ضرور معاف فرمادیتے ہیں۔

اللہ کی شانِ کریمی

حدیث شریف میں آتا ہے کہ بندہ نے گناہ کیا، اس سے یہ حماقت ہوئی کہ اس سے گناہ صادر ہوگیا، بعد میں وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یا اللہ مجھے معاف فرمادیں، مجھ سے قصور ہوا ہے، مجھے معاف فرمادیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے گناہ کیا، اس کے بعد وہ توبہ کے لئے میرے پاس آیا ہے اور میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہوں کو

معاف فرما دیا کرتا ہے، سو میں نے اپنے بندے کا گناہ معاف فرمادیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اس نے دوبارہ گناہ کا ارتکاب کیا اور گناہ کر کے پھر اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوئی، جرم ہوا ہے، اپنی رحمت سے اس کو معاف فرمادیجئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے نے قصور کیا ہے اور وہ تائب ہو کر میرے پاس آیا ہے اور میرا بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی گناہ کو معاف نہیں کرتا، میں نے اپنے بندے کو معاف کردیا۔ تیسری بار پھر بندہ گناہ کرتا ہے، پھر اسی طرح تائب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ سے معافی کا طالب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے سے غلطی ہوئی اور اب یہ تائب ہو کر میرے پاس آیا ہے اور یہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہوں کو معاف کردیا کرتا ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کو معاف کرسکے، لہٰذا میں نے اپنے بندے کو معاف کردیا، اور آئندہ یہ جو کچھ بھی کرتا رہے، میں نے معاف کردیا۔

اللہ اکبر! کیا شانِ کریمی ہے؟ یہ نہیں فرماتے کہ میں دو بار اس کو معاف کرچکا ہوں، لیکن یہ پھر گناہ کرتا ہے، تیسری بار پھر معافی مانگنے آیا ہے اب اس کو معاف نہیں کروں گا، نہیں! بلکہ اس کے بجائے یہ فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جتنی بار بھی گناہ کرے میں معاف کرتا جاؤں گا، قربان جایئے اس رحمت اور اس شانِ کریمی پر یہ مطلب نہیں کہ آئندہ گناہ تو کرتا رہے لیکن توبہ نہ کرے تو تب بھی معافی کا وعدہ ہے، نہیں! بلکہ یہ مطلب ہے کہ سو مرتبہ بھی گناہ کر کے آئے، اور معافی کا طالب ہو، تب بھی میں معاف کرتا رہوں گا، گویا اس حدیث میں گناہ کرتے رہنے کی چھوٹ نہیں دی گئی، بلکہ بار بار توبہ کی ترغیب دی گئی ہے، کہ خواہ کتنی ہی بار توبہ ٹوٹ گئی ہو تب بھی بندہ مایوس نہ ہو بلکہ فوراً توبہ

کی تجدید کر کے معافی کا مستحق ہو سکتا ہے۔

ایک اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر تم لوگ گناہ کر کے معافی کے طالب نہ ہوا کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں لے جاتا، تمہاری جگہ کسی دوسری مخلوق کو لاتا جو گناہ کرتے، معافی مانگتے اور اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرماتے۔

اللہ تعالیٰ کس کو سزا دیتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ مجرموں کو سزا بھی دیتے ہیں، لیکن ایسے سرکشوں کو اور مجرموں کو سزا دیتے ہیں جو باغی ہوں، اور جو لوگ اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے، اپنے ضعف و کمزوری کی وجہ سے یا اپنی نفسانی خواہشات کی وجہ سے گناہوں کا ارتکاب کر لیتے ہیں، لیکن ارتکاب کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تائب ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو سزا دینے کے بجائے معاف کرنے کو پسند فرماتے ہیں، حق تعالیٰ شانہ کو معاف کر دینا اتنا محبوب ہے کہ سزا دینا اتنا محبوب نہیں ہے، اس غفور و رحیم کو بخشش فرمانا زیادہ محبوب ہے بہ نسبت عذاب دینے کے اور میں نے ایک حدیث شریف کا حوالہ دیا تھا اور اس کا ایک ٹکڑا ذکر کیا تھا، اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو! اگر تم سارے کے سارے ایک میدان میں جمع ہو جاؤ اور تمہارے گناہ اتنے زیادہ ہو جائیں کہ آسمان سے لے کر زمین تک، زمین سے لے کر آسمان تک، پورا خلا ان گناہوں سے بھر جائے، اور تم آ کر میری بارگاہ میں توبہ کرو اور معافی کے طالب ہو جاؤ تو میں اتنی ہی مغفرت لے کر تمہارے استقبال کو آؤں گا، جتنے تمہارے گناہ ہیں۔

گناہوں کی نقدی پر مغفرت

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا یہ عالم ہے کہ قیامت کے دن کچھ بندے ایسے ہوں گے، جو گناہوں کی نقدی کے ذریعہ اللہ کی مغفرت کے خریدار بن جائیں گے، نیکیوں کی نقدی کے ذریعہ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت خریدی ہی جاتی ہے، لیکن گناہوں کے ذریعہ بھی جب کہ آدمی ان کے ساتھ توبہ کو لگادے اللہ تعالیٰ کی مغفرت خریدی جاتی ہے۔

تو آدمی کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، اس کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی بخشش نہیں ہوگی، بلکہ یہ یقین رکھنا چاہئے کہ ہمارے گناہ خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں، اللہ تعالیٰ کی مغفرت و قدرت کے احاطہ سے باہر نہیں، جب چاہیں بخش دیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے گناہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں لیکن وہ ہماری صفت ہیں، ہمارے افعال ہیں، ہمارے اقوال ہیں، ہماری صفات ہیں، ہم بھی مخلوق، ہماری صفات بھی مخلوق اور حق تعالیٰ شانہ کی مغفرت اور بخشش اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، بندوں کی صفت اللہ کی صفت سے کیسے بڑھ سکتی ہے؟ بندے کی صفت بھی اتنی ہی چھوٹی ہے جتنا یہ خود چھوٹا ہے اتنا چھوٹا، جتنا چیونٹی کا انڈہ ہوتا ہے، اتنا تو ہے بے چارہ کل، ایک ذرہ بے مقدار کی تو اس کی حیثیت ہے، آخر اس کے گناہوں کا رحمت خداوندی سے کیا مقابلہ؟ ارے! تمہارے تمام گناہوں کو دھونے کے لئے اس کی رحمت کا ایک چھینٹا کافی ہے، بس ضرورت اس کی ہے کہ تم سچے دل سے تائب ہو کر آؤ۔ تو یہ چوتھا نمبر ہوا۔

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ مجرم جب جرم سے توبہ کرتا ہے، معافی مانگتا ہے، تو یہ کہا کرتا ہے کہ آئندہ نہیں کروں گا۔ ایک شخص مجرم کو ڈانٹ رہا ہے

اور پوچھتا ہے کہ "پھر کروگے؟" وہ کہتا ہے "میری توبہ، پھر نہیں کروں گا" اور اگر یہ کہے کہ آئندہ بھی کروں گا تو وہ معافی نہیں مانگ رہا، مذاق اڑا رہا ہے، لہٰذا توبہ کے توبہ ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ توبہ کرتے وقت آدمی یہ عزم رکھے اور پختہ ارادہ رکھے کہ آج کے بعد کوئی گناہ نہیں کروں گا، بس آج تک جو ہونا تھا ہوگیا، یہ آخری گناہ ہے، انشاء اللہ اس کے بعد گناہ نہیں ہوگا، ہمیں معلوم ہے کہ اگرچہ یہ پھر گناہ کریں گے، اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ بندے پھر گناہ کریں گے، اس لئے کہ یہ ہماری کمزوری ہے لیکن بھئی! جس وقت کہ ہم توبہ کریں، اس وقت یہی عزم ہو کہ آج کے بعد پھر نہیں کریں گے، بس ختم۔ جیسے کوئی نشہ چھوڑ دیتا ہے تو چھوڑنے کے معنی یہ نہیں کہ آج کے بعد نہیں ہوگا، بس ختم، کوئی بری عادت چھوڑ دیتا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ آج کے بعد نہیں کریں گے، ہم بھی جب اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کریں تو یہ عزم لے کر کریں کہ انشاء اللہ آج کے بعد مجھے یہ کام نہیں کرنا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ سے صلح ہوگئی، لیکن اگر خدانخواستہ پھر گناہ ہوجائے تو یہ نہ سوچو کہ "چونکہ میری توبہ ٹوٹ گئی، لہٰذا توبہ تو نبھتی نہیں ہے، تو اب توبہ ہی کیا کرنی ہے" اگر یہ سوچ کر آئندہ توبہ کرنا چھوڑ دوگے تو یہ غلط ہے، نہیں! بلکہ اگر بار بار توبہ ٹوٹ جائے تو بار بار اس کی تجدید کرو۔

توبہ ٹوٹنے پر مایوس نہیں ہونا چاہئے

اس کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں، فرض کیجئے ایک شخص پیٹ کی بیماری میں مبتلا تھا، بڑی مشکل سے مرض قابو میں آیا، علاج معالجہ اس کا ہوتا رہا، طبیب نے اس سے کہا کہ اس شرط پر علاج کرتا ہوں کہ آئندہ بد پرہیزی نہیں کروگے، اس

نے کہا کہ جی بالکل نہیں کروں گا۔ طبیب نے توجہ سے علاج کیا، مرض قابو میں آگیا، الحمدللہ طبیعت بڑی حد تک بحال ہوگئی، لیکن اس نے پھر بدپرہیزی کرلی اور طبیعت پھر بگڑ گئی، بیماری بے قابو ہوگئی تو اب کیا یہ عقل کی بات ہوگی کہ چونکہ میں پرہیز نہیں کرسکتا تو اس لئے مرنے دو مجھے ؟ کبھی دنیا میں کوئی ایسا شخص دیکھا ہے ؟ جو یہ کہے کہ مجھے مرنے دو، مجھ سے پرہیز تو ہوتا نہیں، علاج کا کیا فائدہ؟ نہیں! بلکہ اس کے بجائے یہ ہوتا ہے کہ طبیب نے اس سے کہا کہ تم نے بدپرہیزی کی ہے؟ کہا جی، بس ہوگئی، حکیم صاحب! آپ ذرا مہربانی کر کے توجہ کے ساتھ علاج کریں، انشاء اللہ پھر بدپرہیزی نہیں کروں گا، مطلب یہ کہ بدپرہیزی کو چھوڑنا چاہیے، علاج کو تو نہیں چھوڑا جاتا؟ کہ چونکہ میں نے بدپرہیزی کی ہے لہٰذا میرا علاج نہ کراؤ، بس چھوڑ دو، مجھے اس طرح مرنے دو، خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ جب ہم نے توبہ کرلی تو آئندہ بدپرہیزی سے تو ضرور بچنا چاہیے، اپنی توبہ پر قائم رہنا چاہیے۔ ارے عزم یہی ہونا چاہیے کہ آئندہ مجھے یہ گناہ نہیں کرنا ہے لیکن اگر خدا نہ کرے گناہ پھر ہوجائے تو ہمت ہار کر اور مایوس ہو کر نہ بیٹھ جائے، اور یہ نہ سوچے کہ مجھے توبہ پر استقامت تو نصیب ہوئی نہیں، اب کیا توبہ کریں بس توبہ کا خیال چھوڑ دینا چاہیے اور بے دھڑک گناہ کرتے رہو، نہیں! تم نے بدپرہیزی کرلی تو پھر توبہ کرلو، پھر بدپرہیزی کرلی، پھر توبہ کرلو، حتی کہ بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر ایک دن میں سو مرتبہ توڑ دی ہو تو سو مرتبہ اس کو جوڑ لو، اگر نفس اور شیطان اتنے حاوی ہیں کہ توبہ پر قائم نہیں رہنے دیتے تو اتنا تو کرو کہ جب بھی توبہ کرو تو یہ نیت کرلیا کرو کہ اب نہیں کروں گا۔

توبہ توڑنے اور پھر جوڑنے کا فائدہ؟

یہ ذہن میں رکھو کہ اگر توبہ توڑتے رہے، جوڑتے رہے، توڑے رہے، جوڑتے رہے، تو کیا بعید ہے کہ توبہ توڑنے کے بعد جب تم نے جوڑ لی تھی تو اس حالت میں تمہارا انتقال ہو، تم توبہ جوڑتے رہے، اور توبہ ٹوٹتی رہی، لیکن آخری جو عمل ہوا، وہ تھا توبہ کا جوڑنا، توبہ کرلی، اس کے بعد پھر گناہ کا ارتکاب نہیں کیا، بلکہ اس حالت میں موت آگئی اور اللہ کی بارگاہ میں پہنچ گیا تو دنیا سے تائب ہو کر گیا اب یہ شخص اگرچہ روزانہ سو مرتبہ توبہ توڑتا تھا، جوڑتا تھا، توڑتا تھا، جوڑتا تھا، لیکن اس کا آخری عمل تو توبہ ہی رہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

انما الاعمال بالخواتیم

یعنی "اعمال کا مدار خاتمہ پر ہے"۔

جب اعمال کا مدار خاتمہ پر ہے تو اگر آخری عمل توبہ کر کے تمہارا اللہ کی بارگاہ میں پہنچنا ہے کہ توبہ کرنے کے بعد پھر گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تو تمہاری توبہ مکمل ہوگئی، تم تائب ہو کر اللہ کی بارگاہ میں پہنچ گئے اور خاتمہ بالخیر ہوا، اس لئے توبہ کرتے وقت تم عزم یہ رکھو کہ آج کے بعد انشاء اللہ گناہ نہیں کروں گا، لیکن اگر فرض کرو کہ پھر گناہ کا ارتکاب ہو جائے تو دل شکستہ ہو کر توبہ سے نہ ہٹو بلکہ پھر توبہ کرو، بلکہ پہلے سے زیادہ پکی توبہ کرو اور کہو کہ یا اللہ! مجھ سے پھر غلطی ہوگئی ہے، میں ایسا رذیل آدمی ہوں، اتنا کمینہ ہوں کہ آپ سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ دوبارہ گناہ نہیں کروں گا، اس وعدہ کو بھی پورا نہ کرسکا، یا اللہ! مجھے معاف فرمادیجئے، میں اب نہیں کروں گا۔

کپڑے کا گندہ ہو جانا بُرا نہیں اس کو صاف نہ کرنا بُرا ہے

بھئی! کپڑے کو گندہ کرنے سے تو پرہیز کرنا چاہئے، اس سے بچنا چاہئے لیکن اگر گندہ ہوجائے تو اس کو صابن لگا کر دھونے سے پرہیز کرنا تو عقل کی بات نہیں ہے، ایک مرتبہ تم نے کپڑے کو دھولیا، صاف کرلیا، صابن لگا کر اچھی طرح تمام کے تمام داغ دھبے خوب اتار دیئے، اب کیا کرنا چاہئے؟ یہ کہ آئندہ ملوث نہ ہوں، لیکن بچوں کی طرح اگر نادانی کا دور ہے، پھر کپڑے خراب ہوجاتے ہیں تو کپڑوں کو گندہ کرنے سے بچانا چاہئے تھا لیکن جب گندے ہوجائیں تو صابن لگا کر دھونے سے تو نہیں بچنا چاہئے، خوب یاد رکھو کہ گناہوں کے ارتکاب سے ہمارے ایمان کا جامہ گندہ ہوجاتا ہے، بدبو دار اور متعفن ہوجاتا ہے، میلا ہوجاتا ہے، قابل نفرت ہوجاتا ہے اور خوب اچھی طرح جم کر توبہ کرنے سے وہ ایمان کا جامہ صاف ہوجاتا ہے اور پھر نکھر آتا ہے۔ توبہ کر کے آئندہ گناہ کرنے سے ضرور بچو، لیکن پھر اگر کوئی داغ دھبہ لگ گیا تو فوراً توبہ کرو، فوراً صابن لے کر ملو، انشاءَ اللہ جب تم بار بار توبہ کروگے اور اللہ تعالیٰ سے استقامت کی دعا کروگے کہ یا اللہ تعالیٰ! اب مجھے بچالیجئے، میں اپنی استعداد و قوت کے ساتھ، اپنی طاقت کے ساتھ گناہ سے نہیں بچ سکتا، جب تک آپ مجھ پر رحم نہ فرمائیں، اور میری مدد نہ فرمائیں، مجھے آئندہ گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمادیجئے، اگر ایسا کرتے رہوگے تو انشاءَ اللہ رفتہ رفتہ یہ کیفیت ہوجائے گی کہ توبہ کروگے، لیکن گناہ نہیں ہوگا، انشاءَ اللہ۔

تو یہ پانچواں نمبر ہوا، یعنی توبہ کرتے وقت ارادہ رکھو کہ آئندہ گناہ نہیں ہوگا، اب مستقل طور پر ہمارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہوگیا، اب ہم ٹھیک چلیں گے، اور پھر ہمت سے کام لو، گناہ کا کتنا ہی تقاضا ہو، گناہ نہ کرو،

کوشش کرو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو عہد کیا ہے، اس کو پورا کریں اور آئندہ گناہ کے ساتھ اپنے دامن کو آلودہ نہ کریں، لیکن اگر ہوجائے تو فوراً توبہ کرو، بس اس کو ہمیشہ کا دستور العمل بنالو کہ گناہ ہوجائے تو فوراً توبہ کی جائے۔

(٦) چھٹی بات یہ کہ جتنی کوتاہیاں ہوگئی ہیں، ان کی تلافی کرو، نمازیں قضا ہوتی رہیں، اب تم نے سچے دل سے توبہ کرلی، لیکن توبہ کرنے سے نمازیں معاف نہیں ہوگئیں، بلکہ نمازیں تمہارے ذمہ اب بھی باقی ہیں جیسے کہ آج ایک ظہر کی نماز ہمارے ذمہ فرض تھی (اور وہ ہم نے ادا کی) پوری زندگی کی ظہر کی نمازیں ہمارے ذمہ فرض ہیں، اور یہ فرض ہمارے ذمہ باقی ہے، ان تمام نمازوں کا ادا کرنا، اسی طرح ضروری ہے، جس طرح کہ آج کی نماز کا ادا کرنا فرض تھا۔ رہا یہ سوال کہ پھر توبہ کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ توبہ کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ تاخیر کی وجہ سے تم نے جو کوتاہی کی کہ وقت پر ادا نہیں کی، اس کی معافی مل جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسے سمجھو کہ کسی شخص نے پلاٹ خریدا تھا، اس کی قسطیں بہت آسان سی رکھی ہوئی تھیں، اس نے بے پروائی کی، ادا نہیں کیں۔ متعلقہ محکمہ نے اس کا پلاٹ ہی منسوخ کردیا اور جو پیسے دیئے تھے وہ بھی ضبط کرلئے، اب یہ بڑے افسر کے پاس جاکر کہتا ہے کہ جی مجھ سے بڑی کوتاہی ہوئی ہے میں آئندہ سستی نہیں کروں گا اور وہ افسر اس کی بات سن کر لکھ دیتا ہے کہ اس کا پلاٹ بحال کردیا جائے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ جو پرانی قسطیں رہ گئی ہیں، وہ بھی معاف ہوگئیں؟ نہیں! پلاٹ کی منسوخی تو اس نے ازراہ ترحم ختم کردی، لہٰذا پلاٹ تو بحال ہوگیا، لیکن جو قسطیں تمہارے ذمہ تھیں، وہ تو بدستور واجب الادا رہیں گی، بلکہ دنیا کا حاکم اول تو ایسے منسوخ شدہ پلاٹ کو بحال ہی نہیں کرے گا اور اگر کوئی رحم دل ایسا کر بھی دے تو وہ حاکم یہ کہے گا کہ تمام گزشتہ قسطیں یک

مشت یہاں لاکر رکھ دو، تب میں بحالی کا حکم جاری کرتا ہوں تو جتنی زندگی میں ہم نے نمازیں قضا کی ہیں، اگر عزم رکھتے ہو کہ میں ان کو ادا کروں گا، تب تو توبہ صحیح ہوئی اور گزشتہ نمازیں قضا کرنے کا اگر عزم نہیں تو توبہ ہی نہیں، مذاق اڑاتے ہو توبہ کا۔

اسی طرح کسی شخص کے ذمہ روزے باقی ہیں، اس نے روزے چھوڑ دیئے تھے، یا توڑ دیئے تھے رمضان المبارک کے، بعض چھوڑ دیتے ہیں، بعض توڑ دیتے ہیں، اگر کسی نے روزہ چھوڑ دیا تو اس کے بدلے ایک روزہ اس کے ذمہ ہے اور اگر کوئی شخص روزہ توڑ دے تو اکسٹھ روزے اس کے ذمہ ہیں ایک روزہ تو چھوڑے ہوئے روزے کی جگہ اور ساٹھ روزے کفارے کے اور یہ ساٹھ روزے لگاتار ہوں کہ درمیان میں وقفہ نہ ہو، درمیان میں ناغہ نہ ہو، اگر ناغہ ہو جائے تو پھر نئے سرے سے شروع کرے، یہاں تک کہ لگاتار کفارہ کے ساٹھ روزے پورے ہو جائیں، رمضان کا ایک روزہ توڑ دینے کا اتنا بڑا گناہ ہے۔

اسی طرح کسی شخص نے کسی شخص کو قتل کیا ہو اور یہ قتل جان بوجھ کر نہیں، بلکہ غلطی سے ہوا ہو، خطا سے ہوا ہو تو اس کا کفارہ قرآن کریم نے یہ ذکر کیا ہے کہ غلام آزاد کرے، اگر غلام نہیں ملتا تو دو مہینے پے درپے روزے رکھے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے کے لئے۔ بس اس کی توبہ قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے، اگر روزے رکھنے شروع کردیئے تھے کہ درمیان میں بیمار ہوگیا اور روزہ کا ناغہ ہوگیا تو جتنے روزے رکھے تھے، وہ ختم، اب نئے سرے سے شروع کرکے ساٹھ پورے کرے، البتہ عورت کو جو اس کے خاص ایام کی وجہ سے روزے قضا کرنا پڑتے ہیں وہ اس تسلسل میں رکاوٹ نہیں ڈالتے، لیکن شرط یہ ہے کہ پاک ہونے کے بعد فوراً شروع

کردے۔ الغرض جس نے روزے نہیں رکھے تھے وہ قضا کرے، یا اگر توڑ دیئے تھے تو توڑے ہوئے روزوں کا کفارہ ادا کرے۔

اسی طرح اگر کسی نے اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں دی تھی تو گزشتہ سالوں کا حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرے، جتنے سال سے اس کے پاس مال تھا اس کا حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرے۔

اسی طرح حقوق اس نے دبائے ہوئے ہیں تو جو حقوق ادا کرنے کے لائق ہیں، ان کو ادا کرے، اور اگر ان کا ادا کرنا ممکن نہیں، یعنی ان کا معاوضہ ادا نہیں کیا جاسکتا تو صاحب حق سے معافی مانگے، مثلاً ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ ظلم اور زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے تو اس کی معافی کی شرط یہ ہے کہ اس سے معافی مانگے، اسی طرح اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ زیادتی کی ہے تو توبہ کے لئے شرط یہ ہے کہ اس سے معافی مانگے، اگر کسی کا کسی کے ذمہ قرض ہے، اس کو ادا کرے اور ادا کرنے میں جو تاخیر کی، اس کی معافی مانگے، اگر کسی کی چوری کی ہے، کسی سے رشوت لی ہے، کسی کا مال ناجائز کھایا ہے اس کو واپس کردے۔

سچی توبہ پر نصرت الٰہی

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے پاس ایک آدمی آیا کہ میں بیعت ہونا چاہتا ہوں، پوچھا کیا کام کرتے ہو، کہا کہ ڈاکے ڈالتا تھا، لیکن اب میں تائب ہو کر آیا ہوں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ تمہیں بیعت ضرور کریں گے، لیکن جب سے تم نے یہ کاروبار شروع کیا تھا، اس کی فہرست بنا کر لاؤ کہ کتنے ڈاکے ڈالے، کس کس کا گھر لوٹا تھا۔ حضرتؒ فرماتے

ہیں کہ آدمی سچا تھا، چند دن کی محنت کے بعد اس نے یاد کر کے جتنے ڈاکے ڈالے تھے، جتنی چوریاں کی تھیں، ان سب کی فہرست بنالی اور حضرتؒ کی خدمت میں پیش کی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اب دوسرا کام یہ کرو کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس جاؤ کہ فلاں وقت میں نے تمہاری چوری کی تھی، ڈاکہ ڈالا تھا اور اب میں تائب ہو گیا ہوں، تمہارا مال میرے ذمہ قرض ہے۔ یہ قرض مجھے فوراً ادا کرنا چاہئے تھا مگر اتنی گنجائش میرے پاس نہیں کہ اس کو فوراً ادا کر دوں، اب اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ آپ معاف کر دیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بدلہ قیامت کے دن عطا فرمائیں گے، دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ میرے ذمہ ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ توفیق دیں گے تو میں فوراً ادا کر دوں گا، بہر حال آپ کو اس کی وجہ سے جو اذیت پہنچی، اس پر مجھ کو معاف کر دیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ ہر ایک کے پاس جاؤ اور ہر ایک سے لکھوا کر لاؤ کہ میں نے معاف کر دیا یا میں مہلت دیتا ہوں ادا کرنے کی کہ جب تم چاہو جب تمہیں سہولت ہو تم ادا کر دینا، اس شخص کے دل میں سچی طلب تھی، ہمارا نفس تو کہے گا کہ میاں! اگر اس کے سامنے جا کر اقرار کرو گے تو تمہیں پکڑوا دیں گے، پکڑے جائیں گے، جب تم نے کسی سے رشوت لی ہے، جب تم نے کسی کی چوری کی ہے، جب تم نے ڈاکہ ڈالا ہے تو بھئی! پکڑ تو لازماً ہو گی، اگر یہاں نہیں پکڑے جاؤ گے تو وہاں پکڑے جاؤ گے، تم پکڑ سے بچ نہیں سکتے، اگر یہاں کی پولیس نہیں پکڑے گی تو وہاں کی پولیس پکڑے گی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ یہ شخص ہر ایک کے پاس گیا اور اللہ کی شان کہ اس نے سب سے ایسی بات کی، اللہ جانے کتنے اخلاص کے ساتھ بات کی کہ ہر ایک نے لکھ دیا کہ میں نے اللہ کے لئے معاف کیا، حتیٰ کہ ایک ہندو کی چوری کی تھی اس ہندو نے یہ لکھ دیا کہ

میں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے معاف کردیا۔ یہاں تک کہ ایک ہندو نے لکھا میں نے حسبتاً للہ معاف کردیا، تب حضرت نے اس کو بیعت فرمایا، یہ ہوئی ناسچی توبہ!

تو حقوق اللہ ہوں، یا حقوق العباد ہوں، ان کو ادا کرنا اور جب تک ادا نہ ہوں، اپنے ذمہ قرض سمجھنا لازم ہے۔ کسی کی دکان غصب کی ہوئی ہے، کسی کی زمین غصب کی ہوئی ہے، کسی کی املاک پر قبضہ کیا ہوا ہے، کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ مالک کو کہہ دیا کہ جاؤ کرلو جو تم سے ہوسکتا ہے، مکان نہیں چھوڑیں گے، اگر کوئی شخص لوگوں کی املاک پر غاصبانہ قبضہ جمالے اور پھر خانہ کعبہ میں جاکر غلافِ کعبہ پکڑ کر توبہ کرے گا، تب بھی اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی، جب تک کہ اس غصب سے توبہ کر کے اس کے مالک کو واپس نہیں کردیتا۔

تم مخلوق کو عاجز کرسکتے ہو، مگر اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے، مخلوق کو دھوکہ دے سکتے ہو، تمہارے تسبیح پڑھنے سے، تمہارے بار بار حج و عمرہ کرنے سے مخلوق دھوکہ کھاسکتی ہے، لیکن اللہ کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا تم غلافِ کعبہ پکڑ کر اللہ سے توبہ کرو، لیکن تمہاری توبہ قبول نہیں ہوگی، جب تک کہ اربابِ حقوق کے حقوق ادا نہیں کرتے یا ان سے معاف نہیں کرواتے۔

یہ چھ نمبر میں نے ذکر کردیئے ہیں، ان چھ نمبروں کو مکمل کرلیا جائے تو توبہ، توبہ ہے اور اگر یہ نہ ہو تو پھر توبہ نہیں ہے، صرف توبہ کے الفاظ ہیں۔ سارا دن روٹی، روٹی کا وظیفہ پڑھتے رہو، تمہارا پیٹ نہیں بھرے گا، جب تک کہ روٹی عملا کھا نہیں لیتے، اور نہ ہی تمہیں روٹی کا ذائقہ آئے گا، پیٹ تب بھرے گا جبکہ روٹی کو حلق سے نیچے اتاروگے، تب قوت بھی حاصل ہوگی اور پیٹ بھی بھرے گا۔

استغفراللہ العظیم، استغفراللہ العظیم، پوری تسبیح پڑھ دو لیکن دل میں معافی مانگنے کا مضمون نہیں ہے، نہ گناہ کو گناہ سمجھا، نہ آئندہ گناہ سے بچنے کا عزم کیا، نہ گزشتہ گناہوں پر افسوس ہوا، نہ ان کا تدارک کیا، نہ حقوق اللہ ادا کئے، نہ حقوق العباد ادا کئے، نہ اللہ تعالیٰ سے معاملہ درست کیا، نہ بندوں سے معاملہ درست کیا، پھر چاہتے ہو کہ توبہ قبول ہوجائے؟ کیسے ہوگی؟ اس کا نام تو توبہ نہیں ہے۔

سبحہ درکف، توبہ برلب، دل پر از ذوق گناہ
معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

بزرگ فرماتے ہیں کہ ہاتھ میں تسبیح ہے، دانے پر دانہ پھینک رہا ہے، ٹھک ٹھک تسبیح چل رہی ہے، لیکن دل گناہوں کی لذت سے بھرا ہوا ہے، دل میں گناہ سے کراہیت پیدا نہیں ہوئی، بلکہ دل گناہوں کی لذت سے بھرا ہوا ہے، ایسا استغفراللہ پڑھنے پر گناہ ہنستا ہے، ایسے استغفار پر معصیت کو ہنسی آتی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ اگر صحیح توبہ ہوجائے تو آدمی کی زندگی کی لائن بدل جاتی ہے جو معاملات ہم شریعت کے خلاف کرتے ہیں، توبہ کے معنی یہ ہیں کہ ہم ان غلط کاموں کو چھوڑ دیں، ہمارا کاروبار، ہماری دکان، ہمارا کارخانہ اور ہمارا لین دین جو شرع کے خلاف ہے اس کی کل درست ہوجائے، اس کی لائن درست ہوجائے، یہ ہے توبہ، اگر وہی بے ڈھنگی چال ہے، جو پہلے سے تھی تو پھر صحیح توبہ نہیں کی، زبان پر توبہ کے الفاظ ہیں، حقیقت توبہ کی نصیب نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائیں میں توبہ کے فضائل بیان کرچکا ہوں، توبہ اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے۔ ارشاد ہے:

"ان اللّٰہ یحب التوابین ویحب المتطھرین"

(البقرہ: ۲۲۲)

یعنی "اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں کو، اور اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں خوب پاک صاف رہنے والوں کو"۔

خلاصہ

خلاصہ اس سارے مضمون کا اتنا ہے کہ گناہ ایک گندگی ہے، جیسے پاخانہ، پیشاب ایک گندگی ہے، چونکہ ہماری ناک یہ بدبو نہیں سونگھتی، اس لئے ہمیں گناہوں سے بدبو نہیں آتی، مشکوۃ شریف میں حدیث ہے کہ جب یہ بندہ ایک لفظ جھوٹ کا زبان سے نکالتا ہے تو اس کی بدبو کی وجہ سے فرشتہ ایک میل دور ہوجاتا ہے، اسی طرح جتنے بھی گناہ ہیں، یوں سمجھو کہ بدن کے اندر کوڑھ کی بیماری ہے اور اس سے بدبو دار مادہ رس رہا ہے، اس بدبو دار مادہ کے ساتھ تم عبادت کرو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقرب ہوجاؤ، یہ کیسے ممکن ہے؟

تو میں نے کہا کہ خلاصہ ساری بات کا اتنا ہے کہ گناہ ایک نجاست ہے، اور ایسا تعفن کہ اگر ہم پر پردہ نہ ڈالا ہوتا تو اس کی بدبو اور تعفن کی وجہ سے ہمارے دماغ پھٹ جاتے، اس گندگی سے صفائی صرف اس صورت میں ممکن ہے جبکہ ہم اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیں اور آئندہ گناہ سے بچنے کا اور گزشتہ گناہوں کا تدارک کرنے کا فیصلہ کرلیں اور اللہ رب العزت سے عہد کرلیں تو انشاءاللہ فوراً معافی مل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین
وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد
وآلہ واصحابہ اجمعین

حسد

کی بیماری اور اس کا علاج

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و
نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور
انفسنا ومن سیاٰت اعمالنا، من یھدہ اللّٰہ
فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد
ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھدان
سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ،
صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلی اٰلہ واصحابہ
وبارک وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرا۔ اما بعد!

حسد کے معنی

حسد ایک بیماری ہے دل کی، جس کے معنی ہیں کسی کی نعمت سے جلنا، ایک شخص کے پاس ہم کوئی نعمت دیکھتے ہیں، مثلاً اس کو کھانے کو اچھا ملتا ہے، یا پہننے کو اچھا مل گیا، کوئی رشتہ اچھا ہو گیا، مکان اچھا بن گیا، اس کا کاروبار چمک گیا، اس کو کوئی حیثیت مل گئی، کوئی عہدہ مل گیا، اس کی ان نعمتوں کو دیکھ کر بعض لوگوں

کے دل میں جلن پیدا ہوتی ہے کہ اس کو یہ چیز کیوں ملی؟ اور جی یوں چاہتا ہے کہ اس کے پاس سے یہ نعمت چھن جائے، یہ تو حسد کہلاتا ہے اور اگر کسی کی نعمت دیکھ کر یہ تمنا پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی یہ نعمت عطا فرمادیں تو اس کو غبطہ یعنی رشک کرنا کہتے ہیں۔

حسد اور غبطہ کے درمیان فرق

رشک میں اس شخص سے نعمت کے زائل ہونے کی تمنا نہیں ہوتی، یعنی یہ تمنا نہیں ہوتی کہ یہ نعمت اس کے پاس نہ رہے، بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ عطا کرے، لیکن یہ تمنا بھی ہوتی ہے کہ کاش یہ نعمت مجھے بھی مل جائے، آدمی کا دل نعمت کے حصول کے لئے للچاتا ہے، یہ رشک کہلاتا ہے، اور اس کی اجازت ہے، کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب بھی کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھتا ہے تو تمنا کرتا ہے کہ یہ نعمت مجھے بھی مل جائے۔

صرف دو نعمتیں لائق رشک ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"لاحسد الافی اثنین رجل اتاہ اللّٰہ مالا فسلطہ علی ھلکتہ فی الحق، ورجل اتاہ اللّٰہ الحکمۃ فھو یقضی بھا ویعلمھا۔"

(متفق علیہ مشکوٰۃ صفحہ ۳۲)

یعنی "لائق رشک صرف دو آدمی ہیں"۔

یہاں حسد سے غبطہ اور رشک مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اگر کوئی

لائق رشک ہے تو صرف دو آدمی ہیں جن پر آدمی کو رشک کرنا چاہئے۔

> "ایک وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہے، مال عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلط کردیا اس کے ہلاک کرنے پر، یعنی اس کے خرچ کرنے پر حق کے راستوں میں"۔

کہ وہ نیک کاموں میں مال کو خرچ کرتا ہے، تو یہ شخص قابل رشک ہے، اس سے معلوم ہوا کہ محض مال کا جانا قابل رشک نہیں، ہاں! کسی آدمی کو مال مل جائے اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو توفیق دیں رضائے الٰہی کے مطابق اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کی تو ایسا شخص واقعی لائق رشک ہے، اور اگر مال مل گیا لیکن وہ اس کو غلط راستوں پر خرچ کرتا ہے تو یہ شخص لائق رشک نہیں، بلکہ لائق رحم ہے، اس کی تمنا نہیں کرنی چاہئے "اور دوسرا آدمی لائق رشک وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا وہ اپنے علم کے ساتھ خود بھی منتفع ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی نفع پہنچاتا ہے" یہ شخص لائق رشک ہے کہ اللہ ہمیں بھی ایسا بنادے، تو یہ دو آدمی لائق رشک ہیں۔ گویا دنیا کی نعمتوں میں صرف دو نعمتیں ایسی ہیں جن پر رشک کیا جائے، ایک یہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ مال عطا فرمائیں اور وہ مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہو، دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہو اور وہ اس کو صحیح طور پر استعمال کرتا ہو۔

چار قسم کے آدمی

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ لوگ چار قسم کے ہیں ایک وہ آدمی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی عطا فرمایا اور علم بھی عطا فرمایا۔ اور وہ اس مال میں اللہ

تعالیٰ سے ڈرتا ہے صلہ رحمی کرتا ہے اور اس کو علم کے مطابق نیکی کے مصارف میں خرچ کرتا ہے، مسجدیں بنواتا ہے، مدارس بنواتا ہے، غریبوں، محتاجوں، بیواؤں اور یتیموں کی خدمت کرتا ہے، رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کرتا ہے، مخلوق کی خدمت کرتا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ: "فھذا بافضل المنازل" "یعنی یہ شخص سب سے افضل اور اعلیٰ ترین مرتبے میں ہے"۔

اور ایک شخص وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا لیکن مال نہیں دیا، یہ اس پہلے آدمی کو دیکھ کر بہت رشک کرتا ہے اور دل میں یہ تمنا کرتا ہے کہ اے کاش! مجھے بھی مال مل جاتا تو میں بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا کرتا جس طرح یہ شخص خرچ کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ "فاجرھما سواء"۔

یعنی اس شخص کو اللہ تعالیٰ اس کی نیت پر اتنا ہی اجر عطا فرمائیں گے جتنا خرچ کرنے والے کو عطا فرماتے ہیں، دونوں کا اجر برابر ہے۔

تیسرا آدمی وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے لیکن علم نہیں دیا، وہ اس مال میں خبط کرتا ہے یعنی نہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، نہ صلہ رحمی کرتا ہے، نہ خیر کے کاموں میں خرچ کرتا ہے، اور نہ دین کے راستوں میں خرچ کرتا ہے، وہ مال کو خرچ کرتا ہے مگر اپنی خواہش نفس پر، خرچ کرتا ہے لغویات پر، خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں، یہ شخص سب سے بدترین مرتبے کا ہے۔

چوتھا آدمی وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نہ علم دیا نہ مال دیا، یہ شخص اس تیسرے آدمی کو دیکھ کر کہتا ہے کہ کاش! ہمارے پاس مال ہوتا تو ہم بھی ایسا ہی کرتے کہ اس نے لڑکے کے ختنے کی تقریب کیسی شاندار کی، کنجریاں نچوائیں، ڈھول بجائے، ہمارے پاس پیسہ ہوتا تو ہم بھی یہ سب کچھ کرتے، دیکھو! اس نے

کیسی دھوم دھام سے شادی کی، اور اس پر کتنا خرچ کیا، ہمارے پاس دولت ہوتی تو ہم بھی اسی طرح کرتے۔ اسی طرح مال دار کے گھر جتنے غلط کام ہوتے ہیں، یہ سب پر رشک کرتا ہے اور افسوس کرتا ہے کہ اس کے گھر میں ٹی وی ہے، فلاں فضول چیز ہے، فلاں غلط چیز ہے، ہمارے پاس پیسے نہیں، اگر ہوتے تو ہم بھی یہ ساری چیزیں گھر میں لا ڈالتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "فھو نیتہ ووزرھما سواء"۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث صحیح مشکوٰۃ:۴۵۱)

اس کو اس کے ارادے اور قصد کی وجہ سے اتنا ہی گناہ ملے گا جتنا کہ اس تیسرے آدمی کو ملے گا۔ نعوذ باللہ بڑا بد قسمت ہے یہ شخص کہ اپنے جہل کی وجہ سے بیٹھے بٹھائے گناہ گار ہوگیا، اور گناہ گاری میں حصہ لے لیا۔ تو میں عرض کر رہا تھا کہ رشک تو یہ ہے کہ ہم کسی شخص کی ریس کرنا چاہیں۔ دل میں یہ خواہش پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ نعمت عطا فرمائیں۔ تو بھئی اگر رشک کرنا ہے تو کسی کی نیکی پر کرو، کسی کی برائی پر کیا رشک کرنا ہے۔ یہ دو آدمی ہیں قابل رشک، ان پر رشک کرو۔

حسد کا منشأ تکبر ہے

تو ایک ہوتا ہے حسد، یعنی کسی کی نعمت کو دیکھ کر جل جانا کہ اس کو یہ نعمت کیوں ملی؟ اور کسی کی نعمت کو برداشت نہ کرسکنا، یہ تمنا کرنا کہ کاش یہ نعمت اس کے پاس نہ رہے، مجھے بھلے ملے یا نہ ملے، یہ حسد دل کی بیماری ہے، اور منشأ اس کا تکبر ہے، یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھا، اور دوسرے شخص کو چھوٹا سمجھا کہ یہ شخص تو اس نعمت کے لائق نہیں تھا، اس کو یہ نعمت کیوں دی گئی؟

حاسد کو اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے

حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اے مومن تو کسی مسلمان بھائی کی نعمت کو دیکھ کر اس پر کیوں حسد کرتا ہے؟ کیوں جلتا ہے؟ اس لئے کہ اس کو جو نعمت ملی ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملی ہے، اور تم کو جو نہیں ملی یہ بھی من جانبِ اللہ نہیں ملی، اب جو تم اس پر حسد کرتے ہو اس کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک تو تم یہ کہتے ہو کہ یہ شخص اس نعمت کا اہل نہیں تھا، اس کو نہیں ملنی چاہئے تھی، یہ اللہ تعالیٰ کو تقسیم نہیں کرنا آتا۔ نعوذ باللہ۔ تبھی تو تم اعتراض کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت اس شخص کو کیوں دے دی؟

شیطان حسد کی وجہ سے کافر بنا

تمہیں معلوم ہو گا کہ دنیا کا سب سے پہلا کافر اس حسد کی وجہ سے کافر بنا، شیطان کو اسی حسد نے شیطان بنایا، حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا اور فرشتوں سے کہا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، ملائکہ کو کیا عذر تھا؟ جبریل ہیں، اسرافیل ہیں، میکائیل ہیں، عزرائیل ہیں، ملائکہ مقربین ہیں، حاملین عرش ہیں، بڑے بڑے درجے کے فرشتے ہیں، لیکن سب حکم الٰہی کے تابع ہیں، دل و جان کے ساتھ حکم الٰہی کے مطیع ہیں۔

"لا یعصون اللّٰہ ما امرھم ویفعلون مایومرون۔" (تحریم: ٦)

ان کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم ہو جائے اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور ان کو جو حکم ہو جائے اسے کر ڈالتے ہیں، فرشتوں کو حکم ہوا کہ

آدم کو سجدہ کرو، مالک کا حکم تھا بغیر توقف کے تمام کے تمام فوراً سجدہ میں گر گئے، سب کے سب مل کر آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ بجالائے، "الا ابلیس" مگر ابلیس، آدم علیہ السلام کے سامنے نہیں جھکا، اس نے سجدہ کرنے سے انکار کردیا، اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟

"قال انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین۔"

کہنے لگا کہ آدم کو سجدہ نہیں کرسکتا کیونکہ میں اس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھے آگ سے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے، اب میں بڑا اور یہ چھوٹا، اور بڑے کو یہ کہنا کہ وہ چھوٹے کے سامنے جھکے یہ حکمت کے خلاف ہے، تو شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام پر حسد کیا، لیکن حضرت آدم علیہ السلام پر حسد کرنا در حقیقت اعتراض تھا اللہ تعالیٰ کے فعل پر، نعوذ باللہ اس کا یہ مطلب تھا کہ آپ کا یہ حکم غلط ہے۔ شیخؒ فرماتے ہیں: تم جو کسی کی نعمت کو دیکھ کر حسد کرتے ہو، اور جلتے ہو، ذرا یہ تو سوچو کہ نعمت کے عطا کرنے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں، یہ نعمت تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے، تو تم گویا یہ کہنا چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ غلط ہے، (نعوذ باللہ) اب تم ہی بتاؤ کہ تمہارا مقام کیا ہوگا؟ جو شخص کہ فیصلۂ الٰہی پر اعتراض کرتا ہو اس کا مقام کیا ہے؟

حسد کا دوسرا منشأ

حسد کا دوسرا منشأ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ نعمت مجھے ملنی چاہئے تھی، مجھے کیوں نہیں ملی، یہ ایک طرح سے اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں کیوں محروم رکھا؟ تم جب کہتے ہو کہ یہ چیز مجھے ملنی چاہئے تھی تو گویا تم یہ دعویٰ

کرتے ہو کہ یہ تمہارا ذاتی استحقاق ہے۔ ابلیس نے بھی تو یہی کہا تھا کہ میں اس سے بہتر ہوں، میں اس کا مستحق تھا کہ آدم علیہ السلام میرے سامنے سجدہ کریں نہ یہ کہ اُلٹا مجھے کہا جائے کہ میں آدم کو سجدہ کروں، تو نعمت کو تم نے اپنا ذاتی استحقاق سمجھا، ذاتی استحقاق سمجھتے ہوئے ہی تو شیطان نے فیصلۂ خداوندی پر اعتراض کیا کہ اس نعمت کا حق تو میرا تھا آپ نے میرے بجائے آدم علیہ السلام کو یہ نعمت دے دی۔ تو حاسد ایسا احمق ہے کہ وہ دراصل اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر معترض ہے—

حاسد اپنی آگ میں خود جلتا ہے

اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے جلنے سے ہوگا کچھ نہیں، جس پر حسد کررہا ہے، اس کی نعمت زائل نہیں ہوگی، بلکہ یہ خود جلتا رہے گا، دنیا میں بھی جلے گا، اور آخرت میں بھی جلے گا، یہاں حسد کی آگ میں جلتا ہے، وہاں جاکر جہنم کی آگ میں جلے گا۔

حسد بہت سے گناہوں کا منبع ہے

اور یہ حسد کی بیماری بہت سی برائیوں کا منبع ہے، جب اس کو کسی پر حسد ہوگا تو لوگوں کے سامنے اس کی برائی بیان کرے گا، تاکہ لوگوں کے دل میں اس کی عزت نہ رہے، کیونکہ یہ سمجھے گا کہ لوگوں کے دل میں اس کی عزت ہے، میری نہیں، اس نعمت کی وجہ سے اس کو نیچے گرانا چاہے گا تو اس کی برائیاں کرے گا، اس کو کوئی نہ کوئی ایذا پہنچانے کی کوشش کرے گا، اس کو کسی نہ کسی طرح ستائے گا، یہ وہ تمام افعال ہیں جن کی وجہ سے یہ غضب الٰہی کا مورد بنے

گا۔ کسی مسلمان کی غیبت کرنا بھی کبیرہ گناہ، کسی مسلمان کو ایذا پہنچانا بھی کبیرہ گناہ، یہ کوئی نہ کوئی تہمت تراشے گا، کوئی نہ کوئی بات بنائے گا، لوگوں کے ذہن کو اس کی طرف سے پھیرنے کے لئے کوئی نہ کوئی افسانہ تراشے گا۔ تو غیبت، بہتان تراشی اور ایذاء رسانی جیسے گناہ اس حسد سے پیدا ہوتے ہیں۔

حسد نیکیوں کو کھالیتا ہے

اسی بناء پر حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"ایاکم والحسد فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔"

(رواہ ابوداؤد، مشکوۃ صفحہ ۴۲۸)

ترجمہ: "حسد سے بچو! کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھالیتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھالیتی ہے"۔

یہ حاسد بے چارہ حسد میں مشغول ہے کہ اول تو اس سے نیکیاں کی ہی نہیں جائیں گی، جس شخص کو فیصلۂ خداوندی پر اعتراض ہو وہ نیکی کیا کرے گا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ناخوش ہو اسے طاعت و عبادت کی توفیق کیسے ہوگی؟ وہ تو آگ میں جلے گا، اور پھر حسد کرنے کی وجہ سے اس سے گناہ سرزد ہوں گے، کسی مسلمان کی غیبت کرنے کے، اس پر بہتان لگانے کے، اس کو ستانے کے، اس کے خلاف کوئی تدبیر کرنے کے، لوگوں کو برگشتہ کرنے کے، اور آخرت کا اصول یہ ہے کہ جتنی کسی مسلمان کی برائی کرے گا، اس کو ستائے گا، قیامت کے دن اس کی اتنی نیکیاں لے کر مظلوم کو دلوادی جائیں گی،

قیامت کے دن مفلس کون ہو گا؟

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اتدرون ما المفلس؟" "جانتے ہو مفلس کون ہے؟"۔ صحابہؓ نے عرض کیا، ہم تو مفلس اس کو کہتے ہیں جس کے پاس پیسہ نہ ہو، مال ودولت نہ ہو، ارشاد فرمایا کہ "میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ، زکوٰۃ (اور دیگر طاعات) لے کر آئے، لیکن اس حالت میں آئے کہ اس کو گالی دی تھی، اس پر تہمت لگائی تھی، اس کا مال کھایا تھا، اس کا خون بہایا تھا، اس کو مارا پیٹا تھا، پس اس کی کچھ نیکیاں یہ لے گیا، کچھ وہ لے گیا، اس کے ذمہ جو حقوق ہیں اگر وہ ادا نہیں ہوئے کہ نیکیاں ختم ہوگئیں، تو ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے گئے اور اس کو جہنم میں پھینک دیا گیا"۔

(مشکوٰۃ صفحہ ۴۳۵ بروایت مسلم)

دوسروں سے اپنا معاملہ صاف رکھو

تو یہ اپنے خیال میں لوگوں سے دشمنی کر رہا ہے لیکن اتنا احمق ہے، نادان ہے کہ اپنی کمائی بھی انہی دشمنوں کو دے رہا ہے، کماتا ہے اور کمائی کر کے ان کے بینک میں جمع کروا رہا ہے۔

ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

میرے دو غلام ہیں، مجھے جھٹلاتے ہیں، میری خیانت کرتے ہیں، نافرمانی کرتے ہیں، اور میں ان کو گالیاں بکتا ہوں، مارتا پیٹتا ہوں، یارسول اللہ! میرا اور

ان کا معاملہ قیامت کے دن کیسا رہے گا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، انہوں نے جو تیری خیانت کی ہوگی، جتنی نافرمانیاں کی ہوں گی، اور تجھے جھٹلایا ہوگا، قیامت کے دن اس کا بھی میزانیہ تیار کرلیا جائے گا، اور تو نے جو ان کو گالیاں دی ہوں گی، ان کو مارا پیٹا ہوگا، ان کو تکلیف پہنچائی ہوگی، اس کی بھی میزان لگادی جائے گی، پھر دونوں کا وزن کرلیا جائے گا، اگر دونوں برابر ہوگئے تو نہ تجھے کچھ دینا پڑا نہ لینا پڑا، اور اگر ان کا ستانا زیادہ تھا اور جو تم نے سزادی وہ کم تھی تو تم بچت میں رہے، اور اگر تم نے سزا زیادہ دی تھی اور ان کا قصور کم تھا تو زیادتی کے بقدر تم سے ان کا بدلہ لیا جائے گا اور تمہاری نیکیاں لے کر ان کو دے دی جائیں گی۔ وہ شخص یہ سن کر مسجد کے کونے میں بیٹھ کر رونے لگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلوایا اور فرمایا روتے کیوں ہو؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"ونضع الموازين القسط ليوم القيمة فلا تظلم نفس شئيا۔" (انبیاء آیت نمبر ۴۷ پارہ نمبر ۱۷)

ترجمہ: "اور ہم قائم کریں گے انصاف کے تول قیامت کے دن، سو ظلم نہیں کیا جائے گا کسی نفس پر ذرا بھی، اور اگر رائی کے دانے کے برابر کوئی عمل ہوگا، اچھا یا برا ہم اس کو لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب لینے والے"۔

وہ صاحب کہنے لگے یارسول اللہ! بچاؤ کی صورت تو یہی نظر آتی ہے کہ ان سے اپنا معاملہ ختم کردوں۔ اور یارسول اللہ! میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ وہ لوجہ اللہ آزاد ہیں، میں ان کو آزاد کرتا ہوں۔

اپنی نیکیاں دوسروں کو دینا حماقت ہے

بڑا ہی احمق ہے وہ شخص جو نیکیاں کرے اور نیکیاں کر کے پھر اپنے دشمنوں کو، جن سے وہ دشمنی رکھتا ہے، ان کے کھاتے میں جمع کرادے، اپنے خیال میں یہ ان کی برائی کررہا ہے، ان کی غیبت کررہا ہے، ان کو گرانا چاہتا ہے، ان کو ایذاء دینا چاہتا ہے، کبھی ان کے خلاف خفیہ سازشیں کرتا ہے، بعض لوگ تعویذ گنڈے کرتے ہیں، بعض لوگ ٹونے ٹوٹکے کرتے ہیں، اور بعض جادو کرتے ہیں کہ اس کا کام نہ ہو، یہ سب اسی بیماری کی شاخیں ہیں وہ جو اپنے اندر ہے، یعنی حسد کی جو بیماری ہے، یہ سب اس کی شاخیں ہیں، اور وہ تمہاری نیکیوں کو کھا رہی ہیں۔

ایک دفعہ ہم تبلیغی چلہ میں گئے ہوئے تھے، میرے چھوٹے بھائی عبدالستار صاحب بھی میرے ساتھ تھے، ادھر پشاور کے علاقے میں گئے ہوئے تھے، کبھی جماعت کے ساتھیوں میں باہم رنجش ہوجاتی ہے۔ بعض دفعہ بعض ساتھی اناڑی ہوتے ہیں، اُصولوں کی پابندی نہیں ہوتی، فہم پورا نہیں ہوتا، آپس میں رنجش ہوجاتی ہے، چنانچہ ہمارے ساتھیوں میں بھی ایک ساتھی کا دوسرے کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ ہوگیا، تو میرے بھائی صاحب کہنے لگے کہ دراصل اس راستے میں نیکیاں بہت ملتی ہیں، اللہ کے راستے میں نکل کر نیکیاں بہت ملتی ہیں، اور شیطان نہیں چاہتا کہ ہم ساری نیکیاں محفوظ کرکے لے جائیں، وہ چاہتا ہے کہ ہماری نیکیوں کی اس ٹینکی میں کوئی سوراخ کردیا جائے، تاکہ پانی ٹپکتا رہے اور ٹینکی خالی ہوتی رہے، اس لئے وہ ایسے شوشے چھوڑتا ہے ہمارے ساتھیوں کے درمیان، تاکہ وہ اپنی نیکیوں کی خرجیاں بھر کر نہ لے جائیں، کچھ نہ کچھ بوجھ ہلکا کرتے جائیں، اللہ کے بندو! یہ تو سوچو کہ ہم سے نیکیاں ہوتی ہی کتنی ہیں اور

جو تھوڑی بہت بن پڑتی ہیں وہ بھی لوگوں کو دے کر چلے جاتے ہو؟

حاسد شیطان کا چھوٹا بھائی ہے

شیخ نوّر اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے بندے تو کسی مسلمان پر حسد کیوں کرتا ہے۔ اس کو نعمت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔ اگر تجھ کو اس پر اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نعمت کیوں عطا فرمائی ہے تو تو شیطان کا چھوٹا بھائی ہے، اس لئے کہ اس نے بھی یہی اعتراض کیا تھا، تیری ضد اس شخص کے ساتھ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، تو دشمنی اس کے ساتھ نہیں کررہا، بلکہ دشمنی اللہ تعالیٰ سے کررہا ہے، اور اگر تجھے یہ شکایت ہے کہ یہ نعمت مجھے کیوں نہیں دی گئی تو اس میں دو قباحتیں ہیں ایک یہ کہ تجھ کو اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے کہ اللہ نے تیرے ساتھ ناانصافی کی ہے کہ یہ نعمت تجھے نہیں دی۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو نعمت دے کر نعوذ باللہ حکمت کے خلاف کیا۔

شیخؒ فرماتے ہیں کہ جانتے نہیں ہو کہ حق تعالیٰ حکیم وعلیم ہیں، ان کا جو معاملہ جس کے ساتھ بھی ہے وہ علم وحکمت پر مبنی ہے، تم کون ہوتے ہو دخل دینے والے؟

اپنے اوپر انعامات الٰہیہ کو دیکھو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی نوّر اللہ مرقدہ بہت اچھی بات فرمایا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ تم دوسروں کی طرف دیکھتے ہی کیوں ہو؟ تم یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ میرے ساتھ کیسا ہے؟ زید کے ساتھ یہ ہے، عمرو کے ساتھ یہ ہے، بکر کے ساتھ یہ ہے، تم لوگوں کے بکھیڑے میں پڑتے ہی کیوں ہو؟ تم یہ

دیکھو میرے ساتھ اللہ کا معاملہ کیا ہے؟ کوئی ضرورت ہے تو مانگو اللہ تعالیٰ سے، ان کا دربار کھلا ہوا ہے، بند تو نہیں ہوا، اللہ کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا، اور تمہاری زبان بھی چلتی ہے، اللہ کے فضل سے گونگی نہیں ہے، تمہارے ہاتھ پھیلانے کے لئے بھی موجود ہیں، اللہ کے سامنے ہاتھ کیوں نہیں پھیلاتے، کیوں اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتے ہو، وہ بخیل تو نہیں ہے کہ تمہیں نہیں دے گا۔

اگر اس بات پر نظر ہو جائے بھئی کہ لوگوں سے کیا واسطہ؟ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ میرے ساتھ میرے اللہ کا معاملہ کیا ہے، تو ہماری ساری بیماریوں کا علاج ہو جائے، آدمی کیوں حسد کرے، کسی کے پاس نعمت دیکھ کر اس کے لئے دعائے برکت کرو، اللہ تعالیٰ اس میں اور برکت عطا فرمائے۔

حسد کا علاج

ہمارے حضرت حکیم الامت نوّر اللہ مرقدہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"حسد کا علاج یہ ہے کہ جس سے حسد ہو اس کے لئے ترقی کی خوب دعا کرے، اور اس کے ساتھ احسان بھی کرتا رہے خواہ مال سے، یا بدن سے یا دعا سے، چند دنوں میں حسد دور ہو جائے گا"۔ (انفاس عیسیٰ)

اسی طرح جس سے حسد ہو لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرو، اس کی تعریف کرنے کو جی تو نہیں چاہے گا۔ جی تو یہ چاہے گا کہ اس کی برائی کروں، لیکن برائی نہ کرو، بلکہ تعریف کرو، اس میں تمہیں تکلّف سے کام لینا پڑے گا، اور نفس کی خواہش اور چاہت کے خلاف کرنا پڑے گا، اسی کا نام مجاہدہ ہے، اس مجاہدہ کی برکت سے رفتہ رفتہ حسد کی بیماری اِن شاء اللہ جاتی رہے گی۔

علماً کا حسد

یہ حسد کبھی تو ہوتا ہے دنیا کے مال و دولت پر، عام لوگ اس میں مبتلا ہیں، کبھی ہوتا ہے جاہ و مرتبہ پر کہ اس کو یہ مرتبہ کیوں ملا، مجھے کیوں نہیں ملا، کبھی ہوتا ہے کسی کے علم و فضل پر، اس لئے اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے، یہ حسد مولویوں کی خاص بیماری ہے، ایک روایت میں ہے کہ چھ آدمی چھ جرموں کی وجہ سے ایک سال پہلے بغیر حساب کے دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ اُمراء وسلاطین ظلم وجور کی وجہ سے، عرب عصبیت (قومی تفاخر) کی وجہ سے، گاؤں کے چوہدری تکبر کی وجہ سے، تاجر لوگ جھوٹ اور خیانت کی وجہ سے، علماً حسد کی وجہ سے۔ (کنز العمال صفحہ ۶۸۷ جلد ۱)

ظلم جہنم میں لے جانے والا ہے

حکام ظلم اور جور کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حکومت دی ہو اس کو عدل کا حکم ہے، حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

"ان اللّٰہ یامرکم ان تودوا الا مانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔" (النساء آیت ۵۸)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ تمہیں یہ حکم دیتے ہیں کہ امانتیں امانت والوں کے سپرد کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو حق وانصاف کا فیصلہ کرو"۔

جس کو اللہ تعالیٰ نے قدرت عطا فرمائی ہو، حکومت عطا فرمائی ہو، اقتدار عطا

فرمایا ہو، اس پر عدل کو لازم کردیا ہے، ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، ارشاد فرماتے ہیں:

"یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلہ بینکم محرما، فلا تظالموا۔"

(مشکوٰۃ صفحہ ۲۰۳ بروایت مسلم)

ترجمہ: "اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر بھی بند رکھا ہے، اور اس کو تمہارے آپس میں بھی حرام قرار دیا ہے، اس لئے ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو"۔

یعنی جب میں نے ظلم اور ناانصافی کو اپنے اوپر بھی حرام کر رکھا ہے، تو تمہیں کیسے اس کی اجازت دوں گا؟ جو چیز اللہ کے حق میں حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے لئے بھی ممنوع قرار دے رکھا ہے تو وہ تمہارے لئے کیسے حلال ہوگی؟ اللہ تعالیٰ کسی سے بے انصافی نہیں فرماتے، اس لئے کسی کو ظلم کی اجازت بھی نہیں دیتے، تو حکام ظلم وجور کے مرتکب ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ جہنم کا ایندھن بنتے ہیں، اور گاؤں کے رئیس تکبر کے مرتکب ہوتے ہیں، ان کو تکبر کی وجہ سے، اور تاجر لوگوں کو خیانت کی وجہ سے دوزخ میں داخل کیا جائے گا، تاجر لوگ گھپلا ضرور کرتے ہیں تجارت میں، اور شیطان نے ان کے کان میں ایک بات پھونک دی ہے۔ یہ منتر پھونک دیا ہے، شیطان کے بھی مختلف منتر ہیں، ہر ایک کو دم کرنے کے لئے اس نے الگ منتر ایجاد کئے ہوئے ہیں، اس نے تاجروں کے کان میں یہ منتر پھونک دیا ہے کہ میاں اگر تم نے یہ نہ کیا تو تمہاری تجارت ٹھپ ہوجائے گی، اس لئے تجارت میں کچھ نہ کچھ گھپلا ضرور کرنا پڑتا ہے، ایک چیز میں عیب ہے، تمہیں معلوم ہے کہ اس میں عیب ہے، تم

گاہک کو نہیں بتلاتے ہو، وہ انجان ہے، ناواقف ہے، وہ چیز کو لے جاتا ہے، اور تمہاری دیانت وامانت سے دھوکہ کھا جاتا ہے، تم خوش ہوتے ہو کہ ہم نے مال نکال دیا۔ مال نکال نہیں دیا بلکہ خیانت اپنے کھاتے میں ڈال لی ہے۔

بدکار تاجر

حدیث شریف میں ہے:

"التجار یحشرون یوم القیمة فجارا الامن اتقی وبروصدق"۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۲۴۴ بروایت ترمذی وغیرہ)

ترجمہ: یعنی "تاجر لوگ قیامت کے دن بدکار اٹھائے جائیں گے، سوائے اس شخص کے جس نے تقویٰ سے کام لیا، نیکی سے کام لیا اور سچائی سے کام لیا، دیانت وامانت سے کام لیا"۔

اگر جھوٹ بول کر اور قسمیں کھاکر سودا بیچ دیا تو دو ٹکے تو ضرور مل گئے۔

ایک نیک تاجر کا قصہ

لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تم نے اپنا کتنا نقصان کرلیا، مومن کی شان تو یہ ہے کہ اس کے معاملے میں صفائی ہو، مجھے اپنے طالب علمی کے زمانے میں کتابوں کا بہت شوق ہوتا تھا، اب بوڑھا ہوگیا ہوں مگر یہ شوق اب بھی کچھ کم نہیں ہے، اس شوق کی وجہ سے میں گرمی کے دنوں میں کتب خانوں میں گھومتا رہتا تھا، ہمارے ملتان میں ایک کتب خانہ تھا، جس کے مالک مولانا عبدالتواب تھے، اہل حدیث تھے، بے چارے اپاہج تھے، رینگ کر چلتے تھے، ایک دن مجھے

ایک کتاب بہت پسند آئی، میں نے کتاب نکالی اور ان سے پوچھا کہ اس کی کتنی قیمت ہے؟ وہ مجھے فرماتے ہیں یہ آپ کے لینے کی نہیں، معیوب ہے اس میں عیب ہے، میں لے جاتا تو مجھے پتہ بھی نہ چلتا، سالوں بعد کبھی پڑھتا تو شاید پتہ چلتا، میں ان مولانا صاحب کی تاجرانہ دیانت سے بہت متاثر ہوا، میرے ایک اور دوست دکاندار تھے میں ان سے کوئی چیز خرید تا تو پوچھتا تھا کہ حاجی صاحب کیسی ہے یہ چیز؟ وہ فرماتے کہ آپ کے سامنے ہے، کبھی تعریف نہیں کرتے تھے کہ اچھی ہے لے لو، نہیں، بلکہ صرف یہ کہہ دیتے کہ تمہارے سامنے ہے، اب تو تاجر لوگ چیزوں میں کھوٹ ملاتے ہیں، ملاوٹ کرتے ہیں اور نامعلوم کیا کیا کرتے ہیں، دیانت اور امانت کا دامن ہم نے چھوڑ رکھا ہے، اور ماشاء اللہ سب کو تو نہیں کہتا، اللہ کے کچھ بندے اب بھی ہیں جو تجارت میں بھی دیانت وامانت سے کام لیتے ہیں، اور جس دن اللہ تعالیٰ کے یہ بندے نہیں رہیں گے اس دن آسمان اور زمین کی ضرورت نہیں رہے گی، ان کو توڑ پھوڑ دیا جائے گا،

بلاشبہ! ابھی اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے موجود ہیں، ورنہ اکثر لوگوں نے دیانت اور امانت کو چھوڑ رکھا ہے، جائز وناجائز کا، حرام و حلال کا، کسی مسلمان کو نقصان پہنچانے کا، ان کا کوئی تصور ہی نہیں کہ یہ بھی کوئی برائی ہے، تو تاجر لوگ خیانت کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے اسی لئے حدیث میں فرمایا:

> ”تاجر لوگ قیامت کے دن بدکار اور نافرمان لوگوں کے زمرے میں اٹھائے جائیں گے، مگر جس نے تقویٰ، سچائی اور نیکی سے کام لیا وہ اس سے مستثنیٰ ہے“۔

نیک تاجر کی فضیلت

اور ان کے مقابلے میں جو تاجر کہ صدق اور امانت سے کام لیتا ہو، صدوق، سچ بولنے والا، اور امین، امانت سے کام لینے والا ہو اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

"التاجر الصدوق الامین مع النبین والصدیقین والشهداء۔" (مشکوٰۃ صفحہ ۱۴۳)

ترجمہ: یعنی "جو تاجر کہ صادق وامین ہو اس کا حشر قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں، شہیدوں کے ساتھ ہوگا"۔

اُن کے ساتھ اٹھایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اسے ان کی معیت نصیب فرمائیں گے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اپنا کام بھی کررہا ہے اور اپنی آخرت بھی بنارہا ہے، بھئی صدق وامانت کے ساتھ تجارت کرنے کا بڑا درجہ ہے، جب کہ آدمی دوسرے کاموں میں بھی متقی ہو، پرہیز گار ہو۔

قاریوں اور مولویوں کا حسد

قاریوں کے بارے میں جو فرمایا اس سے مراد علماً بھی ہیں۔ قراء کے بارے میں فرمایا کہ یہ قاری لوگ حسد کی وجہ سے ایک سال پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ حسد ان کی خاص بیماری ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔

حسد کم ظرفی کی علامت ہے

یہ حسد کی بیماری دراصل احساس کمتری کی شاخ ہے، اصل میں آدمی جب

سمجھتا ہے کہ اسے چھوٹا بنادیا گیا اور دوسرا بڑا بن گیا یا بنادیا گیا، تو قدرتی طور پر حسد پیدا ہوتا ہے، یہ کم ظرفی کی علامت ہے، حوصلہ بلند ہو آدمی کا تو پھر دوسرے پر حسد نہیں آتا۔

شیطان کے تین عین

حسد ایسی بری چیز ہے کہ اس کی وجہ سے شیطان راندۂ درگاہ ہوا۔ اور اس نے حکم الٰہی سے سرتابی کی، ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ حضرت تھانوی نوّر اللہ مرقدہ سے نقل کرتے تھے کہ شیطان میں تین عینیں تھیں، چوتھی عین نہیں تھی۔ وہ بڑا عالم تھا، اتنا بڑا عالم کہ معلّم الملکوت کہلاتا تھا، یعنی فرشتوں کا استاد، وہ عابد تھا اور اتنا بڑا عابد کہ اس نے آسمان کے چپے چپے پر سجدہ کیا تھا، وہ عارف بھی تھا یعنی اللہ کی معرفت اس کو حاصل تھی اور اتنا بڑا عارف کہ اللہ تعالیٰ اس کو فرماتے ہیں:

"فاخرج منها فانك رجيم وان عليك اللعنة الى يوم الدين۔" (الحجر: ۳۴، ۳۵)

"نکل جا یہاں سے تو مردود ہے، اور تجھ پر قیامت تک لعنت ہوگی"۔

لیکن وہ عین غضب کی حالت میں کہتا ہے:

"رب فانظرني الى يوم يبعثون۔" (الحجر: ۳۶)

"اے میرے رب مجھے مہلت دیجئے قیامت تک"۔

آپ مجھے راندہ درگاہ تو کررہے ہیں، یہ ایک بات تو منظور کرلیجئے، ظالم عین

غضب کی حالت میں مانگ رہا ہے، کیا غصہ کی حالت میں کچھ مانگا جاتا ہے؟

حضرت فرماتے ہیں کہ شیطان عارف تھا، جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا غضب اللہ تعالیٰ کو مغلوب نہیں کرتا، اس حالت میں بھی مانگوں تو وہ دیں گے۔ یہ تو ہماری شان ہے کہ ہم غصہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں، اور جب تک غصہ اترے نہیں اس وقت تک کسی کی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، لیکن اللہ تعالیٰ کا غضب ایسا نہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ تین عین تو شیطان میں تھے عالم تھا عابد تھا، عارف تھا، لیکن چوتھی عین اس کے پاس نہیں تھی، وہ عاشق نہیں تھا، اگر اللہ تعالیٰ کا عشق اس کو نصیب ہوتا اور اللہ کی محبت حاصل ہوتی تو حکم الٰہی سے سرتابی نہ کرتا بلکہ فوراً حکم بجالاتا، کیونکہ عاشق محبوب کے حکم پر مرمٹتے ہیں ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو
نینگیختن علّت از کار تو

"ہمارا کام تو تیرے اقرار کے ساتھ زبان کو تازہ کرنا ہے،
تیرے کاموں میں علتیں تلاش کرنا ہمارا کام نہیں"۔

ہم کون ہوتے ہیں کہ محبوب حقیقی کے حکم پر چوں چرا کریں؟ محبوب کی طرف سے جو حکم ہو جائے، عاشق اس کو بجالاتا ہے، اور اگر اہل عقل یہ کہیں کہ یہ تو بڑی ذلت کی بات ہے جو تم کہہ رہے ہو، دوسرے لوگ اسے فہمائش کریں کہ محبوب کا جو حکم بجالائے یہ تو بڑی ذلت کی بات ہے تو وہ کہے گا عقل اور ننگ و نام تمہیں مبارک ہو ؎

مانمی خواہیم ننگ و نام را

محبوب کے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے نہ ہمیں شرم کی پروا ہے، نہ نام کی

پروا ہے، اگر اس سے عزت ہوتی ہو تو اس کی پروا نہیں، اگر بے عزتی ہوتی ہو تو اس کی پروا نہیں، بھئی اگر اللہ تعالیٰ سے محبت ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر اعتراض کرو؟ لوگوں سے حسد کرو؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

حسد کرنا علم کے کچا ہونے کی علامت ہے

اہل علم میں جو حسد ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کچھ پکا ہوتا ہے کچھ کچا۔ بھئی ہم جیسے لوگوں کا علم کچا ہے، اور تم جانتے ہو کہ کچا پھل تو کھٹا ہوتا ہے، تلخ ہوتا ہے، اور گیلی لکڑی کو جلاؤ تو دھواں ہی دھواں ہوتا ہے، ہم لوگ بھی اپنے دھوئیں میں رہتے ہیں، اگر علم میں پختگی پیدا ہوجائے تو ہم میں بھی شیرینی پیدا ہوجائے، علم تو حقیقت سے آگاہ کرتا ہے، لیکن عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ علم کچا رہتا ہے، ہم لوگ علم کو پکاتے نہیں ہیں، اور وہ سوکھ جاتا ہے، ہم لوگ بوڑھے ہوجاتے ہیں، اور علم کچا ہی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حسد پیدا ہوتا ہے، ایک عالم کو دوسرے عالم سے حسد ہوگیا کہ لوگ اس کے معتقد ہوجائیں گے، گویا یہ تقریر کرنے والا بھی لوگوں کو معتقد کرنے کے لئے تقریر کررہا ہے، اللہ تعالیٰ معاف کرے اللہ کی رضا اس کا بھی مقصد نہیں، اور وہ جو دوسرا احمق حسد کررہا ہے اس کے نزدیک بھی تقریر سے یا وعظ سے بس لوگوں کو معتقد بنانا مقصود ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"من طلب العلم ليجارى به العلماء اوليمارى به السفهاء اويصرف به وجوه الناس اليه ادخله الله النار۔"

(مشکوٰۃ صفحہ ۳۴ بروایت ترمذی)

"جو شخص اس غرض سے علم حاصل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ علماؑ سے بحث کرے گا، یا احمقوں سے جھگڑا کرے گا، یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف پھیرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ میں داخل کریں گے"۔

تو یہ تمام علامتیں علم کے کچا ہونے کی ہیں کہ اس شخص کی نظر حقیقت پر نہیں گئی، اگر حقیقت پر نظر ہوتی تو حسد نہ ہوتا، اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھتا، اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض نہ کرتا، جس چیز پر اعتراض ہے اس چیز کو بڑا نہ سمجھتا، حالانکہ سب سے بڑی چیز اور سب سے بڑی دولت تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوجائیں، حق تعالیٰ شانہ ہمیں حسد سے اور تمام امراض روحانی سے محفوظ رکھیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رضا اور محبت نصیب فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

دُنیا

کی محبت کے بُرے اثرات

فہرست مضامین

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد للّٰه نحمده ونستعينه ونستغفره و نؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سيٰات اعمالنا، من يهده اللّٰه فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لاشريك له ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وعلى اٰله واصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيرًا كثيرا۔ اما بعد!

فاعوذ باللّٰه من الشيطن الرجيم۔

بسم اللّٰه الرحمن الرحيم۔

فقد اخرج ابو نعيم فى الحلية۔ عن ابى الدرداء رضى اللّٰه عنه قال لا تزال نفس احدكم شابة فى حب الشئى ولو التقت ترقوتاه من الكبر الا الذين امتحن اللّٰه قلوبهم للتقوى، وقليل ماهم۔ واخرجه ابن عساكر عن ابى الدرداء مثله

كما في الكنز۔ (حیات الصحابہ ص: ۵۱۸ ج: ۳)

واخرج ابونعيم في الحلية عن ابي الدرداء رضي الله تعالى عنه قال: ثلاث من ملاك امر ابن آدم: لا تشك مصيبتك، ولا تحدث بوجعك، ولا تزك نفسك بلسانك۔ واخرج ابونعيم في الحلية عن ابي الدرداء رضي الله عنه قال: اياكم ودعوة المظلوم ودعوة اليتيم فانهما تسريان بالليل والناس نيام۔ وعنده ايضا عنه قال: ان ابغض الناس الي ان اظلمه من لا يستعين علي الا بالله عزوجل۔ (حیات الصحابہ ص ۵۱۸ ج ۳)

ترجمہ: ''حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ تم میں سے کسی ایک شخص کا نفس جوان ہوتا جاتا ہے کسی چیز کی محبت میں، خواہ بڑھاپے کیوجہ سے اس کے دونوں جبڑے مل گئے ہوں، سوائے ان لوگوں کے جن کے دل کو اللہ نے تقویٰ کے لئے چن لیا ہے، اور ایسے لوگ بہت کم ہیں''

ترجمہ: ''ابونعیم نے حلیہ میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے: تین چیزیں بندے کے معاملہ کا مدار ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی مصیبت کی شکایت نہ کرو، دوم یہ کہ اپنی تکلیف لوگوں کو نہ بتاؤ۔ سوم یہ کہ اپنی زبان سے اپنے نفس کا تزکیہ نہ کرو۔ یعنی اپنے منہ سے

اپنے آپ کو پاک نہ بتاؤ"۔

ترجمہ: "ابونعیم نے حلیہ میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ فرماتے تھے کہ مظلوم کی اور یتیم کی بددعا سے بچا کرو۔ اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں رات کے وقت چلتی ہیں جب کہ لوگ سو رہے ہوں۔ اور ایک روایت میں ان سے منقول ہے کہ سب سے ناپسندیدہ چیز میرے نزدیک یہ ہے کہ میں کسی ایسے شخص پر ظلم کروں جو اللہ تعالیٰ کے سوا میرے مقابلہ میں کسی سے مدد نہیں لے سکتا۔"

یہ حضرت ابوالدردا رضی اللہ عنہ کے چند مواعظ ہیں۔ ایک یہ کہ کسی چیز کی محبت میں آدمی کا نفس ہمیشہ جوان رہتا ہے۔ چاہے اتنا بڈھا ہوگیا ہو کہ اس کے جبڑے بھی مل گئے ہیں۔ منہ نہیں کھلتا لیکن نفس کی جوانی نہیں جاتی وہ اب تک جوان ہے سوائے ان لوگوں کے جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے چن لیا ہو وہ تو مستثنیٰ ہیں اور ایسے لوگ بہت کم ہیں بہت ہی کم۔ یہ مضمون حدیث شریف کا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا ہے:

"یهرم ابن آدم ویشب منه اثنان، الحرص علی المال والحرص علی العمر۔"

(متفق علیہ، مشکوٰۃ ص۴۴۹)

یعنی آدمی بڈھا ہوتا رہتا ہے لیکن دو خصلتیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں جیسے جیسے اس کی عمر ڈھلتی ہے ویسے ویسے اس کی یہ دو حالتیں جوان ہوتی رہتی ہیں۔ ایک مال کی محبت دوسرے طول الامل لمبی لمبی امیدیں یعنی زیادہ زندہ رہنے

کی محبت یہ انسان میں فطری طور پر رکھی گئی ہے۔ یہ چیز رکھی بھی ایسی گئی ہے کہ بوڑھا ہونے کے بعد آدمی کا دل سرد ہوجاتا ہے تمام چیزوں سے۔ بہتیرا کھالیا، بہتیرا کمالیا اب چھوڑ دیں۔ اللہ نے گھربار دیا ہے، آل اولاد دی ہے تو دنیا میں بہتیرا کھالیا اب آگے کی تیاری کریں لیکن نہیں بڑے میاں کا دل نہیں بھرتا۔ اس حالت میں بھی کہ جب پاؤں قبر میں لٹکے ہوئے ہیں چاہتا ہے کہ مال زیادہ سے زیادہ ہو اور اپنی آرزوئیں بناتا رہتا ہے شیخ چلی کی طرح۔ یہ فطرتی چیز ہے سوائے ان لوگوں کے جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے ساتھ مخصوص کردیا ہے خوف خدا ان کے دل میں ہے۔ ان کا دل سرد ہوجاتا ہے۔

ایک درباری شیخ الاسلام کا قصہ:

ایک بادشاہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ایک بزرگ کے پاس گیا، بادشاہ کا شیخ الاسلام بھی ساتھ تھا۔ سرکاری شیخ الاسلام جیسے بے نظیر نے کوثر نیازی کو شیخ الاسلام بنایا ہوا تھا۔ (اللہ معاف کرے) تو بادشاہ اس بزرگ سے بہت ادب سے ملا اور بادشاہوں میں یہ چیز ہوتی ہے کہ جب کسی اللہ والے کو دیکھتے ہیں تو اخلاص سے ملتے ہیں۔ شیخ الاسلام جل گئے کہ بزرگ کی اتنی تعظیم بادشاہ کرتا ہے اور ہمیں گھاس بھی نہیں ڈالتا۔ چلتے ہوئے بادشاہ نے کچھ ہدیہ پیش کیا، نقدی کی ایک تھیلی پیش کی، بزرگ فرمانے لگے کہ بادشاہ سلامت! ہم اس کو کیا کریں گے ہمارے کام کی یہ چیز نہیں آپ لے جائیے اور ضرورت مندوں کو تقسیم کردیجئے۔ میرے کام کی یہ چیز نہیں ہے۔ دنیا ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا ایک تجربہ کرکے دیکھ لو، کہ جس شخص کے دل میں اس کی عزت نہ ہو اس کی عزت ہمارے دل میں آجاتی ہے، اور جس کے دل میں اس کی حرص ہو۔ وہ خواہ

اپنی جگہ کتنے ہی اس دنیا کے حریص نہ ہوں لیکن جب دوسرے کے دل میں ہم دنیا کی محبت دیکھتے ہیں اور روپے پیسے کی محبت دیکھتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت ہمارے دل سے مٹ جاتی ہے یا کم ہو جاتی ہے۔ اس بزرگ نے جب بادشاہ سے یہ بات کہی تو شیخ الاسلام صاحب نے سمجھا کہ بادشاہ کے دل میں تو اس کی اور وقعت پیدا ہو جائے گی۔

شیخ الاسلام نے وہی حدیث پڑھی جو میں نے پڑھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یھرم ابن آدم ویشب منہ خصلتان"

ترجمہ: آدم کا بیٹا بوڑھا ہوتا رہتا ہے لیکن دو خصلتیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں، پرورش پاتی رہتی ہیں۔ مال کی محبت اور دنیا میں رہنے کی محبت۔

مقصد اس بزرگ پر چوٹ کرنا تھا کہ یہ چیزیں آپ میں بھی موجود ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان برحق ہے۔ لیکن نمائش کے طور پر آپ ترک دنیا ظاہر کرتے ہیں کہ مجھے دنیا کی ضرورت نہیں۔ وہ بزرگ فرمانے لگے کہ حضرت! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ دو خصلتیں جوان ہوتی رہتی ہیں، جوان وہ ہوتا ہے جو پیدا ہو گیا ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہاں پیدا ہی نہیں ہوا۔ یعنی یہ دو چیزیں یہاں پیدا ہی نہیں ہوئیں۔ پیدا ہوتیں تو جوان ہوتیں؟ یہ سن کر شیخ الاسلام صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بزرگ فرمانے لگے کہ ایک حدیث میں بھی سنادوں۔ وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "العلماء امناء الدین" "علماء دین کے امین ہیں" "مالم یخالطوا السلطان" "جب تک حکومت کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں۔ "بادشاہ کے قریب ہوکر نہ رہیں" "فاذا خالطوا السلطان فاحذروھم فانھم لصوص الدین" اگر وہ بادشاہ کے قریب ہوکر رہیں، حکومت کے

اقتدار کے قریب ہو کر رہیں تو ان سے بچو کیونکہ وہ دین کے ڈاکو ہیں۔ یعنی غلام احمد قادیانی کی طرح تقدس کے پردہ میں دین و ایمان کے چور اور ڈاکو ہیں۔

شیخ الاسلام صاحب مناظرہ ہار گئے۔ اور اس حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

دنیا کی اور اللہ کی محبت جمع نہیں ہوسکتیں

اس لئے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے چن لیا ہے۔ جن کو اپنا خوف، اپنی محبت اور اپنی رضا نصیب فرمادیتے ہیں ان کو دنیا کی محبت سے پاک فرمادیتے ہیں۔ ایک برتن میں دو چیزیں نہیں ڈالی جاسکتیں پاک اور ناپاک۔ اور ایک ہی دسترخوان پر گندی اور پاک دونوں چیزوں کو جمع نہیں کیا جاسکتا۔ جن لوگوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ اپنی محبت کے لئے چن لیتے ہیں، ان کے دلوں کو دنیا کی محبت سے پاک کردیتے ہیں، اور جس شخص کے دل میں یہ محبت موجود ہے وہ سمجھے کہ اس کے دل میں اللہ کی محبت نہیں ہے۔ اور اگر اس کا نفس اس کو دھوکہ دیتا ہے کہ ہمیں بھی اللہ سے محبت ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس دل کے اندر اگر اللہ کی محبت ہے تو ناپاک (دنیا) کی محبت نہیں ہوسکتی۔ اور ناپاک کی محبت جب تک ہے اور اس سے دل پاک نہیں ہوا اس وقت تک اللہ کی محبت نہیں آئے گی۔ اور ایسے لوگ بہت کم ہیں، بہت کم ہیں، بہت ہی کم ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ تبارک و تعالیٰ دنیا کی محبت سے پاک فرمادیتے ہیں۔ ان کے لئے مال و دولت کا آنا جانا برابر ہوتا ہے۔ دنیا آئے خوشی نہیں ہوتی، جائے تو غم نہیں۔ دنیاوی نقصان پر ان کا ہارٹ فیل نہیں ہوتا، بہت سے لوگوں کو نقصان

کی اطلاع پہنچ جائے کہ مال کا نقصان ہوگیا تو دل کا دورہ ہوجاتا ہے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ مال کی محبت دل کے اندر رچی بسی تھی۔ دنیا کی محبت دل کو کمزور کرتی ہے اور اللہ کی محبت دل کو قوی کرتی ہے۔ دنیا کی محبت تشویش لاتی ہے اور اللہ کی محبت دل کو سکون اور اطمینان کی دولت مہیا کرتی ہے۔ دنیا کی محبت خارش کی طرح ہے، جتنی آدمی کو خارش ہوتی ہے، اس کو کھجلی ہوتی ہے، خارش کرتا رہتا ہے اس کو مزہ آتا رہتا ہے اور جب خارش بند کردی جلن شروع ہوگئی۔ ہم لوگ بے حس ہوگئے ہیں۔ ہمارے دلوں میں احساس نہیں رہا ورنہ ہمیں معلوم ہوتا کہ دنیا کی محبت سے دلوں پر کیا گزرتی ہے

"الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب"

ترجمہ: "سنو اللہ ہی کے ذکر سے اور اللہ ہی کی یاد سے چین آتا ہے دلوں کو۔"

جن لوگوں کو اللہ کے ذکر کے بغیر اطمینان ہے، وہ بیچارے دھوکہ میں ہیں۔ غرضیکہ یہ چیز لائق علاج ہے۔ قابل علاج ہے۔ جوانی آئی دُنیا کی محبت بڑھتی گئی، ہم بھی بڑھ رہے تھے، یہ محبت بھی بڑھ رہی تھی۔ جوانی سے بڑھاپے میں قدم رکھا ہم تو بوڑھا ہونا شروع ہوگئے مگر دنیا کی محبت ابھی تک جوان ہے اور بڑھاپے سے قبر میں قدم لٹکا ہوا ہے لیکن اس کی محبت اب تک ختم نہیں ہوئی۔ تمام عضاء قویٰ جواب دے گئے لیکن یہ جو دنیا کی محبت کی بلا ساتھ لگی ہوئی تھی، یہ بوڑھی نہیں بلکہ اور جوان بلکہ جوان تر ہوتی گئی اور جب یہ مرے گا تو رضائے الٰہی کے لئے اور اللہ کی محبت کے لئے تو کوئی محنت نہیں کی تھی۔ محنت کی تھی ان چیزوں کے لئے، اب ان کو دیکھ دیکھ کر حسرت کرے گا، ہائے! فلاں چیز کو چھوڑ کر جارہا ہوں۔ بڑے شوق سے مکان بنایا تھا، بڑے شوق سے یہ کیا

تھا، بڑے شوق سے وہ کیا تھا، یہ سب شوق دھرے کے دھرے رہ گئے اور جہاں جانا تھا یعنی قبر، اس کے لئے کوئی سامان ہی نہیں کیا، اور نہ ہی قبر کے اندھیرے کے لئے کوئی تیاری کی، نہ کبھی بجلی کی فٹنگ وہاں کی، نہ کوئی ٹارچ کی روشنی لے کے گئے۔ نہ کوئی وہاں بستر کا سامان کیا۔ نہ کوئی وہاں کی تنہائی اور وحشت کے لئے سوچا۔ جیسے دنیا میں خالی ہاتھ آئے تھے ـــــ اب یہاں پر سب کما کر یہیں چھوڑ کر خالی ہاتھ قبر میں چلے گئے۔ کوئی غیر ملک کمانے کے لئے گیا ہو، اگر تو وہاں سے زرمبادلہ لانے کی اس کو اجازت مل جائے تب تو ٹھیک ہے اور اگر سب کچھ وہیں چھین لیا جائے تو اس نے بیس تیس سال ضائع بھی کئے اور خالی ہاتھ آگیا۔ اس کے دوست احباب، بیوی، بچے پوچھنے لگے کہ کیا لائے ہو؟ کہنے لگا کہ کچھ نہیں لایا ہوں، سب کچھ چھین لیا گیا، ہم لوگ بھی یہاں محنتیں کررہے ہیں اور جب جائیں گے تو سب کچھ چھین لیں گے۔ جو اپنے اندر تھا وہ تو ساتھ جائے گا۔ باہر کی سب چیزیں ہم سے چھین لی جائیں گی۔ کپڑے تک چھین لیتے ہیں، اللہ کے بندے یہ بھی نہیں کہتے کہ مولوی صاحب کے کپڑے تو رہنے دو یار۔ ہم ان کو بہت اچھے اچھے کپڑے بنا کر دیا کرتے تھے، رہنے دو، لے جانے دو، کہتے ہیں نہیں صاحب! سلے ہوئے کپڑے لے جانے کی بھی اجازت نہیں۔ چادر دیں گے لٹھے کی دو چادریں پہنا دیں گے بس۔ نہ عمامہ ہے نہ کھسّہ ہے۔ تم خود ہی چھینتے ہو، اس غریب کو ذلیل کرکے آجاتے ہو لحد میں۔ کون سی چیز رہنے دی اس کے پاس۔ اے کاش مرنے سے پہلے ہمیں عقل آجاتی۔ اور یہاں سے یہ چیز بھی معلوم ہوگئی کہ یہ چیزیں قابل علاج ہیں۔ اللہ والوں سے ان چیزوں کا علاج کروایا جاتا ہے۔ میرے دل کے اندر دنیا کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ چیز قابل علاج ہے۔ یہ دنیا کی محبت کس طرح نکل جائے،

مال کی محبت کس طرح نکل جائے اور مال کی محبت ہونے کا معیار کیا ہے؟ یہ چیزیں بزرگوں کے سامنے ذکر کرنے کی ہوتی ہیں۔ شیخ سے اصلاحی تعلق ہونے کا یہی مطلب ہوتا ہے۔

تمام معاملات کا مدار:

دوسرا ارشاد حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ابن آدم کے تمام معاملات کا مدار تین چیزیں ہیں۔ جس کو تین چیزیں حاصل ہوگئیں سمجھو کہ بیڑا پار ہوگیا۔ ایک یہ کہ اپنی مصیبت کی کسی سے شکایت نہ کرو۔ دوسری یہ کہ اپنے دکھ کا اظہار کسی کے سامنے نہ کرو۔ اور تیسری یہ کہ اپنی زبان سے اپنی صفائی اور پاکیزگی بیان نہ کرو۔ جی میں تو بے گناہ ہوں، اپنی بے گناہی کو تو زرداری اور بے نظیر بھی بیان کریں گے، زبان سے ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ! ذرا بند قبا دیکھ

اپنی مصیبت کی شکایت کسی سے نہ کرو:

اپنی مصیبت کی شکایت اللہ کے سامنے کرو مخلوق کے سامنے نہ کرو۔ جب حضرت بنیامین کو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے پاس روک لیا مصر میں اور بھائی خالی ہاتھ گئے انہوں نے جاکر اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا ”ان ابنک سرق“ تیرے بیٹے نے چوری کی ہے، اس کو اپنے پاس رکھ لیا ہے عزیز مصر نے۔ حضرت یعقوب علیہ السلامؑ نے فرمایا کہ نہیں بیٹے نے چوری نہیں کی ہے تمہارے نفسوں نے کوئی بات بنائی ہے، خیر میں صبر جمیل اختیار کروں گا۔

یوسف علیہ السلام تو پہلے سے گم تھے ان کا بھائی بھی ہاتھ سے گیا۔ بے اختیار حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل سے آہ نکلی "یا حسرتی علی یوسف" ہائے حسرت حضرت یوسف پر "وابیضت عیناہ من الحزن فھو کظیم" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ غم کی وجہ سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں، آنکھوں کا نور جاتا رہا، آنکھوں کی چمک ختم ہوگئی اور اتنا شدید غم تھا کہ گویا گلا گھٹا جاتا ہے۔ بچوں نے کہا "تفتوا تذکر یوسف" آپ ہمیشہ یوسف کو یاد کرتے رہیں گے "حتی تکون حرضا اوتکون من الھلکین" یہاں تک آپ گھل گھل کر ختم ہوجائیں گے ہڈیاں بھی ختم ہوگئیں غم یوسف میں۔ میں جو سنانا چاہتا ہوں وہ اگلی بات ہے "قال انما اشکو بثی وحزنی الی اللّٰہ" میں اپنے غم اور پریشانی کا اظہار صرف اللہ کے سامنے کرتا ہوں۔ کبھی کسی کے سامنے شکایت کی حضرت یعقوب علیہ السلام نے؟ میں نے کبھی تذکرہ کیا کسی بندے کے سامنے؟ صرف ایک مالک سے شکایت کرتا ہوں، اپنی پریشانی کی بھی، اور اپنے غم کی بھی۔ اگر اس کے پاس بھی نہ کروں تو اور کس کے پاس کروں۔ کوئی آفت اور کوئی مصیبت آن پڑی، شکایت کرو لیکن مولا کے سامنے کرو، شکایت بھی شکایت کے انداز میں نہیں بلکہ اپنی حالت زار کو اس کے سامنے رکھ کر اپنی عبدیت کا اظہار کرنے کے لئے۔ مخلوق کے سامنے اپنی شکایت نہ کرو۔ اس لئے کہ مخلوق خواہ چھوٹی ہو یا بڑی ہو، آسمان والی ہو یا زمین والی ہو، تمہاری شکایت رفع نہیں کرسکتی۔ ایک ہی ہے جو شکایتوں کو رفع کرسکتا ہے اس لئے فرماتے ہیں "لاتشک مصیبتک" اپنی مصیبت کی کسی کے سامنے شکایت نہ کرو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور اپنے درد کا اظہار کسی کے سامنے نہ کرو صرف اُسی کے سامنے کرو۔ "انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین" حضرت

ایوب صابر علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے سامنے کہہ رہے ہیں پروردگار مجھے تکلیف پہنچی ہوئی ہے آپ ارحم الراحمین ہیں، ہٹاسکتے ہیں، لگانے والے بھی آپ ہیں، ہٹانے والے بھی آپ ہیں۔ وہاں کوئی دوا دارو کرنے کی ضرورت تھی "ارکض برجلک" حکم دیا اپنی ایڑی کو مارو زمین پر۔ جب ایڑی ماری چشمہ پھوٹ پڑا اور فرمایا: "ھذا مغتسل بارد وشراب" ٹھنڈا پانی بھی پیو اور نہاؤ بھی، غسل کیا اور پانی پیا، پھر کیا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند نکل آیا۔ وہاں فوراً تکلیف دور ہوگئی۔ بتانا چاہتے تھے کہ لگانا چاہیں تو کوئی ہٹا نہیں سکتا۔ اور جب ہٹانا چاہیں تو ان کے لئے تدبیروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ چشمہ کا پانی اس سے غسل کیا سب کچھ دور ہوگیا، تمام بیماریاں دور ہوگئیں۔ اپنی تکلیف کا اظہار اللہ کے سامنے کرو، سجدے میں گر جاؤ اور پھر حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا پڑھو "انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین" ہمارے مولانا ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ تعالیٰ بیمار ہوگئے تھے فرمانے لگے کہ آج مجھے شفا ہوجائے گی۔ عرض کیا گیا کہ کس طرح شفاء ہوجائے گی فرمایا کہ میں نے اپنے سجدے میں یہ دعا کی ہے "رب انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین" واقعی شفاء ہوگئی۔ تم سے دعا منگواتے اس لئے ہیں کہ انہوں نے دعا قبول کرنی ہوتی ہے اگر منظوری نہ دیں تو تم سے دعا نہ کروائیں، تمہیں دعا کرنے کی توفیق نہ دیں۔ لیکن جیسے اللہ کے دربار میں التجا کرتے ہو ویسے اس کی رضا پر بھی راضی رہو۔ دل میں تنگی کا مضمون نہیں آنا چاہئے۔

زندہ کنی عطائے تو
گر بہ کشی رضائے تو

زندہ کریں آپ کی عطا ہے۔ مار ڈالیں آپ کی رضا ہے۔ آپ جو کچھ کریں،

آپ کی جو بھی رضا ہو اس پر راضی ہوں۔ ہمارے مولانا حضرت حکیم الامت ؒ ارشاد فرماتے تھے، علاج مقصود ہے شفا مقصود نہیں۔ تمہارا کام ہے تمہیں علاج بتلایا کرتے رہیں۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی نوّر اللہ مرقدہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ آخری دنوں میں مجھ سے حضرت حکیم الامت ؒ نے فرمایا کہ میاں کیا تمہارے ہاں اس کا علاج نہیں ہوتا؟ میں نے کہا حضرت ہوتا ہے۔ فرمایا کہ پھر تم علاج کرو، کہنے لگے بہت اچھا، فرمانے لگے ہمارے ہاں نزاکت زیادہ ہے پرہیز بہت ہوتا ہے۔ فرمایا کہ تم علاج شروع کرو نتیجہ مجھے معلوم ہے۔ تو حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے علاج شروع کیا تو ذرا ہومیو پیتھک کا علاج نازک اور پرہیز بہت ہوتا ہے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت تھوڑا سا پرہیز ہو۔ ارشاد فرمایا کہ ہم نے تو کوئی پرہیز نہیں کروایا۔ معمولی نوک پلک درست کرکے چلتا کردیا، یہ سارے دنیا بھر کے پرہیز ہمارے لئے رکھے تھے۔ حضرت فرمانے لگے کہ یہ ارشاد سن کر سر سے پاؤں تک پسینہ آگیا۔ ہم نے تو کوئی پرہیز نہیں کروایا تھا، معمولی سی نوک پلک درست کرکے چلتا کردیا۔ بھائی بیماری کا آخری انجام کیا ہے موت۔ کیا مرنا نہیں ہے اس سے کیا گھبرانا۔ ہاں سُنّت ہے علاج کرنا، کرو۔ علاج کی تدبیر کرکے اللہ پر چھوڑ دو۔ چاہیں گے شفا دیدیں گے، نہیں چاہیں گے تو ان کی رضا۔ ہمیں اپنے پاس لے جانا چاہیں گے چلئے حاضر ہیں بصد خوشی حاضر ہیں۔

اپنی پاکیزگی بیان نہ کرو:

اور تیسرے یہ کہ اپنے نفس کا تزکیہ نہ کرو۔ قرآن مجید میں آتا ہے کہ "فلا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقی" اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کیا کرو کہ ہم اچھے ہیں، ہم یہ ہیں، ہم وہ ہیں۔ اپنی صفائی دینے کی کوشش نہ کرو، اللہ

تعالیٰ بہت بہتر جاننے والے ہیں جو تم میں سے بچنے والا ہے یعنی متقی ہے۔ ارے مخلوق کے سامنے تو صفائی پیش کرتے ہو۔ کیا اللہ کے سامنے بھی صفائی پیش کرتے ہو؟ مخلوق کو تو کہہ سکتے ہو کہ تمہیں بدگمانی ہوئی میرے بارے میں۔ میں ایسا نہیں تھا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ کیا اللہ کو بھی کہو گے کہ تمہیں بدگمانی ہوئی ہے؟ نعوذ باللہ۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اللہ کے سامنے اپنی پاکیزگی کا تصور کرتے ہو۔ اپنی سراپا گندگی کا تصور کرو۔ اللہ کا کرم ہے کہ ہمیں چلتا پھرتا چھوڑ دیا ورنہ یہ نجاست تو دفن کے لائق تھی۔ ایک شخص کی نظر اس پر ہو تو وہ اپنے منہ سے اپنی پاکیزگی اور صفائی پیش نہیں کرے گا۔ اور اگر کوئی کرتا ہے تو جھوٹا ہے۔ تیسرے ارشاد میں فرمایا کہ دو آدمیوں کی بددعاؤں سے بچو، ایک مظلوم کی بددعا اور ایک یتیم کی بددعا۔ یہ اس وقت آ کے سر اٹھاتی ہیں جب لوگ سو رہے ہوتے ہیں رات کے دو بجے۔ مظلوموں کی بددعا سے بچو۔ اور یتیموں کی آہ سے بچو، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو رخصت فرما رہے تھے، ساتھ چل رہے تھے، رخصت کرنے کے لئے چلتے چلتے آخری جو نصیحت فرمائی وہ یہ تھی "یا معاذ لعلنی لا ترنی بعد هذا" شاید تم اس کے بعد مجھے نہیں دیکھ سکو گے۔ لیکن میں تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں۔

مظلوم کی بددعا سے بچو:

"ایاک ودعوة المظلوم" مظلوم کی بددعا سے بچنا، بچتے رہنا "لیس بینه وبین اللّٰه حجاب" اس کے درمیان اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں، سیدھی عرش پر جا کر پہنچتی ہے۔ اسی کو فارسی شاعر کہتا ہے ؎

بترس آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت درحق بر استقبال می آید

مظلوموں کی بددعا سے بچو اس لئے کہ جب وہ دعا کرتے ہیں تو قبولیت عرش الٰہی سے اس کے استقبال کے لئے آتی ہے۔ اور اسی طرح یتیم کی بددعا سے بچو۔ یتیم کا مال نہ کھاؤ خواہ تیجہ، دسواں، چالیسواں، کے عنوان سے ہو، یتیم پر ظلم نہ کرو۔ اور یتیم کا مال نہ ہتھیاؤ۔ اس لئے کہ ان کی آہ لگتی ہے تو بیڑا غرق کر دیتی ہے۔ کراچی میں کتنے بچے یتیم کئے گئے ان کی آہیں نہیں لگیں۔ کتنے بے گناہوں کو تختۂ ستم اور تختۂ مشق بنایا گیا۔ کیا ان کی آہیں رائیگاں جائیں گی؟ ایک نکتہ یاد رکھو کہ مظلوم کا ولی اللہ ہونا شرط نہیں ہے کہ مظلوم اگر ولی اللہ ہو تو اس کی بددعا لگتی ہے واللہ مظلوم اگر کافر بھی ہو اس کی بھی بددعا لگتی ہے۔ فاجر فاسق ہو اس کی بھی بددعا آدمی کو مار دیتی ہے۔ اس لئے کسی شخص پر ظلم و ستم کرنا، کسی سے زیادتی کرنا کسی کا حق اپنے ذمہ لینا اس سے ڈرو۔ اور یہ قیامت تک ساتھ نہیں چھوڑتی۔ چاہے کتنی معافیاں اللہ میاں سے مانگو، معافی نہیں ملتی جب تک کہ صاحب معاملہ معاف نہ کردے۔ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک سب سے بُری صورت حال یہ ہے کہ میں ایسے آدمی پر ظلم کروں جو میرے مقابلہ میں اللہ کے سوا کسی سے مدد نہیں لے سکتا۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ اس کا کوئی نہیں۔ کوئی تھانہ کچہری والا اس کا واقف نہیں، کوئی بڑا آدمی اس کی سفارش کرنے والا نہیں، اور کوئی اس کے ساتھ جتھا نہیں جو اس کے ساتھ پیروی کرے۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں، کچل دو، مار دو۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ سب سے بڑا اس کے ساتھ موجود ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے

کہ "یا رب المستضعفین" اے کمزوروں کے رب، مجھے یہ دعا پیاری لگتی ہے۔ مجھے یہ لفظ بہت مزہ دیتا ہے "یا رب المستضعفین" اے کمزوروں کے رب، جن کا دنیا میں کوئی شنوا نہیں ان کی کوئی سننے والا نہیں تو ان کا بھی رب ہے اور تو ان کا بھی انتقام لیتا ہے۔ ان کی بھی فریاد رسی کرتا ہے، مدد کرتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کمزور کا کوئی نہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ سب سے بڑا مالک ان کے ساتھ ہے اور جس کا کوئی نہیں ہوتا خدا اس کے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ نہ کرے اگر اللہ تعالیٰ کسی سے انتقام لیں تو پھر اس کا جو حشر ہونا چاہئے، وہ ہوتا ہے۔

مظلوم کا انتقام اللہ تعالیٰ خود لیتے ہیں:

میں نے آپ کو ایک قصہ سنایا تھا کہ ایک بزرگ تھے، ان کو کسی نے بُرا بھلا کہا وہ اپنے ایک ساتھی سے کہنے لگے کہ فوراً اس کے ایک تھپڑ ماردو۔ اس نے ذرا دیر کردی تاخیر کردی۔ وہ آدمی وہیں پھسلا اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ یہ بزرگ اس ساتھی سے کہنے لگے کہ تو نے اس کی ٹانگ توڑ دی تو اس کے تھپڑ لگا دیتا تو اس کی ٹانگ نہ ٹوٹتی۔ میں نے اس لئے کہا تھا کہ میرا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ ہے کہ اگر میں کسی کی زیادتی کا بدلہ خود لے لوں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ٹھیک کیا، لیکن اگر میں انتقام نہ لوں وہ خود انتقام لے لیتے ہیں، اور میں کہتا ہوں کہ یہ صرف اس بزرگ میں منحصر نہیں۔ اس معاملہ میں تم سارے بزرگ ہو۔ جو شخص اپنا انتقام نہیں لے سکتا، اللہ تبارک و تعالیٰ خود اس کا انتقام لیتے ہیں الاّ یہ کہ تم معاف کردو۔ اللہ سے کہدو کہ ہماری صلح ہوگئی ہے۔ مقدمہ داخل دفتر کردو ورنہ اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لیتے ہیں۔ تاہم جلد بازی نہیں

کرتے۔ بندوں کو مہلت دیتے ہیں کہ نادان ہیں شاید آپس میں معاملہ درست کرلیں۔ غرضیکہ ایسا شخص جس کا کوئی انتقام لینے والا نہ ہو اللہ تعالیٰ کے سوا اس پر ظلم کرتے ہوئے زیادہ ڈرو۔ مخلوق کے انتقام کی تو تم تاب لاسکتے ہو۔ اللہ کے انتقام کی تم تاب نہیں لاسکتے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

صبر

کے درجات

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام علی عباده الذين اصطفى، امابعد!

ایک موقع پر حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تفویض اور تسلیم کو بیان فرماتے ہوئے فرمایا، یہ حضرات صوفیاء کی اصطلاحات ہیں، اور قرآن کریم میں بھی یہ لفظ آیا ہے: "وافوض امری الی اللّٰه۔" (میں سپرد کرتا ہوں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے) اس کو تفویض وتسلیم کہتے ہیں یعنی اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردینا اور مالک کی جانب سے جو معاملہ ہو اس کے سامنے سر تسلیم خم کردینا۔ شیخؒ نے فرمایا کہ نہ تو نعمتوں کو حاصل کرنا اپنے لئے اختیار کرو اور نہ مصائب کو دفع کرنا اپنے لئے تجویز کرو۔ نعمتیں تم تک بہرحال پہنچیں گی، جو تمہاری قسمت میں لکھی جاچکی ہیں، خواہ تم ان کے لئے تگ ودو کرو یا نہ کرو، محنت کرو یا نہ کرو، اور مصیبتیں اور تکالیف تم تک آکر رہیں گی خواہ تم ان کو ناگوار سمجھو، ان پر بے قراری کا اظہار کرو یا جو چاہو کرو، یہ مصائب اور تکالیف تم سے ٹل نہیں سکتیں اس لئے اگر حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے کوئی نعمت آئے تو اس کا استقبال شکر کے ساتھ کرو اور اگر کوئی مصیبت آئے تو اس کا استقبال صبر کے ساتھ کرو، لیکن اس معاملے میں لوگوں کے درجات مختلف ہیں۔

رونا نہ آئے تو شکل ہی بنالو:

سب سے پہلا درجہ ہے تصبر، یعنی تکلیف کے ساتھ صبر کرنے کی اور اسے سہارنے کی کوشش کرنا، اگر آدمی سے صبر نہ ہو سکے تو صابروں کی سی شکل وصورت بنالینا، جو حضرات اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ہیں ان کی شکل وصورت بنالینا بھی اللہ کے یہاں بڑا محبوب ہے، ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابکوا فان لم تبکوا فتباکوا۔" (ابن ماجہ ص۳۰۹) (رویا کرو اور اگر تمہیں رونا نہ آئے تو رونے والوں کی سی شکل بنالو۔)

اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانا چاہئے، لیکن ہمیں رونا نہیں آتا، آنکھوں میں آنسو نہیں آتے، دل میں رقت پیدا نہیں ہوتی، بھائی اگر رونا نہیں آتا تو رونے والوں کی سی شکل تو بنالو، اللہ تعالیٰ اس بہانے سے رونا بھی عطا فرمادیں گے، ہمارے شیخ قطب الاقطاب حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی نوّر اللہ مرقدہ وقدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اکابر میں دو بزرگوں کو اخیر شب میں آواز سے روتے دیکھا ہے، ایک اپنے والد ماجد حضرت مولانا یحییٰؒ کو، دوسرے حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو، یہ دونوں بزرگ اس طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے روتے اور بلبلاتے جیسے کسی بچے کی پٹائی ہورہی ہواور وہ رورہا ہو، لیکن دن کے وقت اور لوگوں سے ملتے وقت ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے، تو اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں جو واقعۃً اللہ تعالیٰ کے سامنے رونے کا حق ادا کرتے ہیں، اللہ کے سامنے رونا اپنی عبدیت کا اظہار کرنا ہے، حضرت شیخؒ کے یہ الفاظ کہ "جس طرح بچے کی پٹائی کی جارہی ہو" بڑے عجیب الفاظ ہیں۔

تو رونے والے اللہ تعالیٰ کے سامنے روتے ہیں، تمہیں اگر رونا نہیں آتا تو رونے کی شکل ہی بنالو، اللہ کے سامنے گڑگڑاؤ اور اگر گڑگڑانے کی کیفیت پیدا

نہیں ہوتی تو اللہ کے سامنے گڑگڑانے کی شکل بنالو، اور اگر اصل بھی نہیں ہوتی اور نقل بھی نہیں تو پھر پیچھے کیا باقی رہا؟

حضرت بنوریؒ کا جماعت نہ ملنے پر رونا:

ایک دن ہمارے حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی عصر کی جماعت رہ گئی، کیونکہ معتقدین تو بڑا ہجوم کرتے ہیں، پھر ماشاء اللہ جمعہ کے دن تو کیا ہی کہنے؟ غالباً کسی دکان کا افتتاح تھا، حضرتؒ کو لے کر گئے، حضرت نے فرمایا بھائی جمعہ کی عصر کی جماعت اپنی مسجد میں پڑھتا ہوں، میری عصر کی نماز جماعت سے نہ رہ جائے، انہوں نے کہا کہ نہیں جی! ہم پہنچائیں گے، لے جاتے وقت تو لوگ بہت مستعد ہوتے ہیں، اپنے کام کا خیال ہوتا ہے، دوسرے کا خیال نہیں ہوتا، حضرت بنوریؒ جب واپس پہنچے تو نماز ہوچکی تھی، اس پر حضرتؒ بڑا روئے، اس دن میں نے حضرتؒ کو خوب روتے ہوئے دیکھا، بہت روئے اور فرمانے لگے کہ ہمارے پاس اصل تو ہے نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل ہے، نماز تو ہمیں پڑھنی آتی نہیں بس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل کرلیتے ہیں، یہ نقل بھی ہمارے پاس نہ رہے تو پھر ہمارے پاس کیا رہا؟ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے ہمیں اس چیز کی قدر نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تکبیر تحریمہ کا اہتمام:

پوری زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو تین مواقع پر تکبیر تحریمہ میں شامل نہیں ہوسکے، ایک دفعہ بنو عمرو بن عوف میں صلح کرانے کے لئے تشریف لے گئے تھے اور حضرت بلالؓ سے فرماگئے تھے کہ نماز کا وقت ہوجائے

اور میں نہ آؤں تو ابوبکرؓ سے کہنا نماز پڑھا دیں گے، چنانچہ نماز کا وقت ہوا، حضرت بلالؓ نے اذان کہی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ آپ نماز پڑھائیں گے؟ انہوں نے کہا "نعم ان شئت" (ہاں اگر تم کہو تو پڑھا دیں گے) چنانچہ کچھ دیر انتظار کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لائے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا کہ نماز پڑھائیے، انہوں نے نماز شروع کردی، نماز ابھی شروع ہوئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، اب لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو توجہ دلانے کے لئے تالیاں پیٹنا شروع کردیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے ہیں "وکان ابوبکر لایلتفت" (حضرت ابوبکرؓ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو ان کو کسی اور چیز کی طرف التفاف نہیں ہوتا تھا) جب لوگوں نے بہت تالیاں بجائیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تنبہ ہوا، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کے اشارے سے فرمایا "کھڑے رہو" انہوں نے اظہار تشکر کے لئے دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھائے اور پھر پیچھے ہٹ گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھ کر نماز پڑھا دی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا "تم لوگ تالیاں کیوں بجا رہے تھے؟ جب تم میں سے کسی کو نماز میں کوئی چیز پیش آجائے یعنی امام کو متنبّہ کرنے کی ضرورت ہو تو تسبیح کہا کرو کیونکہ جب تسبیح کہی جائے گی تو امام کو تنبہ ہوجائے گا "فانما التصفیق للنساء" (تالیاں بجانے کا حکم عورتوں کے لئے ہے) مردوں کے لئے نہیں، مردوں کے لئے تسبیح ہے یعنی سبحان اللہ کہے، اور پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ جب میں نے کہا تھا کہ اپنی

جگہ کھڑے رہو اور نماز پڑھاؤ تو تم پیچھے کیوں ہٹے؟ انہوں نے عرض کیا:

"ماکان لابن ابی قحافة ان یصلی بین یدی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔"

ترجمہ: "ابوقحافہ کے بیٹے سے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے ہوکر نماز پڑھائے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے ہوں اور میں نماز پڑھاؤں یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اس قسم کا ایک واقعہ مرض الوفات میں بھی پیش آیا تھا، طبیعت مبارک ٹھیک نہیں تھی، طبیعت پر ثقل تھا، اس لئے مسجد میں تشریف نہیں لاسکتے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے نماز پڑھاتے تھے، ایک دن ذرا تھوڑا طبیعت میں سکون اور خفت محسوس ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو آدمیوں کے سہارے سے مسجد میں تشریف لے گئے ایک حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے اور دوسرے حضرت فضل بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاکر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پہلو میں بیٹھ گئے:

"فکان ابوبکر یصلی بصلوة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والناس یصلون بصلوة ابی بکر رضی اللّٰہ عنہ۔" (صحیح بخاری ج۱ ص۹۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی اقتداء کررہے تھے اور لوگ حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کررہے تھے، اس میں علماء کا اختلاف ہوا ہے کہ اس نماز

میں امام کون تھا؟ حضرت ابوبکرؓ تھے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم؟ غالباً مذکورہ بالا الفاظ کے پیش نظر صحیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امام تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو پہلے امام تھے اب ان کی حیثیت مکبر کی بن گئی تھی۔

یہ دو واقعات ایسے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع ہونے کے بعد تشریف لائے ایک اور موقع پر سفر میں، غالباً یہ سفر تبوک کا واقعہ ہے، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت ضرورت کے لئے تشریف لے گئے تھے، میں پانی کا لوٹا لے کر پیچھے پیچھے گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو میں نے وضو کروایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شامی جبہ پہنا ہوا تھا، اس کی آستینیں تنگ تھیں، آستینیں اوپر کو نہیں آٹھتی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اتار کر کندھے پر ڈال لیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چمڑے کے موزے پہنے ہوئے تھے، میں لپکا کہ ان کو اتاروں، فرمایا رہنے دو میں نے ان کو پاک حالت میں پہنا ہے چنانچہ آپ نے موزوں پر مسح فرمایا، حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم وہاں سے واپس آئے تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی کیونکہ ذرا دیر ہو گئی تھی، لوگوں نے انتظار کیا لیکن جب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لائے، ممکن ہے پیچھے رہ گئے ہوں، ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں نماز قضاء نہ ہو جائے تو حضرات صحابہؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امام بنا لیا، جماعت کی ایک رکعت ہو چکی تھی کہ صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ مسبوق ہیں اور ایک رکعت رہ گئی ہے، صحابہؓ بہت پریشان ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکعت پوری کرنے کے بعد ان

کو اطمینان دلانے کے لئے فرمایا کہ تم نے بہت اچھا کیا کہ نماز شروع کرلی، یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خصوصیت ہے کہ صحابہؓ کی جماعت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اقتدا میں نماز ادا کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھائی، یہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، سابقین اولین میں سے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن پڑھا کرتے تھے، جو ان کے بچوں کے برابر تھے ان سے قرآن پڑھا کرتے تھے، یہ ان کی تواضع تھی، ترمذی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات المؤمنین سے فرمایا تھا:

"ان امركن مما يهمنى بعدى ولن يصبر عليكن بعدى الا الصابرون۔" (ترمذی باب مناقب عبدالرحمٰن بن عوفؓ کنز ج ۱۲ حدیث: ۳۳۴۳۳، کنز ج ۱۶ حدیث: ۴۴۹۶۱)

ترجمہ: "کہ تمہارا معاملہ مجھے فکرمند کرتا ہے اپنے بعد اور تمہارے معاملہ میں صابرین ہی کچھ خدمت کریں گے۔"

یعنی میرے بعد تمہاری کفالت کی کیا شکل ہوگی؟ اس کا کبھی مجھے خیال آجاتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اپنے اہل و عیال کے بارے میں فکر مند ہونا بھی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور یہ توکل کے خلاف نہیں ہے آخر انسان انسان ہے پتھر نہیں ہے گوشت پوست کا انسان ہے اور پھر فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ: اللہ کے نیک ومقبول بندے صابرین تمہاری خدمت کیا کریں گے، ان حضرات میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تھی جو حضرات امہات المؤمنینؓ کی خدمت کیا کرتے تھے اور ان کے پاس اپنے ہدایا بھیجا کرتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہا ان کو بہت دعائیں دیتی تھیں، حضرات امہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن اپنے پاس کچھ نہ رکھتی تھیں جو آتا اسی وقت لٹادیتی تھیں، وہ بھی تو آخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں تھیں، لاکھوں کے عطیات آتے تھے، ایک دن ام المؤمنین کے پاس دراہم کا ڈھیر لگا ہوا تھا، تقسیم کرتی رہیں حتی کہ سارا تقسیم کردیا تو خادمہ کہنے لگی کہ حضور (رضی اللہ عنہا) کا روزہ ہے، شام کو کچھ افطار کے لئے بچالیتیں؟ فرمانے لگیں: پہلے یاد دلادیتی، اب عورتوں کی طرح طعنہ دینے کا کیا فائدہ؟ یعنی یہ بات بھی یاد دلانے کی ہے کہ تمہارا روزہ ہے کچھ افطار کرنے کے لئے رکھ لو۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ صحیح معنی میں تو ایک ہی نماز نکلی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک رکعت نکل گئی تھی، پوری زندگی میں دو واقعات ایسے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کا ابتدائی حصہ نہیں ملا اور ہماری جماعت تو کیا پوری نماز بھی رہ جائے تو ہماری مسلمانی میں کچھ فرق نہیں آتا، بھئی نقل تو اتارو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی، اللہ کے بندو! اگر اصل بھی نہ ہو اور نقل بھی نہ ہو تو پھر کیا رہے، کچھ بھی نہیں رہے گا۔

اصل نہیں تو نقل ہی اتارو:

نقل تو اتارو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور یہ نقل بھی اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے، فکر مند نہ ہوا کرو کہ ہمارے پاس اصل نہیں یا جیسی نماز ہونی چاہئے ویسی نماز نہیں ہے ہمارے پاس، جیسی تلاوت ہونی چاہئے وہ نہیں ہے، جیسا درجہ احسان کا عبادت میں ہونا چاہئے ویسا درجہ حاصل نہیں، ہو بھی نہیں سکتا، کیسے ہو سکتا ہے؟ اس میں زیادہ فکر مند نہ ہوا کرو بس کوشش کرو کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل اتارو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا نقشہ کھینچو بس انشاء اللہ وہ نماز قبول ہوجائے گی۔

صبر نہیں تو صبر والوں کی شکل ہی بنالو:

تو شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر صبر نہیں کرسکتے تو تصبر کرو یعنی صبر کرنے والوں کا نقشہ لو، تکلیف اور بناوٹ کے ساتھ ہی صبر کا اہتمام کرو، شروع شروع میں ایسا ہوگا لیکن رفتہ رفتہ مشق ہوجائے گی۔ بقول حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحبؒ کے پہلے ریا ہوگی پھر عادت بنے گی پھر عبادت بنے گی، پہلے تو صرف دکھاوا ہوگا، نام ہوگا، پھر مشق کرتے کرتے عبادت کی ایسی عادت ہوجائے گی کہ کوئی تم سے چھڑانا چاہے تو تم چھوڑ نہیں سکو گے، اور جب اتنی پختگی ہوجائے گی تو پھر عبادت کی طرف تیسرا قدم اٹھے گا کہ اللہ کے سامنے جھک رہے ہیں، اس میں حقیقت آنا شروع ہوجائے گی، اور اسی کا نام مجاہدہ ہے، یہی محنت ہے جو مطلوب ہے، ہم لوگ چاہتے ہیں کہ پہلے دن جنید بغدادیؒ بن جائیں، اگر جنید بغدادیؒ جیسی نماز پڑھیں تو پڑھیں ورنہ پھر نماز سے کیا فائدہ؟ یہ بات غلط ہے۔

صبر کے درجات:

تو شیخ نوّر اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے، کوئی مصیبت آئے تو صبر کے ذریعہ اس کا استقبال کرو اور اس کے بہت سے درجات ہیں۔

پہلا درجہ تصبر کا ہے یعنی بتکلّف صبر کرو، پھر اس کے بعد دوسرا درجہ آئے گا

صبر کا۔

مصائب کی حکمت؟

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نوّر اللہ مرقدہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو تکلیف ہمیں پہنچتی ہے اس کے بارے میں یہ عقیدہ تو تمہارا ہو گا ہی کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے کیونکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، اب یہ چیز جو منجانب اللہ آتی ہے یہ کسی مقصد کے لئے ہے یا بے فائدہ ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، حکیم کا کوئی کام مقصد سے خالی نہیں ہوتا، چلو یہ بات بھی طے ہوگئی کہ اس میں کوئی فائدہ ضرور بہ ضرور ہو گا، اب فائدے میں تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ اللہ میاں کا کوئی فائدہ ہو گا، دوم یہ کہ تمہارا کوئی فائدہ ہو گا، سوم کہ مشترکہ فائدہ ہو کہ تھوڑا سا اللہ تعالیٰ کا فائدہ ہے اور کچھ تمہارا بھی ہے، لیکن پہلی اور تیسری صورت غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فائدہ حاصل کرنے سے بے نیاز ہیں، وہ تو مخلوق کو فائدہ پہنچاتے ہیں، یہ اس کا عام فیض ہے کہ سب کو فائدہ پہنچاتے ہیں لیکن مخلوق سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے، اسی لئے اللہ تعالیٰ کو منعم حقیقی کہتے ہیں کہ وہ سب کو نعمتیں عطا کرتے ہیں، سب پر احسان کرتے ہیں مگر مخلوق سے کوئی نفع اور کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے، واقعی اللہ تعالیٰ کے سوا جتنے منعم ہیں، احسان کرنے والے ہیں وہ احسان وانعام میں کوئی نہ کوئی اپنا فائدہ ضرور رکھتے ہیں، کوئی شخص ثواب کی نیت کرتا ہے کہ مجھے اس کا ثواب ملے گا یہ بھی فائدہ حاصل کرنا ہوا، اور اگر کوئی اور فائدہ نہ ہو تو کم از کم یہی ہے کہ کسی کی بدحالی کو دیکھ کر دل میں جو کڑھن پیدا ہوگئی تھی احسان کے ذریعہ وہ کڑھن دل سے جاتی رہے گی، کسی کو دیکھ کر جو ہمارے دل کو تکلیف ہوتی تھی

وہ ہمارے دل کی تکلیف دور ہوگی، بعض لوگ ووٹوں کے لئے احسان کرتے ہیں، خدمت خلق کرتے ہیں مگر نام آوری کے لئے، سرداری حاصل کرنے کے لئے، قیادت حاصل کرنے کے لئے، کوئی احسان کرتا ہے آخرت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے: "انما الاعمال بالنیات۔" جیسی کسی کی نیت ہوگی حق تعالیٰ شانہ ویسا ہی اس کے ساتھ معاملہ فرمائیں گے، لیکن بہرحال مخلوق کی طرف سے کسی پر جو احسانات ہو رہے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی فائدہ بھی اپنا ہوتا ہے، خواہ کسی درجہ کا بھی ہو اپنا فائدہ بھی مدنظر ہوتا ہے، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات عالی ہے کہ تمام مخلوق پر انعام فرما رہے ہیں لیکن اپنا کوئی فائدہ نہیں، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

من نہ کردم خلق تاسودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ مخلوق اس لئے نہیں بنائی کہ میں ان سے کوئی نفع کا معاملہ کرنا چاہتا ہوں، کوئی سودا کرنا چاہتا ہوں، نہیں بلکہ صرف بندوں پر احسان کرنے کے لئے یہ تخلیق فرمائی ہے، پس اللہ تعالیٰ کا محض احسان ہی احسان ہے، فضل ہی فضل، انعام ہی انعام ہے، تو اللہ کی طرف سے اگر کوئی تکلیف آتی ہے اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں، وہ فائدے سے پاک ہے، قرآن کریم میں ہے کہ:

"مایفعل اللّٰہ بعذابکم ان شکرتم وآمنتم۔"

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے کر کیا کریں گے تمہیں تکلیف دے کر کیا کریں گے اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ۔"

تو یہ طے ہوگیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے تمہارے فائدے کے لئے ہو رہا ہے، اللہ

تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں، لیکن بات یہ کہ فائدہ کبھی محسوس ہوتا ہے کبھی محسوس نہیں ہوتا، مولانا فرماتے ہیں:

طفل می لرزد زنیش احتجام
مادر مشفق ازاں غم شاد کام

بچے کے پھوڑا نکل آیا تھا، ماں نشتر لگانے والے کے پاس لے گئی تاکہ اس کا آپریشن کردیا جائے، نشتر تو بعد میں لگے گا بچے نے اس جراح کو دیکھ کر ہی چلانا شروع کردیا، بہرحال اس کو جیسے کیسے پکڑ کر نشتر لگوادیا اور پیپ گندگی سب نکل گئی، زخم کو صاف کرکے مرہم لگادیا، تو بچہ لرز رہا ہے، کانپ رہا ہے لیکن ماں خوش ہورہی ہے کہ بچے کی تکلیف دور ہوگئی، شکریہ بھی ادا کرتی ہے ڈاکٹر صاحب کا اور اس کو فیس بھی دیتی ہے، احسان بھی مانتی ہے، تو ماں جو اپنے بچے کے نشتر لگواتی ہے یہ بچے کے ساتھ اس کی شفقت و محبت ہے مگر بچہ اپنی نادانی کی وجہ سے یوں سمجھتا ہے کہ ماں اس پر بڑا ظلم کررہی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے وہ دراصل ہمارے گندے مواد کا آپریشن ہوتا ہے، ہم اپنی کم عقلی اور نادانی کی وجہ سے اس کو نہیں سمجھتے، یہ بھی رحمت ہی کا معاملہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ جب نظر ذرا زیادہ صحیح کردیتے ہیں تو بات سمجھ میں بھی آنے لگتی ہے کہ یہ معاملہ میرے ساتھ کیوں ہورہا ہے، اس کی وجہ بھی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔

دوسرا درجہ:

بہرحال دوسرا درجہ صبر کا ہے جس کا مطلب کسی مصیبت کو من جانب اللہ سمجھتے ہوتے اس کو سہارنا، اس پر شکایت نہ کرنا۔ صبر کے بڑے درجات ہیں اللہ

تعالیٰ فرماتے ہیں: "وبشر الصابرین۔" (اور خوش خبری دیدو صبر کرنے والوں کو۔) "الذین اذا اصابتھم مصیبة۔" (صبر کرنے والے وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے۔) "قالو انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔" (تو یوں کہتے ہیں ہم اللہ کے لئے ہیں اللہ کا مال ہیں اور اللہ کی طرف جانے والے ہیں۔) "اولئک علیھم صلوۃ من ربھم ورحمة۔"

شاہ عبدالقادر دہلویؒ ترجمہ فرماتے ہیں: (یہ لوگ ہیں کہ ان کو شاباشیں ان کے رب کی جانب سے اور ان پر رحمت ہے۔)

یعنی ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتیں ہیں۔ "واولئک ھم المھتدون۔" (اور یہی لوگ ہیں صحیح راستہ پانے والے۔) "ان اللّٰہ مع الصابرین۔" (بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

تکلیف محبوب کا عطیہ ہے:

پس جو تکلیف آئے اسے محبوب کا عطیہ سمجھتے ہیں اور صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، اس کی شکایت نہ کرو، بس یہی صبر ہے۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ صبر کی تین علامتیں ہیں، ایک یہ کہ شکوہ شکایت نہ کرے، دوسری یہ کہ ضرورت سے زیادہ جزع فزع نہ کرے، ویسے آدمی کمزور ہے جب تکلیف ہو تو ہائے کرے گا، اس کی اجازت ہے، اس کا مضائقہ نہیں، بھئی ہم تو بندے ہیں، ہائے کہنا بندگی کا اظہار ہے، اپنے عجز کا اظہار ہے، اپنی کمزوری کے اظہار کے لئے منہ سے ہائے بھی نکلے گی، تکلیف بھی ہوگی لیکن جزع فزع کی اجازت نہیں جس سے بے صبری کا اظہار ہو اور شکوہ شکایت کی

کیفیت پیدا ہو جائے۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب کوئی مزاج پرسی کرے تو بیمار کو چاہئے کے پہلے الحمد للہ کہے اس کے بعد اپنی بیماری کو بیان کرے تاکہ بیماری کا ذکر کرنا اللہ تعالیٰ کی شکایت نہ سمجھا جائے۔

تیسرے یہ کہ مصیبت کی وجہ سے تمہارے اعمال شرعیہ یا طبعیہ میں کسی قسم کا تغیر پیدا نہ ہو، اگر تکلیف کی وجہ سے مصیبت کی وجہ سے نمازیں قضا ہو گئیں یا اور معمولات میں فرق آنے لگا تو یہ صبر کے خلاف ہے، یہ تین چیزیں اگر پائی جائیں تو یہ صبر جمیل ہے اور ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بہت سی عنایتیں ہیں، بڑی ہی عنایتیں ہیں۔

تیسرا درجہ:

شیخؒ فرماتے ہیں کہ تیسرا درجہ موافقت ہے، جو معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا اس پر رضائے الٰہی کی موافقت کرو، جب اس طرف نظر چلی جائے کہ معاملہ مالک کی طرف کیا جارہا ہے تو موافقت پیدا ہو جاتی ہے، یہ صبر سے اونچا درجہ ہے، وہ قصہ مشہور ہے کہ شاہ دولہ رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں نے کہا کہ دریا میں کٹاؤ لگا ہوا ہے آپ ذرا دعا کر دیجئے کہ دریا کا رخ بدل جائے، فرمایا کہ مجھے وہاں لے چلو، لے گئے، فرمایا ذرا کدال دے دو، کدال دے دیا گیا، تو خود بھی گرانے لگے، لوگوں نے کہا کہ یہ کیا غضب ہے، فرمایا جدھر مولا ادھر شاہ دولہ، اگر مولا ہی چاہتا ہے کہ اس کو گرایا جائے تو شاہ دولہ کون ہوتا ہے جو کہے کہ نہ گراؤ، اور ان کی اس موافقت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے دریا کا بہاؤ دوسری طرف پھیر دیا، کٹاؤ بند ہو گیا، اور دریا کا بہاؤ دوسری طرف مڑ گیا، اللہ تعالیٰ کا

معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ عجیب ہوتا ہے، تو یہ تیسرا درجہ ہے بھئی، جدھر مولا ادھر شاہ دولہ۔

چوتھا درجہ:

شیخؒ فرماتے ہیں چوتھا درجہ اس سے بھی اوپر کا ہے اور وہ ہے تنعم و تلذذ کا، جب یہ چیز اور آگے بڑھتی ہے تو جس طرح نعمتوں سے لذت حاصل ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مصائب اور تکالیف آتی ہیں ان سے آدمی کو لذت حاصل ہونے لگتی ہے، جیسے بچے حلوہ کھاتے ہیں، ان کو لذیذ لگتا ہے لیکن بعض لوگ مرچیں کھاتے ہیں، ناک سے پانی بہہ رہا ہے، آنکھوں سے بھی پانی بہہ رہا ہے، سی سی بھی کر رہے ہیں لیکن کھا رہے ہیں، اس کے بغیر کھانا لذیذ معلوم نہیں ہوتا، ہم لوگوں کو جس طرح نعمتوں سے لذت حاصل ہوتی ہے اسی طرح ان مقبولان الٰہی کو ان معاملات سے جن کو تکالیف و مصائب کہتے ہیں لذت حاصل ہوتی ہے، یہ چھوٹا درجہ نہیں بہت بڑا درجہ ہے۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما دونوں باپ بیٹا صحابی ہیں، حضرت عمرانؓ بہت اونچے درجے کے بہت پیارے صحابی ہیں، وہ بھی تکلیف میں مبتلا ہوگئے تھے، انہوں نے داغ لگوا لیا، پرانے زمانے میں داغ دے کر، یعنی لوہا گرم کر کے داغ لگاتے تھے اور اس کے ذریعے بعض بیماریوں کا علاج کرتے تھے، تو آپؓ نے کسی آدمی سے شکایت کی کہ میں جب سے اس تکلیف میں مبتلا ہوا تھا تو مجھے فرشتے روزانہ سلام کرتے تھے جب سے داغ لگوایا تو انہوں نے سلام بند کر دیا لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے یہ دولت دوبارہ نصیب فرمادی۔

الغرض چوتھا درجہ یہ ہے کہ تکلیف اور مصیبت کو محبوب کی جانب سے جان کر اس سے لذت حاصل کی جائے کیونکہ محبوب کی جانب سے جو تکلیف

آئے وہ عاشق کے لئے موجب مسرت ہوا کرتی ہے، ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کئی سالوں کے فراق کے بعد کسی کا محبوب اچانک ملا ہو، اور وہ پیچھے سے آکر اس کو دبا دے اب محبوب موٹا تازہ فربہ اور عاشق بیچارہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا ہے، محبوب نے جو اس کو زور سے دبایا تو عاشق کی ہائے نکل گئی، محبوب نے کہا کہ تمہیں تکلیف ہو رہی ہو تو تمہیں چھوڑ کر رقیب کو پکڑ لوں؟ اس حال پر عاشق کیا کہے گا، وہ تو یہی کہے گا:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاکت تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ترجمہ: "دشمن کو یہ بات نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہوا کرے دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ خنجر آزمائی کریں۔"

صبر کرنے والوں کے بڑے درجات ہیں، یہاں امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بہت عجیب بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں ایک ہے مصیبت پر اجر، ایک ہے صبر پر اجر، یہ دونوں الگ الگ اجر ہیں، اگر کوئی صبر نہ کرے گا تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ تکلیف اور مصیبت کا اجر عطا کریں گے، اور اگر صبر کرے گا تو صبر کا اجر الگ ملے گا اور تکلیف کا اجر الگ عطا فرمائیں گے۔

درجہ تلذذ:

شیخ ؒ فرماتے ہیں دوسرا درجہ صبر کا ہے اور تیسرا درجہ اس سے بڑھ کر آگے ہے یعنی یہ دیکھ کر کہ یہ مالک کی طرف سے ہے پھر آدمی میں جذبہ موافقت پیدا ہو جاتا ہے اور چوتھا درجہ مصیبت سے تلذذ کا ہے، ہمارے حضرت مفتی محمد حسن

صاحبؒ جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے، ان کی ٹانگ میں تکلیف ہوگئی تھی، ڈاکٹروں نے کہا ٹانگ کاٹنا پڑے گی، فرمایا بہتر ہے، ڈاکٹروں نے بے ہوش کرنے کو کہا تو فرمایا تم اپنا کام کرو ہم اپنا کام کریں گے بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بس تم اپنا کام کرو، اب اندازہ کیجئے کہ زندہ آدمی ہے، اس کی ٹانگ کاٹی جارہی ہے مگروہ اف تک نہیں کرتا، سی بھی نہیں کرتا، ہائے بھی نہیں کہا، سبحان اللہ ان لوگوں کا کیا مقام ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام اللہ کے نبی تھے ان پر جو گذری وہ آپ کو معلوم ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "انا وجدنا صابرا نعم العبد انه اواب۔" ترجمہ: "ہم نے اس کو صبر کرنے والا پایا، بڑا اچھا بندہ تھا، بڑا رجوع کرنے والا تھا۔"

سبحان اللہ کیا بات ہے! مالک کہہ رہا ہے بندے کو کہ وہ بڑا رجوع کرنے والا تھا۔

تو جب موافقت کے مقام سے بندہ ترقی کرتا ہے تو تنعم اور تلذذ کے مقام پر پہنچتا ہے کہ جس طرح نعمتوں سے لذت حاصل کرتا ہے اسی طرح اس کو تکلیف ومصائب سے راحت ملتی ہے۔

درجہ فنا:

لیکن قصہ یہیں ختم نہیں ہوا، اس سے اوپر بھی ایک درجہ ہے شیخؒ فرماتے ہیں وہ درجہ فناء کا ہے کہ مالک کے سامنے بندے کا ارادہ واختیار ختم ہوجائے، اس کے حکم کے سامنے ہماری کوئی خواہش باقی نہیں رہ گئی فنا ہوگئی "مردہ بدست

زندہ" والا مضمون ہوگیا، اب مردے بے چارے کی کیا خواہش ہے؟ اس کو جہاں چاہو رکھ دو، جس طرف چاہو پلٹ دو، اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینا کہ نہ لذت رہے نہ تکلیف، نہ راحت نہ تکلّف، اس کی کوئی چاہت ہی نہیں رہی، یہ فنا کا مقام ہے، یہ آخری مرتبہ ہے، اس کے بعد کوئی مرتبہ نہیں، اور یہ اصل مقام عبدیت ہے، یہ ہے بندے کا اصل مقام، یہ تو ظاہر ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کرتے ہیں، اور بندہ چاہے نہ چاہے اس کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کے کرنے سے ہوگا، جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلت دے، جس کو چاہے غنی کردے، جس کو چاہے فقیر کردے، صحت اس کے قبضے میں ہے، بیماری اس کے قبضہ میں ہے، راحت اس کے قبضے میں ہے، تکلیف اس کے قبضہ میں ہے، یہ سب چیزیں جو اسباب کی دنیا میں ہیں ان اسباب کو تمہارے موافق کردیں یہ اس کے قبضے میں ہے، اور تمہارے خلاف برگشتہ کردیں یہ اس کے قبضہ میں ہے، دشمن کو سرنگوں کردیں یہ اس کے قبضہ میں ہے، کمزوروں کو تم پر مسلّط کردیں یہ اس کے قبضہ میں ہے، یہ تو ظاہر ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ کے کرنے سے ہی ہوتا ہے لیکن بندہ عملی طور پر اس مقام پر آجائے یہ مقام بندگی ہے، بندہ اس مقام پر نہ آئے سرکش رہے نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی شکایتیں کرتا پھرے تب بھی ہوگا وہی جو وہ چاہے گا لیکن یہ محروم رہا۔

یہ اصل مقام عبدیت ہے شیخؒ فرماتے ہیں جب اس مقام عبدیت پر آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمتوں اور عنایتوں کے دروازے کھول دیں گے اور اپنی رحمت ورضا کی آغوش میں اس کی پرورش فرمائیں گے، حق تعالیٰ شانہ اپنے لطف وکرم سے ہمیں بھی اپنی رضا کی دولت نصیب فرمائے۔

اصلاحی مواعظ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ
انسان پر گزرنے والے ادوار
روضہ اقدس پر حاضری
شب برات۔۔۔ایک تحقیقی جائزہ
صبر و شکر
زبان کی حفاظت
بہترین تاجر کی علامت
خوف خدا اور فکر آخرت
قبر کی تیاری ضروری ہے
مقام بندگی اور دعاء کی حقیقت

جلد دوم

مکتبہ لدھیانوی

اصلاحی مواعظ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ
انسان پر گزرنے والے ادوار
روضہ اقدس پر حاضری
شب برات... ایک تحقیقی جائزہ
صبر و شکر
زبان کی حفاظت
بہترین تاجر کی علامت
خوف خدا اور فکر آخرت
قبر کی تیاری ضروری ہے
مقام بندگی اور دعاء کی حقیقت

جلد دوم

مکتبہ لدھیانوی

اصلاحی مواعظ

جلد دوم

شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

مکتبہ لدھیانوی

اصلاحی مواعظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشاعت اول: ستمبر ۲۰۰۱ء

تعداد: گیارہ سو

کمپوزنگ: صدیقی کمپوزرز، کراچی۔فون: 450-4007

ناشر: مکتبہ لدھیانوی

18- سلام کتب مارکیٹ

علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

برائے رابطہ:

جامع مسجد باب الرحمت

پرانی نمائش، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

فون: 7780337

بسم الله الرحمن الرحيم

شہیدِ اسلام کیسٹ لائبریری کا قیام:

ہم اپنے قارئین کو ایک خوشخبری سنانا ضروری سمجھتے ہیں کہ بحمداللہ شہید اسلام کیسٹ لائبریری کا قیام عمل میں آگیا ہے، لہٰذا جو حضرات، حضرت شہیدؒ کے مواعظ، تفسیر، حدیث اور خطبات جمعہ کی کیسٹ حاصل کرنا چاہیں وہ مکتبہ لدھیانوی سے رجوع کریں۔ اسی طرح جن حضرات کے پاس حضرتؒ کے مواعظ ہوں وہ ہمیں اس کی ایک نقل بھیج کر امت کو حضرت شہیدؒ کے علوم و فیوض سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں۔

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کو اللہ تعالیٰ نے کن کن صفات و کمالات سے نوازا تھا، ظاہری طور پر اس کا کوئی احاطہ اور احصاء کرنا چاہے تو ممکن ہے کہ شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو جو باطنی کمالات عطا فرمائے تھے ان کا ہم ایسے کم فہموں کے لئے احصاء تو کیا ادراک بھی مشکل ہے۔

آپؒ نے اپنی چند روزہ زندگی میں جس قدر اپنی صلاحیتوں اور کمالات کا لوہا منوایا اس کے اپنے اور پرائے سب ہی معترف ہیں۔ تصنیف و تالیف کا میدان ہو یا وعظ و بیان کی مجلس، درس و تدریس کی مسند ہو یا بحث و مناظرہ کی نشست، اصلاح و ارشاد کا عنوان ہو یا سلوک و احسان کی لائن، آپؒ ہر جگہ سیادت و قیادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آپؒ نے تصنیفی میدان میں دفاعِ اسلام کی جو مبارک سعی فرمائی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

پیش نظر کتاب آپؒ کے ان شاہکار مواعظ کا مجموعہ ہے جو آپؒ نے اصلاح

امت کے جذبے، خوف وخشیت الٰہی میں ڈوب کر ارشاد فرمائے ہیں۔ خطبات کیا ہیں؟ اس کا صحیح اندازہ تو قاری ہی لگا سکتا ہے، مگر اتنی بات ضرور ہے جو انہیں پڑھے گا پڑھتا جائے گا، اور اس کے ایک ایک حرف میں اس کو اپنے اعمال کی تصویر نظر آئے گی۔

یہ اصلاحی مواعظ کی جلد دوم ہے، اس کی جلد اول آج سے دو سال قبل شائع ہوکر عوام وخواص اور حلقہ اہل علم سے داد تحسین حاصل کرچکی ہے، جب کہ اس کی مزید جلدوں کی ترتیب پر کام جاری ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں جن حضرات نے کسی بھی درجہ میں تعاون کیا ہے وہ قابل تشکر ہیں، خصوصاً برادر عزیز مولانا محمد اعجاز صاحب جنہوں نے ان مواعظ کی نقل، تیاری، تخریج اور پروف پڑھنے میں محنت کی۔ اسی طرح جناب مولانا محمد طیب لدھیانوی، محمد عتیق الرحمٰن لدھیانوی، بھائی محمد اجمل، عبداللہ ملک، حاجی عبداللطیف اور کمپوزر بھائی عامر صدیقی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے خلوص واخلاص سے اپنی خدمات پیش کیں۔

سعید احمد جلال پوری

۱۴۲۲/۵/۲ھ

فہرست مقالات

تفصیلی فہرست

(۱)

(۲)

(۵)

(۱۲)

خود کو دین کا محتاج سمجھنا

(۱۳)

شب برأت......تحقیقی جائزہ ۲۱۷

(۱۵)

(۱۶)

بہترین تاجر کی علامات

(۱۷)

گھاٹے کے بیوپاری

(۲۰)

(۲۱)

مقام بندگی اور دعا کی حقیقت ۳۷۱

حضرت آدمؑ
کا
تذکرہ

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شکایت
کی کہ میری اولاد نے مجھے بھلا دیا کہ دوسروں کا تو وہ
تذکرہ کرتے ہیں، لیکن میرا تذکرہ نہیں کرتے،
اورآپ نے بھی حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ
والسلام کا تذکرہ کم ہی سنا ہوگا،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد!

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ و السلام ہمارے جد امجد ہیں، اب کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ''جد امجد بندر'' ہیں، ان کے جد امجد بندر ہوں گے، بھائی ہمارے تو جد امجد حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ السلام ہیں، اور حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

''خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ.'' (آل عمران:۵۹)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو مٹی سے بنایا اور پھر ان سے فرمایا ہوجا، پس وہ ہوگئے!

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی تشریح یوں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے کل روئے زمین کا خلاصہ لیا اور زمین کے خلاصے سے حضرت آدم وعلیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا

قالب بنایا، پہلے گارا گوندھا اور گارا گوندھنے کے بعد وہ اتنا سڑ گیا کہ اس گارے سے بدبو آنے لگی، چنانچہ قرآن کریم میں ہے:"مِنْ حَمَأٍ مَّسْنُوْنٍ." (سڑے ہوئے گارے سے) اور صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"قَالَ لَمَّا صَوَّرَ اللّٰهُ آدَمَ فِي الْجَنَّةِ تَرَكَهُ مَاشَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَّتْرُكَهُ فَجَعَلَ اِبْلِيْسُ يَطِيْفُ بِهٖ يَنْظُرُ مَا هُوَ فَلَمَّا رَاٰهُ أَجْوَفَ عَرَفَ أَنَّهٗ خُلِقَ خَلْقًا لَا يَتَمَالَكُ."

(مسلم ج:۲ ص:۳۲۷)

یعنی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قالب بنایا، اور قالب خشک ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس سے کھن کھن کی آواز آنے لگی، ابلیس لعین حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قالب کے ارد گرد چکر لگاتا تھا اور جگہ جگہ سے ٹھونک بجا کر دیکھتا تھا، جب پیٹ پر بجا کر کے دیکھتا تو اندر سے خلا معلوم ہوتا، کہنے لگا کہ اس کے پیٹ میں خلا ہے، اس کو گمراہ کرنا آسان ہوگا، نعوذ باللہ! اس کے بعد حق تعالیٰ شانہ نے اس میں روح پھونکی۔ جیسا کہ فرمایا:"وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ." (السجدہ:۹)

حضرت آدم علیہ السلام کا سب سے پہلا کلام:

تو حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو چھینک آئی، اور انہوں نے کہا الحمدللہ! سب سے پہلا کلام جو ہمارے جدِ امجد کے منہ سے نکلا، وہ الحمد للہ ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

"قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ وَنَفَخَ فِيْهِ الرُّوْحَ عَطَسَ

فَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ.“ (مشکوٰۃ ص:۴۰۰)

ترجمہ:......”جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیدا فرمایا اور ان میں روح پھونک دی تو حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو چھینک آئی تو انہوں نے کہا: الحمدللہ۔“

اور آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ جب بھی آدمی کو چھینک آئے، تو کہے الحمدللہ!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی چھینک لے رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ”یرحمک اللہ“ کہہ رہے تھے، تین دفعہ کہا تو فرمایا: ”اَلرَّجُلُ مَزْکُوْمٌ.“ (مشکوٰۃ ص:۴۰۵) چھوڑ دو، اسے زکام ہو رہا ہے، چھینکیں دیئے جا رہا ہے۔

ایک مسئلہ بتادوں، کوئی آدمی چھینک لینے کے بعد ”الحمدللہ“ کہے تو اس کے جواب میں ”یرحمک اللہ“ کہو، اور اگر وہ ”الحمدللہ“ نہیں کہتا تو ”یرحمک اللہ“ کہلوانے کا مستحق نہیں، اسلئے بعض اکابر کو میں نے دیکھا کہ وہ اونچی آواز سے ”الحمدللہ“ نہیں کہتے تھے، جو لوگوں کو سنائی دے، اس لئے کہ اگر چھینک لینے کے بعد چھینک لینے والا ”الحمدللہ“ اونچی آواز سے کہے تو لوگوں کے ذمے ”یرحمک اللہ“ کہنا واجب ہوجاتا ہے، تو اس لئے بعض اکابر ”الحمدللہ“ اونچی آواز سے نہیں کہتے تھے تاکہ لوگوں کو ”یرحمک اللہ“ نہ کہنا پڑے اور یہ قرض ان کے ذمے نہ ہو، وہ ”الحمدللہ“ آہستہ کہتے ہیں۔ تو الحمدللہ! ہمارے جدامجد حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی شکایت:

ایک بات بیچ میں اور یاد آئی کہ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت آدم علیہ

الصلوٰۃ والسلام نے شکایت کی کہ میری اولاد نے مجھے بھلا دیا (عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی ناظم تبلیغ مولانا بشیر احمد فرماتے ہیں کہ حضرت نے سکھر میں حضرت آدمؑ کی شکایت سے متعلق اپنے خواب کا واقعہ بھی بیان فرمایا۔ ناقل) کہ دوسروں کا تو وہ تذکرہ کرتے ہیں، لیکن میرا تذکرہ نہیں کرتے، اور آپ نے بھی حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ کم ہی سنا ہوگا، اسی لیے میں نے ان کا تذکرہ شروع کیا ہے کہ آج اپنے جد امجد کا تذکرہ کریں (علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام) جب بھی کسی نبی کا نام لو تو حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک، ان نبیوں میں سے کسی نبی کا بھی نام لو تو ان نبیوں کے ناموں کے ساتھ یہ کہو:...... ''**علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام!**'' ہمارے نبی ﷺ پر اور ان پر سلام ہو، اور اگر ہمارے نبی اکرم ﷺ کا نام لیا جائے تو پھر علیٰ نبینا کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، پھر تو اپنے نبی کا نام ہی ذکر کیا جائے گا، کبھی کسی نبی کا نام بغیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نہ لو اور کبھی کسی نبی کا نام لو...... تو اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو نہ بھو لو، ''**علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام**'' کہو، یعنی ہمارے نبی ﷺ پر اور ان پر سلام ہو۔

سب سے پہلے سلام حضرت آدمؑ نے کہا:

جب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام میں روح ڈالی گئی تو انہیں فرمایا گیا کہ آپ فرشتوں کے پاس جا کر انہیں سلام کریں، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:

''وَعَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالٰی آدَمَ قَالَ: اِذْهَبْ

فَسَلِّمْ عَلٰی اُولٰئِکَ النَّفَرِ وَهُمْ نَفَرٌ مِّنَ الْمَلٰئِکَةِ جُلُوْسٌ فَاسْتَمِعْ مَایُحَیُّوْنَکَ؟ فَاِنَّهَا تَحِیَّتُکَ وَتَحِیَّةُ ذُرِّیَّتِکَ. فَذَهَبَ فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ، فَقَالُوْا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، قَالَ فَزَادُوْهُ وَرَحْمَةُ اللّٰه ......"

(مشکوٰۃ ص:۳۹۷)

ترجمہ:......"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور اس میں روح ڈالی تو فرمایا کہ: فرشتوں کی جماعت کے پاس جاؤ اور ان کو سلام کہو، اور دیکھو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں؟ وہ جو جواب دیں وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا جواب ہوگا۔ چنانچہ حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام فرشتوں کے پاس گئے اور ان سے کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" تو فرشتوں نے جواباً کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" پس انہوں نے "وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" کا اضافہ کیا، یعنی انہوں نے کہا: تم پر بھی سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔"

افسوس ہے کہ آج کل لوگ صحیح طور پر "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" بھی نہیں کہتے کچھ اور ہی کہہ دیتے ہیں، اور ہمارے پنجابی بھائی تو کہتے ہیں سَلَامُ عَلَیْکُمْ! اور بعضے کہتے ہیں اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ، حالانکہ یہ بددعائیہ کلمہ ہے، جو یہودی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف استعمال کرتے تھے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے:

"عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: اِنَّ الْیَهُوْدَ

أَتَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا: اَلسَّامُ عَلَيْکَ. قَالَ: وَعَلَيْکُمْ. فَقَالَتْ عَائِشَةَ: اَلسَّامُ عَلَيْکُمْ وَلَعَنَکُمُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْکُمْ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَهْلًا يَا عَائِشَةُ! عَلَيْکِ بِالرِّفْقِ...... قَالَتْ: أَوَلَمْ تَسْمَعْ مَا قَالُوْا؟ قَالَ: أَوَلَمْ تَسْمَعِيْ مَا قُلْتُ؟ رَدَدْتُّ عَلَيْهِمْ فَيُسْتَجَابُ لِيْ فِيْهِمْ وَلَا يُسْتَجَابُ لَهُمْ فِيَّ......الخ."

(مشکوٰۃ ص:۳۹۸)

ترجمہ:......"ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی یہودی آئے تھے اور آکر کہنے لگے: "اَلسَّامُ عَلَيْکَ!" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا "وَعَلَيْکُمْ" (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو برے لفظ سے بولا تھا تجھ پر موت ہو، نعوذ باللہ!) ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں نے سن لیا، میں نے کہا:"اَلسَّامُ عَلَيْکُمْ وَلَعَنَکُمُ اللّٰهُ." (بلکہ تم پر موت ہو اور اللہ کی لعنت ہو!)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عائشہ! نرمی اختیار کیجئے (ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مؤمن کو اچھا ہونا چاہئے، مؤمن بدگو نہیں ہوتا اور مؤمن بدگوئی نہیں کیا کرتا، کسی کو گالی نہیں نکالتا، فحش نہیں بکتا) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میں نے کہا یارسول اللہ! آپ نے سنا نہیں، انہوں نے کیا کہا؟ یعنی یہودیوں نے کیا کہا؟ فرمایا: اور تم نے نہیں سنا کہ میں

نے ان کے جواب میں کیا کہا تھا؟انہوں نے کہا تھا...... اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ!......تم پر موت ہو، میں نے کہا...... وَعَلَیْکُمْ...... اور تم پر بھی۔ پھر فرمایا کہ میری دعا ان کے حق میں قبول کی جائے گی، ان کی دعا میرے حق میں قبول نہیں کی جائے گی۔''

سلام کے جواب کا مسنون طریقہ:

حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو صرف السلام علیکم کہا تھا، مگر فرشتوں نے جواب میں السلام علیکم کے ساتھ ورحمۃ اللہ کا لفظ بڑھا دیا، اسی طرح قرآن کریم میں ہے:

''وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوْهَا.'' (النسآء:۸۶)

ترجمہ:......''جب تم کو سلام کہا جائے کسی لفظ سے تو تم اس سے بہتر جواب دو، یا کم سے کم وہی لوٹا دو۔''

کوئی کہے، السلام علیکم، تو جواب میں کہو ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔''

اور اگر کوئی کہے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' تو تم جواب میں کہو ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔'' جیسا کہ حدیث میں ہے:

''عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰه عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ، فَرَدَّ عَلَیْهِ، ثُمَّ جَلَسَ، فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: عَشْرٌ. ثُمَّ جَاءَ آخَرُ، فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ

وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ، فَقَالَ: عِشْرُوْنَ. ثُمَّ جَاءَ آخَرُ، فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ، فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ، فَقَالَ: ثَـلَاثُوْنَ." (ابوداؤد ج:۲ ص:۳۵۰)

ترجمہ:......''حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہا: ''السلام علیکم''، آپؐ نے فرمایا: (اس کے لئے) دس (نیکیاں ہیں)۔ پھر ایک دوسرا شخص آیا اس نے کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' آپؐ نے اس کا جواب دیا تو وہ بھی بیٹھ گیا، آپؐ نے فرمایا: (اس کے لئے) بیس (نیکیاں ہیں)۔ اتنے میں ایک تیسرا آدمی آیا تو اس نے کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' آپؐ نے اس کا جواب دیا تو وہ بھی بیٹھ گیا، پھر آپؐ نے فرمایا: (اس کے لئے) تیس (نیکیاں ہیں)۔''

اور کوئی یہاں تک پہنچ جائے یعنی پورے الفاظ کہہ دو تو فرمایا کہ اس نے تو پھر سرے پر تیر پھینک دیا، اس کے جواب میں صرف کہو ''وعلیکم!'' سارا مضمون جتنا اس نے بیان کیا وہ سارا وعلیکم اس میں آجاتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا قد:

اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا ہوئے تھے تو ساٹھ گز کے تھے، یعنی ساٹھ ہاتھ کے تھے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

”خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ طُوْلُهٗ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا...... قَالَ فَكُلُّ مَنْ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلٰى صُوْرَةِ اٰدَمَ وَطُوْلُهٗ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا فَلَمْ يَزِلِ الْخَلْقُ يَنْقُصُ بَعْدَهٗ حَتّٰى الْاٰنَ.“ (مشکوٰۃ ص:۳۹۷)

ترجمہ:......”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا، حضرت آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ ہاتھ لمبا تھا، (اور جیسے ہماری زبان میں کہتے ہیں کہ اب ہم تو گٹھ مُٹھے بن گئے، کہاں ساٹھ ہاتھ کے تھے، اور کہاں اب ہمارا قد ہے؟ اور وہ بھی دیکھ رہے ہیں آپ! کہ دن بدن کم ہی ہورہا ہے) ارشاد فرمایا کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ اہل جنت کو جنت میں بھیجیں گے تو سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کی شکل پر ہوں گے، اور آپ کے قد پر ہوں گے، یعنی ساٹھ ہاتھ کے قد ہوں گے...... فرمایا کہ پھر آہستہ آہستہ ان کی اولاد چھوٹی ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس نوبت کو پہنچ گئی ہے، لیکن جب ہم جنت میں داخل ہوں گے تو پورے قد کے ساتھ ہوں گے۔“

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا، جیسا کہ میں نے عرض کیا، مٹی سے پیدا کیا، تو ان کے قالب کا گارا پڑا رہا، پھر ان کا قالب بنایا، وہ پڑا رہا، سوکھتا رہا۔

حضرت حواؑ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئیں:

جب حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوگئے تو ایک دن سورہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پسلی سے حضرت حواؑ کو پیدا کر دیا، ان کو پتہ بھی نہیں چلا، سونے کے بعد جب جاگے تو ان کے قریب ہی ہماری اماں بیٹھی ہوئی تھیں، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تم کون ہو؟ فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے انس کے لئے پیدا کیا ہے، ان کی طرف ذرا ہاتھ بڑھایا، تو فرمانے لگیں نہیں، ابھی اجازت نہیں، مہر ادا کرو گے، اور نکاح ہوگا تب فرمایا کہ مہر کیا ہے؟ کہنے لگیں: محمد رسول اللہ ﷺ پر درود شریف پڑھ لو۔

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے جوڑے کو اللہ نے جنت میں ٹھہرنے کا حکم فرمایا، حضرت حواؑ کو شیطان نے ورغلایا، اللہ نے تو فرمایا تھا: ''وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ.'' (البقرہ:۳۵) اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ اپنا نقصان کر بیٹھو گے۔

آپ نے غور کیا! کہ میں نے ''فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ'' کا ترجمہ کیا کیا ہے؟ ترجمہ ادب سے کرنا چاہئے، منہ پھٹ نہیں کرنا چاہئے، (ورنہ تم اپنا نقصان کر بیٹھو گے) شیطان نے سمجھ لیا کہ ان کو بہکانے کا یہی راستہ ہے، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بہکاتا رہا۔ وہ نہیں مانتے تھے، پھر ان کی اہلیہ کو سمجھایا اور قسمیں کھانے لگا، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''وَقَاسَمَهُمَا اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ.'' (الاعراف:۲۱) (دونوں سے قسم کھا کر یہ کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں) چونکہ عورتیں رحم دل ہوتی ہیں، اعتبار کر جاتی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے طلاق مرد کے ہاتھ میں

رکھی ہے، عورت کے ہاتھ میں نہیں رکھی، کیونکہ یہ جذباتی ہوتی ہیں، کبھی غصے میں ہوتی ہیں، کبھی ناراض بھی ہوجاتی ہیں، اور ناراض ہوجاتی ہیں تو پھر کسی کی پرواہ نہیں کرتیں، تو ہماری اماں حوا رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہنے لگیں: یہ آدمی یہ بات کہہ رہا ہے، اس کی بات کیوں نہیں مانتے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس درخت کے کھانے سے منع فرما دیا ہے۔ ممانعت کا فلسفہ شیطان نے پہلے بتادیا تھا کہ تمہیں اس لئے منع کیا گیا تھا کہ تم یہاں نئے رہنے آئے تھے اور یہ غذا ذرا ثقیل ہے اور اب چونکہ جنت کی آب و ہوا کے ساتھ تمہیں مناسبت پیدا ہوگئی ہے، اس لئے اب اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں، وہ ممانعت وقتی تھی، جیسا کہ میں نے پہلے کہا: "وَقَاسَمَهُمَا اِنِّی لَکُمَا لَمِنَ النَّاصِحِیْنَ." (الاعراف:۲۱) (ان کے سامنے قسمیں کھائیں کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں)۔

اماں جی کہنے لگیں کہ آدمی کو کسی پر اعتبار بھی کرنا چاہئے، وہ قسمیں کھا رہا ہے کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، خیر خواہی کے ساتھ بات کرتا ہوں، لیکن آپ مان ہی نہیں رہے ایک دفعہ مان تو لیجئے۔

حضرت آدمؑ کا نادم ہونا:

چنانچہ دونوں بات مان گئے، اور اماں جی نے بہلا پھسلا کر کے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو آمادہ کرلیا، بس اس درخت کا کھانا تھا کہ جنت کا لباس جو پہنا ہوا تھا وہ اتر گیا، دونوں ننگے ہوگئے، اب جنت کے پتوں سے مدد لینے لگے کہ جنت کے درختوں کے پتے لپیٹ لیں تو کسی جنتی درخت نے پتے بھی نہ دیئے اور کہا کہ ان پر اللہ کا عتاب ہے، ایسا نہ ہو کہ ہم پر بھی یہ عتاب ہو جائے، برگد کا ایک

درخت تھا، اس سے کہا تو اس نے اجازت دے دی کہ میرے پتے لے لو، حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا کہ دوسرے درخت تو کہتے ہیں کہ ہم پر اللہ کا عتاب ہوگا، برگد کہنے لگا جب تم پر عتاب ہوا ہے تو ہم پر بھی عتاب ہو جائے گا تو کیا ہوا؟ بڑی بات ہے، تم اللہ کے خلیفہ ہو، جب تم پر عتاب ہوا تو ہم پر بھی سہی، درختوں کے پتے لپیٹ لیے اپنے ستر کو چھپانے کے لئے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ یہاں سے نکلو، اور پھر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواؑ دونوں زمین پر اتار دیئے گئے اور ایک سو سال تک حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام روتے رہے، اور شرم کی وجہ سے منہ اٹھا کر آسمان کی طرف بھی نہیں دیکھا، یہ آدمی ہیں، وہ شیطان تھا جس نے بہکایا، اور ایک غلطی ہوگئی تھی اور وہ بھی تھی محض اللہ کی محبت میں، اور جنت میں ہمیشہ قیام کے شوق میں، اس پر جب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر عتاب ہوا تو اتنے پشیمان ہوئے کہ سو سال تک سر اوپر نہیں اٹھایا، پھر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی، اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمانے والے ہیں، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہندوستان میں اترے تھے، اور یہاں سے پیدل سوحج کئے۔

بیت اللہ کی پہلی تعمیر:

پہلی بار بیت اللہ شریف حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تعمیر کیا، یہ میں نے بہت ہی مختصر سی بات کی ہے، اپنے جد امجد کے بارے میں، حق تعالیٰ شانہ ان کو اپنی رضا اور رحمت کی چادر سے ڈھانپ دے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ جائیں گے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ السلام کے پاس، اور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اور آپ میں اپنی روح ڈالی، اور مسجود

ملائکہ بنایا، فرشتوں سے سجدہ کروایا، آج آپ کی اولاد پر بڑا سخت وقت آیا ہوا ہے، آپ ان کے لئے دعا کیجئے، ان کا حساب و کتاب شروع ہوجائے، جنت اور دوزخ کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا، مگر اس پر حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمائیں گے کہ:

"اِنَّ رَبِّیْ غَضِبَ الْیَوْمَ، لَمْ یَغْضَبْ قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ." (ترمذی ج:۲ ص:٦٦) (میرا رب آج اتنا غضب ناک ہے کہ نہ کبھی اس سے پہلے اتنا غضب ناک ہوا اور نہ کبھی بعد میں ہوگا۔)

اور فرمائیں گے: نفسی نفسی، مجھے تو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، کسی اور کے پاس جاؤ، نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس جاؤ۔

وہ غلطی جو شیطان کے بہکانے سے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کروائی گئی تھی اور وہ بھی محض اللہ کی محبت کی وجہ سے ہوئی تھی کہ شیطان نے، اللہ تعالیٰ کی محبت کا واسطہ دے کر آمادہ کیا، مگر حضرت آدم علیہ السلام نے اس غلطی کو ایسا یاد رکھا کہ قیامت کو بھی نہیں بھولیں گے۔

میرے عزیز بھائیو! ہم سب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہیں، ایک تو ان کے لئے ایصال ثواب کرنا چاہئے، دوسرا ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے، غلطی ہوجانا بندے کا کام ہے، لیکن غلطی پر اصرار نہیں کرنا چاہئے، رجوع کرلینا چاہئے، یا اللہ! ہم سے غلطی ہوگئی ہے، ہمیں معاف فرمادے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین

اللہ سبحانہ وتعالیٰ اہل جنت کو جنت میں بھیجیں گے تو سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کی شکل پر ہوں گے اور آپؑ کے قد (ساٹھ ہاتھ) پر ہوں گے۔

انسان پر گزرنے والے ادوار

ایک دور تو تھا ماں کے پیٹ میں آنے سے پہلے کا، دوسرا دور تھا ماں کے پیٹ میں آنے کے بعد کا، تیسرا دور ہے پیدا ہونے کے بعد کا، یہاں ہم نے اس زمین پر قدم رکھا، کیسے قدم رکھا؟......

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا. مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

حق تعالیٰ شانہ نے ہمیں یہاں بہت مختصر وقت کے لئے بھیجا ہے، اور یہ زندگی عمل کے لئے ہے، ”جیسی کرنی ویسی بھرنی“ اچھا عمل کریں گے تو اچھا بدلہ ملے گا، اور خدانخواستہ برا عمل کریں گے...... تو پھر برا بدلہ ملے گا، ہم پر کئی مرحلے گزر چکے ہیں اور کئی مرحلے ابھی باقی ہیں، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

”ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا.“ (الدہر:۱)

(انسان پر ایک بہت بڑا وقت گزر چکا ہے، جب کہ وہ قابل ذکر چیز نہیں تھا) میرے پیدا ہونے سے پہلے، میرے والدین کی شادی ہونے سے پہلے کوئی مجھے نہیں جانتا تھا، کوئی تذکرہ نہیں تھا، کئی صدیاں گزریں، کوئی تذکرہ نہ تھا، کوئی ایسی بات نہ تھی، اور کوئی تذکرہ نہیں تھا،...... کوئی چیز بھی نہیں تھی، ایک دور ہمارے اوپر یہ گزرا ہے۔

دوسرا دور ہمارے اوپر گزرا جب کہ ہم اپنی والدہ کے شکم میں آئے، اللہ تعالیٰ نے عجیب نظام بنایا، قربان جاؤں اس کی قدرت پر، اور قربان جاؤں اس کی رحمت وعنایت پر، ہم نے ہسپتالوں میں دیکھا جو بچے قبل از وقت پیدا ہوجاتے ہیں، ان کو ایک خاص قسم کا شیشہ ہوتا ہے، اس میں رکھتے ہیں، اب ہر آدمی جانتا ہے کہ اس پر کتنا خرچ ہوتا ہے، لیکن ماں کے پیٹ میں وہ سارا نظام اللہ تبارک وتعالیٰ نے فٹ کردیا ہے، کسی کو پتہ بھی نہیں، کوئی خرچ نہیں، بہرحال جب ہم ماں کے پیٹ میں تھے تو اس وقت ہماری حالت ایسی تھی کہ نہ ہمارے ماں باپ کو پتہ تھا کہ یہ کیا ہے، نہ خود ہمیں پتہ تھا، ہمیں تو کیا پتہ ہوتا، چار مہینے تک مختلف شکلیں بدلتے بدلتے ہمارے اندر روح ڈالی گئی۔

چار ماہ گزرنے کے بعد حمل گرانا جائز نہیں:

یہاں ایک مسئلہ بتادوں، عام طور پر خواتین خطوط میں لکھتی ہیں، سوال کرتی ہیں، کہ بچہ ضائع کرنا ہے، اس میں کچھ ماں کی غلطی ہوتی ہے، یا کوئی اور عارضہ ہوتا ہے، شرعاً چار مہینے پورے ہونے سے پہلے پہلے بچے کو ضائع کردینا جائز ہے، کیونکہ ابھی تک اس کی صورت جمے ہوئے خون کی ہے، یا گوشت کی بوٹی کی ہے، اس کے

اندر روح نہیں ہے، لیکن جب بچے کے اندر روح ڈال دی گئی، تو اس کا ضائع کرنا جائز نہیں، اور اگر کوئی ضائع کرے گا تو قتل کا گناہ ہوگا، بہت سی بے وقوف عورتیں اس حالت میں بھی بچے کو ضائع کردیتی ہیں، یہ ایسا ہے جیسے کوئی آدمی کسی کو قتل کردے۔

چار ماہ گزرنے کے بعد رزق لکھ دیا جاتا ہے:

حدیث شریف میں آتا ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں اپنی شکلیں تبدیل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے چار مہینے پورے ہوجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتے ہیں، فرشتہ آکر اللہ تعالیٰ سے پوچھتا ہے کہ یا اللہ! اس کا رزق کتنا ہے؟ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے:

''عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ اِنَّ اَحَدَكُمْ یُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِیْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا، ثُمَّ یَكُوْنُ فِیْ ذَالِكَ عَلَقَةً مِثْلُ ذَالِكَ، ثُمَّ یَكُوْنُ فِیْ ذَالِكَ مُضْغَةً مِثْلُ ذَالِكَ، ثُمَّ یُرْسِلُ اللّٰهُ الْمَلَكَ فَیَنْفُخُ فِیْهِ الرُّوْحَ وَیُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ: بِكَتْبِ رِزْقِهٖ وَأَجَلِهٖ وَعَمَلِهٖ وَشَقِیٌّ اَوْ سَعِیْدٌ......الخ.''

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۳۲)

ترجمہ:......''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا، جو صادق و مصدوق ہیں کہ بے شک تم میں سے ہر ایک کو

اس کی ماں کے رحم میں چالیس دن تک نطفہ کی شکل میں، اور چالیس دن تک جمے ہوئے خون اور چالیس دن تک گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں رکھا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیجتے ہیں جو اس میں روح ڈالتا ہے، اور اسے ان چار چیزوں کے لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے: (۱)اس کا رزق کتنا ہوگا؟ (۲)اس کی زندگی کتنی ہوگی؟ (۳)اس کی موت کب اور کہاں واقع ہوگی؟ (۴)اور یہ کہ وہ نیک بخت ہوگا یا شقی و بدبخت......"

اب دیکھیں کہ ماں کے پیٹ میں چار مہینے گزرے ہوئے ہمیں کتنا عرصہ ہوا، ابھی اللہ ہی جانتا ہے کہ مزید یہاں کتنا رہنا ہے، تو پہلے دن ہی اللہ تعالیٰ نے رزق لکھ دیا کہ اس کا رزق کتنا ہے......؟ اور یہ کہ یہ بچہ کہاں کہاں پھرے گا......؟ وغیرہ وغیرہ، غرض موٹی موٹی باتیں ساری کی ساری لکھ دی جاتی ہیں، اور آخر میں فرشتہ اللہ تعالیٰ سے پوچھتا ہے۔ "شَقِیٌّ اَوْ سَعِیْدٌ؟" (پروردگار! یہ نیک بخت ہے یا بدبخت ہے؟)

اب ہمارا نام کن لوگوں میں لکھا ہوا ہے؟ اللہ ہی جانتا ہے، فرشتہ یہ سب پوچھتا ہے اور پوچھنے کے بعد پھر بچے میں روح ڈال دی جاتی ہے، پانچ مہینے اس حالت میں آدمی گزارتا ہے، پھر فرمایا:

"وَکُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ. وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ کِتَابًا یَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا. اِقْرَأْ کِتَابَکَ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا." (بنی اسرائیل:۱۴،۱۳)

ترجمہ:......"اور ہر انسان، ہم نے لٹکا دیا ہے اس کی

قسمت کا پروانہ اس کی گردن میں۔ اور قیامت کے دن ہم اس کے لئے ایک کتاب کھولیں گے (یہ اس کی نامہ اعمال کی کتاب ہوگی) جس کو وہ پھیلا ہوا پائے گا اور کہا جائے گا: اپنی کتاب پڑھ، تو ہی کافی ہے آج کے دن اپنا حساب لینے والا۔''

اب آپ کی، میری اور دنیا کے تمام انسانوں کی جو بھی قسمت ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے پروانے کی شکل میں گردن میں لٹکادیا، کتاب کیا ہے، ہمارے اپنے اعمال جو کچھ بھی ہم نے کیا ہے، چھوٹا عمل ہو یا بڑا، تمام کا تمام لکھا ہوا ہے، اللہ اکبر! یہ تو دوسرے جہان کی بات ہوگئی۔

انسانی زندگی کا پہلا دور:

میں نے عرض کیا کہ ایک دور ہم پر گزرا ہے، جس وقت مجھے اور آپ کو پتہ نہیں تھا کہ میں کون ہوں؟ شاید آپ حضرات کو پتہ ہوگا......؟ مجھے تو پتہ نہیں تھا، پورے پانچ مہینے ماں کے پیٹ میں رہے، روح ڈال لینے کے بعد، چار مہینے پہلے اور پانچ مہینے بعد، یہ کوئی ضروری نہیں، میں ایک عام حالت بتا رہا ہوں کہ بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں نو مہینے رہتا ہے، کبھی کم بھی ہوسکتا ہے، شریعت کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر بچہ چھ مہینے کا پیدا ہو تو اس کو اس کے باپ ہی کا سمجھا جائے گا، تم اس کی ماں پر تہمت نہیں لگا سکتے، الا یہ کہ باپ کہے یہ میرا نہیں ہے، وہ دوسری بات ہے، پھر وہ دوسرا مسئلہ چلتا ہے۔

آدمی کو زبان کا استعمال سوچ سمجھ کے کرنا چاہئے، ادھر یہاں یہ بچہ پیدا ہوا، ہم نے چہ میگوئیاں شروع کردیں، آپ سے قیامت کے دن حساب لیا جائے گا، تو

میں نے کہا نو مہینے عام حالت ہے، کہ بچے ماں کے پیٹ میں رہتے ہیں، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے پیدا ہوجاتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعد میں پیدا ہوتے ہیں۔

آپ نے حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی سنا ہوگا؟ آپ چار اماموں میں سے چوتھے امام ہیں، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ...... ہمارے امام، امام اعظم سے امام مالک رحمہ اللہ چھوٹے ہیں عمر میں، حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، اور ان کے شاگرد ہیں، امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ...... یہ چار امام ہیں، یہ سلسلہ ختم ہوگیا، دوسرے بزرگان دین اور مجتہد بھی تھے، لیکن ان کے مذہب مٹ گئے، البتہ کتابوں میں ان کا تذکرہ باقی ہے اور ان کے اقوال باقی ہیں، باقی باقاعدہ مذاہب ان چار ائمہ کے علاوہ کسی کے مدون نہیں ہوئے۔ تو میں عرض کررہا تھا کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی والدہ ماجدہ کے پیٹ میں دو سال رہے، اسی طرح بعض بچے ایسے بھی پیدا ہوئے کہ جو پیدا ہوئے تو ان کے دانت نکلے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کی رنگینیاں ہیں، لیکن یہ دور جو گزرا، میرے اوپر اور آپ کے اوپر اس کا مجھے بھی اور آپ کو بھی پتہ نہیں، بہرحال اس کے بعد ہم دنیا میں آگئے۔

انسانی زندگی کا دوسرا دور:

اب یہاں سے دوسرا دور شروع ہوگیا، ایک دور تو تھا ماں کے پیٹ میں آنے سے پہلے کا، دوسرا دور تھا ماں کے پیٹ میں آنے کے بعد کا، تیسرا دور ہے پیدا ہونے کے بعد کا، یہاں ہم نے اس زمین پر قدم رکھا، کیسے قدم رکھا؟...... تم جانتے

ہو! علامہ اقبال کا شعر ہے کہ:

یاد داری کہ وقت زیست تو

خندہ بودند و تو گریاں

ترجمہ: تجھے یاد ہے کہ جب تو پیدا ہوا تھا، تو سارے ہنس رہے تھے اور تو رو رہا تھا۔

بچہ کیوں روتا ہے؟ یہ کوئی اس سے پوچھے صاحبزادے میاں روتے کیوں ہو؟ تم نے کبھی ڈاکٹروں کی دکانوں پر جا کر دیکھا ہوگا، اس میں بچے کا نقشہ کیسا بنا ہوتا ہے، اس کا سر ٹانگوں میں دیا ہوا ہوتا ہے، اس حالت میں بے چارے نے ماں کے پیٹ کی ساری عمر گزاری، لیکن جب پیدا ہوا تو رو رہا ہے اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے بہت اچھی چیز چھین لی گئی، بس اتنا ہی جانتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کو کوئی ہنر نہیں آتا، آنکھیں کھولتا نہیں، اس وقت آنکھیں بھی بند ہوتی ہیں، تھوڑی تھوڑی کھولتا ہے دیر کے ساتھ، چند لمحوں کے بعد کھولتا ہے، بولنا نہیں آتا، اپنے ساتھ کپڑا کوئی نہیں لایا، بھلا کوئی بچہ کپڑے ساتھ لاتا ہے؟...... بلکہ الف ننگا ہوتا ہے کوئی چیز بھی تو نہیں اس کے پاس، ماں کے پیٹ سے کچھ کما کے لایا ہے؟ مالک نے ماں کے پیٹ میں پانچ مہینے روح ڈالنے کے بعد رکھا، کل نو مہینے رکھا، نہ باپ کو کچھ پتہ، نہ ماں کو کچھ پتہ، نہ ان صاحبزادے صاحب کو کچھ پتہ، لیکن حق تعالیٰ شانہ نے کرم فرمائی کی، جب پیدا ہوگیا، اب بولنا نہیں جانتا، ہلنا نہیں جانتا، ہل نہیں سکتا، اب اس کو صرف ایک رونے کا کام آتا ہے اور بس......

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بچہ کو صرف ایک ہنر آتا

ہے رونے کا اور کوئی ہنر نہیں آتا، بھوک لگے تو روئے گا، دھوپ لگے تو روئے گا، سردی لگے تو روئے گا، تکلیف ہو تو روئے گا، کاش! اے کاش! ہم اپنی حالت اللہ کے سامنے ایسی بنالیتے کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں، اللہ کے سامنے رونا ہے بس! جب بھی کوئی ضرورت پیش آئے، جب بھی کوئی حاجت پیش آئے تو اللہ کے سامنے رولیں تو ہماری ساری ضرورتیں پوری ہوجایا کریں۔

انسانی زندگی کا تیسرا دور:

اگر ہمیں عقل ہوتی تو ہم دو کام کرتے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے جو حکم فرمایا، اس کو پورا کرتے رہتے، اور دوسرے یہ کہ ہماری جو ضرورت ہوتی اللہ سے مانگتے، روکر مانگتے، بلبلا کر مانگتے، اب ہماری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا اور یہ کتنا لمبا ہے؟ آپ کو معلوم ہے، کس کس حالت سے ہم گزرے؟ وہ بھی مجھ سے زیادہ آپ حضرات کو معلوم ہے، آخر طاقت آتی گئی، سیانے ہوتے گئے، پہلے بچپن تھا، پھر اس کے بعد جوانی آئی، اور جوان ہونے کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دنیا میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں، اسی لئے کہا جاتا ہے: "اَلشَّبَابُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْجُنُوْنِ." یعنی ارشاد فرمایا گیا کہ: جوانی جنون کا ایک شعبہ ہے، بڑا ہوگیا، پھر خود اہل وعیال والا ہوگیا، اب چلتے چلتے یہاں تک پہنچ گیا کہ اب میری طرح کوئی ہاتھ پکڑ کر پھراتا ہے، خود سے چلنے پھرنے سے بھی معذور، دنیا میں آنے کے بعد کوئی تاریخ لکھتا ہے، کوئی کچھ لکھتا ہے، کوئی کچھ لکھتا ہے، میں نے کہا تاریخ میری اور آپ کی وہاں لکھی ہوئی ہے، اور صحیح تاریخ کراماً کاتبین لکھ رہے ہیں۔

انسانی زندگی کا چوتھا دور:

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن بندہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس حال میں پیش ہوگا کہ:

"عَنْ عَدِیِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَا مِنْکُمْ مِّنْ اَحَدٍ اِلَّا سَیُکَلِّمُہٗ رَبُّہٗ لَیْسَ بَیْنَہٗ وَ بَیْنَہٗ تُرْجَمَانٌ وَّلَا حِجَابٌ یُّحْجِبُہٗ......الخ."

(مشکوٰۃ ص:۴۸۵)

ترجمہ:......"تم میں سے ہر ایک قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اس حال میں پیش ہوگا کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان نہ کوئی ترجمان ہوگا، اور نہ کوئی ایسا حجاب ہوگا کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حائل ہو۔"

یعنی ہر شخص کو اپنے اعمال کی براہ راست جوابدہی کرنا ہوگی، اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی ترجمانی کرنے والا نہیں ہوگا۔ لہٰذا چپ چاپ اپنا سر نیچے کئے ہوئے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا منتظر کھڑا ہوگا کہ میرے بارے میں بارگاہ الٰہی سے کیا فیصلہ ہوتا ہے؟ کیونکہ فرشتوں نے ساری مسلیں پڑھ کر سنادیں، اب فیصلہ لکھنا ہے، اور یہ کھڑا کانپ رہا ہوگا کہ اب میرے ساتھ کیا ہوگا؟ تب اللہ تعالیٰ اس کو قریب بلائیں گے اور ارشاد فرمائیں گے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اللّٰہَ یُدْنِی الْمُؤْمِنَ

فَيَضَعُ عَلَيْهِ كَنَفَهٗ وَيَسْتُرُهٗ فَيَقُوْلُ اَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟ اَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟ فَيَقُوْلُ: نَعَمْ! اِيْ رَبِّ. حَتّٰى قَرَّرَهٗ بِذُنُوْبِهٖ وَرَاٰى فِيْ نَفْسِهٖ اَنَّهٗ قَدْ هَلَكَ. قَالَ سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا وَاَنَا اَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ. فَيُعْطٰى كِتَابُ حَسَنَاتِهٖ.........الخ." (مشکوٰۃ ص:۴۸۵)

ترجمہ:...... "حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک مؤمن کو اپنے قریب بلائیں گے اور اس پر پردہ ڈال کر اسے چھپاکر پوچھیں گے کہ تم نے فلاں فلاں گناہ کئے تھے، تمہیں یاد ہیں؟ بندہ مؤمن کہے گا ہاں! مجھے یاد ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے بار بار اس کے گناہ یاد دلائیں گے، تو وہ دل میں کہے گا کہ بس اب تو ہلاک ہوگیا، مگر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے تم پر دنیا میں ستاری کی تھی (آج بھی میں تمہیں رسوا نہیں کروں گا، جاؤ) میں آج تمہیں معاف کرتا ہوں، پس اسے اس کی نیکیوں کا اعمال نامہ دیا جائے گا......"

یعنی اللہ تعالیٰ اسے فرماویں گے کہ کیا میرے فرشتوں نے تو تم پر ظلم تو نہیں کیا؟ کہیں کراماً کاتبین نے غلط لکھ دیا ہو؟ وہ کہے گا: یا اللہ! انہوں نے بالکل صحیح لکھا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرماویں گے کہ انہوں نے تجھ پر کوئی ظلم تو نہیں کیا؟ وہ جواب میں کہے گا: یا اللہ! انہوں نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ پھر فرماویں گے تیرے پاس گناہ کا کوئی عذر ہو تو اس کو بیان کرو۔ بندہ کہے گا یا اللہ میرے پاس کوئی عذر نہیں، اب کیا کیا جائے،

حدیث کے الفاظ ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں تیری پردہ داری کی اور آج بھی تیری پردہ پوشی کرتے ہوئے تیری بخشش کرتا ہوں۔

یہ وہ بندہ ہے جو اپنے پروردگار کے سامنے عجز و نیاز کو بجا لاتا ہے، کوتاہیاں ہوتی ہیں، معافی مانگتا ہے، اور جانتا ہے کہ میں سر سے پاؤں تک گندگی میں لتھڑا ہوا ہوں، اب کروں تو کیا کروں، پیش کروں تو کیا پیش کروں؟

بیماری اور تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے:

ایک بزرگ تھے، وہ جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوئے تو اللہ تعالیٰ ان سے فرماتے ہیں کہ ہمارے لئے کیا لائے، انہوں نے سوچا، سوچ کر کہنے لگے کہ اور چیزیں تو میں کیا پیش کروں، اتنا ہے کہ میں ایک اللہ کو مانتا ہوں، توحید کا قائل ہوں، یہ واقعہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے، بندہ کہے گا کہ آپ کی بارگاہ میں توحید پیش کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ "اَمَا تَذْكُرُ لَيْلَةَ اللَّبَنِ؟"

وہ دودھ والی رات یاد نہیں رہی؟ یعنی جب تم نے یہ کہا تھا کہ رات کو میں نے دودھ پیا تھا، اور پیٹ میں درد ہوگیا، یعنی جب صبح لوگوں نے پوچھا کیا بات ہوگئی، کہا کہ میں نے رات دودھ پیا تھا اس لئے پیٹ میں درد ہوگیا، فرمایا دودھ پینے سے درد ہوا کرتا ہے؟ اور اسی کو توحید کہتے ہیں؟ اب ہماری حالت آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیسی ہے؟

یہ زندگی ہم نے پوری کی اور جیسے تیسے باقی بھی پوری ہوجائے گی، ہمارے باپ دادا نے پوری کرلی ہم بھی پوری کرلیں گے، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر اب تک لوگ پوری کرتے ہوئے جارہے ہیں، اور زندگی کی ایک عجیب

خاصیت ہے۔ باری آنے والی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مجھے پہاڑ چڑھنا ہے، آگے بہت مشکل ہے، اور جو پیچھے گزر گئی ہے، ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کل کی بات ہے یہ، کوئی بات ہی نہیں، کبھی روتے ہیں، کبھی چلاتے ہیں، کبھی شکایتیں کرتے ہیں، کبھی کچھ کرتے ہیں، کبھی کچھ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر نہیں کرتے، جب بھی کسی سے حالت پوچھنے بیٹھ جاؤ، جیسا بھی کھاتا پیتا آدمی ہو، اپنا کچا چٹھا بیان کرنے لگ جاتا ہے، شکایتیں شروع کردیتا ہے۔

امت مسلمہ کی عمر ساٹھ ستّر سال کے درمیان:

میرے بھائیو! ہم نے اللہ تعالیٰ کو کیا دیا؟...... میں اکثر یہ حدیث شریف سناتا رہتا ہوں، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ پہلی امتوں کی عمریں بڑی لمبی ہوتی تھیں، ہماری تو بہت چھوٹی عمریں ہیں۔ پوچھا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ: ”أَعْمَرُ أُمَّتِیْ مِنْ سِتِّیْنَ اِلٰی سَبْعِیْنَ.“ (ترمذی ج:۲ ص:۵۹) میری امت کی عمر ساٹھ ستّر سال کے درمیان ہے بس!

ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک صاحب نے پانچ سو سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، نافرمانی کبھی نہیں کی، ان کا حساب پیش ہوا، اللہ تعالیٰ فرمانے لگے، جاؤ میری رحمت کے ساتھ جنت میں داخل ہوجاؤ، وہ کہنے لگا رحمت کے ساتھ؟ میں نے تو پانچ سو سال عمل کیا ہے، اس کا کوئی شمار ہی نہیں، فرشتوں سے کہا جائے گا اسے ذرا دوسری طرف سیر کرالاؤ فرشتے اسے لے جائیں گے جہنم کی طرف، راستے میں اسے پیاس لگے گی، شدید پیاس! اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجیں گے پانی دے کر وہ راستے میں ملے گا، یہ کہے گا کہ اے اللہ کے بندے تو مجھے پانی پلاسکتا ہے، وہ کہے گا کہ ضرور

پلاؤں گا، کہے گا یار پلادو، وہ کہے گا کہ پانی مول بکتا ہے، قیمت ادا کرنی پڑے گی، کہنے لگے کتنی قیمت ہے؟ وہ کہے گا پانچ سو سال کی عبادت ایک گلاس کی قیمت ہے، یہ بیچارہ پیاس کی وجہ سے مر رہا ہوگا، برا حال ہوگا، کہنے لگا ایک گلاس دے دو، دے دیا، پی لیا، ٹھنڈ آ گئی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا واپس لے آؤ، واپس لے آئے حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرمائیں گے عبادت دے دی؟ پانچ سو سال کی عبادت، ایک گلاس کے بدلے میں، اچھا یہ بتاؤ کہ پانچ سو سال کی زندگی میں میں نے کتنے گلاس پلائے تھے؟ یہ چپ، فرمایا اچھا میری رحمت کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔

اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیں کہ ہم نے اللہ کی نعمتوں کا کیا شکر ادا کیا، شکایتیں ہی کیں، کہا یہ تکلیف ہے، مجھے یہ تکلیف ہے، مجھے یہ تکلیف ہے، جو گزر گئی ہے، اس کا پتہ بھی نہیں تھا تجھے، یہ بھی گزر جائے گی، اور موت آ جائے گی۔

اب مسئلہ چلتا ہے کہ قبر کی زندگی کس کو کہتے ہیں، بہت سے بے وقوف تو اس کے منکر ہی ہو گئے، کہ یہ قبر میں کیا ہوتا ہے، مرا ہوا ہوتا ہے، ان کو نظر نہیں آ رہا، یہ سامنے کی چیز کو دیکھتے ہیں، غائب کی چیز کو نہیں دیکھتے، اور اسی لئے بہت سارے لوگ تو ایسے ہیں جنہوں نے حیات النبی کا انکار کر دیا، نعوذ باللہ! نبیؐ نہیں سنتے، ان کی قبر پہ جا کر ان کو سلام کرو، وہ نہیں سنتے۔ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ)

حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ سَمِعْتُهٗ، وَمَنْ صَلّٰی عَلَیَّ نَائِیاً اُبْلِغْتُهٗ.“ (مشکوٰۃ ص:۸۷)

ترجمہ:......”جو میرے روضہ اقدس پر آ کر مجھے سلام کرے گا، میں اس کو کانوں سے سنتا ہوں، اور جواب بھی دیتا

ہوں۔ اور جو دور سے مجھے سلام کرتا ہے، مجھے پہنچایا جاتا ہے۔"

قبر کی زندگی:

بہر کیف مرنے کے بعد قبر میں اسے دفن کردیا جاتا ہے، لوگوں کے علم میں کچھ نہیں، حالانکہ اس زندگی پر، پوری زندگی مرتب ہونے والی ہے، حضور اقدس ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْحُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ." (ترمذی ج:۲ ص:۷۳)

ترجمہ:...... "قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے، یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔"

کبھی کبھی اللہ تعالیٰ دکھا بھی دیتے ہیں، جو کچھ قبر میں انسان پہ گزرتی ہے اس کو کبھی کبھی دکھا بھی دیتے ہیں، ویسے عام طور پر دکھاتے نہیں، چنانچہ قبر کے عذاب کو نہ دکھانے کی حکمت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"فَلَوْ لَا اَنْ تَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ اللّٰهَ اَنْ يُّسْمِعَكُمْ مِّنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِیْ اَسْمَعُ مِنْهُ." (مشکوٰۃ ص:۲۵)

ترجمہ:...... "آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ تم اپنے مردے قبروں میں دفن کرنا چھوڑ دوگے، تو میں اللہ تعالیٰ سے کہتا کہ وہ تمہیں سنادے قبر کے عذاب سے جو کچھ میں سن رہا ہوں، (لیکن مجھے اندیشہ یہ ہے کہ اگر تمہیں یہ باتیں معلوم ہوگئیں تو پھر تم مردوں کو دفن کرنا چھوڑ

دو گے۔'' (یہ تو اللہ پاک کی عنایت و رحمت ہے ہم پر مگر ہم نے اس کا انکار کردیا، انکار کرنا شروع کردیا، زندگی سے انکار کرنا شروع کردیا۔)

مشکوٰۃ شریف میں ہے:

''اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا وُضِعَ فِیْ قَبْرِہٖ..........الخ.''

(مشکوٰۃ ص:۲۴)

جب میت کو دفن کردیا جاتا ہے اور اس کی اینٹیں برابر کردی جاتی ہیں، تو دو فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور تین سوال کرتے ہیں۔

تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور حضور اکرم ﷺ کا نقشہ پیش کرکے پوچھا جاتا ہے کہ تم ان کے بارے میں کیا کہتے تھے؟ نیک آدمی تو صحیح صحیح جواب دیتا ہے، بخاری شریف کی حدیث ہے کہ: حضور ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت:

''وَیُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا.'' (مشکوٰۃ ص:۲۴)

کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ثابت قدم رکھیں گے مرنے کے وقت۔

قرآن مجید میں ارشاد فرمایا کہ جب نیک آدمی کا انتقال ہوتا ہے: ''وَتَتَلَقّٰھُمُ الْمَلٰئِکَۃُ.'' (الانبیاء:۱۰۳) تو فرشتے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ دوسری آیت میں ہے کہ فرشتے کہتے ہیں کہ: ''وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ.''(حم السجدہ:۳۰) تمہیں اس جنت کی بشارت ہو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

اگر دوسری ٹائپ کا آدمی ہو، اور دوسری قسم کا آدمی ہو، تو ہر بات پر کہتا ہے: ''هَا هَا لَا اَدْرِیْ، هَا هَا لَا اَدْرِیْ، هَا هَا لَا اَدْرِیْ.'' مجھے پتہ نہیں، بھول جاتا ہے، آگے فرمایا کہ اس سے کہا جاتا ہے:''لَا دَرَیْتَ وَ لَا تَلَیْتَ.'' (مشکوٰۃ ص: ۲۵) تو نے نہ خود جانا، نہ کسی جاننے والے کے پیچھے چلا۔ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتا ہے...... تو نے نہیں جانا، یہاں کے علوم تو بڑے پڑھے، اسکول بھی بنائے، یونیورسٹیاں بنائیں، تعلیم گاہیں بنائیں، دانش گاہیں بنائیں، لیکن مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ نہیں معلوم۔

نوجوان کا قصہ:

یہ تمہارے لاہور کا ہی واقعہ ہے، ایک صاحب نے اپنا بچہ پتہ نہیں کتنی تکلیفوں کے ساتھ، کتنا خرچ کرکے بھیجا، ولایت، ولایت پاس کرنے کے لئے، اعلیٰ علوم کی تعلیم حاصل کرکے آیا، آتے ہی بیمار ہوگیا، اور بیمار ہوا تو اس کا چالان ہوگیا، انگریزی میں کچھ کہہ رہا تھا، باپ نے انگریزی جاننے والوں سے پوچھا کہ یہ کیا کہتا ہے، انہوں نے کہا یہ کہتا ہے اپنے باپ سے کہ اس وقت کے لیے مجھے تو نے کیا پڑھایا۔

میرے بھائیو! میں تم سے بھی کہتا ہوں کہ اس وقت کے لئے کیا پڑھایا ہے تم نے اپنی اولاد کو؟ اور تم نے خود کیا سیکھا ہے؟ ولایت بھی پاس کرلی، ایل ایل بی بھی کرلیا، ڈاکٹری بھی کرلی، اور نامعلوم اب کتنی کتنی قسم کی ڈگریاں آگئی ہیں، وہ تم نے سب حاصل کرلیں، لیکن جب عزرائیل آئے گا اور روح قبض کرے گا، اس وقت کے لئے تم نے کیا کیا؟ ان کو کیا سکھایا؟

برزخی زندگی:

اب یہاں سے برزخ کی زندگی شروع ہوتی ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا: "اَلْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ" ہے، قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے، نیک آدمی ہو تو حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کے لئے جنت کا کفن لاؤ، یہ تم جو پہناتے ہو نا کفن، اور ہمارے یہاں تو ایک ہی چل رہا ہے، اور وہ یہ کہ ہم تو لٹھے کا پہناتے ہیں، کوئی امیر ہو یا غریب، ایک لمبا کرتا اور دو چادریں۔

اچھا ایک مسئلہ بتا دوں، وہ یہ کہ پتہ نہیں لوگوں کو یہ مسئلہ کہاں سے معلوم ہوا، پیچھے کی جانب تھوڑا سا رکھتے ہیں، اور اوپر کی جانب جو کرتا ہوتا ہے وہ لمبا رکھتے ہیں، حالانکہ کرتہ دونوں جانب سے برابر ہونا چاہئے۔ بہرحال وہ کرتا ان سلا یعنی سلائی کے بغیر ہوتا ہے، یا تو بہت زیب و زینت کے ساتھ سیتے تھے، کڑھائی کرتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ جنتی کے لئے حکم ہوگا: "فَافْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا مِنَ الْجَنَّةِ. قَالَ فَيَأْتِيْهِ مِنْ رَّوْحِهَا وَطِيْبِهَا." (مشکوٰۃ ص:۲۵) ترجمہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے کے لئے جنت سے کفن لاؤ، (خوشبودار، معطر، جنت کا کفن اس کو پہنایا جاتا ہے) اور جنت کا بستر بچھاؤ اور جنت کا لباس پہناؤ اور اس کے لئے جنت کی طرف سے ایک دروازہ کھول دو، اس سے ہوائیں آتی ہیں، اور اس کی خوشبوئیں آتی ہیں۔ سبحان اللہ۔

اور اگر دوسری قسم کا ادمی ہو، جس نے اس زندگی کے لئے کچھ نہیں کیا تھا، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، اللہ سے پناہ مانگو تو پھر:

"فَتَلْتَئِمُ عَلَيْهِ فَتَخْتَلِفُ اَضْلَاعُهٗ فَلَا يَزَالُ فِيْهَا مُعَذَّبًا حَتّٰى يَبْعَثَهُ اللّٰهُ

مِنْ مَّضْجَعِهٖ......الخ." (مشکوٰۃ ص:۲۵) ترجمہ: حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ قبر اس کو اس طرح بھینچتی ہے کہ اس کی پسلیاں ایک طرف سے دوسری طرف نکل جاتی ہیں (نعوذ باللہ من ذالک) یا اللہ اپنی پناہ میں رکھ، اور اس حالت میں یہ پورے وقت یعنی آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک آرہے ہیں یہاں تک کہ اللہ پاک ان کو قبروں سے اٹھادے، تم سوچتے ہو کہ گل سڑ کے مٹی ہوگئے ہوں گے، نہیں! عذاب یا ثواب باقاعدہ ہو رہا ہے، میں نے کہا تھا کہ تمہیں واقعہ سنادوں، واقعات اس قسم کے ہیں، اتنے ہیں، قبروں کے حالات اتنے ہیں اور اتنے مجھے یاد ہیں کہ اس کے لئے ایک مجلس کافی نہیں ہے۔

مسلمان کا قاتل جہنمی:

رسول اللہ ﷺ جہاد میں تھے، اور آئے دن لوگ نئے نئے مسلمان ہوتے تھے، اور بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ کبھی کسی کے دل میں وہ پرانی باتیں پیدا ہوجاتی ہیں، ایک صاحب نے کسی مسلمان کو قتل کردیا، جہاد کے دوران، اس کی پرانی دشمنی تھی جاہلیت کی، وہ بھی مسلمان ، یہ بھی مسلمان، قتل تو کردیا لیکن آکر حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کرنے لگا یا رسول اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، میرے لئے بخشش مانگیں، بخشش کی دعا کریں، غلطیاں تو اور بہت سی ہوجاتی ہیں، لیکن کسی مسلمان کو قتل کرنا بڑا گناہ ہے، بڑا گناہ ہے بڑا پاپ ہے، چنانچہ اس نے کہا:

"اِنَّهٗ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنْ لَقِيْتُ كَافِرًا، فَاقْتَتَلْنَا، فَضَرَبَ يَدَىَّ بِالسَّيْفِ فَقَطَعَهَا ثُمَّ لَاذَا بِشَجَرَةٍ وَقَالَ: اَسْلَمْتُ لِلّٰهِ. اَقْتُلُهٗ بَعْدَ اَنْ قَالَهَا؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَقْتُلْهُ. قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَاِنَّهٗ طَرَحَ اِحْدىٰ يَدَیَّ ثُمَّ قَالَ ذَالِکَ بَعْدَ مَا قَطَعَهَا. أَ اَقْتُلُهٗ؟ قَالَ لَا تَقْتُلْهُ فَاِنْ قَتَلْتَهٗ فَاِنَّهٗ بِمَنْزِلَتِکَ قَبْلَ اَنْ تَقْتُلَهٗ وَاَنْتَ بِمَنْزِلَتِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّقُوْلَ كَلِمَتَهُ الَّتِیْ قَالَ.‘‘

(بخاری ج:۲ ص:۱۰۱۴)

یعنی ایک صحابی (حضرت مقداد بن عمرو الکندی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پوچھتے ہیں یا رسول اللہ! ایک کافر کے ساتھ میرا مقابلہ ہورہا ہے، اس نے میرا ایک ہاتھ کاٹ دیا ہے، میں نے جب تلوار اس پر اٹھائی، وہ کہنے لگا ’’لا الہ الا اللہ‘‘ یعنی ’’لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ‘‘ پڑھ کر مسلمان ہوگیا، میری تلوار اٹھی ہوئی ہے، اور اس نے مجھے نقصان پہنچایا، فرمایا اس کو تم نہیں قتل کرسکتے، ’’لا الہ الا اللہ‘‘ کے بعد تم اس کو قتل نہیں کرسکتے، اگلی بات میں سنانا چاہتا ہوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، وہ یہ کہ اگر تو نے اس کو قتل کیا، تو تو اس کی جگہ ہوگا اور وہ تیری جگہ ہوگا، مسلمان ہونے سے پہلے اس کی جو جگہ تھی وہاں تجھے پہنچادیں گے (جہنم) مسلمان ہونے کے بعد جو تیری جگہ تھی، (جنت) اس کو وہاں پہنچادیں گے۔

حضرت اسامہ ابن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے، حضرت زید ابن حارثہؓ کے بیٹے تھے، نوجوان تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک فوجی دستے میں بھیجا، تو ان کو بھی مغالطہ ہوگیا، ایک آدمی ’’لا الہ الا اللہ‘‘ کہہ رہا تھا،

انہوں نے اس کو قتل کر دیا، اور یہ خیال کیا کہ یہ ڈر کے مارے کہتا ہے، جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کارگزاری سنائی، کہ یہ واقعہ بھی درمیان میں آیا، آپ ﷺ (میرے ماں باپ قربان ہوں آپ پر) نے فرمایا:

"وَ قَد قَتَلْتَهُ وَقَدْ قَالَ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ." (مسلم ج:۱ ص:۶۸) تو نے اس کو قتل کر دیا، حالانکہ وہ "لا الہ الا اللہ" کہہ رہا تھا......؟ یہ کہہ کر آپ کی آنکھیں سرخ ہوگئیں، حضرت اسامہ نے کہا یا رسول اللہ اس نے بچنے کے لئے یہ کلمہ پڑھا تھا، تو آپ نے فرمایا:

"فَهَلْ اَشُقَقْتَ عَنْ قَلْبِهٖ." (مسلم ج:۱ ص:۶۸) ترجمہ: کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟

مسلمان کے قاتل کو قبر نے باہر پھینک دیا:

بہرحال میں اس کا ذکر کر رہا تھا کہ ایک آدمی دوسرے کو قتل کر کے آ گیا، پھر کہنے لگا یا رسول اللہ! میرے لیے معافی مانگیے، مجھ سے یہ غلطی ہوئی، چونکہ وہ پرانی جاہلیت میں قتل کرتے تھے، اور اب تو وہ مسلمان تھا، اور یہ بھی مسلمان تھا، لیکن پرانی جاہلیت کا بدلہ لیا، اب آنحضرت ﷺ اس کو کیسے معاف کرتے یا اس کے لئے کیسے استغفار کرتے؟ تم نے ابھی سنا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا پوتا، یعنی زید ابن حارثہ، آپ کا بیٹا تھا، منہ بولا بیٹا، اور اسامہ گویا آنحضرت ﷺ کا پوتا تھا، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ حضرت اسامہ سے ایسے پیار کرتے تھے جیسے کہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما سے کرتے تھے، لیکن آپ نے اس کو معاف نہیں کیا، حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لَا غَفَرَ اللّٰهُ لَکَ."

یعنی اللہ تیری بخشش نہ کرے...... توبہ، استغفراللہ! تو نے ایک مسلمان کو قتل کردیا...... چنانچہ البدایہ والنہایہ میں ہے:

"لَا غَفَرَ اللّٰهُ لَکَ. فَقَامَ وَهُوَ يَتَلَقّٰى دُمُوْعَهٗ بِبُرْدَيْهِ فَمَا مَضَتْ لَهٗ سَابِعَةٌ حَتّٰى مَاتَ فَدَفَنُوْهُ فَلَفَظَتْهُ الْاَرْضُ، فَجَاؤُا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرُوْا ذٰلِکَ لَهٗ فَقَالَ اِنَّ الْاَرْضَ لَتَقْبَلُ مَنْ هُوَ شَرٌّ مِنْ صَاحِبِكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَرَادَ اَنْ يَعِظَكُمْ مِنْ حُرْمَتِكُمْ...... الخ."

(حیاۃ الصحابہ ج:۲ ص:۳۷۳، البدایہ ج:۴ ص:۲۲۴)

خلاصہ یہ کہ صحابیؓ کہتے ہیں کہ ایک چادر اس کے پاس تھی مجھے اس کا نقشہ اب بھی نظر آرہا ہے، دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، چادر سے صاف کررہا تھا، بڑی منتیں کرتا رہا، توبہ کرتا رہا، اللہ کے سامنے لیکن آنحضرت ﷺ نے جواب نہیں دیا، کافی دیر بیٹھا رہا آپ کے پاس، بالآخر چلا گیا، اور سات دن کے بعد اس کا انتقال ہوگیا، یعنی اس کو اتنا غم اور اتنا صدمہ ہوا کہ سات دن کے بعد ختم ہوگیا، لوگوں نے قبر کھودی، نہلایا دھلایا، کفن وغیرہ کا کیا، اور قبر میں دفن کرکے آگئے، اگلے دن جاکے دیکھا باہر پڑا ہے، یعنی قبر سے باہر پڑا ہے، حضور اقدس ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا گیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا زمین تو اس سے زیادہ گنہگاروں کو بھی پناہ دے دیتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ تم کو اپنی قدرت کی نشانی دکھانا چاہتا ہے۔

قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل:

میرے بھائیو! قبر میں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے، اس سے تو بالکل ہم

غافل ہوگئے، اور ہم اس کو بھول گئے۔ امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کسی قبر پہ جاتے تھے، تو اتنا روتے تھے، اتنا روتے تھے، اتنا روتے تھے کہ آپ کی داڑھی مبارک تر ہوجاتی تھی، عرض کیا گیا کہ:

"تَذْكُرُ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ وَلَا تَبْكِ." (ترمذی ج:۲ ص:۵۵)

آپ جنت اور دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں آپ نہیں روتے، مگر آپ اس پر اتنا کیوں روتے ہیں؟ فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے، اگر یہاں کامیاب ہوگیا تو انشاء اللہ آگے بھی کامیاب ہوجاؤ گے، اگر یہاں کامیاب نہ ہوا، اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے، تو پھر آگے بھی فیل، قبر والوں پر کیا کیا گزرتی ہے..... ہم تو جانتے نہیں ہیں، ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ چہلم کرلو، قل شریف کرلو، اور ایک اور رواج نکال لیا ہے کہ برسی کرلو، لوگ مجھے خط لکھ لکھ کر برسی کا پوچھتے ہیں، میں نے کہا مجھے تو پتہ نہیں ہے اس کا، بس وقت ہوگیا ہے اس پر ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی
نصیحت

رسول اللہ ﷺ بھی امت کے لئے ایسی نصیحتیں فرماتے تھے کہ امت اپنے دل کی گہرائی کے ساتھ ان کو سنے اور سن کر ان کو محفوظ کرلے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا. مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

حضرات گرامی!

مولانا ہمارے شاہ صاحب نے، جناب سید سلمان گیلانی صاحب نے نظم پڑھی، اور مولانا امجد خان نے ہمارے خون کو گرمایا، ہمارا خون تو ٹھنڈا تھا، ہمارے خون کو بھی گرمادیا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، میں اپنی بات تو بعد میں کروں گا، ایک بات کہہ دیتا ہوں، اور وہ اپنی بات نہیں ہوگی، بلکہ حضور ﷺ کی بات ہوگی، لیکن ایک بات کہتا ہوں، ہمارا جو کچھ بھی ہے، رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے۔

ناموس رسول کے لئے جان کی قربانی سستا سودا ہے:

اگر ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ بھی نہیں رہے..... تو کچھ نہیں رہا، اس

لئے اگر گردن بھی کٹانی پڑے تو حاضر ہے، سودا سستا ہے۔

اور اگر گورنمنٹ بزدلی اختیار کرتی ہے، ناموس رسالت قانون پاس ہوگیا تھا، اب بزدلی اختیار کرتی ہے، تو پھر آزما کرکے دیکھ لے، زیادہ اس سلسلے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں، قانون بن چکا ہے اور قانون یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے گستاخ کی سزا موت ہے، یہ اٹل ہے، اس کو نہیں بدل سکتے، تم اینچ پیچ کرکے باتیں کر رہے ہو، لیکن مسلمان تو...... مسلمان بیچارہ چاہے جتنا بھی کمزور ایمان والا ہو، لیکن رسول اللہ ﷺ کی ناموس کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہے، (بالآخر حضرت شہیدؒ نے عملاً اپنی جان عزیز کا نذرانہ پیش کرکے بتلادیا کہ ناموس رسالت کے تحفظ کے لئے یہ سودا سستا ہے،) بس اب یہ بات تو ختم ہوگئی، اب میں حضور ﷺ کی بات کرتا ہوں۔

حضور ﷺ کی حضرت معاذؓ کو وصیتیں:

حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ، آنحضرت ﷺ کے بہت ہی پیارے اور لاڈلے صحابی تھے، مسند احمد میں ہے:

"عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ لَمَّا بَعَثَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْيَمَنِ خَرَجَ مَعَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْصِيهِ وَمُعَاذٌ رَاكِبٌ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِي تَحْتَ رَاحِلَتِهِ، فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ يَا مُعَاذ! اِنَّكَ عَسَى اَنْ لَا تَلْقَانِيْ بَعْدَ عَامِيْ هٰذَا اَوْ لَعَلَّكَ اَنْ تَمُرَّ بِمَسْجِدِيْ هٰذَا اَوْ

قَبْرِیْ هٰذَا......الخ۔" (مسند احمد ج:۸ حدیث:۲۲۱۱۳)

ترجمہ:......"حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن کی طرف (گورنر بناکر) بھیجا، تو آپؐ مجھے رخصت کرنے کے لئے مدینہ منورہ سے باہر تک تشریف لائے، اور آپؐ مجھے وصیتیں فرمارہے تھے، میں سواری پر سوار تھا، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدل چل رہے تھے، جب آپؐ وصیتوں سے فارغ ہوئے، تو فرمایا: اے معاذ! بہت ممکن ہے کہ آج کے بعد تم مجھ سے نہ مل سکو، یا یہ فرمایا کہ: اے معاذ! آئندہ تم میری اس مسجد میں تو آؤ گے (مگر مجھے نہ پاؤ گے) یا یوں فرمایا: آئندہ تم میری قبر پر آؤ گے...... اور پھر آگے وصیتیں فرمائیں......"

یعنی رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری دور میں ان کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا، یہ اپنی سواری پر سوار تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری ساتھ تھی، انہوں نے کہا یارسول اللہ! یا مجھے اجازت دیجئے کہ میں اتر جاؤں، یا آپ سوار ہوجایئے، فرمایا نہ تم اترو گے، نہ میں سوار ہوں گا، تمہارا کیا حرج ہے، اگر اللہ کے راستے کا غبار میرے قدموں کو لگ جائے، تمہارا کیا نقصان ہے اور ایک بات آخری ان سے کہی تھی اور بہت سی باتیں کہیں راستے میں، ایک بات یہ کہی تھی کہ معاذ! ہوسکتا ہے کہ تم آج کے بعد مجھے نہیں دیکھو گے، تم میری قبر پر گزرو گے، مجھے نہیں دیکھو گے، (چنانچہ یہی ہوا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چند نصیحتیں فرمائی، اور ان میں سے ایک نصیحت یہ تھی کہ اپنی زبان کی حفاظت کیا

کرو، حضرت معاذؓ کہنے لگے:

”وَهَلْ نُؤَاخَذُ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهٖ يَارَسُولَ اللّٰهِ؟ ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا مُعَاذُ! وَهَلْ يُكِبُّ النَّاسَ عَلٰى وُجُوهِهِم اَوْ قَالَ عَلٰى مَنَاخِرِهِم اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِم.“

(مسند احمد ج:۸ حدیث:۲۲۱۲۹)

ترجمہ:...... ”یا رسول اللہ! ہم اپنی زبان سے جو باتیں کردیتے ہیں، اس پر بھی ہم سے پکڑ ہوگی؟ فرمایا: معاذؓ! تیری ماں تجھے گم پائے یعنی تو مرجائے (یہ عربوں کا محاورہ ہے)، لوگوں کو چہروں کے بل یا ناکوں کے بل جہنم میں گرانے والی سوائے زبان کے کھیتیوں کے اور کیا چیز ہوگی؟“

میرے بھائیو! جو عمل کرو یہ دیکھو کہ میرے رسول ﷺ کو ناراضگی تو نہیں ہے اس میں! حضور اقدس ﷺ اس سے ناراض تو نہیں ہوں گے، یہ دیکھ لیا کرو، داڑھی منڈواتے ہوتو بھی دیکھ لیا کرو، کپڑا پہنتے ہوتو بھی دیکھ لیا کرو، کوئی بات کرتے ہوتو بھی دیکھ لیا کرو، کوئی جھگڑا کرتے ہوتو بھی دیکھ لیا کرو، ایک ایک چیز دیکھ لیا کرو کہ رسول اللہ ﷺ...... جن کی بارگاہ میں ہمیں شفاعت کے لئے حاضر ہونا ہے، وہ ناراض تو نہیں ہوں گے۔ پھر فرمایا: معاذ!...... ”اُحِبُّ لَکَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِیْ.“

میں تمہارے لئے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں، یہ رسول اللہ ﷺ کا طرز تکلم تھا، بات کہنے سے پہلے بات اگلے کے دل میں اتر جائے، بات ابھی کہی نہیں، لیکن اس انداز سے بات کی گئی کہ دل اس کے لئے تیار ہوجائے، جس طرح کہ بارش کا قطرہ ہوتا ہے، بارش ہوتی ہے نا! بارش کا قطرہ برستا ہے تو سیپ

اپنا منہ کھول دیتی ہے، اور ادھر قطرہ گر جاتا ہے سیپ کے اندر اور فوراً سیپ اپنا منہ بند کر لیتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ بھی امت کے لئے ایسی نصیحتیں فرماتے تھے کہ امت اپنے دل کی گہرائی کے ساتھ ان کو سنے، اور سنکر کے ان کو محفوظ کر لے، فرمایا معاذؓ! میں تمہارے لیے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو چیز اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔

تین باتوں کی نصیحت:

اور پھر فرمایا میں تمہیں تین باتوں کی نصیحت کرتا ہوں۔ اور بھائی یہ تین باتیں جیسے تمہارے لئے ضروری ہیں، ایسے ہی میرے لئے بھی ضروری ہیں، اس کو پکالو، اللہ تعالیٰ مجھے بھی توفیق عطا فرمائے اور آپ کو بھی، ان کو اپنا معمول بنالو، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا تھا معاذؓ کبھی ان چیزوں کو نہ چھوڑنا، اور وہ چھوٹی چھوٹی تین باتیں یہ ہیں:

"اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَ شُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ." (مسند احمد ج:۸ حدیث:۲۲۱۸۰)

اے اللہ! میری خاص مدد فرما۔ "عَلٰی ذِکْرِکَ." اپنے ذکر پر۔

ہم دنیا کا تذکرہ تو بہت کرتے ہیں، اللہ کا ذکر بھی کیا کریں، حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آنحضرت ﷺ نے نصیحت فرمائی، کہ یہ کہا کرو:

"اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَ شُکْرِکَ."

(یا اللہ! میری خاص مدد فرما کہ میں آپ کا ذکر کیا کروں۔)

"وَ شُکْرِکَ." اور آپ کا شکر کیا کروں، کوئی نعمت اللہ تعالیٰ نے عطا

فرمائی ہو، کوئی نعمت اللہ کی طرف سے آئی ہو، ہم اس پر اللہ کا شکرادا کیا کریں، ناشکری کرنے والے تو بہت ہیں، شکر کرنے والے کم ہیں، اللہ کی شکایت کرنے والے تو بہت ہیں، لیکن یہ کہنے والے کہ ''یا اللہ! تیرا شکر ہے، میں تو اس کا بھی اہل نہیں تھا۔ یہ تو آپ نے انعام فرمادیا۔''

ایک چھوٹا بچہ ہے ہمارے پاس، ہم اسے ۱۰۰ کا نوٹ پکڑادیتے ہیں، کبھی اس کے دل میں وسوسہ بھی نہیں آئے گا کہ میں اس کا اہل تھا، حق تعالیٰ شانہ نے ہمیں کتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، مال ہے، اولاد ہے، بیوی بچے ہیں، گھر بار ہے، عزت و آبرو ہے اورسب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے نام کی توفیق عطا فرما دی ہے، اور سب چیزیں ایک طرف، اللہ تعالیٰ کے نام کی اور رسول اللہ ﷺ کی عظمت کی بات بھی سیکھو، یا اللہ! مجھے اپنے ذکر کی توفیق عطا فرما، اپنے شکر کی توفیق عطا فرما، اور کم سے کم یہ کہہ دیا کرو یا اللہ! آپ نے جتنی بھی نعمتیں عطا فرمائیں تیرا شکر ہے، زبان سے کہہ دیا کرو، اور آخری بات یہ کہ: ''وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ.'' اپنی عبادت کو اچھی کرنے کی توفیق عطا فرما۔

ایک ہے عبادت کرنا اور ایک ہے عبادت کو اچھی طرح کرنا، دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے، ہم لوگ نماز پڑھتے ہیں، جان چھڑانے والی، یعنی سجدے سے اٹھے، سیدھے بھی نہیں بیٹھے پھر چلے گئے، کیونکہ جب ہم نماز پڑھنے لگتے ہیں اس وقت ہمیں پوری دنیا کے کام یاد آجاتے ہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ اس نماز کو ٹرخا کے جلدی جلدی اس کام کو نمٹائیں۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ایک شخص کو نصیحت:

نہیں بھائی! یہ تو وہی بات ہوگئی حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں ایک آدمی آیا، کہنے لگا حضرت ایک بات پوچھنے کے لئے آیا ہوں، فرمایا کیا؟ کہا کہ میں کسی جگہ اپنا روپیہ دبا کر کے بھول گیا ہوں، روپیہ دبایا تھا، لیکن اب مجھے یاد نہیں رہا، بہتیرا تلاش کیا، جگہیں بھی کھودیں، مگر وہ نہیں مل رہا، تو مجھے کوئی ایسی ترکیب بتادیجئے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ دو رکعت نماز کی نیت باندھ لو، تمہیں وہ دبایا ہوا خزانہ یاد آجائے گا، لیکن مہربانی کر کے نماز پوری کر لینا۔

اس نے نماز کو جو شروع کیا، شیطان نے فوراً یاد دلا دیا اور وہ نماز توڑ کر کے بھاگ گیا۔ تو ہمارا ایسا ہی حال نہ ہو بھائی، اپنی عبادت کریں لیکن اچھی طرح عبادت کریں، ایک بات کہتا ہوں، عبادت مثلاً نماز ہے، پڑھنے لگو تو یہ تصور کرو کہ ممکن ہے یہ نماز میری آخری نماز ہو اور اس کے بعد پھر مجھے نماز پڑھنے کی توفیق بھی نہ ملے، اطمینان کے ساتھ نماز پڑھو، اور پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! اگر آئندہ بھی میری قسمت میں نماز ہے تو اپنی رحمت کے ساتھ اس نماز کو اچھی طرح پڑھنے کی توفیق عطا فرمادے، ایک نماز کی بات نہیں، اور جتنی بھی نمازیں ہیں۔

"وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ." جتنی بھی عبادت کی چیزیں ہیں یا اللہ! مجھے ٹھیک کرنے کی توفیق عطا فرما۔

میرے بھائیو! داڑھی نہ منڈواؤ، قیامت کے دن اس پر عذاب ہوگا، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہم پیش ہوں گے اور حضور ﷺ فرمائیں گے...... یہ کیا کر کے آئے ہو؟ میں نے تمہیں یہ سنت دی تھی؟

داڑھی منڈے سے حضور ﷺ کی نفرت:

آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اور ایران کے دو سپاہی آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور شاہ ایران نے انہیں بھیجا تھا، آپ ﷺ کو پکڑنے کے لئے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ ان کی داڑھیاں منڈی ہوئی ہیں، مونچھیں رکھی ہوئی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا ناس ہوجائے...... یہی الفاظ ہیں، تمہارا ناس ہوجائے......تم نے اپنی یہ شکل کیوں بگاڑی ہوئی ہے، انہوں نے کہا کہ ہمارے رب یعنی کسریٰ نے، شاہ ایران نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے، آنحضرت ﷺ نے جواب میں فرمایا: "لیکن میرے رب نے تو مجھے حکم فرمایا ہے کہ مونچھیں کٹواؤں اور داڑھی بڑھاؤں، چنانچہ بدایہ والنہایہ میں ہے:

"......فَكَرِهَ النَّظَرُ اِلَيْهِمَا. وَقَالَ وَيْلَكُمَا مَنْ اَمَرَكُمَا بِهٰذَا؟ قَالَ اَمَرَنَا رَبُّنَا يَعْنِيَانِ كِسْرٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنَّ رَبِّىْ اَمَرَنِىْ بِاِعْفَاءِ لِحْيَتِىْ وَقَصِّ شَارِبِىْ."

(حیاۃ الصحابۃ ج:۱ ص:۱۱۵، البدایۃ والنہایۃ ج:۴ ص:۲۷۰)

میرے بھائیو! انگریز کی نقل نہ کرو، ایرانیوں کی نقل نہ کرو، مجوسیوں کی نقل نہ کرو، اپنے نبی پاک ﷺ کی نقل کرو، آنحضرت ﷺ نے ان مجوسیوں کو یہ کہا اور ساتھ ہی فرمایا کہ "میرے پاس سے اٹھ جاؤ، میرا نمائندہ تم سے بات کرے گا، میں تم سے بات بھی نہیں کرتا۔

حضور ﷺ داڑھی منڈے کے سلام کا جواب نہیں دیتے:

ایک صاحب گئے مدینہ طیبہ...... ان سے ہمیشہ ملاقات ہوتی رہتی ہے، انہوں نے بتایا کہ ایک صاحب حضوری ہیں، جنہیں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کی توفیق ہوتی ہے، انہوں نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ! آپ کی حیات طیبہ میں کوئی قصور کر کے آتا تھا، وہ آکر سلام کرتا تھا تو آپ منہ ادھر کر لیتے تھے، ادھر سلام کرتا تھا تو آپ منہ ادھر کر لیتے تھے، تو جو لوگ داڑھی منڈوا کر کے آپؐ کے روضہ اقدس پر آتے ہیں اور آپؐ کو سلام کرتے ہیں، کیا آپؐ ان کے سلام کا جواب دیتے ہیں؟ فرمایا میں ان کے سلام کا جواب نہیں دیتا۔

میرے بھائیو! ہمارا خسارہ ہے، یہ داڑھی کے بال تمہیں بوجھ محسوس ہوتے ہیں؟ بوجھ نہیں ہیں، یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، قیامت کے دن تو یہ ہوگی ہی نہیں، کہتے ہیں کہ...... بعض روایتوں میں آتا ہے، ایک حضور ﷺ کی داڑھی ہوگی، ایک آدم علیہ السلام کی داڑھی ہوگی، اور کسی کی داڑھی نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس لئے رسول اللہ ﷺ کی ہر سنت پر عمل کرو اور انشاء اللہ اس میں ہماری نجات ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

میرے بھائیو! انگریز کی نقل نہ کرو، ایرانیوں کی نقل نہ کرو، مجوسیوں کی نقل نہ کرو، اپنے نبی پاک ﷺ کی نقل کرو۔

روضۂ اقدس پر
حاضری کے آداب

مدینہ کا سفر محبت کا سفر ہے، اور آنحضرت ﷺ سے شفاعت طلب کرنے کا سفر ہے، ہم آنحضرت ﷺ کے در دولت پر اس لئے حاضری دیتے ہیں کہ ہم عرض معروض کرسکیں کہ حضورؐ ہماری بھی شفاعت کردیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد!

مدینہ طیبہ میں حاضری حج کا رکن نہیں ہے، اگر کوئی شخص مکہ مکرمہ جاکر حج کرلے، اور مدینہ منورہ نہ جائے تو اس کا حج ہوجائے گا، لیکن آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ."

(درمنثور ج:۱ ص:۲۳۷، کشف الخفاء للعجلونی ج:۲ ص:۳۳۸، ۳۸۲، تنزیہ الشریعۃ لابن العراق ج:۲ ص:۱۷۲)

ترجمہ:...... "جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہیں آیا اس نے میرے ساتھ بے مروتی (بے وفائی) کی۔"

میں نے یہ مسئلہ تو بتادیا ہے کہ مدینہ طیبہ کی حاضری کا حج سے کوئی تعلق نہیں ہے، حج تو اس کے بغیر بھی ہوجاتا ہے، لیکن آدمی نے اتنا لمبا سفر طے کیا اور حضور اقدس ﷺ کی بارگاہ میں حاضر نہیں ہوا تو بڑی محرومی کی بات ہے۔

ہمارے ایک پیر بھائی ہیں جناب ڈاکٹر محمد اسماعیل مدنی صاحب، وہ ایک

مرتبہ امریکہ سے آئے اور آئے بھی حج کے دنوں میں، مگر حج نہیں کیا، بلکہ وہ پورے موسم حج میں مدینہ طیبہ میں ٹھہرے رہے، فرمانے لگے کہ حج تو بہت کئے ہیں، لیکن اس سال کا یہ سفر صرف مدینہ منورہ کے لئے کیا ہے۔

طلب شفاعت کا سفر:

میرا بھائی! مدینہ کا سفر محبت کا سفر ہے، اور آنحضرت ﷺ سے شفاعت طلب کرنے کا سفر ہے، ہم آنحضرت ﷺ کے در دولت پر اس لئے حاضری دیتے ہیں کہ ہم عرض معروض کرسکیں کہ حضورؐ ہماری بھی شفاعت کردیں۔ ہمارے اکابر نے فرمایا ہے کہ مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت یہ نہ کہے کہ میں مدینہ کی زیارت کے لئے آیا ہوں بلکہ یوں کہے کہ میں آنحضرت ﷺ کی زیارت کے لئے آیا ہوں، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ اپنے روضۂ اقدس میں بھی اسی طرح حیات ہیں جس طرح کہ آپ ﷺ اپنی زندگی میں حیات تھے، یہ اپنا عقیدہ ہے۔

مدینہ منورہ کے آداب:

مدینہ منورہ کی حاضری کے کچھ آداب ہیں، اب میں اس کے مختصر آداب بتاتا ہوں:

ا:......پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم جب مدینہ طیبہ کی طرف چلیں، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم اس مبارک شہر کے سفر میں آنکھوں کے بل چل کر جاتے، موٹر اور سواری پر سوار نہ ہوتے، لیکن چونکہ ہم کمزور ہیں، ٹانگوں میں چلنے کی طاقت نہیں ہے، اور پھر ۴۰۰ کلومیٹر سے زیادہ کا سفر ہے، اور اتنا لمبا سفر پیدل مشکل ہے، چنانچہ میرے بہت سے اکابر کا معمول رہا ہے کہ جب مسجد نبوی ﷺ پر نظر پڑتی تو سواری سے اتر

جاتے، اور جوتے کے بغیر جاتے، لیکن بھئی ہم تو اس سے بھی کمزور ہیں، میں تو ایک دو قدم بھی نہیں چل سکتا، اس لئے سواری پر سفر کرو تو کوئی گناہ نہیں، لیکن میں ادب بتا رہا ہوں کہ اکابر کا ادب یہ تھا کہ مدینہ کا سفر پیدل کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کا ادب:

ہمارے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مدینہ طیبہ میں حاضر ہوتے تھے مگر صرف ایک دن اور ایک رات کے لئے، یا تین دن، تین رات کے لئے، اس عرصہ میں نہ کھاتے تھے نہ پیتے تھے اور نہ پیشاب کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میں اس سے زیادہ یہاں رہ نہیں سکتا، فرماتے تھے کہ جس جگہ اور جس زمین پر حضور اکرم ﷺ کے قدم مبارک لگے ہوں میں اس جگہ کو پیشاب پاخانہ سے ملوث کروں، مجھے شرم آتی ہے۔ ہم کہتے ہیں مدینہ پاک، مدینہ منورہ، مدینہ طیبہ وہ پاک بھی ہے، منور بھی ہے، وہ طابہ بھی ہے، اس کے ایک ایک قدم پر آنحضرت ﷺ کے نشانات لگے ہوئے ہیں، اس لئے ہمیں آنحضرت ﷺ کا حد سے زیادہ احترام کرنا چاہئے۔

۲:...... بزرگوں نے فرمایا کہ جب مدینہ منورہ کا سفر شروع کرے تو پورے راستہ میں جتنا ہوسکے درود شریف پڑھتا رہے، پورے سفر کو آنحضرت ﷺ پر درود شریف پڑھنے میں مشغول کرلے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے کپڑے بدلے اور پاک صاف کپڑے پہن کر آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو، مدینہ طیبہ میں بارگاہ نبوت میں حاضری کے علاوہ دوسرا کوئی عمل نہیں ہے۔ کہتے ہیں ایک پٹھان بھائی مدینہ طیبہ گئے کہنے لگے: وہ صفا، مروا کدھر ہے؟ اس کو بتایا گیا کہ یہاں صفا اور مروہ نہیں ہوتا، تو کہنے لگا واہ روضے والے تیرے ہاں کتنا اچھا ہے کہ یہاں صفا بھی نہیں ہے اور

مروا بھی نہیں ہے، تو وہاں کوئی کام نہیں ہے، البتہ مدینہ منورہ میں صرف دو کام ہیں، ایک تو یہ کہ آپ چالیس نمازیں تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ پڑھیں۔

حدیث میں ہے، اگرچہ یہ حدیث ذرا کمزور ہے مگر فضائل اعمال میں چلتی ہے کہ:

"عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ مَنْ صَلّٰى فِيْ مَسْجِدِيْ اَرْبَعِيْنَ صَلَاةً لَا يَفُوْتُهُ صَلَاةٌ كُتِبَتْ لَهُ بَرَاءَةٌ مِّنَ النَّارِ وَنَجَاةٌ مِّنَ الْعَذَابِ وَ بَرِئَ مِنَ النِّفَاقِ."

(مسند احمد ج:۳ ص:۱۵۵)

ترجمہ:...... "آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہاں جس شخص نے چالیس نمازیں اس طرح پڑھیں کہ اس کی تکبیرِ تحریمہ فوت نہیں ہوئی، اس کو دو پروانے عطا کئے جاتے ہیں، ایک پروانہ دوزخ سے نجات کا، دوسرا نفاق سے برأت (نجات) کا (یعنی یہ منافق بھی نہیں ہے اور دوزخ میں بھی نہیں جائے گا)۔"

حضرت رائے پوریؒ کا واقعہ:

ہمارے حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ تھے، کل میں نے حضرت نفیس شاہ صاحب کو یہ واقعہ سنایا کہ میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ وہاں چلا گیا، جہاں حضرت رائے پوریؒ ٹھہرے ہوئے تھے، عصر کی نماز ہوئی ہم بھی شریک ہوئے، نماز کے بعد سارے لوگ اٹھ کر اپنے اپنے کاموں کے لئے چلے گئے، اس لئے کہ مقامی لوگ

تھے، حضرت اکیلے بیٹھے رہ گئے، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ سبحان اللہ کیا بات ہے؟ اچھا موقع ہے کہ ہم حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت، ہمیں تنہائی میں مل گئے، میں نے کہا حضرت ایک بات پوچھنی ہے، کہنے لگے ہاں پوچھئے! میں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

”عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى لِلّٰهِ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا فِيْ جَمَاعَةٍ يُدْرِكُ التَّكْبِيْرَةَ الْأُوْلىٰ كُتِبَ لَهُ بَرَاءَتَانِ بَرَاءَةٌ مِّنَ النَّارِ وَبَرَاءَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ.“

(ترمذی ج:۱ ص:۳۳)

ترجمہ:...... ”جو شخص چالیس دن کی نمازیں اس طرح پڑھے کہ تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو، تو اس کے لئے دو براٴتیں لکھی جاتی ہیں، ایک براٴت دوزخ سے دوسری نفاق سے۔“

حضرت! میں ایک سال سے نمازیں پوری کرنے کی کوشش کررہا ہوں، (پھر حضرت لدھیانوی شہیدؒ نے مجمع سے پوچھا کہ آپ نے بھی کبھی تکبیر اولیٰ کا چلّہ پورا کرنے کی کوشش کی ہے؟ ناقل) تو میری کوشش ہے کہ ۴۰ نمازیں ایسی پڑھوں کہ درمیان میں کسی تکبیر اولیٰ کا ناغہ نہ ہو اور پوری مکمل کی مکمل تکبیر اولیٰ کے ساتھ پڑھوں، مگر ہمیشہ آخر میں جاکر یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، حضرت نے سن کر فرمایا کہ: اگر آدمی کو یہ فضیلت مل جائے تو بھی آدمی کو بے فکر نہیں ہونا چاہئے کہ بس اب مل گئی ہے نجات، بلکہ پھر بھی دھن میں لگا رہے، پھر فرمایا کہ آپ تو کہہ رہے ہیں کہ چالیس دن کی نمازیں پوری نہیں ہوئیں، میں نے کہا کہ میرا تو سوال ہی یہ ہے اور اس کے لئے ایک

سال سے لگا ہوا ہوں، اور بعض مرتبہ تو آخری دن کی نماز کی تکبیر اولیٰ چھوٹ گئی، اور میں نے پھر نئے سرے سے شروع کردی، حضرت نے ارشاد فرمایا: (یہ بات سب حضرات کو سنانے کی ہے) تمہاری اور شیطان کی لڑائی ہو رہی ہے، اب دیکھو کون غالب آتا ہے؟ بس حضرت کی مجلس سے اٹھا، حضرت کے ساتھ تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھی، حضرت کی یہ کرامت تھی کہ اس دن کے بعد میں نے اپنی ۴۰ دن کی نمازیں تکبیر اولیٰ کے ساتھ پوری کرلیں، میں اپنے دوستوں سے (جن کو بیعت کرتا ہوں) چند تاکیدیں کیا کرتا ہوں۔ ایک تاکید یہ ہوتی ہے کہ تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھو گے، یہ میری پہلی شرط ہے، میرے ایک ساتھی نے بتایا کہ بعض ان میں سے ایسے بھی ہیں کہ جن کی ۶ مہینے تک تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔ تو یہاں تو چالیس دن ہیں اور وہاں مدینہ منورہ میں تو صرف چالیس نمازیں ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے شہر کی رعایت ہے کہ وہاں صرف چالیس نمازیں ہیں، میرے حاجی بھائی جاتے ہیں بازاروں میں پھرتے رہتے ہیں، ان میں سے بہت سے تو ایسے ہوتے ہیں جو تہجد کی نماز کے لئے اور ریاض الجنہ میں پہنچنے کے لئے دوڑتے ہیں، میں کبھی ریاض الجنہ کے لئے نہیں دوڑا، اگر موقع مل گیا تو پہنچ گیا، ورنہ ٹھیک ہے، ویسے دو یا چار رکعتیں پڑھ لیں۔

میں نے کہا وہاں تو صرف کھانا، پینا اور سونا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں نمازیں پڑھنا ہے، اس لئے کوشش کرو کہ وہاں ۴۰ نمازیں تکبیر اولیٰ کے ساتھ پڑھو۔

مدینہ اور اہل مدینہ کا ادب:

جب تم آنحضرت ﷺ کے شہر میں پہنچو اور جب اس کے در و دیوار پر تمہاری نظر پڑے تو اس کا نور تمہاری نظر میں آجائے، تمہاری آنکھیں روشن ہوجائیں، تم سوچو، تصور کی دنیا میں سوچو کہ میرے آقا ﷺ ان راستوں سے گزرے ہوں گے، اونٹ پر گزرے ہوں گے، پیدل گزرے ہوں گے، لہٰذا نہایت ادب کے ساتھ شہر میں رہو، مدینہ والوں کے ساتھ کوئی مکر وفریب نہ کرو، ان کے ساتھ اونچی آواز میں بھی نہ بولو اور مسجد میں آؤ تو ستھرا لباس پہن کر اور یہ سوچ کر کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔

صلوٰۃ وسلام کا ادب:

علماء نے لکھا ہے کہ: "اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا سَیِّدَ الْمُرْسَلِیْنَ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا شَفِیْعَ الْمُذْنِبِیْنَ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ." کہتے وقت نظریں نیچی ہوں۔ ہو سکے تو تمہاری آنکھوں سے دل کے گناہ نکل کر کے بہہ رہے ہوں، یعنی چشم نم کے ساتھ صلوٰۃ وسلام پڑھو، پوری محبت اور اخلاص کے ساتھ درود وسلام پڑھو، علماء نے لکھا ہے کہ کم سے کم ۸۰ مرتبہ سلام پیش کرو۔

آنحضرت ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا روضہ مبارک ہے، ان کے ساتھ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار مبارک ہے، یعنی ایک قدم ادھر آئیں حضرت ابوبکر ہیں، ایک قدم اور آگے کو جائیں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، ان کی خدمت میں بھی سلام عرض کرو۔

یعنی یوں کہو: "اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا خَلِیْفَۃَ رَسُوْلِ اللّٰہِ." جو بھی الفاظ آتے ہیں پڑھ لو، جو جو کتابوں میں الفاظ آتے ہیں وہ پڑھ لیں، ورنہ اپنی ہی زبان میں سلام پیش کر لو، پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں دوبارہ پیچھے کو لوٹو، مگر ہجوم زیادہ ہوتا ہے، بڑا مشکل ہوتا ہے، اتنا سارے آدمی مواجہہ شریف پر جمع ہوں تو بڑا مشکل ہو جاتا ہے، وہاں آدمی ٹھہر نہیں سکتا، اس لئے میں تو اقدام عالیہ کی طرف عام طور پر جاتا ہوں، یعنی جس طرف آنحضرت ﷺ کے قدمین مبارکین ہیں، میں عام طور پر وہاں جاتا ہوں، اور اپنے گناہوں سے ڈرتا ہوا، میں تو آنحضرت ﷺ کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں۔

دوسروں کی جانب سے سلام کا طریقہ:

بہرحال حکم یہ ہے کہ اپنا سلام پیش کرنے کے بعد اپنے اہل و عیال کی جانب سے، دوست احباب کی طرف سے، جن جن لوگوں نے سلام پیش کرنے کو کہا ہے ان لوگوں کی طرف سے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کرے، اور اگر یاد نہ ہو تو صرف یہ کہہ دے کہ یا رسول اللہ! آپؐ کی امت کے بہت سے لوگوں نے مجھے آپؐ کو سلام پہنچانے کے لئے کہا ہے یا رسول اللہ! ان سب کی طرف سے حضورؐ کی خدمت میں سلام۔

بارگاہ رسالت کا ادب:

مسجد شریف میں جہاں تک بھی مسجد ہے، وہاں نہایت وقار کے ساتھ رہو، آواز بلند نہ کرو، قرآن کریم میں ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ

اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی. " (الحجرات:۳)

ترجمہ:...... "جو لوگ کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنی آواز پست رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں کو تقوے کے لئے چن لیا ہے۔"

شور شرابہ نہ کرو، پہلی مرتبہ جب میں گیا تھا، میں دیکھتا ہوں کہ اس وقت کا اور اب کے وقت کا رنگ بہت بدلا ہوا ہے، اب بھی جاتا ہوں لیکن وہ لذت نہیں آتی جو پہلی دفعہ آئی تھی، پہلے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام مسجد میں سناٹا ہے جب کہ مسجد بھری ہوئی ہوتی تھی، لوگ قرآن مجید کی تلاوت میں لگے ہوئے ہوتے تھے، ذکر میں لگے ہوئے ہوتے تھے، درود شریف میں لگے ہوئے ہوتے تھے، اور کچھ آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر سلام پیش کر رہے ہوتے تھے، لیکن مکمل سناٹا، مگر اب دیکھتا ہوں اور سنتا ہوں کہ ایک شور ہوتا ہے، اور بالکل شور ہوتا ہے۔

ہماری مستورات بھی جاتی ہیں، بے چاری ایک تو یہ پردہ کے بغیر ہوتی ہیں، میری بہنو! کم سے کم حضور اقدس ﷺ کے دربار میں حاضر ہونے کے لئے تو برقع لے لیتیں، مگر یہ وہاں بھی ایسے ہی پھرتی ہیں جیسے گویا اپنا گھر ہے، بھائی! جتنا ادب اس پاک مقام کا ہوسکتا ہے کیا کرو۔ میں نے کہا کہ اور تو کوئی عمل ہے نہیں، آنحضرت ﷺ سے ادب ہی سیکھ لیں۔

داڑھی منڈوں کے سلام کا جواب:

میرے ایک دوست تھے، اب بھی ہیں انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک بزرگ تھے جن کو آنحضرت ﷺ کے دربار میں حضوری اور حاضری نصیب ہوتی تھی، کچھ اللہ

کے بندے ایسے بھی ہیں جن کو شرف باریابی نصیب ہوتا ہے اس کو حضوری کہتے ہیں انہوں نے آنحضرت ﷺ کی بارگاہ عالی میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ جب دنیا میں تشریف فرما ہوتے تھے اور کوئی آدمی آتا تھا جس نے کوئی غلطی کی ہوتی، اگر وہ آکر کہتا ''**السلام علیک یا رسول اللّٰہ**'' یا ویسے ہی السلام علیکم کہتا، تو آپؐ ادھر سے منہ مبارک دوسری طرف فرمالیتے، وہ اُدھر سے ہوکر کے سلام عرض کرتا آپؐ اِدھر سے منہ دوسری طرف کرلیتے، وہ ادھر سے ہوکر سلام عرض کرتا آپؐ ادھر کو ہولیتے، آپؐ اس کے سلام کا جواب نہیں دیتے تھے، اب آپ کا کیا معمول مبارک ہے؟

یہاں ایک واقعہ سنادوں: ''ایک آدمی نے سونے کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی، اور رسول اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے اسی طرح دائیں طرف سے سلام عرض کیا آپؐ نے بائیں طرف منہ کرلیا، پھر بائیں طرف حاضر ہوا، سلام عرض کیا تو آنحضرت ﷺ نے دائیں طرف منہ کرلیا، مگر سلام کا جواب نہیں دیا، اس شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بعض لوگ میری مجلس میں آگ کی انگوٹھی پہن کر آجاتے ہیں'' وہ سونے کی انگوٹھی جو پہنی تھی اس کو آگ کی انگوٹھی فرمارہے تھے، انہوں نے فوراً ہاتھ سے نکالی اور نکال کر پھینک دی۔'' (مسند احمد ج:۳ ص:۱۴)

پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہوگی، جب آنحضرت ﷺ گھر تشریف لے گئے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان صاحب سے کہا: میاں تم نے انگوٹھی پھینک دی؟ اس کو اٹھالیتے عورت کو پہنادیتے (عورتوں کو پہننا تو جائز ہے نا) فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے جس چیز کو ناگوار سمجھا ہے، اور اس پر نفرت کا اظہار کیا ہے میں اس کو نہیں اٹھاتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، حضور اکرم ﷺ کی مجلس

میں حاضر ہوتے تھے تو خود فرماتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا: "کأن علی رؤسنا الطیر." (مسند احمد ج:۴ ص:۲۷۸، ۲۸۷، ۲۹۵، ابوداوٴد ج:۲ ص:۱۸۳) گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، ہل نہیں سکتے اگر ہلے تو پرندے اڑ جائیں گے ــــ تو ان صاحب نے پوچھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دیتے تھے یا رسول اللہ! آپ کا زندگی کا معمول تو یہ تھا کہ کوئی غلطی کرکے آتا تھا اور آپؐ کو السلام علیک کا کہتا، تو آپ دوسری طرف منہ کرلیتے تھے، دوسری طرف سے اگر سلام کرتا، آپؐ دوسری طرف منہ کرلیتے تھے، یا رسول اللہ! اب تو بہت سے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، ان کی داڑھیاں منڈھی ہوئی ہوتی ہیں، تو آپؐ ان کے سلام کا جواب دیتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان کے سلام کا جواب نہیں دیتا۔

میری بات یاد رکھو اور یہ پکی بات ہے جو لوگ اس (داڑھی منڈانے) سے توبہ نہیں کرتے ــــ داڑھی کا ایک مشت تک رکھنا واجب ہے ــــ جو لوگ اس سے توبہ نہیں کرتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سلام کا جواب نہیں دیتے (اللہ تعالیٰ معاف فرمائے) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے در دولت پر بھی حاضر ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالی میں شفاعت کی درخواست بھی کریں اور وہاں سے محرومی ہوجائے، صرف انگریزوں کی سنت کے لئے؟

ایرانی قاصدوں کا قصہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایران کے بادشاہ کے دو قاصد آئے تھے، میری کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ (داڑھی کے بارے میں، میرا چھوٹا سا رسالہ ہے

''داڑھی کا مسئلہ'') ان کو بھیجا گیا تھا کہ اس شخص کو نعوذ باللہ پکڑ کر لاؤ (حضور اکرم ﷺ کو)، وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا ناس ہو تم نے اپنی شکل کیوں بگاڑ رکھی ہے؟ یعنی داڑھی کیوں کترائی ہوئی ہے، اور مونچھیں کیوں بڑھائی ہوئی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے رب (کسریٰ) نے اس کا حکم دیا ہے۔ رسول اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے رب یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے تو مجھے حکم دیا ہے کہ میں داڑھی بڑھاؤں اور مونچھیں کتراؤں۔ یہ فرمایا اور کہا میری مجلس سے اٹھ جاؤ، میرا نمائندہ تم سے بات کرے گا میں تم سے بات نہیں کروں گا۔

(البدایہ والنہایہ ج:۴ ص:۲۷۰، حیاۃ الصحابہ ج:۱ ص:۱۱۵)

بہت ہی ادب کے ساتھ اپنے تمام بھائیوں سے میں عرض کرتا ہوں کہ داڑھی رکھ لیں اور آئندہ کے لئے توبہ کرلیں اور پھر آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور پھر عرض کریں کہ یا رسول اللہ! ہم گناہگار ہیں، ہماری شفاعت فرمایئے؟

میرا معمول:

میں اب تو کمزور ہوگیا ہوں، پہلے جب میں حاضر ہوتا تھا تو دس ہزار درود شریف پڑھنے کا روزانہ کا معمول تھا، تلاوت بھی اور دوسرے معمولات بھی تھے، دس ہزار روزانہ، مسجد شریف میں، بازار میں اور چلتے ہوئے ہمیشہ درود شریف پڑھتا رہتا تھا، اور کسی سے بات نہیں کرتا تھا، اب تو کمزور ہوگیا ہوں اہتمام تو اب بھی کرتا ہوں لیکن اب اتنی ہمت نہیں رہی۔

ایک بزرگ کا درود کا معمول:

ایک صاحب ہمارے بزرگ ہیں وہ اب بھی حیات ہیں، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو کہنے لگے کہ میں جوانی کے زمانہ میں اسّی ہزار درود شریف روازانہ پڑھتا تھا (سبحان اللہ)، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے میں نے تو دس ہزار کا کہا ہے اور میرے بزرگوں نے ایک دن کا اسّی ہزار کا معمول کیا ہے۔ تو وہاں یہ کام ہے کہ نماز کی پابندی کرنا اور درود شریف کثرت سے پڑھنا، نہایت ادب کے ساتھ، نہایت احترام کے ساتھ رہنا، جتنی زیادہ محبت ہوگی اور ادب ہوگا، اتنا ہی زیادہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے، بس اسی پر اکتفاء کرتا ہوں وقت کافی ہوگیا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مدینہ پاک، مدینہ منورہ، مدینہ طیبہ وہ پاک بھی ہے، منور بھی ہے، طابہ بھی ہے، اس کے ایک ایک قدم پر آنحضرت ﷺ کے نشانات لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہمیں آنحضرت ﷺ کا حد سے زیادہ احترام کرنا چاہئے۔

جنت میں معیتِ نبویؐ

اس لئے ہماری محبت کا محور آنحضرت ﷺ کی ذات، آپ ﷺ کی سیرت وسوانح اور اسوۂ حسنہ ہونا چاہئے، اگر جنت میں حضور ﷺ کے ساتھ جانا چاہتے ہو تو اپنی شکل، شباہت، وضع قطع اور لباس پوشاک حضور ﷺ جیسی بناؤ، میرے بھائیو! داڑھیاں مونڈنا بند کردو، یہ گناہ کبیرہ ہے، اور گناہ کبیرہ کرنے والے کو حضور ﷺ کی معیت نصیب نہیں ہوگی، اور حضور ﷺ ایسے کسی شخص کے سلام کا جواب نہیں دیتے جو داڑھی مونڈتا ہے، بلکہ اس سے اعراض فرما کر اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد!

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہم سب کو مسجد میں بیٹھنے کی توفیق بخشی، اور آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ مسجد اللہ کا گھر ہے، گویا اس وقت ہم اللہ کے گھر میں بیٹھے ہیں، جتنی دیر ہم مسجد میں بیٹھے رہیں گے، اتنی دیر گویا ہم اللہ کے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں، آپ سب حضرات دعا کریں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و احسان سے ہمیں دنیا میں اپنے گھر میں بیٹھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے آخرت کے گھر، جنت میں بھی ایک ساتھ بیٹھنے کی اجازت اور توفیق مرحمت فرمائیں، آمین۔

جنت دراصل نبیوں، صدیقوں، شہیدوں، صالحین اور ہمارے آقا و مولیٰ سید الاولین و الآخرین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا گھر ہے، خدا کرے ہم سب کو جنت میں آقائے دوعالم ﷺ کی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل ہو جائے، اور اس سے قبل

آخرت کی طرف جانے کے تمام مراحل میں بھی شرف زیارت نصیب ہوجائے، آمین۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

"عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰه عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْ أَشَدِّ أُمَّتِیْ اِلَیَّ حُبًّا نَاسٌ یَکُوْنُوْنَ بَعْدِیْ یَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ رَءَانِیْ بِأَهْلِهٖ وَمَالِهٖ."

(صحیح مسلم ص:۳۷۹ ج:۲)

ترجمہ:......"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: میری امت میں سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جن میں کا ایک شخص یہ خواہش کرے گا کہ وہ اپنا گھر بار مال و متاع قربان کرکے مجھے دیکھ سکے، (مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکے گا)۔"

آج ہم اور آپ سب حضور ﷺ کی زیارت و ملاقات کرنا چاہتے ہیں مگر نہیں ہوسکتی، اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہم سب کو یہ سعادت دنیا میں نہیں تو جنت میں نصیب ہوجائے، انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس محبت اور سچی محبت کی بدولت جنت میں آنحضرت ﷺ کی زیارت و معیت نصیب فرمادیں گے، چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے:

"آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک انصاری صحابی تشریف لائے طبیعت پر حزن و ملال کا اثر تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ کیوں پریشان ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ یہ سوچ کر پریشان ہوں کہ دنیا میں ہم صبح شام حاضر خدمت

ہوتے ہیں، جب جی چاہتا ہے آپ کا دیدار کر لیتے ہیں، آپؐ کی زیارت سے محظوظ ہوتے ہیں، آپؐ کی خدمت میں بیٹھتے ہیں، حتیٰ کہ اگر آدھی رات کو بھی خیال آجائے تو مسجد میں چلے آتے ہیں اور آپؐ سے ملاقات ہوجاتی ہے، مرنے کے بعد ہمارا کیا ہوگا؟ کیونکہ آپ تو انبیاءؑ کے درجے پر پہنچ جائیں گے، پہلے تو یہی پتہ نہیں کہ ہم کہاں ہوں گے؟ اگر جنت میں چلے بھی گئے تو آپ تو جنت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں گے، اور ہم آپ سے بہت دور ہوں گے، اس وقت آپ کی ملاقات کے بغیر ہمارا گزارہ کیسے ہوگا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ) ''آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہوگی۔''

(درمنثور ج:۲ ص:۱۸۲، معالم التنزیل ج:۱ ص:۴۵۰)

یعنی کسی فکر کی ضرورت نہیں انشاءاللہ جنت میں بھی ساتھ ہوں گے۔

اس حدیث میں بڑی بشارت اور خوشخبری ہے ان لوگوں کے لئے جو حضور ﷺ، صحابہ کرامؓ اور اکابرین علماءِ امت سے محبت کرتے ہیں، کہ جنت میں آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے دنیا میں اس کو محبت تھی۔

ہماری محبت کا محور:

اس لئے ہماری محبت کا محور آنحضرت ﷺ کی ذات، آپ ﷺ کی سیرت وسوانح اور اسوۂ حسنہ ہونا چاہئے، اگر جنت میں حضور ﷺ کے ساتھ جانا چاہتے ہو تو اپنی شکل، شباہت، وضع قطع اور لباس پوشاک حضور ﷺ جیسی بناؤ، میرے بھائیو!

داڑھیاں مونڈنا بند کردو، یہ گناہ کبیرہ ہے، اور گناہ کبیرہ کرنے والے کو حضور ﷺ کی معیت نصیب نہیں ہوگی، اور حضور ﷺ ایسے کسی شخص کے سلام کا جواب نہیں دیتے جو داڑھی مونڈتا ہے، بلکہ اس سے اعراض فرما کر اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

داڑھی منڈوانے والے کو حضورؐ سلام کا جواب نہیں دیتے:

مدینہ منورہ میں ایک بزرگ رہتے ہیں، انہوں نے مجھے بتایا کہ یہاں ایک بزرگ ہیں جن کو بارگاہ نبوت میں حاضری اور ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے (ہاں اب بھی اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جن کو یہ شرف حاصل ہوتا ہے)، انہوں نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ دنیا کی زندگی میں تو آپ کا معمول مبارک تھا کہ اگر کوئی شخص گناہ کرکے آپ کے پاس آتا اور سلام کرتا تو آپ (ﷺ) اس سے منہ پھر لیتے تھے، اگر وہ دائیں جانب سے آتا تو آپ ﷺ بائیں جانب منہ پھیر لیتے، وہ اگر بائیں جانب سے آتا تو آپ ﷺ دائیں جانب منہ پھیر لیتے، اب آپ ﷺ کا معمول مبارک کیا ہے؟ جب کہ لوگ داڑھیاں مونڈ کر آپ ﷺ کے روضۂ اطہر پر سلام پیش کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میرا اب بھی وہی معمول ہے کہ میں ایسے لوگوں کے سلام کا جواب نہیں دیتا۔

کتنی بڑی محرومی کی بات ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں حاضری ہو، اور آپ ﷺ ہمارے سلام کا جواب نہ دیں، دعویٰ ہے حضور ﷺ کی محبت کا، مگر شکل ہے انگریزوں اور یہود و نصاریٰ جیسی، آج کے بعد وعدہ کرو کہ ڈاڑھی نہیں کاٹیں گے، کالرنہیں لگائیں گے، اے اللہ محض اپنے فضل و کرم سے جنت میں ہمیں حضور ﷺ کی معیت نصیب فرما، بھائی محض اس کے فضل سے ہی نجات ہوگی۔

ایک اسرائیلی زاہد کا قصہ:

مستدرک حاکم میں ایک بنی اسرائیلی عابد کا قصہ بایں الفاظ منقول ہے:

"عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ خَرَجَ مِنْ عِنْدِیْ خَلِیْلِیْ جِبْرِیْلُ آنِفًا فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ! وَالَّذِیْ بَعَثَکَ بِالْحَقِّ اِنَّ لِلّٰهِ عَبْدًا مِنْ عَبِیْدِهٖ عَبَدَ اللّٰهَ تَعَالٰی خَمْسُ مِائَةِ سَنَةٍ عَلٰی رَأْسِ جَبَلٍ فِیْ الْبَحْرِ عَرْضُهٗ وَطُوْلُهٗ ثَلاثُوْنَ ذِرَاعًا فِیْ ثَلاثِیْنَ ذِرَاعًا وَالْبَحْرُ مُحِیْطٌ بِهٖ أَرْبَعَةَ آلَافِ فَرْسَخٍ مِّنْ کُلِّ نَاحِیَةٍ وَأَخْرَجَ اللّٰهُ تَعَالٰی لَهٗ عَیْنًا عَذْبَةً بِعَرْضِ الْاُصْبُعِ تَبِضُّ بِمَاءٍ عَذْبٍ فَتَسْتَنْقِعُ فِیْ أَسْفَلِ الْجَبَلِ وَشَجَرَةُ رُمَّانٍ تَخْرُجُ لَهٗ کُلَّ لَیْلَةٍ رُمَّانَةً فَتُغْذِیْهِ یَوْمِهٖ فَاِذَا أَمْسٰی نَزَلَ فَأَصَابَ مِنَ الْوُضُوْءِ وَأَخَذَ تِلْکَ الرُّمَّانَةَ فَأَکَلَهَا ثُمَّ قَامَ لِصَلَاتِهٖ فَسَأَلَ رَبَّهٗ عَزَّ وَ جَلَّ عِنْدَ وَقْتِ الْأَجَلِ أَنْ یَقْبِضَهٗ سَاجِدًا وَأَنْ لَّا یَجْعَلَ لِلْأَرْضِ وَلَا لِشَیْءٍ یُّفْسِدُهٗ عَلَیْهِ سَبِیْلًا حَتّٰی یَبْعَثَهٗ وَهُوَ سَاجِدٌ قَالَ فَفَعَلَ فَنَحْنُ نَمُرُّ عَلَیْهِ اِذَا هَبَطْنَا وَاِذَا عَرَجْنَا فَنَجِدُ لَهٗ فِیْ الْعِلْمِ أَنَّهٗ یُبْعَثُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَیُوْقَفُ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَیَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ أَدْخِلُوْا عَبْدِیْ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِیْ فَیَقُوْلُ رَبِّ بَلْ بِعَمَلِیْ فَیَقُوْلُ الرَّبُّ أَدْخِلُوْا عَبْدِیْ الْجَنَّةَ

بِرَحْمَتِیْ فَیَقُوْلَ یَا رَبِّ بَلْ بِعَمَلِیْ فَیَقُوْلُ الرَّبُّ أَدْخِلُوْا عَبْدِیْ الْجَنَةَ بِرَحْمَتِیْ فَیَقُوْلَ رَبِّ بَلْ بِعَمَلِیْ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ لِلْمَلٰئِکَةِ قَایِسُوْا عَبْدِیْ بِنِعْمَتِیْ عَلَیْهِ وَبِعَمَلِهِ فَتُوْجَدُ نِعْمَةُ الْبَصَرِ قَدْ أَحَاطَتْ بِعِبَادَةِ خَمْسِ مِائَةِ سَنَةٍ وَبَقِیَتْ نِعْمَةُ الْجَسَدِ فَضْلًا عَلَیْهِ فَیَقُوْلُ أَدْخِلُوْا عَبْدِیْ النَّارَ، قَالَ فَیُجَرُّ اِلٰی النَّارِ فَیُنَادِیْ رَبِّ بِرَحْمَتِکَ أَدْخِلْنِیْ الْجَنَّةَ فَیَقُوْلُ رُدُّوْهُ فَیُوْقَفُ بَیْنَ یَدَیْهِ فَیَقُوْلُ یَا عَبْدِیْ! مَنْ خَلَقَکَ وَلَمْ تَکُ شَیْئًا؟ فَیَقُوْلُ أَنْتَ یَا رَبِّ، فَیَقُوْلُ کَانَ ذٰلِکَ مِنْ قِبَلِکَ أَوْ بِرَحْمَتِیْ؟ فَیَقُوْلَ بَلْ بِرَحْمَتِکَ، فَیَقُوْلُ مَنْ قَوَّاکَ لِعَبَادَةِ خَمْسِ مِائَةِ عَامٍ؟ فَیَقُوْلُ أَنْتَ یَا رَبِّ، فَیَقُوْلُ مَنْ أَنْزَلَکَ فِیْ جَبَلٍ وَسْطَ اللُّجَّةِ وَأَخْرَجَ لَکَ الْمَاءَ الْعَذْبَ مِنَ الْمَاءِ الْمَالِحِ وَأَخْرَجَ لَکَ کُلَّ لَیْلَةٍ رُمَّانَةً وَاِنَّمَا تَخْرُجُ مَرَّةً فِیْ السَّنَةِ وَسَأَلْتَنِیْ أَنْ أُقْبِضَکَ سَاجِدًا فَفَعَلْتُ ذٰلِکَ بِکَ فَیَقُوْلَ أَنْتَ یَا رَبِّ فَقَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فَذٰلِکَ بِرَحْمَتِیْ وَبِرَحْمَتِیْ أُدْخِلُکَ الْجَنَّةَ. أَدْخِلُوْا عَبْدِیْ الْجَنَّةَ. فَنِعْمَ الْعَبْدُ کُنْتَ یَا عَبْدِیْ فَیُدْخِلُهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ قَالَ جِبْرِیْلُ عَلَیْهِ السَّلَامُ اِنَّمَا الْأَشْیَاءُ بِرَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی یَا مُحَمَّدُ. هٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحُ الْأَسْنَادِ.'' (مستدرک ج:۴ ص:۲۵۰)

ترجمہ:......''حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے

کہ ایک دن آنحضرت ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ ابھی حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے بتلا کر گئے ہیں کہ: اے محمد (ﷺ) قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، اللہ کے نیک بندوں میں سے ایک ایسا بندہ تھا جس نے پانچ سو سال تک بیچ سمندر کے ایک ایسے پہاڑ پر جس کا طول و عرض نو سو ذراع تھا، اور جس کے چاروں طرف چار چار ہزار فرسخ کی مسافت تک پانی تھا، پانچ سو سال تک اللہ کی عبادت کی، وہاں اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک انگشت برابر میٹھا چشمہ جاری فرما دیا تھا، جس سے وہ پانی پیتا اور دامن پہاڑ میں انار کا ایک درخت اگا دیا تھا، جس پر ہر رات ایک انار لگ جاتا، جو اس کی غذا کا کام دیتا، جب شام ہوتی تو وہ اپنی عبادت کی جگہ سے اتر کر اسے توڑتا، اور کھا لیتا اور نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا۔

جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے دعا کی کہ یا اللہ! سجدہ کی حالت میں میری روح قبض کی جائے، اور یہ کہ میرا بدن گلنے سڑنے سے محفوظ رہے، اور قیامت کے دن مجھے سجدے ہی کی حالت میں اٹھایا جائے...... چنانچہ اس کی یہ دونوں دعائیں قبول کی گئیں...... جب قیامت کے دن اسے اٹھایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی پیشی ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمادیں گے کہ: میرے بندے کو میری رحمت سے جنت

میں داخل کردو۔ مگر وہ کہے گا: نہیں، بلکہ میرے اعمال کی بدولت! یعنی میں نے جو پانچ سو سال تک رات دن عبادت کی تھی، اس کے بدلے میں مجھے جنت ملنی چاہئے، اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماویں گے کہ میرے بندے کے اعمال اور میری نعمتوں کا حساب لگاؤ، پس جب حساب لگایا جائے گا تو پانچ سو سال کی عبادت صرف بینائی کی نعمت کا بدلہ ثابت ہوگی، جب کہ جسم اور جسم کی دوسری تمام نعمتوں کا حساب اس کے ذمہ باقی ہوگا، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے بندے کو جہنم میں ڈال دو، چنانچہ اسے آگ کی طرف کھینچ کر لے جایا جارہا ہوگا کہ وہ آواز دے گا: ''اے اللہ! محض اپنی رحمت سے مجھے جنت میں داخل فرمادیجئے۔'' اس پر اللہ تعالیٰ فرماویں گے میرے بندے کو واپس لاؤ، جب اسے واپس لایا جائے گا اور بارگاہ الٰہی میں لاکھڑا کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرماویں گے:

اے میرے بندے! تمہیں کس نے پیدا کیا؟ حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے؟ وہ کہے گا یا اللہ آپ نے ہی پیدا فرمایا! پھر فرماویں گے یہ میری رحمت سے ہوا، یا تیرے مطالبہ پر؟ وہ کہے گا محض تیری رحمت سے، پھر فرماویں گے: تجھے پانچ سو سال تک عبادت کی قوت و طاقت اور توفیق کس نے دی؟ کہے گا اے اللہ آپ نے! پھر فرماویں گے کہ وسط سمندر میں اس پہاڑ پر آپ کو کس نے بٹھایا؟ وہاں کڑوے پانی کے بیچ میں میٹھا چشمہ کس

نے جاری کیا؟ ہر رات انار کون لگا تا تھا؟ آپ نے سجدے کی حالت میں روح قبض کرنے کی دعا کی اور قبول کی گئی، یہ سب کچھ کس نے کیا؟ وہ کہے گا یا اللہ آپ ہی نے کیا! پس اللہ تعالیٰ فرماویں گے (جس طرح) یہ سب کچھ میری رحمت سے تھا، اسی طرح آج بھی میں اپنی رحمت سے آپ کو جنت میں داخل کرتا ہوں۔ اور حکم ہوگا کہ میرے بندے کو میری رحمت سے جنت میں داخل کردو، پھر اللہ تعالیٰ فرماویں گے اے میرے بندے! تم میرے اچھے بندے تھے، پس اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمادیں گے۔ حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا یا محمد (ﷺ) سب چیزیں اللہ کی رحمت سے ہوتی ہیں۔''

اور بعض روایتوں میں کسی قدر فرق سے یوں آتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک عابد و زاہد تھا جس نے پانچ سو سال اس طرح عبادت کی کہ درمیان میں کبھی کوئی گناہ نہیں کیا، جب اس کا انتقال ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا: جا میری رحمت سے جنت میں چلا جا، اس نے عرض کیا: یا اللہ پانچ سو سال اس طرح عبادت کی کہ درمیان میں کبھی کوئی گناہ نہیں کیا، میری پیشانی سجدوں سے گھس گئی اور آپ فرماتے ہیں کہ: ''میری رحمت سے جنت میں چلا جا''، کیا میرے ان اعمال اور نیکیوں کی کوئی قیمت نہیں؟ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے، ذرا اس کو جہنم کی طرف لے جاؤ، فرشتے لے جائیں گے، راستہ میں ایک فرشتہ پانی لے کر کھڑا ہوگا، پانچ سو سال کے عبادت والے زاہد کو پیاس محسوس ہوگی، وہ اس فرشتہ سے کہے گا کہ آپ مجھے پانی پلا سکتے ہیں؟ وہ کہے گا کیوں نہیں! مگر قیمتاً، عابد کہے گا کیا قیمت ہے اس کی؟ فرشتہ عرض

کرے گا: ایک گلاس، پانچ سو سال کی عبادت کے عوض، اتنے میں پیاس کا غلبہ اس قدر شدید ہوگا کہ جان نکلنے کو آجائے گی، اور وہ پانچ سو سال کی عبادت دے کر ایک گلاس پانی پی لے گا۔

ملائکہ اسے واپس لائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے دے آئے پانچ سو سال کی نیکیاں؟ اور وہ بھی صرف ایک گلاس پانی کے عوض؟ دنیا میں تو نے میرے کتنے گلاس پانی پیے تھے؟ اور کیا کیا نعمتیں تم نے استعمال کی تھیں؟ ذرالاؤ تو ان کا حساب؟ وہ عابد خاموش ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جا میری رحمت سے جنت میں چلا جا۔

جنت و مغفرت اللہ کے فضل و کرم سے:

تو بھائی بات دراصل یہ ہے کہ جنت و مغفرت تو محض اللہ کے فضل اور رحم و کرم سے ہے، ہمارے پاس ایسے کوئی اعمال تو ہیں نہیں کہ جن کو پیش کر سکیں، البتہ ہم جنت میں جانے اور حضور ﷺ کی معیت حاصل کرنے کے لئے کم از کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ گناہوں کو چھوڑ دیں، ارے اپنی شکل وشباہت اور وضع قطع حضور ﷺ جیسی بنالیں، انشاءاللہ ہماری اس تھوڑی سی محنت، تبدیلی اور پیش قدمی سے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کو ہماری طرف متوجہ فرمادیں گے اور ہمیں انشاءاللہ جنت میں حضور ﷺ کی معیت نصیب ہوگی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضور اقدس ﷺ کے صحابی ہیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے سب سے زیادہ احادیث کو نقل کرنے والے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، ان کے داماد تھے حضرت سعید ابن

المسیب رحمہ اللہ ان کو سید التابعین کہا جاتا ہے، یعنی تابعین کے سردار، تابعی اس کو کہتے ہیں جس نے صحابہ کو دیکھا ہو اور صحابی اس کو کہتے ہیں جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو۔

قابلِ مبارک:

آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

"طُوْبیٰ لِمَنْ رَاٰنِیْ وَاٰمَنَ بِیْ وَمَنْ رَاٰی مَنْ رَاٰنِیْ
وَمَنْ رَاٰی مَنْ رَاٰی مَنْ رَاٰنِیْ." (مجمع الزوائد ج:۱۰ ص:۲۰)

مبارک ہو اس شخص کو جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا، اور مبارک ہو اس شخص کو جس نے میرے دیکھنے والوں کو دیکھا، اور مبارک ہو اس شخص کو جس نے میرے دیکھنے والوں کے دیکھنے والوں کو دیکھا، یہ تین زمانے "خیر القرون" کہلاتے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ کا زمانہ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا زمانہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھنے والے "تابعین" کا زمانہ اور تابعین کو دیکھنے والے "تبع تابعین" کا زمانہ، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "ثُمَّ یَفْشُو الْکَذِب." پھر جھوٹ پھیل جائے گا، یہ تین زمانے بہت مبارک زمانے ہیں۔

روضہ اطہر سے اذان کی آواز:

بہرحال! حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے داماد ہیں، حضرت سعید ابن المسیبؒ۔ یزید کے زمانے میں یزید کی فوجوں کی وجہ سے تین دن مسجد نبوی (علیٰ صاحبہ الف الف تحیۃ وسلام) میں جماعت نہیں ہوسکی تھی، اور مسجد میں صرف ایک آدمی تھے

اور وہ سعید بن المسیب ہی تھے، باقی کوئی مسجد میں نہیں آتا تھا، یعنی کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی، یزید کی فوج کے سپاہی آئے، ان سے کہنے لگے: بڈھے تو کیسے بیٹھا ہے؟ وہ آئیں بائیں کرنے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی پاگل ہے، دوسرے نے کہا کہ: یار رہنے دو اس کو، بیچارہ کوئی معذور آدمی ہے، یہ پتہ نہیں ہے کہ یہ تمام تابعین کا سردار ہے۔

حضرت سعید ابن المسیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب نماز کا وقت ہوتا تھا تو:

"فَكُنْتُ اِذَا حَانَتِ الصَّلَاةُ اَسْمَعُ اَذَانًا يَّخْرُجُ مِنْ قِبَلِ الْقَبْرِ حَتّٰى اَمِنَ النَّاسُ." (ابن سعد ج:۵ ص:۱۳۲)

ترجمہ: جب نماز کا وقت قریب ہوتا، تو مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے اذان کی آواز سنائی دیتی تھی، اور میں اس پر نماز پڑھتا تھا، تین دن نہ کھایا، نہ پیا، نہ باہر جانے کی ضرورت پیش آئی، ایسے عجیب آدمی تھے، خیر! ترمذی شریف میں ہے:

جنت کا بازار:

"عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّهُ لَقِيَ أَبَاهُرَيْرَةَ فَقَالَ أَبُوْهُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: أَسْأَلُ اللّٰهَ أَنْ يَّجْمَعَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ فِيْ سُوْقِ الْجَنَّةِ. فَقَالَ سَعِيْدٌ: أَفِيْهَا سُوْقٌ؟ قَالَ: نَعَمْ...... ثُمَّ يُؤْذَنُ فِيْ مِقْدَارِ يَوْمِ الْجُمُعَةِ مِنْ أَيَّامِ الدُّنْيَا......الخ." (ترمذی ج:۲ ص:۷۸)

ترجمہ:......"حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ سے

روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے ملاقات کی تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: سعید! دعا کرو! اللہ تعالیٰ ہمیں جنت کے بازار میں جمع کردے، وہ کہنے لگے کہ: حضرت! جنت میں بازار ہوگا؟ فرمایا: ہاں! جنت میں بازار ہوگا، جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ جامع مسجد میں لوگوں کو جمع فرمالیں گے۔''

جنت میں جمعہ کا خطاب:

اب تم خود سوچو، وہ کتنی بڑی جامع مسجد ہوگی، جس میں تمام اہل جنت جمع ہوجائیں گے؟ اور آپ جانتے ہیں کہ جمعہ کے دن خطیب خطبہ دیا کرتا ہے، اور خطبہ سے پہلے ہمارے یہاں تھوڑی سی تقریر بھی ہوتی ہے، میں ادھر ڈنڈی کی طرف گیا تھا یعنی کئی سال ہوگئے ہیں کہ مجھے بھیجا گیا کہ تم وہاں جمعہ پڑھا دینا، میں نے پوچھا کہ: تقریر کتنی ہوگی؟ کہنے لگے کہ جی پندرہ منٹ!...... ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' اتنی دور سے تو میں گیا، ان لوگوں کی زیارت کے لئے اور منٹ صرف پندرہ دیئے گئے، مجھے افسوس بھی ہوا لیکن افسوس اس اعتبار سے ٹل گیا کہ یہ بیچارے مشغول لوگ ہیں، ان کی یہی بڑی مہربانی ہے کہ یہاں مسجد میں آجائیں تو غرضیکہ! جنت میں اللہ تعالیٰ تمام اہل جنت کو جمعہ کے دن جمع کریں گے۔

جنت کی روشنی:

یہاں یہ بات یاد رکھو کہ دن رات کا یہاں جو نظام ہے، وہ وہاں نہیں ہوگا، وہاں دن نہیں ہوگا، رات نہیں ہوگی، ایک خاص روشنی ہوگی جو ہمیشہ ہی رہا کرے گی جیسے کہ سورج نکلنے سے چند لمحہ پہلے روشنی ہوتی ہے، نہ دن ہوتا ہے، نہ رات ہوتی ہے،

جنت میں نہ دن ہوگا، نہ رات ہوگی، لیکن روشنی ہوگی۔

بعض علماءؒ نے فرمایا ہے کہ: جنت جنتیوں کے انوار کی وجہ سے روشن ہوگی، جنتی اتنے نورانی ہوں گے کہ اس کے بعد کسی روشنی کی ضرورت نہیں ہوگی۔

تو جنت کے اندر دن اور رات کا نظام تو ہوگا نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی نظام بنایا ہوگا، جس سے معلوم ہوگا کہ کس کام کو اتنے دن ہوگئے ہیں، اتنے دن رہتے ہیں۔

بہرحال! جمعہ کے دن یعنی ساتویں دن اللہ تعالیٰ تمام اہل جنت کو دعوت دیا کریں گے، یہاں تو ہمارے خطیب خطبہ دیتے ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیتے ہیں، خطیب صاحب کا خطبہ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور جنت میں جس میدان کی میں بات کررہا ہوں اور جس ''جامع مسجد'' کی میں بات کررہا ہوں، اس میں براہ راست اللہ تعالیٰ خطبہ دیا کریں گے، حق تعالیٰ شانہ خطبہ دیں گے، ایک روایت میں آتا ہے کہ:

''وَلَا يَبْقٰى فِيْ ذَالِكَ الْمَجْلِسِ رَجُلٌ اِلَّا حَاضَرَهُ اللّٰهُ مُحَاضَرَةً.'' (ترمذی ج:۲ ص:۷۸)

ترجمہ:...... ''اس مجلس کا کوئی آدمی باقی نہیں رہے گا مگر اللہ تعالیٰ اس سے آمنے سامنے کلام فرمائیں گے۔''

یعنی ایک ایک آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ گفتگو فرمائیں گے، اب کروڑہا کروڑ آدمی جمع ہوں گے لیکن ''لَايَشْغَلُهٗ شَأْنٌ عَنْ شَأْنٍ.'' اللہ تعالیٰ کو ایک شان دوسری شان سے مشغول نہیں کرتی، جیسے کہ یہاں بھی اس کے بندے تو بہت ہیں مگر کوئی اس کو مشغول نہیں کرسکتا۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہاں ہمیں کون پوچھے گا؟ لیکن

پھر خیال آتا ہے نہیں! اگر اللہ تعالیٰ ہمیں اس وقت نہیں بھولے جب کہ ہم اپنی ماں کے پیٹ میں تھے تو اس وقت بھی نہیں بھولیں گے جب ہم ماں کے پیٹ میں چلے جائیں گے، ایک ماں وہ تھی جس نے ہمیں جنا اور ایک ماں وہ ہے جس نے ہمیں اپنی آغوش میں لیا (مرنے کے بعد)۔

ایک روایت میں ہے کہ: اللہ تعالیٰ اندھیری رات میں جب کہ مکمل سکون ہوتا ہے اور کوئی آہٹ نہیں ہوتی، کوئی آواز نہیں آتی، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ ''بھوری'' یعنی چھوٹی سی چیونٹی کے چلنے کی آواز سنتے ہیں۔

ایک بزرگ نے کہا کہ: یا اللہ! آپ ان چیزوں کو کیسے جانتے ہیں؟ فرمایا اس پتھر کو توڑو، پتھر توڑا گیا، اس کے اندر ایک اور پتھر نکلا، اس کو توڑا گیا، ایک اور پتھر نکلا، اس کو توڑا گیا، ایک اور پتھر نکلا اور ان تمام پتھروں کے درمیان سے ایک کیڑا نکلا جس کے منہ میں سبز پتا تھا، اللہ تعالیٰ کسی کو بھی نہیں بھولتے۔

تو حق تعالیٰ شانہ تمام اہل جنت سے اور ہر ایک سے خطاب فرمائیں گے، اس خطاب کی تفصیلات آتی ہیں مگر میں اس کو چھوڑتا ہوں، چنانچہ حدیث میں ہے:

''وَیَقُوْلُ رَبُّنَا قُوْمُوْا اِلٰی مَا أَعْدَدْتُّ لَکُمْ مِنَ الْکَرَامَةِ فَخُذُوْا مَا اشْتَهَیْتُمْ فَنَأْتِیْ سُوْقًا...... فَیُحْمَلُ اِلَیْنَا مَا اشْتَهَیْنَا لَیْسَ یُبَاعُ فِیْهَا وَلَا یُشْتَرٰی ......الخ.''

(ترمذی ج:۲ ص:۷۸)

یعنی پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ: تم مہمان آئے ہو، مہمان کا حق ہوتا ہے کہ اس کا اکرام کیا جائے، اس کی دعوت کی جائے، ہم نے تمہارے لئے یہ ایک بازار لگایا ہے، (وہاں ایک بازار لگا ہوا ہوگا) اس میں جو چیز تمہیں پسند آتی ہے لے لو!

اس کے پیسے ہمارے ذمہ ہیں ہم نے پیسے ادا کردئے، گویا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے وہ ہوگا، پیسے اس کے کیا ہونگے؟ یوں آتا ہے کہ:

"فَتُوْضَعُ لَهُمْ مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ وَمَنَابِرَ مِنْ لُؤْلُؤٍ وَمَنَابِرَ مِنْ يَاقُوْتٍ وَمَنَابِرَ مِنْ زَبَرْجَدٍ وَمَنَابِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَمَنَابِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَيَجْلِسُ أَدْنَاهُمْ وَمَا فِيْهِمْ مِنْ دَنِيٍّ عَلٰى كُثْبَانِ الْمِسْكِ وَالْكَافُوْرِ مَايُرَوْنَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَرَاسِيِّ بِأَفْضَلَ مِنْهُمْ مَجْلِسًا......الخ."

(ترمذی ج:۲ ص:۸۱)

اہل جنت کا اعزاز:

اس میدان میں جب لوگ جمع ہوں گے، کچھ لوگ یاقوت کے ممبروں پر ہوں گے، کچھ لوگ زمرد کے ممبروں پر ہوں گے کچھ ایسے اور کچھ ایسے، درجہ بدرجہ ہوں گے یہاں تک کہ بعض لوگ کستوری کے ٹیلوں پر بیٹھے ہوں گے، اور کچھ نیچے بیٹھے ہوں گے، اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ان میں سے کوئی بھی گھٹیا نہیں ہوگا، جو وہ نیچے بیٹھے ہوں گے، وہ یہ سمجھیں گے کہ ہم سب سے اونچے بیٹھے ہیں، آگے فرمایا:

"وَفِيْ ذَالِكَ السُّوْقِ يَلْقٰى أَهْلُ الْجَنَّةِ بَعْضُهُمْ بَعْضًا قَالَ فَيُقْبِلُ الرَّجُلُ ذُوالْمَنْزِلَةِ الْمُرْتَفِعَةِ فَيَلْقٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهُ وَمَا فِيْهِمْ دَنِيٌّ فَيَرُوْعُهُ مَايَرٰى عَلَيْهِ مِنَ اللِّبَاسِ فَمَا يَنْقَضِي آخِرُ حَدِيْثِهٖ حَتّٰى يَتَخَيَّلَ عَلَيْهِ مَا هُوَ أَحْسَنُ مِنْهُ."

(ترمذی ج:۲ ص:۷۸)

ایک جنتی دوسرے جنتی سے ملے گا، وہاں بھی ملاقاتیں ہوں گی، سارے جنتی جمع ہوں گے، جیسے اہل محلّہ جمع ہو جائیں تو ایک دوسرے سے مزاج پرسی کرتے ہیں، اہل جنت جمع ہوں گے تو ایک اونچے درجے کا جنتی ہوگا اور ایک نیچے درجے کا جنتی ہوگا، اب ظاہر ہے کہ دونوں کے درمیان فرق تو ہوگا ہی!، ان کے لباس میں بھی فرق ہوگا اور دوسری چیزوں میں بھی فرق ہوگا، اس نیچے درجے والے جنتی کے دل میں خیال آجائے گا کہ میرے کپڑے گھٹیا ہیں، ان کے کپڑے بڑھیا ہیں، اس خیال کا آنا ہوگا کہ یکایک اس کو ایسا محسوس ہوگا کہ میرے کپڑے اس سے زیادہ قیمتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت میں کسی کو غم نہیں ہوگا، کسی کو رشک نہیں ہوگا، کسی کو کسی پر حسد نہیں ہوگا اور کوئی کسی کو دیکھ کر جلے گا نہیں کہ اس کے پاس نعمت ہے، میرے پاس کیوں نہیں ہے، یہ جنتی اس بازار میں جائیں گے اور جو چیز ان کو پسند آئے گی اس کی طرف اشارہ فرمادیں گے، فرشتے ان کو وہاں پہنچادیں گے، ان کے مکان پر پہنچادیں گے، اور وہ مکان ان کے ایسے نہیں ہوں گے جیسے تم نے سمجھے ہوں گے بلکہ ایک مکان دوسرے مکان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

جنت کے درجات:

مشکوٰۃ میں ہے:

”عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ أَنَّ الرَّبِیْعَ بِنْتَ الْبَرَاءِ وَھِیَ أُمُّ حَارِثَۃَ بْنِ سُرَاقَۃَ أَتَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَلَا تُحَدِّثُنِیْ عَنْ حَارِثَۃَ وَکَانَ قُتِلَ یَوْمَ بَدْرٍ اَصَابَہٗ سَھْمٌ غَرْبٌ فَاِنْ کَانَ فِی الْجَنَّۃِ صَبَرْتُ وَاِنْ کَانَ غَیْرَ ذَالِکَ اجْتَھَدْتُ عَلَیْہِ فِی الْبُکَاءِ.

فَقَالَ یَا أُمَّ حَارِثَةَ اِنَّهَا جِنَانٌ فِی الْجَنَّةِ وَاِنَّ ابْنُکِ أَصَابَ الْفِرْدَوْسَ الْاَعْلٰی.“ (مشکوٰۃ ص:۳۳۱)

ترجمہ:......”ربیع بنت براءؓ جو حارثہ بن سراقہ کی ماں ہیں، ان کا بچہ شہید ہوگیا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی کہنے لگیں: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا بچہ شہید ہوگیا ہے۔ آپ کے ساتھ جہاد میں تھا، مجھے پتہ چل جائے کہ وہ جنت میں گیا ہے تو میں صبر کروں، اور خدانخواستہ دوسری طرف چلا گیا تو پھر میں اپنے بیٹے پر رونے کا حوصلہ نکال لوں...... (ماں کا اولاد کے ساتھ یہی تعلق ہوتا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ام حارثہ ایک جنت نہیں کئی جنتیں ہیں، اور تیرا بیٹا فردوس اعلیٰ میں ہے۔“

دوسری حدیث میں ہے:

”فَاِنَّ فِی الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ مَا بَیْنَ کُلِّ دَرَجَتَیْنِ کَمَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَالْفِرْدَوْسُ أَعْلَی الْجَنَّةِ وَأَوْسَطُهَا وَفَوْقَ ذَالِکَ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ ...... وَاِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْئَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ......الخ.“ (ترمذی ج:۲ ص:۷۶)

ترجمہ:......”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ ایک جنت نہیں ہے! سو جنتیں اوپر نیچے ہیں، اور ہر جنت کا فاصلہ اتنا ہے جتنا کہ زمین کا فاصلہ آسمان تک، اور سب سے اوپر جنت الفردوس ہے اور اس کی چھت اللہ کا عرش ہے، اس کا

سائبان اللہ کا عرش ہے۔ جب تم اللہ سے جنت مانگو تو جنت الفردوس مانگا کرو، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرمائے۔"

اسی طرح ترمذی شریف میں ہے:

"ثُمَّ نَنْصَرِفُ اِلٰی مَنَازِلِنَا فَتَلَقَّانَا أَزْوَاجُنَا، فَيَقُلْنَ مَرْحَبًا وَّأَهْلًا! لَقَدْ جِئْتَ وَاِنَّ لَکَ مِنَ الْجَمَالِ أَفْضَلَ مِمَّا فَارَقْتَنَا عَلَيْهِ. فَنَقُوْلُ اِنَّا جَالَسْنَا الْيَوْمَ رَبَّنَا الْجَبَّارُ وَيَحِقُّنَا اَنْ نَنْقَلِبَ بِمِثْلِ مَا انْقَلَبْنَا." (ترمذی ج:۲ ص:۷۸)

تو تمام جنتی اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے، اور فرشتے سامان ان کے گھروں کو پہنچادیں گے، ان کی بیویاں ان کو دیکھیں گی، کہیں گی تم اتنے حسین کیوں ہوگئے ہو؟ یہ کہیں گے کہ ہمیں تو حسین ہونا ہی چاہئے، اس لئے کہ ہم اللہ رب العالمین کے پاس بیٹھ کر آئے ہیں، یہ اہل جنت کا ایک نقشہ ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرمائے لیکن:

بہرے غفلت یہ تیری ہستی نہیں
دیکھ جنت اس قدر سستی نہیں

ہم نے تو یوں سمجھا ہے کہ یہاں بھی اپنی من مانی کرتے رہیں گے، آگے ہمارے لئے جنت بنی بنائی ہے، نہ بھائی! ایسا نہیں!!، محنت کرنی ہوگی، محنت یہاں نہیں کروگے تو پھر اللہ تعالیٰ وہاں محنت کروائیں گے!

دنیا محنت کی جگہ ہے:

یوں آتا ہے کہ: جس نے دنیا میں محنت کی، اللہ کے سامنے توبہ تائب کی،

اللہ کے سامنے روتا رہا، معافیاں مانگتا رہا، اور ڈرتا رہا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو ڈر سے محفوظ رکھیں گے، ہاں بھائی اللہ تعالیٰ کے سامنے کرتے جاؤ اور ڈرتے جاؤ، تمام احکام الٰہی جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ بھیجے ہیں، وہ میرے اور آپ کے لئے ہی ہیں، سکھوں اور ہندوؤں کے لئے نہیں ہیں، اگر ہم رسول اللہ ﷺ والے اعمال کو درخور اعتنا نہ سمجھیں، ان کی طرف توجہ نہ فرمائیں، اپنی من مانی میں لگے رہیں، تو یہ احکام جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے ان پر عمل کون کرے گا؟ کیا یہ یہودیوں کے لئے ہیں؟ کیا یہ سکھوں اور ہندوؤں کے لئے ہیں؟ نہیں بھائی یہ احکام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کے لئے ہیں، اور ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' ﷺ! پڑھنے والوں کے لئے ہیں۔

اگر ہم نے اس زندگی میں محنت نہ کی، اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ نہ کی اور اپنی غلطیوں کو نہ چھوڑا تو پھر قبر میں معاملہ طے ہوگا، وہاں تو تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہوگا، یہاں تو تمہارے چار یار ہیں، اور دوسری چیزیں ہیں، وہاں تو کوئی نہیں ہوگا، اکیلے ہوں گے۔ اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں کہ:

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے!
تہہ خاک ہم تو اکیلے رہیں گے

بے شک قبر کے اوپر چادریں چڑھا لو، بہت سارے بے وقوف ہیں جو پکی قبر بناتے ہیں، حماقت کی بھی حد ہوگئی، جا کے دیکھو قبرستان میں پکی قبریں بنی ہوئی ہیں، بہت سے اوپر گنبد بنا دیتے ہیں، کیا حماقت ہے!

مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد پر اور کہنے پر عمل کرنا ہی چھوڑ دیا، جو کچھ میرے جی میں آیا میں نے کرلیا، جو تمہارے جی میں آیا تم نے کرلیا، اللہ

اللہ خیر سلا!

یوں کہتے ہیں کہ دنیا میں اپنے اعمال کی اصلاح نہ کی، توبہ نہ کی، تو پھر مرنے کے بعد قبر میں معاملہ طے ہوگا، اور اگر پھر بھی کسر پوری نہ ہوئی تو میدان حشر میں حساب برابر ہوگا، اگر پھر بھی کسر پوری نہ ہوئی تو پھر جہنم میں غوطہ دیا جائے گا۔ ''نعوذ باللہ، استغفر اللہ'' اللہ تعالیٰ معاف رکھیں۔

جنت میں تو پاک کرکے لوگوں کو لے کر جائیں گے، تو سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پاک صاف ہوجائیں، علماء موجود ہیں، مسئلے مسائل بتانے والے موجود ہیں، سب چیزیں موجود ہیں لیکن ہم نے اپنی مرضی کرنی شروع کردی ہے، پوچھ کر کے چلنا شروع ہی نہیں کیا، ہمیں کوئی کام کرنا ہوتا ہے یا کوئی فارم بھرنا ہوتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ ہمیں بتادو کس طرح بھرنا ہے؟ یہ ایک معمولی چیز ہے، مگر اس کو بھی جاننے والے سے پوچھتے ہیں اور پوچھ کر کے کرتے ہیں۔

لیکن دین کا کام اور رسول اللہ ﷺ کے احکام پر عمل کرنے کیلئے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، جو میں نے کرلیا وہ ٹھیک ہے، جو آپ نے کرلیا وہ ٹھیک ہے۔

اور اگر ہمیں کسی نے کہہ دیا کہ نہیں بھئی ایسا نہیں! تو ہم اس سے لڑ پڑیں گے چل اوے! بڑا مولوی بنا ہے! یہ ہمارے پاس جواب ہوتا ہے۔ کوئی بات نہیں تو مولویوں کو جو کچھ کہنا چاہو کہہ لو، تمہارے جی میں جو کچھ آتا ہے کہہ لو لیکن ایک وقت آنے والا ہے، ہمارے جانے کا وقت آنے والا ہے اور ہم یہاں زندہ نہیں رہیں گے، اور وہ وقت قبر کا وقت ہوگا، وہاں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا، کوئی فریاد کو پہنچنے والا نہیں ہوگا۔

عذاب قبر کا ایک واقعہ:

میں نے پرانے زمانے میں ایک کاپی لکھنی شروع کی تھی، اس میں جو واقعات عجیب وغریب ہوتے تھے اس کو لکھ لیا کرتا تھا، بعد میں یہ چیزیں چھوڑ دیں۔

ایک واقعہ اس کا مجھے یاد ہے کہ:

''ایک فوجی تھے وہ گھر آئے، گھر میں ان کی بہن کا انتقال ہوگیا، اس کو دفن کیا، جیسا کہ عام طریقہ ہے اور قبر میں ذرا ٹیڑھے ہونے لگے تو جیب سے بٹوا گر گیا، اس کو خیال نہیں رہا، بعد میں دیکھا کہ بٹوا نہیں، تب معلوم ہوا کہ قبر میں رہ گیا، قبر اکھیڑ لی، ''یہ مسئلہ یاد رکھو! کہ قبر کو دوبارہ نہ کھولو اس لئے کہ میت پر جو کچھ گزرتا ہے اس کو دیکھنا ہم برداشت نہیں کر سکتے، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائیں۔''

''تو اس فوجی نے قبر کھود لی اور اپنا بٹوا اٹھالیا، اس نے دیکھا کہ اس کی بہن کے سر کے بال اس کے پاؤں کے ساتھ باندھے ہوئے ہیں اور وہ بیٹھی ہوئی ہے، ابھی تو دفن کیا، اس خاتون کے سر کے بال پاؤں کے انگوٹھوں سے باندھے ہوئے ہیں، اس کو دیکھ کر بہت ترس آیا، اس نے چاقو لے کر کے بال کاٹ دئے اور میت دھڑام سے پیچھے گر گئی، ساتھ ہی اس سے باقاعدہ یہ آواز آئی کہ ظالم تو نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا؟''

ہمیں کیا معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے قبرستان میں؟ قبروں میں، یہاں عیش و

عشرت اڑا رہے ہیں، میت کو دفن کردیا ہمیں کوئی خیال ہی نہیں گزرتا۔

تو یوں کہتے ہیں کہ قبر کے اندر میت کو عذاب دیا جاتا ہے، اور اتنا عذاب دیا جاتا ہے، اتنا عذاب دیا جاتا ہے کہ میت اتنی چیخیں مارتی ہے کہ مشرق و مغرب کی تمام چیزیں اس کی آواز سنتی ہیں، "اَلَّا الثَّقَلَيْنِ" صرف انسان اور جنوں کے سوا۔

انسان اور جن نہیں سنتے، کیونکہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے عالم غیب رکھا ہے، ہمارے سامنے مردے پڑے ہوئے ہیں ویسے ہی، ہم کہتے ہیں ٹھیک ٹھاک ہیں۔

عذاب قبر کی مثال:

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: عذاب قبر کی مثال ایسی ہے کہ کوئی آدمی تمہارے ساتھ سویا ہوا ہو، دونوں بھائی ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے اور سوئے ہوئے ہیں، ایک جنت کی سیر کررہا ہے اور ایک دوزخ کی سیر کررہا ہے، اس کے مناظر اور ہیں، اس کے مناظر اور ہیں، امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: بالکل اسی طرح سمجھو کہ میت پر جو حالات گزرتے ہیں ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کیا حالات ہیں؟

ہمیں صرف مردہ لیٹا ہوا نظر آتا ہے کہ قبر میں ہم نے مردہ لٹادیا ختم! اور جیسا میں نے کہا کہ بعض بیوقوف اوپر پکی گنبدیں بنادیتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک نوجوان فوت ہوا، اس کے باپ نے اس پر قبہ بنادیا، میرا بھائی! باہر کے قبے کو کیا کریں گے؟ بات تو اندر کی ہے! قبر کے اندر کیا ہورہا ہے؟ اس کے لئے ہم نے کوئی انتظام نہیں کیا، جو چلے گئے ہیں ان کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا بہرحال! میں عرض کررہا تھا کہ جنت میں ایک میدان ہے، جس میں اللہ تعالیٰ اہل جنت کو جمعہ کے دن جمع کیا کریں گے، اور اس میں خود خطبہ ارشاد فرمائیں گے، اور ان

کو اس دن تحائف دیں گے، ہر ایک جنتی جو جو چیز چاہے گا، جنتیوں کے پاس تو ویسے بھی کمی نہیں ہوگی، مگر وہ جو چاہے گا وہ اس کو دے دیا جائے گا، یہ جنتیوں کا گویا جمعہ ہوگا۔

عورتوں کی اللہ سے ملاقات:

یوں کہتے ہیں کہ عورتوں کو بھی جنت میں دعوت دی جائے گی، لیکن وہ عیدین میں دی جائے گی، مردوں کو ہر جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوا کرے گی، اور اللہ تعالیٰ کی زیارت کے لئے ایک میدان میں جمع ہوا کریں گے، اور خواتین کو عید الفطر، بقر عید، دو عیدوں کے موقع پر جمع کیا جائے گا، اس میں ان کو اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوا کرے گی، اللہ تعالیٰ ہمیں اہل جنت کی نعمتوں سے نوازیں اور ہماری تمام خطاؤں لغزشوں کو معاف فرمادیں۔

میرے بھائیو! وہ وقت آنے والا ہے، یہ سارے اوقات ہم پر گزرنے والے ہیں، برزخ کے بھی حالات گزرنے والے ہیں، مرنے کے بعد اٹھنے کے، یعنی میدان محشر کے حالات ہم پر گزرنے والے ہیں، نفسا نفسی کا عالم ہوگا، وہ حالات ہم پر گزرنے والے ہیں، وہاں کوئی کسی کو نہیں پوچھے گا، کوئی کسی کی بات نہیں سنے گا، یہ حالات ہم پر گزرنے والے ہیں، کچھ اللہ کے بندے ایسے ہوں گے، جن کو بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل کردیا جائے گا۔

ایک دفعہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: کچھ اللہ کے بندے ایسے ہونگے جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں جائیں گے، رسول اللہ ﷺ نے جب یہ بات فرمائی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ) آپ کچھ اللہ تعالیٰ سے اور مانگ لیتے! ۷۰ ہزار تو جنت میں بغیر حساب و کتاب کے جائیں گے، آپ کچھ

اور مانگ لیتے! فرمایا: ہر ایک آدمی کے ساتھ ۷۰ ہزار اور..... "تم اب حساب و کتاب لگاؤ ۷۰ ہزار کو ۷۰ ہزار سے ضرب دو۔" کہا کہ: یا رسول اللہ آپ کچھ اور مانگ لیتے! فرمایا: اور بھی مانگ لیا تھا! وہ یہ مانگا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ: "وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى." "عنقریب تیرا رب تجھ کو اتنا دیگا کہ تو راضی ہو جائے گا۔

اور میں نے قسم کھالی ہے کہ میرا امتی اگر ایک بھی دوزخ میں ہوگا تو میں راضی نہیں ہوں گا، جب تک کہ میرے تمام امتیوں کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل نہیں کر دیا جاتا، میں نہیں راضی ہوں گا، مگر میرا بھائی! وہ تو اس وقت ہوگا جب کہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت ہوگی، ہم نے رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کا مذاق اڑایا تو وہ ہماری شفاعت کیسے اور کیونکر کریں گے؟

اس لئے میں ہمیشہ کہتا ہوں، اپنے ہر بیان میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی شکل بناؤ اور ہم سے جو کوتاہیاں ہوئی ہیں، اس کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور اس بات کی اللہ سے دعا کرو کہ یا اللہ! ہمیں قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی امت میں شامل فرما اور ہم سے جو کوتاہیاں، لغزشیں ہوئی ہیں ہمیں معاف فرما۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

حضور ﷺ کی معیت حاصل کرنے کے لئے کم از کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ گناہوں کو چھوڑ دیں، ارے اپنی شکل وشباہت اور وضع قطع حضور ﷺ جیسی بنالیں، انشاءاللہ ہماری اس تھوڑی سی محنت، تبدیلی اور پیش قدمی سے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کو ہماری طرف متوجہ فرمادیں گے اور ہمیں انشاءاللہ جنت میں حضور ﷺ کی معیت نصیب ہوگی۔

زندہ اور فوت شدہ

بزرگوں کے حقوق

حضرت آدم علیہ السلام ہمارے جد امجد ہیں، سب سے بڑے ہمارے بزرگ ہیں، کیا ہم نے ان کے لئے کبھی ایصال ثواب کیا؟ ہم نے کبھی ان کے لئے رفع درجات کے لئے دعاء کی؟ کبھی ہم نے ان کے لئے ذخیرۂ آخرت بھیجا؟ آخر ان کے بھی ہم پر حقوق ہیں، ہمارے والدین جن سے ہم پیدا ہوئے، ان کے بھی ہم پر حقوق ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب نے (ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر) بہت اچھی باتیں آپ کو بتائی ہیں۔ رمضان مبارک کا مہینہ آرہا ہے، اور کم وبیش ہر سال آپ اس موضوع پر باتیں سنتے رہے ہیں، اب علماءؒ کے پاس کوئی نئی بات کہنے کی نہیں، صرف یاد دہانی کی ضرورت ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں ایک مستقل باب باندھا گیا ہے "بَابُ تَنْزِیْهِ الصَّوْمِ" جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے روزے کو پاک رکھنا۔

ترغیب وترہیب میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں دو عورتوں نے روزہ رکھا، روزہ میں اس شدت سے بھوک لگی کہ ناقابل برداشت بن گئی، وہ ہلاکت کے قریب پہنچ گئیں، صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ان کا معاملہ پیش کیا تو آپ ﷺ نے ان دونوں کے پاس ایک پیالہ بھیجا اور فرمایا کہ اس

میں قے کریں، چنانچہ حدیث میں ہے:

"فَقَالَ لِاِحْدَاهُمَا "قِيئِی" فَقَاءَتْ قَيْحًا وَدَمًا وَصَدِيْدًا وَلَحْمًا حَتّٰی مَلَأَتْ نِصْفَ الْقَدْحِ ثُمَّ قَالَ لِلْأُخْرٰی .... ثُمَّ قَالَ اِنَّ هَاتَيْنِ صَامَتَا عَمَّا أَحَلَّ اللّٰهُ لَهُمَا وَأَفْطَرَتَا عَلٰی مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا جَلَسَتْ اِحْدَاهُمَا اِلَی الْأُخْرٰی فَجَعَلَتَا تَأْكُلَانِ مِنْ لُحُوْمِ النَّاسِ."

(الترغیب والترہیب ج:۳ ص:۳۲۸)

حضور ﷺ نے ان دونوں کو قئے کرنے کا حکم فرمایا، دونوں نے قئے کی، تو اس میں پیپ، گوشت کے ٹکڑے اور تازہ کھایا ہوا خون وغیرہ نکلا، لوگوں کو حیرت ہوئی، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: انہوں نے حق تعالیٰ شانہ کی حلال روزی سے روزہ رکھا اور حرام چیزوں کو کھایا کہ دونوں عورتیں لوگوں کی غیبت کرتی رہیں۔

کسی مسلمان کی غیبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ قرآن کریم میں بھی یہ مضمون بیان فرمایا گیا ہے۔

ماشاءَ اللہ آپ کے ملک میں تو اب دن بہت چھوٹے ہوگئے اور رات بہت بڑی ہوگئی، دن اتنے چھوٹے کہ صبح ہم گلاسگو میں تھے تو آٹھ بجکر ۱۹ منٹ پر سورج نکلا، اور چار بجنے والے تھے کہ مغرب ہوگئی۔ اب چار بجے سے لے کر صبح نو بجے تک رات ہی رات ہے، اور دن چھوٹا سا، لیکن اس میں بھی ہمارے بہت سے بھائی ایسے ہوتے ہیں جو روزہ نہیں رکھتے۔

روزہ کی حفاظت:

ہمارے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے تھے کہ: ''مردوں کی نسبت عورتیں روزہ زیادہ رکھتی ہیں۔''

کسی گھر میں آپ کم دیکھیں گے کہ عورتیں روزہ رکھنے والی نہ ہوں، مرد تو کوتاہی کر لیتے ہیں، سستی کر لیتے ہیں، لیکن عورتیں نہیں کرتیں۔ اور جن مردوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ذوق نصیب فرمایا ہے، وہ بھی اس میں کوتاہی نہیں کرتے۔ گرمیوں کے موسم میں آپ کے یہاں بائیس گھنٹہ کا بھی روزہ رہا، لیکن آپ میں سے جو روزہ رکھنے والے تھے، انہوں نے ان دنوں میں بھی روزہ رکھا۔ ایک بات تو یہ ہے کہ جب آپ نے روزہ رکھ لیا، پھر اس کی حفاظت کریں۔ روزہ رکھنا تو آسان ہے لیکن محض اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے اس روزے کی حفاظت بھی کی جائے۔ حتیٰ کہ اور چیزوں کے علاوہ لغویات سے بھی پرہیز کیا جائے، فضول بات نہ کی جائے، آج ہمارے ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر اسکندر صاحب) ایک واقعہ سنا رہے تھے کہ:

> ''ایک بزرگ دوسری جگہ گئے، پوچھا کہ وہ صاحب کہاں ہیں؟ گھر والوں نے کہا نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا: کہاں گئے ہیں؟ گھر والوں نے کہا ہمیں معلوم نہیں۔ واپس آ گئے اور واپس آ کے بے تحاشا روئے کہ مجھے اس بات کے کہنے کی ضرورت کیا تھی؟ یہ میں نے لغو بات کی ہے، فضول بات کی ہے، قیامت کے دن اس کا بھی حساب ہوگا۔''

جب آپ نے روزہ رکھ لیا تو حتی الوسع جہاں تک ممکن ہو آپ کی زبان سے

کوئی لغو اور کوئی فضول کلمہ نہیں نکلنا چاہئے، رمضان المبارک میں روزہ تو آپ رکھیں گے ہی، ساتھ کے ساتھ اس روزہ کی پرورش کرنے کی ضرورت ہے، اور وہ ہوگی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے۔

جامع نصیحت:

ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، کہنے لگا: یا رسول اللہ (ﷺ) مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، لیکن بات لمبی نہ ہو، بڈھا ہوگیا ہوں بات یاد نہیں رہتی۔

آنحضرت ﷺ نے ایک ہی لفظ ارشاد فرمایا: "لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رَطَبًا مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ." (الترغیب والترہیب ج:۲ ص:۳۹۴) ہمیشہ تیری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہئے۔ چلئے سارا کچھ اس میں آ گیا۔

آنحضرت ﷺ کی ایک بات پر عمل کرلیں، "لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رُطَبًا مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ." ہمیشہ تیری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہئے۔

گپیں ہانکنا، فضول باتیں کرنا، لغو بات ہے، جو لمحہ آپ کا گزر گیا، جو وقت آپ کا گزر رہا ہے اس کو اللہ کے ذکر کے ساتھ معمور کریں۔

انسانی اعضاء زبان کی بارگاہ میں:

یہ زبان انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی چیز عطاء فرمائی ہے کہ یہ عجیب وغریب مخلوق ہے!

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ

اِذَا أَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَاِنَّ الْأَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ فَتَقُوْلُ اِتَّقِ اللّٰهَ فِيْنَا فَاِنَّا نَحْنُ بِكَ فَاِنْ اسْتَقَمْتَ اِسْتَقَمْنَا وَاِنْ أَعْوَجْتَ أَعْوَجْنَا." (مشکوٰۃ ص:۴۱۳)

ترجمہ:......"حضرت ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب صبح ہوتی ہے تو انسان کے سارے اعضاء اس کی زبان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: "فَاِنَّا نَحْنُ بِكَ." ہمارے ساتھ معاملہ ویسا ہوگا جو تو کروائے گی۔ اگر تو ٹھیک رہی تو ہم بھی ٹھیک رہیں گے اور اگر تو نے خرابی کردی تو اس کا وبال ہم پر بھی پڑے گا۔"

یہ زبان فضول بات کر کے خود تو چھپ جاتی ہے دانتوں کے درمیان، اور جوتے پڑتے ہیں سر پر، کوئی غلط بات کہی، کسی کو برا بھلا کہا، کوئی ایسی بات کہی جو نہ کہنے کی تھی، اب زبان تو چھپ گئی لیکن جوتے پڑتے ہیں دوسرے اعضاء کو، تم خود سوچو! کہ جب یہاں جوتے کھلواتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والے اعمال کر کے پھر آخرت میں بھی جوتے پڑیں گے یا نہیں؟ اس لئے اللہ تعالیٰ زبان کے جاتے کھلوانے سے بچنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

بچوں کی تربیت:

آپ ماشاء اللہ روزے رکھیں گے، اپنے اہل وعیال کو بھی روزے رکھوائیں، اپنے متعلقین کو بھی، اور اب تو چھوٹے چھوٹے بچے بھی روزے رکھتے ہیں۔ حدیث

شریف میں ہے: "مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ وَھُمْ اَبْنَاءُ سَبْعَ سِنِیْنَ. وَاضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا وَھُمْ اَبْنَاءُ عَشَرَ." (ابوداؤد ج:۱ ص:۷۱) یعنی بچوں کو نماز کا حکم کرو جبکہ وہ سات سال کے ہوں، اور اگر دس سال کے ہونے کے باوجود نماز نہ پڑھیں تو ان کی پٹائی کرو۔ اور ہم نے اس معاملہ میں اب بچوں کو آزاد کردیا ہے، خصوصاً آپ کے انگلینڈ میں، کیونکہ یہاں تو بچے کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے، فوراً پولیس کو شکایت کردے گا، ٹیلیفون کردے گا، ہمارے بچے بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئے، یہاں ہم کمانے، کھانے آئے تھے، وہ کمائی بھی ہمارے لئے پریشانی کا باعث بن گئی۔ بہت سے لوگوں سے بات سنی ہے کہ ہم مصیبت میں مبتلا ہیں، نہ واپس جاسکتے ہیں نہ یہاں رہ سکتے ہیں۔

میرا بھائی! ہم نے اپنے بچوں کی تربیت نہیں کی، تھوڑی ان پر محنت کرلیتے، اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حکم سمجھ کر محنت کرلیتے، اور خاص طور پر یہ رمضان مبارک کا مہینہ یہ جو پاک اوقات ہیں، جس میں ایک خاص ماحول ہوتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ رمضان مبارک کے مہینہ میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق معلوم ہوجاتا ہے، مسلمان کے گھر میں سحری اور افطاری کے وقت کھانا کھایا جاتا ہے، اور دوسرے سارے وقت میں ناغہ ہوتا ہے، چھوٹے بچوں کی خیر دوسری بات ہے، بچوں کو دودھ پلانا پڑتا ہے، بچوں کو روزے رکھوانا ضروری نہیں، خصوصاً جب بچہ کمزور ہو تو اس کو کہا جاتا ہے کہ بیٹا! روزہ نہ رکھو۔ لیکن اگر بچے میں صلاحیت ہو، ہمت ہو تو روزہ رکھوانا چاہئے، اور اب تو آٹھ گھنٹہ کا دن ہے، بچہ بھی بڑی آسانی کے ساتھ روزہ رکھ سکتا ہے۔ خیر میں عرض کر رہا تھا کہ ہم ان مبارک اوقات میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خزانے جتنے زیادہ سمیٹ سکتے ہیں سمیٹیں، اپنے لئے بھی، اپنے اہل وعیال کے لئے

بھی، اور ہمارے جو بزرگ فوت ہو چکے ہیں ان کے لئے بھی ایصال ثواب کریں۔

مالی ایصال ثواب:

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ (جن کی معارف القرآن یہاں بھی ہوگی) ان کے والد ماجد مولانا محمد یاسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے آخری وقت میں فرمایا تھا، اور حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کو نقل کیا ہے کہ فرماتے تھے: ''محمد شفیع! تم ملّا لوگ ہو، قرآن مجید پڑھ کر ایصال ثواب تو کر لیتے ہو، اس کی تو مجھے امید ہے تم اہتمام کرو گے، لیکن کچھ صدقہ و خیرات کے ساتھ بھی اپنے بزرگوں کا تعاون کرنا چاہئے۔'' پورا سال گزرا ہے، ہم نے اپنے بزرگوں کے لئے یا والدین کے لئے جو فوت ہو چکے ہیں، یا دوسرے بزرگوں کے لئے ہم نے کیا کیا؟ ذرا غور فرمائیں۔

حضرت آدمؑ کی شکایت:

میں نے ایک حدیث میں پڑھا ہے کہ سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام شکایت فرماتے تھے کہ ''میری اولاد نے مجھے یاد نہیں رکھا۔'' حضرت آدم علیہ السلام ہمارے جد امجد ہیں، سب سے بڑے ہمارے بزرگ ہیں، کیا ہم نے ان کے لئے کبھی ایصال ثواب کیا؟ ہم نے کبھی ان کے لئے رفع درجات کے لئے دعاء کی؟ کبھی ہم نے ان کے لئے ذخیرۂ آخرت بھیجا؟ آخر ان کے بھی ہم پر حقوق ہیں، ہمارے والدین جن سے ہم پیدا ہوئے، ان کے بھی ہم پر حقوق ہیں۔

رسول اقدس ﷺ کے اور آنحضرت ﷺ کی امت کے اکابر کے بھی ہم پر حقوق ہیں، ان سے پہلے جو انبیاءِ کرام علیہم السلام گزر چکے ہیں ان کے بھی ہم پر حقوق ہیں، تو میرا بھائی! رمضان مبارک کا مبارک مہینہ ہے، کچھ ان حضرات کے لئے

بھی کرلیا کرو، کچھ کھلا پلا سکتے ہو، صدقہ وخیرات کرسکتے ہو تو اس کے ثواب میں ان کو بھی شریک کرلیا کرو۔ اگر کچھ صدقہ خیرات نہیں بھی کرسکتے تو ان کے لئے کچھ زبانی ہی ایصال ثواب کرلیا کرو۔

اللہ کا کرم:

ویسے میرے اللہ کا کرم ہے، میرے اللہ کا احسان ہے، لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے اللہ تعالیٰ نے معاملہ ہم پر نہیں رکھا بلکہ خود ہی طریقہ بتادیا کہ نماز کے آخر میں ہم پہلے التحیات پڑھتے ہیں، پھر درود شریف پڑھتے ہیں اور آخر میں دعاء پڑھتے ہیں:

"رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابِ." (ابراہیم: ۴۰، ۴۱)

تمام مؤمنین، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر قیامت تک آنے والے تمام اہل ایمان سب کے سب اس میں شامل ہوگئے۔ اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا، آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی نقل کر رہا ہوں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب تم یہ کہو گے: "رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ." تو تمام مسلمان جو فوت ہوچکے یا آئندہ آنے والے ہیں قیامت تک، ان سب کو اللہ تعالیٰ ثواب پہنچادیں گے، جو آسمان میں ہوں، ان کو بھی اللہ تعالیٰ ثواب پہنچادیں گے، اور جو زمین میں ہوں گے ان کو بھی ثواب پہنچادیں گے۔

یہ تو اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا کہ ہم نے یہ دعاء پڑھ لی اور ایصال ثواب ہوگیا۔ لیکن میرا بھائی! کچھ اپنی طرف سے بھی کیا کرو، ان بزرگوں کے لئے ایصال

ثواب بھی کیا کرو۔

اکابر کے معمولات:

میرے شیخ حضرت مولانا محمد زکریاؒ جن کی تم تبلیغی نصاب پڑھتے ہو، وہ ہمیشہ اپنی طرف سے، اپنے والدین کی طرف سے، اپنے مشائخ کی طرف سے اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے قربانی کا اہتمام کرتے تھے۔ اور اکابر کی جانب سے قربانی کا ثبوت حدیث میں ملتا ہے، جیسا کہ مشکوٰۃ میں ہے:

"عَنْ حَنَشٍ رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: رَأَیْتُ عَلِیًّا یُضَحِّیْ بِکَبْشَیْنِ فَقُلْتُ لَہٗ مَا ھٰذَا؟ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَوْصَانِیْ أَنْ أُضَحِّیَ عَنْہُ فَأَنَا أُضَحِّیْ عَنْہُ." (مشکوٰۃ ص:۱۲۸)

ترجمہ:...... حضرت حنش رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے دو مینڈھے ذبح کئے، میں نے سوال کیا کہ یہ کیا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ آپ ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ: علی! میری طرف سے قربانی کرنا نہ بھولنا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس ﷺ کی وصیت کے مطابق آنحضرت ﷺ کی طرف سے باقاعدہ قربانی کیا کرتے تھے۔ تم اپنے اکابر کے لئے قربانی کرو۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قربانی کرو، اور کچھ پڑھ کے بخشو!

میرے شیخ حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک قرآن رمضان المبارک میں دن کا اور ایک قرآن رات کا پڑھا کرتے تھے اور ایک قرآن تراویح کا،

جب صحت اچھی تھی، بعد میں کمزور ہو گئے تھے، اور میں نے پڑھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی معمول تھا۔ ایک قرآن دن کا، ایک قرآن رات کا اور ایک قرآن تراویح کا پڑھتے تھے۔

اس کے علاوہ دعائیں ہیں، استغفار ہے اس کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔

فضائل اعمال میں لکھا ہے کہ: حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص ستر ہزار مرتبہ کلمہ شریف پڑھ کر کسی کو بخش دے تو اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرما دیتے ہیں، تو اپنے مشائخ کے لئے، اپنے بزرگوں کے لئے یہ بھی کیا کرو۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سے نصاب بنا رکھے تھے کلمہ شریف کے، لمبا واقعہ ہے...... میرے بھی بہت سے ساتھیوں نے مجھ سے کہا کہ ہم نے تیرے لئے ستر ہزار مرتبہ کلمہ شریف پڑھا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے، چونکہ یہ کمائی کا مہینہ ہے اس لئے اپنے والدین کے لئے، اپنے عزیز و اقارب کے لئے، دوست احباب کے لئے کچھ کمائی کر کے بھیجو۔ اپنے لئے بھی کمائی کرو اور ان کے لئے بھی بھیجو۔ ہم پر ان کے بہت بڑے حقوق ہیں، جیسا کہ میں نے ابھی نقل کیا کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام شکایت فرماتے تھے کہ: ''میری اولاد نے مجھے بھلا دیا ہے۔'' دوسروں کے لئے تو ایصال ثواب کرتے ہیں لیکن میرے لئے نہیں کرتے۔ بھائی! ہم پر ان کا بھی حق ہے۔ اپنے دوسرے اکابر کا بھی حق ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ اپنے گناہوں سے توبہ کرو۔ سب سے بڑا اہم کام اس مہینہ میں کرنے کا یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کرو۔ اور میں اپنے بھائیوں سے کہوں گا کہ داڑھی رسول اللہ ﷺ کے مطابق رکھو، تا کہ قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری

ہوتو یہ کہہ سکو کہ: یا رسول اللہ! میں آپ کا امتی ہوں، میری بھی شفاعت کیجئے۔ اور اگر تم نے رسول اللہ ﷺ کی سنت پر استرا چلادیا تو میرا بھائی! کیسے کہو گے؟ کہ: یارسول اللہ! ہم بھی آپ کے امتی ہیں۔ حضور ﷺ کی سنت پر عمل کرو، اور تم نہیں جانتے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس شکل بنانے پر بخش دے کہ انہوں نے میرے محبوب ﷺ کی سنت کو اپنایا تھا، میں ان کی بخشش کردوں۔

اللہ تعالیٰ ہماری بخشش فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہمیں ان مبارک اور سعید اوقات کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

رسول اقدس ﷺ کے اور آنحضرت ﷺ
کی امت کے اکابر کے بھی ہم پر حقوق ہیں، ان سے
پہلے جو انبیاءؑ کرام علیہم السلام گزر چکے ہیں ان کے بھی
ہم پر حقوق ہیں۔ صدقہ وخیرات کرتے وقت ان کو بھی
شریک کرلیا کرو۔

قرآن کریم کے حقوق

ہمارے دل میں اس کی ظاہری اور باطنی دونوں طور پر عظمت ہونی چاہئے۔ باطنی عظمت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا جتنا مرتبہ اور اس کی بڑائی ہے، وہ خوب دل میں بیٹھ جائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

اللہ تعالیٰ نے ہمیں تین دولتیں عطا فرمائی ہیں: بیت اللہ، کلام اللہ (قرآن مجید) اور رسول اللہ (ﷺ)۔

تجلیاتِ الٰہی کا مرکز:

کعبہ شریف پر تجلیات کا روز افزوں غلبہ ہے، تجلیات روز بروز بڑھ رہی ہیں، ۱۲۰ نعمتیں روزانہ نازل ہوتی ہیں، پھر ان سے پورے عالم میں سپلائی ہوتی ہے، مرکز تجلیات الٰہیہ خانہ کعبہ ہے، یعنی سپلائی سینٹر ہے۔

اگرچہ کوچۂ جاناں میں پھر پھر کے سر مارا
نہ دیکھا یار کو، گھر بار کو دیکھا، تو کیا دیکھا

اور طواف، حقیقت میں تجلیات الٰہیہ کا طواف ہے، جتنا بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قوی ہوگا، اسی قدر رحمتوں سے حصہ پائے گا، جتنا تعلق کمزور ہوگا، اتنا رحمتوں سے حصہ کم پائے گا۔

بیت اللہ شریف حق تعالیٰ کی نعمت کبریٰ ہے، ابھی پچھلے دنوں مکۃ المکرّمہ میں بارش ہورہی تھی، بیت اللہ شریف پر ہلکی ہلکی پھوار پڑرہی تھی، میں نے کہا آنکھوں والوں کو انوار کی بارشیں ہوتی نظر آرہی ہیں۔

خانہ کعبہ میں اتنی جاذبیت اور اتنی کشش ہے کہ مشرق و مغرب، شمال و جنوب چہار اطراف سے والہانہ انداز میں تکبیر پڑھتے ہوئے لوگ چلے آرہے ہیں، ہر زبان، نسل، ملک اور مسلک و مشرب کے لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں، اہل ایمان کے لئے یہ جگہ مقناطیس ہے، کہ اس کی طرف لوگوں کی رغبت ہے۔

قرآن کریم کی عظمت:

دوسری چیز اللہ کا کلام ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ: حق تعالیٰ شانہ کا قرب کسی چیز سے اتنا حاصل نہیں ہوتا، جتنا کہ قرآن مجید سے حاصل ہوسکتا ہے، یہ کلام اللہ تعالیٰ سے نکلا ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ کی شان بہت رفیع ہے، بیت اللہ شریف کی شان بہت اونچی ہے، مگر وہ اللہ تعالیٰ سے نہیں نکلے، مگر یہ کلام تو اللہ تعالیٰ سے نکلا ہوا ہے، یہ حبل اللہ ہے، اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے، خوب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسی مضبوطی سے تھام لو، اس رسی کے تھامنے میں کسی کا اختلاف نہیں، جتنا قرآن کریم سے تعلق مضبوط ہوگا، اتنا انسان کھنچتا، چلا جائے گا۔

قرآن کے حقوق:

قرآن مجید کے تین حقوق ہیں، حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں ہمیں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایک کتاب ''اصلاح انقلاب امت'' ہے، جس میں اس سلسلہ کی ہماری کوتاہیوں کی تفصیلات بیان کی گئیں ہیں۔

پہلا حق:

بہر حال قرآن مجید کا پہلا حق اس کی عظمت ہے، ہمارے دل میں اس کی ظاہری اور باطنی دونوں طور پر عظمت ہونی چاہئے۔ باطنی عظمت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا جتنا مرتبہ اور اس کی بڑائی ہے، وہ خوب دل میں بیٹھ جائے، چنانچہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن مجید کا علم عطا فرمایا ہو، مثلاً حافظ ہو، عالم ہو، تو وہ دنیا کی نعمت کو دیکھ کر کبھی دل میں یہ حسرت نہ لائے کہ: افسوس مجھے یہ چیز (مثلاً کار، کوٹھی وغیرہ) نہیں ملی، واللہ العظیم دنیا کی کوئی نعمت قرآن مجید سے بڑھ کر نہیں، یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ: دنیا کی دوسری تمام نعمتیں اگرچہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، اس نعمت قرآن کے سامنے گردِ راہ ہیں، اور تخت سلیمانی اس کے سامنے ہیچ ہے۔

تخت سلیمانی سے بہتر:

حضرت سلیمان علیہ السلام تخت سلیمانی پر کہیں تشریف لے جارہے تھے، آپ کے جلو میں جنات، انسان اور پرندے پرا باندھے ہوئے تھے، عجیب سماں تھا، اتنے میں کسی نے زمین سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس کروفر کو دیکھا تو کہا: سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے کیسی سلطنت حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمائی ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب یہ کہتے ہوئے کسی سے سنا، تو حکم فرمایا کہ تخت زمین پر اتارا جائے، زمین پر اتر کر اس شخص کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ تم نے یہ کیا کہا؟ اس نے سمجھا کہ شاید گستاخی ہوگئی ہے، کہنے لگا: یا حضرت! یہ بے اختیار نکل گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیسی حکومت عطا فرمائی ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ: بندۂ خدا تیرے منہ سے جو ''سبحان اللہ'' نکلا ہے، وہ ہزار تخت سلیمانی سے بہتر

ہے۔

قرآن مجید کی دولت کے مقابلے میں، کائنات کی تمام چیزیں بچوں کے کھلونوں کی طرح ہیں، اصل دولت تو یہ قرآن مجید ہے، اس کی جتنی عظمت دل میں آئے گی، قرآن مجید اتنا ہی اپنا رنگ دکھائے گا۔

دوسرا حق:

دوسرا حق قرآن مجید کی تلاوت کا ہے، قرآن مجید میں ہے: ''يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ.'' (وہ رسول ان پر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے)۔

''رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً.'' (رسول، اللہ کی طرف سے تلاوت کرتا ہے پاکیزہ صحیفے)۔

ایک بزرگ فرماتے تھے کہ: یہ تو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ ہمارے اور اللہ کے درمیان میں دو واسطے ہیں۔ ایک حضرت جبرائیل علیہ السلام کا اور دوسرا آپ ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن مجید کا جاری ہونا، اگر یہ واسطے درمیان میں نہ ہوتے، تو ہم قرآن مجید کی تلاوت پر قادر نہ ہوتے، آپ ﷺ کی خدمت میں ایک وفد آیا آپ ﷺ سے براہ راست قرآن مجید سنا، آپ ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن مجید سن کر دلوں پر کیا اثرات پڑے ہوں گے؟ کون اندازہ کرسکتا ہے؟ وہ حضرات تلاوت سن کر رونے لگے۔

ٹی وی اور اخبارات کی نحوست:

آج ہم لوگوں کو تلاوت کی توفیق کم ہوتی ہے، آج مسلمانوں کے گھروں میں کتنے پڑھے لکھے لوگ ہیں، مگر انہیں قرآن مجید کی تلاوت کی توفیق کم ہی ہوتی

ہے۔ دوسری کتابیں کتنی پڑھی جاتی ہیں، جب سے اخبارات، ٹی وی آگیا ہے اور ناول، افسانے آگئے ہیں، مسلمانوں کے ہاتھوں سے قرآن مجید چھین لیا گیا ہے، بہت سے گھر ہیں، جن میں مہینوں تک قرآن مجید کی تلاوت نہیں ہوتی۔

حدیث شریف میں ہے: "اِنَّ الَّذِیْ لَیْسَ فِیْ جَوْفِہٖ شَیْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ کَالْبُیْتِ الْخَرِبِ." (مشکوٰۃ ص:۱۸۶)

ترجمہ: "جس انسان کے دل کے اندر قرآن مجید کا کچھ حصہ نہ ہو، اس دل کی مثال ویران گھر کی سی ہے۔"

مثال مشہور ہے "خانہ خالی را دیوے گیرد" (خالی گھر میں شیطان بسیرا جمالیتا ہے۔)

پریشانیوں کا سبب:

افسوس آج ہمارے گھر قرآن مجید کی تلاوت سے خالی ہوگئے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ شیاطین نے بسیرا کرلیا، یہی وجہ ہے کہ آج ہر گھر میں پریشانیاں بڑھ گئی ہیں، گھر میں ہر نعمت موجود ہے، مگر قلب کا سکون نہیں ہے، آپ کسی کو تھوڑا سا نشتر لگا دیں، اور ٹٹولیں تو وہ اپنی پریشانیوں کی داستان سنانا شروع کردے گا، پریشانیاں ہیں، مگر وجہ معلوم نہیں ہے، گھر میں بچے کا فوٹو لگا ہوا ہے، ۹۰ فیصد گھروں میں فوٹو لگے ہوئے ہیں، آپ حضرات نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد تو سنا ہوگا کہ: "لَا تَدْخُلُ الْمَلٰئِکَۃُ بَیْتًا فِیْہِ کَلْبٌ وَلَا تَصَاوِیْرٌ." (مشکوٰۃ ص:۳۸۵) (کہ جس گھر میں تصویر یا کتا ہوگا اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آئیں گے)۔

گھر میں قرآن کی تلاوت نہیں ہوتی، ذکر نہیں ہوتا، درود شریف نہیں پڑھا

جاتا اور دوسری دین کی بات نہیں ہوتی، اس لئے رحمت رخصت ہوگئی، دل کا مسکرانا کہاں سے حاصل ہوگا؟

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

"عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِسًا لَمْ یَذْکُرُوْا اللّٰهَ فِیْهِ وَلَمْ یُصَلُّوْا عَلٰی نَبِیِّهِمْ اِلَّا کَانَ عَلَیْهِمْ تِرَةً فَاِنْ شَآءَ عَذَّبَهُمْ وَاِنْ شَآءَ غَفَرَ لَهُمْ." (ترمذی ج:۲ ص:۱۷۴)

ترجمہ:......"ان لوگوں کی مثال جوایک جگہ جمع ہوئے (اور انہوں نے کھانا وغیرہ کھایا) مگر اللہ کا ذکر کئے اور درود شریف پڑھے بغیر اٹھ گئے، انہوں نے بہت بڑا نقصان کیا، اگر اللہ پاک چاہیں تو ان کو عذاب دیں یا چاہیں تو ان کو معاف فرمادیں۔"

اسی طرح ابوداؤد شریف میں ہے:

"مَا مِنْ قَوْمٍ یَقُوْمُوْنَ مِنْ مَجْلِسٍ لَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ فِیْهِ اِلَّا قَامُوْا عَنْ مِثْلِ جِیْفَةِ حِمَارٍ وَکَانَ عَلَیْهِمْ حَسْرَةً."

(ابوداؤد ج:۲ ص:۳۱۰)

ترجمہ:......"جولوگ کسی مجلس سے اس حال میں اٹھے کہ انہوں نے اس میں اللہ کا ذکرنہیں کیا تو وہ ایسے ہیں جیسے (چند کتے) مردار گدھے پر جمع ہوئے اور کھاکر چلے گئے، ایسی مجلس ان لوگوں پر قیامت کے دن حسرت و افسوس کا سبب

ہوگی۔"

ہم شام سے لے کر صبح تک اور صبح سے لے کر شام تک اپنی زندگی کا جائزہ لیں، کہ گھر میں قرآن پڑھا جاتا ہے یا نہیں؟ پہلے ہر گھر میں اس کا اہتمام ہوتا تھا، روزانہ گھروں میں تلاوت ہوتی تھی، سب سے بہترین وقت تلاوت کا نماز فجر کے بعد کا وقت ہے، فجر کی نماز سے پہلے تسبیحات افضل ہیں اور نماز کے بعد تلاوت، باقی دونوں سونے کی کانیں ہیں، بڑے گھروں میں لوگ اٹھتے ہی نو بجے ہیں، دیر سے سوتے ہیں، عشاء کے بعد ٹی وی دیکھا جارہا ہے، تبصرے ہورہے ہیں، باتیں کی جارہی ہیں، حالانکہ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

"كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ وَالْحَدِيْثَ بَعْدَهَا."

(موطا امام مالک ص:۱۰۱)

ترجمہ:......"آنحضرت ﷺ عشاء سے پہلے نیند کرنے کو اور نماز عشاء کے بعد باتیں کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔"

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خانقاہ میں حضرتؒ کے زمانے میں عشاء کے بعد قانوناً بات کرنے کی ممانعت تھی، حکم تھا کہ عشاء کے بعد سو جاؤ، جلدی سونے سے تہجد کے لئے اٹھنا آسان ہوگا، بے خوابی کی شکایت نہیں ہوگی، گولیوں کی ضرورت نہیں رہے گی، سنت کے خلاف کروگے تو ایسا ہی ہوگا، بہرحال مسلمانوں کا کوئی گھر تلاوت سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔

تلاوت کے معمول اکابر کے مختلف رہے ہیں، روزانہ ایک قرآن مجید، ۱۵

سپارے روزانہ، ۱۰ سپارے روزانہ اور کم سے کم معمول ایک پارہ روزانہ اور مہینہ میں ۳۰ سپارے، یہ اپنے اوپر لازم کرلینا چاہئے، جتنا ادب واحترام کے ساتھ پڑھو گے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ نوازیں گے، ایک صاحب قرآن پڑھنا نہیں جانتے تھے، انگلی پھیر کر "ھٰذَا کَلَامُ رَبِّیْ، ھٰذَا کَلَامُ رَبِّیْ." پڑھتے رہتے تھے، حق تعالیٰ شانہ نے بخش دیا۔

بدی کا غلبہ:

اب تو دیندار گھروں میں بھی یہ تلاوت کا معمول نہیں رہا، باپ نیک ہے، تو بیٹا آزاد ہے، سارا شیرازہ بکھر گیا ہے، اب لوگ بودے (انگریزی بال) رکھتے ہیں، پہلے اس کا رواج نہیں تھا۔ ایک صاحب نے مجھے جدہ ایرپورٹ پر بتلایا کہ ایک نوجوان فوج میں گئے، جب واپس آئے تو بودے بنوائے اور ننگے سر پھرنا شروع کردیا، پرانے زمانے کی بات ہے، کچھ عورتیں چرخہ کات رہی تھیں، انہوں نے اس کو دیکھا تو محبت کے ساتھ بلایا، ایک بڑھیا گھر میں گئی، چولہے کی راکھ لے کر آئی اور اس کے سر پر ڈال دی، اس کو کہا کہ تو لڑکیوں کو بال دکھاتا پھرتا ہے؟

اس وقت نیکی غالب تھی، اس کو نصیحت آگئی اور اس نے بال کٹوالئے، اللہ کی شان! اب نیکی مغلوب اور بدی غالب آرہی ہے، باپ اپنے بچوں کی اصلاح و تربیت سے گھر میں عاجز ہورہا ہے، شوہر اپنی بیوی اور بیوی اپنے شوہر کی اصلاح سے عاجز ہے، باپ بیٹے کی اور بیٹا باپ کی اصلاح سے عاجز ہے، ہم نے حضرت محمد ﷺ کو دیکھنے کی بجائے یہود ونصاریٰ کے معاشرے کو دیکھنا شروع کردیا، نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بدی غالب آرہی ہے اور نیکی مغلوب ہورہی ہے، اب نیکی کا پنپنا مشکل ہوگیا

ہے، یہ سب کچھ مسلمانوں کے معاشرے میں ہورہا ہے، اگر کوئی شادی بیاہ سنت کے مطابق کرنا چاہتا ہے، تو اس کو معاشرہ نہیں کرنے دیتا، ''خود کردہ راعلاجے نیست۔''

تلاوت کی برکات:

پہلے تلاوت قرآن مسلمانوں کے روزہ مرہ کے معمولات میں تھی، تلاوت سے دل، بدن اور آنکھوں میں نور آتا ہے، دل مجمع الانوار، نورالانوار بنتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ہر ہر حرف کے نیچے تجلیات رکھی ہیں، تلاوت کا ثواب قیامت کو تو ملے گا ہی، مگر دنیا میں بھی بہت کچھ ملے گا، مشکلات آسان ہوں گی، دل میں سکون آئے گا، گھروں میں برکتیں اور رحمتیں آئیں گی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''یَا اَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ.''

(یونس:۵۷)

ترجمہ:......''اے لوگو تمہارے پاس آتی ہے نصیحت تمہارے رب سے اور شفاءُ دلوں کے روگ کی اور ہدایت اور رحمت مسلمانوں کے لئے۔''

تم اس کو کہاں بھول گئے؟ یہ بھولنے کی چیز نہیں ہے، واللہ العظیم قرآن مجید تمہاری سب ظاہری، باطنی اور اندرونی، بیرونی بیماریوں کے لئے شفاءُ ہے۔

تیسرا حق:

قرآن مجید کا تیسرا حق: قرآن مجید کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاہا کے ایک شاگرد حضرت

مسروقؒ تھے وہ آپؓ کی خدمت میں تھے، انہوں نے عرض کیا: "يَا أُمَّاهُ! نَبِّئِينِيْ عَنْ خُلُقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ." (اماں جان! مجھے حضور ﷺ کے اخلاق بتلایئے۔) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "يَا بُنَيَّ اَوَمَا تَقْرَأُ الْقُرْآنَ؟ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ." (صاحب زادے کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ آپ کا خلق تو قرآن ہی تھا)۔آپ ﷺ کا اخلاق سراپا قرآن ہی تھا، جہاں قرآن نے کھڑا کر دیا، کھڑے ہوگئے، جہاں بٹھا دیا، بیٹھ گئے، جہاں روک دیا، رک گئے، جہاں چلا دیا چل دیئے، جہاں کھانے کو کہا، کھالیا، آپ ﷺ کی پوری زندگی قرآن مجید کی عملی تفسیر تھی، قرآن مجید ہمارے لئے نازل ہوا ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم قرآن مجید کے مطابق بن جائیں۔

ایک حدیث شریف میں ہے: "مَثَلُ الْقُرْآنِ مَثَلُ الْاِبِلِ الْمُعَلَّقَةِ اِنْ تَعَاهَدَهَا صَاحِبُهَا أَمْسَكَهَا وَاِنْ تَرَكَهَا ذَهَبَتْ." (مسند احمد ج:۲ ص:۲۳)

یعنی قرآن کی مثال اس اونٹ کی سی ہے جس کی ناک میں نکیل ہو، (اور ناک زخمی ہو، اگر بچہ بھی اس اونٹ کو لے چلے گا، تو چلا جائے گا، جہاں اس کو بٹھائے وہ بیٹھ جاتا ہے، اگر اٹھا دیا جائے تو اٹھ جاتا ہے) اور اگر چھوڑ دیا تو بھاگ جاتا ہے۔

ہماری نکیل قرآن کے ہاتھ میں ہے، ہمیں چاہئے کہ جہاں قرآن مجید بٹھا دے، ہم بیٹھ جائیں، جہاں چلا دے، چل پڑیں، ہم نے آج قرآن پر عمل کرنے کی بجائے اسے طاق میں رکھ دیا ہے، حضرت تھانویؒ سے پوچھا گیا: کیا قرآن مجید کو چومنا جائز ہے؟ آپؒ نے فرمایا: "چومنا تو جائز ہے ہی، اس کو دل میں اتارا جائے۔" آج ہماری نکیل قرآن کے ہاتھ میں نہیں رہی، اب تو یہ ہونے لگا ہے کہ اگر قرآن مجید کی کوئی بات سامنے آتی ہے تو اس میں تاویل کی جاتی ہے قرآن مجید میں ہے:

"وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا
فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ
بِزِیْنَةٍ وَّاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ." (النور: ٦٠)

ترجمہ:...... "وہ بوڑھی عورتیں جو نکاح کی حد سے گزر گئی ہیں، ان پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے کپڑے (پردہ) اتار رکھیں، کہ نہ دکھاتیں پھریں اپنا سنگھار، اگر وہ اس سے بچیں (یعنی پردہ میں رہیں) تو ان کے لئے بہتر ہے۔"

اب قصہ برعکس ہوگیا، بوڑھی کجا نوجوان بھی پردہ نہیں کرتیں، برقعہ تو گیا، دوپٹہ بھی اتر گیا ہے، اگر ہماری بہنیں چاہتی ہیں کہ گھروں میں آرام اور چین وسکون ہو، دلوں کو راحت نصیب ہو، تو قرآن مجید پر عمل کریں، آج چہرے کے پردے کا انکار کیا جاتا ہے، اگر چہرے کا پردہ نہیں، تو کس کا پردہ ہے؟ قرآن مجید میں "قَرْنَ" کا لفظ ہے کہ ٹک کر اور جم کر گھروں میں بیٹھیں، بناؤ سنگار نہ کرتی پھریں، مگر آج معاملہ اس کے برعکس ہوگیا ہے، عورتیں گھروں میں بیٹھنے کی بجائے دفاتر اور اسمبلیوں میں ہیں، اور ان کی بھرتی ہورہی ہے، یہاں تک کہ وزارت عظمیٰ کے حصول کے لئے بے تاب ہیں، بلکہ اب تو یہ منصب بھی ان کے زیر پا ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حفاظت فرمائے۔

تلاوت قرآن سے دل، بدن اور آنکھوں میں نور آتا ہے، دل مجمع الانوار، نور الانوار بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ہر ہر حرف کے نیچے تجلیات رکھیں ہیں۔ تلاوت سے دل میں سکون آئے گا، گھروں میں برکتیں اور رحمتیں آئیں گی۔

قرآن کریم

اور

شفاعتِ رسول ﷺ

میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے طفیل
اللہ تعالیٰ نے ہم پر بے شمار انعامات فرمائے ہیں۔
قیامت کے دن کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا،
سوائے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد!

حضرت مولانا مفتی محمد جمیل خان صاحب نے آپ حضرات کے سامنے وضاحت فرمادی ہے کہ یہ ادارہ ''اقرأ روضۃ الاطفال'' ایک مدرسے سے شروع کیا تھا، بیس تیس طالب علموں کے ساتھ، اوراب الحمدللہ کراچی سے لے کر گلگت تک اس کی اٹھائیس شاخیں بن گئی ہیں، اور اٹھارہ ہزار طالبعلم اس میں زیر تعلیم ہیں، تو آپ کے لاہور میں بڑے تردد کے ساتھ ہم نے ایک شاخ کھولی تھی، اور خیال تھا کہ یہ پتہ نہیں کامیاب ہوگی یا نہیں، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ساتویں شاخ کا آج افتتاح ہورہا ہے، اور ابھی مزید اس کے لئے لوگوں کی فرمائشیں ہیں اور ہمارے پاس ابھی استطاعت اتنی نہیں ہے، بہرحال ہم کوشش کریں گے کہ انشاء اللہ تعالیٰ جہاں تک ممکن ہو، اس سلسلے کو مزید بڑھایا جائے، اور جیسا کہ مولانا نے فرمایا گلگت میں دو شاخیں بن چکی ہیں، اور گلگت ایسا پسماندہ علاقہ ہے کہ وہاں مسلمان تین فیصد ہیں، بلکہ اس سے

بھی کم تعداد میں ہیں، اور آغا خانیوں کا اور شیعوں کا اس میں زیادہ حصہ ہے، ان کے ہسپتال بھی ہیں، ان کے اسکول بھی ہیں، ان کے سب کچھ ہیں اور ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے، وہاں جاکر، حالات کا جائزہ لے کر، نہایت افسوس اور صدمہ ہوا، لیکن الحمدللہ وہاں اقرأ کی بھی دو شاخیں بن چکی ہیں، اور انشاء اللہ مزید توسیع کے امکانات ہیں، لوگوں کی فرمائشیں ہیں، جہاں تک ہوسکا انشاء اللہ وہاں بھی کوشش کی جائے گی، اب میں چند باتیں آپ حضرات کی خدمت میں اس سلسلے میں عرض کرتا ہوں۔

یہ قرآن کریم...... جس کی نسبت سے ہم اور آپ یہاں جمع ہوئے ہیں، حق تعالیٰ شانہ کی عظیم الشان نعمت ہے، اور یہ وہ نعمت ہے کہ سوائے مسلمانوں کے کسی قوم کے پاس نہیں، ہم لوگ تو اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، اپنے مشاغل میں مشغول ہیں، اور ان چیزوں میں مشغول ہیں، جن میں ساری دنیا مشغول ہے، لیکن یہ قرآن کریم، رسول اللہ ﷺ ہمارے لئے لے کر آئے، حضور ﷺ لے کر نہیں آئے، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ پر نازل فرمایا، اس وقت پوری روئے زمین پہ صرف ایک آسمانی کتاب ہے، جسے قرآن کریم کہتے ہیں، اور جو صرف مسلمانوں کے پاس ہے، اس آسمانی کتاب کے علاوہ اور اس صحیفۂ مقدسہ کے علاوہ جتنی دنیا کی کتابیں ہیں، وہ سب کی سب محرف اور مبدل ہیں۔

مباحثہ شاہ جہان پور میں اسلام کی عظمت:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند، مباحثہ شاہ جہان پور میں تشریف لے گئے تھے، وہاں عیسائیوں کا، مسلمانوں کا اور دوسری قوموں کا مشترکہ جلسہ تھا، حضرتؒ کو اس جلسہ کا پتہ چلا تو آپ بھی تشریف لے گئے، اور وہاں

پہنچ کر اطمینان سے بیٹھ گئے، عیسائیوں نے اپنی بڑی تیاری کر رکھی تھی، اس وقت حکومت بھی نئی نئی انگریزوں کی بنی تھی، انگریزوں کا بہت رعب داب تھا، حضرتؒ نے عیسائیوں کے نمائندہ سے فرمایا کہ: عیسائی صاحب! کچھ فرمانا چاہتے ہیں تو فرمائیں، اس عیسائی مناظر پر اتنا رعب طاری ہوا، حالانکہ حضرت کا قد بھی چھوٹا تھا، اور وہ لباس بھی ایسا ہی بوسیدہ پہنے ہوئے تھے، ایک نیلی لنگی پاس ہوتی تھی اور سر پر ٹوپی اور بس، جب حضرت نے للکارا کہ ہاں کوئی ہے جو مقابلے میں آنا چاہتا ہے؟ اور اپنی کتاب کی کوئی فضیلت بیان کرنا چاہتا ہے تو بیان کرے، انہوں نے کہا کہ حضرت! آپ ہی بیان فرمائیں، ''مباحثہ شاہ جہان پور'' اور ''حجۃ الاسلام'' کے نام سے کتاب چھپی ہوئی ہے، اور بازار میں ملتی ہے، آپ لے کر اس کو پڑھ سکتے ہیں، حضرتؒ نے تمام مذاہب پر نہایت مدلّل بحث کی۔

بائیبل میں پانچ لاکھ غلطیاں:

اور اسی بھرے جلسے میں فرمایا کہ عیسائیوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ پانچ لاکھ غلطیاں ہماری کتاب میں ہیں، بائیبل کی چھوٹی سی کتاب ہے، اور پانچ چار آدمیوں کی لکھی ہوئی ہے، چھوٹے چھوٹے اس کے حصے ہیں، اس کے علاوہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف جو کتابیں منسوب کی جاتی ہیں وہ بھی ہیں، حضرتؒ نے فرمایا کہ پانچ لاکھ غلطیاں ان کی بائیبل میں موجود ہیں اور ان (علمائے مسیحی) میں سے کوئی شخص آپ کے مقابلے میں نہیں بولا۔

اس کے بعد حضرتؒ نے عام اعلان کیا کہ کوئی صاحب اپنی کتاب کی حقانیت ثابت کرنا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں، پیش کریں، اور اسلام کی حقانیت اور

قرآن کریم کا صحیح مستند ہونا، بغیر کسی تحریف کے اور بغیر کسی تبدیلی کے ہونا، میں ثابت کروں گا۔

چنانچہ کوئی شخص بھی آپ کے مقابلے میں نہیں اٹھا، ان کے بڑے بڑے علماء بھی موجود تھے، عیسائیوں کی حکومت تھی، عیسائیوں کی صدارت تھی، لیکن کوئی نہیں اٹھا، یہ میدان مسلمان جیت گئے۔

میرے بھائیو اور بزرگو دوستو! ہم لوگ تو دنیا کے چکروں میں لگ گئے، دنیا کے قصوں میں لگ گئے، اور یوں سمجھ لیا کہ یہ قرآن مجید پڑھنا، پڑھانا تو مولویوں کا کام ہے، یہ خود ہی سب کچھ کرتے رہیں گے اور لڑتے مرتے رہیں گے۔ اور ہمیں تو اپنی دنیا کمانی ہے، اپنی دکانیں چلانی ہیں، اور ہمیں فلانا کام کرنا ہے، فلانا کام کرنا ہے، اتنی فرصت کس کے پاس ہے کہ وہ قرآن پاک پڑھے، یا قرآن مجید کے معنی و مفہوم کو سمجھے، یا مسجد میں جا کر کسی استاذ سے قرآن مجید کے صحیح تلفظ کو معلوم کرے، جیسا کسی نے الٹا سیدھا ہمیں بچپن میں پڑھا دیا، ایسا ہی ہم پڑھ رہے ہیں، اور زیادہ تر رمضان المبارک میں ہم پڑھتے ہیں، دوسرے گیارہ مہینے اپنے کام کے لئے ہیں، اور ایک مہینہ رمضان المبارک کا ہے کہ اس میں کچھ تھوڑا سا پڑھتے ہیں، بہت سے ایسے ہیں کہ رمضان المبارک میں بھی قرآن مجید پورا نہیں کرتے، اول سے آخر تک قرآن مجید بھی پورا نہیں کرتے، جہاں تک قرآن مجید کی تعلیمات کا تعلق ہے، اللہ رب العزت نے ہماری ہدایت کے لئے نازل کیا ہے، اللہ کا اس میں کوئی مفاد نہیں تھا۔

مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ما نہ بودیم و تقاضہ ما نہ بود
رحمت حق ناگفتہ ما می شنید

ہم نہیں تھے، ہمارا تقاضہ نہیں تھا، محض اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہماری ان کہی بات کو سن لیا، اور ہمیں اس دین حق کے لئے قبول کرلیا، جتنے میرے بھائی موجود ہیں سب کے سب اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن کریم کی نعمت عطا فرمائی ہے، اور ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام بنا لیا ہے۔ والحمدللہ علی ذلک

چونکہ آپ حضرات کو اس کا موقع کم ملتا ہے اور یوں بھی جیسا کہ میں نے عرض کیا آپ حضرات کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہوگئی ہے کہ قرآن پڑھنا، پڑھانا تو مولویوں کا کام ہے، ملاؤں کا کام ہے، ہمیں اپنی دکانداریاں کرنی ہیں، تجارتیں کرنی ہیں، بڑے بڑے کاروبار کرنے ہیں، یہ مسجد میں بیٹھ کر کے قرآن نہیں پڑھانا یا پڑھنا...... یہ تو ملاؤں کا کام ہے، اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا کہ آپ کو اپنے کاموں کے لئے فارغ کردیا اور اپنی کتاب کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان ٹوٹے پھوٹے مولویوں کو منتخب کرلیا، یہ کتاب...... جس کو ہم قرآن مجید کہتے ہیں، اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تئیس سال کے عرصے میں تھوڑی تھوڑی، تھوڑی تھوڑی نازل ہوئی، کبھی ایک آیت، کبھی دو آیتیں، کبھی ایک سورت...... اس طرح تئیس سال کے عرصے میں یہ کتاب نازل ہوئی۔

حضرت جبرئیلؑ ہر رمضان میں قرآن کا دور کرتے:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"كَانَ يَلْقَاهُ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ فِيْ شَهْرِ رَمَضَان فَيُدَارِسهُ الْقُرْآنَ." (بخاری ص:۳)

ترجمہ:...... "حضرت جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر

رمضان میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے
اور پورے قرآن کا دور کرتے تھے۔''

حالانکہ ابھی قرآن نازل نہیں ہوا تھا، لیکن پورے قرآن کا دور کرتے تھے۔

''عَنْ فَاطِمَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: أَسَرَّ اِلَیَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ جِبْرِيْلَ يُعَارِضُنِیْ بِالْقُرْآنِ كُلَّ سَنَةٍ وَاِنَّهٗ عَارَضَنِی الْعَامَ مَرَّتَيْنِ وَلَا أُرَاهُ اِلَّا حَضَرَ أَجَلِیْ.'' (بخاری ج:۲ ص:۷۴۸)

ترجمہ:...... ''حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا...... (جو آنحضرت ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ہمارے سر کا تاج ہیں) فرماتی ہیں کہ...... ان کو رسول اللہ ﷺ نے بلایا اور بلا کے فرمایا فاطمہؓ! جبرئیل علیہ السلام ہر سال رمضان مبارک میں میرے پاس آتے تھے اور ایک بار قرآن کریم کا دور کرتے تھے، فاطمہؓ! اس سال جبرئیل علیہ السلام نے میرے ساتھ قرآن مجید کا دو مرتبہ دور کیا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید میرے جانے کا وقت آگیا ہے۔''

میرے آقا حضرت محمد ﷺ نے کتنی محنت کے ساتھ، کتنی مشقتوں کے ساتھ، کتنی گالیاں سن کر، اس قرآن کریم کو اس امت کے لئے پہنچایا ہے، تاکہ یہ امت محروم نہ رہے۔

ستر ہزار آدمی بغیر حساب جنت میں جائیں گے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری امت کے ستر ہزار آدمی ایسے ہوں گے جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوجائیں گے، چنانچہ ترمذی شریف میں ہے:

”عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ زِيَادٍ الْاَلْهَانِي قَالَ سَمِعْتُ اَبَا اُمَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ وَعَدَنِيْ رَبِّيْ اَنْ يُّدْخِلَ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِيْ سَبْعِيْنَ اَلْفًا لَا حِسَابَ عَلَيْهِمْ وَلَا عَذَابَ. مَعَ كُلِّ اَلْفٍ سَبْعُوْنَ اَلْفًا وَثَلٰثُ حَثَيَاتٍ مِنْ حَثَيَاتِ رَبِّيْ، هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ.“ (ترمذی ج:۲ ص:۷۰)

ترجمہ:...... ”حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری امت کے ستر ہزار آدمی بغیر حساب و کتاب کے اس طرح جنت میں داخل ہوں گے کہ ان کو کوئی عذاب نہیں دیا جائے گا۔ (صرف یہی نہیں بلکہ) ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار مزید بھی جائیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنی تین لپیں (چلّو) بھر کر جنت میں داخل کریں گے۔“

تو ہر ہزار کو ستر ہزار کے ساتھ ضرب دے کر دیکھ لو کتنا بنتا ہے؟

ایک دوسری حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

"اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَ جَلَّ وَعَدَنِیْ اَنْ یُّدْخِلَ الْجَنَّۃَ مِنْ اُمَّتِیْ اَرْبَعْمِائَۃِ اَلْفٍ بِـلَا حِسَابٍ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ زِدْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! قَالَ وَھٰکَذَا فَحَثَا بِکَفَّیْہِ وَجَمَعَھُمَا فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ زِدْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! قَالَ وَھٰکَذَا فَقَالَ عُمَرُ دَعْنَا یَا اَبَابَکْرٍ فَقَالَ وَمَا عَلَیْکَ اَنْ یُّدْخِلَنَا اللّٰہُ کُلَّنَا الْجَنَّۃَ فَقَالَ عُمَرُ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَ جَلَّ اِنْ شَآءَ اَنْ یُّدْخِلَ خَلْقَہُ الْجَنَّۃَ بِکَفٍّ وَّاحِدٍ فَعَلَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَدَقَ عُمَرُ." (مشکوٰۃ ص:۴۹۴)

ترجمہ:...... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری امت میں سے چار لاکھ آدمیوں کو بلا حساب جنت میں داخل فرمائیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کچھ زیادہ مانگ لیا ہوتا، آپؐ نے فرمایا: اتنا اور زیادہ مانگا تھا، یہ کہہ کر آپؐ نے دونوں ہاتھوں کو یکجا کرکے چلو بنایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! اس تعداد میں اور اضافہ کر دیجئے۔ آپ نے پھر چلو بنا کر فرمایا: اچھا اتنا اور زیادہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: بس کیجئے، اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجئے (یعنی اتنی رعایت نہ کرائیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے کرم پر اعتماد کرکے بیٹھ جائیں اور عذاب خداوندی سے بے خوف ہوکر عمل کرنا چھوڑ

دیں)۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس میں تمہیں کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم سب کو بلا حساب و کتاب جنت میں داخل فرمادیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ: اگر اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایک چلو میں بھر کر جنت میں داخل کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کی بات سن کر فرمایا: عمر سچ کہتے ہیں۔“

ایک دوسری حدیث میں آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے:

”عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهٖ اَوْ نَفْسِهٖ. رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ.“ (مشکوٰۃ ص:۴۸۹)

ترجمہ:...... ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن میری شفاعت سے وہ شخص حصہ پائے گا جس نے خلوص دل سے یا یہ فرمایا: خلوص نفس سے لا الٰہ الا اللہ پڑھا ہوگا۔“

یعنی کسی ایسے آدمی کو جہنم میں نہیں رہنے دوں گا جس نے اخلاص سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کیا ہوگا۔

آخر میں فرمایا کہ مجھے اللہ تبارک و تعالیٰ حکم فرمائیں گے فرشتوں کے ساتھ، نبیوں کے ساتھ صدیقوں کے ساتھ، صالحین کے ساتھ، جاؤ اور جہنم میں تمہیں جتنے بھی آدمی نظر آتے ہیں انہیں نکال لو، نکال لیں گے، اور آکر عرض کریں گے کہ یااللہ! اب

تو جہنم میں کوئی آدمی بھی نہیں رہا، جتنے آدمی نکال سکتے تھے نکال لئے، جس کے دل میں ایک جو کے دانے کے برابر بھی ایمان تھا وہ بھی نکال لیا، جس کے دل میں ایک گیہوں کے دانے کے برابر ایمان تھا وہ بھی نکال لیا، جس کے دل میں ایک تل کے دانے کے برابر ایمان تھا وہ بھی نکال لیا، اب کوئی جہنم میں نہیں رہا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ:

"شَفَعَ النَّبِيُّوْنَ وَشَفَعَتِ الْمَلَائِكَةُ وَشَفَعَ الصِّدِّيْقُوْنَ، وَلَمْ يَبْقَ اِلَّا اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ."

(مشکوٰۃ ص:۴۹۰)

یعنی نبیوں نے شفاعت کرلی، فرشتوں نے شفاعت کرلی، صدیقوں نے شفاعت کرلی، ایک ارحم الراحمین باقی ہے، جس کو ابھی شفاعت کرنی ہے، مخلوق کی نظریں وہاں تک نہیں پہنچ سکیں، جہاں تک اللہ کی نظر پہنچے گی، فرمایا تین لپیں اللہ تبارک و تعالیٰ جہنم سے نکالیں گے، اور اللہ تعالیٰ کی ان لپوں میں کتنے آدمی آئیں گے؟...... یہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، ان کو نہر حیات میں ڈالا جائے گا، کوئلے کی شکل میں داخل ہوں گے، اور چودہویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوئے باہر نکلیں گے۔

تمام انبیاءؑ کرامؑ شفاعت سے انکار کردیں گے:

میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اللہ تعالیٰ نے ہم پر بے شمار انعامات فرمائے ہیں۔ قیامت کے دن کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا، سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، لوگ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس جائیں گے، کہ آپ ہمارے جد امجد ہیں، آپ سے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو شروع کیا ہے، آپ

ہماری شفاعت کریں، وہ فرمائیں گے کہ میرا حوصلہ نہیں ہے شفاعت کرنے کا، اس لئے کہ مجھ سے ایک چوک ہوگئی تھی، اور مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس چوک کی وجہ سے پکڑ نہ لیا جاؤں، آج میرے اللہ کو اتنا غضب ہے اتنا غصہ ہے کہ: "لَمْ يَغْضَبْ مِثْلَهُ قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ." (مشکوٰۃ ص:۴۸۸) (نہ ایسا غصہ اس سے پہلے کبھی ہوا، نہ ایسا غصہ اس کے بعد کبھی ہوگا) پھر حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے، اور آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس جائیں گے، تمام نبی ہاتھ جوڑ دیں گے کہ نہیں! نفسی نفسی، نفسی نفسی!!! ہمیں تو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

شفاعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

صرف ایک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے، روایات میں آتا ہے کہ کئی دھکے کھانے کے بعد لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں گے، ذرا اندازہ کرو یہاں تو ہم تھوڑی سی دیر کے لئے بیٹھتے ہیں تو پیاس لگ جاتی ہے، بھوک لگ جاتی ہے، پیاسے ہوجاتے ہیں، اور یوں فرمایا کہ لوگ اپنی قبروں سے نکلیں گے مادر زاد ننگے، جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔

"غیر مختون" ان کے ختنہ بھی نہیں ہوئے ہونگے، اور ایسے ہی دوڑتے ہوں گے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ!

"اَلرِّجَالُ وَالنِّسَآءُ جَمِيْعًا يَنْظُرُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ؟ فَقَالَ يَا عَائِشَةَ اَلْاَمْرُ اَشَدُّ مِنْ اَنْ يَّنْظُرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ؟" (مشکوٰۃ ص:۴۸۳)

ترجمہ:......''کیا مرد بھی ننگے، عورتیں بھی ننگی اور سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہوں گے؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا عائشہؓ! اتنی فرصت کسی کو نہیں ہوگی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکے۔''

ہر ایک کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہوں گے، سب ننگے، آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے ہوں گے۔

میرے بھائیو! رسول اللہ ﷺ کے طفیل، اللہ پاک نے ہمیں قرآن مجید عطا فرمایا، رسول اللہ ﷺ کے طفیل، اللہ پاک نے ہمیں دین قیم عطا فرمایا، رسول اللہ ﷺ کے طفیل، اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا و آخرت کی نعمتیں عطا فرمائیں، اگر ہم رسول اللہ ﷺ کا شکریہ ادا نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہ کریں تو یہ ہماری کوتاہی ہے۔

ہمارے ساتھیوں نے آپ کے شہر میں قرآن کریم کی تعلیم کے ادارہ کی ساتویں شاخ کھولی ہے، آپ ان کے لئے دعا فرمائیں، اللہ ان لوگوں کو مزید توفیق عطا فرمائیں، اور آپ کوشش کریں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ایک ایک محلے میں ''اقرأ روضۃ الاطفال'' کی شاخیں کھل جائیں، اس لیے کہ اس قرآن کریم کی قدر و منزلت ہمیں اب معلوم نہیں ہے، اب تو زیادہ سے زیادہ ہم یہ کر لیتے ہیں کہ قرآن مجید خرید لیا، بہت اچھا سا غلاف اس پر چڑھالیا اور طاق میں رکھ لیا، الماری میں رکھ لیا، کبھی سال کے بعد بھی دیکھنے کی توفیق نہیں ہوتی، کیونکہ ہمارے گھروں میں اور دلچسپی کے سامان بہت ہیں، ڈش انٹینا بھی ہے، وی سی آر بھی ہے، ریڈیو بھی ہے، دوسرے کھلونے بھی ہیں، یہ ساری چیزیں موجود ہیں، قرآن کریم کے پڑھنے کی اور دیکھنے کی فرصت کس کو ملتی ہے؟ لیکن ہمیں اس کی قدر اس وقت معلوم ہوگی جب کہ ہمیں بیک

بنی و دو گوش یہاں سے چلتا کیا جائے گا، چلو یہاں رہنے کی میعاد ختم ہوگئی، پھر بندہ کہے گا: یا اللہ! مجھے تھوڑی سی مہلت اور مل جائے، میں اپنی اصلاح کرلوں، جو نمازیں ہمارے ذمے ہیں پوری کرلوں، جو زکوتیں ہمارے ذمے ہیں، ان کو پورا کرلوں، اگر حج نہیں کیا تو حج کرلوں، بچوں کو قرآن نہیں پڑھایا تو پڑھالوں، بچے ڈش انٹینا دیکھ رہے ہوں گے، وی سی آر دیکھ رہے ہوں گے، ریڈیو سن رہے ہوں گے، دوسری خرافات میں مبتلا ہوں گے، اور قبر میں سانپ اور بچھوؤں کی شکل میں عذاب ہمیں ہورہا ہوگا، یہ میں کوئی ایسی بات نہیں کر رہا، واقعات جو ہمارے سامنے آنے والے ہیں، ان کو بیان کررہا ہوں، اس وقت تو ہماری آنکھیں بند ہیں، ہمیں نظر نہیں آرہا، ہمیں اپنا ماحول نظر نہیں آرہا، آگا پیچھا نظر نہیں آرہا، کہاں سے آئے تھے اور نامعلوم کہاں جارہے ہیں؟ داڑھی میری بھی سفید ہوگئی، عقل مجھے بھی نہیں آئی، آپ کو تو کیا آئے گی، آپ کے تو ماشاءاللہ بال ابھی کالے ہیں۔

قرآن پاک شفاعت کرے گا:

میرے بھائیو! صرف ایک قرآن کریم ہے، اس کی تعلیمات پر ہم عمل کریں گے تو یہ ہمارا سفارشی ہوگا، اور اگر ہم نے اس کو کنگال کردیا، اس کو پس پشت ڈال دیا، اس کی قدر نہ کی اور رسول اللہ ﷺ نے ہم پر جو احسانات فرمائے، اور اپنے مقبول بندوں کی پیروی کا ہمیں حکم فرماکر کے گئے، اس کی ہم نے پرواہ نہ کی، تو پھر تم دیکھ لو کہ کیا ہوگا، خود سوچ لو، ایک لمحہ کے لے ذرا سوچ لو کہ میری دنیا میں رہنے کی میعاد ختم ہوگئی ہے، اور میرے لئے چلنے کا حکم ہونے والا ہے، اور روزانہ ہمارے سامنے، ایک محلے میں، دوسرے محلے میں یہ مناظر پیش آتے ہیں۔

ایک شخص کی حضرت عزرائیلؑ سے دوستی:

ایک شخص کے ساتھ دوستی تھی عزرائیل علیہ السلام کی، کہنے لگے یار! تمہارے ساتھ دوستی ہے، کبھی اس دوستی کا حق بھی ادا کرو گے! کہنے لگے جیسے کہو! دوست جو ہوئے، کہنے لگے کہ جب میرے جانے کا وقت ہو تو مجھے بتا دینا، تاکہ میں اپنی تیاری کرلوں، کہنے لگے بہت اچھا! ایک دن تشریف لائے، فرمانے لگے چلئے، کہا کدھر چلیں، کہنے لگے جہاں جانا ہے سب کو ادھر چلیں، کہا کہ آپ نے تو میرے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ آپ میرا وقت آنے سے پہلے مجھے مطلع کر دیں گے، تاکہ میں اپنی تیاری کرلوں، فرمایا میں نے مطلع تو کیا تھا لیکن آپ سمجھے نہیں، میں نے آپ کو آگاہ کیا تھا، لیکن آپ نے سوچا ہی نہیں، سمجھا ہی نہیں۔ کہنے لگے کب کیا تھا؟ کہنے لگے ایک دن میں پڑوس میں آیا تھا، ایک دن ادھر آیا تھا، ایک دن سامنے والے مکان پر آیا تھا، ایک دن پیچھے والے مکان پر آیا تھا، آتا رہا تھا کہ نہیں آتا رہا تھا؟ کہا کہ ہاں آتے رہے تھے، فرمایا میں اسی طرح بتایا کرتا ہوں، میں جب بھی بتاتا ہوں اسی طرح بتاتا ہوں۔

قرآن سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں:

تو قرآن کریم کی نعمت اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہے، اور میں سو بار قسم کھا کر کے بات کہوں تو انشاء اللہ میں حانث نہیں ہوں گا کہ ہمارے پاس قرآن کریم سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے، اللہ کا شکر ہے، اگر ہمارے کپڑے پھٹے ہوئے ہوں تو ہمارا گزارہ ہوسکتا ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا گزارہ ہوا تھا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے،

ایک کمبل لپیٹا ہوا ہے، اور اس پر ببول لگے ہوئے ہیں، اسی حالت میں مگن ہیں، ان کو کبھی شکایت نہیں ہوئی، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کبھی شکایت نہیں ہوئی، نہ اللہ سے شکایت ہوئی، نہ رسول سے شکایت ہوئی، نہ اپنے بھائی بندوں سے شکایت ہوئی، نہ بڑوں سے شکایت ہوئی، شکایت ہوتی تو کس بات پر ہوتی؟

تسبیحات فاطمیؓ کی برکات:

ایک دفعہ فقرائے صحابہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ یارسول اللہ! ہم لوگ تو فقیر ہیں، صدقہ ہم نہیں دے سکتے، کوئی مالی نیکی کا کام ہم نہیں کرسکتے، حج کے لئے ہم نہیں جاسکتے، وغیرہ وغیرہ، اور یہ مالدار لوگ ہیں یہ سارے نیکی کے کام کرتے ہیں، غریبوں کو کھانا یہ کھلاتے ہیں، صدقات یہ کرتے ہیں، غریب غرباً کی دستگیری یہ کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا، میں تمہیں ایک بات بتا دیتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کرلوگے تو یہ لوگ تمہارے برابر نہیں ہوسکیں گے، کہنے لگے یا رسول اللہ! ضرور بتلایئے۔

فرمایا فرض نماز کے بعد تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ، ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو، کوئی شخص نہیں مل سکے گا تمہارے ساتھ، یہ حضور ﷺ کی بات تو کوئی راز نہیں تھی، حضرات امراً کو بھی معلوم ہوگئی، انہوں نے بھی یہ عمل شروع کردیا، یہ غرباً پھر آئے، کہا کہ حضور! وہ عمل تو انہوں نے بھی شروع کردیا ہے، یعنی امیروں نے بھی شروع کردیا ہے، فرمایا: "ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ." (یہ اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہیں عطا فرمادیں)۔

اتنی بڑی بات...... کہ جو لوگ فقیر ہیں، امیروں سے آدھا دن پہلے جنت میں جائیں گے، کھانے کو کچھ نہیں، پیٹ میں کچھ نہیں، پہننے کے لئے کچھ نہیں، مکان کچھ نہیں، ہر طرح سے بھوکے ننگے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کی معیت اختیار کرلی، وہ آپؐ پر ایمان لائے، ان کو اتنی خوشی ہے، اتنی راحت ہے کہ ان کی راحت کون بتائے! مال و دولت کے ذریعے سے ان کو راحت نہیں ملتی، جاگیرداری سے راحت نہیں ملتی، البتہ ایک بات سے راحت ملتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر چلیں۔

اللہ پاک ہمیں حضور ﷺ کے طریقہ پر چلنے کی توفیق دے۔

وما علینا الا البلاغ

علمائے فرائض

ہمارے اکابرؒ کی جو عادت رہی ہے، یعنی اپنے نفس کی اصلاح کرنا اور اسوہ رسول اکرم ﷺ کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لینا، کسی شیخ سے، جس سے عقیدت، محبت اور تعلق ہو، اس سے اپنا اصلاحی تعلق قائم کرلیں، شتر بے مہار نہ رہیں، شتر بے مہار آدمی خراب ہوجاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد!

آپ حضرات کو اس لئے زحمت دی گئی ہے کہ آپ سے ملاقات ہوجائے، اور آپ کی زیارت ہوجائے، دوسرا کوئی خاص موضوع (اس وقت ذہن میں) نہیں ہے۔

آپ حضرات ماشاءَ اللہ اس ملک (انگلینڈ) میں رہتے ہیں، بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی ہمارے ذریعے سے اصلاح ہوسکتی ہے۔ الحمد للہ آپ حضرات ان میں مشغول ہیں، دینی تعلیم کا بھی اہتمام فرماتے ہیں، اور بعض چیزیں ایسی ہیں، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: "مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَ فِيهِمْ تَعُوْدُ." (مشکوٰۃ ص: ۳۸)، (انہی کے اندر سے فتنہ نکلے گا اور انہیں میں لوٹے گا۔) ہمیں اس بات کا اہتمام کرنا چاہئے کہ خدانخواستہ ہم لوگ ان میں شامل نہ ہوں کہ جن سے فتنہ نکلتا ہے، اور ان ہی میں لوٹتا ہے۔

علماءَ امت کی ذمہ داریاں جیسا کہ آپ حضرات کو مجھ سے بہتر معلوم ہے، عام لوگوں سے زیادہ ہیں، اور میں ان ذمہ داریوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں:

ذاتی اصلاح:

۱:......ایک حصہ تو ہے اپنی ذاتی اور انفرادی اصلاح کا، جس میں اپنے اہل و عیال بھی شامل ہوجاتے ہیں، اپنے گھر والے بھی اور دوسرے متعلقین بھی، اس کا خاص طور پر اہتمام ہونا چاہئے۔

امت کی اصلاح:

۲:...... اور دوسری ذمہ داری امت کی اصلاح کی ہے، یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ امت کا اس وقت کیا حال ہو رہا ہے؟ کوئی کسی کی بات سننے اور ماننے کے لئے تیار نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود جہاں تک آپ حضرات کی رسائی ہوسکتی ہے اور جہاں تک آپ کی آواز پہنچ سکتی ہے، نہایت حکمت کے ساتھ، پورے تدبر کے ساتھ، امت کی فکر کرنی چاہئے، اپنے علاقے میں جہاں جہاں ہم رہتے ہیں، وہاں وہاں تک اور جہاں تک ہم اپنی آواز پہنچا سکتے ہیں، وہاں تک اپنی آواز پہنچانی چاہئے۔ یہ دو حصے ہوئے ایک حصہ انفرادی اصلاح کا اور دوسرا حصہ امت کی اصلاح کا۔

آقائے دوعالمؐ کی ریس نہیں:

آپ حضرات کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال کے بعد نبوت ملی اور اس کے بعد آپؐ دنیا میں صرف تیئس سال رہے، اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی راحت، آسائش اور اپنے آرام کی پرواہ نہیں کی، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے امت کی راہنمائی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو پیغمبرانہ قوت و عزیمت تھی، ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریس نہیں کرسکتا، عقل حیران ہوتی ہے کہ تیرہ سال تو مکہ مکرمہ میں تکلیفیں اٹھاتے رہے، بعد

میں مدینہ طیبہ آگئے، دس سال کے پورے عرصے میں عرب جیسی اجڈ قوم، جو کسی کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھی، آپؐ نے ان کو بھی رام کرلیا اور دوسری طرف آپؐ نے اسلامی سرحدوں پر کسریٰ سے اور ان کی فوجوں سے مقابلہ شروع کردیا۔ یہ آپؐ کی اسی محنت کا نتیجہ اور ثمرہ تھا کہ جب آپ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو سارا ملک عرب آپؐ کے زیر نگیں تھا، بعد میں پھر فتنے بھی پیدا ہوئے اور بہت سے ایسے لوگ مرتد ہوئے جن کی مکمل اصلاح نہیں ہوئی تھی، آپؐ کے خلفاءؓ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اصلاح فرمائی، خاص طور پر آنحضرت ﷺ کے یار غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعہ ان کی اصلاح فرمائی، تو میں عرض کر رہا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی تو کوئی ریس نہیں کرسکتا، کیونکہ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں آنحضرت ﷺ نے امت کی راہنمائی نہ فرمائی ہو، عقل حیران رہ جاتی ہے کہ تھوڑے سے عرصہ میں آنحضرت ﷺ نے پوری قوم کو اور قوم کے بعد آنے والی نسل انسانی کو راہ راست دکھائی اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ فرمایا، ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے نام لیوا ہیں، لیکن ہم میں بہت کمزوریاں پائی جاتی ہیں، سب سے پہلے میں نے کہا تھا کہ اپنی انفرادی اصلاح ضروری ہے، مگر افسوس کہ ہم اس کی طرف متوجہ نہیں۔

کرنے کا کام:

آپ نے احادیث میں پڑھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر موقع کی دعائیں فرماتے تھے، اور امت کو سکھاتے تھے، ہم سے تقریباً یہ بھی چھوٹ چکی ہیں، بہت کم آدمی ایسے ہوں گے جو اس میں مشغول ہوں گے، یہاں (انگلینڈ) کے رہنے والے مولویوں کا تو حال یہ ہے کہ سونا، کھانا اور بس! خوب سوتے ہیں اور خوب کھاتے ہیں،

اور کچھ اللہ کے بندے تو ایسے بھی ہیں جو موٹے بھی بہت ہوجاتے ہیں۔ تو میں اس سلسلے میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی ذاتی اصلاح سے کبھی آدمی کو فارغ نہیں ہونا چاہئے۔

ہمارے اکابرؒ ہمیشہ صاحب نسبت ہوتے تھے، اہل اللہ سے تعلق ہوتا تھا، اور تقویٰ وطہارت کی زندگی ان کا شعار ہوتا تھا، مگر ہم تقریباً ان چیزوں کو بالکل بھول گئے ہیں، ادھر ادھر کی چیزوں میں تو مشغول ہیں، لیکن خاص ہمارے جو کرنے کا کام ہے اس میں کوتاہی ہوگئی ہے۔

میں آپ حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ حضرات اپنی اصلاح کی طرف اور ذکر الٰہی کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوں، کسی شیخ سے تعلق ہو تو ان کے بتائے ہوئے معمولات کے مطابق عمل کریں، اگر کسی شیخ سے تعلق نہ ہو تو کسی شیخ سے تعلق قائم کریں، بہرحال ہمارے علماء کرام کو شتر بے مہار نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان کی نکیل کسی کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔

ہماری کوتاہیاں:

علماء کرام میں ایک کمزوری یہ پائی جاتی ہے کہ کسی کی بات مانتے نہیں ہیں، اپنے گھر میں چوہدری ہوتے ہیں، نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہئے، کوئی اجتماعی کام ہو تو اس میں بھی مشورے کے ساتھ اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے۔

ایک بات تو مجھے یہ عرض کرنی تھی، اور یہ سب سے اہم ترین بات ہے، دوسری بات جو میں نے کہا کہ امت کی اصلاح بھی آپ کے ذمہ ہے، پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کسی خاص علاقے اور کسی خاص بستی کے لئے مبعوث کئے جاتے تھے،

ان حضرات کے ذمہ صرف اپنے ماحول کی اصلاح ہوتی تھی، دوسری بستی یا دوسرے علاقے کے لئے اللہ تعالیٰ دوسرے رسول کو بھیج دیتے تھے جیسا کہ حدیث میں ہے:

"كانت بنو اسرائيل تسوسهم الانبياء. كلما هلك نبي خلفه نبي. وانه لا نبي بعدي وسيكون خلفاء." (بخاری ج:۱ص:۱۹۱)

ترجمہ:......"بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ میں ہوتی تھی، کسی نبی کا وصال ہوجاتا تو اس کی جگہ دوسرا مقرر کردیا جاتا۔"

وہ خاص خاص علاقوں کے لئے ہوتے تھے، اور ان کی ذمہ داری اپنے علاقے تک محدود رہتی تھی، مگر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پورے عالم کے لئے تشریف لائے ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی اور امت میں سے علماء کرام ماشاء اللہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں، آپ حضرات جس علاقے میں رہتے ہیں، جہاں تک ممکن ہوسکے اس علاقے کی اصلاح آپ کے ذمہ فرض ہے، مسلمانوں کی بھی اور غیرمسلموں کی بھی، جہاں تک ہوسکے آپ حضرات ایسے اخلاق اپنائیں، ایسے طور طریقے اپنائیں کہ دوسرے لوگوں کو آپ کو دیکھ کر نفرت نہ ہو، بلکہ جیسے فرمایا گیا ہے: "عباد الله اذا رؤا ذُكِر الله." اللہ کے بندے وہ ہیں کہ جب ان کے چہرے پر نظر پڑے تو اللہ تعالیٰ یاد آجائے، کے مصداق بنیں، آپ ایسے طریقے پر رہیں کہ آپ کے ذریعہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ یاد آجائے۔

علماءؑ کے اختلافات:

علماءؑ کرام میں اختلافات بھی ہوجاتے ہیں، یہ کوئی بری بات نہیں ہے، بلکہ علماءؑ کرام میں اختلافات کا پیدا ہوجانا اچھی چیز ہے، لیکن اس اختلاف کو فساد تک نہیں پہنچنا چاہئے کہ بات عوام میں آجائے، اس سے آپ حضرات کی سبکی ہوگی، اور لوگ کہیں گے کہ علماءؑ کرام آپس میں لڑتے ہیں، حالانکہ لڑتے تو وہ بھی ہیں، بلکہ وہ ہم سے زیادہ لڑتے ہیں، مگر علماءؑ کے اختلاف سے عوام میں ان کی بے وقعتی ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ حضرات اگر اختلاف ختم نہیں کرسکتے تو کم سے کم اتنا تو کرسکتے ہیں کہ کسی کو اپنا بڑا بنالیں، اور بغیر دلیل کے ان کی بات مان لیں۔

تنظیم کی ضرورت:

میں کل تذکرہ کررہا تھا کہ حضرت مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا، کہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا بلکہ چھوٹے درجے میں مدرس تھا اور ماشاءؑ اللہ مفتی صاحب سیاست کے میدان میں تھے، تو میں نے ان کو ایک لمبا چوڑا خط لکھا، بہت سی باتیں لکھی تھیں، ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ یہ زمانہ تنظیم کا ہے حتیٰ کہ ہمارے یہاں چوہڑوں، چماروں اور بھنگیوں کی بھی تنظیم ہے، اگر کوئی بھنگی ناراض ہوجائے تو سارے بھنگی ہڑتال کردیتے ہیں، کلرکوں کی تنظیم ہے، وکیلوں کی تنظیم ہے، وغیرہ وغیرہ۔ امت کے جتنے طبقات ہیں ان کی تنظیم ہے اور اگر کوئی تنظیم نہیں ہے تو علماءؑ کرام کی نہیں ہے، اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک آدمی بڑا ہے، لائق احترام ہے، کوئی کسی کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتا، اور میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے: ''السمع والطاعة ولو امر علیکم عبد حبشی مجدع.''

(سمع و طاعت بجا لاؤ، خواہ تمہارا امیر بنادیا جائے کسی حبشی نکٹے غلام کو) اس کو اپنا بڑا بنالو، بڑا بنا کر کے اس کی سمع و طاعت بجا لاؤ۔ میں نے کہا کہ دوسری امتوں کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت نہیں دی، یہ سب سے زیادہ مسلمانوں کے لئے تھی اور بالخصوص علمائے کرام کے لئے، لیکن اس کو سب سے زیادہ پس پشت بھی ہم نے ڈالا ہے، جب ہماری صورت حال یہ ہو تو کوئی کسی کو کیا کہہ سکتا ہے؟

اگر ہم رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر آجائیں اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد پر عمل کرنے والے ہوجائیں تو پھر ہمارا سارا معاملہ ٹھیک ہوجائے گا۔

جیش اسامہ کی روانگی:

اپنے وصال شریف کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر بنا کر ملک شام کی سرحد پر بھیجنا چاہا تھا، سترہ سال یا اٹھارہ سال آپؓ کی عمر تھی، لوگوں نے کہا کہ یہ بچہ (لونڈا) ہے، اس کو آپؐ ہم پر امیر بنارہے ہیں؟ ان سے تو ہمارے پوتے بھی بڑے ہیں، آنحضرت ﷺ کو یہ بات پہنچی تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "اس سے پہلے تم نے اس کے باپ پر اعتراض کیا تھا (حضرت زید بن حارثہؓ پر) اور اب تم نے ان پر اعتراض کیا ہے، بہرحال آنحضرت ﷺ نے ناگواری کا اظہار فرمایا۔ ابھی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر جمع ہونے ہی لگا تھا، کہ اتنے میں رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر کی تیاری تھی، اب چونکہ آنحضرت ﷺ دنیا سے تشریف لے جاچکے تھے، اس لئے لوگوں کو یہ بات کہنا آسان ہوگئی تھی، مگر حضرت

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لوگ جھجکتے تھے، اس لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی طرف سے نمائندہ بنا کر لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیجا۔ (یہ واقعہ حضرت مولانا محمد یوسف دہلویؒ نے حیاۃ الصحابہ میں نقل کیا ہے۔)، حضرت عمرؓ نے یہ کہا کہ: اول تو اس لشکر کے بھیجنے میں توقف کریں، کیونکہ ایک تو پہلے ہی حالات بہت مخدوش ہیں، اور فی الحال اس لشکر کی تیاری میں توقف کریں، اگر بھیجنا ہی ضروری ہے تو کسی اور آدمی کو امیر مقرر کردیں۔ یہ چھوٹا بچہ ہے اس کو ہم پر امیر مقرر کر رہے ہیں، چونکہ حضرت عمرؓ بھی اس لشکر میں شامل تھے، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امیر المؤمنین بن چکے تھے، تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہؓ سے یہ کہہ کر حضرت عمرؓ کو اپنے پاس رکھ لیا کہ: ان کو میرے پاس رہنے دیں۔ یعنی حضرت اسامہؓ سے ان کو اپنے پاس رکھنے کی درخواست کی۔

بہرحال حضرت عمرؓ یہ پیغام لے کر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے روایت کے الفاظ یہ ہیں: "فوثب ابوبکر و اخذ بلحیته" (اچھل کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی داڑھی پکڑ لی) اور فرمایا کہ: "امره رسول الله صلى الله عليه و سلم و تريد ان انزعه." (آنحضرت ﷺ نے اس (حضرت اسامہؓ) کو امیر بنایا ہے اور تو یہ چاہتا ہے کہ میں اس کو اتار دوں؟) آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو امیر بنایا! (اس موقع پر میں نے کسی جگہ لکھا تھا کہ) بظاہر یہ ایک سیاسی بات ہے کہ فلاں آدمی کو امیر بنایا جائے یا نہ بنایا جائے، فوج کا سپہ سالار بنایا جائے یا نہیں بنایا جائے؟ بظاہر یہ خلیفۂ وقت کا کام ہے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو برداشت نہیں کیا، اور آخر میں اتنی بات فرمائی میں یہ چاہوں گا کہ عمرؓ کو میرے پاس رہنے دیں۔ اب لشکر جہاں رسول اللہ ﷺ نے بھیجا

تھا چلا گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا کہ لشکر چلا گیا اور آپؓ نے اس کے ساتھ سارے مہاجرین و انصار جمع کر دیئے ہیں، تو پیچھے مدینہ خالی ہو جائے گا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر کتے عورتوں کے پاؤں گھسیٹ کر لے جائیں تب بھی میں اس لشکر کو نہیں روک سکتا، جس کو رسول اللہ ﷺ نے تیار کیا ہے، حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو نوجوان تھے، ان کو امیر بنانا، ظاہری بات ہے کہ میری اور آپ کی عقل میں کیسے آسکتا ہے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عقل میں نہیں آرہا تھا، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عقل میں نہیں آرہا تھا، صرف ایک حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جنہوں نے اس بات کو سمجھا تھا، تو جب مسلمانوں نے ایک شخص کو امیر مقرر کرلیا، اپنا بڑا بنالیا، اس کے حکم کے مطابق چلے، تو جس طرف گئے مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی کہ ان کے پاس پتہ نہیں کتنا لشکر ہے کہ اتنا لشکر تو یہ باہر بھیج رہے ہیں، باقی لشکر پتہ نہیں ان کے پاس کتنا ہوگا؟ اور راستے میں جہاں جہاں لوگ مرتدین تھے ان کو ہدایت دیتے گئے۔

تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارا ایک طریقہ تھا یعنی کسی کے ساتھ جڑ کر رہنا، خود بڑا نہ بننا بلکہ کسی بڑے کے ماتحت ہوکر رہنا اور اپنے آپ کو اللہ کی مخلوق میں کمزور تر سمجھنا، یہ چیز ہمارے اسلاف میں تھی مگر ہم سے یہ چیز نکل گئی ہے۔ اور اس کے نکلنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں فتنہ و فساد در آیا ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے، ہمارے بگاڑ کی وجہ سے امت بگڑ رہی ہے، (جن لوگوں کی اصلاح ہمیں کرنی تھی) جب ہماری خود ہی اصلاح نہیں ہوئی، تو امت کی اصلاح کیسے کریں گے؟ کوئی داڑھی منڈواتا ہے، اور نہ معلوم کیا کیا خرافات کرتا ہے، اور ہم پھر بھی مسلمان کہلاتے ہیں۔

تم اسلامی تہذیب کے نمائندے ہو:

ہمارے بزرگ فرماتے تھے کہ تم اس ملک میں اسلامی تہذیب کے نمائندے بن کر آئے ہو، اگر تم بھی غیروں کے طریقوں پر چلنے لگے تو تمہاری نمائندگی کیا رہی؟ تو بھائی دو چیزیں میں نے عرض کی ہیں، ایک اپنی انفرادی اصلاح، اور ایک اپنی قومی اصلاح، دونوں چیزوں کا آپ حضرات کو اہتمام کرنا ہے۔

ادھر رمضان مبارک آرہا ہے، آپ کے یہاں تو رمضان المبارک بھی بہت سستا ہے، آج کل چھوٹے چھوٹے دن ہیں، اِدھر روٹی کھائی ادھر ہضم نہیں ہوئی کہ روزہ کھل گیا، ۴ بجے روزہ کھل جاتا ہے، بہرحال اللہ تعالیٰ نے دن کو بھی بنایا ہے، رات کو بھی بنایا ہے، کبھی راتیں لمبی ہوتی ہیں دن چھوٹے ہوتے ہیں، کبھی دن لمبے ہوتے ہیں راتیں چھوٹی ہوتی ہیں، اور تمہارے ہاں اگر اور اوپر کی طرف چلے جائیں تو پھر اور بھی مسئلہ مشکل ہوجاتا ہے، آپ حضرات کو ایک تو اپنی انفرادی اصلاح کرنی چاہئے اس کا اہتمام کرنا چاہئے اور بے فکر نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہے اور آپ رسول اللہ ﷺ کے وارث ہیں، اور دوسرے امت کی اصلاح کرنی چاہئے جہاں تک ہوسکے۔ ایک خاص بات جو آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنے کی ہے وہ یہ کہ ہم میں سے ہر ایک کا منہ اپنی اپنی طرف ہے، کسی کا کسی طرف ہے، کسی کا کسی طرف ہے، بڑوں کے ساتھ جڑ کر رہو اور وہ جو مشورہ دیں اس کے مطابق عمل کرو، ہمارے تمام مسائل جو اُلجھے ہوئے ہیں اس کا آسان حل یہی ہے، میں جانتا ہوں کہ انگلینڈ میں بہت سے مسائل ہیں تمہارے مسائل حل کرتے ہوئے مفتی محمود صاحبؒ بھی بے چارے چلے گئے، اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت

فرمائے، (آمین) لیکن یہ مانتے ہی نہیں ہیں، ہار کر بے چارے چھوڑ کر چلے گئے، تو میں تو تمہارے مسائل میں دخل نہیں دینا چاہتا، میں تو بہت کمزور آدمی ہوں، بہت چھوٹا آدمی ہوں، تمہارے مسائل اور معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتا، البتہ یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے معاملات کو اپنے بڑوں کی رائے کے مطابق حل کرو، اس کے ساتھ ذکر الٰہی کی پابندی کرو۔

ہمارے اکابر کا معمول:

میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ہمارے اکابرؒ کا معمول یہ تھا کہ وہ فارغ ہونے کے بعد کسی شیخ سے بیعت ہوتے تھے اور ان کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے تھے، مارے مارے پھرتے تھے جب تک کہ یہ چیز حاصل نہیں ہوجاتی تھی اس وقت تک کسی کام میں لگتے نہیں تھے، اور ہم نے یہ طریقہ اپنالیا ہے کہ اِدھر فارغ ہوئے اُدھر کسی مسجد کی تلاش کی فکر میں گم ہوگئے، کہ کوئی نہ کوئی مسجد ملے، ارے بھائی روٹی کی فکر نہ کرو، روٹی انشاءَ اللہ، اللہ تعالیٰ دے گا، اور تمہیں تو اچھی روٹی ملتی ہے۔ ذکر کی پابندی کرو، مولانا (سلیم) دہرات صاحب سے عرض کیا ہے کہ یہ بھی اپنے حلقے میں ذکر شروع کریں، انہوں نے اپنے طور پر تو اہتمام کیا ہے لیکن اپنے ساتھیوں کے ساتھ اہتمام نہیں کیا، میں نے کہا کہ آپ کو حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی طرف سے بیعت کی اجازت دی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ آپ اہتمام کریں، آپ خود ہی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے، ایک تو ذکر کا اہتمام کرو، دوسرے رمضان المبارک آرہا ہے، قرآن مجید کی تلاوت کا اہتمام کرو، جو حضرات قرآن مجید کے حافظ ہیں وہ سنانے کا کوئی اہتمام کریں اور جو حافظ نہیں ہیں وہ بھی تلاوت کا اہتمام کریں۔ راتیں ماشاءَ اللہ بڑی

ہیں، کم سے کم رمضان المبارک میں ۵ پارے، ۱۰ پارے تو منزل ہونی چاہئے، اور تیسری بات یہ کہ آپس میں جوڑ رکھو، جتنی ہوسکے ایک دوسرے کی بات کی کاٹ نہ کرو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو: "لا تحاسدوا و لا تباغضوا و کونوا عباد اللّٰہ اخوانًا." (ایک دوسرے کے ساتھ حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، اللہ کے بندو بھائی بھائی بن کر رہو۔) بس یہی میں عرض کرنا چاہتا تھا۔

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

اللّٰھم صلی علی سیدنا و مولانا محمد و بارک و سلم۔

طلبائ اور علمائ کے لئے لائحہ عمل!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجب ۱۴۲۰ھ کو جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی میں ختم بخاری شریف کی تقریب تھی، حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ آخر میں تشریف لائے، اور چند کلمات ارشاد فرما کر دعا فرمائی، آپ کے اس مختصر خطاب میں جو سوز و گداز تھا اسے جس نے بھی سنا وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ''خطاب مودع'' ہے اور واقعی وہ خطاب مودع ہی ثابت ہوا، جو پیش خدمت ہے:

الحمد للہ کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد!

میرے عزیز طلبا! میں چند باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں:

پہلی بات: تو یہ ہے کہ حضرت ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم نے جن جن بزرگوں کا نام لیا ہے، ان کے لئے بھی اور جن جن بزرگوں کا نام رہ گیا ہے ان کے لئے بھی، آپ تمام حضرات دعا فرمائیں، خصوصاً ہمارے محسن اعظم

حضرت اقدس مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ، جن کا یہ دین کا باغیچہ (جامعہ علوم اسلامیہ) لگایا ہوا ہے، ان کے علاوہ تمام حضرات کے لئے بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں۔

ہمیں معاف کردو:

دوسری بات: مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ مدرسے میں رہتے ہوئے ہم لوگوں سے آپ حضرات کے حق میں بہت سی کوتاہیاں ہوئی ہوں گی، کھانے پینے کے معاملے میں، رہنے سہنے کے معاملے میں، برت برتاؤ کے معاملے میں، جیسا آپ کا اکرام ہمیں کرنا چاہئے تھا، ویسا ہم نہیں کر سکے، آپ لوگ ہم لوگوں کو معلّم اور ہم آپ کو طلباء سمجھتے رہے، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ تم بھی تو مہمانان رسول ﷺ تھے اور تم ہمارے لئے لائق تعظیم اور لائق اکرام تھے، مگر ہم آپ کا کما حقہ اکرام نہیں کر سکے۔

تو بھائیو! ہمارے عملے میں سے، مدرسے والوں میں سے جس صاحب سے جو کوئی کوتاہی ہوئی ہو، ہم دست بستہ اس کی معافی مانگتے ہیں، آپ حضرات ہماری تمام کوتاہیوں کو معاف فرمادیں۔

تیسری بات: یہ عرض کرنی ہے کہ آپ حضرات یہاں سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں میں جائیں گے، کسی کا دعوت و تبلیغ میں جانے کا ارادہ ہوگا، کسی کا کوئی مدرسہ بنانے کا ارادہ ہوگا، کسی کا کوئی منصوبہ ہوگا۔

اصلاحی تعلق کی ضرورت:

ہمارے اکابرؒ کا معمول یہ رہا ہے کہ وہ حضرات جب بھی دینی مدرسے سے فارغ ہوتے تھے، تو کسی شیخ سے اصلاحی تعلق قائم کر لیتے تھے، چونکہ اب آپ ہی

حضرات نے دین کی خدمت کرنی ہے، ہمارا وقت تو پورا ہو چکا ہے، ہم تو آج کل جانے والے ہیں، آج چلے جائیں، یا کل چلے جائیں! تو آپ حضرات کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے، خصوصیت کے ساتھ ہمارے اکابرؒ کی جو عادت رہی ہے، یعنی اپنے نفس کی اصلاح کرنا اور اسوہ رسول اکرم ﷺ کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لینا، کسی شیخ سے، جس سے عقیدت، محبت اور تعلق ہو، اس سے اپنا اصلاحی تعلق قائم کرلیں، شتر بے مہار نہ رہیں، شتر بے مہار آدمی خراب ہوجاتا ہے، نفس بڑا ذلیل ہے، آدمی کو جگہ جگہ بہکاتا ہے۔ اپنے اکابرؒ سے تعلق رکھیں اور کوئی بات بھی ہو، ان سے پوچھے بغیر نہ کریں، ان سے مشورہ کیے بغیر نہ چلیں۔

غلط مسئلے نہ بتاؤ:

اب تمہارے پاس لوگ آئیں گے اور آپ ہی سے اپنے مسائل کا حل معلوم کریں گے۔

ہمارے حضرت مولانا عبدالشکور کامل پوری رحمہ اللہ ہوتے تھے، وہ سند فراغت کو ''مصلیٰ'' کہا کرتے تھے، ان کی زبان میں، اب تمہیں مصلیٰ تو مل جائے گا یعنی سند مل جائے گی، اس اعتبار سے اب تم ماشاءاللہ عالم بن جاؤ گے۔

میرے پاس تو یہ مصلیٰ بھی نہیں ہے، وہ بھی مجھ سے گم ہوگیا ہے، میں تو خالی ہوں، ایک دم ظاہراً و باطناً بالکل خالی ہوں، اب مصلیٰ (سند) لے کر آپ جائیں گے، لوگ آپ سے مسائل پوچھیں گے، دینی معلومات کریں گے، اور آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم آئے گی کہ بھائی یہ مسئلہ تو مجھے نہیں آتا۔ اس لئے آپ کچھ نہ کچھ گھڑ کر بیان کرنے کی کوشش کریں گے، یہ حماقتیں ہم نے بھی کی ہیں، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

میں آپ حضرات کو نصیحت کرتا ہوں کہ میرے بھائیو! جو مسئلہ معلوم ہو، وہ بتادو، اور جو معلوم نہ ہو صاف کہہ دو کہ بھائی مجھے معلوم نہیں، پوچھ کر بتاؤں گا۔ پہلے کتابوں میں دیکھو، علما سے پوچھو اور پھر بتاؤ، اپنی طرف سے اجتہاد کر کے بیان کرنے کی کوشش نہ کرو۔

اصلاح نیت:

دین کا علم تم نے سیکھا ہے، اور چار سال، آٹھ سال، نو سال، دس سال مدرسوں میں لگائے ہیں، اگر تم نے دین کا علم دنیا کمانے کے لئے سیکھا ہے، تو یہ بہت خسارے کا سودا کیا ہے، اگر صرف پیٹ کے لئے سیکھا ہے، تو نہایت خسارے کا سودا کیا ہے۔

میرے بھائیو! نیت اب بھی صحیح کرلو، کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کے لئے پڑھیں گے، اللہ تعالیٰ کے لئے دین پڑھا ہے، اللہ کے لئے آئندہ عمل کریں گے، چاہے روٹی ملے یا نہ ملے۔ ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے، تو انشاً اللہ، اللہ تعالیٰ روٹی دے گا، یہ تو میں ویسے کہہ رہا ہوں، روزی تو اس نے لکھ دی ہے، اس میں حبہ، ایک دانہ، تل کے دانہ کے برابر اس میں نہ اضافہ ہوسکتا ہے، نہ کمی ہوسکتی ہے، اس لئے میرے بھائیو! اپنے تمام ارادوں کو اور نیتوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے وقف کردو، اللہ تعالیٰ تم سے جو کام بھی لے، اسے محض اللہ تعالیٰ کی خاطر کرو۔

باتیں تو بہت کرنے کی تھیں، لیکن وقت زیادہ ہوگیا ہے، اب دعا کرو، جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ دعا مجھے لمبی آتی بھی نہیں اور جانتا بھی نہیں ہوں۔ حضرت کے لئے یعنی حضرت اقدس بنوری رحمہ اللہ کے لئے اور ان کے تمام رفقاءُ کے لئے اور

اپنے تمام اساتذہ کے لئے، تمام مدرسوں کے لئے، مدرسے کے معاونین کے لئے، سب کے لئے دعا کرو، اللہ تعالی قبول فرمائے۔

دعا:

"اللھم صل علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آل سیدنا ومولانا محمد وبارک وسلم، ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولاتجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رءوف رحیم."

"یا اللہ! ہم سے کوتاہیاں ہوئی ہیں، یا اللہ! ہمیں معاف فرمادے، یا اللہ جو کوتاہیاں ہوئی ہیں، انہیں معاف فرمادے، یااللہ ہم نا اہل تھے، اہلیت نہیں تھی، استعداد نہیں تھی، یا اللہ ہم نے تیرے بندوں کو گمراہ کیا ہے، ان کو غلط سلط باتیں بتائی ہیں، یااللہ جو غلط باتیں بتائی ہیں، انہیں معاف فرمادے۔ یا الہ العالمین تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تونے اپنے دین کے لئے ہمیں قبول فرمالیا ہے، ہمیں دین میں لگادیا، بچپن سے لے کر آخر عمر تک، یا اللہ دین میں مشغول رکھا، یا اللہ اس کی لاج رکھتے ہوئے ہماری بخشش فرمادیجئے، یا اللہ ہم سب کی بخشش فرمادیجئے، تمام حاضرین کی بخشش فرمادیجئے، یا اللہ اس مجمع میں جتنے لوگ موجود ہیں اور محض تیری رضا کے لئے حاضر ہوئے ہیں، یا اللہ ان سب کو قبول فرما اور ان سب کی بخشش فرما، ہم سب کی بخشش فرما، یا اللہ ہمیں سنت کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔

جو لوگ داڑھیاں منڈا رہے ہیں، ان کو توفیق عطا فرما کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق داڑھیاں رکھیں، یا اللہ دین کی خدمت کے لئے اس مدرسے کی جو حضرات خدمت کر گئے، یا اللہ ان تمام حضرات کی مساعی کو قبول فرما، یا اللہ اس

میں جتنے طالب علم ہیں، یا جو فارغ ہو چکے ہیں ان کی برکت سے ہم سب کی بخشش فرما، یا اللہ اپنی رحمت سے اپنے فضل سے ہمیں معاف فرما۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم
وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین
برحمتک یا ارحم الراحمین

سب سے بڑا
عبادت گزار

جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے ان کو چھوڑ دو، اور اللہ تعالیٰ سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کرلو کہ آج سے میں نے سب محرمات چھوڑ دیں تو تم سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، امابعد!

مشکوٰۃ شریف کی ''کتاب الرقاق'' میں دوسری فصل کی پہلی حدیث، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشادفرمایا:

''مَنْ یَّأْخُذُ عَنِّیْ ھٰؤُلَاءِ الْکَلِمَاتِ فَیَعْمَلُ بِھِنَّ اَوْ یُعَلِّم مَنْ یَّعْمَلُ بِھِنَّ؟ فَقُلْتُ أَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، فَأَخَذَ بِیَدِیْ فَعَدَّ خَمْسًا: اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَکُن أَعْبَدَ النَاسِ، وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰہُ لَکَ تَکُنْ أَغْنَی النَّاسِ، وَأَحْسِنْ اِلیٰ جَارِکَ تَکُنْ مُؤْمِنًا، وَاحب لِلنَّاسِ مَاتُحِبُّ لِنَفْسِکَ تَکُنْ مُسْلِمًا، وَلَا تُکْثِرِ الضِّحْکَ فَاِنَّ کَثْرَۃَ الضِّحْکِ تُمِیْتُ الْقَلْبَ.'' (مشکوٰۃ ص:۴۳۹)

ترجمہ:...... ''کون ہے جو مجھ سے یہ چیزیں (باتیں) سیکھے، ان پر خود عمل کرے یاکم سے کم کسی ایسے آدمی کوسکھادے جوان پرعمل کرسکے......الخ۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ) فرماتے ہیں: کہ میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشادسن کر یک دم کھڑا ہوگیا، سب سے پہلے میں نے کہا: ''فَقُلْتُ أَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ.'' میں نے کہا: یا رسول اللہ! میں اس کے لئے

حاضر ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک، دو، تین، چار اور پانچ باتیں شمار کیں (سکھائیں)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تو کھڑے ہوگئے تھے، آنحضرت ﷺ کی بات کو محفوظ کرنے کے لئے، غالباً ہم میں سے کسی کے دل میں یہ وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوا ہوگا کہ میں کھڑا ہوجاؤں۔ آنحضرت ﷺ کی طرف سے اعلان ہے کہ کون ہے جو مجھ سے یہ چیزیں لے، ان پر خود عمل کرے یا کسی ایسے آدمی کو سکھا دے جو ان پر عمل کرے۔

میرا خیال ہے کہ ہمارے تو دل میں یہ ہوس پیدا نہیں ہوئی ہوگی، الا ماشاٗ اللہ۔ اللہ کرے کہ آنحضرت ﷺ کی باتوں پر عمل کرنے کی ہم میں حرص پیدا ہوجائے، اور ہم میں سے ہر ایک کہے کہ میں حاضر ہوں، مجھے سکھایئے۔ میں نہیں سکھاتا، حضور اکرم ﷺ سکھاتے ہیں بھائی، میں تو نقل کر رہا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑا اور ۵ تک گنا اور فرمایا کہ:

"اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُن أَعْبَدَ النَاسِ."

محرمات کو ترک کرنا سب سے بڑی عبادت ہے:

اول:...... "یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو چیزیں حرام کردی ہیں ان سے بچو، تم سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔"

یعنی جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کردیا ہے ان کو چھوڑ دو، اور اللہ تعالیٰ سے اور آنحضرت ﷺ سے وعدہ کرلو کہ آج سے میں نے سب محرمات چھوڑ دیں تو تم سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے۔ زیادہ نفل پڑھنے کا نام عبادت نہیں ہے، (یہ بھی اچھی چیز ہے بلکہ بہت اچھی چیز ہے) اسی طرح زیادہ تسبیح پڑھنے کا نام عبادت

نہیں ہے، (یہ بھی اچھی چیز ہے) علی ھٰذا القیاس اور جو جو نیکیاں ہیں، ان کا کرنا بھی عبادت گزاری نہیں ہے، سب سے بڑی چیز اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا اور رک جانا ہے، اب بھائی بات اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کی ہے، اپنے سر سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک ذرا غور کرو کہ کون کون سی چیزیں ہمارے اندر پائی جاتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حرام کر دیا ہے، لیکن ہم نے تو ایک بہت اچھا اور بہت سستا سا نسخہ تلاش کرلیا ہے، جس پر دو پیسے کا خرچہ بھی نہیں آتا، اور وہ یہ کہ ہم ہر بات میں کہہ دیتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے؟ جو مرضی آئی لباس پہن لیا، اور کہہ دیا کہ اس میں کیا حرج ہے؟ کالر لگالئے اور پھر کہہ دیا کہ اس میں کیا حرج ہے؟ داڑھی منڈالی اور کہہ دیا کیا حرج ہے؟ کسی کے ساتھ بے ایمانی کرلی، اور کہہ دیا اس میں کیا حرج ہے؟

غرضیکہ ہم نے سارے دین کو اس بات میں اڑا دیا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے؟:

انہوں نے دین کب سیکھا ہے رہ کر شیخ کے گھر میں
پڑے کالج کے چکر میں، مرے صاحب کے دفتر میں

اکبر الٰہ آبادی مرحوم فرماتے ہیں کہ ہم نے دین کو سیکھا ہی کب ہے؟

حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "فَتَعَلَّمْنَا الْاِیْمَانَ قَبْلَ اَنْ نَتَعَلَّمَ الْقُرْآنَ، ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ فَازْدَدْنَا بِهٖ اِیْمَانًا."

(ابن ماجہ ص:۷)

یعنی ہم نے پہلے ایمان سیکھا تھا پھر قرآن سیکھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ: "اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ

یَنْشَؤُ نَشْوٌ یَقْرَءُ وْنَ الْقُرْآنَ لَا یُجَاوِزُ تَرَاقِیَهُمْ..........الخ" (ابن ماجہ ص:۱۶)

(اوراب کچھ لوگ آئیں گے جو قرآن تو فرفر پڑھیں گے لیکن حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔)

بارگاہ الٰہی میں پیشی:

میرے بھائیو! ایک وقت آیا چاہتا ہے کہ جب میں بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا اور آپ حضرات بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے، اس وقت اللہ تعالیٰ ہم سے سوال کریں گے، اور وہاں ہم سے جواب نہیں بن پڑے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ سَیُخَلِصُ رَجُلًا مِنْ اُمَّتِیْ عَلیٰ رُؤُوْسِ الْخَلَائِقِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَیُنْشِرُ عَلَیْهِ تِسْعًا وَتِسْعِیْنَ سِجِلًّا کُلُّ سِجِلٍّ مِثْلُ مَدِّ الْبَصَرِ ثُمَّ یَقُوْلُ اَتُنْکِرُ مِنْ هٰذَا شَیْئًا؟......الخ"

(مشکوٰۃ ص:۴۸۶)

ترجمہ:......"ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا، اپنے آگے کی طرف دیکھے گا تو جہاں تک نظر پہنچتی ہوگی نامۂ اعمال کا ڈھیر لگا ہوگا اس کے اعمال بد کے نوسو ننانوے دفتر ہوں گے اور ہر دفتر حد نگاہ تک پھیلا ہوا ہوگا، ارشاد ہوگا: کیا ان میں سے کسی کا انکار کرتے ہو؟"

گویا کہا جائے گا کہ پہلے ان کا حساب دے دو اور پھر آگے چلے جاؤ۔ ذرا غور فرمایئے کہ میرا اور آپ کا کیا حال ہوگا؟ ایک ایک چیز کے بارے میں اللہ تعالیٰ سوال کریں گے، اب تو لوگ امتحان میں ناکام ہوکر خودکشی کر لیتے ہیں، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ کہتے ہیں ایک دفعہ امتحان دیا، دوسری دفعہ امتحان دیا، تیسری دفعہ امتحان دیا، کامیابی نہیں ہوئی، خودکشی کرلی، پھر خودکشی کر کے جان چھوٹ جائے گی؟ نہیں! بلکہ اور پھنس جائے گی، میاں یہ تم نے پڑھنا ہی کیوں تھا؟ تم نے یہ پڑھنے کی کوشش ہی کیوں کی؟ جانے دیتے، جہاں تک روٹی کا مسئلہ ہے، مل جائے گی۔ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ دے ہی رہے ہیں، خواہ مخواہ ہم نے اپنے ذمہ روٹی کا بوجھ اٹھالیا ہے، روٹی پیٹ میں ڈالنے کے لئے ہے، سر پر اٹھانے کے لئے نہیں ہے، اللہ تعالیٰ دے دیں گے، غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام کی ہیں، ایک ایک کر کے ان کو چھوڑ دو، تم سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔ اور اگر نہیں چھوڑو گے تو پھر یہ بھی یاد رکھو کہ موت آنے والی ہے، قبر میں دفنا کر آجائیں گے، یہ میرے اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ کسی کو زیادہ رسوا نہیں کرتے، لیکن قبر میں کیا ہوگا؟ اس سے پناہ مانگو، حدیث شریف میں ہے کہ:

"کَانَ عُثْمَانُ اِذَا وَقَفَ عَلٰی قَبْرٍ بَکٰی حَتّٰی یَبُلَّ لِحْیَتَہٗ فَقِیْلَ لَہٗ تَذْکُرُ الْجَنَّۃَ وَالنَّارَ فَلَا تَبْکِیْ وَ تَبْکِیْ مِنْ ھٰذَا. فَقَالَ اِنَّ الْقَبْرَ اَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَّنَازِلِ الْآخِرَۃِ، فَاِنْ نَجَا مِنْہُ، فَمَا بَعْدَہٗ اَیْسَرُ مِنْہُ، وَاِنْ لَّمْ یَنْجِ مِنْہُ فَمَا بَعْدَہٗ اَشَدُّ مِنْہُ..........الخ"

(ترمذی ج:۲ ص:۵۷، ابن ماجہ ص:۳۱۵، مسند احمد ج:۱ ص:۶۳، ۶۴)

ترجمہ:......''حضرت عثمان بن عفان امیر المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جب قبر پر جاتے تھے تو اتنا روتے تھے، اتنا روتے تھے کہ ریش مبارک تر ہوجاتی تھی، عرض کیا گیا: آپ جنت اور دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں مگر اتنا نہیں روتے جتنا کہ اس سے روتے ہیں، فرمانے لگے: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ: قبر سب سے پہلی منزل ہے آخرت کی منزلوں میں سے، اگر یہاں کامیاب ہوگیا تو آگے بھی کامیاب ہوجاؤں گا اور اگر یہاں ناکام ہوگیا تو آگے کی کیا امید کی جاسکتی ہے؟ یہ تو کھیل تماشہ ہے، ہمارے سامنے لوگ مرتے ہیں اور جیتے ہیں، جینا اور مرنا ساتھ لگا ہوا ہے، جب بچہ پیدا ہوتا ہے ماں باپ خوشی کرتے ہیں، عزیز و اقرباءٔ خوشی کرتے ہیں، بچہ روتا ہے، کیوں؟ کیوں روتا ہے؟ اس کو معلوم ہے کہ دوسری منزل آگئی، یہ پہلا سبق ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمادے (آمین)۔ تو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دو، ان سے بچو، تم سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔

یہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں، اپنے نفع کے لئے نہیں، ہمارے نفع کے لئے کی ہیں۔ تم آنحضرت ﷺ کی شکل بنالو، اول سے لے کر آخر تک، علماءٔ کرام سے پوچھ پوچھ کر عمل کرو، اب تو کتابیں بھی لکھی ہوئی ہیں، کتابوں سے علم نہیں آتا بلکہ اللہ والوں کی خدمت میں بیٹھ کر علم آتا ہے، اس لئے کہ معلومات اور چیز ہیں، علم اور چیز ہے۔

دل کی دنیا بدل جائے:

یوں تو میں بھی سارا دن کتاب پڑھتا رہتا ہوں، لیکن علم وہ ہے جو آدمی کے باطن پر اثر کرتا ہے، اندر سے اس کی دنیا بدل جائے، کسی اللہ والے کی خدمت میں

بیٹھو، صحبت میں بیٹھو، لیکن ہمیں اس کا موقع ہی نہیں ملتا، اپنے کاموں میں، اپنے دھندوں میں اتنے مشغول ہو گئے ہیں کہ کسی اللہ والے کو کہاں تلاش کریں؟ اور اس کی خدمت میں کیسے بیٹھیں؟ پھر ہم نے اپنے دل سے ہی ایک بات بنالی ہے کہ ہماری اصلاح کی ضرورت نہیں، اور بعض لوگ جو اپنے آپ کو قصوروار سمجھتے ہیں وہ مایوسی کی اس انتہا کو پہنچ گئے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری اصلاح ہی ناممکن ہے، جب کہ یہ دونوں شیطانی خیالات ہیں۔

دوسری بات یہ کہ آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع میں خطبہ دیا تھا اور اس میں ارشاد فرمایا تھا: "اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ" سنو! میں نے بات پہنچادی ہے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! پہنچادی ہے، پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: "فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنكُمَ الْغَائِبَ." جو موجود ہیں وہ غائبین تک اس بات کو پہنچادیں، حضور اکرم ﷺ اتنا اہتمام کر کے گئے ہیں، اور قیامت تک کے لئے ہمارے ذمہ لگادیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر آنے والی نسل کو تم پہنچاؤ، اور وہ اپنی آنے والی نسل کو پہنچائیں، تو خیر مختصر کر دیتا ہوں۔

غنا کا نسخہ:

حدیث کا دوسرا فقرہ ہے: "وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَکَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ." (اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہارے لئے تقسیم کیا ہے اس پر راضی ہو جاؤ، سب سے زیادہ غنی بن جاؤ گے) اس کے سمجھنے کے لئے ایک مثال دیتا ہوں کہ ایک ماں کے چار بیٹے ہیں، ماں تو ماں ہے ناں، وہ کمی نہیں کرتی، وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ ظلم و

تعدی نہیں کرتی، وہ ہر ایک کا حصہ بانٹ کر رکھ دیتی ہے، جو موجود ہے اس کے لئے بھی اور جو موجود نہیں اس کے لئے بھی حصہ بانٹ کر رکھ دیتی ہے، تو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ماں سے بھی زیادہ محبت کرتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ہر ایک کا حصہ بانٹ کر رکھ دیا ہے اور تم اس پر راضی ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا حصہ تمہارا لکھ دیا ہے، صحت کے اعتبار سے، مال کے اعتبار سے، عمر کے اعتبار سے، اور جتنی چیزیں اللہ کے قبضہ میں ہیں ان کے اعتبار سے، سب کا حصہ الگ الگ بانٹ کے دے دیا ہے، اور آنحضرت ﷺ نے لفظ اتنا پیارا فرمایا: "وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَکَ." (اور تو راضی ہوجا اس پر جو اللہ نے تجھے بانٹ کر دے دیا ہے) "تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ." (تو سب سے زیادہ غنی ہوجائے گا) پھر تجھ سے زیادہ بڑا غنی، دنیا میں کوئی نہیں ہوگا، اور جتنا اللہ تعالیٰ نے تجھے حصہ دے دیا ہے اس حصہ کو لینے کے بعد پھر تجھے دوسروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں، دوسروں سے لڑنے کی ضرورت نہیں ہے، دوسروں پر حسد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ جتنا حصہ اللہ تعالیٰ نے دے دیا ہے نہ اس سے زیادہ ہم لے سکتے ہیں نہ اس سے کم لے سکتے ہیں، کیوں یہی بات ہے ناں؟ لیکن افسوس کہ آج کل ایسا نہیں ہورہا اور یہی بات رسول اللہ ﷺ سمجھانا چاہتے ہیں، ایسا ہو نہیں رہا، دل میں حرص پیدا ہوتی ہے کہ مجھے اور زیادہ ملتا، کبھی کبھی ہم دوسروں کی طرف دیکھتے ہیں کہ اللہ نے اس کو زیادہ دے دیا ہے، مجھے نہیں دیا، یہ شکایت حقیقت میں اس آدمی کی نہیں ہے بلکہ اللہ کی ہے، تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور روزانہ دعا کرو کہ یا اللہ! آپ نے جتنا میرے لئے لکھ دیا ہے، میں اسی پر راضی ہوں، اور کسی دوسرے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں، میں قربان جاؤں اپنے نبی پاک ﷺ کے کہ آپ ﷺ نے ایک ایسا نسخہ بتادیا ہے کہ ساری تکلیفیں اور

پریشانیاں دور کردی ہیں، میرا بھائی! ایک تنکے اور دانے کے برابر بھی تمہیں زیادہ نہیں مل سکتا، تم جو چاہو کرلو، اور ایک دانہ برابر کی نہیں ہوسکتی، کبھی کہیں بھاگے پھر رہے ہو، کبھی کہیں، جوتے تڑوا رہے ہو، اس تگ و دو سے چیزیں مل جائیں گی؟ نہیں ملیں گی۔ حلال وحرام کا کوئی احساس نہیں، ہم یہ تک نہیں سوچتے کہ یہ چیز میرے لئے حرام ہے یا حلال؟ اگر حرام ہے تو مجھے اگلنی پڑے گی، بہرحال اس بات کو مختصر کرتا ہوں۔

دنیا کے کسی انسان نے نہیں دیا، میں نے نہیں دیا، کسی حاکم نے نہیں دیا، اور دنیا کے کسی انسان نے نہیں دیا، میرے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، تمہارے خیال میں تھوڑا دیا ہے یا زیادہ دیا ہے، اس پر راضی ہوجاؤ۔ مشکوٰۃ شریف کی حدیث میں آتا ہے اور ترمذی نے نقل کیا ہے:

”مَنْ اَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِنًا فِیْ سِرْبِهٖ مُعَافًا فِیْ جَسَدِهٖ وَعِنْدَهٗ قُوْتُ یَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حُیِّزَتْ لَهُ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِهَا.“

(مشکوٰۃ ص:۴۴۲، ترمذی ج:۲ ص:۶۰، ابن ماجہ ص:۳۰۵)

ترجمہ:...... ”جس شخص نے صبح کی اس حالت میں کہ اس کا دل مطمئن ہے، اور اللہ تعالیٰ نے عافیت عطا فرمائی (کہ صبح اٹھے تو ہاتھ ٹیڑھا نہیں، زبان گنگ نہیں، کان بند نہیں، صبح اٹھتا ہے تو چلتا پھرتا ہے)، اور ایک دن کی روزی اس کے پاس موجود ہے (یعنی صبح و شام کی)، بس یوں سمجھو کہ دنیا ساری کی ساری بمع ساز و سامان کے اس کے گھر میں سمٹ کر آگئی ہے

(جب اگلا دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا بھی بندوبست فرما دیں گے، تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں)۔''

لیکن ہمارا حال تو یہ ہے کہ فلاں کام بھی کرنا ہے، فلاں کام بھی کرنا ہے، فلاں کام بھی کرنا ہے، بلڈنگ بھی بنانی ہے، ہم اس سوچ میں تھے کہ ادھر عزرائیل علیہ السلام آگیا اور کہنے لگا: چلو چلیں، ارے بھائی! اس وقت اس کو کہہ دینا کہ میں نے تو ابھی بلڈنگ بنانی ہے، ذرا بنا لینے دو۔

مالک بن دینارؒ کا قصہ:

حضرت مالک ابن دینار رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے اور ایک مکان بن رہا تھا، ایک نوجوان مزدوروں کو ہدایات دے رہا تھا، حضرت مالک ابن دینار رحمہ اللہ جا کر اس کے پاس کھڑے ہوگئے، فرمانے لگے صاحبزادے! اس مکان پر کتنا خرچ کرنے کا ارادہ ہے؟ (فرض کرلو ۵ لاکھ) فرمانے لگے: کیا تم ایسا نہیں کرسکتے کہ پانچ لاکھ روپے مجھے دے دو، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بدلے میں ایک ایسا مکان عطا فرما دیں جو کبھی بوسیدہ نہیں ہوگا، اور کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ اور تمہارا جانا یقینی ہوگا، ہمیں کوئی ایسے کہہ دے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ وہ نوجوان کہنے لگا کہ حضرت کل پتہ کیجئے گا، کل تک مجھے مہلت دیجئے، اگلے دن یہ پھر گئے اس کے پاس، چنانچہ اس کے پاس جتنی پونجی تھی، جتنا روپیہ پیسہ تھا وہ سارے کا سارا لا کر حضرت کے سامنے ڈھیر کر دیا، اور فرمایا تحریر لکھ دو، کیونکہ آخر سودا کرنا ہے تو تحریر لکھ دو، کہ میں نے اس نوجوان سے اتنے پیسے وصول کر لیے ہیں، اور اس نوجوان سے میں نے یہ وعدہ کرلیا ہے۔ حضرت مالک بن دینارؒ نے وہ روپے سنبھال لئے اور

سنبھال کر بانٹ دیئے، اور اسی وقت اس کو تحریر لکھ دی کہ میں نے فلاں بن فلاں سے اتنا روپیہ لیا ہے اور جنت میں اس کے عوض مکان بنا کر دینے کا وعدہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی شان کہ سات یوم نہیں گزرے تھے کہ اس نوجوان کا انتقال ہوگیا، وہی جو مکان بنا رہا تھا۔ اس کے سرہانے کے نیچے وہی پرچہ لکھا ہوا لوگوں نے اٹھایا، اس پر لکھا ہوا تھا کہ مالک بن دینارؒ نے اس سے جو وعدہ کیا تھا ہم (اللہ تعالیٰ) نے اس کو پورا کردیا۔

میرا بھائی! آگے بھی ہمارے لئے منزلیں ہیں، مرنے کے بعد کی منزل ہے، اور پھر جنت میں جانا ہے یا دوزخ میں جانا ہے، اللہ رب العزت معاف فرمائے، وہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنا ہے، تم سوچتے سوچتے تھک جاؤ گے مگر وہ ختم نہیں ہوگی، بھائیو! ہم نے اس منزل کے لئے کیا کیا ہے؟ وہاں کے لئے ہم نے یہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی کردے گا، تعجب ہے کہ اس دنیا کے لئے تو ہم محنت کرتے ہیں اور وہاں کے لئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ ہی کردے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا تمہیں تقسیم کرکے دے دیا ہے، اس پر راضی ہوجاؤ، اور اللہ تعالیٰ کے کام میں لگ جاؤ، اپنی نماز میں، روزہ میں، اور تمام نیکیوں میں لگ جاؤ، مجھے تبلیغ والوں کی بات بہت پسند آتی ہے، انہوں نے (جو پکے تبلیغی ہیں) ان کو کہہ دیا ہے کہ اتنے گھنٹے کے لئے دکان کھولو، اور اس کے بعد پھر بند کردو۔ شام کا وقت سب کا سب تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں لگاؤ، وہ جو اس کام کو کرنے والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تین گھنٹے میں وہ کچھ دے دیتا ہے جو سارے دن میں دیتا تھا۔

مؤمن بننے کا نسخہ:

حدیث کا تیسرا فقرہ ہے: ''وَأَحْسِنْ اِلیٰ جَارِکَ تَکُنْ مُؤْمِنًا.'' (اپنے

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو، تم مؤمن بن جاؤ گے، ہماری پڑوسیوں کے ساتھ لڑائی ہے، اور جس کو دیکھو اس کے ساتھ لڑائی ہے، میاں بیوی کی لڑائی ہے، باپ بیٹے کی لڑائی ہے، بھائی بھائی کی لڑائی ہے، کوئی بھی آدمی ایسا نہیں کہ اس کے ساتھ ہماری بنتی ہو، کاہے کے لئے لڑائی ہے؟ روٹی تو جتنی اس نے کھائی ہے، آپ نے بھی کھائی ہے۔ میرا بھائی! پھر لڑائی کرنے سے کیا فائدہ؟ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، اس کو ستاتا نہیں، ایذا نہیں پہنچاتا، کسی قسم کی کوئی اذیت نہیں دیتا، کسی کے ساتھ خیانت نہیں کرتا، دھوکہ نہیں کرتا۔

اور آخری بات (یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں) آنحضرت ﷺ نے یہ فرمائی کہ: "وَلَا تُکْثِرِ الضَّحِکَ." (زیادہ ہنسا مت کرو) کیونکہ زیادہ ہنسا دل کو مردہ کردیتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے، آنحضرت ﷺ کی ہدایات پر عمل کرنے کی، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خود کو دین کا محتاج

سمجھنا ضروری ہے

کسی کے ساتھ جڑ کر رہنا، خود بڑا نہ بننا بلکہ کسی بڑے کے ماتحت ہوکر رہنا اور اپنے آپ کو اللہ کی مخلوق میں کمزور تر سمجھنا، یہ چیز ہمارے اسلاف میں تھی مگر ہم سے یہ چیز نکل گئی ہے۔ اور اس کے نکلنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں فتنہ وفساد در آیا ہے۔

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

"جانشین شیخ الاسلام سید بنوری" حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی دامت برکاتہم مدیر ماہنامہ "بینات" کراچی' وفاقی شرعی عدالت میں قادیانی درخواست کی سماعت کے دوران گزشتہ ماہ لاہور تشریف لاکر وہیں مقیم رہے' ۱۰ر اگست ۱۹۸۴ء کو عدالت میں جمعتہ المبارک کی تعطیل تھی اس روز مولانا موصوف مجاہد ختم نبوت حضرت مولانا تاج محمود نور اللہ مرقدہ کی یادگار دفتر ہفت روزہ لولاک جامع مسجد محمود فیصل آباد تشریف لائے اور یہاں پر جمعہ کے اجتماع سے خطاب بھی فرمایا

عابد و شاکر اور مؤمن بننے کا نسخہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ پانچ باتیں ارشاد فرمائیں :

"مَنْ يَّأْخُذُ عَنِّیْ هٰؤُلَاءِ الْکَلِمَاتِ فَیَعْمَلُ بِهِنَّ اَوْ یُعَلِّمُ مَنْ یَّعْمَلُ بِهِنَّ؟ فَقُلْتُ أَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، فَأَخَذَ بِیَدِیْ فَعَدَّ خَمْسًا: اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَکُنْ أَعْبَدَ النَاسِ، وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَکَ تَکُنْ أَغْنَی النَّاسِ، وَأَحْسِنْ اِلٰی جَارِکَ تَکُنْ مُؤْمِنًا، وَاحب لِلنَّاسِ مَاتُحِبُّ لِنَفْسِکَ تَکُنْ مُسْلِمًا، وَلَا تُکْثِرِ الضِّحْکَ فَاِنَّ کَثْرَةَ الضِّحْکِ تُمِیْتُ الْقَلْبَ." (مشکوٰۃ ص:۴۳۹)

۱ : ------اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام قرار دے دی ہیں ان سے بچو تم عابد بن جاؤ گے۔

۲ : ----- اللہ تعالیٰ نے جو قسمت تمہارے لئے لکھ دی ہے اس پر شاکر ہو جاؤ۔

۳ : ------دوسروں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو مومن بن جاؤ گے۔

۴ :----- ہمسائے کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

۵ :----- زیادہ نہ ہنسا کرو۔

میں زیادہ لمبی چوڑی تقریر نہیں کروں گا بس اسی حدیث پاک کے متعلق چند باتیں عرض کروں گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے حق کہنے اور آپ کو حق سننے اور ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

ہمارے بیانوں میں اثر کیوں نہیں:

ایک چیز جس کا مشاہدہ آپ حضرات نے بھی کیا ہوگا ہم بھی دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ آج کل اس قدر وعظ ہو رہے ہیں' دینی موضوعات پر بڑے بڑے لیکچر دئے جارہے ہیں' مضامین لکھے جارہے ہیں' مگر ان کا نتیجہ ویسا نہیں نکل رہا جیسا کہ نکلنا چاہئے؟

اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا کبھی آپ نے اس پر بھی غور فرمایا؟

بات دراصل یہ ہے کہ اگر کہنے والے کے دل میں نورانیت ہوگی تو اس کے الفاظ میں بھی نورانیت ہوگی اور اگر آدمی خود باعمل نہ ہوگا تو اس کی تقریر محض لفاظی کی حد تک رہ جائے گی اور اس کا اثر نہیں ہوگا ایک مرتبہ میں نے اپنے بعض دوستوں سے کہا تھا اور اگر آپ حضرات ناراض نہ ہوں تو آپ سے بھی یہی کہتا ہوں کہ آپ بیس بیس' تیس تیس سال تک وعظ سنتے ہیں' بچے سے جوان جوان سے بوڑھے ہوجاتے ہیں مگر آپ پر اس کا اثر نہیں ہوتا' اب سوچنے کی بات ہے کہ مولوی صاحب کی زبان میں اثر نہیں رہا کہ آپ میں استطاعت ختم ہوگئی ہے۔ مولوی صاحب ہمیشہ کہتے ہیں قرآن پر عمل کرو' سنت کو اپناؤ مگر کتنے لوگ ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں؟ اور کتنے لوگ ہیں جو مولوی صاحب کی تقریر سے متاثر ہوکر اپنی زندگیوں کے دھارے کو بدل دیتے ہیں؟

مولوی کی تقریر کی غرض:

اصل میں مولوی صاحب بھی اس لئے تقریر نہیں کرتے کہ لوگ ٹھیک ہوجائیں بلکہ وہ محض تقریر کرنے کو اپنے ڈیوٹی سمجھ کر کرتے ہیں اور لوگوں کی اصلاح کرنے کے خیال سے نہیں اور سننے والے بھی حاصل کرنے کے ارادے سے

نہیں سنتے بلکہ آئے اور آکر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سننے والوں کے سروں پر سے گزرتا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی غور سے سنتا ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا کہ وہ تو صرف تقریر سننے کے لئے آیا ہوتا ہے کوئی عمل کرنے یا کچھ حاصل کرنے کے لئے نہیں۔

سامعین کی غرض:

سننے والے یہ نہیں سوچتے کہ ہمیں اپنی بیماریوں (روحانی عوارض) کا علاج کروانا ہے اگر کسی کے کان' ناک میں تکلیف ہے تو وہ خود کو بیمار سمجھتا ہے اور ڈاکٹروں سے علاج کروانے کے لئے ادھر ادھر جاتا ہے۔ فیس ادا کرتا ہے لیکن اگر کسی کے دل میں تکبر ہے تو وہ اسے کوئی بیماری نہیں سمجھتا' حسد کی بیماری اس کی نظر میں کوئی بیماری نہیں' کفر کی بیماری اس کی نظر میں کوئی بیماری نہیں' دل میں کینہ ہے تو کوئی بیماری نہیں' میری شکل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل کے خلاف ہے مگر میں اسے کوئی عیب نہیں سمجھتا۔

تو آدمی جب کسی عیب کو عیب اور کسی بیماری کو بیماری نہیں سمجھے گا تو وہ اس کا علاج کس طرح کروائے گا اور جب علاج بھی نہیں کروائے گا تو اسے اس بیماری سے شفا کیسے ہوگی؟

میاں صاحب کا قصہ:

یہاں پر مجھے حضرت میاں صاحبؒ کا واقعہ یاد آگیا کہ ان کے صاحبزادے عبدالوہاب پڑھائی سے فارغ ہو کر آئے تو حضرت میاں صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ آج جمعہ کا وعظ تم کرو گے۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب نے حسب الحکم وعظ کیا

اور خوب علمی نکات بیان کیۓ لیکن ان کی اس مدلل تقریر کا کسی پر اثر نہ ہوا۔

ان کی تقریر کے بعد کچھ وقت حضرت نے اپنے لئے رکھا ہوا تھا چنانچہ جب صاحبزادہ صاحب کا وعظ ختم ہوا تو حضرت کھڑے ہو گئے اور فرمایا :

"رات ہم نے دودھ رکھا تھا وہ بلی پی گئی"۔

ان کا یہ جملہ کہنا تھا کہ لوگ تڑپ اٹھے اور رونے لگے بھلا غور کیجئے کہ اس جملے میں ایسی کون سی بات تھی جس نے لوگوں کو رلادیا اور تڑپادیا؟

پیران پیر اور امام جوزیؒ کے وعظ کے اثرات:

حضرت پیران پیر اور حضرت عبد الرحمن ابن جوزی وغیرہما کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ جب یہ وعظ فرماتے تو ان کے سامعین میں سے جنازے اٹھا کرتے تھے یعنی موثریت کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کی روحیں قبض ہو جایا کرتی تھیں۔

ہمارا چونکہ باطن نہیں ہے اور ہماری زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں ان کا تعلق دل سے نہیں ہوتا اور دوسرے سننے والے بھی اصلاح وحصول کی خواہش نہیں رکھتے اس لئے آج کل کہی گئی باتوں اور نصیحتوں کا اثر نہیں ہوتا۔ زمین میں بیج ڈالنے کے لئے پہلے زمین کو تیار کیا جاتا ہے۔ آپ سیم زدہ اور بنجر زمینوں میں بیج ڈال کر فصل کی امیدیں باندھ کر بیٹھ جائیں تو یہ آپ کی خام خیالی ہوگی۔

اپنے کو محتاج سمجھو:

اسی طرح دین کو حاصل کرنے کے لئے پہلے اندر استعداد پیدا کرو بغیر استعداد پیدا کیئے دین حاصل نہیں ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ استعداد کیسے پیدا

ہوگی؟ استعداد ایسے پیدا ہوگی کہ اپنے آپ کو دین کا محتاج سمجھو' اپنے دل ودماغ میں یہ بات بسالو کہ ہم دین کے محتاج ہیں' دین ہمارا محتاج نہیں ہے۔ جب آپ اپنے کو دین کا محتاج سمجھ کر اور دین کو اپنی ضرورت سمجھ کر اللہ کے کسی نیک بندے کے پاس جائیں گے' اس کی باتیں سنیں گے تو انشاء اللہ ضرور نفع ہوگا اور آپ میں دین کی صحیح فکر اور عمل کی روح پیدا ہوجائے گی' لیکن یہ تب ہی ہوگا جب پہلے اپنے آپ کو کاملا محتاج دین سمجھا جائے گا۔

بدعمل عالم کا وعظ بے نور ہوتا ہے:

ہمارے ہاں کراچی میں ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی صاحب ہیں ان کی مجالس میں اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ہوتی ہیں' میں بھی ان کی مجالس میں حاضر ہوتا ہوں لیکن وہاں حاضری سے پہلے اپنے تئیں محتاج ہونے کا یقین کرلیتا ہوں' لیکن پھر بھی چونکہ استعداد صحیح نہیں ہے اس لئے صحیح نفع نہیں ہوتا۔ ہم میں عالم کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ بے عملی کے اور نقصانات کے علاوہ اس کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ اس کے وعظ میں نورانیت نہیں رہتی لیکن اس حدیث میں ہے کہ جب تم تک کوئی حکم پہنچے تو چاہئے کہ اس پر خود عمل کرو یا کسی ایسے شخص کو سکھادو جو اس پر عمل کرلے۔ ایک بے عمل عالم آپ کو خدا کا پیغام پہنچاتا ہے تو آپ اس پیغامبر کو نہ دیکھیں بلکہ یہ دیکھیں کہ یہ پیغام کس کا پہنچارہا ہے اور وہ ہستی آپ کے لئے واجب الاطاعت ہے یا نہیں؟

یہ دیکھو پیغام کس کا ہے:

ایک مرتبہ ایک صحابیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور عرض کیا حضورؐ! شادی کرنا چاہتا ہوں مگر نہ مال ہے نہ میرے پاس کوئی مکان ہے نہ ہی میری شکل وصورت اتنی اچھی ہے (کہ کوئی میری شکل دیکھ کر ہی مجھ سے شادی کرے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ فلاں صحابیؓ کے پاس چلے جاؤ اور کہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا ہے کہ آپ اپنی لڑکی کا رشتہ مجھ سے کردیں۔

چنانچہ یہ صاحب وہاں چلے گئے اور لڑکی کے والدین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچادیا۔ اب لڑکی کے والدین یہ سن کر سوچ میں پڑ گئے کہ بھلا ہم اس شخص سے اپنی لڑکی کا عقد کیسے کردیں کہ نہ اس کے پاس شکل وصورت ہے نہ کوئی اسے جانتا ہے نہ مال ودولت ہے کہ باسانی زندگی گزار سکے؟

جب لڑکی کو یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنے والدین سے کہا کہ ابا جان! آپ اسے نہ دیکھیں بلکہ اسے دیکھیں جس نے اسے بھیجا ہے۔ غرضیکہ میں عرض کرتا ہوں کہ اگر بے عمل آدمی سے آپ کو محبوب کا کوئی پیغام ملتا ہے تو آپ یہ نہ کہیں کہ مولوی صاحب خود تو عمل کرتے نہیں دوسروں کو کہتے ہیں تو آپ ڈاکیے کو نہ دیکھیں ڈاک کو دیکھیں۔

یہ سچ ہے کہ عالم بے عمل کی بات میں نور نہیں ہوتا مگر میں آپ سے پھر یہی کہتا ہوں کہ آپ اس بات کی طرف مت دیکھیں کہ کہنے والا خود عمل کرتا ہے کہ نہیں بلکہ آپ تک جو حکم خداوندی' سنت نبوی پہنچے آپ اس پر صدق دل سے عمل پیرا ہوجایئے۔

پانچ باتیں:

اب آیئے ان پانچ باتوں کی طرف جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں اگرچہ ان باتوں کی تشریح کیلئے تو پانچ جمعے درکار ہیں مگر میں انتہائی اختصار کے ساتھ یہاں پر ان کا ذکر کرتا ہوں۔

۱۔ حرام اشیاء سے بچنا :

فرمایا : اللہ نے جو چیزیں حرام کی ہیں ان سے بچو تم عابد اعظم بن جاؤ گے۔ نفل روزے، صدقے، خیرات بھی محض عبادت نہیں ہیں بلکہ سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اللہ نے جو چیزیں حرام قرار دی ہیں ان سے بچا جائے۔

بعض حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ مولوی صاحب! بچوں کو پالنا، ان کو کھلانا پلانا بھی تو عبادت ہے! گویا کہ ان لوگوں نے صرف ایک اسی چیز کو عبادت سمجھ لیا ہے اللہ و رسولؐ کے جس قدر احکام پامال ہوتے رہیں، انہیں کوئی پرواہ نہیں، یہ اپنی عبادت میں مگن ہوں گے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا ہے کہ زبان سے متعلق گناہ کبیرہ کی تعداد بیس ہے جھوٹ، غیبت، چغلی، بہتان وغیرہ۔ اور یہ بیماریاں آج ہمارے ہاں بہت عام ہیں اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور دوسروں کی غیبت بھی کیا کرتے ہیں، تسبیحات بھی کرتے ہیں، چغلی بھی کھاتے ہیں، عبادات کرتے ہیں، مگر آنکھوں، کانوں کی حفاظت بھی نہیں کرتے وہ چیزیں جو حرام کی گئی ہیں انہیں دیکھتے ہیں یا ان کی حرمت کا لحاظ نہیں رکھتے اور ایسی باتیں جن کا سننا ممنوع قرار دیا گیا ہے ان کے سننے سے احتراز نہیں کرتے تو بتایئے کہ ان کی عبادات کیا ہوئیں؟

غرضیکہ یہ تمام گناہ ایسے ہیں جن کا لحاظ نہیں رکھا جاتا اور یہی باتیں روز قیامت پکڑ کا باعث بھی بن سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نو سو (۹۰۰) کے قریب گناہ کبیرہ جمع کیئے ہیں ایک آدمی ان سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا تو بتائیں اگر وہ حج بھی کر آئے تو کیا عابد ہو جائے گا؟

اللہ تعالیٰ ہمیں حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

۲۔ تقدیر پر شاکر رہنا :

اب آیئے دوسری بات کی طرف اللہ تعالیٰ نے ہر ایک انسان کے لئے ایک نوشتہ لکھ دیا ہے جس میں سے زندگی بھر ملنے والی اشیا اور اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی تفصیل درج ہے اسے تقدیر (قسمت) کہتے ہیں' اور اس میں نہ کمی ہے اور نہ زیادتی' یہ ہی ہمارا عقیدہ ہے' مگر اس عقیدے کے باوجود اکثر لوگ شاکی رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے تنگی کی شکایت کرتے ہیں' گلہ کرتے ہیں' شکر ادا نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ چیز (شکوۂ تقدیر) قطعی غلط ہے بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے پر راضی رہنا چاہیئے اس لئے تنگی کی شکایت چھوڑ دو جس قدر اللہ نے دیا ہے اس پر قناعت کرو۔

اگر آپ چاہیں کہ ہم کارخانوں' کوٹھیوں' بنگلوں اور مال و دولت کے ذریعہ امیر بن جائیں تو خدا کی قسم نہیں بن سکتے۔ دولت کی زیادتی تو انسان کو محتاج بناتی ہے آپ امیروں' کبیروں کے بنگلوں کی طرف کبھی اس نقطہ نگاہ سے نہیں دیکھتے کہ ان بیچاروں کو نرم بستروں اور گرم گدوں پر بھی سکون وچین کی نیند میسر نہیں ہے' وہ لوگ جھونپڑیوں میں رہنے والے ان فقیروں پر رشک کرتے ہیں جنہیں

شب خوابی کے لئے چارپائی تک میسر نہیں، لیکن وہ سکون وچین والی نیند کی نعمت سے بہرہ ور ہیں۔

دیکھئے کہ ایک آدمی سارا دن محنت مزدوری کرتا ہے اور رات تو آرام کی نیند سوتا ہے اس کے برعکس جو شخص دن بھر لاکھوں کروڑوں میں کھیلتا ہے اسے نیند نہیں آتی بلکہ ان لوگوں کو نیند کی گولیاں کھانی پڑتی ہیں اور بعض اوقات یہ نیند کی گولیاں بھی بیکار ہو جاتی ہیں۔

تم ان لوگوں کے ظاہری آرام و آسائش، دولت و ثروت کو دیکھتے ہو مگر ان کے پس منظر کو نہیں دیکھتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

"جو شخص میری قضا پر راضی نہیں اور جو کچھ میں نے دیا ہے اس پر صبر و شکر نہیں کرتا تو اسے کہو کہ کوئی اور رب ڈھونڈ لے"۔

تو بھائی! ملے گا تو اتنا ہی جتنا کاتب تقدیر نے مقدر میں لکھ دیا ہے، اس سے زیادہ ملے گا اور نہ کم ملے گا، خواہ آپ ہزار شکوہٗ شکایت کریں یا صبر و شکر۔

تو پھر جب ملتا اتنا ہی ہے کیوں نہ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے اور اس کے مقدر کی ہوئی قسمت پر راضی رہا جائے۔

۳- دوسروں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے کرتے ہو :

تیسری بات یہ ہے کہ لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو تو تم مومن بن جاؤ گے۔

درحقیقت ایمان یہی ہے کہ آدمی جو اپنے لئے پسند کرے وہی دوسروں

کے لئے پسند کرے' ایک مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے لئے تو نفع کی بات سوچے اور دوسرے مسلمان کے لئے اس کے برعکس سوچے۔ یہ چیز تقاضائے ایمان کے خلاف ہے اگر ایک آدمی جج ہے اور وہ فیصلہ کرنے کے لئے سائل سے رشوت طلب کرتا ہے اور اس کے رشوت ادا کرنے پر فیصلہ کرتا ہے تو اس (جج) کو چاہئے کہ وہ یہ سوچے کہ اگر میں اس سائل کی جگہ ہوتا تو میرے دل پر میرے اعصاب پر کیا گزرتی یعنی انسان کو اپنے آپ کو دوسرے کی جگہ رکھ کر سوچنا چاہئے' پھر اگر وہ اس جگہ یا چیز کو اپنے لئے پسند کرے تو اسے دوسرے کے لئے بھی پسند کرے اگر اسے خود وہ ناپسند ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اسے دوسرے کے لئے بھی ناپسند کرے۔

۴۔ پڑوسی سے حسن سلوک :

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھی بات جو ارشاد فرمائی ہے کہ اپنے پڑوسی سے حسن سلوک سے پیش آؤ تو مومن بن جاؤ گے۔ حسن سلوک کسے کہتے ہیں؟ ایک ہے احسان کا بدلہ احسان سے دینا' یہ بدلہ کہلاتا ہے' بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دینا بھی بدلہ ہے جب کہ احسان یہ ہے کہ آدمی برائی کا بدلہ بھلائی سے دے اسی کا نام حسن سلوک ہے' ایک اس کا الٹ بھی ہے یعنی بھلائی کا بدلہ برائی سے دینا اس کا نام کمینگی ہے۔

اگر ہمارا ہمسایہ ہمارے ساتھ بھلائی کا سلوک کرتا ہے اور ہم اسے اس کا بدلہ برائی سے دیتے ہیں تو یہ کمینگی کہلاتی ہے' اور اگر وہ ہمارے ساتھ برائی کرتا ہے اور ہم اسے اس کا بدلہ اچھائی سے دیتے ہیں تو اسے حسن سلوک کہتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جبرئیلؑ امین مجھے ہمسایہ کے

حقوق کا خیال رکھنے کے بارے میں اکثر تاکید کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ مجھے خیال ہوا کہ اللہ ہمسائے کو وراثت میں حقدار بنائیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث مبارکہ سے ہمسائے کے حقوق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

آج ہمارے معاشرہ میں ہمسائے کے حقوق کا کس قدر خیال رکھا جاتا ہے اس کو ہر آدمی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ سکتا ہے۔

۵۔ زیادہ نہ ہنسا کرو :

زیادہ ہنسنا اچھی بات نہیں ہے یہ دل کو مردہ کردینے کا باعث ہوتا ہے۔ آج ہمارے ہاں اس چیز کو زندہ دلی کا نام دے دیا گیا ہے جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ زیادہ ہنسنا دلوں کو مردہ کردیتا ہے۔ زیادہ ہنسنے کو مردہ دلی اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس سے انسان کا دل اللہ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے اور اللہ کی یاد سے غافل دل اللہ کے نزدیک مردہ ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ :

> ”جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اور جو نہیں کرتا ان کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے“۔

کھلکھلا کر ہنسنا مردہ دلی کی علامت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کھلکھلا کر نہیں ہنستے تھے، مسکراہٹ کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ تبسم ہمیشہ چہرۂ مبارک پر رہتا تھا مگر کھلکھلا کر نہیں ہنستے تھے۔

یہ پانچ باتیں ہیں جن کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ان پانچوں باتوں کو یاد کرلیں۔ اور اپنے گھروں میں جاکر سنادیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سیکھو سکھاؤ جو چیز خود سیکھو دوسروں کو بھی سکھادو۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

شب برأت.....

تحقیقی جائزہ

اللہ تعالیٰ شعبان کی نصف شب کو قریب کے
آسمان (دنیا) کی طرف نزول فرماتے ہیں، پس اتنے
لوگوں کی بخشش فرما دیتے ہیں، جو تعداد میں بنوکلب کی
بکریوں کے بالوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد!

آج شعبان کی پندرہویں رات ہے، میرا تو بیان کرنے کا ارادہ نہیں تھا، مگر احباب نے تقاضا کیا کہ کچھ بیان کیا جائے، تو خیال ہوا کہ اس رات کے بارے میں جو روایات وارد ہوئی ہیں وہ آپ کی خدمت میں پیش کردوں اور ان سے جو احکام و فضائل نکلتے ہیں ان کو ذکر کردوں، صاحب مشکوٰۃ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس باب میں پانچ روایات ذکر کی ہیں۔

پہلی حدیث:

یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے:

"عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: فَقَدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً فَخَرَجْتُ فَإِذَا هُوَ بِالْبَقِيْعِ فَقَالَ: أَكُنْتِ تَخَافِيْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْكِ

وَرَسُوْلُهٗ؟ قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ظَنَنْتُ اِنَّکَ أَتَیْتَ بَعْضَ نِسَائِکَ. فَقَالَ: اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی یَنْزِلُ لَیْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ اِلٰی سَمَاءِ الدُّنْیَا فَیَغْفِرُ لِأَکْثَرَ مِنْ عَدَدِ شَعْرِ غَنَمِ کَلْبٍ." (ترمذی ج:۱ ص:۱۵۶)

ترجمہ:...... "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بستر پر نہ پایا، میں ان کی تلاش میں نکلی تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ طیبہ کے قبرستان) بقیع میں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ کیا تو یہ اندیشہ رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تجھ سے بے انصافی کریں گے؟ یعنی تیری باری میں کسی اور کے پاس تشریف لے جائیں گے؟ میں نے کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے یہ خیال ہوا کہ شاید آپ اپنی بیویوں میں سے کسی کے پاس تشریف لے گئے ہوں گے، ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شعبان کی نصف شب کو قریب کے آسمان (دنیا) کی طرف نزول فرماتے ہیں، پس اتنے لوگوں کی بخشش فرما دیتے ہیں، جو تعداد میں بنو کلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہیں (بنو کلب عرب کا ایک قبیلہ تھا، وہ بکریاں پالنے میں مشہور تھا، اور تمام قبائل سے زیادہ اس کے پاس بکریاں ہوا کرتی تھیں، ناقل) تو بنو کلب کے قبیلے کی بکریوں کے بالوں کی تعداد سے بھی زیادہ، اللہ تعالیٰ بخشش فرماتے ہیں۔"

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اسے ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے، اور رزین کی روایت میں ہے کہ یہ ایسے لوگ ہوں گے جو دوزخ کے مستحق تھے۔ امام ترمذیؒ اس حدیث کو روایت کرکے کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ سے سنا کہ وہ اس حدیث کو کمزور اور ضعیف قرار دیتے تھے۔

دوسری حدیث:

یہ روایت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے:

”عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: هَلْ تَدْرِيْنَ مَافِيْ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ يَعْنِيْ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ؟ قَالَتْ: مَافِيْهَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ: فِيْهَا اَنْ يُكْتَبَ كُلُّ مَوْلُوْدِ بَنِيْ آدَمَ فِيْ هٰذِهِ السَّنَةِ وَفِيْهَا اَنْ يُكْتَبَ كُلُّ هَالِكٍ مِنْ بَنِيْ آدَمَ فِيْ هٰذِهِ السَّنَةِ وَفِيْهَا تُرْفَعُ أَعْمَالُهُمْ وَفِيْهَا تُنْزَلُ أَرْزَاقُهُمْ. فَقَالَتْ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! مَامِنْ أَحَدٍ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى؟ فَقَالَ مَامِنْ أَحَدٍ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى ثَلٰثًا. قُلْتُ: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَوَضَعَ يَدَهٗ عَلٰى هَامَتِهٖ فَقَالَ: وَلَا أَنَا اِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ مِنْهُ بِرَحْمَتِهٖ يَقُوْلُهَا ثَلٰثَ مَرَّاتٍ.“

(مشکوٰۃ ص:۱۱۵ بحوالہ بیہقی فی الدعوات الکبیر)

ترجمہ:......”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو جانتی ہے کہ یہ رات کیسی

ہے؟ یعنی نصف شعبان کی رات؟ میں نے کہا یا رسول اللہ! (ﷺ) اس میں کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: اولاد آدم میں سے اس سال میں جو بچہ پیدا ہونے والا ہو، اس کا نام لکھ دیا جاتا ہے، اور سال بھر میں جتنے انسان مرنے والے ہوتے ہیں، ان کا نام لکھ دیا جاتا ہے، اور اس میں بندوں کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں، اور اس رات میں بندوں کے رزق نازل کئے جاتے ہیں۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! کیا کوئی شخص جنت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر داخل نہیں ہوگا؟ ارشاد فرمایا کہ نہیں! کوئی شخص بھی جنت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر داخل نہیں ہوگا، تین مرتبہ فرمایا، میں نے کہا کہ یا رسول اللہ آپؐ بھی نہیں؟ آنحضرت ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک اپنے سر پر رکھا اور فرمایا: ”وَلَا أَنَا اِلَّا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ مِنْهُ بِرَحْمَتِهٖ.“ (میں بھی جنت میں داخل نہیں ہوں گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ مجھ کو ڈھانپ لیں) یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی، یہ روایت امام بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کی ہے۔“

تیسری حدیث:

یہ حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی ہے:

”عَنْ أَبِيْ مُوْسَى الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى

لَيَطَّلِعُ فِيْ لَيْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُ لِجَمِيْعِ خَلْقِهٖ اِلَّا لِمُشْرِكٍ أَوْ مُشَاحِنٍ." (مشکوٰۃ ص:۱۱۵ بحوالہ ابن ماجہ)

ترجمہ:...... "حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ بے شک اللہ تعالیٰ جھانکتے ہیں نصف شعبان کی رات میں، پس مغفرت فرمادیتے ہیں اپنی تمام مخلوق کی، مگر مشرک کی، یا کینہ رکھنے والے کی بخشش نہیں فرماتے۔"

چوتھی حدیث:

مسند احمد میں یہی حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور ان کی روایت میں ہے:

"عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ...... اِلَّا اثْنَيْنِ مُشَاحِنٍ وَقَاتِلِ نَفْسٍ."

(مشکوٰۃ ص:۱۱۵ بحوالہ مسند احمد)

ترجمہ:...... "مگر دو آدمیوں کی بخشش نہیں فرماتے، ایک کینہ رکھنے والا اور دوسرے قاتل نفس، یعنی کسی دوسرے مسلمان کو قتل کرنے والا۔"

پانچویں حدیث:

یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے:

"عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ

اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَانَتْ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَقُوْمُوْا لَيْلَهَا وَصُوْمُوْا يَوْمَهَا فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَنْزِلُ فِيْهَا لِغُرُوْبِ الشَّمْسِ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ أَلَا مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَلَهُ، أَلَا مِنْ مُّسْتَرْزِقٍ فَأَرْزُقَهُ، أَلَا مُبْتَلًى فَأُعَافِيَهِ، أَلَا كَذَا، أَلَا كَذَا، حَتّٰى يَطْلُعَ الْفَجْرُ."

(مشکوٰۃ ص:۱۱۵ بحوالہ ابن ماجہ)

ترجمہ:..... ''حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب نصف شعبان آجائے تو تم اس کی رات میں قیام کیا کرو اور اس کے دن کا روزہ رکھا کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس میں سورج کے غروب ہونے سے لے کر طلوع فجر تک قریب کے آسمان پر نزول فرماتے ہیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا ہے کوئی استغفار کرنے والا! بخشش مانگنے والا! کہ میں اس کی بخشش کردوں؟ کیا ہے کوئی رزق مانگنے والا! کہ میں اس کو رزق دوں؟ کیا ہے کوئی کسی مصیبت یا بیماری میں مبتلا کہ میں اس کو عافیت دوں؟ کیا ہے کوئی فلاں؟ کیا ہے کوئی فلاں؟ اللہ تعالیٰ برابر یہ ارشاد فرماتے رہتے ہیں یہاں تک کہ سورج طلوع ہوجائے۔''

ان پانچ روایتوں میں ایک روایت تو ترمذی کی ہے، جس کو خود امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ ضعیف ہے، دو روایتیں ابن ماجہ کی ہیں۔ حدیث شریف کی چھ کتابیں

صحاح ستہ کہلاتی ہیں، اور ان میں ابن ماجہ سب سے کمزور تر درجہ کی کتاب کہلاتی ہے۔ بعض علماء نے تو یہ اصول وضع کر دیا کہ وہ روایت جو صرف ابن ماجہ میں ہو، باقی صحاح ستہ کی کتابوں میں نہ ہو، کمزور ہوتی ہے، اور ابن ماجہ کی چالیس روایتوں میں سے علماء نے ایک ایک روایت کو موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے۔ تو دو روایتوں کا صرف ابن ماجہ میں ہونا ہی اس کے ضعیف ہونے کی کافی دلیل ہے۔ ایک روایت مسند احمد کی ہے، اس کتاب میں صحیح احادیث بھی ہیں، مقبول حدیثیں بھی، اور کمزور بھی ہیں۔ اور ایک روایت امام بیہقیؒ کی دعوات کبیر میں ہے، یہ غیر معروف کتاب ہے، غالب یہ ہے کہ وہ روایت بھی کمزور ہوگی۔ بہر حال اس کی سند کی مجھے تحقیق نہیں۔

تو روایت کے لحاظ سے اس رات کی فضیلت میں جتنی روایتیں آئی ہیں وہ قریباً سب کی سب کمزور ہیں، اس کے علاوہ کچھ لوگوں نے بے اصل روایتیں بھی گھڑ رکھی ہیں، کل جمعہ کے اخبار میں ایک مولانا کا مضمون آیا تھا، اس کے بارے میں لوگوں نے مجھ سے پوچھا، اکثر روایتیں من گھڑت ہیں، پتہ نہیں لوگ کہاں سے نقل کر دیتے ہیں؟ اسی طرح رجب کے بارے میں جتنی روایتیں لوگ لکھتے ہیں وہ سب من گھڑت ہیں، نصف شعبان کی فضیلت کی یہ روایتیں جو میں نے ذکر کی ہیں، کمزور ہیں، لیکن بعض روایتیں تو بالکل ہی بے اصل ہیں، یہ تو مختصر حال ہوا ان روایتوں کا۔

اب علماء دو قسم کے ہیں، بعض متشدد ہیں، جن میں ہمارے مولانا...... بھی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ سب روایتیں من گھڑت ہیں، ان کی کوئی قیمت نہیں، یہ حضرات ضعیف روایتوں کو بھی من گھڑت قرار دے رہے ہیں، اور اکثر اکابر اس کے قائل ہیں کہ چونکہ روایتیں ایک مضمون کی مختلف حضرات صحابہؓ سے مروی ہیں، اس لئے ان کی فی الجملہ کچھ نہ کچھ اصل ہونی چاہئے اور فضائل کی احادیث میں زیادہ تشدد نہیں کیا

جاتا، احکام کی احادیث کو لینے میں تو علماً بہت زیادہ سختی کرتے ہیں، سخت معیار پر ان کو جانچتے ہیں، لیکن جو روایتیں فضائل اعمال سے متعلق ہوں ان میں زیادہ شدت اختیار نہیں کرتے، بلکہ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، تو چونکہ یہ روایتیں متعدد صحابہؓ سے مروی ہیں اور ان کا تعلق بھی فضائل سے ہے، اس لئے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ان کو فی الجملہ کسی نہ کسی درجہ میں قبول کر لینا چاہئے۔

ہمارے اکثر اکابر کی یہی رائے ہے، یہ تو روایتوں کے بارے میں گفتگو ہوئی اب اس شب کے جو فضائل ان روایات میں آئے ہیں ان کو ذکر کرتا ہوں۔

اس شب میں فیصلوں کا نازل ہونا:

ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ اس رات میں تقدیریں نازل ہوتی ہیں، یعنی آئندہ سال میں جتنے بچے پیدا ہونے والے ہیں ان کے ناموں کی فہرست جاری کردی جاتی ہے، اور جتنے لوگ اس سال میں مرنے والے ہوتے ہیں ان کی فہرست جاری کردی جاتی ہے، لیکن اس میں ایک اشکال ہے، وہ یہ کہ بعینہ یہی بات لیلۃ القدر کے بارے میں آتی ہے اور یہ روایتیں تو جیسا کہ آپ سن چکے ہیں، کمزور ہیں، اور لیلۃ القدر میں فیصلوں کا نازل ہونا، قرآن کریم میں آیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

”حٰمٓ. وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ. اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ. فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ. اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا.“ (الدخان: ۱ تا ۵)

ترجمہ:...... ”حم، قسم ہے اس واضح کتاب کی کہ ہم نے اس کو ایک برکت والی رات (یعنی شب قدر) میں اتارا ہے، ہم

آگاہ کرنے والے تھے، اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ
ہماری پیشی سے حکم ہو کر طے کیا جاتا ہے۔" (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

سورۂ دخان کی ان ابتدائی آیات میں بابرکت رات کا ذکر ہے جس میں قرآن کریم نازل کیا گیا، اور فرمایا ہے کہ اسی رات میں تمام حکمت والے کاموں کے فیصلے ہوتے ہیں، اس "بابرکت رات" سے بعض حضرات نے شب قدر مراد لی ہے، اور حضرت تھانویؒ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے، اور بعض حضرات نے "شب براءت" مراد لی ہے۔

تو بعض اکابر نے ان دونوں کے درمیان تطبیق دی ہے کہ فیصلوں کی تجویز تو "شب براءت" میں ہو جاتی ہے، اور یہ فیصلے شب قدر میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا میں جو فرشتوں کا صدر دفتر ہے وہاں ان کی نقول جاری کر دی جاتی ہیں۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے یہی تطبیق ذکر فرمائی ہے تو اس تفسیر کے مطابق ایک تو اس شب براءت میں تقادیر جاری ہوتی ہیں، یعنی سال کے اندر پیدا ہونے والوں کی فہرست تجویز کر دی جاتی ہے، سال کے اندر مرنے والوں کی فہرست تجویز کر دی جاتی ہے۔

اعمال کا چڑھنا اور ارزاق کا نازل ہونا:

اور ایک بات یہ فرمائی گئی کہ اس میں تقادیر نازل ہوتی ہیں کہ بندوں کے اعمال اوپر چڑھتے ہیں اور رزق نازل ہوتے ہیں۔ رزق نازل ہونے کا بھی یہی مطلب ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو جتنا رزق ایک سال کے اندر ملنا ہے اس کی مقداریں اور تفصیلات تجویز کر دی جاتی ہیں۔

رزق سے کیا مراد ہے؟

صرف روٹی، پانی کو رزق نہیں کہتے، رزق ہر وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے کو عطا کی جاتی ہے، ہم جو سانس لے رہے ہیں یہ بھی رزق ہے، مثلاً اس سال میں فلاں آدمی اتنے سانس لے گا، اور سال بھر میں اس کے یہ اعمال آسمان پر جائیں گے، اچھے اعمال ہوں یا برے اعمال، لیکن برے اعمال پھینک دیئے جاتے ہیں، اور نیک اعمال جو رضائے الٰہی کے لئے کئے گئے ہوں وہ بارگاہ رب العزت میں شرف قبولیت پاتے ہیں۔

حق تعالیٰ کا نزول:

اور پانچویں بات اس رات کے بارے میں یہ کہی گئی کہ حق تعالیٰ شانہ آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں (جیسا کہ ان کی شان کے لائق ہے) اور بندوں کو نظر رحمت کے ساتھ دیکھتے ہیں اور اہل طاعت کی بخشش فرما دیتے ہیں، ایک روایت میں ہے کہ بنو کلب کی بکریوں کے بدن پر جتنے بال ہیں اتنے لوگوں کی بخشش فرما دیتے ہیں، مراد کثرت کا بیان کرنا ہے، یعنی اتنے لوگوں کی بخشش فرماتے ہیں جن کی تعداد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ قریب کے آسمان پر نزول فرما کر ارشاد فرماتے ہیں کہ ہے کوئی بخشش مانگنے والا کہ میں اس کی بخشش کروں؟ ہے کوئی رزق مانگنے والا کہ میں اس کو رزق دوں؟ ہے کوئی مبتلائے مصیبت و بیماری کہ میں اس کو عافیت دوں؟ ہے کوئی ایسا آدمی؟ اور یہ سلسلہ طلوع فجر تک جاری رہتا ہے، اس میں ترغیب ہے کہ یہ رات دعاؤں کی قبولیت کی رات ہے، اس لئے اہل حاجت کو خوب خوب

دعائیں مانگنی چاہئیں۔ یہ تو اس رات کے فضائل ہیں۔

صیام و قیام کا حکم:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ارشاد ہے کہ:

"قُوْمُوْا لَیْلَهَا وَ صُوْمُوْا نَهَارَهَا." (مشکوٰۃ ص:۱۱۵ بحوالہ ابن ماجہ)

ترجمہ:...... "اس رات کو قیام کیا کرو اور اس کے دن کو روزہ رکھا کرو۔"

یعنی پندرہویں شب میں اللہ کی عبادت کیا کرو، اور پندرہویں تاریخ کا روزہ رکھو۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں جو علماً اس رات کی فضیلت کے قائل ہیں اور اکثر ہمارے اکابر اس رات کی فضیلت کے فی الجملہ قائل ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کے مطابق اس رات میں قیام کرنا اور اس سے اگلے روز روزہ رکھنا بہتر اور مستحب ہے۔

کن لوگوں کی بخشش نہیں ہوتی:

اور تیسرا مضمون ان احادیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس رات میں فلاں فلاں آدمی کی بخشش نہیں ہوتی۔

گناہ صغیرہ اور کبیرہ کی تعریف:

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں، صغیرہ اور کبیرہ۔ یعنی کچھ تو چھوٹے گناہ ہیں ان کو صغیرہ گناہ کہتے ہیں۔ اور کچھ بڑے گناہ ہیں، جن کو گناہ کبیرہ کہا جاتا ہے، کبیرہ گناہ وہ کہلاتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے، یا جناب رسول اللہ ﷺ نے دوزخ کی وعید سنائی ہو، یا اللہ کے غضب کی وعید سنائی ہو کہ جو شخص ایسا

کرے گا اس پر اللہ کا غضب ٹوٹے گا، اس پر اللہ کا قہر ہوگا، یا ان پر لعنت فرمائی ہو، یا اس قسم کی کوئی اور وعید سنائی ہو، تو اس قسم کے گناہ، گناہ کبیرہ کہلاتے ہیں۔ اور جس کام کو پسند نہیں فرمایا، لیکن اس کے بارے میں کوئی وعید بھی نہیں سنائی ہو، ان کو گناہ صغیرہ کہا جاتا ہے۔ گناہ کبیرہ کی معافی کے لئے یہ شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے، معافی مانگنے والوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں، اگر وہ چاہیں تو بغیر استغفار کے ویسے ہی معاف کردیں، ان کو کوئی روکنے والا بھی نہیں، اللہ تعالیٰ پر کوئی پابندی تو نہیں ہے لیکن اصول اور قاعدہ یہ ہے کہ ایسے مجرم کو جو اپنی بدعملی اور اپنے کبیرہ گناہوں کی وجہ سے اللہ کے قہر کا اور اس کے غضب کا مستحق ہوا، اللہ کی لعنت کا مستحق ہوا اس کو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہئے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں آپ نے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا ہے کوئی بخشش مانگنے والا کہ میں اس کی بخشش کردوں؟ معلوم ہوا کہ اس رات میں یہ جو مغفرت کا وعدہ آیا ہے یہ ان لوگون کے لئے ہے جو بخشش مانگنے والے ہیں، اور جو لوگ کہ بخشش مانگنے والے نہیں بلکہ عین اس شب میں بھی انہی جرائم کے مرتکب ہیں جن کی وجہ سے ان پر اللہ کا قہر اور غضب ہے، اللہ کی لعنت ہے، تو ظاہر ہے کہ پھر ان کی بخشش کا وعدہ نہیں، اس سے ایک سبق تو ہمیں یہ ملا کہ ہمیں خوب ندامت کے ساتھ اپنے گناہوں کی بخشش مانگنی چاہئے، تاکہ ہم بھی مغفرت کا دامن پکڑنے والے ہوجائیں۔ دوسری بات یہاں یہ فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رات میں سب کو بخش دیتے ہیں مگر چند آدمیوں کی بخشش نہیں ہوتی۔ ایک مشرک۔ دوسرا مشاحن (مشاحن کی دو تفسیریں کی گئی ہیں، ایک بدعتی اور دوسرا کسی مسلمان سے کینہ رکھنے والا)، تیسرا کسی کو ناحق قتل کرنے والا۔ اب اس بات کو آپ چاہیں تو یوں بیان کرسکتے ہیں کہ ان لوگوں کی بخشش اس رات میں معافی

مانگنے کے باوجود بھی نہیں ہوتی، جب تک کہ اپنے اس فعل سے توبہ نہ کرلیں، اور اس گناہ کا تدارک نہ کرلیں، مثال کے طور پر کوئی شخص مشرک اور کافر ہے، مثلاً کوئی مرزائی ہے، جب تک کہ وہ اپنے اس گناہ سے تائب نہیں ہوتا اس کی بخشش نہیں، کافر اور مشرک کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔

بدعت کی تعریف:

بدعت کے معنی یہ ہیں کہ دین کے نام پر ایسی چیزیں ایجاد کی جائیں جو رسول اللہ ﷺ سے، صحابہ کرامؓ سے اور سلف صالحین سے ثابت نہ ہوں، نہ صراحتاً اور نہ ائمہ اجتہاد کے استنباط و قیاس کے ذریعہ، خواہ ایسی نئی عبادتیں ایجاد کرلی جائیں یا ایسی قیود اپنی طرف سے تراش لی جائیں جن کا شرع شریف میں ثبوت نہیں۔

بدعت کی دو قسمیں:

کچھ بدعتیں اعتقادی ہوتی ہیں، کچھ عملی ہوتی ہیں، بدعت اعتقادی وہ تمام نظریات ہیں جو سلف صالحین اہل سنت کے خلاف ایجاد کرلئے جاتے ہیں، اور عملی بدعات وہ تمام اعمال ہیں جن کا ثبوت سلف صالحین سے نہیں، اور ان کو کار ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے۔

بدعتی کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی:

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ شیطان نے کہا کہ اولاد آدم نے میری کمر توڑ ڈالی، اس لئے کہ میں بڑی محنت سے ان سے گناہ کرواتا ہوں اور میرے کہنے پر کر بھی لیتے ہیں، مجھ ہی سے پوچھو کہ گناہ کرانے کے لئے مجھے کتنی محنت کرنا پڑتی ہے، اور مجھے ہزار جتن کر کے ان کو آمادہ گناہ کرنا پڑتا ہے، لیکن بڑے افسوس کی بات

ہے کہ وہ گناہ کرکے فوراً اللہ تعالیٰ سے کہہ دیتے ہیں کہ یا اللہ! غلطی ہوگئی، معاف کردیجئے، ندامت کے ساتھ اللہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیتے ہیں، توبہ کرلیتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جاؤ! بخش دیا، تو میری ساری کی ساری محنت ضائع ہوجاتی ہے۔ فرمایا کہ شیطان کو یہ ترکیب سوجھی کہ ان کو ایسی چیز میں مبتلا کیا جائے کہ وہ لوگ گناہ بھی کریں لیکن وہ اس گناہ کو اچھا سمجھ کر کریں اور اس سے توبہ نہ کریں اور وہ بدعت ہے کہ لوگ اس کو کارثواب سمجھ کر کرتے ہیں، حالانکہ بدعت اتنا بڑا گناہ ہے کہ اسی مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے:

"مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ أَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْإِسْلَامِ." (مشکوٰۃ شریف ص:۳۱)

ترجمہ:......"جس نے کسی بدعتی کی توقیر کی، عزت کی، اس نے اسلام کے ڈھادینے پر مدد کی۔"

اور بدعت کے اتنا گندہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دین اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا، صحابہؓ نے اس پر عمل کیا، ائمہ مجتہدین نے اس کو سمجھ کر بیان کیا، ایک ایسا عمل دین کے نام پر ایجاد کرنا اور اس کو کارثواب سمجھنا جس کو اللہ نے نازل نہیں کیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم نہیں دی، صحابہؓ نے اس پر عمل نہیں کیا، اور ائمہ فقہاءؒ نے اس کو نہیں سمجھا، دین میں اپنی طرف سے اضافہ ہے، گویا بدعتی، اللہ تعالیٰ، رسول اللہ، صحابہ سے زیادہ عقلمند؟

نعوذ باللہ، بدعتی شخص سب سے زیادہ عقل مند نکلا، اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی (نعوذ باللہ) صحابہؓ، تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ سے بھی کہ وہ تو دین کو نہیں سمجھے، اس نے سمجھ لیا، ایک چیز کو اپنے پاس سے گھڑ کر اس کو دین خداوندی کہنا یہ افترا علی

اللہ ہے، اللہ پر بہتان باندھنا ہے، اور بدعتی جو بدعت گھڑ کر لوگوں میں رائج کرتا ہے وہ دراصل مفتری ہے، کہ اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتا ہے، اب معلوم ہوا ہوگا کہ بدعت اتنا بڑا گناہ کیوں ہے؟

کئی سال ہوئے علامہ شاہ تراب الحق قادری کے ساتھ قبروں پر پھول ڈالنے کے مسئلہ میں میری تحریری بحث چلی تھی، جو میری کتاب ''اختلاف امت اور صراط مستقیم'' کے آخر میں بطور ضمیمہ کے شامل ہے، میں نے ان کی تحریر کے جواب میں لکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قبریں بھی موجود تھیں، انبیاءؑ کرام کی بھی قبریں تھیں، صحابہ کرامؓ شہید بھی ہوئے، دفن بھی ہوئے، اس وقت پھول بھی موجود تھے، کیا رسول اللہ ﷺ نے کسی قبر پر پھول چڑھائے؟ پھر صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے زمانے میں بھی پھول ہوتے تھے، قبریں بھی ہوتی تھیں، کیا کسی صحابیؓ نے، کسی تابعیؒ نے، کسی امامؒ نے قبروں پر پھول چڑھائے؟ اگر تم اس کو کارِ ثواب سمجھ کر بزرگوں کے مزار پر چڑھاؤ گے تو یہ دین میں اضافہ ہے، گویا رسول اللہ ﷺ کو مشورہ دینا ہے کہ آپؐ کو یہ کام کرنا چاہئے تھا، رسول اللہ ﷺ نے یہ کام نہیں کیا، یا تو آپ اس کو لغو سمجھتے تھے اور تم اس کو کارِ ثواب سمجھتے ہو، یا یہ کہ آپؐ کو اور بڑے بڑے کام تھے، اس لئے آپؐ نے یہ کام نہیں کیا، تو صحابہ کرامؓ کے عمل کو دیکھو، رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب ہستی تو اس دنیا میں پیدا نہیں ہوئی، اور صحابہ کرامؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بڑا کوئی عاشق پیدا نہیں ہوا ہوگا، خلفاءؓ راشدین نے اور تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہؓ میں سے کسی ایک نے رسول اللہ ﷺ کی قبر پر پھول چڑھائے؟

قبروں پر پھول چڑھانا بدعت ہے:

الغرض قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانا یہ رسول اللہ ﷺ، خلفاء راشدین اور صحابہ کرامؓ اور سلف صالحینؒ کی سنت تو نہیں، ہاں! انگریز بہادر نے یہ رسومات ضرور جاری کی ہیں کہ ان کے جو قومی مقتدا ہوتے ہیں ان کو وہ قومی ہیرو کہتے ہیں یا جو کچھ بھی کہتے ہوں گے ان کی قبروں پر پھولوں کی چادر چڑھائی جاتی ہے، ہمارے یہاں قائد اعظم کی قبر پر بھی پھولوں کی چادر چڑھائی جاتی ہے، اندر پتہ نہیں کیا ہے؟ مولانا رومی کے بقول:

از بروں چو گور کافر پر حلل
و اندروں قہر خدائے عزّ و جل

ترجمہ:...... ''اوپر سے کافر کی قبر کی طرح حلے چڑھے ہوتے ہیں، چادریں چڑھی ہوتی ہیں اور اندر اللہ تعالیٰ کا قہر ہے۔''

نہرو، اندرا گاندھی اور شاستری کی قبروں پر بھی پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں، ان لوگوں کی قبروں پر اوپر سے تو چادریں چڑھی ہوتی ہیں، لیکن اندر خدا کا قہر ہے۔ میں افریقہ میں تھا جس دن اندرا گاندھی کو قتل کیا گیا اور اس کی لاش جلائی گئی تھی، ایسے میں زبردستی دوست ٹی وی پر لے گئے، اللہ مجھے معاف کرے، میں نے کہا کہ کوئی جاندار کی تصویر تو نہیں ہے، چلو عبرت کے لئے ایک ہندو کافرہ کے جلانے کا تماشا دیکھ لیتے ہیں، اندرا گاندھی کو میں نے جلتے ہوئے دیکھا، پتہ نہیں کتنے من خالص گھی تھا، جو آدمیوں کو کھانے کے لئے نہیں ملتا جس میں اس کو جلایا گیا، وہ جیسے ظاہر

میں جل رہی تھی ویسے ہی اندر سے بھی جل رہی تھی اور جب اس کی مڑھی بنادی گئی تو اس پر پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں، حالانکہ اندر آگ ہی آگ ہے۔ یہاں بھی ہمارے دوستوں نے یہ اصول تجویز کرلیا ہے کہ کوئی پکی قبر بنادے تو اس پر بھی چادریں چڑھنی شروع ہوجاتی ہیں۔ پھول چڑھاؤ، چادریں چڑھاؤ، اگر کوئی شخص گدھے کو دفن کردے، اسی کی بھی قبر بنادے، اس پر جھنڈا لگادے، تم میرے سامنے یہ کام کر کے دکھاؤ، ایک سال بعد میں تم کو چادریں چڑھتی ہوئی دکھاؤں گا، کسی گدھے کا، کتے کا ''روضہ شریف'' اور اوپر لکھ دو ''دربار پیر خر شاہ صاحب'' ''پیر کلب شاہ صاحب'' بس لوگ اس پر نذریں، نیازیں، پھول اور چادریں چڑھانے لگیں گے، اور یہ میں فرضی بات نہیں کر رہا، اس کے دسیوں واقعات موجود ہیں، اللہ کے بندو! کیا اس چیز کو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے؟ اور کیا یہی حضور ﷺ کا لایا ہوا دین تھا؟ تم جو بارہ ربیع الاول کو آنحضرت ﷺ کے روضہ اقدس کی شبیہیں بناتے ہو، خانہ کعبہ کی شبیہیں بناتے ہو، کیا یہی حضور ﷺ کا دین تھا؟ شیعہ تو امام حسین رضی اللہ عنہ کا تعزیہ بنایا کرتے ہیں، تم نے رسول اللہ ﷺ کا بنانا شروع کردیا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور یہ بارہ ربیع الاول کے جلوس اور جانے کیا کیا خرافات کرتے ہیں، یہ دین سمجھ کر کرتے ہیں یا بے دینی سمجھ کر؟ ظاہر ہے کہ اس کو دین سمجھ کر بڑی عقیدت سے کرتے ہیں، بس اس کو بدعت کہتے ہیں، تقرب الی اللہ کا وہ ذریعہ جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں بتایا تم اس کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہو، پھر اس کے بدعت ہونے میں کیا شک ہے؟ عقیدہ بنالیا گیا ہے کہ گیارہویں کے دن روٹی دو گے یا کھیر کھلاؤ گے تو قرب حاصل ہوگا، بارہویں کو دو گے تو قرب حاصل نہیں ہوگا، گیارہویں کے بغیر تمہارے عقیدے میں بات ہی نہیں بنتی، تیسرے دن میت کا کھانا کھلاؤ گے، یا

ساتویں دن، یا نویں دن، یا بیسویں دن، یا چالیسویں دن، یا برسی کے دن، کیا یہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم تھی؟ صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کیا تھا؟ یا ائمہ فقہاءؒ نے جو دین کو سمجھا اس میں کہیں ان تاریخوں کو نقل کیا ہے؟ اب یہ تو دوسرا موضوع چل پڑے گا، خلاصہ یہ کہ بدعتی کو کبھی توفیق نہیں ہوتی توبہ کرنے کی۔

سائنسی ایجادات بدعت نہیں:

بلکہ اگر منع کرو تو کٹ حجتیاں کرتے ہیں کہ پھر ہوائی جہاز پر بھی نہ سوار ہوا کرو، یہ بھی بدعت ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں نہیں تھا، میرے بھائی! کیا ہوائی جہاز پر سوار ہونا عبادت ہے؟ کیا ہم اس کو عبادت سمجھتے ہیں؟ ہرگز نہیں! ہوائی جہاز کی سواری کو بذاتِ خود کوئی شخص بھی عبادت یا نیکی کا کام نہیں سمجھتا، ہاں! بیت اللہ شریف پہنچنے کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا، وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ."

(آل عمران:۹۷)

ترجمہ:......"اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا، جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف راہ چلنے کی، اور جو نہ مانے تو پھر اللہ پرواہ نہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی۔"

پس مقصود بیت اللہ تک پہنچنا ہے، خواہ بیت اللہ تک پہنچنے کا جو ذریعہ بھی مل جائے، گدھے پر مل جائے، گھوڑے پر مل جائے، کشتی پر مل جائے، ہوائی جہاز پر مل جائے، موٹر پر مل جائے، اللہ تعالیٰ نے کسی راستہ کی تعیین تو نہیں کی تھی اور نہ ہم سمجھتے

ہیں کہ سفینہ حجاج میں بیٹھنا کارثواب ہے، تو یہ کٹ حجتی نہیں تو اور کیا ہے؟ اپنی بدعت کا جواز پیدا کرنے کے لئے اس قسم کی فضول باتیں کرتے ہیں، لیکن خیر ہمارے سامنے یہ کٹ حجتی کرلو! مگر یاد رکھو کل اللہ کے سامنے یہ کٹ حجتیاں نہیں چلیں گی، جوابدہی تو تمہیں اللہ کے سامنے کرنی ہے، ہمارے سامنے نہیں کرنی، ہم محاسب نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

"وَمَا جَعَلْنَاکَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا. وَمَا اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَکِیْلٍ." (الانعام:۱۰۷)

ترجمہ:...... "ہم نے آپؐ کو ان کا نگران نہیں بنایا، اور نہ آپؐ ان کے کارساز ہیں۔"

بدعت بری بلا:

غرضیکہ بدعت ایسی بری بلا ہے کہ بدعتی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے، لیکن اس کو کبھی توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، ندامت ہی نہیں ہوتی، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی توفیق نصیب فرمائیں اور سنت کا نور اس کے قلب پر القا فرمادیں تو ہوسکتا ہے کہ اپنی بدعت سے تائب ہونے کی توفیق ہوجائے تو جب وہ توبہ ہی نہیں کرتا تو بخشش کیوں ہوگی؟

کینہ رکھنے والا:

تیسرا اور چوتھا آدمی مشاحن ہے، یعنی کینہ پرور، جو اپنے مسلمان بھائی سے کینہ رکھتا ہے، اس کی بخشش نہیں ہوتی اور یہ حدیث صحیح میں آتا ہے کہ جن دو آدمیوں کے درمیان میں بغض ولڑائی ہے، بات چیت، سلام کلام بند ہے، اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ ان کو چھوڑ دو، جب تک یہ آپس کا معاملہ طے نہیں کرلیتے، ہم ان

کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کریں گے، ان کی بخشش کا بھی فیصلہ نہیں کریں گے، اور بہت موٹی سی بات ہے کہ جو شخص اس دنیا کی ایک ذلیل سی چیز اپنے بھائی کو نہیں بخش سکتا وہ کس منہ سے اللہ تعالیٰ سے بخشش کا طالب بن کر آتا ہے؟ بھائی! اگر تم اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے ہو تو تم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کردو، بھائی تم نے اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے بڑے جرائم کئے ہیں، اور کسی مخلوق نے تو ہمارا بہت ہی چھوٹا قصور کیا ہوگا، ہم اس کا چھوٹا گناہ معاف نہیں کرسکتے اور اللہ تعالیٰ سے چاہتے ہیں کہ ہمارے گناہ کبیرہ بخش دے، ہمیں دوزخ سے رہائی دے، پس جو شخص عین اس حالت میں کہ اپنے بھائی سے کینہ رکھنے والا ہو، اس رات میں بھی اس کی بخشش نہیں ہوتی، جب تک کہ اپنے کینہ سے توبہ نہ کرلے۔

قاتل کی بخشش نہیں ہوتی:

اور قاتل کا گناہ ایسا ہے کہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے بھی ہے اور حقوق العباد سے بھی، حق تعالیٰ شانہ کی نظر میں کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کی سزا دائمی جہنم فرمائی ہے:

”وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءُہٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا.“

(النساء:۹۳)

ترجمہ:...... ”اور جو قتل کرے کسی مسلمان کو جان بوجھ کر، اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ کا غضب ٹوٹ پڑا اس پر، اور اللہ کی لعنت برسی اس پر اور اللہ تعالیٰ

نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

ذرا زورِ کلام دیکھئے! جہنم میں جھونک دیا اور اس پر ہمیشگی کی مہر بھی لگادی، لیکن اس پر بس نہیں کی، اللہ کا غضب ٹوٹا اس پر اور اللہ کی لعنت برسی اس پر اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے، یہ شخص جب تک صاحب معاملہ سے معافی نہیں مانگتا اس کی بخشش کیسے ہوگی؟ اور علماءؒ فرماتے ہیں کہ حقوق العباد کی یہی شان ہے، کسی بندے کے جو حقوق تلف کئے ہوں، اللہ تعالیٰ ان کی بخشش نہیں فرماتے، جب تک کہ بندوں سے معافی نہ مانگ لے یا بندوں کے حقوق ادا نہ کر دے، مشہور حدیث ہے، آپ مجھ سے کئی دفعہ سن چکے ہوں گے کہ:

"عَنْ أَبِیْ قَتَادَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَامَ فِیْهِمْ فَذَکَرَهُمْ اَنَّ الْجِهَادَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْاِیْمَانَ بِاللّٰهِ أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَرَأَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُکَفَّرُ عَنِّیْ خَطَایَایَ؟ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: نَعَمْ! اِنْ قُتِلْتَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَأَنْتَ صَابِرٌ مُّحْتَسِبٌ مُّقْبِلٌ غَیْرَ مُدْبِرٍ، ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَیْفَ قُلْتَ؟ فَقَالَ أَرَأَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ أَیُکَفَّرُ عَنِّیْ خَطَایَایَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ! وَأَنْتَ مُحْتَسِبٌ مُّقْبِلٌ غَیْرَ مُدْبِرٍ اِلَّا الدَّیْنُ، فَاِنَّ جِبْرِیْلُ قَالَ ذَالِکَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ."
(مشکوٰۃ ص:۳۳۰)

یعنی ایک صاحب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں

آئے اور کہنے لگے: ''یا رسول اللہ! اگر میں اللہ کے راستے میں جہاد میں قتل ہوجاؤں (اس حالت میں کہ میں آگے بڑھنے والا تھا، پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا) تو کیا میری بخشش ہوجائے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! بخشش ہوجائے گی، (شہید کی بخشش تو پہلے قطرے پر ہوجاتی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''اِنَّ السَّیْفَ مَحَّاءٌ لِلْخَطَایَا.'' (مشکوٰۃ ص:۳۳۵) (تلوار گناہوں کو مٹانے والی ہے) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل ہونے سے تمام گناہ مٹ جاتے ہیں، اسی لئے شہید کو غسل نہیں دیتے، اس کو کیا غسل دیں، یہ تو پہلے ہی پاک ہوچکا ہے؟ ظاہر اور باطن کے اعتبار سے پاک ہوگیا، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی شہادت نصیب فرمائیں۔ ناقل) تو فرمایا ہاں! گناہ معاف ہوجائیں گے (وہ صاحب اٹھ کر جانے لگے ابھی دروازے تک ہی پہنچے تھے، فرمایا: ان کو بلاؤ، وہ واپس آئے تو۔ ناقل) ارشاد فرمایا کہ: تم نے کیا پوچھا تھا؟ (ذرا اپنا سوال پھر دہراؤ) عرض کیا: ''یا رسول اللہ! اگر میں قتل ہو جاؤں اللہ کے راستے میں (اس حال میں کہ میں آگے بڑھنے والا تھا، پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا) تو کیا میری بخشش ہوجائے گی؟ ارشاد فرمایا کہ: جی ہاں! مگر ایک استثنا ہے کہ پرایا حق معاف نہیں ہوگا، جبریل علیہ السلام نے ابھی آکر یہ مسئلہ بتایا ہے۔''

تو جس طرح کہ قاتل کی گردن میں ایک مظلوم کا خون ہے جب تک کہ وہ

معاف نہ کردے خون معاف نہیں ہوگا، اسی طرح وہ تمام لوگ جنہوں نے دوسروں کا حق مارا ہے، خواہ آبرو کے متعلق ہو یا مال کے متعلق ہو، یا جان سے متعلق ہو، مثلاً کسی کو زخم پہنچایا، کسی کو گالی دی، کسی کی غیبت کی، کسی کو ستایا، کسی کا مال کھایا، کسی پر ڈاکہ زنی کی، تو جب تک صاحب حق معاف نہیں کردے گا یہ لوگ پکڑے رہیں گے، پس حقوق العباد کا معاملہ بڑا سخت ہے اور کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا تو اتنا بڑا گناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر دائمی دوزخ کی وعید سنائی ہے، اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ کفر و شرک کے سوا جتنے گناہ ہیں ان پر دائمی جہنم کی سزا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہیں کہ اگر چاہیں تو بغیر سزا کے معاف فرمادیں اور اگر چاہیں تو گناہ پر مناسب سزا دینے کے بعد معاف فرمادیں (اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف فرمائیں) اس لئے اہل سنت اس آیت کی تاویل کرتے ہیں جس میں قاتل کی سزا "خَالِدًا فِيهَا" بیان فرمائی ہے، کہ اس خلود سے مراد بہت دیر تک دوزخ میں ٹھہرنا ہے، بالآخر اس کی بھی معافی ہوجائے گی۔

شب برأت کی بدعات

آتش بازی:

اب آخر میں چند بدعات کا تذکرہ کرتا ہوں جو اس رات میں ایجاد کی گئی ہیں، ان میں سب سے بدترین بدعت آتش بازی ہے جو مجوسیوں کی نقل ہے، ہمارے فقہاءؒ نے لکھا ہے کہ قبرستان میں آگ لے جانا بھی ممنوع ہے کیونکہ آگ قہر الٰہی کا نشان ہے، اس کو قبرستان میں نہیں لے جانا چاہئے، تو اس آگ کے ساتھ کھیلنا یہ اہل اسلام کا کام نہیں ہے، یہ مجوسیوں کا فعل ہے، میں نے بہت پڑھا بھی ہے، سوچا بھی

ہے، لیکن مجھے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ مجوسیوں کا فعل ہم مسلمانوں میں کہاں سے آ گیا؟ بہرحال حدیث میں ہے: "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ." (جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔) یہ فعل مجوسیوں کا ہے، مسلمان لڑکے آتش بازی کر کے مجوسیوں کی مشابہت کرتے ہیں۔

ایک مسلمان کو ہندوؤں کے ساتھ مشابہت پر عذاب:

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ شریف میں ہے کہ: ہندوؤں کی ہولی تھی تو ایک مسلمان جا رہا تھا، پان کھاتے ہوئے، اس نے گدھے پر پیک پھینک دی کہ تجھے کسی نے نہیں رنگا، میں تجھے رنگ دیتا ہوں، تو وہ اسی میں پکڑ لیا گیا کہ تو نے ہندوؤں کی مشابہت کی تھی، اس رات، دن رنگ سے کھیلنا، یہ ہندوؤں کی مذہبی رسم تھی، تو نے بطور مذاق کے ان کی مشابہت کی، یہ تشبیہ کا مسئلہ بڑا خطرناک ہے، کسی قوم کی مشابہت کرنا تو سب سے بدترین اور قبیح ترین بدعت ہے، اللہ کرے کہ مسلمانوں میں یہ آتش بازی کی رسم نہ رہے، ہر سال اس سے جانی، مالی نقصان بھی ہوتے ہیں لیکن نہ جانے مسلمانوں کو عقل کیوں نہیں آتی؟ دین بھی گیا دنیا بھی گئی، ایمان بھی گیا، جان بھی گئی۔

حلوہ شریف:

ایک بدعت اس دن کی حلوہ شریف ہے، یہ تو میرے جیسے کسی ملا نے ایجاد کی ہوگی، اور ایسا ایجاد کیا کہ اس دن مسلمانوں کے گھر گھر حلوہ پکتا ہے، اور ایک دوسرے کو تحفہ دیتے ہیں، رات ایک خاتون فون پر مجھ سے ایک مسئلہ پوچھ رہی تھی کہ حلوہ اگر آ جائے تو کیا کریں؟ کھانا حلال ہے کہ حرام؟ میں نے کہا میں حرام تو نہیں

کہوں گا، حلال چیز کو حرام کیوں کہوں؟ باقی یہ دیکھ لو کہ یہ حرام مال سے پکا ہے کہ حلال سے؟ بینک کے سود سے پکایا جارہا ہے؟ پرائز بانڈ سے پکایا جارہا ہے؟ رشوت کے پیسے سے پکایا جارہا ہے؟ دھوکے اور فریب کی رقم سے حلوہ شریف بنایا جارہا ہے؟ اس کو تو تم بھی حلال نہیں کہو گے میں بھی نہیں کہوں گا۔ میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ لوگ پرائی مرغی چرالیتے ہیں اور اس کو ذبح کر کے کھا لیتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس کو ذبح کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ تو ذبح کرنے کے بعد بھی حرام کی حرام ہی رہی، ذبح کرنے سے حلال تھوڑی ہو جاتی ہے، وہ تو اللہ کا بنایا ہوا پاک مال ہے، مرغی، بکری اور دوسرے جو کھانے والے جانور ہیں جن کو اللہ نے حلال کیا ہے، اللہ نے پاک بنایا ہے لیکن تم نے زم زم میں پیشاب ڈال دیا، نعوذ باللہ، غصب کی چیز تھوڑی حلال ہو جاتی ہے؟ پرائی بکری چرا کے تم قربانی کردو تو کیا قربانی قبول ہو جائے گی؟ حلال ہی نہیں، جیسے مردار حرام ہے ویسے ہی چوری کی بکری ذبح کی ہوئی حرام ہے، تو خیر یہ بات تو درمیان میں آگئی، بات یہ ہو رہی تھی کہ اس رات لوگ حلوہ پکاتے ہیں، اس کی کوئی اصل نہیں ہے، بھائی میں نے تمہارے سامنے ساری حدیثیں پڑھ دی ہیں، جو کوئی لائق توجہ ہیں وہ پڑھ دی ہیں، ان میں کہیں حلوے کا ذکر آیا ہے؟ یہ محض فضول حرکت ہے، اور اس کو اگر تم تہوار سمجھ کر کرتے ہو تو بھی یہ بدعت ہے، یہ مسلمانوں کا قومی دن نہیں ہے، تم ہندوؤں سے مسلمان ہوئے تھے، میں بھی سکھوں سے مسلمان ہوا ہوں، میرا خاندان سکھوں کا تھا، یہ صدیقی صاحب ہیں، میں ان کی بات نہیں کر رہا، یہ تو پرانے مسلمان ہیں، کوئی رانگڑ ہو، کوئی راجپوت ہو، کوئی کچھ ہو، آرائیں ہو، جٹ ہو، کسی اور برادری کا ہو، تو یہ سب پہلے ہندو، سکھ تھے، پہلے تمہارے یہاں یہ رواج ہندوؤں میں سکھوں میں ہوتا ہوگا، وہاں سے لائے ہو گے، مگر یہ ہمارے اسلام میں

نہیں ہے۔

چراغاں کرنا:

اور ایک بدعت یہ ہے کہ ان راتوں میں چراغاں کیا جاتا ہے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اور اس کا منشا وہی ہے کہ اس دن کو قومی تہوار بنالیا۔ ایک خاتون مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اس دن نئے کپڑے پہننا کیسا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اس دن لوگ نئے کپڑے بھی پہنتے ہیں، میں تو کہتا ہوں اللہ تعالیٰ ہم کو ہر دن نیا کپڑا عطا کردیا کرے، ہر روز، روز عید اور ہر شب، شب برأت، لیکن خاص طور سے پندرہویں کو نئے کپڑے پہننا یہ خالص بدعت ہے، اور ایک بدعت قبرستان میں چراغاں کرنے کی ہے، اللہ اکبر! شہر خموشاں کو آباد کیا جارہا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”کُنْتُ نَهَیْتُکُمْ عَنْ زِیَارَةِ الْقُبُوْرِ، فَزُوْرُوْهَا فَاِنَّهَا.....تُذَکِّرُ الْآخِرَةَ.“ (مشکوٰۃ ص:۱۵۴)

ترجمہ:.....”میں تم کو قبروں کی زیارت کرنے سے منع کیا کرتا تھا، لیکن اب وہ حکم واپس لیتا ہوں، سنو! اب ان کی زیارت کیا کرو، کیونکہ وہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔“

وہاں چراغاں کرنا، لہو ولعب کرنا، بے ہودہ بات ہے اور خصوصیت کے ساتھ بدعت ہے، مردوں اور عورتوں کا بھڑ کیلے اور بہترین کپڑے پہن کر وہاں جانا، میں کبھی نہیں گیا، لیکن میں نے سنا ہے کہ لوگ جاتے ہیں اور مستورات بھی جاتی ہیں، اب ان کو مستورات تو نہیں کہنا چاہئے، مستور چھپی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، وہ تو کہتی ہیں کہ ہمیں گالی دیتے ہیں مستورات کہہ کر، ہم کسی کے ابا سے کم ہیں؟ ہم نے اپنی

نمائندہ بے نظیر بنادی ہے، تم پر حکومت کر رہی ہے، اب بھی ہمیں مستورہ کہتے ہو؟ واقعی ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا ان کو مستورات کہنے کا، یہ خود ہی مکشوفات ہوگئی ہیں، کھل گئی ہیں، بہر کیف مردوں اور عورتوں کا قبرستان میں جمع ہونا اور ایک جشن کے انداز میں، عریاں لباس پہن کر اور بھڑکیلا لباس پہن کر بے پردہ ہوجانا، لعنت در لعنت، خدا ان کو ہدایت دے۔ حضور ﷺ نے قبروں کی زیارت کا حکم دیا تھا کہ لوگوں کو عبرت ہو، عورتوں کا قبرستان میں جانا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں علماءؒ کا اختلاف واقع ہوا ہے، کیونکہ اجازت تو دے دی قبرستان میں جانے کی لیکن مشکوٰۃ شریف میں حدیث موجود ہے:

"اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ." (مشکوٰۃ ص:۱۵۴)

ترجمہ:...... "اللہ کی لعنت ہو قبروں پر زیارت کے لئے جانے والی عورتوں پر۔"

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

فضائل کی احادیث میں زیادہ تشدد نہیں کیا جاتا، احکام کی احادیث کو لینے میں تو علمائ بہت زیادہ سختی کرتے ہیں، سخت معیار پر ان کو جانچتے ہیں، لیکن جو روایتیں فضائل اعمال سے متعلق ہوں ان میں زیادہ شدت اختیار نہیں کرتے، اس لئے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ان کو فی الجملہ کسی نہ کسی درجہ میں قبول کر لینا چاہئے۔

صبر و شکر

انسان کو دو قسم کی حالتیں پیش آتی ہیں، مصیبت اور تکلیف، یا نعمت اور راحت، اگر کوئی نعمت حاصل ہو تو شکر کا مطالبہ کرتی ہے، اور اگر کوئی تکلیف آجائے تو وہ صبر کا مطالبہ کرتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلام وعلی عبادہ الذین اصطفیٰ

پیران پیر حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ انسان کو دو قسم کی حالتیں پیش آتی ہیں، مصیبت اور تکلیف، یا نعمت اور راحت، اگر کوئی نعمت حاصل ہوتو شکر کا مطالبہ کرتی ہے، اور اگر کوئی تکلیف آجائے تو وہ صبر کا مطالبہ کرتی ہے۔

شکر کی تین اقسام:

اور شکر تین قسم کا ہوتا ہے زبان کا شکر، دل کا شکر، اور اعضاء و جوارح کا شکر۔

زبان کا شکر:

زبان کا شکر یہ ہے کہ تم اس نعمت پر زبان سے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ، اور اس نعمت کو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کرو، اور اس بات کا اقرار کرو کہ یہ نعمت حق تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے، محض اس کا فضل و انعام ہے، اس کو اپنی ذات کی طرف، اپنی قوت کی طرف، اپنے فہم و بصیرت کی طرف، اپنے ہنر اور کسب کی طرف، یا کسی اور مخلوق کی طرف منسوب نہ کرو، اس لئے کہ جن جن واسطوں سے اور جن جن ذریعوں

سے ہوتی ہوئی نعمت تم کو پہنچی ہے، وہ صرف واسطوں کی حیثیت رکھتے ہیں، نعمت کے عطا کرنے والے کی حیثیت نہیں رکھتے، یہ چیزیں نعمت دینے والی نہیں ہیں، نعمت کے دیئے جانے کا واسطہ اور ذریعہ ضرور ہیں، ان ذرائع کو ذریعہ بنانا بھی اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، ان کی ایجاد بھی اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے، اور ان اسباب کو تمہارے لئے مہیا فرمادینا بھی اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، مخلوق کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، یہ تمام نعمتیں حق تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں، اس بات کا زبان سے اقرار کرو اور مخلوق کی طرف اس کو منسوب نہ کرو، مخلوق کی طرف منسوب کروگے تو ناقص العقل ٹھہروگے، تمہاری عقل صحیح نہیں۔

شیخؒ کہتے ہیں عاقل کو عاقل اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ انجام اور نتیجے کو دیکھتا ہے، جب تم نے ظاہری سطح کو دیکھ لیا اور اس کی طرف نسبت کرنے لگے تو تم نے نعمت کے اصل منبع کو فراموش کردیا، جس ذات عالی کی طرف سے نعمتوں کا فیضان ہورہا ہے، وہاں تک تمہاری عقل کی رسائی نہیں ہوتی، اس لئے ناقص العقل ٹھہرے، ہمارے یہاں اگر کوئی نعمت مل جاتی ہے تو لوگ اس کو اسباب ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، اللہ کی طرف کم ہی منسوب کرتے ہیں، کوئی کسی کی صلاحیتوں کی طرف منسوب کرتا ہے، کوئی اپنے عقل وفہم کی طرف منسوب کرتا ہے اور کوئی کسی طرف کرتا ہے، یہ نظر کی کوتاہی ہے قرآن کریم میں ہے:

''مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَکَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ.'' (النسآء:۷۹)

ترجمہ:...... ''تجھ کو کوئی بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور جو پہنچے تجھ کو کوئی برائی، وہ تیرے نفس کی جانب

سے ہے“

اگرچہ انسان کو برائی بھی اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے پہنچتی ہے، لیکن اس میں ہماری نحوست کا دخل ہے، ہماری بداعمالیوں کی نحوست ہے، بخلاف بھلائی کے، راحت کے، اور مصلحت کے، کہ اس میں ہمارا ذرا سا بھی کوئی دخل نہیں، وہ محض عطیہ الٰہی ہے، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

ما نبودیم و تقاضا ما نبود
رحمت تو ناگفتہ مامی شنید

ترجمہ:...... ”ہم نہیں تھے ہماری طرف سے تقاضا نہیں
تھا۔ اے اللہ آپ کی رحمت نے ہماری نہ کہی ہوئی باتوں کو سنا۔“

ہم ماں کے پیٹ میں تھے تو کون سا تقاضا کر رہے تھے؟ ہم تو شروع ہی سے اللہ تعالیٰ کے انعامات کا مورد چلے آتے ہیں، جب سے عدم پر وجود کا فیض چمکا ہے، اس وقت سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مورد چلے آتے ہیں، ہمارے پاس جتنی چیزیں ہیں، یہ سب ہم نے مانگی بھی تو نہیں ہیں، یہ بھی تو نہیں کہ یہ ہمیں مانگنے پر ملی ہوں۔

اگرچہ ہمیں حکم تو ہے کہ مانگو، تاکہ تمہارا فقر ظاہر ہو، تمہاری عبدیت کا یہی تقاضا ہے کہ تم مانگو، لیکن یہ نعمتیں ہمارے مانگنے پر تو نہیں ملیں، بغیر مانگے کے ملی ہیں۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت اعلیٰ دماغ دیا ہے، آپ بہت اونچی سوچ رکھتے ہیں، آپ کی عقل بہت صحیح ہے، بندہ پرور! یہ عقل وفہم کس نے دی تھی؟ کس کے پاس سے لائے تھے؟ آپ کی عقل کام کرتی ہے، مگر عقل کس نے دی ہے؟ آپ کی استعداد بہت اونچی ہے، آپ کی ہمت بہت بلند ہے، قوت بہت زیادہ ہے، آپ بڑے ہنر مند

ہیں، آپ بڑے صحت مند ہیں، آپ کے پاس فلاں چیز ہے، فلاں چیز ہے، جس کی وجہ سے آپ یہ کام کر لیتے ہیں، ٹھیک ہے، مسلّم ہے، مگر ان ساری چیزوں کو وجود کس نے دیا تھا؟ آپ نے؟

ایک دہریہ کا واقعہ:

حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کمیونسٹ دہریہ تھا، خدا کو نہیں مانتا تھا، اور اسکولوں کا انسپکٹر تھا، امتحانات لینے کے لئے جاتا تھا، تو بچوں کو چھیڑا کرتا تھا، ان سے اللہ کے بارے میں سوالات کرتا، ایک اسکول کے استاد نے کہا: جناب یہ چھوٹے بچے ہیں، یہ اس قسم کے سوالوں کو کیا جانتے ہیں؟ آپ ان کو کیوں پریشان کرتے ہیں؟ آپ ان بچوں کے بجائے مجھ سے گفتگو کیجئے، اس نے کہا: اچھا تم بتاؤ کہ اللہ کون ہوتا ہے؟ کہنے لگے: اللہ وہ ہوتا ہے جس نے آپ کو وجود بخشا ہے، کہنے لگا وہ تو میرے ماں باپ نے بخشا ہے، اس پر گفتگو ہوتی رہی، اتفاق سے یہ شخص ایک آنکھ سے کانا تھا، اس نے اسکول کے استاد سے کہا کہ اگر اللہ کا وجود ہے تو اس سے کہو میری ایک آنکھ ٹھیک کردے، استاد نے اوپر دیکھ کر ویسے ہی کچھ منہ ہلایا، جیسے کسی سے باتیں کرتا ہو، بعد میں کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تو اس کو دونوں آنکھیں دی تھیں، مگر یہ ایسا نالائق نکلا کہ اس نے ہمارے وجود کا انکار کردیا، اس لئے ہم نے اس کی ایک آنکھ پھوڑ دی، اور اگر یہ ایسا ہی چلتا رہا تو ہم اس کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ دیں گے، تو بھائی آنکھیں بھی اللہ نے دی ہیں۔

اسباب کے بجائے مسبب کی طرف نظر ہو:

اللہ تعالیٰ نے زبان کی نعمت بولنے کے لئے دی ہے، آپ بہت اچھی تقریر

کرتے ہیں، بہت عمدہ بیان کرتے ہیں، یہ زبان کس نے دی تھی؟ کیا یہ سب اپنے گھر سے لے کر آئے تھے؟ کیا یہ آئی جی نے دی تھی؟ نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اللہ کی عطا ہے، ہاتھ ہیں، پاؤں ہیں، پورا وجود ہے، سب اللہ کی عطا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

”وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ. ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ.“ (النحل:۵۳)

ترجمہ:...... ”تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں، وہ اللہ کی جانب سے ہیں، اور جب تم کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو تم اسی کی طرف گڑگڑاتے ہو۔“

غرضیکہ جتنے اسباب و وسائل ہیں، خواہ انسان کے اپنے وجود کے اندر ہوں، یا اس کے وجود سے باہر پھیلے ہوئے ہوں، جن واسطوں اور ذریعوں سے ہوتی ہوئی یہ نعمت ہم تک پہنچی ہے، سب کا موجد ایک اللہ ہے، وجود میں لانے والا اللہ ہے، اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والا اللہ ہے، مثلاً ایک شخص کی آنکھیں ہیں، مگر ان میں روشنی نہیں، نور اور بینائی پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے، آنکھیں عطا کرنے والا بھی اللہ ہے، آج آپ کی سائنس بہت ترقی کرچکی ہے لیکن آنکھ نہیں بناسکی، نہ آنکھ کی بینائی پیدا کرسکی، آج سائنسی ترقی کا غلغلہ ہے، سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے مگر اس کی ترقی کی انتہا یہ ہے کہ ایک آدمی کی آنکھ نکال کر دوسرے میں لگا دیتے ہیں، لیکن سائنس آنکھ کو وجود میں ابھی تک نہیں لاسکی، اور پھر آنکھ کو جو کنکشن دیا جاتا ہے، آدمی کے دماغ میں نور کا مرکز رکھا گیا ہے، اور آنکھوں کو اس مرکز سے روشنی کا کنکشن دیا جاتا ہے، یہ عطا کرنے والے بھی اللہ تعالیٰ ہیں، وجود میں لانے والے اللہ تعالیٰ ہیں

"لَامُوْجِدَ اِلَّا اللّٰہُ." (اللہ کے سوا وجود میں لانے والا کوئی نہیں ہے۔) "وَلَا مُسَبِّبَ اِلَّا اللّٰہُ." ان اسباب کو اسباب بنانے والے بھی اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ اسباب کو اسباب نہ بنائیں تو یہ اسباب سب بے کار ہیں، دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، الغرض ان اسباب کو مہیا کرنے والا اللہ ہے، اسباب میں تأثیر بھی اللہ کی ڈالی ہوئی ہے، پھر ان اسباب کے استعمال کی قدرت دینے والے بھی اللہ تعالیٰ ہیں، اسباب مہیا ہیں لیکن جب تک حکم الٰہی نہ ہو ہم ان کو استعمال نہیں کر سکتے، تو یہ تمام کے تمام اسباب جن سے تمہیں یہ نعمت ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔

شیخؒ فرماتے ہیں یہ سب اللہ کی جانب سے ہیں، کسی مخلوق کا ان میں دخل نہیں، اس لئے نعمت کو بھی اللہ کی جانب منسوب کرو، واسطوں اور ذریعوں کی طرف منسوب نہ کرو، تم کہتے ہو، قلم لکھ رہا ہے، قلم کہاں لکھ رہا ہے؟ یہ تو بے چارا بے جان ہے، یہ رکھا ہوا ہو تو ذرا لکھ کے دکھا دے، قلم کو کوئی ہاتھ پکڑے گا تو لکھے گا، آپ کہتے ہیں اچھا ہاتھ لکھتا ہے، ہاتھ کاٹ کر رکھ دو، کیا لکھ دے گا؟ آپ کہتے ہیں اچھا انسان لکھتا ہے، یہ ہاتھ والا آدمی لکھتا ہے، بھلا اگر اس میں روح نہ ہو تو لکھے گا؟ اچھا آپ کہتے ہیں روح لکھتی ہے، ہم نے کہا اب بھی نظر صحیح نہیں ہوئی، روح کے اندر اللہ کی مشیت کار فرما ہے، وہ لکھتی ہے، لکھتا ہوا قلم سے نظر آ رہا ہے، ہاتھ سے نظر نہیں آتا، ہاتھ والے کو انسان نظر نہیں آتا، انسان کو روح نظر نہیں آتی، اور جن کی نظر روح پر جاتی ہے، ان کی نظر مشیت الٰہی پر نہیں ہوتی، اصل میں جو محرک ہے لکھنے کا، وہ تو اللہ کی قدرت اور اللہ کی مشیت ہے، یہ ایک مثال ہے، باقی تمام مثالوں کو اسی طرح سمجھ لو۔

واسطۂ نعمت لائق قدر ہے:

ہاں یہ ضرور ہے جن واسطوں سے ہمیں نعمت ملی ہو، ہمیں حکم ہے کہ ان واسطوں کو بھی ہم قدر کی نگاہ سے دیکھیں، ان واسطوں کی تذلیل نہ کریں، اگر واسطوں کی تذلیل کریں گے، تو نعمت مکدر ہوجائے گی، بلکہ نعمت چھن جائے گی، یہ بھی سنت اللہ ہے، والدین آدمی کے وجود کا واسطہ بنتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ حق والدین کا رکھا ہے، ایسے ہی استاد علم کے لئے واسطہ بنتا ہے، اللہ تعالیٰ نے استاد کا احترام رکھا ہے، غرض جتنے بھی لوگ تمہارے لئے واسطہ نعمت بنے، ان سب کی قدردانی ہم پر واجب کی گئی ہے، ان کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو واسطہ بنایا ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کو بغیر کسی واسطے کے بھی نعمت عطا کرنے کی قدرت تھی، لیکن اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں ہیں کہ واسطوں کے ذریعہ نعمتیں عطا فرماتے ہیں۔

میرے حج کا قصہ:

اس پر میں اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں، میرے والد مرحوم کئی سال سے حج کی درخواستیں دے رہے تھے، منظور نہیں ہو رہی تھیں، میں یہاں کراچی آ گیا، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا، حضرتؒ نے فرمایا درخواست دے دو، اپنی بھی ساتھ دے دو، اگر نکل آئی ٹھیک ہے، ورنہ پھر اور کوشش کریں گے، چنانچہ ہم دونوں نے درخواستیں دے دیں، اب درخواست جمع کرانے کے بعد، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ! کسی اور کو واسطہ نہ بنایئے یا اللہ! درخواست کو نکال دیجئے۔

لیکن میری یہ دعا احمقانہ تھی، چنانچہ درخواست نہیں نکلی، حضرت مولانا محمد

یوسف بنوریؒ نے ایک دوست سے کہا وہ حج افسر کے پاس مجھے لے گئے، اور مجھ سے راستے میں کہنے لگے کہ تم افسر سے یہ کہنا کہ والد صاحب کی درخواست کئی سال سے نہیں نکل رہی، اور مجھے والد صاحب کے ساتھ خادم کی حیثیت میں جانا ہے، کیونکہ وہ کمزور ہیں، بات صحیح تھی، غلط نہیں تھی، الغرض حج افسر سے یہ سارا قصہ بیان کیا، حج افسر نے کہا کہ درخواست کا فارم لے لو، اور اس کو پر کر کے مجھے دے دو، میں منظوری دے دوں گا، چنانچہ فارم پر کر کے دے دیئے گئے، اور اس دوست نے، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں، باقی تمام کاروائی مکمل کرائی۔

جن لوگوں کی درخواتیں نکل آئی تھیں، ان کو ایک ایک مہینے کے بعد اطلاع دی گئی کہ تمہاری سیٹیں فلاں جہاز میں ہیں، اور فلاں تاریخ کو تمہیں جانا ہوگا، اور ہمیں موصوف نے آٹھویں دن وہ ساری چیزیں لاکر دے دیں، ٹکٹ بھی دے دیا اور تاریخ کا تعین بھی ہوگیا، میں نے کہا اتنے لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے واسطہ اور ذریعہ بنانا تھا، جن کو ہمارے ثواب میں شامل کرنا تھا اور جن کی قدر دانی ہم پر واجب کرنا تھی، ہم ان کو کیسے محروم کرسکتے تھے؟ اس لئے میں نے کہا وہ دعا احمقانہ تھی، عبدیت کے خلاف تھی، بندے کا کام مانگنا ہے، تجویزیں پیش کرنا نہیں، اگر وہ کوئی نعمت کسی واسطہ کے ذریعے دینا چاہتے ہیں، تو ہمیں اس واسطہ کی بھی قدر کرنی چاہئے، الغرض جو لوگ بھی کسی نعمت کا واسطہ اور ذریعہ بنیں، وہ بھی لائق قدر ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:"مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ."

(ترمذی ج:۲ ص:۱۷)

ترجمہ:......"جو شخص انسانوں کا شکر نہ کرے، اس نے اللہ تعالیٰ کا بھی شکر نہیں کیا۔"

مطلب یہ کہ منعم حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہیں، لیکن جن لوگوں کو حق تعالیٰ شانہ نے نعمت کا واسطہ اور ذریعہ بنانا ہے، اگر یہ شخص ان کا شکر نہیں کرتا تو یہ شخص منعم حقیقی کا کیا شکر کرے گا؟ اسباب اور ذرائع کو اللہ تعالیٰ نے جو واسطہ اور ذریعہ بنایا، اس میں بھی بے شمار حکمتیں ہیں، اس کی قدرتیں، اس کی حکمت کے راز ہیں، لیکن ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم ان پردوں میں الجھ کر نہ رہ جانا، بلکہ پردے کے پیچھے سے ہمیں دیکھنا، نعمتیں ہم دینے والے ہیں، منعم حقیقی ہم ہیں، اور جس شخص کی بصیرت کی نگاہ صحیح ہو اور یہ پردہ اس کے سامنے سے ہٹ گیا ہو، اس کو اس تصور سے کہ جتنی نعمتیں مل رہی ہیں وہ مالک کی طرف سے مل رہی ہیں، ایک خاص قسم کی لذت نصیب ہوتی ہے، وہ ان نعمتوں کو صحیح طور پر استعمال کرے گا۔

کھانا کھانے کے آداب:

رسول اللہ ﷺ کھانا کھاتے تھے، دسترخوان پر بیٹھ کر تو اس طرح تواضع کے ساتھ، عاجزانہ انداز میں بیٹھتے تھے جیسے غلام اپنے آقا کے سامنے کھانا کھاتا ہے، اور فرماتے تھے: ”اِنَّمَا اَنَا عَبْدٌ آکُلُ کَمَا یَأْکُلُ الْعَبْدُ.“ (کنز العمال ۱۵: ۲۲۳)

ترجمہ:...... ”میں تو بندہ ہوں اس طرح کھاؤں گا جیسے غلام کھاتا ہے۔“

کیوں کہ نظر اس طرف تھی کہ حق تعالیٰ شانہ، سامنے بٹھا کر کھلا رہے ہیں، ہماری نظر اس طرف نہیں جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کھانا کھاتے ہیں مگر شروع میں ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ نہیں پڑھتے، حالانکہ بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: ”اِنَّ الشَّیْطَانَ یَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ اَنْ لَّایُذْکَرَ اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ.“ (مشکوٰۃ ص: ۳۶۳ بروایت مسلم) جس کھانے پر بسم اللہ نہ پڑھی جائے شیطان اس

میں شرکت کر لیتا ہے۔‘‘

بسم اللہ کے فوائد:

کھانے پر بسم اللہ شریف نہ پڑھنے سے دو نقصان ہوں گے، ایک یہ کہ شیطان اس کھانے میں اپنا حصہ لگا لے گا، جس کی وجہ سے کھانے میں برکت نہیں رہے گی، کھانے کی برکت اٹھ جائے گی۔ دوسرا نقصان یہ کہ اس نے نعمت کو استعمال کرتے وقت منعم کا خیال نہیں رکھا، منعم پر اس کی نظر نہیں گئی، نعمت عطا کرنے والے، اور ولی نعمت کو بھلا دیا، اور یہ اس مالک کی ناشکری ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمت کو کھاتے وقت اس کی ذات کو سامنے نہیں رکھا، اور جب ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘‘ کہو گے تو ایک تو شیطان کی شرکت سے بچو گے، دوسرے اس بات کا اقرار ہوگیا کہ یہ نعمت ولی نعمت کی طرف سے ہے، یہ شکر نعمت ہے، پھر جب کھانا کھالیا تو حکم ہے کہ کھانے کے بعد شکر الٰہی بجا لاؤ اور یہ دعا پڑھو:

’’اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ.‘‘

(ترمذی ج:۲ ص:۱۸۴)

ترجمہ:......’’اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا۔‘‘

اللہ تعالیٰ کا شکر اس لئے کیا کہ یہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی نے عطا کی ہیں، ایک لقمہ ہی پر غور کرلو یہ کہاں کہاں سے چلتا ہے، تمہارے تک پہنچا ہے، اور پھر تمہارے معدے تک پہنچنے میں اس نے کتنے مراحل طے کئے ہیں، ذرا سی دانت میں تکلیف ہوتی ہے تو کھانا نہیں چبایا جاتا، اس وقت پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی ایک نعمت

ہے، حلق میں تکلیف ہوتی ہے نگلا نہیں جاتا، ہاتھ میں تکلیف ہوتی ہے، کھانا اٹھایا نہیں جاتا۔ کتنے انعامات در انعامات ہیں ایک لقمہ کے اندر؟

شکر کا پہلا درجہ:

الغرض ہر نعمت میں یہ بات پیش نظر رکھو، اور زبان سے بھی اقرار کرو کہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں، اس کا عطیہ ہیں، کھانا کھاؤ اس کو سامنے رکھو، کپڑا پہنو تو اس کو سامنے رکھو، اور زبان سے ان کا شکر بجا لاؤ، اور ان نعمتوں کو مالک کی طرف منسوب کرو، واسطوں میں الجھ کر نہ رہ جاؤ، یہ ہے زبان کا شکر۔

شکر کا دوسرا درجہ:

شیخ ؒ فرماتے ہیں کہ دوسرا درجہ دل کا شکر ہے، یعنی زبان کے ساتھ ہمیشہ دل میں یہ عقیدہ رکھو کہ تمہاری تمام حرکات وسکنات، تمہارا اٹھنا، بیٹھنا، تمہاری قوتیں اور طاقتیں، تمہاری صلاحیتیں اور تمہاری تمام چیزیں، اور تمام نعمتیں سب اللہ کی جانب سے ہیں، دل میں بھی یہ مضمون ہمیشہ مستحضر رہے۔

شکر کا تیسرا درجہ:

تیسرا درجہ اعضاءٔ وجوارح کا یعنی انسان کے اعضاءٔ کا شکر یہ ہے، کہ تم اپنے اعضاءٔ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں استعمال کرو، اللہ تعالیٰ کے سوا اعضاءٔ کو کسی کے لئے حرکت نہ دو، اللہ تعالیٰ کی نعمت کو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں استعمال کرو، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہ کرو، اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں، مثلاً تمہیں کسی نے بہت نفیس چاقو دیا، تم نے لے لیا اور اسی کے پیٹ میں گھونپ دیا، بہت اچھی قدر کی! ماشاءٔ اللہ کیا اچھا صلہ دیا، اس نے محبت میں تمہیں بہت نفیس چاقو دیا اور تم نے کہا دینے

والے پر ہی اس کا تجربہ کرنا چاہئے، کیا خوب! اللہ تعالیٰ نے تم کو مال دیا تھا، تم نے کہا اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں خرچ کرنا چاہئے، اللہ نے اولاد دی تھی، تم نے کہا کہ اس اولاد کو اللہ کی نافرمانیوں میں استعمال کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے گھر بار دیا، دوست احباب دیئے اور نعمتیں در نعمتیں عطا فرمائی ہیں، لیکن کہاں استعمال ہورہی ہیں؟ ان نعمتوں کو کہاں استعمال کیا جارہا ہے؟ اللہ کی نافرمانیوں میں، یہ ہاتھ استعمال ہورہا ہے اللہ کی نافرمانی میں، پاؤں استعمال ہو رہے ہیں، اللہ کی نافرمانی میں، زبان، کان، ناک، آنکھ، دل، دماغ تمام وجود کو اللہ کی نافرمانیوں میں استعمال کیا جارہا ہے، کیا یہی شکر ہے؟ نہیں! بلکہ شکر یہ ہے کہ آدمی اپنے اعضاء کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں استعمال کرے، ان کو نافرمانی میں نہ لگائے۔

شیخؒ کے بقول: "لَا تُحَرِّكُهَا وَلَا تَسْتَعْمِلْهَا اِلَّا بِطَاعَةِ اللّٰهِ."

کہ تم اللہ کی اجازت کے بغیر اپنے اعضاء کو حرکت نہ دو، اور ان کو اللہ کی اطاعت کے بغیر استعمال نہ کرو، اور اگر کبھی غفلت ہوجاتی ہے، معافی مانگ لو، اپنی غلطی کا اقرار کرلو۔ ہم جتنی اللہ کی نافرمانیاں کرتے ہیں اس میں آقا کی نافرمانی ہے، اور غلام کو زیبا نہیں ہے کہ آقا کی نافرمانی کرے، تم چاہتے ہو کہ میری بیوی میری فرماں بردار ہو، بیوی تمہاری مخلوق نہیں ہے، تمہاری مملوک نہیں ہے، تمہاری ملکیت نہیں ہے یا بکاؤ مال نہیں ہے، تمہارے برابر کی ہے، صرف اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے ساتھ تم میں جوڑ پیدا کردیا، تمہیں اللہ تعالیٰ نے ان پر فوقیت عطا فرمادی، باقی اس کا اپنا مستقل وجود ہے، تمہارا اپنا مستقل وجود ہے، اس کے باوجود چونکہ تمہیں اک ذرا سی فوقیت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادی، تم شکایت کرتے ہو کہ میری بیوی نافرمان ہے، میرے سامنے بولتی ہے، کہا نہیں مانتی، بندہ نواز! کیا آپ اللہ تعالیٰ کا کہا اسی طرح

مانتے ہیں، جس طرح اپنی بیوی کو منوانا چاہتے ہیں؟ اپنی اور اللہ تعالیٰ کی نسبت کو ذرا دیکھو کہ کیا ہے؟ اور پھر ذرا اپنی اور اپنی بیوی کی نسبت دیکھو، تم سب کچھ اللہ تعالیٰ سے لے کر اللہ کی نافرمانی میں لگاتے ہو، ایک تو وہ آقا اور مالک ہے، اور بندے کو زیبا نہیں کہ اس کی نافرمانی کرے، بندے کا کام بندگی بجالانا ہونا چاہئے، نہ کہ بندگی کے خلاف کرے، بندے کا کام نیاز مندی اور جھکنا ہے، نہ کہ اکڑنا اور تکبر کرنا، بندے کا کام اطاعت ہے، نہ کہ معصیت و نافرمانی اور حکم عدولی، چلو اس بات کو بھی جانے دو، ایک منٹ کے لئے فرض کرلو کہ اللہ تعالیٰ کے درمیان اور تمہارے درمیان بندے اور خدا کا تعلق نہیں ہے، تو اتنی بات تو ہے کہ یہ تمام نعمتیں تمہیں اسی کی طرف سے ملی ہیں، اور "اَلْاِنْسَانُ عَبْدُالْاِحْسَانِ" عربی کا مقولہ ہے کہ انسان احسان کا غلام ہوتا ہے، تم پر کوئی احسان کردے تو تم ساری عمر نہیں بھولتے، اور بھولنا بھی نہیں چاہئے، تو حق تعالیٰ کی طرف سے تو تمام کی تمام نعمتیں ملی ہیں، ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی میں استعمال نہ کیا جائے۔

شیخؒ فرماتے ہیں کہ یہ تین قسم کا شکر ہے اگر تمہیں شکر کا مقام حاصل ہوجائے گا، تو تمہارا نام شاکرین کی فہرست میں لکھ لیا جائے گا، نعمتوں کو اللہ کی طرف منسوب کرو، اور تمہارے دل میں بطور عقیدے کے یہ مضمون مستحضر رہے، کہ یہ سب کچھ مالک نے عطا کیا ہے، میرے پاس میرا اپنا کچھ نہیں ہے، زبان سے تو کبھی کبھی ہم بھی کہہ دیتے ہیں، لیکن محض رسماً کہتے ہیں، دل کی گہرائیوں سے عقیدے کے طور پر نہیں کہتے، اپنی حول وقوت سے، اپنی طاقت سے، اپنے ہنر سے اور اپنے خول سے نکل جاؤ، جو کچھ ہے اس کو مالک کا سمجھو، عقیدے کے طور پر اس کا استحضار رکھو اور پھر جب یہ عقیدہ دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوجائے اور ہر بن مو میں سرایت کرجائے،

تو اب آگے بڑھو، اور اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ شانہ کی اطاعت میں استعمال کرو، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہ کرو، جب یہ ہوگا تو تم شاکرین میں لکھ لئے جاؤ گے۔

احسان بالائے احسان:

شکر کرنے والوں کا بہت اونچا مقام ہے، اور شکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے درجات عطا کئے جاتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے، ایک چیز جو ہم پر عقلاً واجب تھی، اس کے بجا لانے پر انعام دے رہے ہیں، ایک چیز آپ نے مجھے دے دی، میں نے اس کے جواب میں کہہ دیا شکریہ، آپ سے ایک قیمتی چیز وصول کر کے میں نے چھوٹے منہ سے شکریہ کہہ دیا، تو کیا میں اس پر انعام کا مستحق ہو گیا؟ جب تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ شانہ وجل مجدہ کی ہیں، اگر ہم شکر بجا لائیں، تو یہ نعمت کا حق ہے اس کا شکر بجا لانے پر مزید انعام کیسا؟ اور اگر ہم کفران نعمت کریں، تو یہ ہماری نالائقی ہے، لیکن مالک کی عجیب شان ہے، عجیب رحمت ہے، عجیب فیاضی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اگر تم ہماری نعمتوں کا شکر کرو گے تو ہم تمہیں اس شکر پر بھی انعام دیں گے: ”لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ.“ (ابراہیم:۷) ”اگر تم شکر کرو گے تو ہم تمہیں اور نعمتیں عطا فرمائیں گے۔“

اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو کس قدر محبوب رکھتے ہیں، اس کا اندازہ اس حدیث شریف سے ہوگا، فرمایا: ”اَلطَّاعِمُ الشَّاكِرُ بِمَنْزِلَةِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ.“ (مشکوٰۃ ص:۳۶۵ بحوالہ ترمذی)

ترجمہ:..... ”یعنی ایک آدمی کھا کر شکر کرتا ہے وہ ایسا ہے جیسے ایک آدمی روزہ رکھ کر صبر کرے۔“

کھا کر شکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ وہ ثواب عطا فرماتے ہیں، جو روزہ رکھ کر صبر کرنے والے کو عطا فرماتے ہیں، کوئی حد ہے اس انعام و احسان کی؟ اس لطف و کرم کی؟ تو اگر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو گے اور یہ تینوں قسم کے شکر بجا لاؤ گے، تو اللہ تعالیٰ کے شاکرین بندوں میں لکھے جاؤ گے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر گزار بندوں کے لئے بہت سے انعامات کا وعدہ فرمایا ہے، ان میں سے ایک انعام جو سب سے بڑا انعام ہے، وہ اپنی رضا کا مرتب کرنا ہے، حق تعالیٰ شانہ، شکر کرنے والے بندوں سے راضی ہوجاتے ہیں، مقام رضا اس کو نصیب ہوجاتا ہے۔

ناموافق حالات کی حکمت:

یہ تو وہ حالات تھے جو آدمی کی خواہش کے موافق پیش آتے ہیں، ان کو نعمت کہا جاتا ہے، ان پر شکر بجا لاؤ، لیکن کبھی کبھی الٹ بھی ہوتا ہے، کوئی تکلیف پہنچی، کوئی مصیبت پہنچی، کوئی آفت پہنچی، کوئی پریشانی ہوئی، جو ہمیں ناگوار ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہوتا ہے، کہ میٹھا ہی کھانا چاہتے ہو، یا کبھی مرچیں بھی کھائی ہیں، کبھی منہ کا ذائقہ بھی بدلا ہے؟ یا بچوں کی طرح میٹھا کھانے ہی کے عادی ہو؟ کبھی کبھی ناگوار حالات بھی پیش آتے ہیں، بھائی ان حالات کا پیش آنا بہت ضروری ہے، اس میں بھی حق تعالیٰ شانہ کی حکمت کے بے شمار اسرار ہیں، بلایا ہیں، مصائب ہیں، تکالیف ہیں، اور حق تعالیٰ نے پہلے سے اعلان کردیا ہے، تاکہ جب یہ ناگوار حالات پیش آئیں، تو ان کو سہارنے کی ہمت پیدا ہوجائے، اور ان پر صبر کرنا آسان ہوجائے چنانچہ ارشاد ہے:

”وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ

وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ." (البقرہ:۱۵۵)

ترجمہ:...... "ہم تمہاری آزمائش کریں گے، کچھ خوف کے ذریعہ، تھوڑی سی بھوک دے کر، جان میں، مال میں، اولاد میں، کچھ کمی دے کر۔"

یعنی کبھی جان کا نقصان، کبھی مال کا نقصان، کبھی اولاد کا نقصان، کبھی بھوک، کبھی خوف، کبھی فقر، کبھی تکلیف، دکھ، بیماری، پریشانی دے کر ہم تمہیں آزمائیں گے، ہم نے تمہیں پہلے سے بتادیا کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا، ان ناگواریوں پر صبر کرنا ہوگا:

"وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُم مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ." (البقرۃ:۱۵۶)

ترجمہ: "اور خوش خبری دے دیجئے صبر کرنے والوں کو، صبر کرنے والے لوگ وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، تو کہتے ہیں ہم اللہ کا مال ہیں، اور اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔"

مالک کو مال میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے۔ آپ نے کپڑا پہنا ہوا ہے، آپ اس کے مالک ہیں، اگر آپ اسے کسی کو دے دینا چاہتے ہیں، یا اس کو کسی اور طریقہ سے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اس کپڑے کو کیا شکایت ہوسکتی ہے، بھائی یہ مالک ہے اور مالک اپنی ملکیت میں جو چاہے تصرف کرے، مالک کو کامل طور پر اپنے مال میں تصرف کا حق حاصل ہے، اور یہ تمام عقلاً کا مسلمہ اصول ہے، باوجود اس کے کہ ہم مالک حقیقی نہیں، جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ تمام نعمتیں اللہ کی جانب سے ہیں، اللہ کی عطا ہیں، عطا بھی مستعار، امانت کے طور پر دی گئی ہے، جب چاہیں گے واپس

لے لیں گے، یہ تمہیں ہمیشہ کے لئے لکھ کر نہیں دے دی، جس مکان میں رہتے ہو، جب چاہیں گے اس کو تم سے چھین کر دوسروں کو دے دیں گے، خود تمہارے وجود کے اندر جو نعمتیں تمہیں دی گئی ہیں، یہ بھی تم سے واپس لے لیں گے، اس لئے کہ وہ مالک ہیں، ہم اول تو مالک نہیں، یعنی جو چیزیں ہماری کہلاتی ہیں، ہم واقعتاً ان کے مالک نہیں، بلکہ یہ مانگے کی چیزیں ہیں، اور پھر یہ ہمیں ہمیشہ کے لئے نہیں دی گئیں، بلکہ مستعار ہیں، اسی لئے تعلیم دی گئی کہ زوال نعمت پر کہو: ''اناللہ'' بیشک ہم اللہ کے ہیں، اللہ کا مال ہیں۔

حضرت ام سلیمؓ کا عجیب واقعہ:

''عَنْ أَنسٍ رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ مَاتَ اِبْنُ لِأَبِیْ طَلْحَۃَ مِنْ أُمِّ سُلَیْمٍ فَقَالَتْ لِأَھْلِھَا لَاتُحَدِّثُوْا أَبَا طَلْحَۃَ بِابْنِہٖ حَتّٰی أَکُوْنَ أَنَا أُحَدِّثُہٗ قَالَ فَجَاءَ فَقَرَّبَتْ اِلَیْہِ عَشَاءً فَأَکَلَ وَشَرِبَ، فَقَالَ ثُمَّ تَصَنَّعَتْ لَہٗ أَحْسَنَ مَاکَانَ تَصَنَّعُ قَبْلَ ذَالِکَ فَوَقَعَ بِھَا فَلَمَّا رَأَتْ أَنَّہٗ قَدْ شَبِعَ وَأَصَابَ مِنْھَا قَالَتْ: یَا أَبَا طَلْحَۃَ أَرَأَیْتَ لَوْ أَنَّ قَوْمًا أَعَارُوْا عَارِیَتَھُمْ أَھْلَ بَیْتٍ فَطَلَبُوْا عَارِیَتَھُمْ أَلَھُمْ أَنْ یَّمْنَعُوْھُمْ؟ قَالَ لَا، قَالَتْ فَاحْتَسِبْ ابْنَکَ. قَالَ فَغَضِبَ فَقَالَ تَرَکْتِنِیْ حَتّٰی تَلَطَّخْتُ ثُمَّ أَخْبَرْتِنِیْ بِابْنِیْ فَانْطَلَقَ حَتّٰی أَتٰی رَسُوْلَ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرَہٗ بِمَا کَانَ.''

(مسلم ج:۲ ص:۲۹۲)

ترجمہ:...... ''حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک بیٹا جو ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تھا، فوت ہوگیا، تو ام سلیم نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم نے ابوطلحہ کو اس کے بچے کے بارے میں نہیں بتانا، جب ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھر واپس آئے تو اس نے ان کو کھانا وغیرہ کھلایا، پھر ان کے لئے اپنے آپ کو سنوارا، ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے اپنی ضرورت پوری کی، ام سلیم نے جب دیکھا کہ وہ مطمئن ہوگئے ہیں، تو (صبح کو) کہا: اے اباطلحہ! جب کسی سے کوئی چیز عاریتاً لی جائے اور پھر وہ لوگ اپنی چیز کی واپسی کا مطالبہ کریں تو (جنہوں نے عاریتاً چیز لی ہے) ان کو روکنے کا حق ہے؟ ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ انہیں روکنے کا کوئی حق نہیں۔ ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ تیرا بیٹا فوت ہوچکا ہے۔ (ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب یہ سنا) تو غصہ ہوئے اور فرمایا کہ تو نے مجھے رات کو نہیں بتایا، اور ابھی بتارہی ہو، پھر ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرم ﷺ کے پاس گئے اور رات کا واقعہ بتایا۔''

یعنی حضرت ابوطلحہؓ، حضرت انسؓ بن مالک کے سوتیلے والد ہیں، ان کا ایک بچہ تھا، یہ کام سے گئے ہوئے تھے، پیچھے بچے کا انتقال ہوگیا، شام کو واپس آئے تو گھر والی سے پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ ان کی اہلیہ حضرت ام سلیمؓ حضرت انسؓ کی والدہ ہیں، وہ کہنے لگیں کہ بچہ ٹھیک ہے، انہوں نے اطمینان سے کھانا کھایا، لیٹ گئے، رات کو میاں بیوی ملے بھی، صبح ہوئی تو ام سلیمؓ نے حضرت ابوطلحہؓ سے کہا کہ ایک مسئلہ پوچھنا

تھا، انہوں نے کہا کیا مسئلہ ہے؟ کہنے لگیں یہ جو میرے ساتھ والی پڑوسن ہے، ان سے میں نے کچھ زیور لے لیا تھا، اب وہ واپس مانگ رہی ہیں، مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میں اسے واپس نہ کروں، کہنے لگے، واپس کیوں نہ کرو؟ جب یہ زیور ہمسائی کا ہے اور تم نے مانگے کے طور پر ہمسائی سے لے لیا تھا تو واپس کیوں نہ کرو؟ کہنے لگیں کہ مجھے اچھا بہت لگتا ہے، کہنے لگے اللہ کی بندی! جب اس کا ہے اور وہ واپس مانگ رہی ہے تو تمہیں اچھا لگے یا برا لگے اس کو واپس دے دینا چاہئے، ایسے ہی بھولی سی بن کر کہنے لگیں۔

اچھا واقعی واپس کردینا چاہئے، حضرت ابوطلحہؓ نے فرمایا: کیا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ جب تم نے ایک چیز مستعار لی ہے، اور مالک اس کی واپسی کا مطالبہ کررہا ہے تو تم اس کو کیسے روک سکتی ہو؟ کہنے لگیں وہ تمہارا بیٹا اللہ کی امانت تھا، وہ فوت ہوچکا ہے، مالک نے اپنی امانت واپس لے لی ہے، اس کو دفن کردو، یہ سن کر حضرت ابوطلحہؓ بہت برہم ہوئے، کہنے لگے مجھے رات بتادیتیں، کہنے لگیں: میں نے سوچا تھک کر آئے ہیں، اب دفن کرنے کا وقت تو ہے نہیں، اب بتاؤں گی، تو خواہ مخواہ ساری رات پریشان ہوں گے، کیا فائدہ؟ بتادوں گی، بچے کو تو جنازہ پڑھنے کے بعد دفن کردیا، تدفین کے بعد حضرت ابوطلحہؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رات کا یہ واقعہ ذکر کیا۔

حضور ﷺ کی دعا کی برکت:

بہرحال حضرت ابوطلحہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آنحضرت ﷺ کو ام سلیمؓ کا واقعہ سنایا، واقعہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"بَارَکَ اللّٰہُ لَکُمَا فِیْ غَابِرِ لَیْلَتِکُمَا ...... وَسَمَّاہُ عَبْدُاللّٰہِ." اللہ تمہاری اس رات میں برکت عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی دعا قبول فرمائی، اور اللہ تعالیٰ نے اس رات کے نتیجے میں ان کو بیٹا عطا فرمایا، جس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ (مسلم ج:۲ ص:۲۹۲) اور ان کے صاحبزادے کے نو بیٹے قرآن کریم کے حافظ اور عالم ہوئے۔

اس خاندان کو نبی کریم ﷺ سے بہت خصوصیت تھی، اور بڑا ہی تعلق تھا، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے:

"عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ لَمَّا رَمٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْجَمْرَۃَ وَنَحَرَ نُسُکَہٗ وَحَلَقَ، نَاوَلَ الْحَالِقَ شِقَّہُ الْأَیْمَنَ فَحَلَقَہٗ ثُمَّ دَعَا أَبَاطَلْحَۃَ الْأَنْصَارِیَّ فَأَعْطَاہُ اِیَّاہُ، ثُمَّ نَاوَلَہُ الشِّقَّ الْأَیْسَرَ فَقَالَ أَحْلِقْ فَحَلَقَہٗ فَأَعْطَاہُ أَبَاطَلْحَۃَ فَقَالَ: أَقْسِمْہُ بَیْنَ النَّاسِ." (مسلم ج:۱ ص:۴۲۱)

یعنی حجۃ الوداع کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے حلق کرایا اور سر سے موئے مبارک اتارے، تو دائیں جانب کے آدھے بال حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلواکر عنایت فرمائے، فرمایا یہ تمہارے ہیں، اور پھر بائیں طرف کے بال اتارے تو ابوطلحہؓ کو دے کر فرمایا: یہ لوگوں میں ایک ایک دے دو، بال سب میں تقسیم کردو، آدھے سر مبارک کے بال صرف ابوطلحہؓ کے پاس رہے، اور آدھے پورے مجمع میں ایک ایک، دو دو کرکے تقسیم کئے گئے۔

تو صبر کے کیا معنی ہیں؟ صبر کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شکایت نہ کرو، بلکہ یہ

مضمون ذہن میں رکھو: "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ." (یعنی ہم اللہ کا مال ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والے ہیں)۔

اللہ کا مال ہے، اللہ نے لے لیا، اور ہم بھی اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، ہم بھی اسی کے پاس جانے والے ہیں، اس میں دو مضمون ذکر کردیئے، ایک یہ کہ اگر یہ نعمت چھن گئی، تو ہم خود چھننے والے ہیں، نہ صرف یہ کہ یہ نعمت پائیدار نہیں تھی، خود ہمارا وجود بھی پائیدار نہیں ہے، پھر اس پر اتنا غم کیوں کیا جائے؟ اور دوسرے یہ کہ ہم اللہ کی بارگاہ میں پہنچنے والے ہیں، تو ہمیں تمام تکالیف، تمام مصائب اور تمام پریشانیوں کا اجر اور بدلہ عطا فرمائیں گے، حدیث شریف میں فرمایا ہے:

"مَایُصِیْبُ الْمُؤْمِنُ مِنْ وَصَبٍ وَلَانَصَبٍ وَلَا سَقَمٍ وَلَا ھَمٌّ وَلَاحُزْنٍ وَلَا اَذًی وَغَمٌّ حَتّٰی الشَّوْکَۃِ یُشَاکُھَا، اِلَّا کَفَّرَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ خَطَایَاہُ."

(مسلم ج:۲ ص:۳۱۹)

ترجمہ:...... "مسلمان کو کوئی تکلیف، کوئی بیماری، کوئی پریشانی، کوئی غم، کوئی ایذا یا کوئی صدمہ پہنچے، حتیٰ کہ اگر اس کے کانٹا بھی چبھے، اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے گناہ جھاڑ دیتے ہیں۔"

ایک اور حدیث میں دنیاوی تکالیف پر اجر و ثواب کو یوں بیان فرمایا گیا ہے:

"یَوَدُّ اَھْلُ الْعَافِیَۃِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ حِیْنَ یُعْطٰی اَھْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابُ لَوْ اَنَّ جُلُوْدَھُمْ کَانَتْ قُرِضَتْ فِی الدُّنْیَا بِالْمَقَارِیْضِ." (ترمذی ج:۲ ص:۶۶)

ترجمہ:...... ”قیامت کے دن جب اہل مصیبت کو ثواب عطا کیا جائے گا تو عافیت والے لوگ یہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کے چمڑے دنیا میں قینچیوں سے کاٹ دیئے جاتے (اور یہ ثواب ان کو بھی مل جاتا)۔“

تو یہ اللہ تعالیٰ کا انعام واحسان ہے کہ بندہ مؤمن کو جو تکلیف پہنچتی ہے اور اس پر وہ صبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اس کو برداشت کرتا ہے، اور کوئی شکوہ شکایت نہیں کرتا، تو حق تعالیٰ شانہ، اس کے لئے انعامات کے دروازے کھول دیتے ہیں، اور اس کو اپنی عنایات والطاف کا مورد بنادیتے ہیں۔

ایمان کے دو بازو:

خلاصہ یہ کہ شکر اور صبر ایمان کے دو بازو ہیں، جن پر ایمان پرواز کرتا ہے، اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ شانہ، ہمیں اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، اور ہمیں اپنے شکر گزار بندوں میں سے بنائیں، ہم کمزور ہیں، حق تعالیٰ شانہ، ہمیں عافیت کی نعمت عطا فرمائیں، اور تمام تکالیف اور مصائب و پریشانیوں سے ہماری حفاظت فرمائیں، اور جب کوئی تکلیف پیش آئے تو حق تعالیٰ شانہ، ہمیں اس پر صبر و رضا کی توفیق نصیب فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

زبان کی حفاظت

جب صبح ہوتی ہے تو انسان کے بدن کے تمام اعضائ زبان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھ! ہم تیرے ساتھ ہیں، اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے، اگر تو ٹیڑھی چلی تو ہم بھی ٹیڑھے چلیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

قال اللّٰہ تعالیٰ: مایلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید-

(ق: ۱۸)

ترجمہ :-”فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے-“

زبان بہت بڑی نعمت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زبان بہت بڑی نعمت عطا فرمائی ہے، آنکھ اور زبان یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی منفعت سب سے بڑھی ہوئی ہے- انسانی اعضا میں زبان ہی کے ذریعہ ہم اپنے دل کے مدعا کو دوسروں کے سامنے بیان کر سکتے ہیں، اسی کے ذریعے اپنی تکلیف وغیرہ کا اظہار کر سکتے ہیں، اسی سے کاروبار اور معاملات چلتے ہیں، زبان نہ ہو تمام کاروبار معطل ہو جائیں، کتنی بڑی نعمت ہے- زبان کا

استعمال کرنا، جس طرح ایک بہت بڑی منفعت ہے، اسی طرح اس کے نقصانات بھی بہت زیادہ ہیں، تو عقل مند آدمی وہ ہے جو اپنی زبان کو منفعت کے لئے استعمال کرے، نقصان کے لئے استعمال نہ کرے، اس کے نقصان سے بچے، اس کی دینی منفعتیں تو ظاہر ہیں، اور آخرت کی منفعت وہ بھی بالکل واضح ہے، اس زبان کے ذریعہ آدمی اللہ تعالیٰ کا ذکر کر سکتا ہے، قرآن کریم کی تلاوت کر سکتا ہے، درود شریف پڑھ سکتا ہے، اور خیر کے دوسرے کاموں میں اس کو استعمال کر سکتا ہے، اپنے لئے ذخیرۂ آخرت بنا سکتا ہے۔

چھوٹے سے عمل سے نجات آخرت:

یہ یہاں کی بات تو نہیں ہے لیکن یاد آگئی تو ذکر کر دیتا ہوں نماز کے بعد ہم لوگ تسبیحات پڑھتے ہیں، تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ، چونتیس مرتبہ اللہ اکبر، اس طرح سے یہ پورا سو ہو جاتا ہے، اس سلسلے میں احادیث مختلف آئی ہیں، بعض روایتوں میں یہ ہے کہ تینتیس مرتبہ تینوں کلمات پڑھے جائیں، سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر یہ ننانوے ہو جائیں گے، اور سوویں مرتبہ چوتھا کلمہ لا اله الا الله وحده لاشريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شيئى قدير پڑھے۔اور بعض روایتوں میں اس کے ساتھ یہ دعا بھی آتی ہے:

"اللهم لامانع لما اعطيت، ولامعطى لما منعت، سبحانك لاينفع ذا الجد منك الجد"۔

اور بعض روایتوں میں پچیس پچیس مرتبہ آیا ہے، پچیس مرتبہ سبحان اللہ،

پچیس مرتبہ الحمد للہ، پچیس مرتبہ اللہ اکبر، پچیس مرتبہ لا الہ الا اللہ، اور ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ : کیا تم میں سے ایک آدمی اس بات سے عاجز ہے کہ ہر نماز کے بعد دس دس مرتبہ یہ پڑھ لیا کرے ؟ دس مرتبہ سبحان اللہ، دس مرتبہ الحمد للہ، دس مرتبہ اللہ اکبر، تو یہ تیس کلمات ہو جائیں گے اور پانچ نمازوں میں پڑھنے سے ڈیڑھ سو کلمات بن جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر نیکی دس گنا دی جاتی ہے، تو یہ ڈیڑھ ہزار بن جائیں گے، اور رات کو سوتے وقت یہ کلمات دس مرتبہ پڑھ لئے جائیں، یعنی تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ، چونتیس مرتبہ اللہ اکبر، تو یہ سو ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر نیکی دس گنا ہوتی ہے تو یہ ایک ہزار ہو جائیں گے، پانچوں نمازوں کے اور رات کو سوتے وقت کے ملا کر یہ کلمات اللہ تعالیٰ کے یہاں ڈھائی ہزار ہو جائیں گے، تو دن میں تم ڈھائی ہزار نیکیاں اس طرح کما سکتے ہو، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ تم دن میں ڈھائی ہزار گناہ تو نہیں کرو گے اور نیکیاں تمہیں ڈھائی ہزار مل جائیں گی تو تمہارا نیکیوں کا پلڑا بھاری رہے گا، اب دیکھئے کہ یہ بہت ہلکی پھلکی سی چیز ہے- میں اس سے پہلے ایک دفعہ بتا چکا ہوں کہ پہلے تو نماز کے بعد الحمد شریف پڑھنی چاہئے، پھر آیت الکرسی پڑھنی چاہئے، پھر سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۸ شھد اللہ (پوری آیت) پڑھنی چاہئے، پھر سورۂ آل عمران کی آیت ۲۶-۲۷ قل اللھم مالك الملك سے "بغیر حساب" تک پڑھنی چاہئے- پھر تسبیحات پڑھنی چاہئیں، تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ، تینتیس مرتبہ اللہ اکبر، اور ان کے بعد پھر چوتھا کلمہ، اور یہ دعا جو میں نے بتائی :

"اللھم لامانع لما اعطیت، ولا معطی لما منعت
سبحانك لاینفع ذا الجد منك الجد"۔

ترجمہ :-"اے اللہ! کوئی روکنے والا نہیں اس چیز کو جو آپ عطا فرمائیں، اور کوئی دینے والا نہیں اس چیز کا جو آپ منع کردیں، آپ پاک ہیں، آپ کے مقابلے میں کسی مالدار کی مالداری کام نہیں دیتی"۔

یہ پڑھنا چاہئے اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہونے کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر تین مرتبہ پڑھتے تھے:

"بسم اللہ الذی لا الہ الا ھو الرحمن الرحیم اللھم
اذھب عنی الھم والحزن"۔

ترجمہ :-"اس اللہ کے نام سے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ نہایت رحم کرنے والا بڑا مہربان ہے، اے اللہ! دور کردے مجھ سے فکر اور غم"۔

مختصر سی نصیحت:

خیر یہ بات تو درمیان میں آگئی، میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ یہ زبان ہے، اگر یہ خیر کے کاموں میں استعمال ہو تو آدمی بڑا ذخیرہ بنا سکتا ہے، اپنے لئے بے شمار نیکیاں کما سکتا ہے۔ ایک صاحب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، لیکن مختصر سی نصیحت ہو،

بات لمبی نہ ہو، کہ مجھے یاد نہ رہے، دیہاتی قسم کے آدمی تھے، اس لئے خیال ہوا کہ لمبی بات بھول نہ جاؤں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لایزال لسانك رطبًا من ذكر اللّٰه-" (تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے)۔

کتنی مختصر اور کیسی عمدہ نصیحت فرمائی کہ اس بات کو پلے باندھ لو کہ ہمیشہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے، ذکر کرتے رہو، جب بھی تمہیں موقع ملے، جب بھی تمہیں فرصت ملے، تمہاری زبان پر اللہ کا نام جاری ہو جائے، بڑے ہی مبارک ہیں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ یہ سعادت نصیب فرما دیتے ہیں کہ ان کی زبانیں اللہ کے نام اور اللہ کے ذکر سے مانوس ہو جاتی ہیں، یا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں ان کی زبانیں اللہ کے ذکر سے تر رہتی ہیں، زبان اللہ کے ذکر میں مشغول رہتی ہے تو یہ زبان کی آخرت کی منفعت ہے، جو آخرت میں آدمی کو کام دینے والی ہے، جہاں اس کی (زبان کی) منفعتیں بے شمار ہیں، وہاں اس کے نقصانات بھی بے پناہ ہیں، اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں، یہ دودھاری تلوار ہے۔

دودھاری تلوار:

اس زبان کی دودھاریں ہیں، اس لئے یہ زبان دودھاری تلوار ہے ہر طرف کاٹ کرتی ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب صبح ہوتی ہے تو انسان کے بدن کے تمام اعضا زبان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھ! ہم تیرے ساتھ ہیں، اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے، اگر تو ٹیڑھی چلی تو ہم بھی ٹیڑھے چلیں گے گویا تیری وجہ سے ٹیڑھا چلنا ہوگا تو زبان بڑی خطرناک چیز

ہے، اور خطرناک ہتھیار کو لوگ بند کر کے رکھا کرتے ہیں، کھلا نہیں رکھا کرتے، ایسا نہ ہو کہ لگ جائے، اس (زبان) کو بھی اللہ تعالیٰ نے بند کر کے رکھا ہے، اس دو دھاری تلوار کو نیام کے اندر رکھا ہے، یہ تمہاری مرضی ہے کہ جب چاہو اس کو کھولو، لیکن بہر حال یہ بند ہتھیار ہے، اللہ تعالیٰ نے تو اس کو بند کر رکھا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو دیکھا کہ اپنی زبان کو پکڑ کر کھینچ رہے ہیں کہا "یا خلیفة رسول اللّٰه! ما هذا" اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ فرمایا: "ان هذه اوردتنی الموارد"- اس نے مجھ کو بہت سے گھاٹوں پر اتارا ہے "ذرا اس کو تنبیہ کر رہا ہوں- اللہ اکبر! یہ صدیق ہیں جن کی زبان سے صدق کے سوا کچھ نہیں نکلتا تھا، یہ ان کی بات ہے-

حضرت معاذ بن جبلؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحتیں

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بہت سی نصیحتیں فرمائی تھیں، تو آخیر میں فرمایا:

"الا اخبرك بملاك ذلك كله، قلت: بلى يا نبى اللّٰه فأخذ بلسانه كف عليك هذا- فقلت : يا نبى اللّٰه، وانا لمؤاخذون بما نتكلم به- قال ثكلت امك يا ماذ! وهل يكب الناس فى النار على وجوههم او على مناخرهم الاحصائد السنتهم-" (مشکوۃ ص ۱۴)

ترجمہ:- "کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز نہ بتادوں جس پر تمام

چیزوں کا مدار ہے؟ میں نے کہا حضور! ضرور بتایئے، آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا: اپنی زبان کو قابو میں رکھو- حضرت معاذؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ہماری زبان سے جو الفاظ نکل جاتے ہیں کیا ہم سے اس پر بھی مواخذہ ہوگا؟ فرمایا: معاذ! تیری ماں تجھ کو گم پائے (عرب کے یہاں یہ کلمہ ملامت کے لئے استعمال ہوتا تھا- ناقل) لوگوں کو دوزخ میں اوندھے منہ ڈالنے والی چیز زبان کی کھیتیاں ہی تو ہوں گی"-

لیجئے سب چیزوں کا مدار اس پر ہے کہ اپنی زبان کی حفاظت کرو-

تو یہ زبان ہی ہے جو آدمی کو اوندھے منہ دوزخ میں گرائے گی، تو معلوم ہوا کہ یہ زبان جتنی منفعت بخش ہے، اتنی خطرناک بھی ہے، حد سے زیادہ خطرناک چیز ہے، مگر ہم لوگ اس کے استعمال میں احتیاط نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ نے زبان کی حفاظت کے لئے ایک مراقبہ ہمیں بتایا ہے-

سورۂ ق کی جو آیت شریفہ میں نے پڑھی ہے اس میں یہی مراقبہ ذکر فرمایا ہے:

"مایلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید" (یعنی وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے)

کراماً کاتبین کی مثال:

یہ فرشتے کراما کاتبین ہیں، جو انسان کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات فورا اچک لیتے اور انسان کے تمام اعمال واقوال کا ریکارڈ کر لیتے ہیں۔

گھر میں لڑائی ہو رہی تھی، عورتیں لڑتی بہت ہیں اور جب لڑتی ہیں تو ان کو خیال نہیں رہتا کہ ہمارے منہ سے کیا نکل رہا ہے، بہر حال عورتیں لڑ رہی تھیں تو ایک لڑکے نے یہ شرارت کی کہ اس نے خفیہ ٹیپ لگادی خیر لڑائی بند ہو گئی، اب اس لڑکے کے والد ماجد گھر تشریف لائے تو لڑکے نے وہ ٹیپ لگادی، اب عورتوں کی لڑائی میں جو الفاظ زبان سے نکلتے ہوں گے ذرا غور کیجئے کہ اگر ٹیپ ان کو سنائی جائے تو ان کو خود کتنی شرم آنے لگے گی؟ جس طرح ٹیپ ریکارڈر اپنے اندر تمام الفاظ کو بند کر لیتا ہے اور محفوظ کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم زبان سے جو لفظ بھی نکالتے ہو، تمہارے پاس ایک فرشتہ موجود ہوتا ہے، جو اس کام کے لئے مقرر ہوتا ہے، جو ان الفاظ کو اچک لیتا ہے، بند کر لیتا ہے، یہ کراماً کاتبین ہیں، ان کے پاس ٹیپ ریکارڈ ہے، اور یوں کہتے ہیں کہ آدمی کی حرکات وسکنات کے ساتھ ان کے قلب کو حرکت ہوتی ہے، یعنی جوں جوں آدمی حرکت کرتا ہے یا اس کی زبان حرکت کرتی ہے یا اس کے ہاتھ پاؤں حرکت کرتے ہیں جس طرح بھی آدمی حرکت کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ کراماً کاتبین کا قلم چلنے لگتا ہے، ان کو لکھنے میں تکلیف نہیں ہوتی، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دو کہ ان کے پاس لکھنے کی خود کار مشینیں ہوتی ہیں، ہماری ہر حرکت کو قلم بند کرنے کے لئے اور ہمارے تمام الفاظ کو ضبط کرنے کے لئے ان کے (کراماً کاتبین کے

پاس) خودکار مشینیں ہیں۔

انسان کی موت کے وقت کراماً کاتبین کے تأثرات:

یہ بات یہاں کی نہیں، دوسری جگہ کی ہے، لیکن یہاں ذکر کر دیتا ہوں۔ جب آدمی مرتا ہے تو کراما کاتبین کو چھٹی مل جاتی ہے، اگر نیک آدمی ہو تو فرشتے اس سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو جزائے خیر عطا فرمائیں، ہمیں تمہاری بہت اچھی رفاقت حاصل رہی، اور اگر برا آدمی ہو تو مرتے وقت کراماً کاتبین اسکو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو تجھ پر، تو نے کہاں کہاں ہمیں پھرایا، اور کتنی کتنی گندی جگہوں پر ہمیں لے گیا، تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ مراقبہ بتایا ہے کہ اگر ہم اسکو ذہن میں رکھیں، اپنے سامنے رکھیں، تو ہمیں اس ہتھیار کو بند رکھنے میں یا صحیح طور پر استعمال کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا ہے:

"المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده"۔

ترجمہ:۔"مسلمان تو وہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان سے اور اس کے ہاتھ سے محفوظ رہے"۔

یعنی مسلمان وہ ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو اس کے وجود سے ایذا نہ پہنچے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے وجود کو ذکر کرنے کے بجائے اس کے دو اعضا کا نام لیا، ایک زبان، دوسرے ہاتھ، یعنی اس کی زبان سے اور اس کے ہاتھوں سے لوگوں کو ایذا نہ پہنچے، علما فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اکثر ایذا انہی دو چیزوں سے پہنچتی ہے، اور جب تک کہ ان دو چیزوں کی کثرت نہ ہو آدمی اپنے باقی وجود سے کسی کو ایذا نہیں پہنچا سکتا، ان دونوں اعضا

کے بغیر کسی کو ایذا پہنچانا ممکن ہی نہیں ہے، اگر اس کی زبان بھی بند ہو، اور اس کے ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہوں، تو پھر یہ کسی کو ایذا نہیں پہنچا سکتا، زبان چلے گی، ہاتھ چلیں گے، تو کسی کو ایذا پہنچائے گا، اور پھر رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ کو بعد میں ذکر فرمایا ہے زبان کو پہلے ذکر فرمایا ہے۔

زبان کا دائرہ:

علما فرماتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کا دائرہ ہاتھ کے دائرے سے زیادہ پھیلا ہوا ہے، مطلب یہ کہ آدمی جتنی ایذا زبان سے پہنچا سکتا ہے، ویسی ایذا ہاتھ سے نہیں پہنچا سکتا، ایک تو اس لئے کہ ہاتھ صرف اسی آدمی پر اٹھے گا جو سامنے ہوگا، اور جو اس کے ہاتھ کی زد میں ہوگا، اور ہاتھ اس تک پہنچ سکے گا، اگر کوئی شخص ہاتھ کی زد سے باہر ہو تو ہاتھ سے ایذا نہیں پہنچا سکتا، کسی کے ہاتھ میں تلوار ہے تو جو شخص تلوار کی زد سے باہر ہوگا اس کو ایذا نہیں پہنچا سکتا، اس کے ہاتھ میں تیر ہے تو تیر جہاں تک پھینکا جا سکتا ہے وہاں تک اس کی زد ہے، جو اسکی زد سے باہر ہوگا اس کو ایذا نہیں پہنچا سکتا، اس کے ہاتھ میں پستول ہے یا کوئی دوسرا خود کار اسلحہ ہے جہاں تک اس کی گولی کی مار ہے وہاں تک اسکا دائرہ ہے، وہیں تک ایذا پہنچا سکتا ہے، جو اس سے باہر ہوگا اس کو ایذا نہیں پہنچا سکتا، بخلاف زبان کے کہ اس کا کوئی دائرہ نہیں ہے، آسمان سے زمین تک پوری دنیا اس کے احاطے میں ہے، زبان کا احاطہ اتنا وسیع ہے کہ کوئی آدمی کسی اوٹ میں چھپ کر اس زبان سے پناہ نہیں لے سکتا، زبان جیسے سامنے والے پر چلے گی ویسے ہی غائب پر بھی چلے گی، جیسے سامنے والے پر چلے گی دیوار کے پیچھے والے پر بھی چلے گی، اور پھر ہاتھ تو

صرف اسی آدمی پر چل سکتا ہے جو اس وقت موجود ہو، لیکن زبان جب سے دنیا قائم ہوئی ہے اس وقت سے لے کر اور جب تک رہے گی اس وقت تک سارے انسانوں پر چلتی ہے۔

ایک بزرگ کو فوت ہوئے صدیاں ہو گئی ہیں، وہ عرصہ دراز سے جنت میں ڈیرہ لگائے ہوئے ہیں، اور ہم اس کو گالیاں نکال رہے ہیں، برا بھلا کہہ رہے ہیں، کتنی بے احتیاطی کی بات ہے، لوگ صحابہ کرامؓ کو برا بھلا کہتے ہیں، نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ، اللہ کی پناہ! حضرات ائمہ دینؒ کو برا بھلا کہتے ہیں، بزرگان دینؒ کو برا بھلا کہتے ہیں، اللہ کے بندو! ذرا یہ تو سوچو کہ تمہاری اپنے زمانے والوں سے لڑائی کوئی کم تھی کہ جن بزرگوں کو دنیا سے گزرے ہوئے صدیاں بیت چکی ہے، ان کی قبروں کے نشان تک مٹ چکے ہیں تم ان کو برا بھلا کہہ رہے ہو- تو زبان کا دائرہ محدود نہیں، ماضی مستقبل اور حال تینوں زمانے اس کی زد میں آتے ہیں، زمانے کے اعتبار سے ہی اس کا دائرہ وسیع ہے، اور پھر تلوار اور نیزے کے زخم تو مندمل ہو جاتے ہیں، لیکن زبان کا زخم مندمل نہیں ہوتا، اس کے گھاؤ مٹتے نہیں ہیں، یہ ایک اللہ تعالیٰ نے آدمی کو ایسا خطرناک ہتھیار دیا ہوا ہے کہ اللہ کی پناہ!-

زبان کے گناہ:

اس لئے اس کو حفاظت کے ساتھ استعمال کرنا یہ ہمارے ذمے فرض قرار دیا گیا ہے، اپنی زبان کو خیر کا عادی بنایا جائے، شر سے اس کو بچایا جائے، امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ: بیس گناہ کبیرہ زبان سے متعلق ہیں، بیس کبیرہ گناہ بھی مثال کے طور پر ہیں مثلاً کسی مسلمان کو گالی دینا، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے :"سباب المومن فسوق وقتاله کفر"۔

ترجمہ :۔"کسی مومن کو گالی گلوچ کرنا یہ فسق اور نافرمانی ہے کہ آدمی اس سے فاسق ہو جاتا ہے، اور کسی مومن کے ساتھ لڑائی کرنا قتال کرنا یہ تو کفر کی بات ہے"۔

اور مثال کے طور پر کسی پر بہتان لگانا، بہتان کے کیا معنی ہیں؟ آپ جانتے ہیں، جو کام کسی نے نہ کیا ہو، اس کو اس کی طرف منسوب کرنا کہ اس نے یہ کام کیا ہے، حالانکہ اس بیچارے نے نہیں کیا ہے، ایک غلط بات کو کسی مسلمان سے منسوب کرنا، یہ بہتان تراشی ہے، اور بہتان تراشی کا کبیرہ گناہ ہونا ظاہر ہے، کیونکہ اس میں جھوٹ بھی ہے کیونکہ ایک خلاف واقعہ بات جب کوئی شخص کہہ رہا ہے تو یہ بات جھوٹ ہوئی، اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایک مسلمان کی بے آبروئی بھی ہے، اور کسی مسلمان کی ہتک عزت یہ بھی گناہ کبیرہ ہے، حجۃ الوداع کے موقع پر جو آنحضرت ﷺ نے خطبہ دیا تھا اس میں ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی تھی :

انسان کی حرمت:

"الا ان دمائکم واموالکم حرام علیکم کحرمة یومکم هذا فی شهر کم هذا فی بلدکم هذا"۔ (مشکوۃ ص ۲۲۴)

ترجمہ :۔"سنو تمہارے آپس کے خون ایک دوسرے کے لئے، تمہارے آپس کے مال ایک دوسرے کے لئے، (اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے کے لئے) حرام ہیں جیسے آج

کے دن کی حرمت ہے اس مہینے میں، اور اس شہر میں۔"

کسی کا خون بہانا حرام، کسی کا مال کھانا حرام، اور کسی کی بے آبروئی کرنا حرام، اور یہ ایسا حرام ہے جیسا کہ آج کا دن لائق احترام ہے، آج کا مہینہ لائق احترام ہے، اور یہ شہر لائق احترام ہے، یعنی شہر مکہ! جس طرح شہر مکہ کی حرمت کو پامال کرنا حرام ہے، اور جس طرح یوم عرفہ کی حرمت کو پامال کرنا حرام ہے، اسی طرح تمہارے آپس کے خون، آپس کے مال، اور آپس کی عزتیں ان کو پامال کرنا حرام ہے، تو کسی مسلمان کی بے آبروئی کر دینا یہ معمولی گناہ نہیں ہے، اور مثال کے طور پر کسی مسلمان کی غیبت کرنا، غیبت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی کی پیٹھ پیچھے ایسی بات کہی جائے کہ اگر اس کے منہ پر کہی جاتی تو اس کو ناگوار ہوتی، چاہے وہ تمہاری وجہ سے نہ بولتا ہو، لیکن اس کو تکلیف ہوتی، بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ میں اس کے منہ پر کہہ دوں گا، تو تم اس کے منہ پر اگر کہہ دو گے تو اس سے وہ بات کرنا جائز نہیں ہو گیا، بھائی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، سوال یہ ہے کہ اگر تم اس کے منہ پر کہو تو تمہارا کہنا اس کو برا لگے گا یا نہیں لگے گا؟ اس کو اس سے تکلیف ہو گی یا نہیں ہو گی؟ اگر اس کے منہ پر تمہارا کہنا برا نہیں لگے گا تو ٹھیک ہے، پھر یہ غیبت نہیں ہے، اور غیبت کتنا بڑا گناہ ہے؟ حدیث میں فرمایا ہے: "الغيبة اشد من الزنا" (یعنی غیبت زنا سے بھی سخت اور بدتر ہے)

غیبت کی برائی:

غیبت زنا سے زیادہ سخت ہے، غیبت زنا سے بھی زیادہ گناہ ہے، خدانخواستہ کسی سے زنا سرزد ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ

محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محفوظ رکھے، اس کا ضمیر بھی اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے، کہ میں نے برا کیا، دنیا تو اس کو برا کہتی ہی ہے۔ لیکن یہ غیبت کرنے والا اپنے آپ کو پاکباز سمجھتا ہے، ماشاء اللہ زنا کرنے والا زنا کرے تو چونکہ اس کو برا سمجھتا ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ بھی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے، لیکن غیبت کرنے والے کو کبھی اللہ سے معافی مانگتے نہیں دیکھا، سارا دن لوگوں کی غیبتیں کرتا رہے گا، اور کبھی اللہ کے سامنے یہ نہیں کہے گا کہ یا اللہ مجھ سے قصور ہو گیا ہے، معاف کر دے، پھر زنا اللہ کا حق ہے، یعنی اس گناہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، اگر کسی سے غلطی ہو جائے، اور وہ سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم سے یہی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے، لیکن غیبت کا تعلق بندوں سے ہے، اللہ تعالیٰ سے بھی ہے، اللہ کی بھی نافرمانی ہے، اور بندوں کی بھی حق تلفی ہے۔ اور چونکہ غیبت کا تعلق بندوں سے ہے اس لئے جب تک بندوں سے معافی نہ مانگ لی جائے اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتے، خواہ کتنی ہی توبہ کر لو، بھائی! میں نے قصور تو زید کا کیا ہو اور معافی عمر سے مانگوں؟ یہ کون سا اصول ہے، زید کا قصور ہے تو تم زید سے معافی مانگو، غیبت تو تم نے کی ہے انسانوں کی، اور معافی مانگتے ہو اللہ سے، اللہ کا بھی قصور کیا ہے، اللہ تعالیٰ اپنا قصور معاف فرما دیں گے، لیکن جب تک صاحب حق معاف نہیں کرتا اس وقت تک کیسے معافی ہو گی؟ لیکن، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائیں، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائیں، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائیں، غیبت کے معاملے میں تو ہماری زبانیں قینچی کی طرح چلتی ہیں، ہماری

مجلسوں کا موضوع غیبت ہوتی ہے، اور یہ بیماری خاص طور سے عورتوں کی بیماری ہے، جب بھی یہ دو آکر بیٹھیں گی تیسری کی بات ضرور کریں گی، لیکن اب یہ صرف عورتوں کی بیماری نہیں رہی، مرد اس بیماری میں عورتوں سے بھی زیادہ بیمار ہو گئے ہیں، اللہ ہمیں معاف فرمائے، ہماری زبان سے کسی مومن کو امان نہیں، خصوصیت کے ساتھ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو پھر تو کھلی چھٹی مل جاتی ہے اس کے کیڑے نکالنے کی، اس کی برائیاں کرنے کی، اس کی عیب جوئی کرنے کی، ایک بزرگ ایک بس میں جارہے تھے، ان کے منہ سے نکل گیا کہ ڈرائیور ماہر نہیں ہے، بعد میں احساس ہوا کہ یہ تو میں نے غیبت کی ہے، میں نے ڈرائیور کو کہا ہے کہ یہ ماہر نہیں ہے، یہ فقرہ اگر ڈرائیور کے سامنے کہا جاتا تو برا مانتا کہ نہیں مانتا؟ یہ تو میں نے غیبت کی ہے، اب دیکھیے یہ ایک چھوٹی سی بات تھی- ستر پوشی اور عیب پوشی یعنی کسی کے عیب کو کسی کے سامنے بیان نہ کرنا، یہ تو ہمارے یہاں ہے ہی نہیں- جب کسی کا عیب معلوم ہو جائے تو پیٹ میں اپھارہ ہو جاتا ہے، نفخ ہو جاتا ہے، ہوا بھر جاتی ہے، ایک شخص جابر جعفی ہوا ہے، ہماری کتابوں میں سنیوں کی کتابوں میں بھی اس کی روایتیں موجود ہیں، لیکن اصل میں شیعہ تھا، ہمارے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ :

”ما رأيت افضل من عطاء، وما رأيت اكذب من جابر الجعفی-“

ترجمہ :-”میں نے عطاء بن رباح سے افضل اور بہتر آدمی نہیں دیکھا اور جابر جعفی سے جھوٹا آدمی کسی کو نہیں دیکھا“

جابر جعفی کے کذبات:

شیعوں کی ایک کتاب ہے رجال کشی اس میں لکھا ہے کہ جابر جعفی کہتا تھا کہ مجھے امام باقرؒ نے تین دفتر دیئے احادیث کے، اب مجھے صحیح تعداد یاد نہیں رہی کہ کتنی لاکھ حدیثیں ذکر کی تھیں، تو انہوں نے مجھے اتنے لاکھ احادیث کے تین دفتر دئے اور یہ فرمایا تھا کہ یہ جو پہلا دفتر میں نے دیا ہے اس کو تو تم بیان کر لو لوگوں کے سامنے، اور یہ جو میں نے دوسرا دفتر تمہیں دیا ہے یہ میری زندگی میں بیان نہ کرنا، میرے مرنے کے بعد بیان کرنا، اور یہ تیسرا دفتر دے رہا ہوں یہ کبھی بیان نہ کرنا، یہ صرف تمہارے لئے ہے، جابر کہتا ہے کہ میں نے کہا کہ جی بہت اچھا! لیکن ان احادیث کو بیان نہ کرنے سے میرے پیٹ میں درد ہو گیا، اور میں جنگل میں چلا گیا، جنگل میں جا کر تنہائی میں ان حدیثوں کو بیان کرنا شروع کیا، جھوٹا آدمی ہے خبیث۔ تو ہم بھی جب تک کسی سے بات نہ کر لیں ہمیں نفخ ہو جاتا ہے، پیٹ میں درد ہو جاتا ہے، اور یہ بہت بری عادت ہے، اسی طرح ایک گناہ زبان کا ہے کسی مسلمان کو عار دلانا، کسی سے کوئی غلطی ہو گئی، اس بے چارے کو اپنی غلطی پر خود ہی شرمندگی ہے، لیکن یہ اس کو طعن و تشنیع کرتا ہے، آنحضرت ﷺ نے اس گناہ کو بھی گناہ کبیرہ فرمایا ہے، کیونکہ اس عار دلانے سے مقصود اس کی تذلیل ہے، یہ مقصود نہیں ہے کہ یہ گناہ چھوڑ دے، اور ایک گناہ زبان کا کسی مسلمان کی تکلیف پر خوشی کا اظہار کرنا ہے، یہ رذالت اور کمینگی ہے، لیکن اللہ ہمیں معاف فرمائے ہم میں سے اکثر لوگ اس کمینگی میں مبتلا ہیں، آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

دکسی مسلمان کی تکلیف پر خوشی کا اظہار نہ کرو ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو عافیت عطا فرمادیں اور تم کو مبتلا کردیں"۔

کسی کو عار دلانا:

اور عار دلانے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان کو کسی گناہ کی عار دلائے گا اللہ پر لازم ہے کہ مرنے سے پہلے اسکو اس میں مبتلا کرے، نعوذ باللہ، ثم نعوذ باللہ،۔ اللہ تعالیٰ مرنے سے پہلے اس کو ضرور مبتلا کردیں گے۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زبان شر میں استعمال نہیں ہونی چاہئے، خیر میں استعمال ہونی چاہئے، دوسروں کے قصوں میں نہ پڑو، اپنا قصہ نمٹاؤ، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ دوسروں کی اصلاح کی فکر میں پڑ گئے، اور اپنی اصلاح کی فکر سے غافل ہوگئے، دنیا جہان پر تنقیدیں اور تبصرے ہو رہے ہیں، لیکن اپنی ذات شریف سامنے نہیں ہے، اگر کسی کو تنقید ہی کرنی ہو تو تنقید کرنے کے لئے خود اپنی ذات بہت ہے۔ ایک بزرگ تھے ایک آدمی ان کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ وہ بزرگ چلتے گئے، یہ شخص ان کے پیچھے جاتے ہوئے ان کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ وہ بزرگ آگے جاکر ٹھہر گئے، فرمانے لگے کہ بھائی اب یہ میرا محلّہ آرہا ہے، یہاں کے لوگ جان پہچان رکھتے ہیں، تو جو کچھ تمہیں کہنا ہو ابھی کہہ لو، آگے جاؤ گے تو ایسا نہ ہو کہ کوئی تمہیں پکڑ لے یا تم سے کوئی تعرض کرے، اس لئے تم نے جو کچھ کہنا ہے ابھی ابھی کہہ لو۔ ایک دوسرے بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا، ایک شخص ان کو برا بھلا کہتا رہا، وہ شخص جب تھک گیا تو وہ بزرگ فرمانے لگے کہ میاں میرے اصل عیب تو تمہیں معلوم ہی نہیں ہیں، تم نے بہت چھوٹی باتیں بیان کی ہیں، اگر تمہیں میرے اصل عیوب کا علم

ہو جائے تو نہ معلوم تم مجھے کیا کہتے، مبارک ہے وہ آدمی جو دوسروں کے عیبوں سے اندھا ہو، اور اپنے عیب دیکھنے والا ہو، بہت ہی بد قسمت ہے وہ آدمی جس کی آنکھیں اپنے عیبوں سے بند ہوں اور لوگوں کے عیب اس کو نظر آئیں، تو لوگوں کے عیوب سے اپنی نظریں بند کرلو، نظریں بند کرلو گے تو زبان بھی بند ہو جائے گی، تمہیں کسی کا عیب نظر ہی نہیں آنا چاہیے- اب ایک بات کہہ دیتا ہوں کہ تم کہو گے کہ اب آنکھیں کھلی ہیں تو لوگوں کے عیب کیسے نظر نہ آئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بہت آسان کام ہے، یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے، آنکھوں کو بھی بند کر سکتے ہو، لیکن اگر کسی کے عیب پر نظر پڑ بھی جائے تو تم یوں سوچ سکتے ہو کہ اس کا ایک عیب مجھے معلوم ہے- میرے اندر نہ معلوم کتنے عیب ہیں، میرے سے تو یہ اچھا ہی ہے- اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائیں، اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمائیں، اللہ تعالیٰ نے بہت ہی قیمتی نعمت عطا فرمائی ہے زبان، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، زبان بڑی قیمتی چیز ہے اس کو اچھی جگہ استعمال کرو اللہ کے ذکر میں استعمال کرو، غلط جگہوں میں استعمال نہ کرو-

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

بہترین تاجر کی علامت

امیر عامہ سے بڑا غدار کوئی نہیں ہے، امیر عامہ سے مراد ہے حاکم، بادشاہ، خلیفہ، وزیراعظم جو قوم سے ایک معاہدہ کرنے کے بعد اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ سب سے بڑا غدار ہے۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی خطبتہ: "الا ان خیر التجار من کان حسن القضا حسن الطلب، وشر التجار من کان سیئی القضا سیئی الطلب، فاذا کان الرجل حسن القضأ سیئی الطلب او کان سیئی القضاء حسن الطلب فانھا بھا، الا ان لکل غادر لواء یوم القیامة بقدر غدرتہ، الا واکبر الغدر غدر امیر عامة، الا لایمنعن رجلا مھابة الناس ان یتکلم بالحق اذا علمہ، الا ان افضل الجھاد کلمة حق عند سلطان جائر، الا ان مثل مابقی من الدنیا فیمامضی منھا مثل ما بقی من یومکم ھذا فیما مضی منہ"۔

(حیاۃ الصحابہؓ عربی جلد ۳ ص ۴۲۷)

دنیا میٹھی اور سرسبز ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کے کئی مضامین ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ: آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا میٹھی ہے، سرسبز ہے اور اللہ تعالیٰ نے تم کو اس میں خلیفہ بنایا ہے، وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو؟

اس لئے دنیا سے ڈرو اور عورتوں سے ڈرو، اس لئے کہ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ عورتوں میں ہوا۔

خوش قسمت و بدقسمت:

دوسرا مضمون بیان فرمایا: کہ ایک آدمی مومن پیدا ہوتا ہے، مومن جیتا ہے، اور مومن مرتا ہے، یہ خوش قسمت ہے، ایک کافر پیدا ہوتا ہے، کافر جیتا ہے، کافر مرتا ہے، اور ایک کافر پیدا ہوتا ہے، کافر جیتا ہے، لیکن مومن ہو کر مرتا ہے، اور چوتھی قسم کا وہ آدمی ہے جو مومن پیدا ہوتا ہے، مومن جیتا ہے، لیکن کافر ہو کر نعوذ باللہ مرتا ہے۔

غصہ آگ کا شعلہ:

تیسرا مضمون یہ ہے کہ غصہ آگ کا ایک شعلہ ہے جو آدمی کے دل میں بھڑک سکتا ہے، اور غصے کے اعتبار سے انسانوں کی چار قسمیں ہیں، سب سے بہتر آدمی وہ ہے جس کو بڑی دیر سے غصہ آئے، یعنی کبھی کبھار غصہ آئے، اور فوراً اتر جائے، سب سے برا آدمی وہ ہے جس کو بات بات پر غصہ آئے اور آنے کے فورا بعد نہ اترے، اور جس کو دیر سے غصہ آئے اور دیر سے اترے یا جلدی غصہ آئے اور جلدی اتر جائے، یہ دونوں برابر ہیں۔

بہترین تاجر:

چوتھا مضمون جو یہاں ذکر کرنا ہے یہ ہے کہ: "سب سے بہتر تاجر وہ ہے جو اپنا حق وصول کرنے میں، یعنی قرضہ وصول کرنے میں خوش معاملہ ہو، اور قرضہ ادا کرنے میں بھی خوش معاملہ ہو، جن لوگوں کے قرضے اس کے ذمے

ہوں ان کو پریشان نہ کرے بلکہ فورا ادا کرنے کی کوشش کرے اور اس کے اپنے قرضے جو لوگوں کے ذمے ہوں ان کے معاملے میں لوگوں کو پریشان نہ کرے بلکہ جب بھی لوگ سہولت کے ساتھ دے سکیں وصول کرلے، اس کو فرمایا ہے: "حسن القضاء حسن الطلب"- قرضے کے ادا کرنے میں بھی خوش معاملہ ہو، اور قرضے کے مانگنے اور وصول کرنے میں بھی خوش معاملہ ہو، ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں کہ کسی کا حق اپنے ذمہ ہو تو فورا ادا کرنے کی کوشش کریں اور اپنا حق دوسروں کے ذمے ہو تو وصولی کی زیادہ فکر نہ کریں، اور کہیں کہ آجائیں گے بھائی، کوئی بات نہیں، یہ سب سے اچھا تاجر ہے، فرمایا سب سے بدتر تاجر وہ ہے: "سیئی القضاء" اور "سیئی الطلب" ہو- یعنی کسی کا دینا ہو تو ٹال مٹول کرے، اور جب کسی سے لینا ہو تو فورا تقاضا کرے اور وہ اگر نہ دے سکے یاد دینے میں پس و پیش کرے تو اس کو بے عزت کرے، یہ سب سے بدتر تاجر ہے اور عام لوگوں کی نفسیات یہی ہیں کہ اپنے کچھ ذمے ہوتا ہے تو ادا کرنے کی پرواہ نہیں کرتے، بس یہ کہہ دیں گے: دے دیں گے یار! حالانکہ پیسے بھی موجود ہیں، کوئی مجبوری بھی نہیں، قرضہ ان کو واپس کرسکتے ہیں، لیکن اس کے باوجود نہیں دیتے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ایسے ہی شخص کے بارہ میں ہے: "مطل الغنی ظلم"- مالدار آدمی جو دینے کی ہمت اور گنجائش رکھتا ہے اس کے باوجود اس کا ٹال مٹول سے کام لینا ظلم ہے، دوسروں کے پیسے دبائے ہوئے ہے اور اپنے کام کے بڑھانے کی فکر کررہا ہے، اس کو یہ خیال تو گزرتا ہے کہ اگر لوگوں کے پیسے ادا کردیئے تو بڑی مشکل پیدا ہوجائے گی، میرے کاروبار میں کمزوری پیدا ہوجائے گی، مگر یہ احساس نہیں کہ جن لوگوں کے پیسے میرے ذمے

ہیں ان کے کاروبار میں بھی تو کمزوری آسکتی ہے۔ گویا اس کا تو رواج ہی ختم ہو گیا کہ جو وقت طے کر لیا اس وقت پر قرضہ واپس کر دیا جائے، اس رمضان کو طے کیا ہے تو اگلے رمضان کو دیں گے، الا ماشاء اللہ۔

عام لوگوں کی نفسیات:

تو عام لوگوں کی نفسیات یہ ہے کہ وہ دیتے ہوئے ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں، باوجودیکہ ان کے پاس گنجائش ہوتی ہے، گنجائش ہونے کے یہ معنی ہیں کہ آگے پیچھے کر کے دے سکتے ہیں لیکن ان کی حرص اور ان کا بخل ان کو قرض لوٹانے سے مانع ہوتی ہیں، حرص اپنے کام کو بڑھانے کیلئے اور بخل اپنے ہاتھ سے پیسہ نکلنے کی وجہ سے۔ عام طور پر لوگ وصول کرنے کے معاملہ میں بھی ایسے ہی ہیں، کسی سے لینا ہو تو بہت برے طریقے سے پیش آتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے مال دار کا قصہ:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک آدمی بہت بڑا سیٹھ اور مال دار تھا، اس نے اپنے ملازموں سے کہہ رکھا تھا کہ بھائی! قرضے کے وصول کرنے کے معاملے میں کسی کو تنگ نہیں کرنا، جو شخص قرضہ لے جائے یا اس کے ذمے ادھار ہو، خود ہی دے جائے گا اس کا زیادہ پیچھا نہ کیا کرو، یاد دہانی کرا دی، وہ تو ایک الگ بات ہے، لیکن وہ بھی بڑے بھونڈے طریقے سے نہیں ہونی چاہئے، اس نے اپنے غلاموں سے کہا کہ بات یہ ہے کہ میرے ذمے بھی اللہ تعالیٰ کا بہت قرضہ ہے اگر اللہ تعالیٰ نے اسی طرح شدت اور سختی کے ساتھ اس کا مطالبہ شروع کر دیا تو پھر میرے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں ہو گا مشکل پیش آئے گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کا انتقال ہو گیا تو حق تعالیٰ شانہ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میرا یہ بندہ لوگوں کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرتا تھا، مجھے شرم آتی ہے کہ میرا بندہ تو اتنی نرمی کرے اور میں رب کائنات اور خدا تعالیٰ ہو کر یہ نہ کروں، یہ تو بیچارہ عاجز تھا، محتاج تھا، اس میں پیسے کی حرص بھی تھی، مال بڑھانے کی حرص بھی تھی اور ہم بے نیاز ہیں، ہمیں کسی چیز کی حاجت بھی نہیں تو جب وہ بندہ ہو کر ایسا معاملہ کرتا تھا، میں خدا ہو کر ایسا معاملہ کیوں نہ کروں؟ بس میرے بندے سے درگزر کا معاملہ کرو، اس سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کرو "سخت مے گیرد جہاں بر مردمان سخت گیر"۔ جو لوگ سخت گیری کا معاملہ کرتے ہیں آسمان والے کی طرف سے ان کے ساتھ بھی سخت گیری کا معاملہ ہوتا ہے۔ تو سب سے بہتر آدمی وہ ہے کہ کسی کا حق اپنے ذمے ہو تو فوراً ادا کرنے کی کوشش کرے، پہلی فرصت میں اور پہلی گنجائش میں حقوق ادا کرنے کی کوشش کرے، اس لئے کہ خدانخواستہ کسی وقت داعی اجل کا بلاوا نہ آجائے؟۔

زندگی کا پتہ نہیں:

حضرت سفیان بن عیینہؒ ایک بہت بڑے محدث تھے، ایک استاذ اور شیخ سے حدیث سن رہے تھے، شیخ زبانی حدیث بیان فرما رہے تھے، کتاب سامنے نہیں تھی کیونکہ ان کو حدیث یاد تھی، سفیان بن عیینہؒ شیخ سے کہنے لگے: جی چاہتا تھا کہ آپ کتاب دیکھ کر حدیث سناتے تاکہ مزید اطمینان ہو جاتا۔ شیخ نے کہا کہ میں کتاب دیکھ کر سنا دیتا ہوں، اندر سے کتاب لانے کے لئے اٹھنے لگے، تو سفیان بن عیینہؒ کہنے لگے: جی ٹھہر جائیے یہ حدیث تو مجھے آپ زبانی سنا دیجئے، گھر سے کتاب لا کر پھر سنا دیجئے گا، نا معلوم آپ کے آنے تک میں زندہ رہوں یا نہ رہوں،

ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ آپ کے واپس آنے تک میں چلتا بنوں اور حدیث سے محروم ہو جاؤں۔

میرے بھائی! اپنے ذمے جو حقوق ہوں وہ جتنی جلدی ادا ہو جائیں بہتر ہیں، خدا جانے کس وقت موت کا بلاوا آجائے، اور پھر پیچھے آپ کے وارث ہوں گے وہ ادا کریں یا نہ کریں پکڑے ہوئے آپ ہوں گے مگر ادا کرنے والا کوئی بھی نہیں ہوگا، ان کو کیا درد ہے؟ معاملہ آپ نے کیا تھا، پکڑے ہوئے آپ ہیں، اب وہ ادا کریں، نہ کریں ان کی مرضی، آپ وہاں سے ان کو ٹیلی فون بھی نہیں کر سکتے کہ بھائی میں یہاں پکڑا ہوا ہوں چھڑوالو، کیونکہ وہاں ٹیلی فون سروس نہیں ہے، اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں جو وہاں سے بھی ٹیلی فون کر دیتے ہیں، میری پھوپھی صاحبہ کا واقعہ ہے، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، بہت نیک خاتون تھیں، کسی خاتون نے ان کے پاس امانت رکھی ہوئی تھی یعنی کچھ پیسے رکھے ہوئے تھے، وہ کافی دن بیمار رہیں لیکن اس خاتون کو بھی ذہن میں نہیں رہا، اور پھوپھی صاحبہ کے ذہن میں بھی واپس کرنے کا خیال نہیں آیا، اسی طرح وہ چلی گئیں ان کو اس کا خیال بھی نہ رہا، تیسرے دن اپنی بہو کو خواب میں آتی ہیں اور کہتی ہیں کہ برتنوں کی فلاں کوڑی کے فلاں برتن میں (دیہاتوں میں برتنوں کی کوڑیاں ہوتی ہیں) اتنے پیسے رکھے ہوئے ہیں اور یہ فلاں خاتون کے ہیں، ان کو واپس کر دو، ہماری بھابھی نے صبح اٹھ کر خواب کے مطابق وہ تلاش کئے تو جہاں نشان دہی کی تھی وہیں پیسے رکھے ہوئے تھے اور اتنے ہی رکھے ہوئے تھے، اس عورت کو بلوایا اس سے پوچھا کہ تم نے اماں کے پاس کوئی پیسے بھی رکھے ہوئے تھے؟ کہا کہ جی! امانت رکھی ہوئی تھی، پوچھا کہ کتنے پیسے تھے؟ کہا کہ اتنے پیسے تھے، جتنے پیسے اس

نے بتائے تھے اتنے ہی تھے، ان کے پیسے واپس کیے اور کہا کہ اماں نے خواب میں ہدایت کی ہے کہ تمہیں واپس کردوں- تو بھائی ہر ایک کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوتا نہیں، کیونکہ قبر سے ٹیلی فون کرنے کی ہر ایک کو اجازت نہیں ہے، کسی کو کال ملتی ہے، اپنے قبضے کی بات نہیں ہے، مالک کے خاص کرم کا معاملہ کسی کے ساتھ ہو تو دوسری بات ہے-

ٹال مٹول ظلم ہے:

تو بھائی ایک تو یہ کہ آدمی کو گنجائش ہو تو ظلم سے بچنا چاہئے کیونکہ گنجائش والے کا ٹال مٹول سے کام لینا ظلم ہے اور دوسرا یہ کہ زندگی کا کیا بھروسہ ہے، خدا جانے کس وقت موت آجائے؟ اور پھر جب اپنا حق میں خود نہیں ادا کرسکا تو دوسرے میرا حق کیا ادا کریں گے؟ دوسروں کے بارے میں کیا توقع رکھتے ہو؟ اور خاص طور پر جب کہ میں نے لوگوں کو یہ بتایا بھی نہیں ہے کہ میرے ذمے فلاں فلاں لوگوں کے حقوق ہیں- اسی لیے مرنے سے پہلے اپنے ذمے کے حقوق کی وصیت کرنا واجب ہے-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ مومن پر تین راتیں نہیں گزرنی چاہئیں مگر اس حالت میں کہ اس کی وصیت اس کے تکیہ کے نیچے رکھی ہوئی ہو، کم سے کم اتنا تو ہو کہ آدمی کوئی یادداشت چھوڑ جائے، کسی کو کہہ کر مرے، کوئی یادداشت بھی نہیں چھوڑی، کسی کو کہہ کر بھی نہیں مرا، اپنی زندگی میں بھی ادا کرنے کا اہتمام نہیں کیا، تو میرا بھائی پھر تمہارا قرضہ کون ادا کرے گا؟ وہ تو تمہارے ذمے رہ گیا-

بدترین تاجر:

بہر کیف سب سے بدتر تاجر وہ ہے جو لینے کے معاملے میں بھی برا ہو اور دینے کے معاملے میں بھی برا ہو، لینے کے معاملے میں سختی سے کام لے اور دینے کے معاملے میں ٹال مٹول سے کام لے، یہ سب سے بدتر تاجر ہے اور میں نے عرض کیا کہ ہم میں سے اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے- الا ماشاء اللہ-

پھر فرمایا کہ تیسری قسم کا آدمی وہ ہوتا ہے جو لینے میں بھی بے پرواہ ہو اور دینے میں بھی بے پرواہ، لینا ہو تو کسی سے مانگتا نہیں اور دینا ہو تو اس کی بھی پرواہ نہیں کرتا، اور کبھی کبھی اس کے الٹ کہ: لینے میں سختی کرتا ہے اور دینے میں بھی پورا اہتمام کرتا ہے تو یہ دونوں برابر برابر ہو جاتے ہیں، ان دونوں میں ایک وصف اچھا اور ایک وصف برا، تو یوں اچھائی اور برائی کے درمیان میں توازن ہو گیا، برابر ہو گیا، ہمارے حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن مرحوم دینے کے معاملے میں تو مجھے معلوم نہیں، لیکن لینے کے معاملے میں بڑے ڈھیلے تھے، کسی نے ان کے پیسے دینے ہوتے تو کبھی پوچھتے نہیں تھے، دے جائے، دے جائے نہ دے جائے تو نہ سہی، میں نے کسی معاملے میں ان سے تیس ہزار قرضہ لے رکھا تھا، میرے ساتھی مولانا مفتی محمد جمیل خان صاحب ہیں، جو کبھی کبھی یہاں میری جگہ جمعہ بھی پڑھاتے ہیں، ان کے سامنے ایک دفعہ ذکر ہوا، میں نے کہا کہ مفتی صاحب کے پیسے میرے ذمے ہیں تھوڑے تھوڑے کر کے ادا کر رہا ہوں- مولانا جمیل خانصاحب مجھے ہنس کے کہنے لگے ماموں! آپ بھی عجیب آدمی ہیں، مفتی صاحب کے پیسے بھی کبھی دیا کرتے ہیں، بہر حال میں نے دے دئے الحمد للہ، اور یقین تھا کہ اگر نہ دیتا تو وہ نہیں مانگتے مگر میرے ذمے تو رہ جاتے ان کے وارثوں کو دینے

پڑتے، یا میں ان سے معاف کروالیتا، وہ تو دوسری بات تھی۔

عہد شکنی کی سزا:

اس کے بعد دوسرا مضمون بیان فرمایا کہ ہر آدمی جو کہ غدار ہو اس کی غداری کے بقدر قیامت کے دن اس کیلئے جھنڈا بلند کیا جائے گا، غدار کہتے ہیں عہد شکن کو، جو شخص عہد کر کے توڑ ڈالے اس کو عربی میں غدر کہتے ہیں اور جو بہت زیادہ عہد توڑنے والا ہو اس کو غدار کہتے ہیں، تو غدار وہ آدمی ہے جو عہد کرنے کے بعد توڑ دیتا ہے، ایفائے عہد کی پرواہ نہیں کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر عہد توڑنے والے کی نشان دہی کرنے کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا اور بعض احادیث میں آتا ہے کہ اس کی سرین میں گاڑا جائے گا اور جتنا بڑا غدار ہوگا اتنا بڑا جھنڈا ہوگا تاکہ لوگوں کو نظر آئے۔ "ویقال ھذہ غدرۃ فلان"۔ اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں آدمی کی غداری کا نشان ہے، عہد شکنی کا نشان ہے اسی لیے ارشاد الٰہی ہے:

"یا ایھاالذین آمنوا اوفوا بالعقود"۔

ترجمہ: "اے ایمان والو اپنے عقود کو پورا کرو"۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر قرآن کریم کا صرف اتنا ہی ٹکڑا نازل ہوتا تو ہدایت کے لئے کافی تھا تمہارے ذمے اللہ کے جو عقود ہیں ان کو بھی پورا کرو اور کسی مخلوق کے ساتھ تم نے عقد کر لیا ہو، معاہدہ کر لیا ہو تو اس کو بھی پورا کرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ عہد شکنی ایک وبال ہے اور قیامت کے دن عہد شکنی کرنے والے کو رسوا کیا جائے گا جھنڈا گاڑا جائے گا اور اس کے اوپر لکھا ہوگا کہ فلانے کی عہد شکنی کا نشان ہے، جتنا بڑا عہد شکن ہوگا، (عہد کو توڑنے

والا) اس کو رسوا اور ذلیل کرنے کے لیے اتنا ہی اونچا جھنڈا ہو گا- نعوذ باللہ- اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے-

حاکم سے بڑا کوئی غدار نہیں:

اسی کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ یہ بات بھی سن رکھو کہ امیر عامہ سے بڑا غدار کوئی نہیں ہے- امیر عامہ سے مراد ہے حاکم، بادشاہ، خلیفہ، وزیر اعظم جو قوم سے ایک معاہدہ کرنے کے بعد اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ سب سے بڑا غدار ہے، عہد شکنی یعنی وعدے کر کے معاہدے کو توڑ دینا اور ان کی خلاف ورزی کرنا یہ قوم کا معمول بن گیا ہے اور ہمارے سیاسی لیڈروں کی تو سیاست بن گئی ہے، ہمارے ایک سابق سیاسی لیڈر نے لوگوں سے روٹی، کپڑا اور مکان کا معاہدہ (وعدہ) کیا تھا- روٹی، کپڑا اور مکان، تو پڑھے لکھے لوگوں کے لئے تھا اور ہمارے پنجاب کے جاہل جٹ اور بدوؤں سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ ہر ایک کو بارہ بارہ ایکڑ زمین دوں گا، الیکشن کا وقت آیا تو ایک بڈھا بیچارہ بہت زیادہ کمزور ہسپتال میں داخل تھا، مرنے کے قریب، اس کو چارپائی پر ڈال کر لوگ ووٹ ڈلوانے کے لئے لائے تو کسی نے کہا کہ جی بڑے میاں کو تو معاف کر دیتے، بڑے میاں کہنے لگے "جی ہمارا کلہ مرتا ہے"- یعنی ایک ایکڑ زمین کا نقصان ہوتا ہے، قوم ایسی بدھو کہ اللہ کے وعدوں پر اتنا یقین نہیں، جتنا ان صاحب کے وعدوں پر یقین تھا، لیکن پھر جو کچھ ہوا، وہ آپ کے سامنے ہے- پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک ہمارے سیاسی لیڈروں کی یہی روش چلی آتی ہے کہ انتخابات کے موقع پر یہ قوم کو سبز باغ دکھاتے ہیں اور ان سے بڑے دلکش وعدے کرتے ہیں، جس کو محاورے کی زبان میں بیوقوف بنانا کہتے ہیں، قوم کو خوب الو بناتے ہیں، ان سے وعدے کرتے ہیں

اور ان وعدوں کی سیڑھیوں سے جب وہ اقتدار کے بلند وبالا ایوان تک پہنچتے ہیں تو ان کو کوئی چیز یاد نہیں رہتی، ان کو سب وعدے فراموش ہو جاتے ہیں۔ چار پانچ سال کے بعد الیکشن ہوا، وہ پہلے والے جو وعدے تھے، جیسے کیسے ہوئے ختم ہو گئے، یہ لوگ پھر قوم کے پاس ایک نیا وعدہ لے کر آ گئے، اور ہمارے لوگ بھی عادی ہیں بیچارے، اللہ کیلئے یہ بھی نہیں کرتے اور اللہ کیلئے وہ بھی نہیں کرتے۔

ہمارے حکمرانوں کی غداریاں:

سن ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں جو یحییٰ خان نے کروائے تھے۔ بھٹو صاحب میدان میں تھے، ہماری جمعیت علمائے اسلام نے بہت آدمی کھڑے کر دیئے اور چن چن کر بزرگ کھڑے کر دیئے، خدا کا غضب حضرت مولانا خان محمد صاحب دامت برکاتہم سجادہ نشین کو کھڑا کر دیا گیا، ابھی گوجرانوالہ سے ہمارے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر تشریف لائے تھے، وہ قصہ سنا رہے تھے کہ مولانا عبد الواحد صاحب کو کھڑا کر دیا گیا اور یہ (شیخ الحدیث اور دوسرے حضرات) لوگوں کو یہ کہنے کیلئے نکلے کہ بھائی ان کو ووٹ دو۔ اسی طرح ہمارے علاقے میں شیخ الحدیث مولانا فیض احمد صاحب ہیں، یہاں کبھی کبھی تشریف لاتے ہیں، ان کا بیان بھی یہاں ہوا ہے ان کو کھڑا کیا گیا تھا، اور یہ فقیر پر تقصیر ان کے لئے کھیتوں میں پھرتا رہا، میں کسی کے کام کیلئے کبھی نہیں اٹھ کے گیا، یہ میری کمزوری ہے، لیکن پتہ نہیں وہ کیا آفت آ گئی تھی، اس وقت میں نے کہا تھا، جبکہ ابھی الیکشن شروع نہیں ہوا تھا تمام اکابر اولیاء اللہ، بزرگان دین، خانقاہوں والے، مسجدوں والے، مدرسوں والے اور چوٹی کے بزرگ یہ جو میدان میں آ گئے ہیں مجھے خیر نہیں نظر آتی، اس لئے کہ غالباً ایک مرتبہ پھر حق تعالیٰ

شانہ قوم پر اتمام حجت کر دینا چاہتے ہیں اور حجت پوری کرنے کے بعد پھر پکڑتے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، مجھے کسی خطرناک عذاب کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا، یعنی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آفت آرہی ہے کیونکہ یہ تمام اکابر اولیاً اللہ کبھی خانقاہ سے نکل کر نہیں گئے، خانقاہ سے باہر قدم نہیں رکھا، یہ لوگ جو سیاست کے میدان میں انتخاب لڑنے کے لئے آگئے ہیں، یہ عجیب بات ہے، اور میرے جیسا آدمی کھیتوں میں پھر رہا ہے، پھر جو کچھ ہوا آپ کو معلوم ہے، مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار نوے ہزار فوجی قید ہوئے، ملک دو ٹکڑے ہوا، اور تم پر بھٹو جیسا آدمی مسلط کیا گیا- میں نے رات ہی سنایا تھا کل شام کے درس میں کہ حجاج بن یوسف کے خوف سے حضرت حسن بصریؒ چھپے ہوئے تھے، روپوش تھے، کسی نے کہا کہ حضرت آپ اس کے لئے بددعا کیوں نہیں کرتے، حسن بصریؒ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے کہ تم شکر نہیں کرتے کہ ایک آدمی تم پر حاکم ہے ورنہ تمہارے اعمال تو ایسے تھے کہ تم پر خنزیر اور بندروں کو مسلط کیا جاتا- مولانا شیر محمد صاحب کو لاہور میں ایک فاحشہ عورت کے ساتھ پوری رات رکھا گیا اور اس کے فوٹو لئے گئے، علما اور صلحا کے ساتھ اور شریف لوگوں کے ساتھ وہ کچھ کیا گیا کہ اس کو بیان کرنا بھی ممکن نہیں-جب مجھے یہ اطلاع پہنچی تو میں یہیں اپنے مدرسے میں بیٹھا ہوا تھا، کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے، مجھے رونا آگیا میں نے کہا ہماری سزا کا وقت آگیا ہے، ہماری بد عملیوں کی وجہ سے، ہم اس لائق ہی نہیں رہے کہ ہم پر کسی انسان کو مسلط کیا جاتا، یہ بندر اور خنزیر ہم پر مسلط کر دیئے گئے ہیں، صرف چمڑی انسانوں کی تھی اندر سے بندر اور خنزیر تھے واقعتاً خنزیر تھے، شریف لوگوں کی بہو بیٹیاں اٹھوالی گئیں، ایک عالم دین کو فاحشہ

کے ساتھ رکھا گیا اور اس کے ننگے فوٹو لئے گئے، یہ ہمارے سیاسی لیڈر ہیں، اور ہم لوگ ہمیشہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر ان لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر یہ جو کچھ ہمارے ساتھ سلوک کرتے ہیں ہمیں معلوم ہے، نہ ہم اللہ کیلئے کوئی کام کرتے ہیں، نہ یہ اللہ کیلئے کوئی کام کرتے ہیں، ان کا کام ہے قوم کو دھوکہ دینا اور تمہارا کام ہے دھوکہ کھانا، پوری نصف صدی گزر رہی ہے اسی دھوکے میں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سن رکھو! امیر عامہ سے بڑھ کر کوئی غدار نہیں، یعنی اگر وہ عہد شکنی کرے، عہد کے خلاف کرے، معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو وہ سب سے بڑا غدار ہے اس سے بدتر کوئی غدار نہیں۔

بڑا اور چھوٹا غدار:

بات یہ ہے کہ ایک آدمی معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے کسی چھوٹی سی بات پر، اور ایک معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے کسی بڑی بات پر، پھر ایک آدمی معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے کسی مجبوری کی وجہ سے اور دوسرا آدمی معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے بغیر کسی مجبوری کے، دونوں کے درمیان فرق ہوگا کہ نہیں؟ جو دس روپے پر عہد شکنی کرتا ہے اس کا غدر چھوٹا ہوا اور جو غداری کرکے ہزار روپیہ ہضم کر جاتا ہے اس کا غدر یعنی اس کی عہد شکنی بڑی ہوئی، پھر ایک بیچارہ تنگ دست ہے وہ کسی مجبوری کی وجہ سے معاہدے کے خلاف کر لیتا ہے اور ایک آدمی ایسا ہے کہ اس کو کوئی مجبوری نہیں، تو یہ شخص زیادہ غدار ہوگا۔ اسی طرح امیر عامہ، صدر مملکت، وزیر اعظم، گورنر اور وزیر اعلیٰ اور دوسرے مقتدر حکام، کہ تمام اختیارات اللہ تعالیٰ نے ان کے قبضے میں دے رکھے ہیں، اگر وہ ان تمام اختیار و اقتدار کے باوجود عہد شکنی کرتے ہیں اور معاہدہ پورا نہیں کرتے

توان سے بڑا غدار کون ہو گا؟

ٹھیک فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ امیر عام کا غدر سب سے بڑا غدر ہے، کیونکہ میں نے اور آپ نے کسی سے معاہدہ کیا تو کسی چھوٹی موٹی بات کا معاہدہ ہو گا، مگر یہ ہم سے پچاس سال سے وعدے کرتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام پاکستان میں نافذ کریں گے، کتنا بڑا وعدہ ہے؟ اور جب عمل کا وقت آتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ بنیاد پرستی ہے، ملائیت ہے- ان سے کوئی پوچھے کہ تمہیں کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ تم انتخاب کے وقت لوگوں سے یہ وعدہ کرو کہ ہم اسلام نافذ کریں گے؟ اس وقت جب تم لوگوں سے ووٹ لے رہے تھے اس وقت صاف کہتے کہ ہم اسلام کو غلط سمجھتے ہیں، اس زمانے میں نہیں چل سکتا، ہم نہیں کریں گے، پھر میں دیکھتا کہ تمہیں کتنے لوگ ووٹ دیتے ہیں؟ ووٹ لینے کے وقت تم نے اسلام کا نام لے کر لوگوں کو دھوکہ دیا اور آج اخباروں میں یہ بیانات چھاپتے ہو کہ یہ بنیاد پرستی ہے، پاکستان بنیاد پرستی کے لئے نہیں بنا تھا، آج ہمیں اخباروں کے ذریعہ فلسفہ سمجھاتے ہیں، انگریزی اخباروں میں زیادہ سمجھاتے ہیں، اردو اخباروں میں ذرا کم سمجھاتے ہیں، اب تم ہی بتلاؤ کہ ان غداروں کیلئے کتنا بڑا جھنڈا بلند کیا جائے گا- قیامت کے دن؟

افضل ترین جہاد:

اس کے بعد ارشاد فرمایا: "الا لایمنعن رجلا مهابة الناس ان یتکلم بالحق اذا علمه-"

ترجمہ: "سن رکھو جب کسی شخص کو حق بات معلوم ہو تو لوگوں کا خوف اس کو حق بات کہنے سے روکے نہیں"- اور اسی کے ساتھ فرمایا: "الا ان افضل الجهاد

كلمة حق عند سلطان جائر –" ظالم شخص، چاہے صاحب سلطنت بادشاہ ہو، کسی جمہوری حکومت کا سربراہ ہو، یا کسی حکومت کا نام نہاد خلیفہ ہو، اس کے سامنے حق بات کہنا یہ سب سے افضل ترین جہاد ہے، کافروں کے مقابلے میں لڑائی کرنا یہ بھی جہاد ہے، لیکن ایک مطلق العنان بادشاہ کے سامنے اور صاحب اختیارات کے سامنے حق بات کہنا یہ افضل ترین جہاد ہے، اس لئے کہ اپنے آپ کو سانپ کے منہ میں دینا ہے- یہ سب سے بڑا جہاد ہے- اور آخری فقرہ تھا، یہ تو پہلے بیان میں بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھائی اور عصر کی نماز کے بعد خطبہ شروع فرمایا اور قیامت تک ہونے والے جتنے واقعات تھے سب موٹے موٹے بیان کر دیئے، اب خود سوچ لو کہ کتنا وقت لگا ہوگا اور سورج غروب ہونے میں کتنا وقت باقی ہوگا، اندازہ کر سکتے ہیں کہ عصر کی نماز کے بعد تو خطبہ شروع ہوا اور خطبہ اتنا طویل تھا کہ حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں :

"فلم يدع شيئًا يكون الى قيام الساعة الا اخبرنا به–"

ترجمہ :"قیامت تک کے جتنے واقعات تھے سب موٹے موٹے بیان کر دیئے-"

تو مغرب کا وقت آنے میں کتنا وقت رہا ہوگا؟ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں- آخری فقرہ اس خطبے کا یہ تھا کہ : یاد رکھو! اس وقت دن کے پورا ہونے میں جتنا وقت باقی ہے یعنی جتنا وقت کہ اب غروب میں باقی رہ گیا ہے، دنیا کی عمر کا، بس اتنا وقت باقی رہ گیا ہے،

دنیا کی عمر:

"الا ان مثل ماہقی من الدنیا فیما مضی -"

دنیا کا جتنا وقت باقی ہے یعنی اس کی عمر کا جتنا وقت باقی ہے وہ گزشتہ کے مقابلے میں ایسے ہے: "مثل ما بقی من یومکم ھذا فیما مضی" - بس اتنا ہے جتنا تمہارے اس دن کا حصہ باقی ہے گزشتہ کے مقابلے میں - مقصود یہ تھا کہ دنیا کی عمر پوری ہو چکی ہے اب زیادہ وقفہ نہیں ہے، اسی مضمون کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ کپڑا پھاڑنے لگے، پھاڑتے پھاڑتے ایک تار باقی رہ گئی، اب یہ دو ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں، اس لئے کہ صرف ایک تار باقی ہے، باقی سب پھٹ چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جتنی عمر باقی رہ گئی ہے، اس کی مثال ایسے سمجھو کہ بس ایک تار باقی رہ گیا، باقی سب پھاڑا جا چکا ہے -

یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں وقت پورا ہو گیا ہے - مختصراً عرض کر دیتا ہوں، ایک یہ کہ ہر آدمی کی عمر گزشتہ عمر کی بہ نسبت یہی حیثیت رکھتی ہے، ہماری عمر کتنی گزر چکی، اور اگلی زندگی موہوم ہے، پتہ ہی نہیں کہ ہے بھی یا نہیں؟ لیکن عجائبات میں سے یہ ہے کہ آدمی اپنی اس موہوم زندگی کے لیے تو بڑا فکر مند ہوتا ہے، لیکن یقینی زندگی کے لئے کبھی فکر مند نہیں ہوتا، ہماری زندگی کیسے گزرے گی، اگلی زندگی کیسے گزرے گی، یہ موہوم زندگی پتہ نہیں کتنے دن کی ہے، پھر یہ بھی پتہ نہیں کہ ہے بھی یا نہیں؟

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

اور دنیا کی عمر کا بھی یہی قصہ ہے، یوں تو کچھ علامات ظاہر ہونے والی ہیں، ابھی ظاہر ہوں گی، لیکن معلوم نہیں کہ کس وقت قیامت کا بگل بجادیا جائے؟ کسی کو کچھ پتہ نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ علم کسی کو بھی نہیں دیا۔

دوسری بات مجھے یہ سمجھانی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ ایک تار باقی رہ گیا ہے یا اتنا وقت باقی رہ گیا ہے کہ بالکل غروب کے قریب ہے، یہ کسی چیز کے قریب ہونے کو سمجھانے کے لئے ہے، مثال کے طور پر کسی آدمی کو سورج کے غروب ہونے سے پہلے پہلے کام کرنا ہے اور سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے، تو وہ کتنی مستعدی کرے گا، اس وقت اس کام کے کرنے میں؟ مقصود یہ سمجھانا ہے کہ تمہاری زندگی کا بھی اور اس دنیا کی عمر کا بھی کوئی پتہ نہیں ہے کہ کس وقت منقطع ہو جائے۔

اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

من نمے گویم کہ در بند زیاں یا سود باش!

بزرگ فرماتے ہیں کہ میں تمہیں یہ تو مشورہ نہیں دیتا کہ تم اپنے نقصان کی فکر کرو یا اپنے نفع کی فکر کرو، یہ تو تم جانو اور تمہارا کام جانے، لیکن اتنا کہنا چاہوں گا کہ اے وہ آدمی جو فرصت سے بے خبر ہے "در ہر چہ خواہی زود باش" جو بھی تم نے کرنا ہے ذرا جلدی سے کرلو وقت ختم ہو رہا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

وصلى الله تعالى على خير خلقه سيدنا

محمد وآله واصحابه اجمعين

سب سے بہتر تاجر وہ ہے جو اپنا حق وصول کرنے میں خوش معاملہ ہو، اور قرضہ ادا کرنے میں بھی خوش معاملہ ہو۔ جن لوگوں کے قرضے اس کے ذمے ہوں ان کو پریشان نہ کرے بلکہ فوراً ادا کرنے کی کوشش کرے۔

گھاٹے کے بیوپاری

زندگی کے لمحات ختم ہونے والے ہیں، اس سے زیادہ قیمتی چیز اگر ہم نے اس کے ذریعہ خریدلی تو ہم عقلمند ٹھہریں گے، اور اگر یہ نعمت مفت میں رائیگاں چلی گئی یا اس سے گھٹیا چیز خریدلی تو معاف کیجئے لوگ ہمیں احمق کہیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِیْھِمَا کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ: اَلصِّحَۃُ وَالْفَرَاغُ."

(مشکوٰۃ ج:۲ ص:۴۳۹، ترمذی کتاب الزہد ج:۲ ص:۵۴)

ترجمہ:...... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو نعمتیں ایسی ہیں جس میں بہت سے لوگ خسارے میں ہیں، صحت اور فراغت۔"

سب سے پہلی بات تو یہ کہ یہ دونوں نعمتیں ہیں، اور اگر غور کیا جائے تو انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ نعمت ہے، اور اس نعمت کا پتہ اس وقت چلے گا جب یہ نعمت ہمارے پاس نہیں رہے گی، جب یہ زندگی کی مہلت جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کر رکھی ہے، یہ ہمارے پاس نہیں رہے گی، اس وقت ہمیں اس کا افسوس ہوگا، یوں کہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی یہ چاہے کہ ساری دنیا کے خزانے خرچ کرکے ایک سانس خرید لے تو یہ اس کو نہیں مل سکے گا، یہ ایسی نعمت ہے جس کو ہماری زبان میں انمول کہتے ہیں یعنی جس کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

حق تعالیٰ شانہ نے یہ دولت اور یہ نعمت بغیر کسی استحقاق کے، بغیر کسی مطالبہ

کے اور بغیر کسی فرمائش کے ہمیں عطا کر رکھی ہے، مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول:

ما نبودیم و تقاضا ما نبود
رحمت تو ناگفتہ ما می شنید

ترجمہ:...... "ہم نہیں تھے، ہماری طرف سے تقاضہ بھی نہیں تھا، کوئی مطالبہ نہیں تھا، کوئی درخواست نہیں تھی، آپ کی رحمت ہماری ان کہی بات کو بھی سن رہی تھی۔"

گھاٹے کا سودا:

پہلی بات تو یہ کہ یہ دونوں نعمتیں ہیں، اور کبھی ہم نے سوچ کر بھی نہیں دیکھا کہ یہ دونوں نعمتیں ہمارے پاس واقعی ہیں بھی؟ یہ زندگی اول سے آخر تک ہمارے پاس نعمت ہے، اور ایک اصول کی بات بتاتا ہوں کہ یہ نعمت تو ختم ہونے والی ہے اور یہ زندگی کے لمحات ختم ہونے والے ہیں، اس سے زیادہ قیمتی چیز اگر ہم نے اس کے ذریعہ خرید لی تو ہم عقلمند ٹھہریں گے، اور اگر یہ نعمت مفت میں رائیگاں چلی گئی یا اس سے گھٹیا چیز خرید لی تو معاف کیجئے لوگ ہمیں احمق کہیں گے، بلکہ خود ہم اپنے آپ کو احمق کہیں گے، آپ نے بہت بڑھیا سامان خرید لیا، بہترین قسم کی بلڈنگیں بنالیں، اعلیٰ درجے کا فرنیچر لے لیا اور یہاں کی جتنی نعمتیں ہیں وہ ہم نے حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ نعمت جو ہم نے حاصل کی، زندگی خرچ کرنے کے بعد حاصل کی، اب تم دیکھو زندگی کے وہ لمحات زیادہ قیمتی تھے یا یہ چیزیں زیادہ قیمتی ہیں؟ تم خود انصاف کرلو، جیسے میں نے عرض کیا کہ ہم اب تک تو اس سے خوش نہیں ہیں لیکن جب یہ زندگی نہیں رہے گی اور ختم ہوجائے گی یا ختم ہونے کے قریب ہوگی تو اس وقت کہیں گے کہ: اے

کاش! ہم اپنی زندگی کی قدر کر لیتے۔

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ دو نعمتیں ہیں کہ جس میں بہت سارے لوگ خسارے میں ہیں، میں نے خسارہ اٹھانے کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ ہمارے ذہن میں ہی یہ بات نہیں آتی کہ ہمارے پاس یہ نعمتیں ہیں؟

وقت کی مثال:

کبھی ہم، لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ تاش کھیل رہے ہیں، اچھا کیوں کھیل رہے ہو بھائی؟ ویسے ہی جناب وقت پاس کر رہے ہیں ذرا سوچو! بھلا کیا وقت پاس کرنے کی چیز ہے؟ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''میں صوفیا کی مجلس میں بیٹھا ہوں اور میں نے ان کے انفاس طیبہ سے فائدہ اٹھایا ہے، جو بات میں نے ان سے سیکھی ہے، ان میں سب سے بہترین بات یہ تھی کہ وقت ایک تلوار ہے اگر تم اس کو نہیں کاٹو گے تو یہ تمہیں کاٹ دے گی۔''

وقت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا ہے، کسی کی پچاس سال کی زندگی ہے، کسی کی ساٹھ سال کی، کسی کی چالیس سال کی، کسی کی کم، کسی کی زیادہ، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس زندگی میں ہم نے کیا حاصل کیا؟ کیا کھانے پینے کے لئے یہ زندگی تھی؟ کیا ہمیں اس لئے بھیجا گیا ہے؟ کہ برخوردار! ذرا کھا ہی لیں، اچھی طرح کھالیں، یہاں آئے ہوئے ہیں، جہاں کی حیثیت سے ذرا اپنی صحت کو بنالیں! صحت تو ہماری بنی نہیں جیسے میری صحت ہے؟!

بال سفید ہو گئے، قبر کا کنارہ نظر آنے لگا، جب تک زندہ تھے، یا زندگی کی امید تھی، ہم سوچتے تھے کہ یہ کیسے گزرے گی؟ اب سوچتے ہیں کہ کیسے گزر گئی؟

تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: دو نعمتیں ہیں کہ "مَغْبُوْنٌ فِیْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ." (جس میں بہت سے لوگ خسارے میں ہیں)۔

''غبن'' عربی زبان کا لفظ ہے ''گھاٹا یا خسارہ کے معنی میں آتا ہے۔

گھاٹے کا کاروبار:

ہم کوئی تجارت کا کام کریں اور اس میں ہمیں نفع کے بجائے نقصان پہنچے، تو اس کو کہتے ہیں گھاٹا پڑ گیا، لاکھ روپیہ لگایا تھا تجارت میں، روپیہ تو اس لئے لگایا جاتا ہے کہ نفع ہوگا، لیکن سال کے بعد جب حساب کیا تو وہ بھی نہیں رہا، وہ بھی پھنس پھنسا گیا۔

میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ بیچارے بہت مالدار تھے لیکن خسارہ پڑ گیا اس کے بعد وہ مانگنے کے قابل بن گئے، بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کو دیتے تھے، اب مانگنے کے قابل بن گئے، اور کئی آدمی ایسے بھی ہیں کہ میں نے ان کے گلو خلاصی کروائی ہے۔

۸۰،۰۰۰ روپیہ ایک آدمی کے ذمہ تھے، اب غریب آدمی کے لئے تو یہ بھی بہت بڑی رقم ہے، وہ کہاں سے ادا کرے گا؟ تو غبن اس کو کہتے ہیں کہ آدمی خسارے میں چلا جائے، تجارت میں مال لگائے، روپیہ لگائے، لیکن خسارے میں چلا جائے اور اس کو اس وقت پتہ چلے جب وقت بیت چکا ہو۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ دو نعمتیں ایسی ہیں جس میں بہت سے لوگ خسارے میں ہیں، پہلے تو ان نعمتوں کو نعمت ہی نہیں سمجھا، اور اگر نعمت سمجھا بھی تو ان کو استعمال کرنے کا طریقہ نہیں آیا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مال لگایا تو اس لئے جاتا ہے کہ نفع پہنچے، مگر اس کو نقصان ہوگیا، تو یہ خسارہ ہے۔

اس طرح ہماری زندگی کا ایک ایک لمحہ خرچ تو ہو رہا ہے، اور خرچ بھی اس طرح ہو رہا ہے جس طرح برف، کہ اگر تم اس کو استعمال نہیں کروگے تو پگھل کر ختم ہو جائے گی، جب سے پیدا ہوئے ہیں، یہ زندگی گھٹ رہی ہے اور ختم ہو رہی ہے، لیکن ہمیں استعمال کرنے کا ڈھنگ نہیں آیا، سوائے اللہ تعالیٰ کے مقبول اور خاص بندوں کے۔

ڈھنگ آنے کا مطلب یہ ہے کہ اس زندگی کے ذریعہ سے انسان ابدالاباد کی زندگی حاصل کرلے، اس تھوڑی سی پونجی کے ذریعہ سے ایسی تجارت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرلے، اور ابدالاباد کی زندگی حاصل کرلے، لیکن یہ ڈھنگ ہمیں نہیں آیا، ابھی ہم نماز پڑھ کر یہاں سے چلے جائیں گے، پھر اپنی اسی گپ تراشی میں لگ جائیں گے۔

میرے خیال میں کبھی ہم نے ایک دن کے لئے بھی نہیں سوچا کہ میری زندگی کتنی قیمتی ہے؟ اور یہ کس ڈھپ پر چل رہی ہے؟ آیا اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے؟ یا اس میں کسی ترمیم کی ضرورت ہے؟ یا پھر کسی ڈاکٹر اور حکیم کو دکھانے کی ضرورت تو نہیں؟ یا کہیں یہ زندگی بیمار تو نہیں ہے؟ یا کسی اللہ والے کی خدمت میں بیٹھ کر کے ہمیں ضرورت محسوس ہوئی کہ میری زندگی صحیح گزر رہی ہے یا غلط گزر رہی ہے؟

تو فرمایا گیا کہ دو نعمتیں ایسی ہیں جس میں بہت سے لوگ خسارے میں ہیں: "الصحة والفراغ." (ایک صحت اور دوسری فراغت)۔

صحت:

ایک نعمت تو صحت کی ہے، الا ماشاءاللہ کوئی ایسا آدمی ہوگا جو تندرست ہو، عام طور پر لوگ بیمار رہتے ہیں، اکابر فرماتے ہیں: صحت نام ہے اعتدال مزاج کا، آدمی میں اللہ تعالیٰ نے جتنی قوتیں رکھی ہیں وہ صحیح نہج پر ہوں، اعتدال پر ہوں، نہ کم ہوں اور نہ زیادہ، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں کسی کو اعتدال مزاج نصیب نہیں ہوا، سوائے آنحضرت ﷺ کے، بس ایک رسول اللہ ﷺ کی ذات عالی تھی جن کو اللہ تعالیٰ نے صحت کامل عطا فرمائی تھی...... تو کامل صحت تو ممکن ہی نہیں جو ٹھیک اعتدال پر ہو، اور کانٹے کے تول پر ہو کہ تمام قویٰ میں سردی گرمی کا اعتدال ہو۔

لیکن جو صحت کہ اعتدال کے قریب تھی وہ رسول اللہ ﷺ کو دی گئی، ہمارا حال تو یہ ہے کہ بلڈ پریشر ہوگیا، یا غصہ بہت آتا ہے، یا ویسے ہی دھیٹ ہوگئے، غرضیکہ ہماری زندگی اعتدال پر ہے ہی نہیں۔ صحت کے معاملہ میں ہم لوگ خسارے میں ہیں۔

فراغت:

اور دوسری (نعمت ہے) فراغت کی، فراغت کے معنی آدمی کے پاس فرصت ہو، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس بہت فرصت ہوتی ہے، لیکن اس وقت جب ہم کسی کام کے نہیں رہتے، جب کمائی کرنے کا وقت ہوتا ہے تو ہمیں نماز پڑھنے کا بھی موقع نہیں ملتا، دفتر میں جاتے ہیں، اپنے کاروبار میں جاتے ہیں اور گدھے کی طرح جتے ہوئے ہوتے ہیں، ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دن کدھر سے نکلتا ہے اور کدھر چھپتا ہے؟

ابھی پچھلے ہفتے میں جہاز میں لاہور جا رہا تھا، کہ ایک سوٹ، بوٹ اور ٹائی والا نوجوان میرے ساتھ آبیٹھا، بات ہونے لگی، میں کچھ اپنا ذکر کر رہا تھا، اس نے

مجھے مشغول کردیا اور کہنے لگا آپ کہاں ہوتے ہیں؟ اور کیا کرتے ہیں وغیرہ؟ میں نے کہا: میرا نام محمد یوسف لدھیانوی ہے، جنگ اخبار میں میں لکھتا ہوں، بہت ہی خوش ہوگیا، اور کہنے لگا کہ میرے بچے اقرأ میں پڑھتے ہیں۔

خیر! میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ وہ کہنے لگا کہ جی یہ آپ لوگ اقرأ میں چھٹی کرتے ہیں جمعہ کو، جب کہ چھٹی ہوتی ہے گورنمنٹ کی نواز شریف کی بدولت اتوار کو، تمہارے حکمران بھی غلط کام کرکے چلے جاتے ہیں، پھر اس کے بعد کوئی صحیح کرنے والا نہیں ہوتا کہنے لگا، آپ کو چھٹی اتوار کی کرنی چاہئے، میں نے کہا بھئی ہمارے ہاں یہ مسئلہ پیش آیا تھا، دوستوں نے اس سلسلہ میں مشورہ کیا، تو میں نے ان سے کہا کہ بھئی! کسی کا کہنا ہے کہ:

وہ اپنی خو نہ بدلیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟

میں نے کہا ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟ وہ انگریز ملعون کے مسلک پر عمل کرتے ہیں، تمہاری گورنمنٹ والے! آپ دینی مدارس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ ان کی روش پر چلیں؟ کہنے لگے: جی اصل میں بات یہ ہے کہ سال گزر جاتا ہے بچوں سے کبھی بات ہی نہیں ہو پاتی، کیونکہ جب ہم آتے ہیں، بچے سو چکے ہوتے ہیں اور ہماری اتوار کی چھٹی ہوتی ہے، مگر ان کو پڑھنے کے لئے جانا ہوتا ہے، میں نے کہا کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ یہ تجویز تو آپ حکومت کو دیں کہ انہوں نے تعطیلات کے اسلامی نظام کو کیوں بدلا ہے؟ بہرحال میں عرض کر رہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَغْبُوْنٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ." بہت سے لوگ خسارے میں ہیں، ایک صحت کے بارے میں اور دوسرے فراغت کے معاملہ میں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ فراغت کسی کو ملتی نہیں، اگر مل بھی جائے تو دوسری

چیزوں میں خرچ ہوتی ہے، اصل چیز جس میں خرچ ہونی چاہئے جو ہمیں کام دینے والی ہے، اس میں خرچ نہیں ہوتی کہ اللہ کا ذکر کریں، تسبیحات پڑھیں، کسی اللہ کے بندے کے پاس بیٹھیں، نہیں! نہیں! ان سے تو ہم فارغ ہوگئے، لیکن میرا بھائی!! یہ تو اس وقت پتہ چلے گا جب آنکھیں بند ہوں گی کہ ہم خسارے میں تھے یا نفع میں؟ جب ہم مریں گے، جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ.'' ایک آدمی کی بات نہیں، بہت سے لوگ! خسارے میں ہیں، دو نعمتوں کی وجہ سے، اور ان دو نعمتوں میں خسارہ پانے کی وجہ سے پوری زندگی خسارے میں چلی جاتی ہے، ایک صحت اور ایک فراغت۔

صحت نہیں، علاج مطلوب ہے:

اب اس سلسلہ کی صرف دو باتیں کہہ کرکے بات ختم کردیتا ہوں۔ میرا بھائی! تم نے یہ طے کرلیا ہے کہ صحت ہوگی تو کام کریں گے، اگر صحت نہیں ہوگی تو کام بھی نہیں ہوگا۔ یہ بات غلط ہے ہمارے حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے تھے کہ: ''صحت مطلوب نہیں، علاج مطلوب ہے۔''

صحت ہوتی ہے ہو، نہیں ہوتی نہ ہو، صحت اللہ کے قبضہ میں ہے ہمارے قبضہ میں نہیں، البتہ علاج معالجہ کرنا ہمارے قبضہ میں ہے، جہاں تک ہوسکتا ہے اللہ سے دعا بھی کریں، علاج بھی کریں، اور علاج بھی حلال کریں، حرام نہ کریں، جائز کریں، ناجائز نہ کریں، باقی صحت ہوتی ہے تو ٹھیک، اور نہیں ہوتی تو الحمدللہ! تب بھی ٹھیک، لیجئے سارا مسئلہ ہی حل ہوگیا، ہر ایک آدمی پریشان ہے کہ میری صحت ٹھیک نہیں رہتی، یہ نہیں رہتی، وہ نہیں رہتی، میرا بھائی! یہ معاملہ تو ایسا ہی رہے گا! اور ایسا ہی چلے

باقی اللہ سبحانہ وتعالیٰ توفیق عطا فرمائے، اپنی جتنی بھی صحت ہے اس کو صحیح طریقہ سے استعمال کرو۔

ایک کوتاہی:

اور دوسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں فراغت کے بارے میں کہ اب لوگوں کو یہ خیال نہیں کہ اس فراغت کو کیسے استعمال کریں؟

اس کا طریقہ ہم نے یہ سوچا ہے کہ چلو کسی جگہ سیر کر کے آتے ہیں، ٹور کر کے آتے ہیں، فلاں جگہ چلے گئے، فلاں جگہ چلے گئے، تاکہ یہ جو لمحات ہیں یہ خرچ ہو جائیں، نہیں! میاں! اس کی ضرورت نہیں ہے، ضرورت اس کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں صحت عطا فرمادی اور جو وقت عطا فرمادیا اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق خرچ کرو۔

ایک آخری بات کہتا ہوں، کہ اگر تم اس صحت کو اور اس فراغت کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے مطابق خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایسی راحت عطا فرمائیں گے، کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اور اگر اس نعمت کو دوسری جگہ استعمال کرلیا تو پھر پریشانی ہی پریشانی رہے گی۔ جتنی زیادہ فکر کرو گے اتنی ہی پریشانی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ صحت و عافیت عطا فرمائے، اور اپنے حبیب پاک ﷺ کے طریقے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

"وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین"

ضرورت اس کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں
صحت عطا فرمادی اور جو وقت عطا فرمادیا اس کو
اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق
خرچ کرو۔

ملاقاتِ الٰہی کا شوق

جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو محبوب رکھے اور پسند کرے، اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند فرماتے ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے کو ناپسند کرے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنے کو پسند نہیں فرماتے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

”عَنْ شَرْجِيْلٍ أَنَّ أَبَا الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ كَانَ اِذَا رَأٰى جَنَازَةً قَالَ أُغْدُوْا فَاِنَّا رَائِحُوْنَ أَوْ رُوْحُوْا فَاِنَّا غَارُوْنَ مَوْعِظَةٌ بَلِيْغَةٌ وَغَفْلَةٌ سَرِيْعَةٌ كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا يَذْهَبُ الْأَوَّلُ فَالْأَوَّلُ وَيَبْقَى الْآخَرُ لَا حِلْمَ لَهٗ.“ (ابونعیم فی الحلیۃ ج:۲ ص:۲۱۷)

ترجمہ:...... ”شرجیل کہتے ہیں کہ حضرت ابو درداءؓ رضی اللہ عنہ جب کسی جنازے کو دیکھتے تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ تم صبح جاؤ ہم شام کو آرہے ہیں یا تم شام کو جاؤ ہم صبح کو آئیں گے، بڑی نصیحت ہے اور بڑی تیز غفلت ہے موت کا وعظ کافی ہے، ایک کے بعد دوسرا جارہا ہے اور پیچھے ایسے لوگ رہ جاتے ہیں کہ نہ ان کے پاس حلم ہے اور نہ بردباری۔“

”عَنْ أَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: ثَـلَاثٌ أَحَبُّهُنَّ وَیَكْرَهُهُنَّ النَّاسُ: اَلْفَقْرُ وَالْمَرَضُ وَالْمَوْتُ...... قال: أَحَبُّ الْمَوْتَ اِشْتِیَاقًا اِلٰی رَبِّیْ، وَأَحَبُّ الْفَقْرَ تَوَاضُعًا لِرَبِّیْ، وَأَحَبُّ الْمَرَضَ تَكْفِیْرًا لِخَطِیْئَتِیْ.“

(ابونعیم فی الحلیة ج:۱ ص:۲۱۷)

ترجمہ:......”حضرت ابو درداءؓ رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے تھے کہ: میں تین چیزوں سے محبت کرتا ہوں اور ان کو پسند کرتا ہوں، لوگ ان کو ناپسند کرتے ہیں (۱) موت، (۲) فقر، (۳) مرض۔ موت کو تو اپنے رب سے ملنے کے اشتیاق کی وجہ سے (کیونکہ اپنے رب سے ملنے کا اشتیاق ہے اور اس کا ذریعہ موت ہے، اس لئے کہ دنیاوی زندگی کے دریا کو پار کرنے کے لئے موت کے پل سے پار ہوجائیں گے) اور فقر کو پسند کرتا ہوں اپنے رب کے سامنے تواضع کرنے، بندہ بننے اور عاجزی اختیار کرنے کے لئے، بیماری کو پسند کرتا ہوں اپنی خطاؤں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے۔“

لوگ چاہتے ہیں زندہ رہیں، موت کو ناپسند کرتے ہیں، لوگ چاہتے ہیں کہ مالدار ہوں، فقر کو ناپسند کرتے ہیں، اور لوگ چاہتے ہیں کہ تندرست ہوں، بیماری کو ناپسند کرتے ہیں، لیکن میں ان تینوں چیزوں کو پسند کرتا ہوں۔

جیسے کہ حضرت ابو درداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، تین چیزیں بالطبع لوگوں کو محبوب ہیں اور تین چیزیں مبغوض اور ناپسندیدہ ہیں، لوگوں کو موت ناپسند اور زندگی

پسندیدہ ہے۔

موت نام ہے، اس دنیا میں تمام چیزوں کے مٹ جانے کا، حتیٰ کہ نام و نشان بھی مٹ جاتا ہے، تمام تعلقات مٹ جاتے ہیں، اور ہم لوگ چاہتے ہیں کہ زندگی زیادہ سے زیادہ طویل ہو، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ." (مسلم ج:۲ ص:۳۴۳)

ترجمہ:...... "جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو محبوب رکھے اور پسند کرے، اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند فرماتے ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے کو ناپسند کرے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنے کو پسند نہیں فرماتے۔"

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تو میں نے کہا: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كُلُّنَا يَكْرَهُ الْمَوْتَ." کہ ہم میں سے تو ہر آدمی موت کو ناپسند کرتا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہم سب کے سب ایسے ہی لوگ ہیں، جو کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتے ہیں، فرمایا "لَيْسَ ذَاكِ يَا عَائِشَةَ." عائشہ! یہ بات نہیں ہے، بات یہ ہے کہ جب آدمی کے یہاں سے رخصت ہونے کا وقت آتا ہے اور عالم غیب اس کے سامنے کھل جاتا ہے، تو نیک آدمی کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو اچھا سامان تیار کر رکھا ہے، وہ اس کے سامنے آجاتا ہے اور برے آدمی کے لئے جو مصائب اور تکالیف پیش آنے والی ہیں، وہ اس کے سامنے آجاتی ہیں، اس وقت نیک آدمی یہ چاہتا ہے کہ فوراً چلا جائے اور اللہ تعالیٰ سے جا کر

ملے اور برا آدمی یہ چاہتا ہے کہ نہ جائے، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش نہ ہوتو اس وقت جوشخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرے، اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند فرماتے ہیں اور اس وقت جوشخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرے، اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند فرماتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند یا ناپسند کرنے کا معاملہ موت کے وقت کا ہے، جب کہ اس کے سامنے عالم غیب کھل جاتا ہے، لیکن اتنی بات تو معلوم ہے کہ جب تک مریں گے نہیں، اللہ تعالیٰ سے ملاقات نہیں ہوگی تو عقلی طور پر تو ہر مسلمان چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے، جس کے دل میں محبت ہوگی، جس کو اللہ تعالیٰ سے تعلق ہوگا، وہ عقلی طور پر یہ چاہے گا کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہونی چاہئے، رہا طبعی طور پر چاہنا تو یہ حال کی بات ہے، بعض لوگوں پر حال غالب آجاتا ہے اور وہ طبعی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند فرماتے ہیں اور چونکہ ملاقات کا ذریعہ موت ہے اس لئے وہ موت کو پسند فرماتے ہیں۔

ملاقات الٰہی کا اشتیاق:

مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ ہمارے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے خلیفہ تھے، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور ان کو حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے خلافت بھی تھی، انہوں نے تذکرۃ الخلیل میں حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کا تذکرہ کیا ہے کہ آخری دنوں میں حضرتؒ پر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے اشتیاق کی ایک کیفیت طاری تھی، وہ کہتے ہیں کہ میں حاضر خدمت ہوا، اس وقت آپؒ صاحب فراش تھے، خود کروٹ نہیں بدل سکتے تھے، دوسرے آدمی کروٹ بدلواتے تھے،

جب میں حاضر ہوا تو سب لوگوں سے کہا کہ تم چلے جاؤ مجھے ان سے تنہائی میں بات کرنی ہے، سب لوگ چلے گئے تو تنہائی میں فرمانے لگے کہ حج پر جانے کا ارادہ ہے، لیکن اس میں ایک رکاوٹ ہے وہ یہ کہ حضرت اجازت نہیں دیں گے۔ حضرت سے مراد تھی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ آپ کے پیر بھائی تھے، مگر آپ ان کا ادب اتنا کرتے تھے جتنا اپنے پیر کا کیا جاتا ہے، چنانچہ کوئی کام بھی ان کی اجازت کے بغیر نہیں کرتے تھے، تو فرمایا مجھے آپ سے یہ کام ہے کہ آپ مجھے حضرت سے اجازت لے کر دیں، میں اس سال حج پر جانا چاہتا ہوں۔ مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ نے کہا کہ حضرت! آپ کی بھی عجیب حالت ہے کروٹ بدل نہیں سکتے، چلنا پھرنا تو کیا وضو تک خود نہیں کر سکتے، مگر حالت یہ ہے کہ ارادہ کر رکھا ہے حج کا! غصہ ہو کر فرمانے لگے کوئی مجھے ریل میں ڈال دے، میں پڑا پڑا پہنچ جاؤں گا، میں نے کہا کہ بڑے میاں پر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق غالب ہے، مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ میں نے محسوس کیا کہ حج نہیں، بلکہ ملاقات خداوندی کا شوق غالب آ گیا ہے، آخری وقت ہے تو میں نے دوسرا پہلو لے لیا، میں نے کہا کہ حضرت آپ فکر نہ کریں، میں حضرت سے عرض کروں گا اور حضرت آپ کو ضرور حج کی اجازت دیں گے اور آپ پہنچیں گے انشاءاللہ! میرا اتنا کہنا تھا کہ ان کا چہرہ کھل گیا، کہنے لگے جزاک اللہ، دراصل اللہ کے گھر کا اشتیاق اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لئے تھا:

اگر کوچہ جاناں میں پھر پھر کے سر مارا
نہ دیکھا یار کو، گھر بار کو دیکھا، تو کیا دیکھا

اللہ کے بندے بیت اللہ کو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لئے

جاتے ہیں، خانہ کعبہ کو دیکھنے کے لئے نہیں جاتے، گھر بار کو دیکھنے کے لئے نہیں جاتے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری دینے کے لئے جاتے ہیں۔

حضرت شبلیؒ کا قصہ:

فضائل حج میں حضرت شبلی رحمہ اللہ کا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید حج کے لئے گیا، جب واپس آیا تو شیخ ان سے پوچھنے لگے کہ کس طرح حج کرکے آئے ہو؟ کہنے لگے احرام باندھا، پوچھا کہ کیا نیت کی تھی؟ کہا کہ حج کی نیت کی تھی، عمرہ کی نیت کی تھی "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ." پوچھا کیا اس وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کا قصد و ارادہ تھا؟ کیا اس وقت اس کا ارادہ تھا کہ مجھے میدان محشر میں لے جایا جارہا ہے اور اللہ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا؟ کہنے لگے یہ قصد تو نہیں تھا۔ فرمایا کہ تم نے احرام بھی نہیں باندھا، اچھا جب مکہ مکرمہ میں گئے تھے تو کیا کیا تھا؟ کہا کہ بیت اللہ کا طواف کیا تھا۔ پوچھا کہ بیت اللہ کا طواف کیا تھا، یا اللہ تعالیٰ کا طواف کیا تھا؟ کہا بیت اللہ کا طواف کیا تھا۔ درو دیوار کا ہی طواف کیا نا، تیرا طواف بھی صحیح نہیں ہوا، اسی طرح ایک ایک رکن کے بارے میں پوچھتے رہے اور وہ بیچارہ بتاتا رہا اور آخر میں فرمانے لگے کہ تیرا حج نہیں ہوا، دوبارہ جا، حج کرکے آ۔ کہا عرفات کے میدان میں گئے؟ اس نے کہا گیا تھا، پوچھا کیا تصور کیا تھا؟ ایک کھلا میدان ہے، لوگ وہاں وقوف کرتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں، التجائیں کرتے ہیں۔ اس نے کہا کچھ بھی خیال نہیں کیا، فرمایا اس وقت میں تم یہ خیال کرتے کہ تمام لوگ میدان محشر میں جمع ہیں اور اپنی اپنی مغفرت کے منتظر ہیں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے، اپنے اپنے فیصلہ کے اور مغفرت کے منتظر ہیں۔

تو اہل اللہ پر ملاقات خداوندی کا شوق اس رنگ میں غالب آتا ہے کہ کہتے ہیں کہ حج کر کے آئیں۔ چنانچہ اس کے چند دنوں کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کا انتقال ہوگیا، تو غلبہ حال کے طور پر بعض بزرگوں پر نزع کے وقت سے پہلے پہلے حال طاری ہوجاتا ہے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا، اور یہی چیز ہے جو شہداء کو عام لوگوں سے ممتاز کر دیتی ہے، جو اللہ کے راستے میں شہید ہوتے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق غالب ہوتا ہے:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بارگاہ خداوندی میں اس کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اور ان پر اللہ سے ملاقات کا شوق غالب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ یہ شوق ہمیں بھی نصیب فرمائے، آمین۔

آنحضرت ﷺ کی ایک دعا مناجات مقبول میں (بحوالہ مستدرک ج:۱ ص:۵۲۴) ہے:

''وَشَوْقًا اِلٰی لِقَاءِ کَ مِنْ غَیْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَّفِتْنَةٍ مُّضِلَّةٍ.'' ''یا اللہ، آپ کی ملاقات کا شوق مانگتا ہوں، لیکن یہ شوق اس قدر غالب نہ آجائے کہ بدن کو نقصان پہنچ جائے اور کسی فتنہ میں مبتلا ہوجاؤں۔'' دنیا کے کام سے رہ جاؤں اور کوئی اور ٹوٹ پھوٹ کا کام کرنے لگوں، اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اپنی ملاقات کا شوق نصیب فرمائے:

اے خوشا وقت کذیں منزل ویراں بروم

نظر کردم گر بسراید ایں غم روزے

کیا مبارک وقت ہوگا کہ اس منزل ویران سے میں جاؤں گا اور محبوب کو دیکھوں گا اور اس کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کروں گا، میں نے بھی منت مانگ رکھی ہے کہ یہ چند دن کا جو غم ہے ختم ہوجائے، دنیا کی زندگی ختم ہوجائے:

''تادر میکدہ شاہ جان غزل خواں میروم''

میکدے کے دروازے تک خوشی میں غزل پڑھتے ہوئے اور ناچتے ہوئے جاؤں گا، آج اذن ملا ہے بارگاہ خداوندی میں حاضری کا۔ سبحان اللہ!

تو حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جن پر اشتیاق اور لقاءِ الٰہی کا غلبہ تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا شوق غالب تھا، عقلی طور پر تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں، کہ ہم بھی اللہ کی ملاقات کو اچھا سمجھتے ہیں، لیکن جب یہ تصور آتا ہے کہ پہلے عزرائیل علیہ السلام آکر گلا دبائیں گے تو ہم کانپ جاتے ہیں، موت کا تصور اتنا خوفناک ہے کہ ہم اس کی تمنا کی جرأت بھی نہیں کرسکتے اور کرنی بھی نہیں چاہئے کہ یااللہ مجھے موت دے دے، یہ دعا بھی نہیں کرنی چاہئے، اس کی بھی اجازت نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''فَاِنْ كَانَ لَا بُدَّ مُتَمَنِّيًا فَلْيَقُلْ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَاكَانَتِ الْحَيٰوةُ خَيْرًا لِّيْ. وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ'' (مسلم ج:۲ ص:۳۴۲)

ترجمہ:...... ''جس کو موت مانگنی ہی ہو تو یوں کہے: یا اللہ مجھے زندہ رکھ جب تک کہ زندگی میرے حق میں اچھی ہو، اور مجھے وفات دے دے جب کہ آپ کے علم میں وفات میرے لئے بہتر ہو۔''

اللہ تعالیٰ زندہ رکھیں تو اسلام پر زندہ رکھیں، اور موت دیں تو ایمان کی موت دیں، "اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ." یہ دعا ہم ہر نماز جنازہ میں پڑھتے ہیں کہ یااللہ جس کو آپ ہم میں سے زندہ رکھیں اسلام پر زندہ رکھیئے اور جس کو آپ وفات دیں تو ایمان پر وفات دیں، کم سے کم اتنا تو ہو کہ یا اللہ زندگی مطلوب نہیں، بلکہ زندہ رہ کر آپ کی اطاعت مطلوب ہے، کیونکہ یہاں ہمیں بھیجا گیا ہے کچھ کمانے کے لئے، اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں بسانے کے لئے، ذکر کے لئے، تسبیح کے لئے، نماز کے لئے، اور اس کے لئے جتنی مہلت مل جائے، غنیمت ہے، زیادہ سے زیادہ کما لیں، زندگی بجائے خود مطلوب نہیں، بلکہ یاد الٰہی کے لئے مطلوب ہے، جتنا یاد کریں گے اور جتنا وقفہ گزرے گا، اتنا ہی اشتیاق اللہ کی ملاقات کا بڑھے گا، اور جب ملاقات اشتیاق کے بعد ہوگی تو اس طرح ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوں گے اور یہ اللہ تعالیٰ سے خوش ہوگا اور ارشاد ہوگا:

> "يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً." (الفجر:۲۸)
>
> ترجمہ:......"اے اطمینان والی روح تو لوٹ اپنے رب کی طرف، اس حال میں کہ وہ تجھ سے راضی اور تو اس سے راضی۔"

اور اگر خدانہ کرے کہ یہ نصیب نہ ہو تو پھر گدھے کی موت میں اور اس کی موت میں کیا فرق ہے؟ کتے کی موت میں اور اس کی موت میں کیا فرق ہے؟ فرق یہ ہے کہ گدھے اور کتے پر عذاب نہیں ہوگا، حساب و کتاب نہیں ہوگا، اس کا حساب بھی ہوگا، عذاب بھی ہوگا۔

فقر افضل ہے یا غنا؟:

فقر کہتے ہیں خالی ہاتھ ہونے کو اور غنا کہتے ہیں مالدار اور غنی ہونے کو، پھر اس میں اختلاف ہے کہ ان دونوں میں سے افضل کون سا ہے، فقر افضل ہے یا غنا افضل ہے؟ امام غزالی رحمہ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں دونوں طرف کے دلائل جمع کردیئے ہیں۔

غنا کی فضیلت کے دلائل:

ایک فریق کہتا ہے کہ غنا افضل ہے، اس لئے کہ اگر مال اس کے پاس ہوگا اور اس کو یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے گا تو دین و دنیا کا تمام نظام چلے گا، اور اگر سب کے سب فقیر ہوتے تو نظام عالم کیسے چلتا؟

دوسری بات یہ کہ جس کے پاس مال ہوتا ہے اس کے لئے اجر و ثواب کمانے کے بہت سے ذرائع اس کو حاصل ہوتے ہیں، فقیر آدمی بیچارہ کچھ بھی نہیں کرسکتا، یتیموں کی، بیواؤں کی اور ناداروں کی خدمت کرنا کتنا بڑا کلہ ثواب ہے؟ اب یہ کام مالدار ہی کر سکتے ہیں، فقیر تو نہیں کر سکتے، مساجد کا بنانا، مدرسوں کا بنانا، رفاہ عامہ کی چیزوں کا بنانا، یہ مال دار ہی کر سکتے ہیں، فقیر آدمی نہیں کرسکتا، جیسا کہ حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ اَنَّ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِیْنَ اَتَوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا قَدْ ذَهَبَ اَهلُ الدُّثَارِ بِالدَّرَجَاتِ الْعُلٰی وَالنَّعِیْمِ الْمُقِیْمِ. فَقَالَ وَمَا ذَاکَ؟ قَالُوْا یُصَلُّوْنَ کَمَا نُصَلِّیْ وَیَصُوْمُوْنَ

كَمَا نَصُوْمُ وَيَتَصَدَّقُوْنَ وَلَا نَتَصَدَّقُ وَيُعْتِقُوْنَ وَلَا نُعْتِقُ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفَلَا اُعَلِّمُكُمْ شَيْئًا تُدْرِكُوْنَ بِهٖ مَنْ سَبَقَكُمْ وَ تَسْبِقُوْنَ بِهٖ مَنْ بَّعْدَكُمْ وَلَا يَكُوْنُ اَحَدٌ اَفْضَلَ مِنْكُمْ اِلَّا مَنْ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُمْ؟ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ تُسَبِّحُوْنَ وَتُكَبِّرُوْنَ وَتُحَمِّدُوْنَ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلٰوةٍ ثَلَاثًا وَثَلَاثِيْنَ مَرَّةً............الخ. وَفِيْ رِوَايَةٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ تَسْبِيْحَةً، ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ تَحْمِيْدَةً، وَأَرْبَعًا وَّثَلَاثِيْنَ تَكْبِيْرَةً." (مسلم ج:۱ ص:۲۱۹)

خلاصہ یہ کہ فقراءِ مہاجرین نے شکایت کی تھی کہ سارا اجروثواب تو یہ مالدار حضرات لے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیسے؟ تو انہوں نے کہا: "نُصَلِّی وَهُمْ يُصَلُّوْنَ" مہاجرین نے کہا کہ ہم بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، ہم روزہ رکھتے ہیں، وہ بھی روزہ رکھتے ہیں، (ہم دین کے دوسرے کام کرتے ہیں، وہ بھی کرتے ہیں) وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، ہم خرچ نہیں کرسکتے، (اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا بہت بڑا ثواب ہے، تو وہ اجر لے گئے) وہ غلام آزاد کرتے ہیں، ہم غلام آزاد نہیں کرسکتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں ایک ترکیب بتادیتے ہیں تم ان کے برابر آجاؤ گے اور اپنے بعد میں آنے والوں سے تم بڑھ جاؤ گے، اور تم سے سوائے ان لوگوں کے جو تم کرو وہ بھی وہی کریں، کوئی افضل نہیں ہوگا۔ فقراءِ مہاجرین نے کہا اے اللہ کے رسول! ضرور بتایئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم ہر نماز کے بعد تسبیحات پڑھ لیا کرو یعنی ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمدللہ اور ۳۴ بار اللہ

اکبر پڑھا کرو۔

یہ کلمات تم لوگ پڑھ لیا کرو، کوئی بھی اس دن تمہارے برابر نہیں پہنچ سکے گا اتنا تمہیں اجروثواب ملے گا، کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا مال دار بھی خیرات کر کے تمہارے برابر نہیں آئے گا، مال دار صحابہ کو پتہ چلا تو انہوں نے بھی یہ کلمات پڑھنا شروع کردیا، فقرا مہاجرین نے پھر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے مالدار بھائیوں کو آپ کے اس ارشاد کا پتہ چلا، انہوں نے بھی پڑھنا شروع کردیا، وہ پھر ہم سے آگے نکل گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "ذَالِکَ فَضُلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ." یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ جس کو چاہتے ہیں عطا کرتے ہیں۔

تو ایک فریق اس بات کا قائل ہوا ہے کہ غنا افضل ہے فقر سے، اوران کے پاس مضبوط دلائل ہیں۔

فقر کی فضیلت کے دلائل:

لیکن دوسرا فریق کہتا ہے کہ نہیں فقر افضل ہے غنا سے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ ساری زندگی فقیر رہے، آنحضرت ﷺ نے کبھی مالدار ہونے کی دعا نہیں کی، بلکہ آپ یہ دعا مانگا کرتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِیْ مِسْكِيْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْكِيْنًا
وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ." (مشکوٰۃ ص:۴۴۷)

یعنی یہ دعا کی کہ "یا اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین ہونے کی حالت میں موت دے، اور قیامت کے دن بھی مجھے مسکینوں میں اٹھا۔" یعنی میرا حشر مسکینوں میں فرما، مالداروں میں نہیں، اس لئے فرمایا گیا ہے کہ فقرا مہاجرین، مالداروں سے آدھا

دن پہلے جنت میں داخل ہوجائیں گے، اور آدھا دن ہے پانچ سو سال کا، تم نے پچاس، ساٹھ سال کی عمر میں عیش اڑائے، دنیا کی نعمتوں سے اور فقیر کو یہ راحت نہیں ملی اور وہ تم سے پانچ سو سال پہلے جنت میں پہنچ گیا اور اس نے وہ توکسر پوری کرلی، لہٰذا ان لوگوں کے پاس بھی مضبوط دلائل ہیں اور زیادہ قوی ہیں، زیادہ تر صوفیا کرام کا رجحان اسی طرف ہے کہ فقر افضل ہے۔

قول فیصل:

ایک تیسرے فریق نے کہا کہ علی الاطلاق نہ غنا افضل ہے، نہ فقر افضل ہے، بات یہ ہے کہ غنا کی اپنی جگہ فضیلتیں ہیں اور فقر کی بھی اپنی جگہ فضیلتیں ہیں، لیکن ہر نعمت کے ساتھ بلا بھی لگی ہوئی ہوتی ہے، ایک بلا لگی ہوئی ہے نعمت کے ساتھ اور وہ ہے مالدار ہونے کی وجہ سے ''کبر'' کا پیدا ہونا، مالداری عموماً کبر پیدا کردیتی ہے، اگر کسی کے پھٹے ہوئے کپڑے ہوں تو مال دار اس کی عزت نہیں کرتا، اپنے کبر کی وجہ سے، اس کی عزت نہیں کرتا، یہ سمجھتا ہے کہ جس کے پاس مال ہوتا ہے وہ بڑا آدمی ہوتا ہے اور جس کے پاس مال نہیں ہوتا ہے وہ چھوٹا آدمی ہوتا ہے، اور اس سے بہت سی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، میں تفصیل میں نہیں جاتا، وقت نہیں ہے، اسی طرح ایک بلا فقر کے ساتھ لگی ہوئی ہے اور وہ ہے ''شکایت کی'' کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیوں نہیں دیا، شکایت کی تو مارا گیا، گویا تجھ پر اللہ تعالیٰ نے ظلم کیا ہے اور تیرے ساتھ اس نے بے انصافی کی ہے؟ وہ اُس راستے سے مارا گیا، یہ اِس راستے سے مارا گیا۔ اس لئے خوش قسمت وہ آدمی ہے جس کو اللہ تعالیٰ مالداری عطا فرمائیں اور پھر کبر سے اور خواہش نفسانی سے بچائے رکھا، مال کو اپنی خواہشات میں خرچ کرنے کے بجائے رضائے

الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنائے رکھا، اور یہ سمجھتا رہا کہ مال میرے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، مال مجھے اپنے نفس کی پوجا پاٹ کرنے کے لئے نہیں دیا گیا، بلکہ خلق خدا کو نفع پہنچانے کے لئے دیا گیا ہے، دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں، میں تقسیم کرنے والا ہوں، تقسیم کا کام میرے ذمہ لگا دیا گیا ہے۔

آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے "اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ" (مشکوٰۃ ص:۳۲) میں تو تقسیم کرنے والا ہوں، اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں، آپ ﷺ خود فقیر تھے، لیکن کون سا بادشاہ ہوگا کہ جس نے اتنے خزانے لٹائے ہوں گے، جتنے رسول اللہ ﷺ نے لٹائے؟ اور کون سا سائل تھا جو آپ ﷺ کے در سے خالی گیا ہو؟ لیکن تواضع کا یہ حال تھا کہ آپ ﷺ فرماتے میں کسی کو نہیں دیتا، بلکہ میں تو تقسیم کرتا ہوں، عطا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں، تو اگر غنا ان آفات سے محفوظ ہے، تو بہت اچھی چیز ہے، اور دوسری طرف فقر اگر شکایت سے محفوظ رہے اور وہ کیفیت پیدا ہوجائے، جو حضرت ابو درداءؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرما رہے ہیں کہ میں تَوَاضُعًا لِلّٰہِ فقر کو پسند کرتا ہوں، کیونکہ مال ہوگا تو سمجھا جائے گا کہ یہ مالک ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اپنے مالک کے سامنے، اپنا مالک ہونا منسوب کروں، بندہ اس کو کہتے ہیں کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو اور بندگی یہ ہے کہ اس کی کوئی خواہش نہ رہے، اس کی ملکیت میں کچھ نہ ہو، اس کے ہاتھ میں کچھ نہ ہو، اس کی کوئی خواہش پوری نہ ہو، اسی طرح فقیر کا فقر کے بارے میں یہ نظریہ ہو کہ چونکہ فقر اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اس لئے وہ اس پر خوش رہے اور کہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عبدیت کا مقام عطا فرمایا ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:

ما ہیچ نہ داریم غمِ ہیچ نہ داریم
دستار نہ داریم غم نہ پیچ داریم

ترجمہ:...... ''ہم کچھ نہیں رکھتے اور کسی چیز کا غم بھی نہیں رکھتے پگڑی ہوگی تو سر پر باندھنے کی فکر ہوگی اور اگر پگڑی نہیں ہوگی تو باندھنے کی بھی فکر نہ ہوگی۔''

فقر کے فوائد:

جن فقراء پر اللہ تعالیٰ نے حقیقت کھول دی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جتنا کم ہوگا اتنا حساب بھی کم ہوگا، اور جتنا سامان زیادہ ہوگا، اتنا جھنجھٹ بھی زیادہ ہوگا، ہم باہر ملک سے سفر کرکے آتے ہیں، اگر ہاتھ میں ایک صرف دستی بیگ ہو تو جہاز سے اترتے وقت کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے، بلکہ جلدی سے ایئرپورٹ سے نکل جاتے ہیں، اور اگر سامان کا ڈھیر ساتھ ہوتا ہے تو پہلے تو وزن کراؤ گے جہاز پر جمع کرنے کے لئے اور اگر سامان مقدار سے زیادہ ہوا تو اس کا جرمانہ ادا کرو گے یعنی کرایہ دو گے اور پھر یہاں ایک ایک چیز کی تفتیش ہوگی، کسٹم والے تفتیش کریں گے، اِدھر والے بھی کریں گے اور اُدھر والے بھی کریں گے، کتنا وقت لگے گا، اب ایک آدمی کو گھر جانا ہے، گھر بھی کون سا جنت کا اور وہ وہاں پھنسا ہوا ہے، دوسری طرف ایک آدمی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا صرف ایک چادر تھی جو کندھے پر ڈالی او. چل پڑا، سواری تیار ہے بیٹھ جاؤ، تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیں گے، ان دونوں کا جب موازنہ کیا جائے تو پھر تو ایسا لگتا ہے کہ فقر بہت اچھی چیز ہے، لیکن داروئے تلخ ہے، دوائی کافی کڑوی ہے، ہر ایک آدمی کے حلق سے نیچے نہیں اترتی۔

کوئی اللہ کے بندے ہوں گے جو اس کو انگیز کرتے ہوں گے، تو فقر سے تواضع پیدا ہوتی ہے اور حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں

"تواضعًا للّٰہ" اللہ تعالیٰ کے سامنے متواضع بننے کے لئے اپنی عبدیت کا اظہار کرنے کے لئے کہ صاحب مجھے کچھ نہیں چاہئے، مجھے تو صرف بندگی چاہئے، اور کچھ نہیں چاہئے، فقر کو ترجیح دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے بہت سے بندے ایسے ہوئے ہیں کہ وہ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ کوئی چیز ان کی ملک میں نہیں تھی۔

صحت نہیں، علاج مقصود ہے:

تیسری چیز کہ میں مرض کو پسند کرتا ہوں، لوگ صحت کو پسند کرتے ہیں، بڑی بڑی گرانقدر فیسیں دیتے ہیں، بیماری دور کروانے کے لئے، اور آدمی کا بدن اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ ایک بیماری کا علاج کرلو، دوسری کھڑی ہے، کہاں تک کرتے جاؤ گے؟ تم علاج کرواتے ہو، موت سے بچنے کے لئے، موت سے تو بچنا ممکن نہیں ہے، ہاں ہمارے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے تھے کہ علاج مقصود ہے، صحت مقصود نہیں، سبحان اللہ! کیا بات ہے، حکم ہے کہ علاج کرواؤ:

"یَا عِبَادَ اللّٰهِ! تَدَاوَوْا. فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ یَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهٗ شِفَاءً. غَیْرَ دَاءٍ وَّاحِدٍ اَلْهَرَمُ."

(مشکوٰۃ ص:۳۸۸)

آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری ایسی پیدا نہیں کی، جس کی دوا پیدا نہ کی ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ کے بندو! علاج کروایا کرو" اور ایک حدیث شریف میں فرمایا کہ: "مَاجَعَلَ اللّٰهُ دَاءً اِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ دَوَاءً اِلَّا

اَلْهَرَمُ.'' ایک روایت میں ''اِلَّا الْمَوْتُ.''

'' اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کی دوا پیدا کی ہے، لیکن بڑھاپے کی کوئی دوا نہیں۔'' اورایک روایت میں ہے کہ ''موت کی کوئی دوا نہیں۔'' جس کا وقت مقدر آچکا ہے اس کوتم بہترین قسم کا علاج مہیا کرو، بچے گا نہیں، ہمارے دیہاتی محاورہ میں کہتے ہیں کہ:

''جب اللہ کو شفا دینی ہوتو راکھ کی چٹکی سے دے دیتے ہیں، اور جب شفا نہ دینی ہوتو ہیرے جواہرات کے کشتے بھی کھلادو کچھ نہیں بنے گا، شفا نہیں ہوگی۔'' بہرکیف دوا کرنی چاہئے اور ہم تو کمزور آدمی ہیں، جب تک علاج نہ کروائیں اطمینان نہیں ہوتا اور دل مطمئن نہیں ہوگا، مگر علاج اس لئے نہ کرواؤ کہ علاج سے صحت حاصل ہوگی، نہیں، صحت میرے مالک کے پاس ہے، شفا میرے مالک کے پاس ہے، حکیموں ڈاکٹروں کے پاس اور دوائیوں میں شفا نہیں ہے، شفا میرے مالک کے پاس ہے، جب چاہتے ہیں شفا عطا فرماتے ہیں، لیکن کچھ بندے اللہ تعالیٰ کے ایسے ہوئے ہیں جیسے حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ، وہ فرماتے ہیں کہ نہیں! دوا کی ضرورت نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے، آخری مرض الوفات میں، عرض کیا گیا کہ حضرت کسی طبیب کو بلائیں؟ فرمایا طبیب آیا تھا، عرض کیا گیا کہ اس نے کیا کہا؟ فرمایا کہ اس نے کہا کہ بہت اچھی حالت میں ہو، بالکل ٹھیک ہو، اور طبیب اللہ تعالیٰ تھے، مالک نے جو حالت دی ہے وہ بالکل ٹھیک حالت ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو آخری تکلیف ہوئی، زہر دے دیا گیا تھا، لوگوں نے کہا کہ طبیب کو بلائیں؟ فرمایا ضرورت نہیں ہے، پھر بے ہوشی ہوگئی تو لوگوں نے طبیب کو بلالیا، یعنی ایک نصرانی طبیب کو بلایا گیا، جب ہوش آیا تو شکایت

کی کہ اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ میں نے اپنی بیماری کی شکایت اس کے دشمن کے سامنے کی تھی؟ بیماری اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور نصرانی اللہ کا دشمن، بہرحال علاج کروانا فرض نہیں ہے، یہ مسئلہ یاد رکھو! البتہ علاج کروانا اچھا ہے، مستحب ہے، فرض نہیں ہے، اگر کوئی شخص بیمار ہوجائے اور اپنا علاج نہ کروائے تو گناہ گار نہیں ہے، علاج کی اجازت دی گئی ہے، فرض نہیں کیا، جب بھوک لگے، روٹی کھانا فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سنت یہ قائم کی ہے کہ بھوکا آدمی روٹی کھالے تو اس کو تسکین ہوجاتی ہے، پیاسا آدمی پانی پی لے تو اس کو تسکین ہوجاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ سنت نہیں ہے کہ بیمار آدمی علاج کرائے تو اس کو لازماً شفا ہوجائے، ہاں کبھی ہو بھی جاتی ہے، اور کبھی نہیں بھی ہوتی، لیکن بیماری کفارہ سیئات ہے، یعنی گناہوں کا کفارہ ہے، بیماری سے سارے گناہ جھڑ جاتے ہیں، انشاءاللہ اس مضمون کو پھر کسی دوسرے وقت میں بیان کریں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خوفِ خدا اور فکرِ آخرت

بندے کے قدم اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے جب تک اس سے چار سوال نہ کر لئے جائیں، دیکھنے میں تو یہ چار سوال بہت چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں، مگر ان چار سوالوں کے جواب دئے بغیر کسی کے قدم اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین

وعلی آلہ الطیبین الطاہرین اما بعد!

قاری صاحب نے جو رکوع تلاوت کیا ہے اس میں ایک آیت یہ آئی:

"فَأَمَّا مَنْ طَغىٰ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا. فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَأْوٰى. وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى. فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى." (نازعات:۳۷ تا ۴۱)

ترجمہ:......"جس شخص نے سرکشی کی (اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کی اور سر پھیر لیا) اور اس نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ تو بیشک دوزخ اسکا ٹھکانہ ہے۔ لیکن جو شخص ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے (یعنی ایک دن اللہ کے سامنے

کھڑے ہونا ہے، اور اس کے دل میں اس کا خوف و خیال پیدا
ہوگیا کہ مجھے اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے) اور نفس کو روکے رکھا
خواہشات سے پس اس شخص کا ٹھکانہ جنت ہوگا۔''

بارگاہ الٰہی میں:

قیامت کے دن جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا، وہ بغیر کسی وکیل کے اور بغیر کسی معین اور مددگار کے حاضر ہوگا۔

وہ تو سب سے بڑی عدالت ہوگی، جب کہ یہ بیچارہ دنیا کی معمولی عدالتوں میں بھی کبھی پیش نہیں ہوا تھا اور اگر خدانخواستہ کبھی ضرورت پیش آئی تو وکیل کرلیا کرتا تھا، لیکن قیامت کے دن کسی کا کوئی وکیل نہ ہوگا، کوئی اس کی طرف سے جواب دہی کرنے والا نہیں ہوگا، ہر آدمی کو اپنے تمام اعمال کی خود جواب دہی کرنی ہوگی۔

چار سوال:

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''لَاتَزُوْلُ قَدَمَا عَبْدٍ یَّوْمَ الْقِیَامَةِ حَتّٰی یُسْئَلَ عَنْ اَرْبَعٍ ......الخ.'' (ترمذی ج:۲ ص:۶۴) بندے کے قدم اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے جب تک اس سے چار سوال نہ کرلئے جائیں، دیکھنے میں تو یہ چار سوال بہت چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں، مگر ان چار سوالوں کے جواب دئے بغیر کسی کے قدم اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے وہ چار سوال یہ ہیں:

۱:...... ''عَنْ عُمْرِهٖ فِیْمَ اَفْنَاهُ؟'' پہلا چھوٹا سا سوال یہ ہوگا کہ عمر کس چیز میں ضائع کی؟

میری عمر ۷۰ کے قریب ہوگئی ہے، مجھے تو صبح کا کھانا بھی یاد نہیں رہتا کہ کیا

کھایا تھا؟ تو اس سے کہا جائے گا کہ اپنی پوری زندگی کس چیز میں خرچ کی تھی؟ اس کا جواب دو۔

۲:...... "وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَ اَبْلَاهُ؟" دوسرا سوال یہ ہوگا کہ:"جوانی کس چیز میں بوسیدہ کی؟" بڈھا ہوگیا، پہلے بچہ تھا، پھر جوان ہوا، پھر بوڑھا ہوگیا، اس جوانی کو کہاں ضائع کیا؟

۳:...... "وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ أَيْنَ اِكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَ؟" مال کے بارے میں دو سوال ہوں گے، ایک یہ کہ کہاں سے حاصل کیا تھا؟ اور دوسرا یہ کہ کس جگہ خرچ کیا؟ دنیا میں تو چونکہ ہمارے اوپر کوئی نگران نہیں ہے کہ کہاں سے لیتے ہیں اور کہاں خرچ کرتے ہیں؟ اس لئے ہم نے یہ تصور کرلیا ہے کہ ہمارے اوپر کبھی کوئی نگران نہیں ہوگا، اور ہم سے کوئی نہیں پوچھے گا۔

۴:...... اور چوتھا سوال:"وَعَنْ عِلْمِهٖ بِمَاذَا عَمِلَ فِيْهِ" یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں علم عطا فرمایا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟ اس کا غالباً ہم بہت آسان سا جواب دیں گے کہ ہم نے علم حاصل ہی نہیں کیا، اور اگر یہ پوچھ لیا گیا کہ کیوں نہیں کیا تو پھر......؟

انعامات کے بارے میں سوال:

بہرحال انسان سے تمام نعمتوں اور مال و دولت سے متعلق سوال کیا جائے گا، جیسا کہ حدیث میں ہے:

"عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ يُجَاءُ بِابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَأَنَّهٗ بَذَجٌ فَيُوْقَفُ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ تَعَالیٰ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ اَعْطَيْتُكَ وَخَوَّلْتُكَ وَأَنْعَمْتُ عَلَيْكَ فَمَاذَا

أَصْنَعْتَ؟ فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ جَمَعْتُهٗ وَثَمَّرْتُهٗ وَتَرَكْتُهٗ اَكْثَرَ مَاكَانَ فَارْجِعْنِیْ اٰتِکَ بِهٖ كُلِّهٖ. فَيَقُوْلُ لَهٗ أَرِنِیْ مَا قَدَّمْتَ فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ جَمَعْتُهٗ وَثَمَّرْتُهٗ فَتَرَكْتُهٗ أَكْثَرَ مَا كَانَ فَارْجِعْنِیْ اٰتِکَ بِهٖ كُلِّهٖ فَإِذَا عَبْدٌ لَّمْ يُقَدِّمْ خَيْرًا فَيُمْضٰی بِهٖ اِلَی النَّارِ."

(ترمذی ج:۲ ص:۶۵)

ترجمہ:...... ''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: قیامت کے دن آدمی کو ایسی حالت میں لایا جائے گا کہ وہ بھیڑ کے بچے کی طرح (ذلیل وحقیر) ہوگا۔ پس اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میں نے تجھ کو بہت کچھ عطا کیا تھا، میں نے تجھے مال و دولت سے نوازا تھا، میں نے تجھ پر انعامات کئے تھے، پس تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں نے مال خوب جمع کیا اور اسے خوب بڑھایا، اور اسے زیادہ سے زیادہ حالت میں چھوڑ کر آیا ہوں، اب مجھے واپس کردیجئے! میں اسے لے کر آتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ مجھے یہ بتا کہ تو نے آگے کیا بھیجا؟ وہ کہے گا اے پروردگار! میں نے اِسے خوب جمع کیا اور خوب بڑھایا اور اسے زیادہ سے زیادہ حالت میں چھوڑ کر آیا ہوں، اب مجھے واپس بھیج دیجئے، وہ سارے کا سارا آپ کو لاکر دے دوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بندے نے کوئی خیر آگے نہ بھیجی

ہوتو اسے دوزخ کی طرف چلتا کردیا جائے گا۔‘‘

خلاصہ یہ کہ: ’’اللہ تعالیٰ بندے سے پوچھیں گے کہ میں نے تجھے بہت مال دیا تھا تو نے اس میں کیا عمل کیا اور کہاں خرچ کیا؟ بندہ کہے گا کہ: ’’یااللہ! وہ سارے کا سارا میں چھوڑ کر آگیا ہوں، مجھے واپس بھیج دے، میں واپس لے آتا ہوں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں پوچھتا ہوں کہ میرے لیے کیا لایا؟ ایک دفعہ جو چلا گیا اس کے واپس آنے کا سوال نہیں ہے۔

آنکھ کھل گئی:

جیسے ایک بنیا (ہندو) تھا لوگوں سے سود لیا کرتا تھا اور وہ ظالم لوگوں کی آٹے کی کنالی میں گوندھا ہوا آٹا اٹھا کر لے جاتا تھا، اسی طرح ہنڈیا تیار ہوتی تھی، اٹھا کر لے جاتا تھا۔ایک دن خواب میں دیکھتا ہے کہ اپنے مقروض سے کہہ رہا ہے کہ آج سود کے دو روپے دیدو، وہ کہتا ہے: ’’لالہ جی! ایک روپیہ ہے آج میرے پاس بس یہی ہے لے لو، لالہ جی کہتا ہے نہیں دوروپے دیدو اور مقروض کہہ رہا تھا ایک لے لو، اسی دو ایک کی بحث میں اس کی آنکھ کھل گئی، لالہ جی جلدی سے آنکھ بند کر کے کہنے لگا چلو ایک ہی دیدو!، اب تو آنکھ کھل گئی ہے بھئی اب آنکھ بند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

عبرت چاہئے:

میرے بھائیو! ہم لوگ غافل ہوگئے ہیں! اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا، بے شار نعمتیں عطا فرمائیں، لیکن ہم نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں کہ میں کسی مالک کا بھیجا ہوا کارندہ ہوں، اس نے مجھ سے حساب بھی لینا ہے، بھائی یہ نہ سوچا کہ میں کسی آقا کا

ملازم ہوں تو مالک نے مجھ سے حساب بھی لینا ہے، ہمیں یہ بات بھی بھول گئی۔ کھانے میں، پینے میں، اور عیش وعشرت میں کچھ ایسے مگن ہوئے اور کچھ ایسے مست اور ایسے مدہوش ہوگئے کہ ہمیں آگا پیچھا، کچھ بھی یاد نہیں رہا، نہ یہ یاد رہا کہ کہاں سے آئے تھے؟ نہ یہ یاد رہا کہ کہاں جانا ہے؟ ہمارے خواجہ مجذوب رحمہ اللہ کا قول ہے کہ:

دفن خود صدہا کئے زیر زمین
پھر بھی مرنے پہ نہیں تجھ کو یقین
کچھ تو عبرت چاہئے نفس لعین

خود اپنے ہاتھ سے لوگوں کو دفن کیا، اپنے ماں باپ کو دفن کیا، اپنے بزرگوں کو دفن کیا، وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے، اور ہم نے کبھی ان کی خبر بھی نہیں لی اور خبر لے بھی کیسے سکتے تھے؟

قبر میں کوئی ٹیلیفون نہیں لگا ہوا، وہاں ٹیلیفون نہیں ہے کہ کوئی پیغام پہنچادیں یا خبر گیری کرلیں۔

مرنے کا یقین نہیں:

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ السلام سے لے کر اب تک اور اب سے لے کر قیامت تک لوگ قبروں میں پڑے ہوئے ہیں، ان کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئی ہیں، مٹی بن گئی ہیں، لیکن روح تو باقی ہے، جسم تو گل سڑ جاتا ہے لیکن روح تو باقی رہتی ہے، اور افسوس یہ ہے کہ جو گلنے سڑنے والا جسم ہے اس پر تو ہم نے بہت محنت کی اور جو ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے، اس پر کوئی محنت نہیں، لوگوں کو روزانہ مرتے دیکھتے ہیں لیکن اپنے مرنے کا یقین نہیں آتا۔

ہمیں یقین ہے کہ ایک وقت تھا کہ اس مکان میں میرا باپ رہتا تھا، مگر باپ چلا گیا، اور کل ہم نے بھی جانا ہے، لیکن ہمیں خیال ہی نہیں آتا، ہم اپنی موج سے رہ رہے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ فرمانے لگے: تیرا باپ زندہ ہے؟ کہنے لگا نہیں میرا باپ فوت ہوگیا۔

فرمانے لگے: اٹھ جا میرے پاس سے، جس کو اس کے باپ کے مرنے نے نصیحت نہیں دی، اس کو عمر بن عبدالعزیز کیسے نصیحت دے سکتا ہے؟

ہم ایک دو دن روتے ہیں، تیسرے دن قل کر لیتے ہیں، قل کر لیے پتہ نہیں ''قل'' کہاں سے نکال لئے، اللہ جانے؟

کیا قضائے نمازوں کی فکر کی؟

کوئی چنے پڑھتے رہتے ہیں، کوئی کچھ کرتے رہتے ہیں، کوئی کچھ کرتے رہتے ہیں، تیسرے دن قل پڑھ لیتے ہیں اور بس قل کر لئے ہیں، ان کے لیے دعا کر لیتے ہیں، ارے بھائی ابا جان کو کبھی دوبارہ بھی یاد کیا؟ کہ ان کے ذمہ کتنی نمازیں تھیں؟ کبھی ان کا حساب لگایا، یا کسی عالم سے پوچھا؟ کہ میرے ابا کی اتنی عمر ہوئی ہے اور اس کے ذمہ اتنی نمازیں تھیں؟

ایک خاتون نے مجھے لکھا کہ میرے پاس اتنا سونا تھا، بیس سال میری شادی کو ہوگئے ہیں، میں نے کبھی زکوٰۃ نہیں دی۔ اب میں زکوٰۃ دینا چاہتی ہوں تو کیسے دوں؟ میں نے پورے آٹھ دن لگا کر اس کا حساب نکالا، آٹھ دن میرے لگے حساب

نکالنے میں، بیس سال پہلے اتنی تھی، ایک سال کم ہوگیا تو اتنی زکوٰۃ ہوگئی وغیرہ وغیرہ اس کو بیس سال کا پورا حساب جوڑ کر کے دیا۔

اس نے اپنی زکوٰۃ کے بارے میں پوچھ لیا لیکن ابا کے بارے میں تو نہیں پوچھا۔

ہماری مدہوشی:

میرے بھائیو! ہم بالکل غافل ہوگئے، غفلت کی بھی ایک حد ہوتی ہے، مدہوشی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے؟ کبھی تو ہوش میں آجائیں۔ ہر آدمی سویا ہوا ہے کبھی تو جاگ پڑے، اب رمضان آجائیں گے، بہت کم آدمی ہوں گے جو ہم میں روزہ رکھنے والے ہوں گے، ورنہ ہم میں سے ہر ایک آدمی زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ یہ روزہ رکھنا، تراویح پڑھنا، قرآن سننا، سنانا، صرف مُلّاؤں کا کام ہے، روزہ رکھنے سے ہمارے کاروبار متأثر ہوتے ہیں، نماز کی اس کو توفیق نہیں ہوتی، ان لوگوں کو اپنے بچوں کو نصیحت کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، گھر والوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا یا ان سے کیسا معاملہ کرنا ہے اس کی توفیق نہیں ہوتی۔

معاف کیجئے! مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق ہے؟ صرف اتنا فرق ہے کہ ہم کھانا پلیٹوں میں ڈال کر کھا لیتے ہیں اور وہ بیچارے جو بھی ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے نظام بنایا ہے، وہ اس طرح کھا لیتے ہیں، عقل پر خدا جانے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ غالبًا اس دھرتی کی تأثیر ہی ایسی ہے جو یہاں پیدا ہوجاتا ہے اس کو واپس لوٹنے کا خیال ہی نہیں رہتا۔

دنیا والوں کی قسمیں:

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ تبلیغ دین میں جو ان کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، لکھتے ہیں کہ: دنیا میں رہنے والوں کی چند قسمیں ہیں، اس کو مثال دے کر فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک کشتی پر لوگ سوار ہوئے اور کشتی کسی جزیرے پر جا کر لگی، ملاح نے کہا کہ اپنی ضرورت کی چیزیں لے لو اور ذرا جلدی آؤ، بعض لوگوں نے اس نصیحت پر عمل کیا اور اپنی ضرورتیں پوری کیں اور فوراً آگئے اور اچھی جگہ سنبھال لی، کچھ لوگ ایسے ہوئے کہ وہ سیر سپاٹے میں لگ گئے اور جزیرے کے پتھر جمع کرنے میں لگ گئے اور ڈھیر سر پر لادلیا اور کشتی میں آئے تو دیکھا کشتی بھری ہوئی ہے اور بیٹھنے کی بھی جگہ نہیں ہے، سر پر بوجھ ہے وہ بہرحال پہنچ گئے، تیسری قسم کے لوگ کچھ ایسے مگن ہوئے کہ کشتی چھوٹ گئی۔ وہ پہنچے تو کشتی جا چکی تھی، وہ درندوں کا لقمہ بن گئے۔ فرمایا کہ یہاں آنے والے لوگوں کی بھی یہی مثال ہے۔

کچھ تو اللہ کے بندے وہ ہیں جن کو اپنی آخرت یاد رہی، اللہ کے سامنے جانا یاد رہا اور بعض وہ ہیں جنہوں نے بھلا دیا مگر ان کو جلدی عقل آگئی، بہرحال! کشتی میں سوار ہوگئے لیکن: قرآن مجید میں ہے: ”وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ.“ (الانعام:۳۱)

ترجمہ:...... ”اور وہ لوگ اٹھائے ہوئے ہوں گے اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر۔“

اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو یاد ہی نہیں رہا کہ واپس بھی جانا ہے، عام طور پر آج کل لوگوں کی حالت وہی ہوگئی جو یہاں کے لوگوں کی ہے، (برطانیہ میں) یہاں کے تو انگریزوں کو دیکھتے ہو اور دوسرے لوگوں کو دیکھتے ہو، جو بالکل

بھولے ہوئے ہیں، اور کچھ ان کی دیکھا دیکھی ہم بھی بھول گئے، آئے تو تھے یہاں کچھ کمانے کے لئے، مگر ان کو دیکھ کر ہم بھی بھول گئے۔ بالکل تھوڑا سا تعلق رہ گیا مسجدوں کے ساتھ، ورنہ ہماری بھی حالت وہی ہوگئی ہے۔

غفلت نہیں بیداری چاہئے:

بہرحال! مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ہمیں غفلت سے نہیں کام لینا چاہئے، جو فرصت ہمیں اللہ تعالیٰ نے دی ہے، اس فرصت کو غنیمت سمجھنا چاہئے اور جتنی تلافی ہوسکتی ہے، اتنی تلافی کرنی چاہئے، جب آدمی یہاں دنیا سے جائے گا تو خالی ہاتھ جائے گا، کوئی روپیہ، پیسہ ساتھ نہیں ہوگا، اور کوئی آدمی ساتھ نہیں ہوگا، قبر کا اکیلا گڑھا ڈھائی فٹ چوڑا اور چھ فٹ لمبا ہوگا، چادر اس پر لپٹی ہوئی ہوگی اور اس میں ڈال کر بند کرکے آجائیں گے، قبر میں کیا کیا ہوتا ہے؟ اس کو کیا عرض کریں؟

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْحُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ." (ترمذی ج:۲ ص:۷۳) ترجمہ: قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ (نعوذ باللہ)

قبر کا مراقبہ:

وہاں کتنے سانپ ہوں گے؟ اور کتنے بچھو ہوں گے؟ وہاں کتنی ایذا دینے والی چیزیں ہیں؟ میں کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں، مکان میں لیٹا ہوا ہوں، کمرہ بند ہے مکان اچھا خاصا ہے، لیکن فرض کرو باہر سے کوئی کنڈا لگا دے اور میرے نکلنے کی کوئی صورت نہ رہے تو میں کیا کروں گا؟ اتنی طبیعت پریشان ہوتی ہے اس بات کو سوچ کر، اور قبر کا معاملہ تو اور بھی زیادہ گہرا ہے، یہاں تو بتی جل رہی ہے، روشنی ہے، لیکن قبر

میں تو کوئی سوراخ بھی نہیں چھوڑا ہوا ہوگا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ مجھے بھی توفیق عطاءفرمائے، آپ حضرات کو بھی توفیق عطاء فرمائے، اپنی آخرت کو یاد رکھنے کی۔ رمضان المبارک آرہے ہیں اس کی تیاری کریں اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے معافی مانگیں، اور میرے بھائیو! میں ہمیشہ کہتا ہوں ''اپنی شکلیں رسول اللہ ﷺ کے مطابق بنالو'' تم نے یہ جو شکلیں بگاڑی ہوئی ہیں، یہ تمہیں کام نہیں دیں گی، جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا، اب اپنی شکل رسول اللہ ﷺ کے مطابق بناؤ، اور اپنے اعمال درست کرو، اور کسی اللہ والے کے پاس بیٹھو اور اس سے کچھ بات سمجھو، پوچھو، کچھ تعلیم لو، اللہ سبحانہ و تعالیٰ مجھے بھی ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے اور آپ کو بھی توفیق عطاء فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

کچھ تو اللہ کے بندے ایسے ہیں جن کو اپنی آخرت یاد رہی، اللہ کے سامنے جانا یاد رہا، اور بعض وہ ہیں جنہوں نے بھلا دیا مگر ان کو جلدی عقل آ گئی اور اکثر وہ لوگ ہیں جن کو یاد ہی نہیں رہا کہ واپس بھی جانا ہے۔

قبر کی تیاری

بے شمار لوگ آئے اور اپنے وقت پر چلے گئے، اپنے اپنے وقت پر ان کا بلاوا آگیا، وہ چلے گئے اور ہم اپنے بلاوے کے منتظر ہیں، نہیں معلوم کہ ہم میں سے کس کا کس وقت بلاوا آجائے؟ کیا ہم نے جانے کی تیاری بھی کی ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام وعلیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

حق تعالیٰ شانہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے پاک گھر میں بیٹھنے کی توفیق عطا فرمائی اور پھر اپنی عبادت ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی، مسجدیں اللہ کا گھر ہیں، جو شخص مسجدوں میں آتا ہے وہ اللہ کا مہمان ہوتا ہے، اور مہمان کی خاطر، تواضع کرنا صاحب خانہ پر حق ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں مسجد کے صحیح حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ہم مسجد میں آتے ہیں تو ہمیں اس پاک گھر کے آداب کی رعایت کی توفیق نہیں ہوتی۔

مسجد کے حقوق:

عام طور پر طالب علم اور نمازی حضرات، مسجدوں میں بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ گپ شپ اور باتیں کرتے ہیں، اس بات کا ہمیں دھیان ہی نہیں رہتا کہ ہم کس دربار میں حاضر ہیں؟ کس کے لئے آئے ہیں؟ اور یہاں سے کیا لے کر جارہے ہیں؟

چونکہ ہمارا مسجد میں آنا اور مسجد سے جانا روز مرہ کا معمول بن گیا ہے، اس لئے مسجد میں آنے سے ہم پر کوئی خاص کیفیت طاری نہیں ہوتی اور کوئی نئی بات ہم

یہاں لے کر آتے ہیں اور نہ لے کر جاتے ہیں، آپ چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جیسے آتے ہیں ویسے ہی چلے جاتے ہیں، اللہ پاک مجھے بھی اور آپ کو بھی صحیح ادب کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

قبر کی ہولناکیوں کا استحضار:

بے شمار لوگ آئے اور اپنے وقت پر چلے گئے، اپنے اپنے وقت پر ان کا بلاوا آگیا، وہ چلے گئے اور ہم اپنے بلاوے کے منتظر ہیں، نہیں معلوم کہ ہم میں سے کس کا کس وقت بلاوا آجائے؟ کیا ہم نے جانے کی تیاری بھی کی ہے؟

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ أَبُوْالْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا وَلَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًا. وَفِیْ رِوَایَةٍ وَلَخَرَجْتُمْ اِلَی الصُّعُدَاتِ......الخ"

(مشکوٰۃ ص:۴۵۶، ۴۵۷)

ترجمہ:......"اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر تم جان لو وہ چیز جس کو میں جانتا ہوں، تو تم کم ہنسا کرو اور زیادہ رویا کرو اور دھاڑیں مارتے ہوئے جنگلوں کی طرف نکل جاؤ۔"

حق تعالیٰ شانہ نے اپنی رحمت فرمائی ہے، وہ جو اگلا جہاں ہے جسے عالم برزخ کہتے ہیں اور جو مرنے کے بعد مجھ کو اور آپ کو پیش آنے والا ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر وہ منظر ہمارے سامنے آجائے تو وہ اتنا ہولناک ہے کہ ہم اپنے

مردے دفنانا چھوڑ دیں، کسی کی ہمت ہی نہ پڑے کہ قبروں میں مردہ کو دفن کرسکے، یہ تو حق تعالیٰ شانہ کا احسان ہے کہ ہم پر غفلت کا پردہ ڈال دیا ہے، کہ استحضار نہیں اور خیال ہی نہیں کہ ہمیں یہ مرحلہ پیش آنے والا ہے،

برزخ کے ہولناک مناظر:

حدیث میں ہے:

”عَنْ عُثْمَانَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ اَنَّہٗ کَانَ اِذَا وَقَفَ عَلٰی قَبْرٍ بَکٰی حَتّٰی یَبُلَّ لِحْیَتَہٗ. فَقِیْلَ لَہٗ تَذْکُرُ الْجَنَّۃَ وَالنَّارَ فَلَا تَبْکِیْ، وَتَبْکِیْ مِنْ ھٰذَا. فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الْقَبْرَ اَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَّنَازِلِ الْاٰخِرَۃِ. فَاِنْ نَجَا مِنْہُ فَمَا بَعْدَہٗ اَیْسَرُ مِنْہُ وَاِنْ لَمْ یَنْجُ مِنْہُ فَمَا بَعْدَہٗ اَشَدُّ مِنْہُ. قَالَ: وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا رَأَیْتُ مَنْظَرًا قَطُّ اِلَّا وَالْقَبْرُ اَفْظَعُ مِنْہُ.“

(مشکوٰۃ ص:۲۶)

ترجمہ:...... ”امیرالموٴمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جب قبر کا تذکرہ کرتے تو اتنا روتے کہ داڑھی مبارک تر ہوجاتی، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت آپ جنت اور دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں، مگر اتنے نہیں روتے، جتنا کہ قبر کے تذکرے پر روتے ہیں، فرمایا کہ: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ: قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے، اگر انسان یہاں کامیاب ہوا، تو اگلی منزلوں میں بھی کامیاب ہوجائے گا، اور اگر

یہاں ناکام ہوا تو اگلی منزلوں میں کامیابی کی کیا صورت اور کیا امید کی جاسکتی ہے؟ اور ارشاد فرمایا کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے یہ بھی سنا ہے کہ: ''میں نے جتنے مناظر دیکھے ہیں ان میں سب سے زیادہ خوفناک قبر کا منظر ہے۔''

آدمی یہاں تو یوں سمجھتا ہے کہ میں یہاں ہمیشہ رہنے کے لئے آیا ہوں، کوئی تیاری کرنے کی فکر ہی نہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اگلے جہان کی تیاری کی توفیق عطا فرمائے، بعض حضرات اور بعض بندے تو ایسے ہوں گے، جن کو اپنی آخرت کی تیاری کی، اپنی اگلی منزل کی تیاری کی فکر ہوگی کہ مجھے جانا ہے، اور جا کر حساب و کتاب دینا ہے، ایک تو بڑا حساب کتاب ہے، جو قیامت کے دن ہوگا، وہ تو بعد کی چیز ہے، یہ جو پہلا حساب ہے اور مرنے کے بعد کا مرحلہ ہے، اس کی فکر ہوگی کہ اتنی سی جگہ ہوتی ہے، جس میں آدمی کو لٹا دیتے ہیں، اور گویا کہتے ہیں لیٹ جا شاباش: کیونکہ مردہ بدست زندہ ہوتا ہے، اس کو جیسے بھی لٹادو، وہ بیچارہ لیٹ جائے گا، کیونکہ وہ تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتا، پھر اوپر سے اس کو بند کردیتے ہیں اور منوں مٹی ڈال دی، تاکہ بھاگ کر نہ آجائے حالانکہ وہ بے جان محض نہیں ہوتا بلکہ اس میں روح ڈالی جاتی ہے اور وہ اپنے دفن کرنے والوں کی جوتیوں کی آہٹ سنتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

''عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا وُضِعَ فِیْ قَبْرِہٖ وَتَوَلّٰی عَنْہُ اَصْحَابُہٗ اِنَّہٗ لَیَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِھِمْ اَتَاہُ مَلَکَانِ......الخ. وَفِیْ رِوَایَۃٍ: یُقَالُ لِاَحَدِھِمَا الْمُنْکَرُ وَلِلْاٰخَرِ النَّکِیْرُ.'' (مشکوٰۃ ص:۲۴،۲۵)

ترجمہ:...... ''حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''مردہ کو ابھی دفنانے والے کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہوتی ہے، یعنی جب وہ دفنا کر واپس ہوتے ہیں ان کے قدموں کی آہٹ سن رہا ہوتا ہے کہ دو فرشتے آجاتے ہیں جن کو منکر نکیر کہتے ہیں۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ان کو مبشر بشیر کہتے ہیں۔''

قبر میں تین سوال:

خلاصہ یہ کہ وہ اس سے بہت آسان سے تین سوال کرتے ہیں:

''وَعَنْ بَرَاء بْنِ عَازِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عَن رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَأْتِیْہِ مَلَکَانِ فَیُجْلِسَانِہٖ فَیَقُوْلَانِ لَہٗ مَنْ رَّبُّکَ؟ فَیَقُوْلُ رَبِّیَ اللّٰہُ. فَیَقُوْلَانِ لَہٗ مَادِیْنُکَ؟ فَیَقُوْلُ دِیْنِیَ الْاِسْلَامُ. فَیَقُوْلَانِ مَا ھٰذَا الرَّجُلُ الَّذِیْ بُعِثَ فِیْکُمْ؟ فَیَقُوْلُ ھُوَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم. فَیَقُوْلَانِ لَہٗ وَمَا یُدْرِیْکَ؟ فَیَقُوْلُ قَرَأْتُ کِتَابَ اللّٰہِ فَاٰمَنْتُ بِہٖ وَصَدَّقْتُ.........فَیَقُوْلَانِ مَنْ رَّبُّکَ؟ فَیَقُوْلُ ھَاہَ ھَاہَ لَا اَدْرِیْ. فَیَقُوْلَانِ لَہٗ مَادِیْنُکَ؟ فَیَقُوْلُ ھَاہَ ھَاہَ لَا اَدْرِیْ. فَیَقُوْلَانِ مَاھٰذَا الرَّجُلُ الَّذِیْ بُعِثَ فِیْکُمْ.....الخ.'' (مشکوٰۃ ص:۲۵)

ترجمہ:...... ''حضرت براءؓ بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس آدمی کے

پاس دو فرشتے آتے ہیں اس کو قبر میں بٹھاتے ہیں پھر وہ دونوں فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں کہ: تیرا رب کون ہے؟ (اگر تو وہ نیک آدمی ہوتا ہے تو) کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ پھر وہ دونوں فرشتے اس نیک آدمی سے سوال کرتے ہیں کہ: تیرا دین کیا ہے؟ وہ نیک آدمی جواب دیتا ہے کہ میرا دین اسلام ہے۔ پھر وہ فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں کہ اس آدمی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جو تم میں بھیجا گیا تھا؟ وہ آدمی کہتا ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر وہ فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں کہ تجھے کیسے معلوم ہوا؟ وہ آدمی کہتا ہے کہ میں نے اللہ کی کتاب پڑھی تھی، اس پر میں نے یقین کیا تھا اور میں نے تصدیق کی تھی.......... (اگر کوئی بدکار آدمی ہوتا ہے تو) اس سے فرشتے سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ تو وہ کہتا ہے مجھے معلوم نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ پھر وہ فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے مجھے معلوم نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ پھر وہ فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں کہ اس آدمی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جو تم میں بھیجا گیا تھا؟ وہ آدمی کہتا ہے کہ مجھے معلوم نہیں، مجھے معلوم نہیں۔"

پہلا سوال:

ایک سوال یہ کہ تیرا رب کون ہے؟ دوسرا یہ کہ تیرا دین کیا ہے؟ اور تیسرا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ تو ان کے بارے میں کیا کہتا تھا؟

آنحضرت ﷺ نے جب اس کو بیان فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس وقت ہمارے ہوش وحواس ہوں گے؟ فرمایا کہ ہوش حواس ہوں گے، اور ایسے ہی ہوں گے جیسے اب ہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشادفرمایا کہ: پھر ہم نمٹ لیں گے انشاءاللہ۔ یہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حوصلہ تھا، اور کہہ سکتے ہیں کہ ہم نمٹ لیں گے، مگر سوچئے تو کہ جہاں کوئی غم خوار، کوئی مددگار نہیں ہوگا، نہ کوئی تلقین کرنے والا ہوگا، اور نہ کوئی سمجھانے والا ہوگا، وہاں وہ ان سوالوں کا جواب کیسے دے گا؟ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق بندے کی دستگیری کرے، تو پھر وہ ان کا صحیح صحیح جواب دے گا، اور کہے گا کہ میرا رب اللہ ہے، اس لئے کہ اس کا دنیا میں یقین بنا ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ میرا رب ہے، وہاں جھوٹ تو چلے گا نہیں، سچ پر وہاں نجات ہوگی، جھوٹ پر نجات نہیں ہوگی۔

دوسرا سوال:

دوسرا سوال ہوگا کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب میں کہے گا: اسلام! کیا ہم نے دین اسلام کو مانا تھا؟ کیا ہم نے دین اسلام کو مان کر داڑھی منڈوائی ہوئی ہے؟ اسی طرح ہم نے کالر لگائے ہوئے ہیں، کیا یہ بھی دین اسلام کو سمجھ کر کیا ہے؟ غرض جتنی تعلیمات رسول اللہ ﷺ نے دی تھیں، ہم نے ان پر عمل کیا تھا؟ اسلام کے معنی ہیں جھک جانے کے، کیا ہم اللہ تعالیٰ کے اور رسول اللہ ﷺ کے حکموں کے سامنے جھکے تھے؟

تیسرا سوال:

اور تیسرا سوال ہوگا کہ ان صاحب (حضرت محمد رسول اللہ ﷺ) کے بارے میں کیا کہتے تھے؟ حافظ بن حجرؒ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ: آنحضرت ﷺ کا

نام نہیں بتایا جائے گا، ویسے ہی فرشتے پوچھیں گے کہ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ بعض حضرات نے تو یہ فرمایا کہ مردے کے درمیان اور آنحضرت ﷺ کے درمیان کے سارے پردے ہٹا دیئے جاتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کی زیارت کروائی جاتی ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایسا ہوتو یہ بہت ہی بڑی سعادت ہے، لیکن ایسی روایت مجھے کہیں نہیں ملی، بہرحال رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پوچھا جاتا ہے کہ ان کے بارے میں کیا کہتے تھے؟ ان کو رسول مان کر اپنے آپ کو امتی سمجھتے تھے؟ رسول اور امتی کا تعلق تم نے صحیح طور پر نبھایا تھا؟ بندہ مؤمن ہو، تو ان تین سوالوں کا صحیح صحیح جواب دے دیتا ہے، زیادہ مشکل سوال نہیں ہیں، اور ان ہی تین سوالوں میں پوری زندگی آگئی ہے، اگر مؤمن ہوگا تو ان تین سوالوں کا صحیح صحیح جواب دے دے گا۔

مقام ناز:

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کے بارے میں آتا ہے کہ ان کا انتقال ہوا، جب ان کو دفن کردیا گیا تو ان کے پاس منکر نکیر آئے، اور ان سے بھی تین سوال کیے، تو کہنے لگیں کہ کہاں سے آئے ہو؟ فرشتوں نے کہا کہ آسمان سے آئے ہیں، رابعہ بصریہ رحمہا اللہ نے کہا تم آسمان سے یہاں تک آئے اور تم اپنے رب کو بھول گئے؟ اور رابعہ کے بارے میں خیال ہے کہ زمین سے صرف ڈیڑھ گز نیچے پہنچ کر بھول گئی ہوگی؟ جاؤ اپنا کام کرو۔

عام طور پر آدمی جب مرتا ہے تو لوگ لا الہ الا اللہ کی تلقین کیا کرتے ہیں، تو لوگ معمول کے مطابق ان کو بھی تلقین کرنے لگے، مسکرا کر فرمانے لگیں کہ: ساری عمر اسی وقت کے لئے تو محنت کی تھی، اب تم مجھے کیا سکھاتے ہو؟ تو جو لوگ صحیح صحیح جواب دے دیتے ہیں، تو حکم ہوتا ہے کہ ان کے لئے جنت کا لباس لاؤ، جنت کا بستر بچھاؤ، اور حدیث میں فرمایا کہ قبر اس کے لئے اتنی وسیع کردی جاتی ہے، جہاں تک اس کی نظر پہنچتی ہے۔

دو قسم کے آدمی:

اور دوسرا آدمی جس نے دنیا میں ایمان و یقین نہیں بنایا تھا، وہ ہر سوال کے جواب میں کہے گا: "هَاهَا لَا اَدْرِیْ." مجھے نہیں معلوم، مجھے نہیں معلوم: چنانچہ فرشتے پوچھیں گے، تیرا رب کون ہے؟ کہے گا:"هَاهَا لَا اَدْرِیْ." پھر وہ کہیں گے: تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہے گا:"هَاهَا لَا اَدْرِیْ، هَاهَا لَا اَدْرِیْ." مجھے معلوم نہیں، مجھے معلوم نہیں، پھر فرشتے حضور اکرم ﷺ کے بارے میں پوچھیں گے کہ ان کے بارے میں تو کیا کہتا تھا؟ تو کہے گا:"هَاهَا لَا اَدْرِیْ، هَاهَا لَا اَدْرِیْ." انا للہ و انا الیہ راجعون۔

تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا جائے گا کہ تو جھوٹ بولتا ہے، تو نے ساری عمر کبھی یہ کام کیا ہی نہیں تھا۔ میرے بھائیو! اللہ تعالیٰ کو پہچانو، اور اپنے دین کو پہچانو، اپنے رسول ﷺ کو پہچانو، اور ان کی تعلیمات کو پہچانو، اور تعلیمات کو پہچاننے کے بعد ان پر عمل کرو، مگر ہم نے ساری عمر یہ کام کیا ہی نہیں، بہرحال میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ یہ جو آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے، جو ہمارے بزرگ آگے چلے گئے ہیں، ان کو تو یہ پیش آ گئی ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان

کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ اور ادھر ہمارے سر پر یہ منزل کھڑی ہے، مگر ہم یہاں اس سے غافل اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، خوشیاں ہو رہی ہیں، گپیں ہانکی جارہی ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے تھے کہ آدمی کھلکھلاتا ہے، یعنی ہنستا ہے حالانکہ اس کا کفن دھوبی سے دھل کر آچکا ہے، سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ ہم اس بات کو جانیں اور پہچانیں کہ ہماری منزل کون سی ہے؟

احساس ندامت کی برکت:

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص کا انتقال ہوگیا اتنا برا آدمی تھا کہ کوئی اس کی وفات کا سن کر اس کے گھر نہیں آیا، عام طور پر وفات ہوجاتی ہے، تو لوگ جمع ہوجاتے ہیں، مگر وہاں کوئی نہ آیا، تو اس کی بیوی نے چار مزدور لئے اور ان کے کندھے پر لاد کر قبرستان کے پاس پہنچادیا، قبرستان کے قریب ایک میدان تھا، جہاں لوگ عموماً جنازہ پڑھتے تھے، وہاں پہنچادیا گیا، اس علاقے کے ایک مشہور بزرگ تھے، ان کو الہام ہوا کہ ایک ولی اللہ کا انتقال ہوگیا ہے اور کوئی اس کا جنازہ پڑھنے کے لئے نہیں آیا، جاؤ! جاکر جنازہ پڑھو، وہ جنازہ کے لئے نکلے تو ان کو دیکھ کر بے شمار مخلوق ٹوٹ پڑی، جنازہ ہوا تدفین ہوگئی، اس کے جنازہ سے فارغ ہوکر وہ بزرگ اس کے گھر آئے اور اس کی بیوی سے پوچھنے لگے کہ اس کا کون سا عمل ایسا تھا کہ جس کی بناء پر اس کا اکرام کیا گیا؟ اس عورت نے کہا کہ اور تو میں کچھ نہیں جانتی، البتہ دو عمل اس کے مجھے یاد ہیں، ایک تو یہ تھا کہ وہ رات کو شراب پیتا تھا اور ساری رات اس نشے میں دھت پڑا رہتا تھا، آخری رات میں اس کا نشہ ٹوٹتا اور اللہ تعالیٰ کو خطاب کرکے ہمیشہ کہتا رہتا کہ یا اللہ تو مجھے جہنم کے کس کونے میں ڈالے گا؟ ساری رات اسی طرح کرتا رہتا، یہاں تک کہ فجر کا وقت ہوجاتا، فجر ہوجاتی تو پھر یہ

غسل کرتا، نئے کپڑے پہنتا اور نماز پڑھتا اس کا ایک تو یہ عمل تھا۔ اور اس کا دوسرا عمل یہ تھا کہ اس کا گھر کبھی یتیم سے خالی نہیں ہوا، ہمیشہ کسی یتیم کو اپنے گھر میں رکھتا تھا، وہ بچہ بڑا ہوتا، اس کی شادی کراتا، پھر دوسرا بچہ لے آتا، اسی پر اللہ تعالیٰ نے ان کی نجات کردی، میرا بھائی! ہمیں تو رات کو کبھی لیٹتے ہوئے بھی خیال نہیں آیا کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ اسی طرح صبح کو اٹھتے وقت بھی کبھی یہ خیال نہیں آیا، بھائیو! سب باتیں غلط ہیں، مگر موت برحق ہے، دنیا کی سب باتیں غلط ہوسکتی ہیں، موت غلط نہیں ہوسکتی، موت برحق ہے، تو ہم لوگوں کو اپنی موت کی فکر کرنی چاہئے، اور اس کی تیاری کرنی چاہئے، بس آپ حضرات گرمی میں بیٹھے ہیں میں ان ہی کلمات پر ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے
اگر انسان یہاں کامیاب ہوا تو اگلی منزلوں میں بھی
کامیاب ہوگا اور اگر یہاں ناکام ہوا تو اگلی منزلوں
میں کامیابی کی کیا صورت اور کیا امید کی جاسکتی ہے؟

مقامِ بندگی

اور

دعا کی حقیقت

بندہ مؤمن کی شان یہ ہونی چاہیے کہ جب وہ
ایک بار ہاتھ اٹھا لے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی مان لیں،
یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مؤمن کی اتنی وجاہت تو کم
ازکم ہونی چاہیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

"وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ." (البقرۃ:؟)

ترجمہ:...... "جب میرے بندے، میرے بارے میں آپ سے پوچھیں، تو ان کو بتادو کہ میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارے، سو ان کو چاہئے کہ میری بات ہی مانیں، مجھ پر ایمان اور یقین رکھیں، ہوسکتا ہے کہ ان کا بھلا ہوجائے ان کو رشد و ہدایت مل جائے۔"

رمضانِ مبارک غیر متوقع طور پر تیزی سے گزر رہا ہے، اندازہ نہیں تھا کہ اس تیزی سے گزر جائے گا، چنانچہ اب یہ دوسرا عشرہ، جو مغفرت کا عشرہ کہلاتا ہے، یہ

بھی ختم ہونے کو ہے، کل یہ بھی پورا ہوجائے گا، اس کے بعد صرف تیسرا عشرہ ہی باقی رہ جائے گا یعنی "عِتْقٌ مِّنَ النَّار" (دوزخ کی آزادی کا عشرہ)۔ میں نے رمضان المبارک کے پہلے جمعہ میں ذکر کیا تھا کہ: رمضان المبارک میں چند چیزوں کا اہتمام کیا جائے اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سنائی تھی، اب تو شاید ہم سنبھلتے سنبھلتے یہ اہتمام کریں گے، اور اتنے میں شاید رمضان ہی گزر جائے گا، اور چونکہ اعتکاف کا عشرہ شروع ہونے والا ہے، اس لئے خصوصیت کے ساتھ چند چیزوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے بندوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے پوچھا تھا، اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کا جواب دیا ہے، انہوں نے یہ پوچھا تھا کہ: "یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اَقَرِیْبٌ رَبُّنَا فَنُنَاجِیْهِ اَمْ بَعِیْدٌ فَنُنَادِیْهِ؟" یعنی یا رسول اللہ! کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس سے آہستہ آہستہ سرگوشی کے انداز میں بات کریں؟ یا دور ہے تاکہ ہم اس کو پکار کر کہیں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس کا ترجمہ میں سنا چکا ہوں۔

خاص بات:

یہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ آیت روزہ اور رمضان کے تذکرے کے بیچ میں آگئی ہے، پہلے بھی رمضان کے روزہ کا تذکرہ ہے اور بعد میں بھی اسی کے مسائل ذکر ہورہے ہیں، مگر درمیان میں اللہ تبارک و تعالیٰ اس دعا والی آیت کو لے آئے ہیں، تو میں اسی دعا کے سلسلے میں کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ رمضان المبارک میں ایک خاص اہتمام دعا و التجا کا کیا جائے، یعنی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا اور

یہ مانگنا بھی مانگنے کے انداز میں ہو۔

بندۂ مؤمن کی شان:

جب بے نظیر ہم پر مسلط تھی ان دنوں کی بات ہے میں نے خواب دیکھا کہ بہت بڑے علماءؑ اور صلحاءؑ کا مجمع ہے، اور میں ان حضرات کی خدمت میں بڑے جوش کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ: آپ لوگوں سے ایک عورت بھی نہیں ہٹتی، بڑے بڑے طروں والے بزرگ بنے ہوئے ہیں، ایک عورت بھی تم سے نہیں ہٹتی؟ تمہاری اتنی بھی وجاہت اللہ کے نزدیک نہیں ہے، تو ڈوب کر مر جاؤ، کہ تم اللہ تعالیٰ سے کہو اور وہ ہٹا دے، یہ میں گستاخی کر رہا ہوں بزرگوں کی خدمت میں کہ: اگر تمہاری وجاہت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنی بھی نہیں ہے کہ تم ہاتھ اٹھاؤ اور اللہ تعالیٰ انقلاب پیدا نہ کردے تو ڈوب کر مر جاؤ، اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی لاج رکھ لی اور پھر اللہ نے اس کو ہٹا دیا۔ یہ خواب کا قصہ میں نے اس لئے سنایا کہ آپ کو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بندہ مؤمن کی شان یہ ہونی چاہئے کہ جب وہ ایک بار ہاتھ اٹھالے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی مان لیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مؤمن کی اتنی وجاہت تو کم از کم ہونی چاہئے، ورنہ انسان کی وجاہت کیا ہوسکتی ہے؟ قطرۂ ناپاک سے پیدا ہونے والے کی عزت کیا ہے؟ اس کی کوئی عزت نہیں ہے، لیکن جیسے جیسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت، فرمانبرداری، عبدیت اور بندگی بڑھتی جائے گی، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی اتنی ہی وجاہت بھی بڑھتی جائے گی، ایک بزرگ اپنی مناجات میں فرما رہے تھے:

کہ چہار چیز آوردہ ام شاہا کہ در گنج تو نیست
عاجزی و بے کسی عذر گناہ آوردہ ام

اللہ میاں سے کہہ رہے ہیں کہ ''اے بادشاہوں کے بادشاہ! چار تحفے آپ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے لایا ہوں، جو آپ کے پاس نہیں ہیں، آپ کے خزانے میں نہیں ہیں۔ ایک عاجزی، دوسری بے کسی، تیسرے گناہ اور چوتھے توبہ، یہ آپ کے پاس نہیں ہیں، یہ بندوں کی شان ہے، خدا کی شان نہیں ہے، یہ چار تحفے ہیں جو بندے کی طرف سے خدا تعالیٰ کی بارگاہ عالی میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

عبدیت کا اظہار:

ارے تم کیا بڑا بن کر دکھاؤ گے کہ میں نے اتنے عمل کئے ہیں، میں نے اتنی عبادتیں کی ہیں، اتنی ٹکریں ماری ہیں، کیا دکھاؤ گے؟ یہ چیزیں کچھ نہیں ہیں، اپنی عبدیت کا اظہار کرو، اپنے کو مٹاؤ، اپنی نفی کرو، اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھو اور جتنا اس میدان میں آگے بڑھو گے، اتنا اتنا عجز وانکسار کا استحضار ہوتا جائے گا اور اپنی بے کسی کا اظہار ہوگا۔

میں نے ''اختلاف امت اور صراط مستقیم'' میں لکھا ہے کہ ہمارے جو دوست جن اولیاء اللہ کو مالک ومختار مانتے ہیں اور جن سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہیں، ان سے ذرا جاکر پوچھو کہ کیا حال ہے ان کا؟ ہم تو اپنی طرف سے جو چاہیں گھڑتے رہیں، مگر ان بزرگوں سے تو پوچھو کہ ان کا کیا حال ہے؟ ہم لوگ تو اپنے اوپر اختیار کی تہمت دھر بھی لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا، میں نے ویسا کیا، میں یہ کرتا ہوں، اور میں وہ کرتا ہوں، مگر ان حضرات کے نزدیک تو یہ بھی نہیں ہے، تم ان کو خدائی کے اختیارات دے رہے ہو، لیکن وہ تو اس کے کہنے سے بھی گریزاں ہیں کہ میں یہ کرتا ہوں، میں وہ کرتا ہوں۔

پیران پیرؒ کی تواضع:

میں نے اسی کتاب میں حضرت پیران پیر حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ’’مخلوق ساری کی ساری اللہ رب العزت کی بارگاہ عالی کے سامنے بے بس اور عاجز محض ہے، لاچار ہے۔‘‘ یعنی کوئی چارہ نہیں ہے ان کے پاس، بندے اور خدا کا بھی بھلا کوئی مقابلہ ہے؟ تمام کی تمام مخلوق آسمان کی ہو یا زمین کی، ولی ہوں یا نبی، انسان ہوں یا جن، سب کے سب محض ناکارہ اور لاچار ہیں، اور شیخؒ نے تو اس کے بعد اوپر کا لفظ کہا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ عدم محض ہیں، عدم محض، جن کا وجود اور عدم برابر ہوتا ہے۔

اللہ کے ہاں بڑا بننے کا گُر:

یعنی بالکل ہیں ہی نہیں، خیر یہ بات تو بیچ میں آگئی، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ کی کچھ تو وجاہت ہونی ہی چاہئے اللہ تعالیٰ کے ہاں، لیکن وجاہت بڑا بننے سے نہیں ہوتی کہ مونچھوں کو تاؤ دے لو اور کالر رکھوالو، تو تم اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے بن جاؤ گے؟ بڑے خان صاحب کہلانے سے اللہ کے ہاں بڑے نہیں بنو گے، بلکہ اپنے آپ کو جتنا ذلیل سمجھو گے، اور اپنے آپ کو جتنا مٹاؤ گے، اتنے ہی اللہ کے ہاں بڑے بنو گے، تمہاری عاجزی اور بے کسی کی کیفیت جتنی بڑھتی جائے گی، اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہاری وجاہت اتنی بڑھتی جائے گی، اور جس قدر اپنے اوپر ہستی کی تہمت رکھو گے، اسی قدر اللہ تعالیٰ کی نظر سے گرتے جاؤ گے، عاجزی و بے کسی، توبہ اور گناہ بس یہ چار ہتھیار ہیں، بندہ مؤمن کے پاس، جتنا ان میں کمال پیدا ہوتا جائے گا، اتنی ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں وجاہت بڑھتی جائے گی، اور پھر وہ حال آئے گا جیسا کہ حدیث میں

آتا ہے:

"عَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَمْ مِنْ اَشْعَثٍ اَغْبَرَ ذِیْ طِمْرَیْنِ لَا یُؤْبَہُ لَہٗ، لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ وَمِنْھُمُ الْبَرَاءُ بْنُ مَالِکٍ." (مشکوٰۃ ص:۵۷۹)

یعنی بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں، بدن میلا کچیلا ہے اور دو پھٹی پرانی چادریں پہنی ہوئی ہیں، ایک اوپر اوڑھنے کی چادر ہے، کرتہ وغیرہ نہیں ہے، جیسے احرام والوں نے باندھی ہوئی ہوتی ہیں، اور ایک نیچے کی لنگی اور وہ بھی پھٹی پرانی، اب اس نقشہ کا آدمی، اس کی عزت و وقعت لوگوں کی نظر میں کیا ہوگی؟ سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں، بدن میلا کچیلا ہے، گویا بدبو آرہی ہے اور ڈھنگ کا کوئی کپڑا بدن پر نہیں، صرف دو چادریں ہیں اور وہ بھی پھٹی پرانی میلی کچیلی، تمہارے نزدیک اس آدمی کی قیمت کیا ہوگی یہ تم جانو! لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی قدر و قیمت یہ ہے کہ اگر وہ قسم کھا کر یہ کہہ دے کہ آج اللہ ایسا کرے گا، تو اللہ تعالیٰ ویسا ہی کریں گے۔

اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کردیں گے، اور انہی لوگوں میں سے براؑ بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب کبھی جنگ بہت سخت ہو جاتی تھی، مقابلہ سخت ہوتا تھا، بظاہر مسلمانوں کی فتح کا کوئی امکان نہیں ہوتا تھا، تو حضرت براؑ بن مالک رضی اللہ عنہ کو بلا کر لے جاتے اور فرماتے تھے کہ قسم کھاؤ کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح دے گا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمادیا تھا: "لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ"

آنحضرت ﷺ کی بات پر، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یقین تھا، اس لئے حضرت براٗ بن مالک کو لے جاتے تھے، جب دیکھتے کہ صرف ظاہری اور مادی اسباب سے جیتتے نظر نہیں آتے، تو براٗ بن مالک کو کہتے کہ قسم کھاؤ اللہ پر، وہ زبان سے اتنا کہہ دیتے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح دے گا، بس پھر اللہ تعالیٰ فتح دے دیتے تھے، میں اس کو عزت و وجاہت کہہ رہا ہوں کہ دعا مانگنے کے لئے تمہاری، اللہ تعالیٰ کی نظر میں ایسی عزت ہونی چاہئے۔

دعا سب کی قبول ہوتی ہے:

یوں ٹکڑا تو کتے کو بھی آدمی ڈال ہی دیتا ہے، دعائیں تو سب کی منظور ہوتی ہیں، بلکہ شاہ تاج الدین ابن عطا اللہ اسکندری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں لکھا ہے وہ فرماتے ہیں: کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ ان کا کام جلدی کردو، ان کا ہاتھ اٹھانا مجھے اچھا نہیں لگتا، اس کا کام جلدی نمٹادو، کام ہوجائے گا تو ہاتھ اٹھانا بند کردے گا، مگر بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ اللہ سے ہاتھ اٹھا کر کوئی دعا مانگتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ اس کا کام ذرا تاخیر سے کرنا، اس کا ہاتھ اٹھانا مجھے بہت اچھا لگتا ہے، جی چاہتا ہے کہ ہاتھ اٹھائے رکھے، اٹھائے رکھے، تمہیں تمہارے مالک کے ہاں سے ملے، نہ ملے، اور کیوں نہ ملے؟ ضرور ملے گا! لیکن تمہارا ہاتھ اٹھانا اللہ کو بہت اچھا لگتا ہے، کاش! ہم ایسے بن جائیں کہ ہمارا ہاتھ اٹھانا اللہ کو محبوب بن جائے، اور کیا تمہارے مانگنے پر دیں گے؟ نہیں۔ بھولتے ہو، وہ تو تمہارے بنانے سے پہلے دینے کا وعدہ کرچکے ہیں۔

جنید بغدادیؒ کا ذوق:

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دعا مانگنے کے بارے میں کہا، تو فرمانے لگے کہ ہاں اگر وہ بھول گیا ہے تو اس کو یاد دلادو۔ اللہ کو یاد دلاتے ہو؟ اللہ میاں! شاید آپ کو یاد نہیں رہا، ہم آپ کو یاد دلاتے ہیں کہ میری ضرورت یہ ہے، نعوذ باللہ! ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام عرفات کے میدان میں حج کے لئے تشریف لے گئے تھے، آپ نے پیدل سوچ کئے تھے، آپؑ عرفات کے میدان میں کھڑے ہیں، اور صرف اتنا مانگتے ہیں: ''اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ تَعْلَمُ حَاجَتِیْ فَاٰتِنِیْ سُؤْلِیْ.'' کہ یااللہ آپ کو میری حاجتیں معلوم ہیں، میری حاجتیں پوری فرمادے، یہ ہمارے ابا جی کی دعا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو یاد نہ دلاؤ، اس کو یاد ہے، اس کے علم میں نہ لاؤ، وہ جاہل نہیں ہے، تمہاری ضرورتوں اور تمہاری حاجتوں کو جانتا ہے، سوال یہ ہے کہ پھر یہ ہاتھ کیوں اٹھاتے ہیں؟ مانگتے کیوں ہیں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا مانگنا اچھا لگتا ہے، ہمارا ہاتھ اٹھانا اس کو پسند آتا ہے، فقیر کا کام ہے مانگنا، اگر ہم مانگیں نہیں، اگر ہم ہاتھ نہ اٹھائیں، تو کیسے پتہ چلے گا کہ ہم فقیر ہیں؟ جیسا کہ ارشاد ہے: ''یَاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰهِ وَاللّٰهُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ.'' (فاطر:۱۵) لوگو! تم سب کے سب اللہ کے فقیر ہو، اور اللہ تعالیٰ غنی وحمید ہے، فقہاءؒ کہتے ہیں کہ فقیر اس کو کہتے ہیں جس کے پاس کوئی شے نہ ہو، اس کو فقیر کہتے ہیں، اور جس کے پاس تھوڑا ہو مگر نصاب کے برابر نہ ہو، تو اس کو مسکین کہتے ہیں، فقیر فقر سے ہے اور فقر کے معنی خالی ہونے کے ہیں۔

ایک نکتہ:

اور یہاں ایک اور نکتہ عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:"اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ." (التوبہ:٦٠)(صدقات، فقراء اور مساکین کے لئے ہیں) بھائی فقیر بنوگے، تو صدقہ ملے گا، اپنے آپ کو خالی کروگے اور واقعتاً فقیر الی اللہ بنوگے، تو پھر صدقات ملیں گے اور اگر نہیں بنتے، تو جاؤ دفع ہوجاؤ، بھئی مالدار تو مالدار کو نہیں دیا کرتا، نہ مالدار، مالدار سے مانگتا ہے، ہم اس سے مانگنے کیوں جائیں؟ تو مالدار، مالدار سے مانگتا بھی نہیں اور مالدار، مالدار کو دیا بھی نہیں کرتا، غنی، غنی سے مانگتا بھی نہیں اور غنی، غنی کو دیتا بھی نہیں، ہاں البتہ غنی، فقیر کو دیتا ہے، اور فقیر، غنی سے مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فقیر بنوگے، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا محتاج بنا کے اللہ تعالیٰ سے مانگو گے، تو اللہ تعالیٰ دیں گے، اور اگر تم یوں کہو کہ ہمارے پاس بھی بہت کچھ ہے، تو پھر جاؤ، پھر مانگنے کیوں آئے ہو؟

خیر یہ تو چونکہ درمیان میں بات آگئی اور میں نے کہہ دی۔ تو رمضان المبارک کا تذکرہ چل رہا تھا اس کے آگے بھی اور پیچھے بھی، درمیان میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمادیا، شاید اس لئے کہ معلوم ہوجائے کہ رمضان المبارک کے اعمال سے خصوصیت کے ساتھ ایک عمل یہ بھی ہے یعنی دعا والتجا، اللہ تعالیٰ سے مانگنا اور گڑگڑانا۔ پھر مانگنے کی مختلف شکلیں ہیں۔ ایک مانگنا دل سے ہوتا ہے، ایک مانگنا زبان سے ہوتا ہے، اور ایک مانگنا پورے وجود سے ہوتا ہے، ہمارا پورا وجود سراپا سوال بن جائے اور اللہ تعالیٰ سے اس طرح مانگو، اس کا اہتمام کرو، اور حافظ شیرازیؒ کی نصیحت یاد رکھو:

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس
دربندے آں باش شنیدآں یا نہ شنید

(حافظ تمہارا کام صرف دعا مانگنا ہے، اس فکر میں نہ پڑا کرو کہ سنی بھی کہ نہیں سنی۔) یہ ان کا کام ہے ان پر رہنے دو، تم اپنا کام کرو۔ کہاوت ہے کہ! "اَلْحَائِکُ یُصَلِّی الرَّکْعَتَیْنِ ثُمَّ یَنْتَظِرُ الْوَحْیَ." (جولاہا دو رکعت پڑھ لیتا ہے اور وحی کے انتظار میں ہوتا ہے) کہ اب جبرائیل علیہ السلام راستے میں ہوں گے، ایک دفعہ کہیں الٹی سیدھی دعا مانگ لی، یعنی دل کہیں دماغ کہیں؟ اور لگے انتظار میں کہ اب دعا قبول ہوتی ہے اور جبرائیل علیہ سلام ابھی قبولیت کا پیغام لے کر آتے ہوں گے کہ تمہاری دعا قبول ہوگئی، اس فکر میں نہ پڑو کہ قبول ہوئی کہ نہیں ہوئی؟ سنی ہے یا نہیں سنی؟ سنانا تمہارا کام نہیں، مانگنا تمہارا کام ہے، بلکہ صرف اور صرف مانگنا تمہارا کام ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ دعا ہر آدمی کی قبول ہوتی ہے:

"عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: یُسْتَجَابُ لِاَحَدِکُمْ مَا لَمْ یُعَجِّلْ. یَقُوْلُ دَعَوْتُ فَلَمْ یُسْتَجَبْ لِیْ." (ترمذی ص:۱۷۴)

آنحضرت ﷺ کا ارشادگرامی ہے "بندے کی دعا قبول ہوتی ہے جب تک کہ جلد بازی نہ کرے، (عرض کیا گیا: یارسول اللہ! جلد بازی سے کیا مراد ہے؟) فرمایا کہ یوں کہنے لگے کہ میں نے بہت مانگا مگر ملتا ہی نہیں، اور تھک ہار کر مانگنا چھوڑ دیا۔ اچھا چھوڑ دیا؟ تو پھر اب کسی اور خدا کی تلاش ہے؟ کسی اور خدا کو تلاش کروگے؟ اور اس سے مانگو گے؟ بھائی بنیادی غلطی یہاں سے لگی کہ تم اس فکر میں لگ گئے کہ منظور ہوئی یا نہیں؟ جب تم نے ہاتھ اٹھالئے، منظور ہوگئی، بس ختم! اب یہ ان پر چھوڑ دو

کہ تمہاری دعا کی قبولیت کو کس شکل میں ظاہر فرماتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ایک تو دعاؤں کا التزام کرو، اللہ تعالیٰ سے مانگو، اپنے لئے بھی مانگو اور اپنے والدین کے لئے بھی مانگو، اپنے عزیز و اقارب کے لئے بھی مانگو، اور پوری امت کے لئے مانگو۔

ابدال بننے کا نسخہ:

ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ جو شخص امت کی مغفرت کے لئے روزانہ ۲۵ مرتبہ دعا مانگے، اللہ تعالیٰ اس کو "ابدال" میں لکھ دیتے ہیں، امت کے لئے مانگنا بڑی چیز ہے، آج اپنے لئے رونے والے موجود ہیں، بیوی بچوں کے لئے رونے والے موجود ہیں، عزیز و اقارب کے لئے رونے والے موجود ہیں، لیکن امت کے لئے رونے والے نہیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی امت دوزخ میں جانے سے بچ جائے۔ ہم گنہگاروں کو نظر حقارت سے تو دیکھتے ہیں، لیکن کبھی جذبۂ ترحم ہمارے دل میں پیدا نہیں ہوتا اور ہمارے ہاتھ نہیں اٹھتے کہ: یا اللہ یہ صورت بھی دوزخ میں جائیگی؟ یا اللہ اس کو جنت میں داخل کر دیجئے؟ امت کے لئے مانگنے والا آنحضرت ﷺ کو محبوب ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کو محبوب ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے، اس لئے کہ امت کی نسبت آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے، امت کے لئے مانگنے والا دراصل آنحضرت ﷺ کے لئے مانگ رہا ہے، یا اللہ امت میں جتنے نیک اور صلحاء گزرے ہیں، ان کے درجات بلند فرما اور یا اللہ امت کے جتنے گناہ گار بندے ہیں، ان کو اپنے مقبول اور نیک بندوں کے طفیل معاف فرما، بس سارے آگئے، تمہاری کوئی دعا اس قرآنی دعا سے خالی نہیں ہونی چاہئے:

"رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَؤُفٌ الرَّحِيْمٌ." (الحشر:١٠)

اللہ تعالیٰ نے بعد میں آنے والوں کو یہ دعا سکھائی ہے کہ بعد میں جو لوگ آئیں وہ یہ کہیں۔ پہلے مہاجرین کا ذکر فرمایا پھر انصار کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد تیسرے فریق کا ذکر فرمایا:

"وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَؤُفٌ الرَّحِيْمٌ." (الحشر:١٠)

ترجمہ:......"جو لوگ کہ آئے مہاجرین اور انصار کے بعد، وہ یہ کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہماری بخشش فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ہم سے پہلے سبقت لے گئے ایمان کے ساتھ اور نہ رکھئے ہمارے دلوں میں کینہ ایمان والوں کی جانب سے (خدا کرے ہمارے سینے میں کسی مؤمن کی جانب سے کینہ نہ رہے بغض دشمنی اور عداوت اللہ کے دشمنوں سے ہو، اللہ کے دوستوں سے نہیں، کسی اللہ کے دوست سے ہمارے دل میں بغض اور کینہ نہ ہو) اے ہمارے پروردگار! تو بہت ہی بخشنے والا، شفقت کرنے والا، بہت ہی رحم کرنے والا ہے۔"

اصلاحی مواعظ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذریعہ معاش
موذن کے فضائل
اعتکاف کے آداب
رجال آخرت
تبلیغ والوں کے لئے ہدایات
شیعان علی اور حضرات اہل بیت
غصہ کے اسباب اور اس کا علاج
حج کے انعامات
غدار کی سزا
جواہر پارے

جلد سوم

مکتبہ لدھیانوی

اصلاحی مواعظ

جلد سوم

شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی

مکتبہ لدھیانوی

قانونی مشیر اعزازی: ___ منظور احمد ایڈووکیٹ ہائیکورٹ
اشاعت اول: ___ جولائی ۲۰۰۲ء
ناشر: ___ مکتبہ لدھیانوی
___ 18 سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن، کراچی
برائے رابطہ: ___ جامع مسجد باب رحمت
___ پرانی نمائش ایم اے جناح روڈ، کراچی
کراچی کوڈ : 74400 فون : 7780337

بسم الله الرحمن الرحيم

قل متاع الدنيا قليل

والآخرة خير لمن اتقى صدق الله العظيم

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم ''اصلاحی مواعظ'' کی تیسری جلد قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں، اس سے قبل ''اصلاحی مواعظ'' کی دوسری جلد کی منجانب اللہ مقبولیت اور قارئین حضرات کی طرف سے پسندیدگی اور مزید جلدوں کی ترتیب واشاعت کے شدید تقاضے اور مطالبے نے ہمیں تیسری جلد کی ترتیب اور اشاعت کے لئے ہمت اور ولولہ عطا کیا، چنانچہ الحمدللہ بہت ہی تھوڑے عرصہ میں تیسری جلد کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور آج تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

برادرم مولانا محمد اعجاز صاحب استاذ حدیث جامعہ امینہ للبنات کراچی، نے حسبتاً للہ اس کام کو جس قدر اہمیت دی، مضامین کی تصحیح، پروف ریڈنگ اور تخریج احادیث کے سلسلہ میں جس شوق ولگن کا مظاہرہ کیا وہ قابل مبارک باد ہے، اسی طرح برادر مکرم جناب بھائی عبداللطیف صاحب طاہر، برادرم مولانا عبدالسلام بابر، مولانا مفتی عبدالقیوم دین پوری، مولانا نعیم امجد سلیمی، جناب عامر صدیقی اور جناب حافظ محمد عتیق الرحمٰن لدھیانوی نے بھی بھرپور تعاون کیا، ان کا تذکرہ نہ کرنا ناسپاسی ہوگی،

اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو اپنی بارگاہِ عالی سے بہترین بدلہ عطا فرمائے اور اپنے اکابر کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے، آمین۔

پیش نظر جلد ۱۸ مواعظ اور ایک مقالہ پر مشتمل ہے، اس تیسری جلد کی تکمیل کے بعد بحمداللہ ''اصلاحی مواعظ'' کی چوتھی جلد کا کام شروع کردیا گیا ہے، اسی طرح ہماری کوشش ہے کہ حضرت شہیدؒ کے دستیاب مواعظ کی کیسٹوں کو نقل کرکے کتابی شکل میں لایا جائے، اور امت کو اس خزانۂ عامرہ اور حضرت شہیدؒ کے علوم و معارف سے روشناس کرایا جائے، اس لئے قارئین میں سے کسی کے پاس اگر حضرت شہیدؒ کا کوئی وعظ یا اس کی کوئی کیسٹ ہو تو نقل کرکے ہمیں ارسال کریں، ہم اسے بھی شامل اشاعت کریں گے، والاجر علی اللہ!

حضرتؒ کے مواعظ کی ترتیب میں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اس سے مکررات کو حذف کردیں اور جہاں کہیں بات سمجھنے میں دقت محسوس ہورہی ہے، اس کی تسہیل کردیں، لیکن اس کے باوجود بیان و وعظ اور تحریر و تصنیف میں فرق ہوتا ہے، اس لئے اگر کہیں وعظ و بیان کی جھلک نمایاں محسوس ہو تو یہ سمجھا جائے کہ ہم نے حضرتؒ کے مواعظ کے اصلی رنگ کو برقرار رکھنے کے لئے یہ اسلوب برقرار رکھا ہے، اللہ تعالیٰ امت کو اس مفید سلسلہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی توفیق بخشے، ہماری مغفرت و نجات اور حضرت شہیدؒ کے رفع درجات کا ذریعہ بنائے، آمین۔

خاکپائے حضرت لدھیانوی شہیدؒ

سعید احمد جلال پوری

۱۴۲۳/۳/۲۷ھ

فہرست مقالات

تفصیلی فہرست

۱

آنحضرت ﷺ کا ذریعہ معاش

۲

(۱۱)

عزم پر توفیق کا ملنا

(۱۴)

(۱۵)

شیعانِ علی اور حضرات اہل بیتؓ ۲۷۱

(۱۶)

غصہ کے اسباب اور اس کا علاج ۲۸۹

(۱۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
ذریعۂ معاش

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

بزرگان محترم میں نے سنا ہے کہ آپ حضرات ماشاً اللہ حج پر تشریف لے جا رہے ہیں، اور حج کے سلسلہ میں کچھ باتیں سننے کے لئے تشریف لائے ہیں۔

حج کے ضمن میں آتا ہے کہ عشق و محبت کا تقاضا ہے کہ جو شخص حج کرنے جائے وہ مدینہ طیبہ آنحضرت ﷺ کی بارگاہ عالی میں بھی ضرور حاضری دے۔

بلاشبہ آپ حضرات بھی مدینہ منورہ تشریف لے جائیں گے، اور جانا بھی چاہئے، وہاں آپ دیکھیں گے کہ مدینہ منورہ کی مارکیٹیں، بازار اور دوکانیں اسباب تعیش اور ضروریات زندگی سے پر ہوں گی، جی چاہے گا کہ یہاں کا سب کچھ ہی خرید کرلوں، بھائی! وہاں آنحضرت ﷺ کے زہد کو پیش نظر رکھو گے تو اس مشکل سے نجات ہو جائے گی، اسی طرح اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں یہ نہ ہو کہ آپ یہ سمجھیں کہ یہ سب یوں ہی آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی ہوگا، نہیں بھائی! حضرات صحابہ کرامؓ اور آنحضرت ﷺ کی معیشت کا نقشہ ہی کچھ اور تھا، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سامنے سرکار دو عالم ﷺ کے ذریعہ معاش اور آپ ﷺ کی معیشت کا کسی قدر مختصر سا تذکرہ کر دیا جائے:

بادشاہ یا فقیر نبی:

حیاۃ الصحابہ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک تابعی (عبداللہ الھوزنی) نے پوچھا کہ آنحضرت ﷺ کا ذریعہ معاش کیا تھا؟ آپ کے ذہن میں فوراً یہ بات آئی ہوگی کہ حضور اقدس ﷺ کی بہت بڑی مارکیٹ ہوگی، بڑے کارخانے ہوں گے، اور آپ کے لنگر جاری ہوں گے، نہ بھائی! ایسا کچھ نہیں تھا بلکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا قَالَتْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا عَائِشَةَ! لَوْ شِئْتُ لَسَارَتْ مَعِیَ جِبَالُ الذَّھَبِ. جَاءَنِیْ مَلَکٌ وَاِنَّ حُجْزَتَہٗ لَتَسَاوِیِ الْکَعْبَةِ فَقَالَ اِنَّ رَبَّکَ یَقْرَأُ عَلَیْکَ السَّلَامُ وَیَقُوْلُ اِنْ شِئْتَ نَبِیًّا عَبْدًا وَاِنْ شِئْتَ نَبِیًّا مَلِکًا. فَنَظَرْتُ اِلٰی جِبْرِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ فَأَشَارَ اِلٰی أَنْ ضع نَفْسَکَ...... فَقُلْتُ نَبِیًّا عَبْدًا." (مشکوٰۃ ص:۵۲۱)

ترجمہ:...... "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اے عائشہ! اگر میں چاہوں تو میرے ساتھ سونے کے پہاڑ چلا کریں، اور فرمایا میرے پاس آنے والا آیا اور (وہ بہت ہی طویل تھا) مجھ سے کہا کہ حق تعالیٰ شانہ سلام کہتے ہیں (سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور علیہ السلام کو سلام بھجوایا گیا ہے۔) اور ارشاد فرماتے

ہیں کہ بادشاہ نبی بن کر رہنا چاہتے ہو یا فقیر نبی بن کر رہنا چاہتے ہو؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام (آنحضرت ﷺ کے پاس تھے) ان کی طرف آنحضرت ﷺ نے دیکھا، انہوں نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا، مطلب یہ کہ اپنے آپ کو بالکل گرادو، (یعنی یہ کہو کہ بادشاہ نبی نہیں، فقیر نبی بن کر رہنا چاہتا ہوں) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یا اللہ! میں بادشاہ نبی نہیں بلکہ فقیر نبی بن کر رہنا چاہتا ہوں۔"

ایک اور روایت میں ہے، فرمایا:

"وَلٰكِنْ أَشْبَعُ يَوْمًا وَأَجُوْعُ يَوْمًا فَاِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ اِلَيْكَ وَذَكَرْتُكَ وَاِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُكَ وَشَكَرْتُكَ." (مشکوٰۃ ص:۴۴۲)

ترجمہ:...... "لیکن ایک دن کھانا کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں جب بھوک لگے تو میں آپ کی طرف عاجزی کروں اور آپ کو یاد کروں، اور جب کھالوں تو آپ کی حمد کروں اور آپ کا شکر کروں۔"

خلاصہ یہ کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن ملا کرے تاکہ کھاکر تیرا شکر ادا کروں اور دوسرے دن نہ ملا کرے تو میں صبر کروں اور شکر کروں، آنحضرت ﷺ کی ساری معیشت اسی پر گزری ہے۔

درمیان میں ایک بات آگئی، کہ ہر نبی کے دو مشیر آسمان اور دو زمین کے ہوتے ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے:

”عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ نَّبِیٍّ إِلَّا وَلَہٗ وَزِیْرَانِ مِنْ أَھْلِ السَّمَاءِ، وَوَزِیْرَانِ مِنْ أَھْلِ الْأَرْضِ، فَأَمَّا وَزِیْرَایَ مِنْ أَھْلِ السَّمَاءِ فَجِبْرِیْلُ وَمِیْکَائِیْلُ وَأَمَّا وَزِیْرَایَ مِنْ أَھْلِ الْأَرْضِ فَأَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ۔“

(ترمذی ص:۲۰۹)

ترجمہ:...... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو مشیر آسمان سے اور دو مشیر زمین سے مقرر کئے ہیں جو اس کو مشورے دیتے ہیں، اور میرے دو مشیر زمین کے ہیں، اور دو مشیر آسمان کے ہیں، زمین کے مشیر ابوبکر و عمر ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہما!) اور آسمان کے مشیر جبرئیل و میکائیل (علیہم السلام) ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ محبوبِ خلائق ہیں اس لئے انسان تو انسان، ملائکہ اور پہاڑ بھی آپؐ سے محبت کرتے تھے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

”عَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ نَظَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ إِلٰی أُحُدٍ فَقَالَ: إِنَّ أُحُدَ جَبَلٌ یُّحِبُّنَا وَنُحِبُّہٗ۔“ (مسلم ج:۱ ص:۴۴۶)

ترجمہ:...... ”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد پہاڑ کو دیکھا اور فرمایا: بے شک یہ احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے، ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔“

لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے یہ چیز نہیں رکھی۔

حضرت بلالؓ حضور ﷺ کے وزیر خزانہ:

"عَنْ عَبْدِاللّٰهِ الْهَوْزِنِيِّ قَالَ: لَقِيْتُ بِلَالًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مُؤَذِّنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِحَلَبٍ فَقُلْتُ: يَا بِلَالُ! حَدِّثْنِيْ كَيْفَ كَانَتْ نَفَقَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَقَالَ: مَا كَانَ لَهُ شَيْءٌ إِلَّا اَنَا الَّذِيْ كُنْتُ اِلٰى ذٰلِكَ مِنْهُ مُنْذُ بَعَثَهُ اللّٰهُ اِلٰى أَنْ تُوُفِّيَ، فَكَانَ اِذَا أَتَاهُ الْمُسْلِمُ فَرَآهُ عَائِلًا يَأْمُرُنِيْ فَأَنْطَلِقُ فَأَسْتَقْرِضُ فَأَشْتَرِيْ الْبُرْدَةَ وَالشَّيْءَ فَأَكْسُوْهُ وَأُطْعِمُهُ، حَتّٰى اِعْتَرَضَنِيْ رَجُلٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَقَالَ: يَا بِلَالُ! اِنَّ عِنْدِيْ سَعَةً فَلَا تَسْتَقْرِضْ مِنْ أَحَدٍ اِلَّا مِنِّيْ، فَفَعَلْتُ، فَلَمَّا كَانَ ذَاتَ يَوْمٍ تَوَضَّأْتُ ثُمَّ قُمْتُ لِأُؤَذِّنَ بِالصَّلَاةِ فَإِذَا الْمُشْرِكُ فِيْ عِصَابَةٍ مِّنَ التُّجَّارِ فَلَمَّا رَآنِيْ قَالَ: يَا حَبَشِيُّ! قُلْتُ: يَا لَبَّيْهِ. فَتَجَهَّمَنِيْ وَقَالَ قَوْلًا عَظِيْمًا ـ أَوْ غَلِيْظًا ـ وَقَالَ: أَتَدْرِيْ كَمْ بَيْنَكَ وَبَيْنَ الشَّهْرِ؟ قُلْتُ: قَرِيْبٌ، قَالَ: اِنَّمَا بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ أَرْبَعُ لَيَالٍ فَآخُذُكَ بِالَّذِيْ لِيْ عَلَيْكَ فَإِنِّيْ لَمْ أُعْطِكَ الَّذِيْ أَعْطَيْتُكَ مِنْ كَرَامَتِكَ وَلَا مِنْ كَرَامَةِ صَاحِبِكَ وَاِنَّمَا أَعْطَيْتُكَ لِتَصِيْرَ لِيْ عَبْدًا فَأَذَرُكَ تَرْعٰى فِي الْغَنَمِ كَمَا كُنْتَ قَبْلَ ذٰلِكَ، قَالَ فَأَخَذَنِيْ فِيْ نَفْسِيْ مَا يَأْخُذُ فِيْ أَنْفُسِ النَّاسِ فَا

فَنَادَيْتُ بِالصَّلَاةِ حَتّٰى إِذَا صَلَّيْتُ الْعَتَمَةَ وَرَجَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى أَهْلِهٖ فَاسْتَأْذَنْتُ عَلَيْهِ فَأَذِنَ لِيْ فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! بِأَبِيْ أَنْتَ وَأُمِّيْ! إِنَّ الْمُشْرِكَ الَّذِيْ ذَكَرْتُ لَكَ أَنِّيْ أَتَدَيَّنُ مِنْهُ قَدْ قَالَ كَذَا وَكَذَا، وَلَيْسَ عِنْدَكَ مَا يُقْضٰى عَنِّيْ وَلَا عِنْدِيْ وَهُوَ فَاضِحِيْ فَأْذَنْ لِيْ أَنْ آتِيَ بَعْضَ هٰؤُلَاءِ الْأَحْيَاءِ الَّذِيْنَ قَدْ أَسْلَمُوْا حَتّٰى يَرْزُقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يُقْضٰى عَنِّيْ! فَخَرَجْتُ حَتّٰى أَتَيْتُ مَنْزِلِيْ فَجَعَلْتُ سَيْفِيْ وَجِرَابِيْ وَرُمْحِيْ وَنَعْلِيْ عِنْدَ رَأْسِيْ فَاسْتَقْبَلْتُ بِوَجْهِيَ الْأُفُقَ، فَكُلَّمَا نِمْتُ اِنْتَبَهْتُ فَإِذَا رَأَيْتُ عَلَيَّ لَيْلًا نِمْتُ حَتّٰى اِنْشَقَّ عَمُوْدُ الصُّبْحِ الْأَوَّلِ، فَأَرَدْتُ أَنْ أَنْطَلِقَ فَإِذَا إِنْسَانٌ يَدْعُوْ: يَا بِلَالُ! أَجِبْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ! فَانْطَلَقْتُ حَتّٰى آتِيَهٗ فَإِذَا أَرْبَعُ رَكَائِبَ عَلَيْهِنَّ أَحْمَالُهُنَّ! فَأَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَأْذَنْتُ فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ: أَبْشِرْ! فَقَدْ جَاءَكَ اللّٰهُ بِقَضَاءِ دَيْنِكَ، فَحَمِدْتُ اللّٰهَ، وَقَالَ: أَلَمْ تَمُرَّ عَلَى الرَّكَائِبِ الْمُنَاخَاتِ الْأَرْبَعِ؟ قَالَ: قُلْتُ: بَلٰى! قَالَ: فَإِنَّ لَكَ رِقَابَهُنَّ وَمَا عَلَيْهِنَّ - فَإِذَا عَلَيْهِنَّ كِسْوَةٌ وَطَعَامٌ أَهْدَاهُنَّ لَهٗ عَظِيْمُ فِدَكَ! - فَاقْبِضْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اقْضِ دَيْنَكَ! قَالَ: فَفَعَلْتُ فَحَطَطْتُ عَنْهُنَّ أَحْمَالَهُنَّ ثُمَّ

عَلَفْتُهُنَّ ثُمَّ عَمَدْتُ اِلٰى تَأْذِيْنِ صَلَاةِ الصُّبحِ، حَتّٰى اِذَا صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجْتُ اِلَى الْبَقِيْعِ فَجَعَلْتُ أُصْبَعِيْ فِيْ أُذُنَيَّ فَقُلْتُ: مَنْ كَانَ يَطْلُبُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَيْنًا فَلْيَحْضُرْ! فَمَا زِلْتُ أَبِيْعُ وَأَقْضِيْ وَأَعْرِضُ حَتّٰى لَمْ يَبْقَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَيْنٌ فِي الْأَرْضِ حَتّٰى فَضَلَ عِنْدِيْ أُوْقِيَتَانِ أَوْ أُوْقِيَةٌ وَنِصْفٌ. ثُمَّ انْطَلَقْتُ اِلَى الْمَسْجِدِ وَقَدْ ذَهَبَ عَامَّةُ النَّهَارِ فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاعِدٌ فِي الْمَسْجِدِ وَحْدَهُ، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَقَالَ: مَا فَعَلَ مَا قِبَلَكَ؟ قُلْتُ: قَضَى اللّٰهُ كُلَّ شَيْءٍ كَانَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَبْقَ شَيْءٌ، قَالَ: فَضَلَ شَيْءٌ؟ قُلْتُ: نَعَمْ! دِيْنَارَانِ، قَالَ: أُنْظُرْ أَنْ تُرِيْحَنِيْ مِنْهُمَا! فَلَسْتُ بِدَاخِلٍ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْ أَهْلِيْ حَتّٰى تُرِيْحَنِيْ مِنْهُمَا، فَلَمْ يَأْتِنَا أَحَدٌ فَبَاتَ فِي الْمَسْجِدِ حَتّٰى أَصْبَحَ وَظَلَّ فِي الْمَسْجِدِ الْيَوْمِ الثَّانِيْ، حَتّٰى اِذَا كَانَ فِيْ آخِرِ النَّهَارِ جَاءَ رَاكِبَانِ فَانْطَلَقْتُ بِهِمَا فَكَسَوْتُهُمَا وَأَطْعَمْتُهُمَا، حَتّٰى اِذَا صَلَّى الْعَتَمَةَ دَعَانِيْ، فَقَالَ: مَا فَعَلَ الَّذِيْ قِبَلَكَ؟ قُلْتُ: قَدْ أَرَاحَكَ اللّٰهُ مِنْهُ، فَكَبَّرَ وَحَمِدَ اللّٰهَ شَفَقًا مِنْ أَنْ يُدْرِكَهُ الْمَوْتُ وَعِنْدَهُ ذٰلِكَ، ثُمَّ اتَّبَعْتُهُ حَتّٰى جَاءَ أَزْوَاجَهُ فَسَلَّمَ عَلَى امْرَأَةٍ امْرَأَةٍ حَتّٰى أَتٰى مَبِيْتَهُ. فَهٰذَا الَّذِيْ

سَأَلْتَنِیْ عَنْهُ۔" (حیاۃ الصحابۃ ج:۲ ص:۱۹۴تا۱۹۶)

ترجمہ:......"عبداللہ الہوزنی سے روایت ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو حضور اکرم ﷺ کے مؤذن تھے، حلب میں میں نے ان سے ملاقات کی، میں نے کہا: اے بلالؓ! حضور اقدس ﷺ کے اخراجات کی کیا صورت ہوتی تھی؟ حضرت بلالؓ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کے پاس کچھ جمع تو رہتا ہی نہیں تھا، یہ خدمت میرے سپرد تھی، جس کی صورت یہ تھی کہ جب کوئی مسلمان بھوکا آتا تو حضور اقدس ﷺ مجھے ارشاد فرمادیتے، میں کہیں سے قرض لے کر اس کو کھانا کھلا دیتا، کوئی ننگا آتا تو مجھے ارشاد فرمادیتے، میں کسی سے قرض لے کر اس کو کپڑا بنادیتا، یہ صورت ہوتی رہتی تھی، ایک مرتبہ ایک مشرک مجھے ملا، اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے وسعت اور ثروت حاصل ہے، تو کسی سے قرض نہ لیا کر (جب ضرورت ہوا کرے مجھ ہی سے قرض لے لیا کر، میں نے کہا اس سے بہتر کیا ہوگا) اس سے قرض لینا شروع کردیا (جب ارشاد عالی ہوتا اس سے قرض لے آیا کرتا، اور ارشاد والا کی تعمیل کردیتا) ایک مرتبہ میں وضو کرکے آذان کہنے کے لئے کھڑا ہی تھا تاکہ نماز کے لئے آذان دوں کہ وہ مشرک ایک جماعت کے ساتھ آیا اور کہنے لگا او حبشی! میں ادھر متوجہ ہوا تو ایک دم بے تحاشا گالیاں دینے لگا اور برا بھلا جو منہ میں آیا کہا اور کہنے لگا کہ مہینہ ختم ہونے میں کتنے دن باقی ہیں؟

میں نے کہا قریب ختم کے ہے، کہنے لگا کہ چار دن باقی ہیں (اگر مہینہ کے ختم تک میرا سب قرضہ ادا نہ کیا تو تجھے اپنے قرضہ میں غلام بناؤں گا) میں نے جو قرض دیا ہے وہ نہ تو تیری بزرگی کی بنا پر دیا ہے اور نہ تیرے ساتھ کی کسی بزرگی کی بنا پر دیا ہے، میں نے تو صرف اس لئے قرض دیا ہے تا کہ تو میرا غلام بن جائے، اور اسی طرح بکریاں چراتا پھرے جیسا کہ پہلے تھا۔ (یہ کہہ کر چلا گیا) مجھ پر دن بھر جو گزرنا چاہئے تھا وہی گزرا تمام دن رنج وصدمہ سوار رہا۔ میں نے جا کر اذان دی، جب عشأ کی نماز پڑھ لی، آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو کر گھر کی طرف گئے (تو میں بھی پیچھے چلا گیا) میں نے آپ ﷺ سے گھر کے اندر آنے کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے اجازت دے دی، میں نے کہا اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، وہ مشرک جس کا ذکر میں نے آپ سے کیا ہے، جس سے میں قرض لیتا رہتا ہوں، آج اس نے اس اس طرح کہا ہے، (اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ!) نہ آپ کے پاس اس وقت ادا کرنے کو فوری انتظام ہے اور نہ کھڑے کھڑے میں کوئی انتظام کر سکتا ہوں، وہ ذلیل کرے گا، اس لئے اگر اجازت ہو تو اتنے قرض اترنے کا انتظام ہو میں کہیں روپوش ہو جاؤں، جب آپ ؐ کے پاس کہیں سے کچھ آ جائے گا، میں حاضر ہو جاؤں گا، یہ عرض کر کے میں گھر آیا، تلوار لی، ڈھال اٹھائی، نیزہ اٹھایا، جوتہ اٹھایا

(یہ ہی سامان سفر تھا) اور صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا (کہ صبح کے قریب کہیں چلا جاؤں گا) رات کو جب بھی تھوڑی سی آنکھ لگتی پھر خوف سے اچانک بیدار ہوجاتا، صبح قریب ہی تھی کہ ایک صاحب دوڑے ہوئے آئے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں جلدی چلو، میں حاضر خدمت ہوا تو دیکھا کہ چار اونٹنیاں جن پر سامان لدا ہوا تھا، بیٹھی ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: خوشخبری قبول کرو، اللہ تعالیٰ نے تیرے قرضہ کی بیباقی کا انتظام فرمادیا، میں نے اللہ کا شکر ادا کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کیا آپ کا گزران چار اونٹنیوں کے پاس سے ہوا؟ میں نے کہا کیوں نہیں! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ اونٹنیاں بھی تیرے حوالے اور ان کا سب سامان بھی تیرے حوالے، (میں نے جب دیکھا) تو اس میں کپڑا اور کھانے کا سامان تھا، فدک کے رئیس نے یہ نذرانہ آپ ﷺ کے لئے بھیجا تھا، (حضور اکرم ﷺ نے فرمایا) آپ یہ سامان قبضہ میں لے لیں اور اپنا قرض ادا کریں، میں نے ایسے ہی کیا، ان اونٹنیوں سے میں نے سامان اتار دیا پھر چرنے کے لئے ان کو چھوڑ دیا، پھر میں نے صبح کی اذان کے لئے ارادہ کیا، جب آپ ﷺ نے نماز پڑھالی تو میں بقیع کی طرف گیا، کانوں میں انگلیاں ڈال کر بلند آواز سے میں نے کہا جس نے حضور اکرم ﷺ سے قرض لینا ہے وہ حاضر ہوجائے، میں وہ مال بیچتا رہا اور قرض ادا کرتا رہا، اور بیچنے کے لئے سامان

لوگوں کو دکھاتا رہا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کا قرض سب ادا ہوگیا، میرے پاس صرف دو اوقیہ یا ڈیڑھ اوقیہ باقی بچی، پھر میں مسجد کی طرف گیا اور دن کا اکثر حصہ گزر گیا، حضور اقدس ﷺ اتنے مسجد میں انتظار فرماتے رہے، میں نے واپس آکر عرض کیا کہ حضور! اللہ کا شکر ہے حق تعالیٰ نے سارے قرضہ سے آپ کو سبکدوش کردیا اور اب کوئی چیز بھی قرضہ کی باقی نہیں رہی، حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ سامان میں سے بھی کچھ باقی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں دو دینار باقی ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اسے بھی تقسیم ہی کردے تاکہ مجھے راحت ہوجائے، میں گھر میں بھی اس وقت تک نہیں جانے کا جب تک یہ تقسیم نہ ہوجائے، ضرورتمند آئے نہیں، تو حضور ﷺ نے دوسرے دن مسجد ہی میں آرام فرمایا، دن کے آخری حصہ میں دو آدمی سواری پر آئے میں ان دونوں کو لے کر گیا، دونوں کو کپڑے پہنائے اور کھانا کھلایا، دوسرے دن عشاءٔ کے بعد پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہو جی کچھ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ جل شانہ نے آپ کو راحت عطا فرمائی کہ وہ سب نمٹ گیا، حضور ﷺ نے اللہ جل شانہ کی حمد و ثناءٔ فرمائی، حضور ﷺ کو یہ ڈر ہوا کہ خدانخواستہ موت آجائے اور کچھ حصہ مال کا آپ ﷺ کی مِلک میں رہے، اس کے بعد گھروں میں تشریف لے گئے اور بیویوں سے ملے۔ یہ حضور اکرم ﷺ کی گزران تھی جو تو نے مجھ سے

پوچھی۔"

خلاصہ یہ کہ آپؓ کے معاملے پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا اس آدمی نے کہ آنحضرت ﷺ کا ذریعہ معاش کیا تھا؟ حضرت بلالؓ نے ارشاد فرمایا کہ میں حضور اقدس ﷺ کا وزیر خزانہ تھا، جب بھی کوئی مہمان آتے، ایک یا زیادہ...... ان کو کپڑے کی ضرورت ہوتی، ان کو روٹی کی ضرورت ہوتی، ان کو کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی، آنحضرت ﷺ مجھے ارشاد فرماتے تھے، اور میں کسی سے قرض لے لیتا، اور اس ضرورت مند کی ضرورت پوری کر دیتا، ایک دن ایک یہودی مجھے ملا، وہ کہنے لگا کہ تمہیں ہر مہینے قرض لینا پڑتا ہے، تم مجھ سے قرض لے لیا کرو (یہودی اور اتنا فیاض...... ماشاء اللہ!) مجھ سے قرض لے لیا کرو اور پرواہ نہ کرو، میں نے کہا بہت بہت شکریہ، چنانچہ آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے تو میں اس کے پاس پہنچ جاتا قرض کے لئے، ابھی مہینہ ختم ہونے میں کوئی تین چار دن باقی تھے میں وضو کر کے اذان کے لئے تیاری کر رہا تھا کہ اتنے میں وہ یہودی آیا اور اس کے ساتھ کچھ اور آدمی بھی تھے، مجھے کہنے لگا کہ او حبشی غلام! مہینہ ختم ہونے میں کتنے دن باقی ہیں، میں نے کہا کوئی یہی دو چار دن باقی ہیں، کہنے لگا، اگر مہینہ ختم ہونے پر میرا قرض ادا نہ کیا تو تجھ کو بیچ دوں گا، اس طرح اونٹ، بکریاں جا کر چرائے گا جس طرح پہلے چرایا کرتا تھا، یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مجھے وہ صدمہ ہوا جو ہونا چاہئے تھا، عشاءؑ کی نماز کے بعد میں حاضر خدمت ہوا اور میں نے کہا کہ یا رسول اللہ! وہ یہودی جس سے میں قرض لیا کرتا تھا اس نے مجھے ایسا کہا ہے، وہ یہودی ہے، اس کو تو کوئی ادب نہیں، لحاظ نہیں، اگر حضور ﷺ اجازت فرمائیں تو اتنی دیر کے لئے باہر چلا جاؤں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آپ کے

لئے کوئی انتظام فرمادیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: بہت اچھا! (آنحضرت ﷺ کی اس ''بہت اچھا'' پر مجھے ہمیشہ تعجب ہوتا ہے، کبھی آنحضرت ﷺ نے کسی کو نہیں ٹوکا) فرمایا کہ میں نے اپنی تلوار، اپنی ڈھال اور اپنے جوتے سرہانے رکھ لئے اور صبح صادق کے انتظار میں بیٹھ گیا کہ صبح ہو تو جاتا ہوں، روشنی ہوجائے ذرا، اتنے میں ایک آدمی آیا کہ آنحضرت ﷺ تجھ کو یاد فرماتے ہیں، میں حاضر خدمت ہوا، آنحضرت ﷺ کے در دولت پر چار اونٹنیاں بیٹھی تھیں، اور لدی ہوئی، ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے تیرے قرضے کا انتظام فرمادیا ہے، یہ اونٹنیاں جو غلے سے لدی ہوئی ہیں، فدک کے بادشاہ نے مجھے بھیجی ہیں، جاؤ اپنا قرضہ ادا کرو، یہ تمہاری ہیں، میں بہت خوش ہوگیا، آنحضرت ﷺ نے فجر کی نماز پڑھی، میں نے ان اونٹنیوں کو بھی بیچا، اونٹنیاں بھی تھیں اس میں اس پر جو بار لدا ہوا تھا وہ بھی تھا، اس یہودی کا بھی قرضہ ادا کیا اور بھی جتنے قرضے تھے ادا کئے، میں نے حاضر خدمت ہوکر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا تمام بوجھ ادا کردیا ہے، فرمایا کچھ بچا بھی ہے، عرض کیا حضرت! کچھ ابھی باقی ہے، ارشاد فرمایا کہ میں مسجد سے اس وقت جاؤں گا گھر جب تم اس کو خرچ کردو گے، میں نے کہا حضرت اتنا جلدی تو خرچ نہیں ہوسکتا، فرمایا پھر میں نہیں گھر جاتا، رات اسی مسجد میں گزاروں گا، دوسرے دن وہ میں نے نمٹایا اور آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی کہ یا رسول اللہ! وہ سارا مال خرچ ہوگیا ہے، ٹھکانے لگ گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ الحمدللہ! اور آپ اپنے گھروں میں تشریف لے گئے، تمام ازواج مطہرات کو جاکے سلام کہا، تو وہ صاحب جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھ رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ کا ذریعہ معاش کیا تھا، ان کے سوال کا جواب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کا ذریعہ معاش یہ تھا۔

چند سکوں کی وجہ سے رات کو نیند نہیں آئی:

”عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهَا قَالَتْ: دَخَلَ عَلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ سَاهِمُ الْوَجْهِ فَخَشِیْتُ ذٰلِکَ مِنْ وَجْعٍ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا لَکَ مِنْ سَهْمِ الْوَجْهِ؟ فَقَالَ مِنْ أَجْلِ الدَّنَانِیْرِ السَّبْعَةِ الَّتِیْ أَتَیْنَا بِهَا أُمس أَمْسَیْنَا وَهُوَ فِیْ خصم الْفِرَاشِ. وَفِیْ رِوَایَةٍ أَتَتْنَا وَلَمْ نُنْفِقْهَا.“ (مسند احمد)

ترجمہ:......”ایک رات آنحضرت ﷺ باہر سے گھر میں تشریف لائے اور پریشانی کی حالت میں تھے، ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ڈر گئی شاید آپ کو کوئی تکلیف ہے، میں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا کچھ تکلیف ہے؟ آپ بے چین سے ہیں، سرہانے سے وہ چند سکے نکال کر کے دکھائے، فرمایا یہ آج خرچ نہیں ہوسکے۔“

اور دوسری حدیث میں ہے کہ:

”مَا ظَنَّ مُحَمَّدٌ لَوْ لَقِیَ اللّٰهَ وَهٰذِهٖ عِنْدَهٗ وَمَا تَنْفِیْ هٰذَا مِنْ مُحَمَّدٍ لَوْ لَقِیَ اللّٰهَ وَهٰذَا عِنْدَهٗ.“

(بیہقی ج:۶ ص:۳۵۶)

ترجمہ:......”مجھے اس چیز سے شرم آتی ہے کہ اگر میری وفات اس حالت میں ہوجائے کہ یہ سکے میرے پاس موجود ہوں تو میں اللہ کو کیا جواب دوں گا؟“

ازواج مطہرات گھر میں کچھ نہیں رکھتی تھیں:

آنحضرت ﷺ کا معمول مبارک تھا کہ ازواج مطہرات کو ان کے نفقات دے دیتے تھے، ہر ایک کا خرچہ دے دیتے تھے، نو ازواج مطہرات تھیں، ہر ایک کو دے دیتے تھے، اور وہ بھی تو ہماری مائیں تھیں، آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات تھیں، آنحضرت ﷺ صبح کو دیتے اور شام کو وہ بھی فقیر ہوتیں، تمام کا تمام خرچ کردیتیں، جو بھی ملتا تھا، اپنے پاس وہ بھی نہیں رکھتی تھیں۔

ایک روایت میں ہے:

''أَخْرَجَ ابْنُ سَعْدٍ عَنْ أُمِّ ذَرَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ أُتِيَتْ عَائِشَةَ بِمِائَةِ أَلْفٍ فَفَرَّقَتْهَا وَهِيَ يَوْمَئِذٍ صَائِمَةٌ فَقُلْتُ لَهَا: أَمَاسْتَطَعْتِ فِيمَا أَنْفَقْتِ أَن تَشْتَرِيَ بِدِرْهَمٍ لَحْمًا تُفْطِرِيْنَ عَلَيْهِ. فَقَالَتْ: لَوْ كُنْتِ اذْكَرْتِنِيْ لَفَعَلْتُ.'' (حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۳۱۴، الاصابہ ج:۴ ص:۳۵۰)

ترجمہ:......''ام ذرہ رضی اللہ عنہا (جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باندی تھیں) سے روایت ہے کہ ایک لاکھ دینار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیئے گئے جو (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک بوری مستقل دراہم کی پہنچی، آنحضرت ﷺ کے بعد کا قصہ ہے) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے تقسیم کرنا شروع کردیا، سارا نمٹادیا، اور روزے سے تھیں، اور گھر میں روزہ افطار کرنے کے لئے کوئی چیز نہ تھی، خادمہ کہنے لگی کہ حضرت! شام کو روزہ افطار کرنے کے لئے کم از کم کچھ رکھ

لیتے ، روزہ افطار کرنے کے لئے کوئی چیز نہیں، فرمانے لگیں یا تو پہلے یاد دلادیتی تو میں کچھ رکھ لیتی، اب عورتوں کی طرح طعنے دینے کا کیا فائدہ؟''

واقعہ ایلا:

ایک موقع پر آنحضرت ﷺ ازواج مطہرات سے ناراض ہوگئے تھے، وہ یہ کہ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ امت کے گھروں میں ماشاء اللہ اب بڑی کشائش ہوگئی ہے، لیکن ہماری حالت وہی ہے، تو ایک نے کہا کہ آنحضرت ﷺ گھر تشریف لائیں گے، تو ایک نے کہا میں فلانی چیز مانگوں گی، دوسری نے کہا میں فلانی چیز مانگوں گی، تیسری نے کہا میں فلانی چیز مانگوں گی، چنانچہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو ساری جمع ہوگئیں، اور آپ سے مطالبہ کرنے لگ گئیں، آنحضرت ﷺ چپ، خاموش رہے، ایک حرف نہیں فرمایا، جھڑکا نہیں، کوئی بات نہیں کی، لیکن ایک بالاخانہ تھا اوپر اس میں تشریف لے گئے، سب بیویوں سے الگ ہوگئے، ایک مہینہ بیویوں کے پاس نہ جانے کی گویا قسم کھالی۔

اسی منظر میں دو واقعے یاد دلاتا ہوں، ایک تو جب آنحضرت ﷺ ازواج مطہرات سے ناراض ہوگئے، حضرات صحابہ کرامؓ پر اس کا کتنا اثر ہوا، چنانچہ جب حضرت عمرؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو کہا گیا:

''فَقَالَ: قَدْ حَدَثَ الْيَوْمَ أَمْرٌ عَظِيْمٌ! قُلْتُ: مَا هُوَ؟ أَجَاءَ غَسَّانُ؟ قَالَ: لَا! بَلْ أَعْظَمُ مِنْ ذٰلِكَ وَأَهْوَلُ، طَلَّقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِسَآءَهُ.''

(بخاری ج:۲ ص:۷۸۱)

ترجمہ:...... ''تو کسی نے جا کر کے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطلاع دی کہ آج ایک بہت بڑا واقعہ ہوگیا ہے، آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔''

لوگوں میں مشہور ایسا ہوگیا، (اللہ اکبر!) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ذرا تھوڑے فاصلے پر رہتے تھے، ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''فَجَمَعْتُ عَلَيَّ ثِيَابِيْ فَصَلَّيْتُ صَلٰوةَ الْفَجْرِ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَدَخَلْتُ عَلٰى حَفْصَةَ، فَإِذَا هِيَ تَبْكِيْ، فَقُلْتُ: مَا يُبْكِيْكِ؟ اَلَمْ اَكُنْ حَذَّرْتُكِ هٰذَا؟ اَطَلَّقَكُنَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَتْ: لَا اَدْرِيْ هَا هُوَ ذَا مُعْتَزِلٌ فِي الْمَشْرُبَةِ.''

ترجمہ:...... ''کہ میں نے کپڑے سمیٹے سب سے پہلے میں نے حضورؐ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی، پھر حضرت حفصہ کے پاس، رضی اللہ تعالیٰ عنہا، ام المؤمنین کے پاس گیا اور ان کو ڈانٹا کہ میں تجھے نہیں کہا کرتا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایسی بدمزاجی نہ کیا کرو، (اب آیا مزہ) پھر پوچھا کہ آنحضرت ﷺ نے تجھے طلاق دے دی ہے، وہ کہنے لگیں مجھے معلوم نہیں وہ اوپر بالا خانہ میں تشریف فرما ہیں، وہ ساری بیٹھی رو رہی تھیں۔''

''فَجِئْتُ الْمَشْرُبَةَ الَّتِي فِيْهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقُلْتُ لِغُلَامٍ لَهٗ اَسْوَدَ اِسْتَأْذِنْ لِعُمَرَ، فَدَخَلَ الْغُلَامُ فَكَلَّمَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ:

كَلَّمْتُ النَّبِيَّ صَلَى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذَكَرْتُكَ لَهُ فَصَمَتَ. فَانْصَرَفْتُ حَتّٰى جَلَسْتُ مَعَ الرَّهْطِ الَّذِيْنَ عِنْدَ الْمِنْبَرِ، ثُمَّ غَلَبَنِيْ مَا اَجِدُ فَجِئْتُ، فَقُلْتُ لِلْغُلَامِ اسْتَأْذِنْ لِعُمَرَ، فَدَخَلَ ثُمَّ رَجع فَقَالَ ذَكَرْتُكَ لَهُ فَصَمَتَ، فَرَجَعْتُ فَجَلَسْتُ مَعَ الرَّهْطِ الَّذِيْنَ عِنْدَ الْمِنْبَرِ ثُمَّ غَلَبَنِيْ مَا اَجِدُ فَجِئْتُ الْغُلَامَ، فَقُلْتُ اسْتَأْذِنْ، فَدَخَلَ ثُمَّ رَجَعَ اِلَيَّ فَقَالَ: قَدْ ذَكَرْتُكَ لَهُ فَصَمَتَ، فَلَمَّا وَلَّيْتُ مُنْصَرِفًا قَالَ اِذَا الْغُلَامُ يَدْعُوْنِيْ فَقَالَ: قَدْ اَذِنَ لَكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَدَخَلْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.'' (بخاری ج:۲ ص:۷۸۱)

ترجمہ:...... ''حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اس بالاخانے پر گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خادم ٹانگیں لٹکائے ہوئے سیڑھی پر بیٹھا تھا، میں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو کہ عمر آنا چاہتا ہے، وہ گئے جاکے پوچھا ہوگا، واپس آکر کہا: میں نے پیغام پہنچادیا تھا، لیکن جواب نہیں ملا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ تو مسجد میں رو رہے تھے، کہرام مچا ہوا تھا، لیکن مجھ سے تو رویا نہیں جاتا تھا، تھوڑی دیر کے بعد پھر میں گیا، پھر خادم سے پوچھا، وہ گئے اور آکر کے وہی جواب دیا، کہ میں نے پیغام عرض کردیا تھا، لیکن جواب نہیں ملا۔ میں پھر بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد پھر گیا، اور پھر

آپ ﷺ نے خاموشی فرمائی؟ انہوں نے آکر مجھے جواب دے دیا، یہ واپس لوٹنے لگے تو پیچھے سے خادم نے آواز دے دی کہ ''اجازت مل گئی ہے'' یعنی آنحضرت ﷺ نے اجازت مرحمت فرمادی ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر خدمت ہوئے، (دل میں ارادہ کرکے گئے تھے کہ آنحضرت ﷺ کو ہنساؤں گا، کوئی ایسی بات کروں گا کہ آنحضرت ﷺ ہنس پڑیں)

چنانچہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

''ثُمَّ قُلْتُ وَاَنَا قَائِمٌ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! اَطَلَّقْتَ نَسَاءَکَ؟ فَقَالَ: لَا! ثُمَّ قُلْتُ وَاَنَا قَائِمٌ اَسْتَأْنِسُ يَارَسُوْلَ اللهِ لَوْ رَأَيْتَنِي وَكُنَّا مَعْشَرُ قُرَيْش نَغْلِبُ النِّسَآءَ، فَلَمَّا قَدِمْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ اِذَا قَوْمٌ تَغْلِبُهُمْ نِسَآئُهُمْ. فَتَبَسَّمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ...... الخ.'' (بخاری ج:۲ ص:۷۸۲)

ترجمہ:...... ''میں نے سب سے پہلے تو یہ پوچھا کہ کیا آپ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، بس! میری تسلی ہوگئی، میں نے کہا یا رسول اللہ جب ہم مکے میں ہوتے تھے تو وہاں کے مرد عورتوں پر غالب ہوتے تھے، اور دبا کر رکھتے تھے، یہاں ہم مدینہ طیبہ میں آئے تو یہاں معاملہ الٹ تھا، یہاں کی عورتیں مردوں پر حاوی تھیں، اور ان کی دیکھا دیکھی یہی بات کچھ ہماری عورتوں نے بھی سیکھ لی،

آنحضرت ﷺ ذرا سے مسکرائے، پھر میں نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں حضرت ﷺ کا توشہ خانہ دیکھوں! فرمایا اجازت ہے۔“

حضور ﷺ کے گھر کی کل کائنات:

”فَجَلَسْتُ حِیْنَ رَأَیْتُهٗ تَبَسَّمَ فَرَفَعْتُ بَصَرِیْ فِیْ بَیْتِهٖ فَوَاللّٰهِ مَا رَأَیْتُ فِیْهِ شَیْئًا یَرُدُّ الْبَصَرَ غَیْرَ اُهْبَةٍ ثَلَاثَةٍ ...... الخ.“ (بخاری ج:۲ ص:۷۸۲)

ترجمہ:......”فرماتے ہیں جب میں نے آپ ﷺ کو خوشی میں دیکھا تو میں بیٹھ گیا، پھر میں نے آپ ﷺ کے گھر میں نظر دوڑائی، اللہ کی قسم پورے گھر میں سوائے دو تین کھالوں کے اور کچھ نظر نہیں آیا، (اور کچھ کرز، کرز کہتے ہیں رنگائی کا سامان، کھالیں رنگنے کا سامان، اتنی سی پوٹلی اس کی پڑی تھی، اور اللہ اللہ خیر صلہ!)

یہ کل کائنات تھی آنحضرت ﷺ کے گھر کی۔

آنحضرت ﷺ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے، آپؐ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے آنے سے تکلف نہیں فرماتے تھے، اسی طرح لیٹے رہے، ان سے بے تکلفی تھی، چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے اور چٹائی کے نشانات جسم اطہر پر پڑے ہوئے تھے، بدن پر کرتہ نہیں تھا، میری آنکھوں سے آنسو آگئے اور میں نے عرض کیا:

”فَقُلْتُ:یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اُدْعُ اللّٰهَ فَلْیُوَسِّعْ عَلٰی

اُمَّتِکَ، فِاِنَّ فَارِسًا وَّالرُّوْمَ قَدْ وُسِّعَ عَلَيْهِمْ وَاُعْطُوْا الدُّنْيَا وَهُمْ لَا يَعْبُدُوْنَ اللّٰهَ. فَجَلَسَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مُتَّكِئًا، فَقَالَ: اَوَ فِيْ هٰذَا اَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟ اِنَّ اُولٰئِکَ قَوْمٌ عُجِّلُوْا طَيِّبَاتِهِمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا. فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اسْتَغْفِرْ لِيْ......الخ." (بخاری ج:۲ ص:۷۸۲)

ترجمہ:......''یارسول اللہ! اپنی امت کے لئے وسعت کی دعا کیجئے، قیصر و کسریٰ تو اتنے تاج و تخت کے مالک ہیں، اور آپ اللہ کے رسول ہوکر اس حالت میں ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن کو ان کی پاکیزہ چیزیں یعنی نعمت کی چیزیں دنیا ہی میں دے دی گئیں (آخرت میں ان کے لئے کچھ ہی نہیں، اور آخر میں فرمایا کیا تو اس پر راضی نہیں کہ ان کو دنیا ملے اور ہمیں آخرت ملے) میں نے کہا یارسول اللہ! میرے لئے دعا کیجئے! استغفار کیجئے، مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔''

حضور ﷺ کی نظر میں دنیا کی قیمت:

جس دنیا کے لئے ہم مارے مارے پھر رہے ہیں، حضور ﷺ کی نظر میں اس کی قیمت بکری کی مینگنی کے برابر بھی نہیں ہے، اور صحیح کہہ رہا ہوں۔

اور دوسرا واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اسی کے ساتھ ہے، جب مہینہ ختم ہوا تو آنحضرت ﷺ اوپر سے نیچے اترے اور سب سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر گئے، اور جا کر فرمایا:

"اِنِّی ذَاکِرٌ لَکِ اَمْرًا فَلَا عَلَیْکِ اَنْ تَسْتَعْجِلِیْ حَتّٰی تَسْتَأْمِرِیْ اَبَوَیْکِ وَقَدْ عَلِمَ اَنَّ اَبَوَیَّ لَمْ یَکُوْنَا یَأْمُرَانِّیْ بِفِرَاقِہٖ...... الخ." (بخاری ج:۲ ص:۷۰۵)

ترجمہ:...... "عائشہ! ایک بات کہنا چاہتا ہوں اپنے ماں باپ کے مشورے کے بغیر جواب نہ دینا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال تھا کہ چونکہ ان کی عمر اتنی پختہ نہیں اور ان کے والدین معمر ہیں، وہ اچھا مشورہ دیں گے، اور وہ اسے جدائی کا مشورہ نہیں دیں گے۔"

حضرت عائشہؓ کہنے لگیں کہ آپ بات تو کریں، اگر والدین سے مشورے کی ضرورت ہوگی تو وہ بھی کرلیں گے، تب آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں آپ سے کہوں:

"یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَھَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْکُنَّ وَاُسَرِّحْکُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا. وَاِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللہَ وَرَسُوْلَہٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَۃَ. فَاِنَّ اللہَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْکُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا."

(الاحزاب:۲۸، ۲۹)

ترجمہ:... "اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیا کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمہیں فارغ کردیتا ہوں اور خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کردیتا ہوں، اگر تم اللہ کو، اس کے رسول کو، اور آخرت کے گھر کو

چاہتی ہو، تو اللہ تعالیٰ نے تم میں سے جو نیکو کار ہیں ان کے لئے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔"

حضرت عائشہؓ کی ذہانت ومحبت رسولؐ:

آنحضرت ﷺ نے آیتیں پڑھیں، لمبی آیتیں ہیں، رکوع تو پورا ہے، حضرت عائشہؓ نے سن لیں۔

"فَقَالَتْ لَهٗ عَائِشَةَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! اِنَّکَ کُنْتَ قَدْ اَقْسَمْتَ اَنْ لَّا تَدْخُلَ عَلَيْنَا شَهْرًا وَّاِنَّمَا اَصْبَحْتُ مِنْ تِسْعٍ وَّعِشْرِيْنَ لَيْلَةٍ اَعُدُّهَا عَدًّا؟ فَقَالَ: اَلشَّهْرُ تِسْعٍ وَّعُشْرُوْنَ فَکَانَ ذٰلِکَ الشَّهْرُ تِسْعٌ وَّعُشْرُوْنَ لَيْلَةٌ."

(بخاری ج:۲ ص:۷۸۲)

ترجمہ:...... "پہلی بات تو یہ کہی کہ یارسول اللہ! آپ نے تو مہینہ کی قسم کھائی تھی نہ آنے کی اور آج تو انتیس دن ہوئے ہیں، فرمانے لگے تمہیں کیسے معلوم، فرمایا میں نے گن گن کر دن گزارے ہیں، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مہینہ کبھی انتیس دن کا بھی تو ہوتا ہے۔"

اور دوسری بات یہ کہی کہ:

"اَفِيْکَ اَسْتَشِيْرُ اَبَوَیَّ يَارَسُوْلَ اللهِ؟ بَلِ اخْتَارُ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ." (مسلم: ص:۴۸۰)

ترجمہ:...... "یارسول اللہ! آپ کے بارے میں مجھے

ماں باپ سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہے؟ بلکہ میں اللہ اور اس
کے رسول کو اختیار کرتی ہوں۔''

اس کا مطلب یہ تھا کہ تمہارا کوئی مطالبہ نہیں آئندہ، خبردار! اگر تمہیں دنیا چاہئے تو بڑی دنیا ہے، دنیا والوں کے پاس، آؤ تمہیں فارغ کردیتا ہوں، ورنہ آج کے بعد تمہارا کوئی مطالبہ نہیں ہوگا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

''بَلِ اخْتَارُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ.''

بلکہ میں اللہ اور اللہ کے رسول کو اختیار کرتی ہوں، اس کے لئے مجھے ماں باپ سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

''وَاَسْأَلُکَ اَنْ لَّا تُخْبِّرَ امْرَأَۃً مِّنْ نِّسَآءِکَ
بِالَّذِیْ قُلْتُ، قَالَ: لَا تَسْأَلُنِیْ اِمْرَأَۃٌ مِّنْھُنَّ اِلَّا اَخْبَرْتُھَا......
الخ.'' (مسلم ج:۱ ص:۴۸۰)

ترجمہ:...... ''اور ایک بات یہ کہی کہ یا رسول اللہ! ایک
بات میری قبول کرلیں، وہ یہ کہ اگر کوئی دوسری خاتون آپ کی
بیویوں میں سے پوچھے کہ عائشہؓ نے کیا جواب دیا؟...... تو کسی کو
میرا جواب نہ بتایئے (ان کا مطلب یہ تھا کہ کوئی تو کم ہو، نو کی
بجائے آٹھ ہی رہ جائیں، کم از کم ایک ٹوٹے، آٹھویں دن باری
آجائے)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی مجھ سے پوچھے گی تو
میں بتاؤں گا، اپنے آپ نہیں بتاؤں گا۔''

ازواجِ مطہرات کے جوابات:

چنانچہ ایک ایک کے پاس تشریف لے گئے اور وہی مضمون (حضرت عائشہ

رضی اللہ عنہا والا) ان سب کو سنایا، ایک ایک کو سنایا، اور باقی حضرت عائشہؓ تو نویں تھیں، آٹھ پیچھے رہ گئیں، آٹھ کی آٹھ کا جواب یہی تھا کہ عائشہؓ نے کیا جواب دیا ہے؟ ہر ایک خاتون یہ سوال پوچھتی تھی کہ عائشہؓ نے کیا جواب دیا، آنحضرت ﷺ فرماتے کہ اس نے تو یہ جواب دیا ہے، تو ہر ایک نے کہا: "بَلِ اخْتَارُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ." (بلکہ میں اللہ اور اللہ کے رسول کو اختیار کرتی ہوں)۔

بس! اس پر ختم کرتا ہوں، آنحضرت ﷺ کی باتیں تو اتنی مزیدار اور اتنی لذیذ ہیں کہ ساری رات ہی بیان کرتا رہے آدمی، اللہ تعالیٰ ہمیں آنحضرت ﷺ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، بیویاں ہمارے گھر میں بھی ہیں، بیویاں حضور ﷺ کے گھر میں بھی تھیں، ہمیں چار نکاح کرنے کی اجازت ہے۔

ایک نوجوان آیا میرے پاس، لمبی بات ہے مختصر کرتا ہوں، ماموں کانجن میں، ہمارے برابر میں، گلی کے سامنے ایک خاتون رہتی تھی ڈاکٹر، اس کا بھائی تھا، آ کے پوچھا اور بہت سے سوال کئے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ ہمیں چار کرنے کی اجازت ہے، اور سنا ہے حضور ﷺ کی نو بیویاں تھیں، میں نے کہا بیٹھ جاؤ، لمبی بات اس سے کی، اس سے میں نے کوئی گھنٹہ لگایا، پورا وقت لگایا، عصر کے بعد مغرب تک اور اس کا آخری لفظ یہ تھا کہ اگر تم مجھے آدمی سمجھتے ہو تو میں سمجھ گیا ہوں، بات کو سمجھ گیا ہوں، میں نے کہا تھا کہ مجھے اور آپ کو اور امت کے سارے لوگوں کو چار چار بیویوں کی اجازت ہے، میں تو اب کچھ تھوڑا سا موٹا ہو گیا ہوں، بڑھاپے کی وجہ سے، اس وقت تو بالکل ہی دبلا پتلا تھا، میں نے کہا ذرا میری شکل کی طرف دیکھ لیجئے، ایک عورت کے بھی قابل ہے؟ اور آپ تو مجھ سے بھی گئے گزرے ہیں، میں نے کہا ہمارے ساتھ یہ رعایت کی ہے کہ چار بیویوں کی اجازت دی ہے بشرطیکہ عدل و انصاف ہو۔

آنحضرت کی قوت:

اور آنحضرت ﷺ کو سو جنتی آدمیوں کی قوت عطا فرمائی گئی تھی، اور ایک جنتی میں چالیس پہلوانوں کی طاقت ہوتی ہے، یہاں گاما پہلوان، یہاں کا...... اس کے چالیس کی طاقت اور حضور اقدس ﷺ میں طاقت تھی سو جنتیوں کی......تو کتنے بنے بھائی...... چار ہزار، اور ایک آدمی کو کتنے کی اجازت ہے، چار بیویوں کی، تو چار ہزار کو چار سے ضرب دینے سے کتنے ہوئے بھائی...... سولہ ہزار میں نے کہا حضور ﷺ کو سولہ ہزار کی اجازت ہونی چاہئے تھی، اب ایک آدمی کو سولہ سو روٹی کی بھوک ہے اور اس کو نو دی جاتی ہیں، اور ایک آدمی ایک روٹی بھی پوری نہیں کھا سکتا، اس کو چار دے دی جاتی ہیں، وہ ایک بھی نہیں کھا سکتا، کہتا ہے میں ایک بھی نہیں کھا سکتا، اب تم بتاؤ کہ ہمارے ساتھ زیادہ رعایت کی ہے یا حضور ﷺ کے ساتھ زیادہ رعایت کی ہے، اب میں نے اس کو نمبر وار باتیں کہیں، نمبر ایک، نمبر دو، نمبر تین، نمبر چار، جب میں نے نمبر پانچ کہا، پتہ نہیں کہاں سے، اللہ تعالیٰ القا فرمارہے تھے، میں تو سوچ کر بھی نہیں بیٹھا ہوا تھا، مجھے پتہ نہیں تھا، کیا پوچھ رہا ہے یہ، جب نمبر چار پورا کرکے نمبر پانچ شروع کردیا میں نے، تب اس نے یہ کہا کہ اگر تم مجھے انسان سمجھتے ہو تو میں سمجھ گیا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مؤذنوں کے فضائل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"وَاَخْرَجَ الْبَيْهَقِيُّ فِیْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ:عَنْ اَبِی الْوَقَّاصِ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ قَالَ: سِهَامُ الْمُؤَذِّنِيْنَ عِنْدَ اللهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَسِهَامِ الْمُجَاهِدِيْنَ وَهُمْ فِيْمَا بَيْنَ الْاَذَانِ وَالْإِقَامَةِ كَالْمُتَشَحِّطِ فِیْ دَمِهٖ فِیْ سَبِيْلِ اللهِ. قَالَ: وَقَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ لَوْ كُنْتُ مُؤَذِّنًا مَا بَالَيْتُ اَنْ لَّا اَحُجَّ وَلَا اَعْتَمِرَ وَلَا اُجَاهِدَ. قَالَ: وَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ: لَوْ كُنْتُ مُؤَذِّنًا لَكَمُلَ اَمْرِیْ وَمَا بَالَيْتُ اَنْ لَّا اَنْتَصِبَ لِقِيَامِ اللَّيْلِ وَلَا صِيَامِ النَّهَارِ. سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِيْنَ! اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِيْنَ! فَقُلْتُ تَرَكْتَنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ وَنَحْنُ نَجْتَلِدُ عَلَی الْاَذَانِ بِالسُّيُوْفِ. قَالَ: كَلَّا يَا عُمَرُ اِنَّهٗ سَيَأْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ يَتْرُكُوْنَ الْاَذَانَ عَلٰی ضُعَفَائِهِمْ وَتِلْكَ لُحُوْمٌ حَرَّمَهَا اللہُ عَلَی النَّارِ لُحُوْمُ الْمُؤَذِّنِيْنَ. قَالَ: وَقَالَتْ (عَائِشَةُ رَضِیَ اللہُ عَنْهَا) لَهُمْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللهِ

وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ. قَالَتْ: هُوَ الْمُؤَذِّنُ. فَاِذَا قَالَ: حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ فَقَدْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ وَاِذَا صَلّٰی فَقَدْ عَمِلَ صَالِحًا وَاِذَا قَالَ: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰہُ فَهُوَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ."

(کنزالعمال ج:۸ ص:۳۳۸ حدیث:۲۳۱۵۸)

ترجمہ:...... "امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت ابوالوقاص رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے تھے کہ: قیامت کے دن جس طرح مجاہدین فی سبیل اللہ کو حصے ملیں گے اسی طرح کے حصے مؤذنین کو ملیں گے، یعنی اذان کہنے والوں کو اور اذان اور اقامت کے درمیان میں جو وقفہ ہوتا ہے وہ وقفہ ایسا ہے گویا مؤذن اپنے خون میں لت پت ہوتا ہے جیسا کہ شہید اللہ کے راستے میں شہید ہوجائے تو خون میں لت پت ہوجاتا ہے، جو شخص اذان کہنے کے بعد اقامت کا منتظر ہو وہ خون میں لت پت ہے یعنی اس کا اتنا اجر ہے جتنا کہ اللہ کے راستے میں زخمی ہونے والے اور خون میں لت پت ہونے والے کا اجر ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میں مؤذن ہوتا تو مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی کہ میں حج نہ کرتا، عمرہ نہ کرتا اور جہاد فی سبیل اللہ نہ کرتا۔

(مطلب یہ کہ اذان دینا ایسا عمل ہے جو تمام نیک اعمال کے قائم مقام ہوجاتا ہے) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں مؤذن ہوتا تو میرے لئے اذان کہنا ہی

کافی ہوتا رات کو اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنا اور دن کو روزے رکھنا اس کی مجھے ضرورت نہ رہتی اس لئے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا آپ فرماتے تھے :"**اللهم اغفر للمؤذنين، اللهم اغفر للمؤذنين**" یا اللہ اذان کہنے والوں کی بخشش فرمادے، یا اللہ اذان کہنے والوں کی بخشش فرمادے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے تو اتنی ترغیب دلادی کہ آئندہ ہم اذان کہنے کے لئے تلواروں سے لڑا کریں گے (میں کہوں گا کہ میں اذان کہوں گا، دوسرا کہے گا کہ میں اذان کہوں گا، دونوں کی تلواریں نکل آئیں گی یعنی اتنا بڑا عمل کہ اذان کے لئے لوگ تلواروں سے لڑا کریں گے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عمر! تم سمجھے نہیں ہو، تم سمجھے نہیں ہو، ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ اذان کا کام سب سے گھٹیا قسم کے جو لوگ ہوں گے ان پر ڈال دیں گے (یہ کون ہے؟ کہتے ہیں کہ جی مسجد کا مؤذن ہے یہ کون ہے؟ ہماری مسجد کا مؤذن ہے یعنی اذان دینا اتنا گھٹیا کام بن گیا کہ سب سے جو گھٹیا آدمی ہوتا ہے اس پر ڈالا جاتا ہے یہ ہماری مسجد کا خادم ہے، مسجد میں جھاڑو دیتا ہے، صفیں ٹھیک کرتا ہے، یہ مسجد کا مؤذن ہے اور باقی کون ہیں؟ چودھری صاحب، خان صاحب، لاحول ولا قوۃ الا باللہ! اور واقعی جو رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی وہ پوری ہوگئی، اب تو ثواب کا کام سمجھ کر اذان نہیں دیتے، اذان گھٹیا کام سمجھ کر دیتے ہیں)۔

حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

فرماتی ہیں کہ قرآن کریم کی آیت ہے:"وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ."(حم سجدہ:۳۳) (یعنی اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں)، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس آیت کی تفسیر فرمایا کرتی تھیں کہ اس سے زیادہ اچھی کس کی بات ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے؟ فرمایا اس سے مراد مؤذن ہے یہ "حی علی الصلوۃ" کہتا ہے اور نمازوں کے لئے بلاتا ہے "حی علی الصلوۃ حی علی الفلاح" لوگوں کو آوازیں دیتا ہے، اللہ کی طرف بلاتا ہے سب سے اچھی بات اس کی ہے۔

دوسری بات یہ فرماتی تھیں کہ "وَعَمِلَ صَالِحًا" کا معنی ہے کہ نیک عمل کرے اذان کہنے کے بعد نماز بھی پڑھتا ہے تو عمل صالح ہے:"وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" اور یہ شخص کہتا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں یہ مؤذن کا قول ہے:"اشہد ان لا الہ الا اللہ ، اشہد ان محمد رسول اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہے اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتا ہے۔"

کافروں کے ملک میں تو اس کی بھی اجازت نہیں کہ ہم اونچی آواز سے اذان کہیں، انگلینڈ میں میں نے دیکھا ہے کہ صرف چند مسجدیں ایسی ہیں جن میں صرف ظہر کی اذان بلند آواز سے ہی کہی جاتی ہے ورنہ مسجد کے اندر اذان کہی جاتی ہے، باہر آواز نہیں جاتی، لوگ گھڑیاں دیکھ کر کے وقت پر آجاتے ہیں نماز کے لئے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد تو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اگر میں مؤذن ہوتا تو مجھے حج وعمرے کی ضرورت نہ رہتی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ:

”وَلَوْ كَانَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ نُزُوْلًا مَا عَلَيْهِمْ اَحَدٌ عَلَى الْاَذَانِ.“ (کنز العمال ج:۱۰ص:۳۳۸ حدیث:۲۳۱۵۷)

ترجمہ:......”اگر فرشتے نازل ہوجاتے اور ان کو اذان کہنے کی اجازت مل جاتی تو کوئی شخص ان پر غالب نہ آسکتا فرشتے ہی اذان کہا کرتے۔“

اذان کی عظمت حضرت عمرؓ کے ہاں:

ایک اور روایت میں ہے:

”عَنْ قَيْسِ بْنِ اَبِىْ حَازِمٍ قَالَ قَدِمْنَا عَلٰى عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ فَقَالَ مَنْ مُؤَذِّنُكُمْ؟ فَقُلْنَا عَبِيْدُنَا وَمَوَالِيْنَا: فَقَالَ اِنَّ ذٰلِكُمْ بِكُمْ لَنَقْصٌ شَدِيْدٌ لَوْ اَطَقْتُ الْاَذَانَ مَعَ الْخَلِيْفِىْ لَاَذَّنْتُ.“

(کنز العمال ج:۱۰ ص:۳۳۹ حدیث:۲۳۱۶۰)

ترجمہ:......”قیس ابن ابی حازم سے روایت ہے کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا تمہاری اذان کون کہا کرتا ہے؟ کہا کہ ہمارے غلام، اس قسم کے لوگ گرے پڑے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم نے اپنا بہت نقصان کرلیا اور پھر فرمایا خلافت کا بوجھ میرے ذمہ ہے ورنہ ایک مسجد میں مؤذن لگ جاتا، (روٹی اللہ تعالیٰ دے دیا کرتے)۔“

خلافت راشدہ کے دور میں مؤذنوں کی کفالت:

یہاں ایک بات سمجھ لو کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں اور خلفاء کے زمانے میں مؤذنین کا باقاعدہ وظیفہ جاری ہوتا تھا، اسی طرح مدرسین کا بھی وظیفہ جاری ہوتا تھا اور دین کے جتنے شعبے تھے حکومت ان کی سرپرستی کرتی تھی اور ان تمام شعبوں کے لئے وظائف تھے، ہمارے یہاں مسجدوں میں مسجد کا خرچ پورا کرنے کے لئے چندہ کیا جاتا ہے، جھولی پھرتی ہے اس زمانے میں یہ نہیں تھا بلکہ دین، دین کے تمام شعبے، مسجد اور مسجد کے تمام شعبے، ان تمام چیزوں کے لئے حکومت کفیل ہوتی تھی، نہ امام صاحب کو تنخواہ کی ضرورت ہوتی تھی، نہ خطیب صاحب کو، نہ مدرس صاحب کو، نہ مؤذن صاحب کو اور نہ کسی اور صاحب کو، جب انگریز ملعون ہمارے ملک میں آیا اس نے ہمارا سارا نظام درہم برہم کردیا، ایک تو یہ کہ اس نے اسکول کالج اور یونیورسٹیاں بنائیں، انگریزی تعلیم رائج کی، عدالت میں آج تک پچاس سال گزر چکے ہیں سرکاری زبان انگریزی ہے، عدالتی زبان انگریزی ہے ایک فیصد آدمی بھی ہمارے ملک میں انگریزی نہیں جانتے تھے، لیکن انگریز بہادر نے انگریزی عدالتی زبان جاری کی اور لوگ دھڑا دھڑ انگریزی پڑھنے لگے کیونکہ نوکری ہی ان لوگوں کو ملتی تھی جو انگریزی جانتے تھے۔

دو لطیفے:

اس پر مجھے دو لطیفے یاد آگئے شاید میں پہلے بھی سنا چکا ہوں ایوب خان کے زمانے میں بی ڈی جمہوریت جاری ہوئی تھی اور اس کے لئے آدھے ممبر تو منتخب ہوئے تھے ووٹوں کے ذریعے سے اور آدھے ممبر لوگ تجویز کرتے تھے، ہمارے علاقہ میں ڈپٹی کمشنر تشریف لائے اور کہا کہ اپنے علاقے کے معزز لوگ بتاؤ، یعنی جو بی ڈی ممبر بنیں، ایک صاحب نے ایک آدمی کا نام لیا ڈپٹی کمشنر صاحب پوچھتے ہیں کہ اس کی تعلیم کتنی ہے؟ کہنے لگے یہ حافظ قرآن ہے، دارالعلوم دیوبند کا فارغ ہے، یہ ہے اور

وہ ہے، کمشنر صاحب کہنے لگے کہ بھائی! میں یہ پوچھتا ہوں کہ تعلیم اس کی کتنی ہے؟ قرآن کریم کا حافظ ہونا تعلیم نہیں ہے، دارالعلوم دیوبند کا فارغ ہونا تعلیم نہیں ہے، یہ پاکستان بننے کے بعد کی بات ہے ایوب خان کے دور کی، آخر اس نے کہا کہ یہ پرائمری پاس ہے؟ کہنے لگے ہاں! یہ تو بات ہوئی ناں۔

ذرا اندازہ فرمایئے کہ انگریز نے ہماری ذہنیت کو کس طرح بدلا اور اب تک وہی چلا آرہا ہے بلکہ اس سے زیادہ اب اضافہ ہوگیا، جبکہ انگریز کے آنے سے پہلے سرکاری طور پر لوگوں کی دینی اور علمی بنیاد کو اہمیت حاصل تھی اور سرکاری ملازموں کو دینی معاملات پر انعام ملتا تھا، چنانچہ عالمگیرؒ کے زمانے میں ایک بار عالمگیر بادشاہ نے اپنے مصاحبین اور دوسرے لوگوں سے کہا کہ فلاں دن امتحان ہوگا اور جو لوگ پوری نماز سنائیں گے اور مسائل سنائیں گے ان کو انعام ملے گا، اب تمام لوگ میاں جی کے پاس پہنچے۔

دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ ہمارے ساتھی تھے جن کا نام تھا حبیب الرحمٰن، وہ میرے حدیث کے ساتھی تھے، بعد میں ملے نہیں پتہ نہیں کہاں گئے، بعد میں ان کی زیارت نہیں ہوئی، وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''ہیں سائیں'' وہ سرائیکی زبان بولتے تھے ملتانی زبان ''ہیں سائیں امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ مولوی فاضل ہائی کہ نہ ہائی'' یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ مولوی فاضل تھے یا نہیں تھے؟ ان جاہلوں کے نزدیک امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ان پڑھ تھے اور یہ انگریز اور انگریز کی ذریت جو انگریزی پڑھا ہوا نہ ہو اس کو سمجھتے ہیں جاہل ہے، میں نے کوئی مولوی فاضل نہیں کیا اس لئے میں کسی کے معیار پر پورا نہیں اترا۔ الحمدللہ۔ خدا کرے کہ اللہ کے معیار پر پورا اتروں۔

تو بات چل رہی تھی کہ اذان کا کام تو سپرد کردیا دوسرے لوگوں کے اور یہ بڑے بڑے چودھری جو ہیں یہ ملازمتیں کرتے ہیں، دکان داریاں کرتے ہیں، کماتے ہیں اور ان کو نماز پڑھنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی، میں عرض یہ کررہا تھا کہ اس بھلے

زمانے میں گورنمنٹ اس کی کفالت کرتی تھی۔

انگریزی سازش:

انگریز آیا تو اس نے ہمارا سارا نظام برباد کردیا، جتنے اچھے لکھے پڑھے تھے یعنی قابل دماغ تھے وہ اس نے کھینچ لئے جدید عصری علوم کے لئے، ان کو عصری علوم کہتے ہیں، استنجا کرنا بھی آتا ہے یا نہیں لیکن عصری علوم حاصل ہیں اور ہمارے پاس مولویوں کے پاس کیا رہا کچھ نہیں رہا، ہمارے اکابر نے، بزرگوں نے لوگوں کی منت سماجت کی کہ ہمیں اپنی اولاد دو دین کے لئے، کوئی معذور آدمی ملا، کوئی نابینا ملا اس قسم کے لوگوں کو پڑھایا، تو ہمارے کام کے لئے یہی لوگ پیچھے رہ گئے، دل کو تکلیف تو ہوتی ہے، اور صدمہ بھی ہوتا ہے، لیکن میں نے سوچا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ غَرِیْبًا
فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ." (صحیح مسلم ج:۱ ص:۸۴)

ترجمہ:...... "اسلام غربت کی حالت میں شروع ہوا تھا
اور عنقریب غربت کی حالت کی طرف لوٹ جائے گا، مبارک ہو
ان لوگوں کو جو اس لائن میں آگئے۔"

اللہ تعالیٰ دین کی بقا میں کسی کے محتاج نہیں:

انگریز کا ارادہ یہ تھا کہ دین کو مٹادیا جائے اور ختم کردیا جائے، روپے پیسے کا لالچ دے کر، دوسری چیزوں کا لالچ دے کر کہ دین کا نام لینے والا کوئی نہ رہے لیکن میرے اللہ نے اس دین کو رکھنا تھا اور دین کو باقی رکھنے میں وہ ہمارا محتاج نہیں، چنانچہ فرمایا: "وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْا اَمْثَالَکُمْ." (محمد:۳۸) (اگر تم بدل جاؤ گے، منہ پھیر لوگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو بدل دیں گے، پھر وہ تمہارے جیسے نہیں ہوں گے) حق تعالیٰ شانہ نے اپنے دین کا کام لیا اندھوں سے، لولے لنگڑوں سے، انہوں نے تمہارے طعنے بھی سنے کہ یہ مانگ

کر کھاتے ہیں، ہم نے کہا ٹھیک ہے، بجا فرمایا ہے، اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ہم اپنے بچے کو نہیں پڑھائیں گے یہ کہاں سے کھائے گا؟

میں ایک بات کہتا ہوں تمہارے پڑھے لکھے جو لوگ ہیں جتنے اونچے لوگ ہیں ان کو خودکشی کرتے ہوئے دیکھا ہے لیکن کبھی ملا کو خودکشی کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا اللہ ان کو بھی روزی دے دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، ان کے صاحب زادے حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور ان جیسے دوسرے حضرات کی قبروں کو نور سے بھر دے، جنہوں نے دین کو دوبارہ زندہ کیا، بڑے بڑے ڈاکٹروں اور کیپٹنوں کے بچے ان عربی مدرسوں میں پڑھتے ہیں، الحمدللہ دین زندہ ہے اور زندہ رہے گا لیکن بھائی اس کو حقیر نہ سمجھو، بہت سے لوگ جو اس وقت اونچے ہیں قیامت کے دن نیچے کردیئے جائیں گے اور بہت سے لوگ جو نیچے ہیں جن کو کوئی پوچھتا نہیں ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کو اونچا کردیں گے۔

حضرت علیؓ کے ہاں مؤذنوں کا مقام:

ایک اور روایت میں ہے:

''عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: نَدِمْتُ اَنْ لَّا اَكُوْنَ طَلَبْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَجْعَلُ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ مُؤَذِّنِيْنَ.'' (حیاۃ الصحابۃ ج:۵ ص:۱۷۹)

ترجمہ:...... ''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ندامت ہوتی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کیوں نہ کی کہ حسن وحسین رضی اللہ عنہم کو مؤذن لگادیا جائے، یعنی مجھے یہ بات ذہن میں نہیں رہی کہ یہ حضور ﷺ سے عرض کروں۔''

مؤذن صحیح سالم ہو:

طبرانی نے سیر کبیر کے حوالے سے نقل کیا ہے:

"عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: اُحِبُّ اَنْ یَّکُوْنَ مُؤَذِّنُوْکُمْ عُمْیَانَکُمْ قَالَ: وَاَحْسِبُہٗ قَالَ: وَلَا قُرَّائُکُمْ." (حیاۃ الصحابہ ج:۵ ص:۱۷۹)

ترجمہ:......"حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا کرتے تھے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہارے مؤذن اندھے ہوں، یا تمہارے مؤذن قاری ہوں۔

اندھوں کے مؤذن نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے چارے پاکی ناپاکی کا لحاظ نہیں رکھ سکتے اسی لئے نابینا کی امامت بھی مکروہ ہے ہاں اگر وہ پاک صاف ہوں تو ان کے امامت اور اذان دینے میں کوئی حرج نہیں، ماشاءاللہ ہمارے قاری فتح محمد صاحب ماشاءاللہ اماموں کے امام تھے۔

دوسرے یہ کہ نابینا کو وقت کا نہیں پتہ چلے گا ہاں اگر کوئی دوسرا اس کو بتانے والا ہو تو الگ بات ہے۔

باقی قاریوں کے مؤذن ہونے کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ وہ اپنے دوسرے اہم مشاغل میں مشغول ہیں، لوگوں کو قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہیں تو اس لئے ان کا حرج ہوگا۔

اذان میں غلطیوں پر ناراضی:

ایک روایت میں ہے:

"قَالَ رَجُلٌ لِابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ: اِنِّیْ لَاُحِبُّکَ فِی اللہِ! فَقَالَ اِبْنُ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا: لٰکِنِّیْ اُبْغِضُکَ فِی اللہِ! قَالَ: وَلِمَ؟ قَالَ: اِنَّکَ تَتَغَنّٰی فِیْ

اَذَانِکَ وَتَأْخُذَ عَلَيْهِ اَجْرًا." (حیاۃ الصحابہ ج:۵ ص:۱۷۹)

ترجمہ:......"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک صاحب کہنے لگے کہ میں اللہ کی خاطر آپ سے محبت رکھتا ہوں (یہاں مسئلہ بتادوں کہ اگر کوئی کسی کو کہے کہ میں اللہ کی خاطر آپ سے محبت رکھتا ہوں تو اس کے جواب میں یہ کہنا چاہئے کہ:"اَحَبَّکَ اللهُ كَمَا اَحْبَبْتَنِیْ لَهٗ." اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت فرمائے جس طرح کہ تو اللہ کی خاطر میرے ساتھ محبت رکھتا ہے) تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمانے لگے کہ لیکن میں اللہ کی خاطر تجھ سے بغض رکھتا ہوں، وہ صاحب کہنے لگے حضرت! یہ کیا بات ہوئی؟ فرمایا ایک تو یہ کہ تو اذان کہتے ہوئے بڑا ترنم لگاتا ہے سیدھی سادی اذان نہیں کہتا بلکہ ترنم سے (شیعوں کی اذان کبھی سنی ہوگی تو ایسی اذان) کہتا ہے اور دوسرے یہ کہ تو اذان پر اجرت لیتا ہے۔"

میں نے کہا تھا کہ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مؤذنین کا سرکاری طور پر باقاعدہ وظیفہ جاری تھا، انگریز بہادر کے آنے کے بعد پھر ہمیں انتظام کرنا پڑا۔

اذان اہل علاقہ کے ایمان کی علامت ہے:

ایک روایت میں ہے:

"عَنْ خَالِدِ الْاَحْوَلِ عَنْ خَالِدِ بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ: بَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَالِدَ ابْنَ سَعِيْدِ بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اِلَى الْيَمَنِ فَقَالَ: اِنْ مَرَرْتَ بِقَرْيَةٍ فَلَمْ تَسْمَعْ اَذَانًا فَأَصِبْهُمْ، فَمَرَّ بِبَنِیْ زُبَيْدٍ فَلَمْ يَسْمَعْ اَذَانًا فَسَبَّاهُمْ. فَاَتَاهُ عَمْرِ بْنِ مَعْدِيْكَرُبَ فَكَلَّمَهٗ فَوَهَبَهُمْ لَهٗ

خَالِدٌ۔" (کنزالعمال ج:۴ ص:۴۸۳ حدیث:۱۱۴۴۱)

ترجمہ:...... "آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد ابن سعید رضی اللہ عنہ کو جہاد کے لئے یمن بھیجا اور فرمایا کہ فجر کے وقت حملہ کرو حملہ کرنے سے پہلے یہ دیکھو کہ اس قبیلے سے اذان کی آواز آئی ہے یا نہیں اگر اذان کی آواز آئے تو ہاتھ روک لو، قبیلہ بنو زبید میں حضرت خالد بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ گئے تو انہوں نے دیکھا کہ اذان نہیں ہوئی یہاں آپ نے ان کو گرفتار کرلیا تو حضرت عمر بن معد یکرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سفارش کر کے چھڑایا کہ مسلمان ہیں لیکن اذان کی آواز آپ کو نہیں سنی ہوگی۔"

ایک اور روایت میں ہے:

"قَالَ كَانَ اَبُوْبَكْرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ يَأْمُرُ اُمَرَائَهُ حِيْنَ كَانَ يَبْعَثُهُمْ فِي الرِّدَّةِ اِذَا غَشِيْتُمْ دَارًا فَاِنْ سَمِعْتُمْ بِهَا اٰذَانًا فَكُفُّوْا حَتّٰى تَسْأَلُوْهُمْ مَاذَا تَنْقِمُوْنَ فَاِنْ لَّمْ تَسْمَعُوْا اٰذَانًا فَشُنُّوْهَا غَارَةً وَاقْتُلُوْا......"

(حیاۃ الصحابہ ج:۵ ص:۱۷۹)

ترجمہ:...... "حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ارتداد کے زمانے میں، جب لوگ مرتد ہوگئے تھے حضور ﷺ کے بعد) لوگوں کو بھیجتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب تم اذان سنو تو رک جاؤ یہاں تک کہ ان پر حملہ نہ کرو لیکن یہ پوچھو کہ ان کو ہمارے اوپر کوئی اعتراض ہے، خلافت کے معاملے میں کوئی اعتراض ہے ان کے شبہات دور کرو اور اگر کسی جگہ سے اذان کی

آواز نہ آئے تو سمجھ لو کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مرتد ہیں ان پر حملہ کرو۔"

مصنف عبدالرزاق میں امام زہری رحمہم اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مرتدین سے لڑائی کرنے کے لئے بھیجا تو فرمایا رات گزارو وہاں اور صبح کی اذان سنو اگر وہ لوگ اذان کہیں تو ٹھیک ہے اور اگر اذان نہ کہیں تو پھر ان سے قتال کرو، اس لئے کہ اذان شعار ایمان ہے، جس بستی سے اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بستی مسلمانوں کی نہیں ہے۔

بھائی! مسلمانوں کے ہاں اذان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بستی کے لوگ ان پڑھ تھے بیچاروں کو اذان نہیں کہنی آتی تھی تو انہوں نے یہودی کو کرائے پر رکھ لیا اذان کہنے کے لئے کہ پانچ وقت کی اذان تم کہہ لیا کرو اب اذان دینا یہ اس کے عقیدے کے خلاف تھا اور نوکری بھی کرنی تھی اس لئے: "اشہد ان لا الہ الا اللہ" تو اس کو ہضم ہوجاتا تھا، مگر "اشہد ان محمد رسول اللہ" جب کہنا ہوتا تو یہ کہتا کہ اس بستی کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں ﷺ یعنی مؤذن بھی کرائے کا رکھا ہوا تھا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نیکی عطا فرمائے اور مسلمانوں کو ہدایت عطا فرمائے تمام مسلمان اللہ کی بارگاہ میں توبہ کریں اور جو کوتاہیاں اور لغزشیں ہم سے ہوئی ہیں ان کی معافی مانگیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اعتکاف کے آداب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

حق تعالیٰ شانہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہم اعتکاف میں بیٹھ گئے ہیں، حق تعالیٰ شانہ اپنی رحمت کے ساتھ اس اعتکاف کے آداب صحیح طور پر بجالانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اعتکاف کا معنی جم کر بیٹھنے کے ہیں یعنی بندے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جم کر بیٹھ جائیں اور اس طرح بیٹھ جائیں کہ جب تک نجات نہیں ہوتی، ہم اس وقت تک دروازہ نہیں چھوڑیں گے، وہ کریم آقا ہے، مالک الملک ہے، کسی سوالی کے سوال کو رد نہیں کرتا، کوئی شخص اس کے دروازے پر سوال کرے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ رد کردے۔

کریم کا کرم:

ایک مشہور قصہ ہے کہ ایک شخص غیر اللہ کو پوجنے والا تھا، وہ غیر اللہ کو پکارتا تھا، ایک دفعہ اتفاق سے اس کے منہ سے نکل گیا "یا صمد!" تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً آواز آئی کہ میرے بندے کیا کہتا ہے؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اتنے بے نیاز ہیں کہ ان کو کسی کی پروا نہیں، لیکن اتنے کریم آقا ہیں کہ اگر کوئی بھول کر بھی اس کا نام لے لے، تو فرماتے ہیں کہ کیا کہتا ہے؟ تو ہم لوگ مسجد میں، اللہ کے گھر میں، محض اس کی رضا کے لئے، محض اس کی خوشنودی کے لئے، اس کو راضی کرنے کے لئے بیٹھ گئے ہیں، کوئی کام نہیں، اور سوائے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے اور کوئی مقصد نہیں، اس لئے

ایک بات تو یہ یاد رکھو کہ انشاءاللہ ثم انشاءاللہ ثم انشاءاللہ، اللہ تعالیٰ تمہاری تمام عبادتوں کو قبول فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی عبادتوں کو قبول فرمائیں گے، اگرچہ ہماری عبادتیں اس لائق نہیں کہ انہیں قبول کیا جائے لیکن وہ آقا بہت کریم ہے، وہ ہمیں نہیں دیکھتا، اپنے کرم کو دیکھتا ہے، اپنی بندہ نوازی کو دیکھتا ہے، تو ایک بات تو یہ عرض کرنی تھی کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے، اللہ تعالیٰ کے کرم سے، اس کے گھر میں اعتکاف بیٹھ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کے اعتکاف کو قبول فرمائے اور ایسا قبول فرمائے، ایسا قبول فرمائے، ایسا قبول فرمائے کہ جب ہم اعتکاف ختم کریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہو کہ جاؤ تمہیں بخش دیا، سب پر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے، بندہ نوازی ہے۔

مسجد کے آداب:

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ یہاں مسجد میں آدمی بہت جمع ہوجاتے ہیں، بہت آہستہ بھی بولیں تو آواز اٹھتی ہے تو ہونا یہ چاہئے کہ اللہ کے گھر میں ہماری آواز نہ آئے، ایک دوسرے سے ہم بات کریں تو بہت آہستہ سے بات کریں، یہ اللہ کا دربار ہے، اللہ کی بارگاہ ہے، یہاں آواز بلند کرنا اچھا نہیں ہے، اس کی عادت ڈالیں، ویسے الحمدللہ ہماری مسجد میں اس کا بڑا اہتمام رہتا ہے، یہاں ساتھی آتے ہیں مسجد میں تو نہایت اطمینان کے ساتھ، وقار کے ساتھ، اپنے اپنے شغل میں مشغول ہوجاتے ہیں باتیں نہیں کرتے، لیکن پھر بھی یہ مجمع چونکہ بہت ہے، دس آدمی بھی اگر بات کریں تو پھر دیکھو کتنی آواز بلند ہوجائے گی، اس لئے میں اپنے تمام دوستوں کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ بات نہ کریں اور اگر ضرورت پڑے تو بہت ہی آہستگی کے ساتھ، گویا کہ جیسے کان میں بات کہتے ہیں اور یہ میری وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے جلال کی وجہ سے، یہ بارگاہ خداوندی ہے، بہت اونچا دربار ہے، بہت ہی اونچا دربار ہے، قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: "فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا." قیامت کے دن لوگ

اولین و آخرین جمع ہوں گے اور بہت سے منظر ذکر فرمائے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''بس تو نہیں سنے گا سوائے اس کانہ پھوسی کی آواز کے۔'' بندے جمع ہوں گے لیکن وہاں چلانا یا شور مچانا کیا معنی؟، ایک دوسرے سے بات بھی کریں گے تو بہت آہستہ کہ کسی کو سنائی بھی نہ دے، تو وہ تو قیامت کا منظر ہے اور یہ اللہ کا گھر ہے، تو اللہ تعالیٰ کے اس گھر میں بھی جہاں تک ہوسکے کسی کی آواز نہیں سنائی دینی چاہئے، میں جانتا ہوں کہ میں بات تو کر رہا ہوں لیکن اس پر عمل نہیں ہوگا، اس لئے کہ ہم مسجد کی اہمیت اور آداب سے ناآشنا ہیں، حضرات صحابہ کرامؓ کو اس کی اہمیت کا اندازہ تھا، اس لئے وہ اس کا اہتمام بھی فرمایا کرتے تھے، چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ:

''عَنْ مَالِکٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ قَالَ بَنٰی عُمَرُ رَحْبَةً فِیْ نَاحِیَةِ الْمَسْجِدِ تُسَمَّی الْبُطَیْحَاءُ وَقَالَ مَنْ کَانَ یُرِیْدُ اَنْ یَّلْغُطَ اَوْ یَنْشُدَ شِعْرًا اَوْ یَرْفَعَ صَوْتَهٗ فَلْیَخْرُجْ اِلٰی هٰذِهِ الرَّحْبَةِ۔'' (مشکوٰۃ ص:۷۱ بحوالہ موطا)

ترجمہ:...... ''امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد کے ایک طرف ایک جگہ بطیحاء نامی بنائی تھی، ان کا معمول تھا کہ مسجد بھری ہوئی ہوتی تھی کہ کسی کی ذرا بھی آواز نکلتی تھی تو اس کو بلاتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہ مسجد سے باہر ایک جگہ بنی ہوئی ہے، اگر بات کرنی ہے یا کوئی شعر وغیرہ پڑھنے ہیں تو وہاں جا کر کرو (مسجد میں بات نہیں کرنے دیتے تھے)۔''

ایک اور روایت میں ہے:

''عَنِ السَّائِبِ بْنِ یَزِیْدِ رَّضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: کُنْتُ نَائِمًا فِی الْمَسْجِدِ فَحَصَبَنِیْ فَنَظَرْتُ فَاِذَا هُوَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، فَقَالَ: اِذْهَبْ فَأْتِنِیْ

بِهٰذَيْنِ فَجِئْتُهُ بِهِمَا، فَقَالَ: مِمَّنْ اَنْتُمَا اَوْ مِنْ اَيْنَ اَنْتُمَا؟ قَالَا: مِنْ اَهْلِ الطَّائِفِ! قَالَ: لَوْ كُنْتُمَا مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ لَاَوْجَعْتُكُمَا تَرْفَعَانِ اَصْوَاتَكُمَا فِيْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ." (مشکوۃ ص:۱۷)

یعنی حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں مسجد میں سویا ہوا تھا، ایک آدمی نے کسی چیز کے ذریعہ مجھے جگایا، میں نے دیکھا تو وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، (ایک دفعہ کچھ لوگ آئے انہوں نے آپس میں کچھ بات کی، آواز تھوڑی اونچی ہوگئی) فرمایا ان دونوں آدمیوں کو بلاکر لاؤ، میں ان دونوں کو بلاکر لایا، تو ان سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ مدینہ کے تو معلوم نہیں ہوتے کہاں سے آئے ہو؟ کہنے لگے: ہم طائف سے آئے ہیں! کہنے لگے: اچھا مسلمان ہو، باہر سے آئے ہو، ورنہ تم جس طرح اونچی آواز نکالتے ہو مسجد میں، میں تمہاری پٹائی کرتا مگر تم مہمان ہو اس لئے تمہیں کچھ نہیں کہتا مگر آئندہ تمہیں یہ فہمائش کرتا ہوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز اونچی کرنے سے ایذا پہنچتی ہے، اس لئے آواز اونچی نہ کرو، وہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد تھی، لیکن دوسری مساجد کا بھی احترام ہے، آواز بلند کرنا، قہقہے لگانا، یا اس طرح دوسرے کام کرنا یہ ٹھیک نہیں ہے، جتنا مسجد کا ادب کروگے اور جتنی اپنی آواز پست کروگے اللہ تعالیٰ اتنا ہی تم سے راضی ہوجائیں گے، تو اس لئے آپ حضرات سے ایک بات تو مجھے یہ عرض کرنی تھی، آپ جانتے ہی ہیں کہ مجمع زیادہ ہے اس لئے تھوڑی آواز بھی زیادہ ہوجاتی ہے اس لئے کوشش کرو کہ بالکل آواز نکلے ہی نہیں، بہت ہی اہتمام کے ساتھ کسی کو کوئی بات کہنی ہو، تو بہت ہی آہستہ سے کہو۔

اعتکاف کے معمولات:

ایک بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ ہم یہاں مسجد میں بیٹھے ہیں، ہمارے

مختلف تقاضے ہوں گے، مسجد میں رہنے کے بعد ہمیں یہاں کیا اعمال کرنے چاہئیں، ہمارے ڈاکٹر صاحب نے تمہیں بتا ہی دیا ہے کہ کچھ معمولات تو اپنے اپنے انفرادی ہیں اور کچھ معمولات اجتماعی ہیں، فجر کی نماز کے بعد، تسبیحات کے بعد کچھ تھوڑا سا بیان ہوا کرے گا، زیادہ لمبا بیان نہیں ہوگا، اس کے بعد آپ سو سکتے ہیں، تھوڑا آرام کرسکتے ہیں، اس کے بعد تقریباً ساڑھے گیارہ بجے سب حضرات اٹھ جائیں، انشاءاللہ آپ پہلے ہی اٹھے ہوئے ہوں گے، قرآن مجید کی تلاوت کریں، ساڑھے گیارہ بجے اجتماعی عمل شروع ہوگا، وہ یہ کہ کچھ تھوڑی تعلیم ہوگی، کچھ مذاکرہ ہوگا اور سنا سنایا جائے گا، اس سے بھی بہت فائدہ ہوگا، ہم ایک دوسرے کے گواہ بن جائیں گے قیامت کے دن، یہ عمل جاری رہے گا اور اس کے بعد اذان، پھر جماعت اور اس کے بعد ختم خواجگان، پھر ذکر کی مجلس ہوگی، ذکر کی مجلس کا طریقہ اس وقت بتادیں گے، انشاءاللہ ذکر کی مجلس ختم کرنے کے بعد، اب آپ آزاد ہیں، اب آپ اپنا اپنا کام کریں، کسی کو آرام کرنا ہے آرام کرے، کسی کو تلاوت کرنی ہے تلاوت کرے اور عصر کی نماز کے بعد جیسا کہ آپ کو معلوم ہے حدیث کا درس ہوتا ہے اور عصر کے بعد وقت بھی مختصر ہوتا ہے، مغرب کے بعد اپنی نماز ہوگی اور اپنا کھانا پینا ہوگا اور عشاءؑ کی نماز پڑھ کے جیسا کہ آج آپ نے سنا ہے، پہلے درود شریف ہوگا اور اس کے بعد حکایت صحابہ ہوگی، بس یہ دن رات کے معمولات ہیں، یہ بہت مختصر سے رکھے ہیں، تاکہ آپ لوگ اپنے انفرادی اعمال بھی کرسکیں، اور اپنے اجتماعی اعمال بھی کرسکیں۔

ہمارے شیخ نوراللہ مرقدہ ہمیشہ ارشاد فرماتے تھے کہ بھئی ہمارے یہاں کھانے پینے کی پابندی نہیں، جتنا کھا سکتے ہو کھاؤ اور جتنا چاہو سو، سونے کی پابندی نہیں، آرام کی پابندی نہیں، لیکن باتیں کرنے کی پابندی ہے، مسجد میں رہتے ہوئے، اعتکاف کرتے ہوئے تمہاری آواز نہیں آنی چاہئے، جو معمولات میں نے تمہیں بتادیئے، انہیں کے مطابق آواز آئے گی، اس کے علاوہ تمہاری آواز نہیں آنی چاہئے۔

صلاۃ التسبیح کا اہتمام:

ایک بات مجھے خاص طور سے یہ عرض کرنی ہے آپ حضرات ماشاءاللہ معتکف ہیں اور دوسرے حضرات بھی ہیں، تو اعتکاف کے دنوں میں اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے صلاۃ التسبیح کا اہتمام فرمائیں، دن کو پڑھ لیں، رات کو پڑھ لیں، اس کا اہتمام کریں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ چار رکعت کی نیت باندھی جائے، پہلی رکعت میں سبحانک اللہ پڑھنے کے بعد اعوذ باللہ، بسم اللہ، الحمد شریف پڑھی، اس کے بعد کوئی سورت پڑھ لی، چھوٹی سورت پڑھو، بڑی سورت پڑھو، تمہاری مرضی اپنی ہمت ہے تمہاری، جتنا گڑ ڈالوگے اتنا میٹھا ہوگا، اس کے بعد: "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلهِ وَلَا اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ." پندرہ دفعہ پڑھو، اس کے بعد رکوع میں چلے گئے، رکوع میں "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم، سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم، سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم." جتنی دفعہ چاہو پڑھو، تمہاری مرضی گیارہ دفعہ پڑھو، اکیس دفعہ پڑھو، زیادہ پڑھو، جب تم نے رکوع کی تسبیحات پڑھ لیں تو اس کے بعد دس مرتبہ پڑھو: "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلهِ وَلَا اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ." رکوع سے کھڑے ہوگئے "سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ." کہا اور اس کے بعد دس مرتبہ پھر تسبیحات "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلهِ وَلَا اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ." پھر اس کے بعد سجدے میں چلے گئے، سجدے میں جانے کے بعد، سجدے کی تسبیحات پڑھیں "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى، سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى، سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى." جس طرح میں نے کہا کہ جتنا چاہو پڑھو، جب تم نے یہ تسبیحات پڑھ لیں، اس کے بعد دس مرتبہ پڑھو: "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلهِ وَلَا اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ." پھر پہلے سجدے سے اٹھنے کے بعد بیٹھ کے دس مرتبہ پڑھو، پھر دوسرے سجدے میں سجدے کی تسبیحات پڑھنے کے بعد دس مرتبہ پڑھو، پھر دوسرے سجدے کے بعد اٹھ کر دس بار پڑھو، یہ کل پچھتّر مرتبہ ہوگئیں، اب کھڑے ہوجاؤ، اسی ترتیب کے ساتھ دوسری رکعت پوری کرو، اس کے بعد قعدہ

اولیٰ میں التحیات پڑھ لی، اس کے بعد درود شریف بھی پڑھ لو، اس کے بعد چاہو تو دعا بھی پڑھ لو، سلام نہ پھیرو، غرض یہ کہ ایک رکعت میں پچھتّر مرتبہ چار رکعتوں میں تین سو مرتبہ، یہ صلوٰۃ التسبیح ہے، اس کی بھئی کم از کم رمضان المبارک میں تو پابندی کرلو، اللہ تعالیٰ تمہیں نیکی عطا فرمائیں، برکتیں عطا فرمائیں اور اگر عادت ہی بن جائے تو بہت ہی اچھی بات ہے، دن کو پڑھو، رات کو پڑھو، اگر دن کو پڑھو تو زوال سے پہلے پہلے پڑھ لو، اور اگر رات کو پڑھو تو جب چاہو پڑھو۔

تلاوت کا اہتمام:

ایک ضروری بات یہ عرض کرنی ہے کہ ہم یہاں اللہ کے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہیں، مانگنے والے ہیں، جہاں تک ہوسکے اپنی ہمت کے مطابق دعائیں مانگو، قرآن کریم کی تلاوت بھی جہاں تک ہوسکے کرو، پتہ نہیں آپ حضرات کا معمول ہوگا تلاوت کا جیسا کہ میں نے پہلے بتایا تھا۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ ایک قرآن مجید دن کو پڑھا کرتے تھے، ایک قرآن مجید رات کو پڑھا کرتے تھے، ایک قرآن مجید تراویح میں پڑھا کرتے تھے، پورے رمضان میں اکسٹھ قرآن مجید پڑھتے تھے۔ یہی طریقہ امام شافعیؒ کا بھی تھا اور امام بخاریؒ کا بھی تھا، یہ ہمارے وہ بزرگ تھے جن کو ہم اپنا مقتدیٰ سمجھتے ہیں، ہمارے امام حضرت امام ابوحنیفہؒ مدینہ طیبہ تشریف لے جاتے تھے تو تین دن وہاں قیام فرماتے، تین دن نہ کھانا، نہ پینا، نہ پیشاب، نہ پاخانہ اور فرماتے تھے کہ بھئی اس سے زیادہ کا تحمل نہیں، ورنہ رسول اللہ ﷺ کے شہر میں گندگی پھیلانا، حیاء کے خلاف ہے، شرم آتی ہے، یہ ہمارے وہ بزرگ ہیں جن پر ہم فخر کرتے ہیں، ظاہر بات ہے کہ ہم ان کی ریس نہیں کرسکتے۔

دعاؤں کا اہتمام:

دوسرے معمولات کے علاوہ ایک معمول دعا کا ہونا چاہئے تم اللہ تعالیٰ سے

مانگو اور جم کر مانگو جو جو بھی تمہارے دل میں خواہش ہے دنیا کی اور آخرت کی وہ اللہ سے مانگو اور ہم تو دنیا ہی مانگیں گے آخرت کیا مانگیں گے، ہمارے ہاں تو دنیا ہی ہے، آخرت تو ہم نے دیکھی ہی نہیں، اس لئے اللہ سے کیا مانگیں گے آخرت، نہیں بھائی دنیا تو اللہ سے اگر مانگوتو بھی دیتا ہے اور نہ مانگوتو بھی دیتا ہے، اگر تم یہ کہو کہ مجھے دنیا نہیں چاہئے ہرگز نہیں چاہئے مگر وہ جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے نام پر لکھی ہوئی ہے، وہ ضرور تمہیں دے گا۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ہماری پیدائش سے پہلے ہی ہمارا رزق لکھ دیا جاتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

"ثُمَّ یُرْسِلُ اللّٰہُ الْمَلَکَ فَیَنْفُخُ فِیْہِ الرُّوْحَ ......
وَفِیْ رِوَایَۃٍ فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ اَشَقِیٌّ اَوْ سَعِیْدٌ؟ فَیَکْتُبَانِ فَیَقُوْلُ: یَا رَبِّ اَذَکَرٌ اَوْ اُنْثٰی؟ فَیَکْتُبَانِ وَیَکْتُبُ عَمَلَہٗ وَاَثَرَہٗ وَاَجَلَہٗ وَرِزْقَہٗ."

یعنی بچہ ماں کے پیٹ میں تین چلے کا ہوتا ہے چار مہینے کا ابھی پورا نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو بھیج دیتے ہیں اور وہ اس میں روح پھونکتا ہے ......اور ایک روایت میں ہے کہ وہ فرشتہ اللہ تعالیٰ سے پوچھ پوچھ کر لکھتا رہتا ہے، فرشتہ کہتا ہے: یا اللہ! نیک بخت ہوگا یا بد بخت ہوگا؟ وہ بھی بتادیتے ہیں، یا اللہ! یہ لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ وہ بھی بتادیتے ہیں، یا اللہ! یہ کیا کرے گا؟ یہ بھی بتا دیتے ہیں اور یا اللہ! یہ سفر کتنا کرے گا؟ وہ بھی بتا دیتے ہیں، اور اس کی زندگی کتنی ہے؟ وہ بھی بتادیتے ہیں، اور اس کی موت کب آئے گی؟ وہ بھی بتادیتے ہیں، اور اس کا رزق کتنا ہوگا؟ وہ بھی بتادیتے ہیں۔

ایک سوال جیسا کہ آپ نے ابھی سنا یہ ہوتا ہے کہ — اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے — یا اللہ یہ نیک بخت ہے یا بدبخت؟ نعوذ باللہ کوئی پتہ نہیں، یہ بھی بتا دیتے

ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ بتاتے جاتے ہیں وہ لکھتا جاتا ہے اور وہ پروانہ اس کی گردن میں لٹکا دیا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

''وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنَاهُ طَآئِرَهُ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَّلْقَاهُ مَنْشُوْرًا.'' (الاسراء:۱۳)

ترجمہ:......''اور ہر انسان، ہم نے چپکا دیا ہے پروانہ اس کی گردن میں، اور قیامت کے دن ہم ایک اور کتاب نکالیں گے جس کو کھلا ہوا پائے گا (وہ انسان کا اپنا نامہ اعمال ہوگا اور پتہ نہیں کیا کیا ہم نے کیا ہے)۔''

اللہ سے کیا مانگیں؟

تو میرا بھائی میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ رزق تو اللہ تعالیٰ سے مانگو تب بھی دے گا اور اگر تم اللہ تعالیٰ سے یہ کہو کہ نہیں لیتا تب بھی دے گا، جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھ دیا ہے وہ دے گا، لیکن اصل مسئلہ آخرت کا ہے، مرنے کے بعد میرے ساتھ اور آپ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ اس کی فکر کی ضرورت ہے اور قیامت کے دن میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ اس کی فکر کی ضرورت ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک بندے کو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیری نیکیاں اور بدیاں برابر ہیں اگر تو ایک نیکی کہیں سے لے آئے تو تو جنت میں چلا جائے گا، وہ بندہ کہے گا کہ یہ تو بہت معمولی بات ہے، میری ماں ہے، میرا باپ ہے، میرا بھائی ہے، میرا فلاں ہے، میرا فلاں ہے، جاکے ایک نیکی مانگ کر لے آتا ہوں، وہ باپ کے پاس جائے گا وہ انکار کردے گا، ماں کے پاس جائے گا وہ انکار کردے گی، بھائی کے پاس جائے گا وہ انکار کردے گا، تمام محشر میں سے ایک آدمی بھی اس کو ایک نیکی دینے کے لئے تیار نہیں ہوگا، وہ بہت پریشان ہوگا پہلے تو خوش تھا کہ ایک نیکی کی کیا بات ہے مل جائے گی، لیکن یہاں کا معاملہ الٹ نکلا، راستے میں اسے ایک

آدمی ملے گا وہ کہے گا کہ کیا بات ہے بھائی! وہ اسے اپنا قصہ سنائے گا وہ کہے گا کہ میرے پاس ایک ہی نیکی ہے اور تیرے پاس اتنی نیکیاں تھیں وہ رد ہوگئیں، میرے پاس ایک ہی نیکی ہے یہ تو لے لے، وہ دے دے گا، خوش خوش جائے گا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کہاں سے ملی یہ نیکی؟ وہ سارا قصہ بتائے گا، فرمایا پہلے اُس کو جنت میں بھیجیں گے پھر تجھے بھیجیں گے، اس لئے کہ اس بیچارے کے پاس ایک ہی نیکی تھی، معلوم ہوا کہ مخلوق خدا پر رحم کرنا قیامت کے دن بھی کام دے گا، تو بہرحال کہنا یہ ہے کہ ذرا سوچ لیں کہ ہم نے اپنی نیکیاں کتنی بنائی ہیں اور کھوئی کتنی ہیں؟ اس لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رو رو کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور ہمیشہ اعتکاف کے دنوں میں اس طرح معافی مانگو کہ اللہ تعالیٰ کرے کہ ہم یہاں سے سب پاک ہوکر کے نکلیں، بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

باقی انشاءاللہ پھر باتیں کریں گے، حافظ جی کہتے ہیں کہ ستر ہزار مرتبہ کلمہ شریف پڑھ لو، بہت اچھی بات ہے۔ سونے اور کھانے کے علاوہ کوئی وقت بھی فارغ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ انہوں نے بہت اچھی بات کی کہ ستر ہزار مرتبہ کلمہ شریف پڑھ لو، بزرگوں نے اس طرح ستر ہزار کے کئی نصاب بنا رکھے تھے، کسی نے بھائی کو دے دیا، کسی نے کسی کو دے دیا، کسی نے کسی کو دے دیا، یعنی بنا کر کے رکھتے تھے، تم بہت آسانی سے ایک ساتھ کئی نصاب بنا سکتے ہو، ایک میرے لئے بھی پڑھ لو، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے، بس اسی پر ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علم اور اہل علم کے فضائل و آداب!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ شَقِیْقِ بْنِ سَلَمَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ رَّضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ اِنِّیْ لَاُخْبَرُ بِمَجْلِسِکُمْ فَمَا یَمْنَعُنِیْ مِنَ الْخُرُوْجِ اِلَیْکُمْ اِلَّا کَرَاهِیَّةُ مَلَلِکُمْ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ مَخَافَةَ السَّامَةِ عَلَیْنَا.“

(ابن عبدالبر فی جامع العلم ج:۱ ص:۱۰۵)

ترجمہ:......”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک شاگرد شقیق ابن سلمہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے پاس تشریف لائے، گھر سے باہر آئے اور آکر ارشاد فرمایا: کہ آپ لوگ کافی دیر سے یہاں تشریف فرما ہیں، مجھے اس کا علم ہے، لیکن میں قصداً مکان سے باہر نہیں نکلا کیونکہ مجھے اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ میرا تم سے باتیں کرنا، حدیثیں سنانا، اس سے تم لوگ اکتا نہ جاؤ، بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وعظ و نصیحت کرنے میں ہمیں اس بات کی رعایت رکھتے تھے کہ ہم لوگ اکتا نہ جائیں،

اس لئے لمبی بات نہیں کرتے تھے۔''

یہاں سے چند باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہر بات میں رسول اللہ ﷺ کی نقل کیا کرتے تھے، جو طریقہ اور جو کام رسول اللہ ﷺ نے کرکے دکھایا، یہ حضرات بھی اسی طرح کرتے تھے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آنحضرت ﷺ اس بات کے باوجود کہ آپؐ کی بات سے کسی کے اکتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ آنحضرت ﷺ کوئی بات ارشاد فرمائیں اور لوگ اکتا جائیں یہ تو ممکن ہی نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ اس بات کی رعایت رکھتے تھے کہ لوگ اکتا نہ جائیں۔

اور تیسری بات یہ کہ آدمی وعظ و نصیحت کرے تو اُسے اس چیز کی رعایت رکھنی چاہئے کہ لوگ تنگ نہ آجائیں، بس اتنی بات کرے جتنی کے ساتھ لوگ مانوس ہوسکیں۔

امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے اور ایک صاحب وعظ کر رہے تھے، یعنی تقریر کر رہے تھے، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو خطاب کرکے فرمایا کہ میاں واعظ! لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ کرنا، ان کے حوصلے بڑھیں، ان کے حوصلے گھٹیں نہیں۔

صحیح اور سچے عالم کی پہچان:

ابن الضریس اور ابونعیم نے حلیہ میں اور ابن عساکر وغیرہ نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد نقل کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

''عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِالْفَقِيْهِ حَقَّ الْفَقِيْهِ؟ (۱)مَنْ لَّمْ يُقَنِّطِ النَّاسَ مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، (۲)وَلَمْ يُرَخِّصْ لَهُمْ فِيْ مَعَاصِي اللّٰهِ تَعَالٰى، (۳)وَلَمْ

يُؤْمِنُهُمْ مَكْرَ اللهِ، (٤)وَلَمْ يَتْرُكِ الْقُرْآنَ رَغْبَةً عَنْهُ اِلٰى غَيْرِهٖ، (٥)وَلَا خَيْرَ فِيْ عِبَادَةٍ لَيْسَ فِيْهَا تَفَقُّهٌ، (٦)وَلَا خَيْرَ فِيْ فِقْهٍ لَيْسَ فِيْهِ تَفَهُّمٌ، (٧)وَلَا خَيْرَ فِيْ قِرَاءَةٍ لَيْسَ فِيْهَا تَدَبُّرٌ۔" (ابونعیم فی الحلیۃ ج:۱ ص:۷۷)

ترجمہ:...... "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا کہ: میں یہ نہ بتاؤں کہ صحیح اور سچا عالم کون ہے؟ (اور پھر فرمایا صحیح اور سچے عالم کی یہ صفات ہیں) جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ کرے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کی چھوٹ نہ دے، اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے لوگوں کو بے خوف نہ ہونے دے، دوسری چیزوں میں رغبت کی وجہ سے قرآن کو نہ چھوڑے، (اسے دینی مسائل میں تفقہ کا درجہ حاصل ہو، کیونکہ) اس عبادت کا کوئی اعتبار نہیں جس میں تفقہ نہ ہو۔ (دین کے مسائل میں تفقہ کے ساتھ ساتھ) اسے فہم دین میں پرہیزگاری بھی حاصل ہو کہ جس تفقہ میں پرہیزگاری نہ ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں، اسے قرأت میں تدبر حاصل ہو کہ جس قرأت میں تدبر نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں۔"

یعنی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ صحیح اور سچا عالم وہ ہے جس میں درج ذیل صفات ہوں:

اول:...... وہ جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ کرے۔

دوم:...... وہ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کی چھوٹ بھی نہ دے کہ لوگ کہیں مولوی صاحب نے آج بہت اچھی بات کہی کہ سب کچھ کرتے رہو اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے، بھائی! اللہ تعالیٰ کے بخشنے والا ہونے میں تو کوئی شک و شبہ نہیں، چنانچہ ایک

شعر قسم کا لفظ اور فقرہ ہے کہ: یا اللہ اگر آپ بخشنے پر آئیں تو سارے گناہوں کو بخش دیں اور آپ کا ایسا بندہ کون ہے جس نے اونچ نیچ نہ کی ہو، گڑ بڑ نہ کی ہو، تو واعظ اللہ کی رحمت سے مایوس بھی نہ کرے اور لوگوں کو گناہوں پر جری بھی نہ کرے کہ کرتے رہو جو کرنا ہے۔

سوم:...... تیسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے لوگوں کو بے خوف نہ ہونے دے قرآن کریم میں ہے کہ:

"فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُوْنَ."

(الاعراف:۹۹)

ترجمہ:...... "اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہوتے ہیں وہی لوگ جو خسارے میں پڑنے والے ہیں۔"

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا جب بخشنے پر آئیں تو سارے گناہ بخش دیں، لیکن پکڑنے پر آئیں تو ایک بات پر بھی پکڑ لیں، پھر ان کی پکڑ سے چھڑانے والا کون ہے؟ اس لئے اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے آدمی کو نڈر نہیں ہونا چاہئے۔

چہارم:...... چوتھی بات یہ کہ قرآن کریم کو تو چھوڑ دے اور دوسری قصہ کہانیوں میں لگ جائے یہ بھی ٹھیک نہیں، یہ عالم حقانی کا کام نہیں ہے اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات یہ تفسیر ہیں قرآن کریم ہی کی، اس لئے قرآن کریم اور احادیث طیبہ یا بزرگان دین کے ارشادات بیان کرو، ایسے ہی فضول باتیں کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

پنجم:...... پانچویں بات حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہ فرماتے تھے کہ اس عبادت کا کوئی اعتبار نہیں جس میں تفقہ نہ ہو، یعنی دین کے مسائل اور دین کا علم پاس نہیں، لیکن عبادت کر رہا ہے۔

ششم:...... چھٹی بات یہ کہ دین کے مسائل کا کوئی اعتبار نہیں اور اس میں

کوئی خیر نہیں، اگر اس کے ساتھ دین کا فہم اور دین کی پرہیزگاری اور دین کے معاملے میں پرہیزگاری سے کام لینا نہ ہو تو ایسے مسائل کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔

ہفتم:...... ساتویں بات یہ ارشاد فرماتے تھے کہ اس قرأت میں کوئی خیر نہیں جس میں تدبر نہ ہو، یعنی آدمی قرآن کریم سوچ کے پڑھے۔

علماً کے لئے نبوی وصیت:

ایک روایت میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَعَاذَ بْنَ جَبَلٍ وَاَبَا مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اِلَی الْیَمَنِ فَقَالَ: تَسَانَدَا وَتَطَاوَعَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا. فَخَطَبَ النَّاسَ مُعَاذٌ فَحَثَّھُمْ عَلَی الْاِسْلَامِ وَالتَّفَقُّہِ وَالْقُرْآنِ، وَقَالَ: اُخْبِرُکُمْ بِاَھْلِ الْجَنَّۃِ وَاَھْلِ النَّارِ! اِذَا ذُکِرَ الرَّجُلُ بِخَیْرٍ فَھُوَ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ وَاِذَا ذُکِرَ بِشَرٍّ فَھُوَ مِنْ اَھْلِ النَّارِ."

(حیاۃ الصحابہ ج:۵ ص:۳۱۴)

ترجمہ:...... "حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ارشاد فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبل اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو یمن بھیجا، (بہت سی نصیحتیں فرمائیں، ان میں سے ایک نصیحت یہ تھی) اور فرمایا کہ ایک دوسرے کی معاونت کرنا، ایک دوسرے کے خلاف نہ کرنا اور ایک دوسرے کی بات مان کر چلنا، (یہ نہ ہو کہ اس کا راستہ الگ ہو اور اس کا راستہ الگ) اور لوگوں کو خوشخبری دینا، نفرت نہ دلانا۔ پس حضرت معاذؓ نے لوگوں میں خطبہ دیا تو ان کو اسلام

لانے، تفقہ حاصل کرنے اور قرآن کریم پڑھنے کی ترغیب دی۔
پھر فرمایا کہ میں تمہیں نہ بتاؤں کہ جنتی کون ہے اور جہنمی کون ہے؟ پھر فرمایا کہ: جب کسی آدمی کا خیر سے تذکرہ کیا جائے تو وہ اہل جنت میں سے ہے، اور جب اس کا برائی سے تذکرہ کیا جائے تو وہ اہل جہنم میں سے ہے۔“

جنتی اور جہنمی کی پہچان:

حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطبہ دینے لگے اور فرمایا کہ ایک تو جہاں تک ممکن ہوسکے اسلام قبول کرلو، دوسری بات یہ کہ دین کا فہم حاصل کرلو، دین کی سمجھ حاصل کرلو اور تیسری بات یہ کہ قرآن کریم پڑھ لو، پھر انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں دیکھ کر آدمی کو بتا سکتا ہوں کہ فلاں آدمی جنتی ہے، فلاں آدمی جنتی نہیں ہے، بلکہ دوسری طرف کا ہے تو حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ تمہیں بتاؤں کہ جنتی کون ہے اور جہنمی کون ہے؟ فرمایا کہ جب کوئی آدمی کسی کا تذکرہ کرے، یا جب کسی کے سامنے کسی کا تذکرہ آئے، اور وہ خیر کے ساتھ اس کا تذکرہ کرتا ہے کہ اچھا آدمی ہے، تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ یہ جنتی ہے اور دوسرا آدمی جب اس کے بارے میں کسی سے پوچھا جائے اور وہ کہنے لگے کہ اچھا نہیں ہے، تو وہ جہنمی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ”أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللهِ فِيْ الْأَرْضِ“ (تم اللہ کے گواہ ہو زمین میں) تم کسی کے بارے میں کہتے ہو کہ اچھا آدمی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کہہ رہے ہیں کہ اچھا آدمی ہے، میں بھی اس کو اچھا ہی کردوں تو فرمایا کہ اگر ایک آدمی ایسا ہے جو بھی اس سے ملتا ہے، اسے برا ہی کہتا ہے اور کہتا ہے کہ اچھا نہیں ہے، تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ دوسری طرف کا آدمی ہے۔ جہاں تک ہوسکے کسی کو برا بھی مت کہو اس کی برائی ختم کرنے کی کوشش کرو، لیکن اس کو برا نہ کہو۔

اس حدیث سے ایک بات یاد آ گئی، جیسے ہمارے تبلیغ میں ایک بزرگ تھے، حاجی محمد حسین صاحب، جو کہ فوت ہوگئے، بہت پہلے کی بات ہے، ان دنوں میں بھی رمضان میں تبلیغ میں چلا جاتا تھا، تو میں نے وہاں کے بزرگوں سے کہا کہ بھئی کوئی پرانا آدمی ایسا ہو جو ہمارا امیر بنایا جائے کیونکہ ہمارے مولویوں کی لڑائی ہوجاتی ہے، وہ کہنے لگے اب کس کو بھیجیں، آدمی تو سارے چلے گئے ہیں، خیر دو تین دن کے بعد پھر ایک جماعت تیار ہوئی اور حاجی محمد حسین مرحوم کو (اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے) ہمارا امیر بنا دیا گیا، ان کی دو باتیں مجھے یاد ہیں، وہ کبھی بھولتی نہیں۔

ایک یہ کہ حاجی صاحب بیٹھے ہوئے تذکرہ کررہے تھے، اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ بھائی عبدالوہاب صاحب بیوی کو چھوڑ کر نکل آئے اور بعد میں نہیں گئے، تو میں نے ان سے کہا کہ یہ آپ کمال کی بات بتاتے ہیں، جس خاتون کا نکاح ہوا ہوگا بھائی عبدالوہاب صاحب کے ساتھ، آخر اس کے بھی حقوق ہیں، میں نے ذرا تیز سے لہجے میں بات کی تو وہ خاموش ہوگئے، مگر بعد میں مجھ سے فرمانے لگے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بھائی عبدالوہاب صاحب کی اہلیہ کو بلائیں گے اور فرمائیں گے کہ یہ عبدالوہاب کھڑا ہے، اس نے تیرے حقوق ضائع کئے، لیکن اس کے بدلے میں یہ اجر وثواب ہے اب تم حقوق لینا چاہتی ہو یا یہ اجروثواب لینا چاہتی ہو؟ مجھے بات سمجھ میں آ گئی کہ ضد نہیں کرنی چاہئے، بات ٹھیک ہے، لیکن بھائی سارے لوگوں کو یہ مشورہ نہیں دیا جائے گا کہ بال بچوں کو چھوڑ کر تبلیغ میں نکل جاؤ، تبلیغ میں بھی جاؤ ضرور جاؤ، لیکن اپنے اہل حقوق کے حقوق بھی ادا کرو، یہ تو بات ویسے ہی آ گئی تھی۔

بشارت کی ضرورت ہے وعید کی نہیں:

یہاں کی بات یہ ہے کہ اس حدیث سے متعلق میں کسی جماعت کے ساتھ گفتگو کررہا تھا اور اس گفتگو میں یہ بھی تذکرہ آ گیا کہ جو شخص نماز نہ پڑھے اس کو یہ عذاب ہوگا، حاجی صاحب نے سن لیا مجھے کچھ نہیں کہا، بعد میں اکیلے میں مجھے کہا کہ

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ عذاب کی وعیدیں نہ سنایا کرو، ثواب کی بشارتیں سنایا کرو، جب سے میرا یہ سبق پکا ہوا ہے، میں نے کہا بات بالکل ٹھیک ہے، تو آنحضرت ﷺ اسی بات کو بیان فرمارہے ہیں "بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا" لوگوں کو بشارت دو نفرت نہ دلاؤ۔

اب میں کسی آدمی کے سر ہو جاؤں کہ بھئی تو یہ گناہ کررہا ہے، یہ غلطی کررہا ہے، نعوذ باللہ، استغفراللہ، اللہ تعالیٰ تجھے دوزخ میں ڈالیں گے، نہیں بھائی ہمارا یہ کہنے کا منہ نہیں ہے، گناہ گار تو ہم سب ہیں، یہ ضرور کہیں گے کہ بھئی گناہوں کو چھوڑ دو، جتنی بھی غلطیاں ہیں، شریعت کے لحاظ سے ان کو چھوڑ دو، لیکن اللہ تعالیٰ ایسا کریں گے یہ نہیں، میں نہیں کہتا، یہ بچپن کی اور نوجوانی کی باتیں ہیں، اب تو میں قبر کے کنارے کھڑا ہوں، میں بھی اللہ تعالیٰ سے مانگ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمادیں، آپ حضرات بھی گناہوں سے بخشش کی دعا فرمائیں اور غلطیوں کو چھوڑنے کی کوشش کریں۔

چنانچہ یہ دونوں بزرگ حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہما، الگ الگ علاقوں میں پہنچے، ایک علاقے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، ایک علاقے میں حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔

گناہگار سے نہیں گناہ سے نفرت:

ہمارے حضرت تھانویؒ ارشاد فرماتے تھے کہ تمہارا بیٹا، تمہارا بھائی، تمہاری بیوی بیمار ہے، تو ہمیں اپنے بیٹے سے، یا اپنے بھائی سے، یا اپنی بیوی سے نفرت ہے، یا بیماری سے نفرت ہے؟ بھائی بیمار سے نفرت نہیں ہے، بیماری سے نفرت ہے، ہم اپنے بھائیوں کو بیماری سے نکالنا چاہتے ہیں، شریعت کی خلاف ورزی یہ بیماری ہے، کیونکہ یہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف ہے۔

ارتداد کی سزا:

یہ قصہ تو میں نے آپ حضرات کو میرا خیال ہے کہ سنایا تھا، بہرحال یہ دونوں

بزرگ گئے، میں نے کہا کہ الگ الگ علاقوں میں تھے، کوئی زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا، ایک جگہ وہ تھے، ایک جگہ وہ تھے، دونوں امت کی تعلیم و تربیت میں لگے ہوئے تھے، ایک دن حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے کے لئے گئے۔تو دیکھا کہ ایک آدمی کو دھوپ میں کھڑا کیا ہوا ہے، اب عرب کی دھوپ بھی بہت سخت ہوتی ہے، یہ سواری پر پہنچے تو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے استقبال کے لئے نکلے، حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس کو دھوپ میں کیوں کھڑا کیا ہوا ہے؟ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ آدمی مسلمان ہوکر مرتد ہوگیا، نعوذ باللہ، فرمانے لگے یہ بات ہے، فرمانے لگے کہ میں سواری سے اس وقت تک نہیں اتروں گا جب تک اس کو قتل نہ کردیا جائے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے "مَنْ بَدَّلَ دِیْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ" جو شخص اپنا دین بدل دے یعنی اسلام چھوڑ کر نعوذ باللہ کفر کا دین اختیار کرلے اس کو قتل کردو، چنانچہ پہلے اس سے توبہ کرنے کو کہا، مگر اس نے توبہ نہیں کی تو اس کو قتل کردیا۔

صحابہؓ کی آپس کی بات چیت:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب جمع ہوتے تھے تو ان کی آپس میں بات چیت یہ ہوتی تھی کہ کوئی کسی سے مسئلہ پوچھ رہا ہے، کوئی کسی سے کوئی اور بات پوچھ رہا ہے۔ یا پھر یوں کرتے تھے کہ کسی صاحب کو کہتے تھے کہ قرآن مجید سناؤ، قرآن مجید سنانے لگتے تھے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مشغلہ ہی یہ تھا، جب بھی جمع ہوتے تھے آپس میں دین کا اور علم کا مذاکرہ کرتے تھے، یا قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور پڑھاتے، قرآن سنتے اور سناتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ لوگ دنیا کے لئے نہیں، بلکہ آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اگر اب بھی ایک صحابی نظر آجائے تو پوری مسجد

روشن ہوجائے گی۔

صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کا مقام:

”عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: یَأْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ یَغْزُوْ فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ فَیُقَالُ لَھُمْ: فِیْکُمْ مَنْ رَاٰی رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟ فَیَقُوْلُوْنَ: نَعَمْ! فَیُفْتَحُ لَھُمْ، ثُمَّ یَغْزُوْ فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ فَیُقَالُ لَھُمْ: ھَلْ مِنْکُمْ مَّنْ رَاٰی مَنْ صَحِبَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟ فَیَقُوْلُوْنَ: نَعَمْ! فَیُفْتَحُ لَھُمْ، ثم یَغْزُوْ فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ فَیُقَالُ لَھُمْ: فِیْکُمْ مَّنْ رَاٰی مَنْ صَحِبَ مَنْ صَحِبَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟ فَیَقُوْلُوْنَ: نَعَمْ! فَیُفْتَحُ لَھُمْ.“(صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۰۸)

ترجمہ:...... ”حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ایک وقت آئے گا جب لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کہا کریں گے، جبکہ وہ جہاد کے لئے گئے ہوئے ہوں گے کہ تمہاری جماعت میں ایسا کوئی آدمی ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہو؟ یعنی کوئی صحابی ہے؟ وہ لوگ کہیں گے کہ جی ہاں! ہماری جماعت میں ایک صاحب ہیں۔ پھر وہ ان کے طفیل سے دعا کریں گے، ان کو اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائیں گے۔ پھر ایک زمانہ آئے گا لوگ پوچھیں گے کہ تمہاری جماعت میں کوئی ایسا آدمی ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والوں کو دیکھا ہو؟ لوگ کہیں گے کہ ہاں ایک صاحب ہیں جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والوں کو دیکھا،

فرمایا ان سے دعا کی درخواست کریں گے، اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمادیں گے۔ پھر ایک تیسرا زمانہ آئے گا اس وقت لوگ پوچھیں گے کہ تمہاری جماعت میں ایسا کوئی آدمی ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے دیکھنے والوں کے دیکھنے والوں کو دیکھا ہو؟ لوگ کہیں گے کہ ہاں ایک آدمی ہے، ان سے دعا کروائیں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں فتح عطا فرمائیں گے۔"

اب تو ہم اس زمانہ کو بہت پیچھے چھوڑ آئے، بھئی اس لئے تو ہمارے حلیے بھی بدل گئے، میاں اب تو ہماری شکلیں بھی بدل گئیں، الا ماشاءُ اللہ۔ اگر ہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھ لیتے تو ایمان تازہ ہوجاتا، آنحضرت ﷺ کے چہرے پر نظر پڑتی تو ایمان میں نور آجاتا، جن کی نظر آنحضرت ﷺ کے رخ انور پر پڑی سبحان اللہ! کیا بات ہے۔

علم کے آداب:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ علم خود سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، لیکن علم کے لئے حلم اور وقار کو بھی سیکھو، اللہ تعالیٰ اپنا علم عطا فرماتے ہیں تو ساتھ حلم اور وقار بھی پیدا ہوجائے گا، اور فرمایا کرتے تھے کہ جس سے علم سیکھو اس کے سامنے متواضع ہوجاؤ، یعنی اپنے آپ کو اس کے سامنے گرادو، جس سے علم سیکھو، اس کے سامنے متواضع ہوجاؤ۔ صرف اس کے سامنے نہیں بلکہ جو تم سے سیکھے، اس کے سامنے بھی متواضع ہوجاؤ، بہت اونچی بات ہے، تم سے جو دین سیکھے اس سے بھی تواضع اختیار کرو، سیکھنے والا بھی تواضع اختیار کرے اور سکھانے والا بھی تواضع اختیار کرے۔ فرمایا کہ علماءٗ میں سے جبار قسم کے عالم نہ بنو، جس کی اکڑفوں ہی ختم نہیں ہوتی، نہ بھائی نہ! جبار قسم کے عالم نہ بنو، ورنہ تمہارا جہل تمہارے علم پر غالب آجائے گا۔

علماً کے حقوق و آداب:

امام ابن عبدالبرؒ نے کتاب العلم میں حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد نقل کیا ہے، اس میں ایسے پاکیزہ کلمات ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سونے کے نگینے لگائے ہوئے ہیں، اس کے الفاظ یہ ہیں:

”عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: اِنَّ مِنْ حَقِّ الْعَالِمِ اَنْ لَا تُكْثِرَ عَلَيْهِ السُّؤَالُ وَلَا تُعْنِتَهُ فِي الْجَوَابِ وَاَنْ لَّا تُلِحَّ عَلَيْهِ اِذَا اَعْرَضَ وَلَا تَأْخُذْ بِثَوْبِهٖ اِذَا كَسَلَ وَلَا تُشِيْرَ اِلَيْهِ بِيَدِكَ وَاَنْ لَا تَغْمِزَهُ بِعَيْنَيْكَ وَاَنْ لَّا تَسْاَلَ فِيْ مَجْلِسِهٖ وَاَنْ لَّا تَطْلُبَ ذِلَّتَهُ وَاِنْ زَلَّ تَأَنَّيْتَ اَوْبَتَهُ وَقَبِلْتَ فَيْئَتَهُ وَاَنْ لَّا تَقُوْلَ قَالَ فُلَانٌ خِلَافُ قَوْلِكَ وَاَنْ لَا تُفْشِيْ لَهُ سِرًّا وَاَنْ لَّا تَغْتَابَ عِنْدَهُ اَحَدًا وَاَنْ تَحْفَظَهُ شَاهِدًا وَغَائِبًا وَاَنْ تَعُمَّ الْقَوْمَ بِالسَّلَامِ وَاَنْ تَخُصَّهُ بِالتَّحِيَّةِ وَاَنْ تَجْلِسَ بَيْنَ يَدَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَهُ حَاجَةٌ سَبَقْتَ الْقَوْمَ اِلٰى خِدْمَتِهٖ وَاَنْ لَّا تَمِلَّ مِنْ طُوْلِ صُحْبَتِهٖ اِنَّمَا هُوَ كَالنَّخْلَةِ تَنْتَظِرُ مَتٰى يَسْقُطُ عَلَيْكَ مِنْهَا مَنْفَعَةٌ وَاِنَّ الْعَالِمَ بِمَنْزَلَةِ الصَّائِمِ الْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِذَا مَاتَ الْعَالِمُ انْثَلَمَتْ فِي الْاِسْلَامِ ثُلْمَةٌ لَا تُسَدُّ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَطَالِبُ الْعِلْمِ يُشَيِّعُهُ سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِنْ مُقَرَّبِي السَّمَاءِ.“

(کنزل العمال ج:۱۰ حدیث:۲۹۵۱۰)

ترجمہ:...... ”حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عالم کا حق یہ ہے کہ تم اس سے زیادہ سوال نہ کرو، تم اس کو جواب کے لئے مشقت میں نہ ڈالو، اگر وہ جواب نہ دینا چاہے تو اسے مجبور نہ کرو، اگر کبھی اسے کسل مندی ہو تو جواب کے لئے

اس کا دامن نہ پکڑو، اس کی طرف ہاتھوں اور آنکھوں سے اشارے نہ کرو، اس کی مجلس میں (عاجز کرنے کے لئے) اس سے سوال نہ کرو، ان کی کوتاہیاں نہ تلاش کرو، اگر کبھی اس سے لغزش ہوجائے تو اس کے رجوع اور توبہ کو قبول کرو، یہ نہ کہو کہ فلاں آدمی تمہارے خلاف کہتا ہے، اس کا راز فاش نہ کرو، اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرو، اس کی موجودگی اور عدم موجودگی میں اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرو، جب کسی عالم کی مجلس میں جاؤ تو پہلے سب کو اور پھر خصوصیت سے اس کو سلام کرو، عالم کے سامنے بیٹھنے کی کوشش کرو، اگر عالم کو کسی کام اور خدمت کی ضرورت ہو تو سب سے پہلے بڑھ کر اس کی خدمت اور کام کو بجا لاؤ، عالم کے پاس اتنا زیادہ دیر نہ بیٹھو کہ وہ اکتا جائے، اسی طرح اس کی صحبت میں زیادہ بیٹھنے سے نہ اکتاؤ، عالم کی مثال کھجور کے درخت کی سی ہے کہ جس سے کبھی پکی کھجوریں گرتی ہیں، تم بھی اس انتظار میں رہو کہ اس سے علمی فوائد حاصل کرتے رہو، عالم کی مثال اس مجاہد فی سبیل اللہ کی ہے جو روزہ دار ہو، جب عالم فوت ہوتا ہے تو اس کی موت سے اسلام میں ایسا رخنہ واقع ہوجاتا ہے جو قیامت تک پُر نہیں ہوتا، اور طالب علم جب علم حاصل کرنے کے لئے نکلتا ہے تو ستر ہزار مقرب فرشتے اس کی مشائیت کے لئے ساتھ چلتے ہیں۔''

یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ عالم کا حق یہ ہے کہ تم اس سے زیادہ سوال نہ کرو، یہ ادب کے خلاف ہے، جو بات پوچھنی ہو پوچھو، بلا دھڑک پوچھو، لیکن فضول باتیں نہ کرو، اور تم عالم کو جواب دینے کے لئے مجبور بھی نہ کرو، جب کبھی

عالم میں کسل مندی پائی جائے، کوئی سستی پائی جائے، طبیعت اچھی نہیں، یا وہ تھک گیا ہے، تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے تو اس کو تنگ نہ کرو، ہاتھوں کے ساتھ اشارے نہ کرو، آنکھوں کے ساتھ اشارے نہ کرو، کیونکہ کسی کی طرف اشارہ کرنا اور خاص طور پر آنکھوں کے ساتھ اشارے کرنا، یہ توہین کی مد میں آجاتا ہے اور توہین ٹھیک نہیں، کبھی مجلس میں بیٹھے ہوئے کوئی ایسی بات نہ کرو کہ ہم اس سے بات پوچھیں گے وہ بتا نہیں سکے گا، پھنس جائے گا، کسی عالم کو پھانسنے کے لئے بات نہ کرو، اس سے استفادہ کے لئے بات کرو، پھانسنے کے لئے نہیں اور عالم بے چارہ معصوم نہیں ہے، کبھی لغزش بھی ہوسکتی ہے، تو اگر کوئی ایسی بات کرے کہ جس میں اس سے لغزش ہوگئی ہو، تو توقع رکھو کہ یہ رجوع کرلے گا اور اس سے یہ نہ کہو کہ فلاں آدمی تو تمہارے خلاف کہتا ہے، یہ ہمارے یہاں رواج ہے، ہم کسی سے مسئلہ پوچھتے ہیں اس نے اپنی سمجھ کے مطابق بتادیا، اب ہم اس سے کہتے ہیں کہ فلاں تو اس کے خلاف کہتے تھے۔ میرا بھائی! اگر فلاں پر اعتماد تھا تو اسی سے پوچھ لیتے، پھر دوسرے آدمی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی، کسی عالم کے بھید کو ظاہر نہ کرو، اس سے ایذا ہوتی ہے اور کسی عالم کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرو، یہ تو عام لوگوں میں بیماری پائی جاتی ہے ایسا نہ کرو، ہمیں تو مشغلہ چاہئے کہ کوئی عالم مل گیا، ہم اس کے پاس باتیں کرنے لگے کہ فلاں ایسا ہے، فلاں ایسا ہے، میاں اپنی نبیڑو، ہمارے سامنے اور تمہارے سامنے بڑے سخت سخت مرحلے آنے والے ہیں، ایک تو موت آنے والی ہے، پھر قبر آنے والی ہے، اس کے بعد حشر آنے والا ہے، حشر کا حساب و کتاب آنے والا ہے، ہم لوگوں کے قصوں میں کیا پڑ گئے ہیں؟ اپنے قصے نہیں نمٹتے، ذرا کسی وقت بیٹھ کر سوچا کرو کہ ہمارے سامنے کیا کیا آنے والا ہے؟ کبھی عالم سامنے موجود ہوتا ہے اور کبھی موجود نہیں ہوتا، اگر وہ موجود ہو جب بھی اور موجود نہ ہو جب بھی تم اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرو۔

اور یہ بھی ارشاد فرماتے تھے کہ کسی عالم کی مجلس میں جاؤ تو ایک تو جس مجلس

میں تم پہنچے ہو سب کو السلام علیکم کہو اور پھر ان کو خصوصیت کے ساتھ سلام کہو، عالم کے سامنے بیٹھنے کی کوشش کرو اور اس کوشش میں رہو کہ خدانخواستہ کوئی کام کی ضرورت پیش آجائے، تو اس کے لئے میں سب سے پہلے خدمت کو ادا کروں گا، اسی طرح زیادہ دیر بیٹھنا کہ جس سے وہ اکتا جائے یہ بھی نہ کیا کرو، اس کے پاس بیٹھو، لیکن بس اتنا ہی جس سے وہ اکتا نہ جائے۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ عالم کی مثال ایسی ہے جیسے کھجور کا درخت ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً اس سے پکی ہوئی کھجوریں گرتی رہتی ہیں، تو تم بھی ایسا کرو کہ کسی عالم کے پاس بیٹھو کہ تمہاری قسمت میں کتنے دانے آتے ہیں۔ حضرت یہ بھی ارشاد فرماتے تھے کہ عالم کی مثال ایسی سمجھو کہ "اَلصَّائِمُ الْمُجَاهِدُ" یعنی اس نے روزہ بھی رکھا ہوا ہے اور اللہ کے راستے میں جہاد بھی کررہا ہے، تو جیسے "اَلصَّائِمُ الْقَائِمُ" اللہ کے راستے میں روزے رکھنے والے اور قیام کرنے والے اور جہاد کرنے والے کو اجر ملتا ہے، عالم کو بھی ایسا اجر ملتا ہے۔ اور یہ بھی ارشاد فرماتے تھے کہ عالم آدمی جب انتقال کر جاتا ہے تو اسلام میں ایسا رخنہ واقع ہو جاتا ہے کہ پُر نہیں ہوتا۔

میں نے اپنی زندگی میں جتنے بزرگوں کو دیکھا، وہ جب چلے گئے اور ان کے جانے سے جو جگہ خالی ہوئی وہ کبھی پُر نہیں ہوئی، اور ان کا بدل نہیں آیا، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے انحطاط کا دور شروع ہوا، کتنے کتنے آدمی گزرے۔

ہمارے مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ، حافظ ابن تیمیہؒ کے بارے میں فرماتے تھے کہ اتنے اونچے آدمی ہیں اگر ان کے مرتبہ کی طرف دیکھو تو ٹوپی نیچے گر جاتی ہے، غرض یہ ہے کہ عالم کے انتقال کر جانے سے ایک ایسا رخنہ واقع ہو جاتا ہے جو کبھی بھی پر نہیں ہوتا اور آخر میں ارشاد فرمایا کہ یہ تو عالم تھا۔

طالب علم، علم طلب کرنے کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو آسمان کے ستر ہزار مقرب فرشتے اس کی مشائیت کرتے ہیں۔

بہرحال حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس روایت میں علماء کے فضائل اور آداب بیان فرمائے ہیں۔

عالم یا بزرگ کے ہاتھ چومنا:

اسی طرح امام ابویعلیٰ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خادمہ ام جمیلہ سے نقل کیا ہے کہ:

"عَنْ جَمِيْلَةَ اُمِّ وَلَدِ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَتْ: كَانَ ثَابِتٌ اِذَا اَتٰى اَنَسًا قَالَ: يَا جَارِيَةَ هَاتِيْ لِيْ طِيْبًا اَمْسَحُ يَدَيَّ! فَاِنَّ اِبْنَ اُمِّ ثَابِتٍ لَا يَرْضٰى حَتّٰى يُقَبِّلَ يَدَيَّ." (حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۲۱۶ طبع دار المعرفۃ بیروت)

ترجمہ:...... "حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خادمہ حضرت جمیلہؒ فرماتی ہیں کہ جب حضرت ثابتؒ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس آتے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ ان سے فرماتے تھے کہ ذرا تھوڑی خوشبو لے آؤ میرے ہاتھوں کو لگادو کیونکہ ابن ام ثابت (ثابت بنانی کی والدہ کا بیٹا) تشریف لائیں گے وہ پیچھا نہیں چھوڑے گا جب تک میرے ہاتھ نہیں چوم لے گا اس لئے میرے ہاتھوں میں خوشبو لگا دو۔"

سبحان اللہ!! اللہ تعالیٰ ہمیں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

علم اور اہل علم
کے فضائل و آداب

صحابہ کرامؓ کا علمی مقام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے:

''وَأَخْرَجَ ابْنُ سَعَدٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّهَا نَظَرَتْ اِلٰى ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ مَعَهُ الْحِلَقُ يُعَلِّمُ الْحَجَّ وَهُوَ يُسْأَلُ عَنْ عِلْمِ الْمَنَاسِكِ فَقَالَتْ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ بَقِيَ بِالْمَنَاسِكِ.'' (ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۴)

ترجمہ:......''حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے موسم حج میں دیکھا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارد گرد بہت سے لوگوں کے حلقے جمع ہیں اور وہ ان سے حج کے مسائل پوچھ رہے ہیں، تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کہ جو لوگ زندہ باقی ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ مناسک کو جاننے والے ہیں، یعنی حج کے مسائل کو جاننے والے ہیں، (جو لوگ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ارد گرد حج کے مسائل پوچھنے کے لئے جمع تھے، یہ صحابہؓ اور تابعینؒ تھے)۔''

مسائل حج کی اہمیت:

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوگئی کہ صحابہؓ اور تابعینؒ کو بھی حج کے مسائل معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی اور وہ علماءؒ سے پوچھتے تھے، جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ حج اسلام کے ارکان میں سب سے آخری رکن ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے عمر میں ایک ہی مرتبہ فرض کیا ہے، ظاہر بات ہے کہ ایسا عمل جو عمر میں ایک مرتبہ کیا جاتا ہے، اس کے مسائل بہت زیادہ ہوں گے اور ان مسائل کو سیکھنے کی بھی ضرورت ہوگی۔

ایک لطیفہ:

ہمارے یہاں ایک لطیفہ مشہور ہے کہ صاحب کنزالدقائق نے (کنز الدقائق فقہ کی کتاب ہے) اپنی کتاب میں اول سے لے کر آخر تک فقہ کے مسائل نقل کئے ہیں اور اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے اصل کتاب اسی جلدوں میں لکھی تھی، لیکن پھر بعد میں اس کو مختصر کردیا۔ خیر کہنا یہ ہے کہ انہوں نے فقہ پر کتاب لکھی اور وہ کتاب ہمارے ہر مدرسے میں پڑھائی جاتی ہے، وہ جب حج پر گئے، تو چونکہ جگہیں دیکھی ہوئی نہیں تھیں، اس لئے الٹا طواف کرنا شروع کردیا، کسی نے کہا کہ بھئی طواف یوں کیا جاتا ہے، تم کون ہو، جس کو یہ بھی پتہ نہیں کہ طواف کدھر سے کیا جاتا ہے؟ تو ارشاد فرمانے لگے کہ میں کنزالدقائق کا مصنف ہوں۔ کنزالدقائق کتاب تو لکھی، لیکن عمل کا موقع نہیں آیا تھا۔

تو ہمارے لوگ حج کے لئے تشریف لے جاتے ہیں، اب اللہ تعالیٰ نے پیسے بھی لوگوں کو بہت دے دیئے ہیں، الٹا سیدھا جیسے بھی بن پڑتا ہے، لوگوں کی دیکھا

دیکھی حج کرنا شروع کردیتے ہیں اور حاجی بن کر گھر آجاتے ہیں، لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعینؒ مسائل معلوم کرتے تھے ہر موقع پر، کہ یہ عمل کس طرح کیا جاتا ہے؟ اس کی تحقیق کرتے تھے، تفتیش کرتے تھے، خود کو اگر معلوم نہیں ہوتا تھا تو دوسرے علماء سے پوچھ لیتے تھے آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

”وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّةَ.“ (مشکوٰۃ ص:۲۲۱)

ترجمہ:...... جس شخص نے حج مبرور کیا ہو اس کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔

اور ساتھ ہی یہ فرما دیا کہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ حج مبرور کس کا ہوتا ہے؟ اب لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کو ساتھ لایا تھا تو وہ بیچاری ذرا معذور ہے، اس لئے میں نے اس کی کنکریاں خود ہی ماردیں اور کنکریاں بھی کیسے ماریں؟ جمرہ اتنی دور ہے اور اس نے سات کنکریاں لے لیں اور زور سے ماردیں، چلو حج ہوگیا اللہ اللہ خیر سلا۔

حج کی جان نکل گئی:

میں دیکھتا ہوں کہ حج کی تو جان نکل گئی ہے، کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا جس کا حج مقبول ہوتا ہو اور جس کو صحیح طریقے سے حج کرنے کی توفیق ہوتی ہوگی، ورنہ اکثریت ایسی ہے جیسے میں نے ذکر کی ہے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اردگرد لوگوں کا حلقہ تھا اور وہ مسائل پوچھ رہے تھے، حج کے مسائل، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا اور فرمایا جتنے لوگ زندہ باقی رہ گئے ہیں، ان میں یہ شخص حج کے مسائل کا سب سے بڑا عالم ہے، اور بات یہ ہے کہ اگرچہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اردگرد کے علاقوں

میں حاکم بھی رہے ہیں، لیکن آخر میں مکہ مکرمہ میں قیام ہوگیا تھا اور مکے والے جتنے حج کے مسائل کو جانتے ہیں، دوسرے نہیں جانتے۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

”عَنْ يَعْقُوْبَ بْنَ زَيْدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ: سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا يَقُوْلُ حِيْنَ بَلَغَهُ مَوْتُ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا وَصَفَّقَ بِاِحْدَىٰ يَدَيْهِ عَلَى الْاُخْرٰى: مَاتَ اَعْلَمُ النَّاسِ وَاَحْلَمُ النَّاسِ وَلَقَدْ اُصِيْبَتْ بِهِ هٰذِهِ الْاُمَّةُ مُصِيْبَةً لَا تُرْتَقُ.“ (ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۶)

ترجمہ:...... حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: جب ان کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے انتقال کی خبر پہنچی (حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا انتقال طائف میں ہوا تھا اور طائف میں ان کی قبر ہے) تو انہوں نے فرمایا اور اس طرح اپنے ہاتھوں کو ملا اور مل کر کے فرمایا: آج انسانوں میں جو سب سے بڑا عالم تھا اور سب سے زیادہ حلیم تھا، اسکا انتقال ہوگیا ہے اور ان کے انتقال کی وجہ سے اس امت پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔“

یہ تو مشہور بات ہے کہ جو جاتا ہے اپنی جگہ خالی چھوڑ کر کے جاتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی آجائے، رفتہ رفتہ اس امت کا رنگ پھیکا ہوتا جارہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس امت کا رنگ اور تھا، صحابہ رضوان اللہ

علیہم اجمعین کے زمانہ میں اور تھا اور چلتے چلتے چلتے اب ہم تک پہنچ گیا ہے، فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک اور روایت میں ہے:

"عَنْ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ قَالَ: لَمَّا مَاتَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ رَافِعُ بْنُ خَدِیْجٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ: مَاتَ الْیَوْمُ مَنْ کَانَ یَحْتَاجُ اِلَیْهِ مَنْ بَیْنِ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ فِیْ الْعِلْمِ." (حیاۃ الصحابۃ ج:۵ ص:۳۸۳)

ترجمہ:...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے انتقال کے موقع پر حضرت رافع ابن خدیج رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: آج اس شخص کا انتقال ہوگیا کہ مشرق سے لے کر مغرب تک ساری دنیا ان کے علم کی محتاج تھی اور وہ علم ساتھ لے گئے انہوں نے پڑھایا، لوگوں کو سکھایا، لوگوں کو تعلیم دی، لیکن آج ان کے ساتھ ان کا علم چلا گیا، ان جیسا کوئی دوسرا آدمی پیدا نہیں ہوسکا، کوئی ثانی پیدا نہیں ہوسکا۔

حضرت محمد بن حنفیہؒ:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یمامہ میں قبیلہ بنی حنیفہ کے ساتھ جو جہاد ہوا تھا، مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں، ان میں جو قیدی پکڑے گئے تھے، ایک محمد ابن حنفیہ کی والدہ ماجدہ تھیں اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئی تھیں اور ان سے محمد ابن حنفیہ پیدا ہوئے۔

آنحضرت ﷺ سے حضرت علی کرم اللہ وجہ نے کہا تھا کہ یا رسول اللہ! اگر آپؐ کے بعد میرے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام آپؐ کے نام پر رکھ لوں؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ضرور رکھو، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس بچے کا نام محمد رکھا تھا، اصل نام محمد ابن علی تھا، لیکن کہتے محمد ابن حنفیہ یعنی قبیلہ بنی حنفیہ کی خاتون کا لڑکا، اور انہوں نے اپنے والد ماجد سے علوم سیکھے تھے اور بہت اونچے آدمی تھے، حضرات حسنؓ وحسینؓ کے بھائی تھے، کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لڑکے اور لڑکیاں ملا کر کے چالیس ہوئے تھے، ان کے اپنے بچے چالیس تھے، ان کے بچوں سے جو بچے پیدا ہوئے وہ الگ رہے، تو جس دن حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا حضرت محمد بن حنفیہ نے کہا کہ: آج اس امت کا ربانی فوت ہوگیا، قرآن کریم میں ہے: ”وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيّٖنَ“ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ربانی بنو، رب والے بنو، تو ربانی وہ ہوتا ہے جو رب والا ہو۔

حضرت ابن عمرؓ:

عمرو ابن دینار کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے، ان کو جنگ بدر میں نہیں لیا گیا تھا، کیونکہ چھوٹے تھے اور جنگ احد میں شریک ہوئے تھے، گویا نوجوان تھے، عمر ابن دینار فرماتے ہیں کہ: جوانوں میں سب سے بڑے عالم عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے اور ان کی عجیب شان تھی، کسی جگہ سفر کر رہے ہوتے تو جس جگہ آنحضرت ﷺ کبھی تقاضہ بشری کی بنا پر پیشاب کے لئے اترے تھے، ان کو ضرورت ہو یا نہ ہو، یہ اس جگہ اونٹنی بیٹھاتے تھے اور پیشاب کے لئے بیٹھتے تھے، اتنے متبع سنت تھے کہ ایک ایک بات میں آنحضرت

ﷺ کی نقل کو ضروری سمجھتے تھے۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ:

"عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ قَالَ: لَمْ یَبْقَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالشَّامِ اَحَدٌ کَانَ اَوْثَقُ وَلَا اَفْقَہُ وَلَا اَرْضٰی مِنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ وَشَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا۔" (ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۸)

ترجمہ:......خالد ابن معدانؒ ایک تابعی ہیں وہ کہتے ہیں: کہ (ملک شام میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے، تو ملک شام میں حضرت عبادہ ابن صامت اور شداد ابن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہما تھے) خالد ابن معدان کہتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر قابل وثوق اور ان سے بڑھ کر کوئی فقیہ اور ان سے زیادہ کوئی پسندیدہ آدمی اور نہیں تھا، رسول اللہ ﷺ کے یہ صحابہ عبادہ ابن صامت اور شداد ابن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہما آنحضرت ﷺ کے سب سے زیادہ ثقہ اور سب سے زیادہ فقیہ اور سب زیادہ پسندیدہ آدمی تھے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ:

حنظلہ ابن سفیان اپنے مشائخ سے نقل کرتے ہیں: کہ چھوٹے صحابہ میں یعنی جو کم عمر تھے، ان میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو عقل عطا فرمائی تھی، علم عطا فرمایا تھا اور بہت ہی نیک اور پارسا آدمی

تھے، ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک علاقے کا امیر بنا کر بھیجا اور کئی خطوط حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان کے نام ہیں، ان کو خطوط کے ذریعے سے ہدایات دیتے تھے۔

حضرت ابوسعیدؓ کی احتیاط:

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک آدمی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مسئلہ پوچھا، انہوں نے مسئلہ بتادیا اور مسئلہ بتا کر فرمانے لگے کہ تم یہ مسئلہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جا کر پوچھو اور وہ جو جواب دیں وہ آکر مجھے بھی بتاؤ، چنانچہ وہ شخص حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت نے فرمایا تم نے یہ مسئلہ کسی اور سے بھی پوچھا ہے، انہوں نے کہا جی ہاں! میں نے یہ مسئلہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا تھا، انہوں نے مجھے مسئلہ کا جواب دے دیا اور ساتھ ہی کہا کہ میں یہ مسئلہ آپ سے پوچھوں، حضرت فرمانے لگے کہ:

اگر میں یہ فتویٰ دوں جو انہوں نے دیا تو میں گمراہ ہوجاؤں گا، ہدایت پانے والوں میں سے نہیں ہوں گا، وہ مسئلہ غلط ہے، صحیح مسئلہ یہ ہے، وہ مسئلہ نہیں بتاتا میں۔

حضرت ابوہریرہؓ کا علمی مقام:

"عَنْ اَبِی الزُّعَیْزِعَةِ کَاتِبِ مَرْوَانَ بْنِ الْحَکَمِ اَنَّ مَرْوَانَ دَعَا اَبَا هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ فَاَقْعَدَنِیْ خَلْفَ السَّرِیْرِ، وَجَعَلَ یَسْأَلُهٗ وَجَعَلْتُ اَکْتُبُ حَتّٰی اِذَا کَانَ عِنْدَ رَأْسِ الْحَوْلِ دَعَا بِهٖ فَاَقْعَدَهٗ وَرَاءَ الْحِجَابِ فَجَعَلَ یَسْأَلُهٗ عَنْ ذٰلِکَ، فَمَا زَادَ وَلَا نَقَصَ وَلَا قَدَّمَ وَلَا اَخَّرَ."

ترجمہ:......مروان بن حکم کے کاتب سے روایت ہے کہ مروان نے مجھے چھپ چھپا کے بیٹھا دیا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو طلب فرمایا، ان سے کچھ مسئلے پوچھے، وہ بتاتے رہے اور یہ پردے میں بیٹھے ان مسائل کو لکھ رہے تھے، ایک سال پورا گزرنے کے بعد انہوں نے پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا اور وہی مسئلے پوچھے اور ابو زعیزعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بدستور پردے میں بیٹھا دیا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسئلوں کا جواب دیا (ان کو بھی یہ یاد نہیں رہا ہوگا کہ انہوں نے پہلے بھی یہ مسئلے پوچھے تھے) لیکن کسی مسئلے میں ایک حرف کا آگا پیچھا نہیں ہوا۔

گویا ٹیپ تھی جو چل رہی تھی، ایک سال پہلے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو مسئلے بیان کئے تھے، جن الفاظ سے بیان کئے تھے، جس ترتیب سے بیان کئے تھے، ایک سال کے بعد اسی طرح ان مسائل کو بیان کر دیا اور یہ صرف تین سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہے ہیں اور حضور اقدس ﷺ کے صحابہؓ میں سب سے زیادہ احادیث کو جاننے والے یہ ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا اپنے آپ کو علم کے لئے وقف کرنا:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ خود ہی فرماتے ہیں کہ انصار کو تو اپنی کھیتی باڑی کا بھی کام ہو جاتا تھا اور حضرات مہاجرین کچھ اپنا تجارت کا مشغلہ کر لیتے تھے، لیکن اپنے لئے تو کوئی چیز بھی نہیں تھی، نہ گھر تھا اور فرماتے ہیں کہ میں بھوک کی وجہ سے

مسجد نبوی ﷺ میں بے ہوش ہوکر گر جاتا تھا اور لوگ میری گردن پر پاؤں رکھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ان کو مرگی کا دورہ ہوگیا ہے، فرماتے تھے کہ مرگی ورگی کچھ نہیں ہوتی تھی، صرف بھوک تھی۔

ایک روایت میں ہے:

"فَمَرَّ اَبُوْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَسَأَلْتُہٗ عَنْ آیَۃٍ مِّنْ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ مَا سَأَلْتُہٗ اِلَّا لِیَسْتَتْبِعَنِیْ فَلَمْ یَفْعَلْ، فَمَرَّ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَسَأَلْتُہٗ عَنْ آیَۃٍ مِّنْ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ مَا سَأَلْتُہٗ اِلَّا لِیَسْتَتْبِعَنِیْ فَلَمْ یَفْعَلْ، فَمَرَّ اَبُوالْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَعَرَفَ مَا فِیْ وَجْهِیْ وَمَا فِیْ نَفْسِیْ، فَقَالَ: اَبَا هُرَیْرَۃَ! قُلْتُ لَہٗ: لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! فَقَالَ: اِلْحَقْ......" (حیاۃ الصحابۃ ج:۱ ص:۳۳۲)

ترجمہ:...... "حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (میرے قریب سے) گزرے، ان سے قرآن کریم کی ایک آیت کے بارے میں سوال کیا، میرے سوال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ مجھے ساتھ لے جائیں گے (گھر میں) لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گزرے، ان سے بھی قرآن کریم کی ایک آیت کے بارے میں سوال کیا، ان سے بھی سوال کا مقصد صرف یہ تھا کہ مجھے ساتھ لے جائیں گے، لیکن انہوں نے بھی ایسا نہیں کیا، پھر آپ ﷺ گزرے، آپؐ نے جو کچھ میرے دل اور چہرے پر تھا اس کو پہچان لیا، آپ ﷺ نے آواز دی

اے ابوہریرہ! میں نے کہا: اے اللہ کے رسول میں حاضر ہوں!
آپ ﷺ نے فرمایا: میرے ساتھ چلو۔"

خلاصہ یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے پاس سے گزرے، کہنے لگے کہ جی میں ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں، انہوں نے مسئلہ بتا دیا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گزرے انہوں نے بھی مسئلہ بتا دیا، اس کے بعد آنحضرت ﷺ گزرے تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے بھی مسئلہ پوچھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کہ ابوہریرہؓ اپنا مسئلہ تو تم اپنے پاس رکھو، میرے ساتھ آجاؤ تمہیں کچھ کھانے کو مل جائے گا، اتنی جفاکشی کے ساتھ اس دین کے علم کو حاصل کیا تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ ایک خاتون تھی مدینے میں، میں نے ان سے کہا کہ بڑی بی تم مجھ سے کچھ کام کروالیا کرو اور مجھ کو روٹی دے دیا کرو، کہنے لگیں نہیں بھئی مہنگا ہے، یعنی روٹی پر بھی یہ آدمی مہنگا ہے۔ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ وہی عورت آج میرے نکاح میں ہے۔ دراصل ان کو آپ ﷺ نے دعا دی تھی اور یہ دعا کا نتیجہ تھا، ایک روایت میں اس کا ذکر کچھ اس طرح ہے:

آنحضرت ﷺ کی دعا:

"وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَنْ یَّبْسُطَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ ثَوْبَہٗ حَتّٰی اَقْضِیَ مَقَالَتِیْ ھٰذِہٖ ثُمَّ یَجْمَعُہٗ اِلٰی صَدْرِہٖ فَلَا یَنْسٰی مِنْ مَّقَالَتِیْ شَیْئًا اَبَدًا، فَبَسَطْتُّ نَمِرَۃً لَیْسَ عَلَیَّ ثَوْبٌ غَیْرُھَا حَتّٰی قَضَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَقَالَتَہٗ ثُمَّ جَمَعْتُھَا اِلٰی صَدْرِیْ فَوَالَّذِیْ بَعَثَہٗ بِالْحَقِّ

مَا نَسِیْتُ مِنْ مَّقَالَتِہٖ تِلْکَ اِلٰی یَوْمِیْ ھٰذَا.‘‘

(بخاری ج:۱ ص:۳۱۶)

ترجمہ:......’’آنحضرت ﷺ نے فرمایا آج جو آدمی اپنی چادر بچھائے گا میں اس پر دم کروں گا پھر وہ آدمی اس کو اپنے سینے سے لگالے گا، تو وہ میری احادیث کو کبھی نہیں بھولے گا، میں نے چادر بچھادی اور میری پشت پر اس چادر کے علاوہ کچھ نہ تھا، اور آنحضرت ﷺ نے کچھ پڑھا، (اللہ جانے کیا پڑھا ہوگا اور پڑھ کر چادر پر دم کردیا) میں نے چادر سمیٹ کر سینے سے لگالی، وہ دن ہے اور آج کا دن، کبھی کوئی بات مجھے بھولی نہیں۔‘‘

میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ احادیث کو جاننے والا مجھ سے زیادہ کوئی نہیں ہے، مجھ سے زیادہ کوئی شخص احادیث کو نہیں جانتا الا عبداللہ ابن عمر بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

ایک ہیں عبداللہ ابن عمر حضرت عمرؓ کے صاحبزادے اور ایک ہیں عبداللہ ابن عمرو حضرت عمرو ابن عاصؓ کے صاحبزادے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ (عبداللہ بن عمرو بن العاص) البتہ مجھ سے احادیث زیادہ جانتے ہیں، اس لئے کہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے میں لکھا نہیں کرتا تھا۔

حضرت عائشہؓ کی فقاہت:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام

رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اگر کسی مسئلے میں اختلاف ہوجاتا تو حضرات صحابہ، حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ ان کے مسئلے کو حل کردیتی تھیں۔ (ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۹)

قمیصہ ابن زبیرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عام لوگوں سے زیادہ عالمہ تھیں، مسائل کو جاننے والی تھیں اور میں نے رسول اللہ ﷺ کے اکابر صحابہؓ کو دیکھا کہ ان کی خدمت میں مسائل کی تحقیق کے لئے حاضر ہوتے تھے۔

(ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۹)

حضرت عائشہؓ اور شان نزول:

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بہتر کوئی عالم نہیں دیکھا اور اگر کسی مسئلے میں کسی رائے کی ضرورت ہوتو ان سے بہتر کوئی رائے والا نہیں دیکھا اور قرآن کریم کی جو آیتیں نازل ہوئیں ہیں ان میں ایک ایک آیت کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ معلوم تھا کہ یہ آیت کس سلسلے میں نازل ہوئی ہے اور جب کوئی فریضہ پیش آتا تو وہ اس کو سب سے زیادہ جاننے والی ہوتی تھیں۔ (حیاۃ الصحابۃ ج:۵ ص:۳۸۵)

حضرت عائشہؓ اور علم فرائض:

بھئی ہمارے دین کے علوم میں سے ایک مستقل علم فرائض ہے یعنی اگر کوئی شخص فوت ہوجائے تو اس کا مال کس طرح تقسیم کیا جائے گا جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ صحابہ کرامؓ میں سے بھی چند حضرات اس مسئلے کو جانتے تھے، اکابر صحابہؓ جانتے تھے اور علماء میں سے بھی بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں جو علم فرائض کو جانتے ہیں۔

تو حضرت مسروق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا علم فرائض کی ماہر تھیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان کسی مسئلے میں وراثت کے مسئلے میں اختلاف ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رجوع کرتے۔

(ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۹)

ایک روایت میں ہے:

"عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ قَالَ: كَانَ اَزْوَاجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْفَظْنَ مِنْ حَدِيْثِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَثِيْرًا وَلَا مِثْلًا لِعَائِشَةَ وَاُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، وَكَانَتْ عَائِشَةُ تُفْتِيْ فِيْ عَهْدِ عُمَرَ وَعُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اِلٰى اَنْ مَاتَتْ يَرْحَمُهَا اللّٰهُ، وَكَانَ الْاَكَابِرُ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمَرُ وَعُثْمَانُ بَعْدَهٗ يُرْسِلَانِ اِلَيْهَا فَيَسْأَلَانِهَا عَنِ السُّنَنِ."

(ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۹)

ترجمہ:......حضرت محمود ابن لبیدؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات دین کے مسائل کو خوب جانتی تھیں اور لوگ ان سے اس معاملے میں استفادہ کرتے تھے، لیکن ازواج مطہرات میں بھی دو ہستیاں ایسی تھیں جو سب سے بڑی عالمہ تھیں، ایک حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دوسری حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

حضرت ام سلمہؓ کی عقل وبصیرت:

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی بات آگئی تو یہ بات بھی سن لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عقل وبصیرت کا بہت بڑا حصہ عطا فرمایا تھا، بڑی ذہین اور دانش مند تھیں، صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے قریش مکہ کے ساتھ صلح کی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بہت صدمہ ہوا تھا، کیونکہ وہ صلح بظاہر دب کر ہوئی تھی، آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا احرام کھول دو، چلیں گے واپس، حدیبیہ مکہ مکرمہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے اور تقریباً سوا چار سو میل کا سفر کر چکے ہیں، اس سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بہت زیادہ صدمہ ہوا، لیکن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اب احرام کھول دو، آنحضرت ﷺ کا ارشاد تو صحابہؓ کے لئے آب حیات تھا، لیکن صدمہ ایسا تھا کہ گم صم تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا احرام کھول دو، وہ بیٹھے ہیں، اس سفر میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھیں، آنحضرت ﷺ ان کے خیمے میں آئے اور شکایت کی کہ میں نے کہا احرام کھول دو، لیکن کوئی میری بات نہیں مانتا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ــ اللہ تعالیٰ پوری امت کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے ــ فرمانے لگیں یا رسول اللہ! صحابہ کرامؓ کو صدمہ ہے اور صدمے کی وجہ سے ان کو کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔

اس لئے آپؐ ان پر ناراض نہ ہوں اور آپؐ ایسا کیجئے کہ خیمے سے باہر جائیں اور حجام کو بلائیں اور اس سے کہیں کہ بال اتار دے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے یہی کیا، باہر تشریف لائے اور حجام کو بلا کر بال اتار دیئے، آنحضرت ﷺ کو جب احرام اتارتے ہوئے لوگوں نے دیکھا تو ایک دوسرے کے بال اتارنے لگے حتیٰ کہ

اتنی تیزی کے ساتھ کہ ایک دوسرے کو قتل کردیں گے، یعنی زخمی کردیں گے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بہت دانا تھیں، فرماتے ہیں کہ یہ دو بزرگ خواتین حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما اکابر صحابہؓ کی موجودگی میں فتویٰ دیا کرتی تھیں اور خاص طور سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں فتویٰ دیتی تھیں، یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی، ان کا انتقال ہوگیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آجاتا تھا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور ان سے مسئلہ دریافت کرتے تھے، یہ تو مسائل کا معاملہ تھا۔

حضرت عائشہؓ کی فصاحت:

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا خطبہ سنا ہے، اتنی بلاغت والا خطبہ ہوتا تھا اور اتنا فصیح و بلیغ خطبہ ہوتا تھا اور اتنی دانش مندی کے ساتھ بات کرتی تھیں کہ میں نے ایسا خطیب نہیں دیکھا جو حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ فصیح و بلیغ اور دانش مندی کا خطبہ دینے والا ہو۔ (حیاۃ الصحابۃ ج:۵ ص:۳۸۵)

فقہ، طب اور اشعار میں مہارت:

ان کے بھانجے حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو ان کے شاگرد بھی ہیں اور ان کے راوی بھی ہیں یعنی سب سے زیادہ روایات نقل کرنے والے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضرت عروہؓ ہیں، ایک حضرت ''عروہ'' عروہ ابن زبیرؓ، حضرت زبیرؓ کے صاحبزادے تھے، حضرت اسماءؓ رضی اللہ عنہا کے بیٹے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہا کے بھانجے تھے، اور دوسری راویہ ہیں ان کی، حضرت عروہ بنت عبدالرحمٰن وہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علوم کو نقل کرنے والی ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے کوئی عورت نہیں دیکھی جو علم طب میں، فقہ میں اور اشعار میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بڑھ کر ہو۔

حضرت عروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ فقہ تو خیر آپ کے گھر کی چیز ہے، آنحضرت ﷺ سے حاصل کی ہوئی تھی، لیکن اشعار آپ کو کہاں سے معلوم ہوگئے؟ اور دوسرا علم طب کہاں سے آپ کو حاصل ہوگیا؟ فرمانے لگیں کہ اشعار تو میں نے اپنے والد ماجد سے سیکھے اور وہ عرب کے اشعار سے سب سے زیادہ واقف تھے، عرب کے قبائل سے اور عرب کے اشعار سے سب سے زیادہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ واقف تھے، یہ تو میں نے اپنے والد ماجد سے سیکھے، جہاں تک طب کا تعلق ہے آنحضرت ﷺ جب بیمار ہوتے تو لوگ آ کے مختلف دوائیاں بتایا کرتے تھے آپ کو اور میں یاد کرلیا کرتی تھی، اس طرح مجھے علم طب حاصل ہوگیا۔ (مسند احمد ج:٦ ص:٦٧)

صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کا
قرآن کریم سے قلبی تعلق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

حضرت ابوموسیٰؓ کا قرآن پڑھانا:

"وَأَخْرَجَ أَبُوْيَعْلٰى عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَعَدَ أَبُوْمُوْسٰى الْأَشْعَرِيُّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فِيْ بَيْتِهٖ وَاجْتَمَعَ اِلَيْهِ نَاسٌ فَانْشَأَ يَقْرَأُ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنَ قَالَ فَأَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَلاَ اُعْجِبُكَ مِنْ أَبِيْ مُوْسٰى قَعَدَ فِيْ بَيْتٍ وَاجْتَمَعَ اِلَيْهِ نَاسٌ فَانْشَأَ يَقْرَأُ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَتَسْتَطِيْعُ أَنْ تُقْعِدَنِيْ حَيْثُ لَا يَرَانِيْ أَحَدٌ مِّنْهُمْ؟ قَالَ نَعَمْ. قَالَ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاَقْعَدَهُ الرَّجُلُ حَيْثُ لَا يَرَاهُ مِنْهُمْ أَحَدٌ. فَسَمِعَ قِرَاءَةَ أَبِيْ مُوْسٰى فَقَالَ اِنَّهُ يَقْرَأُ عَلٰى مِزْمَارٍ مِنْ مَزَامِيْرِ آلِ دَاوُدَ." (کنز العمال ج:۷ ص:۹۴)

ترجمہ:...... "امام ابو یعلیٰ نے حضرت انس رضی اللہ

عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے گھر میں بیٹھ گئے اور لوگ ان کے پاس جمع ہونے لگے اور وہ ان کو قرآن پڑھانے لگے، تو رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اس نے کہا یارسول اللہ! کیا میں آپ کو تعجب میں نہ ڈالوں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکان میں بیٹھ گئے، لوگ ان کے پاس جمع ہوگئے اور وہ ان کے پاس قرآن پڑھنے لگے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تو ایسا کرسکتا ہے کہ تو مجھے ایسی جگہ بیٹھا دے جہاں سے ان میں سے کوئی آدمی مجھے نہ دیکھ سکے؟ انہوں نے کہا ضرور کروں گا، پس رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے، اس آدمی نے رسول اللہ ﷺ کو ایسی جگہ بٹھا دیا کہ جہاں ان میں سے کوئی آنحضرت ﷺ کونہیں دیکھتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت سنی پھر فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لحن میں سے پڑھ رہے ہیں۔"

لحنِ داؤدیؑ:

حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی آواز عطا فرمائی تھی کہ سننے والے اس پر غش غش کر اٹھتے تھے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ جب وہ زبور پڑھتے تھے تو پرندے اپنی اڑان چھوڑ کر اور دوسرے جانور اپنی حرکتیں چھوڑ کر حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قرأت سننے لگتے تھے، قرآن کریم میں ہے کہ: "یَاجِبَالُ أَوِّبِیْ مَعَهٗ"

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ اے پہاڑو تم ان کے ساتھ یعنی حضرت داوٗد علیہ السلام کے ساتھ قرأت کیا کرو۔ اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ حسین آواز والے حضرت داوٗد علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے۔

جنت میں تلاوت کی محفل:

اور روایتوں میں آتا ہے کہ اہل جنت کبھی مشتاق ہوا کریں گے تو حضرت داوٗد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور ان سے عرض کریں گے کہ حضرت ہمیں قرآن کریم سنا دیجئے، اپنی کتاب زبور سنا دیجئے۔ اسی طرح اس امت میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے لحن داوٗدی عطا فرمایا تھا۔

آنحضرت ﷺ کا حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی تلاوت سننا:

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ سحری کے وقت یعنی تڑکے کے وقت (تہجد کے وقت) آنحضرت ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ تینوں حضرات مسجد میں گئے تو دیکھا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاص لحن سے قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں، یعنی نماز میں قرآن پڑھ رہے ہیں، دیر تک یہ حضرات ان کی قرأت سنتے رہے اور اس پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لَقَدْ أُوتِيَ مِزْمَارًا مِّنْ مَّزَامِيْرِ آلِ دَاوُدَ." ان کو اللہ تعالیٰ نے سریلا نغمہ اور سریلی آواز عطا فرمائی ہے جیسے حضرت داوٗد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا فرمائی تھی۔

یہ حدیث جو آپ نے اس وقت سنی ہے اس کا مضمون بھی یہی ہے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور فرمایا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس بات کو سنیں تو بہت تعجب فرمائیں گے

فرمایا کیا ہوا؟ اس آدمی نے کہا وہ اپنے گھر میں بیٹھ گئے ہیں، لوگ ان کے پاس اردگرد جمع ہوگئے اور وہ ان کو قرآن سنانے لگے۔

آنحضرت ﷺ فرمانے لگے: کیا تم ایسا کرسکتے ہو کہ مجھے لے جاؤ ایسی جگہ بیٹھا دو جہاں ان میں سے کوئی مجھے نہ دیکھتا ہو؟ اس آدمی نے کہا جی ہاں ضرور ایسا کروں گا، چنانچہ آنحضرت ﷺ ان کے ساتھ گئے، ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں وہ حضرات نہیں دیکھ رہے تھے، مگر آنحضرت ﷺ ان کو دیکھ رہے تھے، ان کا قرآن سنا اور سننے کے بعد فرمایا: ''لَقَدْ أُوتِیَ مِزْمَارًا مِّنْ مَّزَامِیْرِ آلِ دَاوُدْ.''

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ خوش قسمت تھے جن کی قرأت کو آنحضرت ﷺ سن رہے تھے اور آنحضرت ﷺ ان کی تحسین فرمارہے تھے، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں نغمہ (ترنم) کے اعتبار سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کوئی جواب نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ تہجد میں ان کا قرآن سنا کرتے تھے، لیکن یہ آنحضرت ﷺ ہی کا فیض تھا۔

آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ کی مثال:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے چلتے چلتے لکھ دیا کہ آنحضرت ﷺ کی مثال ایسی ہے کہ بہت بڑا بادشاہ ہو، اس کے اردگرد کچھ ان کے خلفاء ہوں، کچھ جرنیل ہوں، کچھ معلمین ہوں، اسی طرح آنحضرت ﷺ سے حضرات صحابہ کرامؓ اپنا فن سیکھ رہے تھے، اور اپنا فن دیکھ رہے ہیں، وہ فنون سپاہ گری سیکھ رہے ہیں، چنانچہ آپؐ کی خدمت میں حضرت خالد ابن الولید اور حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے

سپاہ سالار بھی تھے اور حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے خلفاءؑ بھی تھے، حضرت ابی ابن کعب، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے قاری بھی تھے، معلمین بھی تھے، ایک ہی شخصیت کے گرد یہ الگ الگ ہالے بنے ہوئے تھے، یہ ایک ہی چاند تھا جس کے اردگرد متعدد ہالے بنے ہوئے تھے، لا الہ الا اللہ۔

دوسری روایت میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: بَعَثَنِی الْاَشْعَرِیُّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اِلٰی عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، فَقَالَ عُمَرُ: کَیْفَ تَرَکْتَ الْاَشْعَرِیَّ؟ فَقُلْتُ لَہٗ: تَرَکْتُہٗ یُعَلِّمُ النَّاسَ الْقُرْآنَ. فَقَالَ: اَمَا اِنَّہٗ کَیِّسٌ وَلَا تُسْمِعُہَا اِیَّاہُ، ثُمَّ قَالَ لِیْ: کَیْفَ تَرَکْتَ الْاَعْرَابَ؟ قُلْتُ: اَلْاَشْعَرِیِّیْنَ؟ قَالَ: لَا بَلْ اَھْلُ الْبَصْرَۃِ، قُلْتُ: اَمَا اِنَّھُمْ لَوْ سَمِعُوْا ھٰذَا لَشَقَّ عَلَیْھِمْ! قَالَ: فَلَا تُبَلِّغْھُمْ! فَاِنَّھُمْ اَعْرَابٌ اِلَّا اَنْ یَّرْزُقَ اللّٰہُ رَجُلًا جِھَادًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ." (ابن سعد ج:۴ ص:۱۶۲)

ترجمہ:......"حضرت انس ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں بھیجا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اشعری کو کس حال میں چھوڑا؟ (کیونکہ ان دنوں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بصرہ کے گورنر تھے) میں نے کہا کہ میں نے ان کو اس حال

میں چھوڑا ہے کہ وہ لوگوں کو قرآن سکھا رہے ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ وہ بہت سمجھدار آدمی ہیں، بہت سمجھدار آدمی ہیں، لیکن یہ بات ان کو نہ بتانا، پھر مجھ سے فرمایا کہ تم نے اعراب کو کیسے چھوڑا؟ (اعراب کہتے ہیں دیہاتی گنواروں کو) میں نے کہا کہ اعراب سے مراد اشعری لوگ ہیں؟ فرمایا: نہیں بصرہ والے، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب یہ بات مجھ سے پوچھی تو میں نے کہا کہ حضرت بصرہ والوں کو یہ بات پہنچے گی تو ان کو تکلیف ہوگی، فرمایا کہ ان کو نہ بتاؤ، لیکن اہل بصرہ میں سے جن کو حق تعالیٰ شانہ جہاد فی سبیل اللہ کی توفیق عطا فرمادیں وہ ان سے مستثنیٰ ہیں۔''

کوفہ اور بصرہ یہ دو چھاؤنیاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قائم فرمائی تھیں، یہ دونوں شہر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قائم فرمائے تھے اور یہ عراق کا علاقہ تھا، کوفہ میں تو فوجی چھاؤنی قائم فرمائی تھی، جس میں ڈیڑھ ہزار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک وقت میں جمع ہوگئے تھے اور بصرہ بھی اس کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر ہے، لیکن ان دونوں شہروں میں علم کا بہت چرچا تھا، اگرچہ غلط آدمی بھی تھے۔

حضرات فقہاءؒ کا اخلاص:

ابن ندیم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ لوگ یہ کہتے تھے کہ حضرت ابوحنیفہؒ کی فقہ اور حضرت عاصم کی قرأت، یہ کوفہ کے پل سے پار نہیں جاسکے گی، لیکن اللہ تعالیٰ کی شان! کہ ان دونوں نے تو مشرق ومغرب کو ڈھک دیا، آج ہم قرأت کر

رہے ہیں حضرت عاصم رحمہ اللہ تعالیٰ کی، بلکہ ہم نہیں، پوری دنیا میں ان کی قرأت پڑھی جارہی ہے، کیونکہ ان کے شاگرد ہیں حضرت حفص رحمہ اللہ، جن کی قرأت حفص عن عاصم کی روایت سے پڑھی جارہی ہے۔ اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی فقہ مشرق ومغرب تک پھیل گئی، بات یہ ہے کہ یہ قبولیت من جانب اللہ ہوتی ہے، آدمی اپنے کسب سے یہ چیز حاصل نہیں کرسکتا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ نے جو کمال دیا تھا، ان جیسا کمال پوری دنیا میں اس زمانے میں کسی کو نہیں ملا، گم نام تھے، کوئی جانتا بھی نہیں تھا کہ اس شہر میں ایک شخص ابوحنیفہ نامی بھی پیدا ہوگا، لیکن دیکھتے دیکھتے پوری دنیا نے ان کے علم سے استفادہ کیا، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ مشرق ومغرب، جنوب وشمال، جبل وسہل، نرم زمین اور پہاڑی زمین، جہاں جہاں علم نظر آتا ہے یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فیض ہے۔

ابونعیم نے حلیہ میں حضرت ابی رجأ العطارد یؒ سے نقل کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

''عَنْ اَبِیْ رَجَاءِ الْعَطَارُدِیْ رَحِمَهُ اللهُ قَالَ: کَانَ اَبُوْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیُّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ یَطُوْفُ عَلَیْنَا فِیْ هٰذَا الْمَسْجِدِ، مَسْجِدَ الْبَصْرَةِ، یَقْعُدُ حِلَقًا فَکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَیْهِ بَیْنَ بُرْدَیْنِ اَبْیَضَیْنِ یُقْرِئُنِی الْقُرْآنَ، وَمِنْهُ اَخَذْتُ هٰذِهِ السُّوْرَةِ: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ.''

(ابونعیم فی الحلیۃ ج:۱ ص:۲۵۶)

ترجمہ:...... ''حضرت ابو رجأ عطاردیؒ سے منقول ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہمارے پاس اس مسجد یعنی مسجد بصرہ

میں تشریف لاتے اور اس مسجد میں پڑھاتے تھے اور گویا مجھے آج بھی نظر آ رہا ہے کہ دو سفید چادریں اوڑھی ہوئی ہیں، ایک تہہ بند اور ایک اوپر چادر اوڑھی ہوئی اور وہ پھر رہے ہیں اور مسجد میں قرآن کریم کے قاریوں کو قرأت پڑھا رہے ہیں، کہنے لگے کہ میں نے "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ." حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پڑھی تھی۔"

تعلیم قرآن کا اعزاز:

یہاں یہ بات بھی یاد رہے جیسا کہ میں نے بتایا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ کا گورنر بنا کر بھیجا تھا اور حضرت عمار کو کوفہ کا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وہاں کا قاضی بنا کر بھیجا تھا، لیکن حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بصرہ کے گورنر تھے، مسجد میں بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے، ہمارے یہاں یہ چیز عار سمجھی جاتی ہے، بچوں کو قرآن پڑھانا عار سمجھا جاتا ہے، لیکن حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے قرآن پڑھانا شرف تھا۔

آنحضرت ﷺ کے چار فرائض:

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے چار کام بتائے: "یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ آیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْھِمْ." قرآن کریم کی آیات کی تلاوت، چنانچہ پوری امت نے قرآن کریم آنحضرت ﷺ سے سیکھا اور آج تک آنحضرت ﷺ کا فیض ہے، یہ ملاؤں کا کام نہیں ہے، ہمارے محمد عربی ﷺ کا کام ہے، یہ شرف

حضرت محمد ﷺ کو اللہ نے عطا فرمایا کہ: "یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ آیٰتِہٖ" قرآن کریم رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتا تھا اور رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اور اہل ایمان کو اس کی تعلیم فرماتے تھے، گویا آپؐ میاں جی کا کام بھی کر رہے تھے، ہمارے نزدیک تو یہ میاں جی کا کام ہے، میاں جی صاحب کا۔ نعوذ باللہ! استغفر اللہ!

آپ حضرات کی نظر میں یہ گھٹیا کام ہے۔ ہمیں بڑے بڑے کام کرنے چاہئیں اور قرآن کریم پڑھانے کے لئے یہ مسجد میں ملاّ رکھ دیا ہے اور اس کے لئے فقرے چست کرتے ہیں، نعوذ باللہ۔

"یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ آیٰتِہٖ" ان کو قرآن کریم پڑھاتے تھے، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت ابی ابن کعب، سالم مولیٰ ابی حذیفہ اور چند صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ تھے، جنہوں نے قرآن کریم، رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یاد کیا تھا "وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ" تو الکتاب یہی قرآن مجید ہی ہے اور الحکمت سے کیا مراد ہے؟

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جہاں بھی الکتاب کے ساتھ الحکمۃ کا لفظ آیا ہے، وہاں الحکمۃ سے مراد آنحضرت ﷺ کے ارشادات ہیں، آنحضرت ﷺ کی تعلیم و تربیت کے نتیجے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن کے قاری بھی بنے، کتاب اللہ کے معلم بھی بنے اور حدیث کے حافظ بھی بنے، پانچ لاکھ حدیثیں امام بخاریؒ کو یاد تھیں۔

امام بخاریؒ کا حافظہ:

ایک دفعہ کچھ لوگوں نے امتحان لینا چاہا امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ کا، دس آدمیوں کو مقرر کر دیا حدیث ایک، سند دوسری اس کے ساتھ جوڑ دی، ایک صاحب

نے دس حدیثیں پڑھیں اورامام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ ان احادیث کے بارے میں کیا خیال ہے؟ فرمایا: "لَا أَدْرِیْ" مجھے پتہ نہیں۔ دوسرے نے اپنی دس حدیثیں پڑھیں، حدیث کوئی اور، سند کوئی اور، لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی سبکی ہوجائے گی، جب یہ سو احادیث ہوگئیں تو حضرت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ پہلے آدمی کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تو نے پہلی حدیث یہ پڑھی تھی، اس کی سند یہ پڑھی تھی، اس کی سند یہ نہیں ہے، حدیث صحیح ہے اس کی سند یہ نہیں ہے، دس کی دس احادیث کی تصحیح کردی، پھر دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے، پھر تیسرے کی طرف، غرضیکہ دس آدمیوں کی سو احادیث کو صحیح کرکے پڑھا اور ہر ایک کی صحیح سند بیان کی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں حضرت امام بخاریؒ کے صحیح احادیث پڑھنے پر تعجب نہیں ہوا، ہمیں تعجب اس پر ہوا کہ غلط احادیث یاد رکھیں، ایک، دو، تین نہیں، بلکہ ایک سے لے کر سو تک اور واقعی بڑی بات ہے، تو یہ آنحضرت ﷺ کا معجزہ تھا۔ تعلیم کتاب میں کتاب سے مراد ہے قرآن کریم اور تعلیم حکمت سے مراد ہے احادیث طیبہ، "وَيُزَكِّيْهِمْ" یہ چوتھا کام تھا آنحضرت ﷺ کا، کہ ان کو پاک فرماتے تھے۔

پہلا کام:

پہلا کام قرآن مجید کی تلاوت، یہ قاریوں اور حافظوں نے لے لیا، الحمدللہ آنحضرت ﷺ کے وقت سے لے کر آج تک آنحضرت ﷺ کے اس عمل میں اضافہ ہوا ہے، کمی نہیں ہوئی۔

دوسرا کام:

دوسرا کام کتاب اللہ کا علم، الحمدللہ اس کو فقہاءؒ نے لے لیا، امام ابوحنیفہ، امام

شافعی، امام مالک، امام احمد ابن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ، یہ حضرات قرآن کریم کے سمندر سے ایسے ایسے موتی نکال کر لائے کہ لوگوں کی عقلیں حیران ہوگئیں۔

تیسرا کام:

اور تیسری چیز تعلیم حکمت، یہ خدمت حضرات محدثین کے سپرد کردی، ایک بہت بڑا مجمع ہے جو احادیث طیبہ کو یاد کرنے والا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی صحیح بخاری ہی کو لیجئے کہ تقریباً بارہ سو صفحے تو اس کے ہیں، اور دو جلدوں میں ہے، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی مسند احمد پہلے ٦ چھ جلدوں میں چھپی تھی، اب دس جلدوں میں چھپی ہے، غرض یہ کہ حضرات محدثین نے رسول اللہ ﷺ کی اس امانت کو سینے سے لگایا، یہ تین فریق بن گئے۔

چوتھا کام:

اور چوتھا فریق تزکیہ کرنے والے، یہ منصب حضرات صوفیأ نے لے لیا، ان حضرات نے کہا کہ اس خدمت کے لئے ہم حاضر ہیں، یہ چار منصب آنحضرت ﷺ کے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے تھے، ان کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے اور انشأ اللہ قیامت تک چلتا رہے گا، کافروں نے بہت کوشش کی، انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ یہ علم مٹادیا جائے، ہزارہا نسخے قرآن مجید کے تلف کئے، لیکن دلوں سے کیسے کھرچ سکتے تھے؟ الحمد للہ رسول اللہ ﷺ کی امت کے بچوں میں سے، سات سال کے بچے قرآن کریم کے حافظ ہیں، میرے پوتے نے اور میری پوتی نے سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا ہے اور یہ میرا کمال نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں تو رسول اللہ ﷺ کا کمال ہے اور دوسرے پھر وراثت کے طور پر میرے والد ماجد صاحب کی دعا ہے۔

میرے والد ماجدؒ کی دعاء:

میں ایک جگہ درس دے رہا تھا ظہر کے بعد، مشکوٰۃ شریف کا درس دے رہا تھا، درس سے فارغ ہوا، دعا ہوئی تو میرے والد صاحب فرمانے لگے ہمارے گھر میں علم آگیا ہے، اب یہ مشکل سے نکلے گا۔ الحمدللہ! مجھ کو تو علم نہیں آیا، لیکن پیچھے والوں کو علم زیادہ آجائے، یہ آنحضرت ﷺ کا فیض ہے۔

یہ آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کے اللہ تعالیٰ نے چار شعبے بیان فرمائے ہیں، باقی مجاہدین جہاد کرنے والے، سپاہ سالار، حکمرانی کرنے والے اور بہت سے شعبے ہیں، جو رسول اللہ ﷺ سے جاری ہوئے اور الحمدللہ اب تک جاری ہیں۔

اس امت کا شرف:

اللہ کا شکر ہے کہ یہ امت بانجھ نہیں ہوئی اور نہ ہوگی انشاءاللہ! محمد رسول اللہ ﷺ کی امت ہے آنحضرت ﷺ سے پہلے بھی بڑے بڑے اور اونچے نبی ہوئے اور بے شک ان کے بہت بڑے کمالات ہیں، صاحب کمال ہیں، لیکن ان کا دین مٹ گیا، ان کی شریعت مٹ گئی، ان کی کتابیں مٹ گئیں، بقول ہمارے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے، کہ: بڑے بڑے آئے اور ان میں سے بہت سے بڑے مشکل وقتوں میں آئے، لیکن جو آیا، جانے کے لئے آیا اور ایک آیا جو صرف آنے کے لئے آیا اور وہ آیا، وہ سورج ابھرا اور ابھرتا ہی چلا گیا بڑھتا ہی چلا گیا، دنیا کو ہدایت کی روشنی پھیلاتا رہا اور انشاءاللہ قیامت تک وہ روشنی پھیلتی رہے گی۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

رجالِ آخرت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"أَخْرَجَ الطَّبْرَانِيُّ وَأَحْمَدُ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ مُتَّكِيءٌ عَلٰى بُرْدٍ لَهُ أَحْمَرُ فَقُلْتُ لَهُ يَا رَسُوْلَ اللهِ! إِنِّيْ جِئْتُ أَطْلُبُ الْعِلْمَ فَقَالَ مَرْحَبًا بِطَالِبِ الْعِلْمِ..... الخ." (الترغیب والترہیب ج:۱ ص:۵۹)

ترجمہ:..... "طبرانی اور امام احمد نے حضرت صفوان ابن عسال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور سرخ دھاریوں کی چادر کا تکیہ بنایا ہوا تھا (لیٹے ہوئے تھے)، میں نے خدمت میں حاضر ہوکر سلام عرض کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں طلب علم کے لئے آیا ہوں، یعنی علم حاصل کرنے کے لئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مرحبا - ہو طالب علم کے لئے اور آگے پورا قصہ ذکر کیا ہے۔"

امام ترمذیؒ نے اس کی تفصیل کے لئے ابوہارون کی درج ذیل روایت نقل کی ہے:

"عَنْ اَبِیْ هَارُوْنَ قَالَ: کُنَّا نَأْتِیْ اَبَا سَعِیْدٍ فَیَقُوْلُ مَرْحَبًا بِوَصِیَّةِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ النَّاسَ لَکُمْ تَبَعٌ وَاِنَّ رِجَالًا یَأْتُوْنَکُمْ مِنْ اَقْطَارِ الْاَرْضِ یَتَفَقَّهُوْنَ فِی الدِّیْنِ وَاِذَا اَتَوْکُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَیْرًا.

وَفِیْ رِوَایَةٍ: یَأْتِیْکُمْ رِجَالٌ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ یَتَعَلَّمُوْنَ فَاِذَا جَاؤُکُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَیْرًا."

(ترمذی ج:۲ ص:۹۳)

ترجمہ:......"حضرت ابو ہارونؒ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے تو آپؓ فرمایا کرتے تھے کہ مرحبا ہو ان لوگوں کو جن کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی اور پھر فرمایا کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے آپؐ نے فرمایا کہ لوگ تمہارے تابع ہیں اور دور دور سے لوگ تمہارے پاس علم حاصل کرنے کے لئے آئیں گے اور جب لوگ تمہارے پاس علم حاصل کرنے کے لئے آئیں تو تم ان کو مرحبا کہو۔

اور ایک روایت میں ہے کہ مشرق سے تمہارے پاس لوگ طلب علم کے لئے آئیں گے، جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کو سب کے لئے خیر کی وصیت کرو۔"

چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جب لوگ علم حاصل کرنے کے لئے آتے تو ان کا ہمیشہ سے معمول تھا کہ آنے والوں کو مرحبا کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد طلب علم کے لئے آنے والوں کے لئے پیش گوئی

فرمائی تھی اور ارشاد فرمایا تھا کہ لوگ تمہارے پاس طلب علم کے لئے آئیں گے لہٰذا جب وہ آئیں تو ان کو مرحبا کہو اور جیسا کہ اگلی حدیث میں آتا ہے کہ ہمیں حضور اقدس ﷺ نے حکم فرمایا تھا کہ ہم ان کے لئے مجلس کو کشادہ کرلیا کریں اور ان کو بات سمجھایا کریں، اس لئے کہ وہ ہمارے اخلاف ہیں اور ہمارے بعد آئیں گے، حضرت ابوسعید خدریؓ فرمایا کرتے تھے بھائی اگر کسی کو بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو سمجھ لے، اس لئے کہ بغیر سمجھے مجلس سے اٹھ جانا صحیح نہیں ہے، سمجھنا ضروری ہے۔

ابن ماجہ میں ایک روایت ہے:

حضرت حسن بصریؒ کے شاگرد حضرت اسماعیل فرماتے ہیں کہ ہم حضرت حسن بصریؒ کی عیادت کے لئے ان کے مکان پر گئے اور اتنے آدمی تھے کہ پورا گھر بھر گیا، حضرت حسن بصریؒ فرمانے لگے کہ ہم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ بیمار تھے ان کی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوئے، تو اتنے آدمی تھے کہ ان کا گھر بھر گیا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیں حدیثیں سنائی کہ ہم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوئے، آنحضرت ﷺ کروٹ پر لیٹے ہوئے تھے اور ہم اتنے آدمی ہوگئے کہ آنحضرت ﷺ کا پورا گھر بھر گیا، آنحضرت ﷺ نے پاؤں پھیلائے ہوئے تھے، پاؤں سمیٹ لئے اور اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی پاؤں سمیٹ لئے۔

حضرت حسن بصریؒ نے بھی اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے پاؤں سمیٹ لئے اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

جب تمہارے پاس لوگ آئیں تو ان کو مرحبا کہو، حضرت حسن بصریؒ فرماتے تھے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اسی طرح آنے والوں کو مرحبا کہا کرتے تھے، لیکن ان کے بعد یہ معمول ختم ہوگیا، اب ہم لوگوں کے پاس جاتے ہیں، تو کوئی مرحبا نہیں کہتا۔"

اخلاص میں بھی کمی آگئی، علم کے رنگ میں بھی کمی آگئی، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے جن لوگوں کے لئے وصیت فرمائی تھی، یہ وہ لوگ تھے جو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے آتے تھے، محض رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کا دین سیکھنے کے لئے آتے تھے، بعد میں لوگوں کی اغراض مختلف ہوگئیں، کوئی کسی مقصد کے لئے آتا ہے، کوئی کسی مقصد کے لئے آتا ہے، ہونا یہ چاہئے کہ جو شخص دین کا علم سیکھنے کے لئے خالص نیت سے آئے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسے مرحبا کہا جائے اور اگر آنحضرت ﷺ کی سنت سیکھنے کے لئے نہیں آتا یا دین سیکھنے کے لئے نہیں آتا تو ظاہر ہے کہ وہ مستحق نہیں ہے مرحبا کہلانے کا۔

مسند احمد میں ایک روایت ہے:

"عَنْ اُمِّ الدَّرْدَاءِ قَالَتْ: کَانَ اَبُو الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ لَا یُحَدِّثُ حَدِیْثًا اِلَّا تَبَسَّمَ فِیْہِ. فَقُلْتُ لَہٗ: اِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ یُحَمِّقَکَ النَّاسُ. فَقَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُحَدِّثُ بِحَدِیْثٍ اِلَّا تَبَسَّمَ فِیْہِ."

(مسند احمد ج:۵ ص:۱۹۹)

ترجمہ:......"ام درداؒ (حضرت ابو دردا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ ہیں اور یہ دو ہیں، ام دردا دو ہیں، ایک چھوٹی، ایک بڑی، ام دردا جو بڑی تھیں وہ رسول اللہ ﷺ کی صحابیہ تھیں اور

جو چھوٹی تھیں یہ صحابیہ نہیں تھیں) فرماتی ہیں کہ ابودردا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معمول تھا کہ جب حدیث بیان فرماتے تھے تو مسکراتے تھے، میں نے کہا کہ لوگ کہیں گے کہ پاگل ہے کہ یہ ہر بات پر مسکراتا ہے، لہٰذا احمق کہیں گے، فرمایا کہ: (کہتے ہیں تو کہتے پھریں، میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیا ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کوئی بات ارشاد فرماتے تھے تو مسکرا کر فرماتے تھے۔"

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت پر عمل کرنے کے لئے میں نے یہ معمول اپنایا ہے، جب بھی کوئی بات کرتا ہوں، مسکرا کر کرتا ہوں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عجیب شان تھی، وہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس حالت میں دیکھ لیتے تھے، ہمیشہ اس کی نقل اتارتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو اپناتے تھے، جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر بات کی، اس طرح بیٹھ کر بات کرتے تھے اور جس طرح کھڑے ہوکر بات کی، اسی طرح کھڑے ہوکر بات کرتے تھے، مسکرا کر بات کی، مسکرا کر بات کرتے تھے۔ غصہ اور جلال میں بات کی، تو غصہ اور جلال میں بات کرتے تھے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا نقشہ اتار دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک بات جس طرح ارشاد فرمائی تھی بعینہٖ اسی طرح نقل کرتے تھے۔

علم کی مجالس اور علمائے کے ساتھ ہم نشینی:

ایک روایت میں ہے:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: قِیْلَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَیُّ جُلَسَائِنَا خَیْرٌ؟ قَالَ: مَنْ ذَکَّرَکُمُ اللّٰہَ رُؤْیَتُہٗ، وَزَادَ فِیْ عِلْمِکُمْ مَنْطِقُہٗ، وَذَکَّرَکُمْ بِالْاٰخِرَۃِ عَمَلُہٗ." (حیاۃ الصحابہ ج:۵ ص:۳۰۴)

ترجمہ:......''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ارشاد فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ ﷺ کہ ہمارے ہم نشینوں میں سے کون سا ہم نشین زیادہ بہتر ہے کہ اس کے پاس بیٹھا جائے اور اس کے ساتھ ہم نشینی کی جائے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تمہارا ہم نشین سب سے بہتر وہ ہے جس میں تین باتیں پائی جائیں، (۱) اس کا دیدار، یا اس کی زیارت، یا اس کو دیکھنا، اللہ کو یاد دلادے، یعنی جس کو دیکھ کر اللہ یاد آجائے، (۲) جب وہ بولے تو تمہارے علم میں اضافہ ہوجائے یعنی جب وہ بات کرے تو اس کے بات کرنے سے تمہارے علم میں اضافہ ہوجائے، (۳) اس کا عمل تمہیں آخرت یاد دلادے (یہ آدمی رجال آخرت میں سے ہے)۔''

ہمارے حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ مولانا ادریس کاندھلویؒ کے بارے میں ارشاد فرماتے تھے (میں نے حضرت سے خود سنا ہے) کہ یہ صاحب یعنی مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ رجال آخرت میں سے ہیں، ان کو دنیا کا پتہ ہی کوئی نہیں تھا اور جب بات بیان کرتے تھے، تقریر کرتے تھے تو واقعتاً مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ حافظ ابن حجرؒ بات کررہے ہیں اور بھولے اتنے تھے کہ ان کے ایک صاحب زادے کے پاس سائیکل تھی، اور وہ ان سے پیسے لے لیتے تھے، ایک دن فرمایا یہ کیوں لے رہے ہو؟ صاحبزادے کہنے لگے: پٹرول ڈالنا ہے سائیکل میں، حضرت کی سادگی دیکھئے کہ ان کے بیٹے ان سے پٹرول ڈالنے کے لئے پیسے لے لیتے تھے۔ تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارا سب سے بہتر ہم نشین وہ ہے کہ اس کا دیدار تمہیں اللہ کی یاد دلادے، اور اس کی بات تمہارے علم میں اضافہ کرے، اور اس کا عمل دیکھ کر آخرت یاد

آجائے کہ یہ آدمی آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، دنیا کے لئے نہیں، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

"عَنْ يَزِيْدَ الرَّقَاشِيِّ قَالَ: كَانَ اَنَسٌ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ مِمَّا يَقُوْلُ لَنَا اِذَا حَدَّثَنَا هٰذَا الْحَدِيْثَ: اِنَّهُ وَاللهِ مَا هُوَ بِالَّذِيْ تَصْنَعُ اَنْتَ وَاَصْحَابُكَ. يَعْنِيْ يَقْعُدُ اَحَدُكُمْ فَيَجْتَمِعُوْنَ حَوْلَهُ فَيَخْطُبَ! اِنَّمَا كَانُوْا اِذَا صَلُّوا الْغَدَاةَ قَعَدُوْا حِلَقًا حِلَقًا يَقْرَءُوْنَ الْقُرْآنَ وَيَتَعَلَّمُوْنَ الْفَرَائِضَ وَالسُّنَنَ." (مجمع الزوائد ج:۱ ص:۱۳۲)

ترجمہ:......"یزید رقاشی کہتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ تم لوگ کس طرح بیٹھتے ہو؟ میری عقل میں نہیں آتا، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھتے تھے تو حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے، جتنے آدمی بڑھتے جاتے تھے، اتنا ہی حلقہ بڑھتا جاتا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس طرح بیٹھا کرتے تھے، گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں، اگر ہل جائیں گے تو پرندے اڑ جائیں گے، اتنے سکون اور وقار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھتے تھے اور وہ حضرات جب فجر کی نماز سے فارغ ہوتے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تو الگ الگ حلقے بن جاتے تھے، کیونکہ سارے تو قرآن مجید نہیں پڑھے ہوتے تھے، کسی نے پڑھا ہے اور کسی نے نہیں پڑھا، تو الگ الگ حلقے بن جاتے تھے اور ان حلقوں میں قرآن کریم کا مذاکرہ ہوتا تھا، سنت کا مذاکرہ ہوتا تھا، دین کی باتوں کا مذاکرہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ سورج نکل جاتا اور وہ لوگ اشراق پڑھ کر نکل جاتے، باہر گھروں کو چلے جاتے۔

لیکن اب تم لوگ کس طرح بیٹھتے ہو ہمارے ساتھ، جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم لوگ گھروں کو چلے جاتے ہیں، کچھ لوگ ہوتے ہیں جو قرآن مجید کی

تلاوت کرتے ہیں اور اشراق پڑھ کر کے جاتے ہیں، ورنہ نماز سے فارغ ہوئے ابھی امام نے دعا مانگ کر کے ہاتھ منہ پر نہیں پھیرا اور اٹھ کر چلے گئے، بہرحال ہمارے درمیان اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رنگ میں بہت فرق آ گیا، یہاں تو ہماری مسجد میں پھر بھی اللہ کا فضل ہے، لوگ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہوتے ہیں، باتیں واتیں نہیں ہوتیں، قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، ذکر کرتے ہیں، تسبیحات پڑھتے ہیں، ورنہ بہت سی مسجدوں میں دیکھا ہے کہ یہاں جتنا دیر مسجد میں بیٹھیں گے، باتیں کریں گے، بعض لوگوں کو احساس نہیں ہوتا کہ ہم مسجد میں بیٹھے ہیں اور مسجد اللہ کا گھر ہے۔

میں نے آپ حضرات کی خدمت میں کئی دفعہ یہ بات عرض کی ہے یہ ہمارے سامنے تھانہ ہے، تھانے دار بہت معمولی سا افسر ہوتا ہے، بہت معمولی سا، لیکن وہاں جا کر لوگ نہیں شور مچاتے، بلکہ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہوتے ہیں، کسی کو کوئی بات کہنی ہے، تو وہ درخواست پیش کرتا ہے، اور بڑی عدالت میں بھی یہی ہوتا ہے، چنانچہ آپ نے کبھی کسی عدالت میں شور مچاتے ہوئے واہیات باتیں کرتے ہوئے کبھی کسی کو نہیں دیکھا ہوگا، یہ مسجد اللہ کا گھر ہے، یہاں جس ادب کے ساتھ، جس وقار کے ساتھ، جس اطمینان کے ساتھ بیٹھنا چاہئے، اس طرح لوگ نہیں بیٹھتے الا ماشاءً اللہ اور خاص طور سے ہمارے پنجاب میں تو لوگوں کی عادت ہے باتیں کرنے کی، مسجد میں آتے ہیں باتیں کرتے ہیں۔

یہاں نہیں تو وضوخانہ میں تو ایسا کرتے ہوں گے، یہ ہماری مسجد میں حاضری کا حال ہے، جب مسجد میں حاضر ہو کر ہم مسجد کا ادب نہیں کرتے، تو دل میں نورانیت کیسے پیدا ہو؟ اور رسول اللہ ﷺ والی بات ہم میں کیسے آئے؟ دل یقین سے خالی ہو گئے، آخرت کا یقین اور مرنے کا یقین اور مرنے کے بعد قبر میں تنہا جانا اور وہاں اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا سوال و جواب کرنا، اس کا احساس ہی نہیں ہے۔

ایک اور روایت میں ہے:

"عَنْ بِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ فِیْ عِصَابَۃٍ مِنَ الْمُهَاجِرِیْنَ ‌جَالِسًا مَعَهُمْ، وَاِنَّ بَعْضَهُمْ لَیَسْتَتِرُ بِبَعْضٍ مِنَ الْعُرْیِ وَقَارِیءٌ لَّنَا یَقْرَأُ عَلَیْنَا، فَكُنَّا نَسْمَعُ اِلٰی كِتَابِ اللهِ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ اُمِرْتُ اَنْ اَصْبِرَ مَعَهُمْ نَفْسِیْ. قَالَ: فَاسْتَدَارَتِ الْحَلْقَۃُ وَبَرَزَتْ وُجُوْهُهُمْ. قَالَ: فَمَا عَرَفَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَحَدًا مِنْهُمْ غَیْرِیْ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اَبْشِرُوْا مَعَاشِرَ صَعَالِیْكِ الْمُهَاجِرِیْنَ بِالنُّوْرِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ! تَدْخُلُوْنَ قَبْلَ الْاَغْنِیَآءِ بِنِصْفِ یَوْمٍ وَذٰلِكَ خَمْسُمِائَۃِ عَامٍ." (مسند احمد ج:۳ ص:۶۳)

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی میں حلقہ لگا ہوا تھا بلکہ مختلف حلقے لگے ہوئے تھے، کوئی اپنی دعا کررہا ہے، کوئی استغفار کررہا ہے، کوئی تسبیحات کررہا ہے، کوئی قرآن مجید سکھا رہے ہیں، آنحضرت ﷺ اپنے حجرہ شریف سے باہر تشریف لائے اور آکر ارشاد فرمایا کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا کئے ہیں کہ مجھے ان کے پاس بیٹھے کا حکم ہوا ہے، میں اللہ تعالیٰ کا حکم لے کرکے آیا ہوں۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ بیچارے ایسے تھے کہ ان کے پاس ستر ڈھکنے کے لئے پورا کپڑا نہیں تھا، اس لئے ایک دوسرے کی اوٹ میں بیٹھے تھے آنحضرت ﷺ جب تشریف لائے اور جب یہ بات ارشاد فرمائی تو صحابہ کرام نے حلقہ بنالیا، کیونکہ معمول مبارک یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ جب پاس بیٹھتے تھے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حلقہ بنالیا کرتے تھے، لیکن ان کے بدن

برہنہ تھے، کپڑا پورا نہیں تھا، ایسے ڈھک ڈھکا کر وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بیٹھ گئے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سوائے میرے آنحضرت ﷺ کسی کو نہیں پہچان سکے، صرف ایک آدمی کو یعنی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہچانا، باقی کسی کو نہیں پہچانا، آنحضرت ﷺ بیٹھ گئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی حلقہ بنا کر بیٹھ گئے، جیسی بھی حالت تھی، معمولی کپڑا تھا یا کوئی ننگا ہی تھا، صرف چادر پہنی ہوئی تھی، لنگی پہنی ہوئی تھی، باقی سارا بدن ننگا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے بیٹھتے ہی ارشاد فرمایا کہ اے کمزور مہاجرین، نادار مہاجرین، تم کو مبارک ہو، تم دوسرے لوگوں سے آدھا دن پہلے جنت میں جاؤ گے۔

اور یوں ارشاد فرمایا کہ آدھا دن ہے پانچ سو سال کا، کیونکہ ایک دن ہے ایک ہزار سال کا، یہ بھی اس حدیث میں فرمایا ہے، ورنہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ پچاس ہزار سال کا ایک دن ہوگا، پچاس ہزار سال کا ایک دن اور آنکھیں آسمان پر اٹھی ہوئی ہوں گی، ایسا نہیں ہوگا کہ کوئی آدمی ایک دوسرے کو دیکھ سکے، لیکن بعض اللہ کے بندوں کے لئے یہ پچاس ہزار سال کا دن ایسا چھوٹا ہو جائے گا جیسے چار رکعت نماز عصر کی پڑھ لی بس۔

بہرحال جو حضرات کہ فقیر ہیں، نادار ہیں، کھانے کے لئے روٹی نہیں، پہننے کے لئے کپڑا نہیں، حق تعالیٰ شانہ کی نوازش ان پر ہے، وہ قیامت کے دن سب سے پہلے جنت میں جائیں گے، لوگ اپنے حساب وکتاب میں پھنسے ہوئے ہوں گے اور وہ اڑتے ہوئے جنت میں چلے جائیں گے، وہاں اللہ تعالیٰ ان کو لباس بھی عطا فرمائیں گے اور جنت میں جا کر وہ نامعلوم کتنی دیر پہلے استراحت بھی فرمائیں گے، اس وقت یہ چاہیں گے کہ کاش! ہمیں دنیا میں کچھ بھی نہ ملا ہوتا، یہ آخرت کا اجر ہمیں مل جاتا، ویسے اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمانے والے ہیں۔

بھائیو! ہماری ساٹھ سال کی عمر ہوگی، یا ستر سال کی اور زیادہ سے زیادہ اسی

سال کی عمر ہو جائے گی، کہاں تک پہنچیں گے؟ اس سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک ذرا غور فرمایئے اور کتنے لوگ گزر چکے ہیں اور ہمارے بعد کتنے لوگ آئیں گے، اتنی سی زندگی کے لئے ہم نے اپنے دین اور ایمان کو خراب کر دیا ہے، کسی کی عمر پچاس سال ہے، کسی کی ساٹھ سال ہے، کسی کی ستر سال ہے، اتنی سی بات کے لئے اپنے آپ کو برباد کرلیا ہم نے اور لگ گئے محلات بنانے میں، لگ گئے فلاں چیز میں، کہیں علماءِ کرام کا مذاق اڑا رہے ہیں، کہیں کوئی بات کر رہے ہیں، کہیں کوئی بات کر رہے ہیں۔ پندرہ سال تو آدمی کے ہوتے ہیں بالغ ہونے کے، پندرہ سال کے بعد اس کا حساب و کتاب شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر اس کا اعمال نامہ لکھا جانا شروع ہو جاتا ہے اور ایک ایک بات اس کی لکھ لی جاتی ہے۔

میرے بھائیو! ذرا غور فرماؤ کہ کتنے دن ہم دنیا میں رہے اور کتنے دن کے لئے رہیں گے، کہیں کسی سے لڑائی ہے، کہیں کسی کے ساتھ جھگڑا ہے، کسی کے ساتھ فساد ہے، کسی کے ساتھ کچھ ہے، کسی کے ساتھ کچھ ہے، لیکن ان چند دنوں کے لئے جو ہم یہاں آئے، اس کو بھی خراب کر کے چلے گئے، اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔

ایک حدیث میں ہے کہ:

"عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِمَجْلِسَیْنِ فِیْ مَسْجِدِهٖ، اَحَدُ الْمَجْلِسَیْنِ یَدْعُوْنَ اللّٰهَ وَیَرْغَبُوْنَ اِلَیْهِ، وَالْاٰخَرُ یَتَعَلَّمُوْنَ الْفِقْهَ وَیُعَلِّمُوْنَهٗ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: کِلَا الْمَجْلِسَیْنِ عَلٰی خَیْرٍ، وَاَحَدُهُمَا اَفْضَلُ مِنَ الْاٰخَرِ صَاحِبِهٖ اَمَّا هٰؤُلَاءِ فَیَدْعُوْنَ اللّٰهَ وَیَرْغَبُوْنَ اِلَیْهِ فَاِنْ شَاءَ اَعْطَاهُمْ وَاِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ. وَاَمَّا هٰؤُلَاءِ فَیَتَعَلَّمُوْنَ وَیُعَلِّمُوْنَ الْجَاهِلَ وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا."

(مشکوٰۃ ص:۳۶)

ترجمہ:......''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو ملاحظہ فرمایا کہ مجلس میں دو قسم کے لوگ ہیں کچھ لوگ تو اپنے ذکر اذکار میں لگے ہوئے ہیں، دعا و استغفار میں لگے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ سیکھنے سکھانے میں لگے ہوئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ دو مجلسیں ہیں ایک ذکر اذکار کرنے والوں کی ہے یہ اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں اب اللہ کی مرضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کتنا دیتا ہے، کتنا نہیں دیتا اور ایک مجلس پڑھنے پڑھانے، سیکھنے سکھانے والوں کی ہے قرآن مجید پڑھا رہے ہیں، ایک دوسرے کو احادیث سکھا رہے ہیں، فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے معلم بنا کر بھیجا ہے یہ فرما کر آنحضرت ﷺ اس جماعت میں بیٹھ گئے، جو کہ پڑھا رہے ہیں۔''

ایک اور روایت میں ہے:

''وَاَخْرَجَ عَبْدُالرَّزَّاقِ وَابْنُ اَبِیْ شَیْبَۃَ عَنْ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ اَبِیْ مُوْسٰی اَنَّ اَبَا مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَتٰی عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ بَعْدَ الْعِشَاءِ، فَقَالَ لَہٗ عُمَرُ: مَا جَاءَ بِکَ؟ قَالَ: جِئْتُ اَتَحَدَّثُ اِلَیْکَ. قَالَ: ھٰذِہِ السَّاعَۃَ؟ قَالَ: اِنَّہٗ فِقْہٌ! فَجَلَسَ عُمَرُ فَتَحَدَّثَا طَوِیْلًا، ثُمَّ اِنَّ اَبَا مُوْسٰی قَالَ: اَلصَّلَاۃَ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ! قَالَ: اِنَّا فِیْ صَلَاۃٍ.'' (   )

ترجمہ:......''عبدالرزاق وابن ابی شیبہ کی روایت ہے کہ عشاء کی نماز ہوچکی تھی، عشاء کی نماز کے بعد کا وقت تھا، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور جا کر کہا کہ میں آپ کے پاس بیٹھنے کے لئے آیا ہوں حضرت نے ڈانٹ کر فرمایا کہ اب کوئی بیٹھنے کا وقت ہے اور کہنے لگے کہ فقہ کے کچھ مسائل ہیں ان کے بارے میں گفتگو کرنی ہے، فرمایا بیٹھ جاؤ دیر تک گفتگو ہوئی، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی بیٹھے رہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی بیٹھے رہے، اس کے بعد حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ نے اجازت لی اور ساتھ ہی کہا کہ حضرت آپ چاہیں تو ساتھ ہی تہجد کی نماز پڑھ لیتے ہیں، تہجد کا وقت ہوگیا ہے فرمایا جب سے تہجد ہی پڑھ رہے تھے اور کیا ہو رہا تھا؟ جب سے تم میرے پاس بیٹھے تھے، جب سے تہجد ہی ہو رہی تھی، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عجیب شان تھی۔

ایک روایت میں ہے:

”عَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْبَجَلِيِّ قَالَ: اَتَيْتُ الْمَدِيْنَةَ ابْتِغَاءَ الْعِلْمِ، فَدَخَلْتُ مَسْجِدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا النَّاسُ فِيْهِ حِلَقٌ يَتَحَدَّثُوْنَ. فَجَعَلْتُ اَمْضِي الْحِلَقَ حَتّٰى اَتَيْتُ حَلْقَةً فِيْهَا رَجُلٌ شَاحِبٌ، عَلَيْهِ ثَوْبَانِ كَاَنَّمَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ. قَالَ: فَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ: هَلَكَ اَصْحَابُ الْعُقْدَةِ، وَرَبِّ الْكَعْبَةِ! وَلَا اٰسٰى عَلَيْهِمْ. اَحْسِبُهُ قَالَ مِرَارًا. قَالَ: فَجَلَسْتُ اِلَيْهِ فَتَحَدَّثَ بِمَا قُضِيَ لَهُ ثُمَّ قَامَ. قَالَ: فَسَاَلْتُ عَنْهُ بَعْدَ مَا قَامَ، قُلْتُ: مَنْ هٰذَا؟ قَالُوْا: هٰذَا سَيِّدُ الْمُسْلِمِيْنَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ. رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ. قَالَ: فَتَبِعْتُهُ حَتّٰى اَتٰى مَنْزِلَهُ، فَاِذَا هُوَ رَثُّ الْمَنْزِلِ، رَثُّ الْهَيْئَةِ، فَاِذَا رَجُلٌ زَاهِدٌ مُنْقَطِعٌ يُشْبِهُ اَمْرُهُ بَعْضَهُ بَعْضًا. فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ عَلَيَّ السَّلَامَ ثُمَّ سَاَلَنِيْ مِمَّنْ اَنْتَ؟ قُلْتُ: مِنْ اَهْلِ الْعِرَاقِ. قَالَ: اَكْثَرُ مِنِّيْ سُؤَالًا. قَالَ: لَمَّا قَالَ ذٰلِكَ

غَضِبْتُ. قَالَ: فَجَثَوْتُ عَلٰی رُکْبَتَیَّ وَرَفَعْتُ یَدَیَّ هٰکَذَا، وَصَفَ حِیَالَ وَجْهِهٖ. فَاسْتَقْبَلْتُ الْقِبْلَةَ. قَالَ: قُلْتُ: اَللّٰهُمَّ! نَشْکُوْهُمْ اِلَیْکَ. اِنَّا نُنْفِقُ نَفَقَاتِنَا وَنُنْصِبُ اَبْدَانَنَا وَنَرْحَلُ مَطَایَانَا ابْتِغَاءَ الْعِلْمِ. فَاِذَا لَقِیْنَاهُمْ تَجَهَّمُوْا لَنَا وَقَالُوْا لَنَا. قَالَ: فَبَکٰی اُبَیٌّ وَجَعَلَ یَتَرَضَّانِیْ وَیَقُوْلُ: وَیْحَکَ! لَمْ اَذْهَبْ هُنَاکَ. لَمْ اَذْهَبْ هُنَاکَ. قَالَ: ثُمَّ قَالَ: اَللّٰهُمَّ! اِنِّیْ اُعَاهِدُکَ لَئِنْ اَبْقَیْتَنِیْ اِلٰی یَوْمِ الْجُمُعَةِ لَأَتَکَلَّمَنَّ بِمَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا اَخَافُ فِیْهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ. قَالَ: لَمَّا قَالَ ذٰلِکَ انْصَرَفْتُ عَنْهُ وَجَعَلْتُ اَنْتَظِرُ الْجُمُعَةَ. فَلَمَّا کَانَ یَوْمُ الْخَمِیْسِ خَرَجْتُ لِبَعْضِ حَاجَتِیْ فَاِذَا السِّکَکُ غَاصَّةٌ مِنَ النَّاسِ لَا اَجِدُ سِکَّةً اِلَّا یَلْقَانِیْ فِیْهَا النَّاسُ. قَالَ: قُلْتُ: مَا شَأْنُ النَّاسِ؟ قَالُوْا: اِنَّا نَحْسِبُکَ غَرِیْبًا. قَالَ: قُلْتُ: اَجَلْ. قَالُوْا: مَاتَ سَیِّدُ الْمُسْلِمِیْنَ اُبَیُّ بْنُ کَعْبٍ. قَالَ جُنْدُبٌ: فَلَقِیْتُ اَبَا مُوْسٰیؓ بِالْعِرَاقِ فَحَدَّثْتُهٗ حَدِیْثَ اُبَیٍّ. قَالَ: وَا لَهْفَاهُ! لَوْ بَقِیَ حَتّٰی تَبْلُغَنَا مَقَالَتَهٗ۔"

(حیاۃ الصحابہ ج:۵ ص:۳۰۷، ۳۰۸)

ترجمہ:...... "حضرت جندل ابن عبداللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد نبوی ﷺ میں حاضر ہوا، میں نے دیکھا کہ لوگ مختلف حلقوں میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، ایک حلقہ میں گیا، دوسرے حلقہ میں گیا، تیسرے حلقہ میں گیا، لیکن کوئی بات مجھے پسند نہ آئی، لیکن اسی کے بعد میں ایک اور

حلقہ میں گیا تو میں وہاں بیٹھ گیا وہ ایک بزرگ بات کررہے تھے، اٹھ کر کے چلے گئے، کافی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر اٹھ کر کے چلے گئے، میں نے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ میں کوفہ سے گیا تھا، لوگوں نے کہا کہ سیدالمسلمین، مسلمانوں کے سردار ابی ابن کعب ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ اٹھ کر گئے، تو میں ان کے پیچھے چلا گیا، ان کے گھر کو دیکھا تو وہ اتنا ٹوٹا پھوٹا اور اتنا شکستہ تھا کہ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ یہ اس مکان میں رہتے ہیں! مجھے کہنے لگے کہ کچھ کہنا ہے میں نے کہا کہ میں کوفہ سے آیا ہوں، فرمانے لگے کہ کوفہ کے لوگ تو مجھ سے بہت سوال کیا کرتے ہیں، میں نے اس طرح ہاتھ اٹھا لئے اور کہا کہ یااللہ میں آپ سے شکایت کرتا ہوں کہ میں آیا تھا دین سیکھنے کے لئے اور مجھے یہ جواب دے رہے ہیں، یہ بات سن کر کے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونے لگے اور مجھے منانے لگے کہ بھائی میرا مطلب یہ تھا، میرا مطلب یہ تھا اور پھر مجھ سے فرمایا کہ اگر میں اگلے جمعہ تک زندہ رہا تو تم سے احادیث بیان کروں گا اور اس طرح احادیث بیان کروں گا کہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا مجھے اندیشہ نہیں ہوگا، صاف صاف بات کروں گا، میں نے کہا اچھا، اور پھر میں واپس چلا آیا، جمعرات تھی جمعہ سے ایک دن پہلے اپنی ضرورت کے لئے نکلا تو جدھر دیکھتا ہوں اور جو بازار دیکھتا ہوں بھرا ہوا ہے، میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ آج بازار کیوں بھرے ہوئے ہیں؟ ان صاحب نے کہا کہ تم اجنبی آدمی ہو؟ میں نے کہا کہ اجنبی ہوں،

کہنے لگے کہ ابی ابن کعبؓ کا انتقال ہوگیا ہے، انہوں نے کہا تھا
کہ اگر اگلے جمعہ تک زندہ رہا تو اگلا جمعہ آیا ہی نہیں۔"

ان صاحب نے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھنا چاہا لیکن وہ لازمی بات ہے، کمزور تھے فرمایا اگلے جمعہ بیان کروں گا ماشاءاللہ اور یہ معلوم ہی نہیں کہ اگلا جمعہ آئے گا بھی کہ نہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہی کیفیت تھی، معلوم ہوتا تھا کہ رجال آخرت ہیں، دنیا کے لئے پیدا نہیں کئے گئے، بلکہ آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے ان کے لئے فرمایا تھا: "أَقْرَءُهُمْ أُبَیٌّ ابْنُ کَعْبٍ" میری امت کا سب سے بڑا قاری ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں خود انہوں نے قرآن کریم حفظ کیا تھا اور دین کے مسائل معلوم کئے تھے، اس لئے فرمایا تھا کہ سب سے بڑے قاری ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں "وَأَفْرَضُهُمْ زَیْدُ ابْنُ ثَابِتٍ" سب سے زیادہ فرائض کو جاننے والے زید ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں "وَأَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مَعَاذُ ابْنُ جَبَلٍ" حلال اور حرام کو سب سے زیادہ جاننے والے معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

ایک روایت میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمَا قَالَ: خَطَبَ عُمَرُ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ النَّاسَ بِالْجَابِیَةِ وَقَالَ: یَا أَیُّهَا النَّاسُ! مَنْ اَرَادَ اَنْ یَسْأَلَ عَنِ الْقُرْاٰنِ فَلْیَأْتِ اُبَیَّ بْنَ کَعْبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ، وَمَنْ اَرَادَ اَنْ یَسْأَلَ عَنِ الْفَرَائِضِ فَلْیَأْتِ زَیْدَ بْنَ ثَابِتٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ، وَمَنْ اَرَادَ اَنْ یَسْأَلَ عَنِ الْفِقْهِ فَلْیَأْتِ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ، وَمَنْ اَرَادَ اَنْ یَسْأَلَ عَنِ الْمَالِ فَلْیَأْتِنِیْ فَاِنَّ اللّٰہَ جَعَلَنِیْ لَهٗ وَالِیًا وَقَاسِمًا."

(حیاۃ الصحابہ ج:۵ ص:۳۰۱)

ترجمہ:......''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملک شام میں تشریف لے گئے، تو جابیہ کے مقام پر خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا کہ: لوگو! جس شخص کو قرآن کریم کے بارے میں کوئی بات پوچھنی ہو، وہ ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جائے اور جس شخص کو فرائض کے بارے میں کوئی مسئلہ پوچھنا ہو وہ زید ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جائے اور جس کو فقہ کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو وہ معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جائے اور اگر کسی کو مال کی ضرورت ہو تو وہ میرے پاس آجائے، اس لئے کہ اللہ نے مجھے مال کا والی اور تقسیم کرنے والا بنایا ہے، حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سب سے افضل اور اولیٰ تھے۔''

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ''ازالۃ الخفا'' میں باقاعدہ اول سے لے کر آخر تک پوری فقہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی درج کردی ہے، وضو سے لے کر فرائض تک، تمام کے تمام مسائل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کردیئے ہیں اور خود ارشاد فرماتے تھے کہ: اب کیا کروں مصیبت یہ ہے کہ میرے ذمہ خلافت کا بوجھ ہے، ورنہ کسی مسجد میں مؤذن ہوتا، خلافت کا بوجھ میرے ذمہ نہ ہوتا تو کسی مسجد میں مؤذنی کیا کرتا۔ بس اسی پر ختم کرتا ہوں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

اپنی اصلاح کی فکر کی ضرورت!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

فَمِنْ حَدِیْثِ اَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! زِدْنِیْ. قَالَ: قُلِ الْحَقَّ وَاِنْ کَانَ مُرًّا. قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! زِدْنِیْ. قَالَ: لِیَرُدَّکَ عَنِ النَّاسِ مَا تَعْلَمُہٗ مِن نَّفْسِکَ وَلَا تَجِدُ عَلَیْھِمْ فِیْمَا تَأْتِیْ وَکَفٰی بِکَ عَیْبًا اَنْ تَعْرِفَ مِنَ النَّاسِ مَا تَجْھَلُہٗ مِن نَّفْسِکَ وَتَجِدَ عَلَیْھِمْ فِیْمَا تَأْتِیْ، ثُمَّ ضَرَبَ بِیَدِہٖ عَلٰی صَدْرِیْ فَقَالَ: یَا اَبَا ذَرٍّ! لَا عَقْلَ کَالتَّدْبِیْرِ وَلَا وَرَعَ کَالْکَفِّ وَلَا حَسَبَ کَحُسْنِ الْخُلُقِ.'' (کنزل العمال ج:۳ ص:۱۸۹)

ترجمہ:......''حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کچھ مزید ارشاد فرمایئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کہ: حق کہو اگرچہ کڑوا ہو، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: یا رسول اللہ! کچھ اور اضافہ کیجئے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس عیب کو تو اپنے اندر پاتا ہے اور تجھے اس کا علم ہے تو تجھے

اپنے نفس کے عیب کا علم ہونا دوسروں کے عیوب بیان کرنے سے روک دے، اور فرمایا کہ جو کام خود کرتے ہو اس کام کے دوسروں کے کرنے پر اظہار ناراضگی نہ کرو، اور تیرے عیب کے لئے یہی بات کافی ہے کہ تو اپنے نفس کے عیب سے ناواقف ہو اور لوگوں کے عیب سے واقف ہو، اور خود کرے تو تجھے اپنے اوپر غصہ نہ آئے اور لوگ کریں تو تجھے اس پر غصہ آئے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا اور فرمایا: تدبیر سے بڑھ کر کوئی عقل نہیں ہے اور ممنوع چیزوں سے رکنے سے بڑھ کر کوئی پرہیز گاری نہیں اور حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی حسب نہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ حق کا سننا دوسروں کے لئے ناگوار ہوگا اور جب تم حق بات کہو گے تو یقیناً حق بات ان کو بری لگے گی۔

سب سے آسان کام:

میں پہلے ایک دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ دنیا میں سب سے آسان کام دوسروں کو نصیحت کرنا ہے اور سب سے مشکل کام نصیحت کو قبول کرنا ہے، اس سے زیادہ مشکل کوئی کام نہیں کہ ہمیں کوئی نصیحت کرے تو ہم دل کی گہرائیوں سے اس کو قبول کرلیں، بلکہ اس کی نصیحت کو سن کر ہمارے چہرے پر شکنیں آئیں گی، تغیر پیدا ہوگا اور کچھ نہ کچھ اپنی زبان مبارک سے اس کے بارے میں ارشاد فرمائیں گے، کبھی تو ایسا ہوگا کہ ہم اپنے فعل کی کوئی نہ کوئی تاویل تراشیں گے کہ دراصل یہ کام میں اس لئے کر رہا ہوں اور کوشش کریں گے کہ اس تاویل کے ذریعہ سے اپنے آپ کو فرشتہ معصوم ثابت کریں کہ مجھ میں کوئی غلطی نہیں ہے، بھائی میرے اندر تو خطا اور غلطی کا امکان ہی نہیں ہے، اور کبھی ایسا ہوگا کہ ہم نصیحت کرنے والے کو اس سے دوگنا سنائیں گے کہ آپ ذرا

اپنے گھر کی خبر لیجئے! ذرا اپنی حالت دیکھئے! اور اگر کچھ بھی نہ کریں اور زبان سے بھی اس کو کچھ نہ کہیں اور چہرے میں تغیر بھی پیدا نہ ہو تو دل میں تغیر ضرور پیدا ہوگا، ہم یوں سمجھیں گے کہ اس نے ہماری توہین کردی، یہ ساری باتیں میں اپنے بارے میں کہہ رہا ہوں، تمہارے بارے میں نہیں کہہ رہا، میں اپنی بات کر رہا ہوں۔

تو کسی صاحب کی نصیحت سن کر یا تو ہمارے چہرے میں تغیر پیدا ہوگا یا ہمیں ناگواری ہوگی اور ناگواری کے آثار ہمارے چہرے پر ظاہر ہوں گے، کبھی تو اپنی ناگواری کا اظہار ہم زبان سے کریں گے، کبھی اشاروں سے کریں گے، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو آخری درجہ میں دل کے اندر ضرور تغیر پیدا ہوگا کہ اس نے اچھا نہیں کیا مجھے ٹوک دیا، کسی کے نصیحت کرنے پر ہم اپنی اصلاح کے لئے آمادہ ہوں اور یہ سمجھیں کہ اس بے چارے نے مجھے میرے عیب پر مطلع کر کے بہت اچھا کیا ہے، مجھے ندامت ہوجائے، میں اللہ تعالیٰ سے دل میں معافی مانگوں اور اس کا شکر گزار بنوں اور یہ سمجھوں کہ میرا نفس مجھے تاویلیں سکھا رہا تھا، آج معلوم ہوا کہ میرے نفس کی تاویلیں مخلوق کے سامنے نہیں چلتیں، اللہ کے سامنے کیسے چلیں گی؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم ایسا نہیں کرتے۔

نصیحت سننا سب سے مشکل کام:

تو میں نے کہا کہ سب سے مشکل کام دنیا میں کسی نصیحت کرنے والے کی نصیحت کو قبول کرنا ہے، خصوصاً جبکہ نصیحت تنہا ایک آدمی کو کی گئی ہو، اگر ہمیں اور کوئی تاویل نہ سوجھے تو ہم کہتے ہیں کہ ساری دنیا تو کرتی ہے، ایک ہم ہی تھوڑی کرتے ہیں، ماشاءاللہ کیا اچھی تاویل ہے جو ہمارے نفس نے ہمیں سکھادی ہے، اور ہماری زبان سے بھی اس کو جاری کردیا ہے، ہم اکیلے تھوڑا ہی کرتے ہیں، ساری دنیا کرتی ہے۔

اور سب سے آسان کام کسی کو نصیحت کرنا ہے، میرے جیسے نالائق آدمی کو بھی

اگر کہا جائے تو میں نصیحتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ جاؤں گا، اپنی خبر ہے ہی نہیں، لیکن لوگوں کو نصیحتیں کر رہا ہے، اور بعض لوگوں نے اپنے اس جذبہ نصیحت کے لئے اس حدیث کو آڑ بنالیا ہے کہ جی حق کہو چاہے کسی کو کڑوا لگے، بالکل بجا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ حق کہو چاہے کسی کو کڑوا لگے، مگر تمہارا مقصود حق کہنا ہے یا لوگوں کو کڑوا لگوانا ہے، یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے، اگر حق کہنا ہی مقصود ہے تو بہت مبارک اور بہت اچھی بات ہے، لوگوں کا ذائقہ کڑوا کرنا مقصود نہیں گو فطری طور پر ہو جائے وہ دوسری بات ہے، لیکن تمہارا مقصود یہ نہیں کہ لوگوں کا دل برا ہو، ان کا حلق کڑوا ہو جائے اور نصیحت کرنے والے سے نفرت کرنے لگیں، نہ صرف یہ کہ تم سے نفرت کرنے لگیں بلکہ آئندہ نصیحت کرنے والوں سے بھی نفرت کرنے لگیں۔

نصیحت کا انداز:

سچی بات یہ ہے کہ ہم میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو حق کہتے ہیں صرف لوگوں کا منہ کڑوا کرنے کے لئے، لوگوں کا منہ کڑوا کرنا مقصود نہیں، حق ہی مقصود ہے تو کڑوی دوائی مٹھائی میں بھی لپیٹ کر دی جاسکتی ہے، بعض کیپسول ایسے ہوتے ہیں، ان کو بند کر کے معدہ میں اتارا جاتا ہے کہ آہستہ آہستہ تحلیل ہوں گے اور ان کا اثر ظاہر ہوگا، تو اگر حق ہی کہنا مقصود ہے اور تم واقعتاً چاہتے ہو کہ حق ان کے معدے میں اتر جائے تو کوشش کرو کہ اس پر کوئی شیرینی لپیٹو، کسی ڈھنگ سے اور کسی صحیح انداز سے بات کرو تاکہ ان کے حلق سے اتر جائے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخاطب اتنا ضدی اور ایسا سخت ہوتا ہے کہ اس وقت اس کا منہ کڑوا کرنا ہی ضروری ہوتا ہے تو مضائقہ نہیں۔

حق بات کہنے سے پہلے اپنا دل ٹٹولو!

بہرحال حق ضرور کہو، چاہے کسی کو کڑوا ہی لگے، لیکن اپنی طرف سے کوشش کرو کہ کسی کا منہ کڑوا کرنا مقصود نہ ہو، اپنی نیت کو پہلے دیکھ لو، اپنا جائزہ لے لو اور پھر تم

سوچو کہ اگر میں اس کو کسی اور انداز سے بات کروں تو شاید صحیح رہے، کسی کو نصیحت کرنی ہے تو کوشش کرو کہ اچھے سے اچھا اسلوب اور انداز اختیار کرو۔

اپنی کوتاہی پیش نظر رکھو!

میں اپنی بات کرتا ہوں، جب بھی کوئی بات کسی کو کہی اور اسے کڑوی لگی مجھے بعد میں افسوس ہی ہوا، مجھے ندامت ہوئی کہ میں اس کو دوسرے انداز سے بھی کہہ سکتا تھا، اور شاید کہ اگر میں دوسرے انداز میں کہتا تو اس کو ناگوار نہ ہوتی، استغفراللہ! لاحول ولاقوۃ الا باللہ! میری کوتاہی ہے، دوسرے آدمی نے جب برا مانا اور میری بات کو رضا کے ساتھ قبول نہیں کیا تو اس میں کوتاہی میری ہی ہے، مجھے ڈھنگ سے بات کہنی نہیں آئی، بیسیوں مرتبہ نہیں بلکہ سینکڑوں مرتبہ میری زندگی میں یہ واقعات پیش آئے ہوں گے کہ میری عجلت پسندی نے یا یوں کہو کہ بات کو سوچ کر نہ کہنے میں یہ موقع پیش آیا کہ میں نے کسی کو حق بات کہی، لیکن اس نے قبول نہیں کی، بلکہ برا مانا اور مجھے ہمیشہ اس پر افسوس ہوا کہ میں اگر اس کو اور کسی صحیح انداز سے بات کہہ دیتا تو شاید یہ قبول کرلیتا، لیکن کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں نے اپنی حد تک بات بہتر سے بہتر انداز سے کہنے کی کوشش کی، مگر اس نے نہیں مانا، اس کو کڑوی لگی، چلو ہمارا فرض ادا ہوگیا، اب اس سے الجھنا نہیں، کہہ دو اچھا بھئی تمہیں اگر یہ بات اچھی نہیں لگی تو میری غلطی ہے کہ میں صحیح طور پر سمجھا نہیں سکا، لڑائی نہ کرو، اگر ان تمام امور کی رعایت کرکے قولِ حق کہو، سچی بات کہو تو پھر ان شاءاللہ ثم ان شاءاللہ بات مفید بھی ہوگی، کارگر بھی ہوگی اور عنداللہ تم اس کے اجر وثواب کے بھی مستحق ہوگے، لیکن اگر ویسے ہی دوسرے کو لاٹھی مارنا مقصود ہو، عنوان تو قولِ حق کا ہے لیکن حقیقت میں یہ نہیں، حقیقت میں دوسرے کی تذلیل، دوسرے کی توہین، دوسرے کو طعنہ دینا یہ مقصود ہے تو پھر معاملہ گڑبڑ ہی ہے۔

قولِ حق سب کے لئے:

اور ایک بات یہ ہے کہ ہم قولِ حق کہتے ہوئے دوست اور دشمن کے درمیان تمیز کرتے ہیں، ہماری عقل خداداد دوست اور دشمن کے درمیان تمیز کرتی ہے، اپنے اور پرائے کے درمیان میں امتیاز کرتی ہے، دشمنوں کے سامنے ہم قولِ حق کہتے ہیں لیکن دوستوں کے سامنے نہیں، کیونکہ اگر دوستوں کے سامنے کہیں گے تو پھر ہمارا دوست رہے گا کون؟ دشمن تو دشمن ہیں، اگر ان کے سامنے سچی بات کہہ دی اور ان کو کڑوی لگی تو ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیؓ کے بارے میں غالباً حضرت عمرؓ کا نام لیا تھا یا کوئی اور صحابی تھے، اس وقت میرے ذہن میں نہیں رہا، فرمایا اللہ تعالیٰ ہم پر رحمت فرمائے، ان کے قولِ حق نے ان کا کوئی دوست نہیں چھوڑا، لیکن ہم بڑے محتاط رہتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے قولِ حق کہیں، پرائے کے سامنے قولِ حق کہیں، لیکن اپنوں کے سامنے نہیں، دشمنوں کے سامنے کہیں، دوستوں کے سامنے نہیں، ہاں بھئی تم بتاؤ پھر ہم اس کی جواب دہی قیامت کے دن کیا کریں گے؟

فتنہ کے اندیشہ سے حق نہ کہنا:

البتہ ایک وجہ امتیاز اور بھی ہوتی ہے، کبھی کبھی ہم اس شخص کے سامنے قولِ حق کہتے ہیں جس کے بارے میں توقع ہوتی ہے کہ ہماری بات سن لے گا، اور اس شخص کے سامنے قولِ حق نہیں کہتے جس کے بارے میں توقع ہوتی ہے کہ یہ سنے گا تو نہیں، لیکن الٹا دست و گریباں ہوگا، یہ صحیح بات ہے، یہ فرق کرنا البتہ صحیح ہے۔

عام عنوان سے نصیحت کیجئے!

ایک اور بات بھی لائق غور ہے کہ اگر آپ کو حق بات کہنی ہے تو عام عنوان سے کہئے، خاص آدمی کو مخاطب بنا کر اور اس پر درشتی اور سختی کرتے ہوئے بات نہ کہئے۔

نبی اکرمؐ کا انداز نصیحت:

رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ایسی بات معلوم ہوتی تھی جس کی اصلاح ضروری ہوتی تھی تو منبر پر تشریف لے جاتے تھے اور فرماتے: "مَا بَالُ اَقْوَامٍ یَفْعَلُوْنَ کَذَا وَ کَذَا." ان لوگوں کا کیا حال ہے جو ایسا ایسا کرتے ہیں، سمجھنے والا سمجھ جاتا کہ مجھے کہہ رہے ہیں، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو سامنے بھی کہہ دیتے، ڈانٹ بھی دیتے، فرض کرو جوتی بھی کسی کے لگا دیتے تو اس کے لئے یہ فخر کی چیز ہوتی، لیکن خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کریمانہ اس سے بالاتر تھا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے منہ پر ایسی بات نہیں کہتے جو اس کو ناگوار گزرے، بلکہ یوں فرماتے کہ: "مَا بَالُ اَقْوَامٍ یَفْعَلُوْنَ کَذَا وَ کَذَا." ان لوگوں کا کیا حال جو ایسا ایسا کرتے ہیں، اور اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں، میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں، مثلاً جنہوں نے یہ کہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بخشے بخشائے ہیں، ہمیں زیادہ عبادت کرنی چاہئے، کیونکہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو کم سمجھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: "مَا بَالُ اَقْوَامٍ یَتَنَزَّهُوْنَ شَیْئًا اَفْعَلُهَا." ان لوگوں کا کیا حال ہے جو ایسی چیز سے پرہیز گاری کرتے ہیں جس کو میں کرتا ہوں، ایسی چیز سے پرہیزگاری کا مظاہرہ کرتے ہیں جس کو مین کرتا ہوں، حالانکہ یہ چار پانچ آدمی تھے، ان کو بلا کر بھی کہہ سکتے تھے، لیکن نہیں، ان کو بھی نہیں فرمایا، آپؐ کے خدام تھے، جاں نثار تھے، لیکن ان کو نہیں فرمایا، کیونکہ آپ کا اخلاق کریمانہ اس سے بالاتر تھا کہ کسی کے منہ پر ایسی بات کہیں جو اس کو ناگوار گزرے، حدیث شریف میں بیسیوں نہیں، سینکڑوں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

اپنے عیوب پر نظر ہو:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے کہا: یا رسول اللہ! کچھ اور

اضافہ کیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس عیب کو تو اپنے اندر پاتا ہے اور تجھے اس کا علم ہے تو تجھے اپنے نفس کے عیب کا علم ہونا دوسروں کے عیوب بیان کرنے سے روک دے، اور فرمایا کہ جو کام خود کرتے ہو اس کام کے دوسروں کے کرنے پر اظہار ناراضگی نہ کرو اور تیرے عیب کے لئے یہی بات کافی ہے کہ تو اپنے نفس کے عیب سے ناواقف ہو، اور لوگوں کے عیب سے واقف ہو اور خود کرے تو تجھے اپنے پر غصہ نہ آئے اور لوگ کریں تو تجھے اس پر غصہ آئے، اس مضمون کو متفرق طور پر میں کئی موقعوں پر ذکر کر چکا ہوں۔

دوسروں کی عیب بینی:

ایک تو یہ کہ جس شخص کی نظر اپنے عیوب پر ہو وہ دوسروں کے عیوب سے اندھا ہو جاتا ہے، اور جس کی نظر دوسروں کے عیوب پر جائے وہ اپنے آپ سے اندھا ہو جاتا ہے، اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ دوسروں کے اندر اگر عیوب ہیں تو یہ اس کے لئے عار کی بات ہوگی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، لیکن تمہارا تو کوئی نقصان نہیں اور اگر ہمارے اندر عیب ہوگا تو یہ ہمارے لئے عار کی بات ہوگی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ ہمیں دوسروں کے عیوب کی تو فکر ہے، اپنے عیب کی فکر نہیں۔

عجیب تماشہ:

عجیب تماشہ ہے یہ میرے دامن پر گندگی لگی ہوئی ہے اور دوسرے کے دامن پر کوئی معمولی سا دھبہ لگا ہوا ہے، اپنے دامن کی گندگی تو مجھے نظر نہیں آتی البتہ دوسروں کے دامن کا معمولی دھبہ مجھے نظر آتا ہے، اور میں دوسروں سے کہتا ہوں کہ بھائی! یہ اچھا نہیں لگتا، اس کو ہٹاؤ یعنی میں دوسروں کے عیوب بیان کرتا ہوں لیکن اپنے نفس کی پڑتال کرتا ہوں، نہ اس کا محاسبہ کرتا ہوں، نہ تفتیش کرتا ہوں، نہ یہ دیکھتا ہوں کہ میرے اندر یہ عیب ہے یا نہیں؟ اور اگر عیب کا پتہ چل جائے تو تاویل کے پردے

میں ڈھانکنے کی کوشش کرتا ہوں اور اس کو تاویل کے ساتھ ڈھانک کر یہ سمجھ لیتا ہوں کہ لوگوں کی نظر اس پر نہیں جاتی، فرض کرو کہ لوگوں کی نظر نہیں جاتی، اول تو یہ غلط ہے، اگر تمہیں نظر آتا ہے تو لوگوں کو بھی نظر آسکتا ہے۔

گناہ یا نیکی چُھپتی نہیں:

ایک حدیث شریف کا مضمون ہے کہ تم رات کی تاریکی میں دروازہ بند کر کے کوئی نیک عمل کرو اللہ تعالیٰ صبح کو اس کا چرچا کر دیں گے، خود بخود مخلوق کو خیال ہو جائے گا کہ بھئی یہ نیک آدمی ہے، اور اگر تم رات کی تاریکی میں چھپ کر بند کمرے میں کوئی گناہ کا کام کرو گے تو اگلے دن چرچا ہو جائے گا یا دو دن بعد ہو جائے گا، مگر ہو گا ضرور۔

دروازے پر، پیشانی پر لکھا آجاتا تھا:

میں نے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل جب کوئی گناہ کرتے تھے چھپ کر تو صبح کو دروازے پر لکھا ہوتا تھا، اس امت کی اللہ پاک نے ستاری فرمائی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں، دروازے پر نہیں لکھتے لیکن پیشانی پر لکھ دیتے ہیں، یہ تمہیں بتاؤں تم جو بھی خیر کا عمل یا برائی کا عمل کرو گے، تمہاری پیشانی سے ظاہر ہو کر رہے گا، اور مخلوق کو اس کی خوشبو یا بدبو ضرور آئے گی۔

دوسروں کو تو پتہ نہیں میرے عیب کا، حالانکہ واقعہ یہ ہے لوگوں کو فرض کرو تفصیل معلوم نہ ہو لیکن اس کے اثرات معلوم ہو جاتے ہیں، اگر تم چھپ چھپ کر نیکی کرتے ہو، بقول ہمارے خواجہ مجذوب رحمۃ اللہ علیہ کہ:

ارے کچھ تو مجذوبؔ یاروں کا حق بھی
یہ چپکے چپکے پینا اکیلے اکیلے

تم اگر تنہائی میں، علیحدگی میں، اکیلے اکیلے شراب معرفت کے جام لٹاتے ہو

تو لوگوں کو پتہ چل جاتا ہے، اور اگر تم بند کمروں میں منہ کالا کرتے ہو تو تمہاری سیاہی تمہارے چہروں پر آجاتی ہے، اگر چہ مخلوق کو یہ معلوم نہیں ہے، اپنے نفس کو یہ کہہ کر مطمئن نہ کرو کہ کسی کو کیا پتہ؟ تمہیں معلوم ہے کہ نیکی اور بدی کی تاثیر کا لوگوں کو پتہ چلتا ہے، اگر چہ تمہارے عیوب کا تفصیلی علم نہ ہو، اور اگر فرض کرلو کہ مخلوق کو پتہ نہیں تو کیا تمہارے خالق کو بھی پتہ نہیں؟ میں مخلوق کے سامنے اپنی زندگی پر پردہ ڈال سکتا ہوں، لیکن کیا خالق کے سامنے بھی پردہ ڈال سکتا ہوں؟ ہمیں اپنے عیوب معلوم ہوتے ہیں اور ان کو تو ہم ڈھانپ لیتے ہیں، کبھی تاویل کے پردے سے، کبھی غفلت کے پردے سے، کبھی جہل کے پردے سے لیکن لوگوں کے عیوب پر تو ہماری نظر فوراً جاتی ہے، مگر اپنا ستر نظر نہیں آتا۔

دوسروں کے نہیں اپنے عیوب کی فکر کرو!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذرؓ سے فرماتے ہیں: بڑے عیب کی بات ہے کہ جو عیوب تمہاری اپنی ذات کے اندر تمہیں معلوم ہیں ان عیوب کی بنا پر تو تم لوگوں پر نکتہ چینی کرو، لیکن تم اپنی اصلاح کی فکر نہ کرو اور بات یہ ہے کہ مجھے تو اپنی تاویل معلوم ہے کہ میں گناہ کرتا ہوں، میرے اندر یہ کیوں کمزوری ہے، مجھے خود معلوم ہے، چاہے لوگوں کو مطمئن کردوں، لیکن میں جانتا ہوں کہ میں غلط کہتا ہوں، لیکن بھائی! دوسروں کے اندر کوئی عیب اگر پایا جاتا ہے، ہوسکتا ہے کہ ان کی بھی کوئی تاویل ہو، ہوسکتا ہے کوئی عذر ہو، اور اگر فرض کرلو کہ کوئی بھی تاویل نہیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے گناہ سے تائب ہوگئے ہوں، ممکن ہے جہاں دو ماشے سیاہی لگ گئی تھی وہاں انہوں نے دو پاؤ صابن لگادیا ہو اور اس کی توبہ کا تمہیں علم نہ ہو۔

امام مالکؒ کا قصہ:

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ آخری زمانے میں مسجد نہیں آتے تھے، اتنا بڑے امام ہیں لیکن مسجد میں جماعت کے لئے نہیں آتے، اپنے گھر پر نماز پڑھتے تھے،

کسی نے کہا کہ حضرت آپ مسجد میں نہیں آتے، آپ نے مسجد چھوڑ دی؟ ارشاد فرمایا: ہر آدمی کو اپنا عذر معلوم ہے، بعض عذر ایسے ہیں کہ کسی کے سامنے نہیں بیان کئے جاسکتے، اب وہ شریعت کے امام ہیں، اور امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں، ظاہر ہے ان کا کوئی عذر ہوگا۔

مشکوٰۃ شریف میں، ''دارمی'' کے حوالے سے حدیث نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک وقت آئے گا کہ لوگ اونٹ دوڑائیں گے، یعنی سواریوں پر سفر کریں گے اور ان کو مدینے کے ایک عالم سے بڑا کوئی عالم نہیں ملے گا، علماء فرماتے ہیں کہ اس سے امام مالکؒ مراد ہیں، اس لئے وہ مسئلہ تم سے زیادہ جانتے ہیں، وہ اگر جماعت میں نہیں آتے، تم کیوں آگ لگاتے ہو، وہ مسئلہ بہتر جانتے ہیں، ہم سے زیادہ جانتے ہیں، کیا ان کو جماعت کی اہمیت اتنی بھی معلوم نہیں جتنی ہمیں معلوم ہے؟

دوسروں کے بارے میں تاویل کرو!

تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے عیب پر اول تو تمہاری نظر نہ جائے، اگر ہماری نظر اپنے عیوب پر جمی ہوتی تو لوگوں کے عیوب پر نظر نہ جاتی، جو شخص اپنے عیوب کا بصیر ہو، دیکھنے والا ہو، وہ مخلوق کے عیوب سے اندھا ہوجاتا ہے، اور اگر تمہاری نظر چلی بھی گئی تو تمہارے ذہن میں کوئی تاویل آجانی چاہئے کہ چلو بھئی اس بیچارے کا کوئی عذر ہوگا، چھوڑو، صریح گناہ میں بھی مبتلا ہے تو چلو اللہ معاف کرے، ہم بھی بہت سے کبیرہ گناہوں میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے نجات عطا فرمادیں اور اگر کوئی تاویل بھی نظر نہیں آتی، تو یوں سوچ لو کہ شاید اس نے توبہ کرلی ہوگی، اللہ اسے توبہ کی توفیق عطا فرمادے تو اس کا گناہ دھل جائے گا، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ.'' گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہوجاتا ہے کہ گویا اس نے گناہ کئے ہی نہیں، توبہ سارے داغ دھبے

بھی دھو دیتی ہے۔ کیونکہ سچی توبہ صرف گناہ کو نہیں بلکہ گناہ کے داغ دھبوں کو بھی مٹا دیتی ہے، ہم بعض دفعہ کسی گندے کپڑے کو دھوتے ہیں، تو کپڑا تو پاک ہوجاتا ہے، نجاست بھی اتر جاتی ہے، لیکن اس کا دھبہ باقی رہ جاتا ہے، لیکن سچے دل سے تائب ہوجاؤ تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے چھینٹے سے داغ دھبے بھی دور کردیتے ہیں۔

توبہ کے آداب:

لیکن بھائی سچی توبہ کے کچھ آداب ہیں، ان کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، دوسرے موقع پر بیان کردوں گا۔

وہ جو بزرگ فرماتے ہیں نا کہ:

سبح در کف تو بر لب دل ذوقِ گناہ

معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

حضرت کے ہاتھ میں تسبیح ہے اور زبان مبارک سے توبہ توبہ کے الفاظ صادر ہورہے ہیں: "اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ." لیکن دل ذوقِ گناہ سے بھرا ہوا ہے، دل کے اندر گناہ کا حرص اور ذوق ہے۔ جیسے کہ میٹھا کھا کھا کے حلق میٹھا ہوجاتا ہے، اسی طرح دل ابھی تک ذوقِ گناہ اور گناہ کی شیرینی سے میٹھا ہے، دل کے اندر گناہ کی لذت محسوس ہورہی ہے، تو ہمارے ایسے استغفار پر گناہ کو بھی ہنسی آتی ہے اور گناہ زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ میں تو زہر کا انجکشن اس کے دل میں لگاچکا ہوں، اور یہ زبان سے بیچارا استغفار کررہا ہے، اگر تمہارے دل میں گناہ کا انجکشن لگا ہے اور زہر اندر پھیل گیا ہے تو مہربانی کرکے توبہ کا انجکشن بھی دل کے اندر لگاؤ تاکہ جہاں زہر پہنچا ہے وہاں تریاق پہنچے، زبان کو انجکشن لگانے کا کوئی فائدہ نہیں اور ہاتھ کے ساتھ تسبیح کو گردش دینے کا کوئی فائدہ نہیں، اس سے گناہ نہیں دھلے گا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ دوسروں کے لئے تاویل کرلو کہ شاید بے چارے سے گناہ تو ہوگیا ہے، لیکن اس نے توبہ کرلی ہوگی، اور اگر یہ تاویل بھی تمہاری عقل میں نہیں آتی تو اتنا ہی کرلو کہ: "لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ." (الغاشیہ) یعنی تو ان پر کوئی داروغہ نہیں ہے، وہ جو کہتے ہیں نا رندخراب حال کو جو بیچارہ پی کر کے مست ہوگیا ہے، حالت اس کی بری ہوگئی ہے،

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

قیامت کے دن لوگوں کے عیوب کے بارے میں تم سے بازپرس نہیں ہوگی، تم سے تمہارے عیوب کے بارے میں بازپرس ہوگی، اپنی نبیڑو، ان کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو، خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کے عیوب سے اندھے ہوجاؤ، تمہاری نظر ان کے عیوب پر نہیں جانی چاہئے، گونگے بن جاؤ، دوسروں کے عیوب مت بیان کرو، اور تمہارا دل ان کی برائی کے ادراک سے مردہ ہوجانا چاہئے، جانے دو، بس ان کا معاملہ ان کے ساتھ ہے۔

تدبیر عقل سے بڑھ کر:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ باتیں ارشاد فرماکر آپؐ نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا، سبحان اللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ مبارک اور کسی کا سینہ! کیا بات ہے!! صحابہ کرامؓ کے بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے سینے پر ہاتھ مارا، یا کسی کے سینے پر ہاتھ پھیرا، تو صحابہ کرامؓ یوں کہتے ہیں کہ: "حَتّٰى وَجَدْتُ بَرْدَ يَدِهٖ فِيْ قَلْبِيْ." یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک کی ٹھنڈک میرے دل نے محسوس کی، گویا ایک ہاتھ پھیرنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف کردیا، اللہ تعالیٰ ان کو یہ سعادت مبارک کرے، اللہ تعالیٰ ان کو مبارک کرے، بڑے سعادت مند لوگ تھے،

فرمایا کہ پھر میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا:

"یَا اَبَا ذَرٍّ! لَا عَقْلَ کَالتَّدْبِیْرِ." تدبیر سے بڑھ کر کوئی عقل نہیں ہے، تدبیر کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی کام کے انجام کو سوچ لینا کہ یہ جو میں کام کرنے جارہا ہوں، یا جو بات کہنے جارہا ہوں اس کا انجام کیا نکلے گا؟ سب سے بڑا عقل مند آدمی وہ ہے جو ہر کام کے انجام کو سوچ کر قدم اٹھائے۔

سب سے بڑا تقویٰ:

"وَلَا وَرَعَ کَالْکَفِّ." اور ممنوع چیزوں سے رکنے سے بڑھ کر کوئی پرہیزگاری نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ سب سے بڑی پرہیزگاری یہ ہے کہ آدمی ممنوع اور گناہ کی چیزوں سے رک جائے، نماز روزہ بھی اچھی چیز ہے، نیکیاں بھی اچھی چیز ہیں، اور دوسری چیزیں بھی اچھی ہیں، بہت اچھی ہیں، لیکن اس سے آدمی پرہیزگار نہیں بنتا، آدمی پرہیزگار بنتا ہے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنے اور اور مکروہ چیزوں سے پرہیز کرنے سے، آدمی کی پرہیزگاری کا اصل معیار یہ ہے کہ یہ محرمات سے اور گناہوں سے کتنا بچتا ہے؟

جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا تھا: "اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَکُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ." اللہ نے جو چیزیں حرام کردی ہیں ان سے بچو تم ساری دنیا سے بڑھ کر عبادت گزار بن جاؤ گے، سب سے بڑا عبادت گزار وہ ہے جو حرام چیزوں سے پرہیز کرتا ہے، یہ حرام چیزیں خواہ لقمہ سے تعلق رکھتی ہوں، پیٹ سے تعلق رکھتی ہوں، آنکھوں سے تعلق رکھتی ہوں، زبان سے تعلق رکھتی ہوں، ہاتھ پاؤں سے تعلق رکھتی ہوں، یا تمہارے وجود میں سے کسی اور چیز کے ساتھ تعلق رکھتی ہوں، حقوق سے تعلق رکھتی ہوں یا فرائض سے تعلق رکھتی ہوں، بہرحال حرام سے بچو، یہ سب سے بڑی پرہیزگاری ہے، اسی لئے فرمایا: "وَلَا وَرَعَ کَالْکَفِّ." گناہوں اور ممنوعات سے بچنے سے بڑھ کر کوئی پرہیزگاری نہیں ہے۔

حسن اخلاق:

"وَلَا حَسَبَ كَحُسْنِ الْخُلُقِ." اور حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی حسب نہیں، ہمارے یہاں مشہور ہے اس کا حسب نسب کیا ہے؟ عربی زبان میں حسب کہتے ہیں ان کمالات کو جو خاندانی طور پر لوگوں میں منتقل ہوتے آئے ہیں، کچھ کمالات آدمی کے انفرادی ہوتے ہیں، اور کچھ موروثی ہوتے ہیں، جو باپ دادا سے چلے آتے ہیں، مثلاً: ایک خاندانی روایت چلی آتی ہے کہ لوگ سخی ہوتے ہیں، ایک خاندانی روایت چلی آتی ہے کہ حلیم ہوتے ہیں، بردبار ہوتے ہیں، ایک خاندانی روایت چلی آتی ہے کہ متواضع ہوتے ہیں، متکبر نہیں ہوتے، خاندان اونچا ہے لیکن رہتے ہیں نیچے ہوکر، یہ بیچارے نودولتیے ہوتے ہیں ناں! یہ اپنی دولت کا اظہار کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اور جو خاندانی طور پر متمول اور رئیس چلے آرہے ہیں، ان کو اظہار دولت کی ضرورت پیش نہیں آتی، ان کو اپنی بڑائی کے اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی، اور جو بالشتیئے بڑا بننے کی کوشش کرتے ہیں ان کو اپنی بڑائی کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ لباس کے ذریعہ سے، چال ڈھال کے ذریعہ سے لوگوں کو بتادیں کہ ہم بڑے ہیں، بہرحال ان کمالات کو جو خاندانی طور پر لوگوں میں منتقل ہوتے چلے آتے ہیں ان کو حسب کہا جاتا ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ حسب ان کمالات کو کہتے ہیں جو انسان کو ذاتی طور پر حاصل ہوں اور نسب کہتے ہیں ان کمالات کو جو موروثی طور پر حاصل ہوں۔

ایک حدیث شریف میں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

"اِنَّمَا تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِمَالِهَا، وَلِحَسَبِهَا، وَلِجَمَالِهَا، وَلِدِيْنِهَا، فَاظْفُرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ."

(مشکوٰۃ ص:۲۶۷)

ترجمہ:...... "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی لڑکی سے شادی کی جاتی ہے کبھی تو مال دیکھ کر، کبھی اس کا حسب دیکھ کر (کہ لڑکی اونچے خاندان کی ہے)، کبھی اس کا جمال دیکھ کر اور کبھی اس کا دین دیکھ کر، (یہ چار ترجیحات ہوتی ہیں لوگوں کے سامنے) پس تو کامیاب ہو دین والی کے ساتھ، اللہ تعالیٰ تیرے ہاتھوں کو خاک آلود کرے (تجھے سجدے کی توفیق ہو، سجدے میں جاتا ہے تو ہاتھوں کو مٹی لگتی ہے، چہرے کو مٹی لگتی ہے)۔"

تو یہاں حسب سے مراد خاندان ہے، تو یہاں فرمایا حضرت ابوذرؓ سے: "لَا حَسَبَ کَحُسْنِ الْخُلُقِ." سب سے بڑا حسب موروثی یا ذاتی کمال حسن اخلاق ہے، حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی حسب نہیں۔

یہ موضوع بہت تشریح طلب ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذرؓ کو جو نصیحت فرما رہے تھے وہ یہاں ختم ہوگئی، اسی پر ختم کرتا ہوں، حق تعالیٰ شانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو سمجھنے کی اور اپنے دل میں بٹھانے کی اور ان پر عمل کرنے کی اور اپنے ظاہر اور باطن کو ان ارشادات نبویہ سے منور کرنے کی توفیق عطا فرمائے، یہ بات یاد رکھو پہاڑوں میں چشمے نکلتے اور پھوٹتے ہیں، کوئی گرم ہوتا ہے، کوئی سرد اور ٹھنڈا ہوتا ہے، اور کوئی کچھ ہوتا ہے، کوئی کچھ ہوتا ہے، مختلف تاثیریں ہوتی ہیں ان کی، اور بعض مشہور بھی ہوجاتے ہیں ان تاثیروں میں، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک بھی معدن نبوت تھا، جو کچھ بھی یہاں سے پھوٹ رہا ہے یہ نبوت کا چشمہ ہے، اور جو کلمات طیبات آپ کی زبان مبارک سے صادر ہوتے ہیں، یہ نبوت کے کلمات ہیں، ایسے پاک اور شفاف، ایسے صحت افزا، صحت مند، امراض کو دور کرنے والے، اور ایسے متبرک کلمات دوسری جگہ نہیں ملیں گے، یہ چشمہ نبوت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا، اللہ

کرے یہ کلمات ہمارے کان کے راستے سے ہمارے دل میں اتر جائیں تاکہ وہ انوارِ نبوت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کلیتًا حاصل تھے، اس کا کچھ حصہ ہمارے قلب کو بھی نصیب ہوجائے، آمین یارب العالمین۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

دین و ایمان سیکھنے کی ضرورت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: لَا تُنْکَحُ الْعَمَّةُ عَلٰی بِنْتِ الْاَخِ وَلَا ابْنَةُ الْاُخْتِ عَلَی الْخَالَةِ۔"

(مسلم شریف ج:۱ ص:۵۲)

ترجمہ:......"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح نہ کیا جائے پھوپھی سے بھتیجی پر اور نہ بھانجی سے اس کی خالہ پر۔"

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نہ نکاح کیا جائے عورت سے اس کی پھوپھی پر، نہ اس کی خالہ پر، یہ دراصل ایک ہی حدیث ہے، البتہ روایت کے الفاظ مختلف ہیں۔

نسبی محرمات کا بیان:

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں سورۂ نسأ میں اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کا ذکر فرمایا ہے جن سے نکاح کرنا درست نہیں، ان میں سات نسبی رشتے ذکر فرمائے ہیں اور وہ یہ ہیں:

”حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَاَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْاَخِ وَبَنَاتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهَاتُكُمُ اللّٰتِی اَرْضَعْنَكُمْ.....الخ.“ (النسآ:۲۳)

ترجمہ:......”حرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور تمہاری بھتیجیاں اور تمہاری بھانجیاں اور تمہاری رضاعی مائیں .....الخ“

رضاعی محرمات:

اسی طرح اس سے آگے ہے: ”وَاَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ.“ (اور تمہاری دودھ شریک بہنیں بھی حرام ہیں)۔

علماً فرماتے ہیں اس سے بھی سات رضاعی رشتے حرام ہوجاتے ہیں، یعنی جس طرح سات نسبی رشتے حرام ہیں، ایسے سات رضاعی بھی حرام ہوجاتے ہیں، اس کے بعد دو رشتے سسرالی ہیں جن سے نکاح ناجائز ہے، اس کو اگر مزید پھیلایا جائے تو زیادہ بن جائیں گے، اور وہ دو رشتے یہ ہیں: یعنی ساس اور بہو، اور آخر میں فرمایا: ”وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ.“ یعنی یہ بھی منع ہے کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو، یعنی ایک نکاح میں دو بہنیں جمع نہیں ہوسکتیں، آگے پیچھے ان سے نکاح ہوسکتا ہے۔

آگے پیچھے کا مطلب یہ ہے کہ ایک بہن سے نکاح کیا تھا، وہ مرگئی اب اس کے مرنے کے بعد دوسری بہن سے نکاح کرلیا، یا ایک بہن کو طلاق دے دی تھی، اس کی عدت بھی گزر گئی، اب دوسری بہن سے نکاح کرلیا، تو یہ تو جائز ہے، یکے بعد دیگرے دو بہنوں سے نکاح صحیح ہے، بشرطیکہ ایک وقت دونوں بہنیں نکاح میں جمع نہ ہوں۔

مزید دو محرمات:

اس حدیث شریف میں دو رشتے مزید بتائے گئے ہیں، ایک یہ کہ جس طرح دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا جائز نہیں اسی طرح ایک خالہ کے ساتھ اس کی بھانجی کو جمع کرنا بھی جائز نہیں اور جس طرح کہ دو بہنوں کو جمع کرنا جائز نہیں، اسی طرح ایک پھوپھی کے ساتھ اس کی بھتیجی کو جمع کرنا بھی جائز نہیں، یہاں تو روایت میں لفظ نہیں آئے دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں:

"لَا تُنۡكَحُ الصُّغۡرٰى عَلَى الۡكُبۡرٰى وَلَا الۡكُبۡرٰى عَلَى الصُّغۡرٰى." (مشکوٰۃ ص:۲۷۴)

ترجمہ:......"نہ چھوٹی کو بڑی پر اور نہ بڑی کو چھوٹی پر نکاح میں لایا جائے۔"

بڑی سے مراد ہے خالہ، پھوپھی اور چھوٹی سے مراد ہے بھتیجی، بھانجی ہیں، یعنی اگر پہلے سے بھتیجی یا بھانجی نکاح میں ہے تو اس کی خالہ کو یا اس کی پھوپھی کو اس پر نکاح میں نہ لایا جائے، مطلب یہ کہ اپنی بیوی کی خالہ سے یا اپنی بیوی کی پھوپھی سے نکاح کرنا جائز نہیں، جب تک کہ یہ بیوی اس کے نکاح میں ہے۔

"وَلَا تُنۡكَحُ الصُّغۡرٰى عَلَى الۡكُبۡرٰى." اور نہ چھوٹی کو بڑی پر لایا جائے، مطلب یہ کہ جس شخص کے نکاح میں ایک عورت ہو، اب اس کی بھانجی یا بھتیجی کو نکاح میں لانا جائز نہیں، یعنی بیوی کے ہوتے ہوئے بیوی کی خالہ یا پھوپھی کو لانا جائز نہیں اور بیوی کے ہوتے ہوئے اس کی بھانجی یا بھتیجی کو لانا بھی جائز نہیں، یہ گویا "اَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ." کی نبوی تشریح ہوگئی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کی تشریح فرمارہے ہیں۔

دین سے دوری کی نحوست:

یہ مسائل الحمدللہ عام طور سے لوگوں کو معلوم ہیں، لیکن بعض بیچارے اتنے

دین سے، دین کے علم سے اور دین والوں کی صحبت سے دور ہو گئے ہیں کہ بعض لڑکوں نے مجھے لکھا کہ میری خالہ میری ہم عمر ہیں، میں اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں، اندازہ کرو! یہاں ہم گفتگو کر رہے ہیں بیوی کی خالہ کے بارے میں، بھائی تمہاری خالہ کے بارے میں نہیں، یا تمہاری سگی بھانجی، بھتیجی کے بارے میں نہیں، بلکہ تمہاری اہلیہ کی بھانجی، بھتیجی، خالہ اور پھوپھی سے نکاح جائز نہیں ہے، میں نے کہا عام طور سے مسلمان ان مسئلوں کو جانتے ہیں، لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو یہاں تک پہنچے ہوئے ہیں کہ اپنی سگی خالہ کے بارے میں پوچھتے ہیں اور ساتھ کہتے ہیں کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے، اُو بدبخت! اپنی ماں سے کیوں نہیں کر لیتا؟ لیکن ان لوگوں سے کیا تعجب ہے!!

پہلی امتوں کے قدم بقدم:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ”لتتبعن سنن من کان قبلکم.“ (تم اپنے سے پہلی امتوں کے نقش قدم پر چلو گے) ان میں سے کسی نے اگر گوہ کے سوراخ میں گوہ کے بل میں پاؤں دیا ہوگا تو تم بھی ضرور دو گے، اور ایک روایت میں ہے:

”لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَـلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَّصْنَعُ ذَالِكَ....الخ.“ (مشکوٰۃ ص:۳۰)

ترجمہ:......”میری امت پر وہی احوال آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے اور اگر ان پہلی امتوں میں سے کسی بدبخت نے اپنی ماں سے اعلانیہ بدکاری کی ہوگی تو میری امت میں سے بھی ایسے لوگ ہوں گے جو یہ کام کریں گے۔“

تم میں بھی ایسے ہوں گے، نعوذباللہ! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیاں پوری کر رہی ہے یہ امت، اور جب امت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

مزاج سے اور آپ کے دین سے ہٹ جائے تو وہ امت کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ اور سنت کی خلاف ورزی کرنے کے بعد ان کے درمیان میں نفاق اور شقاق پیدا ہو جاتا ہے۔

ایمان کی محنت کی ضرورت:

ایمان وہ دولت ہے جو امت کو جوڑتی ہے اور نفاق اور شقاق وہ نحوستیں ہیں جو امت کے ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت ملنے کے بعد ۲۳ سال دنیا میں قیام فرمایا، ۱۳ سال مکہ مکرمہ میں اور ۱۰ سال مدینہ منورہ میں، مکہ مکرمہ میں احکام نہیں تھے، ۱۳ سال گزرے اور کوئی حکم نہیں آیا، صرف نماز کا حکم تھا کہ نماز پڑھ لیا کرو، وہ بھی دو وقت کی، دو وقت یعنی فجر اور عصر کی نماز، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے ہیں، تب آپ پر پانچ نمازیں نازل ہوئیں اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد پھر ہجرت کا حکم ہو گیا، گویا احکام کی باقاعدہ پابندی کا حکم وہاں سے شروع ہوتا ہے، معراج سے پہلے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کا حکم بھی تھا، لیکن اس کی مقدار معین نہیں تھی، اس زمانے کی جو سورتیں اور آیتیں ہیں ان کی خصوصیت یہ ہے کہ لمبی نہیں چھوٹی ہیں، اور بیشتر مضامین ان کے آخرت کے متعلق ہیں، آخرت کے مضامین سے مراد جنت، دوزخ، اللہ تعالیٰ سے ڈرانا، اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کا بیان، اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر، آپؐ کو تسلی، یہ مضامین تھے، گویا مکی زندگی میں یقین دل میں اتارا جا رہا تھا۔

مکی زندگی کے مجاہدے:

میں نے کہا کہ مکی زندگی میں احکام تو نہیں تھے لیکن اللہ پاک مجاہدہ کروا رہے تھے، اور وہ دو قسم کا مجاہدہ تھا، ایک مجاہدہ تو مخالفوں کے ذریعے سے کروا رہے

تھے، ٹھکائی خوب ہوتی تھی مسلمانوں کی، جتنا کسی کو ذلیل کیا جاسکتا ہے، جتنا کسی کو نکّو بنایا جاسکتا ہے اور جتنی کسی پر لعنت ملامت کی جاسکتی ہے وہ کفار مکہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ روا رکھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی پر ایمان لے آنا گویا ان مصائب اور بلاؤں کا ایک طوفان تھا جس میں آدمی گھر جاتا تھا۔

۶/۵ سال میں چالیس آدمی:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۵ نبوی میں مسلمان ہوئے ہیں، ۵ میں یا ۶ میں ۴۰ آدمیوں کی تعداد انہوں نے پوری کی تھی، اللہ اکبر! اندازہ کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعوت کے راستے میں کتنی مشقت برداشت کرنا پڑی ہوگی، چھ سال گزر رہے ہیں، چالیسواں آدمی مسلمان ہوا ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ اللہ تعالیٰ سے مانگ مانگ کر لیا کہ اے اللہ! تو دو عمروں میں ایک دے دے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی:

"اَللّٰهُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِاَبِیْ جَهْلِ بْنِ هِشَامٍ اَوْ بِعُمَرَ بْنَ الْخَطَّاب.....الخ." (مشکوٰۃ ص:۵۵۷)

یعنی یا اللہ! دو عمروں میں سے ایک عمر دے دیجئے، یا عمر ابن ہشام کو (ابوجہل) یا عمر ابن خطاب، دو میں سے ایک دے دے، کام نہیں چلتا ہمارا، دعوت کا کام ٹھیک سے نہیں چلتا، یا اللہ! عطا فرمادے اس کام کے لئے دعا کی، اللہ نے منظور فرمالی۔

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کا قصہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ گئے تھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن اتارنے کے لئے، مگر اپنی گردن دے بیٹھے، لمبا قصہ ہے، آپ نے پڑھا ہوگا حیاۃ الصحابہ میں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دارارقم میں تھے، یہ صفا کے پاس ایک جگہ تھی،

صفا پہاڑی کے پاس دار ارقم تھا، یہ ہمارے دیکھنے تک تو لائبریری بنی ہوئی تھی، اب وہاں سے سب کچھ اڑا دیا، اب سب کچھ حرم شریف میں آگیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لے گئے، تو چند صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، ان میں شیر خدا اسد اللہ الغالب حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، "**حمزة اسد الله واسد رسوله.**" (حمزہ اللہ اور اللہ کے رسول کے شیر ہیں) اور عجیب بات یہ ہے کہ ان کو بھی مسلمان ہوئے کوئی چار پانچ دن ہوئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب دار ارقم میں جارہے تھے، لوگوں نے دروازے کی دراڑ سے دیکھا تو کانپ گئے کہ عمر آرہے ہیں، مسلمان کانپ گئے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دہشت ایسی تھی، حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ بھئی گھبرانے کی کیا بات ہے؟ ادھر اگر عمر ہیں تو ادھر حمزہ ہیں، آنے دو، دیکھ لیتے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دروازہ کھول دو، آنے دو، حضرت عمرؓ اندر داخل ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کا گریبان پکڑ لیا اور فرمایا: عمر کہاں پھر رہے ہو؟ کہا: یا رسول اللہ! مسلمان کر لیجئے!

صحابہ کرامؓ کا مجاہدہ:

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ یہ دعوت کا کام دلوں میں ایمان کے اتارنے کے لئے تھا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو جانتے ہو! گرم چٹان پر لٹا کر (مکہ کی گرمی، اللہ کی پناہ! ایک دن مجھے دو رکعتیں پڑھنا پڑیں، حرم شریف سے باہر، بس کچھ نہ پوچھو کہ کیا ہوا میرے ساتھ؟ حالانکہ نیچے کپڑا بھی بچھایا تھا) تو کفار حضرت بلالؓ پر اس گرمی میں زمین پر لٹا کر اوپر بھاری پتھر کی چٹان رکھتے تھے، تاکہ ہل نہ سکیں، اور کہتے تھے کہ ایمان چھوڑ دو، اور یہ خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور یہ صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ، ایک دن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بات ہو رہی تھی، جب کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ تھے، خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے لگے: امیر المؤمنین! ذرا میرا کپڑا

اٹھایئے پیچھے سے، کپڑا اٹھایا تو کمر پر اتنے بڑے بڑے داغ تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ کہنے لگے: حضور! آگ کے انگاروں پر مجھے لٹادیا جاتا تھا، اور ان انگاروں کو میری چربی پگھل پگھل کے بجھاتی تھی۔

میں نے کہا کہ مکی زندگی میں صرف مجاہدے کروائے جارہے تھے اور کچھ بھی حکم احکام نہیں تھے، گویا یہ کہا جارہا تھا کہ پہلے تم مسلمان ہوجاؤ بعد میں بتائیں گے، پہلے کام کرنے کی صلاحیت تو پیدا کرو، اپنے اندر۔

حق تعالیٰ کی جانب سے مجاہدہ:

اور دوسرا مجاہدہ حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے یہ تھا:

"قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا. نِّصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا.
اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا." (المزمل:۲ تا ۴)

یعنی رات کا تھوڑا سا حصہ چھوڑ کر پوری رات قیام کیا کیجئے، رات کا حصہ چھوڑ کر، کیا مطلب؟ یعنی آدھا کرلیں، یا اس سے کچھ کم کرلیں، یا اس سے کچھ زیادہ کرلیں، پیمانہ ہے آدھی رات، اب تو گھڑی گھنٹے ہیں، اب رات آدھی کب ہوئی، اس کا اندازہ کرتے کرتے ہی پوری رات گزر جاتی تھی، وہ اوپر سے مجاہدہ اور یہ نیچے سے مجاہدہ، یہی مجاہدہ تھا جس نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں وہ ایمان پیدا کردیا تھا، قرآن میں ہے: "وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ." (الحجر:۴۶) (ان کافروں کے مکر ایسے ہیں کہ ان سے پہاڑ ٹل جائیں) مگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نہیں ٹلے کافروں کے مکر سے۔ ان کی سازشوں اور خوفناک تدبیروں سے قریب تھا کہ ہمالیہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے، لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایسے راسخ الایمان ہوگئے تھے کہ نہیں ہٹ سکے، کوئی خوف اور کوئی لالچ ان کو ایک انچ کیا ایک بال برابر بھی ان کے ایمان سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

صحابہ کرامؓ کے نہج کی دعوت کی ضرورت:

اب سمجھو لوگ کہتے ہیں کہ علم، تعلیم وتعلّم اور پڑھنا سیکھو، جب تک دعوت کے راستے سے تم میں ایمان نہیں آئے گا، اس وقت تک پڑھنے پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کتابیں رسالے اور فتوے تو ان لوگوں کے لئے ہیں جو ان چیزوں کو مانتے ہوں اور آج ہمارے دلوں کی استعداد نے ماننے سے انکار کردیا ہے، تو ضرورت اس بات کی ہے کہ دعوت کے کام کو پھر اسی نہج پر لایا جائے، ادھر سے بھی گالیاں پڑیں اور ادھر سے بھی مشقتیں آئیں، گھر سے بے گھر ہوں، بیوی بھی طعنہ زنی کررہی ہے، ماں باپ بھی طعنہ دے رہے ہیں، ملّا بن گیا اور جماعتوں کی جماعتیں طعنہ دے رہی ہیں کہ ان کی علامت کیا ہے؟ تبلیغ والوں کی علامت کیا ہے؟ میں نے اس سلسلے کی کتاب پڑھی ہے، بتاتا ہوں کہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ آدھی پنڈلی تک پاجامہ، سر پر عمامہ، کان پر مسواک آج اس کا مذاق اڑا رہے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی، کبھی کہتے ہیں بستر بند پارٹی۔ اور پارٹیاں چندے کرتی ہیں، کوئی ظلماً، کوئی کچھ، یہ جماعت تو کسی سے چندہ نہیں کرتی، نہ جماعتی حیثیت سے اور نہ انفرادی حیثیت سے، تو بھائی مقصد کہنے کا یہ ہے (شاید میں اپنی بات کو سمیٹ نہیں سکا) کہ یہ جو دعوت کا کام ہے، یہ دعوت کا کام بنیاد ہے، جتنی مضبوطی سے دعوت چلے گی، اتنی تیزی سے دین آئے گا، اور جتنی گہرائی کے ساتھ کوئی شخص دعوت کا کام کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے دل میں اتنا ہی گہرا ایمان پیدا فرمائیں گے، تو یہ دعوت کا کام جو نکل کرکے کیا جاتا ہے، یہ ایمان سیکھنے کا کورس ہے۔

اصولوں کی پابندی کی ضرورت:

بزرگوں کا تجربہ یہ ہے کہ اگر صحیح اور ٹھیک اصولوں کے مطابق امیر کی اطاعت کرتے ہوئے، ساتھیوں کی رعایت رکھتے ہوئے، حق تعالیٰ شانہ کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کرتے ہوئے اس

راستے میں قدم اٹھایا جائے، تو تین چلے اور چار مہینے میں انشاءاللہ تعالیٰ دین پر چلنے کی استعداد پیدا ہوجائے گی، یہ نہیں کہ تبلیغی بن گیا، بلکہ استعداد پیدا ہوجائے گی، جیسے مشائخ اجازت دیتے ہیں، خلافت دیتے ہیں کہ تمہیں بیعت کرنے کی اجازت ہے، اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ آئندہ اس میں استعداد پیدا ہوگئی ہے، انشاءاللہ اگر یہ اس استعداد کو بڑھائے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے کام لے لیں گے۔

تو آج تشکیل کرنی ہے، بھئی جو پرانے لگے ہوئے ہیں وہ بھی اور جو نئے لگے ہوئے ہیں وہ بھی اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ کام کرکے جائیں اور اپنے رمضان کو وصول کرکے جائیں، آپ تقاضا رکھیں، ڈاکٹر صاحب آپ تقاضا رکھیں ایک تقاضا ملکوں کی جماعت کا ہے، ماشاءاللہ! ماشاءاللہ! اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

صوم وصال کی ممانعت:

صحیح بخاری میں روایت ہے:

”عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: لَا تُوَاصِلُوْا فَاَیُّکُمْ اَرَادَ اَنْ یُّوَاصِلَ فَلْیُوَاصِلْ حَتَّی السَّحَرِ. قَالُوْا: فَاِنَّکَ تُوَاصِلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! قَالَ: لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ اِنِّیْ اَبِیْتُ لِیْ مُطْعِمٌ یُّطْعِمُنِیْ وَسَاقٍ یَسْقِیْنِیْ.“ (بخاری ج:۱ ص:۲۶۴)

ترجمہ:...... ”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صوم وصال نہ رکھا کرو۔ یعنی بغیر افطار کئے کئی دن کا روزہ اکٹھا رکھ لینا۔ تم میں سے جو شخص ایسا روزہ رکھے اس کو چاہئے کہ سحر تک وصال کرلیا کرے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ تو صوم وصال

رکھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میں تمہاری طرح نہیں ہوں، میں رات اس طرح گزارتا ہوں کہ مجھے کھلانے والا کھلاتا بھی ہے اور پلانے والا پلاتا بھی ہے۔"

دوسری روایت میں ہے:

"عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَكْرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّهَا جَآءَتْ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: لَا تُوْعِیْ فَیُوْعِیَ اللّٰهُ عَلَیْکِ اِرْضَخِیْ مَا اسْتَطَعْتِ."

(بخاری ج:۱ ص:۱۹۳)

ترجمہ:...... "حضرت اسماؓ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بند کر کے نہ رکھ، ورنہ اللہ بھی تجھ پر بند لگا دے گا، اور دیتی رہ اللہ کے راستے میں جتنا تجھ سے ہو سکے، گن گن کر نہ دے ورنہ اللہ تعالیٰ تجھے بھی گن گن کر دے گا۔"

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے:

"عَنْ جُبَیْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَا حِلْفَ فِی الْاِسْلَامِ وَاَیُّمَا حِلْفٍ کَانَ فِی الْجَاهِلِیَّةِ لَمْ یَزِدْهُ الْاِسْلَامُ اِلَّا شِدَّةً."

(مسلم ج:۲ ص:۳۰۸)

ترجمہ:...... "حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: کفر کے عہد و پیمان کا کوئی اعتبار نہیں، اور جس شخص نے کوئی عہد معاہدہ کیا تھا جاہلیت میں نیک کام کا تو اسلام اس کی شدت اور

سختی ہی میں اضافہ کرے گا۔“

پہلی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال سے منع فرمایا ہے، صوم وصال یہ ہے کہ ایک دن کا روزہ رکھا اور پھر اس کو افطار کئے بغیر اور سحری کھائے بغیر اگلے دن کا روزہ رکھ لیا، کئی دن کے روزے ملا کر رکھ لئے، اس طرح کہ درمیان میں آدمی افطار نہ کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے روزے رکھتے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کچھ صحابہؓ نے بھی ایسے روزے رکھنے شروع کردیئے، کہا کہ ہم نے آپ کو دیکھا، ہم نے بھی شروع کردیئے، فرمایا: ”ایکم مثلی؟“ (تم میں سے کون سا آدمی ہے جو میری مثل ہو؟) کون بہادر آدمی ہے جو میری مثل ہو؟ ”انی ابیت یطعمنی ربی ویسقینی.“ میں رات اس حال میں گزارتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا ہے، اور پلاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے روا نہیں ہے، چنانچہ روزے پر روزہ رکھ لینا اور درمیان میں افطار نہ کرنا مکروہ ہے۔

صوم وصال کی صورتیں:

اور علماءؒ فرماتے ہیں کہ اس کو موالات کہو یا وصال کہو، اس کی کئی شکلیں ہیں، ایک شکل تو یہ ہے کہ آدمی روزے کو افطار بھی نہ کرے، اور سحری بھی نہ کھائے، یہ ”اشد کراھتًا“ ہے، یعنی سب سے زیادہ کراہت والا ہے۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ افطار کرلے، سحر نہ کرے یہ مکروہ تنزیہی ہے، اس لئے کہ حدیث شریف میں ہے: ”تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السُّحُوْرِ بَرَکَةً.“ (مشکوٰۃ ص:۱۷۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سحری کا کھانا کھایا کرو کیونکہ اس کھانے میں برکت ہے۔ رات کو کھا کے لیٹو گے تو صبح تک وہ ہضم ہوجائے گا، ورنہ تو پھر ناطاقتی ہوجائے گی، چند دن تو تم نبھالو گے پھر آگے جاکے مشکل پڑے گی، عقل مند آدمی ایسا کام ہی کیوں کرے کہ بعد میں پشیمانی ہو۔

کہتے ہیں کہ عاقل خان اصل میں وزیر تھے، بادشاہ کی لڑکی سے (شہزادی سے) کچھ تعلق ہوگیا، بادشاہ کو پتہ چلا، اس نے اس کو معزول کردیا، لڑکی نے شعر لکھ کر کے بھیج دیا جس کا ترجمہ یہ ہے:

میں نے سنا ہے کہ عاقل خان نے ترک خدمت کردی ہے نادانی کی وجہ سے، اپنی حماقت کی وجہ سے نوکری چھوڑ دی یا چھڑادی گئی، اس نے نام تو عاقل خان رکھا ہوا ہے، عاقل ایسا کام ہی کیوں کرے کہ جس پر پشیمانی ہو۔

افطار میں تأخیر کا حکم:

اور تیسری صورت یہ کہ آدمی سحری تو کھائے، سحور کھائے، لیکن افطار کے وقت افطاری نہ کرے، یہ اس سے زیادہ کراہت کی چیز ہے، اس لئے کہ اس میں ایک درجہ میں یہ عقیدہ ہوا کہ روزے کا افطار ہوجانے کے بعد اور افطار کا وقت ہوجانے کے بعد بھی روزہ رکھنا، یہ بھی عبادت ہے، اسی قسم کا عقیدہ بنانا یعنی باوجودیکہ اللہ کی طرف سے تو روزہ کھولنے کا حکم ہوگیا، لیکن جناب فرماتے ہیں کہ نہیں! میں نہیں کھولوں گا، گویا اللہ تعالیٰ کو مشورہ دینا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "لَا یَزَالُ النَّاسُ بِخَیْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ۔" (مشکوٰۃ ص:۱۷۵) ہمیشہ لوگ خیر پر رہیں گے جب تک کہ وہ فطر میں جلدی کرتے رہیں گے، اور ایک روایت میں ہے: "لَا یَزَالُ اُمَّتِیْ بِخَیْرٍ اَوْ قَالَ عَلَی الْفِطْرَۃِ مَا لَمْ یُؤَخِّلُوا الْمَغْرِبَ..... الخ۔" (مشکوٰۃ ص:۶۱) کہ میری امت خیر پر رہے گی یا فرمایا کہ سنت پر قائم رہے گی جب تک کہ مغرب میں جلدی کریں گے۔

افطار میں جلدی کرنا:

ایک روایت میں ہے:

عَنْ اَبِیْ عَطِیَّۃَ رَحِمَہُ اللہُ قَالَ: دَخَلْتُ اَنَا وَمَسْرُوْقٌ عَلٰی عَائِشَۃَ، فَقُلْنَا: یَا اُمَّ الْمُؤْمِنِیْنَ رَجُلَانِ مِنْ

اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَدُهُمَا يُعَجِّلُ الْاِفْطَارَ وَيُعَجِّلُ الصَّلٰوةَ وَالْآخَرُ يُؤَخِّرُ الْاِفْطَارَ وَيُؤَخِّرُ الصَّلٰوةَ، قَالَتْ: اَيُّهُمَا يُعَجِّلُ الْاِفْطَارَ وَيُعَجِّلُ الصَّلٰوةَ؟ قُلْنَا: عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ مَسْعُوْدٍ! قَالَتْ: هٰكَذَا صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْآخَرُ اَبُوْمُوْسٰى." (مشکوۃ ص:۱۷۶)

ترجمہ:...... "ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ابی عطیہ اور مسروق رحمہما اللہ نے کہا کہ دو صحابی ہیں، ایک افطار اور نماز میں ذرا جلدی کرتے ہیں، اور دوسرے ذرا تاخیر کرتے ہیں، کہنے لگیں کون کون ہیں؟ بتایا گیا کہ تعجیل یعنی جلدی تو کرتے ہیں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور تاخیر کرتے ہیں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فرمانے لگیں: حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ٹھیک کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت تھی۔"

بھوکے مرنے کا نام روزہ نہیں:

اور راز اس کا یہ ہے کہ بھوکے مرنے کا نام روزہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کا نام روزہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے: "ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ." (پھر پورا کرو روزہ رات تک) رات آئی تو روزہ غائب، اب اگر کوئی شخص توقف کرتا ہے اس کے افطار کرنے میں، تو وہ حکم خداوندی کی تعمیل نہیں کرتا، بلکہ ہوائے نفس کی پیروی کرتا ہے، اپنے نفس کی خواہش اور نفس کی پیروی کرتا ہے۔

بیوی کا شوہر کے مال سے صدقہ کرنا:

دوسری حدیث میں ایک قصہ ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بڑی صاحبزادی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا، جو

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، انہوں نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس تو کوئی چیز نہیں ہوتی سوائے اس کے جو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ لا کر کے دیتے ہیں، گھر میں اور تو کوئی چیز ہوتی نہیں، تو مجھے صدقے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ صدقہ کر سکتی ہوں؟ فرمایا: کرلیا کرو! شوہر کی طرف سے اگر اجازت ہو تو کر سکتی ہو، اور اگر شوہر کی طرف سے اجازت نہیں تو صدقہ نہیں کر سکتی، بلکہ فقہاءؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ عورت اپنا مال بھی شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں خرچ کر سکتی، یہ عجائبات میں سے ہے، تم نے نادان بچے کو پیسے دیئے ہوئے ہیں تو بچے کو اگر تم اپنے طور پر خرچ کرنے کا عادی بنا دو گے تو بے مصرف اور فضول خرچ ہو جائے گا، ٹھیک ہے پیسے اسی کے ہیں، لیکن تم سے پوچھ کے خرچ کرے، اور عورت بھی آدھا بچہ ہوتی ہے، اس لئے اس پر بھی کوئی نگران ہونا چاہئے، جس سے یہ مشورہ کرلیا کرے کہ میں یہ خرچ کروں یا نہ کروں، ورنہ بچگانہ کام کرے گی۔

تو میں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اجازت دینا حضرت اسماءؓ رضی اللہ عنہا کو کہ تو خرچ کیا کر، اس کا مطلب یہ تھا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اجازت تھی، یا یوں کہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ میرے فرمانے کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ منع نہیں کریں گے، بلکہ خوش ہوں گے۔

بند لگا کر اور گن گن کر خرچ نہ کیا جائے:

اس کے بعد فرمایا: بند لگا کر نہ رکھا کر، ورنہ اللہ بھی بند لگا دے گا، خرچ کرے گی تو اللہ دے گا اور اگر بند لگا کر کے رکھ دیا تو پھر اللہ بھی بند لگا دے گا کہ بس ان کی ضرورت سے زیادہ پہلے ہی پڑے ہوئے ہیں، اور گن گن کے نہ دیا کرو ورنہ اللہ بھی گن کے دے گا، انگنت دے گی تو اللہ بھی انگنت دے گا، بھئی یہ عورتوں کو نہ جا کے بتا دینا کہیں، ورنہ وہ شام ہونے سے پہلے بازار کا رخ کریں گی، اللہ کے راستے میں نہیں خرچ کریں گی، توبہ کرو، آپا بازار کا رخ کریں گی اور نئے نئے کپڑے جتنے

بھی ان کو مل سکیں گے، نئے ڈیزائن کے آئے ہوئے، سب خرید لائیں گی اور کہیں گی حدیث میں آیا ہے کہ خرچ کیا کرو، انگنت خرچ کیا کرو، بھائی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسراف کا حکم نہیں دیا، بلکہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، اور وجہ یہ ہے کہ طبائع میں بخل ہے، اس کو کتنا ہی کہو کہ لٹا دے، کہتا ہے جانے دے یار! یعنی پھر وہ رکے گا، اس کو جتنی بھی ترغیب دو تب بھی وہ کہے گا کہ اگر جان طلب حاضر است، جان مانگتے ہو، حاضر ہے، کوئی اور چیز مانگتے ہو حاضر ہے، اگر زر طلبی سخن دریں چہ است، اگر مال مانگتے ہو تو اس میں ذرا سوچنا پڑے گا، جان حاضر ہے، لیکن مال نہیں، بڑے حوصلے کا کام ہے مال کا خرچ کرنا، بڑے حوصلے کا کام ہے، اور خرچ کہاں کرنا؟ اللہ کے راستے میں! اپنی خواہشات پر خرچ کرنا کوئی مشکل نہیں، یہ تو نادان بچے اور بے وقوف عورتیں بھی کرلیتی ہیں، اللہ کے راستے میں خرچ کرنا صرف رضائے الٰہی کے لئے، یہ مشکل کام ہے، اس لئے فرمایا: گن کر نہ دیا کرو، اور ایک لفظ اس میں اور آیا: برتن میں بند کر کے نہ رکھ ورنہ اللہ بھی بند کر کے رکھے گا، ایک ہے بند لگانا اور ایک ہے بند کر کے رکھنا، بلکہ فرمایا: جتنا تجھ سے ہو سکے دیتی رہ، یعنی خرچ کرتی رہ۔ یہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا ذوق کیا تھا مال کے بارے میں؟ اپنے اوپر تو خرچ کرتے ہیں نہیں، اللہ کے راستے میں دینے کے لئے ترغیب دی۔

جاہلیت کے معاہدوں کا حکم:

اور تیسری حدیث میں ایک مضمون کو ذکر فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں دو آدمی یا دو قبیلے آپس میں حلیف ہو جاتے تھے، حلیف یعنی ایک دوسرے سے معاہدہ کرنے والے، مددگار، معاون اور اس معاہدہ کرنے کا نام تھا ''حلف''، یعنی آپس میں قسمیں کھالیتے تھے کہ بھئی تم پر کوئی افتاد آن پڑے گی تو ہم تمہاری مدد کریں گے، اور ہم پر کوئی افتاد پڑے گی تو تم مدد کرو گے، دونوں طرف سے

قسمیں ہوجاتی تھیں، اور پھر یہ ہوتا تھا کہ اب ایک حلیف نے کسی کے ساتھ جنگ چھیڑ دی، دوسرے کو لامحالہ اس میں شرکت کرنا پڑے گی، کیونکہ تقاضا حلف یہی ہے، وہ حق پر ہو یا باطل پر ہو، ظالم ہو یا مظلوم ہو، اس کو اس کا ساتھ دینا پڑتا ہے، چنانچہ جاہلیت کا فقرہ گویا چلتے سکے کی طرح تھا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، اپنے بھائی کی مدد کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا: "**لا حلف فی الاسلام**." اسلام میں اس قسم کے معاہدوں کی پابندی نہیں ہے، یہ جاہلیت میں جو معاہدہ کرلیتے تھے دو قبیلے یا دو آدمی کہ ہم حق پر ہوں یا ناحق پر، تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔ اسلام میں ایسا حلف نہیں، ہاں حق پر ہو تو اس کا ساتھ دو اور ناحق پر ہو تو اس کو روکو، نہیں رکتا تو اسے کہو کہ جا جہنم میں، ہم تیرا ساتھ نہیں دیں گے، چنانچہ فرمایا کہ جو حلف جاہلیت میں ہوچکے ہیں اور وہ شریعت کے خلاف نہیں تو اسلام ان کی شدت اور ان کی مضبوطی میں اضافہ کرے گا، یعنی اسلام اس کی تائید کرے گا، اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ آپس میں ایسا معاہدہ کرلینا جائز نہیں جس کی وجہ سے ظلم کی معاونت ہوتی ہو، البتہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے پہلے سے ہی معاہدہ ہے کہ: "**اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُ وَلَا یَخْذِلُ**." رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ کبھی اس پر ظلم کرے اور نہ کبھی اس کو بے مدد چھوڑے، یعنی کوئی اس پر ظلم کرے تو یہ نہ کہے کہ مجھے کیا پڑی ہے؟ نہیں! اس کی مدد کرے، اس کو بے مدد نہ چھوڑے۔

سبحانک اللّٰھم وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفرک واتوب الیک۔

تبلیغ میں جانے والوں کے لئے

ہدایات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

اللہ کے دین کی خاطر، اللہ کے راستہ میں چلنا بہت ہی اونچا عمل ہے، اگر اس راستے کی صحیح رعایت نہ رکھی گئی اور اس راستے کی عظمت کو سامنے رکھ کر اس کے حقوق ادا نہ کئے گئے تو پھر محض یہ چلنا، پھرنا اور خالی سفر رہا، جیسے کہ سیر سپاٹے کر کے آپ آجائیں گے، جیسے دوسرے لوگ جاتے ہیں سفروں میں، اور پھر سفر کر کے واپس آجاتے ہیں۔

جذبات کی قربانی:

ان آداب میں سے سب سے پہلی چیز جس کو آپ کو یاد رکھنا چاہئے وہ بہت دقیق سی بات ہے، اگر سمجھ میں آجائے تو فائدہ بہت ہوگا، وہ یہ کہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ آپ نے جان کی قربانی دی، مال کی قربانی دی، اپنے اہل وعیال اور اپنے عزیز واقارب سے جدا ہونے کی قربانی دی، کیونکہ ہر ایک آدمی کا کچھ نہ کچھ مشغلہ تو ضرور ہوتا ہے، اب آپ نے ان مشاغل کی اور اپنے کاروبار کی ایک اچھی خاصی مدت کے لئے قربانی دی، اور پھر سفر، اور سفر بھی ایسا کہ در در پھرنا ہے، تو جہاں آپ نے اتنی قربانیاں دی ہیں، ایک قربانی آپ کو اور بھی دینا ہوگی، اس قربانی کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں تاکہ آپ اس کے لئے پہلے سے تیار رہیں، اور وہ اپنے جذبات کی اور اپنی انا کی قربانی ہے، آپ جب اللہ کے راستے میں نکلے ہیں تو اپنی ''میں'' اور اپنی

''انا'' کو تو گھر رکھ کے جائیں، اگر ضروری ہوا تو واپس آ کر لے لیں، اس راستے میں جس وقت تک آپ اللہ کے راستے میں ہیں، آپ کے پاس ''میں'' نہیں آنی چاہئے۔

ایک بھائی نے دوسرے بھائی کا صحیح اکرام نہیں کیا، یا یہ کہ اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات کہہ دی، ایک بہن نے دوسری بہن کا اکرام نہیں کیا، تو دلوں میں قدرتی طور پر نفرت پیدا ہو ہی جاتی ہے، منافرت پیدا ہو جاتی ہے۔

مشکل کام:

اس تبلیغ کے راستے میں سب سے بڑا مشکل کام جماعت کے ذمہ دار کے لئے ساتھیوں کے درمیان جوڑ پیدا کرنا ہوتا ہے، کیونکہ کوئی کہیں کا ہے اور کوئی کہیں کا، کوئی کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اور کوئی کسی طبقے سے، کوئی چھوٹی سطح کا آدمی ہے اور کوئی بڑی سطح کا، کوئی عالی حوصلہ ہے اور کوئی میرے جیسا کم ظرف ہے، مختلف مزاج کے لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں، اور ان کے درمیان اس سے پہلے کوئی رابطہ بھی نہیں ہوتا، ایک دوسرے کے مزاج سے آشنائی نہیں ہوتی، تو ان تمام ساتھیوں کا جڑ کر چلنا اور جڑ کر رہنا بڑا مشکل کام ہے، اور میری مراد جڑنے سے دلوں کا جڑنا، دلوں کا جڑ کر چلنا، آپ ساتھیوں سے اس طرح کا معاملہ کریں کہ ان کے دل اتنے جڑ جائیں کہ ایک دل بن جائے، جو سب ساتھیوں کے بدنوں میں دھڑک رہا ہے، سینوں میں دھڑک رہا ہے۔

مستوارت کا جوڑ:

اور مستورات کے لئے یہ بات اور بھی مشکل ہو جاتی ہے، مرد لوگ تو پھر بھی تھوڑا بہت صبر کر لیا کرتے ہیں، جذبات پر قابو کر لیا کرتے ہیں، عورتیں ذرا جلدی لڑ پڑتی ہیں، آپ نے یہ دیکھا ہوگا کہ ریل کے ڈبوں میں مردوں کی بھی بڑی بھیڑ ہوتی ہے، لیکن وہ جیسے کیسے گزارا کر لیتے ہیں، ان کا باقاعدہ جنگ کا میدان نہیں بنتا، لیکن

عورتیں جس ڈبے میں ہوتی ہیں وہاں ایسا کہرام مچتا ہے کہ خدا کی پناہ! جھک جھک کرتی رہتی ہیں، اور سارا سفر اسی میں گزر جاتا ہے، اب جو بیٹھی ہوئی ہیں ان کو اتار بھی نہیں سکتے، اگر یہ عورتیں جوڑ کے ساتھ، تحمل اور برداشت کے ساتھ، صبر کے ساتھ یہ وقت گزار لیا کرتیں تو کسی کو بولنے کی ضرورت پیش نہ آتی، لیکن وہ بولتی ہیں ان کی عادت ہے، تو یہیں سے معلوم ہوگیا کہ بے چاری عورتوں میں تحمل اور برداشت کا عنصر تھوڑا کم ہوتا ہے، اب جب مردوں کا ایک ساتھ چلنا اور جڑ کر چلنا مشکل ہے تو عورتوں کا تو اور بھی زیادہ مشکل ہوگا۔

پھر ایک مشکل یہ کہ مرد تو آپس میں مشورے کر رہے ہیں، عورتیں بے چاری اپنے مکان میں بند ہیں، اب اس کا محرم اس سے جا کر بات کرسکتا ہے، دوسرا بات بھی نہیں کرسکتا، تو یہ بڑا مشکل ہے، عورتوں کا ایک جماعت بن کر چلنا جس کو انگریزی والے ٹیم کہتے ہیں، بڑا مشکل ہے۔

''انا'' کو ختم کیجئے:

پھر یہ بات خوب یاد رکھئے کہ آپ جب اللہ کے راستے میں نکلے ہیں تو اپنی ''انا'' کو ختم کر دیجئے، اس کی قربانی دے دیجئے اور دوسرے ساتھی سے یا اپنے رفیق سفر سے یا جہاں آپ جائیں وہاں گھر والوں سے، ان کے کسی عزیز سے، غرضیکہ کسی بھی انسان سے، کسی قسم کی کوئی تکلیف آپ کو پہنچے، اگر آپ اس کو محسوس کریں گے یا کریں گی تو سمجھ لیجئے کہ آپ کے سفر کا ثواب ضائع ہوگیا۔

لیلائے دین کے مجنون بن جاؤ!

بزرگ فرماتے ہیں کہ اس لیلیٰ کے راستے میں جہاں جان کا خطرہ ہے، یہاں پہلا قدم رکھنے کی شرط یہ ہے کہ تم مجنوں بن جاؤ، اس کو نہ سردی کی پرواہ، نہ گرمی کی پرواہ، نہ کسی کے پتھر مارنے کی پرواہ، نہ کسی کی تحسین کی پرواہ، کسی چیز کی

پرواہ نہیں، بس دیوانہ ہے، مجنون ہے، وہ تو اپنی لیلیٰ کا مجنون ہے اور اس کو کوئی غرض نہیں، کسی سے کوئی غرض نہیں، نہ کسی کے اچھے سے، نہ کسی کے برے سے، اس کے لئے تو ایک ہی چیز سامنے ہے کہ منزل لیلیٰ میں جارہا ہوں، اور ایک دوسرے عارف اسی مضمون کو فرماتے ہیں کہ اگر تم اس محبوب کے راستے میں نکلے ہو، اور تمہارے قدموں اور تمہارے پاؤں کی ببول کے کانٹے تواضع کرتے ہیں تو تم غم نہ کھاؤ، اتنے اتنے بڑے کانٹے ہیں، میخوں جیسے، نیچے پاؤں کے تلوے میں لگا اوپر نکل آیا، پرواہ نہ کرو، تم اس اونچے راستے میں چل رہے ہو یہ تو معمولی مشقتیں ہیں، تو اس راستے میں نکلنے کے لئے سب سے بڑے کانٹے یہ ہوتے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کی طرف سے تکلیف پہنچے اور تم اس پر صبر و برداشت سے کام لو، اس کا اہتمام کرو، احتیاط کرو کہ تمہاری کسی بات سے، تمہارے کسی طرز عمل سے، تمہاری کسی حرکت سے، تمہارے سکون سے، تمہارے اٹھنے سے، تمہارے بیٹھنے سے، تمہارے لیٹنے سے، آرام کرنے سے، تمہارے جاگنے سے، غرضیکہ کسی بھی حرکت سے تمہارے کسی ساتھی کو تکلیف نہ پہنچے۔

کسی کو ایذا نہ دو:

بزرگ تو فرماتے ہیں چپل بھی ایک دوسرے کی نہ اٹھاؤ، استعمال نہ کرو، چنانچہ استنجا خانے میں جانے لگے اور دوسرے کے چپل پڑے ہیں، بغیر اجازت لے جائیں، ایسا نہ کرو، بلکہ اگر دوسرے کی اطلاع کے ساتھ ہو اور اس کی اجازت کے ساتھ ہو، ہاں عموماً اس کی اجازت ہوتی ہے، ساتھیوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی، لیکن اطلاع ہونی چاہئے، تو جہاں تک اپنا رویہ ہے وہ یہ رکھو کہ تمہاری طرف سے کوشش ہو کہ پورے سفر میں کسی کو ایک بال برابر بھی تمہارے سے کوئی ایذا نہ پہنچے، اپنے اندر کا شیطان ہے ناں! اس کو گھر باندھ کر کے جاؤ۔

اپنے شیطان کو گھر چھوڑ جاؤ:

یوں کہتے ہیں کہ آدمی کے اندر دو حصے ہیں، ایک حصہ فرشتے کا ہے، دوسرا حصہ شیطان کا ہے، اور یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اگر فرشتہ پن اس کا غالب آجائے تو یہ فرشتوں سے آگے نکل جاتا ہے، اور اگر اس کا شیطان کا حصہ غالب آجائے تو ابلیس سے بڑھ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب اللہ کے راستے میں نکلو تو اپنے شیطان کو گھر باندھ کے جاؤ، اور پورا سفر تمہارا ایسا گزرے کہ (تم نہ کہو اپنے آپ کو) تمہارے ساتھ بیٹھنے والے کہیں یہ انسان نہیں، یہ تو فرشتہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ جب دوسروں کی طرف سے کوئی معاملہ تم کو پہنچے تو اس کو محسوس نہ کرو۔

صبر و تحمل کے درجات:

دیکھو یہ تین درجے ہیں:

پہلا درجہ:

ایک یہ کہ آدمی دوسروں کی تکلیف کو محسوس ہی نہ کرتا ہو، کوئی ایسا بے حس ہوجائے، یہ تو بڑا مشکل ہے، آدمی تو آدمی ہے، اور محسوس بھی کرتا ہے، لیکن کوئی بات نہیں، اللہ کی رضا کے لئے اپنے آپ کو بے حس کرلو۔

دوسرا درجہ:

اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی محسوس تو کرتا ہے لیکن معاف کردیتا ہے، چلو درگزر کردیتا ہے، اگر پہلے درجے میں نہیں آسکتے تو دوسرے درجے میں آجاؤ کہ چلو محسوس تو ہوگیا لیکن درگزر کرو، اس پر صبر کرو، صبر کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی سے نہ شکوہ نہ شکایت، نہ اس سے، نہ کسی دوسرے سے، تمہارے شوہر تمہارے ساتھ ہیں، ان سے بھی شکایت نہ کرو کہ مجھے آج یہ تکلیف پہنچی ہے، اگر ایسا کیا تو پھر وہ صبر نہ رہا،

ہاں! ایک یہ ہے کہ جس کے سامنے تم تنہائی میں شکایت کرسکتے ہو، اور وہ بھی یہ کہے کہ: یا اللہ! میری اصلاح ہوجائے، اپنی اصلاح کی نیت سے اللہ سے درخواست کرسکتے ہوتو یہ دوسرا درجہ ہوا۔

تیسرا درجہ:

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی محسوس بھی کرے اور اس کو معاف بھی نہ کرے، پھر اس کے بھی کئی درجے ہوتے ہیں، بعض لوگ معافی مانگنے پر معاف کردیتے ہیں کہ جب تک معافی نہیں مانگو گے، نہیں معاف کروں گا، چلو بہت بڑا بن گیا یہ آدمی کہ لوگ اس سے معافی مانگتے ہیں، اچھی بات ہے، چلو اس کو بڑا بنادو، لیکن حاصل کچھ نہیں ہوا بلکہ بغیر معافی مانگنے کے اگر یہ معاف کرتا تو بڑا اچھا ہوتا، یہ بڑا آدمی ہوتا، اور ایک درجہ یہ ہے کہ معافی مانگنے پر بھی معاف نہیں کرتا، اور بعض لوگ تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ میں قیامت میں بھی معاف نہیں کروں گا، اس پر ایک بزرگ نے بہت اچھی بات کہی تھی، مجھے بہت اچھی لگی کہ اگر اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ یہی معاملہ کریں، تو پھر کیا ہوگا؟ تم تو کہتے ہو میں قیامت میں بھی معاف نہیں کروں گا، تم نے بھی تو اللہ تعالیٰ کے کئی قصور کئے ہوں گے، اگر اللہ تعالیٰ بھی تم سے کہہ دیں کہ میں تمہیں معاف نہیں کروں گا، سزا دوں گا، اور تم تو سزا دینے پر بھی قادر نہیں ہو، وہ تو قادرِ مطلق ہیں، مگر نہیں، اللہ تعالیٰ تم جیسے کم ظرفوں کی سطح پر نہیں آتے، یہ کم ظرفی کی بات ہے، تو ایک نکتہ یہ ہوا کہ اپنی ''انا'' کو ختم کرو۔

اپنی اصلاح کو پیش نظر رکھو:

یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس راستے میں اپنے آپ کو کچلنے کے لئے، روندنے کے لئے مٹی کی طرح پامال ہونے کے لئے بھیجا ہے، اور مجھے اس راستہ میں نکالا ہے، مجھے اپنی اصلاح مقصود ہے، دوسروں کی اصلاح تو جب ہوگی ہوگی، سب

سے پہلے اپنی اصلاح مقصود ہے، اور اگر تم کو یہ دولت مل گئی، یہ ''انا'' کے ختم ہونے کی، تواضع کرنے کی کہ تم مٹی بن جاؤ اور ان تین چار مہینوں میں اگر اتنی مشق ہوگئی اور گھر آنے کے بعد بھی تمہاری کایا پلٹ جائے اور وہی لوگ جن کے ساتھ لڑائیاں تھیں، اب کوئی لڑائیاں نہ رہیں اور تم کہو: اچھا بھئی کرلو جو کرنا ہے، تو سمجھ لو کہ تمہارا وقت قیمتی بنا ہے اور کچھ اصلاح ہوگئی ہے، اس پر ایک مثال دیتا ہوں:

کچھ بننے کے لئے رگڑائی کی ضرورت ہے:

یہ جو ہم جوتے پہنتے ہیں ناں! ابتدا میں یہ صرف کھال ہوتی ہے، اس کو پہلے رنگ لیتے ہیں، اور رنگنے کے بعد موچی اس کو ملتا ہے، اتنا ملتا ہے، اتنا رگڑتا ہے کہ یہ چمڑا جھاگ جیسا ہوجاتا ہے، تب وہ اس کا جوتا بناتا ہے، ایسا نہیں کہ گائے کی کھال اتار لی اور اس کا جوتا گانٹھ لیا، ایسا نہیں ہوتا، اس غریب کھال کو جوتا بننے کے لئے کتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، تمہیں انسان بننے کے لئے کتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا، یہ تو سوچو، جوتے کو جوتا بننے کے لئے اتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے تب وہ جوتا بنتا ہے۔

یہ کپڑے جو تم نے بدن پر پہنے ہوئے ہیں، یہ بیچارے کتنے مرحلوں سے گزرے ہیں؟ کپاس تھی، اگر کپاس کے کپڑے ہیں تو پہلے تو یہ بیلنے میں دیا گیا، آپ جانتے ہیں بیلنے سے گزرنا آسان ہے؟ پھر دھنکی کے ساتھ اس کو دھنا گیا، پھر اس کے تار بنائے گئے، پھر اس کو بننے والوں نے بنایا، بنائی کی اس کی، پھر دھوبی نے اس کی دھلائی کی، پٹخا اس کو، اور نہ معلوم کیسے کیسے گرم پانی میں اور کیسے کیسے مصالحے ڈال کے پھر اس پر استری گرم گرم چلائی، پھر درزی کے پاس آیا، اس نے قینچی لے کر کے اس کے ویسے ہی ناک کان کاٹ دیئے، اور پھر اس پر مشین چلائی، سوئی چلائی، اتنے مرحلوں سے گزرنے کے بعد وہ آپ کے سینے سے لگا، ایسے نہیں لگتا، ایک کپڑا معمولی

جس کی کل عمر چھ مہینے ہے، چھ مہینے پہنتا ہے آدمی، چلو زیادہ پہن لے، کئی کئی سال کے بھی لوگ رکھ لیتے ہیں، اور ایک جوتا جو چھ مہینے کی چیز ہے، اس کے بننے کے لئے اس غریب کو اتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، تم سوچو کہ تم انسان ہو، تم کو انسان بننے کے لئے کتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا؟ اور اپنے آپ کو کتنا مٹانا پڑے گا؟ کتنا روندنا پڑے گا؟ اور یہ تو بیچارے بے جان ہیں، بے شعور ہیں، تم ہو باشعور، تم جو کچھ کرو مولا کی رضا کے لئے کرو، مالک کی رضا کے لئے کرو۔

ارکانِ نماز میں تذلل:

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نور اللہ مرقدہ تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں کہ حقیقت رکوع کی یہ ہے کہ جب آدمی رکوع میں جھکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو سیدھی قامت کا، سیدھے قد کا بنایا تھا، یہ بیل کی طرح بن جاتا ہے، اور بیل کی طرح بن کے اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے: جو کچھ لادنا ہے لاد دیجئے، میں حاضر ہوں، میں آپ کے سامنے بیل کی حیثیت رکھتا ہوں، جو کچھ لادنا ہے اس گدھے پر لاد دیجئے، اٹھاؤں گا، اور پھر حقیقت سجدے کی یہ ہے کہ اپنی پیشانی جو سب سے محبوب ترین عضو ہے، آدمی کے حسن و جمال کی بھی مظہر یہی ہے، اس کی عزت و شرف کا بھی مظہر یہی ہے، تمام کمالات اللہ تعالیٰ نے انسان کے اسی چہرے کے اندر رکھے ہیں، جتنے بھی کمالات ہیں سب اس کے اندر رکھے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انسان کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں، آدمی زندہ ہے، پاؤں کاٹ دیئے جائیں، آدمی زندہ ہے، اور کوئی اور عضو کاٹ دیا جائے، آدمی زندہ ہے، لیکن اگر سر کاٹ دیا جائے تو زندہ نہیں رہ سکتا، تو انسان نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا، پستی کی حد ہوگئی، انتہا ہوگئی کہ زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ میں تو مٹی ہوں، اور ساتھ ہی زبان قال سے کہہ رہا ہے: ''سبحان ربی الاعلیٰ، سبحان ربی الاعلیٰ، سبحان ربی الاعلیٰ'' پاک ہے میرا رب جو سب سے اونچا ہے، سب سے اونچا

ہے، آج سب سے اونچے کے سامنے سب سے نیچا بننے کی آج توفیق حاصل ہوگئی، الحمدللہ! الحمدللہ! تو میں نے کہا یہ سب کچھ تمہیں برداشت کرنا ہے اور اس کے لئے کرنا ہے کہ ایک راضی ہوجائے، ہمارے پنجابی میں کہتے ہیں کہ:

سفر کی قبولیت کی علامت:

میں سارے خاندان کی غلام ہوں، صرف ایک تیری جان کے لئے، ایک تیری جان کے لئے سب کی غلام ہوں، اللہ تعالیٰ سے کہو ایک تیری ذات کے لئے سب کے غلام، میری کوئی حیثیت ہی نہیں، کوئی مرتبہ ہی نہیں، نہ میری کوئی عزت، نہ میرا کوئی مرتبہ، نہ میری کوئی انا، کوئی روندتا ہے، روند جائے، اُف نہ کرو، یہ چیز آپ کو اس راستے میں جتنی زیادہ میسر آجائے گی اور اس راستے میں جتنی زیادہ اس کی تربیت ہوجائے گی اور اس راستے میں جتنی زیادہ اس کی مشق ہوجائے گی تو تم سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے سفر کو اتنا ہی زیادہ قبول کرلیا، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

علم پر عمل کی ضرورت ہے:

دوسری بات یہ کہ کتابوں کی اور ورقوں کی تو کمی نہیں ہے، لیکن امت میں دو چیزوں کی کمی ہے، ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں علم دیا تھا، تین چیزیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت ہیں، خوب یاد رکھو! ایک تو علم ہے، دوسرا عمل ہے، اور تیسرا ہے علم پر عمل سے آدمی پر کیفیات کا پیدا ہونا، جس کو ہم حال کہتے ہیں، یہ تین چیزیں ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت ہیں، علم کی حد تک تو الحمدللہ کاغذ کالے کرنے کا میں بھی تیس سال سے کام کر رہا ہوں، اور پڑھنے پڑھانے کا بھی سلسلہ الحمدللہ چل ہی رہا ہے، کوئی شک نہیں، لیکن اگر دس من علم ہے تو عمل ایک چھٹانک بھی نہیں، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ علم ایک چھٹانک ہوتا تو عمل دس من ہوتا، لیکن قصہ الٹ ہوگیا کہ زبان چلانے پر، علم پر تو بہت زور ہو رہا ہے لیکن عمل کے اعتبار سے

کمزور ہیں۔

مجھے بہت سے ساتھی شکایت کرتے رہتے ہیں کہ فلاں آدمی تبلیغ میں ہے، لیکن اپنی کاروباری زندگی میں الٹے سیدھے معاملات میں وہ دوسروں سے بھی اونچا نکلا ہوا ہے، یہ بھی ایک ذہن ہے کہ یہاں تبلیغ میں تو اکرام مسلم بھی ہے، اور معاملات کی صفائی بھی ہے اور اپنے جذبات کو قربان کر کے دوسروں کے جذبات کی رعایت بھی رکھنا ہے، یہ بات ہمیں تعلیم میں بھی اور ہدایات میں بھی بتائی جاتی ہے، لیکن جب گھر آگئے تو فارغ ہوگئے، پھر وہی ماحول اور وہی قصہ کہانی، وہی رگڑے جھگڑے، معلوم ہوا کہ عمل جمع نہیں ہوا، علم کی حد تک تو وہ تبلیغ میں گیا، لیکن عمل کی مشق نہیں ہوئی۔

کیفیات عمل سے حاصل ہوں گی:

اور تیسری چیز احوال و کیفیات جو پیدا ہوتی ہیں وہ تو اعمال سے پیدا ہوں گی، بھائی! دودھ ایک چھٹانک ہوگا تو مکھن اس میں سے کتنا نکلے گا؟ وہ تو مکھن ہے۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک دودھ بیچنے والا تھا، وہ کسی نالے سے پانی ڈال کر لایا، اس میں مچھلی کا پونگ چھوٹا سا تھا، اس نے دودھ دیا تو وہ دودھ میں نکل آیا، دودھ لینے والے نے اس سے کہا کہ یہ تو مچھلی کا پونگ اس دودھ میں سے نکلا ہے، کہنے لگا ایک پاؤ تو آپ نے دودھ لیا ہے، اس میں سے یہی نکلے گا، اس میں دس سیر کی مچھلی تھوڑا ہی نکلے گی! اتنا سا ہی نکلے گا، تو جب ہمارا عمل بہت کمزور ہوجائے گا تو ظاہر ہے کہ وہ احوال و کیفیات کیسے پیدا ہوں گی؟

اپنی فکر کرنی چاہئے:

تو ایک بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ اس راستے میں نکل کر جہاں آپ کو دعوت کی مشق کرنی ہے، جہاں آپ کو لوگوں کو بلانے کی مشق کرنی ہے، جہاں، جس جگہ، جس بستی میں، محلے میں آپ جائیں وہاں کے احباب کو یا بہنوں کو جوڑنے کی اور

اس راستے کی ترغیب دینے کی فکر کرنی ہے، اس کام میں جوڑنے کی فکر کرنی ہے، وہاں بلکہ اس سے بھی پہلے خود اپنے عمل کی فکر کرنی ہے، آپ کے اعمال اور اخلاق میں کوئی کچا پن نہ رہے۔

کرنے کا کام:

ہماری تو کوئی حیثیت ہے نہیں، ہم تو دنیا دار لوگ ہیں، لیکن ہم نے راستہ اللہ والوں کا اختیار کرلیا ہے، اہل اللہ کا راستہ اختیار کرلیا ہے، تو جب ان کا راستہ اختیار کرلیا تو چلو جھوٹی سچی ان کی نقل تو اتاریں، اس لئے اپنی نمازوں کا اہتمام، تلاوت کا اہتمام، تسبیحات کا اہتمام، اپنے نوافل کا اہتمام، اور اسی طرح اپنے اخلاق کا اہتمام، غرضیکہ جو کچھ آپ سنیں اور جس کی ہم دعوت دیں، سب سے پہلے اپنے دل میں اتاریں اور عمل میں لائیں۔

اس سفر سے آگے ایک اور سفر ہے:

بے شک یہ ہماری زبان کے الفاظ ہیں، مگر ان کی حقیقت بھی ہمارے دل میں اتر جانی چاہئے کہ آپ اللہ کا راستہ طے کر رہے ہیں، جس کو خروج فی سبیل اللہ کہتے ہیں، جس طرح آپ اللہ کے راستے میں نکلے ہوئے ہیں، اسی طرح ایک راستہ طے کرکے آپ کو اللہ کے سامنے بھی کھڑا ہونا ہے، اس کی ہیبت، اس کا جلال، اس کی عظمت اور اس کی محبت، اس کی ذات عالی سے امید، جیسی اس وقت ہوسکتی ہے جب ہم اس کے سامنے ہوں، اس کی مشق ابھی سے کرلو، پھر قبر کی تنہائی میں جب عزیز و اقارب ہم سے جدا ہوجائیں گے، اور ایک بند کوٹھری میں جس میں کوئی سوراخ بھی نہیں ہوگا، کوئی کھڑکی بھی نہیں رکھی ہوئی ہوگی، ہمیں بند کردیا جائے گا، وہاں کوئی روشنی بھی نہیں ہوگی، اور وہاں کسی تک آواز پہنچانا بھی ممکن نہیں ہوگا، خدانخواستہ کوئی تکلیف ہوتو کسی کو بلا ہی لیں، آواز ہی دے دیں، یہ بھی ممکن نہیں ہوگا، وہاں صرف ایک

ذات کا سہارا ہوگا، اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، سارے تعلقات ختم اور ایک تعلق باقی رہ گیا، اس کی مشق کرو، اس راستے میں نکل کے تو اپنے اعمال کی، اپنے اخلاق کی اور اپنے یقین کی مشق کرو، اب یہ دو نمبر ہوگئے، اخلاق میں یہ ساری چیزیں آجاتی ہیں، اکرام مسلم اور اسی میں اعمال اور اذکار وغیرہ، نمازوں کا اہتمام بھی ہوگیا، یہ ساری چیزیں نکل آئیں، ان چیزوں کی آپ کو عملی طور پر مشق کرنی ہے اور ان کو پختہ کرنا ہے، اور روزانہ آپ کو انفرادی طور پر، ہر آدمی اپنے طور پر سمجھے کہ آج میرے اعمال کا میزانیہ کیا رہا؟ اور پھر نفس کو غیرت بھی دلائے کہ اب تو، تو اتنے پیسے خرچ کرکے اللہ کے راستے میں نکلا ہوا ہے، اگر اب بھی کام نہیں کررہا تو گھر پر کیسے کام کرے گا؟

عمل سے دعوت:

تیسرا نمبر ہے دعوت کا، دعوت کے بارے میں آپ حضرات مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، ماشاءاللہ، بزرگوں کی ہدایات بھی آپ لوگوں نے سنی ہوئی ہیں، میں اس معاملے میں کیا عرض کروں؟ لیکن ایک جملہ میں بھی عرض کردیتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے، ایک دعوت زبان سے ہوتی ہے، ایک اپنے عمل سے ہوتی ہے، اور ایک اپنے دل سے ہوتی ہے، زبان کی دعوت تو تقریر ہے، میں نے بھی شروع کردی، آپ کو دعوت دینا شروع کردیا، اور لاؤڈ اسپیکر کا، ٹیپ ریکارڈوں کا اور نہ معلوم کس کس کا دور ہے، اب تو خیر سے لوگ ڈش اینٹینا تک پہنچ گئے ہیں، ایک جگہ آدمی بیٹھا بول رہا ہے، ساری دنیا اس کی آواز کو سن رہی ہے، اس لفاظی کا تو عموم ہوگیا ہے، لیکن یہ سب سے کمزور چیز ہے، دوسری چیز ہے عمل، تمہارا لباس دیکھ کر، تمہاری رفتار دیکھ کر، تمہاری گفتار دیکھ کر، تمہارا سراپا دیکھ کر، تمہاری شکلیں دیکھ کر لوگوں کو ہدایت آنا شروع ہوجائے۔

صحابہؓ نے عمل سے دعوت دی:

تیس سال پرانا قصہ ہے، ایک تبلیغی دوست بیان کر رہے تھے، مجھے ان کی بات بہت پسند آئی، کہنے لگے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بہت سے ایسے ملکوں میں گئے جن کی زبان یہ نہیں جانتے تھے، اور وہ ان کی زبانیں نہیں جانتے تھے، اور بیچ میں کوئی ترجمان بھی نہیں تھا، کچھ دن رہنے کے بعد کچھ دو چار جملے سیکھے ہوں گے ایک دوسرے کی بات سمجھانے کے لئے، لیکن لوگ ان حضرات کی شکلیں دیکھ دیکھ کر اور ان کے معاملات دیکھ کر مسلمان ہو رہے تھے، اور جہاں جہاں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین گئے، وہاں نور پھیلتا چلا گیا، یہ بات بالکل صحیح اور حقیقت ہے۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی نکلے کہ انہیں کہہ دیا جائے کہ تمہیں بولنا نہیں ہے، گونگوں کی جماعت نکلے، تم جہاں جاؤ تمہیں بولنا نہیں ہے، تمہارا کام کیا ہوگا؟ اپنے اعمال کو درست کرنا، حالانکہ بولنے والے ہیں، یہ نہیں کہ واقعتاً گونگے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے رہنا بس، ایک بستی میں جاؤ، ایک رات لگاؤ یا دو رات، جتنا بھی وقت لگے، پھر آگے چلے جاؤ، اپنے اذکار میں، اپنے اعمال میں، اپنے یقین بنانے میں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں اور التجائیں کرنے میں لگے رہو، پھر دیکھو کہ اس جماعت کے گزرنے سے کیا اثرات ہوں گے؟ تو یہ دعوت کے تین طریقے ہیں، ایک یہ کہ زبان سے کہا جائے، دوسرا طریقہ یہ کہ عمل سے دعوت دی جائے، آپ جائیں گے راستے میں نماز کا وقت آ گیا، وہاں اپنا سامان وغیرہ رکھا، کھڑے ہو کر اذان دی، وہ علاقے جہاں اذان کی آواز گونجی اللہ تعالیٰ کی زمین کے وہ ٹکڑے جو اللہ تعالیٰ کے نام کو ترس رہے ہیں، وہاں اللہ کا اور اللہ کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام گونجے گا، تو فرشتے تمہارے لئے دعائیں کریں گے، حدیث شریف میں ہے:

''عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: اَلْمُؤَذِّنُ يُغْفَرُ لَهٗ

مَدٰی صَوْتِهٖ وَيَشْهَدُ لَهٗ كُلُّ رَطْبٍ وَّيَابِسٍ......"

(مشکوٰۃ ص:۶۵)

ترجمہ:......"مؤذن کی آواز جہاں جہاں تک پہنچتی ہے وہاں تک اللہ تعالیٰ بخشش فرما دیتے ہیں، اور قیامت کے دن یہ شجر و حجر تک اس کے حق میں گواہی دیں گے (کہ اس نے اللہ کا نام بلند کیا تھا)۔"

آپ کی اذان کی آواز ایک فرلانگ تک پہنچے گی، وہاں کے درخت اور سارے کے سارے شجر و حجر اور پرندے آپ کے حق میں قیامت کے دن گواہی دیں گے اور لوگ بھی آپ کو دیکھیں گے تو یہ ایک عملی مشق ہے، دعوت ہے۔

دنیا پیاسی ہے:

ماشاء اللہ جن علاقوں میں آپ جارہے ہیں وہاں کے لوگ بہت پیاسے ہیں، وہ اپنی زندگی سے عاجز ہوچکے ہیں، میں دیکھتا ہوں شراب پر شراب انڈیل رہے ہیں، اور ہمارے یہاں جس طرح ہے ناں کہ مولویوں نے گلی گلی میں مسجدیں بنا رکھی ہیں، اچھا کام کرتے ہیں، وہاں میں نے دیکھا ہے باہر ملکوں میں، انگلینڈ وغیرہ میں کہ ہر گلی کے کونے پر آپ کو شراب خانہ ملے گا، اور شراب پی کر بدمست مرد اور عورتیں میں نے سڑکوں پر لیٹے ہوئے دیکھے ہیں، وہ اپنی زندگی سے اتنے عاجز ہوچکے ہیں بیچارے کہ ان کو سوائے اس کے کہ شراب پی کر اپنے آپ کو عقل و خرد سے محروم کر کے بے ہوش ہوجائیں، اور کوئی ذریعہ سکون نظر نہیں آتا، آپ اپنے عمل اور دعوت کے ذریعے ان کا تعلق جب اللہ تعالیٰ سے جوڑیں گے تو ان کے دلوں کو ایک خاص سکون محسوس ہوگا، اس لئے کہ ارشاد الٰہی ہے: "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ." (الرعد:۲۸) (آگاہ ہوجاؤ! اللہ کے ذکر میں دلوں کا اطمینان ہے)، اس وقت ان کو

پتہ چلے گا کہ ہم کس دوزخ میں جل رہے تھے۔

مسلمان دنیا میں بھی جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں:

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا میں جنت عطا فرمادی ہے، ہم لوگ ناقدرے ہیں، ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں جنت ملے گی، یعنی وہاں آگے چل کر جنت ملے گی، مگر میں یوں سمجھتا ہوں کہ جنت تو تمہیں اللہ نے ابھی سے عطا فرمادی ہے، راحت اور سکون کی وہ زندگی اور تعلق مع اللہ کی وہ زندگی اور قلبی راحت کی وہ زندگی جو اللہ نے تمہیں اپنے دین کی نسبت اور اپنے دین کی برکت سے عطا فرمادی ہے، وہ دنیا میں کسی کو بھی نصیب نہیں ہے، تو آپ اور کس جنت کو چاہتے ہو؟ یہ لوگ تخت شاہی پر بیٹھے ہیں، کرسی صدارت پر بیٹھے ہیں، لیکن اندر جا کے دیکھو کتنے کھوکھلے ہیں؟

اتباع سنت کی خوشبو:

تو عملی طور پر بھی دعوت دو اپنے اعمال کو اپنی شریعت کے مطابق اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ڈھالو، اور کوشش کرو کہ تم سے ایک چھوٹی سے چھوٹی سنت بھی اس سفر میں چھوٹنے نہ پائے، ان سنت والے اعمال کے خود اثرات ہوں گے، جن کو ہم نہیں محسوس کرتے، جیسے ظاہری خوشبو کی ایک خوشبو ہوتی ہے، اور جتنی تیز خوشبو ہوتی ہے، اتنی زیادہ پائیدار بھی ہوتی ہے، اتنی زیادہ پھیلتی بھی ہے، اور جتنی اس ظاہری گندگی کی بدبو ہوتی ہے وہ اتنا ہی ماحول کو متعفن کرتی ہے، اس طرح ہمارے وہ اعمال جو سنت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں گے ان کی ایک خوشبو ہے۔ جب وہ عمل سنت کے سانچے سے ڈھل کر نکلے گا تو اس کی خوشبو خود بخود پھیلے گی۔

گناہوں کی بدبو:

اسی طرح ہماری بدعملیاں جو آج پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہیں، جب وہ

شیطان کے سانچے سے ڈھل کر نکلیں گی تو ان کی بدبو خوبخود پھیلے گی، اب اگر تم اس بدبو کو روکنا چاہو ہاتھ کے ذریعہ، یا زبان کے ذریعہ اور اس کے خلاف تقریر کرو کہ بدبو پھیلی ہوئی ہے، تو تمہاری تقریروں سے کیا ہوگا؟ یہی وجہ ہے کہ یہ بدبو جو ہمارے ماحول میں پھیلی ہوئی ہے کسی تقریر سے، کسی مقالے سے، کسی تحریر سے یہ ختم نہیں ہو رہی، یہ تو اعمال کی بدبو ہے، وہ اعمال جو سنت سے نہیں بلکہ شیطان کے سانچے سے نکلے ہیں، شیطانی اعمال ہیں، ان اعمال کی بدبو تو رہے گی۔ ہاں جب آپ سنت کے سانچے سے نکلے ہوئے اعمال لے کر چلیں گے اور آپ کا ہر عمل سنت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوگا تو انشاءاللہ خود بخود یہ خوشبو پھیلے گی اور گناہوں کی بدبو ختم ہوگی۔

ہدایت کے لئے قلوب کو متوجہ کرو:

تیسری بات یہ کہ آپ کا قلب پوری طرح متوجہ ہو ہدایت کے لئے، ہدایت دینا تو میرے اللہ کا کام ہے، کسی انسان کے قبضے میں اللہ نے ہدایت کو نہیں رکھا، لیکن جب قلوب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسم ''ہادی'' کا ظہور فرماتے ہیں، اسم ''ہادی'' کی تجلی فرماتے ہیں، شرط یہ ہے کہ ہم اللہ کے سامنے التجا کریں۔ تو عرض ہے کہ اپنے قلب کو پوری طرح مخلوق کی طرف متوجہ نہ کرو، مخلوق کی طرف متوجہ کرو گے تو اللہ سے محجوب ہوجاؤ گے، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرو، عین اسی وقت جب تم مخلوق سے بات کر رہے ہو اس وقت بھی متوجہ اللہ کی طرف رہو، اس لئے کہتے ہیں کہ: متکلم بات کرے، باقی ساتھی ذکر کرتے رہیں، بزرگ نصیحت کرتے ہیں ناں، اس کی یہی شرح ہے، اس وقت بھی تمہارا تعلق اللہ کی طرف رہے، اس کے حکم کو بجالانے کے لئے، اس سے دین کی بات کہو باقی اللہ سے التجا کرو کہ یا اللہ! ہماری زبان سے تو نہیں آپ کی قدرت سے کام چل سکتا ہے، بس انہی کلمات پر ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

عزم کرنے پر ہی توفیق ملے گی!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

۱:......"عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اَلتَّوْفِيْقُ خَيْرُ قَائِدٍ وَحُسْنُ الْخُلُقِ خَيْرُ قَرِيْنٍ وَالْعَقْلُ خَيْرُ صَاحِبٍ وَالْاَدَبُ خَيْرُ مِيْرَاثٍ وَلَا وَحْشَةَ اَشَدُّ مِنَ الْعُجْبِ." (کنز العمال ج:۱۶ ص:۲۹۶ حدیث:۴۴۳۹۶)

۲:......"عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ لَا تَنْظُرْ اِلٰى مَنْ قَالَ وَانْظُرْ اِلٰى مَا قَالَ."

(کنز العمال ج:۱۶ ص:۲۹۶ حدیث:۴۴۳۹۷)

۳:......"وَعَنْهُ قَالَ كُلُّ اِخَاءٍ مُنْقَطِعٌ اِلَّا اِخَاءً كَانَ عَلٰى غَيْرِ طَمْعٍ."

(کنزل العمال ج:۱۶ ص:۲۹۶ حدیث:۴۴۳۹۸)

ترجمہ:ا:......"حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: توفیق سب سے بہتر قائد ہے، اور حسن خلق سب سے بہترین ساتھی ہے اور رفیق ہے، اور عقل سب سے بہترین ساتھی ہے، اور ادب سب سے بہترین میراث ہے اور کوئی وحشت عجب اور خود پسندی سے بڑھ کر نہیں۔"

۲:......''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؓ نے ارشاد فرمایا کہ: یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا، یہ دیکھو کہ کیا کہا ہے۔''

۳:......''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہر دوستی ٹوٹنے والی اور ختم ہونے والی ہے، سوائے اس دوستی کے جو بغیر طمع کے ہو۔''

پہلی روایت میں پانچ فقرے ہیں، اور دوسری روایت میں دو فقرے ہیں،

ا:......انسان کا سب سے بہتر راہ نما توفیق ہے۔

توفیق:

اگر کسی بندے کے لئے حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے خیر کے اسباب مہیا کردیئے جائیں تو اس کو توفیق کہتے ہیں، جیسے لوگ کہتے ہیں کہ الحمدللہ اس کی توفیق ہوگئی۔

خذلان:

اور کسی بندے کے لئے شر کے اسباب جمع کردیئے جائیں تو اس کو ''خذلان'' کہتے ہیں، یعنی حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے اس کو رسوا کردیا جائے اور دور کردیا جائے، یہ تو ظاہر ہے کہ نیکی کا کام کرو یا برائی کا کام کرو، اس سے پہلے کچھ اسباب ہوتے ہیں، اور ان اسباب کا مہیا کردیا جانا من جانب اللہ ہوتا ہے، اگر کسی بندے کے لئے خیر کے اسباب جمع کردیئے گئے، تو یہ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے انعام ہے، توفیق ہے۔

توفیق کے اسباب:

مزید یہ ہے کہ اسباب دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو کسی کام کو تیار کرنے

کے لئے ہوتے ہیں، اور ایک وہ ہیں جو عین کام کرنے کے وقت مہیا کئے جاتے ہیں، مثال کے طور پر کسی شخص کو حج پر جانا ہے، اس کے لئے زادِ راہ بھی چاہئے، پیچھے بال بچوں کا انتظام کرنا چاہئے، یہ سارے حج کے اسباب ہیں، اور جب یہ سارے اسباب مہیا ہو گئے تو اب اس کے سفر حج کے دوران اس کو طاقت کا مل جانا، اور تمام معاملات میں اس کی راہنمائی ہو جانا، اور ٹھیک ٹھیک مناسک حج کا ادا کرنا، سفر حج کے آداب بجا لانا، یہ وہ توفیق ہے جو حج کے ساتھ ہوتی ہے، اسی طرح نماز کا معاملہ ہے، اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کے اسباب مہیا فرمادیئے ہیں، بدن کی بھی صحت ہے، چلنے پھرنے کی بھی گنجائش ہے اور اپنے ستر کو ڈھانکنے کے بھی اللہ تعالیٰ نے اسباب مہیا کر دیئے ہیں، تو جتنے اسباب، نماز پڑھنے کے لئے پہلے چاہئیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے مہیا فرمادیا۔ اس کے بعد نماز کے لئے ''اللہ اکبر'' کہہ کر نماز شروع کی، تو ایک توفیق وہ ہے جو نماز شروع کرنے سے لے کر اس کے ختم کرنے تک حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے شامل حال ہوتی ہے، اور ایک توفیق وہ ہے جو نماز کے شروع کرنے سے پہلے پہلے تھی، اور اسی توفیق میں سے آدمی کا عزم اور ارادہ کرنا بھی ہے، اسباب خواہ کتنے ہی مہیا ہوں لیکن آدمی عزم اور ارادہ نہ کرے تو ظاہر ہے کہ سارے اسباب بے کار ہوں گے، اور دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

توفیق کے ساتھ عزم بھی ضروری ہے:

حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ایک صاحب بہت مالدار تھے، سیٹھ تھے، جب ان سے کہا جاتا کہ بھئی آپ حج کرلیں، تو وہ کہتے کہ بس دعا کیجئے اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمادیں، ایک بزرگ نے اسی طرح حضرت تھانویؒ سے کہا، حضرت! دعا کیجئے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمادے، حضرتؒ فرمانے لگے: دعا ضرور کریں گے، لیکن آپ اپنے نفس پر مجھے اختیار دے دیں، کہنے لگے: کیا اختیار؟ حضرتؒ کہنے لگے: حج کے لئے روانگی کا وقت آئے اور جہاز چلے تو میں آپ کو

اٹھا کر اندر بٹھا دوں، اس کی مجھے اجازت دے دیجئے۔ تو اسباب تو مہیا ہیں تمام کے تمام، لیکن پھر نہیں جا پاتا کیوں؟ اس لئے کہ کوئی اس کو اٹھا کر کے بٹھانے والا نہیں ہے جہاز پر اور وہ چیز انسان کا اپنا عزم اور ارادہ ہے۔

سنت ابراہیمی یہی ہے:

میرے ایک عزیز تھے، میرے چھوٹے بھائی کے خسر تھے، فوت ہو گئے بیچارے، اچھے خاصے مالدار تھے، میں ہمیشہ ان کو کہا کرتا تھا کہ چچا جی! آپ حج کر آئیں، تو مجھے کہتے مولوی جی! چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے، ان کی اہلیہ تھی نہیں، اب میں ان کو چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں؟ میں ان سے کہتا تھا کہ سنت ابراہیمی یہی ہے کہ چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر فریضہ حج کے لئے آپ چلے جائیں۔

بیت اللہ شریف کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی، اور حج کا ارادہ کیا تھا، قرآن کریم میں ہے: "وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ." اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ سنت یوں جاری ہوئی تھی کہ شیر خوار بچہ اور اس کی ماں کو حج کی جگہ بٹھانے کا حکم فرمایا، وہاں نہ کوئی آبادی تھی، نہ کوئی بستی تھی، حتیٰ کہ بیت اللہ بھی نہیں تھا، اردگرد پہاڑ تھے اور درمیان میں وادی تھی، حکم دے دیا کہ تم اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو وہاں چھوڑ کے آجاؤ، اس قربانی پر اللہ تعالیٰ نے حج کو شروع کیا، جبکہ نہ ان کا کوئی مونس ہے، نہ کوئی غمخوار ہے، نہ کوئی ان کا پرسانِ حال ہے، نہ کوئی آدم نہ آدم زاد، اس کے برعکس ہمیں حکم دیا کہ تم اپنے بیوی بچوں کو یہاں چھوڑ جاؤ، خود چلے جاؤ حج کے لئے، اور ان کو کہا تھا کہ اپنے شیر خوار بچے کو اور اس کی والدہ کو میرے گھر کے پاس چھوڑ کر جاؤ، اور خود اپنے وطن ملک شام میں واپس چلے جاؤ، کہاں ملک شام اور کہاں مکہ مکرمہ، اور ہمیں حکم دے دیا کہ تم اپنے بیوی بچوں کو گھر چھوڑ جاؤ، جیسے بھی ہیں، جس حال میں بھی ہیں ان کو چھوڑ جاؤ، تم فریضہ حج ادا کرو، جا کے میرے گھر کا حج کرو، انہوں نے تو اس حکم کی تعمیل کر لی، ہم اس حکم کی تعمیل نہیں کرتے، چنانچہ مرحوم کو

حج کی توفیق نہیں ہوئی، اس کے بعد ان کے صاحبزادے ہیں، ایک ہی صاحبزادے ہیں، کئی لڑکیاں ہیں، ہم نے ان سے بھی کہا کہ بھئی تم حج کرلو، اور اپنے باپ کا حج بھی کراؤ، اس کے ذمہ فرض تھا، اس نے آج تک نہیں کیا، لوگ عیاشیوں پر تو پیسہ خرچ کرتے ہیں، لیکن اس پر نہیں، بس یوں کہتے ہیں کہ توفیق نہیں ہے۔

ہمارے یہاں عام رواج ہے کہ لوگ جب سارے کاموں سے فارغ ہوجاتے ہیں، بچے بچیوں کی شادیاں ہوجاتی ہیں، پوتے پوتیوں کی بھی اور بوڑھے میاں اور بڑھیا جب کسی کام کے نہیں رہتے، تو کہتے ہیں کہ چلو ان کو حج پر بھیج دو، راستے میں مریں یا جئیں اس سے ان کو کوئی غرض نہیں اور ٹھیک بھی ہے، بھائی! جب یہ لوگ یہاں نماز نہیں پڑھتے تو حج کرکے کیا کریں گے؟ جب یہاں اللہ کے گھر پر نہیں آتے تو وہاں اس کے گھر پر کیسے جائیں گے؟ جی ہاں! وہ وہاں بھی ایسے ہی سیر سپاٹے کرکے آئیں گے۔

ہمارے ایک ملتانی بھائی حج پر گئے ہوئے تھے، تو وہ بیت اللہ کو دیکھ کر پوچھنے لگے کہ یہ کس کی خانقاہ ہے؟ ان بیچاروں کو بس یہی معلوم ہے کہ لائق احترام اور لائق زیارت مزار ہی ہوتا ہے، اس لئے وہ کہنے لگا کہ یہ کس کا مزار ہے؟ تو میں عرض کررہا تھا کہ تمام اسباب مہیا ہوجائیں، لیکن آدمی کے قلب میں عزم پیدا نہ ہو اور وہ ارادہ نہ کرے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا، توفیق کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ عزم بھی پیدا کردیں کہ کچھ بھی ہوجائے مجھے یہ کام کرنا ہے، نہ کوئی مصلحت آڑے آئے گی، نہ کوئی مشغولیت رکاوٹ بنے گی اور نہ اِدھر اُدھر دیکھوں گا، مجھے اللہ کا یہ حکم بجالانا ہے، عزم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا دنیا میں۔

کسان کا عزم:

میں دیکھتا ہوں ہمارے کسان بھائی ہیں۔ میں خود بھی دیہاتی ہوں۔ ہمارے کسان بھائی سردی کے موسم میں آدھی رات کو یعنی رات کے ایک، دو بجے جبکہ

برف جمی ہوئی ہوتی ہے، ہاتھ اور پاؤں ٹھٹھر رہے ہوتے ہیں، اگر فصل کو پانی لگانا ہو اور دو بجے کا وقت ہو، تو وہ اس وقت بھی کندھے پر کسّی رکھ کر وہاں جاتا ہے، اور دو گھنٹے پہلے جا کے گھڑی کے پاس بیٹھ جاتا ہے کہ کب میرا وقت ہوتا ہے؟ کوئی سستی درمیان میں مانع نہیں ہوتی کہ جی آنکھ نہیں کھلی، بس کیا کریں۔ بعض دفعہ آدمی بیمار ہوتا ہے، طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی، لیکن وہ عزم ہے جو انسان کو لئے لئے پھرتا ہے، اور یہ عزم پیدا ہوتا ہے نفع کے فوت ہو جانے کے اندیشے سے، یا کسی ضرر کے لاحق ہونے کے اندیشے سے کہ اگر پانی نہ لگایا تو فصل سوکھ جائے گی، بچے چھ مہینے کہاں سے کھائیں گے؟ لیکن دین کے معاملہ میں یہ عزم پیدا نہیں ہوتا، یہ بے توفیقی ہے، خذلان ہے اللہ کی جانب سے اور شیطان نے ہمارے کان میں پھونک دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، پرواہ نہ کرو، اگر ہمارا عزم تھوڑا سا ابھرتا بھی ہے، تو شیطان سلانے والا یہ انجکشن دے دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

دنیاوی کاموں میں ہمارا طرز عمل:

ہمارے حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ دنیا کے کاموں میں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، خود ہی پال دے گا، رب العالمین ہے، بچہ بیمار ہے، بیوی بیمار ہے، کبھی آپ کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، خود ہی ٹھیک کر دے گا، اس کو تڑپنے دو، ہسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں، یا کسی ڈاکٹر یا حکیم کو بلانے یا دکھانے کی ضرورت نہیں ہے، صرف دین ہی سے ہٹانے کے لئے شیطان یہ انجکشن دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، میں دنیاوی اسباب اختیار کرنے سے انکار نہیں کرتا، اللہ کا حکم بجا لاؤ، پھر کہو کہ اللہ غفور رحیم ہے، ان شاء اللہ قبول کر لے گا، ہمارے گناہوں کو معاف کر ہی دے گا، ہم سے بن تو نہیں پڑا جیسا ہونا چاہئے، لیکن اللہ غفور رحیم ہے پھر تو بات ہوتی۔

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّوفِیقُ خَیرُ قَائِدٍ." توفیق کا

ہوجانا یہ سب سے بہترین قائد ہے، قائد کے معنی کھینچنے والا، لے جانے والا، اللہ تعالیٰ توفیق سے کسی کو محروم نہ فرمائے، ظاہری اور باطنی اسباب کا، اسباب خیر کا مہیا ہوجانا یہ توفیق کہلاتا ہے، حق تعالیٰ شانہ نے ہر انسان میں طاقت رکھی ہے، ہر انسان نیکی بھی کرسکتا ہے، برائی بھی کرسکتا ہے، طاقت رکھی ہے، نیکی کا ارادہ بھی کرسکتا ہے، برائی کا ارادہ بھی کرسکتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

''وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا. فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا. قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا. وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا.'' (الشمس:۷تا۱۰)

ترجمہ:......''اور قسم ہے نفس کی اور جس نے نفس کو بنایا اس کی، پس اللہ نے الہام کیا اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس کا تقویٰ، تحقیق مراد کو پہنچا وہ شخص جس نے اس کو پاک کرلیا (آلودگیوں سے، نجاستوں سے، گندگیوں سے، اور اللہ کی نافرمانیوں سے اس کو پاک رکھا) اور نامراد اور ناکام ہوا وہ شخص جس نے اس کو مٹی میں ملادیا۔''

نفس کی بدکاری بھی الہام فرمائی اور نفس کا تقویٰ بھی الہام فرمایا، دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہیں، ''دسها''، ''دس'' کے معنی مٹی میں دفن کرنے کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتے رہو، اور کام کا عزم کرتے رہو، اور پھر کام کرتے ہوئے کوشش کرو کہ یہ اللہ کی رضا کے مطابق ہوجائے، اس کے بعد پھر استغفار کرو، تو یہ چار مرتبے ہوگئے۔

۱:...... پہلا مرتبہ ہوگیا اللہ سے مانگنا، روٹی مانگتے ہیں اللہ سے، رزق مانگتے ہیں، صحت مانگتے ہیں، اور دوسری چیزیں مانگتے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی مانگو، یا اللہ! میں آپ کی عبادت کا محتاج ہوں، مجھے اپنی رضا کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرمادیجئے۔

۲:......دوسرے نمبر پر عزم کرو اور جو ظاہری اسباب اللہ نے پیدا کئے ہیں ان کو بھی مہیا کرو اور یہ عزم اور ارادہ ایسی چیز ہے، میں نے ابھی کہا ہے نا کہ کسان آدھی رات کو اٹھتا ہے، پانی کے اندر کھڑا ہوتا ہے، کپکپی طاری ہے، ٹھٹھر رہا ہے، اور بعض دفعہ تو گرمی حاصل کرنے، سینکنے اور تاپنے کے لئے قریب میں آگ جلانی پڑتی ہے، مگر پانی ضرور لگاتا ہے۔

عزم کی طاقت:

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ تبلیغی جماعت کے بانی دلّی میں صاحب فراش تھے، اور اتنے بیمار تھے کہ کروٹ خود نہیں بدل سکتے تھے، کسی نے آکے بتایا کہ حضرت تشریف لاتے ہیں، یعنی حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جو ان کے پیر تھے، اس خبر کا سننا تھا کہ بستر سے اٹھ کر بھاگنے لگے، یہ کہاں سے طاقت آگئی تھی؟ بھائی یہ اندر کے جذبہ اور عزم کی طاقت تھی، ان کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں بیمار ہوں، اور میں ہل نہیں سکتا، حضرتؒ سے ایسا تعلق تھا کہ یہ سننا تھا کہ بستر سے اٹھ کر خود ہی حضرتؒ کی طرف بھاگنے لگے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے راستے کا ایسا عزم نصیب فرمائیں، یہ دوسری چیز ہے عزم کرنا۔

۳:......اور تیسری چیز ہے کام شروع کرنا، مثلاً نماز ہے، شروع کردی تو اب ایک ایک حصہ، ایک ایک رکن ایسا ادا کرنے کی کوشش کرو کہ یہ اللہ کی رضا کے مطابق ہو، جیسی نماز اللہ تعالیٰ مجھ سے پڑھوانا چاہتے ہیں میں ایسی نماز پڑھ کے دکھاؤں، جب نماز پڑھ لی۔

۴:......اب استغفار کرو کہ یا اللہ! نہیں پڑھ سکے، سلام پھیرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین دفعہ فرماتے تھے: ’’استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ‘‘ یعنی جب نماز پڑھ لی تو اب کہو کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، جیسی کیسی تھی منظور کرلے گا۔

شیطان کی چال:

ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ نماز پڑھنے سے پہلے شیطان کہتا ہے: کیا کرو گے پڑھ کے؟ تمہاری نماز اللہ کی ذات، اس کی صفات، اس کی خدائی اور بڑائی میں کیا اضافہ کردے گی؟ چھوڑو! ایسی نماز کا کیا فائدہ؟ خیر نماز شروع کردی تو اب وسوسے ڈال رہا ہے، کبھی ادھر کا خیال، کبھی ادھر کا خیال، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کو نماز میں وہ چیزیں یاد دلاتا ہے جو اس کو کبھی یاد نہیں آتی تھیں، جیسا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا لطیفہ مشہور ہے، ایک صاحب نے آ کے کہا کہ حضور! میں کسی جگہ کچھ روپیہ، خزانہ دبا کر، یا دفن کر کے بھول گیا ہوں، اب مجھے وہ جگہ نہیں مل رہی، حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا: اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز کی نیت باندھ لو تمہیں یاد آجائے گا، لیکن نماز پوری کر لینا، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا مگر اس نے ابھی سورۂ فاتحہ بھی نہیں پڑھی تھی کہ یاد آ گیا، اور وہ نماز چھوڑ کر بھاگ گیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کو ایسی باتیں یاد دلاتا ہے جو اس کو کبھی یاد نہیں آتی تھیں، نماز کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا، اور جب آدمی نماز سے فارغ ہوگیا تو اب دوسرا کام کرتا ہے، اب اس کو ملامت کرتا ہے کہ یہی نماز تھی، شرم نہیں آتی تجھے، قربان جاؤں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اس کو کہہ دو کہ میرا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، وہ خود ہی قبول فرمائے گا، تو جا۔

تو اب اس پر پچھتاوے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ استغفار کی ضرورت ہے، شیطان تم سے اخلاص یا محبت کی بنا پر نہیں کہتا کہ تم نے کیسی نماز پڑھی ہے؟ بلکہ یہ کہتا ہے کہ آئندہ پڑھو ہی نہیں، تو حق تعالیٰ شانہ اپنی رحمت سے، اپنے فضل سے اپنا کرم ہمارے شامل حال فرمائے کہ ہمیں اعمال صالحہ کی توفیق ہوجائے۔

وہ اعمال جو اللہ کو پسند ہیں، ان کو اعمالِ حسنہ بھی کہتے ہیں، اعمالِ صالحہ بھی کہتے ہیں، اور جو اعمال اللہ کو پسند نہیں ہیں ان کو اعمالِ سیئہ اور برے اعمال کہتے ہیں،

جو اللہ تعالیٰ کے غضب کو اور قہر کو دعوت دینے والے ہیں، اعمالِ صالحہ تمہیں اللہ کے قریب کرنے والے ہیں، اور اعمالِ طالعہ یا یوں کہو اعمال سیئہ، برے اعمال یہ اللہ پاک سے دور کرنے والے ہیں، نیک اعمال، اعمالِ صالحہ بندے کو اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کے لطف اور فضل کا مورد بنانے والے ہیں اور برے اعمال بندے کو اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنانے والے ہیں، نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ!

حسن خلق:

دوسرا فقرہ ہے: ”وَحُسْنُ الْخُلُقِ خَيْرُ قَرِيْنٍ.“ قرین کہتے ہیں ساتھی کو جو ہمیشہ ساتھ رہے، اس لئے ہمزاد کو قرین کہتے ہیں، یوں کہتے ہیں کہ ایک آدمی کا ہمزاد ہوتا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک شیطان کو لگادیتے ہیں اور ایک فرشتے کو لگادیتے ہیں، اس کی راہ نمائی کے لئے دومشیر اس کو دے دیتے ہیں، ایک نیکی کا مشورہ دینے والا اور اس کی حفاظت کرنے والا، اور ایک اس کو بہکانے والا، ایک اس کی روح کا معاون، دوسرا اس کے نفس کا معاون تو ایک فرشتہ اس کے ساتھ رہتا ہے ہمہ وقت، اور ایک شیطان آدمی کے ساتھ رہتا ہے، ایک حدیث شریف میں فرمایا:

”عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ عَلَيْهِمْ قَرِيْنُهُ مِنَ الْجِنِّ، قَالُوْا: وَاَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ وَاَنَا اِلَّا اَنَّ اللهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمُ فَلَيْسَ يَأْمُرُنِيْ اِلَّا بِخَيْرٍ.“ (مسند احمد ج:۱ ص:۴۶۰)

ترجمہ:......”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس پر ایک جن نہ مسلط کیا گیا ہو (یعنی

شیطان نہ مسلط کیا گیا ہو)، صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپ پر بھی مسلط کیا گیا ہے؟ فرمایا: جی ہاں! مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے میری اس کے مقابلے میں مدد فرمائی، پس میں صحیح سالم رہتا ہوں، بچا رہتا ہوں۔''

اور دوسری روایت میں: ''فَاَسْلَمَ.'' پس وہ میرے کہنے سے مسلمان ہوگیا، اب وہ مجھے خیر ہی کا بتلاتا رہتا ہے۔

کوئی بعید نہیں کہ شیطان بھی مسلمان ہوگیا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے سے، اس کو کہتے ہیں ''قرین''، امیرالمؤمنین حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ سب سے بہتر قرین جو ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتا ہے وہ اچھا اخلاق ہے، خوش خلق آدمی ہر جگہ معزز ہے، اور بد خلق آدمی کو ہر جگہ دھتکار اور پھٹکار ہوتی ہے۔

حسن خلق کی تعریف:

حسن اخلاق یعنی اچھا اخلاق۔ اچھے اخلاق میٹھی میٹھی باتیں کرنے کا نام نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی خوش اخلاق نہیں تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں ایسے واقعات موجود ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سخت الفاظ کے ساتھ ڈانٹ پلائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے تفسیر ابن کثیر میں اس روایت کو نقل کیا ہے کہ ایک موقع پر جمعہ کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر بیٹھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اُخْرُجْ یَا فُلَانُ فَاِنَّکَ مُنَافِقٌ.'' (تفسیر ابن کثیر ج:۴ ص:۱۴۳) فلانے اٹھ جا نکل جا یہاں سے تو منافق ہے، ''اُخْرُجْ یَا فُلَانُ فَاِنَّکَ مُنَافِقٌ.'' ستر آدمیوں کو نکال دیا کان سے پکڑ کے جمعہ کی نماز میں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے ذرا آنے میں دیر ہوگئی تھی، تو اتنے آدمیوں کو میں نے دیکھا تو میں نے کہا شاید جمعہ ختم ہوگیا، آگے گیا تو پتہ

چلا کہ یہ قصہ ہوا ہے، لوگ کہہ دیتے ہیں کہ تم بڑے بداخلاق ہو، میں کہتا ہوں: ہاں میں بداخلاق ہوں، بے شک کوئی شک نہیں، میں اپنے لئے تو ہر جرم کا اقرار کرنے کے لئے تیار ہوں، مجھے جو چاہو کہو لیکن ذرا آپ اپنے طرزِ عمل کو بھی دیکھئے، آپ اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں، میں بداخلاقی کا مظاہرہ آپ کی کن اداؤں پر کرتا ہوں، یہ بھی یاد ہے؟ یہ بھی آ؛ دیکھو ہم کیا کرتے ہیں، میں نے یہ قصہ سنایا تھا، حدیث شریف میں ہے کہ:

''عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ دَیْنٍ کَانَ عَلٰی اَبِیْ فَدَقَقْتُ الْبَابَ فَقَالَ: مَنْ ذَا؟ فَقُلْتُ: اَنَا! فَقَالَ: اَنَا اَنَا. کَاَنَّہٗ کَرِھَھَا.''

(مشکوٰۃ ص:۴۰۰)

ترجمہ:...... ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا ایک قرض کے سلسلہ میں جو میرے باپ پر تھا میں نے دروازہ باہر سے کھٹکھٹایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر سے پوچھا: کون؟ میں نے کہا: ''میں!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں میں کیا ہوتی ہے؟ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے اور وہی ہی دروازہ کھٹکھٹانے والے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر سے پوچھا: کون؟ میں نے کہا: میں، فرمایا: میں میں کیا ہوتی ہے۔

خوش خلقی اور بدخلقی کا معیار:

تم نے صرف میٹھی بات کرنے کا نام ہی خوش اخلاقی سمجھا ہے، اگر کوئی

اصلاح کے لئے ڈانٹے تو یہ بداخلاقی ہے، نہ بھائی! خوش اخلاقی کا معیار بھی میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، نرمی کی جگہ نرمی کرو، سختی کی جگہ سختی ہونی چاہئے، قرآن کریم میں ہے: "یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ." (التحریم:۹) اے، نبی جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں سے اور ان پر سختی کیجئے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں قرآن کریم کی آیت ہے، بہرحال اپنے عزیزوں کے ساتھ اخلاق کے ساتھ پیش آنا، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اخلاق کے ساتھ پیش آنا، اپنے دوست احباب کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا، اپنے معاملہ والوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا یہ حسن خلق ہے اور واقعہ یہ ہے کہ حسن خلق سے بہتر کوئی دولت نہیں ہے۔

خوش خلقی کی قیمت:

ایک حدیث شریف میں فرمایا کہ:

"عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَثْقَلَ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ .... الخ." (مشکوٰۃ ص:۴۳۱)

ترجمہ:...... "حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن حسن خلق سے زیادہ بھاری مؤمن کے میزان عمل میں کوئی چیز نہیں ہوگی۔"

یعنی قیامت کے دن اعمال کو تولنے کے لئے جو ترازو رکھی جائے گی، اس میں حسن خلق سب سے بھاری عمل ہوگا۔

بنی اسرائیلی تاجر کا واقعہ:

ایک حدیث شریف میں ہے کہ:

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: تَلَقَّتِ

الْمَلٰـٓئِكَةُ رُوْحَ رَجُلٍ مِمَّنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَقَالُوْا: اَعَمِلْتَ مِنَ الْخَيْرِ شَيْئًا؟ قَالَ: لَا! قَالُوْا: تَذَكَّرْ! قَالَ: كُنْتُ اُدَايِنُ النَّاسَ فَاٰمُرُ فُتْيَانِيْ اَنْ يُنْظِرُوْا الْمُعْسِرَ وَيَتَجَوَّزُوْا عَنِ الْمُوْسِرِ. قَالَ: قَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: تَجَوَّزُوْا عَنْهُ. وَفِيْ رِوَايَةٍ: فَقَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: اَنَا اَحَقُّ بِذَالِكَ! تَجَاوَزُوْا عَنْ عَبْدِيْ۔"

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۱۷، ۱۸)

ترجمہ:...... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ملائکہ کی تم سے پہلے کے ایک شخص کی روح سے ملاقات ہوئی، انہوں نے اس سے پوچھا کہ تو نے کوئی نیکی وغیرہ بھی کی تھی؟ اس نے کہا: نہیں! ملائکہ نے کہا: یاد کرو، شاید کوئی نیکی یاد آجائے، کہنے لگا: ہاں! یہ ضرور ہے کہ میں نے اپنے عملہ کو کہہ رکھا تھا کہ غریب کو مہلت دے دیا کرو اور مال دار سے بھی درگزر کرلیا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا کہ: اس سے بھی تجاوز کرلو۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ عز وجل فرمائیں گے کہ: میں اس تجاوز کرنے کا زیادہ حق دار ہوں، پس میرے بندے سے درگزر کرو۔"

یعنی بنی اسرائیل میں ایک شخص بڑا امیر کبیر تھا، اس کی دوکانیں بڑی چلتی تھیں، سوداگری بڑی تھی، تجارت بڑی تھی، لیکن اس نے اپنے نوکروں چاکروں سے کہہ رکھا تھا کہ بھئی کسی کے ساتھ سختی نہیں کرنی، کوئی دے دے تو بھی ٹھیک ہے، نہ دے تو بھی ٹھیک ہے، اگر کسی نے کہہ دیا کہ میں پیسے نہیں ادا کرسکا، کچھ مہلت دے دی جائے، دے دیا کرو، جب اس کا انتقال ہوا، اور اُسے بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا: کیا عمل لے کر آئے ہو؟ کہا: عمل وَمل تو کچھ نہیں ہے، لیکن اتنا

ضرور تھا کہ میں اپنے نوکروں سے کہا کرتا تھا کہ بھئی کسی پر سختی نہ کرو، کسی غریب کے پاس پیسے نہیں ہیں تو ان سے نہ لو، بلکہ کہہ دو کہ پھر دے دینا جب تمہیں گنجائش ہو، اور کوئی میعاد مقرر کی گئی تھی کہ فلاں وقت پیسے دیں گے اگر وہ اس وقت پر نہیں دے سکے تو اس میں بھی سختی نہ کرو، دے دے گا۔

اور میں درمیان میں یہ نکتہ بتادوں کہ ایسی تجارت میں گھاٹا نہیں ہوتا، لوگ تو کہتے ہیں کہ سختی سے پیسے وصول کرو تو تب دوکان چلے گی اور تجارت چلے گی، ورنہ ٹھپ ہوجائے گی، ایسا نہیں ہے، کر کے دیکھو، میرے سامنے کی بات ہے، ہمارے مدرسے کے پاس ایک کتب خانہ ہے، وہ مولوی صاحب بیچارے مسجد کے سامنے چارپائی رکھ کر کتابیں بیچا کرتے تھے، ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے بڑا کتب خانہ بنالیا، حتیٰ کہ وہ کتب خانہ سنبھالا نہیں گیا تو وہ کسی کو دے دیا، پھر چھوٹی سی دوکان لے لی، میں ان سے کتابیں منگواتا یا آپ منگوالیں، یا کوئی اور منگوالیں سال دو سال تو پوچھتے ہی نہیں، اگر ہم نے پوچھ لیا کہ آپ کے پیسے دینے ہیں تو کہتے کہ آجائیں گے جی! پٹھان ہیں، آجائیں گے جی کوئی بات نہیں! دو سال کے بعد پوچھیں کہ بھئی تیرے پیسے میرے ذمہ تھے، آپ سے کتابیں خریدی تھیں، تو جواب دیتے کہ آجائیں گے جی، خود ہی اپنی ذمہ داری پر دو، اس نے ایک دن بھی کسی سے پیسے نہیں مانگے، ایسی اللہ نے اس میں برکت فرمائی کہ دوکان سنبھالے نہیں سنبھلتی۔

تو غرض یہ ہے کہ اس شخص نے کہا کہ عمل وِل تو میرے پاس ہے نہیں، یہ بات ضرور تھی کہ میں نے اپنے لوگوں سے کہہ رکھا تھا کہ آسانی کا معاملہ رکھو، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا یہ محتاج ہوکر اپنے مقروضوں کے ساتھ یہ معاملہ کرتا تھا، میں تو غنی ہوں، اس کو لے جاؤ جنت میں۔

بھائی! معاملات میں سختی نہ کرو، بدزبانی نہ کرو، خوش اخلاقی سے پیش آؤ، غرض یہ ہے کہ خوش اخلاقی اس کا نام ہے، اپنے حقوق کے طلب کرنے میں سختی نہ کرو،

اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں اپنے نفس پر سختی کرو۔

عقل بہترین مصاحب:

اور تیسرا فرمایا عقل سب سے بہترین مصاحب ہے اور مصاحب وہ ہوتا ہے ناں پاس بیٹھنے والا جو مشورہ دیا کرتا ہے کہ یہ ایسے کرلینا چاہئے وغیرہ، تو سب سے بہترین مصاحب عقل ہے، بشرطیکہ عقل، عقل سلیم ہو، عقل صحیح ہو، عقل ایک آئینہ ہے، جس میں اشیاءٔ کی تصویریں صاف صاف منعکس ہوتی ہیں۔ میں غسل خانے میں غسل کرتا ہوں، بعض دفعہ پانی گرم ہوتا ہے تو غسل خانہ میں جو آئینہ لگا ہوا ہے اس پر دھند آجاتی ہے، شکل ہی نہیں دکھاتا، اس کو صاف کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہواؑ و ہوس، خواہشاتِ نفس کا غبار عقل پر آجائے گا، یا دھند آجائے گی تو آپ کو صحیح تصویر نہیں دکھائی دے گی، اور نہ ہی عقل صحیح مشورہ دے گی، عقل کو سلیم ہونا چاہئے، صاف اور شفاف ہونا چاہئے، اغراض سے، نفسانیت سے، خودغرضی سے، لالچ سے، طمع سے، بدگمانی سے، بدخواہی سے، لوگوں کی برائی سے عقل کو صاف شفاف ہونا چاہئے، پھر تمہیں صحیح تصویریں دکھائے گی، اس کی اسکرین پر تمام چیزوں کی تصویریں صحیح آئیں گی، عقل دوربین ہے، لیکن اگر دوربین کے شیشے خراب ہوں تو کیا کرے گی بے چاری؟ لوگ عقل کا تو بہت پرچار کرتے ہیں، لیکن یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے کہ عقل صحیح بھی ہے یا نہیں؟ بھئی عقل کا بھی تو کوئی پیمانہ ہونا چاہئے۔ ہر چیز کا ایک پیمانہ ہوتا ہے، اور ہر چیز کو صیقل کرنے والی ایک چیز ہوتی ہے، لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے اس کو صیقل کرتے ہیں، صاف کرتے ہیں، رگڑتے ہیں، دلوں کو زنگ لگ جاتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَءُ كَمَا تَصْدَءُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ، قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! وَمَا جِلَاؤُهَا؟ قَالَ: كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ." (مشکوٰۃ ص:۱۸۹)

ترجمہ:......''ان دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے، جیسا کہ لوہے کو پانی لگنے سے زنگ لگ جاتا ہے، کہا گیا: یا رسول اللہ! پھر اس کو صیقل کیسے کیا جائے؟ ان کو مانجھا اور صاف کیسے کیا جائے؟ فرمایا: موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا۔''

قلوب کا زنگ تو اس سے صاف ہوگا، لیکن سوال یہ ہے کہ عقل کیسے صاف ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عقل صاف ہوگی شریعت کی ریتی سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی ریتی سے عقل کو ذرا رگڑو تو پھر صاف ہوگی، اور آج اپنی عقل نارسا کے ذریعہ سے لوگ شریعت کے احکام پر اعتراض کرتے ہیں، نکتہ چینی کرتے ہیں، نعوذ باللہ!

بہترین وراثت:

چوتھا فقرہ ہے: ''وَالْاَدَبُ خَيْرُ مِيْرَاثٍ.'' سب سے بہترین وراثت ادب ہے، وراثت تو آپ جانتے ہی ہیں، باپ کی جو جائیداد بیٹے کو ملتی ہے، اس کو وراثت کہتے ہیں، اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ باپ جو سب سے زیادہ قیمتی چیز اولاد کو دے سکتا ہے وہ ادب سکھانا ہے، یہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ:

''مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نَحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ.'' (ترمذی ج:۲ ص:۱۷)

ترجمہ:......''کسی باپ نے اپنی اولاد کو اس سے بہتر تحفہ نہیں دیا جتنا کہ اچھا ادب سکھا دینا۔''

یعنی کسی باپ نے اپنے بچے کو اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں دیا۔ اور سب سے بڑی وحشت عجب اور خود پسندی ہے، یہ بات پہلے بھی آچکی ہے کہ خود پسند آدمی اپنی

دنیا میں، اپنے تنب میں بند رہتا ہے، اس کا کوئی رفیق، مونس وغمخوار نہیں ہے۔

یہ دیکھو کیا کہا؟

دوسری روایت میں ہے کہ یہ نہ دیکھو کس نے کہا؟ یہ دیکھو کیا کہا؟ اگر تم کیا کہا کی تمیز کر سکتے ہو، یہ بات یاد رکھو اگر تم میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ تم کھوٹے اور کھرے کو پہچان سکتے ہو تو پھر یہ دیکھو صحیح کہا یا غلط کہا؟ اور اگر اتنی صلاحیت نہیں تو پھر یہ دیکھو کہنے والا قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ دیکھو میں نے اصول بتادیا، زیادہ تشریح کا موقع نہیں۔

دائمی دوستی:

اور آخری فقرہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کہ ہر دوستی ختم ہونے والی ہے، سوائے اس دوستی کے جس کی بنیاد طمع پر نہ ہو، دوستی اخلاص اور خلوص پر ہو، دوستیاں بھی کئی قسم کی ہوتی ہیں، ایک دوستی نفسانیت کے لئے ہوتی ہے، جیسے آج کل کے لڑکے لڑکیوں کی دوستیاں لگتی ہیں، یہ کہتا ہے مجھے خلوص کی محبت ہے اس کے ساتھ، مجھے معلوم ہے کیسا خلوص ہے؟ میں جانتا ہوں، من خوب می شناسم پیران پارسا را، پاک محبت ہے! میں جانتا ہوں کیسی پاک محبت ہے؟ ایک محبت خلوص پر ہوتی ہے اور ایک محبت فلوس پر ہوتی ہے، خلوص والی محبت پائیدار رہتی ہے اور فلوس والی محبت ختم ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو خلوص کے ساتھ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ جو معاملہ بھی کریں تمہاری محبت قائم رہے گی، اور اگر اللہ سے محبت مطلب کے لئے ہے تو مطلب پورا ہوتا رہے گا تو تم اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے رہو گے اور کہتے رہو گے کہ اللہ تعالیٰ بہت اچھے ہیں، اور اگر خدانخواستہ کبھی معاملہ دوسرا ہوگیا تو شکایتیں کرنے لگو اللہ تعالیٰ کی شکایتیں کرنے لگو گے، حق تعالیٰ شانہ ہمیں خلوص والی محبت نصیب فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

دنیا ـــــــ ایک گزرگاہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

حضرت ابوامامہؓ کا وعظ:

"قَدْ أَخْرَجَ ابْنُ عَسَاكِرٍ عَنْ سُلَيْمَانِ بْنِ حَبِيْبٍ قَالَ دَخَلْتُ فِيْ نَفَرٍ عَلٰى أَبِيْ أُمَامَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَإِذَا شَيْخٌ قَدْ رَقَّ وَكَبُرَ وَإِذَا عَقْلُهٗ وَمَنْطِقُهٗ أَفْضَلُ مِمَّا يُرَىٰ مِنْ مَنْظَرِهٖ فَقَالَ فِيْ أَوَّلِ مَا حَدَّثَنَا أَنَّ مَجْلِسَكُمْ هٰذَا مِنْ بَلَاغِ اللهِ إِيَّاكُمْ وَحُجَّتِهٖ عَلَيْكُمْ فَإِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ بَلَّغَ مَا أُرْسِلَ بِهٖ وَإِنَّ أَصْحَابَهٗ قَدْ بَلَّغُوْا مَا سَمِعُوْا فَبَلِّغُوْا مَا تَسْمَعُوْنَ، ثَلَاثَةٌ كُلُّهُمْ ضَامِنٌ عَلَى اللهِ حَتّٰى يُدْخِلَ الْجَنَّةَ أَوْ يُرْجِعَهٗ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ وَغَنِيْمَةٍ، فَاصِلٌ فَصَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللهِ حَتّٰى يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ اَوْ يُرْجِعَهٗ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ وَغَنِيْمَةٍ، وَرَجُلٌ تَوَضَّأَ ثُمَّ غَدَا اِلَى الْمَسْجِدِ فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللهِ حَتّٰى يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ أَوْ يُرْجِعَهٗ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ وَغَنِيْمَةٍ، وَرَجُلٌ دَخَلَ بَيْتَهٗ بِسَلَامٍ ثُمَّ قَالَ اِنَّ فِيْ جَهَنَّمَ جِسْرٌ لَهٗ سَبْعُ قَنَاطِرَ

اَلا أَوْسَطِهِنَّ الْقَضَاءُ فَيُجَاءُ بِالْعَبْدِ حَتّٰى اِذَا انْتَهٰى اِلَى الْقَنْطَرَةِ الْوُسْطٰى، قِيْلَ مَاذَا عَلَيْكَ مِنَ الدَّيْنِ فَيَحْبَسُهُ ثُمَّ تَلا هٰذِهِ الْآيَةَ: "وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللهَ حَدِيْثًا." فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ عَلَيَّ كَذَا وَكَذَا فَيَقُوْلُ: اَقْضِ دَيْنَكَ فَيَقُوْلَ: مَالِيْ شَيْءٌ مَّا أَدْرِيْ مَا اَقْضِيْ بِهٖ فَيُقَالُ خُذُوْا مِنْ حَسَنَاتِهٖ فَمَا زَالَ يُؤْخَذُ مِنْ حَسَنَاتِهٖ حَتّٰى مَا يَبْقٰى لَهٗ مِنْ حَسَنَةٍ، فَاِذَا فَنِيَتْ حَسَنَاتُهٗ فَيُقَالُ خُذُوْا مِنْ سَيِّأٰتِ مَنْ يَّطْلُبُهٗ فَرَكَّبُوْا عَلَيْهِ، قَالَ فَلَقَدْ بَلَغَنِيْ أَنَّ رِجَالًا يَجِيْئُوْنَ بِأَمْثَالِ الْجِبَالِ مِنَ الْحَسَنَاتِ فَمَا زَالَ يُؤْخَذُ لِمَنْ يَّطْلُبُهُمْ، حَتّٰى مَا يَبْقٰى لَهُمْ حَسَنَةٌ، ثُمَّ يُرَكَّبُ لَهُمْ سَيِّأٰتٌ مَنْ يَّطْلُبُهُمْ حَتّٰى يُرَدَّ عَلَيْهِمْ أَمْثَالِ الْجِبَالِ، ثُمَّ قَالَ اِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَاِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ اِلَى الْفُجُوْرِ، وَالْفُجُوْرُ يَهْدِيْ اِلَى النَّارِ، وَعَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ اِلَى الْبِرِّ، وَالْبِرُّ يَهْدِيْ اِلَى الْجَنَّةِ. ثُمَّ قَالَ أَيُّهَا النَّاسُ لَأَنْتُمْ أَضَلُّ مِنْ أَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ اِنَّ اللهَ تَعَالٰى قَدْ جَعَلَ لِأَحَدِكُمُ الدِّيْنَارَ يُنْفِقُهٗ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ بِسَبْعِمِائَةِ دِيْنَارٍ وَالدِّرْهَمَ بِسَبْعِمِائَةِ دِرْهَمٍ، ثُمَّ اِنَّكُمْ صَارُّوْنَ تُمْسِكُوْنَ اَمَا وَاللهِ لَقَدْ فَتَحَتِ الْفُتُوْحُ بِسُيُوْفٍ مَا حِلْيَتُهَا الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ وَلٰكِنْ حِلْيَتُهَا الْعُلَابِيُّ وَالْآنُكُ وَالْحَدِيْدُ."

(کنز العمال ج:۱۶ ص:۲۱۷ تا ۲۱۹ حدیث:۴۴۲۳۸)

ترجمہ:...... "ابن عساکرؒ نے سلیمانؒ ابن حبیب سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ: میں چند آدمیوں کے ساتھ

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں گیا، دیکھا کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ دبلے پتلے اور بوڑھے ہو چکے ہیں اور دیکھا کہ ان کی عقل اور ان کی گفتگو ان کے منظر سے زیادہ بہتر ہے، سب سے پہلی بات جو آپ نے بتائی، اس میں فرمایا تمہاری یہ مجلس اللہ کی جانب سے تمہارے لئے توشہ اور اس کی طرف سے تمہارے لئے محبت ہے، رسول اللہ ﷺ نے وہ پیغام پہنچا دیا جس کے ساتھ آپ کو بھیجا گیا تھا اور آپؐ کے صحابہؓ نے وہ پیغام پہنچا دیا جو انہوں نے سنا تھا، تم آگے پہنچا دو جو سنتے ہو۔

تین آدمی اللہ کی ذمہ داری میں ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کرے یا اجر اور غنیمت کے ساتھ ان کو واپس کر دے۔

ایک تو وہ شخص جو اپنے قبیلے اور گھر سے جدا ہوا، اللہ کے راستے میں، پس وہ اللہ کی ذمہ داری میں ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمادیں یا اس کو اجر اور غنیمت کے ساتھ واپس کر دیں۔

دوسرا وہ آدمی جس نے وضو کیا پھر مسجد کی طرف چلا گیا، پس وہ اللہ کی امان میں ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کر دیں یا اجر اور غنیمت جو اس نے حاصل کی اس کے ساتھ اس کو واپس کر دیں۔

تیسرا وہ آدمی جو اپنے گھر میں داخل ہوا سلام کے ساتھ، پھر فرمایا کہ جہنم میں ایک بڑا پل ہے، جس کے ساتھ

چھوٹے چھوٹے سات پل ہیں، ان میں سب سے درمیانہ پل پر لوگوں کے معاملات کا فیصلہ ہوگا، پس ایک بندے کو لایا جائے گا یہاں تک کہ جب درمیان پل پر پہنچے گا، تو اس سے کہا جائے گا کہ تیرے ذمہ لوگوں کے حقوق کیا تھے؟ وہ گننے لگے گا، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ''اور وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہیں سکے گا۔'' وہ کہے گا: اے رب! میرے ذمہ فلاں فلاں چیزیں ہیں، کہا جائے گا کہ تیرے ذمہ جو کچھ ہے اس کو ادا کر، وہ کہے گا کہ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں، میں نہیں جانتا کہ کس چیز کے ساتھ ادا کروں، فرمایا جائے گا کہ اس کی نیکیاں لے لو، پس اس کی نیکیاں لی جاتی رہیں گی، یہاں تک کہ اس کے پاس ایک بھی نیکی باقی نہیں رہے گی، جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی، تو فرمایا جائے گا کہ اُس شخص کی برائیاں لو جو اس سے مطالبہ رکھتا ہے، پس لوگ اس پر سوار ہو جائیں گے۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ کچھ لوگ پہاڑوں جتنی نیکیاں لے کر آئیں گے، پس ان نیکیوں سے وصول کیا جاتا رہے گا، مطالبہ کرنے والوں کے لئے، یہاں تک کہ ان کے پاس ایک بھی نیکی نہیں رہے گی، پھر ان پر برائیاں ڈال دی جائیں گی ان لوگوں کی جو اس سے مطالبہ رکھتے ہوں گے اور وہ پہاڑوں کے برابر ہوں گی، پھر فرمایا جھوٹ بولنے سے بچو، کیونکہ جھوٹ بولنا گناہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور گناہ جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔

سچ بولنے کو لازم پکڑو، اس لئے کہ سچ بولنا نیکی کی

ہدایت کرتا ہے اور نیکی جنت میں لے جاتی ہے، پھر فرمایا: لوگو! تم اہل جاہلیت سے بھی گمراہ ہو، اللہ تعالیٰ نے مقرر کردیا ہے کہ تم میں سے کوئی ایک دینار خرچ کرے اللہ کے راستے میں، تو اس کو سات سو دینار دیں گے، اور ایک درہم خرچ کرے، تو سات سو درہم دیں گے، لیکن تم لوگ بچابچا کر رکھتے ہو، اللہ کی قسم! بہت سی فتوحات تلواروں کے ساتھ ہوئیں ہیں، جن تلواروں کا زیور سونا اور چاندی نہیں تھا، بلکہ لوہا اور اس قسم کی دوسری چیزیں تھیں۔‘‘

حضرت عبداللہ ابن بسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مواعظ:

’’اَخْرَجَ الْبَیْھَقِیُّ وَابْنُ عَسَاکِرَ عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ بُسْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اَلْمُتَّقُوْنَ سَادَۃٌ وَالْعُلَمَاءُ قَادَۃٌ وَمُجَالَسَتُھُمْ عِبَادَۃٌ بَلْ ذَالِکَ زِیَادَۃٌ وَاَنْتُمْ بِمَرِّ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ فِیْ اٰجَالٍ مَنْقُوْصَۃٍ وَاَعْمَالٍ مَحْفُوْظَۃٍ وَاَعِدُّوا الزَّادَ فَکَأَنَّکُمْ بِالْمَعَادِ.‘‘

(کنز العمال ج:۱۶ ص:۲۲۲ حدیث:۴۴۲۴۷)

ترجمہ:......’’امام بیہقیؒ اور ابن عساکرؒ نے حضرت عبداللہ ابن بسر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے: متقی لوگ سردار ہیں اور علماً قائد ہیں، ان کی ہم نشینی عبادت ہے بلکہ عبادت سے بھی کچھ اوپر ہے، تم لوگ رات اور دن کی گزرگاہ میں بیٹھے ہو، تمہاری مدتیں مقرر ہیں جو دن بدن کم ہورہی ہیں، تمہارے اعمال محفوظ ہورہے ہیں، اس لئے اپنا توشہ لو، گویا کہ تم میدان محشر میں جمع ہو۔‘‘

سلیمان ابن حبیب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں گیا، ہماری چند آدمیوں کی جماعت تھی، ان کے پاس پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں ہیں، بدن بہت لاغر اور خستہ، لیکن ان کی گفتگو، ان کے ظاہری حلیے سے زیادہ بہتر لگتی تھی، انہوں نے ارشاد فرمایا کہ: تمہاری یہ مجلس کہ جس میں تم میرے پاس بیٹھے ہو، اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہارے لئے توشہ بھی ہے اور تمہارے لئے حجت بھی ہے۔ توشہ اس لئے ہے کہ کچھ حاصل کرلوگے اور اس پر عمل کرلوگے، تو تمہارا کام بن جائے گا اور اللہ کی جانب سے حجت اس لئے ہے کہ تم نے سنا اور عمل نہیں کیا، بلکہ یہاں سے کپڑے جھاڑ کر اٹھ گئے، تو قیامت کے دن یہ مجلس تمہارے خلاف حجت بن جائے گی۔

پھر ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر جو کچھ نازل کیا گیا اور جس میں لوگوں کا نفع تھا، آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو پہنچا دیا، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے جو کچھ سنا وہ آگے پہنچا دیا اور تم جو کچھ سن رہے ہو تم آگے پہنچادو، جو بات آج سنو اس کو آگے پہنچا دینا۔

تین آدمی اللہ کی ذمہ داری میں ہیں:

میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ تین آدمی اللہ کی ذمہ داری میں ہیں۔ ایک تو وہ جو اپنے گھر سے جدا ہوا اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے لئے، وہ اللہ کی ذمہ داری میں ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کردیں، یعنی وہ شہید ہوجائے اللہ کے راستے میں، یا مال غنیمت اور ثواب کے ساتھ اس کو گھر میں واپس کردیں۔

دوسرا وہ شخص جو اپنے گھر سے نکلا اللہ کے گھر کی زیارت کے لئے، یعنی نماز پڑھنے کے لئے مسجد گیا وہ بھی اللہ تعالیٰ کی ضمانت میں ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کردیں، راستے میں موت آجائے، مسجد میں مرجائے، آتے جاتے

مرجائے، یا اس کو اجر وثواب کے ساتھ واپس کردیں، خیریت کے ساتھ اس کی گھر واپسی ہوجائے۔

تیسرا وہ آدمی اللہ تعالیٰ کی ضمانت میں ہے جو گھر میں داخل ہوا ہو السلام علیکم کہہ کر، بھائی! گھر میں جاؤ تو گھر میں جاتے ہوئے السلام علیکم کہو، گھر کے دروازے پر جاؤ تو دروازے پر داخل ہوتے وقت السلام علیکم کہو، پھر گھر کا جو آدمی بھی ملے اس کو السلام علیکم کہو۔

سلام کی برکت:

یوں آتا ہے کہ دوشیطانوں کی آپس میں ملاقات ہوئی، ایک شیطان کسی مسلمان پر مسلط تھا۔ دوسرا شیطان کسی کافر پر مسلط تھا، یا کسی منافق بے ایمان پر، مسلمان کا شیطان بہت دبلا پتلا لاغر اور وہ دوسرا بہت موٹا تازہ، وہ کہنے لگا کہ بھائی تمہیں کیا ہوا؟ کہنے لگا نہ مجھے رہنے کو جگہ ملتی ہے اور نہ کھانے کو ملتا ہے اور نہ کوئی اور حصہ ملتا ہے، جب وہ گھر میں جاتا ہے تو بسم اللہ پڑھ کر کے دروازہ بند کرلیتا ہے اور گھر والوں کو السلام علیکم کہتا ہے، میرا داخلہ ممنوع، کھانا کھانے بیٹھتا ہے تو بسم اللہ پڑھ کر کے کھانا شروع کرتا ہے، تو میرا داخلہ ممنوع، کسی چیز میں بھی میرا حصہ نہیں، کافر کا شیطان کہنے لگا مجھے تو خوب حصہ ملتا ہے بسم اللہ کہہ کر گھر میں داخل نہیں ہوتا اور دروازہ بند نہیں کرتا، بسم اللہ کہہ کر کے کھانا نہیں کھاتا اور بسم اللہ کہہ کر کے لیٹتا نہیں، مجھے کھانے کو بھی ملتا ہے، رہنے کو بھی ملتا ہے اور لیٹنے کو بھی ملتا ہے، تو جو شخص کہ السلام علیکم پڑھ کر کے گھر میں داخل ہو، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں یہ شخص اللہ کی ضمانت میں ہے۔

جہنم کے سات پُل:

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جہنم کے پل پر سات منزلیں آئیں گی۔ ایک منزل پر حساب وکتاب ہوگا لوگوں کے معاملات کا، لین دین کا، ایک آدمی سے کہا

جائے گا کہ تیرے ذمہ کوئی لین دین ہے تو پورا کردو، وہ حساب شروع کرے گا جانے کتنی دیر حساب میں لگے گی، ساری زندگی کا لین دین ہے، پھر اس سے کہا جائے گا کہ ادا کرو، عرض کرے گا کہ یاالٰہی کہاں سے ادا کروں؟ میرے پاس تو کوئی بھی چیز نہیں ہے، گھر والوں نے تو کپڑے بھی اتار لئے تھے، مکان میں تو کیا جگہ ملتی کپڑے بھی اتار لئے، فرمایا جائے گا کہ یہاں نیکیوں کا سکہ چلتا ہے، لوگوں کو نیکیاں دے دو، ارباب حقوق کو، جن جن کے ذمہ تمہارے حقوق ہیں، ان کو اپنی نیکیاں بانٹ دو، لوگ چڑھ آئیں گے اس کے اوپر، نیکیوں کی لوٹ مار کرنے لگیں گے یہاں تک کہ اس کی نیکیاں ختم ہوجائیں گی، مگر حقوق ختم نہیں ہونگے، تو اعلان ہوگا کہ لوگوں کے گناہ لے کر اس کے ذمہ ڈال دو، لوگوں کے گناہ لے کر اس کے ذمہ ڈال دیئے جائیں گے اس کے حقوق کے بقدر۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ لوگ پہاڑوں کے برابر نیکیاں لے کر آئیں گے، مگر سب نیکیاں ختم ہوجائیں گی۔ نعوذ باللہ! استغفر اللہ! معاذ اللہ!

حقوق کا اہتمام کرو!

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا، پھر عرض کرتا ہوں، ہم لوگوں نے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں کوتاہیاں کیں، اور من مانی زندگی گزار رہے ہیں حافظ شیرازیؒ کہتے ہیں کہ لوگ اللہ کے معاملے میں ایسا کھوٹ اور ایسی جعلسازی کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ انصاف کے دن پر، قیامت کے دن پر ایمان ہی نہیں رکھتے، ہم بچپن سے جوانی میں گئے، جوانی سے کہولت میں گئے، کہولت سے اب بال سفید ہوگئے، اس کے بعد قبر ہے، اس سانس کی آمد و رفت کب بند ہو جائے، اللہ ہی کو معلوم ہے، لیکن ہمیں کوئی ہوش نہیں اور کوئی احساس نہیں کہ بھائی جو لین دین ہے وہ یہیں کرلیں۔

مخلص گناہ گار کا قصہ:

میں نے ایک حکایت سنائی تھی کہ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں ایک آدمی آیا، کہا بیعت ہونا چاہتا ہوں، فرمایا کیا کام کرتے ہو؟ کہا جی پہلے چوری کیا کرتا تھا، ڈاکے ڈالا کرتا تھا، اب توبہ کرلی ہے، بیعت ہونا چاہتا ہوں، فرمایا بہت اچھا، سوچ سوچ کر فہرست بنا کر کے لاؤ کہ تم نے اپنی زندگی میں کتنے لوگوں کی چوری کی اور کتنے ڈاکے ڈالے ہیں؟ آدمی مخلص تھا، فہرست بنالایا، پتہ نہیں کتنے دن لگے ہوں گے غریب کو، حضرتؒ نے فرمایا کہ اب ایسا کرو کہ ہر ایک کے پاس جاؤ کہ میں نے فلاں وقت تمہارے گھر میں چوری کی تھی، اتنا مال چرایا تھا۔ ہر ایک سے دستخط کروا کے لاؤ کہ وہ معاف کرتا ہے، یا وصول کرتا ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ مخلص آدمی تھا، سب کے پاس گیا، سب سے دستخط کروا کے لایا اور سب نے لکھا کہ میں اللہ کے لئے معاف کرتا ہوں، یہاں تک کہ ایک ہندو نے لکھا کہ میں حَسْبَتاً للہ معاف کرتا ہوں، زبان سے کسی کو ایذا پہنچائی ہو، ہاتھ سے کسی کو ایذا پہنچائی ہو، غیبت کی ہو، تہمت لگائی ہو، ایذا پہنچائی ہو، کسی طرح پہنچائی ہو، کسی کی بے آبروئی کی ہو، کسی کا مال کھایا ہو، یہیں صاف کروالو، اس پل پر معاملہ صاف کروانا ذرا مشکل ہے۔

یہاں نہیں تو وہاں حساب دینا ہوگا!

کہتے ہیں ایک بڑھیا تھی بڑھیا، بادشاہ کا محل بن رہا تھا، بادشاہ کے کارندوں نے کہا کہ تمہاری کٹیا بادشاہ کے محل میں آتی ہے، تم اس کو دے دو، تمہیں معاوضہ ادا کردیں گے، اس نے کہا میں نہیں دیتی، وہ بیچاری بڑھیا کیا کرسکتی تھی؟ انہوں نے زبردستی بڑھیا کی کٹیا کو محل میں شامل کرلیا، محل تیار ہوگیا، تو بادشاہ سلامت دیکھنے کے لئے آئے تو راستے میں ایک چھوٹی سے نہر تھی اس کو عبور کرکے آنا تھا، بڑھیا راستہ میں بیٹھ گئی، بادشاہ کی سواری وہاں پہنچی تو بڑھیا نے لگام پکڑلی، بادشاہ کے گھوڑے کی لگام

پکڑ لی اور کہا بادشاہ سلامت! آپ کے کارندوں نے مجھ غریب کا مکان آپ کے محلات میں شامل کرلیا ہے، ہر چند میں انکار کرتی رہی، لیکن انہوں نے نہیں چھوڑا، اب بتاؤ کہ حساب اس پل پر دینا ہے یا اس پل پر دینا ہے، کوئی نواب ہوگا اپنے گھر میں ہوگا، کوئی رئیس ہوگا اپنے گھر میں ہوگا، بڑا ہوگا اپنے گھر میں ہوگا، چھوٹا ہوگا اپنے گھر میں ہوگا، لیکن قیامت کے دن سب برابر ہوں گے، نہ کوئی بڑا ہے، نہ کوئی چھوٹا ہے، نہ بادشاہ ہے، نہ فقیر ہے، تو میاں حساب اسی پُل پر دے دو، اس پُل کے بجائے۔

سچ کی برکت اور جھوٹ کی نحوست:

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جھوٹ سے پرہیز کرو اس لئے کہ جھوٹ برائی کی دعوت دیتا ہے اور برائی جہنم میں لے جاتی ہے، سچائی کو لازم پکڑو، اس لئے کہ سچائی نیکی کی رہنمائی کرتی ہے اور نیکی جنت میں لے جاتی ہے۔

حدیث میں فرمایا ہے:

"اِنَّ الرَّجُلَ يَصْدُقُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيْقًا ..... وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّابًا."

(مسلم ج:۲ ص:۳۲۵)

ترجمہ:...... "ایک آدمی سچ بولتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ سچ بولوں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں صدیق لکھا جاتا ہے (سچ بولنے والا)، اور ایک آدمی جھوٹ بولتا ہے اور قصد کرتا ہے جھوٹ بولنے کا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے (جھوٹ بولنے والا)۔" نعوذ باللہ!

ہمارا نام صدیقوں میں لکھا گیا ہے یا کذابوں میں؟ یہ بھی سوچو۔

انفاق فی سبیل اللہ کا ثواب:

اس کے بعد حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لوگو اہل جاہلیت جتنے گمراہ تھے، ایسا لگتا ہے کہ تم ان سے بھی زیادہ گمراہ ہو، جاہلیت کے لوگوں سے زیادہ گمراہ ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایک ایک کے ساتھ سات سو گنا دینے کا وعدہ کر رکھا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

''مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ وَّاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَآءُ.'' (آل عمران:۲۶۱)

ترجمہ:...... ''مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اللہ کے راستے میں، مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی نے بیج ڈالا اور ایک بیج سے سات خوشے نکلے اور ہر خوشے پر سو دانے تو سات سو ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ بڑھا دیتا ہے جس کے لئے چاہے۔''

یہ بھی کوئی تحدید نہیں ہے کہ ایک کے سات سو دیں گے، ایک روپیہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے، محض اللہ کی رضا کے لئے تو ایک کے سات سو ملیں گے، یہ آخری حد نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتے ہیں بڑھاتے ہیں، سات سو کے بجائے سات ہزار بنا دیتے ہیں، سات لاکھ بنا دیتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اندازہ ہی نہیں ہے ہم لوگوں کو اندازہ نہیں ہے۔

نیکیوں کے پہاڑ:

حدیث شریف میں فرمایا کہ:

''مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ وَلَا يَقْبَلُ اللّٰهُ اِلَّا الطَّيِّبَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتَقَبَّلُهَا بِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ يُرَبِّيْهَا

لِصَاحِبِهَا كَمَا يُرَبِّىْ اَحَدُكُمْ فَلُوَّهٗ حَتّٰى تَكُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ." (مشکوٰۃ ص:۱۶۷)

ترجمہ:...... "ایک آدمی اللہ کے راستے میں صدقہ کرتا ہے، ایک کھجور کے برابر حلال پاکیزہ مال میں سے، اور اللہ پاک پاکیزہ مال ہی قبول فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہاتھ میں لے کر بڑھاتے رہتے ہیں جیسا کہ تم میں سے ایک آدمی اپنے بچھیرے کی (گھوڑی کے بچے کی) خدمت کرتا ہے اور اس کو پالتا ہے، یہاں تک کہ جب بندہ قیامت کے دن حاضر ہوگا تو ایک کھجور کے برابر صدقہ جو اللہ کی رضا کے لئے کیا، پہاڑ کے برابر ہوگا۔"

تو اللہ تعالیٰ نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے ایک کے سات سو دینے کا، بلکہ اس سے زیادہ دینے کا "لَا يَحْسَبُهٗ أَحَدٌ" جس کا کوئی شخص حساب نہیں کرسکتا، لیکن تم لوگ عجیب آدمی ہو، روک روک کر گھروں میں رکھتے ہو، اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی حد:

یہ مطلب نہیں ہے کہ سب کچھ لٹا دو، رکھنے کی اجازت نہیں ہے، ضرورت کا گھر میں بھی رکھ سکتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر میں بکری ذبح کرائی، خود باہر تشریف لے گئے کسی کام سے، اور فرما گئے کہ اس کا گوشت تیار ہوجائے تو تقسیم کردینا لوگوں کو، حکم کی تعمیل کی گئی واپس تشریف لائے تو فرمایا کہ گوشت تقسیم کردیا تھا؟ عرض کیا: جی! فرمایا کچھ بچا بھی؟ کہا: جی کہ صرف ران بچی ہے، باقی سارا تقسیم ہوگیا، فرمایا وہی ران نہیں بچی، باقی سارا بچ گیا، وہی ایک ران نہیں بچی، ہم آپ کو یہ تو نہیں کہتے کہ سب کچھ لٹا دو، کنگال بن جاؤ، کیونکہ ہم سے اس کا تحمل نہیں ہوسکے گا، ہم کمزور

ہیں، لیکن اتنا تو جانیں کہ جو اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں وہ بچ جاتا ہے اور جو گھر میں خرچ کرتے ہیں وہ ضائع ہوجاتا ہے۔

قیامت کی سرداری:

حضرت عبداللہ ابن بسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے فرماتے ہیں کہ متقی لوگ سردار ہوں گے، یہاں لوگوں کو مختلف وجوہات سے سرداری ملتی ہے، لیکن قیامت کے دن سرداری ملے گی تقویٰ پر، جتنا زیادہ متقی ہوگا، اتنا بڑا سردار ہوگا اور علماً قائد ہوں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی توفیق عطا فرمائے کہ صحیح معنوں میں قائد، عالم باعمل، عالم ربانی، عالم حقانی کے پاس بیٹھا کریں، اور علماً کے پاس بیٹھنا عبادت ہی نہیں، بلکہ عبادت سے بھی کچھ زیادہ ہے، کیونکہ بعض اوقات ایک بات مل جاتی ہے اللہ کے کسی بندے کے منہ سے جس سے ہمارا بیڑا پار ہوجاتا ہے۔

رات دن کی گزرگاہ:

اس کے بعد فرمایا کہ تم رات اور دن کی گزرگاہ پر بیٹھے ہو، رات گئی دن آیا، دن گیا، رات آئی دن و رات کی آمد و رفت ہو رہی ہے، آتے ہیں جاتے ہیں، آتے ہیں جاتے ہیں، بعض احمق سالگرہ مناتے ہیں، میری اتنی ویں سالگرہ ہے اور بعض تو مرے ہوؤں کی سالگرہ مناتے ہیں، جو مرجاتا ہے اس کے مرنے کی تاریخ کو لوگ برسی مناتے ہیں اور زندوں کی سالگرہ مناتے ہیں، پوچھ لو یہ جو تم جس کی سالگرہ منارہے ہو، اللہ کی رحمت میں ہے یا اللہ کے غضب میں ہے؟ اور جس کی تم برسی منارہے ہو، وہ جہنم کے گڑھے میں ہے یا جنت کے باغیچے میں ہے؟ جو کچھ غیر قوموں سے سیکھ لیا، اس پر عمل کرنا شروع کردیا، اور کہتے ہیں میرے لڑکے کی سالگرہ ہے، میری لڑکی کی سالگرہ ہے، میری سالگرہ ہے اور بیوی کی سالگرہ ہے اور پھر اس موقع پر تحفے تحائف لئے دیئے جاتے ہیں، عقل کو پتہ نہیں کہاں لوگوں نے استعمال کرنا شروع

کردیا، بھلا کیا یہ چیز خوشی کی ہے بیسویں سالگرہ ہے، یعنی بیس سال کی عمر ہوگئی؟ بالغ ہونے سے پہلے پہلے تو کوئی ذمہ داری نہیں تھی، ذرا حساب کر کے تو دیکھو کہ بالغ ہونے کے بعد جو وقت گزرا ہے ہمارے حق میں گیا یا ہمارے اوپر وبال بن گیا؟ اس پر رونا چاہئے یا سالگرہ منانی چاہئے؟ مردوں کی برسی مناتے ہو، وہ قبر میں ہے، پتہ نہیں اس کی ہڈیوں کا نام ونشان رہا بھی یا نہیں رہا، اللہ جانے وہ کس حالت میں ہے؟ اگر کوئی مردہ واپس آجائے اور اپنا حال سنائے، پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم تو ان کی سالگرہ مناتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ مردوں پر جو گزرتی ہے میں اللہ سے دعا کرتا کہ تمہیں بھی کچھ سنا دیتا، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تم مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے، ہمت نہیں کرو گے قبرستان جانے کی، اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے، تو حضرت عبداللہ ابن بسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگو تم رات اور دن کی گزرگاہ میں ہو: ''آجَالٌ فِیْ آجَالٍ مَنْقُوْصَۃٍ'' تمہاری عمریں لکھ کر کے دے دی گئی ہیں، ایک ایک دانہ کر کے کم ہورہا ہے:

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹا دی

یہ الارم ہوتے ہیں اس میں ایک ایسا پتھر ہوتا ہے، میں اس کو دیکھنے کا تحمل نہیں کرسکتا، اس لئے کہ ایک جو ادھر گیا ختم ہوگیا، ہماری زندگی میں سے اتنا ختم ہوگیا اور اعمال محفوظ ہیں، اچھے اعمال ہیں یا برے اعمال ہیں وہ لکھے ہوئے ہیں، محفوظ ہیں، برے اعمال سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لو، توبہ کرلو اور نیک اعمال کو محفوظ رکھو۔

توشہ لینے کا وقت ہے:

اور آخر میں فرمایا توشہ لینے کا وقت ہے، توشہ! یہ سمجھ کرلو کہ تم میدان محشر

میں جمع ہو گئے ہو، تمہیں توشہ لینے کی ضرورت ہے اور تم محتاج ہو، کل کو موقع نہیں ملے گا، آج موقع ہے الحمدللہ یہ باب ختم ہوگیا، اب اگلا باب آئے گا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ تائیدات غیب کا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کس طرح ان کے شامل حال تھی، اے اللہ! جتنی کوتاہیاں اور لغزشیں ہیں ہماری، ان کو معاف فرمادے، شکل و صورت رسول اللہ ﷺ جیسی بناؤ، اعمال رسول اللہ ﷺ کے مطابق بناؤ اور اپنے آپ کو غفلت میں نہ ڈالو، جن کی عمریں ابھی چھوٹی ہیں وہ اس غفلت میں نہ رہیں کہ ہماری عمریں بہت ہیں کوئی پتہ نہیں کب داعی اجل آجائے اور ہم چلتے بنیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

مطلب پرستی کا دور!

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

"فَقَدْ اَخْرَجَ اَحْمَدُ عَنْ شَيْخٍ مِّنْ بَنِىْ تَمِيْمٍ قَالَ خَطَبَنَا عَلِىٌّ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ اَوْ قَالَ: قَالَ عَلِىٌّ: يَأْتِىْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ عَضُوْضٌ يَعَضُّ الْمُوْسِرُ عَلٰى مَا فِىْ يَدَيْهِ قَالَ وَلَمْ يُؤْمَرْ بِذٰلِكَ، قَالَ عَزَّ وَجَلَّ:"وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ." وَيَنْهَدُ الْاَشْرَارُ وَيُسْتَذَلُّ الْاَخْيَارُ وَيُبَايِعُ الْمُضْطَرُّوْنَ، قَالَ وَقَدْ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْمُضْطَرِّيْنَ وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ وَعَنْ بَيْعِ الثَّمَرَةِ قَبْلَ اَنْ تُدْرِكَ." (مسند احمد ج:۱ ص:۱۱۶)

"وَاَخْرَجَ اَحْمَدُ عَنْ اَبِىْ عُبَيْدٍ مَّوْلٰى عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ: ثُمَّ شَهِدْتُهٗ مَعَ عَلِيٍّ رَضِىَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَصَلّٰى قَبْلَ اَنْ يَّخْطُبَ بِلَا اَذَانٍ وَّلَا اِقَامَةٍ ثُمَّ خَطَبَ فَقَالَ: يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ نَهٰى اَنْ تَأْكُلُوْا نُسُكَكُمْ بَعْدَ ثَلٰثِ لَيَالٍ، فَلَا تَأْكُلُوْهَا بَعْدُ." (مسند احمد ج:۱ ص:۱۴۱)

"وَاَخْرَجَ اَحْمَدُ عَنْ رِبْعِيِّ بْنِ حِرَاشٍ اَنَّهُ سَمِعَ عَلِيًّا رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَخْطُبُ يَقُوْلُ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَكْذِبُوْا عَلَيَّ فَاِنَّهُ مَنْ يَكْذِبْ عَلَيَّ يَلِجِ النَّارَ." (مسند احمد ج:۱ ص:۱۵۰)

ترجمہ:...... "مسند احمد میں بنوتمیم کے ایک شیخ سے روایت ہے کہ ہمیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا، یا فرمایا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہ لوگوں پر ایک وقت آئے گا کہ مالدار اپنے مال کو دانتوں کی کچلیوں سے پکڑے گا، فرمایا حالانکہ اس کو اس کا حکم نہیں دیا گیا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "اور نہ بھولا کرو فضیلت کو آپس میں۔" اور برے لوگ اوپر آجائیں گے، اچھے لوگ ذلیل سمجھے جائیں گے، اور لوگ مجبوری کا سودا کیا کریں گے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبور آدمی کی بیع سے منع فرمایا ہے، اور دھوکہ کی بیع سے اور پھلوں کے آنے سے پہلے پھل کی بیع سے۔

مسند احمد میں حضرت ابوعبیدہ مولیٰ عبدالرحمٰن ابن عوفؓ سے روایت ہے کہ میں عیدالاضحیٰ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حاضر ہوا، پس آپؓ نے خطبہ دیا، اور فرمایا: لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ تم اپنی قربانیوں کا گوشت کھاؤ تین دن کے بعد، لہٰذا اس کے بعد نہ کھایا کرو۔

مسند احمد میں ربعی بن حراشؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا، اس میں انہوں نے ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا ہے کہ: میرا نام لے کر جھوٹ نہ بولا کرو، اس لئے کہ جو مجھ پر جھوٹ باندھتا ہے وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔"

کاٹ کھانے کا دور:

یہ تین خطبے ہیں، یہاں ان میں سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نقل کئے گئے ہیں، ان میں سے پہلے خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک کٹکھنہ زمانہ آئے گا، یعنی کاٹ کھانے والا، مطلب پرستی کا یہ عالم ہوگا کہ ان میں سے ہر آدمی دوسرے کو کاٹ کھانا چاہے گا، اور اس زمانے میں مالدار لوگ اپنے مال پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں گے، اور مال کو گویا کچلیوں سے مضبوط پکڑ لیں گے کہ کہیں ہاتھ سے نکل نہ جائے، حالانکہ ان کو یہ حکم نہیں دیا گیا، اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اس فضیلت کو بھولا نہ کرو، مالداروں کو اللہ تعالیٰ نے فقراً پر مال کی وجہ سے فضیلت دی ہے، تو اس کو نہ بھولا کریں، اسی طرح جتنے بھی اہل فضیلت ہیں ان کو آپس کی فضیلت کو بھولنا نہیں چاہئے، میاں بیوی کے درمیان جدائی ہوجائے، یعنی بیوی کو طلاق ہوجائے، تو وہاں اس کے ذیل میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات قرآن کریم میں ارشاد فرمائی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر عورتوں کے آباد ہونے سے پہلے تم ان کو طلاق دے دو تو کوئی مضائقہ نہیں، یعنی رخصتی سے پہلے طلاق دینے پر کوئی مضائقہ نہیں، پھر اگر مہر مقرر کیا گیا تھا تو آدھا مہر ادا کرو، اور اگر مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا تو حیثیت کے مطابق ان کو کچھ سامان دے دو، اس مسئلے کو ذکر کرکے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِلَّا اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ." آدھے مہر کا ادا کرنا یا عورت کو آدھے مہر کے بدلے متعہ دینا یعنی سامان دینا لازم ہے، الّا یہ کہ عورت معاف کردے، اور عورت کہہ دے کہ میں مہر نہیں لیتی، یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے یعنی شوہر وہ

معاف کردے، وہ کہہ دے: آدھا نہیں بلکہ پورا مہر دوں گا، یہ آدھا مہر چھڑواؤں گا نہیں، بلکہ پورا ادا کروں گا، اس کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا: "وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ." اور تم آپس میں اپنی بڑائی اور فضیلت کو بھولا نہ کرو، تم میں جو بڑا ہے اس کو بڑے اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہئے، اور جتنے بڑے اخلاق کا مظاہرہ کرو گے اسی کے مطابق تمہاری فضیلت اللہ کے یہاں قائم ہوگی، اور اگر گھٹیا پن کا ثبوت دو گے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں گھٹیا سمجھے جاؤ گے، تو اس سیاق میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ تم آپس کی فضیلت کو بھولا نہ کرو، اگر اللہ نے تم میں سے کسی کو فوقیت دی ہے کسی چیز میں، یعنی فضیلت عطا فرمائی ہے تو اس فضیلت کا حق بھی ادا کرو، اس کو نہ بھولو، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ یہ زمانہ ایسا ہوگا کہ اس میں اشرار اور برے لوگ تو اوپر آجائیں گے، یعنی چوہدری اور لیڈر ہوں گے، ان کی مانی جاتی ہوگی، حالانکہ آدمی دو پیسے کے بھی نہیں ہوں گے، اور اخیار یعنی نیک اور اچھے لوگ ذلیل ہوجائیں گے، کوئی ان کو پوچھے گا نہیں، کوئی ان کو سنے گا نہیں۔

تنزل و انحطاط کا زمانہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے آج تک زمانہ تنزل اور انحطاط میں ہے، چنانچہ صحیح بخاری شریف میں ہے:

"قَالَ اَتَيْنَا اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَشَكَوْنَا اِلَيْهِ مَا نَلْقٰى مِنَ الْحَجَّاجِ، فَقَالَ اصْبِرُوْا فَاِنَّهُ لَا يَأْتِيْ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ اِلَّا الَّذِيْ بَعْدَهٗ شَرٌّ مِّنْهُ حَتّٰى تَلْقَوْا رَبَّكُمْ، سَمِعْتُهٗ مِنْ نَّبِيِّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ."

(بخاری ج:۲ ص:۱۰۴۷)

ترجمہ:...... "ہم لوگ حضرت انس رضی اللہ عنہ (جو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حجاج بن یوسف کی طرف سے (جو اس امت میں بڑا ظالم ہوا ہے) جو سختی ہمیں پہنچ رہی تھی، اس کی ہم نے ان سے شکایت کی، تو ارشاد فرمانے لگے کہ: صبر سے کام لو بھائی! اس لئے کہ تم پر جو وقت بھی آئے گا اس کے بعد کا وقت اس سے بدتر ہوگا، یہ بات میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی ہے۔''

راز اس کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ نبوت کی وجہ سے نورانیت کا زمانہ تھا، علوم کے اندر صلاحیت، تقویٰ اور خوفِ خداوندی کی استعداد نمایاں تھی، جوں جوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بُعد ہوتا گیا اسی نسبت سے یہ استعداد کم ہوتی چلی گئی۔

حق پرستوں کی ایک جماعت رہے گی:

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ امت بانجھ نہیں ہے، اللہ کے بندے ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہے اور ان شاٗ اللہ قیامت تک ہوتے رہیں گے، جو اللہ تعالیٰ کے دین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت کو سینے سے لگائے رکھیں گے، علماً، عملاً، حالاً، ذوقاً، ہر اعتبار سے دین کی حفاظت کریں گے۔

میں نے ایک موقع پر ان احادیث کو جمع کیا تھا، تقریباً پندرہ صحابہؓ سے یہ حدیث مروی ہے:

''لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ وَلَا مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰی یَأْتِیَ اَمْرُ اللهِ وَهُمْ عَلٰی ذَالِکَ.'' (ترمذی ج:۲ ص:۴۷)

ترجمہ:...... ”یعنی ایک جماعت میری امت میں سے ہمیشہ قائم رہے گی حق پر، کوئی ان کی مخالفت کرے اور کوئی ان کی مدد سے دست کش ہوجائے، ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے یعنی قیامت (اور قیامت کی علامتوں میں سب سے بڑی علامت ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور دجال کا آنا)۔“

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ: ”حَتّٰی یَأْتِیَ عِیْسٰی ابْنُ مَرْیَمَ۔“ (مسلم ج:۱ ص:۸۷) (یعنی یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوجائیں)۔

پھیکا رنگ:

تو بے شک یہ امت کبھی بھی بانجھ نہیں ہوگی، ایسا نہیں ہوگا کہ دین مٹ جائے، ایسا نہیں ہوگا کہ کتاب وسنت کا صحیح علم باقی نہ رہے، ایسا نہیں ہوگا کہ دین پر کوئی عمل کرنے والا باقی نہ رہے، ایسا نہیں ہوگا کہ اس دین کی تعلیم وترویج، اس کی نشر واشاعت کا سلسلہ منقطع ہوجائے، نہیں! ہمیشہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ ایک الگ چیز ہے اور وہ پہلی چیز الگ ہے، یعنی رنگ بدلتا رہے گا، جوں جوں زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بابرکت زمانے سے دور ہوتا جائے گا، اسی نسبت سے اس کی نورانیت کم ہوتی جائے گی، اور ظلمت بڑھتی جائے گی، اور قلوب کی استعداد کمزور پڑتی جائے گی، دین داری کا رنگ پھیکا ہوتا جائے گا۔

اہل اللہ کا ذوق:

ایک بزرگ تھے، وہ رات کو روٹی پکاتے، صبح کھاتے تھے، اور صبح کی روٹی شام کو کھاتے تھے، تازہ روٹی نہیں کھاتے تھے، فرماتے اس سے زیادہ وقت رہ نہیں سکتی

روٹی کیونکہ جورات کی روٹی ہے اس کو بارہ گھنٹے قرب حاصل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے، اور اس میں نورانیت زیادہ ہے بنسبت تازہ روٹی کے، یہ ذوق کی بات ہے، مسئلہ نہیں ہے کہ ایسا کیا جائے، محبت اور ذوق کی بات ہے، عام مزاج یہ ہے کہ لوگ جدت کو پسند کرتے ہیں اس لئے وہ ''جدت پسندی'' کے قائل ہیں، لیکن اللہ والوں کا ذوق ہے ''قدامت پسندی''، یعنی جتنی پرانی چیز ہے، اتنی زیادہ لائق قدر ہے، اس لئے کہ اس کو نسبت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے۔

اشرار کا زمانہ:

ایک زمانہ گزرا جبکہ اخیار کا غلبہ تھا اور اشرار تھے ہی نہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا زمانہ یہی تھا، پھر آہستہ آہستہ اشرار بھی پیدا ہونے لگے، لیکن غلبہ اخیار کا ہی رہا، نیک لوگوں کا، اچھے لوگوں کا، شریف اور دیندار لوگوں کا، اور پھر چلتے چلاتے یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ اشرار کا غلبہ ہوگیا، لیکن اخیار کی بات بھی سنی جاتی تھی، اچھے لوگوں کی بات بھی سنی جاتی تھی، اور ان کا احترام کیا جاتا تھا، ان کی بات کو بہر حال وزن دیا جاتا تھا، جس زمانے کی بات یہاں کر رہے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اشرار غالب ہوں گے، ان کو فوقیت حاصل ہوگی اور اخیار ذلیل ہوں گے اور ان کو نظر حقارت سے دیکھا جائے گا، فانا للہ وانا الیہ راجعون!

مجبوری کی بیع:

اور ارشاد فرمایا کہ اس زمانے میں ''بَیْعِ الْمُضْطَرِّیْنَ'' ہوگی، یعنی ایک آدمی اپنی مجبوری کے عالم میں اپنی چیز فروخت کرنا چاہے گا، تو اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگ اونے پونے لینے کی کوشش کریں گے۔

ابونواز شاعر کا قصہ:

میں نے ابونواز شاعر کا قصہ تمہیں سنایا تھا کہ اس کے پڑوسی کو اپنا مکان

فروخت کرنے کی ضرورت پیش آئی، تو خریدار نے پوچھا کہ کتنی قیمت ہے؟ کہنے لگے: بیس ہزار! کہنے لگے: بیس ہزار تو تمہارے مکان کی قیمت نہیں ہے، تم زیادہ بول رہے ہو، تو مالک مکان کہنے لگا کہ آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں، میرا مکان بیس ہزار کا نہیں ہے، دس ہزار کا ہے، میں دس ہزار مکان کی قیمت لے رہا ہوں اور دس ہزار ابونواز کے پڑوس کی قیمت لے رہا ہوں، یہ مکان ابونواز شاعر کے پڑوس میں ہے، صرف مکان نہیں بیچ رہا، بلکہ ساتھ کے ساتھ ابونواز شاعر کا پڑوس بھی دے رہا ہوں، تو اس نے کہا کہ بیچتے کیوں ہو؟ کہنے لگے: میں بالکل نہ بیچتا لیکن ضرورت پیش آ گئی ہے بیچنے کی، ابونواز کو اس کا پتہ چلا تو اس کو بلایا اور بلا کر پوچھا: کیوں مکان بیچتے ہو؟ کہا: حضور! ضرورت پیش آ گئی ہے، بیچنا ہے، پوچھا: کتنی قیمت ہے مکان کی؟ اور تمہاری ضرورت کتنی ہے؟ انہوں نے کہا: مکان بھی دس ہزار کا اور میری ضرورت بھی دس ہزار کی ہے، ابونواز نے دس ہزار درہم اس کو دیئے اور کہا کہ: یہ تمہارے مکان کی قیمت ہے، اور دس ہزار مزید دیئے اور کہا کہ: یہ ابونواز کے پڑوس کی قیمت ہے۔

مؤرخ اس قصے کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ مسلمانوں پر ایک وقت ایسا گزرا ہے جبکہ شاعروں کے مکان میں اخلاقیت تھی، اس وقت اللہ کے نیک بندوں کے اور دوسرے لوگوں کے اخلاق کیسے ہوں گے؟ ایک شرابی ابونواز ــ عام طور پر شاعر اس قسم کی حرکتیں کیا کرتے ہیں ــ اس کے اخلاق یہ تھے تو اللہ والوں کے اخلاق کیا ہوں گے؟ تو غرض یہ ہے کہ "بَیْعُ الْمُضْطَرِّیْنَ" ہوگی، یعنی لوگ مجبوری کی وجہ سے اپنی چیز فروخت کریں گے اور لوگ اس کو غنیمت سمجھیں گے بلکہ کچھ اور بھی کم کروائیں گے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبور لوگوں کی چیز (سستے داموں) خریدنے سے منع فرمایا ہے، "وَقَدْ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِ الْمُضْطَرِّیْنَ." یہ مکارم اخلاق کے خلاف ہے، تمہیں خریدنی ہے تو اس چیز کی پوری قیمت دو، ورنہ مت خریدو۔

اور آج کل "بَیْعُ الْمُضْطَرِّیْنَ." کی ایک دوسری صورت نکلی ہوئی ہے کہ کسی مجبور سے مکان لے لیا، اور مکان فرض کرو کہ دس ہزار کا ہے، اس سے مکان لے لیا پانچ ہزار میں، پانچ ہزار اس کے سپرد کردیئے، مکان پر قبضہ کرلیا، اور اس کے بعد پھر دس ہزار کا مکان اس کے پاس بیچ دیا اور اس کی قیمت ادھار کرلی، یعنی بجائے اس کے کہ پانچ ہزار روپیہ نقد دے کر پانچ ہزار روپیہ اس پر سود لیتا یہ ترکیب نکالی کہ پانچ ہزار کا مکان خرید لیا اور پھر اسی مالک کو دس ہزار روپے کا بیچ دیا مگر سال کے ادھار پر، اس کو شریعت میں "بیع عینہ" کہتے ہیں، اور ہمارے فقہاءؒ نے تصریح کی ہے کہ: "ویکرہ بیع عینه." بیع عینہ مکروہ ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منع کرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ مجبور لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ ایسی ٹھگی کی جائے، یہ اسلام کے اخلاق کے خلاف ہے، اسلام جن اخلاق کی تعلیم دیتا ہے یہ انداز اس کے خلاف ہے، گو تمہیں قانون منع نہ کرے، کوئی عدالت تمہارا ہاتھ نہ پکڑ سکے کیونکہ مالک نے اپنی مرضی سے بیچا ہے، اور میں نے اپنی مرضی سے خریدا ہے، اس لئے کہ تمہارے دل میں اس کی وجہ سے قساوت اور سنگدلی پیدا ہوگی، اور تمہیں یہ خیال نہیں رہے گا کہ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس میں مبتلا کردیں اور مجھے کسی مجبوری کی وجہ سے یہ مکان بیچنا پڑے اور اس سے بھی کم قیمت میں بیچنا پڑے، حالات کے یہ نقشے بھی ہوسکتے ہیں۔

دھوکہ کی بیع:

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "بیع الغرر" سے منع فرمایا ہے، "بیع الغرر" کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس بیع میں دھوکہ پایا جاتا ہو، یعنی معلوم نہیں کہ یہ چیز ملے گی بھی یا نہیں ملے گی، جیسے ہماری گورنمنٹ کسی علاقے کو فروخت کردیتی ہے، شکار کے لئے ٹھیکہ دے دیا ہے کہ اس علاقے میں جتنے جانور ہیں گویا ان کو فروخت کیا جارہا ہے، یا دریا میں یا سمندر میں مچھلیاں ہیں، ان کو فروخت کردیا جاتا ہے، اور اس

کا ٹھیکہ دے دیا جاتا ہے، یہاں سے لے کر یہاں تک کا علاقہ اتنے لاکھ ٹھیکہ پر چڑھا ہے، یہ بھی حرام ہے، حضرات فقہاءؒ نے اس ''بیع الغرر'' کی بہت سے صورتیں بیان فرمائی ہیں، یہ دو مثالیں میں نے بیان کردی ہیں، ہوا میں پرندہ اڑ رہا ہے، اس کو بیچ دیا، جنگل کے شکار کو بیچ دیا، دریا میں مچھلیوں کو بیچ دیا، یہ ''بیع الغرر'' ہے، دھوکہ کی بیع ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

پھل آنے سے پہلے اس کی بیع:

ایک بیع اور ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، وہ ہے: ''بَیعِ الثَّمَرَۃِ قَبْلَ اَنْ تُدْرَکَ'' یعنی پھل آنے سے پہلے پھلوں کی فروخت کردی جائے، عام طور پر باغات میں یہی ہوتا ہے، آج کل تو کئی کئی سالوں کی بیع کردی جاتی ہے، یہ شرعاً ناجائز ہے، پھل آجائیں تو پھل بیچو، الا یہ کہ وہ زمین اتنی دیر کے لئے ٹھیکے پر دے دی جائے، پورا باغ ٹھیکہ پر دے دیا گیا، یعنی زمین بمع درختوں کے تو وہ دوسری بات ہے۔

شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ کا تقویٰ:

سرسید احمد خان مرحوم نے ایک کتاب لکھی تھی: ''آثار سنادید'' جس میں اکابر دہلی کے حالات بیان کئے ہیں، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا خاندان اور دوسرے اکابر کے تذکرے کئے ہیں، اس میں شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ جو ہمارے اکابر دیوبند کے استاذ ہیں، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ جیسے اکابر کے وہ شیخ ہیں، حضرت سہارنپوریؒ نے تو اجازت لی ہے اور باقی حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے باقاعدہ ان سے پڑھا ہے، اور ان کی تعلیم کے بارے میں لکھا ہے کہ ان بزرگوں کی بارہ آدمیوں کی جماعت تھی، اور صحیح بخاری شریف کا ایک نسخہ تھا، جو صرف استاذ کے پاس تھا، دوسری کوئی کتاب ہی نہیں تھی، تو استاذ کا نسخہ لے کر پہلے تو اس کو اپنے

قلم سے نقل کرتے تھے، اور پھر جتنے دن کا سبق لینا ہوتا تھا اتنا لکھتے اور نقل کرتے تھے، پھر پڑھتے تھے، یہ صحیح بخاری کے جو نسخے چھپے ہوئے ہیں سب سے پہلے حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ نے شائع کئے ہیں، اور اس پر پچیس پارے کا حاشیہ خود لکھا حضرتؒ نے، اور آخری پانچ پارے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے لکھوائے جو اس وقت طالب علم تھے، گویا چھوٹے مولوی تھے، ان کے شاگردوں کی مد میں تھے اور اب تو صحیح بخاری ہر ایک عالم تو کیا جاہل کے گھر میں بھی موجود ہے، نہ ہو تو لوگ ترجمہ لے لیتے ہیں، تو یہ شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ مہاجر مدنی وہاں سے ہجرت کرکے مدینہ طیبہ چلے گئے تھے، سرسید احمد خان نے آثار السنادید میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

حضرت شاہ صاحب دلّی میں بکنے والے پھلوں کے ذائقے سے واقف نہیں تھے، اس لئے کہ ان کی خرید وفروخت شریعت کے خلاف ہوتی ہے، کھاتے نہیں تھے، ذائقہ تک معلوم نہیں کہ پھل کا ذائقہ کیا ہے؟ مفتی رشیدالدین ان کے ہم عصر تھے، بڑے اکابر علمأ میں سے تھے، یہ بھی ہمارے اکابر کے استاذ ہیں، یہ ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب کے مکان کے پاس سے گزر رہے تھے، گھر کی خادمہ شاہ صاحب کے بچے کو لئے کھڑی تھی اور بچہ بالکل لاغر اور کمزور تھا، مفتی صاحب نے پوچھ لیا کہ بچہ اتنا کمزور کیوں ہے؟ بیمار ہے کیا؟ خادمہ نے بتایا کہ تین دن سے حضرتؒ کے گھر میں فاقہ ہے، بچہ بھی بھوکا ہے، مفتی صاحب کو بہت صدمہ ہوا، بازار گئے اور کھانے پینے کا سامان ساری چیزیں ایک بوری میں لدواکے شاہ صاحب کے گھر پہنچائیں، چاول، آٹا، دالیں وغیرہ۔ شاہ صاحب گھر آئے تو گھر والوں نے کہا کہ آپ نے یہ چیزیں بھجوائی ہیں؟ کہا کہ: میں نے تو نہیں بھجوائیں، کس نے بھجوائی ہیں؟ تحقیق سے پتہ چلا کہ مفتی رشیدالدین صاحب نے بھجوائی ہیں۔ مفتی رشیدالدین کو کس نے ہمارا حال بتایا؟ ٹوہ لگانے سے پتہ چلا کہ خادمہ نے بتایا ہے، تو حضرتؒ اس خادمہ سے فرماتے

ہیں کہ بڑی بی اگر تم ہمارے ساتھ صبر نہیں کرسکتی ہو تو تم جاسکتی ہو، لیکن ہمارے گھر کا حال دوسروں کو نہ بتایا کرو۔

ایک دفعہ مفتی رشید الدین صاحب حضرت شاہ صاحبؒ سے پڑھنے کے لئے کتاب لے گئے، وہ بغیر جلد کے تھی، واپس کی تو مجلد تھی، مفتی صاحب نے مجلد کرواکے بھیج دی اور ساتھ ہی خادم سے کہلوا بھیجا کہ شاہ صاحبؒ سے کہہ دیں کہ یہ جلد میں نے اپنی تنخواہ سے نہیں لگائی، بلکہ میری زمین کی جو آمدنی ہے وہ میں الگ رکھتا ہوں اس سے یہ جلد بنوائی ہے، یہ پیغام دے دیا اور کتاب حضرت شاہ صاحبؒ کو دے دی، حضرتؒ نے یہ کتاب لیتے ہوئے کتاب کی جلد پھاڑ کر کے پھینک دی اور فرمایا: ان کی زمین کی آمدنی کون سی پاک ہے؟ یہ وہی بات ہے جو میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ رنگ بدلتا رہا، یہ ہمارے چوتھی پیڑھی کے استاذ ہیں اور تیرہویں صدی کے آدمی ہیں، ایک ڈیڑھ سو سال میں یہ رنگ بدل گیا، تو غرضیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھلوں کے آنے سے پہلے پھل کی خرید و فروخت سے بھی منع فرمایا ہے۔

عید کی نماز کا طریقہ:

دوسری روایت میں ہے کہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ عیدالاضحیٰ یعنی بقرہ عید کی نماز میں حاضر ہوا، مجھے ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، تو آتے ہی خطبہ سے پہلے نماز پڑھائی، نہ اذان، نہ اقامت، عیدین کی نماز کا یہی مسئلہ ہے کہ ان میں اذان اور اقامت نہیں ہوتی اور خطبہ بھی بعد میں ہوتا ہے، پہلے نہیں ہوتا، جمعہ کا خطبہ پہلے ہوتا ہے اور بعد میں نماز بلکہ خطبہ شرط ہے نماز کے لئے، جمعہ کی نماز خطبہ کے بغیر ہوتی ہی نہیں، چاہے مختصر ہی خطبہ ہو، لیکن خطبہ شرط ہے نمازِ جمعہ کے لئے، جبکہ عیدین کی نماز بغیر خطبہ کے ہوتی ہے اور خطبہ بعد میں پڑھا جاتا ہے۔

عید کا خطبہ سنت ہے:

اور لطف کی بات یہ ہے کہ عیدین کا خطبہ واجب نہیں ہے، سنت ہے، اگر امام صرف عیدین کی نماز پڑھا کے آجائے اور خطبہ نہ دے تو اس نے کسی واجب شرعی کا ترک نہیں کیا، البتہ خلافِ سنت کیا، اب تو کسی کی عقل میں آہی نہیں سکتی یہ بات کہ عید کی نماز خطبہ کے بغیر بھی ہوسکتی ہے، عیدین کا خطبہ نہ فرض ہے نہ واجب ہے، بلکہ سنت ہے، اور کوئی شک نہیں کہ سنت مؤکدہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے یہی تعامل چلا آرہا ہے۔

جمعہ کا خطبہ اور اس کا سننا فرض ہے:

لیکن اس خطبہ کا سننا فرض ہے، جمعہ کا خطبہ بھی فرض اور اس کا سننا بھی فرض، حتی کہ حدیث شریف میں ہے:

''اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِکَ اَنْصِتْ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ وَالْاِمَامُ یَخْطُبُ فَقَدْ لَغَوْتَ.'' (مشکوٰۃ ص:۱۲۲)

ترجمہ:...... ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جس شخص نے امام کے خطبہ دیتے ہوئے اپنے رفیق سے کہہ دیا کہ ''چپ'' اس نے بھی بے ہودہ بات کی (اور اس کے جمعہ کا ثواب باطل)۔''

فرض تو ادا ہوجائے گا لیکن جمعہ کا خاص ثواب باطل ہوجائے گا۔

خطبہ جمعہ کی حالت میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنا بھی جائز نہیں ہے، حتی کہ نماز پڑھنا بھی جائز نہیں ہے، اور ایک لفظ بولنا بھی جائز نہیں ہے، مکمل خاموشی اور مکمل سکوت، قرآن کریم میں ہے:

''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ.'' (الاعراف:۲۰۴)

ترجمہ:...... ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

امام بیہقیؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت خطبہ اور نماز کے لئے نازل ہوئی ہے، یعنی خطبہ میں قرآن پڑھا جاتا ہے، خطبہ کا سننا لازم اور خاموشی واجب، اسی طرح نماز میں امام قرأت کرتا ہے، تو امام کے پیچھے کسی کو پڑھنے کی اجازت نہیں۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ جمعہ کا خطبہ شرط ہے نماز کے لئے اور اس کا سننا بھی فرض ہے، اور اس میں کسی کو ''امر بالمعروف'' کرنا اور یہ کہنا کہ دیکھو یہ بری بات ہے، یہ بھی نہ کرو، اسی طرح کسی بچے کو آپ کہیں کہ بیٹھ جا، یہ بھی آپ نے لغو کام کیا، اور آپ کے جمعہ کا ثواب باطل ہوگیا۔

جمعہ کا ثواب:

یہ جمعہ کا ثواب کیا ہوتا ہے؟ نماز پڑھ لی بس ٹھیک ہے۔ جمعہ کا ثواب یہ ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

''قَالَ مَنِ اغْتَسَلَ ثُمَّ اَتَی الْجُمُعَةَ فَصَلّٰی مَا قُدِّرَ لَهٗ ثُمَّ اَنْصَتَ حَتّٰی یَفْرُغَ مِنْ خُطْبَتِهٖ ثُمَّ یُصَلِّیْ مَعَهٗ غُفِرَ لَهٗ مَا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰی وَفَضْلُ ثَلَاثَةِ اَیَّامٍ.''

(مشکوٰۃ ص:۱۲۲)

ترجمہ:...... ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے غسل کیا پھر مسجد کی طرف جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے گھر سے چلا، مسجد میں جا کر جتنی نماز مقدر میں تھی وہ پڑھی، خطبہ سنتے وقت خاموش رہا، امام کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی تو ایک جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ تک جتنے گناہ کئے تھے، اللہ

تعالیٰ معاف کردیتے ہیں، بمع تین دن اضافے کے۔''

جمعہ کی یہ فضیلت ہے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں، کبیرہ کے لئے توبہ شرط ہے، ایک جمعہ پڑھنے سے دس دن کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

جمعہ کے نمازیوں کی حاضری:

اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتوں کا ایک مستقل عملہ مقرر کیا جاتا ہے جمعہ کی حاضری لگانے کے لئے کہ کون کس وقت آیا تھا، اور جب خطبہ شروع ہوتا ہے تو حدیث میں فرمایا کہ: ''طَوَوْا صُحُفَهُمْ وَيَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ.'' (مشکوٰۃ ص:۱۲۲) فرشتے اپنے صحیفے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں، اور ذکر الٰہی کے سننے میں مشغول ہوجاتے ہیں، اس کے بعد جمعہ میں آنے والوں کی حاضری نہیں لگتی، ان کے اپنے نامۂ اعمال میں درج ہوتا ہوگا، لیکن جمعہ کا جو رجسٹر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جاتا ہے اور اس کے لئے مستقل عملہ مقرر کیا گیا ہے، اس میں ان لوگوں کا نام درج نہیں ہوتا جو جمعہ کا خطبہ شروع ہونے کے بعد آتے ہیں، تو جس طرح کہ جمعہ کا خطبہ سننا فرض ہے، علماً فرماتے ہیں کہ اسی طرح عیدین کا خطبہ سننا بھی اسی ادب کے ساتھ فرض ہے، اگرچہ خطبہ کہنا سنت ہے، واجب نہیں اور یہ عجائبات میں سے ہے کہ خطبہ کہنا سنت اور اس کا سننا فرض۔

تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت کھانے کی ممانعت:

نماز پڑھانے کے بعد امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ کھانے سے منع فرمایا، لہٰذا تین دن کے بعد نہ کھایا کرو، لیکن یہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منسوخ فرمادیا تھا۔

حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"كُنتُ نَهَيتُكُمْ عَنْ لُحُومِ الْاَضَاحِيِّ فَوْقَ ثَلَاثٍ لِيَتَّسِعَ ذُوْ الطَّوْلِ عَلٰى مَنْ لَا طَوْلَ لَهُ فَكُلُوْا مَا بَدَا لَكُمْ وَاَطْعِمُوْا وَادَّخِرُوْا." (ترمذی ج:۱ ص:۱۸۲)

ترجمہ:......"میں نے تمہیں قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ کھانے کو منع کیا تھا تاکہ صاحب استطاعت غربا پر وسعت کریں، اب تم کھاسکتے ہو، تین دن سے زیارہ کھاسکتے ہو، اور ذخیرہ بھی کرسکتے ہو۔"

تو یہ حکم وجوب کی حیثیت سے تو منسوخ ہوگیا، لیکن مکارم اخلاق کی وجہ سے اب بھی ہے، تین دن اللہ تعالیٰ کی مہمانی کے ہیں، ان میں تو خوب کھائیے بلکہ گوشت ہی کھائیے۔

میں نے شاید ایک دفعہ بتایا تھا کہ ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہ کے گھر میں تین دن میں کھانا نہیں پکتا تھا، آپ کے یہاں کوئی سبزی نہیں پکتی تھی، روٹی نہیں پکتی تھی، صرف گوشت، اور ہمارے یہاں کھانا تو پکتا ہے لیکن میں گوشت ہی کھاتا ہوں، میں اور کوئی چیز نہیں کھاتا، نہ چاول نہ کوئی اور چیز، صرف گوشت کھاتا ہوں، قربانی کے تین دنوں میں۔

سبحانک اللھم وبحمدک اشھد ان لا الہ الا انت استغفرک واتوب الیک

حق و باطل کے درمیان امتیاز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ قَالَ: اِنَّ لِلّٰہِ عِبَادًا یُمِیْتُوْنَ الْبَاطِلَ بِھَجْرِہٖ، وَیُحْیُوْنَ الْحَقَّ بِذِکْرِہٖ. رُغِّبُوْا فَرَغِبُوْا، فَرُھِّبُوْا وَرَھِبُوْا، خَافُوْا فَلَا یَأْمَنُوْنَ، اَبْصَرُوْا مِنَ الْیَقِیْنِ مَالَمْ یُعَایِنُوْا، فَخَلَطُوْہُ بِمَالَمْ یُزَایِلُوْہُ، اَخْلَصَھُمُ الْخَوْفُ، فَکَانُوْا یَھْجُرُوْنَ مَا یَنْقَطِعُ عَنْھُمْ لِمَا یَبْقٰی لَھُمْ اَلْحَیَاۃُ عَلَیْھِمْ نِعْمَۃٌ وَالْمَوْتُ لَھُمْ کَرَامَۃٌ، فَزُوِّجُوْا الْحُوْرَ الْعِیْنَ وَاُخْدِمُوْا الْوِلْدَانَ الْمُخَلَّدِیْنَ.“

(حیاۃ الصحابہ ج:٦ ص:۷۳۰)

ترجمہ:......”حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: بے شک اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو باطل کو مٹاتے ہیں (اس کو چھوڑ کر) اور حق کو زندہ کرتے ہیں (اس کا ذکر کرکے) ان کو ترغیب دی گئی تو انہوں نے رغبت کی اور ان کو

ڈرایا گیا تو وہ ڈر گئے اور ان کو ایسا ڈر ہوا کہ اب وہ امن نہیں پاتے، اور انہوں نے یقین کے ذریعے اس چیز کو دیکھ لیا جن کو انہوں نے آنکھوں سے نہیں دیکھا، پس انہوں نے اس کو مخلوط کردیا ایسی چیز کے ساتھ جو ان سے زائل نہیں ہوتی، ان کے خوف نے خالص کردیا، پس وہ چھوڑتے تھے ایسی چیز کو جو ان سے منقطع ہوجاتی ہے، اس چیز کے لئے جو باقی رہتی ہے، حیات ان کے لئے نعمت ہے، موت ان کے لئے کرامت ہے، پس (جنت میں) ان کی شادی کی گئی موٹی آنکھوں والی حور کے ساتھ، اور ان کو خادم دیئے گئے ایسے بچے جو ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

یہ حضرت امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چند ناصحانہ ارشادات ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جو باطل کو مٹاتے ہیں ان کو چھوڑ کر اور حق کو زندہ کرتے ہیں اس کا ذکر کر کے۔'' اس میں باطل کو مٹانے کا حکم ہے اور حق کو زندہ کرنے کا ذکر ہے۔ حق اور باطل یہ آدمؑ اور ابلیس کے زمانے سے چلے آرہے ہیں، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام حق کی علامت اور حق کا نشان راہ تھے اور باطل ابلیس کی گزرگاہ ہے اور ابلیس اس کا مرشد ہے۔

حق کو حق اور باطل کو باطل پہچانا جائے:

تو پہلی بات تو یہ ہے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل پہچانا جائے، حق اور باطل کے درمیان شناخت کی جائے کہ حق الگ ہے اور باطل الگ ہے، آدمی پر جب حرص و ہواً کا غلبہ ہوتا ہے اور اس کا مطمح نظر صرف پیٹ بھرنا رہتا ہے یعنی پیٹ اور جیب جب اس کا مطمع نظر بن جائے تو پھر اس کو حق و باطل سے کوئی غرض نہیں رہتی، حق و باطل کا

امتیاز اس کی نظر سے اٹھ جاتا ہے، حق و باطل کے درمیان امتیاز کیا جائے کہ حق حق ہے اور باطل باطل ہے اس لئے کہ ارشاد الٰہی ہے : "جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ." (حق آیا اور باطل گیا) کیونکہ حق آئے گا تو باطل جائے گا۔

اور کچھ لوگ ایسے ہیں، کہ انہوں نے حق اور باطل کے درمیان صلح کروادی کہ سب کو چلنے دو، اکٹھے ہی چلنے دو، یہ بھی چلے، وہ بھی چلے اور تم کسی کے طرف دار نہ بنو، حق اور باطل میں سے کسی کے بھی طرف دار نہ بنو، اس لئے کہ تم ایک کے طرف دار بن گئے تو تمہاری غیر جانبداری پر حرف آئے گا۔

حق و باطل کے دو کیمپ:

بہت مدت ہوئی، میں دبئی گیا تھا وہاں (مرکز پاکستان) ایک ہمارے پاکستانیوں نے پاکستان گھر بنایا ہوا ہے، ایک عمارت لے رکھی ہے، یعنی اس میں کوئی اجتماعی تقریب ہوگئی، کوئی شادی ہوگئی، کوئی جلسہ ہوگیا تو وہ وہاں منعقد کرتے ہیں، وہاں دوستوں نے میرا پروگرام کروایا چونکہ میں وہاں قادیانیت کے سلسلے میں گیا ہوا تھا تو میں نے یہی بات پیش کی، دوسرے الفاظ اور دوسرے انداز میں، میں نے کہا کہ یہ لکیر لگی ہوئی ہے، ایک طرف محمد رسول اللہ ﷺ کا کیمپ ہے، اور دوسری طرف غلام احمد کا، اب تمہیں اختیار ہے، جس کیمپ میں جانا اور شامل ہونا چاہتے ہو تو اس میں چلے جاؤ، اللہ نے تمہیں اختیار دیا ہے سوچ سمجھ کر جاؤ، لیکن یہ بات یاد رہے کہ تمہیں لکیر کے اوپر نہیں چلنے دیں گے، بلکہ درمیان کی لکیر پر نہیں کھڑے ہونے دیں گے، یہ خیال دل سے نکال دو، تمہیں اگر محمد ﷺ کے کیمپ میں نہیں آنا ہے، غلام احمد کے کیمپ میں جاسکتے ہو، شوق سے جاؤ، لیکن تم کہو کہ ہم لکیر پر رہیں گے، نہ ادھر کے نہ ادھر کے، ایسا نہیں ہوسکتا، بلکہ تمہیں ایک طرف آنا ہوگا اور اگر نہیں آؤ گے تو دوسری طرف کے سمجھے جاؤ گے، اور حضرت محمد ﷺ کے کیمپ میں شمار نہیں کئے جاؤ گے،

بہت تفصیل کے ساتھ ڈیڑھ گھنٹہ میرا بیان ہوا تھا، صرف اسی ایک نکتے پر۔

غیر جانبداری کی بیماری:

ہمارے پڑھے لکھے لوگوں میں اور اونچے دماغ والوں میں انگریزی تہذیب کی وجہ سے یہ غیر جانبداری کی بیماری سرایت کر گئی ہے، ان کا کہنا ہے کہ مولوی لڑتے ہیں، اور مولویوں کا کام ہی لڑنا ہے، ان کو لڑنے دو، بلکہ ان کا کہنا ہے کہ اگر تم سے ہو سکے تو ایک آدھ پتھر پھینک دیا کرو مولویوں کی طرف، اور یہ نہ ہو سکے تو زبان کا ایک آدھ تیر ونشتر چلا دیا کرو، اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے، باقی غیر جانبدار رہو، دوسری طرف نہ تمہارا کبھی پتھر گیا، نہ کبھی تمہارا تیر ونشتر گیا، وقت آنے دو، قیامت کے دن جب یہ لکیر قائم کردی جائے گی، اور کہا جائے گا کہ: "وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ." (یٰسین:۵۹) (او مجرمو! آج کے دن الگ ہو جاؤ) وہ وقت آنے دو، اس وقت تمہیں پتہ چلے گا کہ حق حق ہے، اور باطل باطل ہے، حق کا ساتھ دیا جائے اور باطل کو چھوڑا جائے، اس وقت تمہاری غیر جانبداری نہیں چلے گی، یہاں تم اپنی عقل چلا رہے ہو، پوری دنیا دھوکے میں ہے، آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے، قیامت سامنے نہیں ہے، میدان محشر سامنے نہیں ہے، اسی لئے غیر جانبداری سوجھتی ہے۔

حق و باطل کی ٹکر:

تو خلاصہ یہ کہ حق حق ہے، باطل باطل ہے، اور بیچ میں لکیر ہے، امت مسلمہ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے اور اہل باطل سے جتنی قوت ہے اپنی ہمت کے مطابق ٹکرائے، اس لئے کہ یہ ٹکر آدمؑ و ابلیس کے وقت سے چلی آرہی ہے، یہ آج کی نہیں ہے، محمد ﷺ اور ابوجہل کے وقت سے چلی آرہی ہے، اور یہ قیامت تک رہے گی چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

"لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا

يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ ......حَتّٰى يَأْتِيَ اَمْرُ اللهِ.‘‘

(ترمذی ج:۲ ص:۴۷)

قریب قریب پندرہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ حدیث مروی ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، جو ان کی مخالفت کرے ان کو اس کی پروانہیں، اسی طرح اگر کوئی ان کے مقابلے میں آئے، ان سے کوئی تعرض نہیں، یعنی جو مقابلہ پر آتا ہے آئے، وہ حق پر قائم رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ اضافہ ہے:’’وینزل عیسیٰ ابن مریم.‘‘ (صحیح مسلم ج:۱ ص:۸۷) (یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے اور عیسیٰ ابن مریم دجال کے مقابلے میں نازل ہوجائیں) اور یہ آخری معرکہ ہوگا اور اس پر ختم۔

حق کی مدد کے لئے تیار نہیں:

ہم نے اگر بہت بڑا احسان کیا، تو ہم نہ اس طرف کے ہوئے، نہ اس طرف کے ہوئے، اہل حق کو بھی کچھ نہیں کہتے، اور اہل باطل کو بھی کچھ نہیں کہتے، یہ ہماری بڑی مہربانی ہے، ہم حاجی ہیں، اور حج پر جارہے ہیں، نمازی ہیں، پیشانی پر گٹھہ پڑا ہوا ہے، سخی ہیں لنگر چل رہا ہے، ہمارے گھر سے ہر ایک کو خیرات ملتی ہے، لیکن حق کو یہ خیرات نہیں ملتی، حق کی مدد کے لئے تیار نہیں ہیں، اور ہمارے خیال میں اگر ہمارے ہاں سے حق کی حمایت نہ کی جائے تو کوئی حرج اور مضائقہ نہیں چلتے رہو، لیکن یاد رکھو! قرآن کریم کی اسی آیت (جو میں نے پڑھی ہے) کے آگے ہے:

’’قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا.‘‘ (بنی اسرائیل:۸۴)

ترجمہ:......’’آپ کہہ دیجئے کہ جو کوئی عمل کرتا ہے

اپنے طرز پر کرتا ہے، تمہارا رب جانتا ہے کہ تم میں سے کون صحیح راستے پر ہے؟"

وہ تمہیں بتادے گا کہ کون صحیح راستہ پر تھا اور کون غلط راستہ پر، آج تو میں بھی، آپ بھی اور ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ میں صحیح راستے پر ہوں، بہت جلد وہ وقت آیا چاہتا ہے، جب پتہ چلے گا کہ کون صحیح راستے پر ہے؟ جیسے کہا گیا ہے:

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْكَشَفَ الْغُبَارُ
اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارٌ

(بہت جلد تمہیں پتہ چل جائے گا جب یہ غبار چھٹے گا، تم گدھے پر سوار تھے یا گھوڑے پر)، تو اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو حق و باطل کے درمیان امتیاز کرتے ہیں، حق کا ساتھ دیتے ہیں اور باطل کو چھوڑتے ہیں۔

اجتماعی کردار پر فیصلے:

اگر امت مسلمہ جس کو قرآن کریم کی درج ذیل آیت میں خیر امت کہا گیا ہے: "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ." (آل عمران:۱۱۰) (تم بہترین امت ہو اور لوگوں کے نفع کے لئے نکالی گئی ہو)۔

امت اگر صرف اس ایک نکتے کو سمجھ لیتی تو اس کی حالت کچھ سے کچھ ہوجاتی، چند آدمیوں کی باطل پرستی سے پوری قوم ڈوب جاتی ہے، یہاں تو مسئلہ ایسا ہی ہے نا، یہ تو دنیا ہے، آپ کے نیک یا بدعمل کا اجر تو قیامت میں ملے گا، یہاں تو اجتماعی کردار پر فیصلے ہوں گے، جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ:

"مَثَلُ الْمُدْهِنِ فِیْ حُدُوْدِ اللهِ وَالْوَاقِعِ فِیْهَا مَثَلُ قَوْمٍ اِسْتَهَمُوْا سَفِیْنَةً فَصَارَ بَعْضُهُمْ فِیْ اَسْفَلِهَا وَصَارَ بَعْضُهُمْ فِیْ اَعْلَاهَا فَكَانَ الَّذِیْ فِیْ اَسْفَلِهَا یَمُرُّ بِالْمَاءِ

عَلَى الَّذِیْنَ فِیْ اَعْلَاهَا فَتَاَذَّوْا بِهٖ فَاَخَذَ فَأْسًا فَجَعَلَ یَنْقُرُ اَسْفَلَ السَّفِیْنَةِ فَاَتَوْهُ فَقَالُوْا مَا لَکَ قَالَ تَاَذَّیْتُمْ بِیْ وَلَا بُدَّ لِیْ مِنَ الْمَاءِ فَاِنْ اَخَذُوْا عَلٰی یَدَیْهِ اَنْجَوْهُ وَنَجَّوْا اَنْفُسَهُمْ وَاِنْ تَرَکُوْهُ اَهْلَکُوْهُ وَاَهْلَکُوْا اَنْفُسَهُمْ۔" (مشکوٰۃ ص:۴۳۶)

ترجمہ:......"ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی حدود کو توڑ رہے ہیں اور ان کی مثال جو ان کا ہاتھ نہیں پکڑتے اور ان کو نہیں روکتے، اس کشتی کی سی ہے، جس میں بہت سے لوگ سوار تھے، اور اس کی ایک اوپر کی منزل تھی، ایک نیچے کی منزل تھی، پانی اوپر کی منزل میں تھا، نیچے والے پانی سے محروم تھے، اوپر پانی لینے کے لئے جاتے تھے، تو اوپر والوں کو تکلیف ہوتی تھی، انہوں نے کہا کہ آؤ یہیں کشتی میں سوراخ کرلیں، اور پانی یہیں سے لے لیا کریں گے، چنانچہ وہ سوراخ کرنے لگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اوپر والے ان کو روک دیں گے، تو وہ خود بھی بچ جائیں گے، اور نیچے والوں کو بھی بچالیں گے، اور اگر اوپر والوں نے نیچے والوں کو نہ روکا بلکہ یہ کہا کہ ہمیں کیا پڑی؟ تو وہ بھی ڈوبیں گے، اور ان کو بھی لے ڈوبیں گے، اس لئے کہ کشتی میں پانی بھرے گا، اور سب کا بیڑا غرق ہوجائے گا۔"

چند بڑے بڑے آدمی جو دنیا کو بے وقوف بنائے ہوئے ہیں، تم سمجھتے ہو کہ ہمارا ان سے کیا تعلق؟ ان کا عمل ان کے ساتھ، اور ہمارا عمل ہمارے ساتھ، بھائی تمہارا عمل تمہارے ساتھ اور ہمارا عمل ہمارے ساتھ کا اصول قیامت میں چلے گا، یہاں نہیں، یہاں تو تم ایک کشتی کے سوار ہو، تمہارے شہر میں شراب خانے کھل رہے ہوں، بدمعاشیاں ہورہی ہوں، ڈاکے پڑ رہے ہوں، عزتوں کو لوٹا جارہا ہو، جان اور مال کی

لوٹ مچی ہوئی ہو، اور تم کہو ہمیں کیا؟ یہ اس بات کی علامت ہے کہ کشتی میں سوراخ کردیا گیا ہے، اور سوراخ کرنے والوں کا ہاتھ نہیں روکا گیا، اور ہاتھ پکڑنے والوں نے پکڑا نہیں، یعنی جن کو پکڑنے کی قدرت تھی، یا وہ جانتے نہیں تھے، یا وہ پکڑتے نہیں، سب کے سب غرق ہوجائیں گے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم:

اب تو سائنس داں بھی کچھ پیشگوئیاں کرنے لگے ہیں، اللہ معاف کرے! ۱۹۹۵ء ختم ہورہا ہے، اس بیسویں صدی کے ختم ہونے میں پانچ سال باقی ہیں، اور سائنس داں کچھ ایسی پیشگوئیاں کررہے ہیں کہ شدت کی گرمی پڑنے کی وجہ سے برفانی پہاڑوں کی چوٹیاں خالی ہوجائیں گی، اور برف بہہ بہہ کر سمندروں میں آئے گی، اور دریا اور سمندر ان کو برداشت نہیں کرسکیں گے، نعوذ باللہ! خدا نہ کرے کہ یہ صورتحال پیدا ہو، لیکن اگر پیدا ہوجائے تو پھر روک لوگے؟ ووٹ کی طاقت سے روک لوگے؟ بھائی! ووٹ کی قوت اور پرچی کی طاقت سے تم کیا روکوگے؟ اس وقت دعا کی طاقت سے بھی نہیں روک سکوگے، حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ:

"..... وَاللهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذُنَّ عَلٰى يَدَىِ الظَّالِمِ..... وَلَتَقْصُرُنَّ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا." (مشکوٰۃ ص:۴۳۸)

ترجمہ:...... "بھلائی کا حکم دو، برائی سے روکو، ظالم کا ہاتھ پکڑو، اور اس کو حق پر جمنے پر مجبور کرو۔"

یہ تمہیں کرنا ہوگا، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں تمہیں کرنا ہوگا، تمہیں امر بالمعروف کرنا ہوگا، نہی عن المنکر کرنا ہوگا، ظالم کا ہاتھ پکڑنا ہوگا، اور اس کو حق پر قائم رہنے پر مجبور کرنا ہوگا، اور اگر نہیں کروگے تو: اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب عام میں مبتلا

کردیں گے۔ پھر تم اللہ کو پکاروگے دعاؤں کے لئے، اور تمہاری دعائیں نہیں سنی جائیں گی۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"......اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِنْ عِنْدِہٖ ثُمَّ لَتَدْعُنَّہٗ وَلَا یُسْتَجَابُ لَکُمْ." (مشکوٰۃ ص:۴۳۶)

بہرحال بات اس پر چل رہی تھی کہ ہم نے حق و باطل کا امتیاز بھی کھودیا، ہم نے بہت مہربانی کی تو یہ کہہ کر اور کپڑے جھاڑ کر الگ ہوگئے کہ جی ہمیں کیا ہے؟ مولویوں کا کام ہے، لڑتے رہتے ہیں، "کار ملا فی سبیل اللہ فساد" سبحان اللہ! حضرت علامہ اقبال کا "الہامی" شعر ہے: "کار ملا فی سبیل اللہ فساد" اس کو ہر چیز فساد ہی نظر آتی ہے، خواہ ہمارے علماء جہاد کرنے والے ہی کیوں نہ ہوں، وہ نعوذ باللہ فساد ہے؟ اورتم سیاست کے لئے لڑو، عہدوں اور منصبوں کے لئے لڑو، تو چشم بددور! یہ تمہارا جہاد ہے؟ خیر سے جہاد زندگانی اس کو کہتے ہو؟

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

یعنی یہ تو تمہارا جہاد ہے، مگر مُلّا اگر باطل کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوتا ہے، تو تم کہتے ہو "کار ملا فی سبیل اللہ فساد" اب اس پر کیا کہوں؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد!
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہی تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں ہے

ہم اللہ کی خاطر کسی سے لڑیں تو فساد، اورتم دنیا کے لئے، جیب کے لئے، پیٹ کے لئے، اور اللہ کی مخلوق کو تنگ کرنے کے لئے فساد مچاؤ تو یہ جہاد؟ اگر ہم اللہ

کے لئے کسی کو ٹوکیں تو زبان بند، اور اپنی خواہش کے لئے تمہاری گولیاں چلیں تو تمہیں کوئی روکنے والا نہیں، مسلمانو! حق کو حق جانو، باطل کو باطل جانو، حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرنا سیکھو، اگر حق اور باطل کے درمیان امتیاز نہیں کرو گے، تو یہ تمہارے دین کی، تمہارے اخلاق کی، اور تمہاری شرافت کی موت ہے اور جس شخص کے اندر سے یہ ساری چیزیں مٹ جائیں تو اس کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

اللہ کے کچھ بندے:

تو حضرت عمرؓ فرماتے ہیں اللہ کے کچھ بندے ہیں جو باطل کو مٹاتے ہیں (اس کو چھوڑ کر) باطل نہ صرف یہ کہ خود ترک کر دیا، بلکہ اس کو مٹانے کے لئے باطل کے مقابلے میں آگئے، چنانچہ ارشاد ہے: "وَيُحْيُوْنَ الْحَقَّ بِذِكْرِهٖ." اور حق کو زندہ کرتے ہیں بذریعہ اس کے ذکر کے، حق ذکر کرو۔

نکتہ کی بات:

یہاں یہ نکتہ خوب یاد رکھو کہ باطل کو باطل کے ساتھ نہیں مٹایا جا سکتا، ظلم کا علاج ظلم نہیں، جھوٹ کی کاٹ جھوٹ سے نہیں کی جا سکتی، جھوٹ کا علاج سچ ہے، ظلم کا علاج عدل ہے اور باطل کا علاج حق کو تھامنا ہے۔

ترغیب کا مطلب:

تیسرا فقرہ ہے: "فَرُغِّبُوْا فَرَغِبُوْا." ان لوگوں کو ترغیب دی گئی، کا ہے کی ترغیب؟ ان لوگوں کو کہہ دیا گیا کہ اللہ کی رحمت کی آغوش تمہارے لئے کھلی ہے چلو دوڑو اس کی طرف، تو وہ اس کی طرف دوڑ پڑے، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو جنت کی رغبت دلاتے ہوئے فرمایا:

"سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا
كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ." (الحدید:۲۱)

ترجمہ:......"دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور
اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان و زمین کے برابر
ہے۔"

آسمان و زمین کے برابر کا مطلب یہ کہ سات آسمانوں کا تختہ بنا کر ملا کر ایک دوسرے سے جوڑتے جاؤ، اور پھر سات زمینوں کا تختہ بنا کر ایک دوسرے سے جوڑتے جاؤ، یہ سات آسمان ملے ہوئے اور سات زمینیں ملی ہوئی ہوں، اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا جائے، یہ جنت کی چوڑائی بنے گی، جنت کی لمبائی کتنی ہوگی؟ اس کا کوئی اندازہ نہیں، اس جنت کی طرف دوڑو، اللہ کی مغفرت کی طرف دوڑو، رحمت کی طرف دوڑو، ان کو اس کی ترغیب دی گئی اور جب ترغیب ان کے سامنے ذکر کی گئی، اور ان کو یقین آ گیا، تو "رَغِبُوْا" اس کی رغبت میں مبتلا ہوگئے، ان کو جنت کا شوق ہوگیا۔

ترہیب کی ضرورت:

چوتھا فقرہ ہے: "فَرُهِّبُوْا فَرَهِبُوْا" اور ان کو ڈرایا گیا اللہ کے غضب سے، اللہ کے قہر سے، دوزخ سے، قبر کی سختی سے، قبر کی تنگی سے، نزع کی سختی سے، قبر کی تنگی سے، قبر کے عذاب سے، میدان محشر کی ہولناکیوں سے، جب ان کو ان سے ڈرایا گیا تو وہ ڈر گئے، ایسا کوئی کام نہیں کرتے جو کل اللہ کی بارگاہ میں، اللہ کی ناراضی کا سبب ہو، معلوم ہوا کہ ترغیب کے ساتھ ترہیب بھی چاہئے۔

مسلمانوں کے لئے ترغیب و ترہیب کی ضرورت ہے، ایک آدمی سب چیزوں کو مانتا ہے، لیکن جب تک اس کو ترغیب نہیں دی جاتی، اپنی جگہ سے نہیں ہلتا اور جب تک اس کو نہیں ڈرایا جاتا وہ اس سے باز نہیں آتا، خود ہمارے ساتھ ایسا ہوتا ہے، ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں چیز صحیح نہیں ہے، لیکن کر رہے ہیں، چلو چلنے دو۔ مگر بعض

اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کتاب میں مسئلہ پڑھا، حالانکہ مسئلہ وہی ہے جو ہم نے پڑھا تھا، پہلے بھی ہمیں معلوم تھا، لیکن کتاب میں مسئلہ پڑھنے کے وقت ہم نے وہ چیز چھوڑ دی، مسئلہ ہمیں پہلے بھی معلوم تھا، لیکن جب مسئلہ ہمارے سامنے آیا اور ہم نے پڑھا تو ترہیب ہوگئی، اور اس چیز کو چھوڑنے کی ترغیب ہوگئی۔

لہٰذا اچھے کام کرنے کی اور نیکی کی رغبت دلاؤ، مسلمانوں میں نیکی پر جمنے کی، نیکی کی طرف رغبت کرنے کی، اور برائی سے بچنے کی، برائی سے رکنے کی استعداد موجود ہے لیکن اس کے لئے ضرورت ہے ترغیب وترہیب کی، ہمارے یہاں ترغیب و ترہیب کا مضمون بھی ٹوٹا ہوا ہے، ایک بے چارے یہ تبلیغ والے کچھ کام کررہے ہیں، لیکن لوگ ان پر سو سو اعتراض کرتے ہیں، کیا کیا اعتراض کرتے ہیں؟ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے۔

نکتے کی بات:

یہ دیکھو نکتے کی بات کہتا ہوں، کہنے والا دل سے کہے اور اخلاص کے ساتھ کہے اور سننے والا دل سے سنے تو انشاءاللہ تعالیٰ نفع سے خالی نہیں جائے گا، اگر کہنے والا صرف میری طرح زبان سے کہے، دل سے نہ کہے، اور سننے والے آپ کی طرح کانوں سے سنیں دل سے نہ سنیں تو بیکار ہے، مولوی صاحب کی تقریر گرمی محفل ہے بس، کچھ بھی نہیں ہے، اس کے اندر کچھ بھی نہیں ہے۔

اکابر فرماتے ہیں کہ ایک گرمی وہ ہوتی ہے جو آگ سے حاصل کی جاتی ہے، اور ایک گرمی وہ ہوتی ہے جو کشتہ کھانے سے حاصل ہوتی ہے، بڈھے نے سونے کا کشتہ کھایا اور اس کے اندر حرارت بڑھ گئی، اور سردی کا مقابلہ کرنے کی اس میں طاقت پیدا ہوگئی، بوڑھے میں سردی کے برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہوتی کیونکہ حرارت غریضیہ کم ہوجاتی ہے، اور جوان سردی کی پرواہ نہیں کرتا، اس کا وجود خود

مدافعت کرتا ہے، تو ایک ہے سردی دفع کرنے کا طریقہ کہ آگ جلا کر اس سے تاپتے رہو، اس سے سینکتے رہو لیکن اس کا ایک نقصان ہوگا۔

لطیفہ:

جیسے کہ میراثی کا لطیفہ ہے کہ میراثی گیا چودھری کے پاس، پوچھا کہ: میر صاحب کیا حال ہے؟ کہنے لگے: بس کیا بتائیں؟ وہ بچوں کو اٹھک بیٹھک نے مار دیا ہے، چودھری نے کہا کیا ہوا؟ میراثی بولا: چودہری صاحب جی! وہ آگ جلاتے ہیں ناں، رات کو سردی دفع کرنے کے لئے، لو ذرا کم ہوگئی تو آگے ہوگئے، تیز ہوگئی تو پیچھے ہوگئے، بس اسی ورزش میں ساری رات گزر گئی۔

تو اس آگ کا فائدہ تو ہوتا ہے، مگر وقتی فائدہ ہوتا ہے، اور ایک یہ کہ کسی نے کشتہ کھالیا تو اندر سے حرارت غریضی پیدا ہوگئی، اس میں طاقت آگئی، یہ ہوتی ہے پائیدار گرمی۔ تو یہ جو زبانی جمع خرچ ہوتا ہے، وعظ اگر زبان سے ہو اور ظاہری کانوں سے آدمی سنے تو صرف گرمی محفل سے جتنی دیر اس محفل میں بیٹھے رہے، خوب گرمے اور گرمائے رہے، اور جب اٹھ کے چلے گئے تو وہی ٹھٹھر شروع ہوگئی، اور ایک بات وہ ہوتی ہے جو دل سے کہی جائے اور دل پہ جاکے لگے، دل میں اثر کر جائے، زبان اور کان محض واسطہ بن کر رہ جائیں، بات اصل میں دل سے دل تک پہنچانی تھی، دل سے دل میں منتقل کرنی تھی، اور یہ زبان اور کان محض درمیان میں پائپ تھے، اکابر فرماتے ہیں ''از دل خیزد بردل ریزد'' جو چیز دل سے نکلتی ہے دل پر اثر کرتی ہے، اگر کوئی بات ایسی ہو کہ دل سے نکلے اور دل میں منتقل ہوجائے، تو اس کا نفع تام ہوتا ہے وقتی نہیں ہوتا۔

امن واطمینان نہیں خوف چاہئے:

آگے فرماتے ہیں: ''خَافُوْا فَلَا یَأْمَنُوْنَ'' (ان حضرات کو ایسا خوف لاحق

ہوا کہ امن میں نہیں) ہر وقت بے سکونی ہے، بے اطمینانی ہے کہ پتہ نہیں ایمان ساتھ لے کر جاتے ہیں کہ نہیں جاتے، میں نے سنایا تھا کہ بادشاہ نے چھیڑا صوفی کو کہ میاں درویش تم اچھے ہو کہ ہمارا کتا اچھا ہے؟ کہنے لگے کہ حضور میرے درمیان اور آخرت کے درمیان ایک گھاٹی ہے، جس کو موت کہتے ہیں، اگر میں موت کی گھاٹی سے ایمان سلامت لے گیا، تو انشاءاللہ میں کتے سے اچھا ہوں، اور خدانخواستہ دوسری صورت ہوئی تو کتا مجھ سے بھی اچھا ہے، اور بادشاہ سے بھی اچھا ہے، ان کو تو ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے کہ خدانخواستہ ایسا نہ ہوجائے کہ ہم نقد ایمان ہار کر چلے جائیں، دنیا سے ایمان کے بغیر رخصت ہوجائیں، ان کو خوف طاری رہتا ہے کہ ان سے کوئی کلمہ بارگاہ الٰہی میں بے ادبی کا نہ صادر ہوجائے، کوئی بڑا بول نہ بولا جائے، کوئی ایسی بات نہ ہوجائے کہ میاں ناراض ہوجائیں۔

بن دیکھے یقین کیا:

آگے فرماتے ہیں: "اَبْصَرُوْا مِنَ الْیَقِیْنِ مَا لَمْ یُعَایِنُوْا." لوگ تو آنکھوں سے دیکھ کر مانتے ہیں، مگر یہ دل کے یقین کے ساتھ ایسا مانتے ہیں جس چیز کو نہیں دیکھا اس کو مان گئے، اللہ کو نہیں دیکھا مان گئے، دوزخ کو نہیں دیکھا، جنت کو نہیں دیکھا، قیامت کو نہیں دیکھا، قبر کے عذاب اور ثواب کو نہیں دیکھا، مان گئے، بہت سے لوگ نہیں مانتے، ان کی مرضی، بھائی ایک وقت آئے گا کہ یہ دیکھ کر مان جائیں گے، الحمدللہ اور اللہ کا شکر ہے کہ جو کچھ آنحضرت ﷺ نے بتایا ہم نے تو مان لیا "آمَنَّا وَصَدَّقْنَا" اس لئے کہ ہم ہزار بار دیکھیں، ہمارے ہزار بار دیکھنے پر وہ اعتماد نہیں، جو محمد ﷺ کے کہنے پر اعتماد ہے، ایک سرکار نے فرمادیا، بس ٹھیک ہے، ساری دنیا بھی تردید کرے، ساری دنیا جھوٹی ہوسکتی ہے، لیکن کملی والا ﷺ جھوٹا نہیں ہے، وہ سچا ہے۔

خوف کا ساتھ:

مزید فرمایا: "فَخَلَطُوْهُ بِمَا لَمْ يُزَايِلُوْهُ." سو انہوں نے اس خوف میں، اس عمل کو ملا دیا جو اس سے کبھی جدا نہیں ہوتا عمل مستقیم عمل دائم۔ آگے ہے: "اَخْلَصَهُمُ الْخَوْفُ." ان کو خوف نے خالص کرلیا، اب کسی اور کام کا نہیں رہنے دیا، کھانا پینا ہے، بیوی بچوں کے جھگڑے ہیں، دنیا کے قصے ہیں، یہ بھی چلتے ہی رہتے ہیں، لیکن بس بقدر ضرورت اتنا ہی جتنا کہ مسافر بے چارہ زادراہ کا بھی انتظام کرتا ہے، راستے میں چلتے چلتے کبھی بھوک لگ جاتی ہے، کھانا بھی کھانا پڑتا ہے، اور دوسری ضروریات بھی مسافر کو پیش آتی ہیں، بس اتنی ہی جتنی کہ مسافر کی ضروریات ہوتی ہیں، اتنا ہی کرتا ہے باقی اپنے کام میں لگا رہا۔ فرماتے ہیں: "اَلْحَيَاةُ لَهُمْ نِعْمَةٌ." انہوں نے باقی رہنے والی زندگی کے لئے اس کو چھوڑ دیا، یہ جو فانی زندگی تھی، منقطع زندگی تھی، فرمایا: زندگی ایسے لوگوں کے لئے نعمت ہے، ایسے لوگوں کی زندگی نعمت ہے، اپنے لئے بھی نعمت دوسروں کے لئے بھی نعمت۔

آگے فرماتے ہیں: "وَالْمَوْتُ لَهُمْ كَرَامَةٌ." اور موت ان کے لئے کرامت ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ دعا فرماتے تھے: "اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَا عَلِمْتَ الْحَيٰوةَ خَيْرًا لِّيْ." یا اللہ مجھے زندہ رکھ جب تک کہ زندگی میرے لئے بہتر ہے اور فرماتے تھے۔ "وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ." اور مجھے وفات دے جب کہ میرے لئے وفات بہتر ہے، موت ان کے لئے کرامت ہے، اور ایسی موت پر سو زندگیاں قربان، اللہ تعالیٰ ہمیں کرامت والی موت نصیب فرمائیں، اور شہادت والی موت نصیب فرمائیں، شہادت فی سبیل اللہ والی موت نصیب فرمائیں۔

حوران بہشتی سے نکاح:

مزید ارشاد ہے: "وَزُوِّجُوْا مِنَ الْحُوْرِ الْعِيْنِ." ان کی شادی کردی گئی

حور عین کے ساتھ، حور عین بہشتی کے ساتھ، وہ تمہاری منتظر کھڑی ہیں، جس کا شوہر پردیس میں گیا ہوا ہو، وہ دوشیزہ کتنی منتظر ہوتی ہے، تم پردیس میں آئے ہوئے، تمہاری بیویاں جنت کی بیویاں، حوران بہشتی تمہاری منتظر ہیں، لیکن کچھ لے کر تو جاؤ نا یہاں سے، کوئی زیور وغیرہ تو لے کر جاؤ ان کے لئے، کوئی کپڑے وغیرہ لے کر جاؤ، کوئی نقد لے کے جاؤ۔

خدمت گار بچے:

فرمایا :"وَاُخْدِمُوا الْوِلْدَانَ الْمُخَلَّدِيْنَ." قرآن کریم میں ہے: "وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ." خادموں کے طور پر چھوٹے چھوٹے بچے ہوں گے، ہمیشہ چھوٹے رہیں گے، وہ خدمت کے لئے گھومتے پھریں گے، ان سے پردہ نہیں ہوگا، چھوٹے ہیں نا، ویسے بھی جنتی ہیں، وہ ایسے ہی رہیں گے، ان کی خوبصورتی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: "اِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا." جب تم ان کو دیکھو گے تو ایسا لگے گا کہ موتی بکھرے ہوئے ہیں، بکھرے ہوئے موتی یہ ان کے خادم بنادیئے گئے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرمائیں، حق کو اختیار کر کے باطل کو چھوڑنے کی، اور فانی کو چھوڑ کر باقی کے لئے محنت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

شیعانِ علی

اور

حضراتِ اہل بیتؓ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

''اَخْرَجَ الطِّبْرَانِیُّ عَنْ اَبِیْ جَمِیْلَۃَ اَنَّ الْحَسَنَ بْنَ عَلِیٍّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا حِیْنَ قُتِلَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ، اُسْتُخْلِفَ فَبَیْنَا هُوَ یُصَلِّیْ بِالنَّاسِ اِذْ وَثَبَ اِلَیْهِ رَجُلٌ فَطَعَنَهٗ بِخَنْجَرَ فِیْ وَرِکِهٖ فَتَمَرَّضَ مِنْهَا اَشْهُرًا ثُمَّ قَامَ فَخَطَبَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ: یَا اَهْلَ الْعِرَاقِ! اِتَّقُوْا اللهَ فِیْنَا فَاِنَّا اُمَرَائُکُمْ وَضِیْفَانُکُمْ وَنَحْنُ اَهْلَ الْبَیْتِ الَّذِیْنَ قَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا: فَمَا زَالَ یَوْمَئِذٍ یَتَکَلَّمَ حَتّٰی مَا تَریٰ فِی الْمَسْجِدِ اِلَّا بَاکِیاً.'' (تفسیر ابن کثیر ج:۳ ص:۴۸۶)

ترجمہ:...... ''طبرانی میں حضرت ابوجمیلہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے تو وہ خلیفہ ہوئے ایک دن وہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے کہ اچانک ایک آدمی ان کی طرف لپکا پس ان کی سرین میں خنجر کا زخم لگایا جس سے وہ کئی مہینے بیمار رہے پھر آپ کھڑے ہوئے منبر پر اور خطبہ دیا، اس میں فرمایا کہ: اے

اہل عراق اللہ تعالیٰ سے ڈرو ہمارے معاملے میں بے شک ہم تمہارے امیر ہیں اور ہم تمہارے مہمان ہیں اور ہم اس اہل بیت میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا." (احزاب:۳۳) (اللہ تعالیٰ تو بس یہ چاہتے ہیں کہ اے اہل بیت تم سے گندگی کو دور کردیں اور تم کو اچھی طرح پاک کردیں) پس اس دن آپ گفتگو فرماتے رہے یہاں تک کہ مسجد میں کوئی آدمی بھی باقی نہیں رہا جو نہ رو رہا ہو۔"

اس واقعہ میں تین باتیں ذکر کی گئی ہیں:

۱:......ایک یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد جب حضرت حسنؓ خلیفہ ہوئے اور وہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے تو ایک آدمی نے ان کو خنجر کا زخم لگایا، یہاں سرین پر یعنی کولہے پر، جس سے وہ کئی دن بیمار رہے۔

۲:......دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ آپ نے خطبہ دیا اور اہل عراق سے فرمایا کہ: "اے اہل عراق ہمارے معاملے میں تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو ہم تمہارے امیر بھی ہیں، حاکم بھی ہیں، اور تمہارے مہمان بھی ہیں کیونکہ مدینے سے آئے ہوئے ہیں، اہل عراق نہیں ہیں۔"

۳:......اور تیسری بات یہ فرمائی کہ: ہم ان اہل بیت میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا." (احزاب:۳۳)

ترجمہ:......اللہ تعالیٰ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اے اہل بیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ تم سے گندگی کو دور کردے اور تم کو پوری طرح پاک کردے۔

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا خطبہ دیا کہ مسجد کے تمام لوگ

رو رہے تھے، اہل کوفہ اور اہل عراق یہ شیعان علی کہلاتے تھے یعنی حضرت علیؓ کا گروہ اور ان کی جماعت۔

شیعان علی کا کردار:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ مدینہ کے بجائے کوفہ میں تشریف لے آئے تھے اور کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنالیا تھا لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ان لوگوں نے وفا نہیں کی، اسی طرح حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان لوگوں نے بڑی ایذائیں پہنچائیں، شریف نجفی نے (جو شیعہ مصنف ہیں) اپنی کتاب ''نہج البلاغۃ'' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جو چند خطبے جمع کئے ہیں ان میں بار بار اس بات کی شکایت کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب بھی ان کو حکم فرماتے تھے، قتال کا، لڑائی کا، تو وہ اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتے تھے، اور جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی سے صلح کا ارادہ فرماتے تھے تو وہ اس پر معترض ہوتے تھے۔

شیعان علی حضرت علیؓ کی نگاہ میں:

ایک خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ میں تم لوگوں سے تنگ آگیا ہوں اور شاید تم مجھ سے تنگ آگئے ہو، اللہ کی قسم! میں اس بات پر راضی ہوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ سودا کرلوں، جس طرح کہ دینار کا درہم سے سودا کیا جاتا ہے، دینار سونے کا سکہ تھا اور درہم چاندی کا سکہ، ایک دینار کے دس درہم ملتے تھے تو میں چاہتا ہوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کے آدمیوں کا تم سے سودا کرلوں جس طرح کہ دینار کا درہم سے سودا کیا جاتا ہے، یعنی تمہارے دس آدمی دے دوں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک آدمی لے لوں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت کے لوگ ان کے نہایت فرمانبردار ہیں، وہ جو حکم کرتے ہیں اس کی تعمیل کرتے ہیں لیکن تم لوگ میرے حکم کی تعمیل نہیں کرتے۔

اسی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان لوگوں کے ہاتھوں کتنے تنگ ہوں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کسی فیصلے پر وہ جان و دل سے راضی نہیں ہوتے تھے، نکتہ چینی کرتے تھے، معارضہ کرتے تھے، مقابلہ کرتے تھے تو ایسے لوگوں کو لے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیسے لڑیں؟ یہی معاملہ ان لوگوں نے ان کے صاجبزادہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا۔

حضرت حسنؓ کے ساتھ شیعان علی کے مظالم:

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں تو یہ کہا جاتا تھا اور اہل کوفہ کہا کرتے تھے کہ یہ سخت آدمی ہیں، جو رائے قائم کرلیتے ہیں اس سے بدلتے نہیں اور بلاوجہ لڑائی بھڑائی کرتے ہیں، مختلف قسم کی نکتہ چینیاں کرتے تھے، لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاجبزادے حضرت حسن سبط اکبر، نواسہ رسول، رسول اللہ ﷺ کے پھول، ریحانۃ النبی ﷺ انکا لقب تھا، یہ مزاج کے بہت نرم تھے، ان میں سخت گیری نہیں تھی اور نرم مزاج حاکم رعایا کے دل میں محبوب ہوتا ہے لیکن ان لوگوں کا رویہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہی رہا یہاں تک کہ نماز کی جماعت کھڑی ہے، ایک آدمی نے خنجر کے ساتھ حملہ کیا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زخمی کردیا۔

اور بعض روایات میں آتا ہے کہ ان لوگوں نے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیمہ لوٹ لیا، سامان اڑا کے لے گئے، زدوکوب بھی کیا ایک صاحب حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے کے لئے آئے تو حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے فرمانے لگے کہ تم دیکھ رہے ہو یہ لوگ جو میرے شیعہ کہلاتے ہیں انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ اللہ کی قسم! میں یہ چاہتا ہوں کہ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صلح کرلوں اور اپنی جان کو، اپنے اہل وعیال کو اس کے ذریعے سے محفوظ کرلوں اس لئے کہ اگر یہی عالم رہا تو میں سمجھتا ہوں کہ نہ میری جان محفوظ رہے گی ان لوگوں سے اور نہ میرے اہل وعیال محفوظ رہیں گے، نہ میرا خاندان محفوظ رہے گا۔

شیعہ اور حضرت حسینؓ:

اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ جو کچھ ان کوفہ والوں نے کیا وہ تو سب کو معلوم ہے، ان لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا اور جن لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر غائبانہ بیعت کی تھی حضرت حسینؓ کو بلوا کر انہیں لوگوں نے آپ کے خلاف تلوار اٹھائی، تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی، حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی، یعنی تینوں زمانوں میں ان لوگوں نے جو کہ شیعان علی کہلاتے تھے ان تینوں بزرگوں کی خوب خوب بددعائیں سمیٹیں اور شاید اسی کا اثر ہے کہ کبھی ان لوگوں کو چین نصیب نہیں ہوا، ان بزرگوں کی بددعائیں سمیٹنے کے بعد یہ کبھی چین سے نہیں بیٹھے، یہاں تک کہ سینہ کوبی شعار بن گیا۔

تو ایک مضمون تو یہ ہے کہ اہل کوفہ اور اہل عراق، جو خاص حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گروہ تھا ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور ان سے پہلے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ رویہ۔

اور دوسرا مضمون ہے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ان کو خطبہ دینا اور فہمائش کرنا جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اپنے خطبات شریفہ میں ان کو بار بار فہمائش کرتے تھے، خدا کا خوف دلاتے تھے، نصیحت کرتے تھے، خیر خواہی کرتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے ان کی زبان کتنی مبارک ہوگی، کتنی بابرکت ہوگی، باب مدینۃ العلم تھے، ان کی زبان مبارک سے علم اور معرفت کے گویا چشمے پھوٹتے تھے، لیکن ان لوگوں پر کوئی چیز اثر نہیں کرتی تھی حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی خطبے دیئے، اور متعدد بار خطبے دیئے، ایک خطبہ کا اس روایت میں ذکر کیا گیا ہے جس میں فرمایا:

اے اہل عراق تم اس معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اس لئے کہ ہم تمہارے امیر بھی ہیں اور تمہارے یہاں مہمان بھی ہیں، امیر کا بھی حق ہے کہ جب تک وہ راہ راست پر چلے لوگ اس کی اطاعت کریں۔ آنحضرت ﷺ بار بار تاکید فرماتے ہیں: ''اِسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا۔'' سنو اور اطاعت بجالاؤ یعنی اپنے حاکم کی سنو اور اس کی مانو، ''اِلَّا اَنۡ تَرَوۡا کُفۡرًا بَوَّاحًا عِنۡدَکُمۡ مِنَ اللّٰہِ فِیۡہِ بُرۡهَانٌ۔'' (مشکوٰۃ:۳۱۹) الا یہ کہ تم دیکھو کہ وہ صریح کفر بک رہا ہے، تمہارے پاس اس معاملے میں اللہ کی جانب سے برہان موجود ہے۔

غیر مشروط اطاعت نبویؐ:

یہ مسئلہ اس سے پہلے میں ذکر کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے علاوہ اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت غیر مشروط ہے اس میں کوئی شرط نہیں ہے، یہ نہیں کہ اگر کوئی اچھی بات کہیں تو مانو اور اگر کوئی دوسری قسم کی بات کہیں تو نہ مانو۔ اس لئے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ آنحضرت ﷺ خیر کے علاوہ کوئی دوسری بات کہیں، اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت صرف دین کے کاموں میں نہیں ہے، صرف یہ نہیں کہ دین کے کاموں میں آپ ﷺ کی بات مانی جائے، بلکہ اگر خالص دنیاوی کام میں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ کسی شخص کے شخصی اور ذاتی معاملے میں کوئی حکم صادر فرمائیں تو اس کی تعمیل بھی واجب ہے، قرآن کریم میں ہے:

> ''وَمَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّلَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَمۡرًا اَنۡ یَّکُوۡنَ لَهُمُ الۡخِیَرَۃُ مِنۡ اَمۡرِهِمۡ وَمَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَهٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیۡنًا۔'' (احزاب:۳۶)
>
> ترجمہ:...... ''کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ، کسی

معاملے کا فیصلہ کردیں تو ان کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہ جائے، (رسول اللہ ﷺ کا حکم صادر ہونے کے بعد کسی شخص کو اپنے ذاتی معاملے میں بھی اختیار باقی نہیں رہتا، تعمیل واجب ہے) اور جو شخص نافرمانی کرے، اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی، تو وہ بہہ گیا دور کی صریح گمراہی میں۔"

تو آنحضرت ﷺ کی اطاعت غیر مشروط ہے، مگر اس کے باوجود آنحضرت ﷺ جب بھی فرماتے تھے تو یہ فرماتے تھے کہ میرے نیک کاموں میں اطاعت کرو۔

ماں باپ کی اطاعت مشروط ہے:

اسی طرح والدین کی اطاعت بھی فرض ہے، ماں باپ کی اطاعت بھی فرض ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

"وَقَضٰی رَبُّکَ اَن لَّا تَعۡبُدُوۡا اِلَّا اِیَّاہُ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا." (بنی اسرائیل:۲۳)

ترجمہ:...... "اور تیرے رب نے قطعی فرمان جاری کردیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔"

لیکن ماں باپ کی اطاعت مشروط ہے غیر مشروط نہیں اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ماں باپ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف حکم نہ دیں اگر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف حکم دیں تو اطاعت کرنا جائز نہیں، قرآن کریم میں ہے:

"وَاِنۡ جَاھَدَاکَ عَلٰٓی اَنۡ تُشۡرِکَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡھُمَا." (لقمٰن:۱۵)

ترجمہ:...... "اور اگر تجھے والدین اس بات پر مجبور

کریں کہ تو ایسی چیز کی عبادت کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کا
کہا نہ مان۔''

حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی والدہ ماجدہ کے بہت ہی زیادہ فرمانبردار تھے جب یہ مسلمان ہوگئے تو ان کی ماں نے کھانا کھانا چھوڑ دیا، کہنے لگیں کہ تم مسلمان ہوگئے ہو، جب تک محمد ﷺ کے دین کو نہیں چھوڑتے میں کھانا نہیں کھاؤں گی، یہ ان کی بڑی منت سماجت کرتے رہے کہ اماں تم کھانا کھالو (دین کا معاملہ آدمی کا اپنا اختیاری ہے، اپنی اپنی سمجھ کے مطابق آدمی دین اختیار کرتا ہے) لیکن بڑھیا نہیں مان کے دیتی تھی، دو دن گزر گئے اس نے کھانا نہیں کھایا، تیسرے دن حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اماں! اگر تو مر بھی جائے گی تو میں اسلام نہیں چھوڑوں گا، اب تیرا جی چاہے کھانا کھالے اور تیرا جی چاہے نہ کھا، مرجا، میں نہیں چھوڑوں گا اسلام چنانچہ اس نے کھانا کھانا شروع کردیا کہ یہ بیٹا تو نہیں مان رہا، بہرحال ماں باپ کا بہت بڑا حق، بہت بڑا حق ہے اور یہ تو بہت ہی مشہور حدیث ہے ہر ایک کو یاد ہوگی: ''اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ.'' (کنزالعمال: ج:۱۶ حدیث نمبر:۴۵۴۳۹) (جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ:

''اَلْوَالِدُ اَوْسَطُ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَاِنْ شِئْتَ فَحَافِظْ
عَلَى الْبَابِ اَوْ ضَيِّعْ.'' (مشکوۃ:۴۲۰)

یعنی آپ ﷺ نے فرمایا کہ باپ جنت کا درمیانی دروازہ ہے اگر تو چاہے تو اس کو قائم رکھ، چاہے تو اس کو ڈھا دے۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا:

''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ وَلَدٍ بَارٍّ يَنْظُرُ اِلٰى وَالِدَيْهِ نَظْرَةَ

رَحْمَةٍ اِلَّا كَتَبَ اللهُ لَهُ بِكُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً. قَالُوْا: وَاِنْ نَظَرَ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ؟ قَالَ: نَعَمْ! اَللهُ اَكْبَرُ وَاَطْيَبُ.''

(مشکوۃ ص:۴۲۱)

ترجمہ:......حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اگر فرمانبردار بیٹا اپنے ماں باپ میں سے کسی کو نظر رحمت کے ساتھ دیکھے تو ایک دفعہ نظر ڈالنے پر اللہ تعالیٰ اس کو حج مبرور کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔''(ایک دفعہ ماں باپ کو نظر رحمت کے ساتھ دیکھنے سے حج مبرور، حج مقبول کا ثواب ملتا ہے) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا چاہے ہم دن میں سو بار بھی اپنے ماں، باپ کو دیکھیں پھر بھی یہی ثواب ملتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پھر بھی یہی ثواب ملتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ دینے والا ہے اس سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ کو ثواب دینا کیا مشکل، کیا اللہ کا ثواب ختم ہوجائے گا؟ تو والدین کا بڑا درجہ ہے ان کی ہر جائز خواہش کو پورا کرو جہاں تک تمہارے امکان میں ہو، لیکن دو باتوں کا لحاظ رکھو:

ایک یہ کہ والدین کی اطاعت اللہ کی نافرمانی کرکے نہ کرو، شریعت کی خلاف ورزی کرکے نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماں باپ کی اطاعت پر مقدم ہے، اگر والدین اس پر ناراض ہوتے ہیں کہ یہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کیوں مانتا ہے؟ تو ان کو ناراض ہونے دو، اللہ ان کو ہمیشہ رنجیدہ رکھے دنیا میں بھی، قبر میں بھی، آخرت میں بھی، اللہ کبھی ان کا رنج دور نہ کرے اس لئے کہ وہ اپنی اولاد کو اللہ کی نافرمانی پر آمادہ کرتے ہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتے ہوئے کسی کی حق تلفی نہ کرو، ساس اور بہو کا قضیہ تو ہمیشہ چلتا رہتا ہے اور شاید یہ اماں حوا کے زمانے سے چلا آرہا ہے، یہ ایسی لاعلاج بیماری ہے کہ کسی حکیم نے کبھی اس کا علاج نہیں کیا، کرہی کیا سکتا ہے؟ اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ یہ وہ پل صراط ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک، ماں کو خوش رکھے تو بیوی ناراض اور بیوی کو خوش رکھے تو اماں ناراض اور اس معاملے میں بعض احمق تو وہ ہیں جو زن مرید ہوکر ماں باپ کے گستاخ ہوجاتے ہیں، بیوی کی مانتے ہیں، ماں کی سنتے ہی نہیں، اس کے حقوق واجبہ بھی ادا نہیں کرتے اور ان کے مقابلے میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ماں باپ کے فرمانبردار ہوتے ہیں اور بیوی پر ظلم ڈھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بیوی ان کی غلام بن کر رہے، بہت اچھی بات ہے اگر کوئی بیوی شوہر کے ماں باپ کو اپنے ماں باپ سمجھتے ہوئے (کہ چونکہ شوہر کے ماں باپ ہیں اس لئے اپنے بھی ماں باپ ہیں) ان کی خدمت اسی طرح کرے جس طرح ماں باپ کی خدمت کی جاتی ہے تو یہ اس کے لئے بڑی سعادت ہے اور ایسی بچیاں دنیا اور آخرت میں خوشحال ہوتی ہیں۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بوڑھی عورتوں کی عادت ہوتی ہے طعن تشنیع کی، بہو یہ بھی برداشت کرتی رہے، کوئی بات نہیں ٹھیک ہے آخر ماں بھی تو ناراض ہوجاتی ہے نا بچیوں سے، کوئی حرج نہیں کرنے دو، تو اگر کوئی بہو ایسی نیک بخت ہو کہ اپنے شوہر کے والدین کو واقعتاً اپنے والدین سمجھے بلکہ ان سے بڑھ کر، تو یہ اس کی بہت بڑی سعادت ہے، اس کی کرامت اور بزرگی ہے، اس کی نیکی ہے اور انشاء اللہ دنیا میں بھی اس کا اجر پائے گی اور مرنے کے بعد بھی اجر پائے گی، لیکن بھائی! اگر وہ اس پر آمادہ نہیں ہوتی تو تم اس پر زبردستی نہیں کر سکتے، پھر شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس کا چولہا الگ کردو، بہت سے گھر برباد ہوگئے ہیں صرف اس نقطے کی وجہ سے کہ لڑکی کی اپنی ساس کے ساتھ بنتی نہیں اور میاں نے اسکو اپنے میکے میں بٹھا دیا ہے۔

تو میں عرض کر رہا ہوں کہ والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری مشروط ہے اس کے ساتھ کہ کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو، اگر تم ماں باپ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے کسی کی حق تلفی کر رہے ہو تو قیامت کے دن تم سے مواخذہ ہوگا اور تم فرمانبردار نہیں سمجھے جاؤ گے۔

حاکم کی اطاعت بھی مشروط ہے:

اسی طرح حاکم کی اطاعت بھی فرض ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف کوئی حکم نہ دے، اگر وہ شریعت کے خلاف کوئی حکم دیتا ہے تو اس کی اطاعت فرض نہیں: "فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ." اگر شریعت کی حدود میں حاکم کوئی حکم دیتا ہے تو امیر کا یعنی حاکم کا حق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم تمہارے حاکم ہیں اور ظاہر ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ایسی ناجائز بات کا تو حکم نہیں فرمائیں گے جیسا ان کے والد ماجد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کسی ناجائز بات کا حکم نہیں فرماتے تھے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے ایسے حاکم عطا فرمائے ہوں اور وہ ان کی قدر نہ کریں تو ان کی بڑی بدقسمتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہوسکتی ہے؟

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے خطبات میں یہ فرمایا تھا کہ میں تم سے تنگ آ گیا ہوں اور میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے یہاں سے رخصت کر دیں اور مجھے ایسے لوگوں کی رفاقت عطا فرمائیں جو تم سے بہتر ہوں اور تمہیں ایسے حاکم نصیب فرمائے جن کا تم مزہ چکھو، اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم تمہارے مہمان بھی ہیں، مہمان کا بھی حق ہے، کیونکہ حدیث میں ہے:

"مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ
وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ وَمَنْ

كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ.‘‘

(مسند احمد ج:۲ ص:۱۷۴)

ترجمہ:......’’جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے ہمسائے کو ایذا نہ پہنچائے (نہ قول کے ساتھ نہ فعل کے ساتھ)، اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ اچھی بات کہے یا خاموشی اختیار کرے۔‘‘

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا مہمان کا اکرام ضروری ہے تو ہم تمہارے حاکم بھی ہیں اور تمہارے مہمان بھی ہیں اور تیسری بات یہ کہ ہم ان اہل بیت میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

’’اِنَّمَا يُرِيْدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا.‘‘ (احزاب:۳۳)

ترجمہ:......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ تمہیں یہ احکام اس لئے دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم سے گندگی کو دور رکھیں اور تم کو پوری طرح پاک اور پاکیزہ کریں جس طرح کہ پاک اور پاکیزہ کرنے کا حق ہے۔

اہل بیت کا مصداق:

یہاں پر یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ یہاں پر حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو آیت تلاوت فرمائی یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے اور اس آیت کے ٹکڑے سے پہلے اور بعد میں سلسلہ گفتگو چل رہا ہے امہات المؤمنینؓ کے ساتھ اور پورے رکوع میں انہیں کے ساتھ گفتگو کا ذکر ہے اور اسی ضمن میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ اے اہل

بیت! اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کردے، ظاہر ہے کہ اس سے اخلاق اور اعمال کی گندگی مراد ہے یعنی تمہارے اخلاق بھی پاکیزہ ہوں، تمہارے اعمال بھی پاکیزہ ہوں، اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں۔ تو اہل بیت کون ہیں؟ چونکہ گفتگو چل رہی ہے ازواج نبی ﷺ کے بارے میں تو اہل بیت بھی وہی ہوں گے، اہل بیت کا خطاب بھی انہیں کے لئے ہے۔

ایک اور موقع پر بھی اہل بیت کا ذکر آیا ہے قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس فرشتے آئے تھے بیٹے کی خوشخبری لے کر، حضرت اسحاق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت کی خوشخبری لے کر فرشتے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَامْرَأَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ." (ہود:۷۱)

ترجمہ:...... ان کی اہلیہ کھڑی تھیں (حضرت اسحاق کی والدہ، حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیوی) پس وہ مسکرائیں ہم نے اس کو خوشخبری دی حضرت اسحاق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کی۔"

یعنی ہم نے ان کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی خوشخبری دی اور یہ بھی خوشخبری دی کہ صرف بیٹا نہیں پوتا بھی ہوگا، یعنی اسحاق کے بعد یعقوب بھی ہوگا، اور تم دونوں میاں بیوی بیٹے کی اولاد دیکھ کر کے جاؤ گے، کہنے لگیں کہ تعجب کی بات ہے کہ اب میں بچہ جنوں گی نوے سال کی بڑھیا؟ اوپر یہ میرے میاں کھڑے ہیں! اس پر ارشاد ہوا:

"قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ." (ہود:۷۳)

ترجمہ:......"فرشتے کہنے لگے کیا تم تعجب کرتی ہو اللہ کے حکم سے؟ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں تم پر اے گھر والو! بے شک اللہ بہت خوبیوں والا اور بہت بزرگی والا ہے۔"

یہ تو گھر ہی ایسا ہے کہ ہمیشہ اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا مورد رہا ہے، تو اگر حق تعالیٰ شانہ نے اس عمر میں بیٹا عطا فرمادیا کون سا مشکل ہے، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اب یہاں پر فرشتے اہل البیت (اے گھر والو) کس کو کہہ رہے ہیں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سے گفتگو کررہے ہیں، ان کو اہل بیت کہہ رہے ہیں، تو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیوی کو فرشتے اہل بیت کہہ رہے ہیں، اور نبی کی بیوی کو اللہ تعالیٰ اہل بیت کہہ رہے ہیں۔

شیعہ اور اہل سنت کا اہل بیت کے مصداق میں اختلاف:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ایک چادر کے نیچے، کالی کملی کے نیچے حضرت علیؓ کو، حضرت حسنؓ کو، حضرت حسینؓ کو اور حضرت فاطمہؓ کو جمع کیا اور کہا:

"اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ فَاَذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَطَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا۔" (مجمع الزوائد ج:۹ ص:۱۶۷)

ترجمہ:......"اے اللہ یہ لوگ میرے گھر والے ہیں اہل بیت ہیں یا اللہ ان سے بھی گندگی کو دور کردے اور ان کو بھی پاک کردے۔"

بس ہمارا اور ان حضرات کا جھگڑا بس اسی "بھی" اور "ہی" میں ہوگیا۔

ہم نے کہا کہ نبی کی بیویوں کو قرآن نے اہل بیت کہہ دیا تھا، بات کو سمجھو مسئلہ سمجھ لو، نبی کی بیویوں کو، امہات المؤمنین کو اللہ تعالیٰ نے اہل بیت کہہ کر پکارا اہل بیت بھی انہیں کو کہا اور ان سے گندگی کو دور کرنے کا حکم بھی اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد

فرمایا، ان کو پوری طرح پاک کردینے کا فیصلہ بھی خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اور آنحضرت ﷺ نے چاہا کہ اس حکم میں ان کو بھی شریک کردیا جائے، چنانچہ ان کو چادر کے نیچے جمع کرکے اللہ سے دعا فرمائی اور رسول اللہ ﷺ کی دعا مقبول ہے اس لئے یہ چاروں بھی رسول اللہ ﷺ کی چادر کے نیچے اہل بیت میں شامل ہوگئے اور قرآن کریم کا یہ اعلان کہ اللہ تعالیٰ تم سے گندگی دور کرنا چاہتا ہے اور تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے ان کو بھی شامل ہوگیا، کیونکہ حضور ﷺ کی دعا مقبول ہے، تو ہم نے کہا یہ بھی اہل بیت ہیں اور ان حضرات نے کہا نہیں یہی اہل بیت ہیں، جن کو اہل بیت قرآن نے کہا تھا ان کو خارج کردیا، یہ تو زیادتی کی بات ہے، انصاف کیا جائے جن کو قرآن اہل بیت کہہ کر پکار رہا ہے ''یانساء النبی، یانساء النبی، یانساء النبی'' بار بار اور درمیان میں چلتے چلتے ان کو کہہ دیا اہل البیت جیسا کہ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو کہا تھا اہل البیت ان سے بات کرتے ہوئے، اب یہ کیسے ممکن ہے کہ فرشتے بات تو کررہے ہوں حضرت سارا سے اور اہل بیت کوئی اور ہو؟ کیا کسی کی عقل مانے گی؟ اسی طرح یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ گفتگو تو فرمارہے ہوں ازواج مطہرات سے لیکن ان کو اہل بیت کے زمرے سے خارج کردیں، یہ نہیں ہوسکتا، ہم نے کہا کہ اہل بیت تو ازواج النبی ﷺ ہیں، کیونکہ ان کو اللہ نے اہل بیت کہا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے کہا: یا اللہ! یہ چار بھی اہل بیت میں شامل کرلیجئے! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ٹھیک ہے یہ بھی شامل ہیں اور وہ بھی شامل ہیں، ہمارا اللہ پر بھی ایمان، رسول اللہ ﷺ پر بھی ایمان، لہٰذا ہمارے نزدیک یہ سب اہل بیت ہیں۔

''پنج تن پاک'' کا مسئلہ:

اب ایک اور مسئلہ سمجھو، کہتے ہیں پنج تن پاک جب اللہ نے کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے تو ان کے پاک ہونے میں کیا شک ہے بھئی جن کو اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے گندگی دور کرنا چاہتا ہے اور تمہیں پوری طرح پاک

کر دینا چاہتا ہے، تو کون کافر ہوگا جو ان کے پاک ہونے سے انکار کرے اور جب رسول اللہ ﷺ اپنی مبارک زبان سے دعا کر رہے ہیں: "اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلُ بَيْتِىْ فَاَذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيْرًا." یا اللہ یہ بھی میرے اہل بیت ہیں یا اللہ ان سے بھی گندگی دور فرما دیجئے اور ان کو بھی پوری طرح پاک کر دیجئے تو ان کے پاک ہونے میں کیا شک ہے، کسی مسلمان کے ذہن میں دور دور تک بھی یہ خیال نہیں آسکتا کہ خدانخواستہ نجاست اور گندگی کا کوئی شائبہ، کوئی دھبہ ان حضرات کے دامن پر لگا ہوا ہو۔

میری بات کو اچھی طرح سمجھ لو! حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم، رسول اللہ ﷺ کی تو بات ہی کیا ہے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے ذہن میں کبھی دور تک بھی یہ وسوسہ نہیں آسکتا کہ خدانخواستہ ان حضرات کے دامن پر گندگی کی چھینٹ یا کوئی دھبہ دور سے بھی لگا ہوا ہو، ان حضرات کے پاک ہونے میں کیا شبہ ہے؟ پھر جھگڑا کس بات کا؟ تم کہتے ہو یہی "پنج تن" ہی پاک ہیں، ہم کہتے ہیں یہ "پنج تن" پاک ہیں اور ازواج مطہرات بھی، "بھی" اور "یہی ہی" کا جھگڑا ہے، ہم کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے گھر میں جو نو بیویاں تھیں جن کو مسلمانوں کی مائیں کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پاکیزگی اور طہارت کا اعلان فرمایا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں۔

مسلمان جب بھی بولتے ہیں ازواج مطہرات یعنی پاک مائیں! سبحان اللہ! ان کے دامن ایمان اور دامن اخلاق پر کوئی دھبہ باقی نہیں رہا، رکھا ہی نہیں اللہ تعالیٰ نے اور نبی ﷺ کے گھر میں ایسی ہی بیویاں ہونی چاہئے تھیں اور مسلمانوں کی مائیں ایسی ہونی چاہئے تھیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے بھائی تھے لیکن بمنزلہ فرزند تھے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی تھیں، لخت جگر تھیں، جگر کا ٹکڑا تھیں اور حسن اور حسین رضی اللہ عنہما دونوں رسول اللہ

ﷺ کے پھول تھے، وہ بھی پاک، یہ بھی پاک، یہ پنج تن بھی پاک، لیکن کہنے والے صرف ان کو پاک نہیں کہتے بلکہ دوسروں کو ناپاک کہنا چاہتے ہیں، ہمیں اختلاف اسی سے ہے۔

جب کسی کے دولڑکے کھڑے ہوں تم کہو یہ بچہ اپنے ماں باپ کا بڑا فرمانبردار ہے تو حقیقت میں تعریض ہوتی ہے کہ دوسرا نافرمان ہے، وہ ازواج مطہرات امت کی مائیں جن کو قرآن نے کہا تھا: "وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا." تم ان کے دامن پر چھینٹے اڑاتے ہو اور صرف اس لئے ان چار یا پانچ بزرگوں کو پنج تن پاک کہتے ہو، ہمیں اس سے اختلاف ہے، ان کے پنج تن پاک ہونے میں اختلاف نہیں ہے، کیونکہ ان کے پاک ہونے میں کیا شبہ ہے؟ ہمیں اختلاف اس بات سے ہے کہ تم پنج تن پاک کہہ کر دوسروں کو ناپاک کہنا چاہتے ہو۔

معصوم اور پاک کا فرق:

ایک اور بات بھی سمجھ لو کہ معصوم ہونا اور چیز ہے پاک ہونا اور چیز ہے، تم جانتے ہو کہ ہر گناہگار سے گناہگار مسلمان جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو اس کو گناہوں سے پاک کر دیتے ہیں، پاک تو وہ بھی ہوگیا اور کوئی ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو پاک رکھتے ہیں یعنی گناہوں کی آلودگی سے ان کو ملوث ہی نہیں ہونے دیتے، یہ بھی پاک ہیں، اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ گناہوں کی آلودگی کے ساتھ ملوث ہونا ان کا ممکن ہی نہیں، ان کو معصوم کہتے ہیں، ہمارے نزدیک اولیاء اللہ محفوظ ہیں معصوم نہیں ہیں، پاک وہ بھی ہیں اور اللہ کے بے شمار بندے ہیں جو پاک ہیں، لیکن معصوم نہیں، معصوم صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

غصہ کے اسباب اور علاج

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُلِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ، وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا. مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ. وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡکَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسۡلِيۡمًا كَثِيۡرًا كَثِيۡرًا. اَمَّا بَعۡدُ!

”عَنۡ عُمَرَ رَضِىَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنۡهُ قَالَ مَنۡ خَافَ اللّٰهَ لَمۡ يَشۡفِ غَيۡظَهٗ وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ لَمۡ يَصۡنَعۡ مَايُرِيۡدُ وَلَوۡلَا يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ لَكَانَ غَيۡرَ مَا تَرَوۡنَ.“

(کنز العمال ج:۱۶ ص:۲۶۴ حدیث:۴۴۳۷۴)

ترجمہ:...... ”حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے: کہ جو شخص اللہ کا خوف رکھتا ہو وہ اپنے غصے کو ٹھنڈا نہیں کرتا، اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے وہ جو کچھ چاہتا ہے وہ نہیں کیا کرتا،

اور اگر قیامت کا دن نہ ہوتا تو اس کے سوا کچھ اور ہوتا جو تم دیکھتے۔"

بیہقی وغیرہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص لوگوں کو اپنی ذات سے انصاف دے، اس کو اس معاملے میں کامیابی عطا کی جاتی ہے، اور اللہ کی فرمانبرداری میں ذلت اختیار کرنا، نیکی کے زیادہ قریب ہے بہ نسبت گناہ کے ساتھ عزت حاصل کرنے کے، یہ پانچ فقرے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مواعظ کے۔

پہلا فقرہ یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو، وہ اپنے غصے کو ٹھنڈا نہیں کیا کرتا، یہاں تین باتیں ہیں، ایک ہے کسی کو غصہ آنا، اور دوسرا ہے غصے کے مطابق عمل کرنا، اور تیسرا ہے اس عمل کو جب تک غصہ ٹھنڈا نہ ہوجائے جاری رکھنا...... یہ تین چیزیں ہیں۔

غصہ کی مثال:

غصہ آنا تو ایک طبعی چیز ہے، ہر آدمی میں غصہ رکھا گیا ہے، اور حکماءً کہتے ہیں کہ غصے کی مثال اس کتے کی ہے جو گھر پر، یا فصل پر، کھیتی پر، یا ریوڑ پر پہرے کے لئے رکھا گیا ہو، ہر وہ چیز جو آدمی کو ناگوار ہوتی ہے، اس کے لئے وہ بھڑکتا ہے، غصہ بھڑکتا ہے، تو اس کی حیثیت مدافع اور پہرے دار کی ہے، کتا گھر میں ہوتا ہے تو وہ سارا دن آرام سے سویا رہتا ہے، کوئی آئے کوئی جائے، اس کو کوئی غرض نہیں، لیکن اگر کوئی چور چکار آئے یا کوئی مشکوک آدمی ہو تو وہ بھونکتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تیرا غصہ شکاری کتے جیسا ہونا

چاہئے، شکاری کتے کو اگر مالک شکار پر چھوڑے تو وہ جاتا ہے، اور بعض دفعہ تو اپنی جان بھی لڑادیتا ہے، اور اگر مالک اس کو نہ چھوڑے تو اس کو کوئی غرض نہیں ہوتی، چاہے سامنے سے شکار گزر رہا ہو، وہ نہیں بھڑکتا، اپنے آپ نہیں جاتا، یہ شکاری کتا سُدھایا ہوا ہوتا ہے، اور جس شخص کا غصہ سدھایا ہوا نہیں ہے، وہ باؤلے کتے کی طرح ہے، ہر ایک کو کاٹتا ہے، کوئی مہمان آجائے اس کو بھی کاٹتا ہے، اس کا بس چلے تو گھر والوں کو بھی کاٹتا ہے، غرضیکہ جو کوئی بھی سامنے آجائے اس کو کاٹتا ہے، تو آدمی کے اندر غصہ اللہ پاک نے رکھا ہے اور اسے خاص حکمت کی بناء پر رکھا ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ غصہ سُدھایا ہوا ہو، مہذب ہو، باؤلے کتے کی طرح ہر ایک کو کاٹتا نہ پھرے، ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ہر ایک پر غصہ آتا رہے، ذرا کسی نے مزاج کے خلاف کردیا تو مابدولت کا پارہ اوپر چلا گیا، یہ نہیں ہونا چاہئے۔

غصہ کی تہذیب:

غُصّہ کی تہذیب ضروری ہے، اور مشائخ اس کی تدابیر بتاتے ہیں کہ تمہارا غصہ مہذب ہوجائے، ایک ہے غصہ، دوسرا ہے غصے کے تقاضوں پر عمل کرنا، یہ شرعاً مذموم ہے، اگر یہ غصہ اپنے محل پر ہو اور تم نے اسے خاص خاص مواقع پر چھوڑا ہے تو بہت اچھا ہے، اللہ کے دشمنوں پر غصہ آتا ہے، تو یہ غصہ آنا چاہئے، اور اس کا موقع محل بھی دیکھنا چاہئے کہ آیا مجھے اس موقع پر غصہ کرنا چاہئے یا نہیں؟ اور اس پر عمل کرنا چاہئے یا نہیں؟ اور کرنا چاہئے تو کتنا؟ بس یہ دو سوال ہیں، اگر بے موقع، بے محل آپ نے غصہ کیا تو یہ شرعاً مذموم ہوگا، اور یہ باؤلے کتے کی مثال ہوگی کہ ہر ایک کو کاٹتا ہے۔

غصے کے اسباب:

اور اگر آپ نے موقع محل پر غصہ کیا، یعنی غصے کا اظہار کیا تو پھر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ حد شرعی کے اندر آپ رہے؟ یا باہر نکل گئے؟ تو میں نے کہا کہ غصہ تو ہر ایک میں اللہ نے رکھا ہے، لیکن غصے کا منشأ مختلف ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کو کمزوری کی وجہ سے غصہ آتا ہے، اعصاب میں تحمل نہیں ہوتا، اور بعض بڈھوں کو زیادہ غصہ آتا ہے، حالانکہ بڑھاپے میں غصہ ٹھنڈا ہوجانا چاہئے، بچوں پر جوانی میں غصہ کرلیا اب تو ٹھنڈے ہوجاؤ، لیکن اب اس کا کیا کیجئے کہ قویٰ متحمل نہیں ہیں، غصہ آتا ہے تو برداشت نہیں ہوتا، کمزور آدمی کو زیادہ غصہ آیا کرتا ہے، اور جتنا آدمی زیادہ صحت مند، قوی دل و دماغ کا ہوگا اتنا ہی متحمل مزاج ہوتا ہے۔

کبھی غصہ آتا ہے انانیت کی وجہ سے، جس کو آپ چاہیں تو فرعونیت کہہ لیں، کہ آدمی یہ کہے کہ میرے منشا کے خلاف کیوں کرتا ہے؟ یہ جو ہمارے اندر (شیطان) بیٹھا ہے، یہ سب سے ''اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی'' کہلوانا چاہتا ہے، اور جب دیکھتا ہے کہ یہ آدمی میرے سامنے رام نہیں ہوتا، اور میری انانیت و فرعونیت کو نہیں مانتا، ''اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی'' کے نعرے کے سامنے سر نہیں جھکاتا تو اس کو غصہ آتا ہے کہ یہ آدمی میری منشا کے خلاف کہتا ہے؟ غصے کی یہ قسم اللہ معاف فرمائے کم و بیش ہم سب میں ہے۔ یہ بجا ہے، اور درست ہے کہ اگر مابدولت کو کسی نے کچھ بات کہہ دی ہے، جو مزاج عالی کے خلاف ہے تو غصہ برحق ہے، لیکن میرا بھائی ایسی بھی کیا بات ہے، چلو کہہ دیا تو کہہ دیا۔

خلیفہ ہارون الرشید کا انداز نصیحت:

شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ ہارون الرشید کا لڑکا اپنے باپ کے سامنے شکایت لایا اور کہنے لگا کہ مجھے فلاں سپاہی کے لڑکے نے ماں کی گالی دی ہے، ہارون الرشید رحمۃ اللہ علیہ نے ارکان دولت سے پوچھا کہ کیوں بھئی کیا سزا ہونی چاہئے! کسی نے کہا کہ اس کو قتل کر دینا چاہئے، خلیفہ کی بیوی کو اور سلطنت اسلام کی خاتون اول کو اس نے گالی دی ہے، کسی نے کہا زبان کاٹ دینی چاہئے، کسی نے کہا اس کا مال و جائداد ضبط کر لینا چاہئے، کسی نے کہا اس کو جلاوطن کر دینا چاہئے، یا کم سے کم جیل کی سزا دینی چاہئے۔

ہارون الرشید نے بیٹے کو کہا بیٹا تم معاف کر دو تو زیادہ بہتر ہے، اس لئے کہ اس نے اپنا منہ گندا کیا ہے ورنہ اس نے تمہارا کیا نقصان کیا؟ تمہاری ماں کو گالی لگی نہیں، اگر کسی کی ماں ایسی نہیں ہے جیسے اس نے کہا تو اس کا منہ گندا ہوا، اس کی ماں کا کیا بگڑا، تو بہتر یہی ہے، مکارم اخلاق تو یہ ہیں کہ تم اس کو معاف کر دو، اور اگر تم سے برداشت نہیں ہوتا تو: "وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا." (الشوریٰ: ۴۰)

برائی کا بدلہ اتنی برائی ہے، تم بھی اس کی ماں کو گالی دے دو، لیکن شرط یہ ہے کہ جتنی اس نے دی تھی اتنی دو، اس سے زیادہ نہیں، کیونکہ اگر تم اس سے زیادہ دو گے تو تم ظالم بن جاؤ گے اور تمہارا مخالف مظلوم بن جائے گا۔

حضرت موسیٰؑ کی شکایت:

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حق تعالیٰ شانہ کی دربار عالیہ میں درخواست کی تھی کہ یا اللہ! آپ قادر مطلق ہیں اور میں آپ کا کلیم ہوں، یہ دو دو پیسے

کے لوگ مجھے برا بھلا کہتے پھرتے ہیں، آپ ان کی زبان بند نہیں کر سکتے۔ ارشاد ہوا کہ موسیٰ! اپنی مخلوق کی زبان تو ہم نے اپنے سے بند نہیں کی، تجھ سے کیونکر بند کریں گے؟

غصہ کے متعلق حضور ﷺ کا اسوۂ حسنہ:

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو کیا کچھ نہیں کہا گیا؟ اور ہمارے آقا، سید الکونین ﷺ، دو جہان کے بادشاہ کو کیا کچھ نہیں کہا گیا؟ اور اب تک کیا کچھ نہیں کہا جارہا؟...... اور ان سے اور سب سے بڑھ کر حق تعالیٰ شانہ وجل مجدہ کی شان عالی میں لوگ کیا کچھ نہیں بکتے؟ اللہ سے صبر سیکھو، حالانکہ اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ وہ ایک آن میں ساری دنیا کو تہس نہس کر ڈالے، آن واحد میں، بلکہ آنکھ جھپکنے سے بھی پہلے، لیکن وہ حکیم ہے، اور حلیم ہے، اگر کوئی شخص تمہاری برائی کرتا ہے، غصہ بجا ہے، آنا چاہئے، لیکن غصے کا پینا بھی تو مردانہ کام ہے، غصے کا جاری کرنا اور غصے کو اتارنا، غصے کے مطابق عمل کرنا...... یہ ہمت مردانہ نہیں، بلکہ تحمل کرنا، برداشت کر لینا مردانگی ہے۔

اہل اللہ کا ضبط نفس:

ایک بزرگ کو کوئی برا بھلا کہہ رہا تھا، فرمانے لگے بھائی تمہیں میری چند ظاہری چیزیں معلوم ہوگئی ہیں، تم ان کو بیان کر رہے ہو، اللہ بہتر جانتا ہے، اگر میری اصل حقیقت معلوم ہو جائے تو تم پتہ نہیں کیا کرو؟ مجھے اپنے ان عیوب پر نظر ہے، جن پر تمہیں نہیں، اس لئے اگر کسی کا پورا وجود گندگی میں ملوث ہو، اور کوئی شخص اسے کہے کہ حضور! یہ ذرا سی نجاست آپ کے کپڑے کے کنارے پر لگی ہوئی ہے، تو وہ غصہ

کرے گا؟...... نہیں! بلکہ وہ تو یہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے سارے وجود کی نجاست اس کی نظر سے چھپالی، اسے صرف اتنی سی نظر آئی ہے، وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرے گا، اور اسے کہے گا کہ بھائی تیرا شکریہ، ہم اس کو صاف کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ تجھے خوش رکھے۔

غصہ سے متعلق ایک بزرگ کا واقعہ:

ایک بزرگ جا رہے تھے، ایک آدمی ان کے پیچھے برا بھلا کہتے ہوئے چلنے لگا، وہ بزرگ چلتے چلتے ٹھہر گئے، فرمانے لگے میرے بھائی، میرے گھر کا دروازہ آگیا ہے، اب تو میں اندر چلا جاؤں گا، تمہیں کچھ اور کہنا ہے تو کہہ لو، میں ٹھہرتا ہوں، میں کھڑا ہوتا ہوں، کچھ تمہیں اور کہنا ہے تو کہہ لو، یہ تو ان لوگوں کی باتیں ہیں، جن کا غصہ مہذب ہو گیا تھا، اپنی ذات کے لئے غصہ نہیں آتا تھا، چنانچہ حدیث میں ہے:

''مَاانْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِہٖ قَطُّ.'' (مسلم ص:۲۵۶)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ کوئی کچھ بھی کہے آپؐ نے کسی سے انتقام نہیں لیا، کبھی ہم نے اس پر غور بھی نہیں فرمایا، یہ جتنے صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) آپؐ کے ارد گرد نظر آتے ہیں، معدودے چند حضرات کے سوا، باقی سارے کے سارے یہ وہی تو تھے جو حضور ﷺ کو برا بھلا کہتے تھے، یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاروق اعظم وہی ہیں جو تلوار لے کر کے آنحضرت کو قتل کرنے کے لئے نکلے تھے، اخلاق کی تلوار نے سب کو فتح کر لیا، اور وہ آنحضرت ﷺ کے عاشق زار بن گئے، اور اگر تم چاہو تو یوں کہہ لو کہ جب تک

اللہ کو منظور تھا، حضور ﷺ کے درمیان اور ان کے درمیان اللہ نے پردہ لٹکا دیا تھا، ان کی آنحضرت ﷺ کی حقیقت پر نظر نہیں تھی، اور جب توفیق الٰہی نے ان کی یاوری فرمائی، اور سعادت نے ان کی رہبری کی، تو اللہ تعالیٰ نے پردہ ہٹا دیا، آنحضرت ﷺ ان کے محبوب بن گئے، فتح مکہ سن ۸ھ میں ہوئی، جب سے رسول اللہ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا...... اس وقت سے لے کر فتح مکہ تک پورے بیس سال گزرے تھے۔

حضرت ابوسفیانؓ کا اعزاز:

ابوسفیانؓ اور ابوسفیانؓ کی بیوی...... یہ نمبر اول کے دشمن تھے حضور ﷺ کے، مکے کے چوہدری ابوسفیانؓ، اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ماجد، جب مکہ فتح ہوا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ، ابوسفیان کو لے کر راستے میں آگئے، اور ابوسفیان سے کہا کہ اب طاقت نہیں ہے...... بیعت کرلو، چنانچہ راستے میں آکر مسلمان ہوئے، اور آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمادیا: "مَنْ أَغْلَقَ بَابَهُ فَهُوَ آمِنٌ وَمَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِيْ سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ." (مسند احمد ج:۲ ص:۲۹۲) ترجمہ: جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کردیا اس کو امن اور جو ابوسفیانؓ کے گھر میں چلا جائے گا اس کو امن۔

قبول اسلام سے پہلے حضرت ہندہؓ کی کیفیت:

جس کا گھر سب سے بڑا دارالحرب تھا، آج اس کا گھر دار الامن ہے، اور ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہ وہ ابوسفیانؓ سے بھی دو ہاتھ آگے تھی، جب ابوسفیانؓ مسلمان ہوکر مکہ مکرمہ گئے، تو اس نے اپنے شوہر کی داڑھی پکڑلی، کہنے لگی تیرے جیسا بزدل نامرد، محمد کی بیعت کر کے آگیا، شرم نہیں آتی تجھے، انہوں نے مسکرا کر فرمایا کہ ابھی

آتے ہیں، تمہیں پتہ چل جاتا ہے، اس وقت انہوں نے تلخی سے جواب نہیں دیا، اتنا کہا، محمد ﷺ ابھی آتے ہیں، تمہیں پتہ چل جاتا ہے، مکہ مکرمہ بغیر کسی لڑائی بھڑائی کے فتح ہوگیا، آنحضرت ﷺ دیوار کعبہ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، یہی مکے والے آآ کے بیعت کر رہے تھے۔

قبول اسلام کے بعد ہندہؓ کی حالت:

مرد بیعت کر چکے تو عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں، ان عورتوں میں ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہؓ بھی تھی، منہ پر نقاب پہنے ہوئے تھی، لمبا قصہ ہے مختصر کرتا ہوں، بیعت کر چکیں، تو کہنے لگیں کہ یارسول اللہ! آج کے دن سے پہلے دنیا کی زمین کی سطح کا کوئی انسان مجھے آپ سے زیادہ ناپسند نہیں تھا، اور اللہ کی قسم! آج آپ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں ہے، آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر فرمایا...... ادھر بھی یہی معاملہ ہے، ادھر بھی یہی معاملہ ہے۔

غصہ میں اسوۂ نبویؐ:

یہ ہمارے نبی کریم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے، میں نے اس لیے ذکر کیا کہ ہندہ کچھ دیر پہلے اپنے شوہر کی داڑھی پکڑ کر کھینچ رہی ہے کہ ''محمد ﷺ کی بیعت کیوں کر آئے ہو''...... ایک دن پہلے کی یہ بات ہے، اگلی صبح کو آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے...... ان صاحبہ کو آنحضرت ﷺ سے کتنی نفرت ہوگی، کتنا بغض ہوگا، اور آنحضرت ﷺ کو کیا کیا کہتی ہوں گی؟...... لیکن التفات ہی نہیں فرمائی، اور جب اللہ تعالیٰ نے وہ پردہ سرکا دیا...... تو حقیقت محمدیہ ﷺ کی ذرا سی جھلک نظر آگئی...... تو سمجھ میں آگیا کہ محمدؐ یہ ہیں، تب سارے کا سارا بغض، محبت میں تبدیل ہوگیا۔ نفرت،

الفت میں بدل گئی، تو غرضیکہ اگر ہمیں کوئی برا بھلا کہتا ہے تو ہماری انانیت کو تحریک نہیں ہونی چاہئے، ذرا ٹھنڈا کر کے کھاؤ کہ معاف کر دینے میں وہ لذت ہے جو انتقام میں نہیں ہے، آج دنیا اس نکتے سے غافل ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے انتقام نہ لیا تو ہماری کمزوری سمجھی جائے گی، قدرت کے باوجود انتقام نہ لینا کمزوری نہیں ہے، عزت اور رفعت ہے، ہاں کمزور آدمی جو بے چارہ انتقام لینے پر قادر نہیں، وہ اگر صبر کے گھونٹ پیتا ہے تو اس کو آپ کمزوری کہہ سکتے ہیں، لیکن جس کو انتقام لینے کی قدرت ہے، اور قدرت کے باوجود وہ انتقام نہیں لیتا...... تو یہ کمزوری نہیں ہے۔ شیطان تمہیں بھڑکانے کے لئے انجکشن لگاتا ہے کہ دیکھو اگر تم نے انتقام نہ لیا، اگر تم نے خاموشی اختیار کرلی، اگر تم نے مخالف کی باتیں سن کر صبر کرلیا، اور زبان روک لی تو لوگ کیا کہیں گے؟ اور پھر تو تمہیں کمزور سمجھا جائے گا۔

شیطان بھڑکاتا ہے:

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ اَیِسَ اَنْ یَّعْبُدَہُ الْمُصَلُّوْنَ وَلٰکِنْ فِی التَّحْرِیْشِ بَیْنَھُمْ۔"

ترجمہ: "شیطان مایوس ہو چکا ہے کہ جزیرۂ عرب میں دوبارہ اس کی عبادت کی جائے، یعنی غیر اللہ کی عبادت کی جائے۔ لیکن ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکانے میں اس کو طمع ہے۔"

اور یہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ ہے، جس کو شیطان دباتا ہے، اور منشأ اس کا

وہی انانیت ہے، تبھی تو غصہ آتا ہے، ہاں اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف بات سن کر غصہ آتا ہے تو یہ غصہ برحق ہے۔

آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی تھے ابوسفیان، ایک تو ابوسفیان یہ تھے جن کا تذکرہ میں نے ابھی کیا تھا، یہ ابوسفیان ابن حرب ہیں، اور یہ عبدالشمسؒ کی اولاد ہیں، اور ایک آنحضرت ﷺ کے چچیرے بھائی ابوسفیان ہیں، ابوسفیان ابن حارث ابن عبدالمطلب...... یہ رسول اللہ ﷺ کے شدید ترین مخالف تھے، اور نہایت گالیوں کے قصیدے آنحضرت ﷺ کے بارے میں تصنیف اور نظم کرتے تھے، انہی کو حضرت حسان ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا وَاَجَبْتُ عَنْهُ...... وَعِنْدَ اللّٰهِ فِيْ ذَاکَ الْجَزَاءُ

ترجمہ:...... ''تم نے محمد ﷺ کی برائی کی ہے اور میں نے اس کا جواب دیا ہے، اور اللہ کے نزدیک اس میں میرے لئے جزا ہے۔''

اَتَهْجُوْهُ وَلَسْتَ لَهٗ بِکُفْءٍ...... فَشَرُّکُمَا لِخَيْرِکُمَا فِدَاءٌ

ترجمہ:...... ''تو آنحضرت ﷺ کو گالیاں دیتا ہے، منہ تو دیکھو اپنا تو ان کے برابر کا بھی ہے؟''

فَاِنَّ أَبِيْ وَ وَالِدَتِيْ وَعِرْضِيْ...... لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْکُمْ وِقَاءٌ

ترجمہ:...... ''میرا باپ، میری ماں اور میری آبرو، محمد ﷺ کی آبرو کے لئے ڈھال ہیں، اب تم کو جتنی گالیاں نکالنی ہوں گی مجھے نکالو گے محمد ﷺ کو نہیں۔''

شجاعت رسول ﷺ:

بات میں سے بات یاد آجاتی ہے، یہی ابوسفیان ابن الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، جن کے جواب میں حضرت حسانؓ نے یہ قصیدہ لکھا، اور اس کے چند شعر صحیح بخاری میں آئے ہیں، فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت ﷺ ہوازن کی جنگ کے لئے تشریف لے گئے، جس کا تذکرہ سورہ توبہ میں ہے: "وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا." (التوبہ:۲۵)

اس موقع پر صرف یہی ایک ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جو آنحضرت ﷺ کے خچر کی لگام پکڑے ہوئے تھے، سب کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، ایک حضور ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ اور دوسرے یہ چچا زاد بھائی ابوسفیان ابن حارث ابن عبدالمطلب...... یہ دو حضراتؓ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے، اور آنحضرت ﷺ اپنے خچر سے نیچے اتر کر کہہ رہے تھے: "اَنَا النَّبِیُّ لَا كَذِبْ، اَنَا بْنُ عَبْدُالْمُطَّلِبْ" (میں نبی ہوں، جھوٹ نہیں ہے، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں، بھاگنے والا نہیں ہوں) بجائے اس کے کہ ایسے موقع پر خچر پر سوار ہوکے بھاگ جائیں...... نہیں، نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ خچر سے نیچے اتر آئے، اور حضرت عباسؓ سے فرمایا: عباسؓ! ذرا آواز دو، درخت کے نیچے بیٹھ کر، جنہوں نے بیعت کی ہے وہ کہاں چلے گئے؟ اس کو قرآن نے بھی ذکر کیا ہے:

"لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ."

(سورۃ الفتح:۱۸)

فرمایا: "اَيْنَ اَصْحَابُ الشَّجَرَةِ؟" چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی آواز

بہت بلند تھی، چنانچہ جب پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو کر آواز لگاتے، تین میل تک آواز جاتی تھی، وہیں چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑے ہو کر حضرت عباسؓ نے کہا: ''یَا اَھْلَ الْاَنْصَارِ؟'' (انصار کہاں چلے گئے؟) ''اَیْنَ اَصْحَابُ الشَّجَرَۃِ؟''

وہ درخت کے نیچے بیعت کرنے والے کہاں چلے گئے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ حضرت عباسؓ کی آواز کا کانوں میں پہنچنا تھا کہ صحابہ کرامؓ اس طرح دوڑے رسول اللہ کی طرف، جیسا کہ بچے اپنی ماں کی طرف دوڑتے ہیں، اور اس کے بعد اللہ نے فتح عطا فرمائی۔

تو میرے بھائیو! یہ حضرت ابوسفیان تھے جن کے جواب میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ قصیدے کہہ رہے ہیں، اور جنگ ہوازن میں، حنین میں، یہی ابوسفیان رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے خچر کی لگام پکڑے ہوئے تھے۔

تو خیر! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کیخلاف اگر کوئی کچھ کرتا ہے......تو اس کو جواب دینا چاہئے، کیونکہ یہ اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے، دین اسلام کی کسی بات پر کوئی اعتراض کرتا ہے تو یہ مسلمان کو برداشت نہیں کرنا چاہئے، لیکن بھئی! اس وقت بھی حکمت سے کام لینا چاہئے، تو یہ دوسرا مرحلہ تھا غصے کے اظہار کا۔

تیسرا مسئلہ ہے غصے کو ٹھنڈا کرنا، غصے کا ٹھنڈا کرنا جانتے ہو؟ نہیں! کبھی ہمارے مدرسے میں آجاؤ، جہاں بچے پڑھتے ہیں مکتب کے، وہ قاری صاحب جو غصہ ٹھنڈا کرتے ہیں اس کو دیکھو، کسی چھوٹے سے بچے نے قصور کر دیا، چلو معمولی ایک آدھ طمانچہ لگا دیا، ایک معمولی چھڑی لگا دی، ختم ہوگئی بات، تنبیہ کر دی۔

قاری صاحبان کا بچوں کو مارنا:

لیکن بعض قاری صاحبان بچے کو اس طرح ذبح کرتے ہیں جیسے ایک قصاب بکری کو ذبح کرتا ہے، اور جب تک کہ وہ چھڑی بے چاری ٹوٹنے نہیں لگ جاتی اور قاری صاحب کے ہاتھ دکھنے نہیں لگ جاتے اس وقت تک قاری صاحب کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔

''احکام الصغار'' ایک کتاب ہے فقہ حنفی کی، جس میں چھوٹے بچوں کے احکام لکھے ہیں، اللہ کے بندوں نے وضو سے لے کر، وصایا تک سارے کے سارے چھوٹے بچوں کے احکام پر کتاب لکھ دی، اسی میں لکھا ہے کہ بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز کے لئے کہو، اور دس سال کا ہوجائے اور خود نہ پڑھے تو مار کر نماز پڑھاؤ، لیکن تین ضربوں سے زیادہ مارنے کی اجازت نہیں، اور لکڑی سے مارنے کی اجازت نہیں، اور اسی میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ جو شخص بچے کو بے دردی سے پیٹتا ہے، قیامت کے دن اس کا قصاص لیا جائے گا، ہم تو قاری صاحبان سے کہہ کہہ کر تھک گئے کہ بچوں کو نہ مارا کرو، لیکن وہ کہتے ہیں یہ پڑھتے نہیں ہیں، میں کہا کرتا ہوں کہ اگر بچے نہیں پڑھتے تو پھر اس کا یہ مطلب ہے کہ تمہیں پڑھانا نہیں آتا، بھلا کیا بچے مارنے سے پڑھتے ہیں؟ اور یہی سلسلہ تمہارے گھروں میں بھی ہے، یہ قاری صاحب کی مثال تو میں نے ویسے دی ہے، اخلاق اور شرافت کے ساتھ اولاد کو تنبیہ کرو۔ تم تو حلال اور حرام کی تمیز ہی نہیں کرتے، جائز اور ناجائز تو تمہاری شریعت میں ہے ہی نہیں، تمہارے معاشرے کی شریعت میں، اسلام کی شریعت کی بات نہیں کر رہا، تمام قسم کی گندگیاں تم نے گھروں میں ڈالی ہوئی ہیں، اور تم چاہتے ہو کہ بچے بااخلاق اور خالد

ابن ولید بنیں، یہ بچے ٹی وی دیکھنے والے، ڈش انٹینا دیکھنے والے اور ریکارڈنگ سننے والے، ان سے توقع رکھتے ہو کہ یہ خالد ابن ولیدؓ کے نقش قدم پر چلیں گے؟ جو بالغ ہونے سے پہلے بالغ ہوجاتے ہیں۔

منبر پر بیٹھا ہوا ہوں، اچھی بات نہیں ہے کہ اس کی تشریح کروں کہ وقت سے پہلے بالغ ہونا کیا ہوتا ہے؟ تم لوگ یا تو اس کا لحاظ ہی نہیں کرتے کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے، کیا انسانیت، کیا شرافت ہے، بچوں کو کس چیز کی تعلیم دی جائے؟ اور اگر کبھی کسی بچے سے غلطی ہوجاتی ہے تو غلطی کی بھی ایک حد ہوتی ہے، غلطی انسان کا خاصہ ہے، چھوٹے بچے تو تمہارے بچے ہیں، مجھے ایک صاحب کی بات بہت پسند آئی، فرمانے لگے: تم بھی کبھی بچے تھے، مجھے یہ بات بہت اچھی لگی، بچوں کی تو شرارتیں اور ان کی غلطیاں بھی معصوم ہوتی ہیں بھئی، اچھے انداز سے ان کو سمجھاؤ اور کوشش کرو کہ ان کی تربیت صحیح انداز سے ہو، میرے پاس دوتین آدمیوں کا کیس آیا ہے کہ اولاد جوان ہوگئی مگر یہ بڑے میاں اب بھی غصہ کررہے ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ بیوی بھی مخالف، بچے بھی مخالف ہوگئے اور بڑے میاں کو گھر سے نکال دیا، چلو جاؤ، چھٹی کرو، تو اگر کوئی بات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف ہو تو ضرور غصہ آنا چاہئے، لیکن حکمت کے ساتھ، اسی طرح اپنے چھوٹوں پر غصہ ٹھنڈا نہ کرو کہ جب تک تمہارا دل ٹھنڈا نہیں ہوجاتا اس وقت تک تم اپنا غصہ ہی جاری کرتے رہو، یہ نہیں ہونا چاہئے۔

غصہ کا علاج:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، جس شخص کے دل میں اللہ کا خوف ہو، وہ اپنے غصے کو ٹھنڈا نہیں کیا کرتا، اس میں ایک علاج بھی تجویز فرمادیا ہے،

جب تمہارا غصہ بھڑکے تو اتنا سوچ لیا کرو کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر غصہ کرنے لگیں تو میرا ٹھکانہ کیا ہوگا!!

یہ سوچو کہ میں نے اپنی پوری طاقت ان کے خلاف کام میں صرف کر دی ہے، اگر اللہ تعالیٰ میری غلطیوں پر، جو اس سے ہزاروں گنا، ہزاروں درجہ بڑی ہیں، اپنی طاقت استعمال کرنے لگیں تو پھر کیا ہوگا؟ ڈرو اللہ سے، اللہ کا خوف کرو، اس لئے کہ جو شخص اپنی فرعونیت کا مظاہرہ کرتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی قہرمانیت کا مظاہرہ کرتے ہیں، تھوڑی سی گوشمالی کرتے ہیں اور پھر تم اس میں چلاتے ہو، یہ جزاٗ وسزا کا ایک مستقل موضوع ہے۔

میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے، اور میرے پاس لوگ اپنی شکایتیں لکھتے رہتے ہیں، کسی بیچارے نے لالچ میں آکر قرآن کریم کی جھوٹی قسم تو کھالی، لیکن پھر قرآن کریم کی ایسی مار پڑی کہ دشمن بھی عبرت پکڑ کر کان پر ہاتھ رکھتے ہیں، اور دشمنوں کو بھی رحم آتا ہے، تم اللہ کے نام کو کھیل سمجھتے ہو؟ اللہ کے حلم پر نہ جاوٗ اللہ کے حلم پر نہ جاوٗ، بزرگوں کا ارشاد ہے کہ حلیم کے غصے سے ڈرو، حلیم برداشت کرتا رہتا ہے، پکڑتا نہیں ہے، غصہ نہیں کرتا، لیکن جب پکڑتا ہے تو پھر چھٹکارا مشکل ہوجاتا ہے۔

جو اللہ سے ڈرے وہ من چاہے اعمال نہیں کرتا:

اور دوسری بات یہ فرمائی کہ جو شخص اللہ سے ڈرے وہ اپنے من چاہے اعمال نہیں کرتا، جب اسے کہیں کہ یہ کیوں کیا؟ وہ یہ نہیں کہتا کہ میری مرضی، میں نے کرلیا، ارے تو کون ہے اور تیری مرضی کیا ہے؟ ذرا تھوڑا سا سوچ تو لیتے، تم ہوتے کون ہو؟

کس کھیت کی مولی ہوتم؟ تمہاری بھی مرضی چلتی ہے دنیا میں؟ میاں! اگر تمہارے سامنے اللہ کی ذات ہوتی تو تمہارے منہ سے میری مرضی کا لفظ نہ نکلتا۔ غلطی آدمی سے ہوتی ہے، لیکن وہ اکڑ کر ''میری مرضی'' نہیں کہتا۔

تیسری بات یہ فرمائی کہ ''قیامت کا ڈر ہے'' تم زندگی دیکھ رہے ہو ورنہ...... کچھ اور دیکھتے، جس شخص کے سامنے یہ ہو کہ میری ہر بات پر قیامت کے دن باز پرس ہونے والی ہے...... میزان عدل قائم ہونے والی ہے، اور میرے ہر عمل کو کانٹے پر تول کر دیکھا جائے گا......تو وہ ذرا محتاط زندگی بسر کرے گا۔

چوتھا فقرہ یہ ہے کہ جو شخص لوگوں کو اپنی ذات سے انصاف دے، اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کو اس کے تمام معاملات میں کامیابی دی جاتی ہے، لوگوں سے تو انصاف ڈھونڈتے اور مانگتے ہو، لیکن خود بھی تو دوسروں کو انصاف دو، یعنی جس چیز کا تم دوسرے لوگوں سے مطالبہ کرتے ہو، ہائے کاش! کہ تم نے بھی لوگوں کو انصاف دیا ہوتا۔

''تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ.''

یہ دن ہیں ہم ان کو ادلتے بدلتے رہتے ہیں لوگوں میں، کبھی تمہاری چڑھت تھی، تم نے اللہ کی مخلوق کو ستایا، اب اللہ نے ستانے والوں کو تم پر مسلط کر دیا، اور ایک وقت آئے گا کہ جب اللہ تعالیٰ ان پر دوسروں کو مسلط کریں گے۔

حج کے انعامات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد!

میری طبیعت علیل چل رہی ہے، آج بہت ہی ہمت کرکے اپنے آپ کو آمادہ کیا ہے کچھ بیان کرنے کے لئے۔ اسلام کے ارکان میں سے پانچواں اور آخری رکن حج بیت اللہ ہے۔ تمام مسلمان جانتے ہیں کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں (۱): ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کی گواہی دینا یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول اور نبی برحق ہیں۔ (۲) پانچ وقت کی نماز قائم کرنا۔ (۳) رمضان مبارک کے روزے رکھنا۔ (۴) مالداروں کے لئے جو صاحب نصاب ہوں، اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا۔ (۵) اور پانچواں رکن ہے حج بیت اللہ، یعنی بیت اللہ شریف کا حج کرنا۔

فرضیت حج:

حج عمر میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے، اور یہ اس شخص پر فرض ہے جو وہاں جانے کی طاقت رکھتا ہو، جو شخص طاقت نہیں رکھتا اس پر حج فرض نہیں، اور جو شخص ایک مرتبہ حج کرلے اس پر دوبارہ حج کرنا فرض نہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

''عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰه تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: یَا اَیُّهَا النَّاسُ قَدْ

فُرِضَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ فَحُجُّوْا. فَقَالَ رَجُلٌ اَكُلَّ عَامٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَسَكَتَ حَتّٰى قَالَهَا ثَلٰثًا. فَقَالَ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ......الخ." (مشکوٰۃ ص:۲۲۱)

ترجمہ:......"ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج بیت اللہ کی فرضیت کا مسئلہ بیان فرمایا، تو حضرت اقرع بن حابسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! حج صرف ایک ہی مرتبہ فرض ہے، یا ہر سال؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ جب اس نے تین بار سوال دہرایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اگر میں یہ کہہ دیتا کہ ہاں ہر سال فرض ہے تو ہر سال فرض ہوجاتا پھر تم اس کو کر نہ سکتے، پھر فرمایا صرف ایک ہی مرتبہ فرض ہے۔"

شیخ بنوریؒ کے حج وعمرے:

بہرحال حج عمر میں ایک ہی مرتبہ فرض ہے یوں اللہ تعالیٰ توفیق دے تو ہمیشہ حج کے لئے جانا چاہئے اور بار بار جانا چاہئے، ہمارے حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سال میں دو مرتبہ حرمین شریفین تشریف لے جاتے تھے، ایک مرتبہ رمضان میں عمرہ کے لئے، اور دوسری مرتبہ حج کے موقع پر، اور پھر فرماتے تھے کہ مجھے معلوم نہیں کہ میں کیوں جاتا ہوں، نہ طواف کرسکتا ہوں، نہ کوئی عمل کرسکتا ہوں، بس بیٹھا بیت اللہ شریف کو دیکھتا رہتا ہوں، چونکہ حضرتؒ کو گھٹنوں میں تکلیف رہتی تھی اس لئے زیادہ طواف اور عمرے نہیں کر پاتے تھے، اور کئی مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ہم بیٹری

چارج کرنے کے لئے جاتے ہیں، یہ بیٹری کون سی تھی؟ دل کی، روحانیت کی، ایمان و یقین کی اور تعلق مع اللہ کی۔

تجلیات الٰہی کا مرکز:

بیت اللہ شریف تجلیات الٰہیہ کا مرکز ہے، اور رحمت خداوندی کی تقسیم کا مرکز ہے، روزانہ ایک سوبیس رحمتیں بیت اللہ پر نازل ہوتی ہیں، اور دنیا میں جتنی رحمتیں اور جتنی برکتیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں وہ بیت اللہ پر اترتی ہیں اور پھر وہاں سے پورے عالم میں تقسیم ہوتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو ظاہری اور باطنی سعادتوں کا مرکز بنایا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ”وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَاَمْنًا.“ (البقرہ)۔ (اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے کہ جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا معبد اور مقام امن ہمیشہ سے مقرر رکھا) نا معلوم مشرق ومغرب سے، جنوب وشمال سے، کس کس خطے سے لوگ دیوانہ وار لبیک لبیک پکارتے ہوئے آرہے ہیں، جیسے پروانے شمع پر ٹوٹتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ حرمین شریفین جانے کا اتفاق تو ہمیشہ ہوتا ہے لیکن اس مرتبہ چار باتیں ذہن میں آئیں جن کو میں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

روحانی طور پر دلوں کا مقناطیس:

ایک بات ذہن میں آئی اور میں اس کو عطیہ الٰہی سمجھتا ہوں، گویا وہاں سے انعام ملا ہے کہ ساری دنیا جو یہاں کھنچ کھنچ کر جمع ہورہی ہے تو آخر کیوں جمع ہورہی ہے؟ بیت اللہ شریف کا ایک تو ظاہری نقشہ ہے، کہ پتھروں کی عمارت ہے، جن میں سیمنٹ لگایا ہوا ہے، نہ سنگ مرمر ہے، نہ کوئی اور ظاہری زینت کی چیز ایسی ہے جو

لوگوں کے لئے موجب کشش ہو، موٹے موٹے پتھروں کی عمارت، یہ بیت اللہ ہے، اوپر سیاہ غلاف پڑا ہوا ہے اس میں کوئی مادی کشش نہیں ہے کہ لوگ اس کی چمک دمک کو دیکھنے کے لئے آئیں، جیسے تاج محل کو دیکھنے کے لئے جاتے ہیں، یا کسی اور خوبصورت عمارت کو دیکھنے کے لئے جاتے ہیں، وہاں کوئی ظاہری، مادی کشش اللہ تعالیٰ نے نہیں رکھی، لیکن باطنی اور روحانی طور پر اللہ تعالیٰ نے اس کو دلوں کا مقناطیس بنایا ہے، جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اس طرح بیت اللہ قلوب کو اپنی طرف کھینچتا ہے، چنانچہ تمام اہل ایمان کے دل میں یہ جذبہ موجزن ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے اللہ کے گھر پہنچ جائیں، کوئی مسلمان ایسا نہیں ہوگا جس کے دل میں یہ تمنا اور یہ آرزو چٹکیاں نہ لیتی ہو، اور جس دل میں اللہ کا گھر دیکھنے کی تمنا نہیں، اور جس شخص کے دل میں یہ تڑپ نہیں ہے وہ صحیح معنی میں مسلمان ہی نہیں، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے فرضیت حج کا اعلان فرمایا: ”وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا.“ (آل عمران) (اور لوگوں کے ذمے ہے اللہ کی رضا کی خاطر اس بیت اللہ کا حج کرنا جو شخص یہاں پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو) تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا: ”وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ“ (اور جو کفر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ غنی ہے جہان والوں سے، اللہ کو کسی کی احتیاج نہیں ہے) اس میں اللہ تعالیٰ نے حج کے لئے نہ آنے کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”مَنْ لَّمْ يَمْنَعْهُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ اَوْسُلْطَانٌ جَائِرٌ اَوْمَرَضٌ حَابِسٌ فَمَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ اِنْ شَاءَ يَهُوْدِيًّا وَاِنْ شَاءَ نَصْرَانِيًّا.“ (مشکوٰۃ ص۲۲۲)

ترجمہ:...... ”جس شخص کو حج کرنے سے نہ فقر و فاقہ

> مانع تھا، نہ ظالم حاکم مانع تھا، نہ کوئی روکنے والی بیماری مانع تھی، اس کے باوجود وہ حج کئے بغیر مر گیا تو (اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں) چاہے وہ یہودی ہوکر مرے، چاہے نصرانی ہوکر مرے۔'' نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ۔

تو میں نے کہا کہ ہر مومن کے دل میں یہ آرزو چٹکیاں لیتی ہے کہ کسی طرح اللہ کے گھر پہنچے، اور یہ تقاضائے ایمان ہے، اور اگر کسی کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آتا تو پھر کہنا چاہئے کہ اس کا ایمان ہی صحیح نہیں، تو بیت اللہ کو اللہ تعالیٰ نے محبوبیت عطا فرمائی ہے، میں نے کہا کہ وہاں کوئی مادی کشش نہیں ہے کہ وہاں ظاہری طور پر کوئی نظارہ قابل دید ہو، وہاں دلچسپ مناظر ہوں، لیکن باطنی کشش اللہ تعالیٰ نے ایسی رکھی ہے کہ ہر آدمی کا جی چاہتا ہے کہ بیت اللہ سے لپٹ جائے اور لپٹ کر جتنا روسکتا ہے روئے، چنانچہ حکم بھی ہے لپٹنے کا، اگر اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو ملتزم سے لپٹا جائے، بیت اللہ شریف کے دروازے اور حجر اسود کے کونے کے درمیان کا جو حصہ ہے یہ ملتزم کہلاتا ہے، ملتزم کے معنیٰ ہی یہ ہیں ''لپٹنے کی جگہ'' کسی اور جگہ نہیں لپٹنا چاہئے کہ ادب کے خلاف ہے، وہاں اپنے جذبات پر نہیں بلکہ آئین ادب پر عمل کرنا ہے، یہ نہیں کہ جہاں چاہو بیت اللہ سے لپٹتے رہو، یہ ادب کے خلاف ہے، لپٹنے کی جگہ ملتزم کو بنادیا، اور دوسری جگہ میزاب رحمت کے نیچے حطیم کے اندر وہاں لپٹ جاؤ، الغرض کسی کو وہاں پہنچنے کی، بیت اللہ کی زیارت کی، اور ملتزم پر لپٹنے کی توفیق ہوجائے تو اس سے بڑی کیا سعادت ہوگی؟ ایک عارف کا قول ہے:

نازک بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است
افتم بپائے خویش کہ بہ کویت رسیدہ است

ہزار بار بوسہ دہم من دست خویش را
کہ دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

ترجمہ:...... ''مجھے اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے
تیرا جمال دیکھ لیا، میں اپنے پاؤں پر گرتا ہوں کہ چل کر تیرے
کوچہ میں پہنچ گئے، اور میں ہزار بار اپنے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہوں
کہ انہوں نے تیرے دامن کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ہے۔

لیلائے کعبہ کی محبوبیت:

لیلائے کعبہ میں اللہ نے ایسی محبوبیت اور ایسی کشش رکھی ہے کہ لوگ اس پر دیوانہ وار ٹوٹتے ہیں، چاہتے ہیں کہ کسی طرح بیت اللہ تک پہنچ جائیں، وہاں پہنچ کر بھی (کیونکہ بھیڑ ہوتی ہے) جس خوش قسمت کو چمٹنے کا موقع نصیب ہوجائے اس کا جی پھر یہ نہیں چاہتا کہ بس کرے، پیچھے ہٹ جائے، لوگ اس کو پیچھے سے ہٹاتے ہیں کہ میاں دوسروں کو بھی موقع دو، لیکن نہیں، وہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتا، یہ کیا چیز اللہ تعالیٰ نے وہاں رکھی ہوئی ہے؟ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے کیا مقناطیس بھرا ہوا ہے؟ لوگ یہ سب کچھ محض دیکھا دیکھی تو نہیں کرتے، یہ کیا بات ہے کہ میرے جیسا سنگ دل آدمی بھی جو باہر سے ہنستا کھیلتا چلا آتا ہے، لیکن جوں ہی بیت اللہ شریف کے پردے کو پکڑتا ہے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے، لوگوں کو وہاں روتے ہوئے دھاڑیں مارتے ہوئے چلاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ تو ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ بیت اللہ شریف کو اللہ تعالیٰ نے مرکز ایمان اور دلوں کا مقناطیس بنایا ہے، جیسے ہمارے حضرت بنوریؒ فرماتے تھے کہ بیٹری چارج کرنے کے لئے وہاں جاتے ہیں، اپنے ایمان کو اس جنریٹر کے

ساتھ لگا دو، دل کو اس کے ساتھ جوڑ دو، دل کی بیٹری چارج ہو جائے گی، دل ایمان سے بھر جائے گا، عشق الٰہی سے دل کی انگیٹھی روشن ہوجائے گی اور جاذبہ عشق ومحبت تمہیں ملأ اعلیٰ کی طرف کھینچ لے گا۔

اللہ کی بڑائی و کبریائی کا احساس:

دوسری بات سمجھ میں آئی کہ یہاں بڑوں کو بھی دیکھا، چھوٹوں کو بھی دیکھا کہ سب ایک لائن میں لگے ہوئے ہیں، وہاں پہنچ کر بڑے سے بڑے کی بڑائی کا شیش محل چکنا چور ہوجاتا ہے اورسب کو اپنے ہیچ در ہیچ اور لاشئی ہونے کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوجاتا ہے، اور اپنا بندۂ محض ہونا کھل جاتا ہے، ہمارے ایک دوست کراچی میں بھی ملتے رہتے ہیں، حرم شریف میں میرے پاس آبیٹھے تو انہوں نے میرے بارے میں کوئی ایسی بات کہی، میں نے کہا بھائی یہاں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے، وہاں پہنچتے ہی بڑوں کی بڑائی کافور ہوجاتی ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور کبریائی کا ایسا احساس ہوتا ہے کہ اپنے وجود سے شرم آنے لگتی ہے، وہاں شاہوں کو دیکھا، گداؤں کو دیکھا، عابدوں کو دیکھا، نیکوں کو دیکھا، بدوں کو دیکھا کہ سب کے سب دامن دل پھیلائے گڑگڑا رہے ہیں، اسی در پر انبیأ علیہم السلام بھی اپنا ماتھا رگڑ رہے ہیں اور ہم جیسے سیاہ کار اور گناہ گار بھی، ایک فقیر بےنوا بھی وہاں دست سوال دراز کرتا ہے، اور بارگاہ صمدیت سے بھیک مانگتا ہے، "یَارَبَّ الْبَیْتِ" (اے گھر کے مالک) کہہ کر کے اسے پکارتا ہے، اور ہارون الرشید جیسا مطلق العنان خلیفہ و بادشاہ بھی وہاں پہنچ کر گدائے گدایان بن جاتا ہے اور بھکاریوں کی طرح لپک لپک کر مانگتا ہے اور کہتا ہے یَارَبَّ الْبَیْتِ! وہاں پہنچ کر مشاہدہ ہوجاتا ہے کہ بس یہی ایک بارگاہ عالی، داتا کا دربار

ہے۔

داتا صرف اللہ تعالیٰ ہیں:

وہی ایک دینے والا ہے، باقی سب کے سب بھیک منگتے ہیں، سب کے سب ایک گھر کے بھکاری ہیں، الغرض وہاں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز اٹھ جاتا ہے، وہاں شاہ و گدا کا سوال نہیں رہتا، وہ ایک دینے والا رب ہے، باقی سب لینے والے بندے ہیں، وہ ایک داتا ہے، باقی سب کے سب اس کی بارگاہ کے، اس کے دروازے کے سوالی ہیں، فقیر ہیں، چنانچہ ارشاد ہے: ”یَا اَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ.“ (سورۃ فاطر:۱۵) (اے لوگو تم سب کے سب اللہ کی طرف فقیر ہو اور اللہ غنی ہے، لائق حمد ہے) فقیر اس کو کہتے ہیں جو محتاج ہو، اللہ تعالیٰ غنی مطلق ہیں کسی چیز میں کسی کے محتاج نہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سوا ساری کائنات، ہر آن اور ہر لحہ اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے، اپنے وجود میں بھی، اپنی بقاء میں بھی، اور اپنی تمام ضروریات میں بھی، دنیا و آخرت کی کوئی چیز ایسی نہیں جس میں بندے، اللہ تعالیٰ کے محتاج نہ ہوں، اور کوئی شر ایسا نہیں جس کے دفع کرنے میں اللہ تعالیٰ کے محتاج نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”یَا اَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَى اللّٰهِ“ اے لوگو تم سب کے سب فقیر ہو اللہ کی طرف، تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں، سب کے سب خالی ہاتھ ہو، ”وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْد“ اور تنہا اللہ تعالیٰ ہی غنی ہیں، حمید ہیں، اس کے سوا کوئی غنی نہیں، ہم لوگ حقیقت ناشناس، یوں ہی در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں، کبھی ادھر بھاگتے ہیں، کبھی ادھر بھاگتے ہیں۔

شیخ سعدیؒ کی حکایت:

شیخ سعدیؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک مانگنے والا تھا، گھر گھر صدائیں لگا رہا تھا، دروازے کھٹکھٹا رہا تھا، ''کہ کوئی پیسہ دے اللہ کے نام پر'' مانگتے مانگتے مسجد کے دروازے پر پہنچ گیا، اس نے مسجد کا دروازہ کھٹکھٹادیا اور کہا کہ کچھ اللہ کے نام پر، کسی نے کہا میاں! یہ گھر نہیں ہے، یہ مسجد ہے، کسی گھر پر جا کر مانگو، فقیر کہنے لگا کہ یہ کس بخیل کا گھر ہے جو کسی فقیر کو خیرات نہیں دیتا؟ کہا بھئی ایسا نہ کہو! یہ تو احکم الحاکمین کا، سخیوں کے سخی کا اور غنیوں کے غنی کا گھر ہے، رب العالمین کا گھر ہے، اللہ کا گھر ہے، کہا اللہ کا گھر ہے؟ کہا ہاں! کہا اچھا میں اللہ کے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا ہوں؟ کہا ہاں! اس نے اپنا کشکول، جو اس کے پاس تھا، اس کو پھینک دیا، کہنے لگا، جب اللہ کے دروازے پر پہنچ گیا ہوں تو پھر کسی اور سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر اور سے مانگنے کی کیا حاجت ہے؟ ہم لوگ اللہ کے گھر پر حاضری دیتے ہیں، اور اپنی آنکھوں سے وہاں ہر ایک کو اللہ سے مانگتا ہوا دیکھتے ہیں، جس سے مشاہدہ ہوجاتا ہے کہ سب فقیر ہیں، مانگنے والے ہیں، دینے والا صرف ایک ہے، تو کیوں نہ اسی سے مانگنا شروع کردیں، الغرض اس سال حج میں ایک انعام یہ ملا کہ مخلوق سے نظر اٹھاؤ، اور خالق پر نظر جماؤ، سب کو فقیر سمجھو، ایک کو غنی سمجھو، ایک دینے والا ہے، غنی ہے، جو کسی سے مانگتا نہیں، اور باقی سب مانگنے والے ہیں، اور یہ یقین دل میں پیدا ہوجائے تو واقعتاً پھر حج، حج ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کے گھر جا کر بھی دوسروں پر ہی نظر رہی تو پھر قصہ ختم، گویا اس بے چارے کو حج سے کچھ نہیں ملا۔

صرف ایک کی طرف نظر:

ایک بزرگ تھے آنکھ پر پٹی باندھی ہوئی تھی اور بیت اللہ کا طواف کر رہے

تھے اور بار بار ایک ہی لفظ کہہ رہے تھے کہ "اے مالک! میں آپ کی ناراضگی سے پناہ چاہتا ہوں، آپ کی ناراضگی سے پناہ چاہتا ہوں۔" بار بار یہی لفظ دہرا رہے تھے، طواف کے بعد کسی بزرگ نے ان کو پکڑ لیا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اور یہ آنکھوں پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟ کہنے لگے بھائی بات بتانے کی تو نہیں تھی، لیکن تم نے پوچھ لیا ہے تو بتا دیتے ہیں، میں بیت اللہ شریف کا طواف کر رہا تھا کہ اچانک نظر نامحرم پر پڑ گئی، اور میں اس کو دیکھنے لگا، غیب سے ایک تھپڑ آنکھ پر لگا کہ آنکھ جاتی رہی، اور ساتھ آواز آئی کہ شرم نہیں آتی میرے گھر میں پہنچ کر دوسروں کو دیکھتا ہے؟ اس وقت سے بس یہی ورد کر رہا ہوں کہ "آپ کی ناراضگی سے پناہ چاہتا ہوں" تو اس بار اللہ تعالیٰ کے گھر پہنچ کر ایک حقیقت یہ سمجھ میں آئی کہ اس کی ذات عالی کے سوا سب سے نظر اٹھالی جائے، اور یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دولت ہمیں نصیب فرمائیں اور یہ مضمون ہمارے دل میں بیٹھ جائے تو ساری دولتیں اس پر قربان۔

کوئی محروم نہیں آتا:

اور ایک بات اور سمجھ میں آئی، وہ یہ کہ جانے والے تو سب ہی جاتے ہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا چھوٹے بھی جاتے ہیں، بڑے بھی جاتے ہیں، عالم بھی جاتے ہیں، جاہل بھی جاتے ہیں، نیک بھی جاتے ہیں، بدکار بھی جاتے ہیں، اچھے بھی جاتے ہیں، برے بھی جاتے ہیں، اور یقین ہے کہ کوئی وہاں سے محروم نہیں آتا کسی کو محروم نہیں کیا جاتا۔

لاکھوں انسانوں کی دعا رد نہیں ہوتی:

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ وہ اپنے دوستوں سے میدان عرفات میں فرمانے لگے کہ بھئی! ایک بات بتاؤ، یہ پانچ لاکھ، دس لاکھ، یا پندرہ بیس لاکھ حاجی ہیں، جو

میدان عرفات میں اترے ہوئے ہیں، اگر اتنا بڑا مجمع، دس لاکھ کا مجمع کسی سخی کے دروازے پر جمع ہو جائے، اور اسے یہ کہے کہ برائے کرم ایک چھٹانک آٹا دے دیجئے، یا یہ سارا مجمع کسی سخی کے دروازے پر جمع ہو کر درخواست کرے کہ ایک پیسے کی ضرورت ہے، ایک پیسہ دے دیجئے تو تمہارا کیا خیال ہے وہ سخی ان دس لاکھ آدمیوں کی فرمائش پر ایک پیسہ نہیں دے گا؟ ایک چھٹانک آٹا نہیں دے گا؟ دوستوں نے کہا جی حضرت کیوں نہیں دے گا، فرمایا یہ سب لوگ ایک بارگاہ عالی سے مغفرت مانگ رہے ہیں اور پوری دنیا کی بخشش کر دینا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا آسان ہے جتنا کہ ایک سخی کے لئے ایک پیسہ دے دینا، سارے حاجی صاحبان مل کر، گڑگڑا کر، رو رو کر اللہ تعالیٰ سے کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ! بخش دے، گناہ معاف کر دے، بخشش فرمادے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھنا چاہئے کہ وہ ان کی درخواست کو رد نہیں فرمائے گا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ مجھے یقین ہے ان شاء اللہ وہاں سے کوئی محروم نہیں آتا، اور اللہ تعالیٰ وہاں سے کسی کو محروم نہ لوٹائے، اس لئے کہ جو شخص نعوذ باللہ وہاں سے بھی محروم آیا اس کے لئے پھر کونسا دروازہ ہے؟

ایک بزرگ کا واقعہ:

ایک بزرگ تھے، وہ جب بھی لبیک کہتے تھے تو آواز آتی تھی ”لا لبیک“ (تمہاری لبیک منظور نہیں) ہر سال حج پر جاتے، اور جب بھی لبیک کہتے تو آواز آتی کہ تیری لبیک قبول نہیں، ایک دفعہ ساتھ میں ان کا خادم بھی تھا، اس نے بھی یہی آواز سنی، وہ بزرگ اسی ذوق وشوق اور اسی رغبت ومحبت کے ساتھ حج کے ارکان ادا کر رہے تھے، خادم نے کہا حضور! لبیک تو نامنظور، پھر اس محنت کا فائدہ؟ کہنے لگے تم نے بھی سن لی ہے؟ کہنے لگے ہاں! فرمایا: میں پچاس سال سے سن رہا ہوں، پچاسواں

حج ہے، پچاس سال سے برابر سن رہا ہوں کہ جب بھی لبیک کہتا ہوں، ادھر سے آواز آتی ہے تیری کوئی لبیک نہیں، چل دفعہ ہو۔ شاگرد کہنے لگا کہ پھر ٹکریں مارنے کا کیا فائدہ؟ فرمایا: برخوردار! کوئی اور دروازہ ہے جہاں چلا جاؤں؟ یہ تو منظور نہیں کرتے، کوئی اور دروازہ ہے کہ جا کر وہاں سے مانگ لوں؟ نہیں! نہیں! یہی ایک دروازہ ہے، ملتا ہے تب بھی،نہیں ملتا تب بھی، مانگنا تو اسی دروازے سے ہے، ایک عارف نے خوب کہا ہے:

یا بم او را یا نہ! جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نہ آید آرزوئے می کنم

ترجمہ:......میں اس کو پاؤں یا نہ پاؤں ، جستجو کرتا رہوں گا اور وہ مجھے ملے یا نہ ملے آرزو کرتا رہوں گا۔

بہت بڑی محرومی:

الغرض اگر کوئی وہاں سے خدانخواستہ محروم واپس آگیا تو اس کی محرومی ناقابل علاج ہے، اس کی محرومی کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا، وہ تو ابلیس کا بھائی ہوا کہ ابلیس خدا کی بارگاہ سے بھی راندہ گیا،لیکن اندازہ یہ ہوا (واللہ اعلم بالصواب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات کو بہتر سمجھتے ہیں) کہ جو بھی محبت کے ساتھ جاتے ہیں وہ کچھ نہ کچھ لے کے آتے ہیں۔

جتنا برتن اتنی خیرات:

مگر یہ بات سمجھ میں آئی کہ جتنا برتن لے کر جاؤ گے اتنی ہی خیرات ملے گی، افسوس اس بات کا ہے کہ ہم اپنا برتن بہت چھوٹا لے کے جاتے ہیں، جاتے ہیں سب سے بڑی بارگاہ میں کہ اس سے بڑی کوئی بارگاہ نہیں، اس سے کوئی بڑا دربار نہیں، لیکن

وائے حسرت کہ ہم بہت چھوٹا برتن لے جاتے ہیں، اتنا برتن لے کر کہ ایک چلو پانی سے بھر جائے، اس کا افسوس اور صدمہ ہے، حد سے زیادہ صدمہ! کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو سمیٹنے کے لئے جیسا برتن چاہئے ویسا برتن ہمارے پاس نہیں اور اس کا مہیا کرنا بھی مشکل ہے، بھائی! اللہ تعالیٰ کی رحمتیں تو لامحدود ہیں، لامحدود رحمتوں کو سمیٹنے کے لئے لامحدود برتن کہاں سے لائیں؟ لیکن پھر بھی ذرا بڑا برتن تو ہونا چاہئے، اتنا بڑا ظرف ہونا چاہئے کہ آسمان و زمین کی وسعتیں اس کے سامنے ہیچ ہوں، اور وہ کیا ہے؟ عبدیت کا برتن، فنائیت کا برتن، یعنی اپنے آپ کو مٹا دینا اور اپنی انا کو ختم کر دینا، جتنی فنائیت اور عبدیت زیادہ ہوگی اسی قدر رحمتوں کی بارش بھی زیادہ ہوگی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں پر ہوتی ہے، اور جو لوگ اپنے دلوں کے اندر انانیت اور غرور و پندار کے بت لے کر بیٹھے ہوں ان پر کیا رحمت ہوگی؟ تو جتنی عبدیت کسی کی کامل ہوگی اور جس قدر اپنے آپ کو مٹا دینے اور اپنی عقل کے، اپنے نفس کے اور اپنی طبیعت کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر بارگاہ الٰہی میں حاضری دینے کی کیفیت ہوگی اسی قدر عنایات خداوندی کی دولت سے نوازا جائے گا۔

حلق نہ کرانے پر ایک کرنل کا واقعہ:

میں حرم شریف میں بیٹھا تھا ایک دوست ایک کرنل صاحب کو لے کر آئے، کرنل صاحب ماشاء اللہ، وہاں جا کر بھی کرنل کے کرنل ہی تھے، انگریزی بال رکھے ہوئے تھے، اور احرام کھولنے کے لئے دو تین بال کاٹ دیئے تھے، داڑھی اسی طرح مونڈی ہوئی تھی، میرے دوست کہنے لگے کہ جی میں نے ان کو مسئلہ سمجھایا ہے کہ احرام کھولنے کے لئے حلق یا قصر کرانا ضروری ہے، لیکن یہ مانتے نہیں ہیں، آپ ذرا ان کو سمجھا دیں، میں نے کہا بھائی سب سے اول نمبر پر حلق ہے، یعنی سر کے سارے بال

استرے سے منڈوا دیئے جائیں، جیسا کہ حدیث میں ہے:

"عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِيْنَ. قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِيْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِيْنَ. قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِيْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِيْنَ. قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِيْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ وَالْمُقَصِّرِيْنَ." (مشکوٰۃ ص:۲۳۲)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ: اے اللہ رحمت نازل فرما حلق کروانے والوں پر، صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بال کٹانے والوں کے لئے بھی دعا کردیجئے، یعنی جو لوگ احرام کھولنے کے لئے حلق کرانے کے بجائے قینچی کے ساتھ، مشین کے ساتھ بال کٹوادیتے ہیں ان کے لئے رحمت کی دعا فرمادیجئے، فرمایا: اے اللہ رحمت نازل فرما حلق کرانے والوں پر، یعنی بال صاف کرانے والوں پر، اس پر صحابہؓ نے پھر عرض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار فرمایا: اے اللہ رحمت نازل فرما حلق کرانے والوں پر، صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! قصر کرنے والوں کے لئے بھی دعا کردیجئے، فرمایا: چلو مقصرین پر بھی اللہ کی رحمت ہو۔

ایک آدمی اللہ کے گھر پہنچتا ہے، اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے رحمت سے محروم رہنا گوارا کرتا ہے اس سے بڑا بدنصیب کون ہوگا؟ تو پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ بھائی استرے کے ساتھ سارے سر کے بال اتارو، یہ افضل ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے آدمی کے لئے تین دفعہ دعائے رحمت فرمائی ہے، لیکن اگر یہ نہ ہو تو پورے سر کے بال ایک پورے کے برابر کٹوادو، اور یہ بھی نہ ہو تو کم سے کم چوتھائی سر

کے بال اتار دینے سے احرام کھل جائے گا، گو ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے، لیکن اگر کسی نے چوتھائی سر سے کم بال اتارے تو اس کا احرام ہی نہیں کھلا، وہ بدستور احرام میں ہے، اسی طرح احرام کی حالت میں کپڑا پہن رہا ہے، اسی طرح دوسرے کام کر رہا ہے، میں نے یہ مسئلہ بیان کیا تو کرنل صاحب کہتے ہیں کہ جی مولوی صاحب! اتنی تنگی تو نہیں چاہئے، سبحان اللہ! ماشاءاللہ! میں بھی ذرا تیز مزاج ہوں میں نے غالبؔ کا شعر پڑھ دیا:

ہاں! ہاں! نہیں وفا پرست، جاؤ! وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟

آپ کو کس حکیم نے مشورہ دیا تھا یہاں تشریف لانے کا؟ اگر آپ کو اپنے بالوں سے اتنی محبت ہے اور اس کو تنگی سمجھتے ہیں تو کس حکیم نے کہا تھا کہ آپ حج بیت اللہ کے لئے یا عمرے کے لئے تشریف لائیں؟ تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ یہ تنگی کر رہے ہو؟ اب آپ خود ہی دیکھ لیں کہ یہ بے چارہ کتنا چھوٹا برتن لے کر گیا، اسی کو میں کہہ رہا ہوں کہ اللہ کے گھر میں بیٹھ کر بھی چہرے پر استرا پھیرتے ہو؟ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسی طرح جاتے ہو؟ نہیں بھائی! اپنے آپ کو بدلنے کی نیت سے جاؤ اور پختہ ارادہ لے کر جاؤ کہ اب تک تو جو کچھ ہوا سو ہوا، لیکن اب اللہ کے گھر پہنچ گئے ہیں، اب یہ گھر والا جو کچھ کہے گا وہ کریں گے، پھر گھر والے سے جو مانگو گے وہ دے گا۔

حجر اسود کو بوسہ دینا اللہ تعالیٰ سے مصافحہ:

اسی لئے اکابر فرماتے ہیں کہ یہ جو حجر اسود کو چومتے ہیں، بوسہ دیتے ہیں یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مصافحہ کرنا اور اس کے ساتھ عہد باندھنا ہے، ایک مسئلہ

درمیان میں سمجھ لیجئے! اصل تو یہ ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دیا جائے، لیکن اگر ہجوم زیادہ اور حجر اسود تک پہنچنا مشکل ہو تو کسی کو دھکا نہ دو اور نہ دھکا کھاؤ، بلکہ اس طرح استلام کرلو یعنی حجر اسود کی طرف ہاتھ لمبے کرکے یہ تصور کرو کہ گویا ہم نے اپنے ہاتھ حجر اسود پر رکھ دیئے اور پھر ان کو چوم لو، یہ اسی کے حکم میں ہے کہ تم نے حجر اسود کو بوسہ دے دیا، حدیث میں فرمایا گیا کہ ''یہ حجر اسود اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے، جو لوگ اس کو چومتے ہیں یا استلام کرتے ہیں وہ اللہ سے مصافحہ کرتے ہیں (ذکرہ العجلانی فی کشف الخفاء و قال: ولہ شواھد، فالحدیث حسن) اور اللہ سے مصافحہ کرنے کے بعد کھرا اور کھوٹا الگ الگ ہوجاتے ہیں، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لِیَمِیْزَ اللّٰہُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ'' (تاکہ اللہ تعالیٰ خبیث اور طیب کے درمیان امتیاز کردے)۔ اگر حج کے بعد زندگی بدل گئی تو سمجھو اس کسوٹی پر کھرا نکلا۔

حج مبرور کی جزاء:

اور اگر زندگی ویسے کی ویسی ہی رہی جیسے پہلے تھی، یا پہلے سے بھی بدتر ہوگئی تو معلوم ہوا کہ کھوٹا نکلا، اور حدیث شریف میں فرمایا:

''وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَیْسَ لَہٗ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّۃَ.''

(مشکوۃ ص:۲۲۱)

ترجمہ:......''حج مبرور کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔''

حج مبرور اس کو کہتے ہیں کہ جس میں کوئی غلطی نہ کی گئی ہو، اور گناہ نہ کیا گیا ہو، اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کیا گیا ہو، کسی شخص کو حج مبرور نصیب ہونے کی علامت یہ ہے کہ آئندہ کے لئے اس کی زندگی کی لائن بدل جائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔

بیت اللہ شریف تجلیات الٰہیہ کا مرکز ہے، اور رحمت خداوندی کی تقسیم کا مرکز ہے، روزانہ ایک سو بیس رحمتیں بیت اللہ پر نازل ہوتی ہیں، اور دنیا میں جتنی رحمتیں اور جتنی برکتیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں وہ بیت اللہ پر اترتی ہیں اور پھر وہاں سے پورے عالم میں تقسیم ہوتی ہیں۔

غدار کی سزا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی خطبۃ......

"......اَلَآ اِنَّ لِکُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ یَّوْمَ الْقِیَامَۃِ بِقَدْرِ غَدْرَتِہٖ، اَلَآ وَاَکْبَرُ الْغَدْرِ غَدْرُ اَمِیْرِ عَامَّۃٍ، اَلَآ لَا یَمْنَعَنَّ رَجُلًا مَھَابَۃَ النَّاسِ اَنْ یَّتَکَلَّمَ بِالْحَقِّ اِذَا عَلِمَہٗ، اَلَآ اِنَّ اَفْضَلَ الْجِھَادِ کَلِمَۃُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ، اَلَآ اِنَّ مَثَلَ مَابَقِیَ مِنَ الدُّنْیَا فِیْمَا مَضٰی مِنْھَا مِثْلَ مَابَقِیَ مِنْ یَّوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْمَا مَضٰی مِنْہُ." (حیات الصحابۃ عربی ج:۳ ص:۴۲۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں کئی مضامین ارشاد فرمائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ: ہر آدمی جو کہ غدار ہو اس کی غداری کے بقدر، قیامت کے دن اس کے لئے جھنڈا بلند کیا جائے گا۔

غدار کی تعریف:

غدار کہتے ہیں عہد شکن کو، جو شخص عہد کر کے توڑ ڈالے اس کو عربی میں غدر کہتے ہیں اور جو بہت زیادہ عہد توڑنے والا ہو اس کو غدار کہتے ہیں، تو غدار وہ آدمی

ہے جو عہد کرنے کے بعد توڑ دیتا ہے، ایفائے عہد کی پرواہ نہیں کرتا، آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر عہد توڑنے والے کی نشان دہی کرنے کے لئے قیامت کے دن ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا، اور بعض احادیث میں آتا ہے کہ اس کی سرین میں گاڑا جائے گا اور جتنا بڑا غدر ہوگا اتنا بڑا جھنڈا ہوگا تاکہ لوگوں کو نظر آئے۔ "وَيُقَالُ هٰذِهٖ غَدْرَةُ فُلَانٍ." اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں آدمی کی غداری کا نشان ہے، عہد شکنی کا نشان ہے۔

عہد پورا کرنے کا حکم:

اسی لئے ارشاد الٰہی ہے: "يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ." (المائدہ:۱)

ترجمہ: ''اے ایمان والو اپنے عقود کو پورا کرو''

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر قرآن کریم کا صرف اتنا ہی ٹکڑا نازل ہوتا تو ہدایت کے لئے کافی تھا، تمہارے ذمے اللہ کے جو عقود ہیں ان کو پورا کرو اور کسی مخلوق کے ساتھ تم نے عقد کرلیا ہو، معاہدہ کرلیا ہو تو اس کو بھی پورا کرو، اور اس بات کو یاد رکھو کہ عہد شکنی ایک وبال ہے اور قیامت کے دن عہد شکنی کرنے والے کو رسوا کیا جائے گا، جھنڈا گاڑا جائے گا اور اس کے اوپر لکھا ہوگا کہ یہ فلانے کی عہد شکنی کا نشان ہے، جتنا بڑا عہد شکن ہوگا (عہد کو توڑنے والا) اس کو رسوا اور ذلیل کرنے کے لئے اتنا ہی اونچا جھنڈا ہوگا، نعوذ باللہ، اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے۔

حکمرانوں سے بڑا غدار کوئی نہیں:

اسی کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ یہ بات بھی سن رکھو کہ امیر عامہ سے بڑا غدار

کوئی نہیں ہے، امیر عامہ سے مراد ہے حاکم، بادشاہ، خلیفہ، وزیراعظم جو قوم سے ایک معاہدہ کرنے کے بعد اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ سب سے بڑا غدار ہے، عہد شکنی یعنی وعدے کرکے معاہدے کو توڑ دینا اور ان کی خلاف ورزی کرنا یہ قوم کا معمول بن گیا ہے اور ہمارے سیاسی لیڈروں کی تو سیاست بن گئی ہے، ہمارے ایک سابق سیاسی لیڈر نے لوگوں سے روٹی، کپڑا اور مکان کا معاہدہ (وعدہ) کیا تھا، روٹی، کپڑا اور مکان، تو پڑھے لکھے لوگوں کے لئے تھا، ہمارے پنجاب کے جاہل جٹ اور بدوؤں سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ ہر ایک کو بارہ بارہ ایکڑ زمین دوں گا، الیکشن کا وقت آیا تو ایک بڈھا بے چارہ بہت زیادہ کمزور ہسپتال میں داخل تھا، مرنے کے قریب، اس کو چارپائی پر ڈال کر لوگ ووٹ ڈلوانے کے لئے لائے، تو کسی نے کہا جی بڑے میاں کو تو معاف کردیتے، بڑے میاں کہنے لگے ''جی ہمارا کلہ مرتا ہے'' یعنی ایک ایکڑ زمین کا نقصان ہوتا ہے، قوم ایسی بدھو کہ اللہ کے وعدوں پر اتنا یقین نہیں، جتنا ان صاحب کے وعدوں پر یقین تھا، لیکن پھر جو کچھ ہوا، وہ آپ کے سامنے ہے، پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک ہمارے سیاسی لیڈروں کی یہ روش چلی آتی ہے کہ انتخابات کے موقع پر یہ قوم کو سبز باغ دکھاتے ہیں، قوم کو خوب اُلو بناتے ہیں، ان سے وعدے کرتے ہیں اور ان وعدوں کی سیڑھیوں سے جب وہ اقتدار کے بلند و بالا ایوان تک پہنچتے ہیں تو ان کو کوئی چیز یاد نہیں رہتی، ان کو سب وعدے فراموش ہوجاتے ہیں، چار پانچ سال کے بعد الیکشن ہوا، وہ پہلے والے جو وعدے تھے، جیسے کیسے ہوئے ختم ہوگئے، یہ لوگ پھر قوم کے پاس ایک نیا وعدہ لے کر آگئے، اور ہمارے لوگ بھی عادی ہیں، بے چارے اللہ کے لئے یہ بھی نہیں کرتے، اور اللہ کے لئے وہ بھی نہیں کرتے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں علماءٔ کے ساتھ سلوک:

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جو یحییٰ خان نے کروائے تھے، بھٹو صاحب میدان میں تھے، ہماری جمعیت علمائے اسلام نے بہت آدمی کھڑے کر دیئے اور چن چن کر بزرگ کھڑے کر دیئے، ابھی گوجرانوالہ سے ہمارے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر تشریف لائے تھے، وہ قصہ سنا رہے تھے کہ مولانا عبدالواحد صاحب کو کھڑا کر دیا گیا اور یہ (شیخ الحدیث اور دوسرے حضرات) لوگوں کو یہ کہنے کے لئے نکلے کہ بھائی ان کو ووٹ دو، اسی طرح ہمارے علاقے میں شیخ الحدیث مولانا فیض احمد صاحب ہیں، یہاں کبھی کبھی تشریف لاتے ہیں، ان کا بیان بھی یہاں ہوا ہے، ان کو بھی کھڑا کیا گیا تھا، اور یہ فقیر پر تقصیر ان کے لئے کھیتوں میں پھرتا رہا، میں کسی کے کام کے لئے کبھی نہیں اٹھ کر گیا، یہ میری کمزوری ہے، لیکن پتہ نہیں اس وقت کیا آفت آگئی تھی، اس وقت میں نے کہا تھا جب کہ ابھی الیکشن شروع نہیں ہوا تھا، تمام اکابر اولیاءٔ اللہ، بزرگان دین، خانقاہوں والے، مسجدوں والے، مدرسوں والے اور چوٹی کے بزرگ یہ جو میدان میں آگئے ہیں، مجھے خیر نہیں نظر آتی، اس لئے کہ غالباً ایک مرتبہ پھر حق تعالیٰ شانہ قوم پر اتمام حجت کر دینا چاہتے ہیں اور حجت پوری کرنے بعد پھر پکڑتے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، مجھے کسی خطرناک عذاب کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا، یعنی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آفت آرہی ہے کیونکہ یہ تمام اکابر اولیاءٔ اللہ کبھی خانقاہ سے نکل کر نہیں گئے، خانقاہ سے باہر قدم نہیں رکھا یہ لوگ جو سیاست کے میدان میں انتخاب لڑنے کے لئے آگئے ہیں، یہ عجیب بات ہے اور میرے جیسا آدمی کھیتوں میں پھر رہا ہے، پھر جو کچھ ہوا آپ کو معلوم ہے، مسلمانوں کی تاریخ میں

پہلی بار نوے ہزار فوجی قید ہوئے، ملک دو ٹکڑے ہوا، اور تم پر بھٹو جیسا آدمی مسلط کیا گیا (مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ حضرت درخواستیؒ، حضرت مولانا حبیب اللہ گمانویؒ، حضرت پیر خورشید احمد شاہ، حضرت مولانا محمد عبداللہ بہلویؒ، حضرت مولانا سید نیاز احمد شاہ تلمبہ جیسے درویش منش علمائے کرام الیکشن ہار گئے)۔

اعمال کا تقاضا کہ خنزیر اور بندر حکمران ہوں:

میں نے رات ہی سنایا تھا کل شام کے درس میں کہ حجاج بن یوسف کے خوف سے حضرت حسن بصریؒ چھپے ہوئے تھے، روپوش تھے، کسی نے کہا کہ حضرت آپ اس کے لئے بددعا کیوں نہیں کرتے، حضرت حسن بصریؒ سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے کہ تم شکر نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کا کہ ایک آدمی تم پر حاکم ہے، ورنہ تمہارے اعمال تو ایسے تھے کہ تم پر خنزیر اور بندروں کو مسلط کیا جاتا، مولانا شیر محمد صاحب کو لاہور میں ایک فاحشہ عورت کے ساتھ پوری رات رکھا گیا اور اس کے فوٹو لئے گئے، علماء اور صلحاء کے ساتھ اور شریف لوگوں کے ساتھ وہ کچھ کیا گیا کہ اس کو بیان کرنا بھی ممکن نہیں، جب مجھے یہ اطلاع پہنچی تو میں یہیں اپنے مدرسے میں بیٹھا ہوا تھا، کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے، مجھے رونا آگیا میں نے کہا ہماری سزا کا وقت آگیا ہے، ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے، ہم اس لائق ہی نہیں رہے کہ ہم پر کسی انسان کو مسلط کیا جاتا، یہ بندر اور خنزیر ہم پر مسلط کردیئے گئے ہیں، صرف چمڑی انسانوں کی تھی اندر سے بندر اور خنزیر تھے، واقعتاً خنزیر تھے، شریف لوگوں کی بہو بیٹیاں اٹھوالی گئیں، ایک عالم دین کو فاحشہ کے ساتھ رکھا گیا اور اس کے ننگے فوٹو لئے گئے، یہ ہمارے سیاسی لیڈر ہیں، اور ہم لوگ ہمیشہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر ان لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر یہ

جو کچھ ہمارے ساتھ سلوک کرتے ہیں ہمیں معلوم ہے، نہ ہم اللہ کے لئے کوئی کام کرتے ہیں، نہ یہ اللہ کے لئے کوئی کام کرتے ہیں، ان کا کام ہے قوم کو دھوکہ دینا، تمہارا کام ہے دھوکہ کھانا، پوری نصف صدی گزر رہی ہے اسی دھوکے میں، تو آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ سن رکھو! امیر عامہ سے بڑھ کر کوئی غدار نہیں، یعنی اگر وہ عہد شکنی کرے، عہد کے خلاف کرے، معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو وہ سب سے بڑا غدار ہے اس سے بدتر کوئی غدار نہیں۔

بات یہ ہے کہ ایک آدمی معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے کسی چھوٹی سی بات پر، اور ایک معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے کسی بڑی بات پر، پھر ایک آدمی معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے کسی مجبوری کی وجہ سے اور دوسرا آدمی معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے بغیر کسی مجبوری کے، دونوں کے درمیان فرق ہوگا کہ نہیں؟ جو دس روپے پر عہد شکنی کرتا ہے اس کا غدر چھوٹا ہوا اور جو غداری کر کے ہزار روپیہ ہضم کر جاتا ہے اس کا غدر یعنی اس کی عہد شکنی بڑی ہوئی، پھر ایک بے چارہ تنگ دست ہے وہ کسی مجبوری کی وجہ سے معاہدے کے خلاف کر لیتا ہے اور ایک آدمی ایسا ہے کہ اس کو کوئی مجبوری نہیں، تو یہ شخص زیادہ غدار ہوگا، اسی طرح امیر عامہ، صدر مملکت، وزیر اعظم، گورنر اور وزیر اعلیٰ (چیف ایگزیکٹو) اور دوسرے مقتدر حکام، کہ تمام اختیارات اللہ تعالیٰ نے ان کے قبضے میں دے رکھے ہیں، اگر وہ ان تمام اختیارات و اقتدار کے باوجود عہد شکنی کرتے ہیں اور معاہدہ پورا نہیں کرتے تو ان سے بڑا غدار کون ہوگا؟

ٹھیک فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کہ امیر عامہ کا غدر سب سے بڑا غدر ہے، کیونکہ میں نے اور آپ نے کسی سے معاہدہ کیا تو کسی چھوٹی موٹی بات کا معاہدہ ہوگا، مگر یہ ہم سے پچاس سال سے وعدے کرتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام پاکستان

میں نافذ کریں گے، کتنا بڑا وعدہ ہے؟ اور جب عمل کا وقت آتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ بنیاد پرستی ہے، ملاّئیت ہے،ان سے کوئی پوچھے کہ تمہیں کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ تم انتخاب کے وقت لوگوں سے یہ وعدہ کرو کہ ہم اسلام نافذ کریں گے؟ اس وقت جب تم لوگوں سے ووٹ لے رہے تھے اس وقت صاف کہتے کہ ہم اسلام کو غلط سمجھتے ہیں، اس زمانے میں نہیں چل سکتا، ہم اسلام نافذ نہیں کریں گے، پھر میں دیکھتا کہ تمہیں کتنے لوگ ووٹ دیتے ہیں؟ ووٹ لینے کے وقت تم نے اسلام کا نام لے کر لوگوں کو دھوکہ دیا اور آج اخباروں میں یہ بیانات چھاپتے ہو کہ یہ بنیاد پرستی ہے، پاکستان، بنیاد پرستی کے لئے نہیں بنا تھا، آج ہمیں اخباروں کے ذریعہ فلسفہ سمجھاتے ہیں، انگریزی اخباروں میں زیادہ سمجھاتے ہیں، اردو اخباروں میں ذرا کم سمجھاتے ہیں، اب تم ہی بتلاؤ کہ ان غداروں کے لئے کتنا بڑا جھنڈا بلند کیا جائے گا، قیامت کے دن؟

سب سے افضل جہاد:

اس کے بعد ارشاد فرمایا:"اَلَا لَا يَمْنَعَنَّ رَجُلًا مَهَابَةُ النَّاسِ اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِالْحَقِّ اِذَا عَلِمَهُ."

ترجمہ:......"سن رکھو جب کسی شخص کو حق بات معلوم ہو تو لوگوں کا خوف اس کو حق بات کہنے سے نہ روکے۔"

اور اسی کے ساتھ فرمایا:"اَلَا اِنَّ اَفْضَلَ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ." ظالم شخص، چاہے صاحب سلطنت بادشاہ ہو، کسی جمہوری حکومت کا سربراہ ہو، یا کسی حکومت کا نام نہاد خلیفہ ہو، اس کے سامنے حق بات کہنا یہ سب سے افضل ترین جہاد ہے، کافروں کے مقابلے میں لڑائی کرنا یہ بھی جہاد ہے، لیکن ایک مطلق العنان

بادشاہ کے سامنے اور صاحب اختیارات کے سامنے حق بات کہنا یہ افضل ترین جہاد ہے، اس لئے کہ اپنے آپ کو سانپ کے منہ میں دینا ہے، یہ سب سے بڑا جہاد ہے۔

دنیا کی بقیہ عمر:

آنحضرت ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی اور عصر کی نماز کے بعد خطبہ شروع فرمایا اور قیامت تک ہونے والے جتنے واقعات تھے سب موٹے موٹے بیان کردیئے، اب خود سوچ لو کہ کتنا وقت لگا ہوگا اور سورج غروب ہونے میں کتنا وقت باقی ہوگا، اندازہ کرسکتے ہیں کہ عصر کی نماز کے بعد تو خطبہ شروع ہوا اور خطبہ اتنا طویل تھا کہ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں:

"فَلَمْ یَدَعْ شَیْئًا یَکُوْنُ اِلٰی قِیَامِ السَّاعَةِ اِلَّا اَخبَرَنَا بِهٖ."

ترجمہ:......"قیامت تک کے جتنے واقعات تھے سب موٹے موٹے بیان کردیئے۔"

تو مغرب کا وقت آنے میں کتنا وقت رہا ہوگا؟ اس سے آپ اندازہ فرماسکتے ہیں، آخری فقرہ اس خطبے کا یہ تھا کہ: یاد رکھو! اس وقت دن کے پورا ہونے میں جتنا وقت باقی ہے یعنی جتنا وقت کہ اب غروب میں باقی رہ گیا ہے، دنیا کی عمر کا بس اتنا وقت باقی رہ گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

"اَلَا اِنَّ مَثَلُ مَابَقِیَ مِنَ الدُّنْیَا فِیْمَا مَضیٰ مِنْھَا مِثْلَ مَابَقِیَ مِنْ یَّوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْمَا مَضیٰ مِنْهُ."

دنیا کا جتنا وقت باقی ہے یعنی اس کی عمر کا جتنا وقت باقی ہے وہ گزشتہ کے مقابلے میں ایسے ہے جتنا تمہارے اس دن کا حصہ باقی ہے گزشتہ کے مقابلے میں،

مقصود یہ تھا کہ دنیا کی عمر پوری ہوچکی ہے اب زیادہ وقفہ نہیں ہے، اسی مضمون کو آنحضرت ﷺ نے ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ کپڑا پھاڑنے لگے، پھاڑتے پھاڑتے ایک تار باقی رہ گئی، اب یہ دوٹکڑے جڑے ہوئے ہیں، اس لئے کہ صرف ایک تار باقی ہے، باقی پھٹ چکا ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا جتنی عمر باقی رہ گئی ہے، اس کی مثال ایسے سمجھو کہ بس ایک تار باقی رہ گیا، باقی سب پھاڑا جاچکا ہے۔

یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں وقت پورا ہوگیا ہے، مختصراً عرض کردیتا ہوں، ایک یہ کہ ہر آدمی کی عمر گزشتہ عمر کی بہ نسبت یہی حیثیت رکھتی ہے، ہماری عمر کتنی گزر چکی، اور اگلی زندگی موہوم ہے، پتہ ہی نہیں کہ ہے بھی یا نہیں؟ لیکن عجائبات میں سے یہ ہے کہ آدمی اپنی اس موہوم زندگی کے لئے تو بڑا فکر مند ہوتا ہے، لیکن یقینی زندگی کے لئے کبھی فکر مند نہیں ہوتا، ہماری زندگی کیسے گزرے گی؟ اگلی زندگی کیسے گزرے گی؟ یہ موہوم زندگی پتہ نہیں کتنے دن کی ہے؟ پھر یہ بھی پتہ نہیں کہ ہے بھی یا نہیں؟

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں

اور دنیا کی عمر کا یہی قصہ ہے، یوں تو کچھ علامات ظاہر ہونے والی ہیں، ابھی ظاہر ہوں گی، لیکن معلوم نہیں کہ کس وقت قیامت کا بگل بجادیا جائے؟ کسی کو کچھ پتہ نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ علم کسی کو بھی نہیں دیا۔

قیام قیامت کا وقت:

دوسری بات مجھے یہ سمجھانی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ ایک تار باقی رہ گیا ہے اتنا وقت باقی رہ گیا ہے، کہ بالکل غروب کے قریب ہے، یہ کسی چیز

کے قریب ہونے کو سمجھانے کے لئے ہے، مثال کے طور پر کسی آدمی کو سورج کے غروب ہونے سے پہلے پہلے کام کرنا ہے، اور سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے، تو وہ کتنی مستعدی کرے گا، اس وقت اس کام کے کرنے میں؟ مقصود یہ سمجھانا ہے کہ تمہاری زندگی کا بھی، اس دنیا کی عمر کا بھی کوئی پتہ نہیں ہے کہ کس وقت منقطع ہو جائے؟

اے زفرصت بے خبر در ہرچہ باشی زود باش
من نے گویم کے دربند زیاں یا سودباش!

بزرگ فرماتے ہیں کہ میں تمہیں یہ تو مشورہ نہیں دیتا کہ تم اپنے نقصان کی فکر کرو یا اپنے نفع کی فکر کرو، یہ تو تم جانو اور تمہارا کام جانے، لیکن اتنا کہنا چاہوں گا کہ اے وہ آدمی جو فرصت سے بے خبر ہے "در ہرچہ خواہی زود باش" جو بھی تم نے کرنا ہے ذرا جلدی سے کرلو وقت ختم ہو رہا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین

جواہر پارے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً ومسلماً ' اما بعد :

مقبولان الٰہی کی زندگی عام لوگوں کے لئے درس عبرت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے انبیا سابقین کے واقعات کے بار بار دہرانے کی یہی حکمت بیان فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے :

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب۔

ترجمہ: یعنی ان حضرات کے واقعات میں دانشمندوں کے لئے عبرت ہے۔"

اولیاء اللہ کی صحبت ہی وہ کیمیا ہے جس سے انسان کی قلبِ ماہیت ہوتی ہے اور ان کے حالات و سوانح ان کی مجالس کا نعم البدل ہیں حال ہی میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تالیف "سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ" کا دوسرا ایڈیشن (باضافہ و ترمیم) چھپ کر آیا تو اس کے مطالعہ کی سعادت دوبارہ نصیب ہوئی۔ ذیل میں اسی کے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں :

تلاوتِ قرآن

"جب حضرت رحمہ اللہ کی صحت اچھی تھی تو رمضان المبارک میں بعد نماز عصر مجلس سے الگ تنہائی میں قرآن پاک کی تلاوت فرماتے' ایک صاحب جو وہیں رہا کرتے تھے بتلاتے ہیں کہ میں ادھر سے گزرا تو حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی قرآن پڑھنے کی کیفیت کچھ کھلی اور بہت ہی بھلی معلوم ہوئی اور دل ہی دل میں بے ساختہ یہ دعا کی کہ اے اللہ اس طرح پر قرآن پاک پڑھنا ہم کو بھی عطا فرما دے۔ رمضان المبارک کے گزرنے کے بعد غالباً" حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے انہیں صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ آؤ تمہیں بتلائیں' قرآن ایسے پڑھا کرو وہ جو قرآن پاک میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا سے باتیں کرتے اور اس شجر سے سنتے تھے اپنے کو وہی شجر تصور کرو اور پھر اپنے میں سے قرآن پاک کے نکلتے ہوئے الفاظ کو یوں سمجھ لو کہ یہ خدائے پاک فرما رہے ہیں اور کانوں سے اسی انداز پر سنو جیسے کہ میں اپنے اللہ ہی کی آواز میں سن رہا ہوں' اور اسی طرح پر فرماتے ہوئے یہی کیفیت سراپا اپنے اوپر طاری کرلی اور فرمانے کا یہ اثر ہوا کہ وہی کیفیت دل میں جیسے اتر گئی' وہی صاحب یوں بتلاتے ہیں کہ مدت تک قرآن پاک ایسی ہی کیفیت کے ساتھ پڑھنا نصیب ہوا اور بہت ہی لطف آیا' اور یہ انداز قرآن پاک کی تلاوت کے سلسلہ کی ترقیوں میں نئے نئے اضافوں کا سبب بنا۔"

(صفحہ ۴۳۸)

جمالِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

"ایک مرتبہ حضرتؒ مسجد نبوی میں تشریف رکھتے تھے اس خادم نے عرض کیا کہ حضرت! اس مسجد میں بعد کے لوگوں نے بڑی زیب و زینت پیدا کردی اور قیمتی قالین بچھادیئے' کاش! یہ مسجد اپنی پہلی سادگی پر ہوتی! معلوم نہیں اس وقت حضرتؒ کس حال میں تھے' جوش آگیا فرمایا :

حضرت! اور زیادہ زیب و زینت ہو' دنیا میں جہاں کہیں جمال اور زینت ہے انہیںؐ کے صدقہ میں تو ہے۔" (صفحہ ۲۳۹)

مقامِ صحابہؓ

ایک روز ایک مجلس میں فرمایا :

"اگر شیعہ کے اصول کو دیکھا جائے تو پھر اسلام میں تو کچھ نہیں رہ جاتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی کمال ہی معلوم نہیں ہوتا' ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ کی صحبت سے ہزاروں' لاکھوں انسانوں کی اصلاح ہو جاتی ہے اور صحبت کی برکت سے پکّے دیندار بن جاتے ہیں کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے کوئی بھی پکّا مسلمان نہیں بنا؟"۔

ایک مرتبہ ان حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے' جو سادات کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں اور تشیع کی طرف مائل ہیں' فرمایا :

" بھائی میں تو سیّدوں سے عرض کرتا ہوں کہ مجھے تو آپ

حضرات پر اعتبار نہیں رہا کہ ہم تو اچھے خاصے مندروں میں پوجا پاٹ میں لگے رہتے تھے آپ کے بڑوں نے ہمارے بڑوں کو اسلام کی دعوت دی ہم لبیک کہتے ہوئے ان کے پیچھے ہولئے۔ اب آپ ہمیں یہیں چھوڑ کر کوئی شیعہ ہو رہا ہے' کوئی مرزائی اور کوئی عیسائی اور کوئی منکر حدیث۔ پس بھائی ہمیں یہی اسلام کافی ہے' یہ ہمارے بس کا نہیں کہ تم جہاں جاؤ ہم تمہارے پیچھے پیچھے بھاگے پھریں' اگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم مسلمان نہیں تو ہمیں تو اور کوئی مسلمان نظر نہیں آتا۔"

(صفحہ ۲۴۱)

علمی شغف

"فرماتے تھے کہ رامپور سے کسی دوست نے خط لکھ دیا کہ غلام جیلانی کا انتقال ہو گیا مجھے جب اس کا علم ہوا تو میں نے خط لکھا کہ میں زندہ ہوں۔ والدہ صاحبہ نے والد صاحب سے اصرار کیا کہ اس کو لے آؤ۔ والد صاحب رام پور تشریف لے گئے.... بڑی محبت سے ملے اور فرمایا کہ تمہاری والدہ نے اصرار کیا کہ میں تمہیں لے آؤں' تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ابھی پڑھوں گا جب تک فارغ نہیں ہو جاتا واپس نہیں جاتا' والد صاحب سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم پڑھ کر آؤ۔"

طالب علمی میں تقویٰ' زہد واستغنا

"رات کے وقت حضرتؒ نے کہیں سے بستر مانگ کر والد

صاحب کے لئے بچھایا' عرض کیا کہ آپ آرام فرمائیں' میں مطالعہ کر آؤں' آپ مسجد کے چراغ کی روشنی میں ازراہِ احتیاط مطالعہ نہیں فرماتے تھے بازار کی لالٹین کی روشنی میں مطالعہ فرماتے تھے۔ بعض اوقات کھانا نہ ہونے کی وجہ سے مولی کے پتے اٹھا کر کھا لیا کرتے تھے اور کئی کئی وقت اس پر گزارا ہوتا تھا' واپس آئے تو والد صاحب سو چکے تھے سردی کا زمانہ تھا خود ایک لپٹی ہوئی صف کے اندر گھس کر سو گئے' کپکپی سے ایسی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے کوئی چوہا یا بلی ہے' والد صاحب جب یہ آواز سنتے تو چھڑی زمین پر پٹک کر اس کو بھگا دیتے جب بار بار اس کی نوبت آئی تو حضرتؒ نے فرمایا کہ میں غلام جیلانی ہوں' آپ فکر نہ کریں اس حالت کو دیکھ کر والد صاحب کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس وقت آٹھ روپے ان کے پاس تھے' فرمایا کہ میرے پاس آٹھ روپے ہیں اس سے رضائی بسترا بنوا لو۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ آپ میری فکر نہ فرمائیں آپ کو راستہ میں ضرورت ہو گی۔ لیکن آپ نے اصرار سے دے دیا' والد صاحب نے اساتذہ سے شکوہ کیا کہ آپ کا ایک طالب علم ہے آپ اس کا خیال نہیں فرماتے۔ انہوں نے کہا ہم نے مولوی صاحب سے ہرچند اصرار کیا' مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔"

" آپ نے رام پور سے دہلی کا قصد کیا......... اس وقت سفر خرچ کے لئے صرف ایک آنہ پاس تھا رام پور سے دہلی پیدل سفر ہوا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ راستہ بھر اسی ایک آنہ کے چنے پر گزارا

کیا۔ ایک جگہ دریا کو عبور کرنا تھا کشتی والے نے رعایت کی اور طالب علم سمجھ کر مفت اتار دیا۔"

ایک عجیب انکشاف

"حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہ کے پہلے شیخ آپ ہی کے ہم نام حضرت میاں صاحب شاہ عبدالرحیم صاحب سہارنپوری تھے۔ بڑے قوی النسبت اور صاحب کشف و تصرف بزرگ تھے۔ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا اس کے باوجود روزانہ سو رکعتیں نفل پڑھ لیا کرتے تھے خادم کھڑا کر دیتے تھے آپ نفل پڑھنے لگتے اور اٹھنے بیٹھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی' کشف کا یہ حال تھا کہ مرزا صاحب کی شہرت اور دعوئ سے بہت دن پہلے حکیم نور الدین صاحب مہاراجہ جموں کی صحت کے لئے دعا کرانے کے لئے آئے' فرمایا "تمہارا نام نورالدین ہے؟" حکیم صاحب نے کہا "ہاں" فرمایا علاقہ قادیاں میں ایک غلام احمد پیدا ہوا ہے جو کچھ عرصے کے بعد ایسے دعوے کرے گا جو نہ اٹھائے جائیں گے نہ رکھے جائیں گے تم اس کے مصاحب لکھے ہوئے ہو' حکیم صاحب نے استعجاب کا اظہار کیا تو فرمایا: تم میں الجھنے کی عادت ہے اور مناظرہ کا شوق ہے یہی عادت وہاں لے جائے گی۔"

اصلاحی مواعظ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

حضورؐ کے سفرِ حج کی تفصیلات
فضیلت شیخینؓ
حضرت عمرؓ کی چھ نصیحتیں
حضرت علیؓ کی شہادت
دو بڑے بدبخت
شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی چند دعائیں
ریاکاری اور اخلاص
۱۲ ربیع الاول اور اس کے تقاضے
مدرسہ کے چار بنیادی اصول
اللہ کی نعمتوں کا استحضار

جلد چہارم

مکتبہ لدھیانوی

اصلاحی مواعظ

جلد چہارم

شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

مکتبہ لدھیانوی

قانونی مشیر اعزازی: ــــ منظور احمد ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

اشاعت اول. ــــــ نومبر ۲۰۰۲ء

کمپوزنگ: ــــــــ صدیقی کمپوزرز، ماڈل کالونی کراچی

فون: 0320-4084547,4504007

ناشر: مکتبہ لدھیانوی

18- سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن کراچی

برائے رابطہ: جامع مسجد باب رحمت

پرانی نمائش، ایم اے جناح روڈ، کراچی

پوسٹ کوڈ:74400 فون:7780337

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفٰی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی:

ہمارے حضرت اقدس شہید اسلام مولانا محمد یوسف لدھیانوی قدس سرہ پر حد درجہ اخفاً کا غلبہ تھا۔ انہوں نے زندگی بھر اپنے آپ کو مٹایا اور چھپایا' مگر کرشمۂ قدرت دیکھئے کہ انہوں نے جس قدر اپنے آپ کو چھپایا اور مٹایا' اللہ تعالیٰ نے انہیں اتنا ہی شہرت و ناموری کی معراج پر پہنچایا۔ بلاشبہ: "من تواضع لله رفعه الله" کے مصداق جس نے بھی اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کی' اللہ تعالیٰ نے اسے سر بلندی عطا فرمائی۔

یوں تو زندگی بھر حضرت شہیدؒ سے جب بھی آپؒ کے مواعظ کی جمع و ترتیب کی بات کی گئی آپ نے ہمیشہ اس سے انکار فرمایا' لیکن آخر میں آپؒ کے فرزند ارجمند برادرم مولانا محمد طیب لدھیانوی صاحب نے اس موضوع پر کام شروع کر دیا تو آپؒ نے ان کی دل داری کرتے ہوئے اس پر نہ صرف خاموشی کا اظہار فرمایا بلکہ اصلاحی مواعظ کی جلد اول کے مسودہ کو از خود اول تا آخر ملاحظہ فرمایا' تصحیح فرمائی اور بعض جگہ اضافے بھی فرمائے۔

یہ حضرتؒ کی تواضع اور فنائیت کی برکت ہے کہ جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو اسے علماً' طلبہ اور عوام نے خوب خوب پسند فرمایا' چنانچہ حضرتؒ کی شہادت کے بعد یکے بعد دیگرے اس سلسلہ کی دوسری اور تیسری جلد منظر عام پر آئی تو اس کی مزید جلدوں کی طباعت کا مطالبہ شدت سے ہونے لگا۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے برادرم مولانا محمد اعجاز صاحب' عزیزم حافظ عتیق الرحمٰن صاحب' جناب مولانا نعیم امجد سلیمی صاحب اور برادرم عبداللطیف طاہر صاحب کو' جن کی شبانہ روز کوششوں سے اصلاحی مواعظ کی چوتھی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ جلد درج ذیل مواعظ پر مشتمل ہے:

فضیلت شیخین' حضرت عمرؓ کی چھ نصیحتیں' حضرت علیؓ......شہادت' فضائل ومناقب' دو بڑے بد بخت' امت کے خیر کے تین زمانے' جہاد میں صحابہ کرامؓ کی مدد کو فرشتوں کا آنا' عقائد میں حق و باطل کا معرکہ' شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی چند دعائیں' امتی ہونے کا حق' اصولِ زندگی' ریاکاری اور اخلاص' عمل کی کھیتی' شب برأت......اہمیت وفضیلت' ۱۲/ ربیع الاول اور اس کے تقاضے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر حج کی تفصیلات' مدرسہ کے چار بنیادی اصول' اللہ کی نعمتوں کا استحضار۔

بحمداللہ! یہ جلد بھی دوسری جلدوں کی طرح بہت ہی مختصر عرصہ میں مرتب ہوکر قارئین کے ہاتھوں میں ہے' اور تخریج وتحقیق کے اعتبار سے اس میں بھی وہی معیار برقرار رکھا گیا ہے جو پہلی جلدوں کی ترتیب میں روا رکھا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت شہیدؒ کے علوم و معارف کو بیش از بیش شائع کرنے اور پھیلانے کی توفیق عطا فرمائے اور امت کو ان سے نفع اٹھانے کی سعادت نصیب فرمائے' آمین۔

خاکپائے حضرت شہیدؒ

(مولانا) سعید احمد جلال پوری

۲۱/ رمضان ۱۴۲۳ھ

فہرست مواعظ

فہرست مضامین

١

۲

۳

حضرت علیؓ.....شہادت، فضائل و مناقب ۶۷

(۴)

۵

امت کی خیر کے تین زمانے ۱۱۱

(۷)

عقائد میں حق و باطل کا معرکہ

(۸)

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی چند دعائیں ۱۶۹

۱۲

عمل کی کھیتی ۲۶۳

(۱۳)

(۱۴)

(۱۵)

فضیلتِ شیخین رضؓ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

"وَاَخْرَجَ ابْنُ اَبِیْ عَاصِمٍ وَابْنُ شَاهِیْنَ وَالْـلالْكَائِیُّ فِی السُّنَّةِ وَالْاَصْبَحَانِیُّ فِی الْحُجَّةِ وَابْنُ عَسَاكِرَ عَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ: خَطَبَنَا عَلِیٌّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ، فَحَمِدَ اللهَ وَاَثْنٰی عَلَیْهِ، ثُمَّ قَالَ: اِنَّهٗ بَلَغَنِیْ اَنَّ نَاسًا یُفَضِّلُوْنِیْ عَلٰی اَبِیْ بَكْرٍ وَعُمَرَ، رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا، وَلَوْ كُنْتُ تَقَدَّمْتُ فِیْ ذَالِکَ لَعَاقَبْتُ فِیْهِ، وَلٰكِنِّیْ اَكْرَهُ الْعَقُوْبَةَ قَبْلَ التَّقَدُّمِ. فَمَنْ قَالَ شَیْئًا مِنْ ذَالِکَ بَعْدَ مَقَامِیْ هٰذَا فَهُوَ مُفْتَرٍ، عَلَیْهِ مَا عَلَی الْمُفْتَرِیْ، خَیْرُ النَّاسِ بَعْدَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَبُوْبَكْرٍ ثُمَّ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا، ثُمَّ اَحْدَثْنَا بَعْدَهُمْ اَحْدَاثًا یَقْضِیَ اللهُ فِیْهَا مَا یَشَاءُ، كَذَا فِی الْمُنْتَخَبِ.

وَعِنْدَ اَبِیْ نُعَیْمٍ فِی الْحِلْیَةِ عَنْ زَیْدِ بْنِ وَهْبٍ اَنَّ

سُوَیْدَ بْنِ غَفَلَةَ دَخَلَ عَلٰى عَلِيّ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ فِى اِمَارَتِهٖ، فَقَالَ: يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! اِنِّىْ مَرَرْتُ بِنفَرٍ يَذْكُرُوْنَ اَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، بِغَيْرِ الَّذِىْ هُمَا لَهٗ اَهْلٌ. فَنَهَضَ فَرَقِىَ الْمِنبَرَ، فَقَالَ: وَالَّذِىْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ! لَا يُحِبُّهُمَا اِلَّا مُؤْمِنٌ فَاضِلٌ، وَلَا يُبْغِضُهُمَا اِلَّا شَقِىٌّ مَارِقٌ، فَحُبُّهُمَا قُرْبَةٌ وَبُغْضُهُمَا مُرُوْقٌ، مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَذْكُرُوْنَ اَخَوَىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَزِيْرَيْهِ وَصَاحِبَيْهِ وَسَيِّدَىْ قُرَيْشٍ وَاَبَوَىِ الْمُسْلِمِيْنَ؟ فَاَنَا بَرِئٌ مِّمَّنْ يَذْكُرُهُمَا بِسُوْءٍ وَعَلَيْهِ مُعَاقِبٌ. كَذَا فِى الْمُنْتَخَبِ."

"وَاَخْرَجَ اللَّالْكَائِىُّ وَاَبُوْ طَالِبِ الْعُشَارِىُّ وَنَصْرٌ فِى الْحُجَّةِ عَنْ عَلِيّ بْنِ حُسَيْنٍ قَالَ: قَالَ فَتٰى مِنْ بَنِىْ هَاشِمٍ لِعَلِيّ بْنِ اَبِىْ طَالِبٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ حِيْنَ اِنْصَرَفَ مِنْ صِفِّيْنَ سَمِعْتُكَ تَخْطُبُ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! فِى الْجُمُعَةِ تَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْنَا بِمَا اَصْلَحْتَ بِهِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ. فَمَنْ هُمْ؟ فَاغْرَوْرَقَتْ عَيْنَاهُ، ثُمَّ قَالَ: اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَر رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اِمَامَا الْهُدٰى، وَشَيْخَا الْاِسْلَامِ، وَالْمُهْتَدٰى بِهِمَا بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَنِ اتَّبَعَهُمَا هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ، وَمَنِ اقْتَدٰى بِهِمَا يَرْشُدُ، وَمَنْ تَمَسَّكَ بِهِمَا فَهُوَ مِنْ حِزْبِ اللّٰهِ وَحِزْبُ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.."

(حیاۃ الصحابہ ج:۶ ص:۶۹۳، ۶۹۴)

ترجمہ:...... ''ابن ابی عاصم، ابن شاہین اور لالکائی نے سنہ میں اور اصبحانی نے حجہ میں، اور ابن عساکر نے حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیں خطبہ دیا، پس اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ کچھ لوگ مجھے فضیلت دیتے ہیں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر، اگر اس سلسلہ میں میں نے پہلے تنبیہ کردی ہوتی تو اس معاملہ میں میں ایسے لوگوں کو سزا دیتا، لیکن آگاہ کرنے سے قبل سزا دینے کو مناسب نہیں سمجھتا، جو شخص اس قسم کی کوئی بات میرے اس بیان کے بعد کرے گا، وہ مفتری ہے، اور اس کی وہی سزا ہوگی جو مفتری کی سزا ہے۔ پھر فرمایا: تمام انسانوں سے بہتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں، پھر ہم نے ان کے بعد بہت سے کام کئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان میں فیصلہ کرے گا جو چاہے کرے۔

ابونعیم نے حلیہ میں زید بن وہاب سے نقل کیا ہے کہ حضرت سوید بن غفلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ وہ کوفہ میں امیرالمؤمنین تھے، سوید بن غفلہ نے کہا: اے امیرالمؤمنین! چند لوگوں کے پاس سے میرا گزر ہوا، وہ لوگ حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا نامناسب انداز میں تذکرہ کر رہے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور منبر پر چڑھے اور پھر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ کو پھاڑا اور روح کو وجود دیا، نہیں محبت رکھتا ان دونوں سے مگر مؤمن

فاضل، اور نہیں بغض رکھتا ان دونوں سے مگر بدبخت اور دین سے نکلنے والا، سو ان دونوں سے محبت رکھنا عبادت ہے اور ان دونوں سے بغض رکھنا دین سے نکلنا ہے۔ کیا حال ہے ان لوگوں کا جو برا تذکرہ کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں بھائیوں کا، آپؐ کے دو وزیروں کا، آپؐ کے دونوں رفیقوں کا، قریش کے دونوں سرداروں کا اور مسلمانوں کے دونوں والدین کا۔ میں اس شخص سے بری ہوں جو ان کا تذکرہ کرتا ہے برائی کے ساتھ اور اس پر میں سزا دینے والا ہوں۔

لالکائی، ابو طالب عشاری اور نصر نے حجہ میں حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بنوہاشم کے ایک نوجوان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: اے امیرالمؤمنین! آپ جنگ صفین سے جب سے واپس آئے ہیں تو میں آپ سے سن رہا ہوں کہ آپ جمعہ کے خطبے میں یہ دعا کرتے ہیں: ''اے اللہ! ہماری اصلاح فرما جس چیز کے ساتھ آپ نے اصلاح فرمائی تھی خلفائے راشدین کی۔'' تو یہ کون لوگ ہیں؟ آپؓ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور فرمایا: ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما، دونوں ہدایت کے امام تھے، اسلام کے بزرگ تھے، جن کی اقتدا کی جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جس شخص نے ان دونوں کی پیروی کی، اس کو صراط مستقیم کی ہدایت ملی، اور جس شخص نے ان دونوں کی اقتدا کی اس نے بھلائی پائی، اور جس نے ان دونوں سے تمسک کیا پس وہ اللہ کا گروہ ہے، اور اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہونے والا ہے۔''

گزشتہ جمعہ میں البدایہ والنہایہ کے حوالے سے میں نے امیرالمؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ خطبہ ذکر کیا تھا:

”خَیْرُ النَّاسِ بَعْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَبُوْبَکْرٍ ثُمَّ عُمَرَ (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا).“

(البدایہ والنہایہ ج:۰ ص:۲۷۷)

ترجمہ:...... ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے بہتر اور افضل حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔“

”ازالۃ الخفا“ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ امیرالمؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس خطبے کو نقل کرنے والے اسّی آدمی ہیں۔ گویا تواتر کے ساتھ یہ خطبہ ثابت ہے۔ اسّی آدمی جھوٹ نہیں بول سکتے، اور مختلف کتابوں میں ان حضرات سے مروی ہے، صحیح بخاری میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔

محمد بن حنفیہؒ:

اور ان کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہؒ جو اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے عالم اور فاضل تھے اور جن کو بعض لوگوں نے اپنے وقت کا امام مہدی کہا تھا، حالانکہ یہ جھوٹ کہا، کیونکہ امام مہدیؒ تو بعد میں آئیں گے لیکن بہرحال ان کی مہدویت کی دعوت ایک عرصہ تک چلتی رہی، یہ حضرت محمد بن حنفیہؒ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے چھوٹے بھائی ہیں، لیکن دوسری والدہ سے تھے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نہیں تھے۔

محمد بن حنفیہؒ کی وجہ تسمیہ:

حدیث شریف میں ہے کہ:

"عَنْ عَلِيّ بْنِ اَبِیْ طَالِبِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَرَأَیْتَ اِنْ وُلِدَ لِیْ بَعْدَکَ اُسَمِّیْہِ مُحَمَّدًا؟ .... قَالَ: نَعَمْ!" (ترمذی ج:۲ ص:۱۰۷)

ترجمہ:....."حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ: یا رسول اللہ! آپؐ کے بعد میرے یہاں لڑکا ہو تو اس کا نام "محمد" رکھ لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جی ہاں!"

چنانچہ حضرت علیؓ نے ان کا نام محمد رکھا تھا، محمد ابن علی، ان کو محمد بن حنفیہ بھی کہا جاتا ہے، اس لئے کہ قبیلہ بنو حنیفہ کی خاتون کے بطن سے ان کا تولد ہوا تھا۔

سب سے افضل کون ہے:

تو امام بخاریؒ نے انہی محمد بن علی سے نقل کیا ہے کہ:

"قَالَ: قُلْتُ لِاَبِیْ: اَیُّ النَّاسِ خَیْرٌ بَعْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: اَبُوْبَکْرٍ. قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: عُمَرَ. وَخَشِیْتُ اَنْ یَّقُوْلَ عُثْمَانَ، قُلْتُ: ثُمَّ اَنْتَ؟ قَالَ مَا اَنَا اِلَّا رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ." (بخاری ج:۱ ص:۵۱۸)

ترجمہ:....."میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام انسانوں میں سب سے افضل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر میں نے پوچھا: ان کے بعد کون افضل ہیں؟ تو فرمایا: ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر میں نے اس ڈر سے کہ کہیں یہ نہ فرمادیں کہ اس کے

بعد حضرت عثمانؓ، میں نے خود ہی کہا کہ: اس کے بعد آپ افضل ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: نہیں! میں مسلمانوں میں سے ایک آدمی ہوں۔''

طرقِ حدیث:

اور یہ حضرت علقمہؒ کی روایت ہے، اس سے پہلی ابوجحیفہؒ کی روایت تھی، دوسری علقمہؒ کی روایت ہے، تیسری سوید بن غفلہؒ کی روایت ہے، سوید بن غفلہؒ مقدم ہیں، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہے، لیکن زیارت نہ ہوسکی، اس لئے صحابی نہیں ہیں، تابعی ہیںؒ، لیکن اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اکابر تابعینؒ میں سے ہیں۔

اکابر تابعین؟

حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا زمانہ جنہوں نے پایا ہو، وہ تمام تابعین میں سب سے بڑے شمار کئے جاتے ہیں، ابویونس خولانیؒ جن کا نام عائض باللہ ہے، وہ بھی اور یہ سوید بن غفلہؒ بھی اکابر تابعین میں سے ہیں، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام بھی لے آئے تھے لیکن زیارت سے مشرف نہ ہوسکے۔

ابویونس خولانیؒ:

ابویونس خولانیؒ کے بارے میں آتا ہے کہ جس دن وہ مدینہ پہنچے ہیں، صحابہ کرامؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کرکے مٹی سے ہاتھ جھاڑ رہے تھے، اللہ کی شان! زیارت نہ ہوسکی۔

امام زین العابدینؒ:

اور چوتھی روایت حضرت علی بن حسینؒ کی ہے، جن کو امام زین العابدینؒ کہتے ہیں۔ امام باقرؒ کے والد اور امام جعفرؒ کے دادا، حضرت حسینؓ کے صاحبزادے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کربلا میں صرف یہی بچے تھے، حضرت حسینؓ کی اولاد میں سے، نرینہ اولاد میں سے صرف یہی بچے تھے اور تمام کے تمام حسینی سید انہیں کی اولاد ہیں۔

حضرت علی کی دعاء:

حضرت علی بن حسین بن ابی طالب، حضرت علیؓ کے پوتے ہیں، حضرت حسینؓ کے صاحبزادے ہیں، امام باقرؒ کے والد ماجد ہیں اور امام جعفر صادقؒ کے دادا ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ قریش کے ایک نوجوان نے حضرت امیرالمؤمنینؓ سے پوچھا، جبکہ جنگ صفین سے لوٹ کر آئے تھے کہ آپ اکثر اپنے خطبوں میں یہ دعا کیا کرتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْنَا بِمَا اَصْلَحْتَ بِهِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ."

ترجمہ:......"یا اللہ! ہماری ایسی اصلاح فرما، جیسی آپ نے خلفائے راشدین کی اصلاح فرمائی ہے۔"

یہ خلفائے راشدین کون ہیں؟ جن کا آپؓ تذکرہ کرتے ہیں، فرمایا کہ: ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما، ہدایت کے امام اور اسلام کے دونوں بزرگ۔

اس امت کے پہلے شیخ الاسلام:

شیخ الاسلام کا لفظ سنا ہوگا آپ لوگوں نے کہ فلاں شیخ الاسلام ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس امت میں سب سے پہلے یہ لقب حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ

عنہما کو دیا ہے، شیخ الاسلام حضرت ابوبکرؓ اور شیخ الاسلام حضرت عمرؓ، اس وقت گویا پوری امت کے شیخ تھے، اپنے وقت میں ملت اسلامیہ کے شیخ یہی تھے، یہ مطلب ہوتا ہے شیخ الاسلام کا، اور پھر فرمایا کہ یہ وہ حضرات ہیں جن کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہدایت پائی جاتی ہے، جو شخص کہ ان کی اقتدا کرے گا وہ رشد و ہدایت پر ہوگا، اور جو شخص ان سے تمسک کرے گا وہ حزب اللہ میں شمار ہوگا، وہ اللہ کے گروہ میں شمار ہوگا، اور اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہے۔

حضرت علیؓ کی حضرات شیخینؓ سے عقیدت:

اور سوید بن غفلہ کی روایت میں ہے کہ میں کوفہ میں حضرت امیرالمؤمنینؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے کہا کہ: میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا بیٹھے ہوئے حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا تذکرہ کچھ نامناسب انداز سے کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ علیؓ ان سے افضل ہیں۔ آپؓ یہ سن کر منبر پر تشریف لے گئے، لوگ جمع ہوگئے، اور ارشاد فرمایا کہ: اس ذات کی قسم جس نے دانے کو چیر کر اس سے درخت نکالا اور جس نے روح کو پیدا کیا، یہ دونوں بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ہیں، جو ان سے محبت رکھے گا وہ مؤمن فاضل ہوگا، اور جو شخص ان سے بغض رکھے گا وہ بدبخت اور دین سے نکلنے والا ہوگا، اس کے بعد دوسرے فضائل بیان فرمائے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

"اَیُّهَا النَّاسُ! اِنَّ خَیْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِیِّهَا اَبُوْبَکْرٍ وَعُمَر، وَلَوْ شِئْتُ اَنْ اُسَمِّیَ الثَّالِثَ لَسَمَّیْتُ."

(البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳)

ترجمہ:...... "اے لوگو! بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے بعد اس امت میں سب سے بہتر ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) ہیں اور پھر اترتے ہوئے فرمایا: اگر میں چاہتا تو تیسرے کا نام بھی بتادیتا (کسی نے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ بتادیجئے! فرمایا: عثمانؓ!)۔''

فرقِ مراتب:

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ چار خلفائے راشدین اس امت میں سب سے افضل ہیں: حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ خلیفہ راشد ہونے کے اعتبار سے یہ سب یکساں احترام کے مستحق ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کی تنقیص بھی جیسا کہ حضرت امیرالمؤمنین فرما رہے ہیں، دین سے نکلنے کی علامت ہے، لیکن جیسا کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب صحابیت کی وجہ سے لائق احترام ہیں اور مرجع عقیدت ہیں، بلکہ قبلہ عقیدت ہیں، لیکن ان کے مابین بھی درجات کا فرق ہے، اسی طرح یہ چاروں خلفائے راشدین بحیثیت خلیفہ راشد ہونے کے یکساں اور برابر ہیں، لیکن ان کے درجوں میں بھی فرق ہے، تیسرے پارے کے شروع میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ.''

(البقرہ:۲۵۳)

ترجمہ:......''یہ رسولوں کی جماعت ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔''

تمام کے تمام رسول اور نبی آپ حضرات کو معلوم ہے کہ معصوم ہیں، اللہ تعالیٰ کے مقدس و برگزیدہ ہیں لیکن ان کے درجات میں بھی فرق ہے اور کسی بڑے کو بڑا کہنے کا یہ معنی نہیں ہے کہ چھوٹے کی تنقیص کی جائے، اس کو چھوٹا اس کے اعتبار

سے تو کہہ سکتے ہیں لیکن اپنی ذات کے اعتبار سے وہ چھوٹا نہیں ہے، کوئی نبی چھوٹا نہیں، سب بڑے کے بڑے ہیں لیکن جب انبیاءؑ کا آپس میں مقابلہ ہوتا ہے تو ان کے اعتبار سے کہہ سکتے ہیں، مثلاً پانچ اولوالعزم رسول ہیں، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جو ان سب سے افضل ہیں، خیرالبشر ہیں، سید الرسل ہیں، امام الانبیاءؑ ہیں، خاتم الانبیاءؑ ہیں، ٹھیک اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ خلفائے راشدین سب کے سب لائق احترام ہیں، ان میں سے کسی ایک کی تنقیص اور ادنیٰ سے ادنیٰ تنقیص بھی جائز نہیں، کسی ایک صحابی کی تنقیص محرومی کی علامت ہے اور بدبختی کا نشان ہے اور دین سے نکلنے کی ابتدا ہے۔

اس امت کے افضل:

تاہم ان چاروں کے درجات میں فرق ہے، حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کا افضل ھذہ الامۃ ہونا قطعی تھا اور ہے، امت کے کسی ایک متنفس کا بھی اس میں اختلاف نہیں، اور پوری امت میں دو آدمیوں کا بھی اس سلسلہ میں اختلاف نہیں ہے، شیعوں کو شمار نہ کرو، ان کے علاوہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت میں ایک متنفس بھی اس عقیدے سے اختلاف کرنے والا نہیں ہے کہ ابوبکرؓ وعمرؓ اس امت میں سب سے افضل ہیں، اسی طرح تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور اسی طرح ائمہ دینؒ، مجددین امتؒ، محدثینؒ وغیرہ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شیخین حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ ہیں، اور حضرات عثمانؓ وعلیؓ یہ دونوں داماد ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے دہری دامادی کا شرف عطا فرمایا تھا۔

حضرت عثمان کا شرف:

حضرت عثمانؓ کے نکاح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی صاحبزادیاں تھیں؟ دو صاحبزادیاں تھیں، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ، میں کہتا ہوں کہ صرف دو

نہیں بلکہ بے شمار، کیونکہ جب حضرت ام کلثومؓ کا انتقال ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: اگر میری تیسری بیٹی ہوتی تو عثمانؓ کو دیتا، وہ مرجاتی تو چوتھی ہوتی تو عثمانؓ کو دیتا، وہ مرجاتی تو اگلی ہوتی تو عثمانؓ کو دیتا۔

امام ابوحنیفہؒ کی حاضر جوابی:

اور یہ لطیفہ تو میں نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے تذکرے میں آپ کو سنایا تھا کہ نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! کوفہ میں ایک شخص تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہودی کہتا تھا، کوفہ ہمیشہ اہل بیت کی عداوت کا گڑھ رہا ہے، ظاہر میں محبت اور اندرونِ خانہ عداوت، بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عداوت میں کوفہ تو ہمیشہ بدنام رہا ہے۔ اس لئے مثل بن گئی تھی کہ: "اَلْکُوْفِیُ لَا یُوْفِیْ." یعنی کوفی کبھی وفا نہیں کریں گے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وفا نہ کی، ان کے صاحبزادے سبط اکبر حضرت حسنؓ سے وفا نہ کی اور ان کے بعد پھر ان کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ سے وفا نہ کی، "اَلْکُوْفِیُ لَا یُوْفِیْ." کوفی کبھی وفا نہیں کرے گا، اہل بیت سے غداری کرنے میں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے عداوت رکھنے میں کوفی مشہور تھے، ہمارے امامؒ بھی اسی کوفہ کے رہنے والے تھے اور یہ لطیفہ بھی میں نے سنایا تھا۔

ایک دفعہ حضرت امام ابوحنیفہؒ مدینہ طیبہ گئے، وہاں امام مالکؒ تھے، تعارف پوچھا کہ کہاں سے آئے ہیں؟ امام ابوحنیفہؒ کہنے لگے: کوفے سے آیا ہوں! حضرت امام مالکؒ نے فرمایا: کوفے کے لوگ منافق ہوتے ہیں، کوفہ منافقوں کا گڑھ ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ نہایت ادب سے کہنے لگے حالانکہ حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرت امام مالکؒ سے عمر میں بڑے ہیں، لیکن اخلاق شریفہ کے ساتھ متصف تھے اور مدینے کے زائر تھے، حاضری دینے والے تھے، مدینے کے رہنے والے نہیں تھے، اہل مدینہ کا ادب

کرتے تھے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کہنے لگے: حضرت! ایک اجنبی آدمی ہوں، ایک مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا ہوں۔ امام مالکؒ نے فرمایا: کہیے! فرمایا کہ: ذرا اس آیت کا مطلب پوچھنا ہے کہ:

''وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْاَعْرَابِ مُنَافِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ.'' (التوبہ:۱۰۱)

ترجمہ:...... ''تمہارے گرد و پیش میں بہت سے منافق رہتے ہیں اور مدینے میں بھی وہ لوگ موجود ہیں جو نفاق رکھے ہوئے ہیں آپ ان کو نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔''

یہ سن کر امام مالکؒ کا تو رنگ فق ہوگیا، کہنے لگے: آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کی تعریف کیا ہے؟ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: مجھے نعمان کہتے ہیں، ابوحنیفہ کہتے ہیں۔ حضرت امام مالکؒ کھڑے ہوگئے معانقہ کیا اور اس گستاخی کی معافی چاہی، تو امام ابوحنیفہؒ بھی وہیں کے ہیں، جیسا وہ مدینہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: اہل مدینہ میں بعض لوگ ایسے ہیں جو نفاق میں پکے ہیں۔

اہل کوفہ کے دلوں میں امام ابوحنیفہؒ کی وجاہت:

تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں ایک کوفی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہودی کہتا تھا، حضرت امامؒ کی وجاہت تو سارے کوفہ میں تھی، ہر دشمن اور دوست عزت کرتا تھا اور جو بڑا آدمی صاحب اخلاق بھی ہو اور صاحب علم وفضل بھی ہو، تو تمام طبقے کے لوگ اس کا احترام کیا کرتے ہیں، وہ اپنے اخلاق اور اپنے اعمال کی بنا پر سب کے نزدیک محترم ہوتا ہے، شیعوں کا اور سنیوں کا اختلاف تمہیں معلوم ہے، دیوبندیوں

کا اور بریلویوں کا اختلاف آپ کو معلوم ہے۔

ہمارے مولانا مفتی منیر احمد اخون صاحب کے والد ماجد کا جس دن انتقال ہوا، میں نے ان کا جنازہ پڑھایا، سارا بھاول نگر اُمڈ آیا تھا، تمام شیعہ بھی اور تمام بریلوی بھی کہنے لگے: ہمیں ان سے کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ تو ولی اللہ آدمی تھا۔

حضرت عثمانؓ کے دشمن کا علاج:

تو حضرت امامؒ ان صاحب کے پاس گئے اس نے پوچھا: کیسے تشریف آوری ہوئی؟ امام ابوحنیفہؒ کہنے لگے: ایک رشتے کا پیغام لے کر آیا ہوں، جناب کی صاحبزادی کے رشتے کا پیغام لے کر آیا ہوں، بہت خوش ہوا، لڑکے کے بارے میں بتایا کہ لڑکا بہت اچھا ہے، برسرروزگار ہے، علامہ ہے، وغیرہ وغیرہ، دنیا میں جو وجاہت کی چیزیں رائج ہیں ساری گنوادیں، وہ آدمی کہنے لگا: بہت اچھا! منظور ہے، حضرت فرمانے لگے کہ: بھئی میں نے اس کے ہنر بتادیئے ہیں، تھوڑنے سے عیب بھی بتادینے چاہئیں کہ ہر ایک کو پتہ چل جائے، دوسرے سامنے والے کو پتا چل جائے، دھوکہ نہ ہو، تھوڑا سا اس میں عیب بھی ہے وہ یہ کہ وہ لڑکا یہودی ہے، یہ سن کر اس کو تو آگ لگ گئی، چہرہ سرخ ہوگیا، کہنے لگا کہ: اتنے بڑے امام ہوکر آپ مجھ سے مذاق کرنے کے لئے آئے ہیں؟ وہ بھی میری بیٹی کے معاملے میں! حضرت امام: برافروختہ نہیں ہوئے، بلکہ نہایت متانت سے فرمانے لگے: کیوں کیا بات ہے؟ یہ برافروختہ ہونے کی چیز ہے؟ میں نے تو سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو دو بیٹیاں دی تھیں، اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس نے ہاتھ جوڑے اور کہا: آئندہ میں توبہ کرتا ہوں، حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: بس یہی مسئلہ سمجھانے کے لئے آیا تھا، تیری بیٹی کے لئے اگر میں یہودی کا رشتہ لاؤں تو تو مجھے قتل کرنے پر آمادہ ہوجائے اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کے شوہر کو کوئی یہودی کہہ دے تو وہ واجب القتل نہیں؟

منکرین بناتِ نبوت:

لیکن اس وقت لوگ اتنے ڈھیٹ نہیں ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادیوں کا بالکلیہ انکار ہی کر دیں اور اب تو یہاں یار لوگوں نے باقی تین صاحبزادیوں کا انکار ہی کر دیا اور کہتے ہیں کہ کوئی بیٹی تھی ہی نہیں سوائے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے، یہ غلط ہے، بھائی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے محبت یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت ہی کا انکار کر دو، یہ ایک مستقل موضوع ہے۔

اہل بیتؓ کے دشمن:

میں نے اپنی کتاب ''شیعہ سنی اختلاف'' میں تھوڑا سا بادلِ نخواستہ اس کا ذکر کیا ہے کہ یہ حضرات جو محبت اہل بیت کا دم بھرتے ہیں اور ان کی ہر مجلس میں یاحسین! پر سینہ کوبی ہوتی ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے سب سے بدترین دشمن ہیں، آپ حضرات میری اس کتاب کو پڑھ لیں، مزہ آئے گا، ان کے بارہ امام ہیں، بارہواں امام تو بے چارہ غائب ہوگیا ہے اور پہلے امام حضرت علیؓ تھے، دوسرے حضرت حسنؓ، تیسرے حضرت حسینؓ تھے، ان تین کو بھی چھوڑ دو، پیچھے کتنے رہ گئے؟ آٹھ، ہر امام کے زمانے میں اس کے بھائی بندوں نے اختلاف کیا، اس کی امامت پر شیعوں نے لکھا اور میں نے شیعہ کتابوں کے حوالے سے اس کی پوری تفصیل لکھ دی ہے۔

حضرت علیؓ کی اولاد امامت سے غائب:

یہی علی بن حسین حضرت علیؓ کے پوتے ہیں، حضرت حسینؓ کے بھائی، اور بڑے بھائی کے بعد امامت کس کو ملتی ہے؟ چھوٹے بھائی کو، تو محمد بن علی مستحق تھے امامت کے، جیسے حضرت حسنؓ کے بعد حضرت حسینؓ کو امامت ملی، اور اب حضرت

حسینؓ کے بعد کس کو ملنی چاہئے؟ حضرت علیؓ کے لڑکے موجود ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کے صاحبزادوں کو ملی، حضرت حسنؓ کی اولاد کو بھی امامت سے نکال دیا، حضرت علیؓ کی اولاد بھی امامت سے غائب، حضرت علیؓ کے دو بیٹوں کو لے کر باقی بیٹوں کو امامت سے نکال دیا اور حضرت حسنؓ کی اولاد میں سے ایک بھی امام نہیں، سب امامت سے خارج۔

چچا بھتیجے کا اختلاف:

حضرت علیؒ حضرت حسینؓ کے لڑکے ہیں، علی زین العابدین جن کا میں نے ابھی تذکرہ کیا، ان کا اپنے چچا کے ساتھ اختلاف ہوا، چچا یعنی محمد بن حنفیہ کہتے تھے کہ میں امام ہوں، یہ کہتے تھے کہ میں امام ہوں اور اصولِ کافی میں لکھا ہے کہ حجر اسود سے فیصلہ لیا گیا، مکہ مکرمہ میں پہنچے اور دونوں نے وہاں کھڑے ہوکر دعا کی تو حجر اسود سے آواز آئی ''علی'' یعنی بھتیجے امام ہیں، چچا امام نہیں ہیں، آئی ہوگی آواز، ایک بات تو یہ ہوگئی۔

ہر زمانہ میں مسئلۂ امامت پر اختلاف ہوا:

اسی طرح ہر امام کے زمانے میں یہاں تک کہ حسن عسکریؒ تک جو امام غائب کے باپ ہیں، ہر ایک کے زمانے میں امامت کے مسئلہ میں اختلاف ہوا، یعنی اس کے بھائی بندوں میں سے، اس کے عزیزوں میں سے، ایک بھی ان کی امامت کا قائل نہیں، امام جعفرؒ کے آٹھ بیٹے تھے اور آٹھوں اپنی اپنی جگہ امامت کے مدعی تھے موسیٰ کاظمؒ کو ان کے بھائیوں میں سے کوئی امام نہیں مانتا تھا۔ خیر یہ تو چھوڑو!

روافض کے ہاں منکرِ امامت ''حرامی'' ہے:

لیکن شیعہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جو امامت کا منکر ہو وہ حرام زادہ ہے، اس کتاب میں حوالے دیکھ لو، ان کی کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ

اس کا نسب ناپاک ہے، میں گستاخی کی معافی چاہتے ہوئے پوچھوں گا کہ: جب حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمدؒ نے انکار کردیا تھا اپنے چچا کی امامت سے، تو وہ کون ہوئے؟ اور امام باقرؒ کے بھائیوں نے امام باقرؒ کی امامت کا انکار کردیا تو وہ کون ہوئے؟ ہم نے آج تک مخالف کو حرام زادہ نہیں کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو یہ لقب دینے کا پہلی بار ان حضرات کو شرف حاصل ہوا ہے (نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ)۔ یہ گیارہ آدمی ہوگئے، بارہواں تو ہے ہی نہیں، ان گیارہ آدمیوں سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری نسل کو یہ خطاب دیتے ہیں، فرمائیے! یہ محبّ اہل بیت ہیں یا اہل بیت کے دشمن ہیں؟

حضرت علیؓ کی حضرت عثمانؓ سے عقیدت:

تو خیر مسئلہ یہ چل رہا تھا کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہیں اور اگر کسی کی عقل میں نہ آئے تو میں نے اس کتاب میں یہ بھی حوالہ نقل کردیا ہے کہ حضرت امیرالمؤمنینؓ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا تھا کہ حضرت عثمانؓ کو کہیں کہ آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا وہ شرف حاصل ہے جو کہ شیخین کو نہیں، ٹھیک ہے ان دو حضرات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر ہونے کا شرف تو حاصل ہے۔ لیکن داماد ہونے کا شرف حاصل نہیں، تو ان میں ذرا اختلاف ہوا کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ میں کون افضل ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہوا کہ حضرت عثمانؓ سے حضرت علیؓ افضل ہیں۔

ترتیبِ خلافت، ترتیبِ فضیلت ہے:

صحیح بات جس پر کہ جمہور اہل سنت متفق ہوئے وہ یہ ہے کہ ان کی ترتیبِ خلافت کے مطابق ان کی ترتیبِ فضیلت ہے، یعنی یوں کہو کہ جس طرح اللہ کے نزدیک ان کی ترتیب فضیلت تھی، اسی ترتیب سے اللہ نے ان کو خلیفہ بنایا۔ سب سے

اول نمبر پر حضرت ابوبکرؓ تھے تو وہ پہلے خلیفہ ہوئے، اور دوسرے نمبر پر حضرت عمرؓ تھے وہ بعد میں خلیفہ ہوئے، تیسرے نمبر پر حضرت عثمانؓ تھے وہ بعد میں خلیفہ ہوئے اور چوتھے نمبر پر حضرت علیؓ تھے وہ بعد میں خلیفہ ہوئے، رضی اللہ عنہم۔

دور والا قریب تر:

یہاں ایک لطیفہ یہ ہے کہ جتنا دور والا تھا، اتنا پہلے خلیفہ بنا، حضرت علیؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد ہیں، دادے میں جا کے مل جاتے ہیں، وہ سب سے آخری نمبر پر، اور حضرت عثمانؓ پردادے میں جا کے ملتے ہیں وہ تیسرے نمبر پر آئے، حضرت عمرؓ قبیلہ بنوعدی کے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچویں پشت میں جا کے ملتے ہیں، اور حضرت ابوبکرؓ اس سے بھی اوپر جا کے ملتے ہیں، بتایا گیا کہ اسلام میں نسلی قرب کا لحاظ نہیں ہے بلکہ باطنی کمالات اور دائمی قرب کا لحاظ ہے، جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی قریب ہوگا اتنا عنداللہ افضل ہوگا، یعنی اللہ کے نزدیک افضل ہوگا۔ تو بہرکیف اس امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔

حضرت علیؓ کو شیخینؓ پر فضیلت دینے والا مفتری ہے:

یہ خطبہ حضرت امیرالمؤمنینؓ کوفے کے منبر پر ارشاد فرماتے تھے اور ان لوگوں کو جو حضرت علیؓ کو حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ پر فضیلت دیتے تھے، حضرت علیؓ ان کو مفتری کہتے تھے یعنی کسی پر بہتان لگانے والا اور بہتان لگانے والے کی سزا اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے:

"وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً." (نور:۴)

ترجمہ:...... "وہ لوگ جو بہتان باندھتے ہیں کسی پر، پھر

نہیں لاتے چار گواہ، ان کے اسّی کوڑے لگاؤ۔''

حضرت امیرالمؤمنینؓ نے فرمایا کہ میں نے پہلے اعلان نہیں کیا تھا اس لئے آج تو کچھ نہیں کہتا لیکن اگر آئندہ میں نے کسی کو سنا کہ وہ مجھے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ پر فضیلت دیتا ہے تو اس کو سزا دوں گا، اور سزا اس کی مفتری کی سزا ہوگی، یعنی اسّی کوڑے لگاؤں گا۔

شیعوں کے ہاں حضرت علیؓ کی پوزیشن:

حضرات شیعہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی امیرالمؤمنین نے کوفے کے منبر پر اس قسم کے خطبات ارشاد فرمائے تھے لیکن کہتے ہیں کہ یہ مجبوری تھی، اس لئے کہ حضرت امیرالمؤمنینؓ کے ساتھ جو تھوڑے بہت آدمی رہ گئے تھے باقی تو حضرت معاویہؓ لے گئے تھے، جو تھوڑے بہت ان کے ساتھ رہ گئے تھے وہ بھی حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے گرویدہ تھے، اگر حضرت امیرالمؤمنینؓ ان کے بارے میں اپنا عقیدہ بیان کرتے تو سارا لشکر تتر بتر ہوجاتا۔ سبحان اللہ!

میں نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ تم ہی بتاؤ کہ پھر حضرت علیؓ کا سب سے بڑا دشمن کون نکلا؟ امیرالمؤمنینؓ قسم کھا کر اور منبر رسول پر بیٹھ کر کہہ رہے ہیں اور اپنی امارت میں کہہ رہے ہیں، اپنی قوم کے درمیان میں کہہ رہے ہیں جن پر وہ امیرالمؤمنین اور خلیفۃ المسلمین ہیں، ان کے سامنے کہہ رہے ہیں، مگر تم کہتے ہو کہ ڈر کے مارے کہہ رہے تھے، ورنہ خلافت ہاتھ سے چلی جاتی، کیا اپنی خلافت کو بچانا بڑا ضروری تھا؟ یہ ہے شیعوں کے نزدیک حضرت علیؓ کی پوزیشن۔

بہرحال اہل سنت والجماعت کا عقیدہ وہی ہے جیسا کہ حضرت امیرالمؤمنینؓ نے فرمایا کہ شیخینؓ افضل ہیں اور یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ سب سے پہلے دن سے یہ عقیدہ ان ہی کے ہاں سے نکلنا شروع ہوا ہے، حضرت امیرالمؤمنین فرماتے ہیں کہ جو

شخص حضرات شیخینؓ کی فضیلت کا انکار کرتا ہے یا ان کی تنقیص کرتا ہے یا ان پر کسی قسم کا اعتراض کرتا ہے یا نکتہ چینی کرتا ہے، اسے سمجھنا چاہئے کہ اس نے دین سے نکلنا شروع کر دیا، اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حضرت عمرؓ کی چھ نصیحتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّہٗ وَعَظَ رَجُلًا فَقَالَ: لَا تُلْهِکَ النَّاسُ عَنْ نَفْسِکَ فَاِنَّ الْاَمْرَ یَصِیْرُ اِلَیْکَ دُوْنَهُمْ، وَلَا تَقْطَعِ النَّهَارَ سَارِبًا فَاِنَّہٗ مَحْفُوْظٌ عَلَیْکَ مَا عَمِلْتَ وَاِذَا اَسَأْتَ فَاَحْسِنْ فَاِنِّیْ لَا اَرٰی شَیْئًا اَشَدَّ طَلَبًا وَلَا اَسْرَعَ دَرَکَۃً مِنْ حَسَنَۃٍ حَدِیْثَۃٍ لِذَنْبٍ قَدِیْمٍ۔“ (کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۲۰۲)

”عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: اِعْتَزِلْ مَا یُؤْذِیْکَ وَعَلَیْکَ بِالْخَلِیْلِ الصَّالِحِ وَقَلَّ مَا تَجِدُہٗ وَشَاوِرْ فِیْ اَمْرِکَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اللّٰہَ۔“

(کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۱۹۶)

ترجمہ:...... ”حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ آپؓ نے ایک آدمی کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: تجھ کو

لوگ تیری ذات سے غافل نہ کردیں، اس لئے کہ معاملہ تیری طرف لوٹے گا ان کی طرف نہیں اور دن کو چل پھر کر نہ گزار، اس لئے کہ جو تو نے عمل کیا وہ تجھ پر محفوظ کرلیا گیا اور جب تو برائی کرے تو اس کے پیچھے بھلائی کر اس لئے کہ میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جو تیزی سے تلاش کرتی ہو اور سختی سے طلب کرتی ہو، اس نئی بھلائی سے جو پرانے گناہ کو تلاش کرتی ہے۔''

ترجمہ:...... ''امام بیہقیؒ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپؓ نے ارشاد فرمایا: جو چیزیں تمہیں ایذا پہنچاتی ہیں ان سے الگ رہو اور نیک دوست کو لازم پکڑو اور تم اس کو کم پاؤ گے اور اپنے معاملہ میں ان لوگوں سے مشورہ کرو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔''

یہ امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی چھ نصیحتیں ہیں، تین پہلی روایت میں اور تین دوسری روایت میں۔

حضرت عمرؓ کی عظمت:

رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''وَلَقَدْ كَانَ فِيمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنَّ يَّكُ فِيْ اُمَّتِيْ اَحَدٌ فَاِنَّهٗ عُمَرُ.'' (مشکوۃ ص:۵۵۶)

ترجمہ:...... ''پہلی امتوں میں محدث ہوتے تھے، یعنی جن کی زبان پر فرشتے باتیں کرتے تھے، میری امت میں اگر کوئی ہے تو وہ عمر ہے۔''

حضرت عمرؓ کی زبان پر سکینہ:

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمیں ایسا لگا کرتا تھا کہ: ''اِنَّ السَّکِیْنَۃَ تَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ.'' (مشکوٰۃ ص:۵۵۷) یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ جس سے دلوں کو سکون اور اطمینان آجاتا ہے۔ زبان پر سکینہ بولتی ہے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے کہ:

''اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِہٖ.'' (مشکوٰۃ ص:۵۵۷)

ترجمہ:...... ''اللہ تعالیٰ نے حق کو عمرؓ کی زبان اور دل پر رکھ دیا ہے۔''

حضرت عمرؓ کی راست گوئی:

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ:

''رَحِمَ اللّٰہُ عُمَرَ، یَقُوْلُ الْحَقَّ وَاِنْ کَانَ مُرًّا، تَرَکَہُ الْحَقُّ وَمَا لَہٗ مِنْ صَدِیْقٍ.''

(البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۶۰)

ترجمہ:...... ''اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو عمرؓ پر وہ حق بات کہتے ہیں اگرچہ حق کڑوا ہوتا ہے، ان کے حق کہنے نے ان کا کوئی دوست نہیں چھوڑا۔''

کیونکہ نصیحت کی بات کڑوی لگا کرتی ہے اور جس کی بات کڑوی لگے آدمی پھر اس سے دوستی نہیں کرتا، تو ان ارشادات نقل کرنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلب مبارک کو نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کے علوم کا خزانہ بنادیا تھا اور جو بات دل میں ہوتی ہے زبان سے وہی نکلتی ہے، دل کی بات کسی نہ کسی طریقہ سے زبان پر آہی جاتی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ!

حضرتؓ لوگوں کے مرشد:

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دنیا کے اعتبار سے لوگوں کے سربراہ مملکت اور حاکم اعلیٰ ہی نہیں تھے بلکہ ان کے مرشد بھی تھے اور یہ حضراتِ خلفائے راشدین کی جامعیت تھی، بعد کے خلفاءمیں یہ بات نہیں رہی، وہ حضرات بیک وقت منتظم اعلیٰ بھی تھے، ان کے معلّم اور مدرس بھی تھے، ان کے قائد اور سپہ سالار بھی تھے، ان کے منصف اور قاضی بھی تھے، ان کے مرشد اور پیر بھی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام جہتوں کے جامع ہوتے تھے۔

تو پہلی روایت میں ہے کہ حضرت امیر المؤمنینؓ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے تین باتیں ارشاد فرمائیں:

اپنی ذات سے غافل نہ ہو:

ا:......ایک یہ ہے کہ لوگ تجھے اپنی ذات سے غافل نہ کردیں۔ یعنی لوگوں کے دھندوں میں مشغول ہوکر اپنے آپ کو نہ بھول جاؤ، لوگوں کی فکر پڑی ہوئی ہے اور یہ فکر اس قدر غالب آگئی کہ اپنے ضروری مشاغل یا اپنے ذاتی معمولات کا وقت ہی نہیں ملتا، اس لئے کہ تیرا معاملہ تیری طرف پہنچے گا، ان کی طرف نہیں، یعنی تیرے اعمال کی بازپرس اور تیرے اعمال کے مطابق برتاؤ تیرے ساتھ ہوگا، لوگوں کے ساتھ نہیں، جو اعمال کہ ہم کرتے ہیں خواہ کسی کی خیرخواہی کے لئے کریں، یا کسی کی بدخواہی کے لئے کریں، اچھا کریں، یا برا کریں، اس کا بھگتان ہمیں خود کرنا ہوگا، لوگوں کی جائز فرمائشیں پوری کرتے ہو تو ٹھیک اور اگر ناجائز فرمائشیں پوری کرتے ہو تو حساب تمہیں دینا ہوگا، ان کو نہیں، ان کو اپنے عمل کا حساب دینا ہوگا، اس لئے کہ قیامت کے

دن تم یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ جی کیا کریں؟ بچے تنگ کرتے تھے، دوستوں نے مجبور کردیا تھا۔

نفس کی تاویلات کا علاج:

عام طور پر ہمارا نفس تاویلیں کیا کرتا ہے اور جتنے گمراہ لوگ ہیں، وہ اپنے غلط مطلب کے لئے تاویلیں کیا کرتے ہیں، ہمارا نفس ہمارے غلط کاموں کے لئے تاویل کرتا ہے، قادیانی اپنے غلط عقائد کی تاویلیں کیا کرتے ہیں، یعنی یہ مطلب ہے، یہ مطلب ہے، ان کی ساری عمر "یعنی یہ مطلب ہے" سے ختم نہیں ہوتی اور اسی طرح دوسرے گمراہ فرقے بھی ہیں جو اپنی بدعات اور اپنی گمراہیوں کے لئے قرآن کریم اور سنت نبویؐ میں تحریف کرتے ہیں، ادل بدل کرتے ہیں، ان کے مطالب بگاڑتے ہیں، تاویلات کرتے ہیں، اور ہمارا نفس ہماری غلط روی کے لئے تاویل کیا کرتا ہے کہ جی کیا کریں، یہ عذر ہے، وہ عذر ہے، میں جو باتیں کہہ رہا ہوں یہ بہت بڑا علم ہے، یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے کئی دفعہ قادیانیوں کو لکھا کہ یہ سوچ کر قرآن کریم اور احادیث میں تاویل کرو کہ قیامت کے دن تم اللہ کے سامنے کھڑے ہوکر یہ تاویل بیان کرسکو، بس ایک ہی فقرہ ہے، اس پر غور کرلو کہ تمہارا نفس اگر تمہاری غلطیوں کی تاویل کرتا ہے اور تمہیں دھوکہ دیتا ہے تو اس سے پوچھ لو کہ جب تم اللہ کے سامنے کھڑے ہوگے، تو یہ تاویل کرسکو گے؟ اور یہ تمہاری تاویل چل جائے گی؟ اگر نہیں تو مجھے کیوں دھوکہ دیتے ہو؟ مجھے کیوں فریب دیتے ہو؟ یہ جتنے غلط رو فرقے ہیں، یہ سارے کے سارے اللہ تعالیٰ کے کلام میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں غلط تاویلات کرتے ہیں، کاش کہ یہ اپنے نفس کی طرف رجوع کرتے اور اس سے پوچھ لیتے کہ کل قیامت میں ہم اللہ کے سامنے یہ تاویل کرسکیں گے؟ اور کاش کہ ہم اپنی غلطی پر تاویل کا پردہ ڈالنے سے پہلے اپنے نفس سے رجوع کرکے پوچھ لیتے کہ

کل قیامت کے دن یا قبر میں تمہاری یہ تاویل سنی جائے گی؟

اس کو میں نے بہت بڑا علم اس لئے کہا کہ ہر قدم پر اگر اس بات کو پیش نظر رکھا جائے تو انشاءاللہ! ہماری بہت سی غلطیوں کی اصلاح ہوسکتی ہے، تو حضرت امیرالمؤمنین فرماتے ہیں: "لَا تُلْهِکَ النَّاسَ عَنْ نَّفْسِکَ." لوگ تجھے تیرے معاملہ سے غافل نہ کردیں، "فَاِنَّ الْاَمْرَ یَصِیْرُ اِلَیْکَ دُوْنَهُمْ." اس لئے کہ معاملہ تجھ تک پہنچے گا ان تک نہیں۔

اوقات کی حفاظت:

۲:......اور دوسری نصیحت یہ فرمائی کہ سارا دن مٹرگشت کرتے ہوئے نہ گزارو کہ:

"صبح ہوئی، شام ہوئی، عمر یونہی تمام ہوئی"

اس لئے کہ تمہارے اعمال محفوظ کر کے بند کردیئے گئے ہیں، قرآن کریم میں ہے: "اَحْصَاهُ اللهُ وَنَسُوْهُ." اللہ تعالیٰ نے ان کو تو گن کر اور شمار کر کے رکھا تھا لیکن ان لوگوں نے ان کو بھلادیا تھا۔ ہمارا حافظہ کمزور ہے، ہم تو عمل کرتے ہیں بھول جاتے ہیں اور جب غلطیاں ہماری پرانی ہوجاتی ہیں تو ان پر نسیان کا پردہ آجاتا ہے، بھول کا پردہ آجاتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے، "یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ." (جس دن یہ پردے ہٹادیئے جائیں گے، بھیدوں کے) اور اندر جو کچھ چھپا ہوا ہے وہ نکال کر دکھادیا جائے گا، اس دن معاملہ ذرا مشکل ہوگا، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، آمین!

پہلا نقصان تو یہ تھا کہ ہم عمل کرتے وقت تاویلیں کر کے اپنے نفس کو مطمئن کرلیتے ہیں اور دوسرا یہ ہے کہ غلطیاں کر کے پھر ان کو بھول جاتے ہیں، یہاں ہم سے کسی نے انتقام نہیں لیا، ہمارے جرم کا کسی کو پتہ نہیں چلا اور ہم بلی کی طرح سو

چوہے کھا کر حاجی کے حاجی رہ گئے، تو ہم سمجھتے ہیں کہ واقعتاً ہم حاجی ہیں، کسی کو ہماری غلطیوں کا پتہ نہیں چلا اور یوں چلتے چلتے وقت گزر گیا تو پرانی غلطیاں ویسے ہی بھول گئیں۔ بچپن کیسے گزارا تھا؟ جوانی کی دہلیز پر کیسے قدم رکھا تھا؟ اور عنفوان شباب میں، چڑھتی جوانی میں کیا کیا خرمستیاں کی تھیں؟ اور بڈھے ہونے کے بعد بھی تبلیغ والوں کے بقول: بچپن کی عادتیں پچپن تک نہیں جاتیں گویا بچپن کی عادتیں پچپن تک نہیں چھوڑیں، کیونکہ پردہ پڑا ہوا ہے، کچھ تو اللہ تعالیٰ کی ستاری کا پردہ ہے اور کچھ ہمارے حافظہ کی کمزوری کا پردہ ہے کہ ہم ان کو بھول گئے، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ: ''مَحْفُوْظًا اِلَیْکَ.'' وہ تجھ پر محفوظ ہیں، تو نے جو عمل کیا وہ ضائع نہیں ہوا، اچھا عمل کیا تو بھی، اور برا عمل کیا تو بھی۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ کا مسئلہ ارشاد فرمارہے تھے، کسی نے مجلس میں سے پوچھا کہ حضور! اگر کسی کے پاس گدھے ہوں ان پر بھی زکوٰۃ ہوتی ہے؟ ارشاد فرمایا:

> ''مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیَّ فِیْھَا اِلَّا الْاٰیَةُ الْفَاذَّةُ الْجَامِعَةُ: مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَہٗ. وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَہٗ.'' (مسند احمد ج:۲ ص:۲۶۲)
>
> ترجمہ:...... ''ان کے بارے میں مجھ پر کوئی چیز نازل نہیں کی گئی سوائے ایک تنہا آیت کے جو کہ پوری کی پوری جامع ہے کہ جو شخص عمل کرے گا ایک ذرہ برابر خیر کا، اس کو بھی دیکھ لے گا اور جو شخص عمل کرے گا ایک ذرہ برابر برائی کا، اس کو بھی دیکھ لے گا۔''

حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ ایک ذرہ نیکی کا ضائع نہیں ہوگا، اس کی قدر کریں گے، اور ایک

ذرہ برائی کا غائب نہیں ہوگا، یعنی لا کے حاضر کردیں گے، سزا دینا ضروری نہیں، ہوسکتا ہے کہ معاف کردیں لیکن ایک دفعہ دکھا ضرور دیں گے کہ تو نے یہ کیا تھا، اس لئے غفلت میں اور سوتے ہوئے وقت نہ گزارو، اس لئے کہ تمہارے اعمال کا ریکارڈ جمع کیا جارہا ہے، اور وہ محفوظ ہے۔

بدی کے بعد نیکی:

۳:......اور تیسری نصیحت یہ فرمائی کہ جب تجھ سے کوئی غلطی ہوجائے، کوئی گناہ ہوجائے، کوئی برائی ہوجائے تو فوراً نیکی کا کام کرو، یہ حدیث شریف کا مضمون ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاحب کو نصیحتیں فرما رہے تھے، آپؐ نے ارشاد فرمایا: "وَاتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا." (مسند احمد ج:۵ ص:۱۵۳)(اور برائی کے پیچھے بھلائی کرلو، فوراً وہ بھلائی اس برائی کو مٹادے گی) دونوں کی کشتی ہوجائے گی، تم سے کوئی غلطی ہوگئی، کوئی برا کام ہوگیا فوراً نیک کام کرو، اب ان میں سے جو طاقت ور ہوگا وہ اس کو گرادے گا ان شاء اللہ! نیکی برائی کو گرادے گی، اس لئے کہ نیکی میں دس گنا طاقت ہوتی ہے، دس گنا ثواب ملتا ہے، ایک نیکی پر دس نیکیاں ملتی ہیں، اللہ تعالیٰ نو گنا اس میں مزید طاقت پیدا فرمادیتے ہیں، اب یہ دس آدمی ہیں، وہ بے چارہ اکیلا ہے، اکیلا دس آدمیوں کا مقابلہ کیسے کرے گا؟

اکابرؒ تو یوں فرماتے ہیں کہ اگر غلطی ہوجائے، گناہ ہوجائے، کوئی برائی ہوجائے تو نیکی کرتے ہی رہو، کرتے ہی رہو، کرتے ہی رہو، یہاں تک کہ تمہیں یقین ہوجائے کہ ان شاء اللہ! وہ برائی مٹ گئی ہوگی، تمہاری یہ نیکیاں ان برائیوں کو مٹادیں گی، یعنی چھپادیں گی، اس پر غالب آجائیں گی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اور بعد کے اولیاء اللہ کا یہی معمول تھا۔

حضرت عائشہؓ کی ندامت:

حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جنگ جمل میں گئی تھیں، بس وہ اللہ کی حکمت تھی، چلی گئیں، لیکن بعد میں جب یہ بات کبھی یاد آتی تو اتنا روتیں کہ دوپٹہ تر ہو جاتا اور پچاس کے قریب غلام آزاد فرمائے، اور فرماتی تھیں: یا اللہ! میری غلطی تھی، مجھے نہیں جانا چاہئے تھا۔

لوگوں کو طعن کرنا تو آتا ہے لیکن ان اکابر کا حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ جو تعلق تھا، وہ ان کو معلوم نہیں ہے، یہ دور سے بیٹھے ہوئے بزرگوں پر، اکابر پر تنقیدیں کرتے ہیں۔

تو امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب تو برائی کرلے تو اس کے پیچھے بھلائی کرلیا کر، اس لئے کہ ایک چیز دوسری چیز کا تیزی کے ساتھ تعاقب کر رہی ہے۔ پھر اس کو ایک مثال سے سمجھایا کہ جیسے ایک آدمی دوڑا جا رہا ہے، اس کے پیچھے دوسرا آدمی اس کو پکڑنے کے لئے دوڑا جا رہا ہے، اسی طرح برائی کے پیچھے نیکی دوڑ رہی ہے، اسی لئے فرمایا میں نے نیکی سے زیادہ کسی کو تعاقب کرنے والا نہیں دیکھا، جتنا نیکی برائی کا تعاقب کرتی ہے اور اس کو جا کے پکڑ لیتی ہے، میں نے کسی تعاقب کرنے والے کو اتنا تیز رو نہیں دیکھا، جتنا کہ نیکی برائی کا تعاقب کرتے ہوئے تیز دوڑتی ہے اور فوراً جا کر اس کو پکڑتی ہے، یہ بھی بہت بڑا علم ہے، جب بھی کوئی کوتاہی ہو جائے، جب بھی کوئی لغزش ہو جائے، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہم میں یہ حس پیدا کردے کہ ہمیں پتہ چل جائے کہ مجھ سے غلط کام ہوا ہے، دل سیاہ ہو جاتا ہے تو آدمی تمیز ہی نہیں کرسکتا کہ میں اچھا کر رہا ہوں کہ برا کر رہا ہوں؟ دل اندھا ہو جاتا ہے۔

تو پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ کرے ہم میں تمیز پیدا ہو جائے کہ یہ نیکی ہے یا بدی ہے؟ میں اچھا کر رہا ہوں یا برا کر رہا ہوں؟

نیکی اور برائی کی پہچان:

ایک صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، کہنے لگے: یا رسول اللہ! مجھے کیسے معلوم ہو کہ میں نے اچھا کام کیا ہے یا برا کام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

''اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِیْ صَدْرِکَ وَکَرِھْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْہِ النَّاسُ.'' (مشکوٰۃ ص:۴۳۱)

ترجمہ:...... ''نیکی تو اچھے اخلاق کا نام ہے، (اگر تم نے کسی کے ساتھ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے تو سمجھ لو کہ تم نیکی کے راستے پر ہو) اور برائی وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے اور تجھے یہ اچھا نہ لگے کہ لوگوں کو پتہ چلے۔''

جس چیز کو ہم لوگوں سے چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں یا کہتے ہیں کہ لوگوں کو پتہ نہیں چلنا چاہئے، معلوم ہوا کہ برائی ہے، انسانی بدن کے جو اعضا ستر کہلاتے ہیں، آدمی نہیں چاہتا کہ اس پر کوئی مطلع ہو، ڈھانپ کر رکھتا ہے، پردہ کرکے رکھتا ہے، اسی طرح انسانی اخلاق و اعمال میں جو چیزیں عیب کی ہیں، آدمی نہیں چاہتا کہ کوئی ان پر مطلع ہو اور اگر علی الاعلان گناہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اللہ کے پردہ کو خود چاک کردیا، اللہ تو لوگوں کا پردہ رکھتا ہے اور اس نے ''ستر اللہ'' کو، اللہ کے تانے ہوئے پردے کو پھاڑ کے پھینک دیا ہے، علی الاعلان گناہ کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ نہ اس کو خالق سے شرم، نہ مخلوق سے شرم، تو پہلی بات تو یہ کہ ہم میں بدی اور نیکی کی حس پیدا ہوجائے، جب بھی ہم سے کوئی غلطی اور کوتاہی ہو، ہم جان لیں کہ میں نے اچھا نہیں کیا، برا کیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ جب یہ پتہ چل جائے تو فوراً اپنی غلطی کا اقرار

کر کے اس کا تدارک کرے، سب سے آسان، سہل تدارک یہ ہے کہ اللہ سے معافی مانگے، توبہ کرے۔

موذیوں سے احتراز:

۴:......اور چوتھی نصیحت یہ فرمائی کہ: "اِعْتَزِلْ مَا یُؤْذِیْکَ." جو چیزیں تجھے ایذا پہنچانے والی ہیں ان سے الگ تھلگ رہو، جو کام ایذا پہنچانے والا ہو اس کے قریب نہ جاؤ، کوئی آدمی موذی ہے، تو کوشش کرو کہ اس کے قریب نہ جاؤ، ایذا پہنچانے والا جسم کے اعتبار سے ہو یا ذہنی طور پر ایذا پہنچانے والا ہو، دنیا کے اعتبار سے ہو یا آخرت اور قبر کے اعتبار سے ہو، جو چیز کہ ایذا پہنچانے والی ہے، اس سے الگ رہو، موذی کے قریب نہ جاؤ، موذی انسان ہوں، موذی چیزیں ہوں، یا موذی تمہارے اعمال ہوں، موذیوں سے بچو، ہم دوسروں کو تو موذی سمجھتے ہیں، لیکن اپنے آپ کو نہیں سمجھتے، تمہارا نفس تو موذی نہیں ہے؟ اس سے پوچھ لو، کیوں میاں کسی کو ایذا تو نہیں پہنچائی تم نے؟ تنہائی میں بٹھا کے اس سے پوچھو، اگر تم نے ایذا پہنچائی یا پہنچانے کی عادت ہے تو قیامت کے دن تمہارا شمار موذیوں میں ہوگا، تم اللہ کی مخلوق کو ایذا پہنچانے والے ہو۔

حدیثِ مسلسل:

یہ حدیث حدیثِ مسلسل ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر جب بھی مشائخ اس کی سند کی اجازت دیتے ہیں تو وہ خاص کیفیت جو ملحوظ تھی، اس کو محفوظ رکھتے ہیں، مثلاً حدیث بیان کرتے ہوئے چھوہارہ کھلایا، کھجور کھلائی اور پانی پلایا پھر حدیث سنائی، چنانچہ جو صحابیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے تھے، وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کھلائی، پانی پلایا اور یہ حدیث ارشاد فرمائی، اس وقت سے ہمارے شیخ تک یہ حدیث مسلسل چلی آرہی ہے، اسی لئے جب

ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہ نے ہمیں اس حدیث کی اجازت دی تھی، تو اسی طرح اجازت دی تھی، پہلے کھجور کھلائی، پانی پلایا اور پھر ارشاد فرمایا:

"اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ. اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمُکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ." (ترمذی ج:۲ ص:۱۴)

ترجمہ:...... "رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔"

یہ راحمین ہیں جن پر رحمٰن رحم کرتا ہے، جو اللہ کی مخلوق کو ایذا نہیں پہنچاتے ان کے مقابلے میں وہ لوگ موذی اور ایذا پہنچانے والے ہیں، قرآن کریم میں ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا." (احزاب:۵۷)

ترجمہ:...... "جو لوگ ایذا پہنچاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو، ان پر اللہ کی لعنت ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور ان کے لئے تیار کر رکھا ہے اہانت آمیز یعنی ذلیل کرنے والا عذاب۔"

بعض لوگ ایسے موذی ہیں جو اللہ اور رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں، وہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں جو لمبی حدیث مشہور ہے کہ: "اَللّٰہَ! اَللّٰہَ! فِیْ اَصْحَابِیْ!" میرے صحابہؓ کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو! آگے چل کر اس کا ایک فقرہ یہ ہے:

"وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِیْ، وَمَنْ آذَانِیْ فَقَدْ آذَی اللهَ، وَمَنْ اٰذَی اللهَ فَیُوْشِکُ اَنْ یَّأْخُذَهٗ." (مشکوٰۃ ص:۵۵۴)

ترجمہ:...... "جس نے ان کو ایذا پہنچائی، اس نے مجھ کو ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس نے اللہ کو ایذا پہنچائی اور جو شخص اللہ کو ایذا پہنچائے تو قریب ہے کہ اس کو پکڑ لیا

جائے۔“

بعض لوگ اللہ کو ایذا پہنچاتے ہیں، تو بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایذا پہنچاتے ہیں، اور صحیح بخاری کی حدیث ہے:

”مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ.“

(بخاری ج:۲ ص:۹۶۳)

ترجمہ:..... ”جو میرے کسی ولی کو ستاتا ہے اور اس سے عداوت رکھتا ہے، تو میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں۔“

بعض لوگ اللہ کے مقبول بندوں کو ایذا پہنچاتے ہین اور بعض لوگ عام مسلمانوں کو ایذا پہنچاتے ہیں، اور ان کو ایذا پہنچانے میں مزہ آتا ہے، یہ سب موذی ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے موذیوں سے محفوظ رکھے اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہمارا شمار ان موذیوں میں نہ کرے جو اللہ کی مخلوق کو ایذا پہنچاتے ہیں، بہرحال فرمایا: ”اِعْتَزِلْ مَا یُؤْذِیْکَ.“ جو چیز تمہیں ایذا پہنچائے اس سے الگ تھلگ رہو۔

اچھا دوست بناؤ:

۵:.....اور پانچویں نصیحت یہ ہے کہ: ”وَعَلَیْکَ بِالْخَلِیْلِ الصَّالِحِ.“ اور لازم پکڑو نیک خلیل کو، نیک دوست کو، ”وَقَلَّ مَا تَجِدُهٗ.“ بہت کم ملے گا، آسانی سے نہیں ملتا۔

مولانا رومیؒ کا ایک قصیدہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ کل رات شیخ ہاتھ میں چراغ لئے سڑک پر کوئی چیز ڈھونڈ رہے تھے، میں نے پوچھا کہ حضرت! کیا تلاش کر رہے ہیں؟ فرمایا: ان بھیڑیوں اور درندوں سے تنگ آ گیا ہوں، کسی انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں! یہ شکار کرنے والے جانور ہیں، انسان نہیں مل رہے۔ میں نے بہت نیازمندی سے عرض کیا کہ حضور! ”یافتہ نمی شود۔“ وہ تو ملتا نہیں، میں نے بھی تلاش کیا تھا، انسان

نہیں ملتا، فرمایا جو ملتا نہیں ہے نا اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں، اگر مل جاتا تو ڈھونڈنے کی ضرورت کیا تھی؟ تو فرمایا خلیل صالح کو لازم پکڑو، جو دل سے دوستی کرنے والا ہو اور نیک بھی ہو۔ ”وَقَلَّ مَا تَجِدُهٗ.“ بہت کم ملے گا، بہت کم پاؤ گے۔

کس سے مشورہ کیا جائے؟

۶:......چھٹی نصیحت یہ فرمائی کہ: ”وَشَاوِرْ فِیْ اَمْرِکَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اللہَ.“ اور اپنے معاملہ میں مشورہ ان لوگوں سے کرو جو اللہ سے ڈرتے ہیں، کسی معاملے میں مشورہ کرنا ہو تو ایسے لوگوں سے مشورہ کرو جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا کہ: ”وَلَا تُحَدِّثْ بِهَا اِلَّا لَبِیْبًا اَوْ حَبِیْبًا.“ (ترمذی ج:۲ ص:۵۲) یعنی اگر کسی کو خواب آوے تو ہر ایک سے بیان نہ کرے، اپنا خواب یا تو کسی حبیب سے بیان کرو، جو تم سے محبت کرتا ہے، تمہارا محبوب ہو یا لبیب ہو، یعنی عقل مند ہو، کیونکہ جو ان دونوں صفتوں کے ساتھ موصوف نہیں، وہ تو الٹی سیدھی ہانک دے گا۔ لوگ تعبیر پوچھتے ہیں، میں کہتا ہوں میں تو تعبیر نہیں جانتا، تکلف کرنے کا کیا فائدہ؟

یہ ہمارے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کا مذاق تھا جب بھی کوئی خواب لکھتا تو حضرتؒ فرماتے کہ:

شب ام نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چوں غلام آفتابم ہمہ از او گویم

ترجمہ:......”میں نہ شب ہوں، نہ شب پرست ہوں
کہ خواب کی باتیں کروں، میں تو آفتاب کا غلام ہوں، جو کچھ کہتا
ہوں دن کی روشنی میں کہتا ہوں۔“

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ خواب کا اچھے اور برے پر مدار نہیں ہے، تمہاری

بیداری کی زندگی کا اچھے اور برے ہونے پر مدار ہے، مجھ سے تو تعبیریں پوچھو زندگی کی، زندگی کے اعمال کے بارے میں پوچھو، خواب کی تعبیر کیا پوچھتے ہو؟ لیکن میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ بعض خواب اچھے بھی ہوتے ہیں، سچے بھی ہوتے ہیں۔

خواب کی تین قسمیں:

یوں کہا گیا ہے کہ خواب کی تین قسمیں ہیں، کچھ خواب نفسانی ہوتے ہیں، رات کو سوچتے سوچتے سوگئے یا آگے پیچھے کبھی سوچتے تھے، رات کو وہی خیالات متمثل ہوکر فلموں کی شکل میں آگئے، ان خوابوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور کچھ خواب شیطانی ہوتے ہیں، شیطان القا کرتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ شیطان گدی پر آکے بیٹھ جاتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مثال دے کر سمجھایا جیسے انجکشن لگاتے ہیں نا، ایسے انجکشن کی طرح سوئی ڈال دیتا ہے دماغ کے اندر اور القا کرتا رہتا ہے، گندے گندے خیالات لاتا رہتا ہے، یہ شیطانی خواب ہیں، کیونکہ شیطان بڑا استاد ہے، لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے اس کے پاس ہزاروں طریقے ہیں۔ یعنی اس دوسری قسم کے خواب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: "تَخْوِيفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ." فرمایا ہے کہ شیطان کی طرف سے ڈرانا ہوتا ہے، پریشان کرنا ہوتا ہے، اور یوں فرمایا: ایسا کوئی ڈراؤنا خواب کوئی دیکھے تو بائیں طرف کو تین بار تھوک دے، اور ''لا حول'' پڑھ کے کروٹ بدل دے، انشاءاللہ! شیطان نقصان نہیں دے گا، اور تیسرا خواب ہوتا ہے رحمانی جو من جانب اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے القا کیا جاتا ہے، اس کی البتہ تعبیر ہوتی ہے، بعض اوقات بظاہر خواب بہت گندہ ہوتا ہے لیکن اس کی تعبیر بہت اچھی ہوتی ہے، اور نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! کبھی اس کا الٹ ہوتا ہے۔

علامہ ابن سیرینؒ سے کسی نے آکر کہا کہ نعوذ باللہ! استغفر اللہ! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں قرآن کریم پر پیشاب کر رہا ہوں، لا حول ولا قوۃ الا باللہ! وہ

بے چارہ ڈرتا ہوا آیا اور کہنے لگا: میں کافر تو نہیں ہوگیا؟ بے شک خواب دیکھنے سے آدمی کافر نہیں ہوتا، کیونکہ خواب آدمی کے اختیار میں نہیں ہوتا ہے، فرمایا: پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تیرے ہاں بیٹا ہوگا جو قرآن کریم کا حافظ ہوگا، کیونکہ یہ حافظ صاحب پیشاب ہی سے تو پیدا ہوا ہے ناں!

زبیدہ کا خواب:

ایک بار خلیفہ ہارون رشید کی بی بی زبیدہ نے قاضی ابو یوسفؒ کے پاس اپنی لونڈی کو بھیجا کہ جا کے کہو کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ لوگ آ کے مجھ سے بدکاری کر کے جاتے ہیں، زنا کر کے جاتے ہیں، وہ آئی تو حضرت امام ابو یوسفؒ کہنے لگے: بی بی تیرا تو خواب نہیں ہے، یہ تو کسی بڑی اونچی خاتون کا خواب ہوسکتا ہے، جب تک بتاؤ گی نہیں کہ کس کا خواب ہے، اس وقت تک تعبیر نہیں دوں گا، وہ چلی گئی، زبیدہ نے خود بلوایا قاضی ابو یوسفؒ کو، اور کہنے لگی کہ خواب تو میرا تھا، مگر مجھے شرم آتی تھی اتنا گندہ خواب ذکر کرتے ہوئے، فرمایا: اللہ تعالیٰ تیرے ہاتھ سے کوئی کام لے گا جس سے ساری مخلوق منتفع ہوگی۔ جس کی تعبیر یہ ہوئی کہ زبیدہ نے نہر کھدوائی تھی اور پتہ نہیں صدیوں تک اللہ تعالیٰ نے اس کا فیض جاری رکھا، تو جس طرح خواب کی تعبیر ایک مشکل کام ہے، اسی طرح جب تم اپنا معاملہ کسی کے سامنے رکھو، اس کی تہہ کو پہنچنا اور اس کے مطابق مشورہ دینا یہ بھی ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے، اس لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مشورہ کرو تو نیک آدمی سے مشورہ کرو، جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو، ایک تو وہ اپنی نیکی اور پارسائی کی وجہ سے بات کی حقیقت کو پہنچ سکے گا اور دوسرے تمہیں غلط مشورے نہیں دے گا، کیونکہ اس کو یہ فکر ہوگی کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ باز پرس کریں گے کہ تو نے میرے بندے کو غلط مشورہ دے کر گمراہ کیا تھا! اس لئے مشورہ کرنا چاہئے، اور اپنے ہر معاملہ میں مشورہ کرو، خود رائی سے کام نہ لو اور دوسرے استخارہ کرو،

استخارہ کا مطلب اللہ تعالیٰ سے مشورہ کرنا ہے، بہت سے لوگ بیعت کے لئے کہتے ہیں، میں نے کہا: استخارہ کیا؟ کہتے ہیں: استخارہ تو نہیں کیا! میں نے کہا: اللہ کے بندے! بغیر استخارے کے بھی کوئی کام کیا کرتے ہیں! بیٹے، بیٹی کا نکاح کرنا ہو، رشتہ کرنا ہو، اس کے لئے استخارہ کرو، سفر پر جانا ہو، اس کے لئے استخارہ کرو، ہر اہم کام جو کرنا ہو، اس کے لئے استخارہ کرو اور کسی ایسے آدمی سے مشورہ کرو جو معاملہ فہم ہو، اس معاملہ کو جانتا ہو، بعض لوگ کاروبار کے بارے میں آکر مجھ سے مشورہ کرتے ہیں، میں کہتا ہوں: بھائی! میں کام جانتا نہیں ہوں، میں اس لائن کا نہیں تو تمہیں کیا مشورہ دوں گا؟ کوئی انجینئر آکر مجھ سے پوچھے کہ حضور! یہ نقشہ کیسے بنوائیں؟ اس کا مجھے کیا معلوم ہے! تم جانو یا اس فن کے کسی ماہر سے پوچھو، ہاں جائز، ناجائز مجھ سے پوچھو، اور جو چیزیں میرے دائرے میں آتی ہیں، میں ان کے بارے میں مشورہ دے سکتا ہوں، تو مشورہ کرو کسی عقل مند سے اور مشورہ کرو کسی ماہر سے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

شہادت، فضائل و مناقب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

"اَخْرَجَ اِبْنُ سَعْدٍ عَنْ هُبَيْرَةَ قَالَ: لَمَّا تُوُفِّيَ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَامَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ فَقَالَ: اَيُّهَا النَّاسُ! قَدْ قُبِضَ اللَّيْلَةَ رَجُلٌ لَمْ يَسْبَقْهُ الْاَوَّلُوْنَ وَلَا يُدْرِكُهُ الْآخِرُوْنَ، قَدْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَبْعَثُهُ الْمَبْعَثَ فَيَكْتَنِفُهُ جِبْرَائِيْلُ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَمِيْكَائِيْلُ عَنْ شِمَالِهٖ فَلَا يَنْثَنِيْ حَتّٰى يَفْتَحَ اللهُ لَهُ وَمَا تَرَكَ اِلَّا سَبْعَمِائَةِ دِرْهَمٍ اَرَادَ اَنْ يَّشْتَرِيَ بِهَا خَادِمًا وَلَقَدْ قُبِضَ فِي اللَّيْلَةِ الَّتِيْ عُرِجَ فِيْهَا بِرُوْحِ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ لَيْلَةَ سَبْعٍ وَّعِشْرِيْنَ مِنْ رَمَضَانَ. وَزَادَ فِيْ رِوَايَةٍ اُخْرٰى: مَا تَرَكَ صَفْرَاءَ وَلَا بَيْضَاءَ اِلَّا سَبْعَمِائَةِ دِرْهَمٍ فَضَلَتْ مِنْ عَطَائِهٖ.

وَعِنْدَ اَبِيْ يَعْلٰى وَابْنُ جَرِيْرٍ وَابْنُ عَسَاكِرَ: عَنِ

الْحَسَنِ ..... اَنَّهُ لَمَّا قُتِلَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَامَ خَطِیْبًا فَحَمِدَ اللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَیْہِ ثُمَّ قَالَ: اَمَّا بَعْدُ! قَالَ: وَاللّٰہِ لَقَدْ قَتَلْتُمُ اللَّیْلَةَ رَجُلًا فِیْ لَیْلَةٍ نَزَلَ فِیْھَا الْقُرْآنُ، وَفِیْھَا رُفِعَ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ، وَفِیْھَا قُتِلَ یُوْشَعُ بْنُ نُوْنٍ فَتٰی مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ، وَفِیْھَا تِیْبَ عَلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ .... وَزَادَ ثُمَّ قَالَ: مَنْ عَرَفَنِیْ فَقَدْ عَرَفَنِیْ وَمَنْ لَّمْ یَعْرِفْنِیْ فَاَنَا الْحَسَنُ بْنُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ تَـلَا ھٰذِہِ الْآیَةَ قَوْلَ یُوْسُفَ: ”وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِیْ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ.“ ثُمَّ اَخَذَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ ثُمَّ قَالَ: اَنَا ابْنُ الْبَشِیْرُ! اَنَا ابْنُ النَّذِیْرُ! وَاَنَا ابْنُ النَّبِیُّ! اَنَا ابْنُ الدَّاعِیْ اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ، وَاَنَا ابْنُ السِّرَاجِ الْمُنِیْرِ! وَاَنَا ابْنُ الَّذِیْ اُرْسِلَ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ، وَاَنَا مِنْ اَھْلِ الْبَیْتِ الَّذِیْنَ اَذْھَبَ اللّٰہُ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَطَھَّرَھُمْ تَطْھِیْرًا، وَاَنَا مِنْ اَھْلِ الْبَیْتِ الَّذِیْنَ اِفْتَرَضَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ مَوَدَّتَھُمْ وَوِلَایَتَھُمْ وَقَالَ فِیْمَا اَنْزَلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، قُلْ لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی.“

(حیاۃ الصحابۃ ج:۶ ص:۶۹۸، ۶۹۹ طبع دارالفکر)

ترجمہ:......”ابن سعد نے ہبیرہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کھڑے ہوئے، منبر پر تشریف لے گئے، پھر فرمایا: اے لوگو! تحقیق قبض کیا گیا ہے آج کی رات وہ شخص جس سے آگے نہیں نکلے پہلے لوگ، اور جس کو پائیں گے

نہیں پچھلے لوگ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو بھیجتے تھے کسی مہم کے لئے تو فرشتے ان کے ساتھ ہوتے تھے، جبرائیل دائیں جانب، میکائل بائیں جانب، وہ لوٹتے نہیں تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے فتح کردے اور انہوں نے نہیں چھوڑی کوئی چیز سوائے سات سو درہم کے کہ ان پیسوں سے خادم خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے اور وہ قبض کئے گئے اس رات میں جس میں اوپر لے جایا گیا روح اللہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو، یعنی رمضان المبارک کی ۲۷؍رات۔

اور ابن سعد کی دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے کوئی سونا، چاندی نہیں چھوڑا، سوائے سات سو درہم کے، جو ان کے وظیفے سے بچ گئے تھے۔

ابویعلیٰ ابن جریر اور ابن عساکر نے حضرت حسنؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو حضرت حسنؓ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: اما بعد! اللہ کی قسم تم نے قتل کردیا آج کی رات اس آدمی کو، اس رات میں جس میں قرآن نازل ہوا تھا اور جس میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو اٹھایا گیا لور جس میں حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو قتل کیا گیا، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم تھے اور جس میں بنی اسرائیل کی توبہ قبول ہوئی۔

طبرانی نے ابوطفیل سے ایک اور روایت نقل کی ہے، اس میں یہی روایت ہے، آگے اتنا اضافہ ہے کہ: پھر آپؓ نے فرمایا: جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہے اور جو مجھے نہیں جانتا میں

اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں حسن بن محمد ہوں (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہے: ''اور میں نے پیروی کی اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے مذہب کی۔'' پھر قرآن کریم کی تلاوت فرماتے رہے، اس کے بعد فرمایا: میں بشیر کا بیٹا ہوں، میں نذیر کا بیٹا ہوں، میں نبی کا بیٹا ہوں، میں داعی الی اللہ کا بیٹا ہوں، میں سراجاً منیراً کا بیٹا ہوں، میں اس ذات کا بیٹا ہوں جن کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا گیا تھا، میں ان اہل بیت میں سے ہوں جن سے اللہ تعالیٰ نے رجس اور گندگی کو دور کردیا اور ان کو خوب پاک کردیا اور میں اس اہل بیت کا فرد ہوں جن پر اللہ عزوجل نے ان کی دوستی اور ولایت کو تم پر فرض کردیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: آپ کہہ دیجئے کہ میں اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا مگر اتنا کہتا ہوں کہ قرابت کی دوستی کا لحاظ رکھو۔''

خلافتِ راشدہ کا تتمہ:

خلفائے راشدین چار ہیں، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان حضرت علی رضی اللہ عنہم اور پانچویں خلیفہ راشد حضرت حسن بن علیؓ ہیں، امام حسنؓ اور ان کی خلافت حقیقت میں تتمۂ خلافت راشدہ تھی، وہ چھ مہینے خلیفہ رہے، چالیس کا سن ہونے میں چھ مہینے باقی تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا جیسا کہ اس سے پہلے آچکا ہے، لوگوں نے آخری وقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کے صاحبزادے کو آپؓ کا جانشین بنادیا جائے؟ یعنی حضرت حسنؓ کو۔ حضرت علی رضی اللہ

عنہ نے فرمایا: نہ میں اس کا تمہیں حکم کرتا ہوں اور نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ آپؓ سے کہا گیا کہ: آپؓ کسی کو اپنی جگہ نامزد کرجائیں، فرمایا: میں کسی کو نامزد نہیں کرتا، میں تمہیں اسی طرح چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں چھوڑ گئے تھے، بہرکیف حضرت علیؓ کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے نواسے ہیں، سبط اکبر ہیں، ان کو خلیفہ بنایا گیا، اور یہ خلیفہ تھے اس حصہ پر جس حصے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی اور اس وقت ملک کا بیشتر حصہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زیرنگیں آچکا تھا، تھوڑا سا حصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس رہ گیا تھا، چھ مہینے کے بعد جبکہ چالیس کا سن پورا ہوا تو اکتالیسویں سال میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کرلی اور حکومت ان کے سپرد کرکے خود دستبردار ہوگئے، اس لئے اکتالیسویں سن کو اسلامی تاریخ میں عام الجماع کہا جاتا ہے یعنی وہ سال جس میں سارے مسلمان متفق ہوگئے اور دو گروہ اور دو جماعتیں نہیں رہیں۔

حضرت حسنؓ کی حضرت معاویہؓ سے صلح:

صحیح بخاری کی حدیث ہے، اور یہ حدیث شیعہ کتابوں میں بھی موجود ہے، جس کو میں نے ”شیعہ سنی اختلافات اور صراط مستقیم“ میں نقل کردیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا تھا، جبکہ حضرت حسنؓ بچے تھے، فرمایا:

”اِبْنِیْ ھٰذَا سَیِّدٌ، وَلَعَلَّ اللہَ اَنْ یُّصْلِحَ بِہٖ بَیْنَ فِئَتَیْنِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔“ (صحیح بخاری ج:۱ ص:۵۳۰)

ترجمہ:...... ”یہ میرا بیٹا سید ہے، مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان جوڑ پیدا کردیں گے، صلح کردیں گے۔“

میں نے شیعہ کی مستند کتابوں کے حوالے سے اس میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی تو ایک تحریر لکھ کر دی تھی:

''هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ حَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ وَمُعَاوِيَةُ بْنُ سُفْيَانَ.''

ترجمہ:...... ''یہ وہ تحریر ہے جس پر کہ حسنؓ بن علیؓ اور معاویہؓ بن سفیانؓ نے صلح کی۔''

یعنی یہ وہ معاہدہ ہے کہ حضرت حسنؓ حکومت سے دستبردار ہوتے ہیں اور حکومت حضرت معاویہؓ کے سپرد کرتے ہیں اور یہ ہے کہ ان سے عہد لیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور خلفائے راشدینؓ کی سنت پر عمل کریں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی چھ ماہ خلافت یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تتمہ تھا، اس لئے خلفائے راشدین چار ہی کہلاتے ہیں، مشہور چار خلفائے راشدینؓ ہیں اور حضرت حسنؓ کو بھی خلفائے راشدین میں بایں معنی شامل کیا جاتا ہے کہ ان کی خلافت ان کے والد حضرت علیؓ کی خلافت کا تتمہ ہے۔

حضرت علیؓ کا مقام:

ہبیرہ کہتے ہیں کہ جب حضرت علیؓ کا انتقال ہوا جیسا کہ میں پہلے بتاچکا ہوں کہ فجر کی نماز کے وقت عبدالرحمٰن بن ملجم نے حضرت علیؓ پر حملہ کیا تھا اور اس سے وہ زخمی ہوگئے تھے، رات میں جاکے انتقال ہوگیا، تو حضرت حسنؓ منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ پڑھا اور اس میں فرمایا:

''لوگو! آج رات ایک ایسے آدمی کا انتقال ہوگیا ہے
کہ پہلے لوگ اس سے آگے نہیں نکل سکے اور پچھلے لوگ نہیں پا

سکیں گے۔‘‘

بالکل صحیح فرمایا، یہ آخری خلفائے راشدین و خاتمۃ الخلفائے المہدیین تھے۔

خلفائے راشدینؓ کا درجہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اس صف کے آدمی تھے، جب ایک لائن میں امام کے پیچھے کھڑے ہوں، تو ایک آدمی بھی ان میں سے آگے نہیں ہیں اور نہ پیچھے، یہ حضرات اپنے اپنے درجے کے اعتبار سے الگ الگ ہیں لیکن صف ایک ہے، یہ چاروں خلفائے راشدینؓ اپنے اپنے مراتب اور اپنی اپنی افضلیت کے باوجود ایک لائن کے اور ایک صف کے آدمی ہیں اور وہ صف خلافتِ راشدہ کی صف ہے، اس لئے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی بھی اس سے آگے نہیں نکل سکا کہ اس سے اگلی صف میں چلا جائے، آگے صف بھی نہیں ہے، آگے تو امام کا مصلیٰ ہے، اور امام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپؐ کے پیچھے سب سے پہلی صف خلفائے راشدینؓ کی ہے۔

پوری امت کے اولیاء مل کر صحابی کی شان کا مقابلہ نہیں کر سکتے:

فرمایا کہ پچھلوں میں سے ان کو کوئی پا نہیں سکے گا، یہ بات بھی بالکل بجا ہے، ساری امت کے اولیاء اللہ، پیرانِ پیر، شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ، خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ، صرف اس سطح کے بزرگ نہیں بلکہ اس سے بھی اوپر کے امام حسن بصریؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور دوسرے اکابر تابعینؒ، یہ سارے کے سارے مل جائیں، کسی ایک صحابیؓ کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتے۔

مشکوٰۃ شریف کی حدیث ہے اور یہ صحیحین کے حوالے سے یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے حوالے سے ہے:

”قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: یَأْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ فَیَغْزُوْ فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ فَیَقُوْلُوْنَ: هَلْ فِیْکُمْ مَنْ صَاحَبَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ؟ فَیَقُوْلُوْنَ: نَعَمْ! فَیُفْتَحُ لَهُمْ. ثُمَّ یَأْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ فَیَغْزُوْ فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ فَیُقَالُ: هَلْ فِیْکُمْ مَنْ صَاحَبَ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ؟ فَیَقُوْلُوْنَ: نَعَمْ! فَیُفْتَحُ لَهُمْ. ثُمَّ یَأْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ فَیَغْزُوْ فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ فَیُقَالُ: هَلْ فِیْکُمْ مَنْ صَاحَبَ مَنْ صَاحَبَ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ؟ فَیَقُوْلُوْنَ: نَعَمْ! فَیُفْتَحُ لَهُمْ. مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ.“ (مشکوٰۃ ص:۵۵۳)

ترجمہ:...... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: لوگوں پر ایک وقت آئے گا کہ ایک مجاہد فوج جہاد کے لئے جائے گی (کافروں سے مقابلہ ہو رہا ہے اور صورتحال پیچیدہ ہو رہی ہے) تو لوگ کہیں گے: (تلاش کرو) تم میں کوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابیؓ ہے؟ (یعنی جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو، جس کی ظاہری نظریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر پڑی ہوں، کوئی ہے تم میں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تلاش کرنے پر ایک آدمی مل جائے گا، جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رخِ انور کے جمال جہاں آرا کو دیکھا تھا) لوگ کہیں گے: جی ہاں! (لوگ اس کے طفیل سے دعا کریں گے کہ یا اللہ! یہ تیرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، ان کی برکت سے ہمیں فتح عطا فرمادے۔ ناقل) پس اللہ

تعالیٰ فتح عطا فرمادیں گے۔ اس کے بعد ایک اور فوج جائے گی کافروں کے مقابلہ میں (یہاں بھی یہی صورتحال پیچیدہ ہوگی) تو لوگ کہیں گے: کیا تم میں سے کوئی ایسا آدمی ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی دیکھنے والے کو دیکھا ہو؟ (اس کو تابعی کہتے ہیں، کوئی ایسا خوش نصیب انسان جس نے صحابہ کرامؓ کی زیارت کی ہو، فرمایا: تلاش کرنے پر وہ مل جائے گا، اس کے طفیل سے لوگ دعا کریں گے۔ ناقل) اور اللہ اس کو فتح عطا فرمائیں گے۔ پھر ایک تیسرا لشکر جائے گا (کسی زمانے میں ان کافروں سے مقابلہ ہوگا) تو لوگ کہیں گے: تم میں سے کوئی ایسا آدمی ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والوں کے دیکھنے والوں کو دیکھا ہے؟ (یعنی صحابہؓ کے دیکھنے والوں کو دیکھا ہو، تابعین میں سے کسی کو دیکھا ہو، ان کو کہتے ہیں تبع تابعین، فرمایا: تلاش کرنے پر مل جائے گا، لوگ اس کی برکت سے دعا کریں گے فتح کی) اللہ تعالیٰ ان کو فتح عطا فرمادیں گے۔''

تو میں عرض کررہا تھا کہ ساری امت کے اولیاؒ اور اکابر مل کر، کسی صحابیؓ کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتے، چل ہی نہیں سکتے، ممکن ہی نہیں اور سارے صحابہ کرامؓ مل جائیں تو خلفائے راشدین کو نہیں پہنچ سکتے، تو بعد والے حضرت علیؓ کو کیسے مل جائیں گے؟

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا موازنہ:

شیعوں کی کتاب ہے ''نہج البلاغۃ'' جس کو سید شریف رضی نے جمع کیا ہے، اس میں گڑبڑ تو بہت کی گئی ہے لیکن خیر اس میں امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا

ایک خط نقل کیا ہے (اور اس کو بھی میں نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے)، جس کا ترجمہ یہ ہے: ''زمانے کی بوالعجبی دیکھو کہ میرے مقابلہ میں معاویہؓ کو لایا جاتا ہے۔'' اور واقعی یہ بوالعجبی تھی زمانے کی، کوئی شک نہیں، کہاں حضرت علیؓ اور کہاں حضرت معاویہؓ، دونوں کا کوئی جوڑ نہیں ہے، صحابیؓ دونوں ہیں اس میں شک نہیں ہے لیکن امیرالموٴمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ ''السابقون الاولون'' میں سے ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں میں سے ہیں، جن کو طلقا' کہا جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطَّلَقُ.'' (یعنی جاوٴ تم سب آزاد ہو)، بالکل صحیح فرمایا، بالکل بجا ارشاد فرمایا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ جوڑنا، ان کا ان کے ساتھ موازنہ کرنا، زمانے کی ستم ظریفی اور بوالعجبی ہے، بھائی! ان دو آدمیوں کو تولا جاتا ہے جن کے درمیان دو قدریں مشترک ہوں، دونوں کا باٹ تو ایک ہو۔

حضرت معاویہؓ اور بعد کے لوگوں کا موازنہ:

میں نے حضرت امیرالموٴمنینؓ کے اس قول کی شرح کرنے کے بعد لکھا کہ جس طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیرالموٴمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں لانا اور ان سے موازنہ کرنا زمانے کی ستم ظریفی اور بوالعجبی ہے، اسی طرح بعد کے لوگوں کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے برابر لانا اور ان سے موازنہ کرنا یہ بھی ستم ظریفی اور بوالعجبی ہے، بعد کے لوگوں کا حضرت معاویہؓ سے کیا مقابلہ؟ تو حضرت امام حسنؓ فرماتے ہیں کہ آج رات وہ آدمی اللہ کو پیارا ہوگیا کہ پہلے لوگ اس سے آگے نہیں نکل سکے، ایک ہی صف میں کھڑے ہیں، مرتبہ کے اعتبار سے عنداللہ آگے پیچھے ہوں گے، مگر ہم تو سب کو ایک لائن میں کھڑا دیکھتے ہیں، چاروں ایک لائن میں کھڑے ہیں اور پچھلے لوگ اس کو پا نہیں سکتے، پھر فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ان کو بھیجتے تھے کسی مہم پر، یعنی جہاد کے لئے تو دائیں جانب جبرائیل ہوتے تھے اور بائیں جانب میکائیل ہوتے تھے اور وہ آتے تھے تو فتح کرکے آتے تھے۔

فتح خیبر کا قصہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ خیبر کی وجہ سے مشہور ہیں، خیبر کا دروازہ توڑنے والے تھے۔ لوگوں نے کچھ اس میں اپنی طرف سے بھی ملادیا ہے، ملا بھی دیتے ہیں زیب داستاں کے لئے، لیکن اتنی بات ہے کہ خیبر کا قلعہ فتح نہیں ہوا، پہلے دن حضرت ابوبکرؓ کو بھیجا گیا مگر قلعہ فتح نہیں ہوا، دوسرے دن حضرت عمرؓ کو بھیجا گیا مگر قلعہ فتح نہیں ہوا، ایک دن میں فتح نہیں ہوا کرتا، بعض دفعہ کسی قلعے کو فتح کرنے میں مہینوں لگ جاتے ہیں، پہلے دن تو یوں کہو کہ تدبیروں میں گزر جاتے ہیں کہ کس طرح کیا جائے، تو شیخینؓ نے جو کچھ کیا تھا وہ امیرالمومنینؓ کے لئے کیا تھا، ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَأُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ رَجُلًا يَفْتَحِ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ .... قَالَ فَلَمَّا اَصْبَحَ النَّاسُ غَدَوْا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّهُمْ يَرْجُوْ اَنْ يُّعْطَاهَا فَقَالَ اَيْنَ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ؟ فَقَالُوْا: هُوَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ يَشْتَكِيْ عَيْنَيْهِ. قَالَ: فَاَرْسَلُوْا اِلَيْهِ، فَاُتِيَ بِهٖ فَبَصَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ عَيْنَيْهِ وَدَعَا لَهٗ فَبَرَءَ حَتّٰى كَاَنْ لَمْ يَكُنْ بِهٖ وَجَعٌ فَاَعْطَاهُ الرَّايَةَ ....قَالَ: ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ .... فَوَاللّٰهِ لَاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ يَّكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ." (صحیح مسلم ج:۲ ص:۲۷۹)

''وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ اِمْشِ وَلَا تَلْتَفِتْ حَتّٰی یَفْتَحِ اللّٰہُ عَلَیْکَ قَالَ فَسَارَ عَلِیٌّ شَیْئًا ثُمَّ وَقَفَ وَلَمْ یَلْتَفِتْ فَصَرَخَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! عَلٰی مَاذَا اُقَاتِلُ النَّاسَ؟ قَالَ: قَاتِلْھُمْ حَتّٰی یَشْھَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ.....الخ.''

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۲۷۹)

ترجمہ:...... ''آج میں جھنڈا ایک ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اس سے محبت رکھتے ہیں، جب صبح ہوئی صحابہؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور ہر ایک اس امید میں تھا کہ جھنڈا اس کو دیا جائے گا، لوگ سر اونچا کرکے دیکھنے لگے کہ کس کو دیا جاتا ہے، (اور امیرالموٴمنین عمرؓ فرماتے ہیں کہ: ''وَاللّٰہِ! مَا اَحْبَبْتُ الْاِمَارَۃَ اِلَّا یَوْمَئِذٍ.'' اللہ کی قسم! امیر بننے کی کبھی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی، سوائے اس دن کے، تو لوگ گردن اونچی کرکے دیکھنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ہم پر پڑے، آپؐ نے نظر دوڑائی) اور فرمایا: ''اَیْنَ عَلِیٌّ؟'' علی کہاں ہیں؟ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! ان کی تو آنکھیں پھولی ہوئی ہیں، آشوبِ چشم ہے، آنکھیں دکھتی ہیں، فرمایا: ان کو لاوٴ، ان کے خیمے سے ایک آدمی ان کا بازو پکڑ کر لایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا تو فرمایا: قریب ہوجاوٴ! حضرت علی رضی اللہ عنہ قریب ہوگئے، لعاب مبارک لے کر دونوں آنکھوں پر لگایا، امیرالموٴمنین علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! اسی لمحہ آنکھیں ٹھیک ہوگئیں، اور

پھر ساری عمر کبھی مجھے آنکھوں کی شکایت نہیں ہوئی۔ جھنڈا ان کے ہاتھ میں دیا، اور فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ تیرے ذریعہ سے ایک آدمی کو ہدایت عطا فرمادیں، تو یہ تیرے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا، حضرت علیؓ چل پڑے، ساتھ لشکر تھا، ابھی چند قدم چلے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بات پوچھنے کی ضرورت پیش آئی، منہ اسی طرف ہے پیچھے نہیں لوٹے، کہنے لگے: یا رسول اللہ! کس بات پر لوگوں سے قتال کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں.....الخ۔"

تو کوئی شک نہیں کہ اللہ کے فرشتے ان کے دائیں بائیں ہوتے ہوں، یہ جہاد کے لئے جاتے تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کسی مہم پر بھیجا ہو اور اللہ نے فتح نہ عطا فرمائی ہو۔

حضرت علیؓ کو شیخینؓ پر فضیلت:

یہاں کسی کو یہ وہم نہیں ہونا چاہئے کہ شیخینؓ پر افضلیت ثابت ہوگئی، اس پر اگر بحث کروں گا تو بات بہت لمبی ہوجائے گی اور میں یہاں سے دوسری طرف نکل جاؤں گا، بہر حال ایک خاص فضیلت جو اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کو عطا فرمائی ہے، اس کا نہ دوسروں سے مقابلہ ہے اور نہ اس سے ان کا ان اکابر سے افضل ہونا لازم آتا ہے۔

فضیلتِ شیخینؓ اور حضرت علیؓ:

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے منبر پر بیٹھ کر اپنے

امیرالمؤمنین ہونے کے زمانے میں فرمایا کرتے تھے کہ:

"اِنَّ خَیْرَ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ بَعْدَ نَبِیِّھَا اَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرَ."

(البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳)

ترجمہ:...... "اس امت میں سب سے افضل ترین انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ ہیں۔"

اور میں نے یہ بھی نقل کیا تھا کہ منبر سے اترتے ہوئے فرمایا: "لَوْ شِئْتُ اَقُوْلُ ثَالِثٌ." اگر میں چاہوں تو تیسرے کا نام بھی لے سکتا ہوں، کسی نے پوچھا ہوگا کہ وہ تیسرا کون ہے؟ فرمایا: "عثمانؓ۔"

محمد بن حنفیہ ان کے صاحبزادے ہیں، ان کا قول بھی نقل کرچکا ہوں کہ:

"قُلْتُ لِاَبِیْ اَیُّ النَّاسِ خَیْرٌ بَعْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: اَبُوْبَکْرٍ! قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: عُمَرُ! وَخَشِیْتُ اَنْ یَّقُوْلَ عُثْمَانُ، قُلْتُ: ثُمَّ اَنْتَ! قَالَ: مَا اَنَا اِلَّا رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ." (بخاری ج:۱ ص:۵۱۸)

ترجمہ:...... "میں نے اباجان سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل آدمی کون ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: (بیٹے تم جانتے نہیں؟ میں نے کہا: نہیں!) حضرت ابوبکرؓ! میں نے کہا پھر کون افضل ہیں؟ فرمایا: عمر! میں نے کہا اگر پھر میں نے "ثُمَّ مَنْ؟" کہہ دیا کہ اور کون؟ تو یہ حضرت عثمانؓ کا نام لیں گے، اس لئے میں نے سوال بدل دیا اور کہا: "ثُمَّ اَنْتَ؟" پھر آپ؟ فرمایا: میں تو مسلمانوں کی جماعت کا ایک آدمی ہوں۔"

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تواضع تھی (میں مسلمانوں کی جماعت کا ایک

آدمی ہوں، میری کیا بات)۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے افضلیت کا تاج تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سر پر سجایا ہے، مگر ان کے افضل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے سے فضیلت کی نفی ہو رہی ہے۔

حضرت علیؓ کا زہد:

اس کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ دنیا سے اس شان سے گئے ہیں کہ صرف سات سو درہم باقی تھے اور یہ ان کے عطیے میں سے باقی تھے اور وہ بھی ایک خادم خریدنے کے لئے رکھے تھے، یہ حضرت امیرالمؤمنینؓ کا زہد تھا، کوئی چیز ساتھ نہیں تھی، یہ سات سو درہم کسی ضرورت کے لئے رکھے تھے، ورنہ ان کو بھی نمٹا دیتے، جیسے ان سے پہلے دونوں بھائیوں نے نمٹا دیئے تھے۔

شیخینؓ کا زہد:

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جس دن گئے ہیں، دامن جھاڑ کر گئے ہیں، حضرت ابوبکرؓ کا معمول شریف یہ تھا کہ ہر ہفتے بیت المال میں جھاڑو دلوا دیتے تھے کہ کوئی چیز پڑی نہ رہے، آپ کو معلوم ہے یہ تو پہلے آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو روز کے روز نمٹا دیتے تھے، اگلے دن کے لئے نہیں رکھتے تھے، یعنی مسلمانوں کے مال سے بھی اسی دن نمٹا دیتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن کروٹیں بدل رہے تھے، نیند نہیں آرہی تھی، میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا بات اور کیا پریشانی ہے؟ تکیہ کے نیچے سے سات درہم نکالے (سات تھے یا کم و بیش تھے)، فرمایا کہ: یہ آج خرچ ہونے سے رہ گئے ہیں، اور مجھے فکر لگ رہی ہے کہ اگر اسی رات میں میرا انتقال ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ نبی صاحب

تشریف لا رہے ہیں، سات درہم چھوڑ کر کے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تو یہ تھا کہ روز کے روز نمٹاتے تھے۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا (معیار نیچے آ گیا) کہ ہفتے کے ہفتے نمٹاتے تھے اور جس شخص کو بیت المال پر مقرر کیا تھا، اس کو حکم تھا کہ ہر ہفتے بیت المال پر جھاڑو دے دی جائے، قومی خزانے میں ایک سوئی بھی باقی نہ رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مہینے میں جھاڑو دلواتے تھے اور فرماتے تھے کہ کسی چیز کو ایک مہینے سے زیادہ نہیں پڑا رہنا چاہئے، سب کو نمٹا دو، تو ان اکابرؒ کی طرح ایسا کون کرسکتا ہے؟

حضرت علیؓ کی شہادت کا دن:

حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ آج رات جس میں کہ ان کا انتقال ہوا یہ وہ رات ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھایا گیا اور اس میں کہ حضرت یوشع بن نون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم کو شہید کیا گیا، بنی اسرائیل نے ان کو شہید کیا تھا، ان کے لئے تو یہ معمولی بات تھی اور اس رات میں بنی اسرائیل کی توبہ قبول کی گئی تھی اور یہ تھی رمضان کی ۲۷ رشب، لیلۃ القدر۔

یہاں دو مسئلے ذکر کرتا ہوں، وقت تھوڑا ہے، بہت مختصر کرتا ہوں:

موت کے لئے اچھے وقت کا ملنا:

ایک تو یہ ہے کہ کسی شخص کو وفات کے لئے مبارک ترین وقت دے دیا جاتا ہے، یہ حق تعالیٰ شانہ کی خاص عنایت ہے، شب قدر میں کسی کا انتقال ہو، سبحان اللہ! کیا بات ہے! زہے سعادت، زہے نصیب، اسی طرح رمضان المبارک میں کسی کا انتقال ہو جانا اور خصوصیت کے ساتھ رمضان المبارک میں جمعہ کے دن انتقال ہونا، شب جمعہ میں، سبحان اللہ! ایک حدیث میں آتا ہے:

"قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ اِلَّا وَقَاهُ اللهُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ." (مشکوٰۃ ص:۱۲۱)

ترجمہ:......"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شب جمعہ میں یا جمعہ کے دن میں جس مسلمان کا انتقال ہو، اس سے قبر کا حساب و کتاب نہیں ہوتا، (اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے، اچھی موت نصیب فرمائے اور موت کے لئے اچھا وقت نصیب فرمانا یہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ ناقل)۔"

حیات و رفع عیسیٰ علیہ السلام:

دوسرا مسئلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اٹھایا جانا، اس معاملے میں مسلمانوں کو مرزائی بہت دھوکہ دیتے ہیں، مسلمانوں کی عام گفتگو میں یہ مسئلہ بھی نہیں آتا، نہ کبھی وعظ میں، نہ کبھی منبر پر، اس کا تذکرہ ہی نہیں آتا، مسلمان خالی الذہن ہوتے ہیں، مرزائی کہتے ہیں کہ جی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا، اچھا! اور ساتھ ہی کہتے ہیں کہ مولوی تو کہتے ہیں اٹھالیا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیسے اٹھالیا؟ کس طرح اٹھاسکتے ہیں؟ جدید سائنس تو یہ کہتی ہے کہ آسمان ہے ہی نہیں۔

قادیانی دجل:

ہمارے عوام بے چارے تو کسی چیز سے واقف نہیں، کہتے ہیں کہ بھائی! آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے اور قادیانی یہ بھی کہتے ہیں کہ دیکھیں ان مُلاؤں کا عقیدہ عیسائیوں جیسا ہے، عیسائی بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنے باپ کے پہلو میں جاکر بیٹھ گیا اور یہ مُلاّ بھی یہی کہتا ہے (نعوذ باللہ! استغفر اللہ!)۔

ایک بات یہ بھی کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے

بچانے کے لئے زمین میں کوئی جگہ نہیں ملی تھی کہ اللہ پاک ان کو آسمان میں لے گئے، جو شخص کافر ہو، وہ جو چاہے بکتا رہے۔

حیات و رفع الی السمأ کا عقیدہ قرآن و سنت سے ثابت ہے:

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کا مسئلہ، مولوی کا مسئلہ نہیں ہے، قرآن کا مسئلہ ہے، حدیث شریف کا مسئلہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک تمام بڑے بڑے علمائے امت و اکابرین کا مسئلہ ہے، ایک عالم کا، ایک بزرگ کا بھی اس میں اختلاف نہیں ہے۔

حیات عیسیٰؑ اور قرآن:

ساتویں پارے کے شروع میں جو پہلا رکوع چلتا ہے، اس میں بنی اسرائیل پر، یہودیوں پر اللہ تعالیٰ نے کئی فرد جرم عائد کئے ہیں، ایک نمبر، دو نمبر، تین نمبر، چار نمبر، ایسے چلتے گئے۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَبِقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللهِ." ان پر ایک فرد جرم یہ ہے کہ بکتے ہیں کہ ہم نے قتل کردیا عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو، (نعوذ باللہ من ذالک)، قرآن کریم نے یہ ان کا دعویٰ نقل کیا، اس کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا." (المائدہ: ۱۵۷، ۱۵۸)

ترجمہ:....."انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو نہ قتل کیا، نہ سولی پر چڑھایا، بلکہ ان کو اشتباہ ہوگیا، جو لوگ اس مسئلہ میں

اختلاف کررہے ہیں وہ خود شک میں پڑے ہوئے ہیں، ان کو کوئی علم نہیں حقیقت حال کا، محض اٹکل پچو خیالات کی پیروی کررہے ہیں، (بتادیا کہ ان کو علم نہیں جو کچھ بھی ان کی کوئی رائے وعقیدہ ہے، محض اٹکل پچو ہے، اس کی بنیاد یقین پر نہیں ہے اور آگے پھر لوٹتے ہیں) اور فرماتے ہیں: انہوں نے قتل نہیں کیا عیسیٰ علیہ السلام کو یقینی طور پر، بلکہ اٹھالیا ان کو اللہ نے اپنی طرف اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔''

ہمارے حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ کوئی تشریح نہ کرو آیت کی اپنی طرف سے، ایک عام مسلمان کے سامنے اس آیت کو پڑھو اور پڑھ کر اس سے پوچھو کہ کیا مطلب سمجھے اس آیت کا؟ انہوں نے قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے ماردیا ہے، کیا آیت کا یہ مطلب ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں انہوں نے قتل نہیں کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قطعی طور پر، یقینی طور پر، بلکہ اللہ نے اٹھالیا ان کو اپنی طرف۔

ہم نے نہیں اللہ نے اٹھالیا:

رہی یہ بات کہ کیسے اٹھالیا؟ اور وہ آسمان پر کیسے جاسکتے ہیں؟ بھائی! ہم نے کب کہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خود گئے تھے، ہم تو کہتے ہیں کہ اٹھالیا تھا، یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ اٹھاسکتا ہے کہ نہیں؟

رفع کی حکمت:

اور یہ دعویٰ کرنا کہ ان کے بچانے کے لئے کیا زمین پر کوئی جگہ نہ ملی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ملی ہوگی لیکن اللہ کو منظور ہی یہ ہوگا کہ وہاں رکھیں، چنانچہ فرمایا: اور اللہ تعالیٰ ہے بہت بڑا زبردست اور بڑی حکمت والا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سارے اعتراضات کا جواب دے دیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زندہ بجسدہ آسمان

پر اٹھایا جانا، قرآن کا مسئلہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسئلہ ہے، تمام صحابہ کرامؓ کا اس پر اجماع ہے اور پوری امت کا اس پر اجماع ہے، اب اگر کوئی اس کو نہیں مانتا ہے، اور وہ کفر کی وادی میں گرنا چاہے تو گرے، لیکن اسلام کا مسئلہ یہ ہی رہے گا۔

رفع عیسیٰؑ کے منکر معراج کے منکر کیوں نہیں؟

یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیسے اٹھالیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو یہ بتایا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر کیسے تشریف لے گئے تھے؟ مشہور قصہ ہے کہ ایک کافر نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا تھا کہ وہ تمہارے دوست دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اوپر تشریف لے گئے تھے، تو فرمایا کہ وہ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں، کہا کہ کیسے ٹھیک کہتے ہیں؟ وہ اوپر کیسے جاسکتا ہے؟ تو فرمانے لگے کہ ہم اس سے بڑی بات کو مانتے ہیں کہ اوپر والے ان کے پاس آتے ہیں، تم عجیب آدمی ہو، یہ تو چھوٹی بات ہے کہ ان کو اوپر لے گئے، ہم تو اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام ان کے پاس آتے ہیں، کیا فرشتے نہیں آتے؟ تو جو اللہ تعالیٰ جبرائیل و میکائیل اور دوسرے ملائکہ کو ان نبیوں کے پاس بھیج سکتا ہے وہی نبیوں کو اگر اوپر لے جانا چاہے تو کیوں نہیں لے جاسکتا؟

اسی پر بس کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دو بڑے بدبخت!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

"عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ سَبُعٍ قَالَ خَطَبَنَا عَلِیٌّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ فَقَالَ: وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَءَ النَّسَمَةَ لَتُخْضَبَنَّ هٰذِهٖ مِنْ هٰذِهٖ. قَالَ: قَالَ النَّاسُ فَاَعْلِمْنَا مَنْ هُوَ؟ وَاللهِ لَنُبِیْرَنَّ عِتْرَتَهٗ. قَالَ: اَنْشُدُکُمْ بِاللهِ اَنْ یُّقْتَلَ غَیْرُ قَاتِلِیْ. قَالُوْا: اِنْ کُنْتَ قَدْ عَلِمْتَ ذَالِکَ اِسْتَخْلِفْ اِذًا. قَالَ: لَا! وَلٰکِنْ اَکِلُکُمْ اِلٰی مَا وَکَّلَکُمْ اِلَیْهِ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ." (مسند احمد ج:۱ ص:۱۵۶)

ترجمہ:...... "عبداللہ بن سبع رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا: اس ذات کی قسم جس نے دانے کو چیرا اور روح کو پیدا کیا ہے، البتہ رنگین ہوجائے گی یہ (داڑھی) اس (گردن کے خون) سے، لوگوں نے کہا ہمیں بتایئے کون ہے؟ ہم اس کی آل اولاد کو بھی ہلاک

کردیں گے۔ فرمایا: تم کو قسم دیتا ہوں اللہ کی کہ میرے قاتل کے سوا کسی دوسرے کو قتل نہ کیا جائے، انہوں نے کہا: اگر آپ کو علم ہوگیا ہے اس کا تو پھر کسی کو اپنا جانشین بنادیجئے، فرمایا: نہیں! لیکن میں تم کو سپرد کرتا ہوں اسی چیز کی طرف جس کے سپرد کیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔''

حضرت علیؓ کا خطبہ:

یہ حضرت امیرالمؤمنین علی رضی اللہ عنہ کا آخری دنوں کا خطبہ ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر مبارک مشہور قول کے مطابق ۶۳ سال ہوگئی تھی، ایک دن اپنے رفقا سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کتنی تھی؟ رفقا کہنے لگے: ۶۳ سال! فرمایا: اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی؟ کہا: ۶۳ سال! اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی؟ کہا: ۶۳ سال، پھر فرمایا: میرے بھی ۶۳ سال پورے ہو رہے ہیں۔

حضرت علیؓ کو اپنی شہادت کی پیشگی اطلاع:

پھر آپؓ نے منبر پر خطبہ دیا اور اس خطبے میں یہ بات بھی ارشاد فرمائی کہ اللہ کی قسم اسی گردن کے خون سے یہ داڑھی رنگین ہوجائے گی، لوگوں نے کہا کہ آپ بتائیے ایسا کون شقی ہے، ہم اس کے پورے گھرانے کو ہلاک کردیں گے، فرمایا: میں تم کو اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں کہ میرے قاتل کے سوا کسی کو کچھ نہ کہا جائے، لوگوں نے کہا کہ جب آپؓ کو قرب اجل کا پتہ چل گیا ہے کہ اب وقت قریب آیا چاہتا ہے تو کسی کو اپنا جانشین مقرر کردیجئے اور خلیفہ بنادیجئے، فرمایا: نہیں! میں تمہیں اسی حالت کے سپرد کرنا چاہتا ہوں جس حالت کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سپرد کرکے گئے تھے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو متعین طور پر صراحت کے ساتھ خلیفہ بنا کر نہیں گئے تھے، بعد میں ہم نے بنایا۔

حضرت علیؓ کی شہادت کی خوشخبری:

اب اس خطبہ شریفہ میں چند چیزیں قابل غور ہیں، ایک حضرت امیرالمؤمنینؓ کا یہ کہنا کہ اللہ کی قسم یہ داڑھی اس خون سے رنگین ہوجائے گی، یہ علم ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تھا، کیونکہ متعدد احادیث میں یہ مضمون وارد ہوا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا تھا کہ:

”عَنْ عَلِيٍّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ: اَتَدْرِیْ مَنْ اَشْقَی الْاَوَّلِیْنَ؟ قُلْتُ: اَللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ! قَالَ: عَاقِرُ النَّاقَةِ. قَالَ: اَتَدْرِیْ مَنْ اَشْقَی الْاٰخِرِیْنَ؟ قُلْتُ: اَللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ! قَالَ: قَاتِلُکَ.“ (قرطبی ج:۲۰ ص:۷۸)

ترجمہ:...... ”حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (اے علی!) کیا تو جانتا ہے کہ سب سے پہلا بدبخت کون ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: وہ اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: (اے علی!) کیا تو جانتا ہے کہ سب سے آخری بدبخت کون ہے؟ میں نے کہا کہ: اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: تیرا قاتل!“

دنیا کا بڑا بدبخت:

گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا کے سب سے بڑے بدبخت دو ہوئے ہیں، ایک حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کرنے والا، اس کی کونچیں کاٹنے والا، یہ سب سے بڑا بدبخت تھا جس نے اپنی پوری قوم کے لئے عذاب الٰہی کو

دعوت دی، خود بھی مرا، قوم بھی مری جبکہ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو آگاہ کردیا تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: "فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللهِ نَاقَةَ اللهِ وَسُقْيَاهَا." (الشمس:۱۳) پس کہا ان کو اللہ کے رسول نے یہ اللہ کی خاص پیدا کی ہوئی اونٹنی ہے اس کو تکلیف اور گزند پہنچانے سے بچو، اور اس کی پانی کی باری کے معاملہ میں بھی ڈرو، اس کو روکو نہیں۔

تو سب سے بڑا بدبخت اٹھا اور اس نے اپنے رفقا کے ساتھ مل کر اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اس کو قتل کر ڈالا۔

اور دوسرا سب سے بڑا بدبخت وہ ہوگا جو تیری اس داڑھی کو اس گردن کے خون سے رنگین کرے گا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بتادیا تھا اور حضرت امیرالمؤمنین محسوس فرماتے تھے کہ اس کا اب وقت آگیا ہے، اس لئے خطبے میں یہ بات ارشاد فرمائی۔

بڑا بدبخت کیوں؟

اب رہی یہ بات کہ یہ سب سے بڑا بدبخت کیوں ہے؟ واللہ اعلم! اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ابھی بتایا تھا کہ وہ بدبخت جس نے ناقہ صالح کو قتل کیا تھا اس نے اپنی پوری قوم کے لئے اللہ کے عذاب کو دعوت دی تھی، اور اس دوسرے بدبخت عبدالرحمٰن ابن ملجم خارجی نے امیرالمؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو شہید کرکے خلافت نبوت کا خاتمہ کردیا۔

خلفائے راشدین چار ہیں، حضرات ابوبکر، عمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم، اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت جو چھ مہینے رہی یہ حضرت علیؓ کی خلافت کا تتمہ تھا، اس بدبخت نے حضرت امیر المؤمنین خلیفہ راشد کو شہید کرکے امت کو خلافت نبوت سے محروم کردیا، کچھ وہ بدبخت تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا اور

حضرت عثمانؓ کو شہید کرنا، سب سے پہلا رخنہ تھا جو اسلام کی دیوار میں ڈالا گیا اور آخری رمق جو خلافتِ نبوت کی باقی رہی تھی اس کو حضرت علیؓ کی شہادت سے ختم کردیا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہایت بابرکت زمانہ تھا اور تمام سعادتیں اور برکتیں حق تعالیٰ شانہ نے اس زمانے میں جمع کردی تھیں۔

زمانۂ نبوت کا بقیہ:

حضرات خلفائے راشدین کا زمانہ گویا بقیہ نبوت کا زمانہ تھا، اس لئے کہ حضرات خلفائے راشدین ٹھیک ٹھیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہاج پر تھے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ "ازالۃ الخفا" میں لکھتے ہیں کہ:

"ایام خلافت بقیہ ایام نبوت بودہ است، گویا در ایام نبوت حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم تصریحاً بزبان میفرمود۔"

ترجمہ:...... "خلافت راشدہ کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا بقیہ تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بنفس نفیس تشریف فرما تھے تو اپنی زبان مبارک سے احکامات صادر فرماتے تھے۔"

اور شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں اس خلافت راشدہ کے زمانے میں: "ساکت نشستہ بدست وسر اشارہ میفرماید۔" (خلافت راشدہ کے زمانہ میں آپؐ خاموش بیٹھے گویا سر اور آنکھوں کے اشاروں سے سمجھا رہے تھے) سمجھنے والوں نے آپ کے اشاروں کو سمجھا اور اس کے مطابق عمل کیا، عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

خلافت علیٰ منہاج نبوت:

تو ان چار خلفائے راشدین کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا ایک عمل بھی منہاج نبوت سے ہٹا ہوا نہیں ہے اور یہی معنی ہیں خلافت راشدہ کے کہ کسی قسم کی کوئی

مصلحت، کوئی تقاضۂ وقت اور کسی قسم کی کوئی رعایت ان حضرات کے مدنظر نہیں تھی، ٹھیک ٹھیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنا اور امت کو چلانا یہ ان کے مدنظر تھا، خلافت راشدہ ختم ہوئی تو یہ ساری برکات ختم ہوگئیں، دنیا میں اندھیرا چھا گیا، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم جیسے لوگ بھی اسے محسوس کرتے ہیں، ان اکابر نے جن کے سامنے یہ واقعات پیش آئے ہوں گے کیا انہوں نے محسوس نہیں کیا ہوگا؟

دنیا اندھیر ہوگئی:

جس دن حضرت مولانا محمد یوسف دہلویؒ تبلیغ والوں کے انتقال کی خبر پہنچی ہے، واقعتاً مجھے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا تاریک ہوگئی ہے، سورج ڈوب گیا ہے، بالکل یہی قصہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ کی وفات پر مجھے پیش آیا تھا۔ جس دن حضرت کے انتقال کی خبر آئی تھی جمعہ کا دن تھا بس یوں سمجھئے کہ مجھ سے ضبط نہیں ہو رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندھیرا چھا گیا ہے، ذرا غور کرو جس دن امیرالمؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا گیا ہوگا اور خلافت راشدہ کا آخری چراغ گل کردیا گیا، اس دن دنیا میں کتنا اندھیرا چھایا ہوگا؟ اور جس شخص نے امت کو خلافت راشدہ کی ان برکات سے محروم کردیا اس سے بڑا بدبخت کون ہوسکتا ہے؟

خلافتِ راشدہ کی دو قسمیں:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خلافت راشدہ کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک خلافتِ راشدہ خاصہ اور دوسری عامہ۔

شہادتِ عثمانؓ سے خلافتِ خاصہ کا خاتمہ:

خلافتِ راشدہ خاصہ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم ہوگئی تھی، شاہ صاحبؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ:

"عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: اَتَیْتُ النَّبِیَّ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِتَمَرَاتٍ فَقُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اُدْعُ اللّٰہَ فِیْھِنَّ بِالْبَرَکَۃِ. فَضَمَّھُنَّ ثُمَّ دَعَا لِیْ فِیْھِنَّ بِالْبَرَکَۃِ. قَالَ: خُذْھُنَّ فَاجْعَلْھُنَّ فِیْ مِزْوَدِکَ کُلَّمَا اَرَدتَّ اَنْ تَأْخُذَ مِنْھُنَّ شَیْئًا فَاَدْخِلْ فِیْہِ یَدَکَ فَخُذْہُ وَلَا تَنْثُرْہُ نَثْرًا. فَقَدْ حَمَلْتُ مِنْ ذَالِکَ التَّمْرِ کَذَا وَکَذَا مِنْ وَسْقٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَکُنَّا نَأْکُلُ مِنْہُ وَنُطْعِمُ وَکَانَ لَا یُفَارِقُ حَقْوِیْ حَتّٰی کَانَ یَوْمُ قَتْلِ عُثْمَانَ فَاِنَّہٗ اِنْقَطَعَ.'' (مشکوٰۃ ص:۵۴۲)

''وَکَانَ یَقُوْلُ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ:

لِلنَّاسِ ھَمٌّ وَلِیَ ھَمَّانِ بَیْنَھُمْ
ھَمُّ الْجِرَابِ وَھَمُّ الشَّیْخِ عُثْمَانَا.''

(مرقاۃ ج:۵ ص:۴۷۹)

ترجمہ:...... ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چند کھجوریں لے کر آیا، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ان میں برکت کی دعا فرمادیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کھجوریں لیں ان میں برکت کی دعا فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ان کو لے لیجئے اور اپنے توشہ دان میں ان کو ڈال لیجئے، جب ان میں سے لینے کا ارادہ ہو تو اس میں ہاتھ ڈال کر لے لینا اور اس کو جھاڑنا نہیں، میں نے ان کھجوروں میں سے اتنے اتنے وسق لئے اللہ کے راستے میں (خرچ کرنے کے لئے) ہم ان میں سے خود بھی کھاتے رہے اور لوگوں کو بھی کھلاتے رہے اور وہ ہمیانی ہمیشہ میرے پاس رہی، یہاں تک کہ جس دن حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تو اس دن وہ کہیں گرگئی۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ لوگوں کو ایک غم ہے اور میرے لئے دو غم ہیں، ایک تھیلی کے گم ہوجانے کا غم اور دوسرا حضرت شیخ عثمان رضی اللہ عنہ کے شہید کئے جانے کا غم۔"

حضرت ابو ہریرہؓ کی تھیلی میں برکت:

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کھجوریں مجھے عنایت فرمائی تھیں، میں نے ان کو تھیلی میں، ہمیانی میں ڈال لیا، کھجوریں ڈال کر ہمیانی کو کمر پر باندھ لیا جب ضرورت ہوتی کھالیتا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بتا نہیں سکتا کہ کتنے صاع، کتنے ٹن میں نے ان میں سے کھائے ہوں گے اور صدقہ کیا ہوگا، لیکن جس دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ وہ تھیلی گرگئی اور گر کر ایسی گم ہوگئی کہ معلوم نہیں زمین اس کو کھاگئی یا آسمان اس کو اچک کے لے گیا، پتہ ہی نہیں چلا۔

برکاتِ نبوت کا خاتمہ:

حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ یہ برکات نبوت کے ختم ہونے کی طرف اشارہ تھا، حضرت ابو ہریرہؓ اس دن گلیوں میں روتے پھرتے تھے اور فرماتے تھے کہ آج دنیا کو ایک غم ہے اور مجھے دو غم ہیں، ایک اپنی تھیلی کے گم ہوجانے کا، اور ایک شیخ عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل ہوجانے کا، تھیلی کا گم ہوجانا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن غم اس کا تھا کہ برکات نبوت ختم ہوگئیں، اور امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے شہید کئے جانے کے بعد یہ برکات نبوت بالکلیہ ختم ہوگئیں، اس لئے بجا فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ سب سے بڑا بدبخت یہ شخص ہے جس نے پوری امت کو برکات نبوت

سے محروم کردیا ہے۔

خارجی اور تکفیر صحابہؓ:

یہ عبدالرحمٰن ابن ملجم خارجی تھا، یہ خارجیوں کا ایک گروہ ہوا ہے جو حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جو لڑائی صفین میں ہوئی تھی اس کے خاتمے پر پیدا ہوا تھا، اس وقت دو حکم مقرر کردیئے گئے تھے، لمبا قصہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے درمیان میں اس اختلاف کا فیصلہ کریں گے، اسی وقت یہ خارجی کھڑے ہوگئے، خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت کے لوگ شیعانِ علی میں سے ایک گروہ کٹ کر کے خارجی بن گیا، وہ کہتا تھا دونوں کافر ہیں، نعوذ باللہ! حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کافر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی کافر، جب دونوں کافر تو باقی سارے صحابہؓ کافر، نعوذ باللہ! یہ سب سے پہلا گروہ ہے جس نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اعلانیہ تکفیر کی اور یہ بدبخت ایسے تھے کہ صحابہؓ کے پاس تو جاتے نہیں تھے، ان سے ملتے نہیں تھے، اس لئے جو جی میں آتا تھا مسئلے بتاتے تھے۔

حروری خارجی تھے:

مشکوٰۃ اور دوسری احادیث کی کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے کہ ایک خاتون، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی، اور کہنے لگی کہ:

"مَا بَالُ الْحَائِضِ تَقْضِی الصَّوْمَ وَلَا تَقْضِی الصَّلَاۃَ؟ قَالَتْ عَائِشَۃُ: (اَحَرُوْرِیَّۃٌ اَنْتِ؟) کَانَ یُصِیْبُنَا ذَالِکَ فَنُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّوْمِ وَلَا نُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّلَاۃِ."

(مشکوٰۃ ص:۱۷۸)

ترجمہ:...... "یہ کیا بات ہے کہ حائضہ عورت روزے کی قضا کرتی ہے، اور نماز کی قضا نہیں کرتی؟ (جب ماہ رمضان میں

عورتوں کے خاص ایام شروع ہو جائیں تو وہ روزہ نہیں رکھیں گی لیکن ان کی قضا کریں گی، اور ان خاص ایام میں جو نمازیں گزر جاتی ہیں ان کی قضا ان کے ذمہ نہیں ہے، خارجی لوگ یہ فتویٰ دیتے تھے کہ نماز، روزے سے زیادہ اہم ہے، جب روزے کی قضا ہے تو نماز کی قضا کیوں نہیں؟ جاہل کسی عالم کے پاس بیٹھتے تو مسئلہ معلوم ہوتا صرف اپنی عقل دوڑاتے تھے، تو ام المؤمنین نے اس کے سوال کو سن کر فرمایا:) تو حروریہ (خارجی) ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب ہمیں یہ حالت پیش آتی تھی تو ہمیں روزے کی قضا کرنے کا حکم کیا جاتا تھا، نماز کے قضا کرنے کا حکم نہیں کیا جاتا تھا۔"

حضرت علیؓ کی شہادت کا سبب:

یہ خارجیوں کا گروہ تھا نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! ان کا مشورہ ہوا کہ اس وقت امت میں فساد کے سرغنہ (نعوذ باللہ) تین آدمی ہیں، ایک حضرت علی، دوسرے حضرت معاویہ اور تیسرے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم، تین آدمی اس کام کے لئے مقرر ہوئے کہ فلاں تاریخ کو ان تینوں کا کام تمام کردیا جائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لئے یہ عبدالرحمٰن ابن ملجم بدبخت مقرر ہوا، اور ان دونوں حضرات کو شہید کرنے کے لئے دوسرے آدمی مقرر ہوئے اور طے یہ کیا کہ جب یہ نماز کے لئے آئیں تو آتے ہوئے ان پر حملہ کردیا جائے، حضرت امیرالمؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی عادت شریفہ تھی کہ جب نماز کے لئے تشریف لاتے تھے تو لوگوں کو اٹھاتے ہوئے تشریف لاتے تھے، الصلوٰۃ! الصلوٰۃ! کہہ کر لوگوں کو اٹھاتے ہوئے آتے تھے، یہ عبدالرحمٰن بن ملجم بدبخت چھپ کر بیٹھا ہوا تھا، اس نے بھرپور حملہ کیا اور زخم کاری لگایا،

لوگوں نے اس کو پکڑ لیا تو اس نے ایک دو اور آدمیوں کو بھی زخمی کیا، لیکن پکڑا گیا، کہنے لگا کہ اتنے دن ہوگئے ہیں اس تلوار کو زہر میں بجھا رہا ہوں۔

حضرت علیؓ کا عدل و احتیاط:

لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس کو قتل کردیں، فرمایا: اپنے قاتل کو کیسے قتل کروں؟ یہ بھی کبھی سنا ہے؟ پھر ارشاد فرمایا کہ اگر میں بچ گیا اور زخم ٹھیک ہوگیا تو پھر میں اس سے خود معاملہ کروں گا، کوئی اس کو سزا دے دوں گا، اور اگر میں رخصت ہوگیا تو تم لوگوں کو اختیار ہے کہ تم اس کو معاف کردو یا اس سے قصاص لے لو، لیکن دیکھو قصاص برے طریقے سے نہیں لینا، جو شریعت کا دستور اور اصول ہے اس کے مطابق قصاص لینا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ کَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَ .... الخ." (مسلم ج:۲ ص:۱۵۲)

ترجمہ:...... "اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے معاملے میں احسان کا حکم دیا ہے، یعنی حسن سلوک کا، جب تم کسی کو قتل کرو تو احسن طریق سے قتل کرو اور جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو اسے ایذا نہیں دو، اس میں بھی حسن سلوک کرو (یعنی چھری تیز ہوتا کہ جلدی فارغ ہوجائے)۔"

اسلامی شریعت کا مسئلہ ہے: "لَا قَوَدَ اِلَّا بِالسَّیْفِ." (مجمع الزوائد ج:۶ ص:۲۹۱) یعنی قصاص نہیں لیا جائے گا مگر تلوار کے ساتھ۔ یعنی اگر خدانخواستہ کوئی کسی کو قتل کردے، اس کا قاتل ہونا ثابت ہوجائے اور مقتول کے اولیاً معاف نہ کریں تو مقتول کے بدلہ میں اس سے قصاص لیا جائے گا، اور اُسے قتل کیا جائے گا، لیکن یہ نہیں

کہ ایذا پہنچا کر قتل کرو، بلکہ تلوار سے سر قلم کردو بس۔

جس رات حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوا اسی رات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی جب گھر سے مسجد کی طرف تشریف لا رہے تھے ان پر بھی حملہ ہوا، لیکن الحمدللہ! کارگر نہیں ہوا، تاہم ان کے کولہے پر زخم آیا تھا جس سے ان کی ایک رگ کٹ گئی تھی جس کی وجہ سے پھر اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اولاد نہیں ہوئی، اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس دن فجر کی نماز کے لئے تشریف ہی نہیں لائے تھے، وہ مصر میں تھے، مصر کے گورنر تھے ان کی جگہ کسی اور آدمی نے نماز پڑھائی اور وہ شہید ہوگیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معمولی زخم آیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا عطا فرمادی، اس کے بعد بیس ساڑھے بیس سال تک وہ ماشاءاللہ حیات رہے، سن ۶۱ھ میں ان کا انتقال ہوا، یہ سن ۴۰ھ کا قصہ ہے۔

بہرکیف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے درخت کو چیرا ہے اور روح کو پیدا کیا ہے کہ یہ داڑھی اس خون سے رنگین ہوگی، لوگوں نے کہا کہ اگر قاتل آپ کو معلوم ہے تو پھر ہمیں بتادیجئے تاکہ ہم صرف اس شخص کو نہیں بلکہ اس کے پورے خاندان کو برباد کردیں، فرمایا: نہیں! میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ میرے قاتل کے سوا کسی دوسرے کو کچھ نہ کہنا، جس نے مجھے قتل کیا ہے اگر تم چاہو تو اس سے قصاص لے سکتے ہو، یہ سازش ہے جو تیار کی گئی ہے، لہٰذا اس سازش کے تمام سرغنوں کو پکڑو اور کیفر کردار تک پہنچاؤ، مگر کسی دوسرے آدمی کو مارنے کی اجازت نہیں۔

حضرت علیؓ کا جانشین کے تقرر سے انکار:

لوگوں نے کہا کہ حضرت! اگر آپ محسوس فرماتے ہیں کہ اب وقت قریب آیا چاہتا ہے اور خطبے کا یہی مطلب ہے تو پھر آپ کسی کو اپنا جانشین مقرر کردیجئے کہ

میرے بعد فلاں آدمی ہوگا، فرمایا: نہیں! میں جانشین مقرر نہیں کروں گا بلکہ میں تمہیں اسی حالت پر چھوڑ کر جاؤں گا جس حالت میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں چھوڑ کر گئے تھے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔

اب یہاں اتنی بات سمجھ لیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا، یعنی جس طرح کہ عام طور سے دستور ہے کہ تحریر لکھوادی جاتی ہے اور اس کا اعلان کروادیا جاتا ہے کہ فلاں آدمی ولی عہد ہے، یعنی ان کے بعد فلاں آدمی ان کا جانشین ہے۔

غدیرخم میں جانشینی کے تقرر کا قصہ:

لہٰذا جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جانشین بنادیا تھا، فلاں وقت پر بنادیا تھا، یا فلاں موقع پر بنادیا تھا، وہ غلط ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''شیعہ سنی اختلاف اور صراط مستقیم'' میں اس مسئلہ پر مکمل بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ غدیرخم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنادیا تھا۔

غدیرخم کیا ہے؟

غدیرخم کیا ہے؟ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ آتی ہے جس کا نام خم ہے، وہاں ایک تالاب تھا جس میں بارش کا پانی جمع ہوجاتا تھا، ایسے ہی کوئی نشیبی جگہ ہوگی اس کو غدیرخم کہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپسی پر وہاں پڑاؤ کیا تھا اور وہاں یہ فرمایا تھا کہ:

''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ.'' (مشکوٰۃ ص:۵۶۴)

ترجمہ:...... ''جس کا میں مولا ہوں علیؓ بھی اس کا مولا ہے۔''

حضرت علیؓ کو مولیٰ کہنے کی وجہ:

مولیٰ کے بہت سے معنی آتے ہیں، ان میں سے ایک معنی محبوب کے بھی ہیں، مطلب یہ کہ جو شخص کہ مجھ سے محبت رکھتا ہو وہ علیؓ سے بھی محبت رکھے، اور یہ بات اس لئے ارشاد فرمائی تھی کہ حجۃ الوداع سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہیں یمن سے مکہ مکرمہ آکر ملے تھے اور وہاں یمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دوسرے حضرات بھی گئے ہوئے تھے، ان کا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آپس میں کسی بات پر مناقشہ ہوگیا اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شکایت کی، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ہوا کہ جب میری زندگی میں علیؓ پر اعتراض کئے جارہے ہیں، تو بعد میں کیا ہوگا؟ اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کو ایک فریضہ لازمہ کے طور پر امت کے ذمے ضروری قرار دے دیا، یہ مطلب ہے اس حدیث: "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ." کا۔

اور یہیں سے "مولا علی" کی اصطلاح چلی ہے، اہل سنت اس کو مانتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمارے محبوب ہیں، اور ان کی محبت اور ان کی آل و اولاد کی محبت، اہل سنت کے نزدیک جزو ایمان ہے اور جو شخص ان کی محبت سے خالی ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایمان سے فارغ ہوجائے گا، نعوذ باللہ!

لڑائی سے رشتے ختم نہیں ہوتے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر کی لڑائیاں بھی ہوئیں، ان پر گفتگو کرنے کا موقع نہیں، لیکن اتنی مختصر سی بات یاد رکھی جائے کہ اس لڑائی کے باوجود محبت باقی تھی، کیونکہ دو بھائیوں کے درمیان مناقشہ ہوجایا کرتا ہے اور آپس میں دست و گریباں بھی ہوجاتے ہیں، بعض دفعہ لڑائی تک

نوبت بھی آجاتی ہے، لیکن بھائی ہونا اپنی جگہ ہے، اس کی محبت اپنی جگہ ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہرقل کو انتباہ!

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع پہنچی کہ روم کا بادشاہ ہرقل ہمارے باہمی اختلاف کی وجہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے، اسلامی مملکت پر حملہ کرنا چاہتا ہے، اس نے سوچا کہ مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں تو اس وقت ان پر حملہ کرنے کا موقع اچھا ہے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو خط لکھا کہ او نصرانی کتے! یعنی اشتعال دلانے والا خط، تو ہماری لڑائی سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے؟ تجھے یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ اگر تو نے اسلامی مملکت پر حملہ کرنے کی حماقت کی تو میں اپنے بھائی سے صلح کرلوں گا اور ان کے ماتحت ہو کر لڑوں گا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کا سب سے پہلا سپاہی جو تیرے سامنے آئے گا اس کا نام معاویہ ہوگا۔ یہ واقعہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''مقام صحابہ'' میں بھی نقل کیا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ حضرت نے جب وہ کتاب لکھی تھی، اس کے بعد ہمارے مدرسے میں تشریف لائے تو میں نے حضرت کو مبارکباد دی تھی، میں نے کہا کہ آخری زندگی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر کتاب لکھنا یہ انشاء اللہ حسن خاتمہ کی علامت ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے میری اس بات کو بہت پسند فرمایا تھا۔

ہمیں صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان محاکمہ کی اجازت نہیں:

تو بس اتنی مختصر سی بات یہاں یاد رکھئے کہ ان کی آپس میں غلط فہمی کی وجہ سے مناقشہ ہوگیا، ہمیں اس پر فیصلہ کرنے یا محاکمہ کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ دو بھائیوں کی لڑائی تھی۔ چنانچہ اگر دو شہزادوں کے درمیان لڑائی ہوجائے یا مناقشہ

ہو جائے تو بھنگی کے لڑکے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان کا فیصلہ کرے۔ یا ان کا محاکمہ کرے۔ ان اکابر کے مقابلہ میں ہماری حیثیت تو بھنگیوں کی بھی نہیں ہے کہ ہم ان کے بارے میں اپنی زبان کھولیں اور محاکمہ کریں اور یہ کہیں کہ فلاں حق پر تھا، فلاں باطل پر تھا۔ نہیں! اہل سنت نے ایک چھوٹی سی بات ہمارے لئے محفوظ کر دی کہ ان مشاجرات میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اولیٰ بالحق تھے، یعنی حق کے زیادہ قریب تھے یا یوں کہو کہ وہ حق پر تھے اور دوسرے حضرات غلطی اور خطا پر تھے، ان کو غلط فہمی ہوگئی تھی، صحابہؓ کے درمیان حق و باطل کا اختلاف نہیں ہے، بلکہ خطا اور صواب کا اختلاف ہے، تو بہرحال ہمارے لئے اتنی مزئی سی بات ہے اسی کو یاد رکھو، اس کے بعد زیادہ کاوش نہ کرو۔

تین مسئلے جنت میں جا کر بھی نہیں کھلیں گے:

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس سرہ ارشاد فرماتے تھے کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کا ارشاد ہے (ان کا قول حضرت نقل کرتے ہیں) کہ: تین مسئلے ایسے ہیں جو جنت میں جاکے بھی نہیں کھلیں گے، ان کی حقیقت منکشف نہیں ہوگی، ان میں سکوت ہے، زبان کا بھی سکوت، دماغ کا بھی سکوت، گویا سوچو ہی نہیں، فرمایا: ایک وحدۃ الوجود کا مسئلہ ہے، ایک تقدیر کا مسئلہ ہے اور ایک مشاجرات صحابہ کا مسئلہ ہے۔ صحابہ کرامؓ کے اختلافات، بس تقدیر الٰہی تھی ہمیں زیادہ اس میں کاوش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب کے نام پر ''رضی اللہ عنہ'' دل کی گہرائی سے کہتے ہیں، دونوں بھائی ہیں، ایک باپ ہے، ایک چچا ہے، ہم نہ باپ کی گستاخی کریں نہ چچا کی گستاخی کریں۔

چھوٹوں کو بڑوں کے معاملہ میں فریق بننے کی اجازت نہیں:

حضرت حکیم الامتؒ فرماتے تھے کہ: ایک دفعہ میرے والد ماجد کی میرے

چچا کے ساتھ کچھ رنجش ہوگئی اور رنجش اتنی بڑھی کہ آپس میں بات چیت بند ہوگئی، میں دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا، گھر آیا تو دوسرے دن یا تیسرے دن والد صاحب نے پوچھا کہ تم اپنے چچا سے ملے ہو؟ میں نے کہا ان کی آپ سے بات چیت نہیں ہے تو میں کیوں ملتا! حضرتؒ فرماتے ہیں کہ پوری زندگی میں والد صاحب نے مجھے کبھی تھپڑ نہیں مارا لیکن اس دن میرے ایک تھپڑ مارا اور فرمایا کہ میرا بھائی ہے میں تو لڑوں گا، تیرا تو چچا ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ اپنے والد ماجد کا یہ قصہ نقل کرکے فرمایا کرتے تھے کہ ہاں اولاد کی یوں تربیت کیا کرتے ہیں اور اب تو لوگ ایسے جھگڑا کرتے ہیں کہ اپنی اولاد کو روک دیتے ہیں کہ خبردار! دودھ معاف نہیں کروں گی، اگر تو فلاں سے ملا، لاحول ولاقوۃ الا باللہ!

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو اسی طرح چھوڑ کر گئے تھے آپؐ نے کسی کو خلیفہ نامزد مقرر نہیں کیا، لیکن صحیح بخاری میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی ہے اور شاہ ولی اللہؒ نے تو ''ازالۃ الخفا'' میں دلائل کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے کہ یہ بات متواتر تھی کہ:

''عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ مَرَضِهٖ: اُدْعِیْ لِیْ اَبَابَكْرٍ وَاَخَاكِ حَتّٰى اَكْتُبَ كِتَابًا فَاِنِّیْ اَخَافُ اَنْ یَّتَمَنّٰى مُتَمَنٍّ وَیَقُوْلُ قَائِلٌ اَنَا اَوْلٰى وَیَأْبَى اللهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلَّا اَبَابَكْرٍ.'' (مسلم ج:۲ ص:۲۷۳)

ترجمہ:...... ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری کے دنوں میں مجھے فرمایا کہ اپنے باپ اور اپنے بھائی کو بلاؤ کہ میں تحریر لکھ دوں، ایسا نہ ہو کہ کل کوئی کہنے والا کہے اور کوئی تمنا کرنے والا تمنا

کرے کہ میں خلافت کا زیادہ حق دار ہوں، اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان بھی ابوبکرؓ کے سوا کسی اور کو خلیفہ بنانے سے انکار کرتے ہیں۔"

صدیق اکبرؓ کی امامت اور حکم الٰہی:

لیکن بعد میں ارشاد فرمایا کہ: مجھے اللہ کے اعتماد پر اور مسلمانوں کی فراست پر اعتماد ہے اس لئے مجھے تحریر کی ضرورت نہیں رہی اور وہ واقعہ بھی حدیث کی کتابوں میں موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف نہیں لا سکتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ نماز پڑھائیں، اور جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک جانشینی تھی، حدیث شریف میں آتا ہے:

"عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ زَمْعَةَ قَالَ: لَمَّا اُسْتُعِزَّ بِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا عِنْدَهُ فِيْ نَفَرٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ دَعَاهُ بِلَالٌ اِلَى الصَّلٰوةِ فَقَالَ: مُرُوْا مَنْ يُّصَلِّيْ لِلنَّاسِ فَخَرَجَ عَبْدُاللهِ بْنُ زَمْعَةَ فَاِذَا عُمَرُ فِي النَّاسِ وَكَانَ اَبُوْبَكْرٍ غَائِبًا فَقُلْتُ: يَا عُمَرُ! قُمْ فَصَلِّ بِالنَّاسِ. فَتَقَدَّمَ فَكَبَّرَ فَلَمَّا سَمِعَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَوْتَهٗ وَكَانَ عُمَرُ رَجُلًا مُجْهِرًا، قَالَ: فَاَيْنَ اَبُوْبَكْرٍ؟ يَاْبَى اللهُ ذَالِكَ وَالْمُسْلِمُوْنَ يَاْبَى اللهُ ذَالِكَ وَالْمُسْلِمُوْنَ فَبَعَثَ اِلٰى اَبِيْ بَكْرٍ فَجَاءَ بَعْدَ اَنْ صَلّٰى عُمَرُ تِلْكَ الصَّلَاةِ فَصَلّٰى بِالنَّاسِ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ: لَمَّا سَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ صَوْتَ عُمَرَ، قَالَ ابْنُ زَمْعَةَ: خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اطَّلَعَ رَأْسَهُ مِنْ حُجْرَتِهِ ثُمَّ قَالَ: لَا! لَا! لَا! لِيُصَلِّ لِلنَّاسِ ابْنُ اَبِيْ قُحَافَةَ. يَقُوْلُ ذَالِكَ مُغْضِبًا۔"

(ابوداؤد ج:۲ ص:۲۸۵)

ترجمہ:...... "حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شدید ہوگئی تو دوسرے صحابہؓ کے علاوہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو باجماعت نماز کی اطلاع دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی کو کہو کہ نماز پڑھائیں۔ حضرت عبداللہ بن زمعہ باہر آئے تو دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں میں موجود ہیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غائب ہیں، حضرت ابن زمعہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ سے کہا: آپ آگے بڑھ کر نماز پڑھایئے، حضرت عمرؓ آگے بڑھے اور تکبیر تحریمہ کہی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی آواز سنی تو چونکہ حضرت عمرؓ کی آواز (قدرتی طور پر) بلند تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ابوبکرؓ کہاں ہیں؟ اللہ نے اس کا انکار کیا اور مسلمانوں نے انکار کیا، اللہ نے اس کا انکار کیا اور مسلمانوں نے انکار کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف آدمی بھیجا، حضرت عمرؓ کے نماز پڑھالینے کے بعد حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے انہوں نے لوگوں کو دوبارہ نماز پڑھائی۔

اور ایک روایت میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی آواز سنی، ابن زمعہؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ سے باہر تشریف لائے، اپنے حجرے سے جھانک کر فرمایا: لا! لا! لا! ابن ابی قحافہ کو چاہئے کہ لوگوں کو نماز پڑھائے، آپ نے یہ بات غصہ میں ارشاد فرمائی۔"

ابوبکرؓ ہی نماز پڑھائیں:

بہرکیف ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نہیں تھے، ظہر کا وقت تھا یا پتہ نہیں کون سا تھا حافظہ غلطی کرتا ہے، حضرت ابن زمعہؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ابوبکرؓ تو ہیں نہیں، آپ نماز پڑھادیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم کہو تو پڑھا دوں گا، کہنے لگے چلو پھر حضرت عمرؓ آگے ہوگئے، انہوں نے اقامت کہی اور جب حضرت عمرؓ نے اللہ اکبر کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامعہ مبارک تک آواز پہنچی، گھر قریب ہی تو تھا، پھر حضرت عمرؓ کی آواز بھی بڑی بلند تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا: "لا! لا! لا!" نہیں! نہیں! نہیں! ابوبکرؓ کو کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں، ابوبکر کے سوا کا اللہ بھی انکار کرتا ہے اور اہل ایمان بھی انکار کرتے ہیں، ابوبکرؓ کو کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں تو استخلاف فرمایا، مگر یوں نہیں فرمایا کہ تحریر لکھ دی ہو کہ میرے بعد ابوبکرؓ خلیفہ ہوں گے، ان کو ولی عہد مقرر کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ کی جانشینی:

البتہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی زندگی میں خلیفہ بنایا، زندگی میں نہیں بلکہ زندگی کے آخری وقت میں، اور استخلاف کی تحریر لکھوائی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کاتب (لکھنے والے) تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لکھواتے لکھواتے جب یہاں تک پہنچے کہ میں اپنے بعد خلیفہ بناتا ہوں، یہاں تک بولے ہی تھے تو غشی ہوگئی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود ہی لکھ دیا: "عمر کو میں خلیفہ بناتا ہوں۔" غشی سے افاقہ ہوا تو فرمایا پڑھ کر سناؤ کہ کیا لکھا ہے؟ سنایا تو انہوں نے عمرؓ کا

لفظ بھی ساتھ بول دیا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: اللہ تجھے جزائے خیر عطا فرمائے، تجھے خیال آیا ہوگا کہ اسی غشی کی حالت میں اس کا انتقال ہوگیا تو بات ادھوری رہ جائے گی، مجھے انہیں کا نام ہی لکھوانا تھا، خیر لمبا قصہ ہے۔

خلافتِ عثمانؓ کے لئے چھ آدمیوں کی شوریٰ.

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد چھ آدمیوں کے درمیان میں مسئلہ دائر ہوگیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنادیا گیا، اور امیرالمؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی نہج کو اختیار کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے امت کے حق میں بھلائی سوچی کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی اختلاف ہوجائے اور اگر کسی کو اشکال ہے تو اپنی زندگی میں اس کو حل کردیں گے، چنانچہ لوگوں نے اور صحابہؓ نے کہا بھی کہ آپ اتنے سخت آدمی کو ہمارے اوپر خلیفہ مقرر کر کے جاتے ہیں، اللہ کو کیا جواب دیں گے؟ فرمایا: مجھے اٹھا کے بٹھادو، لوگوں نے بٹھادیا، ان لوگوں سے کہا تم مجھے میرے رب سے ڈراتے ہو، تم مجھے میرے رب سے ڈراتے ہو، میں اپنے رب سے کہہ دوں گا کہ تیری مخلوق میں جو سب سے افضل تھا اس کو خلیفہ بنا کر آیا ہوں، تو اب خوشی سے سب کی گردنیں جھک گئیں، یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ مقرر ہوجانے پر ایک آدمی نے بھی اختلاف نہیں کیا، بیعت عامہ ہوئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بیعت عامہ ہوئی ایک آدمی نے بھی نہیں کہا کہ مجھے ان سے اختلاف ہے، اور جب حضرت عمرؓ نے چھ آدمیوں کے درمیان خلافت کو دائر کردیا اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام نامزد کردیا تو اس پر بھی ایک آدمی نے بھی اختلاف نہیں کیا، یہ خلفائے ثلاثہ ہیں، لوگ کہنے کو جو چاہیں کہیں لیکن تاریخ کا ریکارڈ موجود ہے کہ ایک آدمی کا بھی ان سے اختلاف نہیں ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

امت کی خیر کے تین زمانے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

''عَنِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ خَطَبَ بِالْجَابِیَۃِ فَقَالَ: قَامَ فِیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَقَامِیْ فِیْکُمْ فَقَالَ: ''اِسْتَوْصُوْا بِاَصْحَابِیْ خَیْرًا، ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ، ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ، ثُمَّ یَفْشُوا الْکَذِبَ، حَتّٰی اَنَّ الرَّجُلَ لَیَبْتَدِئُ بِالشَّھَادَۃِ قَبْلَ اَنْ یُّسْأَلَھَا فَمَنْ اَرَادَ مِنْکُمْ بِحُبُوْحَۃِ الْجَنَّۃِ فَلْیَلْزِمِ الْجَمَاعَۃَ، فَاِنَّ الشَّیْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ وَھُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ، لَا یَخْلُوَنَّ اَحَدُکُمْ بِامْرَأَۃٍ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ ثَالِثُھَا، وَمَنْ سَرَّتْہُ حَسَنَتُہٗ وَسَائَتْہُ سَیِّئَتُہٗ فَھُوَ مُؤْمِنٌ۔''

(مسند احمد ج:۱ ص:۱۸)

''عَنْ سُوَیْدِ بْنِ غَفَلَۃَ اَنَّ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ خَطَبَ النَّاسَ بِالْجَابِیَۃِ، فَقَالَ: نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ، اِلَّا مَوْضِعَ اُصْبُعَيْنِ اَوْ ثَـلَاثَةٍ اَوْ اَرْبَعَةٍ وَاَشَارَ بِكَفِّهٖ۔'' (مسند احمد ج:۱ ص:۵۱)

ترجمہ:...... ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقام جابیہ میں خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ خطبہ دیا تھا، جہاں کہ میں تمہیں خطبہ دے رہا ہوں، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ: میرے اصحاب کے بارے میں خیر کی وصیت قبول کرلو، پھر ان کے بعد جو آئیں گے اور وہ جو ان کے پیچھے ہوں گے، پھر جھوٹ پھیل جائے گا، یہاں تک کہ ایک آدمی ابتدا کرے گا شہادت کی اس سے پہلے کہ اس سے سوال کیا جائے، تم میں سے جو شخص جنت کے وسط میں جانا چاہتا ہو، اس کو چاہئے کہ جماعت کو لازم پکڑے، کیونکہ شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ دو سے دور ہوتا ہے، تم میں سے کوئی آدمی کسی غیر عورت کے ساتھ خلوت نہ کرے، کیونکہ وہاں تیسرا شیطان ہے اور جس شخص کو اس کی نیکی خوش کردے اور اس کی برائی اس کو غمگین کردے وہ مؤمن ہے۔''

''حضرت سوید بن غفلہؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اس میں یہ بھی فرمایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم پہننے سے منع فرمایا، ہاں دو انگلی کی مقدار یا تین کی یا چار انگلی کی مقدار کی اجازت ہے۔''

صحابہؓ کے بارے میں خیر کی وصیت:

حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی خطبے کا حوالہ دیا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے صحابہؓ کے بارے میں خیر کی وصیت قبول کرو، مطلب یہ کہ میں تمہیں ان کے بارے میں خیر کا گمان رکھنے کی وصیت کرتا ہوں اس وصیت کو یاد رکھو۔

امت میں سب سے بہتر:

امت میں صحابہؓ سب سے بہتر ہیں اور اس کے بعد وہ جو ان کے پیچھے ہوں گے، مراد اس سے تابعینؒ ہیں اور پھر وہ جو ان سے پیچھے ہوں گے، اس سے مراد تبع تابعینؒ ہیں، پھر فرمایا کہ اس کے بعد جھوٹ پھیل جائے گا، یہاں تک کہ ایک آدمی شہادت دینے کے لئے تیار ہوگا، خواہ اس سے شہادت طلب نہ کی جائے۔

صحابی کی تعریف:

''صحابی'' ان لوگوں کو کہتے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہو، مشہور قول علماء کا یہی ہے کہ جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس پر پڑی، کوئی نابینا ہے یا چھوٹا شیرخوار بچہ ہے، وہ بھی صحابی ہے، تو ہر وہ شخص جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا ہو، وہ صحابی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس دنیاوی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو۔

صحابی کی شرائط:

اگر کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو وہ صحابی نہیں ہے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

کے بعد کسی کو زیارت ہوئی (اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے) تو وہ صحابی نہیں، صحابی ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ اِس زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ تمام انبیاءؑ کرام کی ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں دو مرتبہ ہوئی تھی، ایک مرتبہ زمین پر جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاءؑ کرام کو بیت المقدس میں نماز پڑھائی اور دوسری مرتبہ آسمانوں پر۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انبیاءؑ کرام کا ملاقات کرنا ثابت ہے لیکن وہ صحابی نہیں کیونکہ ان انبیاءؑ کرام نے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، وہ صحابی ہیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی وفات سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں۔

نبی صحابی:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ابھی نہیں ہوئی، وہ زندہ ہیں، اس لئے حافظ نے ''الاصابہ'' میں جس میں صحابہ کرامؓ کے حالات جمع کئے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مستقل طور پر تذکرہ کیا ہے اور کہا کہ وہ قطعی صحابی ہیں۔

حضرت خضر کا بھی انہوں نے تذکرہ کیا ہے لیکن یہ لکھا ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ صحابی ہیں یا نہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زندہ تھے یا نہیں؟ صوفیاءؒ کہتے ہیں کہ زندہ تھے اور اب بھی زندہ ہیں اور محدثین کہتے ہیں کہ نہیں! ان کی وفات ہوگئی ہے۔

چار زندہ نبی:

''شرح عقائد'' کے حاشیہ میں علامہ خیالی نے لکھا ہے کہ محقق علماءؒ کے نزدیک چار انبیاءؑ کرام علیہم السلام زندہ ہیں، حضرت ادریس اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام

آسمان پر اور حضرت الیاس اور حضرت خضر علیہما السلام زمین پر، لیکن جیسا کہ میں نے ذکر کیا حضرت خضر، حضرت ادریس اور حضرت الیاس علیہم السلام کے بارے میں بھی علمأ کا اختلاف ہے کہ زندہ ہیں کہ نہیں؟

حیاتِ عیسیٰؑ پر اجماعِ امت:

لیکن حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے زندہ ہونے میں کسی ایک متنفس کا بھی اختلاف نہیں، پوری امت میں ایک عالم نے بھی اس مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سلامت باکرامت آسمان میں زندہ ہونا اسلام کا متواتر اور قطعی عقیدہ ہے اور تمام علمأ امت کا اجماعی عقیدہ ہے، اس کا منکر صرف فاسق اور گمراہ نہیں بلکہ سیدھا سیدھا کافر ہے، تو خیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی صحابہؓ میں شامل ہیں۔

حضرت شمس الدین ذہبیؒ کی کتاب ہے، ''تجرید اسمأ صحابہ'' دو جلدوں میں ہے، اس میں زیادہ حالات نہیں لکھے صرف نام لکھے ہیں، صحابہ کے ناموں کی تجرید کی ہے یا کسی کے بارے میں معلوم ہوگیا تو اس کا سن وفات لکھ دیا۔ اس کتاب میں بھی انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے، حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے کہ چونکہ ان کی ملاقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہوئی ہے، اس لئے وہ نبی بھی ہیں، رسول بھی ہیں اور صحابی بھی ہیں۔

شیخینؓ سے افضل صحابی:

اور ساتھ لکھتے ہیں کہ ایک پہیلی پوچھی جاتی ہے کہ بتاؤ وہ کون سا صحابی ہے جو حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے بھی افضل ہے؟ صحابہؓ کی جماعت میں سب سے افضل تو حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ہیں، بتاؤ وہ کون سا صحابی ہے جو حضرات

ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے افضل ہے؟ اور فرماتے ہیں کہ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہیں، اس لئے کہ وہ صحابی ہیں، ان کو صحابی کہنا بھی ٹھیک ہے، لیکن مستقل نبی اور رسول بھی ہیں، اور انبیائ کرام علیہم السلام کا حضرات شیخینؓ سے افضل ہونا واضح ہے۔ تو صحابی وہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہو اور زیارت بھی بحالت حیات دنیاوی اور بیداری میں کی ہو۔

صحابی کی دوسری شرائط:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اگر کسی بزرگ کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی لیکن آپؐ سے ملاقات نہیں ہوسکی تو وہ صحابی نہیں، یہ حضرت سوید بن غفلہؒ جن کی روایت نقل کی ہے، اس دن یہ مدینہ طیبہ پہنچے جس دن صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کرکے ہاتھ جھاڑ رہے تھے، اس لئے صحابی نہ ہوسکے البتہ اکابر تابعینؒ میں سے ہیں، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کو دیکھا اور ان سے روایتیں لیں، لیکن قسمت کی بات کہ ان کے آنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوچکا تھا اور آپؐ کو دفن کیا جاچکا تھا اس لئے صحابی نہ ہوسکے۔

صحابی ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس نے اسلام کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے وہ لوگ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی لیکن آپؐ کے زمانے میں اسلام نہیں لائے، بلکہ بعد میں اسلام لائے، وہ صحابی نہیں۔

ایک سوال:

یہاں آپ یہ سوال کرسکتے ہیں کہ بتاؤ وہ کون سا آدمی ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور مسلمان بھی ہے، لیکن وہ صحابی نہیں تھا، اس کا

جواب یہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفر کی حالت میں دیکھا لیکن آپؐ کی زیارت اسلام کی حالت میں نہیں ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اس وقت ہوئی جب یہ مسلمان نہیں تھا، اور اسلام لایا اس وقت جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے پردہ فرما چکے تھے۔

ارتداد کے بعد اسلام لانے سے شرفِ صحابیت کا حکم:

صحابی ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کا خاتمہ بھی ایمان پر ہوا ہو، اگر کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری کی حالت میں، اپنی زندگی میں اور اسلام کی حالت میں دیکھا لیکن نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ بعد میں مرتد ہوگیا، تو وہ بھی صحابی نہیں بلکہ مرتد ہوتا ہے، اب تو لوگ مرتدوں کو بھی شہید کہتے ہیں، ہاں اگر مرتد ہوگیا تھا اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے پھر اسلام لانے کی توفیق دے دی اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا تو درمیان کا جو ارتداد ہے اس کا اعتبار نہیں ہوگا، اس کو بھی صحابہ کی صف میں شمار کیا جائے گا۔

اس میں اشکال ہوتا ہے کہ مرتد ہونے سے تو تمام اعمال حبط ہوجاتے ہیں، نعوذ باللہ پہلے کا کیا کرایا سب غارت اور اکارت ہوگیا، اگر حج کیا تھا پھر مرتد ہوگیا تھا تو اسلام لانے کے بعد اس آدمی کو نئے سرے سے دوبارہ حج کرنا ہوگا، مرتد آدمی کا بیوی سے نکاح فسخ ہوجائے گا، مسلمان ہوگیا تو دوبارہ نکاح کی تجدید بھی کرنی پڑے گی، ایمان کی تجدید کرے، نکاح کی تجدید کرے اور اپنے اعمال کی بھی تجدید کرے، تو اگر کوئی شخص صحابی تھا پھر نعوذ باللہ مرتد ہوگیا، پھر اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اسلام لے آیا تو اس شخص کو تو صحابی نہیں کہنا چاہیے، کیونکہ درمیان میں کفر آگیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دوبارہ اسلام لانے سے اور اعمال تو نہیں لوٹیں گے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا جو شرف تھا وہ دوبارہ لوٹ آئے گا۔

صدیق اکبرؓ کا معیار:

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ ایسے چند آدمی جو فتنے کی وجہ سے اسلام سے پھر گئے اور بعد میں مسلمان ہوگئے تھے، ان کے دوبارہ اسلام لانے کے بعد صحابہ کرامؓ نے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو صحابہ کرامؓ سے کیا جاتا تھا، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں کسی علاقے کا گورنر، کسی علاقے کا سپہ سالار، کسی فوجی دستے کا سردار، رئیس، کسی جماعت کا امیر، کوئی قاضی یا کوئی عہدہ سوائے صحابی کے کسی اور کو نہیں دیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ تو بہت ہی مختصر تھا، صرف دو سال سات ماہ۔ تو ان کے دورِ خلافت میں جتنے بھی عاملین تھے صحابی تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی یہ شرط قائم رہی حالانکہ بہت سارے لوگ اسلام میں داخل ہوگئے تھے اور ان میں تو بعض بہت فاضل بھی تھے، لیکن کسی غیر صحابی کو حکومت کا کوئی عہدہ نہیں دیا گیا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے بارے میں اتنی سی بات معلوم ہوجائے کہ وہ شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فلاں عہدہ پر فائز تھا، یا ان کو امیر بنایا گیا تھا، یا قاضی بنایا گیا تھا، یا اسے صدقات کی تحصیل اور وصولی پر مقرر کیا گیا تھا یا فلاں کام ان کے سپرد تھا، جس شخص کے بارے میں یہ بات ثابت ہوجائے تو یقین کرلینا چاہئے کہ وہ صحابی ہے، اس لئے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں سوائے صحابہؓ کے کسی اور کو کوئی عہدہ دیا ہی نہیں جاتا تھا، یہ ایک مسئلہ ہوا صحابی کا، اس کے بعد ہے، تابعی۔

تابعی کی تعریف:

''تابعی'' اس کو کہتے ہیں جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والوں کو دیکھا یعنی صحابہؓ کو دیکھا، پھر ان کے مختلف طبقات ہیں، بعض ان میں سے پہلے درجے

کے ہیں جیسے کہ میں نے ابھی حضرت سوید بن غفلہ رحمہ اللہ کا ذکر کیا، اگر ایک دن پہلے پہنچ جاتے تو صحابہؓ کے زمرے میں داخل ہوجاتے، لیکن اب تابعینؒ کے زمرے میں داخل ہیں، یہ اکابر تابعی ہیں اور کچھ تابعین درمیانے طبقے کے ہیں اور کچھ چھوٹے طبقے کے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ تابعی:

ہمارے امام ابوحنیفہؒ حضرات تابعینؒ کے اسی طبقے میں ہیں کیونکہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو جن کی رہائش بصرہ میں تھی ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کو جن کی رہائش کوفہ میں تھی، ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، دو صحابہؓ کو دیکھنا تو قطعی طور پر ثابت ہے، ان کے علاوہ کوئی دس صحابہؓ ایسے تھے جو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں حیات تھے، ان سے ملاقات کرنا اور ان کو دیکھنے کا احتمال ہے، بہرحال اس پر محدثینؒ متفق ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ تابعی ہیں، یعنی صحابہ کرامؓ کے دیکھنے کی وجہ سے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اس فضیلت میں داخل ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> ”خَیْرُ اُمَّتِیْ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ۔“ (مشکوٰۃ ص:۵۵۳)
>
> ترجمہ:...... ”میری امت کا سب سے بہتر طبقہ میرا طبقہ ہے، یعنی صحابہ، ان کے بعد وہ لوگ جو ان کے پیچھے آرہے ہیں، یعنی ان کے دیکھنے والے اور ان کے بعد وہ لوگ جو ان کے پیچھے ہوں گے، یعنی تبع تابعین۔“

تو حضرت امام ابوحنیفہؒ اس خوش قسمت جماعت میں شامل ہیں، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کا دیدار حاصل ہے اور جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے خیر ہونے کی سند عطا فرمائی ہے۔

ائمہ ثلاثہ تبع تابعین:

دوسرے درجہ پر ائمہ اربعہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی جماعت میں سے یہ شرف صرف امام ابوحنیفہؒ کو حاصل ہے اور کسی کو حاصل نہیں، امام مالکؒ تبع تابعین میں سے ہیں، یعنی تابعین کو دیکھنے والے ہیں، اسی طرح امام شافعیؒ ہیں، کیونکہ یہ زمانہ بہت لمبا چلا گیا ہے، یعنی ایک سو سال تک تبع تابعینؒ کا زمانہ ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے درمیان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کم سے کم تین واسطے آتے ہیں، اس سے کم واسطے نہیں۔

امام بخاریؒ کا درجہ:

امام بخاریؒ، امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد کے شاگرد ہیں، اصل میں تو امام بخاریؒ امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں، امام شافعیؒ، امام محمدؒ کے شاگرد ہیں، امام محمدؒ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں۔ اتنے واسطوں سے امام بخاریؒ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ بڑا استاذ لمبی عمر والا مل گیا، چنانچہ خوش قسمتی سے امام بخاریؒ کو بھی ایک لمبی عمر والے استاذ مل گئے تھے، جن کا نام ہے: مکی بن ابراہیمؒ، یہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں، اٹھارہ حدیثیں صحیح بخاری میں ثلاثی ہیں، یعنی امام بخاریؒ کے درمیان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہیں، صحابی، تابعی اور تبع تابعی اور بس، تو امام بخاریؒ سے لے کر امام شافعیؒ تک اس طبقے کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین واسطوں سے شاگرد ہیں، یعنی ان کے درمیان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کم سے کم تین واسطے ہیں، امام مالکؒ مقدم ہیں کہ وہ امام شافعیؒ کے استاذ ہیں، ان کے درمیان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کم سے کم دو واسطے ہیں، ایک تابعی کا، ایک صحابی کا، البتہ امام ابوحنیفہؒ کے

درمیان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف ایک یعنی صحابی کا واسطہ ہے، اگرچہ بعض روایتوں میں دو دو، تین تین، چار چار واسطے بھی آجاتے ہیں، تو یہ شرف امام ابوحنیفہؒ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔

افضل صحابہ؟

اس میں اعتراض ہوا ہے کہ تابعین میں سے افضل کون ہے؟ اور صحابہؓ کی جماعت میں سب سے افضل کون ہے؟ تو حضرات صحابہ کرامؓ میں سے حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم اجمعین، اس کے بعد عشرۂ مبشرہ حضرات طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ بن الجراح، سعید بن زید رضوان اللہ علیہم اجمعین، کو ملا کر عشرۂ مبشرہ بن جاتے ہیں، جو صحابہ کرامؓ میں سے افضل ہیں۔

افضل تابعیؒ:

لیکن اس میں اختلاف ہوا ہے کہ تابعینؒ میں سب سے افضل کون ہے؟

کسی نے کہا کہ اویسؒ قرنی ہیں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی تھی کہ یہ صاحب آئیں گے ان سے اپنے لئے مغفرت کی دعا کروانا، تو بڑا رشک آیا کہ حضرت عمرؓ جیسے آدمی کو کہا جائے کہ ان سے دعا کرواؤ۔

بعض نے کہا کہ سیدالتابعین حضرت سعید بن المسیبؒ ہیں، کسی نے کچھ کہا، اور کسی نے کچھ کہا اور چلتے چلتے بات یہاں تک آگئی کہ افضلیت کے معنی کیا ہیں؟ اگر افضلیت کے معنی کثرت ثواب ہیں تو امام ابوحنیفہؒ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے، اگرچہ چھوٹے درجہ کے تابعی ہیں، ایک دو صحابہؓ کو دیکھا یا پانچ سات کو دیکھا، لیکن ان سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے کہ ان کے بعد آنے والی دو تہائی امت ان کے مذہب پر عمل کرتی ہے اور یہ شرف کسی اور کو حاصل نہیں۔

سفیان بن عینیہؒ کی شہادت:

امام سفیان بن عینیہؒ دو چیزوں کے بارے میں بڑے مزے سے کہتے تھے کہ میرا خیال تو یہ تھا کہ کوفے کے پل سے آگے نہیں جائیں گی یہ تو آسمانوں کے کناروں تک پہنچ گئی ہیں۔ ایک امام ابوحنیفہؒ کی فقہ، دوسرے امام عاصمؒ کی قرأت، قرآن کریم کی یہ قرأت جو ہم پڑھ رہے ہیں یہ امام عاصم کی قرأت ہے، ان کے راوی امام حفصؒ ہیں، حضرت سفیان بن عینیہؒ کہتے تھے کہ میرا خیال تھا کہ اس قرأت کو کوئی نہیں لے گا اور کوفے کے اندر ہی رہے گی، لیکن انہوں نے تو پورے آفاق کو اتار دیا، کہنا یہ تھا کہ بندوں کو وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ جو کچھ بھی ہوا منجانب اللہ ہوا، کسی بندہ کا اس میں دخل نہیں ہے۔

معاندین کی کوشش:

بہت سارے لوگ بلکہ ایک مستقل طبقہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانے سے لے کر آج تک چاقو چھری لے کر یہ اعزاز چھیننے کے لئے امام ابوحنیفہؒ کے پیچھے پڑا ہوا ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں ایسے ایسے گندے فتوے دیئے گئے ہیں کہ کوئی حد نہیں اور ایسے ایسے الزامات عائد کئے گئے ہیں کہ عقل حیران ہے کہ کوئی دماغ میں مغز رکھنے والا آدمی یہ سوچ سکتا ہے؟ لیکن بہرحال الزام لگائے گئے ہیں، ان تمام مخالفتوں کے باوجود دیکھنے والوں نے دیکھا اور آج تک دیکھ رہے ہیں کہ امت کی دو تہائی حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مذہب پر عامل ہے، اور یہ بات صرف ہم نہیں کہتے سب نے کہی ہے، شافعی بھی مانتے ہیں، مالکی بھی مانتے ہیں اور حنبلی بھی مانتے ہیں، تو جب دو تہائی امت کے لوگ فقہ حنفی پر عمل پیرا ہیں تو اس میں کوئی تو اللہ تعالیٰ کا راز تھا اور دو تہائی امت کا ثواب ان کے نامہ عمل میں لکھا جارہا ہے، کیونکہ استاذ کے نامہ عمل میں شاگرد کے اعمال لکھے جاتے ہیں، تو اس لئے لکھنے والوں نے ٹھیک کہا اور کچھ غلط نہیں

کہا کہ اگر فضیلت سے کثرت ثواب مراد ہے تو یہ کہنے کی اجازت دے دیجئے کہ افضل التابعین امام ابوحنیفہؒ ہیں، اس لئے کہ مستقل طور پر اتنی بڑی امت ان کے مذہب پر عمل کر رہی ہے جس کا ثواب ان کو پہنچ رہا ہے۔

ایک لطیفہ:

مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ہے، پہلی التحیات میں عبدہ ورسولہ تک تشہد پڑھا جاتا ہے، اور اس کے بعد اٹھ جاتے ہیں، اگر کوئی شخص درود شریف پڑھ لے حالانکہ اس کو اٹھنا تھا، لیکن وہ درود شریف پڑھ لے اور صرف ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی'' تک ہی پڑھا تھا کہ اس کو یاد آ گیا کہ مجھے تو اٹھنا تھا اور پھر وہ اٹھ جائے تو اس پر سجدہ سہو واجب نہیں، لیکن ''مُحَمَّدٍ'' کہہ دیا تو سجدہ سہو واجب ہوجائے گا۔ تو ایک دفعہ امام ابوحنیفہؒ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میرا نام لینے پر سجدہ سہو واجب کردیتے ہو؟ فوراً عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کا نام اگر غفلت سے لیا جائے تو سجدہ سہو واجب کرتا ہوں، اس جرم میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام غفلت سے کیوں لیا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ مسئلہ تو یہ ہی تھا کہ بھول کر، غفلت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے رہا ہے، جہاں نام نہیں لینا چاہئے تھا۔

تبع تابعین کی تعریف:

اب ان کے بعد ''تبع تابعین'' یعنی وہ تمام حضرات جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والوں کے دیکھنے والوں کو دیکھا، یہ تیسرے درجے میں آگئے، ان تین لوگوں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں فتویٰ دیتا ہوں کہ یہ امت میں سب سے بہتر تھے اور میری تاکید اور وصیت ان کے بارے میں بہتری کی ہے، اس کو قبول کرو۔

خیرالقرون کا عمل حجت ہے:

لیکن اب امت کی بدقسمتی یہ ہے کہ سب سے زیادہ تنقید انہیں تین طبقوں پر ہوتی ہے، صحابہ کرامؓ پر، تابعینؒ پر، تبع تابعینؒ پر، میں نے عرض کیا کہ امام احمد بن حنبلؒ تک تبع تابعین کا زمانہ پورا ہوجاتا ہے، یہ تین زمانے خیر کے زمانے ہیں، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جو عمل صحابہ کرامؓ کے زمانے میں رواج پا گیا، صحابہؓ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، جو عمل تابعینؒ کے زمانے میں رواج پا گیا اور اکابر تابعینؒ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی اور اسی طرح تبع تابعینؒ کے زمانے میں جو عمل رواج پا گیا اور اس طبقہ کے اکابرؒ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، اس پر ٹوکا نہیں کہ غلط کر رہے ہو، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت کا یہ مسئلہ برحق ہے، اس لئے کہ یہ تین طبقے ایسے تھے کہ شریعت کے خلاف بات کو برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے، اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

خیرالقرون اور غیر شرعی عمل:

چنانچہ مشکوٰۃ میں حدیث ہے:

”عَنْ عَمَّارَةَ بْنِ رُوَيْبَةَ اَنَّهُ رَاٰى بِشْرَ بْنَ مَرْوَان عَلَى الْمِنبَرِ رَافِعًا يَدَيْهِ، فَقَالَ: قَبَّحَ اللّٰهُ هَاتَيْنِ الْيَدَيْنِ، لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَزِيْدُ عَلٰى اَنْ يَّقُوْلَ بِيَدِهٖ هٰكَذَا وَاَشَارَ بِاُصْبُعِهِ الْمُسَبِّحَةِ.“

(مشکوٰۃ ص:۱۲۴)

ترجمہ:...... ”حضرت عمارہ بن رویبہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بشر بن مروان کو دیکھا کہ خطبہ دے رہا تھا (اور جس طرح ہمارے خطیبوں کو آپ نے دیکھا ہوگا اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہے ہوتے ہیں، وہ بھی اسی طرح ہاتھوں کو مار رہا تھا) یہ

صحابی بھی اس خطبے میں موجود تھے، کہنے لگے کہ: اللہ تعالیٰ دونوں ہاتھوں کو برا کرے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیتے تھے تو ایک انگلی کے اشارے سے زیادہ ہاتھ کو حرکت نہیں دیتے تھے، یعنی انگلی سے اشارہ کردیا کرتے تھے۔"

اتنی بات پر بھی صحابہؓ نکیر فرما رہے ہیں کہ یہ خطبہ دیتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف کر رہا ہے۔

بلا طلب شہادت:

اس کے بعد فرمایا پھر کچھ اور لوگ آئیں گے، ان سے شہادت مانگی نہیں جائے گی بلکہ شہادت دینے اور گواہی دینے کے لئے تیار ہوں گے۔

اور دوسری روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ حضرت عمرؓ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ہی کا حوالہ دے رہے ہیں:

"ثُمَّ يَأْتِيْ قَوْمٌ تَسْبِقُ شَهَادَتُهُمْ يَمِيْنَهُ وَيَمِيْنُهُ مِنْ شَهَادَتِهِ."

ترجمہ:...... "پھر ایک قوم آئے گی کہ یہ قسم کھانے سے پہلے شہادت دینا چاہیں گے اور شہادت دینے سے پہلے قسم کھانا چاہیں گے، یعنی جھوٹی گواہی دیں گے اور جھوٹی قسمیں کھائیں گے۔"

عدل و انصاف کا معیار:

یہاں پر ایک بات عرض کردوں کہ عدل و انصاف کا مدار صحیح فیصلہ پر ہے، اور صحیح فیصلہ کا مدار صحیح شہادت پر ہے، کیونکہ سامنے ریکارڈ پر جیسی شہادتیں آئیں گی،

قاضی اسی کے مطابق فیصلہ کرے گا، تو عدل و انصاف کا مدار ہے صحیح فیصلے پر اور صحیح فیصلے کا مدار ہے صحیح شہادت پر، اب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ جس معاشرے میں چائے کی پیالی پر اور سگریٹ کی ڈبیہ پر گواہ مل سکتے ہوں، اس معاشرے میں شہادت کا معیار کیا ہوگا؟ اور جب شہادت کا معیار یہ ہے تو صحیح فیصلے کیسے ہوں گے؟ اور جب فیصلوں کا معیار یہ ہے تو عدل و انصاف کیسے قائم ہوگا؟

سب سے پہلے انصاف کا قتل ہوگا:

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا غالباً مسند احمد کے حوالے سے جامع صغیر میں یہ روایت موجود ہے کہ اسلام کے تمام حلقوں کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جائے گا، سب سے پہلے جس چیز کو توڑا جائے گا وہ انصاف کے مطابق فیصلہ کرنا ہے، یہ چیز سب سے پہلے توڑ دی جائے گی اور آخر میں جو چیز ٹوٹے گی وہ نماز ہے، اب تو مدت ہوچکی نماز بھی ٹوٹ چکی ہے۔

موجودہ عدالتیں:

عدالتوں کے نام سے بڑی بڑی بلڈنگیں بناؤ اور قاضیوں کو، جج حضرات کو، موٹی موٹی تنخواہیں دو اور پروپیگنڈا کرو، ڈھول پیٹو کہ ہمارے یہاں عدلیہ آزاد ہے جبکہ آزاد نہیں ہے، لیکن کچھ بھی کرلو یہاں انصاف نہیں مل سکے گا۔ اس لئے کہ پولیس نے جو مقدمہ بھی قائم کرنا ہو اسے گواہی کے لئے آدمی مل جاتے ہیں، اس کے لئے انہوں نے ٹاؤٹ رکھے ہوئے ہیں، ان کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، یہ عدالتیں بھی جانتی ہیں کہ وکیل صاحب سب سے پہلے جھوٹ بلواتے ہیں، ایک مقدمہ بھی ایسا نہیں ہوگا جس میں ساٹھ فیصد جھوٹ نہ بولا گیا ہو، یا مدعی اور سائل نے اپنی درخواست میں کم سے کم ساٹھ فیصد جھوٹ نہ ملایا ہو اور بعض دفعہ تو ایک سو ایک فیصد جھوٹ ہوتا ہے، یعنی جو جھوٹ ہے اس میں مزید ڈبل اضافہ ہوتا ہے، گواہ بدلے جاتے ہیں،

وکیل جو جرح کرتے ہیں وہ جھوٹی ہوتی ہے اور جج فیصلہ لکھتا ہے وہ جھوٹا ہوتا ہے، مگر نام رکھا جاتا ہے انصاف، یہ تو بات نیچے سے بگڑی ہوئی ہے۔

نیچے سے اوپر تک رشوت:

میرے ایک دوست چند دن پہلے آئے کہنے لگے میرا لڑکا انجینئر ہے، اور اس کو ملازمت مل رہی ہے، میں نے اس کو کہا کہ بیٹا رشوت نہیں لوگے، وہ لڑکا بھی ساتھ آیا تھا، یہ کہہ رہا ہے کہ میں نہیں لوں گا، مگر اوپر والے جو مانگیں گے اس کا میں کیا کروں گا؟ ہر ادارے میں یہی ہوتا ہے۔ رشوت صرف رشوت لینے والا نہیں لیتا بلکہ وزیر صاحب تک اور اگر یہ کہا جائے کہ صدر صاحب تک یہ رشوت جاتی ہے تو بالکل بجا ہے، ہاں تو یہ سلسلہ وزیر تک پہنچتا ہے، نیچے چپڑاسی سے لے کر اوپر تک ہے، یہ جتنی لاقانونیت ہو رہی ہے، کیا یہ ساری کی ساری چھوٹے کر رہے ہیں؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ! ان کی کیا مجال ہے؟ بلکہ یہ لاقانونیت بڑے اعلیٰ افسروں کے ذریعہ سے ہو رہی ہے، جن کو قانون نافذ کرنا ہے اور جو قانون کے محافظ ہیں وہ قانون شکنی کر رہے ہیں۔

برے دور کی علامت:

تو اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ ان تین زمانوں کے بعد پھر کچھ ایسے لوگ آئیں گے کہ شہادت دینے سے پہلے قسم کھانا چاہیں گے اور قسم کھانے سے پہلے گواہی دینا چاہیں گے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ قسم پہلے کھانا چاہتا ہے یا گواہی پہلے دینا چاہتا ہے۔

لیکن ایک بات یاد رکھو! بدگمانی کا ازالہ کر دینا چاہتا ہوں کہ امت میں بگڑے ہوئے افراد ہیں، اور یہ بگاڑ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے، ایک زمانہ تھا کہ بگڑے ہوئے لوگ تھوڑے تھے، اچھے لوگ زیادہ تھے، اور پھر چلتے چلتے بگڑے ہوئے لوگوں کا گراف اونچا ہوتا گیا اور اچھے لوگوں کا گراف نیچے ہوتا گیا اور اب اکثریت میں بدی

کے جراثیم آگئے ہیں۔

اہل حق اب بھی باقی ہیں:

لیکن یہ مطلب نہیں ہے کہ اب پوری کی پوری امت ہی ایسی ہے، نہیں، بلکہ اب بھی کچھ اچھے ضرور ہیں، اس لئے کہ یہ بات ذہن میں رکھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ قَائِمَةٌ بِاَمْرِ اللّٰہِ لَا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَذَلَھُمْ اَوْ خَالَفَھُمْ ... الخ."

(مسند احمد ج:۴ ص:۱۰۱)

ترجمہ:...... "میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی (قولاً، عملاً، سیرتاً اور اخلاقاً)، جو ان کی مخالفت کرے یا ان کی مدد سے ہاتھ کھینچ لے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا (وہ اپنا کام کرتی رہے گی) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے اور عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوجائیں۔"

کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا آنا یہ قیامت کی علامت ہے تو قیامت تک ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، عقیدہ کے اعتبار سے بھی، عمل کے اعتبار سے بھی، سیرت و اخلاق کے اعتبار سے بھی، طور و طریقہ کے اعتبار سے بھی، اس لئے اس قسم کی بات سن کر بھائی! پوری امت کو نہ لپیٹا جائے، اچھے لوگ بھی ہیں اور ہر زمانے میں رہے ہیں، اگرچہ دن بدن تھوڑے ہوتے جارہے ہیں، ان میں کمی آتی جارہی ہے اور ہم جیسے لوگ بڑھ رہے ہیں، لیکن کبھی ختم نہیں ہوئے۔ جیسا کہ اکبر الٰہ آبادی نے کہا ہے:

خدا کی یاد میں دنیائے دوں سے منہ جو موڑے ہیں
وہی انسان اچھے ہیں مگر افسوس تھوڑے ہیں

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

جہاد میں

صحابہؓ کی مدد کو فرشتوں کا آنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے:

"بَلٰی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَأْتُوْكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ. وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ. لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ."

(آل عمران: ۱۲۵ تا ۱۲۷)

ترجمہ:...... "کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور وہ تم پر حملہ آور ہوں، تو تمہاری اسی حالت میں مدد کرے گا تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ جو خاص نشان رکھتے ہوں گے، اور نہیں بنایا اللہ تعالیٰ نے اس کو مگر محض خوشخبری

تمہارے لئے اور تاکہ مطمئن ہوجائیں تمہارے دل اس کے ساتھ اور مدد نہیں ہوتی مگر اللہ کے پاس، جو بڑا زبردست، بڑی حکمت والا ہے، تاکہ وہ کاٹ ڈالے اور ہلاک کرڈالے ایک حصہ ان کافروں کا یا ان کو ذلیل کرے، پس وہ لوٹیں گے نامراد اور ناکام ہوکر۔"

بدر میں فرشتوں کی تعداد:

اس سے قبل میں نے عرض کیا تھا کہ جنگ بدر میں کتنے فرشتے نازل ہوئے تھے، اس سلسلے میں سورۂ الانفال میں تو وعدہ فرمایا تھا کہ ایک ہزار فرشتے نازل کریں گے اور یہاں دو وعدے ہیں، ایک وعدہ تو غیر مشروط یعنی اللہ تعالیٰ تین ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد فرمائیں گے۔ اور دوسرا وعدہ مشروط ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر تم صبر سے کام لو، تقویٰ اختیار کرو، بشرطیکہ وہ تم پر فوری طور پر حملہ آور ہوں تو اللہ تعالیٰ پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد فرمائیں گے۔

پانچ ہزار کا وعدہ کس غزوہ کے لئے؟

اب اس میں گفتگو ہوتی ہے کہ پانچ ہزار فرشتے نازل کرنے کا یہ وعدہ جنگ بدر سے متعلق ہے یا جنگ احد سے متعلق ہے؟ اور پھر یہ کہ یہ پانچ ہزار فرشتے نازل کئے گئے یا نہیں؟

بعض اکابرؒ اس طرف گئے ہیں کہ یہ وعدہ غزوۂ احد سے متعلق تھا، تین ہزار فرشتے نازل کرنے کا وعدہ تو جنگ بدر میں ہوا اور پانچ ہزار فرشتے نازل کرنے کا وعدہ جنگ احد سے متعلق تھا جو کہ ان تین مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ مشروط تھا لیکن اس میں مسلمانوں میں سے بعض افراد نے تھوڑا سا بے صبری سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ کی یہ مدد نہیں آئی اور مسلمانوں کو ظاہری طور پر شکست ہوئی، لیکن عام علمائؒ کا قول یہ ہے کہ یہ

تیسرا وعدہ بھی جنگ بدر سے متعلق ہے، گویا تین وعدے ہوئے۔

پہلا وعدہ:

پہلا وعدہ تھا ایک ہزار فرشتے نازل کرنے کا جو کہ سورۃ الانفال میں ذکر کیا گیا وہ تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے استغاثہ پر یعنی ان کے فریاد کرنے پر نازل فرمائے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: "اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ لَکُمْ." جب تم اپنے رب سے فریادیں کر رہے تھے تو انہوں نے تمہاری فریاد کو سن لیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد فرمائی ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ "مُرْدِفِیْنَ" جو لگاتار، پے در پے آرہے تھے۔

دوسرا وعدہ:

دوسرا وعدہ بھی جنگ بدر سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے فرما رہے تھے کہ کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہارا رب تمہاری مدد کرے تین ہزار فرشتوں سے جن کو آسمان سے نازل کیا جائے گا۔ اگرچہ زمین میں فرشتے بہت ہیں ان سے بھی مسلمانوں کی مدد کا کام لیا جاسکتا تھا، لیکن یہ حق تعالیٰ شانہ کی خاص عنایت تھی کہ آسمان سے فرشتے نازل فرمائے تو یہ تین ہزار فرشتے بھی نازل ہوئے۔

تیسرا وعدہ:

رہا تیسرا وعدہ پانچ ہزار فرشتے نازل کرنے کا، یہ اس وقت سے متعلق ہے جبکہ مسلمانوں کو اطلاع پہنچی کہ ایک ہزار مکہ کے کافر تو جنگ بدر میں آئے ہوئے ہیں لیکن کچھ باہر کے سردار اور رئیس بھی ان کافروں کی مدد کے لئے آرہے ہیں، ظاہر بات ہے کہ اس خبر سے مسلمانوں کو مزید پریشانی ہوئی، قرض بن جابر کے بارے میں اطلاع پہنچی کہ وہ بھی کافروں کی مدد کے لئے لشکر لے کر آرہا ہے تو اس وقت وعدہ

فرمایا گیا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہم پانچ ہزار فرشتے بھیج دیں گے، تو یہ ایک ہزار اور تین ہزار اور پانچ ہزار یہ کل مجموعی تعداد ہوئی۔

فرشتوں کی مجموعی تعداد:

مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک ہزار تھے، پھر دو ہزار مزید نازل ہوئے تین ہزار ہوگئے، پھر دو ہزار مزید نازل کرنے کا وعدہ فرمایا تو پانچ ہزار ہوگئے، تو مجموعی تعداد کو ذکر فرمایا ہے ورنہ کل تعداد تو نو ہزار فرشتوں کی بن جاتی ہے، لیکن یہ شرط کیوں نہیں پائی گئی وجہ یہ ہے کہ وہ کافر (جس کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ وہ بھی ان کی مدد کے لئے آرہا ہے، وہ نہیں آیا، کیونکہ اس کو) وہاں اطلاع پہنچی تھی کہ وہ کافر تو مار کھا رہے ہیں، اس لئے اس نے ہمت ہار دی، ان کو شکست ہورہی ہے تو وہ بھی ڈر گیا اور نہیں آیا، اس لئے پانچ ہزار فرشتوں کے بھیجنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

فرشتوں کی آمد کا مقصد:

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ایک ہزار یا تین ہزار یا پانچ ہزار فرشتوں کے بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟ فرشتہ تو ایک ہی کافی ہے، اللہ تعالیٰ نے جب حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قوم لوط کی بستیاں الٹنے کا حکم فرمایا تھا تو اکیلے حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمام علاقے کو ایک انگلی پر اٹھالیا تھا، اور شہر سدوم کو ایک انگلی پر اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر فرشتوں کو مدد کے لئے بھیجا جائے اور فرشتے آکر جنگ میں لڑیں تو پھر مسلمانوں کو لڑنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ ایک ہی فرشتہ سارے کافروں کو مار ڈالے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ فرشتوں کو لڑنے کے لئے نہیں بھیجا جاتا، بلکہ مسلمانوں کی تقویت کے لئے، ان کی ڈھارس بندھانے کے لئے اور ان میں قوت پیدا کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

غزوات شریفہ میں فرشتے نازل ہوتے تھے لیکن ان سے لڑائی کا کام نہیں لیا گیا۔

البتہ بعض علماءؒ فرماتے ہیں کہ جنگ بدر میں فرشتے لڑے تھے، تو غالباً فرشتوں نے مسلمانوں کی مدد کی ہوگی جنگ بدر ہی میں "اَقْدِمْ حَیْزُوْمَ" کی آواز صحابہؓ نے سنی تھی، "حَیْزُوْمَ" حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گھوڑے کا نام تھا، صحابہؓ نے آواز سنی کہ: "اَقْدِمْ حَیْزُوْمَ" حیزوم آگے بڑھو، یہ جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آواز تھی، صحابہؓ نے فرشتوں کو دیکھا بھی تھا اور ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ عجیب بات تھی کہ کوئی آدمی لڑنے والا اور قتل کرنے والا نظر نہیں آتا تھا، لیکن کافر کا سر کٹ گیا۔ بہرحال فرشتوں کی تائید اور مدد اصلاً لڑائی کے لئے نہیں ہوتی بلکہ مسلمانوں کی تقویت کے لئے ہوتی ہے، ہوسکتا ہے کہ جنگ بدر میں فرشتوں نے کاروائی بھی فرمائی ہو لیکن اگر فرشتے لوگوں کو قتل کرنے لگیں تو ایک بھی آدمی نہ بچے۔

اور تیسرا سوال یہ ہے کہ انسانوں سے انسانوں کو لڑنا چاہئے، یہ فرشتے کیوں بھیجے گئے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ خود دے رہے ہیں: "وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَکُمْ." اور نہیں بنایا اللہ نے اس کو یعنی فرشتوں کے بھیجنے کو مگر خوشخبری تمہارے لئے، تمہیں اس کا احساس ہو کہ کافر اگر مقابلے میں بہت کثیر تعداد میں ہیں تو کوئی پریشانی کی بات نہیں، اللہ تعالیٰ ہماری مدد کے لئے آسمان سے فرشتوں کو بھیج رہے ہیں، تمہیں خوشخبری ہو، "وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُکُمْ بِهٖ." اور تاکہ مطمئن ہوجائیں تمہارے دل اس خوشخبری کے ساتھ اور تمہارے دلوں کو سکون ہوجائے، چنانچہ سورۂ الانفال میں فرمایا گیا ہے:

"اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَةِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ ......الخ." (الانفال:۱۲)

ترجمہ:...... "جب اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو وحی فرما

رہے تھے یعنی حکم فرما رہے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم ذرا
مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرو، میں کافروں کے دلوں میں
رعب ڈال دوں گا۔''

تم لوگ ذرا مسلمانوں کو ثابت قدم رکھو اور ان کے دلوں کو اطمینان دلاؤ تو ملائکۃ اللہ کے آثار کی وجہ سے مسلمان اتنے بہادر اور اتنے جری ہوگئے کہ پہاڑوں سے ٹکرا جائیں، کافر کیا ہوتے ہیں؟ یہ مقصد تھا فرشتوں کو نازل کرنے کا تا کہ تمہارے دلوں کو ثبات نصیب ہو، اطمینان ہو، تمہاری پریشانی جاتی رہے، تم پر سکینت نازل ہوجائے، ''وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ.'' باقی جہاں تک مدد کا تعلق ہے وہ صرف اللہ رب العزت کی جانب سے ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا: ''اور نہیں ہوتی مدد مگر اللہ کی جانب سے، جو بڑا زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔'' اس کو تو فرشتوں کی بھی ضرورت نہیں ہے اور تمہاری بھی ضرورت نہیں ہے۔

غزوات سے مقصد:

یہ دنیا دارالابتلاً ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی غزوات میں مجاہدے کروائے گئے اور آپ کو صدمات بھی پہنچے، دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے، زخم بھی لگے، یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفع درجات کے لئے اور یہ بتانے کے لئے کہ یہ راستہ مجاہدے کا راستہ ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو محتاج نہیں ہے قلوب کو پھیر سکتے ہیں، وہ بڑے زبردست بھی ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ حکیم بھی ہیں، اپنی حکمت کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں، تمہاری محدود عقل کے مطابق نہیں، ''لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا.'' اللہ تعالیٰ نے ایسا اس لئے کیا تا کہ قطع کردے، ''قطع'' کے معنی کاٹ ڈالنا، تا کہ کاٹ ڈالے، اور ''طرف'' کے معنی حصہ کے ہیں، تا کہ کاٹ ڈالے کافروں کے ایک حصے کو، مطلب یہ ہے کہ ان کی جماعت میں سے ایک حصے کو ہلاک

کردے، قتل کردے، ختم کردے، چنانچہ جنگ بدر میں موٹے موٹے کافر اللہ تعالیٰ نے قتل کروائے جو کہ کفر کے رئیس تھے، تو گویا یوں کہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں سر کاٹ دیا تھا اس لئے قطع کا لفظ یہاں استعمال فرمایا تاکہ کاٹ ڈالے ''اَوْ يَكْبِتَهُمْ.'' یا ان کو نیچا کردے، ناکام کردے، ذلیل کردے، ''فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ.'' وہ بے مراد ہوکر لوٹیں۔

سمجھنے کی باتیں:

اب یہاں پر ایک دو باتیں مزید سمجھنے کی ہیں وہ یہ کہ میں نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کی تین صفتیں ذکر فرمائی ہیں، جن کو آسمان سے نازل فرمایا گیا:

۱:......سورۂ الانفال میں ایک ہزار فرشتوں کے لئے ''مردفین'' کا لفظ آیا ہے، ''مردفین'' کے معنی پرہ باندھ کر آئیں گے، لگاتار آئیں گے، اور جب فرشتے پے در پے آتے ہوئے محسوس ہوں گے تو مسلمانوں کو تقویت زیادہ ہوگی۔

۲:......اور تین ہزار فرشتوں کے لئے فرمایا گیا: ''منزلین'' جن کو آسمان سے نازل کیا جائے گا، اس کا نکتہ میں عرض کرچکا ہوں، ایک تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے یہ خدمت زمین کے فرشتوں سے نہیں لی بلکہ آسمان سے فرشتے بھیجے، یہ خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ عنایت تھی۔

مقربین سے مقربین کی مدد:

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ آسمان کے فرشتے ملائکہ مقربین کہلاتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدد کے لئے ملائکہ مقربین کو نازل فرمایا، کوئی شک نہیں کہ یہاں مقربین انسان موجود تھے۔

کائنات میں سب سے زیادہ مقرب ہستی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضراتِ اہل بدر سب سے زیادہ

مقربان خداوندی تھے، تو ان کی مدد کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقرب فرشتوں کو نازل فرمایا۔

وردی والے ملائکہ:

۳:......اور پانچ ہزار فرشتوں کے لئے ''مسومین'' کا لفظ آیا ہے، ''مسومین'' کا معنی خاص علامت والے، جس طرح کہ فوجی دستوں کے مختلف نشانات ہوتے ہیں، مختلف وردیاں ہوتی ہیں، مختلف ان کی علامتیں ہوتی ہیں، اسی طرح ان فرشتوں کی بھی مختلف علامتیں تھیں، مختلف وردیاں تھیں، احادیث میں آتا ہے کہ کچھ ملائکہ سفید عمامے پہنے ہوئے تھے، اور کچھ ملائکہ سیاہ عمامے پہنے ہوئے تھے، اور کچھ ملائکہ زرد عمامے پہنے ہوئے تھے، گویا اللہ تعالیٰ نے ان کے مختلف طبقات بنادیئے تھے اور ہر ایک کی الگ الگ علامت مقرر کردی تھی، اس لئے فرمایا: ''مسومین'' ان پر نشان لگے ہوئے ہوں گے، نشان زدہ ہوں گے، یعنی ان کی خاص وردی اور خاص علامت ہوگی۔

انبیاءؑ اور امتیوں کے ایمان کا فرق!

اور دوسری بات یہ سمجھنے کی ہے کہ مسلمان کا عقیدہ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے مدد آتی ہے، لیکن بشریت کی بنا پر اور ظاہری اسباب کی بنا پر آدمی کو اس وقت اطمینان قلب ہوتا ہے جبکہ کچھ ضروری اسباب بھی مہیا ہوں اور حضرات انبیاءؑ کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام باوجود اس کے کہ ان کا تعلق حق تعالیٰ شانہ کی ذات کے ساتھ بہت ہی قوی ہوتا ہے، غیر نبی کے ایمان و یقین کو انبیاءؑ کے ایمان و یقین کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں ہے، خصوصاً سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان اور ان حضرات کی نظر اسباب پر نہیں ہوتی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کا اعتماد علی اللہ:

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصہ پیچھے گزر چکا ہے کہ جب

نمرود نے ان کو آگ میں ڈالا تھا تو آگ میں ڈالے جانے سے ایک لمحہ پہلے جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے پاس پہنچے اور عرض کیا: ''مدد کرسکتا ہوں!'' فرمایا: ''بھیجے ہوئے آئے ہو یا اپنے آپ آئے ہو؟'' کہا کہ: ''بھیجا تو نہیں گیا لیکن اجازت لے کر آیا ہوں۔'' فرمایا: ''پھر تمہاری ضرورت نہیں ہے!''

غرض یہ ہے کہ ان حضرات کا ایمان تو اتنا قوی ہوتا ہے کہ اسباب و وسائل پر بالکل ان کی نظر نہیں ہوتی، انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جانتے ہیں کہ کرنے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں لیکن حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم پوری امت کے لئے ہوتی ہے اور امت میں چونکہ طاقتور بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی ہوتے ہیں، قوی الایمان بھی ہوتے ہیں اور ضعیف الایمان بھی ہوتے ہیں، اعلیٰ درجے کے مضبوط طبیعت کے مالک بھی ہوتے ہیں اور چھڑولک قسم کے آدمی بھی ہوتے ہیں، اس لئے حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ضعفائے امت کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، تو ملائکہ کا آسمان سے نازل کیا جانا یہ اس لئے تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں، تاکہ تمہارے دل مطمئن ہوجائیں اور تمہیں خوشخبری ہوجائے کہ فرشتے نازل ہو رہے ہیں ہم تنہا نہیں ہیں، اگر فرشتے نازل نہ کئے جاتے تو تم سمجھتے کہ ہم اکیلے ہیں۔

یہاں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اسباب کو ترک نہیں کرنا چاہئے اور قوی آدمی کو ضعفائ کی رعایت کرتے ہوئے چلنا چاہئے، اپنی قوت کے مطابق عمل درآمد نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کی رعایت کرتے ہوئے عمل کرنا چاہئے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

عقائد میں
حق و باطل کا معرکہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

۱:...... "عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: مَا مِنْکُمْ اِلَّا ضَیْفٌ وَمَالُہٗ عَارِیَۃٌ وَالضَّیْفُ مُرْتَحِلٌ وَالْعَارِیَۃُ مُؤَدَّاۃٌ اِلٰی اَھْلِھَا." (حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۱۳۴)

۲:...... "عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ: اَتَاہُ رَجُلٌ، فَقَالَ: یَا اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ! عَلِّمْنِیْ کَلِمَاتٍ جَوَامِعَ نَوَافِعَ. فَقَالَ: اُعْبُدِ اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکْ بِہٖ شَیْئًا، وَزُلْ مَعَ الْقُرْآنِ حَیْثُ زَالَ وَمَنْ جَاءَکَ بِالْحَقِّ فَاقْبَلْ مِنْہُ وَاِنْ کَانَ بَعِیْدًا بَغِیْضًا وَمَنْ جَاءَکَ بِالْبَاطِلِ فَارْدُدْ عَلَیْہِ وَاِنْ کَانَ حَبِیْبًا قَرِیْبًا."(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۱۳۴)

۳:...... "عَنِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اَلْحَقُّ ثَقِیْلٌ مُرِیٌّ وَالْبَاطِلُ خَفِیْفٌ وَبِیٌّ وَرُبَّ شَھْوَۃٍ تُوْرِثُ حُزْنًا طَوِیْلًا." (حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۱۳۴)

ترجمہ:......''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے ارشاد فرمایا کہ: تم میں سے ہر شخص مہمان ہے اور اس کا مال عاریت کا ہے، مہمان کوچ کرنے والا ہے اور عاریت یعنی مانگے کی چیز اس کے مالکوں کو واپس کردی جائے گی۔''

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ: اے ابوعبدالرحمٰن! مجھے چند کلمات کی تعلیم دیجئے جو بہت جامع اور نافع ہوں۔ ارشاد فرمایا کہ: اللہ کی عبادت کیا کر، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا اور قرآن کے ساتھ چل جس طرف وہ چلے اور جو شخص تیرے پاس حق بات کو لے کر آئے اس کو قبول کر، اگرچہ وہ کتنی دور کا اور ناپسندیدہ آدمی کیوں نہ ہو اور جو شخص تیرے پاس باطل لے کر آئے اس کو واپس لوٹا دے اگرچہ وہ تیرا دوست اور قریبی ہی کیوں نہ ہو۔''

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ: حق بوجھل ہے لیکن خوشگوار ہے اور باطل ہلکی پھلکی چیز ہے لیکن بدہضمی پیدا کرتی ہے اور بہت سی شہوتیں ایسی ہیں جو طویل غم کو جنم لیتی ہیں۔''

دنیا مہمان خانہ:

پہلے ارشاد میں اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ تم میں سے ہر آدمی یہاں

دنیا میں مہمان ہے ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آیا، خواہ کسی کو عمر نوح عطا کردی جائے، اس کو بھی بہرحال یہاں سے رخصت ہونا ہے اور اس کے پاس جتنا مال ہے وہ اس کا اپنا نہیں ہے، ذاتی نہیں ہے، بلکہ مانگ کرلیا ہوا ہے، مہمان کو رخصت ہوجانا ہے اور یہ مانگے کی چیز اس کے مالکوں کو واپس کردی جائے گی۔

سامان سو برس کا:

یہی دنیا کی حقیقت ہے، یہاں آنے کے بعد آدمی ایسا تصور بٹھالیتا ہے جیسا کہ مجھے یہاں ہمیشہ ہی رہنا ہے، ''سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں۔'' اور اپنے مال کو اپنا ذاتی مال سمجھتا ہے، یہ دونوں غلط فہمیاں یہاں پیدا ہوجاتی ہیں، اور ہم میں سے اکثر لوگوں کو ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہاں کی چیزوں میں رغبت رکھی ہے، آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میں ہمیشہ رہوں گا۔

سب کچھ یہاں رہ جائے گا:

جیسے جوانی ہمیشہ نہیں رہتی، اسی طرح آدمی کی عمر بھی ہمیشہ نہیں رہتی، جوانی کے زمانے میں آدمی کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ مجھے بوڑھا بھی ہونا ہے اور یہ قویٰ مجھ سے سلب کرلئے جائیں گے، صحت اور عمر کے زمانے میں آدمی کو خیال ہی نہیں رہتا کہ مجھے مرنا بھی ہے، حق تعالیٰ شانہ نے یہاں کی چیزوں کو ہماری ملک بنادیا ہے، فلاں آدمی مالک ہے، فلاں آدمی مالک ہے لیکن ساتھ ہی قرآن کریم نے فرمایا دیا: ''متاع الحیوۃ الدنیا۔'' یہ دنیا کی زندگی میں نفع اٹھانے کا سامان ہے، حقیقتاً تم اس کے مالک نہیں ہو، نفع اٹھالو، جتنا اٹھانا ہے، اس کی تمہیں اجازت دی گئی ہے۔

اور یہ بہت واضح بات ہے کہ جس کے پاس اپنا ذاتی مال ہو وہ اس کو جہاں چاہے لے جاسکتا ہے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ جب ہم مرجاتے ہیں تو کچھ بھی ساتھ نہیں لے جاتے، نہ مکان ساتھ لے جاتے ہیں، نہ اور چیزوں کو ساتھ لے جاتے

ہیں، ہاں اپنی زندگی میں پہلے آگے بھیج دیں تو دوسری بات ہے۔

ہمارا تصورِ آخرت:

جب بھی دنیا اور آخرت کا مقابلہ ہوتا ہے تو ہماری ترجیح دنیا ہوتی ہے آخرت نہیں، ہمارا تصور یہ ہے کہ اگر آخرت ہماری دنیا میں کوئی نقصان نہ کرے تو بجا ہے، درست ہے، کوئی حرج نہیں، آخرت بھی چلے اور دنیا بھی چلے، لیکن جہاں کہیں آخرت ہماری دنیا پر ضرب لگاتی ہو وہاں آخرت کی خاطر دنیا کے نقصان کو ہم برداشت نہیں کرتے، الّا ماشاءاللہ!

آخرت کے یقین کی کمزوری:

جنت و جہنم اور جزا و سزا اخروی پر ہمارا یقین کمزور ہوگیا ہے، اور یہ اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ بے چارہ حس و حرکت ہی نہیں کرتا، اتنا بیمار ہے جیسے تپ دق کا مریض جو آخری درجہ میں ہو، وہ بے چارہ اتنا کمزور ہوجاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں بھی حرکت نہیں کرتے، زندہ ہے، روح اس میں بھی موجود ہے، لیکن وہ اتنی کمزور اور مضمحل ہوگئی ہے کہ اس کے لئے کوئی حس و حرکت نہیں، ایسے ہی ہمارے یقین بھی کمزور اور بیمار ہوگئے ہیں۔

دنیاوی نفع و نقصان پر یقین:

اگر یقین قوی ہو تو آدمی آخرت کی ہلاکت سے بھی ایسے ہی بچتا، جیسے دنیا کی ہلاکت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، مثلاً ایک آدمی کے سامنے آگ جل رہی ہو اور اس شخص کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں، تو وہ کبھی بھی اس آگ میں چھلانگ نہیں لگائے گا، اگر کوئی اسے کہے کہ ایک ہزار روپے دیں گے، اس آگ میں چھلانگ لگادو، تو وہ کہتا ہے: نہ بھائی! اگر اس سے کہیں کہ اچھا تمہیں امریکہ کا صدر بنادیں گے، چھلانگ لگادو، تو وہ کہے گا کہ جب میں چھلانگ لگادوں گا تو سلطنت کس کو دو گے؟ تم بھی

میرے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ اسی طرح اسے کہیں کہ تمہیں گورنر بنادیں گے، وزیراعظم بنادیں گے، صدر بنادیں گے یا اتنے پیسے دیں گے وغیرہ، لیکن کبھی کوئی عقلمند آدمی آگ میں چھلانگ لگانے کے لئے تیار نہیں ہوگا، کیونکہ اسے یقین ہے کہ جل جاؤں گا، مگر جن اعمال پر اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دوزخ کی وعیدیں سنائی ہیں، ان اعمال کو ہم کرتے رہتے ہیں، آخر کیا بات ہے؟ لگتا ہے کہ ہمیں ان ارشادات پر کامل یقین نہیں۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا ہے: "اَلْیَقِیْنُ الْاِیْمَانُ کُلُّہٗ." (بخاری ج:۱ ص:۶) (ایمان تو نرا یقین کا نام ہے)۔

گناہوں کا اثر:

جہاں تک گناہوں کی ہلاکت خیزی کا تعلق ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ جب آدمی زنا کرتا ہے، چوری کرتا ہے یا اور کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو ایمان دل سے نکل کر سائبان کی طرح ہوجاتا ہے، اس وقت دل میں ایمان نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے:

"لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا یَسْرِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ."

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۵۶)

ترجمہ:..... "زانی جب زنا کرتا ہے، مؤمن نہیں ہوتا، چور جب چوری کرتا ہے، مؤمن نہیں ہوتا۔"

دوسرے علمائ تو اس کی تاویل کرتے ہیں، لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس وقت ایمان دل سے نکل کر سایہ فگن ہوجاتا ہے، عین اس حالت میں مرجائے تو بے ایمان مرے گا، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے!

یقین و استحضار کی ضرورت:

حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے کسی صاحب کو بدنظری کے لئے علاج لکھا کہ جب بھی نامحرم پر نظر پڑے، تو فوراً نظر کو روک لیا کرو، جب بھی نامحرم سامنے آئے تو فوراً نظر نیچی کرلو۔ اس آدمی نے دوبارہ لکھا کہ حضرت! بات یہ ہے کہ عمل تو کرتا ہوں، لیکن پوری طرح اس پر عمل نہیں ہوتا ہے، پھر بھی دیکھ لیتا ہوں۔ حضرتؒ نے جواب میں ایک لفظ لکھ دیا کہ: ''اگر میں تمہارے پاس ہوں تو اس وقت بھی دیکھو گے؟'' اس نے جواب میں لکھا کہ: ''حضرت! بس سمجھ میں آگئی بات۔''

اپنے شیخ و مرشد کے سامنے بھی اس جرم کا ارتکاب کرو گے؟ نہیں! حالانکہ شیخ و مرشد بے چارہ غریب کیا کرے گا؟ وہ خود بہت ہی زیادہ کمزور ہے، جب اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، تو پھر کیسے ارتکاب کرتے ہو گناہ کا؟

استحضار کی مشق:

اسی لئے پہلے زمانے میں حضرات صوفیا اسی کی مشق کرواتے تھے کہ اپنے مریدوں کو خلوت میں اور تنہائی میں بٹھا دیتے تھے کہ کوئی تمہارے پاس نہ آئے اور کامل یکسوئی کے ساتھ تصور کرو کہ اللہ مجھے دیکھتا ہے۔

جنید بغدادیؒ کا استحضار:

حضرت جنید بغدادیؒ ابھی نابالغ تھے، ان کی والدہ ماجدہ نے اپنے بھائی جان حضرت سعد بن عبداللہ تسطریؒ سے کہا کہ: بھائی جان! اس بچے کی بھی کچھ ذرا تربیت کیا کیجئے! فرمایا: بہت اچھا! جنیدؒ سے کہا کہ بیٹا آج سے ہر چیز، ہر موقع، ہر وقت اور ہر لمحہ یہ خیال کیا کرو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اور پھر آٹھ دن کے بعد مجھے بتاؤ۔ آٹھ دن کے بعد ماموں جان کی خدمت میں گئے، کہنے لگے کہ: حضرت! اور تو خیر ہے، لیکن پیشاب، پاخانہ بھی مشکل ہوگیا ہے، کیسے کروں؟ اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا

استحضار اتنا بڑھ گیا ہے کہ ستر کھولنا بھی مشکل ہوگیا، ماموں جان نے فرمایا بس تمہارا کام بن گیا، ہوگیا کام۔

یقین بڑی دولت ہے:

اگر یہ یقین دل میں پیدا ہوجائے تو سب سے بڑی دولت یہی ہے اور یہی حقیقت میں ایمان ہے، اور جہاں غفلت پائی جاتی ہے، وہاں ایمان کے اوپر گرد وغبار آجاتا ہے، پردہ آجاتا ہے، بادل آجاتے ہیں، تم دیکھتے نہیں ہو کہ جب دوپہر کا وقت ہو اور بادل سورج کے سامنے آجائے تو سورج بھی چھپ جاتا ہے، اس کی روشنی اور اس کی تپش ختم ہوجاتی ہے، اسی سے سوچ لو کہ جب گناہوں کا پردہ، معاصی کا پردہ، غفلت کا پردہ، ایمان پر آئے گا تو ایمان کی نورانیت کیسے باقی رہے گی؟ اور یقین کو وہ کیفیت کیسے حاصل رہے گی؟ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح یقین نصیب فرمائے۔

ایک گونہ غفلت بھی نعمت:

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس سرہ ارشاد فرماتے تھے کہ: یک گونہ غفلت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، ایک درجہ میں تھوڑی غفلت رہے، یہ بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، ورنہ میاں! ہر وقت استحضار رہے تو جینا بھی مشکل ہوجائے، حق تعالیٰ کی عنایتیں ہیں کہ انعامات عطا فرماتے ہیں، تو غلاف میں لپیٹ کر عطا فرماتے ہیں۔

ایمانیات میں شک کفر ہے:

اس کے بعد فرمایا: "وَالرَّيْبُ مِنَ الْكُفْرِ." اور حقائق الٰہیہ اور ایمانیات میں شک وشبہ کرنا یہ بھی کفر ہے۔

شک ویقین کے درجے:

تین درجے ہوتے ہیں، ایک یہ کہ کسی چیز کے ہونے کا یقین ہو، اور ایک یہ

کہ نہ ہونے کا یقین ہو، اور ایک یہ کہ تردّد کی کیفیت ہو، یعنی نہ یقین ہے، نہ بے یقینی ہے، اس درمیانی حالت کو شک کہتے ہیں اور اگر یقین غالب آجائے، یعنی ایک طرف کو جھک جائے تو اس کو غلبہ ظن کہتے ہیں، جبکہ اس صورت میں دوسری طرف کا بھی کچھ احتمال ہوتا ہے کہ بھئی یہ بھی ہوسکتا ہے، ورنہ غالب خیال تو یہی ہے، اس کو کہتے ہیں غلبہ ظن، اور اگر ایک طرف کا اتنا یقین بڑھ جائے کہ دوسری طرف کا احتمال ہی نہ ہو، تو اس کو کہتے ہیں عقیدہ، جب ہم کہتے ہیں کہ میرا عقیدہ یہ ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ: ''اَلْيَقِيْنُ الْجَاذِبُ لَا يَقْبَلُ التَّشْكِيْكَ مُشَكِّكٍ.'' وہ پختہ یقین کہ کسی شک میں ڈالنے والے کی تشکیک کو بھی قبول نہیں کرتا، ایسا کچا یقین نہیں ہے کہ کوئی وسوسہ ڈالے اور شبہ ڈالے تو ختم ہوجائے، یہ ہے عقیدہ۔

جہالتِ جدیدہ کی ظلمت:

اب لوگوں کے عقائد متزلزل ہوگئے ہیں، نئی ہوا کی وجہ سے، نئی روشنی یا نیا اندھیرا کہہ دو، لوگ تو اسے نئی روشنی کہتے ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ جاہلیت جدیدہ کی ظلمت ہے، تمہیں اگر روشنی نصیب ہوتی تو تم حقائق کو ان کی اصل حالت پر دیکھتے۔ آگے آرہا ہے: ''العقد اللازم الجازم الذی لا یقبل التشکیک مشکک.'' اس کا نام عقیدہ ہے، یعنی ایک طرف کا اتنا پختہ یقین ہے کہ دوسری طرف کا احتمال ہی نہیں، اور اس میں کسی شک ڈالنے والے کی شک اندازی کی گنجائش ہی نہیں، جیسے ''لا الٰہ الا اللہ'' (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) کیا اس میں ادنیٰ بال برابر بھی احتمال ہے دوسری طرف کا؟ کہ نعوذ باللہ ہوسکتا ہے کہ خدا کوئی دوسرا بھی ہو؟ اور ''محمد رسول اللہ'' (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) اس میں بھی بال برابر شک نہیں، بال کا بھی لاکھواں حصہ کرلو، کیا اس کا احتمال ہے کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسول اور نبی نہ ہوں؟ نہیں، نہیں! بالکل اس کا شک نہیں! اسی کا نام ہے یقین اور عقیدہ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ."
(ترمذی ج:۲ ص:۴۵)

ترجمہ:....."میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔"

یہ ایسی حقیقت اور ایسا یقین ہے کہ کسی مسلمان کا دل اس کے خلاف کو قبول ہی نہیں کرسکتا۔

مدعیٔ نبوت سے معجزہ کا مطالبہ:

اسی لئے ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ایک آدمی نے نبوت کا دعویٰ کیا، لوگ پوچھتے ہیں کہ تیرا معجزہ کیا ہے؟ فرمایا اس سے معجزہ کا سوال کرنے والے بھی کافر ہیں! کیوں؟ اس لئے کہ معجزہ ہوتا ہے دلیل نبوت، اور کسی شخص میں معجزے کا احتمال ہو تو نبوت کا احتمال ہے، اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، آپؐ کے بعد کسی کے نبی بننے کا احتمال ہی نہیں تو معجزے کا کیا سوال؟ معجزہ کا مطلب یہ ہے کہ نعوذ باللہ! یہ کوئی شعبدہ دکھادے گا، تو ہم اس کو نبی مان لیں گے؟

مدعیٔ نبوت کے صدق و کذب کے لئے استخارہ بھی کفر ہے:

غلام احمد قادیانی نے اور دوسرے جھوٹوں نے لوگوں کا ایمان اسی طرح برباد کیا ہے، شیطان خواب میں بزرگ کی صورت میں آکر کہتا ہے، بہت ہی نورانی شکل میں آکر کہتا ہے کہ: "میں تمہیں خوشخبری دینے کے لئے آیا ہوں کہ غلام احمد سچا ہے، اس کو مان لو۔" صبح اٹھ کر قادیانی ہوگیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ! نعوذ باللہ! استغفر اللہ! اللہ کی پناہ! اور غلام احمد قادیانی کے زمانے میں مرزائی بہت تلقین کیا کرتے تھے، اب تو پتہ نہیں یہ تلقین کرتے ہوں گے کہ نہیں؟ چنانچہ جب وہ کسی مسلمان سے ملتے تو

کہتے کہ استخارہ کرلو، مرزا صاحب کے بارے میں استخارہ کرلو، اور استخارہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں پہلو برابر ہیں، میں کس کو اختیار کروں؟ اللہ سے مشورہ کرنا ہے۔ کبھی کسی نے مشورہ نہیں دیا کہ استخارہ کرلو کہ میں گو کھالوں کہ نہ کھاؤں؟ کیا اس بارے میں کبھی کسی نے استخارہ کیا؟ کیوں نہیں کیا؟ کیا کبھی کسی نے استخارہ کیا کہ میں نماز پڑھوں کہ نہ پڑھوں؟ جن چیزوں کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دوٹوک فیصلہ فرمادیا ہو، وہاں استخارہ کی کیا گنجائش؟ استخارہ تو اس چیز میں ہوتا ہے کہ جس میں ہم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے کہ یہ خیر ہے یا نہیں؟ تو جب تم نے قادیانی کے بارے میں یا کسی اور بے ایمان کے بارے میں استخارہ کیا، تو ایمان تو تمہارا اسی وقت سلب ہوگیا۔ "وَالرَّیْبُ مِنَ الْکُفْرِ." اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شک وشبہ کا ہوجانا، یہ کفر ہے، اب لوگوں کو نہ تو علم صحیح ہے، نہ اللہ کے بندوں کے پاس جاکر کبھی بیٹھے، نہ عقل، نہ ایمان، نہ علم، نہ عمل، اللہ کی مخلوق اسی لئے گمراہ ہورہی ہے۔

دل کا اندھا پن:

"وَشَرُّ الْعَمٰی عَمَی الْقَلْبِ." (درمنثور ج:۵ ص:۲۲۵) اور سب سے بدترین اندھا پن، دل کا اندھا ہوجانا ہے، دل اندھے ہوجائیں، نعوذ باللہ! جیسا کہ قرآن کریم میں ہے کہ:

"فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ." (الحج:۴۶)

بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوئیں، آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں، لیکن سینوں کے اندر جو دل ہوتے ہیں وہ اندھے ہوگئے ہیں، اللہ تعالیٰ دلوں کے اندھے پن سے محفوظ فرمائے، جیسا کہ آدمی کو ظاہری بینائی سے چیزیں نظر آتی ہیں، سیاہ اور

سفید کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اور جیسا کہ یہ ظاہری بینائی مختلف درجات رکھتی ہے، بعض لوگوں کی نظر اتنی تیز ہوتی ہے کہ دن میں تارے دیکھ لیتے ہیں، اور بعض کی اتنی کمزور ہوتی ہے کہ تیسویں کا چاند بھی نظر نہیں آتا، پھر کسی کو دور کی چیزیں نظر نہیں آتیں، نزدیک کی نظر آتی ہیں، اور کسی کو نزدیک کی چیزیں نظر نہیں آتیں، دور کی چیزیں صحیح نظر آتی ہیں، مختلف درجات ہیں، مختلف کیفیات ہیں، کچھ یہی قصہ دل کے اندھے پن کا بھی ہے، دلوں کے اندر بھی روشنی ہوتی ہے، جیسا کہ آنکھوں کے اندر روشنی ہوتی ہے، اور دلوں کے اندر بھی روشنی کم و بیش ہوتی ہے، جیسا کہ آنکھوں کے اندر بینائی کم و بیش ہوتی ہے، ظاہر کی روشنی سے چیزوں کو دیکھا جاتا ہے، رنگوں کی پہچان ہوتی ہے، اور دل کی روشنی سے حق و باطل کو پہچانا جاتا ہے۔

اور جب ظاہری بینائی اور آنکھوں کی روشنی نہ رہے تو آدمی کو نابینا کہتے ہیں، اور جب دل کی روشنی نہ رہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ." (البقرۃ:۷) (مہر لگادی اللہ نے ان کے دلوں پر)۔ "كَلَّا بَلْ رَّانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ." (المطفّفین:۱۴) (سن رکھو کہ ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے، ان کی بدعملیوں کی وجہ سے)۔ یعنی بدعملی نے ماؤف کردیا ہے دلوں کو۔ اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے، اللہ تعالیٰ دل کی بصیرت نصیب فرمائے۔

دونوروں کی ضرورت ہے:

علماً فرماتے ہیں کہ دونور ملتے ہیں، تو راستہ نظر آتا ہے، ایک آنکھوں کے اندر کا نور، اور ایک باہر کا نور، آدمی کی نظر صحیح ہے، لیکن اگر اندھیرا ہو تو نظر نہیں آتا، کیونکہ باہر کا نور نہیں، اور باہر کا نور موجود ہو لیکن آنکھوں میں بینائی نہ ہو تو نظر نہیں آتا کیونکہ اندر کا نور نہیں ہے، اسی طرح دل کی بصیرت کے لئے بھی دونوروں کی ضرورت ہے، ایک دل کا نور ایک باہر کا نور، دل کا نور وہ کیفیت ہے جو اللہ تعالیٰ قلب میں القاً

فرماتے ہیں، جیسا کہ آنکھوں میں روشنی پیدا فرماتے ہیں، اور باہر کا نور انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی لائی ہوئی روشنی ہے، اور انبیا کرام کے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد تو آفتاب نبوت طلوع ہے، سورج چمک رہا ہے، دوپہر کی روشنی ہے۔

آفتابِ نبوت کی شعاعیں:

شاہ ولی محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: دوسروں کے چراغ تو گل ہوگئے لیکن ہمارا آفتاب کبھی بے نور نہیں ہوگا، قیامت تک چمکتا رہے گا، تو باہر آفتاب نبوت کی شعاعیں موجود ہیں، روشنی موجود ہے، دوپہر ہے، دن چڑھا ہوا ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ دلوں میں روشنی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نورِ قلب عطا فرمائے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم والی روشنی ہمارے لئے انشاء اللہ ہدایت و رحمت کا ذریعہ بنے گی۔

جامع اور نافع نصیحت:

دوسرے ارشاد میں فرماتے ہیں کہ ایک صاحب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ: اے ابوعبدالرحمٰن! مجھے چند کلمات تعلیم فرمایئے جو بہت جامع ہوں اور نافع ہوں، مجھے ان کلمات سے نفع پہنچے۔ ارشاد فرمایا کہ بنیادی بات یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن جس طرف چلے، اس طرف چلو، یعنی قرآن کریم جس قسم کا حکم دے اس حکم کی تعمیل کرو۔

حق قبول کرو:

اور تیسری بات یہ کہ جب کوئی شخص تمہارے سامنے حق بات پیش کرے تو اس کو قبول کرلو، چاہے وہ آدمی کتنا اجنبی ہو، دور کا ہو، تمہاری اس کے ساتھ جان

پہچان نہ ہو، یا وہ آدمی کتنا ہی ناپسندیدہ ہو، تمہیں اس سے نفرت اور بغض ہو لیکن اگر وہ حق بات کہے تو قبول کرلو، اور بمقابلہ اس کے جو شخص تمہارے سامنے باطل پیش کرے اس کو قبول نہ کرو بلکہ اس پر رد کردو، اس کے منہ پر مار دو، چاہے وہ کتنا ہی قریبی دوست ہو، اور کتنا ہی قریبی رشتہ دار ہو۔

قبولِ حق کا نتیجہ خوشگواری:

اور تیسرے فقرے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ حق ثقیل ہوتا ہے، یعنی بوجھل ہوتا ہے، لیکن ہوتا خوشگوار ہے، اس کا نتیجہ بہت اچھا نکلتا ہے، ایک کھانا جب آدمی اس کو کھاتا ہے تو بدذائقہ ہوتا ہے، کھایا نہیں جاتا، لیکن صحت کے لئے بہت مفید ہے، جیسے کڑوی دوائی ہوتی ہے، جیسے کہ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ: ’’شفا بایدت داروئے تلخ نوش۔‘‘ اگر تمہیں شفا چاہئے تو کڑوا دارو استعمال کرو، یہی مثال حق کی ہے کہ حق پر عمل کرتے ہوئے اور اس کو قبول کرتے ہوئے بڑی تکلیف ہوتی ہے، بہت دشواری ہوتی ہے، اور وہ کسی طرح بھی گلے سے نیچے نہیں اترتا، لیکن ’’مری‘‘ ہوتا ہے، یعنی خوشگوار ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس کا نتیجہ بہت نفیس نکلتا ہے۔

باطل کی ظاہری لذت مہلک ہے:

اس کے مقابلہ میں باطل بہت لطیف ہوتا ہے، بڑی آسانی سے اس کو نیچے اتارا جاسکتا ہے لیکن وہ وبال جان ہوتا ہے، اس سے پیٹ کی خرابی پیدا ہوتی ہے، تخمہ ہوجاتا ہے، بدہضمی ہوجاتی ہے، ہیضہ ہوجاتا ہے، اور بالآخر اس سے موت واقع ہوجاتی ہے، یہی مثال باطل کی ہے کہ یہ زہر آلود کھانا ہے، زہر آلود حلوہ ہے، بہت ہی لذیذ معلوم ہوتا ہے، لیکن نادان نہیں سمجھتا کہ اس کے اندر زہر ملا ہوا ہے، بہت مزیدار سمجھ کر اس کو کھا رہا ہے، وہ حلق سے نیچے اترے گا تو انتڑیاں کاٹنا شروع کردے گا۔

حق و باطل کا معرکہ:

یہ حق اور باطل دو متقابل چیزیں ہیں، ''حق'' اللہ کی جانب سے ہے اور ''باطل'' کی تعلیم شیطان دیتا ہے، حق اور باطل کا معرکہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے چلا آرہا ہے، اور یہ لڑائی زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبہ میں ہے، عقائد کے باب میں بھی حق اور باطل ہے کہ کون سا عقیدہ رکھا جائے اور کون سا نہ رکھا جائے؟ یہاں حق اور باطل کا معرکہ ایسا ہے کہ جو حق کو اختیار کرے گا، نجات پائے گا اور جو باطل کو اختیار کرے گا، وہ ہمیشہ کے لئے ہلاک ہوجائے گا۔ یہاں حق کو قبول کرنا بہت مشکل ہے، اور باطل کو قبول کرنا بہت آسان ہے۔ آپ اندازہ فرمالیجئے کہ اہل اسلام کتنے ہیں؟ اور ان کے مقابلے میں اہل باطل کتنے ہیں؟ اور ان کے کیا کیا نظریات ہیں؟ اور انہوں نے ان نظریات کو کیوں قبول کیا؟ بت پرست قومیں اپنے ہاتھ سے پتھر تراشتی ہیں اور ان کو سجدہ کرتی ہیں، ان کو نفع اور نقصان کا مالک سمجھتی ہیں، ان کو داتا اور دیوی سمجھتی ہیں، الگ الگ بتوں کے لئے الگ الگ محکمے تجویز کر رکھے ہیں، چنانچہ ان کا ایک ان داتا ہے، روٹی دینے والا، ایک جل داتا ہے، پانی دینے والا، ایک شفا کی دیوی ہے، شفا دینے والی، وغیرہ وغیرہ، حالانکہ اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے پتھر کے بت ہیں، ''لَا یَنفَعُ وَلَا یَضُرُّ.'' نہ کسی کو نفع پہنچائیں نہ نقصان، لیکن شیطان نے عقیدے میں یہ بات داخل کردی کہ یہی نفع و نقصان رکھتے ہیں۔

عیسائیوں کو شیطان کی پٹی:

عیسائیوں کو شیطان نے پٹی پڑھادی کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، نعوذ باللہ! استغفر اللہ! لا حول ولا قوۃ الا باللہ! اور ان کو صلیب پر لٹکادیا گیا، اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کے گناہوں کی گٹھری باندھ کر اپنے بیٹے کے سر پر رکھ دی اور اپنے بیٹے کو قربان کردیا، عیسائیوں کے یہاں یہ نجات کا مسئلہ ہے کہ جو شخص ''تثلیث'' کا

عقیدہ رکھے گا، تین خدا مانے گا، اس کی بخشش ہوجائے گی، اور جو شخص یہ عقیدہ نہیں رکھے گا اس کے لئے بخشش نہیں، اس کے لئے نجات نہیں ہے، اور کتنے مذاہب ہیں دنیا میں، یہ حق اور باطل کا معرکہ ہے۔

صراطِ مستقیم:

پھر جو فرقے اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان میں بھی حق اور باطل ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

''وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ.'' (الانعام:۱۵۳)

ترجمہ:...... ''اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے، سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کردیں گی۔''

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ہے میرا راستہ سیدھا، جرنیلی سڑک! ناک کی سیدھ جاتی ہے، اسلام کا راستہ اللہ تعالیٰ تک بالکل سیدھا جاتا ہے، اس میں کوئی کجی نہیں، کوئی نشیب و فراز نہیں، اور یہ وہ راستہ ہے جس پر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام علیہم السلام چلے، یہ وہ راستہ ہے جس پر تمام صدیقین چلے، تمام اولیاء اللہ چلے، بزرگانِ دین چلے، اکابر امت، مجددین ملت چلے، ائمہ دین چلے، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْبَيْضَاءِ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا.'' (اتحاف ج:۱ ص:۱۸۱) یعنی تمہیں ایک روشن راستے پر چھوڑ کر جارہا ہوں، اس کے دن اور رات ایک جیسے ہیں۔ رات کو چلو، دن کو چلو۔

گمراہی کی پگڈنڈیاں:

لیکن آج کتنی شاخیں نکل آئیں؟ کتنے نظریات گھڑ لئے گئے؟ اور شیطان نے کن کن راستوں سے لوگوں کی راہ ماری؟ عقل حیران ہوجاتی ہے۔

لوگوں کو راستہ مشتبہ ہوگیا:

میں معافی چاہوں گا! بہت سے لوگوں کے ذہن میں راستہ ہی مشتبہ ہوگیا ہے، اور کبھی کبھی اس کا اظہار اپنی زبان سے یوں کرتے ہیں کہ جی! مولوی لڑتے جھگڑتے ہیں، کس کے پیچھے چلیں؟ کس کو سچا سمجھیں؟ ان مسکینوں کے سامنے ابھی تک راستہ ہی واضح نہیں ہوا، چلیں گے کیا؟ راستہ تو چلنے کے لئے ہوتا ہے، راستہ بذات خود مقصود نہیں ہوتا، اس پر چلنا مقصود ہوتا ہے، آپ کو کسی جگہ جانا ہو اور آپ کو راستہ معلوم نہ ہو، آپ پوچھتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے نئے نئے نظریات ایجاد کرلئے، اپنے اپنے راستے الگ کرلئے، الگ الگ پگڈنڈیاں بنالیں، اور ایک عالم کا عالم اس حیرت میں مبتلا ہوگیا کہ کس راستے پر چلیں؟ ان بیچاروں کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ راستہ کیا ہے؟ اندازہ فرمائیے کہ حق و باطل کا معرکہ کتنا سخت ہے!!

صراطِ مستقیم کی نشاندہی:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے اور صحیح حدیث ہے کہ:

"عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ:
خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خطًّا، ثُمَّ قَالَ:
هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ، ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ،
وَقَالَ: هٰذِهٖ سُبُلٌ عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُوْ اِلَيْهِ
..... الخ." (مشکوٰۃ ص:۳۰)

ترجمہ:......"حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھا خط کھینچا اور اس کے دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی لکیریں بنادیں، پھر فرمایا: یہ جو میں نے لمبی لکیر کھینچی ہے، یہ سیدھا خط تو اللہ کا راستہ ہے، (حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے چلا آرہا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے چلا آرہا ہے، ہم تک پہنچا اور ہم سے آگے انشاءاللہ قیامت تک سیدھا جائے گا، کوئی ادھر ادھر اس میں موڑ نہیں۔ ناقل) اور یہ جو دائیں بائیں خطوط ہیں، یہ وہ راستے ہیں کہ ہر راستے پر شیطان موجود ہے، جو اپنی طرف بلا رہا ہے۔"

شیطان کے ایجاد کردہ راستے:

یعنی یہ وہ راستے ہیں جو شیطان نے ایجاد کئے ہیں، اس میں سے شاخیں نکال دیں اور جب چلنے والا چلتا ہے تو ہر موڑ پر ایک شیطان کھڑا ہے، پوچھتا ہے کہاں جانا ہے؟ اللہ تک پہنچنا ہے؟ جی راستہ ادھر جاتا ہے، وہ راستہ جو سیدھا جارہا ہے وہ چھوڑ دو، یہ راستہ جارہا ہے چند قدم آگے چلے، ایک موڑ پر اور شیطان مل گیا، پوچھتا ہے کہ کہاں جانا ہے؟ کہا: اللہ تک پہنچنا ہے، شیطان نے کہا: ادھر سے جاتا ہے، حق پر چلنا کتنا مشکل بنادیا ہے شیطان نے؟ حق کے راستے کو پانا اور حق اور باطل کا فیصلہ کرنا، کتنا مشکل بنادیا ہے؟ حالانکہ حق اتنا واضح ہے کہ نظر آرہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جارہے ہیں، صحابہ کرامؓ جارہے ہیں، اکابر امت کا قافلہ چل رہا ہے، لیکن شیطان لوگوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کبھی دائیں کا اور کبھی بائیں کا مشورہ دیتا ہے، اور یہ وہ راستے ہیں جو کھڈے میں جاکر گرتے ہیں، اور لوگ ایسے عجیب وغریب دلائل

پیش کرتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

طوفانِ بدتمیزی:

خاص طور پر موجودہ دنیا میں، کیونکہ لوگوں کی ہمتیں صرف دنیا کی طرف متوجہ ہوگئی ہیں، دین کا صحیح فہم ہی اٹھ گیا، جس کے منہ میں جو آتا ہے، بکتا ہے، اور اس کے نوک قلم پر جو آتا ہے لکھتا ہے، رسالے، اخبارات چھاپنے کے لئے تیار ہیں، ایسا لگتا ہے بدتمیزی کا ایک طوفان برپا ہے، کسی کو حق و باطل سے بحث ہی نہیں ہے، جو کچھ حضرت لکھ رہے ہیں بس وہی حق ہے، باقی سب باطل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پیش کیجئے، تو کہتے ہیں: غلط ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا حوالہ دیجئے تو وہ بھی قابل قبول نہیں ہے، مفسرین ہیں، محدثین ہیں، ائمہ دین ہیں، مجددین ہیں، ان کی نظر میں کسی کی کوئی قیمت ہی نہیں، اللہ مجھے معاف فرمائے۔

امام احمدؒ کو گمراہ کہنے والے، گمراہ ہیں:

میں نے مستقل طور پر ایک تحریر دیکھی ہے کہ امام غزالی رحمہ اللہ گمراہ تھے، مجدد الف ثانی رحمہ اللہ گمراہ تھے، ائمہ دین کو گمراہ کہا جارہا ہے، امام احمد بن حنبلؒ امام بخاریؒ کے استاد ہیں، ان کے زمانے سے آج تک ان کو اللہ تعالیٰ نے راہ مستقیم کا نشان منزل بنادیا ہے، ان کے بارے میں اکابرؒ فرماتے ہیں کہ جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ امام احمد بن حنبلؒ کی تنقیص کرتا ہے تو سمجھ لو کہ گمراہ ہے، اور یہی بات امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں بھی کہی گئی تھی کہ: ''امام ابوحنیفہؒ سے محبت نہیں رکھے گا مگر حق پرست آدمی، اور ان سے بغض رکھے گا مگر باطل پرست آدمی۔'' میں نے اپنی کتاب ''اختلاف امت اور صراط مستقیم'' میں یہ فقرہ باحوالہ نقل کیا ہے، تو خیر میں عرض کر رہا ہوں کہ آج ایک جماعت پڑھے لکھوں کی موجود ہے جو امام احمد بن حنبلؒ سے لے کر

آج تک تمام دنیا کو گمراہ کہتی ہے۔

حزب اللہ اور جماعت المسلمین:

یہ توحیدی پارٹی کیپٹن مسعود کی ہے، جو اپنے آپ کو ''حزب اللہ'' کے نام سے موسوم کرتی ہے، اور کراچی میں کیماڑی میں ان کا مرکز ہے، یہ کہتے ہیں گویا امام بخاریؒ صحیح مگر امام بخاریؒ کا استاد غلط، اور ایک ''جماعت المسلمین'' بنائے پھر رہے ہیں، ان کے نزدیک ساری دنیا غلط، ان کے نزدیک کسی کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، ایسے ایسے عجیب وغریب لوگوں کے نظریات پڑھتا ہوں، عقل دنگ رہ جاتی ہے، عقل حیران رہ جاتی ہے کہ ان کو کیا ہوگیا ہے؟ تو میں نے کہا کہ حق و باطل کا معرکہ اس کا پہلا میدان عقائد و نظریات ہیں۔

اُردوخواں مجتہد:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بیان فرمائی تھی کہ: ''وَلَعَنَ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا.'' (ترمذی ج:۲ ص:۴۴) یعنی اس امت کا آخری حصہ امت کے پہلے حصہ پر لعنت کرے گا۔ نعوذ باللہ پہلے سب بے وقوف تھے، جن کی پوری کی پوری زندگی دین کی خدمت کرتے ہوئے گزری، کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن کو نہیں سمجھتے تھے، حیرت ہے کہ ان لوگوں نے تو قرآن کو سمجھا جنہوں نے اردو ترجمے یا انگریزی ترجمے کی مدد سے قرآن کے مفہوم کو معلوم کیا، اور نعوذ باللہ! یہ تو قرآن کو جانتے ہیں اور وہ نہیں جانتے تھے، غلام احمد پرویز بھی یہی کہتا تھا کہ عجمی سازش ہے، پورے دین کو عجمی سازش کہتا تھا، اور بے شمار لوگ ہیں جو اس احمق کے مقلد ہیں، اور یہ لوگ برملا کہتے ہیں کہ حدیثیں بعد میں لکھی گئی ہیں، اس لئے یہ قابل اعتماد نہیں۔

گمراہوں کے ہاتھوں ملنے والا قرآن کیونکر صحیح ہے!

میرے پاس ایک ساتھی آئے، جو میرے دوست ہیں اور اسٹیل مل میں رہتے ہیں، انہوں نے کہا کہ منکرین حدیث بہت خفیہ طور پر بہت شر پھیلا رہے ہیں، لوگوں کو انکار حدیث پر مائل کر رہے ہیں، ان کو کیا کہا جائے؟ میں نے ان تمام باطل فرقوں کے مقابلے میں ایک چیز ایجاد کرلی، الحمدللہ! ایک ہی ہتھیار مجھے اللہ تعالیٰ نے سکھلا دیا اور دے دیا ہے، اس ہتھیار کے مقابلہ میں کوئی بھی نہیں ٹھہرتا، وہ ہتھیار یہ ہے کہ یہ جتنے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، حتیٰ کہ منکرین حدیث بھی، حتیٰ کہ شیعہ اور رافضی بھی، منکرین صحابہ بھی، یہ سارے کے سارے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قرآن کو مانتے ہیں، قادیانی بھی کہتے ہیں کہ ہم مولویوں کی بات نہیں مانتے، میں نے کہا: بہت اچھا! تم درمیان کے واسطوں کو نکال کر اور ان سے عدم اعتماد کا اعلان کر کے دلیل کے ساتھ یہ ثابت کردو (جس کا میں بھی قائل ہوجاؤں، جو ساتھ بیٹھا ہوا ہو وہ بھی قائل ہوجائے) کہ یہ قرآن وہی قرآن ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، اور میں دلیل سے ثابت کرتا ہوں کہ تمہارے عقیدے کے مطابق (نعوذ باللہ!) یہ قرآن باطل ہے، معاف کیجئے! میں کیا کہہ رہا ہوں، سوچ لیجئے! ان کے عقیدے کے مطابق کہہ رہا ہوں اپنے عقیدے کے مطابق نہیں کہہ رہا، اس لئے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو دیا، جبریل علیہ السلام نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیا، صحابہؓ نے تابعینؒ کو دیا، تابعینؒ نے تبع تابعینؒ کو دیا، انہوں نے اپنے بعد والوں کو دیا، اس طرح صدی درصدی یہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، جو آج ہم تک پہنچا اور قیامت تک جائے گا، ایک مرتبہ یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ کے پاس وحی کون لاتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جبریل علیہ السلام! یہودیوں نے کہا

کہ: ہم نہیں مانتے، قرآن کے منکر ہوگئے، جبریلؑ کا حوالہ دے کر قرآن کے منکر ہوگئے، قریش مکہ نے کہا کہ: ہمیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اعتماد نہیں، لہٰذا ہم قرآن کو نہیں مانتے، رافضیوں نے کہا کہ: ہمیں صحابہؓ پر اعتماد نہیں، لہٰذا ہم قرآن کو نہیں مانتے، اور تم لوگوں نے کہا کہ تمام مولوی مُلّا یہ عجمی سازش کا شکار ہوگئے، تو پوری کی پوری امت چودہ صدیوں کی جب گمراہ ہوئی تو تم بتاؤ کہ گمراہوں کے راستے سے جو قرآن کریم ہم تک پہنچا وہ برحق کیسے ہوسکتا ہے؟

میں قادیانیوں سے بھی کہتا ہوں، منکرینِ حدیث سے بھی کہتا ہوں، جماعت المسلمین والوں سے بھی کہتا ہوں، ان توحیدیوں سے بھی کہتا ہوں، تمام گمراہوں کے لئے میرا ایک ہی جواب ہے، تمہارے نزدیک امت کی صدیوں کی صدیاں گمراہ ہوگئیں، اور تم کسی کو بھی مستثنیٰ نہیں کرتے، تمہاری نظر میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو حق پر ہو، تو یہ قرآن گمراہوں کے راستے سے آیا ہے، انہی کے ہاتھوں سے تمہیں ملا، یہ قابلِ اعتماد کیسے ہوگیا؟ حدیث تو قابلِ اعتماد نہیں، کیونکہ تمہارے نزدیک راوی کمزور ہیں، تو قرآن بھی تو روایت اور نقل ہوتے ہوئے آیا ہے نا۔

چیلنج:

قرآن کریم میں یہ آیت کئی بار آئی ہے: "وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ." (البقرہ:۱۷۳) اور "وَمَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ." (المائدہ:۳) ایک جگہ "بہٖ" پہلے اور باقی جگہ "بہٖ" بعد میں آتا ہے، تم دلیل سے ثابت کرو کہ یہاں "بہٖ" پہلے ہے اور یہاں بعد میں، قرآن کا ایک ہی لفظ ہے، پہلی جگہ سورہ بقرہ میں جہاں آیا ہے، وہاں "وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ." "بہٖ" کو پہلے لائے ہیں، اور باقی جگہ جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں "وَمَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ." "بہٖ" بعد میں ہے، ایسا کیوں ہے؟ کوئی منکرِ حدیث، کوئی قادیانی مجھے بتادے کہ "بہٖ" یہاں پہلے کیوں ہے اور وہاں بعد میں کیوں

ہے؟ اور اس پر دلیل قائم کر کے دکھا دیں۔

مجموعہ امت معصوم ہے:

میں دلیل دیتا ہوں، میں کہتا ہوں کہ جس امت نے اس قرآن کو نقل کیا ہے وہ برحق ہے، وہ جھوٹی نہیں ہوسکتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی معصوم تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں، آپؐ کی زبانِ مبارک سے جو لفظ نکلا، جس طرح نکلا وہ ٹھیک ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی معصوم نہیں، لیکن مجموعہ کا مجموعہ امت معصوم ہے، یہ ممکن نہیں کہ ساری کی ساری امت یک لخت گمراہ ہوجائے، ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشین ہے، اور ان کو آگے دین پہنچانا ہے، مجھ سے غلطی ہوسکتی ہے، میں معصوم نہیں، بڑے سے بڑے عالم سے غلطی ہوسکتی ہے، وہ معصوم نہیں، اور ہمارے عقیدے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی معصوم نہیں، ہم تو صحابہؓ کو بھی معصوم نہیں کہتے، معصوم صرف ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، نہ بارہ معصوم مانتے ہیں، نہ چودہ، ایک ہی معصوم مانتے ہیں، لیکن جس طرح یہ بات محال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے یا زبانِ مبارک سے کوئی غلط لفظ نکلے، اسی طرح ناممکن ہے کہ پوری کی پوری امت کسی غلط بات پر متفق ہوجائے، یہ ممکن نہیں ہے۔

سچے کی نقل سچی اور جھوٹے کی جھوٹی:

میں نے اس دوست کو یہ بات سمجھائی کہ جو تم سے یہ بحث کرتا ہے، اس کو بولو پہلے قرآن کا ثبوت دو، حدیث کی بات بعد میں کریں گے، لاؤ تو کسی منکر حدیث کو، مجھے اس کا جواب دے دے، کہتا ہے جی! قرآن تو قرآن ہے نا، میں نے کہا کہ قرآن تو قرآن ہے، لیکن تجھ پر تو نازل نہیں ہوا، اور نہ مجھ پر نازل ہوا ہے، نہ میرے ابا پر، نہ تیرے ابا پر نازل ہوا ہے، قرآن تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور

نقل درنقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا۔ کیا کوئی اس بات کا انکار کرے گا؟ اور جب بھی کوئی چیز نقل کی جاتی ہے تو نقل کرنے والے پر اعتماد ہوتا ہے، اگر سچا آدمی ایک بات کو نقل کرے تو ہم سچی سمجھتے ہیں، اور اگر جھوٹا آدمی ایک بات کو نقل کرے تو ہم اس پر اعتماد نہیں کرتے، ہدایت یافتہ بات کرے تو ہم اس کو قبول کرتے ہیں، اور گمراہ آدمی اگر بات کرے تو ہم نہیں مانتے۔

چودہ صدیاں گمراہ؟

تمہارے نزدیک دس پانچ مولوی نہیں بلکہ ساری کی ساری امت گمراہ اور ایک صدی نہیں، نسلوں کی نسلیں گمراہ، ایک صدی میں تین نسلیں بدلتی ہیں، چودہ صدیوں میں باون نسلیں گزریں، تم کہتے ہو کہ امت کی باون نسلیں گمراہ ہیں، تو پھر تم اسلام سے کیا لیتے ہو؟ لیکن شیطان نے جال لگا دیا ہے، اس میں لوگ پھنس رہے ہیں، تو ایک معرکہ حق و باطل کا عقائد میں ہے، سب سے پہلا معرکہ، اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل سیدھی شاہراہ روشن کردی ہے، الحمدللہ! لائٹیں لگی ہوئی ہیں، پوری روشنی آرہی ہے، راستے میں پڑی ہوئی سوئی تک نظر آرہی ہے، اللہ تعالیٰ اس امت کے اکابرؒ کو جزائے خیر عطا فرمائے اپنے دین کی، اپنی کتاب کی اور اپنے نبیؐ کی جتنی خدمت کی ہے دوسری قوموں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

یہود و نصاریٰ اپنے بزرگوں کے نام کا بوجھ نہیں اٹھاسکتے:

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کی سیرت طیبہ پر ایک چھوٹی سی کتاب ہے ’’النبی الخاتم‘‘ کے نام سے، بہت عجیب و غریب کتاب ہے، اس کے شروع میں دوسری قوموں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تم سے اپنے بزرگوں کے نام کا بوجھ نہیں اٹھایا جاسکا، تو تم ان کے کارناموں کا بوجھ کیسے اٹھاسکتے ہو؟ ان کے دین کی کیسے حفاظت کرسکتے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک جس

طرح قرآن کریم کو حفظ کیا گیا، کوئی قوم اس کی ایک مثال پیش کردے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث طیبہ کو جس طرح اس امت نے ضبط کیا، کوئی قوم اس کی ایک مثال پیش کردے۔

ہماری ہر بات کی سند ہے:

میں تمہارے سامنے منبر پر بیٹھ کر یہ کہا کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا، یہ فرمایا اور یہ فرمایا، میں گپ نہیں ہانکتا، یہ سب کچھ کتاب میں سند کے ساتھ لکھا ہوا ہے، میں نے اپنے استاد سے پڑھا، انہوں نے اپنے استاد سے پڑھا، انہوں نے اپنے استاد سے پڑھا، انہوں نے اپنے استاد سے پڑھا، سینتیس (۳۷) واسطوں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں، یعنی ہر بات ہر استاذ سند کے ساتھ کہتا ہے، بغیر سند کے نہیں۔

کسی یہودی اور عیسائی کے پاس سند نہیں:

کسی یہودی سے کہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اقوال سند کے ساتھ بیان کرے، اقوال تو الگ رہے، اپنی کتاب کی سند بیان کردے، یہ جو بائبل لئے پھر رہے ہیں، اس کی سند بیان کریں، کسی عیسائی عالم سے کہو کہ اپنی کتاب کی سند حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بیان کردے، اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے اقوال، ان کے افعال، ان کے ارشادات، ان کا عملی نمونہ کہ آپؑ اس طرح نماز پڑھتے تھے، اس طرح حج کرتے تھے، اس طرح روزہ رکھتے تھے، اس طرح سوتے تھے، اس طرح جاگتے تھے، اس طرح چلتے تھے، اس طرح پھرتے تھے۔

کوئی امت ایسا ریکارڈ پیش کرسکتی ہے؟

امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو ریکارڈ جمع کیا ہے اور محفوظ رکھا ہے کوئی قوم ایسا ریکارڈ پیش کرسکتی ہے؟

اگر ہے تو لاؤ، ہمارے دین کی ایک ایک چیز اللہ کے فضل سے محفوظ ہے، اس کے عقائد پر الگ کتابیں لکھی گئیں، اصول پر الگ کتابیں لکھی گئیں، تفسیر پر الگ لکھی گئیں، حدیث شریف پر الگ لکھی گئیں، ایک ایک فقرہ قرآن کریم کا اور اس کی تشریح علمائے امت نے کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ایک ایک جملے کی شروحات کی گئیں، تشریحات کی گئیں، الحمدللہ! لوگوں کے کہنے کے مطابق ہم اندھیرے میں نہیں ہیں۔

مجھے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ جی کس کے پیچھے چلیں؟ ہمیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے ہوئے نظر آرہے ہیں، ہمارے دین کی ایک ایک بات منقح ہے، اور یہی مسئلہ بعد میں اعمال میں بھی آجاتا ہے۔

بدعات کی کوئی سند نہیں:

بدعات کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے لوگوں نے، یہ بھی ایک چیز (دین) ہے، یہ بھی چیز (دین) ہے، یہ بھی چیز (دین) ہے، نعوذباللہ! اب سڑکوں پر مارچ کرنا، عید میلاد النبی کا جلوس نکالنا، یہ بھی دین ہے، یہ دین کس وقت سے ایجاد ہوا تھا؟ کیا ایک حدیث پیش کرسکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جلوس نکالے تھے؟ کسی صحابیؓ نے نکالے تھے؟ امام ابوحنیفہؒ نے نکالا تھا؟ شاہ عبدالقادر جیلانیؒ نے نکالا تھا؟ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس قسم کے جلوس نکالے تھے؟ تم نے شیعوں کی نقل اتارنا شروع کردی، وہ تو گمراہ تھے اور اسی قسم کی اور بے شمار بدعات لوگوں نے ایجاد کرلیں۔

گلشن محمدیؐ سدا بہار ہے:

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ علمائے اہل سنت نے ایک ایک چیز کو منقح کرکے، چھانٹ کرکے رکھ دی، جتنے یہ فالتو پودے اُگے ہوئے تھے سب کو کاٹ کر رکھ دیا، گلشن

محمدی الحمدللہ! سدا بہار ہے، اور قیامت تک رہے گا، چودہ صحابہؓ سے یہ حدیث مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِيْنَ عَلَی الْحَقِ.“ (ترمذی ج:۲ ص:۴۶) یعنی میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر لڑتی رہے گی، ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سلسلہ نہیں رکے گا، دوام کے ساتھ لڑتی رہے گی، ایک امت، ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، چلتی رہے گی یہاں تک کہ وہ مسیح دجال سے لڑے گی۔

اور صحیح مسلم کی روایت میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے: ”فَيَنْزِلُ عِيْسَی بْنُ مَرْيَمَ.“ (ج:۱ ص:۸۷) یعنی حتیٰ کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نازل ہوجائیں گے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں دے کر ہم فارغ ہوجائیں گے، جب تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل نہیں ہوجاتے یہ امانت اپنے سینے سے لگائے رکھیں گے، اور لڑتے رہیں گے، قتال و جہاد جاری رہے گا، ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے اور طریقے سے ایک انچ ہٹنے نہیں دیں گے، نکیر کریں گے۔ تو باطل لوگوں کو کتنا خوشنما نظر آتا ہے کوئی کوئی نظریہ ایجاد کرتا ہے، کوئی کوئی نعرہ لگاتا ہے، لیکن انجام کار کچھ بھی نہیں۔

دعا:

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیں حق پر قائم رکھے، حق ہی پر ہمیں مارے، حق ہی پر ہماری موت ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رسالت و نبوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہمیں وابستہ رکھے، آپؐ کی سنت پر ہمیں قائم رکھے اور جو اعمال، جو اخلاق، جو عقائد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دے کر گئے تھے، الحمدللہ! محفوظ چلے آتے ہیں، مٹے نہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان پر قائم رکھے، اگر ہم میں عملی کوتاہیاں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں تو ہم اس کا اقرار کریں گے، ہماری غلطی ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات برحق ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی
چند دعائیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے معمولات:

آج میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی کچھ دعائیں نقل کرتا ہوں، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے صاحبزادے شاہ عبدالرزاقؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد کا معمول تھا کہ وہ اپنی مجلس وعظ میں یہ دعائیں کیا کرتے تھے:

''اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ بِوَصْلِکَ مِنْ صَدِّکَ وَبِقُرْبِکَ مِنْ طَرْدِکَ وَبِقُبُوْلِکَ عَنْ رَدِّکَ وَاجْعَلْنَا مِنْ اَهْلِ طَاعَتِکَ وَوُدِّکَ وَاَهِلْنَا لِشُکْرِکَ وَحَمْدِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.'' (قلائد الجواہر ص:۴۱)

ترجمہ:......''اے اللہ! ہم پناہ لیتے ہیں آپ کے وصل کی آپ کے منہ پھیرنے سے، اور ہم پناہ لیتے ہیں آپ کے قرب کی آپ کے دھتکارنے سے، اور ہم پناہ لیتے ہیں آپ کے

قبول کی آپ کے رد کردینے سے، اے اللہ! ہمیں اپنی اطاعت اور دوستی کرنے والوں میں سے بنا، اور ہمیں اپنے شکر وحمد کا اہل بنا کہ ہم ہر دم آپ کا شکر بجالاتے رہیں اور آپ کی حمد کرتے رہیں۔"

اس کے بعد دوسری دعا نقل کی ہے:

"اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ اِیْمَانًا یَصْلُحُ لِلْعَرْضِ عَلَیْکَ وَاِیْقَانًا نَقِفُ بِهٖ فِی الْقِیَامَةِ بَیْنَ یَدَیْکَ، وَعِصْمَةً یُنْقِذُنَا بِهَا مِنْ وَرْطَاتِ الذُّنُوْبِ، وَرَحْمَةً تُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ دَنَسِ الْعُیُوْبِ، وَعِلْمًا نَفْقَهُ بِهٖ اَوَامِرَکَ وَنَوَاهِیَکَ، وَفَهْمًا نَعْلَمُ بِهٖ کَیْفَ نُنَاجِیْکَ، وَاجْعَلْنَا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ مِنْ اَهْلِ وِلَایَتِکَ، وَامْلَأْ قُلُوْبَنَا بِنُوْرِ مَعْرِفَتِکَ، وَاکْحُلْ عُیُوْنَ عُقُوْلِنَا بِاِثْمَدِ هِدَایَتِکَ، وَاحْرُسْ اَقْدَامَ اَفْکَارِنَا مِنْ مَّزَالِقِ مَوَاطِئِ الشُّبُهَاتِ، وَامْنَعْ طُیُوْرَ نُفُوْسِنَا مِنَ الْوُقُوْعِ فِیْ شُبَّاکِ مُوْبِقَاتِ الشَّهَوَاتِ، وَاَعِنَّا فِیْ اِقَامَةِ الصَّلَوَاتِ عَلٰی تَرْکِ الشَّهَوَاتِ، وَامْحُ سُطُوْرَ سَیِّاٰتِنَا مِنْ جَرَائِدِ اَعْمَالِنَا بِاَیْدِی الْحَسَنَاتِ، کُنْ لَنَا حَیْثُ یَنْقَطِعُ الرَّجَاءُ مِنَّا اِذَا اَعْرَضَ اَهْلُ الْجُوْدِ بِوُجُوْهِهِمْ عَنَّا حِیْنَ تَحْصُلُ فِیْ ظُلَمِ اللُّحُوْدِ رَهَائِنُ اَفْعَالِنَا اِلٰی یَوْمِ الْمَشْهُوْدِ، وَاَجِرْ عَبْدَکَ الضَّعِیْفَ عَلٰی مَا اَلِفَ، وَاعْصِمْهُ مِنَ الزَّلَلِ، وَوَفِّقْهُ وَالْحَاضِرِیْنَ لِصَالِحِ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ، وَاَجْرِ عَلٰی لِسَانِهٖ مَا یَنْتَفِعُ بِهِ السَّامِعُ وَتَذْرُفُ لَهُ الْمَدَامِعُ وَیَلِیْنُ الْقَلْبُ

الْخَاشِعُ، وَاغْفِرْ لَهُ وَلِلْحَاضِرِيْنَ وَلِجَمِيْعِ الْمُسْلِمِيْنَ.“
(قلائد الجواہر ص:۴۱)

ترجمہ:......”یا اللہ! ہم آپ سے مانگتے ہیں ایسا ایمان جو صلاحیت رکھتا ہو آپ کی بارگاہ عالی میں پیش ہونے کی، یا اللہ! ہم آپ سے مانگتے ہیں ایسا یقین جس کے ساتھ قیامت میں ہم آپ کے سامنے کھڑے ہوں، یا اللہ! ہم آپ سے مانگتے ہیں ایسی عصمت جس کے ذریعہ آپ ہمیں گناہوں کے گرداب سے بچالیں، یا اللہ! ہم آپ سے ایسی رحمت کی درخواست کرتے ہیں جس کے ساتھ آپ ہمیں عیوب کی گندگی سے پاک کردیں، یا اللہ! ہمیں ایسا علم عطا فرما، جس کے ذریعہ ہم آپ کے امر و نہی کو سمجھیں، یا اللہ! ہمیں ایسا فہم نصیب فرما جس کے ذریعہ ہم یہ جان لیں کہ آپ کے ساتھ کیسے مناجات کریں، یا اللہ! ہمیں دنیا اور آخرت میں اپنے اہل ولایت میں سے بنادے، یا اللہ! ہمارے دلوں کو اپنی معرفت کے نور سے بھردے، یا اللہ! ہماری عقلوں کی آنکھوں میں اپنی ہدایت کا سرمہ لگادے، یا اللہ! ہمارے افکار کے قدموں کی شبہات کے موقعوں پر پھسلنے کی جگہوں سے حفاظت فرما، یا اللہ! ہمارے نفسوں کے پرندوں کو ہلاک کرنے والی شہوتوں کے جال میں پھنسنے سے بچا، یا اللہ! نمازوں کے قائم کرنے میں شہوتوں کو چھوڑنے پر ہماری مدد فرما، یا اللہ! نیکیوں کے انعامات کے ذریعہ ہمارے نامۂ اعمال کے صحیفوں سے ہماری برائیوں کی سطروں کو مٹادے، یا اللہ! جب قبروں کی تاریکیوں میں ہم اپنے کئے ہوئے افعال میں قیامت

تک محبوس ہوں گے، اس حالت میں جب تمام اہل سخاوت ہم
سے منہ پھیر لیں گے اور جب ہماری امیدیں سب سے منقطع
ہوجائیں گی، اس وقت آپ ہماری امیدوں کا سہارا بن جایئے،
یا اللہ! اپنے اس کمزور بندے کو اس تالیف پر اجر عطا فرما اور
لغزشوں سے اس کو بچا اور اس کو اور تمام حاضرین کو اچھی بات
کہنے اور اچھے کام کرنے کی توفیق عطا فرما، یا اللہ! اس کی زبان
پر وہ مضامین جاری فرما جن سے سننے والوں کو نفع ہو، جن سے
آنسو بہ پڑیں اور خشوع والے دل تر ہوجائیں، یا اللہ! اپنے اس
بندے کی اور تمام حاضرین کی اور تمام مسلمان مردوں اور عورتوں
کی بخشش فرما۔''

قیامت کی پیشی:

اس دعا میں عرض سے مراد سب سے بڑی پیشی، قیامت کی پیشی، اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونا۔

اور حضرت شیخ رحمہ اللہ مجلس کے ختم ہونے پر حاضرین سے فرمایا کرتے تھے:

''جَعَلَنَا اللہُ وَاِیَّاکُم مِمَّنْ تَنَبَّہَ لِخِدْمَتِہٖ وَتَنَزَّہَ عَنِ الدُّنْیَا وَتَذَکَّرَ یَوْمَ حَشْرِہٖ وَاقْتَفٰی آثَارَ الصَّالِحِیْنَ اِنَّہٗ وَلِیُّ ذَالِکَ وَالْقَادِرُ عَلَیْہِ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ.'' (قلائد الجواہر ص:۴۱)

ترجمہ:......''اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں ان لوگوں میں
سے بنائیں جو اس کی خدمت کے لئے بیدار اور چوکنے رہتے
ہیں، جو دنیا کی آلائشوں سے پاک وصاف رہتے ہیں، جو اپنے
حشر کے دن کو یاد رکھتے ہیں، اور جو سلف صالحین کے نشان قدم

کی پیروی کرتے ہیں، بے شک وہ اس کا مالک ہے اور اس پر قادر ہے، اے رب العالمین! ایسا ہی کیجئے۔''

اور پھر یہ شعر پڑھتے تھے:

وَمَنْ یَّتْرُکُ الْآثَارَ قَدْ ضَلَّ سَعْیُهٗ
وَهَلْ یَتْرُکُ الْآثَارَ مَنْ کَانَ مُسْلِمًا

(قلائد الجواهر فی مناقب الشیخ عبدالقادر ص:۱۴۱ مطبوعہ حلبی مصر)

ترجمہ:...... ''اور جو شخص سلف صالحین کے نشان قدم کو چھوڑ دے اس کی محنت رائیگاں گئی اور کیا کوئی شخص جو مسلمان ہو سلف صالحین کے نشان قدم کو چھوڑ سکتا ہے؟''

قرب اور وصل الٰہی کی دعا:

اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنا وصل نصیب فرماکر ہماری طرف سے منہ پھیر لینے سے ہمیں اپنی پناہ عطا فرما، ایسا نہ ہو کہ جب قیامت میں ہم آپ کی بارگاہ عالی میں حاضر ہوں تو آپ ہم سے منہ پھیرنے والے ہوں، اور ہم سے اعراض کرنے والے ہوں، اور ہمیں اپنا قرب نصیب فرماکر ہمیں اپنی بارگاہ سے دھتکار دینے سے پناہ عطا فرما، ایسا نہ ہو کہ آپ ہمیں اپنی بارگاہ سے نکال دیں اور راندۂ درگاہ بنادیں، جیسے ابلیس کو فرمایا گیا: ''اُخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ.'' (نکل جا کہ تو مردود اور راندۂ درگاہ ہے)۔

قبولیت کی درخواست:

یا اللہ! ہمیں اپنا قبول نصیب فرماکر ہمیں اور ہمارے اعمال کو رد کرنے سے پناہ عطا فرما، یعنی ہم سے جو کچھ بن پڑتا ہے اس کو شرف قبول نصیب فرما، اور جو کچھ بھی ہم پیش کررہے ہیں، اس کو رد نہ فرما۔

اہل طاعت و محبت سے ہونے کی درخواست:

یا اللہ ہمیں اپنے اہل طاعت اور اہل محبت میں سے بنا، جو لوگ کہ آپ کی طاعت کرتے ہیں، بندگی کرتے ہیں، آپ کے حکموں کی فرمانبرداری کرتے ہیں، ہمارا شمار قیامت کے دن اہل محبت اور طاعت میں سے کیجیو، اور ہمیں اپنے شکر اور حمد کا اہل بنا کہ ہم ہر دم آپ کا شکر بجالاتے رہیں اور آپ کی حمد کرتے رہیں۔

لوگوں کی مختلف حالتیں:

یا ارحم الراحمین قیامت کے دن کچھ لوگ ایمان کے ساتھ حاضر ہوں گے، کچھ لوگ نفاق کے ساتھ حاضر ہوں گے، کچھ لوگ نعوذ باللہ! کفر کے ساتھ حاضر ہوں گے، کچھ لوگ اخلاص لے کر حاضر ہوں گے اور کوئی دکھلاوا اور ریا کاری لے کر حاضر ہوں گے، کوئی طاعت لے کر حاضر ہوں گے اور کوئی نافرمانیاں لے کر حاضر ہوں گے، کوئی اس حالت میں حاضر ہوں گے کہ ملائکہ ان کو مبارکباد دے رہے ہوں گے اور کچھ اس حالت میں حاضر ہوں گے کہ فرشتے ان پر لعنت کر رہے ہوں گے، کچھ ایسے حضرات حاضر ہوں گے کہ ان کی مہمان نوازی کی جائے گی، "نُزُلًا مِّنْ رَّبٍّ الرَّحِيمٍ." (رب رحیم کی طرف سے ان کی مہمانی کی جائے گی)، کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کو ذلیل کیا جائے گا، اے اللہ ہمیں ایسا ایمان نصیب فرما جو قیامت کی پیشی کی صلاحیت رکھتا ہو اور ایسا یقین نصیب فرما جس کے ساتھ ہم قیامت کے دن آپ کے سامنے کھڑے ہوسکیں اور ہمیں ایسی عصمت عطا فرما (عصمت کے معنی بچانا) جو ہمیں گناہوں کی دلدل سے نکال دے۔

عصمتِ انبیاءؑ کا مفہوم:

حضرات انبیاء علیہم السلام کو عصمت عطا فرمائی جاتی ہے، نبی معصوم ہوتے ہیں کہ ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوسکتا، نہ کبیرہ گناہ، نہ صغیرہ گناہ، نہ نبوت سے

پہلے، نہ نبوت کے بعد، ہاں! بھول چوک اور خطا ان سے ہوسکتی ہے، لیکن ان کی خطا بھی رضائے الٰہی کے لئے ہوتی ہے۔

خطا کے معنی یہ ہیں کہ ایک کام محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنے کا قصد کیا، وہ کام اپنی جگہ صحیح تھا، جائز تھا، لیکن ان حضرات انبیاءؑ کے مقام رفیع سے نیچا تھا، ان حضرات کی شان کے لائق یہ تھا کہ اس سے اونچی بات کو سوچتے، اس سے اونچی بات کا قصد کرتے، اور اسی کو اختیار کرتے، الغرض یہ حضرات کبھی بھول چوک کی وجہ سے افضل کو چھوڑ کر غیر افضل کو اختیار کرلیتے ہیں، جو ان کے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے خطائے اجتہادی کہلاتی ہے، حضرات انبیاءؑ کرام علیہم السلام کی جتنی خطائیں ذکر کی گئی ہیں وہ سب اسی طرح کی ہیں کہ وہ کبھی شاذ و نادر طور پر افضل کو چھوڑ کر غیر افضل کو اختیار کرلیتے ہیں، وہ بھی قصداً نہیں بلکہ خطائے اجتہادی کے طور پر، بہرحال حضرات انبیاءؑ کرام علیہم السلام پر ہمیشہ عصمت کا پہرہ رہتا ہے۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ اور عصمتِ انبیاءؑ کا مفہوم:

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کا فارسی میں ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جس کا نام ''منصب امامت'' ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے، اس میں فرماتے ہیں:

> ''ومعنی عصمت آنست کہ آنچہ بایشاں تعلق می دارد اقوال و افعال و احوال آن ہمہ راحق جل و علا از مداخلت نفس و شیطان وخطاً ونسیان بقدرت کاملہ خود محفوظی دارد، و ملائکہ حافظین را بر ایشاں می گارد، تا غبار بشریت دامن پاک ایشاں را نہ آلاید .....''

ترجمہ:...... ''اور عصمت کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام

چیزیں جو ان حضرات سے تعلق رکھتی ہیں، خواہ وہ اقوال ہوں یا افعال، (عبادات ہوں یا عادات، معاملات ہوں یا مقامات، اخلاق ہوں) یا احوال، حق تعالیٰ شانہ ان تمام چیزوں کو اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ نفس و شیطان کی مداخلت سے محفوظ رکھتے ہیں، اور محافظ فرشتوں کو ان پر مقرر فرمادیتے ہیں تاکہ بشریت کا غبار ان کے پاک دامن کو آلودہ نہ کرے.......''

(سبحان اللہ! ہمارے کچھ دوست حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کو ''وہابی'' کہتے ہیں۔ ناقل)

تو حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے حضرات انبیاءؑ کرام علیہم السلام پر ہمیشہ عصمت کا پہرہ رہتا ہے تاکہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے بقول ان کے مقدس دامن پر غبار بشریت کا کوئی داغ دھبہ نہ آنے پائے۔

انبیاءؑ سے باوجود طاقت کے معصیت کا صدور محال ہے:

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ایک ہے گناہ کرنے کی طاقت نہ ہونا، یہ عصمت نہیں اور ایک یہ ہے کہ گناہ کرنے کی طاقت تو ہے لیکن اس کے باوجود گناہ کا صادر ہونا ممکن نہیں، اسی کو عصمت کہتے ہیں۔

اس کی مثال ایسے سمجھ لیجئے کہ ایک شخص روزے دار ہے، شام کا وقت ہے، افطار کے وقت بہت اچھی اچھی چیزیں اس کے سامنے رکھی ہوئی ہیں، بھوک اور پیاس بھی ہے، کھانے کی خواہش بھی ہے، اور یہ ان کو کھا بھی سکتا ہے، اس کو کھانے کی طاقت بھی ہے، یہ نہیں کہ کھانے کی قدرت نہ ہو، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ جب تک سورج غروب نہیں ہوجاتا نہیں کھاؤ گے، اس لئے یہ نہیں کھاتا، اس حکم الٰہی کے احترام میں ممکن نہیں کہ یہ کھائے، اگر کوئی اس کو زبردستی کھلانا چاہے تب بھی نہیں

کھائے گا، الغرض کھانے کی طاقت ہے لیکن اس کے باوجود محض حلم الٰہی سمجھتے ہوئے نہیں کھاتا، یہی مثال انبیائے کرام علیہم السلام کی عصمت کی سمجھ لیجئے، عصمت کے یہ معنی نہیں جس کام کو ہم گناہ کہتے ہیں ان حضرات کو اس کے کرنے کی قدرت و طاقت نہیں ہوتی، بلکہ ان میں بھی طاقت موجود ہے، لیکن وہ عصمت کی وجہ سے گناہ نہیں کر سکتے، کیونکہ ہمہ وقت ان پر عصمت کا پہرہ رہتا ہے، یہ معنی ہیں عصمت کے، ان میں طاقت ہوتی ہے بلکہ دوسرے لوگوں سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔

چالیس ہزار مردوں کے برابر طاقت:

چنانچہ صحیح بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ارشاد منقول ہے کہ:

"قَالَ (اَنَسٌ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ): كُنَّا نَتَحَدَّثُ اَنَّهُ اُعْطِیَ قُوَّةَ ثَلٰثِیْنَ." (بخاری ج:۱ ص:۴۱)

ترجمہ:...... "ہم آپس میں یہ بات ذکر کیا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تیس مردوں کی قوت عطا کی گئی ہے۔"

اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس جنتیوں کی طاقت عطا کی گئی تھی۔ چنانچہ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وقع فی روایة الاسماعیلی من طریق ابی موسیٰ عن معاذ بن هشام: "اربعین" بدل ثلاثین ...... وفی صفة الجنة لابی نعیم من طریق مجاهد مثله، وزاد: "من رجال اهل الجنة." ومن حدیث عبدالله بن عمرو رفعه: "اعطیت قوة اربعین فی البطش والجماع."

(فتح الباری ج:۱ ص:۳۷۸)

ترجمہ:......"اور اسماعیلی من طریق ابوموسیٰ عن معاذ بن ہشام کی روایت میں تیس کے بجائے چالیس مردوں کی طاقت کا ذکر ہے، اور ابونعیم کی صفت جنت میں مجاہد کے حوالے سے بھی اسی طرح ہے، البتہ اس میں جنت کے آدمیوں کا اضافہ ہے، اور عبداللہ بن عمرو کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مجھے پکڑنے اور جماع کے معاملہ میں چالیس مردوں کی طاقت دی گئی ہے۔"

اور صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک جنتی کو سو مردوں کی قوت عطا کی جائے گی، چنانچہ متعدد کتب حدیث میں ہے:

"وعند احمد والنسائی وصححه الحاکم من حدیث زید بن ارقم رفعه: ان الرجل من اهل الجنة لیعطٰی قوة مائة فی الاکل والشرب والجماع والشهوة." (ترمذی ج:۲ ص:۷۶ عن انسؓ، مسند احمد ج:۴ ص:۳۷۱، ابن ابی شیبہ ج:۱۳ ص:۱۰۸، دارمی ج:۲ ص:۲۴۱، موارد الظمان ص:۶۰۰ عن زید بن ارقمؓ)

ترجمہ:......"احمد، نسائی میں حضرت زید بن ارقمؓ سے مرفوع حدیث ہے اور اس کی امام حاکم نے تصحیح کی ہے کہ ایک جنتی کو جنت میں کھانے، پینے، جماع کرنے اور شہوت میں سو مردوں کی طاقت دی جائے گی۔"

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں کے ملانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت چالیس ہزار مردوں کے برابر ثابت ہوئی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

"فَعَلٰی هٰذَا یُعْطٰی قُوَّةُ نَبِیِّنَا اَرْبَعَةَ آلَافٍ."

(فتح الباری ج:۱ ص:۳۷۸)

ترجمہ:......"پس اس اعتبار سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چار ہزار جوانوں کی طاقت دی جائے گی۔"

انبیاءؑ کا مجاہدہ:

تو انبیاءؑ کرام علیہم السلام میں طاقت زیادہ ہوتی ہے، اس کے باوجود عصمت کی بنا پر وہ ضبطِ نفس سے کام لیتے ہیں، صبر کرتے ہیں، اس لئے ان کا مجاہدہ بھی بڑھ جاتا ہے، اور ان کا اجر بھی بڑھ جاتا ہے۔

بیس روٹی کھانے والا اگر چار کھائے تو مجاہدہ ہے:

ہمارے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی خدمت میں شکایت کی گئی کہ خانقاہ میں ایک آدمی روٹیاں بہت کھاتا ہے، یہ شخص خانقاہ کے ذاکرین میں سے تھا، یہ حضرات حکیم ہوتے ہیں، حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی! یہ جو خانقاہ میں کھانا کھاتا ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو، اس سے پوچھو کہ خانقاہ میں آنے سے پہلے کتنا کھایا کرتا تھا؟ چنانچہ اس سے پوچھا گیا کہ یہاں آنے سے پہلے کتنی روٹیاں کھایا کرتے تھے؟ کہنے لگا: بیس کھایا کرتا تھا، یہاں آکر چار نہیں پانچ کھالیتا ہوں، تو جس شخص کو بیس روٹیوں کی بھوک ہو اور وہ پانچ روٹیاں کھائے، اس نے چوتھائی بھوک کے مقدار روٹی کھائی، اور جو ڈیڑھ روٹی نہ کھاسکتا ہو، اگر وہ دو روٹیاں کھالے تو اس نے اپنی بھوک سے آدھی روٹی زیادہ کھائی، اب غور کرو کہ کس نے تھوڑا کھایا؟ ڈیڑھ روٹی کی بھوک رکھنے والا اگر دو روٹیاں کھا جائے، اس نے تو مجاہدہ نہیں کیا، اس نے تو اپنی بھوک سے زیادہ کھالیا، لیکن جس بے چارے کی بھوک بیس روٹیوں کی تھی، اس نے پانچ کھائیں، اس نے واقعی مجاہدہ کیا کہ اپنی بھوک کا چوتھا حصہ پورا کیا، تین حصے

پورے نہ کیئے، تو حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے عام انسانوں سے زیادہ قوتیں عطا فرمائی ہیں، ان قوتوں کے باوجود وہ صبر کرتے ہیں۔

تعدّد ازواج کی حکمتیں:

میں ماموں کانجن میں ہوتا تھا، ہمارے سامنے ایک خاتون ڈاکٹر تھیں، اس کا بھائی اس سے ملنے کے لئے آیا، بالکل نوعمر سا تھا، بیس، بائیس سال کی عمر ہوگی، بے چارا بہت سے مسائل میں غلط فہمیوں میں الجھا ہوا تھا، وہ ہر بات میں کہتا تھا کہ یا تو یہ مسئلہ غلط ہے یا مولوی جھوٹ بولتے ہیں، خیر مجھ سے گفتگو کرنے لگا، میں نے کہا کہ بے چارہ نوعمر ہے، اس کو سمجھانا چاہئے، کہنے لگا کہ ہم نے سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں، اور مولوی کہتے ہیں کہ صرف چار نکاح کر سکتے ہیں، یا تو مولوی جھوٹ بولتے ہیں یا حدیث غلط ہے، میں نے اس کو سمجھایا کہ نہ تو مولوی جھوٹ بولتے ہیں اور نہ حدیث غلط ہے، ہمیں چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت ہے، چار سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت دنیا سے تشریف لے گئے، اس وقت آپؐ کے عقد میں نو ازواج مطہراتؓ تھیں، میں نے اس کو تعدد ازواج کے مسئلہ میں بہت سی چیزیں سمجھائیں، ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار ہزار مردوں کی طاقت عطا فرمائی گئی تھی، اور جب ہر مرد کے لئے چار بیویوں کی اجازت ہے تو جو شخص چار ہزار مردوں کے برابر طاقت رکھتا ہو، اس کو سولہ ہزار بیویوں کی اجازت ہونی چاہئے تھی، مگر آپؐ نے صرف نو بیویوں پر کفایت فرمائی، ادھر میرا اور آپ کا یہ حال ہے کہ شاید ایک بیوی کے بھی لائق نہیں، اب ایک شخص وہ ہے جس کی طاقت ایک بیوی کی بھی متحمل نہیں، اس کو چار بیویوں کی اجازت ہے، اور ایک شخص وہ ہے جس کو سولہ ہزار کی طاقت ہے، اس کو صرف نو بیویاں دی گئیں، اب تم بتاؤ کہ کس کے ساتھ رعایت کی گئی؟

دعوتِ نبوت کے لئے عورتوں کی ضرورت:

دوسری بات یہ ہے کہ ہر آدمی کے کچھ نظریات ہوتے ہیں، اور اس کو اپنی دعوت کو پھیلانے کا حق دیا گیا ہے، مردوں میں تو آدمی خود کام کرسکتا ہے، لیکن عورتوں میں کام کرنے کے لئے اس کو کسی نائب کی، کسی سیکریٹری کی ضرورت ہے، اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے بیوی کو تجویز کیا ہے۔

ہمارے زمانے کا دستور:

یہ تو ہمارے زمانے کا دستور ہے کہ نامحرم بھی سیکریٹری ہیں، عورتوں کے مرد اور مردوں کی عورتیں۔ عورتوں کے اعضاءِ مستورہ کا علاج مرد کرتے ہیں، اور مردوں کے اعضاءِ مستورہ کا علاج بے چاری لڑکیاں کرتی ہیں، میرے پاس بہت سی لڑکیوں کے خطوط آتے ہیں کہ ہم ڈاکٹری پڑھتی ہیں، اور ہمیں مردوں کے اعضاءِ مستورہ کو دیکھنا اور چھونا پڑتا ہے، ہم کیا کریں؟ میں لکھ دیتا ہوں کہ یہ اس معاشرے کی خرابی ہے، یا تو تم ڈاکٹری پڑھنا چھوڑ دو، یا گورنمنٹ سے اس قباحت کے خلاف احتجاج کرو، ہوتا یہ ہے کہ میت کی برہنہ لاش رکھی ہوئی ہے اور لڑکے اور لڑکیاں سب مل کر اس کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں، اور سب کے سامنے مردہ کے اعضاءِ مستورہ کو ہاتھ لگاتے ہیں، نہ معلوم جدید معاشرے نے شرم و حیا کا جامہ کیوں تار تار کردیا ہے؟ مرد اور عورت کا کوئی امتیاز نہیں رہنے دیا گیا۔

جدید فیشن نے مرد اور عورت کی تمیز ہی ختم کردی:

اب دیکھئے کہ زچہ خانوں میں بعض مرد ڈاکٹر زچگی کرواتے ہیں، حالانکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ سے عورتوں کے ساتھ خاص سمجھی گئی ہے، لیکن یہ جدید فیشن ہے جس نے مرد کو مرد نہیں رہنے دیا اور عورت کو عورت نہیں رہنے دیا، حیا اور شرم کا تصور ہی ختم کردیا، نرسنگ کا پیشہ خاص طور سے لڑکیوں کے ساتھ خاص کردیا گیا ہے،

اور کہا جاتا ہے کہ عورت بہتر تیمارداری کر سکتی ہے، حالانکہ محرم عورتیں بھی اپنے محرم مرد کو پیشاب، پاخانہ کرواتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں، لیکن ہسپتالوں میں نامحرم لڑکیوں کو اس خدمت پر مقرر کر دیا گیا ہے، اور وہ اجنبی مردوں کو پیشاب، پاخانہ کراتی ہیں، اس کا کوئی احساس ہی نہیں کہ شرم و حیا بھی کوئی چیز ہے، تو میں اس زمانے کی بات نہیں کر رہا یہ تو ماشاءاللہ بیسویں صدی ہے، میں اس معاشرے کی بات کر رہا ہوں جس میں غیر عورتیں سیکریٹری نہیں بن سکتیں تھیں۔

ایک مرد کو چار کی اجازت ہے، تو نبی کی دعوت کے لئے کتنی ہونی چاہئیں؟

تو اللہ تعالیٰ نے ہر مرد کو چار تک سیکریٹری رکھنے کی اجازت دے دی ہے کہ عورتوں کے میدان میں دعوت و تبلیغ کا کام کرنے کے لئے تم اپنے چار معاون رکھ سکتے ہو، وہ تمہارے لئے محرم ہوں گی، نامحرم نہیں، تم ان کو سمجھا دو گے اور وہ مستورات تک تمہاری دعوت پہنچا دیں گی، یہ تو اللہ تعالیٰ نے عام آدمیوں کو اجازت دی ہے، اب رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر غور کرو، جن کا دین اسود و احمر کے لئے ہے، گورے اور کالے کے لئے ہے، مشرق اور مغرب کے لئے ہے، موجود اور غائب کے لئے ہے، ہر وقت اور ہر زمانے کے لئے ہے، ہر خطہ اور ہر جگہ کے لئے ہے، ہر شخص اور ہر قوم کے لئے ہے، تم بتاؤ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کو امت کی تمام عورتوں تک پہنچانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کتنی عورتیں ہونی چاہئے تھیں؟

اس وقت پتہ نہیں کہاں سے مضامین کی آمد ہوئی تھی، اس نوجوان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ بیویاں ہونے کی حکمتیں سمجھاتے ہوئے جب میں نے چار نکات بیان کر کے یہ کہا کہ نمبر پانچ، تو وہ صاحب کہنے لگے کہ اگر آپ مجھے

آدمی سمجھتے ہیں تو یہ مسئلہ میں سمجھ گیا ہوں۔

انبیاءؑ کی جتنی قوت ہوتی ہے ضبط بھی اسی طرح کا ہوتا ہے:

تو میں عرض کر رہا تھا کہ انبیاءؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام میں اور لوگوں سے زیادہ قوت ہوتی ہے، اور جتنی زیادہ قوت اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی ہے، اتنا ہی کامل ضبط و نفس بھی انہیں عطا فرمایا ہے، یہی مجاہدہ ہے جس سے ان کا اجر بھی بڑھتا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

"عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: دَخَلْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ یُوْعَکُ. فَقُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّکَ تُوْعَکُ وَعْکًا شَدِیْدًا. قَالَ: اَجَلْ! اِنِّیْ اُوْعَکُ کَمَا یُوْعَکُ رَجُلَانِ مِنْکُمْ. قُلْتُ: ذَالِکَ بِاَنَّ لَکَ اَجْرَیْنِ. قَالَ: اَجَلْ! ذَالِکَ کَذَالِکَ ..... الخ."

(صحیح بخاری ج:۲ ص:۸۴۳)

ترجمہ:...... "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، (میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بخار ہے، اور بہت ہی شدید بخار ہے) میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ کو تو بہت ہی شدید بخار ہے، فرمایا: ہاں! مجھے تم لوگوں سے دوگنا بخار ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجر بھی دوہرا ملے گا۔ فرمایا: ٹھیک سمجھے ہو۔"

اللہ اکبر! دو آدمیوں کے برابر بخار، اگر معمولی بخار ایک سو دو یا ایک سو تین

درجہ کا فرض کرلیا جائے تو اس کا ڈبل کتنا ہوگا؟ معمول کا بخار اگر ایک سو چار یا ایک سو پانچ تک پہنچ جائے تو ہمارا جو حال ہوجاتا ہے وہ آپ کو معلوم ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بخار جو اس کا ڈبل ہوجاتا ہوگا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہاں! تمہارے دو آدمیوں کے برابر مجھے بخار ہوتا ہے۔

خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ عصمت کے یہ معنی نہیں کہ نبیوں میں طاقت نہیں ہوتی، طاقت ہوتی ہے، اگر طاقت نہ ہوتو ان کو ثواب کیا ملے گا؟ ان میں طاقت ہوتی ہے، طاقت ہونے کے باوجود ان پر عصمت کا پہرہ رہتا ہے۔

اس عصمت کی بدولت ممکن نہیں کہ ان کی آنکھ بھٹک جائے، ممکن نہیں کہ ان کی زبان بھٹک جائے، ممکن نہیں کہ ان کے کان بھٹک جائیں، ممکن نہیں کہ ان کے ہاتھ پاؤں بھٹک جائیں، ان کے وجود کے کسی حصہ سے گناہ سرزد نہیں ہوسکتا، یہ عصمت ہے جو حضرات انبیاؑ علیہم السلام کا خاصہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی معصوم نہیں، یہ جو شیعہ لوگ بارہ معصوم اماموں کا عقیدہ رکھتے ہیں، محض غلط ہے، عصمت صرف انبیاؑ کرام علیہم السلام کا خاصہ ہے، کسی کو معصوم سمجھنا گویا اس کو نبی سمجھنا ہے۔

اولیاؑ محفوظ ہوتے ہیں:

ہاں! اولیاؑ اللہ محفوظ ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی بھی گناہوں سے حفاظت کرتے ہیں تو اسی حفاظت کو طلب کرنے کے لئے حضرت شیخ رحمہ اللہ دعا کر رہے ہیں:

''یا اللہ! ہمیں ایسی حفاظت نصیب فرما جس کے ذریعہ آپ ہمیں گناہوں کی دلدل سے نکال دیں۔''

مطلب یہ کہ ہم گناہوں کی دلدل میں مبتلا نہ ہوں، کبیرہ گناہوں میں مبتلا ہونے والا ولی اللہ نہیں ہوسکتا، اور اگر کبھی غلبۂ بشریت کی وجہ سے کبیرہ گناہ سرزد ہو بھی جائے تو وہ بغیر توبہ کے نہیں رہ سکتا، جس شخص کا حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ صحیح تعلق ہو وہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتا ہے، اور کبیرہ گناہوں سے بچنے کے لئے صغیرہ گناہوں سے بھی بچتا ہے، کیونکہ صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنا بھی کبیرہ گناہ ہے۔

مؤمن اور منافق میں فرق:

ایک حدیث شریف میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

''اَنَّ الْمُؤْمِنَ یَرٰی ذُنُوْبَہٗ کَاَنَّہٗ فِیْ اَصْلِ جَبَلٍ یَخَافُ اَنْ یَّقَعَ عَلَیْہِ، وَاِنَّ الْفَاجِرَ یَرٰی ذُنُوْبَہٗ کَذُبَابٍ وَّقَعَ عَلٰی اَنْفِہٖ، قَالَ بِہٖ ھٰکَذَا فَطَارَ ..... الخ.''

(ترمذی ج:۲ ص:۷۳)

ترجمہ:......''مؤمن سے جب گناہ سرزد ہوتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے کہ جیسے پہاڑ کے نیچے آگیا ہوں، (جو شخص پہاڑ کے نیچے دب جائے اس پر کتنا بوجھ ہوگا؟ اور وہ اس سے نکلنے کی کتنی کوشش کرے گا؟) بخلاف منافق کے، منافق کو ایسا لگتا ہے کہ مکھی ناک پر بیٹھی تھی، اڑادی۔''

منافق التفات بھی نہیں کرتا کہ مجھ سے کوئی گناہ ہوا ہے، اور مجھے توبہ کی ضرورت ہے، ہمارے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کے درمیان یہی فرق ہے، ہم اپنی زندگی گزارتے ہوئے پرواہ نہیں کرتے کہ ہم سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ تو سرزد نہیں ہو رہا؟

ہماری بے اعتنائی:

اول تو ہمیں توجہ نہیں ہوتی اس لئے کہ ہمیں پرواہ نہیں، فکر نہیں کہ ہم سے کوئی نافرمانی سرزد نہ ہو اور اگر کبھی توجہ ہو بھی جائے تو کہتے ہیں کہ چلو جی اللہ تعالیٰ معاف کرے گا، یعنی ہمیں بچنے کی ضرورت نہیں ہے، بس یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے کہ وہ خود ہمیں معاف کردیا کرے، ہمیں یہ کہنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، اپنی رحمت سے مجھے معاف کردیجئے، بس یہ کہہ دیتے ہیں کہ کوئی بات نہیں، اللہ معاف کرے گا۔

ہماری غفلت اور شیطان کی ہوشیاری کی مثال:

یہ بے پروائی ہے اور جو شخص اپنے دین کے بارے میں بے پرواہ ہوجاتا ہے وہ دین کو غارت کرڈالتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی بہت بڑے خزانے پر کسی شخص کو پہرے دار مقرر کیا گیا ہو، وہ آرام سے سوجائے، یا کہیں بے پروائی سے چلا جائے اور چور ڈاکو اس کا خزانہ لوٹ کر لے جائیں، ہمیں اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ پر پہرے دار مقرر فرمایا کہ اعمال صالحہ کرو، اور ان کا پہرہ بھی دو کہ وہ ضائع نہ ہوجائیں، اور یہ اعمال صالحہ بہت بڑی دولت ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہیں، یہ جو ہمارے اعضا ہیں، ہاتھ پاؤں، یہ بہت بڑی دولت ہیں، اور یہ اعمال صالحہ کے خزانے ہیں، لیکن ہمیں نہ تو یہ احساس ہے کہ ہمارے پاس کتنا خزانہ ہے اور نہ اس کا احساس ہے کہ اس خزانے کو لوٹ بھی لیا جاتا ہے۔

شیطان، انسان کے تعاقب میں ہے:

شیطان ہمارے تعاقب میں ہے، ہمہ دم چوکس بیٹھا ہے، جیسے بلی گھات لگاکر بیٹھتی ہے، اسی طرح ہمارے اعمال صالحہ کو اچکنے کے لئے شیطان گھات لگاکر بیٹھتا ہے، اس کی صرف ایک مثال دے دیتا ہوں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

”عَنْ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اَلشَّیْطَانُ جَاثِمٌ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ، فَاِذَا ذَکَرَ اللّٰہَ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ۔“

(مشکوٰۃ ص:۱۹۹)

ترجمہ:......”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: شیطان آدمی کے دل پر جم کر بیٹھتا ہے، اگر بندہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور جوں ہی بندہ ذکر الٰہی سے غافل ہو جائے شیطان وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔“

شیطان کی قسم:

ادھر یہ غافل ہوا نہیں ادھر شیطان نے اپنا کام کیا نہیں، تو معلوم ہوا کہ شیطان تو ہر دم تاک میں رہتا ہے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے قسم کھائی تھی، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

”فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ۔“ (ص:۸۲)

ترجمہ:......”تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کروں گا، ہاں تیرے مخلص بندے بچ جائیں تو دوسری بات ہے۔“

تو ہم لوگ اول تو بے پرواہ ہیں، گناہ ہوتے ہیں تو کوئی پرواہ نہیں، نہیں ہوتے تب بھی ٹھیک ہے، یعنی گناہوں سے بچنے کا اہتمام نہیں ہے، اپنے دامن کو گناہوں سے بچانے کا اہتمام نہیں ہے، اور جب گناہ ہو جاتا ہے اور ہمیں اس کا

احساس بھی ہوجاتا ہے کہ ہم سے گناہ سرزد ہوا ہے تو اب رجوع الی اللہ کا اور حق تعالیٰ شانہ کی طرف توبہ کرنے کا اہتمام نہیں ہے، یہ فکر نہیں کہ گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں، اور اس گناہ کی نجاست سے اپنے دامن کو توبہ کے پانی سے دھوڈالیں، بس یوں کہہ دیتے ہیں کہ چلو جی! کوئی بات نہیں، اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں، بھئی اللہ تعالیٰ کی ذات تو بڑی کریم ہے، نہ معلوم کس کس کو کس کس بات پر بخش دیں گے، ان کی بخشش میں تو کوئی شبہ نہیں، کوئی کلام نہیں، گفتگو تو اس میں ہے کہ اگر ہم سے گناہ ہوجائے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کیا ہمیں اس پر بے چین نہیں ہونا چاہئے تھا؟ کیا ہمارا صرف یہ کہہ لینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی بخش دیں گے۔

اہل اللہ کا گناہوں سے بچنے کا اہتمام:

تو میں نے کہا اللہ کے بندوں کے درمیان اور ہمارے درمیان یہ فرق ہے کہ وہ اول تو اہتمام کرتے ہیں گناہوں سے بچنے کا، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر زباغش یک خلائے کم شود

سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر اس کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہوجاتا ہے، یہ جو باغ اس نے لگا رکھا ہے دل میں، اگر اس میں ایک تنکے کی بھی کمی آجاتی ہے تو اس پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں، تو وہ گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں، خدانخواستہ اگر کبھی سہو کی بنا پر، بشریت کی بنا پر کوئی غلطی سرزد ہوجائے تو فوراً توبہ کرتے ہیں۔

جب تک اللہ راضی نہ ہوجائے:

ایک حدیث شریف میں دعا کا مضمون آتا ہے:

"وَلَکَ الْحَمْدُ حَتّٰی تَرْضٰی وَلَکَ الْحَمْدُ اِذَا

رَضِیۡتَ یَا اَہۡلَ التَّقۡوٰی وَیَا اَہۡلَ الۡمَغۡفِرَۃِ.“

(کنزالعمال ج:۲ حدیث:۵۱۰۰)

ترجمہ:......”اور تجھ کو منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہوجائے اور تیرے لئے حمد ہے جب تو راضی ہوجائے، اے تقویٰ (کو پسند کرنے) والے اور معاف کرنے والے۔“

عجیب الفاظ ہیں! اللہ تعالیٰ سے کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ! اگر آپ ہماری کسی غلطی کی وجہ سے ناراض ہوجائیں تو چین سے نہیں بیٹھیں گے، بلکہ آپ کو بہرصورت منانا ہے، اور جب تک آپ راضی نہ ہوجائیں ہم بدستور آپ کو مناتے رہیں گے، پس اگر کہیں غلطی ہوجائے تو جب تک اللہ تعالیٰ راضی نہ ہوجائیں اور اس بات کا اطمینان نہ ہوجائے کہ ہاں توبہ قبول ہوگئی، اس وقت تک وہ چوکھٹ کو نہیں چھوڑتے، اور جب آپ راضی ہوجائیں تو آپ کا شکر ادا کرنا ہے۔

گناہوں کی دلدل:

تو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ اپنی دعا میں فرماتے ہیں کہ:

”یا اللہ! ہمیں ایسی عصمت عطا فرما کہ آپ ہمیں گناہوں کی دلدل سے بچالیں، اس دلدل میں مبتلا نہ ہونے دیں۔“

اس کو دلدل اس لئے کہا کہ جیسے دریا میں بھنور ہوتا ہے، اس میں اگر کوئی شخص پھنس جائے تو پھر اس کا نکلنا بہت مشکل ہوجاتا ہے، ہاں کوئی اس کا ہاتھ پکڑ لے تو پھر دوسری بات ہے، کوئی دوسرا ہاتھ پکڑ کر نکال لے تو نکال لے، ورنہ بھنور اسے نیچے لے جاتا ہے اور غرق کرکے چھوڑتا ہے، اسی طرح گناہوں کے گرداب میں جو شخص جاپہنچتا ہے، پھر اس کے لئے نکلنا بہت مشکل ہوجاتا ہے، جب تک کہ کوئی

دست گیری کرنے والا نہ ہو، ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو، تو اللہ ہی بچائیں، یا اللہ! ہمیں ایسی عصمت عطا فرما جو ہمیں گناہوں کے ورطہ سے، گناہوں کے بھنور سے، گناہوں کی دلدل سے، گناہوں کے گرداب سے نکال دے۔

رحمت اور مغفرت کا مفہوم:

"یا اللہ ہمیں ایسی رحمت عطا فرما جو ہمیں عیوب کی گندگی سے، میل کچیل سے پاک صاف کردے۔"

اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا وعدہ فرمایا ہے، ایک مغفرت اور ایک رحمت، ایک ہے بخش دینا، اور ایک ہے رحمت کردینا، تو یہ بخش دینا اور رحمت کرنا کیا ہوا؟ بزرگ فرماتے ہیں کہ بخش دینا تو یہ ہوا کہ گناہ پر مؤاخذہ نہ کیا جائے بلکہ گناہوں کو ڈھانک دیا جائے، لیکن گناہ کا اثر تو باقی رہے گا، پکڑ تو نہ کی لیکن گناہ کا عیب تو لگا ہوا ہے، بھئی میرے دامن کو دھبہ لگا ہوا ہو اور گندگی لگی ہوئی ہو، آپ اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں کرتے، لیکن آپ کے اس مؤاخذہ نہ کرنے سے گندگی تو دور نہیں ہوجائے گی، وہ تو لگی رہے گی، تو رحمت یہ ہے کہ اس گندگی کو بھی دھوڈالے، پاک صاف کردے۔ حق تعالیٰ شانہ گناہوں کی مغفرت بھی فرماتے ہیں اور اپنی رحمت سے گناہوں کے داغ دھبے بھی دھوڈالتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:

"فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّئَاتِہِمْ حَسَنَاتٍ."

(الفرقان:۷۰)

ترجمہ:......"یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی سیئات کو حسنات سے بدل دیں گے۔"

برائیوں کو جھاڑ دیں گے، جیسے کہ کپڑے کو دھوکر پاک صاف کردیا جاتا ہے، اسی طرح حق تعالیٰ شانہ گناہوں کی آلودگی سے، ان کی گندگی سے، ان کی نجاست سے

ہمارے دامن ایمان کو پاک کردیں گے، یہ رحمت ہے اور اسی کو شیخ رحمہ اللہ ذکر فرما رہے ہیں کہ: ''ہمیں اپنی طرف سے ایسی رحمت عطا فرما جس کے ذریعہ عیوب کی گندگی اور اس کے میل کچیل سے آپ ہمیں پاک کردیں۔''

رحمت کا دوسرا معنیٰ:

ایک معنیٰ رحمت کے اور بھی ہیں۔ وہ یہ کہ قصوروار کے قصور کو معاف کردینا، یعنی اس پر مؤاخذہ نہ کرنا، پکڑ نہ کرنا تو مغفرت ہے اور جب قصوروار ندامت کے ساتھ آئے تو اس کو انعامات سے نوازنا رحمت ہے، تو حق تعالیٰ شانہ صرف گناہوں کی مغفرت پر کفایت نہیں فرماتے بلکہ جو بھی توبہ لے کر آئے اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے نوازشیں اور عنایات فرماتے ہیں، گناہ بھی معاف ہوئے اور ساتھ کے ساتھ عنایات الٰہیہ کے تحائف بھی لے کر آئے، حق تعالیٰ شانہ ہم سب کو اپنی رحمت و مغفرت کا مورد بنائیں۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ حاضرین سے فرمایا کرتے تھے:

> ''جَعَلَنَا اللهُ وَاِيَّاكُمْ مِمَّنْ تَنَبَّهَ لِخِدْمَتِهٖ وَتَنَزَّهَ عَنِ الدُّنْيَا وَتَذَكَّرَ يَوْمَ حَشْرِهٖ وَاقْتَفٰى آثَارَ الصَّالِحِيْنَ اِنَّهٗ وَلِيُّ ذَالِكَ وَالْقَادِرُ عَلَيْهِ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ.'' (قلائد الجواہر ص:۴۱)
>
> ترجمہ:...... ''اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ان لوگوں میں سے بنائیں جو اللہ تعالیٰ کی خدمت کے لئے متنبہ ہوجائیں اور جاگ جائیں، (خدمت سے مراد ہے اللہ کی عبادت کے لئے کھڑا ہونا) اور دنیا سے پرہیز کریں اور اپنے حشر کے دن کو یاد کریں، اور نیک لوگوں کے آثار کی اقتدا کریں (اللہ تعالیٰ ہمیں

ان لوگوں میں سے بنائیں)، بے شک اللہ تعالیٰ اس کے ولی
ہیں اور اس پر قادر ہیں۔"

سلف صالحین کی اتباع:

اور آخر میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

وَمَنْ يَتْرُكُ الْآثَارَ قَدْ ضَلَّ سَعْيُهُ
وَهَلْ يَتْرُكُ الْآثَارَ مَنْ كَانَ مُسْلِمًا

(قلائد الجواہر فی مناقب الشیخ عبدالقادر ص:۴۱)

ترجمہ:......"جو شخص کہ سلف صالحینؒ کے نشاناتِ قدم کو چھوڑ دے اس کی محنت رائیگاں جاتی ہے، اور کیا کوئی مسلمان اپنے سلف صالحینؒ کے آثار اور نشانات کو چھوڑ سکتا ہے؟"

یہ گویا ان کی دعا کا خلاصہ ہوتا تھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے جو خدمت کے لئے متنبہ ہوجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بندگی میں مشغول رہتے ہیں، عقلمند اور دانشمند غلام اپنے مولیٰ کی خدمت میں مشغول رہتا ہے، بیدار رہتا ہے، غافل نہیں ہوتا، اور سوتا نہیں، سونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دل کی آنکھیں بند نہیں ہوتیں، اگر آرام کرتا ہے تو اس مقصد کے لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی مشین ہے، اس کو آرام دینا بھی ضروری ہے، غرضیکہ اپنی خواہشات میں مشغول ہونے کی بجائے اپنے مالک کی خدمت میں مشغول ہوتا ہے۔

دنیا سے نزاہت:

اور دوسری چیز دنیا سے منزہ ہونا ہے، اور یہ اس لئے نزاہت اور پاکیزگی حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ دنیا ہے ہی ایسی چیز کہ اس سے پاکیزگی حاصل کی جائے، چنانچہ کنز العمال میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول نقل کیا ہے:

"اَلدُّنْیَا جِیْفَةٌ، فَمَنْ اَرَادَهَا فَلْیَصْبِرْ عَلٰی مُخَالَطَةِ الْکِلَابِ." (کنز العمال ج:۳ حدیث:۸۵۶۴)

ترجمہ:...... "دنیا مردار ہے، جو شخص اس کو حاصل کرنا چاہے، وہ کتوں سے میل جول پر صبر کرے۔"

اسی مضمون کو عام طور پر اس طرح ذکر کیا جاتا ہے کہ:

"اَلدُّنْیَا جِیْفَةٌ وَطَالِبُهَا کِلَابٌ."

ترجمہ:...... "دنیا مردار ہے اور اس کے طلب کرنے والے کتے ہیں۔"

دنیا کو مقصد بنانے کے نقصانات:

جب دنیا کو مقصد بنایا جائے تو اسی طرح ہوتا ہے جس طرح آج ہو رہا ہے، لڑائیاں بھڑائیاں ہوتی ہیں، منافشت ہوتی ہے، چھینا جھپٹی ہوتی ہے، ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش ہوتی ہے، ایک دوسرے سے حسد ہوتا ہے، کینہ ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

دنیا آخرت کے لئے ہو:

لیکن اگر دنیا کی زندگی اس مقصد کے لئے ہو کہ آخرت کی تیاری کرنی ہے، اور آدمی کو آخرت کی فکر ہمیشہ لگی رہے، اور آخرت کا مقصد سامنے رہے تو پھر آدمی کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا اور اس کے تمام کام دنیا نہیں، بلکہ سب کچھ آخرت کے حساب میں شمار ہوتا ہے۔

دنیا آخرت کے لئے ہو تو وہ بھی دین ہے، ایک مثال!

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مقام پر فرمایا کہ جب کھانے کا حساب کرتے ہیں کہ کھانے کی مد میں اتنے پیسے خرچ ہوئے، یعنی مطبخ کا

حساب کرتے ہیں تو اس میں لکڑیوں اور اوپلوں کی بھی قیمت لگاتے ہیں، گائے اور بھینس کا گوبر ایندھن کے کام آتا ہے، اس سے کھانا پکایا جاتا ہے، تو لکڑی اور اوپلے بھی کھانے کی مد میں لگائے جاتے ہیں، اب کوئی پوچھنے والا ہو کہ تم نے کھانے کے حساب میں لکھا ہے کہ کھانے پر اتنا خرچ ہوا، تو کیا اوپلے بھی کھائے جاتے ہیں؟ کہ ان کو کھانے کے حساب میں شمار کیا، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اوپلے کھائے تو نہیں جاتے لیکن ان کے بغیر کھانا تیار نہیں ہوتا، اس لئے جب کھانے کا حساب کیا جائے گا، تو اوپلوں کو بھی ان میں شامل کیا جائے گا۔

بس اسی مثال سے سمجھ لیجئے کہ مؤمن آدمی دنیا میں کھاتا ہے، پیتا ہے، نکاح کرتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے، مشاغل اختیار کرتا ہے، لیکن یہ تمام چیزیں خود مقصد نہیں بلکہ اوپلے ہیں، ان کو کھانے کے لئے نہیں خریدتا بلکہ جلانے کے لئے خریدتا ہے، ان سے کھانے کی تیاری میں کام لینا مقصود ہے، اگر ان تمام چیزوں سے آخرت کی تیاری کا کام لینا مقصود ہے تو یہ چیزیں دنیا نہیں بلکہ دین کی مد میں اور آخرت کے حساب میں شمار ہوتی ہیں۔ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"اِذَا اَنْفَقَ الْمُسْلِمُ نَفَقَةً عَلٰی اَھْلِہٖ وَھُوَ یَحْتَسِبُھَا كَانَتْ لَہٗ صَدَقَةٌ." (مشکوٰۃ ص:۱۷۰)

ترجمہ:...... "جب مسلمان اپنے گھر والوں پر ثواب کی نیت سے خرچ کرے تو وہ اس کے لئے صدقہ شمار ہوتا ہے۔"

جائز خرچ پر اجر:

گویا مؤمن کو اس کے جائز خرچ میں اجر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ جو لقمہ اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتا ہے، اس پر بھی اس کو اجر دیا جاتا ہے، اب بیوی کو کھلانا یہ تو دنیاداری کی چیز ہے، ہر کافر اور ہر مؤمن میں مشترک ہے، نیک اور بد میں

پائی جاتی ہے، اپنے گھر والوں کو سبھی کما کر کھلاتے ہیں، لیکن مؤمن کو اس پر اجر دیا جاتا ہے، اس لئے کہ وہ آخرت کے لئے یہ کام کرتا ہے، صرف دنیا مقصد نہیں بلکہ آخرت مقصد ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:

”عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِنَّ بِکُلِّ تَسْبِیْحَۃٍ صَدَقَۃً، وَکُلِّ تَکْبِیْرَۃٍ صَدَقَۃً، وَکُلِّ تَحْمِیْدٍ صَدَقَۃً، وَکُلِّ تَھْلِیْلَۃٍ صَدَقَۃً، وَاَمْرٍ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَۃً، وَنَھْیٍ عَنِ الْمُنْکَرِ صَدَقَۃً، وَفِیْ بُضْعِ اَحَدِکُمْ صَدَقَۃً. قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَیَاْتِیْ اَحَدُنَا شَھْوَتَہٗ وَیَکُوْنُ لَہٗ فِیْھَا اَجْرٌ؟ قَالَ: اَرَأَیْتُمْ لَوْ وَضَعَھَا فِیْ حَرَامٍ اَکَانَ عَلَیْہِ فِیْہِ وِزْرٌ، فَکَذَالِکَ اِذَا وَضَعَھَا فِی الْحَلَالِ کَانَ لَہٗ اَجْرٌ۔“ (مشکوۃ ص:۱۶۸)

ترجمہ:......”ہر تسبیح (سبحان اللہ کہنا) صدقہ ہے، ہر تکبیر (اللہ اکبر کہنا) صدقہ ہے، ہر تحمید (الحمدللہ کہنا) صدقہ ہے، ہر تہلیل (لا الٰہ الا اللہ کہنا) صدقہ ہے، نیکی کا حکم کرنا صدقہ ہے، برائی سے روکنا صدقہ ہے، بیوی کے پاس جانا صدقہ ہے، عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! ایک آدمی بیوی سے اپنی خواہش پوری کرتا ہے، کیا اس کو بھی اجر ملتا ہے؟ فرمایا: دیکھو اگر وہ ناجائز جگہ خواہش پوری کرتا تو اس کو گناہ ہوتا ہے، اسی طرح جب حلال جگہ جنسی خواہش پوری کرتا ہے تو اس کو اجر ملتا ہے۔“

تو ”تنزہ عن الدنیا“ جس کو شیخ رحمہ اللہ فرما رہے ہیں، یعنی دنیا کی زندگی سے تنزہ حاصل کرنا، وہ یہی ہے کہ اب دنیا کی آسائشوں اور یہاں کی لذتوں میں ایسا مشغول نہ ہوا جائے کہ اپنے مقصد کو بھول جائے، اگر یہ اپنے مقصد کو بھول گیا تو پھر

یہ دنیادار ہے۔

مؤمن دنیادار نہیں ہوتا:

مؤمن کو دنیادار نہیں ہونا چاہئے، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے اگر کوئی شخص کہتا کہ ہم تو دنیادار ہیں، تو حضرتؒ فرماتے کہ کیا مسلمان بھی دنیادار ہوتا ہے؟ مؤمن تو آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، ایک روایت میں فرمایا گیا ہے:

''اَنَّمَا الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ.''

ترجمہ:...... ''دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔''

عجیب فقرہ ہے! تو ہم یہاں کھانے کمانے کے لئے پیدا نہیں ہوئے، مکان بنانے کے لئے پیدا نہیں کئے گئے ہیں، یہ چیزیں بھی چلیں گی، یہ بھی بند نہیں ہوں گی، لیکن یہ سب کچھ دنیا کی معیشت ہے، خود مقصود نہیں۔

دنیا ہمارا مقصد نہ ہو:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے:

''وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا غَایَۃَ رَغْبَتِنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَّا یَرْحَمُنَا. رواہ الترمذی.'' (مشکوٰۃ ص:۲۱۹)

ترجمہ:...... ''اور نہ بنادینا دنیا کو ہمارا مقصود اعظم، اور نہ ہماری رغبت کی منزل مقصود، اور نہ ہماری معلومات کی انتہا، اور ہم پر اس کو حاکم نہ کر جو ہم پر مہربان نہ ہو۔''

مسلمان دنیا میں مشقت میں ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک جنازہ گزرا، فرمایا: "مُسْتَرِیْحٌ اَوْ مُسْتَرَاحٌ مِّنْهُ." (یہ راحت پانے والا ہے، یا اس سے راحت حاصل ہوگئی) عرض کیا گیا: اس کا کیا مطلب ہے کہ یہ راحت پانے والا ہے یا اس سے راحت مل گئی؟ فرمایا: مؤمن بندہ دنیا کی مشقتوں سے، یہاں کی تکلیفوں سے خلاصی حاصل کرلیتا ہے، راحت پالیتا ہے، مرگیا تو سب چیزوں سے آرام مل گیا، ہرقسم کی رحمت نصیب ہوگئی، اور فاجر اور بدکار آدمی اس سے اللہ کی مخلوق اور اللہ کی زمین راحت پاتی ہے، مرجاتا ہے تو اس سے سب کی جان چھوٹ جاتی ہے، زندگی ہو تو ایسی ہو کہ خیر ہی خیر سمیٹنے والی ہو۔

آدمی سے خیر پھیلے:

آدمی کو ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے وجود سے خیر پھیلے اور شر بند ہو، زندگی ایسی ہو کہ اس کی ذات سے اس کو بھی نفع پہنچے، راحت پہنچے اور اللہ کی دوسری مخلوق کو بھی نقصان نہ پہنچے، آدمی کا وجود نفع رساں ہونا چاہئے، پھر تو انشاءاللہ زندگی ہر خیر میں زیادتی کا باعث ہوگی، اور اگر آدمی کا وجود ایسا ہے کہ اپنے آپ کو بھی ہلاک کر رہا ہے اپنی بدعملیوں کی وجہ سے اپنے کو غارت کر رہا ہے اور اللہ کی مخلوق بھی اس سے تنگ ہے، زمین کے جن ٹکڑوں پر بدعملی کرتا ہے، وہ اس پر لعنت کرتے ہیں، تو ظاہر ہے ایسی زندگی سے موت اچھی ہے۔

زندگی کی معاش سے چارہ نہیں:

تو مقصد یہ ہے کہ زندگی کی معاش سے تو چارہ نہیں ہے، جب یہاں زندگی گزرے گی تو یہاں کی زندگی کے لوازم بھی حاصل کرنے پڑیں گے، کھانا پینا ہے، رہنا سہنا ہے، لباس و پوشاک ہے، اور دوسری ضروریاتِ زندگی ہیں، مگر مؤمن و کافر میں

یہی فرق ہے کہ مؤمن ان کو مقصد نہیں بناتا، کافر ان کو مقصد بناتا ہے۔

حضراتِ انبیاءؑ اور شیطان کی تلقین کا فرق:

حضرات انبیاءؑ کرام علیہم السلام دنیا کے لوگوں کو یہی تعلیم دیتے ہیں کہ کھاؤ، پیو اور حدود کے اندر رہ کر دنیا برتو، لیکن یہاں کی چیزوں کو مقصد نہ بناؤ، اور شیطان لوگوں کو یہ تعلیم و تلقین کرتا ہے کہ بس انہیں چیزوں کو مقصد بناؤ، تم نے آخرت کہاں دیکھی ہے؟ کون مرے گا، کون جئے گا؟ چھوڑو اس قصے کو، تو ''تنزہ عن الدنیا'' یہ ہے کہ دنیا کو ایک نجاست سمجھتے ہوئے اس سے اپنے دامن کو پاک رکھنے کی کوشش کرو تاکہ تمہارے دامنِ ایمان کو اس کی کوئی آلودگی نہ لگے، وہ آلودگی کیا چیز ہے؟ حرام، ممنوع اور ناجائز چیزیں تمہاری زندگی کے دامن کو آلودہ نہ کریں، یہ ''تنزہ عن الدنیا'' ہے۔

بارگاہِ الٰہی کی پیشی کی یاد کی ضرورت:

اور تیسری دعا یہ فرمائی ہے کہ:

''یا اللہ! ہمیں ان لوگوں میں سے بنا جو تیرے سامنے جمع ہونے کو اور تیری بارگاہ میں پیش ہونے کو یاد رکھتے ہیں۔''

اس کو یاد رکھنے میں لوگوں کے درجات مختلف ہیں، اللہ کی بارگاہ میں پیشی کا ایک دھندلا سا تصور ہمارا بھی ہے، کسی بھی مسلمان سے پوچھو کہ ہم نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے؟ فوراً کہے گا: ہاں! بھئی بڑی اچھی بات ہے، واقعی یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، لیکن بندہ پرور! اس عقیدے کا اور تصور کا ہماری زندگی میں کیا اثر ہے؟

بارات کی تیاری اور آخرت سے غفلت:

آپ کے لئے کسی بارات میں شامل ہونے کی ایک تاریخ مقرر کردی گئی،

آپ اس کے لئے تیاری کرتے ہیں، کپڑے سلواتے ہیں، اور ضرورت کی چیزیں خریدتے ہیں، اور خوب بن ٹھن کر جاتے ہیں، اسی طرح اگر آپ کے لئے کسی بڑے افسر سے ملاقات کی تاریخ مقرر کردی گئی ہو تو آپ کا رکھ رکھاؤ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے، اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ وہ افسر صاحب شلوار قمیص کو پسند نہیں کرتے، تو آپ اس افسر سے ملاقات کے لئے سوٹ سلواتے ہیں۔

دنیاوی افسر سے ملاقات کا لباس:

ایک صاحب نے لکھا تھا کہ میں ایک صاحب سے ملنے کے لئے گیا تھا، اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، میں واپس آگیا، اس کے بعد میں سوٹ پہن کر گیا، یعنی انگریزوں کا لباس، تو کھڑا ہوگیا، اور اس نے کھڑے ہوکر میرا استقبال کیا اور کہا کہ: ہاں! اب آدمیوں کا لباس پہن کر آئے ہو نا! تو اگر حاکم خاص قسم کا لباس پسند کرتا ہے تو آپ اس لباس کا اہتمام کرتے ہیں، اور ان تمام آداب کا اہتمام کرتے ہیں جو اس حاکم کی ملاقات کے لئے ضروری ہیں۔

ملاقاتِ الٰہی کا یقین ہے تو اہتمام کیوں نہیں؟

اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا واقعی یقین ہے تو کیا آپ نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا بھی کبھی اہتمام کیا ہے؟ کہ فلاں قسم کے لباس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں، اس لئے وہی لباس پہنا کریں گے، کیونکہ میری اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تاریخ مقرر ہوچکی ہے، اور پھر مجھے اپنا پورا نامہ اعمال لے کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنا ہے، اس نامۂ اعمال میں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہئے جو کل قیامت کے دن میرے لئے باعثِ ندامت ہو، جس سے مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے، میرے نامۂ اعمال میں کوئی عمل ایسا نہیں ہونا چاہئے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوں یا میں اللہ تعالیٰ کے غضب یا ناراضگی کا مورد بن جاؤں۔

ملاقاتِ الٰہی کا دھندلا تصور:

تو میں نے کہا کہ تصور تو ہمارا بھی یہی ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنی ہے، مگر یہ تصور اتنا دھندلا ہے کہ ہمیں ملاقات کی تیاری پر آمادہ نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے اس پیشی کے مضمون کو قرآن کریم میں بار بار دہرایا ہے، مختلف عنوانات سے، مختلف پیرایوں سے، اور مختلف اسالیب سے اس کو ذکر فرمایا ہے تاکہ لوگوں کی سمجھ میں بات آجائے اور وہ اس کی تیاری کریں۔

چنانچہ سورۂ المطفّفین میں فرماتے ہیں:

''وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ. وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ. اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُم مَّبْعُوْثُوْنَ. لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ. يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْن.'' (المطففین: ۱ تا ۴)

ترجمہ:...... ''ہلاکت ہے ان کمی کرنے والوں کے لئے جب لوگوں سے لیتے ہیں، تو پورا کر لیتے ہیں۔ اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو یہ گمان نہیں ہے؟ (کیا ان کو یہ دھیان اور خیال نہیں ہے؟) کہ ان کو اٹھایا جائے گا ایک بڑے دن میں۔ جس دن کھڑے ہوں گے لوگ رب العالمین کے سامنے۔''

کیا دنیا کا کوئی شخص یہ چاہے گا کہ مجھے کم چیز دی جائے؟ ہرگز نہیں! پھر جب دوسروں کو ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بارگاہ الٰہی کی پیشی ان کے سامنے نہیں۔ کیا ان لوگوں کو رب العالمین کے سامنے کھڑے ہونے کا اور اس دن کے حساب و کتاب کا خیال نہیں؟ یہاں تو تم نے

ایک پیسے کی یا معمولی سی چیز کی کمی کر کے اپنے نفس کو خوش کرلیا، لیکن ذرا سوچو کہ تم نے اپنی زندگی میں جو گھپلا کیا ہے، جب اس کا حساب دینا پڑے گا تو کہاں سے پورا کرو گے؟ یہاں تو جو کچھ لے لیا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ایک پیسہ آیا تو کیا نہ آیا تو کیا لیکن تم لوگ تھوڑی تھوڑی جو کمی کرتے گئے، جب پوری زندگی کا میزانیہ لگایا جائے گا تو کہاں سے پورا کر کے دو گے؟ ذرا سوچو! جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا یقین ہو، کیا ان کا کردار یہی ہونا چاہئے کہ کسی کے ساتھ ٹھگی کرتے رہیں؟ کسی کی چوری کرتے رہیں؟ کسی کے ساتھ ناپ تول میں گھپلا کرتے رہیں؟

متقین کی پیشی کا نقشہ!

قرآن کریم میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا."

(مریم:۸۵)

ترجمہ:...... "جس دن ہم حشر کریں گے متقیوں کا رحمٰن کی طرف وفد کی شکل میں۔"

جیسے کوئی معزز وفد کسی بڑے حاکم سے ملنے کے لئے جاتا ہے، اسی طرح متقی اور پرہیزگار لوگوں کو فرشتے اعزاز و اکرام کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں پیش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ تم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

مجرمین کی پیشی کا منظر!

اور مجرموں کے بارے میں فرمایا:

"وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ وِرْدًا."

(مریم:۸۶)

ترجمہ:...... "اور ہم مجرموں کو ہانک کر جہنم کی

طرف لے جائیں گے، اس حال میں کہ وہ پیاسے ہوں گے۔"
کسی کا حشر اُس طرح ہوگا، کسی کا اِس طرح ہوگا۔

میدانِ حشر میں لوگوں کی حالت:

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا. قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَلرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ جَمِيْعًا يَنْظُرُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ؟ فَقَالَ: يَا عَائِشَةُ! اَلْاَمْرُ اَشَدُّ مِنْ اَنْ يَّنْظُرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ."

(مشکوٰۃ ص:۴۸۳)

ترجمہ:......"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا: لوگ قیامت کے دن اس طرح اٹھائے جائیں گے کہ پاؤں سے ننگے، برہنہ اور غیر مختون ہوں گے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا مرد اور عورتیں سب ننگے اٹھائے جائیں گے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے؟ فرمایا: عائشہ! معاملہ اس سے کہیں سنگین ہے کہ کوئی کسی کو دیکھے۔"

قیامت کے دن لوگ ننگے ہوں گے:

یعنی قیامت کے دن لوگ اس طرح ننگے ہوں گے جیسا کہ پہلے دن پیدا ہوئے تھے، گویا جس شکل اور حالت میں ماں کے پیٹ سے تشریف لائے تھے، اس

حالت میں دوسری ماں یعنی زمین کے پیٹ سے نکلیں گے، چنانچہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: ”كَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ.“ (الانبیاء:۱۰۴) یعنی جس طرح ہم نے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا، اسی طرح دوبارہ پیدا کریں گے۔

سب سے پہلے کس کو لباس پہنایا جائے گا؟

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”وَاَوَّلُ مَنْ يُّكْسٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِبْرَاهِيْمُ.“

(مشکوٰۃ ص:۴۸۳)

ترجمہ:...... ”قیامت کے دن سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔“

حضرات علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس روایت میں دو احتمال ہیں:

ایک احتمال یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لباس حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے پہنایا جائے گا، لیکن چونکہ متکلم اپنی بات نہیں کیا کرتا بلکہ دوسروں کی بات کیا کرتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولیت اپنے علاوہ دوسری مخلوق کے اعتبار سے بیان فرمائی ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر باقی مخلوق میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا، اس صورت میں یہ اولیت اضافی ہوگی۔

حضرت ابراہیمؑ کی جزوی فضیلت:

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اولیت حقیقی ہو یعنی ابراہیم علیہ السلام کو یہ خاص فضیلت دی گئی ہو تو یہ بھی بعید نہیں، کیونکہ بعض باتوں میں دوسرے انبیاءؑ کو بھی فضیلت دی گئی، جس کو فضیلت جزئی کہتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کی خاطر برہنہ کیا گیا تھا، ان کے کپڑے اتار کر ان کو نارِ نمرود میں ڈالا گیا تھا، اور اللہ کی ذات کی

خاطر ان کو ذلیل کیا گیا تھا، جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام معززوں کے سردار تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا یہ بدلہ عطا فرمایا۔

حضرت موسیٰؑ کا بے ہوش نہ ہونا:

جیسا کہ ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"....... فَاِنَّهٗ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَیَصْعَقُ مَنْ فِی السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ. قَالَ: ثُمَّ یُنْفَخُ فِیْهِ اُخْرٰی فَاَکُوْنُ اَوَّلُ مَنْ بُعِثَ اَوْ فِیْ اَوَّلِ مَنْ بُعِثَ فَاِذَا مُوْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ آخِذٌ بِالْعَرْشِ فَلَا اَدْرِیْ اَحُوْسِبَ بَصَعْقَتِهٖ یَوْمَ الطُّوْرِ اَوْ بُعِثَ قَبْلِیْ ...... الخ."

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۲۶۷)

ترجمہ:...... "جب صور پھونکا جائے گا تو سب آسمان و زمین والے بے ہوش ہوجائیں گے، سوائے ان کے جن کو اللہ چاہیں گے، پھر دوسرا صور پھونکا جائے گا تو سب سے پہلے میں ہوش میں آؤں گا، تو دیکھوں گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عرش الٰہی کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اب میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بے ہوش ہی نہیں ہوئے، یا یہ کہ وہ بے ہوش تو ہوئے تھے لیکن مجھ سے پہلے ان کو ہوش آگیا، کیونکہ وہ ایک دفعہ کوہ طور پر تجلیٔ الٰہی سے بے ہوش ہوگئے تھے۔"

یہ تجلّی براہ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ یہ تجلّی کوہِ طور پر ہورہی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو بھی برداشت نہ کرسکے، حضرت موسیٰ

علیہ السلام نے تو جمالِ جہاں آرا کے دیدار کی درخواست کی تھی، دیدار نہیں ہوا تھا، صرف تجلّی ہوئی تھی، ایک جھلک دکھادی گئی تھی، پورا جمال نہیں دکھایا گیا، موسیٰ علیہ السلام پر تجلّی ہوجاتی تو شاید برداشت نہ کرسکتے، موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوگئے، بہت دیر کے بعد ہوش آیا۔

"فَلَمَّا اَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَکَ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ." (الاعراف:۱۴۳)

ترجمہ:...... "جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوش میں آئے تو کہنے لگے کہ: آپ پاک ہیں، میں آپ کی طرف توبہ کرتا ہوں، رجوع کرتا ہوں، اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔"

تو چونکہ کوہ طور پر تجلّی ہوئی اور اس تجلّی کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگئے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ہوسکتا ہے کہ اس بے ہوشی کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اس وقت بے ہوش ہونے سے محفوظ رکھا ہو۔

جزوی فضیلت:

تو میں عرض کررہا تھا کہ بعض خصوصیات میں بعض انبیائے کرام علیہم السلام کو بعض پر جزئی فضیلت حاصل ہے، رہی فضیلت کلی، جو تمام کمالات کی جامع ہے، وہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام بھی سب کے سب اللہ تعالیٰ کے محبوب و مقبول اور مقرب بندے ہیں۔ اس لئے یہ بھی احتمال ہے کہ سب سے پہلے لباس پہنایا جانا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خصوصیت ہو، ملا علی قاریؒ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ:

"وعندی واللہ اعلم ان الانبیاء بل الاولیاء

يقومون من قبورهم حفاة عراة لكن يلبسون اكفانهم بحيث لا ينكشف عوراتهم علىٰ احد ولا علىٰ انفسهم ثم يركبون النوق يحضرون المحشر فيكون هٰذا الا لباس محمولًا على الخلع الالهية والحلل الجنتية علىٰ الطائفة الاصطفائية واولية ابراهيم يحتمل ان يكون حقيقة او اضافية. مرقاة.“ (حاشیہ مشکوٰۃ ص:۴۸۳)

ترجمہ:...... ”میرے نزدیک، واللہ اعلم، انبیائے کرام علیہم السلام بلکہ اولیاء اللہ بھی اپنے کفنوں میں اٹھائے جائیں گے، جس سے ان کا ستر نہ کھلے، پھر سواریوں میں سوار ہوکر میدان محشر میں حاضر ہوں گے، وہاں بارگاہ الٰہی سے انہیں خلعتیں عطا کی جائیں گی، اور سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خلعت کا عطا کیا جانا جو اس حدیث مذکور میں ہے، وہ حقیقی بھی ہوسکتا ہے اور اضافی بھی۔“

میدانِ حشر میں لوگوں کی مختلف حالتیں:

خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ لوگوں کا حشر مختلف صورتوں میں ہوگا، کچھ ایسے حضرات ہوں گے جن کو لباس پہنایا جائے گا، اور پھر لباس بھی ہر ایک کی شان کے مطابق ہوگا، اس کے بعد بارگاہ الٰہی میں لے جانے کے اعتبار سے بھی لوگوں کے حالات مختلف ہوں گے، بعض خوش قسمت حضرات کو سواری عطا کی جائے گی، اور انہیں میدان محشر میں سواری پر لے جایا جائے گا، اور بعضوں کو پیدل لے جایا جائے گا، پھر بعضوں کو مجرمانہ طور پر طوق پہنا کر لے جایا جائے گا، اور بعضوں کو سر کے بل چلا کر لے جایا جائے گا۔ نعوذ باللہ!

''عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَجُلًا قَالَ: یَا نَبِیَّ اللّٰہِ! کَیْفَ یُحْشَرُ الْکَافِرُ عَلٰی وَجْھِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ؟ قَالَ: اَلَیْسَ الَّذِیْ اَمْشَاہُ عَلَی الرِّجْلَیْنِ فِی الدُّنْیَا قَادِرٌ عَلٰی اَنْ یُّمْشِیَہٗ عَلٰی وَجْھِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ.'' (مشکوٰۃ ص:۴۸۳)

ترجمہ:...... ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ایک نے کہا: یا رسول اللہ! کافر لوگ قیامت کے دن سر کے بل کیسے چلیں گے؟ فرمایا: جو ذات دنیا میں ٹانگوں کے بل چلاسکتی ہے، وہ ذات قیامت کے دن سر کے بل بھی چلاسکتی ہے، (اس کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے)۔''

قرآن کریم میں ہے:

''یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ. وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ.'' (القارعہ:۴، ۵)

ترجمہ:...... ''جس دن کہ لوگ ہوجائیں گے پروانوں کی طرح، (حیرت کے مارے لوگوں کا یہ حال ہوگا) اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔''

قیامت کے دن کی ہولناکی:

قیامت کے دن کی ہولناکی کے سلسلے میں ارشادِ خداوندی ہے:

''یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ. یَوْمَ تَرَوْنَھَا تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَۃٍ عَمَّا اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا

هُمْ بِسُکٰرٰی وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیْدٌ." (الحج:۱،۲)

ترجمہ:......"اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے، قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے، جس دن بھول جائے گی دودھ پلانے والی اپنے بچے کو اور حاملہ کا حمل جھڑ جائے گا، اور تم لوگوں کو دیکھو گے مدہوشوں کی طرح پھریں گے، حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔"

اس دن کے ہول سے دودھ پلانے والی مائیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی، حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہوجائیں گے، اور لوگوں پر مدہوشی کا سا عالم طاری ہوگا، اوسان خطا ہوجائیں گے اور ہوش وحواس اڑ جائیں گے۔

یہ بارگاہِ خداوندی میں پیشی کی ایک جھلک ہے، ہر آدمی کو بارگاہ الٰہی میں پیش ہونا ہے، اور اپنی پوری زندگی کا کچا چٹھا پیش کرنا ہے، ملائکہ گواہی دینے والے ساتھ ہوں گے، اور فرمایا جائے گا:

"اِقْرَأْ کِتَابَکَ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا." (الاسراء:۱۴)

ترجمہ:......"پڑھ لے کتاب اپنی، تو ہی بس ہے آج کے دن اپنا حساب لینے والا۔"

اس حشر کو یاد رکھنا اور اس بارگاہ الٰہی میں پیشی کو یاد رکھنا، یہ بہت بڑی بات ہے، ہم میں سے اکثر لوگ اس کو فراموش کئے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں یاد کرنے والوں میں سے بنائے، آمین!

شیخ رحمہ اللہ نے چوتھی دعا یہ فرمائی ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں سے بنائیں جو سلف صالحین کے نشانات قدم پر چلتے ہیں۔"

نئے راستے نہ ڈھونڈو:

لوگوں کو شوق ہوتا ہے نئے راستے اختیار کرنے کا، یہ شوق پتہ نہیں کہاں سے آیا کہ ایسا کام کریں، ایسا کام کریں کہ پہلے کسی نے نہ کیا ہو، لوگ کوشش کرتے ہیں کہ بچہ کا ایسا نام رکھا جائے جو پہلے کسی نے نہ رکھا ہو، لیکن اس میں عافیت نہیں ہے۔

بھئی یہ بات یاد رکھو! کسی کے آگے چلنے میں عافیت نہیں ہے، لوگ بھول گئے، نئے نئے راستے تلاش کرتے ہیں، نئی نئی راہیں ڈھونڈتے ہیں، اور پھر بعض دفعہ ایسے گم ہوجاتے ہیں کہ وہیں بھٹک کر رہ جاتے ہیں، راستہ ہی نہیں ملتا، آگے راستہ گم ہوگیا، اب کدھر جائیں؟

اسلاف کی راہ ہی صراطِ مستقیم ہے:

بھئی پائمال راستہ اختیار کرو، جس پر سب اکابر چلتے گئے ہیں، اور جس پر سب کے نشان قدم موجود ہیں، یہی صراط مستقیم ہے جس کی سورہ فاتحہ میں دعا کرتے ہیں کہ: یا اللہ! ہمیں چلا صراط مستقیم پر، صراط مستقیم کیا ہے؟ جس پر انبیاء کرام علیہم السلام چلتے رہے ہیں، جس پر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم چلے ہیں، جس پر امت کے صدیقین چلے ہیں، شہداء چلے ہیں، اولیاء اللہ اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے چلے ہیں، تو ہمیں اس راستے پر چلتے ہوئے کیوں عار آتی ہے؟

اپنے طور طریق اور اپنا طرز عمل ان اکابرؒ کے مطابق بناؤ، بعید نہیں کہ ان کے پیچھے چلتے چلتے تم بھی پہنچ جاؤ، آدمی صحیح راستے پر ہو اور کسی کا دامن پکڑا ہوا ہو اور کسی کے پیچھے چل رہا ہو تو کسی نہ کسی دن انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائے گا، اور اگر پائمال راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ لے لے گا تو اندیشہ ہے کہ کہیں بھٹک نہ جائے، ہلاک نہ ہوجائے، پس سلف صالحین کے آثار کی پیروی کرو، جس راستہ پر وہ چلے ہیں

اس راستہ پر چلو، جو عمل انہوں نے اختیار کیا ہے اس کو اختیار کرو، جو طرز زندگی انہوں نے اختیار کیا ہے اس طرز زندگی کو محبوب سمجھو، یہ اللہ کو محبوب بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور بہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا حکم بھی ہے۔

دین کا خلاصہ:

اگر مجھ سے پوچھو تو میں نے ساری زندگی میں دین کا خلاصہ دو ہی چیزیں پائی ہیں، ساری زندگی کا خلاصہ دو حرف ہیں:

ایک یہ کہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے نیک اور مقبول بندوں کا ساتھ نصیب ہوجائے۔

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رضا نصیب ہوجائے، بس بات ختم۔ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کا ساتھ اسی شخص کو نصیب ہوگا جس کو ان کے عمل میں، ان کے طریق کار میں، ان کے راستے میں ان کا ساتھ نصیب ہوگیا، اور جو شخص یہاں ان کے راستے سے ہٹ کر چلتا ہے اس کو وہاں ان کا ساتھ کیسے نصیب ہوگا؟ ساتھ تو ساتھ والوں کو نصیب ہوتا ہے۔

دولتِ کبریٰ:

مقبولانِ الٰہی کا ساتھ نصیب ہوجانا وہ دولت کبریٰ ہے جس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں، یہ بہت بڑی دولت ہے، دولت کیا ساری دولتوں کا خلاصہ ہے، دولتوں کی کنجی ہے، خزانوں کی کنجی ہے، یہ دو چیزیں اللہ تعالیٰ کے خزانوں کی کنجیاں ہیں، ایک یہ کہ اللہ کی رضا نصیب ہوجائے اور دوسری یہ کہ اللہ کے مقبول بندوں کا ساتھ نصیب ہوجائے، سارے پاپڑ ان ہی دونوں کے لئے بیلتے ہیں، اور یہ وہ دولت کبریٰ ہے جس کی انبیائے کرام علیہم السلام بھی دعا کرتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کی دعا:

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا قرآن کریم میں مذکور ہے:

"فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ."

(یوسف:۱۰۱)

ترجمہ:......"اے آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے، آپ ہی میرے رب ہیں دنیا و آخرت میں، مجھے وفات دے مسلمان ہونے کی حالت میں، اور ملادے مجھے نیک لوگوں کے ساتھ۔"

حضرت سلیمانؑ کی دعا:

حضرت سلیمان علیہ السلام تخت سلیمانی پر بیٹھ کر، فقیر بن کر اور محتاج بن کر دعا کر رہے ہیں، دیکھو دنیا کے اس بڑے بادشاہ کو، یہ بھی کسی کے دروازے کا فقیر ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت تو مشہور ہے، تخت سلیمانی پر بیٹھ کر کسی کے دروازے کے فقیر بن رہے ہیں اور دعا کر رہے ہیں:

"رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ." (النمل:۱۹)

ترجمہ:......"اے پروردگار مجھ کو توفیق دے کہ میں شکر کروں اس نعمت کا جو تو نے مجھ پر کی ہے، اور میرے ماں باپ پر کی ہے اور میں نیک عمل کروں، جس سے تیری رضا حاصل ہو جائے اور داخل کر دے مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں۔"

اس سعادت کی قدر چاہئے:

ہم لوگ بڑے ہی خوش قسمت ہیں، بڑے ہی سعادتمند لوگ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور آپ کے سچے متبعین کا ساتھ ہمیں اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمادیا ہے، ہم بڑے خوش قسمت ہیں، ہمیں اللہ تعالیٰ نے محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نصیب فرمادیا، لیکن بڑے بے قدرے ہیں، ہمیں اس کی قدر نہیں، اے کاش! ہمیں قدر ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتنی بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔

دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی خدمت میں کھڑا ہونے کی توفیق نصیب فرمائیں، دنیا کی نجاستوں سے اللہ تعالیٰ ہمارے دامن کو پاک رکھیں، اور اللہ تعالیٰ ہمیں بارگاہ عالی میں حاضری کو یاد کرنے والوں میں سے بنائے، اور اپنے نیک بندوں اور مقبول بندوں کا راستہ ہمیں نصیب فرمائیں، ان کی معیت نصیب فرمائیں، ان کے نشان قدم پر چلنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائیں، یا اللہ! ہم آپ کے کمزور بندے ہیں، نالائق ہیں، نادان ہیں، یا اللہ اپنی رحمت سے ہماری دستگیری فرما، جو آپ نے اپنے مقبول اور محبوب بندوں کو نصیب فرمائی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

امتی ہونے کا حق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

آج سے چند سال قبل (۱۴۱۹ھ بمطابق ۱۹۹۹ء) جامعہ فاروقیہ شجاع آباد ملتان میں ''مکین گنبد خضریٰ'' کانفرنس منعقد کی گئی، جس کے مہمان خصوصی حضرت شہیدؒ تھے، اس موقع پر آپؒ نے جو چشم کشا بیان فرمایا، پیش خدمت ہے۔ ....(ادارہ)

مولانا رشید احمدؒ کو خراج عقیدت:

سب سے پہلے حضرت مولانا رشید احمد مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرمائے، آمین! اور اللہ تعالیٰ ان کے لگائے ہوئے باغیچے کو اور زیادہ بارآور کرے۔

اساتذہ کو مبارک باد:

دوسرے نمبر پر جناب مولانا زبیر احمد صاحب اور مدرسہ کے دوسرے حضرات مدرسین کی خدمت میں ہدیہ مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اس مدرسہ کو

نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ترقی عطا کی، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور اپنے اکابرؒ کے ساتھ ہمیشہ ان کو منسلک فرمائے رکھے۔

چند نصیحتیں:

آپ حضرات یہاں بیانات سننے کے لئے تشریف لائے ہیں، بہت سے علمائے حقانی و علمائے ربانی آپ کو اپنے بیانات سے مستفید فرما رہے ہیں، چند گزارشات آپ کی خدمت میں میں بھی عرض کرتا ہوں۔

نعرہ بازی میرا مزاج نہیں:

پہلی بات تو یہ کہ یہ نعرے بازی اور ہاؤ ہو، میرے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی، اس لئے نہ میں نعرہ لگواؤں گا اور نہ آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ نعرے لگائیں، البتہ یہ گزارش کروں گا کہ توجہ کے ساتھ میری بات کو سنیں۔

مسلمانوں پر اللہ کا احسان:

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل فرمایا، میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر اللہ نے ہم پر یہ احسان نہ فرمایا ہوتا اور ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے منور نہ کیا ہوتا، تو خدا جانے ہم کہاں ہوتے؟ (نعوذ باللہ!) میں نے انگلینڈ میں بھی دیکھا ہے اور دوسرے ممالک میں بھی دیکھا ہے کہ عورتوں کا برا حال ہے، مردوں کا برا حال ہے، نہ ان بے چاروں کو کھانے کی تمیز اور نہ پینے اور رہنے کی تمیز، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان نہیں بلکہ حیوانات ہیں۔

اللہ کا کرم:

میں اکثر سوچتا ہوں کہ میرے اللہ نے ہم پر کرم نہ فرمایا ہوتا تو ہمارا بھی وہی

حال ہوتا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی صحابہ کرامؓ کو یہ کلمات تلقین کیا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَوْ لَا اَنْتَ مَا اهْتَدَيْنَا
وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

(بخاری ج:۱ ص:۳۹۸)

ترجمہ:...... "اے اللہ آپ اگر نہ ہوتے تو ہم نہ ہدایت پاتے، نہ ہم صدقہ ادا کرتے اور نہ ہم نماز پڑھتے۔"

غرضیکہ ہم پر اللہ کا احسان ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں پیدا فرمادیا۔ الحمدللہ! ثم الحمدللہ!

کیا ہم نے امتی ہونے کا حق ادا کیا؟

دوسری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بھائی! الحمدللہ! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی تو ہیں، لیکن ایک بات ہمارے لئے سوچنے کی ہے کہ کیا ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا کوئی حق بھی ادا کرتے ہیں یا نہیں؟

رفاقتِ نبویؐ کی شرائط:

ایک حدیث شریف میں ہے:

"(حَدَّثَنِیْ رَبِیْعَةُ بْنُ کَعْبِ الْاَسْلَمِیّ) قَالَ کُنْتُ اَبِیْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلِیْهِ وَسَلَّمَ فَاٰتِیْهِ بِوَضُوْئِهٖ وَحَاجَتِهٖ، فَقَالَ لِیْ: سَلْ! فَقُلْتُ: اَسْأَلُکَ مُرَافَقَتَکَ فِی الْجَنَّةِ. قَالَ: اَوَ غَیْرَ ذَالِکَ؟ قُلْتُ: هُوَ ذَاکَ! قَالَ: فَاَعِنِّیْ عَلٰی نَفْسِکَ بِکَثْرَةِ السُّجُوْدِ."

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۹۳)

ترجمہ:...... ''حضرت ربیعہ بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ
میں نے ایک رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گزاری،
میں (رات کو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وضو کا پانی اور
آپؐ کی (دوسری) ضروریات کی چیزیں لے آیا، آپ صلی اللہ
علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا: مانگ کیا مانگتا ہے! میں نے کہا کہ:
میں جنت میں آپؐ کی رفاقت چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ارشاد فرمایا کہ: اس کے علاوہ (کیا مانگتا) ہے؟ میں نے کہا:
بس یہی (چاہتا ہوں کہ جنت میں آپؐ کی رفاقت مل جائے)۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میری مدد کرو کثرت سجود
کے ساتھ۔''

مطلب یہ کہ صحابیؓ سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ مبارک جہاں لگا ہوا تھا، انہوں نے طے کرلیا کہ آج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بجا لاؤں گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ کے دروازہ پر سر رکھ کر سو گئے، انہوں نے سوچا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب باہر نکلیں گے یا اندر کھٹ کھٹ کی آواز آئے گی تو مجھے فوراً جاگ آجائے گی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تہجد کے وقت اپنے معمول کے مطابق جب اٹھے تو اس صحابیؓ کو فوراً جاگ آگئی، رات کو آپؐ کی جو ضروریات تھیں یعنی پانی وغیرہ انہوں نے وہ تمام ضروریات مہیا کیں، پانی کا لوٹا لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کروایا، تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مانگ کیا مانگتا ہے! وہ کہنے لگے کہ میں اور کچھ نہیں مانگتا ہوں، صرف ایک چیز مانگتا ہوں وہ یہ کہ جنت میں آپؐ کی رفاقت نصیب ہوجائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کے علاوہ کچھ اور مانگو، اس صحابیؓ نے کہا یا رسول اللہ! بس یہی ایک چیز مانگنی ہے، یہ مل جائے تو ٹھیک ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ: دیکھو وعدہ ہوگیا لیکن تم میری مدد کرنا کثرت سجود کے ساتھ۔

تم چاہتے ہو کہ قیامت کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نصیب ہو، لیکن من مانی اپنی کرتے ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ بھائی! اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت چاہتے ہو تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چال ڈھال، آپؐ کی شکل و شباہت، آپؐ کی رفتار و گفتار، طور طریقے اختیار کرو۔

اسلامی وضع قطع:

میں اپنے تمام بھائیوں سے گزارش کروں گا کہ میری بات کو نوٹ کرلیں اور آئندہ میرے ساتھ وعدہ کرلیں کہ ہم اپنی چال ڈھال، شکل و شباہت، رفتار و گفتار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی بنائیں گے، مگر ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم نے بال بھی الٹے بنائے ہیں، سر بھی ننگے ہیں، قمیصوں کو کالر لگائے ہوئے ہیں، غرضیکہ ہم نے اپنا حلیہ انگریزوں جیسا بنایا ہے اور کہلاتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی...!!

اہل جنت میں مسلمانوں کی تعداد:

اس پر ایک بات مجھے یاد آگئی کہ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ:

"اَتَرْضَوْنَ اَنْ تَکُوْنُوْا رُبُعَ اَھْلِ الْجَنَّۃِ؟ قَالُوْا: نعمْ! قَالَ: اَتَرْضَوْنَ اَنْ تَکُوْنُوْا ثُلُثَ اَھْلِ الْجَنَّۃِ؟ قَالُوْا: نَعَمْ! قَالَ: اَتَرْضَوْنَ اَنْ تَکُوْنُوْا شَطْرَ اَھْلِ الْجَنَّۃِ؟ ....الخ." (ترمذی ج:۲ ص:۷۷)

ترجمہ:...... "کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ اہل جنت میں تم چوتھائی ہو (یعنی کل دنیا تین حصہ ہو اور ایک حصہ تمہارا)؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: جی ہاں! آپؐ نے پھر فرمایا کہ: کیا تم

چاہتے ہو کہ ایک تہائی تم ہو اور دو تہائی تمام امتیں ہوں؟ صحابہؓ نے عرض کیا: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: کیا تم اس پر راضی ہو کہ آدھے جنت میں تم ہو اور آدھی دوسری تمام امتیں ہوں؟....الخ۔''

امت پر آپؐ کی شفقت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی قسم کھا کر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے:

''وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی.'' (الضحیٰ:۵)

ترجمہ:.....''عنقریب دے گا آپؐ کو آپؐ کا رب اتنا کہ آپؐ راضی ہو جائیں گے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ فرمالیا ہے کہ آپؐ کو راضی کرنا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کی قسم! جب تک میرا ایک امتی بھی دوزخ میں ہے اس وقت تک میں راضی نہ ہوں گا۔

امت کی نالائقی:

ایسا شفیق نبیؐ، ایسا محبوب نبیؐ، ایسا پیارا نبیؐ کہ تم اس کی شکل بھی نہ اپناؤ، تم اس کا طور طریقہ بھی نہ اپناؤ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں جو لائن دی ہے، تم اس کو چھوڑ کر دوسری لائن اختیار کرو اور وہ تمہاری مغفرت اور نجات کے لئے بے چین ہو، الغرض تم اپنی شکلوں کو بدلو، اپنی عقلوں کو بدلو، اپنے رسم و رواج کو بدلو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے چلو، صحابہ کرامؓ نے یہی سیکھا تھا کہ جدھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تھے، ادھر صحابہ کرامؓ بھی چلتے تھے، جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، وہی صحابہ کرامؓ کرتے تھے۔

نبوت کے رنگ میں صحابہ کرامؓ کا رنگ جانا:

اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں باہر سے کوئی آدمی آجاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف فرما ہوتے تھے، صحابہ کرامؓ کا مجمع لگا ہوتا تھا، تو باہر سے آنے والا آدمی پہچان نہیں سکتا تھا کہ ان میں نبی کون سے ہیں؟ اس لئے باہر کا آدمی آکر پوچھتا تھا کہ: ''مَا مُحَمَّدٌ مِنْکُمْ؟'' تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ ہم اشارہ کرکے کہتے: ''هٰذَا الْاَبْيَضُ!'' یہ گورے چٹے جو بیٹھے ہیں، یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے والے صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں اتنے رنگین ہوگئے تھے کہ کوئی دوسرا باہر کا بندہ پہچان نہ سکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کون ہیں؟

صحابہؓ کی نقل اتارو:

میرے بھائیو! اگر ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی کہلانا چاہتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی شمار ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی چاہئے کہ ہم صحابہ کرامؓ کی نقل اتاریں، ہماری نمازیں بھی خراب ہیں، میں تو بعض دفعہ دوستوں سے پوچھتا ہوں کہ آپ ماشاءاللہ نماز تو پڑھتے ہوں گے، تو کہنے لگتے ہیں: کہ اجی! کبھی کبھی پڑھ لیتے ہیں۔ (بہت اچھی بات ہے) کبھی کبھی پڑھ لیتے ہیں، میرا بھائی! تم سے اگر کوئی پوچھے کہ روٹی کھاتے ہو؟ تو تم اس کو جواب دو کہ کبھی کبھی کھالیتا ہوں، کیا یہ معقول جواب ہوگا؟ بلکہ کیا کہتے ہو کہ نہیں نہیں، روٹی دو وقت نہیں بلکہ تین وقت کھاتے ہیں لیکن افسوس کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلنے کے لئے ہم سے پوچھا جائے تو ہم کہتے ہیں کہ: جی! کبھی کبھی کرلیتے ہیں۔ یہ طرز عمل چھوڑ دو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ صحیح صحیح اپناؤ۔

قبر کے احوال کو پیش نظر رکھو:

تیسری بات یہ ہے کہ ہم سب کے سب ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں، میں بھی اپنی والدہ کے پیٹ سے پیدا ہوا ہوں اور جب میں پیدا ہوا تو میرا نام محمد یوسف رکھ دیا گیا، اسی طرح آپ حضرات بھی سارے کے سارے اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں، کسی آدمی کو اس کے حالات جو ماں کے پیٹ میں ہوئے ہیں وہ محفوظ نہیں ہیں، میرے اوپر جو حالات گزرے ہیں مجھے یاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کو یاد ہوں گے لیکن جب پیدا ہوگئے تو ہم رو رہے تھے اور ماں باپ خوشی کر رہے تھے۔ سبحان اللہ! اور لوگ مبارک باد کہہ رہے تھے، بچپنا تھا، بچپن سے پھر جوان ہوئے، جوانی سے بڈھے ہوگئے اور پھر جوان اولاد اپنے ماں باپ کو کہنے لگی کہ یہ بات نہیں سمجھے ہیں، اکبرالہ آبادی کہتے ہیں کہ:

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کر بچے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

بچوں نے پڑھ لیا اور پڑھنے کے بعد باپ کو خبطی سمجھنے لگے، خیر باپ تو چلے گئے اور اب آپ بھی جانے والے ہو۔

میرے والد ماجد کا انتقال شوال ۱۳۹۵ھ میں ہوا، یعنی چودہویں صدی کے پانچ سال باقی تھے، میرے والد کو گویا فوت ہوئے پچیس سال ہوگئے ہیں، میں اس وقت جوان تھا، اب خود بوڑھا ہوگیا ہوں، میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ماں کے پیٹ میں جو ہم پر گزری وہ ہم کو یاد نہیں، مگر جب دوسری ماں کے پیٹ ''قبر'' میں ہم جائیں گے وہ ہم کو ضرور معلوم ہوگا۔

قبر میں ہوش ہوگا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا

کہ: یا رسول اللہ! یہ جو آپؐ فرماتے ہیں کہ قبر میں عذاب وثواب ہوگا، جزا وسزا ہوگی، اس میں ہمیں کچھ ہوش بھی ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے کہ: اتنا ہوش سب کو ہوگا جتنا اب تم کو ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: پھر ہم نمٹ لیں گے۔

قبر کی تیاری:

میرے بھائیو! قبروں میں سب جارہے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آپ کے مولانا رشید احمد صاحبؒ تک، اور آپ بھی سب تیار بیٹھے ہیں، کبھی کسی کو بھول کر بھی خیال آیا کہ ہمیں بھی جانا ہے؟ اور ہم نے اس کے لئے کوئی تیاری بھی کی ہے؟ یہاں پلاٹ لینے کے لئے، دوسری چیزیں حاصل کرنے کے لئے ہم ہر طرح کی تیاریاں کرتے ہیں، لیکن قبر میں جانے کے لئے اور وہاں رہنے کے لئے بھی کوئی تیاری کی ہے؟

قبر کا خطاب:

حدیث شریف میں ہے کہ:

"فَاِنَّهٗ لَمْ يَأْتِ عَلَى الْقَبْرِ يَوْمٌ اِلَّا تَكَلَّمَ فَيَقُوْلُ: اَنَا بَيْتُ الْغُرْبَةِ وَاَنَا بَيْتُ الْوَحْدَةِ وَاَنَا بَيْتُ التُّرَابِ وَاَنَا بَيْتُ الدُّوْدِ ..... الخ." (مشکوٰۃ ص:۴۵۷)

ترجمہ:....."کوئی دن ایسا نہیں آتا کہ قبر پکار کر ہر آدمی کو کہتی ہے کہ میں مسافری کا گھر ہوں، میں تنہائی کا گھر ہوں، میں مٹی کا گھر ہوں، میں کیڑوں کا گھر ہوں۔"

قبر کی فکر کرو!

کبھی کسی کو دفن ہوتے ہوئے دیکھو، دفن کرنے والے دفن کرنے کے بعد مٹی ڈال دیتے ہیں، مٹی کے بعد اگر اللہ کی طرف سے کوئی انتظام نہ ہو تو میرے

بھائی! کیا صورت بنے گی؟ اس لئے قبر کی بہت فکر کرو، ہمیں بھی جانا ہے اور ہمارے بچے ہمارے پیچھے آئیں گے، یہاں مت پھنسو، ٹھیک ہے، کھانا پینا، لباس وغیرہ یہ آدمی کی ضرورت ہے، لیکن یہ نہیں کہ کپڑے جوڑے سی سی کر جمع کرتے رہو، نہیں! اپنی آخرت کی بھی فکر کرو، کیونکہ ہم ایک ماں کے پیٹ سے نکلے ہیں اور دوسری ماں کے پیٹ میں جانے کے لئے تیار ہیں، کچھ اس کا انتظام بھی کرلو۔

میدانِ حشر کا منظر:

چوتھی بات، قبر میں جو حالات گزرتے ہیں ان میں سے اتنی مختصر سی بات ذہن میں رکھو کہ جب قبروں سے آدمی اٹھیں گے اس وقت پچاس ہزار سال کا ایک دن ہوگا۔

> ''عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا ...... قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَلرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ جَمِیْعًا یَنْظُرُ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ؟ فَقَالَ: یَا عَائِشَةُ! اَلْاَمْرُ اَشَدُّ مِنْ اَنْ یَنْظُرَ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ.'' (مشکوٰۃ ص:۴۸۳)
>
> ترجمہ:...... ''ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: میں نے کہا: یا رسول اللہ! قیامت کے دن سب لوگ ننگے اٹھائے جائیں گے، مرد و عورت سب یکساں ہوں گے تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: عائشہ! معاملہ اس سے زیادہ سنگین ہوگا (ایسا نہیں ہوگا، بلکہ ہر ایک کی آنکھیں آسمان پر لگی ہوئی ہوں گی) کس کو ستر دیکھنے کا اس وقت ہوش ہوگا؟''
>
> ''وَفِیْ رِوَایَةٍ: وَاَوَّلُ مَنْ یُّکْسٰی یَوْمَ الْقِیَامَةِ

اِبْرَاهِیْمُ۔" (مشکوٰۃ ص:۴۸۳)

ترجمہ:......"ایک اور روایت میں ہے کہ: سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جوڑا پہنایا جائے گا۔"

اور فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو ننگا کرکے آگ میں ڈالا گیا تھا، اور بعض اکابرؒ فرماتے ہیں کہ متکلم اپنی بات نہیں کرتا ہے، دوسروں کی کرتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا، صحابہ کرامؓ کو الگ لباس پہنایا جائے گا، اپنے اپنے درجوں کے مطابق لباس پہنایا جائے گا، لیکن میرے بھائی! یہاں پر سِلا سِلا کر رکھتے ہو، وہاں کے لئے بھی کچھ بھیج دو! وہاں کا لباس بھی کبھی بھیجا؟

میدانِ عرفات میں امت کے لئے دعائیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے، زوال کے بعد سارا دن اونٹنی پر کھڑے دعائیں مانگتے رہے، اپنی امت کے لئے دعائیں مانگتے رہے اور جب شام ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ میں نے اللہ سے کہا کہ یا اللہ! آپ میری امت کی بخشش کردیجئے! اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: میں اپنے حقوق تو معاف کردوں مگر لوگوں کے حق کیسے معاف کردوں؟ میں نے بہت کہا کہ: یا اللہ! آپ اپنا حق بھی معاف کردیں اور دوسروں کے حق بھی معاف کردیں، فرمایا کہ: ایسا نہ ہوگا!

مزدلفہ میں دعائیں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرفات سے مزدلفہ چلے گئے، مزدلفہ پہنچے، صبح صادق ہوئی، اذان ہوئی، آپ نے نماز پڑھائی اور پھر وقوف مزدلفہ شروع کردیا، اللہ سے مانگ رہے ہیں بمع صحابہ کرامؓ کے، دعا مانگتے مانگتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے، حضرت عمرؓ کہنے لگے کہ: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوجائیں، یا رسول اللہ! یہ کوئی ہنسنے کا موقع نہیں تھا، آپؐ کیسے مسکرائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں نے

کل جو دعا کی تھی وہی دعا یہاں کی کہ یا اللہ! میری امت کی بخشش فرمادیجئے، اللہ پاک نے فرمایا کہ: میں اپنے حقوق چھوڑتا ہوں مگر بندوں کے حق کیسے چھوڑ دوں؟ میں نے کہا کہ یا اللہ! آپ ایسا بھی تو کرسکتے ہیں کہ بندوں کو اپنے پاس سے حقوق دے دیں اور مستحقوں کو معاف کردیں، فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا کہ: چلو قبول ہوا۔ ادھر میں نے جب یہ بات اللہ پاک سے کی تو قبول فرمالی، ادھر شیطان کو پتہ چلا تو وہ مٹی لے کر اپنے سر پر ڈالنے لگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی بخشش ہوگئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے احسانات ہیں ہم پر، لیکن ناز نہیں کرنا چاہئے کہ معلوم نہیں کہ ہم پر کیا کیا گزرنے والی ہے، اپنی عاقبت کی فکر کرو!

تین جگہوں میں سے کسی ایک پر ملاقات!

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عنہُ قَالَ سَأَلْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّشْفَعَ لِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ. فَقَالَ: اَنَا فَاعِلٌ. قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! فَاَیْنَ اَطْلُبُکَ؟ قَالَ: اطْلُبْنِیْ اَوَّلَ مَا تَطْلُبُنِیْ عَلَی الصِّرَاطِ. قُلْتُ: فَاِنْ لَّمْ اَلْقَکَ عَلَی الصِّرَاطِ؟ قَالَ: فَاطْلُبْنِیْ عِنْدَ الْمِیْزَانِ. قُلْتُ: فَاِنْ لَّمْ اَلْقَکَ عِنْدَ الْمِیْزَانِ؟ قَالَ: فَاطْلُبْنِیْ عِنْدَ الْحَوْضِ فَاِنِّیْ لَا اُخْطِئُ ھٰذِہِ الثَّلَاثَ الْمَوَاطِنَ.'' (ترمذی ج:۲ ص:۶۶)

ترجمہ:......''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ: آپؐ قیامت کے دن میری شفاعت فرمائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں ضرور آپ کی شفاعت کروں گا۔ میں

نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: پہلے پل صراط پر دیکھنا۔ میں نے کہا: اگر میری وہاں آپؐ سے ملاقات نہ ہو تو؟ فرمایا: میزان پر دیکھنا۔ میں نے کہا: اگر میزان پر ملاقات نہ ہو تو؟ فرمایا: حوض کوثر پر دیکھنا، میں ضرور ان تین جگہوں (میں سے کسی ایک جگہ) پر ہوں گا۔"

یعنی ہر جگہ دیکھنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے غم میں ہر جگہ ہوں گے، مگر یہ امت وفا کرنے والی نہیں ہے، قیامت کا دن ہوگا، بعض لوگوں کے نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ہوں گے اور بعض کے بائیں ہاتھ میں، ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ یہ کھیل ہے، میرے بھائیو! اب پیدا ہوگئے ہو تو اب یہ سارا سلسلہ سامنے آنے والا ہے، اس کے لئے تیاری کرو۔

بس میں تھک گیا ہوں، اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اصولِ زندگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

"عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کَانَ یَقُوْلُ:
وَیْلٌ لِکُلِّ جَمَّاعٍ فَاغِرٍ فَاہُ کَاَنَّہٗ مَجْنُوْنٌ، یَرٰی مَا عِنْدَ النَّاسِ، وَلَا یَرٰی مَا عِنْدَہٗ،وَلَوْ یَسْتَطِیْعُ لَوَصَلَ اللَّیْلَ بِالنَّھَارِ، وَیْلَہٗ مِنْ حَسَابٍ غَلِیْظٍ وَعَذَابٍ شَدِیْدٍ."

(حلیۃ الاولیأ ج:۱ ص:۲۱۷)

"عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کَانَ یَقُوْلُ:
یَا مَعْشَرَ اَھْلَ دِمَشْقَ! اَلَا تَسْتَحْیُوْنَ؟ تَجْمَعُوْنَ مَا لَا تَأْکُلُوْنَ، وَتَبْنُوْنَ مَا لَا تَسْکُنُوْنَ، وَتَأْمَلُوْنَ مَا لَا تَبْلُغُوْنَ، قَدْ کَانَ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِکُمْ یَجْمَعُوْنَ فَیُوْعُوْنَ وَیَأْمَلُوْنَ فَیُطِیْلُوْنَ، وَیَبْنُوْنَ فَیُوْثِقُوْنَ فَاَصْبَحَ جَمْعُھُمْ بُوْرًا، وَاَمَلُھُمْ غُرُوْرًا وَبُیُوْتُھُمْ قُبُوْرًا، ھٰذِہٖ عَادٌ قَدْ مَلَأَتْ مَا بَیْنَ عَدْنٍ اِلٰی عَمَّانَ اَمْوَالًا وَاَوْلَادًا فَمَنْ یَّشْتَرِیْ مِنِّیْ تَرْکَۃَ اٰلِ عَادٍ بِدِرْھَمَیْنِ."

(حلیۃ الاولیأ ج:۱ ص:۲۱۷)

ترجمہ:...... ''حضرت ابودرداؑ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہلاکت ہے ہر مال جمع کرنے والے کے لئے جو اپنا منہ کھولے رکھتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ پاگل ہے، وہ ان چیزوں کو دیکھتا ہے جو لوگوں کے پاس ہیں اور اس کو نہیں دیکھتا جو اس کے پاس ہیں، اگر اس کے بس میں ہو تو وہ رات کو دن کے ساتھ ملائے، اس کے لئے ہلاکت ہے سخت حساب سے اور شدید عذاب سے۔''

ترجمہ:...... ''حضرت ابودرداؑ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اے اہل دمشق! تم شرم نہیں کرتے، تم جمع کرتے ہو وہ چیز جس کو کھاتے نہیں اور وہ عمارتیں بناتے ہو جن میں رہتے نہیں اور وہ امیدیں لگائے بیٹھے ہو جن کو تم پہنچ نہیں سکتے، تم سے پہلے بہت سی امتیں ہوئی ہیں، انہوں نے مال جمع کیا تو خوب جمع کیا، وہ امیدیں رکھتے تھے تو بڑی لمبی امیدیں اور عمارتیں بناتے تھے، بڑی مضبوط عمارتیں، پس ان کی جمعیت نے نقصان میں صبح کی، ان کی آرزوئیں دھوکہ نکلیں اور ان کے مکانات ان کی قبریں بن گئے، یہ قوم عاد ہے، جس نے عدن سے عمان تک سارے خطے کو مال اور اولاد سے بھر دیا تھا، آج کوئی ہے جو آل عاد کا ترکہ مجھ سے دو درہموں کے بدلے خرید سکے؟''

قابل مذمت حالت:

پہلے ارشاد میں اس شخص کی قابل مذمت حالت بیان فرمائی ہے جو مال جمع

کرتا جائے لیکن اس کا پیٹ نہ بھرے، یہ آدمی گویا ایسا ہے کہ اس نے سب کچھ ہڑپ کرنے کے لئے منہ کھولا ہوا ہے اور مال کی تلاش اور دولت کے جمع کرنے میں گویا دیوانہ اور پاگل ہو رہا ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو دوسروں کے پاس کی چیزیں نظر آتی ہیں مگر اپنے پاس کی چیزیں نظر نہیں آتیں، جب بھی کبھی کسی کے پاس کوئی چیز دیکھتا ہے تو فوراً اس کے دل میں تڑپ اٹھتی ہے کہ یہ چیز مجھے ملنی چاہئے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اور بھی بہت سی نعمتیں دے رکھی ہیں ان میں اس کو مزہ نہیں آتا، حضرت ابودرداً رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اس کے لئے ہلاکت ہوگی، اس کا حساب وکتاب بڑا سخت ہوگا اور بڑا شدید عذاب ہوگا۔

ضرورت سے زیادہ تعمیر:

دوسری روایت میں ہے کہ جب دمشق شہر آباد ہوا، لوگوں نے وہاں درخت لگائے، بڑی اچھی اچھی عمارتیں بنائیں تو حضرت ابوالدرداً رضی اللہ عنہ ان کی مسجد میں کھڑے ہوگئے، فرمانے لگے: اے اہل دمشق! تم لوگ شرم نہیں کرتے، تم کو حیا نہیں آتی کہ تم لوگ وہ جمع کرتے ہو جو کھاتے نہیں یعنی اپنی تھال سے بچا ہوا ہے اور جمع کرکے رکھا ہوا ہے، اور تم وہ عمارتیں بناتے ہو جس میں تم رہتے نہیں، وہ عمارتیں تمہاری رہائش کی ضرورت کی نہیں، مکان رہائش کی ضرورت کے لئے ہوتا ہے مگر تم مکان پر مکان بنائے جاتے ہو خواہ تمہاری ضرورت ہو یا نہ ہو اور تم لمبی لمبی امیدوں میں مبتلا ہو جن تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

پہلی قوموں کا انجام:

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے کچھ امتیں ہوئی ہیں انہوں نے مال جمع کیا اور خوب جمع کیا، مال جمع کرکر کے ڈھیر لگا دیا اور انہوں نے بھی امیدیں پالی تھیں بڑی لمبی لمبی امیدیں، اور وہ عمارتیں بناتے تھے بڑی پختہ، بڑی پکی عمارتیں لیکن

ان کا نتیجہ کیا ہوا کہ ان کا تمام کا تمام سامان تباہ ہوگیا، ان کی تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور ان کے وہی مکانات ان کی قبریں بن گئے۔

قوم عاد کا انجام:

دور کیوں جاتے ہو؟ یہ قوم عادتم سے پہلے ہوئی ہے، عدن سے عمان تک ان کی آبادی تھی اور اس خطے کو انہوں نے مال و اولاد سے بھر دیا تھا، قرآن کریم میں ہے:

"اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ. اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ. الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ. وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ." (الفجر:٦ تا ٩)

ترجمہ:...... "تو نے دیکھا نہیں تیرے رب نے کیا کیا تھا قوم عاد کے ساتھ، یہ قوم عاد ارم کہلاتی تھی بڑے لمبے لمبے ستونوں والے (آدمی کا قد اونچا ہوتو دروازہ بھی اونچا رکھتا ہے، اور چھتری نیچی رکھتا ہے، ان کے قد بہت لمبے تھے، قدآور قوم تھی اس لئے قرآن کریم نے ان کو ذات العماد فرمایا) یہ قوم تھی کہ اس جیسی قوم دنیا میں پیدا ہی نہیں کی گئی (اتنی طاقتور قوم تھی) اور تم نے قوم ثمود کو نہیں دیکھا جنہوں نے وادی قریٰ میں چٹانوں کو تراش تراش کر مکان بنائے، پہاڑوں کو کھود کھود کر مکان بنادیئے تھے۔"

دوسری جگہ قرآن کریم میں اس قوم کا ذکر ہے:

"وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ." (ہود:۵۰)

ترجمہ:...... ’’اور ہم نے قومِ عاد کے پاس بھیجا ان کے بھائی ہود کو، انہوں نے دعوت دی کہ اے قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔‘‘

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

’’اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ آيَةً تَعْبَثُوْنَ، وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ.‘‘ (الشعراء: ۱۲۸، ۱۲۹)

ترجمہ:...... ’’کیا تم ہر اونچے مقام پر ایک یادگار بناتے ہو، جس کو محض فضول بناتے ہو اور بڑے بڑے محل بناتے ہو جیسے دنیا میں تم کو ہمیشہ رہنا ہے۔‘‘

کیا ہمیں ہمیشہ رہنا ہے؟

تم ایسی فیکٹریاں اور ایسے کارخانے، ایسی عمدہ اور مضبوط عمارتیں بناتے ہو گویا کہ تم رہتی دنیا تک رہو گے، یہ اس قوم کی بیماری تھی اور یہی حال دوسری قوموں کا ہوا، بنیاد یہ تھی کہ ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ ہمیں یہیں رہنا ہے، آخرت میں کچھ نہیں ہے، یہی زندگی بس یہی زندگی ہے، یہاں کی خوشحالی ہی خوشحالی ہے، یہاں کی تکلیف ہی تکلیف ہے، یہاں کی راحت راحت ہے، یہاں کا دکھ دکھ ہے، یہاں کی عزت عزت ہے اور یہاں کی ذلت ذلت ہے، ان قوموں کا تصور ہی یہ تھا، آخرت کا یقین ان کے ذہن میں نہیں تھا، آخرت کی تیاری اور آخرت کے حساب وکتاب کا اس قوم کو خیال نہیں تھا، تو حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ قوم عاد ہوئی ہے عدن سے عمان تک ان کی آبادیاں تھیں اور اس خطے کو انہوں نے مال واولاد سے بھر دیا تھا، لیکن کوئی ہے جو دو درہم میں ان کا ترکہ لے لے، مٹ گئیں ہیں یہ قومیں ان کا تمام ساز وسامان مٹا ڈالا گیا، کیا تم بھی ان کے نقش قدم پر چل رہے ہو؟

پہلے حکیم الامت کی تشخیص:

یہ امت کے پہلے حکیم ہیں، یہ سب سے پہلے حکیم الامت ہیں، اس امت میں ان کو سب سے پہلے حکیم الامت کا لقب دیا گیا، کیوں؟ اس لئے کہ اس بیماری کا علاج کرتے تھے، حکیم الامت اس لئے تھے جو امت کے اس مرض کا علاج کرتے تھے، اور وہ مرض تھا دنیا کی محبت کا دلوں میں بیٹھ جانا اور جم جانا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آنکھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تھی، انہوں نے آپؐ کا نقشہ زندگی دیکھا تھا، آپؐ کا سامان معیشت دیکھا تھا، کیسا لباس آپ پہنتے تھے؟ کیسا کھانا کھاتے تھے؟ کیسی زندگی گزارتے تھے؟ یہ سب کچھ ان حضرات نے دیکھا تھا۔

ازواجِ مطہراتؓ سے خفگی کی وجہ:

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امہات المؤمنین سے ناراض ہونے کا واقعہ ذکر کیا ہے، جس پر یہ آیت نازل ہوئی: ''یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِکَ اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَھَا .... الخ.'' یہ پورا رکوع نازل ہوا اکیس ویں پارے کا آخری اور بائیس ویں پارے کے شروع میں یہ رکوع ہے۔

صحابہ کرامؓ کی معاشی تنگی:

ہوا یہ تھا کہ شروع میں بہت تنگی تھی، ایک دفعہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا کہ حضور! ایک کپڑے میں نماز پڑھ سکتے ہیں؟ اکیلی چادر پہنی ہوئی ہے اور نماز پڑھ رہے ہیں، فرمایا: تم میں سے کتنے ہیں جن کے پاس دو دو کپڑے ہیں۔ یعنی صحابہ کرامؓ کی اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کے پاس تن ڈھکنے کے لئے کپڑا نہیں تھا، ایک چادر میں نماز پڑھتے تھے، بعض

اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ایک چادر بھی نہیں ہوتی تھی تو وہ کوئی کمبل وغیرہ جو رات کو اوڑھنے کا ہوتا تھا لپیٹ کر آجاتے تھے اور کانٹوں کے ساتھ ان کے بٹن لگالیتے تھے، اور جن کے پاس کپڑے تھے وہ بھی ہماری طرح ان کے پاس نہیں تھے کہ یہ فلاں کپڑا ہے، یہ فلاں کپڑا ہے، بازار بھرے پڑے ہیں اور دوکانیں بھری پڑی ہیں، ان کا سادا لباس تھا، سوتی نہیں، جانوروں کی اون سے اس طرح کے کپڑے بنالیتے تھے۔

جمعہ کے غسل کی وجہ:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جمعہ کے دن مجمع زیادہ ہوتا تھا، ارد گرد سے بھی لوگ آجاتے تھے، صحابہ کرامؓ محنت کار تھے، موٹا موٹا ان کا لباس تھا، گرم موسم، چھت بھی اتنی نیچی کہ ہاتھ لگتا تھا، صحابہ کرامؓ جب جمعہ میں جمع ہوتے تو پسینہ آتا، پسینہ سوکھ کر ایسی بدبو آتی تھی جیسے بدبو پسینہ کی ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مسجد میں آؤ تو کپڑے دھوکر آؤ اور غسل کر کے آؤ اور خوشبو لگا کر آؤ چاہے تم کو گھر والوں کی خوشبو لگانی پڑے، یہ نقشہ تھا صحابہ کرامؓ کا، جہاد میں جاتے تو ٹوٹی ہوئی تلواریں، زرہ پہننے کا کیا سوال اور یہ کپڑے بھی نہیں ہیں بلکہ ننگا بدن ہے اور جہاد کر رہے ہیں۔

قدرے وسعت:

لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے کچھ آسانی فرمادی تھی جب خیبر فتح ہوگیا لوگوں کی حالت اچھی خاصی ہوگئی، گھر میں روٹی پکنے لگی، لباس بھی ذرا تبدیل ہوگئے۔

کاشانۂ نبوت کی معیشت:

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں وہی نقشہ ہے، وہی حالت، وہی کیفیت، وہی پرانی حالت کوئی تبدیلی نہیں آئی، امہات المؤمنین ازواج مطہرات تھیں اور دو باندیاں تھیں پھر ان ازواج مطہرات کی دو جماعتیں تھیں، ایک کی قیادت

حضرت عائشہؓ کرتی تھیں اور ایک پارٹی حضرت زینبؓ کی قیادت میں تھی، لیکن اس موقع پر نو کی نو جمع ہوگئیں۔

ازواجِ مطہراتؓ کی درخواست:

انہوں نے بیٹھ کر میٹنگ کی کہ امت کے گھروں میں تو خوشحالی آگئی، ہمارا وہی حال ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرنا چاہئے کہ ہمارا بھی خرچ بڑھادیں، ایک نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے تو میں سر کا دوپٹہ مانگوں گی، ایک نے کہا کہ میں فلاں چیز مانگوں گی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو سب جمع ہوگئیں اور یہی بات پیش کی کہ حضورؐ سب کے گھر میں خوشحالی ہے جبکہ اس گھر میں وہی سختی، کچھ ہمارا بھی خرچ بڑھادیں۔

آپؐ کا فقر اختیاری تھا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کنگال نہیں تھے کہ آپؐ کے پاس کچھ نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ قربانی کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وقت میں ایک سو اونٹ قربان کئے تھے، دنیا کے کس سیٹھ نے اتنے اونٹ قربان کئے ہوں گے؟ س وقت کس حاتم طائی نے اتنے اونٹ قربان کئے ہوں گے؟ اور پورا خیبر حضور صلی للہ علیہ وسلم کی ملکیت تھا، اور ہزاروں من غلہ وہاں سے آتا تھا، تھوڑا تھوڑا خرچ مہات المؤمنینؓ کو سال کا دیتے تھے باقی غریب غرباؑ کو تقسیم کردیتے تھے اور باقی جو بچتا تھا وہ اللہ کے راستے میں جہاد کی غرض سے ہتھیار خریدنے کے لئے اور دوسری چیزیں خریدنے کے لئے، امت کی ضرورتوں کے لئے خرچ کرتے تھے، گویا کہ کل آمدنی کے نین حصے کئے ہوئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب تقسیم کرکے اٹھتے تھے، بچا ہوا کچھ نہیں ہوتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بیت المال جس کو سرکاری خزانہ کہتے ہیں، نہیں تھا، سرکاری خزانے کے نام کی بھی کوئی چیز نہیں تھی، کوئی چیز جمع کرنے

کے لئے ہوتی ہی نہیں تھی۔

صدیق اکبرؓ اور بیت المال:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیت المال بنایا گیا لیکن قانون یہ تھا کہ ہر ہفتہ کو جھاڑو دے دی جائے اور جو کچھ سرکاری خزانے میں ہے اس کو نکال کر پھینک دیا جائے، تقسیم کردیا جائے، تو میں نے کہا کہ یہ بات نہیں تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ ہوتا نہیں تھا بلکہ لیتے ہی نہیں تھے، بڑی بات یہ ہے کہ ملے اور آدمی نہ لے اور اس سے کم تر بات یہ ہے کہ لے بھی اور الحمدللہ بھی نہ کہے۔

ایلا کا واقعہ:

تو امہات المؤمنینؓ نے مطالبہ کیا کہ حضور! ہمارا بھی کچھ خرچ بڑھا دیا جائے، آپؐ خاموش رہے، کچھ نہیں کہا، نہ غصہ ہوئے اور نہ کوئی اور بات، لیکن وہاں سے اٹھے تو قسم کھالی کہ ایک ماہ ان کے پاس نہیں جاؤں گا، یہ مجھ سے خرچ مانگتی ہیں اور ایک جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چھوٹا سا بالاخانہ تھا، اس بالاخانہ کو سیڑھی لگی ہوئی تھی، کیسے سیڑھی لگی ہوئی تھی؟ ایک لمبا سا کھجور کا تنا رکھ دیا گیا تھا اس پر پاؤں رکھ کر آدمی اوپر چڑھ جاتا تھا، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محل کی سیڑھی تھی، اور یہی کیفیت حضرات ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی تھی، اگرچہ حضرت عثمانؓ بہت بڑے مالدار تھے لیکن مال اللہ کے لئے تھا، اپنے لئے نہیں تھا، اور حضرت علیؓ کے پاس تو تھا ہی نہیں، حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے پاس بھی نہیں تھا، بعد میں فتوحات میں ملتا رہا اس کو بھی اپنے لئے استعمال نہیں کیا۔

تاریخ کا مشہور قصہ:

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ جس دن شاہِ ایران، کسریٰ کا خزانہ مدینہ منورہ

میں آیا، جس میں اس کا تاج بھی تھا جو حضرت سراقہ بن مالکؓ کو پہنایا گیا، سونے کا تاج، تاج کسروی کیا تھا؟ جواہرات کا ایک ڈھیر تھا جو اس میں لگادیا گیا اور یہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ تھا جو بیت المال پہنچایا گیا، چار حصے مجاہدین میں تقسیم کردیئے گئے تھے، پانچواں حصہ مدینہ میں بھیجا گیا، اس دن مدینے میں جتنی خوشی تھی وہ دیکھنے کے لائق تھی، سب لوگ خوش تھے، فرحاں وشاداں تھے

حضرت عمرؓ کا وسعت دیکھ کر رونا:

اس دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد کے کونے میں بیٹھے رو رہے تھے، ایک آدمی رو رہا تھا باقی سب خوش تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں ہیں، ان کے پاس گئے، کہا: یا امیرالمؤمنین! ساری دنیا خوش ہے اور آپ بیٹھے رو رہے ہیں! یہ رونے کا موقع ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ جو مال ان کے مالکوں کو نہیں پچا ہے، وہ ہمیں کیسے پچے گا؟ جس مال نے قیصر و کسریٰ کو ہلاک کردیا وہ ہمارے ساتھ کیا کرے گا؟

تو میں نے کہا حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ کو جو حکیم الامت کہتے ہیں وہ صرف اس بنا پر کہ وہ صحابہ کرامؓ کو دنیا کی بے ثباتی کا بتاتے تھے، ماشاءاللہ! اللہ تعالیٰ نے بہت فتوحات دے دی تھیں لیکن ان کا یقین کامل تھا، دنیا کا زہر ان کو نقصان نہیں دے سکتا تھا لیکن رفتہ رفتہ رنگ بدلتا گیا۔

آخرت کے بجائے دنیا کو ترجیح دینے والا:

صحابہ کرامؓ کے بعد جو لوگ آئے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا، دنیا ان کے دل میں بیٹھتی گئی، دنیا دل میں آئے اور دین بھی رہ جائے ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ دونوں کا آپس میں بیر ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ

اَحَبَّ دُنْیَاہُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِہٖ، وَمَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَہٗ اَضَرَّ بِدُنْیَاہُ، فَاٰثِرُوْا مَا یَبْقٰی عَلٰی مَا یَفْنٰی۔" (مشکوٰۃ ص:۴۴۱)

ترجمہ:...... "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے دنیا کو پسند کیا اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا، اور جس نے آخرت کو پسند کیا اس نے دنیا کو نقصان پہنچایا، باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دو۔"

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (دنیا اور آخرت دونوں سوکنیں ہیں) اگر ایک خوش ہوگی تو دوسری ناراض ہوجائے گی، کبھی دونوں سوکنیں شوہر سے خوش نہیں ہوسکتیں، ایک خوش ہوگی تو دوسری ناراض ہوگی، ایک کے ساتھ ہنس کر بولے گا تو دوسری ناراض ہوجائے گی۔

دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ:

تو امت کی سب سے بڑی بیماری دنیا کی محبت ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار مختلف عنوانات سے امت کو اس سے ڈرایا ہے، دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے اور دنیا بہت میٹھی ہے اور بہت سرسبز معلوم ہوتی ہے، کھاؤ تو بہت مزے دار ہے، دیکھو تو آنکھوں کو بہت بھاتی ہے، جس شخص نے اس کو حق کے ساتھ لیا اور حق کے ساتھ خرچ کیا اس کے لئے یہ معین و مددگار ہوگی، اور جو شخص اس کو حاصل کرنے میں اور اس کے خرچ کرنے میں حق کا تابع نہ رہا اس کو یہ ہلاک کردے گی۔

دنیا کی سرسبزی کا نقصان:

فرمایا جیسے برسات کے زمانے میں سبزہ ہوتا ہے، جانوروں کو بہت بھاتا ہے، سبزہ بہت میٹھا ہوتا ہے جانور کھاتا ہے، ایک جانور تو وہ ہے جس نے ضرورت کے مطابق کھایا اور بند کردیا، پھر دھوپ میں چلا گیا پسینہ آیا سب کچھ ہضم ہوگیا، پھر کھالیا اتنا کھاتا ہے جتنا ہضم ہوجائے، اور اگر وہ میٹھا سمجھ کر اور لذیذ سمجھ کر کھاتا

جائے تو اس کو بیماری ہوجائے گی، کیونکہ سبز چارے سے پیٹ پھول جاتا ہے اور آخرکار جانور مر جاتا ہے۔

سب سے بڑی حکمت:

تو سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ امت کے دلوں سے دنیا کی محبت کو نکالا جائے، مگر ہماری سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ کبھی معاشی شکایت اور کبھی کوئی دوسری شکایت، کبھی یہ شکایت کہ ہاتھ بہت زیادہ تنگ ہے، حالانکہ گھر میں سارا سامان موجود ہے مگر کہتے ہیں کہ بہت زیادہ تنگی ہے، اگر کسی کی آمدن دس ہزار تھی اور اس کی جگہ پانچ ہزار رہ گئی تو کہتے ہیں کہ پوچھو نہیں کتنی تکلیف اور تنگی ہے؟ اے کاش! کہ یہ ان لوگوں کو دیکھ لیتے جن کی آمدنی دو ہزار یا اس سے بھی کم ہے، آخر وہ بھی تو ہمارے جیسے انسان ہیں مگر جتنا ان کو ملتا ہے بہرحال جیسے کیسے کر کے وہ بھی زندگی بسر کر ہی رہے ہیں۔

اپنی حالت کا جائزہ:

تو حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو مال کو جمع کرنے والا ہو اور ہر وقت اس کا منہ کھلا ہی رہے، اس کی خواہش پوری نہ ہو اور جو لوگوں کے پاس ہے اس کو دیکھے اور جو اپنے پاس ہے اس کو نہ دیکھے، بڑے سے بڑے آدمی پر ہماری نظر جاتی ہے لیکن چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو تو کبھی دیکھ لو، مالداروں کو بھی اور فقیروں کو بھی ایک لائن میں کھڑا کردو اور پھر اپنی حالت کا جائزہ لو! اگر تم بہت سارے لوگوں سے کمتر ہو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ ان سے زیادہ لوگوں سے بہتر ہو۔

ساری دنیا کا جمع ہونا:

اگر کھانے کے لئے رات کو پیٹ بھر کر روٹی مل جائے، پہننے کو جیسا بھی

لباس ہے مل جائے اور گھر میں اطمینان اور امن سے سوئے، تو حدیث میں فرمایا گویا دنیا اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ اس کے گھر میں جمع ہوگئی ہے، تو جو اس حال میں صبح کرے کہ بدن میں الحمدللہ عافیت ہے، کوئی بیماری نہیں، اللہ کا فضل ہے کہ چلتے پھرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، سو فیصد تندرست تو کوئی بھی نہیں ہوتا، پھر اپنے گھر میں امن ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اطمینان ہے، اور اس کے پاس ایک دن کی روزی موجود ہے، آج کا کام چل سکتا ہے، یوں سمجھو کہ ساری دنیا بمع ساز و سامان کے جمع کر کے اس کے گھر میں ڈال دی گئی ہے، لیکن اب تو ہمارا ایمان بہت کمزور ہوگیا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں آخرت کی تیاری کی توفیق دے، بھائی! جتنا زیادہ جمع کریں گے اور اڑائیں گے اتنا زیادہ طویل حساب دیں گے، جو تمہاری ضرورت کی چیزیں ہیں اگر بقدر ضرورت ملتی رہیں تو حساب بھی نہیں ہوگا، اگر فالتو ملے گا تو اس کا حساب بھی دینا ہوگا، اسی پر ختم کرتا ہوں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

ریاکاری اور اخلاص

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”عَنِ الْحَسَنِ قَالَ: رَأَیْتُ عُثْمَانَ عَلَی الْمِنبَرِ قَالَ: اَیُّهَا النَّاسُ! اِتَّقُوا اللّٰهَ فِیْ هٰذِهِ السَّرَائِرَ، فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: ”وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ! مَا عَمِلَ اَحَدٌ عَمَلًا قَط سِرًّا اِلَّا اَلْبَسَهُ اللّٰهُ رِدَائَهٗ عَلَانِیَةً اِنْ خَیْرًا فَخَیْرٌ وَاِنْ شَرًّا فَشَرٌّ.“ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰیَةَ وَرِیَاشًا وَلَمْ یَقُلْ وَرِیْشًا وَّلِبَاسُ التَّقْوٰی ذَالِکَ خَیْرٌ. قَالَ السَّمْتُ الْحَسَنُ.“ (کنز العمال ج:۳ حدیث:۸۴۲۷)

ترجمہ:...... ”حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو منبر پر دیکھا آپ یہ ارشاد فرما رہے تھے کہ لوگو! ان پوشیدگیوں میں اللہ سے ڈرو! کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! نہیں عمل کیا کسی نے کوئی عمل کبھی بھی چھپ کر مگر اللہ تعالیٰ

اس کو پہنا دیتے ہیں اس کی علانیت کی چادر، برا (عمل) ہو تو بری (چادر)، بھلا (عمل) ہو تو بھلی (چادر)۔ پھر آپ نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی: "وَرِيَاشًا وَّلِبَاسُ التَّقْوٰى ذَالِكَ خَيْرٌ." اور آپ نے "رِيْشًا" کو "رِيَاشًا" پڑھا۔"

اعمال کی دو قسمیں:

ایک علانیہ عمل ہوتا ہے جو سب کے سامنے کیا جاتا ہے، اور ایک پوشیدہ عمل ہوتا ہے جس کی اطلاع دوسروں کو نہیں ہوسکتی جب تک ان کو اطلاع نہ دی جائے، علانیہ عمل کبھی ظاہر ہوتا ہے اور کبھی باطن۔

ظاہری عمل:

مثال کے طور پر ہم لوگوں کے سامنے نماز پڑھتے ہیں تو ایک اس کا ظاہری ڈھانچہ ہے، مثلاً رکوع کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں، قرأت کرتے ہیں، اللہ اکبر کہنے سے لے کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک جتنے افعال یا اقوال ہیں یہ سب ظاہری اعمال ہیں، ظاہری ڈھانچہ ہے۔

ظاہری عمل کا باطن:

ایک اس کا باطن ہے کہ ہم کس جذبے سے یہ اعمال کرتے ہیں؟ کس نیت سے کرتے ہیں؟ اور اس عمل کو کرتے وقت ہماری کیا کیفیت ہوتی ہے؟ قلب کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ غفلت کی کیفیت ہے یا حضوری کی کیفیت ہے؟ نماز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یا: "اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ" کے مصداق بنتے ہیں؟ تو ایک عبادت کا ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے یعنی اندر کا پوشیدہ پہلو۔

پوشیدہ عمل:

اور دوسرا عمل ہے پوشیدہ، اس کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ عمل تو کیا ظاہری اعضا سے مگر چھپ کر کیا، خواہ نیک عمل ہو یا برا عمل لوگوں کی نظر سے چھپ کر کیا گیا اور اس عمل کا اللہ تعالیٰ کو پتہ ہوگا یا اس کے ''کراماً کاتبین'' (عمل لکھنے والے فرشتوں) کو پتہ ہوگا باقی کسی کو کچھ پتہ نہیں۔

باطنی اعضاً کا عمل:

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عمل باطنی اعضا سے کیا گیا کہ لوگوں کو اس کا پتہ نہیں چلا، جیسے صبر ہے، شکر ہے، رضا بالقدر ہے، اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اس کے دین کی محبت ہے، یہ اعمال باطنی ہیں کہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کے دل میں کیا ہے؟ جب تک وہ خود اس کا اظہار نہ کرے، اسی طرح یہ کہ قلب میں کبر ہے یا تعلّی ہے، اللہ تعالیٰ کی ناشکری کا مضمون ہے یا اللہ تعالیٰ سے ناراضگی کا مضمون ہے، یا نعوذ باللہ! دل میں کفر چھپا ہوا ہے، یا اسی قسم کے اور اعمال جن کا تعلق دل سے یا قلب سے ہے ان میں سے بعض اعمال وہ ہیں جن کا کراماً کاتبین کو پتہ چلتا ہے۔

کراماً کاتبین کو خبر نہیں!

اور بعض وہ ہیں جن کا کراماً کاتبین کو بھی پتہ نہیں چلتا، اسی کو کہتے ہیں کہ:

میان عاشق ومعشوق رمزیست
کراماً کاتبین راہم خبر نیست

یعنی عاشق ومعشوق کے درمیان اور محبوب کے درمیان ایسی رمز ہے، ایسا اشارہ ہے کہ کراماً کاتبین کو بھی اس کا پتہ نہیں چلتا۔

ذکرِ خفی کی فضیلت:

ایک روایت میں ہے اور یہ روایت ذرا کمزور ہے کہ:

"اَلذِّکْرُ الَّذِیْ لَا یَسْمَعُہُ الْحَفَظَۃُ یَزِیْدُ عَلَی الذِّکْرِ الَّذِیْ یَسْمَعُہُ الْحَفَظَۃُ سَبْعِیْنَ ضِعْفًا."

(کنز العمال ج:۱ حدیث:۱۷۵۰)

یعنی ذکرِ خفی، ذکرِ جلی سے ستر گنا افضل ہے۔ ذکرِ خفی وہ ذکر ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو پتہ نہ چلے، دل سے ذکر کرتا ہے، یہ ذکرِ جلی سے کئی گنا افضل ہے، ستر گنا افضل فرمایا ہے۔

ایک اور روایت میں یوں آتا ہے:

ترجمہ:...... "بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ ایسے اعمال کی جزا دیں گے جو کراماً کاتبین کے نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ (یہ اعمال سر ہیں یعنی پوشیدہ اعمال)۔"

دو باتیں:

تو ایک بات تو میں نے یہ سمجھائی کہ اس روایت میں ہے کہ ایک ہیں ظاہری اعمال اور ایک ہیں باطنی اعمال، یا یوں کہیے کہ ایک ہیں علانیہ اعمال اور ایک ہیں پوشیدہ اعمال۔

پھر دوسری بات یہ سمجھائی کہ ظاہری اعمال میں اس کا ظاہری پہلو تو مخلوق کے سامنے ہے لیکن باطنی اعمال مخلوق کے سامنے نہیں وہ صرف اللہ کے سامنے ہیں۔

ظاہری اعمال کے پوشیدہ اعمال:

باطنی اعمال یا پوشیدہ اعمال کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ اعمال تو ظاہری

اعضا سے کیے گئے ہیں لیکن کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

''يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ.''

(المؤمن:۱۹)

ترجمہ:......''اللہ تعالیٰ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کو اور اس کو جس کو چھپاتے ہیں سینے میں۔''

مثلاً: کسی نامحرم کو دیکھا آنکھوں کی چوری کے ساتھ اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہونے دیا، لوگوں کو کچھ پتہ نہیں کہ یہ صوفی جی بھی غیر عورتوں کو دیکھ رہے ہیں، اس کو ''خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ'' کہتے ہیں، یا ظاہری کانوں سے گانے کی آواز آرہی ہے، کسی کو معلوم نہیں کہ یہ صوفی صاحب اس سے لذت لے رہے ہیں یا نفرت کر رہے ہیں؟ تو سن بھی رہے ہیں یا نہیں سن رہے؟

تو بعض اعمال ایسے ہیں کہ ظاہری اعضا سے کیے جاتے ہیں لیکن مخلوق کو پتہ نہیں چلتا، لوگوں کی نظر وہاں تک نہیں جاتی، اپنے گھر میں چھپ کر کے عمل کیا گھر کی تنہائی میں، میں نے کہا کہ ان اعمال کو اللہ تعالیٰ بھی جانتے ہیں اور کراماً کاتبین بھی جانتے ہیں کیونکہ وہ تو ڈیوٹی پر ہیں وہ تو لکھیں گے۔

باطنی اعضاۂ کے اعمالِ بد:

کچھ اعمال ایسے ہیں جو ظاہری اعضا سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ باطنی اعضا سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے کسی عورت کے محاسن کو سوچنا، صوفی جی مراقبہ میں ہیں اور سوچ رہے ہیں کسی نامحرم عورت کے حسن کو، اس عورت کے حسن میں ڈوبے ہوئے ہیں اور یہ مسئلہ لوگوں کو معلوم نہیں ہے۔

مردہ بیوی کا تصور:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی کسی کی بیوی سے لذت لیتا ہو، اس آدمی کے لئے یہ بھی گناہ اور حرام ہے اور اسی طرح اپنی مردہ بیوی کا ناجائز تصور کرتا ہے تو یہ بھی حرام ہے، اس لئے کہ مرنے کے بعد یہ اس کی بیوی نہیں رہی، اس کے نکاح سے نکل چکی ہے، مرنے سے پہلے یہ اس کی بیوی تھی چاہے جتنا اس کا مراقبہ کرتا، لیکن مرنے کے بعد اس کا ناجائز تصور بھی گناہ ہے، لوگ اس سے غافل ہیں، مستورات سن رہی ہیں اور مجمع میں مجھے بات کرتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے لیکن شرعی مسئلہ ہے بیان کئے دیتا ہوں، کوئی شخص اپنی بیوی سے ملتا ہے اور تصور کسی اور عورت کا کرتا ہے تو یہ زنا کے حکم میں ہے، گویا یہ غیر عورت سے بدکاری کر رہا ہے، یہ میں نے سمجھانے کے لئے ایک دو باتیں عرض کی ہیں۔

دل کے اعمال:

اسی طرح قلب کے اعمال بھی ایسے ہیں کہ وہ خیر کے ہیں یا شر کے ہیں، دل میں بری بات سوچو گے تو وہ گناہ ہے، اچھی بات سوچو گے تو عبادت ہے، تو یہ اعمال بھی قلب کے اعمال کہو یا اعمال باطنہ کہو، میں نے کہا کہ اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ اعمال ہیں جن کو فرشتے بھی جانتے ہیں اور اعمال نامہ میں لکھے جاتے ہیں، "یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ" (وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو)۔

ملائکہ تمام اعمال کو جانتے ہیں:

مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کا ریڈیو پر درس ہو رہا تھا اور میری طالب علمی کا زمانہ تھا، سورہ انفطار کا درس تھا، انہوں نے فرمایا کہ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل کے اعمال کو بھی جانتے ہیں، "یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ" تمہارا ہر فعل ان کو معلوم ہے، فرشتوں کو معلوم ہے، چاہے ظاہری عمل ہو، ظاہری فعل ہو یا دل کا فعل ہو لیکن

بعض ایسے افعال بھی ہیں جو اتنے گہرے ہیں کہ وہاں فرشتوں کو بھی رسائی نہیں ہوتی، وہ صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں۔

ظاہر کی طرح باطن کی اصلاح کی ضرورت ہے:

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اب یہ بات بھی سمجھو کہ جتنا ظاہر کو درست کرنے کی ضرورت ہے اتنا باطن کو بھی درست کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ شاید تھوڑا سا زیادہ اپنے باطن کو اور اپنے باطنی اعمال کو اور اپنے اعمال کے باطن کو درست کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ ظاہر اور باطن دونوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے، قرآن کریم میں ہے:

''یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ.'' (النسآ:۱۰۸)

ترجمہ:...... ''یہ لوگ چھپنا چاہتے ہیں مخلوق سے لیکن چھپ نہیں سکتے اللہ تعالیٰ سے وہ تو ان کے ساتھ ہوتا ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

''مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ.'' (المجادلہ:۷)

ترجمہ:...... ''تین آدمی سرگوشی کریں تو چوتھے اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں ہاں پانچ آدمی مل کر سرگوشی کریں چھٹے اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں تو اس سے کم (مثلاً تین سے کم دو ہوں گے، پانچ سے کم چار ہوں گے) یا اس سے زیادہ (جتنے بھی ہوں، جہاں بھی ہوں) اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔''

اللہ سے دھوکہ نہیں چلتا:

تو مخلوق کے ساتھ ظاہرداری کا معاملہ کرسکتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ سے ظاہرداری نہیں ہوسکتی، تمہارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، مخلوق کے ساتھ ہوتا تو دھوکہ فریب چل جاتا، جیسے آج کل چل رہا ہے کیونکہ ہمارا سارا کا سارا معاملہ مخلوق سے چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق ختم ہوگیا ہے، دغا فریب، جھوٹ بہتان۔

کوثر نیازی کے رد میں میں نے جب مضمون لکھا تھا اس میں میں نے حافظ کا ایک شعر نقل کیا تھا اور وہ مجھے بار بار یاد آتا رہتا ہے، حافظؒ کہتے ہیں:

گوئیا باور نمی دارند روزے داوری
تاچناں قلب و دغل درکار داور می کنند

یعنی ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ انصاف کے دن پر یقین نہیں رکھتے، یہ اللہ کے معاملہ میں ایسا کھوٹ ملاتے ہیں، ایسی گڑبڑ کرتے ہیں کہ ان کو قیامت کے دن پر ایمان ہی نہیں ہے۔

اور یہ ہی وہ بات ہے جس کو صحیح بخاری شریف میں کتاب الایمان کے شروع میں ہی حضرت ابراہیم التیمیؒ سے نقل کیا ہے:

"وَقَالَ اِبْرَاهِیْمُ التَّیْمِیُّ مَا عَرَضْتُ قَوْلِیْ عَلٰی عَمَلِیْ اِلَّا خَشِیْتُ اَنْ اَکُوْنَ مُکَذَّبًا."

(صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۲)

مُکَذَّبًا ذال کے فتحہ کے ساتھ اور مُکَذِّبًا ذال کے کسرہ کے ساتھ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

ترجمہ:...... "میں نے قول کو جب بھی اپنے عمل پر پیش کیا، قول و عمل کا جب بھی میں نے موازنہ کیا تو مجھ کو ایسا اندیشہ لگا کہ میں مکذب ٹھہرایا جاؤں یعنی میں مانتا نہیں تھا ایسی باتیں

کرتا تھا مانتا تو کرتا بھی یا یہ کہ قیامت کے دن مکذبا مجھے بھلا دیا جائے گا۔“

یہ تیرا کرتوت تھا یہ تیرا عمل تھا دعویٰ تو یہ کرتا تھا۔

اکابرؒ کا خوف الٰہی:

اکابرؒ سب کچھ کرنے کے باوجود اتنا ڈرتے تھے کہ حد نہیں، ایک راوی ابن ابی ملیکہؒ کہتے ہیں کہ:

”اَدْرَكْتُ ثَلٰثِيْنَ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّهُمْ يَخَافُ النِّفَاقَ عَلٰى نَفْسِهٖ.“

(صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۲)

ترجمہ:.....”میں نے تیس صحابہ کرامؓ کو پایا، ان میں سے ہر ایک اپنے بارے میں نفاق کا شبہ کرتا تھا، ہر ایک یہ خیال کرتا کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہوگیا؟“

فتنہ وفساد کا سبب:

قول وعمل کا تضاد، ظاہر و باطن کا اختلاف، ظاہر کا مضمون کچھ ہے، باطن کا مضمون کچھ ہے اور ہمارے پاس تو ظاہر ہی ظاہر رہ گیا تھا، باطن تو ختم ہوگیا الّا ما شآ اللہ! اور وہ بھی ظاہر بھی مٹتا جارہا ہے، ایسی قوموں میں پھر ایسے ہی فتنے اور فساد ہوں گے۔

گناہ کا ظاہر و باطن چھوڑ دو!

تو میں نے عرض کیا کہ جتنا ظاہر کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے اتنا ہی باطن اور باطنی اعمال اور اپنے اعمال کا باطن درست کرنے کی ضرورت ہے، یہ تین لفظ بول رہا ہوں: اپنا ظاہر، اپنا باطن اور ظاہری اعمال کا ایک باطنی پہلو، ان تینوں کو

درست کرنے کی ضرورت ہے، اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا ہے: "وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ." (الانعام:۱۲۰) یعنی اور چھوڑ دو گناہ کے ظاہر کو اور گناہ کے باطن کو۔

ہم عام طور پر اس کا ترجمہ کرتے ہیں ظاہری گناہ سے اور باطنی گناہ سے، لیکن قرآن کریم کے الفاظ ہیں گناہ کے ظاہر کو اور گناہ کے باطن کو، جب یہ باتیں سمجھ میں آگئیں۔

سرائر کو ظاہر کا لباس:

تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فتویٰ پیش کرتا ہوں، ارشاد فرماتے تھے کہ لوگو! ان پوشیدہ معاملات میں جن کو باطن کہتے ہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو، ظاہر میں تم لوگوں کے منہ ملاحظہ کے طور پر بھی کرتے ہوگے، مگر جہاں تک باطن کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کا منہ ملاحظہ ہی چلتا ہے یہاں مخلوق کا تو چلتا نہیں اس لئے ان سرائر کے بارے میں تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بندہ چھپ کر جیسا بھی عمل کرلے اللہ تعالیٰ ظاہر میں اس کا لباس اس کو پہنا کر چھوڑتے ہیں، اچھا عمل چھپ کر کیا، کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا اور جیسا کہ میں نے کہا کہ بعض مرتبہ کراماً کاتبین کو بھی معلوم نہیں ہونے دیا، لیکن ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کا لباس نہ پہنائے، اچھائی کا لباس نہ پہنائے اور ایک آدمی نے چھپ کر برا عمل کیا، اپنے خیال میں تو وہ مخلوق سے چھپ گیا لیکن اس کا مالک اس کو دیکھ رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی برائی کا لباس اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر میں پہنائیں گے۔

استحضارِ الٰہی کی حکایت:

وہ کہتے ہیں نا کہ ایک شیخ کے پاس دو آدمی مرید ہونے کے لئے آئے، شیخ نے دونوں کو ایک ایک مرغی پکڑا دی اور چاقو دے دیا اور فرمایا کہ: ایسی جگہ ذبح کرکے

لاؤ جہاں پر کوئی دیکھتا نہ ہو، ایک آدمی تو گیا اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کوئی انسان اسے نظر نہیں آیا تو کسی دیوار کی اوٹ میں جلدی جلدی مرغی ذبح کرلی اور لے آیا، اور دوسرا سارا دن گھومتا رہا، شام کو واپس آیا اور کہنے لگا: حضرت! مجھے تو کوئی ایسی جگہ نہیں ملی جہاں میں مرغی ذبح کرتا، اور اسی لئے ذبح کرنے سے قاصر رہا، آپ نے شرط لگادی تھی کہ کوئی نہ دیکھے، اگر آپ یہ نہ فرماتے کہ کوئی آدمی نہ دیکھے تو میں مرغی ذبح کردیتا لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ کوئی نہ دیکھے، میں ایسی جگہ کہاں تلاش کرتا کہ جہاں کراماً کاتبین بھی نہ دیکھتے اور اللہ تعالیٰ بھی نہ دیکھتے، اس لئے میں تو مرغی ذبح کرنے سے قاصر رہا، شیخ نے فرمایا: تجھے مرید کرتا ہوں، اور پہلے کو کہا کہ تجھے مرید نہیں کرتا کہ تو مخلوق کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اللہ تعالیٰ سے تعلق نہیں رکھتا، کراماً کاتبین کو سامنے نہیں رکھتا۔

ریاکاری کا عنصر:

تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم نے جو پوشیدہ عمل کیا، لوگوں کی نظر سے چھپ کر عمل کیا وہ کسی کو پتہ نہیں چلتا، اس لئے سیاسی جماعتیں اگر کوئی رفاہِ عامہ کا کام کرتی ہیں تو دکھا کر کرتی ہیں، نیکی کا کام بھی کرتی ہیں تو دکھا کر کرتی ہیں، کرتے تو ووٹوں کے لئے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا کام بھی کرتے ہیں تو مخلوق کے لئے کرتے ہیں، تسبیح بھی پڑھتے ہیں تو مخلوق کے لئے پڑھتے ہیں، خدمت خلق کرتے ہیں تو مخلوق کے لئے کرتے ہیں، اور ایک سیر کام کیا اور اس کا پروپیگنڈہ ایک من کا کیا تاکہ لوگ معتقد ہوجائیں کہ یہ جماعت بہت اچھی ہے، یہ پارٹی بہت اچھی ہے آئندہ ووٹ اس کو دینا چاہئے۔

سیاسی جماعتیں اور ریاکاری:

سیاسی جماعتوں میں ایک تو ریاکاری کا عنصر بہت غالب ہے، غالب نہیں

بلکہ سراسر ریاکاری ہے، خالص ریاکاری ہے، شاید کسی عمل میں ایک لاکھ واں حصہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں ہوگا، نو ہزار نو سو ننانوے بلکہ ننانوے ہزار نو سو ننانوے حصے مخلوق کے لئے ہوتے ہیں، الّا ما شاءٔ اللہ! کوئی اللہ کا نیک بندہ ہو، نیک بندے بھی ہوتے ہیں ساری مخلوق اللہ تعالیٰ نے یکساں پیدا نہیں کی اور سب کے لئے ایک کلیہ نہیں ہوتا، کچھ اللہ کے نیک بندے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کی رضا کے لئے کرتے ہیں۔ ایک تو ان میں ریاکاری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور دوسرا سیاسی جماعتوں کی خاص بیماری یہ ہے کہ ان کو دوسروں کا عیب نظر آتا ہے، اپنا عیب نظر نہیں آتا، ان کی آنکھوں پر دو چشمے چڑھے ہوئے ہیں ایک نفرت کا اور ایک محبت کا، ایک پاسداری کا اور ایک مخالفت کا۔

سیاسی اصول:

آج کا سیاسی اصول یہ ہے کہ یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بات جو کہی جارہی ہے وہ حق ہے یا باطل ہے؟ بلکہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کہنے والا کون ہے؟ اگر مخالف کوئی بات کہتا ہے حق ہو یا باطل تو بہرحال باطل ہے اور ہم اس کی تردید کریں گے، اور اگر اپنا بندہ بات کرتا ہو تو چاہے دنیا جہان کی مہمل ترین بات کرتا ہو تو ہم اس کو یہ کہیں گے کہ ما شاءٔ اللہ کیا بات کہہ دی! ایسے مضامین عالیہ صرف اسی کو سوجھتے ہیں۔

حکمرانوں کی غیرت مر گئی ہے:

تین دن پہلے کے اخبار پر نظر پڑی تو سرخی کو دیکھا، عبداللہ شاہ، یہاں کا وزیر اعلیٰ کہہ رہا ہے کہ: ''دہشت گرد دم توڑ رہے ہیں۔'' ما شاءٔ اللہ! اگر کوئی یہاں لکھنے والا ہے تو میری اس بات کو ان تک پہنچادے کہ دہشت گرد دم نہیں توڑ رہے بلکہ تمہاری شرم و حیا دم توڑ رہی ہے، یہ الفاظ میرے ان تک پہنچادو، اگر تم میں ذرہ بھی

شرم و حیا ہوتی تو تم مستعفی ہو جاتے، جو حکمران اپنی عوام کا انتظام نہیں کرتا یا کر نہیں سکتا، اتنا نااہل ہے، اتنا نالائق ہے، اس کو حکمرانی کا کوئی حق حاصل نہیں، اگر کسی شریف ملک میں یہ وارداتیں ہوتیں، یہ قصے اور یہ حالات ہوتے تو وہ فوراً مستعفی ہو جاتا اور اپنی نااہلی کا اقرار کرتا۔ دہشت گردوں نے ابھی تک دم نہیں توڑا بلکہ سات کی جگہ آٹھ، آٹھ کی جگہ نو، نو کی جگہ دس، دس کی جگہ گیارہ قتل ہو رہے ہیں، روزانہ ترقی ہو رہی ہے، لیکن تمہاری حیا اور تمہاری شرم دم توڑ گئی ہے، حکمرانوں میں غیرت مرگئی ہے، موجودہ دور کی یہی سیاست ہے، اور اسی سیاست کو کہا جاتا ہے کہ یہ اسلام کا حصہ ہے، اور اسی سیاست کو سامنے رکھ کر مارشل لا کو گالی دی جاتی ہے، اور جنرل ضیأالحق کو گالیاں دی جاتی ہیں، لیکن انسانوں کے دماغ کو کیا ہو گیا ہے؟

قوم کی اجتماعی بدعملی:

رات عشأ کے بعد کسی آدمی کے خط کا جواب دے رہا تھا، اس نے انہیں حالات کو لکھا جو کراچی میں گزر رہے ہیں، میں نے کہا کہ شامت اعمال ہے، اور سب سے بڑی بدعملی ہماری یہ ہے کہ ہم نے نااہل اور نالائق حکمرانوں کو منتخب کیا، یہ قوم کی اجتماعی نافرمانی اور اجتماعی بدعملی ہے، ہم نے کہا کہ عورت کی حکمرانی جائز نہیں، کچھ حضرات نے کہا کہ صوفیوں کی سوئی عورت کی حکمرانی پر اٹکی ہوئی ہے، یعنی ان لوگوں کو ضرورت نہیں اسلام کی، تم سب نے مل کر عورت کو حکمران بنایا ہے، ووٹ دے دے کر بنایا اور قاضی جی نے مخالفت کر کر کے بنایا۔

قاضی اور امریکہ کی خوشنودی:

میں اپنی محفلوں میں کہتا ہوں کہ .... آج سیاسی بات شروع ہو گئی ہے، چلو آ گئی تو آ گئی زبان پر، کوئی شخص قاضی جی کو بھی میرا پیغام پہنچا دے کہ یہ تمام کا تمام گناہ قاضی کے اوپر ہے، قاضی حسین احمد اسلامی فرنٹ والے، اسلامی فرنٹ یا اسلام

سے فرنٹ کا حکم دیا گیا، فلسفہ کیا بیان کیا؟ جماعت اسلامی کے اخباروں کو میں پڑھتا ہوں، ان کی باتیں بھی سنتا ہوں، آج تک یہ تسلسل انہوں نے نہیں چھوڑا، چھوٹی برائی، بڑی برائی ہم دونوں برائیوں کے مخالف ہیں، حالانکہ یہ اسلام کے مسلّمہ قدیم اصولوں کے خلاف ہے، کیونکہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ جو شخص دو مصیبتوں میں سے ایک مصیبت میں گرفتار ہوجائے، اور اس کو اس کے بغیر چارہ نہیں تو جو ہلکا گناہ ہو اس کو اختیار کرلے، یہ شریعت کا اصول ہے، یہ قاضی حسین احمد نے اسلام کے اصول کو بھی پامال کردیا امریکہ کی خوشامد کے لئے، امریکہ کی خوشنودی کے لئے، نواز شریف کو ہٹانا اور معین قریشی کو لانا بے غیرتی کا واضح پتہ چلتا ہے، زنانہ عقل کا میں بھی قائل ہوں لیکن یہ زنانہ عقل کیا گل کھلاتی ہے یہ تو آنے والا وقت بتائے گا، یہ میرا آخری فقرہ ہے، اور مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ گل کھلیں گے۔ واللہ! مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا، میں سمجھ رہا تھا کہ قہر خدا اس قوم پر نازل ہوگا، لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ قہر ان شکلوں میں نازل ہوگا، نعوذ باللہ! استغفر اللہ! اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے اور اپنے قہر سے بچائے۔

قہر خداوندی کی لپیٹ میں:

کراچی اور حیدرآباد والے قہر خداوندی کی لپیٹ میں ہیں، اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو، ایسی ویسی باتیں دیکھنے اور پڑھنے میں آتی ہیں، وہ ایک فارسی کا شعر ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

ترجمہ:......''بہت سی ناگفتنی باتوں کو میں نے سنا ہے
جو سننے کے لائق نہیں تھیں، ان کو دیکھ رہا ہوں کاش کہ میری ماں
نہ مجھے جنتی، میں پیدا نہ ہوا ہوتا۔''

ہمیں قطعاً ایسی توقع نہیں تھی کہ ہمیں ایسے انسانوں میں رہنا ہوگا اور ایسے

انسانوں سے واسطہ پڑنے والا ہے، گناہگار تو پہلے بھی ہوئے ہیں، نیکی اور بدی دونوں چلتے ہی آئے ہیں لیکن نیکی اور بدی کا تناسب یہ ہوجائے گا، ہمیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔

انسان کی نیکی اور برائی چہرے پر لکھ دی جاتی ہے:

تو خیر عرض یہ کر رہا تھا کہ بھائی! نیک کام چھپ کر کرو گے تو اللہ تعالیٰ نیکی کا لباس پہنائے گا، تم نے چھپ کر کیا کہ کسی کو پتہ نہ چلے لیکن اللہ تعالیٰ چہرے پر نیکی لکھ دیتے ہیں، اور تم نے چھپ کر گناہ کیا، کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا لیکن مت بھولو کہ تم مخلوق سے تو چھپا سکتے ہو مگر خالق سے نہیں چھپا سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

قسم ہے اس ذات کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان اس کے ہاتھ میں ہے، نہیں عمل کیا کسی شخص نے کوئی سا عمل کبھی بھی چھپ کر مگر اللہ تعالیٰ اس عمل کی چادر اس کو اعلانیہ پہنا دیتے ہیں، چھپ کر نیکی کا کام کرتا ہو لیکن لوگوں کی زبان پر ہوگا کہ فلاں آدمی بہت اچھا ہے، اور چھپ کر برائی کرتا ہو، بدکاری کرتا ہو، خیانت کرتا ہو اور گڑبڑ کرتا ہو کسی کو بظاہر اس نے پتہ نہیں چلنے دیا لیکن اللہ تعالیٰ اس پر اس کے جھوٹ کی، خیانت کی چادر اس کو پہنا دیں گے، لوگ چلتے ہوئے کہہ دیں گے کہ خائن آدمی ہے، حالانکہ کسی کو معلوم نہیں کہ کب اس نے خیانت کی، کوئی ثبوت نہیں دے سکتا، اسی کو کہتے ہیں: ''زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو!'' اللہ تعالیٰ ان کی زبان پر بلواتے ہیں۔

ظہور و مدح کی نیت بھی ریا ہے:

یہاں ایک بات خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں، اکابرؒ فرماتے ہیں کہ نیک عمل چھپ کر کیا، مخلوق کو پتہ نہیں چلنے دیا لیکن دل میں یہ تھا کہ کاش لوگوں کو میری

عبادت کا پتہ چل جائے تو یہ بھی ریاکاری ہے، یہ خواہش بھی نہیں ہونی چاہئے، اگر نیک عمل کروگے تو نیکی کی چادر اللہ تعالیٰ پہنائیں گے اور برا عمل کروگے تو نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! برائی کی چادر پہنائیں گے لیکن یہ نیت کرکے مت کرنا کہ مخلوق مجھے دیکھے گی اور مخلوق کو میرا پتہ چل جائے۔

بلانیت، ظاہر ہونے پر خوشی:

اگر یہ نیت نہ ہو تو چاہے مخلوق دیکھ بھی لے کچھ بھی نہیں ہوتا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے:

”قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ! بَيْنَا اَنَا فِيْ بَيْتِيْ فِيْ مُصَلَّايَ اِذْ دَخَلَ عَلَيَّ رَجُلٌ فَاَعْجَبَنِيَ الْحَالَ الَّتِيْ رَاٰنِيْ عَلَيْهَا. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: رَحِمَكَ اللهُ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ! لَكَ اَجْرَانِ اَجْرُ السِّرِّ وَاَجْرُ الْعَلَانِيَةِ.“

(مشکوٰۃ ص:۴۵۴)

ترجمہ:..... ”میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں چھپ کر اپنے گھر میں نماز پڑھ رہا تھا (اور اہتمام اس بات کا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے) لیکن اچانک وہاں ایک آدمی آگیا اور اس کے دیکھنے کی بنا پر دل میں خوشی آگئی، تو یا رسول اللہ! یہ ریاکاری تو نہیں ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابوہریرہ! اللہ آپ پر رحم کرے، آپ کے لئے تو دو اجر ہیں، ایک اجر چھپ کر عبادت کرنے کا اور ایک علانیہ عبادت کرنے کا۔“

اور ایک روایت میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"تِلْکَ عَاجِلُ بُشْرَی الْمُؤْمِنِ."

(مشکوٰۃ ص:۴۵۴)

ترجمہ:...... "یہ مؤمن کی جلدی کی خوشخبری ہے۔"

یعنی چھپ کر کر رہا تھا اور چھپنا چاہتا تھا لیکن ہم تم کو چھپنے دیتے ہیں؟ تو ذرا چھپ کر دکھا! اللہ تعالیٰ آخرت میں تجھ کو بدلہ دیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں ظاہر کردیا، یہ جلدی کی خوشخبری ہے، ریاکاری نہیں کیونکہ تم نے ریاکاری کے لئے نہیں کیا تھا اچانک نظر پڑ گئی۔

تحسین پر خوشی:

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ غیراختیاری طور پر تمہارے دل میں تحسین پیدا ہوگئی کہ اچھا ہوا اس نے دیکھ لیا تو یہ ریاکاری نہیں، کیونکہ یہ غیراختیاری معاملہ ہے، صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی پوچھا کہ یا رسول اللہ! میں چھپ کر نیکی کا کام کرتا ہوں، اچانک کوئی ظاہر ہوجاتا ہے تو کسی کے دیکھنے سے دل میں ایک خوشی سی محسوس ہوتی ہے، یا رسول اللہ! یہ ریاکاری تو نہیں؟ فرمایا: یہ بتاؤ اگر خدانخواستہ تمہیں کسی گناہ کی حالت میں دیکھ لیتا تو تمہیں شرمندگی ہوتی کہ نہ ہوتی، وہ شرمندگی بھی غیراختیاری ہے اور یہ خوشی بھی غیراختیاری ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ تو لائق شکر ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ! آپ کا شکر ہے، اس نے مجھے اچھی حالت میں دیکھا، بری حالت میں نہ دیکھا، اگر میری بری حالت کو اللہ تعالیٰ دکھا دیتے تو اس کو اس پر قدرت تھی، یہ میرے مالک کا کرم اور احسان ہے کہ میری برائیوں پر پردہ ڈال دیا، مخلوق کی نظر وہاں تک پہنچنے نہیں دی اور میری نام نہاد نیکیوں کو اچھال دیا، حقیقت میں تو ہماری نیکی ایسی ہی بے جان ہوتی ہے جیسے ہم کرتے ہی ہیں، یہ میرے اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے، یہ ارشاد فرمایا کہ: اچھی نیکی کروگے چھپ کر تو اللہ

تعالیٰ علانیہ طور پر نیکی کی چادر پہنادیں گے، اور چھپ کر برائی کرو گے تو اللہ تعالیٰ علانیہ طور پر برائی کی چادر پہنادیں گے، اس مضمون کو ارشاد فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم یہ آیت تلاوت فرمائی:

"یَا بَنِیْ آدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا وَّلِبَاسُ التَّقْوٰی ذَالِکَ خَیْرٌ."

(الاعراف:۲۶)

راوی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر "رِیَاشًا" پڑھا۔

ترجمہ:......"اے بنی آدم ہم نے تم پر لباس اتارا ہے جو تمہارے ستر کو بھی چھپائے اور زینت کا کام بھی دے اور تقویٰ کا لباس اس سے بھی بہتر ہے۔"

معلوم ہوا کہ تقویٰ کا بھی ایک لباس ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے رحم وکرم سے وہ لباس ہمیں پہنائے تو سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

عمل کی کھیتی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حُجَیْرَۃَ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ عَبْدِاللہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ اَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ اِذَا قَعَدَ: اِنَّکُمْ فِیْ مَمَرِّ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ فِیْ آجَالٍ مَنْقُوْصَۃٍ وَّاَعْمَالٍ مَّحْفُوْظَۃٍ، وَالْمَوْتُ یَأْتِیْ بَغْتَۃً، فَمَنْ یَّزْرَعْ خَیْرًا یُوْشِکُ اَنْ یَّحْصُدَ رَغْبَۃً وَّمَنْ یَّزْرَعْ شَرًّا یُّوْشِکُ اَنْ یَّحْصُدَ نَدَامَۃً، وَّلِکُلِّ زَارِعٍ مِّثْلُ مَا زَرَعَ، لَا یَسْبِقُ بَطِیْءٌ بِحَظِّہٖ، وَلَا یُدْرِکُ حَرِیْصٌ مَّا لَمْ یُقَدَّرْ لَہٗ، فَمَنْ اُعْطِیَ خَیْرًا فَاللہُ تَعَالٰی اَعْطَاہُ، وَمَنْ وُقِیَ شَرًّا فَاللہُ تَعَالٰی وَقَاہُ، اَلْمُتَّقُوْنَ سَادَۃٌ، وَالْفُقَھَاءُ قَادَۃٌ، وَمَجَالِسُھُمْ زِیَادَۃٌ۔“

(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۱۳۴)

ترجمہ:...... ''عبدالرحمٰن بن حجیرہؒ اپنے والد سے اور وہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب وہ مجلس میں بیٹھتے تھے تو فرماتے تھے: تم لوگ رات اور دن کی راہ گزر پر ہو، ان میعادوں میں جو دم بدم کم ہو رہی ہیں اور ان اعمال میں جو محفوظ کئے جارہے ہیں اور موت اچانک آئے گی، سو جو شخص نیکی کاشت کرتا ہے وہ بہت جلد رغبت کے ساتھ اس کی فصل کاٹے گا اور جو شخص برائی کاشت کرتا ہے وہ بہت جلد اس کی برائی اٹھائے گا، ہر کاشت کرنے والے کو وہی چیز ملے گی جو اس نے کاشت کی، کوئی سست آدمی اپنے حصے سے پیچھے نہیں رہ سکتا اور کوئی حریص آدمی ایسی چیز کو نہیں پاسکتا جو اس کے لئے مقدر نہیں کی گئی، پس جس شخص کو بھلائی ملی ہو تو حق تعالیٰ شانہ نے ہی اس کو عطا فرمائی ہے اور جس شخص کو شر سے بچالیا جائے اس کو اللہ تعالیٰ نے ہی بچایا ہے، پرہیزگار لوگ سردار ہیں، فقہا قائد ہیں اور ان کی مجلسیں علم و عمل میں اضافہ کرنے والی ہیں۔''

رات دن کی گزرگاہ:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب اپنی مجلس میں دوستوں کے پاس بیٹھتے تھے تو اکثر یہ بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ تم لوگ رات اور دن کی راہ گزر پر بیٹھے ہو، رات اور دن تمہارے پاس سے ہو کر گزرتے ہیں اور رات اور دن کا گزرنا بچے کو بوڑھا کر دیتا ہے، بوڑھوں کو قبروں میں لے جاتا ہے۔

تم لوگ گن، گن کر اپنی اپنی میعادیں دے کر بھیجے گئے ہو، ہر ایک کو اتنے سال، اتنے مہینے، اتنے دن، اتنے گھنٹے، اتنے منٹ اور اتنے سانس گزارنے ہیں، تم دنیا میں اپنی عمر کا چارٹ ساتھ لے کر آئے ہو، اس میں نہ ایک سانس کم ہوسکے گا اور نہ ایک سانس کا اضافہ ہوسکے گا اور یہ دن اور رات کا گزرنا، یہ تمہاری عمروں کو کم کر رہا ہے، لمحہ بہ لمحہ تمہاری عمر کم ہورہی ہے اور اس عمر کے اپنے پیمانے ہیں، تم جتنے اعمال بھر رہے ہو، وہ اعمال محفوظ کئے جارہے ہیں، عمریں منقوص یعنی کم ہورہی ہیں، اور وقت کے پیمانے میں جو اعمال تم نے بھرے ہیں ان کو محفوظ کیا جارہا ہے، ہر لمحہ اور ہر وقت جو عمل تم کرتے ہو اس کو ریکارڈ کیا جارہا ہے اور اس کا نامہ عمل تیار ہورہا ہے، صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''قَالَ یَتَعَاقَبُوْنَ فِیْکُمْ مَلٰٓئِکَۃٌ بِاللَّیْلِ وَمَلٰٓئِکَۃٌ بِالنَّھَارِ وَیَجْتَمِعُوْنَ فِیْ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ وَصَلٰوۃِ الْعَصْرِ ثُمَّ یَعْرُجُ الَّذِیْنَ بَاتُوْا فِیْکُمْ فَیَسْأَلُھُمْ رَبُّھُمْ وَھُوَ اَعْلَمُ بِھِمْ کَیْفَ تَرَکْتُمْ عِبَادِیْ فَیَقُوْلُوْنَ تَرَکْنَاھُمْ وَھُمْ یُصَلُّوْنَ وَاَتَیْنَاھُمْ وَھُمْ یُصَلُّوْنَ۔'' (صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۲۷)

ترجمہ:...... ''دو نمازوں میں دن کے فرشتے اور رات کے فرشتے تم پر باری باری بدلتے ہیں، ایک فجر کی نماز میں اور ایک عصر کی نماز میں، جب فرشتے یہاں سے فارغ ہوکر اللہ تعالیٰ کے پاس جاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، تم میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو؟ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کے پاس گئے تھے جب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب چھوڑ کر آئے جب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔''

فجر کی نماز میں رات والے فرشتے بھی موجود ہوتے ہیں اور جن کو دن کی ڈیوٹی دینی ہوتی ہے وہ بھی موجود ہوتے ہیں، نماز سے فارغ ہوکر وہ نامہ عمل دن والے فرشتوں کے سپرد کردیتے ہیں۔ اسی طرح عصر کی نماز میں دن بھر جن فرشتوں نے ڈیوٹی دی ہوتی ہے، وہ بھی موجود اور جن کی ڈیوٹی آئندہ رات کے لئے ہے، وہ بھی موجود، نماز سے فارغ ہوکر دن والے فرشتے اپنا نامہ اعمال رات والے فرشتوں کے سپرد کردیتے ہیں۔

فرشتوں کی شہادت:

یہ دن میں دو وقت کی اہل اسلام کے لئے فرشتوں کی شہادت ہے اور اسی بنا پر فجر کی نماز اور عصر کی نماز کی مزید تاکید اور تاکید در تاکید فرمائی گئی ہے اور اسی بنا پر جماعت کے اہتمام کو ضروری قرار دیا گیا ہے، لوگ اپنی اکیلے نماز پڑھ لیتے ہیں، پتہ نہیں کیسے پڑھ لیتے ہیں؟ خدا نہ کرے کبھی اکیلے نماز پڑھنی پڑے، مجھے بڑی مشکل ہوتی ہے، فرض نماز اکیلے پڑھی ہی نہیں جاتی، نفلیں تو چاہے گھنٹہ پڑھتے رہیں، لیکن فرض نماز پانچ منٹ کے لئے نہیں پڑھی جاتی۔

اکیلے اور جماعت کی نماز کا فرق:

اکابرؒ فرماتے ہیں کہ جماعت کی نماز ایسی ہے جیسے دعوت کا کھانا اور اکیلے کی نماز ایسی ہے جیسے کوئی شخص روٹی اپنے ہاتھ پر رکھ کر کھانے لگ جائے، لا الٰہ الا اللہ!

ہمارے اعمال کی نگرانی:

غرض یہ ہے کہ اعمال محفوظ کئے جارہے ہیں، اچھے اعمال بھی، برے اعمال بھی، قرآن کریم میں فرمایا ہے:

''وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ. كِرَامًا كَاتِبِيْنَ. يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ.'' (الانفطار:۱۰ تا ۱۲)

ترجمہ:......''اور بے شک تم پر مقرر ہیں بہت ہی معزز فرشتے لکھنے والے (جو تمہارے اعمال کی محافظت اور نگہداشت کرتے ہیں) وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔''

تم پر نگران مقرر ہیں جن کو ''کراماً کاتبین'' کہا جاتا ہے، وہ جانتے ہیں جو تم چھپ کر کرتے ہو یا ظاہری طور پر کرتے ہو، ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم کوئی عمل فرشتوں کی نظر سے بچا کر کرلو کہ فرشتوں کو معلوم نہ ہو، آج کل تو آٹومیٹک مشینوں کا دور ہے، مسئلہ کا سمجھنا بہت آسان ہوگیا، ادھر تمہارا عمل شروع ہوا اور ادھر خود بخود ان کا قلم چلنے لگا۔ ان فرشتوں کے پاس خودکار مشینیں ہیں، اقوال کی بھی اور افعال کی بھی، حتیٰ کہ دل کے ارادوں کی بھی وہ خبر معلوم کرلیتے ہیں، وہ فرشتے آتے ہی تم پر اپنے آلات لگادیتے ہیں اور نگرانی کرنے لگتے ہیں، تم خلوت میں ہو یا جلوت میں ہو، گھر میں ہو یا محفل میں ہو، رات کی تنہائی میں ہو یا دن کی روشنی میں، فرشتوں کی نظر سے غائب نہیں ہوسکتے۔

زندگی کا چراغ:

تو تمہاری عمریں گھٹ رہی ہیں، دم بہ دم، لحظہ بہ لحظہ، اور تمہارے جتنے بھی اعمال ہیں ان پر کراماً کاتبین نگران مقرر ہیں، ان کو محفوظ کیا جارہا ہے، ان کو ریکارڈ کیا جارہا ہے اور موت اچانک آجائے گی، کبھی تو اس طرح اچانک آتی ہے کہ ہم بھی اس کو اچانک کہتے ہیں اور کبھی بظاہر موت سے پہلے آدمی بیمار ہوتا ہے، کمزور ہوتا ہے، بالآخر اس کی زندگی کا چراغ گل ہوجاتا ہے، لیکن پھر بھی جب موت آتی ہے ایسا لگتا ہے کہ غیر متوقع طور پر آگئی، چنانچہ اکثر و بیشتر مریض کے پاس لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، ہنسی مذاق کررہے ہوتے ہیں، مگر جوں ہی مریض کا سانس نکلتا ہے تو رونے لگتے ہیں، حالانکہ اسی مجلس میں بیٹھے ہیں، یہ اچانک کیا تبدیلی ہوئی؟ کہتے ہیں موت آگئی

اچانک! تو موت کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ کب آئے گی؟ تمہاری زندگی کا چراغ کب بجھ جائے گا؟ اور تمہارا نامۂ اعمال کب لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا؟

دنیا آخرت کی کھیتی:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ کسی نے خیر کو کاشت کیا تو اس کی فصل اٹھائے گا، کاٹے گا، اور کسی نے برائی کو کاشت کیا، اس کو کاٹے گا، یوں کہتے ہیں: "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْآخِرَۃِ." (اتحاف ج:۸ ص:۵۳۹) یعنی دنیا آخرت کا کھیت ہے، یہاں تم اپنے اعمال کی کاشت کر رہے ہو اور جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔

گندم از گندم بروید جو زجو
از مکافات عمل غافل مشو

''گندم'' کاشت کرو گے تو ''گندم'' کاٹو گے، اور ''جو'' بیجو گے تو ''جو'' کاٹو گے، بہرحال تمہیں جو کچھ ملے گا وہ اپنا کیا ملے گا، یہ الگ بحث ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نیکی کو بڑھا دیں اور اپنی رحمت سے برائی کو مٹا دیں، لیکن یہ اسی وقت ہوگا جبکہ نیکی کاشت بھی کی ہو!!

مقدر کا رزق:

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ جو کاہل آدمی زمین کی کاشت کے وقت جب کہ بیج ڈالنے اور بوائی کا موسم ہوتا ہے، میٹھی نیند سوتا رہے، اس کو کٹائی کے دن پتہ چلے گا کہ میرے سونے کی کتنی قیمت پڑی ہے؟ جہاں تک دنیا کا اور دنیا کی قسمت کا تعلق ہے، وہ بھی ساتھ لکھ کر دے دی گئی ہے، ایسا ممکن نہیں کہ ایک سست آدمی اپنا حصہ اس لئے وصول نہ کر سکے کہ ذرا سی سستی ہوگئی تھی، نہیں! جتنا تمہارے لئے لکھا ہوا ہے، وہ تمہیں ملے گا۔

اور کوئی حریص اور لپکنے والا آدمی ایسی چیز کو حاصل نہیں کر سکتا اور نہیں پا سکتا

جو اس کے لئے مقدر نہیں، رزق مقدر سے ملے گا، تمہاری محنت سے نہیں، ہر چند کہ محنت کرنے کا بھی حکم ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

"طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ."

(کنز العمال ج:۴ حدیث:۹۲۰۳)

ترجمہ:......"حلال کا طلب کرنا فریضہ ہے بعد فریضہ کے۔"

فریضہ ہے بعد فریضہ کے، جس کا مطلب یہ ہے کہ فرائض شرعیہ ادا کرنے کے بعد اگر وقت بچتا ہے تو اس میں طلب حلال بھی فرض ہے۔

روٹی کے لئے دوسرے فرائض کی قربانی:

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس سرہ ارشاد فرماتے تھے: اب یار لوگوں نے بعد فریضہ کا لفظ اڑا ہی دیا ہے، بس ایک بات ہی یاد رہ گئی کہ رزق کی تلاش کرنا بھی تو فرض ہے، روٹی کمانا بھی تو فرض ہے، تو ایک تو بعد فریضہ کا لفظ حذف کر دیا، اور میں کہتا ہوں کہ ساتھ طلب حلال کا لفظ بھی حذف کر دیا لوگوں نے، بس اتنا یاد رہ گیا کہ روٹی کمانا فرض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ فرائض شرعیہ ادا کرنے کے بعد حلال کا تلاش کرنا فرض ہے، حلال ملتا ہے تو لو، نہیں ملتا نہ لو، رزق کا ٹھیکہ تو ہمارا نہیں ہے، اللہ میاں نے خود اٹھایا ہوا ہے، ہم لوگوں کی حرص نے اور طلب دنیا نے باقی فرائض کو تو غارت کر دیا، نماز فوت ہوتی ہے، ہوتی رہے، جماعت نہیں ملتی، نہ ملے، اور دین کے جو دیگر فرائض ہیں وہ میسر نہ آئیں، نہ آئیں، روٹی کمانا شرط ہے، اور پھر حلال کی قید بھی ہم نے اڑا دی، بس کمائی ہونی چاہئے، آمدنی ہونی چاہئے، حلال ہو یا حرام، اس سے بحث نہیں۔

سود کی کثرت:

صحیح بخاری شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی مروی ہے:

''یَأْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَّا یُبَالِی الْمَرْءُ مَا اَخَذَ مِنْهُ اَمِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ الْحَرَامِ.'' (بخاری ج:۱ ص:۲۷۶)

ترجمہ:......''ایک وقت آئے گا کہ جب آدمی کو یہ پرواہ نہیں ہوگی کہ کس چیز سے لے رہا ہے (پیسہ جو اس کو مل رہا ہے کہاں سے مل رہا ہے؟) حلال سے یا حرام سے (حلال و حرام کا تصور ہی غائب)۔''

اضطراری سود:

میرا بھائی! ایک ہے براہ راست سود لینا اور سود کا کاروبار کرنا، یہ تمہارے اختیار کی چیز ہے۔ اور ایک ہے کہ کسی صورت میں بچاؤ ممکن نہیں، مثال کے طور پر پانی اب گدلا ہوگیا ہے، وہی پینا پڑتا ہے، کیا کریں سود کی آمیزش ہوگئی تمام چیزوں میں، اور یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''ایک وقت آئے گا کہ سود کا غبار یا فرمایا: بخار، ہر ایک کو پہنچے گا۔''

اضطرار پر گرفت نہیں:

اب اگر کسی علاقے کا موسم اور وہاں کی آب و ہوا مسموم چیزوں کے ساتھ مخلوط ہوگئی ہے، تو جو لوگ اس آب و ہوا میں سانس لے رہے ہیں، ظاہر ہے گناہگار نہیں ہوں گے، اور اگر زہر خود اٹھا کر کوئی کھاوے تو گناہگار ہوگا، جہاں تک تمہارا بس چلتا ہے حرام ذریعہ کا دروازہ اپنے اوپر بند کردو، حلال ذریعہ اختیار کرو، اب اگر حلال ذریعہ سے ملنے والا پانی بھی گدلا ہے تو آپ گناہگار نہیں۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر کاشت کرنے والے کو وہی ملے گا جو اس نے کاشت

کیا، کوئی سست آدمی اپنی سستی کی وجہ سے اپنے حصے سے، اپنے رزق کے حصے سے پیچھے نہیں رہ سکتا، اس کو ملے گا، اور کوئی ہوشیار اور حریص آدمی اپنے لکھے ہوئے رزق سے زیادہ حاصل نہیں کرسکتا۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کوئی خیر عطا فرمادیں تو اس کو شکر ادا کرنا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی عطا فرمانے والے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے کسی شر سے بچالیں تو اس کو شکر کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کو بچایا ہے، خیر کا حاصل کرنا اور شر سے بچنا یہ بھی لطف خداوندی ہے، ورنہ تم محض اپنے وسائل سے نہ شر سے بچ سکتے ہو، نہ خیر کو حاصل کرسکتے ہو، توفیق الٰہی مددگار ہو اور عنایت الٰہی متوجہ ہو تو آدمی خیر کو حاصل کرسکتا ہے اور شر سے بچ سکتا ہے۔

متقی سردار:

پھر فرمایا متقی لوگ سردار ہیں، قرآن کریم میں بھی ارشاد باری ہے:

”اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ.“ (الحجرات:۱۳)

ترجمہ:...... ”تم میں سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔“

قیامت کے دن کی سرداری ریاست اور وجاہت یہ تقویٰ کے پیمانے سے ناپ ناپ کر تقسیم کی جائے گی۔

فقہاً قائد ہیں:

اور فقہاً قائد ہیں، قائد کے معنی قیادت کرنے والا، آگے چلنے والا، ہمارے یہاں تو قائدوں کی بہت سی قسمیں ہیں، ایک قائد اعظم ہیں، ایک قائد عوام ہیں، اب کوئی نیا قائد پیدا ہوا ہوگا، درست ہے بھائی! بالکل بجا ہے، تم جس قائد کے پیچھے آنکھیں بند کرکے چل رہے ہو، یہ سوچ لو کہ کدھر لے جارہا ہے جنت کی طرف یا جہنم کی طرف؟ وہ تمہاری قیادت کرتے ہوئے کدھر تمہیں ہانک رہا ہے؟ اور حضرات

فقہائے امت کی قیادت قبول کرو گے اور ان کے پیچھے چلو گے تو وہ تمہیں کتاب و سنت کے سرچشمے پر لے جائیں گے، اور کتاب وسنت کا سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حوضِ کوثر ہے، یہاں کتاب وسنت سے سیراب ہوگے اور وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بابرکت حوضِ کوثر سے سیراب ہوگے، اس کے بارے میں فرمایا:

"مَنْ وَرَدَهُ فَشَرِبَ مِنْهُ لَمْ يَظْمَأْ بَعْدَهَا اَبَدًا."

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۲۵۱)

ترجمہ:......"جو شخص ایک دفعہ اس میں سے پی لے گا، پھر اس کو کبھی پیاس نہیں لگے گی۔"

پھر پیاس ہمیشہ کے لئے ختم، پیاس کا علاج ہوگیا، حضرات فقہأ کی قیادت میں اگر تم کتاب وسنت کے چشمۂ شیریں تک پہنچ جاؤ گے اور اس کا ایک گھونٹ پی لو گے تو پھر انشأ اللہ تمام طریقۂ زندگی سے بے نیاز کردیں گے، تمہاری پیاس بجھ جائے گی، تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا پھر کسی اور کا طریقۂ زندگی اچھا ہی نہیں لگے گا، پیاس ہی بجھ جائے گی۔

فقہأ کے دشمن:

لیکن اللہ کی کچھ مخلوق اب پیدا ہوئی ہے جو فقہأ کے دشمن ہیں، جب حضرات فقہأ کو قائد بنادیا گیا اور دوسرے حضرات ان کے پیچھے پیچھے چلنے والے ہیں اور یہ سب پہنچ رہے ہیں حوضِ کوثر پر، کتاب وسنت کے حوضِ کوثر پر، تو جو شخص کہ اس قافلے سے کٹ کر دوسری طرف جائے گا اس کے بارے میں کیا خیال شریف ہے؟ ہر چند کہ دعویٰ کرتا ہے کتاب وسنت پر عمل کرنے کا، مگر حضرات فقہأ سے کٹ کر کوئی شخص کتاب وسنت پر عمل نہیں کرسکتا، اپنی ہوا پر، اپنی خواہش پر عمل کرے گا، جیسے کہتے ہیں کہ میں نے یہ سمجھا ہے کتاب اللہ سے، کتاب اللہ میں ہے بھی یا تو نے ویسے ہی سمجھ لیا، یہ بھی

تو سوچنے کی بات ہے، جیسے مرزائی لوگ قرآن سے ثبوت پیش کیا کرتے ہیں کہ نبوت جاری ہے، کسی مرزائی سے بات کرو، وہ تمہیں آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائے گا، انا للہ وانا الیہ راجعون! اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام مرگئے ہیں اور وہ حوالے تو دیتے ہیں اپنے خیال میں کتاب اللہ کے، لیکن حقیقت میں وہ مضمون کتاب اللہ کا نہیں، ان کے نفس کی کتاب کا ہے، جس کو ہوا کہتے ہیں، یعنی خواہش نفس۔

صحیح غلط کا معیار!

آج ہر آدمی کتاب کھول کر ہمیں آیتیں سنا رہا ہے، تو بھئی اس کی صحت وسُقم کا بھی تو معیار ہونا چاہئے کہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ اس کا بھی کوئی معیار تو ہو، کوئی پیمانہ تو ہو، تم لیبارٹری میں جاکے دوائیں ٹیسٹ کرواتے ہو، پانی ٹیسٹ کرواتے ہو، دوسری چیزیں ٹیسٹ کرواتے ہو، پیشاب اور پاخانہ ٹیسٹ کرواتے ہو، لیکن نظریات کی کوئی لیبارٹری نہیں تمہارے یہاں؟ قرآن وسنت کے دلائل کو جانچنے اور پرکھنے کی کوئی فیکٹری اور کوئی لیبارٹری نہیں جس کے ذریعے تمہیں معلوم ہوسکے کہ یہ استدلال صحیح ہے یا غلط ہے؟ یہ نتیجہ درست ہے اور یہ نتیجہ نادرست ہے، اب تو لوگوں کی نظر میں ہر باطل پرست اور حق پرست ایک ہی کانٹے سے تولے جارہے ہیں اور اپنے نفس کو سمجھانے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ اجی! مولوی لڑتے بہت ہیں! مولوی لڑتے ہیں؟ بھائی! مولوی بالکل نہ لڑا کرتے اگر تمہارے پاس صحیح پیمانہ موجود ہوتا، اگر تمہارے پاس صحیح پیمانہ موجود ہوتا تو تم باطل پرست کی گردن پکڑ لیتے اور یہ جو لڑنے والے ہیں آپ ان سے پوچھتے کہ جو بات تم کہہ رہے ہو تم سے پہلے بھی کسی نے کہی ہے؟ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے؟ امام ابوحنیفہؒ نے؟ شاہ عبدالقادر جیلانیؒ نے؟ امام غزالیؒ نے؟ مجدد الف ثانیؒ نے؟ کسی بزرگ کا نام تو لو، اگر تم اس پیمانے پر ان باطل پرستوں کو دیکھتے، تو لتے اور اس لیبارٹری میں ان کا تجزیہ

کرتے تو تمہیں فوراً معلوم ہوجاتا کہ یہ صحیح ہے، یہ غلط ہے۔

پوری امت ایک طرف اور غلام احمد قادیانی ملعون دوسری طرف ہے، مگر یہ لوگ ان کی باتیں بھی سن لیتے ہیں اور سن کر متأثر ہوجاتے ہیں، ہر قادیانی ایسی چرب زبانی سے بات کرتا ہے کہ سننے والے متاثر ہوجاتے ہیں۔ اور اسی طرح منکرین حدیث بھی لوگوں کے پاس جاکر الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ جو حضرات فقہاءؒ کے منکر ہیں، یہ فقہاءؒ جو امت کے مسلّمہ فقہاءؒ ہیں، جیسے امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ یہ امت کے مسلّمہ امام ہیں۔ کیونکہ پوری کی پوری امت ان کی فقاہت پر، ان کی فضیلت پر، ان کے تقویٰ وطہارت پر متفق ہے، یہ لوگ غلط راستے پر چلنے والے نہیں تھے، اپنے علم کے اعتبار سے، اپنے فہم کے اعتبار سے، اپنے تقویٰ کے اعتبار سے، دل کی روشنی کے اعتبار سے، بصیرت کے اعتبار سے، وہ امت کو غلط راستے پر نہیں لے جارہے تھے، اور اگر غلط راستے پر لے جانے والے ہوتے تو اللہ کے مقبول بندے ان کے نقش قدم پر نہ چلتے، آخر اور بھی تو بہت سے گمراہ ہوئے ہیں، لیکن امام ابوحنیفہؒ کا نام دنیا میں آفتاب کی طرح چمک رہا ہے، پورے عالم میں روشنی پھیل رہی ہے، آخر کیوں؟

امام ابوحنیفہؒ کا خواب:

امام محمد بن سیرینؒ جو اکابر تابعین میں سے ہیں، اپنے وقت کے بہت بڑے معبّر تھے، یعنی خوابوں کی تعبیر بتانے والے، امام ابوحنیفہؒ کی عمر ان سے کم تھی، ان کا انتقال سن ۱۱۰ ہجری میں ہوا ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کا انتقال ان کے چالیس سال بعد ۱۵۰ھ میں ہوا ہے، امام ابوحنیفہؒ نے خواب بیان کیا اور کہا حضرت! خواب بڑا خراب سا دیکھا ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ نوجوان تھے، محمد بن سیرینؒ نے فرمایا: کیا خواب دیکھا ہے؟ فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کو کھود رہا ہوں اور اس

میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہڈیاں جمع کر رہا ہوں، نعوذ باللہ! استغفر اللہ! لا حول ولا قوۃ الا باللہ!

اول تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کھودنا، حالانکہ کسی مسلمان کی قبر کھودنا جائز نہیں اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہڈیوں کے جمع کرنے کا کیا سوال؟ آپ تو اسی طرح حیات ہیں جس طرح دنیا میں حیات تھے، بہت گھبرائے ہوئے تھے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کوفہ سے بصرہ پہنچے تھے اس تعبیر کو معلوم کرنے کے لئے۔

خواب کی تعبیر:

محمد بن سیرینؒ نے فرمایا: تم نے یہ خواب دیکھا ہے؟ کہا: جی میں نے دیکھا ہے، فرمایا: اگر تم نے واقعی یہ خواب دیکھا ہے تو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کو جمع کرو گے۔ اور علمائے امت اس بات پر متفق ہیں، جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ''تبلیغ الصحیفہ'' میں نقل کیا ہے: ''اَوَّلُ مُدَوِّنُ الْعِلْمِ.'' سب سے پہلا شخص حضرت امام ابوحنیفہؒ ہے جس نے علوم کو مدون کیا، ایک ایک باب کا الگ الگ مسئلہ، وضو کے مسائل، غسل کے مسائل، تیمّم کے مسائل، وغیرہ وغیرہ، الخ، تو یہ امام ابوحنیفہؒ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے فقہی مسائل کو الگ طور پر مدون اور مرتب کیا، اور اسی بنا پر حضرت امام شافعیؒ فرماتے تھے: ''جو شخص کہ علم فقہ حاصل کرنا چاہتا ہے (فقہ کہتے ہیں قرآن وسنت کے فہم کو) وہ ابوحنیفہؒ کا محتاج ہے، ابوحنیفہؒ کا عیال ہے، جس دن امام ابوحنیفہؒ کا انتقال ہوا تھا، اس دن امام شافعیؒ کی ولادت ہوئی تھی، اللہ کی شان ہے کہ امام شافعیؒ ان کے سامنے بچے ہیں، اور حضرت امامؒ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں، انہوں نے حضرت امامؒ سے نہیں، بلکہ حضرت امامؒ کے شاگردوں کے شاگردوں سے استفادہ کیا ہے، امام محمدؒ اور دوسرے شاگردوں سے۔

امام بخاریؒ، امام صاحبؒ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں:

امام بخاریؒ کو بھی یہ فضیلت حاصل ہوئی ہے کہ وہ حضرت امامؒ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے ایک شاگرد تھے مکی بن ابراہیم، اللہ تعالیٰ نے ان کو طویل عمر عطا فرمادی، اور امام بخاریؒ نے ان سے حدیث پڑھی ہے، چنانچہ حضرت امام بخاریؒ بڑے مزے لے کر اس سند کو بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: حدثنا مکی ابن ابراہیم، مکی بن ابراہیم حضرت امام ابوحنیفہؒ کے طویل العمر شاگرد تھے، اور طویل عمر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امام بخاریؒ کو بھی ان سے استفادے کا موقع عطا فرمایا تھا، اور ان کے واسطے سے انیس احادیث امام بخاریؒ نے نقل کی ہیں کہ امام بخاریؒ کے درمیان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہیں، ایک مکی بن ابراہیم تابعی، ان کے بعد صحابیؓ اور چوتھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ورنہ امام شافعیؒ شاگرد ہیں امام احمدؒ کے، امام احمدؒ شاگرد ہیں امام شافعیؒ کے، امام بخاریؒ شاگرد ہیں امام احمد بن حنبلؒ کے، امام بخاری حدیث لیتے ہیں امام احمد بن حنبلؒ سے اور وہ امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں، اور امام شافعیؒ، امام محمدؒ کے شاگرد ہیں، اور وہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد،، تو امام بخاریؒ تین واسطوں کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ تک پہنچتے ہیں، لیکن امام ابوحنیفہؒ کی کرامت کہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایک شاگرد کو طویل عمر نصیب فرمائی اور امام بخاریؒ کو ان کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تین واسطوں کے ساتھ پہنچادیا۔

اور فرمایا کہ ان فقہاء کی مجلس میں بیٹھنے سے تمہارے علم میں، تمہارے عمل میں، تمہاری بصر میں، تمہاری بصیرت میں، تمہارے تقویٰ میں اور تمہاری طہارت میں اضافہ ہوگا، بشرطیکہ تم ان کے پاس جاکے بیٹھو بھی۔

سبحانک اللھم وبحمدک اشھد ان لا الہ الا انت استغفرک واتوب الیک

شب برأت

فضیلت و اہمیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

اس شب برأت کے بارے میں جو کرنے کے کام ہیں اور جو نہ کرنے کے کام ہیں، ان کے متعلق چند باتیں عرض کرتا ہوں، حق تعالیٰ شانہ ہمارے قلوب میں صحیح استعداد پیدا فرمائے، اپنے اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو سمجھنے، ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما کر ان کو قبول بھی فرمائے۔

عنایت الٰہی:

یہ حق تعالیٰ شانہ کی خاص عنایت ہے کہ بعض مبارک اوقات کی محبت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دی ہے، باوجود اس کے کہ حق تعالیٰ شانہ کی عنایتیں ہر وقت انسان کے شامل حال رہتی ہیں، لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ جمعہ کا اجتماع، عام نمازوں سے زیادہ ہوتا ہے، رمضان مبارک میں مسلمانوں کی توجہ زیادہ ہوتی ہے، بہ نسبت اور مہینوں کے، اور اسی طرح جو خاص اہمیت کی راتیں ہیں، ان میں بھی ہماری رغبت زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت عام راتوں کے، یہ بھی حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے بندوں پر خاص عنایت ہے کہ اس کی خصوصی عنایت اور مغفرت کے جو

مواقع ہیں، یا عنایت اور مغفرت کے جو اسباب ہیں ان کی محبت زیادہ ڈال دی جاتی ہے، اور یہ عنایت یوں ہے کہ شاید اسی راستے سے کسی کا کچھ کام بن جائے۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے ہمیں اس موقع پر جمع ہونے کی توفیق عطا فرمادی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی توقع رکھنی چاہئے۔

نیکی زیادہ تو گناہ بھی!

لیکن اسی کے ساتھ دوسری بات بھی ذہن میں رکھو، تصویر کے دونوں پہلو سامنے رکھنے چاہئیں جس طرح خاص مقامات میں عبادت کا درجہ بڑھا ہوگا، اسی طرح ان مواقع پر گناہ کا وبال بھی دوسرے اوقات کی نسبت زیادہ ہوگا، چنانچہ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ! اگر کوئی شخص کنویں میں پیشاب کرے تو بہت بری بات ہے، لیکن اگر کوئی شخص چاہ زمزم میں پیشاب کرے تو اس سے بدتر بات ہوگی، بلکہ نعوذ باللہ! کفر کے درجے تک پہنچنے والی بات ہوگی، اسی طرح اگر کوئی شخص عام مسجدوں کی بے حرمتی کرے تو بہت ہی بری بات ہوگی، لیکن خدانخواستہ اور نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ! اگر حرم شریف میں کوئی گستاخی اور بے ادبی کرے تو یہ اور زیادہ بدترین بات ہے، ایسے ہی آخر شب کا وقت، جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا وقت ہے اس وقت میں اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو بہت بڑا درجہ ہے، اور اگر کوئی نعوذ باللہ! اس وقت بدکاری کرے، یا چوری کرے تو اس کا بدترین ہونا ظاہر ہے، یہ ساری باتیں میں نے سمجھانے کے لئے عرض کی ہیں کہ جن اوقات یا مقامات میں عبادت کا درجہ بڑھا ہوا ہوتا ہے، ان مقامات میں یا اوقات میں گناہ کا درجہ بھی بڑھا ہوا ہوتا ہے، اور ان اوقات میں گناہ کرنا زیادہ سنگین ہوتا ہے۔

ایک کی لاکھ مرغیاں:

اس پر ہمارے حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ کا لطیفہ یاد آیا کہ جب پہلے

حج پر گئے تھے تو شاہ عبدالقادر قدس سرہ بھی ساتھ تھے اور مدینہ طیبہ جاتے ہوئے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ کو (یہ اس وقت نوجوان اور پورے قافلے میں سب سے زیادہ کم عمر تھے) ''اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ'' (کہ ائمہ قریش میں سے ہوں گے) کہہ کر امیر قافلہ بنادیا تھا، تو ایک موقع پر حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ہاں مرغی پکائی گئی تھی، اور شیخ رحمہ اللہ اس وقت اتفاق سے موجود نہ تھے، ان کی شرکت نہ ہوسکی، حضرت رائے پوریؒ نے معذرت کی کہ آپ اس کھانے میں تشریف فرما نہیں تھے، تو بے تکلفی سے شیخ نے فرمایا کہ حضرت! آپ کو اس کا معاوضہ ادا کرنا پڑے گا، شاہ عبدالقادرؒ نے فرمایا کہ حضرت ضرور معاوضہ ادا کریں گے، شیخ نے کہا کہ حضرت! یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں کی ایک نیکی لاکھ نیکی کے برابر ہے، تو ایک مرغی کی لاکھ مرغیاں بنتی ہیں، چنانچہ حضرت رائے پوریؒ نے ساری عمر حضرت شیخ کا یہی قرض چکایا، وہیں سے خط لکھنے شروع کردیئے کہ شیخ کی ایک لاکھ مرغی ہمارے ذمے واجب ہے، اس کا انتظام کررکھو۔ یہ تو میں نے لطیفہ عرض کردیا کہ ایک مرغی کی لاکھ مرغیاں بنتی ہیں، حرم شریف میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں ایک روپیہ خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک لاکھ روپیہ پاؤ گے، وہاں ایک دوگانہ ادا کرو گے تو ایک لاکھ دوگانہ کا ثواب ملے گا، اسی طرح عرض کررہا ہوں کہ اگر خدانخواستہ کوئی الٹا چلے تو پھر بہت بری بات ہے، اس کا گناہ بھی اتنا ہی سنگین ہوگا۔

گناہوں سے بچنا زیادہ ضروری ہے:

اسی کے ساتھ ایک بات اور ہے کہ آدمی نیکی چاہے تھوڑی کرے، لیکن برائی سے بچنے کی بھرپور کوشش کرے، کیونکہ نیکی منافع کی چیز ہے، جتنا کمالو گے اتنا تمہارا زرمبادلہ بن جائے گا، لوگ دبئی، سعودی عرب جاکر کماتے ہیں اور گھر والوں کو خرچ بھیجتے ہیں یا پیسے جمع کرکے لاتے ہیں، یہ ہماری نیکیاں ہمارا زرمبادلہ ہیں، یہ وہاں

آخرت میں ملے گا، کسی نے زیادہ کمالیا، زیادہ ملے گا، کم کمایا تو کم ملے گا، لیکن اگر برائیاں کرو گے تو یہ بہت سنگین بات ہے، نیکی تو چاہے تھوڑی کرو لیکن برائی سے بچنے کی زیادہ کوشش کرو، یہ دو باتیں ہوگئیں۔

میں ایک غلطی پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں باتوں کی لوگ رعایت نہیں رکھتے، ایک تو یہ کہ نیکی کی رغبت ہوتی ہے اور ہونی چاہئے، عرض کر رہا ہوں کہ نیکی زرمبادلہ ہے، جتنی زیادہ آدمی نیکی کرے اتنی کم ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذر غفاریؓ کو ایک موقع پر فرما رہے تھے، حضرت ابوذرؓ بڑے زاہد صحابی تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ان کے مطلب اور ذوق کی باتیں فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا:

"یَا اَبَاذَرٍّ! خَفِّفِ الْحَمْلَ فَاِنَّ الْعَقَبَةَ کَئُوْدٌ، وَخُذِ الزَّادَ فَاِنَّ السَّفَرَ طَوِیْلٌ، وَاَخْلِصِ الْعَمَلَ فَاِنَّ النَّاقِدَ بَصِیْرٌ."

ترجمہ:......"اے ابوذر! بوجھ ذرا تھوڑا اٹھانا اس لئے کہ گھاٹی بڑی دشوار گزار ہے (جس گھاٹی پر تمہیں چڑھنا ہے وہ بڑی دشوار گزار ہے، ذرا بوجھ کم اور ہلکا رکھنا)، اور ذرا توشہ لے کر چلنا اس لئے کہ سفر بڑا لمبا ہے، اور عمل ذرا کھرا لے کر چلنا اس لئے کہ پرکھنے والا بہت سمجھ رکھنے والا ہے، اس کی نظر بڑی باریک ہے۔"

اگر کھوٹ ملا ہوا ہوگا تو نکال دیا جائے گا، وہاں کھوٹ نہیں چلتا ہمیں تو ہر چیز میں ملاوٹ کی عادت ہے، اور اخلاص کے معنی ہیں ملاوٹ نہ کرنا، یعنی اپنے عمل میں ملاوٹ مت کرو، خالص اللہ کی ذات کے لئے کرو، عمل بھی خالص ہو اور خالص اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے ہو، لوگوں کو دکھانے یا ریاً کے لئے، یا مخلوق کی خاطر نہ ہو،

کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”توشہ لے کر چلو اس لئے کہ سفر بہت لمبا ہے۔“

نیکی کرنا آسان ہے:

لیکن ہم لوگوں کو نیکی کرنے کی طرف جتنی رغبت ہے، اتنا برائی سے بچنے کا اہتمام نہیں، یہ ایک عجیب بات ہے، میں تو اپنی بات کر رہا ہوں، آپ کی بات نہیں کر رہا، آپ اپنے طور پر اپنی حالت پر غور کر لیجئے، عام ذوق یہ ہے کہ نیکی کی طرف رغبت تو بہت ہوتی ہے، لیکن برائی سے بچنے کا اہتمام کم ہے۔

ہمارے حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس کی عجیب حکمت بیان فرمائی، فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ نیکی میں نفس اپنا کچھ حصہ لگا لیتا ہے، کم از کم لذت ہی سہی، یا یوں خیال کر لیا جاتا ہے کہ تم اب اچھے آدمی بن گئے ہو کہ نیکی کا کام کرتے ہو، چنانچہ وہ اپنا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لگا لیتا ہے، اس لئے نیکی پر لگنا تو اس کے لئے آسان ہے۔

گناہ کو چھوڑنا مشکل ہے:

لیکن برائی چھوڑنے میں چونکہ کوئی لذت نہیں، نہ ہی کسی کو پتہ چلتا ہے کہ اس نے برائی چھوڑی، نہ اس میں ریاکاری چل سکتی ہے اور نہ کچھ نفس کو لذت آسکتی ہے، نیکی ایک وجودی یعنی کرنے کا کام ہے، کوئی بھی کرے گا تو دوسرا اسے دیکھے گا، ریاکاری کا بھی اس میں احتمال، خود اپنے نفس کو بھی لذت، اس لئے نیکی کرنے کی طرف تو نفس کو رغبت ہوتی ہے، مگر برائی اور بدی چھوڑنے کی طرف رغبت نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس میں لذت نہیں ہوتی، تو میں نے کہا:

ایک یہ کہ نیکی کا اہتمام چاہے تھوڑا کرو، لیکن بدی سے بچنے کا اہتمام زیادہ کرو۔

دوسری بات یہ کہ خصوصیت کے ساتھ مقدس مقامات میں، مقدس اوقات

میں بدی کے کرنے سے زیادہ سے زیادہ ڈرو، چنانچہ جمعہ کے دن اور عصر کے بعد کا وقت بھی بہت زیادہ مبارک وقت ہوتا ہے، اس وقت میں بدی کا ارتکاب بہت بری بات ہے، رمضان المبارک کا مہینہ بہت ہی مبارک مہینہ ہے، بہت ہی مبارک وقت ہے۔

میرے پاس آج اکثر خطوط رمضان المبارک کے مسائل سے متعلق آرہے ہیں، لوگ پوچھتے ہیں کہ روزہ رکھ کر اگر فلمی گانا سن لیا جائے تو اس سے روزہ تو نہیں ٹوٹتا؟ رمضان المبارک کی تقریریں تو رمضان المبارک میں ہوں گی، یہ درمیان میں ایک مثال کے طور پر بات آگئی، آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی سنا ہوگا:

''مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ.'' (مشکوٰۃ ص:۱۷٦)

ترجمہ:...... ''جو شخص روزہ رکھنے کے باوجود غلط کاری اور غلط بات کو نہیں چھوڑتا، تو اللہ تعالیٰ کو کچھ پرواہ نہیں اور کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔''

پٹاخے اور آتش بازی سنگین جرم ہے:

اسی طرح یہ شب برأت کی ساعت اور اوقات ہیں ان میں بھی گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے، مجھے ان پٹاخوں سے شدید تکلیف ہو رہی ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کار ثواب ہے، یا یوں سمجھتے ہوں گے کہ نہ ثواب ہے نہ گناہ ہے، لیکن میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آئندہ کے لئے کم از کم یہ معلوم کر لیجئے کہ یہ گناہ ہے، اگر یہ رات مبارک ہے تو جس طرح اس رات میں نیکی کرنے کا درجہ زیادہ ہے، اسی طرح بدی کرنے کا جرم بھی زیادہ ہے، اس لئے اس رات میں پٹاخے بجانا، آتش بازی کرنا

یہ بہت ہی زیادہ سنگین جرم ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عقل عطا فرمائے۔

تو یہ ایک بات میں نے عرض کی، یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ مبارک اوقات کی محبت ہمارے دلوں میں ڈال دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کی اس عنایت کا ہمیں شکر کرنا چاہئے اور ساتھ کے ساتھ توقع اور امید بھی رکھنی چاہئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ عنایت اور توفیق ہم پر فرمائی ہے، تو انشاء اللہ اس کو قبول بھی فرمائیں گے، اور ہمیں اپنی رحمت کا مورد بھی بنائیں گے۔ انشاء اللہ!

شب برأت مانگنے کی رات ہے:

دوسری بات حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"فَإِنَّ اللهَ تَعَالىٰ يَنْزِلُ فِيهَا لِغُرُوْبِ الشَّمْسِ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ: اَلَا مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ فَاَغْفِرُ لَهٗ، اَلَا مِنْ مُّسْتَرْزِقٍ فَاَرْزُقُهٗ، اَلَا مِنْ مُّبْتَلًى فَاُعَافِيْهِ، اَلَا كَذَا اَلَا كَذَا." (مشکوۃ ص:۱۱۵)

ترجمہ:......"شعبان کی پندرھویں رات کو اللہ تعالیٰ قریب کے آسمان پر نزول فرماتے ہیں، اور یوں پکارتے ہیں: کیا کوئی بخشش مانگنے والا ہے کہ میں اس کی بخشش کردوں، کیا کوئی رزق مانگنے والا ہے کہ میں اس کو رزق دوں، کیا کوئی مبتلائے مصیبت ہے جو اس مصیبت سے بچنے کی درخواست کرے، میں اس کو عافیت عطا کردوں، کیا کوئی فلاں قسم کا آدمی ہے، فلاں قسم کا آدمی ہے، ایک ایک ضرورت کا نام لے کر اللہ میاں پکارتے ہیں۔

تو اس رات میں کرنے کے دو کام ہیں، ایک تو جہاں تک ممکن ہوسکے

عبادت کرو اور قرآن کریم کی تلاوت کرو، نماز پڑھنا سب سے افضل ہے، لیکن اگر بیٹھ کر تسبیحات پڑھنا چاہو تو یہ بھی جائز ہے، غرضیکہ اللہ کی یاد میں جتنا وقت بھی گزار سکتے ہو، گزارو، باقی سونے کا تقاضا ہو تو سو جاؤ، فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ضرور پڑھ لو، تو ایک یہ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے عبادت میں وقت گزارا جائے، اور دوسرے یہ کہ رات مانگنے کی ہے، کچھ اللہ تعالیٰ سے مانگا جائے، مانگا کیا جائے؟ اس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمادیا ہے، مختصرسی اس کی تشریح کردیتا ہوں۔

مانگنے کی تین چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہیں، ایک تو اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگو، دوسرے اللہ تعالیٰ سے رزق مانگو، اور تیسرے اللہ سے عافیت مانگو، لیجئے خدا تعالیٰ نے کنجیاں تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں، جتنا چاہے کھولو اور لو، فرمایا ایک اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگو۔

مغفرت مانگیئے:

بھائی! مغفرت کے معنی ڈھانکنے کے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے اندر جو کچھ ہے وہ ناپاکی اور گندگی کے سوا کچھ نہیں، چنانچہ ابھی چھیل دو تو خون نکلنے لگے گا، اور اگر خدانخواستہ پیٹ میں سوراخ ہوجائے تو پھر جو کچھ ہوگا وہ ظاہر ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر اس حسین وجمیل چمڑے کا پردہ ڈال دیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ پاک سے پاک مجلسوں میں اور معزز مجلسوں میں ہم بیٹھتے ہیں، لیکن جو گندگیاں ہمارے اندر چھپی ہوئی ہیں، وہ اس پردے کی وجہ سے لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتیں، خدانخواستہ ہماری گندگیاں ظاہر ہونے لگیں تو ہم کسی شریفانہ محفل میں بیٹھنے کے لائق نہ ہوتے، یہ تو ظاہری چمڑے کی بات کر رہا ہوں، اور بالکل اسی طرح معنوی طور پر ہمارے اندر جو قصور، لغزشیں، خطائیں ہیں، جو جرائم اور گناہ ہم نے کئے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی ستاری کا پردہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو فاش نہیں فرماتے، دنیا میں اللہ تعالیٰ نے

ستاری فرمارکھی ہے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطابؓ کی خدمت میں ایک چور لایا گیا، حکم فرمایا کہ اس کے ہاتھ کاٹ دو کہ شریعت کا حکم ہے، چور ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوگیا کہ امیر المؤمنین میں نے پہلی دفعہ چوری کی ہے، آپ اس دفعہ تو مجھے معاف کردیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا: اللہ کے دشمن! تو جھوٹ بولتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس سے کریم ہے کہ پہلی بار آدمی کو پکڑوادیں، یہ اس کے کرم سے بعید ہے۔ جن لوگوں کے پردے فاش ہوجاتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے سامنے جری بن جاتے ہیں:

ہم مشو مغرور از حلم خدا
دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

ہاں اللہ کے حلم اور اس کی ستاری سے مغرور نہ ہوجاؤ، دھوکہ نہ کھاجاؤ، اس لئے کہ دیر سے پکڑیں گے لیکن جب پکڑیں گے تو سخت پکڑیں گے۔

میں عرض کررہا ہوں کہ ہم میں سے ہر شخص کو اپنا مطالعہ کرکے اپنا ایکسرے کرنا چاہئے، اپنے چمڑے کے نیچے کرید کر دیکھو تو نجاست ہی نجاست بھری ہوئی نظر آئے گی، یہ اوپر سے ہم پر اللہ تعالیٰ کی ستاری کا پردہ پڑا ہوا ہے، وگرنہ کوئی کرید کر دیکھے تو ہمارے گناہ، وساوس، خیالات، اور اندرونی جذبات وغیرہ تو اندر نجاست ہی نجاست ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ستاری ہے کہ ہم پر پردہ ڈال دیا ہے، اگر کوئی جری ہوجاتا ہے تو تھوڑا سا پردہ اٹھادیتے ہیں، اس کو اپنی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے کہ تو ایسا ہے، اللہ تعالیٰ تو بہت ہی پردہ پوش اور ستار ہے، بقول شیخ سعدیؒ کے کہ: ''گناہ بیند و پردہ پوشد بحلم'' گناہوں کو دیکھتا ہے، اور اپنے حلم کے ساتھ پردہ ڈالتا ہے۔

خدا کے سوا تم نے کوئی ایسا دیکھا کہ اس کے سامنے تم اس کا قصور کرو، اور وہ تمہیں رسوا کرنے پر بھی قادر ہو اور رسوا نہ کرے؟ تم سے انتقام لینے پر قادر ہو اور انتقام نہ لے؟ اللہ کی شان رحیمی و کریمی، ستاری و غفاری ہے کہ ہم سراپا قصور و عیب

ہیں، گناہ کرتے ہیں، مسلسل کرتے ہیں، اور بے دھڑک، بغیر جھجک اور بغیر وقفے کے کرتے ہیں، لیکن اللہ میاں پردے ڈالتے چلے جاتے ہیں، تم نادان ہو لیکن اللہ تعالیٰ تمہیں لوگوں کے سامنے رسوا نہیں کرتا، یہ ہے اللہ کا پردہ ڈالنا، اس پردہ ڈالنے کو مغفرت اور بخشش کہتے ہیں، اگر یہ پردہ دنیا میں ہی رہا، اور آخرت میں یہ پردہ اٹھالیا گیا تو سمجھو کہ پکڑ ہوگئی لیکن اگر اللہ رب العزت نے دنیا میں پردہ ڈالے رکھا، اور اسی طرح آخرت میں بھی پردہ ڈال دیا اور ہمارے عیوب کو مخلوق کے سامنے ظاہر نہ فرمایا تو اس کو بخشش اور مغفرت کہتے ہیں، عیوب تو ہمارے ذاتی نقائص ہیں، وہ تو ہم سے جدا نہیں ہوسکتے، جیسے ممکن نہیں ہے کہ انسان کے بدن کو چھیلو اور اندر سے خون وغیرہ نہ نکلے، اسی طرح ہماری عبدیت اور بندگی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم سے لغزشیں، خطائیں، کوتاہیاں ہوتی ہیں، یہ ہمارا لازمۂ ذات ہے، حق تعالیٰ شانہ اپنی رحمت سے جیسے ان تمام چیزوں پر دنیا میں پردہ ڈال رہے ہیں، آخرت میں بھی ڈال دیں تو اس کو مغفرت کہتے ہیں، اب ایک تو اس رات میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش مانگو۔

ایک بات یاد آگئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے:

"اَللّٰهُمَّ لَا تُخْزِنِیْ فَاِنَّکَ بِیْ عَالِمٌ وَّلَا تُعَذِّبْنِیْ فَاِنَّکَ عَلَیَّ قَادِرٌ." (کنز العمال ج:۲ حدیث:۵۱۲۶)

ترجمہ:......"اے اللہ مجھے رسوا نہ کیجئے، کیونکہ آپ مجھے جانتے ہی ہیں، اور مجھے عذاب اور سزا نہ دیجئے اس لئے کہ آپ مجھ پر قادر ہیں (جب چاہیں عذاب دے سکتے ہیں، آپ کی قدرت ہے)۔"

اسی طرح ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے درخواست فرماتے ہیں:

"یَا مَنْ لَّا تَضُرُّہُ الذُّنُوْبُ وَلَا تَنْقُصُہُ الْمَغْفِرَۃُ،

هَبْ لِیْ مَا لَا یَنْقُصُکَ وَاغْفِرْ لِیْ مَا لَا یَضُرُّکَ۔“

(اتحاف ج:۵ ص:۸۱)

ترجمہ:......”اے وہ ذات جس کو بندوں کے گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتے، اور جس کے خزانے میں، مغفرت کوئی نقص اور کمی پیدا نہیں کرتی (اگر اللہ تعالیٰ سب مجرموں کو یک قلم بخش دیں تو کچھ نقصان بھی نہیں ہوا) مجھ کو وہ چیز عطا فرمادے جو آپ کے خزانوں میں کمی نہیں کرتی اور مجھ کو وہ چیز معاف فرمادے جو آپ کو نقصان نہیں پہنچاتی (یعنی میرے گناہوں کو معاف فرمادے)۔“

تو اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگو جیسے بھی مانگ سکتے ہو، اور یوں سمجھ کر مانگو کہ وہ ہمارا خدا ہے، ہم اس کے بندے ہیں، کسی اجنبی سے معاملہ نہیں ہو رہا، اپنے خدا سے ہو رہا ہے، اپنے رب سے مانگ رہے ہیں، ہمارا کام ہی مانگنا ہے، اور اس کا کام عطا کرنا ہے، بلبلا کر مانگو، گڑگڑا کر مانگو، امید کے ساتھ مانگو، اللہ تعالیٰ مجھے معاف کردے، کوئی بے ادبی کا لفظ نہ ہو، وہ ہمارے مالک اور خدا ہیں، ہمیں اپنے خدا پر ناز ہونا چاہئے۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ایک تو بخشش مانگو اور جس کا خلاصہ میں نے عرض کردیا کہ یا اللہ! دنیا اور آخرت میں ہمارے عیوب اپنی مخلوق کے سامنے ظاہر فرماکر ہمیں رسوا نہ فرمایئے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے:

”اَللّٰھُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِی الْاُمُوْرِ کُلِّھَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْیِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَۃِ۔“

(کنزالعمال ج:۲ حدیث:۳۶۲۴)

ترجمہ:......”اے اللہ! تمام امور میں ہمارا انجام اچھا

کر، اور ہمیں دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے محفوظ فرما۔"

کیونکہ آخرت میں جس کو رسوا کریں گے اس کو عذاب دیئے بغیر نہیں چھوڑیں گے، یا اللہ! ہماری خطاؤں سے درگزر فرما کر دنیا کی رسوائی اور آخرت کی رسوائی اور عذاب سے بچالیجئے، نہ دنیا میں ہمارا پردہ لوگوں میں فاش کیجئے اور نہ آخرت میں ہمارا پردہ اپنی مخلوق کے سامنے فاش کیجئے، یا اللہ! ہماری بخشش فرمادیجئے، اور اگلے پچھلے، چھوٹے بڑے جتنے گناہ ہیں، ان سب کی معافی مانگو، اس طرح مانگو کہ گویا آج تو سارے قرضے بے باق کر کے جانا ہے، آج سارا معاملہ نمٹا کے جانا ہے۔

رزق مانگیئے:

دوسرا رزق مانگیں، کیونکہ اعلان ہوتا ہے: "اَلَا مِنْ مُّسْتَرْزِقٍ فَاَرْزُقَهٗ." کیا ہے کوئی رزق مانگنے والا کہ اس کو میں رزق دوں، بھائی ہم تو رزق اسی روٹی پانی کو سمجھتے ہیں، اور اس میں لوگ پریشان بھی بہت ہیں، اپنی اپنی سمجھ اور اپنا اپنا خیال ہے، تاہم جہاں تک تمہارا تصور جاسکتا ہے، وہاں تک رزق کے حدود پھیلے ہوئے ہیں، دنیاوی یا اخروی، جسم یا روح کی بقا کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو سامان پیدا فرمائے ہیں، اور جن پر انسان کی بقا کا دارومدار ہے وہ ساری کی ساری چیزیں رزق کہلاتی ہیں، روٹی پانی بھی اس میں داخل ہے، یہ جسم کی نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کر رکھی ہیں، یہ بھی اس میں داخل ہیں، اور پھر اردگرد جو چیزیں پھیلی ہوئی ہیں، وہ بھی اس میں داخل ہیں، ظاہری چیزیں بھی داخل ہیں، باطنی چیزیں بھی داخل ہیں، رزق کا لفظ ایسا جامع ہے کہ ہماری ضرورت کی کوئی چیز اس سے باہر نہیں ہے، اور کہا یہ جارہا ہے: "اَلَا مِنْ مُّسْتَرْزِقٍ فَاَرْزُقَهٗ." کیا ہے کوئی رزق مانگنے والا کہ میں اس کو رزق دوں، ہماری سمجھ چونکہ بہت ناقص ہے، تو الفاظ بھی ایسے گول مول سے استعمال کر لئے جائیں، جو

ہمارے سامنے اہم چیزیں ہوں وہ تو ہم نام لے کر مانگ لیں کہ:

اے اللہ! ہماری فلاں ضرورت ہے، وہ پوری کردیجئے، لیکن جب ہم ان چیزوں کو مانگ لیں تو اتنا ضرور کہہ دیں کہ یا اللہ! آپ کے رزق کی حدود جہاں تک پھیلی ہوئی ہیں وہ ساری کی ساری چیزیں مانگتے ہیں، تاکہ کوئی چیز بھی پیچھے نہ رہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بات چیت کرنے کے لئے تشریف لائے، اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کچھ دعا مانگ رہی تھیں، آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو بات کرنے کے لئے ایک طرف کردیا اور بعد میں فرمایا: عائشہ! تم دعا مانگ رہی تھیں، تمہیں اپنی دعا درمیان میں چھوڑ دینی پڑی، تمہیں ایک جامع سی دعا بتادیں یعنی چھوٹے الفاظ میں بہت بڑی دعا آجائے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ضرور بتادیجئے! فرمایا: جو کچھ مانگنا ہے اللہ تعالیٰ سے مانگ لیا کرو، اور بعد میں دعا کرلیا کرو:

”اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنْ خَیْرِ مَا سَأَلَکَ مِنْہُ نَبِیُّکَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَ مِنْہُ نَبِیُّکَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ.“

(ترمذی ج:۲ ص:۱۹۲)

ترجمہ:...... ”یا اللہ! میں آپ سے خیر کی تمام چیزیں مانگتی ہوں جو آپ سے آپ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگی ہیں، اور آپ سے شر کی ان تمام باتوں سے پناہ مانگتی ہوں جس سے آپ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے۔“

لیجئے پیچھے رہ کیا گیا؟ بھائی رزق مانگو اللہ تعالیٰ سے خوب مانگو، جب وہ خود بلوا رہے ہیں کہ آؤ لیجاؤ، تو پھر کیوں نہ مانگیں؟ جو آپ مانگ سکتے ہیں اور جو کچھ آپ کے ذہن میں ہے، مانگ لیں، کوئی ضرورت ہو، کوئی تقاضا ہو، اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ

چیز کہاں مل سکتی ہے؟ مشکوٰۃ شریف میں حدیث قدسی ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

"....... یَا عِبَادِیْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْکُمْ مَا زَادَ فِیْ مُلْکِیْ شَیْئًا. یَا عِبَادِیْ! لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْکُمْ مَا نَقَصَ ذَالِکَ مِنْ مُلْکِیْ شَیْئًا ...... الخ." (مشکوٰۃ ص:۲۰۳)

ترجمہ:......"اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ: اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور تمہارے آخر، تمہارے پہلے، تمہارے پچھلے، تمہارے مرد، تمہاری عورتیں، تمہارے چھوٹے، تمہارے بڑے، تمہارے انسان، تمہارے جن، سارے کے سارے مل کر سب سے متقی آدمی کی مثال بن جائیں تو میری خدائی میں مچھر کے پر کے برابر بھی اضافہ نہیں ہوگا، اور اگر تمہارے پہلے، تمہارے پچھلے، تمہارے مرد، عورت، چھوٹے، بڑے اور انسان و جن سارے مل کر تم میں سب سے جو زیادہ برا آدمی ہے اس جیسے بن جائیں، تو میری خدائی میں مچھر کے پر کے برابر نقصان نہیں ہوگا۔"

بھائی! یہ تمہاری جمہوری گورنمنٹیں تھوڑی ہیں، جو ووٹوں سے بنتی ہوں، وہ تو خدا کی خدائی ہے۔ لہٰذا تمہارے پہلے، پچھلے، مرد، عورت، چھوٹے، بڑے، انسان، جن، سارے کے سارے مل کر جو کچھ کسی کے جی میں آئے وہ مجھ سے مانگنے لگیں اور میں اس کو دینے لگوں تو میرے خزانوں میں مچھر کے پر کے برابر کمی نہیں ہوگی، یہ

خیال مت کرو کہ یہ چیز بہت بڑی ہے، کیا مانگیں گے؟ مادی نعمتیں مانگنی چاہتے ہو تو وہ بھی مانگ لو، معنوی نعمتیں مانگنی چاہتے ہو تو وہ بھی مانگ لو، (لیکن محمود غزنویؒ والی بات کیوں نہ کی جائے) اس سلسلہ میں دو مثالیں عرض کر دیتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی آئے، اور عرض کیا کہ میرے لئے دعا فرما دیجئے یعنی اللہ تعالیٰ میری دعائیں قبول کرلیا کریں کہ میں مستجاب الدعوات بن جاؤں، دوسرے لفظوں میں وہ سارا کچھ سمیٹ کر لے گئے کہ ایک آدھ کیا دعا کروائیں، جب دعا کروانی ہے تو ایسی کروائیں کہ ساری چیزیں آ جائیں۔

محمود غزنویؒ سے لوگوں نے ایاز کے بارے میں شکایت کی تھی کہ آپ ان کو بہت مانتے ہیں، آخر کیوں؟ محمود غزنویؒ نے کہا: اچھا! اس کی وجہ بتائے دیتے ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ اس نے ہیرے، جواہرات بکھیر دیئے اور کہا جو کوئی لوٹنا چاہے، یا لینا چاہے لے لے، جب اذن عام ہوگیا تو سارے اٹھ کر چیزیں لینے لگے، ایاز جہاں کھڑا تھا وہاں کھڑا رہا، محمود غزنویؒ نے اس سے کہا: ایاز! تمہیں بھی اجازت ہے، جو کچھ لینا چاہتے ہو لے لو، انہوں نے بادشاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا: میں نے یہ لے لیا ہے، جب آپ نے خود کہا ہے جو چاہو لے لو، میں نے تو بادشاہ ہی کو لے لیا۔

بھائی! خدا سے جو چاہو گے ملے گا، لیکن اگر خدا سے خود خدا ہی کو مانگ لو تو کیا وہ نہیں ملے گا؟ ضرور ملے گا! اور جس کو خدا ہی مل گیا تو پیچھے کیا رہ گیا؟ تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو تمہارے جی میں ہو، زور، قوت اور یقین کے ساتھ مانگو، جائز مانگو، ناجائز مت مانگو، کوئی پابندی نہیں ہے، ضرور ملے گا، خزانہ عام ہے، اور جب وہ خود کہہ رہے ہیں، انشاءاللہ روکیں گے نہیں۔

میں کہتا ہوں ساری چیزیں مانگ لو، اور ایک چیز مانگنے کی نہ چھوڑ دینا، وہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ سے اس کی رضا مانگ لو، "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ رِضَاکَ." یا

اللہ! میں تجھ سے تیری رضا چاہتا ہوں۔ اور وہ راضی ہوگئے، ان کی رضا مل گئی تو سب کچھ مل گیا، خدا کی قسم! اس کی رضا کے بعد پھر پیچھے کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی اور خدانخواستہ نعوذ باللہ! استغفر اللہ! توبہ! توبہ! اگر اس کی رضا نصیب نہیں ہوئی، پھر اگر تخت سلیمانی بھی دے دیا جائے، تو لغو اور لایعنی ہے، اس کی رضا کے بغیر کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں، تو دوسری چیز مانگنے کی رزق ہے، اور میں نے کہا کہ رزق کا مفہوم بہت وسیع ہے، دنیا اور آخرت کی ساری نعمتیں اس میں سمٹ آتی ہیں، اور ان نعمتوں کا اصل الاصول اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے، اور اللہ کی رضامندی مشروط ہے ایمان اور اہل اللہ کی صحبت اور معیت کے ساتھ، اس لئے اللہ کی رضامندی مانگو تو ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ بھی مانگو کہ:

یا اللہ! اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایمان صحیح نصیب فرما، ایمان کامل نصیب فرما، تقویٰ نصیب فرما، اپنے نیک اور مقبول بندوں کا دنیا اور آخرت میں ساتھ نصیب فرما، اور ان کے نقش قدم پر چلا۔

اللہ والوں کے ساتھ چلو گے تو اللہ تک ضرور پہنچو گے، بھائی جو راستہ جانتا ہو تم اس کے ساتھ ہو لیتے ہو، جب اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہو گے جب وہ پہنچے گا تو تم بھی پہنچ جاؤ گے، اس لئے کہ وہ راستہ جانتا ہے، اور تم جانتے نہیں، جب تم اس کے ساتھ چلے اور وہ تو راستہ جانتا تھا، وہ پہنچ گیا، تو تم بھی ساتھ پہنچ گئے، حالانکہ تم جانتے نہیں تھے۔

اہل اللہ کے ساتھ چلو گے، اللہ والے تو اللہ تک پہنچیں گے، مگر تمہیں بھی ساتھ لے کر کے پہنچیں گے، انشاء اللہ! اور یہی راز ہے: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ. صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ." میں، کہ یا اللہ! ہمیں چلا سیدھی راہ پر یعنی راہ ان کی جن پر تو نے انعام کیا۔ اس میں صرف سیدھی راہ کی دعا نہیں سکھائی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی راہ بتائی ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، جن حضرات پر

اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا، جس راہ پر وہ چلے ہیں ان کی راہ پر چلو گے تو ممکن نہیں جہاں وہ پہنچے ہیں وہاں تم نہ پہنچو۔

میں عرض کر رہا ہوں کہ اصل الاصول اور مقصد المقاصد، غایۃ الغایات آخری اور چوٹی کی چیز ہے اللہ کی رضا اور اسی کو فرمایا: ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ.'' اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے، اسی کو فرمایا ہے: ''يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ.'' اے اطمینان والی جان اپنے رب کی طرف لوٹ جا، ''رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً'' تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، ''فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ.'' میرے بندوں میں داخل ہوجا، میری جنت میں داخل ہوجا، میرے بندے میری رضا کا مورد ہیں اور میری جنت میری رضا کا محل ہے۔

عافیت مانگیے:

اور تیسری چیز عافیت ہے، جس کی نشاندہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، عافیت کا معنی ہے مکروہ اور ناپسندیدہ چیزوں سے حفاظت، جیسے مصیبتیں، بیماریاں، دکھ درد، پریشانیاں اور رنجش وغیرہ یہ ساری چیزیں جو انسان کو ناگوار گزرتی ہیں، ان سے بچالینا اس کو عافیت کہتے ہیں، اور پھر عافیت کی دوصورتیں ہیں۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی کسی تکلیف میں مبتلا ہوگیا ہو اور اللہ سے یہ مانگے کہ یا اللہ! مجھے تکلیف سے نجات عطا فرما۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی تکلیف اور کسی مصیبت کے نازل ہونے سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ سے مانگے کہ یا اللہ! مجھے اس تکلیف سے بچانا اور اس سے حفاظت فرمانا، حدیث میں ہے: ''اَلَا مِنْ مُّبْتَلًى فَاُعَافِيَهُ.'' کیا ہے کوئی مبتلا کہ میں اس کو عافیت دوں، معلوم ہوا کہ جو شخص کسی مصیبت میں، کسی تکلیف، کسی رنج میں مبتلا ہوچکا ہے وہ بھی مایوس نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگے، اللہ تعالیٰ اس کو عافیت

عطا فرمائیں گے، اور اس کے ساتھ جو مصائب ابھی نازل نہیں ہوئے ان سب سے اجمالی طور پر عافیت مانگے، اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لو کہ یا اللہ! میں فلاں فتنے سے تیری پناہ، اور فلاں فلاں مصیبتوں سے تیری پناہ میں آتا ہوں، سب سے اللہ کی پناہ میں آجاؤ، سب سے بڑی دولت اللہ کی رضامندی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عافیت ہے، یہ رضا اور عافیت دو چیزیں جس کو مل گئیں تو سب کچھ مل گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

"سَلُو اللهَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ. فَاِنَّ اَحَدًا لَمْ يُعْطَ بَعْدَ الْيَقِيْنِ خَيْرًا مِّنَ الْعَافِيَةِ." (کنز العمال ج:۲ حدیث:۳۲۰۹)

یعنی اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو! اس لئے کہ ایمان و یقین کے بعد عافیت سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں جس کو آدمی مانگے۔

جن پریشانیوں میں ہم مبتلا ہیں، ان سے بھی اور جن پریشانیوں میں مبتلا ہوسکتے ہیں ان سے بھی، بس انہی معروضات پر ختم کرتا ہوں، آپ حضرات دعا فرمائیں حق تعالیٰ شانہ ہمیں ایمان صحیح نصیب فرمائے، اپنی رضا نصیب فرمائے، ہماری بخشش فرمائے، اس رات میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جو کچھ عطا فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے جو کچھ مانگتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں سب کچھ نصیب فرمائے، آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

۱۲ربیع الاول

اور اس کے تقاضے

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

جلسہ سیرت کے آداب:

آج کل ربیع الاول کے مہینے میں عام طور پر سیرت کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک سراپا خیر و برکت ہے، اس کے لئے کسی زمان و مکان کی تخصیص نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ آدابِ عظمت کو شدت کے ساتھ ملحوظ رکھا جائے، مثلاً:

ا:......سیرتِ طیبہ کو عملاً اپنایا جائے:

سیرت مبارکہ کے تذکرے سے اصل مقصود یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و آداب کا تتبع کیا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو عملاً اپنایا جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم کی پیروی کی جائے، کیونکہ دنیا و آخرت کی تمام سعادتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے وابستہ ہیں۔

۲:.......آپؐ کے کمالات کو اجاگر کیا جائے:

سیرت مبارکہ کے تذکرے میں اصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات اجاگر کئے جائیں، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خشیت وتقویٰ، اخلاص و للّٰہیت اور عبدیت وتعلق مع اللہ کی کیفیت کیا تھی؟ فرائض وعبادات کا کتنا اہتمام تھا؟ دعوت الی اللہ کا کیا جذبہ تھا؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تربیت وتزکیہ کیسے فرماتے تھے؟ دنیا سے زہد و بے رغبتی کا کیا عالم تھا؟ بندوں کے حقوق کی ادائیگی کا کس قدر اہتمام تھا؟ الغرض دین کے تمام شعبے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہی کے مختلف پہلو ہیں۔

۳:.......سیرت کے جلسوں کو منکرات سے پاک رکھا جائے:

سیرت طیبہ کے جلسوں کو ہر قسم کے منکرات سے پاک رکھا جائے۔ مثلاً: غلط سلط روایات و حکایات کا بیان کرنا، بے مقصد چراغاں کرنا، مردوں اور عورتوں کا اختلاط، عورتوں کا سیرت طیبہ کے جلسوں میں تقریریں کرنا، بے ریش اور فاسق لوگوں کا غلط سلط نظمیں پڑھنا، شرکائے جلسہ کا نمازیں قضا کردینا، یہ اور اس قسم کی بیسیوں باتیں ایسی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ناپسندیدہ اور مبغوض ہیں، مگر آج کل ان کا ارتکاب کیا جاتا ہے، جو نیکی برباد، گناہ لازم کا مصداق ہیں۔

۴:.......جعلی اور مصنوعی سوانگ نہ رچائے جائیں:

سیرت کانفرنسوں کے علاوہ آج کل ''جشن میلاد'' یا ''عید میلاد'' کے نام پر بہت سی قباحتوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے، بازاروں اور دکانوں پر چراغاں کیا جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مطہرہ اور بیت اللہ شریف کی شبیہیں بنائی جاتی ہیں، ان پر درود وسلام پڑھا جاتا ہے، اور طواف کئے جاتے ہیں، جلوس نکالے جاتے ہیں، یہ ساری چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت کے نام پر کی جاتی

ہیں، لیکن ذرا بھی غور و تأمل سے کام لیا جائے تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اظہارِ محبت کا صحیح طریقہ نہیں، مثلاً روضۂ مطہرہ کی شبیہ بناکر اس کے ساتھ روضۂ شریف کا سا معاملہ کرنا، اسی طرح بیت اللہ کی شبیہ بناکر اس سے سچ مچ بیت اللہ کا سا برتاؤ کرنا، بہت ہی توہین آمیز اور نازیبا حرکت ہے، کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ روضۂ اطہر اور بیت اللہ کی جو شبیہ بنائی جاتی ہے وہ محض جعلی اور مصنوعی ہے، جسے آج بنایا جاتا ہے اور دوسرے دن توڑ پھوڑ دیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس مصنوعی بناوٹ میں اصل روضۂ اطہر اور بیت اللہ کی کوئی خیر و برکت منتقل نہیں ہوتی، اور خود اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے اس سوانگ میں واقعتاً کسی درجہ کا تقدس نہیں پیدا ہوجاتا، پس جب اس میں اصل کا کوئی تقدس اور کوئی برکت پیدا نہیں ہوتی تو اس کے عبث اور لغو ہونے میں کیا شک ہے؟ اور ایک لغو چیز کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مقدسہ کا اور بیت اللہ شریف کا سا معاملہ کرنا کس قدر ناشائستہ اور توہین آمیز حرکت ہے۔

۴:......۱۲ وفات کو جشن نہ منایا جائے:

۱۲/ربیع الاول کو ''جشنِ میلاد'' اور عید منانا بھی بہت تعجب انگیز چیز ہے، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت میں تو مؤرخین کا اختلاف ہے، بعض ۹/ربیع الاول بتاتے ہیں، بعض ۸/اور بعض نے ۱۲/ربیع الاول مشہور کر رکھی ہے، لیکن اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات ۱۲/ربیع الاول ہے، اگر ۱۲/ربیع الاول کو تاریخ ولادت بھی تسلیم کرلیا جائے تو گویا یہ تاریخ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت بھی ہے اور یہی تاریخ وفات بھی، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن کو جشن عید کا دن بنالینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی محبّ اور عاشق کا کام ہوسکتا ہے؟

صفر کا آخری بدھ:

مسلمانوں کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ صفر کے آخری بدھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری بیماری کا آغاز ہوا تھا، اور ۱۲/ربیع الاول کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی دشمن نے صفر کے آخری بدھ کو ''جشن کا دن'' بنانے کے لئے یہ مشہور کردیا کہ آخری بدھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیماری سے صحت یاب ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل صحت فرمایا تھا، حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم وفات کو جشن کا دن بنانے کے لئے یہ مشہور کردیا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت ہے، حالانکہ محققین کے نزدیک یہ بھی غلط ہے، لیکن دشمن کی سازش کامیاب نکلی، اب مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے آغاز پر مٹھائی تقسیم کرکے خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور ۱۲/ربیع الاول کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جشن منایا جاتا ہے، اور اس کا نام ''جشن عید میلاد'' رکھا گیا ہے، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم وصال کو خوشی کا دن باور کرانا اور اس دن جشن منانا کسی بدترین دشمن کا کام ہوسکتا ہے، جس شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا بھی تعلق و محبت ہو وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرسکتا، لیکن شیطان نے مسلمانوں کو ایسی پٹی پڑھائی کہ یہ اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یوم مرض اور یوم وفات کو خوشی کرتے اور جشن مناتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

اللہ تعالیٰ امت کے حال پر رحم فرمائے۔

حضورؐ کے سفرِ حج کی تفصیلات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

حجۃ الوداع کا سفر:

"عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَثَ بِالْمَدِيْنَةِ تِسْعَ سِنِيْنَ لَمْ يَحُجَّ، ثُمَّ اَذَّنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ فِي الْعَاشِرَةِ، اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَاجٌّ فَقَدِمَ الْمَدِيْنَةَ بَشَرٌ كَثِيْرٌ فَخَرَجْنَا مَعَهُ حَتّٰى اِذَا اَتَيْنَا ذَاالْحُلَيْفَةِ فَوَلَدَتْ اَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ مُحَمَّدَ بْنَ اَبِيْ بَكْرٍ فَاَرْسَلَتْ اِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ اَصْنَعُ؟ قَالَ: اِغْتَسِلِيْ وَاسْتَثْفِرِيْ بِثَوْبٍ وَاَحْرِمِيْ ..... الخ." (مشکوٰۃ ص:۲۲۴)

ترجمہ:..... "حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نو سال تک مدینہ منورہ

میں رہے اور حج نہیں کیا، پھر دسویں سال آپؐ نے حج کا اعلان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج پر تشریف لے جارہے ہیں، پس مدینہ منورہ میں بے شمار لوگ جمع ہوگئے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالحلیفہ تک پہنچے، تو اسماءؓ بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے ہاں محمد بن ابی بکر کی ولادت ہوئی، تو حضرت اسما رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آدمی بھیج کر مسئلہ معلوم کرایا کہ میں اب کیا کروں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو غسل کرلے اور ایک چوڑا کپڑا لے کر اس میں روئی رکھ کر اس کا لنگوٹ پہن لے اور احرام باندھ لے۔''

اس حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کا ابتدائی حصہ نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نو سال مدینہ طیبہ میں رہے اور حج نہیں کیا، دسویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لئے تشریف لے جارہے ہیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان سن کر گرد و پیش کے اور نامعلوم کہاں کہاں کے لوگ جمع ہوگئے، مدینہ طیبہ میں بے شمار مخلوق جمع ہوگئی، ذیقعدہ کے پانچ دن رہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر فرمایا، مدینہ شریف میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں اور ''ذوالحلیفہ'' پہنچے، جو مدینے والوں کی میقات ہے، وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھیں، اور رات بھی وہاں قیام کیا۔

آپؐ کا احرام سے پہلے ازواجِ مطہراتؓ کے پاس جانا:

اس رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فارغ ہوئے، حضرت ابی رافع مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

روایت ہے کہ:

"قَالَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَافَ ذَاتَ یَوْمٍ عَلٰی نِسَائِہٖ یَغْتَسِلُ عِنْدَ ھٰذِہٖ وَعِنْدَ ھٰذِہٖ، قَالَ فَقُلْتُ لَہٗ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَلَا تَجْعَلُہٗ غُسْلًا وَّاحِدًا اٰخِرًا؟ قَالَ: ھٰذَا اَزْکٰی وَاَطْیَبُ وَاَطْھَرُ۔" (مشکوٰۃ ص:۵۰)

ترجمہ:...... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے جاتے تھے، ہر ایک کے پاس غسل کرتے تھے، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایک ہی غسل کرلیتے کافی تھا، فرمایا: نہیں! یہ زیادہ پاکیزہ ہے اور زیادہ نشاط کی چیز ہے۔"

اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نو ازواج مطہرات تھیں، اور نو کے پاس تشریف لے گئے اور نو کی نو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیق سفر تھیں۔

ازواج مطہراتؓ کو نصیحت:

حج ادا کرلینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان سے) ارشاد فرمایا تھا کہ: بس یہ حج کرلیا اور اس کے بعد اپنے گھروں میں چٹائی کی طرح بیٹھ جانا۔

چنانچہ بعض ازواج مطہرات نے اس پر عمل کیا اور بعض ازواج مطہرات آپؐ کے بعد بھی حج کرتی تھیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں، یہ حضرات ان کے ساتھ کسی معتمد آدمی کو کردیتے تھے، جو ان کی نگہداشت کرتا تھا۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

یہ اعلان سن کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج پر تشریف لے جارہے ہیں، مدینے میں بے شمار لوگ جمع ہوگئے، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "ذوالحلیفہ" پہنچے، "ذوالحلیفہ" کو آج کل بیر علی بھی کہتے ہیں اور یہ مدینے والوں کی میقات ہے، اور مدینے سے چھ میل پر ہے، جب کہ مکہ مکرمہ کا چار سو کلومیٹر کا فاصلہ ہے، مدینے والوں کے لئے یہ لمبی میقات رکھی گئی ہے، دوسروں کے لئے نہیں۔

محمد بن ابی بکر کی ولادت:

اللہ کی شان کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "ذوالحلیفہ" پہنچے تو حضرت اسماءؓ بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یہاں بچہ پیدا ہوا، اس حج میں سفر کے دوران محمد ابن ابی بکر پیدا ہوئے، اور یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، اسماءؓ بنت عمیسؓ پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں تھیں، ان کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نکاح کرلیا تھا، اور یہ محمد ابن ابی بکر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گود میں پلے بڑھے، بڑے ہوکر انہیں کے ساتھ رہے، اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں مصر میں ان کو بری طرح شہید کردیا گیا، ان کی والدہ اس وقت زندہ تھیں، پہلے ان کو شہید کیا گیا اور پھر گدھے کی کھال میں لپیٹ کر آگ لگائی گئی تھی، نعوذباللہ! حضرت اسماءؓ بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس کا پتہ چلا تو صدمہ کی وجہ سے ان کی چھاتیوں سے خون نکلنے لگا۔

حیض اور نفاس والی عورت کا احرام:

بہرکیف اسی سفر کے دوران "ذوالحلیفہ" میں حضرت محمد ابن ابی بکرؓ کی ولادت ہوئی، تو حضرت اسماءؓ بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ معلوم کرایا کہ میں اب کیا کروں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تو غسل کرلے اور ایک چوڑا کپڑا لے کرکے، پٹی ذرا چوڑی ہو، اس میں روئی رکھ

کر کے اس کا لنگوٹ پہن لے اور تلبیہ پڑھتی رہے، جب پاک ہوجائے گی تو ارکان حج ادا کرلے گی، باقی ارکان حج تو ادا ہوجائیں گے، صرف بیت اللہ شریف کا طواف رہ جائے گا، اگر خدانخواستہ پہلے پاک نہ ہوئی، تو پاک ہونے تک انتظار کرلینا، بس اور کچھ نہیں، بہرحال جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چلے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری بیداء پر چڑھی، تو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلبیہ پڑھا: "لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ."

آپؐ نے تلبیہ کہاں سے شروع کیا؟

حج کے بیان میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلبیہ کہاں سے پڑھا تھا، اس روایت میں آتا ہے کہ جب آپ کی سواری آپ کو لے کر بیداء پہاڑی پر چڑھی تب آپ نے تلبیہ پڑھا، اور بعض روایات میں آتا ہے کہ جب آپ سواری پر سوار ہوئے، اس وقت تلبیہ پڑھا، اور بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آپؐ نے بیر علی سے احرام باندھا تھا، اب تو وہاں بہت شاندار مسجد بن گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی کچی پکی مسجد ہوگی، تو وہاں آپ نے احرام باندھا تھا، تلبیہ پڑھا تھا، صحیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد سے بھی تلبیہ پڑھا، جب احرام باندھا اور جب سواری پر سوار ہوئے جب بھی تلبیہ پڑھا، اور جب آپؐ کی سواری اونچائی پر چڑھی یعنی بیداء پہاڑی پر چڑھی، اس وقت بھی آپؐ نے تلبیہ پڑھا، اس لئے جس نے جو کچھ دیکھا وہ بیان کردیا، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ کے الفاظ تو یہ تھے، لیکن بعض لوگ کچھ الفاظ زیادہ بھی کررہے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو کچھ نہیں کہا، حنفیہ کے نزدیک افضل ترین یہ ہے کہ یہی الفاظ پڑھے جائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھے تھے، تلبیہ کے الفاظ یہ ہیں:

''لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، اِنَّ الْحَمْدَ، وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَا شَرِیْکَ لَکَ۔''

حج میں تلبیہ کی کثرت:

ایک حدیث میں آتا ہے کہ:

''اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُئِلَ اَیُّ الْحَجِّ اَفْضَلُ؟ قَالَ: اَلْعَجُّ وَالثَّجُّ۔'' (ترمذی ج:۱ ص:۱۰۲)

ترجمہ:...... ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کون سا حج افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حج نام ہے آواز بلند کرنے کا اور خون بہانے کا۔''

یعنی جتنی کثرت سے تلبیہ پڑھا جائے، اتنا ہی اچھا ہے، اور قربانیاں کی جائیں، لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ گپوں میں مشغول ہوجاتے ہیں، تلبیہ کا اہتمام نہیں کرتے، اب میں ویسے ہی کمزور ہوں، دماغ کمزور ہے، زیادہ تلبیہ پڑھ بھی نہیں سکتا، اور اچھے خاصے نوجوان وہ بھی گپوں میں لگ جاتے ہیں، سگریٹ پیتے ہیں اور دوسری چیزیں کرتے ہیں، مذاق کرتے ہیں، اور ماشاٴاللہ! یہ حج کے لئے جارہے ہیں، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے دیکھا تو جہاں تک نظر پہنچتی تھی آدمی ہی آدمی تھے، دائیں جانب بھی، بائیں جانب بھی، پیچھے بھی، اتنا مجمع بڑھ گیا کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کتنے آدمی ہیں؟ اور لطف کی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چار ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ پہنچے تھے، اور نو ذی الحجہ کو عرفات میں گئے تھے، نو ذی الحجہ کو جمعہ کا دن تھا، اور یہ جمعہ کا حج تھا، لیکن اس وقت تک لوگ آتے ہی رہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تعداد کتنی ہوگئی تھی، قریباً

سوا لاکھ آدمی ہوگئے ہوں گے، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تھے، قرآن آپ پر نازل ہوتا تھا، اور آپ قرآن پر عمل کرتے تھے، اور جو کچھ آپ عمل کرتے تھے، ہم لوگ اس کو دیکھ کر، اس کے مطابق عمل کرتے تھے، آگے لمبی حدیث ہے، صحیح مسلم شریف میں یہ حدیث تین صفحے کی ہے، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث کا یہاں تو صرف ایک ٹکڑا نقل کیا ہے۔

جابر ازرک کا قصہ:

حج ہی کا ایک اور قصہ ایک صاحب سے نقل کیا گیا ہے، جابر ازرک غادری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، سواری پر دوسرا سامان بھی ساتھ تھا، میں نے انتظام کرلیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنا ہے، بیچارے یمن سے آئے ہوئے تھے، چنانچہ ایک جگہ پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں نزول اجلال فرمایا، اور آپ کے لئے ایک قبہ یعنی خیمہ تیار کروایا گیا، تیں آدمی آپ کے قبے کا پہرا دے رہے تھے، اور کوئی مجھے قریب نہیں آنے دیتا تھا، میں قریب ہوا تو ایک آدمی نے مجھے دھکا دیا، میں نے کہا کہ تم مجھے دھکا دیتے ہو، تو میں تمہیں دھکا دوں گا، اور تم مجھے مارو گے، تو میں تمہیں ماروں گا، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا ہوں، اور تم مجھے آپؐ کے پاس جانے نہیں دیتے، پتہ ہے میں یمن سے آیا ہوں؟ اور میں یہ چاہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنوں، اور سن کر کے اپنے لوگوں کو پہنچاؤں، تو ایک آدمی ان میں سے کہنے لگا کہ تم ٹھیک کہتے ہو، اس نے معذرت کی اور کہا کہ بھئی یہ ہماری غلطی ہے، ہمیں کسی کو روکنا نہیں چاہئے، بہرحال وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات گزاری، یہاں تک کہ آپ مزدلفہ میں پہنچ گئے، مزدلفہ سے منیٰ پہنچے، منیٰ سے آپ جمرہ عقبیٰ میں پہنچے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد اتنا مجمع ہوگیا کہ ان

میں سے کوئی آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بات کر ہی نہیں سکتا تھا۔

حلق کرانا افضل ہے:

ایک شخص حاضر ہوا، بال کترائے ہوئے تھے، کہنے لگا: یا رسول اللہ! میرے لئے رحمت کی دعا کیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رحم اللہ المحلقین" اللہ تعالیٰ حلق کرنے والوں پر رحم فرمائے، دوسری دفعہ پھر کہا، پھر آپ نے یہی فرمایا، تیسری دفعہ پھر فرمایا، تو یہ جابر ابن ازرک کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس پورے مجمع میں میں نے سوائے حلق والوں کے کسی کو نہیں دیکھا، تمام لوگ حلق کروائے ہوئے تھے۔

آپؐ کے بال:

البتہ یہاں چند باتیں سمجھ لینی چاہئیں، ایک تو یہ کہ ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک ہوتے تھے، کبھی کانوں کی لو تک، کبھی اصلاح کرنے میں دیر ہو جاتی تھی تو نیچے بھی پہنچ جاتے تھے، یعنی کندھوں تک بھی پہنچ جاتے تھے، ورنہ اصل کانوں کی لو تک ہوتے تھے، سوائے حج اور عمرے کے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی حلق نہیں کروایا۔

دوسری بات یہ کہ شریعت نے قصر کی بھی اجازت دی ہے اور حلق کی بھی، اگر اتنے اتنے بال ہوں یعنی ایک پورے کے مطابق بال ہوں تو ان بالوں کو کٹوا سکتا ہے، اور اس سے احرام کھل سکتا ہے، اور اگر بال اس سے بھی کم ہوں تو پھر استرا پھیرانا ضروری ہے۔

اور تیسری بات یہ کہ لوگ حج یا عمرے کے لئے جاتے ہیں، تھوڑے تھوڑے بال کاٹ لیتے ہیں، کچھ ادھر سے، اور کچھ ادھر سے، اور بس، پورے سر کے بال کٹوانے اور منڈوانے سے احتراز کرتے ہیں۔

ایک کرنل صاحب قصہ:

ایک کرنل صاحب عمرے پر گئے ہوئے تھے، میں حرم شریف میں بیٹھا ہوا تھا، ایک صاحب ان کو لائے، کہنے لگے کہ: ان کو سمجھایئے! انہوں نے تھوڑے بال کاٹ لئے ہیں، یعنی معمولی معمولی، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمیشہ کانوں کی لوتک موئے مبارک ہوتے تھے، لیکن حج یا عمرے کے موقع پر استرے کے ساتھ صاف کرواتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: ''رحم اللہ المحلقین'' اللہ کی رحمت ہو حلق کرنے والوں پر، عرض کیا گیا: یارسول اللہ! قصر کروانے والوں کے لئے بھی دعا فرمادیجئے، تین دفعہ یہی فرمایا: ''رحم اللہ المحلقین'' صحابہؓ فرماتے اور مقصرین یارسول اللہ! آپ فرماتے: ''محلقین'' حلق کرانے والوں پر، صحابہ کہتے یارسول اللہ! قصر کرنے والوں کے لئے بھی دعا فرمادیجئے، چوتھی دفعہ فرمایا: ''والمقصرین'' چلو مقصرین پر بھی، یعنی ''رحم اللہ المحلقین'' کے بجائے ''رحم اللہ المقصرین'' فرمایا، تو وہ کرنل صاحب آئے، اور انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ بھی پاکستان ہے، میں نے ان کو سمجھایا کہ نہیں بھائی! حلق کرالینا افضل ہے، بہت متانت کے ساتھ کہا کہ حلق کروالینا افضل ہے، دیکھونا ہم کتنی مسافت طے کرکے آئے ہیں، اللہ کے گھر پر آئے ہیں، تو یہ معمولی چیز ہے؟ یہ گھر کی کھیتی ہے، یہ پھر ہوجائے گی، تو وہ مجھے کہنے لگے کہ: ''اسلام میں اتنی تنگی نہیں ہے۔''

یہ شیطان نے ہمیں تلقین کردی ہے کہ اسلام میں تنگی نہیں ہے، جو بھی کرو، بس اسلام میں تنگی نہیں ہے، اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں بھی مزاج کا تیز ہوں، میں نے کہا مرزا غالب کا شعر ہے:

ہاں! ہاں! نہیں وفا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی!
جس کو ہو جان و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟

میں نے کرنل صاحب سے کہا آپ کو کس نے کہا تھا کہ یہاں تشریف لائیں؟ کس نے دعوت دی تھی آپ کو؟ چپ کرکے چلا گیا۔

صحابہؓ کا علوم نبوت میں حرص:

اس معاملے میں لوگ بہت گھپلا کرتے ہیں، اللہ کے بندو! تم اتنا روپیہ خرچ کرکے جاتے ہو، اتنا سفر کرکے جاتے ہو، اور جاکر کے وہاں صرف گپیں رہ گئی ہیں، تبدیلی کوئی نہیں آئی، جیسے تھے ویسے ہی آئے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جہاد پر جاتے تھے تو پیچھے اپنے آدمیوں کو کہہ جاتے تھے، یعنی اپنے حلقے کے دو تین آدمیوں کو تلقین کر جاتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہماری غیر موجودگی میں جو باتیں ارشاد فرمائیں گے، ان کو اچھی طرح محفوظ کر رکھو اور ہمارے واپس آنے کے بعد ان کو ہم سے بیان کرو۔

اصحابِ صفہ اور تعلیم قرآن کا شوق:

اصحاب صفہ میں ستر آدمی تھے، تعداد ان کی کبھی زیادہ ہوجاتی تھی، کبھی کم ہوجاتی تھی، اس وقت ستر آدمی تھے، رات کا وقت ہوتا تو ایک ایک آدمی کے پاس جاکر وہ قرآن مجید پڑھا کرتے تھے، اور بعض تو ساری رات ہی لگے رہتے تھے، پھر ان میں سے دن کو کچھ لوگ لکڑیاں اکٹھی کرکے لاتے، اور ان کو بیچ کر اپنی روٹی چلاتے، کچھ زیادہ ہمت والے تھے، تو بکری ذبح کر لیتے، اور اس کے ٹکڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر بھی لٹکا دیتے، ان میں سے کچھ میٹھا پانی لینے کے لئے جاتے، اور انہی اصحابِ صفہ میں سے حضرت خبیبؓ بھی تھے، جنہیں کفار نے پکڑ لیا تھا، اور مکہ مکرمہ میں ان کو شہید کیا تھا، سولی پر چڑھایا تھا۔

صحیح بخاری میں تفصیل سے پورا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، حضرت خبیبؓ نے شہادت سے پہلے یہ اشعار پڑھے تھے:

مَا اِنَّ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا

عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ لِلّٰہِ مَصْرَعِیْ

وَذَالِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَّشَأْ
یُبَارِکْ عَلٰی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعٖ
(صحیح بخاری ج:۲ ص:۵۸۶)

ترجمہ:......''مجھے پروا نہیں ہے جب کہ مجھے مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کیا جائے، کہ میں کس کروٹ پر گرتا ہوں۔

یہ محض اللہ کی خاطر ہے، وہ اگر چاہے تو بوسیدہ ہڈیوں میں بھی برکت ڈال سکتا ہے۔''

یہ ان کی کرامت ظاہر ہوئی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کو ان پر بھیج دیا، اور کافران کی لاش کی بے حرمتی نہیں کر سکے، ان کا بڑا لمبا واقعہ ہے۔

ستر قراً کی شہادت کا سانحہ:

صحیح بخاری کی روایت میں ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور دھوکا دہی کے طور پر کہنے لگے کہ ہمارے ساتھ کچھ آدمی بھیجئے، جو ہمیں کتاب وسنت کی تعلیم دیں، مقصد دھوکا دینا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ ستر آدمی کر دیئے، ان کو قراً کہا جاتا تھا، اور آگے جا کر کے انہوں نے، ان تمام صحابہ کو شہید کر دیا، ایک آدمی بھی نہیں بچا، صحابہ کرامؓ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اب ہماری خبر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تو کوئی پہنچانے والا نہیں ہے، آپ ہی ہماری خبر ان کو پہنچا دیجئے، اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کی شہادت کی خبر پہنچا دی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خبر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دی، اور انہیں میں حضرت حرام ابن ملحان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا کا قصہ بھی پیش آیا کہ ایک آدمی پیچھے سے آیا، اس نے آکر ان کو تیر مارا، جو آر پار ہو گیا، اور یہ وہاں گر گئے،

انہوں نے شہادت سے قبل کہا: "فزت ورب الکعبة" رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے شہید ہونے پر جتنا صدمہ ہوا، ہم نے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا صدمہ نہیں دیکھا۔

حضرت عمرؓ اور ان کے ساتھی کا قصہ:

صحیح بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا قیام بھی عوالی میں تھا، یعنی مدینہ کا بالائی حصہ، مدینے سے فاصلے پر کچھ بستیاں تھیں، ان کو عوالی کہا جاتا تھا، وہاں میرا بھی قیام تھا، اور ہم نے باری باندھی ہوئی تھی، ایک دن میں اپنے ساتھی کا کام کرتا تھا، اور ان کے اونٹ وغیرہ چراتا تھا، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اگر کوئی خبر ہوتی تو مجھے بتا دیتے، کوئی حدیث سنی ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، وہ مجھے آکر کے بتاتے، اور دوسرے دن میں جاتا تھا، ان کو بتاتا تھا، ایک دن شام کے وقت وہ میرے ساتھی آئے، اور میرا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا، میں چادر گھسیٹتے ہوئے گھر سے نکلا، اور کہنے لگے بہت بڑا حادثہ پیش آگیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ان دنوں ہمارے یہاں شہرت تھی کہ ملک شام کا حاکم ہرقل مدینے پر چڑھائی کرنا چاہتا ہے، تو میں نے کہا کہ کیا ہرقل نے چڑھائی کردی ہے؟ وہ صاحب کہنے لگے کہ اس سے بھی بڑا واقعہ ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔

حضورؐ کے ایلا کا قصہ:

ایسا ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے، مستورات بے چاری کمزور تو ہوتی ہیں، انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائیں گے، تو تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مانگنا، میں یہ مانگوں گی، فلاں یہ مانگے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظرف تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم تشریف لائے، تمام ازواج مطہرات آپ کے گرد جمع ہوگئیں، اور اپنے مطالبات پیش کردیئے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سال بھر کا خرچ دے دیتے تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام ازواج مطہرات سے الگ بالا خانے میں تشریف لے گئے، ان کو کچھ نہیں کہا، بالکل خاموش بیٹھے رہے، اور لوگوں میں یہ مشہور ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جب میرے ساتھی نے مجھے آکر بتایا تو مجھے اپنی لڑکی پر غصہ آیا، میں گیا وہ بیٹھی رو رہی تھیں، تمام ازواج مطہرات بیٹھی رو رہی تھیں، میں اپنی بیٹی کے پاس گیا، میں نے کہا کہ اب تم کیوں رو رہی ہو؟ یہ تمہارا اپنا کیا دھرا ہے، کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں طلاق دے دی ہے؟ فرمانے لگیں مجھے معلوم نہیں، بہت لمبا قصہ ہے، تین دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بالا خانے پر گئے، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، اور ایک خادم پہرا دے رہا تھا، اور اندر جانے کی اجازت مانگی، جب تین دفعہ لوٹے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اجازت ہوئی فرماتے ہیں: پہلی بات میں نے یہ پوچھی کہ آپؐ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے؟ فرمایا: نہیں تو! عرض کیا: لوگوں میں میں اعلان کردوں؟ فرمایا: کردو! تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہیں سے اعلان کردیا لمبا قصہ ہے۔ بس اسی پر ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مدرسہ کے چار بنیادی اصول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''۲ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ بمطابق ۹ اگست ۱۹۹۴ء
بروز منگل جامعۃ الامام محمد زکریا مہاجر مدنی بریڈفورڈ برطانیہ، میں ظہر کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ کا بیان ہوا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

یاد رہے کہ یہ جامعہ یکم رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء میں قائم ہوئی، یہ صرف طالبات کے لئے رہائشی مدرسہ ہے، یورپ اور امریکہ میں دینی تعلیم کے اعتبار سے لڑکیوں کا یہ پہلا دارالعلوم ہے، اس کے مہتمم و بانی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کے خلیفہ حضرت مولانا یوسف متالا ہیں، اور حضرت شیخ الحدیث کی نسبت سے ہی اس کا نام ''جامعۃ الامام محمد زکریا مہاجر مدنی'' رکھا گیا ہے، اور یہ جامعہ دارالعلوم ہولکمب ہال (بری) کی شاخ ہے۔..................(منظور احمد الحسینی)

مدرسہ کس چیز کا نام ہے؟ مدرسہ کا موضوع کیا ہے؟ اور اس کا مقصد یا اس کی غایت کیا ہونی چاہئے؟ مدرسہ عام طور سے عمارتوں کو کہا جاتا ہے کہ یہ مدرسہ ہے، لیکن مدرسہ صرف تعمیرات یا جگہ کا نام نہیں، بلکہ مدرسہ کے چار ارکان ہیں:

پہلا رکن:

سب سے پہلے جگہ، جہاں تعلیم دی جاتی ہے، جگہ نہ ہو تو کہاں بیٹھ کر تعلیم دیں گے؟ یہ جگہ عام ہے کہ اچھی خاصی بلڈنگ ہو، یا کوئی درخت کا سایہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مسجد نبوی تعمیر فرمائی تھی تو وہاں ایک صفہ (چبوترہ) بنادیا تھا، اور وہی اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ ہے، جگہ ہونی چاہئے، جگہ اچھی بھی ہوسکتی ہے، اور ظاہر کے اعتبار سے کمزور بھی ہوسکتی ہے۔

اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ ''صفہ'' سے شروع ہوا اور دارالعلوم دیوبند جس کی پورے عالم میں شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، وہ انار کے درخت کے نیچے شروع ہوا، اچھی سے اچھی سہولتوں والی جگہ اللہ تعالیٰ عطا فرمائے، الحمدللہ، ورنہ مدرسہ تعمیرات پر موقوف نہیں ہے۔

دوسرا رکن:

مدرسہ کا دوسرا رکن ہے پڑھنے والے طلبہ اور طالبات، حقیقت میں یہی مدرسہ کی جان ہوتی ہے، انہی کے لئے مدرسہ قائم کیا جاتا ہے، انہی کے لئے اساتذہ کو زحمت دی جاتی ہے، انہی کے لئے انتظام کرنے والوں کو انتظامات کرنے پڑتے ہیں، تو اصل روح رواں یہ پڑھنے والے حضرات ہیں، اور باقی یوں سمجھئے کہ سب ان کے خدام ہیں۔

تیسرا رکن:

تیسرا رکن ہے حضرات اساتذہ کرام! جو طالب علموں کو تعلیم و درس دیتے ہیں۔

چوتھا رکن:

اور مدرسہ کا چوتھا رکن ہے مدرسہ کی انتظامیہ، جس میں مدرسہ کے معاونین بھی شامل ہیں، اور بچوں اور بچیوں کے والدین جو اس مدرسہ کو آباد کرنے کے لئے یا اس سے نفع اٹھانے کے لئے اپنے بچوں کو بھیجتے ہیں، وہ سب بھی اس کے رکن ہیں۔

یہ مدرسہ کے چار ارکان ہیں، اور ان چاروں کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کا نام مدرسہ کا معیاری یا غیر معیاری ہونا ہے، اساتذہ کیسے ہیں؟ کتنی اعلیٰ قابلیت کے مالک ہیں؟ کتنے متقی اور پرہیزگار ہیں؟ کتنے شفیق اور ہمدرد ہیں؟ کتنے مخلص اور خدا پرست ہیں؟ کسی مدرسہ کے اساتذہ کی نوعیت جس قسم کی اعلیٰ ہوگی، اتنا مدرسہ اونچا سمجھا جائے گا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ اپنے والد کا ارشاد نقل کرتے تھے کہ ہم نے دارالعلوم دیوبند کا وہ دور دیکھا ہے کہ جب شیخ الحدیث سے لے کر مدرسہ کے چپڑاسی تک سب کے سب صاحب نسبت بزرگ اور ولی اللہ تھے۔ جس مدرسہ کے طلبہ، اس کے اساتذہ، حتیٰ کہ چپڑاسی تک صاحب نسبت ولی ہوں، اس مدرسہ کے کیا کہنے! ماشاء اللہ! اساتذہ کا اخلاق اور تدین، ان کا تقویٰ اور طہارت اور ان کا تعلق مع اللہ مدرسہ کو بہت اونچا لے جاتا ہے، اور جتنی اس میں کمی آتی جائے گی، اتنی مدرسہ میں کمی آتی جاتی ہے۔ عمارتیں موجود ہوتی ہیں، طالب علموں کی بھی فراوانی ہوتی ہے، سہولتوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہوتی، لیکن مدرسہ کے اندر وہ کشش اور وہ مقبولیت من جانب اللہ نہیں ہوتی، جب تک اساتذہ کا (روحانی طور پر) اتنا اونچا معیار نہ ہو، جہاں تک طالب علموں کا تعلق ہے، ان میں بھی یہی بات ہے، ایک مدرسہ کے طالب علم کس قدر محنتی ہیں؟ کتنے ذہین ہیں؟ اور اپنے مقصد سے کتنی لگن رکھنے والے ہیں؟ اس سے مدرسہ کی کارکردگی سمجھ آتی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ جب مدرسہ کے نتائج سامنے آتے ہیں تو ان میں درجات قائم ہوتے ہیں، یہ اول درجے کے طالب علم ہیں، یہ دوسرے درجے کے طالب علم ہیں، یہ تیسرے درجے کے ہیں، اور پھر یہ کامیاب ہیں اور یہ ناکام ہیں، یہ پاس ہیں اور یہ فیل ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ان کی محنت اور ذہانت پر موقوف ہوتا ہے، تو طالب علم طالب علمی کے دوران جتنی محنت سے کام لے گا، حق تعالیٰ شانہ اس میں اتنی برکت عطا فرمائیں گے۔

میرے شیخ حضرت مولانا خیر محمد صاحب نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ طالب علمی کے زمانے میں طالب علم نہ کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن، یعنی اس کو کسی سے تعلق ہی نہیں، اس کو صرف اپنی کتابوں سے، اپنے درس سے اور اپنے مقرر کردہ فرائض سے تعلق ہوتا ہے اور کسی چیز سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ایک اور چیز: یہ ہے کہ طالب علم میں جس قدر اساتذہ کا احترام، علم کا ادب، اہل علم کا ادب، تقویٰ اور طہارت پائی جائے گی، مستقبل میں حق تعالیٰ شانہ اس کو اتنے زیادہ نوازیں گے، یعنی فوری کامیابی: کہ یہ اول نمبر آیا، یہ دوم نمبر آیا ہے، یہ تو موقوف ہے محنت اور مجاہدے پر یا ذہانت پر، لیکن مستقبل میں اس کے علم کا نافع ہونا یا غیر نافع ہونا، امت کے لئے مفید ہونا یا غیر مفید ہونا، یہ موقوف ہے اس کی ان صلاحیتوں پر جن کو باطنی صلاحیتیں کہا جاتا ہے، یعنی تقویٰ، طہارت، تعلق مع اللہ اور ادب۔

ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں طالب علم فارغ ہوتے ہیں، خصوصاً ہمارے پاکستان میں سالانہ فارغ ہونے والوں کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ ہوگی مگر جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

”عَنِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّمَا النَّاسُ كَاِبِلٍ مِائَةٍ، لَا تَجِدُ فِيْهَا

رَاحِلَةً. اَوْ قَالَ: لَا تَجِدُ فِيْهَا اِلَّا رَاحِلَةً."

(ترمذی ج:۲ ص:۱۱۰)

یعنی انسانوں کی مثال ایسی ہے جیسے سو اونٹوں کی قطار کہ اس میں سواری کے قابل صرف ایک ملے گا اور اب تو یہ شرح اور بھی نیچے گر گئی ہے، ہزار میں سے ایک نہیں ملے گا، پھر علم کی خاصیت یہ ہے کہ اگر یہ صالح ہو تو نفع دیتا ہے، اور اگر یہ صالح نہ ہو تو یہ نہیں کہ چلو بے فائدہ گیا، نہیں! بلکہ فساد کا موجب بنتا ہے، علم نافع نہ ہو تو مضر ہے، اور علم کے نافع ہونے کے لئے یہ شرطیں جو میں نے عرض کیں یعنی تقویٰ اور ادب، یہ مختصر تعبیر عرض کر رہا ہوں، حق تعالیٰ شانہ آپ کے اس جامعہ کو اور اس مدرسہ کو علم نافع کا مرکز بنائے اور یہاں پڑھنے والی تمام بچیوں کو حق تعالیٰ شانہ علم کی دولت اور علم کے زیور سے آراستہ فرمائے کہ ان کے وجود سے امت کو اور آنے والی نسلوں کو نفع عطا فرمائے۔

مدرسہ کا موضوع:

اب دوسری بات کہ مدرسہ کا موضوع کیا ہے؟ اس کے لئے کسی زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں ہے، مدرسہ کا موضوع ہے: "طالب علموں کی تربیت۔" ہماری مادر علمی دارالعلوم دیوبند، دوسرے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں لیکن انگریز جانتا تھا کہ یہ انسانوں کی تربیت گاہ ہے، ہمارے پنجاب میں ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا، مدرسہ رشیدیہ، (اور اس کے اعداد و شمار بتلاؤں تو لمبی بات ہو جائے گی) کبھی کسی کی نظر میں جچتا نہیں ہوگا کہ قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ان کے خلیفہ حافظ محمد صالحؒ نے یہ مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ ایک چھوٹی سی اور معمولی سی بستی میں قائم تھا، پندرہ پندرہ میل تک طالب علم روٹیاں مانگ کر کے لاتے تھے، میرے استاذ محترم جن سے میں نے قرآن مجید پڑھا، وہ وہاں کے پڑھے ہوئے تھے، وہ وہاں کے عجیب و غریب قصے بیان کیا

کرتے تھے، خیر برطانیہ کی ایک جماعت آئی اور انہوں نے اس مدرسہ کا معائنہ کیا، اور وہاں جاکر واپسی میں رپورٹ درج کی کہ ہم نے چھوٹے سے ایک گاؤں میں مسلمانوں کا ایک مدرسہ دیکھا ہے جس میں اسلام کے پہلوان تیار کئے جاتے ہیں، اور اس قسم کے مدارس اگر پھیل گئے تو مسلمانوں کو اسلام سے کوئی طاقت برگشتہ نہیں کرسکتی۔

یہ ہمارے دینی مدارس، ان کے نام چاہے جو کچھ بھی ہوں، حقیقت میں یہ تربیت گاہیں ہیں، جہاں اسلام کے سپاہی تیار کئے جاتے ہیں، ابن ماجہ میں حدیث ہے:

"لَا يَزَالُ اللّٰهُ يَغْرُسُ فِيْ هٰذَا الدِّيْنِ غَرْسًا يَسْتَعْمِلُهُمْ فِيْ طَاعَتِهٖ" (ابن ماجہ ص:۳)

یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس دین میں پودے لگاتے رہیں گے۔ باغوں میں یہ ہوتا ہے کہ پرانے درخت اکھڑتے رہتے ہیں اور نئے نئے پودے لگتے رہتے ہیں، حق تعالیٰ شانہ ہمیشہ اس گلشن دین میں پودے لگاتے رہیں گے، جن کو اپنی طاعت میں استعمال فرمائیں گے، ان سے کام لیں گے، "یَسْتَعْمِلُهُمْ" کے معنی ہیں ان سے کام لیں گے اپنی اطاعت کا اور اپنے دین کا۔

تو یہ دینی مدارس حقیقت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باغ ہیں اور یہ جتنے طلبہ یا طالبات زیر تعلیم ہیں، حقیقت میں یہ پنیری لگائی جارہی ہے، کل انشاء اللہ یہ بارآور درخت بنیں گے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی امت ان کے پھلوں سے سیراب ہوگی اور کتنی کتنی امت ان کے سایہ میں پناہ لے گی، تو یہ مدرسہ کا موضوع ہے، یعنی دین محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے لئے انسان سازی کا کام، یعنی انسانوں کو تیار کرنا، اسی جذبے اور اسی مشن کے تحت اگر یہ دونوں فریق یعنی اساتذہ بھی اور طلبہ بھی محنت کریں گے تو انشاء اللہ یہ محنت بارآور ہوگی۔

مدارس کا مقصد:

اور اب تیسری بات کہ مدارس کے قیام کا ''مقصد'' کیا ہے؟ تو اس مقصد کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا ہے: "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ." (بے شک ہم نے الذکر یعنی قرآن کریم کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔

ہمارے شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، صرف قرآن مجید کی حفاظت ہی نہیں بلکہ دین محمدی کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب قیامت تک محفوظ رہے گی۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کا کام انسانوں ہی سے لیں گے، کرنے والے تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں، لیکن اس دارالاسباب میں اللہ تعالیٰ حفاظت ونگہبانی کا کام بھی اپنے بندوں ہی سے لیں گے، اور میں نے ابن ماجہ کی حدیث ابھی بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ پودے لگاتے رہتے ہیں۔

تو مدارس کے قیام کا مقصد ہے دین قیم کی پاسبانی اور اس کی حفاظت، جہاں اللہ تعالیٰ نے ''الذکر'' کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے وہاں اس کے ضمن میں وہ تمام شعبے جو قرآن کریم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور دین سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی حفاظت کا بھی وعدہ فرمالیا ہے۔ گویا علم قرأۃ کی حفاظت بھی ہوگی، علم حدیث کی بھی حفاظت ہوگی، علم فقہ کی بھی حفاظت ہوگی، علم کلام کی بھی حفاظت ہوگی اور ساتھ کے ساتھ جتنے ان شعبوں میں کام کرنے والے افراد ہیں ان کی بھی حفاظت ہوگی، آپ حضرات کی حفاظت ونگہبانی بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔

تو ان مدارس دینیہ کا مقصد دین قیم کی حفاظت و پاسبانی ہے، اب یہ بھی

ایک مستقل شرح طلب چیز ہے کہ یہ پاسبانی کیسے ہوگی؟ خلاصہ یہ کہ علم بھی محفوظ رکھا جائے، اس کا عمل بھی محفوظ رکھا جائے، اس کی دعوت بھی جاری رہے اور لوگوں کو اس دین پر لانا بھی مقصود ہو، اور جس طرح جھاڑ جھنکار کھیت یا باغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور ان جھاڑیوں کی صفائی کرکے کھیت کی حفاظت کی جاتی ہے، اسی طرح اگر گلشن دین میں رسم و رواج یا بدعات کی جھاڑیاں پیدا ہوجائیں تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ ان کا قلع قمع کرکے دین کے صاف چہرہ کو امت کے سامنے پیش کریں۔

یا بعض دفعہ درخت کی شاخیں بھی زیادہ لمبی ہوجاتی ہیں، ان کی کانٹ چھانٹ بھی ہوتی رہتی ہے تو جتنی بدعات دین میں جنم لیتی رہیں ان کی چھٹائی بھی ہوتی رہے، ان کی کانٹ چھانٹ بھی ہوتی رہے، ان ہمارے دینی مدارس کا ایک موضوع دنیا کے اعتبار سے خالص دین قیم کی پاسبانی ہے اور بس۔ خود دین پر عمل کرنا اور لوگوں کو دین کی دعوت دینا اور اس پر چلنے والوں کے لئے دین قیم کو صاف ستھرا کرکے پیش کرنا کہ اس میں کسی قسم کی کوئی کمی یا زیادتی نہ ہو، الحمدللہ! اس حفاظت کی برکت سے ہمارا دین آج بھی اسی طرح محفوظ ہے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے اندر محفوظ تھا، آج یہ شرف حق تعالیٰ شانہ نے اس دین کو عطا فرمایا ہے اور حضرات علمأ دین جن کو ورثۃ الانبیأ فرمایا ہے ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام لیا ہے۔

بہت ہی بڑی خوش قسمتی اور سعادت ہے ان لوگوں کی جن کو اللہ تعالیٰ کی اس فوج میں شامل اور بھرتی کرایا جائے۔

مدارس کی غرضِ اصلی:

اب آخری مقصد جو ہے وہ حق تعالیٰ شانہ کی رضا ہے، ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ علمأ کے قلم کی روشنائی قیامت کے دن شہیدوں کے خون کے برابر تولی

جائے گی، ان کا مرتبہ کوئی کم نہیں ہے، شہید کا بہت بڑا مرتبہ ہے، شہیدوں کے بڑے عالی مقامات ہیں، لیکن جن لوگوں نے اس دین کے تعلیم و تعلّم، اس کے سیکھنے سکھانے، اس پر چلنے اور چلانے میں زندگیاں خرچ کیں، انشاءاللہ حق تعالیٰ شانہ کے نزدیک ان کا مرتبہ بھی کچھ کم نہیں ہے، یہ ورثۃ الانبیاءؑ بھی انشاءاللہ انبیاءؑ کرام کے پیچھے پیچھے ہوں گے، اور یہ مرتبہ اس صورت میں حاصل ہوسکتا ہے (جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں) جبکہ خالص اللہ کی رضا مقصود ہو، نام و نمود درمیان میں نہ ہو، کوئی مادی منفعت درمیان میں نہ ہو، کوئی شہرت درمیان میں نہ ہو، بلکہ محض اور محض اللہ کی رضا کے لئے اس کام کو کیا جائے۔

حضرت مولانا بدرعالم میرٹھیؒ نے ''ترجمان السنۃ'' میں شرح مواہب سے ابونعیم کی معرفۃ الصحابۃ کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازدی وفد کی گفتگو پر فرمایا:

''حُكَمَاءُ عُلَمَاءُ كَادُوْا مِنْ فِقْهِهِمْ اَنْ يَّكُوْنُوْا اَنْبِيَاءَ.'' (ترجمان السنہ ج:۱۰ ص:۱۵۵۸ البدایہ والنہایہ ج:۵ ص:۴۹ اتحاف سادۃ المتقین ج:۹ ص:۶۴۹)

اتنے حکیم اور فقیہ لوگ ہیں کہ قریب تھا کہ اپنی فقہ کی وجہ سے نبی بن جائیں۔ یعنی اس امت کے حضرات حکماءؑ اور فقہاءؑ حضرات انبیاءؑ کرام علیہم السلام کے مشابہ ہیں، ان کے نقش قدم پر ہیں اور یہ اتنی بڑی فضیلت ہے کہ جس کی کوئی مثال نہیں کیونکہ سب سے عالی مرتبت اور سب سے عالی منصب اس کائنات میں منصب نبوت ہے، جو حضرات ان کے سب سے زیادہ قریب ہوں گے وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اتنے ہی عالی قدر ہوں گے۔

آپ سب کا مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی بارگاہ عالی میں قبولیت ہوجائے، یہ مقصد اخلاص سے حاصل ہوگا، پھر یہ بات بھی یاد رہنی چاہئے کہ ایک تعلیم

ہے اور ایک تربیت ہے، دونوں جدا جدا چیزیں ہیں، تعلیم کے معنی تو ہیں ان علوم کو جان لینا اور ان کو سکھا دینا، آپ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں مستشرقین سب سے زیادہ اسلام پر کام کر رہے ہیں، کتابیں لکھ رہے ہیں، چھاپ رہے ہیں، ان کو ایڈٹ کر رہے ہیں، بقول ہمارے مولانا ابوالحسن ندویؒ کے کہ مستشرقین کا گروہ وہ بدقسمت گروہ ہے جنہوں نے علوم نبوت میں ہزاروں غوطے لگائے لیکن ہمیشہ خشک دامن نکلے، شب و روز وہ حدیث پڑھتے ہیں، قرآن کریم پر تحقیق کرتے ہیں، فقہ پر تحقیق کرتے ہیں، اسلامی موضوعات پر تحقیق کرتے ہیں، اور الگ الگ، ایسی ایسی نادر کتابیں ان کے قلم سے سامنے آرہی ہیں کہ عقل حیران ہے، آج تک ہم میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا تھا کہ فلاں لفظ صحیح بخاری میں فلاں جگہ آیا ہے، صحیح مسلم میں فلاں جگہ آیا ہے، نسائی میں فلاں جگہ، ابوداؤد میں فلاں جگہ آیا ہے، مسند احمد میں فلاں جگہ آیا ہے، مستشرقین نے یہ بھی کر دکھایا۔ "**المعجم المفهرس لالفاظ الحديث.**" آٹھ ضخیم جلدوں میں مارکیٹ میں موجود ہے۔

اسی طرح "**المعجم المفهرس لالفاظ القرآن.**" ہے، جس میں بتلایا گیا ہے کہ یہ لفظ قرآن کریم میں کتنی جگہ آیا ہے، کن کن آیتوں میں آیا ہے۔ یہ سب کتابیں ان کی مرتب کردہ ہیں، مگر افسوس کہ اس سب کے باوجود کافر کے کافر ہی رہے، اس لئے کہ انہوں نے علم برائے معلومات حاصل کیا، انہوں نے علم برائے عمل نہیں سیکھا، مسلمانوں اور مستشرقین میں فرق یہ ہے کہ مسلمان علم برائے عمل حاصل کرتا ہے اور اس کا نام تربیت ہے، اور علم کی غرضِ اصلی یہی تربیت ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو علم کے ساتھ ساتھ عمل کی بھی توفیق عطا فرمائے، حضرات اساتذہ کرام سے بھی یہی درخواست ہے کہ وہ طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اللہ کی نعمتوں کا استحضار!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

حافظ ابونعیمؒ نے حلیۃ الاولیاء میں نقل کیا ہے کہ:

"عَنْ جَعْفَرَ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ عَلِیًّا شَیَّعَ جَنَازَةً، فَلَمَّا وُضِعَتْ فِیْ لَحْدِهَا، عَجَّ اَهْلُهَا وَبَکَوْا، فَقَالَ: مَا تَبْکُوْنَ؟ اَمَا وَاللهِ! لَوْ عَایَنُوْا مَا عَایَنَ مَیِّتُهُمْ، لَاَذْهَلَتْهُمْ مُعَایَنَتُهُمْ عَنْ مَیِّتِهِمْ، وَاِنَّ لَهٗ فِیْهِمْ لَعَوْدَةً ثُمَّ عَوْدَةً، حَتّٰی لَا یَبْقٰی مِنْهُمْ (اَحَدًا)، ثُمَّ قَامَ فَقَالَ: اُوْصِیْکُمْ عِبَادَ اللهِ بِتَقْوَی اللهِ الَّذِیْ ضَرَبَ لَکُمُ الْاَمْثَالَ وَوَقَّتَ لَکُمُ الْآجَالَ، وَجَعَلَ لَکُمْ اَسْمَاعًا تَعِیْ مَا عَنَاهَا وَاَبْصَارًا لِتَجْلُوْ عَنْ غِشَاهَا، وَاَفْئِدَةً تَفْهَمُ مَا دَهَاهَا، فِیْ تَرْکِیْبِ صُوَرِهَا، وَمَا اَعْمَرَهَا، فَاِنَّ اللهَ لَمْ یَخْلُقْکُمْ عَبَثًا، وَلَمْ یَضْرِبْ عَنْکُمُ الذِّکْرَ صَفْحًا، بَلْ اَکْرَمَکُمْ بِالنِّعَمِ السَّوَابِغِ، وَاَرْفَدَکُمْ بِاَوْفَرِ الرَّوَافِدِ، وَاَحَاطَ بِکُمْ

الْإِحْصَاءَ، وَأَرْصَدَ لَكُمُ الْجَزَاءَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ، فَاتَّقُوا اللهَ عِبَادَ اللهِ! وَجِدُّوا فِي الطَّلَبِ، وَبَادِرُوا بِالْعَمَلِ مُقَطِّعَ النَّهِمَاتِ، وَهَادِمَ اللَّذَّاتِ، فَإِنَّ الدُّنْيَا لَا يَدُوْمُ نَعِيمُهَا، وَلَا تُؤْمَنُ فَجَائِعُهَا، غُرُوْرٌ حَائِلٌ، وَشَبَحٌ فَائِلٌ، وَسِنَادٌ مَائِلٌ، يَمْضِي مُسْتَطْرِفًا، وَيُرْدِي مُسْتَرْدِفًا بِإِتْعَابِ شَهَوَاتِهَا وَخَتْلِ تَرَاضُعِهَا، اِتَّعِظُوْا عِبَادَ اللهِ بِالْعِبَرِ، وَاعْتَبِرُوْا بِالْآيَاتِ وَالْأَثَرِ، وَازْدَجِرُوْا بِالنُّذُرِ، وَانْتَفِعُوْا بِالْمَوَاعِظِ، فَكَأَنْ قَدْ عَلِقَتْكُمْ مَخَالِبُ الْمَنِيَّةِ، وَضَمَّكُمْ بَيْتُ التُّرَابِ، وَدَهَمَتْكُمْ مُفْظِعَاتُ الْأُمُوْرِ بِنَفْخَةِ الصُّوْرِ، وَبَعْثَرَةِ الْقُبُوْرِ، وَسِيَاقَةِ الْمَحْشَرِ، وَمَوْقِفِ الْحِسَابِ بِإِحَاطَةِ قُدْرَةِ الْجَبَّارِ، كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ يَسُوْقُهَا لِمَحْشَرِهَا، وَشَاهِدٌ يَشْهَدُ عَلَيْهَا بِعَمَلِهَا، (وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا، وَوُضِعَ الْكِتَابُ، وَجِيْٓءَ بِالنَّبِيِّيْنَ وَالشُّهَدَآءِ، وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ) فَارْتَجَّتْ لِذَالِكَ الْيَوْمِ الْبِلَادُ، وَنَادَى الْمُنَادِ، وَكَانَ يَوْمُ التَّلَاقِ، وَكُشِفَ عَنْ سَاقٍ، وَكُسِفَتِ الشَّمْسُ، وَحُشِرَتِ الْوُحُوْشُ مَكَانَ مَوَاطِنِ الْحَشْرِ، وَبَدَتِ الْأَسْرَارُ، وَهَلَكَتِ الْأَشْرَارُ، وَارْتَجَّتِ الْأَفْئِدَةُ، فَنَزَلَتْ بِأَهْلِ النَّارِ مِنَ اللهِ سَطْوَةٌ مَجِيْحَةٌ، وَعُقُوْبَةٌ مُنِيْحَةٌ، وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لَهَا كَلَبٌ وَلَجَبٌ، وَقَصِيْفُ رَعْدٍ، وَتَغَيُّظٌ وَوَعِيْدٌ، تَأَجَّجَ جَحِيْمُهَا، وَغَلٰى حَمِيْمُهَا، وَتَوَقَّدَ سُمُوْمُهَا، فَلَا يُنَفَّسُ خَالِدُهَا، وَلَا تَنْقَطِعُ حَسَرَاتُهَا، وَلَا

يُقْصَمُ كُبُوْلُهَا، مَعَهُمْ مَلَائِكَةٌ يُبَشِّرُوْنَهُمْ بِنُزُلٍ مِنْ حَمِيْمٍ، وَتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ، عَنِ اللّٰهِ مَحْجُوْبُوْنَ، وَلِأَوْلِيَائِهِ مُفَارِقُوْنَ، وَإِلَى النَّارِ مُنْطَلِقُوْنَ، عِبَادَ اللّٰهِ! اِتَّقُوا اللّٰهَ! تَقِيَّةَ مَنْ كَنَعَ فَخَنَعَ، وَوَجِلَ فَرَحِلَ، وَحُذِّرَ فَأَبْصَرَ فَازْدَجَرَ، فَاحْتَثَّ طَلَبًا، وَنَجَا هَرَبًا، وَقَدَّمَ لِلْمَعَادِ، وَاسْتَظْهَرَ بِالزَّادِ، وَكَفٰى بِاللّٰهِ مُنْتَقِمًا وَبَصِيْرًا، وَكَفٰى بِالْكِتَابِ خَصْمًا وَحَجِيْجًا، وَكَفٰى بِالْجَنَّةِ ثَوَابًا، وَكَفٰى بِالنَّارِ وَبَالًا وَعِقَابًا، وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ۔" (حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۷۷)

ترجمہ:...... "حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک جنازے کے ساتھ اس کو رخصت کرنے کے لئے تشریف لے گئے، جب میت کو اس کی لحد میں رکھا گیا تو اس کے متعلقین اہل و عیال چلانے اور رونے لگے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ارشاد فرمایا: روتے کیوں ہو؟ اللہ کی قسم! یہ لوگ اگر دیکھ لیتے اس چیز کو جس کا معائنہ ان کی میت نے کرلیا ہے، تو ان کا معائنہ ان کو ان کی مجلس سے غافل کردیتا، اور بے شک اس کے لئے، یعنی موت کے لئے ان میں لوٹنا ہے، یعنی بار بار لوٹنا ہے، یہاں تک کہ ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا۔ پھر آپؓ خطبے کے لئے کھڑے ہوئے، اس میں ارشاد فرمایا: اے اللہ کے بندو! میں تم کو وصیت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے کی، وہ اللہ جس نے تمہارے لئے مثالیں بیان کی ہیں، تمہارے لئے میعادیں مقرر کردی ہیں، تمہارے لئے کان رکھے ہیں، تم کو کان عطا فرمائے ہیں، جو سنتے ہیں ان چیزوں کو جو ان کو مشقت پیش آنے والی

ہے، اور تمہیں آنکھیں دی ہیں، تاکہ وہ اپنے پردے کو ہٹا کر دیکھے، اور دل دیئے ہیں جو ان حوادث کو جو پیش آنے والے ہیں، سمجھیں، یہ کان، آنکھیں اور دل ایسی صورتوں میں، ایسی ترکیب میں اللہ نے رکھے ہیں جن کی صورت اللہ تعالیٰ نے خود بنائی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے تم کو بیکار پیدا نہیں کیا، اور نصیحت کو تم سے ہٹایا نہیں، بلکہ تم کو عزت دی ہے کامل نعمتوں کے ساتھ، اور تمہاری مدد فرمائی ہے، تمہاری پوری پوری حاجتوں کے ساتھ، اور جو کچھ تم کرتے ہو، تمہارا پوری طرح احاطہ کرلیا ہے، اور تمہارے لئے جزا تیار کر رکھی ہے، خوشی میں بھی اور تکلیف میں بھی، بس اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو، تلاش کرنے میں کوشش کرو، خواہشوں کی قطع کرنے والی چیزوں اور لذتوں کے گرادینے والی چیز کے آنے سے پہلے پہلے عمل کی طرف سبقت کرو، اس لئے کہ دنیا ایسی چیز ہے کہ اس کی نعمتیں ہمیشہ نہیں رہتیں، اور اس کے دردناک حوادث سے کبھی آدمی بے خوف نہیں ہوسکتا، یہ ایک دھوکہ ہے جو درمیان میں آگیا ہے، اور یہ ایک سایہ ہے جو بہت کمزور ہے، اور یہ ایک سہارا ہے جو جھکا چاہتا ہے، اور گرا چاہتا ہے، تیزی سے گزر جاتا ہے، اور آدمی کو ہلاک کر کے چلی جاتی ہے، اپنے پیچھے شہوتوں کی تھکن کو چھوڑ جاتی ہے، اس لئے اللہ کے بندو! عبرتوں کے ساتھ نصیحت حاصل کرو، آیات اور آثار کے ساتھ عبرت لو، ڈرانے والی چیزوں کو سن کر ڈر جاؤ، اور نصیحت کی ہوئی باتوں سے نفع اٹھاؤ، مجھے یوں لگ رہا ہے کہ گویا موت نے اپنے پنجے تم میں گاڑ دیئے ہیں، اور مٹی کے گھر نے تم

کو سمیٹ لیا ہے، اور پریشان کرنے والے احوال تمہارے سامنے آگئے ہیں، صور پھونکا جارہا ہے، قبریں اکھڑی جارہی ہیں، محشر کی طرف کشاں کشاں لے جایا جارہا ہے، حساب کے لئے تمہیں کھڑا کیا جارہا ہے، یہ قدرت جبار کا احاطہ ہے، ہر نفس اس طرح آرہا ہے کہ ایک اس کے ساتھ ہانکنے والا ہے، جو اس کو محشر کی طرف ہانک رہا ہے، اور ایک گواہ ہے جو اس پر گواہی دے رہا ہے اس کے عمل کی، (زمین چمک اٹھی اپنے رب کے نور سے اعمال نامے سامنے رکھ دیئے گئے، نبیوں کو لایا گیا، شہیدوں کو لایا گیا، گواہوں کو لایا گیا اور لوگوں کے درمیان انصاف کا فیصلہ کردیا جائے گا اور ان پر ذرا ظلم نہیں ہوگا)، اس کی وجہ سے شہر کانپ گئے اور ایک منادی نے آواز دی کہ آج ملاقات کا دن ہے، پنڈلی کھول دی گئی، سورج بے نور ہوگیا، وحشی جانور تک جمع کردیئے گئے حشر کی جگہوں میں، اور بھید دل کے خفیہ بھید کھل گئے، حشرات ہلاک ہوگئے، دل کانپ اٹھے اور اہل نار کو اللہ کی جانب سے ہلاک کرنے والی پکڑ اور چیخیں نکالنے والی سزا نازل ہوگئی، دوزخ ظاہر ہوگئی جس کی کنڈیاں ہیں، جس کے لئے شور ہیں اور جو اس طرح کڑکڑاتی ہے جس طرح بادل کڑکڑایا کرتے ہیں، وہ غیظ وغضب میں ہے، وعید میں ہے، اس کی آگ بھڑک رہی ہے، اس کا گرم پانی جوش مار رہا ہے، اور اس کی سموم یعنی گرم ہوا چلا رہی ہے، اس میں رہنے والوں کو سانس لینا مشکل ہوگا اور اس کی حسرتیں اور واویلا کبھی ختم نہیں ہوگا، اس کے منہ کو جو اگادی گئی ہے، اس کو کوئی توڑے گا نہیں،

ان کے ساتھ فرشتے ہوں گے جو ان کو کھولتے ہوئے پانی کی اور جہنم میں داخل ہونے کی خوشخبری دے رہے ہوں گے، یہ لوگ اللہ سے محجوب ہوں گے، اولیأ اللہ سے جدا ہوں گے، دوزخ کی طرف لئے جا رہے ہوں گے، اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو! اس طرح ڈرنا جو بہت ہی کمزور اور بہت ہی عاجز ہوگیا ہو، جو کپکپاتا اور کپکپاتے ہوئے چل پڑا ہو، اور جو ڈر گیا اس نے دیکھا ہو ڈرنے کی وجہ سے وہ خوف ناک چیزوں سے رک گیا ہو، پس اچھی چیز کی طلب میں تیز بھاگ رہا ہو، اور شر سے بچنے کے لئے نجات حاصل کرنے کے لئے دوڑ لگا رہا ہو، اس نے معاد کے لئے توشہ آگے بھیج دیا اور اس توشہ کے ذریعہ سے (نیکیوں کے توشے کے ذریعہ سے) قوت حاصل کرلی، دیکھو اللہ تعالیٰ منتقم اور بصیر ہونے کے لئے کافی ہے، اور تمہارا نامہ عمل تم سے لڑنے کے لئے اور دشمنی کرنے کے لئے بہت ہے، جنت ثواب کے لئے کافی ہے، دوزخ وبال اور عتاب کے لئے کافی ہے، اور میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں اپنے لئے اور تمہارے لئے۔"

تین مضامین:

یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طویل خطبہ ہے، اور اس میں تین مضمون بیان فرمائے ہیں، ایک حشر کا، دوسرا قبر کا، اور تیسرا میدان محشر کا۔ حضرت امام جعفرؒ صاحبزادے ہیں حضرت امام باقرؒ کے، اور وہ صاحبزادے ہیں حضرت امام علی زین العابدینؒ کے، اور وہ صاحبزادے ہیں حضرت امام حسینؓ کے، اور وہ حضرت علیؓ کے صاحبزادے ہیں، یہاں روایت جعفر بن محمدؒ کی ہے، یہ امام جعفر صادقؒ جن کی طرف

منسوب کر کے شیعہ اپنے آپ کو جعفریہ کہلاتے ہیں، تو یہ امام جعفرؒ کی روایت ہے اپنے والد سے، یعنی امام محمد سے، اور وہ روایت کرتے ہیں اپنے دادا سے، آگے پھر سند نہیں ہے، یعنی امام علی زین العابدینؒ تک یہ سلسلۂ سند پہنچا، غالباً انہوں نے اپنے والد ماجد سے سنا ہوگا۔

اگر یہ لوگ برزخ کا مشاہدہ کر لیتے؟

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دفعہ ایک جنازے میں تدفین کے لئے گئے، تو میت پر جب مٹی ڈالنے لگے تو جو ان کے اہل وعیال تھے وہ چلانے لگے، جیسے کہ جب جنازہ گھر سے نکالا جاتا ہے تو اس وقت کہرام مچ جاتا ہے، اب تک کم سے کم لاش آنکھوں کے سامنے تھی، جب مٹی ڈالنے لگے، قبر کو بند کرنے لگے تو لاش بھی غائب ہوگئی، اس وقت پھر کہرام مچا ہوگا، تو اس موقع پر حضرت امیر المؤمنینؓ نے فرمایا کہ: میاں! روتے کیوں ہو؟ چلاتے کیوں ہو؟ یہ رونا اور چلانا کیسا، ان کی میت نے یعنی ان کے مردے نے جس چیز کا مشاہدہ کیا ہے، یعنی عالم برزخ کا، اگر یہ لوگ اس چیز کا مشاہدہ کر لیتے تو پھر ان کو مردہ بھول جاتا، اپنی فکر پڑ جاتی اور وہ قصہ ویسا ہی ہو جاتا جس طرح کہ لطیفہ مشہور ہے۔

موت کا ڈر، ایک واقعہ:

ایک خاتون کی لڑکی بیمار تھی، وہ اس کے سرہانے بیٹھی دعائیں کر رہی تھی، یا اللہ! اس کو شفا دے دے، یا اس کی جگہ مجھے ہی موت آجائے، اتنے میں گھر میں کوئی کتا آیا، اس نے کسی ہنڈیا میں منہ ڈالا، منہ تو اس نے گھسالیا، لیکن پھر نکلا نہیں، اسی ہنڈیا سمیت وہ بھاگ رہا تھا، وہ ادھر کو نکلا تو اس نے سمجھا کہ یہی عزرائیل ہیں، تو اسی طرح اس کو دیکھ کر وہ خاتون کہتی ہے کہ: عزرائیل میاں! وہ بیمار لڑکی ادھر پڑی ہے، یعنی میری طرف نہ آئے۔ واقعی جب آدمی کی اپنی جان پر بنتی ہے، پھر دوسرا یاد نہیں رہتا۔

قبر کا نقشہ دیکھتے تو مردہ بھول جاتے:

امیر المؤمنینؓ فرماتے ہیں کہ قیامت کی ہولناکیاں اور قبر کے نقشے ان کے سامنے آجاتے تو ان کو اپنا مردہ بھول جاتا، اور پھر فرماتے ہیں کہ یہ موت تو بار بار تمہارے گھر کا پہرہ دے گی، بار بار آئے گی، یہاں تک کہ ایک آدمی کو بھی نہیں چھوڑے گی، جتنے گھر میں آدمی ہیں موت سب کو ایک ایک کر کے لے کر جائے گی۔

مثالیں اور میعادیں:

یہ تو وہاں ارشاد فرمایا، اس کے بعد واپس ہوئے تو حضرت امیر المؤمنینؓ نے خطبہ دیا، اور وہ بڑا طویل خطبہ ہے، فرمایا کہ دیکھو میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے کی، جس اللہ نے تمہارے لئے مثالیں بیان کردی ہیں، نیک لوگوں کی مثالیں بھی بیان کردی ہیں، اور برے لوگوں کی بھی۔ فرعون کی بھی مثال بیان کردی، موسیٰ علیہ السلام کی بھی مثال بیان کردی، اشرار کی بھی، ابرار کی بھی، ہر ایک کی مثال بیان کردی، سخاوت کرنے والوں کی بھی مثال بیان کردی، بخیلوں کی بھی مثال بیان کردی، ماں باپ کے نافرمان کی بھی مثال بیان کردی، اور فرمانبرداروں کی بھی مثال بیان کردی، تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کے لئے اللہ نے اپنے پاک کلام میں مثالیں نہ بیان کردی ہوں، اور اسی طرح تمہارے لئے میعادیں بھی مقرر کردی ہیں۔

ہر آدمی کا پروانہ:

ہر ایک آدمی کی قسمت کا پروانہ اور اس کے گنے ہوئے دن، اس کی گردن میں لٹکا کر کے بھیجے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے:

"وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنَاهُ طَآئِرَهُ فِیْ عُنُقِهٖ." (بنی اسرائیل:۱۳)

ترجمہ:...... "ہر ایک کی قسمت کا پروانہ ہم نے اس کی گردن میں

لٹکا دیا ہے۔''

اپنا سبق دہراتا ہوں:

یہ پٹا تمہاری گردن میں پڑا ہوا ہے، تمہیں نظر نہ آئے اور تم نہ پڑھ سکو تو دوسری بات ہے، بھئی! میں اپنا سبق پکایا کرتا ہوں، تم کہو گے کہ وہی پرانی باتیں دہراتا ہے، جیسے حافظ جی سبق دہراتا رہتا ہے، اپنا پارہ پکانے کے لئے، میں بھی اپنی باتیں اپنے ذہن میں پختہ کرنے کے لئے دہراتا رہتا ہوں، تمہارے کام آجائے تو تم بھی اس کو استعمال کرلو، نہ کام آئے تو میرے پاس چھوڑ کر چلے جاؤ، مجھے تو اپنا سبق پکانا ہے، آپ کو نصیحت نہیں کرنی، استاد کے سامنے طالب علم آموختہ دہراتا ہے، پکاتا ہے، تو میں تو اپنا سبق تمہیں سناتا رہتا ہوں تاکہ میں بھول نہ جاؤں۔

حضرت ام حبیبہؓ کی دعا:

میں نے آپ حضرات کو حدیث شریف سنائی تھی کہ ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دعا کر رہی تھیں:

''اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنِیْ بَزَوْجِیْ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَبِاَبِیْ اَبِیْ سُفْیَانَ وَبِاَخِیْ مُعَاوِیَةَ. فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّکِ سَأَلْتِ اللهَ لِآجَالٍ مَضْرُوْبَةٍ وَاٰثَارٍ مَوْطُوْئَةٍ وَاَرْزَاقٍ مَقْسُوْمَةٍ لَا یُعَجِّلُ شَیْئًا مِنْهَا قَبْلَ حِلِّهٖ وَلَا یُؤَخِّرُ مِنْهَا شَیْئًا بَعْدَ حِلِّهٖ وَلَوْ سَأَلْتِ اللهَ اَنْ یُّعَافِیَکِ مِنْ عَذَابٍ فِی النَّارِ وَعَذَابٍ فِی الْقَبْرِ لَکَانَ خَیْرًا لَّکِ.'' (صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۳۸)

ترجمہ:...... ''یا اللہ! مجھے میرے شوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے، میرے والد ابوسفیانؓ کے ذریعے سے

اور میرے بھائی معاویہؓ کے ذریعہ سے نفع دیجئے، (مطلب یہ کہ یہ زندہ رہیں، اللہ ان کی زندگی لمبی کرے، اور ان کا سایہ دراز فرمائے اور میرے سر پر قائم رکھے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تو اللہ تعالیٰ سے ایسی چیز مانگ رہی ہے، اور ان میعادوں کے بارے میں سوال کر رہی ہے جن کی تعیین کی جا چکی ہے، اور ان رزقوں کے بارے میں مانگ رہی ہے جن کو تقسیم کر کے دیا جا چکا ہے، اور ان سانسوں کے بارے میں سوال کر رہی ہے جن کو گن کر شمار کر لیا گیا ہے (کہ اتنے سانس ہیں فلاں صاحب کے)، اللہ تعالیٰ ان اجال اور انفاس کو نہ مؤخر کریں گے نہ مقدم کریں گے، اگر تو نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ تجھے دوزخ سے پناہ عطا فرمائیں اور قبر کے عذاب سے پناہ عطا فرمائیں تو یہ افضل ہوتا اور بہتر ہوتا۔''

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ مانگنے کی چیز تو یہ تھی مگر تو کچھ اور مانگ رہی ہے! تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے میعادیں مقرر کر دی ہیں۔

انعاماتِ الٰہیہ کا استحضار:

اس کے بعد فرمایا: تمہیں کان دیئے ہیں، آنکھیں دی ہیں، دل دیئے ہیں، کان دیئے ہیں تاکہ کانوں میں جو بات پڑتی ہے، اس کو تم ذرا سمجھ لو۔

کان گانے سننے کے لئے ہیں؟

کیا تم سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کان اس لئے دیئے ہیں تاکہ تم گانے سنو؟ سن لو، سنتے ہو تو سن لو، ایک بچی نے مجھے خط لکھا کہ میں گانے کے بغیر رہ نہیں سکتی، اللہ تعالیٰ فضل فرمائے، بچپن سے ایسی عادت پڑ گئی، بس حضرت! رہنے دیجئے اس کو

بچپن سے ایسی عادت پڑگئی گانے سننے کی، گویا گانے گھٹی میں ڈال دیئے گئے ہیں، گانے سننے سے تمہاری طبیعت بدمزہ نہیں ہوتی؟ تم کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ دل میں ظلمت آرہی ہے، تم کو خیال نہیں آتا کہ ہمارے کانوں کے ذریعہ سے اندر کیا انڈیلا جارہا ہے؟

آنکھوں کی نعمت:

فرمایا اور تم کو نظریں دی ہیں، آنکھیں دی ہیں، تاکہ تم اس کے پردے کو ہٹاؤ اور عبرت کی نظر سے دیکھو۔

آنکھیں اس لئے دی ہیں تاکہ تم ان آنکھوں سے نظر عبرت کے ساتھ دیکھو، اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے دل عطا فرمائے ہیں تاکہ تم ان حوادث اور مسائل کو سمجھو جو تمہیں پیش آنے والے ہیں

انسان اور جانور کا فرق:

تم میں اور جانور میں یہی فرق ہے کہ تم مستقبل پر نظر رکھتے ہوئے اس کا تحفظ کیا کرتے ہو، اور جانور بے چارہ جو سامنے آتا ہے کھالیتا ہے، آگے کی اس کو فکر نہیں، تم تدبر اور تدبیر کیا کرتے ہو، تدبر کے معنی ہیں انجام کو سوچنا اور تدبیر کے معنی ہیں: انجام کے لئے کوئی سامان کرنا کہ یہ چیز پیش آنے والی ہے، اس کا کیا بندوبست کیا جائے؟ اس کو تدبیر کہتے ہیں، کسی چیز پر غور وفکر کرنا تدبر کہلاتا ہے، اپنے انجام کو سوچنا تدبر کہلاتا ہے، اور اس انجام کی بھلائی کے اسباب مہیا کرنے کی فکر کرنا تدبیر کہلاتا ہے، انسان کو حق تعالیٰ شانہ نے تدبر بھی دیا ہے اور تدبیر بھی دی ہے، حیوانات کو یہ چیز نہیں دی، اور یہ تدبر اور تدبیر دلوں کا کام ہے، اور یہ دماغ اس کی مشینری دل ہے۔

حکماء کی غلط فہمی:

حکما بے چارے یہاں ٹھوکریں کھاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ غور وفکر کا مرکز انسان کا دماغ ہے، وہ بھی ٹھیک کہتے ہوں گے، لیکن مرکز یہ نہیں ہے، ہاں البتہ یہ سوچنے کی مرکزی مشین ہے، تو گویا دل کے ذریعہ سے اس سوچنے کی مشین کا بٹن دبایا جاتا ہے، اگر دل میں تقویٰ ہو تو دماغ تقویٰ کی بات سوچے گا، اور اگر دل میں خباثت اور نجاست ہو تو قلب میں لوگوں کی ایذا رسانی کی تدبیریں گردش کریں گی، قلب میں نیکی اور پارسائی ہو تو دماغ اس کا بندوبست سوچے گا، اور دل میں خدا کا خوف نہ ہو تو پھر دماغ اس کے مطابق تدبیریں کرے گا، تو حکم تو چلتا ہے دل کا، چاہت اور ناچاہت تو دل کا کام ہے، نیکی اور بدی دل کا کام ہے، اسی طرح خباثت یا طہارت یہ قلب کی صفت ہے، دماغ تو اس کی مشین ہے، جس طرف دل کہے گا اسی طرح کرے گا، جو حاکم کہے گا ماتحت اس کی تعمیل کریں گے۔

دل کی نعمت:

تو ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو دل بخشے ہیں تاکہ آئندہ جو حوادث پیش آنے والے ہیں ان کی فکر کرو، اس لئے تم لوگ یوں نہ سمجھو کہ اللہ نے تمہیں پیدا کرکے مہمل چھوڑ دیا ہے، تم سے کوئی حساب وکتاب نہیں لے گا، اور یہ بھی نہ سمجھو کہ چونکہ تم نے کانوں میں ڈاٹ دے لئے ہیں، آنکھیں بند کرلی ہیں اور دلوں کو اللہ کی نصیحت سے پھیر لیا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی تم سے نصیحت پھیرلیں گے، نہیں! اللہ تعالیٰ اپنی عنایت اور نصیحت کرنے کا اپنا فضل تمہاری طرف متوجہ رکھیں گے، تم سنو تب بھی، نہ سنو تب بھی، تم عبرت حاصل کرو تب بھی اور عبرت کی آنکھیں بند کرلو تب بھی اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے نصیحت کرتے رہیں گے۔

احساناتِ الٰہی اور اعمال کی جزا و سزا:

بہرکیف! اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کامل ترین نعمتیں تم کو عطا فرمائی ہیں، اور چھوٹی بڑی تمام حاجتیں تم کو دیں، تمہاری زندگی کے لئے تم کو جو سامان چاہئے وہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادیا، اب تم بھی تو کچھ کرو گے نا! کتنی نعمتیں تم نے اڑائیں وہ اللہ کے علم میں ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو احسانات تمہارے ساتھ کئے وہ اللہ کے علم میں ہیں، اور تم جو اس کے مقابلے میں اچھے اور برے اعمال بجالاتے ہو وہ بھی اللہ کے علم میں ہیں، اور یہ بات خوب یاد رکھو کہ نیک اعمال ہوں یا برے اعمال ہوں، وہ تم نے خوشی میں کئے ہوں یا تنگی میں کئے ہوں، صحت میں کئے ہوں یا بیماری میں کئے ہوں، بہرحال ان اعمال کی اور ان اعمال کے مناسب جو جزا و سزا ہے وہ دیں گے۔ اللہ کے بندو! تلاش میں محنت کرو اور وہ چیز جو تمام خواہشات کے گھروندے کو چکنا چور کردیتی ہے اور جو تمام لذتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے، یعنی موت، اس کے آنے سے پہلے پہلے عمل کرلو، ورنہ بازی ہار جاؤ گے۔

لہو ولعب:

آج کل تو پوری قوم لگی ہوئی ہے کھیل کے میدان کو دیکھنے کے لئے، مجھے ایک نوجوان نے لکھا کہ ٹی وی دیکھنا گناہ ہے یہ تو ٹھیک ہے چونکہ میں کھیل دیکھنے کا شوقین ہوں، کھیل کا بہت شوق ہے، تو میں کبھی کبھی ٹی وی پر میچ دیکھ لیتا ہوں، ماشاءَ اللہ! فلاں، فلاں کے مقابلے میں ہار گیا، فلاں، فلاں کے مقابلے میں جیت گیا، اتنی بات ہوتی ہے اور کیا ہوتا ہے؟ اس سے زیادہ بھی کچھ ہے؟ ابھی دسمبر میں جیت گئے تھے تو پھولے نہیں سماتے تھے کہ پاکستان جیت گیا، کیا بات ہے اور ابھی ہار رہے ہیں تو جوتے پڑ رہے ہیں، کیا بات ہے، بس اسی پر بس کرگئے، اس ہار اور جیت کو تم نے ہار اور جیت سمجھ لیا، ہار اور جیت کا میدان تو آگے آنے والا ہے، میرا بھائی! ہار اور

جیت کا میدان آگے آنے والا ہے، قرآن کریم نے جس کو: "یَوْمُ التَّغَابُن" فرمایا ہے دراصل ہار جیت کا دن اور ہار جیت کا میدان تو میدانِ محشر ہے تو محنت کرو، کوشش کرو، ابھی تم میں صحت ہے، قوت ہے موت کے آنے سے پہلے پہلے اعمال کرلو، اس لئے کہ جس دنیا میں تمہارا دل اٹک گیا ہے، اس کی نعمت دائم نہیں رہتی، اور کیا معلوم یہاں کون سا حادثہ کس وقت پیش آجائے؟ اس بارے میں کوئی اطمینان نہیں ہے۔

دھوکے کا پردہ:

ایک دھوکے کا پردہ ہے جو تمہارے درمیان میں لٹکا دیا ہے، ایک بہت کمزور سا سایہ ہے جو ڈھلا چاہتا ہے، سامنے کوئی بہت ہی گہری وادی ہو، جیسے کوئی سامنے کھائی ہو، کھڈا ہو بہت گہرا، اور درمیان میں پردہ لٹکا دیا گیا اور تم جھول رہے ہو اس پردے کے ساتھ نادان ہو، تمہیں معلوم نہیں ہے کہ آگے کیا ہے؟ اس کو فرما رہے ہیں اور یہ سائے میں بیٹھے ہو آرام سے، اور سایہ بھی بے چارہ بڑا کمزور، بعض درخت ہوتے ہیں ان کا سایہ بہت گھنا ہوتا ہے اور بعض ہوتے ہیں جن کا سایہ اتنا گھنا نہیں ہوتا لیکن خیر پھر بھی غنیمت ہے، لیکن وہ سایہ ڈھل جائے گا، پھر وہ آنکھ جھپکنے میں گزر جاتا ہے، اور اپنے پیچھے بہت سی ہلاکتیں چھوڑ جاتا ہے، بہرکیف! یہ تو فرمایا کہ یہ تو دنیا کا نقشہ ہے، لہٰذا یہاں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی آیات و حالات سے عبرت پکڑو اور اللہ تعالیٰ نے یہاں جو عبرت کے نمونے رکھ دیئے ہیں ان کو دیکھ کر باز آجاؤ۔

موت کے بعد کا نقشہ:

اس کے بعد پھر نقشہ بیان فرمایا ہے، آگے تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں آگے کیا پیش آنے والا ہے؟ قبر کے اندر تو جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ آنے والا ہے لیکن قبروں کے بعد صور پھونک دیا جائے گا، قبریں اکھاڑ دی جائیں گی، محشر کی طرف سب لوگوں کو ہانک کر لے جایا جائے گا اور حساب کے کٹہرے میں لوگوں کو کھڑا کردیا

جائے گا، حساب لینے والا وہ ہوگا جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہیں ہوگی۔

طویل سفر کا توشہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تھا کہ: "یَا اَبَا ذَرٍ! خُذِ الزَّادَ فَاِنَّ السَّفَرَ طَوِیْلٌ." یعنی اے ابوذر! توشہ ساتھ لے کر جانا سفر بڑا لمبا ہے۔ صبح کھاتے ہو شام کی فکر کرتے ہو اور وہ جو قبر میں پڑے ہوئے ہیں ان کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ سب یہ قیامت تک تو وہیں رہیں گے اور قیامت کے بعد اٹھائے جائیں گے، جب نفخہ ثانیہ ہوگا، وہ پچاس ہزار سال کا دن ہوگا، اس کے لئے بھی کچھ سامان کی ضرورت ہے کہ نہیں؟ توشہ لے کر جانا سفر بڑا لمبا ہے، "وَخَفِّفِ الْحَمْلَ، فَاِنَّ الْعَقَبَةَ كَئُوْدٌ." اپنا بوجھ ذرا ہلکا رکھنا، اس لئے کہ گھاٹی بڑی دشوار ہے، اس پر چڑھنا بڑا مشکل ہے

کھرا عمل:

"وَاَخْلِصُ الْعَمَلَ فَاِنَّ النَّاقِدَ بَصِیْرٌ." اور اپنا عمل ذرا کھرا لے کر جانا، عمل تمہاری پونجی ہے، سکہ کھوٹا نہیں ہونا چاہئے کھرا ہونا چاہئے اس لئے کہ پرکھنے والا بڑا باریک بین ہے، رات کی تاریکی میں کھوٹا سکہ تو چلا سکتے ہو، جعلی نوٹ چلا سکتے ہو، لیکن جو اس سے واقف ہے جس کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا اس کے سامنے نہ کھوٹہ سکہ چلا سکتے ہو نہ جعلی نوٹ چلا سکتے ہو۔

بارگاہِ الٰہی کی پیشی:

اسی کو فرما رہے ہیں کہ پھر تمہیں حساب و کتاب کے لئے کھڑا کیا جائے گا، اور تم اس شان سے لائے جاؤ گے کہ: "وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ." (ق:۲۱) اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہوگا جو ڈنڈے کے ساتھ ہانک رہا ہوگا، جیسے گائے بھینسوں کو ہانکا جاتا ہے۔

عدالتِ الٰہی کے گواہ:

ساتھ ایک گواہی دینے والا ہوگا یہ دونوں گواہی دیں گے، ایک ہانکنے والا گواہ، ایک دوسرا گواہ۔ اور حضرات علمأفرماتے ہیں کہ یہ دو گواہ دائیں اور بائیں والے ہیں جن کو کراماً کاتبین کہتے ہیں، تمہارے نامہ اعمال کا کاتب کہے گا: "ھٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیْدٌ." (ق:۲۳) یہ اس کا دفتر ہے جو میرے پاس تیار رکھا ہے، انکار کرے گا تو گواہی دیں گے، جب اس پر بھی انکار کرے گا، کہے گا کہ جھوٹ بولتے ہیں، غلط بولتے ہیں، میں نے یہ کام نہیں کیا۔

چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ:

"عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: کُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَضَحِکَ، فَقَالَ: هَلْ تَدْرُوْنَ مِمَّا اَضْحَکُ؟ قَالَ: قُلْنَا: اَللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ! قَالَ: مِنْ مُخَاطَبَةِ الْعَبْدِ رَبَّهٗ یَقُوْلُ: یَا رَبِّ! اَلَمْ تَجِرْنِیْ مِنَ الظُّلْمِ؟ قَالَ: یَقُوْلُ: بَلٰی! قَالَ: فَیَقُوْلُ: فَاِنِّیْ لَا اُجِیْزُ عَلٰی نَفْسِیْ اِلَّا شَاهِدًا مِّنِّیْ ...... الخ." (مشکوٰۃ ص:۴۸۵)

ترجمہ:...... "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں بیٹھے تھے، آپؐ مسکرائے اور فرمایا تم کیوں نہیں پوچھتے کہ میں کیوں مسکرایا؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ارشاد فرمایئے! فرمایا: بندہ قیامت کے دن کہے گا کہ یا اللہ! کیا یہ بات نہیں ہے کہ آپ نے مجھ کو ظلم سے امن دیا ہے، یعنی تجھ پر ظلم نہیں ہوگا، (بالکل بے پرواہ رہو، اگر تم کسی چیز سے نڈر ہونا چاہتے ہو تو پھر

صرف ایک نڈر ہونے کی چیز ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا، بالکل بے خوف ہوجاؤ، مطمئن ہوجاؤ، یہ یہاں کی پولیس نہیں ہے کہ بھائی جرم کرے اور باپ کو پکڑ لیں، یا دوسرے بھائی کو پکڑ لے، بیٹا جرم کرے تو باپ کو پکڑ لے، باپ کرے تو بیٹے کو پکڑ لیا جائے، شوہر کرے تو بیوی کو پریشان کیا جائے، یہ رذالت اور کمینگی کی حد ہے کہ جس مجرم نے جرم کیا ہے اس کو چھوڑ کر اس کے بال بچوں کو، دوسرے اہل وعیال اور متعلقین کو پریشان کیا جائے کہ بتاؤ کہاں ہیں؟) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ بالکل ٹھیک ہے، میرا وعدہ ہے کہ تجھ پر ظلم نہیں ہوگا، تو وہ کہے گا کہ اگر آپ کا وعدہ ہے کہ ظلم نہیں ہوگا تو میں ان میں سے کسی کی گواہی کو تسلیم نہیں کرتا۔"

انسانی اعضاء کی گواہی:

کن کی؟ فرشتوں کی گواہی کو میں تسلیم نہیں کرتا، احمق یہ سمجھے گا کہ شاید اس سے میری جان چھوٹ جائے گی، فرمایا: بہت خوب! بالکل ٹھیک ہے، وہ جو سورہ یٰسین میں فرمایا:

"اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ." (یٰسین:۶۵)

یعنی اللہ تعالیٰ فرمائیں گے بالکل ٹھیک ہے، منہ پر مہر لگادی جائے گی، ہاتھ گواہی دیں گے کہ ہم نے یہ یہ کیا تھا، اور پاؤں گواہی دیں گے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اب تو ٹھیک ہے، اب تو کوئی اور گواہی نہیں دے رہا، اب تو تم خود ہی اپنے اوپر گواہی دے رہے ہو، کسی کی شہادت ہم تمہارے حق میں قبول نہیں کرتے، لیکن تم

اپنے ہاتھ اور پاؤں کی شہادت تو تم مانو گے کہ نہیں؟ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا:

"وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا، قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ." (حم السجدہ:۲۱)

ترجمہ:...... "وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم میرے خلاف کیوں گواہی دیتی ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں بلوادیا ہے اس نے جس نے ہر چیز کو بلوادیا ہے، جس نے ہر چیز کو گویائی عطا فرمائی ہے۔"

جو زبان کو بلواسکتا ہے وہ ہاتھ کو بھی بلواسکتا ہے، وہ چمڑی کو بھی بلواسکتا ہے، جب تمہارے وہ اعضا جنہوں نے جرائم کا ارتکاب کیا وہ بول کے بتائیں گے پھر کیا رہے گا؟ اب کچھ پردہ ڈھکا ہوا تھا، مگر جب اس بندہ نے جو کچھ کیا اور کراماً کاتبین نے لکھا کہ اس نے زنا کیا ہے، یہ تو اس نے مانا نہیں، اب اگر اس کی شرمگاہ بول کر بتائے پھر تو کچھ شرم آئے گی، اس کی آنکھیں یہ بول کر بتائیں کہ میرے ساتھ اس نے یہ کیا، اگر کراماً کاتبین کی گواہی کو نہیں مانو گے، یہ اللہ تعالیٰ کے معصوم فرشتے جو تمہارے نامہ عمل لکھنے پر مقرر ہیں، اور وہ دیوان اور دفتر تمہارا پھیلا دیا جائے گا، اس کو نہیں مانو گے تو پھر اپنی گواہی تو مانو گے۔

میدانِ حشر کا نقشہ:

حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان محشر کا نقشہ کھینچتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

"مَا مِنْكُمْ مِّنْ رَجُلٍ اِلَّا سَيُكَلِّمُهٗ رَبُّهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ تُرْجُمَانٌ، ثُمَّ يَنْظُرُ اَيْمَنَ مِنْهُ فَلَا يَرٰى شَيْئًا اِلَّا شَيْئًا قَدَّمَهٗ، ثُمَّ يَنْظُرُ اَشْاَمَ مِنْهُ فَلَا يَرٰى شَيْئًا اِلَّا

شَيْئًا قَدَّمَهُ، ثُمَّ يَنْظُرُ تِلْقَاءَ وَجْهِهٖ فَتَسْتَقْبِلُهُ النَّارُ. قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ يَّقِيَ وَجْهَهُ النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ فَلْيَفْعَلْ."

(ترمذی ج:۲ ص:۶۴)

ترجمہ:......"بندہ قیامت کے دن اپنے رب سے کلام کرے گا، بندہ اور اس کے رب کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا، وہ بندہ دائیں جانب دیکھے گا تو اس کے عمل پھیلے ہوئے ہوں گے، بائیں جانب دیکھے گا تو اس کے اعمال پھیلے ہوئے ہوں گے، آگے کو دیکھے گا تو آگ سامنے ہوگی، (گویا چاروں طرف دیکھے گا، پیچھے تو دیکھ نہیں سکتا، اور ہر طرف اس کے اعمال پھیلے ہوئے ہوں گے، کوئی ایک آدھ ورقہ تھوڑا ہی ہے، ہم نے پوری زندگی میں کراماً کاتبین کے کتنے کاغذ سیاہ کروائے ہیں، یہ نقشہ بیان کرکے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی استطاعت رکھتا ہے، چاہے کھجور کی ہی ایک پھانک ہی دینی پڑے تو وہ ایسا کرے، (آدھا حصہ کھجور کا اس کو بھی معمولی چیز نہ سمجھو، یہ بھی دوزخ سے بچانے والی چیز ہے)۔"

غرضیکہ یہ تمہارے اعمال کا نقشہ ہے، تو اور کیا کہیں آگے پورے کوائف ذکر فرمائے، سورج بے نور ہوجائے گا، چوپائے تک جمع کردیئے جائیں گے، دل کے بھید کھل کر سامنے آجائیں گے، دل کانپ رہے ہوں گے، چہرے اداس ہوں گے، کہیں چھپنے کی جگہ نہیں، کہیں پناہ کی جگہ نہیں، کوئی سایہ نہیں، کوئی پینے کو پانی نہیں، یہ میدان محشر ہے، اگر یہ ساری چیزیں برحق ہیں، تو تم کس غفلت میں بھولے ہوئے ہو اور

تمہیں یہاں کی زندگی نے کیوں فریب دے رکھا ہے، کیوں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔

دوزخ کا نقشہ:

پھر اللہ تعالیٰ فضل فرمائے، اللہ تعالیٰ بچائے دوزخ سے، دوزخ میں کنڈیاں ہیں جن میں آدمی پھنس جائے تو نکل نہ سکے، جیسے کانٹا ڈالا جاتا ہے دریا میں مچھلیوں کو پھانسنے کے لئے، مچھلیاں اس کانٹے کو نگل تو لیتی ہیں، پھر اگل نہیں سکتیں، اس کے لئے کنڈیاں ہوں گی اور شور مچا رہی ہوں گی، چلا رہی ہوں گی، دھاڑیں مار رہی ہوں گی، اتنا شور کہ اس شور سے آدمی کے ہوش اڑ جائیں گے اور ایسی کڑک جیسے بجلی کی کڑک ہوتی ہے، ایسی لپٹ کہ آدمی کو جھلسا دے گی، یہ جہنم میں داخل ہونے سے پہلے کا نقشہ ہے، خدا محفوظ فرمائے، اللہ تعالیٰ بچائے، ایک لمحہ کے لئے بھی دوزخ میں اللہ پاک نہ بھیجے، بہرکیف غفلت کی زندگی نہ گزارو، اپنی آخرت کی تیاری کرو، یہ موت، موت کے بعد قبر کی زندگی، قبر کے بعد پھر حشر اور اس کے بعد دوزخ، یہ ہولناکیاں اور فتنہ سامانیوں سے بچنے کے لئے اللہ سے ڈرو اور نیک اعمال کا ذخیرہ تیار کرو، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اصلاحی مواعظ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

بڑوں کے بعد چھوٹوں کی ذمہ داری
جذبہ ایثار، حکمت ودانائی
حضرت ابو درداءؓ کی پانچ نصیحتیں
عورتوں کا فتنہ
بدعت کی حقیقت
قرآن سیکھ کر پڑھنے کے فضائل
صوفیاء کے اخلاق
شہادت کی فضیلت اور اقسام
موت کے وقت کے احوال
شاہراہ انسانیت کی روشن قندیلیں

جلد پنجم

مکتبہ لدھیانوی

اصلاحی مواعظ

جلد پنجم

شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

مکتبہ لدھیانوی

قانونی مشیر اعزازی: ـــ منظور احمد میو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

اشاعت اول: ـــــــ مارچ ۲۰۰۳ء

کمپوزنگ: ـــــــــ صدیقی کمپوزرز، ماڈل کالونی، کراچی

فون: 0320-4084547,4504007

ناشر: مکتبہ لدھیانوی

18- سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن، کراچی

برائے رابطہ: جامع مسجد باب رحمت

پرانی نمائش، ایم اے جناح روڈ، کراچی

پوسٹ کوڈ: 74400 فون: 7780337

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں میں سے ہر ایک کے ساتھ نرالہ معاملہ ہے، کسی کو شہرت ومقبولیت سے نوازتے ہیں تو کسی کو اخفا اور تواضع کی لذتوں سے سرفراز فرماتے ہیں، اور کچھ حضرات کو تواضع اور اخفا کے ساتھ شہرت ومقبولیت کی بلندیوں پر فائز فرمادیتے ہیں۔

اسی طرح بعض اکابر کو زبان و بیان کی شیرینی سے نوازتے ہیں تو بعض کو تصنیف وتالیف اور تحریر؛ انشا کی سروری عطا فرماتے ہیں، اور کچھ خوش نصیبوں کو مجموعۂ کمالات بنادیتے ہیں۔

حضرت اقدس حکیم العصر مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کو اللہ تعالیٰ نے اس کا مصداق بنایا تھا کہ بلاشبہ وہ جامع کمالات تھے۔ آپؒ کو اللہ تعالیٰ نے جہاں قلم کا دھنی، تصنیف وتالیف اور تحریر وانشا کا بے تاج بادشاہ بنایا تھا، وہاں آپؒ زبان و بیان اور وعظ وتقریر کے میدان میں بھی موتی لٹاتے تھے۔ آپؒ کا ہر بیان از دل خیزد بردل ریزد کے مصداق، جامع، مؤثر اور مسحور کن ہوتا، وہ علم وعمل کے پہاڑ اور بحرِ

معرفت کے غواص تھے، اس لئے حضرتؒ کے خدام نے طے کیا کہ حضرتؒ کے مواعظ کو کیسٹ سے نقل کر کے کتابی شکل میں مرتب کیا جائے اور اس کا نفع عام کیا جائے۔ بحمداللہ اس کام کے آغاز کو ابھی تھوڑا عرصہ ہی ہوا ہے کہ اس سلسلہ کی پانچویں جلد پیش خدمت ہے، جو درج ذیل عنوانات پر مشتمل ہے:

''بڑوں کے بعد چھوٹوں کی ذمہ داری، مقبولیت کا مدار اخلاص، صوفیأ کے اخلاق، ایثار و مواسات، جذبۂ ایثار، حکمت و دانائی، حضرت ابودرداءؓ کی پانچ نصیحتیں، اعمالِ صالحہ کے عناصر اربعہ، عورتوں کا فتنہ، بدعت کی حقیقت، بدعات پر نکیر، قرآن کریم سیکھ کر پڑھنے کے فضائل، شہادت کی فضیلت و اقسام، دنیا و آخرت کا تقابل، یوم حساب سے پہلے محاسبہ کی ضرورت، موت کے وقت کے احوال، شاہراہِ انسانیت کی روشن قندیلیں۔''

اللہ تعالیٰ ہمارے رفقأ خصوصاً مولانا محمد اعجاز صاحب، مولانا نعیم امجد سلیمی، بھائی عبداللطیف طاہر اور حافظ عتیق الرحمٰن لدھیانوی کو جزائے خیر دے، جنہوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں جہدِ مسلسل کی۔

خاکپائے حضرت شہیدؒ

سعید احمد جلال پوری

۱۷/۱۲/۱۴۲۳ھ

فہرست مواعظ

فہرست مضامین

(۴)

ایثار و مواسات

۵

٦

۸

⑨

(۱۱)

بدعات پرنکیر ۲۱۷

(۱۲)

قرآن کریم سیکھ کر پڑھنے کے فضائل ۲۳۷

(۱۶)

(۱۷)

بڑوں کے بعد

چھوٹوں کی ذمہ داری

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ کا وصال ہوا، تو حضرتؒ کے خلفاء اور متعلقین کا اجتماع ہوا، جس میں بعد والوں کے لئے کام کرنے کے لئے طریقہ کار اور لائحہ عمل متعین کرنے اور کام کرنے کی نوعیت پر مختلف حضرات کے بیانات ہوئے، اس موقع پر حضرت شہیدؒ نے جو کچھ فرمایا وہ ہدیہ ناظرین ہے۔..............سعید احمد جلال پوری

ہمارے اکابرؒ سب کچھ فرما چکے ہیں، انہوں نے کوئی بات باقی نہیں چھوڑی جو عرض کی جائے، حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی جامعیت اور حضرتؒ کے فضائل و کمالات بیان کرنے کے لئے یہ جلسہ کافی نہیں ہے، اور نہ اس وقت یہ موضوع ہے، اس کی طرف مختلف اشارے ہو چکے ہیں، اس اجلاس کا اصل موضوع حضرت اقدس قدس سرہ کے لئے ایصالِ ثواب ہے، اور وہ ہم ابھی کریں گے، اور ایک بات یہ ہے

کہ جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متبعین ہیں، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والے حضرات ہیں، وہ اپنے آپ کو بٹھائیں نہیں بلکہ چلائیں اور اس کے لئے کوئی لائحہ عمل طے کردیا جائے، یہ اس جلسہ کا اصل مقصد تھا، تو ان حضرات یعنی حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی اور حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب نے یہ دونوں باتیں ارشاد فرمادی ہیں، حضرتؒ سے تعلق رکھنے والے تو ماشاٗ اللہ بہت ہیں، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول وہ فرماتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کا قصد کرنے والے بہت کم لوگ ہیں، اور پھر جو قصد رکھتے ہیں، ان میں سے چلنے والے بہت کم لوگ ہیں، اور جو چلنے لگتے ہیں ان میں سے پہنچنے والے بہت کم لوگ ہیں، اور پہنچنے والے بھی علیٰ خطر عظیم۔'' ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ اس شر و فساد کے زمانے میں ہم موجود ہیں۔

بیعت کی ضرورت:

اس زمانہ میں اہل اللہ سے تعلق رکھنا بھی مفقود ہوگیا ہے، یعنی اللہ والوں سے تعلق رکھنا چاہئے، یہ بات بھی اب بحث ونظر کا موضوع بن گئی ہے، چاہئے یا نہ چاہئے .... ظاہر ہے کہ جب کسی اللہ کے بندے سے تعلق نہیں ہوگا، اس کے جوتوں کی خاک نہیں بنیں گے، تو اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنا کیسے آئے گا؟ اور پھر اس مرض میں عوام تو بے چارے اپنی غفلت کی وجہ سے مبتلا ہیں ہی، ہمارے علماٗ، طلبہ اور اچھے اچھے صلحاٗ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں کہ قرآن و حدیث موجود ہے، ہم اس پر عمل کرتے رہیں گے، اور جیسا ہم عمل کرتے ہیں، وہ ہمیں معلوم ہے، شیطان یہ دھوکہ دے دیتا ہے کہ قرآن کریم بھی موجود ہے، حدیث بھی موجود ہے، ہم عمل کرتے رہیں گے، لیکن جیسا عمل ہم سے بن پڑتا ہے، وہ مجھے اپنا معلوم ہے اور آپ کو اپنا معلوم ہے، اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔

کسی کے ہاتھ میں نکیل ہونی چاہئے:

نفس اور شیطان سے امن کے لئے اور محفوظ ہونے کے لئے لازمی شرط ہے کہ آدمی کی نکیل کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو، یہ ''شتر بے مہار'' نہ ہو، میں نے کل حضرت مفتی صاحب (ولی حسن صاحب مدظلہ) سے کسی بزرگ کا مقولہ عرض کیا تھا، وہ فرماتے تھے کہ کسی گدھے کے ہاتھ میں میری نکیل ہو، یہ اس سے بہتر ہے کہ میں بغیر کسی پابندی کے خودمختار، خود رو رہوں، (یعنی اس کے بجائے کہ میں شتر بے مہار رہوں، بہتر ہے کہ کسی حیوان کے ہاتھ میں میری نکیل ہو)، آدمی کے دین کی حفاظت صرف اسی صورت میں ہے کہ جب اہل اللہ سے اس کا تعلق ہو، اور یہ خودمختار، خود رو نہ ہو، بلکہ کسی کی مان کر چلنے والا ہو۔

جو اپنے اکابرؒ کی نہیں مانتے وہ اللہ رسول کی بھی نہیں مانیں گے:

ہمارے حضرت تھانوی قدس سرہ، ان دوسرے حضرات کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان حضرات نے ہمیں (علمأ دیوبند کو) نہیں پہچانا، تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا پہچانیں گے؟

میں عرض کرتا ہوں کہ جو حضرات اپنے اکابرؒ کی مان کر نہیں چل سکتے، وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مان کر کیسے چل سکتے ہیں؟

شجرۂ طوبیٰ نہ رہا:

بلاشبہ حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمہ اللہ اس زمانہ میں شجرۂ طوبیٰ کی مثال رکھتے تھے، جس کی شاخیں مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک پھیلی ہوئی تھیں، دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں تھا جو حضرت کی نظر شفقت اور آپؒ کی توجہات اور آپؒ کی دعاؤں سے محروم ہو، حضرتؒ کا وہ سایہ سمٹ گیا، خدا کو یہی منظور تھا۔

لائحہ عمل مرتب کریں:

اب حضرتؒ کے جتنے بھی زیر سایہ حضرات ہیں ان کو اپنا لائحہ عمل مرتب کرنا چاہئے کہ ہمیں بیٹھ جانا ہے یا چلنا ہے؟ اور چلنا ہے تو کس طرح چلنا ہے؟

ذکر کا غلبہ چاہئے!

آپ کو معلوم ہے، جیسا کہ اکابرؒ نے فرمایا کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو آخری زمانہ میں غلبۂ ذکر تھا، وہ دیکھ رہے تھے کہ ذکر کی لائن بالکل ٹوٹ گئی، الحمد للہ تبلیغ کی لائن بھی اللہ نے تبلیغی جماعت کے ذریعہ سے زندہ کردی، اور اللہ کا شکر ہے کہ مدارس دینیہ کے ذریعہ سے علم کی لائن بھی چل رہی ہے، لیکن ذکر کی لائن بالکل ٹوٹ گئی، حضرت اس کو محسوس فرما رہے تھے۔

چپڑاسی سے شیخ الحدیث سب صاحبِ نسبت:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحبؒ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ ہم نے دارالعلوم دیوبند کا وہ وقت دیکھا جب شیخ الحدیث سے لے کر چپڑاسی تک اور چپڑاسی سے لے کر شیخ الحدیث تک تمام خدام مدرسہ صاحب نسبت ہوتے تھے، اب وہ نسبت والی کیفیت نہیں رہی۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو آخری دور میں ذکر کی لائن کے بارے میں غلبہ حال تھا کہ اس کو کسی طریقہ سے دوبارہ زندہ کیا جائے۔

تعلق کا معنی اتباع:

اہل اللہ سے تعلق کا معنی یہ ہے کہ ان کی ہدایات پر چلنا اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا تاکہ قلب میں اخلاص پیدا ہو، تزکیہ پیدا ہو، اس کے لئے ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اپنا لائحہ عمل مرتب کریں۔

کاملین دوسروں کو فائدہ پہنچائیں:

ایک بات تو یہ عرض کرنے کی ہے کہ جن حضرات کا سلوک مکمل ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو نسبت کی یہ دولت عطا فرمادی ہے، وہ دوسروں کو فائدہ پہنچائیں۔

سالکین شتر بے مہار نہ رہیں:

جن کا سلوک ابھی مکمل نہیں ہے اور جو ابھی اس راہ پر چل رہے ہیں ان کو بہرحال رہنمائی کی ضرورت ہے، ہمیں شتر بے مہار نہیں رہنا چاہئے، کسی اللہ کے بندے سے تعلق قائم کرنا چاہئے، الحمد للہ یہاں حضرتؒ سے تعلق رکھنے والے بھی موجود ہیں، اور دوسرے اکابر بھی موجود ہیں، جس کی طرف بھی طبیعت راغب ہو اس سے تعلق رکھو، تعلق اصل میں حضرت شیخ ہی کا ہے، خود حضرت شیخ بھی ساری عمر اپنی طرف سے بیعت نہیں فرماتے تھے، بلکہ اپنے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بیعت فرماتے تھے، تعلق تو وہی ہے لیکن مقصود پابندی ہے۔

اکابرؒ کے ایصالِ ثواب:

دوسری بات جیسے حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی مدظلہ نے فرمایا کہ یہ ذکر کی لائن جتنی زندہ ہوگی اس کا ایصال ثواب حضرت شیخ رحمہ اللہ کو پہنچے گا، اور ہمارے حضرت شیخ قدس سرہ کے اور کمالات میں سے ایک کمال یہ بھی ہے کہ خود ان کی زندگی میں جتنا ان کو ایصال ثواب کیا گیا ہے، اتنا کسی کو نہیں کیا گیا، ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں حضرتؒ کی طرف سے حج ہوتے تھے، مخلصین حضرتؒ کی طرف سے حج کرتے تھے، ہزاروں کی تعداد میں عمرے ہوتے تھے، نہ معلوم حضرتؒ کی طرف سے ہر سال کتنی قربانیاں ہوتی تھیں اور دوسرے ذکر واذکار کا تو ذکر ہی کیا، حضرت شیخ رحمہ اللہ ویسے بھی تو بادشاہ تھے۔ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی قدس سرہ، تبلیغی جماعت

والے حضرتؒ کے عزیز اور چچا زاد بھائی بھی تھے، ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ انہوں نے ''حیاۃ الصحابۃ'' کا ایڈیشن چھاپ کر پورا کا پورا حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو ہدیہ کردیا تھا، ''حیاۃ الصحابۃ'' تین جلدوں میں ہے، آج اگر چھاپی جائے تو میرا اندازہ تو یہ ہے کہ کم ازکم ساٹھ ستر ہزار روپیہ چھاپنے کے لئے چاہئیں، اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ جس کو چاہیں دیں، یہ تو مادی ہدیے تھے، اس قسم کے ہدیے حضرت کی زندگی میں حضرت شیخ رحمہ اللہ کے ایصال ثواب کے لئے بہت ہوتے رہتے تھے۔

یہ شکلیں بھی چلتی رہنی چاہئیں، حضرتؒ کے ساتھ جتنا تعلق بڑھے گا، جتنا آپ ایصال ثواب کریں گے اتنا حضرتؒ کی روح پرفتوح بھی انشاءاللہ متوجہ رہے گی اور حضرتؒ کا فیض بھی آپ حضرات کو پہنچتا رہے گا، ایصال ثواب کی جتنی بھی شکلیں ہوسکتی ہیں، خواہ ذکر وتسبیح کے طور پر ہوں، قرآن کریم کی تلاوت کے طور پر ہوں، نوافل کے طور پر ہوں، حج وعمرہ کے طور پر ہوں، قربانی کے طور پر ہوں، اور دوسرے صدقات کے طور پر ہوں، جتنی لائنیں بھی ایصالِ ثواب کی ہوسکتی ہیں ان سب کا صرف وقتی نہیں: کہ ایک مجلس قائم کرلی اور ہم نے کچھ قرآن مجید کی تلاوت کرلی اور حضرت شیخ کو ایصال ثواب کردیا، اور بس، نہیں یہ تو ایک مستقل کام ہے اور الحمدللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ہمارے شیخ رحمہ اللہ تک جتنے اکابرؒ ہیں، سب کو ایصال ثواب کریں گے تو سب سے تعلق قوی ہوگا، یہ لائن یعنی ایصال ثواب والی لائن یہ بھی چلتی رہنی چاہئے، چاہے تھوڑا معمول ہو، چاہے زیادہ، لیکن ہمیشہ کا معمول ہونا چاہئے۔

مقبولیت کا مدارِ اخلاص

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں مزید ارشاد فرمایا:

”وَيَقُوْلُ الرَّجُلُ: قَدْ هَاجَرْتُ وَلَمْ يُهَاجِرْ، وَاِنَّ الْمُهَاجِرِيْنَ هَجَرُوا السَّيِّاٰتِ، وَيَقُوْلُ اَقْوَامٌ جَاهَدْنَا وَاِنَّ الْجِهَادَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ مُجَاهَدَةُ الْعَدُوِّ وَاجْتِنَابُ الْحَرَامِ وَقَدْ يُقَاتِلُ اَقْوَامٌ يُحْسِنُوْنَ الْقِتَالَ، لَا يُرِيْدُوْنَ بِذَالِكَ الْاَجْرَ وَلَا الذِّكْرَ وَاِنَّمَا الْقَتْلُ حَتْفٌ مِنَ الْحُتُوْفِ، وَكُلُّ امْرِئٍ عَلٰى مَا قَاتَلَ عَلَيْهِ، وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيُقَاتِلُ بِطَبِيْعَتِهٖ مِنَ الشَّجَاعَةِ فَيُنَجِّيْ مَنْ يَّعْرِفُ وَمَنْ لَّا يَعْرِفُ، وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيَجْبُنُ بِطَبِيْعَتِهٖ فِيُسْلِمُ اَبَاهُ وَاُمَّهٗ وَاِنَّ الْكَلْبَ لَيَهِرُّ مِنْ وَّرَاءِ اَهْلِهٖ، وَاعْلَمُوْا اَنَّ الصَّوْمَ حَرَامٌ يُجْتَنَبُ فِيْهِ اَذَى الْمُسْلِمِيْنَ كَمَا يَمْنَعُ الرَّجُلَ مِنْ لَذَّتِهٖ مِنَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ وَالنِّسَاءِ فَذَالِكَ الصِّيَامُ التَّامُ ...... الخ۔“

(کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۲۱۳)

ترجمہ:......"(حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ:) بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم مہاجر ہیں حالانکہ وہ مہاجر نہیں ہیں، مہاجر تو وہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے روک دیا ہے ان کو چھوڑ دے (صرف ترکِ وطن کرنے والے کو مہاجر نہیں کہتے) پھر فرمایا کہ بہت سے لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں، ٹھیک ہے کرتے ہوں گے لیکن اللہ کے راستے میں جہاد یہ ہے کہ (محض اللہ کی رضا کے لئے ہو) کہ (دین کے) دشمن سے مقابلہ کرے اور حرام سے اجتناب کرے، اور بہت سے لوگ بہت ہی اچھا قتال کرتے ہیں لیکن اس قتال سے ان کا مقصود ثواب اور اعلاءِ کلمۃ اللہ نہیں ہوتا قتال تو محض موت کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، اور ہر آدمی سے اس کی نیت کے مطابق معاملہ ہوگا، پھر فرمایا کہ بہت سے لوگ اس لئے لڑائی کرتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں لڑائی ہے، پس وہ اس کے ذریعہ ہر آدمی کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں اور بہت سارے لوگ اس لئے تکرار نہیں کرسکتے کہ ان کی طبیعت میں بزدلی ہے، پس وہ اپنے والدین کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے، حالانکہ بے شک کتا اپنے گھر والوں کی وجہ سے بھونکتا ہی ہے، بے شک روزہ (کئی چیزوں کو) حرام (کرنے والا) ہے کیونکہ اس میں مسلمانوں کو تکلیف دینے سے اجتناب کیا جاتا ہے، جیسا کہ روزہ روزہ دار آدمی کو اس کے لذات یعنی کھانے پینے اور عورتوں سے روک دیتا ہے، پس اسی کو مکمل روزہ کہا جاتا ہے۔"

رضائے الٰہی کے لئے لڑنا جہاد ہے:

تو بات یہ ہے کہ کوئی شخص شہرت کے لئے لڑائی کرتا ہے، یا اپنے مزاج کی وجہ سے لڑائی کرتا ہے، یا مزاج ہی لڑاکا پایا ہے تو شریعت نے رخ کافروں کی طرف کردیا، یا کوئی شخص اپنے قبیلے کی حمایت میں لڑتا ہے، کوئی شخص اپنی قوم کی حمایت میں لڑتا ہے، یہ مجاہد نہیں ہے، مجاہد صرف وہ لوگ ہیں جو رضائے الٰہی کے لئے لڑتے ہیں، اور اس پر آخرت کے اجر وثواب کی توقع رکھتے ہیں، دنیا کا کوئی مفاد اور منفعت ان کے پیش نظر نہیں ہوتی۔

کامل روزہ:

اس کے بعد فرمایا کہ دیکھو بھائی! روزے میں کھانا پینا حرام ہوجاتا ہے لیکن کھانا پینا تو پہلے حلال تھا اب روزے کی حالت میں حرام ہوگیا اور مسلمانوں کو ایذا پہنچانا، ان کو تکلیف دینا اور ان کی غیبت کرنا اور ان کی تحقیر کرنا یہ روزے سے پہلے بھی حرام تھا، تو بہت سارے لوگ روزہ رکھتے ہیں، کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں لیکن مسلمانوں کی ایذارسانی کرنا نہیں چھوڑتے، جو کہ حرام ہے جس سے بچنا لازم ہے، ان کی غیبت ترک نہیں کرتے تو ان لوگوں کا روزہ نہیں، جو کھانے پینے کے ساتھ مسلمانوں کی ایذارسانی کو نہ چھوڑدیں، مسلمانوں کو نقصان پہنچانا خواہ ہاتھ سے ہو، یا زبان سے ہو، یا کسی اور طرز عمل سے ہو، تمہارے وجود سے کسی کو ایذا نہ ہو، فرمایا کہ یہ ہے پکا اور پورا روزہ۔

زکوٰۃ فرائض دین میں سے ہے:

پھر فرمایا کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا ان فرائض میں سے ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض فرمایا، زکوٰۃ کا حکم تو قرآن کریم میں ہے لیکن زکوٰۃ کس چیز میں سے کتنی دی جائے اور اس کے شرائط کیا ہیں؟ اس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔

زکوٰۃ کی تفصیلات قرآن میں نہیں:

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ایک موقع پر موجود تھے، کوئی بات ہوئی تو ایک نوجوان کہنے لگا کہ قرآن کریم میں اس کی کیا دلیل ہے؟ غضبناک ہوکر فرمانے لگے کہ یہ بتاؤ کہ تم جو زکوٰۃ دیتے ہو قرآن کریم میں اس کی مقدار بیان کی گئی ہے؟ یہ بیان کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ کس مال میں سے دی جائے؟ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مال میں زکوٰۃ کی ادائیگی کی یہ شرط ہے کہ اس مال پر سال گزر جائے؟ یہ بیان کیا گیا ہے کہ فلاں مال کا نصاب یہ ہے؟ اونٹوں کا نصاب یہ ہے، گائے کا نصاب یہ ہے، بکری کا نصاب یہ ہے، پھلوں کا نصاب یہ ہے، فصل کا نصاب یہ ہے، زمین کا نصاب یہ ہے اور جو زمین بارانی ہو اس کا نصاب یہ ہے، نہری زمین کا نصاب یہ ہے، سونے چاندی کا نصاب یہ ہے، مال تجارت کا نصاب یہ ہے، یہ ساری تفصیل تمہیں معلوم ہے، قرآن کریم سے نکال کر دکھا سکتے ہو؟ کہا کہ نہیں! فرمایا: تم کو شرم نہیں آتی یہ فرائض تم نے ہم سے سیکھے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے اور آج مجھے کہتے ہو کہ قرآن کریم سے اس کی دلیل دکھاؤ! ایسی اور بہت سی چیزیں ذکر فرمائیں۔ تو زکوٰۃ ایک خاص مقدار پر، خاص شرائط کے ساتھ اور خاص مقدار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر فرض فرمائی ہے اور زکوٰۃ کوئی ٹیکس نہیں ہے، تاوان نہیں ہے۔

زکوٰۃ ٹیکس نہیں، عبادت ہے:

ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ زکوٰۃ ٹیکس ہے، زکوٰۃ لینا حکومت کا کام ہے اور یہ کہ نعوذ باللہ! استغفر اللہ! حکومت اس کی مقدار میں بھی رد و بدل کرسکتی ہے، بہت عرصہ پہلے کی بات ہے، میں نے اس وقت لکھا تھا اور میرا یہ مضمون نوائے وقت لاہور میں چھپا تھا، میں نے لکھا تھا کہ ٹیکس اور زکوٰۃ میں فرق ہے، زکوٰۃ ٹیکس نہیں ہے، بھائی! یہ تو عبادت ہے جو لوگ زکوٰۃ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں حقیقت

میں ان کے اندر ایمان نہیں ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایسے ہی ٹیکس ہے جیسے گورنمنٹ کا ٹیکس ہے، اس کو بچاؤ جتنا بچاسکتے ہو، یہ نعوذ باللہ! مولویوں کا لگایا ہوا ٹیکس ہے، بھائی! یہ بات نہیں ہے، حق تعالیٰ نے کچھ عبادتیں بدن سے متعلق فرمائی ہیں جن کو عبادات بدنیہ کہا جاتا ہے، کچھ عبادتیں مال کے متعلق فرمائی ہیں تو زکوٰۃ اور حج یہ مال سے تعلق رکھنے والی عبادتیں ہیں، حج میں دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں، عبادت بدنی بھی پائی جاتی ہے، بدن کی مشقت بھی اور پیسے بھی خرچ کرنے پڑتے ہیں، اس لئے علماءٔ فرماتے ہیں کہ حج عبادت مرکبہ ہے، مال اور بدن دونوں سے متعلق ہے، زکوٰۃ خالص عبادت مالیہ ہے، اسی طرح قربانی اور صدقہ فطر بھی عبادت مالیہ ہے، فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ تو اللہ تعالیٰ نے ہر مال دار پر متعین کی ہوئی ہے جس کو عام طور پر زکوٰۃ کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، صاحب نصاب ہو، ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کا مالک ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس میں سے چالیس واں حصہ لازم آجاتا ہے، یہ زکوٰۃ ہے، اور ایک عبادت واجب کے درجے میں ہے اور وہ قربانی اور صدقہ فطر ہے۔

قربانی اور ملاحدہ کے شکوک وشبہات:

قربانی کے بارے میں تو کئی دفعہ بیان میں بات آبھی چکی ہے، بہت سے لوگ اس کے ویسے ہی منکر ہیں، نعوذ باللہ! یوں سمجھتے ہیں کہ قربانی کرنا مال کو ضائع کرنا ہے، بلاوجہ بکرے ذبح کئے جاتے ہیں، استغفر اللہ! اتنا چندہ مسکینوں کی فلاح و بہبود میں دے دیا جائے، لوگوں کو ان کی بات بڑی اچھی لگتی ہے لیکن ان سے کوئی پوچھے کہ تم جو عیاشیاں اپنے نفس کے لئے کرتے ہو، لغویات اور عیاشیوں کے لئے جو خرچ کرتے ہو، وہ جائز ہے؟ مجھے کہنے کی اجازت دی جائے کہ فحاشیوں کے لئے کبھی تمہیں خیال نہیں آیا کہ بجائے اس فضول خرچی اور گناہوں کے کاموں میں خرچ

کرنے کے اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیا جائے؟ چلو اللہ تعالیٰ کے راستے میں تم دینے کے قائل نہیں ہو، تم اپنی قوم کے لئے خرچ کرو، اپنے وطن کے لئے خرچ کرو، مگر سچ یہ ہے کہ ان لوگوں کو نہ اللہ اور رسول سے تعلق، نہ اپنی قوم و وطن سے تعلق، صرف نفس شریف سے تعلق ہے، یہ نہ ملک کے خیرخواہ، نہ اپنی قوم کے خیرخواہ، نہ انسانیت کے خیرخواہ، تو قربانی کے دنوں میں قربانی واجب ہے۔

وجوبِ قربانی کا نصاب:

مختصر سی بات اس قربانی کے بارے میں بھی عرض کردوں، قربانی صاحب نصاب پر ہوتی ہے جو شخص کہ صاحب نصاب ہو اس پر قربانی واجب ہے، یعنی اس کی ضروریات سے فالتو چیز موجود ہو، اب جس گھر میں ٹی وی موجود ہے، شریعت اس کی ضرورت تسلیم نہیں کرتی، اس پر قربانی واجب ہے اور یہ بات بھی یاد رہنی چاہئے کہ جو شخص صاحب نصاب ہو اس پر قربانی واجب ہے، بیوی کو جہیز میں زیور ملا ہے اور وہ بقدر نصاب ہے تو اس پر الگ قربانی واجب ہے، میاں پر الگ واجب ہے بشرطیکہ وہ صاحب نصاب ہو، باپ بھی صاحب نصاب ہے، بیٹا بھی صاحب نصاب ہے، برسر روزگار ہے خواہ ایک ہی جگہ رہتے ہوں تو بیٹے پر الگ قربانی واجب ہے، باپ پر الگ قربانی واجب ہے، اماں پر الگ قربانی واجب ہے اگر وہ نصاب کی مالکہ ہو۔

بزرگوں کی شان!

میرے والد مرحوم، اللہ غریق رحمت فرمائے قربانی کے موقع پر ہمیشہ نو (۹) قربانیاں کرتے تھے، چار ان کے بیٹے تھے اور چار ان کی بہوویں تھیں، اور ایک اپنی، کیونکہ سب ایک ساتھ رہتے تھے، اگرچہ ہم الگ کھاتے پیتے تھے، ہم باہر ہی رہتے تھے لیکن عید کے موقع پر گھر چلے جاتے تھے، یہ معاملہ والد صاحب ہی کے سپرد تھا، بزرگوں کی عجیب ہی شان تھی، اب تو نفسانفسی کا عالم ہے۔

والد صاحب کی زندگی میں میں نے کبھی اپنے یا اپنی بیوی کے کپڑے خریدنے کی جرأت نہیں کی، حالانکہ میں نے کہا کہ میں مدرسوں میں الگ رہتا تھا، کبھی خیال نہیں آیا کہ سال بھر باہر رہتا ہوں، ہمیشہ یہی سوچا کہ وہ بڑے تھے وہی کریں، اور یہی حال ہمارے دوسرے بھائیوں کا تھا، یہ نہیں کہ نعوذ باللہ! ہمیں انقباض تھا کہ والد صاحب نے ایسا کنٹرول کیا ہوا ہے، نہیں یہ بھی گویا اعزاز کے طور پر تھا، پرانے زمانوں میں بزرگوں کی بزرگ داشت اور چھوٹوں کی خورد داشت کا عجیب وغریب سماں ہوتا تھا۔

نئی روشنی کی تاریکی:

اب ہماری نالائقی کی وجہ سے وہ زمانہ آیا کہ بزرگوں کو بزرگ نہ سمجھا اور چھوٹوں کو چھوٹا نہ سمجھا، جو پڑھ لکھ گئے ہیں ان کو روشنی کچھ زیادہ ہی پہنچ گئی ہے اور اس زمانہ کو تاریکی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ روشنی ایسی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: ''جگمگاتے ہیں در و دیوار دل بے نور ہے۔'' یہ ظاہری روشنی ایسی ہے کہ تمہاری نئی روشنی کے سبب دماغ بھی تاریک اور دل بھی تاریک، اس لئے برخوردار، ابا میاں کو اپنے سے بے وقوف سمجھتے ہیں، خود عقل مند ہیں، ابا میاں بے وقوف اور بعض تو ایسے ہیں ان کو اپنے باپ کو باپ کہنے میں بھی شرم آتی ہے۔

ان پڑھ باپ کا پڑھا لکھا بیٹا:

حضرت تھانوی قدس سرہ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ نئی روشنی والوں کا صاحبزادہ کسی جگہ افسر تھا، باپ بے چارہ ان پڑھ تھا، باپ ملنے کے لئے گیا، اب اس کی دیہاتی قسم کی وضع، غیر مہذب قسم کا آدمی، اب وہ کہہ تو نہیں سکتا تھا کہ ابا جان! میرے پاس تشریف نہ لاؤ، موجودہ زمانہ ہوتا تو شاید یہ وارننگ بھی دے دیتا، تو اپنے دوستوں سے تعارف کروایا تو وہ پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کون ہیں؟ کہنے لگا کہ یہ

ہمارے ملازم ہیں۔ حضرت تھانویؒ کے الفاظ ہیں کہ وہ بوڑھا کہنے لگا: ملازم نہیں ہوں بلکہ اس کی ماں کا خصم ہوں۔ اب یہ زمانہ آیا ہے کہ نئی روشنی نے گل کھلایا ہے کہ باپ کو باپ کہتے ہوئے شرم آتی ہے، اور باپ بھی ایسے ہی ہیں بے چارے کہ ''ڈیڈی'' کہلانا پسند کرتے ہیں، ''ابا''، ''ابو'' والا قصہ تو گیا۔

اولاد کا نہیں والدین کا قصور ہے:

رات میں ایک خط کا جواب لکھ رہا تھا، ایک نوجوان نے پوچھا کہ اولاد کی تربیت کرنی چاہئے، اب بجائے اولاد کی تربیت کرنے کے والدین خود شروع ہی سے ان کو دین سے ہٹاتے ہیں، بچہ ذرا باشعور ہوتا ہے تو ان کو الٹی سیدھی چیزیں سکھائی جاتی ہیں، ٹی وی دکھایا جاتا ہے اور دوسری لغویات دکھائی اور سنائی جاتی ہیں، اب اگر اولاد بالغ ہونے کے بعد بگڑے تو اس میں قصور کس کا ہے؟

اولاد ماں باپ کے تابع:

حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

"مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ ..... الخ." (مشکوٰۃ ص:۲۱)

ترجمہ:...... ''ہر بچہ فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنادیتے ہیں، یا نصرانی بنادیتے ہیں، یا مجوسی بنادیتے ہیں۔''

بہت کم ایسا ہوتا ہے:

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ والدین گمراہ ہوں لیکن اولاد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نقش قدم پر ہو، حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اپنے باپ کو اور اپنی پوری قوم کو ان بتوں کی پوجا کرتے ہوئے دیکھا، یہ سب

اپنے باپ دادے کا دین پھیلا رہے ہیں، تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: تم اور تمہارے باپ دادا صریح غلطی پر پڑے ہوئے ہو، جب تم ان بتوں کو بلاتے ہو تو یہ سنتے کیوں نہیں؟ یہ تمہیں نفع اور نقصان پہنچاتے ہیں؟ پتھر بے چارہ کیا نفع نقصان پہنچائے گا؟ تو یہ تو بہت کم ہوتا ہے کہ اولاد حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نقش قدم پر چلے، ہاں! بعض اوقات اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کی فطری طور پر تربیت فرماتے ہیں، لیکن اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ اولاد جو کچھ اپنے ماں باپ کو کرتے ہوئے دیکھتی ہے اسی رخ پر چلتی ہے۔

اولاد کی غلط کاری کا وبال:

تو نوجوان نے پوچھا کہ اولاد کی غلط کاریوں کا وبال والدین کو ہوگا یا اولاد کو؟ میں نے جواب لکھا کہ عاقل بالغ ہوجانے کے بعد اولاد خود اپنے افعال کی ذمہ دار ہے لیکن چونکہ ان کی گمراہی اور بدکاری میں والدین کا بھی دخل ہے، اس لئے اولاد تو مجرم ہوگی لیکن والدین بھی ان کے جرم میں برابر کے شریک ہیں، آگے میں نے لکھا کہ والدین قبروں کو چلے جائیں گے اور اولاد غلط راستے پر چل رہی ہوگی، ان کی غلط روی کا وبال والدین کو قبروں میں پہنچتا رہے گا۔

نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے:

ہم لوگ اپنے مرحومین کے لئے ایصالِ ثواب کرتے ہیں، حکم بھی ہے کہ ایصالِ ثواب کرو، ان کے لئے دعا کرو، ان کے لئے صدقہ خیرات کرو، ان کے لئے استغفار کرو، ان کے لئے پڑھ کر بخشو تاکہ جو زندگی سے ریٹائر ہوگئے ہیں، قبر میں ان کی پنشن جاری رہے، تو جو نیک والدین نیک اولاد چھوڑ کر جاتے ہیں، یہ نیک اولاد بھی ان کے لئے صدقہ جاریہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: آدمی کے مرنے کے بعد جو چیزیں اس کی قبر میں پہنچتی ہیں ان میں سے وہ علم ہے جو سکھایا تھا،

اور بعد میں اس پر عمل ہو رہا ہے تو اس کو ثواب پہنچ رہا ہے، اسی طرح کوئی قرآن کریم کا نسخہ ترکہ میں چھوڑ گیا تھا اس کو لوگ پڑھ رہے ہیں تو اس کو ثواب مل رہا ہے، کوئی صدقہ جاریہ کر گیا تھا، مثلاً: مسجد بنادی تھی، کوئی مدرسہ بنادیا تھا، حتیٰ کہ کوئی فلاحی کام کر گیا تھا، کوئی مسافر خانہ بنادیا تھا کہ لوگ آرام کرتے رہیں، مسافر کو ٹھہرانے کا جو ثواب ہے اس کو باقاعدہ ملتا رہے گا۔ انہیں میں سے ایک یہ فرمایا کہ نیک اولاد ہو جو اس کے لئے دعا کرے۔

اکابرؒ فرماتے ہیں کہ نیک اولاد بذاتِ خود صدقہ جاریہ ہے، نیک اولاد جتنے نیک کام کرے گی جیسے روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ اکابرؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس لئے فرمادیا گیا ہے کہ اولاد کو دعا بھی کرتے رہنا چاہئے تو نیک اولاد والدین کے لئے اگر ایصالِ ثواب نہ بھی کرے، تب بھی نیک اولاد نیک عمل ہے، اور یہ جو فرمایا کہ اس کے لئے دعا کرے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تو ملے گا ہی والدین کو۔ اولاد کو اپنی طرف سے بھی ایصالِ ثواب کرنا چاہئے کہ یہ والدین کا حق ہے۔

والدین کا حق:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب رحمہ اللہ کے بڑے صاجبزادے حسن بھائی کہہ رہے تھے کہ والد صاحب ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: اولاد کے ذمہ حق ہے کہ اپنے والدین کی قبر پر آٹھ دن کے بعد ضرور جائے، ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے تھے کہ لوگ شروع شروع میں تو خوب یاد رکھتے ہیں، تیجہ اور چالیسواں کرتے ہیں، بعد میں بھول جاتے ہیں۔

مرحومین کی طرف سے صدقہ:

ایک صاحب کی والدہ خواب میں آئیں اور کہا کہ میری طرف سے ختم نبوت کو پانچ سو روپے چندہ دے دو، مرحومہ کی عادت تھی کہ مجھے ختم نبوت کے لئے یا

مدرسہ کے لئے پیسے دیتی اور رسید لیتی تھی، اور کہتی تھی کہ میں رسید اس لئے لیتی ہوں کہ یہ جنت کے ٹکٹ ہیں، تو خواب میں آئی تو کہنے لگی کہ میری طرف سے پانچ سو روپے چندہ دے دو۔ اس کے بعد پھر میں نے کہا کہ میں بھی اپنے والد صاحب کی طرف سے دیتا ہوں۔

والدین کو نہ بھولو:

یہ بھی ہونا چاہئے بھائی! تم اپنے کپڑے بناتے ہو، والدین کے لئے بھی بنا کے دیا کرو، کیوں نہیں دیتے؟ جوڑا بنا کر بھیجو ان کو، یعنی جوڑا یا جوڑے کی قیمت کسی محتاج کو دے دو، والدین کے لئے یہ حق شناس اولاد کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اپنے والدین کو بھولے نہیں بلکہ یاد رکھے۔

اولاد کے گناہوں کے وبال کا حصہ قبر میں پہنچتا ہے:

تو خیر میں تذکرہ کر رہا تھا اس خط کا کہ نیک اولاد جو نیک عمل کرتی ہے مرنے کے بعد والدین کو اولاد کے نیک اعمال کا باقاعدہ حصہ دیا جاتا ہے، ان کے اعمال میں اور ان کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اور جو والدین اپنی اولاد کو غلط راستے پر ڈال دیں یا ڈال کر گئے ہیں، نماز ان کو نہیں سکھائی، دین ان کو نہیں سکھایا بلکہ دوسری چیزیں سکھائیں، یعنی جو مشاغل دنیا میں آج کل تمہارے سامنے ہیں۔ اب اولاد تو دنیا میں عیاشیاں اور فحاشیاں کر رہی ہے مگر قبر میں والدین کو سزا مل رہی ہے۔ بھائی! جس طرح نیک اولاد کا حصہ والدین کو قبر میں پہنچتا ہے، بری اولاد جو برے اعمال میں مبتلا ہے (والدین کی غلط تربیت کی بنا پر) ان کے گناہوں کا حصہ، ان کے وبال کا حصہ بھی والدین کو قبر میں پہنچتا ہے۔ افسوس ان لوگوں کے حال پر کہ خود تو دنیا چھوڑ گئے لیکن ان کے گناہوں کے وبال کا پیچھا آج تک نہیں چھوٹا۔ انہوں نے اپنی قبر جو تاریک کی تھی وہ تو کی تھی لیکن آگے مزید سیاہی چڑھ رہی ہے، مزید عذاب میں

اضافہ ہورہا ہے۔

قربانی گھر کے ہر صاحب نصاب پر:

تو میں گفتگو کر رہا تھا قربانی کے بارے میں کہ ابا کا حصہ الگ ہے، اماں کا حصہ الگ ہے، میاں کا حصہ الگ ہے، بیوی کا حصہ الگ ہے، اگر شوہر نادار ہے اس کے پاس پیسے نہیں، بیوی کے پاس پیسے ہیں تو بیوی کے ذمہ قربانی واجب ہے، شوہر کے ذمہ واجب نہیں، اگر بیوی کے پاس پیسے نہیں یا وہ نصاب کی مالک نہیں ہے، شوہر امیر کبیر ہے تو بیوی کے ذمہ قربانی نہیں شوہر کے ذمہ ہے۔ تو گھر میں جتنے افراد صاحب نصاب ہوں گے اتنی قربانیاں ان کے ذمہ واجب ہوں گی۔

قربانی کا مقصد گوشت نہ ہو:

اور یہ بھی میں نے عرض کیا کہ قربانیوں سے مقصود گوشت کھانا نہیں بلکہ عبادت ہے، گوشت تو ہمیں دوکان پر اس سے بھی زیادہ سستا مل جائے گا، بعض لوگ قربانی کے قائل نہیں، مگر اس لئے قربانی کرتے ہیں کیونکہ وہ تو فرائض کبھی ادا نہیں کرتے تو واجبات کیا ادا کریں گے؟ انہوں نے زکوٰۃ کبھی نہیں دی قربانی کیا کریں گے؟ وہ قربانی صرف اس لئے کرتے ہیں کہ بچوں کا اصرار ہوتا ہے کہ ہمارے گھر بھی جانور آئے، اللہ تعالیٰ منظور کرے یا نہ کرے۔

میں یہ مسئلہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایسی قربانی کا ثواب نہیں ملے گا، ہاں! اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور محض رضائے الٰہی کے لئے جانور ذبح کیا جائے اور گوشت مقصود نہ ہو، اس قربانی کا ثواب ملتا ہے، اور اگر گوشت مقصود ہے یا یہ خیال ہے کہ قربانی نہیں کی تو پڑوس والے لوگ کیا کہیں گے؟ تو ایسی قربانی کا بھی ثواب نہیں۔

ایک کی نہ ہوئی تو سب کی نہ ہوگی:

ایک مسئلہ اور بتادیتا ہوں کہ گائے میں سات حصے ہیں، اگر ایک آدمی صرف گوشت کی نیت والا ہوگا تو ساتوں کی قربانی نہیں ہوگی، گائے میں سات حصے تھے، ان میں ایک آدمی ایسا تھا کہ جس کی نیت قربانی کی نہیں تھی، حقیقت میں عبادت کی نیت نہیں تھی، محض گوشت کھانا مقصود ہے، یا ایک رسم ہے تو چونکہ جانور ایک ہی ہے اس لئے کسی کی بھی قربانی نہیں ہوگی، یہ جانور ہی قربانی کا نہیں۔

اچھے اور نیک لوگوں کے ساتھ قربانی کرو:

اس لئے کہتے ہیں بھائی! نیک لوگوں کے ساتھ حصے رکھا کرو، اچھے لوگوں کے ساتھ حصے رکھا کرو، یا پھر اپنی الگ قربانی کرو، یہ دھڑے کا مال نہیں چلتا۔

حرام مال والے کے ساتھ قربانی:

اسی طرح جن لوگوں کا پیسہ حرام کا ہے، ان کی قربانی ٹھیک نہیں ہے، اور ان کے ساتھ حصہ رکھنا بھی ٹھیک نہیں ہے، غصب کا پیسہ ہے، رشوت کا پیسہ ہے اور دیگر حرام ذرائع سے حاصل کیا ہوا پیسہ ہے نہ ان کی زکوٰۃ، نہ ان کی قربانی اور نہ ان کا حج، نہ ان کا فدیہ، کوئی چیز قبول نہیں۔

قربانی پاک مال سے ہو:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قطعی طور پر ارشاد گرامی ہے:

”اِنَّ اللہَ طَیِّبٌ یُحِبُّ الطَّیِّب ..... الخ.“

(مشکوٰۃ ص:۳۸۵)

ترجمہ:......”اللہ پاک ہے، پاک مال کو قبول کرتا ہے۔“

ناپاک مال کو قبول نہیں کرتا، مال حرام کا ہے تو صدقہ بھی نہیں کیا جاسکتا تو اگر کسی کا مال حرام ہے اور اس نے قربانی میں حصہ رکھا تو باقی لوگوں کی بھی قربانی نہیں ہوگی، کیونکہ جانور ایک ہے، لوگ اس معاملے میں بہت زیادہ غیرمحتاط ہیں، کوئی رافضی ہے اس کو بھی قربانی میں ساتھ کر لیتے ہیں، اور ایک جگہ تو قادیانیوں کا بھی اپنے ساتھ حصہ رکھ لیا، احتیاط نہیں کرتے، احتیاط اس لئے نہیں کرتے کہ دین کے معاملے میں پرواہ نہیں، بے پرواہی ہے۔

قربانی کی کھال کا مسئلہ:

اور اسی طرح قربانی کی کھالوں کا مسئلہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک سو اونٹ نحر فرمائے تھے، تریسٹھ اپنے دست مبارک سے اور باقی حضرت علیؓ کو کہہ دیا تھا کہ قربان کردو، تریسٹھ سال عمر شریف تھی، حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے حکم فرمایا تھا کہ میں ان کی کھالوں کو صدقہ کردوں۔ اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جزار کو اجرت نہ دو، یعنی کھال کو قصائی کی اجرت میں نہ دو، ہم اجرت اپنی طرف سے دیں گے حتیٰ کہ قربانی کے جانور کی رسی، اس کی جھول کو بھی صدقہ کردینے کا حکم ہے۔ اور یہاں قصائی کو دے دیتے ہیں، یہ بھی اپنی قربانی برباد کرنے والی بات ہے، اور بہت سارے لوگ اپنی قربانی کی کھالیں ایسے اداروں اور ایسی تنظیموں کو دیتے ہیں جو کہ اپنی من مانیاں کرتے ہیں، ان کو شرعی مسائل کا علم ہی نہیں اور پچھلے دنوں تو قربانی کی بھری ہوئی گاڑیاں چھین لی گئیں، ختم نبوت کی گاڑی بھی چھین لی تھی، قہر کا نتیجہ تو قہر ہی نکلے گا نا! جب آدمی اپنے سر پر قہر اٹھائے گا تو پھر اس کا نتیجہ تو قہر ہی کی شکل میں ہوگا۔

ہمارے اعمال کی آگ:

ہمارے حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بے ادب جو ہوتا ہے وہ تنہا

اپنا برا نہیں کرتا بلکہ جہان کو آگ لگا دیتا ہے، اور پھر آگ اس اکیلے نے لگائی جلتے اس میں سارے ہیں، یہ کراچی میں پچھلے دنوں جو کچھ ہوا کیا خیال ہے؟ یہ گولیاں اور بندوقیں نہیں تھیں، یہ ہمارے اعمال کی آگ تھی اور یہ بدعملیوں کی آگ جب لگتی ہے تو پھر پڑوس کے ساتھ والے پڑوسی کو بھی پکڑ لیتی ہے وہ تو کچھ نہیں دیکھتی۔

بے عقل حکمران:

اب ہمارے بزرجمہر جو عقل کل ہیں کیونکہ جو برسر اقتدار آجائیں نا! جس کی حکومت ہو وہ یہ سمجھتا ہے کہ ساری دنیا کی عقل مجھے دے دی گئی ہے، باقی سارے بے وقوف ہیں، کسی کو کسی کے مسئلہ پر بولنے کا حق نہیں کیونکہ ان کے پاس تو عقل نہیں، عقل تو صرف ہمارے پاس ہے۔

بدعملیوں کی آگ کا علاج:

اب یہ بے چارے ہراساں ہیں، پریشان ہیں کہ فلاں کو پکڑو، فلاں کو اندر کرو، یہ مسئلہ کا حل نہیں ہے، اپنی بدعملیوں کے ذریعہ جو تم نے آگ لگائی ہے اس کو توبہ سے بجھاؤ، اس انتقام کی آگ سے یہ آگ مزید پھیلے گی کم نہیں ہوگی، تم نے مسئلے کا حل بھی غلط تلاش کیا ہے، جس کو چاہا پکڑ کر اندر کر دیا، اس سے کیا تم سمجھتے ہو کہ زخم پر مرہم لگ جائے گا؟ یہ آگ جو لگی تھی بجھ جائے گی؟ نہیں! بلکہ اور شدت کے ساتھ بھڑکے گی اور پھر ایسا نہ ہو کہ اس کا لاوا تمہیں بھی بھسم کر ڈالے اور قوم کو بھی بھسم کر ڈالے۔ عجائبات میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے جو طاغوتی قوتوں اور ہمارے دشمنوں کی کٹھ پتلیاں بنی ہوئی ہیں، وہ ہمارے برسر اقتدار ہیں، وہ ہمارے اوپر حکومت کر رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے جوتے کھانے کے لئے خود ان کو اپنے اوپر مسلط کیا ہے، مت ماری گئی ہے، جب ایسے لوگ حکمران ہوں گے تو پھر نتیجہ یہی ہوگا۔

زنانہ عقل کیا گل کھلائے گی؟

کوثر نیازی نے بے نظیر کی حمایت میں ایک مضمون لکھا تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ مستثنیات کے طور پر ہی فرض کرلو کہ بے نظیر کو اللہ نے عقل زیادہ دی ہے، علم زیادہ دیا ہے، فہم زیادہ دیا ہے، دوسرے لوگ اس کے مقابلے میں نہیں آتے تو اس میں کیا حرج ہے؟ میں نے اس کے جواب میں لکھا تھا اور وہ رسالہ چھپ رہا ہے، ''بینات'' میں بھی آرہا ہے، میں نے لکھا کہ جناب کی ممدوحہ کی عقل خداداد کا میں بھی قائل ہوں، اس لئے کہ یہ سارے لغاری، مزاری، چیمے، چٹھے، وٹو، ٹوانے اور نیازی یہ سارے اس کی زلف کے اسیر ہیں۔ قرآن نے جو کہا ہے وہ ٹھیک ہی کہا ہے کہ تمہارا مکر بہت بڑا ہے، شیطان کا مکر، اللہ کی نظر میں کمزور ہے، مگر عورتوں کا مکر بڑا ہے، معلوم ہوا کہ یہ اس سے بھی ڈبل ہے، اور آخر میں میں نے لکھا تھا کہ اس پر میرا رسالہ ختم ہوا کہ یہ زنانہ عقل ملک وملت کے حق میں کیا گل کھلائے گی؟ اس کا انتظار کرو! یہ رسالہ (عورت کی حکمرانی) چھپا ہوا موجود ہے، زنانہ عقل ہی یہ سارے گل کھلا رہی ہے، جو قوم مرد و عورت کے درمیان امتیاز کرنا بھول جائے، اس قوم کا کیا انجام ہوگا؟ جہاں مرد مرد نہ رہے، عورتیں عورتیں نہ رہیں، وہاں اخلاق اور اقدار کا کیا پوچھنا؟

ایدھی اور قربانی کی کھالیں:

تو بھائی! قربانی کی کھالیں بھی اپنی جگہ پر خرچ کرو، ایدھی ٹرسٹ کے بارے میں بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ ایدھی والوں کو پہنچادو، پچھلے دنوں اخبار میں آیا تھا کہ ایدھی کی چندہ کی رقم میں سے جو رقم بنک میں جمع ہے اس کے سود کو خرچ کرتے رہتے ہیں، تمہاری زکوٰۃ وصدقات کی رقوم بنک میں جمع ہیں (ایدھی والوں کی) اور اس کا سود خرچ کرتے رہتے ہیں، اب تمہاری عبادت پوری ہوگی؟ مکمل

ہوگی؟ سوچ لو! اپنے نفع اور نقصان کو خود سوچو، تو جو ادارے اور جو تنظیمیں اس قسم کے گھپلے کرتی ہیں، یا جو ناقابل اعتماد ہیں، جن کے دین یا دیانت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ان کو اپنی قربانی کی کھالیں نہ دو اور ختم نبوت کے لئے تو میں کہا کرتا ہوں کہ اس کو اپنی قربانی کی کھالیں دو، بس اسی پر ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

صوفیائے اخلاق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

صوفیاءؒ کے اخلاق کے بارے میں گفتگو چل رہی تھی، فرماتے ہیں کہ صوفیاءؒ کے اخلاق میں سے ایک ہے: لڑائی جھگڑا نہ کرنا اور حق کے بغیر غصہ نہ کرنا، حلم اور بردباری اور برداشت سے کام لینا، یہ مضمون مختصر سا دوسرے عنوانات کے تحت پہلے بھی آ چکا ہے۔

انسان کے اندر موجود دو قوتیں:

غصہ کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ نے انسان کی حفاظت کے لئے اس کے اندر دو قوتیں رکھی ہیں۔ ایک قوت وہ ہے جو منافع کو حاصل کرنا چاہتی ہے، اس کا نام حرص ہے۔ اور دوسری قوت وہ ہے جو اس سے مضرتوں کو دور کرنا چاہتی ہے، اس کا نام غضب اور غصہ ہے۔ جب بھی انسان کو کوئی چیز ایسی پیش آتی ہے جو طبیعت کے لئے ناگوار ہو تو یہ قوت بھڑکتی ہے اور مدافعت کرنا چاہتی ہے اسی قوت کو غصہ آنا کہتے ہیں۔

اب اگر یہ حق پر ہو پھر تو یہ ٹھیک ہے اور اگر ناحق پر ہو تو غلط ہے۔ یہاں پر

دو باتیں قابل ذکر ہیں۔

غصہ کے بارے میں دو باتیں:

ایک یہ کہ: جب آدمی کو غصہ آتا ہے تو اگر ضرورت ہو گفتگو کی تو آدمی بحث کرتا ہے، جھگڑا کرتا ہے، تکرار کرتا ہے، لڑائی کرتا ہے، اور اگر ضرورت ہو ہاتھ استعمال کرنے کی تو دست درازی کرتا ہے، مار پٹائی کرتا ہے، یہ ساری انتقام کی شکلیں ہوتی ہیں، اور اگر وہ بھی نہیں کرسکتا، یہ بھی نہیں کرسکتا تو پھر ایک تیسری کیفیت پیدا ہوتی ہے یعنی دل کی رنجش، دل سے آدمی رنجیدہ ہوتا ہے اور جو شخص اس کو نقصان پہنچاتا ہے یا اس کے خیال میں نقصان پہچانا چاہتا ہے، اس کے خلاف رنجش رکھتا ہے، کینہ رکھتا ہے، بغض رکھتا ہے، دل میں اس سے نفرت کرتا ہے اور یہ ساری صورتیں ہیں اسی ایک انتقام کی، اور پیدا ہوتی ہیں اس قوت سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی ہیں جس کو مدافعت کی قوت کہتے ہیں، اس کا نام غصہ رکھ لیجئے۔

اور دوسری یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ حق تعالیٰ شانہ نے انسان کے اندر جو فطرتی اخلاق رکھے ہیں ان کو ختم نہیں کیا جاسکتا، اب اگر غصہ انسان میں فطری ہے یہ تو آئے گا، اس کو نہیں دباسکتے یعنی ختم نہیں کرسکتے، مار نہیں سکتے۔

ایک فطری بات:

اور کسی چیز کی چاہت و رغبت اور حرص یہ بھی ایک فطری چیز ہے، انسان کی فطرت کے اندر رکھی گئی ہے، اس کا بھی پوری طرح قلع قمع کرنا ممکن نہیں ہے، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز میرے نزدیک قیمتی ہے میں اس کی حرص رکھتا ہوں، آپ کی نظر میں وہ چیز قیمتی نہیں ہے آپ کو اس کی کوئی حرص نہیں ہے، یہ بات تو علم پر مبنی ہے۔

درویش و شیخ الاسلام کا قصہ:

ایک دفعہ ایک بادشاہ، ایک درویش سے ملنے کے لئے گئے، بادشاہ کے

ساتھ ان کے شیخ الاسلام بھی تھے، میں نے پہلے ایک موقع پر بتایا تھا کہ ہمارے طبقہ میں حسد بہت ہوتا ہے، یہ خاص مولوی، قاری بے چاروں کی بیماری ہے، مولوی حسد یعنی ایک دوسرے پر جلنا، (اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم لوگ اس سے بالکل پاک ہو)۔ میرا مطلب یہ ہے کہ علماء میں یہ چیز بہت زیادہ پائی جاتی ہے سوائے ان کے کہ جن کی اصلاح ہوگئی ہو، اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کی خدمت میں، صحبت میں بیٹھنے سے نفس کا تزکیہ ہوگیا ہو، ان کی بات دوسری ہے، ہم اپنے جیسوں کی بات کر رہے ہیں، تو بادشاہ کے ساتھ ان کے شیخ الاسلام مولوی صاحب بھی تھے، بادشاہ نے اس بزرگ کی تعظیم کی، بڑا اکرام کیا، مولوی صاحب جل گئے، آخر میں بادشاہ نے ایک تھیلی اس بزرگ کی خدمت میں پیش کی، وہ بزرگ فرمانے لگے کہ: میں اس کو کیا کروں گا؟ آپ لوگوں پر تقسیم کردیجئے، ضرورت مندوں کو دے دیجئے۔ یہ استغنا ایک ایسی چیز ہے جس سے آدمی کی عظمت بڑھتی ہے، اور حرص خصوصاً ''سوال'' ایک ایسی چیز ہے جس سے آدمی ذلیل ہوتا ہے، تو اس بزرگ کے یہ کہنے سے بادشاہ کی نظر میں اس بزرگ کی عظمت اور بھی بڑھ گئی، مولوی صاحب پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، فوراً حدیث پڑھی:

''قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''يَهْرَمُ اِبْنُ آدَمَ وَيَشُبُّ فِيْهِ اِثْنَانِ: اَلْحِرْصُ عَلَى الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَى الْعُمَرِ.'' (مشکوٰۃ ص:۴۴۹)

ترجمہ:...... ''فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: آدمی بوڑھا ہوتا رہتا ہے اور دو خصلتیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں (جوں جوں بوڑھا ہوتا ہے اسی نسبت سے یہ دو چیزیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں): ایک مال کی حرص اور دوسری لمبی عمر کی حرص۔''

مولوی صاحب کا مطلب یہ تھا کہ یہ جو تم انکار کر رہے ہو یہ محض ریاکاری

ہے، ورنہ حرص تمہارے اندر بھی موجود ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: آدمی بوڑھا ہوتا رہتا ہے اور دو چیزیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں۔ بزرگ سمجھ گئے، جب مولوی صاحب نے یہ حدیث پڑھی تو اس بزرگ نے فرمایا کہ: مولوی صاحب! جوان وہ ہوا کرتا ہے جو پیدا ہو، اللہ کا شکر ہے کہ یہ دو چیزیں یہاں پیدا ہی نہیں ہوئیں، جوان کیا ہوتیں؟ اللہ کا احسان ہے کہ یہ دو چیزیں ہمارے دل میں پیدا ہی نہیں ہوئیں، پیدا ہوتیں تو جوان ہوتی ناں! اور پھر فرمایا اگر اجازت ہو تو ایک حدیث میں بھی سنادوں!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"اَلْعُلَمَاءُ اُمَنَاءُ الرُّسُلِ مَا لَمْ یُخَالِطُوْا السُّلْطَانَ، فَاِذَا خَالَطُوْا السُّلْطَانَ وَدَاخَلُوا الدُّنْیَا فَقَدْ خَانُوا الرُّسُلَ، فَاحْذَرُوْهُمْ!" (کنز العمال ج:۱۰ حدیث:۲۸۹۵۳)

ترجمہ:...... "علماء رسولوں کے امین ہیں بشرطیکہ بادشاہوں سے مل کر نہ رہیں، ان سے خلا ملا نہ رکھیں اور دنیا میں نہ گھسیں، لیکن جب وہ بادشاہوں سے میل جول کرنے لگیں، خلط ملط کرنے لگیں تو وہ رسولوں کے خائن ہیں، ان سے بچو!"

بادشاہ، شیخ الاسلام سے کہنے لگا کہ: اور چھیڑو!

ایک اور روایت میں ہے:

"اِذَا رَأَیْتَ الْعَالِمَ یُخَالِطُ السُّلْطَانَ مُخَالَطَةً کَثِیْرَةً، فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لِصٌّ." (کنز العمال ج:۱۰ حدیث:۲۸۹۷۳)

ترجمہ:...... "جب کسی عالم کو بادشاہ سے زیادہ خلا ملا کرتا ہوا دیکھے تو جان لے کہ یہ ڈاکو ہے۔"

تو میں نے عرض کیا تھا یہ بات عام طور پر ہمارے طبقہ میں ہوتی ہے، اس پر

بات آ گئی تھی کہ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہوں جن میں یہ چیزیں پیدا ہی نہ ہوں، تو یہ ہوسکتا ہے۔ مگر میری اور آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کہ کچھ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو ان چیزوں سے مبرا ہوں۔

لوگ سوچ ہی نہیں سکتے کہ کوئی بغیر غرض کے بھی کام کرسکتا ہے:

ایک فتوے کے سلسلے میں، معلوم نہیں کہ ابوظہبی سے یا سعودی عرب سے، مجھے خط ملا ہے، جو بہت لمبا چوڑا ہے، اس میں بڑی تفصیل لکھی ہوئی تھی، اس میں لکھا تھا کہ یہ امریکی ڈالر جو سعودی تھیلیوں میں مل رہے ہیں ناں! یہ فتویٰ ان کی برکت ہے۔

میں نے ان کو جواب میں لکھا کہ آپ صحیح فرماتے ہیں، اس سے زیادہ آپ سوچ ہی نہیں سکتے، آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے، اور یہ بات آپ کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی منفعت اور لالچ کے اللہ تعالیٰ کے دین کی بات بتاتے ہیں۔

شیخ سعدیؒ کے بقول:

موحد کہ برپائے ریزی زرش
کہ فولادِ ہندی نہی برسرش
امید و حرامش نہ باشد زکس
ہمین است بنیادِ توحید بس

ترجمہ:......"اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے والا تم اس کے پاؤں پر سونے کی اشرفیوں کی تھیلیاں ڈال دو یا تلوار اس کی گردن پر رکھ دو، کوئی چیز اس کو حق کہنے سے مانع نہ ہوگی، اس کی امید اور اس کا خوف صرف ایک سے ہیں اور اسی کا نام توحید ہے۔"

حرص و ہوا کے سیلاب میں...:

توحید کی یہی بنیاد ہے، جہاں حرص و ہوا کا سیلاب بہہ رہا ہو اور لوگ بے دست و پا ہوکر اس میں بہہ رہے ہوں، وہاں کسی کی عقل میں آسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوں گے جو بغیر خواہش اور بغیر کسی منفعت کے کوئی بات کہیں اور ان کا نعرہ وہی ہو جو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا نعرہ تھا؟ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

"وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ." (الشعراء:۱۰۹)

یعنی میں تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا، میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ صرف ایک اللہ کے ذمہ ہے، جو کچھ کہتا ہوں تم سے کچھ وصول کرنے کے لئے نہیں کہتا۔

قیمتی اور بے قیمت کا معیار!

تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ تو ممکن ہے کہ ایک چیز کی مجھے رغبت ہو، اس لئے کہ میری نظر میں وہ چیز قیمتی ہے اور آپ کو رغبت نہ ہو اس لئے کہ آپ کی نظر میں وہ قیمتی نہیں ہے۔ حرص و رغبت تو قیمتی چیز کی ہوتی ہے، جو چیز آدمی کی نظر میں بے قیمت ہو اس کی وہ حرص نہیں رکھتا، جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے:

"مَرَّ (رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) بِجَدْیٍ اَسَکَّ مَیِّتٍ فَتَنَاوَلَهُ فَاَخَذَ بِاُذُنِهٖ ثُمَّ قَالَ: اَیُّکُمْ یُحِبُّ اَنَّ هٰذَا لَهُ بِدِرْهَمٍ؟ فَقَالُوْا: مَا نُحِبُّ اَنَّهُ لَنَا بِشَیْءٍ وَمَا نَصْنَعُ بِهٖ؟ قَالَ: تُحِبُّوْنَ اَنَّهُ لَکُمْ؟ قَالُوْا: وَاللهِ! لَوْ کَانَ حَیًّا کَانَ

عَيْبًا فِيْهِ لِاَنَّهٗ اَسَكّ، فَكَيْفَ وَهُوَ مَيِّتٌ؟ فَقَالَ: فَوَاللهِ! لَلدُّنْيَا اَهْوَنُ عَلَى اللهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ!"

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۴۰۷)

ترجمہ:...... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر بکری کے مرے ہوئے بچے پر ہوا، جو کن کٹا بھی تھا، صحابہؓ ساتھ تھے، آپؐ نے اس کا کان پکڑ لیا (اس حدیث پر امام ابوداوٗدؒ نے باب باندھا ہے، "باب الوضوء من مس المیتۃ۔" (ابوداوٗد ج:۱ ص:۲۵) یعنی مردار کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور وضو کرنا لازم نہیں آتا) اور فرمایا: تم میں کون ہے جو ایک درہم دے کر اس کو خرید لے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ کن کٹا ہے اگر یہ زندہ ہوتا تب بھی کوئی نہ لیتا، اس میں عیب تھا، اب تو یہ مرا ہوا اور مردار ہے اب اس کو کون لے گا؟ فرمایا کہ: جس قدر یہ مردار تمہاری نظر میں ذلیل اور حقیر ہے اللہ تعالیٰ کی نظر میں پوری دنیا اس سے زیادہ ذلیل اور حقیر ہے۔"

اب اللہ تعالیٰ کے جس بندے کی نظر بصیرت صحیح ہوگئی ہو اور دنیا واقعتاً اس کی نظر میں ذلیل اور حقیر ہوگئی ہو وہ اس کی رغبت کیوں کرے گا۔

نماز کی قیمت معلوم نہیں اس لئے دل نہیں لگتا:

ہمارے لوگوں کو تکلیف ہے کہ جی نماز میں دل نہیں لگتا، تسبیح و ذکر میں دل نہیں لگتا، تلاوت میں دل نہیں لگتا، اصل میں ان چیزوں کی دل میں قیمت نہیں ہے۔ کبھی یوں نہیں کہا کہ کھانے میں دل نہیں لگتا، مولوی صاحب کوئی علاج بتاؤ، کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تو دل نہیں لگتا، کیا کریں؟ بڑا مشکل ہے، پانی پینے بیٹھتا ہوں تو دل نہیں لگتا، دوستوں کی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو دل نہیں لگتا اور جتنی لغویات میں ہم

مصروف ہیں اس میں دل نہیں لگتا، یہ کبھی کسی نے شکایت نہیں کی۔ اس لئے کہ ان چیزوں کی منفعت سامنے ہے۔ نماز کی، روزے کی، زکوٰۃ کی، تلاوت کی، ذکر کی اور تنہائی میں اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے کی قیمت معلوم نہیں ہے، دل کیوں لگے گا؟ رغبت اسی چیز کی ہوتی ہے جس چیز کی منفعت سامنے ہوتی ہے، اس کی قیمت سامنے ہوتی ہے۔

اہل اللہ کو دنیا کی قیمت معلوم ہے اس لئے ان کو حرص نہیں ہوتا:

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیائے اللہ رحمہم اللہ کی نظر میں دنیا بے قیمت ہے، ان کو اس کی حرص نہیں اور نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! ہمارے نزدیک دین اور دین کی باتیں بے قیمت ہیں، اس لئے ہمیں اس کی حرص نہیں، تو عرض یہ کر رہا تھا کہ یہ تو ممکن ہے کہ ایک آدمی کو کسی چیز کی اہمیت معلوم نہ ہو، اس لئے اس کی حرص نہ ہو، لیکن جس چیز کی حرص ہوتی ہے آدمی اپنے تمام وسائل جھونک کر بھی اس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

دفع مضرت کے لئے پورے اسباب استعمال کرنے کی وجہ:

اور بالکل یہی قصہ ہے مضرت کے دفع کرنے میں بھی، بچے کے سامنے سانپ رکھ دو، اس کے خوش نما نقوش اس کو بہت اچھے لگیں گے، فوراً پکڑنے کی کوشش کرے گا کیونکہ اس کو پتہ نہیں ہے کہ یہ سانپ ہے، اس لئے شیخ عطارؒ فرماتے ہیں کہ:

زہرے ایں مارے منقش قاتل است

یعنی اس نقشوں والے منقش سانپ کا زہر قاتل ہے۔ جب تک ہمیں کسی چیز کے بارے میں یہ پتہ نہ ہو کہ یہ ضرر رساں ہے اس وقت تک ہماری اندر کی قوت مدافعت بیدار نہیں ہوگی، سوتی رہے گی، کچھ نہیں کہے گی، لیکن جوں ہی معلوم ہوا کہ یہ ضرر رساں ہے تو اس سے بچنے کے لئے اپنی پوری طاقت خرچ کردے گی اور وجود

کے پورے لشکر کو اس کے لئے استعمال کرلے گی، اس کو غضب کہتے ہیں۔

لڑائی کے اسباب:

پھر جیسے کہ میں نے کہا کہ اس کے تین درجے ہیں، اگر ہاتھ استعمال کرسکتا ہے تو ہاتھ کو استعمال کرے گا، زبان استعمال کرسکتا ہے تو زبان استعمال کرے گا اور یہ نہیں کرسکتا تو پھر کم از کم دل میں برا سمجھے گا ہی، تو یا تو مار کٹائی ہوگی، یہ نہ ہو تو لڑائی جھگڑا ہوگا، یہ بھی نہ ہو تو کینہ اور بغض تو ضرور ہی ہوگا، کیونکہ دل پر تو کسی کا پہرا نہیں بٹھایا جاسکتا، تو معلوم ہوا کہ جوش انتقام کی وجہ سے لڑائی جھگڑا شروع ہوتا ہے۔

غصہ رکھوالا ہے:

آپس میں جو لوگ لڑتے ہیں یا بحث و تکرار کرتے ہیں یہ شروع ہوتا ہے جوش انتقام اور غصہ کی بنا پر اور ہماری شریعت نے جیسا کہ میں پہلے بھی بتاچکا ہوں یہ بتایا ہے کہ یہ کتا ہے، تمہارے گھر پر پاسبانی کے لئے رکھا ہوا ہے، یہ غصہ جو ہے ناں غصہ، یہ گھر پر پالا ہوا کتا ہے، کسی گھر کے اندر کوئی چور ڈاکو آئے تو مالک کو بتانے کے لئے اس کو ضرور بھونکنا چاہئے، لیکن اگر یہ ہر ایک کو کاٹتا پھرے تو پھر معلوم ہوا کہ کتا باؤلا ہوگیا ہے اور باؤلے کتے کو شوٹ کردیا کرتے ہیں، گولی مار دیا کرتے ہیں۔

غصہ کی زیادتی جنون کی علامت ہے:

اگر ہم ہر ایک سے لڑائی بھڑائی کرتے پھریں، اس میں دوست اور دشمن کی کوئی تمیز نہ کریں، اپنے اور پرائے کا کوئی امتیاز نہ کریں، کبھی ماں پر غصہ آرہا ہے، کبھی باپ پر آرہا ہے، کبھی بھائی پر آرہا ہے، کبھی بہن پر آرہا ہے، کبھی پڑوس والوں پر آرہا ہے اور کبھی دوست پر آرہا ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ کتا پاگل ہوگیا ہے، اتنی عقل تو اللہ تعالیٰ نے کتے کو بھی عطا فرمائی ہے کہ مالک ہو یا گھر کا کوئی اور فرد ہو اور وہ اس کے پاس سے گزرے تو وہ دم ہلانے لگتا ہے، اس کو بھونکتا نہیں ہے۔

قوتِ غضبیہ دفع مضرت کے لئے ہے:

تو ہمارے اندر جو غصے کی قوت رکھی گئی ہے اس کا مقصد بھی مضرات کی مدافعت کرنا ہے، لیکن یہ نہیں کہ ہر جگہ بھڑکتا پھرے۔ تول کر کے دیکھو کہ تمہیں جو مضرت پہنچ رہی ہے اس کے مقابلے میں کوئی منفعت بھی مل رہی ہے کہ نہیں، دونوں کا موازنہ کرو۔

والدین کے غصہ کی منفعت:

اب والدین جھڑکتے ہیں، اپنے بچے کو ڈانٹتے ہیں، بچہ غصہ ہوتا ہے، بے وقوف ہے، والدین کا نصیحت کرنا اس کی منفعت اور ذرا تھوڑا سا اس کو ڈانٹنے کی جو تکلیف ہوئی ہے وہ مضرت، ان دونوں کا مقابلہ کرو کہ کس کا پلہ بھاری ہے؟

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے اپنا بیٹا مکتب میں پڑھنے کے لئے بٹھایا اور چاندی کی تختی بنا کر دی، اس پر سونے کے حروف سے یہ الفاظ لکھ کر دیئے: ''جورے استاذ بہ از مہر پدر'' استاذ کا ظلم اور استاذ کی سختی باپ کی شفقت سے بہتر ہے۔ قاری صاحب نے ایک بچے کے طمانچہ مار دیا، گھر کے لوگ آگئے، عورتیں تک آکر بے چاری کو سنے دیتی ہیں، اچھا بھائی! تمہاری خوشی، تمہارا یہ غصہ بھڑکنا چاہئے تھا، پہلے مقابلہ کر لیتے کہ اس منفعت اور اس مضرت کے درمیان میں نسبت کیا ہے؟ پلہ کس کا بھاری ہے؟ ایک طرف منفعت بھی ہے اور ایک طرف مضرت بھی ہے، تو دونوں میں سے پلہ کس کا بھاری ہے؟ اگر مضرت کا بلہ بھاری تھا، پھر تو تمہارا غصہ بھڑکنا چاہئے تھا، لیکن اگر منفعت کا پہلو بھاری ہے اور مضرت ایسی کچھ خاص نہیں ہے، وقتی چیز ہے تو پھر اس پر غصے کا ہونا یہ بے عقلی کی بات ہے۔

جیسے تمہارے یہاں کوئی مہمان آتا ہے، بڑا معزز مہمان اور کتا اس کو بھونکتا ہے، بے عقل ہے، جانتا نہیں ہے کہ ان مالکوں کا اس مہمان کے ساتھ کیا تعلق ہے،

یہ ان مہمانوں کو بھی دشمن سمجھ رہا ہے اور دشمن سمجھ کر بھونکتا ہے، یہ تو میں نے غصے کے بارے میں کچھ تفصیلات ذکر کیں۔

مامور وممنوع غصہ:

اب جو بات حضرتؒ فرما رہے ہیں اس کی تشریح کرتا ہوں وہ فرماتے ہیں کہ: صوفیا کے اخلاق میں سے ہے لڑائی جھگڑے کو چھوڑ دینا اور غصے کو چھوڑ دینا، مگر حق کے ساتھ یعنی اگر کسی حق بات پر لڑائی جھگڑے کی نوبت آئے یا غصہ کی نوبت آئے تو پھر تو وہ دوسری بات ہے، غصہ ہونا چاہئے آدمی میں، لیکن غصہ اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ہونا چاہئے، غضب فی اللہ ہونا چاہئے، غضب لنفسہٖ اپنی ذات کے لئے نہیں، غصے کے گلے میں رضائے الٰہی کی زنجیر باندھ دو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے غصہ ہو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر نہ ہو۔

غصہ حدود اللہ توڑنے پر ہو:

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں:

”وَمَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِہٖ اِلَّا اَنْ تُنْتَھَکَ حُرْمَةُ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ.“

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۲۵۶)

ترجمہ:...... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لئے کبھی انتقام نہیں لیا، (کوئی کچھ کہتا رہے، انتقام نہیں لیا) مگر جب اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑا جاتا، یعنی اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدوں کو توڑا جاتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آتا تھا اور ایسا غصہ آتا تھا کہ کوئی اس کا سامنا نہیں کرسکتا تھا۔“

قریش کی ایک عورت نے چوری کرلی تھی، جس کا نام فاطمہ تھا، اب قریش نے کہا کہ: اگر اس خاتون کا ہاتھ کٹ گیا تو بڑی بدنامی ہوگی کہ قریش کی خاتون کا ہاتھ کٹ گیا، یہ قریش کے لوگ چور ہیں، اتنا بڑا خاندان! اور ایسی بدنامی؟ اور لوگ بھی ایسے بے وقوف ہوتے ہیں کہ ایک کا فعل پوری قوم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ تو بڑی بدنامی ہوگی، اس لئے ایسا کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست کرو کہ اس عورت پر حد جاری نہ کریں، سزا جاری نہ کریں، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے کی جرأت کس کو ہو؟ انہوں نے سوچا کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت ہی لاڈلے اور پیارے ہیں، ان سے کہا جائے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالی میں عرض کریں، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نوجوان سے تھے، یہ ہی کوئی سولہ سترہ سال کی اس وقت ان کی عمر ہوگی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبوب تھے، حضرات حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسی ان سے محبت فرماتے تھے، چنانچہ حضرت اسامہؓ کو کہا گیا اور حضرت اسامہؓ تو چونکہ بھولے بھالے نوجوان تھے، کم عمری کی وجہ سے ان باتوں کو سمجھتے نہیں تھے، انہوں نے جاکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش کردی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بات کو سننا تھا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا اور گرج کر فرمایا: ''اَتَشْفَعُ فِیْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ؟'' (مشکوٰۃ ص:۳۱۴) تو اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں مجھ سے سفارش کرتا ہے؟ اس کے بعد ارشاد فرمایا: بنو اسرائیل اسی لئے ہلاک ہوئے کہ ان میں جب کوئی شریف آدمی، جب کوئی کمزور آدمی جرم کا ارتکاب کرتا تھا تو اس پر سزا جاری کردیتے تھے اور جب کوئی بڑا آدمی جرم کا ارتکاب کرتا تھا تو سزا جاری نہیں کرتے تھے۔

ہمارے ہاں دوہرا معیار:

ہمارے ہاں بھی یہی ہو رہا ہے ناں؟ ہاں یہی ہو رہا ہے، پھر ہلاکت میں کیا شبہ ہے؟ اگر کوئی بے چارہ غریب آدمی کوئی جرم کرلے اس کی تأویل بھی ہوسکتی ہے، لیکن ہم تأویل نہیں کریں گے، کبھی کوئی غلط فہمی ہوگئی، اس کی بھی تأویل نہیں کریں گے، اور اس غریب پر ایک ایک گز کی زبان ہم میں سے ہر ایک کی کھلی ہوئی ہوگی، چلو اس نے جرم کیا، سزا مل جائے گی، مجھے اور آپ کو اس کے بارے میں بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں بھائی! میرا اور آپ کا کیا قصہ ہے اس میں؟ لیکن نہیں ہم میں سے ہر ایک آدمی کی ایک گز زبان باہر نکلی ہوئی ہوگی اور پورے محلے میں جہاں جہاں تک معلوم ہوگا ہر ایک آدمی باتیں کرے گا۔ کیوں کرتے ہو؟ تمہارا اس مسئلے سے کیا تعلق ہے؟ صرف اس لئے کہ وہ غریب ہے، کمزور ہے، جس آدمی کو بات نہیں کرنی چاہئے وہ بھی کرتا ہے، بھائی! اس سے جرم ہوا اور قانون نے اس کو پکڑ لیا، سزا مل جائے گی بس ختم، تم بیچ میں کیوں بولتے ہو؟ اور کیوں تبصرے کرتے ہو؟ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن یہ تمہارے تبصرے کس مد میں آئیں گے؟

اور اگر کوئی بڑا آدمی جرم کرلیتا ہے تو سب اس کی تأویل کرتے ہیں اور اس کو چھپاتے ہیں اور عدالت تک پہنچ کر اس جج کو رشوت بھی دینی پڑے تو سزا کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر ہلاکت میں کیا شبہ ہے؟ تو بھائی! غصہ للہ فی اللہ ہونا چاہئے، اللہ کی خاطر غصہ ہونا چاہئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ اللہ کی خاطر آتا تھا، اپنی ذات کے لئے نہیں۔

صوفیائے کے اخلاق:

تو صوفیا کے اخلاق میں سے یہ ہے کہ جو چیز اپنے خلاف جاتی ہو، اس کو تو برداشت کرتے جاؤ، اس کو حلم کہتے ہیں اور جو چیز دین کے خلاف جاتی ہو تو اللہ کے

لئے غصہ کرو، یہ الغضب للہ اور الغضب فی اللہ کہلاتا ہے، محبت بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، غصہ بھی اللہ کے لئے ہو، کسی سے محبت رکھو وہ بھی اللہ کی خاطر رکھو اور کسی سے بغض رکھو تو وہ بھی اللہ کی خاطر رکھو۔ یہ ایمان کا بہت اونچا منصب ہے۔

اونچا مقام:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

”مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ.“ (مشکوٰۃ ص:۱۴)

ترجمہ:...... ”جس نے محبت رکھی تو اللہ تعالیٰ کے لئے، بغض رکھا تو اللہ کے لئے، کسی کو کچھ دیا تو اللہ تعالیٰ کے لئے، نہ دیا تو اللہ کے لئے، اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔“

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ایثار و مواسات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

''ایثار'' کے معنی ہیں اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینا اور ''مواسات'' کے معنی ہیں ایک دوسرے کی ہمدردی، خیرخواہی اور غم خواری کرنا۔

ایک صحابی کا ایثار:

اس سلسلے میں حدیث شریف کا ایک واقعہ ذکر کیا گیا تھا کہ:

"..... فَذَهَبَ اِلٰی اَهْلِهٖ فَقَالَ لِامْرَأَتِهٖ: ضَيْفُ رَسُوْلِ اللهِ لَا تَدَّخِرِيْهِ شَيْئًا. قَالَتْ: وَاللهِ مَا عِنْدِیْ اِلَّا قُوْتُ الصِّبْيَةِ! قَالَ: فَاِذَا اَرَادَ الصِّبْيَةُ الْعَشَاءَ فَنَوِّمِيْهِمْ وَتَعَالِیْ فَاَطْفِئِی السِّرَاجَ وَنَطْوِی بُطُوْنَنَا اللَّيْلَةَ. فَفَعَلَتْ ثُمَّ غَدَا الرَّجُلُ عَلٰی رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ .... فَاَنْزَلَ اللهُ: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ." (صحیح بخاری ج:۲ ص:۷۲۵، ۷۲۶)

ترجمہ:...... ''رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک

مہمان کو ایک صحابی اپنے گھر لے گئے (ان کے پاس گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی)، بیوی نے کہا کہ: اتنا کھانا ہے جو صرف بچوں کو کھلایا جاسکے۔ اس صحابی نے فرمایا کہ: بچوں کو تم بہلادو، کھانا تیار کردو، ہم بیٹھ کر کھانا کھانے لگیں گے تو تم چراغ گل کردینا۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا، مہمان نے کھانا کھالیا اور وہ میاں بیوی اپنے بچوں کے ساتھ بھوکے رہے، صبح کو قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی:

"وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ." (الحشر:۹)

ترجمہ:......"اور وہ دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اپنی ذات پر اگرچہ خود فاقہ اور حاجت ہو۔"

بکری کی سری کا سات گھروں سے واپس آنا:

اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

"(وَاَخْرَجَ الْوَاحِدِيُّ) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: اَهْدَى الرَّجُلُ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأْسَ شَاةٍ، فَقَالَ: اِنَّ اَخِيْ فُلَانًا وَعِيَالُهُ اَحْوَجُ اِلٰى هٰذَا مِنَّا، فَبَعَثَ بِهِ اِلَيْهِ، فَلَمْ يَزَلْ يَبْعَثُ وَاحِدٌ اِلٰى آخَرَ حَتّٰى تَدَاوَلَهَا اَهْلُ سَبْعَةِ اَبْيَاتٍ حَتّٰى رَجَعَتْ اِلٰى اُولٰئِكَ فَنَزَلَتْ: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ."

(التفسیر المنیر پارہ:۲۸ ص:۷۹)

ترجمہ:......"ایک آدمی مشقت میں تھا یعنی گھر میں

فاقہ تھا، اس کو کوئی شخص بکری کی بھنی ہوئی سری دے گیا، اس
نے یہ سوچا کہ میرا ہمسایہ مجھ سے زیادہ مستحق ہے، اس صحابی نے
وہ سری اس کے گھر بھیج دی، ان دوسرے نے تیسرے کے
پاس، تیسرے نے چوتھے کے پاس، یہاں تک کہ سات جگہ
گھومنے کے بعد وہ سری واپس اس کے پاس آگئی اور اس پر حق
تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

"وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ
خَصَاصَةٌ." (الحشر:۹)

ترجمہ:...... "یہ لوگ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے
ہیں چاہے خود کو بھوک ہو۔"

مسلمانوں کے ایثار کا واقعہ:

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوالحسن انطاکیؒ فرماتے ہیں کہ: ایک دفعہ تیس سے اوپر کچھ آدمیوں کا مجمع جمع ہوگیا اور کھانے کے لئے صرف پانچ روٹیاں تھیں، رات کا وقت تھا، ان روٹیوں کے ٹکڑے کردیئے گئے، دسترخوان پر بچھادیئے گئے، دوستوں نے مشورہ دیا کہ بھائی کون کتنا کھاتا ہے، کون کتنا نہیں کھاتا پتہ نہ چلے، چراغ گل کردو، چراغ بجھادو، چراغ بجھادیا تو کھاپی کر سب کے سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن کھانا سب کا سب باقی تھا، کسی نے بھی نہیں کھایا اس خیال سے کہ میں بھوکا رہ جاؤں تو کوئی حرج نہیں دوسرے کھالیں، یہ ایثار ہے۔

دیانت کے امتحان کا ایک واقعہ:

اس کے مقابلے میں وہ مشہور حکایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک بادشاہ نے اپنی رعایا کا امتحان لینے کے لئے کہ لوگوں میں کتنی امانت پائی جاتی ہے؟ یہ حکم دیا کہ یہ

ایک حوض ہے، رات کے اندھیرے میں اس میں ایک ایک گلاس دودھ کا ڈالتے جاؤ، صبح کو یہ بھرا ہوا ہونا چاہئے، لیکن ایک گلاس سے زیادہ کوئی نہ ڈالے، صبح ہوئی تو وہ پانی سے بھرا ہوا تھا، ایک شخص نے یہ خیال کیا کہ میں ایک گلاس پانی کا ڈال دوں گا دوسرے لوگ تو دودھ ہی ڈالیں گے ناں! تو کیا پتہ چلے گا؟ سب نے یہ خیال کر کے کہ میرے ایک گلاس سے کچھ پتہ نہیں چلے گا، ہر ایک نے پانی کا گلاس ڈال دیا، صبح کو بجائے دودھ کے حوض پانی سے بھرا ہوا تھا۔ یہ دیانت و امانت کا امتحان تھا۔

جنگِ یرموک میں دو صحابہؓ کا ایثار:

صحابہ کرامؓ میں حضرت حذیفہ عدوی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"اِنْطَلَقْتُ يَوْمَ الْيَرْمُوْكِ اَطْلُبُ ابْنَ عَمٍّ لِيْ وَمَعِيْ شَيْءٌ مِّنَ الْمَاءِ وَاَنَا اَقُوْلُ اِنْ كَانَ بِهٖ رَمَقٌ سَقَيْتُهٗ، فَاِذَا اَنَا بِهٖ، فَقُلْتُ لَهٗ: اَسْقِيْكَ؟ فَاَشَارَ بِرَأْسِهٖ اَنْ نَعَمْ، فَسَمِعَ آخَرَ يَقُوْلُ: آهْ! آهْ! فَاَشَارَ اِلَيَّ ابْنُ عَمِّيْ اَنِ انْطَلِقْ اِلَيْهِ فَاِذَا هُوَ هِشَامُ بْنُ الْعَاصِ، فَقُلْتُ: اَسْقِيْكَ؟ فَاَشَارَ اَنْ نَعَمْ، فَسَمِعَ آخَرُ يَقُوْلُ: آهْ! آهْ! فَاَشَارَ هِشَامٌ اَنِ انْطَلِقْ اِلَيْهِ، فَجِئْتُهٗ فَاِذَا هُوَ قَدْ مَاتَ، فَرَجَعْتُ اِلٰى هِشَامٍ فَاِذَا هُوَ قَدْ مَاتَ، فَرَجَعْتُ اِلٰى ابْنِ عَمِّيْ فَاِذَا هُوَ قَدْ مَاتَ."

(تفسیر قرطبی ج:۱۸ ص:۲۲)

ترجمہ:......"میں جنگ یرموک میں (یرموک کی جنگ ہوئی تھی، یرموک جگہ کا نام ہے، یہ جنگ اہل فارس کے ساتھ ہوئی تھی اور بڑی شدید جنگ تھی، بہت سے صحابہؓ اور تابعینؒ اس میں شہید ہوئے تھے، بہت ہی سخت معرکہ تھا) کہنے لگے کہ میں زخمیوں میں اپنے چچازاد بھائی کی تلاش میں نکلا، میرے پاس

تھوڑا سا پانی تھا، خیال تھا کہ اگر کوئی رمق زندگی کی باقی ہوگی تو میں اس کو پانی پلاؤں گا، چنانچہ تلاش کرتے ہوئے میرا چچازاد بھائی مجھے مل گیا، وہ اس وقت زندہ تھا، میں نے کہا کہ: تمہیں پانی دوں؟ انہوں نے سر سے اشارہ کیا کہ ہاں! کہتے ہیں کہ میں پانی اس کو دینے لگا اتنے میں ایک اور شخص کے کراہنے کی آواز آئی، اس نے اس کی طرف اشارہ کردیا کہ اس کو پہلے دو، یہ صاحب ہشام بن عاص تھے، میں ان کے پاس دوڑا ان کو پانی دینے کے لئے اتنے میں ان کے کان میں دوسرے آدمی کی آواز پہنچی، انہوں نے کہا کہ اس کو دو، وہ ذرا تھوڑے فاصلے پر تھے میں ان کے پاس پہنچا تو وہ مسافر ہوچکے تھے، اپنی جان جانِ آفرین کے حوالے کرچکے تھے، میں ان کو پانی نہیں پلاسکا، لوٹ کر ہشام بن عاص کے پاس پہنچا تو وہ بھی رخصت ہوچکے تھے، وہاں سے اپنے چچازاد بھائی کے پاس آیا تو میرے آنے تک وہ بھی ختم ہوچکے تھے۔''

موت کے وقت کی پیاس کی شدت اور خصوصاً گرمی کے موسم میں زخمی کے لئے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے ایثار اور قربانی کی ایسی مشق ہوگئی تھی کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، باوجودیکہ خود موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

ایثار کی تعریف اور مقام:

ایک بزرگ ہیں ابوحفص رحمہ اللہ تعالیٰ وہ فرماتے ہیں کہ ایثار یہ ہے کہ

اپنے بھائیوں کی لذتوں کو اور ان کے حصوں کو اپنے نفس کے حصے پر ترجیح دی جائے، دنیا میں اور آخرت میں۔ یعنی آدمی یہ چاہے کہ دوسرا مجھ سے آگے بڑھ جائے میں پیچھے رہ جاؤں۔

اعمالِ صالحہ میں ایثار کا حکم؟

اس میں علماؑ کا اختلاف ہے کہ خیر کے کاموں میں ایثار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثال کے طور پر پہلی صف کی فضیلت ہے، اب ایک آدمی پہلی صف میں آکے بیٹھا ہے اور پیچھے دوسری صف میں کوئی نیک آدمی آکر بیٹھ گیا تو کیا اس کو اپنی جگہ چھوڑ کر اس بزرگ کو جگہ دینی چاہئے یا نہیں؟ اس معاملے میں ایثار کرنا چاہئے کہ پہلی صف کی فضیلت میرے بجائے اس بزرگ کو حاصل ہوجائے؟

بعض حضرات نے اس سے منع کیا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ علامت ہوگی اس بات کی کہ یہ شخص ثواب سے مستغنی ہے، اس کو ثواب کی ضرورت نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ثواب سے مستغنی ہونا ظاہر ہے کہ اچھی بات نہیں ہے، بہت بری بات ہے۔

لیکن محققین کہتے ہیں کہ نہیں! قربات اور عبادات میں بھی ایثار جائز ہے، اس لئے کہ اس کا منشا یہ ہوگا کہ میری عبادت تو پتہ نہیں قبول ہوتی ہے یا کہ نہیں ہوتی؟ اللہ کے اس نیک بندے کی قبول ہوجائے گی اور اس کی برکت سے میری بھی قبول ہوجائے گی، تو اس میں ایک تو دوسرے کو اپنے اوپر مقدم کرنا ہوا، ایثار ہوا اور ایثار اچھی خصلت ہے، دوسرے اس میں بزرگ داشت بھی ہے۔

بزرگ داشت کی تلقین:

ایک دفعہ ایک صحابی عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ ان کا نام ہے، یہ خیبر کے علاقے میں مقتول پائے گئے یعنی کسی نے ان کو قتل کردیا تھا، تو اس مقتول کے دو

چچازاد بھائی اور ایک حقیقی بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کی اطلاع دینے کے لئے حاضر ہوئے، حقیقی بھائی سب سے چھوٹا تھا یعنی عمر میں سب سے چھوٹا تھا اور دوسرے بڑے تھے، حقیقی بھائی بات کرنے لگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کبّر الکبریٰ.“ (مشکوٰۃ ص:۳۰۶) بڑے کو بڑا کرو، یعنی ادب کا تقاضا یہ ہے کہ جس جماعت میں بڑا آدمی موجود ہو، چھوٹے اس جماعت میں نہ بولیں، ہاں جب ان چھوٹوں سے پوچھا جائے جب وہ بولیں، ان سے کوئی بات پوچھی جائے تب بولیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو بزرگ داشت کی یہاں تک رعایت فرماتے تھے کہ گفتگو میں بھی بڑا آدمی گفتگو کرے، چھوٹی عمر کا آدمی گفتگو نہ کرے، بڑے کے سامنے چھوٹی عمر کا آدمی گفتگو نہ کرے۔

دسترخوان کا ادب:

اس لئے اکابر فرماتے ہیں کہ: دسترخوان کا ادب یہ ہے کہ جب بڑا آدمی کھانا شروع کرے تب دوسرے لوگ شروع کریں، جب تک وہ بزرگ شروع نہ کرے تب تک یہ لوگ شروع نہ کریں، یہ نہیں کہ جس کے سامنے کھانا آگیا اس نے کھانا شروع کردیا، یہ خلافِ ادب ہے۔

سب کے سامنے کھانا آئے تو شروع کیا جائے:

میرے والد ماجد اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائے، وہ قصہ ذکر کیا کرتے تھے کہ ہمارے علاقے میں ایک مولوی محمد شفیع صاحب تھے، چکّی ایک گاؤں تھا وہاں کے تھے، ان کی لڑکی کی شادی تھی یا نامعلوم کیا قصہ تھا؟ بہرحال برات آئی ہوئی تھی، اور برات ساری مولویوں کی تھی یا اکثر مولوی اور علماً تھے، اب کھانا رکھنا شروع ہوا تو جس کے سامنے کھانا آیا، اس نے کھانا شروع کردیا، تو دوسروں کے سامنے ابھی کھانا رکھا نہیں گیا کہ انہوں نے ختم کرلیا، لوگوں نے کہا کہ یہ کیا بے تمیزی ہے؟ کھانا پہلے

لگادیں اس کے بعد کھانا شروع کرنا چاہئے، تو مولوی صاحبان نے کہا کہ جب کھانا سامنے آجائے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے بعد انتظار نہیں کرنا چاہئے، ہمارے سامنے کھانا آگیا تھا ہم نے کھانا شروع کردیا۔ میرے والد صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا محمد شفیع صاحب نے ان کو ڈانٹا اور کہا کہ: تمہیں عقل اور تمیز تو ہے نہیں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ جب کھانا سامنے آئے تو کھانا شروع کردیجئے، جب ایک جماعت بیٹھی ہو، جب تک پوری جماعت کے سامنے کھانا نہ آجائے، اس وقت تک شروع نہ کرو اور ابھی تک پوری جماعت کے سامنے کھانا نہیں آیا، تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔

واقعی مولانا محمد شفیع صاحب نے بہت اچھی بات کہی، ایک آدمی کے سامنے کھانا لاکر رکھ دیا اور ایک ہی کھانے والا ہے، اکیلا ہے تو ٹھیک ہے کھائے، لیکن پندرہ آدمیوں کی جماعت دسترخوان پر بیٹھی ہے، ایک آدمی کے سامنے کھانا رکھ دیا اگر وہ کھانا شروع کرے گا تو بے تمیز ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جماعت میں سے جس کے سامنے کھانا آجائے وہ کھانا شروع کردے، یہ آدمی نہیں جانور ہے کہ جس کو اتنی بھی تمیز نہیں۔ تو دسترخوان کے بھی آداب ہوتے ہیں بھائی! اور یہ آداب بھی ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور بزرگانِ دین سے معلوم ہوتے ہیں۔

دسترخوان پر ہاتھ دھلانے کی ترتیب:

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ایک دفعہ حضرت امام مالکؒ کی خدمت میں ایک مہمان آیا ہوا تھا، دسترخوان رکھا گیا تو خادم ہاتھ دھلانے لگا، مہمان کے پہلے ہاتھ دھلانے لگا حضرت امامؒ نے فرمایا: تمہیں تمیز نہیں ہے، پہلے میزبان کے ہاتھ دھلایا کرتے ہیں، پہلے میرے ہاتھ دھلاؤ۔ کھانے

سے فارغ ہوئے تو وہ خادم حضرت امامؒ کے ہاتھ دھلانے لگا، فرمایا: تجھے تمیز نہیں ہے، مہمان کے ہاتھ پہلے دھلایا کرتے ہیں، یہ حضرات بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں۔

بزرگوں کی ذکاوت حس:

ہمارے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ: لوگ بزرگوں کو بے حس سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ جو معاملہ کرتے رہو ٹھیک ہے، ان کو کوئی احساس نہیں ہوتا، بزرگ جو ہوئے۔ یہ اکابر بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں لیکن پھر مزاج اپنا اپنا پایا ہے، بعض حضرات فوراً ٹوک دیتے ہیں اور بعض برداشت کر لیتے ہیں، تسامح کر لیتے ہیں۔

بزرگوں کے اختلافِ مزاج کا قصہ:

ایک دفعہ کسی کو کیا سوجھی کہ وہ ایک بزرگ کا امتحان کرنے لگا، اس بزرگ کو کہہ دیا: حضرت! فلاں وقت آپ کی دعوت ہے، بزرگ کہنے لگے کہ بہت اچھا! وہ آدمی کہنے لگا کہ میں لینے کے لئے نہیں آؤں گا، آپ خود تشریف لے آیئے، فلاں وقت پر آپ آجائیں یعنی عصر کے بعد یا مغرب کے بعد جو وقت بھی دیا، بزرگ فرمانے لگے حاضر ہو جائیں گے، وہ بزرگ تشریف لے گئے تو میزبان صاحب پوچھتے ہیں کہ: حضور! کیسے تشریف آوری ہوئی؟ کہا کہ: بھائی! تم نے دعوت کی تھی، مجھے بلایا تھا! کہنے لگا کہ: کس نے دعوت کی تھی؟ وہ بزرگ فرمانے لگے کہ: کوئی بات نہیں، واپس چلے جاتے ہیں، واپس چلے گئے، جب گلی کی نکڑ پر پہنچ گئے تو وہ آدمی پیچھے پیچھے آیا کہنے لگا کہ: آپ عجیب آدمی ہیں! میں نے آپ کو بلایا ہے دعوت کے لئے اور آپ جا رہے ہیں؟ بزرگ کہنے لگے: اچھا بھائی! وہاں سے پھر وہ لوٹ آئے اور گھر آکر پھر وہ آدمی پوچھتا ہے کہ: آپ کیا دوبارہ پھر آگئے؟ بزرگ نے فرمایا: اچھا بھئی! چلے جاتے ہیں۔ نکڑ پر اس آدمی نے پھر روک لیا، پھر لوٹا دیا، تین دفعہ ایسا ہی کیا، بعد میں اس آدمی نے ہاتھ جوڑے، منت سماجت کی کہ حضرت! میں نے گستاخی کی ہے،

معاف کردیں، میں آپ کا امتحان کرنا چاہتا تھا واقعی آپ اللہ والے ہیں۔ بزرگ نے فرمایا: اس میں "اللہ والے" کی کیا ضرورت تھی، یہ تو کتے کی خصلت ہے، اس کو ٹکڑا ڈالو، آجاتا ہے، دھتکار دو چلا جاتا ہے، اس میں "اللہ والے" کی کیا بات ہے؟ کتے کو دھتکار دو چلا جاتا ہے، پیچھے ہٹ جاتا ہے جب ٹکڑا دکھاؤ واپس آجائے گا، دس دفعہ اس کو دھتکار دو پھر آجائے گا، اس میں اللہ والے کی کیا بات ہے؟ اس میں کیا بزرگی ہے؟ اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے بھی ہوتے ہیں ہر ایک کا اپنا مزاج ہے۔

دلّی کے تین بزرگوں کے اختلافِ مزاج کا قصہ:

حضرت تھانوی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: دلّی میں تین بزرگ تھے، تینوں ہم عصر، ایک ہی زمانے میں تین قطب تھے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں قدس سرہ اور ایک اور بزرگ تھے۔ کسی شخص نے ان تینوں کا امتحان کرنا چاہا، تینوں کو دعوت کہہ دی کہ حضرت! فلاں وقت دعوت ہے آپ تشریف لے آئیں۔ الگ الگ دعوت کہہ دی، یہ تینوں حضرات تشریف لے گئے، اس نے گھر میں کھانے پکانے کا کوئی سامان نہیں کیا تھا، یہ چلے گئے تو ان کو بٹھادیا اور خود کھسک گیا، کہیں گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد واپس آیا تو دو دو پیسے نکال کر دے دیئے، کہنے لگا کہ: حضور! معاف کیجئے کھانے کا انتظام نہیں ہوسکا۔ اس نے صرف یہ دیکھنا تھا کہ ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ ایک بزرگ غالباً ان کا نام فخر الدین تھا یا کیا تھا مجھے بھولتا ہے، انہوں نے تو شکریہ ادا کیا اور کہا کہ: بھائی! کوئی بات نہیں ہے، ایسا ہوجاتا ہے، پریشان ہونے کی بات نہیں، مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ہماری وجہ سے پریشانی ہوئی کیونکہ گھر مہمان بیٹھے ہوں اور گھر والوں سے کھانے کا بندوبست نہ ہوسکے تو گھر والوں اور میزبان کو پریشانی ہوتی ہے، ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو ہماری وجہ سے پریشانی ہوئی، معذرت چاہتے ہیں، دو پیسے لیئے اور شکریہ ادا کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ

محدث دہلوی قدس سرہ نے دو پیسے تو لے لیئے لیکن کہا کچھ نہیں خاموش رہے، برداشت کرلیا۔ اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں قدس سرہ نہایت ذکی الحس بزرگ تھے، نقشبندی سلسلے کے اکابر اولیأ اللہ میں سے ہوئے ہیں، بہت اونچے آدمی تھے، شیعوں نے ان کو ان کے گھر میں شہید کردیا تھا اور آپؒ نے شہادت سے تین چار دن پہلے اپنے دوستوں سے فرمایا کہ: بھائی! ہمارا انتقال ہوجائے تو قبر کی لوح پر ہمارا یہ شعر لکھ دینا:

بلوح تربت ما یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہ ایں نیست تقصیرے

یعنی لوگوں نے ہماری قبر کے کتبے پر غیب سے یہ تحریر لکھی ہوئی پڑھی کہ اس مقتول کا کوئی گناہ بے گناہی کے سوانہیں تھا، اس مقتول کا گناہ صرف بے گناہی تھا۔

حضرت مرزا صاحبؒ کا ضبط:

بہت عجیب وغریب صاحبِ کرامت بزرگ تھے، مگر ایک طرف اتنے ذکی الحس اور دوسری طرف بیوی اتنی بدمزاج ملی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ! حضرت کا معمول تھا کہ ایک وقت مقرر کیا ہوا تھا، خادم کو بھیجتے تھے کہ گھر میں بیگم صاحبہ سے پوچھ کر آؤ کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ خادم آتا تو دس بیس تو اس کو سناتی اور دس بیس سناتی اس کے حضرت کو اور پھر بعد میں کوئی کام ہوتا تو بتاتی۔

ایک دفعہ حسب معمول روزانہ جو خادم جایا کرتا تھا وہ نہیں تھا، کسی اناڑی خادم کو بھیج دیا، وہ تھا پٹھان، بیگم صاحبہ نے جب اپنا وظیفہ شروع کیا تو یہ خادم کہتا ہے کہ ہمارے پیر کو ایسے کہتا ہے، قتل کردے گا۔ اور واپس آکے کہا کہ: پیر صاحب! آپ نے ایسا بیوی کیوں رکھا ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا: اوہو غلطی ہوگئی بھائی! تمہیں نہیں بھیجنا تھا، جو جانتے تھے ان کو بھیجنا تھا اور پھر ارشاد فرمایا کہ:

حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے مجھے الہام ہوا تھا کہ تمہارے سلوک کی ترقی اس عورت کے ذریعہ سے ہوگی، اس لئے میں اس کو اپنی محسنہ سمجھتا ہوں۔ اس معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کے عجیب وغریب واقعات ہیں۔

بیوی کے معاملہ میں طرزِ عمل:

ایک بزرگ کی بیوی بہت ہی زیادہ بدمزاج تھی، لیکن اس بزرگ نے کبھی کوئی شکایت کا کلمہ زبان سے نہیں نکالا، اگر کوئی ان کی اہلیہ یعنی گھر والی کی بات کرتا تو حضرت فرماتے کہ: بھائی! اپنے گھر والوں کی شکایت کرنا مروت اور شرافت کے خلاف ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کو طلاق دے دی، جدا کردیا، اب اگر کوئی شخص اس کی بات آکر کرتا تو فرماتے کہ: بھائی! وہ عورت اجنبی ہوچکی ہے، ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا، اجنبی عورت کی باتیں کرنا اخلاق اور مروت کے خلاف ہے۔

مرزا مظہر جانِ جاناں کی ذکاوت حس:

تو حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں قدس سرہ نے دو پیسے تو لے لیئے لیکن ساتھ ہی فرمادیا کہ: دیکھو بھائی! میری ایک بات سنو! میں تو فارغ آدمی ہوں، میرا تو کوئی ایسا ویسا کام نہیں ہے، بقول ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہ کے صرف نور پھیلانا ہے، لیکن یہ حضرات جو ہیں تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی مشغولیات ہیں، مصروفیات ہیں، دیکھو تم نے ان کا کتنا وقت ضائع کیا، تم نے ان کو بلالیا اور پہلے کھانے کا بندوبست نہیں کیا، اگر تم سے نہیں ہوسکتا تھا تو تم پہلے اطلاع دے سکتے تھے، یہ حضرات آنے کی زحمت ہی نہ فرماتے اور پھر تم ان کو چھوڑ کر غائب ہوگئے، تو ان حضرات کا کتنا قیمتی وقت تم نے ضائع کیا، تمہیں اس کا احساس نہیں ہوا، خبردار! آئندہ ایسی غفلت کا مظاہرہ نہ کرنا۔ تو حضرت تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ تینوں بزرگوں نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق بات کی۔

بڑے کی بڑائی کا خیال رکھنا چاہئے:

میں بات کر رہا تھا حدیث شریف کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے کی بڑائی کا حکم دیا ہے، اس پر بات چلی تھی اور بھی بہت سارے ارشادات ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جن میں یہ مضمون ذکر کیا گیا ہے۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ:

"مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا وَلَمْ يُوْجِرْ عَالِمِيْنَا فَلَيْسَ مِنَّا."

ترجمہ:...... "جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، اور ہمارے بڑوں کی توقیر اور تعظیم نہ کرے اور ہمارے علماء کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

امورِ خیر میں ایثار کے فوائد:

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بڑے کی بڑائی کا لحاظ رکھو! تو اس خیال سے کہ بزرگ آدمی ہے، یہ اگلی صف میں کھڑا ہو جائے گا، اس کی عبادت قبول ہو جائے گی، اس کی برکت سے ہماری بھی قبول ہو جائے گی۔ محققین کہتے ہیں کہ اس قسم کا ایثار جائز ہے، اس لئے کہ اس میں بڑے کی تعظیم و توقیر ہے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے۔

نیکی میں ایثار تواضع ہے:

دوسرا اس میں تواضع پائی جاتی ہے، بڑا آدمی پیچھے کھڑا ہو اور چھوٹا آگے کھڑا ہو تو ایک قسم کا کبر ہے اور جبکہ ہمیں تواضع کا حکم دیا گیا ہے۔

ایثار میں فنائیت ہے:

تیسرے اس میں اپنی عبادت پر نظر نہ کرنا۔اور اپنی عبادت کو ہیچ سمجھنا یہ بھی مضمون پایا جاتا ہے۔

نیکی کر کے ڈرنا چاہئے:

قرآن کریم کی ایک آیت ہے:

”وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ.“ (المؤمنون:۶۰)

ترجمہ:......”اور وہ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل کانپ رہے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔“

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

”قَالَتْ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ هٰذِهِ الْآيَةَ: ”وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ.“ قَالَتْ عَائِشَةُ: اَهُمُ الَّذِيْنَ يَشْرَبُوْنَ الْخَمْرَ وَيَسْرُقُوْنَ؟ قَالَ: لَا يَا بِنْتَ الصِّدِّيْقِ! وَلٰكِنَّهُمُ الَّذِيْنَ يَصُوْمُوْنَ وَيُصَلُّوْنَ وَيَتَصَدَّقُوْنَ وَهُمْ يَخَافُوْنَ اَلَّا يُقْبَلُ مِنْهُمْ.“

(قرطبی ج:۱۲ ص:۸۹)

ترجمہ:......”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ: یا رسول اللہ! کیا اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ گناہ کر کے وہ ڈرتے ہیں؟ فرمایا: نہیں! نہیں! بلکہ صدقہ اور خیرات کرتے ہوئے اور عبادت کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ

ہماری لائی ہوئی عبادت قبول ہو یا نہ ہو، جس معیار کی عبادت
اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنی چاہئے ایسی عبادت ہم سے بن
پڑے کہ نہ بن پڑے، خدا جانے یہ قابل قبول بھی ہے یا نہیں؟
اس بات سے کانپتے ہیں کہ ہم اپنے رب کے سامنے جائیں گے
تو کیا منہ دکھائیں گے؟''

امام غزالیؒ کی مغفرت کا سبب:

امام غزالی رحمہ اللہ کا قصہ لکھا ہے ناں! کسی نے وفات کے بعد ان کو دیکھا تو پوچھا: کیا گزری؟ کہنے لگے کہ: میری پیشی ہوئی، مجھ سے فرمایا کہ: ہمارے لیے کیا لائے ہو؟ میں نے کہا: یا اللہ! میں نے آپ کے دین کی طرف دعوت دینے کے لئے بہت سی کتابیں لکھیں، بہت سے وعظ کئے، لوگوں کو آپ کی طرف بلایا، احیاءُ العلوم اور کیمیائے سعادت جیسی کتابیں لکھیں جو کہ آج بھی زندہ جاوید ہیں اور جن کے پڑھنے سے زندگی کا رخ بدل جاتا ہے۔ فرمایا گیا کہ: اس کا معاوضہ تو تمہیں وہاں مل گیا، لوگ تمہیں امام غزالی کہتے تھے، اسی لئے تو کہتے تھے ناں! اس کا معاوضہ تو تمہیں دنیا میں مل گیا، ہمارے لئے کیا لائے ہو؟ عرض کیا: یا اللہ! پھر میرے پاس تو اور کوئی عمل ایسا نہیں جو آپ کی بارگاہ کے لائق سمجھوں۔ فرمایا: تمہارا ایک عمل ہمارے پاس ہے، اس کی وجہ سے تمہاری بخشش کر دی اور وہ عمل یہ ہے کہ ایک دفعہ تم لکھ رہے تھے، تمہارے قلم پر ایک چیونٹی آ گئی، تم نے قلم روک لیا اس خیال سے کہ شاید بے چاری پیاسی ہوگی، وہ روشنائی پی رہی تھی، جب تک وہ ہٹ نہیں گئی تم نے قلم استعمال نہیں کیا، تمہاری یہ نیکی ہمیں پسند آ گئی کہ تم نے ہماری مخلوق پر شفقت کی، جاؤ تمہاری بخشش کرتے ہیں۔ تو آدمی کی اپنی عبادت پر نظر نہیں ہونی چاہئے۔

عبادت کی دو حیثیتیں:

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ عبادت کی دو حیثیتیں ہیں، جو کام بھی ہم کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں یا کوئی اور کام کرتے ہیں اس کی دو حیثیتیں ہیں،

ایک تو یہ کہ ہمارا فعل ہے اس حیثیت سے تو یہ لائق اعتبار ہی نہیں ہے، ہماری کوئی عبادت بھی لائق اعتبار نہیں ہے۔

اور ایک حیثیت اس کی یہ ہے کہ یہ تحفۂ خداوندی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں تحفہ ملا ہے، اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہم نے نماز پڑھ لی، اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہم نے روزہ رکھ لیا، اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہم نے عبادت کرلی، یہ عطیاتِ الٰہیہ ہیں، تحفۂ خداوندی ہیں، اللہ تعالیٰ کے تحفے ہیں جو حق تعالیٰ شانہ اپنے بندوں کو مرحمت فرماتے ہیں، فرمایا اس لحاظ سے ہماری عبادتیں تمام کی تمام لائق قدر ہیں۔

اور پھر فرماتے ہیں کہ اگر پہلی حیثیت پر نظر کرو گے تو عبادت پر فخر پیدا ہوگا، اور فخر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول نہیں، مردود ہے، اور دوسری حیثیت پر نظر کرو گے تو شکر پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے ہمیں توفیق عطا فرمادی۔

اہل جنت کا شکر:

چنانچہ جنتی جب جنت میں جائیں گے تو قرآن کریم میں ہے کہ کہیں گے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ
لَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ." (الاعراف:۴۳)

ترجمہ:...... ''اس اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم کو اس کی ہدایت عطا فرمادی، (جنت میں جانے کی، جنت

میں جانا تو اعمال کے ذریعہ سے ہے، ان اعمال کی ہدایت عطا فرمادی جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جنت میں پہنچادیا) اور ہم ایسے نہیں تھے کہ ہدایت پالیتے اگر اللہ ہمیں ہدایت عطا نہ فرماتے (اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہیں پاسکتے تھے، توفیق شامل حال نہ ہوتی تو نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، توفیق شامل حال نہ ہوتی تو مسجد میں نہیں آسکتے تھے)۔"

آنے نہیں دیتا:

وہ کہتے ہیں ناں! کہ ایک غلام تھا، ایک آقا تھا۔ غلام نیک آدمی تھا اپنے آقا سے کہنے لگا کہ: نماز کا وقت ہورہا ہے اگر اجازت ہو تو میں نماز پڑھ لوں؟ آقا نے کہا کہ: پڑھ لو! غلام نماز پڑھنے گیا تو تھوڑی سی دیر لگادی تو آقا باہر سے آواز دیتا ہے کہ: ابے آبھی جا! باہر کیوں نہیں آتا؟ غلام مسجد کے اندر سے کہتا ہے کہ: مجھے آنے نہیں دیتے۔ کہا: ابے تمہیں کون نہیں آنے دیتا؟ کہا: جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتا۔

نیکی پر ناز نہیں شکر چاہئے:

جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ کام لیتے ہیں وہ ناز نہ کریں بلکہ شکر کریں جن سے کام لے رہے ہیں، جیسا بھی لے رہے ہیں وہ اس پر شکر بجالائیں، اگر عبادت کی اس حیثیت کو دیکھا جائے کہ یہ عطیۂ الٰہی ہے، عطیۂ خداوندی ہے، مالک کا عطیہ ہے کہ ہمیں سجدے کی توفیق عطا فرمادی، کہاں ہم اور کہاں اس کی پاک بارگاہ! اللہ اکبر! کوئی نسبت بھی ہے، ہم جیسے چماروں کو کون پوچھتا ہے؟ یہ مالک کا احسان ہے کہ ہمیں پکڑ کر اپنے دروازے پر جھکادیا کہ ہمارے سامنے سجدہ کرو، سبحان اللہ! کیا شفقت ہے، کیا عنایت ہے، کیا رحمت ہے، جہاں ملائکہ مقربین سربسجود ہوں اور جہاں انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سجدے میں پڑے ہوئے ہوں، وہاں ہم جیسوں کو کون

پوچھتا ہے؟ اور ان کو کیا ضرورت ہے ہمارے سجدوں کی؟ لیکن کتنا کرم ہے، کتنا احسان ہے اور کتنی عنایت اور کتنا بڑا لطف ہے کہ جہاں ملائکہ سجدہ کر رہے ہیں، جہاں انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سجدہ کر رہے ہیں، ہمیں کہہ دیا کہ تم بھی آجاؤ! آجاؤ آجاؤ! شاباش تم بھی شامل ہوجاؤ، تم بھی جماعت میں شامل ہوجاؤ:

اجازت ہو تو شامل میں بھی آکے ان میں ہوجاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہوگا!

شکر بجالاؤ اللہ تعالیٰ کا کہ حق تعالیٰ شانہ نے جیسے بھی بری بھلی ہم سے پڑھی جاتی ہے یا اور کوئی نیکی کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمادی، ہاں! اچھی سے اچھی کرنے کی کوشش کرو، اپنے فعل پر ناز نہ کرو، بلکہ عطیۂ الٰہی پر شکر کرو۔

مالک کا لطف وکرم:

میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں تو بڑا مزہ آتا ہے، بڑا ہی مزہ آتا ہے، کیا مالک کی حکمت ہے، کیا مالک کی شان ہے اور کتنا مالک کا احسان ہے کہ ہمیں توفیق عطا فرمادی، ہم اس بارگاہ کے لائق تھے یا اللہ! ہمارا شمار بھی انسانوں میں ہونے لگا، یا اللہ! آپ نے ہمیں بھی آدمی سمجھ لیا، ہم تو حیوانوں سے بدتر تھے، کتنا کرم ہے آپ کا کہ آپ نے لاکے نہلا دھلا کر اپنی بارگاہ میں بلالیا اور کہا کہ: ہاں! سجدہ کرو ہمارے سامنے! اچھا ہمارے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہوجاؤ! جھکو! مانگو کیا مانگتے ہو؟ دعائیں مانگ رہے ہیں، سجدہ کر رہے ہیں، نیاز کر رہے ہیں، عجز کر رہے ہیں، یہ سب مالک کے لطف وکرم کے عطا پر ہیں، تو خیر بحث اس پر چلی تھی کہ ایثار فی القرب جائز ہے کہ نہیں؟

عبادت میں ایثار پر کراہت کا قول:

علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس پر بحث کی ہے اور فرماتے ہیں کہ بعض اکابر

نے اس کو مکروہ کہا ہے کہ عبادت میں ایثار نہیں ہونا چاہئے، مثال میں نے دی ہے ناں! کہ پچھلی صف میں ایک بزرگ کھڑا تھا، اگلی صف کا ثواب زیادہ ہے تو پچھلی صف میں یہ چلا جائے اور اس کو آگے کر دے۔

بعض اکابر نے کہا کہ نہیں! ایسا نہیں کرنا چاہئے جیسا وہ بندہ ہے ویسے یہ بندہ ہے، جیسے وہ محتاج ہے ثواب کا ویسے ہی یہ بھی محتاج ہے۔

عبادت میں ایثار پر محققین کا قول:

لیکن محققین کہتے ہیں کہ نہیں، کرنا چاہئے! اس لئے کہ اس صورت میں اپنی عبادت کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ قابل قبول ہو اور اللہ کے مقبول بندے کی عبادت کو لائق قبول اور قابل قبول سمجھتا ہے تو یہ تواضع ہے اور بزرگ داشت ہے، اس لئے اس میں ایثار کرنا چاہئے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

جذبۂ ایثار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

ایک بزرگ ابو حفص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

ایثار یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کے فوائد میں اپنے نفس پر دوسرے بھائیوں کو مقدم کیا جائے۔ اور بعض اوقات انہوں نے یہ فرمایا کہ دنیا کی منفعت تو بہت قلیل ہے، دنیا کے معاملہ میں کسی دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دینا یہ تو معمولی بات ہے، ایثار یہ ہے کہ: آخرت کے معاملہ میں دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دی جائے۔

ایک بزرگ کے ایثار کا قصہ:

ایک بزرگ سے ان کے دوست کی ملاقات ہوئی، تو انہوں نے ان کے ساتھ خندہ پیشانی کا مظاہرہ نہیں کیا، جیسا پرتپاک ملنا چاہئے، ویسے نہیں ملے، ان کے دوست نے شکایت کی تو فرمانے لگے کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی سنا ہے:

ترجمہ:......"جب دو بھائی آپس میں ملیں تو ان میں سے جو شخص زیادہ خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرے اس کو دس گنا

ثواب ملتا ہے، اور جو کم کرے اس کو ایک ثواب ملتا ہے۔ تو میرا جی چاہا کہ آپ کا ثواب مجھ سے بڑھ جائے، اس لئے میں نے کم خندہ پیشانی کا مظاہرہ کیا، تاکہ میرا ثواب آپ سے نہ بڑھے، بلکہ آپ کا ثواب مجھ سے بڑھ جائے۔“

ایثار کی تعریف:

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ایثار یہ ہے کہ: اپنے حقوق پر دوسرے کے حقوق کو مقدم کیا جائے، اور اس میں عزیز، قریب، رشتہ دار، دوست احباب، جان پہچان والے یا دوسرے لوگ جن کے ساتھ جان پہچان نہیں، ان کے درمیان امتیاز نہ کیا جائے، بلکہ ہر کس و ناکس جو بھی ہو، اس کے حقوق کو اپنے حقوق پر مقدم کرنا یہ ایثار ہے۔

دوستی اور قرابت کی پاسداری ایثار نہیں:

وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر آپ قرابت، دوستی اور تعلق کی بنا پر دوسرے کو ترجیح دیتے ہیں، تو یہ جو دوستی اور قرابت درمیان میں آگئی، اگرچہ پہلے قرابت کے حقوق ادا کرنا یہ بھی حکم خداوندی کی بنا پر ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے کسی سے دوستی رکھنا یہ بھی رضاءِ الٰہی کے لئے ہے، لیکن حقوق ادا کرتے ہوئے درمیان میں رشتہ داری کا آجانا، قرابت کا آجانا، دوستی کا آجانا اس میں اخلاص نہیں رہتا۔ مسئلہ تو اس شخص کے بارے میں ہے کہ جس کے ساتھ ہماری کوئی جان پہچان نہیں ہے، کوئی تعلق اس کے ساتھ نہیں ہے، اس کے حقوق کو ادا کرنا محض اللہ کی خاطر یہ ایثار ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ مکارم اخلاق کے بارے میں بیان فرما رہے تھے، اسی کے ضمن میں فرمایا:

”وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ.“

(مشکوٰۃ ص:۳۹۷)

ترجمہ:......"سب کو سلام کہنا (سلام کہنے میں ابتدأ کرنا) چاہے اس شخص کے ساتھ جان پہچان ہو یا جان پہچان نہ ہو۔"

ایک صوفی کے ایثار کا قصہ:

ایثار کا یہ سب سے عالی مرتبہ ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، محض رضائے الٰہی کے لئے دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا یہ ایثار ہے۔

ایک بزرگ تھے، ان کے ساتھ صوفیوں کی ایک جماعت تھی، اپنے ایک دوست کے گھر پر گئے، دیکھا کہ گھر پر تالا لگا ہوا ہے، فرمانے لگے: صوفی کے گھر میں تالا؟ ماشاءاللہ! توڑ دو اس تالے کو، تالا توڑ دیا اور مکان کا سارا سامان بازار میں بکوادیا، وہ صوفی جی کہیں گئے ہوئے تھے، واپس آئے تو دیکھا کہ شیخ بیٹھے ہیں، ان کے ساتھ مہمان بھی بیٹھے ہیں، ان کی اہلیہ کا ایک کمبل تھا جو اس نے اپنے اوپر لیا ہوا تھا، واپسی پر وہ بھی اتار کر شیخ کے پاس بھیج دیا اور کہا کہ: یہ بھی گھر کے سامان میں تھا، فروخت ہونے سے رہ گیا ہے۔ ان کے شیخ کہنے لگے کہ: اس کے بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، یہ تو تم اپنے پاس رکھ لیتے! ان کی اہلیہ کہنے لگیں کہ: اتنے بڑے بزرگ ہیں جو ہمارے گھر میں تصرف کر رہے ہیں، گھر کا سامان بیچ رہے ہیں، تو ایک چیز ان سے کیوں چھپا کر رکھی جائے؟ یہ ہمارے لئے بڑی سعادت اور برکت ہے کہ اتنے بڑے بزرگ، ہمارے گھر میں مالکانہ تصرف کر رہے ہیں، یہ ہے ایثار!

یمن کے اشعریوں کا ایثار:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعریوں کی تعریف فرمائی، قبیلہ اشعریمن کا ایک قبیلہ تھا، یہ قبیلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا قبیلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حاضری سے بہت خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ:

"اَلْاِیْمَانُ یَمَانِیٌّ وَالْحِکْمَۃُ یَمَانِیَّۃٌ."

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۵۳)

ترجمہ:......"ایمان بھی یمنی ہے اور حکمت بھی یمنی ہے۔"

اہل یمن کی بہت تعریف فرمائی ہے۔ تو ایک موقع پر ان کی تعریف فرماتے ہوئے فرمایا: یہ اشعری لوگ جب جہاد میں ہوں اور ان کو فقر و فاقہ لاحق ہوجائے یا ان کے توشے کم ہوجائیں، تو یہ ایسا کرتے ہیں کہ سب کے توشے ملاکر ایک کپڑے میں جمع کردیتے ہیں، اور پھر سب میں برابر تقسیم کردیتے ہیں، حالانکہ کسی کے پاس زیادہ ہوگا اور کسی کے پاس کم، تو سارے توشے اکٹھے کرلو اور اکٹھے کرکے ان کو برابر برابر تقسیم کرلیا کرو۔

ایثار کی تلقین:

ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں دیکھا کہ کچھ لوگوں کے پاس سواری نہیں ہے، کپڑا نہیں ہے، توشہ نہیں ہے، اس موقع پر آپؐ نے خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا کہ: جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اپنے بھائی کو دے دے، جس کے پاس زائد کپڑا ہو وہ اپنے بھائی کو دے دے، جس کے پاس زائد توشہ ہو وہ اپنے بھائی کو دے دے، وہ صحابی فرماتے ہیں کہ یہاں تک کہ ہم لشکر والوں کو یہ خیال ہوا کہ ہمارے پاس جو چیز بھی زائد ہو، اس میں ہمارا حق نہیں ہے، دوسروں کا حق ہے۔

حضرت زینبؓ کو ایثار کی تلقین:

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا قصہ تو بہت مشہور ہے، غالباً حجۃ الوداع سے واپسی کا قصہ ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی سواری کا اونٹ بیمار ہوگیا تھا، تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو فرمایا کہ: تم اپنا اونٹ اپنی بہن صفیہ کو دے دو! اس لئے کہ ان کے پاس زائد ہوگا، چونکہ سوکنوں کی آپس میں چلتی رہتی ہے، اس لئے انہوں نے کہا کہ: میں اس یہودن کو دوں گی؟

حضرت صفیہؓ کا خواب اور یہودی کی تعبیر:

اس لئے کہ حُی بن اخطب خیبر کا رئیس تھا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اس کی صاحبزادی تھیں، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ایک شخص کے نکاح میں تھیں، وہ یہودی تھا، اس سے ایک دن خواب بیان کیا کہ: میں نے بڑا عجیب وغریب خواب دیکھا ہے، وہ کہنے لگا: کیا خواب دیکھا ہے؟ اور کب دیکھا؟ کہنے لگیں کہ: آسمان سے چاند ٹوٹا اور میری گود میں آگیا۔ اس نے ایک زور سے تھپڑ مارا اور کہنے لگا کہ: تم یثرب کے نبی سے نکاح کرنا چاہتی ہو؟ کیسے غضب کی تعبیر دی اس نے! چنانچہ بعد میں یہی ہوا کہ آپ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا۔

پھر ایک اور موقع پر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی کہ عورتیں مجھے طعنہ دیتی ہیں کہ تو یہودی کی بیٹی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم تو نبی کی بیٹی ہو، حضرت ہارون علیہ السلام کی بیٹی ہو، حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے تھی۔ تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے کہا کہ: میں اس یہودن کو اپنا اونٹ دوں گی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا یہ جواب ناگوار گزرا اور آپ نے ان سے قطع تعلق کرلیا، ان کی باری میں ان کے پاس تشریف نہیں لے جاتے تھے، بول چال بند کردی تھی، ذوالحجہ، محرم، صفر ان تین مہینوں

تک بول چال بند رہی، صفر کے آخر میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس قصہ کو خود بیان فرماتی ہیں کہ: میں اپنے گھر میں بیٹھی تھی، اتنے میں میں نے ایک آدمی کا سایہ بڑھتا ہوا دیکھا، میں سوچنے لگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو میرے پاس تشریف نہیں لاتے، یہ کون آدمی ہوسکتا ہے؟ چند لمحوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، وہاں ایک چارپائی کھڑی تھی، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بچھایا اور اس پر تشریف فرما ہوئے، اور اپنے گھر والوں سے صلح کرلی۔

دینی امور میں تین دن سے زیادہ قطع تعلق:

اس سے معلوم ہوا کہ کسی مسلمان بھائی سے کسی دینی وجہ کی بنا پر تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرنا جائز ہے، اور یہ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تین دن سے زیادہ قطع تعلق نہ رکھے، یہ اس صورت میں ہے جبکہ دنیا کی رنجش آپس میں ہو، جن دو آدمیوں کے درمیان دنیاوی رنجش ہو، تین دن تک تو غصہ رکھے، تین دن کے بعد چھوڑ دے۔

قطع تعلق کا وبال:

حدیث شریف میں فرمایا کہ:

"تُفْتَحُ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ كُلَّ يَوْمِ اثْنَيْنِ وَخَمِيْسٍ فَيُغْفَرُ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمَيْنِ لِكُلِّ عَبْدٍ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا، اِلَّا مَنْ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ، فَيُقَالُ اَنْظِرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا." (ابوداؤد ص:۳۱۷)

ترجمہ:......"ہر پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں، اور بندوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں، اور امت کی بخشش کی جاتی ہے، سوائے ان دو

آدمیوں کے جن کے درمیان رنجش ہو، ان کی بخشش نہیں ہوتی، حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ان کو چھوڑ دو جب تک یہ آپس میں صلح نہ کرلیں۔"

مسند احمد اور طبرانی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ:

ترجمہ:...... "جن دو مسلمانوں کے درمیان رنجش ہو اور رنجش تین دن سے زیادہ رہے اور بول چال بند رہے، وہ دونوں دوزخ میں ہیں جب تک وہ صلح نہ کرلیں۔

ایک حدیث میں فرمایا:

"لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ، یَلْتَقِیَانِ فَیُعْرِضُ ھٰذَا وَیُعْرِضُ ھٰذَا وَخَیْرُھُمَا الَّذِیْ یَبْدَأُ بِالسَّلَامِ۔" (ابوداؤد ص:۳۱۷)

ترجمہ:...... "کسی مسلمان کے لئے یہ حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے، سلام و کلام بند رکھے، اگر دونوں کی اچانک ملاقات ہوجائے تو وہ ادھر منہ پھیرلے اور یہ ادھر منہ پھیرلے، اور ان میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو ابتداً بالسلام کرے، سلام کرنے میں ابتداً کرے۔"

ایک اور حدیث میں فرمایا:

"لَا یَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّھْجُرَ مُؤْمِنًا فَوْقَ ثَلَاثٍ، فَاِنْ مَرَّتْ بِہٖ ثَلَاثٌ فَلْیَلْقَہُ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْہِ، فَاِنْ رَدَّ عَلَیْہِ السَّلَامَ فَقَدِ اشْتَرَکَا فِی الْاَجْرِ، وَاِنْ لَّمْ یَرُدَّ عَلَیْہِ فَقَدْ بَاءَ بِالْاِثْمِ۔" (ابوداؤد ص:۳۱۷)

ترجمہ:...... "کسی مؤمن کے لئے حلال نہیں کہ وہ

اپنے مؤمن بھائی سے تین دن سے زیادہ رنجش رکھے، جب تین دن گزر جائیں تو اس کو چاہئے کہ وہ جا کر سلام کہے، اگر وہ سلام کا جواب دے دے تو دونوں اجر میں شریک ہوگئے، اور اگر اس نے سلام کیا اور دوسرے نے سلام کا جواب نہیں دیا تو پورے کا پورا وبال اس پر جا پڑے گا، اور یہ قطع تعلق اور سلام و کلام بند کرنے کے وبال سے بری ہوجائے گا۔“

تو یہ احادیث اور اس قسم کی اور بہت سی احادیث قطع تعلق کے سلسلہ میں ہیں، میں نے چند احادیث بطور نمونہ پیش کی ہیں، یہ اس صورت میں ہے جبکہ کسی دنیوی معاملے کی وجہ سے رنجش ہوجائے۔

دین کے لئے قطع تعلق کا جواز:

لیکن اگر رنجش کی بنیاد کوئی دینی مسئلہ ہو تو تین سے زیادہ قطع تعلق جائز ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ:

”لَا تَمْنَعُوْا نِسَاءکُم الْمَسَاجِدَ وَبُیُوْتھنَّ خَیْرٌ لَّھُنَّ۔“ (مشکوٰۃ ص:۹۶)

ترجمہ:......”(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:) اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں آنے سے روکا نہ کرو، ان کا اپنے گھر پر نماز پڑھنا، مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔“

عورتیں نہ مانتی ہیں اور نہ سمجھتی ہیں:

لیکن عورتیں بے چاری اس مسئلے کو نہیں سمجھتیں، اور مانتی بھی نہیں ہیں، مکہ شریف اور مدینہ شریف میں ان سے کہا جائے کہ تم گھر پر نماز پڑھا کرو، تمہیں یہاں

پورا اجر ملے گا، مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے نہ جایا کرو۔ تو کہنے لگتی ہیں کہ پھر یہاں آنے کا فائدہ کیا ہے؟ نہیں مانتیں، اچھا نہ مانو، تمہاری مرضی ہے۔ حالانکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ نبوت اور مسجد نبویؐ میں، اور اپنے پیچھے نماز پڑھنے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: عورت کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا، مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ اور یہ کہتی ہیں کہ کیا فائدہ ہے؟

تو عورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ترغیب دی ہے کہ وہ اپنے گھر پر نماز پڑھا کریں۔ لیکن مردوں کو فرمایا ہے کہ تم ان کو روکو نہیں، اگر مسجد میں آنا چاہتی ہیں، تو تم نہ روکو، آپ صلی اللہ علیہ سلم نے ان کو خود روکا، مگر مردوں کو کہہ دیا کہ تم نہ روکو۔

حضرت عمرؓ کی ترکیب:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نماز پڑھنے کے لئے جاتی تھیں، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ روکو نہیں، اس لئے روک تو سکتے نہیں تھے، لیکن غیرت بہت آتی تھی، ایک دن راستے میں چھپ کر بیٹھ گئے اور جب وہ پاس سے گزری (پہچانتے تھے) تو چادر کا کنارہ ذرا سا پکڑ کر کھینچ دیا، اگلے دن جب نماز کے لئے جانے کا وقت ہوا تو فرمانے لگے کہ نماز کے لئے نہیں جانا؟ کہنے لگیں: نہیں! میں تو گھر پر ہی پڑھوں گی۔ اس تجویز سے ان کو روکا، لیکن چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ ان کو روکو نہیں، اس لئے زبان سے نہیں کہا کہ مت جایا کرو!

تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے مسئلہ بیان فرمایا کہ اللہ کی بندیوں کو اللہ کے گھروں میں آنے سے نہ روکو! ان کے صاحبزادے حضرت بلالؒ تھے، وہ کہنے لگے کہ: "وَاللهِ! لَا نَأْذَنُ لَهُنَّ فَيَتَّخِذْنَهُ دَغَلًا." (ابوداؤد ص:۸۴) (اللہ کی قسم ہم تو روکیں گے، اس لئے کہ عورتیں اس کو فساد کا ذریعہ بنالیں گی) حضرت عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہ ان پر برہم ہوئے، اور فرمانے لگے کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تم سے بیان کرتا ہوں، اور تو اس کے مقابلے میں کہتا ہے کہ ہم روکیں گے؟ اللہ کی قسم! زندگی بھر تجھ سے بات نہیں کروں گا، اور اگر تو میری زندگی میں مرگیا تو تیرے جنازے میں شریک نہیں ہوں گا، چنانچہ جب ان کی زندگی میں بیٹے کا انتقال ہوا، تو وہ اس کے جنازہ میں شریک نہیں ہوئے۔

حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کا اپنے بھتیجے سے بائیکاٹ:

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے بھتیجے کنکریوں سے کھیلتے تھے، کیونکہ اس وقت عرب میں کنکریوں کا کھیل ہوتا تھا، انہوں نے اس کو بلایا اور کہا: بھتیجے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپؐ اس سے منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے نہ تو دشمن کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے اور نہ شکار کیا جاسکتا ہے، یہ کنکری کسی کی آنکھ میں لگ سکتی ہے، اور کسی کی آنکھ پھوٹ سکتی ہے، اس لئے نہ کھیلا کرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ چونکہ وہ بچہ تھا، ذہن میں بات نہیں بیٹھی، انہوں نے اسے دوبارہ کھیلتے ہوئے دیکھ لیا، اس کو بلاکر کہا کہ: میں نے تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنایا تھا، تو نے کھیلنا بند نہیں کیا، اللہ کی قسم! ساری زندگی تم سے بات نہیں کروں گا۔

حضرت عائشہؓ کا اپنے بھانجے سے قطع تعلق:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بہت سخاوت کرتی تھیں، ایک وقت میں ایک ایک لاکھ درہم بھی تقسیم فرمائے، ایک دفعہ مال کا ڈھیر کسی نے بھیج دیا، آپ نے تقسیم کروانا شروع کردیا، گھر کی خادمہ نے کہا کہ حضرت! آپ کا روزہ تھا، شام کو روزہ افطار کرنے کے لئے ہی کچھ رکھ لیتیں! فرمانے لگیں کہ پہلے بتاتی، اب عورتوں کی طرح طعنہ دینے کا کیا فائدہ؟ اب تو ختم ہوچکا ہے۔

ان کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تھے، ان کو انہوں نے بیٹا بنایا ہوا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر ان کی کنیت ام عبداللہ رکھی تھی، یعنی اسی حضرت عبداللہؓ کے نام پر ام عبداللہ تھیں، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، تو یہ داد و دہش کرتی تھیں، ایک مرتبہ حضرت عبداللہؓ کے منہ سے نکل گیا کہ میں خالہ کو روکوں گا، ان کو بلایا اور بلا کے کہا: تیری یہ جرأت ہوگئی، تو یہ کہتا ہے کہ میں روکوں گا!؟ جا اللہ کی قسم! ساری عمر تم سے بات نہیں کروں گی۔ چنانچہ کئی مہینہ بات نہیں کی اور حضرت عبداللہؓ صحابی بھی ہیں، اور "**اول مولود ولد فی المدینة.**" (یہ مہاجرین کا وہ سب سے پہلا بچہ تھا جو مدینہ میں پیدا ہو)ا، یہ بہت پریشان ہوئے، گھر آنے کی اجازت مانگتے تھے، مگر گھر آنے کی اجازت نہیں ملتی تھی، ایک دن انہوں نے حضرت عائشہؓ کے کچھ دوسرے محرم عزیزوں سے کہا کہ: تم لوگ اجازت لو، میں بھی تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا، اور تم میری سفارش کرنا، میں خالہ کی منت سماجت کروں گا، وہ اپنی قسم توڑ دیں، چنانچہ اس قرارداد کے مطابق وہ رشتہ دار ان کو ساتھ لے گئے، انہوں نے جس وقت اجازت لی تو حضرت عبداللہؓ کا نام نہیں لیا، حضرت ام المؤمنین نے انہیں اندر آنے کی اجازت دے دی، ان کے ساتھ یہ بھی چلے گئے، اور جا کر خالہ سے لپٹ گئے اور بے تحاشہ رونے لگے، پاؤں پکڑتے تھے، لپٹتے تھے، ان لوگوں نے بھی سفارش کی، حضرت عائشہؓ نے تو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا، وہ بھی بہت روئیں، بالآخر اپنی قسم توڑ دی اور اس قسم توڑنے پر نہ معلوم کتنے غلام آزاد کئے، بعد میں ہمیشہ رویا کرتی تھیں کہ میری قسم تڑوادی۔

تو کسی دنیاوی وجہ کی بنا پر اگر قطع تعلق کیا ہو تو تین دن سے زیادہ قطع تعلق اور سلام و کلام بند کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر دینی وجوہ کی بنا پر سلام و کلام بند کیا ہو تو جائز ہے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے ایک لفظ کی بنا پر قطع تعلق فرمایا، لیکن بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کرلی، کیونکہ دنیا سے

تشریف لے جانے کا وقت قریب آ گیا تھا، تقریباً کوئی آٹھ یا دس دن کے بعد آپؐ کا انتقال ہو گیا تھا۔ آپؐ نے مناسب نہیں سمجھا کہ یہ داغ ان بیچاریوں پر ہمیشہ کے لئے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ناراض گئے ہیں۔

مقبولانِ الٰہی کی رضا سعادت ہے:

اللہ کے مقبول بندوں کا کسی سے خوش ہو کر جانا، یہ بڑی سعادت کی بات ہے، اور اللہ کے مقبول بندوں کا کسی سے ناراض ہو کر جانا یہ بڑی بدبختی کی بات ہے۔ آخری وقت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت زیادہ رو رہے تھے، صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہوئے، تسلی دی اور کہنے لگے کہ: تمام عمر آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے ہیں، اور جب دنیا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو آپ سے راضی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں رہے ہیں، اور ان کی رفاقت کا حق آپ نے ادا کیا ہے، اور جب وہ دنیا سے تشریف لے گئے ہیں وہ بھی آپ سے راضی تھے۔

آپؐ کا سایہ تھا:

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ جو مشہور ہے ناں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہیں تھا، یہ روایت غلط ہے۔ مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نور کے بنے ہوئے تھے، اور نور کا سایہ نہیں ہوتا، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ بھی نہیں تھا۔ بڑے بڑے لوگوں کی کتابوں میں یہ بات لکھی ہے، لیکن نہایت غلط بات ہے، یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہیں تھا، قطعاً غلط ہے، یہ صحیح حدیث حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی میں نے جو ذکر کی، یہ بتاتی ہیں کہ میں اپنے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی، میں نے ایک شخص کا سایہ بڑھتے ہوئے دیکھا، میں نے کہا کہ یہ کون آدمی ہو سکتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس

تو تشریف نہیں لاتے، دوسرا کون آدمی میرے پاس آسکتا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ سایہ تھا۔

آپؐ کے سایہ کا نہ ہونا عقلاً بھی غلط ہے:

دوسرا میں کہتا ہوں کہ یہ عقلاً بھی غلط ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ ہو، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی برہنہ بدن نہیں ہوئے کہ بدن مبارک پر کپڑا نہ ہو، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے جاتے ہوں گے تو آپ کے بدن پر تو کپڑا ہوتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ اگر نہ ہو تو کپڑے کا تو سایہ ہونا چاہئے ناں! ہاں اگر یوں کہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر کپڑوں کے بغیر پھرتے رہے اور آپ چونکہ نور تھے، اس لئے نور کا سایہ نہیں ہوتا تو پھر ہم مان لیں گے۔

آپؐ کے نور ہونے کا مطلب:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے، اگر کسی نے یہ مطلب سمجھا ہے کہ نور تھے اور نور کا سایہ نہیں ہوتا، تو یہ مطلب صحیح نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سراپا نور تھے، ہمارا بھی ایمان ہے، لیکن یہ نور آپ کے انسان ہونے کے اور گوشت پوست ہونے کے منافی نہیں تھا، بلکہ گوشت پوست میں بھی نور بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس کی بہت زیادہ تفصیل آتی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَّفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّمِیْنِیْ نُوْرًا وَّعَنْ شِمَالِیْ نُوْرًا وَّخَلْفِیْ نُوْرًا وَّمِنْ اَمَامِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا وَّفِیْ عَصَبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ لَحْمِیْ نُوْرًا وَّفِیْ دَمِیْ نُوْرًا وَّفِیْ شَعْرِیْ نُوْرًا وَّفِیْ بَشَرِیْ نُوْرًا وَّفِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ

نُوْرًا وَّاَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ مِنْ فَوْقِیْ نُوْرًا وَّمِنْ تَحْتِیْ نُوْرًا اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا.“

(صحیح مسلم ج:۲)

ترجمہ:......”یا اللہ میرے دل میں نور پیدا فرمادے، میری آنکھوں میں نور، میرے کانوں میں نور، میرے دائیں نور، میرے بائیں نور، میرے پیچھے نور، میرے آگے نور، اور یا اللہ میرے لئے نور کردیجئے، میرے پٹھوں میں نور، میرے گوشت میں نور، میرے خون میں نور، میرے بالوں میں نور، میرے چمڑے میں نور، میری زبان میں نور اور میری جان میں نور اور مجھے عظیم نور دیجئے اور میرے اوپر نور، اور میرے نیچے نور، یا اللہ مجھے نور عطا فرما۔“

تو یہ بجائے خود صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز نورانی تھی، ہر چیز میں نور تھا، رگ و پے میں نور سرائیت کیے ہوئے تھا، لیکن یہ وہ نور نہیں تھا جس کو تم نور سمجھے ہو اور جو سایہ ہونے کے منافی ہے، اس نور کی حقیقت کو ہم اور آپ سمجھ ہی نہیں سکتے، وہ کیا چیز ہے؟ بہرکیف تو یہ قطع تعلق کے درمیان میں بات آگئی تھی۔

صحابہؓ کو ایثار کی تلقین:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا، اور اس میں فرمایا کہ اے مہاجرین و انصار کی جماعت! تم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے پاس مال نہیں ہے، کوئی توشہ نہیں ہے، تو میرا جی چاہتا ہے کہ کسی کے پاس اگر ایک آدمی کی گنجائش ہو تو اپنے ساتھ ایک آدمی کو ملالے، اگر دو کی گنجائش ہے تو دو کو ملالے، اور اگر تین کی گنجائش ہو تو تین کو ملالے، ایک ایک، دو دو، تین تین، کرکے ان تمام حضرات کو صحابہ کرام نے آپس میں تقسیم کرلیا، صحابہ کرامؓ

ان کو کھلاتے تھے اور خود بھوکے رہتے تھے، کھانا وغیرہ ان کو کھلاتے تھے، ان کو مقدم رکھتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں۔

ایثارِ صحابہؓ کا ایک قصہ:

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی ان دس صحابہؓ میں سے ہیں جن کو جنت کی بشارت دی گئی تھی، نہایت مالدار صحابہؓ میں شمار ہوتے تھے (حضرت عثمان غنی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما)، کہتے ہیں کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی چار بیویاں تھیں، اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک بیوی ہو تو اس کو آٹھواں حصہ ملتا ہے، اور اگر ایک سے زائد ہوں تو وہ سب کی سب اسی آٹھویں حصہ میں شریک ہوتی ہیں۔ تو ایک بیوی کا حصہ بتیسواں حصہ ہوا، غالباً اسّی ہزار میں یا کتنے میں ایک بیوی نے وارثوں سے صلح کرلی تھی کہ مجھے اتنے پیسے دے دیں، میں اپنی وراثت کا حق چھوڑتی ہوں۔ جب یہ مدینہ طیبہ آئے ہیں تو کوئی چیز پاس نہیں تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کردیا تھا، یعنی ایک انصاری کو ایک مہاجر کا بھائی بنادیا تھا، چونکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا بھائی چارہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کے ساتھ قائم کیا گیا تھا، حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ ان کو اپنے گھر لے گئے، اور لے جاکر کہنے لگے کہ دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو بھائی بنادیا ہے، اب میرے پاس جو کچھ بھی ہے، میری ملکیت مکان ہے، زمین ہے اور جو کوئی چیز ہے، ان سب میں تمہارا آدھا حصہ ہے، تم میرے بھائی بنادیئے گئے ہو، میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے جو تمہیں اچھی لگے، میں اس کو طلاق دیتا ہوں، تم عدت کے بعد اس کے ساتھ شادی کرلو، اور آدھا مکان تم کو تقسیم کرکے دیتا ہوں، آدھی زمین تم کو تقسیم کرکے دیتا ہوں، ان کے اس اخلاص اور ان کی اس محبت کو دیکھ کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ:

"بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ فِیْ اَھْلِکَ وَمَالِکَ، دُلَّنِیْ عَلَی السُّوْقِ." (اللہ تعالیٰ تمہارے اہل اور تمہارے مال میں برکت فرمائے، مجھے بازار کا راستہ بتاؤ، میں کما کے کھاؤں گا)۔ غالبًا انہوں نے ایک دینار کسی سے قرض لے لیا اور اس کے ساتھ تجارت کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت میں برکت فرمائی، چند دنوں میں انہوں نے نکاح بھی کرلیا، ان کے کپڑے کو کوئی رنگ وغیرہ لگ گیا تھا، رنگ عورتیں لگاتی ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "اَعَرَسْتَ؟" کیا تم نے شادی کرلی ہے؟ کہا کہ: جی ہاں! فرمایا: "اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاۃٍ." ولیمہ کرو چاہے تم کو بکری ذبح کرنی پڑے، ولیمہ کرو، ولیمہ کھلاؤ۔

بزرگانِ دین اور صوفیوں کا اصول:

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ایثار کا یہ جذبہ پیدا کردیا تھا، اور اس کے بعد حضرات اہل رشد، صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے اندر یہ وراثت منتقل ہوئی اور صوفیوں کا مقولہ ہے، جو ان کا متفقہ علیہ ہے، جس کے بارے میں شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ: ہر چہ درویشان است وقف محتاجان است۔ جو کچھ درویشوں کے پاس ہے وہ محتاجوں کے لئے وقف ہے، وہ اس کی اپنی نہیں، صوفیا فرماتے ہیں جو شخص کسی چیز کو اپنی ملکیت سمجھتا ہو کہ میں اس کے استعمال کا حق دار ہوں، دوسرا نہیں ہے، وہ صوفی نہیں ہے، یہ ہمارے قبیلے سے خارج ہے، کیونکہ ہر کہ کشتہ نیست از قبیلہ ما نیست، جس کا نفس نہیں مرا، اس کے اندر "میں" باقی ہے، وہ ہمارے قبیلہ سے نہیں ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حکمت و دانائی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”عَنْ سُفْیَانَ الثَّوْرِیِّ رَحِمَهُ اللهُ قَالَ: کَتَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ اِلٰی اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ: اَنَّ الْحِکْمَةَ لَیْسَتْ عَنْ کِبَرِ السِّنِّ وَلٰکِنَّهٗ عَطَاءُ اللهِ یُعْطِیْهِ مَنْ یَّشَاءُ، فَاِیَّاکَ وَدَنَائَةَ الْاُمُوْرِ وَمَدَاقَ الْاَخْلَاقِ۔“ (کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۳۸۱)

”عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ اَنَّهٗ کَتَبَ اِلٰی اِبْنِهٖ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ: اَمَّا بَعْدُ! فَاِنِّیْ اُوْصِیْکَ بِتَقْوَی اللهِ فَاِنَّهٗ مَنِ اتَّقَی اللهَ وَقَاهُ، وَمَنْ تَوَکَّلَ عَلَیْهِ کَفَاهُ، وَمَنْ اَقْرَضَهٗ جَزَاهُ، وَمَنْ شَکَرَهٗ زَادَهٗ، وَلْتَکُنِ التَّقْوٰی نُصْبَ عَیْنَیْکَ، وَعِمَادَ عَمَلِکَ، وَجِلَاءَ قَلْبِکَ فَاِنَّهٗ لَا عَمَلَ لِمَنْ لَّا نِیَّةَ لَهٗ، وَلَا اَجْرَ لِمَنْ لَّا حَسْبَةَ لَهٗ، وَلَا مَالَ لِمَنْ لَّا رِفْقَ لَهٗ، وَلَا جَدِیْدَ لِمَنْ لَّا خَلْقَ لَهٗ۔“

(کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۱۸۹)

ترجمہ:......''حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ:
حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو خط لکھا، اس میں تحریر فرمایا کہ: بے شک حکمت عمر کے زیادہ ہونے سے نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے جس کو چاہتے ہیں عطا فرمادیتے ہیں، گھٹیا امور سے اور کمزور اخلاق سے بچتے رہا کرو۔''

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: میں تم کو وصیت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے کی، اس لئے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کو بچالیتے ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی کفالت فرماتے ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو قرض دے اللہ تعالیٰ اس کو بدلہ عطا فرماتے ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اللہ تعالیٰ اس کو مزید عطا فرماتے ہیں، اس لئے چاہئے کہ تقویٰ تمہارا نصب العین ہو، تمہارے عمل کا ستون اور تمہارے دل کی روشنی ہو، اس لئے کہ عمل معتبر نہیں اس شخص کا جس کی کوئی نیت نہیں اور اجر نہیں اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ کے ثواب کی خاطر کام نہ کرے، اور مال نہیں اس شخص کا جس کے ساتھ لوگوں کی ہمدردی کرنا نہیں، اس شخص کے لئے نیا نہیں ملتا جس کے لئے پرانا نہ ہو۔''

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو خط ہیں، ایک حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام (جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے کوفہ اور بصرہ کے گورنر تھے)،

دوسرا خط حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نام ہے (جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عمّال اور گورنروں کے نام مختلف قسم کے خطوط جاری فرماتے رہتے تھے، امام مالکؒ نے ان کے متعدد خطوط نقل کئے ہیں اور بعض حضرات نے تو خطوط تلاش کرکر کے اس پر مکمل کتابیں لکھی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سرکاری خطوط، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سرکاری خطوط اور اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نامہ ہائے گرامی۔

حکمت و دانائی عطیۂ الٰہی ہے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو نامہ گرامی تحریر فرمایا اس میں یہ بات بھی تحریر فرمائی کہ: حکمت اور دانائی عمر کے بڑے ہونے کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یحیٰ علیہ السلام کو ہم نے حکمت عطا فرمادی تھی بچپن میں۔ (وَاٰتَیۡنَاہُ الۡحُکۡمَ صَبِیًّا) (مریم:۱۲)

بعض اکابرؒ نے کہا کہ یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے اور ان کو بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمادی تھی۔

حضرت سلیمانؑ کی حکمت:

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما الصلوٰۃ والسلام کا قصہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نقل کیا ہے کہ ان کی خدمت مین ایک مقدمہ آیا، حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام عمر میں چھوٹے تھے، یعنی نابالغ تھے، حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی صوابدید پر مقدمے کا فیصلہ کردیا، مقدمہ یہ تھا کہ دو عورتیں تھیں، ان میں سے ایک کے بچے کو بھیڑیا لے گیا تھا، اور صرف ایک بچہ رہ گیا، اب ان دونوں عورتوں کا

اس بچہ پر دعویٰ تھا، حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں مقدمہ آیا تو انہوں نے ان دونوں عورتوں میں سے جو عمر میں بڑی تھی اس کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ بڑی عورت بچہ لے گئی، جب دونوں عورتیں عدالت سے باہر نکلیں تو حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام، جو کہ ابھی بچے تھے، وہاں تشریف فرما تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک بچاری روتی جارہی ہے اور ایک ہنستی جارہی ہے، حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ کیا قصہ ہوا؟ لوگوں کو معلوم ہوا ہوگا کہ یہ شہزادہ ہے اس کو یہ واقعہ بتانا چاہئے، لوگوں نے یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بیان کر دیا، حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمانے لگے کہ فیصلہ میں کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے، شاید تم لوگوں نے ٹھیک طرح سے بیانات نہیں دیئے ہوں گے۔ اگر تم کہو تو میں فیصلہ کر دوں، میں فیصلہ ایسا کروں گا کہ دونوں راضی ہوجائیں گی، لوگ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے آپ فیصلہ کر دیں۔

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک چیز کے دو مدعی ہوں اور دونوں کے پاس کوئی گواہ نہ ہو تو وہ چیز تحالف (یعنی دونوں سے حلف لینے) کے بعد دونوں کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کر دی جاتی ہے، تو غالباً تم دونوں نے حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے قسمیں تو کھائی ہوں گی لیکن انہوں نے یہ سوچ کر کہ بچہ تو تقسیم نہیں کیا جاسکتا اس لئے ایک کو دے دیا، یعنی بڑی پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو بچہ دے دیا، لیکن یہ تو انصاف نہیں، جیسے بڑی کا حق ہے ویسے ہی چھوٹی کا حق ہے، میرے پاس چھری لاؤ میں بچہ دونوں میں تقسیم کر کے دیتا ہوں، بچے کے دو ٹکڑے کر کے آدھا اس کو دے دوں گا اور آدھا اس کو دے دوں گا، انصاف کا فیصلہ ہی یہ ہے، آپ نے خادم کو حکم دیا کہ چھری لاؤ، تو چھوٹی نے ہاتھ جوڑ دیئے کہ بچہ اس کا ہے، میرا نہیں، میں اپنے دعوے سے دستبردار ہوتی ہوں، اور بڑی کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی بلکہ اس کا دل خوش ہوا ہوگا کہ میرا بچہ تو بھیڑیا کھا گیا

اس کا بچہ بھی دو ٹکڑے ہو جائے، حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ بچہ ہو اور چھری لائی جائے اور ماں کا دل اپنی جگہ برقرار رہ جائے، یہ ممکن نہیں! یہ بچہ بڑی کا نہیں بلکہ چھوٹی کا ہے، بچہ چھوٹی کو دلوادیا اور چلے گئے۔ اس واقعہ کو قرآن کریم نے ذکر فرمایا: "فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَان." (ہم نے سلیمان کو سمجھایا)۔

تو حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام اگرچہ چھوٹے تھے لیکن زیرکی اور دانائی میں اپنے والد سے بھی آگے نکل گئے، حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ سوچ کر کہ بڑا آدمی تو جھوٹ نہیں بول سکتا، اس لئے بچہ بڑی کو دے دیا، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ بچے کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے، کیونکہ یہ تو کسی قاعدہ و قانون میں نہیں ہے، ہاں البتہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے صرف آزمائش کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔

لہٰذا اگر کوئی بچہ مل جائے اور دو آدمی اس کے مدعی ہوں اور ہر ایک یہ کہے کہ بچہ میرا ہے تو بچہ ٹکڑے کر کے نہیں دیا جائے گا، بلکہ شرع کا فتویٰ یہ ہے کہ دونوں سے کہہ دیا جائے کہ یہ بچہ تم دونوں کا ہے تم اس بچہ میں آدھے آدھے شریک ہو، اگر وہ بچہ مرے گا تو اس کی آدھی آدھی وراثت تم دونوں کو ملے گی، اور اگر ان دونوں میں سے کوئی مرے گا تو یہ بچہ پورے بیٹے کی وراثت لے گا کیونکہ یہ دونوں کا بیٹا ہے۔

تو غرضیکہ حکمت اور دانائی یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں، عطا فرماتے ہیں۔

شیخ سعدیؒ کے بقول بچپن ہی سے بلندی کا ستارہ چمک رہا تھا اور بعض ایسے ہیں، جیسے میں نے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اصطلاح ذکر کی تھی کہ: "بوڑھے تو ہو گئے مگر رہے نابالغ کے نابالغ، عقل نہیں آئی۔"

عقل وشعور کا اندازہ:

اس کے بعد فرمایا کہ آدمی کی عقل کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ یہ دیکھو کہ

وہ کن امور میں حصہ لیتا ہے؟ اور اس کے اخلاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس حیثیت کا آدمی ہے؟ لہٰذا گھٹیا امور سے پرہیز کرو اور اسی طرح پتلے قسم کے اخلاق اور گھٹیا اخلاق سے پرہیز کرو، تمہارے اخلاق جس قدر بلند ہوں گے اسی سے تمہاری قدوقامت کا، تمہاری عقل کا، تمہاری فہم کا، تمہارے شعور کا اندازہ ہوگا۔

ایک حدیث میں ہے:

”عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: عُرِضْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ جَیْشٍ وَاَنَا ابْنُ اَرْبَعَ عَشْرَۃَ، فَلَمْ یَقْبَلْنِیْ، فَعُرِضْتُ عَلَیْہِ مِنْ قَابِلٍ فِیْ جَیْشٍ وَاَنَا ابْنُ خَمْسَ عَشْرَۃَ فَقَبِلَنِیْ۔“ (ترمذی ج:۱ ص:۱۶۲)

ترجمہ:...... ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جنگ بدر کے موقع پر چودہ سال کے تھے، فرماتے ہیں کہ میں جہاد کے لئے پیش ہوا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں فرمایا اور اگلے سال پندرہ سال کی عمر ہوگئی تو قبول فرمالیا۔“

ابن عمرؓ کا تقویٰ:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حد سے زیادہ متقی اور پرہیزگار تھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بالاتفاق کہا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کا رنگ اگر کسی کے اوپر ہے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پر ہے، زمانے کی ہوا سے سب کا رنگ پھیکا ہوجاتا ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا رنگ پھیکا نہیں ہوا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھنے والے فرماتے ہیں کہ: اگر تم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھتے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو کیسے تلاش کرتے ہیں تو تم سوچتے کہ یہ پاگل ہے۔

ابن عمرؓ کی اتباعِ سنت:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے سفر حج پر تشریف لے جاتے ہوئے ایک جگہ اونٹنی کو بٹھایا اور پیشاب کے لئے بیٹھے، خادم نے کہا کہ حضرت! پیشاب کی ضرورت کا تقاضا ہے؟ فرمایا: نہیں! میں یہاں اس لئے بیٹھا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ بیٹھے تھے، مجھے پیشاب کا تقاضا نہیں تھا، مگر چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں بیٹھے تھے، اس لئے میں بھی بیٹھا ہوں، اندازہ کرو کہ اتباع سنت کا شوق کتنا تھا؟ سچ ہے کہ ان حضرات نے اپنے محبوب کی ہر ادا کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔

محبت کی علامت:

مجھے تین دن پہلے کسی آدمی نے کہا کہ ایک مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ: گریبان کھلا رکھنا چاہئے اور وہ مولانا صاحب اپنا گریبان کھلا ہی رکھتے ہیں، میں نے کہا کہ بھائی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی بات ہے۔

اصل قصہ یہ تھا کہ ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اتفاق سے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گریبان کھلا ہوا تھا، تو اس صحابیؓ نے ساری عمر بٹن نہیں لگائے اور یہ کہتے تھے کہ میں نے اپنے محبوب کو اسی طرح دیکھا ہے، اس صحابیؓ نے جس رنگ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، ساری عمر اسی رنگ میں رہے اور یہ تو صحابہ کرامؓ کی بات ہے۔

اکابرؒ کی بے نفسی:

میرے استاذ حضرت مولانا عبداللہ رائے پوریؒ کے والد ماجد حضرت مفتی فقیر اللہ رحمہ اللہ تھے (میں نے پہلے بھی ان کا تذکرہ کیا تھا)، وہ جب کسی کو سلام

بھجواتے تو فرماتے کہ: ان کو کہنا کہ کانہ موچی سلام عرض کر رہا ہے۔ حالانکہ پنجاب میں اپنے وقت کے مفتیٔ اعظم تھے۔

اکابرؒ کی تقلید:

حضرت مولانا عبداللہ رائے پوریؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد قمیص میں بٹن کی جگہ گھنڈی لگاتے تھے، ہم نے درخواست کی کہ حضرت اب تو بہت اچھے اچھے بٹن آگئے ہیں، آپ بٹن لگالیں، اس گھنڈی کا بنانا بھی زحمت اور پھر لگانا بھی زحمت ہے، تو حضرت ارشاد فرماتے کہ: میں نے اپنے شیخ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کو اسی طرح دیکھا ہے، تو ساری عمر اسی طرح رہے، بٹن نہیں لگائے۔

آپ ﷺ کا حسن و جمال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین وجمیل ومحبوب چشم فلک نے نہیں دیکھا، کہاں کی لیلیٰ؟ کہاں کی زینب؟ اور کہاں کی حسینہ؟ (یہ عربوں کی محبوباؤں کے نام ہیں، جن کی وہ اشعار میں تشبیہ دیا کرتے تھے)، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بڑھ کر چشم فلک نے کسی عاشق زار کو نہیں دیکھا ہوگا۔

صحابہ کرامؓ کا عشق نبویؐ:

میں نے صلح حدیبیہ کا ذکر کیا تھا کہ حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ آئے تھے جو اس وقت تک کافر تھے، کافروں کے نمائندہ بن کر آئے تھے (بعد میں مسلمان ہوگئے تھے اور ان کی قوم نے ان کو شہید کر دیا تھا)، ایسی باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے کہ محمد! تمہارے اردگرد یہ بھانت بھانت کی لکڑیاں ہیں، کہیں کی اینٹ ہے اور کہیں کا روڑہ ہے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جب مقابلہ ہوگا تو یہ تتر بتر ہوجائیں گے، بھاگ جائیں گے، وہ دراصل یوں ہی ایسے آزمانے کے لئے، چھیڑنے کے لئے کہہ رہے تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ موجود تھے اور ان کی یہ باتیں سن رہے

تھے، سیدھی گالی نکالی (اس کا کھلا ترجمہ میں کیسے کروں؟) فرمایا: تو جا اپنے ''لات'' (''لات'' عورت کی شکل میں مورتی تھی) کی اندام نہانی کو چوس! کیا ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟ حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کہنے لگے یہ کون صاحب ہیں؟ کہا گیا کہ حضرت ابوبکرؓ ہیں، حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کا سر جھک گیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ حضور! جواب تو میں بھی دے سکتا ہوں، مگر آپ کا جاہلیت کے زمانے کا ایک احسان میرے سر پر ہے، آج تک اس کا بدلہ نہیں دے سکا ہوں، اس لئے خاموش ہوں، ورنہ اس وقت کا تقاضا ہے کہ آپ کی سخت کلامی کا جواب دوں۔

حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ عربوں کے دستور کے مطابق بات کرتے ہوئے بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کو ہاتھ لگا رہے تھے، ریش مبارک کو ہاتھ لگا رہے تھے، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر ننگی تلوار لئے کھڑے پہرہ دے رہے تھے، تو جب بھی حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو ہاتھ لگاتے (حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ) ان کے ہاتھ پر بٹ مارتے اور فرماتے: اپنے ناپاک ہاتھوں کو پیچھے کر، حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا یہ کون ہے؟ صحابہؓ نے کہا یہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ ہیں، حضرت عروہؓ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ اے غدار! ابھی تو میں تیری دیت کا تاوان دے کے آیا ہوں۔ جاہلیت کے زمانے میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کوئی قتل کر دیا تھا، اس کی دیت حضرت عروہ بن مسعودؓ نے ادا کی تھی۔

حضرت عروہ بن مسعودؓ کا اعتراف:

حضرت عروہ بن مسعودؓ بڑے آدمی تھے، جب وہ واپس اپنی قوم کے پاس

گئے (لمبا قصہ ہے، اس کا یہ فقرہ یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں) انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ لوگو! تم جانتے ہو کہ میں قیصر کے دربار میں گیا ہوں، کسریٰ کے دربار میں گیا ہوں، شاہِ حبشہ کے دربار میں گیا ہوں، بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار میں گیا ہوں، کوئی بادشاہ ایسا نہیں جس کے دربار میں میں نے حاضری نہ دی ہو، اللہ کی قسم! میں نے کوئی ایسا دربار نہیں دیکھا جس میں لوگ اپنے بڑے کی ایسی تعظیم کرتے ہوں اور ایسی محبت کرتے ہوں جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اصحاب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کرتے ہیں (وہ کیا دیکھتا میں تو کہتا ہوں کہ چشم فلک نے نہیں دیکھا)۔

پھر کہا کہ واللہ! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی تھوکتے ہیں تو ان میں سے کوئی نہ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوک اپنے ہاتھ پر لے لیتا ہے اور فوراً اپنے چہرہ پر مل لیتا ہے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب وضو فرماتے ہیں تو ان کے اعضائے شریفہ سے جو پانی ٹپکتا ہے ان کے اصحاب اس پر لڑتے ہیں، اس کو زمین پر نہیں گرنے دیتے، تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

حضرت ثوبانؓ کا عشق:

تو غرضیکہ صحابہ کرامؓ کی یہ ہی شان تھی، وہ اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق، اپنے اپنے ظرف کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مرمٹ گئے تھے، لیکن صحابہ میں بھی تو بڑے اور چھوٹے ہیں، صحابہ کرامؓ کی جاں نثاری عجیب وغریب ہوتی تھی۔

ایک روایت میں ہے:

"(اِنَّهَا نَزَلَتْ فِيْ ثَوْبَانَ مَوْلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) وَكَانَ شَدِيْدُ الْحُبِّ لَهُ، قَلِيْلُ الصَّبْرِ عَنْهُ، فَاَتَاهُ ذَاتَ يَوْمٍ وَقَدْ تَغَيَّرَ لَوْنُهُ وَنَحِلَ جِسْمُهُ يُعْرَفُ فِيْ

وَجْهِهِ الْحُزْنُ، فَقَالَ لَهُ: "يَا ثَوْبَانُ! مَا غَيَّرَ لَوْنَكَ؟" فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! مَا بِيْ ضَرٌّ وَلَا وَجْعٌ غَيْرَ اَنِّيْ اِذَا لَمْ اَرَكَ اِشْتَقْتُ اِلَيْكَ وَاسْتَوْحَشْتُ وَحْشَةً شَدِيْدَةً حَتّٰى اَلْقَاكَ ثُمَّ ذَكَرْتُ الْاٰخِرَةَ وَاَخَافُ اِلَّا اَرَاكَ هُنَاكَ لِاَنِّيْ عَرَفْتُ اِنَّكَ تَرْفَعُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَاِنِّيْ اِنْ اُدْخِلْتُ الْجَنَّةَ كُنْتُ فِيْ مَنْزِلَةٍ هِيَ اَدْنٰى مِنْ مَّنْزِلَتِكَ وَاِنْ لَّمْ اُدْخَلْ فَذَالِكَ حِيْنَ لَا اَرَاكَ اَبَدًا. فَاَنْزَلَ اللهُ هٰذِهِ الْاٰيَةَ." (قرطبی ج:۵ ص:۲۷۱)

ترجمہ:...... ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو چہرے کا رنگ زرد تھا، جیسے بہت نقاہت ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا بات ہوئی؟ چہرے کا رنگ اڑا ہوا ہے، کہنے لگے: یا رسول اللہ! نہ کوئی نقصان ہوا ہے اور نہ ہی کوئی تکلیف ہے، ایک غم نے ہلکان کیا ہوا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ خیر کرے! کیا غم ہے؟ کیا فکر ہے؟ کہنے لگے: یا رسول اللہ! آدھی رات کو دل کرتا ہے کہ اٹھ کر آپؐ کی زیارت کروں تو حاضر ہوجاتا ہوں اور جب چہرۂ انور پر نظر ڈالتا ہوں تو دل ٹھنڈا ہوجاتا ہے، پھر جاکر سو جاتا ہوں، اور جب کبھی آپؐ کا تصور آجاتا ہے، خیال آجاتا ہے تو چین نہیں آتا جب تک حضورؐ کی زیارت نہیں کرلیتا، پھر آخرت کا سوچتا ہوں تو خوف آتا ہے کہ آخرت میں تو آپ کی زیارت نہیں کرسکوں گا، کیونکہ میں جانتا

ہوں کہ آپ کا مرتبہ تو بہت بلند ہوگا اور میں اگر جنت میں داخل ہو بھی گیا تو میرا مرتبہ آپؐ سے بہت ہی کم ہوگا اور اگر جنت میں داخلہ نہ ملا تو اس صورت میں تو میں آپ کو کبھی بھی نہیں دیکھ سکوں گا، تو ان کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل ہوئی کہ: جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی تو یہ لوگ ہوں گے ان کے ساتھ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کر رکھا ہے۔"

انعام یافتہ:

سورۂ فاتحہ جس میں ہم یہ آیت پڑھتے ہیں:

"اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ. صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ. غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْن."

ترجمہ:......"یا اللہ ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت نصیب فرما، وہ صراط مستقیم جو راستہ ہے ان لوگوں کا، (ان اکابر کا، ان بزرگوں کا، ان اللہ تعالیٰ کے بندوں کا) جن پر آپ نے انعام فرمایا، پھر نہ ان پر غضب ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔"

یعنی مرتے دم تک یہ حضرات اللہ کے انعام میں رہے، جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بجا لائے، یہ اطاعت کرنے والے ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔

اور یہ انعام یافتہ لوگ کون ہیں؟ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے:

"اُولٰٓئِکَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ

رَفِيْقًا." (النسآ:٦٩)

ترجمہ:......"اور وہ لوگ جن پر اللہ نے انعام کیا وہ یہ ہیں: نبی، صدیق، شہدأ اور اعلیٰ درجہ کے نیک لوگ (جن کو اولیأ اللہ کہتے ہیں) اور (آخر میں فرماتے ہیں) یہ حضرات بہت ہی خوب ہیں رفیق ہونے کے اعتبار سے۔"

صحابہؓ کا ظرف:

بہت پرانی بات ہے کہ ایک صاحب نے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں چند اعتراضات لکھ کر بھیجے تھے، میں نے اس کا جواب لکھا اور وہ جواب میری کتاب "آپ کے مسائل اور ان کا حل" میں چھپا ہوا ہے، اس میں میں نے ایک فقرہ لکھا ہے وہ یہ کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کا سانحہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آنکھوں کے سامنے گزرا، یہ تو ان کا حوصلہ تھا کہ وہ اس کو برداشت کر گئے، کیونکہ جن کا ایسا محبوب روپوش ہوگیا ہو اور وہ پھر بھی زندہ رہیں؟ ایسا نہیں ہوسکتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنا ظرف عطا فرمایا تھا کہ وہ اس صدمہ کو برداشت کر گئے، اور آج ہمیں ان کے واقعات پر تعجب ہوتا ہے، بہرحال حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار صحابی تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، اور صحابہ کرامؓ میں اتباع سنت میں نہایت ممتاز تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا ایک ایک جزئیہ تلاش کرتے تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔

حضرت ابن عمرؓ اور اکابر کا ادب:

صحیح بخاری میں ہے:

"عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ

اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَهِيَ مَثَلُ الْمُسْلِمِ، حَدِّثُوْنِيْ مَا هِيَ؟ فَوَقَعَ النَّاسُ فِيْ شَجَرِ الْبَادِيَةِ، وَوَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ اَنَّهَا النَّخْلَةُ. قَالَ عَبْدُاللهِ: فَاسْتَحْيَيْتُ. قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! اَخْبِرْنَا بِهَا. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هِيَ النَّخْلَةُ! قَالَ عَبْدُاللهِ: فَحَدَّثْتُ اَبِيْ بِمَا وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ. فَقَالَ: لَاَنْ تَكُوْنَ قُلْتَهَا اَحَبُّ لِيَّ مِنْ اَنْ يَكُوْنَ لِيْ كَذَا وَكَذَا."

(بخاری ج:۱ ص:۲۴)

ترجمہ:...... ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: بتاؤ وہ درخت کون سا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے، جس کی مثال مسلمان کی مثال ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں یہ سن کر صحابہ کرامؓ جنگلوں میں دوڑتے پھرے، یعنی ذہن میں سوچنے لگے کہ کون سا درخت ہوسکتا ہے؟ میرے جی میں آئی یہ کھجور کے بارے میں فرمارہے ہیں، (لیکن میرے اکابر پہلی صف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے، میرے والد ماجد حضرت عمرؓ اور ان سے بھی بڑے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ عشرہ مبشرہ وہاں موجود تھے، اس لئے میں نے کہنے کی جرأت نہیں کی)، صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ہی بتلادیجئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: یہ کھجور کا درخت ہے۔ گھر آکے میں نے اباجی سے کہا کہ: میرے جی میں آئی تھی کہ میں بتادوں کہ یہ کھجور

کا درخت ہے، لیکن میں ادب کی وجہ سے چپ کرگیا (یہ اکابر بیٹھے ہیں ان کی موجودگی میں جرأت کروں)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیٹا! اگر تم بتادیتے تو میرے لئے لائق فخر ہوتا۔"

بہرحال انہیں بیٹے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خط لکھا (خط کی بات بعد میں کریں گے) ان کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔

حضرت عمرؓ کی احتیاط:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ سفر پر گئے تو مصر کے گورنر نے بیت المال کی کوئی چیز ان کو دے دی اور کہا کہ: یہ تمہیں قرض کے طور پر دیتا ہوں، تم مدینہ میں جا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دے دینا، قرض کے طور پر اس لئے دیتا ہوں کہ اگر یہ ضائع ہوگئی تو تمہارے ذمہ پڑے گی اور اگر امانت کے طور پر دوں گا تو ضائع ہونے کی صورت میں تم پر ضمان نہیں آئے گی، کیونکہ امانت کا ضمان نہیں ہوسکتا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ٹھیک ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس مال سے اپنی تجارت کا سامان خرید لیا اور اس کو فروخت کیا، رقم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دے دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے اس مال سے تجارت کی ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جی ہاں! حضرت عمرؓ نے کہا: کچھ نفع بھی ہوا؟ کہا کہ: جی! فرمایا: کہ وہ نفع بھی لادو، یہ بات صحیح تھی کہ گورنر نے یہ مال تمہیں قرض کے طور پر دیا تھا اور اس سے یہ مراد تھی کہ ضمان تم پر آئے، لیکن میں جانتا ہوں کہ انہوں نے یہ مال تمہیں ایک خلیفہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے دیا اور وہ گورنر بیت المال سے اتنا بڑا قرض کسی عامی آدمی کو نہ دیتا، یہ خلیفہ کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دیا ہے، میں اس کو تمہارے لئے جائز نہیں سمجھتا، اس منافع کو بھی بیت المال میں جمع

کرواؤ، اگر یہ مال ضائع ہوجاتا تو ضمان بھی غریبوں پر آتا اور جو نفع ہوا وہ بھی عوام الناس کے لئے وصول ہوا۔

خوفِ الٰہی کی برکت:

تو ان کو (یعنی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو) یہ تحریر فرمایا: اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں، تم ہر وقت اللہ کا خوف اور ڈر اپنے سامنے رکھو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بچالیتا ہے، اور جو شخص اللہ پر توکل کرے اور بھروسہ کرے، محض اللہ کے بھروسے پر کام کرتا رہے اور مخلوق پر نظر نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس کی کفایت فرماتے ہیں، وہ اکیلا کافی ہے۔

اللہ کا کام اللہ کے لئے:

اس لئے میں ہمیشہ مولویوں سے کہتا ہوں کہ اللہ کا کام کرو، اللہ کے لئے کرو، اور اللہ کے بھروسہ پر کرو۔ اللہ کا کام کرو، دوسرے کام مت کرو۔ اللہ کے لئے کرو، اپنے کسی مقصد کے لئے، کسی غرض کے لئے نہ کرو، محض اللہ کا کام سمجھ کر کرو اور اللہ کے بھروسہ پر کرو، مخلوق کے بھروسے پر مت کرو، یہ سوچ کر کہ فلاں سیٹھ اگر متوجہ ہوگئے تو اتنا چندہ دے دیں گے، فلاں سیٹھ سے اتنے پیسے مل جائیں گے، ہمارا مدرسہ چل پڑے گا، یہ سوچ نہیں ہونی چاہئے۔

حضرت نانوتویؒ کے اصول:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند نے دارالعلوم دیوبند کے بارے میں ایک وصیت نامہ اپنے قلم سے اور اپنے الفاظ سے چند دفعات کی شکل میں لکھا تھا، وہ وصیت نامہ آج تک دارالعلوم دیوبند میں محفوظ ہے اور اس کا فوٹو شائع ہوچکا ہے، اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ: یہ دارالعلوم دیوبند اس وقت تک چلے گا

جب تک اس میں بے سروسامانی کا عالم ہوگا، اور کسی حاکم یا کسی مالدار کے مال پر نظر نہیں ہوگی، اور خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو (حضرت کے الفاظ ہیں) پھر یہ کارخانہ بگڑتا ہوا نظر آتا ہے۔

انگریز کا منصوبہ اور اکابرؒ کی حکمت:

ہمارے اکابرؒ نے امت کی بھلائی کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی امانت کی حفاظت کے لئے، علوم دینیہ کی حفاظت کے لئے مدارس کا جال بچھایا، انگریز اس ملک کو اسپین بنانا چاہتا تھا کہ یہاں اسلام کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہے، اس نے تمام مدارس جو اس وقت تھے، ضبط کر لئے، بادشاہوں کی طرف سے اوقاف تھے وہ ضبط کر لئے، اور مسجد کے مولوی کو سب سے ذلیل ترین مخلوق قرار دے دیا۔ جتنے علمأ مارے جاسکتے تھے، مار دیئے اور جو باقی رہے ان کا نام کمینوں میں درج کرادیا۔

عموماً گاؤں میں جو چوہدری صاحب کے کام کرنے والے ہوتے ہیں، ان کو کمین کہتے ہیں، کوئی لوہار ہے، کوئی بڑھئی ہے اور کوئی کچھ ہے، انہیں میں مولوی کو بھی شامل کیا۔

دین کے بقأ کی شکل:

ہمارے اکابرؒ کو اللہ تعالیٰ نے الہام فرمایا کہ اب دین کی بقا کی شکل یہ ہے کہ اپنے ذاتی اور نجی مدرسے بناؤ، جس میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہ ہو، اللہ کے ان بندوں پر قوم بھی اعتماد کرتی تھی اور آج تک الحمدللہ! کرتی ہے، لوگ بعض مرتبہ چندہ دیتے ہیں، ہمیں کہتے ہیں کہ اس کی رسید کی ضرورت نہیں، میں کہتا ہوں کہ مجھے رسید کی ضرورت ہے، تمہیں ضرورت نہیں مجھے تو ضرورت ہے، میں نے حساب رکھنا ہے، یہ تمہیں جو رسیدیں دیتے ہیں، تمہارے اطمینان کے لئے نہیں دیتے، بلکہ ہم اپنے اطمینان اور اپنے حساب کے لئے دیتے ہیں۔ مدرسے کی رسید ہے، ختم نبوت کی رسید

ہے یا کسی اور چیز کی رسید ہے، ہاں اگر کسی ادارے کی رسید نہ ہو تو ہم پھر رسید نہیں دیتے، ہم اپنی صوابدید کے مطابق جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں اس کو خرچ کردیتے ہیں۔

میرا طرزِ عمل:

میرے یہاں مستقل لفافوں میں مدیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں، میری دراز میں کبھی پیسے زیادہ ہوتے ہیں، کبھی پانچ دس روپے ہوتے ہیں، اور ہر ایک لفافے پر مد لکھی ہوئی ہوتی ہے، یہ صدقے کی ہے، یہ زکوٰۃ کی ہے، یہ فلاں مد کی ہے اور بعض مرتبہ جب میں دراز میں پیسے ڈالتا ہوں تو پھر رات کو اٹھ کر پریشان ہوجاتا ہوں، اسی وقت وہاں پیسے رکھ کر اس کے اوپر لکھ دیتا ہوں کہ خدانخواستہ اگر میں مرگیا تو پھر کیا ہوگا؟

پوری دنیا میں ایسا رنگ نہیں:

تو ان اللہ کے بندوں نے نجی مدرسے بنائے اور قوم نے ان پر اعتماد کیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس دین کو اس ملک میں باقی رکھا، بلکہ آپ کے ہندوستان اور پاکستان میں جیسا دین ہے پوری دنیا میں ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ باقی جگہ رنگ بہت بگڑ گیا ہے۔

ازہر یونیورسٹی اور دین داری:

جامع ازہر جو دنیا کا سب سے قدیم اور مشہور مدرسہ ہے، ایک ہزار سال سے زیادہ ہوگیا ہے، وہاں کا حال یہ ہے کہ شیخ الحدیث صاحب سوٹ پہن کر، ٹائی لگا کر، منہ میں سگریٹ لے کر بخاری شریف پڑھا رہا ہے، ایسا کبھی یہاں پاکستان میں دیکھا ہے؟ ٹھیک ہے، یہاں پر لوگ داڑھی منڈواتے ہیں، لیکن کوئی مولوی داڑھی منڈوا کر نماز تو پڑھا کر دکھائے؟ داڑھی منڈھے بھی اس کے پیچھے نماز پڑھنے کو تیار

نہیں ہوتے، کیونکہ یہ امامت کا اہل نہیں ہے، اس کی داڑھی کٹی ہوئی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے ان مقبول بندوں کا اثر ہے، میں مانتا ہوں کہ عملی کوتاہیاں ہوں گی، عوام الناس میں بھی ہیں، مولویوں میں بھی ہیں، مگر دین داری کا یہ رنگ عوام میں ہو یا خواص میں، کیا آپ کو دنیا میں کسی جگہ ایسا رنگ ملے گا؟ تو اس لئے اللہ کا کام کرو اور اللہ کے لئے کرو اور اللہ کے اعتماد پر کرو۔

ہمارے اکابرؒ نے دین کا کام اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر کیا، مخلوق کے اعتماد پر نہیں کیا، بھروسہ اللہ پر ہے، اس لئے تم بھی اللہ کے بھروسے سے اس کام کو کرو۔

قرضِ حسنہ کا بدلہ:

اور فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کو قرض دے گا اللہ تعالیٰ اس کو بدلہ عطا فرمائیں گے، یہ تو قرآن کریم کا مضمون ہے:

"مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللہَ قَرْضًا حَسَنًا."

(البقرہ: ۲۴۵)

ترجمہ:......"کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسن۔"

قرضِ حسن کا معنی یہ ہے کہ جس بندے کو قرض دے رہا ہے، قرض دینے والا اس پر احسان نہ جتائے، بلکہ قرض دینے والا اس لینے والے کا احسان مانے، اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا کر کے دیں گے۔

بااخلاص صدقہ کی عظمت:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"فَاِنَّ اللہَ یَتَقَبَّلُھَا بِیَمِیْنِہٖ ثُمَّ یُرَبِّیْھَا لِصَاحِبِھَا کَمَا یُرَبِّیْ اَحَدُکُمْ فَلُوَّہٗ حَتّٰی تَکُوْنَ مِثْلُ الْجَبَلِ."

(مشکوٰۃ ص:۱۶۷)

ترجمہ:......"(جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے صدقہ کرتا ہے تو) "رحمٰن" یعنی اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کو ایسا پالتے ہیں جیسے کوئی آدمی گھوڑے کے بچے کو پالتا ہے، اور جب وہ آدمی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا تو اس صدقہ کا ثواب جو اللہ کی رضا کے لئے کیا تھا احد پہاڑ کے برابر ہوگا۔"

جتنا کوئی اخلاص کے ساتھ صدقہ دے گا اتنا اس کی پرورش ہوگی۔

قرآن کریم میں ارشادِ الٰہی ہے:

"مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَآءُ." (البقرہ:۲۶۱)

ترجمہ:......"مثال ان لوگوں کی جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں مثال اس دانے کی ہے جس نے سات خوشے اُگائے اور ہر خوشے میں سو دانے تو ایک دانے کے سات سو بن گئے اور اللہ پاک اضافہ فرماتے رہتے ہیں جتنا چاہتے ہیں۔"

ایک کے سات سو:

کم سے کم اللہ تعالیٰ دس گنا دیتے ہیں، اور زیادہ تعداد سات سو کی ہے، لیکن یہاں زیادہ تعداد قانون کے مطابق ہے، ورنہ کسی کو سات ہزار دیتے ہیں، کسی کو سات لاکھ دیتے ہیں اور کسی کو ستر لاکھ دیتے ہیں اور کسی کو بغیر حساب کے دیتے ہیں، تو جو شخص خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے دے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔

شکرِ نعمت:

جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کھا کر شکر ادا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ عطا فرماتے ہیں۔

یہ بھی قرآن کریم کا مضمون ہے: "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ." (ابراہیم:۷) یعنی اگر تم شکر کرو گے تو تمہیں زیادہ دیں گے۔ جتنا شکر زیادہ کرو گے اتنی نعمت زیادہ ملے گی۔

تقویٰ نصب العین:

فرمایا کہ دیکھو تقویٰ کو نصب العین بناؤ۔

نصب العین کہتے ہیں وہ چیز جو ہمیشہ پیش نظر رہے، اور اپنے عمل کا اعتبار بناؤ اور اپنے دل کی روشنی بناؤ، تمہارے دل میں روشنی اسی تقوے سے ہونی چاہئے، اس لئے کہ نیت کے بغیر عمل قبول نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ثواب کی توقع نہ ہو تو اجر نہیں ملتا۔

مال نہ ہونے کے برابر:

جو شخص کہ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک نہ کرے، اس کا مال نہ ہونے کے برابر ہے، اس کے لئے مال ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

پرانا نہیں تو نیا نہیں:

اور آخری فقرہ ہے کہ اس شخص کے لئے نیا نہیں ملتا جس کے لئے پرانا نہ ہوگا۔

میں نے اس کو یوں پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا پرانا عمل ہوگا تو نئے

عمل کی توفیق ہوگی، اگر پہلے ہی سے عمل نہیں تو اس پر نیا نتیجہ کیا مرتب ہوگا؟ اور یہ بات بھی ہے کہ نیا کپڑا پہنو تو پرانے کو صدقہ کردو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ جب نیا کپڑا تیار ہوتا تھا اور زیب تن فرماتے تھے تو پرانے کو صدقہ کردیتے تھے، حق تعالیٰ شانہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حضرت ابودرداءؓ کی پانچ نصیحتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ نُضَيْرٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِاَبِى الدَّرْدَاءِ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ: عَلِّمْنِىْ كَلِمَةً يَنْفَعُنِىَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ بِهَا. قَالَ: وَثِنْتَيْنِ وَثَلاثًا وَاَرْبَعًا وَخمْسًا، مَنْ عَمِلَ بِهِنَّ كَانَ ثَوَابَهُ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ اَلدَّرَجَاتُ الْعُلٰى. قَالَ: لَا تَأْكُلْ اِلَّا طَيِّبًا، وَلَا تَكْسِبْ اِلَّا طَيِّبًا، وَلَا تَدْخُلْ بَيْتَكَ اِلَّا طَيِّبًا، وَسَلِ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَرْزُقُكَ يَوْمًا بِيَوْمٍ وَاِذَا اَصْبَحْتَ فَاعْدُدْ نَفْسَكَ مِنَ الْاَمْوَاتِ فَكَاَنَّكَ قَدْ لَحِقْتَ بِهِمْ، وَهَبْ عِرْضَكَ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، فَمَنْ سَبَّكَ اَوْ شَتَمَكَ اَوْ قَاتَلَكَ فَدَعْهُ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَاِذَا اَسَأْتَ فَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ.“ (حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۲۲۲)

ترجمہ:...... ”امام ابونعیم نے حلیہ میں عبدالرحمٰن بن جبیر بن نضیر سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ

عنہ سے عرض کیا کہ: مجھے ایک کلمہ سکھلا دیئے (ایک بات سکھلا دیجئے) جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مجھے نفع عطا فرمائیں۔
فرمایا کہ: (ایک نہیں)، دو، تین، چار، پانچ یعنی پانچ باتیں بتلاتا ہوں، جو شخص ان پر عمل کرے گا، اس کا ثواب اللہ پاک کے پاس بلند درجات پر ہوگا۔ فرمایا کہ: صرف پاکیزہ چیز کھاؤ، پاکیزہ کمائی کرو، اور گھر میں جب داخل ہو تو پاکیزگی کی حالت میں داخل ہو، اللہ تعالیٰ سے دن کے دن کا رزق مانگا کرو، اور جب تو صبح کرے تو اپنے آپ کو مردوں میں شمار کر، گویا کہ تو ان کے ساتھ جا ملا ہے، اور اپنی عزت اللہ تعالیٰ کو ہبہ کر دو، جو شخص تم کو گالی دے، برا بھلا کہے یا تم سے لڑائی کرے، اس کو اللہ تعالیٰ کی خاطر چھوڑ دو، اور جب کوئی برائی ہو جائے تو فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔''

یعنی حضرت ابوالدرداءٌ رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے کہا کہ: مجھے نصیحت کی کوئی ایک بات فرما دیجئے، تاکہ میں اس پر عمل کروں، اللہ پاک مجھے اس کے ذریعہ سے نفع عطا فرمائے۔ حضرت ابوالدرداءٌ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ایک نہیں، دو، تین، چار، پانچ یعنی پانچ باتیں بتلاتا ہوں، جو شخص ان پر عمل کرے گا، اللہ کے ہاں اس کے بلند درجات ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اس کو بلند درجات کا ثواب عطا فرمائے گا۔

پہلی بات یہ کہ تین چیزوں کی پابندی کرو، ایک یہ کہ پاک کھاؤ گے، پاک کماؤ گے اور پاک ہونے کی حالت میں گھر آؤ گے۔ ناپاک چیز تمہارے پیٹ میں نہ جائے، ناپاک چیز تمہاری کمائی میں شامل نہ ہو، اور ناپاک ہونے کی حالت میں اپنے گھر میں نہ آؤ۔

حلال پاک کھانے کا اہتمام:

پاک اور طیب کھانے کا اہتمام! یہ اللہ کے محبوب بندوں کی علامت ہے، ہم تو جانور ہیں، جو کچھ بھی مل جائے اس پر منہ مارتے ہیں، جانور کا یہ ہی کام ہوتا ہے، اس کو اس سے غرض نہیں کہ یہ میرے مالک کا ہے یا نہیں؟ یا میرے حصے کا ہے یا نہیں؟ اس کا منہ جہاں تک پہنچ جائے، وہ اس کو ہڑپ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا کھانے پینے کے معاملہ میں جانور نہ بنو، بلکہ پاک کھاؤ۔

ایک حدیث شریف میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

”اِنَّ اللهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِمَا اُمِرَ بِهِ الْمُرْسَلِیْنَ، فَقَالَ: یَا اَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا.“

(مشکوٰۃ ص:۲۴۱)

ترجمہ:......”اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو جو حکم دیا ہے، وہی حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان دار بندوں کو بھی دیا ہے، رسولوں سے فرمایا کہ: اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔“

اور اہل ایمان سے فرمایا:

”یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ.“ (البقرۃ:۱۷۲)

ترجمہ:......”اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دیں۔“

دوسری جگہ اللہ پاک نے فرمایا:

”یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ.“ (البقرۃ:۲۶۷)

ترجمہ:......''اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم کماؤ اور جو پاکیزہ چیزیں ہم نے زمین سے نکالی ہیں۔''

مؤمن کو پاک کھانے کا اہتمام کرنا چاہئے، ناپاک کھانے کا لقمہ اس کے پیٹ میں نہ اترے۔

پاک و ناپاک:

اکابرؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی دعا قبول ہوا کرے، وہ ناپاک لقمہ سے پرہیز کرے، ناپاک کیا چیز ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ بعض چیزوں کو اللہ نے ناپاک فرمایا ہے اور بعض کو پاک فرمایا ہے۔ بکری پاک ہے، اس کا گوشت پاک ہے، اور خنزیر ناپاک ہے، خرگوش پاک ہے اور بلی ناپاک ہے، حلال وحرام کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہے کہ یہ چیز اچھی ہے یا یہ چیز گندی ہے، شراب کو ناپاک فرمایا گیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ.'' (المائدہ:۹۰) یعنی یہ گندی چیز ہے، شیطان کے عمل سے ہے، اس سے بچا کرو۔ تو شراب کو حرام فرمایا ہے، اسی طرح جو چیزیں شریعت نے حلال کی ہیں وہ پاک ہیں اور جو چیزیں حرام کی ہیں وہ ناپاک ہیں، پاک کھاؤ، ناپاک نہ کھاؤ۔

دوسری بات یہ کہ حدیث شریف میں ہے:

''لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ.''

(کنز العمال ج:۱ حدیث:۳۹۷)

ترجمہ:......''کسی مسلمان کا مال حلال نہیں ہوتا مگر اس کے دل کی خوشی سے۔''

طیب نفس اور دل کی خوشی سے اگر کوئی تمہیں اپنی چیز کھلاتا ہے تو تمہارے

لئے کھانا جائز ہے اور زبردستی کھاتے ہو تو ناجائز ہے، حرام ہے، کسی کی بکری چوری کرلی اور بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر اس کو ذبح کر دیا، وہ حلال نہیں ہے، وہ اسی طرح حرام ہے جس طرح مردار حرام ہے، چوری کی بکری کو تکبیر پاک نہیں کرتی وہ ناپاک ہی رہتی ہے۔ اسی طرح تم نے کسی کی چیز غصب کرلی، دبادی، وہ چیز تمہارے لئے حلال نہیں ہے، کسی کے مکان پر زبردستی قابض ہوگئے اور اس کو استعمال کرتے ہیں، ایک نماز جو اس صورت میں پڑھو گے وہ چالیس دن قبول نہ ہوگی۔ چوری کی بجلی استعمال کرتے ہیں، اس کا استعمال حرام ہے، اور اس بجلی میں جو تم عبادتیں کرتے ہو وہ بھی قبول نہ ہوں گی۔

تو غرضیکہ پرایہ مال کھانا اس کی رضامندی کے بغیر یہ حلال نہیں، حرام ہے۔ پاک نہیں، ناپاک ہے۔ ناپاک نہ کھاؤ!

ناپاک کمائی کیا ہے؟

دوسرا یہ کہ کماؤ بھی پاک، تمہارے گھر میں ناپاک کمائی نہیں آنی چاہئے، ناپاک کمائی کیا ہے؟ کمانے کے جو طریقے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں، وہ پاک ہیں، اور جو طریقے ممنوع و ناجائز ٹھہرائے ہیں وہ ناپاک ہیں۔ اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں سے معلوم ہوسکتی ہے۔ کمائی کے جو طریقے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ممنوع و حرام ہیں، اگر وہ آپس کی رضامندی سے ہوں تب بھی حرام و ممنوع ہیں اور ناپاک ہیں، سود کا لین دین اللہ نے حرام فرمایا ہے اور اس کے خلاف اعلان جنگ فرمایا ہے، قرآن کریم میں ہے:

"فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ."

(البقرۃ:۲۷۹)

ترجمہ:......"اگر تم اس کو نہیں چھوڑتے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کے لئے تیار ہوجاؤ!"

اسی طرح رشوت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَعَنَ اللّٰهُ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ وَالرَّائِشَ بَيْنَهُمَا."

(مشکوٰۃ ص:۳۲۶، مسند احمد ج:۲ ص:۳۸۷)

ترجمہ:......"اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے رشوت لینے اور دینے والے پر، اور ان دونوں کے درمیان دلالی کرنے والے پر۔"

مشکوٰۃ میں صحیح مسلم کے حوالے سے حدیث ہے:

"لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آكِلَ الرِّبٰوا وَمُؤْكِلَهٗ وَكَاتِبَهٗ وَشَاهِدَيْهِ، وَقَالَ: هُمْ سَوَاءٌ."

(مشکوٰۃ ص:۲۴۵)

ترجمہ:......"اللہ نے لعنت فرمائی ہے سود لینے والے پر اور سود دینے والے پر اور اس کو لکھنے والے پر اور اس کی گواہی دینے والوں پر اور فرمایا کہ: یہ گناہ میں سب برابر ہیں۔"

سودخور پر لعنت کا مطلب!

علمأ فرماتے ہیں کہ "لعن اللہ" کا لفظ کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خبر دے رہے ہیں کہ ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ صیغہ دعا کا ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بددعا فرماتے ہیں کہ اللہ لعنت فرمائے ان لوگوں پر۔

اسی طرح خرید وفروخت کی جو چیزیں شریعت نے حرام کی ہیں، ان کا لین دین کرنا اوران کے ذریعہ سے پیسہ کمانا حرام ہے۔

بیع وشراُ کے احکام سیکھنے کی ضرورت ہے:

حضرت جی مولانا محمد یوسفؒ رائے ونڈ میں تقریر فرما رہے تھے اور وہ اپنے بیان میں فرما رہے تھے کہ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے کچھ کمالیں پھر تبلیغ میں نکلیں گے، حضرتؒ نے فرمایا کہ جب سیکھے بغیر کماؤ گے تو حرام کماؤ گے، تمہیں جائز و ناجائز کا تو پتہ نہیں اور حلال وحرام کی پرواہ نہیں اور حلال کے اثرات وحرام کے اثرات کی تمیز نہیں، دل میں آخرت کا خوف اور خدا کا خوف نہیں، تو تمہیں کس نے کمانے کو کہا کہ پہلے کماؤ پھر تبلیغ کو چلیں گے۔

اسی بیان میں یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بازار میں دکان کھولنے کی اجازت صرف اس شخص کو ملتی تھی جو لین دین، خرید وفروخت کے مسائل جانتا ہو، پہلے اس کا امتحان لیتے تھے کہ جانتا بھی ہے؟ اب تو حکومت کو کوئی ٹیکس دے دے اور پولیس کو بھتہ دے دے تو پھر ٹھیک ہے، کہتے ہیں کہ صاحب کرو جو کچھ کرنا ہے، خود بھی حرام کھائے اور پولیس وحکومت کو بھی حرام کھلائے۔

کل ایک صاحب کا خط ملا، اس میں لکھا تھا کہ کچھ دوست کھیل کھیلتے ہیں، اور اس کھیل میں کوئی ہار جائے تو اس سے بوتلیں یا چائے پیتے ہیں۔ میں نے کہا: جرمانہ کرنا حرام ہے، ہمارے فقہاُ حنفیہ نے لکھا ہے کہ جرمانہ کی سزا دینا حرام ہے۔ کسی پر ڈنڈ و تاوان لگادیتے ہیں، حکومت جرمانہ کردیتی ہے، یہ حرام ہے، اس رقم کا لین دین بھی حرام ہے، یہ میں نے چند مسائل کی طرف اشارہ کردیا ہے، کہنا یہ ہے کہ حلال کھانے کا اہتمام اور حلال کمانے کا اہتمام کرو۔

حرام غذا کے اثرات:

تمہارے اور تمہارے بیوی بچوں کے پیٹ میں ناپاک چیز نہ جائے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ:

آں خورد گردد (پلیدی) از و جدا
وآنکہ خورد گردد ہما نور خدا

ایک یہ کھانا کھاتا ہے تو اس سے گندگی نکلتی ہے، اور وہ کھاتا ہے سب کا سب نورِ خدا بن جاتا ہے۔ کھانے کی ایک گندگی حسّی نکلتی ہے، جسے بول و براز کہتے ہیں، اور ایک گندگی اخلاقِ خبیثہ اور عقائد خبیثہ ہیں، حرام کھاؤ گے تو گندے اخلاق پیدا ہوں گے، گندے خیالات پیدا ہوں گے، گندے عقائد پیدا ہوں گے، اور تمہارا باطن سر سے لے کر پاؤں تک گندا ہوجائے گا۔ اس کے نتیجہ میں پھر طاعات کی توفیق سلب ہوجائے گی، نیکی کی توفیق نہ ہوگی، برائی کی طرف رغبت ہوگی۔

غرضیکہ حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلی نصیحت یہ ہے کہ پاک چیز کھاؤ، ناپاک نہ کھاؤ، پاک کماؤ، ناپاک نہ کماؤ، ٹھگی نہ کرو، دھوکا نہ دو، فریب نہ کرو، غصب نہ کرو، چوری نہ کرو اور جتنے شرعاً ناجائز طریقے ہیں ان کو نہ کرو۔

گندے ہوکر گھر نہ آؤ:

گھر میں آؤ تو پاک ہونے کی حالت میں آؤ، گندہ ہونے کے ساتھ نہ آؤ، بداخلاقی کے ساتھ اور بداعتقادی کے ساتھ، گندہ ہوکر گھر نہ آؤ، تمہاری نظر بیوی بچوں پر پڑے گی، تو وہ بھی گندے ہوں گے۔

دن کے دن کی روزی کی دعا:

اور دوسری نصیحت یہ کہ اللہ تعالیٰ سے یہ مانگا کرو کہ یا اللہ! دن کی دن روزی عطا فرما۔

قرآن کریم میں بیسویں پارہ میں پورا ایک رکوع بلکہ رکوع سے بھی زیادہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بھاگ کر مدین چلے گئے تھے، ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے، مدین کے

کنویں پر دیکھا کہ لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں، اور دو لڑکیاں اپنی بکریاں روک کر کھڑی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان سے فرمایا کہ: تم کیوں نہیں پلاتیں؟ فرمانے لگیں کہ: "لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ." یعنی ہم پانی نہیں پلاسکتیں جب تک چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلاکر واپس نہیں آجائیں، پھر جب کنواں فارغ ہوگا تو ہم بکریوں کو پانی پلائیں گی، ہم عورت ذات ہیں، مردوں کے اندر کس طرح جاکر پانی پلائیں؟ اس وقت عورت کا مرد کے شانہ بشانہ کام کرنے کا رواج نہیں چلا تھا، شبہ ہوسکتا تھا کہ تم کسی مرد کو بھیج دیتیں، تم کیوں آئیں؟ وہ کہنے لگیں کہ: "وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ." ہمارے والد بڑی عمر کے بوڑھے ہیں، اس لئے مجبوراً ہمیں کام کرنا پڑتا ہے، بھائی کوئی ہے نہیں، والدہ صاحبہ آنہیں سکتی ہیں، مجبوراً ہمیں کرنا پڑتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا کہ لاؤ میں پانی پلاتا ہوں، "فَسَقٰى لَهُمَا" ان کی بکریوں کو پانی پلادیا، قرآن کریم کے الفاظ ہیں: "ثُمَّ تَوَلّٰى اِلَى الظِّلِّ." پھر ہٹ کر سایہ میں بیٹھ گئے اور فرمایا: "رَبِّ اِنِّيْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ." (القصص:۲۴) پس دعا کی: اے پروردگار! جو خیر آپ میری طرف عنایت فرمائیں، میں اس کا محتاج ہوں۔

یہ ہے دن کی دن کی روٹی مانگنا، اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات ہماری عبرت کے لئے بیان فرمائے ہیں، اب یہ واقعہ میں نے اس لئے بتلایا کہ: "رَبِّ اِنِّيْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ." اے پروردگار! میں محتاج ہوں، فقیر ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے، اور حوائج بشریہ ساتھ لگی ہوئی ہیں، کھانے کی حاجت ہے، پینے کی حاجت ہے، بھوک پیاس ہے۔

میرا معمول:

میرا بھی یہ معمول ہے مجھے جب بھی کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو میں

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا کرتا ہوں: "رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ." اے اللہ! میں حاجت مند ہوں، فقیر ہوں، تیرے اتارے ہوئے رزق کا محتاج ہوں، تجھ پر نظر ہے۔

اِدھر حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا کی اور اُدھر قبول ہوگئی: "فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ." ان دو میں سے ایک ان کے پاس آئی شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی قرآن نے اس کو بھی ذکر فرمایا۔ "قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْکَ لِیَجْزِیَکَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا." اور آ کر کہا: میرے ابا تم کو بلاتے ہیں اور تم نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کی جزا اور بدلہ دینا چاہتے ہیں۔

علماٗ فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ اس لئے کہے کہ ایک اجنبی آدمی سے کوئی کہے کہ آؤ میں تم کو کھانا کھلاتا ہوں تو ایک درجہ میں عیب معلوم ہوگا کہ یہ بے چارا فقیر ہے، محتاج ہے، اس کو اللہ واسطے کھانا کھلاؤ، پھر ایک غیرت مند آدمی کی غیرت اس کو قبول نہیں کرتی، اور ابا جان نے بھیجا ہوگا یہ سمجھ کر کہ وہ کسی شریف خاندان کا لڑکا ہے، اس سے مت کہنا کہ آؤ تم کو کھانا کھلائیں، بلکہ یہ کہنا کہ تمہارے احسان کا بدلہ دینا چاہتے ہیں، خیر آگے لمبا قصہ ہے۔

تو اللہ تعالیٰ سے دن کے دن کا رزق مانگو۔ لوگ تو مزاروں پر جاتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں، بزرگوں سے مانگتے ہیں، شاید اللہ تعالیٰ کے خزانہ سے ان کو نہ ملتا ہوگا، اللہ میاں نے اپنی رزاقی کا دفتر بند کردیا ہوگا، اور کہہ دیا ہوگا کہ اب ان مزار والوں سے مانگا کرو۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ!

اللہ کے ہاں کوئی چیز بڑی نہیں:

آقائے دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے وہ بھی اللہ سے مانگو، نمک کی چٹکی چاہیئے وہ بھی اللہ ہی سے مانگو، اور یہ نہ

سمجھو کہ چھوٹی سی چیز اللہ سے کیا مانگیں؟ اللہ بڑے ہیں ان سے کوئی بڑی چیز مانگنی چاہئے، بات یہ ہے کہ کسی چیز کا چھوٹا ہونا یا بڑا ہونا یہ تمہارے اور ہمارے اعتبار سے ہے، اللہ کے اعتبار سے نہیں ہے، اللہ کی نظر میں سب چھوٹی بڑی چیزیں برابر ہیں، اور ہماری احتیاج کے اعتبار سے بھی برابر ہیں، ہم جس طرح جنت کے محتاج ہیں، اسی طرح نمک کی چٹکی کے بھی محتاج ہیں، ہم تو سراپا احتیاج ہیں۔

ہمارے فقر کی کوئی انتہا نہیں:

میں کبھی کبھی دعا میں کہا کرتا ہوں کہ یا اللہ! آپ کے غنا کی کوئی حد نہیں اور میرے ہاں فقر کی کوئی حد نہیں ہے، کون سی چیز ذکر کروں جس کا میں محتاج نہیں ہوں، یا جس کا میں محتاج ہوں، میں تو ایک ایک چیز کا محتاج ہوں، آپ غنی مطلق ہیں اور میں فقیر مطلق ہوں، میرے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں، کھانا پکا دیا اور پکا کر سامنے رکھ دیا، آپ تناول فرما رہے ہیں، اس کے بھی محتاج ہیں کہ اللہ پاک لقمہ کو نیچے اتار دیں، یہ ہی لقمہ اگر حلق میں پھنس جائے اور اُچھو لگ جائے تو موت کا سبب بن سکتا ہے، اللہ نہ کرے، ہم کس چیز کے محتاج نہیں ہیں؟

تو بڑی چیز بھی اللہ سے مانگو اور چھوٹی چیز بھی اللہ سے مانگو، کیونکہ اللہ کی بارگاہ میں سب برابر ہیں، اس کی قدرت کے اعتبار سے سب برابر ہیں، اور ہمارے احتیاج کے اعتبار سے بھی سب برابر ہیں، اور یہ بھی بتلا دیا کہ دن کے دن کی روزی مانگو، کہو یا اللہ! آج کی روزی کا بندوبست فرمادے، آگے کی فکر نہ کرو، لمبی لمبی سوچیں نہ لے جاؤ، میں نے یہ حدیث کئی مرتبہ سنائی ہے، مشکوۃ شریف میں مسند احمد کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

"مَنْ اَصْبَحَ مِنكُمْ آمِنًا فِیْ سِرْبِهٖ مُعَافًی فِیْ
جَسَدِهٖ وَعِنْدَهٗ قُوْتُ یَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِیْزَتْ لَهُ الدُّنْیَا

بِحَذَافِيرِهَا۔" (مشکوٰۃ ص:۴۴۳)

ترجمہ:...... "جس شخص نے صبح کی اس حالت میں کہ الحمدللہ! اس کے بدن میں عافیت ہے (عافیت ہے، تندرستی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ چلتا ہے، پھرتا ہے، بولتا ہے، کھاتا ہے، کام کرتا ہے، ٹھیک ٹھاک ہے) اپنے گھر میں دل کے اعتبار سے مطمئن ہے، کسی کا کوئی خوف نہیں، اندیشہ نہیں، اور اس کے پاس ایک دن کی روزی موجود ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: گویا ساری دنیا جمع کر کے اس کو دے دی گئی ہو۔"

کل کا دن آئے گا تو کل کا بھی اللہ تعالیٰ انتظام فرمادیں گے۔ عارف رومیؒ فرماتے ہیں:

کارساز ما، فکر کار ما
فکر ما در کار ما آزار ما

یعنی ہمارا کارساز ہمارے کام بنانے میں خود لگا ہوا ہے، اور ہمارا اپنے معاملات و کام میں متفکر ہونا سوائے آزار کے کچھ نہیں، پریشانی ہے اور کچھ بھی نہیں، کر تو کچھ سکتے نہیں ہیں، ساری رات نیند نہیں آتی ہے فکر کی وجہ سے، کیونکہ تمہارے قبضہ میں کچھ نہیں ہے، جس کے قبضہ میں ہے وہ خود ہی کردے گا، کرنا چاہے گا تو کردے گا، تم صرف اس سے مانگو اور اگر اس کی مصلحت و حکمت میں نہ ہوگا تو نہ کرے گا، آرام سے سوجاؤ، پھر کیا پریشانی ہے؟

پریشانیوں کی جڑ تجویز ہے:

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس سرہ فرماتے تھے کہ تمام پریشانیوں کی جڑ "تجویز" ہے، آدمی اپنے لئے ایک چیز تجویز کردیتا ہے کہ مجھے یہ چیز ملنی چاہئے، اب

اس کے لئے پریشان ہوتا ہے، تگ و دو کرتا ہے، یہ کرتا ہے، وہ کرتا ہے۔

تمام معاملات کے حل کی جڑ تفویض ہے:

فرمایا کہ تمام معاملات کے حل کی جڑ ''تفویض'' ہے، معاملہ اللہ کے سپرد کردو، اورآرام سے سوجاؤ، وہ خود ہی کرلیں گے، جس کے قبضہ میں ہے اس سے کہہ دو، اور اپنا معاملہ اس کے سپرد کردو، پھراس کی حکمت پر راضی بھی ہوجاؤ، بس راحت ہی راحت ہے۔

خدائی نہیں بندگی کرو:

اور میں کہا کرتا ہوں کہ ہم بندگی چھوڑ کر خدائی کا کام کرتے ہیں، پھر وہ ہم سے ہوتی ہی نہیں، پریشان ہوتے ہیں، بندہ کا کام صرف بندگی ہی ہے، وہ تو ہم نے چھوڑ دی، اوراس کارخانۂ عالم کو چلانا کہ اِس کو اتنا دیا جائے، اُس کو اتنا دیا جائے، اس کو نہ دیا جائے، فلاں وقت دیا جائے، فلاں وقت نہ دیا جائے، یہ خدائی ہے، بندگی چھوڑکر جب ہم خدائی کرنے لگتے ہیں، تو وہ ہم سے چلتی نہیں۔ ساری پریشانیوں کی جڑ یہی ہے، خدا کے لئے خدائی چھوڑ دیں۔ اپنا کام ہے بندگی کا وہ کریں، مالک سے کہہ دیا یا اس کے سامنے رولو، گڑگڑالو، جتنی تاکید کے ساتھ اور جتنی الحاح وزاری کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہو، کہنے کے بعد مطمئن ہوجاؤ، درخواست دے دی، وہ بھولتا نہیں ہے، اور یہ بھی نہیں کہ اس کو اپنے بندوں کے حال پر رحم نہ ہو، جب وہ شفیق بھی ہے، بھولتا بھی نہیں تو تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ ایک عالَم کے عالَم کو اس روزی کے مسئلہ نے پریشان کر رکھا ہے، حالانکہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، ایک دن کی روٹی اور بس، وہ مل گئی، اگلا دن آئے گا تو وہ لئے کھڑا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے تھے کہ: جس نے اگلے دن کی زندگی تمہیں دی ہے، وہ اگلے دن کی روٹی بھی تمہیں دے گا، اس لئے فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ سے مانگو وہ تم

کو رزق دیں دن کے دن۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور دعا ہے:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ آلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا."

(مشکوٰۃ ص:۴۴۰)

ترجمہ:...... "یا اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آل، ان کے گھرانہ کی روزی دن کے دن ہو۔"

سید زادے پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ تمہارے ابا میاں نے دن کے دن روزی مانگی تھی، سید ہونے پر فخر بھی کرتے ہو اور دعا سے بھی بچ کر نکلنا چاہتے ہو۔

یہ سوچو کہ آج میری موت کا دن ہے:

اور تیسری نصیحت یہ فرمائی کہ جب صبح کو اٹھو تو یہ سمجھو کہ آج میری موت کا وقت ہے، اور گویا کہ تم مُردوں میں جاکر شامل ہوگئے ہو، نفس کا علاج ہوجائے گا، ساری رذالتوں کا علاج ہوجائے گا، لیکن ہمارے دل میں یہ چیز نہیں بیٹھتی ہے۔

لطیفہ مشہور ہے کہ ایک بزرگ نے کسی سے کہا تھا کہ تم سات دن میں مرجاؤ گے، وہ سات دن میں نہیں مرا تو کہنے لگا کہ تم نے مجھے تو سات دن کا کہا تھا، فرمانے لگے کہ ساتویں دن میں ہی مرو گے، اس لئے کہ دن صرف سات ہی ہوتے ہیں۔

موت کے انتظار کا قصہ:

جس دن مولوی منیر احمد صاحب کے والد ماجد کا انتقال ہوا، بہاول نگر میں رات کو فرما رہے تھے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ یا اللہ! میری موت دوشنبہ کو ہو، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال دوشنبہ کو ہوا تھا، تو جب سے مرغ کی اذان ہوئی اس وقت سے منتظر ہوگئے کہ ملک الموت آیا چاہتا ہے، کہنے لگے کہ: چارپائی میری قبلہ رخ کردو اور چشمہ لگایا اور بچوں سے کہا کہ کدھر سے آئے گا فرشتہ؟

اس کے منتظر بیٹھے ہیں کہ کدھر سے آئے گا؟ فرشتہ کو دیکھنے کے لئے چشمہ لگالیا۔ رات کے گیارہ بجے مجھ سے فرمارہے تھے کہ آپ جا کر سو جائیں، میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے دوشنبہ کی موت نصیب فرمائے، اگر یہی دوشنبہ ہے تو وقت آ گیا ہوگا، اور اگر نہیں تو دوشنبے (یعنی پیر کا دن) آتے ہی رہیں گے، صبح فجر کی اذان ہوگئی اسی انتظار میں ہم نے ساری رات گزاردی، مولانا جلیل احمد صاحب نے خوش ہوکر کہا کہ اباجی! وہ آپ کا دوشنبہ تو گیا، کیونکہ وہ خوش ہوگئے تھے کہ آج اباجی نہیں مرتے کیونکہ رات گزرگئی، مگر وہ بڑی حسرت کے ساتھ فرمانے لگے کہ فکر نہ کرو، سورج غروب نہ ہونے دوں گا، دن کے گیارہ بجے انتقال ہوا، اور یہی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا وقت تھا۔

تو میرے بھائی! ہم سب نے سات دنوں میں مرنا ہے، کیونکہ ہفتہ میں سات ہی دن ہوتے ہیں، آٹھواں دن نہیں ہوتا، صبح کرو تو ہمیشہ خیال کرو کہ شاید آج ہی کا دن میری موت کا دن ہے، نفس بے لگام نہ ہوگا۔

اپنی عزت اللہ کو ہبہ کردو:

اور چوتھی نصیحت یہ فرمائی کہ اپنی عزت و آبرو اللہ کو ہبہ کردو، کہو کہ یا اللہ! میں نے اپنی عزت و آبرو آپ کو دے دی، جو چیز آدمی ہبہ کردیتا ہے وہ اپنی نہیں رہتی ہے، جس کو ہبہ کی اس کی ہوجاتی ہے، اپنی عزت و آبرو اللہ کے حوالے کردو، اگر تمہاری کوئی بے آبروئی کرے، توہین کرے، گالی دے، تم سے لڑے، تم کو برا بھلا کہے، اس کو اللہ کے لئے معاف کردو، اس کا معاملہ اللہ کے سپرد کردو کہ میری عزت تو وہاں گئی ہوئی ہے، میرے پاس ہے ہی نہیں۔ جس آدمی کے پاس آبرو ہو، اس کی بے آبروئی ہوسکتی ہے، عزت تو اس کی ہوگی جس کی عزت ہو، اور جس کے پاس آبرو ہی نہ ہو جو اپنی آبرو کسی اور کو دے چکا ہو اس کو کیا گلہ اور کیا شکوہ و شکایت؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی نور اللہ مرقدہ کا شعر ہے، فرماتے تھے کہ:

اب کسی سے کیا شکایت؟ کیا گلہ؟
واقعاتِ زندگی خود بھول جاتا ہوں میں!

اگر کوئی شخص تمہاری بے آبروئی کرتا ہے، تمہیں گالی دیتا ہے، تمہارا کچھ بھی نہیں بگڑتا، وہ گالی دے کر اپنا منہ گندا کرتا ہے، اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرتا ہے، اپنے دل کو تاریک کرتا ہے، تمہارا اس نے کچھ نہیں بگاڑا، کسی کے برا کہنے سے تمہاری بے عزتی نہ ہوگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ: "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَهُ اللّٰهُ .... الخ." (مشکوٰۃ ص:۴۳۴) (اگر کوئی شخص اللہ کے لئے ذلت اختیار کرے، اللہ پاک اس کو عزت عطا فرمائیں گے)۔ صرف ایک فقرہ سے سارے جھگڑے ختم ہوگئے کہ بھائی! میرے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں جو تم مانگ رہے ہو، جو چیز تم چھیننا چاہتے ہو وہ میرے پاس نہیں ہے، گئی ہوئی ہے، اب تم چھینتے رہو۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کا ضبط:

مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ وعظ کے لئے کھڑے ہوئے، دشمن بہت تھے، کسی نے کھڑے ہوکر کہا مولانا سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں؟ حضرتؒ نے بڑے اطمینان سے فرمایا کہ آپ کو کسی نے غلط اطلاع پہنچائی ہے، میرے ماں باپ کے نکاح کے گواہ اب تک موجود ہیں۔ اب کسی کے حرام زادہ کہنے سے کیا تم سچ مچ حرام زادے ہوگئے؟

حضرت مدنیؒ کا تحمل:

اور ٹھیک یہ ہی قصہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ کو پیش آیا۔ برسرِ عام جلسہ میں ایک آدمی نے پرچی اور چٹ بھیجی، چٹ خود پڑھ کر

سنائی کہ ایک صاحب نے یہ لکھا ہے، لیکن ان کو غلط فہمی ہوئی ہے، میرے والد کے نکاح کے گواہ اب بھی موجود ہیں، اور میں اپنے والد کے گھر میں پیدا ہوا ہوں۔ ختم ہوگئی بات!

فوراً توبہ کرنی چاہئے:

اور پانچویں نصیحت یہ فرمائی کہ جب تم سے کوئی غلطی وکوتاہی ہوجائے تو فوراً ہاتھ جوڑ کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔

ان پانچ نصیحتوں پر عمل کروتو انشاءاللہ دین بھی بن جائے گا اور دنیا بھی بن جائے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اعمالِ صالحہ کے عناصرِ اربعہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بزرگ توجہ فرمادیں گے ان کی برکت سے سب کچھ ہوجائے گا، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ بزرگوں کی توجہ اور دعا کا انکار نہیں، بڑی مفید چیز ہے، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

بے عنایات حق و خاصانِ حق

گر ملک است ورق او سیاہ است

یعنی اللہ تعالیٰ کی اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی عنایت وتوجہ کے بغیر اگر فرشتہ بھی ہوتب بھی اس کا ورق سیاہ ہے۔

کسی کی خالی دعا کچھ نہیں کرتی:

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ مسجد میں عرقِ سونف پیا ادھر دھڑ ادھڑ دست ہونے شروع ہوگئے، تو کیا اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ اکیلا عرقِ سونف کافی ہے، حضرت! میری دعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک خود اپنے اختیار کو کام میں نہ لائے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تو بڑھ کر نہ کوئی صاحب برکت ہوسکتا ہے اور

نہ مقبول الدعوات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کیسے جاں نثار اور عاشق زار تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دل و جان سے دعا کی کہ وہ مسلمان ہوجائیں، اصرار بھی فرمایا مگر چونکہ خود انہوں نے نہ چاہا، ایمان نصیب نہ ہوا۔

عزم و ہمت، عنایت الٰہی اور مقبولانِ بارگاہ الٰہی کی توجہ کی برکت:

اللہ کی عنایت اور اللہ کے مقبول بندوں کی توجہ سے کام بنتا ہے، لیکن میرا اس سے نہیں بنتا، جیسے اللہ والے کسی کو کہتے ہیں کہ فلاں کام کیا کرو، تو لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ: دعا کیا کرو، اسی طرح اگر کہا جائے کہ فلاں گناہ چھوڑ دو تو کہتے ہیں، بس! دعا کرو۔ یہ غلط ہے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ محض دعا و برکت سے کچھ نہیں ہوتا، دیکھو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر تو کوئی برکت والا نہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب کے لئے توجہ بھی فرمائی، دعا بھی کی، لیکن ان کو ایمان نصیب نہیں ہوا، کیونکہ انہوں نے خود نہ چاہا۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ: میرے کان میں کلمہ کہہ دو، میں قیامت کے دن گواہی دوں گا۔ لیکن کان میں بھی کہنا گوارا نہ کیا، کیا مشکل کام تھا؟ صرف ابوجہل کے اس کہنے میں آگئے کہ دیکھو لوگ کیا کہیں گے کہ بڈھا مرتے وقت اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ گیا! تو چونکہ انہوں نے خود نہیں چاہا، ہمت سے کام نہیں لیا کچھ نہیں ہوا۔

جس کام کو کرنا ہو اس کو عزم اور ہمت کے ساتھ شروع کردو، پھر اللہ کے بندوں سے دعا کے لئے بھی کہو، ہم کام تو شروع کرتے نہیں مگر کہتے ہیں کہ بس دعا کرو! یہ تو مذاق اڑانا ہوا۔

عام لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب ہم کوئی بات کہتے ہیں، مثلاً: داڑھی کا کہتے ہیں کہ داڑھی رکھ لو! تو جواب میں کہتے ہیں جی دعا کرو! حضرتؒ فرماتے ہیں کہ شیخ اور مرید کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب اور مریض کی، اگر مریض دوا نہ پیئے تو محض

طبیب کی شفقت اور توجہ سے مریض اچھا ہو جائے گا؟ صحت تو اس کے نسخہ استعمال کرنے سے ہوگی، اسی طرح اگر بچہ سبق یاد نہ کرے تو سبق کیسے یاد ہو جائے گا؟ محض استاذ کی توجہ سے تو سبق یاد نہیں ہوسکتا، وہ تو یاد کرنے سے یاد ہوگا۔ عرض کیا گیا کہ شیخ کی برکت سے توفیق ہو جاتی ہے، فرمایا یہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ برکت کی امید ضرور ہے، مگر کافی نہیں، اس کا دخل، دخل اعانت ہے، دخل کفایت نہیں، یعنی شیخ کی توجہ اور برکت سے توفیق ہوتی ہے، لیکن بس یہی کافی نہیں، بلکہ یہ معین اور مددگار ہے، تم عزم وارادہ کرو، پھر شیخ دعا وتوجہ سے تمہیں پیچھے سے دھکا دیں گے، لیکن اگر تم تو پاؤں گاڑ کر کے ایک جگہ جم کر کھڑے ہو جاؤ، اور بزرگوں سے کہو کہ دعا کرو کہ اللہ پاک چلنے کی توفیق عطا فرمادے، اس طرح کبھی نہیں چل سکو گے۔ بچہ سبق یاد نہیں کرتا، پڑھتا نہیں ہے، اسکول نہیں جاتا، سبق پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتا، اپنی تعلیم کا اہتمام نہیں کرتا، اور کہتا ہے دعا کرو! کیا اس سے تعلیم یافتہ ہو جائے گا؟

ہم لوگ اعمالِ آخرت کو اختیار نہیں کرتے اور دعا کے لئے کہہ دیتے ہیں۔

اصل نفع ونقصان آخرت کا ہے:

ایک صاحب یہاں تشریف لائے تھے کسی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا، تنزلی بھی ہوگئی تھی، بہت پریشان تھے، اب ان کا خط آیا ہے، اپنے پڑھنے کے معمولات بھی کچھ لکھے ہیں اور ساتھ پوچھا ہے کہ اگر کوئی وظیفہ ہو تو بتاؤ! بڑے عہدے سے چھوٹے عہدے پر ہوگئے، ترقی کے بجائے تنزلی ہوگئی، اتنے پریشان کہ ہائی کورٹ تک جا پہنچے اور مقدمہ ان کے خلاف ہو گیا، اور مجھے لکھا کہ: اب ہمارا سپریم کورٹ میں جانے کا ارادہ ہے، دنیا کا نقصان برداشت نہیں کر سکتے، وہ لکھتے ہیں کہ: لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں، دنیا کم ہونے سے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہیں، لیکن ہم جو اللہ کی نافرمانیاں کرتے ہیں، اور جو اعمال صالحہ کی توفیق نہیں ہوتی، اس

سے کبھی خیال نہیں ہوتا کہ اللہ پاک ناراض ہیں، اصل میں کسی اللہ والے کے پاس بیٹھے نہیں، دماغ ہی خراب ہے، ذہن بھی صحیح نہیں، اگر اسی کا نام اللہ کی ناراضگی ہے تو نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ ناراض ہوں گے، استغفر اللہ!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں دو دو مہینے، تین تین مہینے کھانا نہیں پکتا تھا، تو نعوذ باللہ! اللہ میاں بہت ناراض ہیں! تو خیر لوگوں کے نزدیک دنیا کا نفع، نفع ہے، دنیا کا نقصان، نقصان ہے۔

یہاں دنیاوی معاملات میں تمام اسباب و وسائل کو جمع کر کے پھر کہتے ہیں کہ دعا کرو! اور آخرت کے معاملہ میں کچھ بھی نہیں کرتے، بس کہہ دیتے ہیں کہ دعا کرو! اگر کوئی کہہ بھی دے اور نصیحت کردے تو اس کو کہہ دیتے ہیں کہ دعا کرو! اپنے طور پر تو کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا کہ کسی اللہ کے بندے کے پاس جا کر کہہ دیں کہ میری آخرت درست ہو جائے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ برکت معین ضرور ہے مگر کافی نہیں، یہاں تک کہ محض دعا کی برکت تو ہرگز کافی نہیں ہوسکتی، مگر یہ ہوسکتا ہے کہ محض ہمت اور استعمالِ اختیار کافی ہو جائے۔

ایک آدمی شیخ سے تعلق رکھتا ہے اور اس آدمی کا خیال ہے کہ شیخ کی برکت سے سارا کام ہو جائے گا، ہرگز نہیں ہوگا۔

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ یہ ہوسکتا ہے کہ صرف شیخ نہیں بلکہ عزم، ارادہ اور اعمالِ آخرت کے اختیار اور برکتِ شیخ کے مجموعہ سے کام لیتا ہے، تو انشاءاللہ بیڑا پار ہو جائے گا۔

کام خود کرنا پڑے گا:

میں تو ان باتوں کو علی الاعلان کہتا ہوں، خواہ مخواہ اپنے متعلقین کو اپنا مقید بنانا نہیں چاہتا، اگر کوئی شخص اپنی اصلاح خود کر سکے، چشم ما روشن دل ما شاد! خوشی کا مقام ہے، ہمارا بوجھ ہلکا ہوا، بیعت کرنے سے مقصود تو یہ ہے کہ اپنی اصلاح ہو، اپنی اصلاح کروائیں، اپنے عیوب شیخ کے سامنے بیان کریں اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل کریں، اگر کوئی اپنے آپ اپنی اصلاح کر لیتا ہے، تو اس کو شیخ سے اصلاح لینے کی ضرورت نہیں ہے، سبحان اللہ کیا بات ہے! بہت ہی اچھی بات ہے۔ ہمارا تو بوجھ ہلکا ہوگیا، ایک دن میں بیس خطوط لکھنے کے بجائے اگر دس خط لکھنے پڑیں تو مجھے خوشی ہوگی، اور دس کے بجائے بیس لکھنے پڑیں تو کام بڑھے گا، اور دوسرا جمگھٹا جتنا زیادہ ہوگا، ہم پر بوجھ ہی بڑھے گا، ہم تو چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی بھی نہ آئے، اپنا اللہ اللہ کیا کریں، اسی لئے میں شروع میں بیعت کرتا بھی نہیں تھا، بزرگوں نے زبردستی حکم دیا۔

بیعت کے انکار کی وجہ:

مکہ مکرمہ میں ہمارے شیخ رحمہ اللہ کے بڑے خلیفہ ڈاکٹر اسماعیل صاحب نے مجھے کہا کہ سنا ہے تم بیعت کرنے سے لوگوں کو انکار کر دیتے ہو؟ میں نے کہا کہ بے وقوف ہیں لوگ جو میرے پاس آتے ہیں، کسی عالم کے پاس جائیں، انکار تو اس لئے کرتا ہوں کہ کسی اچھے آدمی کے پاس چلے جائیں گے، ان کا کام ہو جائے گا۔ میری اس بات سے ڈاکٹر اسماعیل صاحب بہت ناراض ہوئے، فرمایا کہ تم اپنے شیخ سے خیانت کرتے ہو، میں نے کہا کہ آئندہ ایسا نہیں کروں گا، تو واللہ العظیم! جی چاہتا ہے کوئی بھی نہ آئے، کسی اچھے آدمی کے پاس چلے جائیں، اس لئے جب کوئی بیعت ہونے کے لئے کہتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ حکیم اختر صاحب ہیں، ان کے پاس چلے

جاؤ، مفتی رشید احمد صاحب ہیں، ڈنڈے والے پیر، ان کے پاس چلے جاؤ، مولانا تقی عثمانی صاحب ہیں، ان کے پاس چلے جاؤ، دوسرے بہت سے اکابر ہیں، کوئی پنجاب کا ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ تمہارے علاقہ میں حضرت نفیس شاہ صاحب ہیں، ان سے تعلق رکھو، تو ہمیں تو خوشی ہے کہ لوگ نہ آئیں، ہمارا بوجھ ہلکا ہو، لیکن اس کا افسوس ہے کہ آئیں بھی اور کچھ لے کر بھی نہ جائیں۔

میں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ کمزور ماں باپ کی اولاد بھی کمزور ہوا کرتی ہے، ہم کمزور ہیں، ہم سے استفادہ کوئی کیا کرے گا؟ وہ بھی کمزور ہی ہوگا، کسی اچھے اور بڑے آدمی کے پاس چلے جاؤ۔

تو بھائی! اگر کوئی شخص اپنی اصلاح خود کرسکتا ہو تو سبحان اللہ! اس سے اچھی کیا چیز ہے؟ لیکن یہ تو نہیں ہونا چاہئے کہ بیعت کا تعلق بھی ہے اور کوئی اصلاح میں ترقی بھی نہیں ہے، جہاں پہلے دن تھے، وہیں کھڑے ہیں، کوئی ترقی نہیں کی، ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔

شیخ کا کام:

عرض کیا گیا کہ یہ تقریر کہیں اس کے خلاف تو نہ ہوگی:

بے رفیق ہر کہ شد در راہ عشق
عمر بہ گزشت ونشد آگاہ عشق

یعنی جو شخص رفیق کے بغیر عشق کے راستے میں قدم رکھے، عمر بیت جائے گی لیکن عشق کا پتہ نہیں چلے گا۔

عشق بازی مرید کا کام ہے:

تو حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ضرورت ہی نہیں ہے پیر کی، خود ہی کام کرتے رہو۔ عرض کیا گیا کہ اس کے خلاف تو نہیں آپ کی یہ بات۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ:

خلاف کیوں ہو یہ تو اور ہماری معیت ہے، آگاہ عشق فرمایا یعنی بغیر عشق کے آگاہ نہیں ہوگا، لیکن یہ عشق سے آگاہ ہونا، عشق تو یہ خود کرے گا، اس کی جگہ اس کے شیخ تو نہیں کریں گے، عشق بازی تو یہ خود کرے گا۔ شیخ کے ذمہ تو عشق کا راستہ بتانا ہے، عشق خود کرلو، شیخ معشوق کا پتہ بتادے گا۔

رگڑ سے گرمی پیدا ہوگی:

حضرت ذکی الامتؒ، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں گئے، یہ بہت معمر بزرگ تھے، ان سے کہنے لگے کہ حضرت کوئی طریقہ بتلایئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوجائے، فرمایا کہ: اپنے ہاتھ کو رگڑو اور اس طرح ملو، شیخ کا حکم تھا حضرت ذکی الامتؒ ہاتھ ملنے لگے، فرمایا کہ اور زیادہ زور سے ملو، انہوں نے ملا، فرمایا کہ کچھ گرمی پیدا ہوئی؟ کہا: جی! فرمایا: ایسے ہی رگڑتے رگڑتے گرمی پیدا ہوجاتی ہے۔ بس شیخ نے راستہ بتلادیا، بھائی! اللہ کے راستہ پر چلنے سے پہلے ہی دن ولی اللہ نہیں بن جاؤ گے، اور پہلے ہی دن مکاشفے نہیں ملنے لگیں گے، لیکن زور سے رگڑتے رہو گرمی پیدا ہوگی، اللہ کے راستے پر چلتے رہو گے تو تعلق مع اللہ بھی پیدا ہوجائے گا، اور یہی آگاہ عشق ہونا ہے، عشق سے آگاہ ہونا ہے۔ بلا شیخ کے آگاہ نہ ہوگا، علم کا درجہ حاصل نہ ہوگا شیخ اس کا راستہ بتلائے گا، یہ مطلب نہیں کہ شیخ اس کو گھسیٹ کر لے چلے، اندھے کو آنکھوں والا راہ بتلاتا ہے، گود میں اٹھا کر تو نہیں لے جاتا، جیسے کوئی شخص راستہ نہ جانتا ہو، نابلد ہے، اس کو کہتے ہیں کہ اس طرف چلے جاؤ، کبھی انگلی بھی پکڑ لیتے ہیں، لیکن گود میں تو نہیں اٹھاتے کہ حافظ جی کو چلنا نہ پڑے، حافظ جی کو تو چلنا خود ہی پڑے گا۔ اس لئے یہ خیال کرلینا کہ بس بیعت کا تعلق کافی ہے، کام وغیرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، خود ہی سب کام ہوجائے گا، یہ غلط ہے، راستہ بتلانا تو بے شک شیخ کا کام ہے، لیکن راستہ کا طے کرنا تو اسی کے ذمہ ہے۔

ایک نشست میں خدا تک پہنچانا:

حضرتؒ کا ایک پرانا ملفوظ یاد آ گیا کہ ایک صاحب کو بہت مفصل طور پر راہِ سلوک بیان کرتے ہوئے فرمایا: الحمدللہ! میں تو طالب کو ایک ہی جلسہ میں خدا تک پہنچا دیتا ہوں، کیونکہ مقصود کی حقیقت کو بتلا دینا گویا مقصود تک پہنچا دینا ہے، اگر کوئی راستہ بتلا دے اور کہہ دے کہ دیکھو وہ چراغ جل رہا ہے، تو یہ گویا اس کو چراغ ہی تک پہنچانا ہے، اب صرف راستہ قطع کرنا باقی ہے، یہ طالب کا کام ہے، قدم اٹھاتا جائے مقصود تک پہنچ جائے گا۔ فرمایا کہ میں تو ایک ہی جلسہ میں طالب کو مقصود تک پہنچا دیتا ہوں۔

مقصود تک پہنچانے کے معنی راستہ دکھلانے کے ہیں، ایک بات تو صاف ہوگئی، طے ہوگئی کہ یہ کرنا ہے۔

حصولِ مقصد کے انداز:

اب آدمی کو بہت دفعہ یہ پریشانی ہوتی ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ مجھے راستہ کیسے قطع کرنا ہے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ میں تو ایک جلسہ میں مقصود تک پہنچا دیتا ہوں، راستہ دکھلا دیتا ہوں، دور سے دکھا دیا کہ وہ چراغ جل رہا ہے، رات کا وقت ہے، وہاں پر پہنچ جاؤ، اب راستہ اس کو قطع کرنا پڑے گا، چاہے رینگتا ہوا چلے، آہستہ آہستہ چلے اور چاہے فوراً بھاگتا ہوا چلا جائے۔

سوکھی اور گیلی لکڑیاں:

ایک بزرگ تھے ان کے پاس ایک عالم بیعت ہوئے، چند دن رہے خلافت لے کر چلتے بنے، ان کے دوسرے مرید خانقاہ میں برسوں سے پڑے ہوئے تھے، وہ کہنے لگے کہ ہم اتنے عرصہ سے پڑے ہوئے ہیں، ہمیں تو کچھ نہیں ملا، اور یہ صاحب آئے اور خلافت لے کر بھی چلے گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ درخت کاٹ کر لاؤ، مریدین شاخیں کاٹ کر لائے، فرمایا کہ جلاؤ، اب جلائیں کیسے؟ کیونکہ درخت کی

شاخیں گیلی ہیں، ان سے پانی ٹپکتا ہے، وہ دھواں سا ہوتا رہا اور آگ نہیں جلی، پھر شیخ نے خشک لکڑیاں منگوائیں اور لکڑیاں بھی تیل کی، ان کو دیاسلائی دکھلادی فوراً جلنے لگیں، اس بزرگ نے فرمایا: تمہاری مثال گیلی لکڑیوں کی تھی، اتنے دنوں سے تمہارا پانی خشک کر رہا ہوں، ابھی تک وہی خشک نہیں ہو رہا، دھواں ہی اٹھ رہا ہے، اور ان صاحب کی مثال اس سوکھی لکڑی کی ہے جس میں تیل موجود ہے، صرف دیاسلائی دکھلانی تھی وہ دکھلادی کام ہوگیا، عشق کی آگ جل پڑی۔

خواہشات گیلی لکڑیاں ہیں:

یہ گیلی لکڑیاں کیا ہیں؟ نفسانی خواہشات ہیں، ماحول کے تأثرات، ماحول کی آب و ہوا، جب تک ہم اپنی ہوا و ہوس سے گزر کر اللہ کے راستہ میں قدم نہیں رکھتے، اس وقت تک کام نہیں چلے گا، اگر تھوڑا بہت کام کریں گے بھی، تو بس دھواں ہی نکلے گا، آگ نہیں جلے گی، نہ تپش پیدا ہوگی اور نہ روشنی پیدا ہوگی، آگ کی دو خاصیتیں ہیں: ایک تو تپش ہوتی ہے جو کہ اس کی اصلی خاصیت ہے جیسا کہ کسی بزرگ کا قول ہے:

جو آگ کی خاصیت وہی عشق کی خاصیت

ایک خانہ بہ خانہ ہے ایک سینہ بہ سینہ ہے

آگ ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہوتی ہے، اور عشق ایک سینہ سے دوسرے سینہ میں منتقل ہوتا ہے۔ گرمی اور روشنی۔ تو جب تک اپنی خواہش سے آدمی نہیں گزرے گا، اور ہوا و ہوس کو ترک نہیں کرے گا اور عزم کے ساتھ اللہ کے راستہ پر قدم نہیں رکھے گا، کام کس طرح چلے گا؟ ہمت کرلو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمت اور استقلال سے کام لو، عزم، ہمت اور استقلال سے کام لو۔ نیک کاموں کے کرنے اور گناہوں کے چھوڑنے کا عزم کرلو، پھر ہمت سے

کام لو اور پھر استقلال اختیار کرو، ایک دو دن کی تو بات نہیں ساری عمر کا چکر ہے، بس یہ تین لفظ ہیں انشاءاللہ مقصود حاصل ہو جائے گا۔

گناہوں کو چھوڑنے کی ترکیب:

ہمارے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحب نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ میں گناہوں کی تین قسمیں کرتا ہوں:

۱:......ایک گناہ وہ ہیں جن کو تم چھوڑ سکتے ہو، ان کو چھوڑ دو، تمہاری ذات سے تعلق رکھتے ہیں ناں! چھوڑ دو، کیا نقصان ہوتا ہے؟

۲:......اور ایک گناہ ایسے ہیں جن کو فوراً نہیں چھوڑ سکتے، ان میں ارادہ کرلو کہ چھوڑ دیں گے انشاءاللہ، اب اللہ سے مانگتے رہو۔

۳:......اور تمہارے خیال میں بعض گناہ ایسے ہیں کہ تم ان کو چھوڑ نہیں سکتے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے لئے کم سے کم اتنا تو کرو کہ اللہ سے یوں کہو کہ یا اللہ! میں ان گناہوں کو چھوڑنا چاہتا ہوں مگر چھوڑ نہیں سکتا، یا اللہ! یا تو آپ چھڑا دیجئے یا پھر عذاب نہ دیجئے، اس پر پکڑ نہ فرمایئے۔ اپنے قصور کا اعتراف کرلو اور اللہ تعالیٰ سے یہ کہتے رہو انشاءاللہ! اللہ تعالیٰ چھوڑنے کی توفیق عطا فرمادیں گے۔

لیکن جو گناہ ہمارے اختیار میں ہیں، ہم نے کبھی ایک گناہ کے چھوڑنے کا عزم بھی نہیں کیا اور یہی بات نیک اعمال کے بارے میں ہے، جو فرائض و واجبات فوری طور پر ادا کرنے کے ہیں، ادا کرو، اور جن پر عمل نہیں ہوسکتا، ان کے لئے نیت رکھو اور دعا بھی کرو کہ انشاءاللہ ان پر عمل کریں گے، اور کچھ اعمال ایسے ہیں کہ جن کو ہم اختیار ہی نہیں کرسکتے، وہاں اپنی کوتاہی و تقصیر کا اعتراف کرلو، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے، آمین! خلاصہ یہ ہے کہ عزم، ہمت اور استقلال ان تین چیزوں سے کام لو۔

انسان مجبور محض نہیں:

ان گناہوں کے چھوڑنے میں انسان اپنے اختیار کو بھی بروئے کار لائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور محض نہیں بنایا، اختیار کا ظاہر ہونا اتنا ہے کہ انسان تو انسان، جانوروں کو بھی اس کی اجازت ہے، دیکھئے اگر کسی کتے کو لکڑی سے مارا جائے تو وہ مارنے والے پر حملہ کرتا ہے، نہ کہ لکڑی پر، اس کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کون مختار ہے اور کون مجبور۔

جبر و قدر کی حقیقت:

ہر شخص اپنے وجدان کو ٹٹول کر دیکھ لے کہ جب کوئی ناشائستہ حرکت کرتا ہے تو اس کو خجالت ہوتی ہے، اگر وہ اپنے کو مجبور سمجھتا تو پھر خجلت کیوں ہوتی ہے؟ خجلت تو اپنے اختیاری فعل پر ہی ہوسکتی ہے، لہٰذا یہ یقینی ہے کہ انسان مختار ہے، اور یہ مسئلہ اختیار اس قدر ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے اندر صفات اختیار کو وجداناً اور طبعاً محسوس کرتا ہے، حتیٰ کہ جو جبری ہیں وہ بھی محض قولاً جبری ہیں، وجداناً وہ بھی اختیار کے قائل ہیں، کسی کو اس سے مجالِ انکار نہیں۔

عدم علم، عدم شئ کی دلیل نہیں:

پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کی کنہ (حقیقت) کسی کو معلوم ہے اور نہ معلوم ہوسکتی ہے، مگر کسی شئے کے معلوم نہ ہونے سے اس کے وجود کا انکار نہیں کیا جاتا، مثال کے طور پر ضیاءٗ اور روشنی کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں، حالانکہ اس کا وجود بالکل واضح اور مشاہد ہے، کیا اس کے وجود کا انکار کیا جاسکتا ہے؟

جبر و قدر کی حقیقت:

حضرت مولانا رومیؒ نے نہایت سادہ اور سہل عنوان سے اس مسئلہ جبر و

اختیار کو بیان فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

زاریٔ معشوق دلیل اضطرار
وخجلت معشوق دلیل اختیار

اگر اضطرار نہیں تو یہ زاری کیوں ہے؟ اور اگر اختیار نہیں تو اپنے کیئے پر شرمساری کیوں ہے؟

غرض نہ خالص جبر ہے اور نہ خالص اختیار، اختیار خالص نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ماتحت ہے اختیار حق کے، مستقل اختیار نہیں۔

اپنے اختیار کو استعمال کیئے بغیر اصلاح نہ ہوگی:

بہرحال انسان میں صفت اختیار کا ہونا قطعی ہے، جب یہ ہے تو اپنی اصلاح کرنے میں بھی اس صفت کو اختیار کرنا چاہئے، جب تک نہ کرے گا، اصلاح نہ ہوگی۔ مثلاً کسی میں بخل ہے تو کیا میرے ذکر وشغل سے یا شیخ کی دعا کی برکت سے یہ رذیلہ زائل ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! یہ رذیلہ تو نفس کی مقاومت ہی سے زائل ہوگا، البتہ ذکر و شغل معین ضرور ہوجائیں گے مگر کافی نہیں ہوں گے، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ جابجا اپنے مکتوبات میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

کارکن کار گفتار قندری از کار باید کار

کام کرنے سے ہی کام چلتا ہے، نیک تمناؤں اور نیک دعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ اپنی اصلاح کرنا، نیکیوں کا حاصل کرنا، برائیوں سے بچنا، دل کے اندر جو گندے اخلاق ہیں ان سے اپنے آپ کو پاک کرنا، اچھے اخلاق کا پیدا کرنا، یہ تمام کی تمام چیزیں اختیاری ہیں، انسان کے اختیار میں ہے، یوں کوئی بہانہ کرنے کے لئے کہے کہ انسان مجبور ہے تو یہ غلط کہتا ہے، انسان مجبور نہیں۔

جانور بھی جانتے ہیں کہ انسان صاحبِ اختیار ہے:

اکابر فرماتے ہیں کہ انسان کا صاحب اختیار ہونا اتنی واضح چیز ہے، اتنی کھلی ہوئی چیز ہے کہ آدمی تو آدمی، جانور بھی اس کو جانتے ہیں، کتے کو ماریں گے تو مارنے والے کو بھونکتا ہے، لکڑی کو نہیں بھونکتا، مارنے والے پر ہی حملہ کرتا ہے لکڑی پر نہیں کرتا، کتا بھی جانتا ہے کہ لکڑی بے جان ہے، یہ اپنے آپ نہیں چلتی، اس کو کوئی چلانے والا چلاتا ہے، اور انسان جس کے ہاتھ میں لکڑی ہے وہ صاحبِ اختیار ہے۔

تو معلوم ہوا کہ جانور بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ انسان صاحب اختیار ہے، مجبورِ محض نہیں ہے۔

اختیار کی حقیقت ہماری سمجھ سے باہر ہے:

خیر اتنی بات صحیح ہے کہ انسان بااختیار ہے، رہا یہ کہ انسان کے اختیار کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، کوئی اس کو نہیں سمجھ سکتا اور اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

روح کی حقیقت ہماری سمجھ سے بالا ہے:

میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ انسان کے اندر جان ہے اور یہی جان مردہ اور زندہ کے درمیان فرق کرتی ہے، زندہ آدمی میں جان ہوتی ہے اور جب جان نکل جاتی ہے تو آدمی مرجاتا ہے، لیکن جان اور روح کیا چیز ہیں؟ کوئی اس کی حقیقت کو نہیں جانتا، حکمأ بھی عاجز آگئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ سوال ذکر کیا ہے:

"وَيَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ
رَبِّیْ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔" (بنی اسرائیل:۸۵)

ترجمہ:......"وہ آپؐ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے میں کہ روح کیا چیز ہے؟ آپؐ فرما دیجئے کہ روح میرے

رب کے امر سے ہے، اور تم کو نہیں دیا گیا علم مگر بہت تھوڑا‘‘

اس تھوڑے علم کے ساتھ تم روح کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے ہو، چنانچہ تمام حکمائ، تمام سائنسدان، تمام عقلا آج تک روح کی حقیقت کے جاننے سے قاصر ہیں، میری اور آپ کی کیا بات ہے؟ زندہ اور مردہ کے درمیان فرق ہونا اس کو ہر شخص جانتا ہے، اور یہ بات کہ زندگی روح اور جان کے ساتھ ہے، اور موت روح اور جان کے نکالنے کا نام ہے اس کو بھی ہر شخص جانتا ہے، لیکن جان ہے کیا چیز؟ روح کس چیز کا نام ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔

دوسری مثال:

حضرتؒ نے دوسری مثال بیان فرمائی ہے نور کہو یا روشنی کہو یا ضیائ کہو، اس کی حقیقت کیا ہے؟ کوئی نہیں جانتا، بتاؤ روشنی کس کو کہتے ہیں؟ ظلمت یعنی تاریکی، اندھیرا اس کی ہم تعریف کرتے ہیں عدم نور کے ساتھ، روشنی کا نہ ہونا اندھیرا ہے، روشنی کے نہ ہونے کا نام ہے اندھیرا، تاریکی، لیکن مطلق روشنی کیا چیز ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو بتلانے سے عاجز ہیں لوگ۔ اطبائ، حکمائ، سائنسدان وہ بھی اس کی تعریف نہیں کرسکتے ہیں، بتائیں روشنی کس چیز کا نام ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟

تو کیا محض اس وجہ سے کہ ہم روشنی کی حقیقت نہیں جانتے، روشنی کا انکار کرلیا کریں کہ روشنی کوئی چیز نہیں ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ روشنی کوئی چیز نہیں ہے، اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ اندھا ہے، زیادہ سے زیادہ جو تعریف کی گئی ہے نور کی وہ یہ ہے کہ: جو چیز خود روشن ہو، اور اس کی وجہ سے دوسری چیزیں روشن ہوں، بس یہ تعریف ہم کرتے ہیں، لیکن یہ کوئی حقیقت نہیں، حقیقت تک ہم نہیں پہنچے۔

تو جس طرح کہ روح کو سب جانتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت نہیں جانتے، اور روشنی کو اور نور کو سب جانتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت نہیں جانتے، اسی طرح انسان

کا مختار ہونا یعنی صاحب اختیار ہونا اس کو سب جانتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ نہیں جانتے۔ انسان مختار ہے یا مجبور ہے؟ اس میں لوگ بہت بھٹکے ہیں۔

بعضوں نے کہا کہ انسان مجبور ہے، جبری بن گئے۔ بعضوں نے کہا کہ انسان مختار مطلق ہے، یہ بھی بھٹک گئے۔ حالانکہ انسان نہ مجبورِ محض ہے، پتھر لکڑی کی طرح اور نہ یہ صاحب اختیار ہے من کل الوجوہ، مطلق طور پر، بلکہ معاملہ بیچ بیچ میں ہے۔

جبر وقدر حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں:

حضرت تھانویؒ سے کسی شخص نے یہ جبر و اختیار کا مسئلہ پوچھا تھا، حضرتؒ نے فرمایا کہ: ایک ٹانگ اٹھاؤ، ایک پاؤں اٹھاؤ، اٹھالیا، فرمایا کہ دوسرا بھی اٹھالو، کہا کہ حضرت جب ایک پاؤں رکھوں گا تو دوسرا اٹھاؤں گا، بغیر اس کے کیسے اٹھالوں؟ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ بس اتنا اختیار ہے اور اتنی مجبوری، اختیار بھی ہے اور جبر بھی ہے۔

جبر وقدر مولانا رومیؒ کے الفاظ میں:

مولانا رومیؒ نے مثنوی شریف میں بہت ہی خوبصورت الفاظ میں اس کو بیان فرمایا کہ انسان مجبور بھی ہے اور انسان مختار بھی ہے۔ فرماتے ہیں:

زاریٔ معشوق دلیل اضطرار
و خجلت معشوق دلیل اختیار

جب کوئی تکلیف ہوتی ہے، مصیبت ہوتی ہے، روتے ہیں، چلاتے ہیں، بلبلاتے ہیں (حضرت! اگر قادرِ مطلق تھے تو روتے کیوں ہیں؟ قادرِ مطلق بھی رویا کرتا ہے؟ خدا تعالیٰ کو بھی کیا رونا آتا ہے، نعوذ اللہ!) ہم تو ایک کام کرتے ہیں، کام کرنے کے بعد خود شرمندہ ہوتے ہیں، شرمندگی ہوتی ہے، اگر اختیار ہوتا تو شرمندگی

کیوں ہوتی؟ تو معلوم ہوا کہ آدمی نہ من کل الوجوہ مختار ہے، اور نہ اپنے سے جبری ہے، یعنی مجبورِ محض ہے، بلکہ بیچ بیچ میں معاملہ ہے۔ مولانا رومیؒ چٹکیوں میں مسائل حل کر دیتے ہیں۔

جبری کی اصلاح کا ایک قصہ:

ایک جگہ اس جبر وقدر کے مسئلہ پر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک آدمی کہیں چلا گیا تھا، باغ سے پھل توڑ کر کھانے لگا، باغ کے مالک نے اپنے نوکر کو بھیجا کہ اس سے کہو کہ پرائے مال میں سے بغیر پوچھے کیوں پھل کھاتا ہے؟ غلام اس کے پاس آیا اور یہ بات کہی کہ مالک کی اجازت کے بغیر پھل توڑتے ہو، کھاتے ہو، یہ تو ٹھیک نہیں ہے، وہ کہنے لگا کہ باغ بھی خدا کا، پھل بھی خدا کا، اور میں بھی خدا کا، تو روکنے والا کون ہوتا ہے؟ باغ کے مالک نے سن لیا کہ یہ جبری ہے، نوکر کو حکم دیا کہ ایک رسّہ لاؤ، اور ایک ڈنڈا بھی لاؤ، رسّہ کے ساتھ اس کو باندھ دیا اور ڈنڈے کے ساتھ پٹائی کرنے لگا، اب جب ڈنڈا برسے گا تو ہائے، ہائے تو نکلے گی، باغ کا مالک کہنے لگا کہ تو بھی خدا کا، رسّہ بھی خدا کا، ڈنڈا بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا، ہائے، ہائے کیوں کرتا ہے؟ تو یہ کہنے لگا:

توبہ کردم از جبر اے عیار!
اختیار است اختیار است اختیار

میں جبر کے عقیدہ سے توبہ کرتا ہوں، اختیار کا قائل ہوں، اختیار ہے، اختیار ہے، اختیار ہے۔

بڑی غلطی:

یہ بڑی غلطی ہے کہ ہم لوگ اپنے کرنے کا کام تو کرتے نہیں، اور جو کرنے کا نہیں ہے اس میں الجھتے ہیں، بہت سے لوگ مجھے خطوط لکھتے ہیں، اس میں یہی

اختیار اور جبر کا مسئلہ پوچھتے ہیں، کبھی اپنے کرنے کی بات بھی پوچھی کہ میرے کرنے کا کام کیا ہے؟ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ وہ کیوں ہو رہا ہے؟ دنیا میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ حافظ شیرازیؒ نے اسی لئے نصیحت کی تھی کہ:

حدیث مطرب وے گو
راز دہر کم تر جو
در حکمت کس لب نہ کشاید
حکمت ایں معما را

مطرب و مے کی باتیں کرو، اللہ و رسول کی باتیں کرو، اپنے عمل کی باتیں کرو، جن چیزوں کا تعلق تمہارے دائرۂ اختیار سے ہے، اس کے بارے میں بات کرو اور زمانے کے راز کم ڈھونڈا کرو کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ وہ کیوں ہو رہا ہے؟ ایسا کیوں ہوگا؟ ویسا کیوں ہوگا؟ اس لئے کہ یہ ایک ایسا معما ہے، حکمت کے ساتھ نہ کوئی اس معما کو حل کر سکا اور نہ ہی کر سکے گا۔ یہ تمہاری حکمت و دانائی سے بالاتر چیز ہے، تم اپنا کام کرو۔

خدائی معاملات میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں:

بہت سے لوگ نہایت ہی مہمل سوالات کرتے ہیں، اپنا وقت بھی ضائع کرتے ہیں، دوسرے کا وقت بھی ضائع کرتے ہیں، مجھے بہت افسوس اور صدمہ ہوتا ہے، بہت کم لوگ ہوں گے جو اپنی ذات کے بارے میں پوچھتے ہوں۔ سو میں سے دس آدمی بڑی مشکل سے ملیں گے جو شرعی مسئلہ اپنی ذات کے لئے پوچھتے ہوں، یہاں وہاں کی ہانکتے ہیں، لوگوں کی باتیں کرتے ہیں، اپنی نہیں کرتے، یہی لوگ خدائی معاملات میں ٹانگ اڑاتے ہیں، اللہ نے ایسا کیوں کیا؟ ایسا کیوں کیا؟ مرد کو مرد اور عورت کو عورت کیوں بنایا؟ جواب دو، کتے کو کتا اور بلی کو بلی کیوں بنایا؟ کوئی حکمت

کے ساتھ اس معما کو حل کر سکے گا؟

میں ایک ہی لفظ لکھ دیتا ہوں کہ تم بندے ہو، بندگی کے آداب سیکھو، خدائی کو خدا پر چھوڑ دو، خدائی کرنا وہ خود جانتا ہے، اس کو تمہارے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔

میں اگر کوئی بات ہانک بھی دوں تو اس سے کیا خدائی کا معما حل ہوجائے گا؟ اسی طرح یہ جبر و قدر کا مسئلہ ہے، تقدیر کا مسئلہ ہے، یہ میرے آپ کے طے کرنے کی بات نہیں ہے، اتنا جانتے ہو کہ انسان مختار ہے، اچھا کام کرتے ہو تو طبیعت خوش ہوتی ہے، برا کام کرتے ہو تو طبیعت بدمزہ ہوتی ہے، دل میں خود شرمندہ ہوتے ہو، معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو فاعل مختار سمجھتے ہیں، اور اچھا کام کرکے خوش ہونا اور برا کام کرکے برائی ہوجائے تو طبیعت کا بدمزہ ہونا، یہ ایمان کی علامت ہے۔

ایک صاحب نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کیسے پتہ چلے کہ میں مؤمن ہوں؟ فرمایا کہ:

"اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَائَتْکَ سَیِّاَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ." (مشکوٰۃ ص:۱۶)

ترجمہ:...... "جب تیری نیکی تجھے خوش کرے اور تیری برائی تجھے بری لگے بس تو مؤمن ہے۔"

نیکی پر فرحت ہو نہ کہ ناز:

نیکی کا کام کرکے طبیعت میں فرحت پیدا ہو، ناز نہ کرے، ناز اور چیز ہے، دل میں فرحت کا پیدا ہونا اور چیز ہے۔ کسی آدمی نے نماز پڑھی اور اللہ نے توفیق دی نماز پڑھی، اچھی نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ سے باتیں کیں، خوب دعا مانگی تنہائی میں، دل میں ایک خاص خوشی پیدا ہوجاتی ہے، خاص فرحت پیدا ہوجاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ طبیعت کا سارا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ یہ ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تیری نیکی تجھ کو خوش کردے، اور بطور فخر کے بیان کرنا یہ بے ہودگی ہے، اس کو بیان کرنا یہ بے ہودہ کام ہے۔ دل میں فرحت کا پیدا ہوجانا اچھا کام کرکے، نیکی کا کام کرکے اور خدانخواستہ کوئی غلطی ہوگئی، گناہ ہوگیا، برائی ہوگئی تو دل میں غم پیدا ہوجائے، یہ علامت ایمان کی ہے۔

اور اگر نیکی کا کام کرکے خوشی نہیں ہوتی، اور گناہ کا کام کرکے طبیعت بدمزہ نہیں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے کہ چیت ہے سب کچھ، اندر کا جو دل ہے یہ اندھا ہوگیا ہے بے چارا، اس میں تاثر ہی نہیں رہا۔

انسان کو امورِ اختاریہ کا مکلّف بنایا گیا ہے:

تو خلاصہ یہ کہ آدمی میں اختیار ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیاری امور ہی کا مکلّف کیا ہے، نماز ہے، روزہ ہے، نیکی کے کام ہیں، ان کے کرنے کا حکم فرمایا، انسان قادر ہے، انسان کو ان امور پر اختیار ہے، اگر اختیار نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کبھی بھی مکلّف نہ فرماتے، اور گناہ کے جتنے بھی کام ہیں ان کے چھوڑ دینے کا اختیار ہے، ہم اپنے نفس کو دھوکا دیتے ہیں یہ کہہ کر کہ مجھے اس کام کے چھوڑنے کا اختیار نہیں ہے، میں چھوڑ نہیں سکتا، ٹھیک ہے، آپ ٹھیک کہتے ہوں گے کہ میں ان کو چھوڑ نہیں سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو کہا کہ چھوڑ دو، اور یہ تو نہیں کہ دو سال کے چھوٹے بچے کو اللہ تعالیٰ دومن کے بوجھ اٹھانے کا حکم دے دیں کہ اٹھاؤ! اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ دومن چھوٹے بچے سے نہ اٹھے گا، اسی طرح جتنے کاموں کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرمایا ہے، وہ ہمارے اختیار میں ہیں، ہم اس کو کرسکتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ ہمیں کبھی حکم نہ فرماتے۔ اور جتنے کاموں کے چھوڑنے کا حکم فرمایا ہے ہم اس کے چھوڑنے پر قادر ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے چھوڑنے کا حکم نہ دیتے، یہ جانتے ہوئے کہ معذور ہیں،

قرآنِ کریم میں ہے: "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا." یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف نہیں بناتے۔

جب یہ بات طے ہوگئی کہ وہ تمام نیکی کے کام جن کے کرنے کا ہمیں حکم فرمایا ہے، اور گناہ کے کام جن سے باز رہنے کا حکم فرمایا ہے، ان کا کرنا اور ان کا چھوڑنا ہمارے اختیار میں ہے، تو اب دعا اور وظیفہ سے تو کام نہیں چلے گا۔ ہمت سے کام لینے سے کام چلے گا، ہمت سے کام لو۔

حاصل سلوک و تصوف:

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ تمام کا تمام تصوف اور سلوک صرف اسی ایک لفظ میں ہے کہ اپنے اختیاری امور میں ہمت سے کام لو، ہاں ذکر و اذکار، وِرد و وظائف، دعا اور التجا، شیخ کی توجہ اور عنایت، یہ چیزیں معین اور مددگار بنتی ہیں، لیکن اصل کام استعمالِ اختیار سے چلے گا، اور اگر کوئی شخص اپنے اختیار سے تو کام نہ لے، ہمت اور عزم کسی کام کے کرنے اور چھوڑنے کا نہ کرے، اور یہ کہتا رہے کہ کوئی وظیفہ بتلادو نماز قضا نہ ہوا کرے، تو تم بتلاؤ جو وظیفہ مانگتا ہے وہ کیا کام کرے گا؟ کوئی وظیفہ بتلاؤ کہ میرے اندر تکبر نہ رہے، میرا بھائی! اس کا علاج کرواؤ، بیماری ہے، صرف وظیفہ پڑھنے سے تو پیٹ کا درد نہیں جائے گا، علاج کرو، میرے اندر بخل کا مادہ نہ رہے، حسد نہ رہے، کینہ نہ رہے اور جتنے نفسانی رذائل ہیں وہ ختم ہوجائیں، محض وظیفہ پڑھنے سے تو یہ ختم نہ ہوں گے، شیخ کی ضرورت اسی لئے پیش آتی ہے کہ وہ ان رذائل کا علاج بتلائے، اور شیخ کی تجویز کے مطابق تم عمل کرو، اور اس کو اطلاع دیتے رہو۔

تشخیص و تجویز حاصل تصوف:

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سلوک کا خلاصہ دو لفظ میں کردیا ہے: تشخیص اور تجویز۔ اپنے حالات شیخ کے سامنے رکھو وہ تشخیص کرے گا کہ کون سا مرض ہے؟ خود

اپنے پاس سے نہ گھڑو، تم اپنے امراض کی صحیح تشخیص بھی نہیں کرسکتے ہو، شیخ اگر محقق ہوگا تو وہ تشخیص کرسکے گا کہ یہ کون سی بیماری ہے؟

حیاؔ اور کبر کا فرق:

میں نے ایک دفعہ اپنے حضرتؒ کو ایک بات لکھی تھی کہ: ''یہ کام کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، آیا یہ کبر ہے؟'' حضرتؒ نے فرمایا (میرے پاس وہ خط محفوظ ہے) یہ کبر نہیں، حیا کہلاتی ہے، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے تم کو کوئی ہاتھی پر سوار کردے، ہاتھی پر سوار ہوکر کے بدل جاؤ گے، بلکہ شرم آئے گی، ہاتھی پر سوار نہ ہونا کبر کی وجہ سے نہیں، بلکہ حیا کی وجہ سے ہے، اسی طرح اس کام کے کرنے سے جو مجھے شرم آتی ہے وہ حیا کی وجہ سے ہے، کبر کی وجہ سے نہیں، اب بتلایئے میں اس کو کبر سمجھا تھا، شیخ نے بتلایا کہ یہ کبر نہیں، حیا ہے۔

مرید کا کام:

تو شیخ ایک تو تشخیص کرے گا اور دوسری تجویز کرے گا، یعنی اس کا علاج تجویز کرے گا، اس تشخیص اور تجویز کے بعد اب حضرتؒ فرماتے ہیں کہ تمہارے دو کام رہ جائیں گے، اب وہ بھی میں نے دو لفظ بنادیئے ہیں: اطلاع اور اتباع۔ تم شیخ کو اپنے تمام حالات کی اطلاع دیتے رہو، اور تمہاری اطلاع کے بعد شیخ تشخیص کرے گا، اور تشخیص کے بعد تمہارے لئے تجویز کرے گا اور جو علاج تجویز کرے تو اس کی اتباع کرو، اور اس اتباع کی بھی اطلاع دیتے رہو، پس دو لفظ رہ گئے۔

پیر و مرید کے فرائض:

پورا خلاصہ تصوف کا یہ چار الفاظ بن گئے: اطلاع و اتباع، تشخیص و تجویز۔ دو کام شیخ کے ہیں اور دو کام تمہارے کرنے کے ہیں، شیخ کا کام تشخیص اور تجویز ہے اور مرید کا کام اطلاع و اتباع ہے۔

عورتوں کا فتنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ مَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: ثَلاثٌ مَنْ فَعَلَھُنَّ فَقَدْ تَعَرَّضَ لِلْمَقْتِ، اَلضِّحْکُ مِنْ غَیْرِ عَجَبٍ، وَالنَّوْمُ مِنْ غَیْرِ سَحَرٍ، وَالْاَکْلُ مِنْ غَیْرِ جَوْعٍ۔“

(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۳۷)

”عَنْ مَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: اُبْتُلِیْتُمْ بِفِتْنَۃِ الضَّرَّاءِ فَصَبَرْتُمْ، وَسَتُبْتَلُوْنَ بِفِتْنَۃِ السَّرَّاءِ، وَاَخْوَفُ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمْ فِتْنَۃَ النِّسَاءِ اِذَا تَسَوَّرْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَبِسْنَ رِیَاطَ الشَّامِ وَعَصْبَ الْیَمَنِ فَاتَّعَبْنَ الْغَنِیَّ وَکَلَّفْنَ الْفَقِیْرَ مَا لَا یَجِدُ۔“ (حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۳۶)

ترجمہ:......”حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ: جو شخص تین کام کرے، وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا نشانہ بن جاتا ہے:

۱:......بغیر تعجب کے ہنسنا۔

۲:......بغیر نیند کے غلبہ کے سوتے رہنا۔

۳:......اور بغیر بھوک کے کھانا کھانا۔"

ترجمہ:......"(دوسری روایت میں) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ: تم تکلیف کے امتحان میں ڈالے گئے مگر تم نے صبر کیا، اور اب تم خوشحالی کے امتحان میں ڈالے جاؤ گے، اور جس چیز کا تمہارے حق میں سب سے زیادہ اندیشہ کرتا ہوں وہ عورتوں کا فتنہ ہے، جبکہ وہ سونے چاندی کے کنگن پہنیں گی، اور شام کے نرم اور باریک کپڑے پہنیں گی، یمن کے رنگین اور منقش کپڑے پہنیں گی، پس مال دار کو تھکا دیں گی، اور فقیر اور نادار کو ایسی چیز کا مکلّف کریں گی جو اس کو میسر نہیں۔"

غضبِ الٰہی کے موجب تین امور:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پہلے ارشاد میں ہے جو شخص تین چیزوں کا ارتکاب کرے وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا نشانہ بن جاتا ہے:

۱:......بغیر تعجب کے ہنسنا۔

۲:......بلاوجہ اور بغیر نیند کے غلبہ کے سوتے رہنا۔

۳:......بغیر بھوک کے کھاتے رہنا۔

ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوجاتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دو کہ جس شخص سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، اس کو ان تین چیزوں میں مبتلا فرمادیتے ہیں، یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ تین باتیں اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے کا سبب بنتی ہیں۔

فطری امر:

یہ فطری امر ہے کہ غم کی بات پر آدمی کو غم ہوتا ہے، خوشی کی بات پر آدمی خوش ہوتا ہے، رونے کی بات پر روتا ہے، ہنسنے کی بات پر ہنستا بھی ہے، ان میں اللہ تعالیٰ نے انفعالیت رکھی ہے یعنی متاثر ہونا، جیسے حالات اس کے سامنے آئیں، ان سے یہ متاثر ہوتا ہے، غالب کے بقول:

دل ہی تو ہے نہ کہ سنگ وخشت
درد سے بھر نہ آئے کیوں؟

آدمی کا دل اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ یہ متاثر ہوتا ہے، اینٹ پتھر نہیں ہے جو متاثر نہ ہو، اس لئے آدمی کو ہنسنے کی بات پر ہنسی بھی آجاتی ہے۔

ہنسی کے تین درجات:

لیکن ہنسی کے بھی تین درجے ہیں:

ایک ہے تبسم کرنا، جس کو ہم ''مسکراہٹ'' کہتے ہیں۔

اور دوسرا ہے بغیر آواز کے ہنسنا، جس کو عربی میں ''ضحک'' کہتے ہیں، اس میں ہلکی سی آواز بھی آتی ہے، دانت بھی ظاہر ہوجاتے ہیں۔

اور تیسرا ہے قہقہہ لگانا کہ دور تک اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

تبسم سنت انبیاءؑ ہے:

تبسم تو سنت انبیاءؑ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر متبسم رہتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ''ضحک'' بھی ثابت ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ: ہم مسجد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھتے تھے، کبھی جاہلیت کی باتیں شروع ہوجاتی تھیں کہ ہم جاہلیت کے زمانے میں یہ کیا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی سماع فرماتے تھے، صحابہ کرامؓ کہتے ہیں کہ

ہنسنے کی بات پر ہنستے بھی تھے، لیکن ساری زندگی میں کبھی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قہقہہ ثابت نہیں۔

قہقہہ غفلت کی علامت:

بلند آواز سے قہقہہ لگانا غفلت کی دلیل ہے یعنی دل کے غافل اور دل کے سخت ہونے کی علامت ہے، اور حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ:

"..... اِنَّ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللہِ الْقَلْبُ الْقَاسِیْ."

(مشکوٰۃ ص:۱۹۸)

ترجمہ:...... "لوگوں میں سے اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ دور وہ سنگدل آدمی ہے، جس کا دل سخت ہو۔"

جو آدمی اللہ سے دور ہوگیا تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگئے، جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں، تو اس کو قریب کرلیتے ہیں، اسے اپنی محبت نصیب فرماتے ہیں، اپنی رضا نصیب فرماتے ہیں، اپنی خشیت نصیب فرماتے ہیں، اپنا ادب نصیب فرماتے ہیں، اپنا تعلق نصیب فرماتے ہیں، جتنا زیادہ کسی کو قرب ہوگا، اتنی ہی زیادہ اس پر عنایتیں ہوں گی۔ اور جتنا کوئی دور ہوگا، اتنا ہی نعمتوں سے دور ہوگا۔

آدمی سونے کے لئے نہیں:

آدمی کو دنیا میں سونے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کام کرتے ہوئے اس کے بدن میں تعب پیدا ہوجاتا ہے یعنی تھکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے، اس کے علاج کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں نیند عطا فرمائی ہے، تاکہ اس کے بدن کی خوراک اس کو پوری ملتی رہے۔

انسان کھانے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا:

یہی مسئلہ کھانے کا بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں کھانے کے لئے نہیں بنایا

بلکہ کھانا ہمارے لئے بنایا ہے۔ سونا اور کھانا دونوں ضرورت کی چیزیں ہیں، ان میں اتنی کمی نہ کی جائے کہ بدن میں اختلال پیدا ہو، صحت متاثر ہو، آدمی سوئے نہیں تو چڑچڑا ہوجاتا ہے، بے چارے نفسیاتی مریضوں کو نیند نہیں آیا کرتی، بلاشبہ سونا بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت اور ضرورت کی چیز ہے، لیکن تم کو سونے کے لئے پیدا نہیں کیا۔ کھانا بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، کھانے سے ہمارے بدن کی خوراک مہیا ہوتی ہے، اس سے بدن کا قِوام بنتا ہے اور بدن کا ڈھانچہ قائم رہتا ہے، لیکن کھانا بھی ضرورت کی چیز ہے، خود مقصود نہیں، مقصد کچھ اور ہے۔ گاڑی میں تیل ڈالا جاتا ہے، خود تیل ڈالتے رہنا ہی مقصد نہیں، وہ تو اس کی ضرورت ہے، اس کے بغیر وہ چلتی نہیں۔ تو جس شخص نے کھانے، پینے اور سونے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہو، حتیٰ کہ فرائض الٰہیہ کی بجا آوری میں بھی سستی ہوتی ہو، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم سوئے رہ جاتے ہیں، اکثر صبح کی نماز قضا ہوجاتی ہے، معلوم ہوا کہ نماز کو مقصد نہیں سمجھا، بلکہ کھانے پینے اور سونے کو مقصد سمجھا۔

نماز مقصد ہے:

میں بچوں کو کہا کرتا ہوں کہ نماز مقاصد میں سے ہے، کھانا، پینا، سونا مقصود نہیں ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کے لئے پیدا کیا ہے، نماز پڑھنا ہماری تخلیق، ہماری پیدائش اور دنیا میں ہمیں بھیجے جانے کے مدعا اور مقصد میں سے ایک ہے۔ نمازی کا بدن ایک سواری ہے اور سواری کے لئے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، چارے کی ضرورت ہوتی ہے، اگر آدمی اس گھوڑے کو پالنے میں ہی لگا رہے، اور اس سے کام نہ لے اور یا کم لے تو وہ بھی عربوں کے محاورے کے مطابق جیسا کہ عربی کہا کرتے ہیں کہ یہ شخص زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ؟ اگر کوئی گدھے کے پالنے میں ہی لگا رہتا ہے اور اس سے کام نہیں لیتا تو اپنے گدھے سے بڑا گدھا یہ خود ہے، اللہ

تعالیٰ ہمیں مقصد کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آزمائش کی قسمیں:

دوسرے ارشاد میں فرماتے ہیں کہ آزمائشیں دو قسم کی ہوتی ہیں، کبھی اللہ تعالیٰ تنگی کے ساتھ آزماتے ہیں، کبھی فراخی کے ساتھ، کبھی بیماری کے ساتھ اور کبھی صحت کے ساتھ، کبھی کمزوری کے ساتھ اور کبھی صحت وقوت کے ساتھ۔ تو تم لوگ تکلیف اور تنگی کے فتنے میں مبتلا کیے گئے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں تنگی دے کر آزمایا۔

صحابہ کرامؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتنی تنگی میں تھے یہ تو سب کو معلوم ہے، بہرحال آپ نے فرمایا اس پر تو تم نے صبر کرلیا یعنی اس آزمائش پر الحمدللہ! پورے اترے اور اس امتحان میں کامیاب رہے، اور اب اللہ تعالیٰ تمہیں فراخی کے ساتھ آزمائیں گے، اس میں کامیاب ہونے والے بہت کم ہیں۔

عورتوں کے ذریعہ آزمائش:

اور خود تو خیر آدمی چل سکے لیکن ان عورتوں کا کیا علاج کرے؟ یہ عورتیں تو لاعلاج بیماری ہیں، فرمایا کہ: ''جس آزمائش کا مجھے سب سے زیادہ اندیشہ ہے، وہ عورتوں کی آزمائش ہے۔'' کہ تم عورتوں کے فتنے کے سامنے نہیں ٹھہر سکو گے، فتنے کا یہ سیلاب تمہیں بہا کر لے جائے گا، جیسا کہ اکبر مرحوم نے کہا ہے:

اکبر نہ دب سکے برٹش کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بی بی کی نوج سے

اور فرمایا کہ: یہ اس وقت ہوگا جب یہ سونے اور چاندی کے کنگن پہننے لگیں گی، اب تو چاندی بھی گئی، صرف سونا رہ گیا ہے، ''ریاط الشام'' یعنی شام کے مہین نرم و نازک کپڑے پہننے لگیں گی، اُس وقت یہ باریک کپڑے وہاں بنتے ہوں گے، اور یمن کے ''عصب''، یعنی منقش اور پھول دار کپڑے پہننے لگیں گی، اور ان کی فرمائشوں سے

غنی آدمی عاجز آجائے گا۔

عورتوں سے مال دار آدمی کا عاجز ہونا:

اچھا خاصا اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے، لیکن بیگم صاحبہ کی فرمائشیں پوری نہیں کرسکتا، کیا کریں؟ اور فقیر کو اس چیز کا مکلف کریں گی جو اس کو میسر نہیں، اب فقیر کے پاس کچھ ہے نہیں، بے چارہ نادار آدمی ہے وہ کہاں سے لاکر دے؟ لیکن بیگم صاحبہ کا اصرار ہے کہ میں نہیں جانتی، ہمارا معیارِ زندگی ہمسائی کے برابر ہونا چاہئے۔

عورتوں کی کمزوری:

چند چیزیں عورتوں کی کمزوری ہوتی ہیں، ایک تو قدرتی طور پر ان کو نمائش کی عادت ہوتی ہے، مثلاً: اگرچہ اپنے گھر میں بہت ہی سکھ ہے، آرام ہے، اللہ تعالیٰ کا دیا سب کچھ ہے، لیکن اگر آس پڑوس والوں نے دیکھا نہیں، رشتہ داروں نے اس کا معائنہ نہیں کیا، تو پھر اس کا لطف کیا آیا؟ مزے کی بات تو نہ ہوئی، اردگرد کے لوگ آئیں اور ہمارے گھر کے نقار خانے کو دیکھ کر پہلے تو ششدر اور حیرت زدہ رہ جائیں، پھر وہ تعریف کے چند کلمات بول کر جائیں، اور پھر وہاں سے نکلیں تو ہمیں گالیاں نکالیں، عورتیں ایسی عقلمند ہیں کہ جانتی ہیں کہ یہ ہمارے سامنے جھوٹ بول رہا ہے، لیکن اس کی جھوٹی تعریف سے خوش ہو رہی ہیں، ایک تو ان کو نمائش کی بیماری ہے۔

اب اللہ تعالیٰ نے کسی کو زیادہ دے رکھا ہے، کسی کو کم دے رکھا ہے، کسی کو اتنا زیادہ دے رکھا ہے کہ اس کے کتوں کا بجٹ ہزاروں روپے ماہانہ کا ہے، میرے مالک کی تقسیم ہے، کسی کو صرف اتنا دیا ہے کہ روٹی ہی ملتی ہے، کسی کو یہ بھی نہیں، جیتا وہ بھی ہے، جیتا یہ بھی ہے، اس کی بھی گزر رہی ہے، اُس کی بھی گزر جائے گی۔

دنیا میں ساری خواہشیں پوری نہ ہوں گی:

اللہ تعالیٰ کی سنت اور اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ اس عالم میں رہتے

ہوئے ہر ایک کی ساری ضرورتیں اور خواہشیں پوری نہیں ہوتیں، اور دنیا جہاں کی ساری نعمتیں ایک کو نہیں دی جاتیں، حسن و جمال بھی ہو، فضل و کمال بھی ہو اور نوال بھی ہو، علم بھی ہو، عقل بھی ہو، ساری چیزیں ایک ہی گھر میں جمع کردیں، اس دنیا میں یہ نہیں ہوسکتا۔

جنت میں سب خواہشیں پوری ہوں گی:

ہاں البتہ یہ جنت میں ہوگا، اور جنت میں ایسا ہوگا کہ جو شخص جو چاہے گا کہ میں ایسا ہوجاؤں، وہ ویسا ہی ہوجائے گا۔

ایک حدیث میں لمبا قصہ آتا ہے، اس میں ایک جملہ یہ ہے:

"..... قَالَ: فَيَقْبِلُ الرَّجُلُ ذُوْ الْمَنْزِلَةِ الْمُرْتَفِعَةِ فَيَلْقٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ وَمَا فِيْهِمْ دَنِيٌّ فَيَرُوْعُهٗ مَا يَرٰى عَلَيْهِ مِنَ اللِّبَاسِ فَمَا يَقْضِىْ آخِرُ حَدِيْثِهٖ حَتّٰى يَتَخَيَّلَ عَلَيْهِ مَا هُوَ اَحْسَنُ مِنْهُ ..... الخ." (مشکوٰۃ ص:۴۹۹)

ترجمہ:....."جنت والوں کا اجتماع ہوگا تو ایک بڑے درجے کا جنتی ہے اور ایک چھوٹے درجے کا جنتی ہے (ظاہر بات ہے کہ درجات تو وہاں بھی ہوں گے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ بڑے درجے کے جنتی کا لباس اس کی شان کے لائق ہوگا، چھوٹے درجے کے جنتی کا لباس اس کے لائق ہوگا، تو اس شخص کے دل میں خیال آئے گا کہ اس کا لباس عمدہ ہے، کسی کی کوئی عمدہ چیز دیکھ کر آدمی کے دل سے ایک خواہش نکلتی ہے اور ایک خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے، تو اس کے دل میں خیال آئے گا کہ اس کا لباس اچھا ہے گویا اپنے اندر نقص نظر آئے گا) حالانکہ

کوئی نقص نہیں ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:
دیکھتے ہی دیکھتے اس کا لباس اتنا حسین وجمیل ہوجائے گا کہ یہ
اپنے لباس کو اس سے زیادہ حسین سمجھے گا۔"

دنیا میں جنت کے مزے لوٹنے کا گُر:

یہ ایک نکتہ معرفت ہے، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں اس دنیا میں یہ چیز نصیب فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے، میں یہ سمجھوں کہ میرے حسب حال جتنا دیا ہے کسی کو بھی اتنا نہیں دیا، تو ہماری یہ دنیا ہی جنت بن جائے گی، پڑا ہوگا کسی کے پاس مال، پڑا ہوگا کسی کے پاس جمال اور پڑی ہوں گی کسی کے پاس فلاں فلاں نعمتیں، ہمیں کیا؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب نور اللہ مرقدہ کا شعر ہے:

مجھ کو کیا کس کے جام میں ہے کیسی مے؟
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ مے خانہ ہے!

کسی کے پیمانے میں کیسی شراب ہے؟ مجھے اس سے کیا؟ پورے مے خانہ کا نچوڑ میری پیالی میں موجود ہے۔ مجھے کیا دیکھنا ہے کہ کسی کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ کس کے ساتھ کیا عنایتیں ہو رہی ہیں؟ میں دوسروں کو کیوں دیکھوں؟ میں تو صرف اپنے کو دیکھوں اور اپنے مالک کو دیکھوں۔

عورتوں کا انداز:

سارے مالک کے بندے ہیں، مالک کس کے ساتھ کیا معاملہ کر رہا ہے؟ وہ جانے اس کا بندہ جانے، میرے ساتھ میرے مالک نے ایسی عنایت کا معاملہ کیا ہے کہ کیا بات ہے؟ اگر ہر آدمی کے دل میں یہ بات پیدا ہوجائے، تو جنت دنیا میں ہی پیدا ہوگئی، خلاصہ یہ کہ یہ سب چیزیں ہر ایک کو نہیں دی جاتیں۔

تو ان عورتوں کا انداز حاکمانہ ہوتا ہے۔

جب برابر والا اپنے برابر والے سے کہتا ہے کہ یہ کرلیجئے! تو یہ ''التماس'' کہلاتا ہے اور اگر بندہ اپنے اللہ تعالیٰ سے یہ کہے کہ یہ میرا کام کردیجئے! یہ ''دعا'' کہلاتی ہے، اس میں اور حاکم کے صیغے میں لفظ ایک ہی ہے، لیکن حاکم کے لفظ میں ایک انداز کا تحکم پایا جاتا ہے، اور برابر والے میں یہ ہی لفظ کہنے میں ایک قسم کی چاہت پائی جاتی ہے، اور چھوٹا جب بڑے سے یا بندہ جب اپنے خدا سے یہی لفظ کہتا ہے کہ یہ کردیجئے تو اس میں عاجزی، انکساری، تواضع، ذلت، مسکنت پائی جاتی ہے، اور یہی دعا کا حاصل ہے۔ ہم اس کو مانگنا کہتے ہیں، دعا کے معنی اللہ سے مانگنا، مانگنا کام ہوتا ہے گداگر کا، فقیر اور محتاج کا، صیغہ ایک ہے لیکن مخاطب کے لحاظ سے اندازِ گفتگو بدل جاتا ہے، عورتوں کی بھی فرمائش ہوتی ہے لیکن ان کا انداز نیازمندانہ کبھی نہیں ہوتا کہ: ''ہمیں یہ کرلینا چاہئے۔'' ملتمسانہ بھی نہیں ہوتا جیسے برابر والا برابر والے سے کہتا ہے، بلکہ ان کا اندازِ گفتگو تحکمانہ ہوتا ہے، اور حاکم کے حکم میں ترمیم کی یا نظرثانی کی گنجائش ہوتی ہے، لیکن ان کے حکم میں نہیں، ان کے ہاں نظرثانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، حاکم سے کہہ دیجئے کہ ذرا دیکھ لیں اس کام کا کرنا ذرا مشکل ہوگا تو وہ کہتا ہے کہ بھائی! اگر نہیں ہوسکتا تو رہنے دو، گویا اس میں ترمیم ہوسکتی ہے، نظرثانی کی گنجائش ہے۔

لیکن گھر کی ملکہ عالیہ کے فرمان میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں اور پھر حاکم کا حکم بھی سیدھے الفاظ میں ہوتا ہے، عورتوں کو سیدھے الفاظ کہنے کی بیماری نہیں ہے، یہ اپنے تحکمانہ انداز میں مزید پیچیدگی پیدا کیا کرتی ہیں، اور اس کے ساتھ طنز، طعن اور تشنیع کا نشتر بھی ساتھ لگاتی ہیں۔ نادار آدمی تو بے چارہ عاجز ہوجائے گا۔

لوگوں کے حالات میرے سامنے آتے رہتے ہیں، لوگ خطوط کے ذریعے اپنے حالات بتاتے رہتے ہیں، میں اپنے حساب سے ان کو مشورہ دیتا رہتا ہوں، جیسے

مجھے الٹے سیدھے آتے ہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے جتنا فہم دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ بہت سارے گھر بس گئے، قریب تھا کہ وہ گھر اجڑ جاتے۔

تو فقیر آدمی جو نادار ہے، وہ ان سے عاجز آجاتا ہے، اور غنی بھی عاجز آجاتا ہے۔ یہ ہے وہ عورتوں کی آزمائش جس کے بارے میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مجھے سب سے زیادہ اندیشہ اس کا ہے۔

کالا خضاب:

بہت سے نوجوان کہتے ہیں اور کل ایک مولوی صاحب بھی تشریف لائے تھے، انہوں نے اپنی ضرورت پیش کی اور ان کی داڑھی پر "وسمہ" لگا ہوا تھا، منہ کالا کیا ہوا تھا، میں نے کہا کہ تم منہ کالا کرتے ہو، تمہارے پیچھے تو نماز بھی مکروہ ہے، کہنے لگا کہ اصل میں بات یہ ہے کہ: میری بیوی کی عمر مجھ سے کافی چھوٹی ہے، میں نے کہا کہ کوئی اور رنگ کرلو، کالا نہ کیا کرو۔ بھلا اوپر کالے رنگ کا خول چڑھا کر آدمی جوان ہوجائے گا؟ کیا اس کی بیوی نہیں جانتی بے وقوف! اندر سے سفید بال تو نظر آرہے ہیں، بہت سارے لوگوں کو میں نے اس حماقت میں مبتلا دیکھا، بیوی کی وجہ سے بہت سارے لوگ داڑھی منڈوانے کی حماقت میں مبتلا ہیں، اور یہ ٹی وی اور یہ ساری چیزیں کس لئے چل رہی ہیں؟ یہ سب عورتوں کا کیا دھرا ہے۔

خواتین کی نیکی کا اثر:

میں نے شاید یہ قصہ سنایا تھا کہ: ایک مہاجر خاندان مکہ مکرمہ گیا تھا، پرانے زمانے میں لوگ ہجرت کرکے چلے جایا کرتے تھے، اللہ کے بندے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر جاکر ٹک جاتے تھے، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو نوازا بھی، لیکن اس وقت ان کا کوئی سامان نہیں ہوتا تھا، تو ایک مہاجر خاندان جو بہت ہی دیندار تھا، بچے بڑے ہوگئے تو بچے کہنے لگے کہ: ٹی وی لائیں، گھر کی

اسمبلی میں اس پر بحث ہوئی، بہرحال قرارداد یہ منظور ہوئی کہ امام کعبہ سے پوچھ لیا جائے، اگر وہ اجازت دیں تو لے آؤ۔ ابا جان اور ان کے لڑکے امام کعبہ کی خدمت میں گئے، تو امام کعبہ نے فرمایا کہ: تمہارے ہاں ابھی تک ٹی وی نہیں ہے؟ میرے ہاں تو دو ہیں!:

چوں کفر از کعبہ برخیزد
کجا ماند مسلمانی؟

ٹی وی کا وبال:

اسی موقع کے لئے کہا گیا تھا، اب کیا تھا ابا اور بیٹا ٹی وی خرید کر کے گھر لے آئے، وہ خاتون خانہ بہت نیک تھی، رات میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: "تم لوگوں نے بھی یہ لعنت اپنے گھر میں ڈال لی؟ تم تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف ہجرت کر کے آئے تھے!" صبح ہوئی فجر کی نماز کے بعد اس خاتون نے اپنے شوہر کو اور اپنے لڑکوں کو بٹھایا، بٹھا کر اپنا خواب بتایا اور کہنے لگی کہ: میں تم لوگوں کو تو مجبور نہیں کرسکتی، لیکن تم بھی مجھے مجبور نہ کرو، مجھے کوئی کمرہ کسی جگہ کرایہ پر لے کر دے دو یا تو ٹی وی گھر میں رہے گا یا میں گھر میں رہوں گی، دونوں میں سے ایک رہے گا، وہ لڑکے ابھی تک اس نوبت کو نہیں پہنچے تھے کہ ماں کو گھر سے نکال دیں اور ٹی وی کو رکھ لیں، ابھی تک ان کی ماہیت اتنی مسخ نہیں ہوئی تھی، انہوں نے فوراً گھر سے ٹی وی نکال دیا۔

اگر خواتین نیک ہوں تو.....:

اگر ان ہماری عورتوں کو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمادیں، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوجائے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرمائیں کہ: میری امتی ہو، تمہیں شرم نہیں آتی؟ مگر یہ دولت ہر ایک کو تو نصیب نہیں ہوتی ناں! یہ تو

قسمت والوں کو نصیب ہوتی ہے، اگر گھر کی خواتین نیک ہوں، اور یہ کہیں کہ: ہم بھوکی تو مرسکتی ہیں، مگر ہمیں غیر شرعی چیزوں کی ضرورت نہیں، اور ناپاک آمدنی گھر میں نہیں آنے دیں گی، تو تمہارے گھروں کا نقشہ کچھ اور ہو، یہ جتنی نمائشیں ہو رہی ہیں، یہ جتنے ہال سج رہے ہیں، یہ جتنے بھڑکیلے کپڑے پہنائے جارہے ہیں، اور جس طرح عورتیں آزادانہ باہر پھر رہی ہیں، یہ ساری کی ساری عورتوں کی بدعقلی اور بے عقلی کے کرشمے ہیں۔ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے حاکم بنایا، لیکن وہ بے چارے عورتوں کے محکوم ہی نہیں، بلکہ ان کے غلام ہیں، غلام کے بجائے قیدی ہیں، کبھی ان کے دام سے چھوٹ ہی نہیں سکتے۔

عورت کے تین ہتھیار:

ایک دانا کا قول ہے کہ: عورت یا تو طعنہ دے کر منوالیتی ہے یا مسکرا کر منوالیتی ہے، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو روکر منوالیتی ہے۔ یہ تین ہتھیار اپنی بات منوانے کے لئے عورت کے پاس ہیں، اور آدمی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

سب سے خوفناک فتنہ:

یہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ: ''سب سے زیادہ خوف ناک فتنہ جس کا مجھے تمہارے حق میں اندیشہ ہے وہ عورتوں کا فتنہ ہے۔'' اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی ترجمانی ہے، مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ:

''مَا تَرَكْتُ بَعْدِىْ فِتْنَةً اَضَرُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ.'' (مشکوٰۃ ص:۲۶۷)

ترجمہ:...... ''میں نے اپنے بعد کوئی ایسا فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں کے حق میں عورتوں سے زیادہ نقصان دہ ہو۔''

سب سے زیادہ ضرر رساں، سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا فتنہ،

عورتوں کا فتنہ ہے، فتنہ سے مراد عورتوں کی آزمائش ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

"اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ." (الطلاق:۱۵)

ترجمہ:......"تمہارا مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہے۔"

اولاد کی ماں سب سے پہلا فتنہ ہے، اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کا نام ذکر نہیں کیا، گزشتہ آیت میں ذکر کردیا:

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ." (الطلاق:۱۴)

ترجمہ:......"تمہاری بیویوں میں سے اور تمہاری اولاد میں سے بعض ایسے ہیں جو حقیقت میں تمہارے دشمن ہیں، ان سے بچتے رہا کرو۔"

اللہ تعالیٰ نے بچنے کا حکم فرمایا تھا، بچ کے رہنے کا حکم فرمایا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سب سے زیادہ ضرر رساں، نقصان دینے والا فتنہ فرمایا تھا، اور آج پوری کی پوری امت اس میں مبتلا ہوگئی ہے۔

آج نہیں تو کل سمجھ آجائے گی:

اور آج اگر کوئی اس کے خلاف بولے تو بولنے والا دقیانوسی ہے، مُلّا ہے، یہ پرانے زمانے میں رہتا ہے، تاریک زمانے میں رہتا ہے، تاریک ذہن والا ہے، تمہارے دل میں جو کچھ آئے، ہمیں کہہ لو، جو کچھ زبان پر آئے، ہمیں کہہ لو، لغت میں تمہیں جو الفاظ مل سکتے ہیں وہ استعمال کرلو، مولوی کو جتنا برا بھلا کہہ سکتے ہو، جتنی گالیاں دے سکتے ہو، شوق سے دو، لیکن میں آج بھی کہتا ہوں، کل بھی کہوں گا کہ مولوی جو کچھ بھی کہتا ہے، تمہاری خیرخواہی کے لئے کہتا ہے، اپنی ذات کے لئے نہیں کہتا، آج اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو کل مرنے کے بعد تمہیں یقین آجائے گا کہ مولوی

اگر ہم پر کوئی تنقید کرتا تھا یا ہمارے عیوب کی نشاندہی کرتا تھا تو ہمارے ہی فائدہ کے لئے اور ہماری ہی خیر خواہی کے لئے کرتا تھا، اس کی اپنی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی، تم بتاؤ ناں! اس میں میری کیا ذاتی غرض ہے؟

پھر بھی گھروں میں خوشگواری نہیں:

میں دیکھ رہا ہوں کہ تم تمام فرمائشیں اپنی بیویوں کی پوری کرتے ہو، لیکن تمہارے گھر میں خوشگواری نہیں ہے، میاں بیوی کے تعلقات پھر بھی خوشگوار نہیں ہیں، میں جانتا ہوں، میں ناواقف نہیں ہوں، واقف ہوں، سو گھروں میں سے ایک گھر ایسا ہوگا جہاں میاں بیوی کے درمیان میں کامل و مکمل یکجہتی پائی جاتی ہوگی، بیوی صاحبہ کو ذرا چھیڑ کر دیکھ لیجئے کیسے قصیدے سناتی ہیں اُپنے میاں کے، اور میاں صاحب سے پوچھ کر دیکھ لیجئے وہ بھی ایک دفتر کھول کے بیٹھ جائیں گے، تو مقصد یہ ہے کہ خوشگواری یہ نہیں، خوشگواری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام کی دولت عطا فرمادی، دین کی دولت عطا فرمادی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق پیدا فرمادیا، حضورؐ کی امت میں داخل کردیا، اب تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں پر مل کر چلو۔

رشتہ ازدواج کا مقصد:

''رشتہ ازدواج'' میاں بیوی کا رشتہ اس واسطے ہے تاکہ وہ دین پر چلنے کے لئے ایک دوسرے کے مددگار بنیں، نہ اس لئے کہ ایک دوسرے کو پکڑ کر جہنم میں لے جائیں، نکاح اس لئے نہیں کیا جاتا کہ اگر ایک نہیں جانا چاہتا تو دوسرا اس کو پکڑ کر، گھسیٹ کر جہنم میں لے جائے، نہیں بھائی! اگر ایک نہ چل سکتا ہو تو دوسرا اس کو گھسیٹ کر، اٹھا کر جنت میں لے جائے، جنت والے اعمال میں، اللہ تعالیٰ کی رضامندی والے اعمال میں ایک دوسرے کی مدد کرو، تو پھر میرا اللہ تمہارے دلوں میں جوڑ پیدا کردے گا۔ تمہارے گھر میں کچھ نہیں ہوگا اس کے باوجود تمہارا گھر جنت کا

نمونہ ہوگا، تم دوسروں کو کیوں دیکھتے ہو؟

انعاماتِ الٰہیہ:

تمہیں اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دی ہیں، کتنی بڑی نعمت ہیں، ہاتھ پاؤں دیئے ہیں، زبان دی ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اچھی شکل وصورت عطا فرمائی ہے، کتنے انعاماتِ الٰہیہ ہیں اور تمہیں کھانے کے لئے روٹی بھی دے دیتا ہے، بس اتنا ہی ہے ناں! کہ جینا ہے، تم شکایات کے دفتر کھول بیٹھتے ہو، ہمارے پاس یہ نہیں، ہمارے پاس وہ نہیں، کبھی کلمہ شکر بھی تمہاری زبان سے نکلا ہے؟ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا بھی ہوگا، کیا بڑے، کیا چھوٹے، کیا مرد، کیا عورتیں، سب کے سب گھر میں شکر کرنے والے ہوں، تو آسمان سے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور رحمتیں نازل ہوں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی چیز کی کمی ہے تو اللہ تعالیٰ سے مانگ لو، لیکن مانگنا حاکمانہ انداز میں نہیں ہونا چاہئے، پھر اس پر بھی راضی ہوجاؤ کہ دے دیں تو عنایت ہے، نہیں دیں گے تو یہ بھی عنایت ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بدعت کی حقیقت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

"وَاِنَّ اَنْصَحَكُمْ لِنَفْسِهٖ اَطْوَعُكُمْ لِرَبِّهٖ، وَاِنَّ اَغَشَّكُمْ لِنَفْسِهٖ اَعْصَاكُمْ لِرَبِّهٖ، مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ يَأْمَنْ وَيَسْتَبْشِرُ، وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ يَخَفْ وَيَنْدَمُ، ثُمَّ سَلُوا اللّٰهَ الْيَقِيْنَ وَارْغَبُوْا اِلَيْهِ فِي الْعَافِيَةِ، وَخَيْرُ مَا دَامَ فِي الْقَلْبِ الْيَقِيْنُ، اِنَّ عَوَازِمَ الْاُمُوْرِ اَفْضَلُهَا، وَاِنَّ مُحْدَثَاتِهَا شَرَارُهَا، وَكُلُّ مُحْدَثٍ بِدْعَةٌ، وَكُلُّ مُحْدِثٍ مُبْتَدِعٌ، وَمَنِ ابْتَدَعَ فَقَدْ ضَيَّعَ، وَمَا اَحْدَثَ مُحْدَثٍ بِدْعَةً اِلَّا تَرَكَ بِهَا سُنَّةً، اَلْمَغْبُوْنُ مَنْ غَبِنَ دِيْنَهٗ وَالْمَغْبُوْنَ مَنْ خَسِرَ نَفْسَهٗ، وَاِنَّ الرِّيَاءَ مِنَ الشِّرْكِ، وَاِنَّ الْاِخْلَاصَ مِنَ الْعَمَلِ وَالْاِيْمَانِ، وَمَجَالِسُ اللَّهْوِ تُنْسِي الْقُرْآنَ، وَيَحْضُرُهَا الشَّيْطَانُ، وَتَدْعُوْ اِلٰى كُلِّ غَيٍّ، وَمُجَالَسَةُ النِّسَاءِ تُزِيْغُ الْقُلُوْبَ وَتُطْمِحُ اِلَيْهِ الْاَبْصَارُ وَهِيَ مَصَائِدُ

الشَّیْطَانِ، فَاصْدُقُوا اللهَ: فَإِنَّ اللهَ مَعَ مَنْ صَدَقَ، وَجَانِبُوا الْکَذِبَ، فَإِنَّ الْکَذِبَ مُجَانِبٌ لِلْاِیْمَانِ، اَلَا! اِنَّ الصِّدْقَ عَلٰی شَرَفِ مُنْجَاۃٍ وَکَرَامَۃٍ .....الخ۔‘‘

(البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۰۸)

ترجمہ:......’’اور بے شک تم میں سب سے زیادہ اپنے نفس کا خیرخواہ وہ ہے جو سب سے زیادہ اپنے رب کا فرمانبردار ہو، اور بے شک تم میں سے سب سے زیادہ اپنے نفس کے ساتھ دھوکا کرنے والا وہ ہے جو اپنے رب کی سب سے زیادہ نافرمانی کرنے والا ہو، جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے وہ امن میں رہے گا، اور اس کو خوشی نصیب ہوگی، اور جو اللہ کی نافرمانی کرے وہ خوف اور اندیشہ میں رہے گا، اور اس کو ندامت حاصل ہوگی، پھر اللہ سے یقین مانگا کرو اور اس کی طرف رغبت کرو عافیت میں، اور سب سے بہتر وہ چیز جو قلب میں ہمیشہ رہے، یقین ہے، اور جو امور کہ پختہ ہوں وہ سب سے افضل ہیں، اور بے شک جو کام نئے نئے ایجاد کئے جائیں وہ سب سے بدتر ہیں، ہر نئی ایجاد کی ہوئی چیز بدعت ہے، اور ہر نئی چیز ایجاد کرنے والا مبتدع اور بدعتی ہے، اور جس نے کوئی نئی چیز ایجاد کی اس نے اپنے دین کو ضائع کردیا، اور جس شخص نے کوئی بدعت ایجاد کی اس کی نحوست سے اس نے سنت کو ترک کردیا، خسارہ میں وہ شخص ہے جس نے اپنے دین کو ہار دیا ہو، اور خسارہ میں وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس سے خسارہ پایا ہو، بے شک ریا شرک ہے، شرک کا ایک حصہ ہے، اور بے شک اخلاص عمل و ایمان

میں سے ہے، لہو و لعب کی مجلسیں قرآن کو بھلا دیتی ہیں، اور شیطان ان میں حاضر ہوتا ہے، اور وہ ہر گمراہی کی طرف داعی ہوتی ہیں، عورتوں کے ساتھ ہم نشینی دلوں کو ٹیڑھا کر دیتی ہے، نظریں ان کی طرف اٹھتی ہیں، اور یہ شیطان کا جال ہیں، پس اللہ تعالیٰ سے سچائی کا معاملہ کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے ساتھ ہے جو سچ بولے، اور جھوٹ سے کنارہ کش رہے، کیونکہ جھوٹ ایمان کے منافی ہے، سن رکھو کہ سچائی نجات اور عزت کے کنارے پر ہے، اور جھوٹ ہلاکت و پھسلنے کے کنارے پر۔"

اپنے نفس کا خیر خواہ؟:

یہ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خطبہ کے چند فقرے ہیں کہ:

"تم میں اپنے نفس کا سب سے بڑا خیر خواہ وہ ہے جو اپنے رب کا زیادہ فرمانبردار ہو، اور تم میں اپنے نفس کے ساتھ سب سے بڑا دھوکا کرنے والا وہ شخص ہے جو اپنے رب کا بڑا نافرمان ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کرنا اور اس کے حکم کو بجالانا، اپنے نفس کی خیر خواہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا اور اس کے حکموں کے خلاف کرنا، اپنے نفس کے ساتھ غداری، بے وفائی اور دھوکا دہی ہے، عام لوگ نفس کی خواہش و لذتوں میں اپنے نفس کی خیر خواہی سمجھتے ہیں۔

اور جو شخص کہ نفس کو اس کی لذتوں سے روکنے والا ہو، اور محنت و مشقت اور مجاہدے میں اس کو ڈالنے والا ہو، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نفس کا بدخواہ ہے۔

لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے، نفس کی خواہش کو پورا نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضیوں کو پورا کرو، یہ نفس کی خیرخواہی ہے، اور اگر اللہ کی رضا کے خلاف نفس کی خواہش کو پورا کروگے تو اس کو بگاڑ دوگے اور یہ نفس کی بدخواہی ہے۔

اللہ کی فرمانبرداری پر دو بشارتیں:

جو شخص اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرے اس کو دو دولتیں نصیب ہوں گی: ایک امن، دوسرا بشارت۔ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بے خوف ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی پکڑ سے بے خوف کردیں گے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

"اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ." (التوبہ:۶۲)

ترجمہ:...... "سن رکھو! کہ اللہ کے دوستوں پر نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

کوئی مکروہ چیز پیش آنے والی ہو تو اس سے آدمی کو خوف ہوتا ہے، کوئی ناگوار چیز پیش آنے والی ہو تو خوف ہوتا ہے، اور کوئی نامناسب خبر سننے کو ملے تو اس سے آدمی کو غم ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو میرے دوست ہیں، ان پر نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ولی کی تعریف:

اولیائُ اللہ کون ہیں؟ اللہ کا ولی! تم سب اللہ کے ولی ہو بشرطیکہ اس کا کہا مانو، اللہ تعالیٰ کی مان کر چلو تو تم بھی اللہ کے ولی ہو، یوں کہتے ہیں کہ یہ جو ولایت ہے (ولی کہتے ہیں ولایت والے کو) اس کی دو قسمیں ہیں:

۱:......ایک ولایت عامہ ہے۔ ۲:......اور ایک ولایت خاصہ ہے۔

ولایتِ عامہ:

ولایت عامہ تو تمام اہل ایمان کو حاصل ہے، جس نے بھی ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کہا، دل و جان سے اور زبان سے اقرار کرلیا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو قبول کرلیا وہ مؤمن ہے، اور ہر مؤمن اللہ کا ولی ہے۔

ولایتِ خاصہ اور اس کے اجزأ:

اور ایک ولایت خاصہ ہے، اس کے اجزا بہت سے ہیں، لیکن تین چیزیں ان میں سب سے زیادہ اہم ہیں:

۱:......اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا، نافرمانی نہ کرنا۔ اللہ کا حکم ماننا اور اس کے حکم کے خلاف نہ کرنا۔

۲:......کثرت سے ذکر کرنا، اٹھتے، بیٹھتے، جاگتے، سوتے، لیٹتے اللہ کو یاد کرنا، ذکر الٰہی سے غافل نہ ہونا۔

۳:......دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کا شوق ہے، جس شخص کو اللہ تعالیٰ یہ تین نعمتیں عطا فرمادیں وہ ولی ہے۔

اور اس کے مراتب و درجات بے شمار ہیں، کبھی ختم ہی نہیں ہوتے، جو اللہ تعالیٰ کی مان کر چلے وہ اللہ کا ولی ہے، اور اولیأ کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ: ''لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.'' نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس لئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والوں کو دو انعام ملیں گے۔

ولی کے لئے پہلا انعام:

پہلا انعام: امن کا حاصل ہونا، قیامت کی ہولناکیوں سے اللہ پاک ان کو امن عطا فرمائے گا، قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ۔ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. نَحْنُ اَوْلِیَاءُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ." (حٰمٓ السجدہ:۳۰،۳۱)

ترجمہ:......"بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر اس پر قائم رہے (پوری زندگی اسی پر گزار دی اللہ کو رب مان کر)، تو ملائکہ ان کا استقبال کریں گے (اور استقبال کر کے ان سے کہیں گے کہ) نہ تم کوئی اندیشہ کرو اور نہ ہی غم کرو، اور خوشخبری حاصل کرو (یعنی تمہیں بشارت ہو) جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہم تمہارے رفیق و دوست رہیں گے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔"

یہ بشارت کب ملتی ہے؟ فرشتے کب استقبال کرتے ہیں؟ بعض اکابر نے کہا کہ موت کے وقت، اور بعض نے کہا کہ قبروں سے اٹھنے کے وقت۔ دونوں باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ اللہ کی فرمانبرداری کرو گے تو ایک تو امن نصیب ہوگا۔

دوسرا انعام:

دوسری بشارت نصیب ہوگی، چونکہ آدمی سفر آخرت پر اکیلا جاتا ہے، اگر اس وقت ملائکہ کی رفاقت حاصل ہوجائے کہ آؤ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں، ہمیں سارے راستے معلوم ہیں تمہیں بتلاتے جائیں گے، تو پھر کیا پریشانی؟

نافرمان کے لئے دو سزائیں:

اور جو شخص کہ اللہ کی نافرمانی کرے اسے دو سزائیں ملتی ہیں، آخرت میں جو سزا ملے گی وہ تو ملے گی، مگر نقد دو سزائیں ملتی ہیں:

ا:......خوف۔ ۲:......ندامت۔

مرتے وقت بھی خوف ہوگا اور نزع کی حالت میں بھی خوف ہوگا، جب عالم آخرت کھل جاتا ہے اور غیب کا پردہ ہٹا دیا جاتا ہے اس وقت اس شخص پر خوف طاری ہوگا، اور ندامت ہوگی، کسی نے کوئی گندا کام کیا ہو، تو اس کو ہمیشہ اندیشہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو پتہ نہ چل جائے۔ اور ایک ندامت ہوتی ہے کہ میں نے بہت برا کیا، ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا، بڑا غلط کیا، شرمندگی اور اس شرمساری کی وجہ سے نظر کو اوپر نہیں اٹھا کر دیکھ سکے گا۔

تو معلوم ہوا کہ اپنے نفس کی سب سے بڑی خیرخواہی یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگانا ہے، اور اپنے نفس کی سب سے بڑی بدخواہی اس کو گناہوں کے لئے آزاد چھوڑ دینا ہے۔

ماحول اور عزیز واقارب کی نہیں، اللہ کی مانو!

میں بار بار کہتا ہوں کہ اپنی زندگی کا نقشہ بنانے کے لئے تم اردگرد کو دیکھتے ہو کہ ماحول خراب ہے، ہمسائے کیا کر رہے ہیں؟ عزیز واقارب کیا کر رہے ہیں؟ دوست واحباب کیا کر رہے ہیں؟ میں بھی وہی کروں! لیکن اگر تمہارے ہمسائے، تمہارے عزیز واقارب، تمہارے دوست واحباب، تمہارے بیوی بچے جہنم کے راستہ پر چل رہے ہوں، تو ان کے پیچھے پیچھے جاکر جہنم میں چھلانگ لگانا عقلمندی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی مان کر چلو کہ وہ ہمیشہ کا ساتھی ہے، اور دوسروں کی مان کے نہ چلو کہ تمہیں دھوکا دے دیں گے اور راستہ میں چھوڑ جائیں گے۔

یقین سب سے بڑی دولت ہے:

اس کے بعد ارشاد فرمایا: اللہ سے یقین مانگا کرو، سب سے بڑی دولت یقین ہے۔

اور حدیث میں فرمایا کہ: "اَلْیَقِیْنُ اَلْاِیْمَانُ کُلُّہٗ." (بخاری ج:۱ ص:۶)
یعنی یقین سارے کا سارا مکمل ایمان ہے۔ یوں کہو کہ ایمان یقین ہی کا نام ہے، اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر اور غیب کے وہ نقشے جو ہمارے سامنے آنے والے ہیں، ان پر جتنا یقین بڑھتا چلا جائے گا، اتنا ہی ایمان قوی ہوتا جائے گا، اور جتنا یقین گھٹتا جائے گا، اتنا ہی ایمان بیمار و کمزور ہوتا چلا جائے گا، اللہ سے یقین مانگا کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل دعا میں سے ایک ٹکڑا یہ ہے کہ:

"وَمِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُھَوِّنُ بِہٖ عَلَیْنَا مَصَائِبَ الدُّنْیَا."
(سنن ترمذی ج:۲ ص:۱۸۸)
ترجمہ:......"یا اللہ اتنا یقین نصیب فرمادے جس کی برکت سے دنیا کی ساری مصیبتیں ہلکی پھلکی نظر آئیں۔"

آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی مصیبت ہلکی ہے:

کچھ نہیں ہوا بھائی! اتنا یقین ہوجائے کہ بڑی سے بڑی مصیبت بھی آخرت کے اجر و ثواب کے مقابلے میں جب تمہیں ہلکی پھلکی نظر آئے، اور قبر و حشر کی ہولناکیوں کے مقابلہ میں ہلکی پھلکی نظر آئے، اور فقہ کا قاعدہ ہے: "من ابتلی ببلیتین فلیتخذ اھونھا." (جو شخص دو مصیبتوں میں سے کسی ایک مصیبت میں مبتلا ہوجائے تو اس کو چاہئے کہ جو زیادہ ہلکی ہو اس کو اختیار کرے)۔

لہٰذا ہمیں یقین ہوجائے کہ آخرت کی مصیبتوں کے مقابلے میں دنیا کی مصیبتیں بہت ہلکی پھلکی ہیں، اور ہم دنیا کی مصیبتوں سے بچنے کے لئے اپنی آخرت کو برباد نہ کریں، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ آخرت کی قیمت پر دنیا حاصل نہ کریں۔

اللہ سے عافیت مانگو!

دوسری عافیت مانگو اللہ تعالیٰ سے، اللہ کی بارگاہ میں عافیت کی التجا کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَافِیَةَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَة.
اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ
وَاَھْلِیْ وَمَالِیْ. اَللّٰھُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَاٰمِنْ رَوْعَاتِیْ."

(ابوداؤد ج:۲ ص:۳۳۶)

ترجمہ:......"اے اللہ میں عافیت کی درخواست کرتا ہوں اپنی دنیا میں بھی، اور اپنی آخرت کے معاملہ میں بھی۔ یا اللہ! میں آپ سے عفو و عافیت مانگتا ہوں اپنے دین میں بھی، اور اپنی دنیا میں بھی، اور اپنے اہل میں بھی، اور اپنے مال میں بھی۔ یا اللہ! ڈھانپ دے میرے عیوب کو، اور مجھ کو امن دے میری ان چیزوں سے جو ڈرانے والی ہوں۔"

عافیت کا معنی:

عافیت بہت بڑی چیز ہے، عافیت کے کیا معنی ہیں؟ عافیت کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مکروہات سے اپنی حفاظت میں رکھے۔ تو اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگا کرو، بس یہ دو چیزیں مل گئیں، ایک یقین اور دوسری عافیت، یوں سمجھو کہ دنیا و آخرت کی دولت تمہیں مل گئی، بڑے سیٹھ ہوگئے، تم بڑے غنی ہو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے یقین و عافیت کی دولت عطا فرمادی۔ اور جس شخص سے اللہ تعالیٰ نے عافیت سلب کرلی (نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ!) اس سے زیادہ وبال میں کوئی شخص نہیں، اور جس شخص کو یقین سے محروم کردیا گیا، اس سے بڑا بدبخت کوئی نہیں۔

سب سے بہتر چیز:

فرماتے ہیں: سب سے بہتر چیز جو دل میں رہے وہ یقین ہے۔

اور چیزیں تو آتی جاتی رہتی ہیں، حتیٰ کہ انسان کے اعمال میں بھی کبھی زیادہ توفیق ہوجاتی ہے، اور کبھی کم، کبھی اعمال زیادہ کرلیتا ہے اور کبھی کم کرلیتا ہے، دنیا کی دولتیں بھی کبھی کم حاصل ہوتی ہیں؛ اور کبھی زیادہ حاصل ہوجاتی ہیں، بس ایک چیز باقی رہے اور وہ یقین کی دولت ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کا ارشاد ہے کہ: باقی رہنے والی تو صرف دو ہی چیزیں ہیں: ایک ایمان اور دوسری عقل۔ اللہ تعالیٰ آخر وقت تک عقل صحیح سالم رکھے، اور دوسری چیز اللہ تعالیٰ مرتے دم تک ایمان پر قائم رکھے، باقی کوئی چیز آئی اور کوئی نہیں آئی، کچھ مل گیا اور کچھ نہیں ملا:

روزہ اگر رفت گرہ باگ نیست

تو کماں کہ انکہ تو پاک نیست

ہم کہا کرتے ہیں کہ کوئی دن تھے، ایسا تھا، ایسا تھا، وہ دن چلے گئے، جانے دو، اس کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ دل کا یقین الحمدللہ! نہ سفر میں جائے اور نہ بیماری وصحت میں جائے، حتیٰ کہ نہ زندگانی میں جائے اور نہ موت میں جائے، مرنے کے بعد تو اور بھی بڑھ جائے گا، اللہ تعالیٰ ہمیں یقین دائمی نصیب فرمائے، آمین!

دوام واستقلال کی اہمیت:

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: سب سے افضل کام وہ ہیں جن کو پابندی کے ساتھ اور عزم کے ساتھ کیا جائے۔

شب برأت کو یا شب قدر کو ساری رات لوگ ٹکریں مارتے رہتے ہیں، اور دوسرے وقت میں نماز کی بھی توفیق نہیں ہوتی، بھائی! تھوڑا کرو لیکن لگ کے کرو، جسے

رہو، پختگی کے ساتھ، دوام کے ساتھ اس طرح عمل کیا جائے کہ وہ چھٹے نہیں، ہاں کوئی عارضہ پیش آجائے تو دوسری بات ہے، جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ بیماری اور سفر اس سے مستثنیٰ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

”قَالَ اِذَا ابْتُلِیَ الْمُسْلِمُ بِبَلَاءٍ فِیْ جَسَدِہٖ، قِیْلَ لِلْمَلَکِ اُکْتُبْ لَهٗ صَالِحَ عَمَلِهِ الَّذِیْ کَانَ یَعْمَلُ .....الخ۔“ (مشکوٰۃ ص:۱۳۶)

ترجمہ:...... ”جب بندہ کسی عمل کا پابند ہو، لیکن بیماری کی وجہ سے وہ عمل نہ کرسکے (یا سفر کی وجہ سے معمولات چھوٹ جائیں)، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے کے لئے وہی لکھ دو جو کہ صحت اور گھر میں موجود ہونے کی حالت میں کیا کرتا تھا۔“

گویا یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تو اپنے معمولات کا پکا تھا، لیکن اب بیماری اس کو کام نہیں کرنے دے رہی۔ اور یہ عمل سے عاجز ہے مگر ہم تو اجر دینے سے عاجز نہیں، یہ بیچارا عمل نہیں کرسکتا، مگر ہم تو اجر دے سکتے ہیں، لہٰذا اس کو پورا اجر دے دو۔ تو کبھی کرلینا اور کبھی نہ کرنا، اس سے کام نہیں چلے گا، کرو اور جم کر کرو۔ اور ایسے جم کر لگاتار کرو کہ وہ تم سے چھوٹ نہ سکے۔

حضرت علیؓ کی معمولات پر پابندی:

الف:......امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سنی ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی مسلمان سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں پڑھے بغیر بھی سوسکتا ہے۔ آخری رکوع اور خصوصاً ”اٰمَنَ الرَّسُوْلُ“ سے

اس کو پڑھے بغیر بھی مسلمان سوسکتا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا ہوں۔

ب:......اپنی لخت جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خاتون جنت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسبیحات بتائیں تھیں، سبحان اللہ، الحمدللہ، اللہ اکبر۔ اس کا قصہ یہ ہوا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو دیکھا کہ بندے بہت بیٹھے ہیں، تو واپس چلی گئیں، دوسرے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے گھر تشریف لائے، ارشاد فرمایا: فاطمہ! تم آئیں تھیں، کیا کوئی کام تھا؟ انہوں نے شرم کے مارے سر جھکالیا، نہیں بولیں۔ حضرت علیؓ فرمانے لگے کہ: یا رسول اللہ! میں نے ان کو بھیجا تھا، کیونکہ چکی پیستے پیستے ان کے ہاتھوں پر گٹھے پڑ گئے ہیں، اور گھر میں جھاڑو دیتی ہیں جس سے کپڑے میلے کچیلے ہوجاتے ہیں، میں نے ان سے کہا تھا کہ تمہارے ابا کے پاس بہت سے غلام اور باندیاں آئی ہوئی ہیں، جاؤ تم بھی ایک خادمہ لے آؤ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

”اَلَا اَدُلُّکُمَا عَلٰی خَیْرٍ مِّمَّا سَاَلْتُمَا؟ اِذَا اَخَذْتُمَا مَضَاجِعَکُمَا فَسَبِّحَا ثَلٰثًا وَّثَلٰثِیْنَ، وَاَحْمِدَا ثَلٰثًا وَثَلٰثِیْنَ، وَکَبِّرَا اَرْبَعًا وَّثَلٰثِیْنَ، فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمَا مِنْ خَادِمٍ.“

(ابوداؤد ج:۲ ص:۳۳۴)

ترجمہ:......”کیا میں تمہیں اس سے اچھی چیز پر دلالت نہ کروں؟ جب تم سونے لگو تو ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، اور ۳۳ مرتبہ الحمدللہ، اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو، یہ پورا سو ہوجائے گا، یہ تمہارے لئے خادمہ سے زیادہ بہتر ہے۔“

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ:

”فَمَا تَرَکْتُھُنَّ مُنْذُ سَمِعْتُھُنَّ مِنْ رَّسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَّا لَیْلَۃَ الصِّفِّیْنَ فَاِنِّیْ ذَکَرْتُھَا مِنْ آخِرِ

اللَّيْلِ فَقُلْتُهَا." (ابوداؤد ج:۲ ص:۳۳۴)

ترجمہ:...... "جس دن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ بتایا، اس دن سے کبھی قضا نہ ہوئی، صرف صفین کی رات پڑھنے میں تاخیر ہوئی کہ رات کے آخری حصہ میں مجھے یاد آئیں۔"

معمول ہو تو ایسا ہو، شاگرد نے پوچھا کہ: "ولا لیلة الصفین؟" صفین کی رات میں بھی قضا نہ ہوئی؟ کچھ ڈانٹ کر (کوئی اور لفظ بھی فرمایا) اور فرمایا کہ: "ولا لیلة الصفین!" صفین کی رات بھی قضا نہیں ہوئی۔ یعنی کیسی ہی پریشانی کا عالم کیوں ہو اور کیسی ہی مصروفیت کیوں ہو یہ نہیں چھوٹی۔

دراصل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر پکا رنگ چڑھا تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

"صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً."

(البقرة:۱۳۸)

(یہ اللہ کا رنگ ہے، اور رنگنے میں اللہ سے بہتر کون ہوسکتا ہے؟) صحبت نبویؐ کی وجہ سے اللہ کا رنگ چڑھ جاتا تھا ان پر، اور رنگ بھی پکا جو پھر اترتا بھی نہیں تھا۔ تو ارشاد فرماتے ہیں: "اِنَّ عَوَازِمَ الْاُمُوْرِ اَفْضَلُهَا." سب سے پختہ اعمال وہ ہیں جو کہ پابندی اور پختگی کے ساتھ کئے جائیں، اور سب سے بدتر کام وہ ہیں جو "محدثاتها" نئے ایجاد کئے جائیں۔

کیا دین ناقص تھا؟

کچھ لوگوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو نامکمل سمجھ کر اپنی طرف سے اس میں اضافہ شروع کردیا، عبادت کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے ہیں، یہ ختم شریف اور گیارہویں شریف تو چلتے ہی تھے، اب جلوس بھی شروع

ہوگئے ہیں، عرس شریف، جلوس شریف، میلہ شریف، نامعلوم کیا کیا شریف؟ غالباً یہ نئی نئی بدعتیں ایجاد کرنے والے سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مکمل نہیں تھا، اب یہ اس کی تکمیل کرنے چلے ہیں۔ نعوذ باللہ!

بدعت کی نحوست:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص بدعت کی ایجاد کرے، اس کی سب سے پہلی نحوست یہ ہے کہ اس سے سنت چھوٹ جاتی ہے، جب یہ لوگ کوئی نئی بات گھڑتے ہیں تو الٹا کہتے ہیں کہ جی اس میں کیا حرج ہے؟

اہل بدعت کی اُپچ:

آج ہی ایک خاتون کا ٹیلی فون آیا (برسی کر رہے تھے، گھر کے لوگ برسی کرتے ہیں، اور اس کا کوئی دستور ہوگا، انہوں نے مقرر کیا ہوگا، تمام چیزیں رکھ دی جاتی ہیں، گھر کے تمام افراد جمع ہوجاتے ہیں، مرد، عورتیں، بچے سب جمع ہوجاتے ہیں۔ اور مولوی صاحب آکر ختم شریف پڑھتے ہیں)، اس نے مجھے بتلایا اور کہنے لگی کہ: میں تمام چیزیں تیار کر کے رکھ دیتی ہوں، مگر اس مجلس میں شریک نہیں ہوتی اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایصالِ ثواب کرتی رہتی ہوں، تو مجھ سے گھر والے کہتے ہیں کہ تم خاندان میں توڑ پیدا کرتی ہو، اور مجھ سے کہتے ہیں کہ کس قرآن میں لکھا ہے کہ برسی منانا منع ہے؟ اور یہ چیزیں منع ہیں؟ (سبحان اللہ!) کیا بدعت ہے۔

برسی کرنا کس قرآن میں ہے؟

میں نے کہا کہ مناظرہ کرنا ہے تو ان سے پوچھا کرو کہ کس قرآن میں لکھا ہے کہ برسی کیا کرو؟ تم اپنے رسم و رواج کرتے ہو، میں نہیں کہتا کہ اچھا کرتے ہو یا برا کرتے ہو، لیکن ان غلط رسوم کے لئے قرآن پاک کا حوالہ دیتے ہو؟ اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اس سے رکنا چاہے تو تم اس کی جان کو آجاتے ہو۔ کوئی نماز نہ پڑھے تو

تمہارے خاندان میں توڑ پیدا نہیں ہوتا، روزہ نہ رکھے، تمہارا کچھ نہیں بگڑتا، دنیا بھر کی برائیاں اور قباحتیں اس میں پائی جاتی ہیں تو کوئی حرج نہیں، اور اگر تمہاری ان ایجاد کردہ بدعتوں سے کوئی بچنا چاہے تو تم اس کو بچنے کی بھی اجازت نہیں دیتے! کچھ تو خدا کا خوف کرو! شیطان نے ایک ہی سوال تمہارے کان میں ڈال دیا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے؟ اور کچھ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو: "**شر الامور محدثاتها.**" فرمایا ہے۔ شیطان نیکی کے نام سے یہ برائیاں کرواتا ہے، تاکہ کوئی مولوی، مُلّا اس کے خلاف بول بھی نہ سکے۔

قوالی "شریف":

میں نے تمہیں لطیفہ سنایا تھا کہ چھوٹی منی بسوں میں، میں سفر کیا کرتا تھا، اللہ مجھے معاف فرمائے کہ مجھے گانوں سے اتنی نفرت ہے کہ شاید دوسرے بڑے گناہوں سے اتنی نفرت نہ ہو، میں برداشت نہیں کرسکتا، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، تو میں منی بس میں سوار ہوا، اس میں اس نے اپنا راگ رنگ لگایا ہوا تھا، میں نے کہا کہ بھائی! ذرا اس کو بند کردو! تو مجھے کہنے لگا کہ مولوی جی! قوالی ہے قوالی! اس کو کیسے بند کردیں؟ قوالی ہوتی ہے جو نعت گانوں کے انداز میں گائی جاتی ہے، وہ نعت بھی الٹی سیدھی ہوتی ہیں، اس کے ساتھ الٹے سیدھے الفاظ ملائے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ: بھائی! اللہ اور نبی پاک کا نام تو بہت بابرکت ہے، مگر تم ہی بتلاؤ کہ بہت ہی نفیس کھانا کسی گندی پلیٹ میں ڈال کر پیش کیا جائے تو اس کو قبول کیا جائے گا یا یہ اس کھانے کی توہین ہوگی؟ یہ گانے، باجے، ساز اور ان آلات کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: "**انما بعثت لمحق المعازف.**" مجھ کو گانے اور بجانے کے آلات توڑنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ جس گندگی کو دور کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے، آپ اس رسول پاک کا نام اسی میں لپیٹ کر سنتے سناتے ہو،

اور دلیل پیش کرتے ہو کہ یہ قوالی ہے، تو غلط کام عبادتون کے نام پر شیطان نے ایجاد کر دیئے ہیں، اور اس کے ساتھ ''شریف'' کا لفظ بھی لگا دیا ہے۔

کعبہ اور روضۂ اطہر کی شبیہ:

اب ربیع الاول کے موقع پر میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں روضہ شریف بنتا ہے، کعبہ شریف بنتا ہے، تمہارے کراچی میں (نعوذ باللہ! استغفر اللہ!) جب کراچی میں بھی روضہ شریف اور کعبہ شریف بننے لگے تو بتلاؤ دین داری کہاں رہی اور یہ نقل ہے شیعوں کی، چونکہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مقبرہ بناتے ہیں، جس کو تعزیہ کہتے ہیں، تم شیعوں کی مخالفت بھی کرتے ہو، ان کو برا بھلا بھی کہتے ہو، لیکن ان کے نقش قدم کو اپناتے ہو۔ اور روضہ شریف پر لوگ دعائیں کرتے ہیں، جیسے سلام پیش کیا جاتا ہے، اور کعبہ شریف کے دروازہ پر پرچیاں لٹکواتے ہیں، یہ تمہارے کراچی میں بدعات ہو رہی ہیں، اور بڑے بڑے ثقہ مولوی جلوس نکالتے ہیں۔

بدعتی دین کو ناقص سمجھتا ہے:

یہ بدعتی جو ہوتا ہے، یہ اللہ اور رسول کے دین کو ناقص سمجھتا ہے کہ یہ دین نامکمل تھا، میں اب اس کی تکمیل کرنے جا رہا ہوں کہ کہیں فلاں شریف ہو رہا ہے، کہیں کیا ہو رہا ہے۔ تمہیں شیطان نے ان چیزوں میں الجھا دیا، مسجدیں تمہاری ویران ہوگئیں، قرآن کریم کبھی تم نے کھول کے نہیں دیکھا۔

مسلمانوں کا ماضی اور حال:

ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کا بچہ بچہ مسجد میں حاضری دیتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنے والا ہوتا تھا، ہر چھوٹا، بڑا قرآن کریم کی تلاوت کرنے والا تھا، ہر چھوٹا اور بڑا ذکر و اذکار کا پابند تھا، صبح کی دعائیں، شام کی دعائیں، نماز کے بعد کی دعائیں، مسجد میں داخل ہونے کی دعا، نکلنے کی دعا، گھر میں

دسترخوان پر بیٹھنے کی دعائیں نوک زبان پر ہوتی تھیں، اور اب تمہیں تو ''لا الٰہ الا اللہ'' بھی نہیں آتا، تمہارے پاس صرف یہ تعزیہ شریف رہ گیا ہے، تم کہتے ہو کیا حرج ہے؟

بدعات نے دین کو غرق کر دیا ہے:

حرج صرف اتنا ہے کہ ان بدعات نے تمہارا دین غرق کر دیا، تم نے اس کو دین سمجھ لیا، اور جو دین تھا وہ تم سے چھوٹ گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی بدعت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اللہ پاک اس سے سنتیں چھین لیتے ہیں، محروم ہو جاتا ہے، آج یہ امت سنت نبویؐ سے محروم، بدعات وخرافات میں مبتلا ہے، اس پر مجھے ایک حدیث یاد آئی۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ:

''مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ.''

(مشکوٰۃ ص:۳۱)

ترجمہ:...... ''جس قوم نے کوئی بدعت ایجاد کی اس سے اس کی مثل ایک سنت اٹھالی جائے گی۔''

(میرے رسالہ ''عصر حاضر حدیث نبویؐ کے آئینہ میں'' کے اندر یہ حدیث موجود ہے کہ) ایک وقت آئے گا کہ لوگ بدعتوں کو سنت بنالیں گے، اور اگر کوئی اللہ کا بندہ کوشش کرے گا کہ اس بدعت کو ہٹا دیا جائے اور مٹا دیا جائے، تو لوگ کہیں گے کہ: ''ترک السنة.'' سنت چھوڑ دی گئی۔ یہ ہم سے سنت چھڑوا رہا ہے، تم نے بدعتوں کو سنت بنالیا، بدعت کی شکل میں، سنتیں تم سے غائب ہوگئیں۔

سنت کے مطابق تھوڑا عمل بہتر ہے:

بدعت کی شکل میں زیادہ عمل کرنا، اس سے بہتر ہے کہ سنت کے مطابق تھوڑا عمل کرے، کیونکہ سنت کے مطابق جو عمل کرو گے وہ ان شاء اللہ مقبول ہوگا، اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہوگا، اور بدعت کی شکل میں جو کام کرو گے وہ مردود ہوگا، فرماتے ہیں کہ:

"مغبون" یعنی خسارہ میں اور ہارنے والا وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس کو ہار دیا ہو، اور خسارہ اٹھانے والا وہ ہے جس نے اپنے دین کا خسارہ اٹھالیا ہو، نفس کو ہار دیا، یہ جواری جو ہوتے ہیں، بعض مرتبہ بیوی بچوں کو ہار دیتے ہیں، اور تم نے دنیا کا جوا کھیلا اور اس میں اپنے آپ کو ہار دیا، اور سب سے زیادہ بدقسمت اور خسارہ اٹھانے والا وہ ہے جو اپنے دین کو ہار دے، اور اس کے دین کا خسارہ ہو جائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بدعات پر نکیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"عَنْ اُبَیّ بْنِ کَعَبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: عَلَیْکُمْ بِالسَّبِیْلِ وَالسُّنَّةِ! فَاِنَّہٗ مَا عَلَی الْاَرْضِ عَبْدٌ عَلَی السَّبِیْلِ وَالسُّنَّةِ ذَکَرَ الرَّحْمٰنَ فَفَاضَتْ عَیْنَاہُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰہِ فَیُعَذِّبُہٗ، وَمَا عَلَی الْاَرْضِ عَبْدٌ عَلَی السَّبِیْلِ وَالسُّنَّةِ ذَکَرَ اللّٰہَ فِیْ نَفْسِہٖ فَاقْشَعَرَّ جِلْدُہٗ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰہِ اِلَّا کَانَ مِثْلُہٗ کَمَثَلِ شَجَرَةٍ یَبِسَ وَرَقُھَا فَھِیَ کَذَالِکَ اِذَا اَصَابَھَا رِیْحٌ شَدِیْدٌ فَتَحَاتَ عَنْھَا وَرَقُھَا اِلَّا حَطَّ اللّٰہُ عَنْہُ خَطَایَاہُ کَمَا تحات عَنْ تِلْکَ الشَّجَرَةِ وَرَقُھَا وَاِنَّ اقْتِصَادًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَسُنَّةٍ خَیْرٌ مِنْ اجْتِھَادٍ فِیْ خِلَافِ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَسُنَّةٍ، فَانْظُرُوْا اَنْ یَکُوْنَ عَمَلُکُمْ اِنْ کَانَ اِجْتِھَادًا اَوْ اِقْتِصَادًا اَنْ یَّکُوْنَ ذَالِکَ عَلٰی مِنْھَاجِ الْاَنْبِیَاءِ وَسُنَّتِھِمْ۔"

(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۳۵۳)

ترجمہ:......"حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ارشاد

ہے کہ واضح راستے اور سنت کو لازم پکڑ لو، جو بندہ واضح راستہ اور سنت پر ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ جائیں تو اللہ تعالیٰ اس کو کبھی عذاب نہیں دے گا، جو بندہ کہ صحیح راستہ پر ہو اور سنت کے طریقے پر عمل کرنے والا ہو، اگر اس کو اللہ تعالیٰ کا خیال آجائے، اللہ تعالیٰ کا خوف اس کے دل پر غالب آجائے اور اس کی وجہ سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں، تو اس کی مثال ایسی ہے کہ پت جھڑ کے موسم میں کسی درخت کے پتے خشک ہوجائیں اور وہ جھڑنے کے قریب ہوں، اس کے بعد تیز ہوا چلے تو کثرت کے ساتھ پتے جھڑتے ہیں، اس طرح اس آدمی کے گناہ جھڑ جاتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپ جائے۔ اور ارشاد فرمایا کہ صحیح راستے پر ہوتے ہوئے اور سنت پر عمل کرتے ہوئے تھوڑا عمل کرلینا، یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ آدمی غلط راستے پر چلے اور کثرت سے عبادت کرتا ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول نہیں، جس شخص کا عمل صحیح راستے پر چلتے ہوئے سنت کے مطابق ہو تو وہ شخص انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے طریقے اور سنت پر ہے اور یہ شخص بڑا مبارک ہے۔''

وصول الی اللہ، اتباعِ سنت سے ہی ممکن ہے:

آدمی کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ صرف ایک ذریعے سے ملتا ہے، یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے، زیادہ ٹکریں مارنے سے اللہ تعالیٰ کا راستہ نہیں ملتا، پیشانی گھسادیں، اس سے اللہ تعالیٰ کا راستہ نہیں ملتا، اللہ تعالیٰ اس سے خوش

نہیں ہوتے، داڑھی منڈوالیتے ہیں اور بیت اللہ شریف کا غلاف پکڑ کر روتے ہیں، میں نے لوگوں کو اس طرح کرتے دیکھا ہے، بے تحاشا روتے ہیں، بھائی! ایسی عبادت منہ پر ماردی جاتی ہے۔ جو سنت کے خلاف کام کرے اور پھر یہ چاہے کہ مجھے سنت کا راستہ مل جائے گا، اللہ تعالیٰ راضی ہوجائیں گے کلّا وربّ الکعبة! رب کعبہ کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا! صحیح طریقے پر آدمی ہو اور سنت پر ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو زندہ کرے چاہے تھوڑا عمل کرے انشاءاللہ! بہت ہوجائے گا۔

حضرت نانوتویؒ کی اتباع سنت:

شاید میں نے تم لوگوں کو یہ قصہ سنایا تھا کہ سائیں توکل شاہؒ انبالہ میں تھے، اللہ تعالیٰ کے نیک اور مقبول بندے تھے، انہوں نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا قافلہ جارہا ہے، یہ ذرا پیچھے ہیں، تو یہ دوڑ پڑے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جاکر مل جائیں، آگے دیکھا ایک آدمی ہے، وہ ایسے جیسے کوئی کسی چیز کو تلاش کرتا ہے، تلاش کرتے ہوئے جارہا ہے تو سائیں صاحب کہتے ہیں کہ: میاں! جلدی سے آجاؤ! پنجابی زبان میں ''شوق نال بچھے بچھے آ'' یعنی شوق کے ساتھ بھاگو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قافلہ جارہا ہے، وہ صاحب کہنے لگے کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم کے نشانات دیکھ رہا ہوں اور آپؐ کے نشانِ قدم پر قدم رکھتے ہوئے چلنا چاہتا ہوں اور پھر فرمایا کہ: اس صورت میں میں دیر سے پہنچوں گا لیکن اسی راستے سے پہنچنا چاہتا ہوں۔ سائیں صاحب خواب ہی میں کہتے ہیں کہ: تمہارا کیا نام ہے؟ کہنے لگے کہ: مجھے محمد قاسم نانوتوی کہتے ہیں! سائیں صاحب نے تو ان کو چھوڑ دیا اور خود دوڑ پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قافلے کے ساتھ جاملے، آگے دیکھتے کیا ہیں کہ مولانا

محمد قاسم نانوتویؒ آگے موجود ہیں۔ انبالے کا اور دیوبند کا زیادہ فاصلہ نہیں تھا، یعنی آدمی انبالے سے دیوبند جاسکتا تھا لیکن کبھی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا تھا، جب یہ خواب سے بیدار ہوئے تو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا، ان دنوں حضرت نانوتویؒ بیمار تھے، سردی کا موسم تھا اور کوئی پھٹی پرانی سی رضائی (لحاف) اوپر لی ہوئی تھی، سائیں توکل شاہ صاحبؒ کمرے میں داخل ہوئے تو حضرتؒ پر نظر پڑی تو ارشاد فرمایا: میں نے اس آدمی کو ہی دیکھا تھا، یعنی آپؒ کو دیکھتے ہی پہچان لیا پھر اس کے بعد تو بہت ہی زیادہ تعلق ہوگیا۔ تو اصل قصہ یہ ہے کہ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عمل کرے۔

غیر مقلدین کا اتباعِ سنت کا دعویٰ:

یہاں پر ایک بات اور کہہ دوں ہمارے غیر مقلد بھائی، لوگوں کو گمراہ کر دیتے ہیں کہ دیکھو سنت تو یہ ہے کہ رفع یدین اور یہاں ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ باندھنا، اور جب امام ولا الضالین کہے تو اونچی آواز سے کہے کہ آمین، میں نے تو آہستہ کہا ہے، وہ ذرہ ترنم کے ساتھ کہتے ہیں، بس دین یہی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسّی ہزار مسئلے مرتب کئے اور بیان فرمائے تھے، ان کے نزدیک کوئی چیز بھی کام کی نہیں ہے، صرف یہ کہ نماز میں دو چار مسئلے رٹ لئے بس! اور کچھ نہیں، ان بے چاروں کے پاس عقل ہی نہیں ہے اور نہ فہم ہے۔

صحابہؓ کو دیکھنے والوں کا عمل معتبر ہے:

میں اپنے ان دوستوں سے ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اس پر تمام لوگ متفق ہیں حتیٰ کہ علامہ ذہبیؒ نے اپنی دوسری کتابوں میں لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ، چار امام ہیں ناں! ان اماموں میں صرف امام ابوحنیفہؒ تابعی ہیں اور تابعی وہ کہلاتا ہے جس نے صحابی کو دیکھا ہو، امام مالکؒ تابعی نہیں ہیں اور امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ تو بہت بعد کے

لوگ ہیں۔ جس دن امام ابوحنیفہؒ کا انتقال ہوا اسی دن امام شافعیؒ کی ولادت ہوئی، اتنے بعد کے ہیں، تو میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ جنھوں نے صحابہؓ کو دیکھا اور صحابہؓ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ اس طرح نماز پڑھی جاتی ہے، اس کو تو نماز پڑھنی نہیں آتی، مگر تم نے خیر سے کتابوں سے دیکھ کر نماز سیکھ لی؟

صحیح بخاری سے پوری نماز دکھادو!

مجھے صحیح بخاری کھول کر پوری نماز ''اللہ اکبر'' سے لے کر ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' تک نماز پڑھ کے دکھادو! تم نے دو چار مسئلے صحیح بخاری سے دیکھ لئے، تمہیں معلوم نہیں کہ یہ حدیث ناسخ ہے اور یہ حدیث منسوخ، حالانکہ یہ تمام احادیث بخاری میں لکھی ہیں۔

ایک لطیفہ:

ہمارے ایک مولوی صاحب ہیں (ذرا شرم کی بات ہے) ایک حنفی عورت کا نکاح ہوگیا تھا غیر مقلد کے ساتھ، وہ کہتا ہے کہ بخاری شریف میں یہ اس طرح لکھی ہوئی ہے، (بہت تنگ ہوئی بے چاری) اس عالم کو پتہ چلا تو اس عورت سے کہنے لگے کہ: جب تمہارے شوہر آئیں تو ان سے یہ کہئے کہ بخاری شریف میں عورتوں کا ختنہ بھی لکھا ہے، تم نے کبھی ختنہ کروایا عورت کا؟ اور بھی دو چار چیزیں ساتھ بتائیں، ذرا شرم کی بات ہے میں مناسب نہیں سمجھتا، اس آدمی نے یہ حقائق سن کر فوراً اپنے مسلک سے توبہ کرلی کہ واقعی یہ تو مغالطے ہیں اتباع سنت نہیں۔

تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے صحابہ کرامؓ کو دیکھا اور صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، ایک واسطہ ہے امام ابوحنیفہؒ کے درمیان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان، ان کو نماز نہیں پڑھنی آئی تمہیں نماز پڑھنی آگئی چودہ سو سال کے بعد، بہرحال سنت کے مطابق عمل کرنا اس کی بہت بڑی

فضیلت ہے اور اپنی رائے اور بدعت پر عمل کرنا یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مذموم ہے، ہدایت کا راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، بقول شیخ سعدیؒ:

خلاف پیغمبر کسے راہ گزید
ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

منزل پر پہنچنے کے لئے اتباع سنت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور راستے کے خلاف کوئی شخص بھی راستہ اختیار کرے گا، کبھی منزل پر نہیں پہنچے گا، منزل پر پہنچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلو۔

اتباعِ نبویؐ سے سرتابی تمام انبیاؑ کی مخالفت کے مترادف ہے:

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ حقیقت میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا راستہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ دین عطا فرمایا گیا جو تمام انبیاؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دین کا خلاصہ ہے، اس لئے جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا ہے یا آپ کے راستے کے خلاف چلتا ہے حقیقت میں وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خلاف چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلنا چاہئے۔

اتباعِ سنت میں تنگی نہیں:

یہ خیال کرنا کہ ہمیں تنگی لاحق ہوجائے گی، نہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلتے ہوئے کبھی کسی کو تنگی لاحق نہیں ہوگی، تنگی جب لاحق ہوتی ہے جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے کو چھوڑ کر کسی دوسرے راستے کو اپناتے ہیں،

اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ وہ ایسا سمجھئے کہ جرنیلی سڑک ہے، جس میں کوئی گڑھا نہیں ہے، کوئی کھڈہ نہیں ہے، کوئی اونچ نیچ نہیں ہے، آنکھیں بند کر کے چلتے رہو اور جب ادھر یمیناً وشمالاً جاؤ گے تو پھر کسی گڑھے میں گرو گے۔

اتباعِ سنت سے انحراف میں ہی ہلاکت ہے:

حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے جامع میں حضرت سعید بن المسیبؒ سے نقل کیا ہے (سعید بن المسیبؒ سید التابعین ہیں، تمام تابعین سے افضل ہیں، حالانکہ تابعین تو بے شمار ہیں اور آدمی کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون آدمی افضل تھا کون نہیں تھا؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں تو ہم بڑی آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ تمام صحابہؓ میں سے بالترتیب حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم اور اس کے بعد عشرۂ مبشرہ افضل ہیں، وہاں تو فیصلہ ہوسکتا ہے لیکن تابعین کے بارے میں فیصلہ نہیں ہوسکتا، بڑی مشکل ہے، مگر علماء فرماتے ہیں کہ سید التابعین حضرت سعید بن المسیبؒ ہیں، تمام تابعین کے سردار ہیں۔ اور میں نے آپ لوگوں کو بتایا تھا کہ یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد ہیں تو حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج سے واپس تشریف لائے، غالباً یہ آخری بیان تھا آپ کا، مسجد میں تشریف لے گئے، منبر پر بیٹھے اور فرمایا:

"....اَیُّھَا النَّاسُ! قَدْ سَنَّتُ لَکُمُ السُّنَنَ وَفُرِضَتْ لَکُمُ الْفَرَائِضُ وَتُرِکْتُمْ عَلَی الْوَاضِحَۃِ اِلَّا اَنْ تَضِلُّوْا بِالنَّاسِ یمیناً وشمالا....."

(مؤطا امام مالک کتاب الحدود:۴۱ باب:۱ حدیث:۱۰ ص:۸۲۴ دارالاحیاء التراث)

یعنی تحقیق تمہارے لئے سنتیں جاری ہوچکی ہیں اور فرائض تم پر مقرر ہوچکے

ہیں اور تم صاف سیدھے راستے پر ڈال دیئے گئے ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں اندھیرے میں نہیں چھوڑ کر گئے، بلکہ صاف راستے پر چھوڑ کر گئے ہیں، سنتیں تمہارے لئے مقرر ہوچکی ہیں، فرائض تمہارے لئے مقرر ہوچکے ہیں اور زندگی کا پورا نقشہ اور پورا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر تمہارے لئے بیان فرمادیا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ دائیں بائیں راستے پر چل کر نہ بھٹکو۔ آپ نے سنا ہے ناں! کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حوض کوثر دیا جائے گا مدینہ شریف سے لے کر یمن تک جگہ ہے وہاں تک ہوگا۔

صراطِ مستقیم کی کشادگی:

میں ایک مثال دیتا ہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو راستہ دیا گیا ہے الحمدللہ! اتنا کشادہ ہے کہ پوری امت اس پر چل سکتی ہے اور کسی کے بھٹکنے کی گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی شخص امت سے الگ رہتا ہے، ''مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ.'' جو شخص امت سے الگ ہوگا وہ جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

افضل الکلام:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جمعرات کو وعظ فرمایا کرتے تھے تو ارشاد فرمایا کہ: ہمارے لئے دو چیزیں ہیں: ایک چلنے کا طریقہ، اور ایک بات کرنا۔ جہاں تک بات کرنے کا تعلق ہے افضل الکلام یا اصدق الکلام فرمایا، تمام باتوں میں سب سے زیادہ سچی اور سب سے زیادہ افضل کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، قرآن مجید ہے، اس کو اختیار کرو، قرآن مجید پڑھا کرو۔

ہمارے ایک مولانا صاحب، جو حافظ تھے، فرماتے تھے کہ قرآن کریم ہم پڑھتے ہیں، مگر آگے پیچھے تو ہمیں فرصت نہیں ملتی البتہ رمضان میں پڑھتے ہیں۔

اخبار بینی کا فتنہ:

سچی بات یہ ہے کہ ہمارے بھائیوں کو قرآن کریم پڑھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی، اگر اس پوری جماعت میں پوچھا جائے کہ کتنے آدمی ایسے ہیں جو ہر ماہ ایک قرآن کریم ختم کیا کرتے ہیں، شاید سوال کا جواب مشکل ہوگا، جس کو اللہ تعالیٰ نے پڑھنے کا ذوق عطا فرمایا ہے، اخبار تو بہت پڑھتے ہیں، میرے بعض بھائی ایسے ہیں کہ اول سے لے کر آخر تک ''میر خلیل الرحمٰن'' کے نام سے لے کر آخر تک پورا اخبار پڑھتے ہیں اور ساتھ ساتھ اشتہار بھی پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فضل فرمائے، اب اخبار اتنے موٹے موٹے ہوگئے ہیں کہ آدمی اگر پڑھنے لگے تو سارے دن میں ختم نہیں ہوسکتا، کوئی سرخی وغیرہ دیکھ لی، کوئی خاص خبر ہوئی دیکھ لی وہ تو خیر الگ بات ہے، باقی جو دوسرے قصے کہانیاں، جتنے اخبارات میں لکھے ہوئے ہیں اگر کوئی پڑھنے لگے تو میرا خیال ہے کہ نہیں پڑھ سکتا اور یہ اخبارات شیطان کی ایک ایسی ایجاد ہے جس نے امت مسلمہ کو اور اس کے اوقات کو گمراہ کرنے اور ضائع کرنے کا طریقہ ایجاد کردیا ہے۔

میرے گھر میں دو اخبار آتے ہیں، کل بھی میں نے نہیں پڑھا، اخبار میں کیا تھا کیا نہیں تھا؟ کچھ نہیں معلوم، بچے اخبار کو اِدھر اُدھر غائب کردیتے ہیں، میں تلاش بھی نہیں کرتا اور آج بھی نہیں پڑھا، کبھی کوئی اخبار سامنے آجاتا ہے تو ایک آدھ سرخی دیکھ لیتا ہوں۔

تلاوتِ قرآن کا ثواب:

حضرت فرماتے تھے کہ: ایک ہے زندگی کا طریقہ اور ایک ہے کلام، تو کلاموں میں سے سب بہترین کلام، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ سبحان اللہ! ایسا کلام، ایسا کلام کہ ایک حرف پڑھنے پر دس نیکیاں ملیں، قرآن کریم کے علاوہ کوئی ایسا کلام ہے

جس کے ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملیں؟ یہ تو اس صورت میں ہے جبکہ میں قرآن کریم سامنے کھول کر پڑھتا ہوں تو ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور اگر قرآن کریم بند کر کے پڑھوں، زبانی تو ایک حرف پر پچاس نیکیاں ملتی ہیں اور اگر نماز میں پڑھوں تو ایک حرف پر سو نیکیاں ملتی ہیں، مجھے دنیا کی کوئی کتاب ایسی بتاؤ کہ جس کے پڑھنے پر ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہوں یا پچاس نیکیاں ملتی ہوں یا سو نیکیاں ملتی ہوں؟

اخبار بینی وقت کا ضیاع ہے:

جب تم اس کا مقابلہ کرو گے تو پھر تمہیں خود محسوس ہوگا کہ ہم اخبار پڑھ پڑھ کر وقت ضائع کر رہے ہیں، میرے پاس اور آپ کے پاس فالتو وقت نہیں ہے، چند لمحات ہیں، چند سانس ہیں جو ہمیں اللہ تعالیٰ نے گن کر دے دیئے ہیں، یہاں سے شروع ہوگا اور یہاں ختم ہوجائے گا بس۔ قبر میں تمہیں اخبار بھیج دیا کریں گے، بڑا فرصت کا وقت ہوگا، وہاں اخبار پڑھتے رہا کرنا، اگر میرے قبضۂ قدرت میں ہوتا اور حکومت میرے پاس ہوتی تو میں سب سے پہلا کام یہ کرتا کہ یہ اخبار بند کر دیتا، معمولی اخبار چار صفحے کا بس یہ کافی ہے، خبریں معلوم ہوجائیں گی۔

تو سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو چیزیں ہیں ایک ''ہدیٰ'' یعنی طریقہ اور دوسرے ''کلام'' تو جہاں تک کلام کا تعلق ہے سب سے افضل ترین کلام، سب سے اعلیٰ ترین کلام اور سب سے سچا کلام وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

اور میں نے بتا ہی دیا ہے کہ قرآن کریم کا کوئی کتاب بھی مقابلہ نہیں کرسکتی حتیٰ کہ حدیث شریف وہ بھی اللہ تعالیٰ کے کلام کا مقابلہ نہیں کرسکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی فضیلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام پر ایسی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کی

فضیلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے، اللہ تعالیٰ کی فضیلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جیسی ہے ویسے ہی اللہ تعالیٰ کے کلام کی فضیلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام پر ہے، باقی یہ ضرور ہے بھائی! کہ قرآن کریم کی ایک ایک چیز سمجھنے کے لئے حدیث شریف کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ آگے میں ذکر کروں گا۔ تو ایک بات تو ہے اللہ تعالیٰ کا کلام سب سے افضل ترین کلام ہے، سب سے اعلیٰ ترین کلام ہے، سب سے سچا کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

بہترین راستہ:

دوسری چیز تھی طریقہ، راستہ "وَاَحْسَنُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ." سب سے بہترین طریقہ، سب سے بہترین راستہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور قرآن کریم اور حدیث شریف کے خلاف جو چلے گا اس کے بارے میں فرمایا گیا:

"شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، اَلَا كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ."

(مسند احمد ج:۳ ص:۳۱۹، مجمع الزوائد ج:۱ ص:۱۷۱)

ترجمہ:...... "بدترین کام وہ ہیں جو نئے ایجاد کردہ ہوں، ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔"

یعنی ہر نئی ایجاد بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کی پوری سیرت پڑھو تمہیں کہیں نہیں ملے گا کہ سڑکوں پر، سواریوں پر بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلوس نکالا کرتے تھے، اب یہ بتاؤ! کہ یہ بدعت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کئے، وہ تم نے کر لئے نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! تمہیں عقل زیادہ آگئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے؟ ہر بدعت

گمراہی ہے جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، تم نے کر کے دکھایا اور ہر بدعت فی النار ہے یعنی دوزخ میں ہے۔

آرزوؤں کا وبال:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"اَلَا لَا یَتَطَاوَلَنَّ عَلَیْکُمُ الْاَمْرُ فَتَقْسُوَ قُلُوْبُکُمْ."

(حیاۃ الصحابہ ج:۶ ص:۳۶۱)

دیکھو! میں ایک مثال دیتا ہوں، ہم کپڑا نیا پہن کر کے آتے ہیں، اس کا رنگ و روغن اور ہوتا ہے، لیکن وہ دھلتے دھلتے بالکل نکھر ہی جاتا ہے، فرمایا کہ زمانہ تم پر طویل نہ ہو جائے، ورنہ تمہارے دل سخت ہو جائیں گے اور پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی باتیں تمہارے دل پر اثر نہیں کریں گی، دل کو اللہ تعالیٰ نے اخّاذ بنایا ہے یعنی اخذ کرنے والا اور دل ہوگیا ہے سخت، کوئی چیز اس پر اثر ہی نہیں کرتی اور فرمایا کہ یہ دنیا کی آرزوئیں تمہیں غافل نہ کردیں، آدمی یہ کہتا ہے کہ یہ کام بھی ابھی کرنا ہے، یہ کام بھی کرنا ہے اس پریشانی میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ موت کا فرشتہ آجاتا ہے، کہتا ہے کہ چلئے! کہتا ہے کہ: کہاں چلیں؟ کہنے لگا کہ: حکم آگیا ہے چلنے کا!

خواہشات اور موت کا چوکٹا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقشہ بنا کر کے دکھایا، ایک چوکٹا بنایا اور اس چوکٹے کے درمیان میں ایک لکیر کھینچی اور لکیر کھینچنے کے بعد اس کے ارد گرد لکیریں کھینچیں، فرمایا میں نے کیا بنایا ہے؟ صحابہؓ نے کہا: اللہ ورسولہ اعلم! اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ جو میں نے چوکٹا بنایا ہے، چار خانہ یہ تو انسان کی اجل ہے جو اس کے

چاروں طرف سے محیط ہے اور یہ درمیان میں بندہ ہے، چل رہا ہے اور یہ جو اردگرد میں نے نشانات لگائے ہیں، یہ آدمی کے لئے رکاوٹیں ہیں، کوئی اِدھر سے کھینچ رہا ہے، کوئی اُدھر سے کھینچ رہا ہے اور آدمی کی خواہش اس دائرے سے باہر ہے، آدمی اس خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہے یہاں تک کہ موت آجاتی ہے۔

خواہشات کو دل سے نکال دو:

خواہش کرو ہی کیوں؟ نکال دو خواہش کو، میرے اللہ نے روزی دینی ہے، روز کی روز دینی ہے، تین دن کے بعد اگر چوتھا دن ہوجائے تو آدمی کے لئے مردار حلال ہوجاتا ہے، میرے خیال میں ہم میں سے پوری جماعت میں ایک آدمی کو بھی یہ قصہ پیش نہیں آیا ہوگا کہ تین دن ہم پر گزر گئے ہوں اور چوتھا دن آگیا تو ہم پر مردار حلال ہوگیا۔ وہ روز کے روز لئے کھڑا ہے، تم کس لئے فکرمند ہوتے ہو؟ تمہارے سوچنے سے اور کرنے سے ہوگا کچھ نہیں اور ان کے کرنے سے سب کچھ ہوجائے گا، تو جس کے کرنے سے سب کچھ ہوجاتا ہے تم اسی کو کیوں نہیں پکڑ لیتے؟

گیا وقت نہیں آتا:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے اور جو چیز آنے والی نہیں وہ بہت دور ہے، وہ لمحہ جس لمحہ میں میں نے بات شروع کی تھی وہ لمحہ دوبارہ واپس نہیں آسکتا، رسّے ڈال کر کھینچ لیں تب بھی واپس نہیں آسکتا اور جو وقت آنے والا ہے آئندہ اور انہی میں ہماری موت بھی ہے وہ بہت قریب ہے، ہم چاہے اس کو دور سمجھیں، وہ دور نہیں ہے بہت نزدیک ہے۔

اتباع سے وصول، بدعت سے دوری ہوتی ہے:

"عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اَلْاِقْتِصَادُ فِی السُّنَّۃِ اَحْسَنُ مِنَ الْاِجْتِھَادِ فِی الْبِدْعَۃِ."

(مستدرک حاکم ج:۱ ص:۱۰۳)

ترجمہ:...... ’’حضرت امام حاکم رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ سنت میں پیروی کرنا، میانہ روی کرنا یعنی آہستہ چال چلنا، ذرا ٹھہر کے چلنا، جلد بازی نہ کرنا یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت بدعت کے کام میں محنت کرنے سے۔‘‘

اتباعِ سنت کے کام میں تو آدمی آہستہ چلے، چلتا رہے گا، چلتا رہے گا انشاءً اللہ! منزل پر پہنچ جائے گا۔ اور خلافِ سنت کام میں آدمی اگر محنت بھی کرے جتنا محنت کرے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے دور جائے گا، اس لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عمل کرو اور ہم نے جو چیز اپنے ماحول میں دیکھی، اردگرد دیکھی اس کا اعتبار نہیں ہے بھائی۔

پیچھے چلنے سے پہنچ جاؤ گے:

’’عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: نَزَلَ الْقُرْآنُ وَسَنَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ السُّنَنَ. ثُمَّ قَالَ: اِتَّبِعُوْنَا فَوَاللّٰہِ! اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا تَضِلُّوْا.‘‘

(مسند احمد ج:۴ ص:۴۴۵)

ترجمہ:...... ’’حضرت عمران بن حصینؓ (میں نے بتایا تھا کہ یہ باپ اور بیٹا دونوں صحابی ہیں رضی اللہ عنہما، اللہ تعالیٰ ان دونوں سے راضی ہو) وہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم نازل ہوا اور قرآن کریم کی آیات تمہارے سامنے آگئیں اور رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے لئے سنتیں جاری کردیں۔ اور پھر ارشاد فرمایا کہ ہمارے پیچھے پیچھے چلو! (حضرت عمران بن

حصینؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے پیچھے پیچھے چلو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلنے والے تھے اور ہم ان کے پیچھے چلیں) تو تم منزل پر پہنچ جاؤ گے اور اگر تم ہمارے پیچھے نہیں چلے، اپنا الگ راستہ اختیار کرلیا تو گمراہ ہوجاؤ گے۔"

سب کچھ قرآن میں نہیں ہے:

"عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ لِرَجُلٍ: اِنَّکَ اِمْرَؤٌ اَحْمَقُ! اَتَجِدُ فِیْ کِتَابِ اللهِ الظُّهْرَ اَرْبَعًا لَا تَجْهَرُ فِیْهَا بِالْقِرَاءَةِ؟ ثُمَّ عَدَّدَ عَلَیْهِ الصَّلَاةَ وَالزَّکَاةَ وَنَحْوَ هٰذَا، ثُمَّ قَالَ: اَتَجِدُ فِیْ کِتَابِ اللهِ مُفَسَّرًا؟ اِنَّ کِتَابَ اللهِ اَبْهَمَ هٰذَا وَاِنَّ السُّنَّةَ تُفَسِّرُ ذٰلِکَ."

(حیاۃ الصحابہ ج:۵ ص:۳۶۲)

ترجمہ:......"ایک شخص نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما (سے یہ کہا کہ فلاں چیز مجھے قرآن کریم میں نہیں ملی) نے فرمایا: تم احمق آدمی ہو! تم یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں یہ چیز ملتی ہے کہ ظہر کی چار رکعتیں ہیں اور ان میں قرأت جہر سے نہیں کی جاتی؟ یہ چیز تمہیں قرآن میں ملتی ہے؟ کہنے لگا کہ: نہیں! کہنے لگے کہ: یہ چیز تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں بتائی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو سمجھ رہے تھے اور اس کو بیان فرما رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم نازل ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ فجر کی دو رکعتیں ہیں۔"

کہیں دو رکعتیں فجر کی لکھی ہوئی ہیں قرآن کریم میں؟ ظہر کی چار رکعتیں

فرض ہیں، عصر کی چار رکعتیں فرض ہیں، مغرب کی تین رکعتیں فرض ہیں اور عشاٗ کی چار رکعتیں فرض ہیں، فجر، مغرب اور عشاٗ میں قرأت اونچی آواز سے کی جاتی ہے، ظہر اور عصر میں اونچی نہیں کی جاتی، یہ کہیں لکھا ہوا ہے قرآن کریم میں؟ کہا: نہیں! کہنے لگے: احمق آدمی! یہ باتیں تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لی ہیں اور اگر تم اس سے منکر ہوجاؤ گے تو کافر ہوجاؤ گے۔

منکرین حدیث کا مغالطہ:

ہمارے منکرین حدیث کو سب سے بڑا مغالطہ یہی ہوا کہ یہ چیز قرآن کریم میں نہیں ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا تھا اور بالکل صحیح فرمایا تھا کہ تم دو رکعتیں قرآن کریم سے پڑھ کر سنا دو اور زیادہ نہیں کہتا، اس سے بحث نہیں کہ تم کون سی رکعت پڑھو، رات کی پڑھو، دن کی پڑھو، دو رکعتیں پڑھ کے قرآن کریم سامنے رکھ کر ہمیں پڑھ کر سنادو۔ کوئی افلاطون کا بیٹا بھی نہیں کرسکتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس سال نماز پڑھ کر کے دکھائی ہے، وہ تمہارے نزدیک حجت نہیں نعوذ باللہ! استغفر اللہ! جن پر یہ قرآن کریم نازل ہوا اور انہوں نے اس قرآن کریم پر عمل کرکے یہ نمازیں پڑھائیں، نماز فرض بھی پڑھائی، نماز نفل بھی پڑھائی، سنتیں بھی پڑھائیں اور وتر بھی پڑھائے اور پڑھے بھی، تم ان کو کہتے ہو کہ ایسی چیز ہے۔

نہیں بھائی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقہ سے جو کام کیا ہے اس کو پورا کرو بس! قرآن کریم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سمجھنے والا کوئی نہیں تھا، قرآن کریم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا اور ہمیں سمجھایا، صحابہ کرامؓ کو سمجھایا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سمجھایا، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم کو سمجھایا اور چلتے چلتے یہ ہم تک پہنچا، الحمدللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی متواتر ہم تک پہنچے ہیں۔

اتباعِ صحابہؓ کی ترغیب:

ایک چھوٹی سی حدیث اور سنا دیتا ہوں:

"عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ، فَاِنَّ الْحَیَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ، اُولٰئِكَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبَرَّهَا قُلُوْبًا، وَاَعْمَقَهَا عِلْمًا، وَاَقَلَّهَا تَكَلُّفًا، اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ، فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ، وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰى اٰثَرِهِمْ، وَتَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ اَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ فَاِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهُدٰى الْمُسْتَقِيْمِ." (مشکوٰۃ ص:۳۲)

ترجمہ:...... "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: جس شخص کو اقتدا کرنی ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابہؓ کی اقتدا کرے، جو کہ دنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں، کیونکہ جو زندہ آدمی ہے اس کے بارے میں کیا معلوم کہ خدانخواستہ فتنے میں مبتلا ہوجائے اور یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تھے، ان کے دل امت میں سب سے زیادہ پاکیزہ تھے، اور ان کا علم سب سے زیادہ گہرا تھا، ان میں سب سے زیادہ کم تکلف تھا، ان کا طریقہ سب سے زیادہ سیدھا تھا اور ان کی حالت سب سے زیادہ اچھی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لئے چنا۔"

وہ کتنے خوش قسمت ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو چنا تھا، ہم بھی تو پہلے آسکتے تھے، لیکن ہمیں اپنے وقت پر آنا ہوا۔

میں تو اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس وقت پہنچایا، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی ہدایت عطا فرمادی، اگر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ہمیں سمجھ میں نہ آتیں، خدا جانے ابوجہل کے ساتھ ہوتے؟ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہماری حفاظت فرمائی۔

فرمایا حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت کا اعتراف کرو اور ان کے نشانِ قدم پر چلو! اس لئے کہ وہ سیدھی ہدایت پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے طریقے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قرآن کریم سیکھ کر
پڑھنے کے فضائل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"تَعَلَّمُوْا كِتَابَ اللهِ فَاِنَّهٗ اَفْضَلُ الْحَدِيْثِ، وَتفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ فَاِنَّهٗ رَبِيْعُ الْقُلُوْبِ، وَاسْتَشْفُوْا بِنُوْرِهٖ فَاِنَّهٗ شِفَاءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ، وَاَحْسِنُوا تِلَاوَتَهٗ فَاِنَّهٗ اَحْسَنَ الْقَصَصِ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْكُمْ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ، وَاِذَا هُدِيْتُمْ لِعِلْمِهٖ فَاعْمَلُوْا بِمَا عَلِمْتُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تهْتَدُوْنَ، فَاِنَّ الْعَالِمَ الْعَامِلَ بِغَيْرِ عِلْمِهٖ كَالْجَاهِلِ الْجَائِرِ الَّذِىْ لَا يَسْتَقِيْمُ عَنْ جَهْلِهٖ بَلْ قَدْ رَأَيْتُ اَنَّ الْحُجَّةَ اَعْظَمُ وَالْحَسْرَةُ اَدْوَمُ عَلٰى هٰذَا الْعَالِمِ الْمُنْسَلِخِ مِنْ عِلْمِهٖ عَلٰى هٰذَا الْجَاهِلِ الْمُتَحَيِّرِ فِىْ جَهْلِهٖ، وَكِلَاهُمَا مُضَلَّلٌ مَثْبُوْرٌ، لَا تَرْتَابُوْا فَتَشُكُّوْا، وَلَا تَشُكُّوْا فَتَكْفُرُوْا، وَلَا تُرَخِّصُوْا لِاَنْفُسِكُمْ فَتَذْهَلُوْا، وَلَا تَذْهَلُوْا فِى الْحَقِّ فَتَخْسَرُوْا." (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۰۷)

ترجمہ:..... ''اللہ کی کتاب کو سیکھو، اس لئے کہ یہ افضل کلام ہے، اور دین میں تفقہ حاصل کرو، اس لئے کہ یہ دلوں کی بہار ہے، اور اس کے نور سے شفا حاصل کرو کیونکہ وہ شفا ہے سینوں کی بیماریوں کے لئے، اور اس کی خوب تلاوت کیا کرو، اس لئے کہ یہ سب سے بہترین بیان ہے، اور جب تمہارے سامنے قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، اور جب تم کو ہدایت حاصل ہوجائے اس علم کی تو جو تم نے قرآن کریم سے سیکھا ہے، تو اس پر عمل کرو تاکہ تم کو ہدایت کا راستہ نصیب ہو، پس بے شک جو عالم اپنے علم پر عمل نہ کرتا ہو وہ اس جاہل کی مانند ہے جو راستے سے بھٹکا ہوا ہو اور اپنی جہالت سے سیدھی راہ پر نہ آتا ہو، بلکہ میں نے دیکھا ہے کہ جو عالم اپنے علم سے نکلا ہوا ہو اس پر حجت بڑی اور حسرت دائمی ہے بہ نسبت اس جاہل کے جو اپنے جہل میں متحیر ہے، اور دونوں گمراہ اور ہلاک ہونے والے ہیں، تردد میں نہ پڑا کرو ورنہ تم شک میں پڑ جاؤ گے، اور دینی حقائق میں شک میں نہ پڑو ورنہ تم کافر ہوجاؤ گے، اور اپنے نفسوں کے لئے رخصتیں نہ تلاش کیا کرو ورنہ تم بھول میں پڑ جاؤ گے اور حق کے معاملے میں بھول اختیار نہ کرو ورنہ تم خسارے میں پڑ جاؤ گے۔''

قرآن کریم کی انفرادیت:

اس خطبہ میں پہلے یہ بات فرمائی کہ اللہ کی کتاب کو سیکھو اس لئے کہ یہ سب سے بہتر کلام ہے، اس سے احسن، اس سے افضل، اس سے انفع اور اس سے بہتر کوئی

کلام نہیں ہے۔

میں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ محض اس کی تلاوت کرنا، اس کا پڑھنا موجب اجر وثواب ہو، جبکہ قرآن کریم وہ واحد کتاب ہے کہ اس کے الفاظ کی تلاوت بھی موجب اجر وثواب ہے، صرف اس کے الفاظ کو زبان پر جاری کرنا بھی مستقل عبادت ہے، چنانچہ ایک حدیث کا مضمون ہے:

"قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا اَبَاذَرٍّ! لَاَنْ تَغْدُوْ فَتَعَلَّمَ آیَـةً مِّنْ کِتَابِ اللهِ خَیْرٌ لَّکَ مِنْ اَنْ تُصَلِّیَ مِائَةَ رَکْعَةٍ وَلَاَنْ تَغْدُوْ فَتَعَلَّمَ بَابًا مِّنَ الْعِلْمِ عَمِلَ بِهٖ اَوْ لَمْ یَعْمَلْ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ تُصَلِّیَ اَلْفَ رَکْعَةٍ."

(ابن ماجہ ص:۲۰)

ترجمہ:...... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! تو اس طور پر صبح کرے کہ قرآن کریم کی ایک آیت سیکھ لے، یہ تیرے لئے ایک سو رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے، اور یہ کہ تو اس طور پر صبح کرے کہ دین کا ایک باب سیکھ لے چاہے تو اس پر عمل کرے یا نہ کرے، تیرے لئے ایک ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔"

ایک آیت سیکھنے کا ثواب:

پہلی بات کہ ایک آیت سیکھ لے یہ سو رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! سمجھ کر یا بے سمجھے؟ فرمایا: خواہ سمجھ کر یا بے سمجھے۔ تو قرآن کریم کی ایک آیت سیکھ لیں چاہے اس کا مضمون سمجھ میں آئے یا نہیں آئے دونوں صورتوں میں یہ اجر برابر ہے۔

دوسری بات کے بارے میں صحابہ کرامؓ نے پوچھا: یا رسول اللہ! خواہ عمل

کرے یا نہ کرے؟ فرمایا: خواہ عمل کرے یا نہ کرے۔ یعنی علم سیکھنے کی فضیلت الگ ہے اور اس پر عمل کرنے کی فضیلت الگ ہے، یہ مضمون آگے آرہا ہے۔ تو کتاب اللہ کو سیکھو اور سیکھنے کا شوق پیدا کرو۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے مسجد میں تشریف لائے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن کریم کے سیکھنے اور سکھانے میں مشغول تھے، ان میں سے کچھ چھوٹی عمر کے تھے، کچھ بڑی عمر کے تھے، عام طور پر بڑی عمر کے لوگوں کی زبان سیدھی نہیں ہوتی، تلفظ میں بڑی مشکل ہوتی ہے، ان صحابہؓ میں کچھ عرب تھے، کچھ عجم تھے، عجمیوں کے لئے عربی زبان کا تلفظ مشکل ہوتا ہے، ارشاد فرمایا کہ: "اِقْرَؤُوْا فَكُلٌّ حَسَنٌ." (مشکوٰۃ ص:۱۹۱) یعنی سب ٹھیک ہے، سیکھتے رہو۔

دورِ حاضر کی رسم:

ہمارے اس زمانے میں یہ رسم چل نکلی ہے کہ ہر چیز کو سیکھنے کی ضرورت ہے پر قرآن سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ آپ ہی آپ آجاتا ہے، کسی میاں جی کے پاس، کسی قاری صاحب کے پاس الفاظ سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں، جیسے اردو الفاظ خود ہی آجاتے ہیں، ویسے ہی یہ قرآن بھی آجاتا ہے اور قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے کی ضرورت نہیں، یعنی معنی سیکھنے کی ضرورت نہیں بس ترجمہ دیکھ لینا کافی ہے، بہت سے لوگ مجھے حوالے دیا کرتے ہیں کہ فلاں سورت کی فلاں آیت میں یہ مضمون لکھا ہے میں نے اس پر عمل کیا ہے، اپنے پاس سے مسئلہ گھڑ لیتے ہیں اور ساتھ ہی کہتے ہیں کہ تم یہ مسئلہ بتاتے ہو۔

ایک واعظ صاحب وعظ کہہ رہے تھے، امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ پاس سے گزرے، اس سے فرمایا: تم قرآن کریم کے ناسخ و منسوخ کو جانتے ہو؟ مجمل اور مفصل کو، محکم اور متشابہ کو جانتے ہو؟ اس واعظ نے کہا کہ: نہیں! فرمایا: تم سے کس

نے کہا تھا وعظ کہنے کو؟ غلط سلط جو منہ میں آئے گا ہانکو گے، تو قرآن کریم کے الفاظ کو بھی سیکھو اگر اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو اس کا معنی اور مفہوم بھی سمجھو۔

سب سے آسان اور مشکل کتاب:

میں ہمیشہ ایک بات کہا کرتا ہوں، ایک فقرہ کہا کرتا ہوں کہ میں نے دنیا میں قرآن کریم سے زیادہ آسان کتاب نہیں دیکھی اور قرآن کریم سے زیادہ مشکل کتاب نہیں دیکھی، پڑھتے پڑھاتے عمریں بیت گئیں، بال سفید ہوگئے لیکن سمجھ میں نہیں آیا اور لوگ قرآن کریم کا ترجمہ دیکھ کر مجتہد بن جاتے ہیں، تو اس زمانے میں لوگوں کا یہ ذہن بن گیا ہے کہ سب کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے، لیکن قرآن کریم سیکھنے کی ضرورت نہیں، یہ اپنے آپ ہی آجاتا ہے اور یہ جو ہمارے لوگ ہیں جو علمائ سے تھوڑا بہت تعلق رکھتے ہیں یہ تو بے چارے تھوڑا بہت اردو ترجمہ دیکھ لیتے ہوں گے، یہ جو اونچے طبقے کے لوگ ہیں ان کے لئے اردو ترجمہ دیکھنا بھی گناہ ہے، یہ انگریزوں کا ترجمہ دیکھتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ پکتال کا ترجمہ دیکھ لیا، یوسف علی کا دیکھ لیا بس۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اپنی معلومات کی تصحیح کرواؤ کہ تم نے جو سیکھا ہے وہ صحیح بھی ہے؟ اور تم نے جو سمجھا ہے وہ صحیح بھی سمجھا ہے یا نہیں؟

عالمگیرؒ کی حکمت:

عالمگیرؒ کا لطیفہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے دیکھا کہ ان کے امرأ، وزرأ میں مسجد کی طرف رغبت کچھ کم ہو رہی ہے، حکم دے دیا کہ جو میاں جی سے، مسجد کے امام سے اتنی آیتیں سیکھ کے آئے گا اس کو اتنا انعام ملے گا، اور اتنی ترقیات ہوں گی، سب لوگ دوڑے میاں جی اور قاری صاحب کے پاس، یہ تو عالمگیرؒ کا انعام تھا۔

اللہ کا انعام:

عالمگیرؒ کے خدا کا انعام یہ ہے کہ قرآن کے قاری سے کہا جائے گا کہ:

"اِقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَاِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَأُهَا." (مشکوٰۃ ص:۱۸۶)

ترجمہ:......"پڑھتا جا اور چڑھتا جا (جتنی آیتیں پڑھو گے اتنے درجے بلند کردیں گے) جس طرح تم ترتیل کے ساتھ، آہستگی کے ساتھ دنیا میں پڑھتے تھے، ویسے پڑھو، جہاں تمہارے قرآن کی آخری آیت ختم ہوگی وہی تمہارا مرتبہ ہوگا (چڑھ جاؤ جتنا تم سے اونچا چڑھا جاتا ہے، یہ ترقیات ہیں)۔"

ہر عمر والا قرآن سیکھے:

تو قرآن کریم کو سیکھو بھائی! اس کے الفاظ کو بھی سیکھو، اس میں عار نہ کرو، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بہت سے ایسے تھے جن کی عمریں پختہ ہوگئی تھیں، ساٹھ سال کے تھے، ستر سال کے تھے، اس کے باوجود انہوں نے قرآن کریم سیکھا، تو مجھے یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جن کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہے، وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے قرآن کریم پڑھتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جن کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کوئی دس سال کی تھی، صحیح بخاری میں یہ قصہ ہے۔ تو اتنے بڑے اونچے جلیل القدر صحابی جن کا شمار ان دس صحابہؓ میں ہے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی اور جو "اَفْضَلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ" ہیں، (اس امت میں سب سے افضل ہیں)، لیکن ان کو عار نہیں ہے کہ میں ایک چھوٹے بچے سے قرآن پڑھتا ہوں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت ابن عباسؓ کے پاس قرآن کریم کی

مشق کرتے تھے، جب کہ یہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سیکھتے تھے، تو قرآن کریم کو سیکھو "فانہ افضل الحدیث" سب سے افضل حدیث اور سب سے افضل کلام ہے، "وَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ" اور دین کا فہم حاصل کرو۔

دین داری اور فہم دین:

یاد رکھو! ایک ہے دینداری، اور ایک ہے دین کا فہم، اور ایک ہے مزاج کا دین کے مطابق ڈھل جانا، یہ تین چیزیں الگ الگ ہیں۔

میں بہت سے لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ ماشاءاللہ دیندار ہیں، متشرع ہیں، داڑھی بھی رکھی ہوئی ہے، ماتھے پر محراب ہے، حاجی بھی ہیں، نمازی بھی ہیں لیکن مزاج دینی نہیں ہے، دین میں ڈھلا ہوا نہیں ہے، اور بہت سے ایسے ہیں کہ ماشاءاللہ دیندار ہیں، مسئلے مسائل پر عمل بھی کرتے ہیں لیکن دین کا فہم نہیں ہے، بس ایسا ہی ہے جیسے ڈاکٹر اسرار احمد ہے، خود ہی مجتہد بن گئے، اکبر مرحوم نے کہا تھا:

انہوں نے دین کب سیکھا ہے رہ کر شیخ کے گھر میں؟
پلے کالج کے چکر میں، مرے صاحب کے دفتر میں!

مطالعہ کا علم:

وہی بات جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ ساری عمر تو انگریزی پڑھتے رہے، گھوٹتے رہے اور اپنے بیانات میں بھی حوالے نامعلوم کن کن انگریزوں کے دیتے ہیں، الفاظ تو بولتے ہی تھے، تحریر میں بھی دیکھو تو آدھے الفاظ انگریزی رسم الخط میں لکھتے ہیں، اب میرے جیسا اس کو کیا سمجھے گا؟ لیکن دین کسی سے سیکھا نہیں ہے، ان کا دین بس اپنے فہم کی پیداوار ہے، جتنا خود مطالعے سے سمجھ لیا، سمجھ لیا کسی سے سیکھنے، سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ بھائی! اپنے آپ مطالعہ کر کے آپ کبھی عدالت میں وکیل کی حیثیت سے

کھڑے نہیں ہوسکتے کہ میں نے قانون کا مطالعہ کیا ہے، قانون کو جج سے زیادہ جانتا ہوں، اور ڈاکٹری کے فن کا اپنے آپ مطالعہ کرکے بھی آپ کسی ہسپتال میں مریض کا آپریشن نہیں کرسکتے بلکہ دوا بھی نہیں دے سکتے، آپ یہ کہیں کہ میں نے بہت مطالعہ کیا ہوا ہے، پوچھنے والے پوچھیں گے: ڈگری ہے؟ استادوں نے تمہارے علم کی تصدیق کی ہے یا نہیں؟ کیا قرآن اور حدیث کے علم کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ کسی استاذ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے؟ خالد اسحٰق بھی محقق، ڈاکٹر اسرار بھی محقق اور فلاں بھی محقق اور فلاں بھی محقق، بڑے اونچے اونچے القاب کے ساتھ نام چھپتا ہے، ممتاز عالم دین اسکالر، نہ شکل دین کے مطابق، نہ عقل دین کے مطابق! تفقہ فی الدین کی ضرورت ہی نہیں، جو سمجھ میں آگیا بس وہ ٹھیک ہے:

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا کَشَفَ الْغُبَارُ
اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِکَ اَمْ حِمَارُ

ترجمہ:......"یہ غبار چھٹنے دو تو جب پتہ چلے گا کہ تمہارے نیچے گھوڑا تھا یا گدھا تھا؟"

میدان حشر میں مقالے کام نہ آئیں گے:

وہاں میدان محشر میں یہ کرتب نہیں چلیں گے کہ اتنے مقالے لکھے تھے اور اس طرح اس طرح لوگ داد و تحسین دیا کرتے تھے، وہاں ایک ایک حرف کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کس سے سیکھ کر لکھا تھا؟ کیسے لکھا تھا اور کس نیت سے لکھا تھا؟ اسی لئے فرمایا: "یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ" (اس دن دلوں کے بھید اگل دیئے جائیں گے)، بھائی! دین کا فہم حاصل کرو، دین کے مسائل سیکھو اور ان مسائل کا صحیح فہم بھی حاصل کرو، اس لئے کہ: "فَاِنَّہٗ رَبِیْعُ الْقُلُوْبِ" (یہ دلوں کی بہار ہے) دین کا فہم حاصل کرنے سے دل باغ و بہار ہوجائیں گے۔

فقہ میں لطف:

ہمارے مفتی ولی حسن مرحوم جن کا ابھی رمضان میں انتقال ہوا ہے، مجھ سے فرماتے تھے کہ میں جب فقہ کی کتابیں پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا لطف آتا ہے جیسے لوگوں کو ناول افسانے پڑھنے میں لطف آتا ہے۔

فقہ قانون کو کہتے ہیں اور قانون سب سے زیادہ خشک موضوع ہے، شعروں کی کتاب پڑھنا آسان، وعظ کی کتاب پڑھنا آسان کیونکہ اس میں وعظ اور چٹکلے ہوتے ہیں اور تاریخ و سوانح پڑھنا آسان، کیونکہ اس میں قصے کہانیاں ہوتی ہیں، خالص قانونی الفاظ کا نام فقہ ہے اور پھر اس کی بال کی کھال اتارنا یہ شق کیوں رکھی گئی ہے؟ اس مسئلے میں یہ قید کیوں لگائی گئی ہے؟ لہٰذا فقہ بڑا خشک موضوع ہے، لیکن اگر کسی کو تفقہ فی الدین نصیب ہو جائے تو پھر ربیع القلوب، دلوں کی بہار بن جاتی ہے۔

قرآن سے شفاء:

تیسری بات فرمائی: "وَاسْتَشْفُوْا بِنُوْرِهٖ فَاِنَّهٗ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ" قرآن کے نور سے شفا حاصل کیا کرو، اس لئے کہ سینے کی بیماریوں کے لئے، یعنی روحانی بیماریوں کے لئے قرآن شفا ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ." (بنی اسرائیل:۸۲)

ترجمہ:...... "اور ہم اتارتے ہیں قرآن سے وہ جو شفا ہے اور رحمت ہے اہل ایمان کے لئے۔"

آیاتِ شفاء:

یہاں ایک لطیفہ ذکر کردوں کہ قرآن کریم کی چھ آیتوں میں شفا کا لفظ آیا ہے، قرآن کریم کے لئے بھی "شفاء" کا لفظ آیا ہے اور ایک جگہ شہد کے لئے بھی یہی

"شفاء" کا لفظ آیا ہے، بعض اکابرؒ نے فرمایا کہ ان چھ آیتوں کو جن کو آیات شفا کہا جاتا ہے آدمی پڑھ کر پانی پر دم کرکے پی لے تو اللہ تعالیٰ شفا عطا فرماتے ہیں۔

بہرحال قرآن کریم روحانی امراض کے لئے بھی شفا ہے اور جسمانی امراض کے لئے بھی شفا ہے، اور سورۂ فاتحہ کا ایک نام سورۃ الشفا بھی ہے، ہر بیماری کا علاج سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۂ فاتحہ اکتالیس (۴۱) مرتبہ پڑھ لو، اکتالیس مرتبہ نہیں پڑھ سکتے تو گیارہ مرتبہ پڑھ لو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرلو کہ اس کلام پاک کی برکت سے شفا عطا فرمادیں، اللہ تعالیٰ ظاہری اور باطنی امراض سے شفا عطا فرمادیں گے۔

قرآن امراض روحانی وجسمانی کے لئے شفا:

قرآن کریم ایسی شفا ہے کہ اس سے دلوں کے کفر دُھل جاتے ہیں، دلوں کے نفاق دُھل جاتے ہیں، دلوں کی گندگیاں دُھل جاتی ہیں، دل خوب پاک صاف ہوجاتے ہیں، لیکن قرآن کریم کے نور سے شفا حاصل کرو، نور آئے گا تو سیاہی اور سفیدی کے درمیان امتیاز ہوگا، آج کل تو ایکسرے مشینیں لگی ہوئی ہیں، اس سے پتہ چلے گا کہ اندر کیا چیز ہے؟ جب اس کی ایکسرے کی لائٹ پڑے گی تو بتائے گی کہ اندر کیا چیز ہے؟ قرآن کریم کی روشنی اور قرآن کریم کا نور اندر آئے گا، تو اپنے امراض کا پتہ چلے گا اور اگر درمیان میں دیوار حائل کردی تو پھر کیا نور پہنچے گا؟

سنوار کر تلاوت کرو:

چوتھی بات یہ فرمائی: "وَاَحْسِنُوْا تِلَاوَتَهٗ فَاِنَّهٗ اَحْسَنَ الْقَصَصِ." اور خوب بنا سنوار کر قرآن کریم کی تلاوت کیا کرو اس لئے کہ یہ بہترین واقعات اور بہترین بیان ہے، اللہ تعالیٰ سے بہتر کون بیان کرسکتا ہے؟ کیونکہ یہ کلام الٰہی ہے۔

قرآن میں ہر چیز کا بہترین بیان:

ہمارے امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ ارشاد فرماتے

تھے کہ قرآن کریم میں جہاں ایک لفظ آیا ہے اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا ممکن ہی نہیں، حالانکہ دوسری جگہ قرآن کریم میں وہ لفظ موجود ہے، اگر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا جائے جو قرآن کریم ہی میں آیا ہے تو قرآن کریم کا نظم مختل ہو جائے گا، بگڑ جائے گا۔ تو قرآن کریم میں ہر چیز کا بہترین بیان ہے، اللہ تعالیٰ نے اگر قرآن کریم کا فہم دیا ہو تو تم قرآن کریم کھول کر دیکھو اور قرآن کریم کا آئینہ سامنے رکھ لو اور پھر اپنا سر سے لے کر پاؤں تک، ظاہر سے لے کر باطن تک اپنے تمام اعمال کو قرآن کریم پر پیش کرو، ایک ایک چیز کو دیکھو تمہیں پتہ چلے گا کہ قرآن کیا کہتا ہے، اور میں کیا ہوں؟ قرآن کریم کی تلاوت بہترین طریقے سے کرو، بہترین طریقے سے کیسے کرو گے؟

تلاوت کی مقدار مقرر کرو:

قرآن کریم کی تلاوت کی ایک منزل مقرر کرلو، بدن کی غذا کے لئے تم دو وقت کی روٹی کھانا ضروری سمجھتے ہو کہ نہیں؟ اب تو دو وقت کا نہیں بلکہ چار وقت کا ضروری سمجھتے ہیں، ایک ناشتہ، ایک دوپہر کا کھانا اور ایک عصرانہ اور ایک عشاً کے بعد کا کھانا، چار وقت کھاتے ہیں، کم سے کم قرآن کریم کو غذا سمجھ کر اس کی تلاوت کرو، اور یہ سوچ لو کہ مجھے روزانہ اتنی خوراک لینی ہے اور نفس سے کہہ دو کہ برخوردار! یہ تو تم سے کام کروانا ہی کروانا ہے، پٹھان کے بقول کہ اب چیں کر یا می کر، یہ کالا کالا تو چھوڑتا نہیں، اب تجھے نہیں چھوڑتا یہ تو تجھ سے کام کروانا ہے، ہاں سفر ہو یا بیماری ہو تو عذر ہے، اپنی گپ تراشیوں میں، اپنے فضول اوقات میں کچھ تخفیف کرلو، بے ہودہ مشاغل، لایعنی کام اور بے مصرف ضرورتوں کو ختم کردو، قرآن کریم کی تلاوت کو اپنا یومیہ معمول بناؤ۔

دوسرے یہ کہ قرآن کریم کا صحیح تلفظ کرو، اس کے الفاظ صحیح ادا کرو، سیکھو اور سیکھ کر ادا کرو، میری طرح پنجابی میں قرآن نہ پڑھو۔

غور وفکر کا ثمرہ:

اور تیسری بات یہ کہ اگر تم غور کرو گے، سوچ کر پڑھو گے تو قرآن کریم کے آدھے الفاظ تو تمہیں خود سمجھ میں آنے لگیں گے۔

مدینہ طیبہ میں اقدام عالیہ میں ایک صاحب قرآن کریم کی تلاوت کرتا تھا، وہ تھا تو داڑھی منڈا مگر وہ قرآن کریم پڑھتا ہی رہتا تھا، پڑھتا ہی رہتا تھا، اس سے جب بات چیت ہوئی تو کہنے لگا میں حیدرآباد دکن کا ہوں، میں نے کہا تم نے داڑھی کیوں نہیں رکھی؟ کہنے لگا کہ یہ میری کمزوری ہے، اس نے کہا تلاوت کرتے کرتے قرآن کریم مجھے سمجھ میں آنے لگا ہے، اس کا مطلب سمجھ میں آنے لگا ہے، حالانکہ عربی نہیں پڑھی ہوئی تھی، لیکن قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ تلاوت کی برکت سے اس سے شناسائی ہوجاتی ہے، سمجھ میں آنے لگتا ہے، اسی طرح بھائی! اگر تم بھی سیکھ سیکھ کر تلاوت کرو گے تو تمہیں بھی قرآن کریم سے مناسبت ہوجائے گی اور قرآن کریم خود تم سے پیار کرنے لگے گا۔

بوقتِ تلاوت سوچنے کی چیزیں:

اور پھر تلاوت کرتے وقت یہ دو چیزیں سوچنے کی ہیں، ایک تو یہ سوچو کہ میں اللہ تعالیٰ کو سنا رہا ہوں، یہ ابتدائی درجہ ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اونچا مقام عطا فرمادیں تو یہ سوچو کہ میں اللہ تعالیٰ سے سن رہا ہوں، جیسے کہ جبل طور سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا کلام سن رہے تھے، میں اللہ کا کلام سن رہا ہوں، متکلّم وہ ہیں، یہ میری زبان اسپیکر ہے، اس طرح جم کر تلاوت کرو، تو انشاءاللہ اسی طرح قرآن کریم کی تلاوت کے انوار اور برکات تمہیں نصیب ہوں گی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے، یہ تو اپنی تلاوت کا قصہ تھا۔

غور سے قرآن سنو:

آگے فرماتے ہیں جب قرآن کریم تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر سنو، خوب متوجہ ہو جاؤ، اپنے کانوں کی ساری کھڑکیاں کھول دو اور خاموش رہو، جس محفل میں قرآن کریم پڑھا جائے اس کے لئے دو چیزوں کی شرط ہے، ایک یہ کہ جتنے حاضرین ہیں وہ سب کے سب پوری طرح قرآن کریم کی طرف کان لگائیں جیسے کسی دور کی آواز کو متوجہ ہو کر سنتے ہیں، اور اسی طرح کبھی کبھی دور کی آواز سننے کے لئے کانوں پر ہاتھ بھی رکھ لیتے ہیں، اس کو عربی میں استماع کہتے ہیں، کان دھرنا، سننا نہیں بلکہ پوری طرح متوجہ ہو جانا اور اس کے لئے خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

قرأت خلف الامام:

یہ قرآن کریم کی آیت کا اقتباس ہے، قرآن کریم کی آیت کا ٹکڑا ہے، اور اسی آیت سے ہمارے امام صاحبؒ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ مقتدی کے لئے امام کے پیچھے قرأت کرنا جائز نہیں ہے، مکروہ تحریمی ہے، اس لئے کہ امام قرأت کر رہا ہے، تمہارے سامنے پڑھ رہا ہے، اس کو سنو، اس کی طرف کان لگاؤ، صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا: ''وانصتوا'' خاموش بھی رہو، سنتا ہے یا نہیں سنتا، آواز تم تک پہنچتی ہے یا نہیں پہنچتی، تمہارا فرض ہے کہ اس کی طرف کان دھر کر کے رہو، اور دوسرا فرض یہ ہے کہ خاموش رہو اور خاموش رہنا خود پڑھنے کے منافی ہے، جب خاموش رہنے کا حکم دیا تو پڑھنے کی ممانعت ہوگئی۔

نماز اور خطبے میں خاموش رہو:

حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں اور حافظ ابن قدامہؒ نے ''المغنی'' میں اور یہ دونوں حنبلی بزرگ ہیں، امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد ہیں، دونوں نے امام احمدؒ

سے نقل کیا ہے کہ لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ قرآن کریم کی آیت نماز اور خطبے دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، عام طور پر آدمی پڑھتا ہو تو پڑھنے والے کے ذمہ واجب نہیں ہے کہ وہ دوسروں کا سنے بلکہ وہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کیا کرو، قرآن کریم دوسروں کے سامنے اونچی آواز سے پڑھنے کا حکم نہیں ہے، اور یہ آیت شریفہ نازل ہوئی ہے نماز اور خطبے کے بارے میں، جب نماز میں قرآن کریم کی تلاوت کی جائے تو مکمل سناٹا ہونا چاہئے اور پوری طرح لوگ قرآن کریم کی طرف متوجہ ہوں تاکہ تم پر رحم کیا جائے، اسی طرح خطبے کے اندر قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے تو پورے خطبے کا بھی یہی حکم ہے، حتیٰ کہ جب خطیب یہ کہے:

"اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا." (الاحزاب:۵۶)

ہمارے امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت درود شریف پڑھنا بھی جائز نہیں ہے، جب خطبہ ہو رہا ہو اور درود شریف پڑھنا ہو تو دل میں پڑھو، نماز میں اور خطبے میں مکمل طور پر خاموشی کا اور قرآن کریم کی استماع کا یعنی کان دھرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

امام کے پیچھے خاموش رہنا چاہئے:

اسی لئے ہمارے امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے، مکروہ تحریمی ہے، صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، لمبا قصہ ہے، اس قصے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور ہمیں نماز کا طریقہ بتایا اور آپؐ نے فرمایا کہ:

"اِذَا کَبَّرَ الْاِمَامُ فَکَبِّرُوْا، وَاِذَا قَالَ: "غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ" فَقُوْلُوْا: "آمِیْن" یُحِبُّکُمُ اللہُ، فَاِذَا کَبَّرَ وَرَکَعَ فَکَبِّرُوْا وَارْکَعُوْا، فَاِنَّ الْاِمَامَ یَرْکَعُ قَبْلَکُمْ وَیَرْفَعُ قَبْلَکُمْ ...... وَاِذَا قَالَ: "سَمِعَ اللہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" فَقُوْلُوْا: "رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ" ...... وَاِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا." (مسلم ج:۱ ص:۱۷۴)

ترجمہ:...... "جب امام اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو، جب امام: "غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ." کہے تو تم: آمین کہو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے، جب امام تکبیر کہے اور رکوع کرے تو تم بھی تکبیر کہو اور رکوع کرو (پہلے نہیں کرو) اس لئے کہ امام تم سے پہلے رکوع کرتا ہے اور تم سے پہلے سر اٹھاتا ہے، اور جب امام "سَمِعَ اللہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" کہے تو تم: "رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ" کہو اور جب امام سجدہ کرے تو تم سجدہ کرو۔"

مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا:

یہ تو کہیں نہیں فرمایا کہ جب سورۂ فاتحہ پڑھے تو تم بھی پڑھو، نماز کا پورا طریقہ اول سے آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔ بلکہ امام مسلمؒ نے اسی حدیث میں سلیمان کی روایت قتادہ سے جو نقل کی ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ: "وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا." (مسلم ج:۱ ص:۱۷۴) اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش ہوجاؤ۔ جب تکبیر کہے تو تکبیر کہو، جب قرأت کرے خاموش ہوجاؤ اور جب وہ "غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ." کہے تو آمین کہو، تو سورۂ فاتحہ پڑھنے کی گنجائش

مقتدی کے لئے کہاں رہی؟ حافظ ابن کثیرؒ نے سورۂ یونس کی اس آیت:

"وَقَالَ مُوْسٰی رَبَّنَا اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهٗ زِیْنَةً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ، رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمِ." (یونس:۸۸)

ترجمہ:...... "اور موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اے ہمارے رب! آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامان تجمل اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے گمراہ کریں، اے ہمارے رب! ان کے مال کو نیست و نابود کردیجئے اور ان کے دلوں کو سخت کردیجئے سو یہ ایمان نہ لانے پاویں یہاں تک کہ عذاب الیم کو دیکھ لیں۔"

آمین کہنے والا گویا تلاوت میں شامل ہے:

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا." (یونس:۸۹) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوگئی، کن دونوں کی؟ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی، حالانکہ قرآن کریم کی اس آیت میں دعا صرف حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نقل کی ہے، جیسے فرمایا: "وَقَالَ مُوْسٰی رَبَّنَا اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ .... الخ." حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی، لیکن اس دعا کو نقل کرکے فرماتے ہیں: "قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا." تم دونوں کی دعا قبول ہوگئی۔

حافظ ابن کثیرؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ روایت میں یوں آتا ہے

کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام دعا کر رہے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین آمین کہہ رہے تھے، جب دعا مکمل ہوچکی تو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوگئی، یہ دعا صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نہیں تھی بلکہ حضرت ہارون علیہ السلام کی بھی تھی۔

سورۂ فاتحہ دعا ہے:

سورۂ فاتحہ بھی سورۃ الدعا ہے، اس کے ناموں میں سے ایک نام سورۃ الدعا ہے، سورۃ المسئلۃ ہے، سوال کرنے کی سورۃ، اور اس سورۃ کے ختم پر شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے موضح القرآن میں لکھا ہے کہ یہ سورۃ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی زبان پر نازل فرمائی کہ یوں کہا کریں، ہمیں تعلیم دی ہے کہ ہم سے یوں مانگا کرو، امام پوری قوم کا نمائندہ ہے، وہ تمہاری درخواست بارگاہ رب العالمین میں پیش کر رہا ہے، جب اس نے: ”غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ.“ تک دعا مکمل کرلی تو تم کہو: آمین، تمہاری دعا بھی ہوگئی، وہ دعا اکیلے امام کی نہیں ہے بلکہ تمہاری بھی ہے، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کی دعا تھی تو امام کی دعا بھی تمہاری آمین کہنے کے بعد پوری جماعت کی دعا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ یہ آیت حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی دلیل ہے، حالانکہ وہ خود شافعی المذہب ہیں، اور وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کے قائل ہیں، لیکن فرماتے ہیں کہ یہ آیت دلیل ہے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی کہ جب مقتدی امام کی فاتحہ پر آمین کہہ دیتے ہیں تو یہ دعا سب کی طرف سے ہوجاتی ہے۔

تلاوت پر خاموشی سے رحمت:

تو بہرکیف قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کو سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم

کیا جائے، میں نے اپنی کتاب ''اختلاف امت اور صراط مستقیم'' میں لکھا ہے کہ: ''لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ.'' کا لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ امام کے پیچھے استماع کروگے یعنی کان دھروگے تو تم پر رحم ہوگا ورنہ نہیں ہوگا، امام اپنی پڑھ رہا ہے اور تم اپنی بانسری بجارہے ہو، تو تم پر رحم نہیں ہوگا۔

امام ابوحنیفہؒ کا مسئلہ فاتحہ خلف الامام پر مناظرہ:

حضرت امام اوزاعیؒ نے واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک وفد حضرت امام ابوحنیفہؒ سے فاتحہ خلف الامام کے مسئلے پر بحث کرنے کے لئے آیا، حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی تم اتنے آدمی ہو، میں اکیلا ہوں تم اپنا ایک نمائندہ مقرر کرلو وہ مجھ سے بات کرے، انہوں نے اپنی جماعت میں جو سب سے زیادہ زبان آور تھا اس کو منتخب کرلیا، حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ تمہارا نمائندہ ہے؟ کہا کہ جی ہاں! حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ: اس کی فتح تمہاری فتح اور اس کی شکست تمہاری شکست سمجھی جائے گی؟ کہا: جی ہاں! فرمایا: پھر مسئلہ تو حل ہوگیا، امام پوری قوم کا نمائندہ ہے، اگر اس کی دعا قبول ہوگئی تو پوری جماعت کی قبول ہوگئی اور اگر امام کی نہیں ہوئی تو تم کیا قبول کرواؤ گے؟ تمہیں کون پوچھتا ہے؟ پھر تمہیں تو اس کی فاتحہ پر آمین کہنے کا حکم دیا گیا ہے، صحیح بخاری کتاب الدعوات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فَاِذَا اَمَّنَ الْقَارِیْ فَاَمِّنُوْا.'' (صحیح بخاری ج:۲ ص:۹۴۷) جب قاری آمین کہے تو تم آمین کہو، قاری امام کو فرمایا، تمہیں نہیں قاری فرمایا، قاری کہتے ہیں پڑھنے والے کو، تمہیں امام کی فاتحہ پر آمین کہنے کا حکم دیا ہے اور اس پر مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے، اتنی واضح بات میں لوگ خواہ مخواہ الجھتے ہیں، باقی انشاء اللہ پھر۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

شہادت کی فضیلت واقسام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”....فَاِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللهِ، وَاَوْثَقُ الْعُریٰ کَلِمَةُ التَّقْوٰی، وَخَیْرُ الْمِلَلِ مِلَّةُ اِبْرَاهِیْمَ، وَخَیْرُ السُّنَنِ سُنَّةُ مُحَمَّدٍ (صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ)، وَاَشْرَفُ الْحَدِیْثِ ذِکْرُ اللهِ وَاَحْسَنُ الْقَصَصِ هٰذَا الْقُرْآنُ، وَخَیْرُ الْاُمُوْرِ عَوَازِمُهَا، وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَاَحْسَنَ الْهَدْیِ هَدْیُ الْاَنْبِیَاءِ، وَاَشْرَفُ الْمَوْتِ قَتْلُ الشُّهَدَاءِ، وَاَعْمَی الْعَمٰی اَلضَّلَالَةُ بَعْدَ الْهُدٰی، وَخَیْرُ الْعِلْمِ مَا نَفَعَ، وَخَیْرُ الْهَدْیِ مَا تَبِعَ وَشَرُّ الْعَمٰی عَمَی الْقَلْبِ ...... الخ.“

(حیاۃ الصحابہ ج:۶ ص:۶۲۳)

ترجمہ:......”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ: بے شک سب سے سچا کلام اللہ کی کتاب ہے، سب سے مضبوط کڑا تقویٰ ہے، سب سے بہتر ملت حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملت ہے، سب سے بہتر طریقہ محمد

(صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے، سب سے اشرف کلام اللہ کا ذکر ہے، سب سے بہتر قصہ یہ قرآن ہے، تمام کاموں میں سب سے بہتر وہ ہے جس کو عزیمت سے ادا کیا جائے، اور بدترین کام وہ ہیں جو نئے ایجاد کئے جائیں، سب سے بہتر طور طریقہ انبیاً علیہم الصلوٰۃ والسلام کا طور طریقہ ہے، سب سے اشرف موت شہداً کی شہادت اور ان کا قتل ہے۔"

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ شہید کا قتل ہونا سب سے اشرف موت ہے، اشرف کے معنی سب سے زیادہ بزرگی والی، سب سے زیادہ لائق عظمت۔

قرآن کریم نے حضراتِ شہداً کا تیسرا درجہ بیان فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

"وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا." (النسآ:۶۹)

ترجمہ:......"اور جس نے کہا مان لیا اللہ کا اور رسول اللہ کا تو یہ لوگ ہوں گے نبیوں کے ساتھ اور صدیقین کے ساتھ اور شہداً کے ساتھ اور اعلیٰ درجہ کے نیک لوگوں کے ساتھ اور بہت ہی عمدہ ہیں یہ سب حضرات رفیق ہونے کے اعتبار سے (ان سے زیادہ عمدہ رفیق کس کو میسر آسکتے ہیں؟)۔"

قرآن کریم نے پہلا درجہ اللہ کے نبیوں کا بیان فرمایا، دوسرا صدیقین کا، تیسرا شہداً کا اور چوتھا صالحین یعنی اعلیٰ درجہ کے نیک لوگوں کا، جن کو ہم اولیاً اللہ کہتے ہیں۔ ہم جیسے گناہگار مسلمان جو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں اور اطاعت کی کوشش کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو

خوشخبری دے رہے ہیں کہ: قیامت کے دن ان کا حشر نبیوں، صدیقین، شہداءٔ اور صالحین کے ساتھ ہوگا، اور یہ بہت اچھے ساتھی ہیں، "ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللہِ" یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نصیب فرمادے۔ (اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمادے، آمین!)۔

تو بہرحال شہیدوں کا مرتبہ اللہ نے تیسرے نمبر پر فرمایا ہے، انبیاءٔ اور صدیقین کے بعد پھر شہداءٔ کا درجہ ہے۔ اس لئے کہ سب سے اشرف و اعلیٰ موت تو حضرات انبیاءٔ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ہے، اور دوسرے نمبر پر اشرف و اعلیٰ موت صدیقین کی ہے، صدیقین حضراتِ انبیاءٔ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں۔ یعنی اپنے اوصاف اور اپنے کمالات کے اعتبار سے یہ حضرات انبیاءٔ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مشابہ ہوتے ہیں، لیکن ان کے پاس نبوت نہیں ہوتی، ان کے بعد پھر جتنے امتی ہیں، ان سب میں سے سب سے زیادہ شریف تر موت حضراتِ شہداءٔ کی ہے۔

شہید کسے کہتے ہیں:؟

چند باتیں یہاں سمجھ لینی چاہئیں۔

ا:......شہید کس کو کہا جاتا ہے؟

اصل شہید تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے کافروں کے ہاتھ سے قتل ہوجائے۔ میدانِ جہاد میں کافروں کے ہاتھ سے جو مسلمان قتل ہوجائے تو وہ شہید ہے۔

الف:......حضراتِ فقہاءٔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص میدانِ جہاد میں مقتول پایا گیا اور اس کے بدن پر زخم کا نشان تھا، لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ اس کو کسی کافر نے قتل کیا ہے تو وہ بھی شہید کہلائے گا۔

ب:......اسی طرح میدانِ جہاد سے کسی شخص کو زخمی ہونے کی حالت میں زندہ اٹھالیا گیا ہو، لیکن دوا دارو کی، مرہم پٹی کی، کھانے پینے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس نے دم توڑ دیا تو وہ بھی شہید ہے۔

ج:......اسی طرح جس شخص کو ڈاکوؤں نے قتل کردیا یا ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ مارا گیا، یا باغیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تو وہ بھی شہید ہے۔

د:......اسی طرح جس شخص کو کسی مسلمان نے بغیر کسی وجہ کے ظلماً قتل کردیا ہو تو وہ بھی شہید ہے۔

یہ شہداً کی پانچ قسمیں ہوئیں جو دنیا کے احکام کے اعتبار سے بھی شہید ہیں اور آخرت کے اعتبار سے بھی شہید ہیں۔ گویا:

۱:......جو شخص کسی کافر کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

۲:......جو شخص میدانِ جہاد میں مرا ہوا پایا گیا اور اس پر زخم کا نشان تھا، غالب یہی ہے کہ کسی کافر نے اس کو قتل کیا ہوگا یا کافر کے زخم لگانے سے قتل ہوا ہوگا۔

۳:......جو شخص زخمی حالت میں میدانِ جہاد سے لایا گیا اور ابھی تک کھانے پینے کی یا مرہم پٹی کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس کا پیمانۂ حیات لبریز ہوگیا۔

۴:......جس شخص کو ڈاکوؤں یا باغیوں نے قتل کردیا۔

۵:......جس شخص کو کسی مسلمان نے ظلماً قتل کردیا۔

یہ پانچ قسم کے افراد فقہی اعتبار سے شہید کہلاتے ہیں۔

شہید کے احکام:

شہید کا حکم یہ ہے کہ شہید کو انہی کپڑوں میں بغیر غسل کے دفن کیا جاتا ہے، اس کو کفن نہیں پہنایا جاتا اور اس کے بدن کے کپڑے نہیں اتارے جاتے، البتہ کوئی

زائد کپڑے ہوں جیسا کہ سردیوں کے موسم میں پوستین وغیرہ پہن لیتے ہیں، جیسے صدری، وغیرہ پہن لیتے ہیں یا کوئی اور بھاری کپڑا پہن لیتے ہیں، ایسا کپڑا اگر کوئی پہنا ہوا ہو تو اس کو اتار دیا جائے گا، اسی طرح اگر اوپر چادر دینے کی ضرورت ہو تو وہ بھی دے دی جائے گی، لیکن معروف طریقے سے جیسا کہ کفن کے تین کپڑے ہوتے ہیں وہ کفن شہید کو نہیں دیا جاتا، اب اس کے وجود کو ڈھانکنے کے لئے اوپر ایک چادر ڈال دیں گے، شہید کے اپنے کپڑے اس کا کفن ہیں، حالانکہ میت کو سلے ہوئے کپڑے تو نہیں پہنائے جاتے، لیکن شہید کے لئے اس کے سلے ہوئے کپڑے اس کا کفن ہیں۔

حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ:

"....وَاَنْ یُّدْفَنُوْا بِدَمَائِهِمْ وَثِیَابِهِمْ."

(مشکوٰۃ ص:۱۴۴)

ترجمہ:......"ان کو ان کے زخموں سمیت اور ان کے کپڑوں سمیت دفن کیا جائے۔"

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَا یُکْلَمُ اَحَدٌ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ وَاللهُ اَعْلَمُ بِمَنْ یُّکْلَمُ فِیْ سَبِیْلِهٖ اِلَّا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَجُرْحُهٗ یَثْعَبُ دَمًا، اَللَّوْنُ لَوْنُ دَمٍ وَالرِّیْحُ رِیْحُ الْمِسْکِ." (مشکوٰۃ ص:۳۳۰)

ترجمہ:......"جو شخص اللہ کے راستے میں شہید ہوا، وہ قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے بدن سے جہاں زخم آیا تھا، خون کا فوارہ پھوٹ رہا ہوگا، رنگ تو خون کا ہوگا لیکن خوشبو کستوری کی ہوگی۔"

شہید کی نماز جنازہ پڑھی جائے:

لیکن شہید کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، امام شافعیؒ تو فرماتے ہیں کہ اس کا جنازہ بھی نہیں ہے، ویسے ہی دفن کردو، تمہاری شفاعت کی اب اس کو ضرورت نہیں رہی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: "اَلسَّیْفُ مَحَّاءٌ لِلْخَطَایَا." (کنز العمال حدیث:۳۹۶۸۸) یعنی تلوار گناہوں کو مٹانے والی ہے۔

کافر کی تلوار نے ہی اس کی شفاعت کردی اور وہ بخشا گیا۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

ترجمہ:...... "شہید کے خون کا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرمادیتے ہیں۔"

قبر میں اس سے حساب و کتاب نہیں ہوتا، جیسا عام مردوں سے سوال و جواب ہوتا ہے اس سے نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ شہید کا جنازہ ہے (اس پر طویل گفتگو ہے، اس علمی بحث کو یہاں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں)۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ شہید کا یہ حکم ہے، شہید کی موت اتنی قیمتی ہے کہ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشرف موت فرمارہے ہیں۔

شہادت کی موت کا درجہ!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی تھی، اور شہدأ آپ کے جوتوں کی خاک ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیأ کے سردار ہیں، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ." (مشکوٰۃ ص:۳۲۹)

ترجمہ:..... ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں قتل ہوجاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل ہوجاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل ہوجاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں (یہ سلسلہ چلتا ہی رہے)۔''

ذرا اندازہ فرمالیں! جس موت کی تمنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں، وہ موت کتنی اشرف اور کتنی قیمتی ہوگی؟ صحیح احادیث میں حضراتِ شہدأ کے بہت فضائل وارد ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو شہادت کی موت نصیب فرمائے، آمین!

شہید جنت الفردوس میں:

ایک روایت میں ہے کہ:

''عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ اُمَّ الرُّبَیِّعِ بِنْتَ الْبَرَاءِ وَهِیَ اُمُّ حَارِثَةَ بْنِ سُرَاقَةَ اَتَتِ النَّبِیَّ صَلَّى اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ: یَا رَسُوْلَ اللهِ! اَلَا تُحَدِّثُنِیْ عَنْ حَارِثَةَ وَکَانَ قُتِلَ یَوْمَ بَدْرٍ اَصَابَهٗ سَهْمٌ غَرْبٌ، فَاِنْ کَانَ فِی الْجَنَّةِ صَبَرْتُ وَاِنْ کَانَ غَیْرَ ذَالِکَ اجْتَهَدْتُ عَلَیْهِ فِی الْبُکَاءِ؟ فَقَالَ: یَا اُمَّ حَارِثَةَ! اِنَّهَا جِنَانٌ فِی الْجَنَّةِ وَاِنَّ ابْنَکِ اَصَابَ الْفِرْدَوْسَ الْاَعْلٰى.'' (مشکوٰۃ ص:۳۳۱)

ترجمہ:..... ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حارثہ بن سراقہ کی ماں ام ربیعہ بنت برأً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ! میرا لڑکا سراقہ آپ کے ساتھ غزوۂ بدر میں شہید ہوگیا ہے، اگر تو اس کی بخشش ہوگئی ہے اور وہ جنت میں ہے تو میں صبر کروں، ورنہ

میں اس پر رنج و غم اور صدمہ کا اظہار کروں اور اپنا حق ادا کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حارثہ کی ماں! جنت ایک نہیں بہت ساری جنتیں ہیں، (اوپر نیچے سو جنتیں ہیں اور ہر جنت سے دوسری جنت کا فاصلہ اتنا ہے جتنا آسمان و زمین کا فاصلہ، سو جنتیں اوپر نیچے اتنی ہیں، اور سب سے اوپر جو جنت ہے وہ جنت الفردوس ہے) اور تیرا بیٹا سب سے اوپر کی جنت جنت الفردوس میں ہے۔"

شہید زندہ ہیں:

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ." (البقرۃ:۱۵۴)

ترجمہ:......"اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہوجاتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر اس کی زندگی کا تم شعور نہیں رکھتے (اس کی زندگی تمہارے حواس سے بالاتر چیز ہے)۔"

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ." (آل عمران:۱۶۹)

ترجمہ:......"بلکہ وہ زندہ ہیں اور ان کے رب کے پاس ان کو رزق دیا جاتا ہے۔"

صحیح بخاری کے حوالہ سے مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ:

"..... فَقَالَ اَرْوَاحُهُمْ فِيْ اَجْوَافِ طَيْرٍ خُضْرٍ لَهَا قَنَادِيْلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ

..... الخ." (مشکوٰۃ ص:۳۳۰)

ترجمہ:...... "اللہ تعالیٰ کے عرشِ اعظم کے ساتھ قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں، اور وہ شہداً کا مستقر ہیں، وہ شہداً کے رہنے کی جگہ ہے، اور سبز پرندوں کی شکل میں اللہ تعالیٰ ان کو سواریاں عطا فرماتے ہیں اور ان کی روحیں ان سبز پرندوں میں جنت کے اندر پرواز کرتی ہیں اور جہاں چاہتی ہیں کھاتی پیتی ہیں۔"

یہ قیامت سے پہلے کا قصہ ہے، قیامت کے دن ان کے ساتھ جو معاملہ ہوگا وہ تو سبحان اللہ! کیا بات ہے!

نذرانہ حیات:

لوگ بارگاہِ عالی میں مختلف نذرانے پیش کیا کرتے ہیں، شہید اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کے اس نذرانہ کو قبول فرمالیتے ہیں۔

مرنا تو سب کو ہے:

باقی مرنے کو تو بالآخر سب ہی مریں گے، جئے گا کون؟ کوئی مرنا چاہے اس کو بھی موت آئے گی، اور کوئی مرنا نہ چاہے تب بھی اس کو موت آئے گی۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا کہ:

"قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْمَيِّتُ تَحْضُرُهُ الْمَلَائِكَةُ فَإِذَا كَانَ الرَّجُلُ صَالِحًا قَالُوْا: اُخْرُجِيْ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الطَّيِّبِ اُخْرُجِيْ حَمِيْدَةً وَاَبْشِرِيْ بِرَوْحٍ وَرَيْحَانٍ وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانٍ فَلَا تَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى تَخْرُجَ .....

فَإِذَا كَانَ الرَّجُلُ السُّوْءُ قَالَ اُخْرُجِيْ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيْثَةُ كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الْخَبِيْثِ اُخْرُجِيْ ذَمِيْمَةً وَابْشِرِيْ بِحَمِيْمٍ وَغَسَّاقٍ وَآخَرَ مِنْ شَكْلِهٖ اَزْوَاجٌ، فَمَا تَزَالُ يُقَالُ لَهَا حَتّٰى تَخْرُجَ ....الخ.'' (مشکوٰۃ ص:۱۴۱)

ترجمہ:......''نیک آدمی کے پاس جب ملک الموت آتا ہے تو فرشتہ اس کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ اے پاک روح! پاک جسم میں رہنے والی، اپنے رب کی مغفرت اور رحمت و رضوان کی طرف نکل، جو تجھ پر غضبناک نہیں، (جب وہ آدمی اپنے رب کا نام سنتا ہے تو اس وقت اس کی روح کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا اتنا اشتیاق ہوجاتا ہے کہ وہ روح بے چین ہوجاتی ہے جیسا کہ پنجرہ میں پرندہ، پنجرہ توڑ کر نکلنے کے لئے مشتاق ہوتا ہے، اس مؤمن آدمی کی روح اتنی بے چین ہوجاتی ہے، اتنے میں ملک الموت اس کی روح قبض کرلیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اتنی سہولت کے ساتھ اور آسانی کے ساتھ روح نکل جاتی ہے جیسے مشکیزہ کے منہ سے قطرہ ٹپک جاتا ہے) اور دوسرے قسم کے آدمی کے پاس ملک الموت آتا ہے، تو کہتا ہے کہ اے گندی روح! جو گندے جسم میں تھی، نکل اپنے رب کے غضب کی طرف اور اس کے عذاب کی طرف (نعوذ باللہ! اللہ کی پناہ!)۔''

روح تو پہلے ہی بدن میں سرایت کی ہوتی ہے، لیکن وہ بالوں تک میں سرایت کرجاتی ہے تاکہ وہ نہ نکلے اور وہ فرشتہ پھر اس کو کھینچتا ہے۔ اور فرمایا کہ بالکل ایسی مثال ہوجاتی ہے کہ دُھنی ہوئی روئی کے اندر گرم یا بھیگی ہوئی سلائی ماری جائے

اور پھر اس کو کھینچا جائے، بدن اور روح کا رشتہ چھڑانے کے لئے اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ کوئی اس دنیا سے جانا چاہے، روح اس کی بھی نکلتی ہے اور جو نہ جانا چاہے روح اس کی بھی نکلتی ہے۔ لیکن شہید اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بارگاہِ الٰہی میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کی قدر افزائی فرماتے ہیں، اس کو قبول فرماتے ہیں، اس لئے فرمایا کہ: شہید کی موت اشرف موت ہے۔

یہاں پر یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ شہید تین قسم کے ہوتے ہیں:

دنیا و آخرت کے اعتبار سے شہید:

۱:......ایک تو وہ جو دنیا و آخرت دونوں کے اعتبار سے شہید ہیں۔

آخرت کے اعتبار سے شہید:

۲:......اور ایک وہ جو دنیاوی اعتبار سے شہید نہیں، لیکن آخرت میں اس کا نام بھی شہیدوں کی فہرست میں لکھا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ:

"قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا تَعُدُّوْنَ الشَّهِيْدَ فِيْكُمْ؟ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! مَنْ قُتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ. قَالَ: اِنَّ شُهَدَاءَ اُمَّتِيْ اِذًا لَقَلِيْلٌ. مَنْ قُتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ مَّاتَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ مَّاتَ فِي الطَّاعُوْنِ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ مَّاتَ فِي الْبَطْنِ فَهُوَ شَهِيْدٌ." (مشکوٰۃ ص:۳۳۱)

ترجمہ:......"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تم شہید کس کو سمجھتے ہو؟ (جو جواب دیا جاسکتا تھا وہی دیا

گیا کہ) یا رسول اللہ! جو اللہ کے راستے میں قتل ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: پھر تو میری امت کے شہید بہت تھوڑے رہ جائیں گے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جو اللہ کے راستے میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے، اور جو اللہ کے راستہ میں مرجائے وہ بھی شہید ہے، اور جو طاعون کی بیماری سے مرجائے وہ بھی شہید ہے، اور جو پیٹ کی بیماری سے مرے وہ بھی شہید ہے۔"

اسی طرح کوئی دریا میں ڈوب کر مرگیا وہ بھی شہید، کسی پر دیوار گرگئی یا کسی حادثہ میں مرگیا وہ بھی شہید ہے، عورت زچگی کی حالت میں مرگئی وہ بھی شہید ہے، بچہ جنتے ہوئے مرگئی وہ بھی شہید۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شہیدوں کی بہت سی قسمیں بیان فرمائی ہیں جن کو معنوی شہید کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ دنیا کے احکام کے اعتبار سے شہید نہیں ہوتے، ان کو غسل دیا جائے گا، ان کو کفن پہنایا جائے گا، ان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، یہ لوگ دنیا کے اعتبار سے شہید نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی فہرست میں ان کا نام بھی شہیدوں میں لکھا جائے گا۔

دنیا والوں کے اعتبار سے شہید:

۳:......تیسری قسم شہیدوں کی وہ ہے جن کو ہم اور آپ شہید کہتے ہیں، مگر اللہ کی فہرست میں ان کا نام شہیدوں میں نہیں ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک! وجہ یہ تھی کہ اندر ایمان صحیح نہیں تھا، جان کا نذرانہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے پیش نہیں کیا گیا، بلکہ قومی عصبیت کی بنا پر قتل کیا گیا، یا اپنی جواں مردی اور شجاعت کے جوہر دکھلانے کے لئے مرا، بہادر کہلوانے کے لئے مرا، بھائی! ان کے دلوں کو تو ہم نہیں جانتے کہ کس کی

نیت کیا ہے؟ ہم تو اس کے ساتھ معاملہ شہیدوں کا ہی کریں گے، مگر اللہ تعالیٰ دلوں کی کیفیت کو خوب جانتے ہیں، وہ صرف ظاہری عمل کو نہیں دیکھتے، یہ لوگ جو ریاکاری کے لئے یا دکھلاوے کے لئے یا کسی اور غرض اور مقصد کے لئے قتل ہوئے، چاہے میدانِ جہاد میں ہی قتل کیوں نہ ہوئے ہوں، یہ لوگ اللہ کی فہرست میں شہید نہیں ہیں، دنیاوی اور اپنے علم کے اعتبار سے ہم لوگ ان کو شہید ہی کہیں گے، باقی راہِ حق میں شہادت کی تمنا ہر مؤمن کو رکھنی چاہئے، اللہ تعالیٰ شہادت کی موت نصیب فرمائے اور اللہ تعالیٰ شہیدوں میں اٹھائے، آمین!

شہادت کی موت کی دعا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دعا فرماتے: یا اللہ! شہادت کی موت نصیب فرما اور اپنے رسولؐ کے شہر میں موت نصیب فرما۔ پھر فرماتے کہ عمر دو باتیں اکٹھی کیسے ہوں گی؟ شہادت کی موت بھی مانگتے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں بھی مانگتے ہو، جہاد تو باہر ہوتا ہے، مدینہ میں بیٹھ کر کیسے شہادت مل جائے گی؟ خود ہی سوال کرتے تھے اور خود ہی فرماتے تھے کہ: اگر اللہ چاہے تو دونوں کو جمع کر سکتے ہیں۔ اور واقعی اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جمع کر کے دکھلا دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔

حصولِ شہادت کا وظیفہ:

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص روزانہ پچیس مرتبہ یہ پڑھا کرے:

"اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لِیْ فِی الْمَوْتِ وَفِیْ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ." (الاتحاف ج:۱۰ ص:۲۲۷)

ترجمہ:......"یا اللہ! برکت فرما میرے لئے موت میں

اور موت کے بعد کی زندگی میں۔“

اللہ پاک اس کو شہادت کی موت نصیب فرمائیں گے، اور اللہ تعالیٰ اس کا نام شہیدوں کی فہرست میں درج فرمادیں گے، خواہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ آئے، یہ تو کچھ مشکل نہیں بشرطیکہ تمنا کرو، مانگو، اور اگر تمنا ہی نہ ہو تو پھر کیسے ہوگا؟

مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے کہ:

”مَنْ مَّاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ، مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِّنْ نِفَاقٍ.“ (مشکوٰۃ ص:۳۳۱)

ترجمہ:......”جس نے جہاد میں حصہ نہیں لیا اور کبھی اس کے دل میں خیال بھی پیدا نہ ہوا تو وہ آدمی نفاق کی موت مرا۔“

جہاد کی تمنا کرو:

جہاد کی تمنا تو کرو ناں! فی سبیل اللہ کی تمنا کرو اور اللہ سے مانگو، کیا بعید ہے کہ اللہ پاک اپنی رحمت سے ہم گناہگاروں کو بھی شہادت کی موت نصیب فرمادیں۔

حج نہ کرنے کی وعید:

اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں ہے، فرمایا کہ:

”مَنْ لَّمْ یَمْنَعْهُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ اَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ اَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ، فَمَاتَ وَلَمْ یَحُجَّ فَلْیَمُتْ اِنْ شَاءَ یَهُوْدِیًّا وَاِنْ شَاءَ نَصْرَانِیًّا.“ (مشکوٰۃ ص:۲۲۲)

ترجمہ:......”جو شخص اس حال میں مرا کہ حج سے کوئی چیز اس کے لئے مانع نہیں تھی، نہ بیمار تھا اور نہ کسی ظالم بادشاہ نے اسے روکا تھا، پھر بھی بغیر حج کئے مرگیا تو وہ چاہے یہودی

ہوکر مرے یا نصرانی ہوکر مرے (اللہ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں)۔"

حج کی تمنا بھی نہ ہوئی اور جو شخص مرگیا باوجود قدرت کے حج نہ کیا، مال تھا امریکہ اور فرانس کی سیریں ہوتی تھیں اور دوسری لغویات میں پیسہ ضائع ہوتا تھا، لیکن حج نہیں کیا اور حج کرنے کا کیا معنی؟ اس کو تو تمنا بھی، تڑپ بھی پیدا نہیں ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس کو اختیار ہے کہ چاہے یہودی ہوکر مرے یا نصرانی ہوکر مرے۔ نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ!

نیک کام کی تمنا تو کرو:

بھائی! نیک کام کرو، اگر کر نہیں سکتے تو نیک کام کی تمنا تو کرو، یہ کیا بات ہوئی کہ کام بھی نہ کرو اور کام کی تمنا بھی نہ رکھو، نیک کام کرو، نہیں کرسکتے تو کم از کم اس کی آرزو تو کرو، اللہ سے دعا تو کرو، دعا تو کرسکتے ہو کہ یا اللہ! مجھے بھی عطا فرما، مجھے بھی نصیب فرما۔

برے کام سے بچو، نہیں تو برا سمجھو:

برے کام سے بچو اور اگر بچ نہیں سکتے تو برے کام کو برا تو سمجھو اور اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگو کہ یا اللہ! مبتلا ہوں معاف کردے، اتنا تو کم از کم کرو، دیکھو کتنا سستا نسخہ میں نے بتلا دیا۔

بدترین اندھاپن:

اس کے بعد ارشاد ہے کہ: "وَاَعْمَى الْعَمٰى اَلضَّلَالَةُ بَعْدَ الْهُدٰى." یعنی سب سے بدتر اندھاپن یہ ہے کہ آدمی ہدایت کے بعد گمراہ ہوجائے۔

آدمی کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری آنکھیں دی ہیں اور ان آنکھوں سے نظر آتا ہے، اگر خدانخواستہ ان آنکھوں کی بینائی جاتی رہے تو اس کو ہم کہتے ہیں اندھاپن، بینائی جاتی رہی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دل میں بھی آنکھیں دی ہوئی ہیں، یہ تمہاری

ظاہری آنکھیں سیاہ و سفید کو دیکھتی ہیں، اور دل کی آنکھیں اللہ تعالیٰ نے صحیح اور غلط کو دیکھنے کے لئے دی ہیں، ظاہری آنکھوں کو اور ان کی بینائی کو عربی زبان میں ''بصارت'' کہا جاتا ہے اور دل کی آنکھوں کو اور اس کی بینائی کو عربی زبان میں ''بصیرت'' کہا جاتا ہے۔ اور اسی قوتِ بصیرت سے آدمی حق اور باطل کو پہچانتا ہے اور اسی بصیرت سے انبیاءؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شناخت ہوتی ہے، اسی بصیرت کی بنا پر اللہ تعالیٰ ایمان کی توفیق عطا فرماتے ہیں اور اسی بصیرت کی بنا پہ اس معرکہ کون و فساد میں حق اور باطل کی پہچان ہوتی ہے۔

بصیرت کی آنکھیں کھولو:

بہت سے لوگ مجھے خط لکھ کر پوچھتے ہیں کہ: اتنے فرقے ہیں، کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے، تمہیں تو یہ فرقے نظر آتے ہوں گے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جتنے آدمی ہیں، اتنے ہی فرقے ہیں، مجھ سے پوچھو تو میرا اپنا فرقہ ہے، تمہارا اپنا فرقہ ہے، ہر ایک کے نظریات اپنے اپنے ہیں، لوگ پوچھتے ہیں کہ اتنے فرقے ہیں اب ہم کس کو صحیح سمجھیں اور کس کو غلط سمجھیں؟ لیکن کبھی آپ نے خط لکھ کر مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میری آنکھیں موجود ہیں، دنیا میں بہت سے رنگ ہیں، اب ہم کس کو سفید سمجھیں اور کس کو سیاہ سمجھیں؟ کس کو پیلا سمجھیں اور کس کو سرخ سمجھیں؟ کبھی آپ نے نہیں پوچھا اس دیوار کا رنگ سفید ہے یا سیاہ ہے؟ آنکھیں کھولو! اگر پھوٹی ہوئی نہیں ہیں تو نظر آجائے گا۔

دل کی آنکھوں سے حق و باطل نظر آئے گا:

میں کہتا ہوں اور دعویٰ سے کہتا ہوں اگر اللہ تعالیٰ نے بصیرت ماؤف نہیں کردی، دل کی آنکھیں پھوٹ نہیں گئیں، تو جاؤ جا کر ہر ایک کے پاس بیٹھو، تمہیں حق و باطل خود نظر آجائے گا۔ ہر ایک فرقہ کے جو مقتداٗ ہیں، جو ان کے اصول ہیں، ان کو

دیکھو، پرکھو، جانچو، تمہیں خود نظر آجائے گا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی، سیاہ کا سیاہ اور سفید کا سفید۔ تمہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی، لیکن اب اگر کوئی شخص اس بصیرت کو استعمال ہی نہ کرے تو پھر اس کا کیا علاج کرو گے؟

عاقل بالغ کافر معذور نہیں:

بہت سے لوگ یہ سوال پوچھا کرتے ہیں اور یہ بہت سے لوگوں کے ذہن کا کانٹا بنا ہوا ہے کہ جو لوگ یہودیوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں، نصرانیوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں، مجوسیوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں، تو جیسا ماں باپ کا طریقہ تھا ویسا انہوں نے اختیار کرلیا، اب ان کا کیا قصور؟ جہاں تک نابالغوں کا تعلق ہے کہ ان کو عقل نہیں تھی، میں بھی مانتا ہوں کہ ان کا کوئی قصور نہیں، میں مانتا ہوں کہ نابالغ تھے، نابالغی کی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا، ماں باپ کے طریقہ پر عمل کرتے تھے ان کا کوئی قصور نہیں، اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے محاسبہ نہیں فرمائیں گے۔

لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے عقل عطا فرمادی، عاقل، بالغ ہوگئے، وہ دنیا کے سارے کاموں کو سمجھتے ہیں، اس بات کو نہیں سمجھتے ہیں کہ ہمارا خالق کون ہے؟ مالک کون ہے؟ انہوں نے کیوں اپنی بصیرت کو استعمال نہیں کیا اور کیوں دل کا اندھا پن قبول کیا؟ باپ دادے کی تقلید کی بھی ایک حد ہے، آدمی ہر چیز میں باپ دادا کی تقلید نہیں کرتا، بلکہ کچھ چیزیں خود سوچتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ ہدایت کا راستہ کھول دیا ہے، اور خود انسان کے دل کے اندر بھی شمع روشن کردی ہے جس کو ''بصیرت'' کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے: ''فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا.'' (الشمس:۸) ''اللہ تعالیٰ نے بندے کے دل میں بدکاری کو بھی اور تقویٰ کو بھی الہام کردیا'' انہوں نے اپنی بصیرت کو کیوں استعمال نہیں کیا؟ اب اگر کوئی آدمی آنکھیں بند کرلیتا ہے یا خود اپنی آنکھیں پھوڑ لیتا ہے، تو وہ خود قصوروار اور مجرم ہے۔ اسی طرح

اگر دل کی بصیرت، دل کی آنکھیں کوئی شخص استعمال نہیں کرتا، اندھاپن اختیار کرتا ہے تو وہ بھی مجرم ہے، اور اس کو کہتے ہیں اندھاپن۔ قرآن کریم میں ہے:

"فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ." (الحج:۴۶)

ترجمہ:...... "کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔"

یہ دل کے اندھے ہیں، کچھ لوگ آنکھوں کے اندھے ہوتے ہیں، یہ تو ہوا اندھاپن، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اَعْمَى الْعَمٰى اَلضَّلَالَةُ بَعْدَ الْهُدٰى." یعنی سب سے بدتر اندھاپن یہ ہے کہ ہدایت کے بعد آدمی گمراہ ہو۔

ہدایت کے بعد گمراہی کی قسمیں:

ہدایت کے بعد گمراہ ہو، اس کی دو صورتیں ہیں:

۱:...... پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمان ہوگیا تھا پھر مرتد ہوگیا، (نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! اللہ اپنی پناہ میں رکھے!) مسلمان تھا پھر مرزائی بن گیا، عیسائی بن گیا، نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! استغفر اللہ! تو یہ تو سب سے بدتر اندھاپن ہے کہ آنکھیں ہونے کے باوجود اس نے خود پھوڑ دیں۔

۲:...... اور دوسری شکل یہ ہے کہ ہدایت اس کے سامنے بالکل کھل گئی تھی، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا: "قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ." یعنی ہدایت اور گمراہی دونوں بالکل الگ الگ واضح ہوچکیں، قرآن کریم کے بیانات سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے حق اور باطل، ہدایت اور گمراہی، اس طرح بالکل کھل گئے ہیں، واقعتاً اس طرح کھل گئے ہیں جس طرح کہ دن کی دوپہر میں سیاہی اور سفیدی کھل جاتی ہے۔ ہدایت کا دن چڑھ گیا اور اللہ تعالیٰ نے ہدایت بالکل کھول دی،

ہر شخص جو دیکھنا چاہے دیکھ سکتا ہے، اب اگر اندھیرا ہوتا اور نظر نہ آتا تو پھر آدمی کسی حد تک معذور تھا۔ اندھیرے میں اس طرح ٹٹولتے ہوئے لاٹھی کی جگہ سانپ ہاتھ میں آ گیا تو معذور ہے، اس لئے کہ بے چارے کی بینائی ہی نہیں، لیکن دن چڑھا ہوا ہے، آنکھیں روشن ہیں، پھر لاٹھی کی جگہ سانپ پر ہاتھ ڈالتا ہے تو یہ معذور نہیں ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آفتابِ نبوت طلوع ہو جانے کے بعد اور قرآن کریم کی ہدایت کے آشکارا ہو جانے کے بعد بھی جو شخص اندھا رہتا ہے تو پھر اس سے بدتر کوئی گمراہ نہیں، قرآن کریم میں فرمایا کہ: "فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ." یعنی اب اس قرآن کریم کے بعد پھر کس کلام پاک پر ایمان لائیں گے؟ آخر ان کے ایمان لانے کے لئے کیا تدبیر اختیار کی جائے وہ تو بتاؤ! قرآن جیسی کتابِ ہدایت، ان کی ہدایت کے لئے کافی نہیں، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا رسول اور ہادی ان کو راستہ نہیں دکھا سکتا، تو اب بتاؤ کہ ان کو راستہ دکھلانے کے لئے اور ان کو ہدایت دینے کے لئے کس کو بھیجیں؟ یہ ہے اعمی العمیٰ سب سے بدتر نابیناپن اور سب سے زیادہ اندھاپن، اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

اندھے پن کی دوصورتیں:

اللہ تعالیٰ دل کے اندھے پن سے محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ بصیرت عطا فرمائے، اس لئے فرماتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ."

ترجمہ:......"یا اللہ! ہم کو حق کا حق ہونا دکھلا دیجئے اور واضح کر دیجئے (کہ یہ حق ہے) اور ہمیں اس کی پیروی کی بھی توفیق عطا فرمائیے، اور ہمارے سامنے باطل کا باطل ہونا آنکھوں

سے دکھلا دیجئے اور ہمیں اس سے بچنے کی بھی توفیق عطا فرمائیے۔‘‘

یہ دو درجے ہوا کرتے ہیں، ایک یہ کہ آدمی حق و باطل کے درمیان امتیاز نہ کرسکے، یہ بھی اندھاپن ہے، اور دوسرا یہ کہ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرتا ہے لیکن اپنی نفسانی خواہش کی بنا پر حق کو قبول نہیں کرتا، باطل کی پیروی کرتا ہے، یہ بھی اندھاپن ہے، اس سے بھی اللہ کی پناہ!

یہودیوں کے بارے میں قرآن کریم میں ہے کہ:

’’اَلَّذِیْنَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآئَهُمْ.‘‘

(البقرہ:)

ترجمہ:......’’یہ لوگ اس نبی کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹے کو پہچانتے ہیں۔‘‘

کبھی کسی کو اپنے بیٹے کے پہچاننے میں بھی اشتباہ ہوا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے؟ اندھیرا ہو یا دور سے نظر آئے تو کچھ اشتباہ ہوسکتا ہے کہ حد نظر وہاں تک نہیں پہنچتی، یعنی جس طرح اپنے بیٹے کو پہچاننے میں ان کو کوئی اشتباہ نہیں ہوا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت میں بھی ان کو کوئی اشکال نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود صرف دنیاوی مفادات اور دنیاوی خواہشات کی بنا پر نہیں مانا، اس سے اللہ کی پناہ!

آدمی حق کو حق سمجھ کر بھی نہ مانے اور باطل کو باطل سمجھ کر بھی نہ چھوڑے، اس سے اللہ کی پناہ!

دو روشنیوں کی ضرورت ہے:

اب یہاں پر مختصراً ایک بات اور عرض کردوں، اللہ تعالیٰ نے دو روشنیاں عطا فرمائی ہیں، ایک آدمی کے اندر کی روشنی اور ایک باہر کی روشنی۔ یہ دونوں روشنیاں ملتی ہیں تو نظر آتا ہے۔ اگر دونوں میں سے ایک نہ ہو تو نظر نہیں آتا، آنکھوں کی روشنی بھی

ہو، جو اندر کی روشنی ہے اور باہر کی روشنی بھی ہو، سورج نہ ہو تو چاند کی روشنی ہے، لائٹوں کی روشنی ہے، موم بتی کی روشنی ہے، چراغ کی روشنی ہے، جیسی روشنی ہو یہ دونوں روشنیاں ملتی ہیں، یعنی اندر کی روشنی اور باہر کی روشنی تو راستہ نظر آتا ہے اور چیزیں نظر آتی ہیں، ان میں سے ایک ہو اور ایک نہ ہو تو دکھائی نہیں دیتا۔

ٹھیک اسی طرح ایک آدمی کے دل کی روشنی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کی روشنی ہے، یہ دونوں ملیں گی تو راستہ نظر آئے گا، تمہاری اپنی عقل و بصیرت سے راستہ کبھی بھی نظر نہیں آئے گا، جب تک اس روشنی کو، آفتابِ نبوت کی روشنی کے سامنے نہیں رکھو گے اور آفتابِ نبوت کی روشنی بھی راہ دکھلانے کے لئے کافی نہیں ہوگی، جب تک کہ تمہارے دل کی آنکھیں کھلی ہوئی نہ ہوں۔

سبحانک اللھم وبحمدک اشھد ان لا الہ الا انت!

دنیا و آخرت کا تقابل

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"عَنْ عَلِيّ اَنَّهُ خَطَبَ النَّاسَ فَحَمِدَ اللهَ وَاَثْنٰی عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: اَمَّا بَعْدُ! فَاِنَّ الدُّنْيَا قَدْ اَدْبَرَتْ وَاٰذَنَتْ بِوَدَاعٍ فَاِنَّ الْاٰخِرَةَ قَدْ اَقْبَلَتْ وَاَشْرَفَتْ بِاطِّلَاعٍ وَاِنَّ الْمِضْمَارَ الْيَوْمَ وَغَدًا السِّبَاقُ اَلَا وَاِنَّكُمْ فِيْ اَيَّامِ اَمَلٍ مِنْ وَرَائِهٖ اَجَلٌ، فَمَنْ قَصَرَ فِيْ اَيَّامِ اَمَلِهٖ قَبْلَ حُضُوْرِ اَجَلِهٖ فَقَدْ خَيَّبَ عَمَلَهٗ، اَلَا فَاعْمَلُوْا لِلّٰهِ فِي الرَّغْبَةِ كَمَا تَعْمَلُوْنَ لَهٗ فِي الرَّهْبَةِ، اَلَا وَاِنِّيْ لَمْ اَرَ كَالْجَنَّةِ نَائِمٌ طَالِبُهَا وَلَمْ اَرَ كَالنَّارِ نَائِمٌ هَارِبُهَا اَلَا وَاِنَّهٗ مَنْ لَّمْ يَنْفَعْهُ الْحَقُّ ضَرَّهُ الْبَاطِلُ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَقِمْ بِهِ الْهُدٰى جَارٌّ بِهِ الضَّلَالُ، اَلَا وَاِنَّكُمْ قَدْ اُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ وَدُلِلْتُمْ عَلَى الزَّادِ، اَلَا يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا الدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ يَاْكُلُ مِنْهَا الْبِرُّ وَالْفَاجِرُ وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ وَعْدٌ صَادِقٌ يَحْكُمُ مَلِكٌ قَادِرٌ، اَلَا اِنَّ

(الشَّيْطَانَ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَّاللهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ) اَيُّهَا النَّاسُ اَحْسِنُوْا فِيْ عُمُرِكُمْ تَحْفَظُوْا فِيْ عَقِبِكُمْ فَاِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَعَدَ جَنَّتَهٗ مَنْ اَطَاعَهٗ وَوَعَدَ نَارَهٗ مَنْ عَصَاهُ، اِنَّهَا نَارٌ لَا يَهْدَأُ زَفِيْرُهَا وَلَا يُفَكُّ اَسِيْرُهَا وَلَا يُجْبَرُ كَسِيْرُهَا، حَرُّهَا شَدِيْدٌ وَقَعْرُهَا بَعِيْدٌ وَمَاءُهَا صَدِيْدٌ وَاِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمْ اِتِّبَاعُ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ."

(کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۲۲۵)

ترجمہ:...... ''حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ دنیا آرہی ہے اور جارہی ہے، اور قریب ہے کہ وہ بالکل رخصت ہوجائے، آخرت آرہی ہے اور قریب ہے کہ وہ اپنا جلوہ دکھائے، آج دوڑ ہے، کل کو آگے نکلنا ہوگا، سنو! تم آرزوؤں کے دنوں میں جی رہے ہو، جن کے پیچھے اجل ہے، پس جو شخص کہ اپنی امید کے دن میں کوتاہ کار رہا ہے، اپنی موت کے آنے سے پہلے وہ نامراد گیا، سنو! اللہ کے لئے عمل کرو، رغبت میں بھی جیسا کہ تم اس کے لئے عمل کرتے ہو ڈر کی حالت میں، سنو! میں نے نہیں دیکھی جنت جیسی چیز، جس کے طلب کرنے والے سو رہے ہوں، اور میں نے نہیں دیکھی دوزخ جیسی کوئی چیز جس سے بھاگنے والے سو رہے ہوں، سنو! جس کو حق نفع نہ دے اس کو باطل نقصان دیا کرتا ہے، اور جس کو ہدایت سیدھا نہ کرسکے، گمراہی اس میں اپنا کام کرتی ہے، سنو! تمہیں کوچ کا حکم دیا گیا ہے، اور توشے کی راہ نمائی کردی گئی

ہے، سنو! لوگو دنیا ایک سامان ہے، جو موجود ہے، اس سے نیک بھی کھاتے ہیں اور بد بھی، آخرت ایک سچا وعدہ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ جو بادشاہ ہیں، قدرت والے ہیں، فیصلہ کریں گے، سنو! شیطان تم کو ڈراتا ہے فقر سے اور تم کو حکم دیتا ہے بے حیائی کا، اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی جانب سے مغفرت اور فضل کا، اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں، بڑے علم والے ہیں۔ لوگو! اپنی عمر میں نیک عمل کرلو، اپنی عاقبت محفوظ رکھو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کا وعدہ کیا ہے، ان لوگوں سے جو اس کے فرماں بردار ہوں اور دوزخ سے ڈرایا ہے ان لوگوں کو جو اس کی نافرمانی کریں، خوب یاد رکھو کہ وہ ایسی آگ ہے جس کا جلانا کبھی بند نہیں ہوتا، جس کے قیدی کو کبھی رہائی نہیں ملتی، جس کے ٹوٹے ہوئے کو جوڑا نہیں جاتا، وہاں کی گرمی شدید ہے اور اس کی گہرائی بہت لمبی ہے، اور اس کا پانی پیپ کا ہے، دیکھو سب سے زیادہ خطرناک چیز جس کا مجھے تمہارے بارے میں اندیشہ ہے، وہ خواہش نفس کی پیروی کرنا اور لمبی لمبی امیدیں رکھنا ہے۔"

دنیا جارہی ہے:

یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا خطبہ ہے، اس کے اکثر الفاظ احادیث شریفہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہیں، جیسا کہ ترجمے سے معلوم ہوا ہوگا، اس خطبہ میں دنیا و آخرت کا تقابل فرمایا ہے، اور دنیا اور آخرت کی کیفیت کو ذکر کر کے انسانوں کے انجام کو ذکر کیا گیا ہے، دنیا اور آخرت کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا ہماری

طرف سے پیٹھ پھیر کر جارہی ہے، اور آخرت ہماری طرف منہ کر کے آرہی ہے، یہ دو گاڑیاں ہیں، یا دو ریلیں ہیں، جو چل رہی ہیں، ایک ہم سے جدا ہو رہی ہے، وہ جتنی تیز رفتار کے ساتھ چلے گی، ہم سے الگ ہوگی، اتنی ہم سے دور ہوگی، تو دنیا ہماری طرف پیٹھ پھیر کر چل رہی ہے، اور بڑی تیزی سے چل رہی ہے، اور قریب ہے کہ وہ ہم سے رخصت ہو جائے، یکسر رخصت ہو جائے۔

میں نے ایک خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں سنایا تھا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھی پھر خطبہ دینے کے لئے منبر پر تشریف لے گئے، خطبہ ارشاد فرمایا اور بہت سی چیزیں ذکر فرمائیں، قیامت میں جتنے اہم واقعات تھے، ان کو ذکر فرمایا، بہت سے مضامین کو میں ذکر کر چکا ہوں، اس کے آخر میں یہ تھا کہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ مسلسل جاری رہا، یہاں تک کہ دھوپ کھجوروں کی شاخوں پر اور دیواروں کے کنارے تک پہنچ گئی، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب دنیا کی عمر بالکل اتنی ہی باقی ہے، جتنی کہ آج کا وقت، آج کے دن کے مقابلے میں باقی ہے، سوچو کہ جب دھوپ پیلی ہوگئی ہے تو سورج کے غروب ہونے میں چند منٹ باقی ہوں گے، جس طرح کہ آج کے دن کا آفتاب غروب ہوا چاہتا ہے، اسی طرح سے اس دنیا کا سورج بھی ڈوبا چاہتا ہے۔

موت قریب آرہی ہے:

ایک ہماری میعاد ہے، ہم میں سے ہر آدمی کی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہی ہماری میعاد شروع ہوگئی، اور اجل تک جس کو موت کہتے ہیں یہ میعاد ہماری جاری رہتی ہے، جب فرشتے ہمیں پکڑ کے لے گئے تو ہم دنیا سے غائب ہوگئے، اور

دنیا ہم سے غائب ہوگئی، ایک تو دنیا کا ہم سے جانا اور آخرت کا ہماری طرف آنا، اس اعتبار سے انفرادی طور پر ہم میں سے ایک ایک آدمی جو ایک ایک منٹ گزار رہا ہے وہ اپنی موت کو قریب لا رہا ہے اور اپنی زندگی کو پیچھے چھوڑ رہا ہے۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ یہ دنیا ہی رخصت ہوجائے گی، آپ کو یاد ہوگا میں نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے دنیا کا اور اس دنیا کی زندگی کا برزخ کی زندگی کے مقابلے میں، اور برزخ کی زندگی کا حشر کی زندگی کے مقابلے میں اور حشر کے دن کا دوزخ یا جنت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں موازنہ کیا تھا اور حیثیت بیان کی تھی، تو جب دنیا رخصت ہوگئی نہ دنیا رہی، نہ دنیا کی چیزیں رہیں، نہ تم رہے، نہ ہم رہے، پوری کائنات ہی ختم ہوگئی، جس کشتی میں تم سوار ہو وہ بھی ڈوبنے والی ہے، اور تم اس سے پہلے ڈوبنے والے ہو، اسی دنیا کے لئے سب کچھ کرتے ہیں، تو دنیا جارہی ہے، رخصت ہورہی ہے، یہاں تک کہ وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ وہ تم سے رخصت ہوجائے گی اور آخرت ہماری طرف منہ کرکے بھاگی ہوئی آرہی ہے، اور عنقریب وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ جبکہ وہ اپنا جلوہ دکھائے گی۔

دنیا کی دوڑ:

پھر فرمایا کہ آج دوڑ لگ رہی ہے کل کو اس دوڑ کے نتیجے کھلیں گے کہ کون اس دوڑ میں آگے رہا؟ کون پیچھے رہا؟ اس کے نتائج کل میدان حشر میں سامنے آئیں گے۔

مال کی دوڑ:

اور یہاں دوڑ کے لئے لوگوں نے مختلف میدان منتخب کر رکھے ہیں، کسی نے مال کی دوڑ لگا رکھی ہے، وہ کہتا ہے کہ میں مال زیادہ کماتا ہوں، دوسرا کہتا ہے میں زیادہ کماتا ہوں۔

برائیوں کی دوڑ:

کسی نے برائیوں کی دوڑ لگا رکھی ہے، بقول جاہلی شاعر کے:

اَلَا لَا یَجْهَلُ اَحَدٌ عَلَیْنَا
فَنَجْعَلُ فَوْقَ جَاهِلٍ جَاهِلِیْنَا

ترجمہ:...... ''سنو! کوئی آدمی ہمارے ساتھ جہالت کے ساتھ پیش نہ آئے، ورنہ ہم جاہلوں سے کھل کر جہالت کیا کرتے ہیں۔''

تو گویا جہالت کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔

عریانی کی دوڑ:

دور جدید کی میری محترم بہنوں نے عریانی کی دوڑ لگا رکھی ہے کہ کون زیادہ ننگی ہو کر دکھاتی ہے؟ مغرب کی صاحبزادیاں، شہزادیاں تو صرف یہاں تک پہنچ گئی ہیں، آدھی رانوں تک پہنچ گئی ہیں، اور ایک انگیا پہنی ہوتی ہے، باقی نیچے سے سب کچھ کھلا ہوا ہے، مغرب ہمیں تماشے دکھا رہا ہے، نیچے ایک جانگیہ پہنا ہوا ہے، اور اوپر ایک انگیا پہنی ہوئی ہے، بس یہی کل کائنات ہے ان کے لباس کی، اور ہماری ہندی، پاکستانی اور مشرقی بہنیں اس دوڑ کو بہت پسند کر رہی ہیں، کہا یہ جا رہا ہے کہ ہم اس دوڑ میں ان سے آگے نکل جائیں، تم نہیں آگے نکلو گے، تم جتنے چاہو بے حیا بن جاؤ، مغرب جیسے بے حیا نہیں بن سکتے، مشرق مشرق ہے، مغرب مغرب ہے، تم بے حیائی کا ریکارڈ قائم نہیں کر سکتے، اس کے لئے بے ایمان ہونا شرط ہے، تمہاری مشکل یہ ہے کہ سچا یا جھوٹا، اللہ اور اس کے رسول کا نام لیتے ہو، ابھی بھارت کی ایک لڑکی نے حسینہ عالم کا انتخاب لڑا، تم نہیں لڑ سکتیں، لیکن اس دوڑ میں آگے نکلنے کی کوشش تمہاری بھی ہے۔

کھیلوں کی دوڑ:

کھیلوں کے میدان میں بھی آگے نکل رہے ہو، اور دوڑ رہے ہو اور اس پر فخر کر رہے ہو، مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوگی، اگر تم یہ بتا سکو کہ قبر میں یہ کھیلوں کی دوڑ تمہیں کیا کام دے گی؟ اور میدان حشر میں تمہارے نامہ اعمال میں اس نام کی کتنی قیمت پڑے گی؟ تو دوڑ لگ رہی ہے بھئی، ڈاکوؤں کی بھی دوڑ لگ رہی ہے، کھیلوں کی بھی دوڑ لگ رہی ہے، فتنہ و فساد کی دوڑ لگ رہی ہے، عریانی اور فحاشی کی بھی، یہ ہمارے اخبار والے بھائی، اخبار بیچنے کے لئے دوڑ لگا رہے ہیں کہ لوگوں کی دلچسپی اور جاذبیت کی کون سی چیز ہوسکتی ہے؟ پوری دنیا ایک دوڑ کا میدان ہے۔

نیکیوں کی دوڑ:

اور اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو نیکیوں کی دوڑ لگا رہے ہیں، گو نیکیوں کا رنگ پھیکا ہوتا جارہا ہے، نیکی کا ایک ظاہر ہے، ایک باطن، ایک اس کا طول وعرض ہے، ایک اس کا عمق، یعنی گہرائی، یہ الگ بات ہے، لیکن بہرحال کچھ لوگ ہیں جو اب بھی نیکیوں کا میدان جیتنے کی کوشش کر رہے ہیں، اگرچہ پہلوں کی نیکی کا رنگ ہمارے رنگ سے بہت مختلف تھا، ان کی نیکی میں گہرائی پائی جاتی تھی، جذبہ عشق پایا جاتا تھا، جذبہ محبت پایا جاتا تھا، یقین پایا جاتا تھا، ایمان کی روشنی اور اطمینان کی ٹھنڈک ان کی عبادتوں میں پائی جاتی تھی، جو ہمارے یہاں نہیں، ہمارے ہاں ایمان کی روشنی پھیکی ہوگئی ہے، غرض یہ ہے کہ آج میدان ہے دوڑ کا، پوری دنیا میں آج دوڑ لگ رہی ہے، اور سباق یعنی مسابقت کا نتیجہ کل نکلے گا، ہر آدمی اپنا جائزہ لے اور سوچے کہ میں کس میدان میں دوڑ لگا رہا ہوں؟ اور اب میں نے کون سا کھیل کھیلنے کے لئے میدان منتخب کیا ہے؟ اور قیامت کے دن بلکہ اس سے بھی پہلے برزخ میں، جس دوڑ میں، میں مشغول ہوں، یہ میرے لئے رسوائی کی چیز ہوگی، یا میری سرخروئی اور نیک نامی کا

ذریعہ بنے گی؟

آرزوؤں کا گھیرا:

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ تم جن دنوں کو کاٹ رہے ہو، چاروں طرف سے آرزوئیں اور تمنائیں تمہیں گھیرے ہوئی ہیں کہ یہ ہوجائے، یہ ہوجائے، یہ ہوجائے، کسی کو ذرا چھیڑ کر دیکھو اور پھر اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی داستان سنو، تم خاموش رہو، پھر وہ بولتا رہے گا، لیکن تمہاری تمنائیں موت سے پہلے پوری نہیں ہونے کی، جن تمناؤں اور جن آرزوؤں کو تم نے پال رکھا ہے، یہ کبھی پوری نہیں ہوسکتیں، تم نادانی بلکہ حماقت میں مبتلا ہو کہ ان تمناؤں اور آرزوؤں کو پال رہے ہو، اور اس وہم میں مبتلا ہو کہ شاید ہم اپنی آرزوئیں پوری کر کے یہاں سے جائیں گے، بھائی! کوئی آدمی اپنی آرزوئیں اس دنیا میں پوری نہیں کرسکتا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"قَالَ خَطَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا مُرَبَّعًا وَخَطَّ خَطًّا فِي الْوَسْطِ خَارِجًا مِنْهُ وَخَطَّ خِطَطًا صِغَارًا اِلٰى هٰذَا الَّذِىْ فِي الْوَسْطِ مِنْ جَانِبِهِ الَّذِىْ فِي الْوَسْطِ، فَقَالَ هٰذَا الْاِنْسَانُ وَهٰذَا اَجَلُهُ مُحِيْطٌ بِهٖ، وَهٰذَا الَّذِىْ هُوَ خَارِجٌ اَمَلُهُ، وَهٰذِهِ الْخِطَطُ الصِّغَارُ الْاَعْرَاضُ فَاِنْ اَخْطَاءَهُ هٰذَا نَهَسَهُ هٰذَا وَاِنْ اَخْطَاءَهُ هٰذَا نَهَسَهُ هٰذَا."

(مشکوۃ ص:۴۴۹)

ترجمہ:...... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چوکور دائرہ بنایا اور اس دائرہ کے درمیان ایک لمبا خط کھینچا جو اس دائرہ کے باہر تک تھا، اور کئی خط چھوٹے چھوٹے بنائے جو

درمیان میں تھے، فرمایا یہ جو دائرہ میں نے بنایا ہے نا! چوکور اور مربع، یہ تو انسان کی اجل ہے، یعنی موت، اور اس کے اندر میں نے جو نشان بنایا ہے یہ انسان کھڑا ہے، اور یہ جو میں نے دائرے سے باہر، یعنی خط سے باہر ایک نشان بنایا ہے، یہ انسان کی امل اور اس کی آرزو ہے، اس کی تمنائیں ہیں، اور درمیان میں بھی نیچے بھی ایک خط کھینچ کر آدھے آدھے نشان دے دیئے تھے، فرمایا یہ جو میں نے اندر نشانات بنائے ہیں، اس کی رکاوٹیں ہیں اور اس کی تمنا کے پورے ہونے سے مانع ہیں۔"

آرزوؤں کا خون:

اول تو یہ رکاوٹیں اس کو اجازت نہیں دیں گی کہ آگے چلے، لیکن فرض کرو کہ یہ رکاوٹیں درمیان میں حائل نہ بھی ہوں، تو امل یعنی اس کی آرزو تو اجل سے باہر ہے، یہ جدھر کو بھی بھاگے گا، آگے اس کی اجل کھڑی ہے، اور اس کی آرزو اجل کے دائرے سے باہر ہے، موت سے پہلے کبھی بھی اس کی تمنا پوری نہیں ہوسکتی، آج تک کسی انسان کی تمنائیں پوری نہیں ہوئیں، ناکامیوں پر ناکامیاں، شکستوں پر شکستیں، رکاوٹوں پر رکاوٹیں لوگوں کو پیش آتی ہیں، اور آکر ہمارے پاس شکایت کرتے ہیں کہ مولوی جی! پتہ نہیں کیا ہوگیا؟ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں وہی کام خراب ہوجاتا ہے اور جب کسی کام کو کرنے جاتا ہوں سارے مراحل طے ہوجاتے ہیں اور جب آخر میں ہوتا ہوں تو معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔ کاش کہ ہم لوگوں کو عبرت ہوجاتی۔

ایک مثال:

یوں آتا ہے کہ دوزخ میں دوزخی کو پہاڑ پر چڑھائیں گے، جس کو قرآن کریم میں یوں فرمایا گیا ہے: "سَأُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا."، پتہ نہیں کتنی تکلیف کے ساتھ وہ

پہنچے گا، پیچھے ڈنڈے برسیں گے، اور اس کو کہیں گے چڑھ آگ کا پہاڑ ہے، اور جب چوٹی کے قریب پہنچے گا تو دھکے دے کر نیچے پھینک دیا جائے گا، پھر کہیں گے چڑھ، اس غریب کو یہی سزا ملتی رہے گی، جیسا کہ ہمیں یہ سزا مل رہی ہے کہ ہم آرزوؤں کے پہاڑ پر چڑھنا چاہتے ہیں، اس چوٹی کو سر کرنا چاہتے ہیں، اور جونہی دیکھا کہ تمنا پوری ہونے والی ہے اور مقصد پورا ہونے والا ہے، تو دھکے سے نیچے گرا دیئے جاتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ ہاں پھر چڑھ، ہمیں اس کام میں لگا دیا، ہماری بالکل دوزخی کی مثال ہے، بھئی تھک کر کے اس کام کو ہی چھوڑ دو اور اللہ کے سپرد کر دو جو کرنا ہوگا کر دے گا، اس لئے کہ قرآن کریم میں ہے: "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا." (ھود:٦) ساری مخلوق کے رزق کا ذمہ تو اس نے لے رکھا ہے، "کارساز ما، در فکر کار ما" ہمارا کارساز ہمارے کام کی فکر میں خود لگا ہوا ہے، "فکر ما در کار ما آزار ما" کیا اپنے کام میں یہ ہمارے فکرمند ہونے سے کچھ بنے گا؟ نہیں! بنے بنائے گا تو کچھ نہیں سوائے تکلیف و آزار کے، جب اس کا کوئی نتیجہ نہیں تو چھوڑ دو۔

الغرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ تم آرزوؤں کے دنوں میں ہو، اجل سے پہلے پورا ہونے کی کوئی آس اور توقع نہیں، اور مرزا غالب کے بقول:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

تمہاری امیدیں مرنے سے پہلے پوری ہو نہیں سکتیں تو تم ناامید ہو جاؤ ناں۔

ہاں جن چیزوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مرنے کے بعد کا وعدہ فرمایا ہے، ان کا یقین کرو، دنیا سے تمہارا دل سرد ہو جائے، دنیا کی آرزوؤں کو پس پشت ڈال دو۔

اپنی تمام آرزوئیں اللہ کے سپرد کردو!

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ آرزوئیں خاک ہوں یا حسرتیں پامال ہوں، اب تو اس دل کو تیرے لائق بنانا ہے، قابل بنانا ہے، لات مارو ان حسرتوں کو اور پھینک ڈالو ان آرزوؤں کو، ایک کی تمنا کرو، اور بس، باقی سب تمنائیں چھوڑ دو، ہمارے خواجہ مجذوبؒ کے بقول:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

تم نے کن تمناؤں کو پال رکھا ہے قلب کو پریشان کرنے کے لئے، اپنے تمام امور اس مالک کے سپرد کردو اگر اس کے رحیم ہونے پر، اس کے شفیق ہونے پر، اس کے رزاق ہونے پر، اس کے معبودِ برحق ہونے پر، اس کے مالک الملک ہونے پر اور اس کی قدرتِ کاملہ پر یقین ہے تو تم اپنی تمام آرزوئیں اس کے سپرد کردو۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

ترجمہ:......"میں نے اپنا مال و متاع تیرے سپرد کردیا، یہ کم ہے یا زیادہ، اس کا حساب آپ کرتے رہئے۔"

تم کس فکر میں غلطاں ہوگئے میاں! لیکن کیا کیجئے جس آدمی کو دیکھو، اس میں مبتلا ہے، جسے دیکھو اسی میں مبتلا ہے، ایک طالب علم آٹھ مرتبہ فیل ہوا، بیچارے کو آٹھویں مرتبہ کے بعد کامیابی ہوئی، اسی چیز کو سوچ لیتا کہ امتحان ہی کیا ضروری ہے؟ جاؤ اپنا کام کرو، لیکن آگے یہ جو اس کو ڈگری مل جائے گی، کاغذ کا ایک پرزہ ہوگا، آگے اسی کے سہارے اس کی زندگی بسر ہوگی، کھانے پینے کی اور کام کاج کی ضرورت نہیں ہوگی، اسی طرح حسرت کا ایک میدان تم نے طے کیا، آٹھ مرتبہ کی ناکامی کے بعد،

آگے پھر ایک میدان حسرت اور ہے اسے بھی قطع کرو۔

رغبت کے دنوں میں بھی عمل کرو!

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دیکھو جس طرح خوف کے دنوں میں اللہ کے لئے عمل کیا کرتے ہو، رغبت کے دنوں میں بھی کرو، جب بیماری میں ہوتے، پریشانی میں ہوتے، کسی تکلیف میں مبتلا ہوتے، کوئی افتاد آپڑتی ہے تو تم اللہ کی طرف بھاگتے ہو، عافیت کے زمانے میں بھی تو کرلیا کرو۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش ہوتے ہیں جو خوشحالی میں بھی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہو، اور تنگی میں بھی مانگتا ہو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا سچا بندہ ہے، یہ ہر حالت میں مجھ سے مانگتا ہے، اور اپنے فقر کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اگر تنگی میں مانگتا ہے، اور خوشحالی میں نہیں مانگتا، تو فرماتے ہیں کہ مطلب کا یار ہے۔

تعجب ہے کہ جنت کا طالب سو رہا ہے؟

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جنت جیسی چیز کے طلب کرنے والے سو رہے ہوں، اور دوزخ جیسی چیز سے بھاگنے والے سو جائیں، میں نے جنت جیسی چیز نہیں دیکھی جس کے طلب کرنے والے بھی سو رہے ہیں، اور دوزخ جیسی چیز نہیں دیکھی جس سے بھاگنے والے بھی سو رہے ہیں، ذرا سی فکر ہوتی ہے، پریشانی ہوتی ہے تو ہماری نیند اڑ جاتی ہے، نیند نہیں آتی، اور عاشق نامراد کو عشق و محبت کی وجہ سے نیند نہیں آتی، نہ طالب سوئے، نہ خائف سوئے، لیکن عجیب بات ہے کہ جنت کے عاشق اور طالب بھی بنے پھرتے ہیں اور رات کو سوتے بھی ہیں، اور دوزخ سے بھاگنے والے اس سے خوف کرنے والے بھی بنے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی سو رہے ہیں، اگر جنت اپنی تمام حقیقتوں کے ساتھ ایک مرتبہ اپنی جھلک دکھادیتی تو ساری عمر کے لئے نیند اڑ

جاتی پھر دوبارہ کبھی نیند نہ آتی، اور اگر دوزخ کو نزدیک سے نہیں دور سے بھی ہم ایک مرتبہ دیکھ لیتے تو پھر دوبارہ ہمیں سونا یاد نہ رہتا۔

غفلت بھی نعمت ہے:

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ بھئی یہ غفلت بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، آخرت کا، جنت کا، دوزخ کا، اگر ہمیشہ استحضار رہے تو آدمی معطل ہوکر رہ جائے، نہ کھاسکے، نہ پی سکے، نہ سو سکے، نہ بات کرسکے، بات کیا کرے گا جب کھائے گا پیئے گا نہیں، سوئے گا نہیں تو بات کیا کرے گا؟ تو حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ایک گونہ یعنی ایک درجہ میں غفلت بھی آدمی کو چاہئے، اور اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے ہمیں بھی یہ نعمت عطا فرمائی، غفلت بھی ایک نعمت ہے، لیکن غفلت اتنی نہیں ہونی چاہئے، میرے دوست مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ جی صبح اصل میں فجر کی نماز کے لئے آنکھ نہیں کھلتی، نہ بھائی! اتنی غفلت تو نہ کرو، رات کو سوجاؤ، بس اتنی غفلت بہت ہے۔

غفلت مذموم:

لیکن فرائض کے وقت میں غفلت نہیں ہونی چاہئے، یہ غفلت مذموم ہے، اگر تمام فرائض الٰہیہ کو ادا کرتے ہو، ٹھیک ٹھیک حقوق و فرائض کو صحیح صحیح بجا لاتے ہو، اس کے باوجود ہنستے بھی ہو، سوتے بھی ہو، کھاتے بھی ہو، اپنے اہل وعیال سے بھی ملتے ہو، تو یہ غفلت محمود ہے، یہ ہونی چاہئے، اور اگر غفلت کی حد یہاں تک پہنچ گئی کہ تمہیں گناہوں میں مبتلا کر رہی ہے اور فرائض و واجبات تم کو چھڑوا رہی ہے تو یہ غفلت مذموم ہے، اس کا علاج کراؤ۔

غفلت کا علاج:

اور حکمائے امت فرماتے ہیں کہ اس کا علاج یہی مراقبہ ہے کہ تھوڑے سے

وقت کے لئے تنہائی میں بیٹھ جایا کرو، اور اس برخوردار کو سمجھایا کرو جس کو ''نفس'' کہتے ہیں، اس کو سمجھایا کرو، اور بیٹھ کے اس سے باتیں کیا کرو کہ برخوردار! اب فرشتے آرہے ہیں تیری جان قبض کرنے کے لئے، اب تیری جان قبض ہو رہی ہے، اب تجھے غسل دیا جارہا ہے، تجھے کفن میں لپیٹا جارہا ہے، اب تجھے کندھوں پر اٹھا کر لے جارہے ہیں، اب تجھے لحد میں ڈال دیا ہے، اب تیری اینٹیں بند کردی ہیں، اب تیرے پاس منکر نکیر آرہے ہیں، ان کی شکل اتنی گھناؤنی ہے، اتنی ڈراؤنی ہے کہ اللہ کی پناہ تو تو اتنا بہادر ہے کہ چوہا نکلتا ہے تو تو کانپ جاتا ہے، اس وقت تیرا کیا حال بنے گا؟ تنہائی ہے، اندھیرا ہے، کوئی مونس و غم خوار نہیں، جن کے لئے تو مارا مارا پھر رہا ہے، یہ تیرے کس کام آئے گی؟ اور پھر حشر کے میدان میں جو کچھ ہونے والا ہے، اس کو ذرا سمجھاؤ! جنت تیرے سامنے لاکر کھڑی کردی گئی ہے، اور دوسری طرف دوزخ تیرے سامنے کردی گئی ہے، بتا کس کو لینا چاہتا ہے؟ آج تو غفلت کی وجہ سے تجھے نظر نہیں آتا، یا تو احساس نہیں کرتا، لیکن اگر کوئی بے چارہ نابینا ہو اور اس کو نظر نہ آوے تو اس کے نظر نہ آنے کی وجہ سے سورج اپنا نکلنا نہیں چھوڑتا، سورج تو بہرحال طلوع ہو کر رہے گا، کیوں بھئی! حافظ جی کو نظر نہیں آتا، اب سورج اس کی رعایت تو نہیں کرے گا کہ غریب حافظ جی کو نظر نہیں آتا میں کیا نکلوں؟ اگر ہم اندھے ہوگئے ہیں آخرت سے، اور ہمیں آخرت نظر نہیں آتی، جنت سامنے نظر نہیں آتی، دوزخ سامنے نظر نہیں آتی، آنکھوں پر غفلت کی پٹی بندھی ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حقیقت کا یہ آفتاب طلوع نہیں ہوگا، وہ تو ہو کے رہے گا، اس برخوردار کو سمجھاؤ!

اپنے آپ کو کسی کے سپرد کردو!

اور ہمارے حضرتؒ فرماتے تھے کہ روزانہ سونے سے پہلے کم سے کم پانچ منٹ مراقبہ کرلیا کرو، انشاء اللہ! یہ شریر بچہ تمہیں کام دینے لگے گا، سمجھ جائے گا، اور اگر

اس پر بھی نہ سمجھے تو پھر اس کو کسی سائیس کے سپرد کردو، وہ گھوڑا ہوتا ہے نا گھوڑا، اس کو سائیس کے سپرد کردیتے ہیں، جس کے ہاتھ میں ہنٹر ہوتا ہے، اور وہ ماہر اتنا ہوتا ہے کہ اس پر سوار ہوجاتا ہے، گھوڑا جتنا چاہے کودے، چھلانگ لگائے، مگر وہ نہیں گرتا، اور اس کو زور زور سے مارتا ہے، اور پھر سنگلاخ زمین پر لے جاتا ہے، جب تک وہ اپنی شوخی اور شرارت نہیں چھوڑ دیتا اور جب تک کہ وہ ڈھنگ سے کام نہیں کرنے لگتا، سائیس اس کی پشت پر رہتا ہے، اگر یہ بچہ تمہارے قابو میں نہیں آتا تو کسی سائیس کے سپرد کرو، وہ ہنٹر دکھا کر خوب انشاءاللہ! اس کی چولیں نکال دے گا، لیکن توبہ! توبہ! ایسے کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم تو بہت معزز ہیں، بڑی عزت والے ہیں، اپنے آپ کو کسی اور کے سپرد کردیں؟

غرض یہ ہے کہ جنت کے طالبوں کو سونا نہیں چاہئے، خاص طور پر فجر کے وقت اور عشاء کے وقت، اور دوزخ سے بھاگنے والوں کو سونا نہیں چاہئے، جس سے نمازیں قضا ہوجائیں، فرائض شرعیہ قضا ہوجائیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد تلف ہوجائیں، برباد ہوجائیں۔

حق سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ ....

اس کے بعد ایک بہت قیمتی بات فرمائی کہ جو شخص حق سے فائدہ نہ اٹھائے وہ باطل کا نشانہ بنا کرتا ہے، اور جس شخص کو ہدایت راہ راست پر نہ چلا سکے گمراہی اس میں اپنا کام کیا کرتی ہے، تم دیکھو اگر تم حق پر ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو کہ باطل سے بچ گئے، اور اگر تم نے حق کا ساتھ نہیں دیا، تو باطل اپنا حصہ تم سے وصول کرے گا، اگر ہدایت کا حصہ تم نے پورا لے لیا تو ٹھیک ہے اور اگر ہدایت کا کچھ حصہ تم نے چھوڑ دیا تو گمراہی اپنا حصہ وصول کرلے گی، اور یہ کوئی عمل نہیں کہ نہ حق پر رہو، نہ باطل پر رہو، نہ صحیح ہو، نہ غلط ہو، یہ کچھ ہماری سمجھ میں آنے لگی کہ اجتماع ضدین بھی ہوجاتا ہے؟ کہ

بیک وقت ایک چیز صحیح بھی نہیں ہے اور غلط بھی نہیں ہے، اگر صحیح نہیں تھی تو بھائی تم اس کے آرزومند کیوں رہتے تھے؟ اور اگر غلط نہیں تھی تو تم اس کو چھوڑتے کیوں تھے؟

اب ہمارے بہت سے اعمال ایسے ہیں جن کے بارے میں ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ نہ صحیح ہیں اور نہ غلط ہیں، ٹھیک ٹھاک ہے، مگر یہ کہ ہمیں تو صحیح اور غلط کا سوال ہی نہیں، ہمیں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی، تو نتیجہ یہ ہے کہ حق تو تمہارے پاس ہے نہیں، تو تم چاہو کہ باطل بھی نہ ہو، یہ نہیں ہوگا، یا تو حق کو اختیار کرلو اور پورے طور پر اختیار کرلو ورنہ جتنا حصہ حق کا چھوڑو گے اتنا حصہ باطل کا تمہارے اندر آئے گا، جتنا حصہ ہدایت کا چھوڑو گے اتنا حصہ گمراہی کا تمہارے اندر آئے گا، بس انہی کلمات پر اکتفا کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

یومِ حساب سے پہلے
محاسبہ کی ضرورت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

"..... اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّاب رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کَتَبَ اِلٰی بَعْضِ عُمَّالِہٖ، فَکَانَ فِیْ آخِرِ کِتَابِہٖ: اَنْ حَاسِبْ نَفْسَکَ فِی الرَّخَآءِ قَبْلَ حِسَابِ الشِّدَّۃِ فَاِنَّ مَنْ حَاسَبَ نَفْسَہٗ فِی الرَّخَآءِ قَبْلَ حِسَابِ الشِّدَّۃِ عَادَ مَرْجِعُہٗ اِلَی الرِّضَآءِ وَالْغِبْطَۃِ، وَمَنْ اَلْھَتْہُ حَیَاتُہٗ وَشَغَلَتْہُ سَیِّئَاتُہٗ عَادَ مَرْجِعُہٗ اِلَی النَّدَامَۃِ وَالْحَسْرَۃِ، فَتَذَکَّرْ مَا تُوْعَظُ بِہٖ لِکَیْ تَنْتَھِیَ عَمَّا تُنْھٰی عَنْہُ۔" (کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۱۹۰)

"عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ کَتَبَ اِلٰی مُعَاوِیَۃَ بْنِ اَبِیْ سُفْیَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا: اَمَّا بَعْدُ! فَالْزِمِ الْحَقَّ یُبَیِّنُ لَکَ الْحَقُّ مَنَازِلَ اَھْلِ الْحَقِّ وَلَا تَقْضِ اِلَّا بِالْحَقِّ وَالسَّلَامُ۔" (کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۱۹۳)

ترجمہ:......"..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے

بعض گورنروں کو ایک خط لکھا اور اس کے آخر میں تھا کہ: کشائش کے زمانہ میں اپنے نفس کا محاسبہ کیا کرو، سختی کے حساب سے پہلے، جو شخص اپنا محاسبہ کرتا رہے گا جب شدت اور سختی کا وقت آئے گا تو اس کا انجام رضائے الٰہی اور غبطہ کی شکل میں نکلے گا، اور جس کو اس کی زندگی نے غافل کر دیا اور اس کی برائیوں نے اس کو مشغول رکھا، تو جب اس کا انجام نکلے گا تو نہایت ندامت اور حسرت کا انجام ہوگا، پس جو نصیحت تم کو کی جارہی ہے اس پر غور کرو تاکہ جس چیز سے رکنا چاہئے اس سے تم باز رہ سکو۔"

ترجمہ:......"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو خط لکھا فرمایا کہ: حق کو لازم پکڑو، حق، تمہارے لئے اہل حق کے منازل واضح کردے گا، اور کوئی فیصلہ حق کے بغیر نہ کرنا۔ والسلام۔"

حضرت عمرؓ کا صحابہؓ کو نماز کی تلقین کرنا:

یہ حضرت امیرالمؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دو خطوط ہیں۔ امیرالمؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے حکام، صوبے داروں اور دوسرے ایسے لوگ جو حکومت میں دخیل ہوتے ہیں، ان کو وقتاً فوقتاً نامہ گرامی لکھتے رہتے تھے، ان کو نصیحت فرماتے رہتے تھے، اور تنبیہات فرماتے تھے، مؤطا امام مالک میں ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو خط لکھا تھا کہ:

"اِنَّ اَهَمَّ اَمْرِكُمْ عِنْدِی الصَّلَاةُ فَمَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا حَافَظَ عَلٰی غَيْرِهَا وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا

اَضْیَعُ.“ (مؤطا امام مالک ص:۵)

ترجمہ:......”میرے نزدیک تمہارے تمام کاموں میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے، جو شخص اس کی محافظت اور پابندی کرے وہ دین کے دوسرے کاموں کی بھی پابندی کرے گا، اور جو شخص اس میں لاپروائی کرے گا اور اس کو ضائع کرے گا وہ دین کی دوسری باتوں کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کرے گا۔“

اس کے بعد اسی خط میں نماز کے اوقات تحریر فرمائے ہیں کہ فلاں فلاں وقت نماز پڑھا کرو۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں طویل مدت تک رہے ہیں، اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا اچھی طرح علم ہے، چند صحابہ جو بہت شدت سے روایتیں کرتے ہیں، ان میں ایک نام حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بھی ہے، اس کے باوجود ان کو اس معاملہ میں خط لکھ رہے ہیں تاکہ حکومت کی ذمہ داریوں، اس کی مصروفیات اور اس کی مشغولیت کی وجہ سے کسی قسم کی سستی اور تہاون پیدا نہ ہو جائے۔

کشائش کے زمانہ میں اپنے محاسبہ کی ضرورت:

یہ خط جو میں نے آپ کے سامنے پڑھے ہیں ان میں سے پہلا خط حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک عامل کو یعنی حاکم اور گورنر کو لکھا اور اس میں بہت ساری باتیں تحریر فرمائیں تھیں، اس کے آخر میں یہ تحریر فرمایا کہ کشائش کے زمانے میں اپنے نفس کا محاسبہ کیا کرو، جبکہ تم پر پکڑ دھکڑ کرنے والا کوئی نہیں، اور تمہیں کسی سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں، اس وقت اپنے آپ کا محاسبہ کیا کرو۔ سختی کے حساب سے پہلے۔ سختی کا حساب ہے قیامت کے دن کا حساب۔

امیرالمؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فقرہ عام طور پر مشہور ہے کہ: ''اپنا حساب کرلو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب کیا جائے۔'' یہی مطلب ہے اس جملہ کا بھی کہ شدت کا حساب پیش آنے سے پہلے پہلے کشائش، نرمی اور فراخی کے زمانے میں اپنا حساب کیا کرو۔

محاسبہ سے پہلے محاسبہ کے فوائد:

اس کے بعد فرمایا: جو شخص شدت کے زمانے سے پہلے پہلے کشائش کے زمانے میں اپنا حساب کرلیتا ہے اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جب اس کا حساب ہوگا، تو اس کا نتیجہ رضا اور غبطہ کی شکل میں نکلے گا، یعنی اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا اور لوگوں کو اس کی حالت پر رشک آنا، اس کے حساب کو قیامت کے دن دیکھ کر حق تعالیٰ شانہ کی رضامندی کا اعلان ہوگا، اور محشر کے لوگوں کو اس شخص پر رشک آئے گا کہ اے کاش! ہمارے ساتھ بھی یہ معاملہ کیا جاتا۔

اپنا محاسبہ نہ کرنے والوں کا انجام:

جو شخص ایسا ہوتا ہو کہ زندگی اس کو غافل کردے اور اس کی سیئات، برائیاں اس کو مشغول رکھیں، تو اس کا نتیجہ ندامت اور حسرت ہوگا، قیامت کے دن ایسا آدمی پشیمان ہوگا اور حسرت اٹھائے گا۔

قرآن کریم میں فرمایا:

''اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ وَاِنْ کُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ.'' (الزمر:۵۵)

ترجمہ:...... ''ہائے افسوس اس پر جو میں نے کوتاہی کی اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں، تفریط کی، اور میں تو تھا ہنسی مذاق سمجھنے والوں میں سے (کہ قیامت کا حساب ہنسی کھیل ہے)۔''

تو ایک بات تو یہ تحریر فرمائی اور دوسری بات یہ تحریر فرمائی کہ جس چیز کی تمہیں نصیحت کی جارہی ہے اس پر غور وفکر کیا کرو تاکہ جن چیزوں سے رکنا چاہئے تم ان سے رک سکو اور باز رہ سکو۔

محاسبہ اور نصیحت حاصل کرنا:

تو ایک ہے محاسبہ اور دوسرا ہے نصیحت حاصل کرنا۔ ہر وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنا نامہ اعمال لے کر، اپنے عمل کے دفاتر لے کر پیش ہونا ہے اور اپنا حساب کروانا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے نفع ونقصان کا میزانیہ آج ہی لگالے۔

روز کے روز کا حساب:

اکابرؒ تو فرماتے ہیں کہ روز کا روز حساب لگاؤ، عشاءؑ کی نماز کے بعد جب لیٹنے لگو، تو تھوڑا سا وقت اس کے لئے مقرر کرو، صبح سے لے کر شام تک جو کچھ ہم نے کیا ہے، کتنے لحات ہم پر گزر رہے ہیں اور ان لحات کو ہم نے کس مصرف پر خرچ کیا؟ اچھے کام پر خرچ کیا ہے یا برے کام میں یا لایعنی کام میں؟ تین ہی شکلیں ہوسکتی ہیں، اگر اچھے کام میں خرچ کیا ہے تو شکر کرو اور کہو: "اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ." لیکن پھر یہ بھی سوچ لو کہ جو اچھے کام کئے ہیں، جیسے کرنے چاہئے تھے، ویسے ہی کئے ہیں؟ ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کی؟ کیونکہ حق تعالیٰ شانہ کی عبادت کا حق تو ادا نہیں ہوسکتا، اور حق تعالیٰ شانہ کی عبادت کا حق کس سے ادا ہوسکتا ہے؟ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا میں نے حق ادا کرنے کی کوشش بھی کی ہے یا نہیں؟ اگر کوشش کی ہے تو اس پر شکر بجا لاؤ، اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو پھر ان نیک اعمال بجالانے میں جتنی کوتاہیاں، لغزشیں اور غفلتیں ہوئی ہیں ان پر توبہ استغفار کرو۔ ایک ہی چیز پر شکر بھی ہے اور استغفار بھی ہے۔ شکر تو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے

ان اوقات کو نیک کام میں مشغول کردیا: "اَللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ."

نیکی کی توفیق پر شکر:

ہمارے ایک بزرگ ہیں، جو بہت زیادہ اچھی قسم کی انگریزی جانتے ہیں، قادیانیت کے بارے میں انہوں نے میرے رسائل کا ترجمہ کیا ہے، اب بھی وہ اس کام میں مشغول رہتے ہیں، تھوڑا بہت کرتے رہتے ہیں، اور ان کے انگریزی ترجمہ کی ایک جلد چھپ چکی ہے، تین دن پہلے میرے پاس آئے تھے اور اتنا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے مجھے بہت ہی اچھے کام میں لگادیا، خالصتاً لوجہ اللہ وہ اس کام کو کرتے ہیں، کوئی معاوضہ نہیں، کوئی ستائش نہیں، ممنون تو مجھے ان کا ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ اتنی ممنونیت کا اظہار کر رہے تھے کہ کچھ پوچھو نہیں۔ مالک کی طرف سے نیک کام کی توفیق مل جانا اور کسی اچھے کام میں ہمیں لگادینا یہ کوئی معمولی احسان نہیں، اللہ تعالیٰ کا تو اس پر شکر کرو، دوسرا یہ کہ ہمارے اس کام میں جتنی کوتاہیاں، لغزشیں اور غفلتیں ہوئی ہیں اور جیسا ہمیں کرنا چاہئے تھا، ویسا بن تو کیا پڑتا ہم نے کوشش بھی نہیں کی، اس پر استغفار کیا جائے، شیخ عطارؒ فرماتے ہیں:

بے گناہ نگزشت بدما ساعتے
اور بہ حضور دل نہ کردم طاعتے

ترجمہ:...... "بغیر گناہ کے ایک گھڑی بھی ہم پر نہیں گزری، دل کی حاضری کے ساتھ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے ایک بھی عبادت کی ہو۔"

زندگی میں کوئی عبادت تو ایسی ہو.....:

زندگی میں ایک عبادت تو ایسی ہوتی جو میں نے دل کی حاضری کے ساتھ ادا کی ہوتی۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

”مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ جَسَدِهٖ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِهٖ.“

(مشکوٰۃ ص:۳۸)

ترجمہ:......”جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے، (وضو کو بھی عبادت سمجھ کر کرے کہ یا اللہ! میں ظاہر کو پاک کر رہا ہوں تو میرے باطن کو بھی پاک کردے، ایسا وضو کرے کہ پانی سے صرف ظاہری اعضأ پاک نہ ہوں، بلکہ اس کا باطن بھی پاک ہوجائے، دھل جائے) ایسے وضو کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وضو کرنے ہی سے اس کے سارے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔“

خیر یہ گفتگو دوسری طرف چل پڑے گی، میں تو دوسری حدیث سنا رہا تھا کہ:

”مَنْ تَوَضَّأَ وُضُوْئِیْ هٰذَا ثُمَّ يُصَلِّیْ رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ نَفْسَهٗ فِيْهِمَا بِشَیْءٍ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ.“

(مشکوٰۃ ص:۳۹)

ترجمہ:......”اچھی طرح وضو کرے، وضو کرنے کے بعد دو رکعت نماز پڑھے، اور ان دو رکعتوں میں اپنے نفس کے ساتھ باتیں نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ان دو رکعتوں کی برکت سے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف فرمادیتے ہیں۔“

دو رکعت پر جنت کا وجوب:

اور دوسری حدیث میں ہے کہ:

”قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا مِنْ

مُّسْلِمٍ يَّتَوَضَّأُ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهٗ ثُمَّ يَقُوْمُ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ وَوَجْهِهٖ اِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ."

(مشکوٰۃ ص:۳۹)

ترجمہ:...... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب مؤمن بندہ اچھی طرح وضو کرلیتا ہے پھر دو رکعت اس طرح پڑھتا ہے کہ اپنے دل اور اپنی ذات سے نماز کی طرف متوجہ ہے، اللہ تعالیٰ ان دو رکعت کی برکت سے جنت کے دروازے کھول دیتے ہیں۔"

اب سوچو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں کہ وضو کرے اور وضو کرکے دو رکعتیں ایسی پڑھے کہ اپنے نفس سے باتیں نہ کرے، بلکہ اللہ سے باتیں کرے، کیا کبھی ہم نے ایسی نماز پڑھی ہے؟

کبھی قصد بھی کیا؟

طالب علم، شیخ سے حدیث پڑ رہے تھے تو یہ حدیث آئی، طالب علم نے کہا کہ: حضرت! ایسی نماز کون پڑھ سکتا ہے؟ شیخ نے فرمایا کہ: کبھی قصد بھی کیا ہے؟ افسوس اس پر نہیں کہ تم پڑھ سکتے ہو یا نہیں؟ یا تم نے پڑھی ہے یا نہیں پڑھی؟ ماتم تو اس کا ہے کہ تم نے کبھی اس کا قصد بھی کیا کہ آج مجھے ایسی نماز پڑھنی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہوجائے۔ قصد تو کرو، تو شیخ عطارؒ فرماتے ہیں کہ دل کی حاضری کے ساتھ ایک بھی عبادت نہیں کی اس پر استغفار کرو۔ یا اللہ! ہم سے جو کوتاہی ہوئی ہے، آپ اپنی رحمت کے ۔اتھ اس کا تدارک فرمادیجئے۔

ایک بزرگ کی دعا:

ایک بزرگ دعا کر رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ:

"اِصْنَعْ بِنَا مَا اَنْتَ اَھْلُهٗ، وَلَا تَصْنَعْ بِنَا مَا نَحْنُ اَھْلُهٗ."

ترجمہ:......"یا اللہ! ہمارے ساتھ وہ معاملہ کیجئے جو آپ کے شایانِ شان ہے، وہ معاملہ نہ کیجئے جس کے ہم لائق ہیں۔"

صفر کا تجزیہ کر کے بھی اگر کوئی صفر بن سکتا ہے، ہم تو وہ بھی نہیں ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ ہم جیسا معاملہ کریں گے تو پھر کیا بنے گا؟ ہم نے اپنی شان کے مطابق کیا، آپ اپنی شان کے مطابق کیجئے، ہم نے عمل کیا اپنی شان کے مطابق، اپنی اہلیت اور نالائقی کے مطابق، اور آپ اس پر رضا مرتب فرمائیے اور اس پر جزا عطا فرمائیے اپنے شایانِ شان! ہمیں نہ دیکھئے بلکہ اپنے کو دیکھئے۔ تو جب اپنی کوتاہی عمل پر توبہ و استغفار کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے مانگیں گے تو اس ندامت اور استغفار کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ ہماری اس کمی کو اپنی رحمت سے پورا فرمادیں گے۔

گناہوں کی گندگی:

اور اگر ہمارا وقت معصیت میں گزرا، نافرمانی میں گزرا، تو اس کے یہ معنی سمجھو کہ ہم نے سفید کپڑوں پر گندگی لگائی، صبح کو اٹھے تھے تو کپڑے سفید تھے، شام ہوئی تو جگہ جگہ بول براز کی گندگی اور نجاست کے داغ دھبے لگے ہوئے تھے، اور ہم سے بدبو آرہی ہے، اب اس کا علاج یہی ہے کہ جلدی سے صابن لو اور اس گندگی کو دھولو، سونے سے پہلے پہلے گناہوں کی گندگی کو اپنے دامن ایمان پر رہنے نہ دو، باقی نہ چھوڑو، کیونکہ سونا مرنے کے مشابہ ہے، سونے سے پہلے پہلے اپنے دامن ایمان کو صاف کرلو، داغ اور دھبوں کو دور کرلو اور ایک دو آنسو بھی ان آنکھوں سے نکل جائیں تو یہ گناہوں کے لئے ایسے ہی کام دیتے ہیں جیسے کہ تیزاب سے رنگ اتر جاتا ہے،

دھبے دور ہوجاتے ہیں۔

گناہوں کی گندگی سات سمندروں سے بھی نہیں جاتی:

اس لئے کہتے ہیں کہ گناہوں کی گندگی کو سات سمندر نہیں دھوسکتے، لیکن آنکھوں کے آنسو کا ایک قطرہ بھی نکل آئے تو تمام گناہوں کی گندگی کو دھوڈالتا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ میں شاعری کر رہا ہوں، شاعری نہیں کر رہا، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔

حدیث شریف میں ہے:

"عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَكَذَا، تَعْنِيْ قَصِيْرَةً، فَقَالَ: تعني قَصِيْرَةً. فَقَالَ: لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مزج بِهَا الْبَحْرُ لَمزجته." (مشکوٰۃ ۴۱۴)

ترجمہ:...... "ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ ایک دفعہ حضرت صفیہؓ کے بارے میں میرے منہ سے نکل گیا کہ اتنی سی تو ہے، اور ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ اتنی سی ٹھگنی ہے، (یعنی ہاتھ کا ہی اشارہ کیا تھا اور صرف اتنا کہا تھا زبان سے کہ اتنی سی تو ہے)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عائشہ تو نے ایسی بات کہی ہے کہ اس کی سیاہی کو (سات) سمندر بھی نہیں دھو سکتے۔"

شاعری نہیں کر رہا، صحیح بات کر رہا ہوں، گناہوں کی گندگی سمندر سے بھی دور نہیں ہوسکتی، ہاں آنکھوں کے پانی سے دور ہوسکتی ہے اور آنکھوں کا پانی نہ آئے تو اس کا بھی علاج فرمادیا کہ: "اگر تم رو نہ سکو تو رونے والی شکل ہی بنالو" رونا تو بعض دفعہ اختیاری نہیں ہوتا، لیکن رونے والوں کی شکل بنالینا تو مشکل نہیں ہے۔ اپنے

پورے دن کی زندگی کا جائزہ لو اور جائزہ لے کر ایک ایک عمل کے بارے میں اپنی نیکیوں کی بھی اور اپنے گناہوں کی بھی فہرست مرتب کرلو۔

کتنی بڑی دولت ضائع ہوگئی:

اور تیسری قسم وہ وقت ہے جو ہم نے لایعنی ضائع کیا، یعنی جس کا کوئی مصرف نہیں، ٹھیک ہے تم سے اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، نفس نے کہہ دیا تھا کیونکہ اس پر تمہاری کوئی پکڑ نہیں ہوگی، لیکن یہ تو سوچو کہ تم نے دولت کتنی ضائع کردی؟ اس پر حسرت تو ہونی چاہئے، اور اگر تضیع اوقات پر بھی کوئی حسرت نہیں ہوتی تو پھر ماتم کا مقام ہے کہ وقت جا رہا ہے، گزر رہا ہے، بلکہ گزر چکا ہے اور ہم خالی کے خالی رہے، زیادہ نہیں پانچ منٹ یہ روزانہ کا مراقبہ کرلو، یہ ہے محاسبہ، اور اس کا تدارک کرلو کیونکہ ابھی تدارک کا وقت ہے۔

حاجی محمد شریفؒ کی دعا:

میں نے تمہیں حاجی محمد شریف صاحبؒ کا مقولہ سنایا تھا، وہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے، ملتان میں اسکول کے ماسٹر تھے اور حضرتؒ سے خلافت بھی ملی، اندازہ کرو کتنے نیک آدمی ہوں گے! اسکول ماسٹر ہیں اور حضرتؒ نے ان کو رگڑے کتنے دیئے؟ یہ ان کی سوانح عمری سے معلوم ہوسکتا ہے۔ ان کے ملفوظات میں میں نے پڑھا کہ میں تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں کہ:

> ''یا اللہ! قیامت کے دن آپ میرا حساب لے کر یہی تو بتائیں گے کہ یہ مجرم ہے۔ یہی بتانا چاہیں گے نا کہ یہ مجرم ہے! یا اللہ میں اپنے مجرم ہونے کا ابھی اقرار کرتا ہوں، خود اقرار کرتا ہوں، جو آدمی خود مجرم ہو اور مجرم ہونے کا اقرار کرتا ہو، اس پر گواہوں کے لانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے لئے

عدالت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن آپ مجرم ثابت کریں گے انجام اتنا ہی ہوگا کہ مجھے دوزخ میں ڈالیں گے، اس لئے میں معافی کا طلب گار ہوں، آپ کے عذاب کا تحمل مجھ سے نہیں ہوسکے گا، معاف کردیجئے! میرا کام جرم کرنا اور آپ کا کام معافی دینا ہے، آپ معاف کردیجئے!''

روزانہ کے محاسبہ سے تلافی ہوجائے گی:

روزانہ اگر اس محاسبہ کی عادت ڈال لی جائے جبکہ کوئی تم پر ڈنڈا لے کر نہیں کھڑا اور کوئی تم پر پہرا نہیں دے رہا، انشاءاللہ! بہت کچھ تدارک ہوجائے گا، یہ بکھرے ہوئے بیر دوبارہ جھولی میں ڈال سکتے ہو، یہ اجڑی ہوئی کھیتی دوبارہ لہلہا سکتی ہے، بشرطیکہ اس کا انتظام کرو۔

بددیانتوں کی وجہ:

حقوق العباد کے معاملہ میں جو بددیانتیاں ہو رہی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کے معاملے میں جو بے اعتدالیاں ہو رہی ہیں، یہ کیوں ہو رہی ہیں؟ اس لئے کہ اوپر سے نگرانی کرنے والا کوئی ہے نہیں، اور اندر بندوں نے اپنی نگرانی کرنا چھوڑ دی، اوپر تو حساب لینے والا ایک ہی دن حساب لے گا، تم مطمئن ہو اور بندوں کی نظر بے چاری کمزور ہے، وہ تمہاری خلوت تک کہاں پہنچے گی اور قانون کا ہاتھ اپاہج ہے تم جب چاہو اس کا پنجہ مروڑ ڈالو، وہ تمہارے دامن تک نہیں پہنچے گا، تم مطمئن ہو کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نہیں پکڑ سکتی، ہم نے ایسی ترکیب سے جرم کیا ہے کہ نشان قدم بھی مٹا دیئے ہیں۔

لیاقت علی مرحوم کو بھرے جلسے میں قتل کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اکبر خان کو بھی گولی ماردی گئی جو لیاقت علی خان مرحوم کا قاتل تھا، چلو جرم مٹ گیا۔ آج تک پتہ

نہیں چلا کہ لیاقت علی خان کا قاتل کون تھا؟ یہ پاکستان کا پہلا سیاسی قتل تھا جو کہ وزیراعظم کا قتل تھا، تم نے سمجھا کہ ہم نے ثبوت مٹادیئے، ثبوت موجود ہیں، یوم الحساب آئے گا تو سارے ثبوت پیش کردیئے جائیں گے۔

ہم محاسبہ آخرت کو بھول گئے:

تو میں عرض کر رہا تھا کہ آج دنیا میں جو فساد پیدا ہو رہا ہے وہ اس لئے کہ ہم نے اپنا محاسبہ چھوڑ دیا ہے، اس لئے کہ یوم الحساب کو بھول گئے، یاد ہی نہیں رہا کہ حساب ہونے والا ہے، ایک ایک پائی کا، ایک ایک ذرہ کا حساب لیا جائے گا۔

ترمذی شریف کے حوالہ سے مشکوٰۃ میں روایت ہے:

"لَا تَزُوْلَ قَدَمَا ابْنَ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ. عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ، وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اِكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَمَاذَا عَملَ فِيْمَا اِذَا عَلِمَ." (مشکوٰۃ ص:۴۴۳)

ترجمہ:......"بندے کے قدم اپنی جگہ سے ٹلیں گے نہیں جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ نہیں لیا جائے گا:

۱:......اپنی عمر کہاں برباد کی تھی؟

۲:......اپنی جوانی کہاں بوسیدہ کی؟

۳:......مال کے بارے میں سوال ہوگا کہ کہاں سے حاصل کیا تھا؟

۴:......اور کہاں خرچ کیا تھا؟

۵:......عالم سے سوال ہوگا کہ جو علم سیکھا تھا کیا اس پر

عمل بھی کیا تھا یا نہیں؟''

چھوٹا سوال مگر مشکل جواب:

حساب دو، دیکھنے میں بظاہر چھوٹا سا سوال ہے اس کو حل کرو، لیکن ذرا اس سوال کا جواب لکھنے بیٹھو تو تم کہو گے کہ یاد نہیں رہا، کمپیوٹر تم کو دے دیا جائے گا، جس میں تمہارا زندگی کا سارا ریکارڈ موجود ہے۔ تاکہ دیکھتے رہو اور لکھتے رہو۔

جوانی کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ وہ کہاں بوسیدہ کی تھی؟ ''اَلشَّبَابُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْجُنُوْنِ'' ہے ناں! یہ جوان کسی کی نہیں سنتا، بڈھوں کی نہیں سنتا، عقل پر پردہ آجاتا ہے، اس لئے حافظؒ کہتے ہیں کہ:

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں نیک تر دارند

جوانان سعادت مند پند پیر دانا

ترجمہ:...... ''برخوردار! نصیحت سن لو! کیونکہ سعادت مند بچے بوڑھوں کی نصیحت کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تر جانتے ہیں۔''

جوانی کی نعمت کی قدر کرو:

بڑوں کے تجربے سے فائدہ اٹھالو، ''من نکر دم شما حاضر بکنید'' مجھ سے نہ ہوسکا تم تو کرو۔ یہ جوانی اس قسم کی ہے کہ یہی زمانہ حقیقت میں کام کرنے اور کمانے کا ہے، بچپن کا زمانہ تو لاشعوری کا زمانہ ہے، اور بڑھاپے کا زمانہ میری طرح معذوری کا زمانہ ہے، یہی جوانی کا زمانہ ہے، اگر کمالات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اسی جوانی کے زمانے میں حاصل کرسکتے ہو، اپنے کو غارت اور برباد کرنا چاہتے ہو تو بھی یہی زمانہ ہے، اس کے لئے موزوں ترین زمانہ ہے، بلندیوں پر جانا چاہتے ہو تو آسمان سے اوپر تک پہنچ جاؤ گے اور نیچے گرنا چاہتے ہو تو بہائم سے، درندوں اور چوپایوں سے بھی

نیچے جا سکتے ہو، اسی جوانی کے زمانے میں اگر نیک بننا چاہو تو فرشتے تم پر رشک کریں، اور رخ دوسری طرف کر لو تو شیطان تم سے پناہ مانگے۔ حالانکہ جوانی بھی زندگی ہی کا ایک حصہ ہے لیکن اس کے سوال کا پرچہ الگ دیا گیا ہے۔ ”وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ.“ جوانی کے بارے میں سوال ہوگا کہ وہ کہاں بوسیدہ کردی تھی؟

مال سے متعلق سوال:

مال کے بارے میں سوال ہوگا کہ کہاں سے لیا تھا؟ کہاں دیا تھا؟ حاصل کیسے کیا؟ خرچ کیسے کیا؟ یہ ایک سوال دو مستقل سوالوں کا مجموعہ ہے، ایک ایک پائی کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کہاں سے لیا تھا، حلال سے یا حرام سے؟ احکام خداوندی کی رعایت رکھی تھی یا نہیں؟ اور دوسرا یہ کہ خرچ کہاں کیا تھا؟ بال بچوں کے نفقہ پر خرچ کیا تھا تو بہت اچھا کیا، عزیز و اقارب کی خبر گیری پر خرچ کیا تو بہت اچھا کیا، صلہ رحمی پر خرچ کیا تو بہت اچھا کیا، غربا و مساکین کی مدد پر خرچ کیا تو بہت اچھا کیا، خیر کے کاموں میں خرچ کیا، اللہ تعالیٰ کی رضا کے کاموں میں خرچ کیا تو بہت اچھا کیا، سبحان اللہ! ٹی وی پر خرچ کیا تھا؟ تو لعنت! ڈش انٹینا لگایا تھا؟ لعنت! دنیا بھر کی نجاست تم نے اپنے گھر میں ڈال لی، اس لئے پیسے دیئے تھے؟ اور جتنے گناہ کے کام ہیں، نام و نمود اور نمائش کے کام ہیں، ان پر خرچ کرو گے تو قیامت کے دن پکڑے جاؤ گے۔

علم کے بارے میں سوال:

علم کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ جتنا علم دیا تھا اس پر عمل کتنا کیا؟ لوگوں نے کہا کہ ہم نے علم حاصل ہی نہیں کیا، ماشاءاللہ! عمل کا سوال تو بعد میں ہوگا، ہم نے علم ہی نہیں لیا تو کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مہمل بھیجی تھی؟ اپنے نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فضول بھیجا تھا؟ ہدایت کے لئے بھیجا تھا ناں! تمہاری ہدایت کے لئے

بھیجا تھا، تم ہی بتاؤ کہ قرآن کریم جیسی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے جلیل القدر نبی تمہاری ہدایت کے لئے بھیجے گئے اور تم نے یہ لاپرواہی کی اور کہا کہ ہم نے سیکھا ہی نہیں! چلو اتنا کہنے سے چھوٹ جاؤ گے؟

جاہل دُہرا مجرم ہے:

عالم بے عمل کی برائی نہ پوچھو! لیکن جو شخص علم ہی حاصل نہیں کرتا، اس کے دو جرم ہیں، ایک علم حاصل نہ کرنا، دوسرا عمل نہ کرنا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی کتاب اور ہدایت یہ بندوں کو حقوق انسانیت سکھانے کے لئے ہیں۔ حقوق انسانیت یعنی حقوق اللہ، حقوق العباد۔ تم نے وہ سیکھے ہی نہیں، مطلب یہ کہ انسانیت ہی نہیں سیکھی۔

فرضِ عین وکفایہ کی تعلیم:

اس لئے اکابرؒ فرماتے ہیں کہ پورے دین کا عالم بننا تو فرض نہیں ہے، یہ تو فرض کفایہ ہے، امت میں کچھ افراد ایسے رہنے چاہئیں کہ جو جب بھی ان سے مسئلہ پوچھا جائے وہ بتاسکیں، کسی بھی نوعیت کا مسئلہ ہو، غور وفکر کرکے بتاسکیں، لیکن میری ذات سے متعلق جتنے اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں اور جن کا مجھے روز مرہ سابقہ پیش آتا ہے ان کا سیکھنا فرضِ عین ہے، فرضِ عین! جیسا کہ نماز فرض ہے، روزہ فرض ہے، زکوٰۃ فرض ہے، حج فرض ہے، اسی طرح روز مرہ کے مسائل جو مجھے درپیش ہیں، ان کے بارے میں سیکھنا فرضِ عین ہے، اور یہ کچھ مشکل نہیں، تم کہو گے کہ اب ہمیں مولوی بنائے گا، نہیں! نہیں! فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، تمہیں مولوی نہیں بنانے جارہے مگر اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ جو نیا مسئلہ پیش آئے، جس کا حکم تم کو معلوم نہ ہو، کسی اللہ کے بندے سے، محقق عالم سے پوچھ لیا کرو، بس اتنی سی بات ہے اور یہ کوئی مشکل نہیں، مگر ہمارے بھائیوں کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ نماز بھی کبھی نہیں سیکھی اور نماز

تو نماز یہ اقامت جو کہتے ہیں ناں "اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" یہ بھی کبھی نہیں سیکھی، اقامت کہنے کا شوق ہے، اذان کہنے کا شوق، لیکن اس کے الفاظ ہی کی مشق کر لیتے بھائی! اذان کہتے ہوئے "اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" کہتے ہو، اور "اَنَّا مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہ" کہتے ہو، ان کی نماز سنو وہ بھی غلط، غلط الفاظ ادا کرنا کلمۂ کفر ہے، علماً کہتے ہیں کہ "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہ" کا معنی یہ ہے کہ بے شک میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور اگر "اَنَّا" کہو گے غلط پڑھو گے "الف" کھڑا کر کے یعنی "اَنَّا" پڑھو گے تو پھر معنی یہ بن جائیں گے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ہم اللہ کے رسول ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی بن جاؤ گے، وہ بھی کہتا ہے کہ میں محمد رسول اللہ ہوں۔

وضو نہیں سیکھتے۔ ایک موقع پر میں نے نماز جنازہ پڑھائی، ایک آدمی مجھ سے لڑ پڑا کہ میاں جی! نمازِ جنازہ کی نیت بھی بتایا کرتے ہیں، تم نے بتائی نہیں، میں نے کہا جن کو نمازِ جنازہ کی نیت نہیں آتی وہ تشریف کیوں لائے تھے یہاں؟ انہوں نے زحمت کیوں فرمائی؟ مولوی عین اس وقت جبکہ جنازہ تیار ہو تم کو نمازِ جنازہ کی نیت بھی بتائے، اور مولوی تم لوگوں کو نمازِ جنازہ کا طریقہ بھی بتائے، تم کہاں تھے؟ مولوی سے پہلے مل نہیں سکتے تھے کہ ہمیں بتا دو نمازِ جنازہ کیسے پڑھی جاتی ہے؟ کیونکہ کبھی کبھی ہمیں بھی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

اللہ کے بندو! اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے ہو، اپنے آپ کو کیوں دھوکا دیتے ہو؟ تو یہ میں نے محاسبہ کے بارے میں ذکر کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص اپنا محاسبہ کرتا رہے گا انشاً اللہ جب شدت اور سختی کا وقت آئے گا تو اس کا انجام رضائے الٰہی اور غبطہ نکلے گا، یہ شخص لوگوں کے لئے قابل رشک ہوگا، لوگ اس پر رشک کریں گے، قیامت کے دن اعلان کر دیا جائے گا کہ فلاں آدمی کامیاب ہے، اولین اور آخرین سب سنیں گے، اس کی

خوشی دیکھنے کے لائق ہوگی، اس کا رشک قابل دید ہوگا، حسرت سے نگاہیں اس کی طرف اٹھیں گی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا مصداق بنادے، آمین!

اور جو شخص زندگی کے مشاغل میں مشغول رہا، غافل رہا، غفلت کی زندگی گزر رہی ہے، اور سیئات میں مبتلا اور مشغول رہا، کبھی پیچھے دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ پیچھے بھی دیکھ لیتے، گناہوں کی سڑک پر، اس کے راستے پر سرپٹ دوڑ رہا ہے، کوئی آواز دیتا ہے تو سنتا نہیں، کوئی بلاتا ہے تو بولتا نہیں اور یہ کہہ کر گزر جاتا ہے کہ:

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو!
تجھ کو پرائی کیا پڑی؟ اپنی نبیڑ تو!

بھائی! ہمیں کسی پرائی کی نہیں پڑی، توبہ توبہ! اپنی نبڑ جائے تو بہت ہے، لیکن تم تو یہ کہہ کر فارغ نہیں ہو جاؤ گے، تمہیں جو بلایا جارہا ہے، جو آوازیں دی جارہی ہیں، جو سمجھایا جارہا ہے، وہ تمہارے نفع کے لئے ہے، زاہد کا اپنا نفع نہیں ہے، یہ کہہ کر کہ اپنی نبیڑ تو، تم ہم سے تو فارغ ہو جاؤ گے، لیکن قیامت کے دن کیسے فراغت ہوگی؟ اس کا تو سوچ لو!

گناہ گار اور غافل کا انجامِ بد:

تو جو شخص زندگی بھر مصروفیات میں مصروف رہا، غافل رہا اور گناہوں کے راستے پر دوڑتا رہا، اس کو کبھی متوجہ الی اللہ ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی، جب اس کا انجام نکلے گا تو نہایت ندامت اور حسرت کا انجام ہوگا۔ تم جانتے نہیں ہو کہ جتنی شراب تیز ہوتی ہے اتنا بدمستی زیادہ ہوتی ہے، لیکن جب نشہ ٹوٹتا ہے تو اعضاشکنی بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے، پھر اٹھ نہیں سکتا، معاصی اور غفلت کی شراب میں اتنے بدمست نہ ہو جاؤ کہ قیامت کے دن پھر اٹھا نہ جاسکے، اعضاشکنی تمہیں چلنے نہ دے۔

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو تم کو نصیحت

کی جارہی ہے، اس پر غور کرو، تاکہ جس چیز سے رکنا چاہئے آج تم باز رہ سکو تاکہ کل قیامت کے دن تم کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔''

لزومِ حق سے حق کی راہ نمائی:

اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق کو لازم پکڑو گے تو وہ تمہارے سامنے حق کو واضح کرے گا، حق خود واضح کرے گا اپنے آپ کو، اور جب تمہارے سامنے حق آجائے گا اور تم حق کو لازم پکڑلو گے تو اہل حق کے منازل اور مراتب تمہارے سامنے آجائیں گے، اس لئے کوئی فیصلہ حق کے خلاف نہ کرو، اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نصیحت فرمائی تھی کہ:

''یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی ....الخ.''
(ص:۲۶)

ترجمہ:......''اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کا فیصلہ کیا کرو، خواہش نفس کی پیروی نہ کرو۔''

اللہ کی شان! بات دیکھو کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو فرما رہے ہیں کہ خواہش نفس کی پیروی نہ کرو، نبی کا نفس کیا ہوگا اور اس کی خواہش کیا ہوگی؟ جب نبی کو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو، تو میرے اور آپ کے لئے کیا حکم ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں بصیرت عطا فرمائے، آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

موت کے وقت کے احوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

''حضرت کا ایک وعظ آج سے کئی سال قبل ہفت روزہ ختم نبوت میں شائع ہوا تھا، جو موت اور موت کے بعد پیش آنے والے احوال کی حقیقی عکاسی پر مبنی ہے، وہ بحوالہ ختم نبوت شامل اشاعت ہے۔''

جتنے ہم نے ظلم کئے ہیں، جتنی لوگوں پر زیادتیاں کی ہیں، جتنے گناہ کئے ہیں، وہ موت کے وقت ہمارے سامنے متمثل ہوجائیں گے، سامنے آکر کھڑے ہوجائیں گے، اور پھر شیطان اس وقت اپنا پورا زور لگاتا ہے کہ ان کا ایمان ختم ہوجائے، اس کو کافر کرکے مارا جائے، بندوں کے گناہوں سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ:

ترجمہ:...... ''شیطان کہتا ہے کہ آدم کی اولاد نے میری کمر توڑ ڈالی ہے، بڑی مشقت کے ساتھ اور بڑی محنت کے ساتھ میں ان کو گناہوں کی طرف بلاتا ہوں اور ان سے گناہ

کرواتا ہوں اور جب بندہ گناہ کرلیتا ہے تو اس کو اپنی غلطی کا
احساس ہوتا ہے اور ندامت کے ساتھ کہتا ہے: یا اللہ! مجھ سے
غلطی ہوگئی ہے، میں گناہگار ہوں، میں تیرا قصوروار ہوں، مجھے
اپنی رحمت سے معاف فرمادے! اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول
کرلیتے ہیں اور فرماتے ہیں: چلو معاف کیا! اس طرح شیطان
کی ساری محنت رائیگاں گئی۔"

نزع کے وقت شیطان کا مکر:

لیکن مرنے کے وقت وہ کوشش کرتا ہے کہ آدمی کو یہ یقین دلائے کہ تیری بخشش نہیں ہوسکتی، تو اتنا بڑا گناہگار ہے کہ تیری بخشش ناممکن ہے، اس طرح اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس کرکے اس کا ایمان سلب کرلے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ:

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ ہے کہ وہ نزع کی حالت میں تھے، غشی ہوتی پھر افاقہ ہوجاتا، پھر غشی ہوتی پھر افاقہ ہوتا، اور غشی کی حالت میں کہتے: "لا اذًا، لا اذًا." (نہیں! ابھی نہیں، نہیں! ابھی نہیں) آپ کے صاحبزادے صالح سرہانے پر کھڑے تھے، جب حضرت امامؒ کو ہوش آیا تو صالح کہنے لگے: ابا جی! آپ کیا کہہ رہے تھے؟ یہ عجیب لفظ بول رہے تھے "ابھی نہیں! ابھی نہیں!" فرمایا کہ: سامنے ابلیس کھڑا ہے اور اس طرح دانتوں میں انگلی دبائی ہوئی ہے اور مجھ سے کہہ رہا ہے کہ: "احمد ہائے افسوس! احمد تو مجھ سے بچ کے جارہا ہے۔" تو میں اس کے جواب میں کہہ رہا تھا کہ: "ابھی نہیں! ابھی نہیں!" ابھی چند سانسیں باقی ہیں، پتہ نہیں ان چند سانسوں میں کیا ہوتا ہے؟

حضرت جنیدؒ کا واقعہ:

حضرت جنید بغدادیؒ نزع کی حالت میں تھے، قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے، لوگوں نے کہا کہ حضرت ساری عمر تلاوت کی ہے، ہمت نہیں، طاقت نہیں، اب تو اپنے اوپر رحم کیجئے! فرمایا: تمہارا ناس ہوجائے اس وقت سے زیادہ میں کسی وقت بھی محتاج نہیں تھا، خاتمہ بالخیر ہوجانا بہت بڑی دولت ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے معاف رکھیں کہ کسی کا خاتمہ برا ہو۔ بس یہیں سب کچھ فیصلہ ہوجاتا ہے، پہلی منزل تو نزع ہے، مرنے کو تو سارے ہی مرتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ کیسے مرا؟ اور کیا لے کر مرا ہے؟

ایک بزرگ سے کسی نے کہا کہ حضرت! دعا فرمادیجئے اللہ تعالیٰ گناہ سے حفاظت فرمائے، تو فرمایا: تم گناہ کو روتے ہو، یہاں ایمان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، گناہ کی تو معافی ہوجائے گی، خدانخواستہ اگر ایمان ہی جاتا رہا تو پھر کیا ہوگا؟

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

ترجمہ:...... ''اللہ تعالیٰ کے غضب کو کھینچنے والی ظلم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔''

ظالم کے لئے یہ وقت بڑا مشکل وقت ہوتا ہے، اور ظالم کس کو کہتے ہیں؟ ظالم کون ہوتا ہے؟ کسی سے بے انصافی کرنے والا! کسی کے حقوق جو ہمارے ذمہ لازم ہیں اور ہم نے اس کا حق ادا نہ کیا تو یہ ظلم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ترجمہ:...... ''ظلم قیامت کے دن ظلمتیں بن جائیں گی، ہر طرف اندھیرا، چار سو اندھیرا، کدھر جائیں؟ کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہوگا۔''

ہماری غفلت کا عالم:

ہم اپنی زندگی گزارتے ہوئے اگلے مراحل سے بالکل غافل اور بے پروا ہوجاتے ہیں، کافروں کی طرح شاید اب ہمارا بھی یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ بس زندگی تو یہی زندگی ہے کہ مرتے ہیں اور جیتے ہیں، اور آگے کیا ہے؟ اس کا کچھ کچھ خیال بھی آتا ہے، لیکن یقین نہیں، یہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کا قول نقل کیا ہے: "اِن نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ." جبکہ مؤمن کی یہ شان نہیں، مؤمن کا اگلی زندگی پر، پیش آنے والے اچھے اور برے حالات پر ایسا یقین ہے جیسا کہ آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیز پر ہوتا ہے، اللہ کے بندے بے پرواہ ہوکر نہیں چلتے، ان کو پتہ ہے کہ مرنا ہے۔

موت آخرت کی پہلی منزل:

مرنے کے بعد جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہوتا ہے، میں کہتا ہوں مرنے کے وقت جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی ہمارے لئے ایک سوالیہ نشان ہے، آدمی کا اچھا یا برا ہونا اس وقت اس کو معلوم ہوجاتا ہے، اور اس کے اعمال کی جزا وسزا اسی وقت شروع ہوجاتی ہے۔

نیک لوگوں کی موت کی کیفیت:

حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ:

حضرت عزرائیل علیہ السلام یعنی ملک الموت فرشتوں کی جماعت کے ساتھ جب قبض روح کے لئے مرنے والے کے پاس آتے ہیں، اگر وہ نیک آدمی ہوتا ہے تو سورج کی طرح نہایت چمکتے ہوئے نورانی چہروں اور حسین شکل میں آتے ہیں، ان کے وجود سے خوشبوئیں آتی ہیں، مرنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بہت دیر کا دوست بچھڑا ہوا آج ملا ہے، اس کو سلام کہتے ہیں، نہایت پیار کے ساتھ اس کی روح قبض کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عزرائیل علیہ السلام سے کہا تھا کہ: عزرائیل! میری امت کے ساتھ سختی نہ کیجیو! کہا کہ: یا رسول اللہ! آپ کی امت کے نیک لوگوں کے لئے میں ان کے والدین سے زیادہ شفیق ہوجاتا ہوں، چنانچہ ان کے ساتھ فرشتوں کی ایک جماعت ہوتی ہے جو نہایت نورانی چہرے اور نورانی لباس میں ہوتے ہیں، وہ آکر اس کا احاطہ کرلیتے ہیں اور حضرت عزرائیل علیہ السلام میت کے سرہانے پہنچ کر کہتے ہیں کہ اے ایمان والی اور اطمینان والی روح! اللہ کی رحمت اور رضوان کی طرف نکل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ عزرائیل کا یہ لفظ سن کر روح ایسے نکل جاتی ہے جیسے مشکیزے سے قطرہ ٹپک جاتا ہے، گویا ملک الموت کے پیارے الفاظ سن کر روح نکلنے کے لئے ایسی بے تاب ہوجاتی ہے کہ جیسے کوئی پرندہ پنجرے کا دروازہ کھولتے وقت بے چین ہوتا ہے کہ جلدی سے کھول دو، گویا یہ روح ایک بند پنجرہ میں تھی اور ایک مبارک فرشتہ آیا ہے جو پنجرہ کھول رہا ہے، روح نکلنے کے لئے بے تاب ہوجاتی ہے، پھر روح نکلی اور فوراً رحمت کے فرشتوں نے اپنے ہاتھوں میں لیا، ایک لحہ بھی حضرت عزرائیل علیہ السلام کے پاس نہیں چھوڑتے، جنت سے کفن ساتھ لے کر آتے ہیں، ہم تو اس جسم کو اور اس دھڑ کو کفن پہناتے ہیں، لیکن روح کا کفن فرشتے جنت سے لے کر آتے ہیں، ایسا معطر اور ایسا خوشبودار کفن کہ روئے زمین کی کوئی کستوری اس کا مقابلہ نہیں کرتی، اس روح کو اس میں لپیٹ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لے جاتے ہیں، راستے میں فرشتوں کی جماعتیں ملتی ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ کون مبارک بندہ ہے؟ کون پاکیزہ روح ہے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ فلاں بن فلاں ہیں، دنیا میں جو اس کے بہترین القابات تھے ان کے ساتھ اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور یہ روح پہلے آسمان پر جاتی ہے تو وہاں کے مقرب فرشتے اس کی مشایعت کرتے ہیں، اسی طرح ہر آسمان کے مقرب فرشتے اس کے ساتھ ہوتے ہیں (یہاں تک کہ اس کو بارگاہ الٰہی میں باریابی ہوتی ہے، گویا روح بارگاہ الٰہی میں سجدہ کرتی ہے،

آج تک غائبانہ سجدہ کرتے تھے، آج وہ وقت آیا کہ جیسا سجدہ کرنا چاہئے تھا ویسے سجدہ کیا جائے)، حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: میرے بندے کو علّیین میں لکھ دو اور نیک ارواح کا جو مستقر ہے اس میں پہنچادو۔

برے آدمی کی موت کی کیفیت:

اور جب برا آدمی مرتا ہے تو عزرائیل علیہ السلام نہایت ڈراؤنی شکل میں آتے ہیں، ایسی ڈراؤنی شکل کہ اللہ کی پناہ! اور ان کے ساتھ ڈراؤنی شکل کے فرشتے ہوتے ہیں اور ان کے پاس دوزخ کا بدبودار کفن ہوتا ہے، حضرت عزرائیل علیہ السلام اس کو ڈانٹ کر کہتے ہیں کہ اے خبیث روح! نکل اپنے رب کے غضب کی طرف! نعوذ باللہ! اللہ کی پناہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کی اس جھڑکی کو سن کر روح بجائے نکلنے کے بے تاب ہوکر بدن کے روئیں روئیں میں سرایت کرجاتی ہے جیسا کسی پرندے کو پکڑنا چاہتے ہیں اور وہ چھپنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن بھلا اس کو چھپنے کون دیتا ہے؟ اب اتنی سختی اور شدت اس میں ہوتی ہے جیسے لوہے کی سیخ گیلی پشم پر مار کر اس کو کھینچا جائے، اس کو بھی اس طرح سختی کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ یہ چونکہ نزع کا عالم ہوتا ہے اور نزع کے معنی کھینچنے کے ہیں اور جب اس کی روح نکال لی جاتی ہے تو رواں رواں زخمی ہوجاتا ہے، روح نکالنے کے بعد اس کو فوراً عذاب کے فرشتے لے لیتے ہیں اور اسے گندے اور بدبودار ٹاٹ میں لپیٹتے ہیں وہ اتنا گندہ اور بدبودار ہوتا ہے کہ روئے زمین پر اتنا بدبودار کوئی مردار نہیں، اب فرشتے اس کو لے کر اوپر جاتے ہیں تو جہاں سے وہ گزرتے ہیں، راستے میں جتنے فرشتے ملتے ہیں اس کی گندگی سے ناک بند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: لعنت ہو اس پر، کون خبیث روح ہے؟ لے جانے والے فرشتے بتاتے ہیں کہ فلاں بن فلاں ہے، فرشتے اس کے لئے بددعا کرتے ہیں، جہاں جہاں سے گزرتا ہے اس کی روح اپنا تعفن پھیلاتی جاتی ہے، اور

جب فرشتے اس کو لے کر اوپر آسمان تک پہنچتے ہیں تو اس کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھلتے، بند کردیئے جاتے ہیں، اور حکم ہوتا ہے کہ اس کو سب سے نچلی زمین میں "سجین" میں پھینک دو، چنانچہ وہیں سے پھینک دیتے ہیں۔

نزع کی حالت کا خلاصہ:

یہ میں نے تھوڑا سا نقشہ ذکر کیا ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ موت کا مرحلہ مجھے بھی درپیش ہے اور آپ کے سامنے بھی پیش آنے والا ہے، اور یہ بات میں آپ کے سامنے بار بار کہہ رہا ہوں کہ جیسی ہم نے زندگی گزاری ہے، اسی کے مطابق مرتے وقت ہمارے ساتھ معاملہ کیا جائے گا، نیک لوگوں کے ساتھ ان کے مطابق، اور بروں کے ساتھ ان کے مطابق۔ پھر نیک لوگوں کے بھی مختلف درجات ہیں، اسی طرح برے لوگوں کے بھی بے شمار درجات ہیں، کافروں کے بھی بے شمار درجات ہیں، ہر ایک شخص کے ساتھ اس کے درجہ کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔ ہمارا زندگی گزارنا ایسا ہونا چاہئے کہ نزع کا وقت، موت کا وقت ہمارے لئے اللہ کی رحمت کا وقت ہو، اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا وقت ہو، اللہ کے غضب اور عذاب کا وقت نہ ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ خَيْرَ عُمْرِیْ آخِرَهٗ، وَخَيْرَ عَمَلِیْ خَوَاتِيْمَهٗ، وَخَيْرَ اَيَّامِیْ يَوْمَ اَلْقَاکَ فِيْهِ."

ترجمہ:......"یا اللہ! میری عمر کے آخری حصہ کو سب سے بہتر حصہ بنادے، یا اللہ! میرے اعمال میں سب سے اچھا عمل وہ ہو جس پر میرا خاتمہ ہو، یا اللہ! میرے دنوں میں سب

سے بہترین دن وہ ہو جس دن میں آپ سے ملاقات کروں
(یعنی جس میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور پیش کیا جاؤں،
وہ دن میری زندگی کا سب سے بہترین دن ہو)۔"
اللہ تعالیٰ اس دعا کو ہم سب کے حق میں قبول فرمائیں۔

اللہ کے مقبول بندوں کے لئے موت کا دن عید کا دن ہے:

اللہ کے مقبول بندوں کے لئے موت کا دن گویا ان کے لئے عید کا دن ہے، شادی کا دن ہے کہ اس سے زیادہ خوشی اور مسرت کا دن ان پر کبھی نہیں آیا، اور بدکاروں اور گناہگاروں کے لئے موت کا دن سب سے برا دن اور سب سے زیادہ بربادی کا دن ہے کہ اس سے زیادہ برا دن ان پر کبھی نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ اس مرحلے کو ہمارے لئے اپنی رحمت سے آسان فرمائے اور ہمیں اس وقت کے لئے تیاری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسری منزل قبر ہے:

خدا خدا کر کے یہ مرحلہ گزرا، اب دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ لوگوں کے کندھوں پر سوار ہوکر یہ جارہا ہے، لیکن جاننے والے جان رہے ہیں کہ دوزخ کی طرف جارہا ہے یا جنت کی طرف جارہا ہے۔

میت کو جلدی دفنانے کی تاکید:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کسی شخص کا انتقال ہوجائے تو اس کے کفن دفن میں جلدی کرو، کیونکہ اگر وہ نیک ہوگا تو تم اس کو خیر کی طرف جلدی سے بھیج دو، تم نے اس کو یہاں کیوں مقید کر رکھا ہے؟ کیوں یہاں پھنسایا ہوا ہے؟ اور اگر برا ہے تو اس مردار کو کیوں رکھا ہوا ہے؟ اس لئے حکم ہے کہ جتنی جلد ہوسکے اس کی تجہیز و تکفین فوراً کردو۔

تدفین میں تاخیر کرنے کی بری رسم:

ہمارے یہاں بہت برا رواج ہے کہ میت کو اٹکائے رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ میت کو روکے رکھو، کیونکہ اس کے عزیز و اقارب اس کا منہ دیکھنے کے لئے انگلینڈ سے آرہے ہیں، دبئ سے آرہے ہیں، لاہور سے آرہے ہیں، فلاں جگہ سے آرہے ہیں، فلاں جگہ سے آرہے ہیں، گویا ان عزیز و اقارب نے آج سے پہلے کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ اور ایک اس سے بدتر رسم یہ ہے کہ کسی شخص کا انگلینڈ میں، امریکہ میں انتقال ہوا، اس کی میت کو پاکستان لانے کے انتظامات ہورہے ہیں اور اس میں بعض اوقات کئی کئی دن لگ جاتے ہیں، یہ تمام چیزیں خلاف شرع ہیں۔

اب اس کے بعد میت کو قبر میں پہنچادیا اور قبر کو اوپر سے بند کردیا گیا، بعض بے وقوف قبر پکی بناتے ہیں، اور بعض قمقمے لگاتے ہیں، بعض قبر پر تختی لگاتے ہیں اور اس پر قبر والے کے القاب و آداب لکھتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ ان باتوں کا کیا فائدہ؟ اس کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے وہ تو اندر ہو رہا ہے، اندر کتنی تاریکی ہے؟ اندر کتنا اندھیرا ہے؟ اس کا تو کوئی علاج کرو، اوپر سے دیئے جلانے کا کیا فائدہ؟ اکبر الہ آبادی کے بقول:

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے!
تہہ خاک ہم تو اکیلے رہیں گے!

(ہفت روزہ ختم نبوت کراچی ج:۱۵ ش:۱۱)۔

شاہراہِ انسانیت کی
روشن قندیلیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

معلّم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ نبوت سے رشد و ہدایت کی جو شمعیں روشن ہوئیں اور صاحب خلق عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی اقتدا سے جن سعادت مندوں کے قلب و قالب پر صبغۃ اللہ کا رنگ چڑھا، ان کا وجود سراپا خیر و برکت، ان کی زندگی انسانیت کے لئے مایۂ فخر اور ان کا نقش پا قافلہ انسانیت کے لئے نشان منزل ہے۔ ان اکابر نے ایثار و قربانی، ہمدردی و خیرخواہی، صبر و شکر، زہد و قناعت، ورع و تقویٰ اور اعلیٰ انسانی اقدار کا جو بلند معیار قائم کیا اسے ''شاہراہِ انسانیت کی روشن قندیلیں'' کہئے تو بجا ہے اور ملت مسلمہ کے لئے مینارۂ نور کہئے تو درست۔

ان مقبولانِ بارگاہِ خداوندی کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے اور ان کے حالات و واقعات ان کی صحبت کا بدل ہیں اور ان کی صحبت بارگاہِ قدس میں حاضری، بقول عارف رومی قدس سرہ:

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا
گو نشیند در حضورِ اولیا

وفا ومروّت:

مولانا غلام علی آزادؒ، میر سید طیبؒ کے حالات میں لکھتے ہیں: شیخ عبدالحق (محدث) دہلوی قدس سرہ اور حضرت میر طیبؒ کے مابین بڑ گہرا دوستانہ تعلق تھا، شیخ عبدالحق قدس سرہ برعایت بزرگی انہیں ''شیخ طیب'' کہا کرتے تھے، شیخ عبدالحق قدس سرہ پیرانہ سالی کے زمانے میں کسی کتاب کا درس دے رہے تھے کہ کسی مقام میں شیخ کو تامل ہوا، شیخ نے حضرت میرؒ کو یاد کرکے فرمایا: ''اگر شیخ طیب اس وقت موجود ہوتے تو اس مقام کو آسانی سے حل کر دیتے۔'' ادھر شیخ کے منہ سے یہ بات نکلی اور ادھر حضرت میر طیبؒ جو وطن مالوف (بلگرام) سے بقصد دہلی تشریف لا رہے تھے، کمربستہ شیخ کی خدمت میں پہنچ گئے، شیخ بہت خوش ہوئے، انہیں خوش آمدید کہی اور فرمایا: ''ہم تو آپ کو یاد ہی کر رہے تھے۔'' قصہ بیان فرمایا، کتاب پیش کی گئی، حضرت میر سید طیبؒ نے کتاب ہاتھ میں لے کر قدرے تامل کیا اور پھر ''عبارت رانہج خواند کہ مطلب بے آنکہ تقریر کنند خودبخود واضح گشت۔'' عبارت اس انداز سے پڑھی کہ مطلب بغیر تقریر کے آپ سے آپ واضح ہوگیا۔

شیخ نے فرط مسرت میں حاضرین سے فرمایا: ''دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ شیخ طیب اس مقام کو باآسانی حل کر سکتے ہیں۔

مولانا آزادؒ آگے لکھتے ہیں:

> ''شیخ عبدالحق کے صاحبزادے شیخ نورالحق ان دنوں بادشاہ وقت کے اصرار سے دارالحکومت آگرہ میں منصب قضا پر فائز تھے، شیخ عبدالحقؒ نے میر سید طیبؒ سے دریافت کیا: ''کس راستے سے آنا ہوا؟''، ''آگرہ کے راستے سے!''، ''نورالحق سے بھی ملاقات ہوئی؟''، ''جی نہیں! موانع سفر سے ملاقات کا موقع

نہ مل سکا۔"

ظاہر ہے کہ میر سیدؒ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے تھے۔

شیخ نے فرمایا: "بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ وہ قضا کا مرتکب ہے، اس لئے اعراض فرمایا گیا، بعد ازاں شیخ نے فرزند ارجمند کی شان میں کچھ توصیفی کلمات فرمائے کہ وہ اگرچہ میرا بیٹا ہے مگر ہے باپ کی جگہ، اگرچہ میرا شاگرد ہے، مگر بجائے استاذ کے ہے، اور اگرچہ میرا مرید ہے مگر بمنزلہ مرشد کے سمجھتا ہوں۔"

میر سیدؒ نے اس دوستانہ شکوہ کا کیا اثر لیا؟ وہ خود مولانا آزاد بلگرامیؒ کی زبان سے سنئے:

"میر سید طیبؒ از پیش شیخ برخاست بعنوانے کہ گویا برائے کمر وا کردن می رود، اطلاع شیخ ہما طور کمربستہ بہ رجع القہقہری گرفت و با شیخ نور الحق ملاقات کردہ برگشت۔

شیخ عبدالحق از حسن خلق میر خیلے خوشنود گرچہ معذرتہا بر زبان آورد۔" (مآثر الکرام ص:۲۶)

ترجمہ:...... "میر سید طیبؒ شیخ کے پاس ایسے اٹھے گویا کمر جو باندھ رکھی تھی، اسے کھولنے جا رہے ہیں اور شیخ کو اطلاع کئے بغیر اسی طرح بندھی بندھائی الٹے پاؤں آگرہ کی راہ لی نور الحق سے ملاقات کر کے واپس آئے۔

شیخ عبدالحقؒ حضرت میرؒ کے حسن خلق سے بہت خوش ہوئے اور دیر تک معذرت کرتے رہے۔"

گھر کی بات بازار میں:

انہی میر سید طیب قدس سرہ کے تذکرہ میں مولانا غلام علی آزادؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک دن ایک بزرگ، میر سیدؒ کی مشتاقانہ زیارت کو آئے، دوران گفتگو ''مشکلے از مسائل توحید پرسید۔'' (مسائل توحید کا کوئی نازک مسئلہ پوچھ بیٹھے) مگر حضرت میرؒ طرح دے گئے اور باندازِ تجاہل فرمایا: ''مجھے اس مسئلے کی خبر نہیں۔'' اور اس امر کی مطلق پروا نہیں کی کہ لوگوں کے حسن عقیدت کو ٹھیس پہنچے گی۔ یا کوتاہ علمی کا یہ اعتراف لوگوں کی نظر سے انہیں گرادے گا۔ بہر حال مجلس ختم ہوئی اور خلوت میسر آئی تو حضرت میرؒ نے مہمان سائل سے فرمایا: ''گھر کی بات بازار میں نہیں کہا کرتے، ہاں اب پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' (مآثر الکرام ص:۴۶)

اشراف نفس:

مولانا غلام علی آزاد رحمۃ اللہ علیہ، میر مبارک محدث بلگرامی قدس سرہ کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''استاذ المحققین میر طفیل محمد بلگرامی طاب ثراہ فرماتے تھے کہ ایک روز حضرت میر (سید مبارکؒ) کی خدمت میں باریاب ہوا، وضو کے ارادے سے اٹھے تھے کہ اچانک زمین پر گر گئے۔ میں اٹھ کر پاس گیا کچھ دیر کے بعد افاقہ ہوا تو میں نے سبب دریافت کیا، تو بتانے سے گریز فرمایا بالآخر بڑے اصرار کے بعد فرمایا کہ تین دن سے کسی قسم کی کوئی غذا حلق سے نیچے نہیں اتری۔ ان تین دنوں میں نہ کسی سے اس فاقہ کا اظہار کیا نہ قرض لیا۔ مجھ پر بڑی رقت طاری ہوئی، وہاں سے فوراً اپنے مکان پر پہنچا اور نہایت عمدہ کھانا جو حضرتؒ کو مرغوب تھا،

تیار کیا اور لے کر حاضر خدمت ہوا، پہلے تو بہت ہی مسرت و بشاشت کا اظہار فرمایا اور بڑی دعائیں دیں بعد ازاں فرمایا: ''اگر تمہیں ناگوار نہ ہو تو ایک بات کہوں؟'' عرض کیا ضرور۔

فرمایا: ''ایسے کھانے کا نام فقراءؒ کی اصطلاح میں ''طعام اشراف'' ہے، ہر چند کہ فقہاءؒ کے نزدیک اس کا کھانا جائز ہے اور شریعت میں تین دن کے بعد تو مردار بھی حلال ہے، مگر طریقہ فقراءؒ میں ''طعام اشراف'' کا کھانا جائز نہیں۔''

میں نے حضرت کا یہ ارشاد سنا تو بغیر کسی رد و قدح اور چون و چرا کے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور کھانا اٹھا کر باہر لے آیا، تھوڑی دیر توقف کے بعد کھانا لے کر پھر حاضر ہوگیا اور عرض کیا کہ جب بندہ اس کھانے کو اٹھا کر لے گیا تھا، تو کیا حضرت کو یہ توقع تھی کہ دوبارہ واپس لائے گا؟ فرمایا: نہیں! عرض کیا: اب تو یہ حضرت کی توقع کے بغیر آیا ہے اس لئے ''طعام اشراف'' نہیں رہا۔ حضرت میرؒ اس تاویل سے بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ: تم نے عجیب فراست سے کام لیا، چنانچہ اس کھانے کو بہ رغبت تمام تناول فرمایا۔'' (مآثر الکرام ص:۸۸، ۸۹)

فائدہ:...... ''اشراف'' کے معنی ہیں کسی چیز کو اوپر سے جھانک کر دیکھنا، اور جب کسی چیز کے حصول کو دل للچائے، یا کسی شخص سے کسی چیز کے حاصل ہونے کی توقع ہو تو اس کو ''اشراف نفس'' کہتے ہیں، اور یہ اصطلاح مندرجہ ذیل احادیث سے لی گئی ہے:

''عن حکیم بن حزام قال: سألت رسول الله صلی الله علیه وسلم فاعطانی، ثم سألته فاعطانی، ثم

قال لی: یا حکیم! ان ھٰذا المال خضر حلو، فمن اخذہٗ بسخاوۃ نفسٍ بورک لہٗ فیہ، ومن اخذہٗ باشراف نفسٍ لم یبارک لہٗ فیہ، وکان کالذی یأکل ولا یشبع، والید العلیا خیر من الید السفلیٰ. قال حکیم: فقلت: یا رسول اللہ! والذی بعثک بالحق! لا ازرأ احدًا بعدک شیئًا حتیٰ اُفارق الدنیا. متفق علیہ.“ (مشکوٰۃ ص:۱۶۲)

ترجمہ:..... ”حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دستِ سوال دراز کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مال عطا کردیا، میں نے دوبارہ سوال کیا، پھر عطا فرمایا۔ پھر ارشاد فرمایا: ”اے حکیم! یہ مال بڑا سرسبز، دل فریب اور شیریں ہے، جو شخص اس کو سیر چشمی کے ساتھ لے اس کے لئے تو اس مال میں برکت ہوگی، اور جو نفس کی حرص وطمع (اشرافِ نفس) کے ساتھ لے، اس کے لئے مال میں کبھی برکت نہ ہوگی اور اس کی حالت جوع البقر کے اس مریض کی ہے جو کھاتا جائے، مگر پیٹ نہ بھرے اور اوپر کا ہاتھ (یعنی دینے والا) بہتر ہے نیچے کے ہاتھ سے (یعنی لینے والے سے)۔“

ایک اور حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

”عن عمر بن الخطاب قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعطینی العطاء، فاقول اعطِہ افقر الیہ منی! فقال: خذہ فتمولہ وتصدق بہٖ، فما جاءک من ھٰذا المال وانت غیر مشرف ولا سائل فخذہٗ، وما لا

تتبعُهٗ نفسک. متفق علیه.'' (مشکوٰۃ ص:۱۶۲)

ترجمہ:.......''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے مال کا کچھ عطیہ دیتے، تو میں عرض کرتا کہ کسی ایسے شخص کو دیجئے جو مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا حرج ہے، اس کو لے لو، اپنے پاس رکھو اور صدقہ خیرات کرو۔ (بعد ازاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصولی ضابطہ بیان فرمایا کہ) جو مال بغیر طمع نفس اور سوال کے تیرے پاس آجائے اس کو لے لیا کرو اور جو اس شرط پر پورا نہ اترے، اس کے پیچھے رال نہ ٹپکاؤ۔''

ان احادیث میں تصریح فرمائی گئی ہے کہ جس طرح بغیر ضرورت و اضطرار کے سوال کرنا جائز نہیں، اسی طرح کسی کی چیز پر نظر رکھنا، اس کے حصول کی حرص اور طمع رکھنا بھی ناپسندیدہ ہے اور اس طرح جو مال حاصل ہو، وہ کبھی خیر و برکت کا موجب نہیں ہوتا، اس سے نفس کو تسکین نہیں ہوتی بلکہ اس کی جوع البقر میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ الغرض شریعت میں زبان کا سوال جس طرح ناجائز ہے، اسی طرح دل کا سوال بھی مکروہ ہے، اسی کو ''اشراف نفس'' کہتے ہیں، جس سے بچنے کا اہل اللہ کے یہاں خاص اہتمام ہے۔

ایک پیسہ اور دو کام:

میر سید مبارک محدث بلگرامی قدس سرہ ہی کا ایک اور واقعہ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح نقل کیا ہے کہ موصوف نے اپنے قدیم محلّہ ''سیدواڑہ'' سے ترک سکونت کر کے شہر کی مشرقی جانب ایک میدان میں سکونت اختیار کر لی تھی، وہاں رعایا آباد کی، مسجد بنوائی، رہائشی مکانات بنوائے اور چوروں اور درندوں سے حفاظت کے

لئے آبادی کے گرد پختہ دیوار بنوائی۔ اس بستی میں بیشتر نور بافوں کو آباد کیا، کیونکہ وہ اکثر دیندار اور نمازی ہوتے ہیں، اور تمام آبادکاروں کے لئے قانون مقرر کردیا کہ پنجگانہ نماز باجماعت مسجد میں ادا کیا کریں۔ ایک جولاہے نے عذر کیا کہ میں پنج وقتہ حاضری سے معذور ہوں، میر رحمۃ اللہ علیہ نے وجہ دریافت کی تو جولاہا بولا: جتنی دیر نماز کو جاتا ہوں، کام میں حرج ہوتا ہے اور اجرت میں نقصان۔ حضرت میرؒ نے پوچھا کہ روزانہ نماز کے وقت کام بند رہنے سے کتنی کمی واقع ہوجاتی ہے؟ جواب دیا کہ ایک پیسہ! حضرت میرؒ نے فرمایا: ایک پیسہ ہم سے لے لیا کرو مگر نماز پڑھا کرو، اس نے قبول کرلیا۔

ایک روز یہ جولاہا مسجد میں آیا اور وضو کئے بغیر نماز میں کھڑا ہوگیا، حضرت میرؒ نے ڈانٹا کہ بغیر وضو کے نماز پڑھتے ہو؟ جواب دیا ایک پیسے میں دو کام نہیں ہوسکتے کہ وضو بھی کروں اور نماز بھی پڑھوں، حضرتؒ کو بے اختیار ہنسی آئی اور وضو کے لئے مزید ایک پیسے کا اضافہ فرمادیا۔

دعوت وتبلیغ کا ایک اہم اصول:

یہ تو خیر ایک لطیفہ ہوا، مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ مولانا آزادؒ نے آگے لکھا ہے:

> ”رفتہ رفتہ حائک را رغبت دلی در نماز بہم رسید، واز تقاضائے اجرت درگزشت۔“ (مآثر الکرام ص:۹۷)

یعنی وہ مسکین جولاہا جو نماز کے علاوہ وضو کے لئے الگ پیسے کا مطالبہ کرتا تھا، رفتہ رفتہ ظاہر کا اثر اس کے باطن پر ہوا، نماز اس کے قالب سے قلب تک پہنچ گئی، اور جو نماز صرف ایک پیسے کے لالچ میں پڑھی جارہی تھی وہی بالآخر دلی رغبت کے ساتھ ادا ہونے لگی، اور یوں اس کے اجر ومزدوری کا معاملہ بجائے میر صاحب کے براہ راست اس ذات عالی سے طے ہوگیا جس کی نماز پڑھانا مقصود تھی۔

بظاہر جو نماز ایک پیسے کے بدلے پڑھی پڑھائی گئی وہ ایک پیسے کی بھی نہیں تھی لیکن شروع ہی سے اسے یہ مسئلہ سمجھایا جاتا تو بعید نہیں وہ تمام عمر نماز سے محروم رہتا، مگر حضرت میر قدس سرہ نے حکیمانہ تدریج سے اسے نماز کا عادی بنادیا۔ اس تدریجی حکمت سے کم ہمتوں کی ہمت بڑھانا اور بے راہوں کو راہ پر ڈالنا اسوۂ نبوت ہے۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ بنوثقیف کا وفد بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہوا تو انہوں نے اسلام لانے کے لئے یہ شرط رکھی کہ نہ تو انہیں کبھی جہاد کے لئے بلایا جائے گا، نہ ان سے زکوٰۃ وعشر لیا جائے گا اور نہ انہیں نماز پڑھنے کے لئے کہا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں جہاد وعشر کی معافی دی جاتی ہے، رہی نماز تو اس کی معافی نہیں ہوسکتی کیونکہ اس دین میں ذرا بھی خیر نہیں جس میں نماز نہ ہو: "فانه لا خير في دين لا ركوع فيه."

دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد وعشر کی معافی کی شرط پر ان کا اسلام قبول فرمایا، مگر ساتھ ہی فرمایا کہ یہ لوگ اسلام لے آئیں تو خود بخود صدقہ بھی ادا کریں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ (ابوداؤد ص:۴۶۸)

مولانا بدر عالم نوراللہ مرقدہ پہلی روایت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"امام موصوف (خطابی) کا خیال ہے کہ جہاد اور زکوٰۃ کا استثنا بھی یہاں صرف صورتاً تھا، کیونکہ جہاد ہمیشہ فرض نہیں ہوتا، زکوٰۃ بھی نصاب اور حولان حول پر موقوف ہوتی ہے، اس لئے سردست ان کو ان دونوں سے سبکدوش کیا جاسکتا تھا، رہی نماز تو وہ ایک ایسی عبادت تھی جسے دن میں پانچ بار ادا کرنا ہر شخص پر فرض ہے، اس کا استثنا کسی کے حق میں گوارا نہیں کیا جاسکتا، نیز اس وفد بنوثقیف کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ

یقین حاصل ہوچکا تھا کہ آئندہ چل کر وہ اپنے شوق سے صدقہ بھی کریں گے اور جہاد بھی کریں گے، ایسی صورت میں ان کے ساتھ لفظی مناقشہ کرنا غیر مناسب تھا۔''

(معالم السنن ج:۳ ص:۳۵)

اور دوسری روایت کے تحت لکھتے ہیں:

''اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک مبلغ کے لئے اصل مقاصد کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اور لفظی مناقشات کرنا نامناسب ہے، بعض مرتبہ صرف لفظی گرفتوں سے اصل مقاصد ہی فوت ہوجاتے ہیں۔'' (ترجمان السنہ ج:۲ ص:۴۰)

اسی نوعیت کی ایک اور حدیث ابوداؤد، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں بالفاظ مختلفہ مروی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت فضالہ لیثی رضی اللہ عنہ بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہوکر مشرف باسلام ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز، روزہ اور شرائع اسلام کی تعلیم فرمائی اور نماز پنجگانہ کی محافظت کا حکم فرمایا، انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں ان اوقات میں کچھ زیادہ ہی مشغول ہوتا ہوں، بس کوئی جامع بات، جو کافی وشافی ہو، مجھے بتادیجئے! فرمایا: بہت اچھا! ''عصرین'' کی پابندی کیا کرو۔ یہ لفظ انہوں نے پہلی بار سنا تھا، عرض کیا: یا رسول اللہ! ''عصرین'' سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: سورج نکلنے سے پہلے کی نماز اور سورج ڈوبنے سے پہلے کی نماز۔

(ابوداؤد ص:۶۱، ترجمان السنہ ص:۴۶)

اس حدیث پر اشکال کیا گیا ہے کہ پانچ نمازوں کے بجائے ان صاحب کو فجر اور عصر کی پابندی کا حکم کیسے فرمایا؟ علماء نے اس حدیث پر متعدد پہلوؤں سے کلام کیا ہے، مگر سب سے آسان بات وہی ہے جو اوپر عرض کی گئی، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تدریجی حکمت کو اس میں ملحوظ رکھا ہے، آپؐ نے جب انہیں پنج وقتہ نماز کی

نگہداشت کا حکم فرمایا اور انہوں نے ان اوقات میں اپنی شدید مصروفیت کا عذر کیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ مصروفیت کی بنا پر کبھی دیر سویر ہوگئی تو وعدہ شکنی ہوگی، اس لئے کوئی ایسی جامع بات بتایئے جس کو پورے طور پر نبھا سکوں اور وعدہ خلافی نہ ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بگڑ کر کہتا کہ بندہ خدا! ایسی مصروفیت کون سی ہے جو نماز سے زیادہ اہم ہو؟ مگر نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہوں) ان کے اس عذر پر جرح کرنا خلافِ حکمت سمجھا، اور اس کے بجائے انہیں ''عصرین'' کی پابندی کا حکم فرمایا، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ان دو نمازوں کو اگر ٹھیک وقت پر مسجد میں باجماعت ادا کرنے کا التزام کرلیا جائے (اسی کو محافظت کہتے ہیں) تو باقی تین نمازوں کی محافظت کچھ بھی مشکل نہیں رہتی، گویا ''عصرین'' کی پابندی کا حکم بجائے خود پنج وقتہ کی پابندی کی تمہید یا اس کا پہلا زینہ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے نومسلم کو جو ابھی چند لمحے پہلے اسلام سے آشنا ہوا، اسی تدریجی سیڑھی کے ذریعہ اسلام کی آخری بلندی اور اس کی انتہائی معراج تک لے جانا چاہتے تھے۔

(ہفت روزہ ختم نبوت کراچی ج:۱۵ ش:۱۹)

اصلاحی مواعظ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

جلد ششم

قرابت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا فائدہ
مہاجرین رضی اللہ عنہم وانصار رضی اللہ عنہم کی فضیلت
خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ
آداب تعلیم وتربیت
جھگڑے کے اسباب
صبر، تمام مسائل کا علاج ہے
جھوٹی گواہی، بدترین سود اور شرک
ظلم وستم اور حرص کے نقصانات
کمزور اور مظلوم کی مدد کرنا
عذاب الٰہی سے بچاؤ کی صورت

مکتبہ لدھیانوی

اصلاحی مواعظ

جلد ششم

شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ لدھیانوی

قانونی مشیر اعزازی: ــــ منظور احمد میوایڈووکیٹ ہائی کورٹ

اشاعت اول: ــــــ اکتوبر ۲۰۰۳ء

کمپوزنگ: ــــــــ صدیقی کمپوزرز، ماڈل کالونی، کراچی

فون: 0320-4084547,4504007

ناشر: مکتبہ لدھیانوی

18- سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن، کراچی

برائے رابطہ: جامع مسجد باب رحمت

پرانی نمائش، ایم اے جناح روڈ، کراچی

پوسٹ کوڈ: 74400 فون: 7780337

اصلاحی مواعظ

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

۱۳ر صفر ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۸ر مئی ۲۰۰۰ء کی گرم دوپہر بظاہر ہمارے لئے نہایت مایوس کن اور خزاں رسیدہ تھی، اس دن ہمارے ابرِ گوہر بار، شجرِ سایہ دار، مشفق و مربی حضرت اقدس حکیم العصر مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ ہم سب کو اس دنیا کے لق ودق صحرا میں یکہ وتنہا چھوڑ کر عالم بالا کو تشریف لے گئے تھے۔ اس دن ایسا محسوس ہوا کہ اب ہم سے کوئی کام نہیں ہوسکے گا اور حضرتؒ کے علوم و معارف کی امانت کی اشاعت وترویج اور تدوین وتحقیق کا کام معرضِ التوا میں پڑ جائے گا۔ ہم پریشان تھے کہ اس راہ کی مشکلات کا حل کس سے پوچھیں گے؟ ہماری راہ نمائی کون کرے گا؟ ہم اپنے مسائل کس کے سامنے پیش کریں گے؟ اور آئندہ کے منصوبوں کی تکمیل کیونکر ہوگی؟ لیکن حضرت جی مولانا محمد یوسف دہلویؒ کے ارشاد: ''لینے والا ہاتھ بدلا ہے، دینے والا تو وہی ہے!'' کے مصداق دینے والے نے اپنے فضل وکرم اور منت و احسان میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔

بلاشبہ یہ ہمارے حضرت شہیدؒ کی کرامت اور مقبولیت عنداللہ کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کی لاج رکھی اور ہم ایسے ضعفاً اور جہلائے مطلق خدام کی

ایسی دستگیری فرمائی کہ اس نے حضرتؒ کے جاری فرمودہ تمام امور میں ہماری بھرپور مدد فرمائی، بلاکسی ایک لحہ کے تعطل کے وہ سارے کام ٹھیک اسی طرح چلائے رکھنے کی توفیق عطا فرمائی، جس طرح حضرتؒ کی حیاتِ مبارکہ میں چل رہے تھے۔ چنانچہ یہ محض اسی ذاتِ کبریا کا فضل و کرم ہے کہ آج ہم اپنے حضرت شہیدؒ کی روح کے سامنے شرمندہ ہونے کے بجائے، بحمداللہ سرخرو ہیں، اور آپ کی دوسری تصانیف کی اشاعت و ترویج کے ساتھ ساتھ آپ کے اصلاحی مواعظ کی جلد ششم کی تکمیل کی سعادت بھی حاصل کر رہے ہیں۔ حضرتؒ کی حیات میں اگرچہ اس سلسلہ کی صرف جلد اول ہی معرضِ وجود میں آسکی تھی، لیکن آج اس کی چھٹی جلد ٹھیک اسی آب و تاب اور معیاری تحقیق و تخریج کے ساتھ قارئین کے ہاتھوں میں ہے، جس کی بنیاد حضرت شہیدؒ نے رکھی تھی۔

نہایت بے انصافی اور بخل ہوگا اگر میں اپنے رفیقِ کار برادرِ عزیز مولانا محمد اعجاز صاحب کی شبانہ روز محنت اور انتھک کوشش کا تذکرہ نہ کروں، جنہوں نے اصلاحی مواعظ کی تحقیق و تخریج میں میرے دست و بازو کا کردار ادا کیا۔ اسی طرح بھائی عبداللطیف طاہر صاحب اور عزیز حافظ عتیق الرحمٰن لدھیانوی صاحب کا تعاون بھی قابل ذکر ہے، جنہوں نے اس کی تصحیح، پیسٹنگ اور طباعت کے مراحل کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں درخواست ہے کہ وہ ہماری اس ناچیز سعی و کوشش کو قبول فرماکر ہماری مغفرت و نجات، قارئین کی ہدایت و راہ نمائی اور ہمارے حضرت شہیدؒ کی بلندیٔ درجات کا ذریعہ بنائے، آمین!

خاکپائے حضرت لدھیانوی شہیدؒ

سعید احمد جلال پوری

۱۴۲۲/۸/۲۷ھ

فہرست مواعظ

فہرست

①

قرابت نبویؐ کا فائدہ

مہاجرینؓ وانصارؓ کی فضیلت ۷۵

۴

مؤمن کی صفات

۶

معاشرہ کی اچھائی اور برائی کا معیار ۱۳۵

(۸)

آدابِ تعلیم و تربیت

۹

قلوب کی اقسام ۱۹۱

۱۰

جھگڑے کے اسباب ۲۰۷

(۱۱)

(۱۲)

(۱۵)

کمزور اور مظلوم کی مدد کرنا ۳۰۵

قرابت نبویؐ

کا

فائدہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

''عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ عَلَی الْمِنْبَرِ: مَا بَالُ رِجَالٍ یَقُوْلُوْنَ اَنَّ رِحْمَ رَسُوْلِ اللہِ لَا تَنْفَعُ قَوْمَہٗ، بَلٰی وَاللہِ! اِنَّ رِحْمِیْ مَوْصُوْلَۃٌ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ، وَاِنِّیْ اَیُّھَا النَّاسُ فَرَطٌ لَّکُمْ عَلَی الْحَوْضِ فَاِذَا جِئْتُمْ قَالَ رَجُلٌ: یَا رَسُوْلَ اللہِ! اَنَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ، وَقَالَ اَخُوْہُ: اَنَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ، قَالَ لَھُمْ: اَمَّا النَّسَبُ فَقَدْ عَرَفْتُہٗ وَلٰکِنَّکُمْ اَحْدَثْتُمْ بَعْدِیْ وَارْتَدَدْتُّمُ الْقَھْقَرٰی۔'' (مسند احمد ج:۳ ص:۱۸)

ترجمہ:...... ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: کیا حال ہے ان لوگوں کا جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ قیامت کے دن نفع نہیں

دے گا، کیوں نہیں؟ اللہ کی قسم! بے شک میرا رشتہ ابد تک ملایا گیا ہے، دنیا میں اور آخرت میں، اور بے شک میں اے لوگو! تمہارا پیشوا ہونگا قیامت کے دن حوض پر، اور بے شک جب تم آؤ گے، ایک آدمی کہے گا: یا رسول اللہ! میں فلاں بن فلاں ہوں، اور دوسرا کہے گا: میں فلاں بن فلاں ہوں۔ میں کہوں گا کہ نسب کو تو میں جانتا ہوں، لیکن تم نے میرے بعد نئی نئی باتیں ایجاد کیں اور تم الٹے پاؤں لوٹ گئے تھے۔''

یہ مسند احمد کی روایت ہے، اس حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ ذکر کیا گیا ہے، اور اس میں دو مضمون ہیں۔

دنیا و آخرت میں آپ کا رشتہ کام آئے گا:

پہلا مضمون: یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ قیامت کے دن کام نہیں دے گا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا کہ: کیا بات ہے کہ بعض لوگ یوں باتیں کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ قیامت کے دن کام نہیں دے گا۔ حالانکہ میرا رشتہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ملایا گیا ہے۔ جس کو ہم ''صلہ رحمی'' کہتے ہیں۔

''رحم'' کہتے ہیں رشتہ کو، اور ''صلہ'' کے معنی ہیں ملانا، رشتہ کو جوڑنا، یا یہ کہ رشتہ کی رعایت کرنا، اس کے حقوق بجا لانا، اس کو ''صلہ رحمی'' کہتے ہیں، تو مطلب یہ ہوا کہ میرے رشتے کے حقوق کی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی رعایت رکھی جائے گی اور ان کو بجا لایا جائے گا۔

آپؐ کے رشتہ کے کام نہ آنے کا مطلب:

جن حضرات نے یہ کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ قیامت کے دن کام نہیں دے گا، ان کی بات اپنے اعتبار سے ٹھیک تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پر خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دعوت دی تھی، اور اس میں فرمایا تھا کہ: "لَا اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِنَ اللہِ شَیْئًا." یعنی میں قیامت کے دن تمہارے کوئی کام نہیں آؤں گا، اور اپنی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ: "اے صفیہ بنت عبدالمطلب! قیامت کے دن میں تیرے کام نہیں آؤں گا۔"

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ:

> "وَیَا فَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ! سَلِیْنِیْ مَا شِئْتِ مِنْ مَّالِیْ، لَا اُغْنِیْ عَنْکِ مِنَ اللہِ شَیْئًا." (مشکوٰۃ ص:۴۶۰)
>
> ترجمہ:....."اے فاطمہ بنت محمد! جو کچھ مانگنا چاہتی ہے، مجھ سے مانگ، میں دوں گا، لیکن قیامت کے دن میں تیرے کام نہیں آؤں گا۔"

تو اس حدیث شریف کا یہی مقصد ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا رشتہ قیامت کے دن کام نہیں دے گا، اور یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے، لیکن مطلقاً نہیں، بلکہ ایک قید کے ساتھ۔

وہ یہ کہ جو شخص اپنے عمل یا کفر کی وجہ سے مستحق نار ہو، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ کوئی کام نہیں دے گا، جو شخص کافر مرا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ دار تھا یا آپ کی فرض کرو اولاد میں سے تھا (نعوذ باللہ!) ایمان پر خاتمہ نہیں ہوا، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ کوئی کام نہیں دے گا۔

اسی طرح جو شخص بدکردار ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ دار ہو، تو اس کے بارے میں بھی مسئلہ کچھ گڑبڑ ہی ہے، مسلمان ہو، لیکن بدکردار ہو، اللہ تعالیٰ اس کو معاف کردیں تو دوسری بات ہے۔ اس کے علاوہ جو شخص مسلمان ہو اور اپنے طور پر نیکی کی بھی کوشش کرتا ہو، اس کو قیامت کے دن ان شاءاللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ کام دے گا۔

صرف نسب سے نہیں ایمان و عمل سے مغفرت ہوگی:

یہاں پر دو چیزوں کی اصلاح ضروری ہے:

ایک یہ کہ بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ کے معاملہ میں اتنا غلو کیا ہے کہ اس کے بعد وہ کسی عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے، اگر سید نہ ہوں تو زبردستی سید بن بیٹھتے ہیں اور شیطان نے یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ بس تم آلِ رسولؐ ہو، تمہیں عمل کی کیا ضرورت ہے؟ بخشے بخشائے ہو، یہ نہایت غلط بات ہے، اور بہت سے لوگوں میں تو یہ چیز گمراہی کا سبب بنی ہوئی ہے۔

شیعہ داڑھی کیوں نہیں رکھتے؟

شیعوں کو سنت سے عداوت ہے، یہ اکثر جو اپنے آپ کو ''شیعہ'' کہتے ہیں وہ ''سید'' بن جاتے ہیں۔ عقائد ان کے صحیح نہیں، اعمال ان کے صحیح نہیں، رَوِش ان کی صحیح نہیں، سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو اہتمام نہیں، لیکن فخر کرتے ہیں کہ ہم ''آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' ہیں۔ میری ایک کتاب ہے ''شیعہ سنی اختلافات اور صراطِ مستقیم'' جو دراصل میں نے محسن اجتہادی صاحب کے خط کے جواب میں لکھی ہے، اس میں میں نے چلتے چلتے یہ بات لکھ دی ہے کہ آپ لوگوں کو دعویٰ تو ہے ائمہ اہل بیت کی محبت کا، لیکن تم نے شکل تو ان جیسی بنائی نہیں، اس پر میں نے مُلاَّ باقر مجلسی کی کتاب سے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے۔

ملا باقر مجلسی:

ملا باقر مجلسی دسویں صدی کا شیعوں کا بہت بڑا مجتہد اعظم ہے، اس نے ''بحار الانوار'' کے نام سے ۲۵ جلدوں میں ایک کتاب لکھی تھی، اتنی موٹی موٹی جلدیں پرانے زمانے کی اور جہازی سائز کی، اب وہ ایران سے نئے انداز میں چھپ گئی ہے، لیکن شیعہ اس میں سے آٹھویں جلد غائب کر گئے ہیں، اس نے ''فتن'' کے نام سے لکھی تھی، یعنی ان حالات پر جو بقول اس کے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں فتنہ ہوئے، باقی ۲۴ جلدیں ہیں، یہ ۲۴ جلدیں ۱۰۷ جلدوں میں آئی ہیں، اور ۳ جلدیں اس کی صرف فہرست کی آئی ہیں، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱۔ اور یہ مکمل ۱۱۰ جلدوں کا سیٹ ہے، جیسا کہ میں نے کہا کہ اس کی آٹھویں جلد جو بڑی تھی، اس کو وہ ہضم کر گئے ہیں، اس کی کم از کم ۸ جلدیں الگ سے تو بنتیں۔

داڑھی منڈے ایرانیوں سے آپؐ کا اعراض:

چنانچہ میں نے ملا باقر مجلسی کے حوالہ سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایران کے سفیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کی داڑھی مونڈھی ہوئی تھی، یہ بات ہماری کتابوں میں بھی موجود ہے، ''البدایہ والنہایہ'' میں اور سیرت کی دوسری کتابوں میں موجود ہے، اور میرا چھوٹا سا رسالہ ہے ''داڑھی کا مسئلہ'' اس میں بھی میں اپنی کتابوں کے حوالے سے نقل کر چکا ہوں، لیکن یہاں شیعوں سے گفتگو ہو رہی تھی، تو میں نے مُلّا باقر مجلسی کی کتاب سے یہ ہی واقعہ نقل کیا کہ ایران کے دو سفیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تھے، یہ اصل میں ایرانی نہیں تھے، بُصریٰ کے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ شاہِ ایران پرویز کو پہنچا ہے، تو اس نے بُصریٰ کے گورنر کو خط لکھا کہ: میرے پاس (یثرب) مدینہ سے ایک صاحب کا خط آیا ہے اور اس نے میری شان میں یہ گستاخی کی ہے۔ میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ دو آدمی

بھیجو اور اس کو پکڑ کر لاؤ، گرفتار کر کے لاؤ۔ تو بُصریٰ کے گورنر نے دو آدمی بھیجے، جب یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی داڑھیاں مونڈھی ہوئی تھیں اور مونچھیں بڑی بڑی تھیں، جیسے ہمارے ہاں خان صاحبوں کی ہوتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ: "وَيْلَكُمَا!" تمہارا ناس ہوجائے! یہ تم نے اپنی شکل کیوں بگاڑ رکھی ہے؟ انہوں نے کہا: "قَدْ اَمَرَنَا رَبُّنَا!" یعنی کسریٰ ہمارے رب نے یعنی شاہِ کسریٰ نے اس کا حکم دیا ہے کہ داڑھی صاف کر کے رکھا کرو اور مونچھیں بڑی بڑی رکھا کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "لیکن میرے رب نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں داڑھی بڑھاؤں اور مونچھیں کٹواؤں۔" پھر فرمایا کہ: "میری مجلس سے اٹھ جاؤ، میں تم سے بات نہیں کرتا، میرا نمائندہ تم سے بات کرے گا، بالواسطہ بات کروں گا۔"

شیعہ عوام کیا خواص بھی حضرات حسنینؓ کی شکل نہیں اپناتے:

تو میں نے محسن اجتہادی کو لکھا کہ تمہارے شیعہ عوام نہیں، بلکہ مولوی بھی دیکھے ہیں، کوئی ایسا ہوگا جس نے داڑھی رکھی ہوئی ہو؟ اور جس کی شکل حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما جیسی ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات تو وہ نہیں کرتے، صرف حسن و حسین اور مولا علی، بس! کبھی ان کی مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل بہت کم اس کا حوالہ ملے گا۔

شیعوں کے ہاں بھولے سے بھی حدیث رسولؐ کا تذکرہ نہیں ہوتا:

میں نے ان کی کتابیں پڑھی ہیں، دفاتر کے دفاتر پڑھے ہیں، کہیں کوئی بھولے سے رسول اللہ کی بات آجائے تو آجائے، ورنہ ضرورت ہی نہیں، اور اگر کوئی بات آبھی گئی تو وہ بھی گھڑی ہوئی بات ہوتی ہے، اِلَّا ماشاءُ اللہ! جھوٹ میں کچھ سچ بھی

چل جاتے ہیں، سو جھوٹ میں ایک سچ بھی ہو جاتا ہے۔

شیعہ بناوٹی سید ہیں:

تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ بناوٹی ''سید'' ہیں، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سی شکل، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے الفت!

کسریٰ و پرویز کا قتل:

اب یہ بات بیچ میں آگئی تو اس قصہ کو بھی پورا کردوں، یہ دونوں صاحب واپس آگئے کسریٰ کے پاس، گرفتار انہوں نے کیا کرنا تھا، جب انہوں نے کہا کہ ہمیں آپ کو گرفتار کرکے لے جانے کا حکم دیا گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل جواب دوں گا، اگلے دن آئے تو ارشاد فرمایا کہ: رات تمہارا طاغیہ ختم کردیا گیا ہے، اس کو اس کے لڑکے شیروے نے قتل کردیا ہے، تو یہ دونوں واپس آگئے۔

شاہ بُصریٰ کا ایمان لانا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہِ بُصریٰ کے نام جو شاہِ ایران کا گورنر تھا، خط لکھا کہ وہ تو مردار ہوگیا ہے، میں اللہ کا رسول ہوں، تم ایمان لے آؤ! اور یہ علاقہ تمہارے سپرد رہے گا، تم اس کے گورنر رہو گے، اور اگر تم مسلمان نہ ہوئے تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ تمہاری سب کی سب سلطنت ختم ہوجائے گی۔ یہ دونوں قاصد واپس شاہ بُصریٰ کے پاس گئے، انہوں نے حالات بتلائے، اس نے کرید کرید کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کئے، اور وہ مسلمان ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ: یا رسول اللہ! مجھے آپ کا گرامی نامہ ملا ہے، میں آپ پر ایمان لاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھے توفیق عطا فرمائے تو میں حاضر خدمت ہونے کی بھی کوشش کروں گا۔

آپؐ کی رشتہ داری کے کام نہ آنے پر دلائل:

الغرض ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری کے معاملہ میں یہ غلو کیا جارہا ہے اور دوسری طرف ردِعمل ہے، اس کی خشکی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے، اور دلائل بڑے مضبوط پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے:

"اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقَاکُمْ." (الحجرات:۱۳)

ترجمہ:...... "بے شک اللہ کے نزدیک معزز متقی ہے۔"

وہ کہتے ہیں کہ اس آیت کی رُو سے رشتہ داری کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اللہ پاک نے خود اصول بیان فرمایا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"کُلُّکُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تَرَابٍ."

(مجمع الزوائد ج:۸ ص:۸۶)

ترجمہ:...... "تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔"

یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں، اللہ اور رسول کا فرمان ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہے، ہمیں یہ بات محقق طور پر معلوم ہے تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے ہمارے دل میں اس کی کچھ قدر ہوگی یا نہیں؟ یقیناً ہوگی!! مقتضائے عقل ہے، عقل یہی کہتی ہے۔

آنحضرتؐ سے محبت کی وجہ؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"اَحِبُّوا اللهَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ مِنْ نِّعَمِهٖ، وَاَحِبُّوْنِیْ بِحُبِّ اللهِ تَعَالٰی." (اتحاف ج:۹ ص:۵۴۸)

ترجمہ:......"اللہ سے محبت رکھو، اس لئے کہ وہ تم کو غذا دیتا ہے، اور مجھ سے محبت رکھو اللہ کی محبت کی وجہ سے (کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں)۔"

یہاں پر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے احسان کا حوالہ نہیں دیا، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں، لیکن اپنی محبت کے لئے اللہ کی محبت کا حوالہ دیا، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم پر جو احسانات ہیں، ان کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوگی ہی، لیکن یہ اپنے نفس کے لئے ہوگی کہ ہم پر احسان ہے۔

آنحضرتؐ کی گستاخی پر غصہ کی وجہ؟ اکابرؒ کا ذوق:

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی مجلس میں ایک دفعہ تذکرہ آیا، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہم اللہ بلکہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ان سب کے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ استاذ ہیں، تذکرہ آیا، حضرتؒ نے پوچھا کہ: میاں! اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے، تم لوگوں کو غصہ کیوں آتا ہے؟ کہنے لگے کہ: حضرت! یہ بات بھی کوئی پوچھنے کی ہے؟ غصہ آنا چاہئے! فرمایا: آنا تو چاہئے، مگر میں وجہ پوچھتا ہوں کہ کیوں آتا ہے؟ پھر فرمایا کہ: ہمیں غصہ اس لئے آتا ہے کہ ہمارے رسول کی گستاخی کر رہے ہیں، یہ تو اپنی طرف نسبت ہوگئی، یہ تو اخلاص نہ ہوا، غصہ اس لئے آنا چاہئے کہ اللہ کے رسول کو کہہ رہے ہیں، اور پھر فرمایا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی آدمی ایسا لفظ کہے تو ہمیں غصہ آتا ہے، اگر ایسا ہی غصہ ہمیں دوسرے انبیاؑ علیہم الصلوٰۃ والسلام کی توہین و بے ادبی سن کر آئے تو پھر یہ دلیل ہے اخلاص کی، اور اگر دوسرے انبیاؑ علیہم السلام کے بارہ میں تو سن

کر کوئی غصہ نہیں آتا، اپنے نبی کے بارہ میں سن کر غصہ آتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بھی پارٹی بازی ہوئی، اخلاص تو نہ ہوا۔ بہت ہی دقیق بات ہے۔

آنحضرتؐ کے احسانات:

تو میں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار احسانات ہیں، ہمارا ایک ایک بال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات میں جکڑا ہوا ہے، اور یہ راز ہے کہ جب ہم ''التحیات'' پڑھتے ہیں، ''التحیات'' میں بیٹھتے ہیں (پہلے قعدہ میں) تو حکم ہے کہ ''عبدہ ورسولہ'' پڑھ کر اٹھ جاؤ، ابھی تمہارے ذمہ کچھ کام باقی ہے، لیکن اگر آخری قعدہ ہو تو ''التحیات'' پڑھ کر پھر درود شریف پڑھو، اور پھر دعائیں پڑھو، مانگو کیا مانگتے ہو؟ تم نے اللہ کی عبادت کرلی، اللہ کو سجدہ کرلیا، اللہ سے تعلق قائم کرلیا، اللہ کی بارگاہ سے رخصت ہو رہے ہو، ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہہ کر نماز سے باہر نکل رہے ہو، گویا کمرے سے باہر جارہے ہو، اب ذرا اطمینان سے بیٹھو، مانگو کیا مانگنا چاہتے ہو؟ بولو! اللہ میاں تم سے پوچھ رہے ہیں: کیا مانگتے ہو؟ مانگو! اب مانگ لو جو مانگنا ہے، میری عبادت تو عبادت ہی کیا ہے، پوری کائنات کی عبادت وہ اللہ کے لئے ہے، ''اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ'' تحیات کا معنی زبانی عبادتیں، صلوات کا معنی بدنی عبادتیں، اور طیبات کا معنی مالی عبادتیں، یہ سب اللہ کے لئے ہیں، نظر پڑی اُوہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، وہی تو پکڑ کر لائے تھے ہمیں اللہ کے دربار میں، کہ چلو، اللہ کے دربار میں پہنچو، بے ساختہ ہماری زبان سے نکلا: ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ.'' اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں: ''اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ.'' سلام ہو ہم پر اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر۔

صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ:

"..... فَاِذَا قَالَهَا اَصَابَتْ كُلَّ عَبْدٍ لِلّٰهِ صَالِحٍ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ......" (صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۷۳)

ترجمہ:......"جب تم کہو گے: "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ." تو اللہ کے جتنے نیک بندے ہیں آسمان میں یا زمین میں زندہ ہیں یا فوت ہوچکے ہیں، سب کو سلام پہنچ جائے گا۔"

یہ چھوٹا سا لفظ سب کو پہنچ جائے گا، سب کو حصہ مل جائے گا، اب اپنی بندگی کا اقرار کیا: "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ." یہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، اپنی عبدیت کا اقرار کیا اور بیچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی آگئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سلام کردیا، اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں باقیوں کو بھی محروم نہیں رکھنا چاہئے، لہٰذا تمام نبی، صحابی، تابعی، اولیاً، اتقیاً اور آسمان والے، زمین والے سب کو شامل کرکے کہہ دیا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ." اندازہ کرو کیسے جامع الفاظ رکھے گئے ہیں نماز میں، معمولی نہیں ہیں۔

اب اس کے بعد عبدیت کا اقرار کرلیا، اللہ کی حمد و ثنا کرلی، تمہیں مانگنا ہے اللہ تعالیٰ سے، اس لئے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھو۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "جو شخص یہ چاہے کہ ہم پر یعنی آلِ محمدؐ پر پیمانہ بھر کر درود بھیجے، بھرے ہوئے پیمانہ سے، بڑے سے بڑا پیمانہ اور وہ بھی بھر کر، اس کو چاہئے یہ درودِ ابراہیمی پڑھے۔" اب تم نے درود شریف پڑھ لیا، اب مانگو جو مانگنا ہے، لیکن یاد رکھو کہ حدیث شریف میں ہے کہ:

''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاہٍ.''
(مشکوٰۃ ص:۱۹۵)

ترجمہ:......''اللہ تعالیٰ غافل اور لہو ولعب میں مبتلا دل کی دعا کو قبول نہیں فرماتے ہیں۔''

زبان سے کہہ رہے ہو، لیکن یہ معلوم نہیں کہ کہاں پھر رہے ہو؟ تم اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہو، اللہ کی طرف متوجہ ہو، مانگو کیا مانگنا ہے؟ مگر اللہ کی طرف متوجہ ہوکر مانگو، غفلت کے ساتھ نہیں۔

حدیث شریف میں ہے:

''قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَسْتَحِبُّ الْجَوَامِعَ مِنَ الدُّعَاءِ وَیَدَعُ مَا سِوٰی ذٰلِکَ.''
(مشکوٰۃ ص:۱۹۵)

ترجمہ:......''ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چن چن کر جامع دعائیں کیا کرتے تھے، اور یہ جو دوسری دعائیں ہوتی تھیں اس کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔''

جامع دعائیں کرو (تو خیر یہ درمیان میں بات آئی تھی)۔

التحیات میں آپؐ کے تذکرہ کی حکمت!

میں نے یہ عرض کیا کہ ''التحیات'' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ لانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا راز بزرگ یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر اللہ کی حمد وثنا کر رہے تھے کہ اچانک نظر پڑی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، اُوہ! ہمارا ہاتھ پکڑ کر تو آپ لائے ہیں، بڑی قدرناشناسی ہوگی، بڑی بے مروتی ہوگی کہ ہم اللہ تعالیٰ سے باتیں کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ نہ ڈھونڈیں اور

آپ کا تذکرہ نہ کریں اور آپ کو سلام بھی نہ کریں، اس لئے بے ساختہ کہا: ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللهِ وَبَرَکَاتُہٗ.'' حالانکہ کسی کے ساتھ بات کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، نماز میں بھی صرف اللہ سے بات ہوتی ہے کسی اور سے نہیں، مگر یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کردی، اس لئے کہ یہ بات اس جہاں کی نہیں ہورہی، یہ بات بارگاہِ الٰہی کی ہورہی ہے، اس وقت گویا معنوی طور پر آپ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہیں اور اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز میں محو ہیں، درمیان میں کوئی نہیں ہے، ترجمان نہیں ہے، آپ خود باتیں کر رہے ہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہلے سے تشریف فرما ہیں اور ہمارے محسن ہیں، لازم ہوا کہ ان کا تذکرہ کیا جائے اور ان کو بھی یاد کیا جائے اور ان کو بھی سلام ہو۔

میں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان احسانات کا حوالہ نہیں دیتے، بلکہ حوالہ کیا دیتے ہیں کہ مجھ سے محبت رکھو، اللہ کی محبت کی وجہ سے، اس لئے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور میری آل سے محبت رکھو میری محبت کی وجہ سے۔

قرابت نبویؐ کی پاسداری:

صحیح بخاری شریف میں (غالباً ج:۱ ص:۵۲۶) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقولہ نقل کیا گیا ہے، انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

''وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ! لَقَرَابَۃُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ اِلَیَّ اَنْ اَصِلَ مِنْ قَرَابَتِیْ.''

(ج:۱ ص:۵۲۶)

ترجمہ:...... ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل قرابت کے

ساتھ صلہ رحمی کرنا اپنے اہلِ قرابت سے زیادہ محبوب ہے۔“

یہ مؤمن کا ایمان ہے، اور اسی صفحہ پر امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

”اِرْقَبُوْا مُحَمَّدًا (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) فِیْ اَھْلِ بَیْتِہٖ.“

ترجمہ:..... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کے معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ رکھا کرو۔“

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ نہ رکھنا یہ بڑی بے مروتی کی بات ہے، اُدھر اگر غلو ہے تو اِدھر کوتاہی ہے۔

گناہ گار سید بھی قابلِ احترام ہے:

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ ارشاد فرماتے تھے کہ: ”بھائی! سید اگر گناہگار بھی ہو تب بھی واجب الاحترام ہے۔“ حضرتؒ نے عجیب مثال دی، فرمایا کہ: اگر کوئی قرآن کریم کا نسخہ غلط چھپ گیا ہو، تو اس کو پڑھنا تو جائز نہیں، مسجد میں تو نہ رکھیں گے، کیونکہ لوگ غلط پڑھیں گے، بے چارے انجان ہیں، لیکن اس کی بے ادبی بھی جائز نہیں، بلکہ ادب کے ساتھ اس کو دفن کروادیں گے۔ فرمایا کہ سید اگر غلط راہ ہو اس کی اقتداً جائز نہیں ہے، اس کے پیچھے مت چلو، لیکن توہین بھی درست نہیں، کیونکہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ اور آپ کا تعلق یہ دنیا میں بھی کام دیتا ہے اور آخرت میں بھی کام دے گا، انشاء اللہ!

نکاح ام کلثومؓ سے شیعہ کا اضطراب:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے، آپ نے ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تھا ناں! شیعہ نہیں مانتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پتا تو کاٹنا چاہتے ہیں،

لیکن کٹتا ہے نہیں، کیا کریں مشکل یہ ہے، اب ناخن کو گوشت سے کیسے جدا کریں؟

خلفائے ثلاثہ: حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم، ان کا رشتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تو وہ ہے جو خون اور گوشت کا رشتہ ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: "هُمَا بِمَنْزِلَةِ سَمْعِيْ وَبَصَرِيْ." یہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما میرے کان اور آنکھیں ہیں۔ تو یہ کاٹنا چاہتے ہیں مگر کٹتا نہیں، مجبور ہیں، بے چارے پریشان ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ سے عقد کیا تھا، اور ان سے حضرت کے صاحبزادے زیدؓ بن عمرؓ پیدا ہوئے۔

ایک صاحب میرے پاس ایک دن آئے تھے، میں نے شیعہ کتابوں میں سے نکال کے دکھلایا کہ دونوں ماں بیٹے کا ایک ہی وقت میں انتقال ہوا تھا، اور ان دونوں کا اکٹھا جنازہ پڑھا گیا۔

ام کلثومؓ سے نکاح عمرؓ کی وجہ؟

غرض یہ کہ حضرت عمرؓ نے خطبہ دیا، فرمایا کہ: لوگو! مجھے تم جانتے ہو، میں بوڑھا ہوگیا ہوں، موت کے قریب ہوں، مجھے شادی کی ضرورت نہیں ہے، مجھے بیوی کا شوق نہیں ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے، آپ نے بھی سنا ہے:

"كُلُّ سَبَبٍ وَنَسَبٍ يَنْقَطِعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا سَبَبِيْ وَنَسَبِيْ." (مجمع الزوائد ج:۴ ص:۲۷۱)

ترجمہ:......"تمام کے تمام رشتے اور تمام کے تمام علاقہ نسبی رشتہ ہو یا دامادی رشتہ ہو، یعنی بیوی کی طرف سے جو رشتے آتے ہیں، یہ سارے کے سارے کٹ جائیں گے سوائے

میرے رشتہ کے۔“

تو میں چاہتا ہوں کہ میرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ رہے، صرف یہ لالچ ہے۔

تو قیامت کے دن بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ کا لحاظ رکھا جائے گا، اور لحاظ رکھنا بھی چاہئے، اس لئے مطلقاً نفی کرنا غلط ہے، اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ تعلق والے ہیں، ان سے محبت رکھنا، ان کا اکرام کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے لازم ہے، خاتونِ جنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا اکرام لازم ہے۔

حضورؐ کی چار صاحبزادیاں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں، حضرت زینبؓ یہ حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ سے بیاہی گئی تھیں۔ حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما یکے بعد دیگرے دونوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عقد میں آئیں، اور اسی بنا پر ان کو ”ذوالنورین“ کہا جاتا ہے، یعنی دو نور والے۔

حضرت عثمانؓ سے آپؐ کی محبت:

جب حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: عثمان! یہ جبرائیل کھڑے ہیں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر آرہے تھے ان کو نہیں)، اور مجھے کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تم سے ام کلثوم کا عقد کردوں، اسی مہر پر جس مہر پر رقیہ کا عقد کیا تھا۔ وہ عقد اللہ کے حکم سے ہوا، جبرائیل امین کی آمد سے ہوا، وحی سے ہوا، اور جب حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں انتقال ہوگیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا کہ: عثمان کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ لوگوں سے کہا کہ عثمان کو اپنی لڑکیاں دو، اللہ کی قسم! اگر میرے پاس اور لڑکی ہوتی تو وہ بھی عثمان سے بیاہ دیتا، وہ مرجاتی اور لڑکی ہوتی تو وہ عثمان سے بیاہ دیتا۔ ان کو کیا کمی تھی، یہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہارِ محبت فرمایا۔

شیعہ مذہب کی بنیاد ہی انکارِ اہل بیت پر ہے:

تو بہرکیف یہ چار صاحبزادیاں ہیں، شیعہ تینوں کا انکار کرتے ہیں، اہل بیت کا انکار کرتے ہیں، شیعوں کی بنیاد ہی انکارِ اہل بیت پر ہے، عداوتِ اہل بیت اور انکارِ اہل بیت، اور ایک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رہ گئی تھیں، ان کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اس کو چھوڑتا ہوں۔

حضرات فاطمہؓ، علیؓ اور حسنینؓ ہمارے اکابر ہیں:

بہرحال ہمارے بہت سے سنی مسلمان حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا وہ اکرام نہیں کرتے، جیسا کہ کرنا چاہئے، کیوں شیعوں کی اجارہ داری ہے اس پر؟ یہ تو ہمارے اکابر ہیں، حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما ہمارے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمارے ہیں، ان کا دعویٰ محبت غلط ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے ہیں، عیسائیوں کے نہیں، عیسائیوں کا دعویٰ غلط ہے۔

ہمارے دل کا سرور:

اسی طرح حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم اور دوسرے بزرگ جن کو یہ حضرات ''ائمہ معصومین'' کہتے ہیں، وہ ہمارے اکابر ہیں، آنکھوں کا نور، دل کا سرور، ایمان کا جزو اور ان کی محبت عین ایمان ہے۔

حضرت علیؓ اور حسنینؓ کے فضائل:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّةِ."

(مشکوٰۃ ص:۵۷۰)

ترجمہ:......"حسن و حسین جوانانِ جنت کے سردار ہوں گے۔"

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ:

"یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗ وَیُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ."

(مشکوٰۃ ص:۵۶۳)

ترجمہ:......"وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتے ہیں، اور اللہ اور اس کا رسول ان سے محبت رکھتے ہیں۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بارہ میں فرمایا کہ:

"لَا یُحِبُّنِیْ اِلَّا مُؤْمِنٌ، وَلَا یُبْغِضُنِیْ اِلَّا مُنَافِقٌ."

(مشکوٰۃ ص:۵۶۳)

ترجمہ:......"مجھ سے صرف مؤمن محبت رکھے گا، اور مجھ سے صرف منافق بغض رکھے گا۔"

شیعوں کو حضرت علیؓ اور اولادِ علیؓ سے بغض ہے:

بالکل صحیح فرمایا ہے! شیعوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض ہے، زبان سے کہتے ہیں کہ ہمیں محبت ہے، بالکل جھوٹ بولتے ہیں، یہ منافق ہیں۔

تم بتلاؤ کہ یہ کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پچیس سال تک منافقوں اور مرتدوں کے پیچھے نماز پڑھی، یہ ان سے محبت ہے یا ان پر لعنت ہے؟

سوچو ذرا...! ایک آدمی کو تم مرتد کہتے ہو اور پھر علیؓ شیر خدا کو کہتے ہیں کہ وہ ڈر کر پچیس سال تک ان کے پیچھے نماز پڑھا کرتا تھا، کیا بے ایمان کے پیچھے نماز ہوجاتی ہے؟ کسی کافر کے پیچھے، منافق کے پیچھے نماز ہوجائے گی؟ جب ہمیں پتا ہے کہ یہ مشرک ہے، منافق ہے، مرتد ہے، اس کے پیچھے کسی کی نماز ہوجائے گی؟ میری نماز نہیں ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کیسے ہوگئی؟ معلوم ہوا کہ شیعوں میں محبت نہیں ہے۔ یہ دشمن ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے، ''شیعہ'' علی اور اولادِ علی کے سب سے بدترین دشمن ہیں، اس لئے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح فرمایا کہ: ''لَا یُحِبُّکَ اِلَّا مُؤْمِنٌ، وَلَا یُبْغِضُکَ اِلَّا مُنَافِقٌ.'' علیؓ سے مجھے محبت ہے، اہل سنت کو محبت ہے، ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس کمال کے معترف ہیں، جو واقعی اللہ نے ان کو کمال عطا فرمایا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تین بزرگوں کو اپنا امام سمجھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی، اس زمانہ میں پرچیاں نہیں ڈالتے تھے، ہاتھ سے بیعت کرتے تھے، جب صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح تین حضرات کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کی تھی، حضرات ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم، اور ان کو اپنا امام ومقتدا مانا ہے۔

خلفائے ثلاثہ اماموں کے امام ہیں:

یہ ''شیعہ'' کہتے ہیں حضرت علیؓ ہمارے امام ہیں، ہم کہتے ہیں کہ خلفائے ثلاثہ اماموں کے امام ہیں، ان کو کیوں نہیں مانتے ہو؟ جو مقتدی کو مانے ان کے امام کو نہ مانے وہ ماننے والا ہوتا ہے؟

اہل بدعت کو حضورؐ منہ نہیں لگائیں گے:

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری بات ارشاد فرمائی کہ

قیامت کے دن تم آؤ گے اور اپنا تعارف کراؤ گے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں، میں کہوں گا کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ تم فلاں بن فلاں ہو، نسب کو تو میں بھی جانتا ہوں، لیکن بات یہ ہے کہ تم نے میرے بعد دین بدل دیا تھا، بدعات ایجاد کردی تھیں اور تم کفر کی طرف لوٹ گئے تھے، اس کا کیا علاج ہے؟ یہ بات ارشاد فرمائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حوضِ کوثر پر ہوں گے اور تمام لوگ اپنی پیاس کا علاج کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے، لیکن اہل بدعت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم منہ نہیں لگائیں گے، کیوں؟ خود فرمایا، صحیح بخاری، باب الحوض کی حدیث میں ہے کہ: کچھ لوگوں کو لایا جائے گا، "ثُمَّ لَیُخْتَلَجُنَّ دُوْنِیْ" فرشتے ان کو میرے آنے تک روک دیں گے کہ تم نہیں جاسکتے ہو، میں کہوں گا کہ یہ میرے لوگ ہیں! فرمایا جائے گا کہ: "اِنَّکَ لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَکَ." آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا، کیا ہے؟ اور کیا کیا بدعات گھڑی تھیں، تو میں کہوں گا کہ: "فَسُحْقًا! سُحْقًا! لِمَنْ غَیَّرَ بَعْدِیْ." (بخاری ج:۲ ص:۹۷۴) پھٹکار! پھٹکار! ان لوگوں پر جنہوں نے میرے بعد دین کو بدل دیا۔

دین کو نہ بدلو!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو نہ بدلو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین جیسا آرہا ہے اس کو ویسے ہی آگے چلنے دو، لوگ ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ: جی! "اجتہاد" سے کام لینا چاہئے۔ "اجتہاد" کا معنی دین کو بدلو، لا حول ولا قوۃ الا باللہ!

خیر اس وقت اس پر گفتگو کرنے کا موقع نہیں، میرے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ دین کو اسی طرح چلنے دو، دین تو کسوٹی ہے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط ہے؟

دین بدلنے والوں پر اللہ کے نبی نے پھٹکار کی ہے:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو اسی طرح چلنے دو، اس میں کوئی تغیر د

ترمیم مت کرو، اس میں بدعات کی پیوندکاری نہ کرو، باقی بھائی آپ مجھے دیکھتے ہیں کہ میں دین پر صحیح عمل نہیں کر رہا تو میں گناہگار ہوں، آپ صحیح عمل نہیں کر رہے تو آپ گناہگار ہیں، گناہگار تو ہم سارے ہی ہیں، دین پر عمل نہیں ہو رہا تو گناہگار ہیں، مگر اللہ کے لئے دین کو تو چلنے دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہگاروں پر پھٹکار نہیں فرمائی، ان کے لئے فرمایا کہ: "شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ." (مشکوٰۃ ص:۴۹۴) میری شفاعت ملے گی میری امت کے اہل کبائر کو جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوکر آئے، ان کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں پناہ ملے گی، لیکن جو دین کو بدلنے والے ہیں، ان کو کہیں گے پھٹکار! پھٹکار! اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، آمین ثم آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خلفائے اربعہؓ
کا انتخاب
اور
عدل و انصاف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ فِیْ خُطْبَتِہٖ: اَلَا! اِنِّیْ اُوْشِکُ فَاُدْعٰی فَاُجِیْبُ فَیَلِیْکُمْ عُمَّالٌ مِّنْ بَعْدِیْ یَعْمَلُوْنَ بِمَا تَعْلَمُوْنَ وَیَعْمَلُوْنَ مَا تَعْرِفُوْنَ، وَطَاعَۃُ اُوْلٰٓئِکَ طَاعَۃٌ، فَتَلْبَثُوْنَ کَذَالِکَ زَمَانًا فَیَلِیْکُمْ عُمَّالٌ مِّنْ بَعْدِھِمْ یَعْمَلُوْنَ بِمَا لَا تَعْلَمُوْنَ وَیَعْمَلُوْنَ بِمَا لَا تَعْرِفُوْنَ، فَمَنْ قَادَھُمْ وَنَاصَحَھُمْ فَاُوْلٰٓئِکَ قَدْ ھَلَکُوْا وَاَھْلَکُوْا وَخَالِطُوْھُمْ بِاَجْسَادِکُمْ وَزَایِلُوْھُمْ بِاَعْمَالِکُمْ وَاشْھَدُوْا عَلَی الْمُحْسِنِ اَنَّہٗ مُحْسِنٌ وَعَلَی الْمُسِیْءِ۔“

(مجمع الزوائد ج:۵ ص:۲۳۷)

ترجمہ:...... ”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اس خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ: سنو! وہ وقت قریب آیا چاہتا ہے کہ

میرے پاس میرے رب کا بلاوا آئے گا، تو میں اس بلاوے پر لبیک کہوں گا، میرے بعد تم پر کچھ لوگ حاکم ہوں گے جو عمل کریں گے ایسی باتوں پر جن کو تم جانتے ہو اور کریں گے ایسے کام جو تمہارے نزدیک معروف اور نیکی کے کام ہیں، ان لوگوں کی فرماں برداری کرنا بندگی اور عبادت ہے، پھر تم ایک زمانے تک اسی طرح رہو گے۔ ان کے بعد پھر تم پر ایسے حاکم مقرر ہوں گے جو عمل کریں گے ایسی باتوں پر جو تم نہیں جانتے، اور جو کریں گے ایسے کام جو تمہارے نزدیک معروف نہیں، پس جو شخص ان کی قیادت کرے، اور ان سے خیرخواہی کرے، پس یہ لوگ خود بھی ہلاک ہوئے اور انہوں نے دوسروں کو بھی ہلاک کردیا۔ اور تم لوگ بدن کے اعتبار سے ان میں ملے جلے رہو، لیکن اپنے عمل کے اعتبار سے ان سے الگ رہو، اور نیکوکار پر گواہی دو کہ وہ نیکوکار ہے اور برا کرنے والوں پر گواہی دو کہ وہ برا کرنے والا ہے۔''

اسی طرح صحیح بخاری میں روایت ہے:

''عَنْ اَبِیْ حُمَیْدِ السَّاعِدِیْ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ اَنَّہٗ اَخْبَرَہٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِسْتَعْمَلَ عَامِلًا فَجَاءَہُ الْعَامِلُ حِیْنَ فَرَغَ مِنْ عَمَلِہٖ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللہِ! ھٰذَا لَکُمْ وَھٰذَا اُھْدِیَ لِیْ. فَقَالَ لَہٗ: اَفَلَا قَعَدْتَّ فِیْ بَیْتِ اَبِیْکَ وَاُمِّکَ فَنَظَرْتَ اَیُھْدٰی لَکَ اَمْ لَا؟ ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَشِیَّۃً بَعْدَ الصَّلَاۃِ فَتَشَھَّدَ وَاَثْنٰی عَلَی اللہِ بِمَا ھُوَ اَھْلُہٗ، ثُمَّ قَالَ: اَمَّا بَعْدُ فَمَا بَالُ

الْعَامِلِ نَسْتَعْمِلُهُ فَيَأْتِينَا فَيَقُوْلُ: هٰذَا مِنْ عَمَلِكُمْ وَهٰذَا أُهْدِيَ لِيْ. أَفَلَا قَعَدَ فِيْ بَيْتِ أَبِيْهِ وَأُمِّهِ فَنَظَرَ هَلْ يُهْدٰى لَهُ أَمْ لَا؟ فَوَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ! لَا يَغُلُّ أَحَدُكُمْ مِنْهَا شَيْئًا إِلَّا جَاءَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَحْمِلُهُ عَلٰى عُنُقِهٖ، إِنْ كَانَ بَعِيْرًا جَاءَ بِهٖ لَهُ رُغَاءٌ، وَإِنْ كَانَتْ بَقَرَةً جَاءَ بِهَا لَهَا خُوَارٌ، وَإِنْ كَانَتْ شَاةً جَاءَ بِهَا تَيْعَرُ، فَقَدْ بَلَغْتُ. فَقَالَ أَبُوْحُمَيْدٍ: ثُمَّ رَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ حَتّٰى إِنَّا لَنَنْظُرُ إِلٰى عُفْرَةِ إِبْطَيْهِ، قَالَ أَبُوْحُمَيْدٍ: وَقَدْ سَمِعَ ذٰلِكَ مَعِيَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسْئَلُوْهُ.'' (صحیح بخاری ج:۲ ص:۹۸۲)

ترجمہ:......''حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عامل مقرر کیا تھا، جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوکر آیا تو کہنے لگا: یا رسول اللہ! یہ مال تمہارا ہے اور یہ مجھ کو ہدیہ کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: پھر تو اپنے باپ کے گھر میں یا اپنی ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھ گیا، پھر دیکھتے کہ تجھ کو ہدیہ ملتا ہے کہ نہیں ملتا؟ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کو نماز کے بعد خطبہ دیا، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ: یہ کیا بات ہے کہ ہم ایک عامل کو مقرر کرتے ہیں وہ ہمارے پاس آتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ تمہارے عمل کا نتیجہ ہے، اور یہ مجھ کو ہدیہ دیا گیا ہے، یہ شخص اپنے باپ کے یا اپنی ماں کے گھر کیوں نہ بیٹھا رہا پھر دیکھتے کہ اس کو ہدیہ ملتا ہے کہ نہیں، پس قسم ہے اس ذات کی

جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! کہ تم میں سے کوئی شخص اس میں سے جو چیز بھی چھپائے گا، تھوڑی یا زیادہ، وہ قیامت کے دن اپنی کمر پر اور اپنی گردن پر لادے ہوئے آئے گا، اگر اونٹ تھا تو اس کو لائے گا اور وہ بولتا ہوگا، گائے ہوگی تو اس کو لائے گا اور وہ آواز نکال رہی ہوگی اور اگر بکری ہوگی تو اس کو لائے گا اس حال میں کہ وہ آواز نکال رہی ہوگی۔ دیکھو یہ بات میں نے تمہیں پہنچادی ہے۔ حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا یعنی اس طرح اشارہ کرنے کے لئے یہاں تک کہ ہم آپ کے بغل کی سفیدی دیکھ رہے تھے۔ (حضرت) ابوحمیدؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ میرے ساتھ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بھی سنا تھا، تم چاہو تو ان سے پوچھ لو۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دو خطبے حکام کے بارے میں ہیں۔ پہلے خطبہ میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:

نیک حکام کی طاعت نیکی ہے:

ایک یہ کہ عنقریب میرے پاس میرے رب کی طرف سے بلاوا آنے والا ہے، اور میں اس بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جاؤں گا، دنیا سے رخصت ہوجاؤں گا، میرے بعد تم پر کچھ لوگ حاکم مقرر ہوں گے اور وہ حاکم ایسے ہوں گے کہ جو علم میں تمہیں دے کر جارہا ہوں، اس علم کے مطابق عمل کریں گے، اور جو کام تمہارے ہاں معروف یا نیکی کے سمجھے جاتے ہیں، وہ معروف اور نیکی کا کام

کریں گے، برائی کا کام نہیں کریں گے، ان لوگوں کی اطاعت تو عبادت ہے، ایسے حکام کا حکم ماننا اور ان کے حکم کی تعمیل کرنا اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔

برے حکام کے بارے میں طرز عمل؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس پر ایک زمانہ گزرے گا، اس کے بعد پھر دوسری قسم کے حاکم آئیں گے، وہ اس علم کے مطابق عمل نہیں کریں گے جو تمہیں دیا گیا ہے، اور ان کاموں کو نہیں کریں گے جو کہ معروف اور نیکی کے کام ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ ان کی قیادت کرنے والا، ان کے جلسے میں شریک ہونے والا اور ان کی خیر خواہی کرنے والا خود بھی ہلاک ہوا، دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔ ان حکام کے بارے میں یہ طرز عمل اختیار کرو کہ اپنے جسموں کے اعتبار سے تو ان کے ساتھ مل کر رہو، مسلمانوں کے درمیان تفرقہ نہ ہو، پھوٹ نہ ڈالی جائے، ایسے حکام کے خلاف بغاوت نہ کی جائے، جس سے مسلمانوں کی قوت منتشر ہوتی ہو، لیکن اپنے اعمال کے ساتھ ان سے الگ تھلگ رہو، ان کے جیسے اعمال نہ کرو۔

صدیق اکبرؓ خلیفہ بلافصل تھے:

پہلی قسم کے حکام حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم تھے، اور خلفائے راشدینؓ کہا جاتا ہے چار خلفاءؓ کو، پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بلافصل ہوئے۔

اس امت میں سب سے پہلا جھوٹ:

اس امت میں جو سب سے پہلا جھوٹ بولا گیا تھا وہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بلافصل نہیں، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلافصل ہیں، جھوٹ تو اور بھی بہت سارے بولے گئے، لیکن سب سے پہلا جھوٹ یہ تھا۔

پوری جماعت صحابہؓ نے صدیق اکبرؓ سے بیعت کی:

اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پوری کی پوری جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا، ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کو خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب دیا گیا، ''امیر المؤمنین'' ان کا خطاب نہیں تھا، ''امیر المؤمنین'' کا خطاب سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ''یا امیر المؤمنین!'' کہہ کر لوگ نہیں بلاتے تھے، بلکہ ''یا خلیفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!'' اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ! جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ایک فرد بھی ایسا نہیں جس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی ہو اور ان کی خلافت پر متفق نہ ہوگیا ہو، (شروع میں چونکہ جس طرح دستور ہے کہ ایک خلیفہ کو مقرر کردیا جاتا ہے، ولی عہد بنادیا جاتا ہے، اس دستور کے مطابق نہیں بنایا گیا تھا) اس لئے ذرا سا تھوڑا سا اختلاف ہوا، اور یہ اختلاف تھا انصار اور مہاجرین کا۔

ثقیفہ بنی ساعدہ کے اختلاف کا قصہ:

ثقیفہ بنی ساعدہ (بنو ساعدہ انصار مدینہ کا ایک قبیلہ تھا) ان کا ایک چھپر تھا یعنی چوپال کہنا چاہئے جہاں لوگ بیٹھتے تھے، مجلس ہوتی تھی، اس میں حضرات انصار جمع ہوگئے اور اس پر غور کرنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نظام کیسے چلے گا؟ ان میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ان کے رئیس اور سردار بھی تھے، وہ کہنے لگے کہ بھائی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف لائے تھے، آپؐ ہمارے مقتدا تھے، ہمارے رسول تھے، ہماری جان، ہمارا مال، ہماری بیوی، بچے، ہمارے گھربار آپ پر قربان تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نظم ونسق تو مقامی لوگوں کے پاس ہونا چاہئے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار تھے کھڑے ہوکر تقریر بھی نہیں کرسکتے

تھے، بیٹھے تھے، انصار ان کے اردگرد جمع تھے اور قریب قریب اس پر متفق تھے کہ انہی کو خلیفہ بنائیں گے، ان حضرات کے پیش نظر صرف اتنی بات تھی کہ چونکہ یہ جگہ انصار کی جگہ ہے، لہٰذا یہاں کا حاکم بھی انصار میں سے ہونا چاہئے، لیکن اس پر ان کی نظر نہیں تھی کہ یہ قصہ صرف یہاں مدینے کا نہیں ہے، بلکہ پورے عرب کا اور اس سے بڑھ کر پوری دنیا کا ہے۔

حضرات شیخینؓ اور ابوعبیدہؓ کا ثقیفہ میں جانے کا قصہ:

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو کسی شخص نے آکر اطلاع دی اور کہا کہ: "اَدْرِکُوْا ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ قَبْلَ اَنْ تَھْلِکَ." اس امت کو سنبھالو اس سے قبل کہ یہ شروع ہی سے ہلاک ہوجائے، پہلے دن ان میں پھوٹ پڑجائے، مہاجرین اور باہر کے لوگ انصار کو اپنا بڑا ماننے سے انکار کردیں، تو پہلے ہی دن سے اختلاف ہوجائے گا، یہ دونوں بزرگ اور تیسرے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے، جن کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَمِیْنٌ، وَاَمِیْنُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اَبُوْعُبَیْدَۃَ بْنُ الْجَرَّاحِ." (مشکوٰۃ ص:۵۶۶)

یعنی ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور اس امت کے امین ابوعبیدہ بن الجراحؓ ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی وہ دس آدمی جن کو دنیا میں جنت کی بشارت دی گئی ہے، حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی بات ہی کیا ہے؟

حضرت عمرؓ کی سوچ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم خاموشی سے جارہے تھے، آپس میں بات نہیں کررہے تھے، وہاں جاکر دیکھیں گے کہ مجلس کا کیا رنگ ہے؟ اور میں اپنے ذہن میں ایک تخلیق سوچ رہا تھا کہ جاکر یہ تقریر کروں گا، حضرات انصار کو

سمجھاؤں گا، ہم وہاں پہنچے تو حضرات انصار کی گرما گرم تقریریں ہو رہی تھیں کہ بھئی اس خلافت میں تو صرف ہمارا ہی حق ہے، مہاجرین کا کوئی حق نہیں ہے، یہ تو مقامی لوگوں کی چیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اور مہاجرین بھی ہمارے مہمان تھے، نظم و نسق کا حصہ تو انصار کے پاس ہونا چاہئے، جب یہ تینوں حضرات تشریف لے گئے، چونکہ بزرگ تھے، اس لئے حضرات انصار خاموش ہوگئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اٹھنے لگا کہ میں تقریر کروں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بٹھادیا، جیسا کہ معلوم ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ذرا تیز آدمی تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نہایت حلیم تھے۔

حضرت صدیقؓ کی حکمت عملی:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحہ ارتحال پر تعزیت کی، پھر حضراتِ انصار کے فضائل بیان فرمائے اور انہوں نے اسلام کی خاطر جو جو جانفشانیاں کی تھیں، ان کو ذکر فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کی جس طرح خدمت کی، اس کا تذکرہ فرمایا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے جو فضائل بیان فرمائے ہیں، وہ ذکر فرمائے، اس انداز سے تذکرہ کیا کہ تمام آنکھیں اشکبار تھیں اور سب کے سب رو رہے تھے، اس کے بعد فرمایا کہ بھائیو! تمہیں معلوم ہوگا اور آپ حضرات میں سے اکثر کو یاد ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

"اَلنَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَیْشٍ فِیْ ھٰذَا الشَّانِ مُسْلِمُھُمْ تَبَعٌ لِمُسْلِمِھِمْ وَکَافِرٌ تَبَعٌ لِکَافِرِھِمْ." (مشکوٰۃ ص:۵۵۰)

ترجمہ:...... "لوگ ہمیشہ قریش کے تابع رہیں گے، اس

شان میں کہ ان کے مسلمان، مسلمان قریش کے تابع رہیں گے،
اور کافر، کافر قریش کے تابع رہیں گے۔"

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمادیا تھا کہ: "اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ." یعنی امام قریش میں سے ہوں گے، یعنی حکام۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قریش میں سے امام ہونا چاہئے یعنی خلیفہ اور حاکم اور آپ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی دین کے انصار اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر تھے، اب بھی یہی منصب تمہیں ملے گا۔

ایک صاحب انصار میں سے اٹھ کر کہنے لگے، ایک اعرابی کا فقرہ ضرب المثل ہے وہ انہوں نے پڑھا اور کہا کہ میں اس کا فیصلہ کئے دیتا ہوں: "مِنَّا اَمِیْرٌ وَمِنْکُمْ اَمِیْرٌ." ایک امیر ہمارا اور ایک امیر تمہارا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بھائیو! کبھی ایک نیام میں دو تلواریں بھی سمائی ہیں؟ نہیں! بلکہ "مِنَّا اَمِیْرٌ وَمِنْکُمْ وَزِیْرٌ" امیر قریش میں سے ہوں گے اور وزیر تمہارے ہوں گے۔ یہ کہا تو اس کے بعد فرمایا: قریش کے یہ دو بزرگ تمہارے پاس موجود ہیں، حضرت عمر بن خطاب اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں ان سے رخصت ہوئے ہیں کہ آپ ان سے راضی تھے، ان میں سے ایک کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔

حضرت صدیق اکبرؓ سے صحابہؓ کی بیعت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو تقریر میں سوچتا ہوا گیا تھا، ساری باتیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہہ ڈالیں، میری ایک بات بھی نہیں چھوڑی اور آپ کی پوری تقریر میں مجھے کوئی بات بری نہیں لگی، کسی بات سے مجھے

اختلاف نہیں تھا، سوائے اس بات کے کہ: ''یہ دو بزرگ موجود ہیں، ان میں سے ایک کی بیعت کرلو'' تو یہ بات مجھے بری لگی اور میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا، میں نے کہا: اس قوم کو شرم نہیں آئے گی جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ موجود ہوں اور وہ کسی دوسرے کی بیعت کرے؟ میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا کہ ایک انصاری نے مجھ سے پہلے بیعت کرلی اور پھر تو وہاں جتنے آدمی تھے، سب کے سب نے بیعت کرلی۔ وہاں ثقیفہ بنی ساعدہ میں صرف اتنا اختلاف ہوا تھا۔

حضرت صدیقؓ کا قصور؟

مگر شیعہ لوگ آج تک اس بات کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) نے امت پر یہ احسان کیوں کیا؟ ان کو ایک کلمہ پر متفق کیوں کردیا؟ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق کیوں باقی رہ گیا؟ ان کو یہ اختلاف اور تکلیف ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے امت کی خدمت کیوں کی؟ فتنۂ ارتداد کو فرو کیوں کیا؟ اور فوجیں جا کر عراق و شام سے کیوں لڑائیں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو فوجیں افغانستان میں لڑ رہی تھیں اور ادھر مصر وغیرہ فتح ہوچکے تھے، اتنے ہزار مسجدیں بنا کر دیں، اتنے لاکھوں انسان مسلمان ہوئے، قیصر و کسریٰ کے خزانے مسجد نبوی میں ڈھیر ہوئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔

پوری اسلامی آبادی میں مدت العمر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کسی عزیز قریب رشتہ دار تک کو کسی جگہ کا حاکم مقرر نہیں کیا، حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں ہیں اور حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کے شوہر ہیں، وہی فاطمہؓ جن کا چہرہ حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے زخمی کیا تھا، ان کو بھی کسی علاقے کا گورنر مقرر نہیں کیا، ایک قریہ کا بھی، ایک بستی کا بھی اور کسی فوج کا سپہ سالار مقرر نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے، اپنے بھتیجے اور اپنے کسی عزیز کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ دوسرے عزیزوں کی تو بات ہی چھوڑ دو۔

دو ہی قسم کی منفعتیں ہوتی ہیں یا مالی منفعت ہوتی ہے یا لوگ اثر ورسوخ کی وجہ سے اپنے رشتے داروں کو، اپنے عزیزوں کو بھرتی کروا دیتے ہیں۔

میرا چیلنج ہے:

میں نے اس منبر پر پہلے بھی چیلنج کیا تھا اور آج پھر کرتا ہوں کہ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ذمہ اگر بیت المال کا کوئی پائی پیسہ باقی ہے تو میں دینے کے لئے تیار ہوں، اور ان کے زمانے میں ان کا کوئی عزیز و قریب حاکم مقرر ہوا ہو تو آ کر میری گردن پکڑلو، اور اگر وہ بھی نہیں ہوا، یہ بھی نہیں ہوا، ایک پیسہ انہوں نے بیت المال کا استعمال نہیں کیا، جو استعمال کیا تھا وہ بھی واپس کر دیا، اور ایک عزیز و قریب کو بھی انہوں نے کسی علاقے کا گورنر مقرر نہیں کیا، تو تم انصاف سے بتاؤ کہ بارہ سال خدمت کا صلہ یہ گالیاں ہیں؟ انہوں نے کیا مفاد اٹھایا ہے؟ مجھے یہ تو بتاؤ آج تک ''غصبِ خلافت، غصبِ خلافت'' کا شور مچا رہے ہو، مجھے بتاؤ کہ خلافت کو غصب کر کے کہاں لے گئے تھے؟ انہوں نے ایک جھونپڑی بھی بنائی؟ چونکہ خلیفہ صاحب ہیں تو ان کا مکان اچھا بنا دو، جو کچھ تھا اللہ تعالیٰ کی خاطر تھا، رضائے الٰہی کے لئے تھا

یہی قصہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تھا، جس کو لوگ بدنام کرتے ہیں، پہلے بزرگوں نے تو بیت المال سے تنخواہ اور معمولی وظیفہ لیا تھا، لیکن وہ بھی بعد میں واپس کر دیا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شروع سے لی ہی نہیں، جو خدمت کی اللہ

تعالیٰ کے لئے کی، یہ چار ہمارے خلفائے راشدین ہیں، ان کی سیرت، ان کا عدل، ان کا انصاف، ان کی حکمرانی، رعایا پروری اس کے واقعات ریکارڈ میں محفوظ ہیں، گم نام نہیں ہیں۔ انبیأ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد ایسا پاکیزہ معاشرہ فلک نے کہیں دیکھا ہے تو مجھے بتاؤ؟ یہ وہ خلفاءٔ ہیں جن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میرے بعد کچھ حاکم ہوں گے جو اس علم پر عمل کریں گے جو میں تمہیں دے کر جا رہا ہوں، اور ان اعمال کو بجا لائیں گے جن پر میں امت کو چھوڑ کر جا رہا ہوں، لہٰذا ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی بندگی اور طاعت ہے۔ جس نے میرے مقرر کیے ہوئے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی، جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی طاعت کی، ”وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ.“ اور جس نے میرے مقرر کیے ہوئے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔

حضرت علیؓ کی گواہی:

حضرت امیر المؤمنین اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہمارے خلیفہ چہارم کوفہ کے منبر پر تشریف فرما تھے، کسی نے آ کر کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ حضرات ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) سے افضل ہیں۔ کوفہ کے منبر پر خطبہ ارشاد فرمایا (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے بقول جس کو نقل کرنے والے اسّی آدمی ہیں) کہ: ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس امت میں سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں، ان کے بعد عمرؓ اور اگر میں چاہوں تو تیسرے آدمی کا بھی نام لے سکتا ہوں۔“ منبر سے اترتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”ثم عثمان، ثم عثمان“ پھر عثمان ہیں، پھر عثمان ہیں۔

ابوبکرؓ وعمرؓ سے افضل کہنے والے کو حد لگاؤں گا:

اور یہ بھی اسی خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ: ”آئندہ مجھے کسی کے بارے میں اطلاع پہنچی کہ وہ مجھے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے افضل کہتا ہے اس پر مفتری کی حد لگاؤں گا۔“ بہتان لگانے والے کی حد اسّی کوڑے ہے۔

حضرت علیؓ اپنی مرضی سے کوفہ گئے تھے:

ابن کوّا نے پوچھا کہ: امیر المؤمنین! ذرا اس کی وضاحت کریں۔ (اس خطبہ میں نہیں دوسرے موقع کی بات ہے) ذرا یہ تو وضاحت فرمائیں کہ یہ جو یہاں آپ تشریف لائے ہیں، مدینے سے چل کر کوفہ آئے ہیں، ذرا فرمایئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو حکم فرمایا تھا یا آپ اپنی رائے اور اجتہاد سے تشریف لائے ہیں؟ فرمایا: ”میں پہلا شخص نہیں بنوں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولے، حضور نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا، یہ میری ایک رائے تھی، میں اپنی رائے سے آیا ہوں۔

حضرت علیؓ کی موجودگی میں صدیقؓ کو امام بنایا:

پھر قصہ بیان فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے اور کئی دن بیمار رہے اور ان دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لانے اور نماز پڑھانے سے بھی قاصر رہے، میں موجود تھا آپ کے سامنے، آپ کو میری موجودگی کا اور میری حاضری کا علم تھا، اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ”ابوبکرؓ سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائے۔“

صدیقؓ کی موجودگی میں عمرؓ کی امامت بھی روا نہیں تھی:

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہیں پہنچے نہیں تھے، نماز کا وقت ہوگیا تو موذن صاحب (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ

سے کہہ دیا کہ آپ نماز پڑھا دیں، انہوں نے کہا اگر تم کہو تو پڑھا دوں گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے، آواز بہت اونچی تھی، بلند تھی، نر آدمی تھے (الحمدللہ! آج تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز گونج رہی ہے)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب آواز پہنچی، فرمایا: "لَا! لَا! لَا!" نہیں! نہیں! نہیں! ابوبکر کے سوا اللہ تعالیٰ بھی اور اہل ایمان بھی سب انکار کرتے ہیں۔

حضورؐ نے جس کو ہماری نماز کا امام بنایا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ میں موجود تھا، غیر حاضر نہیں تھا، میرے ہوتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مصلّے پر کھڑا کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تو ہم نے کہا کہ نماز دین کا سب سے اونچا عمل ہے، جب یہ کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے سپرد کر کے گئے ہیں تو باقی دنیا کے معاملات بھی حضرت ابوبکرؓ کے سپرد کر کے گئے، چلو قصہ ختم! چنانچہ میں ان کے زمانے میں ان کے مخلص رفیق اور وزیر کی حیثیت سے رہا۔

حضرت عمرؓ کا انتخاب:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے رب کے پاس گئے تو جانے سے پہلے انہوں نے کہہ دیا کہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ بناؤ، میں نے کہا: "السمع والطاعة!" چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں میں ان کا بہترین رفیق اور وزیر رہا، مالِ غنیمت میں حصہ آتا تھا تو مجھے دیتے تھے، مجھے جہاد کے لئے بھیج دیتے تھے تو میں جاتا تھا، مجھ سے مشورہ طلب فرماتے تھے تو میں مشورہ دیتا تھا، جو کام میرے ذمہ لگاتے تھے بصد شوق، دل و دماغ کے پورے اتفاق کے ساتھ میں سرانجام دیتا تھا۔

حضرت عثمانؓ کا انتخاب:

اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دنیا سے تشریف لے گئے تو ہمارے چھ

آدمیوں کی کمیٹی بناگئے اور یہ چھ آدمی عشرۂ مبشرہ میں سے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس دن دنیا سے تشریف لے گئے، (عشرۂ مبشرہ جانتے ہو؟ جن کو جنت کی بشارت ملی) ان میں سے سات آدمی موجود تھے، تین رخصت ہوچکے تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رخصت ہوچکے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود رخصت ہورہے تھے اور ایک اور بزرگ رخصت ہورہے تھے، بلکہ ہوچکے تھے، باقی سات آدمی تھے ان سات آدمیوں میں ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی تھے، فرمایا ان کو شامل نہیں کروں گا، عجیب بات ہے! ان کو شامل نہیں کروں گا وہ میرے بہنوئی ہیں، باقی چھ جو رہ گئے ہیں ان پر مشتمل کمیٹی بنادی اور فرمایا: یہ چھ آدمی وہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنت کی بشارت دی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے اس حال میں رخصت ہوئے ہیں کہ ان سے راضی تھے، لہٰذا یہی فیصلہ کریں گے کہ کون خلیفہ بنے گا؟ جو یہ فیصلہ کریں پوری امت اس کو مانے۔ یہ ادارۂ انتخاب ہے اور تین دن تک ان حضرات کو اپنا فیصلہ سنانا ہوگا، اس زمانے میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ مسجد میں نماز پڑھایا کریں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر ہم چھ آدمیوں کی جماعت تشکیل دے گئے، اس وقت مجھے نفس نے کہا تھا کہ اب تیرا موقع ہے، لیکن اس جماعت میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے کہا کہ بھائیو! میں تو اس سے دست بردار ہوتا ہوں، میں خلافت کا امیدوار نہیں، میں اپنا نام واپس لیتا ہوں، تم چاہو تو میں تمہارا فیصلہ کرسکتا ہوں، باقی پانچ آدمی ہیں فیصلہ کردیتا ہوں، اس سے پہلے تین آدمیوں نے تین آدمیوں کے معاملہ سپرد کردیا تھا، حضرت عبدالرحمٰن، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم یہ ہی تین رہ گئے تھے، باقی تین نے اپنا معاملہ ان کے سپرد کردیا تھا، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے حق میں، حضرت زبیرؓ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں اور حضرت طلحہؓ نے حضرت علیؓ کے حق میں اپنا معاملہ سپرد کردیا تھا (رضی اللہ

عنہم اجمعین) کہ یہ حضرات جو فیصلہ کریں گے ٹھیک ہے، اب تین آدمی درمیان میں رہ گئے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں خلافت سے دستبردار ہوتا ہوں اس شرط پر کہ ان دو آدمیوں میں سے جس کو مناسب سمجھوں اس کو مقرر کردوں، سب نے کہا کہ منظور ہے، چھ کے چھ نے کہا کہ منظور ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اگر علیؓ کو میں خلیفہ مقرر کردوں تو تم بیعت کرو گے؟ انہوں نے کہا: شوق سے! حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اگر عثمانؓ کو مقرر کردوں، بیعت کرو گے؟ کہنے لگے کہ بالکل خوشدلی سے۔ یہ پہلے دن کے اجلاس کی کاروائی تھی چونکہ تین دن کے بعد فیصلہ سنانا تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان تین راتوں میں میں سویا نہیں، پردہ نشین عورتوں کے پاس جا کر بھی میں نے پوچھا کہ ان دو بزرگوں میں سے کس کو مقرر کیا جائے؟ سب نے یہ ہی رائے دی کہ حضرت عثمانؓ کو مقرر کرو، گویا ووٹ بھی لئے گئے لیکن خفیہ، چنانچہ تیسرے دن جب اجلاس ہوا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس دن میرے نفس میں کچھ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ مجھے خلیفہ بنایا جائے، لیکن جب میں نے دیکھا تو ''عَهْدٌ فِيْ عُنُقِيْ'' حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جو عہد مجھ سے لیا تھا وہ میری گردن میں پہلے پڑ چکا تھا، اب میں اس کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا تھا، چنانچہ حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوگئے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تک وہ خلیفہ رہے میں ان کا ناصح وزیر رہا، مشیر رہا جس طرح کہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کا تھا، اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا گیا تو میں نے دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کا عہد پورا کرچکا ہوں، عثمانؓ کا عہد جو میری گردن میں تھا پورا کرچکا ہوں اب پیچھے کون رہ گیا؟ موٹی سی بات ہے کہ وہ ادارۂ خلافت جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قائم کیا تھا، اس میں ایک ہی آدمی پیچھے رہ گیا، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ ساری تفصیلات میری کتاب ''شیعہ سنی اختلافات اور صراطِ مستقیم'' میں آگئی ہیں، اس میں یہ ساری تفصیلات ذکر کردی گئی ہیں۔

بہرکیف! یہ خلفائے راشدینؓ ہیں اور جیسا کہ میں نے کتاب کا حوالہ دیا ہے، ہمارے اکابر اور ان کی اقتدا کرتے ہوئے میں نے بھی قرآن کریم کی چار آیات سے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چار ارشادات سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چار اقوال سے ان حضرات کا خلیفہ راشد ہونا ثابت کیا ہے، چوتھے میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، یہ حضرات خلیفہ راشد تھے تو ان کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کی اطاعت بجالانا عبادت ہے۔ اور اس کے بعد پھر اور خلفاً ہوئے ان میں کچھ عادل تھے، کچھ جائر تھے۔

حضرت معاویہؓ خلیفہ عادل تھے:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ عادل تھے اور اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ عادل تھے، حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا فقرہ میں نے اس کتاب میں نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ رضی اللہ عنہم کی صف کے آدمی نہیں تھے، لیکن ان کے بعد ایسا خلیفہ اور ایسا حاکم کبھی پوری امت میں نہیں ہوا، ایسا عادل خلیفہ امت میں نہیں ہوا، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عدل کا چرچا ہے، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عدل کے ساتھ ان کا کوئی جوڑ نہیں۔ اور کچھ حاکم جائر بھی ہوئے ہیں، ظالم بھی ہوئے، منحرف تھے، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو ان کے ساتھ ان کی قیادت کرے گا وہ خود بھی ہلاک ہوگا، لوگوں کو بھی ہلاک کرے گا، تم ان سے مل کر رہو لیکن اپنے اعمال الگ رکھو اور وہ قصہ آگے چلتے چلتے اب ہمارے ہاں پہنچ چکا ہے اور جو حال ہے وہ آپ کے سامنے ہے، اور دوسری حدیث میں یہ ایک مستقل موضوع ہے، یعنی حکام کو جو نذرانے پیش کئے جاتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو پھر اس پر عرض کروں گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مہاجرینؓ و انصارؓ

کی

فضیلت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

الف:......"اَخْرَجَ الطَّبَرَانِیُّ عَنْ مُعَاوِیَةَ بْنِ اَبِیْ سُفْیَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: صُبُّوْا عَلَیَّ مِنْ سَبْعِ قِرَبٍ مِنْ آبَارٍ شَتّٰی، حَتّٰی اَخْرُجَ اِلَی النَّاسِ فَاَعْہَدَ اِلَیْہِمْ. قَالَ: فَخَرَجَ عَاصِبًا رَأْسَہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی صَعِدَ الْمِنْبَرَ، فَحَمِدَ اللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَیْہِ، ثُمَّ قَالَ: اِنَّ عَبْدًا مِنْ عِبَادِ اللّٰہِ خُیِّرَ بَیْنَ الدُّنْیَا وَبَیْنَ مَا عِنْدَ اللّٰہِ، فَاخْتَارَ مَا عِنْدَ اللّٰہِ. فَلَمْ یَلْقَنْہَا اِلَّا اَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، فَبَکٰی فَقَالَ: نَفْدِیْکَ بِآبَائِنَا وَاُمَّہَاتِنَا وَاَبْنَائِنَا! فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: عَلٰی رِسْلِکَ. اَفْضَلُ النَّاسِ عِنْدِیْ فِی الصُّحْبَةِ وَذَاتِ الْیَدِ ابْنُ اَبِیْ قُحَافَةَ، اُنْظُرُوْا ہٰذِہِ الْاَبْوَابَ الشَّوَارِعَ فِی الْمَسْجِدِ فَسُدُّوْہَا، اِلَّا مَا کَانَ مِنْ بَابِ اَبِیْ بَکْرٍ، فَاِنِّیْ

رَأَیْتُ عَلَیْهِ نُوْرًا۔“ (حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۴۲۸)

ب:……”وَاَخْرَجَ الْبَیْهَقِیُّ عَنْ اَیُّوْبَ بْنِ بَشِیْرٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِیْ مَرَضِهٖ: اَفِیْضُوْا عَلَیَّ. فَذَکَرَهٗ بِنَحْوِهٖ وَزَادَ، فَکَانَ اَوَّلُ مَا ذَکَرَ بَعْدَ حَمْدِ اللهِ وَالثَّنَاءَ عَلَیْهِ، ذِکْرُ اَصْحَابِ اُحُدٍ فَاسْتَغْفَرَ لَهُمْ وَدَعَا لَهُمْ، ثُمَّ قَالَ: یَا مَعْشَرَ الْمُهَاجِرِیْنَ! اِنَّکُمْ اَصْبَحْتُمْ تَزِیْدُوْنَ وَالْاَنْصَارُ عَلٰی هَیْئَتِهَا لَا تَزِیْدُ، وَاِنَّهُمْ عَیْبَتِی الَّتِیْ اَوَیْتُ اِلَیْهَا، فَاَکْرِمُوْا کَرِیْمَهُمْ، وَتَجَاوَزُوْا عَنْ مُسِیْئِهِمْ. ثُمَّ قَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ: اَیُّهَا النَّاسُ! اِنَّ عَبْدًا مِنْ عِبَادِ اللهِ..... فَفَهِمَهَا اَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ مِنْ بَیْنِ النَّاسِ فَبَکٰی۔“ (حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۴۲۹)

ج:……”وَعِنْدَ اَحْمَدَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: خَطَبَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ فَقَالَ: اِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ خَیَّرَ عَبْدًا بَیْنَ الدُّنْیَا وَبَیْنَ مَا عِنْدَهٗ، قَالَ فَاخْتَارَ ذٰلِکَ الْعَبْدُ مَا عِنْدَ اللهِ. قَالَ: فَبَکٰی اَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ، فَعَجِبْنَا لِبُکَائِهٖ اِنَّ خَبَرَ رَسُوْلُ اللهِ عَنْ عَبْدٍ خُیِّرَ، وَکَانَ رَسُوْلُ اللهِ هُوَ الْمُخَیَّرُ، وَکَانَ اَبُوْبَکْرٍ اَعْلَمَنَا بِهٖ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اَمَنَّ النَّاسِ عَلَیَّ فِیْ صُحْبَتِهٖ وَمَالِهٖ اَبُوْبَکْرٍ، وَلَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا مِنَ النَّاسِ خَلِیْلًا غَیْرَ رَبِّیْ لَاتَّخَذْتُ اَبَابَکْرٍ، وَلٰکِنْ خُلَّةُ الْاِسْلَامِ اَوْ مَوَدَّتُهٗ، لَا یُبْقٰی بَابٌ فِی الْمَسْجِدِ اِلَّا سُدَّ، اِلَّا بَابَ اَبِیْ بَکْرٍ۔“(مسند احمد ج:۳ ص:۱۸)

الف:......ترجمہ:......"حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر مختلف کنوؤں کے پانی کے سات مشکیزے ڈالو، تاکہ میں لوگوں کی طرف نکلوں اور ان کو کچھ وصیتیں کروں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، سر مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی، منبر پر تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، اس کے بعد فرمایا کہ: ایک بندے کو اللہ کے بندوں میں سے دنیا کے درمیان اور جو چیز کہ اللہ کے پاس ہے اختیار دیا گیا ہے، پس اس نے اللہ کے پاس کی چیز کو اختیار کرلیا۔ اس بات کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے نہیں سمجھا، وہ رو پڑے اور کہا کہ ہم آپ پر قربان کرتے ہیں اپنے باپوں کو، اپنی ماؤں کو اور اپنے بیٹوں کو یا رسول اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھہرو! تمام لوگوں سے افضل میرے نزدیک رفاقت میں اور اپنے مال میں ابوبکر بن ابی قحافہؓ ہیں، دیکھو یہ دروازے جو کھل رہے ہیں مسجد کی طرف ان سب کو بند کردو، صرف ایک ابوبکر کا دروازہ باقی رہے، کیونکہ میں اس پر نور دیکھتا ہوں۔"

ب:......ترجمہ:......"بیہقی کی روایت حضرت ایوب بن بشیر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں فرمایا کہ مجھ پر سات مشکیزے مختلف کنوؤں کے ڈالو، باہر تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد اصحاب احد کا، شہدائے احد کا تذکرہ کیا، ان کے لئے استغفار فرمایا، ان کے لئے دعائیں فرمائیں، پھر فرمایا کہ: اے

مہاجرین کی جماعت! تم زیادہ ہوتے رہوگے اور انصار اپنی حالت پر رہیں گے، یہ زیادہ نہیں ہوں گے، یہ میرے مخصوص لوگ ہیں اور میری پناہ گاہ ہے، جن کی طرف میں نے پناہ لی تھی، اس لئے ان کے شرفا کی عزت کرو اور ان میں سے کسی سے غلطی ہو جائے تو اس سے تجاوز کرو۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: لوگو! ایک بندے کو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا۔ آگے وہی بات فرمائی، تو حضرت ابوبکرؓ اس بات کو سمجھے اور رو پڑے۔''

ج:......''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث مسند احمد میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو اختیار دیا ہے دنیا کے درمیان اور اس چیز کے درمیان جو اس کے پاس ہے، اس بندے نے اللہ کے پاس کی چیز کو اختیار کرلیا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رو پڑے، ہمیں ان کے رونے پر تعجب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک بندے کے بارے میں خبر دے رہے ہیں، اور یہ (بوڑھا شخص) رو رہا ہے، لیکن ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اختیار دیا گیا تھا، اور حضرت ابوبکرؓ ہم میں سب سے بڑے عالم تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مجھ پر سب سے بڑھ کر احسان رفاقت میں اور مال میں ابوبکر کا ہے، اگر میں اپنے رب کے سوا کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اسلام کی دوستی اور اسلام کی محبت باقی ہے، مسجد میں کوئی دروازہ باقی نہ رکھا جائے

سوائے ابوبکر کے دروازے کے۔"

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ شریفہ ہے، اس کے بعد کبھی منبر پر رونق افروز نہیں ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات مختلف کنوں کا پانی لاؤ اور وہ مجھ پر ڈالو، مجھے نہلاؤ، چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غسل فرما کر دو آدمیوں کے سہارے باہر تشریف لائے، سرمبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی، اور صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یَقُوْلُ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْہِ مِلْحَفَۃٌ مُتَعَطِّفًا عَلٰی مَنْکِبَیْہِ وَعَلَیْہِ عِصَابَۃٌ دَسْمَاءَ حَتّٰی جَلَسَ عَلَی الْمِنْبَرِ ..... الخ۔" (بخاری ج:۱ ص:۵۳۶)

ترجمہ:...... "حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے آپ پر ایک چادر تھی جو آپ نے دونوں کندھوں پر ڈالی ہوئی تھی اور آپ کے سر پر ایک پٹی تھی جو میلی ہو رہی تھی آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے ....."

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ: اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو دنیا میں رہنے کا اور اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کا اختیار دیا گیا، اس نے اللہ تعالیٰ کے پاس جو نعمتیں ہیں ان کو اختیار کرلیا، دنیا میں رہنا پسند نہیں کیا۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم بات کو نہیں سمجھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے، اور کہنے لگے کہ: "بِآبَائِنَا وَاُمَّھَاتِنَا وَاَبْنَائِنَا!" یا رسول اللہ! ہمارے باپ، ہماری مائیں اور ہمارے بیٹے آپ پر قربان ہوں! صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک آدمی کے بارے میں بتا رہے ہیں، اللہ کے ایک بندے کو دنیا میں رہنے کا یا یہاں سے رخصت ہونے کا اختیار دیا گیا اور یہ بوڑھا

کیوں رو رہا ہے؟ لیکن اصل بات یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے بارے میں ارشاد فرما رہے تھے، تب ہمیں معلوم چلا کہ ابوبکر ہم سے بڑے عالم تھے۔

وفات سے پہلے انبیاؑ سے استفسار:

یہاں یہ بات یاد رکھو کہ حضرات انبیاؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کی مستقل سنت چلی آتی ہے کہ ان کو وقت سے پہلے آگاہ کردیا جاتا ہے اور پھر پوچھا جاتا ہے کہ: یہاں رہنا چاہتے ہو تو مزید تاخیر کردی جائے، یا چلنا چاہتے ہو تو وقت مقررہ آچکا ہے، حضرات انبیاؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جن کی نظر دنیا تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان کو اس آڑ اور پردہ کے پار کی چیزیں بھی ویسی ہی نظر آرہی ہوتی ہیں جیسے یہاں کی چیزیں نظر آتی ہیں، وہ اس اختیار ملنے پر دنیا میں رہنا کب پسند کریں گے؟ تمام انبیاؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا جواب ایک ہی رہا کہ چلنا ہے، یعنی یہاں نہیں رہنا۔

حضرت موسیٰؑ کا عزرائیل کو مارنا:

صحیح بخاری شریف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ آتا ہے کہ:

”عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: اُرْسِلَ مَلَکُ الْمَوْتِ اِلٰی مُوْسٰی فَلَمَّا جَاءَهٗ صَکَّهٗ فَرَجَعَ اِلٰی رَبِّهٖ فَقَالَ: اَرْسَلْتَنِیْ اِلٰی عَبْدٍ لَا یُرِیْدُ الْمَوْتَ! قَالَ: اِرْجِعْ اِلَیْهِ فَقُلْ لَّهٗ یَضَعُ یَدَهٗ عَلٰی مَتْنِ ثَوْرٍ فَلَهٗ بِمَا غَطَّتْ یَدَهٗ بِکُلِّ شَعْرَةٍ سَنَةٌ. قَالَ: اِیْ رَبِّ ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: ثُمَّ الْمَوْتُ! قَالَ: فَالْاٰنَ! قَالَ: فَسَأَلِ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ اَنْ یُّدْنِیَهٗ مِنَ الْاَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ رِمْیَةً بِحَجَرٍ ..... الخ.“ (صحیح بخاری ج:۱ص:۱۸۴)

ترجمہ:...... ”حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجے گئے، جب ملک الموت ان کے پاس آئے تو انہوں نے حضرت عزرائیل علیہ السلام کو تھپڑ رسید کردیا، جس سے ان کی آنکھ نکل گئی، انہوں نے جاکر شکایت کی کہ یا اللہ! آپ نے ایک ایسے بندے کے پاس بھیجا ہے جو دنیا میں رہنا چاہتا ہے، فرمایا: (تم نے پہلے اجازت نہیں لی، آنکھ تو تمہاری بنادیتے ہیں) دوبارہ جاؤ جاکر ان سے پہلے پوچھو اور ان سے کہو اگر دنیا میں رہنا چاہتے ہیں تو ایک بیل کی پشت پر ہاتھ رکھ دیں، جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں گے، اتنے سال ان کی عمر مزید بڑھادیں گے۔ اب حضرت عزرائیل علیہ السلام دوبارہ تشریف لائے، سلام عرض کیا اور حق تعالیٰ شانہ کا پیغام دیا کہ وقت تو آپ کا آچکا ہے، لیکن اگر آپ یہاں رہنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک بیل کی پشت پر ہاتھ رکھیں، اس کے نیچے جتنے بال آئیں گے اتنے سال آپ کی عمر بڑھادی جائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیغام ملا تو ارشاد فرمانے لگے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کہنے لگے کہ: پھر چلیں گے! فرمایا: پھر ابھی کیوں نہ چلیں! چنانچہ فرمانے لگے کہ: مجھے ذرا وہاں تک پہنچادو، (رمیۃ بحجر) بیت المقدس کے قریب وہاں پہنچے تو جان قبض ہوگئی۔"

تو حضرات انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا اکرام کیا جاتا ہے کہ بغیر اجازت کے فرشتہ ان کے پاس نہیں آتا۔

بعض اولیاءُ اللہ کا اکرام:

ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ حضرت عزرائیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، ایک دفعہ تو جوانی کے زمانے میں ہوئی تھی تو میں نے کہا کہ: چلیں؟ تو فرشتے نے کہا کہ: نہیں! ابھی بہت وقت ہے۔ پھر فرمانے لگے کہ: بیماری کے زمانے میں کوئی تین ماہ پہلے ملاقات ہوئی، میں نے کہا: چلیں؟ کہنے لگے کہ: وقت تو اب نزدیک ہی ہے، لیکن ابھی وقفہ ہے۔ وفات سے چند دن پہلے فرمانے لگے کہ: آج عزرائیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ: چلیں؟ کہنے لگے کہ: بس اب چلیں گے انشاءُ اللہ! کہتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ اجازت تو انبیاءُ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے لی جاتی ہے، تو عزرائیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ: انبیاءُ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تو اللہ کا قانون ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ ان سے بھی اجازت لی جاتی ہے، ان کے بارے میں قانون نہیں، حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے اکرام کا معاملہ ہوتا ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ایک بندے کو اللہ کے بندوں میں سے دنیا کے رہنے کے درمیان اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، اس کے درمیان اختیار دیا گیا ہے کہ دونوں میں سے کس چیز کو اختیار کرتے ہو؟ انہوں نے ما عند اللہ کو اختیار کرلیا۔

رفیق اعلیٰ کی طرف:

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری وقت میں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے اور فرما رہے تھے: "اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی." یا اللہ! اوپر والے رفیق کو پسند کرتا ہوں۔ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن رکھا تھا کہ انبیاءُ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اختیار دیا جاتا ہے، تو جب آپ کی یہ بات میں نے سنی کہ: "اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ

الْاَعْلٰی" میں نے کہا: "اِذًا لَا یَخْتَارُنَا!" (مشکوٰۃ ص:۵۴۸) اب یہ ہمارے پاس نہیں رہیں گے، اب ہمارے پاس رہنا یہ پسند نہیں کریں گے۔

سات کنوؤں کے پانی ڈالنے کی حکمت:

دوسری بات یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: سات کنووں کے مشکیزے لاؤ، اور وہ مجھ پر ڈالو۔ یہ چیز صحت کے لئے مفید ہے، لیکن بھائی! علاج کسی طبیب کے مشورے کے بغیر نہیں ہوتا، قاعدہ نہیں ہے، بسااوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس تدبیر سے علاج فرماتے تھے، کوئی بیمار ہوتا تو فرماتے کہ سات کنووں کا پانی لاؤ اور مریض کو غسل کرواتے، تو اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضعف بہت تھا اور آپؐ کی خواہش تھی کہ باہر تشریف لاکر ایک دفعہ سب کو زیارت بھی کروادیں اور کچھ نصائح بھی فرمادیں۔ اس لئے فرمایا کہ مجھے سات کنووں کے پانی کے ساتھ غسل دو تاکہ ذرا تھوڑی قوت آجائے تو میں لوگوں کی طرف نکلوں اور ان کو کچھ وصیتیں کروں، کچھ نصیحتیں کروں، چنانچہ غسل فرمانے کے بعد تشریف لائے، سر درد کی وجہ سے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

آخری بدھ کو مٹھائی بانٹنا، منافقوں کی چال:

سر درد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری مرض شروع ہوا، مرض الوفات، اور ہمارے ہاں جاہلوں نے صفر کا آخری بدھ اس کو بہت بابرکت بنادیا، آخری بدھ کو بیماری شروع ہوئی تھی اور یہ ہمارے دوست اس دن مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں، کارخانوں میں، فیکٹریوں میں اور اداروں میں باقاعدہ مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں۔

معلوم نہیں کس شیطانؑ نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی ہے کہ اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل صحت فرمایا تھا، مطلب یہ ہے کہ جس دن

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شروع ہوئی، منافقوں نے، زندیقوں نے تم سے جھوٹ بول کر اس دن مٹھائیاں تقسیم کروائیں، اور یہ تحقیق کرنے کی تم نے بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ جاکر کسی عالم سے پوچھ لیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ خالص جھوٹ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی آخری بدھ کو غسل صحت فرمایا ہو، خالص جھوٹ اور اس کی بنیاد پر مٹھائیاں تقسیم کرنا خالص جہالت۔

صفر کے آخری بدھ کو مرض الوفات کی ابتدأ:

صفر کا آخری بدھ تھا جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شروع ہوئی اور بیماری شروع ہوئی تھی سر درد سے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

”عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: رَجَعَ اِلَیَّ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ مِنْ جَنَازَةٍ مِنَ الْبَقِیْعِ فَوَجَدَنِیْ وَاَنَا اَجِدُ صُدَاعًا وَاَنَا اَقُوْلُ وَا رَأْسَاهُ قَالَ بَلْ اَنَا یَا عَائِشَةُ وَا رَأْسَاهُ قَالَ وَمَا ضَرَّکِ لَوْ مُتِّ قَبْلِیْ فَغَسَلْتُکِ وَکَفَنْتُکِ وَصَلَّیْتُ عَلَیْکِ وَدَفَنْتُکِ. قُلْتُ: لَکَاَنِّیْ بِکَ وَاللهِ لَوْ فَعَلْتَ ذَالِکَ لَرَجَعْتَ اِلٰی بَیْتِیْ فَعَرَسْتَ فِیْهِ بِبَعْضِ نِسَائِکَ، فَتَبَسَّمَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ بُدِئَ فِیْ وَجْعِهِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْهِ.“

(مشکوٰۃ ص:۵۴۹)

ترجمہ:......”ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ سے فارغ ہوکر گھر تشریف لائے، ادھر اتفاق کی بات کہ میرے سر میں درد تھا، میں لیٹی ہوئی تھی، میں نے کہا: ”وا رأساہ!“ کہ سر میں درد ہو رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمانے لگے:

اے عائشہ! سر میں درد تو میرے ہو رہا ہے، پھر ارشاد فرمایا کہ: (اے عائشہ!) تجھے کیا نقصان ہے، اگر تو میرے سامنے مر جائے تو میں تجھے اپنے ہاتھ سے غسل دوں اور کفن پہناؤں، تیری نماز جنازہ پڑھوں اور اپنے ہاتھ سے دفن کروں۔ میں نے کہا کہ: جی ہاں! آپ تو یہ ہی چاہیں گے کہ یہ مر جائے تا کہ میرے بعد اور کسی اچھی بیوی کو لائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔ تو اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری سر درد سے شروع ہوئی (اور یہ حقیقت میں زہر کا اثر تھا، جو آپ کو خیبر میں دیا گیا تھا)۔"

ابوبکرؓ سب سے بڑے عالم تھے:

بہرکیف! باہر تشریف لائے، منبر پر تشریف لے گئے تو یہ بات ارشاد فرمائی کہ اللہ کے ایک بندے کو اختیار دیا گیا ہے، یہ بات سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سمجھ گئے اور رونے لگے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوبکر صدیق ہم میں سب سے بڑے عالم تھے۔

علم کثرتِ معلومات کا نام نہیں:

علم معلومات کا نام نہیں ہے کہ کسی کو معلومات زیادہ ہوں، کسی چیز کی صحیح حقیقت تک پہنچ جانا اس کا نام علم ہے۔

ہمارے اکابر کا علم:

میں نے ایک موقع پر مدرسہ میں اپنے عزیز طالب علموں سے سبق پڑھاتے ہوئے عرض کیا تھا کہ مجھے اپنے اکابر سے کچھ زیادہ خوش اعتقادی ہے، حضرت نانوتوی

رحمۃ اللہ علیہ دنیا سے تشریف لے گئے، تو مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک صحیح بخاری شریف کا نسخہ اور ایک قرآن کریم ان کے گھر سے برآمد ہوا، اس پر انہوں نے مرزا غالب کا یہ شعر نقل کیا ہے کہ:

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا!

قلت اسباب و وسائل کا تو یہ حال ہے لیکن حجۃ الاسلام کہلاتے تھے، یعنی ان کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔ میں نے کہا: تم لوگ سالہا سال کے بعد غور وفکر کر کے قرآن و حدیث کے دلائل کو دیکھ کر جس نتیجہ پر پہنچو گے، میرا عقیدہ یہ ہے کہ میرے اکابر آنکھ کھولتے ہی وہاں پہنچ جاتے تھے۔

حضرات انبیاؑ اور ہمارے اکابر کی قوت قدسیہ:

اللہ تعالیٰ نے ان کو قوتِ قدسیہ عطا فرمائی تھی۔ فلاسفہ نے عقل انسانی کے درجات قائم کئے ہیں، ان میں ایک درجہ قوتِ قدسیہ کا ہے، انبیاؑ اور اولیاؑ کو اعلیٰ درجہ کی قوتِ قدسیہ عطا ہوتی ہے، ان کو مقدمات کی ترتیب دینے کی ضرورت نہیں ہوتی، کسی بات پر غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ جب بھی وہ کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں علم لَّدُنِیْ کے طور پر فوراً اس کی حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں، اس کا نام علم ہے۔

مستشرقین کا علم حرف شناسی ہے:

حرف شناسی کا نام علم نہیں ہے، اگر اس کا نام علم ہوتا تو مستشرقین سب سے بڑے عالم ہوتے۔ "مفتاح کنوز السنۃ" ایک کتاب ہے جو ایک عیسائی مستشرق کی لکھی ہوئی ہے، حدیث کی کتابوں میں جہاں جہاں کوئی احادیث آئی ہیں، اس نے ان کو عنوانات پر تقسیم کردیا، مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کیا کیا

احادیث ہیں۔ اور مستشرقین کی ایک جماعت نے ایک کتاب بڑی بڑی، موٹی موٹی آٹھ جلدوں میں جو اب سولہ جلدوں میں چھپی ہے، لکھی ہے، اس میں یہ بتایا ہے کہ حدیث کا فلاں لفظ، حدیث کی فلاں کتاب اور فلاں باب میں آیا ہے، اس کتاب کا نام ہے: "**المعجم المفهرس لالفاظ الحدیث**"، لیکن اس کے باوجود وہ ایمان سے محروم ہیں، اس علم کو کوئی کیا کرے گا؟ اس لئے کہ: "علم کہ راہ بحق نہ نماید جہالت است۔" چنانچہ شیخ سعدیؒ نے اسی لئے فتویٰ دیا تھا کہ:

سعدی بشوئے از لوح دل نقش غیرحق
علم کہ راہ بحق نہ نماید جہالت است

فرماتے ہیں کہ: "دل کی تختی سے غیرحق کے نقوش کو مٹا ڈالو اور دھو ڈالو اس لئے کہ جو علم حق کی طرف راہ نمائی نہیں کرتا وہ علم نہیں جہالت ہے۔"

جز یادِ دوست ہرچہ کنی عمر ضائع است
بجز حرف عشق ہرچہ بخوانی بپالت است

یادِ دوست کے سوا جو کچھ بھی کرتے ہو عمر کو ضائع کرتے ہو اور حرف عشق کے علاوہ جو کچھ بھی پڑھتے ہو محض فضول حرکت ہے۔ یعنی وہ کیا علم ہے جو آدمی کو اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچاتا، یعنی اللہ تعالیٰ کے دروازے تک نہیں لے جاتا، وہ کیسا علم ہے؟ کسی چیز کی حقیقت تک پہنچ جانا علم کہلاتا ہے۔

تحصیل علم کے ذرائع:

پھر یہ علم کئی طریقے سے حاصل ہوتا ہے، کچھ تو یہ پڑھنے پڑھانے سے حاصل ہوتا ہے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ہو۔

کبھی اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی صحبت میں رہنے سے علم ملتا ہے اور دل

میں ایک بصیرت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ حقائق کو پہچانتی ہے، اور کبھی علم لدنی ہوتا ہے، یعنی حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے القا کیا جاتا ہے، جیسے قرآن کریم میں ہے: ''وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا.'' (اور ہم نے اس کو اپنی جانب سے علم سکھلایا)۔

صدیق اکبرؓ کا علم:

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بابرکت کا اثر تھا کہ ان کے قلب میں وہی چیز آتی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں آتی تھی، دوسری بات آتی ہی نہیں تھی، اس لئے لقب صدیق ہوا۔

''صدیق'' کا معنی:

صدیق اس کو کہتے ہیں کہ سر کے بالوں سے لے کر، سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک صدق ہی صدق ہو، اور کذب کا نام و نشان نہ ہو، وہ صدیق کہلاتا ہے، قرآن کریم نے بطور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کو ''یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ'' (یوسف:۴۵) کہا ہے، صدیقین کا لفظ عام بولا ہے، دوسری جگہ ارشاد ہے:

''وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوْسٰى اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا.'' (مریم:۵۱)

ترجمہ:......''ذکر کیجئے کتاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کہ وہ صدیق تھے۔''

مقام صدیقی، مقامِ نبوت کا عکس:

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صدیق کہا، حضرات انبیاءؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نبوت ملنے سے پہلے صدیق ہوتے ہیں، بعد میں جب ان کو نبوت عطا کی جاتی ہے، تو ان کے فیض صحبت سے صدیق بنتے ہیں، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انبیاءؑ

کے بعد افضل الصدیقین ہیں، اس لئے کہ وہ افضل النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے برگزیدہ صحابی ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے خاص ان کے بارہ میں فرمایا ہے: "اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا." چنانچہ اس آیت میں: "صَاحِبِهٖ" سے مراد صاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

صدیق اکبرؓ جانشین رسول تھے:

اس لئے میں نے کہا ہے کہ امیرالمؤمنین کا لفظ جو ہے ناں! یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایجاد ہوا، امیرالمؤمنین کی اصطلاح خلیفۃ المسلمین کے لئے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایجاد ہوئی، صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کو امیرالمؤمنین کہنا شروع کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیرالمؤمنین نہیں کہتے تھے، ان کو امیرالمؤمنین نہیں کہا جاتا تھا، ان کو جب بھی بلاتے یا خلیفۃ رسول اللہ! کہہ کر بلاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند کی جانشینی انہی کو زیبا تھی۔

صدیق اکبرؓ کا مقام:

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کیا کہ: "بِآبَائِنَا وَاُمَّهَاتِنَا وَاَبْنَائِنَا! یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عَلٰی رِسْلِکَ" ٹھہرو ابوبکر ٹھہرو! یہ کیوں فرمادیا؟ اس میں بھی رمز تھی، زبان کھل گئی تھی صدیق کی، ایسا نہ ہو کہ یہ دہانہ پھوٹ پڑے اور سب کچھ بہا کر لے جائے، ٹھہر جاؤ! بند لگالیا، غم و اندوہ کی وجہ سے سیلاب امڈ آئے اور حاضرین کے لئے اس کا برداشت کرنا مشکل ہوجائے، فرمادیا: "علی رسلک" ٹھہر جاؤ، بند لگادیا۔ وہ خاموش ہوگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتیں ارشاد فرمائیں۔

ایک بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ اس بھری دنیا میں کسی صاحب نے ہم پر کوئی

احسان کیا ہے، ہم اس کا بدلہ چکا چکے ہیں، سوائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کہ ان کے احسان کا بدلہ ہم سے نہیں چکایا گیا، اللہ تعالیٰ ہی ان کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔

اور دوسری یہ بات ارشاد فرمائی کہ اپنی رفاقت اور اپنے مال کے ذریعہ سے جس قدر احسانات ہم پر ابوبکر کے ہیں، اتنے کسی کے نہیں، ''اِنَّ اٰمَنَّ النَّاسِ عَلَیَّ فِیْ صُحْبَتِہٖ وَمَالِہٖ اَبُوْبَکْرٍ.'' اور ان کے استخلاف کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: مسجد کی طرف دروازے کھلتے تھے، مسجد شریف کے اردگرد صحابہؓ کی آبادی تھی، اور جلدی سے نماز کے آنے کے لئے مسجد میں دروازے کھول رکھے تھے، فرمایا: سارے دروازے بند کردیئے جائیں سوائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دروازے کے کہ ان کو تو ہمہ وقت آنے کی ضرورت ہوگی، باقی دروازے بند کردو، تاکہ خلیفہ کا دوسرے لوگوں سے امتیاز ہوجائے۔

آٹھ سال بعد شہدائے احد پر نماز جنازہ:

اسی خطبہ میں دو باتیں مزید ارشاد فرمائیں، ایک تو شہدائے احد کو یاد فرمایا، یہ اسلام کے لئے سب سے پہلے قربانی دینے والے حضرات تھے، ان کے لئے دعائے رحمت فرمائی اور استغفار فرمایا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

''وَعَنْ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: صَلّٰی رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی قَتْلٰی اُحُدٍ بَعْدَ ثَمَانِ سِنِیْنَ کَالْمُوَدِّعِ لِلْاَحْیَاءِ وَالْاَمْوَاتِ ..... الخ.''

(مشکوٰۃ ص:۵۴۷)

ترجمہ:...... ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے وصال سے چند دن پہلے احد گئے، شہدائے احد کی قبروں پر گئے اور یہ عجائبات میں سے ہے کہ) آٹھ سال کے بعد ان حضرات پر نمازِ جنازہ پڑھی، گویا کہ آپؐ زندوں اور مردوں کو رخصت فرمارہے

تھے، (زندوں کو تو رخصت کر ہی رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مردوں سے بھی رخصت ہوئے)۔"

مہاجرین وانصار کا مقام:

اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ مہاجرین بڑھتے جائیں گے اور انصار کم ہوتے جائیں گے۔ یہ دو طبقے تھے، ایک مہاجرین کا جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہجرت کی، مکہ مکرمہ چھوڑ کر یہاں آگئے، جو اس وقت ان کے لئے پردیس تھا، اپنا وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا، اپنے کاروبار چھوڑے اور بعض نے اپنے اہل وعیال چھوڑے، ایسے حضرات بھی تھے جو ہجرت کر کے تشریف لے آئے، لیکن بال بچے وہاں رہے، ان کے منگوانے کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا تھا، یہ مہاجرین تھے اور مدینے کے حضرات جو پہلے سے ہی یہاں رہ رہے تھے اور جنہوں نے اسلام کے لئے اپنی آغوش کھول دی تھی، خود اسلام کی آغوش میں چلے گئے تھے، یہ انصار کہلاتے تھے، قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی تذکرہ آیا، ان دونوں فریقوں کا المھاجرین والانصار کے ساتھ آیا ہے، پہلے نمبر پر مہاجرین اور دوسرے نمبر پر انصار، گویا مہاجرین کو متبوع اور انصار کو تابع بنایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ یہ انصار "قرشی وعیبتی" میرے اعضائے باطنی ہیں اور عیبا کہتے ہیں اپنا خاص بکس جس میں آدمی نے اپنا سامان اور خزانہ رکھا ہوا ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ انہوں نے مجھے پناہ دی تھی، اس لئے ان میں سے جو کریم اور بڑے لوگ ہیں ان کا اکرام کرو، اور اگر ان میں سے کسی سے غلطی ہوجائے تو اس سے درگزر کرو، یہ کن کو کہہ رہے ہیں؟ مہاجرین کو! اس میں بھی اشارہ فرمادیا کہ خلافت مہاجرین میں ہوگی، انصار میں نہیں ہوگی اور یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَلِاَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ وَاَبْنَاءِ

اَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ۔" (مشکوٰۃ ص:۵۷۷)

ترجمہ:...... "یا اللہ! انصار کی بخشش فرما، انصار کی اولاد کی بخشش فرما، اوران کی اولاد کی اولاد کی بخشش فرما۔"

انصار کے احسانات:

ان حضرات انصار کے عام مسلمانوں پر بڑے احسانات ہیں، اسلام پر احسان کہنا تو غلط ہوگا، بلکہ اسلام کا ان پر احسان تھا، ظاہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے احسانات تھے، لیکن حقیقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان پر احسانات تھے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق تھے، بالکل وہی نقشہ نظر آتا تھا جو شمع اور پروانوں کا نظر آیا کرتا ہے، جس طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نکلتے تھے حضرات انصار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں ہوتے تھے، اور ہر قربانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے لئے دینے کو تیار رہتے تھے، وہ جو جنگ ہوازن کے موقع پر قصہ پیش آیا تھا، وہ میں ذکر کرچکا ہوں، صحیح بخاری شریف میں ہے کہ کسی نوجوان انصاری کے منہ سے نکل گیا تھا کہ:

"..... فَقَالُوْا يَغْفِرُ اللّٰهُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِي قُرَيْشًا وَيَدَعُنَا وَسُيُوْفُنَا تَقْطُرُ مِنْ دِمَائِهِمْ فَحُدِّثَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَقَالَتِهِمْ فَاَرْسَلَ اِلَى الْاَنْصَارِ فَجَمَعَهُمْ فِيْ قُبَّةٍ مِنْ اَدَمٍ وَلَمْ يَدَعْ مَعَهُمْ اَحَدًا غَيْرَهُمْ فَلَمَّا اجْتَمَعُوْا جَاءَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا حَدِيْثٌ بَلَغَنِيْ عَنْكُمْ فَقَالَ فُقَهَاءُهُمْ اَمَّا ذَوُوْا رَاْيِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَلَمْ يَقُوْلُوْا شَيْئًا وَاَمَّا اُنَاسًا مِنَّا حَدِيْثَةٌ اَسْنَانِهِمْ قَالُوْا يَغْفِرُ اللّٰهُ

لِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُعْطِیْ قُرَیْشًا وَیَدَعُ الْاَنْصَارَ وَسُیُوْفُنَا تَقْطُرُ مِنْ دِمَائِهِمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَّا تَرْضَوْنَ اَنْ یَّذْهَبَ النَّاسُ بِالْاَمْوَالِ وَتَرْجِعُوْنَ اِلٰی رِحَالِکُمْ بِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللهِ! قَدْ رَضِیْنَا۔" (مشکوٰۃ ص:۵۷۶)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنوں کو دیتے ہیں، ان کو مکہ یاد آگیا ہے اور ہماری تلواروں سے ابھی تک خون ٹپک رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بالکل الگ ایک خیمہ میں جمع ہونے کا حکم دیا، وہ حضرات جمع ہوگئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، فرمایا: یہاں انصار کے علاوہ کوئی اور آدمی تو نہیں ہے؟ عرض کیا گیا کہ: حضور! اور تو کوئی نہیں ہے، ہمارا بھانجا ہے، ہے تو دوسرے قبیلے کا، انصار کا نہیں ہے، لیکن ہمارا بھانجا ہے، فرمایا اس کو رہنے دو، "فَاِنَّ اِبْنَ اُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُمْ۔" کیونکہ کسی قوم کا بھانجا انہیں میں سے شمار ہوگا، یہ خاص بات تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع پر ارشاد فرمائی، اور پھر پوچھا کہ وہ کیا بات ہے جو مجھے تمہاری طرف سے پہنچی ہے، حضرات انصار رونے لگے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ہم میں سے جو بڑے اور سمجھ دار لوگ ہیں انہوں نے تو کچھ نہیں کہا، یہ جو بچے، لونڈے ہیں، ان کے منہ سے یہ بات نکلی ہے۔ وہاں عجیب و غریب مکالمہ ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: انصار! تم بھول گئے ہو، تم گمراہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی، تم بھوکے تھے، اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمہیں کھانا عطا فرمایا، تم ننگے تھے، فقیر تھے، قلاش تھے، میری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں غنی کردیا، اب وہ رو رہے ہیں، گرج کر فرمایا: مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟ وہ صرف اتنا کہہ پائے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ فرمایا: جواب دو! تم جواب دینا چاہو تو جواب دے سکتے ہو کہ تجھے تیری قوم نے رہنے نہیں دیا تھا،

نکال دیا تھا، ہم نے تجھے پناہ دی تھی، لوگ تجھ کو گالیاں دیتے تھے، ہم نے تیرے لئے یہ کیا تھا، وہ یہ کرتے تھے ہم نے یہ کیا۔ اور بہت ساری ایسی باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گنوادیں، لیکن انہوں نے صرف اتنا ہی کہا کہ: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ فرمایا کہ: اے انصار! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ شام کو اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو لے کر جاؤ، اور دوسری روایت میں ہے:

”وَلَوْ لَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ اِمْرًا مِنَ الْاَنْصَارِ، وَلَوْ سَلَكَ النَّاسُ وَادِيًا وَسَلَكَتِ الْاَنْصَارُ وَادِيًا اَو شِعْبًا لَسَلَكْتُ وَادِيَ الْاَنْصَارِ وَشِعَبِهِمْ.“ (مشکوٰۃ ص:۵۷۶)

اب میں کیا کروں میں مہاجر ہوں، ہجرت کر کے گیا ہوں، اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی اپنے آپ کو انصار ہی کہلاتا، میں بھی انصار ہی میں سے شمار ہوتا، ایک وادی میں چلے انصار، دوسری وادی میں چلے لوگ، تو میں انصار کی وادی اور گھاٹی پر چلوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کے ساتھ بہت ہی تعلق خاطر تھا، بے حد محبت، اس لئے اس آخری وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں وصیت فرمائی اور ان کو بہت ہی زیادہ دعائیں دیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

مؤمن
کی
صفات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

''عارف باللہ شیخ تاج الدین ابن عطاء اللہ سکندریؒ کی تصنیف لطیف ''مفتاح الفلاح ومصباح الارواح'' ذکر الٰہی کے موضوع میں بے نظیر تبرک ہے، جو بیش قیمت افادات پر مشتمل ہے، حیدرآباد (سندھ) کے ایک بزرگ حضرت مولانا عبدالغنی صاحب مدفیوضہم نے یہ کتاب حضرت اقدس مولانا محمد عبداللہ صاحب صدر مفتی خیرالمدارس ملتان کی خدمت میں بغرض اشاعت بھیجی ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے، حضرت موصوف، اس کی اصل اور ترجمہ دونوں کی اشاعت کا الگ الگ اہتمام فرما رہے ہیں۔ ذیل میں اسی کتاب کا ایک باب قارئین کی خدمت میں ہدیہ کیا جاتا ہے، واللہ الموفق!''.................(محمد یوسف)

مساکین جو امور اپنے اوپر لازم قرار دیتے ہیں:

جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ منازعت اور جھگڑالو نفس کے ظہور سے بعید ہے، اس میں نہ ذرہ برابر عذر معذرت کی گنجائش ہے، نہ چشم پوشی کی صورت ہوسکتی ہے، ان امور میں جو خروج عن الطریق کی طرف مؤدی ہوں کسل مندی گوارا کی جاسکتی ہے، ان کے نزدیک زبانی مؤاخذہ اور درگزر نہ کرنا، ان امور میں ہے جن میں شرعاً مسامحت نہیں ہوسکتی، اور اپنے حقوق اور ذاتی امور میں مسامحت کر لیتے ہیں۔

اپنی ذات اور دوسروں کے لئے:

اہل طریق کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ اپنے نفس سے لوگوں کو انصاف دلاتے ہیں، لیکن خود داد طلبی نہیں کرتے، وہ اجانب سے معذرت قبول کر لیتے ہیں لیکن خود عذر خواہی کی نوبت نہیں آنے دیتے، وہ باہم مناصحت کا، اور عام لوگوں کے ساتھ شفقت و رحمت کا برتاؤ کرتے ہیں، ان کے درمیان باہمی بغض، کینہ، حسد، عطیاتِ الٰہیہ میں نہیں پایا جاتا، ان میں سے کوئی ''میری''، ''میرے پاس''، ''میرا سامان''، ''میری سواری'' اور ''میرا کپڑا'' کا لفظ نہیں کہے گا، انہیں جو فتوح حاصل ہوتی ہیں، ان میں وہ سب برابر کے شریک ہوتے ہیں، وہ کسی خاص شخص کی ملک میں نہیں ہوتیں۔

عورتوں اور لڑکوں کی ہم نشینی سے پرہیز:

ان کا طریق عورتوں کی موافقت، ہم نشینی اور دوستی کو ترک کرنا، اور نوعمر لڑکوں کی صحبت اور گفتگو سے پرہیز کرنا ہے۔ ان کے یہاں یہ شرط ہے کہ کسی سے وعدہ نہ کیا جائے، اگر کسی نے غلطی کی اور وعدہ کرلیا تو اس کا ایفا ہر قیمت پر ضروری ہے۔

اہل اللہ کے اوصاف:

سچ بولنا، اور طعام، کلام اور نظر میں ورع اختیار کرنا، ریاکاری سے دور

بھاگنا، شریعت کے تمام آداب کی جو اسے معلوم ہوں، رعایت اور حفاظت کرنا، اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں ہر حالت کا حکم دریافت کئے جانا، ان کے شرائط طریق میں داخل ہے، ان کا یہ نظریہ ہے کہ جو شخص آداب شرعیہ میں خیانت سے نہیں چوکتا وہ اسرارِ الٰہیہ میں خیانت سے کب باز رہے گا؟ اور حق جل مجدہ اپنے اسرار صرف امین حضرات کو عطا فرماتے ہیں، خیانت پیشہ لوگوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں۔

اپنی پسند و ناپسند سے اجتناب:

ان کے طریق میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنی پسند و ناپسند سے دست کش ہوجاتے ہیں، بس حق جل مجدہ نے ان کے لئے جو کچھ پسند فرمالیا اور اختیار کرلیا وہ اسی پر بجان و دل راضی ہیں۔ نیز وہ مباحات کے درپے ہوکر وقت ضائع نہیں کرتے۔ جو شخص اس طریق میں داخل ہو، اگر وہ صاحب نکاح ہوتو اسے طلاق دینے کی ضرورت نہیں، اور اگر مجرد ہوتو نکاح نہ کرے گا تاوقتیکہ اس کی تکمیل نہیں ہوجاتی، اس کے بعد حق تعالیٰ کی جانب سے جو القاٗ کیا جائے گا، اس پر عمل کرے گا۔

روپیہ پیسہ لینے دینے میں احتیاط:

سالک کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ روپیہ پیسہ لینے میں پوری احتیاط اور تورع کے باوجود نقدی پاس رکھ کر رات نہیں گزارے گا، نہ سالک کسی کو دینے کے لئے کسی سے کچھ لیتا ہے، کیونکہ یہ اس کے لئے حجاب ہے، البتہ کامل لے بھی سکتا ہے، اور دل چاہے تو رکھ بھی سکتا ہے، اور دل چاہے تو دے سکتا ہے، کیونکہ کامل القاٗ ربانی کے موافق عمل کرتا ہے، جس طرح شاگرد، استاذ کے اشاروں پر عمل کرتا ہے، جس طرح تلمیذ کے کسی فعل پر اعتراض نہیں (کیونکہ وہ پابند حکم استاذ ہے)، اسی طرح شیخ کامل کے ان افعال پر اعتراض نہیں، اس لئے کہ اگر وہ واقعی شیخ ہے تو یہ سب کچھ من جانب اللہ کرتا ہے۔

ترکِ اغراض:

ان کی ایک شرط ترکِ اغراض ہے، الّا یہ کہ اعتراض کرنے والا اعلیٰ ہو، کیونکہ یہ اعتراض نہیں بلکہ تادیب ہے، اور اگر کم مرتبہ ہے تو اسے خاموش رہنا چاہئے، اگر اس نے اعتراض کیا تو عقد طریق باطل کردیا، اس لئے کہ اہل طریق اہل صدق ہیں، زبان سے وہی کہتے ہیں جس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

آدابِ مرید:

اور جب مرید شیخ کی زیارت کو جائے تو اپنے قلب کو "اپنے پاس کی چیزوں" سے خالی کرلے، تاکہ شیخ کے القاٗ کردہ امور کو قبول کرسکے، اور شیخ کی کسی بات پر انکار کی صورت پیدا نہ ہو، اور اگر کوئی ایسی بات پیش آئے جس کو اس کا قلب قبول نہیں کرتا، تو اپنے کو ملامت کرے اور یوں جانے کہ میں اس مقام کو نہیں پہنچا، شیخ کی طرف خطا کی نسبت نہ کرے، جو شیخ کے پاس بغرض امتحان و آزمائش جاتا ہے، وہ جاہل ہے، اور شیخ سے "خاطر" پر کلام کا مطالبہ نہ کرے، بلکہ امراض نفوس اور ان کے علاج کی معرفت شیخ سے طلب کی جاتی ہے، مکاشفات، مریدین کے احوال ہیں، عارفین کے احوال نہیں۔

بدظنی سے اجتناب:

اور اہل طریق جب کسی گناہگار کو عین حالتِ معصیت میں دیکھتے ہیں تب بھی اس کے بارے میں اصرار کا اعتقاد نہیں رکھتے، ان کا خیال ہوتا ہے کہ شاید اس نے خفیۃً توبہ بھی ساتھ ہی کرلی ہو یا ہوسکتا ہے کہ اس کا خاتمہ عنایت الٰہیہ کی وجہ سے اچھا ہونے والا ہو، اس لئے ممکن ہے کہ یہ گناہ (انجام کے اعتبار سے) اسے مضر نہ ہو، ہاں برا اعتقاد وہ اسی شخص کے متعلق رکھتے جس کے انجام پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مطلع کردیا ہو، اس کے باوجود وہ کسی کو عار نہیں دلاتے۔

اپنے آپ کو کسی سے بہتر نہ جاننا:

اہل طریق اپنی ذات کو کسی سے بہتر نہیں سمجھتے، جو شخص اپنے کو دوسرے سے بہتر جانتا ہے، بغیر اس کے کہ اس کو اپنا اور اس دوسرے کا مرتبہ فی الحال اور انجام کے اعتبار سے معلوم ہوگیا ہو، وہ جاہل باللہ ہے، دھوکے میں مبتلا ہے، اور خیر سے یکسر خالی ہے، خواہ اسے کتنے ہی معارف کیوں نہ دیئے گئے ہوں، علم کی تحقیر درحقیقت حق تعالیٰ کی بے ادبی ہے، اور یہ نقیض ولایت ہے۔

اہل اللہ کے اوصاف:

نیز ان کے اوصاف میں سے ہر دنی اور گندے خلق سے نفس کو پاک کرنا، اور خلق عالی سے نفس کو مزین کرنا ہے۔ وہ مخلوق کی ایذا برداشت کرلیتے ہیں، کسی کو ایذا نہیں دیتے، وہ دوسروں کا بوجھ اٹھالیتے ہیں، اپنا بار دوسروں پر نہیں ڈالتے، وہ نیکی کے کاموں میں اعانت کرتے ہیں، آفت رسیدگاں کی فریاد رسی کرتے ہیں، راستہ بھولے ہوئے کی رہنمائی کرتے ہیں، ناواقف کو تعلیم دیتے ہیں، غافل کو بیدار کرتے ہیں، وہ نہ دربان رکھتے ہیں، نہ پردہ لٹکاتے ہیں، بلکہ جو شخص بھی ان کو تلاش کرے، پالیتا ہے، اور جو ان کا ارادہ کرے، ان تک پہنچ جاتا ہے، وہ کسی سے چھپ کر نہیں رہتے، نہ کسی سائل کو منع کرتے ہیں، نو وارد کی مہمان نوازی کرتے ہیں، وحشت زدہ کو انس دلاتے ہیں، ڈرے ہوئے کو امن دیتے ہیں، وہ نوکروں اور خادموں کی مدد کرتے ہیں، الغرض نہ وہ کسی فضیلت کو چھوڑتے ہیں، نہ کسی رذیلہ کو کرتے ہیں۔

چار قسم کی موت برداشت کرنا:

منجملہ ان کے اوصاف کے مجاہدات بدنیہ یعنی بھوک، پیاس، برہنگی، اور چار قسم کی موت کا برداشت کرنا ہے، سفید موت یعنی بھوک، سرخ موت یعنی مخالفت ہویٰ، سیاہ موت یعنی تحمل ایذاء، سبز موت یعنی اوپر نیچے پیوند لگانا۔

کونین کو دل سے نکال دینا:

ان کے اوصاف میں یہ امور بھی ہیں، کونین کو اپنے قلب سے ترک کر دینا، اپنے پاس کی چیزوں کو اپنے بھائیوں یعنی خلق اللہ پر قربان کر دینا، تمام امور میں حق تعالیٰ پر اعتماد رکھنا، تمام ایسے امور جو نفس کو شاق اور ناگوار ہیں، ان کے جاری ہونے پر راضی ہونا، دکھ درد پر صبر کرنا، وطن سے دور نکل جانا، مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کرنا، بروں سے (بدفہمی کی وجہ سے نہیں بلکہ خالق جل مجدہ کو خلق پر ترجیح کی غرض سے) علائق اور عوائق کو قطع کرنا، اور لوگوں کی حاجات کے پورا کرنے میں سعی کرنا، بشرطیکہ یہ اپنی اصلاح سے فارغ ہو چکا ہو، اور جو شخص اپنے نفس کی تکمیل سے فراغت حاصل کئے بغیر ان امور میں مشغول ہوتا ہے، وہ ریاست اور شہرت کا خواہش مند ہے۔

قناعت پسندی:

منجملہ ان کے اوصاف کے قناعت ہے۔ یعنی ''جتنا رزق مل جائے، نفس کا اس پر قرار پکڑنا اور مزید کا منتظر نہ رہنا۔'' نیز ان کا سر منڈانا، بال کتروانا، ناخن تراشنا اور کسی کو دینے کی غرض سے کپڑا اتارنا، یہ تمام امور باوضو ہونے کی حالت میں ہوتے ہیں، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان سے جب بھی کوئی چیز جدا ہو، طہارت پر جدا ہو، فرشتے کہتے ہیں: ''اے رب! جب ہم ان کے پاس سے آئے تھے وہ نماز پڑھتے تھے۔''

حق عبدیت کا اہتمام:

منجملہ ان کے حق عبدیت ادا کرنے کی نیت سے دعا کرنا، اور حق تعالیٰ کے سامنے فقر و ذلت، خشوع و خضوع اور تواضع و مسکنت کا ظاہر کرنا ہے، تاکہ ان صفات کے مقابل، اسمائے الٰہیہ کا ظہور ہو، ان اسمائے الٰہیہ کا سر اسی پر کھلتا ہے جو ان صفات کے ساتھ متصف ہو جائے جو ان اسماء کے مقابل ہیں۔ یہی حق عبدیت ہے۔

اپنے عیوب پر نظر کرنا:

منجملہ ان کے احوال کے اپنے عیوب پر نظر کرنا، اپنی ذات میں مشغول ہونا اور لوگوں کے عیوب سے اندھا ہوجانا ہے۔ وہ زبان کو خیر کا عادی بناتے ہیں، آنکھوں کو فضول نظر سے بند رکھتے ہیں، نیز رفتار میں قدرے تیزی کرنا، خیر کے سوا ہر بات میں خاموشی اختیار کرنا، جن صاحب سلطنت لوگوں سے نفع کی امید یا نقصان کا اندیشہ کیا جاسکتا ہے، ان کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا، تمام مخلوق سے صاف دل رہنا، تمام مسلمانوں کے لئے غائبانہ دعا کرنا، فقراً کی خدمت کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق سے خواہ انسان ہو یا حیوان، شفقت و رحمت کا برتاؤ کرنا، ان کی صفات ہیں۔

ظالم حاکم کی نفرت کا سبب:

روایت ہے کہ بخارا میں ایک حاکم بڑا ظالم تھا، ایک دن سوار ہوکر نکلا، راستہ میں خارشی کتا دیکھا، سردی اس دن بہت تھی، متعلقین کو حکم دیا کہ اس کتے کو اٹھالو، وہ کتا اٹھا کر اس کے گھر لایا گیا، اس کے ساتھ خوب لطف و احسان کا معاملہ کیا، رات ہوئی تو خواب میں ہاتف غیبی سے آواز آئی: ''تو کتا تھا، تجھے کتے کو ہبہ کردیا۔'' (یعنی کتے کی وجہ سے بخش دیا)۔

دوسروں کے محاسن پھیلانا اور عیوب چھپانا:

منجملہ ان کے اوصاف کے لوگوں کے محاسن کا پھیلانا اور ان کے عیوب کا چھپانا ہے۔ البتہ بدعتی لوگوں کے ساتھ وہ یہ رعایت نہیں کرتے، کیونکہ بدعتی کے حالات کی اطلاع ہر شخص پر فرض ہے، تاکہ لوگ اس کی فساد انگیزی سے اپنی حفاظت کرسکیں۔

لوگوں کی تعظیم کرنا اور حقارت سے اجتناب:

منجملہ ان کے احوال کے لوگوں کو بنظر تعظیم دیکھنا ہے، نہ بنظر حقارت، وہ اپنے کوکسی سے افضل نہیں دیکھتے، نہ کسی پر اپنی فضیلت سمجھتے ہیں، نہ کسی پر اپنا حق تصور کرتے ہیں، خواہ دوسروں کے ان کے ذمہ کتنے ہی حقوق ہوں، وہ کسی کو قرض نہیں دیتے، جب ان سے سائل کچھ مانگتا ہے تو اسے دے دیتے ہیں، لیکن ان کے دل میں واپس لینے کا خیال نہیں ہوتا، اور اگر وہ شخص از خود واپس کرے تو ہر ممکن تدبیر سے واپس نہ لینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اگر وہ واپس دینے پر اصرار کرے تو اس سے لے کر کسی دوسرے محتاج کو دے دیتے ہیں، لیکن اس کو اپنی ملک میں نہیں رکھتے، کیونکہ جس چیز سے وہ نکل جاتے ہیں، اس کی طرف رجوع نہیں کرتے، جب ان کی کوئی چیز راستہ میں گر جاتی ہے، خواہ مال ہو یا کپڑا، یا ہزار دینار ہوں، اور وہ اسے چھوڑ کر آگے نکل گئے ہوں، تو نہ اس کی تلاش کرتے ہیں، نہ اس غرض سے واپس لوٹتے ہیں، نہ اس کا اعلان کرتے ہیں، اور اگر ان کو اس حالت میں اپنے نفس میں تغیر محسوس ہو تو وہ اصحابِ علت ہیں، ہنوز ''کائنات'' کا ان کے قلب میں حصہ ہے، انہیں اس علت کے ازالہ کے لئے محنت کرنی چاہئے، اور اگر کوئی شخص بلاطلب ان کی گم شدہ چیز واپس کر دیتا ہے، تو دل چاہتا ہے تو رکھ لیتے ہیں اور دل چاہتا ہے تو اسے ملک سے نکال دیتے ہیں، ان کے لئے یہ کوئی شرط نہیں کہ ان کے پاس نہ ہو، بعض کے پاس مال ہوتا ہے، بعض کے پاس نہیں ہوتا۔

خلوت وجلوت میں طاعت سے سرشاری:

ان کا ایک وصف خلوت وجلوت میں طاعت کے ساتھ لذت حاصل کرنا، حق تعالیٰ کے ساتھ ایک ایک لحظہ کی رعایت کرنا، اور ہمہ وقتی تلقی وارد کے لئے خاطر مع اللہ کی حفاظت کرنا، جمیع حالات میں حق تعالیٰ سے راضی رہنا، ہر حال میں حق تعالیٰ

کی حمد بجالانا ہے۔

خلافِ عادت پر عمل ہی کرامت ہے:

مخلوق کے نفوس جس عام عادت اور روش پر چل رہے ہیں، جو شخص اپنے نفس کی عادت توڑ کر خرقِ عادت کے طور پر نفس کو عادت عامہ کے خلاف چلا دیتا ہے، حق تعالیٰ اس کے بدلے میں اسی قسم کا خرقِ عادت فرمادیتے ہیں (یعنی اسباب و مسبّبات کا ظہور فرمادیتے ہیں)۔ عوام کی اصطلاح میں اسی کو کرامت کہا جاتا ہے، لیکن خواص کے نزدیک ''وہ عنایت الٰہیہ جس کی بدولت نفس کی سفلی عادات کے خلاف کرنے کی توفیق اور قوت نصیب ہوئی، اس سے مشرف ہوجانا ہی کرامت ہے۔''

(یہاں سے آخر تک کا مضمون اصل کتاب باب سابق سے مقدم ہے، یہاں اس کی تاخیر مناسب معلوم ہوئی۔ محمد یوسف۔)

حق تعالیٰ کی مغفرت و بخشش کی امید:

خبردار! اہل ''لا الٰہ الا اللہ'' کے ساتھ کبھی عداوت نہ کرو، اس لئے کہ ان کو حق تعالیٰ کی ولایت عامہ حاصل ہے، اور وہ اولیاء اللہ ہیں، خواہ وہ کتنے ہی گناہگار ہوں، اور زمین کی بھرتی کے بقدر گناہ لے کر آئیں، حق تعالیٰ اسی قدر مغفرت کے ساتھ ان کا استقبال فرمائیں گے، بشرطیکہ وہ شرک میں مبتلا نہ ہوں، اور جس کے لئے ولایت ثابت ہے اس سے جنگ حرام ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ لڑنے کو تیار ہو، اس کا انجام اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا، دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی۔

(یہ مصنف پر حق تعالیٰ کی مغفرت و بخشش اور رحمت واسعہ کی امید و یقین کا غلبہ کثیر ہے کہ انہوں نے عام قائلین ''لا الٰہ الا اللہ'' کو ولایت عامہ کا مستحق سمجھا، اور بغیر پرسش و حساب کے ان کے لئے نعماء آخرت کی امید باندھی۔ قرآن و سنت کی

روشنی میں ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ ہر مؤمن و مسلم اپنے ایمان و اسلام کی بنا پر مستحق نجات و مغفرت ہوگا، لیکن یہی نہیں کہ وہ اپنے کو اعمالِ صالحہ اور قیود شرعیہ سے بے پرواہ سمجھے اور کتاب و سنت کے خلاف زندگی گزارے۔ ہر مؤمن و مسلم کو بھی اپنے برے اعمال کے لئے اس مالک حقیقی کی بارگاہ میں جوابدہ ہونا ہے۔ مدیر)

بغیر تحقیق کے کسی کو دشمن خدا کہنے سے اجتناب:

اور جس شخص کے دشمن خدا ہونے کی اطلاع تمہیں منجانب اللہ نہیں ہے، اسے بھی دشمن نہ بناؤ، کم از کم یہ ہو کہ جس کے حالات کی تمہیں تحقیق نہیں ہے، اس سے نہ دوستی کا برتاؤ کرو، نہ دشمنی کا، البتہ جب معلوم ہوجائے کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، اور اللہ کا دشمن صرف مشرک اور کافر ہے۔

پس اس سے بری ہوجاؤ، جس طرح کا معاملہ حضرت خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے والد آزر سے کیا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''پس جب ان کو (حضرت ابراہیم علیہ السلام کو) واضح ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، اس سے بری ہوگئے۔'' اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''آپ کسی قوم کو جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں، نہیں پائیں گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ کرتے ہیں، خواہ ان کے باپ ہوں، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا، یا بیٹے ہوں، یا بھائی ہوں، یا برادری کے لوگ۔'' پس یہ میزان ہے، جس سے تم جان سکو گے۔

اولیاءُ اللہ سے عداوت سے پرہیز:

اور حتی الامکان اللہ کے بندوں سے معادات کا برتاؤ نہ کرو، اور نہ دشمنی کا فیصلہ اس بات سے کرنے لگو جو زبان سے ظاہر ہو۔ اگر کسی مسلمان سے ناروا فعل سرزد ہو تو اس کے فعل کو بے شک برا سمجھو، مگر اس کی ذات سے کراہت نہ کرو، اور اللہ کے

دشمن (کافر) کی ذات سے نفرت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''جو میرے ولی سے دشمنی کرے، میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں!'' اور اگر کسی آدمی کی حالت مجہول تھی، اور تم نے اس سے دشمنی کا برتاؤ کیا، تو کہا جائے گا کہ تم نے اللہ کی مخلوق کے معاملہ میں اللہ کا حق ادا نہیں کیا، کیا خبر کہ اللہ کا علم اس کے متعلق کیا ہے؟ تم خواہ مخواہ اس سے بری ہوگئے، اور اس سے دشمنی کرنے لگے۔ اور اگر کسی کا ظاہر حال تمہارے علم میں (اچھا) ہے، اور وہ واقعتاً حق جل مجدہ کا دشمن ہے، مگر چونکہ تم کو اس بات کا علم نہیں، اس لئے اللہ کا حق ادا کرنے کی غرض سے اس سے دوستی رکھو، دشمنی نہ کرو، کیونکہ حق تعالیٰ کا اسم ''ظاہر'' تم سے حق تعالیٰ کے دربار میں مخاصمہ کرے گا، اپنے اوپر اللہ کی محبت قائم نہ کرو، ورنہ مارے جاؤ گے، اس لئے کہ حق تعالیٰ کی حجت غالب آکر رہتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ رحمت و شفقت کا معاملہ کرو، جس طرح اللہ تعالیٰ ان کے کفر کے باوجود انہیں رزق دیئے جاتا ہے، باوجودیکہ ان کے تمام احوال سے واقف بھی ہے، اسی طرح اپنی رحمت و شفقت تمام حیوانات اور تمام مخلوق کے ساتھ عام رکھو، ان کے وجود کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اور تم موجد وجود کی رحمت کے ساتھ ان پر رحم کرو۔

سیر الی اللہ کی آفات:

سیر الی اللہ کی آفات جو بعض سالکین کے لئے رہزن ثابت ہوتی ہیں، دس ہیں:

۱:......عمل کا دیکھنا۔

۲:......آرزو کا لمبا ہونا۔

۳:......دل میں حصول ولایت کے خیال کا آنا۔

۴:......بتوجہ خلق کی طرف مائل ہونا۔

۵:......خوابوں پر قناعت کرنا۔

۶:......ورد سے انس کرنا۔

۷:......وارد سے لذت لینا۔

۸:......وعدوں پر ٹھہر جانا۔

۹:......خوش فہمی پر کفایت کرنا۔

۱۰:......اور اللہ تعالیٰ کے حق میں دھوکے میں رہنا۔

اللہ تعالیٰ کی نظر سے گر جانے کی علامتیں تین ہیں:

۱:......نفس سے راضی ہو جانا۔

۲:......اللہ تعالیٰ سے ناراض ہونا۔

۳:......اور قضاؤ قدر میں حق تعالیٰ سے مزاحمت کرنا۔

حق تعالیٰ کے قرب کی علامات:

حق تعالیٰ کے قرب کی علامتیں تین ہیں:

۱:......نفسانی لذات کا ترک کر دینا۔

۲:......حق پر قائم ہونا۔

۳:......اللہ کی خاطر مخلوق سے تواضع کرنا۔

وصول الی اللہ کی علامتیں تین ہیں:

۱:......فھم عن اللہ (اللہ سے سمجھنا)۔

۲:......استماع من اللہ (اللہ سے سننا)۔

۳:......اخذ عن اللہ (اللہ سے لینا)۔

اللہ کے ساتھ خاص ہو جانے کی علامتیں تین ہیں:

۱:......اختیار ترک کر دینا۔

۲:......تدبیر کو سلب کر دینا۔

۳:......ارادہ کو فنا کر دینا۔

نیابت عن اللہ کی علامتیں تین ہیں:

۱:......اوصاف فانیہ کو اوصاف باقیہ سے بدل لینا۔

۲:......اوصاف فانیہ کو اوصاف باقیہ میں تبدیل کر دینا۔

۳:......ذات فانیہ کو ذات باقیہ میں گم کر دینا۔

"واللہ یؤتی ملکہ من یشاء واللہ واسع علیم."

تعلق مع اللہ کے صحیح ہونے کی علامات:

حق تعالیٰ کے ساتھ بندہ کے تعلق کے صحیح ہونے کی علامتیں تین ہیں:

۱:......اختیار کا فنا ہو جانا۔

۲:......ہر تقدیری واقعہ کا شیریں ہو جانا۔

۳:......ہر چیز میں محبوب سے راضی ہو کر، اور ہر چیز میں اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ہر چیز میں کمال محبوب کا مشاہد کرنا۔

محبت الٰہی کی علامتیں:

بندے کے ساتھ حق تعالیٰ کی محبت ثابت ہونے کی علامتیں تین ہیں:

۱:......بندے سے جو کچھ صادر ہو (اس کے حکم خداوندی کے موافق ہونے کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ کا اس سے راضی ہونا۔

۲:......حق تعالیٰ کی جانب سے تحدث (بیان نعمت) کی اجازت ہونا۔

۳:......اپنی حکمت بالغہ سے سر کا اس پر القاٗ کرنا۔

(ماہنامہ دار العلوم دیو بند، بھارت)

فرائض کی ادائیگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"عَنْ عَلِيّ بْنِ حُسَيْنٍ رَحِمَهُ اللهُ تَعالٰى (قَالَ)
اَوَّلُ خُطْبَةٍ خَطَبَهَا عَلِيٌّ رَضِىَ اللهُ عَنْهُ حِيْنَ اُسْتُخْلِفَ
حَمِدَ اللهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ فَقَالَ: اِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ اَنْزَلَ كِتَابًا
هَادِيًا بَيَّنَ فِيْهِ الْخَيْرَ وَالشَّرَّ فَخُذُوْا بِالْخَيْرِ وَدَعُوا الشَّرَّ،
اَلْفَرَائِضَ اَدُّوْهَا اِلَى اللهِ سُبْحَانَهُ يُؤَدِّكُمْ اِلَى الْجَنَّةِ، اِنَّ اللهَ
حَرَّمَ حُرُمًا غَيْرَ مَجْهُوْلَةٍ وَفَضَّلَ حُرْمَةَ الْمُسْلِمِ عَلَى
الْحُرَمِ كُلِّهَا وَشَدَّ بِالْاِخْلَاصِ وَالتَّوْحِيْدِ الْمُسْلِمِيْنَ،
وَالْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ اِلَّا بِالْحَقِّ، لَا
يَحِلُّ اَذَى الْمُسْلِمِ اِلَّا بِمَا يَجِبُ، بَادِرُوْا اَمْرَ الْعَامَةِ
وَخَاصَّةَ اَحَدِكُمُ الْمَوْتَ فَاِنَّ النَّاسَ اَمَامَكُمْ وَاِنَّ مَا مِنْ
خَلْفِكُمُ السَّاعَةُ تَحْدُوْكُمْ تُخَفِّفُوْا تَلْحَقُوْا فَاِنَّمَا يَنْتَظِرُ
النَّاسُ اُخْرَاهُمْ، اِتَّقُوا اللهَ عِبَادَهُ فِىْ عِبَادِهٖ وَبِلَادِهٖ وَاِنَّكُمْ
مَسْئُوْلُوْنَ حَتّٰى عَنِ الْبِقَاعِ وَالْبَهَائِمِ اَطِيْعُوا اللهَ عَزَّ وَجَلَّ

وَلَا تَعْصُوْهُ وَاِذَا رَأَيْتُمُ الْخَيْرَ فَخُذُوْا بِهِ، وَاِذَا رَأَيْتُمُ الشَّرَّ فَدَعُوْهُ وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ.''

(حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۴۶۴)

ترجمہ:......''حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا خطبہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیا جبکہ آپ کو خلیفہ بنایا گیا، اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل فرمائی ہے، جو ہدایت کرنے والی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر کو ذکر فرمادیا ہے، پس خیر کو لو اور شر کو چھوڑ دو، فرائض کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ادا کرو، وہ تم کو جنت میں پہنچادیں گے، بے شک اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، جو سب کو معلوم ہیں اور مسلمان کی حرمت کی فضیلت تمام حرمت کی چیزوں سے زیادہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اخلاص اور توحید کے ساتھ مسلمان کو مضبوط کیا ہے، مسلمان وہی ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں، ہاں! حق کے ساتھ، کسی مسلمان کو ایذا دینا جائز نہیں، مگر اسی چیز کے ساتھ جو کہ واجب ہے، تمام کاموں سے پہلے اور خاص طور پر اپنے خصوصی کاموں سے پہلے موت کی طرف سبقت کرو، اس لئے کہ لوگ تم سے آگے جاچکے ہیں اور جو تم سے پیچھے ہیں وہ تمہارے پیچھے آئیں گے، ذرا اپنا بوجھ ہلکا رکھو، تاکہ تم بھی پہلوں سے جاملو، کیونکہ سب کے سب لوگ اپنی آخرت کے انتظار میں ہیں، اللہ کے بندوں اور اللہ کی سرزمین میں اللہ سے ڈرو، اس لئے کہ تم سے زمین کے ٹکڑوں اور چوپاؤں کے بارے

میں بھی سوال کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اس کی نافرمانی نہ کرو، خیر کو دیکھو تو اس کو لے لو، اور جب برائی کو دیکھو تو اس کو چھوڑ دو اور یاد رکھو جبکہ تم بہت کم تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔"

حضرت عثمانؓ کی شہادت اور حضرت علیؓ کی خلافت:

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خطبہ ہے، جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت اس وقت سپرد کی گئی تھی جبکہ ان کے پیش رو خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کردیئے گئے تھے، کئی دن تک باغیوں نے ان کا محاصرہ کئے رکھا تھا، بالآخر جب انہوں نے دیکھا کہ اب حاجی لوگوں کے واپس آنے کا وقت آگیا ہے تو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کی دیوار پھلانگ کر ان کو شہید کردیا، اور اس حالت میں شہید کیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے اور روزے سے تھے، حضرتؓ کے خون کا سب سے پہلا چھینٹا مصحف شریف کی جس آیت پر گرا وہ تھی:

"فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ." (البقرہ:۱۳۷)

ترجمہ:......"اللہ تعالیٰ ان کے مقابلے میں آپ کی کفایت فرمائیں گے۔"

وہ تو جنت میں چلے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جا ملے، لیکن مسلمان اس وقت سے آج تک اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔

شہادتِ عثمانؓ کے بعد:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے درمیان خانہ

جنگی ہوئی، جنگ جمل ہوئی، جنگ صفین ہوئی، اس کے علاوہ خارجیوں کے ساتھ مقابلے ہوئے، اور مسلمانوں کی وہ تلوار جو کافروں کے مقابلے میں چلتی تھی، اب آپس میں چلنے لگی، لوگوں کے اندازے کے مطابق تقریباً ستر ہزار (۷۰،۰۰۰) آدمی ان جنگوں میں کام آئے ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہوئیں، جیسا کہ اس آیت شریفہ میں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کفایت فرمائیں گے۔

قاتلینِ عثمانؓ کا انجام:

جن لوگوں نے دیوار پھلانگ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، تمام کے تمام بری طرح قتل ہوئے، ان قاتلین میں ایک محمد بن ابی بکر بھی تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ جن کی پیدائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حجۃ الوداع کے سفر میں ہوئی تھی، ان کی والدہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عقد کرلیا تھا، اس لئے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ربیب ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ! ان شورش کرنے والے باغیوں میں یہ بھی شریک تھے اور ان پانچ آدمیوں میں جنہوں نے دیوار پھلانگی تھی یہ بھی شامل تھے، انہوں نے سب سے پہلے جا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی داڑھی پکڑی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بھتیجے! اگر تمہارے والد اس حالت کو دیکھتے تو پسند نہ کرتے۔'' یہ فقرہ سن کر انہوں نے فوراً داڑھی چھوڑ دی اور واپس نکل آئے، بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی ہٹانے کی کوشش کی، یہ صرف ایک صحابی تھے بایں معنی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، اگرچہ بچے تھے، ورنہ علمائے تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ ایک بھی صحابی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش کرنے والوں میں شریک نہیں، اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کا دامن اس سے پاک رکھا۔ محمد بن ابی بکر بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے گورنر بنادیئے گئے تھے، اور وہاں ان کو قتل کیا

گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی تھے، جس دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سنا، بہت زیادہ صدمہ ہوا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں یہ واقعہ ہوا۔

مدینہ پر باغیوں کا تسلط:

بہرکیف! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کردینے کے بعد مدینہ میں باغیوں کا تسلط تھا اور اکابر صحابہؓ میں کوئی بھی خلافت کا کام سنبھالنے کے لئے تیار نہیں تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی رات کی تاریکی میں چند حضرات نے جنازہ پڑھ کر بقیع کی ایک جانب دفن کردیا۔ وہ جگہ اس وقت جنت البقیع میں شامل نہیں تھی، اس کی دیوار سے باہر تھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دفن ہوکر اس جگہ کو جنت البقیع میں شامل کرایا، اب تو بقیع اس سے بھی آگے چلا گیا ہے۔

حضرت علیؓ کا امت کو سنبھالنا:

تو تین دن تک مدینہ میں باغیوں کا تسلط رہا، لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے تیسرے دن خلافت قبول کی، خلافت اس حالت میں قبول فرمائی کہ کہنا چاہئے کہ زمین شر و فساد سے بھری ہوئی تھی، اور اس بنا پر امیرالمؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ساڑھے چار سال کا زمانہ خلافت کا قریب قریب شورشوں میں گزرا، ایک دن بھی ٹک کر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا، کافروں کے مقابلے میں جہاد معطل ہوگیا، مسلمانوں کی آپس میں تلوار چل گئی، جس میں ستر ہزار کے قریب آدمی مارے گئے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عجیب و غریب خطبات ہیں، کیونکہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کو دنیا کے سانپ نے ڈس لیا ہے، مسلمانوں کی ایک دوسرے کی عزت و آبرو مٹنا شروع ہوگئی ہے، نومسلم لوگ جو بعد میں مسلمان ہوئے تھے اور جنہوں نے دین کو پورا نہیں سمجھا تھا ان کا غلبہ ہوگیا ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کچھ اُٹھ چکے تھے، کچھ پابہ رکاب تھے، ایسے حالات میں خلافت کو قبول کرنا اور امت کو سنبھالنا،

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دل گردہ تھا، ان کی ہمت تھی، بلاشبہ وہ خلیفۂ راشد ہیں اور حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین کے معیار کے آدمی ہیں، معمولی آدمی نہیں۔

حضرت علیؓ کا پہلا خطبہ:

تو سب سے پہلا خطبہ جو دیا اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے کتابِ ہادی نازل فرمائی ہے، جو ہدایت دینے والی کتاب ہے (قرآن کریم) اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر اور شر کو بیان فرمادیا ہے، خیر کی باتوں کو بھی بیان فرمادیا ہے، شر کی باتوں کو بھی بیان فرمادیا ہے۔

خیر کو اپناؤ اور شر کو چھوڑ دو:

خیر کی باتوں کو بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ بندے خیر کے ان اعمال کو اختیار کریں اور شر کو ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ بندے ان چیزوں سے اجتناب کریں، ان چیزوں سے بچیں۔ اس لئے فرمایا کہ: "فَخُذُوْا بِالْخَيْرِ وَدَعُوا الشَّرَّ." خیر کی چیز کو لو اور شر کو چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ نے جتنے خیر کے کام کلام پاک میں ذکر فرمائے ہیں، ان کو اختیار کرو اور جتنے شر کے کام ذکر فرمائے ہیں ان کو چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ نے اپنی پاک کتاب میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت میں بہت سے فرائض بیان فرمائے ہیں، ایک مسلمان کے ذمے کیا کیا چیزیں فرض ہیں؟

مخدوم محمد ہاشم اور ان کی فرائض اسلام:

ٹھٹھہ سندھ کے ایک بزرگ ہوئے ہیں مولانا مخدوم محمد ہاشم سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ، جن کی کتاب ہے: "بذل القوة فی سن النبوة" اس کا میں نے "عہدِ نبوت کے ماہ وسال" کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہے، اور انہوں نے عجیب انداز سے اس کو مرتب کیا ہے، میں نے ایک

بزرگ کی فرمائش پر اس کا ترجمہ کیا تھا، اور اس کے مقدمہ میں میں نے لکھا تھا کہ: یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں، ان کے زمانے کے آدمی ہیں، اور کہنا چاہئے کہ یہ خطہ سندھ کے اپنے وقت کے شاہ ولی اللہ تھے، اتنے بڑے عالم کہ عقل حیران ہوجاتی ہے۔ ٹھٹھہ میں ان کے مزار کی زیارت بھی کر کے آیا ہوں، میں نے اپنے اس مقدمہ میں لکھا ہے کہ دینی موضوعات میں سے کوئی موضوع مشکل سے ہوگا جس پر مخدوم صاحبؒ نے کتاب نہ لکھی ہو، اس وقت زبان فارسی تھی اور علاقائی زبان سندھی تھی اور ہماری دینی زبان عربی ہے، تینوں زبانوں میں ان کی کتابیں ہیں اور تینوں زبانوں پر یکساں عبور ہے، بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور بڑی طویل طویل کتابیں لکھیں، لیکن کیا مجال ہے کہ ان کی تحریر کی ایک سطر بھی معیار سے نیچی ہوگئی ہو؟ میں کہنے یہ لگا تھا کہ ان کا ایک رسالہ عربی میں ''فرائض الاسلام'' کے نام سے ہے، وہ چھپ گیا ہے، جہاں تک مجھے یاد ہے اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ گیا ہے، جس میں بتلایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کے ذمہ اللہ تعالیٰ کی کون کون سی چیزیں فرض ہیں؟

تو حضرت امیرالمؤمنین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے بہت سی چیزوں کو فرض فرمایا ہے، ان فرائض کو ادا کرو، اللہ کی بارگاہ میں ادا کرو، اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے تمہیں جنت میں پہنچادیں گے، فرائض کو ادا کرو، مخلوق کو دکھانے کے لئے نہیں اور مخلوق کی خاطر نہیں، بلکہ فرائض کا ادا کرنا اللہ کی بارگاہ میں ہے، یعنی محض حق تعالیٰ شانہ کی رضا کے لئے کرو۔

فرائض و محرمات معلوم ہیں:

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کئے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزوں کو حرام فرمایا ہے: ''غَیْرُ مَجْهُوْلَةٍ.'' وہ مجہول نہیں ہیں، نامعلوم نہیں ہیں، بلکہ ہر شخص ان کو جانتا ہے۔

فرائض کی اور محرماتِ قطعیہ کی یہ شان ہے کہ جو جانتے ہیں وہ تو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ بھی جانتے ہیں، اسلام کے فرائض کو، موٹے موٹے فرائض اسلام کو ہر آدمی، ہر کس وناکس جانتا ہے، گو تفصیلات زیادہ نہ جانتا ہو، اور اسی طرح ہماری شریعت نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے، وہ بھی کوئی مخفی نہیں ہیں، بلکہ موٹی موٹی محرمات، یہ قریب قریب ہر مسلمان کو معلوم ہوتی ہیں، بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو علماءٔ جانتے ہیں عوام نہیں جانتے، لیکن مشہور چیزیں محرمات میں سے چاہے مسلمان خود ان کے مرتکب بھی ہوں، تب بھی جانتے ہیں کہ یہ حرام ہیں، چنانچہ کسی مسلمان کو قتل کرنا، کسی کی جان لینا، کسی کا ناحق مال کھانا، کسی کے مال پر قبضہ کرلینا، کسی پر ناحق تہمت لگانا، سود کھانا، یتیموں کا مال کھانا، یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو سارے مسلمان جانتے ہیں، کوئی مسلمان تمہیں ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہتا ہو کہ مسلمانوں کو قتل کرنا حلال ہے، کوئی نہیں مانے گا کہ کسی کی چوری کرنا، کسی کا ناحق مال لینا یہ جائز ہے، کوئی مسلمان ایسا نہیں ہوگا۔

فرائض شرعی کا منکر کافر ہے:

اب ایک مسئلہ بتادیتا ہوں اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے۔ ہماری عقائد کی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ فرائض شرعیہ جو قطعی ہیں، ان کا انکار کرنے والا مسلمان نہیں ہے

محرماتِ قطعیہ کا منکر کافر ہے:

اور محرماتِ قطعیہ جو قطعی ہیں، ان کی حرمت کا انکار کرنے والا مسلمان نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بہت سے مسلمان، اللہ بچائے! زنا کے بھی مرتکب ہیں، لیکن تمہیں کوئی مسلمان ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہتا ہو کہ زنا حلال ہے، اور جو زنا کو حلال کہے وہ مسلمان نہیں رہتا۔ بہت سے مسلمان چوری ڈکیتی کرتے ہیں لیکن تمہیں کوئی مسلمان

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنے والا جو اللہ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو، ایسا نہیں ملے گا جو ان گناہوں کو جائز سمجھتا ہو، اور جو جائز سمجھے وہ مسلمان نہیں ہے۔

نماز کی فرضیت کا منکر کافر ہے:

کتنے مسلمان ہیں جو پنجگانہ نماز نہیں پڑھتے، لیکن جس مسلمان سے بھی پوچھو وہ کہے گا کہ نماز فرض ہے، یہ تو اللہ کا فرض ہے، پنجگانہ نماز اللہ کا فرض ہے، خدانخواستہ اگر کوئی نماز کی فرضیت کا منکر ہو جائے تو وہ مسلمان نہیں۔

روزے کی فرضیت کا منکر کافر ہے:

رمضان المبارک کے روزے ہیں، بہت سے مسلمان نہیں رکھتے، اس کے باوجود جانتے ہیں کہ روزہ رکھنا فرض ہے، اللہ کا فرض ہے، آدمی تندرست ہو اور مقیم ہو، روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہو تو اس کے ذمہ روزہ رکھنا فرض ہے، ہاں! بیمار ہو تو اس کے بارے میں حکم ہے کہ دوسرے وقت میں رکھ لے، سفر میں ہو تو اس کو بھی رخصت ہے کہ سفر میں روزہ نہ رکھے کہ دوسرے وقت میں رکھ لے، لیکن بہرحال روزہ فرض ہے، تو کتنے مسلمان ایسے ہیں جو رمضان کے روزہ کے تارک ہیں، لیکن ان سے پوچھئے تو وہ کہتے ہیں کہ جی! روزہ تو فرض ہے، اللہ کا فرض ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی اس کا منکر ہو جائے تو وہ مسلمان نہیں رہتا۔

فرضیت زکوٰۃ کا منکر کافر ہے:

یہی حکم زکوٰۃ کا بھی ہے، بہت سے مسلمان بخل کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں دیتے، بہت سے مسلمان باوجودیکہ ان کے ذمہ زکوٰۃ فرض ہے، زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور بعض دے دیتے ہیں، لیکن پورا حساب کر کے نہیں دیتے، ایسے ہی اندازے سے دے دی، نہیں بھائی! زکوٰۃ تو پورا حساب کر کے دینی چاہئے، دو پیسے زیادہ ہی نکلیں، کم

نہ رہے۔

میت کو فرائض شرعیہ سے سبکدوش کرو:

رات ایک صاحب کے خط کا جواب لکھ رہا تھا، میں نے جواب میں لکھا کہ میت کے ایصالِ ثواب کے لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ میت کو فرائض شرعیہ سے سبکدوش کیا جائے، اب لوگ ان چیزوں کا اہتمام تو کرتے ہیں تیجا کردو، دسواں کردو، چالیسواں کردو، فلاں کام کردو، قرآن مجید پڑھوادو اور کچھ صدقہ و خیرات بھی کردیتے ہیں، فرض کرلو کہ وہ اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں، محض ایصالِ ثواب کے لئے کرتے ہیں، درمیان میں نیت کھوٹی نہیں اور یہ بھی فرض کرلو صحیح طریقہ اختیار کرتے ہیں، غلط نہیں اختیار کرتے، تو کہنا یہ ہے کہ کیا اس معمولی ایصالِ ثواب سے اس کے فرائض ختم ہوجائیں گے؟

زندگی بھر کے نفلی روزے رمضان کے ایک روزہ کا بدل نہیں:

آپ لوگوں نے حدیث سنی ہوئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

> ”مَنْ اَفْطَرَ یَوْمًا مِنْ رَمَضَانَ مِنْ غَیْرِ رُخْصَۃٍ وَّلَا مَرَضٍ، لَمْ یُقْضَ عَنْہُ صَوْمُ الدَّھْرِ کُلِّہٖ وَاِنْ صَامَہٗ۔“
>
> (مشکوٰۃ ص:۱۷۷)
>
> ترجمہ:......”جس شخص نے رمضان مبارک کا ایک روزہ جان بوجھ کر چھوڑ دیا، نہیں رکھا قدرت کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو عمر نوح عطا فرمائیں اور یہ ساری عمر نفلی روزہ رکھتا رہے، تب بھی اس کا معاوضہ ادا نہیں ہوتا۔“

فرائض، فرائض ہیں، ایک آدمی فرض ادا نہیں کرتا نوافل میں لگا ہوا ہے، اس

کے نوافل کی کیا قیمت ہے اللہ کے نزدیک؟

فجر کی جماعت رات بھر کے نوافل سے بہتر ہے:

مؤطا امام مالک میں ہے کہ امیرالمؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نوجوان بیٹھتا تھا، (غالباً اس کا نام سلیمان بن ابی حثمہ تھا) حضرت عمرؓ کو بھی اس سے تعلق تھا، آپؓ فجر کی نماز کے بعد تتبع کیا کرتے تھے، یعنی حاضری لیا کرتے تھے کہ کون کون آدمی حاضر ہے اور کون کون نہیں آیا؟ ایک دن فجر کی نماز میں اپنے اس دوست کو نہیں دیکھا، تو وہاں مسجد سے سیدھے اس کے گھر گئے اس کی والدہ ملیں، آپؓ نے ان کی والدہ سے فرمایا:

"..... لَمْ اَرَ سُلَيْمَانَ فِيْ صَلٰوةِ الصُّبْحِ! فَقَالَتْ: اِنَّهٗ بَاتَ يُصَلِّيْ فَغَلَبَتْهُ عَيْنَاهُ. فَقَالَ عُمَرُ: لَاَنْ اَشْهَدَ صَلٰوةَ الصُّبْحِ فِي الْجَمَاعَةِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَقُوْمَ لَيْلَةً." (مؤطا امام مالک ص:۱۱۵)

ترجمہ:...... "آج سلیمان کو میں نے صبح کی نماز میں نہیں دیکھا! اس کی والدہ کہنے لگیں کہ ساری رات اللہ کی عبادت میں مشغول رہے، فجر کے وقت آنکھ لگ گئی (اس لئے جماعت میں شریک نہیں ہوسکے)۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ: فجر کی نماز میں جماعت میں شریک ہوجاتے تو تمام رات عبادت میں کھڑے رہنے سے میرے نزدیک یہ افضل تھا۔"

فجر کی جماعت کی اہمیت:

بھائی! کچھ سمجھے؟ ساری رات کھڑے ہوکر تم اللہ کی عبادت کرو لیکن فجر کی نماز میں شرکت نہ کرو، اللہ کے نزدیک اس رات بھر کی عبادت کی قیمت نہیں، اور تم

ساری رات سوتے رہو، فجر کی نماز میں شرکت کرو تو یہ اس سے زیادہ قیمتی ہے، لوگ اس سے بہت غافل ہیں، اپنی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد ان کے وارثین، لواحقین جو اپنے باپ کے لئے، اپنے عزیزوں کے لئے ایصالِ ثواب کا اہتمام کرتے ہیں اور ان کے بارے میں بڑے فکر مند ہوتے ہیں، بعض بے چارے بڑے فکر مند ہوتے ہیں۔

مرحوم کی قضا نمازوں اور روزوں کا حساب لگا کر فدیہ دو:

لیکن کیا کبھی حساب کر کے یہ بھی دیکھا کہ اس کے ذمہ کتنی نمازیں فرض رہ گئی ہیں؟ روزے اس کے ذمہ کتنے رہ گئے تھے؟ زندگی کے کتنے سالوں میں اس نے زکوٰۃ ادا نہیں کی؟ حج فرض تھا، لیکن نہیں کر پایا یا نہیں کیا؟ بھائی! ان فرائض سے سبکدوش کرواؤ، ایصالِ ثواب کو مہربانی کر کے رہنے دو۔

ایک روزہ کا فدیہ:

پھر میں نے لکھا کہ ایک روزے کا فدیہ ایک صدقہ فطر کے مطابق، ایک صدقہ فطر کے برابر ہے، دو وقت کا مسکین کو کھانا کھلا دینا یا تقریباً پونے دو سیر، پونے دو کلو رکھ لو، اب تو سیر نہیں رہے، اس کے قریب قریب غلہ یا اس کی نقد قیمت دے دو، یہ ایک روزے کا فدیہ ہے، ایک رمضان کے فدیے ہوگئے تیس۔ اگر دس رمضانوں کے روزے اس کے ذمہ باقی تھے تو اس کے فدیے ہوگئے تین سو۔

نمازوں کا فدیہ:

پھر جتنا فدیہ ایک روزہ کا ہے، اتنا ہی فدیہ ایک نماز کا ہے، اور نمازیں دن میں وتر سمیت چھ ہوتی ہیں، پانچ فرض اور چھٹی واجب، واجب بھی فرض ہوتی ہے، عملی فرض ہوتا ہے، اعتقادی فرض نہیں ہوتا، عملی فرض ہوتا ہے، تو ایک نماز کا فدیہ ایک صدقہ فطر کے برابر، ایک دن کی نمازوں کے چھ صدقے، ایک مہینے کی نمازوں کے

ایک سواسّی صدقے اور ایک سال کی نمازوں کے اکیس سو ساٹھ صدقے، یعنی دو ہزار ایک سو ساٹھ، یہ اگر تم میت کی طرف سے ادا کردو تو حضرت امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ توقع کی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرلیں گے، یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ یقینی بات صرف روزے کے بارے میں فرمائی ہے، تو ایک سال کا صدقہ یعنی فدیہ نمازوں کا، ایک سال کی نمازیں کسی کے ذمہ قضا ہوں، اکیس سو ساٹھ ہے، دو ہزار ایک سو ساٹھ صدقے۔ آج کل تو قیمت زیادہ ہوگئی، لیکن اگر دس روپے فرض کرلئے جائیں تو اکیس ہزار چھ سو (۲۱,۶۰۰) روپے، یہ ایک سال کی نمازوں کا فدیہ ہے، اسی طرح روزوں کا، اسی طرح زکوٰۃ کا حساب کرو، اور اس کی جانب سے زکوٰۃ ادا کرو، حج نہیں کیا تو اس کا حج بدل کراؤ۔

پہلے فرائض کی سبکدوشی پھر ایصال ثواب:

جب ان فرائض سے سبکدوش کردو گے تو پھر ایصالِ ثواب پوچھنا، تم ایصالِ ثواب کہتے ہو، جیسے بھی کچا پکا، الٹا سیدھا، وہ تو پکڑا ہوا ہے زنجیروں میں، پہلے اس کو چھڑواؤ تو صحیح، ایصالِ ثواب تو ترقیات کے لئے ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر لوگوں کے قرضے اس کے ذمہ ہیں تو ان قرضوں کو بھی ادا کرو۔

اپنی آخرت کی خود فکر کرو:

اب آپ کی عقل میں بات آئے گی کہ ہم اپنی زندگی میں غافل تھے اور مرنے کے بعد ہمارے وارث بھی غافل ہیں۔ ان کو غافل ہونا بھی چاہئے، اس لئے کہ جب ہم نے اپنی زندگی میں کچھ نہیں کیا تو وارث ہمارے کیا لگتے ہیں؟ بھئی میں اپنی جان کا جتنا خیر خواہ ہوں دوسرے بیوی، بچے، عزیز و اقارب، دوست و احباب تو اتنے میرے خیر خواہ نہیں ہوں گے، جب مجھے اپنا ہی اہتمام نہیں تو دوسرے میرا اہتمام کیوں کریں گے؟ رو پیٹ کے بیٹھ جائیں گے، بس یہی ان کی محبت ہے، ان کو یہ

معلوم نہیں کہ یہ کس جگہ پکڑا ہوا ہے؟ اور اس کو کیسے چھڑائیں؟

نماز روزہ میں نیابت جائز نہیں:

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ اس نے روزے نہیں رکھے تھے، ہم ان کی جگہ روزے رکھ لیں؟ اس نے نمازیں نہیں پڑھی تھیں، ہم ان کی نمازیں لوٹادیں؟ خوب یاد رکھو! نماز روزے میں نیابت نہیں ہوتی۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا کوئی کسی کی طرف سے نماز یا روزہ رکھ سکتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

"لَا یَصُوْمُ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ وَلَا یُصَلِّیْ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ." (مؤطا امام مالک ص:۲۴۵)

ترجمہ:...... "کوئی آدمی دوسرے کی جانب سے روزہ نہیں رکھ سکتا، کوئی آدمی دوسرے کی جانب سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔"

حج و زکوٰۃ میں نیابت ہوتی ہے:

ہاں! زکوٰۃ دے سکتا ہے اس کے حکم سے، حج بدل کرسکتا ہے اس کے حکم سے، لیکن وہ تو مرگیا تو اس کا وارث اگر اپنی طرف سے دے، تو اللہ تعالیٰ سے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں گے اور میت کو رہائی عطا فرمادیں گے۔

اللہ مجھے معاف فرمائے جیسے کہ میں عرض کر رہا ہوں، یوں تو ہم مسلمان سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں فرض ہیں، لیکن عملی طور پر ہم نے ان کو فرائض کی فہرست سے خارج کردیا ہے، ایک آدمی نمازیں نہیں پڑھتا، روزے نہیں رکھتا، زکوٰۃ نہیں دیتا، حج اس نے نہیں کیا، مرگیا، ہے پکا مسلمان، میاں جی بھی بے چارہ اس کی نماز جنازہ پڑھادے گا، کوئی فرق نہیں پڑتا، تو میرا بھائی! اللہ نے جو فرائض مقرر کئے ہیں ان کو ادا

کرنے کا اہتمام کرو۔

قرض کی ادائیگی کی دو ہی صورتیں ہیں:

اور یہ خوب یاد رکھو کہ جو قرض کسی کے ذمہ ہوتا ہے، اس کے ادا کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں تیسری کوئی صورت نہیں ہوتی، یا ''ادا'' یا ''اِبرا'' یا تو آدمی قرض ادا کردے یا قرض والا معاف کردے، جس کا قرض ہے، وہ کہہ دے میں نے چھوڑ دیا تو خلاصی مل گئی یا اس نے قرض ادا کردیا، یہ ادا نہیں کرتا وہ ابرا نہیں کرتا، معاف نہیں کرتا، تم بتلاؤ کہ اس کے پکڑے جانے میں کیا شبہ ہے؟ اور ہماری شریعت کا حکم ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا مقروض ہو تو وہ اس کو پکڑوا سکتا ہے، جیل میں بند کروادے جب تک کہ اس کا قرضہ ادا نہیں کرتا، تو فرائض کے ادا کرنے میں تو ہم نے کوتاہی کی اور صاحب حق اللہ تعالیٰ ہیں، ویسے تو اللہ بخشنے پر آئیں تو سبھی کچھ بخش دیں، لیکن بھائی کوئی قانون اور ضابطہ تو نہیں ہے، تمہیں صحت دی تھی، قوت دی تھی، آنکھیں دی تھیں، کان دیئے تھے، زبان دی تھی، ہاتھ پاؤں دیئے تھے، تم نے یہ فرائض کیوں ادا نہیں کیئے؟ پوچھ سکتے ہیں، اور اگر سارے گناہگاروں کو معاف کردیں تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟ ان کی رحمت ہے معاف کردیں، معاف کرنا چاہیں تو ہم جیسے گناہگاروں کو بھی معاف کردیں، اور پکڑنا چاہیں تو اچھے اچھوں کو پکڑلیں، یہ تو اس کی مرضی پر ہے۔

فرائض کے ادا کرنے اور محرمات سے بچنے کا اہتمام کرو:

بہرحال یہاں کہنا یہ ہے کہ فرائض کے ادا کرنے کا اہتمام کرو اور محرمات سے بچنے کا اہتمام کرو، فرض کو فرض سمجھنا یہ مسلمانی ہے، اور فرض کو فرض نہ سمجھنا کفر ہے، جو چیزیں کہ قطعی طور پر حرام ہیں، جس کو حضرت فرما رہے ہیں: ''اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ حُرُمًا غَیْرَ مَجْهُوْلَۃٍ.'' کہ اللہ تعالیٰ نے چیزیں حرام کی ہیں، ان کا حرام ہونا مجہول

نہیں ہے۔

قطعی محرمات کو حلال سمجھنا کفر ہے:

ہر آدمی جانتا ہے، ایسی قطعی محرمات میں سے کسی ایک کو حلال سمجھ لینا کفر ہے، تم جانتے ہو کہ ماں، بہن سے نکاح ہوسکتا ہے؟ نعوذ باللہ! استغفر اللہ! قرآن کریم میں ہے:

"حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَاَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ....." (النسآ:۲۳)

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا قرآن کریم میں کہ تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں حرام ہیں۔

ایک صاحب کا میرے پاس خط آیا کہ ایک آدمی نے اپنی بہن سے نکاح کیا ہوا ہے، ایسے لوگ بھی ہیں، ایسے کافر بھی! لیکن میں یہ "کافر" کا لفظ محاورۃً کہہ رہا ہوں، بھائی! اگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ گناہ ہے، بہن سے نکاح نہیں ہوسکتا، اس بات کا قائل ہے تو ہم اس پر کفر کا فتویٰ نہیں دیں گے، گناہگار ہے، ہاں! اگر سمجھتا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، تو پھر کافر ہے، کسی گناہ کو حلال سمجھنا کفر ہے، ہماری عقائد کی کتابوں میں ہے، میں حوالہ دے رہا تھا ناں! کہ ہماری عقائد کی کتابوں میں لکھا ہے کہ: "اِسْتِحْلَالُ الْمَعْصِيَةِ كُفْرٌ." کسی معصیت کے کام کو، گناہ کے کام کو جبکہ وہ قطعی ہو، حلال سمجھنا کفر ہے۔

مسلمان کی حرمت سب محرمات سے بڑھ کر ہے:

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ بھئی اللہ تعالیٰ نے حرام تو بہت سی چیزیں فرمائی ہیں، لیکن مسلمان کی حرمت تمام محرمات سے بڑھ کر ہے، مسلمان کی جان، اس کی آبرو اور اس کا مال یہ بھی ایک مسلمان کے لئے حرام ہیں، حدیث میں ہے:

"کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ." (مشکوٰۃ ص:۴۲۲)

ترجمہ:......"ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان کے لئے حرام ہے اس کا خون بھی، اس کا مال بھی اور اس کی آبرو بھی۔"

مسلمان کی حرمت کعبہ سے بڑھ کر ہے:

جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تھی، بیت اللہ کی طرف منہ کرکے فرمایا کہ: بیت اللہ! میرے دل میں جتنی تیری قدر و قیمت ہے وہ اللہ جانتا ہے لیکن میں کیا کروں؟ میری قوم مجھے یہاں رہنے نہیں دیتی۔ اور پھر فرمایا: تو بڑی حرمت والا ہے، بڑی عزت والا ہے، لیکن اللہ کی قسم! مؤمن کی عزت تجھ سے زیادہ ہے۔ اور یہ تو اس دن فرمایا تھا۔

حجۃ الوداع میں آخری دن، آخری حج میں جس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی دن دنیا میں تشریف فرما رہے، اس خطبہ میں فرمایا تھا کہ: "اَیُّ شَھْرٍ ھٰذَا؟" یہ کون سا مہینہ ہے؟ کہا کہ: ذی الحجہ کا مہینہ ہے! لیکن صحابہ نے یہ جواب نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ: "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ!" بھائی ذی الحجہ تھا، حج کے لئے گئے ہوئے ہیں ناں! تو ذی الحجہ تھا، ذی الحجہ حرمت کے مہینوں میں سے ہے، لیکن صحابہؓ نے ادب کے طور پر فرمایا کہ: "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ!" فرمایا کہ: کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟ کہا کہ: ہاں! ذی الحجہ کا مہینہ ہے، حرمت والا مہینہ ہے۔ پھر فرمایا کہ: "اَیُّ بَلَدٍ ھٰذَا؟" یہ کون سا شہر ہے؟ اب دنیا نہیں جانتی کہ مکہ ہے؟ لیکن صحابہؓ نے کہا: "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ!" فرمایا کہ: کیا یہ مکہ نہیں ہے؟ کہا کہ: ہاں! مکہ ہی ہے۔ پھر فرمایا کہ: یہ کون سا دن ہے؟ یہ دن تھا "یَوْمُ النَّحْرِ" کا، پھر فرمایا کہ: اللہ کی قسم! ایک مسلمان کی حرمت "کَحُرْمَةِ شَھْرِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا وَفِیْ یَوْمِکُمْ ھٰذَا!" کسی مسلمان کی

حرمت اتنی عزت والی ہے جیسے کہ اس مہینہ میں، اس شہر میں اور اس دن میں یعنی اس مہینے کی حرمت، اس شہر کی حرمت اور اس دن کی حرمت جتنی ہے، مسلمانِ کی حرمت اس سے بڑھ کر ہے۔

ایک درہم کے بدلے ستر مقبول نمازیں:

تو یہ بات یاد رکھو یہاں پر ایک تنبیہ کر دینا چاہوں گا، اس میں ہم لوگ مبتلا ہیں، سب مبتلا ہیں میں بھی مبتلا ہوں، اللہ ہمیں معاف فرمادے، اب تو لوگ کسی کے خون کے ساتھ ہاتھ رنگنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے، مسلمانوں کی حرمت دل سے نکل گئی ہے، لیکن دو چیزوں میں ہم احتیاط نہیں کرتے، ایک کسی کا مال ناحق کھانے میں احتیاط نہیں کرتے اور دوسرے کسی کو بے آبرو کرنے میں احتیاط نہیں کرتے۔ ''درمختار'' میں لکھا ہے کہ ایک درہم اگر کسی کا کھائے (تقریباً ساڑھے تین ماشے چاندی کا ہوتا ہے)، اگر کسی کا ایک درہم ناحق کھایا ہو تو قیامت کے دن ستر مقبول نمازیں اس کے بدلے میں دلائی جائیں گی، تمہارے پاس مقبول نمازیں ہیں کتنی؟ تم یہاں کھا پی کر ہضم کر لیتے ہو، ڈکار لے لیتے ہو، تمہیں معلوم نہیں کہ زہر کھایا ہوا ہضم نہیں ہوا کرتا، یہ نکل کے رہتا ہے، کسی مسلمان کا ناحق مال کھانا، یہ کبھی ہضم نہیں ہوگا، جس کا مال کھایا ہے، وہ دعویٰ نہ کر سکے، اپنا حق ثابت نہ کر سکے، اپنا حق تم سے وصول نہ کر سکے، لیکن ایک عدالت قائم ہونے والی ہے، جہاں پر حق والے کو اس کا حق دلایا جائے گا، ہاں! دل کی خوشی سے کھاؤ، ٹھیک ہے، سارا ہی کھالو، بقول سعدی رحمہ اللہ کے کہ: ''دشمناں را پوست برکند دوستاں را پوستین۔'' دشمنوں کا چمڑا اتار لیا کرو اور دوستوں کی پوستین اتار لیا کرو۔ خوشی سے کرلو، چاہے پوستین بھی اتار لو، لیکن اس کی دل کی خوشی کے بغیر اگر کھاؤ گے تو یہ بھرنا پڑے گا اور ایک درہم یعنی ساڑھے تین ماشے چاندی کے بدلے میں ستر مقبول نمازیں دلائی جائیں گی، ہم لوگ اس معاملہ میں احتیاط نہیں کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے، اللہ ہمیں معاف فرمائے، احتیاط کی ضرورت ہے۔

قومی اموال کی چوری سنگین ترین جرم!

بطورِ خاص جو مال کہ کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں، بلکہ عام مسلمانوں کی چیز ہے اس میں تو اور بھی زیادہ گھپلا کرتے ہیں لوگ، بجلی کی چوری کرتے ہیں، بجلی کی چوری کر کے مسجدوں میں روشنی کرتے ہیں، بجلی کی چوری کر کے جس مکان میں روشنی کرو گے اور اس مکان میں نماز پڑھو گے، نماز قبول نہیں ہوگی، مذہبی تقریبات میں چوری کر کے روشنی کرتے ہیں، عرسوں میں اور دوسری چیزوں میں نعوذ باللہ! یہ جو اجتماعی پیسہ ہے، اس کا معاملہ اور بھی سنگین ہے، بھئی ایک آدمی کا پیسہ تم نے کھایا، جیسے کہ میں نے عرض کیا وہ بھی گناہ کی بات ہے، لیکن پھر بھی اس کی منت سماجت کرلو تو شاید مان جائے، اب یہ اجتماعی چیز جس میں دس کروڑ مسلمان شریک ہیں، کس کس سے معافی مانگتے رہو گے؟ کروڑوں انسانوں کا حق اپنی گردن پر لے کے جاؤ گے اور قیامت کے دن یہ سارے کے سارے تمہارے "خصماء" ہوں گے، قرض خواہ ہوں گے، کسی کا ناحق مال کھانے سے بچو۔

مسلمانوں کی آبروریزی سے بھی احتیاط:

دوسری چیز جس میں ہم احتیاط نہیں کرتے وہ مسلمانوں کی آبرو ہے، کسی کی تحقیر کرنا، کسی کو برا بھلا کہنا، کسی کا مذاق اڑانا، کسی کی غیبت کرنا، کسی کے عیب اس کے سامنے بیان کرنا، جبکہ اصلاح کا مقصد نہ ہو، بلکہ عار دلانا مقصد ہو۔

یہ تمام کی تمام چیزیں گناہِ کبیرہ ہیں اور یہ لوگوں کے حقوق ہیں جو ہم اپنے ذمے لے رہے ہیں اور قیامت کے دن ہمیں ان کو ادا کرنا ہوگا، اللہ تعالیٰ ہمیں فہم عطا فرمائے، ہدایت نصیب فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

معاشرہ کی اچھائی

اور

برائی کا معیار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

"عَنْ حَسَّانَ بْنِ عَطِيَّةَ اِنَّ اَبَا الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ كَانَ يَقُوْلُ: لَا تَزَالُوْنَ بِخَيْرٍ مَا اَحْبَبْتُمْ خِيَارَكُمْ وَمَا قِيْلَ فِيْكُمْ بِالْحَقِّ فَعَرِفْتُمُوْهُ، فَاِنَّ عَارِفَ الْحَقِّ كَعَامِلِهٖ."

(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۱۰)

"عَنْ اَبِی الْهَيْثَمِ قَالَ: قَالَ اَبُو الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ: لَا تُكَلِّفُوْا النَّاسَ مَا لَمْ يُكَلَّفُوْا، وَلَا تَحَاسَبُوا النَّاسَ دُوْنَ رَبِّهِمْ، اِبْنَ اٰدَمَ! عَلَيْكَ نَفْسَكَ، فَاِنَّهٗ مَنْ تَتَبَّعَ مَا يَرٰی فِی النَّاسِ يُطِلُّ حُزْنَهٗ وَلَا يَشْفِ غَيْظَهٗ."

(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۱۱)

ترجمہ:......"امام ابونعیم نے حلیہ میں حسان بن عطیہؒ کے واسطے سے روایت کی ہے کہ: حضرت ابوالدرداأ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: تم لوگ ہمیشہ خیر پر رہو گے جب تک اپنے اچھے لوگوں سے محبت کرتے رہو گے اور جب تک کہ تم میں حق

بات کہی جائے گی تو تم اس کو پہچانو گے، کیونکہ حق کا پہچاننے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس پر عمل کرنے والا۔"

ابونعیم نے حلیہ میں حضرت ابوالدرداؓ رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت نقل کی ہے کہ:

ترجمہ:...... "ابو الہیثم رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوالدرداؓ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگوں کو اس چیز کی زحمت نہ دو جس کے وہ مکلّف نہیں ہیں، اور لوگوں سے حساب نہ لو، ان کے رب کے سوا کوئی دوسرا حساب نہیں لیتا۔ آدم کے بیٹے! تو اپنی فکر کر، اس لئے کہ جو شخص جستجو کر رہا ہو اس چیز کی جس کو وہ لوگوں میں دیکھتا ہے، اس کا غم لمبا ہوگا اور اس کے غصہ کو کبھی شفا نہیں ہوگی۔"

حضرت ابودرداءؓ پہلے حکیم الامت:

حضرت ابوالدرداؓ رضی اللہ عنہ کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ وہ صحابی ہیں جن کو اس امت میں سب سے پہلے حکیم الامت کا لقب دیا گیا ہے، یہیں سے معلوم ہوجائے گا کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں جس شخص کو حکیم الامت کا لقب دیا جاتا ہے وہ کس درجہ کا آدمی ہوگا؟ دمشق میں رہائش اختیار کرلی تھی، نماز پڑھاتے تھے اور طالب علموں کو پڑھاتے تھے، حضرات محدثینؒ فرماتے ہیں کہ شاگردی تو بہت سے لوگوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کی، لیکن صحابہ کرامؓ میں دو آدمی بڑے خوش بخت تھے، اور انہوں نے اپنے شاگردوں پر اپنا خاص رنگ چھوڑا، ایک حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، جو کوفہ کے معلّم اور قاضی تھے، اور ایک حضرت ابوالدرداؓ رضی اللہ عنہ۔

حضرت ابوالدرداءؓ کے اقوال حکمت:

عجیب وغریب حکمت کی باتیں فرمایا کرتے تھے، یہاں بھی ان کے دو چار جملے نقل کیے گئے ہیں:

پہلا جملہ یہ ہے کہ تم لوگ ہمیشہ خیر پر رہو گے جب تک تم میں یہ دو باتیں پائی جائیں گی:

ایک یہ کہ تم صرف اپنے اچھے لوگوں سے محبت کرو گے۔ یعنی اچھے لوگوں سے محبت اور برے لوگوں سے نفرت رہے گی۔

اور دوسری یہ کہ جب تک تمہارے معاشرے میں یہ بات باقی رہے کہ جس سے حق بات کہی جائے وہ اس کو قبول کرے اور سنے۔ اس لئے کہ کسی حق بات کو قبول کرلینا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس پر عمل کرلینا۔ گویا کسی معاشرے کی بھلائی ناپنے کا میٹر یہ دو چیزیں ہیں۔ چنانچہ اگر کسی معاشرے کو پہچاننا ہو کہ یہ اچھا معاشرہ ہے یا برا؟ اس میں خیر غالب ہے یا شر؟ یا یہ کہ خیر کی طرف بڑھ رہا ہے یا شر کی طرف؟ تو اس معیار کے ذریعہ تم اُسے پہچان سکتے ہو۔

معاشرہ کی اچھائی کی پہلی علامت:

ایک یہ کہ لوگ اپنے اچھے لوگوں سے لوگ محبت کریں، اس معاشرہ میں اچھے لوگوں کی پذیرائی ہو اور ان کو قدر ومنزلت اور محبت کی نظر سے دیکھا جاتا ہو۔

دوسرے یہ کہ اس معاشرہ میں صحیح اور حق بات بتلانے والے موجود ہوں، اور جب حق بتلایا جائے تو لوگ اس کو قبول کرتے ہوں۔

اگر اس کے الٹ ہو جائے تو سمجھ لو کہ یہ معاشرہ خیر پر نہیں ہے۔

اچھے لوگوں سے الفت ومحبت فطری مناسبت کی علامت:

کیونکہ اچھے اور پسندیدہ لوگوں سے تعلق رکھنا، ان کو پسند کرنا، ان سے محبت

کرنا اس لئے خیر کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں ایک فطرتی اور قدرتی مناسبت رکھی ہے، جب تک کہ دو شخصوں کے درمیان مناسبت نہ ہو، ان کے درمیان جوڑ پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ شادی کے رشتے بعض مرتبہ ناکام ہوجاتے ہیں، کیونکہ میاں بیوی کے درمیان جوڑ نہیں بیٹھتا، میاں جی کا منہ دوسری طرف ہے، بیگم جی کا منہ دوسری طرف ہے، دونوں کی سوچ متفق نہیں ہوتی، ایک اگر صحیح سوچتا ہے تو دوسرا اس صحیح کو بھی غلط سمجھتا ہے، اسی کو کہتے ہیں مناسبت، دو شخصوں کے درمیان مناسبت ہوگی تو ان کے درمیان الفت ہوگی۔

بیعت کے لئے مناسبت کی شرط ہے:

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سے جب کوئی بیعت کے لئے درخواست کرتا تو فرماتے: جس کے ساتھ مناسبت ہے اس سے بیعت کرلو، بغیر مناسبت کے پیری مریدی بھی نہیں چلتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ، فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا اِئْتَلَفَ، فَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اِخْتَلَفَ." (صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۳۱)

یعنی روحیں ایک لشکر ہے جو عالمِ ارواح میں جمع کیا گیا، جن کے درمیان وہاں تعلق ہوگیا ایک دوسرے کی طرف منہ اٹھایا، جان پہچان ہوگئی، ان کے درمیان الفت ہوگئی، اور جن کی وہاں ایک دوسرے سے پیٹھ رہی، ایک دوسرے سے پہچان نہ ہوئی تو ان کا یہاں اختلاف ہوگیا۔

نیک لوگوں کی طرف میلان نیکی کی علامت:

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اب سمجھئے کہ نیک لوگوں کے ساتھ آپ کی رغبت کا ہونا، آپ کی الفت ہونا، آپ کا ان کی طرف التفات ہونا، آپ کا ان کی طرف

جھکاؤ ہونا، ان کی طرف آپ کی کشش ہونا، اس بات کی علامت ہے کہ اللہ نے آپ کو نیک اور نیکی سے مناسبت عطا فرمائی ہے۔

اچھے لوگوں سے بغض نیکی سے نفرت کا نشان:

اور اگر نیک لوگوں کے ساتھ اختلاف ہے، ان سے نفرت ہے، ان سے بغض اور بُعد ہے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی طبیعت کو نیکی کے ساتھ مناسبت نہیں ہے، نیک لوگوں کے ساتھ مناسبت نہیں ہے۔ یہ ایک بیماری ہے جس کا علاج ہونا چاہئے۔

نیک لوگوں پر تنقید کرنا فسادِ مزاج کی نشانی ہے:

میرے بھائی! اللہ کے نیک بندوں پر تو تنقید کرتے ہو، لیکن اپنے آپ کو تو دیکھ لو، کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے اندر بیماری ہو؟ جس کی وجہ سے تمہیں ساری فضا پیلی پیلی نظر آتی ہے، ممکن ہے تم نے چشمہ پیلا لگایا ہوا ہو؟ یا تمہیں پیلیا ہوگیا ہو؟ یہ تو ممکن نہیں کہ سارا عالم ہی پیلا ہوگیا۔ بھائی! فضا کا رنگ تو وہی ہے جو قدرتی رنگ ہے، اگر کسی کی نظر صحیح ہے تو فضا کے رنگ کو اس کے اصل رنگ میں دیکھے گا، اور جس کے مزاج میں تغیر پیدا ہوگیا وہ فضا کا رنگ بدلا ہوا دیکھے گا۔

دوسروں کو ہلاکت زدہ کہنے والا.....:

اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اِذَا قَالَ الرَّجُلُ هَلَکَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ.“ (صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۲۹) یعنی جب کوئی شخص یہ کہے کہ لوگ ہلاک ہوگئے، لوگ ایسا کرتے ہیں، لوگ ایسا کرتے ہیں، یعنی اس کو لوگوں کا ہی حال نظر آتا ہے، پوری فضا اس کو خراب نظر آتی ہے، فرمایا کہ یہ سب سے زیادہ ہلاک ہونے والا ہے، ان سے بڑھ کر ہلاک ہونے والا ہے۔

نیک لوگوں سے کبیدگی کا مرض قابل علاج ہے:

تو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے اگر مناسبت نہیں، بلکہ ایک قسم کی کبیدگی اور نفرت ہے، تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ مرض لائق علاج ہے، لائق علاج ضرور ہے لیکن لاعلاج نہیں۔ کاش کہ تم اپنی بیماری کو پہچانتے، بھائی! کسی سے صحیح تشخیص کرواؤ، اپنا آپریشن کراؤ، تو یہ بیماری دور ہوسکتی ہے۔

لاعلاج مرض؟

لیکن میرے بھائی! اگر تم اپنی بیماری کو تندرستی سمجھتے ہو تو پھر یہ بیماری لاعلاج ہوسکتی ہے۔

حالی یہ کہتے ہیں کہ کسی نے بقراط سے جا کر پوچھا:

مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا؟

بقراط حکیم، کسی نے پوچھا کہ کون سی بیماریاں مہلک ہیں جس سے آدمی مر جاتا ہے؟ اس نے کہا کہ کوئی بیماری اللہ نے ایسی نہیں پیدا فرمائی جس کی دوا پیدا نہ کی گئی ہو، کوئی مرض مہلک نہیں:

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں، کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

یعنی جس بیماری کو آسان سمجھ لیا گیا، اور اگر کسی طبیب نے کہا کہ اس میں یہ بیماریاں ہیں، تو اس سے کہا کہ بکواس کرتا ہے، طبیب کے کہے کو ہذیان سمجھ لیا، تو یہ بیماری مہلک ہے۔

روحانی شفاخانہ سے ایکسرے کی ضرورت ہے:

کسی شفاخانہ میں اپنے ایکسرے کرواؤ، میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ جو تمہارے ہاں ایکسرے کی مشینیں لگی ہوئی ہیں وہاں ایکسرے کراؤ! بلکہ کسی روحانی شفاخانہ میں جا کر ایکسرے کرواؤ، تمہیں اپنی اندر تصویر نظر آئے گی، تمہارے اندر کون سے انسانی

اخلاق ہیں؟ کون سے درندوں والے اخلاق ہیں؟ کون سے بہائم یعنی جانوروں والے اخلاق ہیں؟ کون سے حشرات الارض والے اخلاق ہیں؟ کون سے ایمانی اخلاق ہیں؟ کون سے کافروں والے اخلاق ہیں؟ کون سے رحمانی اخلاق ہیں؟ اور کون سے شیطانی اخلاق ہیں؟ اس مشین کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرو گے تو تمہیں اپنی اندرونی کیفیت معلوم ہوگی۔

بہرکیف! کہنا یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں یا اچھے لوگوں سے محبت کرنا اور ان کی طرف کشش ہونا، آدمی کے خیر پر ہونے کی علامت ہے اور بروں کی طرف کشش ہونا، ان سے رغبت ہونا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ دوسرے راستہ کی طرف بڑھ رہا ہے، خدا نہ کرے کہ یہ بیماری پختہ ہوجائے اور پھر لاعلاج بن جائے۔

نیک لوگوں سے الفت ابرار کے ساتھ حشر کی علامت:

دیکھو ایک بات کہتا ہوں! قرآن کریم میں بھی جگہ جگہ فرمایا گیا ہے کہ: "وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ. وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِیْنَ" دنیا میں ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ قیامت کے دن اس کا حشر اچھے لوگوں کے ساتھ ہو، کیا کوئی یہ چاہے گا کہ اس کا حشر ڈاکوؤں کے ساتھ ہو؟ یعنی جس لائن میں ڈاکوؤں کو کھڑا کیا گیا ہے، مجھے بھی اسی لائن میں کھڑا کیا جائے؟ کوئی چاہے گا کہ زانی و بدمعاشوں کے ساتھ اس کا حشر ہو؟ کوئی نہیں چاہے گا! کیا کوئی چاہے گا کہ جھوٹوں کے ساتھ اس کا حشر ہو؟ ہم میں سے ہر شخص کی خواہش ہے کہ ہمارا حشر انبیأ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ، صدیقین کے ساتھ، شہدأ کے ساتھ، اولیأ اللہ کے ساتھ، اللہ کے نیک اور مقبول بندوں کے ساتھ ہو، ہر شخص یہی چاہتا ہے ناں! کوئی صحیح المزاج آدمی ایسا نہیں ہوگا جو یہ کہے کہ میرا حشر کافروں، منافقوں، فاسقوں اور فاجروں کے ساتھ ہو، بلکہ یہ کہے گا کہ نبیوں کے ساتھ ہو، صدیقوں کے ساتھ ہو شہیدوں کے ساتھ ہو، اولیأ کے ساتھ ہو، اس کے لئے ایک

ضابطہ اور اصول سن لو! کہ تم جیسی روش دنیا میں اختیار کروگے حشر بھی ویسے ہی ہوگا، بس یہی فقرہ بتلانا چاہتا ہوں، اب تم خود فیصلہ کرسکوگے کہ میرا حشر قیامت کے دن کس کے ساتھ ہونے والا ہے؟ تمہیں اگر برے لوگوں سے رغبت ہے، برے لوگوں کو اچھا سمجھتے ہو، برے لوگوں کی صحبت میں بیٹھتے ہو، تو پھر ان کے ساتھ حشر ہوگا، اور اگر اچھے لوگوں کے ساتھ رغبت رکھتے ہو، اچھے لوگوں سے پیار رکھتے ہو، اگرچہ خود اچھے نہیں، لیکن اچھے لوگوں سے پیار تو ہے، گو عمل نہیں مگر اچھے لوگ ہمیں اچھے تو لگتے ہیں، اگر یہ چیز موجود ہے تو انشاء اللہ! انشاء اللہ! انشاء اللہ! اچھوں ہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ حشر فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ ہمارا حشر اچھے بھی لوگوں کے ساتھ فرمائے، وتوفنا مع الابرار!

اچھے معاشرہ کی دوسری علامت: حق کہنا اور قبول کرنا:

دوسری بات یہ کہ وہ معاشرہ جس میں حق بات کہی جائے اور اس کو قبول کیا جائے۔ دنیا میں اچھی باتیں بھی ہوتی ہیں، بری باتیں بھی ہوتی ہیں، پھر صحیح بھی ہوتی ہیں، غلط بھی ہوتی ہیں، حق بھی ہے، باطل بھی ہے، اس عالم کا مزاج ہی اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے، بہت سے لوگ پوچھتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ کیوں نہیں کرتے؟ اللہ تعالیٰ وہ کیوں نہیں کرتے؟ اللہ تعالیٰ نے ظالموں کو اتنی ڈھیل کیوں دے رکھی ہے؟ یہ کیوں کر رکھا ہے؟ وہ کیوں کر رکھا ہے؟ میں نے کہا کہ بھائی! اللہ تعالیٰ نے خدائی تمہارے سپرد نہیں کی بلکہ اپنے پاس رکھی ہے، اور اس کو مشورہ کی بھی ضرورت نہیں کہ تم اس کو مشورہ دو کہ ایسا کرنا چاہئے، بس وہ جانتا ہے، تم تو اپنا کام کرو، اللہ کو مشورے نہ دو، تم سے بندگی نہیں نبھتی، خدائی کیا نبھاؤ گے؟ تمہیں بندہ بنایا ہے، تم سے آدابِ بندگی نہیں بجا لائے جاتے، تو خدائی کو کیا سمجھو گے؟ خدائی معاملات میں کیا مشورہ دو گے؟ یہ تو تم رہنے دو کہ اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ باطل کو کیوں پیدا کیا؟ آدم کے ساتھ

شیطان کو کیوں لگایا؟ یہ کیوں کیا؟ وہ کیوں کیا؟ ظالموں کو کیوں ڈھیل دی؟ ان باتوں کو تم چھوڑ دو، یہ خدائی معاملات ہیں تمہاری اور میری عقل میں آنے والے نہیں ہیں۔

حافظ شیرازیؒ کو کسی نے مشورہ دیا تھا، تو حافظ شیرازیؒ نے کہا:

حدیث مطرب و لہو و را زدہر کم ترجو
کہ کس نہ کشیود و کشاید بحکمت این معما را

یعنی کوئی شخص حکمت و دانائی کے ساتھ اس معما کو نہ حل کرسکا اور نہ کرسکے گا، یہ بندوں کے حل کرنے کی چیز ہی نہیں ہے، ان سے یہ معما حل ہو ہی نہیں سکتا۔

حق بات کہنا اور اس کا قبول کیا جانا غلبۂ حق کی علامت:

اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کو پیدا کیا ہے، لیکن کبھی تو غلبہ ہوتا ہے حق کا، اور اس غلبہ کی علامت یہ ہے کہ جو لوگ حق پر نہیں ہوتے وہ بھی شرمندہ ہوتے ہیں، جیسا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں حق کا غلبہ تھا، صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اگر کسی سے کوئی غلطی ہوتی تھی تو وہ شرمندہ ہوتا تھا، جانتا تھا کہ میں غلطی پر ہوں، بعد میں رفتہ رفتہ حق مغلوب ہوتا چلا گیا، اور باطل بھی اسی رفتار سے بڑھتا رہا، پھیلتا رہا، پھولتا رہا، حق اور باطل دونوں کی لڑائی ہے، میدان ایک کے ہاتھ میں ہوگا یا دوسرے کے ہاتھ میں ہوگا، کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں برابر رہیں، تو جس معاشرہ میں حق بات کہنے کی جرأت کی جائے۔ کہنے والے کہیں اور سننے والے سن لیں، اگرچہ عمل کی توفیق نہ ہوئی لیکن کم از کم سننے کی توفیق تو ہوگئی، یہ علامت ہے غلبہ حق کی کہ حق غالب ہے باطل پر۔

حق کہنے اور قبولیت میں دشواری غلبۂ باطل کی علامت:

جب زمانہ میں حق کہنا دشوار ہوجائے، مصلحت پسندی کی وجہ سے حق نہ کہا جاسکتا ہو یا اس خیال سے کہ اگر حق بات کہیں گے تو لوگوں کی عقل میں نہیں آئے گی

بلکہ اور زیادہ بگڑیں گے۔

جیسا کہ ہمارے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ "لوگوں کو گناہگار اور فاسق رہنے دو، ان کو کافر مت بناؤ۔" بڑی حکیمانہ بات ہے، اس لئے کہ ایک آدمی گناہ کر رہا ہے، تو وہ گناہگار ہے اور فاسق ہے، اگر آپ نے اس کو ٹوکا اور اس نے اس کا انکار ہی کر دیا کہ جاؤ میاں اپنا کام کرو، لئے پھر رہا ہے اپنی شریعت! بتلایئے یہ مسلمان رہا کہ کافر ہوگیا؟ آپ ہی بتائیں کہ جب ٹوکنے پر اس نے یہ کہہ دیا کہ لے جائیں اپنی شریعت کو (نعوذ باللہ!)۔ تو حضرت فرماتے ہیں کہ لوگوں کو گناہگار ہی رہنے دو، ان کو کافر مت بناؤ، کیونکہ حق کہنے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ دیکھو یہ قبول بھی کیا جائے گا کہ نہیں؟ آپ نے حق بات تو کہہ دی لیکن اس کا الٹا اثر ہوا، پہلے وہ چھپ کر کرتا تھا اب دھڑلے سے کرے گا، پہلے وہ کم سے کم دل میں تھوڑی بہت ندامت محسوس کرتا تھا، اب وہ ندامت کا پردہ بھی اٹھالیا گیا، نعوذ باللہ! اللہ کی پناہ! جب کسی معاشرہ میں یہ کیفیت ہوجائے کہ حق کہنے والا سو بار سوچے کہ میں کہوں بھی کہ نہ کہوں؟ اور اگر وہ کہہ بھی دے تو قبول نہ کیا جائے، بلکہ سو تاویلیں کی جائیں کم سے کم یہی کہہ دے کہ جا میاں اپنا کام کر تم جیسے بہت سے مولوی بھی دیکھے ہیں، کیونکہ یہ تو چلتا پھرتا فقرہ ہے ناں!، بھائی! تم نے میرے جیسے مولوی دیکھ لئے، ورنہ ان بے چارے علمائے حقہ کا قصور کیا ہے؟ بات تو تمہاری میرے ساتھ ہو رہی ہے، میرے بھائی! تمہارا مجرم اور قصوروار تو میں ہوں، میرے جیسے مولویوں کو کیوں برا کہتے ہو؟ لہٰذا "تمہارے جیسا مولوی دیکھا ہے" کہنا اس بات کی علامت ہے کہ اس معاشرہ میں حق مغلوب ہے اور باطل غالب ہے، اللہ کی پناہ!

تو اس امت کے پہلے حکیم الامت حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تم لوگ خیر پر رہو گے جب تک یہ حالت رہی کہ تم میں حق کہا جائے اور اس کو قبول بھی کیا جائے، تو جب یہ کیفیت پیدا ہوجائے کہ کوئی حق کہنے کی جرأت ہی نہ کرے

اور اگر کوئی جرأت کر بھی لے تو قبول نہ کیا جائے، اور خاموشی و مصلحت پسندی کو حق کہنے پر ترجیح دی جائے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ معاشرہ کی چولیں ہل گئیں، حق پر نہیں رہا، باطل کا سیلاب اس کشتی میں اتنا داخل ہوگیا ہے کہ وہ قریب قریب ڈوبنا چاہتی ہے، اللہ تعالیٰ حفاظت میں رکھے، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھے۔

نئی نسل کا کیا بنے گا؟

حافظؒ کہتے ہیں:

مشکل دارم زدانائے محفل باز پرس

مجھ کو ایک مشکل درپیش ہے، کسی دانائے محفل سے پوچھنی چاہئے، اور آپ ہی ماشاءاللہ دانائے محفل ہیں، آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ معاشرہ میں کتنے لوگ ہیں جو مسجد میں آتے ہیں؟ خاص طور سے بیچاری نئی نسل! کہ ان کی تو شب و روز کی محفل اور شب و روز کی مصاحبت، ان کا اٹھنا بیٹھنا، کافروں، بے ایمانوں، بروں، چوروں اور بدمعاشوں کے ساتھ ہی ہے، دین، دینداری بلکہ ظاہری دینداری کا ماحول بھی اب ہماری مسجدوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اور ان بیچاروں کو تو یہاں آنے کا کبھی موقع بھی نہیں ملتا، مجھے سمجھاؤ کہ ان بیچاروں کا، نئی نسل کا کیا حال بنے گا؟ تمہارے بچے نماز کے وقت میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ ہفتہ میں ایک دن جمعہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی، مجھے بتلاؤ دینداری کہاں سے آئے گی؟ ایمان کس راستے سے داخل ہوگا؟ مجھے آج کل یہ مشکل درپیش ہے، میں اس کے لئے پریشان ہوں، اس امت کا کیا علاج کیا جائے؟ اور ان کو اپنے دین پر کیسے واپس لایا جائے؟ درندے اس کو نوچ رہے ہیں، بھیڑیئے اس کو اٹھا رہے ہیں، ہزارہا فتنے اس امت کے افراد کو دبوچنے کے لئے موجود ہیں، کیا علاج کیا جائے اس کا؟ میری عقل میں یہ بات نہیں آرہی ہے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

دین کتابوں سے نہیں مسجد کے رابطہ سے آئے گا:

میری بات یاد رکھو! کتابوں سے تمہیں دین نہیں ملے گا، چاہے تم میری بات سے اتفاق کرو یا نہ کرو، تم حدیث کی کتابوں کے ترجمے خرید کر، الماریوں میں رکھ دو، تمہارے اندر دین نہیں آئے گا، تم قرآن کریم کے ترجمے اور تفسیریں خرید کر گھر میں رکھ لو، اور کبھی ان کو پڑھ بھی لیا کرو، تب بھی تم میں دین نہ آئے گا، دین کا مرکز مساجد ہیں، جب تک تمہارا ان مساجد کے ساتھ رابطہ نہیں ہوگا، اس وقت تک تمہارے اندر دین نہیں آئے گا۔

ایمان، ایمان کی دکان سے ملے گا:

جس طرح کوئلوں کی دکان سے خوشبو نہیں ملا کرتی، لوہار کی دکان سے سونا نہیں ملا کرتا، بلکہ خوشبو عطر فروش اور سونا سنار سے ملتا ہے، اسی طرح ایمان، ایمان کی دکان سے ملے گا اور ایمان کی دکان یہ مسجدیں ہیں، اگر تمہیں ایمان کی ضرورت ہے تو واللہ العظیم! تم میں سے ایک ایک کو ان مساجد سے ربط پیدا کرنا پڑے گا، ورنہ تمہیں چاہے کتنا ہی یہ خیال کیوں نہ ہو کہ ہم دیندار ہیں، اور ہم نے دین کو سمجھا ہے، ہمارے اندر دین موجود ہے، ہم نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، مگر معاف کیجئے گا! یہ دین نہیں ہے، تم نے دین کو سمجھا ہی نہیں۔

لوگوں کو ان کی حیثیت سے زیادہ تکلیف نہ دو:

دوسرا ارشاد: حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ کے دوسرے ارشاد میں تین فقرے ہیں:

''ایک یہ کہ لوگوں کو ان کی حیثیت سے زیادہ تکلیف نہ دو۔''

مولانا رومیؒ نے بھی یہ نصیحت فرمائی ہے کہ:

چہار پایہ قدر ہمت بارنیم

یعنی چوپائے پر اس کی طاقت کے مطابق بوجھ رکھا کرو، جو کمزور آدمی زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا، اس پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو، اور جن لوگوں کا دماغ اونچی باتوں کو سمجھ نہیں سکتا، اپنے علوم اپنے پاس ہی رکھو، ان کے سامنے بیان نہ کیا کرو، لہٰذا علم اور عمل کے اعتبار سے بھی، لوگوں کی استعداد اور ہمت کو دیکھو، اس کے مطابق ان پر بوجھ ڈالو۔

پہلے اپنی فکر کرو:

دوسرا فقرہ اسی ارشاد کا یہ ہے کہ تم لوگوں کے محاسب بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ لہٰذا وعظ و نصیحت کرنا، کسی کی خیرخواہی کے لئے اس کو کوئی بات بتلانا یا اگر اس کے اندر غلطی ہے تو اس کی اصلاح کرنا یہ تو ایمانی تقاضا ہے، لیکن میرا حساب میرا رب لے گا، تمہارا حساب تمہارا رب لے گا، تمام انسانوں کا حساب اللہ تعالیٰ لیں گے، ہم میں سے ایک کو دوسرے کا محاسب بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: ”وَمَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ، وَمَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِجَبَّارٍ.“ قرآن کریم میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ جتنا تم سے ہو سکتا ہے تم اپنا حقِ خیرخواہی ادا کرو، لیکن قیامت کے دن تم کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، لوگوں کے اعمال کا حساب نہیں دینا، قبر میں اور حشر میں مجھ سے میرے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا، مجھ سے آپ کے اعمال کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا، اسی طرح آپ سے آپ کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا، زید و عمرو کے عمل کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا حساب اپنے پاس رکھا ہے، حساب و کتاب کی محاسب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، تم لوگوں کے محاسب نہیں ہو، اس لئے حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”اِبْنَ آدَمَ! عَلَیْکَ نَفْسَکَ.“ آدم کے بیٹے! اپنی فکر کر اور اپنی فکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کی فکر میں بعد میں پڑو، پہلے اپنی فکر کرو۔

دنیا والوں کا اصول:

جبکہ ہمارے یہاں یہ اصول بنالیا گیا ہے کہ ایک مجھ کو چھوڑ دو، باقی ساری دنیا کی اصلاح ہونی چاہئے، اور میری اصلاح نہیں ہونی چاہئے، گویا دورِ جدید کا نظریہ یہ ہے کہ ساری دنیا کو ٹھیک ہونا چاہئے لیکن مجھے کوئی کچھ نہ کہے۔

شریعت کا اصول:

اور ہمارا نظریہ اس کے الٹ ہونا چاہئے کہ میری اصلاح ہونی چاہئے، دنیا کی اصلاح ہوتی ہے ہو، نہیں ہوتی نہ ہو، اللہ ان سے خود حساب لے گا، مجھے خود ٹھیک ہونا چاہئے، ہم لوگ اپنی اصلاح سے غافل ہوکر دوسروں کی اصلاح کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، حضرت ابوالدرداءؓ اس کو فرماتے ہیں کہ اپنے نفس کی فکر کرو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمہارے سامنے اگر گناہ ہوتا ہے تو ہونے دو، اس کا غلط مطلب نہ لو، آج کل لوگوں نے اس کا غلط مطلب لیا ہوا ہے کہ اپنی فکر کرو، جب کسی کو کہا جائے کہ بھائی! یہ کام نہیں کرنا چاہئے، تو کہتے ہیں کہ تم اپنا کام کرو جی! ناں بھائی! اگر آپ کے بدن پر خدانخواستہ کوئی زخم ہے، اس کی مرہم پٹی کرنا بھی میرے ذمہ ہے، اگر خدانخواستہ ہمارے کسی بھائی کو سانپ نے کاٹ لیا ہے تو اس کا علاج معالجہ بھی ہمارے ذمہ ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص ایسے کسی آدمی کی خیرخواہی کے لئے اس کا علاج و معالجہ کرنا چاہتا ہے، اور وہ اس کو کہہ دے کہ میاں تم اپنی فکر کرو، مجھے رہنے دو، تو یہ عقل کی نہیں بے عقلی کی بات ہے، اسی طرح اگر کوئی کہیں گر گیا اور اسے چوٹ لگ گئی اور کوئی مسلمان، اس کی مرہم پٹی کی فکر میں ڈاکٹر کو بلاتا ہے، اور یہ اس سے کہتا ہے کہ میاں! تم اپنا کام کرو، مجھے رہنے دو، یہ بات درست نہیں۔

مسلمان کے حقوق کے بارہ میں سوال ہوگا:

کیونکہ اپنے بھائی کی خیرخواہی، جہاں تک ممکن ہو بھی ضروری ہے، اس لئے کہ یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے اور اس کے بارہ میں پوچھا جائے گا، جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے:

"اِنَّ اللهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ: یَابْنَ اٰدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ؟ قَالَ: یَا رَبِّ! کَیْفَ اَعُوْدُکَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ؟ ..... اَمَا عَلِمْتَ اِنَّ عَبْدِیْ فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ ..... یَا ابْنَ اٰدَمَ اِسْتَطْعَمْتُکَ فَلَمْ تُطْعِمْنِیْ ..... یَابْنَ اٰدَمَ اِسْتَسْقَیْتُکَ فَلَمْ تَسْقِنِیْ؟ قَالَ: یَا رَبِّ! کَیْفَ اَسْقِیْکَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ؟ ..... الخ."

(مشکوٰۃ ص:۱۳۳، ۱۳۴)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے ابن آدم! میں بیمار تھا، تو نے میری عیادت نہیں کی..... ابن آدم! میں نے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں دیا..... اے ابن آدم میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا..... اور ابن آدم کہے گا کہ: یا اللہ! آپ تو بیماری، کھانے پینے سے پاک ہیں، ان چیزوں کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟ فرمائیں گے کہ: میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہیں کی، فلاں بھوکا تھا، تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا، فلاں پیاسا تھا تو نے اس کو پانی نہیں پلایا۔

تو یہ بھی ہماری ذمہ داری ہوگئی ناں بھائی! اس لئے یہ بات بھی غلط ہے کہ آدمی دوسرے کی فکر ہی نہ کرے، اور یہ بات بھی غلط ہے کہ آدمی صرف دوسروں ہی کی فکر کرے اور اپنی فکر نہ کرے۔

مسئولیت عنداللہ کا مراقبہ:

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مجھے اپنی ذات کی فکر ہونی چاہئے، میرا معاملہ اللہ کے سامنے پیش ہوگا، میرا اللہ میرے ساتھ کیا کرے گا؟ یہ مراقبہ ہمہ تن رہنا چاہئے۔ اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچنا چاہئے کہ جن چیزوں کی ذمہ داری اللہ نے مجھ پر ڈالی ہے، قیامت کے دن مجھ سے اس کا سوال بھی ہوگا، انشاءاللہ اس مراقبہ سے ان ذمہ داریوں کو نبھانے کا احساس پیدا ہوجائے گا۔ لہٰذا جب کسی کو کوئی خیر کی بات بتلائی جائے یا کسی برائی سے روکا جائے، تو اس کا یہ کہنا کہ تم اپنی فکر کرو، مجھے چھوڑ دو، یہ بھی غلط بات ہے، بھائی تمہارے ساتھ خیرخواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تمہیں اس غلطی سے نکالیں، اور دشمنوں کے چنگل میں تجھے نہ چھوڑیں۔

لوگوں کے عیوب کا تتبع مشکلات کا سبب بنے گا:

پھر فرماتے ہیں کہ: ''لوگوں کے اندر جو باتیں پائی جاتی ہیں، اگر ان کا تتبع کروگے اور ان کو تلاش کروگے تو تم بڑی مشکل میں پھنس جاؤگے۔'' اس لئے ظاہر میں جو بات قابل اصلاح نظر آجائے، اس کی تو اصلاح کرلو، باقی کھود کرید کرنا صحیح نہیں، اس لئے کہ جو شخص لوگوں کے عیوب کا تتبع کرے گا، یعنی ان کو کریدنے، ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا، ''یُطِلُّ حُزْنُہٗ'' اس کا غم بہت لمبا ہوجائے گا کہ کیا کریں؟ اور کیا نہ کریں؟ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے کہ:

تن ہمہ داغ داغ شد
پنبہ کجا کجا نہم

بدن کے روئیں روئیں پر زخم لگے ہوئے ہیں، کہاں کہاں پنبہ رکھوں؟ کہاں کہاں مرہم رکھوں؟ اگر ساری دنیا کی فکر میں مبتلا ہوجاؤگے تو پھر بڑی مشکل پیش آجائے گی، اس لئے جو بات سامنے آجائے اس کو تو کہہ دو، باقی زیادہ کاوش نہ کرو،

جو شخص لوگوں کے عیوب تلاش کرے گا چاہے اصلاح کی فکر سے کیوں نہ ہو، اس کا غم لمبا ہو جائے گا، اور اس کے دل کو کبھی شفا نہیں ہوگی، ہمیشہ پریشان ہی پریشان رہے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خواجہ معین الدین چشتیؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ. لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ." (یونس:۶۲ تا ۶۴)

ابھی گزشتہ دنوں مجھے ایک صاحب نے پرچہ دیا تھا کہ آپ نے چار بزرگوں کے حالات ذکر کرنے کا وعدہ کیا تھا، ان میں سے دو کا ذکر کیا، پھر آپ بھول ہی گئے۔

سلاسل اربعہ:

تو آج انہی سلسلوں کے بارے میں کچھ عرض کرنے کا ارادہ ہے۔ مشہور سلسلے بزرگوں کے چار ہیں، ان کے علاوہ بھی اولیاء اللہ کے سلسلے ہیں، لیکن چار سلسلوں کو اللہ تعالیٰ نے بہت مقبولیت عطا فرمائی ہے، ان میں سے ایک سلسلہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی پیرانِ پیر رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے، جس کو "سلسلۂ قادریہ" کہتے

ہیں، ان کے حالات کا مختصر تذکرہ ہوا تھا۔

اس کے بعد دوسرا سلسلہ ہے شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ کا جو ''سلسلۂ سہروردی'' سے مشہور ہے۔

میں نے بتایا تھا کہ یہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے مریدین میں سے ہیں، لیکن ان کا سلسلہ کسی دوسرے بزرگ سے ہے، اور جو کتاب میں پڑھ کر سنایا کرتا تھا، وہ انہیں کی کتاب ہے، ان کے تذکرے میں ان کے چند افادات کا ذکر آ گیا تھا، وہ آج میں درمیان میں چھوڑ رہا ہوں، اس سلسلے کو ختم کرنے کے لئے درمیان میں چھوڑ رہا ہوں، تصوف پر ان کی کتاب ہے جو میں سناتا تھا، اور اس کتاب کے بارے میں بزرگوں کا کہنا یہ ہے کہ جس شخص کا کوئی مرشد نہ ہو، اس کے لئے یہ کتاب کافی مرشد ہے۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دو امتیاز:

آج میں تیسرے بزرگ خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کا سلسلہ شروع کرتا ہوں، ان کی دو خصوصیتیں ہیں، ایک تو یہ کہ ان کا تعلق سرزمین ہند سے ہے، یعنی ہندوستان کی سرزمین سے، ان کے شیخ نے ولایت ہند ان کے سپرد کی تھی، اس لئے بعض لوگوں نے بطورِ مبالغہ ان کو ''نبی الہند'' کا خطاب دیا ہے، یعنی ہندوستان کا نبی، حالانکہ یہ نبی تو نہیں تھے، نبیوں کی شان تو بہت اونچی ہے۔

اور ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہمارا سلسلہ انہی کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، تو یہ خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ ہمارے پیرانِ پیر ہیں، اس لئے ان کا ذکر کرتا ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے کہ اتنے بڑے بزرگ، مگر ان کے حالات نہیں ملتے، اب تو دو پیسے کا آدمی ہوتا ہے اور اس کی سوانح عمری پر لوگ ہزار ہزار صفحات لکھ دیتے ہیں، یہ زمانہ لکھائی پڑھائی کا زمانہ ہے، ایک بالشت قد ہے،

صرف ایک بالشت، لیکن اس کی سوانح عمری لکھی جاتی ہے کہ یہاں پیدا ہوا، یہ ہوا، وہ ہوا، لیکن ہمارے یہ اکابرؒ جن کے ذریعہ سے دین زندہ ہوا، امت زندہ ہوئی، ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں، کہیں جستہ جستہ کسی نے کوئی تھوڑے بہت لکھ دیئے۔

آپ کے شیخ اور خلفاءؒ:

اتنی بات ہے کہ ان کے شیخ ہیں خواجہ محمد عثمان ہارونی، اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کے خلفاءؒ کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی، جن میں خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ مشہور ہیں، اور خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ کے خلیفہ ہیں حضرت گنج شکر رحمہ اللہ پاک پتن والے۔

پھر ان کے دو خلیفہ مشہور ہوئے، ایک سلطان الہند خواجہ نظام الدین اولیاءؒ رحمہ اللہ، ان کو واقعتاً ''سلطان الہند'' کہا جاتا ہے۔

اور دوسرے خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمہ اللہ، بہرحال یہ بزرگوں کا بہت اونچا سلسلہ تھا۔

تعارف:

خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کا اسم گرامی ''حسن'' ہے اور والد ماجد کا نام غیاث الدین بتاتے ہیں، ایران کا ایک علاقہ ہے ''سیستان'' حضرت خواجہ صاحب اس علاقے کے رہنے والے تھے، اس سیستان کی طرف نسبت کر کے عربی میں اس کو ''سجزی'' کہتے ہیں، اور بعض لوگ اس کو ''سنجری'' پڑھتے ہیں، حسن سنجری یا حسن سجزی اصل میں حسن سجزی ہے، سین کی زبر، جیم کے سکون اور زا کے کسرہ کے ساتھ۔

ولادت:

اس پر تمام اہل تاریخ متفق ہیں کہ ان کی ولادت شریفہ ۵۳۷ھ میں ہوئی یعنی چھٹی صدی میں، اور میں بتا چکا ہوں کہ یہی زمانہ شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا

ہے، یہ دونوں ایک ہی زمانے کے بزرگ ہیں، خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ طبقے کے اعتبار سے ان سے چھوٹے ہیں، لیکن یہی چھٹی صدی اُن کا زمانہ بھی ہے اور یہی چھٹی صدی اِن کا بھی زمانہ ہے۔

اللہ کی حکمت بالغہ:

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے ایک بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ یہ پانچویں اور چھٹی صدی کا زمانہ، اگر تاریخ کو دیکھا جائے تو بادشاہوں کی لڑائی کا اور دنیاداروں کے دنیا پر ٹوٹ پڑنے کا زمانہ ہے، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا دور گزر چکا تھا، ائمہ دین کا دور گزر چکا تھا، اور لوگ بے تحاشا دنیا پر ٹوٹنے لگے تھے، اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ عجیب تھی کہ اس زمانے میں اس قسم کے اکابر اولیاءُ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے کھڑا کیا اور انہوں نے امت کا رخ بدل دیا۔

دین کے لئے نئے پودے:

ابن ماجہ میں ایک حدیث ہے:

”لَا یَزَالُ اللہُ تَعَالٰی یَغْرِسُ فِیْ ھٰذَا الدِّیْنِ غَرْسًا یَسْتَعْمِلُھُمْ فِیْ طَاعَتِہٖ.“ (ابن ماجہ ص:۳)

ترجمہ:......”اللہ تعالیٰ اس امت میں پودے لگاتے رہیں گے جن کو اللہ تعالیٰ اپنے دین کے لئے استعمال فرماتے رہیں گے۔“

ایک پودے کی جگہ دوسرا پودا اللہ تعالیٰ لگاتے رہیں گے، یہاں تک کہ یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری تک جاری رہے گا، دین کو اللہ تعالیٰ مٹنے نہیں دیں گے، دین کے تمام شعبے اپنی اپنی جگہ کام کرتے رہیں گے، کچھ لوگ دین کے مسئلے مسائل بتانے والے ہیں، وہ اپنی جگہ کام کر رہے ہیں، کچھ لوگ

قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے والے ہیں، وہ اپنی جگہ کام کر رہے ہیں، کچھ لوگ حدیث شریف پر کام کرنے والے ہیں، وہ اپنی جگہ کام کر رہے ہیں، کچھ لوگ دلوں کا تزکیہ اور تصفیہ کرنے میں مصروف ہیں، ان کی اپنی الگ دنیا ہے، کچھ دعوت الی اللہ کے کام میں لگے ہوئے ہیں، ان کی اپنی دنیا ہے، یہ عظیم الشان کارخانہ جس کے بے شمار شعبے اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں، یوں ہی یہ سلسلہ چلتا رہے گا، اور اس کے لئے کوئی مستقل منصوبہ بندی نہیں کی جاتی، یعنی جس طرح حکومتیں منصوبے بناتی ہیں، اس طرح کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کہ کس ملک میں کیا ضرورت ہے، کیا نہیں ہے؟ کوئی منصوبہ نہیں بنایا جاتا، جہاں جو ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دل میں ڈال دیتے ہیں، وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں اور کام کرتے ہیں، جتنا فیض اللہ تعالیٰ نے کسی کو پہنچانا ہوتا ہے، وہ پہنچا دیتے ہیں۔

تعلیم:

تو میں عرض کر رہا تھا کہ ۵۳۷ھ میں خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کی ولادت شریفہ ہوئی، وہاں کے دستور کے مطابق قرآن کریم حفظ کیا، پھر علوم کی تحصیل کی، عالم بنے، لیکن دل میں شعلۂ محبت تھا، اس لئے بیعت کی ابتدا ہوئی۔

ان کا سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے، یعنی حسینی سید ہیں، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔

پندرہ سال کی عمر تھی کہ تمام علوم سے فارغ ہو چکے تھے، وراثت میں ان کو ایک بڑا باغ ملا تھا، دوسرے مشاغل کے ساتھ اس باغ کی نگرانی بھی فرماتے تھے، ملازم وغیرہ کام کرتے تھے اور حضرت ابتدائی عمر میں خود اس کی نگرانی فرماتے تھے۔

سلوک واحسان:

ایک مرتبہ ایک مجذوب ابراہیم قہندزیؒ تشریف لائے، شیخ نے ان کی بڑی

تعظیم وتکریم کی اوران کے لئے کچھ انگور اور کچھ پھل لے کر آئے، ابراہیم مجذوب نے اپنے دانتوں سے ایک پھل لیا اور اس کو تھوڑا سا چبایا اور ان کو دے دیا، جس کے کھاتے ہی باغ میں ایک نور ظاہر ہوا، اور حضرت خواجہ کی حالت دگرگوں ہوگئی۔

مجذوبوں سے احتیاط:

یہ مجذوبوں سے ''جذب'' لگ جاتا ہے، اس لئے ذرا مجذوب قسم کے لوگوں سے کچھ محتاط رہنا چاہئے، کچھ تو یہ لوگ پاگل پھرتے ہیں، جن بے چاروں کا دماغ خراب ہوجاتا ہے، یہ مجذوب نہیں ہوتے۔

مجذوب کی تعریف:

''مجذوب'' کہتے ہیں مستِ الست لوگوں کو، جن کو نشۂ خداوندی نے مست کردیا ہو، اور دنیا سے بے خود ہوگئے ہوں۔

مجذوبیت کمال نہیں:

اور یہاں یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ مجذوب ہوجانا کمال نہیں ہے، بلکہ نقص ہے، بعض لوگ ان کو یعنی مجاذیب کو کاملین سمجھتے ہیں، یہ غلطی ہے، مجذوب ہونے کے بعد ترقی رک جاتی ہے، جہاں ہے بس وہیں ہے، اس لئے کہ ترقی ہوتی ہے علم وعمل اور معرفت پر۔

جذب وسلوک:

ہاں اگر جذب کے ساتھ ساتھ سلوک بھی ہو یعنی اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتا بھی رہے، ہوش وحواس گم نہ ہوگئے ہوں، تو پھر یہ جذب نعمت کبریٰ ہے۔

سلوک میں جذب:

بزرگ فرماتے ہیں کہ جذب کے بغیر سلوک بھی نہیں ہوتا، جذب کے معنی

اللہ تعالیٰ کا کسی کو اپنی طرف کھینچ لینا، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشش نہ ہو، جذب نہ ہو، اس وقت تک سلوک نہیں چلتا، سلوک کے معنی راستہ چلنے کے ہیں، راستہ طے کرنے کے ہیں۔

لیکن بزرگ فرماتے ہیں کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں: ایک مجذوب سالک ہوتے ہیں، اور دوسرے سالک مجذوب ہوتے ہیں۔

مجذوب سالک:

مجذوب سالک ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو پہلے کھینچ لئے جاتے ہیں پھر چلائے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کشش ان کو پہلے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور پھر وہ راستے پر چلنا شروع کرتے ہیں۔

سالک مجذوب:

اور بعض اس کے الٹ سالک مجذوب ہوتے ہیں، پہلے وہ چلنا شروع کرتے ہیں، پھر راستے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو اٹھالیتی ہے، چلو تم کیا چلو گے؟ ہم تمہیں پہنچادیتے ہیں! ان حضرات کو سالک مجذوب کہا جاتا ہے، تو جن لوگوں کے ہوش وحواس جاتے رہیں، مست ہوجائیں، وہ کسی کام کے نہیں رہتے، وہ ہمارے کام کے نہیں ہیں۔

مجذوبوں کو نہ ستاؤ:

پھر ان کو ستاؤ بھی نہیں، باقی ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ وہ ایسی منزل پر پہنچے ہوئے ہیں، جہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہے، خدا جانے ان کے منہ سے کیا نکلے، اور اللہ تعالیٰ ان کے کہے ہوئے کی لاج رکھا کرتے ہیں۔

پراگندہ حال لوگوں کا مرتبہ:

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"کَمْ مِنْ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ذِیْ طِمْرَیْنِ لَا یُؤْبَهُ لَهٗ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللهِ لَاَبَرَّهٗ، مِنْهُمُ الْبَرَاءُ بْنُ مَالِکٍ."

(مشکوٰۃ ص:۵۷۹)

ترجمہ:......"بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے سر پراگندہ ہیں، بال بکھرے ہوئے، (پاگلوں کی طرح اور بدن پورے کا پورا مٹی پڑی ہوئی ہے، میل کچیل، ڈھنگ سے ان کو غسل کرنے اور بدن کو صاف کرنے کا بھی سلیقہ نہیں) اور دو پھٹی پرانی لنگیاں پہنی ہوئی ہیں۔ (ایک نیچے اور ایک اوپر اوڑھی ہوئی ہے، قمیص بھی نہیں، ستر پوشی کے لئے ایک چادر اوپر ہے اور ایک نیچے، اور ایسے لوگوں کا مرتبہ لوگوں کی نظر میں کیا ہوسکتا ہے؟ ذرا اندازہ کریں! تصور کریں! لیکن اللہ کی نظر میں ان کا مرتبہ یہ ہے کہ) اگر وہ قسم کھا کر کہہ دیں کہ آج اللہ تعالیٰ ایسا کریں گے، تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کردیں گے، انہی میں سے (حضرت) براؓ بن مالکؓ ہیں۔"

حضرت براؓ بن مالکؓ کا مقام:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اسی جماعت کے ایک فرد براؓ بن مالکؓ ہیں، یہ ایک صحابی تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جب جہاد میں جاتے، محنت کی، کوشش کی، جان لڑائی، لیکن فتح کے آثار نظر نہیں آتے تھے، تو براؓ بن مالک رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر لے جاتے، یہی براؓ بن مالک رضی اللہ عنہ تھے جن کو کہیں سے تلاش کر کے لے جاتے اور محاذ میں کھڑا کر کے کہتے کہ: قسم کھاکے

کہو کہ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو فتح دیں گے، یہ اپنے ساتھیوں کے مجبور کرنے سے قسم کھالیتے کہ: مجھے اللہ کی قسم ہے! اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح دیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کرے گا، جب بھی یہ اس طرح دعا مانگتے فتح ہوجاتی تھی، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ براءؓ بن مالک رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر کوئی بات کہی ہو، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم جھوٹی کردی ہو، ایسا کبھی نہیں ہوا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ مجذوب قسم کے جو لوگ ہوتے ہیں، ان سے ذرا بچتے رہا کرو، قریب نہ جایا کرو، لوگ ان کے معتقد ہوجاتے ہیں۔

غلط عقیدہ:

اور ایک عقیدہ کی غلطی یہ لوگوں میں پھیلی ہوئی ہے کہتے ہیں کہ یہ بزرگ جو کچھ کہہ دیتے ہیں، وہ ہوجاتا ہے، یہ تقدیر بدل دیتے ہیں۔

اور یہ جو فقیر قسم کے لوگ ہیں ناں! انہوں نے ایک اور بات پھیلا رکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ کو جب لکھا تھا، وہاں تقدیریں جب لکھی تھیں، تو کچھ سیاہی بچ گئی تھی، وہ اللہ تعالیٰ نے فقراءؑ کی زبان پر انڈیل دی، تو گویا ان کا کہا ہوا بھی نوشتۂ تقدیر ہے، یہ بات قطعاً غلط اور جھوٹی ہے، افتراءً علی اللہ ہے، اور اس کی حقیقت صرف اتنی ہے جو میں نے ابھی ذکر کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خاص مقبول اور محبوب بندے ہوتے ہیں، جنہوں نے اپنی ہستی کو اللہ تعالیٰ کی رضا میں مٹالیا، اللہ تعالیٰ ان کے منہ کی بات پوری فرمادیتے ہیں، بس اتنی سی بات ہے، باقی تقدیر کا قلم ان کے ہاتھ میں نہیں ہے اور نہ ان کی بات نوشتۂ تقدیر ہے۔

مجذوب کے پس خوردہ سے احتیاط:

اسی سلسلے میں ایک بات یہ بھی یاد رکھو کہ کسی مجذوب کی جھوٹی چیز مت کھاؤ، ورنہ تمہیں بھی جذب ہوجائے گا، اور اگر خدانخواستہ اس قسم کا جذب ہوجائے کہ ہوش

ہی ٹھکانے نہ رہے تو بڑا مسئلہ خراب ہے۔

خلاصہ یہ کہ خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ اپنے باغ میں تھے کہ ابراہیم مجذوب آئے، انہوں نے درویش سمجھ کر ان کی خدمت کی، پھل وغیرہ پیش کئے، انہوں نے ایک پھل کھا کر ان کو دیا، انہوں نے بزرگ کا تبرک سمجھ کر کھالیا، بس کھایا کیا تھا؟ بلکہ منہ کو ہی لگایا تھا کہ حالت دگرگوں ہوگئی اور پھر کیا؟ شیخ سعدی رحمہ اللہ کا ایک قطعہ ہے:

یا مرو با یار ازرک پیراہن
یا بکش برخا نماں انگشت نیل

یا تو نیلے کرتے والے یار کے ساتھ چلو نہیں اور اگر ساتھ چلنا ہے تو عزت و آبرو اور خاندان پر نیل کی انگلی پھیر دو، خط کھینچ دو کہ سب کچھ ختم۔ عزت اور بے عزتی اب کوئی چیز نہیں رہی۔

گرچہ بدنا میست پیش عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

اگرچہ عقل مندوں کے ہاں یہ بدنامی کی چیز ہے، لیکن ہم ننگ و نام کی پرواہ نہیں کرتے، کوئی اچھا کہے، کوئی برا کہے چھوڑ دو۔

یا مکن با پیل با ناں دوستی
یا بناکن خانہ بر انداز پیل

یا ہاتھی والوں سے یاری نہ لگاؤ، یا پھر ہاتھیوں کے برابر مکان بھی بناؤ، یاری لگاتے ہو ہاتھی والوں کے ساتھ اور دروازے رکھتے ہو چھوٹے، یہ نہیں ہوگا۔

حضرتؒ پر جذب:

تو شیخ رحمہ اللہ پر جب جذب طاری ہوا اور حالت بدلی تو پھر کہاں کا باغ؟

اور کہاں کا گھر بار؟ اور کہاں کا خاندان؟ اور کہاں کی یہ چیزیں؟ باغ فوراً بیچ دیا اور جو کچھ اس سے ملا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر لگادیا، جذب پیدا ہوگیا، جذب اسی کو کہتے ہیں یعنی کشش الی اللہ، اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچاؤ پیدا ہوجائے، دنیا سے تعلق ختم، باغ فروخت کردیا اور فروخت کرکے فقرأ پر تقسیم کردیا، گھر میں بھی جو کچھ تھا وہ سب کا سب لٹادیا، اعلانِ عام کردیا کہ جس کا جو جی چاہے لے جائے، اول ثمرقند پہنچے، وہاں حفظ قرآن، تعلیم علومِ ظاہری میں رہے، اس سے فراغت کے بعد عراق تشریف لے گئے اور قصبہ ہرون پہنچ کر خواجہ عثمان ہارونی رحمہ اللہ سے بیعت ہوئے۔

سب اولیأ، علمأ تھے:

یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھو کہ جتنے تمہیں درویش نظر آتے ہیں، اولیأ اللہ، بڑے بڑے اکابر، یہ سب کے سب عالم تھے، حافظ تھے، قاری تھے، اور یہ دینی علوم میں اشتغال رکھتے تھے، اور یہ جو لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ بزرگی کی لائن الگ ہے، اور یہ شریعت کا پڑھنا پڑھانا بالکل الگ چیز ہے، یہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

حضرت پیرانِ پیرؒ کے ہاں چار شعبے قائم تھے:

میں نے آپ کو شاہ عبدالقادر جیلانی پیرانِ پیر رحمہ اللہ کے تذکرہ میں بتایا تھا کہ بیک وقت ان کی خانقاہ میں چار شعبے چلتے تھے، اور اپنے وقت میں وہ چاروں شعبوں کے امام تھے، ان کا باقاعدہ مدرسہ تھا، مدرسہ میں پڑھاتے تھے اور اس وقت کے سب سے بڑے مدرس تھے، ان کی ٹکر کا کوئی استاذ نہیں تھا۔

علامہ ابن خزامہؒ بارگاہِ جیلانی میں:

ابن خزامہ المقدسی حنبلی اپنی کتاب ''المغنی'' میں لکھتے ہیں کہ میرا بالکل ابتدائی زمانہ تھا، میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی خدمت میں پڑھنے کے لئے گیا، آپ نے مجھے چند اسباق پڑھائے، لیکن فرمایا: بیٹا تم بہت دیر سے آئے ہو، میرا اب جانے

کا وقت آچکا ہے، تم میرے فلاں شاگرد سے پڑھو۔

پیرانِ پیرؒ سب سے بڑے مفتی:

پیران پیر رحمہ اللہ اس وقت کے سب سے بڑے مدرس تھے۔ حضرت رحمہ اللہ کتابیں پڑھاتے تھے، اور اس وقت کے سب سے بڑے مفتی تھے، ان کے ہاں سے فتویٰ جاری ہوتا تھا، اور دونوں مذہبوں پر فتویٰ دیتے تھے، امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب پر، اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب پر۔

مفتی ایک مذہب پر فتویٰ دے سکتا ہے:

یہ مسئلہ بھی یاد رکھو کہ فتویٰ صرف ایک مذہب پر دے سکتے ہیں، میں حنفی ہوں، مجھے صرف حنفی مذہب پر فتویٰ دینے کا حق ہے، میں یہ تو بتا سکتا ہوں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا اس مسئلہ میں یہ مذہب ہے، یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ امام مالک رحمہ اللہ اس مسئلہ میں یہ رائے رکھتے ہیں، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ یہ رائے رکھتے ہیں، مجھے ائمہ کے مذاہب بتا دینے کا حق حاصل ہے، لیکن میں فتویٰ اپنے امام کے قول کے مطابق دوں گا، کسی دوسرے امام کے قول کے مطابق نہیں دے سکتا۔ یہ ایک اصول ہے، لیکن حضرت شیخ پیران پیر رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے قدرت عطا فرمائی تھی کہ بیک وقت دونوں مذہبوں پر فتویٰ دیتے تھے، یہ خود حنبلی ہیں، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مقلد ہیں، اور ان کا مذہب وہی ہے جو سعودی عرب والوں کا ہے، یہ پکے وہابی ہیں، حضرت پیران پیر رحمہ اللہ بھی حنبلی ہیں، تو اس وقت کے سب سے بڑے مفتی بھی حضرت پیران پیر ہی تھے، اور اس وقت کے سب سے بڑے واعظ بھی حضرت پیران پیر تھے، وعظ و تقریر فرماتے تھے اور نہ معلوم کہاں کہاں سے سمٹ کر لوگ ان کے وعظ میں جمع ہوتے تھے، اور اگر کبھی بادشاہوں کے معاملات کی اصلاح کرنی ہوتی تو وعظ میں فرماتے تھے، کیونکہ امراءٔ، بادشاہ اور خلفاءٔ تک ان کے وعظ میں شریک اور حاضر ہوتے تھے۔

ولایت میں آپؒ کا مقام:

ان کی درویشی اور بزرگی کا تو پوچھنا ہی کیا؟ آخر پیرانِ پیر کہلاتے ہیں، اپنے وقت کے سب سے بڑے شیخ بھی تھے اور منبر پر بیٹھ کر فرمایا تھا کہ: "قَدَمِی هٰذِهٖ عَلٰی رَقَبَةِ کُلِّ وَلِیٍّ." "میرا یہ پاؤں ہر ولی کی گردن پر ہے۔

ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کو یہ بات پہنچی ممکن ہے کشف ہوگیا ہوگا، یا یوں کہو کہ ٹیلی فون لگا ہوا ہوگا، کیونکہ ان کے بھی ٹیلی فون ہوتے ہیں اور اس باطنی ٹیلی فون کے ذریعہ ان کو خبر پہنچی تو سر جھکا کر فرمایا: "بَلْ عَلَی الرَّأْسِ وَالْعَیْنِ!" گردن پر نہیں بلکہ میری آنکھوں پر اور میرے سر پر!

درویشی اور شریعت الگ نہیں:

تو یہ سمجھنا کہ درویشی الگ چیز ہے اور شریعت الگ چیز ہے، یہ جاہل لوگوں کی پھیلائی ہوئی جہالت ہے، یہ بزرگانِ دین اپنے وقت کے عالم بھی تھے، امام فتویٰ بھی تھے، واعظ بھی تھے، اور ساتھ کے ساتھ صوفی بھی تھے، الحمدللہ! ہمارا سب کا سب سلسلہ ہمارے اکابر رحمہم اللہ کا سلسلہ ان چاروں چیزوں کو لئے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

سلسلۂ چشتیہ اقطاب کا سلسلہ ہے:

میں نے ایک موقع پر عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ ہمارا سلسلۂ طریقت یہ اقطاب کا سلسلہ ہے، ہر بزرگ اپنے زمانے کا قطب ہوا۔ تو خواجہ عثمان ہارونی رحمہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، میں ان کے ملفوظات سناؤں گا، کیونکہ خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ نے اپنے شیخ کے ملفوظات لکھے، پھر حضرت خواجہ رحمہ اللہ کے ملفوظات ان کے خلیفہ اعظم حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ نے لکھے، پھر حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ کے ملفوظات ان کے خلیفہ اعظم حضرت گنج بخش رحمہ اللہ

پاک پٹن والوں نے لکھے، پھر ان کے ملفوظات ان کے خلیفہ اعظم خواجہ نظام الدین سلطان جی رحمہ اللہ نے لکھے، سلطان الہند خواجہ نظام الدین اولیأ رحمہ اللہ اور پھر خواجہ نظام الدین رحمہ اللہ کے ملفوظات ان کے دو شاگردوں یعنی دو مریدوں نے لکھے، یہ بزرگوں کا سلسلہ چلا آ رہا ہے۔

حضرت شیخ کی خدمت کے بیس سال:

''انیس الارواح'' کے نام سے خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ نے اپنے پیر کے ملفوظات جمع کئے ہیں، اور اس کے شروع میں لکھتے ہیں کہ جس دن یہ فقیر حاضر خدمت ہوا اور قدم بوسی کی سعادت نصیب ہوئی، تو مجھے بیعت فرما کر میرے سفر کے بال کٹوائے اور چار گوشہ ٹوپی میرے سر پر رکھی اور پھر فرمایا کہ: جب تک میرے شیخ زندہ رہے، میں ان کے ساتھ رہا، خدمت کے بغیر فقیر، فقیر نہیں بنتا، اشارہ اس طرف تھا کہ تم بھی آگئے ہو تو بس یہیں کے ہو کر رہو گے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں بیس سال اپنے شیخ رحمہ اللہ کی خدمت میں رہا۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ اپنے شیخ کی خدمت میں بیس سال رہے، اور بیس سال میں ملکوں ملکوں کی سیر کی، اپنے شیخ کے ساتھ پھرتے رہے، مکہ مکرمہ بھی گئے، حج بھی کیا، شیخ ہی کے ساتھ رہے، ان کے ذمہ لوٹا، مسواک، کپڑے پہنانے کی خدمت سپرد تھی، بیس سال کے بعد شیخ نے ''معین الدین'' کا خطاب دیا اور کہا: حسن! ولایت ہند تمہارے سپرد کی جاتی ہے، جاؤ وہاں جا کر بیٹھ جاؤ۔ ان کے شیخ حضرت خواجہ محمد عثمان ہارونی رحمہ اللہ ان کو ہندوستان کی ولایت پر مامور فرما کر خود حج کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں جا کر انتقال فرمایا۔ اور یہ اپنے شیخ کے حکم سے یہاں تشریف لے آئے۔

ہمارے سلسلہ کی عجیب بات:

ہمارے سلسلے میں بھی ایک عجیب بات چلی آتی ہے ساری عمر ساتھ رہے

لیکن وفات کے وقت موجود نہیں، ان کے خلیفہ اعظم خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ بیس سال اپنے شیخ کی خدمت میں رہے، لیکن وفات سے پہلے کہہ دیا کہ دہلی کا پایۂ تخت تمہارے سپرد کیا جارہا ہے، جاؤ وہاں پہنچ جاؤ۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں دہلی پہنچا، چالیس دن کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ تمہارے جانے کے بیس دن کے بعد شیخ رحمہ اللہ کا انتقال ہوگیا، اور ان کے خلیفہ اعظم شیخ مسعود اجودھنی گنج شکر رحمہ اللہ وہ بیس سال اپنے شیخ کی خدمت میں رہے، لیکن شیخ نے وفات سے پہلے فرمایا کہ: فلاں جگہ چلے جاؤ، اور یہی خواجہ نظام الدین اولیأ رحمہ اللہ کے ساتھ ہوا، تو خیر یہ بھی عجائباتِ قدرت میں سے ہے۔

اجمیر تشریف آوری:

آپؒ یہاں اجمیر شریف میں تشریف لے آئے، خواجہ صاحب رحمہ اللہ وہاں پہنچے، ایک جگہ ڈیرہ لگادیا، اور اس وقت یہ ہندوستان کی سرزمین خالص ہندوؤں کی سرزمین تھی، بہت کم لوگ ایسے تھے جو کہیں خال خال مسلمان ہوگئے تھے، محمود غزنوی رحمہ اللہ کے زمانے سے وہاں راجہ پرتھوی راج کی حکومت تھی، شیخ رحمہ اللہ آکر ایک قریب کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے، ملنگ، نہ کھانے کا سامان تھا، نہ پینے کا، نہ کوئی اور، نہ کسی سے لین، نہ دین، ایک مسافر تھے، کوئی دم درود کے لئے آجاتا، کوئی بیمار ہوتا یہ پھونک مار دیتے، اللہ تعالیٰ شفا دے دیتے، اس طرح لوگ مسلمان ہونے لگے، جو ان کی خدمت میں بیٹھ جاتا مسلمان ہوجاتا۔

راجہ پرتھوی راج کی گستاخی اور اس کا انجام:

راجہ کو اطلاع پہنچی تو اس نے پیغام بھیجا کہ اس کو کہو کہ نکل جائے یہاں سے، جواب میں ارشاد فرمایا کہ: فقیر یہاں رہنے کے لئے آیا ہے، تمہارا کوئی نقصان نہیں کرتا، مجھے یہاں سے کیوں نکالتے ہو؟ پھر پیغام آیا کہ اس کو کہو کہ نکل جائے

یہاں سے، پھر جواب دیا کہ: میرا قصور کیا ہے کہ مجھے یہاں سے نکالا جارہا ہے؟ تیسری دفعہ پیغام آیا کہ اگر نہیں نکلیں گے تو ہم پکڑ کر نکال دیں گے، شیخ رحمہ اللہ نے جوش میں آکر فرمایا کہ: میں نے تجھے یہاں سے نکال دیا اور زندہ پکڑ کر کسی کے حوالے کر دیا، جاؤ! شیخ رحمہ اللہ کا یہ کہنا تھا کہ چند دن کے بعد شہاب الدین غوری رحمہ اللہ آئے، اور اس پر حملہ آور ہوئے، زندہ پکڑا گیا اور وہ علاقہ مسلمانوں کا ملک بن گیا۔

اب انہوں نے کیا کیا؟ لوگوں کو کس طرح تعلیم و تربیت فرمائی؟ افسوس ہے کہ کتابیں بالکل اس سے خاموش ہوگئیں۔ کیا مشاغل تھے؟ کیا معمولات تھے؟ لوگوں سے کیا برتاؤ کرتے تھے؟ میں نے بتایا ہے کہ خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ نے جوان کے خلیفہ ہیں، ان کے ملفوظات جمع کئے ''دلیل العارفین'' کے نام سے، وہ میرے پاس موجود ہیں، لیکن بس حضرت نے یہ ارشاد فرمایا: ایک مجلس لگی اس میں یہ ارشاد فرمایا اور اس مجلس کی تقریر قلمبند کرلی اور بس! باقی کسی قسم کے حالات کہ لوگوں کو کس طرح دعوت الی اللہ دیتے تھے؟ کیا معمولات تھے آپ کے؟ ان تفصیلات سے کتابیں بالکل خاموش ہیں۔

آپؒ کا فیض:

اس لئے میں نے کہا کہ افسوس ہے کہ اتنے بڑے شیخ! کہ ایک سو پانچ سال کی عمر تھی اور جس دن انتقال ہوا تو آپؒ کے ہاتھ پر اس وقت تک نوے لاکھ انسان مسلمان ہوگئے تھے، نوے لاکھ آدمیوں کو مسلمان کر کے گئے تھے، ویرانہ کفر میں نوے لاکھ کافروں کو مسلمان کر کے گئے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان میں یہ جو مسلمان نظر آرہے ہیں یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کا فیض ہے، یا اس قسم کے اور اولیاء اللہ کا فیض ہے، بادشاہوں کی تلواروں سے اسلام نہیں پھیلا۔

انگریزوں کا غلط پروپیگنڈا:

یہ انگریزوں نے جھوٹ پھیلایا تھا کہ عالمگیر رحمہ اللہ نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بنایا تھا، بھلا تلوار کے زور سے بھی کوئی مسلمان ہوا کرتا ہے؟ بھائی! تلوار کا زور اوپر تک تو چل سکتا ہے، دل تک تو تلوار کی نوک نہیں جاسکتی، یہ جو والہانہ عقیدت کے ساتھ لوگ مسلمان ہوئے، اور آج بھی جبکہ ہندوستان پر کفر کا تسلط ہے، اور مسلمانوں کی پٹائی ہو رہی ہے، اور لوگ مسلمان ہو رہے ہیں، ان کو کون مسلمان کر رہا ہے؟ ہندوستان میں جب انگریز کا تسلط تھا آپ دیکھتے تھے کہ جامع مسجدوں میں اور دوسری جگہوں میں لوگ مسلمان ہوتے تھے، ہندو، مسلمان ہوتے تھے، جبر و تشدد کے ساتھ کفر کو پھیلایا جاسکتا ہے، اسلام کو نہیں پھیلایا جاسکتا، "لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" دین میں زبردستی نہیں چلتی۔

تو اس لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ علماؑ کی تبلیغ اور بادشاہوں کے دبدبہ اور طنطنہ سے دین اتنا نہیں پھیلا، جتنا بزرگانِ دین کے انفاسِ طیبہ سے پھیلا ہے، ان کے فیض وصحبت سے پھیلا ہے۔

اتباعِ سنت:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے حضرت خواجہ رحمہ اللہ کی اتباع سنت کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ: ایک دفعہ وضو فرما رہے تھے، اتفاق سے داڑھی کا خلال کرنا بھول گئے۔

پہلے مسئلہ سمجھو کہ جس شخص کی داڑھی ہلکی ہے، اس کے لئے پوری داڑھی کا بھگونا فرض ہے، وضو میں داڑھی کا تر کرنا فرض ہے، اور جس کی داڑھی گھنی ہو، اس کے لئے بالوں کے اندر پانی پہنچانا فرض نہیں ہے، بلکہ اس کے اوپر کے حصے کو دھونا فرض ہے، لیکن اندر سے داڑھی کا خلال کرنا اس کے حق میں سنت ہے اور سنت بھی

مستحب قسم کی ہے، یعنی کوئی اگر چھوڑ دے، نہ کرے تو گناہگار نہیں ہوگا، اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس نے بہت برا کیا، یعنی سنت کا درجہ مستحب کا ہے، یعنی سنت مستحبہ، حضرت خواجہ رحمہ اللہ ایک دفعہ وضو فرما رہے تھے اور داڑھی کا خلال کرنا بھول گئے، غیب سے آواز آئی کہ محبتِ رسولؐ کا دعویٰ کرتے ہو اور سنت کے خلاف کرتے ہو؟ حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں آپ نے فوراً توبہ کی کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا، اور اس پر استغفار کیا، توبہ کی، ایک مستحب کے ترک کر دینے پر غیب سے عتاب ہوا، اور آپ نے اس پر توبہ کی۔

لوگوں کے ساتھ ان کے مقام کے مطابق معاملہ کرنے کا حکم:

یہاں پر یہ نکتہ خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کا ہر ایک کے ساتھ معاملہ جدا ہے، میں نے آپ کو حدیث سنائی تھی ناں! کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک سائل آیا، اس نے کہا بھوکا ہوں، روٹی دے دو، روٹی کھلاؤ، حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے خادمہ سے کہا کہ اس کو کھانا دے دو، اس کو کھانا ہاتھ میں پکڑا دو، وہ چلا گیا، ایک اور شخص آیا اس کا بھی یہی سوال کہ بھوکا ہوں کھانا کھلاؤ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خادمہ سے فرمایا اس کو عزت کے ساتھ بٹھاؤ، اور اس کو کھانا کھلاؤ، انہوں نے کہا کہ حضور! دو آدمیوں کا سوال ایک تھا لیکن معاملہ دونوں کے ساتھ الگ الگ، ارشاد فرمایا کہ: ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی: "اَنْزِلُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ مَنَازِلِهِمْ." (ابوداؤد ج:۲ ص:۳۰۹) لوگوں سے ان کے مرتبہ کے مطابق معاملہ کیا کرو۔ یعنی جس مرتبے کا آدمی ہو اس مرتبے کا اس کے ساتھ معاملہ کرو، یہ بات کہہ کر فرمایا وہ پہلا آدمی بے چارہ کم حیثیت کا تھا، اس کے ہاتھ میں روٹی پکڑا دی وہ اس پر خوش ہوگیا، اس نے اپنی کوئی بے عزتی محسوس نہیں کی، اور اس آدمی کو میں نے دیکھا کہ صاحبِ وجاہت ہے، اب کسی چوہدری کے ہاتھ میں تم روٹی پکڑا دو، وہ تو اس کو اپنی بے عزتی سمجھے گا، معزز

آدمی کے ہاتھ میں روٹی پکڑا دو، تو وہ اس کو اپنی بے عزتی سمجھے گا، اس لئے اس کو بٹھا کر کھلانا چاہئے، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق دونوں کی حیثیت کے مطابق معاملہ کیا ہے۔

حق تعالیٰ کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ جدا جدا ہے:

میں نے آپ کو اس لئے یہ حدیث سنائی کہ حق تعالیٰ شانہ کا معاملہ بھی اسی طرح ہے، اللہ تعالیٰ ہر بندے کے ساتھ اس کی حیثیت کے مطابق فیصلہ فرماتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے تھے، ایک مستحب ترک ہوا تو اس پر غیب سے ڈانٹ پڑی کہ محبت کے دعوے کرتے ہو؟ حالانکہ ان بے چاروں نے دعویٰ کب کیا تھا؟ یہاں تو دعوے کی نفی ہوگئی تھی، مطلب یہ ہے کہ بزرگ بنے پھرتے ہیں اور مستحب کا التزام نہیں، ان کو ایک دن ایک مستحب پر ٹوک دیا گیا، غیب سے ٹوک دیا گیا، اور ہم فرائض کو بھی ہضم کرتے پھریں، ہمیں کوئی ٹوکنے والا نہیں، ہمارے ساتھ ہماری حیثیت کے مناسب معاملہ کیا جاتا ہے، اور ان اکابر رحمہم اللہ کے ساتھ ان کی حیثیت کے مناسب معاملہ کیا جاتا ہے۔

اس لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ: مقربان را بیش بود حیرانی، جتنے زیادہ مقرب ہوتے ہیں، اتنی حیرانی ان کو زیادہ ہوتی ہے، تم سمجھتے ہو کہ یہ جو بزرگ ہوتے ہیں، بہت امن میں ہوتے ہوں گے، نہیں بھائی! ان پر تو ہر وقت کپکپی طاری رہتی ہے، یہ مضمون انشاء اللہ کسی دوسرے وقت میں آجائے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

آداب تعلیم
و
تربیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اللّٰہَ اَدَّبَنِیْ فَاَحْسَنَ تَأْدِیْبِیْ، ثُمَّ اَمَرَنِیْ بِمَکَارِمِ الْاَخْلَاقِ." (کشف الخفاء ج:۱ ص:۷۰)

ترجمہ:...... "میرے رب نے مجھے ادب سکھایا، بس بہت اچھا ادب سکھایا، پھر مجھے اچھے اخلاق کا حکم دیا۔"

ادب کہتے ہیں طریقہ کو، جو طریقہ کہ انسان کے لئے پسندیدہ ہے، اور جسے پسندیدہ سمجھنا چاہئے، اس طریقے کو اختیار کرنے کا نام ادب ہے۔

تربیت کے اعتبار سے لوگوں کی قسمیں:

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ لوگ دو قسم کے ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ فطری طور پر اخلاق پر پیدا فرماتے ہیں، ان کی معمولی نوک پلک درست کرنے سے وہ چل پڑتے ہیں۔ اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کو فطری طور پر یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، ان کے لئے مجاہدے کی ضرورت ہوتی ہے، ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے، نفس

کو پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے، اور مہذب بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

وفد عبدالقیس کے رئیس کی محبوب خصلتیں:

رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بحرین سے عبدالقیس قبیلہ کا وفد آیا تھا، جب یہ حضرات دور کا سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشتیاق میں اونٹوں سے اتر کر ہی دوڑ پڑے، لیکن اس وفد کے رئیس جن کو ''اشج'' کہتے تھے۔ دراصل ''اشج'' کہتے ہیں اس شخص کو جس کی پیشانی پر زخم کا نشان ہو، چونکہ ان کی پیشانی پر زخم کا نشان تھا، اس لئے ان کو ''اشج'' کہا جاتا تھا۔ انہوں نے تمام سواریوں کو بٹھایا، ان کے بوجھ اتارے، ان کو باندھا، اپنی سواریاں بھی اور اپنے رفقا کی سواریاں بھی باندھیں، اس کے بعد غسل کیا، صاف کپڑے پہنے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ایک انداز تو وہ تھا، جو دوسرے رفقا نے اختیار کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے ایسے بے تاب ہوئے کہ سواریوں کو بٹھانے اور بوجھ اتارنے کا بھی ہوش نہ رہا، اور ایک انداز وہ تھا جو ان کے رئیس نے اختیار کیا، جن کا نام غالباً منذر بن عائذ تھا، جب یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان فیک لَخَصْلَتَیْنِ یحبھما اللہ: الحلم والاناءۃ.'' (مشکوٰۃ ص:۴۲۹) تم میں دو خصلتیں اور دو عادتیں ایسی پائی جاتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں، یعنی جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں اور پسندیدہ ہیں: ایک حلم اور دوسری سوچ سمجھ کر اطمینان کے ساتھ کام کو کرنا، جلد بازی سے کام نہ لینا۔

''حلم'' کے معنی ہیں تحمل کرنا اور حوصلہ کرنا، جلدی سے مشتعل نہ ہوجانا۔

اور اناءۃ کے معنی ہیں آہستگی اور اطمینان کے ساتھ کسی کام کو کرنا، انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ دونوں خصلتیں میرے اندر فطری ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے

پیدا فرمادی ہیں یا کسبی ہیں کہ میں نے محنت کے ساتھ حاصل کی ہیں؟ فرمایا: فطری ہیں! اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی بغیر محنت کے پیدا فرمادی ہیں، یہ سن کر انہوں نے کہا: اس اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے ایسی دو خصلتوں پر پیدا کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں۔

تو بعض لوگوں میں فطری طور پر آداب و اخلاق پائے جاتے ہیں، ان کے لئے ذرا سی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے ان کے جوہر کھل جاتے ہیں۔

اور بعض حضرات ایسے ہیں کہ ان میں کمی ہوتی ہے، ان کو تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

قبولیت تربیت کے اعتبار سے لوگوں کی اقسام:

پھر تعلیم و تربیت کے اعتبار سے لوگوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

۱:......بعض وہ ہوتے ہیں جو تعلیم و تربیت کا اثر جلدی قبول کر لیتے ہیں اور ان پر جلدی رنگ آجاتا ہے۔

۲:......بعض حضرات وہ ہوتے ہیں جن پر اثر بہت دیر سے ہوتا ہے، اور بہت کمزور ہوتا ہے، استعداد ناقص ہوتی ہے۔

ایک مثال:

ایک بزرگ کے پاس کوئی صاحب بیعت ہونے کے لئے آئے، انہوں نے بیعت فرمالیا، دو چار دن رہے رخصت ہونے لگے تو ان کو خلافت عطا فرمادی، جو لوگ دس دس سال سے پڑے ہوئے تھے، مجاہدے کر رہے تھے، ان کو شکایت ہوئی، شیخ کو بھی اس کی اطلاع ہوئی، شیخ نے فرمایا: لکڑیاں درختوں سے کاٹ کر لاؤ، گیلی لکڑیاں لائی گئیں پھر فرمایا: ان کو آگ لگاؤ! مگر ان سے آگ جلتی نہیں تھی، بھلا گیلی لکڑی سے آگ کیسے جلے گی؟ پھر فرمایا: گھاس پھوس لاؤ! وہ لے آئے تو اس کو آگ لگائی تو وہ

فوراً جل پڑی، فرمایا: یہ تمہاری اور ان کی مثال ہے، یہ پہلے تیار ہوکر آئے تھے، صرف ماچس دکھانے کی ضرورت تھی، اور تم ہو گیلی لکڑیاں، دس سال ہوگئے تم کو سکھاتے ہوئے لیکن اب تک سوکھ کے نہیں دیئے ہو، ابھی تک پانی موجود ہے۔

پوشیدہ صلاحیت کی مثال:

تو بزرگ فرماتے ہیں کہ آدابِ شرعیہ کے لحاظ سے لوگوں کی استعدادیں مختلف ہوتی ہیں، بعد میں استعداد ظاہر ہوتی ہے، حقیقت میں ان کے اندر استعداد چھپی ہوئی ہوتی ہے، ان کی ذرا سی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، اور فرماتے ہیں کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کھجور کی گٹھلی کے اندر کھجور کا درخت چھپا ہوا ہے، صرف ان کو کاشت کرنے کی تھوڑی سی محنت ہوگی، یا زناد ایک لکڑی ہے، اس کو رگڑتے ہیں تو اس میں سے آگ نکلتی ہے، فرماتے ہیں کہ اس لکڑی کے اندر آگ چھپی ہوئی ہے، صرف ذرا سا رگڑنے کی ضرورت ہے۔ تو بعض حضرات تو ایسے ہیں اور بعض حضرات ایسے ہیں کہ ان کے اندر استعداد پیدا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور محنت و ریاضت کے بعد استعداد پیدا ہوتی ہے۔

محنت کے میدان:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ بھئی ہمارا گھر ہے، دوست احباب کا حلقہ ہے، ملنے جلنے والوں کا حلقہ ہے، بازار ہے، یہ سارے کے سارے ہمارے مجاہدے کے میدان ہیں، ہمارا برتاؤ گھر والوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہمارا برتاؤ دوست احباب کے ساتھ کیسا ہے؟ اور ملنے والوں کے ساتھ، تعلق والوں کے ساتھ کیسا ہے؟ بہت سی ناگواریاں پیش آئیں گی، بہت ساری چیزیں مزاج کے خلاف پیش آئیں گی، فرماتے ہیں کہ یہ سارے کا سارا مجاہدے کا میدان ہے، ان میدانوں میں ہماری تربیت کے جوہر کھلتے ہیں، ہمارا مزاج کیسا ہے؟

ہماری تربیت کیسی ہے؟ ہمارے اخلاق کیسے ہیں؟ ہم کس حد تک آداب کو لئے ہوئے ہیں؟

حضرات انبیاءؑ کی تربیت:

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد شروع میں پڑھا ہے کہ: میرے رب نے مجھے ادب سکھایا ہے، بہت اچھا ادب سکھایا ہے، اور میرے رب نے مجھے اچھے اخلاق کی تعلیم دی۔

حضرات انبیاءؑ مجموعہ کمالات:

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو حق تعالیٰ نے تمام اخلاق اور کمالات کی استعداد پیدا کر کے مبعوث فرمایا، ان کے بدن میں اور ان کی ظاہری اور باطنی قوتوں میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ان کو کامل ومکمل پیدا کرتے ہیں، اور ہمارے آنحضرت تو سید المرسلین ہیں، سید الخلائق ہیں، سید الاولین والآخرین ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم۔ تمام کمالات جو انسانیت کے ہوسکتے ہیں وہ حق تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ودیعت فرمادیئے تھے، رکھ دیئے تھے، کوئی انسانی کمال ایسا نہیں تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی میں نہ رکھا گیا ہو، اور کوئی نقص ایسا نہیں تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی میں رکھا گیا ہو، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے ادب سکھایا اور مجھ کو تعلیم دی۔''

نبی کا معلّم؟

اب نبی کا معلّم تو اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے، نبی کو ادب سکھانے والے خود اللہ تعالیٰ ہی ہوتے ہیں، کوئی دوسرا ادب سکھانے والا نہیں ہوتا اور انبیاءؑ تمام انسانیت کے معلّم ہوتے ہیں، حضرات انبیاء کرام تمام انسانیت کے مؤدب ہوتے ہیں، انسانیت کو

ادب سکھانے والے ہوتے ہیں، اور دنیا بھر کے حکیم اور فلاسفر ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے ہیں، لیکن ان کی تعلیم وتربیت اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔

جب نبی ادب کا محتاج ہے تو دوسرے کس قدر ہوں گے؟

میں جو بات سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اندر کمالات پیدا فرماتے ہیں اور رکھتے ہیں اور اس کے بعد پھر تعلیم بھی دیتے ہیں، ادب بھی سکھاتے ہیں، ان تمام کمالات کے باوجود ان حضرات کو اللہ تعالیٰ سے ادب سیکھنے اور علم سیکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اب اس سے اندازہ فرما سکتے ہیں کہ دوسرے لوگ، خواہ اللہ تعالیٰ نے ان میں کتنی استعداد رکھی ہو وہ تعلیم اور تادیب کے کس قدر محتاج ہوں گے؟

نبی کی تعلیم عین فطرت ہے:

اور پھر یہ تعلیم وتادیب اگر آپ دوسروں سے سیکھیں گے تو ہلاک ہوجائیں گے، بگڑ جائیں گے، پہلے سے زیادہ بگڑ جائیں گے، اپنی استعداد کو برباد کرلیں گے، اور اگر حضرات انبیاءؑ سے سیکھیں گے تو ان کی تعلیم اور تادیب عین فطرت انسانی کے مطابق ہوگی، آپ انسانِ کامل بنیں گے۔

نبی کی ذات نمونۂ تربیت ہے:

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ بھئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ایسی ہے کہ ایک آقا نے حکم دیا کہ ایسی چیز بنا کے لاؤ، سمجھادیا گیا کہ یہ کرو، یہ کرو، یہ کرو، لیکن انہوں نے کہا کہ: حضور! کوئی نمونہ دے دیں، اس نمونے کے مطابق یہ چیز ہم بنادیں گے، ایسے سمجھانے سے تو ممکن ہے کہ بات سمجھ میں نہ آئے اور حضور کی منشا کے مطابق نہ ہوسکے، تو آقا نے اپنے نوکر کو ایک نمونہ دے دیا کہ اس نمونے کے مطابق بنا کے لاؤ۔ حضرت قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ انسان بن کے دکھاؤ، اپنے بندوں کو حکم دیا کہ انسان بن کے

دکھاؤ، ہمارے بندے بن کے دکھاؤ۔ بندوں نے کہا کہ: یا اللہ! کیسے بندے بنیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ کیا کرو، یہ کیا کرو، لیکن بات پھر بھی قابو میں نہ آئی، تو اللہ تعالیٰ نے ایک نمونہ پیش کر دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی کا کہ تمہیں انسانِ کامل کا ایک نمونہ دے دیتا ہوں، بس اس کی نقل اتار کے آؤ، جیسے یہ ہیں، اپنے آپ کو ان کی شکل میں، ان کے اخلاق میں، ان کے آداب میں ڈھال کے لاؤ۔ اب جتنا کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال، اخلاق، آداب میں آپ کی مشابہت کرے گا، اتنا ہی انسان کامل ہوگا، اور اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ہوگا، اور جتنا اس معاملے میں کسی کے اندر نقص ہوگا اتنا ہی وہ ناقص رہے گا۔ قرآن کریم میں ہے:

> ”قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ......“ (آل عمران:۳۱)
>
> ترجمہ:...... ”کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو پھر میرے پیچھے پیچھے آجاؤ، میری پیروی کرو جیسے جیسے میں کرتا ہوں تم بھی ویسے ہی کرو، تم میری نقل کرو گے تو اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے، اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے۔“

تم تو چلے تھے اللہ تعالیٰ کا محبّ بننے کے لئے، اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کے لئے لیکن جو دولت ہاتھ آئے گی وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے، اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے۔

فطری استعداد کے لئے تربیت کی ضرورت:

خلاصہ یہ ہے کہ فطری طور پر انسان میں اللہ تعالیٰ نے آداب و اخلاق کی استعداد رکھی ہے، اور اس استعداد کے لئے تربیت کی ضرورت ہے، بغیر تربیت کے یہ

استعداد کامل نہیں ہوگی، فائدہ کچھ نہیں ہوگا، کھجور کی گٹھلی کو اگر زمین میں دبا دو گے تو درخت نکل آئے گا، اور اگر زمین کے اوپر سو سال بھی پڑی رہی تو وہ گٹھلی کی گٹھلی رہے گی، تو جو استعداد اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر آدمی بننے کی اور انسانیت کے اخلاق و استعداد کی رکھی ہے، اس کے لئے ضرورت ہے تربیت کی اور تربیت کے طریقے مختلف ہیں، کچھ طریقے اس استعداد کو بگاڑنے والے ہیں اور کچھ طریقے اس استعداد کو سنوارنے والے ہیں۔ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور بالخصوص ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے معلّم بن کر آئے ہیں۔

ہماری غلط فہمی:

ہم لوگوں کو غلط فہمی ہے یا ہمارے دلوں میں غلط فہمی ڈال دی گئی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام صرف نماز، روزہ سکھانے کے لئے آتے ہیں، یہ بھی ٹھیک ہے، نماز، روزہ بھی سکھاتے ہیں، لیکن اگر آپ مجھ کو معاف کریں تو میں کہوں گا کہ ہگنا موتنا، پیشاب اور دوسری چیزوں کے بارے میں بھی سکھاتے ہیں، یہ بے ادبی کا لفظ بول رہا ہوں، ان کی تعلیم کے بغیر آپ کو یہ بات بھی نہیں آسکتی۔

صحیح مسلم میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

"عَنْ سَلْمَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قِیْلَ لَہٗ قَدْ عَلَّمَکُمْ نَبِیُّکُمْ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلَّ شَیْءٍ حَتّٰی الْخِرَاءَۃَ. قَالَ: فَقَالَ: اَجَلْ! لَقَدْ نَھَانَا اَنْ نَّسْتَقْبِلَ الْقِبْلَۃَ لِغَائِطٍ اَوْ بَوْلٍ وَاَنْ نَّسْتَنْجِیَ بِالْیَمِیْنِ اَوْ اَنْ نَّسْتَنْجِیَ بِاَقَلَّ مِنْ ثَـلَاثَۃِ اَحْجَارٍ ..... الخ." (صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۳۰)

ایک یہودی نے ان سے کہا کہ تمہارا نبی تم کو ہر چیز سکھاتا ہے، حتیٰ کہ ہگنا موتنا بھی سکھاتا ہے، یعنی پیشاب پاخانہ کے بھی آداب سکھاتے ہیں، حضرت سلمان

فارسی رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں فرمایا: جی ہاں! ٹھیک کہتے ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منع فرمایا ہے کہ پاخانے پیشاب کے لئے بیٹھو تو قبلہ کی طرف منہ نہ کرو، اور دائیں ہاتھ سے استنجا نہ کرو، تین ڈھیلے استعمال کیا کرو وغیرہ وغیرہ۔

نبی کی تربیت کا کمال:

علمأ فرماتے ہیں کہ اس یہودی کا اشارہ یا تو نعوذ باللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنا تھا، یا مسلمانوں پر اعتراض کرنا مقصود تھا۔ مسلمانوں پر اعتراض کرنا مقصود ہو تو اس کی تقریر یہ تھی کہ تم ایسے بدھو ہو کہ تمہیں پیشاب پاخانہ سکھانے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اس طرح پیشاب کے لئے بیٹھا کرو، اس طرح استنجا کیا کرو، تم کو آج تک یہ بات بھی نہیں آئی تھی، یہ بھی نبی سے سیکھنے کی ضرورت تھی تو جواب کا خلاصہ یہ ہوگا کہ ہاں ٹھیک کہتے ہو، ہمیں نہیں آتا تھا، ہم نے سیکھ لیا اور تم جہل مرکب میں مبتلا رہے، تم کو ابھی تک نہیں آیا، کیونکہ تم نے سیکھا ہی نہیں اور تم کو آیا ہی نہیں۔ اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گفتگو ہو تو اس کے اعتراض کی تقریر یہ ہوگی کہ نبی کا کام تو اونچی باتیں بتانا ہوتا ہے، معرفت کی باتیں بتائے، تعلق مع اللہ کی باتیں بتائے، جنت اور دوزخ کی باتیں بتائے، اونچے علوم جو انسانی عقل سے ماورا ہیں ان باتوں کو بتائے، یہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تعلیم دینا یہ نبی کا کام نہیں ہوتا، یہ کیسا نبی ہے جو چھوٹی چھوٹی باتوں کی تعلیم دیتا ہے، حتیٰ کہ پیشاب پاخانہ، ہگنا موتنا بھی سکھاتا ہے؟ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہاں! ٹھیک کہتے ہو، نبی کا کمال یہ ہے کہ نبی چھوٹی چھوٹی باتوں کی ایسی تعلیم دیتا ہے کہ یہ بھی معرفت الٰہی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور قرب الی اللہ کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

چھوٹی سی سنت پر عمل مدارس کی تعمیر ایسے بڑے عمل سے افضل ہے:

ہمارے حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی رحمہ اللہ ''ابن ماجہ'' کے حاشیہ

(ابن ماجہ حدیث شریف کی کتاب ہے اس) میں شروع کے دوسرے صفحے پر حدیث آئی ہے: ''ہر بدعت گمراہی ہے۔'' اس کے نیچے لکھتے ہیں کہ بدعت بعض ایسی ہوتی ہیں کہ جو کسی دین کے کام کا ذریعہ ہیں ان کو گمراہی نہیں کہا جاتا، جیسے مدرسہ بنانا، کتابیں لکھنا، ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ چیزیں نہیں تھیں، لیکن مقصود چونکہ اس سے تعلیم ہے اور تعلیم شریعت کے مقاصد میں سے ہے اور یہ چیزیں ذریعہ ہیں، اس لئے ان کو بدعت نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کو ''بدعت حسنہ'' کہیں گے۔ بدعت ضلالت نہیں، بلکہ بدعت حسنہ کہا جائے گا۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ علماً کا اتفاق ہے اس بات پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اختیار کرنا بڑی سے بڑی بدعت حسنہ سے افضل ہے، حتیٰ کہ استنجاخانہ میں جاتے ہوئے بایاں قدم پہلے رکھنا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے استنجاخانہ میں جاؤ تو بایاں قدم پہلے رکھو اور جب نکلو تو دایاں قدم پہلے نکالو۔ مسجد میں آؤ تو دایاں قدم پہلے داخل کرو اور باہر جاؤ تو بایاں قدم پہلے نکالو۔ گھر میں آؤ تو دایاں قدم پہلے رکھو اور گھر سے نکلو تو بایاں قدم پہلے نکالو۔ تو شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیت الخلاء میں اتباع سنت کی نیت سے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کی نیت سے بایاں قدم استنجاخانہ میں پہلے رکھنا یہ مدارس کے بنانے سے افضل ہے۔

تربیت میں نبی بمنزلہ باپ کے ہے:

تو میں گفتگو اس پر کر رہا تھا کہ ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہر چیز ہمیں سکھائی ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا:

''اِنَّمَا اَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ ....''

(ابوداؤد ج:۱ ص:۳)

ترجمہ:......''میری مثال ایسی ہے جیسے کوئی بیٹے کے

لئے باپ ہوتا ہے۔"

نادان بچے کو باپ ہر چیز سکھاتا ہے کہ بیٹا ایسے کیا کرتے ہیں، ایسے کیا کرتے ہیں، نہایت شفقت کے ساتھ، نہایت محبت کے ساتھ اس کو سکھاتا ہے، آداب کی تعلیم اس کو دیتا ہے، فرمایا: میں تمہارے لئے بمنزل باپ کے ہوں۔ زندگی کی تمام چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائی ہیں، اور سکھائی بھی نہایت شفیقانہ انداز سے، جس طرح کہ باپ بیٹے کو سکھاتا ہے، صرف نماز، روزہ نہیں، بلکہ شریعت کے تمام آداب، زندگی کے تمام آداب، کھانے کے آداب، پینے کے آداب، لیٹنے اور چلنے پھرنے کے آداب، نہایت شفیقانہ انداز کے ساتھ ہمیں سکھائے، جیسے باپ اپنے بیٹے کو سکھاتا ہے، تو صرف نماز، روزہ نہیں، بلکہ شریعت کے تمام آداب، زندگی کے تمام آداب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائے ہیں، سعادت مند ہیں وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ادب سیکھیں اور بہت ہی بدنصیب ہیں وہ لوگ جن کو اتنا بڑا معلّم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہو اور وہ اس سے استفادہ نہ کریں، مغرب کی طرف دیکھتے ہیں، یورپ کی طرف دیکھتے ہیں۔

ایک کفن چور کا عجیب قصہ:

ایک کفن چور کہنے لگا: حضرت جی! میں کیا بتاؤں، عجیب بات تو یہ دیکھی کہ مسلمان مردوں کو دفن کر کے آتے ہیں اور منہ قبلہ کی طرف کر کے آتے ہیں، لیکن جب میں کفن چرانے کے لئے جاتا تھا تو سب کا منہ قبلے کی طرف سے ہٹا ہوا ہوتا تھا، سوائے چند افراد کے، میں نے سب کا منہ قبلے سے ہٹا ہوا پایا اور مجھے اس پر بڑا تعجب ہوا کہ منہ ہٹ کیسے جاتا ہے؟ اور کیوں ہٹ جاتا ہے؟

قبر میں قبلہ سے منہ ہٹ جانے کا سبب؟

وہ بزرگ فرمانے لگے کہ بھائی! بالکل ہٹنا چاہئے، اس لئے کہ زندگی کا قبلہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، تمہاری زندگی کا قبلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، قبر میں منہ قبلے کی طرف ان لوگوں کا رہتا ہے جن کا منہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف ہو اور جن لوگوں نے قبلہ اپنا بنالیا ہو، کسی نے روس والوں کو قبلہ بنالیا، ان کا جھنڈہ لے کر پھرتے ہیں، کسی نے مغرب کو اپنا قبلہ بنالیا ان کی سنتوں پر عمل کر رہے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ قبر میں ان کا منہ قبلہ کی طرف رہے، انہوں نے زندگی بھر منہ قبلہ کی طرف نہیں کیا تو مرنے کے بعد ان کا منہ قبلے کی طرف کیسے رہے گا؟ العیاذ باللہ!

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اپنا قبلہ بناؤ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اخلاق کی، جن اعمال کی، جن آداب کی ہدایت فرمائی ہے، تعلیم فرمائی ہے ان کو اپناؤ، اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے، آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قلوب
کی
اقسام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

الف:......"عَنْ حُذَیْفَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اَلْقُلُوْبُ اَرْبَعَةٌ: قَلْبٌ اَغْلَفُ فَذَالِکَ قَلْبُ الْکَافِرِ، وَقَلْبٌ مَصَفَّحٌ فَذَالِکَ قَلْبُ الْمُنَافِقِ، وَقَلْبٌ اَجْرَدُ فِیْہِ سِرَاجٌ یَزْھَرُ فَذَاکَ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ، وَقَلْبٌ فِیْہِ نِفَاقٌ وَاِیْمَانٌ، فَمَثَلُ الْاِیْمَانِ کَمَثَلِ شَجَرَةٍ یَمُدُّھَا مَاءٌ طَیِّبٌ، وَمَثَلُ النِّفَاقِ مَثَلُ قَرْحَةٍ یَمُدُّھَا قَیْحٌ وَدَمٌ فَاَیُّھُمَا غَلَبَ عَلَیْہِ غَلَبَ." (حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۲۷۶)

ب:......"عَنْ حُذَیْفَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اِنَّ الْفِتْنَةَ تُعْرَضُ عَلَی الْقُلُوْبِ، فَاَیُّ قَلْبٍ اَشْرَبَھَا نُکِتَتْ فِیْہِ نُکْتَةٌ سَوْدَآءُ، فَاِنْ اَنْکَرَھَا نُکِتَتْ فِیْہِ نُکْتَةٌ بَیْضَاءُ، فَمَنْ اَحَبَّ مِنْکُمْ اَنْ یَّعْلَمَ اَصَابَتْہُ الْفِتْنَةُ اَمْ لَا؟ فَلْیَنْظُرْ فَاِنْ کَانَ یَرٰی حَرَامًا کَانَ یَرَاہُ حَلَالًا، اَوْ یَرٰی حَلَالًا مَا کَانَ یَرَاہُ

حَرَامًا فَقَدْ اَصَابَتْهُ الْفِتْنَةُ.“ (حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۷۲)

ج:......”عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: اِيَّاكُمْ وَالْفِتَنَ! لَا يَشْخَصُ اِلَيْهَا اَحَدٌ فَوَاللهِ! مَا شَخَصَ فِيْهَا اَحَدٌ اِلَّا نَسَفَتْهُ كَمَا يَنْسِفُ السَّيْلُ الدِّمَنَ انها مُشْبِهَةٌ مُقْبِلَةٌ حَتّٰى يَقُوْلُ الْجَاهِلُ هٰذِهٖ تَشَبُّهٌ وَتَبَيَّنٌ مُدْبِرَةٌ فَاِذَا رَأَيْتُمُوْهَا فَاجْثِمُوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ وَكَسِّرُوْا سُيُوْفَكُمْ وَقَطِّعُوْا اَوْتَارَكُمْ.“ (حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۷۳)

الف:......ترجمہ:......”امام ابونعیمؒ نے حلیۃ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ: قلوب چار قسم کے ہیں:

۱:......بعض دل تو وہ ہیں جو پردہ میں لپٹے ہوئے ہیں، یہ کافر کا دل ہے۔

۲:......اور ایک دل وہ ہے جو کہ دو رُخ پر ہے، یہ منافقت کا دل ہے۔

۳:......اور ایک دل ہے جو برہنہ ہے، اس میں چراغ ہے تو جل رہا ہے، یہ مؤمن کا دل ہے۔

۴:......اور ایک قلب وہ ہے جس میں نفاق بھی ہے اور ایمان بھی ہے۔

ایمان کی مثال تو اس درخت جیسی ہے جس کو عمدہ پانی پہنچتا ہے، اور نفاق کی مثال اس پنچھی کی ہے کہ اس کو پیپ اور لہو پہنچتا ہے، ان میں سے جو غالب آجائے گا، پس وہ غالب آجائے گا۔“

ب:......ترجمہ:......''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ فتنے قلوب کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، بس جس دل نے اس کو جذب کرلیا اس میں سیاہ نکتہ لگادیا جائے گا اور اگر اس نے انکار کردیا تو سفید نکتہ لگادیا جائے گا۔ اور جو شخص یہ چاہتا ہو کہ یہ جان لے کہ اس کو فتنہ پہنچا ہے یا نہیں؟ وہ یہ دیکھ لے کہ اگر وہ کسی حلال چیز کو حرام دیکھے، جس کو پہلے وہ حرام نہیں سمجھتا تھا، یا کسی حرام کو حلال دیکھے جس کو وہ حلال نہیں سمجھتا تھا تو سمجھے کہ اس کو فتنہ پہنچ چکا ہے۔''

ج:......ترجمہ:......''امام ابونعیمؒ نے حلیہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: فتنوں سے بچا کرو، کوئی شخص فتنوں کی طرف نہ جائے، پس اللہ کی قسم! جو شخص ان میں کھڑا ہوگا اس کو اسی طرح اڑادیں گے جیسے کہ سیلاب نرم زمین کو اڑادیتا ہے، ان کا پتا نہیں چلتا، جاہل آدمی کہتا ہے کہ یہ (فتنے) واپس جارہے ہیں، حالانکہ وہ واپس نہیں جارہے ہوتے، بلکہ وہ آرہے ہوتے ہیں، اور جب تم ان کو دیکھو تو اپنے گھروں میں جم کے بیٹھ جاؤ، اپنی تلواریں توڑدو اور کمانوں کے تان کاٹ دو۔''

یہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ارشادات تھے۔ پہلے فقرہ میں یا پہلی روایت میں فرمایا کہ: قلوب کی چار قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ دل ہیں جو پردہ میں لپٹے ہوئے ہیں، یہ کافر کا دل ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہود کا قول نقل کیا ہے کہ:

''وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللهُ بِكُفْرِهِمْ.''

(البقرہ:۸۸)

ترجمہ:...... ”اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں، نہیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے، ان کے کفر کی وجہ سے۔“

یہود کے دل غلاف صلابت میں ہیں:

بھائی! یہود جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف میں لپٹے ہوئے ہیں، ان کا مطلب یہ تھا کہ تم ہمیں جتنا چاہو سمجھاتے رہو، ہم پر تمہارے وعظ و نصیحت کا اثر نہ ہوگا، ہمارے دل پردے میں ہیں، یہود یہ بات فخریہ کہا کرتے تھے کہ تمہارا وعظ و نصیحت کرنا ہم پر اثر انداز نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: نہیں بلکہ اللہ نے ان کے اس کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی ہے، ان کو کتنا ہی سمجھاؤ، مگر وہ نہ سمجھیں گے، جیسا کہ ایک چیز پردہ میں محفوظ ہوتی ہے اس پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا ہے، اسی طرح کافر کا دل بھی پردہ میں ہے جو متأثر نہیں ہوتا، ورنہ آدمی کسی وقت کچھ تو سوچتا ہے کہ بھائی یہ جو بات کہہ رہا ہے، آیا یہ صحیح بھی ہے یا غلط ہے؟ غلط و صحیح کی تحقیق کرتا ہے، اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا ہے۔

مرزائی اس پر فخر کیا کرتے ہیں کہ ہمارے آدمی بڑے پکے ہیں، ان پر اثر نہیں ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جی ہاں! واقعی بڑے پکے ہیں، ان پر اثر ہی نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ صلاحیت ہی موقوف ہوچکی ہے، ممکن ہی نہیں کہ اثر ہو۔

منافق دو رُخا ہوتا ہے:

دوسری قسم جو دو رُخہ دل ہوتا ہے، کبھی اِدھر کو ہوگیا، کبھی اُدھر کو ہوگیا، یہ منافق کا دل ہے، اس بے چارے کو رسّی ہاتھ میں نہیں آئی، جو جی میں اچھا لگا، اس کے پیچھے چل پڑا، اور جو چیز مطلب کے مطابق ہوئی، اس کو اختیار کرلیا۔

مسلمان کا دل صاف اور ننگا ہوتا ہے:

تیسرا دل اجرد ہے، بے لباس، بالکل ننگا اور اس میں چراغ چمک رہا ہے، یہ مؤمن کا دل ہے۔

خواب میں ننگا دیکھنا:

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے کسی شخص نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ بالکل ننگے ہیں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے، اس لئے کہ کسی شخص کا ننگا ہونا اس کی تعبیر یہ ہے کہ تمام آلات اس کے ختم ہوگئے۔ تنہا، مجرد۔

مجھے بھی بہت سے آدمیوں نے خط لکھا کہ آپ کو بالکل ننگا دیکھا، میں نے کہا کہ اللہ نصیب فرمائے، یہ دولت ہمیں نصیب ہو جائے تو پھر کیا بات ہے۔ یہ لباس تو ہم نے مخلوق سے چھپانے کے لئے پہنا ہوا ہے، ورنہ ماں کے پیٹ سے تو بچہ ننگا ہی پیدا ہوتا ہے، اور قبر میں جاتا ہے تو حیاء کے طور پر اس کو کپڑوں میں لپیٹ دیتے ہیں، ورنہ اندر ننگا ہی ہوتا ہے، تو مؤمن کے دل کی خصوصیت یہ ہے کہ بالکل اجرد، سامنے کوئی پردہ نہیں ہے، تمام مسائل اس کے سامنے عکس پذیر ہوتے ہیں، ہر چیز اپنی اصلی حالت میں اس کے سامنے آتی ہے، سیاہ ہے تو سیاہ نظر آئے گا، سفید ہے تو سفید نظر آئے گا، اچھا ہے تو اچھا نظر آئے گا اور برا ہے تو برا نظر آئے گا، ایک تو اس کی یہ خصوصیت، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ: "فِیْهِ سِرَاجٌ یَذْهَرُ" اس میں ایک چراغ ہوتا ہے چمکتا ہوا، جس طرح کہ آفتاب چمک رہا ہے، لطف یہ ہے کہ اس کا رخ نہیں، کوئی رخ نہیں آفتاب کا کہ فلاں طرف اس کا منہ ہے اور فلاں طرف اس کی پیٹھ ہے، چمک رہا ہے اور اس کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "سِرَاجًا مُنِیْرًا" فرمایا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال آفتاب کی ہے،

ہر طرف روشنی ہی روشنی آرہی ہے، یہ نہیں کہ اس طرف منہ ہے تو اسی طرف روشنی جائے، اس طرف روشنی نہ جائے۔ نہیں، یہ نہیں، بلکہ حضور علیہ السلام کا آفتاب نبوت ہر طرف چمک رہا ہے، اور یہ ہی مثال ہے قلب مؤمن کی کہ مؤمن کے قلب میں ایک چراغ ہوتا ہے چمکتا ہوا، ہر طرف چمکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں یہ دولت نصیب فرمائے، آمین! اس لئے کہ اس چراغ سے سیاہ سیاہ نظر آنے لگتا ہے اور سفید سفید نظر آتا ہے، ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں نظر آتی ہے، اور یہ بہت بڑی دولت ہے۔

ایمان و نفاق ملا دل:

اور ایک قلب وہ ہے کہ اس میں ایمان بھی ہے، نفاق بھی ہے، کبھی ایمان پر آجاتا ہے، کبھی نفاق پر، خالص نہیں۔ پہلا خالص کافر تھا، دوسرا خالص منافق تھا، تیسرا خالص مؤمن تھا اور یہ چوتھا ہے کہ اس میں ایمان بھی ہے اور نفاق بھی ہے، کبھی وہ غالب آجاتا ہے اور کبھی وہ، اس میں جو ایمان ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک درخت ہے، فرض کرو انار کا درخت ہے، بہت عمدہ پانی، آب و ہوا اور اچھی زمین اس کی مدد کرتی ہے، اس لئے اس پر پھل آتا ہے، لیکن ساتھ کے ساتھ کیڑا بھی لگ جاتا ہے، نفاق کی وجہ سے اس کی ایسی حالت ہوجاتی ہے کہ گویا اس میں پھوڑا ہو، اس سے پیپ اور کچ لہو بہتا رہتا ہے، بس ان میں سے جو چیز غالب آجائے گی، وہ اپنا اثر کر ڈالے گی، اگر ایسا دل ہے جس میں ایمان بھی ہے، نفاق بھی ہے تو اگر ایمان غالب آگیا اور اللہ کرے اس پر خاتمہ ہوگیا تو بیڑا پار اور اگر نفاق کا غلبہ ہوا تو اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھے۔

دوسری حدیث میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فتنے قلوب پر پیش کئے جاتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی:

"تُعْرَضُ الْفِتَنُ عَلَى الْقُلُوْبِ كَالْحَصِيْرِ عُوْدًا عُوْدًا فَاَىُّ قَلْبٍ اُشْرِبَهَا نُكِتَتْ فِيْهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ، وَاَىُّ قَلْبٍ اَنْكَرَهَا نُكِتَتْ فِيْهِ نُكْتَةٌ بَيْضَاءُ حَتّٰى تَصِيْرَ عَلٰى قَلْبَيْنِ ..... الخ." (مسلم ج:۱ ص:۸۲)

ترجمہ:..... "فتنے قلوب کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، جیسا کہ چٹائی پر ایک ایک تنکا پیش کیا جاتا ہے (چٹائی بنتے ہوئے یا کپڑا بنتے ہوئے ایک ایک تان ایک ایک تار اس میں لگائی جاتی ہے، بوریا بنتے ہیں تو اس میں ایک ایک تان لگائی جاتی ہے اور چٹائی بنتے ہیں تو چٹائی کے اندر بھی ایک ایک تنکا لگایا جاتا ہے، تو مطلب یہ ہے کہ فتنوں کی لائن میں سے ایک ایک فتنہ دلوں پر پیش کیا جاتا ہے کہ اس کو قبول کرتے ہو کہ نہیں) اب دو قسموں کے دل ہوں گے، پس جو دل ایسا ہو کہ اس نے ان فتنوں کو قبول کرلیا اور وہ اس کے اندر رچ بس گئے، اس میں ایک سیاہ نکتہ لگادیا جاتا ہے، جس دل نے اس کا انکار کردیا اس میں ایک سفید لکیر لگادی جاتی ہے، یہاں تک کہ تمام دل دو حصوں پر تقسیم ہوجاتے ہیں، ایک سفید لکیر لگتی گئی تو سفید ہوگیا، دل ابیض (سفید سنگ مرمر کی طرح) اور دوسری اسود (کالا بھجنگ کوے کی طرح سیاہ) اس میں ہدایت کی کوئی بات نہیں آتی سوائے اس کے جو اس کے قلب میں پہلے سے موجود ہو۔"

پہلی مثال مؤمن دل کی ہے، اس میں سوائے نیکی اور اچھائی کے کوئی چیز اثر نہیں کرتی، اور دوسری مثال ہے سیاہ دل کی کہ سوائے گندگی اور برائی کے کوئی چیز اس

کے اندر اثر نہیں کرتی، اس حدیث میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: فتنے دلوں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں تو اب قلوب ان فتنوں کو قبول کریں گے یا ان کا انکار کردیں گے، جس دل نے ان فتنوں کو قبول کرلیا، اس میں سیاہ لکیر ڈال دی جائے گی اور جس دل نے ان فتنوں کو قبول نہیں کیا، ان کا انکار کیا، ان میں ہر فتنہ کے مقابلہ میں ایک سفید دھاری ڈال دی جائے گی، اس کا نتیجہ وہی ہے جو میں نے ذکر کیا، یہاں تک کہ دو قسمیں ہوجائیں گی، سیاہ وسفید۔

دل کے فتنہ قبول کرنے کی علامت:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ یہ فرماکر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ آیا اس کے دل نے فتنوں کو قبول کیا ہے یا نہیں؟ اس کا ایک طریقہ بتادیتے ہیں، (بڑا خوفناک ہے، ڈرنے کی چیز ہے) وہ یہ دیکھ لے کہ پہلے ایک چیز حلال سمجھتا تھا، اب اس کو حرام سمجھنے لگا، پہلے ایک چیز کو حرام سمجھتا تھا اور اب حلال سمجھنے لگا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ فتنہ اس کے دل کے اندر گھس گیا ہے، اپنے کو تو یہ بات سمجھ میں نہ آئی، اپنے کو تو کوئی پلے نہیں پڑا کہ پہلے ایک چیز کو حلال سمجھتا تھا اور اب حرام سمجھنے لگا یا پہلے ایک چیز کو حرام سمجھتا تھا، اب حلال سمجھنے لگا، حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھنے لگا، یہ علامت ہے ماؤف دل کی۔

دل میں فتنہ کی مثالیں:

اس کی مثال میں بیان کرتا ہوں، میرے شیخ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: جوانی کے زمانے میں جن گناہوں کا وسوسہ تک نہیں آتا تھا، اب دل میں ان کا تصور آتا ہے۔

ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بادشاہ تھا، اس کی ایک ملاح (کشتی بان) کے ساتھ دوستی تھی، وہ بادشاہ فوت ہوگیا، اس کا لڑکا تخت پر

بیٹھا، اس نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے، بعض ایسے کام کئے جو اس کے باپ نے بھی نہیں کئے تھے، کچھ عرصہ کے بعد اپنے باپ کے دوست بوڑھے ملاح کو کہتا ہے کہ: آپ بتلائیں میرا زمانہ اچھا ہے یا میرے باپ کا زمانہ اچھا تھا؟ ملاح کہنے لگا: حضور! میں کیا کہہ سکتا ہوں، تمہارا زمانہ اچھا ہے یا تمہارے باپ کا زمانہ اچھا تھا، لیکن ایک بات بتلا دیتا ہوں، اسی سے آپ اندازہ کر لینا کہ کون سا زمانہ اچھا تھا؟

رات کے وقت میری کشتی میں ایک مسافر سوار ہوا تھا اور لوگ بھی ہوں گے، وہ مسافر اپنی ہمیانی بھول گیا یعنی روپیہ کی پیٹی، لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور وہ ہمیانی میری کشتی میں پڑی رہی، میں نے اس کو کندھے پر ڈالا، گھر لا کر اپنی ایک کوٹھری میں رکھ دیا، (ہمارے دیہات میں کچی دیواروں کی ایک کوٹھی ہوتی ہے یعنی چھوٹا سا بنایا ہوا حجرہ اس میں لوگ چیزیں رکھ دیتے ہیں)، کوئی ایک سال کے بعد وہ آیا اور کہنے لگا کہ: یار میں تمہاری کشتی میں ایک پیٹی بھول گیا تھا، میں نے کہا کہ وہ موجود ہے، میں اس کو گھر لے آیا اور بچوں سے کہا کہ وہ نکالو، کہاں ہے؟ وہ مٹی کے پیچھے پھینکی ہوئی تھی، اس طرح وہ نکالی تو کچھ اس پر جالے والے لگے ہوئے تھے، وہ تھیلی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی، میں نے کہا کہ دیکھ لیجئے کہ یہ آپ ہی کی ہے؟ اس نے کہا کہ: ہاں میری ہے، اس میں کوئی ہزار روپیہ تھا یا کتنا تھا، نکال کر مجھے اس نے دس روپے یا بیس روپے یا سو روپے دینا چاہا، میں نے کہا کہ شرم کرنی چاہئے، اگر مجھے اس کے پیسے لینے ہوتے تو کیا میں اس کو سنبھال کر رکھتا؟ ٹھکانے نہ لگا دیتا، ہر چند اس نے پیسے دینے کی کوشش کی، لیکن میں نے قبول نہیں کیا، یہ تو تمہارے باپ کا زمانہ تھا، اب تمہارا زمانہ آیا تو مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ تجھ سے زیادہ بڑا بے وقوف کون ہوگا، وہ مسافر سال کے بعد اپنی ہمیانی لینے کے لئے آیا تھا، کوئی اس کے پاس گواہ نہیں تھا، کوئی اس نے شناخت اور پہچان نہیں بتائی تھی، اس نے تو کہا کہ میں پیٹی بھول گیا ہوں، تم نے کہا کہ ہاں موجود ہے، تم انکار کر دیتے اور پیسہ خود رکھ لیتے،

پھر اس زمانہ میں وہ مجھے پیسے دینا چاہتا تھا، میں نے نہیں لئے اور اب تمہارا دور جو آیا ہے، حالانکہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون آدمی تھا کون نہیں تھا؟ اس کی رقم کتنی تھی؟ لیکن میرے دل میں اب یہ وسوسہ آتا ہے، اب تم بہتر جانو کہ تمہارے باپ کا زمانہ اچھا تھا یا تمہارا زمانہ اچھا ہے؟

یہ میں نے دو مثالیں آپ کو بتادی ہیں، خود ہمارے ساتھ بھی یہ قصے پیش آئے ہیں، اب تو قبر کی تیاری ہے، لیکن پہلے بہت سی چیزوں سے بچتے تھے، لیکن اب ان کو کرتے ہیں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ حرام کا ارتکاب نہیں کرتے، وساوس کے درجہ میں یہ چیزیں ہیں، لیکن مقام شکر ہے کہ حرام کا ارتکاب نہیں کرتے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ اس کا دل فتنوں میں مبتلا ہوا ہے یا نہیں؟ وہ یہ دیکھ لے کہ پہلے ایک چیز کو حلال سمجھتا تھا، اب حرام سمجھنے لگا ہے یا پہلے ایک چیز کو حرام سمجھتا تھا، اب اس کو حلال سمجھنے لگا ہے، شریعت کے خلاف، تو سمجھے کہ یہ شخص مبتلا فتنہ ہو چکا ہے۔

آدمی بدلتا رہتا ہے:

آدمی کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے، یہ گھڑی چلتی ہے ناں! جس طرح ہمہ دم رفتار میں رہتی ہے، اسی طرح آدمی کا دل بھی بدلتا رہتا ہے، لیکن اگر اس کی رفتار ہمیشہ کفر پر رہی، ایمان پر نہیں آئی تو پھر اس کا انجام تمہیں معلوم ہے، اور اگر ایمان پر اس کی رفتار رہی کفر پر نہیں گئی تو اس کا انجام بھی معلوم ہے۔

اپنے جائزہ کی ضرورت:

ایک آدمی نے بیس سال تک زندگی گزاری، کبھی اللہ کے بندے سوچ کر تو دیکھ لیتے کہ میری حالت میں کچھ تغیر بھی پیدا ہوا ہے یا نہیں؟ اتنا عرصہ بزرگوں کی

خدمت میں بیٹھا ہوں، ان کی شکلیں دیکھی ہیں، ان کے چہرے پر نظر ڈالی ہے، میں نے ان سے کچھ جذب بھی کیا ہے یا نہیں؟ اخذ بھی کیا ہے یا نہیں؟ یا میری حالت وہی ہے۔ تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دیکھو تو سہی تمہارے دلوں پر فتنوں نے اثر کیا ہے، سیاہ لکیریں لگادی ہیں یا سفید لکیریں لگادی ہیں؟

فتنوں سے بچنے کی ضرورت:

تیسری حدیث میں فرماتے ہیں کہ فتنوں سے بچنے کی کوشش کرو، فتنوں کا زمانہ ہے اور یہ فتنوں کا دور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد شروع ہوگیا۔ میں نے گزشتہ خطبہ میں عرض کیا تھا کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ فتنوں کا یہ بند جو تم کہتے ہو یہ توڑ دیا جائے گا؟ یا دروازہ کھول دیا جائے گا؟ تو حضرت حذیفہؓ نے فرمایا تھا کہ امیر المؤمنین! دروازہ نہیں کھولا جائے گا، بلکہ بند توڑ دیا جائے گا، اس پر آپؓ نے فرمایا تھا کہ: انا للہ وانا الیہ راجعون! اگر دروازہ کھول دیا جاتا تو زور زبردستی کے ساتھ اس کو بند کیا جاسکتا تھا، زیادہ لوگ زور لگاتے، لیکن اب جب توڑ ہی دیا گیا تو اس کی مرمت کون کرے گا؟ تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص فتنوں کو دیکھ کر ان کے مقابلے میں سینہ تان کر کھڑا نہ ہو، بچنے کی کوشش کرے۔

فتنے بہالے جائیں گے:

ہمارے نوجوان اور نئی فوج یہ کہتی ہے کہ جی حرج کیا ہے؟ یہ چیزیں پڑھنی چاہئیں، کافر کی لکھی ہوئی ہیں، منافق کی لکھی ہوئی ہیں، بے ایمان کی لکھی ہوئی ہیں، کس کی لکھی ہوئی ہیں پرواہ نہیں، اور صحیح ہے یا غلط ہے؟ اچھا ہے یا برا ہے؟ اس کی پرواہ ہی نہیں، اپنے دل کی حفاظت کرنے کے لئے کوئی اہتمام نہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو

شخص ان فتنوں کو دیکھ کر کھڑا ہو جائے گا، وہ فتنے اس آدمی کو اس طرح اڑا کر لے جائیں گے، جس طرح کہ نرم زمین کو سیلاب بہا کر لے جاتا ہے، کچی زمین ہوتی ناں! اس مٹی کو سیلاب بہالے جاتا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتنے جارہے ہیں، دور جارہے ہیں، حالانکہ دور نہیں جارہے، بلکہ آرہے ہیں، جاہل سمجھتا ہے، فتنہ ٹل گیا، فتنہ ٹل نہیں گیا بلکہ فتنہ آکر دبوچ رہا ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص خدانخواستہ ان فتنوں کی لپیٹ میں آجائے تو یوں کرے کہ اپنے گھر میں بیٹھ جائے، کنڈا بند کردے، پتھر مار کر تلوار کی دھار کو توڑ ڈالے اور کمان کی تان توڑ دے، مطلب یہ ہے کہ جتنا اسلحہ اس کے پاس ہے، جس کے ساتھ دوسرے کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے توڑ دے۔

اسلحہ مسلمانوں کے بجائے کافروں کے لئے ہو:

ہمارے یہاں کہتے ہیں کہ لائسنس لے لے، نیا اسلحہ خرید لے، اسلحہ کے مقابلہ میں اسلحہ، ٹھیک ہے بھائی اگر اس طرح تم اپنی حفاظت کرسکتے ہو تو کرو، لیکن میرے جیسا آدمی جو بے چارا اٹھ نہیں سکتا، وہ دوسرے کو اپنے ہتھیار سے نقصان کیا پہنچائے گا، ریوالور بھی رکھ لیا اور جو اب گنیں وغیں چلی ہوئی ہیں وہ بھی رکھ لیں، لیکن نتیجہ؟ اگر تمہارے ہاتھ پاؤں چلتے ہوں گے، تو لوگوں کو نقصان پہنچاؤ گے، اور اگر تمہارے ہاتھ پاؤں نہیں چلتے تو خود نقصان اٹھاؤ گے، یہ اسلحہ تو کافروں کے مارنے کے لئے ہوتا ہے بھائی! مسلمانوں کے مارنے کے لئے نہیں ہوتا، اب کافروں سے تو تم نے نجات پالی ہے، کیونکہ اب ہم کافروں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے، مسلمانوں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، اسی لئے پچاس سال پہلے پاکستان بنایا تھا نا، سولہ یا سترہ سال تو اس وقت میری عمر تھی، اسی لئے پاکستان تم نے بنایا تھا کہ کافروں کے ساتھ ہم نہیں رہنا چاہتے، لیکن اسلحہ کی ضرورت اب کاہے کی پیش آرہی ہے؟ تو بہتر نہیں تھا

کہ تم وہیں رہتے، بتلاؤ؟ اب تمہارے گھروں میں اسلحہ کے انبار لگے ہوئے ہیں اور تم نے انسانیت کے امن کو برباد کرڈالا ہے، کہلاتے ہو مسلمان! اور قتل کرتے ہو مسلمان کو، اس کے بجائے اگر خود مرجاؤ، تو اچھا ہے برا تو نہیں ہے بھائی۔

دوسرے مسلمان کو قتل کرنے کے بجائے خود قتل ہوجانا افضل ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

”..... فَاِنْ دَخَلَ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْکُمْ فَلْیَکُنْ کَخَیْرِ اِبْنَیْ آدَمَ.“ (مشکوٰۃ ص:۴۶۴)

ایک صحابی نے پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! صاحب فتنہ، یعنی کوئی فتنہ والا آدمی مجھے قتل کرنا چاہے تو میں تو اس کو قتل نہیں کروں گا، لیکن اگر وہ مجھے قتل کرنا چاہے؟ تو فرمایا آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے بہتر بیٹے جیسا ہوجا۔

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، قابیل اور ہابیل۔ قابیل قاتل تھا اور ہابیل مقتول، ہابیل نے کہا تھا: بھائی میں نہیں مارتا تم کو اور تمہاری مرضی، قتل کردو مجھے۔ قتل ہوجاؤ گے، تو اللہ کے پاس پہنچ جاؤ گے، ویسے بھی پہنچنا ہی ہے ناں! ایک دو دن آگے یا پیچھے، فساد کا علاج فساد سے نہیں ہوتا، میں پہلے بھی اس کو ذکر کرچکا ہوں، فساد کا علاج اصلاح سے ہوتا ہے اسی پر ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین

جھگڑے کے اسباب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صوفیا کے اخلاق میں سے ہے کہ لڑائی جھگڑے کا ترک کردینا اور غصے کو چھوڑ دینا مگر حق کے ساتھ، نرمی اور بردباری کو اختیار کرنا اور اس پر اعتماد کرنا۔

لڑائی سے نفسانیت ظاہر ہوتی ہے:

فرماتے ہیں: وجہ اس کی یہ ہے کہ لڑائی جھگڑے میں آدمی کی نفسانیت ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ لڑائی جھگڑے کے موقع پر دو فریقوں میں سے ہر فریق کا منشا، مدعا اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے پر غالب آجائے، لڑائی میں ہار ماننے کو کسی کا جی نہیں چاہے گا، جب لڑائی ہو اور ایک فریق یہ چاہے کہ میں اس لڑائی میں ہار جاؤں، یہ کبھی کوئی نہیں چاہے گا، بلکہ دونوں فریق یہ چاہیں گے کہ میں غالب آجاؤں۔ تو لڑائی اور جھگڑے میں نفس کو نمایاں ہونے کا موقع ملتا ہے اور اللہ کے نیک بندوں کا یہ طریق ہے کہ جب نفس سر اٹھاتا ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں، نفس جو کہتا ہے یہ اللہ کے بندے اس کے الٹ کرتے ہیں، نفس کہتا ہے کہ میں ہار نہیں مانوں گا، وہ کہتے ہیں کہ

ہم تم کو ہرا کر چھوڑیں گے، جب ایک فریق چپ کر جاتا ہے تو لڑائی مٹ جاتی ہے، ختم ہوجاتی ہے۔

جھگڑے کے اسباب بغض و کینہ:

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''یہ لڑائی اور جھگڑے کا وصف نہیں مٹتا، مگر انہی نفوس سے جو کہ بغض اور کینہ سے پاک ہوں۔'' مطلب یہ ہے کہ لڑائی جھگڑا پیدا ہوتا ہے کینہ سے، دو آدمیوں کے درمیان لڑائی اور جھگڑا اس وقت ہوگا جبکہ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت، ایک دوسرے کی دشمنی اور ایک دوسرے سے کینہ ہو، جن دلوں کے درمیان الفت اور محبت ہو، ان کے درمیان جھگڑا نہیں ہوتا اور یہ چیز پیدا ہوتی ہے یعنی غصے کا آنا، کینہ کا پیدا ہونا منافست کی وجہ سے۔

کینہ کا سبب:

دنیا کی کسی چیز کو اچھا اور نفیس سمجھ کر دو آدمی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک کہتا ہے کہ مجھے ملنی چاہئے، دوسرا کہتا ہے کہ مجھے ملنی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ملے گی، وہ دونوں کو تو نہیں مل سکتی، اب جس کو یہ ملے گی اس کے دل میں تو کبر پیدا ہوگا کہ شاید میں بڑا آدمی بن گیا ہوں کہ یہ چیز مجھے مل گئی ہے اور جس کو نہیں ملی، اس کے دل میں کینہ پیدا ہوگا۔

کینہ کا علاج:

تو معلوم ہوا کہ کینہ دل سے نہیں مٹ سکتا جب تک کہ منافست نہ چھوڑ دی جائے، یعنی دنیا کی چیزوں کے لئے ایک دوسرے سے بڑھنا، ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا، یعنی دل کا تزکیہ ہوجائے گا، جب دنیا کی حقارت اور ذلت کا مضمون دل میں پیدا ہوجائے، آخرت کی عظمت دل میں آجائے اور حق تعالیٰ شانہ کا تعلق پیدا ہوجائے تو کینہ مٹ جائے گا، دلوں کے اندر الفت پیدا ہوجائے گی تو لڑائی

جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

جھگڑا چھوڑنے پر انعام:

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَهُوَ بَاطِلٌ بُنِيَ لَهُ فِيْ رَبَضِ الْجَنَّةِ، وَمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ بُنِيَ لَهُ فِيْ وَسْطِ الْجَنَّةِ.... الخ." (مشکوٰۃ ص:۴۱۲)

ترجمہ:...... "جس شخص نے حق پر ہوتے ہوئے لڑائی جھگڑے کو چھوڑ دیا (دو آدمیوں کے درمیان مقدمہ چل رہا تھا یا جھگڑا چل رہا تھا، بحث چل رہی تھی، ایک ان میں سے حق پر تھا، دوسرا ناحق پر تھا، ایک نے باوجود حق پر ہونے کے جھگڑا چھوڑ دیا کہ چلو بھائی! میں ہارا تم جیتے معاملہ ختم) تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے درمیان میں محل عطا فرمائیں گے، اور جس شخص نے ناحق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دیا اس کو اللہ تعالیٰ جنت کے طرف یعنی کنارے میں محل عطا فرمائیں گے۔ (حالانکہ اس کو تو چھوڑنا ہی چاہئے تھا ناں! جب ناحق پر تھا تو چھوڑنا ہی چاہئے تھا لیکن اللہ تعالیٰ اس کو بھی انعام عطا فرمائیں گے)۔"

مگر یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جب دو آدمی جھگڑ رہے ہوں اور ان کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہو تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر آدمی جانتا ہے کہ میں حق پر ہوں یا حق پر نہیں ہوں؟ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہوتی ہے، بہت سے لوگ باوجود ناحق پر ہونے کے جھگڑا کرتے ہیں، مقدمہ تک کر دیتے ہیں اور مقدمہ میں

جیت بھی جاتے ہیں۔

ناحق مقدمہ بازی کا قصہ:

میرے ایک دوست بتا رہے تھے کہ میرے ایک عزیز تھے، (انہوں نے آتے ہوئے مجھے وہ دوکان بھی بتائی، کہنے لگے کہ یہ جگہ ہے)، انہوں نے چالیس ہزار کی دوکان خریدی تھی، ساٹھ ہزار اس کے اوپر لگادیا، ان کا انتقال ہوگیا تو اس دوکان کے پیچھے ایک چارپائی کی چھوٹی سی جگہ تھی، وہاں ایک ملنگ سا پڑا رہتا تھا، اس کوکسی نے اکسایا، اور شاید پیسے ویسے بھی دیئے ہوں گے کہ تم مقدمہ کردو کہ یہ جگہ میری ہے، اس نے مقدمہ کردیا اور مقدمہ جیت گیا، دوسرے فریق نے اپیل کی، ہائی کورٹ تک پہنچا، ہائی کورٹ میں بھی جیت گیا، جب وہ مرگیا تو اس کا کوئی وارث نہیں تھا، مگراس کے دور کے وارث جاگ اٹھے، وہ مدعی بن گئے، انہوں نے مجھے یہ عجیب و غریب لطیفہ سنایا تھا۔ اور عجیب بات یہ کہ کسی اور کے مکان کا نمبر دے کر کے انہوں نے اس پر مقدمہ کیا، اب جب بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو اس کا نمبر ہی نہیں جس دکان پر جھگڑا چل رہا تھا، تو اس قسم کی بہت ساری صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

ہماری عدالتوں میں جتنے مقدمے چل رہے ہیں، خصوصاً دیوانی مقدمات، ان میں سے اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے ساٹھ فیصد لوگ ایسے ہیں کہ جانتے ہیں کہ میں جھوٹا ہوں، مقدمے کا ایک فریق جانتا ہے کہ میں غلط ہوں۔

حرص و ہواً - جھگڑے کا سبب:

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک صاحب کو قاضی بنادیا گیا، یعنی جج بنادیا گیا، دوست احباب آ کر اس کو مبارک باد دینے لگے، تو ایک دوست جب ان کو مبارک باد دینے کے لئے آئے تو وہ بیٹھا رو رہا تھا، کہنے لگے: یار! ہم تو تمہیں مبارکباد دینے آئے ہیں اور تم رو رہے ہو، رونے کی کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ: رونے

کی بات یہ ہے میں سوچ میں ہوں کہ دو فریق میرے پاس مقدمہ لے کر آتے ہیں، وہ خود صاحب واقعہ ہیں، جو واقعہ گزرا ہوگا وہ ان کے علم میں ہے، ان میں سے ہر فریق یہ بھی جانتا ہے کہ میں کتنا حق پر ہوں، کتنا باطل پر ہوں؟ اس کے باوجود وہ دونوں اپنا تصفیہ نہیں کر سکتے، تو میں ایک اجنبی آدمی ہوں، مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا واقعہ ہے، کیا واقعہ نہیں ہے؟ میں اس قصے کا تصفیہ کیسے کروں گا؟ جب خود صاحبِ واقعہ اس کا تصفیہ نہیں کر سکے تو قاضی اور جج بے چارہ جس کے علم میں کوئی چیز نہیں ہے، وہ اس کی تہہ تک کیسے پہنچے گا؟ حق کو باطل سے کیسے پہچانے گا؟ ظالم اور مظلوم کے درمیان امتیاز کیسے کرے گا؟ اس سوچ نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ وہ کہنے لگے: بس اتنی سی بات ہے! کہنے لگے: ہاں اتنی ہی بات ہے! وہ کہنے لگے کہ: اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ میں تمہارا عقدہ حل کئے دیتا ہوں، بات یہ ہے کہ جیسے تم نے کہا وہ صاحبِ واقعہ ہیں اور صاحبِ واقعہ ہونے کی وجہ سے ان کو پوری کہانی معلوم ہے، لیکن اس کے باوجود اس لئے جھگڑتے ہیں کہ حرص و ہوا اور خواہش نفسانی نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے، ان کو اندھا کر دیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

"لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا." (الاعراف:۱۷۹)

ترجمہ:......"ان کے دل ہیں مگر سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر سنتے نہیں۔"

تو جھگڑا اس لئے کر رہے ہیں کہ ان کی آنکھوں پر حرص و ہوا کی پٹی بندھ گئی ہے اور آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں، دل کی آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں۔ دوست نے کہا کہ: اگر تم حق و انصاف کے لئے عدالت کی کرسی اور مسند پر بیٹھو گے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں بصیرت عطا فرمائیں گے کہ تم حق کو باطل سے پہچانو گے، لیکن اگر تم نے رشوت لینا شروع کر دی تو تمہاری آنکھوں پر بھی حرص و ہوا کی پٹی بندھ جائے گی اور تم بھی

اندھے ہو جاؤ گے، پھر تم حق و باطل کے درمیان شناخت نہیں کر سکو گے۔

اس لئے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

"مَنْ جُعِلَ قَاضِيًا بَيْنَ النَّاسِ فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّيْنٍ." (مشکوٰۃ ص:۳۲۴)

ترجمہ:..... "جس کو قاضی اور جج بنادیا گیا اس کو بغیر چھری کے ذبح کردیا گیا۔"

قضا مشکل کام ہے:

یہ بہت نازک مسئلہ ہے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

"يَا اَبَاذَرٍّ! اِنِّيْ اَرَاكَ ضَعِيْفًا وَاِنِّيْ اُحِبُّ لَكَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِيْ لَا تَأَمَّرَنَّ عَلٰى اِثْنَيْنِ وَلَا تَوَلَّيَنَّ مَالَ يَتِيْمٍ." (مشکوٰۃ ص:۳۲۰)

ترجمہ:..... "اے ابوذر! تم کمزور ہو اور میں تمہارے واسطے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے واسطے پسند کرتا ہوں، دو کام کبھی نہ کرنا، ایک تو یہ کہ دو آدمیوں کے درمیان کبھی امیر نہ بننا اور دوسرے یہ کہ یتیم کا مال کبھی اپنے پاس نہ رکھنا، (اس لئے کہ تم سے بارِ امانت نہیں اٹھ سکے گا اس لئے کہ تم کمزور ہو)۔"

عین حق و انصاف یعنی کانٹے کے تول پر آدمی فیصلہ کرے کہ نہ اِدھر اور نہ اُدھر یہ بہت بڑا کام ہے، چھوٹا کام نہیں ہے اور ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

دورِ حاضر کی قضاۃ:

ہمارے حضرت تھانوی قدس سرہ نے قصہ لکھا ہے کہ انگریز کا زمانہ آیا تھا تو

وہ منصف بنادیا کرتے تھے، کوئی معزز آدمی دیکھا، اس کو منصف بنادیا، تو ایک بالکل ان پڑھ اور جاہل قسم کے آدمی کو منصف بنادیا گیا، اس نے وہاں کے جو لوگ تھے ان سے پوچھا کہ فیصلہ کیسے کرتے ہیں؟ مجھے تو یہ معلوم نہیں، اس کو بتادیا گیا کہ جو پہلے منصف صاحب تھے ناں! جس چیز کو منظور کرنا ہوتا اس کو اِدھر منہ کرکے کہہ دیتے کہ: منظور!، اور جس کو نامنظور کرنا ہوتا وہ اُدھر منہ کرکے کہہ دیتے کہ: نامنظور! کہنے لگا کہ: بس اتنا ہی کام ہے؟ یہ تو بہت آسان کام ہے۔ جو بھی مقدمہ آتا کبھی اِدھر منہ کرکے کہہ دیتا: منظور! اور کبھی اُدھر منہ کرکے کہہ دیتا کہ: نامنظور! تو جن لوگوں کے فیصلے منظور اور نامنظور پر چلتے ہوں ان کی بات نہیں ہے، جس کے بارے میں جو چاہا فیصلہ کردیا۔

عدل وانصاف - ایک امانت:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی تھی میں نے اس کو بڑا پلے باندھا ہے۔ بھائی! بارِ امانت ہم سے نہیں اٹھتا، فیصلہ کرنا بھی ایک امانت ہے، اور یتیم کے مال کی حفاظت کرنا بھی ایک امانت ہے۔ اور ان دو چیزوں کا ذکر اس لئے فرمایا کہ یتیم کے مال میں اگر کوئی گڑبڑ کروگے تو کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں ہوگا، کسی اور نے تمہارے پاس امانت رکھ دی، خدانخواستہ اس میں گڑبڑ کروگے تو مطالبہ کرنے والا موجود ہے، تمہارا گریبان پکڑنے والا موجود ہے، یتیم کے مال میں کوئی گڑبڑ کروگے تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ اب یتیم بے چارہ تو پوچھ بھی نہیں سکتا، اس لئے کہ ناسمجھ ہے۔ اسی طرح اگر دو آدمیوں کے درمیان تم انصاف کرنے بیٹھے اور عدل وانصاف کا فیصلہ نہیں کیا تو وہ دونوں کیا کہہ سکتے ہیں؟

توہین عدالت:

اب ہماری عدالتیں فیصلے کرتی ہیں، جس فریق کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے وہ بے چارا قاضی کو کیا کہہ سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ انگریز کے قانون کے مطابق یہ دستور بھی ہو کہ عدالت کے فیصلہ پر تبصرہ نہیں ہوسکتا، سبحان اللہ! ورنہ توہین عدالت ہے، کیا بات ہے! قرآن اور حدیث کے فیصلے پر تم تنقیدیں کرو اور تمہاری زبان پکڑنے والا کوئی نہیں ہے، اور ملک میں کوئی ایسا قانون بھی نہیں کہ کوئی شخص اگر قرآن و حدیث کے فیصلے پر تنقید کرے تو وہ قانون اسے سزا دے، لیکن عدالت کے فیصلے پر تنقید کرنا اس کے لئے توہین عدالت کا قانون موجود ہے۔

ہمارے ججوں کا معیار:

اب بتایئے صاحب! جج نے فیصلہ کیا اور کھلم کھلا رشوت لے کر فیصلہ کیا ہے پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ عدالت کی کرسی پر ان کو بٹھایا جاتا ہے جن میں عقل، نہ دین، نہ ایمان! غرض ان کو کوئی چیز ظلم سے روکنے والی نہیں ہے، عقل روکنے والی ہے وہ نہیں ہے، ظلم کرنے اور غلط فیصلے کرنے سے دین روکنے والا ہے، وہ نہیں ہے، پرہیزگاری نہیں ہے، تقویٰ نہیں ہے، ورع نہیں ہے، ان لوگوں کے فیصلوں کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے اور ان پر تنقید کرنے کو جرم قرار دیا جاتا ہے۔

زبردستی کی مقدمہ بازی:

خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اکثر و بیشتر جھگڑا کرنے والوں میں یہ احساس موجود ہوتا ہے کہ میں حق پر ہوں یا ناحق پر ہوں؟ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک غریب آدمی کو خواہ مخواہ گھسیٹ لیا جاتا ہے، مدعا علیہ ہے اس کو گھسیٹ لیا ناحق۔ اس لئے ہماری کتابوں میں مدعی کی تعریف یہ کی ہے کہ: ”من اذا ترک تُرک.“ مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان تمیز کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، سب سے مشکل کام قاضی کے لئے

مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان تمیز کرنا ہوتا ہے کہ مدعی کون ہے؟ اور مدعا علیہ کون ہے؟۔ تو مدعی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر وہ اپنی بات کو چھوڑ دے تو کوئی اس کا پیچھا نہ کرے، اچھا بھئی! ٹھیک ہے وہ کہتا ہے کہ میں اپنا مقدمہ واپس لیتا ہوں، ٹھیک ہے، کوئی اعتراض نہیں، لیکن اگر مدعا علیہ کہے کہ میں مقدمہ واپس لیتا ہوں، تو کیا اس کو چھوڑ دیا جائے گا؟ تو بعض فریق مقدمہ بے چارے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ چاہیں، نہ چاہیں ان کو بہرحال اُس مقدمے کو چلانا ہے، کیونکہ وہ مدعی نہیں ہے مدعا علیہ ہے، ان کو مقدمے میں گھسیٹا گیا ہے وہ چھوڑنا بھی چاہے تو نہیں چھوڑ سکتے۔

میں یہ مضمون پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ ایسے ظالم لوگ کبھی نہیں پنپیں گے، جو جانتے ہیں کہ ہم ناحق پر ہیں لیکن اس کے باوجود دعویٰ دائر کیا ہوا ہے، رشوت دے کر جیت بھی جائیں گے، تو اکثر لوگ تو جانتے ہیں، بلکہ ہر فریق مقدمے کا جانتا ہے۔

وکلاءُ کا کمال:

اور ہمارے وکلاءُ! اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے، جب سے یہ انگریزی عدالتیں پیدا ہوئی ہیں اس وقت سے وکلاءُ کا طبقہ بھی پیدا کیا گیا ہے، یہ لازم و ملزوم ہیں، انگریزی عدالت وکیلوں کے بغیر نہیں چل سکتی، کیونکہ قانون دان نہیں ہیں، ان وکیلوں نے ایک اصول قائم کر دیا ہے کہ اپنی جگہ فریق مقدمہ خواہ کتنا ہی سچا ہو، لیکن جب تک وہ جھوٹ کی آمیزش نہ کرے اس وقت تک مقدمے میں کامیاب نہیں ہوسکتا، آپ عدالت میں مقدمہ لے کر جائیں وکیل کرنا ہوگا، وکیل کو آپ صحیح صحیح واقعہ بتادیں، لیکن وہ کہے گا کہ ایسا نہیں، تم یہ کہنا، تم یہ کہنا، تم یہ کہنا.... اگر دس باتیں ان میں سچ ہیں تو ان میں نوے جھوٹ ملا کر ان کو سو پوری کرے گا۔ یعنی جو جھوٹا ہے وہ تو جھوٹا ہے ہی، ہمارے وکلاءُ کا کام ہے کہ عدالت میں سچے کو جھوٹا بنانا اور جھوٹے کو سچا بنانا، اور لطف

کی بات یہ ہے کہ بیان کے شروع میں حلف لیا جاتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ! میں جو کچھ کہوں گا حق اور صحیح بات کہوں گا! قسم کھا کر جھوٹ بلوایا جاتا ہے۔

حضرت عارفیؒ کی وکالت:

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہ نے وکالت پڑھی تھی، حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحب، حضرت تھانوی قدس سرہ سے پہلے ہی سے تعلق تھا مگر بیعت نہیں ہوئے تھے، حضرت تھانویؒ کو خط لکھا کہ حضرت میں وکالت کا امتحان دینا چاہتا ہوں دعا فرمایئے کامیابی کی، حضرتؒ نے لکھا کہ دعا تو کرواتے ہو یہ بھی معلوم کرلیا کہ یہ جائز بھی ہے کہ نہیں؟ ڈاکٹر صاحبؒ نے جواب میں لکھا کہ حضرت جو وکیل جھوٹ نہ بولے، صحیح صحیح مقدمہ لے، جھوٹ اس میں نہ بولے اور کوئی غلط بات نہ کرے تو اس میں ناجائز ہونے کی کیا وجہ ہے؟ حضرتؒ نے جواب میں لکھا کہ: جس قانون کے مطابق یہ فیصلہ کروانا چاہتا ہے اگر وہ قانون ہی غلط ہو تو پھر اس کی کاروائی کیسے صحیح ہوگی؟ اس کا جواب ان کے پاس نہیں تھا، خاموش رہے، لیکن بات دل میں نہیں اُتری، اس وقت حضرتؒ سے بیعت نہیں تھے، خاموش رہے۔ قانون پاس کرلیا بعد میں بیعت ہوگئے، اپنی وکالت شروع کردی، حضرت ڈاکٹر صاحبؒ سے میں نے خود سنا ہے فرماتے ہیں کہ: غلط مقدمہ میں نہیں لیتا تھا، سچے میرے پاس آتے نہیں تھے، بھلا ایک داڑھی والا مولوی بیٹھا ہے وکیل بن کر، اس کے پاس کون جائے گا؟ اس لئے میں سارا دن بیٹھا رہتا تھا، میرے پاس بہت کم لوگ آتے تھے۔

ترکِ وکالت پر خلافت:

میرا کام چلا نہیں، اس لئے میں نے طب کا کام سیکھ لیا اور میں نے آہستہ آہستہ وکالت کو چھوڑ دیا، اور جس دن مکمل طور پر وکالت چھوڑ کر مطب کرنے کا فیصلہ کرلیا، اس دن میں نے حضرتؒ کو خط لکھا کہ حضرت! وہ میرا کام چلتا نہیں تھا، جھوٹ

میں بولتا نہیں تھا اور سچ وہاں عدالت میں چلتا نہیں، اس لئے میں نے وہ پیشہ ترک کردیا اور یہ پیشہ اختیار کرلیا ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک سال پہلے حضرت تھانویؒ نے چند اپنے مریدوں کے نام کا اشتہار دیا تھا کہ ان صاحبوں میں مجھے بعض چیزوں کا انتظار ہے، اگر وہ چیزیں پیدا ہوجائیں تو میں ان کو مجاز بنادوں گا، اجازت دے دوں گا، خلیفہ بنادوں گا، اور ان میں میرا نام بھی تھا، ساتھ ہی حضرتؒ نے لکھ دیا تھا کہ کسی کو یہ پوچھنے کا حق نہیں ہوگا کہ وہ کیا بات ہے؟ خود بخود وہ چیزیں پیدا ہوجائیں، مجھ سے پوچھی نہ جائیں، جب میں نے مطب شروع کیا، وکالت چھوڑ دی اور حضرتؒ کو اطلاع دی تو جواب میں حضرتؒ نے فرمایا کہ: ماشاءُ اللہ مجھے تمہارے بارے میں اسی چیز کا انتظار تھا، اللہ تعالیٰ مبارک کرے، تمہیں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اجازت دیتا ہوں۔ خلافت مل گئی، وکالت چھوڑی خلافت مل گئی۔ تو گفتگو میں اس میں کر رہا تھا کہ اکثر لوگ تو جانتے ہیں کہ میں حق پر ہوں یا باطل پر ہوں؟ یا کتنا حق پر ہوں کتنا باطل پر ہوں؟ یا کتنا سچا ہوں کتنا جھوٹا ہوں؟

نفس و شیطان کی تاویلیں:

لیکن ایک مرحلہ اس کے بعد آتا ہے کہ نفس اور شیطان تاویلیں کرکر کے جس طرح کہ ہمارے وکیل سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بناتے ہیں شیطان اور نفس یہ بڑے وکیل ہیں، یہ وکیلوں سے زیادہ دلائل جانتے ہیں، یہ بعض دفعہ ایسی تاویلیں کرتے ہیں کہ آدمی کو سچ اور جھوٹ کے درمیان امتیاز ہی نہیں رہتا اور ہوتا یہ ہے کہ جھوٹا ہے لیکن اپنے آپ کو سچا سمجھتا ہے، چنانچہ دونوں فریق اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں۔ عدالت میں مقدمہ لے کر جاتے ہیں، اپنے آپ کو دونوں حق پر سمجھتے ہیں اس لئے کہ شیطان نے تاویلیں کرکے، نفس نے تاویلیں کرکے حق کو باطل اور باطل کو حق بنادیا، یہ حالت بڑی خطرناک ہے بھائی! اللہ تعالیٰ معاف کرے اور آپ دیکھیں گے

بہت سے جھگڑا کرنے والوں میں، مقدمہ کرنے والوں میں اس قسم کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔

خطرناک عادت:

ایک فریق سے آپ پوچھیں وہ اپنے آپ کو حق پر بتائے گا، دوسرے فریق سے پوچھیں وہ اپنے آپ کو حق پر بتائے گا، ان مقدموں کے علاوہ رشتے داروں کے درمیان، عزیزوں کے درمیان، دوستوں کے درمیان جو رنجشیں ہوجاتی ہیں، لڑائیاں ہوجاتی ہیں ان میں ہر ایک فریق اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے، اس سے بات کیجئے تو وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھے گا، اپنے آپ کو مظلوم اور دوسرے کو ظالم بتائے گا، اور دوسرے سے پوچھئے تو وہ اپنے آپ کو مظلوم اور دوسرے کو ظالم ثابت کرے گا، کوئی بھی قصور نہیں مانے گا، یہ عادت بڑی خطرناک ہے، اس لئے کہ جب آدمی اپنا قصور ہی نہ سمجھے تو پھر اس سے رجوع کیوں کرے گا؟ اور دو آدمیوں کے درمیان صلح کیسے ہوگی؟ جب ان میں سے ہر ایک آدمی اپنے کو مظلوم اور دوسرے کو ظالم سمجھتا ہے۔

اسلام میں جھگڑا چھوڑنے کی حوصلہ افزائی:

واللہ اعلم! یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دیتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ جنت کے درمیان میں محل عطا فرمائیں گے، اور جو باطل پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے کنارے میں محل عطا فرمائیں گے، تاکہ ہر ایک جھگڑنے والے کو جھگڑا چھوڑنے کی حوصلہ افزائی ہو کہ اگر حق پر ہوں تب بھی نفع میں ہوں، اور باطل پر ہوں تب بھی نفع میں ہوں، دو آدمیوں کے درمیان جب جھگڑا پیدا ہوگا تو اس کا منشا ہے کینہ اور منافست، ایک دوسرے کا کینہ اور ایک دوسرے سے منافست کرنا، یعنی چھینا جھپٹی جس کو کہتے ہیں، دو آدمی ایک چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک آدمی

آگے بڑھ کر چھین لیتا ہے، دوسرے کو نہیں ملتی اور اس کا علاج کیا ہوگا؟

جھگڑے کا علاج بالضد:

اس کا علاج بھی دو چیزیں ہوئیں، علاج بالضد ہے ناں! اس جھگڑے کا علاج دو چیزیں ہوگئیں۔ ایک کینہ کی جگہ الفت کا پیدا ہونا، دوسرے منافست کی جگہ زہد کا پیدا ہوجانا، جب کینہ کی جگہ الفت پیدا ہوجائے گی تو جن دلوں کے درمیان الفت ہوتی ہے ان میں جھگڑا نہیں ہوتا، جوڑ پیدا ہوگیا ناں! جھگڑا ختم، کینہ نہیں رہا، ایک دوسرے سے نفرت نہیں رہی، ایک دوسرے سے بغض نہیں رہا۔

مسلمانوں کے تین فریق:

قرآن کریم میں حق تعالیٰ شانہ نے سورۂ حشر میں مسلمانوں کے تین فریق ذکر کئے ہیں، اور پھر مالِ فئے کا تذکرہ آرہا ہے، ان کا ذکر کرتے ہوئے حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

مہاجرین کی اولوالعزمی:

”لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ.“

(الحشر:۸)

ترجمہ:......”(یہ مالِ فئے) حق ہے ان فقرائے مہاجرین کا جن کو ان کے گھروں سے اور مالوں سے نکال دیا گیا محض اس خاطر کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اس کے فضل کے متلاشی تھے اور یہ لوگ مددگار ہیں اللہ کے اور اس کے رسول کے اور یہ لوگ ہیں سچے۔“

جتنے مہاجرین مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے، جن کو ان کے گھروں سے اور ان کے مالوں سے نکالا گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے فتویٰ دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رضامندی کے متلاشی ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے مددگار ہیں، اللہ اکبر! اور آخر میں فرمایا یہ سچے ہیں۔

اب مجھے بتاؤ! جن کو قرآن کریم سچا کہتا ہے تو جو ان کو جھوٹا کہے اس سے بڑا جھوٹا کون ہوگا؟ سوچو! یہ تھے مہاجرین جو اپنے گھروں میں کھاتے پیتے تھے، اللہ تعالیٰ کا دیا سب کچھ تھا لیکن فقراً بن گئے، صرف اس لئے کہ ان کو ہجرت کر کے آنا پڑا اور اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑنا پڑا، کس لئے؟ اس لئے نہیں کہ یہاں آ کر ملازمتیں ملیں گی، یہاں آ کر جائدادوں پر قابض ہو جائیں گے، نہیں! صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خوشنودی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد، یہ ان کا مطمح نظر تھا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ انہی کے بارہ میں فرمایا گیا: "اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ." (یہ ہیں سچے)۔ سن رہے ہو سچے مہاجر کس کو کہتے ہیں؟ سچے مہاجر بنو بھائی! سچے مہاجر کا بڑا اعزاز ہے، بہت بڑا اعزاز ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

انصار کی وسعت قلبی:

مسلمانوں کا دوسرا فریق انصار کا ہے، جس کی عظمت کو قرآن کریم میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

"وَالَّذِیْنَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ."

(الحشر:۹)

ترجمہ:......"اور وہ لوگ جو ٹھکانہ پکڑے ہوئے تھے

دارالاسلام اور دارالایمان میں ان سے پہلے، یہاں کے پہلے
سے باشندے ہیں انہوں نے دارالاسلام میں ٹھکانہ پکڑا ہوا ہے
اور ایمان میں اپنا گھر کیا ہوا ہے جو ان کے پاس ہجرت کر کے
آتا ہے وہ اس سے محبت کرتے ہیں (بغض نہیں)، اور ان
مہاجرین کو جو کچھ دیا جائے اس کی وجہ سے ان کو دل میں تنگی پیدا
نہیں ہوتی (کہ ان کو کیوں دے دیا گیا؟ ان کا کیا حق تھا؟
ہمیں ملنا چاہئے تھا) اور ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو اپنے اوپر
اگرچہ خود بھوکے بیٹھے ہیں، اور جس کو بچادیا جائے اپنے نفس کی
حرص سے وہ لوگ ہیں بھلائی پانے والے کامیاب۔"

وطنیت کی بنا پر تقسیم شیطانی نعرہ ہے:

بھئی یہ باتیں تو ہم نے پہلے بھی عقلاً سے سنی تھیں اور سنتے ہی چلے آئے تھے کہ ایک چیز آپ کو وراثت میں مل گئی یا آپ نے اس کو خرید لیا یا آپ نے اس کو پیدا کرلیا، کسی طرح بنالیا وہ چیز آپ کی ملکیت ہے، یہ تو ہم سنتے چلے آئے ہیں عقلاً سے، لیکن یہ بات کبھی نہیں سنی تھی کہ چونکہ میں سندھی ہوں لہٰذا سندھ سارا میرا ہے، میں پنجابی ہوں لہٰذا پنجاب سارا میرا ہے، میں بلوچی ہوں لہٰذا بلوچستان سارا میرا ہے اور اب سندھ میں کسی غیر سندھی کے لئے، پنجاب میں کسی غیر پنجابی کے لئے، بلوچستان میں کسی غیر بلوچی کے لئے کوئی گنجائش نہیں! یہ بات تو ہم نے کبھی عقلاً سے نہیں سنی تھی۔ یہ وطنیت کی بنا پر تقسیم سندھی اور غیر سندھی، پنجابی اور غیر پنجابی یہ جاہلیت کا وہ نعرہ ہے جو شیطان نے مسلمانوں کے درمیان میں تفرقہ ڈالنے کے لئے ایجاد کیا ہے۔

یہ مسلمانوں کا شعار نہیں:

کسی مہاجر نے کسی سندھی کی جائیداد پر قبضہ کرلیا ہے، میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا اس مہاجر کے خلاف اور آپ سب کو بھی اس کا ساتھ دینا چاہئے، لیکن اگر کسی سندھی کی جائیداد پر قبضہ نہیں کیا مہاجر نے تو جھگڑا کیا ہے؟ مجھے بتاؤ! یہ شیطان نے نعرے لگا دیئے ہیں، "وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا." ان کو جو کچھ دیا گیا اپنے سینے میں کوئی حرج نہیں پاتے تھے، تنگی نہیں پاتے تھے اور ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو اپنے اوپر اگرچہ خود بھوکے بیٹھے ہیں۔

یہ ہیں انصار اور وہ تھے مہاجر اور جس شخص کو بچادیا جائے اپنے نفس کی حرص سے وہ لوگ ہیں بھلائی پانے والے کامیاب۔

رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین مکہ کے ساتھ جب یہاں مدینہ طیبہ تشریف لائے تھے تو زمینیں مدینے والوں کی تھیں، مکان مدینے والوں کے تھے، متروکہ مکان نہیں تھے، متروکہ جائدادیں نہیں تھیں، ان مدینہ والوں کی ملکیت تھیں، یہاں سے کوئی ہندو چھوڑ کر نہیں گئے تھے، اُن کے مکان تھے، اُن کی زمینیں تھیں، اُن کی جائدادیں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور تشریف لاکر کے ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی بنادیا اور اس کی جائداد دونوں کے درمیان تقسیم کردی، کبھی سنا ہے یہ؟ ایثار کا یہ نقشہ کبھی سننے میں آیا؟ انصاری کی جائداد ہے، اس کا مکان ہے، مہاجر کو اس کا بھائی بنادیا اور آدھی جائداد تقسیم کرکے مہاجر کو دلوادی، آدھا مکان اس کو دے دیا، ۷ھ میں خیبر فتح ہوا، چھ سال یہ ہی قصہ رہا، جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارِ مدینہ کو بلایا اور بلواکر فرمایا کہ: ہم نے تمہاری جائدادیں مہاجروں کو تقسیم کردی تھی اور ان کو تمہارے برابر کا شریک بنادیا تھا، اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتوحات عطا فرمائیں ہیں، خیبر کی زمینیں مل گئی ہیں، میرا یہ جی چاہے گا

کہ مدینے کی زمینیں تمہیں واپس کردی جائیں اور خیبر کی زمینوں میں سے تمہیں حصہ نہ دیا جائے، مہاجروں کو دے دیا جائے، یہاں بھی ترجیح مہاجروں کو ہوئی ناں؟ یعنی اس میں بھی برابر کے دونوں ہیں اور حق دونوں کا بنتا ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا یہ جی چاہتا ہے کہ تمہیں مدینے کی وہ زمینیں لوٹادی جائیں جوتم نے مہاجروں کو دے رکھی ہیں اور خیبر کی زمینیں مہاجروں کو دے دی جائیں، تمہیں نہ دی جائیں، تمہارا کیا خیال ہے؟ انصار کا جواب یہ تھا کہ: یا رسول اللہ! خیبر کی زمینیں بھی مہاجروں کو دے دی جائیں اور مدینے کی جو جائدادیں ہیں وہ ہم ان کو دے چکے ہیں وہ بھی ان کے پاس رہنے دی جائیں۔ یہ ہے "وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ....." کہ دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اپنی ذات پر۔

مسلمانوں کا تیسرا فریق:

اور تیسرا فریق ذکر کیا ہے اللہ تعالیٰ نے:

"وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا ......" (الحشر:۱۰)

ترجمہ:......"اور وہ لوگ جو آئے ان کے بعد، (کن کے بعد؟ مہاجرین و انصار کے بعد اور اس فریق میں بشرطیکہ ہم اس شرط کو پورا کریں قیامت تک آنے والے سب شریک ہیں اس تیسرے فریق میں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو سارے مسلمانوں کو شریک کردیا ہے۔ پہلے ایک طبقہ تھا مہاجرین کا، دوسرا طبقہ تھا انصار کا اور تیسرے طبقے کا ذکر کیا ہے اور وہ لوگ جو آئے ان کے بعد) یہ کہتے ہوئے کہ: اے ہمارے پروردگار! ہماری بخشش

فرما اور ہمارے جو بھائی ہم سے پہلے ہوچکے ہیں ایمان کے ساتھ، ان کی بھی بخشش فرما اور اے اللہ! نہ ڈال کینہ ہمارے دلوں میں کسی ایمان والے کی جانب سے (کسی مسلمان کی جانب سے ہمارے دل میں کینہ نہ ڈال، کینہ نہیں ہوگا تو لڑائی بھی نہیں ہوگی بھائی!)۔''

بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

"صبر"

تمام مسائل کا علاج ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

الف:......"عَنْ شُرَحْبِیْلٍ اَنَّ اَبَا الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کَانَ اِذَا رَاٰی جَنَازَۃً قَالَ: اُغْدُوْا فَاِنَّا رَائِحُوْنَ، اَوْ رُوْحُوْا فَاِنَّا غَادُوْنَ، مَوْعِظَۃٌ بَلِیْغَۃٌ وَغَفْلَۃٌ سَرِیْعَۃٌ کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا، یَذْھَبُ الْاَوَّلُ فَالْاَوَّلُ وَیَبْقٰی الْاٰخِرُ لَا حِلْمَ لَہٗ." (حلیۃ الاولیأ: ج:۱ ص:۲۱۷)

ب:......"عَنْ عَوْنِ بْنِ عَبْدِاللہِ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: مَنْ یَّتَفَقَّدْ یَفْقِدْ، وَمَنْ لَّا یُعِدُّ الصَّبْرَ لِفَوَاجِعِ الْاُمُوْرِ یَعْجِزُ، اِنْ قَارَضْتَ النَّاسَ قَارَضُوْکَ، وَاِنْ تَرَکْتَھُمْ لَمْ یَتْرُکُوْکَ. قَالَ: فَمَا تَأْمُرُنِیْ؟ قَالَ: اِقْرِضْ مِنْ عِرْضِکَ لِیَوْمِ فَقْرِکَ."

(حلیۃ الاولیأ ج:۱ ص:۲۱۸)

ترجمہ:......"شرحبیل رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت ابودرداؔ رضی اللہ عنہ جب جنازہ دیکھتے تھے تو فرماتے تھے

کہ تم صبح کو جاؤ، ہم شام کو آجائیں گے، یا تم شام کو جاؤ، ہم صبح آئیں گے، بڑی مؤثر نصیحت ہے اور بڑی تیز غفلت ہے، موت نصیحت کے لئے کافی ہے، لوگ وقفہ وقفہ سے جارہے ہیں اور پیچھے رہ جاتے ہیں وہ لوگ جن کے پاس نہ عقل ہے نہ حوصلہ۔''

ترجمہ:......''حضرت عون بن عبداللہ سے روایت ہے کہ حضرت ابودرداؔ رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: جو شخص راحت کو تلاش کرتا پھرے گا، وہ گم پائے گا، اور جو صبر کو دردناک امور کے لئے تیار نہیں کرتا، وہ عاجز آجائے گا، تو اگر لوگوں سے مقابلہ کرے تو وہ لوگ تجھے کاٹ ڈالیں گے، اور اگر تو ان کو چھوڑ دے تو وہ تجھے نہیں چھوڑیں گے۔ انہوں نے کہا کہ: آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: اپنی عزت کا ایک حصہ کاٹ کر ان کو دے دو، اپنے فقر کے دن کے لئے۔''

حضرت ابودرداءؓ کے مواعظ:

یہ حضرت ابودرداؔ رضی اللہ عنہ کے مواعظ ہیں کہ جب وہ کسی جنازہ کو دیکھتے تو جنازہ کو اور میت کو مخاطب کرکے کہتے تھے کہ: تم صبح جارہے ہو، ہم تمہارے پیچھے پیچھے شام کو آرہے ہیں، یا تم شام کو جارہے ہو، ہم صبح کو پہنچ رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ زیادہ فاصلہ نہیں ہے، مرنے والے کے درمیان اور پیچھے رہ جانے والے کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے، بس صبح شام کا فرق ہے، صبح گئے یا شام کو گئے، ایک دن یا اس کا بھی کچھ حصہ پیچھے رہنے والوں کو مزید پورا کرنا ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرماتے تھے کہ موت بڑی مؤثر نصیحت ہے، کسی جنازے کو دیکھنا، اس سے جتنی نصیحت حاصل ہوتی ہے، اتنی کسی چیز سے حاصل نہیں ہوتی، مگر عجیب بات ہے کہ غفلت بھی بہت جلدی

طاری ہوجاتی ہے۔

مجذوبؒ کی نصیحت:

بقول ہمارے حضرت مجذوبؒ کے کہ:

دفن خود صبح کیے زیر زمیں
تجھے مرنے کا نہیں پھر بھی یقیں

کچھ تو عبرت چاہیے، نفس لعین اپنے ہاتھ سے دفن کرتا ہے، لحد میں اتارا، بہت سارے لوگوں کو مرتے دیکھا، ان کے جنازے کے ساتھ گئے مگر ہمیں عبرت نہ ہوئی، بھول گئے۔

ایک بزرگ کی نصیحت:

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جب تو قبر کی طرف کسی جنازہ کو اٹھاکے لے جائے تو پھر یوں سمجھا کر کہ اب کسی کو اٹھاکر لے جارہا ہوں، اس کے بعد میرا نمبر ہے، لوگ مجھے اٹھاکر لے جائیں گے۔

موت سب سے بڑا واعظ ہے:

پھر حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ موت کافی واعظ ونصیحت کرنے والا ہے، اس سے بڑا کوئی واعظ نہیں، کیونکہ واعظ صاحب یہی کہیں گے کہ مرجاؤگے، تم کو حساب کتاب دینا ہوگا، اس غریب کے تو الفاظ ہی الفاظ ہیں، لیکن موت تو سامنے نقشہ کھینچ دیتی ہے کہ ایک جنازے کو دیکھ کر پورا منظر ہمارے سامنے آجاتا ہے، موت مشاہدہ کروادیتی ہے، تو اس سے بڑھ کر واعظ کون ہوسکتا ہے؟ اور جس کو اس بڑے واعظ سے بھی نصیحت نہ ہوئی، وہ اس چھوٹے واعظ سے نصیحت کیسے حاصل کرسکتا ہے؟

عقل، فہم، سوچ اور تحمل کا فقدان:

شیخ فرماتے ہیں کہ لوگ یکے بعد دیگرے، ایک کے پیچھے دوسرا، دوسرے کے پیچھے تیسرا، ایک لائن لگی ہوئی ہے اور پیچھے وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کے پاس نہ عقل، نہ فہم، نہ سوچ، نہ حوصلہ و تحمل، مرنے والا مرگیا، پیچھے بھائی جائیداد پر لڑ رہے ہیں، باپ کے جانے کے بعد اولاد اس کی وراثت میں لڑ رہی ہے، اتنا نہیں سوچتے کہ جس نے اس مال کو بڑی محنت سے جمع کیا، رات کی نیند اور دن کی راحت اس کے لئے قربان کی، سختی اور گرمی برداشت کی، اس مال نے اس کے ساتھ وفا نہ کی، ہمارے ساتھ کیا کرے گا؟ لیکن لڑ رہے ہیں اور لڑتے بھی اس چیز پر ہیں جس کی واقعتاً کوئی قیمت نہیں ہے، بے قیمت چیز پر لڑ رہے ہیں، اس لئے کہ اگر کسی کو تھوڑی ملی جب بھی، زیادہ ملی جب بھی، گزر تو اس کی ہو ہی جائے گی، الحمدللہ! وقت گزر جائے گا، لوگ پہلے اپنے لئے کماتے ہیں، جب بوڑھے ہوجاتے ہیں تو پھر اولاد کا خیال آتا ہے کہ ان کے لئے پیچھے چھوڑ کر جائیں، خلاصہ یہ ہے کہ موت سے نصیحت حاصل کرنی چاہئے۔

حضرت عزرائیلؑ کی اطلاع کا انداز:

ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ: ایک شخص کی حضرت عزرائیل علیہ السلام کے ساتھ دوستی ہوگئی تھی، تو اس سے کہنے لگے کہ دوستی کا حق بھی ادا کرو گے؟ حضرت عزرائیل علیہ السلام کہنے لگے: فرمایئے! کہنے لگے کہ: جانے کا وقت آئے تو مجھے پہلے ہی بتادینا، تاکہ میں کچھ تیاری کرلوں۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام کہنے لگے کہ: بہت اچھا! کچھ مدت کے بعد حضرت عزرائیل علیہ السلام کہنے لگے کہ: چلئے! پوچھنے لگے کہ: وقت ہوگیا؟ فرمایا کہ: ہاں وقت ہوگیا! کہنے لگے کہ: یار میں نے کہا تھا کہ مجھے پہلے بتادینا! فرمایا کہ: میں نے بتایا تو تھا، لیکن آپ نے میری زبان

سمجھی نہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ ایک دن میں اُس طرف آیا تھا، اور ایک دن میں اِس طرف آیا تھا۔ کہنے لگے کہ: ہاں یہ تو معلوم ہے! فرمایا کہ: تجھے بتانے کے لئے آیا تھا کہ تیرا وقت قریب آگیا ہے، تو تیاری کرلے، ہم اسی زبان میں بتایا کرتے ہیں، ہم نے بتادیا تھا، لیکن تم نے سمجھا نہیں۔

جو باپ کی موت سے نصیحت نہ پکڑے:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، کہنے لگا کہ حضرت جی! مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ: برخوردار! تیرے والد زندہ ہیں؟ اس آدمی نے کہا: نہیں! فرمایا: میری مجلس سے اٹھ جا، جس کو باپ کی موت نے نصیحت نہیں کی، اس کو عمر بن عبدالعزیز کیا نصیحت کرسکتا ہے؟ باپ کے مرنے پر جس کو عبرت نہیں ملی، اس کو اور کیا نصیحت ہوسکتی ہے؟

ہماری حماقت کی شکلیں:

کسی کے مرنے پر روتے پیٹتے بھی ہیں، اپنے اپنے رنگ میں افسوس بھی کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ اچھا خاصا آدمی تھا، اس کے کھانے پینے کے دن تھے، چلا گیا۔ کیا آگے جاکر وہ بھوکا رہے گا؟ کھانے پینے کے دن یہی تھے؟ اگلے جہاں کا اعتماد نہیں ہے؟ مؤمن کے کھانے پینے کی جگہ یہ نہیں، کھانے پینے کی جگہ تو آگے ہے۔

جس نے پیدا کیا وہی کفالت بھی کرے گا:

کوئی کہتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ گیا ہے، کیا پہلے بچوں کی خدائی اس پر تھی؟ جس مالک نے بچوں کو پیدا کیا ہے، وہ ان کی تربیت بھی کرے گا، میں نے اور آپ نے سینکڑوں مثالیں اس کی دیکھی ہوں گی کہ والدین موجود ہیں اور اولاد نالائق ہے، اور میں نے اور آپ نے بہت ساری مثالیں اس کی بھی دیکھی ہوں گی کہ باپ کی شکل اور ماں کی شکل دیکھنا نصیب نہیں ہوئی، لیکن یہ یتیم بچے ایسے لائق و فائق

ہوئے کہ کیا کہنے! ظاہری تربیت اور باطنی تربیت، جسمانی تربیت بھی، روحانی تربیت بھی ماں باپ پر منحصر نہیں۔

والدین کی حیثیت سرکاری ملازم کی ہے:

والدین کو اللہ تعالیٰ نے ذریعہ ضرورت بنایا ہے اور اس اعتبار سے والدین، اولاد کے سب سے بڑے محسن ہیں، لیکن والدین کی حیثیت سرکاری ملازم کی ہے اور سرکار کو حق پہنچتا ہے کہ اپنے ملازم بدل دے، والدین کے بجائے کسی اور کو ان کی تربیت پر مقرر کردے۔

یتیم سے محبت کا راز!

یہی وجہ ہے کہ جس بچے کے والدین انتقال کرجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ والدین کی شفقت و محبت کو لوگوں کے دلوں میں تقسیم کردیتا ہے، فطری طور پر ہر شخص کی یتیم بچے کے ساتھ شفقت، محبت اور رحمت ہوتی ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی ترغیب دلائی ہے، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

"مَنْ مَسَحَ رَأْسَ يَتِيمٍ لَمْ يَمْسَحْهُ اِلَّا لِلّٰهِ كَانَ لَهُ بِكُلِّ شَعْرَةٍ يَمُرُّ عَلَيْهَا يَدَهُ حَسَنَاتٍ....."

(مشکوٰۃ ص:۴۲۳)

ترجمہ:....."جو شخص اللہ کی رضا کے لئے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے اس کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آئیں گے، اتنی ہی نیکیاں ملیں گی۔"

دوسری روایت میں ہے:

"اِنَّ رَجُلًا شَكَا اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَسْوَةَ قَلْبِهٖ، قَالَ: اِمْسَحْ رَأْسَ الْيَتِيمِ وَاَطْعِمِ الْمِسْكِيْنَ."

(مشکوٰۃ ص:۴۲۵)

ترجمہ:...... ''ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، کہا: یا رسول اللہ! کچھ دل میں سختی معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا: یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کر اور مسکین کو کھانا کھلایا کر، دل کی سختی دور ہوجائے گی۔''

یتیموں سے محبت کی ترغیب:

یتیموں کے ساتھ رحمت کرنا، پیار کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دلائی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ والدین کی جگہ اب دوسرے لوگوں کو ان کی تعلیم و تربیت پر مقرر کردیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا. اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللهِ.'' (الدہر:)

ترجمہ:...... ''اور کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر (اس کھانے کی یا اللہ تعالیٰ کی) مسکین کو، یتیم کو اور قیدی کو محض اللہ کی رضا کے لئے۔''

مسکین اپنی مسکنت کی وجہ سے کھانا کھلانے کا مستحق ہے۔

مسکین سکون سے ماخوذ ہے:

علماً فرماتے ہیں کہ مسکین کا لفظ ''سکون'' سے لیا گیا ہے کہ جب آدمی کے پاس مال ہوتا ہے تو ایسا ہوتا ہے جیسے بدن میں طاقت، بدن میں طاقت ہوتی ہے تو حرکت کرتا ہے، چلتا پھرتا ہے اور پہلوانی کرتا ہے لیکن جب طاقت نہیں ہوتی تو بستر سے لگا ہوا ہوتا ہے، حرکت نہیں کرسکتا، اسی طرح جب اس کے پاس مال ہوتا ہے تو ہواؤں میں اڑتا ہے اور مال نہیں ہوتا تو کہیں آجا بھی نہیں سکتا۔ تو مسکنت بھی ایک قسم

کا سکون پیدا کر دیتی ہے، تو ان مسکینوں کو مسکینی کی وجہ سے کھانا کھلانا، یتیم کو اس کی یتیمی کی وجہ سے کھانا کھلانا، یعنی یتیم کے حال پر شفقت کرنا اور قیدی کو کھانا کھلانا اسی وجہ سے ہے، اس لئے کہ جیل کی چاردیواری میں ان کو دنیا سے کاٹ دیا گیا۔ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام جیل سے رہا ہوئے تھے تو کہتے ہیں کہ جیل کے دروازے کے اوپر لکھ کر آئے تھے کہ تو زندوں کی قبر ہے۔

اپنی اور بچوں کی دنیا کی فکر ہے، مگر آخرت کی پرواہ نہیں:

تو عرض کر رہا تھا کہ والدین تو سرکاری ملازم ہیں، آپ کی تربیت ان کے اختیار میں نہیں، تربیت کے اسباب اللہ تعالیٰ پیدا فرمادیتے ہیں، یہ تو ملازم ہیں، مویشی کو چارہ ڈالنے والے۔ اور مالک کو حق ہے کہ ایک ملازم کی جگہ دوسرا ملازم رکھے، تو ہم لوگ پہلے تو اپنی فکر کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کیسے گزرے گی؟ اور خود بوڑھے ہوجاتے ہیں تو اپنی زندگی سے مایوس ہوجاتے ہیں، لیکن اولاد کی فکر ستائے رکھتی ہے، کسی وقت بھی چین نہیں ہے، کسی وقت بھی سکون نصیب نہ ہوا اور جو چیز فکر کی تھی، اس کے لئے ہم کبھی پریشان نہیں ہوئے، جو آتا ہے کہتا ہے کہ پریشان ہوں، بہت پریشان ہوں۔ کیا ہوا بھائی؟ ملازمت نہیں ہے، ملازمت ختم ہوگئی ہے، کوئی کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں، کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے، لیکن ساری پریشانیاں اپنی دنیاوی ماحول کی ذکر کرتے ہیں، مرنے کے بعد قبر میں بھی کوئی پریشانی ہوگی کہ نہیں؟ تذکرہ ہی نہیں کرتے کہ مجھے یہ پریشانی لاحق ہے کہ مرنے کے بعد میرا کیا حال ہوگا؟

غفلت کا غلبہ:

اس کو کہتے ہیں غفلت! ہم پر بہت تیزی سے غفلت طاری ہوجاتی ہے میت کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے آئے اور فاتحہ پڑھ لی بس، سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے، وہی لڑائی، وہی جھگڑا، وہی دھوکا، وہی دغابازی، وہی دنیا کے دھندے، وہی

آخرت سے نفرت، وہی اللہ تعالیٰ سے نافرمانی، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تم لوگ جانتے ہو کہ (میرے گھر میں تو ٹی وی نہیں ہے) میت ہوجانے پر کتنے دن ٹی وی بند رکھتے ہو؟ غالباً ''تیجے'' تک تو بند رکھتے ہوں گے، میت کا تیجا ہوگیا، تمہارا ٹی وی چالو ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون!

موت سے عبرت ہو تو زندگیاں بن جائیں

اے کاش! کہ مرنے والوں سے زندوں کو عبرت ہوجاتی تو زندگیاں بن جاتیں، وہ بے چارہ جانے والا تو لوٹ کر نہیں آتا اور ہم جانے والوں سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔

مرنے والوں کی تمنا:

جانے والوں سے اگر کہا جائے تم کو واپس لوٹاتے ہیں لیکن دنیا میں تم کو کیا چیز چاہئے؟ وہ کہے گا کہ کچھ نہیں چاہئے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں گا، دو چار لمحات مجھے اور مل جائیں گے تو میں توبہ و استغفار کرلوں گا، قرآن کریم میں ہے قیامت کے دن کفار بھی کہیں گے کہ:

''فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبُ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ..... وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ.'' (الانعام:۲۷، ۲۸)

ترجمہ:...... ''کاش! ہم کو واپس لوٹادے اور اس کے بعد ہم کسی قسم کی کوتاہی نہیں کریں گے .....اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں، اگر ان کو واپس کردیا جائے تو یہ پھر وہی حرکتیں کریں گے جو کرتے آئے ہیں۔''

اب تو تلچھٹ باقی ہے:

یہاں کے جہان کی آب و ہوا ایسی آلودہ ہے جیسے کہتے ہیں کہ کراچی میں بہت آلودگی ہے، یہاں کی آب و ہوا غفلت سے آلودہ ہے، یہاں آئیں گے، پھر بھول جائیں گے اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"لَتُنْتَقَوُنَّ کَمَا یُنْتَقَی التَّمرُ مِنْ اَغْفَالِہٖ فَلْیَذْھَبَنَّ خِیَارُکُمْ." (ابن ماجہ ص:۲۹۲)

ترجمہ:...... "نیک لوگ یکے بعد دیگرے چلے جائیں گے حتیٰ کہ لوگوں کی تلچھٹ پیچھے رہ جائے گی، جیسے کھجوروں کی اور جو کی تلچھٹ رہ جاتی ہے۔"

یہاں تک کہ لوگوں کی تلچھٹ پیچھے رہ جائے گی، برتن میں کھجوریں رکھی ہوئی ہیں اور لوگ چن چن کر کھاتے رہتے ہیں اور گندی کھجوریں رہ جاتی ہیں، اور پھر گندی کھجوروں میں سے جو اچھی ہوتی ہیں، ان کو چن چن کر کھالیتے ہیں، پیچھے ایسی رہ جاتی ہیں کہ وہ کھانے کے قابل نہیں ہوتیں، فرمایا کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ چھانٹ چھانٹ کر لوگوں کو اٹھاتے رہیں گے، پیچھے رہ جائیں گے بالکل تلچھٹ اور اللہ تعالیٰ ان کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔

میں تو اللہ تعالیٰ سے کہا کرتا ہوں کہ ہم تو تلچھٹ رہ گئے ہیں، ہماری آپ کو کیا پرواہ ہے! یہی وجہ ہے کہ ایک عورت کو ہم پر مسلط کیا ہوا ہے، ظالم حکومت کو ہم پر مسلط کیا ہوا ہے، ڈاکو اور چور ہم پر مسلط ہیں، انسانی قیمت باقی نہیں رہی، ہمارے اندر انسانیت باقی نہیں رہی۔

دنیا میں مکمل راحت نہیں ملے گی:

دوسری روایت میں عون بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ

نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: جو شخص راحت و سکون کی تلاش میں مارا مارا پھرے، وہ عاجز آ کر تھک جائے گا، لیکن یہ چیز نہیں ملے گی، اس جہاں کا خمیر ہی ایسا تیار کیا ہے کہ کوئی شخص اگر چاہے تو نہیں ملے گی، دنیا میں ہے ہی نہیں تو آپ ایسی چیز کو تلاش کرنے چلے ہیں جس کا وجود ہی نہیں، ہم میں سے ہر شخص اس کا خواہش مند ہے کہ راحت و سکون ملے، کوئی پریشانی نہ ہو، کوئی بیماری نہ ہو، تو اس جہاں میں یہ چیز نہیں ملتی، حضرت! کسی اور جہاں میں تلاش کریں، اس جہاں میں قدم رکھا ہے تو یہ سوچ کر رکھیں کہ یہاں مسئلہ ملا جلا ہے، سکون بھی ہے، ساتھ پریشانی بھی ہے، راحت بھی ہے، تکلیف بھی ہے، یہاں کوئی راحت ایسی نہیں جس کے آگے پیچھے کوئی تکلیف نہ ہو اور کوئی تکلیف ایسی نہیں جس کے پیچھے راحت نہ ہو۔

دنیا میں پھر راحتیں ہی راحتیں ہیں:

آپ بیمار پڑ گئے، تکلیف کی چیز ہے، لیکن ذرا غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے آگے پیچھے کتنی رحمتیں رکھی ہیں؟ گھر ہے رہنے کے لئے، پانی پینے کے لئے، کھانا کھانے کے لئے، دوائی وغیرہ پیدا کر دی ہے، اللہ تعالیٰ نے تیماردار پیدا کر دیئے ہیں، معاون پیدا کر دیئے ہیں، پوچھنے والے پیدا کر دیئے ہیں، آپ کی ایک بیماری کتنی راحتوں کا سامان بن گئی ہے، اور آپ کی ایک بیماری نے کتنے خدام کو خدمت کا موقع دے دیا، یہ سب کی سب نعمتیں نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن اگر قبر میں خدانخواستہ کسی کو تکلیف ہوگئی تو کوئی پوچھنے والا ہوگا؟

دنیا میں ایک جہان ہماری خدمت پر مامور ہے:

اگر ہم دنیا میں بیمار ہو جائیں تو کوئی سر دبا دے گا، کوئی پاؤں دبا دے گا، کوئی کہتا ہے کہ میں پانی آپ کے لئے لے کر آؤں؟ اور کوئی کہتا ہے کہ میں ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں؟ کوئی کہتا ہے کہ سر درد کی گولی کھالو، قبر میں کوئی ہوگا؟ ایک لقمہ آپ

کھاتے ہیں، کتنا لذیذ ہے، لیکن آگے پیچھے اس کے کتنی مشقتیں ملادی ہیں، اس کے بارے میں تو سوچئے! کھانے کے دسترخوان پر آنے سے پہلے پہلے اس پر کتنی محنت لگائی گئی ہے؟ اور ایک عالَم کا عالَم، جہاں کا جہاں اس کی تیاری میں مصروف رہا ہے، ہمیں تو پسند نہیں آتی روٹی، اور ہم تو لذیذ ہونے نہ ہونے کے فیصلے کے بعد جلدی سے بیٹھنے کی کرتے ہیں، لیکن تم نے کبھی غور بھی کیا کہ مالک نے اپنے کارخانہ کے کتنے ملازموں کو استعمال کیا ہے؟ آسمان والوں کو بھی، زمین والوں کو بھی، اللہ تعالیٰ نے ان غذاؤں کو تیار کرنے کے لئے فرشتوں کو، ہوا کو، سورج کی روشنی کو، چاند کی چاندنی کو، گرمی اور سردی کو، زمین کی حرارت کو، پانی کو اور دوسرے جو محنت کرنے والے ہوتے ہیں کسان، ان کی محنت کو، ذرا غور تو فرمائیں اور اندازہ تو لگائیں، آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس ایک لقمہ کی تیاری پر کارخانۂ عالم کا کتنا خرچ آیا ہوگا؟ اور حضرت کو پسند نہیں آئی! کھانے کے دسترخوان پر آنے سے پہلے اس پر کتنی مشقتیں ہوئیں۔

انسان کے جسم کے اندر کا کارخانہ:

آپ نے لقمہ منہ میں ڈال لیا اور آپ اندازہ فرمائیں کہ اس چبانے پر آپ کی کتنی قوت استعمال ہورہی ہے، کسی حکیم، ڈاکٹر سے پوچھیں کہ اس کے چبانے پر کتنی رگیں حرکت کرتی ہیں؟ اور یہ کارخانہ خدائی کے لشکر ہیں جو خدمت میں لگے ہوئے ہیں، پھر آپ نے لقمہ اندر پہنچادیا، معدہ نے وصول کیا۔

میں چھوٹا بچہ تھا تو مجھے اس پر بہت تعجب ہوتا تھا کہ سائیکل میں ہوا بھر دیتے ہیں، لیکن نکلتی نہیں ہے، تو میں نے کہا کہ جب ہوا داخل کرتے ہیں ٹائر کے اندر تو پھر اس کو باہر بھی نکل جانا چاہئے، یہ جو اس کے اندر وال ہوتا ہے، اس کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا، آپ نے اپنے معدہ میں داخل تو کرلیا، تو آپ غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر ڈھکن دے دیتے ہیں، پھر اس کو نکلنے نہیں دیتے اور خدانخواستہ اگر نکلے تو پھر ہر

وقت سے ہوتی رہے، یہ چھوٹا سا انتظام ہے۔

پھر اس کے بعد جگر کی قوتیں الگ الگ ہیں، قوت جاذبہ الگ ہے، قوت ماسکہ الگ ہے، ہاضمہ کی قوت الگ ہے، وہ اپنے کام کر رہے ہیں، اور جگر اپنا کام کرتا ہے، پھر انتڑیوں میں پہنچایا جاتا ہے، وہ اپنا کام کرتی ہیں۔ یہاں اوپر کے راستے سے اندر پہنچانے تک اور خالی ہونے والے راستے سے خارج ہونے تک، کتنے مراحل اس پر گزرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے کتنی مشینیں اندر لگا رکھی ہیں تو یہ آسانی سے کھاتے نہیں ہیں، بلکہ اس پر بھی طاقت صرف ہوتی ہے۔

شادی کی آفتیں:

اسی طرح شادی کرتے ہیں، گھر آباد کرتے ہیں، لیکن کتنی آفتیں شادی ساتھ لے کر آتی ہے، اس سے پوچھو، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ: حضرت! شادی کی کیا تعریف ہے؟ فرمایا: ''سُرُوْرُ شَھْرٍ!'' ایک ماہ کی خوشی، اس کا نام شادی رکھا، شادی خوشی کو کہتے ہیں۔ عرض کیا گیا: اس کے بعد پھر کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: ''لُزُوْمُ مَھْرٍ'' مہر لازم آجاتا ہے، اس کے بعد ''غُمُوْمُ دَھْرٍ'' دنیا بھر کے، زمانے بھر کے فکر۔ کہا کہ: پھر کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: ''کُسُوْرُ ظَھْرٍ'' کمر ٹیڑھی ہوجاتی ہے! تو کون سی خوشی یہاں ایسی ہے جو مشقت کے اندر لپٹی ہوئی نہ ہو اور کون سی مشقت ایسی ہے جس کے اردگرد انعاماتِ الٰہیہ کا احاطہ نہ ہو؟ اگر آپ چاہیں ہر وقت یہاں خوشی ملا کرے، تو آپ ایک ایسی چیز کے طالب بن کر جا رہے ہیں، جو اس دنیا میں نہیں پائی جاتی، اس پر حضرت ابودرداؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جو شخص کسی چیز کو ڈھونڈنے کے لئے نکلے گا، اس کو گم پائے گا۔

ان تمام مسائل کا حل صبر ہے:

یہاں بہت سارے امور ایسے پیش آجاتے ہیں، بلکہ کہنا چاہئے کہ قدم قدم

پر پیش آتے ہیں، جو آدمی کے سینے کو چھلنی کر دیتے ہیں، دل کو زخمی کر دیتے ہیں، دردمند کر دیتے ہیں، آدمی بلبلا اٹھتا ہے، بہت اچھا! لیکن چارہ کیا ہے؟ اس کا علاج کیا ہے؟ ''صبر'' اس کا علاج ہے! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.'' (البقرہ:۱۵۶)

ہم تمہاری آزمائش کریں گے اور واللہ! آزمائش کریں گے، قسم کھا کر فرماتے ہیں، ان کی تاکید کا نام ''قسم'' ہے، بخدا! ہم تمہاری ضرور بالضرور آزمائش کریں گے اور یہ تمہاری آزمائش کے لئے جو ہو رہا ہے، تم امتحان میں بیٹھے ہو، ممتحن تمہارے نمبر لگائے گا، ویسے ہی امتحان نہیں لیا جاتا، اس کو نمبر دیئے جاتے ہیں، ''پاس'' اور ''فیل'' کا فیصلہ کیا جاتا ہے، پھر ''پاس'' ہے تو اعلیٰ درجہ کے نمبر ہیں یا کم درجہ کے نمبر ہیں یا درمیانے درجہ کے نمبر ہیں، تو ہم تمہاری آزمائش کریں گے۔ پرچہ کیا ہے جس کا امتحان ہوگا؟ خوف دے کر، جان مال اور پھلوں میں کمی دے کر تمہاری آزمائش کریں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیں گے، تمہارے صبر کا امتحان ہے، تم جانتے ہو کہ جتنا کوئی حوصلہ رکھتا ہے اتنا بڑا آدمی ہوتا ہے اور جتنا کم ظرف ہوتا ہے، اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہے۔ جو لوگ صبر کرنے والے ہیں، ان کو خوشخبری دے دیجئے، اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرما رہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے خوشخبری سن کر مسلمانوں کو کتنی تسکین ہوگی۔

صابر کون ہیں؟

صابرین کون ہیں؟ جب ان کو کوئی سی بھی مصیبت پہنچے، علماً فرماتے ہیں

"مصیبةٌ"، پرتنوین تنکیر کی ہے، یعنی چھوٹی سے چھوٹی مصیبت بھی پہنچے، بڑی تو ہے ہی، اگر چھوٹی سے چھوٹی مصیبت بھی اُنہیں پہنچے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں، ہم اللہ کا مال ہیں اور مالک کو حق پہنچتا ہے جیسے چاہے تصرف کرے، تو کوئی شکایت نہیں کرتے۔ جیسے آپ کپڑا خرید کر لائے ہیں، چاہیں تو اس کے تکیے گدّے بنالیں، چاہے پردے بنالیں اور چاہے اپنا لباس تیار کرلیں۔

کسی کے سینے سے لگنا آسان نہیں:

اکابر رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ایک لباس کو دیکھ لو، کن مراحل سے گزرتا ہوا تمہارے سینے سے لگا ہے؟ سب سے آخر میں درزی نے اس کے بند بند پر اس کی تار تار پر سوئیاں چبھوئی ہیں، تب تمہارے پہننے کے قابل ہوا ہے۔ کسی کے سینے سے لگنا آسان کام ہے اور پھر جب ذرا سا میلا ہوتا ہے تو اس کو دھلائی کے لئے دیتے ہیں اور پھر دھوبی اس کو پٹختا ہے، جب کوئی مصیبت پہنچے تو کہتے ہیں انا للہ! ہم اللہ کے ہیں، ہمارے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے، مالک کی جانب سے ہو رہا ہے، اور وہ مالک رحیم ہے، کریم ہے، شفیق ہے، ہمارا خیرخواہ ہے، وہ حکیم ہے، جو معاملہ بھی کرتا ہے ہمارے ساتھ حکمت کا کرتا ہے۔

اللہ شفیق اور حکیم ہیں:

بعض لوگ شفیق ہوتے ہیں، لیکن حکیم نہیں ہوتے، بعض لوگ حکیم ہوتے ہیں مگر شفیق نہیں ہوتے، ہمارا مالک ایسا ہے، وہ سب سے زیادہ رحیم ہے اور شفیق بھی ہے اور حکیم بھی ہے، اور جب اس کی شفقت پر اور حکمت پر اعتماد ہے تو تم کیوں گھبراتے ہو؟ پریشانی سے خوش ہوجاؤ، الحمدللہ! بچہ تو نادان ہوتا ہے، ماں کپڑے اتار کر ذرا سا پانی میں ڈال دیتی ہے تو بچہ چیخنے چلانے لگتا ہے، حالانکہ بزرگ فرماتے ہیں کہ آدمی کھا کر تو پریشان ہوجاتا ہے، مگر نہا کر نہیں پریشان ہوتا، وہ یہی تو کرے گی

کہ میل اتار دے گی، بدن صاف کردے گی، لیکن نادان ہے، اپنی ماں کی اتنی شفقت پر بھی اس کو اعتماد نہیں۔ اے انسان! تو بچے سے بھی زیادہ نادان ہے کہ اپنے مالک کی شفقت پر تجھ کو اعتماد نہیں، تھوڑی سی مزاج کے خلاف بات ہوجاتی ہے تو چیختا ہے، چلاتا ہے، انا للہ! ہم اللہ کے لئے ہیں، وانا الیہ راجعون! اور ہم اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، ایک ادنیٰ سے ادنیٰ چیز پر بھی ہمیں اجر وثواب عطا فرماتے ہیں، حتیٰ کہ ایک بندہ کے پیسے جیب میں تھے، ایک کونے میں تلاش کرتا رہا، مگر دوسرے کونے میں پیسے پڑے ہوئے تھے، اتنی جو پریشانی ہوئی اللہ تعالیٰ اس پر بھی اجر وثواب عطا فرماتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے مالک کی طرف سے، ان کے رب کی طرف سے شاباش اور رحمتیں ہیں اور عنایات ہیں، یہ ہی سیدھے راستے پر ہیں۔ تمام مسائل کا علاج ''صبر'' ہے، حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جو شخص صبر کو ان تکالیف کے لئے ڈھال نہیں بناتا، وہ عاجز ہوکر رہ جائے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

جھوٹی گواہی

بدترین سود اور شرک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

۱:......"عَنْ اَیْمَنَ بْنِ خُرَیْمٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَطِیْبًا، فَقَالَ: یَا اَیُّھَا النَّاسُ! عُدِلَتْ شَھَادَةُ الزُّوْرِ اِشْرَاکًا بِاللّٰہِ. (قَالَھَا) ثَلَاثًا، ثُمَّ قَرَأَ: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ." (مسند احمد ج:۴ ص:۱۷۸)

۲:......"عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَ اَمْرَ الرِّبَا وَعَظَّمَ شَاْنَہٗ وَقَالَ: اِنَّ الدِّرْھَمَ یُصِیْبُہُ الرَّجُلُ مِنَ الرِّبَا اَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰہِ فِی الْخَطِیْئَةِ مِنْ سِتٍّ وَّثَلَاثِیْنَ زَنْیَةً یَزْنِیْھَا الرَّجُلُ، وَاِنَّ اَرْبَی الرِّبَا عِرْضُ الرَّجُلِ الْمُسْلِمِ."

(الترغیب والترہیب ج:۳ ص:۵۰۳)

۳:......"عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ

فَقَالَ: یَا اَیُّھَا النَّاسُ! اِتَّقُوا الشِّرْکَ! فَاِنَّہٗ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ. فَقَالَ مَنْ شَاءَ اَنْ یَّقُوْلَ: وَکَیْفَ نَتَّقِیْہِ وَھُوَ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ یَا رَسُوْلَ اللہِ؟ قَالَ: قُوْلُوْا: اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ اَنْ نُّشْرِکَ بِکَ وَنَحْنُ نَعْلَمُہٗ وَنَسْتَغْفِرُکَ لِمَا لَا نَعْلَمُہٗ." (کنز العمال ج:۲ ص:۱۶۹)

۱:......ترجمہ:......"حضرت ایمن بن خریم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا، اس میں ارشاد فرمایا کہ: اے لوگو! جھوٹی شہادت شرک باللہ کے برابر ہے، یہ بات آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی، پھر آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: "فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ." سو تم بچو گندگی سے بتوں کی اور بچو جھوٹی بات سے۔"

۲:......ترجمہ:......"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا آپ نے سود کی قباحت اور شناعت بیان کی اور فرمایا ایک درہم سود جس کو آدمی حاصل کرتا ہے، اس کا گناہ اللہ کے نزدیک چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ ہے، اور بے شک سب سے بڑا سود کسی مسلمان آدمی کی عزت میں زبان کھولنا ہے۔"

۳:......ترجمہ:......"حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا، فرمایا کہ: لوگو! شرک سے بچو! اس لئے کہ وہ چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔ ایک آدمی نے کہا کہ: یا رسول اللہ! جو

چیز کہ چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہو، اس سے ہم کیسے بچیں؟ فرمایا کہ: یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ! ہم تیری پناہ چاہتے ہیں، اس بات سے کہ ہم تیرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں جان بوجھ کر، اور ہم استغفار کرتے ہیں تجھ سے اس چیز کا جس کو ہم جانتے نہیں۔"

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے چھوٹے تین خطبے ہیں، جن میں بعض کبیرہ گناہوں کا بھی تذکرہ ہے۔

جھوٹی گواہی بت پرستی کے برابر ہے:

ان میں سے پہلی چیز جھوٹی گواہی دینا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اہتمام سے اس کے لئے خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا کہ جھوٹی گواہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے برابر ہے، اور یہ بات مکرر تین مرتبہ ارشاد فرمائی، اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی:

"فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ."

ترجمہ:...... "سو تم لوگ گندگی سے جو کہ بت ہیں بچو، اور تم لوگ جھوٹی بات سے بچو۔"

بت پرستی اور جھوٹ بولنا یعنی جھوٹی گواہی دینا ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ ذکر فرمایا، بت پرستی سے بچنے کی تلقین فرمائی، اور جھوٹ بولنے سے یعنی جھوٹی شہادت دینے سے بچنے کی تلقین فرمائی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ان دونوں سے ایک ہی جگہ اللہ تعالیٰ کا منع فرمانا یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ جھوٹی شہادت شرک باللہ کے برابر ہے، بت پرستی کے برابر ہے، جھوٹی گواہی دینا کسی

مسلمان کو نقصان پہنچانے کے لئے، اس کی عزت یا اس کے مال کا نقصان کرنے کے لئے ہے، ایسی گواہی ان سات گناہوں میں سے ہے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکبر الکبائر فرمایا، سب سے بڑے گناہ۔ ایک حدیث شریف میں ہے:

''اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ! قَالُوا: یَا رَسُوْلَ اللهِ! وَمَا هُنَّ؟ قَالَ: اَلشِّرْکُ بِاللهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِیْ حَرَّمَ اللهُ اِلَّا بِالْحَقِّ، وَاَکْلُ الرِّبٰوا، وَاَکْلُ مَالِ الْیَتِیْمِ، وَالتَّوَلِّیْ یَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ.'' (مشکوٰۃ ص:۱۷)

ترجمہ:...... ''سات گناہ جو آدمی کو ہلاک تباہ کر کے چھوڑتے ہیں، ان سے بچو!

۱:...... اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا۔

۲:...... اور جادو کرنا یا کرانا۔

۳:...... ناحق کسی جان کو قتل کرنا۔

۴:...... سود کھانا۔

۵:...... یتیم کا مال کھانا۔

۶:...... میدان جہاد سے بھاگنا۔

۷:...... کسی پاک دامن پر تہمت لگانا۔''

اور صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ:

''اَلْکَبَائِرُ: اَلْاِشْرَاکُ بِاللهِ، وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ، وَقَتْلُ النَّفْسِ، وَالْیَمِیْنُ الْغَمُوْسُ. وَفِیْ رِوَایَةٍ: شَهَادَةُ الزُّوْرِ.'' (مشکوٰۃ ص:۱۷)

ترجمہ:...... ''کبیرہ گناہ: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، اور

والدین کی نافرمانی کرنا، ناحق قتل کرنا، اور جھوٹی گواہی دینا۔"
اور بخاری ہی کی ایک روایت میں ہے:

"وَجَلَسَ وَكَانَ مُتَّكِئًا فَقَالَ: ا لا وقول الزور فما زال يُكَرِّرُهَا حَتّٰى قُلْنَا لَيْتَهُ سَكَتَ."

(صحیح بخاری ج:۱ ص:۳۶۲)

ترجمہ:......"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سہارا لگائے ہوئے تشریف فرماتھے جب یہ بات ارشاد فرمائی تو سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور مکرر فرماتے رہے: "وَقَوْلَ الزُّوْرِ، وَقَوْلَ الزُّوْرِ، وَقَوْلَ الزُّوْرِ" جھوٹی گواہی دینا، جھوٹی گواہی دینا، جھوٹی گواہی دینا۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ: "حَتّٰى قُلْنَا لَيْتَهُ سَكَتَ!" یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش! آپؐ خاموش ہوجائیں، اور ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ترس آنے لگا، اسی کو یمین غموس (جھوٹی قسم) کہتے ہیں۔"

جھوٹی قسم کا وبال:

جھوٹی قسم کھانا یہ بھی کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اور غموس کا لفظ غمس سے ہے، غمس کے معنی غوطہ دینا اور ڈبودینا یعنی جھوٹی قسم آدمی کو ڈبونے والی ہے۔

مجھے لوگ خطوط لکھتے رہتے ہیں، بہت سارے لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ قرآن کریم کی جھوٹی قسم کھائی تھی، اور اس وقت سے آج تک عذاب میں مبتلا ہوں، کیا کروں؟ لوگ قرآن کی جھوٹی قسم کھاتے ہیں اور جھوٹ موٹ سے قرآن کریم سر پر اٹھالیتے ہیں، پھر قرآن کی مار پڑتی ہے تو روتے ہیں، اول تو آدمی کو جھوٹ بولنا ہی نہیں چاہئے اس لئے کہ ایک حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: بندہ سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کا اہتمام کرتا ہے، "حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيْقًا." (مشکوٰۃ ص:۴۱۲)

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے دفتر میں اس کا نام صدیق لکھ دیا جاتا ہے، بہت سچ بولنے والا کہ رگ و پے میں صدق ہی صدق ہے، اور ایک بندہ جھوٹ بولتا ہے اور پرواہ نہیں کرتا جھوٹ بولتا ہی رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے دفتر میں کذاب لکھ دیا جاتا ہے، جھوٹا، نعوذ باللہ! استغفر اللہ!

جھوٹ کسی مذہب وملت میں اچھا نہیں:

جھوٹ ایک ایسی برائی ہے جو کسی مذہب و ملت میں اور کسی انسانی معاشرے میں اچھی نہیں سمجھی جاتی، بے دین سے بے دین معاشرے میں بھی جھوٹ کو برا سمجھا جاتا ہے۔

معاشرہ کا سنگ بنیاد:

بات یہ ہے کہ تمام معاشروں کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ افراد ایک دوسرے پر اعتماد کریں، اگر آپ ایسا معاشرہ فرض کرتے ہیں جس میں کسی آدم کو دوسرے پر اعتماد نہ ہو تو اس کو معاشرہ کہنا صحیح نہیں، اسی طرح اگر ایک گھر میں کسی کو کسی پر اعتماد نہیں، تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس گھر کی کیفیت کیا ہوگی؟ اسی طرح معاشرے کو سمجھ لیجئے، تو تمام معاشروں کا سنگِ بنیاد ہے ''اعتماد باہمی'' ایک دوسرے پر اعتماد کرنا، اس کے بغیر معاشرت قائم ہی نہیں ہوسکتی

جھوٹ اعتماد باہمی کی بنیاد اکھاڑ دیتا ہے:

اور جھوٹ اس بنیاد کو اکھاڑنے والا ہے، جب لوگ عام جھوٹ بولنے لگیں تو سننے والے کے لئے یہ باور کرنا مشکل ہو جائے گا کہ یہ سچ بولتا ہے کہ جھوٹ؟

جھوٹ سب سے بڑی خیانت:

اعتماد کی بنیاد سچ پر ہے، اور بداعتمادی کی بنیاد جھوٹ پر، اسی بنا پر آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"کَبُرَتْ خِيَانَةً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاکَ حَدِيْثًا هُوَ لَکَ بِهٖ مُصَدِّقٌ وَاَنْتَ بِهٖ کَاذِبٌ." (مشکوٰۃ ص:۴۱۳)

ترجمہ:...... "سب سے بڑی خیانت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے بات کرو، وہ تمہیں سچا سمجھتا ہو اور تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

تو تم نے اس اعتماد کو جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر کرنا چاہئے، اس میں خیانت کی ہے، اس لئے جھوٹ بولنا بری چیز ہے، آدمی کے منہ سے جھوٹی بات نہیں نکلنی چاہئے۔

جھوٹ کی نجاست وقباحت:

انسانی معاشرے کو بھی اس سے نفرت ہے، اور ملائکۃ اللہ کو بھی اس سے نفرت ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے کہ:

"اِذَا کَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَکُ مِيْلًا مِنْ نَتَنِ مَا جَاءَ بِهٖ." (مشکوٰۃ ص:۴۱۳)

ترجمہ:...... "جب بندہ جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹی بات کہتا ہے تو اس کے منہ سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ فرشتہ ایک میل دور چلا جاتا ہے۔"

ایک میل دور تک اس جھوٹ کی بدبو پھیل جاتی ہے جو بے ضرر نہ ہو، بلکہ ضرر پر مبنی ہو، یعنی کسی کے خلاف جھوٹی گواہی دینا وغیرہ، جھوٹی گواہی کا معاملہ تو بہت ہی سنگین ہے، اس کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ شرک باللہ اور بت پرستی کے برابر ہے، اس لئے کہ اس نے جھوٹ کی نجاست کے ساتھ ساتھ

دوسرے مسلمان کی ایذا رسانی اس کا مال ہتھیانے اور جہنم کا ٹکڑا حاصل کرنے کو بھی شامل کرلیا، چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے:

"عَنْ اُمِّ سَلِمَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ رَجُلَیْنِ اِخْتَصَمَا اِلَیْہِ فِیْ مَوَارِیْثِ لَمْ تَکُنْ لَّھُمَا بَیِّنَةٌ اِلَّا دَعْوَاھُمَا فَقَالَ مَنْ قَضَیْتُ لَہٗ بِشَیْءٍ مِنْ حَقِّ اَخِیْہِ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَہٗ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ فَقَالَ الرَّجُلَانِ کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! حَقِّیْ ھٰذَا لِصَاحِبِیْ فَقَالَ لَا! وَلٰکِنْ اِذْھَبَا فَاقْتَسِمَا وَتَوَخَّیَا الْحَقَّ ثُمَّ اِسْتَھِمَا لِیَحْلُلْ کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْکُمَا صَاحِبَہٗ." (مشکوٰۃ ص:۳۲۷)

ترجمہ:...... "دو آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، (ایک کندی تھا دوسرا حضرمی، حضرموت کا۔ ناقل) ایک نے دعویٰ کیا دوسرے پر کہ اس نے میری زمین غصب کر رکھی ہے، اور دوسرے کا کہنا یہ تھا کہ میرے باپ دادا کی زمین ہے، (باپ دادا کے وقت سے میرے ہاں چلی آرہی ہے۔ ناقل) گواہ ان میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھا، (اور قسم کھانے کے لئے دونوں تیار تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ناقل) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے لئے میں فیصلہ کردوں اس کے بھائی کے حق سے، تو میں اسے دوزخ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔ (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی۔ ناقل) تو دونوں صاحب مکر گئے ایک کہنے لگا کہ اس کی ہے، دوسرا کہنے لگا کہ اس کی ہے، (مدعی کہتا ہے کہ مدعیٰ علیہ کی

ہے، مدعیٰ علیہ کہتا ہے کہ مدعی کی ہے، اس پر۔ ناقل) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی نتیجہ پر متفق نہیں ہوتے ہو تو پھر ایسا کرو، اس زمین کو تقسیم کرلو، اور ایک دوسرے سے معافی مانگ لو، معاف کروالو، اگر کسی کا حق کسی کے ذمے ہے تو معاف کراؤ۔"

تو خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ جھوٹی شہادت کے ذریعہ یا جھوٹ بول کر کسی مسلمان کا حق اڑا لینا یہ جھوٹ بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس مسلمان کی حق تلفی بھی ہے اور یہ گناہ بڑا سنگین ہے۔

بعض معاملات میں وحی نہ آنے کی حکمت:

حالانکہ وحیِ الٰہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ نمائی کرسکتی تھی، لیکن وحی اگر ایسے معاملات میں راہ نمائی کرتی تو پھر سنت کیسے جاری ہوتی؟ اب ہر ایک آدمی کے پاس تو جبرائیل علیہ السلام یہ بتانے کے لئے نہیں آئیں گے کہ یہ حق پر ہے، اور یہ باطل پر ہے۔ اسی بنا پر صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ:

"یَقُوْلُ ..... اِنَّ الْوَحْیَ قَدِ انْقَطَعَ وَاِنَّمَا نَأْخُذُکُمُ الْآنَ بِمَا ظَھَرَ لَنَا مِنْ اَعْمَالِکُمْ فَمَنْ اَظْھَرَ لَنَا خَیْرًا اَأْمِنَّاہُ وَقَرَّبْنَاہُ وَلَیْسَ اِلَیْنَا مِنْ سَرِیْرَتِہٖ شَیْءٌ اَللّٰہُ مُحَاسِبُہٗ فِیْ سَرِیْرَتِہٖ وَمَنْ اَظْھَرَ لَنَا سُوْءًا لَمْ نَأْمَنْہُ وَلَمْ نُصَدِّقْہُ وَاِنْ قَالَ اَنَّ سَرِیْرَتَہٗ حَسَنَۃٌ." (بخاری ج:۱ ص:۳۶۰)

ترجمہ:......"وحی بند ہوچکی ہے، ہم تو لوگوں کو ظاہر پر پکڑیں گے، ہم تو لوگوں کے ساتھ معاملہ کریں گے ظاہر کے

مطابق، جس شخص کا ظاہر اچھا دیکھیں گے اس کو اچھا سمجھیں گے، اور جس شخص کا ظاہر غلط ہوگا ہم اس کو غلط سمجھیں گے، (باقی اللہ جانیں، ہمارے پاس وحی نہیں آتی اس لئے قاضی کو حکم ہے کہ وہ ظاہر پر فیصلہ کرے۔ ناقل)۔“

قاضی اپنی معلومات پر، یا شہادت پر فیصلہ کرے؟

اس مسئلہ میں گفتگو ہوئی ہے کہ اگر قاضی کے علم میں خود ذاتی طور پر کوئی اس کو معلومات ہوں، لیکن شہادتوں میں وہ بات سامنے نہ آئے، تو کیا قاضی، جج اپنے علم پر فیصلہ کرسکتا ہے؟ اس مسئلہ میں علمأ نے گفتگو کی ہے، بعض نے کہا ہے کہ کرسکتا ہے، اس کو حقیقتِ حال کا علم ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کرے، اور بعض علمأ فرماتے ہیں کہ نہیں وہ اپنے علم پر عمل کرنے کا پابند نہیں، بلکہ جو کچھ شہادت میں آیا ہے، یا یوں کہو کہ جو کچھ مِسل اور فائل پر موجود ہے، اس کے مطابق فیصلہ کرنے کا پابند ہے، اس لئے کہ اگر وہ اپنے علم پر فیصلہ کرے گا تو لوگ اس پر تہمت لگائیں گے کہ اس نے غلط فیصلہ کیا ہے، جو چیز کہ شہادت میں آئی تھی اور جو چیز ریکارڈ پر موجود تھی، اس نے اس کے خلاف فیصلہ کیا، لوگ تہمت دھریں گے اور قاضی کو تہمت سے بھی بچنا چاہئے، یہ بات بھی معقول ہے۔

قضأ کا اصول:

تو میں عرض کر رہا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تو وحی نازل ہوتی تھی، جبرائیل علیہ السلام آکر بتاسکتے تھے کہ یہ سچا ہے کہ جھوٹا ہے؟ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کو سنت جاری کروانی تھی، جب دونوں نے دعویٰ کیا اور دونوں کے پاس گواہی نہیں تھی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قاعدہ بیان فرمایا ہے جو کہ قضأ کا نہایت اہم ترین اصول ہے، وہ یہ کہ گواہوں کے ذریعہ اپنے دعوے کو ثابت کرنا مدعی کے ذمہ ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے کہ:

"قَالَ لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعٰى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَاَمْوَالِهِمْ وَلٰكِنَّ الْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِىْ وَالْيَمِيْنَ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ." (مشکوٰۃ ص:۳۲۶)

ترجمہ:...... "اگر لوگوں کو محض ان کے دعووں پر ان کے حق میں فیصلے کردیئے جائیں تو لوگ ایک دوسرے کے دماء (خون) اور مال پر دعویٰ کرنے لگ جائیں گے، لیکن گواہ یعنی ثبوت پیش کرنا مدعی کا کام ہے۔ اور قسم مدعا علیہ کے ذمہ ہے۔ (مدعی گواہ پیش کرے اور اگر مدعی کہے کہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ یہ چیز میری ہے، تو پھر مدعا علیہ کے ذمہ حلف ہوتا ہے، یعنی مدعی اس سے حلف لے سکتا ہے کہ یہ چیز اس کی نہیں ہے، میری ہے وہ قسم کھاکر کہے۔ ناقل)۔"

حضرت علیؓ قاضی شریح کی عدالت میں:

قاضی شریح کا مشہور واقعہ ہے ناں! کہ ایک یہودی اور امیرالموٴمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک زرہ پر جھگڑا ہوگیا، قاضی شریح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے قاضی اور جج چلے آرہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تین خلفاءؓ کے زمانے میں وہ جج رہے، بڑے ذہین آدمی تھے، ان کے فیصلوں کے عجیب و غریب واقعات کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں، قاضی صاحب نے نوٹس جاری کیا اور امیرالموٴمنین کو طلب کیا، امیرالموٴمنینؓ حاضر عدالت ہوئے تو قاضی صاحب نے ان کو جگہ دینا چاہی، امیرالموٴمنین فرماتے ہیں کہ غلط: عدالت کے کٹہرے میں امیرالموٴمنین اور یہودی برابر ہے، آپ کسی ایک کے

ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کر سکتے، یہودی کے اوپر حضرت علیؓ کا دعویٰ ہے، قاضی صاحب نے کہا کہ آپ اس میں گواہ پیش کریں کہ یہ زرہ آپ کی ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت امام حسنؓ سبط رسول صلی اللہ علیہ وسلم و ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک تو میرے یہ گواہ ہیں اور ایک حضرتؓ کے خادم تھے قنبرؒ یہ گواہ ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا کہ یہ گواہی تو قابل قبول نہیں ہے کیونکہ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں اور غلام کی شہادت آقا کے حق میں قابل قبول نہیں، کوئی اور گواہ لے کر آئیں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ اور تو میرے پاس کوئی گواہ نہیں، گویا امیر المؤمنینؓ اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام رہے، اب یہودی سے حلف لیا جا سکتا تھا، لیکن یہودی کو حلف اٹھانے میں کیا عار تھی؟ جس طرح غلام احمد قادیانی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر سکتا ہے اور اس سے جتنے چاہو جھوٹ بلوا لو، تو ایک یہودی قسم اٹھانے میں کیوں ہچکچائے گا، یہودی کو حلف دلایا گیا اس نے قسم کھائی، قاضی صاحب نے فیصلہ امیر المؤمنینؓ کے خلاف اور یہودی کے حق میں کر دیا۔ جب فیصلہ ہو گیا تو یہودی کہنے لگا کہ زرہ امیر المؤمنینؓ کی ہے اور میرا دعویٰ جھوٹا ہے، میری قسم جھوٹی تھی، اور اس نے کلمہ پڑھا اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اس عدل پر آسمان و زمین قائم ہیں کہ امیر المؤمنینؓ، قاضی کی عدالت میں بنفسِ نفیس آتے ہیں، اور عدالت میں ایک معمولی چیز زرہ پر بھی اپنی ملکیت ثابت نہیں کر سکتے، اور قاضی جو کرسی عدالت پر بیٹھا ہے، وہ امیر المؤمنینؓ کے خلاف ایک یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہے، یہ ہے وہ عدل و انصاف جس پر آسمان و زمین قائم ہیں، پھر جب اس یہودی نے مسلمان ہو کر وہ زرہ واپس دینا چاہی تو امیر المؤمنین نے اس کے لینے سے انکار کر دیا۔

جھوٹ سے حاصل کردہ مال کا حکم:

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اِنَّکُمْ لَتَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَکُمْ اَنْ یَّکُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِہٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِیْ لَہٗ عَلٰی نَحْوِ مَا اَسْمَعُ مِنْہُ، فَمَنْ قُضِیْتُ لَہٗ بِشَیْءٍ مِنْ حَقِّ اَخِیْہِ فَلَا یَأْخُذَنَّہٗ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَہٗ قِطْعَۃً مِّنَ النَّارِ۔'' (مشکوٰۃ ص:۳۲۷)

ترجمہ:...... ''تم لوگ میرے پاس اپنے مقدمے لاتے ہو اور بہت ممکن ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کی بہ نسبت زیادہ منہ زور ہو (اور وہ اپنی بات کھل کر بیان کرسکتا ہے، یا عدالت کو متأثر کرسکتا ہے، اور دوسرا بیچارہ نہیں کرسکتا باوجود حق پر ہونے کے وہ عدالت کو متأثر نہیں کرسکتا، ہوسکتا ہے کہ تم میں سے بعض زیادہ منہ زور ہوں دوسرے کی نسبت۔ ناقل) اور میں جیسی چیز میرے سامنے آئی اس کے مطابق فیصلہ کردوں، تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ اگر میں تمہارے بیانات سے متأثر ہوکر ایک کا حق دوسرے کو دلادیتا ہوں اور فیصلہ کردیتا ہوں تو میں ایک کا حق دوسرے کو نہیں دلا رہا ہوں، بلکہ اس کو جہنم کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں، (اب اس کا جی چاہے تو لے اور جی چاہے تو چھوڑ کر چلا جائے۔ ناقل)۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ کرکے دیتے ہیں کہ یہ زمین فلاں کی ہے، لیکن خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر یہ فیصلہ واقعہ کے خلاف ہوا، ہم نے اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا، لیکن واقعہ اس کے خلاف تھا تو اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ میں اسے دوزخ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں، اس کے نام دوزخ الاٹ کر رہا ہوں۔

بھائی! اور سب ٹھیک ہے، لیکن جھوٹ بول کر کسی مسلمان کا حق اڑالینا، حق مارلینا اس کا خمیازہ بڑا سخت ہے، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور جیسے میں نے عرض کیا

کہ اس قسم کی مار ایسی پڑتی ہے کہ ساری عمر پچھتاتا ہے۔

بدترین سود:

دوسرا خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کے بارے میں دیا، سود کا تذکرہ فرمایا ہے، اور ارشاد فرمایا ہے کہ سود بڑی سخت چیز ہے، کتنی سخت ہے؟ اس کو صرف ایک مثال سے سمجھایا کہ سود کا ایک درہم، چھتیس زنا سے بدتر ہے، یعنی چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بدتر ہے، گویا چھتیس مرتبہ منہ کالا کرنے سے آدمی کا ایمان اتنا سیاہ نہیں ہوتا، جتنا سود کا ایک درہم کھانے سے ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بچائے، جبکہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ لوگ اس کو شیر مادر سمجھتے ہیں، یوں سمجھتے ہیں کہ اپنے پیسے کا منافع ہے۔ اور پھر ایک تیسری بات ارشاد فرمائی کہ سب سے بڑا سود کسی مسلمان کی عزت اور آبرو میں زبان کھولنا ہے، یعنی کسی مسلمان کی بے عزتی کرنا، ہتکِ عزت کرنا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ سود کے ستر درجے ہیں، چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ہے:

''اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْأً اَیْسَرُھَا اَنْ یُّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ.''   (مشکوٰۃ ص:۲۴۶)

ترجمہ:...... ''سود کے ستر درجے ہیں، سب سے ادنیٰ درجے کا سود اتنا برا ہے گویا اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرنا، اور منہ کالا کرنا ہے۔''

اور سب سے بڑا سود ہے کسی مسلمان بھائی کی بے عزتی کرنا، چنانچہ فرمایا: ''اَ لْاِسْتِطَالَۃُ فِیْ عِرْضِ الْمُسْلِمِ.'' یعنی کسی مسلمان کے خلاف زبان درازی کرنا۔

اللہ کے ہاں کسی مسلمان کی حرمت؟

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوجائے گی کہ کسی مسلمان کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتنی زیادہ ہے؟ ہمیں اور حرمتیں تو یاد ہیں، عہدہ کی حرمت، منصب کی

حرمت، قرابت داری کی حرمت، عزیزداری کی حرمت، لیکن ایمان کی حرمت ہمیں یاد نہیں، بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کے دل میں کسی مسلمان کی حرمت اس کے ایمان کی وجہ سے ہو، الاّ ما شاءَ اللہ! اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں جتنی ایمان کی حرمت ہے، اتنی کسی چیز کی بھی نہیں، قرآن کریم میں ہے:

"....وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ." (المنافقون:۸)

ترجمہ:...... "اور اللہ کے لئے ہے عزت اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور اہل ایمان کے لئے لیکن منافق لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

عزت صرف تین کے لئے ہے، اللہ کے لئے واقعی عزت ہے، تمام عزتوں کا مالک ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عزت ہے، اس لئے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، بھلا ان سے زیادہ معزز کون ہوگا؟ اور اہل ایمان کے لئے، ان تین کے علاوہ کسی کے لئے عزت نہیں ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں عزت صرف ایمان کی ہے، اور کسی چیز کی نہیں۔ اور ہمارے یہاں اس کے الٹ ہوگیا کہ ہمارے دل میں الاّ ماشاءَ اللہ! بس ایمان کی عزت نہیں ہے، باقی ہر چیز کی عزت ہے۔

شرک سے بچو:

تیسرا خطبہ تھا ریاکاری کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا، اس میں ارشاد فرمایا: لوگو! شرک سے بچو! اس لئے کہ وہ چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! جب چیونٹی کی چال سے خفی ہے تو اس سے بچیں کیسے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: یہ دعا کیا کرو کہ یا اللہ!

میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ جان بوجھ کر آپ کے ساتھ شریک کروں، اور آپ کی پناہ چاہتا ہوں، آپ سے معافی مانگتا ہوں اس چیز کے لئے کہ اس کو میں جانتا نہیں، یعنی اگر انجانے میں ہو جائے تو اس کی بخشش چاہتا ہوں۔

شرک کا مفہوم:

یہاں تین مسئلے ذکر کرنے کے قابل ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا یہ سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے، یہ تو سب مسلمانوں کو معلوم ہے، اب شریک ٹھہرانے کا کیا مطلب؟ اس کی زیادہ تفصیل نہیں کروں گا، مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں یا صفات میں، صفاتِ خاصہ جو اللہ تعالیٰ کی خاص صفات ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے ساتھ مخصوص ہیں، ان میں کسی اور کو بھی شریک سمجھنا یہ شرک فی الذات کہلاتا ہے۔ یہ شرک تو کبھی کسی نے کیا نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے برابر کسی کو کوئی نہیں سمجھتا، کبھی کسی بد سے بدتر قوم کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی جیسا یکتا کوئی اور بھی ہے، اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی اور بھی ہے، ایسا کبھی کسی نے کوئی لفظ نہیں سنا، شرک فی الذات کبھی کسی نے نہیں کیا۔

توحید فی الذات:

مشرکین نے کہا تھا کہ ہمارے سامنے اپنے رب کا وصف بیان کریں، اس پر سورۂ اخلاص نازل ہوئی، اخلاص کا معنی ردِ شرک کے ہیں، یہ سورۃ التوحید ہے، "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" کہہ دیجئے کہ وہ اللہ یکتا ہے۔ علماٗ فرماتے ہیں کہ ایک ہوتا ہے واحد، بمعنیٰ ایک، اس کو عربی زبان میں کہتے ہیں واحد، اللہ تعالیٰ واحد بھی ہے، لیکن یہاں فرمایا: "احد" احد کے معنی "یکتا" کہ اس جیسا نہ کوئی ہے اور نہ ہو سکتا ہے، اپنی ذات میں، اپنے کمالات میں، اپنی صفات میں، اپنے افعال میں، وہ یکتا ہے، یہ تو توحید فی الذات ہوئی۔

توحید فی الصفات:

اور آگے توحید فی الصفات ہے، چنانچہ فرمایا: "اَللّٰہُ الصَّمَدُ" اللہ ہی بے نیاز ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری قدس سرہٗ منبر پر تقریر میں بڑے مزے لے کر سنایا کرتے تھے کہ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی قدس سرہٗ نے اللہ الصمد کا ترجمہ کیا کہ "اللہ نرادھار" ہے، یہ کوئی ہندی کا لفظ تھا، شاہ جیؒ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ جیل میں ایک بہت بڑا فاضل ہندو ملا، جس کو جیل میں پڑے ہوئے سال ہوگیا، وہ مجھ سے قرآن کریم پڑھا کرتا تھا، شاہ جیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن پوچھا کہ نرادھار کیا ہوتا ہے؟ کہنے لگا کہ نرادھار اس کو کہتے ہیں کہ سارے اس کے محتاج ہوں وہ کسی کا محتاج نہ ہو، شاہ جیؒ فرماتے ہیں کہ میں یہ ترجمہ سن کر پھڑک گیا، واقعتاً صمد کے یہی معنی ہیں کہ بے نیاز ہے، اللہ بے نیاز ہے، ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی مفرد لفظ نہیں ہے، بے نیاز ادھورا ترجمہ ہے، یعنی کسی کا محتاج نہیں، لیکن صمد کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہیں، بلکہ یہ معنی ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور باقی سارے اس کے محتاج ہیں، یہ توحید فی الصفات اور توحید فی الافعال ہوئی کہ وہ اپنی صفات میں بھی یکتا ہے اور اپنے افعال میں بھی یکتا ہے۔ "لَا رَادَّ لِمَا قَضَاہُ" کوئی رد کرنے والا نہیں ہے اس کو جو وہ فیصلہ کردے، "وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعَہٗ" اس کو کوئی دینے والا نہیں جس کو وہ روک لے، "وَلَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَاہُ" جو دینا چاہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں۔

عقیدۂ ولدیت کا بطلان:

اور بہت سی قومیں عقیدہ ولدیت کی وجہ سے گمراہ ہوئیں، کسی نے کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، کسی نے کہا کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے، کسی نے

کہا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے، اللہ نے فرمایا کہ وہ کسی سے نہیں پیدا ہوا، اور نہ اس کی اولاد ہے، کوئی اس کی اولاد نہیں، عقیدہ ولدیت خدائی کے منافی ہے، اگر خدا پیدا ہو وہ خدا نہ رہا، اور خدا کے جمتے تو خدا پھر بھی خدا نہ رہا۔

پادری سے دیہاتی کا مناظرہ:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیٹا ہونے پر عیسائیوں اور مسلمانوں کا مناظرہ ہو رہا تھا، ایک پرانا بوڑھا دیہاتی ہاتھ میں لاٹھی لئے ادھر آنکلا، جو مولوی صاحب مناظرہ کر رہے تھے، ان سے کہنے لگا مجھے پادری صاحب سے ایک بات پوچھ لینے دیں، مولوی صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے پوچھ لو، تو مناظر کی حیثیت سے وہ دیہاتی کھڑا ہوگیا جس بیچارے کو صحیح سے بولنا بھی نہیں آتا تھا، کہنے لگا: پادری صاحب! آپ کا دعویٰ کیا ہے؟ پادری کہنے لگا کہ یسوع مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ دیہاتی کہنے لگا کہ: ایک ہی بیٹا ہے کہ اور بھی بیٹے ہیں؟ پادری صاحب کہنے لگے کہ: اکلوتا بیٹا ہے! کہا کہ: تمہارے خدا سے تو میں اچھا رہا کہ میرے گیارہ بیٹے ہیں! بس اسی پر مناظرہ ختم ہوگیا۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ: دیہاتی نے دیہاتی زبان میں بات کہی، لیکن کہی بڑی عالمانہ، وہ یہ کہ اگر اولاد ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی صفات غیر محدود ہیں، پھر بیٹے بھی غیر محدود ہوتے، اللہ کی صفات کی کوئی حد نہیں ہے، اگر اولاد ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہوتی کہ اس کے اولاد ہوتو پھر اکلوتا بیٹا کیوں ہوتا؟ ایک دیہاتی کے گیارہ ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے لامحدود بیٹے ہونے چاہئے تھے، معلوم ہوا کہ بیٹا ہونا اللہ کی صفت نہیں، اللہ تعالیٰ مالک ہے اور اللہ کے سوا باقی ساری کائنات اس کی ملکیت ہے۔

اللہ تعالیٰ مالک اور مخلوق مملوک ہے:

اللہ تعالیٰ کے درمیان اور مخلوق کے درمیان: خالق اور مخلوق کا، مالک اور مملوک کا رشتہ ہے، اور قاعدہ یہ ہے کہ باپ، بیٹا ایک دوسرے کے مالک نہیں ہوسکتے، اگر کسی کا باپ غلام ہو اور بیٹا اس غلام باپ کو خرید لے تو خریدتے ہی باپ آزاد ہوجائے گا، اور اگر کسی کا بیٹا غلام ہو اور باپ اس کو خرید لے تو خریدتے ہی بیٹا آزاد، اگر کسی کی بیوی باندی تھی، اس نے اپنی بیوی کو خرید لیا، خریدتے ہی نکاح ختم، ولدیت اور زوجیت، یہ دونوں ملکیت اور مملوکیت کے خلاف ہیں، جمع نہیں ہوسکتے، جب تم کہو گے کہ خدا کا بیٹا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا مالک نہیں ہے، یا وہ مملوک نہیں ہے، تو خدا خدا نہ رہا، اگر خدا مالک نہیں ہے تو وہ خدا نہ رہا، تو چونکہ بہت ساری قومیں اس عقیدہ ولدیت کی وجہ سے گمراہ ہوئیں اور شرک میں مبتلا ہوئیں، اس لئے فرمایا: ”لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ“ اس نے نہ کوئی بچہ جنا، اور نہ اس کے کوئی بچہ پیدا ہوا، اور نہ وہ خود کسی کے ہاں پیدا ہوا، وہ خدا ہے یعنی اس کا وجود خانہ زاد نہیں ہے۔

”وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ“ اور نہیں ہے اس کے جوڑ کا کوئی۔ جتنے بڑے سے بڑے عظیم انسان ہیں یا بڑی سے بڑی عظیم مخلوق ہے، ان کی بڑائی اپنی جگہ، لیکن نسبت خدا کے ساتھ کرو گے تو اس کا کوئی مقابلہ نہیں، خدا کے مقابلے کا کوئی نہیں، اس کے جوڑ کا کوئی نہیں، اور اس میں اس طرف بھی اشارہ فرمادیا ہے کہ بیٹا ہوتا ہے تو رشتے ہوتے ہیں، اور رشتہ جوڑ میں کیا جاتا ہے، کبھی انسانوں کا اور بندروں کا یہاں رشتہ کرتے ہوئے دیکھا؟ کبھی حیوانوں میں رشتہ کرتے ہوئے کسی انسان کو دیکھا؟ انسانوں کا اور حیوانوں کا کیا جوڑ؟ انسان کا جوڑ انسان ہوسکتا ہے، اور پھر اس میں بھی تم لوگ اونچ نیچ کیا کرتے ہو کہ فلاں برادری ہمارا جوڑ ہے، فلاں برادری ہمارا جوڑ نہیں ہے، تو کیا غضب ہے کہ خدا کے لئے رشتہ تجویز کرتے ہو مخلوق کا، حالانکہ وہ ان

سب کا خالق و مالک ہے، ''لَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ'' اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ یہ تو بھائی! شرک ہے، یعنی خدا کی ذات میں، خدا کی صفات میں، خدا کے افعال میں کسی کو شریک بنالینا اور یہ عقیدہ ولدیت بھی شرک ہے کہ نعوذ باللہ حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ خدا کے ہاں بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ خدا کے ہاں تو بیوی بھی نہیں ہے، نعوذ باللہ! اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہو گے تو حضرت مریم کو خدا کی بیوی کہنا پڑے گا، لا حول ولا قوۃ الا باللہ!

ریاکاری شرکِ خفی:

اور ایک ہے پوشیدہ شرک۔ وہ ہے ریاکاری، کل شام کو اسی کا بیان تھا۔

ریاکاری کے بھی بڑے درجات ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ریاکاری شرک ہے، کیونکہ چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفیف ہوتی ہے، اس لئے اس کا سمجھنا ہر ایک آدمی کا کام نہیں، بہرحال بچنے کا اہتمام لازم ہے۔

جو اللہ اور اس کے رسول کا عقیدہ میرا بھی وہی:

اور تیسرا مسئلہ یہ کہ جن گناہوں کا علم ہے، ان سے اللہ کی پناہ مانگو اور جو بے پتے، بغیر علم کے انجانے میں ہوجائیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہو۔

شرح فقہ اکبر میں حضرت امام ابوحنیفہؒ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''وَاِذَا اَشْکَلَ ای التبس عَلَی الْاِنْسَانِ ای من اهل الایمان شَیْءٌ مِنْ دَقَائِقِ عِلْمِ التَّوْحِیْدِ ای وَلَم یتحقق عنده حقائق مقام التفرید ومرام التمجید فَیَنْبَغِیْ لَهٗ ای یحب علیه اَنْ یَّعْتَقِدَ فِی الْحَالِ مَا هُوَ الصَّوَابُ عِنْدَ اللهِ تَعَالٰی ای بطریق الاجمال.....'' (شرح فقہ اکبر ص:۱۳۴)

ترجمہ:......"توحید کے مسائل میں اگر کسی اہل ایمان کو واضح طور پر کوئی بات معلوم نہ ہوسکے (کہ مجھے کیا موقف اختیار کرنا چاہیے، تو پھر یوں کہہ دیا کرے) کہ جو عقیدہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک درست ہے میں اسی کا قائل ہوں، بس سیدھی بات ہے۔"

مطلب یہ کہ جو عقیدہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور جو اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ عقیدہ ہے اور جو عقیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، جو عقیدہ صحابہ کرام کا تھا، اولیاء اللہ کا تھا، میں اسی عقیدے کا قائل ہوں، باقی تمام عقائد سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں، اسی طرح گناہوں کے بارے میں یوں کہے کہ جو گناہ مجھے معلوم ہیں، یا اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ میں ان میں مبتلا ہوں اور خدانخواستہ لاعلمی کی وجہ سے بے پتے کے مبتلا ہوجاؤں تو میں اس کے لئے استغفار کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مسلمان
کی
عزت وحرمت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

".....وَشَدَّ بِالْإِخْلَاصِ وَالتَّوْحِيْدِ المسلمين،
وَالْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ اِلَّا بِالْحَقِّ، لَا
يَحِلُّ اَذَى الْمُسْلِمِ اِلَّا بِمَا يَجِبُ، بَادِرُوْا اَمْرَ الْعَامَةِ
وَخَاصَّةِ اَحَدِكُمُ الْمَوْتَ، فَاِنَّ النَّاسَ اَمَامَكُمْ، وَاِنَّ مَا مِنْ
خَلْفِكُمُ السَّاعَةُ تَحْدُوْكُمْ تُخَفِّفُوْا تَلْحَقُوْا فَاِنَّمَا يَنْتَظِرُ
النَّاسُ اُخْرَاهُمْ، اِتَّقُوا اللّٰهَ عِبَادَهُ فِيْ عِبَادِهٖ وَبِـلَادِهٖ وَاِنَّكُمْ
مَسْئُوْلُوْنَ حَتّٰى عَنِ الْبِقَاعِ وَالْبَهَائِمِ اَطِيْعُوا اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ
وَلَا تَعْصُوْهُ وَاِذَا رَأَيْتُمُ الْخَيْرَ فَخُذُوْا بِهٖ، وَاِذَا رَأَيْتُمُ الشَّرَّ
فَدَعُوْهُ، وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ."

(حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۴۶۴)

ترجمہ:......"اور (اللہ تعالیٰ نے) مسلمانوں کی مدد فرمائی ہے، اخلاص اور توحید کے ساتھ، مسلمان وہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور اس کے ہاتھوں سے محفوظ رہیں مگر حق کے

ساتھ، کسی مسلمان کو ایذا دینا جائز نہیں، مگر اسی چیز کے ساتھ جو کہ واجب ہے، تمام کاموں سے اور خاص طور پر اپنے خصوصی کاموں سے پہلے موت کی فکر کرو، اس لئے کہ لوگ تم سے پہلے جا چکے ہیں اور جو تم سے پیچھے ہیں اس وقت وہ تمہارے پیچھے پیچھے آئیں گے، اپنا بوجھ ہلکا رکھو تا کہ تم پہلوں سے جا ملو، اس لئے کہ لوگ اپنے آخری انجام کا انتظار کیا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے ڈرو اس کے بندوں کے معاملے میں اور اس کے شہروں کے معاملہ میں، کیونکہ تم سے سوال کیا جائے گا زمین کے ٹکڑوں اور بہائم کے بارے میں بھی، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اس کی نافرمانی نہ کرو، خیر کو دیکھو تو اس کو پکڑ لو، شر کو دیکھو تو اس کو چھوڑ دو، اور یاد رکھو کہ تم اس وقت کو جبکہ تم کمزور تھے اور تعداد میں کم تھے۔‘‘

اخلاص کے معنی:

مسلمانوں کی تائید اللہ تعالیٰ نے اخلاص اور توحید کے ساتھ فرمائی۔

اخلاص کے معنی ہیں ہر کام اللہ کی رضا کے لئے کرنا، جس کو ہم ’’خلوصِ نیت‘‘ کہتے ہیں، ہماری زبان میں محض رضائے الٰہی کے لئے کسی کام کو کرنا یہ اخلاص کہلاتا ہے اور اسی سے عمل میں جان آتی ہے۔

اعمال تمام کے تمام بے روح اور دھڑ ہیں، جب تک کہ ان میں اخلاص کی روح نہ ہو، اور آپ جانتے ہیں کہ بغیر روح کے جسم اور دھڑ کوئی قیمت نہیں رکھتا، بلکہ دفن کر دیئے جانے کے لائق ہوتا ہے۔

توحید کا معنی:

دوسرے توحید، توحید کے معنی اللہ کو ایک ماننا اور مسلمانوں کے ساتھ کلمہ میں متحد ہونا، ان کے درمیان میں تفرق اور اختلاف نہ ہونا۔

کامل مسلمان کی تعریف:

اس کے بعد فرمایا کہ: ''مسلمان وہ ہے کہ اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔'' تمہارے ہاتھ سے اور تمہاری زبان سے کسی مسلمان کو ایذا نہ پہنچے۔

علماً فرماتے ہیں کہ مقصود اس سے یہ ہے کہ تمہارے وجود سے کسی کو نقصان نہ پہنچے، تمہارا وجود لوگوں کے لئے سراپا امن اور سلامتی کا وجود ہو اور تمہاری ذات سے کسی کو خطرہ محسوس نہ ہو، نہ تمہاری زبان سے، نہ تمہارے ہاتھ سے، نہ تمہارے کسی اور عضو سے۔

زبان اور ہاتھ سے تکلیف نہ پہنچنے کا مطلب؟

زبان اور ہاتھ دو چیزوں کو اس لئے ذکر فرمایا ہے کہ زیادہ تر ایذا رسانی، کسی کو تکلیف پہنچانا انہی دو اعضا سے ہوتا ہے، زبان کے ساتھ یا ہاتھ کے ساتھ اور اسی بنا پر یہ فرمایا گیا ہے کہ جس شخص کے یہ دو عضو مسلمانوں کو تکلیف اور نقصان نہ پہنچانے کے پابند ہوں، اس کا پورا وجود سلامتی بن جائے گا، بطورِ خاص زبان اس لئے کہ ان سے ایذا زیادہ پہنچتی ہے۔

زبان کی ایذا کا دائرہ:

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک تو زبان کا زخم تلوار کے زخم سے زیادہ گہرا ہوتا ہے، چنانچہ عربی کا مشہور شعر ہے:

جَرَاحَةُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ
وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

ترجمہ:...... ''نیزوں کے زخم بھر جاتے ہیں، لیکن زبان کا زخم، زبان کا گھاؤ نہیں بھرتا۔''

دوسرے یہ کہ ہاتھ کے چلانے کے لئے تو قوت درکار ہوتی ہے، کمزور آدمی کا ہاتھ نہیں چلتا، طاقتور کے سامنے طاقتور کا ہاتھ چلتا ہے، لیکن زبان تو کمزور کی بھی چلتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ آپ کا ہاتھ صرف اس شخص پر چل سکتا ہے جو آپ کے ہاتھ کی زد میں ہو، سامنے ہو، ہماری زبان میں کہا کرتے ہیں ''دسترس'' یہ چیز اس شخص کی دسترس میں ہے، ''دسترس'' کے معنی ہوتے ہیں ہاتھ کی پہنچ یعنی اس کا ہاتھ وہاں تک پہنچ سکتا ہے، یہ چیز میری دسترس سے باہر ہے یعنی میرے ہاتھ کی پہنچ وہاں تک نہیں جاتی، تو ہاتھ تو اسی پر چلے گا جو تمہاری دسترس میں ہو کہ وہاں تک تمہارا ہاتھ پہنچ سکے، لیکن زبان کے لئے آدمی کا سامنے ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ جو لوگ فوت ہو چکے ہیں زبان ان کے خلاف بھی چلا سکتے ہیں، جو لوگ غائب ہیں، موجود نہیں ہیں، تمہارے سامنے نہیں ہیں زبان ان پر بھی چلا سکتے ہو اور پھر یہ بھی کہ ہاتھ ایک پر چلے گا دو پر چلے گا، ایک وقت میں کتنے آدمیوں پر ہاتھ چلالو گے، کلاشنکوف ہاتھ میں ہو تو کئی آدمیوں کو نشانہ بنالو گے، لیکن غیر محدود انسانوں کو تم اس کا نشانہ نہیں بنا سکتے، جبکہ زبان جماعتوں کی جماعتوں اور لاتعداد انسانوں کو اپنی زد میں لے سکتی ہے اور ان کو زخمی کرسکتی ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان کو پہلے ذکر فرمایا:

''اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ.'' (مشکوٰۃ ص:۱۲)

ترجمہ:...... ''مسلمان وہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان

سے اور اس کے ہاتھوں سے محفوظ رہیں۔"

شر و فساد مسلمان کی شان نہیں:

"مسلمان وہ ہے" کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کی زبان سے یا جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ نہیں وہ مسلمان نہیں ہے؟ جی ہاں! وہ مسلمان نہیں ہے، یا کم سے کم کامل مسلمان نہیں ہے، مسلمان کو جیسا ہونا چاہئے تھا ویسے نہیں ہے، اگرچہ ہم ان کے خلاف کفر کا فتویٰ نہیں دیں گے، لیکن ان کو کامل مسلمان بھی نہیں کہیں گے، اس لئے "المسلم"، جس کو ہم مسلمان کہتے ہیں وہ لیا گیا "اسلام" سے اور "اسلام" کا لفظ ہے "سلامتی" سے، اسلام تو سلامتی کا مذہب ہے، سلامتی والا دین ہے کہ اس کے ذریعہ سے سلامتی کی خوشبو پھیلے اور سلامتی کا پیغام عام ہو، مسلمان وہ ہے جو سلامتی کا علمبردار ہو، شر و فساد مسلمان کی شان نہیں ہے۔

کامل مسلمان کسی کافر کو بھی ایذا نہیں دے گا:

پھر یہ جو فرمایا ہے کہ مسلمان وہ ہے کہ دوسرے مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسرے ایذا میں مبتلا ہوں، مسلمان تو اس کی ایذا سے محفوظ رہیں، لیکن غیر مسلم اس کے ظلم و ستم کا نشانہ ہوں، یہ مطلب نہیں، اس لئے کہ بتانا یہ ہے کہ اگر اس کے اندر صحیح اسلام موجود ہوتا تو سب سے پہلے مسلمان اس کی ایذا سے محفوظ ہوتے اور جب مسلمان محفوظ ہوتے تو پھر دوسروں کو بھی ایذا نہ پہنچاتا، پہلے اسلام کی مشق مسلمانوں پر ہوگی، اس کے بعد پھر دوسروں پر بھی ہوگی اور جس شخص کی زبان سے یا ہاتھ سے مسلمان بھی محفوظ نہ ہوں، اس کے بارے میں کیا توقع رکھی جاسکتی ہے کہ اللہ کی باقی مخلوق اس کے ہاتھ سے محفوظ رہے گی، یہ ترغیب دینا مقصود ہے۔

ہمارا دین ظلم وایذا رسانی کا مخالف ہے:

اور یہ بات خوب یاد رکھنی چاہئے کہ ظلم کرنا کسی پر بھی جائز نہیں ہے، خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، ہمارا دین ظلم وستم اور ایذا رسانی کا مخالف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ، فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَ، وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَ."

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۱۵۲)

ترجمہ:......"اللہ تعالیٰ نے احسان کرنا ہر چیز پر واجب فرمادیا ہے، اگر تمہیں کسی کو قتل کرنا ہو (جیسے قصاص میں مجرم کو قتل کیا جاتا ہے یا کافر کو جہاد میں قتل کیا جاتا ہے تو فرمایا) کہ اس میں بھی حسن سلوک کا معاملہ کرو (قتل میں بھی اس کی رعایت رکھو کہ بری طرح قتل نہ کرو، بلکہ اچھی طرح قتل کرو، اچھے انداز سے قتل کرو، برے انداز سے نہیں، جوڑ بند کاٹ کاٹ کر کسی کو قتل کرنا یہ ایذا رسانی ہے) اور جب کسی جانور کو ذبح کرو تو اس کو بھی اچھے طریقہ سے ذبح کرو کہ اس کو کم سے کم ایذا پہنچے، اس لئے فرمایا کہ چھری کو تیز کرلو (کند چھری سے ذبح نہ کرو، کیونکہ جانور کی رگیں نہیں کٹیں گی اور وہ بلاوجہ تڑپے گا)۔"

قتل حق کی صورتیں:

بہرکیف! اسلام سلامتی کا مذہب ہے اور مسلمان وہ ہے کہ مسلمان اس کے ہاتھ سے اور اس کی زبان سے محفوظ رہیں، "اِلَّا بِحَقٍّ" ہاں! مگر حق کے ساتھ، کسی مسلمان کو قتل کرنا پڑے تو الگ بات ہے، اس کی تشریح امیرالمؤمنین حضرت عثمان رضی

اللہ عنہ نے فرمائی تھی، اور یہ حدیث متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے، میں نے اپنے رسالہ "الشھاب المبین لرجم الشیاطین" میں ان تمام احادیث کو جمع کردیا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں "اِلَّا بِاِحْدَیٰ ثَلَاثٍ" مگر تین میں سے ایک بات کے ساتھ، مسلمان میں مسلمان ہونے کے بعد تین چیزوں میں سے ایک پائی جائے تو اس کا خون حلال ہوجاتا ہے، اور وہ کیا ہے؟

ا:......حدرجم:

ان میں سے ایک ہے: "زِنَا بَعْدَ الْاِحْصَانِ" کوئی شخص شادی شدہ ہونے کے باوجود بدکاری کرتا ہے، زنا کرتا ہے اور اس پر صحیح شہادت یا اقرار کے ذریعہ سے جرم ثابت ہوجاتا ہے تو اس کا حکم ہے "رجم" کہ اس کو سنگسار کیا جائے، یہ شریعت کا حکم ہے، اس زمانے میں بہت سے لوگ اس پر بھی اظہارِ خیال کرتے ہیں، حالانکہ یہ رجم کا حکم پہلی کتابوں میں بھی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں موجود ہے، توریت میں آج بھی موجود ہے، یہ جو بائبل لئے پھرتے ہیں، اس میں موجود ہے، ہماری شریعت میں بھی حکم ہے، خیر اس مسئلے پر مجھے گفتگو نہیں کرنی، اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو پتھر مار مار کر سنگسار کردیا جائے۔

یہاں اتنی بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ ایسا گھناؤنا اور ایسا گندہ متعفن جرم ہے کہ شریعت نے اس کے ثبوت کے لئے چار گواہوں کی شرط رکھی ہے، کسی جرم کے ثبوت کے لئے دو گواہوں سے زیادہ کی ضرورت نہیں، دو گواہ کافی ہیں، عادل، ثقہ، قابل اعتماد، لائق اعتماد دو آدمی گواہی دے دیں کہ فلاں نے فلاں کو ہمارے سامنے قتل کیا ہے اور ان کی شہادت واقعتاً قابل اعتماد ہو اور ان پر جرح نہ کی جاسکے، ان کی دیانت و امانت پر جرح نہ کی جاسکے تو جرم ثابت ہوجائے گا، اور اس شخص کو قصاصاً قتل کردیا جائے گا، اگر مقتول کے وارث اس کو معاف نہ کریں، میں ابھی اس مسئلے کو بیان

کرتا ہوں، چوری میں ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے، اس کے لئے بھی دوشہادتیں کافی ہیں، شراب میں اسّی کوڑے لگائے جاتے ہیں، شراب نوشی کے جرم پر اس کے لئے بھی دو شہادتیں کافی ہیں، کسی پر ناحق بدکاری کی تہمت لگائے تو اس کی سزا قرآن کریم میں اسّی کوڑے ذکر کی گئی ہے: "فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً." (نور:۴) تمام جرائم میں زنا ایک ایسا جرم ہے جس کے لئے چار گواہوں کی شرط ہے اور گواہ بھی سنی سنائی بات نہ کریں، ورنہ ان کی پٹائی ہوجائے گی، اسّی کوڑے لگیں گے، بلکہ اپنی عینی شہادت پیش کریں کہ ہم نے ان دونوں کو بدکاری کرتے دیکھا ہے، اپنی آنکھوں سے دیکھیں، آنکھوں دیکھی شہادت پیش کریں، اتنا سنگین جرم کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے چار گواہوں کی شرط رکھی ہے، اور پھر اتنا سخت جرم کہ اگر مرد اور عورت دونوں شادی شدہ ہوں تو دونوں کو سنگسار کیا جائے، اگر ان میں سے ایک شادی شدہ ہے اور ایک کنوارہ ہو تو جو شادی شدہ تھا اس کو سنگسار کیا جائے اور جو غیر محصن ہے، شادی شدہ نہیں ہے، اس کو سو کوڑے لگائے جائیں۔

۲:......حد ارتداد:

دوسرا جرم ہے: "وَكُفْرٌ بَعْدَ اِسْلَامٍ." اسلام لانے کے بعد کوئی شخص مرتد ہوجائے، کافر ہوجائے تو وہ واجب القتل ہے، البتہ اتنی رعایت اس کے ساتھ کی جائے گی کہ اس کو اسلام کی تلقین کی جائے گی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ایک علاقے کے گورنر تھے، وہاں سے ایک صاحب تشریف لائے، امیرالموٴمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں کے حالات پوچھنے لگے کہ کیا حال ہے لوگوں کا؟ خوش ہیں؟ لوگوں کو کوئی شکایت تو نہیں ہے؟ انہوں نے حالات بیان کئے، پھر فرمایا کہ کوئی عجیب وغریب واقعہ وہاں پیش آیا ہو؟ کہنے لگے: امیرالموٴمنین! ایک واقعہ عجیب وغریب پیش آیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ اس آدمی نے کہا کہ ایک آدمی مسلمان ہوگیا تھا، بعد میں اپنے کفر کی طرف لوٹ گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سنجیدہ ہوکر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ: پھر تم نے کیا کیا؟ کہا کہ: اس کو قتل کردیا، اور یہی سزا ہے شریعت میں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ملنے کے لئے گئے، یہ دونوں یمن کے ایک ایک علاقے کے گورنر تھے اور حاکم تھے، یہ سواری پر سوار تھے، دیکھا کہ ایک آدمی کے دونوں ہاتھ گردن پر بندھے ہوئے ہیں، پوچھا کہ اس کو کیوں کھڑا کر رکھا ہے؟ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جو ان کے میزبان تھے، جن سے ملنے کے لئے یہ آئے تھے، کہا کہ: آپ تشریف رکھئے، آپ کو بتاتے ہیں، فرمایا کہ: تشریف نہیں رکھتا، سواری سے بھی نہیں اتروں گا، پہلے بتاؤ کیا معاملہ ہے؟ کیا بات ہے؟ کہنے لگے: یہ خبیث یہودی تھا، مسلمان ہوگیا، پھر یہودی بن گیا۔ حضرت معاذؓ فرمانے لگے: ''.....قَالَ لَا اَجْلِسُ حَتّٰی یُقْتَلَ .....'' (بخاری ج:۲ ص:۱۰۲۳) ''سواری سے نہیں اتروں گا جب تک کہ اس کو قتل نہیں کردیا جاتا'' اس کی سزا یہ تھوڑی ہے کہ دھوپ میں کھڑا کرو، چنانچہ اس کو قتل کیا گیا تو یہ سواری سے اترے۔

یہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کچھ زنادقہ تھے، یہ عبداللہ بن سبا اور اس کے ساتھی تھے، حضرت امیرالموٴمنین کو اس کی شکایت کی گئی کہ یہ لوگ الٹی باتیں کرتے ہیں، نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! کہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مظہر خدا ہیں، حضرت امیرالموٴمنین نے ان کو بلوایا اور پوچھا: تم ایسی باتیں کرتے ہو؟ انہوں نے اقرار کیا، فرمایا: ایک گڑھا کھودو، ایندھن جلاؤ اور اس میں ان کو جھونک دو، چنانچہ جلادیا گیا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہے کہ:

''قَالَ اُتِیَ عَلِیٌّ بِزَنَادِقَةٍ فَاَحْرَقَھُمْ، فَبَلَغَ ذَالِکَ اِبْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ: لَوْ کُنْتُ اَنَا لَمْ اُحَرِّقْھُمْ، لِنَھْیِ رَسُوْلِ

اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تُعَذِّبُوْا بِعَذَابِ اللهِ، وَلَقَتَلْتُهُمْ لِقَوْلِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ." (صحیح بخاری ج:۲ ص:۱۰۲۳)

ترجمہ:...... "حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ان زندیقوں کو لایا گیا، آپ نے ان کو جلانے کا حکم دیا، یہ بات جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو فرمانے لگے: اگر میں ہوتا تو جلاتا نہیں، میں ان کو قتل کرتا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو اپنا دین تبدیل کردے اس کو قتل کردو۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑا عالم کون تھا؟ وہ اپنے زمانے میں سب سے بڑے عالم تھے، یہ بات ان کو پہنچی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یوں کہتے ہیں، فرمایا: "ویہ ابن عباس!" افسوس ہے ابن عباس پر! وہ مجھے پہلے بتاتے، مطلب یہ کہ حضرت نے ان کو قتل کرنے کی شکل یہ تجویز کی اور یہ سمجھا کہ ان کا جرم عام مرتد سے زیادہ سنگین ہے، اس لئے ان کو جلانا چاہئے۔ غرضیکہ کوئی مسلمان نعوذ باللہ! العیاذ باللہ! اسلام کو چھوڑ دے، مرتد ہوجائے، تو اس کی سزا قتل ہے۔

۳:......حد قصاص:

تیسری چیز جو قرآن کریم میں ذکر کی گئی ہے وہ ہے: "النفس بالنفس"، یعنی خون کا بدلہ خون، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ......" (البقرہ:۱۷۸)

ترجمہ:...... "اے ایمان والو! تم پر فرض کردیا گیا ہے

بدلہ مقتولوں کے بارے میں۔''

جان کے بدلے میں جان، لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے عجیب حکیمانہ بات فرمائی ہے: ''فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ.'' اگر اس کو معافی مل گئی، اس کے بھائی کی جانب سے، یعنی ایک قاتل ہے اپنے بھائی کا، کسی مسلمان کا، لیکن اولیاءِ مقتول راضی ہوگئے کہ ہم اس سے خون کا بدلہ خون (قصاص) نہیں لیتے، اس پر راضی ہوگئے تو خون بہا ادا کرنا چاہئے: ''فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ.'' تو اس صورت میں چاہئے کہ وہ لوگ تو اس معاوضے کے وصول کرنے میں ذرا احسان سے کام لیں، معروف طریقے سے وصول کریں اور یہ حسن طریق سے ادا کرے، قاتل عمد یعنی جان بوجھ کر کسی کو قتل کرنا اس کی سزا قصاص ہے کہ قاتل کو اس مقتول کے بدلے میں قتل کیا جائے، لیکن اگر اولیاءِ مقتول میں سے کوئی ایک بھی قصاص معاف کردے تو اس صورت میں خون بہا ادا کرنا پڑے گا، یعنی خون کی قیمت۔ جانتے ہو خون کی قیمت کتنا ہے؟ سو اونٹ ہیں، ایک آدمی کی قیمت سو اونٹ ہیں، اگر کوئی بکریوں سے دینا چاہے تو ایک ہزار بکری، روپیہ، پیسہ اور نقدی سے دینا چاہے تو دس ہزار درہم اس کی قیمت ادا کرے، سونے سے دینا چاہے تو ایک سو دینار، اس کی قیمت کم وبیش ہوجاتی ہے، غرضیکہ اولیاءِ مقتول میں سے اگر ایک آدمی معاف کردے تو قصاص نہیں لیا جاسکتا۔

حضرت عمرؓ کا مرتد کے بارہ میں حکیمانہ مشورہ:

وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ درمیان میں رہ گیا، میں دوسری طرف چلا گیا۔

پوچھنے لگے کہ کوئی نیا واقعہ پیش آیا؟ کہنے لگے کہ: ایک شخص مسلمان ہوا تھا، مرتد ہوگیا۔ کہنے لگے: تم نے کیا کیا؟ کہا کہ: قتل کردیا۔ اس پر تو (قانون کے نفاذ پر تو) اعتراض نہیں کیا، لیکن فرمایا کہ: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے!

اگر تم اس کو مہلت دیتے اور اس کو ایک کمرے میں بند کردیتے اور چوبیس گھنٹے میں ایک روٹی اس کو کھانے کے لئے دیتے، اور تین دن تک تم اس کو دعوت دیتے کہ وہ واپس آجائے تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوتا۔

تو اگر کوئی مرتد ہوجائے اس کو اسلام میں دوبارہ آنے کی دعوت دی جائے گی، اگر وہ اس کو قبول کرلے، دوبارہ مسلمان ہوجائے تو سزا معاف ہوجائے گی، لیکن یہ دعوت دینا ضروری ہے؟ لازم ہے؟ یا بہتر ہے؟ عامۂ علماؑ کے مختلف اقوال ہیں۔

حنفیہ کا قول ہے کہ اس کو واپس آنے کی دعوت دینا ضروری نہیں ہے، امام چاہے تو ویسے بھی بغیر دعوت کے قتل کرسکتا ہے، حاکم قتل کرسکتا ہے، لیکن دعوت دینا بہرحال مستحب اور بہتر ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے دل میں بات آجائے، اس کے شبہات دور کیے جائیں، معلوم نہیں کہ اس کو کیا شبہ پیش آگیا تھا؟ تین دن تک اس کو دعوت دی جائے، شبہات دور کرنے کی کوشش کی جائے، اگر تین دن کے اندر وہ کہتا ہے کہ میرے شبہات دور نہیں ہوئے اور یہ چاہتا ہے کہ اس کو مزید وقت دیا جائے تو مزید وقت بھی دیں گے، اس کی بھی اجازت ہے، لیکن اس کے باوجود بھی اس کے شبہات دور نہ ہوں تو ہم ذمہ دار نہیں ہیں، یہ نہیں کہ ہم اس کو مطمئن کریں، یہ ہماری ڈیوٹی نہیں ہے۔

میں بات کررہا تھا کہ تیسری صورت ہے قتل یعنی جان کے بدلے میں جان، یہ تین چیزیں ہیں جن کی وجہ سے کسی مسلمان کی جان لینا جائز ہے:

۱:......محصن ہونے کے باوجود زنا کرے

۲:......اسلام سے پھر کر مرتد ہوجائے

۳:......اور کسی مسلمان کو بے گناہ جان بوجھ کر قتل کردے۔

قتل کی پانچ قسمیں:

میں نے کہا ہے کہ علماؑ نے قتل کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں:

قتل عمد:

۱:......ایک ان میں سے قتل عمد ہے، قتل عمد میں قصاص ہوتا ہے یعنی خون کا بدلہ خون ہے، شرط یہ ہے کہ تمام کے تمام اولیا متفق ہوکر اس کا مطالبہ کریں، اگر ایک وارث نے کہہ دیا کہ میں معاف کرتا ہوں، اب دوسرے وارث قصاص نہیں لے سکتے، دیت لے سکتے ہیں۔

قتل شبہ عمد:

۲:......اور ایک قتل شبہ عمد کہلاتا ہے، یعنی مارا تو جان بوجھ کر، کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں مارا، لیکن کسی ہتھیار کے ساتھ یا دھار والے آلے کے ساتھ نہیں مارا، ویسے ہی کوئی ڈنڈا وغیرہ مار دیا تو وہ مرگیا۔

ہمارے عزیزوں کے گاؤں میں ایک واقعہ ہوا، شام کے وقت ایک آدمی اپنے مکان کے سامنے گلی میں بیٹھا ہوا حقے میں پانی ڈال رہا تھا، ایک دوسرا آدمی آیا اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، اس نے وہ چھڑی اس کو ماری اور اس کو وہیں ڈھیر کردیا، اس کا بوڑھا باپ زندہ تھا، اس نے تھانے میں کہا کہ: جی یہ اپنی تقدیر سے مرا ہے، میرا بیٹا اپنی تقدیر سے مرا ہے، اتنی سی چھڑی سے کوئی آدمی مرجایا کرتا ہے؟ مارنے والے نے ایک معمولی سی چھڑی ماری، پتلی سی چھڑی تھی، خدا جانے اس کے کہاں لگی؟ مرگیا، کہنے لگے کہ بس اس کا وقت آگیا تھا، ورنہ اتنی سی چھڑی سے کیا آدمی مرجاتا ہے؟ یہ اپنی تقدیر سے مرا ہے، لیکن شریعت اس صورت میں بھی سزا کا حکم کرے گی، قصاص کا نہیں، کیونکہ یہ اتنی معمولی سی چھڑی آلہ قتل نہیں ہے، البتہ یہ قتل شبہ عمد کہلاتا ہے، اور اس صورت میں دیت مغلظہ ہوگی، ایک سو اونٹ، جن میں سے پچیس ایک سال والے، پچیس دو سال والے، پچیس تین سال والے، پچیس چار سال والے، عربی میں ان کے نام بھی ہیں۔

قتل خطأ:

۳:......ایک قتل خطأ کہلاتا ہے، قتل خطأ میں بھی دیت ہے، لیکن دیت مخففہ ہے، ہلکی دیت۔ اس میں بھی ہوتے یہی سو اونٹ ہیں، مگر اس میں پانچ قسمیں کردی جاتی ہیں، خیر یہ مسائل تو بعد کی چیز ہے۔

پھر خطأ کی دو صورتیں ہوتی ہیں، خطأ کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی شکار کو نشانہ بنایا تھا، لیکن اتفاق سے گولی کسی انسان کو لگ گئی، یعنی کوئی آدمی ایسے ہی سامنے آگیا، اس کا مقصد اس کو مارنا نہیں تھا، جیسے عام طور پر پڑھتے رہتے ہیں کہ اتفاقاً گولی چل گئی ایک آدمی اپنی بندوق صاف کر رہا تھا، یا اپنا پستول صاف کر رہا تھا، اتفاقاً گولی چل گئی، یہ قتل خطأ کہلاتا ہے، اسی طرح ڈرائیوروں کے ہاتھ سے جو لوگ مرجاتے ہیں، یہ بھی قتل خطأ ہے، وہ بے چارے جان کے (دانستہ) نہیں مارتے، لیکن بے احتیاطی کرتے ہیں، ان کی بے احتیاطی سے آدمی مرگیا۔

اور قتل خطأ کی دوسری صورت یہ ہے کہ قصداً نشانہ تو اسی کو بنایا تھا، لیکن یہ سمجھا تھا کہ وہ کافر ہے، حالانکہ تھا وہ مسلمان! یعنی جہاد میں نشانہ بنایا تھا کسی کافر کو، مگر پہچان نہیں سکا، نکلا وہ مسلمان۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے والد ماجد حضرت یمان رضی اللہ عنہ بھی ایک مسلمان کے ہاتھ سے شہید ہوگئے تھے، مارنے والے کو غلطی لگ گئی یا پھر نشانہ تو بنایا تھا کسی شکار کو، لیکن پتہ نہیں چلا کہ وہ انسان ہے، نشانہ تو اسی کو بنایا لیکن پہچان نہیں سکا، یہ بھی خطأ کی شکل ہے۔

اور قرآن کریم میں قتل خطا کی تین سزائیں بیان فرمائی ہیں، عام طور پر لوگ اس معاملہ میں احتیاط نہیں کرتے، قرآن کریم کی سورۂ نسا اور پانچویں پارے میں اس کے حکم میں پورا رکوع ہے:

”وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَأً وَّمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ

...... فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ۔" (النسأ:۹۲)

یعنی کسی مؤمن سے ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی مؤمن کو قتل کردے، ہاں! غلطی ہوجانا دوسری بات ہے، اس کے بعد فرمایا کہ جو کسی مسلمان کو خطاءً قتل کردے، اس کی ایک سزا تو یہ ہے کہ دیت ادا کرے سو اونٹ...... اور دوسری سزا یہ کہ غلام آزاد کرے (پہلے زمانہ میں غلام ہوتے تھے، غلام بھی عام نہیں) مؤمن غلام کو آزاد کرے، جس کے پاس غلام نہ ہو تو دو مہینے لگاتار (پے در پے) روزے رکھے (بیچ میں ناغہ نہ کرے، نہ اختیاری ناغہ، نہ جبری ناغہ، مثلاً: روزے رکھ رہا تھا کہ درمیان میں کسی مجبوری سے ناغہ ہوگیا، یا بخار ہوگیا، تو نئے سرے سے شروع کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے: "شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ" (دو مہینے لگاتار) فرمایا ہے۔ ہاں! عورتوں کے خاص ایام مستثنیٰ ہیں، وہ جبری ہیں، من جانب اللہ ہیں۔ اور تیسرے "تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ" اللہ سے توبہ بھی کرے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خطأ ہے تو توبہ کیوں؟ اس لئے کہ خطأ میں اتنی خطأ تو ہوئی کہ اس نے احتیاط سے کام نہیں لیا، اور معاملہ انسانی جان کا ہے، تو اس کو فرمایا کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، مگر حق کے ساتھ اور یہ حق کی تشریح ہے کہ تین قسم کے خون حلال ہیں۔

سبحانک اللّٰھم وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفرک واتوب الیک

ظلم و ستم

اور

حرص

کے نقصانات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

''عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ''اِیَّاکُمْ وَالظُّلْمَ! فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ، وَاِیَّاکُمْ وَالْفُحْشَ وَالتَّفَحُّشَ! وَاِیَّاکُمْ وَالشُّحَّ! فَاِنَّمَا هَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِالشُّحِّ، اَمَرَهُمْ بِالْقَطِیْعَةِ فَقَطَعُوْا، وَاَمَرَهُمْ بِالْبُخْلِ فَبَخِلُوْا، وَاَمَرَهُمْ بِالْفُجُوْرِ فَفَجَرُوْا.'' فَقَامَ رَجُلٌ، فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللهِ! اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: ''اَنْ یَّسْلَمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِکَ وَیَدِکَ!''

فَقَالَ ذَالِکَ الرَّجُلُ اَوْ غَیْرُهُ: یَا رَسُوْلَ اللهِ! اَیُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: ''اَنْ تَهْجُرَ مَا کَرِهَ رَبُّکَ! وَالْهِجْرَةُ هِجْرَتَانِ: هِجْرَةُ الْحَاضِرِ وَهِجْرَةُ الْبَادِیْ، فَهِجْرَةُ الْبَادِیْ اَنْ یُّجِیْبَ اِذَا دُعِیَ وَیُطِیْعَ اِذَا اُمِرَ، وَهِجْرَةُ الْحَاضِرِ

اَعْظَمُهَا بَلِيَّةً وَاَفْضَلُهَا اَجْرًا.“

(الترغیب والترہیب ج:۳ ص:۳۷۹)

ترجمہ:......”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا، اس میں ارشاد فرمایا کہ: ”ظلم سے بچو! کیونکہ ظلم تاریکیاں ہوں گی قیامت کے دن، اور بدگوئی اور فحش کلامی سے بچو! اور حرص سے بچو! اس لئے کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ حرص کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ اس نے ان کو حکم کیا قطع رحمی کا، انہوں نے قطع رحمی کی۔ اس نے ان کو حکم کیا بخل کا، انہوں نے بخل کیا۔ اس نے ان کو حکم کیا بدکاری کا، انہوں نے بدکاری کی۔“

ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! کون سا اسلام افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ”جو مسلمان تیری زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔“ کسی اور آدمی نے کہا کہ: یا رسول اللہ! ہجرت کون سی افضل ہے؟ فرمایا کہ: ”تو چھوڑ دے اس چیز کو جس کو تیرا رب ناپسند کرتا ہے، اور ہجرت دو قسم کی ہوتی ہے: ایک شہری کی ہجرت اور دوسری بادیہ نشین کی ہجرت۔ بادیہ نشین کی ہجرت تو یہ ہے کہ جب اس کو بلایا جائے تو لبیک کہے، اور جب اس کو حکم دیا جائے تو وہ حکم مان لے۔ لیکن شہری کی ہجرت سب سے زیادہ آزمائش والی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برے اخلاق سے آگاہ کرنے کے لئے یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔

ظلم کا معنی و مفہوم:

"ظلم" کے بہت سارے معنی آتے ہیں، اور اس کا بہت زیادہ وسیع مفہوم ہے، لیکن یہاں "ظلم" سے مراد یہ ہے کہ کسی کی حق تلفی کرنا، کسی کا حق ادا نہ کرنا اور دوسروں کے حقوق کو اپنے ذمہ لے لینا، دنیا کا ظالم آخرت کا مفلس ہوگا، چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے:

"اَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ؟ قَالُوْا: اَلْمُفْلِسُ فِيْنَا مَنْ لَّا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ. فَقَالَ: اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِيْ مَنْ يَّأْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلٰوةٍ وَصِيَامٍ وَزَكٰوةٍ وَيَأْتِيْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا، وَاَكَلَ مَالَ هٰذَا، وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا، وَضَرَبَ هٰذَا، فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ، فَاِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ يُّقْضٰى مَا عَلَيْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ."

(مشکوٰۃ ص:۴۳۵)

ترجمہ:...... "تم مفلس کس کو سمجھتے ہو؟ لوگوں نے کہا کہ: ہم تو مفلس اس کو کہتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ اور سامان نہ ہو۔ فرمایا: "میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے، لیکن اس حالت میں آئے کہ کسی کو برا بھلا کہا تھا، کسی کی بدگوئی کی تھی، کسی کا مال کھایا تھا، کسی کی خون ریزی کی تھی، کسی کو مارا تھا، (تو وہاں روپیہ پیسہ تو ہوگا نہیں، نیکیاں ہوں گی، اس کی نماز کسی کو دے دی گئی، روزہ کسی اور کو دے دیا گیا، حج کوئی اور لے گیا، زکوٰۃ بھی کوئی اور لے گیا، غرضیکہ ناقل) اس کی نیکیوں کی قیمت لگا کر اس کے ذمہ

جو حقوق تھے وہ اور اس کے مظالم کا بدلہ ادا کیا جائے گا۔ اس کے باوجود بھی اگر حقوق پورے نہیں ہوں گے، اربابِ حقوق کے گناہ لے کر اس کے ذمہ ڈال دیئے جائیں گے، پھر اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ شخص میری امت کا مفلس ہے)۔''

ظلم و زیادتی سے آخرت کی تاریکی:

شاید ہم لوگ، لوگوں کی حق تلفی کرنے، ان پر ظلم اور زیادتی کرنے کو، عقلمندی یا ہوشیاری سمجھتے ہوں، لیکن یہ قیامت کے دن تاریکی ہوگی، راستہ پھر نظر نہیں آئے گا۔

ظلم کی تاریکی کا عجیب قصہ:

مجھے پہلے زمانے کا ایک واقعہ یاد آیا، ایک درویش تھے، تھیلی میں ان کے پاس پیسے ہوتے تھے، وہ کسی دکاندار سے کوئی چیز لیتے تو اس کے سامنے تھیلی ڈھیر کردیتے، کہتے: بھائی! اس میں سے جتنے پیسے تمہارے بنتے ہیں لے لو، باقی اس میں واپس ڈال دو! دکاندار ایسا کرلیتے۔ ایک دن چیزیں لے کر واپس آرہے تھے، تھیلی ہاتھ میں تھی، جب وہ گھر میں داخل ہونے لگے تو ایک آدمی ان کے تعاقب میں ہوگیا، گھر میں داخل ہونے سے پہلے تھیلی ان سے چھین لی، بزرگ تو گھر میں چلے گئے، اب یہ تھیلی لے کر واپس آنے لگا، تو آگے راستہ بند ہوگیا، اس کو نظر نہیں آرہا تھا کہ کس طرف جانا ہے؟ واپس آتا ہے تو راستہ نظر آتا ہے، اس طرح اس نے بہت سارے چکر لگائے، آخرکار جب اس نے دیکھا کہ یہ تھیلی میں لے کر نہیں جاسکتا تو دروازہ کھٹکھٹانے لگا، اور اس بزرگ سے کہنے لگا: باباجی! اپنی تھیلی واپس لے لو، وہ بزرگ آئے اور تھیلی لے لی، یہ واپس جانے لگا تو راستہ کھل گیا۔

ہر ایک آدمی کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا، کبھی کبھی خرقِ عادت کے طور پر ہوجاتا ہے۔

شہریوں کی جان و مال کی حفاظت حکومت کا فرض:

اب کسی کا مال لینا، کسی کے گھر ڈاکہ ڈالنا، کسی کی چوری کر لینا بہت عام بات ہوگئی ہے، یا شاید موجودہ ''کلچر'' میں داخل ہوگیا ہے، معلوم نہیں کلچر کے کیا معنی ہوتے ہوں گے؟ درمیان میں بات عرض کر دوں کہ شہریوں کے مال کی، ان کی جان کی، ان کی عزت اور آبرو کی حفاظت کرنا حکومت کا فرض ہے، اور جو حکومت شہریوں کی جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکتی اس کو اخلاقی طور پر اور شرعی طور پر حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

جان و مال کا تحفظ نہ دینے کی صورت میں ٹیکس لینا:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں ہمارے ذمی شہریوں یعنی وہ علاقے جو ہم نے فتح کر لئے تھے، وہ تمام کے تمام علاقے مسلمانوں کے زیر حفاظت تھے، اگر وہاں کوئی اس قسم کا واقعہ پیش آجاتا، کوئی لوٹ مار کر کے چلا جاتا، تو قانون یہ تھا کہ ہم مسلمان ان شہریوں سے جزیہ اور ٹیکس نہیں لے سکتے تھے، اس لئے کہ ہم جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکے، ہماری کوتاہی ہے۔ اور غیر مسلم شہری جبکہ وہ ہمارے ماتحت ہوگئے تھے، ان کی جان و مال کی حفاظت ہمارے ذمہ تھی، اور اگر کوتاہی یا غفلت کی وجہ سے یا کمزوری کی وجہ سے ہم ان کی جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکتے تو ہمیں ان سے جزیہ یا کوئی ٹیکس لینے کا کوئی حق نہیں۔

حقوق ادا کرو ورنہ:

تو خیر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دوسروں کے حقوق غصب کرنا اور ان کی حق تلفی کرنا ہم اس کو ''ہوشیاری'' اور ''دانائی'' کہتے ہوں گے، لیکن جیسے میں نے اس بزرگ کا واقعہ ذکر کیا ہے، اسی طرح قیامت کے دن سارے راستے بند ہو جائیں گے،

قیامت کے دن ''یوم الدین'' بدلے کا دن، وہاں ہر ایک کو دوسرے کے حقوق دلائے جائیں گے۔ اس لئے کسی شخص کا حق اگر تمہارے ذمہ ہو تو اس کے ادا کرنے کی فکر کرو اور تمہارا حق اگر کسی کے ذمہ رہ جائے تو فکر مت کرو، وہ محفوظ ہے، وہ تم کو ہر حال میں ملے گا۔

اسلام حقوق مانگنے کی نہیں ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے:

ہمارا دین حق ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے، جو ہمارے ذمہ حقوق ہیں ان کو ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ لوگوں کے حقوق ادا کریں اور جو حقوق لوگوں کے ذمہ ہیں ان کو یہ نہیں کہتا کہ: جاؤ جا کر حق مانگو! اس لئے کہ ان کا حق تو محفوظ ہے، دنیا میں نہیں دے گا تو آخرت میں تو دینا پڑے گا۔

اس پل پر حساب دینا چاہتے ہو یا پل صراط پر؟

اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک بادشاہ نے محل بنانا چاہا تھا، ایک بڑھیا کا چھوٹا سا گھروندا اس میں تھا اور بڑھیا سے کہا گیا: تم پیسے لے لو اور تم کو دوسری جگہ گھر لے کر دیتے ہیں، کہنے لگی کہ: میں نہیں دیتی، میں تو اس جگہ پر رہوں گی۔ بادشاہ کے حکام یا عمال نے زبردستی بڑھیا کا گھر گرا دیا، بادشاہ کا محل جو بنانا تھا۔ بادشاہ کی سواری گزر رہی تھی، پل پر سے گزری تو بڑھیا وہاں کھڑی ہوگئی، اور سواری گزرنے لگی تو بڑھیا نے اس کی لگام پکڑ لی، بادشاہ نے کہا کہ: اماں! کیا بات ہے؟ کیا چاہتی ہو؟ کہنے لگی کہ: چاہتی تو میں کچھ نہیں ہوں، تمہارا محل بنانے کے لئے ایک غریب بڑھیا کا گھروندا تمہارے حاکموں نے گرا دیا ہے، میں صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ اس کا حساب اِس پُل پر دینا ہے یا اُس پُل پر؟ میں صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں تم سے، کوئی بات نہیں منواتی، انصاف نہیں طلب کرتی، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں اس کا بدلہ یا اس کا حساب اِس پُل پر دینا ہے یا اُس پُل پر دینا ہے؟

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَّوْمَ الْقِيَامَةِ." (مشکوٰۃ ص:۴۳۴)

ترجمہ:...... "ظلم ظلمتیں ہوں گی قیامت کے دن۔"

ظلمت کے معنی ہیں اندھیرا، تاریکی، کوئی چیز نظر نہیں آئے گی، کسی کی حق تلفی نہ کرو اور اپنے نامہ عمل کو اس سے محفوظ رکھو۔

اپنا بوجھ ہلکا کرلو:

شیخ عطار رحمہ اللہ نے خوب کہا ہے، فرماتے ہیں کہ: تمہاری سواری نازک سی لگ رہی ہے، بہت نازک سواری ہے، ذرا اپنا بوجھ ہلکا کرلو، ورنہ اس بوجھ کو اٹھا کر چلنا بہت مشکل ہوجائے گا، بڑی مشکل پیش آئے گی۔ بہت ہی مبارک ہیں وہ بندے جو مرنے سے پہلے لوگوں کے حقوق ادا کردیں، معاف کروالیں، اور بہت ہی بدقسمت ہیں وہ بندے جو لوگوں کے حقوق کا پشتارا اپنی کمر پر لاد کر مریں اور وہاں ان کو حساب دینا پڑے۔

بدگوئی اور دشنام تراشی خبث باطن کی علامت:

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ بدگوئی اور دشنام طرازی، گالیاں بکنا اور دوسری بکواس کرنا، فرمایا اس سے بچا کرو۔ اس کی کوئی وجہ نہیں ذکر فرمائی، اس لئے عرب کا مشہور محاورہ ہے کہ ہر برتن سے وہی چھلکا کرتا ہے جو اس میں ہو، اگر برتن میں دودھ بھرا ہوا ہوگا تو دودھ چھلکے گا، شراب بھری ہوگی تو وہ چھلکے گی، زمزم بھرا ہو وہ چھلکے گا۔ نعوذ باللہ! گندگی بھری ہوئی ہو تو وہ چھلکے گی، تمہاری یہ زبان تمہارے دل کے برتن کو چھلکاتی ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارے دل میں کیا بھرا ہوا ہے، اس کو کہنے کی ضرورت نہیں، اگر گندگی نکلتی ہے، گالیاں بکتے ہو، اس کے معنی یہ ہیں کہ اندر گندگی بھری ہوئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تنبیہ فرماتے ہیں کہ ذرا اپنے

برتن کو ٹھیک کرو، کیونکہ جب آدمی افسردہ ہوتا ہے تو اس سے غمگین باتیں نکلتی ہیں، اور آدمی خوشی سے لبریز ہوتا ہے تو اس سے خوشی کی باتیں نکلتی ہیں۔ بھائی! تمہارے دل میں خیر ہوگی تو تمہارے منہ سے بھی کلمہ خیر نکلے گا، اور نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! گندگی بھری ہوئی ہوگی تو پھر گالیاں ہی منہ سے نکلیں گی، اور کیا منہ سے نکلے گا؟

زبان کی حفاظت کی ضرورت:

اپنی زبان کا جائزہ لو اور دیکھو کہ ہماری زبان کس طرح استعمال ہوتی ہے؟

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"اِذَا اَصۡبَحَ اِبۡنُ اٰدَمَ فَاِنَّ الۡاَعۡضَاءَ کُلَّھَا تُکَفِّرُ اللِّسَانَ، فَتَقُوۡلُ: اِتَّقِ اللّٰہَ فِیۡنَا! فَاِنَّا نَحۡنُ بِکَ، فَاِنِ اسۡتَقَمۡتَ اِسۡتَقَمۡنَا، وَاِنۡ اَعۡوَجَجۡتَ اَعۡوَجَجۡنَا."

(مشکوٰۃ ص:۴۱۳)

ترجمہ:...... "آدم کا بیٹا جب صبح کرتا ہے تو تمام اعضاء زبان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور اس کو کہتے ہیں کہ ہم تیرے تابع ہیں خدا کے لئے تو سیدھی چلی تو ہم بھی سیدھے چلیں گے، اور اگر تو ٹیڑھی چلی تو ہم بھی ٹیڑھے ہوجائیں گے۔"

زبان تو ایک کلمہ منہ سے بول کر چھپ جاتی ہے، اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا، مگر جوتے سر پر پڑتے ہیں، بھاگنا پاؤں کو پڑتا ہے، لڑائی ہاتھوں کو کرنا پڑتی ہے، معلوم ہوا کہ زبان کی ذمہ داری بھی اعضاء پر آجاتی ہے، اس لئے تو ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ خدا کے لئے سیدھے رہنا، یہ دن عافیت سے گزار لینا، تمام اعضاء ہر صبح کو منت سماجت کرتے ہیں، اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں۔

صدیق اکبرؓ کا اپنی زبان کو کھینچنا:

ایک حدیث میں ہے کہ:

"اِنَّ عُمَرَ دَخَلَ یَوْمًا عَلٰی اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِ وَھُوَ یُجَبِّذُ لِسَانَہٗ، فَقَالَ عُمَرُ: مَہْ؟ غَفَرَ اللّٰہُ لَکَ! فَقَالَ لَہٗ اَبُوْبَکْرٍ: اِنَّ ھٰذَا اَوْرَدَنِیَ الْمَوَارِدَ." (مشکوٰۃ:۴۱۵)

ترجمہ:......"حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک دن بیٹھے زبان کھینچ رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے، کہنے لگے: کیا بات ہوگئی ہے؟ فرمایا: اس نے مجھے بہت سارے گھاٹوں پر اُتارا ہے۔"

حضرت ابن عمرؓ کا زبان کی حفاظت کا انداز:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ زبان کے نیچے کنکر رکھتے تھے تاکہ جب وہ حرکت کرے تو معلوم ہوجائے کہ یہ زبان چلنے لگی ہے۔

ہمیں اس چیز کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مکمل طور پر ہمارے قبضہ میں دے دیا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ ہم کوئی بات کہنا چاہیں تو زبان بند ہوجائے، احساس ہی نہیں ہوتا، تو بھائی! اپنی زبان کی حفاظت کرنی چاہئے۔

بدزبانی اور فحش کلامی سے بچنے کی تلقین:

بدزبانی اور فحش کلامی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں فرمایا کہ:

"مَا کَانَ الْفُحْشُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَہٗ وَمَا کَانَ الْحَیَاءُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَہٗ." (مشکوٰۃ ص:۴۱۴)

ترجمہ:......"سختی جس چیز میں بھی پیدا ہوجاتی ہے، اس کو عیب دار کردیتی ہے، اور نرمی اور خوش اخلاقی جس چیز میں

بھی پیدا ہو جاتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔''

زبان میں ہڈی نہ ہونے کی حکمت:

قدرت کو سخت زبانی ناپسند ہے، ہڈی کے بغیر اللہ تعالیٰ نے زبان کو بنایا ہے، کیونکہ اس میں سختی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے، نرم گفتاری اور شیریں کلامی کی عادت ڈالو، سخت کلامی کرنا اور بدگوئی کرنا عیب ہے، اور ایک مؤمن کو سبق حاصل کرنا چاہئے۔

خیانت سے بچو:

تیسری بات فرمائی کہ خیانت سے بچو!

''خیانت'' امانت کی ضد ہے، آدمی کے دل میں امانت کا ہونا یہ اس کی صفت ہے، جس کو ہم امانت داری کہتے ہیں، اور پھر یہ اس کے مظاہر ہیں جو سامنے آتے ہیں، امانت داری کی شکلیں سامنے آتی ہیں، یہ اس کے مظاہر ہوتے ہیں، وہ امانت داری نہیں بلکہ وہ امانت داری کے نتائج ہیں، امانت داری آدمی کے دل کی ایک صفت ہے اور خیانت اس کی ضد ہے۔

امانت کے معنی:

علمائ فرماتے ہیں کہ ''امانت'' کے معنی ہیں آدمی پر اس بات کا احساس غالب ہونا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، قیامت کے دن مجھ کو اس چیز کا جواب دینا ہوگا، اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ انسان کے اعضائ جو اللہ تعالیٰ نے اس کو دیئے ہیں یہ بھی امانت ہیں، ان کا ٹھیک استعمال ہوا تو یہ امانت داری ہوئی، اور ان اعضائ کا استعمال ٹھیک نہیں ہوا تو یہ خیانت ہے۔ کسی نے آپ کے پاس کوئی چیز امانت کے طور پر رکھوائی، وہ بھی

امانت ہے، اس میں تصرف کرنے کا آپ کو حق حاصل نہیں ہے۔

کسی کی بات دوسرے کو بتلانا بھی امانت کے منافی ہے:

کسی کی راز کی بات سن کر دوسرے کو بتلانا یہ بھی امانت میں خیانت ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

"اِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ بِالْحَدِیْثِ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِیَ اَمَانَةٌ." (ابوداؤد ج:۲ ص:۳۱۲)

ترجمہ:......"جب کسی نے چپکے سے کوئی بات کہی (اور بات کرنے کے بعد پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی اور تو میری بات نہیں سن رہا) فرمایا اس کی یہ بات بھی تمہارے پاس امانت ہے۔"

جب وہ دائیں بائیں دیکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی اور کا سننا پسند نہیں کرتا، اور کسی کو سنانا نہیں چاہتا، اس نے یہ بات صرف تم کو سنائی ہے، تو یہ اس کا راز، اس کی امانت ہے۔ اگر اس کے راز کو افشا کروگے تو خیانت کے مرتکب ہوجاؤگے۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ:

"اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ، اِلَّا ثَلَاثَةَ مَجَالِسَ، سَفْکُ دَمٍ حَرَامٍ اَوْ فَرْجٌ حَرَامٌ اَوِ اقْتِطَاعُ مَالٍ بِغَیْرِ حَقٍّ."

(مشکوٰۃ ص:۴۳۰)

یعنی مجلس کے اندر جو بات کہی جائے وہ امانت ہوتی ہے، مگر تین چیزیں امانت نہیں ہیں۔ کوئی شخص گناہ کی بات کرتا ہے، کوئی بھی گناہ کا منصوبہ بناتا ہے تو تم اس کو چھپا کر نہ رکھو، اس کو ظاہر کردو۔ یا کوئی شخص ناجائز خون کرنا چاہتا ہے، کسی کو قتل کرنے کا ارادہ اور منصوبہ بنا رہا ہے، اور آپ کو معلوم ہوگیا تو یہاں خاموشی گناہ ہوگی،

یا کوئی بدکاری کا منصوبہ بناتا ہے اور آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا گناہ ہے، کوئی کسی کے مال لوٹنے کا منصوبہ بناتا ہے اور تمہارے سامنے اس کا اظہار کرتا ہے یہ بھی گناہِ کبیرہ ہے، اور اس گناہِ کبیرہ پر تم اگر اس راز کو چھپاؤ گے تو تم بھی اس کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوجاؤ گے۔ غرضیکہ کسی کا راز بھی امانت ہے، اور یہاں پر ایک چھوٹی سی بات اور بھی عرض کردیتا ہوں۔

بلااجازت کسی کا خط پڑھنا بھی خیانت ہے:

کسی کا خط اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا بھی خیانت ہے، حتیٰ کہ باپ کا خط بیٹے کو اور بیٹے کا خط باپ کو پڑھنا بھی جائز نہیں ہے۔ الّا یہ کہ باپ اس خیال سے پڑھے کہ بیٹا کسی غلط کام میں مبتلا نہ ہو، تو وہ دوسری بات ہے، کیونکہ یہ چیز اصلاح کی مد میں آگئی، ورنہ باپ کا خط بیٹے کو اور بیٹے کا خط باپ کو پڑھنا جائز نہیں، یہ بھی امانت ہے۔

نااہل کو منصب دینا یہ بھی خیانت ہے:

یہ سرکاری مناصب، عہدے جو ہمارے ہاں ریوڑیوں کے بھاؤ بکتے ہیں، یہ بھی امانت ہیں۔ حدیث شریف میں ہے:

> "جَاءَ اَعْرَابِیٌّ فَقَالَ: مَتٰی السَّاعَةُ؟ قَالَ: اِذَا ضُیِّعَتِ الْاَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ! قَالَ: کَیْفَ اِضَاعَتُهَا؟ قَالَ: اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ!"
>
> (مشکوٰۃ ص:۴۶۹)
>
> ترجمہ:...... "ایک آدمی حاضر ہوا، عرض کیا: یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب امانت ضائع کردی جائے گی تو قیامت کا انتظار کرو!

اس کی سمجھ میں بات نہیں آئی، پھر اس نے سوال کیا کہ: یا رسول اللہ! امانت کے ضائع ہونے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: جب معاملات نااہل کے سپرد کردیئے جائیں تو قیامت کا انتظار کرو!''

جو شخص کسی منصب کا اہل نہیں ہے، مگر تم وہ منصب اس کے سپرد کردیتے ہو یہ بھی خیانت ہے۔

ووٹ بھی امانت ہے:

آج کل ارکانِ اسمبلی پر بڑی تنقید ہو رہی ہے کہ ارکانِ اسمبلی مجرم ہیں سوال یہ ہے کہ جنہوں نے ان کو ووٹ دیا ہے کیا وہ مجرم نہیں؟ کہ آخر تم نے غلط آدمیوں کو کیوں ووٹ دیا تھا؟ تمہاری آنکھیں پھوٹی ہوئی تھیں؟ تم کو معلوم نہیں تھا کہ یہ بدمعاشوں کا ٹولہ ہے، یہ ملک و ملت کے دشمن ہیں، تم ان کے بیانات نہیں پڑھتے تھے؟ ان کا کردار تمہارے سامنے نہیں تھا؟ تم ایک پارٹی کو یا ایک فرد کو ووٹ دیتے ہو، تم سمجھتے ہو یہ بھی دنیاوی معاملہ ہے، اس کی کوئی مسئولیت نہیں ہوگی؟ نہیں! یہ بھی امانت ہے، اور یہ قیامت کے آثار میں سے ہے کہ تم اپنی اس امانت کو ضائع کرتے ہو۔

مسلمانوں کے اقتدار کے زوال کے اسباب:

یہ لطیفہ شاید میں نے آپ کو سنایا تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، دلّی کی جامع مسجد میں وعظ فرما رہے تھے، اس وقت انگریز کی نئی نئی عمل داری آئی تھی، ایک انگریز بھی آگیا، حضرت کا وعظ ختم ہوا تو کہنے لگا کہ: بھائی! تم اپنی نماز بعد میں پڑھ لینا، میرے ایک سوال کا جواب دو! مسجد میں کھڑے ہوکر مسلمانوں سے کہا: میرا سوال یہ ہے کہ تم ہندوستان کے آٹھ سو سال سے حکمران چلے آرہے تھے، تمہاری حکومت ختم کیوں ہوئی؟ اور ہم اتنی دور سے آکر تم پر حاکم کیوں بن گئے؟

نفری ہمارے پاس نہیں، طاقت ہمارے پاس نہیں، ہمارے اور تمہارے ملک کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے، ہم وہاں سے چل کر آئے اور تم پر حاکم بن گئے، اور تمہاری آٹھ سو سالہ حکومت ہم نے ختم کی، اس کی وجہ کیا تھی؟ لوگ بیچارے کیا جواب دیتے، وہ انگریز کہنے لگا: اس سوال کا جواب میرے پاس ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ ایسے لوگ جو حکومت چلانے کے اہل تھے وہ حجروں میں بیٹھ گئے، اور جو حکومت چلانے کے اہل نہیں تھے وہ حکومت کے ادارے میں آگئے، اس لئے یہی نتیجہ نکلنا چاہئے تھا۔

نظامِ جمہوریت کے ذریعہ اپنے سروں پر جوتے لگوانے کا انتظام:

میں نے پہلے بھی ایک دفعہ کہا تھا کہ تمہارے سر پر تمہارے ہاتھ سے جوتے لگوانے کے لئے اللہ نے یہ انتظام کر دیا ہے، جمہوریت میں یہ ووٹنگ کا جو نظام ہے ناں! میں تو اس کا ویسے ہی قائل نہیں ہوں، اقبال کے بقول:

گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

اقبال کہتا ہے اس جمہوریت پر لعنت بھیجو! اور ذرا عقل مندی سے کام لو کہ دو صد خر، دو سو گدھے جمع ہوجائیں تو وہ ایک آدمی کا کام کرلیں گے، تمہارے ملک کا نظام چلانے کے لئے ایک آدمی کافی ہے، لیکن دو سو گدھے جمع کرتے ہو، ان سے نہیں چلتا، دیانت اور امانت بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔

ہر عہدے کے لئے ڈگری شرط ہے، مگر امانت و دیانت نہیں:

میں نے ایک موقع پر ان صاحبوں کو لکھا تھا کہ تمہارے یہاں ہر عہدے کے لئے ایک خاص تعلیم شرط ہے، اتنا تعلیم یافتہ ہو، ایسی اس کے پاس ڈگری ہو تو اس کو اس عہدے پر لیا جائے گا۔ لیکن دو باتیں تم بھول گئے ہو، ایک یہ کہ تعلیم کو دیکھتے

ہو، دیانت وامانت کو تم نے کبھی نہیں دیکھا، کافر ہے؟ مسلمان ہے؟ نیک ہے بد ہے؟ اچھا ہے یا برا ہے؟ مؤمن ہے یا ملحد ہے؟ تم کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ ڈگری اس کے پاس ہونی چاہئے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ تعلیم کے اداروں میں بھی جو دراصل بچوں کا ذہن بنانے والا ادارہ کہلاتا ہے وہاں بھی تم نے صرف ڈگری کو ہی دیکھا، یہ کبھی نہیں دیکھا کہ ایک اسلامی مملکت کے نونہالوں کا ذہن بنانے والے تعلیمی ادارہ میں کیسا آدمی ہونا چاہئے؟

سوائے حاکم کے ہر چیز کے لئے معیار ہے:

دوسری بات جس کو تم بھول گئے ہو، وہ یہ ہے کہ اور تمام چیزوں کے لئے کوئی معیار نہیں، جو بھی کھڑا ہوجائے اور تمہارے ووٹ خرید لے، دھونس اور فراڈ سے یا طمع سے، جس ذریعہ سے بھی ووٹ خرید لے وہ تمہارا حاکم بن سکتا ہے، آخر کیا اندھیر ہے؟ یہ دنیا میں جو آپ تماشا دیکھ رہے ہیں یہ میرے آقا کے ارشاد کی تفسیر ہے۔ یہ چیز نااہلوں کے سپرد ہوگئی ہے، یہ شاہی باز، بڑھیا کے ہاتھ میں آگیا ہے، یہ بیچارے اس کی چونچ بھی کاٹیں گے، اس کے پنجے بھی کاٹیں گے۔

حرص اور لالچ کا فساد اور تباہ کاریاں:

چوتھی بات ارشاد فرمائی: حرص اور لالچ سے بچو!

علمأ فرماتے ہیں کہ "شُحّ" قرآن مجید میں بھی استعمال ہوا ہے، طبیعت کے بخل کو اور اس کی حرص کو "شُحّ" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ ایک بیماری ہے، اس سے بچو! اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں۔ کیسے ہلاک ہوئیں؟ اسی حرص اور بخل نے ان کو کہا کہ قطع رحمی کرو، انہوں نے قطع رحمی کرلی، بھائی بھائی کی لڑائی ہے، کیوں؟ حرص بنیاد ہے اور کچھ بھی نہیں۔ باپ بیٹے سے جدا ہے، بیٹا نافرمان بن رہا ہے، باپ اس کو عاق کر رہا ہے، کیوں؟ یہ ساری حرص کی کارفرمائی ہے، قطع رحمی کا حکم دیا اس نے تو انہوں نے قطع

رحمی کرلی، اور بخل کا حکم دیا، بخل کرلیا، اور بدکاری، گناہ گاری کا حکم دیا اس میں لگ گئے تو حرص اور لالچ اگر یہ بے قید اور بے لگام ہوجائیں تو پھر اس سے فساد پھیلتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

”وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.“ (الحشر:۹)

ترجمہ:...... ”جس کو اس کے نفس کی حرص اور طمع سے بچادیا گیا وہ کامیاب ہوگیا۔“

اسلام کا سب سے افضل عمل؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو ایک آدمی کھڑا ہوگیا کہنے لگا: یا رسول اللہ! اسلام کا کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ فرمایا: اسلام کا سب سے اونچا عمل یہ ہے کہ اہل ایمان کو تیری زبان سے اور تیرے ہاتھ سے حفاظت ہو، جس شخص کی زبان سے اور ہاتھوں سے کسی مؤمن کو امان نہ ہو، وہ کیا مسلمان ہے؟

بہترین ہجرت:

ایک اور صاحب کھڑے ہوئے، کہنے لگے: ہجرت سب سے اچھی کون سی ہے؟ ”ہجرت“ کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں، عام طور سے ”ہجرت“ کا لفظ بولا جاتا ہے وطن چھوڑ دینے کو، فرمایا کہ: سب سے اچھی ہجرت یہ ہے کہ جن چیزوں کو تیرا رب ناپسند کرتا ہے، تم ان کو چھوڑ دو۔ اور پھر فرمایا کہ: ہجرت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک شہری لوگ ہیں اور بعض دیہات میں رہتے ہیں، دیہاتیوں کی ہجرت تو یہی ہے کہ ان کو جو حکم دیا جائے اس کی اطاعت کریں، ان کو کسی کام سے بلایا جائے تو وہ لبیک کہیں، لیکن شہریوں کی ہجرت ذرا مشکل ہے، پھر فرمایا کہ مشکل بھی ہے اور ساتھ کے ساتھ اجر میں بھی بڑھی ہوئی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

کمزور اور مظلوم
کی
مدد کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"وَاَعِيْنُوا الضَّعِيْفَ وَالْمَظْلُوْمَ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِیْ سَبِيْلِ اللهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَالسَّائِلِيْنَ وَفِی الرِّقَابِ، وَارْحَمُوا الْاَرْمِلَةَ وَالْيَتِيْمَ، وَاَفْشُو السَّلَامَ، وَرُدُّوْا التَّحِيَّةَ عَلٰی اَهْلِهَا بِمِثْلِهَا اَوْ بِاَحْسَنَ مِنْهَا، وَتعاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی، وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ، وَاتَّقُوا اللهَ اِنَّ اللهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ، وَاَكْرِمُوا الضَّيْفَ، وَاَحْسِنُوْا اِلَی الْجَارِ، وَعُوْدُوا الْمَرْضٰی، وَشَيِّعُوا الْجَنَائِزَ، وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللهِ اِخْوَانًا ..... الخ." (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۰۸)

ترجمہ:......"مدد کرو کمزور کی، مظلوم کی اور ان لوگوں کی جو تاوان میں آئے ہوئے ہوں اور اللہ کے راستے میں اور مسافر کی اور مانگنے والوں کی اور گردنوں کے چھڑانے والوں کی اور رحم کرو بیوہ اور یتیم بچوں پر اور سلام کو پھیلاؤ، سلام کا جواب دیا کرو

سلام کہنے والے کو اس کی مثل یا اس سے بہتر اور ایک دوسرے
کی مدد کرو نیکی اور تقویٰ کے کام پر اور ایک دوسرے کی مدد نہ کرو
گناہ اور زیادتی کے کام پر اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ
تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں اور عزت کرو مہمان کی اور حسن
سلوک کرو پڑوسی کے ساتھ اور عیادت کرو بیماروں کی اور رخصت
کرو جنازوں کو اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو۔''

کمزور کی مدد کرنا:

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبہ کے چند فقرے ہیں۔ فرمایا کہ: کمزور کی اور مظلوم کی مدد کرو، طاقت ور آدمی کی مدد کے لئے تو ہر آدمی تیار ہوتا ہے اس کی طاقت کی وجہ سے، لیکن کمزور آدمی کی مدد کرنا اس کے ذمے ہے، جس کے دل میں اللہ کا خوف ہو۔ فرمایا: محض انسانی ہمدردی کی بنا پر کمزور کی مدد کی جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں فرمایا کرتے تھے کہ: ''اے کمزوروں کے رب!'' اللہ تعالیٰ صرف طاقتوروں کا رب نہیں، بلکہ کمزوروں کا رب ہے، کمزوروں کی مدد کرو۔

مظلوم کی مدد کرو:

اسی طرح مظلوم کی مدد کرو، جس پر ظلم ہوا ہو، ظالم کا ساتھ نہ دو، بلکہ مظلوم کا ساتھ دو، خود بھی مظلوم پر ظلم کرنے سے بچو، کسی پر ظلم کرنے سے بچو اور اگر کسی کو کسی پر ظلم کرتے ہوئے دیکھو تو اپنے امکان کی حد تک اس کی مدد کرو۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا:

''اِیَّاکَ وَدَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ! فَاِنَّمَا یَسْأَلُ اللهَ تَعَالٰی
حَقَّهٗ وَاِنَّ اللهَ لَا یَمْنَعُ ذَا حَقٍّ حَقَّهٗ۔'' (مشکوٰۃ ص:۴۳۶)

ترجمہ:...... ''مظلوم کی بددعا سے بچو! اس لئے کہ مظلوم

اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ کسی حق والے کا حق نہیں روکتے۔“

مظلوم کی دعا سیدھی عرش پر جاتی ہے اور جب مظلوم بددعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تیری ضرور مدد کروں گا، چاہے کچھ عرصہ کے بعد ہو۔ یہ اس کی حکمت ہے، بہرحال مظلوم کی بددعا رائیگاں نہیں جاتی، خاص طور پر مظلوم آدمی جو اپنا انتقام خود نہ لے سکتا ہو، اور ظالم طاقتور ہو، کمزور بیچارہ نہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے اور نہ لوگوں کو اپنی مدد کے لئے پکار سکتا ہے، نہ اس کی برادری ہے اور نہ اس کا قبیلہ ہے، ایسے بے کس اور بے بس مظلوم کی مدد کرو۔

ظلم کے سد باب کا طریقہ:

اگر لوگ ایک نکتہ کو سمجھ جائیں تو ظلم وستم کا دروازہ بند ہوجائے، وہ نکتہ یہ ہے کہ اگر میں اس مظلوم کی جگہ ہوتا اور وہ میری جگہ ہوتا تو میں اپنے لئے کیا معاملہ پسند کرتا؟ صرف اتنی سی بات سوچ لی جائے کہ ہم مظلوم پر ظلم کرتے ہیں، کمزور آدمی پر ظلم کرتے ہیں؟ یہ سوچو کہ اگر اس کے پاس طاقت ہوتی اور تم بے طاقت ہوتے اور یہ تم پر ظلم کرنا چاہتا تو تمہارا ردعمل کیا ہوتا؟ تمہارے دل کی کیفیت کیا ہوتی؟ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

”اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ.“

(مشکوٰۃ ص:۴۲۲)

ترجمہ:...... ”ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے کہ ایک مسلمان اپنے بھائی پر ظلم نہیں کرتا اور جہاں اس کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے وہاں اس کو بے مدد نہیں چھوڑتا۔“

اگر ہمارے سامنے کسی آدمی پر ظلم ہوتا ہے اور ہم اس کی مدد نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا اسلام کا رشتہ کمزور ہے۔

زیر بار لوگوں کی مدد کرو:

جو لوگ تاوان کے نیچے آئے ہوئے ہیں، ان کی اعانت کرو، کسی آدمی پر کوئی ناگہانی تاوان پڑ گیا ہو، اس کی وجہ سے وہ بے چارہ پریشان ہے تو اس کی مدد کرو۔

میرے سامنے ایسے بہت سارے معاملات آئے، ایک آدمی بڑا کھاتا پیتا تھا، لوگوں کو آگے بڑھنے کا شوق ہے، آگے بڑھا، مگر تجارت میں خسارہ ہوگیا اور لاکھوں کا زیر بار ہوگیا، اب یہ اپنے قرض خواہوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے، ایسے آدمی کی مدد کرو، جو کسی ناگہانی آفت کی وجہ سے زیر بار آگیا ہو، یا اس نے کسی کا تاوان اپنے ذمے لے لیا ہو، اس کی مدد کرو۔

فی سبیل اللہ کا مفہوم:

اللہ تعالیٰ کے راستے میں مدد کرو، ''فی سبیل اللہ'' قرآن کریم کا لفظ ہے، اور اس کی تفسیر میں علمائے کے متعدد اقوال ہیں۔

بعض نے کہا کہ جو لوگ جہاد کے لئے جا رہے ہوں اور ان کے پاس سامان جہاد کا نہ ہو، ان کی مدد کرنا یہ فی سبیل اللہ ہے۔

بعض نے کہا کہ حاجی حج کے لئے گیا تھا، کسی وجہ سے اس کا توشہ ختم ہوگیا، اس کی مدد کرنا فی سبیل اللہ ہے۔ اسی طرح دینی مدارس کے طالب علم ان کی اعانت کرنا بھی فی سبیل اللہ ہے۔

اور بعض حضرات نے اس میں تعمیم کردی ہے کہ ہر وہ کارِ خیر جو محض اللہ تعالیٰ کی خاطر کیا جاتا ہے، اس میں اعانت کرنا فی سبیل اللہ ہے، جیسے مدارس کی تعمیر، مساجد کی تعمیر۔

زکوٰۃ کا مصرف؟

لیکن یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ زکوٰۃ صرف فقیر کو دی جاسکتی ہے، پلوں کی

تعمیر میں یا ایدھی سینٹر میں زکوٰۃ نہیں لگے گی، بعض لوگ زکوٰۃ کے پیسے سے ہسپتال بنادیتے ہیں اور اس کو کارِ خیر سمجھتے ہیں، تعمیر میں زکوٰۃ نہیں لگے گی، البتہ اگر زکوٰۃ کے پیسے کی دوائیں خرید کر رکھ دی جائیں اور یہ ہدایت کردی جائے کہ صرف مستحق اور ایسے لوگ جو زکوٰۃ کے مستحق ہیں، نادار ہیں، غریب ہیں، ان کو دی جائے، تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، لیکن اس کا اطمینان ہونا چاہئے کہ وہ دوائی کسی دوسری جگہ استعمال نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں اس معاملے میں بے احتیاطی کی جاتی ہے، زکوٰۃ کا پیسہ کہاں خرچ کیا جائے؟ اس کے بارے میں احتیاط نہیں کرتے۔

حکومت کی زکوٰۃ کے مصارف میں بے احتیاطی:

میرے پاس بہت سارے خطوط آتے ہیں، تو ان میں لکھا ہوتا ہے کہ حکومت زکوٰۃ وصول کرتی ہے، تو ایک حصہ طالب علموں پر خرچ کیا جاتا ہے، طالب علموں سے مراد کالج، یونیورسٹی والے طالب علم، اور ایک حصہ باہر بھجوانے کے لئے، اس میں امیر وغریب کی تو پتہ نہیں رعایت رکھتے ہوں گے یا نہیں رکھتے ہوں گے؟ لیکن یہ شکایت ملی ہے کہ بعض مرزائی طالب علموں کو بھی اس مد سے دیا جاتا ہے۔ ہماری حکومت کے ہاں تو کوئی احتیاط ہی نہیں، اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک فرقے کے لوگ زکوٰۃ سے مستثنیٰ کئے گئے ہیں، جو مسلمان کہلاتے ہیں، لیکن اہل سنت کی جو زکوٰۃ جمع کی جاتی ہے وہ بغیر احتیاط کے ہندو، مسلم سب پر خرچ کی جاتی ہے، مرزائی پر خرچ کی جاتی ہے۔ یہ تو جو خرچ کی جاتی ہوگی اس کا حال ہے ورنہ تو اخبارات میں یہ بھی آتا ہے کہ انتخابی اخراجات پر خرچ کی جاتی ہے، استغفر اللہ! بہرحال میں نے عرض کیا کہ ''فی سبیل اللہ'' کا لفظ تو عام ہے، ہر کارِ خیر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہنا چاہئے کہ زکوٰۃ کی رقم کسی غریب کو دینا ضروری ہے، اور اس کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے، ورنہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ سے مکان بنا کر دینا:

میمن برادری میں یہ رواج ہے کہ اپنی اپنی زکوٰۃ ایک جگہ اکٹھی کرتے ہیں، اور پھر اپنی برادری کے لوگوں پر وہ تقسیم کرتے ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مکان بنا کر ان کو دیتے ہیں، بہت اچھی تجویز ہے، یہ حضرات مجھ سے مسئلہ پوچھنے کے لئے آئے، انہوں نے بتایا کہ ہم مکان کی چابی اس کو دیتے ہیں، مگر مکان کے کاغذات اس کو نہیں دیتے، اس کو بیچنے کی اجازت نہیں ہوتی، وہ مکان بیچ کر دوسری جگہ نہیں لے سکتا، گویا مالکانہ اختیارات نہیں ہوتے، میں نے کہا کہ بھائی! اگر اس کو مالکانہ حقوق نہیں دیتے، تو زکوٰۃ تو ادا نہیں ہوتی۔ کہنے لگے کہ وہ بیچ کھا کر پھر ویسے ہی ہو جائیں گے۔ میں نے کہا کہ پھر اس کا کوئی اور طریقہ اختیار کرو۔ زکوٰۃ کے پیسے کے بارے میں لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ پیسہ ہے، بس خرچ کر دیا اچھے کام پر، بس زکوٰۃ ادا ہوگئی۔ نہیں بھائی! یہ بات نہیں، فقر شرط ہے، جس کو زکوٰۃ دی جائے اس کا فقیر ہونا شرط ہے، اگر وہ آدمی فقیر نہ ہو، محتاج نہ ہو، تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔

ٹی وی والے کو زکوٰۃ دینا:

ایک کے گھر میں ٹی وی ہے اور محتاج بھی ہے، حالانکہ ٹی وی ضروریات زندگی میں شامل نہیں اور اس ٹی وی کی قیمت اتنی ہے کہ وہ صاحب نصاب ہو سکتا ہے، تو اس پر زکوٰۃ نہیں لگے گی، اور اس کو زکوٰۃ دینا ٹھیک نہیں ہے۔

مسافروں کی اعانت کرو:

اور مسافروں کی بھی اعانت کرو، ایک شخص سفر کی حالت میں ہے، کسی وجہ سے اس کے پاس توشہ ختم ہو گیا، یا کسی نے اس کی جیب کاٹ لی یا پیسے اس کے گر گئے یا اور کوئی ایسی شکل ہو گئی تو ہر چند کہ وہ اپنے گھر میں غنی ہے، مال دار ہے، اس کو زکوٰۃ اس حالت میں دینا جائز ہے۔ ابن سبیل کی اعانت بھی ضروری ہے۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ مسافر کی خدمت اور رعایت وہ شخص کرتا ہے جو خود کبھی سفر پر گیا ہو، اس کو کبھی ایسا حادثہ پیش آیا ہو، دوسرے لوگوں کو احساس نہیں ہوتا۔

پیشہ ور بھکاری کو زکوٰۃ دینا؟

اور مانگنے والوں کو بھی دو، لیکن مانگنے والے دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک حاجت مند اور ایک پیشہ ور، پیشہ وروں کو نہ دی جائے، زکوٰۃ بھی نہ دی جائے اور دوسری اعانت بھی نہ کی جائے، اور بعض اکابرؒ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ ان کو دینا حرام ہے، کیونکہ یہ اعانت للمعصیت ہے۔

اب کیسے معلوم ہو کہ یہ شخص ضرورت مند ہے یا نہیں؟ اور ضرورت کی بنا پر سوال کر رہا ہے یا بے ضرورت؟ تو بھائی! اس کا معیار تو کوئی بتایا نہیں جاسکتا، یہ تمہارے اندر کا قاضی فتویٰ دے گا، تمہارا دل کہتا ہے کہ یہ شخص ضرورت مند ہے، تو اس کو دے دو، انشاءاللہ قبول ہوجائے گی، اور اگر تمہارا دل یہ شہادت دیتا ہے کہ نہیں! یہ پیشہ ور آدمی ہے تو اس کو مت دو۔

غنی کو فقیر سمجھ کر زکوٰۃ دی تو زکوٰۃ ادا ہوگئی:

فقہ میں مسئلہ لکھا ہے کہ ایک آدمی کو فقیر سمجھتے ہوئے زکوٰۃ دے دی، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ غنی تھا، تو زکوٰۃ ادا ہوگئی۔

حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ ذکر فرمایا ہے:

''قَالَ رَجُلٌ: لَاَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهٖ فَوَضَعَهَا فِيْ يَدِ سَارِقٍ، فَاَصْبَحُوْا يَتَحَدَّثُوْنَ: تُصُدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلٰى سَارِقٍ. فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى سَارِقٍ، لَاَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهٖ فَوَضَعَهَا فِيْ

يَدِ زَانِيَةٍ. فَاَصْبَحُوْا يَتَحَدَّثُوْنَ: تُصُدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلٰى زَانِيَةٍ. فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى زَانِيَةٍ، لَاَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهٖ فَوَضَعَهَا فِيْ يَدِ غَنِيٍّ. فَاَصْبَحُوْا يَتَحَدَّثُوْنَ: تُصُدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلٰى غَنِيٍّ. فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى سَارِقٍ وَزَانِيَةٍ وَغَنِيٍّ. فَاُتِيَ فَقِيْلَ لَهٗ: اَمَّا صَدَقَتُكَ عَلٰى سَارِقٍ فَلَعَلَّهٗ اَنْ يَّسْتَعِفَّ عَنْ سَرِقَتِهٖ، وَاَمَّا زَانِيَةٍ فَلَعَلَّهَا اَنْ تَسْتَعِفَّ عَنْ زِنَاهَا، وَاَمَّا الْغَنِيُّ فَلَعَلَّهٗ يَعْتَبِرُ فَيُنْفِقُ مِمَّا اَعْطَاهُ اللهُ.'' (مشکوٰۃ ص:۱۶۵)

یعنی ایک شخص نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ: یا اللہ! میں تیری رضا کے لئے صدقہ دینا چاہتا ہوں، اس نے رات کے اندھیرے میں، تاکہ کوئی نہ دیکھے، ایک شخص کو صدقے کے پیسے دے دیئے۔ اگلے دن محلّہ میں شہرت ہوگئی کہ آج کسی غنی کو صدقہ دے دیا گیا۔ اس شخص نے کہا: یا اللہ! میں نے تو آپ کی رضا کے لئے صدقہ دیا تھا، لیکن میرا صدقہ بے محل خرچ ہوگیا ہے، اچھا! آج میں نئے سرے سے صدقہ دوں گا۔ رات کو پھر صدقہ کیا، صبح کو پھر شہرت ہوگئی کہ رات کسی نے چور کو صدقہ دے دیا، یہ اور زیادہ پریشان ہوگیا کہ میرا مال ہی ایسا ہے، بے محل خرچ ہوتا ہے۔ تیسرے دن اس نے پھر صدقہ کیا، ایک خاتون کو دیا یہ سمجھ کر کہ یہ بیچاری غریب خاتون ہے۔ اگلے دن شہرت ہوگئی ہے کہ ایک فاحشہ عورت کو صدقہ دے دیا۔ یہ بہت پریشان ہوا، اس کو ہاتف کے ذریعہ سے یا خواب میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے تینوں صدقے قبول کرلئے، تو نے تو اپنی جانب سے، اپنی دانست میں مستحق کو دیا تھا، ہوسکتا ہے کہ غنی کو اس سے عبرت ہو کہ دوسرے لوگ اس طرح چھپ کر صدقہ دیتے ہیں، مجھے بھی شرم کرنی چاہئے، وہ بھی صدقہ دینے لگے، اور ہوسکتا ہے کہ چور کو شرم آجائے کہ لوگ تو اپنا مال گھر سے لاکر رات کے اندھیرے میں دے کر جاتے ہیں اور

میں رات کی تاریکی میں لوگوں کا مال لوٹ کر لاتا ہوں، کتنی بری بات ہے! کیسی شرم کی بات ہے! تو وہ عبرت حاصل کرے اور آئندہ چوری سے باز آجائے یا تائب ہوجائے۔ اور فاحشہ عورت جو بدن فروشی کا کام کرتی ہے، اس کو عبرت ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ حلال ذریعہ سے بھی دے سکتا ہے، حرام ذریعہ سے کیوں کماؤں؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی حسن نیت کی بنا پر تینوں صدقے قبول کرلئے۔

تو میں نے عرض کیا کہ یہ تو آپ کے دل کا مفتی ہی فتویٰ دے سکتا ہے کہ یہ آدمی مستحق ہے یا نہیں؟ آپ اس کے مکمل حالات سے واقف نہیں، بہرحال اگر دل گواہی نہ دے کہ یہ مستحق ہے اور بیچارہ ضرورت کی بنا پر سوال کرتا ہے تو دو، ضرور دو، اگر دل گواہی دیتا ہے کہ نہیں یہ تو پیشہ ور ہے تو مت دو۔

گردن آزاد کرانے میں مدد کرو:

اور گردنوں کے آزاد کرانے میں بھی مدد کرو۔ معارف القرآن میں حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ''وفی الرقاب'' کا لفظ کئی صورتوں کو شامل ہے۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ پہلے زمانے میں غلام ہوتے تھے اور وہ اپنے آقاؤں سے معاہدہ کرلیتے تھے کہ تم کو اتنے پیسے دینے ہوں گے اور تم آزاد ہوجاؤ گے، ایسے شخص کو ''مکاتب'' کہا جاتا ہے، اگر کوئی ایسا غلام ہو اور اس کی مدد کی جائے تاکہ وہ جلد سے جلد آزاد ہو۔

اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی غلام کو خرید کر آزاد کردیا جائے، مگر زکوٰۃ کے پیسے سے نہیں۔

اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی مقروض ہو، قرض کی وجہ سے اس کی گردن پھنسی ہوئی ہے، اس کا قرض ادا کرنے میں اس کی مدد کرو تاکہ وہ اس بار

سے نکل جائے۔

شادی کے رسم و رواج اور جہیز کی لعنت:

یہاں ایک مسئلہ اور ذکر کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ بہت سی نادار بچیاں ہیں، جہیز کے بغیر ان کی شادی نہیں ہوتی، جہیز اور مہر کا اور نکاح کے دوسرے اخراجات کا مسئلہ ہمارے معاشرے میں بڑا پیچیدہ ہوگیا ہے، اور یہ کوتاہی ہماری ہے، ہم لوگ زمانے کی رَوِش اختیار کرنا چاہتے ہیں، لیکن اللہ کا بندہ کوئی نہیں اٹھتا جو اس زمانے کے رسوم و رواجات کی زنجیر کو توڑ کر سنت کے مطابق عقد کردے، مال کو دیکھتے ہیں اور بہت ساری چیزوں کو دیکھتے ہیں، اب تو لڑکے والے یہ دیکھتے ہیں کہ لڑکی جہیز کتنا لائے گی؟ جہیز وہ اپنے لئے لائے گی کہ تمہارے لئے لائے گی؟ جہیز تمہاری ملکیت نہیں ہے، اس بچی کی ملکیت ہے، اور اس لڑکی کی اجازت کے بغیر تمہارے لئے استعمال کرنا حرام ہے، کسی عالم سے اس کا مسئلہ تو پوچھو! والدین جو اپنی لڑکی کو جہیز دیتے ہیں، وہ اس لڑکی کی ملکیت ہے، تمہاری ملکیت نہیں، اس کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانے دے۔ مگر اب تو لوگ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ لڑکی کسی ملازمت پر ہوتا کہ ہمیں کما کر کھلائے اور بعض برادریوں میں یہ رواج ہے کہ اپنے داماد کو گاڑی بھی دیں اور بنگلہ بھی دیں دوسری جو چیزیں دی جاتی ہیں وہ تو الگ ہیں۔

ایک نکاح کے موقع پر میرا بیان ہوا تھا، میمنوں کا نکاح تھا، میں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم ...." (الاعراف:۱۵۷)

ترجمہ:...... "اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے، ان کو دور کرتے ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کی وجہ سے انسانوں کے گلے میں پڑے ہوئے رسم و رواج کے طوق اور بوجھ سب کے سب اتار دیئے اور انسانوں کو ہلکا پھلکا کر دیا تھا، چنانچہ نہایت آسانی کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے نکاح ہوتے تھے، کوئی رسم و رواج نہیں اور کوئی ایسی شرطیں نہیں، اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ نکاح کامیاب بھی ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ کی برکت سے۔ ہمارے یہاں بڑی شرطوں کے ساتھ، بڑے ارمانوں کے ساتھ اور بڑی دھوم دھام کے ساتھ، بڑے اخراجات اور مصارف کے ساتھ نکاح کئے جاتے ہیں۔ اور ان بے جا اخراجات میں ہماری بہنیں پیش پیش ہیں:

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

ان کو اس کی پرواہ نہیں ہے کہ مرد اتنے مصارف کہاں سے لائیں گے؟ حلال سے لائیں گے یا حرام سے لائیں گے؟

مگر اے کاش کہ جاہلیت کے وہی طوق جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توڑے تھے، اور جن بوجھوں کے نیچے انسانیت سسک رہی تھی، چیخ رہی تھی، چلّا رہی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر سارے بوجھ اتار دیئے تھے، ہم نے دوبارہ اپنے اوپر سب کے سب ڈال لئے، ہم اپنی بچیوں کے ہاتھ کیسے پیلے کریں؟ ان کا تو کوئی رشتہ ہی نہیں لیتا، اخلاق، شرافت، ایمان، یقین، دین داری، عفت، عصمت وغیرہ کی تو تمہارے بازار میں کوئی قدر نہیں ہے؟ کوئی قیمت نہیں ہے؟ تمہارے بازار میں کوٹھی، گاڑی، بنگلہ، مال و دولت، ان چیزوں کے سکے چلتے ہیں۔

صاحبِ نصاب دلہن کی زکوٰۃ سے مدد؟

تو خیر میں مسئلہ تو دوسرا بیان کرنے لگا تھا کہ بعض اوقات ایک بچی کا رشتہ تو طے ہو جاتا ہے، لیکن ماں باپ کے لئے جہیز کے بندوبست کرنے کی کوئی صورت نہیں

ہوتی، یا یہ کہ بچی یتیم ہے، لاوارث ہے، تو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جہاں تک کپڑے وغیرہ کا تعلق ہے یا اور چیزوں کا تعلق ہے وہ تو خیر مسئلہ ہے، لیکن زیور اور پیسہ اگر اتنا بچی کے پاس ہوجائے کہ اس کی مالیت ساڑھے باون تولے چاندی کے برابر ہوجائے تو پھر اس کو آگے زکوٰۃ دینا جائز نہیں، لہٰذا اگر اس کے پاس کسی کی اعانت کی وجہ سے تھوڑے بہت پیسے بھی ہوگئے اور کچھ تھوڑا بہت زیور بھی ہوگیا تو غنی ہوگئی، اب آپ زکوٰۃ کے پیسے سے اس کی مدد نہیں کرسکتے، لیکن چونکہ اتنے سے کام بھی نہیں چلتا، تو پھر کیا کیا جائے گا؟ اس کی تدبیر میں بتاتا ہوں:

وہ یہ کہ کوئی صاحب ان کو قرضہ دے دیں اور وہ قرضہ کرکے اپنے ضروری مصارف پورے کرلیں اور شادی کا مسئلہ حل ہوجائے، اب وہ مقروض ہوجائیں تو ان کا قرضہ ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ دے دیں، یہ مسئلہ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو بعد میں مجھ سے پوچھ لے، کیونکہ عموماً یہ باتیں لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں، اور کہتے ہیں کہ اس سے کیا فرق پڑا؟ بات تو وہیں کی وہیں رہی، نہیں بھائی! بہت کچھ فرق پڑگیا ہے۔

حیلہ کا فائدہ:

کل ہی میں ایک دکان پر تھا، وہ کچھ مسائل پوچھ رہے تھے، وہ کہنے لگے کہ لوگ تو کہتے ہیں اس حیلہ سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑا، ایسا کرلیں یا ایسا کرلیں، بات تو ایک ہی ہے۔ میں نے کہا کہ فرق تو پڑتا ہے، لیکن لوگوں کی عقل میں نہیں آتا، میں ایک مثال سے یہ مسئلہ سمجھاتا ہوں کہ: خدانخواستہ ایک لڑکے اور لڑکی کا ناجائز تعلق تھا، تو لوگ میاں جی کے پاس آگئے کہ ان کا نکاح کردو، میاں جی نے لڑکے سے کہا: ''فلاں لڑکی کا اتنے مہر کے بدلے تیرے سے نکاح کیا، تم نے قبول کیا ہے؟'' لڑکے نے کہا کہ: ''میں نے قبول کیا''، اب یہ وہی لڑکا اور وہی

لڑکی ہے، کیا فرق پڑا؟ ہاں! اتنا فرق پڑا کہ پہلے یہ لڑکی اس لڑکے کے لئے حرام تھی، اب حلال ہوگئی، پہلے اجنبی تھی، اب بیوی بن گئی، پہلے شریعت کے خلاف تھی اور ان دونوں کا ناجائز تعلق اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا تھا، اب یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذریعہ بن گئے، میاں جی نے صرف اتنا ہی کہا، اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کہا، یہ باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتیں، کہتے ہیں کہ کیا فرق پڑا؟ بھائی! فرق پڑتا ہے، تاویلات کے ذریعہ سے بھی فرق پڑتا ہے۔ مثلاً: میاں بیوی بہت اچھے گھر میں رہتے تھے، بچے بھی تھے ان کے، میاں کو نہ جانے کیا جوش آیا ایک دم کہہ دیا کہ تجھ کو تین طلاق ہے۔ کیا فرق پڑ گیا؟ وہی عورت ہے، وہی مرد ہے، ان کے بچے ہیں، ان کا گھر ہے، مگر ان الفاظ سے اب وہ میاں بیوی نہیں رہے، فرق تو پڑتا ہے ناں؟ اس لئے مسائل کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، ان کی اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، اس کے مطابق اچھی طرح عمل کیا جائے۔

بیوہ اور یتیموں پر رحم کرو:

اس کے بعد فرمایا بیوہ عورتوں پر اور یتیموں پر رحم کیا کرو۔ وہ لائق رحم ہیں جس خاتون کا سہاگ لٹ گیا ہو، وہ لائق رحم ہے، اس پر رحم کرو، اس کو بے سہارا سمجھ کر کوئی زیادتی نہ کرو، اس کی طرف غلط نظر بھی نہ اٹھاؤ۔ اسی طرح جو بچہ بغیر باپ کے رہ گیا، باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، وہ یتیم ہے، وہ اپنے باپ کی شفقت سے محروم ہوگیا، اب دوسروں کو چاہئے کہ باپ کی شفقت اس کو مہیا کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "اَنَا وَ کَافِلُ الْیَتِیْمِ کَھَاتَیْنِ." میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا اس طرح جنت میں ہوں گے، دو انگلی کو ساتھ ملا کر اشارہ فرمایا، یعنی میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ایسے اکٹھے ہوں گے جیسے یہ دونوں انگلیاں ملی ہوئی ہیں۔ یتیموں اور بیواؤں کی خدمت کرنا کسی نفسانی غرض سے نہیں، بلکہ ثواب سمجھ

کر کی جائے تو بہت اونچا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کو بہت زیادہ محبوب ہے۔

سلام کو پھیلاؤ:

اور سلام کو پھیلایا کرو، یعنی جو بھی ملے، شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، اس کو السلام علیکم کہو، چاہے تمہارا شناسا ہو یا تم سے ناآشنا ہو، حدیث میں آیا ہے:

"وَتُقْرِئُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ." (مشکوٰۃ ص:۳۹۷)

ترجمہ:...... "سلام کہو اس کو بھی جس کو تم پہچانتے ہو، اور اس کو بھی جس کو تم نہیں پہچانتے۔"

نہ جاننے کا معنی یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی جان پہچان نہیں ہے تب بھی سلام کرو۔

عبداللہ بن سلامؓ کا قصہ:

یاد ہوگا میں نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قصہ بیان کیا تھا، یہ یہودی عالم تھے، فرمایا کرتے تھے کہ جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے ہیں، میں اپنے باغ میں کھجوریں کاٹ رہا تھا۔ (آپ کو معلوم ہے کہ کھجوریں کاٹنے کا موسم کتنا سخت ہوتا ہے؟ اس سخت موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی ہے)۔ کسی نے مجھ سے آکر کہا کہ امیوں کا نبی (یہ اہل کتاب جو تھے وہ دوسروں کو امی کہتے تھے) آیا ہے۔ میں اسی شان سے جیسا کہ کسان اور زمیندار ہوتے ہیں، سر پر پگڑی باندھی ہوئی ہے، تیز دھوپ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے آپؐ کی خدمت میں پہنچ گیا اور امتحان کے لئے میں کچھ کھجوروں کا تحفہ ساتھ لے گیا، حاضر خدمت ہوا، میں نے کہا کہ: یہ صدقے کی

کھجوریں لایا ہوں، اس کو قبول فرمالیں۔ ارشاد فرمایا کہ: ہم صدقے کی چیز نہیں کھایا کرتے، ساتھیوں سے کہا کہ تم کھجور اٹھاؤ۔

"قَالَ: فَكَانَ اَوَّلُ شَیْءٍ سَمِعْتُهٗ يَتَكَلَّمُ بِهٖ اَنْ قَالَ: يَا اَيُّهَا النَّاسُ! اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامَ وَصَلُّوْا وَالنَّاسُ نِيَامٌ وَادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ." (طبقات ابن سعد ج:۱ ص:۲۳۵)

ترجمہ:......"فرماتے ہیں کہ: میں نے سب سے پہلی بات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی وہ یہ تھی، آپ فرما رہے تھے: لوگوں کو کھانا کھلایا کرو اور سلام پھیلایا کرو، اور رات کو نماز پڑھا کرو جب لوگ سو رہے ہوتے ہیں، تو جنت میں سلامتی سے داخل ہوجاؤ گے۔ یہ پہلا ارشاد تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور جب میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور دیکھا تو میں نے پہچان لیا کہ یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے۔"

بہرحال سلام پھیلانا بہت اونچی چیز ہے اور سلام "اسلام" کی علامت ہے۔

سلام کا مطلب:

علمائے فرماتے ہیں کہ السلام علیکم کے معنی یہ ہیں کہ: میری طرف سے تم پر سلامتی ہو، یعنی میری شخصیت سے، میری ذات سے تمہیں جان کا، مال کا، عزت کا، آبرو کا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہونا چاہئے، میں مسلمان ہوں اور مسلمان کی جانب سے کوئی خطرہ ہوتا بھی نہیں، منہ میں رام رام اور بغل میں چھری یہ تو ہندوؤں کا شیوہ ہے، مسلمان کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے، وہ زبان سے کہتا ہے: السلام علیکم! تو دل بھی

سلامتی والا ہوتا ہے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

"یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ. اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ." (الشعرآ:۸۸،۸۹)

ترجمہ:...... "جس دن کہ نہیں دے گا کام مال اور بیٹے، مگر وہ جو لے کر آیا دل سلامتی والا۔"

یعنی جو قیامت کے دن سلامتی والا دل لے کر جائے، وہ اس کو کام دے گیا، ایسا دل کہ جس میں کھوٹ نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی کھوٹ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی دھوکا نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ بھی دھوکا نہیں، یہ قلب سلیم ہے، جو یہ لے کر جائے گا، وہ جنت میں داخل ہوجائے گا۔

سلام کا جواب:

کوئی تم کو سلام کہے تو تم اس کو جواب دو۔ یہ قرآن کریم کی آیت کا مضمون ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا." (النسآ:۸۶)

ترجمہ:...... "جب تم کو سلام کہا جائے تو سلام کا اسی طرح جواب دے دو یا اس سے بہتر۔"

اس نے کہا: السلام علیکم! تم جواب میں کہو: وعلیکم السلام! اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ! تم جواب میں کہو: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

سلام اور جواب پر نیکیوں کی مقدار:

ایک حدیث میں ہے:

"اِنَّ رَجُلًا جَاءَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ! فَرَدَّ عَلَيْهِ ثُمَّ جَلَسَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَشْرٌ. ثُمَّ جَاءَ آخَرُ فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ! فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ، فَقَالَ: عِشْرُوْنَ. ثُمَّ جَاءَ آخَرُ فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ! فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ، فَقَالَ: ثَلٰثُوْنَ.'' (مشکوٰۃ ص:۳۹۸)

ترجمہ:...... ''ایک آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اس نے: السلام علیکم! کہا اور بیٹھ گیا، آپ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا: دس نیکیاں۔ دوسرا آیا اس نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا اور بیٹھ گیا، آپ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا: بیس نیکیاں۔ تیسرا آیا اس نے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! کہا، آپ نے اس کا اسی طرح جواب دیا اور فرمایا: تیس نیکیاں۔''

گویا صرف السلام علیکم کہنے پر دس، السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے پر بیس نیکیاں اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ پر تیس نیکیاں ملتی ہیں، اسی طرح حسب سلام اس کے جواب پر دس، بیس اور تیس نیکیاں ملتی ہیں۔

واجب سے بڑھ کر مستحب کا ثواب؟

ہماری فقہ میں ایک سوال پیش کیا جاتا ہے: بتاؤ وہ کون سا مستحب ہے، جس کا ثواب واجب سے بڑھا ہوا ہے؟ السلام علیکم کہنا مستحب اور اس کا جواب دینا واجب، لیکن جو شخص پہلے سلام کہے، اس کو بیس نیکیاں مل گئیں اور جو جواب دے اس کو دس نیکیاں مل گئیں۔

نیکی میں مدد کرو:

آگے قرآن کریم کی آیت نقل فرمائی:

"وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ." (المائدہ:۲)

ترجمہ:...... "اور نیکی اور تقویٰ کے کام پر ایک دوسرے کی مدد کیا کرو، گناہ اور ظلم و زیادتی کے کام پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔"

کوئی نیکی کرنا چاہتا ہے، کوئی تقویٰ کرنا چاہتا ہے، تو اس کا ہاتھ بٹاؤ، اس کی حوصلہ افزائی کرو، جتنی اعانت تم اس کی کرسکتے ہو، کرو، تاکہ معاشرے میں نیکی اور تقویٰ کی فضا قائم ہوسکے۔

گناہ میں کسی کی مدد نہ کرو:

اگر خدانخواستہ گناہ کا کام کرنا چاہتا ہے، یا ظلم و زیادتی کا کام کرنا چاہتا ہے، اس کی مدد نہ کرو، بلکہ جہاں تک ہوسکے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش کرو، تاکہ معاشرے میں برائی، گناہ اور ظلم و زیادتی کی فضا قائم نہ ہو، چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے:

"عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيْرٍ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ اَعْطَانِىْ اَبِىْ عَطِيَّةً، فَقَالَتْ عَمْرَةُ بِنْتُ رَوَاحَةَ لَا اَرْضٰى حَتّٰى تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّىْ اَعْطَيْتُ اِبْنِىْ مِنْ عَمْرَةَ بِنْتِ رَوَاحَةَ عَطِيَّةً فَاَمَرَتْنِىْ اَنْ اُشْهِدَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ اَعْطَيْتَ سَائِرَ وَلَدِكَ مِثْلَ

هٰذَا؟ قَالَ: لَا! قَالَ: فَاتَّقُوا اللهَ وَاعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ! قَالَ فَرَجَعَ فَرَدَّ عَطِيَّتَهٗ." (بخاری ج:۱ ص:۳۵۲)

ترجمہ:...... ''حضرت عامر شعبی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت نعمان بن بشیر سے سنا وہ منبر پر تھے، فرما رہے کہ میرے باپ نے مجھے عطیہ کیا، میری ماں کہنے لگی: میں اس وقت راضی نہیں ہوں گی جب تک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ بنالے، ان کے والد حضرت نعمان بھی صحابی ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: میری بیوی ام بشیر، (بشیر کی والدہ) کہتی ہے کہ میں بشیر کے نام ایک باغ لگوادوں، میں نے کہا کہ: ٹھیک ہے! کہنے لگی کہ میں راضی نہیں ہوتی ہوں، جب تک اس کی رجسٹری نہیں کرواتے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اس پر نہ ہوجائے، تو یا رسول اللہ! میں آپ کی خدمت میں اس لئے آیا ہوں تا کہ آپ گواہ بن جائیں میں اپنے بیٹے بشیر کو یہ عطیہ دے رہا ہوں۔ فرمایا: آخر تیری اور اولاد بھی ہے؟ کہا: جی ہاں! اولاد تو اور بھی ہے، فرمایا: تو نے ساری اولادوں کو اتنا اتنا دیا ہے؟ کہا کہ: نہیں! فرمایا: (یہ ظلم ہے اور ظلم پر میں گواہی نہیں دوں گا) اللہ سے ڈرو اور اولاد میں برابری کرو، کہا کہ وہ لوٹ آئے اور عطیہ واپس کرلیا۔''

ایک دوسری روایت میں آتا ہے آپؐ نے فرمایا: کسی اور سے گواہی دلوالو! میں گواہی نہیں دیتا۔ (حاشیہ بخاری ج:۱ ص:۳۵۲)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم چاہتے ہو کہ

تمہارے سارے بیٹے اور تمہاری ساری اولاد تمہارے ساتھ حسن سلوک میں برابر کے شریک ہوں؟ کہا کہ: جی ہاں! یہ ہی چاہتا ہوں۔ فرمایا: تو پھر تقسیم میں بھی برابری رکھو!

زندگی میں اولاد کو برابر دو:

یہاں ایک مسئلہ اور ذکر کردوں کہ اگر اپنی زندگی میں دینا ہوتو اولاد کو یعنی لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر، برابر دیا جاتا ہے، اور اگر مرنے کے بعد وراثت تقسیم ہوتو لڑکے کا دوہرا، لڑکی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

مخصوص حالات میں کسی کو زیادہ دینا:

یہ مسئلہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ کسی خاص وجہ کی بنا پر اگر اولاد کو ترجیح دے تو اس کی اجازت ہے، مثلاً ایک بچی بیوہ ہے، باپ کے گھر بیٹھی ہے، اس کو کچھ زیادہ دے دیا تاکہ اس کا ذریعہ معاش رہے، یا کوئی بیچارہ معذور ہے یا بچہ دین کی خدمت میں لگا ہوا ہے، دوسرے اپنے کھانے کمانے میں لگے ہوئے ہیں، یہ بیچارہ دین کی خدمت میں لگا ہوا ہے، اس کو زیادہ دے دیا، یا ایک اپنے والدین کی خدمت میں لگا ہوا ہے، دوسرے الگ الگ رہتے ہیں اور یہ والدین کی خدمت میں شب و روز مصروف رہتا ہے، تو اس قسم کی صورت میں ایک کو اگر ترجیح دی جائے، یعنی زیادہ دے دیا جائے تو درست ہے، لیکن بغیر کسی وجہ کے اولاد میں تفریق کرنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جور (ظلم) فرمایا ہے، اور یہ مسئلہ خوب یاد رکھنا چاہئے، ائمہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی باپ نے بلاوجہ ایسا کردیا تو اس نے ٹھیک ہی نہیں کیا، بلکہ اس بچے کی اس عطیہ پر ملکیت ہی ثابت نہیں ہوگی، لیکن ہمارے امام صاحبؒ کے نزدیک اس کی ملکیت تو ثابت ہوجائے گی، لیکن اس کا خمیازہ باپ کو قبر میں بھگتنا ہوگا، اور اگر یہ صاحبزادہ اپنے باپ کو چھڑانا چاہتا ہے، تو پھر خود انصاف کردے، باقی بہن بھائیوں کو بھی دے۔

یہ مسلمانوں کا طریقہ نہیں:

ہمارے یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ مردے کا مال جس کے قبضے میں آجائے، اس کا ہے، نہیں بھائی! یہ طریقہ درست نہیں، یہ مسلمانوں کا طریقہ نہیں ہے، مسلمان کو تو یہ دیکھنا چاہئے کہ میرا حصہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کتنا آتا ہے؟ جتنا آپ کے حصے میں آتا ہے، وہ آپ کے لئے حلال ہے، اور جو اس سے زیادہ ہے، وہ حرام ہے، اب حرام کھا کر حج کرنے جاؤ، اس سے کچھ نہیں بنے گا، حرام کھا کر صدقہ اور خیرات کرو، وہ بھی قبول نہیں ہوگا، حق حلال کا کھاؤ جو تمہارا بنتا ہے، ہاں! اگر دوسرے وارث خوشی سے تمہیں دے دیں، چھوڑ دیں، تو ٹھیک ہے، پھر کوئی حرج نہیں ہے۔ اللہ سے ڈرو! اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے، نیکی اور تقویٰ کے کام پر اعانت کرو، ایک دوسرے کے گناہ اور ظلم و زیادتی کے کام پر ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو، بلکہ ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرو، اللہ تعالیٰ سے ڈرو! اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔ نیکی کرو گے، تمہیں اس کا اجر دے گا، اور نیکی کی مدد کرو گے تو اس پر بھی اجر دے گا، گناہ یا عدوان میں مبتلا ہوگے تو سزا دے گا، اور اگر گناہ کے یا عدوان کے کام میں کسی کی اعانت کرو گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے، قیامت کا دن تو بہت دور ہے، یہیں پکڑے جاؤ گے، ذرا قبر کے منظر کو دیکھ لیا کرو، سوچ لیا کرو۔

مہمان کا اکرام کرو:

مہمان کا اکرام کیا کرو، عزت کا برتاؤ کیا کرو، شرفاء کہتے ہیں کہ اگر دشمن بھی اپنے گھر مہمان ہو جائے تو جب تک وہ تمہارے گھر میں ہے، اس کے ساتھ دشمنی کا مظاہرہ نہ کرو، تمہارے گھر سے چلا جائے پھر چاہو جو کچھ کرو۔

بعض لوگ اس قسم کے ہیں کہ ان کی تھوڑی سی چپقلش تھی، رنجش تھی، وہ گھر پر آجاتا ہے، تو دھکے دے کر نکال دیتے ہیں، یہ اہانت ہے، شرفاء کے ہاں یہ دستور نہیں

ہے، شرفاٗ کا دستور یہ ہے کہ کوئی جانی دشمن بھی تمہارے گھر پر آجائے تو اس کا اکرام کرو، مہمان تمہارے گھر آیا ہوا ہے، اس کو کوئی سخت لفظ اپنے گھر پر آنے کے بعد نہ کہو، اسی طرح پڑوسی کے ساتھ بھی حسن سلوک کرو۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

عذابِ الٰہی

سے

بچاؤ کی صورت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”.....وَاِنِّیْ لَمْ اَرَ مِثْلَ الْجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا، وَلَا كَالنَّارِ نَامَ هَارِبُهَا، وَلَا اَكْثَرَ مُكْتَسِبًا مِنْ شَیْءٍ كَسَبَهُ لِیَوْمٍ تُدَّخَرُ فِیْهِ الذَّخَائِرُ، وَتُبْلٰی فِیْهِ السَّرَائِرُ، وَتُجْتَمَعُ فِیْهِ الْكَبَائِرُ، وَاِنَّهُ مَنْ لَّا یَنْفَعُهُ الْحَقُّ یَضُرُّهُ الْبَاطِلُ، وَمَنْ لَّا یَسْتَقِیْمَ بِهِ الْهُدٰی یَجُرِ بِهِ الضَّلَالُ، وَمَنْ لَّا یَنْفَعُهُ الْیَقِیْنُ یَضُرُّهُ الشَّكُّ، وَمَنْ لَّا یَنْفَعُهُ حَاضِرُهُ فَعَازِبُهُ عَنْهُ اَعْوَزُ، وَغَائِبُهُ عَنْهُ اَعْجَزُ، وَاِنَّكُمْ قَدْ اُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ وَدُلِلْتُمْ عَلَی الزَّادِ. اَلَا! وَاِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَیْكُمْ اِثْنَانِ: طُوْلُ الْاَمَلِ وَاِتِّبَاعُ الْهَوٰی......“ (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۰۸)

ترجمہ:......”اور بے شک میں نے نہیں دیکھی جنت جیسی چیز جس کے طلب کرنے والے سو رہے ہوں، اور نہ دوزخ جیسی چیز کہ اس سے بھاگنے والے سو رہے ہوں، اور نہ اس سے

زیادہ کمائی جو آدمی نے کمایا ہو اس دن کے لئے جس میں ذخیرے جمع کئے جائیں گے، جس میں بھید ظاہر کردیئے جائیں گے، اور جس میں تمام بڑی چیزیں جمع کردی جائیں گی، جس کو حق نفع نہ دے باطل اس کو نقصان دیتا ہے اور جس شخص کو ہدایت سیدھا نہ کر سکے اس کو گمراہی کھینچ کر لے جاتی ہے، اور جس کو یقین نفع نہیں دیتا شک اس کو نقصان دیتا ہے، اور جس کو اس کا حاضر نفع نہیں دیتا تو جو چیز اس سے پوشیدہ ہے وہ اس سے زیادہ اندھا ہوگا اور جو چیز کہ اس سے غائب ہے اس کے معاملہ میں زیادہ عاجز ہوگا اور تمہیں کوچ کرنے کا حکم ہو چکا ہے اور توشہ پر تمہاری راہ نمائی کردی گئی ہے اور سب خوفناک چیزیں جن پر میں تمہارے بارے میں ڈرتا ہوں وہ دو ہیں ایک لمبی لمبی امیدیں اور دوسری خواہشات کی اتباع۔"

واقعہ کربلا کی روایات پر اعتماد:

آج میرے ساتھی کہہ رہے تھے کہ تم نے کبھی دس محرم کے بارے میں ذکر نہیں کیا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا تذکرہ نہیں کیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت یہ تو بہت بڑا سانحہ ہے، بہت بڑا المیہ ہے، لیکن اس کے بارے میں عام طور پر جو روایتیں ذکر کی جاتی ہیں، ان کو قابل اعتماد سمجھنا بڑا مشکل ہے، اس لئے کہ اس زمانے میں اخباری رپورٹر تو ہوتے نہیں تھے، اور یہ خبر رساں ایجنسیاں نہیں ہوتی تھیں، بی بی سی کا نمائندہ نہیں ہوتا تھا، وائس آف امریکا اور وائس آف جرمنی کا نمائندہ نہیں ہوتا تھا۔

میدانِ کربلا کے عینی شاہد:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے تمام رفقاءُ کے ساتھ شہید ہو گئے تھے، ایک حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ اور گھر کی مستورات بچی تھیں، اور حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کربلا کے بعد زبان بالکل بند کردی تھی، گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کے حوالے سے کوئی روایت مشکل ہی سے ملے گی۔

واقعہ کربلا کے راویوں کا حال:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ واقعہ کربلا کی اتنی بڑی جو داستان تصنیف کی گئی ہے، اس کا راوی کون ہے؟ وہ اخباری رپورٹر کون تھا؟ جو ان واقعات کو قلم بند کر رہا تھا۔ ان واقعات کے سننے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کیمرہ ان کے ساتھ تھا اور فوٹو لے رہے تھے۔ جگہ جگہ یہی یزیدی فوج کے آدمی ہوں گے، جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں آئے تھے، اور ان میں اکثریت اہل کوفہ کی تھی، اور انہی لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا تھا اور مقصود فتنہ برپا کرنا تھا، بعد میں یہ روایات تصنیف کی گئیں۔ میں پوچھتا ہوں: کیا قاتلینِ حسین کی روایات معتبر ہیں کہ یہ قصہ ہوا تھا؟ یہ لوگ من گھڑت واقعات ذکر کرتے ہیں، خود بھی روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتے ہیں، یہ ساری روایات کمرے میں بیٹھ کر تصنیف کی گئی ہیں۔

فتنہ کا معنی:

ایک بات خاص طور سے کہتا ہوں، عربی زبان میں فتنہ کہتے ہیں اس حالت کو جس میں حق و باطل کی کیفیت مشتبہ ہو گئی ہو، پتہ نہ چلتا ہو حق کیا ہے؟ باطل کیا ہے؟ سچ کیا ہے؟ جھوٹ کیا ہے؟

سانحہ مشرقی پاکستان کا پس منظر؟

مشرقی پاکستان کے سانحہ کے جو حالات اخبارات میں چھپتے رہے ہیں، اب

تو روز کے روز اخبار آتا ہے، اور روز کے روز حالات چھپتے ہیں، لیکن وہاں کے واقعات کچھ اور تھے، اور یہاں کچھ اور ذکر کئے جاتے تھے۔ حکمرانوں نے عوام کو حالات سے صحیح طور پر مطلع نہیں ہونے دیا، ایک طرف شیخ مجیب الرحمٰن کو سامنے کھڑا کرلیا اور مشرقی پاکستان والے اس کے ساتھ تھے، دوسری طرف بھٹو صاحب اور ان کی کابینہ تھی، دونوں طرف اس قسم کی خبریں پھیلا کر اشتعال پیدا کیا گیا اور نتیجہ وہ ہوا جو سب کے سامنے آیا، اب بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اصل واقعات کیا تھے؟

کراچی کے فسادات کا ذمہ دار کون؟

اسی طرح اب کراچی کے حالات آپ کے سامنے ہیں، یہاں کیا ہو رہا ہے؟ کون قوتیں لڑ رہی ہیں؟ کبھی الزام غریب مولویوں پر دھر دیا جاتا ہے، کبھی کسی پر، اور کبھی کسی پر۔ روزانہ کا اخبار آپ بھی پڑھتے ہیں، میں بھی پڑھتا ہوں، لیکن سچ کیا ہے؟ جھوٹ کیا ہے؟ ظالم کون ہے؟ مظلوم کون ہے؟ کچھ پتہ نہیں چلتا، غبار اتنا اڑا دیا گیا ہے کہ کسی کا چہرہ پہچانا ہی نہیں جاتا، اور جب یہ غبار بیٹھے گا، تم دیکھو گے کہ کرنے والوں نے کیا کردیا ہے؟ نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! اللہ تعالیٰ وہ روزِ بد نہ لائے۔ تو یہ ایک مثال ہے اس بات کی کہ پروپیگنڈہ کے ذریعہ سے حق و باطل کو اس طرح گڈمڈ کردیا جاتا ہے کہ آدمی کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ تو ان واقعات پر تبصرہ کرنے کا کیا نتیجہ ہے؟

اسلامی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات اور دس محرم:

اور ایک بات یہ کہ آج دس محرم ہے، اور اتفاق سے آج جمعہ کا دن بھی ہے، جب سے محرم شروع ہوا تھا، اسی وقت سے ڈر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ خیر کرے، جمعہ دس محرم کو آرہا ہے، ہماری بدعملی کی وجہ سے بڑا خطرناک ہے، ہم لوگ تو دس محرم کو صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حوالے سے پہچانتے ہیں کہ دس محرم کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں انسانی تاریخ کے تمام بڑے بڑے واقعات اس دس محرم کو ہوئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"..... قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیْرُ یَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَیْہِ الشَّمْسُ یَوْمُ الْجُمُعَةِ فِیْہِ خُلِقَ آدَمُ وَفِیْہِ اُھْبِطَ وَفِیْہِ تِیْبَ عَلَیْہِ وَفِیْہِ مَاتَ وَفِیْہِ تَقُوْمُ السَّاعَةُ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا وَھِیَ مُصِیْخَةٌ یَوْمَ الْجُمُعَةِ مِنْ حِیْنَ تُصْبِحُ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ شَفَقًا مِّنَ السَّاعَةِ اِلَّا الْجِنُّ وَالْاِنْسُ ..... الخ." (مشکوٰۃ ص:۱۲۰)

ترجمہ:..... "سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے، اسی میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی، اور اس میں آسمان سے اتارے گئے اور اسی میں ان کی توبہ منظور ہوئی اور اس میں ان کی موت ہوئی، اور اسی میں قیامت قائم ہوگی، (قیامت کا صور جب پھونکا جائے گا، محرم کی دس تاریخ اور جمعہ کا دن ہوگا)۔ اور جب جمعہ کا دن ہوتا ہے (ان کو یہ تو معلوم نہیں کہ تاریخ کیا ہے) تو تمام چرند پرند نہایت پریشان ہوتے ہیں کہ کہیں آج قیامت تو نہیں آرہی؟" جب سورج طلوع ہوجاتا ہے اور دن شروع ہوجاتا ہے تو ان کو سکون ہوجاتا ہے کہ آج کا دن خیریت کے ساتھ گزر گیا۔ صرف ایک انسان اور جن غافل ہیں، ان کے علاوہ ساری مخلوق کو پریشانی ہوتی ہے کہ قیامت تو نہیں آرہی؟"

شہادتِ حسینؓ دس محرم کی تاریخ کا پہلا واقعہ نہیں:

تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اس دن شہادت یہ تاریخ کا پہلا واقعہ نہیں

ہے، بلکہ کچھ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی ایسی ہے کہ تاریخ کے بڑے بڑے واقعات اسی دن ہوئے ہیں۔

انقلابات کے تین موسم:

میں نے تین چیزوں کو خاص طور پر نوٹ کیا ہے، جہاں تک اپنی عقل کام کرتی ہے:

۱:......ایک تو رمضان المبارک فیصلے لے کر آتا ہے، اب جو وقت گزرتا ہے، عجیب وغریب انقلاب لاتا ہے۔

۲:......ایک موسم حج بڑی عجیب وغریب کیفیات لے کر آتا ہے، جب گزرتا ہے تو عجیب وغریب انقلابات پیدا ہوتے ہیں، اور ان کی عملی تکمیل ہوتی ہے۔

۳:......اور ایک دس محرم کہ اس دن سے عظیم واقعات وسانحات کی تاریخ وابستہ ہے اور آئندہ بھی ہولناک مناظر اس دن سے منسلک بتلائے گئے ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہمارے لئے قضاؤ قدر کے فیصلے کیا ہو رہے ہیں؟

مقصد کی بات:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جانب جو واقعات منسوب کئے گئے ہیں، ان واقعات کو ذکر کر کے رونا اور رلانا اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہے، تمہارے مقصد کی بات تو یہ ہے کہ اس دن، اس تاریخ کو تمہارے حق میں کیا فیصلے ہوتے ہیں؟ اور کیا فیصلے ہو رہے ہیں؟ اور انسانی تاریخ کے بارے میں کیا فیصلے کئے جا رہے ہیں؟ اور یہ میں عرض کئے دیتا ہوں کہ تمہارے اعمال جیسے اوپر جائیں گے، ویسے ہی فیصلے اوپر سے نیچے آئیں گے۔

جیسی رعایا ویسے حکمران:

ایک صاحب نے دو دن پہلے خط لکھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ جیسے عوام ہوتی ہے، رعایا ہوتی ہے، ویسے ان پر حکمران مسلط کئے جاتے ہیں؟ میں نے جواب میں لکھا تھا کہ صحیح ہے! قرآن وحدیث سے اس کا ثبوت موجود ہے، آٹھویں پارے میں ہے:

"وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ." (الانعام:۱۲۹)

ترجمہ:......"اسی طرح مسلط کیا کرتے ہیں بعض ظالموں کو بعض پر بسبب ان بدعملیوں کے جو وہ کرتے تھے، اور بسبب اس کے جو وہ کماتے تھے۔"

ان کی کمائی کی بدولت جس قسم کے اعمال بندوں کے بگڑتے یا سنورتے ہیں، اس قسم کے حاکم، اللہ تعالیٰ ان پر مسلط کرتے ہیں، ان ظالموں کو ظلم کا مزہ چکھانے کے لئے۔ مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث قدسی ہے:

"اِنَّ اللهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ: اَنَا اللهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا مَالِكُ الْمُلُوْكِ وَمَلِكُ الْمُلُوْكِ، قُلُوْبُ الْمُلُوْكِ فِيْ يَدِيْ، وَاِنَّ الْعِبَادَ اِذَا اَطَاعُوْنِيْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَ مُلُوْكِهِمْ عَلَيْهِمْ بِالرَّحْمَةِ وَالرَّاْفَةِ، وَاِنَّ الْعِبَادَ اِذَا عَصَوْنِيْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَهُمْ بِالسُّخْطَةِ وَالنِّقْمَةِ فَسَامُوْهُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ فَلَا تَشْغَلُوْا اَنْفُسَكُمْ بِالدُّعَاءِ عَلَى الْمُلُوْكِ وَلٰكِنِ اشْغَلُوْا اَنْفُسَكُمْ بِالذِّكْرِ وَالتَّضَرُّعِ كَيْ اَكْفِيَكُمْ." (مشکوٰۃ ص:۳۲۳)

ترجمہ:......میں اللہ ہوں! میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں بادشاہوں کا بادشاہ ہوں، بادشاہوں کے قلوب میرے ہاتھ میں ہیں۔ لوگ جب میری اطاعت کرتے ہیں تو بادشاہوں کے

دلوں کو پھیر دیتا ہوں، وہ ان سے شفقت اور نرمی سے پیش آتے ہیں، اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو بادشاہوں کے دلوں کو سختی اور ظلم کی طرف پھیر دیتا ہوں، پھر لوگ حکمرانوں کو بددعائیں دیتے ہیں۔ اے میرے بندو! تم اپنے حاکموں کو گالیاں نہ دو، تمہارے حاکم اگر ظالم ہیں تو میری طرف التجا کرو تم ٹھیک ہو جاؤ گے، تو تمہارے حاکموں کو بدل دوں گا۔"

اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ: "کَمَا تَکُوْنُوْنَ کَذَالِکَ یُؤَمَّرُ عَلَیْکُمْ." (مشکوٰۃ ص:۳۲۳) تم جیسے ہوگے ویسے امیر اور حاکم سپرد کئے جائیں گے، ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ ضرور ملتا ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث شریف میں ہے:

"اِنَّ اللهَ تَعَالٰی لَیُمْلِیَ الظَّالِمَ حَتّٰی اِذَا اَخَذَهٗ لَمْ یَفْلِتْهُ." (مشکوٰۃ ص:۴۳۴)

ترجمہ:......"اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتے ہیں، یہاں تک کہ جب اس کو پکڑتے ہیں تو پھر اس کو چھوڑتے نہیں ہیں۔"

دیکھنے والوں کو ان پر ترس آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی گرفت سے وہ بچ نہیں سکتے۔

عذابِ الٰہی سے بچاؤ کی صورت:

اصل چیز تو ہمارے لئے لائق توجہ اور لائق اعتماد یہ ہے کہ ہم اپنے اعمال کو ٹھیک کریں، چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

"فَلَوْ لَا کَانَتْ قَرْیَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَا اِیْمَانُهَا اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ، لَمَّا اٰمَنُوْا کَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ." (یونس:۹۸)

ترجمہ:......''پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟ کہ کوئی بستی ایمان لے آئی ہوتی اور اس کے ایمان نے اس کو نفع پہنچایا ہوتا سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے، جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان کو دنیا کی زندگی میں نفع پہنچایا، (آیا ہوا عذاب ٹال دیا کیونکہ سچے دل سے مسلمان ہوگئے تھے)۔''

حضرت یونس علیہ السلام تو یہ کہہ کر بستی سے نکل گئے کہ اتنے دن کے بعد تم پر عذاب آجائے گا، کافر مذاق اڑاتے رہے اور حضرت یونس علیہ السلام نے جو وقت مقرر کیا تھا، ہر چند کہ اپنے اجتہاد سے کیا تھا، وحی الٰہی سے نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کی لاج رکھتے ہیں، ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات غلط نہیں ہونے دیتے، چنانچہ عین اس دن جس دن حضرت یونس علیہ السلام نے کہا تھا کہ تم پر عذاب آجائے گا، عذاب آیا، جب عذاب کے آثار نمودار ہوئے تو پوری قوم کو اس طرف توجہ ہوئی کہ یہ تو عذابِ الٰہی ہے، حضرت یونس علیہ السلام ٹھیک کہتے تھے، پریشان ہوئے، اپنے بڑے بوڑھوں سے پوچھا، انہوں نے کہا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو تلاش کرو، حضرت یونس علیہ السلام بستی سے جاچکے تھے، بالآخر ان بڑے بوڑھوں نے کہا کہ اگر حضرت یونس علیہ السلام نہیں ہیں تو سچی توبہ کرلو! سارے لوگ، کیا مرد کیا عورتیں، کیا بچے، میدان میں نکل گئے اور سب کے حقوق معاف کروائے حتیٰ کہ اگر کسی نے کسی کا شہتیر اپنی چھت میں لگایا ہوا تھا وہ اکھاڑ کر اس کو واپس کردیا، تمام مظالم سے تائب ہوگئے اور حضرت یونس علیہ السلام کے حق میں جو بے ادبیاں کی تھیں، ان سے تائب ہوگئے، سچی توبہ کرلی، اللہ تعالیٰ نے ان کی سچی توبہ قبول فرماتے ہوئے ان سے عذاب ٹال دیا، ''لَمَّا اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے رسوائی کا عذاب ٹال دیا اس دنیا کی زندگی میں۔

قومِ یونس کی سی دانش مندی کی ضرورت ہے:

اے کاش! کہ کراچی والے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم جیسی دانش مندی کا مظاہرہ کرتے اور اپنے گناہوں سے تائب ہوجاتے، جس نے جس پر کوئی ظلم و زیادتی کی ہے، اس ظلم و زیادتی سے تائب ہوجائیں اور معافی مانگیں! خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج عذاب ٹل سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عنایت حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے ساتھ تم سے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہیں ہے، ارشادِ الٰہی: "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" کے مصداق تم خیر امت ہو اور خیر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر الامم ہو۔

توبہ نہ کی تو ہلاک ہوجائیں گے:

لیکن جب توبہ ہی نہ کرو اور اپنی اصلاح ہی نہ کرو، اپنی روش ہی نہ بدلو، تو پھر تم کو تمہارے ہاتھوں سے ہلاک کروائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے، ہمارے اعمال اتنے بگڑ گئے ہیں کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور کسی کی بھی عقل میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ بے نظیر بھٹو کہتی ہے کہ معاملہ میرے قابو سے باہر ہے، اور دوسرے لوگ جو ذمہ دار ہیں وہ سب عاجز آچکے ہیں، کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ عذابِ الٰہی کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلے گی، یہ عذابِ الٰہی ہے!

کراچی عذاب کیوں؟

تم کہو گے کہ عذاب صرف کراچی والوں کے لئے ہے، باقی دنیا بھی تو ایسی ہے؟ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ کراچی پاکستان کا دل ہے، دل پر گولی چلادی جائے تو

آدمی ختم ہوجاتا ہے، اس پورے ملک کا دوتہائی خرچ یہ تنہا کراچی اٹھا رہا ہے، اور اس شہر کے بارے میں مشہور تھا کہ بھوکوں، ننگوں کا مائی باپ ہے۔ جس کو روزگار نہیں ملتا تھا، وہ یہاں آجاتا تھا، اللہ تعالیٰ کچھ نہ کچھ روزگار اس کو عطا فرما ہی دیتے، چند ہی سالوں میں اس کی آبادی پچاس لاکھ سے بڑھ کر ایک کروڑ سے اوپر ہوگئی ہے۔

یہ گوشمالی ہے:

لیکن جب کسی کو امن اور عیش پسند نہ آئے اور وہ جامے سے نکل جائے، تو پھر اللہ تعالیٰ تھوڑی سی گوش مالی فرماتے ہیں، تھوڑی سی سزا دیتے ہیں، اور اب یہ سزا شاید ایسی ہوچکی ہے کہ خاکم بدہن! شاید یہ شیاطین مغرب نے ہمارے اس ملک کے توڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور تمہارے ہاتھوں سے کروا رہے ہیں، کون سنتا ہے بول درویش! مشہور ہے درویش کی بات کون سنتا ہے؟

اس بندر بانٹ کا نتیجہ؟

یہ پیپلز پارٹی والے ہوں، ایم کیو ایم والے ہوں یا حقیقی والے ہوں یا مجازی والے ہوں یا اور کوئی دوسرے تیسرے ہوں، میں آج انتباہ کرتا ہوں سب کو کہ تمہاری اس بندر بانٹ کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ روٹی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی، تم آپس میں لڑتے رہو گے، قربانیاں تمہاری ہوئیں، ڈیڑھ سال میں سولہ سو آدمی قتل ہوچکے ہیں، یہ اخباری رپورٹ ہے، ورنہ مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے، کتنے بھوکے مرے، لوگوں کو کتنی اذیتیں پہنچائی گئیں، کوئی حد ہے؟

کسی کو کچھ نہ ملے گا:

تم لڑتے رہو، ایک دوسرے کو مارتے رہو اور اپنے حقوق کی جنگ لڑتے رہو، نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا، بلکہ کوئی اور لے کر چلا جائے گا، سازشوں کے پلان تیار ہوچکے ہیں، منصوبے بنائے جاچکے ہیں، نقشے مرتب ہوچکے ہیں، اور

تمہیں دست و گریباں کر دیا گیا ہے کہ تم آپس میں لڑو۔

ملک ہوگا تو حقوق ملیں گے:

میں کہتا ہوں کہ ملک ہوگا تو تمہیں حقوق بھی ملیں گے، زیادہ نہ ملے تھوڑے تو مل ہی جائیں گے، چلو نہ ملے، نہ سہی، ملک تو رہے گا، خدا کے لئے اس لڑائی کو بند کرلو، یہ جتنے متعلقہ طبقے ہیں، میں ایک ایک فرد سے کہتا ہوں، حکومت سے لے کر نیچے والوں تک، ایک وقت آئے گا تم کہو گے کہ ٹھیک کہتا تھا، آج شاید تم لوگوں کو میری بات بری لگے، شاید تمہاری سمجھ میں نہ آئے، کل کو تم بھی کہو گے: ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید!'' قلندر جو کچھ کہتا تھا، ٹھیک کہتا تھا۔

بھائی بھائی بن جاؤ:

خدا کے لئے سارے کے سارے تائب ہو جاؤ اور آپس میں ایک دوسرے سے جو زیادتیاں ہوئی ہیں، معاف کروالو، آج بھی یہ عذابِ الٰہی ٹل سکتا ہے، ورنہ کوئی تدبیر، کوئی قوت، کوئی بھی پولیس، کوئی بھی فوج اس عذاب کو نہیں ٹال سکتی، صرف ایک ہی راستہ ہے اور یہ تمہیں سمجھ میں نہیں آتا، اللہ کرے کہ یہ تمہاری سمجھ میں آجائے۔ اقتدار کی ہوس یا حقوق کی جنگ یا بڑے چھوٹوں کا ہوّا کھڑا کیا ہوا ہے، اس کو چھوڑ دو خدا کے لئے! جس نے کسی پر زیادتی کی ہے، ظالم معافی مانگ لیں مظلوم سے، اور آپس میں گلے مل جاؤ، بھائی بھائی بن جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تائب ہو جاؤ، یہ عذابِ الٰہی ٹل جائے گا۔

اشتعال دلانا آسان ہے، آگ بجھانا مشکل ہے:

تو ہمارے لئے تو اس تاریخ کے آنے سے یہ عبرت ہے کہ ہم اپنے اعمال کو دیکھیں، انفرادی اعمال کو بھی اور اجتماعی اعمال کو بھی، جذبات کو اشتعال دلانا بڑا آسان ہے، لیکن لگی ہوئی آگ کو بجھانا بڑا مشکل ہے، اپنی جان پر کھیل کر خدا کے

لئے اس عذاب کو، اس آگ کو بجھاؤ! مزید تیل چھڑکنے کی کوشش نہ کرو! تو دوستوں کی فرمائش پر اتنے کلمات کہتا ہوں، اس سے زیادہ نہیں، یہ بھی میں نے دکھی دل کے ساتھ کہہ دیئے ہیں، ورنہ سنتا کوئی نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں پاکستان نہ توڑو:

میرے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہٗ منبر پر بیٹھ کر فرماتے تھے، بھرے جلسے میں تقریباً ایک لاکھ کے جلسے میں کہ سنو! آج ہم کہتے ہیں کہ نہ بناؤ پاکستان، کانگریسی کہہ دو، احراری کہہ دو، تم جو گالی دینا چاہتے ہو دے دو، لیکن پاکستان نہ بناؤ۔ ان کو سب کچھ نظر آ رہا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے چشمِ بصیرت عطا فرمائی تھی، ارشاد فرمایا تھا کہ سن لو! آج ہم کہتے ہیں کہ نہ بناؤ، تم ہماری نہیں سنتے ہو۔ کیونکہ اس وقت ہم نعرہ لگاتے تھے "لے کر رہیں گے پاکستان، دینا پڑے گا پاکستان" وغیرہ، علماء کو گالیاں دی جاتی تھیں، یہ دشمن ہیں، ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں، نہ معلوم جتنی گالیاں تمہاری لغت میں تھیں وہ بھی، اور جو تم ایجاد کر سکتے تھے وہ بھی تم نے دے ڈالیں، ان کا قصور صرف اتنا ہی تھا کہ وہ کہتے تھے کہ یہ تم سے نہیں سنبھلے گا، خدا کے لئے نہ بناؤ، خیر بن گیا، یا بنالیا۔ تو حضرتؒ نے فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا ہم کہیں گے نہ توڑو! خدا کے لئے نہ توڑو! تم ہماری یہ باتیں نہیں سنو گے، آج ہم کہہ رہے ہیں نہ بناؤ، تم ہماری نہیں مانتے، ایک وقت آئے گا ہم کہیں گے خدا کے لئے اس کو نہ توڑو! تم ہماری نہیں سنو گے۔

تم نے سقوطِ ڈھاکہ کے وقت ہماری نہ سنی:

۱۹۷۱ء میں ہم نے کہا تھا کہ خدا کے لئے نہ توڑو! تم نے ہماری نہیں سنی، آج پچیس سال کے بعد پھر وہی واقعہ پیش آ رہا ہے، تم ہماری نہیں سنتے ہو، اپنی اپنی خواہشات کی پٹی تمہاری آنکھوں پر بندھی ہوئی ہے، تمہیں نظر ہی نہیں آ رہا۔

سلگتی آگ نظر آ رہی ہے:

الحمدللہ ہماری کوئی خواہش نہیں، ہم اپنی خواہشات کے ساتھ بات نہیں کرتے، اپنے کسی مفاد کے لئے بات نہیں کرتے، ہمیں آگ لگی ہوئی نظر آ رہی ہے، ابھی تم دیکھو گے کہ کیا بنے گا؟

پچھلے دنوں میں معصوم بچوں کا دودھ نہیں ملا، ایسا دل جلا، دکان پر آیا ہوا دودھ یا تو خراب کروادیا گیا یا گرادیا گیا، تمہاری دودھ کی دکانوں پر دودھ نہیں ملے گا تو بچے کہاں سے دودھ پئیں گے؟ تم بیماروں اور بچوں کا تو کچھ خیال کرو! خدا کے لئے اس سے باز آ جاؤ! اس کو نہ توڑو! توڑنے والے تمہارے ہاتھ سے تڑوا رہے ہیں، اور اپنے نقشے بنا رہے ہیں، تمہیں پتہ نہیں ہے، تم ان چھوٹی چیزوں پر لڑ رہے ہو، روٹی ہے، میرا مالک دیتا ہی رہے گا، کسی کو تھوڑی مل جائے گی، کسی کو زیادہ مل جائے گی، ایک دوسرے سے مظالم کی معافی لے لو، ایک دوسرے کو معاف کردو، اور حق وانصاف پر قائم ہوجاؤ، اور اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرلو، آج عذاب ٹل جائے گا، اور اگر ایسا نہیں کروگے تو اس کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔

دوزخ سے بھاگنے والے سو رہے ہیں:

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے جنت جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس کے طلب کرنے والے سو رہے ہوں اور دوزخ جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی، جس سے بھاگنے والے سو رہے ہوں۔ یہ الفاظ تو حدیث نبوی کے ہیں، حضرت امیر المؤمنین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

سب سے بڑی کمائی؟

لیکن ایک تیسرا فقرہ ساتھ ملایا، وہ ان کا اپنا ہے، وہ حدیث میں نہیں آیا کہ میں نے کسی کو اس سے زیادہ کمائی کرنے والا نہیں دیکھا جو شخص کہ کوئی چیز ایسے دن

کے لئے کمالے جس میں ذخائر جمع کیے جائیں گے، جس میں سرائر یعنی بھید کھول دیئے جائیں گے، اور جس میں تمام کبائر جمع کر دیئے جائیں گے۔ مطلب یہ کہ کسی نے آخرت کے لئے کوئی چیز کمالی تو واللہ! اس سے بڑی کوئی کمائی کسی کی نہیں ہے، سب سے بڑی کمائی یہ ہے کہ کوئی آدمی آخرت کے لئے چاہے تھوڑی سی چیز اس نے کمائی ہو، آخرت کے لئے کوئی چیز کمالے۔

اشراق کا ثواب:

ایک صحابی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: یا رسول اللہ! خیبر کے فتح ہونے کے بعد وہاں چیزوں کی خرید و فروخت کا بازار لگ گیا، جس کے حصے میں جو چیزیں آئیں اور اس کی ضرورت سے زائد تھیں تو اس نے بیچ دیں، اور کسی نے ضرورت کی چیز خرید لی تو میں اس سوداگری میں مشغول ہوگیا (جیسے کہ میمن لوگ سوداگر ہوتے ہیں) اس سے بڑا نفع کمایا۔ آج ایک دن میں میں نے بہت ہی نفع کمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کتنا کمالیا؟ معلوم نہیں مجھے اس وقت یاد نہیں رہا، غالباً اس صحابی نے کہا تین سو درہم کمالئے۔ کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! ایک سے چیز لیتا تھا، دوسرے کو بیچ دیتا تھا، ایک سے لی، دوسرے کو بیچ دی۔ حدیث شریف میں ہے کہ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا میں تجھے اس سے زیادہ نفع بخش چیز نہ بتلاؤں؟ اس نے کہا: ضرور! پھر فرمایا:

"قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ قَعَدَ فِيْ مُصَلَّاهُ حِيْنَ يَنْصَرِفُ مِنْ صَلٰوةِ الصُّبْحِ حَتّٰى يُسَبِّحَ رَكْعَتَيِ الضُّحٰى لَا يَقُوْلُ اِلَّا خَيْرًا غُفِرَ لَهٗ خَطَايَاهُ وَاِنْ كَانَتْ اَكْثَرَ مِنْ زَبَدِ الْبَحْرِ." (مشکوٰۃ ص:۱۱۶)

ترجمہ:...... "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر

کوئی شخص فجر کی نماز کے بعد وہیں بیٹھا رہے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہے، یہاں تک کہ اشراق کا وقت ہوجائے، اشراق پڑھ کر اٹھے تو اس کے تمام گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، چاہے سمندر کی جھاگ سے زیادہ ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تو فجر کی نماز کے بعد وہیں بیٹھا رہتا، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہتا، یہاں تک کہ اشراق کا وقت ہوجاتا، اشراق پڑھ کر اٹھتا تو تیری اس کمائی سے زیادہ تھا۔

قرآن کی دو آیتوں کا ثواب:

ایک حدیث شریف میں فرمایا:

"عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ فِی الصُّفَّةِ، فَقَالَ: اَیُّکُمْ یُحِبُّ اَنْ یَّغْدُوَ کُلَّ یَوْمٍ اِلٰی بُطْحَانَ اَوِ الْعَقِیْقَ، فَیَأْتِیَ بِنَاقَتَیْنِ کَوْمَاوَیْنِ فِیْ غَیْرِ اِثْمٍ وَلَا قَطْعِ رَحْمٍ؟ فَقُلْنَا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! کُلُّنَا نُحِبُّ ذَالِکَ! قَالَ: اَفَلَا یَغْدُوْ اَحَدُکُمْ اِلَی الْمَسْجِدِ فَیُعَلِّمَ اَوْ یَقْرَأَ اٰیَتَیْنِ مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ نَاقَتَیْنِ، وَثَلٰثٌ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ ثَلٰثٍ، وَاَرْبَعٌ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَرْبَعٍ، وَمِنْ اَعْدَادِھِنَّ مِنَ الْاِبِلِ." (مشکوٰۃ ص:۱۸۳)

ترجمہ:......"کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے، ہم صفہ میں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ بطحان یا عقیق جنگل میں چلا جائے اور وہاں سے بغیر گناہ اور غصب کے

اور بغیر ظلم کے دو عمدہ اونٹ لے آئے اور نہ کسی پر ظلم ہوا ہو۔
صحابہ کرامؓ نے کہا: یا رسول اللہ! یہ تو ہر شخص چاہے گا۔ فرمایا: مسجد
میں چلے جاؤ، دو آیت قرآن کریم کی سیکھ لو یا پڑھ لو یہ تمہارے
لئے ان دو اونٹنیوں سے بہتر ہے، تین آیت کا سیکھنا یا پڑھنا تین
ناقہ سے بہتر اور چار آیت کا سیکھنا یا پڑھنا چار اونٹنیوں سے بہتر
اسی طرح اور ایسے اتنے اونٹوں سے بہتر۔''

آخرت کی کمائی کی اہمیت:

آخرت کی کمائی کو ہم اہمیت نہیں دیتے، دنیا کی کمائی کو اہمیت دیتے ہیں، آج اگر کسی کو ایک ہزار روپے بغیر کسی تاب کے، بغیر کسی گناہ کے مل جائیں تو وہ خوش ہوگا، خوش ہونا چاہئے، حلال کا پیسہ ہے، حلال طریقہ سے مل جائے تو بہت خوش ہوگا، لیکن دو رکعت پڑھنے کی توفیق ہوگئی تو اس پر خوش نہیں، اس پر اتنی خوشی نہیں ہوتی، اس حقیقت کو امیر المؤمنین سمجھا رہے ہیں کہ میں نے کوئی کمانے والا اس سے زیادہ کوئی کمانے والا، اس سے زیادہ نفع اور اس سے زیادہ بہتر کمائی کرنے والا نہیں دیکھا جو شخص کہ اس دن کے لئے کچھ کمالے، تھوڑی سی چیز ہی کمالے، جو تمہیں کل قیامت کے دن کام دے، جس دن کہ تمام ذخائر جمع کر دیئے جائیں گے، آنجناب کی اتنی زندگی ہوئی اور جناب نے اتنا کل ذخیرہ یہاں جمع کروایا ہے، آپ کا اکاؤنٹ اتنا ہے، اور دل کے تمام کے تمام بھید، اندر کی نیتیں اور اندر کے ارادے، اندر جو کچھ چھپا ہوا ہے، سب باہر کر دیئے جائیں گے، جیسے اسکرین میں نظر آتے ہیں، اعضاء نظر آتے ہیں، اندر کی نیتیں نظر آنے لگیں گی، اور اس میں تمام کبائر جمع ہو جائیں گے، آج تو ہم نے کام کیا ہے، کر کے بھول گئے، لیکن وہ دن ہوگا کہ زندگی کے تمام کے تمام کبائر ہمارے سامنے آجائیں گے، اکٹھے کر دیئے جائیں گے، اور وہ نقشہ دکھا دیا جائے گا کہ

مکر نہ سکیں، اس دن کی کمائی کے لئے کوئی چیز کس نے کمائی؟ اس دن کام دینے والی کوئی نیکی کمائی تو وہ بہت بڑا کمانے والا ہے، اس سے زیادہ کمانے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔

حق نفع نہ دے تو باطل نقصان دے گا:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ بات یہ ہے کہ جس شخص کو حق نفع نہ دے تو باطل نقصان دیتا ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں، یا آپ حق پر ہوں گے یا باطل پر ہوں گے، اگر حق پر ہیں، حق آپ کو نفع پہنچا رہا ہے تو مبارک ہو، ورنہ یہ یقین رکھئے کہ باطل کو اختیار کرنے کے بعد آپ نقصان سے نہیں بچ سکتے، اور جس شخص کو ہدایت سیدھا نہ کر سکے، اس کو گمراہی کھینچ کر لے جاتی ہے۔ ہدایت اور گمراہی یہ دونوں بھی متقابل ہیں۔ سورۂ فاتحہ میں فرمایا: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اللہ تعالیٰ سے مانگی ہدایت کہ ہمیں ہدایت دے صراط مستقیم کی، "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا اور یہ چار فریق ہیں: نبیین، صدیقین، شہداً اور صالحین۔ بہت ہی مبارک ہے وہ بندہ جس کو ان کے راستے پر چلنے کی توفیق ہوگئی، یہ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندے ہیں۔ "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ." نہ ان پر غضب ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔ جن پر غضب ہوا وہ یہودی ہیں، اور جو گمراہ ہوئے وہ نصرانی ہیں۔ یہ گمراہی کا راستہ ہے، آپ یا ہدایت پر ہیں یا گمراہی پر ہیں، جس شخص کو ہدایت سیدھے راستے پر نہیں چلاتی، گمراہی اس کو کھینچ کے لے جاتی ہے۔ اور جس کو یقین نفع نہیں پہنچاتا، شک اور تردد اس کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشاد فرمائی ہوئی تمام باتیں برحق ہیں، ہمارا ان پر ایمان و یقین ہے، ہم نے چونکہ کلمہ پڑھا ہے: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس لئے ہمیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی ایک ایک بات پر

یقین ہے، اور اتنا یقین مؤمن کو ہونا چاہئے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر غیب کا پردہ ہٹادیا جائے اور تمام رکاوٹیں ہٹادی جائیں تو میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، کیونکہ مجھے آج بھی اتنا ہی یقین ہے جتنا مشاہدہ سے ہوگا۔

مابعد الموت کا یقین:

جنت اور دوزخ کی بات سنتے ہو، عذاب قبر کی بات سنتے ہو اور دوسرے تمام حقائق غیبی کی بات سنتے ہو، تو آج بھی اتنا ہی یقین ہونا چاہئے کہ گویا جنت ہمارے سامنے اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ حاضر ہے، دوزخ کی بات سنتے ہیں تو اتنا یقین ہونا چاہئے کہ گویا دوزخ کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس کے عذاب کو دیکھ رہے ہیں، قبر کی بات سنتے ہیں تو وہاں کے بچھو اور سانپ گویا کہ ہمارے سامنے پھر رہے ہیں، اتنا یقین ہونا چاہئے۔ اور یقین سے مقصود یہ ہے کہ اپنی زندگی کو اس یقین کے مطابق ڈھالو، اپنی زندگی کو یقین کے مطابق بناؤ۔

تردد کا نقصان:

حضرت فرماتے ہیں کہ جس شخص کو یقین نفع نہیں دیتا، شک اس کو نقصان دیتا ہے۔ اگر ایک بات میں بھی تردد کیا کہ پتہ نہیں ٹھیک ہے کہ نہیں؟ پٹری سے اتر گیا، نہ اس کے کلمے کا اعتبار، نہ اس کے حج و زکوٰۃ کا، اور نہ اس کی نماز کا، نہ صدقہ و خیرات کا اعتبار، ایک بات میں بھی شک و تردد ہوجائے جو بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، ہلاک ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام باتوں کو یقین کے ساتھ سمجھو اور یقین کو دل میں بٹھاؤ اور اس یقین کا استحضار کرو اور اس یقین کے ساتھ اپنی زندگی کو بناؤ، ورنہ یہ شک وارتیاب تمہیں نقصان دے گا۔

ہمارے یقین کی کمزوری:

قرآن کریم میں کافروں کا مقولہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ: ”اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ.“ (الجاثیہ:۳۲) کچھ کچھ خیال تو ہم بھی رکھتے ہیں، یہ جو جنت، دوزخ کی بات کرتے ہیں، آخرت کی بات کرتے ہیں، کچھ کچھ خیال تو ہمیں بھی آتا ہے، لیکن ہمیں یقین نہیں آتا، یقین ہمیں نہیں ہے۔ مسلمان بھی ان باتوں کو سنتا ہے، تو آج کچھ وہی کیفیت ہوگئی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے، یقین اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ کچھ کچھ خیال تو ہمیں بھی آتا ہے کہ شاید ہونے والا ہوگا ایسا، لیکن یقین نہیں آتا، کوئی دجال آکر کہہ دے تمہارے سامنے کہ نہیں! مولویوں نے ایسے ہی باتیں بنائی ہوئی ہیں، تم کہتے ہو کہ ٹھیک کہتا ہے، نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ!

حاضر سے عبرت نہیں تو پوشیدہ سے کیسے ہوگی؟

اور فرماتے ہیں کہ جس کو اس کا حاضر نفع نہیں دیتا تو جو چیز اس سے پوشیدہ ہے، وہ اس سے زیادہ اندھا ہوگا، اور جو چیز کہ اس سے غائب ہے اس کے معاملہ میں زیادہ عاجز ہوگا، جب تم سامنے کے واقعات کو دیکھ کر عبرت نہیں پکڑتے تو جو چیز تمہارے سامنے نہیں ان سے کیسے عبرت پکڑو گے؟ بیمار پڑتے ہیں، ایک بے بسی کا تماشا نظر آتا ہے، پھر عبرت نہیں اور تکلیفیں آتی ہیں، مصائب آتے ہیں، پھر عبرت نہیں، اور پریشانیاں آتی ہیں، عذاب آتے ہیں، ان سے عبرت نہیں، جب تمہیں سامنے کی چیزوں سے عبرت نہیں، تو جو چیزیں تمہاری نظر سے غائب ہیں، ان کو سن کر تمہیں کیسے عبرت ہوگی؟

کوچ کا نقارہ بج چکا!

اور ارشاد فرمایا کہ دیکھو تمہیں کوچ کرنے کا حکم ہو چکا ہے، یعنی کوچ کا نقارہ بجایا جاچکا ہے۔ پرانے زمانے میں جب بہت بڑا قافلہ چلتا تو نقارہ بجاتے تھے،

مطلب یہ ہوتا تھا کہ چلو بھئی اپنا اپنا سامان باندھو اور چلو، اب اتنے بڑے قافلے کے چلنے میں بھی دیر لگتی ہے، ایک دم سے تو سارے لوگ نہیں چل پڑتے، اور بھئی اپنا سامانِ سفر بھی ساتھ لے جاؤ، جتنا تمہاری ضرورت کا ہے، سامان سفر کو زاد کہتے ہیں، اب منیٰ سے عرفات میں جاتے ہیں، عرفات ایک دن ٹھہرنا ہوتا ہے، اسی دن شام کو غروب کے بعد مزدلفہ آجاتے ہیں، مزدلفہ رات گزار کر پھر منیٰ آگئے، تو حاجیوں کا قافلہ بیس لاکھ ہو، تیس لاکھ کا ہو منیٰ سے عرفات کو چلتا ہے، بہت رش ہوتا ہے، چلتے چلتے بھی دیر ہو جاتی ہے، لیکن کوچ کا نقارہ بج چکا ہے کہ چلنا ہے بھئی کیونکہ اگر آج عرفات کے میدان میں نہیں پہنچے تو حج فوت ہو جائے گا اور حج نہیں ملے گا، جیسا کیسا کرکے آدمی پہنچتا ہے اور وہاں سے پھر شام کو چلنا ہے۔

تو حضرت امیرالمؤمنینؓ فرماتے ہیں تمہیں کوچ کا حکم کیا جاچکا ہے، اور اس کا نقارہ بجایا جاچکا ہے کہ چلو بھئی آخرت کی طرف چلو، اور تمہاری راہنمائی کردی گئی ہے کہ یہ توشہ تمہیں ساتھ لے کر جانا ہے، تم تو سامان سمیٹنے کی کرو، میاں! اپنا سامان سمیٹنے کی کرو، محاورے کی زبان میں بوریا بستر گول کرنے کی کوشش کرو، اور دیکھ لو کہ تمہیں ان ان چیزوں کی ضرورت پیش آجائے گی، جلدی جلدی لے لو۔

سب سے خطرناک چیزیں؟

اس کے بعد فرمایا کہ سنو! سب سے زیادہ خطرناک چیز میرے نزدیک تمہارے حق میں دو ہیں: لمبی لمبی امیدیں اور خواہشات کی پیروی۔ دنیا کی حرص میں مبتلا ہوگئے، کوچ کو بھول گئے اور یہاں سے بڑی بڑی، لمبی لمبی امیدیں وابستہ کرلیں تو اگلے جہاں کے لئے اور اپنے سفر کے لئے توشہ لینا یاد نہیں رہا، یہاں کے معاملات میں ایسے الجھ گئے۔ بس اس کو پھر ذکر کروں گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اصلاحی مواعظ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

معرفت الٰہی
صحابہؓ کا ایمان سیکھنا
اوقات نماز کی حکمتیں
آخرت کی تیاری
تین طلاق کا حکم
زندگی کے مراحل
مسجد کی تعمیر و آبادی کا ذوق
مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک
حرام اشیاء کی خرید و فروخت

جلد ہفتم

مکتبہ لدھیانوی

اصلاحی مواعظ

جلد ہفتم

شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

مکتبہ لدھیانوی

قانونی مشیر اعزازی: ۔ منظور احمد ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

اشاعت اول.................جولائی ۲۰۰۴ء

ناشر: ———— مکتبہ لدھیانوی

———— 18 سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن، کراچی

برائے رابطہ: ———— جامع مسجد باب الرحمت

———— پرانی نمائش، ایم اے جناح روڈ، کراچی

پوسٹ کوڈ: 74400 فون:7780337

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر اور فضل و احسان ہے کہ حضرتِ اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کی زندگی میں شروع ہونے والے سلسلہ ''اصلاحی مواعظ'' کی ساتویں جلد مرتب ہوکر آپ کے ہاتھوں میں ہے، جبکہ اس سے قبل چھ جلدیں آپ ملاحظہ فرماہی چکے ہوں گے۔

بحمداللہ صحت و ثقاہت اور تخریج وتبویب کے سلسلہ میں ہمارے رفقا نے جو معیار روزِ اوّل طے فرمایا تھا، آج بھی اسی پر قائم ہیں۔

ہم نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ حضرت شہیدؒ کے وعظ و بیان میں مذکور کوئی بات بلاحوالہ نہ ہو، چنانچہ جہاں بھی آپؒ نے قرآن یا حدیث کے حوالہ سے کوئی بات ارشاد فرمائی ہے، ہم نے جستجو کرکے اس کے متن کو اصل ماخذ سے نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

مثلاً اگر کہیں حضرتؒ نے فرمایا کہ: ''حدیث میں آتا ہے'' تو ہمارا فرض بن گیا کہ ہم اس حدیث کو تلاش کریں اور اس کا متن مع حوالہ درج کریں۔

اگر کہیں حضرتؒ نے فرمایا کہ: ''قرآن کریم میں آتا ہے'' تو ہم نے اس کی

تخریج کر کے آیت مع ترجمہ نقل کیا ہے۔

اگر کہیں حضرت شہیدؒ کے بیان کے الفاظ جو قرآن و حدیث کے ترجمہ سے زائد تھے، تو انہیں تشریح کا درجہ دینے کی کوشش کی ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ کتاب سلسلۂ مواعظ کی اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے، جس میں اس طرح تخریج کا اہتمام کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس کتاب میں پہلی جلد کو چھوڑ کر، قرآن و سنت سے منسوب کسی بات کو بلاحوالہ نہیں جانے دیا گیا، خدا کرے آئندہ بھی ہم اس کا اہتمام کر پائیں۔ لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ اس میں کوئی غلطی نہیں یا یہ کتاب اغلاط سے مبرا ہے، کیونکہ اللہ کی کتاب کے علاوہ ہر کتاب میں اس کا احتمال ہے اور رہے گا۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے رفیق کار مولانا محمد اعجاز صاحب کو جنہوں نے اس کام میں جی جان سے محنت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ہماری نجات، حضرت شہیدؒ کے رفعِ درجات اور تمام معاونین و کارکنان کی مغفرت کا ذریعہ بنائے، آمین!

خاکپائے حضرت لدھیانوی شہیدؒ

سعید احمد جلال پوری

مدیر ماہنامہ بینات کراچی

فہرست مواعظ

فہرست

①

معرفتِ الٰہی ۲۵

(۳)

حضراتِ صحابہؓ کا تعلیم کے لئے سفر ۶۳

(۴)

عمل، علم کی مقبولیت کی علامت

۵

(۶)

۷

نماز کا اہتمام، فوائد و ثمرات ۱۳۳

(۸)

نمازوں کے اوقات اور اس کی حکمتیں ۱۴۹

۹

(۱۷)

حرام اشیاء کی خرید وفروخت

معرفتِ الٰہی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: ......
وَاَشْرَفُ الْحَدِیْثِ ذِکْرُ اللّٰہِ وَخَیْرُ الْقَصَصِ اَلْقُرْاٰنُ، وَخَیْرُ الْاُمُوْرِ عَوَاقِبُھَا، وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا، وَمَا قَلَّ وَکَفٰی خَیْرٌ مِّمَّا کَثُرَ وَاَلْھٰی ..... الخ." (حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۱۳۸)

ترجمہ:...... "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: سب سے اشرف بات اللہ کا ذکر ہے، اور بہترین قصہ قرآن کریم ہے، اور سب سے بہتر کام وہ ہیں جن کا انجام بہتر ہو، اور سب سے برا کام وہ ہے جس کو گھڑ لیا گیا ہو، اور جو مال کم ہو اور کفایت کرنے والا ہو، وہ اس مال سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور غفلت میں ڈالنے والا ہو۔"

اشرف الحدیث ذکر اللہ کا مفہوم؟

یعنی آدمی جو بھی گفتگو کرتا ہے ان میں سب سے اشرف ذکرِ الٰہی ہے، ذکر

اللہ میں قرآن کریم کی تلاوت بھی شامل ہے، تسبیحات، درود شریف، استغفار اور تمام وہ الفاظ جن سے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے وہ سب ذکرِ الٰہی میں شامل ہیں۔

کلام کے شرف کے اسباب؟

کسی کلام کا شرف یا تو اس کے مقصد کے اعتبار سے ہوتا ہے، یا جس کا تذکرہ کیا جائے اس کے تذکرہ کے اعتبار سے ہوتا ہے، قرآن کریم سب کا سب اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کے باوجود کلام اللہ شریف کے بعض حصے بعض حصوں سے افضل ہیں، سورۂ یٰسٓ کو قرآن کریم کا قلب فرمایا گیا ہے، یعنی قرآن کریم کا دل ہے، آیت الکرسی کو ''اعظم آیة من القرآن'' فرمایا گیا ہے، یعنی قرآن کریم کی سب سے زیادہ عظمت والی آیت۔ سورۂ اخلاص کو ثلث قرآن فرمایا گیا ہے، یعنی تہائی قرآن کریم کے برابر ہے، سورۂ کافرون کو چوتھائی قرآن کے برابر فرمایا گیا ہے۔

پھر قل ھو اللہ احد میں اللہ تعالیٰ کا تذکرہ ہے، یہ ایک سورة ہے جو تہائی قرآن کے برابر ہے، یعنی دس پارے کے برابر، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر ہے، اسی طرح آیت الکرسی میں حق تعالیٰ شانہ کی صفات کا ذکر ہے، اور اس کے دس جملے ہیں اور دسوں میں الگ الگ صفت کو ذکر فرمایا گیا ہے، تو معلوم ہوا کہ کلام کا شرف اس کے اس مضمون کی وجہ سے ہے جس کا ذکر ہو رہا تھا۔

درود کی فضیلت کی وجہ؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ شانہ کی ذاتِ عالی کے بعد سب سے زیادہ صاحبِ مرتبہ ہیں، تو آپ کا ذکرِ خیر، ذکر اللہ کے بعد تمام اذکار سے افضل ہوگا، اس لئے درود شریف کی فضیلت بہت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ:

''مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدَةً صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ عَشْرًا۔''

(مشکوٰة ص:۸۶)

ترجمہ:...... ’’جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود شریف پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں فرمائیں گے۔‘‘

دس مرتبہ درود شریف پڑھو تو سو رحمتیں، اور سو مرتبہ درود شریف پڑھو تو ہزار رحمتیں میسر آئیں گی۔

سب سے افضل کلام؟

اس سے معلوم ہوا کہ ذکرِ الٰہی پر جو کلام مشتمل ہو وہ سب سے افضل ہے، جو کلام ذکرِ الٰہی پر مشتمل ہو وہ اشرف الحدیث ہے، جو بات اللہ تعالیٰ کے ذکر پر مشتمل ہو، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے وہ سب سے اشرف ہے، اس لئے کہ اس پر اجر ملتا ہے اور اس کے ذریعہ بندے کا مرتبہ بلند ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت بندے کے دل میں آتی ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت بندے کے دل میں آتی ہے، بندے کے دل میں عبدیت پیدا ہوتی ہے، حق تعالیٰ شانہ کی عظمت اور بندے کی عبدیت یعنی فنائیت یہی حاصل ہے سب چیزوں کا، اس لئے بلاشبہ اشرف الحدیث ذکر اللہ ہے، سب سے بہترین کلام، اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، اس سے آدمی کو غافل نہیں ہونا چاہئے۔

آنحضرتؐ کی مختصر نصیحت:

ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا: یا رسول اللہ! کوئی نصیحت فرمائیے، بات لمبی نہ ہو تاکہ میں اس کو ضبط کرسکوں۔ فرمایا:

’’لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِّنْ ذِکْرِ اللہِ۔‘‘

(مشکوٰۃ ص:۱۹۸)

ترجمہ:...... ’’تیری زبان ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر

رہنی چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو۔"

حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ نے یہ حدیث فضائل ذکر میں ذکر کر کے اس کے اسّی فائدے لکھے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی توفیق عطا فرمادے۔

سب سے گندی بات کسی مسلمان کو گالی گلوچ کرنا ہے، اور سب سے افضل بات اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، تو اپنی زبان کو گندگی سے آلودہ نہ کرو، بلکہ اس اشرف الحدیث کے ساتھ اپنی زبان کو منور کرو، زبان میں بھی نور آئے گا، دل میں بھی نور آئے گا، اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضا بھی نصیب ہوگی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے!

سب سے بہتر قصص:

قصص کے معنی واقعات کے ہیں، سب سے بہترین واقعہ قرآن کریم کا ہے، قرآن کریم میں انبیاءؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ ہے، گمراہ قوموں کا بھی تذکرہ ہے، حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ بھی ہے اور ابلیس کا واقعہ بھی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بھی ہے، فرعون کا واقعہ بھی ہے، قارون کا واقعہ بھی ہے۔

واقعات کا اصل مقصود عبرت ہے:

لوگوں کو واقعات پڑھنے کا بہت شوق ہوتا ہے، لیکن واقعات سے اصل مقصود عبرت حاصل کرنا ہے! اگر ہم نے کوئی واقعہ پڑھا اور اس سے کوئی عبرت حاصل نہ کی تو وقت ضائع کیا، ہاں! آپ نے کوئی واقعہ پڑھا اور اس سے کوئی مفید نصیحت حاصل کی، عبرت حاصل کی تو پھر یہ پڑھنا صحیح ہوا، اور عبرت کے لئے قرآن کریم میں ذکر کردہ واقعات سے بہتر کوئی واقعہ نہیں ہے، ایک تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، کلامِ معجز ہے، اس کی عجیب وغریب تعبیرات ہیں، پھر حق تعالیٰ شانہ اس کلام کے ضمن میں فوائد اور نصیحتوں کی طرف بھی اشارہ فرماتے جاتے ہیں تاکہ بندوں کے دل میں ان چیزوں کا دھیان پیدا ہو، تاریخ برائے تاریخ ذکر نہیں کی جاتی۔

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے بہت تفصیل سے بیان فرمایا، شروع سے لے کر ان کی وفات تک، لیکن یہاں بھی تاریخ نہیں دہرائی، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی اپنے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام سے درخواست کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کو جنگل میں لے گئے، یہاں تقریروں میں بڑی تفصیل سننے کو ملتی ہے کہ یوں مارا اور یوں جھڑکا، اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو ستایا، یہ ساری تفصیلات ذکر کی جاتی ہیں لیکن قرآن کریم نے ان سب کو لپیٹ کے رکھ دیا، قرآن کریم نے فرمایا:

"فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ....." (یوسف:۱۵)

جب وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو لے گئے اور انہوں نے ایکا کرلیا، اتفاق کرلیا کہ اندھے کنویں میں ان کو ڈال دیں، پھر آگے ذکر ہی نہیں کیا کہ کیا ہوا؟ اور کیا نہیں ہوا؟ ہاں! البتہ قرآن کریم میں صرف اتنا ہے کہ:

"وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ." (یوسف:۱۵)

ترجمہ:......"اور ہم نے ان کو وحی کی کہ ایک وقت آئے گا کہ تم ان کو یہ واقعات بتاؤ گے اور ان کو پتہ بھی نہیں ہوگا، شعور بھی نہیں ہوگا۔"

رہا یہ کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائی لے گئے، اور ان کے بھائیوں نے ان کو کنویں میں ڈالنے کا فیصلہ کیا تو کیا ہوا؟ قرآن کریم نے اس کو ذکر ہی نہیں کیا، کیونکہ وہ محض دل کو نرم کرنے والی باتیں ہوتیں، سننے والوں کو ترس آتا، اور لوگ روتے، یہ کوئی عبرت کی بات تو نہیں تھی، اس میں عبرت کی بات تو اتنی ہوئی کہ لے گئے، لے جا کر کنویں میں ڈال دیا اور کنواں بھی اندھا، تو قرآن کریم میں

جو واقعات ذکر کئے گئے ہیں اس کا ایک ایک حرف نصیحت ہے، عبرت ہے، ایک تو یہ کہ یہ واقعہ مستند ہے، "وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا" (النسآ:۸۷) (بات کرنے سے اللہ تعالیٰ سے بہتر سچا کون ہوسکتا ہے؟) "وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا" (النسآ:۱۲۲) (گفتگو کرنے میں اللہ تعالیٰ سے سچا کون ہوسکتا ہے؟)۔

جن واقعات کو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا وہ قطعی طور پر یقینی ہیں، دوسرا آدمی ہم جیسا کوئی واقعہ بیان کرے گا تو دو چار باتیں اپنے پاس سے بھی ملالے گا۔

واقعاتِ قرآن تاریخی نہیں:

دوسری بات یہ کہ حق تعالیٰ شانہ نے ان واقعات کو تاریخی حیثیت سے ذکر نہیں فرمایا بلکہ عبرت کی حیثیت سے ذکر فرمایا، واقعات کے صرف ان اجزأ کو لیا ہے جن میں کچھ احکام، کچھ مسائل، کچھ فوائد، کچھ نصیحت و عبرت بندوں کو کرنا مقصود تھا، اس لئے سب سے بہترین واقعات قرآن کریم کے ہیں، سورۂ یوسف میں فرمایا: "نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ ....." (یوسف:۳) (ہم آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں بہترین قصہ، بہترین واقعہ)۔

یوں آتا ہے کہ اہل جنت کبھی کبھی اس قسم کے واقعات بیان کریں گے تو حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بھی بیان کریں گے، "احسن القصص" فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔

بہتر کام وہ ہے، جس کا انجام اچھا ہو!

اس روایت میں آیا ہے: "خیر الامور عواقبها" سب سے بہتر کام وہ ہیں جن کا انجام بہتر ہو، ایک کام کرلیا، اپنے خیال میں اچھا کام کیا لیکن انجام اچھا نہیں نکلا تو اس کام کو اچھا نہیں کہیں گے، ہم نے خیر کے کام کئے یا ایسے کام جن کو ہم خیر نہیں سمجھتے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک وہ خیر

کے کام تھے، لیکن نعوذ باللہ! ہماری کسی نحوست کی وجہ سے ان پر صحیح انجام مرتب نہیں ہوا، مثلاً: کسی نیکی وغیرہ کے بعد ریاکاری کی یا خدانخواستہ ایسے الفاظ بول دیئے جس سے وہ اعمال برباد ہوگئے تو کچھ بھی نہ رہا، چاہے صدقہ خیرات وغیرہ کتنا ہی اچھا کام کیوں نہ ہو۔

سخاوت رضائے الٰہی کے لئے نہ ہو تو بے کار:

آج میں نے ایک عجیب وغریب حدیث پڑھی ہے کہ عالم حشرات الارض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تمہارا سردار کون ہے؟ انہوں نے ایک سانپ کا نام لیا اور کہا کہ: ہے تو سردار، بس اس میں تھوڑی سی کسر ہے کہ ذرا بخیل ہے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بخل سے زیادہ لائق ملامت اور چیز کیا ہوتی ہے؟ تو سخاوت بہت ہی اچھا عمل ہے اور بخل بہت بری چیز ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ سخاوت اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نہ ہو تو بے سود اور بے کار ہے، کچھ بھی نہیں ملے گا، قرآن کریم میں فرمایا کہ:

"اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِیْهَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْکِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ." (البقرۃ:۲۶۶)

یعنی کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو اور اس کا بڑھاپا آگیا ہو، جوانی میں تو آدمی محنت کرسکتا ہے، نیا باغ بھی لگاسکتا ہے، لیکن بڑھاپے میں تو پرانی کمائی کھائی جاسکتی ہے، نیا کوئی کام کرنا مشکل ہوتا ہے جس میں محنت ہو، اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں، اگر اولاد بڑی ہوتی، کام کرنے والی ہوتی تو باغ اُجڑ جاتا تو چلو اولاد لگالیتی، بچے چھوٹے

چھوٹے ہیں جو بے چارے کما نہیں سکتے، باغ کیا لگائیں گے، وہ خود اس پر بوجھ ہیں۔ ایسے آدمی کا لہلہاتا ہوا بھرپور باغ جس پر رات کو آگ بگولا آیا اور سب کچھ جلا کر چلا گیا، اس شخص کو کتنی حسرت ہوگی ا کتنی ندامت ہوگی؟ کتنا غم ہوگا؟ سب کچھ ہی لٹ گیا۔

دنیاوی باغ کی طرح اگر نیکیوں کا باغ اُجڑ جائے تو...!

یہ اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی کہ ایک آدمی نے زندگی بھر نیکیوں کا باغ لگایا لیکن یہاں کا آگ بگولا آیا اور سب کچھ جلا کر چلا گیا، بڑھاپے کا وقت سب سے زیادہ محتاجی کا وقت ہوتا ہے، قویٰ کمزور ہوجاتے ہیں، محنت کر نہیں سکتا، چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے، لیکن اگر ساری عمر کی جائیداد ضائع ہوجائے تو اس غریب کی کیا حالت ہوگی؟ اور تمہاری زندگی بھر کے اعمال اگر موت کے وقت معلوم ہوں کہ صفر ہیں تو پھر اس سے زیادہ محتاجی کا وقت کیا ہوگا؟ اب نئی زندگی بھی نہیں مل سکتی کہ نئے عمل کرلیں۔ تو میں نے عرض کیا کہ سخاوت ہو یا دوسرے نیک اعمال، اگر آدمی زندگی بھر محنت کرتا رہے، لیکن ساتھ کچھ بھی نہ لے کر جائے، اور یہیں سب کچھ ضائع کر کے چلا جائے تو اچھا انجام تو نہ ہوا، خیر والے اعمال تو آخرت کے لئے کئے جاتے ہیں، یہ نماز روزہ ہے، یہ حج و زکوٰۃ ہے، یہ ذکرِ الٰہی ہے، صدقات و خیرات ہیں اور جتنے اعمالِ صالحہ کہلاتے ہیں ان کو آخرت کے لئے کیا جاتا ہے، یہ اعمال مرنے کے بعد کام دیں گے، ان اعمال کو دنیا کے لئے نہیں کیا جاتا، اور یہ آخرت میں اسی وقت مفید ہوسکتے ہیں جبکہ یہ بحال بھی رہیں، اگر خدانخواستہ ان کا انجام ہی غلط نکلے تو پھر ایسے اعمال کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لئے کام کرتے ہوئے یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ برے اعمال کرو گے تو اس کا انجام تو ظاہر ہے برا ہی ہوگا، اور نیک اعمال کرو گے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپؐ کے طریقے کے مطابق

نہیں کروگے تو ان کا انجام بھی برا ہی ہوگا۔

بری نیت، برے انجام کی علامت:

اسی طرح نیک اعمال کرو لیکن نیت صحیح نہ ہو یا ان اعمال کی آدمی شرطیں بجا نہ لائے تو اس کا انجام بھی صفر ہے، مطلب یہ ہے کہ سب سے بہتر کام ان کے انجام ہیں، کاموں کی بہتری ان کا انجام ہیں، اور دوسری روایت میں ہے: سب سے بہتر کام وہ ہیں جو عزیمت والے ہوں، ہمت اور عزیمت کے ساتھ کام کو کیا جائے تو کام ہوگا، اور اگر سستی و کاہلی کے ساتھ کیا جائے تو وہ کام ٹھیک سے نہیں ہوگا۔

خیر کے کام کرنے ہوں تو پورے عزم کے ساتھ کرو اور ہمت کو استعمال کرو، اور یہ شکایت نہ ہو کہ معمولات کی پابندی نہیں ہوتی، نماز کی پابندی نہیں ہوتی، فلاں کام کی پابندی نہیں ہوتی، تلاوت کی پابندی نہیں ہوتی، یہ کبھی کسی نے شکایت نہیں کی کہ کھانے کی پابندی نہیں ہوتی، کیا کروں جی تو بہت چاہتا ہے روٹی کھانے کو لیکن پابندی نہیں ہوتی۔ یہ تو کہا جاتا ہے کہ تلاوت کی پابندی نہیں ہوتی، نماز کی پابندی نہیں ہوتی، ذکر کی پابندی نہیں ہوتی، دوسرے اعمالِ خیر کی پابندی نہیں ہوتی، آخر کیوں؟ وجہ کیا ہے؟

اصل میں دو چیزوں کا نقص ہے، ایک یہ کہ آپ نے عزم نہیں کیا کہ مجھے یہ کام کرنا ہے اور ہر حال میں کرنا ہے، اور دوسرے یہ کہ اس کے لئے ہمت کو استعمال نہیں کیا، اب کھانا آپ کے سامنے رکھا ہو تو کوئی دوسرا آدمی تو اُٹھا کے منہ میں لقمہ ڈالنے سے رہا، اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہاتھ پاؤں دیئے ہیں، قوت دی ہے، لقمہ اُٹھا سکتے ہیں تو منہ تک تو خود ہی لقمہ لے کر جانا پڑے گا، اور اگر کسی نے ڈال بھی دیا تو دانت تو آپ کو ہلانے پڑیں گے، اب کوئی دوسرا آدمی تو آپ کی جگہ دانت ہلا نہیں سکتا، اس کو حلق سے نیچے اتارنا تو آپ کا فعل ہوگا، ہمت کے بغیر تو آپ کھانا بھی نہیں

کھا سکتے، اسی کو فرمایا: سب سے بہتر کام وہ ہیں جن کو عزم کے ساتھ کیا جائے۔

اعمال میں عزیمت ہو، ہمیشہ رُخصت پر عمل نہ ہو:

یہاں پر یہ بات یاد رکھو کہ ایک عزیمت ہوتی ہے اور ایک رخصت ہوتی ہے، یہ کام کرلو تو اجازت ہے، لیکن عزیمت یہ ہے کہ یہ کام نہ کرو اس عزیمت کی جمع بھی عزائم آتی ہے، تو سب سے بہتر کام وہ ہیں جن میں عزیمت ہو، ہمیشہ رخصتوں پر عمل نہ ہو، کبھی کبھی آدمی رخصت پر بھی عمل کر لے، چلو اچھا ہے، اللہ تعالیٰ نے رخصت دی ہے، ٹھیک ہے، لیکن اکثر کوشش عزیمت پر عمل کرنے کی ہونی چاہئے۔

سب سے بدترین کام؟

سب سے بدترین کام وہ ہیں جن کو نیا گھڑ لیا گیا ہو، انہی کو بدعت کہتے ہیں، اور لوگ اپنی بے سمجھی یا بے علمی کی وجہ سے اس میں بڑا دھوکا کھاتے ہیں، جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں ہوا، آپ نے اس کی تعلیم نہیں فرمائی، جس کام کو صحابہ کرامؓ نے نہیں کیا اور جس کام کو حضرات فقہائے امت، حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، رحمہم اللہ تعالیٰ، نے قرآن و حدیث سے نکال کر نہیں بیان فرمایا، اس کام کو عبادت کا کام سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔

جو کام خود مقصود نہ ہو مگر دینی مقصد کے لئے کیا جائے وہ بدعت نہیں:

البتہ وہ کام جو دین کے کسی مقصد کے لئے کیا جاتا ہے اور اس کو خود مقصود نہیں سمجھا جاتا یہ بدعت نہیں ہے، بلکہ یہ دین کا ذریعہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابیں نہیں لکھی تھیں، صرف ایک ہی کتاب امت کو دی ہے اور وہ ہے قرآن کریم، صحابہ کرامؓ نے بھی کتابیں نہیں لکھیں لیکن دین

کی تعلیم اور تبلیغ کے لئے قلم کو ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بنایا ہے، شاہانِ عالم کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گرامی نامے بھی تحریر فرمائے ہیں، مقصود دعوت ہے، خط مقصود نہیں۔

اسی طرح بہت سی صورتیں ایسی بھی ہوئیں کہ کوئی صحابی دور دراز رہتے ہیں، ان کے نام گرامی نامہ تحریر فرمایا، اور اس میں کچھ ہدایات جاری فرمائیں کہ ایسا کرو، ایسا نہ کرو، زکوٰۃ وصدقات کی مقداریں اور نصاب یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر کروا کے دیئے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تو اس تحریر کو اپنی تلوار کی نیام میں رکھتے تھے، تو معلوم ہوا علم کو لکھ لینا اور قلم کے ذریعہ سے لوگوں کو دعوت دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، صحابہ کرامؓ اور حضرات خلفائے راشدینؓ بھی گرامی نامے تحریر فرماتے تھے۔

کتاب لکھنا جائز ہے:

چنانچہ تمام علمائے امت اس پر متفق ہیں کہ دین کی کتاب لکھنا جائز ہے اور عبادت ہے، لیکن خود عبادت نہیں بلکہ تعلیم و تبلیغ کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے عبادت ہے، اب آپ یہ نہیں فرمائیں گے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور صحابہ کرامؓ کے زمانے میں کتابیں نہیں لکھی گئیں، لہٰذا کتابیں لکھنا بدعت ہے، یہ کبھی نہیں فرمائیں گے آپ کہ بھائی! کتاب میں کیا لکھا ہے یہ تو دیکھو، دین کی حفاظت کے لئے اگر کتاب لکھی جاتی ہے، تعلیم کے لئے یا تبلیغ کے لئے کوئی کتاب لکھی جاتی ہے تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، کتاب خود مقصود نہیں بلکہ دین کی تعلیم اور تبلیغ مقصود ہے۔

مدرسہ کی تعمیر اور اس کا نظام جائز ہے:

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے اور مسجد

تعمیر فرمائی تو ساتھ ہی ساتھ ایک چبوترا بنادیا تھا اوراس پر چھپر ڈال دیا تھا، جس کو صفہ کہتے ہیں، آج بھی وہ موجود ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدرسہ تھا، اور بعض دفعہ یہاں ستر، ستر طالب علم رہا کرتے تھے،تعلیم حاصل کرتے تھے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دعوت کے کام کے لئے، جہاد کے کام کے لئے بھیجتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جواس امت میں احادیث کے سب سے بڑے راوی ہیں وہ اس مدرسے میں تین یا چار سال مسلسل رہے،تو معلوم ہوا کہ دینی مدارس بنانا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت ہے،مگر بلڈنگ یا اس میں درجہ بندی، اسباق کے گھنٹے تقسیم کرنا اور دوسرے جو نظام ہوتے ہیں مدارس کے یہ صرف تعلیم کے لئے اور انتظامی چیزیں ہیں، مقصود تعلیم دین ہے،تو تعلیم دین یہ اہم مقاصد میں سے ہے اور یہ مدارس یا ان کا نظام اس کا ذریعہ ہے، اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے۔

تبلیغ والوں کا سہ روزہ، چلّہ اور تین چلّے بھی جائز ہیں:

بہت سے سرپھرے مجھے لکھتے ہیں کہ یہ جو تبلیغ والوں نے سہ روزہ، چلّہ اور تین چلّے اور سال مقرر کیا ہوا ہے یہ سنت سے ثابت ہے؟ اور یہ کہتے ہیں کہ فضائل اعمال کی کتابیں پڑھو، یہ سنت سے ثابت ہے؟ جب لوگوں کا فہم اتنا نیچے گرجائے تو ان کو کیا جواب دوں؟ تم خود سوچو، میں لکھ دیتا ہوں کہ ہمارے مدارس میں جو کچھ نظام رائج ہے کیا یہ سنت سے ثابت ہے؟ یہ گھنٹہ بخاری شریف کا ہے، یہ گھنٹہ ترمذی شریف کا ہے، یہ گھنٹہ مسلم شریف کا ہے، کیا یہ کسی حدیث میں آتا ہے؟ حنفی تو خیر بیچارے مقلد ہیں، لیکن اہل حدیث تو اپنے آپ کو پکے سنت پر عمل کرنے والے کہلاتے ہیں، کسی حدیث سے ثابت کریں گے کہ فلاں گھنٹے میں بخاری شریف پڑھایا کرو، فلاں گھنٹے میں ترمذی شریف پڑھایا کرو، مدارس میں کسی میں سات سال کا نصاب ہے، کسی میں پانچ سال کا نصاب ہے، کسی میں دس سال کا نصاب ہے، بچیوں کے لئے کسی نے

تین سال کا نصاب بنادیا، کسی نے چھ سال کا نصاب بنادیا، کیا یہ سنت سے ثابت ہے؟ یہاں کبھی کسی کے دل میں وسوسہ پیدا نہیں ہوا، کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ نصاب کی مقدار یا کتابوں کی تعیین یا اوقات کی تعیین یا نظامِ تعلیم یہ خود مقصود نہیں ہیں، فروعات ہیں، اصل مقصود تو دین کی تعلیم ہے، چونکہ دین کی تعلیم کے لئے تجربہ کی بنیاد پر ایک نقشہ مرتب کردیا گیا ہے تو آپ اس کو بدعت نہیں کہیں گے بلکہ اس کو بھی بہت بڑا کارِ ثواب سمجھتے ہیں، یہ مدارس بنانے کو، قرآن کریم کے مکتب بنانے کو، بہت اونچی عبادت سمجھا اور کہا جاتا ہے، تو میرے بھائی! تبلیغ کے سہ روزہ کو، چلّے کو، تین چلّے کو، سال کو، دو سال کو، پانچ سال کو بھی اسی مد میں شامل کرلو، اگر ان حضرات نے تجربے کے ساتھ دعوت کے کام کو کسی کے اندر پختہ کرنے کے لئے کچھ اوقات مقرر کردیئے ہیں تو مجھے بتایئے آپ اس کو بدعت کیوں فرماتے ہیں؟ لوگ گھپلا کرتے ہیں۔

قبروں پر پھول انگریز کی سنت ہے:

شاہ تراب الحق کے ساتھ کسی زمانہ میں میرا قلمی مناظرہ ہوا تھا، میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ڈانٹ کر فرمایا: ''مولوی صاحب! یہ تم نے کیا شروع کردیا ہے؟'' یہی الفاظ تھے حضرتؒ کے، میں نے کہا: حضرت! آج کے بعد بند۔ وہیں ختم کردیا، تو ان صاحب سے میں نے کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور صحابہؓ کے زمانے میں قبریں بھی موجود تھیں اور پھول بھی موجود تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہ پھول کیوں نہیں چڑھائے؟ یہ پھولوں کی چادر چڑھانا انگریزوں اور مغرب کی طرف سے وحی آئی ہے، یہ آسمان کی وحی نہیں ہے، تم نے مغرب کی چیزوں کو آسمانی وحی کا درجہ دے دیا، جیسے میں نے ایک دفعہ کہا تھا ناں! اسلامی بینک، اسلامی شراب خانہ، نعوذ باللہ! استغفر اللہ! اسلامی جمہوریت، اسلامی کمیونزم، مغرب کی طرف

سے جن گندگیوں کی وحی آتی ہے تو اس پر ''اسلامی'' نام چسپاں کردیتے ہو۔

محدثات پر حدیث سے غلط استدلال:

یہ محدثات ہیں، تم نے اس کو ''اسلامی'' بنادیا اور تم اس کو عبادت سمجھتے ہو، استدلال کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جارہے تھے تو آپ کی سواری بدکی، فرمایا کہ: یہ قبریں کیسی ہیں؟ بتایا گیا کہ فلاں کی ہیں، غالباً مشرکین کی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی تازہ شاخ منگوائی، اس کو درمیان سے دو حصوں میں چیرا، ایک، ایک قبر پر گاڑ دی، دوسری، دوسری قبر پر گاڑ دی یا شاید مسلمانوں کی بھی تھی، فرمایا:

> ''اِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ! وَمَا يُعَذَّبَانِ فِيْ كَبِيْرٍ، اَمَّا اَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ، وَاَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِيْ بِالنَّمِيْمَةِ، ثُمَّ اَخَذَ جَرِيْدَةً رُطَبَةً فَشَقَّهَا بِنِصْفَيْنِ ثُمَّ غَرَزَ فِيْ كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً. فَقَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا؟ فَقَالَ: لَعَلَّهُ اَنْ يُّخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا.''
>
> (صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۸۲)
>
> ترجمہ:...... ''ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے، اور کسی بڑی بات پر عذاب نہیں ہورہا، ایک تو ان میں سے پیشاب سے پرہیز نہیں کرتا تھا، اور دوسرا چغل خوری کیا کرتا تھا۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا کہ: یہ شاخیں میں نے اس لئے گاڑی ہیں کہ شاید ان کے خشک ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ ان کے عذاب میں تخفیف فرمائیں گے۔''

یہ تو ہیں حدیث شریف کے الفاظ، بعض اکابر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے شاخ گاڑنے سے یہ استدلال فرمالیا کہ قبر پر کوئی سبز شاخ گاڑ دی جائے، چلو یہ بھی کسی درجے میں ہے، اگرچہ یہ بھی صحیح نہیں ہے، اب اس سے ہمارے دوست آگے بڑھے کہا کہ پھول ڈالے جائیں، کس کی قبر پر؟ اولیا اللہ کی قبر پر! کیوں؟ کیا ان اولیا اللہ کو عذاب ہو رہا ہے؟ معذّب سمجھ کر قبر پر پھول ڈالتے ہو؟

انگریزوں کی روش کو دلائل مہیا کرنا؟

باہر کے بڑے لوگ جب ہمارے یہاں آتے ہیں تو قائد اعظم کے مزار پر پھول ڈالتے ہیں، تو ہمارے بڑے لوگ جب باہر جاتے ہیں تو ان کے قومی رہنماؤں کی قبروں پر پھول ڈالتے ہیں، قبر بھی نہ ہو تو مٹی پر ڈالتے ہیں، یہ دنیا کی رسم ہے، اب تم اس کو دین بناتے ہو! یہاں تو نہیں لیکن دوسری روایت میں ہے: "وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَّكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ!" (اور ہر نئی بات جو گھڑی جائے وہ بدعت ہے، اور ہر بدعت برائی ہے!) اور اس کے ساتھ ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ: "وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ!" (ہر گمراہی دوزخ میں ہے)، اور ایک حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ: تھوڑی سنت پر عمل کرلینا بڑی بدعت پر عمل کرنے سے بہتر ہے۔

جنت جانے کا نسخہ:

پانچ وقت کی نماز پڑھو! دیکھو میں تمہیں بتاتا ہوں نماز کے ساتھ جو سنتیں ہیں وہ پڑھ لیا کرو، تکبیر تحریمہ کا اہتمام کرو، اس کے علاوہ اگرچہ ایک لفظ بھی نہ پڑھو، انشاءاللہ سیدھے جنت میں جاؤگے، اور ساری ساری رات لیلۃ القدر میں، شب برأت میں، ستائیسویں رجب میں عبادت کرو، لیکن فرض نماز کا اہتمام نہ کرو، "فی النار!" نتیجہ جہنم ہے۔

سنت کا نور اور بدعت کی ظلمت:

سنت پر عمل کرنے والا کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت سے محروم نہیں

ہوگا، اور بدعات میں تھکنے والا کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار و برکات کو حاصل نہیں کرسکتا، اس کے حصے میں ظلمت ہی ظلمت ہے۔

محرم اور ربیع الاول کی خرافات:

اب یہ محرم شروع ہوا ہے، ساری کی ساری خرافات ہیں، بدعات ہیں، چاہے کسی نے گھڑی ہوں، اب ان کو تقدس کا درجہ حاصل ہوگیا، محرم کی بدعات کے بعد پھر ربیع الاول آنے والا ہے، کسی نے صحیح کہا تھا کہ:

یہ امت خرافات میں کھوگئی!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے ہیں، میاں! خدا کے لئے اس پر عمل کرو، فرائض ہیں، واجبات ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن ہیں، پھر عقائد سے متعلق، اعمال سے متعلق، معاشرت سے متعلق، معاملات سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر عمل کرو، ان بدعات کے ذریعہ سے تم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کرسکتے۔

زیادہ غافل کرنے والے سے تھوڑا کفایت کرنے والا مال بہتر ہے:

اس کے بعد فرمایا: تھوڑا مال ہو لیکن کفایت کرجائے، ضرورت پوری ہوجائے وہ بہتر ہے اس زیادہ مال سے جو آدمی کو غافل کردے۔

ایک غلط سوچ کی اصلاح:

بھائی! میں بھی اس میں شامل ہوں، آپ بھی اس میں شامل ہیں، ایک غلط خیال ہم سب میں پختہ ہوگیا ہے، وہ یہ کہ حلال مال زیادہ سے زیادہ کمانا چاہئے، حرام تو خیر نہیں کمانا چاہئے، لیکن حلال مال زیادہ سے زیادہ ہونا چاہئے، یہ ہماری بھول ہے،

کیونکہ جتنا زیادہ ہوگا اتنے زیادہ کا حساب بھی دینا ہوگا، تھوڑا ہوگا تو تھوڑے کا حساب دوگے، زیادہ ہوگا تو زیادہ کا حساب دوگے، ایک نے دس روپے خرچ کئے ہیں، اس کو دس روپے کا حساب دینا ہے، اور ایک نے دس ہزار خرچ کئے ہیں، تو اس کو دس ہزار کا حساب دینا ہوگا، اب تم دیکھ لو کہ دس روپے کا حساب دینے میں وقت زیادہ لگے گا یا دس ہزار کا؟ اور یہ تو جب ہے کہ ہمارا حساب بالکل صاف ہو، اگر حساب میں کہیں گھپلا نظر آ گیا تو پھر وہیں پکڑے گئے۔

زیادہ کمانے کو میں حرام اور ناجائز نہیں کہتا، کماؤ، حلال کماؤ تمہاری خوشی ہے، لیکن اس غلطی کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں جس میں میں بھی مبتلا ہوں، آپ بھی مبتلا ہیں، اگر کوئی زیادہ کھاتا پیتا آدمی ہو تو اس کی قدر ہمارے نزدیک زیادہ ہے، اور ایک فقیر مسکین ہے اس کی عظمت اور قیمت ہمارے دل میں نہیں، لیکن جس طرح کسی چیز کی تہہ رکھی ہوتی ہے، اگر اس کو پلٹ دیا جائے تو نیچے والی اوپر آجاتی ہے، اوپر والی نیچے چلی جاتی ہے، قیامت کے دن ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ انسانوں کو پلٹ دیں گے، آج جو تمہیں نیچے نظر آتے ہیں، وہ کل کو اوپر ہوجائیں گے، اور آج جو اوپر نظر آتے ہیں وہ کل کو نیچے نظر آئیں گے، اور جو آگے نظر آتے ہیں، وہ پیچھے ہوجائیں گے، اور پیچھے والے آگے ہوجائیں گے، اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بالکل بجا فرماتے ہیں، آمنا وصدقنا! کہ جو مال تھوڑا ہو لیکن کفایت کرجائے، بس بقدرِ کفایت ہو وہ بہتر ہے، یہ نہیں کہ ہماری یہ خواہش پوری ہوجائے وہ خواہش پوری ہوجائے! بس کفایت میں زندگی گزر جائے وہ بہتر ہے اس مال سے جو زیادہ ہوکر غافل کردے۔ یہ غافل ہونا کئی طرح کا ہوتا ہے، تشریح کا موقع نہیں، ایک قسم غفلت کی یہ ہے کہ اسی مال کے انتظام میں بیچارہ لگا ہوا ہے، کچھ کرنے کی فرصت ہی نہیں مل رہی، یہ بھی غفلت ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین!

صحابہؓ نے پہلے ایمان،
پھر قرآن سیکھا!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

حدیث شریف میں ہے:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: لَقَدْ عِشْتُ بُرْھَۃً مِنْ دَھْرِیْ وَاِنَّ اَحَدَنَا یُؤْتِی الْاِیْمَانَ قَبْلَ الْقُرْاٰنِ وَتَنْزِلُ السُّوْرَۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَیَتَعَلَّمُ حَلَالَھَا وَحَرَامَھَا وَمَا یَنْبَغِیْ اَنْ یَّقِفَ عِنْدَہٗ مِنْھَا کَمَا تَعْلَمُوْنَ اَنْتُمُ الْقُرْاٰنَ، ثُمَّ لَقَدْ رَأَیْتُ رِجَالًا یُؤْتِیْ اَحَدُھُمُ الْقُرْاٰنَ قَبْلَ الْاِیْمَانِ فَیَقْرَأُ مَا بَیْنَ فَاتِحَۃِ الْکِتَابِ اِلٰی خَاتِمَتِہٖ، مَا یَدْرِیْ مَا اٰمِرُہٗ وَلَا زَاجِرُہٗ، وَمَا یَنْبَغِیْ اَنْ یَّقِفَ عِنْدَہٗ مِنْہُ وَیَنْثُرُہٗ نَثْرَ الدَّقَلِ." (مجمع الزوائد ج:۱ ص:۱۶۵)

ترجمہ:......"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ارشاد فرماتے ہیں کہ: مجھ پر ایک طویل زمانہ گزرا، ہم لوگ پہلے ایمان سیکھتے تھے پھر قرآن سیکھتے تھے، پہلے ایمان سیکھا اور اس کے بعد قرآن سیکھا، قرآنِ کریم کی سورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل

ہوتی تھیں تو ہم ان کے حلال وحرام کو بھی جانتے تھے، اور ہم یہ
بھی جانتے تھے کہ اس آیت پر یہاں وقف کرنا چاہئے، لیکن اس
کے بعد کچھ لوگ آئے ہیں جنہوں نے ایمان تو سیکھا نہیں،
قرآن سیکھ لیا اور وہ سورۂ فاتحہ سے لے کر آخر تک پڑھتے ہیں،
اور پڑھتے بھی دھڑادھڑ ہیں، ان کو یہ معلوم نہیں کہ اس آیت
میں کہاں وقف کرنا ہے؟ کہاں ٹھہرنا ہے؟ کیا اس کے احکام
ہیں؟ سورۂ فاتحہ میں کیا احکام ہیں؟ اور اسی طرح دوسری سورتوں
میں کیا احکام ہیں؟ بس جس طرح کہ ردّی کھجوروں کو چن کر
آدمی الگ کرلیتا ہے، اسی طرح ہم قرآن پڑھ رہے ہیں۔''

صحابہؓ اور بعد کے لوگوں کے قرآن سیکھنے میں فرق!

یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے زمانہ کی بات کر رہے تھے، وہ فرماتے تھے کہ ہم پہلے ایمان سیکھتے تھے، اور ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھ کر دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا تھا۔ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ: ''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم اللہ کو دیکھ رہے ہیں۔'' یہ تو اپنے زمانے کی بات ہے کہ ہم نے سب سے پہلے ایمان سیکھا، اور اس کے بعد قرآن سیکھا، پھر جب قرآن نازل ہوتا تھا، یعنی کبھی ایک چھوٹی سورت، کبھی ایک آیت، کبھی دو آیتیں، کبھی چند آیتیں، تو ایمان کو سیکھنے کے بعد پھر ہم قرآن کو سیکھتے تھے اور قرآن اس طرح سیکھتے تھے کہ اس کے حلال کو، حرام کو، جائز کو، ناجائز کو، ہر چیز کو جانتے تھے، اور اب کچھ لوگ آئے ہیں یا آئیں گے کہ وہ دھڑادھڑ قرآن مجید پڑھنا شروع کردیں گے، ان کو یہ تک معلوم نہیں کہ قرآن مجید ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے؟ ہم سے کیا تقاضا کرتا ہے؟

سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ والناس تک وہ قرآن مجید سارا حفظ سنادیں گے، لیکن قرآن مجید ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا، ہنسلی سے نیچے نہیں اُترے گا، اور قرآن مجید کو اس طرح فرفر پڑھیں گے گویا کہ ردّی کھجوروں کو چھانٹ رہے ہیں، الگ کر رہے ہیں۔ یہی فرق ہے ہمارے درمیان اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان، ان کے اندر خشیت تھی، خشوع تھا، قرآن مجید ان کے ظاہر اور باطن پر اثر کرتا تھا، اور ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں لیکن قرآن کوئی اثر نہیں کرتا، حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟ اس کو سیکھتے ہی نہیں کہ جائز کیا ہے؟ ناجائز کیا ہے؟ کوئی پرواہ ہی نہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون!

ابن ماجہ کی روایت میں حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

"كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ فُتْيَانٌ حَزَاوِرَةٌ فَتَعَلَّمْنَا الْإِيْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ فَازْدَدْنَا بِهٖ اِيْمَانًا." (ابن ماجہ ص:۱۱)

ترجمہ:..... "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے، اور ہم ابھی لڑکے سے تھے، کہنا چاہئے کہ جوان بھی نہیں ہوئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تعلیم فرماتے تھے تو ہم نے سب سے پہلے ایمان سیکھا، اس کے بعد قرآن مجید سیکھا، اور پھر قرآن مجید کے سیکھنے کی برکت یہ ہوئی کہ قرآن مجید کے سیکھنے کے بعد ہمارے ایمان میں اضافہ ہوگیا۔"

صحابہ کے استاذ و معلّم؟

یہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے، جن کے معلّم، معلّمِ

انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، قرآن کریم میں ارشادِ باری ہے:

"لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ." (آل عمران:۱۶۴)

ترجمہ:......"بے شک اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا ہے اہل ایمان پر کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم الشان رسول انہی میں سے بھیج دیا، جو ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور ان کو کتاب اور دانائی کی باتوں کی تعلیم دیتا ہے، بے شک وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے (لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل وہ تمام انسانوں کے معلّم بن گئے)۔"

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو بہت تھوڑے لوگ آئے، کوئی ایک لاکھ آدمی بھی نہیں ہوگا، جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست تعلیم پائی، باقی جتنی دنیا تھی ان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں نے پڑھایا، اور یہ اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا احسان ہے، ان حضرات پر اور ان کے طفیل آنے والی امت پر، جس کی کوئی نہایت اور حد نہیں ہے۔

انصار کا ایثار:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی دو جماعتیں تھیں، ایک مہاجرین تھے جو مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے آئے تھے، یہ کھیتی باڑی نہیں کرتے تھے، مکہ مکرمہ میں کھیتی کہاں ہوتی تھی؟ جانتے ہی نہیں تھے کہ کھیتی باڑی کیا ہوتی ہے؟ اور دوسرے انصار

تھے جو مدینے کے رہنے والے تھے، یہ حضرات کھیتی باڑی جانتے تھے، یہ چھوٹی سی بستی تھی، آج جس کو مدینہ کہتے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اس کو ''یثرب'' کہا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد وہ ''مدینہ'' بن گیا، ''مدینة الرسول'' صلی اللہ علیہ وسلم، ''طابہ''، ''طیبہ'' یہ سب اس کے نام بن گئے تھے، مدینہ میں تھوڑی سی زمینیں تھیں، جب یہ مہاجرین مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے اور ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے، تو مدینے والے حضرات نے کہا: یا رسول اللہ! آپ نے ان مہاجرین کو ہمارا بھائی بنادیا ہے اور بھائی بھی اس طرح بنایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہاجر اور ایک انصاری کو فرمایا کہ: تم آپس میں بھائی ہو! انصاری کے پاس اگر دو بیویاں تھیں تو اس نے کہا: یا رسول اللہ! میں ایک کو طلاق دیتا ہوں یہ میرا مہاجر بھائی اس کے ساتھ نکاح کرلے، اور جتنی ہماری زمینیں ہیں، آدھی ہماری اور آدھی ان کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میں تمہیں ان سے اچھا طریقہ نہ بتاؤں؟ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ ضرور بتائیے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمینیں تو تم اپنے پاس رکھو، لیکن اس کے غلّے اور آمدنی میں سے ان کو آدھا دے دیا کرو، کاشت کاری تم کرو، کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ کاشت کاری کیا ہوتی ہے؟ صحابہؓ نے فرمایا: ٹھیک ہے! اب یہ حضراتِ انصار مدینہ کے رہنے والے کاشت کاری بھی خود کرتے تھے، زمینیں بھی ان کی تھیں مگر اس کا آدھا حصہ مہاجرین کو دے دیتے تھے، جب کچھ وقت گزر گیا اور بعض علاقے فتح ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضراتِ انصار کو بلایا اور ارشاد فرمایا کہ: زمینیں اللہ تعالیٰ نے فتح کردی ہیں، اب میرا خیال یہ ہے کہ جو زمینیں فتح ہوئی ہیں وہ مہاجرین کو دے دیں اور تمہاری زمینیں تمہیں واپس کردیں! انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہماری درخواست یہ ہے کہ یہ جو ہم نے مہاجر بھائیوں کو زمینیں دی ہوئی ہیں، یہ زمینیں بھی ان کے پاس رہیں اور نئی زمینیں بھی آپ ان کو دے دیں۔ کیا کسی نے

ایسے لوگ دنیا میں دیکھے ہیں؟

فتح عراق کے بعد حضرت عمرؓ کا اضطراب:

آخر میں تو اللہ تعالیٰ نے اتنی کشائش فرمادی کہ زمینیں فتح ہوگئیں بلکہ ملکوں کے ملک فتح ہوگئے، اس وقت چونکہ دستور یہ تھا کہ پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کیا جاتا تھا اور چار حصے مجاہدین پر تقسیم کردیئے جاتے تھے، جب یہ عراق اور اس کی زمینیں فتح ہوئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میرے پاس مہاجرین کو بلاؤ! جب مہاجرین آگئے تو حضرت عمرؓ مہاجرین سے کہنے لگے کہ: میں تم سے ایک اہم مسئلہ کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں، وہ مشورہ یہ ہے کہ اب زمینیں تو بہت فتح ہوگئیں، اور تقسیم کرکے اس کا چوتھا حصہ تمہیں دے دیا گیا، لیکن میں سوچتا ہوں کہ تم تو وہ زمینیں لے کر بیٹھ گئے مگر آئندہ قیامت تک آنے والی نسلیں وہ کیا کھائیں گی؟ تو یہ حضرات اس کا کوئی ٹھیک جواب نہیں دے سکے، تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انصار کو بلاؤ! ان کو بلایا وہ بھی کوئی صحیح جواب نہ دے سکے، اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے استخارہ شروع کردیا، مسلسل ایک ماہ تک استخارہ کیا، بعض روایتوں میں اس سے بھی زیادہ مدت ذکر کی گئی ہے، آپؓ برابر استخارہ کرتے رہے، ایک دن بہت ہی خوشی اور مسرت میں ان مہاجرین و انصار کو فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے میرے مسئلے کا حل کردیا ہے، آئندہ یہ زمینیں تقسیم نہیں کی جائیں گی بلکہ یہ جو کاشت کار ہیں، یہ زمینیں ان کے پاس رہیں گی اور یہ مسلمانوں کی زمینیں ہوں گی، اور اس میں آنے والے سارے شریک ہوں گے۔ حضرت نے ایسی تقریر فرمائی کہ تمام کے تمام صحابہؓ اس پر متفق ہوگئے۔

قرآن سے ایمان کی زیادتی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

"قَالَ: كَانَتِ السُّوْرَةُ اِذَا نَزَلَتْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوِ الْآيَةُ اَوْ اَكْثَرُ زَادَتِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا وَّخُشُوْعًا وَنَهَتْهُمْ فَانْتَهَوْا."

(کنز العمال ج:۱ ص:۲۳۲)

ترجمہ:...... "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک سورہ نازل ہوتی یا ایک آیت یا زیادہ تو مسلمانوں کے ایمان اور خشوع میں اضافہ ہوجاتا، جس آیت نے جس چیز سے روکا ہوتا اس سے وہ رُک جاتے اور جس چیز کا حکم فرمایا ہوتا اس پر وہ جم جاتے۔"

صحابہؓ کا قرآن پر عمل کرنا:

ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ قرآن مجید کے بہت بڑے قاری ہیں، لیکن تابعی ہیں، صحابہؓ کے شاگرد ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا مَنْ كَانَ يُقْرِئُنَا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَقْتَرِءُوْنَ مِنْ رَّسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشَرَ آيَاتٍ فَلَا يَأْخُذُوْنَ فِي الْعَشْرِ الْاُخْرٰى حَتّٰى يَعْلَمُوْا مَا فِيْ هٰذِهٖ مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ، قَالَ: فَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ وَالْعَمَلَ!" (مسند احمد ج:۵ ص:۴۱۰)

ترجمہ:...... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے جو حضرات ہمیں قرآن مجید پڑھایا کرتے تھے، انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھا کرتے تھے، جب یہ دس آیتیں پک جاتیں، ان آیات پر ان کا علم اور عمل جب دل میں راسخ ہوجاتا، پھر عرض

کرتے کہ اب اگلا سبق بھی دیں، یعنی اس طرح انہوں نے قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا کہ دس آیتیں حفظ بھی کرتے اور ان کے علم اور عمل کو بھی ازبر کرتے اور اس کی تعمیل بھی کرتے، چنانچہ وہ صحابی فرماتے ہیں جن سے یہ ابوعبدالرحمٰن سلمی نقل کرتے ہیں کہ: ہم نے علم اور عمل دونوں اکٹھے سیکھے تھے، صرف علم نہیں سیکھا بلکہ عمل بھی سیکھا۔''

حضرت ابن مسعودؓ کا مقام:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک دفعہ درخت سے مسواک کاٹنے لگے تو ان کی چادر ہوا سے اُڑ گئی اور پنڈلیاں ننگی ہوگئیں، چونکہ ان کی پنڈلیاں بالکل پتلی تھیں، صحابہؓ دیکھ کر ہنسنے لگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں ہنستے ہو؟ کہنے لگے: عبداللہ بن مسعود کی پنڈلیاں دیکھ کر ہنستے ہیں کہ اتنی پتلی پنڈلیاں ہیں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیکن یہ میزان میں تو پہاڑ سے زیادہ بھاری ہوں گی! ''صاحب النعلین والوسادۃ'' ان کا لقب تھا، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تکیہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جوتا ان کے سپرد تھا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ:

''فَمَكَثْنَا حِيْنًا مَا نَرٰى اِلَّا اَنَّ عَبْدَاللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ بَيْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا نَرٰى مِنْ دُخُوْلِهٖ وَدُخُوْلِ اُمِّهٖ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.''

(مشکوٰۃ ص:۵۷۴)

یعنی ہم مدینے میں آئے، ایک مدت تک ہمیں یہی پتہ نہیں چلا کہ یہ عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی والدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے لوگ ہیں یا باہر کے آدمی ہیں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ:

”اِسْتَقْرَؤُا الْقُرْاٰنَ مِنْ اَرْبَعَةٍ: مِنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ، وَسَالِمٍ مَوْلٰی اَبِیْ حُذَیْفَةَ، وَاُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ، وَمَعَاذَ بْنِ جَبَلٍ۔“ (مشکوٰۃ ص:۵۷۴)

یعنی قرآن کریم چار آدمیوں سے پڑھو! سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا نام لیا، دوسرے نمبر پر سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابوحذیفہؓ کے غلام تھے اور غلام بھی ایسے تھے جب پردے کا حکم نازل ہوا تو ابوحذیفہؓ کی اہلیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہنے لگی: یا رسول اللہ! پردے کا حکم نازل ہوا اور سالم کو تو ہم نے بچوں کی طرح پالا ہے، اب اس سے پردہ کیسے کریں، وہ داڑھی والا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی برتن میں اپنا دودھ نکال کر اس کو پلادو، تمہارے لئے محرم بن جائے گا، اور یہ صرف سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ کی خصوصیت ہے کہ داڑھی والا ہونے کے باوجود ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا۔ بہرکیف حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم دس دس آیتیں سیکھتے تھے اور جب تک کہ ان کے علم کو، عمل کو ہر طرح سے ان کے احکام کو معلوم نہیں کر لیتے تھے، اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے، اس طرح پورا قرآن مجید پڑھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر سال سنایا بھی کرتے تھے، قرآن مجید کے حافظ تھے، اور جس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اس رمضان کو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو مرتبہ سنایا، اسی لئے فرماتے تھے کہ اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ کوئی قرآن مجید مجھ سے بھی زیادہ جانتا ہے تو میں اس کی بھی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے تیار ہوں، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ان دونوں بزرگوں سے یہ بات منقول ہے، چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے کوئی ایسا آدمی معلوم ہو جو مجھ سے زیادہ قرآن مجید جانتا ہے، تو میں اس کے پاس

جا کر قرآن مجید سیکھتا ہوں، اور وہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قسم! قرآن کریم کی کوئی ایسی آیت نہیں مگر میں جانتا ہوں کہ رات میں نازل ہوئی ہے یا دن میں؟ سفر میں نازل ہوئی ہے یا حضر میں؟

ایک روایت میں ہے:

”عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: کُنَّا اِذَا تَعَلَّمْنَا مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَشَرَ اٰیَاتٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ لَمْ نَتَعَلَّمِ الْعَشَرَ الَّتِیْ بَعْدَھَا حَتّٰی نَعْلَمَ مَا فِیْہِ، فَقِیْلَ لِشَرِیْکٍ: مِنَ الْعَمَلِ؟ قَالَ: نَعَمْ!“

(کنز العمال ج:۱ ص:۲۳۲).

ترجمہ:...... ”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب تک ہم اس قرآن مجید کی دس آیات کے احکام کو نہیں سیکھ لیتے تھے، آگے نہیں پڑھتے تھے، شریک جو اس حدیث کے راوی ہیں، ان سے کسی نے پوچھا: عمل مراد ہے؟ یعنی احکام پر عمل کرنا؟ کہنے لگے: جی ہاں! یہی مراد ہے۔“

حضرت حذیفہؓ کا مقام:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے دوستی تھی، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے راز کی باتیں بتائی تھیں اور منافقوں کے بارے میں بتایا تھا، جب کوئی جنازہ آتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے کہ: دیکھو حذیفہؓ ان میں یعنی جنازہ پڑھنے والوں میں موجود ہے یا نہیں؟ اگر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ شریک ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس جنازہ میں شرکت کرتے، اور اگر معلوم ہوتا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس میں شریک نہیں ہیں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ شریک نہیں ہوتے تھے۔

جنازہ میں احتیاط:

ہماری مسجد فلاح کے امام صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، انہوں نے میرا بوجھ ہلکا کردیا ہے، پہلے مجھے بہت ہی دقت ہوتی تھی، جب کوئی جنازہ آتا تھا میں پریشان ہوتا تھا کہ کیا کروں؟ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جن کی داڑھی نہیں ہوتی تھی، ان کا جنازہ کیسے پڑھاؤں؟ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو حرام کھانے والے ہیں، ان کا جنازہ کیسے پڑھاؤں؟ غرضیکہ جب کوئی جنازہ آتا تھا تو مجھے پریشانی ہوتی تھی، اب اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، یہ آگئے ہیں، یہ آگے ہوجاتے ہیں، ہم پیچھے، اللہ اکبر! جو نیت امام کی وہ نیت مقتدی کی، اللہ اکبر!

علم کتنا سیکھا جائے؟

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کرتے تھے:

"یَا اَخَا بَنِیْ عَبَسٍ! اِنَّ الْعِلْمَ کَثِیْرٌ وَالْعُمَرَ قَلِیْلٌ! فَخُذْ مِنَ الْعِلْمِ مَا تَحْتَاجُ اِلَیْهِ فِیْ اَمْرِ دِیْنِکَ، وَدَعْ مَا سِوَاهُ فَلَا تُعَانِهٖ." (حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۱۸۹)

ترجمہ:...... "میاں! عمر بہت تھوڑی ہے اور علم بہت زیادہ ہے، اگر تم سارے قصے کہانیاں پڑھنے لگو گے تو عمر ختم ہوجائے گی، بس ضرورت کی باتیں معلوم کرو اور اپنے عمل میں لگو!"

علم کی وسعت:

ایک اور روایت میں ہے:

"عَنْ اَبِی الْبَخْتَرِیْ قَالَ: صَحِبَ سَلْمَانَ رَجُلٌ

مِنْ بَنِیْ عَبَسٍ قَالَ: فَشَرِبَ مِنْ دَجْلَةَ شَرْبَةً فَقَالَ لَهُ سَلْمَانُ: عُدْ فَاشْرَبْ! قَالَ: قَدْ رَوِیْتُ! قَالَ: أَتَرٰی شَرْبَتَکَ هٰذِهٖ نَقَصَتْ مِنْهَا؟ قَالَ: وَمَا یَنْقُصُ مِنْهَا شَرْبَةٌ شَرِبْتُهَا! قَالَ: کَذٰلِکَ الْعِلْمُ لَا یَنْقُصُ فَخُذْ مِنَ الْعِلْمِ مَا یَنْفَعُکَ!" (حلیۃ الاولیأ ج:۱ ص:۱۸۸)

ترجمہ:......"ابوالبختریؒ کہتے ہیں کہ: ایک آدمی بنی عبس میں سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا ساتھی ہوا، چلتے چلتے راستے میں دریائے دجلہ آتا تھا، انہوں نے اس طرح چلّو لے کر پانی پی لیا، تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: اور پی لو! وہ ساتھی کہنے لگے: حضرت اتنا ہی پینا تھا مجھے جتنا پینا تھا پی لیا! فرمایا کہ: تمہارے اس چلو پینے سے دریائے دجلہ میں کوئی کمی بھی واقع ہوئی ہے؟ (ظاہر بات ہے کہ کیا کمی واقع ہوگی، دریا بھرا ہوا چل رہا ہے، ایک آدمی ایک بالٹی بھی پی لے تو کیا کمی واقع ہوجائے گی؟ انہوں نے تو ایک چلّو پیا تھا، تو ارشاد فرمایا: یہی مثال ہے آدمی کی عمر کی اور یہاں کے علم کی، علم تو بہت ہیں، بے شمار ہیں، اور علوم کے دریا چل رہے ہیں، علم کم نہیں ہوتا، لیکن آدمی کس کس علم کو سیکھے؟) آدمی کو اتنا علم سیکھنا چاہئے جو اس کو آخرت میں کام دے سکے۔"

حضرت ابن عمرؓ کی سائل کو چار نصیحتیں:

محمد بن ابی قیلۃ ذکر کرتے ہیں کہ کسی شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، اور تمام علمأ کا اتفاق ہے کہ

صحابہ کرامؓ کی جماعت میں ان سے بڑھ کر کوئی متبع سنت نہیں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر کیا، ان کو معلوم تھا کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی ضرورت کے لئے اُترے تھے، بعد میں جب سفر میں اس راستہ سے گزرتے، چاہے ان کو ضرورت ہوتی یا نہ ہوتی، وہاں اُترتے اور اس طرح بیٹھتے گویا پیشاب کر رہے ہیں اور اُٹھ کر آجاتے، یعنی ان کو وہ جگہ بھی معلوم ہوتی تھی جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کے لئے بیٹھے تھے، کسی نے کسی مسئلہ میں خط لکھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"اِنَّکَ کَتَبْتَ تَسْأَلُنِیْ عَنِ الْعِلْمِ، فَالْعِلْمُ اَکْبَرُ مِنْ اَنْ اَکْتُبَ بِهٖ اِلَیْکَ، وَلٰکِنْ اِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَلْقَی اللهَ کَافَ اللِّسَانَ عَنْ اَعْرَاضِ الْمُسْلِمِیْنَ، خَفِیْفُ الظَّهْرِ مِنْ دِمَائِهِمْ، خَمِیْصُ الْبَطْنِ مِنْ اَمْوَالِهِمْ، لَازِمًا لِجَمَاعَتِهِمْ فَافْعَلْ!" (کنز العمال ج:۵ ص:۲۳۰)

تو نے مجھے علم کے بارہ میں خط لکھا ہے، مگر علم اتنی بڑی چیز ہے کہ میں اس کی تشریح نہیں کرسکتا، لیکن چار باتوں کی میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں:

ا:......پہلی بات یہ کہ اگر تجھ سے ہوسکے تو یہ کر کہ تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے اس حال میں کہ مسلمانوں کی عزت اور آبرو سے تیری زبان محفوظ ہو، اور کسی مسلمان کا تمہارے ذمہ یہ مطالبہ نہ ہو کہ اس نے فلاں جگہ میری غیبت کی، اس نے برائی کے ساتھ میرا تذکرہ کیا۔

۲:......دوسری بات یہ کہ مسلمانوں کے جو خون ہو رہے ہیں، قیامت کے دن تیرے ذمہ ان میں سے کوئی چیز نہ ہو، تیری پشت مسلمانوں کے خون سے ہلکی پھلکی ہو۔

قرآن مجید میں ہے کہ جس نے ایک جان کو قتل کردیا: "فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ

جَمِيعًا." (المائدہ:۳۲) گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا، نعوذ باللہ! قیامت کے دن کسی آدمی کے ذمہ یہ مطالبہ نہ ہو کہ اس نے کسی مسلمان کو قتل کیا۔

۳:...... تیسری بات یہ کہ مسلمانوں کے مالوں سے تیرا پیٹ بھوکا ہو، یعنی کسی مسلمان کا مال تیرے پیٹ میں نہ جائے، یعنی ناجائز طور پر تیرے پیٹ میں نہ جائے۔

۴:...... چوتھی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت سے الگ تھلگ نہ ہو، بلکہ ان کے ساتھ لازم رہو، یعنی ان کے ساتھ مل کر رہو۔ بس یہ چار نصیحتیں یاد رکھو!

بڑے چھوٹے ہونے کا معیار!

اب ہم نے دیکھا ہے کہ بعض جگہ بعض مسلمان بیچارے مسجد میں نماز پڑھنے نہیں آتے، مسلمانوں سے الگ تھلگ ہی رہتے ہیں، اور بعضے تو بیچارے ایسے ہیں کہ ان کو مسلمانوں کے ساتھ کھڑا ہونا، غریبوں کے ساتھ کھڑا ہونا معیوب معلوم ہوتا ہے، وہ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ ہمارے جیسے غریب آدمیوں کے پاس بیٹھنا اور برابر کھڑا ہونا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے، میرے بھائیو! یہاں ہم کچھ بڑے ہوگئے ہیں، کچھ چھوٹے ہوگئے ہیں، لیکن مرنے کے بعد سب برابر ہوجائیں گے، اور وہاں آخرت کے پیمانے سے بڑا اور چھوٹا ہونا ناپا جائے گا کہ کون بڑا ہے؟ کون چھوٹا ہے؟ ہم نے آخرت کو بھلا دیا، بڑا چھوٹا ہونا وہاں کا ہمیں معلوم ہی نہیں رہا، یہاں اگر کسی کے پاس دنیا زیادہ ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بڑا آدمی ہے! ایک حدیث شریف میں ہے کہ:

"..... يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُوْنَ اَمْثَالَ الذَّرِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيْ صُوَرِ الرِّجَالِ يَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ ....." (مشکوٰۃ ص۴۳۳)

بہت سارے لوگ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں، لیکن قیامت کے دن یہ جو

چیونٹیاں ہوتی ہیں ناں! یعنی گندگی کے کیڑے ان جیسی ان کی حالت ہوگی، اور لوگ ان کو روندتے ہوئے چلیں گے، نعوذ باللہ! استغفر اللہ!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

حضراتِ صحابہؓ
کا
تعلیم کے لئے سفر!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

"عَنْ عُرْوَةَ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَخْلَفَ مَعَاذَ بْنَ جَبَلٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَلٰى اَهْلِ مَكَّةَ حِيْنَ خَرَجَ اِلٰى حُنَيْنٍ وَاَمَرَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّعَلِّمَ النَّاسَ الْقُرْاٰنَ وَاَنْ يُّفَقِّهَهُمْ فِى الدِّيْنِ، ثُمَّ صَدَرَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامِدًا اِلَى الْمَدِيْنَةِ وَخَلَّفَ مَعَاذَ بْنَ جَبَلٍ عَلٰى اَهْلِ مَكَّةَ."

(مستدرک حاکم ج:۳ ص:۲۷۰)

ترجمہ:...... "حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد جب جنگِ حنین کے لئے نکلے تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اہل مکہ پر امیر بنادیا، اور ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ ان لوگوں کو قرآن پڑھائیں اور دین کے معاملے میں ان کو فقیہ بنائیں۔ (جنگِ حنین اور جنگِ طائف سے فارغ ہوکر) آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم جب واپس تشریف لائے تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو کچھ عرصہ کے لئے وہیں مکہ میں چھوڑ دیا تھا (اور وہ اپنے کام میں مشغول رہے، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دوسرے آدمی کو مقرر کردیا، اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو واپس مدینہ اپنے پاس بلالیا)۔"

حضرت معاذؓ کی تعلیمی خدمات:

مکہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پرانا شہر ہے، اور یہاں کے لوگ ابھی نومسلم تھے، اس لئے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ایسے ایک آدمی کی ضرورت تھی جو واقعتاً اس کا اہل ہو، چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مقرر کردیا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے وہاں رہنے سے دین اور دین کی باتوں کا خوب چرچا ہوا، اور اہل مکہ تھوڑی مدت میں دین کی سمجھ پیدا کرنے کے قابل ہوگئے، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنے ہاں بلالیا اور دوسرے آدمی کو مکہ کا امیر مقرر کردیا۔

حضرت زید بن ثابتؓ کا علمی مقام:

اور یہی معمول حضرت عمرؓ کا تھا، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ:

"عَنِ الْقَاسِمِ قَالَ: كَانَ عُمَرُ يَسْتَخْلِفُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فِيْ كُلِّ سَفَرٍ، وَكَانَ يُفَرِّقُ النَّاسَ فِي الْبُلْدَانِ وَيُوَجِّهُهُ فِي الْأُمُوْرِ الْمُهِمَّةِ وَيَطْلُبُ اِلَيْهِ الرِّجَالَ الْمُسَمُّوْنَ فَيُقَالُ لَهُ: زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ! فَيَقُوْلُ: لَمْ يَسْقُطْ عَلٰى مَكَانِ زَيْدٍ وَلٰكِنَّ اَهْلَ الْبَلَدِ يَحْتَاجُوْنَ اِلٰى زَيْدٍ فِيْمَا

يَجِدُوْنَ عِنْدَهٗ فِيْمَا يُحَدِّثُ لَهُمْ مَا لَا يَجِدُوْنَ عِنْدَ غَيْرِهٖ۔“

(طبقات ابن سعد ج:۴ ص:۱۷۴ بحوالہ حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۱۹۷)

یعنی حضرت قاسمؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب کبھی مدینہ طیبہ چھوڑ کر باہر تشریف لے جاتے تھے تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ امیر مقرر کر جاتے تھے، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلیٰ کے نائب اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غیر حاضری میں مدینہ طیبہ کے امیر، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس وقت جتنی بھی اسلامی سلطنت تھی اس کے امیر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہوتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مختلف شہروں میں متعین کر دیا تھا، کسی صحابی کو کسی جگہ بھیج دیا، کسی کو کسی جگہ بھیج دیا، تمام صحابہ کو مدینے میں نہیں رہنے دیا تاکہ مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو دینی فائدہ ہو، رہا حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو اگر کوئی اہم کام ہوتا تو ان کو مدینہ سے باہر کسی علاقہ میں بھیجتے ورنہ نہیں بھیجتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معمول مبارک تھا کہ جب کسی جگہ کوئی آدمی بھیجنا ہوتا تو لوگوں سے مشورہ کرتے کہ ہاں بھائی! نام دو فلاں جگہ یا فلاں علاقہ میں کسی صحابی کو بھیجنا ہے، کس کو بھیجیں؟ صحابہ مختلف لوگوں کا نام لیتے اور ان ناموں میں ایک نام حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بھی آتا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ: میں زید بن ثابتؓ کے نام سے ناواقف نہیں ہوں، لیکن میں ان کو مدینے سے باہر بھیجنا نہیں چاہتا، اس لئے کہ اگر وہ مدینے سے باہر چلے جائیں تو پھر مدینے میں فتویٰ دینے والا کون ہوگا؟ مدینے کا سب سے بڑا عالم تو زید بن ثابتؓ ہے، مدینے میں لوگ اپنے مسائل اور ضرورتیں لے کر آتے ہیں، حضرت زید بن ثابتؓ ان کے مسائل کا جواب دیتے ہیں، اگر یہ بھی مدینہ سے باہر چلے جائیں تو ان لوگوں کو مسائل بتانے والا اور فتویٰ دینے والا کوئی نہیں رہے گا۔“

زید بن ثابتؓ ابن عمرؓ کی نظر میں:

ایک روایت میں ہے:

”عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: كُنَّا مَعَ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يَوْمَ مَاتَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، فَقُلْتُ: مَاتَ عَالِمُ النَّاسِ الْيَوْمَ! فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: يَرْحَمُهُ اللّٰهُ الْيَوْمَ فَقَدْ كَانَ عَالِمُ النَّاسِ فِيْ خِلَافَةِ عُمَرَ وَحِبْرُهَا، فَرَّقَهُمْ عُمَرُ فِي الْبُلْدَانِ وَنَهَاهُمْ اَنْ يُّفْتُوْا بِرَأْيِهِمْ وَجَلَسَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ بِالْمَدِيْنَةِ يُفْتِيْ اَهْلَ الْمَدِيْنَةِ وَغَيْرَهُمْ مِنَ الطُّرَاءِ يَعْنِيْ الْقُدَّامَ.“

(بحوالہ حیاۃ الصحابہ، طبقات ابن سعد ج:۴ ص:۱۷۶)

حضرت سالم رحمہ اللہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے ہیں، وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب حضرت زید بن ثابتؓ کا انتقال ہوگیا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو بہت ہی رنج اور صدمہ ہوا، حاضرین میں سے کسی نے یہ بات کہہ دی کہ حضرت زید بن ثابت تو لوگوں کو فتویٰ دیتے تھے، اب فتویٰ کون دے گا؟ حضرت ابن عمرؓ فرمانے لگے کہ: وہ فتویٰ اب سے نہیں دیتے تھے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے فتویٰ دیتے آئے تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوسرے صحابہ کو باہر ممالک میں بھیجتے تھے لیکن حضرت زید بن ثابتؓ کو مدینہ طیبہ میں رکھتے تھے، کیونکہ مدینے والوں کو ان کی ضرورت تھی، اب ان کا انتقال ہوگیا ہے، اب مدینے میں فتویٰ کون آدمی دے گا؟

زید بن ثابتؓ، عثمان غنیؓ کی نظر میں:

ایک دوسری روایت میں ہے:

"عَنْ اَبِیْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ السُّلَمِی: اَنَّهُ قَرَأَ عَلٰی عُثْمَانَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ فَقَالَ لِیْ: اِنَّکَ اِذَنْ تَشْغُلُنِیْ عَنِ النَّظَرِ فِیْ اُمُوْرِ النَّاسِ، اَمْضِ اِلٰی زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ فَاِنَّهُ اَفْرَغُ لِهٰذَا الْاَمْرِ فَاقْرَأْ عَلَیْهِ فَاِنَّ قِرَاءَتِیْ وَقِرَاءَتَهُ وَاحِدَةٌ لَیْسَ بَیْنِیْ وَبَیْنَهُ فِیْهَا خِلَاف."

(کنزالعمال ج:۱۳ حدیث:۳۷۰۵۳)

حضرت ابوعبدالرحمٰن السلمی رحمہ اللہ جو تابعی ہیں اور فن قرأت کے امام ہیں، انہوں نے اکابر صحابہؓ سے علم قرأت حاصل کیا تھا اور آگے پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے سلسلہ چلایا، ان سے نقل کیا ہے کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور قرأت سیکھتے تھے، ایک دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ: بھائی! خلافت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر ہے، اب میں تمہارے ساتھ مشغول ہوں گا اور تمہیں قرأت سکھاؤں گا تو لوگوں کے کام سے تو پھر فارغ ہوجاؤں گا، امت کے کتنے کام میرے ذمہ ہیں، اس لئے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ اب تم حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس جایا کرو اور جو کچھ سیکھنا ہے ان سے سیکھا کرو، اس لئے کہ میری قرأت کے درمیان اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی قرأت کے درمیان کوئی فرق نہیں، دونوں کی قرأت ایک ہی ہے۔

چنانچہ ابوعبدالرحمٰن السلمی رحمہ اللہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد سننے کے بعد حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے اور ان سے قرأت سیکھتے رہے۔

اور سوچنے کی بات ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہیں، لوگوں کی شب و روز کی ضروریات ان سے متعلق ہیں، اور اس حالت میں وہ دوسروں کو قرآن کریم پڑھاتے بھی ہیں، صرف پڑھاتے ہی نہیں بلکہ پڑھتے بھی ہیں۔

ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھنا:

طحاوی شریف میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے، تو ایک صاحب کہتے ہیں کہ میں اپنی نماز پڑھ رہا تھا، میں نے دیکھا کہ ایک صاحب آئے، آکر نماز کی نیت باندھ لی اور قرآن مجید کی تلاوت شروع کردی، اول سے آخر تک پورا قرآن مجید ایک رکعت میں مکمل کیا (طحاوی ص:۲۴۰)، وہ صاحب کہتے ہیں کہ میں نے پیچھے ہوکر دیکھا تو وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں، یہ چند حضرات تھے جنہوں نے پورا قرآن مجید ایک رکعت میں مکمل کیا: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ، جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امام بھی بنایا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ، اور ہمارے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، اس کے علاوہ اور بھی دو چار آدمیوں کا نام آتا ہے، جنہوں نے ایک رکعت میں پورا قرآن مجید پڑھا ہے۔ اور دوسری رکعت میں کوئی مختصر سی سورۃ پڑھ کر دوگانہ پورا کردیا۔

امام ابوحنیفہؒ کی نماز کے بعد دعا:

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارہ میں آتا ہے کہ قرآن مجید ختم کرنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر یوں دعا کرتے تھے:

"یَـا اللّٰہ! مَـا عَـرَفْـنَـاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ، وَمَـا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ!"

ترجمہ:...... "یا اللہ! جیسا آپ کو پہچاننے کا حق ہے ایسا ہم پہچان نہیں سکے، اور جیسا آپ کی عبادت کرنے کا حق ہے ویسی ہم عبادت نہیں کرسکے!"

چالیس سال عشاؑ کے وضو سے صبح کی نماز:

چالیس سال حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے عشاؑ کے وضو کے ساتھ نمازِ فجر پڑھی ہے۔ غیر مقلدوں بیچاروں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ امام ابوحنیفہؒ نے چالیس سال تک عشاؑ کے وضو کے ساتھ فجر کی نماز کیسے پڑھ لی؟

ایک رات میں دو ہزار رکعت نماز:

ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے ایک بزرگ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ ایک ہزار رکعت ایک رات میں کھڑے ہوکر پڑھتے تھے اور ایک ہزار رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے، دو ہزار رکعتیں ایک رات میں پڑھتے تھے۔

ایک رات میں سات آسمانوں کی سیر ممکن ہے؟

ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا کہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے! میں نے کہا کہ: جی ہاں! ممکن نہیں ہے، واقعی ممکن نہیں، ایک آدمی جاتا ہے مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک اور وہاں انبیاؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی امامت کرتا ہے، اور وہاں سے آسمانوں پر جاتا ہے، پہلے آسمان پر، دوسرے آسمان پر، تیسرے آسمان پر، چوتھے آسمان پر، پانچویں، چھٹے، ساتویں آسمان پر، اور اس کے بعد لامکان پر پہنچ جاتا ہے، اور اوپر سے آواز آتی ہے: "قِفْ یَا مُحَمَّدُ! فِاِنَّ رَبَّکَ یُصَلِّیْ!" (اے محمدؐ! ٹھہر جاؤ، تمہارا رب نماز پڑھ رہا ہے!)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر عنایت اور شفقت فرما رہا ہے، وہاں سے آئے تو جنت اور دوزخ کی سیر کی، حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ:

> "یَا بِلَالُ! حَدِّثْنِیْ بِاَرْجٰی عَمَلٍ عَمِلْتَهٗ فِی الْاِسْلَامِ، فَاِنِّیْ سَمِعْتُ دَفَّ نَعْلَیْکَ بَیْنَ یَدَیَّ فِی الْجَنَّةِ.
> قَالَ: مَا عَمِلْتُ عَمَلًا اَرْجٰی عِنْدِیْ اِنِّیْ لَمْ اَتَطَهَّرْ طُهُوْرًا

فِیْ سَاعَۃٍ لَیْلٍ اَوْ نَھَارٍ اِلَّا صَلَّیْتُ بِذَالِکَ الطُّھُوْرُ مَا
کُتِبَ لِیْ اَنْ اُصَلِّیْ.“ (صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۵۴)

بلال کیا بات ہے؟ جب میں معراج میں گیا ہوں تو تمہارے جوتے کی آہٹ میرے آگے آگے آرہی تھی؟ کیا عمل کیا کرتے ہو؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! میں یہ عمل کرتا ہوں کہ جب بھی میرا وضو ٹوٹتا ہے میں دوبارہ وضو کرتا ہوں اور دو رکعت نماز نفل پڑھتا ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت اور دوزخ کی سیر کی، بزرخ کے بہت سے عجائبات کا مشاہدہ فرمایا اور واپس آئے تو ابھی تک کنڈہ ہل رہا تھا، یعنی جس دروازے کو کھول کر گئے تھے واپس آئے تو کنڈہ ہل رہا تھا۔

واقعہ معراج پر اِشکال کا جواب، ایک حکایت:

میرے والد ماجد، اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائے، انہوں نے یہ واقعہ سنایا تھا، ظاہر ہے انہوں نے یہ واقعہ کسی بزرگ سے سنا ہوگا کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا واقعہ سنا تو اس کو اشکال ہوا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جس آدمی کو واقعہ معراج پر اشکال تھا وہ ایک نہر پر غسل کرنے کے لئے اترا، تنہائی تھی، کپڑے اتار کر نہر کے کنارے پر رکھ دیئے، جب غسل سے فارغ ہوکر واپس آیا تو باہر دیکھا کہ جہان ہی کوئی اور ہے، کپڑے غائب ہیں اور یہ مرد سے عورت بنا ہوا ہے، وہاں ایک مرد نظر آیا اس سے کپڑے مانگے اور اس سے نکاح کرلیا، اور اس مرد سے عورت بننے والے نے بچے جنے، معلوم نہیں یہ معاملہ اس کے ساتھ کتنے سال رہا، ایک دن گھڑا لئے نہر پر گئے، (وہ اس وقت تو گئی تھی) اور باہر نکل کر جو دیکھا تو وہیں اسی جگہ ان کے کپڑے پڑے ہوئے ہیں اور وہ دوبارہ مرد بنے ہوئے ہیں، اب جو اپنے گھر گئے تو وہی پرانا گھر تب اپنی زبان سے کہنے لگا کہ معراج کا واقعہ ہوسکتا ہے،

گویا جب اپنا معاملہ دیکھا تو مان گیا کہ یہ بات ہوسکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی مدت لگائی، آپ ایک آسمان سے دوسرے آسمان، دوسرے سے تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے، ساتویں اس کے بعد عرشِ معلیٰ اور عرشِ معلیٰ سے لامکان تک گئے، کتنا عرصہ لگایا؟ قرآن کریم میں ہے کہ: "لَیۡلًا" رات کا ایک قلیل حصہ لگا، جب سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو حضرت جبریل علیہ السلام رُک گئے:

بدو گفت سالار بیت الحرام
کہ اے حامل وحی برتر خرام

ترجمہ:......"کعبہ کے سردار نے اس سے کہا کہ اے وحی کے حامل آگے بڑھو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جبریل علیہ السلام تھے، وہ پیچھے ہٹ گئے، کہنے لگے: حضرت! آگے آپ جایئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ:

چو در دوستی مخلصم یافتی
عنانم زصحبت چرا یافتی

جب تو نے میری رفاقت کو سچ سمجھا ہے اور تم شروع سے میرے ساتھ آرہے ہو، اب یہاں سے منہ بدل لیا، حضرت جبریل امین علیہ السلام نے فرمایا: آگے میرا کام نہیں ہے! آپ کا کام ہے، اگر ایک بال کے برابر بھی اوپر جاتا ہوں:

اگر یکسر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

تو تجلیاتِ الٰہی میرے پروں کو جلادیں گی۔ ارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو زمین سے اوپر تک چلے گئے، اور یہاں لوگوں کو اشکال ہو رہا ہے کہ وہ بزرگ ایک ہزار رکعت کھڑے ہوکر اور ایک ہزار رکعت بیٹھ کر کیسے پڑھ سکتے ہیں؟

وقت میں برکت کی کرامت:

میں نے اس سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ بزرگوں کی کرامت تو مشہور ہے، اور تمام علماء اس پر متفق ہیں، ایک کرامت تو یہ ہے کہ تھوڑا کھانا زیادہ آدمیوں کو کافی ہوجائے، اور ایک یہ ہوتی ہے کہ تھوڑے وقت میں زیادہ کام ہوجائے، جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں وقت کو ربڑ کی طرح کھینچ لیتے ہیں، ہمارے لئے وہ اتنا ہی وقت ہوتا ہے جو سوکر گزار دیتے ہیں، اور ان حضرات کے لئے وہی وقت اللہ تعالیٰ کی یاد کا ہوتا ہے۔

حضرت عثمانؓ کا زید بن ثابتؓ پر اعتماد:

بہرحال عرض کر رہا تھا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارہ میں کہ انہوں نے ابوعبدالرحمٰن السلمی سے فرمایا کہ: بھائی! مجھے اور بھی کام ہیں، بس آپ کو جتنا پڑھانا تھا پڑھا دیا، اب تم زید بن ثابتؓ کے پاس جایا کرو، کیونکہ میں تمہیں پڑھانے کے لئے مشغول رہوں گا تو امت کے کام کون کرے گا؟

حضرت عثمانؓ اور تدریس قرآن:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حافظِ قرآن تھے، مدونِ قرآن تھے، اور لطف یہ ہے کہ جب تک خلافت کی ذمہ داری آپؓ پر نہیں آئی، اس وقت تک لوگوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے۔

حضرت معاذؓ کا شوقِ جہاد اور حضرت عمرؓ کا فتویٰ کے لئے ان کو روکنا:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مجاہدین کی جماعتیں جب ملک شام اور عراق جانے لگیں تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: حضرت! مجھے بھی اجازت دیجئے میں بھی جہاد کے لئے جانا چاہتا ہوں! حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شوق سے جایئے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ رجال شناس تھے، وہ آدمیوں کو جانتے بھی تھے، اور "لَا یَخَافُوْنَ فِی اللہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ" بھی تھے، اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے، خود فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب حضرت معاذ بن جبلؓ نے ملک شام جانے کی اجازت مانگی تو میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: ان کو نہ جانے دیجئے! یہاں فتوے کون دیا کرے گا؟ میں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارہ میں حدیث سنائی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "وَاَعْلَمُھُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مَعَاذُ بْنُ جَبَلٍ!" (مشکوٰۃ ص:۵۶۶) (حلال اور حرام کو سب سے زیادہ جاننے والے معاذ بن جبلؓ ہیں)۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: ان کو نہ جانے دیجئے! مدینہ خالی ہوجائے گا اور لوگ مسائل پوچھیں گے، اگر آپ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو بھیج دیا تو ان کو مسائل بتانے والا کون ہوگا؟ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ: ایک آدمی اللہ تعالیٰ کے راستے میں جانا چاہتا ہے اور شہید ہونا چاہتا ہے، میں اس کو کیسے روک سکتا ہوں؟

حضرت معاذؓ کا شوق لقائے الٰہی:

ادھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ایک دن کہنے لگے: یا اللہ! یہ سارے لوگ آپ کے پاس جارہے ہیں، معاذ کا وقت ابھی نہیں آیا، اللہ اکبر! اسی وقت حضرت معاذ بن جبلؓ کے گلٹی نکل آئی اور تین دن کے اندر رخصت ہوگئے۔

نور کے پتلے انسانی شکلوں میں:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عجیب شان تھی! بقول ہمارے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کہ اللہ تعالیٰ نے نور کے پتلوں کو انسانوں کی شکل میں زمین پر اُتار دیا

تھا، ان کو ''صحابہ کرام'' کہتے ہیں، رضوان اللہ علیہم اجمعین!

ایک روایت میں ہے:

''عَنْ عَاصِمِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ نَاسًا مِنْ عَضَلَ وَالْقَارَةَ وَهُمَا حَيَّانَ مِنْ جُدَيْلَةَ اَتَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ اُحُدٍ فَقَالُوْا: اِنَّا بِاَرْضِنَا اِسْلَامًا فَابْعَثْ نَفَرًا مِنْ اَصْحَابِكَ يُقْرِءُوْنَنَا الْقُرْاٰنَ وَيُفَقِّهُوْنَنَا فِي الْاِسْلَامِ! فَبَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَهُمْ سِتَّةَ نَفَرٍ مِنْهُمْ مَرْثَدُ بْنُ مَرْثَدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَلِيْفُ حَمْزَةَ بْنَ عَبْدِالْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَهُوَ اَمِيْرُهُمْ.''

(مستدرک حاکم ج:۳ ص:۲۲۲)

ترجمہ:...... ''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عضل اور قارہ کے کچھ لوگ آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ: ہمارے علاقے میں دین کا بہت چرچہ ہوگیا ہے، ہمارے ساتھ کچھ آدمیوں کو بھیج دیجئے تاکہ لوگوں کو دین سکھائیں اور تفقہ فی الدین ان کو نصیب ہوجائے، (یہ بات کہنا ان کی منافقت تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکا دے کر کچھ آدمیوں کو لے جانا اور شہید کرنا چاہتے تھے) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ چھ حضرات کو بھیج دیا، جن میں حضرت مرثد بن ابی مرثد کو (جو حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کے حلیف تھے، یعنی ان کے رفیق تھے) امیر بنا کر بھیجا۔''

جب یہ حضرات مقام رجیع میں پہنچے تو وہاں ان صحابہ کو انہوں نے شہید کردیا، ایک آدمی بھی نہیں بچا، ایک صحابی نے کہا کہ: یا اللہ! اپنے رسول صلی اللہ علیہ

وسلم کو اور اہل ایمان کو آپ اطلاع کردیجئے کہ ہمارے ساتھ یہ گزری ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ جبریلؑ اس کی اطلاع کردی گئی۔

دین کے لئے جب بھی دعوت دی گئی صحابہؓ نے لبیک کہا:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے لئے دعوت دی انہوں نے کبھی انکار نہیں کیا۔

مجھے حضرت جی مولانا محمد یوسف دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد ہے، وہ فرماتے تھے کہ: ہم لوگ نماز کے لئے جاتے ہیں تو بیوی سے کہتے ہیں کہ کھانا تیار رکھنا، میں واپس آکر کھاؤں گا! اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنی بیویوں کو یہ کہہ کر آیا کرتے تھے کہ میں مسجد میں جارہا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جارہا ہوں، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کام کے لئے نہ بھیجا تو واپس آجاؤں گا، ورنہ میرا انتظار نہ کرنا، یہ صحابہ کرامؓ کا معمول تھا، یعنی ان کو دوبارہ گھر والوں کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ گھر سے رخصت ہوکر جایا کرتے تھے۔

حضرت علیؓ کو تعلیم کے لئے یمن بھیجنا:

ایک روایت میں ہے:

”عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاسٌ مِنَ الْيَمَنِ، فَقَالُوْا: اِبْعَثْ فِيْنَا مَنْ يُفَقِّهُنَا فِي الدِّيْنِ، وَيُعَلِّمُنَا السُّنَنَ، وَيَحْكُمُ فِيْنَا بِكِتَابِ اللهِ! فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنْطَلِقْ يَا عَلِيُّ اِلٰى اَهْلِ الْيَمَنِ! فَفَقِّهْهُمْ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُمُ السُّنَنَ وَاحْكُمْ فِيْهِمْ بِكِتَابِ اللهِ. فَقُلْتُ: اِنَّ اَهْلَ الْيَمَنِ قَوْمٌ طُغَامٌ يَأْتُوْنِيْ مِنَ الْقَضَاءِ بِمَا لَا عِلْمَ لِيْ بِهٖ! فَضَرَبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ عَلٰی صَدْرِیْ ثُمَّ قَالَ: اِذْهَبْ! فَاِنَّ اللهَ سَیَهْدِیْ قَلْبَکَ وَیُثَبِّتُ لِسَانَکَ. فَمَا شَکَکْتُ فِیْ قَضَاءٍ بَیْنَ اثْنَیْنِ حَتَّی السَّاعَةُ.“ (کنز العمال ج:۱۳ حدیث:۳۶۳۶۹)

یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ: یمن کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے: یا رسول اللہ! ہمارے ساتھ کسی آدمی کو بھیج دیجئے جو ہمیں فقہ فی الدین کا فہم عطا کرے اور ہمیں سنت کی تعلیم دے اور اللہ کی کتاب کے مطابق ہمارے جھگڑوں کا فیصلہ کرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اور تو کوئی اس وقت تھا نہیں، مجھے فرمایا کہ: تم ان کے ساتھ چلے جاؤ، ان کو دین سکھاؤ اور سنت کی تعلیم دو اور ان میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے کرو! کہاں یمن اور کہاں مدینہ؟ معمولی بات نہیں! میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپؐ کے ارشاد پر جہاں بھی آپ بھیج دیں میں حاضر ہوں، لیکن دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ ان لوگوں کو کچھ دین کا فہم نہیں، بالکل اُجڈ ہیں، ان بیچاروں کو میں کیا کروں گا اور کیسے سمجھاؤں گا؟ اور دوسری بات یہ ہے کہ مجھے فیصلہ کرنا نہیں آتا، یہ لوگ جھگڑے لائیں گے، اپنے مقدمے لایا کریں گے، لڑائی جھگڑا کریں گے، اور مجھے اتنی عقل نہیں کہ ان کے درمیان فیصلہ کیسے کروں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ بات کہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ: جا! اللہ تعالیٰ تیرے دل کو ہدایت کریں گے اور تیری زبان کو ثابت قدم رکھیں گے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ یمن کے ایک علاقے میں چلے گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس وقت سے لے کر مرتے وقت تک جب بھی کوئی مقدمہ میرے سامنے آیا مجھے کبھی شک نہیں ہوا، فوراً دل میں اللہ تعالیٰ ڈالتے تھے کہ اس کا فیصلہ یہ ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں گئے تو حضرت علی رضی اللہ

عنہ یمن میں تھے، وہاں سے تشریف لائے اور مکہ مکرمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر ملے اور اپنے ساتھ ہدی کے جانور بھی لائے تھے، ستر جانور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، اور تیس اونٹ حضرت علی کرم اللہ وجہہ لائے تھے، یعنی کل ایک سو ہوگئے تھے۔ دنیا میں ایسا سیٹھ کون ہے جو ایک سو اونٹ کی قربانی کرے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ تیس اونٹ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردیئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ: تم نے احرام کیا باندھا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ: میں نے احرام یہ باندھا ہے کہ جو احرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہی احرام میرا ہے! فرمایا: ٹھیک ہے! جاکر بیت اللہ شریف کا طواف کرو، یعنی عمرہ کرو اور پھر احرام کی حالت میں رہو، دس تاریخ کو احرام کھولیں گے۔ یہ ایک سو اونٹ تھے، ان میں سات اونٹ ایسے تھے کہ ان میں سے ہر ایک آگے بڑھ کر کہنا چاہتا تھا کہ یا رسول اللہ! پہلے مجھے ذبح کردیجئے! یعنی وہ اونٹ چھری پھرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اونٹ کو لٹا کر ذبح نہیں کیا جاتا، اونٹ کو کھڑے کھڑے گردن میں بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر برچھی اس کے حلق میں مارتے ہیں، جس سے خون کا فوارہ جاری ہوجاتا ہے اور اونٹ گرجاتا ہے، یہی طریقہ ہے اونٹ کے ذبح کرنے کا، تو بخاری شریف کی روایت ہے کہ سات اونٹ ایسے تھے کہ ان میں سے ہر ایک سبقت کرتا تھا کہ: "بـايهـن يبتـدأ؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کس کے ساتھ ابتدا کریں، تریسٹھ اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر فرمالئے اور آپؐ کی عمر مبارک بھی تریسٹھ سال ہی تھی، باقی جو اونٹ بچ گئے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فرمایا کہ تم لوگ ذبح کرلینا۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ یمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھیجا تھا اور انہوں نے دین کا فہم عطا فرمایا اور لوگوں کے فیصلے بھی کئے، وہاں کے جھگڑے بھی نمٹائے، دین کی تعلیم دی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ: ایک دن بھی مجھے کسی مقدمہ میں کبھی شک نہیں ہوا کہ

اس کا فیصلہ کیا کیا جائے؟

حضرت ابوعبیدہؓ کا تعلیم کے لئے مبعوث فرمانا:

ایک روایت میں ہے:

”عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ اَھْلَ الْیَمَنِ قَدِمُوْا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا: اِبْعَثْ مَعَنَا رَجُلًا یُعَلِّمُنَا الْقُرْاٰنَ! فَاَخَذَ بِیَدِ اَبِیْ عُبَیْدَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَاَرْسَلَہٗ مَعَھُمْ، وَقَالَ: ھٰذَا اَمِیْنُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ!“

(مستدرک حاکم ج:۳ ص:۲۶۷)

یعنی یمن کے ایک اور علاقے سے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے کہ: ہمارے ساتھ بھی کچھ آدمی بھیج دیجئے! جو ہمیں تعلیم دیں، ہماری تربیت کریں، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ موجود تھے، ان کو فرمایا کہ: ان کے ساتھ چلے جاؤ!

اس امت کے امین:

اور یہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ وہی آدمی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ: ”لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَمِیْنٌ، وَاَمِیْنُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اَبُوْعُبَیْدَۃَ بْنُ الْجَرَّاحِ!“ (ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے، اور اس امت کا امین ابوعبیدہ بن الجراح ہے!)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف صحابہ کو مختلف خطابات دیئے، اور اللہ تعالیٰ ان صحابہ سے راضی ہوجائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس صحابی کو جو خطاب دیا وہ بالکل حق تھا، اور واقعہ کے مطابق تھا، حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ان کا لقب ہے: ”امین ھذہ الامۃ!“ اس امت کا امین۔ اور یہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی ان دس صحابہ میں سے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زندگی

میں ان کو جنت کی بشارت عطا فرمائی۔ تو ان یمنی حضرات نے کہا کہ: ہمارے ساتھ ایک آدمی کو بھیج دیجئے جو ہمیں قرآن مجید سکھائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور ان کے ساتھ بھیج دیا اور فرمایا کہ یہ اس امت کے امین ہیں۔

تعلیم کے لئے حضرت عمرو بن حزمؓ کی بعثت:

ایک روایت میں ہے:

”عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ: ھٰذَا کِتَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ عِنْدَنَا الَّذِیْ کَتَبَہٗ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ حِیْنَ بَعَثَہٗ اِلَی الْیَمَنِ یُفَقِّہُ اَھْلَھَا وَیُعَلِّمُھُمُ السُّنَّۃَ وَیَأْخُذُ صَدَقَاتِھِمْ فَکَتَبَ لَہٗ کِتَابًا وَعَھْدًا وَاَمَرَہٗ، فَکَتَبَ:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، ھٰذَا کِتَابٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ، یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ.

عَھْدٌ مِّنْ مُّحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ حِیْنَ بَعَثَہٗ اِلَی الْیَمَنِ اَمَرَہٗ بِتَقْوَی اللّٰہِ فِیْ اَمْرِہٖ کُلِّہٖ فَاِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ.“

(تفسیر بن کثیر ج:۲ ص:۴)

حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو یمن کے علاقے میں وہاں کے صدقات وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا، اور ان کے ساتھ ایک گرامی نامہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تھا، حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے پوتے حضرت عبداللہ بن ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم ہیں، فرماتے ہیں کہ یہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو دیا تھا کہ وہاں کے لوگوں کو فقہ بھی سکھائیں، علم بھی سکھائیں اور ان سے صدقات بھی وصول کریں۔ اس میں لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ خط تحریر کیا جارہا ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے۔ اور اس کے شروع میں لکھا تھا: اے ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اور کوئی آیت نازل نہ ہوتی، صرف اتنا ہی ٹکڑا: "یَـا اَیُّھَـا الَّـذِیْـنَ اٰمَـنُـوْا اَوْفُـوْا بِـالْـعُقُوْدِ!" نازل ہوجاتا تو کافی تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو معاہدہ اور جو وعدہ اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یا کسی مسلمان سے کیا کرو تو اس کو پورا کیا کرو۔

اس کے بعد فرمایا: یہ عہد ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے عمرو بن حزم کے لئے جبکہ ان کو بھیجا یمن کی طرف ان کو حکم فرمایا تقویٰ کا اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اور فرمایا: اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو متقی ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو نیکوکار ہیں، اس کے بعد لمبا خط تھا، جس میں صدقات کے اور بھی مسائل تھے، اور اس کی تمہید یہی تھی۔

سبحانک اللّٰھم وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفرک واتوب الیک!

علم، عمل

کی مقبولیت کی علامت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اِنَّ النَّاسَ کُلَّھُمْ قَدْ اَحْسَنُوا الْقَوْلَ، فَمَنْ وَافَقَ قَوْلُہٗ فِعْلَہٗ فَذَالِکَ الَّذِیْ حَظَّہٗ، وَمَنْ خَالَفَ قَوْلُہٗ فِعْلَہٗ فَاِنَّمَا یُوَبِّخُ نَفْسَہٗ.“

(کنزالعمال ج:۱۰ حدیث:۲۹۵۴۰)

”عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: مَا اسْتَغْنٰی اَحَدٌ بِاللّٰہِ اِلَّا احْتَاجَ اِلَیْہِ النَّاسُ، وَمَا عَلِمَ اَحَدٌ بِمَا عَلَّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا احْتَاجَ النَّاسُ اِلٰی مَا عِنْدَہٗ.“

(حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۲۴۹)

ترجمہ:...... ”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: بے شک سب لوگ باتیں تو اچھی کرتے ہیں، پس جس کا قول اس کے فعل کے موافق ہو، یہ وہ ہے جس کو اس کا حصہ مل گیا، اور جس کا عمل اس کے قول کے خلاف ہو تو گویا وہ اپنے آپ کو ڈانٹتا ہے۔“

ترجمہ:...... ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص (مخلوق کو چھوڑ کر) صرف اللہ کا محتاج بنا، سب لوگ اس کے محتاج ہوتے ہیں، اور جس شخص نے وہ علم سیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اس کو سکھایا تو سارے لوگ اس کے اس علم کے محتاج ہوں گے جو اس کے پاس ہے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: لوگ باتیں تو سب اچھی کرتے ہیں، باتیں کرنے کے بعد مرحلہ آتا ہے عمل کا، جس کا فعل اس کے قول کے موافق ہو، یعنی جس طرح باتیں اچھی کرتا ہے، اگر کام بھی اچھا کرتا ہو تو اس کو اپنا حصہ مل گیا، اور جس شخص کا قول اس کے فعل کے موافق نہ ہو، بلکہ خلاف ہو، یعنی باتیں تو بہت اچھی کرتا ہے لیکن کام اس کے خلاف کرتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کا قول وفعل ایک دوسرے کے مخالف ہیں، تو یوں کہو کہ گویا وہ شخص اچھی باتیں کر کے اپنے آپ کو ڈانٹتا ہے، یعنی اپنے نفس کی مخالفت کرتا ہے اور قیامت کے دن اس سے محاسبہ ہوگا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے دوسرے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ: جو شخص اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے لوگوں سے مستغنی ہو جائے (ایک اللہ مل گیا تو اس کو کسی دوسرے کی ضرورت ہی نہیں رہی) تو اس کے نتیجے میں سارے لوگ اس کے محتاج ہو جاتے ہیں، اور جو شخص کہ اس علم پر عمل کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمادیا ہے تو تمام لوگ اس کے علم کے محتاج ہو جائیں گے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے اپنے ان ارشادات میں بڑے پتے کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں، کیونکہ آدمی جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

''لَا یَزَالُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ مُقْبِلًا عَلَی الْعَبْدِ وَھُوَ

فِیْ صَلَاتِہٖ مَا لَمْ یَلْتَفِتْ .....الخ." (مشکوٰۃ ص:۹۱)

یعنی نماز میں آدمی اِدھر اُدھر نہ دیکھے، اس لئے کہ اس کی طرف اس کا رب متوجہ ہوتا ہے (اور اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام ہوتے ہیں)۔

اگر آدمی نماز کی نیت باندھے اور اس کا دھیان لالوکھیت چلا جائے، تو اس نے نماز کی نیت تو یہاں باندھی ہوئی ہے مگر وہ پھر رہا ہے بازار میں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو کہا جاتا ہے کہ بندے میں تیری طرف متوجہ ہوں تو کہاں پھر رہا ہے؟ تو تو یہاں میرے ساتھ باتیں کرنے کے لئے آیا تھا، مگر مجھے چھوڑ کر لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے لگا، اگر بندہ واپس آجائے یعنی اپنی نماز کی طرف متوجہ ہوجائے اور اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے لگے تو ٹھیک ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے حوالے کردیتے ہیں۔

کشف نہ ہونا بھی نعمت:

جیسے ایک صاحبِ کشف بزرگ تھے، ان کو کشف ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ فضل فرمائے اور ہم پر رحم فرمائے، کسی کو کشف بھی نہیں ہونا چاہئے، یہاں آپ کی حالت مجھے معلوم نہیں کہ آپ کے اندر کیا ہے، اور میری خبر آپ کو نہیں کہ میرے اندر کیا ہے؟ یوں اللہ تعالیٰ نے سب کا پردہ رکھا ہوا ہے، ہمیں ایک دوسرے کی خبر نہیں۔

قیامت کے دن بھیدوں کا کھلنا:

لیکن قرآن مجید میں آتا ہے کہ قیامت کے دن سب بھید کھل جائیں گے، چنانچہ ارشاد ہے:

"یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ. فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ."

(الطارق:۸،۹)

ترجمہ:......"جس دن کہ دلوں کے بھید کھول دیئے

جائیں گے۔ تو بندے کو کوئی طاقت بھی نہیں ہوگی اور اس کا کوئی مددگار بھی نہیں ہوگا۔"

یہاں تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پردہ رکھا ہوا ہے، میرا حال آپ کو معلوم نہیں، آپ کا حال مجھے معلوم نہیں، لیکن قیامت کے دن پردے کھول دیئے جائیں گے، بندہ چھپانے لگے گا مگر چھپ نہیں سکے گا، یہ ایسے ہی ہے جس طرح ہمارے حکیم الامت قدس سرہٗ نے نقل کیا ہے کہ:

ایک عورت کسی کے گھر میں ملازمہ تھی، اس کی چوری کرنے کی عادت تھی، گھر کی صفائی کرتے کرتے گھر کا ہی صفایا کرجایا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے ایک ٹائم پیس گھڑی اٹھا کر اپنے لباس میں کہیں چھپادی، صفائی کرتی رہی، گھڑی کا الارم لگا ہوا تھا وہ وقت پر بول پڑا، اب اس کو دباتی ہے، لیکن اس کے دبانے سے تو وہ بند نہیں ہوتا۔ تو ایسے ہی یہاں دنیا میں تو ہم لوگ اپنے اپنے عیبوں کو چھپائے ہوئے ہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ میں گھر میں کیا کر رہا ہوں؟ مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے آگیا اور آپ کے بارے میں مجھے معلوم نہیں کہ آپ وہاں کیا کررہے ہیں؟ لیکن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام بھید کھول دیں گے بندے کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی مددگار ہوگا، بہت دبائے گا مگر دبے گا نہیں۔ یہاں ایک یہ کیفیت ہے اور ایک یہ ہے جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ:

"اِنَّ اللهَ يُدْنِي الْمُؤْمِنَ فَيَضَعُ عَلَيْهِ كَنَفَهٗ وَيَسْتُرُهٗ ..... الخ." (مشکوٰۃ ص:۴۸۵)

یعنی اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے سامنے ایک بندے کو بلائیں گے، اب وہاں کوئی پردے کرنے والی چیز ہے نہیں، کوئی اوٹ ہو اور کوئی پردہ ہو جہاں چھپ جائیں، لیکن حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ: اللہ تعالیٰ اپنا پردہ اس پر ڈال دیں گے، لوگوں کی نظر میں نہیں آئیں گے، اس کے ساتھ کیا سوال و جواب ہو رہا ہے؟ کسی کو

کچھ معلوم نہیں۔

قیامت کے دن کچھ نہ چھپے گا:

عدالتِ الٰہی میں کوئی وکیل و ترجمان نہیں ہوگا، دنیا کے وکیل اور ترجمان یہاں رہ جائیں گے اور بارگاہِ الٰہی میں کوئی کچھ نہ چھپا سکے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ:

"مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا سَيُكَلِّمُهٗ رَبُّهٗ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ تُرْجُمَانٌ." (مشکوٰۃ ص:۴۸۵)

ترجمہ:...... "تم میں سے ہر ایک آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے آئے گا جبکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی ترجمانی کرنے والا نہیں ہوگا۔"

انگریزی عدالتوں کے انگریز وکیلوں کے کارنامے:

یہ عدالتوں کے وکیل یہیں رہ جائیں گے، جو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بناتے ہیں، جو مجرم کو چھڑوانا جانتے ہیں اور بے گناہ کو پھنسانا جانتے ہیں۔

انگریز کی تعلیم ہی ایسی ہے، (اللہ تعالیٰ کے فضل سے) اور انگریز کے دور سے آج تک یہی تعلیم چل رہی ہے، وہی عدالتیں ہیں، وہی وکیل ہیں، وہی لباس ہے، حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کرسکے کہ ان کا لباس ہی بدل دیں، عدالت میں جب وکیل جائے گا تو سیاہ کوٹ پہن کر جائے گا، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جیسے اس کے اوپر کا لباس سیاہ ہے، ویسے ہی اس کا دل بھی کالا ہے، سو سو جھوٹ خود بولتے ہیں اور اپنے مؤکلوں سے بلواتے ہیں، پہلے سے پڑھا کر جاتے ہیں کہ تم نے ایسے کہنا ہے، ویسے کہنا ہے، تم سے کوئی بات پوچھے تو ایسے کہہ دینا، ورنہ چپ رہنا، اور وکیل اس کی طرف سے لڑتا رہتا ہے، وہاں آخرت میں یہ نہیں ہوگا۔ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان میں کوئی

ترجمانی کرنے والانہیں ہوگا، ہر آدمی خود اپنی جواب دہی کرے گا۔

بارگاہِ الٰہی کی پیشی کا منظر:

حد نظر یعنی جہاں تک نظر پہنچے گی دائیں بھی، بائیں بھی اور سامنے بھی اس کے نامہ عمل کے دفاتر پھیلے ہوئے ہوں گے، قرآن کریم میں ہے کہ بندہ کہے گا:

"مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً
اِلَّا اَحْصَاهَا....." (الکہف:۴۹)

ترجمہ:...... "اس کتاب کو کیا ہوا کہ اس نے کوئی چھوٹی اور بڑی بات کو چھوڑا نہیں جس کو گھیر نہ لیا ہو، شمار نہ کرلیا ہو۔"

میرے بھائیو! اول سے آخر تک کے تمام عمل لکھے ہوئے ہمارے سامنے ہوں گے، اور ہر ایک آدمی خود جواب دہی کرنے والا ہوگا، کوئی اس کا معاون و مددگار نہیں ہوگا، اور وہاں کوئی جھوٹ بھی نہیں بول سکے گا، ہاں! جھوٹ بولنے کی کوشش کریں گے اور لوگ جھوٹ بولیں گے بھی، مگر ان کی زبانیں بند کردی جائیں گی، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے کہ:

"اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِمْ
وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ." (یٰسٓ:۶۴)

ترجمہ:...... "ہم ان کے منہ پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ کیا کرتے تھے؟"

جب زبان بند ہوجائے گی اور دوسرے اعضا ان کے خلاف گواہی دیں گے تو وہ اپنے ان اعضا کو کوستے ہوئے کہیں گے:

"وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا، قَالُوْا اَنْطَقَنَا

اللہُ الَّذِیْ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ." (حٰمٓ السجدہ:۲۱)

ترجمہ:......"وہ اپنی کھالوں اور چمڑوں کو کہیں گے کہ تم ہمارے خلاف گواہی کیوں دے رہے ہو؟ وہ کہیں گے کہ آج ہمیں اس ذات نے بلوالیا ہے جس نے ہر چیز کو بلوالیا ہے (ہم اپنے اختیار میں نہیں ہیں)۔"

آدمی سب سے بڑی ہوشیاری یہ کرے گا کہ پہلے مکر جائے گا، لیکن مکرنے کہاں دیتے ہیں؟ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ آدمی کے مستقل ریکارڈ الگ الگ محفوظ ہو رہے ہیں، سب سے پہلا ریکارڈ تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، جو کبھی خطا نہیں ہوتا، "لَا یَشْغَلُہٗ حَالٌ عَنْ حَالٍ!" اس کو ایک حالت دوسری حالت سے مشغول نہیں کرتی، ایک سے بات کر رہے ہیں، یہ نہیں کہ دوسرے آدمی سے غافل ہوجائیں، ایک وقت میں ساری دنیا سے بات کر رہے ہوں گے، پھر لوحِ محفوظ میں ہماری مکمل ہسٹری اور ہمارا ریکارڈ جمع ہے، پھر زمین کے وہ ٹکڑے جن پر ہم چلے پھرے، اٹھے بیٹھے، لیٹے، اچھا عمل کیا، یا برا عمل کیا وہ سب کے سب قیامت کے دن گواہ ہوں گے، دیواریں بھی بولیں گی، زمین کے ٹکڑے بھی بولیں گے۔ جیسا کہ سورۂ زلزال میں فرمایا ہے: "یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَھَا. بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَھَا." یعنی اس دن زمین اپنی خبریں دے گی، کہ اس بندے نے میری پشت اور میرے اوپر یہ یہ کام کیا تھا، فلاں وقت میں فلاں کام کیا تھا، یہ اس لئے ہوگا کہ تیرے رب نے اس کو حکم دے دیا ہے۔ تو اس دن ہمارے سامنے ہمارے سارے ریکارڈ ہوں گے، ہم چھپنا بھی چاہیں گے تو چھپ نہیں سکیں گے، اللہ تعالیٰ ہی ہمیں معاف فرمادیں تو دوسری بات ہے، ورنہ نہ تو کسی کی سفارش کام آئے گی اور نہ کسی شخص کا عذر و معذرت کام آئے گی، یہاں تو ہم عذر و معذرت کرلیتے ہیں کہ جی اصل میں یہ ہوگیا تھا، وہ ہوگیا تھا، وہاں اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز نہیں چھپ سکے گی اور نہ کوئی عذر کیا جاسکے گا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل کا قصہ:

میں نے کہا تھا کہ ایک بندے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے لایا جائے گا، اس بندے کے دائیں بائیں اور سامنے سب جگہ نامہ اعمال پھیلے ہوئے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اپنا پردہ اس پر ڈال دیں گے، کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا کہ کس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ حالانکہ کوئی پردہ نہیں ہوگا، کوئی اوٹ نہیں ہوگی، قرآن کریم میں ہے: ”لَا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا وَّلَا اَمْتًا۔“ (طٰہٰ:۱۰۷) تو اس میں کوئی اوٹ نہیں دیکھو گے، کوئی ٹیلا نہیں دیکھو گے، بالکل صاف چٹیل میدان، بندہ اپنے رب کے سامنے پیش ہوگا، فرشتے اس کے نامہ عمل کو پڑھنا شروع کردیں گے، خدا جانے کتنا وقت اس میں لگے گا؟ اللہ تعالیٰ ہی معاف فرمائے، حق تعالیٰ شانہ سنتے رہیں گے، جب فرشتے نامہ عمل پڑھ کر فارغ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے فرمائیں گے کہ: تو کچھ کہنا چاہتا ہے؟ اس بیچارے کا سر نیچا ہوگا، بولنے کی طاقت اس میں کہاں ہوگی؟ خود ہی اپنے آپ میں شرمندہ ہوگا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کیا میرے فرشتوں نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے؟ وہ کہے گا کہ: نہیں! اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے فرمائیں گے: کوئی نیکی تو نے کی ہو اور وہ فرشتوں نے نہ لکھی ہو، یا کوئی گناہ تو نے نہ کیا ہو اور وہ فرشتوں نے لکھ دیا ہو؟ بندہ کہے گا: نہیں! بندے کے پاس کوئی بھی عذر نہیں ہوگا، کچھ عذر تو آدمی کرے، بندہ بالکل چپ، آخر میں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ: میں نے دنیا میں تیرا پردہ رکھا تھا، آج تجھے معاف کرتا ہوں! یہ تو اللہ تعالیٰ کے فضل کا معاملہ ہے۔

اللہ کی رحمت سے بخشش:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ:

”لَیْسَ اَحَدًا مِّنْکُمْ یُنْجِیْهِ عَمَلُهٗ! قَالُوْا: وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: وَلَا اَنَا! اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللهُ مِنْهُ

بِمَغْفِرَةٍ وَّرَحْمَةٍ." (صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۷۷)

ترجمہ:...... "تم میں سے کسی آدمی کو اس کا عمل نجات نہیں دلائے گا، (مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ!) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی نے کہا کہ: یا رسول اللہ! آپ کی بھی بخشش نہیں ہوگی بغیر اللہ کی رحمت کے؟ (سر جھکالیا اور سر کے اوپر ہاتھ رکھ لیا) اور فرمایا: میری بھی بخشش نہیں ہوگی اِلَّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت و رحمت کے ساتھ مجھے ڈھانک دے!"

بارگاہِ الٰہی میں پیشی کا خوف نہیں:

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ کبڈی کھیلتے ہوئے جنت میں چلے جائیں گے، نہیں بھائی! یہ بات نہیں ہے، وہ دن آنے والا ہے: "يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانُ شِيْبًا." (المزمل:۱۷) جو بچوں کو بوڑھا کردے گا، اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت فرمائے، کم از کم آدمی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا تو رہے، ہم تو ڈرتے بھی نہیں ہیں، ہمارے دل میں کبھی خوف بھی پیدا نہیں ہوتا اور بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہونے کا کبھی تصور بھی نہیں آتا، قرآن مجید میں ہے کہ قیامت کے دن کافر کہیں گے: "اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ." (الجاثیہ:۳۲) (ہم تو معمولی سا خیال کرتے تھے، ہمیں یقین نہیں تھا)۔ وہی کیفیت ہماری ہوگئی ہے، قیامت کے حق ہونے کا خیال کچھ ہمیں بھی آتا ہے کہ مریں گے، قبروں میں جائیں گے، محشر میں اُٹھیں گے، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی، لیکن یقین کے درجے میں نہیں، اللہ سبحانہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے اور ہمارے اس خیال کو یقین میں بدل دے، ہنسی مذاق کی تو ہمیں سوجھی، لیکن آخرت ہمیں یاد نہیں رہی، اب اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیشی کو بھی ہم مذاق ہی سمجھتے ہیں، نعوذ باللہ!

حضرت ابودرداءؓ کا قیامت کی پیشی سے خوف:

ایک روایت میں ہے:

''کَانَ اَبُوالدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یَقُوْلُ: اِنَّمَا اَخْشٰی مِنْ رَّبِّیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَنْ یَّدْعُوْنِیْ عَلٰی رُؤُوْسِ الْخَلَائِقِ فَیَقُوْلُ: یَا عُوَیْمِرُ! فَاَقُوْلُ: لَبَّیْکَ رَبِّ! فَیَقُوْلُ: مَا عَمِلْتَ فِیْمَا عَلِمْتَ؟'' (الترغیب والترہیب ج:۱ ص:۹۰)

یعنی حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے کسی چیز کا ڈر نہیں ہے، صرف ایک بات سے ڈر لگتا ہے، (حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکیم الامت کا لقب دیا تھا، سب سے پہلا شخص اس امت میں حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ ہیں جن کو حکیم الامت کا خطاب ملا تھا) کہ: اللہ تعالیٰ مجھے تمام دنیا کے سامنے، جہاں چھوٹے بڑے سب موجود ہوں گے، مجھے بلائیں گے اور بلاکر کہیں گے کہ: عویمر! (عویمر نام ہے ان کا)، میں کہوں گا کہ: اے رب میں حاضر ہوں! کیا فرماتے ہیں؟ مجھ سے کہا جائے گا کہ تجھے علم دیا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟ بس اس بات پر بڑا ڈر لگتا ہے، کیونکہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔

حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ سب دنیا کے سامنے فرمائیں گے کہ: عویمر! تجھے جو علم دیا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟ اور دوسری روایت میں یہی مضمون ذرا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ: اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کے سامنے مجھے بلائیں گے اور سوال کریں گے۔ ایک تو تمام خلائق کے سامنے کھڑا کیا جانا بڑی سخت رسوائی ہے، پھر یہ سوال کہ تجھے جو علم دیا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟ ایک تو میں نے ابھی حدیث نقل کی ہے ناں کہ بندے پر اللہ تعالیٰ اپنا پردہ ڈال دیں گے، کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا

ہے، وہ تو الگ معاملہ ہے، لیکن ایک یہ کہ ساری مخلوق کو اس کی ندا ہو، خبر ہو، تو اس پر آدمی اتنا شرمندہ ہوگا کہ کہہ اٹھے گا: اے کاش! میں آج سے پہلے مرگیا ہوتا، تو میرے کرتوت مخلوق کے سامنے نہ آتے۔ تو حضرت ابودرداؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کے سامنے مجھے بلائیں گے اور بلاکر کہیں گے: "عُوَيْمِرُ! اَعَلِمْتَ اَمْ جَهِلْتَ؟" تجھے علم ہے یا تو جاہل تھا؟ یعنی یہ وہ سوال ہے جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ یہ حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں، یعنی اس امت کے سب سے پہلے حکیم۔

آخر میں فرماتے تھے کہ: میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ دے، اور اس نفس سے جس کا پیٹ نہ بھرے۔

حریص نفس سے پناہ کی دعا:

ہمارے ساتھ نفس لگا ہوا ہے، ساری دنیا کے خزانے اس کو مل جائیں تو یہ نہیں بھرتا، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

"لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ مَّالٍ لَابْتَغٰى اِلَيْهِ ثَانِيًا، وَلَوْ كَانَ لَهُ وَادِيَانِ لَابْتَغٰى لَهُمَا ثَالِثًا، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ!" (کنز العمال ج:۳ حدیث:۷۴۳۲)

ترجمہ:......"اگر ابن آدم کو سونے کی ایک وادی مل جائے تو اس کی خواہش ہوگی کہ ایک دوسری بھی مل جائے، اور اگر دو وادیاں مل جائیں تو اس کی چاہت ہوگی کہ ایک تیسری بھی مل جائے، اور ابن آدم کے پیٹ کو تو مٹی ہی بھر سکے گی۔"

یعنی اگر بندے کو ایک وادی سونے کی مل جائے تو چاہے گا کہ دو وادیاں مل جائیں، اگر دو وادیاں مل جائیں تو تیسری تلاش کرے گا کہ ایک اور ہونی چاہئے،

انسان نے کارخانے بنائے، فیکٹریاں بنائیں، دیکھ لو نواز شریف نے کئی فیکٹریاں بنالی تھیں، لیکن ابھی بس نہیں ہوئی، کہا کہ دو کافی نہیں، تیسری ہونی چاہئے، تیسری مل جائے تو چوتھی ہونی چاہئے، آدمی کے پیٹ کو قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے، قبر میں جب جسم کو کیڑے کھا جائیں گے اور یہ خود مٹی ہوجائے گا، تب کہے گا کہ: ہاں! اب کافی ہوگیا۔ تو حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: میں ایسے علم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے، آپ حضرات نے سن لیا حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ کیا فرماتے ہیں؟ یا اس کان سے سنا اور اس کان سے نکال دیا؟ چلو جیسے آئے تھے ویسے چلے گئے!

بھائی! بات یہ ہے کہ سنا تو ہم نے بہت، لیکن ہماری عقل میں نہیں آیا، حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرمارہے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ دے، اور اس نفس سے جو نہ بھرے۔

قبول نہ ہونے والی دعا:

اور ایک تیسری چیز ہے: "وَمِنْ دُعَاءٍ لَّا یُسْتَجَابُ لَهَا." اور میں پناہ چاہتا ہوں ایسی دعا سے جو سنی نہ جائے۔ بندہ، اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سنتے ہی نہیں۔

میں نے آپ حضرات کو سنایا تھا، یاد ہوگا کہ شیخ تاج الدین بن عطأ اللہ اسکندری کی کتاب ہے، اس میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ ایک بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کرتا ہے یا اللہ! یا اللہ! یا اللہ! بندہ، اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ اس کی چیز کو پورا نہ کرنا، اس کو ایسے ہی مانگنے دو، تو بندہ مانگتا ہے یا اللہ! مجھے یہ چیز دے، یا اللہ! مجھے یہ چیز دے، مانگتا ہی رہتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ: اس کو دینا نہیں، اس لئے کہ اس کا مانگنا مجھے اچھا

لگتا ہے! سبحان اللہ! کیا بات ہے، ایک وہ بندہ ہے کہ جس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت پوری نہیں کرنا، تم نے ضرورت پوری کردی تو اس نے مانگنا ہی چھوڑ دینا ہے، اور مجھے اس کا مانگنا بہت اچھا لگتا ہے، کیا ہی مبارک ہے وہ بندہ کہ یہ مانگے اور اللہ تعالیٰ کو اس کا مانگنا اچھا لگے۔

اور ایک دوسرا بندہ ہے اس کو کوئی ضرورت پیش آجاتی ہے، وہ مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ فوراً اس بندہ کی ضرورت پوری کردو، اس لئے کہ اس کا ہاتھ اٹھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

ہم یوں سمجھتے ہیں کہ جس کی حاجت جلدی پوری ہوجائے، جس کی ضرورت جلدی پوری ہوجائے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچا ہوا ہے، اِدھر مانگتا ہے اُدھر منظور ہوجاتی ہے، لیکن یہاں معاملہ کچھ اور نکلا، دعا مانگتا ہے لیکن دعا قبول نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کو اس کا مانگنا اچھا لگتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ جب آدمی کو حاجت ہو جب بھی مانگے اور جب حاجت نہ ہو (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، تمام چیزیں میسر ہیں، الحمدللہ!) تب بھی مانگے، کیونکہ اللہ سے مانگنا اللہ تعالیٰ کو بہت اچھا لگتا ہے، اور ایک وہ آدمی ہے کہ جب ضرورت ہوتی ہے تو مانگتا ہے، جب ضرورت نہیں ہوتی تو نہیں مانگتا، حالانکہ اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ موقع بھی مانگنے کا تھا، ایسا آدمی اللہ تعالیٰ کو اچھا نہیں لگتا، تو حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ: میں پناہ لیتا ہوں اللہ تعالیٰ کی اس علم سے جو کہ نفع نہ دے اور اس نفس سے جو کہ بھرے نہیں، اور اس دعا سے جو کہ سنی نہ جائے۔

عمل کے بغیر علم:

ایک اور روایت میں حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

”لَا يَكُونُ تَقِيًّا حَتّٰى يَكُونَ عَالِمًا، وَلَنْ يَّكُونَ

بِالْعِلْمِ جَمِيلًا حَتّٰى يَكُوْنَ بِهٖ عَامِلًا."

(حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۲۱۳)

ترجمہ:......"آدمی متقی نہیں بن سکتا جب تک کہ عالم نہ ہو، اور سچا عالم نہیں بن سکتا جب تک کہ عمل نہ ہو۔"

یوں کہتے ہیں کہ علم اور عمل یہ دونوں بھائی ہیں، علم آتا ہے تو اپنے ساتھ عمل کو بھی بلاتا ہے کہ تم بھی آجاؤ، اگر علم کے ساتھ عمل بھی آجائے تو ٹھیک ہے، ورنہ علم بھی چلا جاتا ہے۔

علم پر عمل علم کی مقبولیت کی علامت:

ایک بزرگ غالباً حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تھے، فرمایا کرتے تھے: "تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللهِ، فَاَبٰى اَنْ يَّكُوْنَ اِلَّا لِلّٰهِ!" ہم نے علم سیکھا تھا تو اللہ تعالیٰ کی رضا سامنے نہیں تھی، ایسے ہی سیکھتے رہے، غیراللہ کے لئے سیکھتے رہے، اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں سیکھا تھا، مگر علم نے انکار کردیا کہ میں تو اللہ تعالیٰ کے لئے ہوں گا کسی اور کے لئے نہیں ہوں گا، چنانچہ علم آیا تو ساتھ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد بھی آئی، اگر علم آئے اور ساتھ کے ساتھ اللہ کی یاد بھی آئے تو سمجھو کہ یہ علم مقبول ہے، اور اگر علم آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی یاد نہیں آتی تو جان لو کہ یہ علم مقبول نہیں ہے، مردود ہے۔ تو حکیم الامت حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: بندہ متقی نہیں ہوسکتا جب تک کہ عالم نہ ہو، اور سچا عالم نہیں بن سکتا جب تک کہ عمل نہ ہو، یعنی علم پر عمل نہ کرے۔

اللہ کے ہاں بدترین آدمی:

ایک روایت میں حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ:

"اِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَالِمًا لَا يَنْتَفِعُ بِعِلْمِهٖ." (حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۲۲۳)

ترجمہ:......"اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے بدترین مرتبے کا آدمی وہ ہوگا جو عالم ہو اور اپنے علم سے نفع نہ اٹھائے۔"

اللہ تعالیٰ نے علم تو دیا ہے لیکن عالم صاحب گپ شپ میں مشغول ہیں، فضولیات اور لغویات میں مشغول ہے، اس سے نفع نہیں اٹھاسکا، یہ عالم اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے بدترین مرتبے کا آدمی ہوگا، نعوذ باللہ من ذالک! اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے علم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

قیامت کے دن انسان سے چار سوال:

حضرت ابی برزۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ترمذی ج:۲ ص:۶۷ پر ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو حسن صحیح کہا ہے کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: قیامت کے دن بندے کے دونوں قدم اپنی جگہ سے ہلنے نہیں پائیں گے (کھڑا رہے گا)۔ فرمایا جائے گا کہ: چار سوالوں کا جواب دے دو اور چلے جاؤ!

جسم کس چیز میں بوسیدہ کیا؟

پہلا سوال یہ ہے کہ اپنا جسم کس چیز میں بوسیدہ کیا؟ چھوٹا بچہ تھا، بڑا ہوگیا، بال سفید ہوگئے، اب چل بھی نہیں سکتا، کس چیز میں اس جسم کو بوسیدہ کیا ہے؟ پہلے اس سوال کا جواب دو۔

عمر کس میں ضائع کی؟

دوسرا سوال یہ کہ عمر کس چیز میں ضائع کی؟ کن کن مشغلوں میں ضائع کی؟ اللہ تعالیٰ نے عمر دی تھی، کسی کو تھوڑی دی تھی، کسی کو زیادہ دی تھی، یہ عمر کن کاموں میں خرچ کی؟ یہ ایک مستقل سوال ہے جس کا ہم میں سے ہر ایک نے جواب دینا ہے،

ہمیں اس کا احساس ہی نہیں، ہم نے یہ عمر ضائع کی اور خوب ضائع کی، بے پروائی سے ضائع کی، گویا اپنے باپ دادا کی میراث سمجھ بیٹھے ہیں، حالانکہ یہ عمر تو اللہ تعالیٰ کا عطیہ تھا، اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔

مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟

تیسرا سوال، اس سوال کی دو شقیں ہیں، مال کہاں سے لیا اور کہاں خرچ کیا، چھوٹا سا سوال ہے، پوری زندگی کا نقشہ ہمارے سامنے آجائے گا، مال کہاں کہاں سے کمایا اور کہاں کہاں خرچ کیا؟ باقی تمام چیزوں کے بارے میں صرف ایک سوال لیکن مال کے بارے میں دو سوال، مال کو آدمی بڑی کوشش سے حاصل کرتا ہے اور خرچ بھی کرتا ہے بڑی محبت کے ساتھ۔

علم پر کتنا عمل کیا؟

چوتھا سوال یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جتنا علم دیا تھا، ان میں سے کس بات پر عمل کیا؟ بس چار سوال، چار سوالات کا جواب دے دو اور جاؤ، امتحانی سوال بتادیتے ہیں حالانکہ ممتحن بتایا نہیں کرتے، لیکن یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا کہ یہ چار سوال ہوں گے اور ان میں سے ایک سوال دو سوال کی جگہ ہے، گویا پانچ سوال ہوگئے، ان پانچ سوالوں کا جواب دے دو اور جاؤ، تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ:

"اِعْلَمُوْا مَا شِئْتُمْ اَنْ تَعَلَّمُوْا! فَلَنْ يَّأْجُرَكُمُ اللهُ بِعِلْمِهٖ حَتّٰى تَعْمَلُوْا."
(حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۲۵۰)

ترجمہ:...... "جان لو! جتنا چاہو علم سیکھ لو! مگر یاد رکھو اللہ تعالیٰ تمہیں علم پر اس وقت تک اجر نہیں دیں گے جب تک کہ تم اس پر عمل نہ کروگے!"

یعنی تم کتابیں اور رسالے پڑھ کر جتنا چاہو اپنی معلومات کا ذخیرہ جمع کرلو، بڑے زبردست علامہ بن جاؤ لیکن اللہ تعالیٰ تمہیں اس پر اجر نہیں دے گا، جب تک کہ اس پر عمل نہیں کرو گے۔ صرف کتابوں کے پڑھنے سے تمہیں اجر نہیں ملے گا، بلکہ اجر ملے گا علم پر عمل کرنے سے۔ اور اسی مضمون کی ایک روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، وہ فرمایا کرتے تھے:

"تَعَلَّمُوْا مَا شِئْتُمْ اَنْ تَعَلَّمُوْا! فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْجُرُكُمْ عَلَى الْعِلْمِ حَتّٰى تَعْمَلُوْا بِهٖ، اِنَّ الْعُلَمَاءَ هَمَّتُهُمُ الْوِعَايَةُ، وَاَنَّ السُّفَهَاءَ هَمَّتُهُمُ الرِّوَايَةُ." (حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۲۵۰)

ترجمہ:...... جتنا چاہو علم سیکھ لو تمہاری خوشی ہے، لیکن تمہیں اللہ تعالیٰ علم پر اجر نہیں دیں گے، بلکہ عمل پر اجر دیں گے، اپنے علم میں سے کتنی چیزوں پر عمل کیا؟ اور فرماتے تھے کہ علماً کا کام بات کو ذہن میں رکھ کر اس پر عمل کرنا ہے، اور احمق لوگوں کا کام روایتیں کرتے رہنا ہے۔"

یعنی جیسے لوگ کہتے ہیں کہ ایک روایت یہ ہے، ایک روایت یہ ہے، ایک روایت یہ ہے، عالم صاحب روایتوں پر لگے ہوئے ہیں، یہ بھی اچھی بات ہے، بہت اچھی بات ہے، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ان روایتوں میں سے عمل کتنی روایتوں پر کیا؟

حضرت سہلؒ کی کرامت:

حضرت سہل بن عبداللہ طستری رحمہ اللہ کبھی کبھی مدرسے میں طالب علموں کے پاس چلے جایا کرتے تھے، یہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے ماموں ہیں، حضرت جنیدؒ ابھی چھوٹے اور نابالغ تھے تو حضرت سہل بن عبداللہ طستریؒ کی بہن اپنے

اس بچے کو بھی اپنے بھائی کے پاس چھوڑ گئی، ان کی بہن اپنے بھائی سے کہنے لگی کہ: ان کو بھی کچھ اللہ اللہ سکھادو، ایک دن حضرت سہل بن عبداللہ کی بہن مدرسہ میں آئیں، اتفاق سے حضرت سہل بن عبداللہ کھانا کھارہے تھے، حضرت سہل بن عبداللہ طستریؒ کے سامنے اچھا کھانا تھا اور بھانجے یعنی حضرت جنیدؒ کے سامنے ایسا ہی معمولی سا کھانا تھا، تو ان کی بہن کہنے لگی کہ: بھائی جی! بھانجے کے سامنے آپ نے کھانا ایسا ہی رکھا ہوا ہے، اور آپ مرغ اُڑا رہے ہیں؟ حضرت سہل بن عبداللہؒ نے جب اپنی بہن کی یہ بات سنی تو وہ ہڈیاں جو جمع تھیں ان کو اِکٹھا کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ''قُمْ بِاِذْنِ اللہِ!'' اللہ تعالیٰ کے حکم سے کھڑی ہوجاؤ! وہ مرغ بن کر اذان دینے لگا، حضرت سہل بن عبداللہؒ بہن سے کہنے لگے کہ: جب آپ کا بیٹا اس مرتبے کو پہنچے گا تو یہ بھی مرغ کھالیا کرے گا، ابھی تو اس کو یہی دال ہی کھانے دو! حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی عمر سات سال تھی، اپنے ماموں کے ساتھ تہجد پڑھتے تھے۔

حضرت سہلؒ کی طلبا کو نصیحت:

میں عرض کر رہا تھا کہ حضرت سہل بن عبداللہ طستریؒ کبھی کبھی مدرسوں میں چلے جاتے تھے اور ان پڑھنے والوں سے فرمایا کرتے تھے: ''یا اھل العلم! ادوا زکوٰۃ العلم!'' (مولوی صاحبان! اپنے علم کی زکوٰۃ دیا کرو!) وہ طالب علم کہتے کہ: حضرت! علم کی زکوٰۃ کیا ہے؟ فرماتے: ایک سو حدیثوں میں سے ایک حدیث پر عمل کرلو! اب ہمارا مدرسہ شروع ہوگا، صحاح ستہ اور صرف بخاری شریف کے گیارہ بارہ سو صفحات ہیں، مسلم شریف، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دوسری کتابیں علمائے کرام دھڑادھڑ پڑھا رہے ہیں، کچھ طلبہ سمجھ لیں گے اور کچھ نہیں سمجھیں گے، لیکن ان طلبہ سے پوچھ لیجئے کہ اس پر کس نے عمل کیا ہے؟

علم کی زکوٰۃ اس پر عمل ہے:

حضرت سہل بن عبداللہ طستریؒ فرمایا کرتے تھے: اے اہل علم! اپنے علم کی زکوٰۃ ادا کیا کرو۔ لوگ عرض کرتے کہ: حضرت! علم کی زکوٰۃ کیا ہے؟ فرمایا: ایک سو میں سے ایک حدیث پر عمل کرلو! چلو ایک سو میں سے نہیں ایک ہزار میں سے ایک پر عمل کرلو۔ تو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: علما کا اہم مقصد علم کو محفوظ کرنا ہے، اور محفوظ کرکے اس پر عمل کرنا ہے، اور احمق لوگوں کا مقصد روایت کردینا ہے، ایک بات سنی اور آگے روایت کردینا ہے اور بس!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

حضرت ابراہیمؑ و موسیٰؑ
کے
صحیفوں کے مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”کَیْفَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُہٗ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ یَعِظُوْنَ وَیَتَّعِظُوْنَ فِی السَّفَرِ وَالْحَضَرِ، وَکَیْفَ کَانُوْا یَصْرِفُوْنَ النَّظْرَ عَنْ ظَوَاھِرِ الدُّنْیَا وَلَذَّاتِھَا اِلٰی نَعِیْمِ الْاٰخِرَۃِ وَاٰلَائِھَا وَیَحْذُرُوْنَ اللّٰہَ تَحْذِیْرًا تَذْرُفُ بِہِ الْعُیُوْنُ وَتوجل بِہِ الْقُلُوْبُ کَأَنَّ الْاٰخِرَۃَ تَجَلَّتْ بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَاَحْوَالَ الْمَحْشَرِ تَبَدَّتْ بِأَعْیُنِھِمْ، وَکَیْفَ کَانُوْا یَأْخُذُوْنَ بِاَیْدِی الْاُمَّۃِ الْمُحَمَّدِیَّۃِ بِعِظَاتِھِمْ یُوَجِّھُوْنَ وُجُوْھَھَا اِلٰی فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَیَقْتَلِعُوْنَ بِھَا شَرَائِیْنَ الشِّرْکِ الْجَلِیِّ وَالْخَفِیِّ.“

ترجمہ:...... ”سفر و حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک دوسرے کو کس طرح نصیحت کرتے اور نصیحت حاصل کرتے تھے؟ وہ ظاہر دنیا

اور اس کی لذات سے منہ موڑ کر آخرت اور اس کی نعمتوں کی طرف کس طرح متوجہ ہوتے اور کرتے تھے، وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے عذاب سے اس طرح ڈراتے تھے کہ آنکھیں بہہ پڑتیں اور دل کانپ جاتے اور گویا ایسا محسوس ہوتا کہ وہ آخرت ان کے سامنے منکشف ہوکر آگئی ہے اور اَحوالِ محشر ان کے سامنے ظاہر ہوگئے ہیں، وہ ان مواعظ کے ذریعہ امتِ محمدیہ کی دستگیری فرماتے، اور ان کو آسمان و زمین کے خالق کی طرف متوجہ کر کے شرکِ جلی و خفی کی دلوں سے جڑیں کاٹ پھینکتے تھے۔''

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نصیحت آموز کلمات اور ارشادات یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین کے پیدا کرنے والے کی طرف متوجہ کرتے تھے اور اپنے ان مواعظ کے ذریعہ دلوں سے شرک جلی اور شرکِ خفی کی رگیں اور جڑیں اُکھاڑ دیتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ سفر و حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک دوسرے کو نصیحت کرتے تھے اور نصیحت پاتے تھے، اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے عذاب سے ڈراتے تھے، آخرت کی نعمتوں کو ایسا محسوس کرتے تھے گویا وہ نعمتیں ان کے سامنے ہیں اور دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے بے رغبتی دلاتے تھے، محشر میں جو حالات ہمارے سامنے آنے والے ہیں ان کا ایسا نقشہ کھینچتے تھے گویا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، اور ان مواعظ کے ذریعہ سے امتِ محمدیہ کی دستگیری فرماتے تھے اور ان کو آسمان و زمین کے خالق کی طرف متوجہ کر کے شرکِ جلی اور شرکِ خفی کی جڑیں دلوں سے اُکھاڑتے تھے۔

علامہ شعرانی رحمہ اللہ نے ''تنبیہ المغترین'' میں، جو اخلاقِ سلف کے نام سے اُردو میں چھپی ہوئی ہے، اس کا ایک باب مستقل اس پر قائم کیا ہے کہ سلف

صالحین کا یہ معمول تھا کہ جب وہ ایک دوسرے کے پاس جاتے تھے تو ایک دوسرے سے نصیحت طلب کرتے تھے کہ کوئی نصیحت فرمائیں اور پھر متعدد حضرات کی نصیحتیں وہاں ذکر فرمائی ہیں۔

یہاں سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مواعظ ذکر کئے ہیں، یعنی آپ کی نصیحتیں، آپ کے ناصحانہ کلمات اور ارشادات، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم ان مواعظ شریفہ کو اپنے دل پر لکھیں، صرف ایک کان سے سن لینا اور دوسرے سے نکال دینا نہ ہو، اور ان سے وقتی طور پر گرمیٔ محفل کا کام نہ لیا جائے، بلکہ ان سے عبرت و نصیحت حاصل کرکے ان پر عمل کی سعی و کوشش کی جائے، کیونکہ یہ وہ کلماتِ طیبات ہیں جو زبانِ نبوت سے نکلے ہوئے ہیں، یہ وہ جواہر و موتی ہیں جس کو نبوت کے سمندر نے اُچھالا ہے۔

صحفِ ابراہیم کے مضامین:

آپ کے ان نصائح میں سے چند ایک یہ ہیں کہ:

”عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللهِ! مَا کَانَتْ صُحُفُ اِبْرَاهِیْمَ؟ قَالَ: کَانَتْ اَمْثَالًا کُلُّهَا اَیُّهَا الْمَلِکُ الْمُسَلَّطُ الْمُبْتَلَی الْمَغْرُوْرِ اِنِّیْ لَمْ اَبْعَثْکَ لِتَجْمَعَ الدُّنْیَا بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ وَلٰکِنِّیْ بَعَثْتُکَ لِتَرُدَّ عَنِّیْ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنِّیْ لَا اَرُدُّهَا وَاِنْ کَانَتْ مِنْ کَافِرٍ، وَعَلَی الْعَاقِلِ مَا لَمْ یَکُنْ مَغْلُوْبًا عَلٰی عَقْلِهٖ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗ سَاعَاتٌ فَسَاعَةٌ یُنَاجِیْ فِیْهَا رَبَّهٗ، وَسَاعَةٌ یُحَاسِبُ فِیْهَا نَفْسَهٗ، وَسَاعَةٌ یَتَفَکَّرُ فِیْهَا فِیْ صُنْعِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَسَاعَةٌ یَخْلُوْ فِیْهَا لِحَاجَتِهٖ مِنَ الْمَطْعَمِ وَالْمَشْرَبِ، وَعَلَی الْعَاقِلِ

اَنْ لَّا یَکُوْنَ ظَاعِنًا اِلَّا لِثَلَاثٍ: تَزَوُّدٍ لِمَعَادٍ اَوْ مِرَمَّةٍ لِمَعَاشٍ اَوْ لَذَّةٍ فِیْ غَیْرِ مَحْرَمٍ، وَعَلَی الْعَاقِلِ اَنْ یَّکُوْنَ بَصِیْرًا بِزَمَانِہٖ، مُقْبِلًا عَلٰی شَأْنِہٖ، حَافِظًا لِلِسَانِہٖ، وَمَنْ حَسِبَ کَلَامَہٗ مِنْ عَمَلِہٖ قَلَّ کَلَامُہٗ اِلَّا فِیْمَا یَعْنِیْہِ۔"

(حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۴۹۷، ۴۹۸)

یعنی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! قرآن کریم میں صحف ابراہیم و موسیٰ کا ذکر آتا ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے۔

بڑی کتابوں کو کتاب کہا جاتا تھا اور چھوٹی کتاب کو جس کو رسالہ کہنا چاہئے، صحیفہ کہا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چار مشہور کتابیں نازل فرمائی ہیں: تورات، انجیل، زبور اور قرآن کریم، اور مختلف اوقات میں ایک سو کے قریب صحیفے نازل کئے ہیں، اور کچھ صحیفے حضرت آدم علیہ السلام پر، کچھ حضرت شیث علیہ السلام پر، کچھ دوسرے انبیأ کرام علیہم السلام پر نازل ہوئے، ان میں سے صحف ابراہیم وموسیٰ کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے، یعنی وہ صحیفے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے۔

تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں نے کہا: یا رسول اللہ! جن صحیفوں کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے، تو ان صحف میں کیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: سب کے سب ضرب الامثال تھے، یعنی ایسے فقرے جن کو ضرب المثل کے طور پر ہمیشہ استعمال کیا جاتا ہے، ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ کا ذکر فرمایا ہے۔

بادشاہوں کے لئے دستور العمل:

ایک یہ کہ اے او بادشاہ! جو لوگوں کی گردنوں پر سوار ہے اور جو اس میں مبتلا کیا گیا ہے اور جو دھوکے میں پڑا ہوا ہے، میں نے تجھ کو لوگوں پر اس لئے مقرر نہیں کیا کہ تو دنیا سمیٹتا جائے، او مغرور! میں نے تجھے اس لئے حکومت نہیں دی کہ دنیا کو جمع کرکے تہہ پر تہہ لگاتا جائے، میں نے تجھے دنیا پر اس لئے مقرر کیا ہے تاکہ تو کسی مظلوم کی بددعا مجھ تک نہ پہنچنے دے، تیری سلطنت میں اور تیرے زیر نگیں علاقوں میں ایک بھی مظلوم ایسا نہیں ہونا چاہئے جو کسی کے لئے بددعا کرے اور اس کی بددعا مجھ تک پہنچے، اس لئے کہ جب کوئی مظلوم بددعا کرتا ہے تو میں اس کی بددعا کو رد نہیں کرتا، چاہے وہ بددعا کافر ہی کیوں نہ کرے! اس سے بحث نہیں کہ یہ مجھے ماننے والا ہے کہ نہیں؟ جب بھی کوئی مظلوم بددعا کرتا ہے تو میں اس کی بددعا کو رد نہیں کرتا، تو یہ پہلی بات تھی جو صحف ابراہیم علیہ السلام میں لکھی تھی، گویا بادشاہوں کے لئے دستور العمل تھا کہ عادل اور منصف بادشاہ وہ ہے جس کی رعایا میں کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، کوئی کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرے اور کسی مظلوم کو ظالم کے خلاف اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔

حضرت عمرؓ کا احساسِ ذمہ داری:

امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے ناں کہ رات کو پہرہ دیا کرتے تھے، ایک بڑھیا کے گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آرہی تھی، حضرت امیر المؤمنین نے پوچھا کہ: اماں! یہ بچے کیوں روتے ہیں؟ کہنے لگی کہ: یہ بھوکے ہیں اور یہ ہنڈیا چولہے پر رکھی ہوئی ہے، میں نے پانی میں پتھر ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا ہے تاکہ بچوں کو اطمینان رہے کہ ہنڈیا پک رہی ہے اور ان کو اس طرح بہلا کر سلا دوں گی کہ کھانا ابھی تیار ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ فرمانے لگے: بڑی بی! تو نے

عمر کونہیں بتایا، خلیفہ کونہیں بتایا، امیرالمؤمنین تمہارے کھانے کا بندوبست کرتا؟ کہنے لگی: میرا فرض تھا کہ اس کو بتاتی یا اس کا فرض تھا کہ وہ رعایا کا پتہ کرتا؟ یہ کیا میرا فرض تھا؟ اس عورت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہچانا نہیں تھا، پھر کہنے لگی کہ: کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عمر کی شکایت کروں گی کہ مدینے میں رہتے ہوئے میرے بچے بھوکے تھے اور اس نے پتہ نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چپکے سے وہاں سے چلے آئے، بیت المال سے غلہ اور دوسری ضرورت کی چیزوں کی بوری بھری اور اپنے غلام اسلم سے کہا کہ: اس کو میری کمر پر رکھ دو! اس نے کہا کہ: حضور! میں اُٹھالیتا ہوں، غلام میں ہوں، میں اُٹھالیتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ: اگر قیامت کے دن بھی میرا بوجھ اُٹھاسکتے ہوتو اُٹھالو! لیکن اگر قیامت کے دن یہ بوجھ عمر کو ہی اُٹھانا ہے تو ابھی بھی اس کو ہی اُٹھانے دو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے اور ہنڈیا میں وہ چیزیں ڈال کر خود پکانے لگے اور چولہے میں پھونکے لگانے لگے، وہ غلام کہتا ہے کہ میں نے امیرالمؤمنین کی داڑھی میں سے دھواں نکلتے دیکھا، جب کھانا تیار ہوگیا اور وہ بچوں کو کھلایا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ دروازے پر ٹھہر گئے اور فرمایا: جس طرح میں نے ان کو روتے ہوئے دیکھا، چاہتا ہوں کہ ان کو ہنستے ہوئے بھی دیکھوں اور اس خاتون سے فرمایا کہ: تم کل آنا میں تمہارا مستقل بندوبست کردوں گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت نہ لگانا!

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے کہ: ”فرات کے پل پر اگر کوئی سوراخ ہوجائے اور اس میں کسی گزرنے والی بکری کا پاؤں پھنس جائے اور اس کو نقصان پہنچ جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ عمر سے قیامت کے دن اس کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا۔

جو حکومت عوام کو انصاف نہ دلائے...:

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے تجھے لوگوں پر اس لئے مسلط نہیں کیا کہ تو دنیا کو سمیٹتا جائے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر ٹیکس لگا لگا کر ان کی زندگی اجیرن کردے، میں نے تجھے لوگوں پر اس لئے مسلط کیا اور مقرر کیا ہے تاکہ کسی مظلوم کی بددعا مجھ تک نہ آنے دے، جس رعایا میں مظلوم بددعائیں کرتے ہوں، وہاں حاکم کے ہونے کا کیا فائدہ ہے؟ انصاف کا کیا فائدہ ہے؟ ''بھاڑ میں جائے سونا جس سے ٹوٹے کان!'' جو حکومت مظلوم عوام کو انصاف نہیں دلاسکتی، اور جو عدالت پسے ہوئے لوگوں کو انصاف نہیں دلاسکتی، ایسی حکومت اور ایسی عدالت کا کوئی فائدہ نہیں، ایسی عدالت لغو ہے، لایعنی ہے۔

عقل مند آدمی کے ہر کام کے لئے اوقات مقرر ہونے چاہئیں:

دوسرا فقرہ یہ تھا کہ ایک عقل مند آدمی جو مغلوب العقل نہ ہو، پاگل، بیہوش، مدہوش، دیوانہ نہ ہو، اس کے اوقات تقسیم ہونے چاہئیں، اس کے اوقات مقرر ہوں۔

عبادت، مناجات اور محاسبۂ نفس کے لئے بھی وقت مقرر ہو:

ایک وقت ہو جس میں وہ اپنے رب سے مناجات کرے، عبادت میں، ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو۔

اور ایک وقت اس بات کے لئے مقرر ہونا چاہئے جس میں اپنے نفس سے محاسبہ کرے کہ یہ نفس شتر بے مہار تو نہیں چل رہا؟ ٹھیک ٹھیک چل رہا ہے کہ نہیں؟

مظاہرِ قدرت میں غور کا بھی وقت ہونا چاہئے:

اور ایک وقت ایسا ہونا چاہئے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مشاہدوں کا تماشا کرے، کسی کو نوازتے ہیں تو کیسا نوازتے ہیں، کسی کو پکڑتے ہیں تو کیسا

پکڑتے ہیں، آسمانوں کو کیسی بلندی عطا فرمائی، اور زمین کا بچھونا کیسا بچھایا، درختوں کو کیسے پیدا کیا، پانی کو اللہ تعالیٰ نے کیسی چیز بنایا اور پانی کا نظام اللہ تعالیٰ نے کیسا جاری فرمایا، وغیرہ، وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کے جو معاملات اپنے بندوں کے ساتھ ہیں، ان پر غور کرتا رہے اور نہیں تو اپنے ساتھ جو معاملات ہیں ان پر غور کرے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: "وفی انفسکم افلا تبصرون" تمہاری ذات میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل موجود ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تمہیں نظر نہیں آتا، دیکھتے نہیں؟

بشری حاجتوں کے لئے بھی وقت مقرر ہو:

اور ایک وقت ایسا ہونا چاہئے کہ جس میں وہ اپنی بشری حاجتیں پوری کرے، کھانے کی، پینے کی، پہننے کی اور دوسری حوائج زندگی میں مشغول ہو۔

سفر تین مقاصد کے لئے ہو:

تیسرا فقرہ یہ تھا کہ عاقل پر لازم ہے کہ وہ جب سفر کرے تو اس کے تین مقاصد میں سے کوئی ایک مقصد ہونا چاہئے۔ سفر کو اپنی آخرت کے لئے توشہ بنانا مقصود ہے، سفرِ آخرت ہے جیسے حج کا سفر ہے، عمرہ کا سفر ہے، اللہ تعالیٰ کے کسی مقبول بندے کی خدمت میں جانے کے لئے سفر ہے، والدین کی زیارت کے لئے سفر ہے، علم کے لئے سفر ہے، دعوت الی اللہ کے راستے میں نکلنے کے لئے سفر ہے، جہاد فی سبیل اللہ کا سفر ہے، وہ سفر جو اس کے لئے توشۂ آخرت بنے اور یا اپنی معیشت کو درست کرنے کے لئے سفر ہونا چاہئے، یا کسی ایسی چیز کی لذت جو حرام اور ناجائز نہ ہو اس کے لئے سفر ہونا چاہئے۔

عاقل زمانہ کو عبرت کی نگاہ سے دیکھے:

ایک فقرہ یہ تھا کہ عاقل کے ذمے لازم ہے کہ وہ اپنے زمانے کو عبرت کی نظر سے دیکھنے والا ہو، اپنے گرد و پیش کے حالات سے آنکھیں بند نہ کرے اور اپنی

حالت کی طرف متوجہ رہے، جیسے کہا جاتا ہے: ''تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو!'' اپنی طرف متوجہ رہے، اپنے کام میں لگا رہے کہ اس کے دین کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اپنے عیوب کی اصلاح کرے، اپنی طاعتوں کو درست کرے اور حافظ اللسان یعنی اپنی زبان کا محافظ ہو، اس کی زبان قینچی کی طرح کاٹتی نہ چلی جائے، بلکہ بات جو بھی کرے، سوچ سمجھ کر کرے اور جو شخص اپنے کلام کو بھی اپنے عمل کے ساتھ سمجھتا ہے یعنی جو انسان اعمال کرتا ہے ان اعمال میں یہ باتیں کرنا بھی شامل ہے، ہمارا کلام کرنا بھی ہمارے اعمال میں شامل ہے، جو آدمی یہ سوچ لے گا وہ بہت کم باتیں کرے گا، سوائے ان چیزوں کے جو ان کے مقصود کی ہیں، ضرورت کی ہیں، وہ لایعنی باتوں میں مشغول نہیں ہوگا، جو شخص اپنے کلام کو بھی اپنا عمل سمجھتا ہے وہ لایعنی باتوں میں مشغول نہیں ہوگا، یہ پانچ فقرے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں تھے۔

صحفِ موسیٰ میں عبرتیں تھیں:

''فَمَا كَانَتْ صُحُفُ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ؟ قَالَ: كَانَتْ عِبَرًا كُلُّهَا عَجِبْتُ لِمَنْ اَيْقَنَ بِالْمَوْتِ ثُمَّ هُوَ يَفْرَحُ، عَجِبْتُ لِمَنْ اَيْقَنَ بِالنَّارِ ثُمَّ هُوَ يَضْحَكُ، عَجِبْتُ لِمَنْ اَيْقَنَ بِالْقَدْرِ ثُمَّ هُوَ يَنْصِبُ، عَجِبْتُ لِمَنْ رَأَى الدُّنْيَا وَتُقَلِّبُهَا بِاَهْلِهَا ثُمَّ اطْمَأَنَّ اِلَيْهَا، عَجِبْتُ لِمَنْ اَيْقَنَ بِالْحِسَابِ غَدًا ثُمَّ لَا يَعْمَلُ.'' (حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۴۹۸)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: میں نے کہا: یا رسول اللہ! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں کیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ساری کی ساری عبرت کی باتیں تھیں۔

صحفِ موسیٰ کے مضامین:

چنانچہ پانچ فقرے اس کے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمادیئے۔

مجھے تعجب ہے اس پر جس کو موت کا یقین ہو اور پھر بھی مسکراتا ہے؟

مجھے تعجب ہوتا ہے اس شخص پر جس کو موت کا یقین بھی ہے اور پھر وہ خوش بھی ہو رہا ہے، واقعی تعجب کی بات ہے:

دفن خود صدہا کئے زیرِ زمیں
پھر بھی مرنے کا نہیں تجھ کو یقیں!

خواجہ صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا کہ سینکڑوں آدمی اپنے ہاتھ سے دفن کئے ہیں، پھر بھی مرنے کا نہیں تجھ کو یقین، ایک گھر میں ایک موت واقع ہوجاتی ہے تو کیسا رنگ ہوتا ہے، آپ کے گھر میں خدانخواستہ ایسا حادثہ ہوجائے تو آپ رقص وسرود کی محفلیں سجائیں گے؟ ٹی وی پر ڈرامے دیکھیں گے؟ یہ تو تمہارے گھر پر موت ہونے پر تجھ کو ساری خوشیاں بھول جاتی ہیں، اور جس دن تمہیں موت آئے گی اس دن کیا حال ہوگا؟ اگر ہمیں اپنی موت کا یقین ہو اور موت پیش نظر رہے تو پھر یہ خوشی بے کار ہوجائے گی، یہ خوشی جاتی رہے گی، دنیا کی کسی چیز سے ہمیں خوشی نہ ہوگی۔

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحف کا پہلا فقرہ یہ ہے کہ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جس کو موت کا یقین بھی ہے اور پھر مسکراتا بھی ہے، کھل کھلا کر ہنستا ہے۔

تعجب ہے کہ دوزخ کا یقین ہو اور پھر بھی ہنسے:

اور دوسرا فقرہ ہے: مجھے تعجب ہے اس شخص پر جس کو دوزخ کا یقین ہے پھر

اس کو ہنسی بھی آتی ہے۔

کوئی سانپ یا کوئی اژدہا منہ کھولے کھڑا ہو، ہڑپ کرنا چاہتا ہو، اس آدمی بیچارے کے پاس بچنے اور بھاگنے کی کوئی شکل نظر نہ آتی ہو، اس وقت کیا یہ اکیلا لڑے گا یا وہ اژدہا اور سانپ خود چھوڑ جائیں گے؟ جہنم منہ کھولے کھڑی ہے اور وہ قیامت کے دن کو آواز دے گی، گویا یوں کہو کہ اب اس کی آواز کان میں آتی ہے: "ھل من مزید؟" (کوئی ہے جو مجھے دیا جائے؟) جہنم اپنی شعلہ سامانیوں اور اپنے تمام عذابوں اور تمام دکھوں اور ماروں کے ساتھ اس وقت موجود ہے، اور وہ اپنے بیٹوں کی منتظر ہے، تو تعجب ہے اس شخص پر جس کو دوزخ کا یقین ہے اس کے باوجود وہ ہنستا بھی ہے۔

تعجب ہے کہ تقدیر کے یقین کے باوجود پریشان ہوتا ہے:

اور اس کا تیسرا فقرہ: مجھے تعجب ہے اس شخص پر جس کو تقدیر الٰہی کا یقین ہے اور پھر وہ پریشان ہوتا ہے، تھکتا ہے۔

تم جہاں چاہو، جو چاہو کرلو، جہاں چاہو چلے جاؤ، آسمان کے تارے توڑ لاؤ یا زمین کے خزانے کھود ڈالو، لیکن تمہیں ملے گا اتنا ہی جتنا تمہارے لئے لکھ دیا ہے، اتنا ہی ملے گا، ایک دانہ بھی نہ کم کر سکتے ہو، نہ زیادہ، جس شخص کو تقدیر پر ایمان نہ ہو وہ تو اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے کہ میرے کرنے سے ہوگا، لیکن جس شخص کو ایمان بالقدر ہو، تقدیر پر ایمان ہو، وہ پریشان نہیں ہوگا، سب کام حکمِ الٰہی سمجھ کر کرے گا۔

تقدیر، گاڑی کی مانند ہے:

بزرگ فرماتے ہیں کہ ہماری مثال اور تقدیر کی مثال ایسی ہے جیسے گارڈ ریل کے ڈرائیور کو ہری جھنڈی دکھاتا ہے اور ریل چل پڑتی ہے، سرخ جھنڈی دکھاتا ہے تو ریل رک جاتی ہے، اب میرے جیسے ناواقف آدمی کو ایسا لگے گا کہ یہ جھنڈی بڑی

کرامت والی ہے، گارڈ کی جھنڈی کو باوجود اس کے کہ ریل کی آنکھیں نہیں ہیں، اس کو دیکھ لیتی ہے اور عجیب وغریب اس میں طاقت ہے کہ جھنڈی ہلاتے ہی گاڑی چل پڑتی ہے، سبز جھنڈی دیکھ کر گاڑی چل پڑتی ہے اور سرخ جھنڈی دیکھ کر گاڑی رُک جاتی ہے، ہمارے جیسے بچے تو یہی سمجھیں گے، لیکن جو حقیقت شناس ہوگا وہ یہ سمجھے گا کہ گاڑی کو چلانا یا اس کو روکنا یہ جھنڈی کا کرشمہ نہیں، بلکہ ڈرائیور اور گارڈ کے درمیان ایک اصطلاح مقرر ہے کہ جب ہری جھنڈی دی جائے گی تو ڈرائیور گاڑی چلادے گا اور سرخ جھنڈی دی جائے گی تو ڈرائیور گاڑی روک دے گا۔

انسان کی دعائیں اور التجائیں سبز جھنڈی کی مانند ہیں:

اکابرؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے کسب، ہماری محنت، ہماری کمائی اور ہماری دعائیں، ہماری التجائیں یہ سبز جھنڈی ہے، اس سے کچھ نہیں ہوتا، گاڑی نہیں چلتی، گاڑی چلانا تو اس ڈرائیور کا کام ہے، ہاں ایک اصطلاح مقرر کرلی کہ تم ایسے کروگے تو ہم ایسا کرلیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ روح الامین نے میرے دل میں یہ بات القا فرمائی ہے کہ: ''اِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰی تَسْتَکْمِلَ رِزْقَهَا۔'' (مشکوٰۃ ص:۴۵۴) یعنی کوئی نفس مرے گا نہیں جب تک کہ اپنی روزی کو پورا نہیں کرلیتا، جتنی لکھوا کے لائے ہو ایک ایک تل کے برابر روزی تمہیں پوری دی جائے گی، ممکن نہیں کہ تم اس سے پہلے مرجاؤ، ہرگز نہیں مرے گا کوئی شخص جب تک کہ اپنی مقررہ روزی کو پورا نہیں کرلیتا، سوتم رزق کے تلاش کرنے میں ذرا خوب صورتی سے کام لو، غلط کام نہ کرو۔

ہماری معاش اور معاد کا انتظام:

ایک صاحب میرے پاس آئے، کہنے لگے کہ: ایک صاحب ہیں (ایسے ہی اس کے منہ سے نکل گیا)، جو یہ کہتے ہیں ابھی مغرب کی نماز پڑھ کے ہی آئے تھے کہ

عشا کا وقت ہوگیا، اذان ہوگئی، کہنے لگے کہ بس نمازیں ہی نمازیں رہ گئی ہیں، تو وہ شخص کہنے لگے کہ اس طرح کہنے سے کافر تو نہیں ہوا؟ میں نے اس کو یوں سمجھایا کہ بزرگ یوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دن کے دو حصے کئے ہیں، ایک حصہ دوپہر سے پہلے پہلے کا ہے، یہ تمہاری معاش کے لئے رکھ دیا، اور ایک حصہ دوپہر کے بعد کا ہے یہ تمہاری معاد کے لئے رکھ دیا، عبادت کے لئے، اپنی آخرت کی تیاری کے لئے، دن ڈھل رہا ہے ناں! تو ہماری زندگی کا دن بھی ڈھل رہا ہے، تیاری کرلو، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فجر کی نماز کے بعد دوپہر تک کوئی عبادت مقرر نہیں فرمائی اور دوپہر کے بعد سے لے کر سونے تک چار نمازیں مقرر کردیں، حق تو یہ تھا کہ دوپہر سے لے کر سونے تک مسجد ہی میں رہتے، جیسا کہ فجر کے بعد سے لے کر دوپہر تک دکان پر تھے دنیا کمانے کے لئے، اب دوپہر کے بعد سونے تک مسجد میں رہو، اس دکان میں رہو، یہ آخرت کمانے کی دکان ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے ضعف کی رعایت کرتے ہوئے ہمیں اس وقت کی اجازت دے دی کہ یہ وقت بھی اپنی ضروریات کے لئے استعمال کرسکتے ہو، تو تمہیں نظر تو یہ آتا ہے کہ پے در پے پانچ نمازیں آگئیں، ٹکنے نہیں دیتے، تمہیں اس پر شکر کرنا چاہئے کہ تمہیں گھر جانے دیتے ہیں، ٹھیک بات ہے ناں! اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہماری آخرت بھی بنارہے ہیں اور گھر جانے کی اجازت بھی دے رہے ہیں، کام کرنے کی اجازت بھی دے رہے ہیں۔

چوبیس گھنٹے نماز میں رہنے کا عجیب لطیفہ:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب نور اللہ مرقدہٗ عجیب لطیفہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: مسلمان چوبیس گھنٹے نماز ہی میں رہتا ہے! اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

".....لَا يَزَالُ اَحَدُكُمْ فِيْ صَلٰوةٍ مَا دَامَتِ

الصَّلٰوۃُ تَحْبِسُہٗ لَا یَمْنَعُہٗ اَنْ یَّنْقَلِبَ اِلٰی اَھْلِہٖ اِلَّا الصَّلٰوۃُ۔"

(صحیح بخاری ج:۱ ص:۹۰)

یعنی بندہ نماز میں رہتا ہے جب تک کہ وہ نماز کا انتظار کرتا رہے، تو مسجد میں ظہر کی نماز یا جمعہ کی نماز کے لئے آکر بیٹھ گئے، گھنٹہ پہلے سے آئے ہوئے ہیں، یہ پورا وقت تمہارا نماز میں لکھا گیا، اس لئے کہ تم نماز کے انتظار میں بیٹھے ہو۔ حضرت فرماتے تھے کہ: مسلمان جب ظہر کی نماز پڑھ کر جاتا ہے تو اس انتظار میں لگ جاتا ہے کہ مجھے عصر کی نماز میں آنا ہے، عصر پڑھ کر جاتا ہے تو اس انتظار میں لگ جاتا ہے کہ میں نے مغرب کے لئے آنا ہے، مغرب کے بعد عشا کے انتظار میں اور عشا کے بعد سوجاتا ہے، لیکن اس انتظار میں کہ مجھے فجر میں اُٹھنا ہے اور فجر کے بعد اپنے کام کاج کے لئے چلا جاتا ہے، لیکن اس انتظار میں کہ مجھے ظہر کے لئے جانا ہے۔ فرماتے تھے کہ: مسلمان چوبیس گھنٹے نماز میں رہتا ہے۔ حضرتؒ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے، اگر نماز کا اہتمام اور نماز کی فکر ہمیں لگ جائے، ہم ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے منتظر رہا کریں تو اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی سے تمہارا پورا وقت نماز ہی میں صرف کیا جائے گا اور لکھا جائے گا، تو یہ مزید عنایت ہوگی کہ ہمیں گھر جانے کی بھی اجازت دے دی اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ تمہارے لئے نماز کی حاضری لگادیں گے، ہم یوں سمجھیں گے کہ ظہر سے لے کر سونے تک تم نماز ہی میں رہے، تم یہ تو کہتے ہو کہ نماز جلدی جلدی آرہی ہے، یعنی اس پر تم تعجب کرتے ہو، لیکن اس عنایت پر تم تعجب نہیں کرتے کہ تمہارا سارا وقت نماز میں لکھا جارہا ہے۔ تو رزق تلاش کرنے کے لئے بھی اپنا وقت مقرر کرو، بھائی! صبح سے لے کر سونے تک اگر رزق ہی رزق کے پیچھے لگے رہو گے تو آخرت کب بناؤ گے؟ اپنے اوقات تقسیم کرو۔

رزق تمہاری تلاش میں ہے:

رزق تو تمہیں ملے گا ہی ملے گا، کیونکہ رزق تمہاری تلاش میں ہے، وہ

تمہارے پیچھے آرہا ہے، تمہیں اس کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا:

"اِنَّ الرِّزْقَ لَیَطْلُبُ الْعَبْدَ کَمَا یَطْلُبُہٗ اَجَلُہٗ!"

(مشکوٰۃ ص:۴۵۴)

ترجمہ:...... "رزق بندے کو ایسے تلاش کرتا ہے جیسے اس کی موت اس کو تلاش کرتی ہے!"

تم کسی جگہ بھی چھپ جاؤ، موت ضرور پہنچے گی، قرآن کریم میں ہے:

"اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ." (النسآ:۷۸)

تم مضبوط قلعوں میں پناہ لے لو، شیشے کا مکان لے کر اس میں بند ہوجاؤ، موت وہاں بھی پہنچ جائے گی، جہاں ہوا کا گزر نہیں، وہاں بھی موت پہنچ جاتی ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جہاں جہاں موت پہنچ سکتی ہے رزق بھی وہاں پہنچے گا۔

اللہ اپنے بندے کو نہیں بھولتے:

مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا تھا کہ: یا اللہ! آپ مجھے یاد بھی فرماتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: موسیٰ! اس چٹان پر عصا مارو۔ عصا مارا تو اس چٹان کے اندر سے ایک کیڑا نکلا، کیڑے کے منہ میں سبز پتا تھا، فرمایا: موسیٰ! جب چٹان میں رہنے والے کیڑے کو نہیں بھولا تو تجھے کیسے بھولوں گا؟ اللہ تعالیٰ تو کسی بندے کو نہیں بھولتے، تمہارا رزق پہنچائیں گے، کیوں پریشان ہوتے ہو؟

تو صحف موسیٰ علیہ السلام کا ایک فقرہ یہ تھا کہ: مجھے تعجب ہوتا ہے اس شخص پر جس کو تقدیر پر ایمان ہے، یقین ہے، اس کے باوجود خواہ مخواہ مشقت میں پڑتا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

خیر القرون میں
مسجد کی تعمیر و آبادی
کا ذوق!

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

عدی بن حاتمؓ اور نماز کا اہتمام:

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اور جیسا کہ معلوم ہے کہ حاتم طائی عرب کے مشہور سخی تھے، ان کے صاحبزادے ہیں، یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: جب بھی نماز کا وقت آیا میں نے اس کی تیاری اس کے وقت سے پہلے کرلی تھی اور جب بھی نماز کا وقت آتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اس کا پہلے سے مشتاق تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہی حال تھا!

سعید بن مسیّبؒ کا مسجد سے تعلق:

حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں آتا ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اذان ہوئی ہو اور وہ مسجد میں موجود نہ ہوں، یعنی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی غیر حاضری میں اذان ہوگئی ہو، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر فتنہ اتنا سخت تھا کہ تین دن تک مسجدِ نبوی بند رہی، مسجدِ نبوی میں کوئی نماز پڑھنے کے لئے نہیں آتا تھا، ایک حضرت سعید بن مسیّبؒ جو ہمیشہ مسجد میں ہی ہوتے تھے، تین

دن تک مسجد میں ہی بیٹھے رہے، نہ کسی جگہ آئے اور نہ کسی جگہ گئے، نہ وضو، نہ طہارت، ان کو ان چیزوں کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، وہ لوگ جو فسادی تھے وہ مسجد میں آتے ان کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر کہنے لگتے: تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ انہوں نے، جیسے پاگل ہوتا ہے، ہاں ہوں کرکے بات ٹال دی، یعنی کسی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ ان کو کچھ آتا بھی ہے، وہ سمجھتے تھے کہ بیچارہ کوئی گونگا ہے، حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: میں اکیلا مسجد میں ہوتا تھا، اب مسجد میں اذان کا اور وقت کا کیسے پتہ چلے۔ سعید بن عبدالعزیز کہتے ہیں جب نماز کا وقت ہوتا تھا: ''وَكَانَ لَا يَعْرِفُ وَقْتَ الصَّلٰوةِ اِلَّا بِهَمْهَمَةٍ يَسْمَعُهَا مِنْ قَبْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ'' (مشکوٰۃ ص:۵۴۵) یعنی جب نماز کا وقت آتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار شریف سے جماعت ہونے کی آواز آتی تھی، اور وہ اس کے مطابق نماز پڑھتے تھے، کتنے پاکباز لوگ تھے اور کیسا ان کا سینہ پاک تھا؟

مسجدِ نبوی کی تعمیر میں حضورؐ کا حصہ لینا:

ایک روایت میں ہے:

''عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ: اَنَّهُمْ كَانُوْا يَحْمِلُوْنَ اللَّبِنَ اِلٰى بِنَاءِ الْمَسْجِدِ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَهُمْ، قَالَ: فَاسْتَقْبَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَارِضٌ لَبِنَةً عَلٰى بَطْنِهٖ فَظَنَنْتُ اَنَّهَا شُقَّتْ عَلَيْهِ، فَقُلْتُ: نَاوِلْنِيْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: خُذْ غَيْرَهَا يَا اَبَا هُرَيْرَةَ! فَاِنَّهٗ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ!''

(مجمع الزوائد ج:۲ ص:۹)

ترجمہ:...... ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت

نقل کی ہے کہ لوگ مسجد کی تعمیر کے لئے اینٹیں ڈھو رہے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اپنے پیٹ پر اینٹیں اُٹھائی ہوئی تھیں جیسے بوجھ اُٹھایا جاتا ہے، تو میں نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے دے دیجئے، میں لے جاتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ابوہریرہ! اور لے لو، زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، مجھے بھی ثواب چاہئے!''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر چھوٹے بڑے تمام صحابہؓ اس میں لگے ہوئے تھے، اور انہوں نے مسجد تعمیر فرمائی، اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے کپڑے خراب ہوجاتے ہیں، ہم چار پیسے دے کر مزدور تو رکھ لیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کہ اپنے ہاتھ سے کوئی کام کریں اور اپنے ہاتھ سے مسجد کی تعمیر کریں۔

مسجدِ نبوی کی زمین کی خریداری:

یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو دفعہ تعمیر ہوئی ہے، ایک دفعہ تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے ہیں اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مہمان ٹھہرے، سب سے پہلا کام آپؐ نے یہ کیا کہ آپؐ نے فرمایا: بھائی! مسجد بناؤ۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان کے سامنے جو مسجد ہے، اس وقت یہ جگہ یتیموں کی تھی، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کا حال یہ تھا کہ وہ کھنڈرات تھے، کچھ پرانی قبریں تھیں اور کچھ کھجور کے درخت تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس جگہ کا میرے ساتھ سودا کرو! صحابہؓ کہنے لگے کہ: یا رسول اللہ! ہم خود ہی خرید کر وقف کردیتے ہیں، جتنا حصہ یتیموں کا ہے، جتنی قیمت اس کی بنتی ہے وہ ان کو دے دیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! مجھے یہ جگہ

اپنی خریدنی ہے۔

اپنی زمین اور اپنے پیسوں سے مسجد کی تعمیر:

''اپنی خریدنی ہے'' پر مجھے ایک بات یاد آگئی۔ ہمارے ختم نبوت کے مولانا محمد شریف بہاول پوریؒ تھے، یہ بنوری ٹاؤن کے مولانا مفتی ابوبکر سعید الرحمٰن ان کے صاحبزادے ہیں، بہاول پور کے متصل ان کی زمین تھی، ایک دن اپنے لڑکوں کو بٹھا کر کہنے لگے کہ: مولوی جی! لوگوں سے چندہ کرکے تو لوگ مسجدیں بہت بناتے ہیں، لیکن کبھی اپنی جگہ میں، اپنے پیسے سے لوگ مسجد نہیں بناتے، اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی زمین کو وقف کروں اور خود ہی اپنے پیسوں سے بغیر کسی چندے کے مسجد بناؤں، اور اس کے کونے پر مسجد سے باہر میں اپنی قبر کی جگہ رکھوں۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی مسجد کا نقشہ بنایا، کسی سے کوئی پیسہ نہیں لیا اور وہ مسجد تعمیر کی اور اردگرد اپنے لڑکے لڑکیوں کے مکان تعمیر کئے اور اپنی قبر کی جگہ ایک کونے پر رکھی، الحمدللہ! وہیں فوت ہوئے اور وہیں ان کو دفن کیا گیا، وہ مسجد میں خود دیکھ کر آیا ہوں، جتنے لڑکے ہیں، سب کا الگ الگ اپنا مکان ہے، اس وقت تو وہ جگہ اجاڑ تھی اب شہر کے اندر آگئی ہے۔

مسجدِ نبوی کا سنگِ بنیاد اور خلافت کی ترتیب:

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ نہیں! بلکہ اس کو خریدوں گا۔ فرمایا بہت اچھا اور اس کی قیمت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ادا کی، دو قول ہیں، انصار سے پیسے نہیں لئے، یہ تو پہلی دفعہ کی تعمیر تھی اور اس موقع پر سب سے پہلی اینٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی، دوسری اینٹ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے، تیسری حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اور چوتھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے، یہ خلافت کی طرف بھی اشارہ ہوگیا۔

حضرت عمارؓ اور مسجدِ نبوی کی تعمیر:

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ پتھر ڈھو رہے تھے، ان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہوتے تھے، تو حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: یا رسول اللہ! ایک پتھر آپ کا اور ایک پتھر میرا، دو پتھر اُٹھا کر لاؤں گا، آپ پتھر نہ اُٹھائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

"وَیْحَ عَمَّارٌ! تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِیَةُ، یَدْعُوْهُمْ اِلَی الْجَنَّةِ وَیَدْعُوْنَهٗ اِلَی النَّارِ!" (صحیح بخاری ج:۱ ص:۶۴)

ترجمہ:...... "افسوس اے عمار! تجھے باغی جماعت قتل کرے گی، وہ ان کو جنت کی طرف دعوت دے گا اور وہ ان کو دوزخ کی طرف دعوت دیں گے۔"

یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے میں شہید ہوئے تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں اور "فئة الباغیة" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قرار پائے، کیونکہ خلیفہ برحق حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ پہلی دفعہ تو یہ تعمیر ہوئی۔

مسجدِ نبوی کی تعمیرِ ثانی:

اور دوسری دفعہ تعمیر ہوئی ہے ۹ھ میں غالباً اس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے، جیسا کہ روایات میں آتا ہے:

"عَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: بَنَیْتُ الْمَسْجِدَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَکَانَ یَقُوْلُ: قَرِّبِ الْیَمَامِیَ اِلَی الطِّیْنِ فَاِنَّهٗ اَحْسَنُکُمْ لَهٗ مَسًّا وَاَشَدُّکُمْ مَنْکِبًا." (مجمع الزوائد ج:۲ ص:۹)

ترجمہ:...... "حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ فرماتے

ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجدِ نبوی کی تعمیر میں حصہ لیا، آپؐ میرے بارہ میں فرماتے تھے: یمامی کو مٹی کے قریب کرو، یہ تم سے اچھی مٹی بناتے ہیں۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ: گارا اچھا بناتے ہیں، تم لوگوں کو گارا بنانا نہیں آتا۔"

مسجدِ نبوی کی تعمیر کا نقشہ:

فرق اتنا تھا کہ اس دفعہ مسجد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ توسیع کردی تھی، لیکن مسجد وہی ویسی کی ویسی رہی، کھجوروں کے درخت کے ستون کھڑے کئے ہوئے تھے اور اوپر سے کاٹ کاٹ کے ان کو شہتیر بنادیا یا پتے وغیرہ ڈال دیئے، مٹی کے ساتھ لپائی نہیں کی تھی۔

انصار کی پیشکش:

ایک دفعہ انصار نے کہا کہ: یا رسول اللہ! آپ کو بھی تکلیف ہوتی ہے، ہم کو بھی تکلیف ہوتی ہے، ہم نے پیسے جمع کئے ہوئے ہیں اگر آپؐ اجازت عطا فرمائیں تو ہم اچھی مسجد بنادیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام کی مسجد جیسی تھی ویسی بنانی ہے، وہ ایک چھپر تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے ہاتھ اٹھاتے تھے تو ہاتھ ان کا چھت کو لگتا تھا، یہ وہی مسجد ہے جو آج کل مسجدِ نبوی بنی ہوئی ہے اور دنیا کی بہترین مساجد میں سے، بلکہ بہترین تعمیرات میں سے ہے، شاید اس سے بہتر کوئی تعمیر نہیں ہوگی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کی حیثیت یہی رہی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تعمیر نہیں ہوئی، آپ نے وہی رکھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تعمیر ہوئی لیکن ذرا تھوڑی سی آگے پیچھے کردی، یعنی اس کی توسیع کردی لیکن مسجد ویسی ہی رہی۔

حضرت عثمانؓ کا مسجدِ نبوی کے بارہ میں ذوق:

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں آپ نے اس مسجد کو شہید کر کے نئے سرے سے پکی مسجد بنوائی، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو سب سے پہلا اعتراض کیا، وہ یہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد اچھی نہیں لگتی تھی، یہ نئی مسجد بناتے ہیں! حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور اس خطبے میں فرمایا کہ: لوگو! تم اپنے مکان تو بہت اچھے بناتے ہو، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد ایسی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بھی تو ایسے ہی تھے، ایک قطرہ پانی کا بارش ہو جائے تو باہر نہیں جا سکتا تھا، اندر ہی رہتا تھا، اب تمہیں اچھا لگتا ہے کہ تمہارے مکان تو بہت اچھے بنے ہوئے ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کا گھر ایسے ہی رہے، ایک یہ بات فرمائی۔

مسجدِ نبوی کی توسیع بیت المال سے نہیں ہوئی:

دوسری بات یہ فرمائی کہ میں نہ تو بیت المال کا پیسہ لگاتا ہوں اور نہ مسلمانوں سے اس کا چندہ کرتا ہوں، میں اپنی جیب سے خرچ کرتا ہوں، جو کچھ بھی خرچ کرتا ہوں، تمہیں اس پر کیا اعتراض ہے؟ سارے چپ ہوگئے! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام علاقوں کو لکھا کہ تمہارے علاقے میں سب سے بہترین جو لکڑی ہو وہ بھیجو! اور بہترین نقش و نگار والی اینٹیں بھیجو! چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شاندار مسجد بن گئی، اور اس کے بعد پھر اس کی اور تعمیر ہوتی رہی، ترکوں نے بھی تعمیر کی اور سعودیوں نے بھی بعد میں تعمیر کی۔

نماز کا اہتمام
فوائد و ثمرات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُمَا قَالَ: مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَأْتِيْ زِيَارَةً مِنَ الْاَرْضِ اَوْ مَسْجِدًا بُنِيَ بِاَحْجَارِهٖ فَصَلّٰى فِيْهِ اِلَّا قَالَتِ الْاَرْضُ: صَلَّى اللّٰہُ فِيْ اَرْضِهٖ وَاَشْهَدُ لَكَ يَوْمَ تَلْقَاهُ." (کنز العمال ج:۸ حدیث:۲۱۶۳۸)

ترجمہ:...... "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: جو مسلمان کسی زمین کی زیارت کے لئے جاتا ہے یا کسی مسجد میں جو کہ پتھروں کے ساتھ بنائی گئی ہو، اس میں نماز پڑھتا ہے، تو زمین اسے کہتی ہے کہ: اللہ تعالیٰ تیری اپنی زمین پر رحمت فرمائے اور میں تیرے لئے گواہی دوں گی جس دن کہ تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا۔"

"عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ: مَا دُمْتَ فِيْ صَلَاةٍ فَاَنْتَ تَقْرَعُ بَابَ الْمَلِكِ، وَمَنْ يَّقْرَعُ بَابَ الْمَلِكِ يُفْتَحُ لَهٗ." (حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۱۳۰)

ترجمہ:......''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب تک تم نماز میں ہو، تم بادشاہ کے دروازے کو کھٹکھٹاتے ہو، اور جو شخص بادشاہ کے دروازے کو کھٹکھٹائے، اس کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے۔''

زمین کی نمازی کے لئے گواہی:

پہلی روایت میں فرمایا کہ: کوئی آدمی کسی مکان کی زیارت کے لئے جائے، اپنے عزیز و اقارب کو ملنے کے لئے جائے اور وہاں کی مسجد میں نماز پڑھے تو مسجد کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرے گھر میں رحمت نازل فرمائے اور میں تیرے لئے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شہادت دوں گی۔

یہ بات تو پہلے بھی معلوم ہوچکی ہے کہ کسی جگہ میں کوئی اچھا کام کرتے ہو یا کوئی برا کام کرتے ہو، قیامت کے دن زمین کے وہ ٹکڑے تمہارے حق میں شہادت دیں گے کہ اس نے میری پشت پر نیک کام کیا تھا، یا برا کام کیا تھا؟ اس لئے بعض بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہوئے اپنی جگہ بدل لیتے ہیں، تاکہ زمین کا وہ ٹکڑا بھی گواہی دے اور دوسرا ٹکڑا بھی گواہی دے۔

تبلیغ والوں کے لئے مسجدیں اور زمین کی گواہی:

بڑے ہی خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے لئے مشرق و مغرب کی زمین کے ٹکڑے اچھی گواہی دیں گے، جو لوگ تبلیغ میں چلے جاتے ہیں، بیچارے سال لگاتے ہیں، وہاں دھکے کھاتے ہیں، اپنے گھر بار کو چھوڑتے ہیں، زمین پر لیٹتے ہیں، بعض اوقات رہنے کے لئے ان کو مسجدیں مل جاتی ہیں، اور بعض اوقات مسجدیں بھی نہیں ملتیں۔

تبلیغی محنت کے اثرات:

میرے ایک دوست مجھ سے ملنے کے لئے آئے، وہ آگے کسی اور جماعت

میں جارہے تھے، یہاں مسجد میں ان کو آنا ہی تھا، وہ میری گاڑی میں بیٹھ گئے، کہنے لگے کہ: ہمارا پہلا دورہ افریقہ میں ہوا تھا، وہاں نہ کوئی مسجد تھی اور نہ کوئی اور چیز، ایک درخت کے نیچے ہم بیٹھ گئے اور بیٹھ کر فضائل اعمال کی تعلیم کرنے لگے، کتاب پڑھنے لگے، ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ: تم پہلے مجھے مسلمان کرلو، پھر میں تمہیں اپنا ایک قصہ سناؤں گا۔

حالانکہ جماعت والوں کا اصول ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کو دعوت نہیں دیتے، جماعتیں جب باہر جاتی ہیں تو اپنے مسلمان بھائیوں کو دعوت دیتے ہیں، اس دعوت کی برکت سے حق تعالیٰ شانہ غیر مسلموں کے دل میں بھی اسلام کی عظمت ڈال دیتے ہیں۔

ایک پادری کے اسلام لانے کا عجیب قصہ:

خیر جماعت والوں نے انہیں مسلمان کرلیا اور اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی اس کو بھی مسلمان کیا، تو وہ آدمی کہنے لگا کہ: میرا قصہ یہ ہے کہ میں یہاں گرجے کا پادری ہوں، یہ عیسائیوں کا ملک ہے، چند دن ہوئے کہ میں نے تم لوگوں کو خواب میں اسی درخت کے نیچے دیکھا، تمہارا ڈیرا لگا ہوا ہے اور یہی کتاب پڑھ رہے ہو، اس وقت سے میرے دل میں اسلام گھر کرگیا تھا، میں نے کہا کہ: میں ان لوگوں سے کیسے مل سکوں گا؟ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے تم لوگوں کو بھیج دیا، میں بھی مسلمان ہوتا ہوں اور یہ میری بیوی بھی مسلمان ہوتی ہے، پکے سچے مسلمان ہوگئے۔ وہ ساتھی کہتا ہے کہ جماعت کا اصول یہ ہے کہ باہر غیر ملک جب جائیں اگر غیر مسلم مسلمان ہوجائے تو اس کو جماعت کے ساتھ چلانا پڑتا ہے، ان سے وقت لیا جاتا ہے، ورنہ تو مسلمان کرنے کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا۔ تو میں نے کہا کہ: بھائی! تمہیں جماعت میں کچھ وقت دینا پڑے گا، وہ صاحب کہنے لگے کہ: بھائی! جتنا وقت کہو، اتنا ہی وقت دیں گے۔ پھر اس نے ہمارے ساتھ وقت لگایا اور دعوت کے کام کو اتنی جلدی

سیکھ گیا کہ اچھے اچھے مشاق، سمجھدار لوگ بھی ایسی دعوت نہیں دیتے تھے، جس طرح وہ دعوت دیتا تھا۔ تو یہ قصہ مجھے اس پر یاد آگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہیں جن کے لئے مشرق و مغرب کے ٹکڑے قیامت کے دن گواہی دیں گے، یہ لوگ قیامت کے دن اُٹھیں گے تو زمین کے یہ ٹکڑے ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے گواہی دیں گے۔

نمازی، بادشاہ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب آدمی نماز میں ہوتا ہے تو بادشاہ کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے، ہم تو گھنٹی بجاتے ہیں، بجلی کا دور ہے ناں! پرانے زمانے میں دروازہ کھٹکھٹاتے تھے، تو وہ نمازی بادشاہ کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے، جو شخص بادشاہ کے دروازے کو کھٹکھٹائے، یہ بادشاہ ایسا بے رحم نہیں ہے کہ اس کے لئے دروازہ نہ کھولے، اس کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ اور محض اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دروازہ کھٹکھٹائے۔

نمازوں کے بعد اپنی ضرورت کی دعا مانگو:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ:

"اِحْمِلُوْا حَوَائِجَكُمْ عَلَى الْمَكْتُوْبَةِ."

(کنز العمال ج:۸ حدیث:۲۱۶۴۳)

اپنی ضرورتوں کو اپنی نمازوں پر اُٹھا رکھو! جو ضرورت تمہیں پیش آئے فرض نماز پڑھنے کے بعد وہ ضرورت مانگو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرمائیں گے۔ جب کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنی ہو تو نمازِ حاجت پڑھ لو، نماز حاجت پڑھ کر خوب گڑگڑا کے مانگو، کسی کام کو کرنے کے لئے دوسرے اسباب کو اختیار کرنا ممنوع نہیں ہے، لیکن اصل چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنے والے بنو، اس سے مانگنا ہے، اور حق تعالیٰ شانہ

کی ذاتِ عالی کے سوا کوئی نبی یا ولی، کوئی آسمان والا یا زمین والا، دینے والا نہیں، وہی ایک دینے والا ہے، وہی ایک حاجت پوری کرنے والا ہے۔

مشکل کشا صرف اللہ ہے!

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے: تمہیں کوئی تکلیف پہنچی، کوئی مصیبت پہنچی تو کہو: لا الٰہ الا اللہ، کیونکہ اس تکلیف کو پہنچانے والے صرف اللہ تعالیٰ ہیں اور دوبارہ پھر کہو لا الٰہ الا اللہ، کیونکہ اس تکلیف کو ہٹانے والے بھی اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہٹانے والا نہیں ہے۔

تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: اپنی حوائج، اپنی ضروریات کو نماز پر اُٹھا رکھو، نماز کا وقت آئے، نماز پڑھو اور نماز پڑھ کر جو مانگنا ہے اللہ تعالیٰ سے مانگو، اپنی چیزیں، اپنی حاجتیں، اپنی ضرورتیں سوچ کر رکھا کرو کہ آج نماز میں یہ چیز مانگنی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: ایک نماز دوسری نماز کے لئے کفارہ ہے، یعنی ایک نماز سے لے کر دوسری نماز کے درمیان میں جتنے گناہ ہوئے یہ نماز ان سب کا کفارہ ہوجاتی ہے۔

نماز سے گناہ جھڑتے ہیں:

مصنف عبدالرزاق میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ

"إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلٰوةِ وَضَعَتْ خَطَايَاهُ
عَلٰى رَأْسِهٖ فَلَا يَفْرُغُ مِنْ صَلٰوتِهٖ حَتّٰى تَتَفَرَّقُ عَنْهُ كَمَا
تَتَفَرَّقُ عَذُوْقُ النَّخْلَةِ تُسَاقِطُ يَمِيْنًا وَشِمَالًا."

(کنزالعمال ج:۸ حدیث:۲۱۶۳۴)

یعنی جب بندہ نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے، اللہ اکبر کہہ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوگیا تو اس کی تمام غلطیاں اور تمام گناہ سر کے اوپر آجاتے ہیں، اور جب

نماز میں سجدے کے لئے جاتا ہے تو تمام گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح کہ شاخ سے پھل گرجاتا ہے، یہ نماز توبہ ہے، کوئی گناہ ہوگیا ہو تو اللہ تعالیٰ کے سامنے نمازِ توبہ کی نیت کرو اور نماز کے لئے کھڑے ہوجاؤ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے خوب معافی مانگو۔

مؤمن کو توبہ کیے بغیر سکون نہیں ملتا:

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"اِنَّ الْمُؤْمِنَ یَرٰی ذُنُوْبَہٗ کَاَنَّہٗ فِیْ اَصْلِ جَبَلٍ یَخَافُ اَنْ یَّقَعَ عَلَیْہِ، وَاِنَّ الْفَاجِرَ یَرٰی ذُنُوْبَہٗ کَذُبَابٍ وَقَعَ عَلٰی اَنْفِہٖ." (ترمذی ج:۲ ص:۷۳)

یعنی مؤمن بندے سے اگر غلطی یا گناہ ہوجائے تو اس پر اتنا بوجھ پڑتا ہے کہ گویا وہ پہاڑ کے نیچے آگیا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو راضی نہ کرلے اور اپنے قصور کی معافی نہ مانگ لے اور اس کو اطمینان نہ ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے معاف کردیا ہوگا، کسی طریقہ سے بھی اس کو چین نہیں آتا۔ اور فرمایا کہ: منافق کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ناک پر مکھی بیٹھی تھی وہ اُڑادی، فرق کیا پڑا؟

مؤمن کا گناہوں سے پریشان ہونا اور توبہ کرنا ایمان کی علامت ہے:

کسی مؤمن کا اپنے گناہوں کو یاد کرکے پریشان ہونا اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا یہ علامت ہے ایمان کی۔ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ بندہ جب نماز پڑھتا ہے تو اس کی غلطیاں سر پر جمع ہوجاتی ہیں، جیسے کہ درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

رات کی تاریکی سے نفع ونقصان اُٹھانے والے:

ایک روایت میں ہے:

"عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ اَنَّهُ بَاتَ عِنْدَ سَلْمَانَ يَنْظُرُ اجْتِهَادَهُ، فَقَامَ يُصَلِّيْ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ فَكَأَنَّهُ لَمْ يَرَ الَّذِيْ كَانَ يَظُنُّ، فَذَكَرَ لَهُ ذَالِكَ، فَقَالَ سَلْمَانُ: حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ! فَاِنَّهُنَّ كَفَّارَاتٌ لِهٰذِهِ الْجَرَاحَاتِ مَا لَمْ يُصِبِ الْمَقْتَلَةَ فَاِذَا اَمْسَى النَّاسُ كَانُوْا عَلٰى ثَلَاثِ مَنَازِلَ: فَمِنْهُمْ مَنْ لَهُ وَلَا عَلَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ عَلَيْهِ وَلَا لَهُ، وَمِنْهُمْ مَنْ لَا لَهُ وَلَا عَلَيْهِ، فَرَجُلٌ اِغْتَنَمَ ظَلْمَةَ اللَّيْلِ وَغَفْلَةَ النَّاسِ فَقَامَ يُصَلِّيْ حَتّٰى اَصْبَحَ فَذَالِكَ لَهُ وَلَا عَلَيْهِ، وَرَجُلٌ اِغْتَنَمَ غَفْلَةَ النَّاسِ وَظَلْمَةَ اللَّيْلِ فَرَكِبَ رَأْسَهُ فِي الْمَعَاصِيْ فَذَالِكَ عَلَيْهِ وَلَا لَهُ، وَرَجُلٌ صَلَّى الْعِشَاءَ وَنَامَ فَذَالِكَ لَا لَهُ وَلَا عَلَيْهِ، فَاِيَّاكَ وَالْحَقْحَقَةَ! وَعَلَيْكَ بِالْقَصْدِ وَدَاوِمْ!" (کنز العمال ج:۸ حدیث:۲۱۶۳۶)

یعنی طارق بن شہاب رحمہ اللہ ایک بزرگ ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک دن قصداً حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مہمان رہا، میرا مقصد یہ تھا کہ ان کی رات کی عبادت کو دیکھوں، عشا کی نماز پڑھی اور سوگئے اور ایسے سوئے کہ اُٹھے ہی نہیں، رات کا آخری حصہ جب باقی رہ گیا تو اُٹھے اور اُٹھ کر صبح صادق ہونے تک تہجد کی نماز پڑھی، میرا خیال تھا کہ یہ تو بہت عبادت کرنے والے بندے ہوں گے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اس خطرے کو محسوس کرگئے اور فرمایا: پانچ نمازوں کی پابندی کرلو اور اس کے بعد یہ جو رات آتی ہے ناں! یہ تین قسم کے آدمیوں کے لئے

آتی ہے، بعض آدمی وہ ہیں کہ رات ان کے لئے ہے، ان پر وبال نہیں لوگوں کے سکون کو، لوگوں کے آرام کو رات کے اندھیرے کو اور رات کی تاریکی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ یہ وقت اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا ہے، مالک کے دروازے کو کھٹکھٹانے کا وقت ہے، اور بعض ایسے ہیں کہ رات ان کے لئے وبال ہے، ان کے لئے نفع نہیں ہے، اس لئے کہ رات کا وقت ہوتا ہے لوگ اپنے ٹھکانے پر جاتے ہیں، سکون ہوجاتا ہے، رات چھاجاتی ہے تو ان کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوتا، ڈاکے ڈالنے کے لئے بہت اچھا وقت ہے، چوری کرنے کے لئے، کسی کا گھر لوٹنے کے لئے، بہت اچھا وقت ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ رات ان کے لئے وبال ہے، رحمت نہیں ہے۔ اور تیسرے قسم کے آدمی وہ ہیں جن کے لئے رات نہ وبال ہے نہ رحمت، سوگئے صبح ہوگئی اللہ! اللہ! خیر صلہ! رات صرف سونے کے لئے ہے اور کسی چیز کے لئے ہے یا پھر آج کل ٹی وی دیکھنے کے لئے ہے، یا پھر ریڈیو پر خبریں وغیرہ سننے کے لئے ہے، یا پھر لوگوں کی باتیں کرنے کے لئے، رات آدھی گزرگئی ہم سوگئے اور پھر ایسے سوئے کہ صبح کو آنکھ نہیں کھلی۔

رات کمائی کا وقت ہے!

بہت سارے دوست شکایت کرتے ہیں کہ جی صبح فجر کی نماز کے لئے آنکھ نہیں کھلتی، سورج نکل آتا ہے، نماز قضا ہوجاتی ہے، کیوں نہ قضا ہو؟ اس لئے کہ ہمارے نزدیک رات کمائی کا وقت ہی نہیں ہے، کچھ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے ہیں جن کے لئے رات کمائی کا وقت ہے۔ مصنف عبدالرزاق نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ: جب نماز کا وقت ختم ہوجاتا ہے تو ہم اپنے آپ کو گناہوں کے ساتھ جلانا شروع کردیتے ہیں، یہاں تک کہ نماز کا وقت آجاتا ہے تو ہم نماز پڑھ کر اس آگ کو بجھادیتے ہیں، ٹھنڈا کردیتے ہیں، پھر اگلا معاملہ شروع ہوجاتا ہے۔

نماز ادائے شکر کا ذریعہ:

ایک حدیث میں ہے:

"عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْمُ مِنَ اللَّیْلِ حَتّٰی تَفَطَّرَ قَدَمَاهُ، فَقُلْتُ لَهٗ: لِمَ تَصْنَعُ هٰذَا یَا رَسُوْلَ اللهِ! وَقَدْ غَفَرَ اللهُ لَکَ؟ ..... قَالَ: اَفَلَا اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا؟" (بخاری ومسلم)

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ اتنی محنت کیوں اٹھاتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کردیئے؟ آپؐ بخشے بخشائے ہیں، اس کے باوجود بھی اتنی محنت اُٹھاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ کرم فرمایا، یہ احسان فرمایا کہ نہ صرف میرے اگلے پچھلے گناہ معاف کردیئے، بلکہ امت کے لئے بھی شفاعت قبول فرمالی، تو میں اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟

آنحضرتؐ کی نماز و روزہ کی کیفیت:

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ:

"سُئِلَ اَنَسُ بْنُ مَالِکٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ عَنْ صَلٰوةِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ اللَّیْلِ، فَقَالَ: مَا كُنَّا نَشَاءُ مِنَ اللَّیْلِ اَنْ نَرَاهُ مُصَلِّیًا اِلَّا رَأَیْنَاهُ وَمَا كُنَّا نَشَاءُ اَنْ نَرَاهُ نَائِمًا اِلَّا رَأَیْنَاهُ، وَكَانَ یَصُوْمُ مِنَ الشَّهْرِ حَتّٰی نَقُوْلَ: لَا یُفْطِرُ مِنْهُ شَیْئًا، وَیُفْطِرُ حَتّٰی نَقُوْلَ: لَا یَصُوْمُ مِنْهُ

شَیْئًا۔" (صحیح بخاری ج:۱ ص:۲۶۴)

یہ عجیب بات تھی کہ جب ہم چاہتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتا ہوا دیکھ سکتے تھے اور جب ہم چاہتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لیٹا ہوا دیکھ سکتے تھے، جب چاہتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں دیکھ سکتے تھے اور جب چاہتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو افطار کے وقت دیکھ سکتے تھے۔

ایک آیت کی تلاوت پر پوری رات قیام:

نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ میں حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک آیت پر پوری رات گزار دی:

"عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: قَامَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃً حَتّٰی اَصْبَحَ بِآیَۃٍ وَالْآیَۃُ: اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔" (مشکوٰۃ ص:۱۰۷)

ترجمہ:...... "حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پوری رات نماز میں کھڑے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی، اور صرف یہ آیت پڑھتے رہے کہ: اگر آپ ان کو بخش دیں تو آپ کے بندے ہیں، اور اگر آپ عذاب دینا چاہتے ہیں تو آپ عزیز و حکیم بھی ہیں۔"

پوری رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روتے رہے اور یہ آیت شریفہ پڑھتے رہے۔

تکلیف کے باوجود آپ کا تہجد میں لمبی سورتوں کا پڑھنا:

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرامؓ نے کہا کہ: یا رسول اللہ!

آپ کو تکلیف بہت زیادہ ہے، طبیعت بوجھل ہے، ارشاد فرمایا: اس کے باوجود میں نے تہجد میں سات لمبی سورتیں پڑھی ہیں، قرآن کریم کی ان سات طویل سورتوں میں سے صرف سورۃ البقرۃ ہی ڈھائی پارے کی ہے، اس کے باوجود میں نے سات لمبی سورتیں پڑھی ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

”عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَافْتَتَحَ الْبَقَرَةَ، فَقُلْتُ: يَرْكَعُ عِنْدَ الْمِائَةِ، قَالَ: ثُمَّ مَضٰى، فَقُلْتُ: يُصَلِّيْ بِهَا فِيْ رَكْعَةٍ، فَمَضٰى فَقُلْتُ: يَرْكَعُ بِهَا، ثُمَّ افْتَتَحَ النِّسَاءَ فَقَرَأَهَا ثُمَّ افْتَتَحَ آلَ عِمْرَانَ فَقَرَأَهَا، يَقْرَأُ مُتَرَسِّلًا، إِذَا مَرَّ بِآيَةٍ فِيْهَا تَسْبِيْحٌ سَبَّحَ، وَإِذَا مَرَّ بِسُؤَالٍ سَأَلَ، وَإِذَا مَرَّ بِتَعَوُّذٍ تَعَوَّذَ، ثُمَّ رَكَعَ فَجَعَلَ يَقُوْلُ: سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ، فَكَانَ رُكُوْعُهُ نَحْوًا مِنْ قِيَامِهِ، ثُمَّ قَالَ: سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، ثُمَّ قَامَ طَوِيْلًا قَرِيْبًا مِمَّا رَكَعَ، ثُمَّ سَجَدَ فَقَالَ: سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى، فَكَانَ سُجُوْدُهُ قَرِيْبًا مِنْ قِيَامِهِ.“

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۶۴)

یعنی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مسلم شریف میں نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ مجھے کیا سوجھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، میں نے بھی آپؐ کے پیچھے نیت باندھ لی، نیت باندھ تو لی مگر پچھتایا بہت، سورۂ بقرہ شروع کردی، میں نے کہا کہ سو آیتیں پڑھ کر رکوع کردیں گے، لیکن آپ پڑھتے رہے، میں نے کہا کہ: سورۂ بقرہ ایک رکعت میں پڑھ لیں گے، (لیکن پھر آپ پڑھتے رہے، سورۂ آل عمران بھی پڑھی اور سورۂ نسا بھی پڑھی اور پڑھی بھی اس طرح نہیں جس طرح رمضانی حافظ پڑھتے ہیں، بلکہ) جہاں پناہ مانگنے کی آیت آتی، اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے، جہاں

کوئی رحمت کی آیت آتی، آپ اللہ تعالیٰ سے رحمت کی دعا کرتے، یعنی آرام آرام سے سوچ سوچ کر اور ہر آیت کا حق ادا کرتے ہوئے ایک ہی رکعت میں سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ نسا پڑھی، نماز پڑھنے کے بعد میں نے کہا: حضرت! آج تو میں بھی پھنس گیا، اب نہ نماز توڑ سکتا ہوں اور نہ چل سکتا ہوں، میری کمر اتنی دکھنے لگی کہ میں سیدھا نہیں ہوسکتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم پیچھے کھڑے ہو تو میں نماز کو مختصر کرلیتا۔ یہ وہ چیز ہے کہ جس کے بارہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

ایک روایت میں ہے:

”عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهَا اَنَّهَا ذُكِرَ لَهَا اَنَّ نَاسًا یَقْرَؤُنَ الْقُرْاٰنَ فِی اللَّیْلَةِ مَرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ، فَقَالَتْ: اُولٰئِکَ قَرَؤُوْا وَلَمْ یَقْرَؤُوْا! كُنْتُ اَقُوْمُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْلَةَ التَّمَامِ فَكَانَ یَقْرَأُ بِالْبَقَرَةِ وَآلَ عِمْرَانَ وَالنِّسَاءَ، فَلَا یَمُرُّ بِآیَةٍ فِیْهَا تَخْوِیْفٌ اِلَّا دَعَا اللّٰہَ وَاسْتَعَاذَ، وَلَا یَمُرُّ بِآیَةٍ فِیْهَا اسْتِبْشَارٌ اِلَّا دَعَا اللّٰہَ وَرَغِبَ اِلَیْهِ.“ (مجمع الزوائد ج:۲ ص:۲۷۲)

ترجمہ:...... ”حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے کہا کہ: سنا ہے کچھ لوگ ایک رات میں قرآن کریم ختم کرلیتے ہیں، اور بعض دو دفعہ ختم کرلیتے ہیں! فرمایا: انہوں نے پڑھا بھی اور نہیں بھی پڑھا! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتی تھی، پوری رات قیام فرماتے تھے سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ نسا اکٹھی پڑھتے تھے، جس آیت میں تخویف ہوتی وہاں اللہ تعالیٰ

سے دعا کرتے، جہاں کوئی ایسی بات ہوتی اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے، جہاں کوئی خوشخبری کی آیت ہوتی وہاں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے اور اللہ تعالیٰ سے رغبت کرتے۔“

مرض الوفات میں آپؐ کی نماز کا حال:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں کا یہ تو صحت میں حال تھا، مرض الوفات میں یہ ہوا کہ بار بار غشی آتی تھی، اس کے بعد ہوش آتا تو آپ سوال کرتے: لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟ عرض کیا جاتا: نہیں یا رسول اللہ! لوگ آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ پھر غشی ہوجاتی پھر ہوش آتا تو پوچھتے: لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟ کئی بار اس طرح ہوا تو ارشاد فرمایا کہ: ابوبکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائے! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میرے دل میں یہ خیال آیا کہ لوگ اس کو نحوست پر محمول کریں گے، نعوذ باللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہیں رہے تو یہ منحوس آگیا، مجھے یہ خیال ہوتا تھا، میں نے کہا: یا رسول اللہ! ابوبکر کمزور آدمی ہے، رونا بھی ان کو بہت آتا ہے، جب ان کو یہ خیال آئے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز نہیں پڑھانے آئے تو ان سے برداشت نہیں ہوسکے گا، آپ کسی اور کو فرمادیجئے وہ نماز پڑھائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اِنَّکُنَّ لَاَنْتُنَّ صَوَاحِبَ یُوْسُفَ!“ (بخاری ج:۱ ص:۹۹) تم یوسف کی سہیلیاں معلوم ہوتی ہو، وہ عورتیں زنانِ مصر زلیخا کے پاس سفارش کرتی تھیں، لیکن ہر ایک کے دل میں اپنا اپنا مطلب تھا، ابوبکر کو کہو کہ نماز پڑھائے! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پیغام پہنچایا گیا، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سترہ نمازیں پڑھائی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجودیکہ دروازہ پاس تھا، لیکن تشریف نہیں لاسکتے تھے، ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ طبیعت میں ہلکاپن محسوس ہوا تو دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر آپ مسجد میں

تشریف لے گئے اور آپ کے پاؤں لکیریں کھینچتے ہوئے جارہے تھے، زمین پر پاؤں نہیں رکھ سکتے تھے، ان دونوں صاحبوں کو فرمایا کہ: مجھے ابوبکر کے برابر میں بٹھادو!

امام کس طرف کھڑا ہوتا ہے؟ یعنی اگر دو آدمی نماز پڑھنے والے ہوں تو امام کس طرف کھڑا ہوتا ہے؟ امام بائیں طرف کھڑا ہوتا ہے ناں! اس لئے فرمایا بائیں طرف مجھے بٹھانا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ:

"..... يَقْتَدِىْ اَبُوْبَكْرٍ بِصَلٰوةِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّاسُ مُقْتَدُوْنَ بِصَلٰوةِ اَبُوْبَكْرٍ."

(صحیح بخاری ج:۱ ص:۹۹)

ترجمہ:...... "لوگ اقتدا کر رہے تھے ابوبکر کی، ابوبکر اقتدا کر رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔"

مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکبّر تھے اور جس جگہ ابوبکر کی قرأت کی آواز پہنچی تھی وہیں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے سے شروع کردی، یہیں سے فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ بھی حل ہوگیا، تو اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نماز پڑھائی۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ تبلیغی جماعت والوں کی ایک نماز بھی قضا نہیں ہوئی جماعت کے ساتھ، آپ کی چارپائی کو لاکر مسجد میں صف کے برابر میں رکھ دیا جاتا تھا اور اسی طرح لیٹے لیٹے آپ نماز پڑھتے تھے، بیٹھ نہیں سکتے تھے، ایک بھی نماز جماعت کے ساتھ قضا نہیں ہوئی، ہمیں تھوڑا سا سر کا درد ہوجائے، تھوڑی سی تکلیف ہوجائے نماز کا ناغہ! اللہ تعالیٰ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والا اہتمام نصیب فرمائے، آمین!

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین!

نمازوں کے اوقات
اور
اس کی حکمتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”..... وَاِنَّ لِلصَّلاۃِ وَقْتًا اِشْتَرَطَہُ اللّٰہُ فَلَا تُصْلُحُ اِلَّا بِہٖ فَوَقْتُ صَلَاۃِ الْفَجْرِ حِیْنَ یُزَایِلُ الْمَرْءَ لَیْلُہٗ وَیَحْرُمُ عَلَی الصَّائِمِ طَعَامُہٗ فَاٰتُوْھَا حَظَّھَا مِنَ الْقُرْاٰنِ، وَوَقْتُ صَلَاۃِ الظُّھْرِ اِذَا کَانَ الْقَیْظُ فَحِیْنَ تَزِیْغُ عَنِ الْفَلَکِ حَتّٰی یَکُوْنَ ظِلُّکَ مِثْلَکَ ..... مَعَ شُرُوْطِ اللّٰہِ فِی الْوُضُوْءِ وَالرُّکُوْعِ وَالسُّجُوْدِ ..... وَاِنَّ الْمُھَاجِرِیْنَ الَّذِیْنَ ھَجَرُو السَّیِّئَاتِ، وَیَقُوْلُ اَقْوَامٌ جَاھَدْنَا، وَاِنَّ الْجِھَادَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مُجَاھَدَۃِ الْعَدُوِّ وَاجْتِنَابِ الْحَرَامِ. وَقَدْ یُقَاتِلُ اَقْوَامٌ یُحْسِنُوْنَ الْقِتَالَ، لَا یُرِیْدُوْنَ بِذٰلِکَ الْاَجْرَ وَلَا الذِّکْرَ وَاِنَّمَا الْقَتْلُ حَتْفٌ مِّنَ الْحُتُوْفِ وَکُلُّ امْرِئٍ عَلٰی مَا قَاتَلَ عَلَیْہِ.“ (کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۲۱۳)

ترجمہ:..... ”اور بے شک نماز کے لئے وقت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے شرط قرار دیا ہے، لہٰذا نماز وقت کے بغیر ادا

نہیں ہوتی (بے وقت نماز ادا نہیں ہوتی)۔ فجر کی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے جب رات ختم ہوجاتی ہے اور جس وقت روزے دار پر کھانا پینا حرام ہوجاتا ہے، یعنی صبح صادق ہوجاتی ہے، اس عرصہ میں اس نماز کو اس کا حصہ قرآن سے دیا کرو، اور ظہر کی نماز کا وقت جب سورج ڈھل جائے، یہاں تک کہ تیرے دائیں طرف آجائے، وضو، رکوع اور سجود میں اللہ کی شرائط کی رعایت رکھتے ہوئے۔ اور بے شک مہاجر وہ لوگ ہیں جنہوں نے گناہوں کو چھوڑ دیا۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے جہاد کیا، حالانکہ جہاد فی سبیل اللہ نام ہے دشمن کے مقابلہ میں مجاہدہ کرنے کا اور حرام سے بچنے کا! اور کچھ لوگ بڑی بہادری سے لڑتے ہیں، لیکن ان کا مقصود کوئی اجر وغیرہ نہیں ہوتا، اور قتل بھی موت کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، اور ہر آدمی کی جیسی نیت ہوگی ویسا بدلہ ملے گا۔''

فجر کے فرائض اور سنن کی تعداد:

یہ تو آپ حضرات کو معلوم ہے کہ نماز فجر کی سنت صرف دو ہی رکعتیں رکھی گئی ہیں، اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان دو رکعت سنت کے علاوہ سورج نکلنے تک فرضوں سے پہلے بھی اور فرضوں کے بعد بھی کسی دوسری نماز کا پڑھنا مکروہ ہے، گویا صبح صادق سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک دو رکعت فرض اور دو رکعت سنت کے علاوہ کوئی نفل نماز جائز نہیں۔ صبح صادق کے بعد فجر کی نماز تک دو رکعت فرض کے علاوہ صرف دو سنتیں پڑھنے کی اجازت ہے، نفل وغیرہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں۔ ہاں! نمازِ جنازہ اور سجدۂ تلاوت کی اجازت ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی قضا نمازیں

رہتی ہوں تو اس وقت ان کے پڑھنے کی بھی اجازت ہے، لیکن لوگوں کے سامنے نہ پڑھے، اپنے گھر میں جاکر پڑھے۔

فجر کے فرائض وسنن میں اختصار کیوں؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے اوقات میں فرض نماز کی رکعتیں بھی زیادہ ہیں اور پھر اس کے ساتھ ساتھ نوافل کی بھی اجازت دی گئی ہے، سنتیں بھی ہیں، نفل پڑھنے کی بھی اجازت ہے، جتنے چاہے نفل پڑھو، جبکہ اس وقت صرف دو رکعتیں فرض اور اس سے پہلے صرف دو سنت پڑھنے کی اجازت ہے اور کچھ نہیں تو آخر ایسا کیوں؟

جواب: یہ اس لئے کیا گیا ہے تا کہ فجر کی نماز کو لمبا کیا جائے، جیسا کہ قرآن کریم نے فجر کی نماز کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

"وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا."

(بنی اسرائیل:۷۸)

ترجمہ:......"(اور پابندی کرو) فجر کے قرآن کی، بے شک فجر کا قرآن پڑھنا ایسا ہے کہ اس وقت فرشتوں کی حاضری ہوتی ہے۔"

اس لئے فجر کی نماز لمبی پڑھنے کا حکم ہے۔

نماز میں کمزوروں کا لحاظ رکھا جائے:

لیکن اس بات کا لحاظ رہے کہ جماعت میں بعض کمزور ہوتے ہیں، بعض بیمار ہوتے ہیں، ان کی رعایت بھی ضروری ہے۔ اس لئے نماز لمبی بھی ذرا مناسب کی جائے، اتنی لمبی نہ کی جائے کہ لوگ بیچارے اُکتا جائیں یا بیمار وغیرہ تنگ آجائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"فَمَنْ اَمَّ قَوْمًا فَلْيُخَفِّفْ فَاِنَّ فِيْهِمُ الْكَبِيْرَ وَاِنَّ فِيْهِمُ الْمَرِيْضَ وَاِنَّ فِيْهِمُ الضَّعِيْفَ وَاِنَّ فِيْهِمْ ذَا الْحَاجَةِ، فَاِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ وَحْدَهٗ فَلْيُصَلِّ كَيْفَ شَاءَ."

(مشکوٰۃ ص:۱۰۱)

ترجمہ:......"تم میں سے جو شخص امام بنے اس کو چاہئے کہ نماز ذرا ہلکی پڑھائے، اس لئے کہ جماعت میں بوڑھے بھی ہوں گے، بیمار بھی ہوں گے، کمزور بھی ہوں گے اور ضرورت مند بھی ہوں گے (ان کو اپنی نماز کے بعد کسی کام سے جانا ہے) اور جب تم اپنی نماز پڑھو تو جتنی چاہو لمبی کرو۔"

دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم، ایک صحابی کو نصیحت فرما رہے تھے، آپؐ نے فرمایا: "وَاقْتَدِ بِاَضْعَفِهِمْ!" (مشکوٰۃ ص:۶۵) "تم جب امام بنو تو جماعت میں جو سب سے زیادہ کمزور آدمی ہو اس کی اقتدا کرو۔" یعنی "اس کی اقتدا کرو" کا مطلب یہ ہے کہ گویا تم اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہو اور وہ نماز پڑھا رہا ہے، یعنی جماعت میں جو سب سے زیادہ کمزور آدمی ہو اس کی رعایت رکھتے ہوئے نماز پڑھاؤ۔

ظہر اور عصر کا وقت؟

اس کے بعد ظہر کا وقت ذکر فرمایا کہ سورج جب ڈھل جائے اس وقت ظہر کی نماز پڑھو، اور عصر کی نماز اس وقت پڑھو جب سورج اوپر ہو، خوب روشن ہو، ابھی دھوپ کی گویا ایک درجے میں گرمی باقی ہو اور سورج غروب ہونے میں اتنا وقت باقی ہو کہ آدمی دو فرسخ کا فاصلہ چل سکے یا اونٹ پر سوار ہوکر چھ میل کی مسافت طے کرسکے۔ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے، عصر کی نماز پڑھ کر تقریباً ایک گھنٹہ میں یہ سفر ہوجائے گا۔

مغرب وعشاءٔ کا وقت؟

مغرب کی نماز پڑھو جوں ہی کہ سورج غروب ہوجائے اور عشاءٔ کی نماز پڑھو جبکہ رات کی تاریکی چھا جائے اور افق کی سرخی جاتی رہے۔ اس وقت سے لے کر تہائی رات کے اندر اندر تک نماز پڑھو۔

عشاءٔ سے پہلے سونا:

عشاءٔ کی نماز سے پہلے سوؤ نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ’’فَمَنْ نَامَ فَلَا نَامَتْ عَیْنُہٗ.‘‘ (مشکوٰۃ ص:٦٠) (جو شخص اس (عشاءٔ کی نماز سے پہلے سو گیا، اللہ کرے) اس کی آنکھ نہ لگے، اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں کو نہ سلائے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا فرمائی کہ اللہ کرے اس کو سونا نصیب نہ ہو جو عشاءٔ کی نماز پڑھے بغیر سو گیا۔

قبل از وقت اور بعد از وقت نماز:

یہ پانچ نمازوں کے اوقات ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ نماز کا وقت ہونے سے پہلے اگر کوئی شخص نماز پڑھے گا تو نماز نہیں ہوگی، اور اگر نماز کا وقت گزر گیا تو نماز قضا سمجھی جائے گی اور قضا پڑھنی پڑے گی۔

مجبوراً نماز کا وقت گزر جانے کی صورتیں؟

یہ بات بھی یاد رہے کہ وقت کا گزر جانا کبھی عذر کی بنا پر ہوسکتا ہے کہ اس کو یاد ہی نہیں رہا کہ مجھے نماز پڑھنی ہے اور کبھی آدمی کو کسی کام میں ایسی مشغولیت ہوتی ہے کہ اس کام سے ہٹ نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر، مریض کا آپریشن کر رہا تھا، وہ آپریشن اتنا لمبا ہوگیا کہ ڈاکٹر اس کو نہ درمیان میں چھوڑ سکتا ہے اور نہ ہی نماز پڑھ سکتا ہے۔ یا مثال کے طور پر مسلمان حالتِ جنگ میں ہیں اور کوئی شکل ایسی بھی نہیں

ہوسکتی کہ دو جماعتیں بنا کر صلوٰۃ الخوف پڑھ لی جائے، جس کی بنا پر نماز کا وقت گزر گیا۔

آپ حضرات نے سنا ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غزوۂ احزاب میں چار نمازیں قضا ہوگئی تھیں، وہ نمازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں اکٹھی پڑھی تھیں، اسی موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حَبَسُوْنَا عَنْ صَلٰوةِ الْوُسْطٰى صَلٰوةَ الْعَصْرِ، مَلَأَ اللهُ بُيُوْتَهُمْ وَقُبُوْرَهُمْ نَارًا." (مشکوٰۃ ص:۶۳)

ترجمہ:...... "اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھرے، انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ یعنی عصر کی نماز سے مشغول کردیا، ہمیں نماز بھی نہیں پڑھنے دی۔"

تو اگر خدانخواستہ کوئی ایسا عذر پیش آجائے کہ آدمی نماز پڑھنے پر قادر ہی نہ ہو تو بعد میں قضا کرے اور اگر جان بوجھ کر وقت گزار دیا نماز نہیں پڑھی یا کوئی ایسی مجبوری نہیں تھی، بلکہ محض دکان پر گاہک تھے، جبکہ ان کو یہ بات کہہ سکتے تھے کہ بھائی نماز کا وقت ہوگیا، چلو نماز پڑھیں، فی الحال دکانداری ختم! تو یہ بات کہہ سکتے تھے لیکن اس کے باوجود نماز چھوڑ دی۔ تو دکان پر ہونے کی وجہ سے نماز باجماعت کا چھوڑ دینا کوئی مجبوری نہیں ہے۔

بلا عذر تارکِ نماز کا حکم؟

اگر کوئی آدمی بغیر عذر کے نماز چھوڑتا ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ شخص جان بوجھ کر ایک نماز قضا کرنے سے مرتد ہوگیا، یہ حضرت پیرانِ پیر کے امام کا فتویٰ ہے، جن کی لوگ گیارہویں دیتے ہیں! لوگوں کا بھی عجیب حال ہے، نماز تو پڑھتے نہیں لیکن گیارہویں دیتے ہیں، یہ ان کے امام کا

فتویٰ ہے! وہ فرماتے ہیں کہ نہ یہ آدمی توبہ کرسکتا ہے اور نہ ہی قضا کرنے سے اس کا گناہ اتر سکتا ہے، اتنا سنگین فتویٰ ہے! وہ فرماتے ہیں کہ بغیر عذر کے نماز چھوڑنے والا مرتد ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ: "مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ!" (طبرانی بحوالہ اتحاف ج:۳ ص:۱۰) (جس نے جان بوجھ کر نماز کو ترک کردیا، وہ کافر ہوگیا)۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسے بے نمازی کو کافر تو نہیں کہیں گے لیکن وہ واجب القتل ہے، لہٰذا اس کو قتل کیا جائے گا۔

شرح مہذب میں امام نووی مالکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: ہمارے اور امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں فرق یہ ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ بھی تارکِ صلوٰۃ کے قتل کا حکم دیتے ہیں اور ہم بھی، لیکن ہم اس کو مسلمان سمجھتے ہوئے بطورِ سزا قتل کا حکم دیتے ہیں، اور امام احمدؒ اس کو مرتد سمجھتے ہوئے واجب القتل قرار دیتے ہیں، اس لئے اس کو قتل کرنے کے بعد ہمارے نزدیک اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ایسے شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

ہمارے نزدیک اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔

جان بوجھ کر نماز قضا کردینا شریعت کی نظر میں بہت سنگین جرم ہے، لیکن افسوس! کہ ہمارے نزدیک اس کی کوئی خاص اہمیت ہی نہیں، اچھے خاصے نمازیوں کو دیکھا ہے کہ اگر کوئی معمولی سا کام پیش آگیا تو نماز چھوڑ دی اور سفر کی حالت میں تو شاید ہم پر ویسے بھی نماز معاف ہوجاتی ہے، اور عذر یہ تراشتے ہیں کہ جی یہاں جگہ کہاں ہے؟ یہاں ریل گاڑی میں کیسے نماز پڑھیں؟ یا اگر بس میں سفر کر رہے ہیں تو ہمارے پاس یہ بہانہ ہوتا ہے کہ بس والا گاڑی کھڑی نہیں کرتا، ہم کیسے نماز پڑھ سکتے ہیں؟ اپنا حال بتاتا ہوں۔

سفر کے دوران نمازوں کا اہتمام:

میں نے سالہا سال تک ریل کا اور بس کا سفر کیا، میرا ہمیشہ کا معمول تھا کہ ریل میں بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا اور اگر بس کا سفر ہوتا تو بس والے سے کہہ دیتا تھا کہ تمہاری بس پر سفر کرنے کی میری یہ شرط ہوگی کہ بس کو فلاں جگہ پر جا کر روکو گے اور اگر نہیں روکتے تو ٹکٹ ہی نہیں لیتا، یا اگر بس پر سوار ہوتا اور نماز کا وقت ہوجاتا تو اس بس سے اتر جاتا اور بس والوں سے کہہ دیتا تھا کہ تم بس لے کر جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ!

ریل میں باجماعت نماز کے اہتمام کی برکت:

میرے بھائی تھے مولانا سلیمان طارق صاحبؒ، یہاں بھی انہوں نے ایک بار تقریر کی تھی، اب تو ان کا انتقال ہوگیا۔ ایک دفعہ انہوں نے میرے ساتھ ریل کا سفر کیا، میں نے ریل گاڑی میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، کئی سال کے بعد وہ مجھے کہنے لگے کہ: اس دن آپ کے ساتھ جو ریل گاڑی میں نماز باجماعت پڑھی، اس وقت سے لے کر آج تک کبھی میری نماز قضا نہیں ہوئی، ورنہ میں ریل گاڑی میں نماز باجماعت تو دور کی بات ہے، سرے سے ریل گاڑی کی وجہ سے نماز بھی چھوڑ دیتا تھا، اور بعد میں قضا کرلیتا تھا۔ مولانا صاحب واعظِ قوم تھے، بڑے اچھے مقرر تھے، لیکن سفر میں نماز کی اہمیت ہی نہیں ہے۔

سفر میں تمام ضرورتوں کا اہتمام ہے، نماز کا نہیں:

سفر میں کھانے کا اہتمام ہے، پینے کا اہتمام ہے، سردی گرمی سے بچنے کا اہتمام ہے اور انسانی حوائج وضروریات کا اہتمام ہے، بچے ساتھ ہوں تو ان کے لئے دودھ کا اہتمام ہے، اگر اہتمام نہیں ہے تو صرف نماز کا نہیں ہے، ہمارے ذہن میں نماز کی اتنی بھی قیمت نہیں جتنی روٹی اور پانی کی قیمت ہوتی ہے، اور عذر یہ کرتے ہیں

کہ صاحب نماز کیسے پڑھیں؟ اتنی تو بھیڑ ہے اور جگہ بھی گندی ہے۔ یہ تو مردوں کا حال ہے، اور عورتوں کا حال یہ ہے کہ -اللہ تعالیٰ معاف کرے- گھر میں بیٹھی ہوئی لوگوں کی غیبتیں کرتی کرتی نماز قضا کرلیتی ہیں، کوئی نیک بخت خاتون ہوگی جو وقت پر نماز پڑھتی ہوگی، ورنہ عموماً قضا کر کے نماز پڑھتی ہیں، اور بطورِ خاص عصر کی نماز اس وقت پڑھیں گی جبکہ سورج پیلا ہوجائے گا اور فجر کی نماز اس وقت پڑھیں گی جب سورج طلوع ہو رہا ہوگا، انا للہ وانا الیہ راجعون!

جماعت کی برکت کا قصہ:

میں آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ الحدیث اور شیخ التفسیر تھے، ان کی تفسیر ''معارف القرآن'' بھی ہے، بخاری شریف کی بھی شرح لکھ رہے تھے، بیضاوی شریف کی بھی شرح لکھی، بہت بڑے فاضل تھے، ان کی تقریر سن کر ایسے معلوم ہوتا تھا کہ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ دوبارہ پیدا ہوگئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنا علم عطا فرمایا تھا۔ ہمارے شیخ حضرت مولانا خیر محمد صاحب قدس سرہٗ ان کے بارہ میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ رجالِ آخرت میں سے ہیں، ان کو دنیا کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ مظاہر العلوم میں غالباً مقاماتِ حریری پڑھتے تھے، بعد میں انہوں نے اس کتاب کی شرح بھی لکھی تھی، تو ایک دن استاذ نے سبق کے وقت کسی کام سے بھیج دیا، آنے میں دیر ہوگئی، اب یہ بیٹھ کر رونے لگے، استاذ نے شفقت کے طور پر ان سے فرمایا کہ: بھئی! سبق میں نے پڑھایا ہے، میں پورا سبق دوبارہ پڑھادوں گا، آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں، استاذ سے کہنے لگے: حضرت! بات سبق کی نہیں، وہ تو میں خود بھی مطالعہ کر کے نکال لوں گا، مگر مجھے جس چیز کا غم ہے وہ یہ بات ہے کہ درس کے وقت جو جماعت بیٹھی ہوئی پڑھ رہی تھی اس پر جو برکت نازل ہو رہی تھی اس برکت کو میں دوبارہ کیسے حاصل کروں گا؟ درس کے وقت

جو جماعت پڑھ رہی تھی اور ان پر حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے جو ایک خاص سکینت نازل ہو رہی تھی وہ میں اب کیسے حاصل کروں گا؟ اس پر مجھے رونا آرہا ہے۔ یہ تھے ہمارے اکابر جن کی برکت سے یہ دین ہمیں ملا ہے۔

ایک بزرگ کی نماز قضا ہونے کا قصہ:

ایک بزرگ کی نماز باجماعت قضا ہوگئی تھی، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

”صَلٰوةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلٰوةَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَّعِشْرِيْنَ دَرَجَةً.“ (مشکوٰۃ ص:۹۵)

ترجمہ:......”جماعت کی نماز کا ثواب اکیلے نماز پڑھنے سے ستائیس گنا بڑھ جاتا ہے۔“

یعنی جماعت کی نماز کا ثواب ستائیس گنا ملتا ہے۔ تو اس بزرگ نے اپنے نفس سے کہا کہ اب تجھ سے ستائیس مرتبہ نماز پڑھواؤں گا۔ مثال کے طور پر اگر چار رکعت کی نماز تھی تو ستائیس مرتبہ چار رکعتیں پڑھواؤں گا، فرض تو ایک ہی ہوگا باقی تجھ پر نفل جرمانہ کروں گا۔ چنانچہ اس بزرگ نے ایسا ہی کیا، ستائیس مرتبہ نماز پڑھ چکے تو غیب سے آواز آئی کہ تم نے بڑی محنت کرلی، تمہیں جماعت کی نماز کا ثواب تو عطا فرمادیں گے لیکن جب امام نے کہا تھا: ”ولا الضالین“ اور پیچھے مقتدیوں نے کہا تھا: آمین! اور اس آمین کہنے میں فرشتے بھی شامل تھے، ان فرشتوں کی دعا کو کہاں سے لاؤ گے؟ نماز کو اس کے وقت پر پڑھنا اور جماعت کے ساتھ پڑھنا یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے!

اوّل وقت میں نماز کی فضیلت:

حدیث شریف میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

"اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: اَلصَّلٰوۃُ لِاَوَّلِ وَقْتِهَا!" (مشکوٰۃ ص:٦١)

ترجمہ:...... "سب سے اچھا عمل کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اوّل وقت پر نماز پڑھنا! اور ایک روایت میں ہے کہ: وقت پر نماز پڑھنا!"

باجماعت نماز پڑھنے کا راز:

اس حدیث کے پیش نظر امام شافعیؒ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر نماز کو اول وقت پر پڑھنا چاہئے۔ ہم نے کہا کہ: حضرت! اول وقت سے مراد مستحب وقت ہے، مستحب وقت کے اول میں نماز پڑھنا افضل ہے، اس کا راز یہ ہے کہ یہ جو اوقاتِ پنجگانہ ہیں، ان اوقات میں حق تعالیٰ شانہ کی خاص تجلیات کا ظہور ہوتا ہے، حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے خاص عنایات ہوتی ہیں اور ان اوقاتِ پنجگانہ میں جو نمازیں فرض کی گئی ہیں وہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آتا ہے کہ آؤ عنایت اور رحمتِ الٰہی کا لنگر تقسیم کیا جارہا ہے تم بھی اپنا حصہ لے لو، لیکن تم نماز باجماعت کے لئے نہیں گئے جس کی وجہ سے ان عنایات اور رحمتِ الٰہی سے محروم رہے، اللہ تعالیٰ کو تمہاری چار رکعت کی ضرورت نہیں تھی، وہ تو تمہیں کسی خاص مقصد کے لئے بلوا رہے تھے، تم نے وہ وقت ہی ٹال دیا۔ اس لئے نماز کو اول وقت میں پڑھنے کی اور جماعت کے ساتھ پڑھنے کی فکر کرنی چاہئے، اس کا اہتمام ہونا چاہئے، سفر میں بھی اس کو معمولی چیز نہ سمجھو۔

حضرت داؤدؑ کے ہاں عبادت کی اہمیت:

یوں تو ہر نبی اللہ کا مقدس و برگزیدہ بندہ ہوتا ہے، مگر حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارہ میں آتا ہے کہ وہ بہت نیک آدمی تھے، آہن گر تھے، یعنی لوہے کا کام

کرتے تھے اور لوہار تھے، ان کا دستور یہ تھا کہ لوہا گرم کیا ہوا ہے اور ہتھوڑا سر کے اوپر اُٹھایا ہوا ہے، ادھر اللہ اکبر کی آواز آئی وہیں ہتھوڑا چھوڑ دیا، یعنی ہتھوڑا سر پر اُٹھایا ہوا ہے، لیکن لوہے پر نہیں ماریں گے، نیچے رکھ دیں گے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کو ان چیزوں کی قیمت معلوم تھی، ان چیزوں کی عظمت ان کے دل میں تھی، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ عظمت نصیب فرمائے۔

تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پانچ نمازوں کے اوقات ذکر فرمائے اور فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

''اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا.'' (النسآ:۱۰۳)

ترجمہ:...... ''بے شک نماز اہل ایمان پر لکھی ہوئی ہے وقت پر۔''

یعنی ایک تو ان پر یہ بات لکھ دی گئی کہ یہ کام ان کو لازماً کرنا ہے اور دوسرے یہ نہیں کہ وقت بے وقت جیسے چاہیں پڑھ لیں، بلکہ خاص خاص اوقات میں یہ نماز ادا کرنی ہے۔

نمازوں کے اوقات کی حکمتیں:

اور اکابرِ امتؒ نے ان اوقات کی حکمت بھی بیان فرمائی ہے کہ فلاں وقت میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توبہ قبول ہوئی تھی، ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص عنایت ہوئی تھی، اس عنایت میں سے اپنے بندوں کو حصہ دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس وقت کی نماز فرض کردی، فلاں وقت حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی طوفان ختم ہونے کے بعد جودی پہاڑ پر لگی تھی، چھ مہینے کشتی پانی پر تیرتی رہی اس وقت سوائے پانی کے روئے زمین پر کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی، جودی پہاڑ پر کشتی جب رُکی تو

حضرت نوح علیہ السلام نے بطورِ شکرانہ نماز پڑھی تھی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ ...." (ہود:۴۴)

ترجمہ:...... "اور حکم آیا اے زمین! نگل جا اپنا پانی، اور اے آسمان! تھم جا، اور سکھا دیا گیا پانی اور ہو چکا کام اور کشتی ٹھہری جودی پہاڑ پر۔"

یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ اپنا پانی نگل جا، وہ پانی نگل گئی اور کشتی جودی پہاڑ پر جا کر لگ گئی تو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے رفقا کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ کی جو عنایت و رحمت ہوئی اس میں سے حصہ دینے کے لئے فلاں وقت کی نماز مقرر کی گئی، اسی طرح اور بھی اکابرؒ نے بہت سی حکمتیں ذکر کی ہیں، مگر ہم سے وہ اونچی چیزیں ہیں۔

مہاجر کے معنیٰ:

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ: آدمی کہتا ہے کہ میں نے ہجرت کی ہے، میں بھی ہجرت کر کے آیا ہوں، حالانکہ اس نے ہجرت نہیں کی، کیونکہ مہاجرین تو وہ ہیں جنھوں نے برائیوں کو چھوڑ دیا۔ **"فان المهاجرين الذين هجروا السيئات!"** جنھوں نے برائیوں کو چھوڑ دیا۔

ہجرت کی وجوہ اور ان کا حکم:

بھائی! مہاجر کے معنی ترکِ وطن کے ہیں، وطن کو چھوڑ دینا، اور وطن کو چھوڑنا کئی وجوہ سے ہوتا ہے، بعض لوگ امریکہ جا کر وہاں کی شہریت حاصل کر لیتے ہیں، کیوں جاتے ہیں؟ صرف اس لئے نا کہ وہاں کھانے پینے کو ملتا ہے! امریکہ کا گرین

کارڈ لوگوں کے نزدیک ایسا ہے گویا جنت کا ٹکٹ مل گیا ہو! یا شاید جنت کا ٹکٹ بھی ان کے نزدیک اتنا قیمتی نہ ہو، یہ لوگ ہجرت کر کے چلے گئے، امریکہ چلے گئے یا کسی اور ملک چلے گئے اور وہاں کی شہریت حاصل کرلی، پاسپورٹ بھی وہاں کا بن گیا، اور ترکِ وطن کبھی نوکری کے لئے ہوتا ہے، کبھی تجارت کے لئے ہوتا ہے اور کبھی دوسرے مقاصد کے لئے ہوتا ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں ہجرت کا مفہوم:

پہلے زمانے میں کبھی کبھی ترکِ وطن عشق کے لئے ہوتا تھا، اب تو عشق کو لوگ جانتے ہی نہیں ہیں، بدمعاشی کا نام ''عشق'' کر رکھا ہے، اور کبھی کبھی ترکِ وطن ہوتا ہے دین کی خاطر! ہندوستان پر جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو بہت سارے لوگ ترکِ وطن کر کے مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ چلے گئے، اور ویسے بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، لیکن اب حکومتوں کی پابندیاں ہیں، حالانکہ ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کہ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں موت آئے۔ تو شریعت کی اصطلاح میں ہجرت کہتے ہیں دین کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جانا، یہ مہاجر ہے۔

مکہ مکرمہ میں جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دین پر عمل نہیں کرنے دیا جارہا تھا، مسلمانوں کو حکم تھا کہ مکہ چھوڑ کر مدینہ آجائیں، صحابہ کرامؓ حبشہ کی طرف بھی دو مرتبہ گئے تھے۔

ہجرت کتنا بڑا عمل ہے؟

اور یہ ہجرت اتنا بڑا عمل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اِنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ! وَاِنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا! وَاِنَّ الْحَجَّ یَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ!''

(مشکوٰۃ ص:۱۴)

یعنی ایک آدمی غیر مسلم تھا، مسلمان ہوگیا، پہلے کے سارے گناہ معاف! اور ہجرت کرلی تو پہلے کے تمام گناہ معاف! اور حج کرلیا، بشرطیکہ حج، حجِ مبرور ہو تو پہلے کے تمام گناہ معاف! اور اگر حج میں داڑھی منڈواتے رہے تو پھر کیا؟ جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آگئے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

کعبہ بھی گئے پر نہ چھوٹا عشق بتوں کا!
اور زم زم بھی پیا پر نہ بجھی آگ جگر کی!

ہمارا کیا حال ہے؟ ہماری کیفیت تو وہ ہے کہ جو عشقِ مجازی اور جو جو بیماریاں ہم ساتھ لے کر جاتے ہیں، وہی واپس لے کر آتے ہیں، تو ہجرت بہت بڑا عمل ہے، لیکن اب ہم کہنے کو تو مہاجر ہوگئے لیکن ہجرت کے تقاضے بھی پورے کر رہے ہیں یا نہیں؟ اس کو سوچا جائے!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مہاجر وہ ہیں کہ جنہوں نے برائیوں کو چھوڑ دیا اور یہ رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی ترجمانی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ!"
(مشکوٰۃ ص:۱۲)

ترجمہ:......"مسلمان وہ ہے کہ مسلمان اس کے ہاتھ سے اور اس کی زبان سے محفوظ رہیں۔"

اور مہاجر وہ ہے جس نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا ہو جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم مجاہد ہیں، ہم نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا، فرمایا کہ: جہاد فی سبیل اللہ نام ہے دشمن کے مقابلہ میں مجاہدہ کرنے کا اور حرام سے بچنے کا! حدیث شریف میں فرمایا: "اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ

نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ" تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے پہلو میں ہے، اس سے تو کبھی لڑائی نہیں کی، دشمنوں سے جہاد کر رہے ہیں، یہ تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے، سب سے بڑا کافر تمہارا نفس ہے، ذرا اس سے بھی مجاہدہ کر کے لڑائی کی ہوتی، اور اس نفس کے ساتھ کبھی مجاہدہ کیا ہے؟ نفس سے مجاہدہ کا مطلب ہے اس کی خواہشات کو پورا نہ کرنا۔

نفس کی مخالفت کا قصہ:

سلطان الہند خواجہ نظام الدین اولیاؒ قدس سرہٗ ایک دفعہ بیمار ہوئے، بیماری کچھ زیادہ سخت ہوگئی، خدام نے عرض کیا کہ: حضرت! یہاں ایک ہندو ہے، جو بیماری سلب کر لیتا ہے، توجہ ڈال کر بیماری چوس لیتا ہے، اس کو بلالیں؟ ارشاد فرمایا: بیماری اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، محبوب کی دی ہوئی چیز کو دور کرنے کے لئے محبوب کے دشمن کو بلانا غیرت کے خلاف ہے! یعنی یہ غیرت کی بات ہے کہ ایک ہندو کو بیماری کی وجہ سے بلائیں! اس بیماری کی وجہ سے آپ کو بیہوشی ہوگئی، دوستوں نے اپنے طور پر اس ہندو کو بلالیا، کیونکہ حضرت تو بیہوش تھے، وہ ہندو آیا، وہ چونکہ اپنے فن کا ماہر تھا، مراقبہ کر کے بیٹھ گیا اور بیماری سلب کرنا شروع کر دی، حضرتؒ چارپائی پر اُٹھ کے بیٹھ گئے، اس نے اپنا عمل مکمل کر لیا، سلطان الہندؒ اپنے دوستوں پر غصہ ہوئے اور فرمایا: میں نے تمہیں منع کیا تھا، اگرچہ تم نے محبت کی وجہ سے کیا، لیکن میری منشا کے خلاف کیا ہے، اب اس ہندو کا مجھ پر احسان ہے اور اس احسان کا بدلہ دینا چاہئے۔ حضرت سلطان الہند قدس سرہٗ نے اس ہندو سے فرمایا کہ: میاں! تمہیں اتنا بڑا کمال کیسے حاصل ہوا؟ وہ کہنے لگا: جی! میرے گرو نے کہا تھا کہ جس چیز کو نفس چاہے اس کی مخالفت کرنا، اور جس چیز کو نفس نہ چاہے وہ کرنا! میں نے ساری زندگی کے لئے یہ اصول اپنالیا، آج اگر دل گوشت کھانے کو چاہتا ہے تو نہیں کھاؤں گا اور فلاں چیز کو چاہتا ہے نہیں کروں

گا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ: بھائی! تم ہو تو بڑے باکمال اور تمہارا اصول بھی بہت اچھا ہے، لیکن تمہارا اصول پکا نہیں کچا ہے۔ کہنے لگا: نہیں جی! میرا اصول بہت پکا ہے، ساری عمر کا اصول ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا: میں ابھی امتحان لے لیتا ہوں کہ تمہارا اصول پکا ہے یا کچا ہے؟

حضرتؒ نے اس ہندو سے فرمایا کہ: سچ سچ بتاؤ تمہارا دل مسلمان ہونے کو چاہتا ہے یا نہیں؟ ہندو کہنے لگا کہ: حضرت! مسلمان ہونے کو میرا دل نہیں چاہتا! حضرتؒ نے فرمایا: پھر نفس کے خلاف ہوا ناں؟ اب اگر تمہارا اصول پکا ہے تو مسلمان ہو جاؤ، اور اگر مسلمان نہیں ہوتے تو معلوم ہوا کہ یونہی بناوٹی سا اصول ہے پکا نہیں! تو وہ کسی قدر سوچنے کے بعد کہنے لگا: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ! حضرتؒ نے فرمایا: جا تم نے مجھ پر احسان کیا تھا، میں نے تم پر احسان کیا، احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے، اس لئے تجھے مسلمان کر دیا۔ اور فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے میرے پاس تجھے بھیجا ہی اس لئے تھا کہ اللہ تعالیٰ تجھے اسلام کی دولت عطا فرمائیں۔ اب وہ ہندو مسلمان ہو گیا اور ٹھیک ٹھاک مسلمان ہوا پھر تو حضرت کی خدمت میں رہ گیا اور حضرتؒ سے خلافت حاصل کی، مجاہدہ تو اس نے پہلے ہی بہت کیا ہوا تھا۔ میاں! نفس کی مخالفت کا نام مجاہدہ ہے۔

گھر بھی مجاہدہ کا میدان ہے:

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہٗ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: بھئی! پہلے زمانے میں بزرگ مجاہدے کرایا کرتے تھے، بزرگ چلّے کھنچواتے تھے، بڑی بڑی محنت کروایا کرتے تھے، لیکن اب لوگوں کے پاس فرصت بھی نہیں ہے، صحت بھی نہیں ہے، ہمت بھی نہیں ہے اور طلب بھی نہیں ہے، اب تو یہ چھوٹے چھوٹے مجاہدے ہیں ان پر ہی پکے ہو جاؤ! اور فرمایا کرتے تھے کہ: تمہارا گھر مجاہدے کا میدان ہے! بیوی

سے ناگواری پیش آرہی ہے اس پر صبر کرو، بچوں سے ناگواری پیش آرہی ہے اس پر صبر کرو، دوستوں سے ناگواری پیش آرہی ہے اس پر صبر کرو، نفس کی ناگواریوں پر صبر کرو اور نفس ایک کام کرنا نہیں چاہتا، اس سے وہ کام کرواؤ، اور نفس چاہتا ہے ایک غلط کام کرنے کو اس کو روکو، اس کی لگام تھامو! بیوی جب بک بک کرتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ دو چار تھپڑ ہی لگادیں، لیکن نہیں! نفس کو روکو! یہ تمہارا مجاہدہ ہے، صبر کرو اور اپنے نفس کو تھپڑ لگاؤ۔

نفس سب سے بڑا دشمن:

غرضیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے، جو تمہارے پہلو میں ہے۔ اور سب سے بڑے دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی جہاد سے تشریف لا رہے تھے، ارشاد فرمایا:

"رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ!" (اتحاف ج:٦ ص:٣٧٩)

ترجمہ:......"ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹے ہیں!"

کافروں سے جو جہاد کر رہے تھے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے اور ہمارے بھی دشمن تھے، مگر نفس بھی تمہارا دشمن ہے، اس کی مخالفت کرنا اور اس سے لڑنا بھی جہاد ہے، تمہارا نفس چاہتا ہے شریعت کے خلاف یہ کریں، یہ کریں، یہ کریں، اس سے کہو کہ قطعاً نہیں کریں گے! لیجئے آج سے تمہیں ولی اللہ کی سند مل جائے گی، ایک آن میں ولی اللہ بن جاؤ گے۔

اللہ کا راستہ دو قدم سے زیادہ نہیں:

آج سے طے کرلو کہ خلافِ شریعت کام جو نفس چاہے گا نہیں کریں گے، اسی کو عارف فرماتے ہیں کہ: اللہ کا راستہ دو قدم سے زیادہ نہیں، لوگ کہتے ہیں: اللہ کا راستہ بہت لمبا ہے، جی ہاں! لمبا تو ہے، اس لئے کہ اللہ کی ذات بھی غیر فانی اس کا راستہ بھی غیر فانی، جس طرح اس ذات کی کوئی حد نہیں، اسی طرح اس کے راستے کی بھی کوئی حد نہیں، ساری عمر چلتے رہو تو ایسا لگے گا کہ ایک قدم بھی طے نہیں ہوا، لیکن ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ: ہمارا جو راستہ ہے، الحمدللہ! جو قدم اُٹھتا ہے وہی منزل ہے، ہر قدم ہماری منزل ہے، جس قدم پر موت آگئی انشأاللہ! وہ قدم مقبول ہوگئے، پار ہوگئے۔

اللہ کے راستہ کے دو قدم سے کیا مراد ہے؟

تو بزرگ فرماتے ہیں کہ: اللہ کا راستہ دو قدم سے زیادہ نہیں، ایک قدم نفس کی گردن پر رکھو، دوسرا محبوب کی منزل میں رکھو! پہلا قدم نفس کی گردن پر رکھو اور دوسرا محبوب کے کوچے میں رکھو! پہنچ گئے، لیکن کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے، کہہ دینا آسان لیکن کرنا مشکل!

نفس کو رام کرنے کے لئے شیخ کی ضرورت:

اور یہ نفس کوئی رام ہونے والی چیز ہے؟ یہ تو سرکش گھوڑا ہے، اس کے لئے تو بڑا ماہر سائیس چاہئے، جس کے ہاتھ میں چھانٹا بھی ہو اور یہ گھوڑا جتنا اچھلے، کودے، وہ اس کی پشت سے چپک جائے، اور سنگلاخ زمین میں ڈال کر اس کے پاؤں توڑ دے، اس لئے فرماتے ہیں کہ:

نفس نتواں کشت اِلاّ ظلِّ پیر!

کسی مرشد کے سائے میں پناہ لو تو یہ نفس مرے گا، ایسے نہیں مرتا، کہہ دینا

آسان، کرنا مشکل، تو غرضیکہ مجاہد وہ نہیں جو کافروں سے لڑا، مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے لڑا۔

جہاد کا مقصد؟

اس کے بعد فرمایا کہ: بعض لوگ اجر کے لئے، تنخواہ کے لئے لڑتے ہیں، بعض لوگ شہرت کے لئے لڑتے ہیں، اور یہ قتل ہونا بھی موت کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، ہر آدمی کو جیسی اس کی نیت ہوگی ویسا بدلہ ملے گا، اور بعض دفعہ ایک آدمی بہادر ہوتا ہے، اس کے دل سے ہی جوش اُٹھتا ہے لڑنے کا، یہ نہیں کہ وہ شہرت چاہتا ہے، یہ نہیں کہ اس کو کسی نے پیسے دیئے ہیں، یہ تمام چیزیں اپنی جگہ، لیکن جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ کی رضا کے لئے لڑے، محض اللہ کو راضی کرنا مقصود ہے، زمین، وطن، قوم، قبیلہ، عصبیت کوئی چیز مدِنظر نہیں، لڑائی میں محض رضائے الٰہی مدِنظر ہے، تو یہ شخص مجاہد فی سبیل اللہ ہے، اور جو شخص اس راستے میں مرے وہ اللہ کے راستے میں مرنے والا ہے، اس کو شہید فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔

سبحانک اللّٰھم وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفرک واتوب الیک

دنیا میں رہنے کا سلیقہ!

حضرت ابو درداءؓ کی نصیحتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

"عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: لَا تَزَالُ نَفْسُ اَحَدِکُمْ شَابَّۃً فِیْ حُبِّ الشَّیْءِ وَلَوِ الْتَقَتْ تَرْقُوَتَاہُ مِنَ الْکِبَرِ اِلَّا الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی وَقَلِیْلٌ مَّا ھُمْ۔" (حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۲۲۳)

"عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: ثَلَاثٌ مِنْ مَلَاکِ اَمْرِ ابْنِ اٰدَمَ: لَا تَشْکُ مُصِیْبَتَکَ، وَلَا تُحَدِّثْ بِوَجْعِکَ، وَلَا تُزَکِّ نَفْسَکَ بِلِسَانِکَ۔"

(حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۲۲۴)

"عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اِیَّاکُمْ وَدَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ! وَدَعْوَۃَ الْیَتِیْمِ! فَاِنَّھُمَا تَسْرِیَانِ بِاللَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ!"

"عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اِنَّ اَبْغَضَ

النَّاسِ اِلَیَّ اَنْ اَظْلِمَهُ مَنْ لَّا یَسْتَعِیْنُ عَلَیَّ اِلَّا بِاللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ." (حلیۃ الاولیاءؒ ج:۱ ص:۲۲۱)

ترجمہ:...... "حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ: تم میں سے ایک کا نفس جوان رہتا ہے کسی چیز کی محبت میں خواہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کے دونوں جبڑے مل گئے ہوں، سوائے ان لوگوں کے جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے چن لیا، اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔"

ترجمہ:...... "حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے تھے کہ: تین چیزیں بندے کے معاملے کا مدار ہیں:

۱:......ایک یہ کہ اپنی مصیبت کی شکایت نہ کرو۔

۲:......دوسری یہ کہ اپنی تکلیف لوگوں کو نہ بتاؤ۔

۳:......اور تیسری یہ کہ اپنی زبان سے اپنے نفس کا تزکیہ نہ کیا کرو، اس کو پاک نہ بتاؤ۔"

ترجمہ:...... "حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے تھے کہ: مظلوم اور یتیم کی بددعا سے بچا کرو! اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں رات کے وقت چلتی ہیں جبکہ لوگ سو رہے ہوں۔"

ترجمہ:...... "حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ: میرے نزدیک لوگوں میں سب سے برا یہ ہے کہ میں کسی ایسے شخص پر ظلم کروں جو میرے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی مدد نہیں لے سکتا۔"

آدمی کے نفس کا جوان رہنا:

یہ حضرت ابودرداؔ رضی اللہ عنہ، حکیم الامت کے چند مواعظ ہیں:

ایک یہ کہ کسی چیز کی محبت میں آدمی کا نفس ہمیشہ جوان رہتا ہے، چاہے وہ اتنا بوڑھا ہوگیا ہو کہ اس کے جبڑے بھی مل گئے ہوں، یعنی منہ نہیں کھلتا، مگر نفس کی جوانی نہیں جاتی، وہ اب تک جوان ہے، سوائے ان لوگوں کے جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے چن لیا ہو، وہ تو مستثنیٰ ہیں، اور ایسے لوگ بہت کم ہیں، بہت ہی کم ہیں، یہ مضمون حدیث شریف کا ہے، ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ:

"یَهْرَمُ ابْنُ آدَمَ وَيَشُبُّ مِنْهُ اثْنَانِ: اَلْحِرْصُ عَلَى الْمَالِ، وَالْحِرْصُ عَلَى الْعُمُرِ!" (مشکوٰۃ ص:۴۴۹)

ترجمہ:...... "آدمی بوڑھا ہوتا رہتا ہے، لیکن دو خصلتیں اس کے اندر جوان ہوتی رہتی ہیں، جوں جوں اس کی عمر ڈھلتی جاتی ہے یہ دو عادتیں اس کی جوان ہوتی رہتی ہیں، ایک مال کی محبت، اور دوسری طول العمر یعنی زیادہ جینے کی محبت۔"

یہ چیز انسان میں فطری طور پر رکھی گئی ہے، اور رکھی بھی ایسی گئی ہے کہ بوڑھا ہونے کے بعد آدمی کا دل تمام چیزوں سے سرد ہوجاتا ہے، بہت کھالیا، بہت کمالیا، اب چھوڑ دیں قصہ، اللہ تعالیٰ نے گھربار دیا ہے، آل و اولاد دی ہے، بہت وقت گزار دیا ہے، اب آگے کی تیاری کریں، لیکن نہیں، اس حالت میں بھی بڑے میاں کا دل نہیں بھرتا، جبکہ پاؤں قبر میں لٹکے ہوئے ہیں، چاہتا ہے کہ مال زیادہ سے زیادہ ہو اور شیخ چلّی کی طرح اپنی آرزوئیں پکاتا رہتا ہے، یہ فطری چیز ہے، سوائے ان لوگوں کے جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے ساتھ مخصوص کردیا ہے، خوفِ خدا ان کے دل میں ہے، ان کا دل سرد ہوجاتا ہے۔

بادشاہ، بزرگ اور شاہی شیخ الاسلام کا قصہ:

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ ایک بزرگ کے پاس گیا، بادشاہ کا شیخ الاسلام بھی ساتھ تھا، وہ سرکاری ''شیخ الاسلام''، جیسے بے نظیر نے کوثر نیازی کو ''شیخ الاسلام'' بنایا تھا، اللہ تعالیٰ معاف کرے! تو بادشاہ بزرگ سے بہت ادب سے ملا، بادشاہوں میں یہ چیز ہوتی ہے کہ جب اللہ والوں کو دیکھتے ہیں تو اخلاص کے ساتھ ملتے ہیں، شیخ الاسلام صاحب جل گئے کہ اس بزرگ کی اتنی تعظیم بادشاہ کرتا ہے، ہمیں گھاس بھی نہیں ڈالتا، چلتے ہُوئے بادشاہ نے کچھ ہدیہ پیش کیا، نقدی کی تھیلی پیش کی، بزرگ فرمانے لگے کہ: بادشاہ سلامت! ہم اس کو کیا کریں گے؟ ہمارے کام کی چیز نہیں ہے، آپ لے جایئے ضرورت مندوں میں تقسیم کردیجئے، یہ میرے کام کی چیز نہیں ہے۔

جس کے دل میں دنیا کی عزت نہ ہو، مخلوق اس کی عزت کرتی ہے:

دنیا ایک ایسی چیز ہے، اس کا تجربہ کرو کہ جس شخص کے دل میں اس کی عزت نہ ہو، اس کی عزت ہمارے دل میں آجاتی ہے، اور جس کے دل میں اس کی حرص ہو، خواہ ہم اپنی جگہ کتنے بھی حریص ہوں دنیا کے لیکن دوسرے آدمی کے دل میں جب ہم دنیا کی محبت دیکھتے ہیں، روپے پیسے کی محبت دیکھتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت ہمارے دل سے مٹ جاتی ہے، کم ہوجاتی ہے، تو اس بزرگ نے جب بادشاہ سے یہ بات کہی تو شیخ الاسلام صاحب نے یہ سمجھا کہ اس کی تو اور بھی وقعت بادشاہ کے دل میں پیدا ہوجائے گی، شیخ الاسلام نے وہی حدیث پڑھی جو میں نے ابھی پڑھی ہے کہ:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدم کا بیٹا بوڑھا ہوتا رہتا ہے لیکن اس میں دو خصلتیں جوان ہوتی رہتی ہیں، یعنی پرورش پاتی رہتی ہیں، مال کی محبت اور دنیا میں زندہ

رہنے کی محبت۔“

شیخ الاسلام کا مقصد اس بزرگ پر چوٹ کرنا تھا کہ یہ چیزیں آپ میں بھی موجود ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان برحق ہے، لیکن نمائش کے طور پر آپ ترکِ دنیا ظاہر کرتے ہیں کہ مجھے دنیا کی ضرورت نہیں۔

وہ بزرگ فرمانے لگے کہ: حضرت! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”یہ دو خصلتیں جوان ہوتی رہتی ہیں“ جوان وہ ہوتا ہے جو پیدا ہوگیا ہو، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ دو چیزیں یہاں پیدا ہی نہیں ہوئیں، پیدا ہوتیں تو جوان ہوتیں!

شیخ الاسلام صاحب اس بزرگ کا جواب سن کر اتنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

بادشاہوں کے حاشیہ نشین علماً:

پھر وہ بزرگ فرمانے لگے کہ ایک حدیث میں بھی سنادوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اَلْعُلَمَاءُ اُمَنَاءُ الرُّسُلِ مَا لَمْ یُخَالِطُوا السُّلْطَانَ! فَاِذَا خَالَطُوا السُّلْطَانَ وَدَاخَلُوا الدُّنْیَا فَقَدْ خَانُوا الرُّسُلَ، فَاحْذَرُوْھُمْ!“ (کنز العمال ج:۱۰ حدیث:۲۸۹۵۳)

ترجمہ:......”علماً رسولوں کے امین ہیں جب تک کہ حکومت کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں، بادشاہ کے قریب ہوکر نہ رہیں! اگر وہ بادشاہ کے قریب ہوکر رہیں، حکومت کے، اقتدار کے قریب ہوکر رہیں، تو ان سے بچو! (اس لئے کہ وہ دین کے ڈاکو ہیں)۔“

غلام احمد قادیانی کی طرح شیخ الاسلام صاحب مناظرہ ہار گئے!

محبتِ الٰہی اور حُبِّ دنیا یکجا نہیں ہوسکتیں:

اس کو حضرت ابودرداؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سوائے ان لوگوں کے جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے چن لیا ہے، جس کو اپنا خوف، اپنی محبت اور اپنی رضا نصیب فرمادیتے ہیں ان کو دنیا کی محبت سے پاک فرمادیتے ہیں۔ ایک برتن میں دو چیزیں نہیں ڈالی جاسکتیں، پاک اور ناپاک، اور ایک ہی دسترخوان پر دونوں چیزوں کو یعنی گندگی کو اور پاک چیز کو جمع نہیں کیا جاسکتا، جن لوگوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ اپنی محبت کے لئے چن لیتے ہیں، ان کے دلوں کو دنیا کی محبت سے پاک کردیتے ہیں، اور جس شخص کے دل میں یہ محبت موجود ہے وہ سمجھے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہے، اور اگر اس کا نفس اس کو دھوکا دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے، اس دل کے اندر اگر اللہ تعالیٰ کی محبت ہے تو ناپاک کی محبت نہیں ہوسکتی، اور ناپاک کی محبت جب تک ہے اور اس سے اس کا دل پاک نہیں ہوا اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہے، ایسے لوگ بہت کم ہیں، بہت ہی کم ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ دنیا کی محبت سے پاک فرمادیتے ہیں، ان کے لئے آنا جانا برابر ہوتا ہے، دنیا آئے تو خوشی نہیں، جائے تو غم نہیں، ان کا ہارٹ فیل نہیں ہوتا، بہت سارے لوگوں کو اگر نقصان کی اطلاع مل جائے کہ مال کا نقصان ہوگیا ہے تو اسی وقت ان کو دل کا دورہ پڑجاتا ہے، معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت دل کے اندر رچی بسی تھی۔

اللہ تعالیٰ اور دنیا کی محبت کے ثمرات واثرات:

دنیا کی محبت دل کو کمزور کرتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل کو قوی کرتی ہے، دنیا کی محبت تشویش لاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل کو سکون اور اطمینان کی دولت مہیا کرتی ہے، دنیا کی محبت کی مثال ایک خارش کی سی ہے، جیسے انسان کو کھجلی ہوتی

ہے، جتنی خارش کرتا رہے اتنا مزہ آتا رہتا ہے، اور جب خارش بند کردی تو جلن شروع ہوگئی، ہم لوگ بے حس ہوگئے ہیں، ہمارے دلوں میں احساس نہیں رہا، ورنہ ہمیں معلوم ہوتا کہ دنیا کی محبت سے دلوں پر کیا گزرتی ہے؟ قرآن کریم میں ہے:

"اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ." (الرعد:۲۸)

ترجمہ:......"سنو! اللہ تعالیٰ ہی کے ذکر سے اور اللہ تعالیٰ ہی کی یاد سے چین پڑتا ہے دلوں کو۔"

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر اطمینان ہے وہ بیچارے دھوکے میں ہیں، غرضیکہ یہ چیز لائق علاج ہے، قابل علاج ہے، جوانی آئی دنیا کی محبت بڑھتی گئی، ہم بھی بڑھ رہے تھے، یہ محبت بھی بڑھ رہی تھی، جوانی سے بڑھاپے میں قدم رکھا، ہم تو بوڑھے ہونا شروع ہوگئے مگر دنیا کی محبت ابھی تک جوان ہے، اور بڑھاپے سے قبروں تک قدم رکھا، لیکن اس کی جوانی ختم نہیں ہوئی، ہمارے تمام قویٰ جواب دے گئے، لیکن یہ جو دنیا کی محبت کی بلا ہمارے ساتھ لگی تھی یہ بوڑھی نہیں ہوئی، بلکہ جوان تر ہوتی گئی۔

دنیا کے لئے محنت کرنے والے کا انجام:

رضائے الٰہی کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے تو کوئی محنت نہیں کی تھی، محنت کی تھی صرف ان چیزوں کے لئے، تو جب مرگیا تو ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر حسرت کرے گا کہ ہائے کس چیز کو چھوڑ کر جارہا ہوں، بڑے شوق سے مکان بنایا تھا، بڑے شوق سے یہ کیا تھا، بڑے شوق سے وہ کیا تھا، یہ سب شوق دھرے کے دھرے رہ گئے تھے، اور جہاں جانا تھا یعنی قبر، اس کے لئے کوئی سامان ہی نہیں کیا، نہ کبھی وہاں کے لئے بجلی کی فٹنگ کی، نہ کبھی کوئی ٹارچ لے کر گئے، نہ کوئی وہاں بستر کا سامان کیا، نہ کوئی وہاں کی وحشت وتنہائی کے بارے میں سوچا، جیسے دنیا میں خالی ہاتھ

گئے تھے، یہاں سب کچھ کما کر یہیں چھوڑ کر چلے گئے۔

صرف دنیا کمانے والوں کی مثال:

کوئی غیر ملک کمانے کے لئے گیا ہوا ہو، اگر تو اس کو زرمبادلہ لانے کی اجازت مل جائے تو ٹھیک ہے، اور اگر سب کچھ وہیں کوئی چھین لیں تو اس نے دس بیس سال ضائع بھی کئے اور خالی ہاتھ آیا، اس کے دوست احباب، بیوی بچے پوچھیں گے کہ کیا لائے ہو؟ وہ کہے گا کہ: کچھ بھی نہیں لایا، سب کچھ چھین لیا گیا! اسی طرح ہم لوگ بھی یہاں محنتیں کر رہے ہیں، اور جب جائیں گے تو سب کچھ دنیا والے چھین لیں گے، جو اپنے اندر بھرلیا وہ تو ساتھ جائے گا، باہر کی تو سب چیزیں ہم سے چھین لی جائیں گی، کپڑے تک چھین لیتے ہیں اللہ کے بندے، یہ بھی نہیں کہتے کہ مولوی صاحب کے کپڑے ہی رہنے دو یار! ہم ان کو بہت اچھے اچھے کپڑے بنا کے دیا کرتے تھے، رہنے دو، لے کر جانے دو، کہنے لگے: نہیں صاحب! سلے ہوئے کپڑے بھی پہننے کا حکم نہیں ہے، چادر لپیٹ دیں گے، یعنی دو چادریں پہنا دیں گے، بس! نہ عمامہ ہے، نہ کھسا ہے، دیکھتے ہو کس طرح چھینتے ہیں؟ تم خود ہی چھینتے ہو، اس غریب کو لحد میں دھکیل کر آجاتے ہو، کون سی چیز رہنے دی اس کے پاس؟ اے کاش! کہ مرنے سے پہلے ہمیں اس کی عقل آجاتی۔

دنیا کی محبت کا علاج چاہئے:

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ یہ چیزیں قابل علاج ہیں، اللہ والوں سے اس چیز کا علاج کروایا جاتا ہے، میرے دل کے اندر دنیا کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، یہ چیز قابل علاج ہے کہ دنیا کی محبت کس طرح نکل جائے؟ مال کی محبت کس طرح نکل جائے؟ مال کی محبت ہونے کا معیار کیا ہے؟ یہ چیزیں بزرگوں کے سامنے ذکر کرنے کی ہوتی ہیں، شیخ سے اصلاحی تعلق کا یہی مطلب ہوتا ہے۔

ابن آدم کے معاملات کا مدار؟

دوسرا ارشاد حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ کا نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ابن آدم کے تمام معاملے کا مدار تین چیزیں ہیں، جس کو تین چیزیں حاصل ہوگئیں سمجھو کہ اس کا بیڑا پار ہوگیا۔

۱:......ایک یہ کہ اپنی مصیبت کی کسی سے شکایت نہ کرو۔

۲:......دوسرا یہ کہ اپنے مرض کا اظہار کسی کے سامنے نہ کرو۔

۳:......اور تیسری یہ کہ اپنی زبان سے اپنی صفائی اور پاکیزگی بیان نہ کرو، جی میں تو بے گناہ ہوں! اپنی بے گناہی کو تو زرداری اور بےنظیر بھی زبان سے بیان کریں گے:

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ! ذرا بندِ قبا دیکھ!

اپنی مصیبت کی شکایت مخلوق کے بجائے خالق سے کرو:

اپنی مصیبت کی شکایت اللہ تعالیٰ کے سامنے کرو، مخلوق کے سامنے نہ کرو، جب حضرت بنیامین کو حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں روک لیا اور بھائی خالی ہاتھ گئے، انہوں نے جاکر اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا تھا: "اِنَّ ابْنَکَ سَرَقَ" (تیرے بیٹے نے چوری کی ہے!)، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ: "بَلْ سَوَّلَتْ لَکُمْ اَنْفُسُکُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ" (نہیں! میرے بیٹے نے چوری نہیں کی ہے! بلکہ تمہارے نفسوں نے کچھ تدبیر بنائی ہے، پس صبر جمیل اختیار کرو)۔ حضرت یوسف علیہ السلام تو پہلے ہی سے گم تھے، ان کا بھائی بھی ہاتھ سے گیا، بے اختیار حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل سے آہ نکلی: "یٰٓاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ وَابْیَضَّتْ عَیْنَاہُ مِنَ الْحُزْنِ فَھُوَ کَظِیْمٌ۔" ہائے میری حسرت یوسف پر! (اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں) غم کی وجہ سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں، آنکھوں کا نور جاتا رہا، آنکھوں کی چمک ختم ہوگئی، اور اتنی شدت کا غم تھا گویا گلا گھٹا جاتا ہے۔ "قَالَ اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْ اِلَى اللهِ" (میں اپنی پریشانی اور غم کا اظہار صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے کرتا ہوں)۔ کبھی کسی کے سامنے شکایت کی ہے میں نے؟ کبھی کسی بندے سے بھی تذکرہ کیا ہے اس کا؟ صرف ایک مالک سے شکایت کرتا ہوں اپنی پریشان کی بھی، اپنے غم کی بھی، اگر اس کے پاس بھی نہ کروں تو پھر کس کے پاس کروں؟

آفت و مصیبت کی شکایت عبدیت کے اظہار کے انداز میں کرو:

کوئی آفت، کوئی مصیبت آن پڑی، شکایت کرو، لیکن مولا کے سامنے کرو، شکایت بھی شکایت کے انداز میں نہیں، بلکہ اپنی حالتِ زار کو اس کے سامنے رکھو، اپنی عبدیت کا اظہار کرنے کے لئے، مخلوق کے سامنے اپنی شکایت نہ کرو، اس لئے کہ مخلوق خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، آسمان والی ہو یا زمین والی، تمہاری شکایت رفع نہیں کرسکتی، ایک ہی ہے جو شکایتوں کو رفع کرسکتا ہے، اس لئے فرماتے ہیں: "لَا تَشْكُ مُصِيْبَتَكَ" اپنی مصیبت کی کسی کے سامنے شکایت نہ کرو سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور اپنے درد کا اظہار کسی کے سامنے نہ کرو، صرف اس کے سامنے کرو۔

حضرت ایوبؑ کا اظہارِ عجز:

حضرت ایوب صابر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سامنے کہہ رہے ہیں: "اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ" پروردگار! مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے، آپ ہٹا سکتے ہیں، لگانے والے بھی آپ ہیں، ہٹانے والے بھی آپ ہیں، وہاں کوئی دوا دارو کرنے کی ضرورت تھی، حکم دیا: "اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ" اپنی ایڑی مارو زمین پر! ایڑی ماری چشمہ پھوٹ پڑا، "هٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ" ٹھنڈا پانی پیو بھی اور نہاؤ بھی، حضرت ایوب علیہ السلام اس چشمہ میں غسل کرکے چودہویں رات کے چاند کی

طرح نکل آئے، تمام تکلیف دور ہوگئی، بتانا چاہتے تھے کہ اللہ پاک اگر بیماری لگانا چاہیں تو کوئی ہٹا نہیں سکتا، اور جب ہٹانا چاہیں تو اس کے لئے لمبی چوڑی تدبیروں کی ضرورت نہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے چشمے کے پانی سے غسل کیا، سب کچھ دور ہوگیا، تمام بیماریاں دور ہوگئیں۔

تکلیف دور کرنے کی دعا اور انداز:

اپنی تکلیف کا اظہار اللہ تعالیٰ کے سامنے کرو، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے سامنے سجدے میں گر جاؤ اور یہی حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا پڑھو:

"اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ!"

ہمارے مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی رحمہ اللہ بیمار ہوگئے تھے، فرمانے لگے کہ: اب مجھے شفا ہوجائے گی! عرض کیا گیا: کس طرح شفا ہوجائے گی؟ فرمایا: میں نے سجدے میں یہ دعا کی: "اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ!" اور واقعی شفا ہوگئی۔

توفیق دعا قبولیت کی علامت:

اللہ پاک تم سے دعا منگواتے ہی اس لئے ہیں کہ ان کو منظور کرنا ہوتی ہے، اگر منظوری نہ دیں، تو تم سے دعا نہ کروائیں، تمہیں دعا کرنے کی توفیق نہ دیں، لیکن جیسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرتے ہو ویسے اس کی رضا پر راضی رہو، دل میں تنگی کا مضمون نہیں آنا چاہئے:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی رضائے تو
دل شدہ مبتلائے تو

زندہ کریں، آپ کی عطا ہے، مار ڈالیں آپ کی رضا ہے، آپ جو کچھ بھی کریں، جو بھی آپ کی رضا ہو، اس پر راضی ہوں۔

علاج مقصود ہے، شفا مقصود نہیں:

ہمارے حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے تھے: ''علاج مقصود ہے، شفا مقصود نہیں!'' تمہارا کام ہے، تمہیں علاج بتایا ہے، کرتے رہو!

چنانچہ ہمارے ڈاکٹر عبدالحی عارفی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ: آخری دنوں میں مجھ سے حضرت حکیم الامتؒ نے اپنی بیماری کا تذکرہ کیا اور فرمایا: ''میاں! تمہارے ہاں اس کا علاج نہیں ہوتا؟'' میں نے کہا: حضرت ہوتا ہے! فرمایا کہ: ''پھر تم علاج کرو!'' عرض کیا: بہت اچھا! ساتھ ہی فرمایا: ''نتیجہ معلوم ہے!'' حضرت فرماتے ہیں: میں نے علاج شروع کیا (تو ذرا ہومیو پیتھک علاج نازک ہے، پرہیز بہت ہوتا ہے)، تو میں نے عرض کیا کہ: حضرت! اس میں تھوڑے پرہیز کی ضرورت ہوگی۔ ارشاد فرمایا: ''ہم نے تو کوئی پرہیز نہیں کروایا تھا! معمولی نوک پلک درست کرکے چلتا کردیا، یہ سارے دنیا بھر کے پرہیز ہمارے لئے رکھے تھے؟'' حضرتؒ فرماتے تھے کہ: یہ ارشاد سن کر مجھے سر سے پاؤں تک پسینہ آگیا۔ بھائی! بیماری کا آخری انجام کیا ہے؟ موت ہی ہے ناں! آخر مرنا نہیں ہے کیا؟ اس سے کیوں گھبرانا ہے؟ ہاں! علاج کرانا سنت ہے، علاج کراؤ! علاج اور تدبیر کرکے نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو، چاہیں گے تو شفا دے دیں گے، نہیں چاہیں گے تو ان کی رضا! ہمیں اپنے پاس لے جانا چاہیں گے بصد خوشی حاضر ہیں!

اپنی پاکیزگی بیان نہ کیا کرو:

اور تیسرا فقرہ یہ کہ اپنے نفس کا تزکیہ نہ کرو، قرآن کریم میں آتا ہے:

''فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى.''

(النجم:۳۲)

اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کیا کرو کہ ہم بہت اچھے ہیں، یہ ہیں، وہ ہیں! اپنی صفائی دینے کی کوشش نہ کرو، اللہ تعالیٰ بہت بہتر جانتا ہے، تم میں سے جو بچنے والا ہے وہ متقی ہے، ارے مخلوق کے سامنے تو صفائی پیش کرتے ہو، کیا اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی صفائی پیش کرتے ہو؟ مخلوق کو تو تم کہہ سکتے ہو کہ تمہیں میرے بارہ میں بدگمانی ہوئی ہے، میں ایسا نہیں تھا، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، کیا اللہ تعالیٰ کو بھی کہو گے کہ تمہیں بدگمانی ہوئی ہے؟ نعوذ باللہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی پاکیزگی کا تصور کرتے ہو، اللہ پاک کے سامنے اپنی سراپا گندگی کا تصور کرو، اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ ہمیں چلتا پھرتا چھوڑ دیا، ورنہ یہ نجاست تو دفن کے لائق تھی، جس شخص کی نظر اس پر ہو وہ اپنے منہ سے تعریف نہیں کرے گا، اپنی صفائی پیش نہیں کرے گا، اور اگر کوئی کرتا ہے تو جھوٹا ہے!

مظلوم اور یتیم کی بددعا سے بچو!

تیسرے ارشاد میں فرمایا کہ: دو بددعاؤں سے بچو! ایک مظلوم کی بددعا سے اور ایک یتیم کی بددعا سے، یہ اس وقت آکر سر اٹھاتی ہیں جب لوگ سو رہے ہوتے ہیں، مظلوموں کی بددعا سے بچو اور یتیموں کی آہ سے بچو!

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یمن تشریف لے جارہے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

”..... اِتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ!“ (مشکوٰۃ ص:۱۵۵)

ترجمہ:..... ”مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا، کیونکہ اس کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے (سیدھی عرش پر پہنچتی ہے)۔“

اسی کو فارسی شاعر کہتا ہے:

بترس از ہائے مظلوماں کہ ہنگامے دعا کردند

اجابت از درے حق بہرے استقبال می آیند!

مظلوم کی بددعا سے بچو! اس لئے کہ جب وہ دعا کرتے ہیں تو قبولیت کے استقبال کے لئے عرشِ الٰہی سے آتے ہیں، اور اسی طرح یتیم کی بددعا سے بچو، یتیم کا مال نہ کھاؤ، خواہ تیجہ، دسواں اور چالیسویں کے عنوان سے ہو، یتیم پر ظلم نہ کرو، اور یتیم کا مال نہ ہتھیاؤ، اس لئے کہ ان کی آہ لگتی ہے تو بیڑا غرق کر دیتی ہے۔

مظلوم چاہے کافر بھی کیوں نہ ہو:

کراچی مین کتنے بچے یتیم کئے گئے؟ ان کی آہیں نہیں لگیں گی؟ کتنے بے گناہوں کو تختۂ ستم بنایا گیا، کیا ان کی آہیں رائیگاں جائیں گی؟ ایک نکتہ یاد رکھو! مظلوم کا ولی اللہ ہونا شرط نہیں ہے کہ مظلوم اگر ولی اللہ ہو تو اس کی بددعا قبول ہوتی ہے، مظلوم کوئی بھی ہو اس کی بددعا لگتی ہے، حتیٰ کہ فاجر و فاسق بلکہ کافر ہو تو اس کی بھی بددعا آدمی کو مار دیتی ہے، اس لئے کسی شخص پر ظلم و ستم کرنا، کسی کے ساتھ زیادتی کرنا، کسی کا حق اپنے ذمے لینا اس سے ڈرو! اور یہ قیامت تک ساتھ نہیں چھوڑتی، چاہے جتنی معافیاں اللہ تعالیٰ سے مانگو، پھر معافی بھی نہیں ملتی جب تک صاحبِ حق خود معاف نہ کردے۔

بے کس پر ظلم بدترین ظلم ہے:

اور ایک ارشاد میں فرمایا کہ: میرے نزدیک سب سے بری صورت حال یہ ہے کہ میں ایسے آدمی پر ظلم کروں جو میرے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے مدد نہیں لے سکتا۔ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا کوئی نہیں ہے، کوئی تھانے کچہری والا اس کا واقف نہیں، کوئی بڑا آدمی اس کی سفارش کرنے والا نہیں، اور کوئی اس کے ساتھ جتھا

نہیں جو پیروی کرسکے، اس کی کوئی حیثیت نہیں، کچل دو! مار دو! لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ سب سے بڑا اس کے ساتھ ہے!

ضعفاً کے ساتھ ربُّ الضعفاً ہے:

حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے: "یا رب الضعفاء!" (اے کمزوروں کے رب!) مجھے یہ دعا بہت پیاری لگتی ہے، مجھے یہ لفظ بہت مزہ دیتا ہے۔

"یا رب الضعفاء!" اے کمزوروں کے رب! جن کا دنیا میں شنواں کوئی نہیں، جن کو سننے والا کوئی نہیں، تو ان کا بھی رب، اور تو ان کا بھی انتقام لیتا ہے، تو ان کی بھی فریاد رسی کرتا ہے، اور مدد کرتا ہے، تم یہ دیکھتے ہو کہ اس کا کوئی نہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ سب سے بڑا اس کے ساتھ ہے! اور جس کا کوئی نہیں ہوتا، اس کا خدا ساتھ ہوتا ہے، اور اللہ نہ کرے، اللہ نہ کرے اگر اللہ تعالیٰ کسی سے انتقام لیں تو پھر اس کا جو حشر ہونا چاہئے وہ ہوتا ہے!

ایک بزرگ کی توہین کا بدلہ:

میں نے آپ کو یہ قصہ سنایا تھا کہ ایک بزرگ تھے، ان کو کسی نے برا بھلا کہہ دیا، اب وہ بزرگ اپنے ساتھی سے کہنے لگے کہ: فوراً اس کے ایک تھپڑ لگادو! اس نے ذرا تھوڑی دیر اور تاخیر کردی اور وہ آدمی وہیں پھسلا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی، یہ بزرگ اپنے ساتھی سے کہنے لگے کہ: تو نے اس کی ٹانگ توڑ دی! اگر تو اس کے تھپڑ لگادیتا تو اس کی ٹانگ نہ ٹوٹتی! میں نے اس لئے کہا تھا کہ میرا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ ہے کہ اگر میں کسی کی زیادتی کا بدلہ خود لے لوں تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ: ٹھیک کردیا، مسئلہ حل ہوگیا! اور اگر میں انتقام نہ لوں تو وہ خود آکر انتقام لیتے ہیں۔

جو انتقام نہیں لیتا اس کا انتقام اللہ لیتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ اسی بزرگ پر منحصر نہیں، اس معاملے میں تم سارے ہی بزرگ ہو، جو شخص انتقام نہیں لے سکتا، اللہ تعالیٰ اس کا انتقام خود لیتے ہیں، اِلّا یہ کہ تم معاف کردو، اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ ہماری صلح ہوگئی ہے، مقدمہ داخل دفتر کردو تو دوسری بات ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ انتقام لیتے ہیں۔ تاہم جلدبازی نہیں کرتے، بندوں کو مہلت دیتے ہیں کہ یہ نادان ہیں، آپس میں معاملہ درست کرلیں، غرضیکہ ایسا کوئی شخص جس کا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی انتقام لینے والا نہ ہو، اس پر ظلم کرتے ہوئے زیادہ ڈرو! مخلوق کے انتقام کی تو تم تاب لاسکتے ہو، اللہ تعالیٰ کے انتقام کی تم تاب نہیں لاسکتے!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

مخلوق کے ساتھ حسن سلوک

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

حدیث شریف میں ہے:

''اَلْـخَـلْـقُ عِيَـالُ اللهِ! فَـاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلىٰ عِيَالِهٖ.'' (مشکوٰۃ ص:۴۲۵)

ترجمہ:...... ''مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، (جیسے کوئی گھر کا بڑا ہوتا ہے، گھر کے تمام افراد اس کا کنبہ ہوتے ہیں) اللہ کے بندوں میں اللہ کو سب سے زیادہ وہ شخص محبوب ہے جو اس کے کنبہ میں سب سے زیادہ احسان کرنے والا ہو (ظلم و زیادتی کرنے والا نہ ہو، بلکہ احسان کرنے والا ہو، حسن سلوک کرنے والا ہو)۔''

کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا یہ بھی رحمت کا شعبہ ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''مَنْ لَّا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ، مَنْ لَّا يَغْفِرُ لَا يُغْفَرُ.''

(کنز العمال ج:۳ حدیث:۵۹۶۶)

ترجمہ:......''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا، اور جو بخشتا نہیں وہ بخشا نہیں جاتا۔''

بخشنے کا مطلب؟

بخشنے کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی نے کسی کا قصور کیا ہو اور وہ اس کو معاف کردے اور انتقام نہ لے، اس کو بخشنا کہتے ہیں، جو صاحبِ معاملات ہیں، جن کے ساتھ میل ملاپ، برتاؤ رہتا ہے، تعلقات رہتے ہیں، کوئی نہ کوئی ناگواری پیش آہی جاتی ہے، کل یہاں کچھ مولویوں کی جماعت آئی ہوئی تھی، کوئی گفتگو تھی، مولوی بھی کبھی کبھی لڑ پڑتے ہیں، بلکہ مولوی زیادہ لڑتے ہیں، عوام کی لڑائی کم ہوتی ہے، مولویوں کی لڑائی زیادہ ہوتی ہے۔

کوئی اپنے کو قصوروار نہیں جانتا:

میں نے ان دوستوں سے کہا کہ انسان کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ جب اس کا معاملہ دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے، تو اپنے تصور میں وہ اپنے آپ کو فرشتہ سے زیادہ معصوم سمجھتا ہے اور اپنے بارہ میں یہ تصور کرتا ہے کہ مجھ سے تو غلطی ہو ہی نہیں سکتی، خدانخواستہ اگر کوئی کسی غلطی کو ان مولانا کی طرف منسوب کردے تو پھر وہ بیچارہ مارا گیا، اس کی دنیا بھی تباہ، آخرت بھی تباہ، اس کے معتقد کہتے ہیں کہ یہ بیوقوف ہمارے حضرت کی طرف غلطی منسوب کرتا ہے، توبہ کرو، کیا کسی فرشتہ سے بھی غلطی ہوسکتی ہے؟ گویا اپنے آپ کو آدمی فرشتہ سے زیادہ معصوم سمجھتا ہے، اس لئے کسی قیمت پر بھی اپنی طرف غلطی کا منسوب کیا جانا برداشت نہیں کرتا، اور اگر کوئی ہماری طرف کسی غلطی و زیادتی کو منسوب کرتا ہے کہ تم سے یہ زیادتی کوتاہی ہوئی ہے، تو ہمارا ضمیر بلکہ ضمیر میں چھپا ہوا چور اس کا فوراً انکار کرتا ہے اور پُرزور تردید کرتا ہے، اور اپنے مدمقابل کو شیطان سے بھی زیادہ پُرعیب سمجھتا ہے، کوئی ذرا سی معمولی بات اس کے بارے میں

کہہ دے تو کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کہتا ہے یہ ہے ہی شیطان، شیطان کی طرف جو برائی بھی منسوب کی جائے بجا ہے، یہ انسانی کمزوری ہے۔

مخلوق کے ساتھ عدل کا معاملہ کریں تو...

واقعہ یہ ہے کہ اگر ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھتے ہوئے (جس کو عدل کہتے ہیں) ہم اللہ کی مخلوق کے ساتھ معاملہ کریں تو ہماری یہ کیفیت نہ ہو، بلکہ اس کے برعکس کیفیت یہ ہوگی کہ اپنے کو غلطی پر سمجھیں، اور دوسرے کو بری سمجھیں گے، بلکہ اس کو غلط فہمی میں مبتلا سمجھیں گے، جس سے جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔

جھکتا تولیں تو ہم ہی مجرم ہیں:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بازار میں تشریف لے جاتے تھے، تو دکانداروں سے فرماتے تھے کہ: "زِنْ وَارْجِحْ" (مشکوٰۃ ص:۲۵۳) تول کر دو اور جھکتا ہوا دو، تم لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے جھکتا ہوا کیوں نہیں دیتے کہ اپنے کو بہ نسبت دوسروں کے زیادہ خطاوار سمجھو، پھر جھگڑا کیا ہوگا؟

دوسرا خطاکار ہے تو فرشتہ آپ بھی نہیں:

یہ جو میں نے کہا کہ عدل یہ ہے کہ ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھو، دوسرا بھی بیچارا خطاکار انسان ہے، اس سے بھی غلطی ہوسکتی ہے، اس سے تمہاری شان میں بھی کوئی بے ادبی ہوگئی ہوگی، اور تم بھی بہرحال بشر ہی ہو، معصوم فرشتہ نہیں ہو، آخر کوئی نہ کوئی کوتاہی و بے رغبتی تمہاری جانب سے بھی ہوجاتی ہوگی اور ہوگئی ہوگی، دونوں کو برابر رکھ کر ہم معاملہ کریں اور اپنے بارے میں فیصلہ کرنے بیٹھیں، تو پھر ہمیں نظر آئے گا کہ ہمارا قصور زیادہ ہے، لوگوں کا کم ہے، اگر انصاف کیا جائے تب تو یہ ہے کہ ہم برابر ہیں، لیکن اگر جھکتا ہوا دو، تو ہمارا پلڑا بھاری ہے، یعنی ہماری غلطیاں اور ہماری بشریت بھاری ہے، کیونکہ ہم بات کہتے ہیں اور بھول جاتے ہیں، بات کہتے

ہوئے ہماری زبان محتاط نہیں رہتی، کبھی کسی سیاق وسباق میں، کبھی کسی پہلو سے، کبھی کسی انداز میں ہم دوسروں کے بارے میں بات کرلیتے ہیں اور پھر ہم اپنے آپ کو پاک صاف بھی سمجھ لیتے ہیں، تو میرے بھائی! سارا فساد ہمارے اس نفس سے پیدا ہوا، اگر سارے کے سارے لوگ اپنے بھائیوں کے ساتھ وہ معاملہ کرتے جو اپنے ساتھ کیا جانا چاہئے، یا اپنے آپ کو اس سطح کی مخلوق سمجھتے جس سطح کی مخلوق دوسروں کو سمجھتے ہیں، تو تھوڑا سا جھکاؤ ہم میں بھی پیدا ہوجاتا۔

اپنی کوتاہیوں کے بارہ میں جو چاہت ہے وہی دوسروں کے لئے بھی ہو:

جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے قصوروں کو، ہماری غلطیوں کو، ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز کردیا جائے، اس کا تذکرہ نہ کیا جائے، میں بھی یہی چاہتا ہوں، آپ بھی شاید یہی چاہتے ہوں گے، ہیں تو ہم سب قصوروار لیکن یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوگ میری غلطیوں کا تذکرہ کریں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری کوتاہیوں کا، ہماری غلطیوں کا، ہمارے قصوروں کا، ہمارے گناہوں کا لوگ چرچا نہ کریں، اس معاملہ میں اپنی زبان بند رکھیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم خود لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے؟ دوسرے بھی آخر انسان ہیں، ان سے بھی غلطی ہوسکتی ہے۔

غیر کی آنکھ کا تنکا:

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول نقل کیا گیا ہے کہ: اے شخص! تجھے دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔'' دوسروں کے قصور کو ہم خوردبین لگا کر دیکھتے ہیں، اور لاؤڈ اسپیکر کی طاقت کے ساتھ اس کا بیان و چرچا کرتے ہیں، دوسروں کی نظر آنے والی برائیوں کو ہم دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، ہماری عقابی نظریں وہاں تک پہنچ جاتی ہیں، اور ہماری پروپیگنڈہ مشینری دوسروں کے عیوب

کو بیان کرنے کے لئے پوری قوت کے ساتھ حرکت میں آتی ہے، جب تک ہم اس کا چرچا نہ کرلیں، پیٹ میں نفخ ہوجاتا ہے۔

کیا لوگ ہمارے عیوب کو اچھالیں؟

کیا تم بھی اپنے ساتھ یہی چاہتے ہو کہ لوگ خوردبین لگا لگا کر تمہارے اندر کے چھپے ہوئے جراثیم دیکھا کریں؟ اور تم چاہتے ہو کہ لوگوں کی زبانیں قینچیوں کی طرح تمہاری عزت کو تار تار کردیں؟ کاٹیں؟ اگر نہیں چاہتے ہو تو پھر لوگوں کو معاف کردو، اگر کسی کی کوتاہی تمہاری نظر میں آئی اس پر پردہ ڈال دو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"مَنْ سَتَرَ عَوْرَةَ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ سَتَرَ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ." (کنز العمال ج:۳ حدیث:۶۳۸۱)

ترجمہ:......"جو اپنے مسلمان بھائی کے عیب پر پردہ ڈالے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیوب پر پردہ ڈالیں گے۔"

جو دوسروں کو نہ بخشے، اسے نہیں بخشا جائے گا:

اور خوب یاد رکھو: "مَنْ لَّا يَغْفِرُ لَا يُغْفَرُ!" اگر تم لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرو گے تو پھر یہ توقع مت رکھو کہ اللہ پاک تمہارے قصوروں کو بھی معاف کردیں، یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے۔

اپنی ذات پر تنقیدی نگاہ ڈالو:

تمہیں لوگوں کے چھاج کے سوراخ نظر آتے ہیں، کبھی اپنی چھلنی کو بھی دیکھ لیا کرو، جس میں بہتّر چھید ہیں، ہماری کون سی کل سیدھی ہے؟ ہمارا کون سا معاملہ درست ہے؟ کبھی یہی تنقیدی نظر جو لوگوں پر ڈالتے ہو، اپنے اوپر بھی ڈال دیا کرو، ہم

اس کے تو روادار نہیں مگر بایں ہمہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اللہ پاک ہمارے عیوب پر پردہ ڈالے رکھے، حدیث شریف میں بھی ہمیں یہی دعائیں سکھلائی گئی ہیں، چنانچہ حدیث کی ایک دعا ہے:

"اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَاٰمِنْ رَّوْعَاتِنَا"

ترجمہ:......"یا اللہ! ہمارے عیوب پر پردہ ڈال دے اور جتنی خوف کی چیزیں ہماری ہیں، ان کو امن سے بدل دے۔"

ہر آدمی یہ چاہتا ہے، ہر آدمی کو یہ دعا کرنی چاہئے:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِی الدِّیْنِ وَالدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ."

ترجمہ:......"یا اللہ! میں آپ سے عفو و عافیت کی درخواست کرتا ہوں، دین میں بھی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔"

اور دوسری حدیث میں ہے:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَاَهْلِیْ وَمَالِیْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَاٰمِنْ رَّوْعَاتِیْ." (ابوداؤد ج:۲ ص:۳۳۶)

ترجمہ:......"یا اللہ! میں آپ سے عفو و عافیت چاہتا ہوں (عفو کا معنی ہے معافی) اپنے دین کے معاملہ میں، اپنی دنیا کے معاملہ میں، اپنے اہل کے معاملہ میں، اپنے مال کے معاملہ میں۔ یا اللہ! ڈھانپ دے میرے عیوب کو اور امن عطا فرما مجھے خوف کی چیزوں سے۔"

اور ایک دعا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمائی:

"اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِیْ مِنْ بَيْنِ يَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ يَّمِيْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ وَمِنْ فَوْقِیْ وَاَعُوْذُ بِعَظْمَتِکَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ." (ابوداؤد ج:۲ ص:۳۳۶)

ترجمہ:...... "یا اللہ! میری حفاظت فرما آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے، اوپر سے اور میں آپ کی پناہ میں آتا ہوں آپ کی عظمت کے سبب اس بات سے کہ ہلاک کیا جاؤں پاؤں کے نیچے سے۔"

ستاری کا مطلب؟

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھلائی ہوئی دعائیں ہیں، یہاں پر میرا مقصد اتنا ہی بیان کرنا ہے کہ یہ جو ہم دعا کرتے ہیں: "اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَاٰمِنْ رَّوْعَاتِیْ" یا اللہ! میرے عیوب کو ڈھانپ دے، جب تم اللہ سے درخواست کرتے ہو اور اس کے کرم کی توقع بھی رکھتے ہو کہ اللہ پاک تمہارے عیوب کو ڈھانپ دے اور ڈھانپنے کا پتہ ہے کیا مطلب ہوتا ہے؟ ڈھانپنے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ڈھکی ہوئی چیز نظر نہیں آتی، یعنی کسی چیز کو کپڑا ڈال کر ڈھانک دیا یا کوئی اور چیز اس پر دے دی، اور وہ نظر نہیں آتی، اسی طرح میرے ان عیوب کو ڈھانک دے، یا اللہ! میرے عیوب تو ایسے ہیں کہ ہر ایک کو نظر آئیں گے، آپ ان کو اپنے ستر جمیل کے ساتھ ایسے ڈھانک دیں کہ کسی کو نظر نہ آئیں۔ پھر ایک تو عیوب ہوتے ہیں اور ایک ان عیوب کی بدبو ہوتی ہے، جیسے کسی کے بدن پر پھوڑا نکلا ہوا ہے۔ وہ ڈھانک دیا، کپڑا اوپر رکھ دیا تو وہ ڈھک گیا، کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ کپڑے کے نیچے کیا ہے؟ لیکن تھوڑی سی بدبو بھی آتی ہے، پیپ وغیرہ نکلتی ہے، تو اس کا ڈھانکنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس کی بدبو سے بھی محفوظ رکھے، اور سچی بات یہ ہے کہ ہمارے اندر کے جو عیوب ہیں اگر اللہ تعالیٰ

ستاری کا معاملہ نہ فرمائیں اور اپنی خاص عنایت اور اپنے لطف و کرم سے ان کو ڈھانک نہ دیں تو انسان کا ہمارے پاس بیٹھنا بھی مشکل ہوتا۔

گناہوں کی بدبو ہوتی تو...

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ: اگر گناہوں کی بدبو ہوتی تو کوئی آدمی میرے پاس بیٹھ نہ سکتا! اور بالکل صحیح فرماتے ہیں، میرا بھی ذوق یہی ہے، اگر اندر کے اخلاقِ رذیلہ جو ہمارے دل میں ہیں، چھپے ہوئے ہیں اور جن سے ہم واقف ہیں یا ہمارا اللہ واقف ہے، اگر ان کی بدبو ہوتی تو بیوی بچے ہمیں گھر میں نہ رہنے دیتے، باہر نکال دیتے، تمہارا مالک تو تمہارے ساتھ یہ ستاری کر رہا ہے، تمہارے عیوب کو ڈھانک رہا ہے، کسی کو پتہ نہیں چلنے دیتا، تمہارا ظاہر بھی حسین بنا دیا، ظاہر میں تم پر خوشبو لگا دی کہ لوگ تم سے لپٹیں، اور اندر کی بدبو تمہاری ڈھک دی ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے، تمہارے عیوب پر پردہ ڈال دیا۔

کیا تمہیں معاف نہ کیا جائے؟

مگر افسوس کہ اللہ کی ستاری سے مغرور ہو کر اب تم چاہتے ہو کہ جس نے ہم پر ظلم کیا ہے، ہم اس کو معاف نہ کریں گے، یہ تمہارا بہت اچھا دعویٰ ہے، معاف نہ کرو، ہرگز معاف نہ کرو، لیکن یہ بات سمجھ رکھو کہ جیسے تم کسی کو معاف کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو، اللہ بھی تمہارے قصور کو معاف نہیں کرے گا، بتاؤ اس بات پر راضی ہو؟ سودا کرنا چاہتے ہو؟ ابھی آپ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک سنا کہ: جو معاف نہیں کرتا اس کو معاف نہیں کیا جاتا، جو آدمی لوگوں کے عیوب نہیں ڈھانکتا اس کو ڈرنا چاہئے کہ اللہ پاک کہیں میرے عیب سے بھی پردہ نہ اٹھادے، وہ کبیر ہے، وہ حلیم ہے، اپنے حلم کے ساتھ اس نے ہم پر پردہ ڈالا ہوا ہے، ایسا نہ ہو کہ اللہ کے بندوں کے درپے آزار ہونے کی وجہ سے کبھی تھوڑا سا پردہ تمہارے عیوب سے بھی ہٹا کر

لوگوں کو دکھلادے، اور یہی رسوائی ہے، میں نے آپ کو حدیث شریف کی ایک دعا سنائی تھی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بڑے اہتمام سے یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

"اَللّٰھُمَّ لَا تُخْزِنِیْ فَاِنَّکَ بِیْ عَالِمٌ وَلَا تُعَذِّبْنِیْ فَاِنَّکَ عَلَیَّ قَادِرٌ." (کنز العمال ج:۲ حدیث:۵۱۲۶)

ترجمہ:...... "اے پروردگار! مجھ کو رسوا نہ کیجو، آپ تو مجھے جانتے ہی ہو، (ہم بندوں کی نظروں سے چھپ سکتے ہیں لیکن اللہ کی نظروں سے نہیں چھپ سکتے) اور مجھے عذاب نہ دیجیو! آپ مجھ پر قدرت رکھتے ہو ناں!"

اللہ جب چاہے ہمیں پکڑ لے:

جب چاہے اللہ تعالیٰ پکڑ لے، جس چیز پر چاہے پکڑ لے، یہ جو تم بڑے مزے سے عبادت کرنے آئے تھے، جمعہ پڑھنے کے لئے آئے تھے، اگر اللہ چاہے تو تمہاری اس نماز پڑھنے پر تمہیں پکڑ لے کہ نالائق! کیسی نماز پڑھتے ہو؟ گناہوں پر نہیں، ہماری عبادتوں پر ہمیں پکڑ لے، یہ کریم آقا کا حلم ہے کہ تمہیں پکڑتے نہیں ہیں، اور تم ہو کہ لوگوں کے عیوب کو تلاش کرتے پھرتے ہو، اس کو لوگوں کے سامنے گاتے پھرتے ہو۔

جو توبہ نہیں کرتا...

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"وَمَنْ لَّا یَتُبْ لَا یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْہِ!"

(کنز العمال ج:۳ حدیث:۵۹۶۶)

ترجمہ:...... "جو توبہ نہیں کرتا اس کی طرف حق تعالیٰ شانہ کی عنایت و رحمت متوجہ نہیں ہوتی۔"

بندے کو چاہئے کہ ہمہ وقت اپنے عیوب پر نظر رکھتے ہوئے اللہ کی بارگاہِ عالی میں توبہ کرتا رہے، یہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے، اور اگر یہ توبہ نہ کرے تو یہ اللہ کی خصوصی عنایت و توجہ کا مستحق نہیں ہے، ویسے تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہر وقت شامل حال رہتی ہے، شیخ سعدی رحمہ اللہ کے بقول کہ:

ادیم زمین سفرائے عام اوست
کہ دشمن بریں خانہ یغما چہ دوست

یہ روئے زمین اس مالک کا دسترخوان بچھا ہوا ہے، سب دوست و دشمن یہاں پر کھا کھا کر جارہے ہیں، کسی کو روک ٹوک نہیں، دوست آئے، دشمن آئے جو آئے کھائے۔

فرعونیت چھوڑ دو:

لیکن ایک عوام کے ساتھ عنایت ہوتی ہے، اور ایک اپنے خاص بندوں کے ساتھ ہوتی ہے، خاص بندوں کے ساتھ اللہ رب العزت کی عنایت اسی وقت ہوتی ہے جبکہ وہ عبدیت بجالائیں، بندے بن کر آئیں، نافرمان نہیں، فرمانبردار بن کر آئیں، سرکش نہیں بلکہ مطیع بن کر آئیں، فرعون نہیں بلکہ متوازن بن کر آئیں، اور خدا نہیں بلکہ بندے بن کر آئیں، اپنی خدائی کا تاج باہر پھینک کر آئیں، یہ دماغ میں جو سوداً سمایا ہوا ہے اپنی خدائی کا، اس کو پھینک کر آئیں، ذہن میں سمائی ہوئی اس خدائی کو گھر کی کنڈی پر لٹکا کر آیا کرو۔

مسجد میں کوئی صاحب بہادر نہیں:

مسجد میں آتے ہو تو اپنی خدائی کا تاج وہیں چھوڑ آیا کرو، مسجد میں نہیں، مسجد میں صرف تم بندے ہو، یہاں نہ کوئی صاحب بہادر ہے، نہ کوئی سیٹھ جی ہے اور نہ کوئی

فلاں افسر ہے، یہاں کچھ بھی نہیں ہو، یہ اپنے القاب وآداب کی تمام کی تمام پگڑیاں اور تاج وہیں ہی چھوڑ کر آیا کرو، یہاں جب آؤ تو بندے بن کر آؤ، یہاں سب برابر ہیں، یہ اس سرکارِ عالی کا دربار ہے، یہاں سب بندے ہیں، ہاں! یہ الگ ہے کہ کچھ زیادہ گناہگار ہوں گے، کوئی کم گناہگار ہوں گے، کوئی زیادہ قصوروار ہوں گے، کوئی کم قصوروار ہوں گے، کسی میں عیوب زیادہ پائے جاتے ہوں گے، کسی میں عیوب کم پائے جاتے ہوں گے، لیکن یہاں آکر دوسروں کے عیوب کو نہ دیکھو، اپنے گریبان میں جھانکو، تم اگر غور کروگے تو تمہارے اندر کا آدمی تمہیں خود کہے گا کہ اللہ کی مخلوق میں مجھ سے زیادہ پاپی اور گناہگار کوئی دوسرا نہیں ہے، یہ خان صاحبی کیوں ساتھ ملاتے ہو؟ یہ صاحب بہادری کیوں ساتھ لگاتے ہو؟ یہ تمام اپنے القابات باہر رکھ کر آیا کرو، اللہ کی بارگاہ میں آؤ تو بندے بن کر آؤ، جو بندہ بن کر آئے، اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے آئے اور اللہ سے معافی مانگتے ہوئے آئے، اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہوئے آئے، اس کی طرف تو عنایت خاص متوجہ ہوتی ہے، پھر جس درجہ کی توبہ ہے اسی درجہ کی عنایت بھی ہوگی، لیکن جو توبہ نہیں کرتا ہے اس پر عنایت نہیں ہوتی، اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جاتی، توبہ کیسے قبول کی جاتی، جبکہ اس نے توبہ ہی نہیں کی۔

جو تقویٰ نہ اپنائے اُسے نہیں بچایا جاتا:

اور اب اس خطبہ کا آخری فقرہ ہے: جو شخص تقویٰ اختیار نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس کو بچاتا نہیں ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ:

"وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا. وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ." (الطلاق:۲،۳)

اور جو ڈرے اللہ سے، اللہ تعالیٰ پیدا کردیتے ہیں اس کے لئے نکلنے کی

صورت، یعنی مشکل جگہ سے نکلنے کی صورت پیدا کردیتے ہیں، اور اس کو رزق دیتے ہیں ایسی جگہ سے کہ اس کو وہم وگماں بھی نہیں ہوتا۔ اور دوسری آیت میں فرمایا کہ:

"وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا."

(الطلاق:۴)

جو شخص تقویٰ اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کے معاملہ میں آسانی پیدا فرمادیتے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین!

مال،
اہل و عیال
اور اعمال،
زیادہ مفید کون؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

"عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا لِاَصْحَابِهٖ: أَتَدْرُوْنَ مَا مَثَلُ اَحَدِكُمْ وَمَثَلُ اَهْلِهٖ وَمَالِهٖ وَعَمَلِهٖ؟ فَقَالُوْا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ! فَقَالَ: اِنَّمَا مَثَلُ اَحَدِكُمْ وَمَثَلُ مَالِهٖ وَاَهْلِهٖ وَوَلَدِهٖ وَعَمَلِهٖ كَمَثَلِ رَجُلٍ لَهٗ ثَلَاثَةُ اِخْوَةٍ فَلَمَّا حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ دَعَا بَعْضَ اِخْوَتِهٖ فَقَالَ: اِنَّهٗ قَدْ نَزَلَ بِیْ مِنَ الْاَمْرِ مَا تَرٰی، فَمَا لِیْ عِنْدَکَ وَمَا لِیْ لَدَيْکَ؟ فَقَالَ: لَکَ عِنْدِیْ اَنْ اُمَرِّضَکَ وَلَا اَنْ اُمَلِّکَ وَاَنْ اَقُوْمَ بِشَأْنِکَ، فَاِذَا مِتَّ غَسَّلْتُکَ وَکَفَّنْتُکَ وَحَمَلْتُکَ مَعَ الْحَامِلِيْنَ، اَحْمِلُکَ طَوْرًا وَاُمِيْطُ عَنْکَ طَوْرًا، فَاِذَا رَجَعْتُ اَثْنَيْتُ عَلَيْکَ بِخَيْرٍ عِنْدَ مَنْ يَّسْأَلُنِیْ عَنْکَ. هٰذَا اَخُوْهُ الَّذِیْ هُوَ اَهْلُهٗ فَمَا تَرَوْنَهٗ؟ قَالُوْا: لَا نَسْمَعُ طَائِلًا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! ثُمَّ يَقُوْلُ لِاَخِيْهِ الْاٰخَرِ: اَتَرٰی مَا قَدْ نَزَلَ بِیْ فَمَا لَدَيْکَ

وَمَا لِیْ عِنْدَکَ؟ فَیَقُوْلُ: لَیْسَ لَکَ عِنْدِیْ غِنَاءٌ اِلَّا وَاَنْتَ فِی الْاَحْیَاءِ، فَاِذَا مِتَّ ذُهِبَ بِکَ فِیْ مَذْهَبٍ وَذُهِبَ بِیْ فِیْ مَذْهَبٍ! هٰذَا اَخُوْهُ الَّذِیْ هُوَ مَالُهٗ کَیْفَ تَرَوْنَهٗ؟ قَالُوْا: لَا نَسْمَعُ طَائِلًا یَا رَسُوْلَ اللهِ! ثُمَّ یَقُوْلُ لِاَخِیْهِ الْآخَرِ: اَتَرٰی مَا قَدْ نَزَلَ بِیْ وَمَا رَدَّ عَلَیَّ اَهْلِیْ وَمَالِیْ فَمَا لِیْ عِنْدَکَ وَمَا لِیْ لَدَیْکَ؟ فَیَقُوْلُ: اَنَا صَاحِبُکَ فِیْ لَحْدِکَ وَاَنِیْسُکَ فِیْ وَحْشَتِکَ وَاَقْعُدُ یَوْمَ الْوَزْنِ فِیْ مِیْزَانِکَ فَاُثْقِلُ مِیْزَانَکَ! هٰذَا اَخُوْهُ الَّذِیْ هُوَ عَمَلُهٗ کَیْفَ تَرَوْنَهٗ؟ قَالُوْا: خَیْرُ اَخٍ وَخَیْرُ صَاحِبٍ یَا رَسُوْلَ اللهِ! قَالَ: فَاِنَّ الْاَمْرَ هٰکَذَا! قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا: فَقَامَ اِلَیْهِ عَبْدُاللهِ بْنُ کُرْزٍ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللهِ! أَتَأْذَنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ عَلٰی هٰذَا اَبْیَاتًا؟ فَقَالَ: نَعَمْ! فَذَهَبَ فَمَا بَاتَ اِلَّا لَیْلَةً حَتّٰی عَادَ اِلٰی رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَوَقَفَ بَیْنَ یَدَیْهِ وَاجْتَمَعَ النَّاسُ وَاَنْشَأَ یَقُوْلُ:

فَاِنِّیْ وَاَهْلِیْ وَالَّذِیْ قَدَّمَتْ یَدِیْ
کَدَاعٍ اِلَیْهِ صَحْبَهٗ ثُمَّ قَائِلٍ
لِاِخْوَتِهٖ اِذْ هُمْ ثَلَاثَةُ اِخْوَةٍ
اَعِیْنُوْا عَلٰی اَمْرٍ بِیَ الْیَوْمَ نَازِلٍ
فِرَاقٌ طَوِیْلٌ غَیْرَ مُتَّشَقٍ بِهٖ
فَمَاذَا لَدَیْکُمْ فِی الَّذِیْ هُوَ غَائِلٍ
فَقَالَ امْرُؤٌ مِنْهُمْ اَنَا الصَّاحِبُ الَّذِیْ
اَطِیْعُکَ فِیْمَا شِئْتَ قَبْلَ التَّزَائُلِ

فَـأَمَّـا إِذَا جَـدَّ الْـفِـرَاقُ فَـإِنَّـنِـىْ
لِـمَـا بَيْـنَـنَـا مِنْ خُـلَّـةٍ غَيْـرُ وَاصِـلِ
فَـخُـذْ مَـا اَرَدْتَّ الْآنَ مِنِّـىْ فَـإِنَّـنِـىْ
سَيُسْـلَـكُ بِـىْ فِـىْ مَهْيَـلٍ مِنْ مَهَـائِلِ
فَـإِنْ تُبْـقِـنِـىْ لَا تُبْـقِ فَـاسْتَنْفِدَنَّـنِـىْ
وَعَـجِّـلْ صَلَاحًـا قَبْـلَ حَتْفٍ مُعَـاجِلِ
وَقَـالَ امْـرُؤٌ قَـدْ كُـنْـتُ جِدًّا أُحِبُّـهُ
وَأُوْثِـرُهُ مِـنْ بَيْـنِهِـمْ فِـى التَّـفَـاضُـلِ
غِـنَـائِـىْ أَنِّـىْ جَـاهِـدٌ لَـكَ نَـاصِـحٌ
إِذَا جَـدَّ جِـدُّ الْـكَـرْبِ غَيْـرُ مُـقَـاتِلِ
وَلٰـكِـنَّـنِـىْ بَـاكٍ عَـلَيْـكَ وَمُعْـوِلٌ
وَمُثْـنٍ بِـخَيْـرٍ عِـنْـدَ مَنْ هُـوَ سَـائِـلِ
وَمُتَّبِـعُ الْـمَـاشِيْـنَ اَمْشِـىْ مُشَيِّـعًـا
اَعِيْـنُ بِـرِفْـقٍ عُـقْـبَةً كُـلَّ حَـامِـلِ
اِلٰـى بَيْـتِ مَثْـوَاكَ الَّذِىْ اَنْتَ مُدْخَلٌ
اُرَجِّـعُ مَـقْـرُوْنًـا بِـمَـا هُـوَ شَـاغِلِـىْ
كَـأَنْ لَـمْ يَـكُـنْ بَيْـنِـىْ وَبَيْـنَكَ خُلَّـةٌ
وَلَا حُـسْـنَ ود مَـرَّةً فِـى التَّـبَـاذُلِ
فَـذٰلِـكَ اَهْـلُ الْـمَـرْءِ ذَاكَ غَنَـاؤُهُـمْ
وَلَيْـسَ وَاِنْ كَـانُـوْا حِـرَاصًـا بِطَـائِـلِ
وَقَـالَ امْـرُؤٌ مِـنْهُـمْ اَنَـا الْاَخُ لَا تَـرٰى
اَخًـا لَـكَ مِثْلِـىْ عِنْـدَ كَرْبِ الزَّلَازِلِ

لَدَى الْقَبْرِ تَلْقَانِیْ هُنَالِکَ قَاعِدًا
اُجَادِلُ عَنْکَ الْقَوْلَ رَجْعَ التَّجَادُلِ
وَاَقْعُدُ یَوْمَ الْوَزْنِ فِی الْکَفَّةِ الَّتِیْ
تَکُوْنُ عَلَیْهَا جَاهِدًا فِی التَّثَاقُلِ
فَلَا تَنْسَنِیْ وَاعْلَمْ مَکَانِیْ فَاِنَّنِیْ
عَلَیْکَ شَفِیْقٌ نَاصِحٌ غَیْرُ خَاذِلِ
فَذٰلِکَ مَا قَدَّمْتَ مِنْ کُلِّ صَالِحٍ
تُلَاقِیْهِ اِنْ اَحْسَنْتَ یَوْمَ التَّوَاصُلِ

فَبَکٰی رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، وَبَکٰی الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ قَوْلِهٖ، وَکَانَ عَبْدُاللهِ بْنُ کُرْزٍ لَا یَمُرُّ بِطَائِفَةٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ اِلَّا دَعَوْهُ وَاسْتَنْشَدُوْهُ، فَاِذَا اَنْشَدَهُمْ بَکَوْا!" (کنز العمال ج:۱۵ حدیث:۴۲۹۸۱)

ترجمہ:...... ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے صحابہ سے فرمایا: جانتے ہو تمہاری مثال اور تمہارے اہل و مال اور عمل کی مثال کیا ہے؟ عرض کیا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں! فرمایا: تم میں سے ایک کی مثال اور اس کے مال اور آل و اولاد اور عمل کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی کے تین بھائی تھے، جب اس کی وفات کا وقت آیا تو اس نے ایک بھائی کو بلایا اور کہا کہ: مجھ پر جو حالت طاری ہے، وہ تم دیکھ رہے ہو، بتاؤ! تم میرے لئے کیا کرسکتے ہو؟ اس نے کہا کہ: میں یہ کرسکتا ہوں کہ تیری تیمارداری کروں اور تیری جو حالت ہے اس پر دن

رات کھڑا رہوں، جب تو مرجائے تو تجھے غسل دوں، کفن پہناؤں اور اٹھانے والوں کے ساتھ تجھے اٹھاؤں، کبھی اٹھاؤں اور کبھی کندھا ہٹادوں، اور جب میں تجھے دفن کرکے واپس آجاؤں تو لوگوں کے سامنے تیری تعریف کروں، جو بھی مجھ سے تیرے بارے میں پوچھے (یہ بھائی اس کے گھر کے لوگ یعنی بیوی اور بچے ہیں)۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے سوال کیا کہ:) تم اس بھائی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہم نہیں سنتے کوئی ایسی چیز جس میں کوئی منفعت ہو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پھر وہ اپنے دوسرے بھائی کے بارے میں کہتا ہے کہ: مجھ پر جو حالت آئی ہے، تم دیکھ ہی رہے ہو، بتاؤ! تم میرے لئے کیا کرسکتے ہو؟ وہ کہتا ہے کہ: تمہارے لئے میرے پاس کوئی کام کی چیز نہیں، مگر جب تک تم زندوں میں شمار ہوتے ہو، جب تم مرجاؤگے تو تمہارا راستہ دوسرا ہوگا، میرا راستہ دوسرا۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:) یہ اس کا دوسرا بھائی ہے، جس کو مال کہتے ہیں، بتاؤ! تم اس کو کیسا دیکھتے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کچھ کام کا نہیں! پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: وہ تیسرے بھائی سے کہتا ہے کہ مجھ پر جو حادثہ نازل ہوا ہے، اور میرے اہل خانہ نے اور میرے مال نے جو جواب دیا ہے، وہ تم نے سن لیا ہے، تم بتاؤ کہ تم میرے لئے کیا کرسکتے ہو؟ وہ کہتا ہے کہ: میں تیرا رفیق رہوں گا تیری لحد میں، تیرا مونس اور تیرا غمخوار رہوں گا تیری وحشت میں، اور میں بیٹھ جاؤں گا وزن

کے دن تیرے ترازو میں (اور تیرے ترازو کو بھاری کردوں گا)۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) یہ اس کا وہ بھائی ہے جس کو عمل کہتے ہیں، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! بہت ہی اچھا بھائی ہے اور بہت ہی اچھا رفیق ہے! فرمایا کہ: پھر معاملہ یوں ہی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سن کر حضرت عبداللہ بن کرز رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے، کہنے لگے: یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں اس پر کچھ اشعار بنا کر پیش کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ضرور! وہ چلے گئے، ایک رات رہے، دوبارہ واپس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ کے سامنے کھڑے ہوگئے، لوگ بھی جمع ہوگئے، انہوں نے یہ نظم پڑھی کہ:

بے شک میں اور میرے اہل خانہ اور وہ عمل جو میں نے آگے بھیجا اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے رفقا کو بلائے پھر وہ کہے اپنے تین بھائیوں سے کہ آج جو حال مجھ پر پیش آیا ہے، اس میں میری مدد کرو! طویل جدائی ہے اور آئندہ کا کچھ معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوگا؟ اب جو حوادث میرے سامنے پیش آنے والے ہیں، بتاؤ! کہ تمہارے پاس اس کا کیا علاج ہے؟ ان میں سے ایک نے کہا کہ: میں تیرا رفیق ہوں، تیری اطاعت کروں گا، اور تو جو بھی کہے تیرا کہنا مانوں گا، لیکن موت آنے سے پہلے پہلے، جب جدائی واقع ہوجائے تو ہمارے درمیان جو دوستی ہے وہ ختم، جو کچھ لینا چاہتا ہے مجھ سے اس

وقت لے سکتا ہے، کیونکہ تیرا جب انتقال ہوجائے گا تو مجھے کسی دوسرے راستے میں لے جائیں گے، اگر تو مجھے باقی رکھنا چاہتا ہے تو باقی نہ رکھ، بلکہ مجھے خرچ کردے، اور جلدی کر، موت کے آنے سے پہلے پہلے مجھے خرچ کردے۔ ایک نے کہا کہ: میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، اور لوگوں کے درمیان جب مقابلہ ہوتا ہے میں تمہیں ترجیح دیتا ہوں، میری خدمت یہ ہے کہ میں تیرے لئے دن رات خیرخواہی اور محنت کروں گا، جو بیماری اور پریشانی ہو، لیکن جب تو مرجائے گا تو تیرے اوپر روؤں گا اور بین کروں گا، کوئی تیرا نام لے گا تو اس کے سامنے تیری تعریف کروں گا، جو تجھے رخصت کرنے جائیں گے میں ان کے ساتھ جاؤں گا، اور کندھا دینے والوں میں کندھا دینے کی مدد کروں گا، اور میری یہ خدمت قبر تک رہے گی جس میں تو داخل کیا جائے گا، جب تو اپنی قبر میں چلا جائے گا تو میں واپس آجاؤں گا، کیونکہ میرے اور بہت سارے مشاغل ہیں، اور میں تجھے ایسا چھوڑ کر آجاؤں گا کہ گویا میرے درمیان اور تیرے درمیان دوستی نہیں تھی اور نہ کوئی حسنِ معاملہ تھا، بس! یہ آدمی کے گھر کے لوگ ہیں، بیوی بچے اور یہ ان کی خدمت ہے، اور یہ چیز اگرچہ وہ کتنے ہی حریص ہوں لیکن مفید نہیں ہے۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا کہ: میں تیرا ایسا بھائی ہوں کہ مجھ جیسا بھائی مصائب کے نازل ہونے کے وقت نہیں دیکھا ہوگا، تو قبر میں جائے گا تو تو وہاں مجھے بیٹھا ہوا پائے گا، تجھ سے منکر نکیر جھگڑا کریں گے تو میں جواب دوں گا، اور وزن کے دن میں اس پلڑے میں بیٹھ جاؤں گا جس میں

تو ہوگا، اور اس پلڑے کو بوجھل کرنے کی کوشش کروں گا، سو تو مجھے بھول نہیں اور میرے مرتبے کو پہچان لے، اس لئے کہ میں تجھ پر شفیق ہوں، تیرا خیرخواہ ہوں، کسی وقت تیری مدد چھوڑنے والا نہیں ہوں، بس یہ بھائی ہر وہ نیک عمل ہے جو تو نے آگے بھیجا تو اس کو پائے گا، اگر تو نے نیکی کی، ملاقات کے دن کے لئے۔

یہ ارشاد سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رو پڑے اور مسلمان بھی روئے۔ حضرت عبداللہ بن کرز رضی اللہ عنہ جب بھی مسلمانوں کے کسی مجمع کے پاس سے گزرتے تھے، وہ حضرات ان کو بلواتے اور ان سے یہ اشعار پڑھواتے، جب یہ شعر پڑھتے تو سب کے سب رو پڑتے۔‘‘

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کہیں مختصر اور کہیں لمبی، بہت ساری کتابوں میں موجود ہے، اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی کے مال اور اس کے اہل وعیال اور اس کے اعمالِ صالحہ کی مثال بیان فرمائی ہے۔

بے وفا دوست:

اس مثال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سمجھائی ہے کہ سب سے زیادہ بے وفا دوست مال ہے کہ تمہاری زندگی میں تو تمہارے کام کا ہے، لیکن جب روح تن سے الگ ہوجائے تو دوسرے کے پاس چلا جاتا ہے، تمہارے پاس رہتا ہی نہیں۔

ابن آدم کا مال؟

ایک حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے:

’’یَقُوْلُ الْعَبْدُ: مَالِیْ! مَالِیْ! وَاِنَّ مَالَهٗ مِنْ مَّالِهٖ

ثَـلاثٌ: مَـا اَکَـلَ فَـاَفْنٰی، اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰی، اَوْ اَعْطٰی فَاَقْنٰی وَمَا سِوٰی ذَالِکَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِکُهٗ لِلنَّاسِ!"

(مشکوٰۃ ص:۴۴۰)

ترجمہ:...... "آدم کا بیٹا کہتا ہے کہ: میرا مال! میرا مال! آدم کے بچے! تیرے مال میں سے صرف تیرا مال وہی ہے جو تو نے کھالیا اور کھا کر ختم کردیا، یا تو نے پہن لیا اور پہن کر بوسیدہ کردیا، یا تو نے آگے بھیج کر اپنے لئے جمع کرلیا، اور ان تینوں چیزوں کے علاوہ باقی جتنا تیرا مال ہے تو اس کو دوسروں کے لئے چھوڑ کر چلا جائے گا، وہ تیرا نہیں!"

اہل وعیال قبر میں کام نہ دیں گے:

اور اہل وعیال کے بارے میں یوں فرمایا کہ: قبر کے کنارے تک ساتھ دیتے ہیں۔

آدمی مرنے والا ہو، موت وحیات کی کشمکش میں ہو تو یہ اپنی حد تک اس کی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں، جو خدمت یہ کرسکتے ہیں اس کے کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بھی کسی کو نصیب ہے اور کسی کو نہیں، مرگیا تو غسل اور کفن کا انتظام کردیا، اور کندھے بدل بدل کر قبر تک پہنچادیا، قبر میں لٹا کر اوپر ہزاروں من وزن ڈال دیا، تاکہ یہ بھاگ نہ آئے، چند روز رودھو لئے، کچھ اپنی رسم و رواج کے مطابق تقریبات کرلیں اور کوئی تعزیت کے لئے آیا تو اس کے سامنے تعریفیں کردیں اور بس! اللہ! اللہ! خیر صلا! قصہ ختم، لیکن قبر میں اس پر کیا گزر رہی ہے؟ اس کا کسی کو کچھ معلوم نہیں! اکبر الٰہ آبادیؒ کے بقول:

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے!
تہہِ خاک ہم تو اکیلے رہیں گے!

پختہ قبر بنانا:

بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں کہ قبر پکی بنادیتے ہیں، اوپر مقبرہ بنادیتے ہیں۔ میں ماموں کانجن میں ہوتا تھا، وہاں ایک صاحب کے لڑکے کا انتقال ہوگیا، جواں سال لڑکا تھا، ظاہر ہے کہ اس کے والدین کو صدمہ تو ہونا ہی تھا، اس کے باپ نے قبرستان میں اس کی پکی قبر بنائی اور اس کے اوپر سائبان کی چھت بنادی۔ بھلا مردے کو اس کا کیا فائدہ؟ کیا اس سے اس کی مغفرت ہوجائے گی یا اس کو ٹھنڈک پہنچے گی؟ اُلٹا خلافِ شریعت کرنے سے اندیشۂ تکلیف ہے۔

قبر پر ڈیرہ لگانا:

ایک روایت میں ہے کہ:

”قَالَ لَمَّا مَاتَ الْحَسَنُ بْنُ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ ضَرَبَتْ اِمْرَأَتُهُ الْقُبَّةَ عَلٰى قَبْرِهٖ سَنَةً ثُمَّ رَفَعَتْ فَسَمِعَتْ صَائِحًا يَقُوْلُ: اَلَا هَلْ وَجَدُوْا مَا فَقَدُوْا؟ فَاَجَابَهٗ آخَرُ: بَلْ يَئِسُوْا فَانْقَلَبُوْا۔“ (مشکوٰۃ ص:۱۵۲)

ترجمہ:...... ”کہتے ہیں کہ حضرت حسن بن حسن بن علی رحمہ اللہ کا انتقال ہوا تو ان کی اہلیہ کو بہت صدمہ ہوا، اور جاکر ان کی قبر پر ڈیرا لگادیا، لوگوں نے بہت منع کیا، مگر وہ مانی نہیں، کہنے لگی کہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا، ایک سال تک قبر پر پڑی رہی پھر اُٹھ کر چلی گئی، اور اس نے ایک آواز سنی کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ: کیا جس کو انہوں نے گم پایا تھا کیا وہ ان کو مل گیا،

دوسرے نے جواب دیا: نہیں! بلکہ مایوس ہوکر لوٹ گئے۔“

یہ تمہاری آہ وزاری میت کے کچھ کام نہیں آئے گی، اس لئے کہ یہ تم اپنے لئے کرتے ہو، اس کے لئے کچھ نہیں، یہ تیجہ اور دسواں کرو، چہلم کرو یا برسیاں مناؤ یہ سب کچھ تم اپنے لئے کر رہے ہو، مرنے والے کے لئے کچھ بھی نہیں کرتے۔

ہمارے یہاں ملتانیوں میں رواج ہے کہ اگر کوئی بوڑھا مرجائے تو باقاعدہ شادی کی طرح دعوت کرتے ہیں، تمام عزیز و اقارب کو بلاتے ہیں، بکرے اور اسی طرح دوسرے جانور وغیرہ کاٹتے ہیں، بڑی ٹھاٹ کی دعوت کرتے ہیں، غرضیکہ اہل و عیال دفن کرکے واپس آگئے، میت کس حال میں ہے؟ اس پر کیا گزر رہی ہے؟ ان کی وہاں تک نہ رسائی ہے اور نہ کوئی ان کی خدمت کرسکتا ہے، اس کے لئے تو اب مشکلات شروع ہوئی ہیں، اب پتہ نہیں ختم کب ہوں گی؟

قبر کی پکار:

حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ قبر آدمی کو روزانہ پکارتی ہے، ترمذی شریف کی یہ حدیث ہے، قبر کہتی ہے:

”اَنَا بَیْتُ الْغُرْبَةِ! اَنَا بَیْتُ الْوَحْدَةِ! اَنَا بَیْتُ التُّرَابِ! وَاَنَا بَیْتُ الدُّوْدِ!“ (ترمذی ج:۲ ص:۶۹)

ترجمہ:...... ”میں تنہائی کا گھر ہوں، میں وحشت کا گھر ہوں، میں مٹی کا گھر ہوں، میں کیڑوں کا گھر ہوں!“

کہا جاتا ہے کہ قبر روزانہ پانچ مرتبہ پکارتی ہے، اور تمہارے لئے روزانہ پانچ ہی نمازیں مقرر کی گئی ہیں، تاکہ تم آخری التحیات میں یہ دعا پڑھو:

”اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْکَسَلِ وَالْھَرَمِ وَالْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ

النَّـارِ وَمِـنْ عَذَابِ النَّارِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْغِنٰى وَاَعُوْذُ بِكَ مِـنْ فِتْـنَةِ الْـفَقْـرِ وَاَعُـوْذُ بِكَ مِـنْ فِتْـنَةِ الْـمَسِيْحِ الدَّجَّالِ....'' (بخاری ج:۲ ص:۹۴۳)

ترجمہ:......''اے اللہ! میں پناہ مانگتا ہوں سستی سے، بڑھاپے سے، گناہوں سے، قرض سے، قبر کے فتنہ سے، قبر کے عذاب سے، آگ کے فتنہ سے، دوزخ کے عذاب سے، مالداری کے فتنہ کے شر سے، اور میں پناہ مانگتا ہوں تنگدستی کے فتنہ سے، اور میں پناہ مانگتا ہوں کانے دجال کے فتنہ سے۔''

عذابِ قبر؟

ایک روایت میں ہے:

''عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: اَنَّ يَهُوْدِيَّةً دَخَلَتْ عَلَيْهَا فَذَكَرَتْ عَذَابَ الْقَبْرِ فَقَالَتْ لَهَا: اَعَاذَكِ اللهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ! فَسَأَلَتْ عَائِشَةُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، فَقَالَ: نَعَمْ! عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ. قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: فَمَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدُ صَلّٰى صَلٰوةً اِلَّا تَعَوَّذَ بِاللهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ.'' (مشکوٰۃ ص:۲۵)

ترجمہ:......''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ایک دفعہ ایک یہودی عورت میرے پاس آئی، اس نے قبر کا ذکر چھیڑ دیا، پھر کہنے لگی: اللہ تعالیٰ تجھے عذابِ قبر سے پناہ عطا فرمائے (میں نے عذاب قبر کی بات کبھی نہیں سنی تھی، میں نے

کہا: کیا عذابِ قبر ہوتا ہے؟) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے تو میں نے قبر کے عذاب کے بارہ میں پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبر کا عذاب برحق ہے! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ: اس واقعہ کے بعد مجھے یاد نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نماز پڑھی ہو اور اس میں عذابِ قبر سے پناہ نہ مانگی ہو۔"

تو غرضیکہ اس دوسرے بھائی اور رفیق سے مراد بیوی ہے، بچے ہیں، عزیز و اقارب ہیں، دوست احباب ہیں، یہ مردے کو قبر کے سپرد کرکے چلے آئے اور آکر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس پر دو چار دن آنسو بہالیتے ہیں، اور کچھ لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کردیتے ہیں کہ بہت اچھا آدمی تھا۔

مردے کی بے جا تعریف پر عذاب:

بعض اوقات تعریف بھی غیرواقعی کرتے ہیں، واقعی تعریف نہیں کرتے، یہ اتنا کماتا تھا، اتنا کھاتا تھا، یہ کرتا تھا، وہ کرتا تھا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اس کی تعریف کرتے ہیں اور جھوٹی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں تو:

"..... اِلَّا وَکَّلَ اللهُ بِهٖ مَلَكَيْنِ يُلْهِذَانِهٖ وَيَقُوْلَانِ: اَهٰكَذَا كُنْتَ؟" (مشکوٰۃ ص:۱۵۲)

ترجمہ:..... "اللہ تعالیٰ مرنے والے پر دو فرشتے مقرر کردیتے ہیں اور وہ دونوں مردے کو چوکے دے کر کہتے ہیں: تو ایسے ہی تھا؟"

لیجئے اہل و عیال، بیوی بچے اور دوست احباب اب بھی اس غریب کا پیچھا

نہیں چھوڑتے، بلکہ کہتے ہیں کہ اس نے گھر کے لئے یہ یہ چیزیں خریدی تھیں، ٹیلی ویژن لائے تھے، فلاں چیز لائے تھے، دوبئی گئے تھے، بہت بڑی مشین لائے تھے اور فلاں فلاں چیزیں لے کر آئے تھے، قبر میں ان چیزوں کو پوچھیں گے، تعریفیں تو کرتے ہیں مگر ایسی فضول و مہمل اور بالکل لغو، جس سے اس غریب کی تکلیف میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے، ان کے منہ سے یہ نہیں نکلتا تھا کہ تہجد کی نماز پڑھتے تھے، ان کے منہ سے یہ نہیں نکلتا تھا کہ سحر کے وقت یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑاتے تھے، اللہ تعالیٰ کے سامنے رویا کرتا تھا، کسی کا حق نہیں مارتا تھا، کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا تھا، فرائض شرعیہ کا پابند تھا، اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ تھا، یہ باتیں ان کے منہ سے نہیں نکلتیں، ہوتیں تو نکلتیں۔

مردے کی واقعی اچھائیاں بیان کرو!

اگر یہ باتیں کریں تو ان کی یہ باتیں کرنا اور تعریف کرنا اللہ تعالیٰ کے یہاں شہادت بن جاتی ہے۔ وہ مشہور حدیث ہے جو کہ میں سنا چکا ہوں:

”عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: مَرُّوْا بِجَنَازَۃٍ فَاَثْنَوْا عَلَیْھَا خَیْرًا، فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: وَجَبَتْ! ثُمَّ مَرُّوْا بِاُخْرٰی فَاَثْنَوْا عَلَیْھَا شَرًّا، فَقَالَ: وَجَبَتْ! فَقَالَ عُمَرُ: مَا وَجَبَتْ؟ فَقَالَ: ھٰذَا اَثْنَیْتُمْ عَلَیْہِ خَیْرًا فَوَجَبَتْ لَہُ الْجَنَّۃُ، وَھٰذَا اَثْنَیْتُمْ عَلَیْہِ شَرًّا فَوَجَبَتْ لَہُ النَّارُ، اَنْتُمْ شُھَدَاءُ اللہِ فِی الْاَرْضِ!“ (مشکوٰۃ ص:۱۴۵)

ترجمہ:...... ”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے جنازہ گزرا، فرمایا: واجب ہوگئی! ایک اور جنازہ گزرا، فرمایا: واجب ہوگئی!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: (یا رسول اللہ! دو جنازے گزرے، دونوں پر آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی!) کیا واجب ہوگئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پہلا جنازہ گزرا تو تم لوگوں نے اس کی اچھی تعریف کی کہ یہ بہت اچھا آدمی ہے، نیک آدمی ہے، میں نے کہا کہ: واجب ہوگئی، یعنی جنت واجب ہوگئی۔ اور جب دوسرا جنازہ گزرا تو تم نے دوسری قسم کی رائے کا اظہار کیا، منافق تھا، بڑا ظالم تھا، میں نے کہا کہ: واجب ہوگئی، یعنی جہنم واجب ہوگئی۔ تم اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو زمین میں، یعنی تمہاری شہادت کے مطابق اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائیں گے۔''

یہ تو تھا دوسرا دوست، اس دوست کا بھی پتہ چل گیا۔

اعمالِ صالحہ کی وفاداری:

اس نے تیسرے دوست کو بلایا، تیسرے رفیق کو بلایا، یہ اس کا عمل تھا، اس سے کہا کہ: مجھ پر جو حالت طاری ہے تم دیکھ رہے ہو، نزع کا سامنا ہے، روح اور بدن کی علیحدگی ہو رہی ہے، اور ایک بالکل نیا سفر درپیش ہے، نہایت طویل سفر اور ان دیکھے راستے، بہت ہی پریشانی اور بے چینی ہے کہ میرا کون ساتھ دے گا؟ یہ جو میرے مال نے جواب دیا وہ بھی تم نے سن لیا ہے، اور میرے اہل وعیال نے جو جواب دیا ہے وہ بھی تم نے سن لیا ہے، انہوں نے صاف صاف جواب دے دیا ہے کہ ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتے، نہ آپ کے ساتھ رفاقت کریں گے، نہ آپ کے ساتھ جائیں گے، نہ آپ کے ساتھ قبر میں اُتریں گے، تم بتاؤ! کہ تم کیا کرو گے؟ کہنے لگے کہ: تم اگر مجھے ساتھ لے جاؤ تو پہلی بات یہ ہے کہ ہر موقع پر تمہاری مدد کروں گا، نزع سے لے کر میزان تک، قیامت کے دن، حشر کے دن، میزان یعنی ترازو جو رکھی جائے گی

اس وقت تک میں تیری مدد کروں گا، تیرے ساتھ رہوں گا اور تیرا مونس و غمخوار بنوں گا، تیری تنہائی پر اکیلے پن کو دور کروں گا، مجھ سے ہوسکا تو روشنی بھی کروں گا، کوئی تجھ پر حملہ آور ہوگا تو جواب بھی دوں گا، مدافعت بھی کروں گا، منکر نکیر سوال کریں گے تو سوال و جواب کی بھی کفایت کروں گا، اور قیامت کے دن اس پلڑے میں بیٹھ جاؤں گا جس پلڑے کو تو بھاری دیکھنا چاہتا ہے، اور جتنی میری ہمت ہوگی، جتنا میرا وزن ہوگا میں اپنا پورا وزن تیرے پلڑے میں ڈال دوں گا، یہاں تک کہ تجھے جنت میں پہنچادوں گا۔

قبر میں برے اعمال کی شکل:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ: بدکار آدمی کے سامنے نہایت ڈراؤنی شکلیں آتی ہیں، اور وہ ان کو دیکھ کر گھبراتا ہے، گھبراہٹ تو پہلے ہی موجود ہے، تنہائی اور وحشت ہے، چنانچہ یہ چلاتے ہوئے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: خدا تمہارا ناس کرے تم کون ہو؟ تو وہ کہتا ہے کہ: تم فکر نہ کرو، میں تمہارا وہ برا عمل ہوں جو تو نے کیا تھا، اس کے بعد وہ سارے کے سارے اعمالِ بد پرّا باندھ کے آجاتے ہیں، چڑیلوں کی شکل میں، بدروحوں کی شکل میں، بھیڑیوں کی شکل میں، جنگل کے درندوں کی شکل میں، سانپوں اور بچھوؤں کی شکل میں، وہ اس کے ساتھ آکر لپٹ جاتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون! کہتے ہیں ناں! کہ قبر میں سانپ اور بچھو ہوں گے، وہ یہی اپنے عمل ہیں۔

قبر میں اعمالِ صالحہ کا منظر:

اور نیک آدمی ہوتا ہے تو اس کے اعمالِ صالحہ نہایت ہی حسین شکل میں اس کے سامنے آتے ہیں، یہ کہتا ہے کہ: اللہ تعالیٰ تمہارا بھلا کرے! میں تو بہت تنہائی میں تھا، میں وحشت محسوس کر رہا تھا، تم لوگ کون ہو جو میرے انس کے لئے اور میری

وحشت کو دور کرنے کے لئے آگئے؟ وہ کہتا ہے کہ: آپ کے نیک اعمال ہیں!

اعمالِ صالحہ عذابِ قبر سے بچاؤ کا ذریعہ:

یوں بھی آتا ہے کہ جب عذاب کے فرشتے آتے ہیں مارنے کے لئے، تو نماز فلاں طرف ہوجاتی ہے، صدقہ فلاں طرف ہوجاتا ہے، قرآن کریم کی تلاوت فلاں طرف ہوجاتی ہے، اور دوسرے اعمالِ صالحہ ایک طرف ہوجاتے ہیں، چاروں طرف سے اس کو نیک اعمال گھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: مارنے نہیں دیں گے، عذاب قبر کو ٹال دیتے ہیں۔ سورۂ ملک کے بارے میں فرمایا ہے کہ: یہ میت کو اس طرح اپنے پَروں کے نیچے لے لیتی ہے جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے لے لیتی ہے، اور عذابِ قبر سے اس کو بچاتی ہے۔ یہ اس کے اعمالِ صالحہ ہیں جو مرتے وقت بھی اس کے ساتھ، قبر میں بھی اس کے ساتھ اور حشر میں بھی اس کے ساتھ ہوں گے۔

بدکار کا اپنے اعمالِ بد پر اظہارِ حسرت:

قرآن کریم میں بھی ہے کہ اپنے برے عمل کو دیکھ کر کہے گا کہ:

"یَا لَیْتَ بَیْنِیْ وَبَیْنَکَ بُعْدَ الْمَشْرِقَیْنِ فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ." (الزخرف:۳۸)

ترجمہ:......"کاش! کہ میرے درمیان اور تیرے درمیان مشرق ومغرب کا فاصلہ ہوتا، تو بہت ہی برا ساتھی ہے۔"

فاصلہ کیسے ہوتا؟ تو نے تو خود کیا تھا، جھوٹ خود بولے تھے، ظلم خود کیا تھا، بدکاریاں اور بے حیائیاں خود کی تھیں، عورتیں ننگے سر اپنے اختیار سے چلی تھیں، اور آج کہتے ہو کہ مغرب ومشرق کا فاصلہ ہوتا، جب تمہیں کہا گیا کہ: یہ گناہ کی باتیں ہیں، تم نے کان ہی نہیں دھرا کہ زندگی ان باتوں کے بغیر کیسے گزر سکتی ہے، موت آنے دو

تمہیں بتاؤں گا کہ یہ جو تم نے لعنت گھروں میں ڈالی ہوئی ہے، ٹی وی اور اسی طرح موویاں وغیرہ بناتے ہو، کیمرے رکھے ہوئے ہیں، یہ تصویریں لٹکائی ہوئی ہیں، اور یہ بچوں کے کھلونے بتوں کی شکل میں رکھے ہوئے ہیں، اور تم جو غلط کاریاں کرتے ہو، تمہیں بتاؤں گا کہ یہ کیا چیز ہے؟

اس وقت رونا کام نہیں دے گا!

آج تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سن کر یقین نہیں لاتے، تب آنکھ سے دیکھ کر یقین لاؤ گے اور اس وقت کوئی علاج کارگر نہیں ہوگا، حدیث شریف میں آتا ہے:

ترجمہ:......"دوزخی لوگ ایک ہزار سال تک آنسوؤں کے ساتھ روئیں گے، ایک ہزار سال تک آنکھوں سے خون نکلے گا، اور ایک ہزار سال تک پیپ نکلتی رہے گی۔"

آج اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی بات سن کر تم اس کو مُلّا ئیت کہتے ہو، ذرا وقت آنے دو!

سَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ
اَتَحْتَکَ الْفَرَسُ اَمْ حِمَارُ!

ترجمہ:......"اس غبار کو چھٹ جانے دو! تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ تمہارے نیچے گھوڑا تھا یا گدھا تھا؟"

عقل کا تقاضا:

تو غرضیکہ یہ تین رفیق ہیں آدمی کے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جتنا جتنا کسی کا نفع ہے، آدمی اس سے اتنا ہی تعلق رکھے، عقل کا قاعدہ یہی ہے، اور اس عقل کا ہم دنیا میں استعمال بھی کرتے ہیں، لیکن آخرت کے معاملات میں ہماری عقل بیکار ہوجاتی

ہے، عقل کے سامنے اندھیرا آجاتا ہے۔

عقل کب کام دیتی ہے؟

عقل کی مثال ایسی ہے جیسے آنکھوں کی روشنی، یہ اندر کی روشنی اس وقت کام دیتی ہے جبکہ باہر کی روشنی ہو، ہم دیکھنے کے لئے دو روشنیوں کے محتاج ہیں، عقل کی روشنی اس وقت کام دیتی ہے جبکہ دل میں ہدایت کی روشنی بھی ہو، نورِ ہدایت بھی ہو اور ہم نے چراغِ ہدایت پھونک مار کر بجھادیا ہے، آخرت کے معاملے میں بالکل اندھے ہوگئے ہیں، دنیا کے معاملات میں تو ہماری عقل کام کرتی ہے، آخرت کے معاملات میں کام ہی نہیں کرتی، کیسے کرے؟ دیکھیں کیسے؟ وہ تو نورِ نبوت رہنمائی کرے گا تو ہماری عقل بھی دیکھے گی۔

دنیا و آخرت میں کام آنے والی شئے سے تعلق چاہئے:

میں نے کہا کہ یہ قاعدہ ہے کہ جتنی چیز مفید ہوتی ہے، آدمی اس کو اختیار کرتا ہے، ہونا یہ چاہئے کہ اعمالِ صالحہ کا اہتمام ہو، اس کے ساتھ رفاقت ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

> ترجمہ:...... ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ گھر میں تشریف لاتے تھے تو گھر کے کام کاج میں مشغول رہتے تھے، جیسے گھر میں کام ہوتا ہے، لیکن جوں ہی اذان کی آواز سنتے اس طرح کھڑے ہوجاتے تھے جیسے ہمیں پہچانتے ہی نہیں ہیں۔''
>
> (فضائل نماز باب سوم ص:۸۸)

ہونا یہ چاہئے کہ حکمِ الٰہی آجائے تو تمہاری جان پہچان سب کے ساتھ ختم ہوجائے۔

مال کا نفع خرچ کرنے میں ہے:

اور دوسرے درجے میں اہل وعیال ہیں، اور تیسرے درجے میں مال ہے، مال تو ایسی بیکار چیز ہے کہ جب تک اس کو خرچ نہ کرو نفع نہیں دے گی، ڈھیر لگا لگا کر رکھتے رہو، کچھ فائدہ نہیں۔

حاجی عبدالستار نے پنجابی میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ ایک سیٹھ تھا، اپنے خزانے کی سیر کرنے کے لئے گیا، دیر ہوگئی تو وہ نظر نہیں آیا، اس کے نوکروں چاکروں نے دروازہ بند کردیا اور چلے گئے، سیٹھ جی اندر وہیں تڑپ تڑپ کر مرگیا، اگلے دن دروازہ کھلا تو سیٹھ جی مرے پڑے ہیں، حالانکہ خزانہ موجود تھا، کیونکہ وہ کھانے پینے اور بھوک پیاس بجھانے کا کام نہیں دیتا، ہاں! اس کو خرچ کرکے کھانے پینے کی اشیأ حاصل کی جاسکتی ہیں، غرض تمہارے مال اور خزانے کسی کام کے نہیں ہیں، جب تک تم ان کو خرچ نہ کرو اس سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا، لیکن ہم نے معاملہ اُلٹ کرلیا، ہمارا جتنا تعلق پیسے سے ہے، اتنا اہل وعیال سے بھی نہیں ہے، دوست احباب سے بھی نہیں، ماں بیٹی کی لڑائی اور باپ بیٹے کی لڑائی، بھائی بھائی کی لڑائی کس چیز پر ہے؟ پیسے پر ہے! یہ پیسہ سب چیزوں پر غالب آگیا ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پیسے کو ان پر خرچ کیا جاتا، لیکن آج ہو یہ رہا ہے کہ ان رشتوں کو اس پر خرچ کیا جارہا ہے، اور مال کے لئے، اہل وعیال کے لئے اپنا دین بھی قربان کردیا، اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح عبرت نصیب فرمائے، اور اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرمائے جو نزع کے وقت بھی ہمارے کام آئیں، قبر میں بھی ہمیں کام دیں، حشر میں بھی ہمیں کام دیں۔

برزخ میں صلحأ کی ملاقات:

اللہ تعالیٰ اپنے مقبول اور نیک بندوں کا ساتھ ہمیں دنیا میں بھی، آخرت میں

بھی اور برزخ میں بھی نصیب فرمائے! نیک آدمی مرجاتا ہے تو وحشت نہیں رہتی، ہزاروں صلحا وہاں پہنچے ہوئے ہیں، مجمع لگا ہوا ہے، یہ سب اس کے اردگرد جمع ہوجاتے ہیں، حال واحوال پوچھتے ہیں، خیریت پوچھتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ: فلاں آدمی کیسا تھا؟ تو وہ دنیا سے جانے والا کہتا ہے کہ: وہ وہاں سے تو آگیا ہے، کیا یہاں نہیں آیا؟ کہا کہ: نہیں! یہاں تو نہیں آیا۔ کہا کہ: پھر وہ اپنی ماں دوزخ کے پاس چلا گیا ہوگا! نعوذ باللہ!

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین!

آخرت کی تیاری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

"عَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ: خَطَبَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ رَضِىَ اللهُ عَنْهُ فَقَالَ فِىْ خُطْبَتِهٖ:

اِبْنَ آدَمَ! اِعْلَمْ اَنَّ مَلَكَ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكَ لَمْ يَزَلْ يَخْلُفُكَ وَيَتَخَطّٰى اِلٰى غَيْرِكَ مُنْذُ اَنْتَ فِى الدُّنْيَا، وَكَاَنَّهٗ قَدْ تَخَطّٰى غَيْرَكَ اِلَيْكَ وَقَصَدَكَ، فَخُذْ حِذْرَكَ وَاسْتَعِدَّ لَهٗ، وَلَا تَغْفُلْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفُلُ عَنْكَ، وَاعْلَمْ اِبْنَ آدَمَ! اِنْ غَفَلْتَ عَنْ نَّفْسِكَ وَلَمْ تَسْتَعِدَّ لَمْ تَسْتَعِدَّ لَهَا غَيْرُكَ، وَلَا بُدَّ مِنْ لِّقَاءِ اللهِ! فَخُذْ لِنَفْسِكَ وَلَا تَكِلْهَا اِلٰى غَيْرِكَ. وَالسَّلَامُ!"

(کنز العمال ج:۱۵ حدیث:۴۲۷۹۰)

"عَنِ الْحَسَنِ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ رَضِىَ اللهُ عَنْهُ خَطَبَ النَّاسَ، فَحَمِدَ اللهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ:

اَيُّهَا النَّاسُ! اِتَّقُوا اللهَ! فَاِنَّ تَقْوَى اللهِ غُنْمٌ وَاِنَّ

اَكْيَسَ الْكَيِّسِ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ، وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَاكْتَسَبَ مِنْ نُوْرِ اللهِ نُوْرًا لِظُلْمَةِ الْقَبْرِ، وَلْيَخْشَ عَبْدٌ اَنْ يُحْشَرَهُ اللهُ اَعْمٰى وَقَدْ كَانَ بَصِيْرًا، وَقَدْ يُكْفَى الْحَكِيْمُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ، وَالْاَصَمُّ يُنَادٰى مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ، وَاعْلَمُوْا اَنَّ مَنْ كَانَ اللهُ مَعَهُ لَمْ يَخَفْ شَيْئًا، وَمَنْ كَانَ اللهُ عَلَيْهِ فَمَنْ يَّرْجُوْ بَعْدَهُ؟" (کنز العمال ج:۱۶ حدیث۴۴۲۵۱)

ترجمہ:......"حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا، اس میں ارشاد فرمایا کہ:

اے ابن آدم! بے شک موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے وہ ہمیشہ تجھ کو چھوڑ کر دوسروں کے پاس جاتا رہا جب سے تو دنیا میں آیا ہے، اور بس یوں سمجھ لے کہ اب وہ دوسروں کو چھوڑ کر تیرے پاس آنے والا ہے، اور وہ تیرے ارادے سے چلا ہے، لہٰذا اپنے بچاؤ کا سامان کرلو، اس کی تیاری کرلو، غفلت نہ کرو، اس لئے کہ تجھ سے غفلت نہیں کی جارہی۔ ابن آدم! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ اگر تو اپنی ذات سے غفلت کرے گا اور تیاری نہیں کرے گا تو دوسرا آدمی اس کے لئے تیاری نہیں کرے گا، اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات بہرحال ضروری ہے، سو اپنی ذات کے لئے حصہ لے اور اس کو دوسروں کے سپرد نہ کر۔"

ترجمہ:......"حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

لوگو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو! کیونکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا غنیمت کی چیز ہے، اور سب سے ہوشیار اور دانا آدمی وہ ہے جو اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے، اور قبر کے اندھیرے کے لئے اللہ تعالیٰ کے نور میں سے کچھ نور حاصل کرلے، بندے کو اس سے ڈرنا چاہئے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو اندھا اُٹھائے حالانکہ وہ دیکھنے والا تھا، حکیم اور دانا آدمی کے لئے چند مختصر کلمات کافی ہیں، اور بہرہ تو یوں لگتا ہے کہ وہ سنتا نہیں ہے، خوب جان لو! کہ جس شخص کے ساتھ اللہ ہو، وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتا اور اللہ تعالیٰ جس شخص کے مقابلے میں ہو وہ پھر اس کے بعد کس سے امید رکھے گا؟''

موت کا فرشتہ اب تمہارے پیچھے ہے:

یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مواعظ شریفہ ہیں، ان میں ایک بات تو یہ فرمائی کہ جب سے تم پیدا ہوئے ہو تم نے لوگوں کو مرتے دیکھا ہے، موت کا فرشتہ تم پر بھی مقرر کیا گیا ہے، لیکن وہ تجھ کو چھوڑ کر دوسروں کے پاس جاتا رہا، لیکن ایسا لگ رہا ہے کہ اب تمہارا نمبر آگیا، اب دوسروں کو چھوڑ کر تمہارے پاس آئے گا، مطلب یہ کہ فرشتے کا آنا کسی وقت بھی متوقع ہے، جو دوسروں کے پاس جاسکتا ہے، وہ تمہارے پاس بھی آسکتا ہے، اور جب اس کا آنا حتمی اور لازمی ٹھہرا تو تمہیں اپنی تیاری کرنی چاہئے، اپنا بوریا بستر تیار رکھو کہ جب موت کا فرشتہ تمہارے پاس آئے تو چل پڑو، اور اس سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔ ایک حدیث شریف میں چند نصیحتیں فرمائی گئی ہیں، ان میں سے ایک نصیحت یہ بھی ہے:

''اِذَا قُمْتَ فِیْ صَلٰوتِکَ فَصَلِّ صَلٰوۃَ مُوَدِّعٍ!''
(مشکوٰۃ ص:۴۴۵)

ترجمہ:...... ''جب تم نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو تو یوں سمجھو کہ بس اب یہ تمہاری آخری نماز ہے (جتنی بنا سنوار کے پڑھ سکتے ہو پڑھ لو)۔''

آخرت کا زادِ راہ تیار کرو:

اپنے لئے زادِ راہ کی تیاری کرلو، اور آئندہ جو خطرات پیش آنے والے ہیں، ان خطرات سے بچنے کا سامان کرو۔ بس دو ہی باتیں ہیں۔

گناہوں کا بوجھ!

ایک یہ کہ جو سامان لاد رہے ہو یہ دیکھ لو کہ اتنا اُٹھاکے چل بھی سکتے ہو کہ نہیں؟ جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے:

''مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِّنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّہٗ یُطَوَّقُہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِیْنَ.'' (مشکوٰۃ ص:۲۵۴)

ترجمہ:...... ''جس شخص نے کسی کی ایک بالشت بھی زمین ہتھیالی، قیامت کے دن سات زمینوں سے نکال کر وہ ٹکڑا اس کے گلے میں طوق کے طور پر پہنایا جائے گا۔''

ہم تو دس کلو مٹی بھی نہیں اُٹھاسکتے، اتنا بڑا بوجھ کیسے اُٹھائیں گے؟ یہاں تو زمین کو بڑھانے کی لالچ میں کہ میرا پلاٹ تھوڑا سا بڑا بن جائے دوسرے کی زمین پر قبضہ کرلیا، میرے بھائی! دوسرے کی زمین پر قبضہ نہیں کیا بلکہ اپنا بوجھ بھاری کرلیا، تمہارے گلے میں زمین کا یہ ٹکڑا پہنایا جائے گا اور پھر کہا جائے گا: شاباش اُٹھاؤ! تو موت سے غفلت نہ کرو، وہ تو آنی ہے، موت سے غفلت نہ کرو بلکہ اس کے لئے

تیاری کرو۔

دوسرا یہ کہ اپنا بچاؤ کرلو، آگے جو مشکلات آنے والی ہیں ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے توشہ ساتھ لو۔

اپنی آخرت کی خود فکر کرو:

پھر ارشاد فرمایا کہ: اے ابن آدم! اگر تو اپنے نفس سے غافل رہا اور اس کی تیاری نہ کی تو پھر تیری جگہ کون تیاری کرے گا؟

ایک صاحب یہاں ہوں گے، وہ کل مجھ سے مسئلہ پوچھ رہے تھے کہ کچھ صاحبان ہیں، ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا، کچھ نمازیں اور روزے اس کے ذمے ہیں، وہ ان کا فدیہ دینا چاہتے ہیں، کوئی چالیس سال کی نمازیں ان کے ذمہ تھیں، ان کا حساب لگایا تو کوئی دس لاکھ روپے بنے، ارے بھائی! تم نمازیں پڑھ نہیں سکتے یا اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی؟

کیا تیجے، دسویں، چالیسویں اور قرآن خوانی سے تیری مغفرت ہوجائے گی؟

کیا خیال ہے کہ بعد والے تیسرے دن یہ قل شریف کرواکر تمہاری بخشش کروالیں گے؟ تم نے قرآن مجید زندگی میں کبھی ختم نہیں کیا، اور نہ روزانہ تلاوت کی، لیکن موت کے دن یا تیسرے دن تمہارے لئے قرآن کریم ختم کرواکے تم سمجھتے ہو کہ تمہارا قرضہ ادا ہوجائے گا؟ بھلے آدمی! تم نے اپنے لئے کچھ نہیں کیا تو دوسرا تمہارے لئے کیا کرے گا؟ اگر تم اپنے لئے کچھ نہیں کروگے تو دوسرا تمہارے لئے کچھ نہیں کرے گا، اور تمہیں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ تیجہ، ساتواں، دسواں، چالیسواں کرتے ہیں، اس سے بخشش ہوجائے گی، نہیں بھائی! یہ تو محض رسمیں ہیں۔

قرآن خوانی کا حال:

لوگ کہتے ہیں کہ جی قرآن خوانی کروانی ہے، قرآن خوانی کا معنی ہے قرآن پڑھنا، پڑھنا آتا بھی ہے کہ نہیں؟ پوچھ لو ان سے کہ تمہیں قرآن پڑھنا آتا بھی ہے؟ اپنے خیال اور اپنے انداز سے قرآن پڑھتے ہیں، لیکن کبھی قرآن پڑھا اور سیکھا بھی تو ہو تو پڑھنا آئے، یہی وجہ ہے کہ قرآن خوانی والے ایک صفحے کو دو دو آدمی پڑھنے لگتے ہیں، ایک اِدھر سے اور ایک اُدھر سے، میرے بھائی! یہ تلاوت ہے یا تلاوت کا دھوکا؟ یاد رکھو اللہ تعالیٰ دھوکوں میں نہیں آتے اور اگر ہم تمہیں کہتے ہیں کہ بھائی! عقل کی بات کرو، سمجھ کی بات کرو، طریقے کی بات کرو، تو پھر کہتے ہو کہ: ہمیں روکتے ہیں! ہم تم کو نہیں روکتے بھائی! تم کرو جو چاہو کرو، لیکن یہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارا طرزِ عمل غلط ہے، کبھی حافظوں کو بٹھا لیتے ہیں اور ان کو اُجرت دیتے ہیں، اُجرت لے کر قرآن مجید کا پڑھنا، اس کا تو ثواب ہی نہیں ملتا، دو چار دن یہ رسمی باتیں کرتے ہیں، قل کر لئے، تیجہ، دسواں کر لیا، چالیسواں کر لیا، پھر سال بہ سال برسی پر یاد آگئے، پھر بھی ایک آدھ تقریب کر لی، دوست احباب کو اکٹھا کر لیا اور کھانا کھلا دیا تو گویا مرنے والے کا سارا فرض ہم نے ادا کر لیا، جس شخص کی ساٹھ سال یا ستر سال کی عمر ہوئی ہے کیا اس کے ذمہ اللہ تعالیٰ کا بس اتنا ہی فرض تھا؟ اور وہ ان رسموں سے ادا ہو گیا؟

آخرت کی تیاری کیا ہے؟

تو بھائی! اپنے لئے خود تیاری کرو، غفلت نہ کرو، آپ پوچھیں گے کہ تیاری کیا ہے؟ کیا تیاری کریں؟ بھائی! جن لوگوں کے حقوق و فرائض تمہارے ذمے ہیں ان کا جائزہ لو، اگر ادا نہیں کئے تو ادا کرو، فرائض کو ضائع کیا ہے تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو، اور آئندہ کے لئے ان فرائض کو ضائع نہ کرنے کا عہد کرو، اگر نمازیں نہیں پڑھی تھیں تو نمازوں کی قضا کرو، روزے نہیں رکھے تو روزے رکھو، پچھلے سالوں کی زکوٰۃ ادا

نہیں کی تو حساب کرکے اس کی زکوٰۃ دو، حج نہیں کیا تو حج کرو، کسی سے رشوت لی ہے، کسی کی کوئی چیز غصب کی ہے، کسی کے کچھ مالی حقوق غصب کئے ہیں اس سے معاف کرواؤ یا اس کو ادا کرو۔

آخرت کا مفلس:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"اَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ؟ قَالُوْا: اَلْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَّا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ! فَقَالَ: اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ یَّأْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِصَلٰوةٍ وَصِیَامٍ وَزَکٰوةٍ، قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَاَکَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَکَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا فَیُعْطٰی هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ، فَاِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ یُّقْضٰی مَا عَلَیْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَایَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَیْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ!" (مشکوٰۃ ص:۴۳۵)

ترجمہ:..... "جانتے ہو مفلس کون ہے؟ عرض کیا گیا: ہم تو مفلس اس کو کہتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہیں ہوتا! فرمایا: نہیں! میری امت کا مفلس آدمی وہ ہے جو نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ اور بہت ساری نیکیاں لے کر آئے، لیکن کسی کا مال کھایا تھا، کسی کی بے آبروئی کی تھی، کسی کو گالی دی تھی، اس کا ناحق مال کھایا تھا، اس کا ناحق خون بہایا تھا، اور اس کو مارا تھا، وغیرہ، پس اس کی نیکیوں سے ان اربابِ حقوق کے حقوق ادا کئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ نمازیں وہ لے جائے، روزے یہ لے جائے، زکوٰۃ یہ لے جائے، غرضیکہ ساری اس کی نیکیاں

> اہل حقوق لے جائیں گے اور یہ خالی کا خالی کھڑا رہ جائے، پھر اس کے حقوق اگر نیکیوں سے پورے ہوگئے تو ٹھیک! ورنہ پھر اہل حقوق کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے جائیں گے، اور اس کو اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا (یہ ہے میری امت کا مفلس!)۔"

ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے ذمہ اللہ تعالیٰ کے جو حقوق ہیں ان سے غفلت، بندوں کے جو حقوق ہمارے ذمہ ہیں ان سے غفلت، غرض غفلت ہی غفلت ہے اور اس کی فکر ہی نہیں، اور آگے کیا کیا منزلیں پیش آنے والی ہیں؟ ہمیں تو مرنے سے پہلے پہلے کی زندگی کی فکر کھائے جاتی ہے اور ستائے جاتی ہے کہ مہنگائی بہت ہوگئی ہے، بچے کیا کھائیں گے؟ کیا کریں گے؟ کیا نہیں کریں گے؟ زندگی کیسے گزاریں گے؟ ارے بھائی! یہ تو گزر جائے گی، جیسے کیسے گزر ہی جائے گی، اچھی گزر جائے، تنگی سے گزر جائے، گزر ہی جائے گی، لیکن مرنے کے بعد جو زندگی شروع ہونے والی ہے اس کے لئے کیا ہوگا؟ ہمیں اس کی بھی فکر کرنی چاہئے!!

مؤمن اپنے اور دوسروں کے لئے بھی آخرت کا سامان کرے:

فرماتے ہیں: ابن آدم! اپنے لئے تیاری کر، غفلت نہ کر، اگر تو اپنی ذات کے لئے تیاری نہیں کرے گا تو دوسرے آدمی تیرے لئے سامان نہیں کریں گے۔

اور میں تو کہتا ہوں کہ مؤمن آدمی کو دوسروں کے لئے بھی سامان کرنا ہوگا، دعا، استغفار، ایصالِ ثواب کرنا ہوگا۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی قدس سرہٗ کے صاحبزادے جناب حسن عباس صاحب فرماتے ہیں کہ: والد صاحب فرماتے ہیں کہ: اولاد کے ذمہ حق ہے کہ وہ آٹھویں دن اپنے ماں باپ کی قبر پر جائے، والدین کی قبر کی زیارت کرے، ان

کے لئے کچھ ایصالِ ثواب کرے، کچھ پڑھ کر بخشے، تمام اہلِ ایمان کے لئے بخشش کی دعا کرے اور جتنے مسلمان مرد اور عورتیں زندہ ہیں ان کے ایمان کی سلامتی کے لئے دعا کرے کہ یا اللہ! ایمان سلامت رکھ، خاتمہ بالخیر فرما۔

ہم لوگ تو اپنی تیاری سے غافل ہیں، دوسروں کے لئے کیا تیاری کریں گے؟

دوسروں کے لئے تیاری بھی دراصل اپنے لئے ہے:

اور یہ جو میں دوسروں کے لئے تیاری کہہ رہا ہوں حقیقت میں وہ بھی اپنے لئے ہے، اس لئے کہ جب تم دوسروں کے لئے مانگو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں پہلے عطا فرمائیں گے، تم دوسروں کے لئے خیر مانگو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں پہلے خیر عطا فرمائیں گے، دوسروں کے لئے بھلائی مانگو گے تو تمہیں اللہ تعالیٰ پہلے بھلائی عطا فرمائیں گے، اس لئے کہ مسئلہ ہے کہ دعائے مغفرت کرنی ہو، بخشش کی دعا کرنی ہو تو یوں کہا جائے: ''یا اللہ! میری بخشش فرما اور ایمان والے مردوں اور عورتوں کی بخشش فرما۔'' اس مختصر سے فقرے میں گویا تمام اہل ایمان کے لئے اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے، جو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے چلے آرہے ہیں اور قیامت تک جائیں گے، سب کے سب کے لئے دعا ہوگئی، ''یا اللہ! میری بھی بخشش فرما اور تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کی بھی بخشش فرما۔'' غرضیکہ حقوق و فرائض کو ادا کرو اور محرمات سے اور مکروہات سے بچو، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور ساتھ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتے رہو، اپنے لئے بھی اور اپنے والدین کے لئے بھی اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے بھی، مرد ہوں یا عورتیں سب کے لئے بخشش کی دعا کرتے رہو۔

کافر و مسلمان کی اللہ سے ملاقات کا حال:

فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ سے ملاقات تو لازم ہے!

مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے جانا ہے، کوئی روشن چہرہ لے کر جائے اور کوئی -نعوذ باللہ- منہ کالا کر کے جائے، اللہ تعالیٰ کی پناہ! بہرحال جانا ہے اور بارگاہِ خداوندی میں حاضری لازم ہے۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ:

”وَلٰکِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا حَضَرَ جَاءَهُ الْبَشِیْرُ مِنَ اللهِ بِمَا هُوَ صَائِرٌ اِلَیْهِ فَلَیْسَ شَیْءٌ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَ قَدْ لَقِیَ اللهَ فَاَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ فَاَحَبَّ اللهُ لِقَاءَهٗ، وَاِنَّ الْفَاجِرَ اِذَا حَضَرَ جَاءَهٗ مَا هُوَ صَائِرٌ اِلَیْهِ مِنَ الشَّرِّ فَکَرِهَ لِقَاءَ اللهِ کَرِهَ اللهُ لِقَاءَهٗ.“ (کنز العمال ج:۱۵ حدیث:۴۲۱۹۸)

ترجمہ:...... ”لیکن جب مؤمن کی وفات کا وقت قریب آتا ہے تو اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک خوشخبری سنانے والا فرشتہ حاضر ہوتا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا اعزاز و اکرام ہونے والا ہے اس سے اس کو آگاہ کرتا ہے، تو اس کے نزدیک اللہ سے ملاقات سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی، پس وہ اللہ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتے ہیں۔ رہا فاسق و فاجر! جب اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اس کے پاس بھی ایک فرشتہ آتا ہے جو اُسے وہ سب کچھ بتلاتا ہے جو اس کے ساتھ برا سلوک ہونے والا ہے، تو وہ اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتے ہیں۔“

یعنی نیک آدمی کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری ایسے ہوتی ہے جیسے کہ کوئی آدمی اپنے وطن سے دور تھا، بچھڑا ہوا تھا، موت کے بعد، ایک عرصے کے بعد اپنے گھر

میں آیا، جس طرح اس کو اپنے گھر والوں اور اہل وعیال سے مل کر خوشی ہوتی ہے، اسی طرح اس کو اللہ تعالیٰ سے مل کر خوشی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس سے مل کر بھی اتنی ہی خوشی ہوتی ہے۔ اور بدکار اور برے آدمی کی حاضری کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بھگوڑا غلام تھا، بھاگ گیا تھا، آقا نے آدمی دوڑائے اور کافی مدت تک وہ پریشان کرتا رہا، لیکن آخرکار وہ پکڑا گیا اور اسے پکڑ کر آقا کی خدمت میں لایا گیا، تو جس طرح اس کو اپنے آقا کے سامنے سزا کے خوف سے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے اور وہ اس کو مکروہ سمجھتا ہے، فاجر بھی ایسے ہی ملاقاتِ الٰہی سے گھبراتا ہے، تب اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتے ہیں۔ اب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تمہاری حاضری کیسے ہونے والی ہے؟ اس کا جائزہ لیتے رہو۔

فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ سے ملاقات تو ضروری ہے، لہٰذا تم اپنی ذات کے لئے توشہ تو تیار کرلو، اور اس توشہ کی تیاری کو دوسروں کے سپرد نہ کرو، اس لئے کہ تم اپنا توشہ خود ہی باندھو گے، تمہارا توشہ دوسرے نہیں باندھیں گے۔

سب سے بڑی دانائی!

دوسری روایت میں فرمایا کہ: لوگو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو! تقویٰ اختیار کرو! اس لئے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا غنیمت ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ:

سب سے اونچی حکمت اور حکمت کا صلہ، حکمت کی چوٹی اللہ سے ڈرنا ہے، جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا اس میں حکمت نہیں ہے، اور یہی بنیاد ہے تمام نیک اعمال کی اور تمام برے اعمال سے بچنے کی۔

> ”اللہ تعالیٰ سے ڈرو کہ یہ غنیمت ہے اور سب سے بڑا
> دانا اور عقل مند آدمی وہ ہے جو اپنے نفس کو حکمِ الٰہی کے تابع
> کردے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے تیاری کرے اور قبر

کے اندھیرے سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے نور میں سے کچھ نور لے کر جائے۔“

قبر میں نور کیونکر پیدا ہوگا؟

اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، مستقل رسالے لکھے ہیں کہ کون کون سی چیزیں ہیں جو قبر میں نور پیدا کرتی ہیں؟ قبر میں روشنی کا سبب ہیں، اور کون کون سی چیزیں ہیں جو قبر میں تاریکی کا سبب ہیں، پھر کون کون سی چیزیں ہیں جو عذابِ قبر کی موجب ہیں؟ اللہ تعالیٰ ان سے پناہ میں رکھے، اور کون کون سی چیزیں ہیں جو عذابِ قبر سے بچانے والی ہیں؟

عذابِ قبر کا خوف:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے کہ:

”كَانَ اِذَا وَقَفَ عَلٰى قَبْرٍ بَكٰى حَتّٰى يَبُلَّ لِحْيَتَهٗ، فَقِيْلَ لَهٗ: تَذْكُرُ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ فَلَا تَبْكِيْ وَتَبْكِيْ مِنْ هٰذَا؟ فَقَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الْقَبْرَ اَوَّلُ مَنْزِلٍ مِّنْ مَّنَازِلَ الْاٰخِرَةِ، فَاِنْ نَّجَا مِنْهُ فَمَا بَعْدَهٗ اَيْسَرُ مِنْهُ وَاِنْ لَّمْ يُنْجَ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهٗ اَشَدُّ مِنْهُ!“ (مشکوٰۃ ص:۲۶)

ترجمہ:...... ”(حضرت عثمانؓ) کبھی کبھی قبرستان جاتے تو اتنا روتے کہ ریش مبارک تر ہوجاتی، عرض کیا گیا کہ: حضرت! آپ جنت اور دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں تو اتنا نہیں روتے جتنا کہ قبر کو دیکھ کر روتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے، جو شخص یہاں نجات

پا گیا وہ انشاء اللہ آگے بھی نجات پا جائے گا جو یہیں پھنس گیا اس سے آگے کی کیا توقع ہے، اس کے بارے میں کیا توقع ہے؟''

یہ تو پہلی منزل ہے، قبر سے لے کر جنت تک برزخ کا فاصلہ، قیامت سے پہلے پہلے کا فاصلہ اور پھر قیامت کے دن کا پچاس ہزار سال کا فاصلہ اور خدا جانے اس میں کتنی منزلیں آنے والی ہیں، کیا کیا حالات پیش آنے والے ہیں، جو غریب پہلے مرحلے میں پکڑا گیا وہ آگے کیا کرے گا؟ حق تعالیٰ شانہ ہماری حفاظت فرمائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی قبروں کو منور فرمائے، قبر کے عذاب سے اور جو چیزیں عذابِ قبر کو ثابت کرنے والی ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان سے بچائے، تقریباً پندرہ کے قریب صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ حدیث مروی ہے، میں نے ایک مضمون میں تمام صحابہ کرام کے اسمائے گرامی کو جمع کیا تھا۔

عذابِ قبر کے اسباب:

عذابِ قبر سے متعلق ایک دوسری حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں:

''مَرَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی قَبْرَیْنِ فَقَالَ: اِنَّهُمَا لَیُعَذَّبَانِ! وَمَا یُعَذَّبَانِ فِیْ کَبِیْرٍ. ثُمَّ قَالَ: بَلٰی اَمَّا اَحَدُهُمَا فَکَانَ یَسْعٰی بِالنَّمِیْمَةِ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَکَانَ لَا یَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهٖ.'' (بخاری ج:۱ ص:۱۸۴)

ترجمہ:...... ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جارہے تھے فرمایا: یہ دو قبریں ہیں، ان دونوں قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے، کسی بڑی بات پر ان کو عذاب نہیں ہو رہا، ان میں سے ایک چغل خوری کیا کرتا تھا (آپ کی بات میرے پاس آکر لگائی اور میری بات آپ کے پاس جاکر لگائی، یہ بیماری عام

ہوگئی ہے، جیسے طاعون کی شکل اختیار کرگئی ہے، یہ وبائی شکل چغل خوری کرنا اور غیبت کرنا یہ چیز موجبِ عذابِ قبر ہے)۔ یہ دوسرا آدمی پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا۔''

یہ جتنے پینٹ پہننے والے ہیں سب ایسے ہی ہیں، ان کو نہ استنجے کی ضرورت پیش آتی ہے، نہ ڈھیلے کی، کھڑے ہوکر پیشاب کرلیتے ہیں، اور پھر یوں ہی فوراً بند کرلیتے ہیں۔

تو جن دو آدمیوں پر عذاب ہو رہا تھا ان میں ایک تو پیشاب کے چھینٹوں سے احتیاط نہیں کرتا تھا، پیشاب آدمی کا ہو یا جانوروں کا، اس سے احتیاط لازمی ہے۔ اور دوسرا لگائی بجھائی کرتا تھا، یعنی اِدھر کی اُدھر، اور اُدھر کی اِدھر پہنچا کر چغل خوری کرتا تھا، یہ بہت بڑا جرم ہے اس سے احتیاط کرو کہ یہ عذابِ قبر کا موجب ہے۔

تو خیر عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ بہت ساری چیزیں قبر کی ظلمت کا سبب ہیں، قبر کے اندر اندھیرے کا سبب ہیں، اور بہت ساری چیزیں قبر کی روشنی اور نور کا سبب ہیں، اسی کو فرمایا: قبر کی روشنی کے لئے اللہ تعالیٰ کے نور میں سے کوئی نور لے کر جاؤ، بہت ساری چیزیں عذابِ قبر کی موجب ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے بچائے اور بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو قبر کے عذاب سے بچانے والی ہیں، ان کا اہتمام کیا جائے۔

قبر جنت کا باغیچہ یا جہنم کا گڑھا ہے:

اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے، یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔'' نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! اللہ تعالیٰ ہماری قبروں کو ''رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ'' بنائے یعنی جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ بنائے، دوزخ کے گڑھوں میں سے گڑھا نہ بنائے۔

عذابِ قبر کا سوال حماقت ہے:

آج کل بیوقوف لوگ یہ پوچھتے پھرتے ہیں کہ قبر میں عذاب ہوتا بھی ہے؟ اللہ تعالیٰ کے بندو! تم کس چکر میں پڑگئے ہو؟ شیطان نے تم کو کس چکر میں ڈال دیا ہے؟ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر اعتبار نہیں رہا؟

شکر کرو کہ عذابِ قبر سنائی نہیں دیتا:

کہتے ہیں کہ ہمیں سنائی کیوں نہیں دیتا؟ یہ اس محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی وجاہت کا طفیل ہے کہ عذابِ قبر سنائی نہیں دیتا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم سے بن نہ پڑتی تمہاری زندگی اجیرن ہوجاتی، اگر تم قبر کا عذاب سن لیتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظِ مبارک یہ ہیں:

”فَلَوْ لَا اَنْ لَّا تَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ اللّٰہَ اَنْ یُّسْمِعَکُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِیْ اَسْمَعُ مِنْہُ!“ (مشکوٰۃ ص:۲۵)

ترجمہ:...... ”اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم اپنے مردوں کو قبر میں دفن کرنا چھوڑ دوگے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ تمہیں سنادے جو میں سنتا ہوں!“

قبر کا عذاب جو قبرستان میں ہورہا ہے، اگر تمہیں سنائی دیتا تو تمہیں قبرستان میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی، یہ اس محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا طفیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال دیا۔ اس پر شکر کرنے کی بجائے اُلٹا کہتے ہیں کہ: ہمیں کیوں نہیں سنائی دیا؟ شیشے کے مکان میں آدمی بند ہو تو آواز آگے نہیں جاتی، وہ ادھر سے سن رہا ہے، دیکھ رہا ہے، مگر آواز نہیں پہنچا سکتا، تمہارا یہ شیشہ آواز کو روک دیتا ہے، تو اگر اللہ تعالیٰ نے برزخ کا پردہ ڈال دیا ہے اور وہ روک رہا ہے تو تمہیں کیوں تعجب ہورہا ہے؟ تم کیوں اصرار کررہے ہو کہ ہمیں دیکھنا چاہئے اور ہمیں سننا چاہئے تو ہم مانیں! ذرا ٹھہر

جاؤ! تھوڑا وقت ہے، تم پر بھی یہ مرحلہ آئے گا، پھر اچھی طرح تجربہ کرلینا، اگر یہاں تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے سے نہیں مانتے تو تجربہ ہوجائے گا، فکر نہ کرو، اس میں جلدی کی کیا بات ہے؟

اندھے اُٹھائے جانے سے ڈرو!

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ: بندے کو اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو اندھا اُٹھائیں، حالانکہ وہ دیکھنے والا تھا۔

بعض مجرموں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے فرمایا:

''وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى. قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِىْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا. قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى.'' (طٰہٰ:۱۲۵، ۱۲۶)

ترجمہ:...... ''ہم اس کو اُٹھائیں گے قیامت کے دن اندھا، وہ کہنے لگا: اے میرے پروردگار! آپ نے مجھے اندھا اُٹھایا میں تو دیکھنے والا تھا! (کیا بات ہوئی؟) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اسی طرح آتی تھی تیرے پاس میری آیتیں تو نے اس کو بھلادیا (تو بصیرت کا اندھا تھا، دل کا اندھا تھا، آج وہ دل کا اندھاپن آنکھوں میں سرایت کرگیا)، آج تجھے بھی بھلادیا گیا۔''

اس پر حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو کہ قیامت کے دن اندھے اُٹھائے جاؤ گے، ایسی کوئی حرکت مت کرو، ایسے گناہوں کا ارتکاب نہ کرو کہ تمہیں نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ! قیامت کے دن اندھا اُٹھایا جائے۔

قیامت کے دن اندھا اُٹھائے جانے کے اسباب؟

اس لئے کہ بعض اعمال ایسے ہیں کہ ان سے آدمی کی ظاہری بصارت جاتی

رہتی ہے، دماغ پر ذرا سی چوٹ لگ جائے یا کوئی ایسا عارضہ پیش آجائے تو آنکھیں بند ہوجاتی ہیں، اسی طرح بعض اعمال ایسے ہیں جن سے دل کی بصیرت جاتی رہتی ہے، ایسے لوگ قیامت کے دن اندھے اُٹھائے جائیں گے، خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کا مذاق اُڑانا یا جیسے آج کل مولوی کو گالی دینا فیشن بن گیا ہے کہ مولوی ایسے ہیں، کیا مولوی اپنے باپ کے گھر سے کہتا ہے؟ مولوی کچھ نہیں کہتا بلکہ تمہارا خدا کہتا ہے! تمہارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتا ہے! مولوی کہاں سے کہتا ہے؟ تو مولوی کو نشانہ بنا کر اول فول باتیں کرتے ہو، لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا دل اندھا ہوگیا ہے، اور یہ دل کا اندھاپن قیامت کے دن تمہاری آنکھوں میں آجائے گا، اللہ تعالیٰ کہیں گے: ”وَكَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا“ (اسی طرح آتے تھے تیرے پاس میرے احکام تو نے ان کو بھلا دیا)۔

عقل مند کے لئے لمبے وعظ کی ضرورت نہیں:

اس کے بعد ارشاد فرمایا: دیکھو دانا آدمی کے لئے لمبے چوڑے وعظ کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے لئے ایک کلمہ حکمت ہی کافی ہوجاتا ہے۔ ایک حکمت کی بات کسی کے کان میں پڑجائے تو آدمی کی زندگی کی لائن بدل دیتی ہے، بشرطیکہ دل میں بصیرت ہو، جس شخص نے اپنے آپ کو بہرا کرلیا ہو، اِدھر سے سنا اور اُدھر سے نکال دیا، گویا کہ سنا ہی نہیں، اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دور سے پکار پکار کر چلّا چلّا کر آواز دے رہا ہے، مگر وہ سنتا ہی نہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

”وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ.“ (سبا:۵۲)

ترجمہ:...... ”یہ وہ لوگ ہیں جن کو پکارا جارہا ہے دور کی جگہ سے۔“

دور سے جب آدمی کسی کو بلاتا ہے تو زور لگا کر بلاتا ہے، چلّاتا ہے، لیکن

یہ پھر بھی سننے کے لئے تیار نہیں، جس شخص نے اپنے آپ کو بہرا بنالیا ہو اس کے سامنے اگر کوئی چلاّ چلاّ کر بھی کہے، اس کی عقل میں بات نہیں آتی، خواہ اسپیکر میں ہی کہا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی مخالفت نہیں، معیت کو اپناؤ!

اور اس کے بعد آخری بات یہ فرمائی کہ: یہ بات خوب یاد رکھو کہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہو اس کو کسی اور کا ڈر نہیں، اور جس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ ہو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے بعد کسی اور سے کیا امید رکھے گا؟ کون ہے جس سے امید رکھے؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ساتھ لے کر چلو، اپنی زندگی کے نقشے ایسے بناؤ کہ اللہ تعالیٰ کو ساتھ لے لو، اللہ تعالیٰ کی معیت تمہارے ساتھ ہو، اللہ تعالیٰ تمہارے طرف دار ہوں تو انشاء اللہ تعالیٰ پھر کسی کی پرواہ نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جن کا خطبہ آپ سن رہے ہیں، ان کو شہید کیا گیا تھا، تو خون کا جب پہلا چھینٹا مصحف شریف پر پڑا تو قرآن مجید پڑھ رہے تھے، وہ قرآن کریم تاشقند میں موجود ہے، مصحف پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پہلا چھینٹا جو پڑا وہ اس آیت شریفہ پر پڑا، پہلے پارے کا بالکل آخر ہے:

''فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ'' (البقرۃ:۱۳۷)

ترجمہ:......''تیری کفایت کرے گا اللہ تعالیٰ ان کے مقابلے میں!''

شہید ہوگئے وہ تو سعادت ہے، لیکن پھر دیکھا کیسی کفایت کی اللہ تعالیٰ نے، آج تک تم جمع نہیں ہوئے، امت آج تک جمع نہیں ہوئی، ایک ایک کو چن چن کر اللہ تعالیٰ نے ہلاک کیا، تو اللہ کو ساتھ لے کر چلو اور اللہ تعالیٰ کو اپنا مقابل بنا کر نہ چلو، اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کروگے تو اللہ تعالیٰ کو اپنا مقابل بناؤ گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

آخرت کے بیٹے!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"..... وَمَنْ لَا يَنْفَعُهُ حَاضِرُهُ فَعَازِبُهُ عَنْهُ اَعْوَرُ وَغَائِبُهُ عَنْهُ اَعْجَزُ وَاِنَّكُمْ قَدْ اُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ وَدُلِلْتُمْ عَلَى الزَّادِ اَلَا! وَاِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمْ اِثْنَانِ: طُوْلُ الْاَمَلِ وَاتِّبَاعُ الْهَوٰى! فَاَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَيُنْسِي الْآخِرَةَ، وَاَمَّا اِتِّبَاعُ الْهَوٰى فَيُبْعِدُ عَنِ الْحَقِّ. اَلَا! وَاِنَّ الدُّنْيَا قَدْ تَرَحَّلَتْ مُدْبِرَةً وَاِنَّ الْآخِرَةَ قَدْ تَرَحَّلَتْ مُقْبِلَةً وَلَهُمَا بَنُوْنٌ، فَكُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الْآخِرَةِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ، وَلَا تَكُوْنُوْا مِنْ بَنِي الدُّنْيَا، فَاِنَّ الْيَوْمَ عَمَلٌ وَّلَا حِسَابٌ، وَغَدًا حِسَابٌ وَّلَا عَمَلٌ!" (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۰۸)

ترجمہ:...... "اور جس کو اس کا حاضر (یعنی جو چیزیں کہ اس کے سامنے موجود ہیں) نفع نہ دیں، تو جو چیزیں کہ اس سے غائب ہیں، پوشیدہ ہیں ان سے وہ زیادہ اندھا ہوگا، اور جو چیزیں کہ اس سے غائب ہیں ان سے زیادہ عاجز ہوگا، اور

بے شک کہ تم کو حکم کیا گیا ہے کوچ کرنے کا، اور تم کو بتادیا گیا ہے توشہ لینے کا، خوب سن رکھو! کہ سب سے زیادہ خوفناک چیز جس کا میں اندیشہ کرتا ہوں تمہارے حق میں وہ دو ہیں: ایک لمبی لمبی امیدیں رکھنا، اور دوسرے خواہشِ نفس کی پیروی کرنا۔ رہا امیدوں کا لمبا ہونا، یہ آخرت کو بھلادیتا ہے، اور رہا خواہش کی پیروی کرنا یہ آدمی کو حق سے دور کردیتا ہے۔ خوب سن رکھو! کہ دنیا پشت پھیر کر جارہی ہے، اور آخرت ہماری طرف متوجہ ہوکر تیزی سے آرہی ہے، اور ان دونوں کے کچھ بیٹے ہیں، سو اگر تم سے ہوسکے تو آخرت کے بیٹوں میں سے بنو! دنیا کے بیٹوں میں سے نہ بنو، کیونکہ آج کا دن عمل کا ہے حساب کا نہیں، اور کل کو حساب ہوگا عمل نہیں ہوگا۔''

ظاہر اور پوشیدہ سے عبرت!

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبہ کے آخری جملے تھے، جن کو میں بیان کر رہا تھا کہ جس شخص کو سامنے کی چیزیں نفع نہیں دیتیں اور ان سے وہ عبرت نہیں پکڑتا، تو جو چیزیں کہ اس سے پوشیدہ ہیں، وہ ان کے بارے میں زیادہ اندھاپن اختیار کرے گا۔ جب آنکھوں دیکھی چیز سے یہ عبرت نہیں پکڑتا تو جو چیزیں اس کی نظر سے پوشیدہ ہیں کیا توقع ہے کہ وہ ان سے عبرت پکڑے گا؟ جب کوئی سامنے کی چیزوں سے عبرت نہیں پکڑتا اور عمل پر آمادہ نہیں ہوتا، تو جو چیزیں کہ اس سے غائب ہیں ان کو سننے کے بعد یہ کیونکر عمل پر آمادہ ہوگا؟ مشہور ہے کہ:

''اَلسَّعِیْدُ مَنْ وَعَظَ بِغَیْرِہٖ!'' (اتحاف ج:۱۰ ص:۲۳۵)

ترجمہ:...... ''نیک بخت وہ ہے جو دوسرے سے عبرت

پکڑے!"

یعنی دوسروں پر جو حالات گزر رہے ہیں، ان حالات کو دیکھ کر عبرت پکڑے، مرنے والے مر رہے ہیں، ہمیں ان سے عبرت پکڑنا چاہئے کہ ایک دن ہمیں بھی مرنا ہے، مرنے والا اپنے بیوی بچوں، گھر بار، اور کاروبار کو چھوڑ کر چلا گیا، اب نہ کوئی اس فیصلہ خداوندی کے خلاف اپیل کرسکتا ہے اور نہ مرنے والے کو کوئی واپس لاسکتا ہے، اور اگر وہ بیچارہ واپس آ بھی جائے تو کوئی اس کو قبول ہی نہیں کرے گا، دوسروں کو چاہئے کہ اس سے عبرت پکڑیں اور سوچیں کہ ہمارے ساتھ بھی یہی ہونے والا ہے!

قبر سے واپس آنے والے کا قصہ:

ایک قصہ ہم نے پڑھا تھا کہ ایک شخص کا انتقال ہوا، اس کو دفن کردیا گیا، حقیقت میں اس کا انتقال نہیں ہوا تھا بلکہ اس کو سکتہ ہوگیا تھا، سکتہ ایک بیماری ہوتی ہے جس سے آدمی مُردے جیسا ہوجاتا ہے، حالانکہ وہ زندہ ہوتا ہے، نبض بھی بند ہوجاتی ہے، دل کی حرکت بھی بند ہوجاتی ہے، پھر یہ سکتہ بعض اوقات دو دو دن، تین تین دن رہتا ہے، لیکن روح کا تعلق بدن سے قائم ہوتا ہے، اس کی علامتیں اطبا بتاتے ہیں، مگر ایک موٹی سی علامت یہ ہے کہ روح جب بدن سے جدا ہوجاتی ہے تو جسم میں تغیر پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے، لیکن اگر سکتہ کی بیماری ہو تو جسم میں تغیر وغیرہ نہیں ہوتا، کئی کئی دنوں سے آدمی سکتہ میں پڑا ہوتا ہے، ہاتھ ہلاؤ تو ہاتھ ہلیں گے، اسی طرح دوسرے اعضا کو حرکت دو، وہ بھی حرکت کریں گے۔

تو خیر اس بے چارے کو سکتہ کی بیماری ہوگئی، ورثا نے اس کو مُردہ سمجھ کر دفن کردیا، جب لوگ اس کو دفن کرکے گھر واپس آگئے تو قبر میں اس کے سکتہ کی بیماری دور ہوگئی اور کوئی ایسی صورت ہوگئی ہوگی کہ قبر سے کراہنے کی آواز آئی، کسی نے سوچا کہ بھائی یہ تو قبر کے اندر کوئی زندہ آدمی ہے، اس کی قبر کھولی تو یہ کفن پہنے ہوئے زندہ نکل

آیا، قبر کھولنے والے نے اس سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ کہنے لگا: میں زندہ تھا، لوگ مجھے دفن کر کے چلے گئے، حالانکہ مجھے سکتہ کی بیماری تھی! اس آدمی نے کہا کہ: تم کون ہو؟ تمہارا گھر کہاں ہے؟ اس نے سب کچھ بتادیا، شام کا وقت تھا، وہ اپنے گھر چلا گیا اور اس نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی، اس کا لڑکا نکلا، اس نے جو دیکھا تو ابا سامنے کھڑا ہے، اس نے سمجھا کہ ابا کی شکل میں کوئی جن آگیا ہے، کیونکہ ابا کو تو وہ اپنے ہاتھوں سے دفن کر آئے تھے، اس لئے گھر والوں نے اس کو قبول نہیں کیا، بلکہ یہ منظر دیکھ کر ان کے ہوش اُڑ گئے، اب وہ بیچارہ کہتا ہی رہا کہ میں فلاں ہوں! مگر لوگوں نے کہا کہ: اس کو تو ہم دفن کر کے آئے ہیں، اتنے میں اس کے لڑکے نے اس کے سر پر کوئی چیز ماری، وہ وہیں ڈھیر ہوگیا، وہیں مرگیا۔ تم ذرا قبر سے اُٹھ کر آ کے تو دکھاؤ! اول تو تمہیں اُٹھنے کون دے گا؟ اور اگر اُٹھ کر آ بھی گئے، تو جنہوں نے تمہیں گھر سے نکال دیا تھا یعنی قبرستان پہنچا آئے تھے، اب وہ قبول نہیں کریں گے۔

تو یہ مطلب ہے کہ جب تم سامنے کی چیزوں کو دیکھ کر عبرت نہیں پکڑتے تو جو چیزیں تمہاری نظر سے غائب ہیں، پوشیدہ ہیں ان کے معاملہ میں تو اس سے بھی زیادہ اندھاپن اختیار کروگے۔

میدانِ حشر کی ہولناکی:

ہم لوگ قبر کے حالات سنتے ہیں، اس سے کوئی عبرت نہیں، قیامت کے دن کے احوال سنتے ہیں، اس کی ہولناکیاں سنتے ہیں، وہاں کا حساب و کتاب، حقوق کا دلایا جانا، لوگوں کا مارے مارے پھرنا وغیرہ، مگر پھر بھی ہم اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے، میدانِ حشر کی ہولناکی کا تذکرہ قرآن کریم میں یوں فرمایا گیا ہے:

"یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ. وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ. وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ. لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ." (عبس:۳۴ تا ۳۷)

ترجمہ:......"جس دن بھاگے گا آدمی اپنے بھائی سے،
اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے، اور اپنی بیوی سے اور اپنے
بچوں سے، ہر آدمی کے لئے ایک ایسی حالت ہوگی جو اس کو
کفایت کرے گی، دوسری طرف متوجہ نہیں ہوسکتا۔"

ایک نیکی کوئی نہیں دے گا:

وہ حدیث شریف میں مشہور قصہ ذکر فرمایا گیا ہے، آپ نے بھی کئی دفعہ سنا ہوگا کہ:

"اِنَّهٗ یُؤْتٰی بِرَجُلٍ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَمَا یَجِدُ لَهٗ حَسَنَةً تُرَجِّحُ مِیْزَانَهٗ وَقَدْ اِعْتَدَلَتْ بِالسَّوِیَّةِ، فَیَقُوْلُ اللهُ تَعَالٰی لَهٗ رَحْمَةً مِّنْهُ: اِذْهَبْ فِی النَّاسِ فَالْتَمِسْ مَنْ یُّعْطِیْکَ حَسَنَةً اُدْخِلُکَ بِهَا الْجَنَّةَ! فَیَسِیْرُ یَجُوْسُ خِلَالَ الْعَالَمِیْنَ، فَمَا یَجِدُ اَحَدًا یُّکَلِّمُهٗ فِیْ ذٰلِکَ الْاَمْرِ اِلَّا یَقُوْلُ لَهٗ: خِفْتُ اَنْ یَخِفَّ مِیْزَانِیْ، فَاَنَا اَحْوَجُ مِنْکَ اِلَیْهَا! فَیَیْأَسُ فَیَقُوْلُ لَهٗ رَجُلٌ: مَا الَّذِیْ تَطْلُبُ؟ فَیَقُوْلُ: حَسَنَةً وَّاحِدَةً! فَلَقَدْ مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَهُمْ مِنْهَا اُلُوْفٌ فَبَخِلُوْا عَلَیَّ، فَیَقُوْلُ لَهُ الرَّجُلُ: لَقَدْ لَقِیْتُ اللهَ تَعَالٰی فَمَا وَجَدْتُّ فِیْ صَحِیْفَتِیْ اِلَّا حَسَنَةً وَّاحِدَةً وَمَا اَضُنُّهَا تُغْنِیْ عَنِّیْ شَیْئًا خُذْهَا هِبَةً مِّنِّیْ اِلَیْکَ. فَیَنْطَلِقُ فَرِحًا مَسْرُوْرًا، فَیَقُوْلُ اللهُ لَهٗ: مَا بَالُکَ؟ وَهُوَ اَعْلَمُ، فَیَقُوْلُ: رَبِّ اتفق مِنْ اَمْرِیْ کَیْتَ وَکَیْتَ، ثُمَّ یُنَادِیْ سُبْحَانَهٗ بِصَاحِبِهِ الَّذِیْ وَهَبَهُ الْحَسَنَةَ فَیَقُوْلُ لَهٗ سُبْحَانَهٗ: کَرَمِیْ اَوْسَعُ مِنْ کَرَمِکَ،

خُذْ بِيَدِ اَخِيْکَ وَانْطَلِقَا اِلَى الْجَنَّةِ۔"

(التذکرہ فی احوال الموتیٰ وامور الآخرۃ، علامہ قرطبیؒ، دارالکتب العلمیہ بیروت، ص:۳۷۱، رسائل غزالی تحت الدرۃ الفاخرۃ فی کشف علوم الآخرۃ، امام غزالیؒ، ص:۱۳۶، ۱۳۷، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

ترجمہ:......"قیامت کے دن ایک ایسے آدمی کو لایا جائے گا جس کے گناہ اور نیکیاں برابر ہوں گی، اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے اُسے فرمائیں گے: جاؤ! کسی سے ایک نیکی مانگ لاؤ تاکہ تیری نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوجائے اور تجھے جنت میں داخل کردیں۔ وہ میدانِ حشر میں نیکی کی تلاش میں چکر لگائے گا، اور ہر ایک سے ایک نیکی کا سوال کرے گا، مگر اس سلسلہ میں اس سے کوئی بات نہیں کرے گا، ہر ایک کو یہ خوف دامن گیر ہوگا کہ کہیں میری نیکیوں کا پلڑا ہلکا نہ ہوجائے اور مجھے ایک نیکی کی ضرورت نہ پڑجائے، یوں ہر ایک اپنی ضرورت اور احتیاج کے پیش نظر اسے ایک نیکی دینے سے انکار کردے گا، وہ مایوس ہوجائے گا کہ اتنے میں اس کی ایک آدمی سے ملاقات ہوگی، جو اُسے کہے گا: کیا تلاش کر رہے ہو؟ یہ کہے گا کہ: ایک نیکی تلاش کر رہا ہوں! پورے خاندان اور قوم سے ملا ہوں، ہزاروں نیکیاں رکھنے کے باوجود کوئی ایک نیکی دینے کا روادار نہیں، سب نے ایک نیکی دینے سے بخل کا مظاہرہ کیا ہے، وہ شخص اسے کہے گا کہ: میرے نامہ اعمال میں صرف ایک ہی نیکی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ ایک نیکی مجھے کوئی نفع نہیں دے گی، لہٰذا یہ نیکی آپ میری طرف سے بطور ہبہ قبول کیجئے! وہ شخص ایک نیکی لے کر

خوش و خرم بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوگا، تو اللہ تعالیٰ باوجود عالم
الغیب ہونے کے اس سے پوچھیں گے: کہاں سے لائے؟ وہ اپنا
پورا قصہ کہہ سنائے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس ایک نیکی والے کو بلاکر
فرمائیں گے: میرا کرم و احسان تیری سخاوت سے وسیع تر ہے!
اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ اور دونوں جنت میں جاؤ۔ یوں وہ دونوں
جنت میں چلے جائیں گے۔''

یعنی ایک آدمی کا نامۂ اعمال تولا جائے گا، نیکیاں اور بدیاں برابر ہوجائیں گی، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کہیں سے ایک نیکی لے آؤ تو تمہارے لئے جنت کا فیصلہ ہوجائے گا!

چاہئے تو یہ تھا کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے کہتا کہ: ایک نیکی کس سے مانگوں؟ آپ ہی سے کیوں نہ مانگ لوں، کہاں مارا مارا پھروں گا؟ آپ احکم الحاکمین ہیں، ایک نیکی انعام کے طور پر اپنے پاس سے عطا کردیجئے، میرا بیڑا پار ہوجائے گا! لیکن شاید اس سے مجاہدہ کرانا ہوگا جو اس نے دنیا میں نہیں کیا، اب آخرت کی ہولناک تپش میں وہ مارا مارا پھرے گا، بھائی کے پاس جائے گا، بھائی نہیں مانے گا، وہ کہے گا کہ: میرا تو کوئی بھائی نہیں تھا! ماں کے پاس جائے گا تو وہ کہے گی کہ: میں نے تو نکاح ہی نہیں کیا! میری اولاد کہاں سے آگئی؟ بیوی کے پاس جائے گا تو وہ کہے گی کہ: تو کون ہوتا ہے؟ میں نے تو کبھی شوہر نہیں کیا تھا! اولاد کے پاس جائے گا وہ بھی نہیں ماننے گی، کہنے لگے گی کہ: ہم تو بغیر باپ کے ہی پیدا ہوئے تھے! اس نے سارے دروازے کھٹکھٹا کے دیکھ لئے، ساری جگہ پھر کے دیکھ لیا، سب سے مل کر دیکھ لیا، تمام عزیزوں نے صاف صاف جواب دے دیا، سب لوگ ایک نیکی تک نہیں دے رہے۔ بالآخر وہ پریشان حال چلتے چلتے ایک آدمی کے پاس سے گزرے گا، وہ کہے گا کہ: کیا قصہ ہے کہ بہت پریشان نظر آتے ہو؟ وہ اپنا ماجرا بتائے گا کہ جنت میں جانے کے

لئے ایک نیکی کی ضرورت ہے، وہ کہے گا کہ: بھائی! ہمارے نامۂ اعمال میں تو ہے ہی ایک نیکی، باقی سب بدیاں ہی بدیاں ہیں، جب تمہیں ایک نیکی نہ ہونے کی وجہ سے جنت میں جانے کی اجازت نہیں مل رہی تو ہمارے لئے تو ظاہر ہے کہ جہنم واجب ہے! ان بدیوں کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ اتنی ساری نیکیاں کہاں سے لائیں گے؟ چلو بھائی! ایک نیکی تم لے جاؤ! تمہارا تو کام بن جائے، ہمارے لئے تو پہلے بھی دوزخ میں جانا تھا، اب بھی دوزخ میں جانا ہے، اس سے زیادہ اور کیا ہوگا؟ ایک نیکی دے کر بھی ہمارا کیا نقصان ہوگا؟ لے جاؤ یہ نیکی تم اپنا کام چلاؤ! اللہ تعالیٰ کو تو سب کچھ معلوم ہی ہے، وہ نیکی لے کر جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ: کس نے دی ہے؟ تمہارے ابا نے؟ کہے گا: نہیں! اماں نے؟ کہنے لگے گا کہ: نہیں! بیوی نے؟ کہے گا کہ: نہیں! اولاد نے؟ کہے گا کہ: نہیں! آخر کس نے دی؟ کہے گا کہ: ایک آدمی ملا تھا، اس غریب کے پاس ایک ہی نیکی تھی، اس نے کہا: یہ نیکی تم لے جاؤ! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اس کو جنت میں پہلے بھیجو! وہ آگے ہوگا اور یہ اس کے پیچھے ہوگا۔

تو ہم یہ سب کچھ سنتے ہیں لیکن ان سنی ہوئی باتوں سے ہمیں کیا عبرت ہو؟ اس کو امیرالمؤمنین رضی اللہ عنہ فرمارہے ہیں جو آنکھوں دیکھی چیزوں سے عبرت نہیں پکڑتا تو وہ ان چیزوں سے جو اس سے غائب ہیں اور جن کے بارے میں صرف سنا ہے، ان سے کیا عبرت پکڑے گا؟

اولاد کا باپ کو دنیا ہی میں برداشت نہ کرنا:

میرے سامنے دسیوں کیس اس قسم کے آئے کہ بڑے میاں کو نہ اس کی بیوی قبول کرتی ہے اور نہ اولاد قبول کرتی ہے، آپ نے بھی ایسے واقعات سنے ہوں گے، ساری عمر ان کو کھلا کھلا کر موٹا کیا اور ان کے لئے اپنا دین بھی برباد کیا، دنیا بھی برباد کی، لیکن آج جب بڑے میاں معذور ہوگئے تو ان کو جواب دے دیا گیا، بڑے میاں

کی کھانسی برداشت نہیں ہوتی، بڑھاپے میں بچارا کھانستا ہے، اس کو ساری ساری رات نیند نہیں آتی، اور ان لوگوں کو اس کی کھانسی برداشت نہیں ہوتی، کہتے ہیں کہ: یہ بوڑھا ساری رات سونے نہیں دیتا! یہ صرف ایک واقعہ نہیں بلکہ بہت سارے واقعات ہیں، تو قبر کے معاملات اور حشر کے معاملات، دوزخ کے معاملات اور جنت کے معاملات یہ تو ابھی ہم سے غائب ہیں، عالم غیب ہے، یہ ابھی کھلا نہیں، اس عالم شہادت سے تم عبرت نہیں پکڑتے تو عالم غیب سے کیا عبرت پکڑو گے؟

ظالم سے ظلم کا بدلہ لیا جائے گا:

تم یہاں نہیں دیکھتے ہو کہ ظالم کو اللہ تعالیٰ پکڑتے ہیں اور بدلہ لیتے ہیں، اس کے باوجود لوگوں کو عبرت نہیں ہوتی، بھائی کبھی کسی پر ظلم نہ کیا جائے، آج تو حالت یہ ہو چکی ہے کہ کسی کے ہاتھ یتیم کا مال لگ جائے تو اس کو پرواہ نہیں وہ کھا پی جاتا ہے، قرآن نے کہا ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتَامٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ نَارًا." (النسآ:۱۰)

ترجمہ:...... "جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں تو وہ مال نہیں کھاتے بلکہ وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں!"

قبر میں بداعمالیوں کے سانپ کا قصہ:

گزشتہ جمعہ کو میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے ایک قصہ سنایا تھا نا! جس کی بیہقی اور ابن ابی الدنیا نے یوں نقل کیا ہے:

"اخرجه ابن ابی الدنیا والبیهقی فی شعب الایمان عن عبدالحمید بن محمود المعولی قال: کُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ ابْنَ عَبَّاسٍ فَاَتَاهُ قَوْمٌ فَقَالُوْا: اِنَّا خَرَجْنَا

حُجّاجًا مَعَنَا صَاحِبٌ لَّنا حَتّٰی اَتَیْنَا ذَاتَ الصِّفَاحِ، فَمَاتَ فَهَیَّأْنَاهُ، ثُمَّ انْطَلَقْنَا، فَحَفَرْنَا لَهُ قَبْرًا لَحِدْنَا لَهُ، فَلَمَّا فَرَغْنَا مِنْ لَحْدِهٖ، فَاِذَا نَحْنُ بِاَسْوَدَ قَدْ مَلَأَ اللَّحْدَ، فَتَرَكْنَاهُ وَحَفَرْنَا لَهُ مَكَانًا آخَرَ، فَلَمَّا فَرَغْنَا مِنْ لَحْدِهٖ اِذَا نَحْنُ بِاَسْوَدَ قَدْ مَلَأَ اللَّحْدَ فَتَرَكْنَاهُ وَاَتَیْنَاکَ، فَقَالَ اِبْنُ عَبَّاسٍ: ذَاکَ الْغُلُّ الَّذِیْ یَغُلُّ - ولفظ البیهقی -: ذٰلِکَ عَمَلُهُ الَّذِیْ کَانَ یَعْمَلُ، اِنْطَلِقُوْا فَادْفِنُوْهُ فِیْ بَعْضِهَا، فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ! لَوْ حَفَرْتُمُ الْاَرْضَ کُلَّهَا لَوَجَدْتُّمُوْهُ فِیْهَا. فَانْطَلَقْنَا فَدَفَنَّاهُ فِیْ بَعْضِهَا، فَلَمَّا رَجَعْنَا سَأَلْنَا اِمْرَأَتَهُ مَا کَانَ یَعْمَلُ زَوْجُکِ؟ قَالَتْ: کَانَ یَبِیْعُ الطَّعَامَ فَیَأْخُذُ کُلَّ یَوْمٍ عَنْهُ قُوْتَ اَهْلِهٖ، ثم یقرض الفصل فَیُلْقِیْهِ فِیْهِ.''

(شرح الصدور بشرح حال الموتیٰ فی القبور ص۱۷۴، طبع دارالکتب العلمیہ بیروت)

ترجمہ:...... ''ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے شعب الایمان میں عبدالحمید بن محمود معولی سے نقل کیا ہے کہ میں ایک دن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آکر کہنے لگے کہ: ہم حج کرنے آئے تھے، ہمارے ساتھ ایک صاحب تھے جن کا انتقال ہوگیا، ہم نے ان کے غسل وکفن سے فراغت کے بعد ان کے لئے قبر کھودی، ابھی ہم اس کی تدفین کرنا ہی چاہتے تھے کہ دیکھا کہ اس قبر میں ایک بہت بڑا کالا سانپ ہے، جس نے قبر کو بھر رکھا ہے، ہم نے وہ جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ قبر کھودی، تو وہاں بھی یہی معاملہ تھا، تب ہم آپ کے پاس آئے ہیں کہ

ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ابن عباسؓ نے فرمایا: یہ اس کا وہ دھوکا اور کھوٹ ہے جو کیا کرتا تھا۔ بیہقی کے الفاظ ہیں کہ: یہ اس کا وہ عمل ہے جو وہ کیا کرتا تھا۔ جاؤ! اس کو ان میں سے کسی قبر میں دفن کردو، مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! تم پوری زمین میں جہاں اس کے لئے قبر کھودو گے اس سانپ کو وہاں پاؤ گے۔ راوی کہتا ہے کہ: ہم نے ان میں سے ایک قبر میں اس کو دفن کردیا، جب ہم حج سے فارغ ہوکر گھر لوٹے تو اس کی بیوی کے پاس گئے، اور اس سے پوچھا کہ تیرا شوہر کیا عمل کرتا تھا؟ اس نے کہا: گندم کی تجارت کرتا تھا، جتنا روز کا گھر کا خرچہ ہوتا وہ اتنا نکال لیتا تھا اور اس کی جگہ گندم کا ردی حصہ یعنی جو وغیرہ اس میں ملاکر وزن برابر کردیتا تھا۔‘‘

یعنی حاجیوں کا قافلہ جارہا تھا، ایک حاجی کا راستے میں مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ کر انتقال ہوگیا، اس کو کفن دینے کے بعد نماز جنازہ پڑھ کر دفن کرنے لگے، قبر کھودی تو ایک بہت بڑا سانپ جس کو اژدہا کہتے ہیں، اس نے پوری لحد گھیری ہوئی ہے، لوگ حیرت زدہ ہوگئے، دوسری جگہ کھودی تو وہاں بھی یہی ہوا، تیسری جگہ کھودی تو وہاں بھی یہی صورتِ حال، تو لوگ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گئے اور کہا کہ: حضرت! کیا کریں؟ فرمایا: ساری دنیا کی زمین بھی کھودلوگے تو یہ تمہیں وہاں بھی ملے گا، یہ اس کا عمل ہے، سانپ نہیں ہے!

یہ جو قبر میں ہم سانپ اور بچھو کا سنتے ہیں، یہ حقیقتِ واقعہ ہے، یہ محض ڈرانے کی باتیں نہیں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشادات ہیں، اور یہ سانپ اور بچھو اور دوسرے کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض اور دوسری بلائیں یہ ساری کی ساری اس کے اپنے اعمال ہیں، اور جو قبر ”رَوْضَةٌ مِّنْ رِیَاضِ الْجَنَّةِ“ یعنی

جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے، یہ بھی اپنے اعمال ہیں۔ تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کو اسی قبر میں دفن کردو! تم ساری روئے زمین بھی کھودلو گے تو یہ وہاں ضرور نکلے گا، کیونکہ یہ اس کا اپنا عمل ہے! پھر کہتے ہیں کہ ہم نے اس کو وہیں دھکیل کر (ڈر اور خوف تو تھا ہی) جلدی سے اوپر سے بند کردیا۔

ملاوٹ کا وبال:

واپس آئے تو اس کے گھر گئے، اس کی بیوی سے پہلے تعزیت کی اور پھر پوچھا: یہ کیا بات تھی؟ سارا قصہ اس کو سنایا، کہنے لگی کہ: غلے کا کاروبار کرتا تھا، جتنی آج کی ضرورت ہوتی اتنے گیہوں نکال لیتا اس کی جگہ ''جو'' ڈال دیتا، وزن پورا رکھتا تھا۔ تاجر حضرات سن لیں! ملاوٹ کرنے والے اتنے سے نفع کے لئے اتنا نقصان کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

> ''وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ. الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ. وَإِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ. اَ لَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُم مَّبْعُوْثُوْنَ. لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ. يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ.'' (المطففین:۱ تا ۶)

> ترجمہ:...... ''ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر دیتے ہیں یا وزن کر کے دیتے ہیں تو ڈنڈی مارتے ہیں، گھاٹا ڈالتے ہیں، لوگوں کو کم دیتے ہیں، کیا ان کو یہ گمان نہیں ہے کہ ان کو ایک بڑے دن میں اُٹھایا جائے گا؟ جس دن سب انسان رب العالمین کے سامنے حاضر

ہوں گے، کھڑے ہوں گے!''

دنیا عبرت کی جا ہے!

دراصل ہمارا آخرت پر ایمان نہیں رہا، اور آخرت سے پہلے قبر پر بھی ایمان نہیں، خواجہ مجذوب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے!
یہ عبرت کی جا ہے، تماشا نہیں ہے!

یہاں تم عبرت پکڑو، تماشے نہ دیکھو!

نیک بخت شخص؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: نیک بخت ہے وہ شخص جو دوسروں کے حال سے عبرت پکڑے! شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لقمان حکیم را گفتند ادب از کسے آموختی؟ گفت از بے ادباں!

حکیم لقمان سے لوگوں نے پوچھا کہ: آپ نے ادب کس سے سیکھا؟ فرمایا کہ: بے ادبوں سے سیکھا! لوگوں نے کہا: وہ کیسے؟ فرمایا: جو بات میں نے کسی کے اندر ایسی دیکھی جو میری نظر میں اچھی نہیں تھی، تو میں نے فیصلہ کرلیا کہ آئندہ مجھ سے یہ بات یا عمل نہیں صادر ہوگا، اس کو تو کچھ نہیں کہا، البتہ اپنی اصلاح کرلی، اس طرح باادب اور صاحبِ ادب بن گئے، گویا جتنے بے ادب تھے اور ان کے اندر جو بات بھی ناپسندیدہ تھی یا نظر آئی، میں نے اس کو چھوڑ دیا، اس کو کہتے ہیں دوسروں سے عبرت پکڑنا! تو جو شخص آنکھوں دیکھی چیز سے عبرت نہیں پکڑتا، وہ کانوں سنی سے کیا عبرت پکڑے گا؟ اس کے سامنے دوزخ کے حالات بیان کرو، اس کے سامنے قیامت کی ہولناکیاں بیان کرو، اس کے سامنے قبر کی باتیں بیان کرو، اس کے لئے یہ سب بے سود ہے!

کوچ کا نقارہ بج چکا:

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ: ایک بات یاد رکھو! کہ تمہارے لئے کوچ کا نقارہ بج چکا ہے۔

نمازِ جنازہ میں اذان اور اقامت نہیں ہوتی، کیونکہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے کان میں اذان اور اقامت کہہ دی جاتی ہے، اور بچے کے کان میں اذان اور اقامت کہنے کا معنی یہ ہے کہ اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ جلدی کر اذان ہوچکی ہے، اقامت ہوچکی ہے، امام نیت باندھنے والا ہے، بس اتنی مہلت ہے تیرے پاس! کیونکہ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ، قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ تکبیر کے بعد امام کی نیت باندھنے میں جتنی دیر لگتی ہے، بس اتنی فرصت ہے تیرے پاس، جلدی کرلے جو کرنا ہے، یہ ہے کوچ کا نقارہ، فرماتے ہیں کہ: کوچ کا نقارہ بج چکا ہے، اور تمہیں یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ توشہ ساتھ لے کر جانا ہے۔ کیا توشہ لے کر جانا ہے؟

بوجھ ہلکا کرو:

میں نے شیخ عطار رحمہ اللہ کا شعر آپ کو سنایا تھا، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ: تیرا وجود اور جثہ بہت کمزور ہے، ذرا اپنا بوجھ ہلکا کرلو، یہ تم نے خوبصورت پتھروں کی گٹھڑیاں باندھ باندھ کر رکھ لیں، ذرا اپنا بوجھ ہلکا رکھو، پیسے جیب میں لے جاؤ، سونے کی اشرفیاں لے جاؤ، یہ تمہیں کام دیں گی، اور یہ جو تم گٹھڑیاں باندھ باندھ کر رکھ رہے ہو تمہیں معلوم ہے کہ کمر پر لاد کے لے جانا ہے، تم تو بہت ہلکا سا، کمزور سا وجود رکھتے ہو، اپنا بوجھ ہلکا رکھو، ورنہ راستے میں تم اپنا معاملہ بڑا سخت دیکھو گے، حضرتؒ یہ ساری چیزیں جو باندھ باندھ کے لے کر جارہے ہیں خود اُٹھانی پڑیں گی، وہاں قلی نہیں ملتے، ارے یہاں لندن کے ایئرپورٹ پر قلی نہیں ملتے تو وہاں کہاں ملیں

گے؟ وہاں تو یہ معاملہ ہوگا کہ: دستِ خود دھنِ خود، یعنی اپنا ہاتھ اور اپنا منہ۔ خود ہی نمٹو، تو تمہیں بتادیا گیا ہے کہ یہ توشہ لے کر جانا ہے، مگر تم سنتے ہی نہیں، جو توشہ لے جانا ہے اس کی فکر نہیں کر رہے، اور جو بوجھ نہیں اُٹھانا ہے اس کو باندھ رہے ہو۔

طولِ امل اور اتباعِ ہویٰ:

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ: دو چیزیں مجھے تمہارے حق میں سب سے زیادہ خوفناک نظر آرہی ہیں، ایک طولِ امل (''طول'' کے معنی لمبا ہونا اور ''امل'' کے معنی امیدیں)۔ ہم میں سے ہر شخص جب مکان بناتا ہے تو آر سی سی کا بناتا ہے، اچھے سے اچھا مال، اتنے موٹے موٹے سریے، گویا زبانِ حال سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کرے یہ مکان حادثہ سے محفوظ رہے، تو یہ عمارت ایک ہزار سال تو کہیں جاتی نہیں، لیکن:

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں!
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں!

یہ تو اپنی موت سے بے خبر ہوکر ہم امیدیں لگائے بیٹھے ہیں کہ یہ کریں گے، وہ کریں گے، اسی کا نام ''طولِ امل'' ہے، امیدوں کا لمبا رکھنا، ہاں بقدرِ ضرورت سامان جمع کرسکتے ہو، مثلاً تم ملازم ہو اور ایک ماہ کے بعد تنخواہ ملتی ہے، تو تم ایک ماہ کا سامان کرلو، اگر کوئی بیچارا کسان ہے اور اس کی فصل چھ ماہ کے بعد آتی ہے، چھ ماہ کا سامان کرلو، اور ایک بیچارہ مزدور ہے، دہاڑی پر کام کرتا ہے، وہ ایک دن کا انتظام کرلے، کل اللہ تعالیٰ دے گا، زندگی ہوگی تو اللہ تعالیٰ ضرور دیں گے، یہ تو موٹی سی بات ہے کہ اگر زندگی اللہ تعالیٰ نے لکھی ہے تو زندگی کسی چیز کے ساتھ قائم بھی تو رہے گی، تو اللہ تعالیٰ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرے گا، اتنی مختصر سی بات تھی کہ ہم اپنے کام میں لگتے اور یہاں کی دلچسپیوں کو کم کرتے، لیکن ہمارا معاملہ بالکل اُلٹ ہوگیا، امیدیں لمبی ہوگئیں، اور آخرت کی فکر بالکل ہی موہوم ہوگئی،

بلکہ موہوم ہوتے ہوتے معدوم ہوگئی، دن رات کے چوبیس گھنٹے میں ہمیں شاید ہی خیال آتا ہو کہ ہمیں جانا ہے، یار تیاری کرلیں! کل سفر ہے اور سفر بہت دور کا ہے! یہاں سے لوگ حرمین شریفین کے سفر پر جاتے ہیں یا کسی اور جگہ کسی اور ملک میں جاتے ہیں تو وہاں جا کر ٹیلی فون کرتے ہیں کہ میں فلاں چیز بھول آیا ہوں، فلاں آدمی آرہا ہے میرے پاس، اس کے ہاتھ بھجوادینا، تو بھائی! یہ ایسا سفر ہے کہ اس سفر میں ٹیلی فون بھی نہیں کرسکو گے، تمہیں واپس آنے کی مہلت نہیں ہوگی اور کچھ منگوانے کی مہلت نہیں ہوگی، تو لمبی امیدوں کی جگہ چاہئے تو یہ تھا کہ ہماری امیدیں منقطع ہوجاتیں، اور آدمی یہ کہتا کہ مجھے اس چیز سے کیا غرض؟ اور میں اس کا کیا کروں گا؟ کیونکہ میرا تو شام کو سفر ہے، جب میں شام کو جارہا ہوں اور رخصت ہورہا ہوں تو مجھے کوئی ہزار بلڈنگیں بھی دے دے تو میں ان کو کیا کروں گا؟ کوئی کہے کہ یہ کارخانہ آپ کا ہے، کوئی مفت بھی دے تو میں لینے کے لئے تیار نہیں ہوں گا، کیونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، بھائی ہمارا اصل معاملہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ موت نصب العین ہوتی، ہماری قبر ہمارے سامنے ہوتی اور ہمیں خیال ہوتا کہ صبح گئے یا شام گئے، کہاں کی امیدیں؟ کہاں کے منصوبے؟ اور کہاں کی یہ چیزیں؟ لیکن ہمیں غارت کردیا یہاں کے منصوبوں نے، اور جس کے لئے منصوبہ بندی کرنا چاہئے تھی وہ تو کی ہی نہیں۔

اتباعِ ہویٰ کے نقصانات:

فرمایا: ایک تو مجھے سب سے زیادہ خطرے کی چیز یہ نظر آرہی ہے، اور دوسری چیز ہے ''اتباعِ ہویٰ'' یعنی خواہش نفس کی پیروی کرنا۔

ہماری خواہش نفس کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی شریعت کا مسئلہ یا شریعت کی کوئی بات ہماری خواہش نفس کے مطابق ہوگی تو ہم عمل کریں گے، ورنہ کہہ دیں گے کہ: ''اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے!'' بس نفس کی خواہش پوری ہونی چاہئے، اللہ اور اللہ

کے رسول کا فرمان پورا ہوتا ہے یا نہیں؟ اس چیز سے ہمیں بحث نہیں! بس ہماری خواہش نفس پوری ہونی چاہئے۔

طولِ امل کا نقصان:

فرمایا کہ: ان دونوں کے خطرناک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ''طولِ امل'' امیدوں کا لمبا ہونا، آدمی کو آخرت بھلا دیتا ہے۔ آرزوؤں میں پڑ کے آدمی آخرت سے غافل ہو جاتا ہے، آخرت کا کام کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

اتباعِ ہویٰ یعنی خواہش نفس اور اس کی پیروی کرنا یہ آدمی کو حق سے روک دیتا ہے۔ جو شخص اپنی خواہش نفس پر چلتا ہو، وہ حق کو قبول نہیں کرسکتا، اس کے سامنے کتنے ہی اخلاص کے ساتھ، کتنی ہی ہمدردی کے ساتھ اور کتنی ہی محبت کے ساتھ اور کیسی ہی نرمی کے ساتھ حق بات پیش کیجئے، چونکہ وہ حق بات اس کی خواہش کے خلاف ہے، اس لئے وہ اسے قبول نہیں کرے گا، بلکہ جواب دے گا کہ: ''جاؤ جی مولوی صاحب! اپنا کام کرو! تم نہیں جانتے ان معاملات کو!'' یہ ہے وہ اتباعِ ہویٰ! جو آدمی کو حق سے روک دیتا ہے، خواہش نفس کی پیروی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جب کوئی حکم سامنے آجائے تو اپنے نفس کی خواہش کو چھوڑ دو یہ ہمارا نفس اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہمارا خیر خواہ نہیں۔

دنیا جارہی ہے اور آخرت آرہی ہے:

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ: دنیا جارہی ہے، آخرت آرہی ہے، اور دونوں کے بیٹے ہیں۔

آخرت کے بیٹے بنو:

کچھ بیٹے ہیں دنیا کے، کچھ بیٹے ہیں آخرت کے، آپ کو معلوم ہے کہ بیٹا جس باپ کا ہوتا ہے اس کی طرف منسوب ہوتا ہے، بیٹا تو ایک ہی باپ کا ہوتا ہے، دو

کا تو نہیں ہوتا، ایک باپ کے دو بیٹے تو ہوسکتے ہیں، مگر ایک بیٹے کے دو باپ نہیں ہوسکتے، باپ تو ایک ہی ہوگا۔ تو بعض لوگ ایسے ہیں جو ابنـاء الدنیا ہیں، دنیا کے بیٹے ہیں، ان کا اور کوئی باپ نہیں ہے، اور کچھ ہیں جو ابناء الآخرۃ ہیں، آخرت کے بیٹے ہیں، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا. اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا." (الکہف:۱۰۳،۱۰۴)

ترجمہ:......"(اے نبی!) آپ کہہ دیجئے کہ تمہیں بتائیں کہ عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ (اکثر سب سے زیادہ خسارہ اُٹھانے والے اعمال کے اعتبار سے کون ہیں؟) یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری محنت ضائع ہوگئی، گم ہوگئی دنیا کی زندگی میں، اور یہ لوگ گمان کر رہے ہیں کہ یہ لوگ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔"

دنیا کے بیٹے ابنائے آخرت کا مذاق اُڑاتے ہیں:

دنیا والے مُلّاؤں کا مذاق اُڑاتے ہیں کہ دنیا کا کام نہیں جانتے، اللہ والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، غریب غرباً کا مذاق اُڑاتے ہیں، فقیروں کا مذاق اُڑاتے ہیں، جن کے پاس دنیا نہیں ہے ان کا مذاق اُڑاتے ہیں، اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہم ہنرمند ہیں، تعلیم یافتہ ہیں، آج کل اسی کو تعلیم یافتہ کہتے ہیں جو دنیا کمانا، حرام کمانا زیادہ جانتا ہو۔

تمہیں کمزوروں کی برکت سے رزق ملتا ہے:

رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص اپنے چھوٹے بھائی کی شکایت لے کر آئے، بڑا بھائی کماتا تھا اور چھوٹا بھائی کماتا نہیں تھا، تمہاری اصطلاح

میں ''صوفی'' تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا تھا، تو بڑے بھائی نے شکایت کی کہ حضرت! یہ یہیں پڑا رہتا ہے، کوئی کام دھندہ نہیں کرتا۔ وہ بیچارہ تو خاموش رہا، آخر بڑے بھائی کو کیا جواب دیتا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ!''

(مشکوٰۃ ص:۴۴۷)

ترجمہ:..... ''تمہاری جو مدد کی جاتی ہے اور تم کو جو رزق دیا جاتا ہے، وہ ان کمزوروں کی وجہ سے دیا جاتا ہے!''

تم سمجھتے ہو کہ میں کما رہا ہوں، تم نہیں کما رہے، اللہ تعالیٰ اس کے حصے کی دے رہا ہے، گھر میں جو سب سے کمزور آدمی ہے اور جو بیچارہ کمائی میں سب سے پھسڈی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے تمام گھر والوں کو پال رہے ہیں، یہ ابناء الآخرۃ یعنی آخرت کے بیٹے ہیں، لیکن دنیا نہیں کماسکتے، کیا کریں؟ تم کبھی ان کا مذاق اُڑاتے ہو کہ خیرات کی روٹیوں پر پلتے ہیں، کبھی کچھ کہتے ہو، کبھی کچھ کہتے ہو، کہتے رہو بھائی! ہمارا کچھ نہیں بگڑتا، تم اپنا ہی نقصان کرتے ہو، لیکن تمہاری یاددہانی کے لئے کہتا ہوں جن کو تم کہتے ہو کہ یہ خیرات کی روٹیوں پر پلتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ تم ان کی وجہ سے پل رہے ہو، اللہ تعالیٰ تم کو ان کی وجہ سے پال رہا ہے، وہ نہ ہوتے تو اللہ تمہیں نہ پالتا، تم ان کو نہیں پال رہے، بلکہ ان کا ضعف، ان کی کمزوری یہ تمہیں پال رہی ہے، وہ اللہ کی رحمت کو کھینچ رہی ہے۔

آج عمل اور کل حساب ہوگا:

تو ارشاد فرمایا کہ: دنیا جارہی ہے۔ آخرت آرہی ہے، اور دونوں کے بنون ہیں، بیٹے ہیں، سو تم ابنائے دنیا نہ بنو، ابنائے آخرت بنو، کیونکہ آج عمل ہے، حساب نہیں، کرلو جو کرنا ہے، ایک ساتھ ہی حساب کریں گے۔ ایک آقا ہوتا ہے وہ ملازم سے ایک ایک بات پوچھتا ہے، یہ کیوں کیا؟ وہ کیوں نہیں کیا؟ اور ایک آقا بلند نظر ہوتا

ہے، وہ ایک ایک بات پر نہیں اُلجھتا، ملازم غلطی کرتا ہے، کرنے دو، ایک ماہ تو پورا ہونے دو، پھر اندازہ ہوجائے گا کہ یہ کیسا ہے؟ ہمارے ساتھ چل سکتا ہے کہ نہیں چل سکتا؟ ایک ایک بات پر نہیں اُلجھتا، ہدایتیں دے دیتا ہے، اخلاص کے ساتھ، محبت کے ساتھ، تو حق تعالیٰ شانہ ایک ایک بات پر تم سے نہیں اُلجھتے، ایک ایک بات پر مناقشہ نہیں فرماتے، عمل کی مہلت دے دی، عمل کرلو، حساب بعد میں کرلیں گے، لیکن آج کا دن ختم ہوگا، کل کا دن آئے گا تو عمل نہیں ہوگا حساب ہوگا، اس کو کہا جائے گا کہ پورا کرو حساب! کہے گا کہ: کہاں سے پورا کروں؟

میدانِ حشر میں ابنائے دنیا کا حال:

ایک حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ:

"یُجَاءُ بِابْنِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ کَاَنَّهٗ بَذَجٌ فَیُوْقَفُ بَیْنَ یَدَیِ اللهِ فَیَقُوْلُ لَهٗ: اَعْطَیْتُکَ وَخَوَّلْتُکَ وَاَنْعَمْتُ عَلَیْکَ فَمَا صَنَعْتَ؟ فَیَقُوْلُ: رَبِّ جَمَعْتُهٗ وَثَمَّرْتُهٗ وَتَرَکْتُهٗ اَکْثَرَ مَا کَانَ فَارْجِعْنِیْ آتِکَ بِهٖ کُلِّهٖ..... الخ."

(مشکوٰۃ ص:۴۴۳)

ترجمہ:...... "ایک آدمی قیامت کے دن ذلیل و رسوا کرکے اللہ تعالیٰ کے سامنے لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ بندے سے پوچھیں گے کہ: میں نے تو بہت سارا مال دیا تھا تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ: یا اللہ! میں نے اس کو خوب بڑھایا تھا، (ایک کی دو دکانیں بنالی تھیں، ایک کی چار بسیں بنالی تھیں، ایک کی چار فیکٹریاں بنالی تھیں، وغیرہ وغیرہ) بہت زیادہ میں نے کاروبار کو بڑھالیا تھا، بڑی ترقی دی تھی کاروبار کو، اگر آپ کو چاہئے تو مجھے واپس بھیج دیجئے میں لاکر آپ کو دے دیتا ہوں! اللہ تعالیٰ

فرمائیں گے کہ: نہیں! مجھے ضرورت نہیں ہے، وہ تو تمہیں یہاں بھیجنے کے لئے دیا تھا، تمہارے کام یہاں آتا۔"

حساب ہوگا عمل نہیں ہوگا اور آج عمل ہے حساب نہیں ہے۔

قبر والے کچھ کر نہیں سکتے:

شرح الصدور میں حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ:

"واخرج ابن ابی الدنیا عن ابی قلابة قال: **اَقْبَلْتُ مِنَ الشَّامِ اِلَى الْبَصْرَةِ فَنَزَلْتُ الْخَنْدَقَ، فَتَطَهَّرْتُ، وَصَلَّيْتُ رَكْعَتَيْنِ بِاللَّيْلِ، ثُمَّ وَضَعْتُ رَأْسِيْ عَلٰى قَبْرٍ، فَنِمْتُ ثُمَّ انْتَبَهْتُ فَاِذَا صَاحِبُ الْقَبْرِ يَشْتَكِيْ وَيَقُوْلُ: لَقَدْ آذَيْتَنِيْ مُنْذُ اللَّيْلَةَ! ثُمَّ قَالَ: اِنَّكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ وَنَحْنُ نَعْلَمُ، وَلَا نَقْدِرُ عَلَى الْعَمَلِ، اِنَّ الرَّكْعَتَيْنِ اللَّتَيْنِ رَكَعْتَهَا خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا. ثُمَّ قَالَ: جَزَى اللّٰهُ اَهْلَ الدُّنْيَا خَيْرًا فَاقْرَأْ مِنِّيَ السَّلَامَ، فَاِنَّهٗ يَدْخُلُ عَلَيْنَا دُعَائُهُمْ نُوْرٌ مِثْلُ الْجِبَالِ.**" (شرح الصدور ص:۳۰۵ طبع بیروت)

ترجمہ:....."ابن ابی قلابہ کہتے ہیں کہ میں شام سے بصرہ کی طرف جارہا تھا کہ راستہ میں رات کو ایک خندق میں اُتر کر وضو کیا، دو رکعت نفل ادا کی اور قبر پر سر رکھ کر سوگیا، خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ قبر والا مجھ سے شکایت کر رہا ہے کہ رات بھر آپ نے مجھے (قبر پر سر رکھنے کی وجہ سے) ایذا دی، پھر کہنے لگا کہ: تم نہیں جانتے اور ہم جانتے ہیں، مگر عمل نہیں کرسکتے، بے شک وہ دو رکعتیں جو تو نے ادا کی ہیں، دنیا و ما فیہا سے بہتر

ہیں، پھر اس نے کہا کہ: اللہ تعالیٰ دنیا والوں کو جزائے خیر دے،
آپ ان کو میرا سلام کہئے اور ان کو بتلایئے کہ ان کی دعائیں
ہماری قبروں میں نور کے پہاڑوں کی طرح داخل ہوتی ہیں۔''

یعنی ایک بزرگ قبرستان کے پاس سے جارہے تھے، وہاں معلوم نہیں ان کو کیا خیال آیا کہ انہوں نے ایک قبر کے پاس کھڑے ہوکر دو رکعت نماز پڑھی اور اس کا ثواب قبر والے کو بخش دیا، چند لمحات کے لئے بیٹھے تھے کہ ان کو نیند آگئی، خواب میں دیکھتے ہیں کہ قبر والے سے ملاقات ہوئی اور اس نے کہا کہ: اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے، ہم تو اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اللہ تعالیٰ کا نام سننے کو ترس گئے تھے، آج تم نے دو رکعتیں میری قبر کے پاس پڑھی ہیں اور مجھے ان کا ثواب بخشا ہے، دنیا بھر کے خزانوں کی قیمت اس کے بدلے میں کچھ نہیں، مجھے اس سے اتنی مسرت ہوئی ہے۔ اور پھر وہ صاحبِ قبر کہنے لگے کہ: ہم سب کچھ جانتے ہیں، مگر کچھ کر نہیں سکتے، اور تم سب کچھ کرسکتے ہو مگر جانتے نہیں ہو۔

حق تعالیٰ شانہ ہم سب کو آخرت کی تیاری کی توفیق عطا فرمائے، دنیا بقدرِ ضرورت منع نہیں، حلال سے لو حرام سے نہ لو، اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کی تلافی کرتے رہو، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لو، بندوں کے حقوق اپنی گردن پر لے کر نہ جاؤ اور یہ سوچتے رہا کرو کہ ہم نے اپنی قبر کے لئے، اپنے حشر کے لئے اور اپنی آخرت کے لئے کیا سامان بھرا ہے؟ کیا توشہ بھرا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

تین طلاق کا حکم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْ اِمْرَأَةُ رِفَاعَةَ الْقُرْظِيِّ اِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ: اِنِّيْ كُنْتُ عِنْدَ رِفَاعَةَ فَطَلَّقَنِيْ فَبَتَّ طَلَاقِيْ فَتَزَوَّجْتُ بَعْدَهٗ عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنَ الزُّبَيْرِ وَمَا مَعَهٗ اِلَّا هُدْبَةُ الثَّوْبِ. فَقَالَ: اَتُرِيْدِيْنَ اَنْ تَرْجِعِيْ اِلٰى رِفَاعَةَ؟ قَالَتْ: نَعَمْ! قَالَ: لَا حَتّٰى تَذُوْقِيْ عُسَيْلَتَهٗ وَيَذُوْقُ عُسَيْلَتَكِ.“

(مشکوٰۃ ص:۲۸۴)

ترجمہ:......”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: رفاعۃ القرظی رضی اللہ عنہ کی عورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگی کہ: میں رفاعہ کے نکاح میں تھی، انہوں نے مجھے طلاق بتہ دے دی، اس کے بعد میں نے عبدالرحمٰن بن زبیرؓ سے نکاح کیا، ان کے ہاں کپڑے کے اس کنارے کے علاوہ کچھ نہیں! (نامرد ہیں)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تو رفاعہ کے پاس واپس جانا چاہتی

ہے؟ اس نے کہا کہ: جی ہاں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں! جب تک یہ دوسرا شوہر تیرا ذائقہ نہ چکھ لے اور تو اس کا ذائقہ نہ چکھ لے! (یہ بات آپؐ نے رفاعہ کی بیوی سے فرمائی تھی، رفاعہ نے ان کو تین طلاقیں دے دی تھیں)۔"

"عَنِ الْبَرَّاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ ..... فَقَالَ: اَتَعْجَبُوْنَ مِنْ لِیْنِ هٰذِهٖ لَمَنَادِیْلُ سَعْدُ بْنُ مَعَاذٍ فِی الْجَنَّةِ خَیْرٌ مِّنْهَا وَاَلْیَنُ." (صحیح مسلم ج:۲ ص:۲۹۴)

ترجمہ:...... "حضرت براءؓ بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا: کیا تم تعجب کرتے ہو اس کپڑے کی نرمی سے؟ البتہ سعد بن معاذؓ کو جنت میں جو رومال ملے ہیں وہ اس سے بہتر ہیں اور اس سے زیادہ نرم ہیں!"

"قَالَ اَبُوْبَكْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ: اِنَّ الْاَقْرَعَ بْنَ حَابِسٍ جَاءَ اِلٰی رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اِنَّمَا بَایَعَکَ سُرَاقُ الْحَجِیْجِ مِنْ اَسْلَمَ وَغِفَارَ وَمُزَیْنَةَ! قَالَ: اَرَأَیْتَ اِنْ كَانَ اَسْلَمَ وَغِفَارَ وَمُزَیْنَةَ وَاَحْسِبُ جُهَیْنَةَ خَیْرًا مِّنْ بَنِیْ تَمِیْمٍ وَبَنِیْ عَامِرٍ وَاَسَدٍ وَغِطْفَانَ اَخَابُوْا وَخَسِرُوْا؟ فَقَالَ: نَعَمْ! قَالَ: فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ! اِنَّهُمْ لَا خَیْرَ مِنْهُمْ." (مسلم ج:۲ ص:۳۰۶)

ترجمہ:...... "حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اقرع بن حابس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ: آپ کی بیعت قبیلہ اسلم، غفار اور جہینہ میں سے حاجیوں کی

چوری کرنے والوں نے کی ہے! آپؐ نے فرمایا: بھلا یہ تو بتا اگر اسلم کی قوم، غفار کی قوم، مزینہ کی قوم، جہینہ کی قوم بہتر ہوں بنوتمیم سے، بنی عامر سے، اسد سے اور غطفان کی قوم سے تو کیا ان کو نقصان اور خسارہ پڑا؟ اقرع بن حابس نے کہا کہ: جی ہاں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! البتہ اسلم کی قوم اور یہ دوسرے لوگ جو ہم نے ذکر کئے ہیں یہ بہتر ہیں ان قوموں سے یعنی بنی تمیم وغیرہ سے۔"

تین طلاق کے بعد تحلیلِ شرعی کی صورت:

حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں، اس نے عدت کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نکاح کرلیا اور کچھ عرصہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، کہا: یا رسول اللہ! مجھے رفاعہ نے طلاق دے دی تھی، میں نے عبدالرحمٰن بن زبیرؓ سے نکاح کرلیا، کپڑے کا پلو پکڑ کر کہا کہ وہاں تو ایسے قصہ ہے، یعنی وہ نامرد ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا کہ: تو دوبارہ رفاعہ کے پاس جانا چاہتی ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں! فرمایا: یہ نہیں ہوسکتا! جب تک کہ دوسرا شوہر تیرا ذائقہ نہ چکھ لے اور تو اس کا ذائقہ نہ چکھ لے جب تک پہلے شوہر کے لئے تو حلال نہ ہوگی۔

قرآن کریم میں ذکر فرمایا گیا ہے کہ:

"فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ." (البقرۃ:۲۳۰)

ترجمہ:......"اگر بیوی کو دو طلاقیں دینے کے بعد

تیسری طلاق دے دی تو یہ عورت اس کے لئے حلال نہیں رہے
گی یہاں تک کہ وہ کسی اور شوہر سے نکاح کرے۔"

اور نکاح سے مراد ہے کہ اس کے ساتھ حقوقِ زوجیت ادا کرلے۔

تین طلاق کا حکم:

پوری امت کا اس پر اجماع ہے کہ پہلا شوہر اپنی بیوی کو تین طلاق دے دے تو وہ اس کے لئے ہمیشہ ہمیشہ حرام ہوجاتی ہے، حرمت مغلظہ کے ساتھ اور اس کے لئے حلال نہیں ہوتی جب تک کہ یہ عورت کسی اور شوہر سے جاکر نکاح نہ کرے اور اس کے ساتھ وظیفۂ زوجیت ادا نہ کرے۔

عوام کی غلط فہمی:

بعض لوگ صرف اتنا سمجھ لیتے ہیں کہ پہلے شوہر نے تین طلاقیں دے دیں تو غیرمقلدوں کے پاس چلے گئے، تو انہوں نے کہا کہ: ایک ہی طلاق ہوئی ہے! وہ فتوے لئے پھرتے ہیں، جب بھی کوئی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا ہے تو پھر وہ سیدھا غیرمقلدوں کے پاس جاتا ہے اور ان سے فتویٰ لیتا ہے، اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کرتے ہیں، وہ حدیث انہوں نے رٹی ہوئی ہے، میں کہتا ہوں: تم غیرمقلدوں کے پاس جانے کے بجائے شیعوں کے پاس جایا کرو، وہ کہیں گے کہ ایک بھی نہیں ہوئی، طلاق سرے سے ہوئی ہی نہیں۔

خلفائے ثلاثہؓ، صحابہ کرامؓ اور امام بخاریؒ کے ہاں تین طلاق کا حکم:

حضرت عمر امیرالموٴمنین تھے، ان کے بعد حضرت عثمان، ان کے بعد حضرت علی، رضی اللہ عنہم، یہ تینوں خلیفہ راشد اپنی اپنی خلافت کے دور میں یہ فتویٰ دیتے رہے

کہ تین طلاقیں تین ہوتی ہیں، ایک نہیں ہوتی، اور امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ”باب من اجاز الثلاث“ کے تحت کئی حدیثیں نقل کی ہیں، اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ تین طلاقیں دی جائیں تو تین ہوتی ہیں۔ غیر مقلد، امام بخاریؒ کو سب سے بڑا امام مانتے ہیں، لیکن یہاں وہ ان کی بھی نہیں مانتے، معلوم ہوا کہ اپنے مطلب کی مانتے ہیں۔

تین طلاق کے بارہ میں ابن عباسؓ کا فتویٰ:

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کا حوالہ دیتے ہیں کہ صحیح مسلم کی حدیث ہے، لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اپنا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

”عن هارون بن عنترة عن ابيه قال: كُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ اِبْنَ عَبَّاسٍ فَاَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا ابْنَ عَبَّاسٍ! اِنَّهُ طَلَّقَ اِمْرَأَتَهُ مِائَةَ مَرَّةً، وَاِنَّمَا قُلْتُهَا مَرَّةً وَّاحِدَةً فَتَبِيْنُ مِنِّىْ بِثَلَاثٍ اَمْ هِيَ وَاحِدَةٌ؟ فَقَالَ: بَانَتْ بِثَلَاثٍ وَعَلَيْكَ وِزْرُ سَبْعَةٌ وَّتِسْعِيْنَ.“ (مصنف ابن ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۳)

ترجمہ:......”ہارون بن عنترہ بیان کرتے ہیں کہ: میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس تھا، ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ: اے ابن عباس! میں نے یکبارگی اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دی ہیں، تو کیا یہ مجھ سے تین طلاقوں سے جدا ہوجائے گی یا یہ ایک طلاق شمار ہوگی؟ آپؓ نے فرمایا: وہ جدا ہوگئی تین طلاقوں سے اور بقیہ ستانوے تم پر بوجھ ہیں۔“ ۱

اور اسی طرح کئی لوگوں نے آپؓ سے اس بارہ میں سوال کیا، کئی روایات

ہیں، ایک جگہ یہ آتا ہے کہ: ایک شخص نے کہا کہ: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دیں! فرمایا: تم میں سے ایک آدمی حماقت کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ: یا ابن عباس! یا ابن عباس! پھر میرے پاس آکر فتوے پوچھتا ہے، جا تیری بیوی کو تین طلاقیں ہوگئیں اور ستانوے طلاقیں تیری گردن میں رہیں، اس کا وبال تجھے قیامت کے دن بھگتنا ہوگا۔

تین طلاق اور ائمہ اربعہؒ:

چاروں امام اس پر متفق ہیں کہ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دے تو تین ہوتی ہیں، اور حلالہ کرنا ضروری ہے، میں ہمیشہ لکھتا ہوں کہ اس کے لئے حلالہ شرعی ضروری ہے۔

حلالہ شرعی؟

مجھے ایک غیرمقلد نے لکھا ہے کہ: حلالہ شرعی بھی کوئی ہوتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں! حلالہ شرعی بھی ہوتا ہے جس کو قرآن نے ذکر کیا ہے: "فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" کہ وہ عورت اس مرد کے لئے حلال نہیں جب تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور سے نکاح نہ کرلے۔ ان الفاظ سے قرآن کریم نے جس حلالہ کو ذکر کیا ہے میں اس کو حلالہ شرعی کہتا ہوں، بعد میں پھر جواب نہیں آیا۔

اس امت میں صرف حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ تعالیٰ، تابعی جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد ہیں، اور ان کے بارہ میں میں نے جمعہ میں بتایا تھا کہ وہ مسجدِ نبوی میں فتنۂ حرّہ کے زمانے میں بیٹھے رہتے تھے، تین دن انہوں نے اس طرح گزارے ہیں، ایسے ہیں جن سے یہ منقول ہے کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرلینا کافی ہے، وظیفۂ زوجیت ادا کرنا ضروری نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بات ان سے غلط نقل ہوئی ہے، ورنہ تمام ائمہ اس وقت اس پر کیسے متفق ہوتے؟ ائمہ اربعہ

اس پر کیسے متفق ہوتے؟

ائمہ اربعہ کا اتفاق و اجماع ہے:

میں اس سے پہلے بتاچکا ہوں کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ نے ''عقد الجید'' میں لکھا ہے کہ جس مسئلے پر ائمہ اربعہ متفق ہوں اس مسئلہ پر اجماع امت ہے، وہ مسئلہ اجماعی ہے۔

جنت کے ریشمی رُومال:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک تاجر آیا، اس کے پاس ایک ریشمی رومال تھا، لوگ اس کو دیکھتے تھے، بہت پسند کرتے تھے، اور ایک روایت یہ ہے کہ نصرانی بادشاہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ریشمی کپڑا ہدیہ کیا تھا، وہ کپڑا اتنا نرم اور اتنا نفیس تھا کہ اس کی تعریف نہیں ہوسکتی، لوگ اس کو ہاتھ لگاکر ٹٹولتے تھے، کہتے تھے کہ: سبحان اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم اس پر تعجب کرتے ہو، سعد بن معاذ کو جنت میں جو ریشمی رومال دیئے گئے ہیں، وہ اس سے زیادہ نرم بھی ہیں اور خوب صورت بھی ہیں۔

آنحضرتؐ کی تربیت کا انداز!

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جب بھی دنیا کی کسی چیز کی تعریف کی وہ تعریف اپنی جگہ صحیح تھی، غلط نہ تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ یہ لوگ اس کو قیمتی چیز سمجھیں گے، چنانچہ ہر ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کے مقابلہ میں ان کے سامنے آخرت کو پیش کیا۔

دنیا کی چیزوں کی قیمت؟

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ کوڑے کے ڈھیر پر ریشمی قسم کے پرانے

چیتھڑے پڑے ہوئے تھے، وہ کہنے لگے کہ: دیکھو یہ ریشمی چیتھڑے کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کہہ رہے ہیں کہ تم نے بہت شوق سے مجھے خریدا تھا، بنایا تھا، آخر میں میں کوڑے کے ڈھیر پر پھینکنے کے قابل ہوگیا، بس یہ حقیقت ہے دنیا کی اور یہاں کی چیزوں کی، لوگ جتنی چاہیں دنیاوی چیزوں کی تعریف کریں وہ ساری کی ساری چیزیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینکنے کے قابل ہیں، جبکہ آخرت کی چیزیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینکنے کے قابل نہیں۔

جنت کی نعمتیں سدابہار ہوں گی:

حدیث شریف میں فرمایا کہ:

"اَهْلُ الْجَنَّةِ جُرْد مُرْدٌ كَحْلٰى لَا يَفْنٰى شَبَابُهُمْ وَلَا تَبْلٰى ثِيَابُهُمْ." (ترمذی ج:۲ ص:۸۰)

ترجمہ:......"اہل جنت سدا جوان رہیں گے اور ان کی جوانی میں کمزوری نہیں آئے گی اور جنتیوں کے کپڑے کبھی میلے نہیں ہوں گے۔"

یہ جنت ہے اور یہ دنیا ہے، جب بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دنیا کی کسی چیز کی تعریف کی، اس حیثیت سے کہ ایک اچھی چیز ہے، ہر اچھی چیز کی تعریف کی جاتی ہے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ یہ دنیا کی چیز کی تعریف کر رہے ہیں جو کوڑے کے ڈھیر میں پھینکنے کے قابل ہے، گندگی میں پھینکنے کے قابل ہے، بمقابلہ اس کے جنت ہے جو ہمیشہ رہے گی اور ہمیشہ تروتازہ رہے گی۔

جنت کے درختوں کے پھل:

ہم کسی درخت سے پھل توڑ لیتے ہیں، مثلاً: آم ہیں، ہم نے پھل توڑ لیا تو اتنی جگہ پھل سے خالی ہوگئی، جنت کے کسی بھی درخت کا جب کوئی پھل توڑا جائے گا

اس کی جگہ فوراً اللہ تعالیٰ دوسرا پھل پیدا فرمادیں گے، کبھی ایسا نہیں ہوگا کہ جنت کے کسی درخت کو پھل لگا ہو، ہم نے اس کو توڑ لیا ہو اور وہ اسی طرح رہ گیا ہو، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے، جنت کا اشتیاق ہونا چاہئے، شوق ہونا چاہئے، اور جنت کا شوق اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ دنیا کی حقارت ہمارے دل میں بیٹھ جائے کہ یہ دنیا حقیر اور ذلیل چیز ہے۔

تیسری حدیث اقرع بن حابس ایک صاحب تھے، بدو قسم کے آدمی تھے، بعد میں سنا تھا کہ مرتد ہوگئے تھے، پتہ نہیں وہ مسلمان ہوگئے تھے کہ نہیں، ان کی قوم بنی تمیم تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ: آپ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے ان لوگوں نے جو حاجیوں کی چوری کرنے والے ہیں، یعنی بنو اسلم، بنو غفار، مزینہ اور جہینہ یہ چند قبیلے تھے جاہلیت کے زمانے میں بھی مشہور تھا کہ وہ حاجیوں کی چوری کرلیتے ہیں، بمقابلہ بنو تمیم، بنو عامر، بنو اسد اور غطفان یہ بڑے معزز قبیلے ہیں، لیکن انہوں نے تو آپ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی (پھر بعد میں کرلی تھی)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اچھا! یہ بتاؤ کہ اگر بنو تمیم، بنو عامر، اسد اور غطفان، بنو اسلم، بنو غفار، مزینہ اور جہینہ، سے بہتر ہیں تو اس صورت میں کیا یہ لوگ خسارہ میں رہے؟ انہوں نے کہا کہ: جی کیا شک ہے اس میں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! یہ قبیلے یعنی بنو اسلم، بنو غفار، مزینہ اور جہینہ ان دوسرے قبیلوں سے افضل ہیں، اور بعد میں پھر جو انہوں نے کارنامے انجام دیئے ہیں، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تصدیق کردی۔

زندگی کے مراحل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"یَا اَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ." (الانشقاق:۶)

ترجمہ:......"اے انسان! تو اپنے رب کے پاس پہنچنے تک کوشش کر رہا ہے، پھر اس سے جا ملے گا۔"

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

آج پچیسویں شب ہے، چار یا پانچ راتیں آج کی رات کے بعد باقی ہیں، حق تعالیٰ شانہ اس رمضان المبارک کے بقیہ اوقات کو اپنی رضا کے مطابق ہمیں گزارنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

سفر زندگی کی منزلیں:

جس راستے کے ہم مسافر ہیں، جس کو زندگی کا راستہ کہتے ہیں، اس کی پیش آنے والی منزلوں کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں، کچھ منزلیں ہم طے کر چکے ہیں۔

سفر زندگی کی ابتدأ عدمِ محض سے:

پہلے عدمِ محض تھے، ہمارا کوئی وجود نہیں تھا، کوئی نام و نشان نہیں تھا، کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔

زندگی کا پہلا نشان:

عناصر سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہماری غذائیں تیار کیں، ان غذاؤں سے چوتھے ہضم کے بعد وہ مادہ تیار کیا، جس سے ہماری پیدائش ہوئی، یہ ہمارے وجود کا پہلا نشان تھا اور یہ گویا ہمارے وجود کی پہلی منزل تھی۔

دوسری منزل: شکم مادر:

پھر ماں کے پیٹ میں رہے، یہ منزل بھی گزر گئی، دنیا میں آگئے، دنیا میں آنے کے بعد کتنی منزلیں طے کیں؟ وہ آپ کے سامنے ہیں، بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

بچپن کی منزل:

جب پیدا ہوئے ایسی حیثیت تھی کہ نہ آنکھیں کھلتی تھیں، نہ زبان کام کرتی تھی، نہ ہاتھ پاؤں سے کام لے سکتے تھے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بقول ہمیں صرف ایک فن آتا تھا، اور وہ تھا ''رونے'' کا فن۔ بھوک لگے تو روتے، پیاس لگے تو روتے، گرمی سردی لگے تو روتے، کوئی بھی تکلیف ہو تو روتے، غرضیکہ ہماری تمام حاجتیں صرف ایک ذریعے سے پوری ہوتی تھیں اور وہ تھا ''رونا''، بچہ جب روتا ہے تو ماں سمجھ لیتی ہے کہ اس کو فلاں چیز کی ضرورت ہے، یہ دور بھی گزرا اس کے بعد ہم آہستہ آہستہ رینگنے لگے اور کچھ عرصے کے بعد بولنے لگے، پھر مختلف مرحلے طے کرتے ہوئے ہمارا بچپن گزر گیا اور ہم نے جوانی کی دہلیز میں قدم رکھا۔

جوانی کی منزل:

حدیث میں ہے: "الشباب شعبة من الجنون." یعنی جوانی جنون کی ایک شاخ ہے۔

جوانی آئی تو ہم نے سمجھا کہ نہ ماں باپ کو عقل ہے، نہ دوسرے لوگوں کو، دنیا بھر کی عقل صرف ہمارے پاس ہے، اور اتنی کہ اپنی اس عقل کے ذریعے سے اللہ اور اس کے رسول کا بھی مقابلہ کرنے لگے، یہ دور بھی گزر گیا، جوانی پختہ ہوئی تو عقل بھی پختہ ہوئی۔

بڑھاپے کی منزل:

چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو قویٰ میں انحطاط شروع ہوگیا، اب چلتے چلتے بڑھاپے کی دہلیز میں پہنچے، اب رفتہ رفتہ یہ حال ہو رہا ہے کہ آنکھیں ہیں مگر دیکھنے کا کام نہیں کرتیں، کان ہیں لیکن سنائی نہیں دیتا، ٹانگیں ہیں مگر بوجھ نہیں اٹھاتیں، ہاتھ ہیں مگر کام نہیں کرتے، معدہ ہے لیکن ہضم نہیں کرتا، کبھی فلاں تکلیف ہے بڑے میاں کو اور کبھی فلاں!

بوڑھے کا قصہ:

جیسے ایک شخص حکیم صاحب کے پاس گیا، اس سے کہا کہ: مجھے فلاں تکلیف ہے، کہنے لگا بڑھاپا ہے، کہا کہ: کھانا بھی ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتا، کہا: بڑھاپا ہے، مختلف قسم کے عوارض اس نے ذکر کئے، حکیم صاحب ہر بات کے ذکر میں ایک ہی جواب دیتے کہ بڑھاپا ہے، بڑے میاں کو غصہ آیا اور بڑی موٹی سی گالی نکالی اور کہا کہ: تجھے ایک ہی بات آتی ہے؟ حکیم صاحب کہنے لگے: بڑے میاں! یہ بھی بڑھاپا ہے!!

ان دیکھی منزلیں:

بڑھاپا بہت بڑی نعمت ہے، بڑھاپے میں جوانی کی ساری لذتیں چھوٹ جاتی ہیں، لوگ اس سے پریشان ہوتے ہیں لیکن عارفین کہتے ہیں کہ بڑھاپا پریشانی کی چیز نہیں، بلکہ نعمتِ کبریٰ ہے۔

اول:......اس لئے کہ دنیا سے بے رغبتی اور اس کی لذتوں سے اعراض اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے۔ ہم ایسے کہاں تھے کہ خود لذاتِ دنیا کو ترک کرتے؟ اللہ تعالیٰ نے احسانِ عظیم فرمایا کہ ہم سے آلاتِ لذت چھین کر ہمیں دنیا کی لذتوں سے بے رغبتی کا مزہ چکھا دیا۔ سبحان اللہ! کیا احسان ہے کہ ہم خود تارک الدنیا نہ بنے تو زبردستی ہم سے دنیا چھڑادی، جس طرح ماں زبردستی اپنے بچے کا دودھ چھڑادیتی ہے۔

دوم:......یہ کہ اب ہم موت کی دہلیز پر کھڑے ہیں، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں، مرتے ہی ہم سے دنیا کی ساری لذتیں ہی نہیں بلکہ خود دنیا ہی چھوٹ جائے گی۔ بڑھاپے کے ذریعہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی اس کی مشق کرادیتے ہیں، جس طرح دلہن کو مایوں بٹھایا جاتا ہے۔

سوم:......یہ کہ آدمی بوڑھا ہوکر آخرت کی تیاری شروع کردیتا ہے، کیونکہ جانتا ہے کہ اب چل چلاؤ ہے، توبہ تلا کرتا ہے، گناہوں کی معافی مانگتا ہے، جو کوتاہیاں سرزد ہوچکی ہیں ان کی تلافی کرتا ہے، اور بڑھاپے کی بدولت ان چیزوں کی توفیق ہوجانا احسانِ عظیم ہے۔ اس لئے عارفین کہتے ہیں: "الشیب برید الموت." یعنی بڑھاپا موت کا قاصد ہے، اور جب قاصد بلاوا لے کر آجائے تو آدمی کو چاہئے کہ سب کچھ چھوڑ کر سفر کی تیاری کرے (اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے)۔

یہاں تک کے مراحل تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے، لیکن اس کے بعد کے جو مراحل ہیں وہ ابھی ہمارے سامنے نہیں، ان میں سب سے پہلے موت کا

مرحلہ ہے، پھر قبر کا مرحلہ، پھر حشر کا مرحلہ ہے، پھر حساب و کتاب کا مرحلہ ہے، پھر پل صراط سے گزرنا ہے، اس کے بعد ہماری آخری منزل آنے والی ہے، جنت یا دوزخ!

پہلی منزل موت:

ہماری یہ کمزوری ہے کہ جس حالت میں ہم ہوتے ہیں، اس کے آگے کی ہمیں سوچ نہیں آتی۔ سب کو معلوم ہے کہ مرنا ہے، پہلے لوگ بھی مرے ہیں، ہم بھی مریں گے، متنبّی کے بقول دنیا کی ہر چیز میں اختلاف ہے، لیکن موت میں اختلاف نہیں۔ تمام مسلمان اور کافر اس بات پر متفق ہیں کہ آدمی مرے گا، لیکن اس میں پھر اختلاف ہوا کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اس میں پھر جھگڑا شروع کردیا۔ تو ہماری سب سے بڑی جو بیماری ہے وہ یہ ہے کہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، زندگی کے جس مرحلے سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں ہم ایسے الجھ کر رہ گئے کہ اگلے مراحل ہماری نظر سے اوجھل ہوگئے۔

آنحضرتؐ کی جامع تعلیم:

اور یہ حق تعالیٰ شانہ کی عنایت ہے، اس کی رحمت اور اس کا فضل ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغامات دے کر بھیجا، دنیا کی یا آخرت کی کوئی خیر ایسی نہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمایا ہو، اور دنیا کا اور آخرت کا کوئی شر ایسا نہیں جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ڈرایا ہو۔ ابوداؤد شریف میں حدیث ہے:

"اِنَّمَا اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَۃِ الْوَالِدِ اُعَلِّمُکُمْ."

(ابوداؤد ص:۳)

ترجمہ:...... "میں تمہارے لئے بمنزلہ باپ کے ہوں،

تم کو تعلیم دیتا ہوں۔''

یعنی جس طرح اولاد کے لئے باپ ہوتا ہے کہ اس کو ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے، ایک ایک بات سکھاتا ہے، شفیق باپ بچوں کو ایک ایک بات بتاتا ہے، کھانا کھاتے ہوئے اگر بچہ نوالہ بڑا لیتا ہے تو باپ اس کو تنبیہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ: اتنا لو کہ جس کو تم چبا سکو، اگر جلدی میں گرم لقمہ اٹھا کر ڈالتا ہے تو باپ اس کو ٹوکتا ہے، اٹھنے بیٹھنے کے بارے میں اس کو تعلیم دیتا ہے۔

والدین کی تعلیم و تربیت کا منشأ اولاد سے شفقت و محبت ہے:

اور والدین کی تعلیم نہایت اخلاص پر مبنی ہوتی ہے، اس تعلیم میں ان کی اپنی کوئی غرض نہیں ہوتی، بلکہ اس کا منشأ اولاد کی محبت و شفقت ہے، ان کی جان کے رگ و ریشے میں اولاد کی محبت سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے، اور یہی محبت تقاضا کرتی ہے کہ ان کو ہر آفت سے بچایا جائے اور ہر بھلائی کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے، لیکن والدین کی جتنی بھی سمجھ ہوتی ہے، جس قدر علم ہوتا ہے، جتنی عقل ہوتی ہے اس کے مطابق وہ اولاد کی تربیت کرتے ہیں۔ پھر محبت کے درجات بھی مختلف ہیں، کسی کو اولاد سے زیادہ محبت ہوتی ہے، کسی کو کم، کسی کو ان کے پیٹ کی فکر ہوتی ہے کہ یہ بڑے ہو کر کمانے کھانے کے قابل ہو جائیں اور کسی کو اولاد کے دین کی فکر ہوتی ہے، ان کے اخلاق کی فکر ہوتی ہے، ان کی انسانیت کی فکر ہوتی ہے۔

امت سے آنحضرتؐ کی شفقت و محبت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لئے بہ منزلہ والد کے ہیں، تمام امت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گویا اولاد ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے والد ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے ساتھ اور امت کے ایک ایک فرد کے ساتھ ایسی محبت ہے کہ دنیا بھر کی تمام ماؤں کی ممتا جمع کر لی جائے اور تمام

باپوں کی شفقت جمع کرلی جائے تو یہ سارا مجموعہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وشفقت کا مقابلہ نہیں کرسکتا، ایسے شفیق، ایسے رؤف اور ایسے رحیم کہ نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی ہوا اور نہ بعد میں کوئی ہوگا۔

بندوں پر اللہ تعالیٰ کی شفقت وعنایت:

ایک حدیث شریف میں آتا ہے:

"اِنَّ لِلّٰہِ مِائَةَ رَحْمَةٍ اَنْزَلَ مِنْهَا وَاحِدَةً بَیْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِّ، فَبِهَا یَتَعَاطَفُوْنَ، وَبِهَا یَتَرَاحَمُوْنَ، وَبِهَا تَعْطِفُ الْوَحْشُ عَلٰی وَلَدِهَا، وَاَخَّرَ اللّٰهُ تِسْعًا وَّتِسْعِیْنَ رَحْمَةً یَّرْحَمُ بِهَا عِبَادَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ.....

وَفِیْ رِوَایَةٍ:..... فَاِذَا كَانَ یَوْمُ الْقِیَامَةِ اَكْمَلَهَا بِهٰذِهِ الرَّحْمَةِ." (مشکوٰۃ ص:۲۰۷)

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے ہیں، ان میں سے ایک حصہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نازل فرمایا، اور اس کو جنوں، انسانوں، جانوروں اور حشرات الارض کے درمیان تقسیم کردیا۔ اور اس رحمت کے سوویں حصہ کا اثر ہے کہ انسان بھی، جنات بھی اور جانور بھی آپس میں شفقت کرتے ہیں، ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور اسی حصۂ رحمت کی وجہ سے وحشی جانور اور پھاڑ کھانے والے درندے بھی اپنی اولاد پر شفقت کرتے ہیں، اور یہ اس رحمت کا اثر ہے۔ فرمایا: رحمت کا یہ سوواں حصہ بھی ختم نہیں ہوا، اللہ کی رحمت کیسے ختم ہوسکتی ہے؟ مخلوق پر اس کا عکس پڑ رہا ہے، سایہ پڑ رہا ہے، جس کی وجہ سے مخلوق آپس میں شفقت کرتی ہے، ایک دوسرے کے ساتھ رحم کرتی ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سوویں حصے کو ان ننانوے حصوں کے ساتھ ملاکر اپنی کامل رحمت اپنے بندوں پر

فرمائیں گے، اپنے خاص بندوں پر یعنی جنتی لوگوں پر۔

اس سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کس قدر رحیم و کریم ہیں؟ اور ان کی رحمت و شفقت کس قدر وسیع ہے؟ اللہ تعالیٰ کے بعد کائنات میں سب سے زیادہ رؤف رحیم ہستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی ہے۔

آنحضرتؐ کی امت پر شفقت و رحمت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اتنی زیادہ ہے، اتنی زیادہ ہے کہ یہ کہنا تو بے ادبی و کوتاہی ہوگی کہ ماں باپ کو اپنے بیٹے کے ساتھ اور کسی ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ اتنی شفقت نہیں، ہاں! یہ کہنا کسی حد تک صحیح ہوگا کہ دنیا بھر کے ماں باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ جو شفقت ہوسکتی ہے، اگر اس کا ایک مجموعہ تیار کرلیا جائے تو وہ مجموعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و محبت کا پاسنگ بھی نہیں بنتا۔ رحمت کرنے والے تو درحقیقت اللہ تعالیٰ ہیں، رحمت تو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، لیکن حق تعالیٰ شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سراپا رحمت بناکر بھیج دیا، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ہمیں عطا کردی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''رحمۃ للعالمین'' کا خطاب دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہان والوں کے لئے رحمت ہیں، آسمان والوں کے لئے بھی رحمت ہیں، زمین والوں کے لئے بھی، دنیا والوں کے لئے بھی رحمت ہیں اور آخرت والوں کے لئے بھی۔ کوئی انسان، کوئی جن اور اللہ تعالیٰ کی دوسری کوئی مخلوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ''رحمۃ للعالمینی'' سے باہر نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ''رحمۃ للعالمین'' ہیں، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمت کرنے والے نہیں بلکہ سراپا رحمت ہیں، تو جس ہستی کو اللہ تعالیٰ نے ''رحمۃ للعالمین'' بنایا ہو اس کی شفقت اپنے تعلق والوں کے ساتھ کیسی ہوگی؟ یا یوں کہو کہ اپنی اولاد کے ساتھ کیسی ہوگی؟ اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟ اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کا معجزہ ہے کہ نبوت ملنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیئس سال کی مدت تک ہمارے درمیان تشریف فرما رہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے اور ہم سے پردہ فرمالیا، اس تیئس سال کے عرصے میں دین کی اور دنیا کی کوئی ایک بات بھی نہیں چھوڑی جس کی تعلیم نہ فرمادی ہو، دفتر کے دفتر لوگوں نے لکھ ڈالے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشادات کی شرح مکمل نہیں ہوسکی، ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک شعر یاد آگیا:

بہت عنوان بدلے اور بہت خاکے بنا ڈالے
مرتب ہوسکا لیکن نہ دردِ دل کا افسانہ!

حضرات علمائے کرام نے احادیث شریفہ کی کتنی شروح لکھیں اور کتنے دفاتر لکھے؟ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی "رحمۃ للعالمینی" کو تقسیم کیا جارہا ہے؟ کتنی تفسیریں لکھیں؟ اور ایک ایک موضوع پر کتنی کتابیں لکھیں؟ اور آج تک بھی "رحمۃ للعالمین" صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامِ رحمت کو کس قدر مسلسل تقسیم کیا جارہا ہے؟ لیکن یہ تقسیم ابھی تک مکمل نہیں ہوئی۔

نادیدہ مراحل کی تعلیم آنحضرتؐ نے فرمائی:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے زندگی کے نقشے بھی کھولے، موت کے وقت کی حالت بھی بیان فرمائی، مرنے کے بعد دوزخ میں انسان پر جو کچھ گزرتی ہے اس کو بیان فرمایا، قبر کے عذاب کو اور ثواب کو بھی ذکر فرمایا، کن چیزوں سے آدمی کے لئے موت آسان ہوجاتی ہے؟ اور کون سی چیزیں ایسی ہیں جن سے جان کنی مشکل ہوجاتی ہے؟ اس کو بھی ذکر فرمایا۔

ماں کی بے ادبی کرنے والے نوجوان کا واقعہ:

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی گئی کہ ایک

نوجوان تین دن سے نزع کی حالت میں ہے، اس کی جان نہیں نکل رہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے گئے۔ یہ نوجوان تکلیف میں تھا، اس کو دیکھ کر ارشاد فرمایا: اس کے ماں باپ زندہ ہیں؟ عرض کیا گیا کہ: اس کی ماں زندہ ہے! فرمایا کہ: اس کو بلاؤ! اس کی والدہ آئی تو اس سے فرمایا: بڑی بی! اس لڑکے نے تمہاری کوئی گستاخی تو نہیں کی؟ کوئی بے ادبی تو نہیں کی؟ کہا: نہیں! یہ بڑا فرماں بردار تھا، البتہ ایک دفعہ اس نے میرے تھپڑ مارا تھا۔ بہت سے بدبخت موذی ایسے ہیں جو اپنے ماں باپ کو مارتے ہیں، ان کو گالی دیتے ہیں، میں تو ان کو موذی کہوں گا، موذی نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بڑی بی! تم اپنے بیٹے کو اللہ کی رضا کے لئے معاف کردو! کہنے لگی: میں تو معاف نہیں کروں گی! کیونکہ مجھے اس سے بہت صدمہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی شخص اپنے ماں باپ پر ہاتھ اٹھائے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: لکڑیاں جمع کرو! وہ مائی کہتی ہے کہ: لکڑیوں کا کیا کریں گے؟ فرمایا: تیرے بیٹے کو جلائیں گے! کہنے لگی: ہائے! میرے بیٹے کو جلائیں گے؟ فرمایا: اگر تم اس کو معاف نہیں کروگی تو اللہ تعالیٰ اس کو جلائیں گے، اور ہمارا جلانا آسان ہے اور اللہ تعالیٰ کا جلانا سخت ہے۔ وہ اماں پھر کہنے لگی کہ: میں اس کو دل سے معاف کرتی ہوں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا کہ: پڑھ کلمہ! اس نے کلمہ پڑھا اور روح پرواز کرگئی۔

نزع کا مرحلہ:

تو میں عرض کر رہا تھا کہ موت کے وقت کون کون سی سختیاں آتی ہیں؟ اور کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جو آدمی کے نزع کو آسان کردیتی ہیں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ: نیک آدمی کی روح ایسے نکل جاتی ہے جیسے مشکیزہ سے قطرہ گرتا ہے، اور فرمایا کہ برے آدمی کی روح اس طرح نکلتی ہے جیسے دھنی ہوئی

روئی ہو اور کانٹے دار چھڑی گیلی کر کے اس کے اوپر ماری جائے اور پھر لپیٹ کر کے اس کو کھینچا جائے، اب وہ چھڑی تو اس روئی سے جدا نہیں ہوسکتی، یہی حال برے آدمی کے نزع کا ہے کہ اس کے رگ و ریشے میں روح سرایت کر جاتی ہے، ایک ایک رونگٹے میں چھپنے کی کوشش کرتی ہے، اس کو کھینچتے ہیں تو ایک ایک رونگٹے کو تکلیف ہوتی ہے۔

یا اللہ! ہمارے لئے نزع کو آسان فرمادے:

بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ اس وقت کو آسان فرمادیتے ہیں (اللہ تعالیٰ ہمارے لئے بھی اس وقت کو آسان فرمائے، ایمان پر خاتمہ فرمائے اور نزع کو آسان فرمائے، آمین!) اور بہت سے بندے ایسے ہیں کہ نزع کے وقت ان کی ساری عمر کی لذت ختم ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ اس سے پناہ میں رکھیں۔

موت کی سختی کو یاد رکھو:

یہ موت کا پیالہ اتنا کڑوا ہے کہ اس کی تلخی بعض لوگوں کو حشر تک باقی رہے گی، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھے، ہم زندگی گزارتے ہوئے اس طرح غافل ہوجاتے ہیں کہ کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ اس کا اثر ہماری موت پر تو نہیں واقع ہوگا؟ دنیا میں دوستی کرتے ہوئے، دنیا میں معاملات کرتے ہوئے، دنیا میں نقل وحرکت کرتے ہوئے، چھپ کر یا اعلانیہ گناہ کرتے ہوئے، ہم اس بات سے غافل ہوتے ہیں کہ اس کا انجام موت کے وقت کیا ہوگا؟ مرنے والے کو لوگ کلمہ کی تلقین کر رہے ہیں، یعنی ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ اس کو کلمہ کی تلقین کرتے ہیں، لیکن کسی کو پتا نہیں کہ وہ کہاں پھنسا ہوا ہوتا ہے؟

شیخ عطارؒ کا واقعہ:

شیخ عطارؒ بہت بڑے بزرگ ہوئے ہیں، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ عطارؒ

عشق کے سات شہروں میں پھر چکے ہیں اور ہم ابھی تک ایک کوچے میں گھوم رہے ہیں۔ ''عطار'' کہتے ہیں دوائی بیچنے والے اور پنسار کو، شیخ عطارؒ بھی دوا فروش اور پنساری تھے۔ ایک مرتبہ ایک ملنگ قسم کا شخص ان کی دکان پر آیا، کندھے کے اوپر گودڑی رکھی ہوئی تھی، کبھی اِدھر دیکھتا ہے، کبھی اُدھر دیکھتا ہے، شیخ عطارؒ اس سے فرماتے ہیں کہ: میاں! کیا دیکھتا ہے؟ کہنے لگا کہ: میں یہ دیکھتا ہوں کہ جو روح اتنی شیشیوں میں پھنسی ہوئی ہے، یہ کیسے نکلے گی؟ شیخ اس وقت دنیادار آدمی تھے، اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے ان صاحب کو بھیجا تھا، بھنّا کر کہنے لگے: جیسے تیری نکل جائے گی، ویسے ہماری نکل جائے گی! اس نے کندھے پر رکھی ہوئی گودڑی بچھائی، لیٹ گیا اور کہا کہ: ہماری تو یوں نکل جائے گی! ایک لمحہ میں رخصت ہوگیا، شیخ پر اس واقعہ کا ایسا اثر ہوا کہ دکان لٹادی اور اللہ تعالیٰ کے راستہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑے مراتب عطا فرمائے۔

موت کا منظر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

الف:......"عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: مَنْ اَکْثَرَ ذِکْرَ الْمَوْتِ قَلَّ فَرْحُہٗ وَقَلَّ حَسَدُہٗ۔"

(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۲۰)

ب:......"عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: مَالِیْ اَرَاکُمْ تَحْرُصُوْنَ عَلٰی مَا تُکَفَّلُ لَکُمْ بِہٖ وَتَضِیْعُوْنَ مَا وُکِّلْتُمْ بِہٖ لَاَنَا اَعْلَمُ بِشَرَارِکُمْ مِنَ الْبَیْطَارِبِا الْخَیْلِ ھُمُ الَّذِیْنَ لَا یَأْتُوْنَ الصَّلَاۃَ اِلَّا دُبُرًا وَلَا یَسْمَعُوْنَ الْقُرْاٰنَ اِلَّا ھِجْرًا وَلَا یُعْتِقُ مَحْرُوْرُھُمْ۔" (حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۲۱)

ج:......"عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اِلْتَمِسُوا الْخَیْرَ دَھْرَکُمْ کُلَّہٗ وَتَعَرَّضُوا النَّفُحَاتِ رَحْمَۃَ اللّٰہِ فَاِنَّ لِلّٰہِ نَفَحَاتٌ مِنْ رَّحْمَتِہٖ یُصِیْبُ بِھَا مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ، وَسَلُوا اللّٰہَ اَنْ یَّسْتُرَ عَوْرَاتِکُمْ وَیُؤْمِنْ رَّوْعَاتِکُمْ۔"

(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۲۱)

الف:......ترجمہ:......''حضرت ابودرداؒ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: جو شخص کثرت سے موت کو یاد کیا کرے، اس کی خوشی اور اس کا حسد کم ہوجاتا ہے۔''

ب:......ترجمہ:......''حضرت ابودرداؒ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: کیا بات ہے تم اس چیز میں بڑی حرص کرتے ہو جس کی اللہ نے تمہارے لئے ضمانت لے لی ہے اور اس کا خود کفیل ہوگیا ہے (یعنی رزق)، لیکن تم اس چیز کو ضائع کرتے ہو جو تمہارے سپرد کی گئی تھی، گھوڑوں کا ڈاکٹر اتنا نہیں جانتا، جتنا میں تمہیں جانتا ہوں، تمہارے بروں کو میں جانتا ہوں، نماز کو نہیں آتے مگر نہایت بے دلی سے، قرآن کو نہیں سنتے، مگر جیسے قصہ کہانی، اور ان کے آزاد کردہ غلام بھی آزاد نہیں ہوتے۔''

ج:......ترجمہ:......''حضرت ابودرداؒ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ہر زمانہ میں خیر تلاش کرو، اللہ کی رحمت کے جھونکوں کا استقبال کرو اور ان کو وصول کرو، اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں، وہ جھونکے پہنچادیتے ہیں اور اللہ سے سوال کرو کہ ہمارے عیبوں پر پردہ ڈال دے اور خوف کی چیزوں کو امن میں مبدل کردے۔''

صاحبِ ایمان کی خوشی کی چیز؟

اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے ساتھ اہل ایمان کو خوش ہونا چاہئے، ایک صاحب ایمان کی خوشی کی چیز یہ ہے کہ اسے اللہ کا فضل نصیب ہوجائے، اور اللہ کی رحمت نصیب ہوجائے، دنیا میں اللہ کے دین پر چلنے کی توفیق ہوجانا، نیکی کی توفیق

ہوجانا، طاعت وخیر کی توفیق ہوجانا اور مرنے کے بعد اللہ کی رضا حاصل ہوجانا، اللہ کی ناراضگی سے بچ جانا، قبر کی سختیوں سے اندھیروں سے بچ جانا، حشر کی فتنہ سامانیوں سے بچ جانا، اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی معیت نصیب ہوجانا، حساب و کتاب کا آسان ہوجانا اور جنت میں داخلہ ہوجانا، یہ ہے اللہ کا فضل اور اس کی رحمت۔

موت کے دھیان سے خوشی کم ہونا:

مؤمن کو تو اس بات سے خوش ہونا چاہئے، لیکن اس کے برخلاف ہماری خوشی ہوتی ہے دنیا کی چیزوں سے، مال سے، دولت سے دوسری چیزوں سے، لیکن اگر موت سامنے ہو تو یہ خوشی خوشی نہ رہے، بلکہ یہ خوشی غمی میں تبدیل ہوجائے، اس لئے حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کثرت سے موت کو یاد کرے، اس کی خوشی کم ہوجاتی ہے۔

موت کے تصور سے حسد کا علاج:

اس دنیا کی خاطر لڑائیاں ہوتی ہیں، تنازعات ہوتے ہیں، رسّہ کشی ہوتی ہے، کھینچا تانی ہوتی ہے، ایک دوسرے پر حسد ہوتا ہے، حاصل یہی ہے کہ ہر ایک دوسرے کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کو اچھی چیز کیوں مل گئی؟ یہ نہیں ملنی چاہئے تھی، تو جس شخص کو موت یاد ہو، اس کی ذات سے برائی ختم، جھگڑا ختم، تنازع ختم، حسد بھی ختم:

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا
اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما بسے

جب اس گھر میں ہمیں رہنا نہیں تو ہماری بلا سے کالا چور رہے ہمیں کیا؟ جب یہ چیز مجھے لینی نہیں، تو میری بلا سے وہ چیز کسی بھنگی کو دے دیں، کسی یہودی کو دے دیں، سکھ کو دے دیں، مسلمان کو دے دیں، فاسق و فاجر کو دے دیں، اچھے یا

برے کو دے دیں، مجھے اس پر کیا حسد؟ مجھے تو یہ لینی نہیں اور جس شخص نے مرنا ہو اس شخص کو وہ چیز لینی نہیں، تو سارے جھگڑے ہی ختم اور یہ منافست اور رسہ کشی ہی ختم، حسد بھی ختم، جو لوگ دنیا کے مال و دولت کے لئے یا حکومت و وجاہت کے لئے لڑ رہے تھے، قبروں میں پڑے ہوئے ہیں، ان کو کیا حسد ہو ان پر، ان کے تو کام کی چیز نہیں ہے۔ تو اگر موت کا آنا آدمی کو یاد رہے تو وہ دنیا کی چیزوں سے خوش نہ ہوگا۔

خوشی کی چیز؟

ہاں! خوشی و مسرت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت میں استعمال فرمالے، بندے کو اپنے حکم میں استعمال فرمالے۔

''ابن ماجہ'' حدیث کی کتاب ہے، اس کا پہلا باب ہے: ''باب اتباع سنة النبی صلی اللہ علیه وسلم'' یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی، اس میں ایک حدث کو نقل کیا ہے جو پہلے ہی صفحہ سے شروع ہوتی ہے:

''لَا یَزَالُ اللہُ یَغْرِسُ فِیْ هٰذَا الدِّیْنِ غَرْسًا یَسْتَعْمِلُهُمْ فِیْ طَاعَتِهٖ.'' (ابن ماجہ ص:۳)

ترجمہ:...... ''اللہ تعالیٰ اس دین میں پودے لگاتے رہیں گے، ان کو استعمال فرماتے رہیں گے اپنی بندگی میں۔''

پرانے پودے اکھاڑ کے نئے لگادیئے، باغ تو تروتازہ ہے اور سدابہار ہے، لیکن نئے نئے پودے مالی لگا رہا ہے۔

یا یوں کہو کہ باغ کا مالک لگا رہا ہے، تو خوشی کی چیز اگر ہے تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ہمیں بھی اس باغ کا پودا بنادے اور ہمیں اپنی طاعت میں استعمال فرمالے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے، آمین!

مرنے والوں کو کیا خوشی؟

اس کے علاوہ کوئی چیز خوشی کی نہیں، خوشی زندوں کو ہوتی ہے، مردوں کو ان چیزوں سے کیا خوشی ہوگی، ہم تو مرنے والے ہیں، ہمیں کیا خوشی ہے اور اگر ہے تو جھوٹی خوشی ہے، بہت جلدی خوشی کا یہ نشہ اترنے والا ہے، اسی طرح اگر موت کا دھیان رہے تو لوگوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے بھی ختم ہوجائیں گے، جس کا زیادہ تر منشا حسد ہوتا ہے، ہمارا سینہ صاف ہوجائے گا سب جھگڑے ختم ہوجائیں گے۔

جھگڑا چھوڑ دینے کی فضیلت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"مَنْ تَرَکَ الْکَذِبَ وَهُوَ بَاطِلٌ بُنِیَ لَهُ فِیْ رَبَضِ الْجَنَّةِ وَمَنْ تَرَکَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ بُنِیَ لَهُ فِیْ وَسِطَ الْجَنَّةِ...... الخ." (ترمذی ج:۲ ص:۲۰)

ترجمہ:...... "دو آدمیوں کا جھگڑا ہو، ایک حق پر ہے اور دوسرا ناحق پر، تو جو شخص ناحق پر ہوتے ہوئے اپنا جھگڑا چھوڑ دے اللہ تعالیٰ جنت کے اطراف میں اس کا محل بنائیں گے، اور جو حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے اس کو اللہ تعالیٰ محل عطا فرمائے گا جو جنت کے درمیان میں ہوگا۔"

جب جھگڑا چھوڑ دینے کی یہ فضیلت ہے کہ ناحق پر ہوتے ہوئے اگر کوئی جھگڑا چھوڑ دے تو اس کو بھی اللہ پاک جنت عطا فرماتے ہیں، اور اگر کوئی حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے اور کہہ دے کہ چھوڑو بھائی! لے جاؤ تم، مجھے جھگڑا نہیں کرنا ہے، اس نے صرف اتنا رتی جیسا حق چھوڑا، اللہ تعالیٰ نے جنت میں اس کو جگہ عطا فرمادی، ایسی جنت کہ پوری دنیا میں بھی اس کی قیمت نہیں۔

رزق اللہ کے ذمہ ہے:

دوسرے ارشاد میں حضرت ابودرداؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کیا بات ہے! تم اس چیز میں بڑی حرص کرتے ہو، جس کی اللہ نے تمہارے لئے ضمانت لے لی ہے، اور اس کا خود کفیل بھی ہوگیا ہے یعنی رزق۔ بڑی ہی حرص کرتے ہو، بڑی تگ و دو کرتے ہو، لیکن تم اس چیز کو ضائع کرتے ہو جو تمہارے سپرد کی گئی تھی، اور تم اس کے سپرد کئے گئے تھے، یعنی اپنا دین۔ دنیا کے مال و دولت کی یا رزق کی تحصیل میں، حاصل کرنے میں تم بڑی حرص کرتے ہو، حالانکہ اگر حرص نہ کرو، تو کیا رزق نہیں ملے گا؟ اور تمہارے حرص کرنے سے کیا زیادہ مل جائے گا؟ نہیں بلکہ اتنا ہی ملے گا جتنا مقدر ہے۔

رزق اور موت انسان کے پیچھے پیچھے ہیں:

حدیث شریف میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

''اِنَّ الرِّزْقَ لَيَطْلُبُ الْعَبْدَ كَمَا يَطْلُبُهُ اَجَلُهُ.''

(مشکوٰۃ حدیث:۵۳۱۲)

ترجمہ:......''رزق بھی اسی طرح بندے کو تلاش کرتا ہے، جس طرح اس کی اجل اس کو تلاش کرتی ہے۔''

رزق اور اجل پیچھے پیچھے پھرتے ہیں، دونوں آدمی کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں لیکن ایک آگے ہے اور ایک پیچھے ہے، رزق آگے ہے اور اجل پیچھے ہے، جب تک رزق اس کو نہ پہنچ جائے، اجل اس کو نہیں پہنچ سکتی ہے، جتنا رزق کسی کے لئے لکھ دیا ہے، مقدر فرمادیا ہے، اس کو مل کے رہے گا اور موت نہیں آسکتی جب تک رزق نہ پورا کرلے، اس کے لئے تو تم حرص کرتے ہو اور اللہ پر توکل نہیں کرتے، جتنا کرنا چاہئے اتنا بھی نہیں کرتے، چلو تھوڑا بہت ہاتھ پاؤں ہلانا جس کو ''کسب'' کہتے ہیں،

محنت کرنا، ریاضت کرنا بقدر ضرورت یہ تو ٹھیک ہے، لیکن بقدر ضرورت محنت پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ حرص، چھینا جھپٹی اور آگے بڑھنے کی کوشش کرنا۔

عرفات اور منیٰ میں سعودیہ کے ٹرک پانی کی تھیلیاں لے کر آتے ہیں، وہ اس طرح پھینکتے رہتے ہیں اور لوگوں کو تقسیم کرتے ہیں، اب کس طرح تقسیم کریں ایک ایک پھینکتے رہتے ہیں، اس وقت لوگوں کا جمگھٹا دیکھنے کے لائق ہوتا ہے، تم تو دنیا کی طلب میں اتنی حرص کرتے ہو جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی کی تھیلی کے لئے حرص کرتا ہے، اتنا جمگھٹا کرتے ہو، حالانکہ مل جائے گا۔

جو چیز ہمارے سپرد ہے اس سے ہم غافل ہیں:

جو چیز تمہارے سپرد کی گئی ہے اور تم جس کے سپرد کئے گئے ہو، اس کو تم ضائع کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کی بندگی تمہارے سپرد کی گئی ہے، اس کام کے لئے تمہیں لگایا گیا ہے، اور تم اپنی جزا اور سزا کے سپرد کئے گئے ہو، اس کو بالکل ضائع کر دیا مہمل چھوڑ دیا، فکر ہی نہیں، نہ جزا کا شوق اور نہ سزا سے خوف، نہ طاعت سے رغبت اور اس کی حرص، اور نہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے کی کوشش۔

برے لوگوں کی علامت:

پھر فرمایا کہ ڈاکٹر گھوڑوں کو اتنا نہیں جانتا جتنا میں تمہیں جانتا ہوں، حیوانات کا ڈاکٹر اتنا نہیں جانتا گھوڑوں کو، ان کی بیماریوں کو، جتنا میں تمہارے بروں کو جانتا ہوں، اسی لئے کہ حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ حکیم الامت تھے، حکیم تھے، فرمایا تمہارے شرار کو جانتا ہوں، بروں کو جانتا ہوں، ان برے لوگوں کی تین علامتیں ذکر فرمائی ہیں۔

پہلی علامت:

۱:......یعنی ان کی پہلی علامت یہ ہے کہ: "لَا يَأْتِيْنَ الصَّلَاةَ اِلَّا دُبُرًا."

نماز کو نہیں آتے مگر نہایت بے دلی سے، جلدی سے نماز ختم ہو تو چلیں، ظاہر میں منہ قبلہ کی طرف ہے، لیکن نماز پڑھتے ہوئے حقیقت میں منہ اپنے گھر کی طرف ہے اور پیٹھ قبلہ کی طرف ہے، ایک منٹ کی تاخیر ہو جائے تو شور ایسا ہوتا ہے کہ بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے، ٹی وی کے سامنے گھنٹوں بیٹھے رہیں گے، پرواہ نہیں، کوئی لہو ولعب کا تماشا ہو بڑی دلچسپی سے اس کو سنیں گے، کبھی بھی ان کو نیند نہیں آئے گی۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ نماز کی نیت باندھتا ہوں تو خیالات بہت آتے ہیں، اور یہ ہم میں سے اکثر کی شکایت ہے، میں نے اس پر پہلے بھی ذکر کیا تھا۔

نماز میں خیالات آنے کی شکایت:

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمہ اللہ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ خیالات نماز میں نہیں آتے، بات یہ ہے کہ ادھر تم نے تکبیر یعنی ''اللہ اکبر'' نماز کے لئے کہا تو گویا کہ بجلی کا بٹن دبا دیا، سوئچ آن کر دیا، اور کمرے میں روشنی ہوگئی، ''اللہ اکبر'' کہنا تھا کہ دل اور دماغ میں روشنی ہوگئی، تو یہ اللہ کی بارگاہ ہے، یہ فرمانے لگے کہ کمرے میں روشنی کر دی جائے تو کبھی چوہے پھدکتے ہیں اور کبھی چھپکلیاں دوڑتی ہیں اور کبھی حشرات الارض کو دیکھتے ہیں، قسم وقسم کی چیزیں کونوں میں بھاگتی ہیں اور جا کر کونوں وغیرہ میں چھپ جاتی ہیں، اسی طرح جب ''اللہ اکبر'' کہتے ہو تو تمہارے دماغ کے تمام چوہے پھدکنے لگتے ہیں، وہ پہلے ہی سے اس میں موجود تھے، صرف تاریکی اور اندھیرے کی وجہ سے تم کو نظر نہیں آرہے تھے، اور اب جب روشنی ہوگئی تو دوڑنے لگے ہیں، اور جب یہ نظر آنے لگے تو تم پریشان ہوگئے، تو میرا بھائی! نماز میں خیالات نہیں آتے، خیالات تو پہلے سے آرہے تھے، یہ دریا پہلے سے چل رہا تھا، پہلے تمہیں نماز سے باہر نظر نہیں آتے تھے، جب نماز میں یکسوئی ہوئی، اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، تو اس طرح نظر آنے لگے کہ جس طرح قیامت کے دن نامہ اعمال نظر آنے لگے گا، یہ

نماز کا کمال ہے یا نقص ہے؟ اور اس کا علاج نماز سے پریشان ہونا نہیں، ان کو آنے دو، تم اللہ کے حضور توجہ کے ساتھ حاضری دو، ان کو آنے دو۔ یہ چوہے ہیں، حشرات الارض ہیں، ان کی پرواہ نہ کرو، انشاءاللہ العزیز تمہیں اللہ کا قرب و رضا حاصل ہوگا، تو پھر اس کے بعد اس کی بدولت تمہیں دوسرے نیک خیالات آنے لگیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا مناجات مقبول میں نقل کی گئی ہے:

"اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ وَسَاوِسَ قَلْبِیْ خَشْیَتَکَ وَذِکْرَکَ."

ترجمہ:......"یا اللہ! میرے دل کے وساوس و خیالات کو اپنی خشیت یعنی ڈر اور اپنے ذکر سے تبدیل فرمادے۔"

نماز تھرمامیٹر ہے:

یوں سمجھ لو کہ نماز تھرمامیٹر ہے، جسے تمہارے ذہن کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے، دل کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے لگایا جاتا ہے، یہ نماز کا میٹر ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہارے قلب کا میٹر ہے تو یہ معلوم ہوجائے کہ ہمارے دل میں کیا کیا خیالات ہیں اور کیسی کیسی گندگیاں بھری ہوئی ہیں، پہلے تو پردہ پڑا ہوا تھا، نماز میں صرف اس پردہ کو اٹھادیا۔

نماز میں وساوس کی مثال:

ایک اور بزرگ سے شکایت کی گئی تھی کہ وساوس بہت آتے ہیں، حضرت فرمانے لگے کہ: صحن میں کافی دن سے جھاڑو نہیں دی تھی، ہواؤں کے ذریعہ سے مٹی، پتے، نا معلوم کیا کیا کچرہ جمع ہو رہا تھا، تم نے کہا کہ اس کو جھاڑو دے لیں، صفائی بڑی اچھی چیز ہے، اسکول کی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے کہ:

صفائی عجیب چیز دنیا میں ہے
صفائی سے بڑھ کر نہیں کوئی شے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے کہ: **"اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ"** طہارت نصف ایمان ہے، تم نے جھاڑو لی اور صاف کرنا شروع کر دیا، مٹی اتنی اٹھی کہ تمہیں سانس لینا مشکل ہوگیا، کیا تم چاہو گے کہ جھاڑو پر الزام دو کہ اس میں بڑی مٹی ہے، جھاڑو دیتے ہوئے تو آدمی سانس بھی مشکل سے لیتا ہے، حالانکہ جھاڑو تو بے چاری صفائی کر رہی ہے، اس صفائی کی وجہ سے گرد و غبار اڑ رہا ہے، یہ مٹی، یہ گرد و غبار یہ کچرہ پہلے سے تمہارے صحن میں موجود تھا، تو شکر کرو کہ صفائی ہو رہی ہے، تھوڑا سا برداشت کرلو۔

توجہ سے نمازوں کے چلہ کی برکت:

اگر تم توجہ الی اللہ کے ساتھ چالیس دن نماز پڑھ لو، خیالات کے پیچھے مت جاؤ تو انشاءاللہ دیکھو تمہارے ذہن کی کیسی صفائی ہوتی ہے۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

> "مَنْ صَلّٰى لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا فِيْ جَمَاعَةٍ يُدْرِكُ التَّكْبِيْرَةَ الْاُوْلٰى كُتِبَ لَهٗ بَرَاءَتَانِ، بَرَاءَةٌ مِّنَ النَّارِ وَبَرَاءَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ." (ترمذی ج:۱ ص:۳۳)
>
> ترجمہ:...... "جو شخص چالیس دن تکبیر تحریمہ کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھے (کل دو سو نمازیں ہوئیں پانچ وقت کی نماز تکبیر تحریمہ کے ساتھ پڑھے اس طرح کہ درمیان میں ناغہ نہ ہو) اس کے لئے دو پروانے لکھ کر دے دیئے جاتے ہیں، دو سندیں اس کو عطا کر دی جاتی ہیں، ایک یہ کہ یہ شخص دوزخ سے

بری ہے، دوسرا یہ کہ یہ شخص نفاق سے بری ہے، منافق نہیں ہے،
پکا ایماندار ہے۔"

نفاق سے بری ہوجاؤ گے اور دوزخ سے بری ہوجاؤ گے، تو انشاءاللہ گندے خیالات سے بھی بری ہوجاؤ گے، لیکن شرط یہ ہے کہ متوجہ رہو۔

متوجہ رہنے کا مطلب؟

متوجہ رہنے کا یہ معنی نہیں کہ تم دنیا و مافیہا سے غافل ہوجاؤ، نہیں! خیالات آئیں گے، تمہارا ذہن ان کے پیچھے لگ جائے گا، پہنچ جائے گا لالوکھیت، پھر اس کو واپس لے آؤ، وہاں سے پکڑ کر واپس لے آؤ، کہو کہ بدبخت! تو اللہ کے سامنے کھڑا ہے، وہ پھر بھاگے گا پھر لے آؤ، پھر بھاگے گا پھر لے آؤ، اس کو بھاگنے کا کام کرتے رہنے دو اور تم اس کو پکڑ کر لانے کا کام کرتے رہو۔ اکابر فرماتے ہیں تمہیں اس طرح کرنے سے پوری کامل نماز کا ثواب ملے گا، ایک ذرہ بھی کم نہ ہوگا۔

ایک لمحہ کی حضوری سے بھی کام بن گیا:

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ سجدہ میں جاکر ایک لمحہ کے لئے تمہیں حضوری حاصل ہوگئی کہ میں اللہ کے سامنے سجدہ کر رہا ہوں، بس تمہارا کام بن گیا، انشاءاللہ! اللہ پاک اس کو ضائع نہیں کریں گے۔

حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تمہارے برے لوگ وہ ہیں جو نماز کو نہیں آتے، مگر پیٹھ پھیرتے ہوئے، منہ گھر کی طرف ہوتا ہے اور پشت مسجد کی طرف ہوتی ہے یعنی بظاہر منہ مسجد کی طرف ہوتا ہے، لیکن ان کے خیالات اور ان کے دل کا رخ اس وقت بھی گھر کی طرف رہتا ہے، مسجد کی طرف نہیں۔

نماز کا حضور طہارت کے حضور پر موقوف ہے:

اس لئے اکابر فرماتے ہیں کہ نماز کا حضور طہارت کے حضور پر موقوف ہے،

آدمی کو وضو کرتے ہوئے جتنا حضور ہوگا، اتنا ہی نمازوں میں حضور ہوگا، اگر وضو کرتے ہوئے غفلت ہوگی، تو نماز میں بھی غفلت ہوگی، کسی بہت محبوب کو، کسی پیارے کو یا کسی معزز کو ملنے جانا ہوتو انسان اپنا لباس تبدیل کرتے ہوئے، منہ ہاتھ دھوتے ہوئے کیسا نفاست و باریک بینی کا مظاہرہ کرتا ہے، وضو کرتے ہوئے یہ تصور ہونا چاہئے کہ میں بارگاہ خداوندی میں حاضری کی تیاری کر رہا ہوں، میرے ظاہر و باطن میں کوئی گندگی باقی نہ رہ جائے۔

ظاہری طہارت اعضا کے دھونے سے ہے:

وہ تو ظاہری طہارت اللہ پاک نے فرمادی ہے کہ تم ان اعضا کو دھولو، سر کا مسح کرلو اور تین اعضا کو دھولو، اور بدن پر کوئی نجاست نہ لگی ہوتو بس تم مکمل پاک ہوگئے ہو، اللہ کے مقدس کلام کو ہاتھ لگا سکتے ہو اور تم اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو سکتے ہو، تمہیں حاضری کا اذن دیا جاتا ہے۔

باطنی گندگی سے طہارت کا علاج:

لیکن ظاہری گندگی کے ساتھ ساتھ باطنی گندگی بھی آدمی لئے پھر رہا ہے، قربان جائیں ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، آپ نے ارشاد فرمایا کہ وضو کے وقت یہ دعا پڑھ لیا کرو:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِیْنَ، وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ."

ترجمہ:...... "یا اللہ! مجھ کو بنادے توبہ کرنے والوں میں سے اور مجھ کو بنادے خوب پاک و صاف ہونے والوں میں سے اور مجھ کو بنادے ان لوگوں میں سے جن پر قیامت کے دن نہ

خوف ہوگا اور نہ غم۔"

لیجئے! اس دعا کی برکت سے انشاءاللہ باطنی طہارت بھی حاصل ہوجائے گی، ظاہرتو پاک کرتے ہیں پانی کے ساتھ اور باطن کو پاک کرتے ہیں توبہ کے ساتھ، تو اگر ہم وضو آداب کے مطابق کریں، تو انشاءاللہ نماز کے اندر بھی حضوری نصیب ہوگی، اس میں نورانیت ہوگی، اور اگر وضو صحیح نہیں کیا تو نماز میں کیا حضور ہوگا؟

ظاہری طہارت میں نقص کا وبال:

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بھول گئے تھے، قرأت میں گڑبڑ ہوگئی تھی، سلام پھیرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

"مَا بَالُ اَقْوَامٍ يُصَلُّوْنَ مَعَنَا لَا يُحْسِنُوْنَ الطُّهُوْرَ فَاِنَّمَا يَلْبِسُ عَلَيْنَا الْقُرْاٰنَ اُولٰئِکَ." (سنن نسائی ج:۱ ص:۱۵۱)

ترجمہ:......"کیا بات ہے کہ لوگ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں وضو ٹھیک کرکے نہیں آتے جس کی بنا پر ہم پر قرأت میں گڑبڑ ہوجاتی ہے۔"

اللہ اکبر! اندازہ فرماؤ! مقتدیوں میں سے کسی ایک مقتدی کے صحیح وضو نہ کرنے کی وجہ سے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اثرات! اس اشارہ کو سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں گڑبڑ ہوگئی، قرأت میں گڑبڑ ہوگئی صرف ایک آدمی کے وضو ٹھیک نہ کرنے کی وجہ سے، اس لئے وضو ٹھیک کرو اور وضو دھیان کے ساتھ کرو۔

وضو کی دعاؤں کا اہتمام:

بزرگ فرماتے ہیں کہ وضو کی دعائیں یاد کرو اور وضو کے دوران وہ دعائیں پڑھتے رہو۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے "احیاءالعلوم" میں وہ دعائیں لکھی ہیں، اور عام طور پر نمازوں کی کتابوں میں بھی لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب

رحمہ اللہ کو بہت اہتمام ہوتا تھا ان دعاؤں کا، کلی کرتے ہوئے یہ دعا پڑھو، ناک میں پانی ڈالتے وقت یہ دعا پڑھو، چہرہ دھوتے ہوئے یہ دعا پڑھو، سر پر مسح کرتے ہوئے یہ دعا پڑھو، پاؤں دھونے تک سب دعائیں ہیں، اگر اور دعائیں یاد نہیں تو پھر یہ چوتھا کلمہ پڑھتے رہو:

"لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ
وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ اَبَدًا اَبَدًا،
ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ بِيَدِهِ الْخَيْرُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ."

تو نماز کو پشت پھیر کر نہ آؤ، منہ پھیر کر آؤ، ہم لوگ تو نماز کی نیت باندھ کر منہ طرف قبلہ شریف کے پیچھے اس امام کے اللہ اکبر کہہ دیتے ہیں، ہمارے ظاہر کا رخ قبلہ کی طرف ہے اور ہمارے باطن کی پیٹھ قبلہ کی طرف ہے، جس طرح ظاہر کا رخ قبلہ کی طرف کیا ہے، اسی طرح باطن کا رخ بھی قبلہ کی طرف کرو، اور اپنی توجہ بھی قبلہ کی طرف کرو، قبلہ نہیں، بلکہ صاحب قبلہ، قبلہ کا مالک، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو۔

دوسری علامت:

۲:......دوسری علامت یہ ذکر فرمائی کہ: "وَلَا يَسْمَعُوْنَ الْقُرْاٰنَ اِلَّا هِجْرًا." اور قرآن کو نہیں سنتے مگر جیسے قصہ کہانی ہوتی ہے، ایک قصہ تھا سن لیا چلو، تھوڑی دیر کے لئے طبیعت خوش ہوگئی، قرآن کوئی قصہ کہانی نہیں ہے، یہ ہمارے احکم الحاکمین کا حکم نامہ ہے، یہ ہمارے محبوب کا نامۂ محبت ہے، اس کا ایک ایک پیغام، ایک ایک لفظ و پیغام ہمارے لئے پیغام حیات ہے، اسی کے ساتھ ہماری دنیاوی فلاح اور اُخروی سعادت وابستہ ہے، قرآن پڑھو یا قرآن سنو، تو قرآن کے انوارات کی طرف متوجہ رہو، اللہ تعالیٰ قرآن کے انوارات سے ہمارے دلوں کو منور فرمادے، امام قرآن

پڑھ رہا ہے اور ہم کسی دوسری سوچ میں ہیں۔

تیسری علامت:

۳:......تیسری علامت یہ ہے کہ: "وَلَا يُعْتَقُ مَحْرُوْرُهُمْ" ان کے آزاد کردہ غلام بھی آزاد نہیں ہوتے، پہلے زمانہ میں غلام ہوتے تھے، ان کو آزاد کرنے کا حکم تھا، کئی موقعوں پر اللہ تعالیٰ نے واجب قرار دیا اور کئی موقعوں پر مستحب قرار دیا، غلاموں کو آزاد کرتے تھے، لیکن ان کو آزاد کرنے کے بعد بھی پھر ان کو اپنا غلام سمجھتے تھے، وہ بے چارے آزاد ہونے کے بعد بھی آزاد نہیں، پھر بھی ان پر رعب جھاڑتے ہیں، دھونس جتلاتے ہیں، یہ برے لوگ ہیں، جب تم نے اس کو آزاد کردیا تو وہ تمہارے برابر ہوگیا، اب تمہارا ان پر کوئی بھی حق نہیں رہا۔

اللہ کی رحمت کے جھونکے:

تیسرے ارشاد میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے جھونکے آتے ہیں، ویسے تو آدمی کو زندگی بھر اللہ کی رحمت کا اور خیر کا طالب رہنا چاہئے، اس کی تلاش میں رہنا چاہئے۔ خاص خاص اوقات کے اندر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے جھونکے آتے ہیں، جیسے ہوا چلتی ہے کبھی جھونکا آجاتا ہے، ہوا تو چلتی ہی رہتی ہے، لیکن کبھی ہوا کا جھونکا آجاتا ہے، کبھی ٹھنڈا اور کبھی گرم جھونکا آتا ہے، اللہ کی رحمت کے جھونکے آتے ہیں، ان جھونکوں کا تعرض کرو اور استقبال کرو اور ان کو وصول کرو، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں، وہ جھونکے پہنچادیتے ہیں، جو اللہ کے بندے اس وقت متوجہ الی اللہ ہوتے ہیں، ان کو مل جاتے ہیں، اللہ کی جانب سے انعامات تقسیم ہو رہے ہیں۔

قبولیت کا وقت:

اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا کہ چوبیس گھنٹوں میں ایک خاص وقت

قبولیت کا وقت آتا ہے، اس وقت آدمی جو کچھ مانگے یا چاہے، دنیا مانگ لو، دین مانگ لو، چاہے اللہ کی رحمت مانگ لو، چاہے موت مانگ لو، اللہ پاک عطا فرماتے ہیں۔

بچوں کو بددعا دینے سے بچو:

ہمارے حضرت حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ عورتیں اپنے بچوں کو کوسنے دیتی رہتی ہیں، بددعائیں دیتی رہتی ہیں، اور کوئی وقت قبولیت کا ہوتا ہے، اس وقت وہ بددعا قبول ہوجاتی ہے، پھر یہ روتی ہیں، تو نے خود بددعا مانگی تھی۔ اس لئے بچوں کو بددعا نہ کرو، کسی دوسرے کے لئے بددعا نہ کرو، نیک دعائیں کرو، جب بھی موقع مل جائے متوجہ الی اللہ ہوجاؤ کہ شاید یہ قبولیت کا وقت ہو، اور اللہ تعالیٰ نے بتلایا نہیں کہ کون سا وقت ہے؟ اور ضروری نہیں کہ ایک ہی وقت ہو، چوبیس گھنٹوں میں سے ایک وقت آتا ہے کہ اس میں دعا قبول ہوتی ہے، یا یوں کہو کہ اس میں اللہ کی رحمت کا جھونکا آتا ہے، اللہ کی رحمت کے جھونکوں کو وصول کرو اور ان کو اپناؤ اور متوجہ الی اللہ رہو، کم از کم چوبیس گھنٹوں میں سے ایک وقت تو آجائے کہ ہم متوجہ الی اللہ ہوجائیں، شاید یہ ہی وقت قبولیت کا ہو۔

انعامی بانڈ کے انعام کی طرح لمحات قبولیت کا خیال رکھو:

انعامی بانڈز خرید خرید کر رکھتے ہو کہ شاید انعام کا ہمارا نمبر نکل آئے، حالانکہ لاکھوں میں سے صرف ایک کا نکلے گا، باقیوں کا نہیں، اور جس کا نکلے گا تم اس کو کہتے ہو کہ بڑے خوش قسمت ہو، انعامی بانڈز وہ جو سرکاری ہوتے ہیں، ان کی حیثیت کرنسی کی ہے، خرید کر رکھنا استعمال کرنا جائز ہے۔

انعامی بانڈز کے انعام کا حکم؟

لیکن اس کا انعام لینا جائز نہیں ہے، میں ماہر معاشیات نہیں ہوں، لیکن اتنی بات مجھ اندھے کو بھی معلوم ہے کہ یہ حکومت کی (اب کیا کہوں منبر پر بیٹھا ہوں، سخت

لفظ نہیں کہنا چاہئے) عوام سے دھوکا بازی ہے (نرم سے یہ لفظ بولتا ہوں) اول تو اگر دس ارب روپے کی مالیت تمہارے پاس ہے تو دس ارب روپیہ ہی کے نوٹ چھاپو، لیکن یہ بجائے دس ارب کے دس کھرب چھاپتے ہیں، یہ محض دھوکا ہے اور پھر یہ نوٹ تو قانونی کرنسی تھی، حکومت نے انعامی بانڈز جاری کردیئے اور یہ غیر قانونی کرنسی ہے، انعام دینے کے بہانے عوام کی رقم ہتھیالی، بظاہر یہ درمیان میں ایک مسئلہ ذکر کیا میں نے۔

انعام نکلنے والا ہے:

کہنا چاہتا ہوں کہ ایک نمبر نکلنے والا لاکھوں میں سے تو تم خرید کر رکھتے ہو، لاکھوں کی تعداد میں نوٹ خرید کر رکھتے ہو کہ شاید ان میں سے کوئی نمبر نکل آئے۔ میں کہتا ہوں کہ انعامی بانڈز تقسیم ہو رہے ہیں اللہ کی طرف سے، خرید لو، ممکن ہے کہ یہ ہی وقت ہو قبولیت کا، یہ ہی نمبر نکل آئے تمہارا، اس وقت جنت مانگو جنت مل جائے گی، اللہ کی رحمت مانگو رحمت مل جائے گی، دنیا و آخرت کی کوئی سعادت مانگو، مل جائے گی۔

اللہ سے دو چیزیں مانگو:

اور آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دو چیزیں مانگا کرو، ایک یہ کہ اللہ پاک ہمارے عیوب پر پردہ ڈال دے: "اَللّٰھُمَّ لَا تُخْزِنِیْ فَاِنَّکَ بِیْ عَالِمٌ" یا اللہ! مجھے رسوا نہ کیجئے، آپ تو مجھے جانتے ہیں، میرے عیوب اللہ کے علم میں ہیں کسی اور کو معلوم نہیں، بیوی بچوں کو بھی معلوم نہیں، اللہ کو معلوم ہے۔ یا اللہ! جس طرح آپ نے آج یہ چھپا کر رکھے ہیں، آپ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، اسی طرح آپ پردہ ڈال دیجئے، آخرت میں بھی ہمارے عیوب ظاہر نہ ہوں، اور دوسری چیز اللہ سے مانگا کرو کہ ہمارے جو خوف کی چیزیں ہیں، جن سے ہلاک ہونے کا خطرہ ہے اللہ تعالیٰ ان کو امن سے مبدل کردے، یہ حدیث شریف کی دعا ہے، حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ اس کی

تلقین فرما رہے ہیں، ان حضرات کے تمام علوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے علوم تھے، ''اَللّٰھُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَآمِنْ رَوْعَاتِیْ'' یا اللہ! پردہ ڈال دے میرے عیوب پر اور امن عطا کر مجھے خطرہ وخوف کی چیزوں سے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حرام اشیائی کی خرید و فروخت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْھُمَا: اِنَّ الَّذِیْ حَرَّمَ شَرِبَھَا ھُوَ الَّذِیْ حَرَّمَ بَیْعَھَا یَعْنِی الْخَمْرَ." (صحیح مسلم)

"عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْھَا: اِنَّ الَّذِیْ یَشْرَبُ فِیْ اِنَاءِ الْفِضَّۃِ فَاِنَّمَا یُجَرْجِرُ فِیْ بَطْنِہٖ نَارَ جَھَنَّمَ."

(مشکوٰۃ ص:۳۷۱)

"عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ: لَا یَکُوْنُ اللَّعَّانُوْنَ شُفَعَاءَ وَلَا شُھَدَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ."

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۲۳)

"عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ: اِذَا کَانَ اَحَدُکُمْ فِی الصَّلٰوۃِ فَاِنَّہٗ یُنَاجِیْ رَبَّہٗ فَلَا یَبْزُقَنَّ بَیْنَ یَدَیْہِ وَلَا عَنْ یَمِیْنِہٖ وَلٰکِنْ عَنْ شِمَالِہٖ تَحْتَ قَدَمِہٖ." (صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۰۷)

ترجمہ:...... "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

بیشک جس نے اس کا پینا حرام کیا، اس نے اس کا بیچنا بھی حرام کیا، یعنی شراب۔"

ترجمہ:...... "حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بے شک جو آدمی پیتا ہے چاندی کے برتن میں تو وہ اُنڈیلتا ہے اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ۔"

ترجمہ:...... "حضرت ابودرداً رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بیشک لعنت کرنے والے سفارش کرنے کے حق دار نہیں ہوں گے اور نہ گواہ ہوں گے قیامت کے دن۔"

ترجمہ:...... "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: بیشک مؤمن جب نماز میں ہوتا ہے تو مناجات کرتا ہے اپنے رب سے، سو نہ تھوکے اپنے آگے، نہ دائیں جانب، بلکہ تھوکے اپنے بائیں جانب یا پاؤں کے نیچے۔"

شراب کا پینا اور بیچنا حرام ہے:

پہلی حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ جس ذاتِ عالی نے شراب کا پینا حرام کیا ہے، اس نے اس کا بیچنا بھی حرام کیا ہے۔

قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک صاحب باہر سے شراب کا مشکیزہ لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں شراب کا ایک مشکیزہ لایا تھا، مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ حرام ہوگئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہاں! حرام ہوگئی

ہے۔ کسی نے اس صحابی سے چپکے سے کہا کہ: کسی غیر مسلم کے پاس اسے بیچ دو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحب کی یہ بات سن لی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جس نے اس کا پینا حرام کیا ہے، اس نے اس کا بیچنا بھی حرام کیا ہے! شراب کا پینا بھی حرام، اس کا بیچنا بھی حرام، اس کا بنانا بھی حرام اور حد یہ ہے کہ جو شخص شراب اُٹھا کر لے جائے اس پر بھی لعنت ہے، شراب پر لعنت، اس کے بنانے والے پر لعنت، اس کے خریدنے والے پر لعنت، اس کے اُٹھانے والے پر لعنت، اس کے پینے والے پر لعنت۔

اس حدیث کے ضمن میں چند مسائل ذکر کرتا ہوں۔

شراب کے نشہ میں دی گئی طلاق مؤثر ہے:

ا:......ایک مسئلہ یہ ہے کہ شراب پینے سے اگر کسی کو نشہ ہوجائے اور وہ اس حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

بہت سارے لوگ یہ مسئلہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ شوہر نے نشے کی حالت میں طلاق دی تھی، مدہوش تھا، اس کو پتہ نہیں تھا، مدہوشی کی حالت میں طلاق دی، تو مدہوش کی طلاق واقع ہوجاتی ہے بشرطیکہ وہ حرام کے نشے کے ساتھ مدہوش ہوا ہو، اگر کسی نے جائز اور پاک چیز کا استعمال کیا تھا، اتفاق سے وہ دماغ پر چڑھ گئی اور اس سے مدہوش ہوگیا، اس حالت میں اگر اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو طلاق واقع نہیں ہوگی یا مثال کے طور پر کسی کافر نے زبردستی اس کو پلادی اور اس کو نشہ ہوگیا، نشے میں بدمست ہوکر اس نے بیوی کو طلاق دے دی تو پھر بھی طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ یہ اس نے اپنے اختیار سے نہیں دی، تو حرام نشہ جو اپنے اختیار سے کیا ہو، اگر اس سے آدمی مدہوش ہوجائے تو طلاق واقع ہوجاتی ہے، اور حرام نشہ نہ ہو لیکن کسی وجہ سے اس سے مدہوشی ہوگئی اور اس حالت میں طلاق دے دی تو طلاق واقع نہیں

ہوگی۔

جس کا استعمال حرام ہے اس کی خرید وفروخت بھی حرام ہے:

۲:......دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کا استعمال کرنا حرام ہے، اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، شراب کا پینا حرام ہے، تو اس کی خرید و فروخت بھی حرام۔

کیا مسلمان کے شراب کے مٹکے توڑنے پر ضمان ہے؟

مسلمان کے حق میں شراب مال نہیں ہے، اگر کسی نے مسلمان کی شراب کے مٹکے توڑ دیئے تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہے، لیکن غیر مسلم کے حق میں مال ہے، اگر غیر مسلم کے مٹکے توڑے تھے تو اس کا تاوان دینا پڑے گا، تو اس سے ایک بہت بڑا اصول معلوم ہوجاتا ہے کہ ہر وہ چیز جس کا استعمال حرام ہے، اس کا بیچنا اور خریدنا بھی حرام ہے۔

ٹی وی کی خرید وفروخت؟

یہیں سے ٹی وی کا حکم بھی معلوم ہوجاتا ہے، ٹی وی حرام تو اس کا بیچنا بھی حرام، اس کا خریدنا بھی حرام اور اسی طرح دوسری چیزیں ہیں، مثلاً: مردار حرام ہے، اب کوئی مردار کا گوشت بیچے، نعوذ باللہ! استغفر اللہ! تو یہ بھی حرام ہے۔

حرام اور مردار کی قیمت بھی مردار ہے:

حرام کا مطلب یہ ہے کہ اس کی جو قیمت حاصل ہوگی اس کا بھی وہی حکم ہوگا جو مردار کا ہے، اگر کسی نے مرا ہوا جانور کسی چوڑھے کے پاس بیچ دیا اور اس سے رقم لے کر استعمال کرلی تو اس رقم کا استعمال بھی ایسے ہی ہے جیسے کہ خود مردار کا استعمال تھا، اور یہیں سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوجائے گا جیسا کہ ہمارے دیہات میں

رواج ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی کی بھینس مرگئی، مرنے سے پہلے اس کو ذبح نہیں کرسکے، حلال نہیں کرسکے تو اس کی کھال اُتار کر چوڑھوں کے پاس بیچ دیتے ہیں کہ لے جاؤ اس کو ساٹھ یا ستر یا سو دوسو روپے میں، جتنے بھی ہوتے ہوں گے، اس کی کھال بیچ دیتے ہیں، حالانکہ ایسا کرنا ناجائز ہے، کیونکہ مردار کی کھال بھی مردار کے حکم میں ہے، لہٰذا اس کا بیچنا بھی حلال نہیں۔

مردہ جانور کی کھال رنگنے سے پاک ہوجاتی ہے:

اِلَّا یہ کہ مردار کی کھال کو اُتروالیا اور اُتروا کر اس کو رنگوالیا۔ اب وہ پاک ہوگئی، اب اس کا بیچنا حلال ہے، مردار کی کھال کو اگر رنگوالیا جائے تو پاک ہوجاتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں دیکھا ایک بکری مری ہوئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِلَّا دَبَغْتُمْ اِهَابَهَا فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ. فَقَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! اِنَّهَا مَيْتَةٌ - وَفِيْ رِوَايَةٍ - يَقُوْلُ: اِذَا دُبِغَ الْاِهَابُ فَقَدْ طَهُرَ." (ابوداؤد ج:۲ ص:۲۱۳)

ترجمہ:...... "تم نے اس کے چمڑے سے کیوں نہیں نفع اُٹھایا؟ کہا: یا رسول اللہ! یہ تو مردار ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کھال کو رنگ دیا جائے وہ پاک ہوجاتی ہے۔"

اس کے بعد اس کو بیچ سکتے ہیں، غرضیکہ ہر وہ چیز جس کا استعمال حرام، اس کا بیچنا بھی حرام، خریدنا بھی حرام۔

شراب کا سرکہ بنانا!

البتہ اگر کسی کے پاس شراب ہو تو اس میں نمک ڈال کر اس کا سرکہ بنالیا کرتے ہیں، شراب کا سرکہ بن جاتا ہے، تو آیا شراب کا سرکہ بنالیا جائے تو یہ جائز

ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے، اس پر تو اتفاق ہے کہ اگر سرکہ بن گیا تو اس کا استعمال جائز ہے، اس لئے کہ اب شراب نہیں رہی، لیکن شراب کو سرکہ بنالینا یہ عمل جائز ہے کہ نہیں؟

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: جائز نہیں ہے! ہمارے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: مناسب تو نہیں ہے، لیکن اگر بنالیا تو حرام بھی نہیں ہے!

سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال:

دوسری حدیث حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ہے کہ جو شخص چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے، وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اُنڈیل رہا ہے اور غٹ غٹ کرکے جو پی رہا ہے، آگ کا سیال یعنی بہنے والی آگ پی رہا ہے۔

یہاں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال جائز نہیں ہے، اور اس معاملے میں لوگ بڑا گھپلا کرتے ہیں، بڑے لوگوں کے چونچلوں کی تو خیر بات ہی کیا ہے؟ ماشاء اللہ! وہ تو مرفوع القلم ہیں، قلم ان سے اُٹھالیا گیا ہے، سونے کی چیزیں رکھی ہوئی ہیں، چاندی کی چیزیں رکھی ہوئی ہیں، محاورہ ہے کہتے ہیں کہ جی سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا ہے، سونے کا یا چاندی کا چمچہ بھی استعمال کرنا جائز نہیں، اس کی پلیٹ یا تشتری کو کسی بھی مقصد میں استعمال کرنا جائز نہیں، حتیٰ کہ بعض لوگ چاندی کا خلال بنالیتے ہیں، وہ بھی جائز نہیں۔

سونے چاندی کا تعویذ:

ہمارے حکیم الامت قدس سرہٗ نے اس معاملہ میں ایک بہت دقیق مسئلہ لکھا ہے، جس کی طرف لوگوں کو التفات نہیں، عام طور پر یہ جو تعویذ دینے والے ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ تعویذ چاندی میں منڈوالینا، بند کروالینا، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے حرام! کیونکہ چاندی کا تعویذ بطور برتن استعمال ہو رہا ہے، عورتوں کے لئے،

بچیوں کے لئے سونے اور چاندی کے زیورات کا استعمال جائز ہے، لیکن سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال عورت کے لئے بھی جائز نہیں، خاصہ دان ہے، پان دان ہے، سرمے دانی ہے، سونے کی ہو یا چاندی کی اس کا استعمال مردوں اور عورتوں سب کے لئے جائز نہیں ہے، سرمہ ڈالنے کی سلائی چاندی کی استعمال کرنا جائز نہیں ہے، بعض دفعہ اطبا بتاتے ہیں کہ فلاں آنکھ کی بیماری کے لئے چاندی کی سلائی استعمال کی جائے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے بجائے قلی جو ہوتی ہے ناں! جس سے برتن قلی کرتی ہیں، پہلے زمانہ میں تانبے کے برتن ہوتے تھے، ان کو قلی کرانے کی ضرورت ہوتی تھی، اب تو اسٹیل کے برتن آ گئے ہیں، اب تو قلی کرانے کی ضرورت پیش نہیں آتی، تو فرماتے ہیں کہ اس قلی کی سلائی استعمال کرے، وہ وہی اثر کرے گی جو چاندی کی سلائی کا اثر ہے۔ اسی طرح تعویذ کو بھی استعمال کرنا کہ چاندی کے اندر تعویذ رکھ کر محفوظ کیا گیا ہو، یہ بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ تعویذ کا برتن بن گیا ہے، برتن کی جگہ استعمال ہو رہا ہے، ہاں! زینت کے لئے استعمال کرتے تو دوسری بات تھی، بچیوں کے لئے اور عورتوں کے لئے تو جائز تھا۔

چھوٹے بچوں کے لئے بھی سونے چاندی کا استعمال ناجائز ہے:

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ لڑکوں کے لئے سونے چاندی کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے، لڑکوں کے گلے میں سونے چاندی کے تعویذ پہنانا یہ بھی جائز نہیں ہے، وہ تو بیچارہ معصوم ہے، لیکن ماں باپ نے اگر پہنایا تو وہ گناہگار ہوں گے، جیسا کہ پیشاب یا پاخانہ کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنا یا پیٹھ کرنا حرام ہے، کیونکہ اس طرح کرنا قبلے کی بے ادبی ہے، تو اسی طرح بچوں کو بھی اس طرف کروانا جائز نہیں، گو بچہ تو گناہگار نہیں مگر یہ کروانے والی گناہگار ہوگی۔

لعنت کا وبال اور اس کی محرومی:

تیسری حدیث ہے کہ لعنت کرنے والے قیامت کے دن نہ گواہ ہوں گے، اور نہ سفارشی ہوں گے، کیونکہ کسی مؤمن کے حق میں شہادت دینا، اس کو اللہ کی رحمت میں داخل کرنا ہے، اور کسی کی شفاعت کرنا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت میں اس کو داخل کرنے کے لئے ہے، اور لعنت کے معنی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہونا، یہ آدمی تو اللہ تعالیٰ سے لعنت مانگتا تھا، یہ تو مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری مانگتا تھا، تو اس کو قیامت کے دن شفیع نہیں بنایا جائے گا، گواہ بھی نہیں بنایا جائے گا۔

لعنت کا حکم؟

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کسی مؤمن یا کافر پر لعنت کرنا جائز نہیں، سوائے ان لوگوں کے جن کے بارے میں ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے، جیسے ابولہب، ابوجہل اور دوسرے پکے پکے کافر، بے ایمان، ان کے لئے ہم لعنۃ اللہ کہہ سکتے ہیں، جیسے ابولہب ملعون، لعنة الله عليه!

یزید پر لعنت کرنا:

یزید پر لعنت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس پر ہمارے ہاں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ تھا ہی ملعون، اس لئے لعنت کرنا جائز ہے، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ نہیں! خدا جانے کس حالت میں اس کا انتقال ہوا ہو، اگر گناہگار تھا تو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، اس لئے نہیں کہ وہ لعنت کا مستحق نہیں بلکہ اس لئے کہ اہل سنت کا اصول یہ ہے کہ کسی کافر پر بھی لعنت جائز نہیں، تمہیں کیا معلوم کہ اس نے توبہ کرلی ہو؟ جس کے بارے میں قطعی طور پر معلوم ہو کہ وہ بغیر توبہ کے مرا ہے، اس پر لعنت کرنا جائز ہے، لیکن پھر بھی لعنت کرنا کوئی عبادت نہیں۔ درود شریف پڑھو، تمہیں ثواب ملے گا، تسبیح پڑھو، تمہیں ثواب ملے گا، اور تم کہو کہ: ابوجہل لعنۃ اللہ، کوئی ثواب نہیں،

لعنت کرنا کوئی ثواب نہیں، لیکن وہ عجیب مذہب ہے جس میں لعنت کرنا ہی سب سے بڑی عبادت ہے!

نماز میں آدمی اللہ سے مناجات کرتا ہے:

اور چوتھی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب آدمی نماز میں ہوتا ہے تو اپنے پروردگار سے مناجات کر رہا ہوتا ہے، مناجات کا معنی چپکے سے بات چیت کرنا، لہٰذا اگر نماز میں تھوکنا پیش آئے تو آگے نہ تھوکے، کیونکہ سامنے رب ہے، نعوذ باللہ! تم رب کے منہ پر تھوکتے ہو؟ تمہارے سامنے جو بیٹھا ہے اگر تم اس کی طرف تھوکو گے تو کتنی بری بات ہوگی؟ اور دائیں طرف بھی نہ تھوکے یہ بھی کرامت والی جانب ہے، بائیں طرف تھوک دے، بشرطیکہ کوئی بائیں جانب نہ ہو، ورنہ اس پر پڑے گا یا پھر پاؤں کے نیچے تھوک کر اس کو مل دے۔

نماز میں تھوکنے کا حکم:

یہاں پر دو باتیں سمجھ لینی چاہئیں، ایک یہ کہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ: تھوکنے کی خدانخواستہ ناگزیر صورت پیش آجائے تو اس کے بارہ میں حکم یہ ہے کہ کپڑے کا کنارہ لے کر اس میں تھوک کر اس کو مل لے۔

نماز میں تھوکنے کا ادب:

یعنی اگر کوئی تھوکنے پر مجبور ہوجائے تو اس کا ادب یہ بتایا ہے کہ آگے نہ تھوکے، دائیں جانب نہ تھوکے، بائیں جانب نہ تھوکے، بلکہ کپڑے کے کنارے میں تھوک کر اس کو مل لے، یا پاؤں کے نیچے تھوں کر اس کو مل دے۔

کچا فرش ہو تو حالتِ نماز میں تھوکنا جائز ہے:

دوسری بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کچی تھی، کچا فرش تھا، مٹی

تھی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر تھوکنے کا حکم فرمایا، یہاں پکے فرش یا قالین پر نہ تھوک دینا!

عملِ کثیر سے نماز ٹوٹ جاتی ہے:

تیسری بات یہ ہے کہ عمل کثیر یعنی اتنا کام نماز میں کیا جائے، مثال کے طور پر منہ میں بلغم تھا، نمازی نے کپڑے کا کونا لیا اور اس میں بلغم لے کر مل دیا، تو اس سے نماز نہیں ٹوٹے گی، بشرطیکہ صرف ایک ہاتھ استعمال ہوا ہو، اگر دو ہاتھ استعمال کئے کسی کام کے لئے تو نماز فاسد ہوجائے گی، کیونکہ یہ عمل کثیر ہے، جس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

عملِ کثیر کی تعریف:

رہی یہ بات کہ عمل کثیر کسے کہتے ہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ دور سے دیکھنے والا اس کو دیکھے تو یہ سمجھے کہ نماز نہیں پڑھ رہا، اور بعض نے کہا کہ عمل کثیر وہ ہے جس میں دونوں ہاتھوں کی ضرورت پیش آئے۔

ارکانِ نماز، روحِ نماز کی علامات ہیں:

حدیث میں فرمایا ہے کہ بندہ اپنے رب سے مناجات کرتا ہے، مناجات نماز کی روح ہے، یہ اُٹھک بیٹھک تو مقصود نہیں، نمازی آدمی کا قیام ہے، ہاتھ باندھ کر کسی کے سامنے کھڑا ہے، رکوع کر رہا ہے تو کسی کے سامنے جھک رہا ہے، اللہ کے فضل سے بڑے بڑے فرعونوں کے سامنے ہماری گردن نہ جھکی، لیکن یہاں آ کے جھکتی ہے، اور جب سجدہ کرتا ہے تو کسی کے پاؤں میں سجدہ کرتا ہے، کسی کی خوشامد کرتا ہے، جب زبان سے کچھ کہتا ہے تو کسی کو بلاتا ہے، کسی سے کچھ مانگتا ہے اور کسی سے کچھ کہتا ہے، غرض یہ جو نماز کے ارکان ہیں یہ صرف علامتی ارکان ہیں، ورنہ اصل روح جو ہے وہ تو دل کے اندر ہے، یعنی مناجات، یہ روح جتنی قوی ہوگی اتنی نماز قوی اور پہلوان

ہوگی، اتنی ہی نماز طاقتور ہوگی، اور جتنی یہ کمزور ہوگی اتنی ہی یہ نماز بھی کمزور ہوگی۔ بھائی! اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے مناجات کر رہا ہوں۔

ہماری نماز!

ہمارے حضرت تھانوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ہماری تو نماز ایسی ہے جیسے گھڑی میں چابی بھر دیتے ہیں، چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ چابی بھر دی تو وہ چلتی رہے گی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے اللہ اکبر کہہ کر نماز کی چابی بھر دی، اب یہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک خود بخود چلتی رہے گی، ہم لالوکھیت پھرتے رہیں گے۔ نہیں بھائی! یہاں حاضر ہونا چاہئے، اپنی نماز میں حاضر ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ بس ہم نے ایک دفعہ اللہ اکبر کہہ دیا تو نماز شروع ہوگئی۔

حالِ دنیا من پرسیدم
گفت یا بادیست یا ظلیست یا افسانہ
باز گفتم حال کست آنکست بگو کہ دل دربے پیوست
گفت یا غولیست یا دیویست یا دیوانہ

میں نے ایک دانا سے دنیا کا حال پوچھا کہ اس کے بارے میں کیا رائے؟ کہنے لگا کہ ہوا ہے، یا سایہ ہے، کبھی اِدھر ڈھل گیا، کبھی اُدھر ڈھل گیا، اور یا یوں کہو کہ افسانہ ہے، ایک خواب دیکھا تھا، بیدار ہوگئے۔ میں نے کہا کہ اس کے بارہ میں کیا ارشاد فرماتے ہیں جو یہاں دل لگالے؟ کہنے لگے کہ: وہ آدمی تو نہیں معلوم ہوتا کوئی بھوت، چڑیل ہوگی یا پھر کوئی دیوانہ ہے، پاگل ہے! اس پاگل پنے کا دورہ ہم سب کو پڑا ہوا ہے۔

دنیا کی نعمت و آزمائش دونوں ناقابل برداشت:

دوست خط لکھتے رہتے ہیں، سوالات و جوابات کے لئے، ابھی بھی شاید وہ

خط میرے پاس پڑا ہوا ہے، ایک صاحب کہتے ہیں، بہت لمبی کہانی لکھی کہ ہم بہت مسرت میں تھے، اس کے بعد میں باہر ملک میں چلا گیا، ہمارے دن پھر گئے، بڑا سرمایہ جمع ہوگیا تھا، (یہ ایک خواب کا منظر تھا، یہ وہ دوسرے خواب کا وہی دوسرا منظر تھا) اور پھر کہتے ہیں کہ وہ تمام رقم جمع کروادی، وہ جو سرمایہ کمپنی نکلی تھی اس میں ہمارے ٹھاٹ تھے، لیکن کمپنی والوں کے بھاگ جانے سے وہ سب رقمیں غارت ہوگئیں، اور آج بیٹی کا زیور ساٹھ ہزار میں گروی رکھا ہوا ہے، بیٹی کو رخصت نہیں کرسکتا، دوسری بیٹی جوان بیٹھی ہے، اس کو رخصت نہیں کرسکتا۔ بدقسمتی سے یہ دنیا جس کے پاس آجاتی ہے اس کا دماغ خراب کردیتی ہے، آدمی سمجھتا ہے کہ مال و دولت اور یہ دنیا میرے پاس ہمیشہ رہے گی، اور جس کے پاس سے چلی جاتی ہے ایسا زخم چھوڑ جاتی ہے کہ اس کی ٹیس برداشت نہیں کرسکتا۔ میں نے اس کو جواب میں لکھا کہ انسان یہاں کی نعمت کو بھی برداشت نہیں کرسکتا اور یہاں کے ابتلا و امتحان کو بھی برداشت نہیں کرسکتا، جب اس کے پاس اللہ تعالیٰ نعمت دیتے ہیں، مال و دولت مل گیا، رزق کی فراوانی ہوگئی، چار پیسے ہاتھ میں آگئے، تو اس کی اکڑفوں دیکھنے کے لائق ہوتی ہے، اس وقت یہ اعتدال پر نہیں رہتا، شکر نہیں بجالاتا، اور جب وہی نعمت اللہ تعالیٰ چھین کر دکھاتے ہیں کہ ہم ایسا بھی کرسکتے ہیں تو پھر اس کا نوحہ، اس کا ماتم سنا نہیں جاتا، انسان بہت کمزور واقع ہوا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

"اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا. اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا. وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا." (المعارج:۱۹ تا ۲۱)

ترجمہ:......"انسان پیدا کیا گیا کمزور (اندر سے خالی)، جب پہنچی ہے اس کو کوئی تکلیف تو جزع فزع کرتا ہے، اور جب پہنچتی ہے اس کو خیر تو روکنے لگتا ہے (اس میں کسی اور کا حصہ نہیں، صرف میرے لئے ہے، یہ بانٹ کر کھالو! نہیں! بانٹنے

کا سوال ہی نہیں، کہتا ہے یہ صرف میری ہے!)۔''

انہی صاحب نے جن کی میں بات کر رہا ہوں، آخر میں شعر لکھا تھا:

اے زرتو خدا نہیں ولیکن بخدا! مسبّب الاسباب وقاضی الحاجاتِ۔

اے زر! مال و دولت کو کہہ رہا ہے تو خدا تو نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی قسم! تو مسبّب الاسباب اور قاضی الحاجات ہے۔

انسان کی حماقت کی حکایت:

اپنی حماقت سے یہ نہیں سمجھتا کہ یہ مال و دولت بھی من جملہ اسباب کے ہے مسبّب الاسباب نہیں ہے، اور قاضی الحاجات نہیں بلکہ خود ایک حاجت ہے، قاضی الحاجات دوسری ذات ہے۔

بہشتی زیور کے شروع میں وہ جو سچی حکایتیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک حکایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی، صحیح حدیث میں ہے کہ تین آدمی تھے، ایک کوڑھی، دوسرا گنجا، تیسرا اندھا۔ اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لئے ان کے پاس فرشتہ بھیجا۔

فرشتہ کوڑھی کے پاس گیا، کہنے لگا: تمہیں کیا چیز چاہئے؟ کہا کہ: دیکھو ناں! میرا کیا حال ہو رہا ہے؟ میری جلد ٹھیک ہوجائے، بدن میرا ٹھیک ہوجائے۔ فرشتے نے ہاتھ پھیر دیا، اسی وقت بیماری ختم ہوگئی! تو پوچھا کہ: تمہیں کون سا مال سب سے زیادہ پسند ہے؟ کہنے لگا کہ: اونٹ! اس نے اس کو ایک اونٹنی دے دی اور کہا کہ: اللہ تعالیٰ برکت فرمائیں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرشتہ کی دعا تھی، بہت مال بڑھا، اونٹوں کے ساتھ حویلی بھرگئی اور وہ سیٹھ بن گیا۔

فرشتہ گنجے کے پاس گیا، اس سے کہا کہ: تمہیں کیا چاہئے؟ کہنے لگا کہ: لوگ میرا مذاق اُڑاتے ہیں، سر کے بال آجائیں! ٹھیک ہے، سر پر ہاتھ پھیر دیا، بال

آگئے، فرشتہ نے پوچھا: تمھیں کون سا مال پسند ہے؟ کہنے لگا: گائے! اس کو گائے دے دی اور کہا کہ: اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائیں، اس کے مال میں اتنی برکت ہوئی کہ باڑہ بھر گیا۔

فرشتہ اندھے کے پاس گیا، پوچھا کہ: تمھیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟ اندھا کہنے لگا کہ: آنکھیں نہیں ہیں، آنکھیں مل جائیں، میں دنیا کو ایک دفعہ دیکھ لوں! فرشتے نے آنکھوں پر ہاتھ پھیر دیا، بینائی لوٹ آئی، فرشتہ نے اس سے کہا کہ: تمھیں کون سا مال پسند ہے؟ کہا کہ: بکری! ایک بکری دے دی اور کہا کہ: حق تعالیٰ شانہ برکت عطا فرمادیں!

کچھ عرصہ گزرا، اسی فرشتہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک سائل کی شکل میں بھیجا، پہلے وہ فرشتہ اس کوڑھی کے پاس گیا، کہتا ہے کہ: بہت ہی آزردہ حال مسافر ہوں، اللہ تعالیٰ کا سہارا ہے، اس کے بعد آپ کا سہارا ہے، خدا کے لئے میری مدد کیجئے، آپ کے پاس اونٹوں کی حویلی بھری ہوئی ہے، ایک اونٹنی مجھے دے دیجئے، میں اس پر سوار ہوکر اپنے گھر جاؤں گا! اس نے جواب میں کہا: جا جا میاں! میرے اور بھی بہت سارے کام اور ضرورتیں ہیں، یہ مانگنے والے روز آجاتے ہیں، ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، روز آجاتے ہیں، تانتا بندھا ہوا ہے۔ اس کو وہ فرشتہ کہنے لگا: تجھے معلوم ہے کہ جب تو کوڑھی تھا اور کسی بزرگ نے آکر تیری جلد پر ہاتھ پھیرا تھا اور پھر تجھے اونٹنی دے گیا تھا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے تیرے اونٹوں میں برکت فرمادی تھی، تو ایسا نہیں کرو! اس نے جواب میں کہا: جا جا! اپنا کام کر! میں تو ہمیشہ سے ایسا تھا اور یہ اونٹ تو میرے باپ دادا کے زمانے سے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اس فرشتے نے کہا: اگر تو جھوٹ بولتا ہے تو اللہ تعالیٰ تجھے ویسا ہی کردے! اسی وقت کوڑھی ہوگیا اور وہ اونٹ مرگئے۔

فرشتہ گنجے کے پاس گیا، وہاں بھی یہ تماشا ہوا، آخر میں اندھے کے پاس

گیا، اس سے کہا کہ: میں مسافر ہوں، اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت مال دیا ہے، کچھ مجھے بھی دے دیجئے، میں اپنے سفر کا انتظام کرلوں، دیکھو! تم اندھے تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں بینائی عطا فرمائی، اورتم بے مال تھے اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال عطا فرمادیا! وہ کہنے لگا کہ: آپ بالکل صحیح کہتے ہیں! میں اندھا تھا، مجھ پر اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا، اور میں فقیر تھا اللہ تعالیٰ نے ایک بزرگ شخصیت کو بھیج دیا تھا، اس نے مجھے ایک بکری دی اور میرے لئے دعا کردی، اور آج میرے پاس مال کی فراوانی ہے، یہ سارا مال اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے، لیجا جتنا لے کر جانا ہے! جتنا لے کر جانا ہے لے جا! میرا نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا ہے! اس فرشتے نے کہا کہ: میں انسان نہیں ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں، مجھے تیرے مال کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے تم تینوں کو آزمانا تھا، آزمالیا، اللہ تعالیٰ تیرے مال میں برکت عطا فرمائیں۔

انسان کے پاس پیسے آجاتے ہیں تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ پیسے ہمیشہ سے تھے میرے پاس، اپنی حیثیت کو بھول جاتا ہے، اور جب اس کے پاس سے وہ نعمت چھن جائے یا کسی مصیبت میں، کسی تکلیف میں مبتلا ہوجائے تو پھر اس کی آہ وزاری دیکھی اور سنی نہیں جاتی، اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے حالات میں تو ہم جیسے پتھر دل بھی پگھل جاتے ہیں، یہ تو ہمارا دنیا کا نقشہ ہے، یہاں کی نعمتوں کو دائمی سمجھتے ہو، حالانکہ یہ تو ڈھلنے والی چھاؤں ہے، یہاں کی لذتوں کو لذتیں سمجھتے ہو، حالانکہ ان میں سو بلائیں چھپی ہوئی ہیں، یہاں کی نعمتوں کو نعمتیں سمجھتے ہو، تمہیں معلوم نہیں کہ حلوے میں زہر ملادیا گیا ہے۔

مبارک لوگ:

بہت ہی مبارک ہیں وہ لوگ جو یہاں رہتے ہوئے یہاں کی حقیقت کو سمجھ جائیں، ان کا دل یہاں نہ لگے، بلکہ وہاں لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک

حدیث شریف میں فرمایا، مجھے ایک مثال دینی ہے، اسی لئے یہ حدیث ذکر کر رہا ہوں، فرمایا: ''سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دیں گے، قیامت کے دن عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوں گے، جس دن کہ اس کے سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا، ان سات آدمیوں کو ذکر فرمایا، اس حدیث کی شرح کرنا مقصود نہیں ہے، صرف ایک مثال دینا ہے، اس میں فرمایا کہ: ایک وہ آدمی جو نماز سے فارغ ہوکر گھر چلا گیا، مگر اس کا دل اَٹکا ہوا تھا مسجد کے ساتھ، خود گھر چلا گیا لیکن دل یہاں اَٹکا گیا، اس کا دھیان یہی ہوتا ہے کہ کب نماز کا وقت ہوتا ہے میں جاؤں، جہاں دل لگا ہوتا ہے وہاں آدمی جانا چاہتا ہے، دل لٹکا ہوا ہے۔

دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی طرف توجہ:

بہت ہی مبارک ہیں وہ بندے جو رہتے تو ہیں دنیا میں، لیکن ان کا دل اٹکا ہوا ہے آخرت میں، تمہارا دل یہاں نہیں لگنا چاہئے، آخرت میں لگنا چاہئے۔

ہم جنت سے قضائے حاجت کو آئے ہیں:

ہم تو جنت سے آئے تھے، ہمارے جدامجد جنت سے آئے تھے، وہاں کی مخلوق ہیں، یہاں آئے تھے قضائے حاجت کے لئے، رفع ضرورت کے لئے آئے تھے، کیونکہ وہاں بیت الخلاء نہیں ہے، یہاں کی جو سرسبزی ہم نے دیکھی، یہاں کی رونقیں دیکھیں تو ہمیں اپنا وطن تو یاد نہیں رہا، یہیں مشغول ہوگئے۔

گورنر ہاؤس اور استنجا خانہ!

ایک دفعہ جنگ اخبار کے دفتر میں میر شکیل کے پاس گیا، وضو کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس کے اپنے دفتر کا جو بیت الخلاء ہے، اس نے کہا کہ: یہاں آپ وضو کرلیں! میں جب وضو سے فارغ ہوکر باہر آگیا تو میں نے کہا کہ: تم نے استنجا خانہ بنوایا ہے یا گورنر ہاؤس؟ اس پر وہ بہت ہنسا، تو استنجے خانے بھی گورنر ہاؤس ہیں،

ہمارے دل میں تمہارے گورنر ہاؤس کی وقعت استنجے خانے سے زیادہ نہیں ہے، تو بہت ہی مبارک ہیں وہ بندے جو یہاں رہتے ہیں لیکن ان کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہے۔

اہلِ قبور کی حالت:

ایک تو یہ مضمون ارشاد فرمایا اور دوسرا اہل قبور کی حالت کو ذکر فرمایا کہ تمہاری طرح وہ بھی کھاتے تھے، پیتے تھے، قوت رکھتے تھے، چلتے تھے، پھرتے تھے، دنیا کو آباد کیا، بڑا نام پیدا کیا، سائنسی ایجادات کیں، دنیا پر حکمرانی کی اور نہ معلوم کیا کیا کیا؟ لیکن آج ان کی وہ کیفیت ہے:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوانہ شکستہ سے چور تھا

کسی کے سر کی کھوپڑی کہیں پڑی تھی، ایسے ہی اچانک پاؤں کے نیچے آ گئی، پرانی ہڈی تھی، بوسیدہ ریزہ ریزہ ہوگئی، وہاں اندر سے آواز آئی کہ:

ذرا سنبھل کے چلو بے خبر!
کل میں بھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

آج وہ کال کوٹھری میں بند ہیں، مکان ان کے ملے ہوئے ہیں، بلکہ ایک ہی قبر میں اگر ساٹھ مردے دفن کر دیئے جائیں تو ایک دوسرے سے نا آشنا، وہ اس کا نہیں، وہ اس کا نہیں، جیسے دو آدمی ایک ہی بستر پر سو رہے ہیں، ایک خواب میں جیل کا مزہ چکھ رہا ہے، اور دوسرا خواب میں بادشاہی کا مزہ چکھ رہا ہے، ایک ہی بستر پر ہیں، لیکن دنیا دونوں کی الگ الگ ہے، ایک باغ کی سیر کر رہا ہے، اور ایک کے پیچھے شیر بھاگ رہے ہیں، کتے اس کے پیچھے لگ رہے ہیں، ان کو اتنی فرصت نہیں کہ کسی کا دکھ درد سنیں، ان میں اتنی تو تاب نہیں کہ ذرا اپنے حجرۂ شریفہ سے باہر قدم رنجہ فرمائیں، وہ بند قید خانہ ہے، تاریک قید خانہ، قید خانہ اندھیرا اور اوپر نا معلوم کتنے سانپ چھوڑے

ہوئے ہیں، بچھو چھوڑے ہوئے ہیں؟

قبر کا نقشہ سامنے رہے!

تو دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ ذرا اس دنیا میں آکر مست ہوگئے ہو، ذرا قبر کا نقشہ بھی سامنے رکھا کرو۔

بارگاہِ الٰہی میں پیشی کو پیش نظر رکھو!

اور تیسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ کل بارگاہِ خداوندی میں تمہاری پیشی ہوگی، نامہ عمل تمہارے سامنے پیش کردیئے جائیں گے، اور ہر آدمی سے کہا جائے گا کہ اپنی اپنی کتاب پڑھ لو، تمہارے تمام پردے ہٹادیئے جائیں گے، یہاں تو رات کی تاریکیوں میں چھپ چھپ کر اور چہرے پر نقاب ڈال ڈال کر ڈاکے ڈالتے ہو، تمہارے چہرے کی نقاب نوچ لی جائے گی، اور یہ تاریکی چھٹ جائے گی، تمہارے دل کے بھید نکال کر ظاہر کردیئے جائیں گے، دل کے اندر جو گندگی پھیلی ہوئی ہے، چاہے وہ ظلمت ہے، وہ چہرے پر آجائے گی، اس وقت تمہارا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوگا، ذرا اس نقشے کو بھی یاد رکھو۔

ہم خوابِ غفلت کے نشہ میں ہیں:

یہ تین مضمون ہیں کہ یہی تین مضمون قرآن کریم میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ شریفہ میں، حضرات خلفائے راشدینؓ کے کلام میں، اور حضرات اولیاءؒ کے ارشادات میں پھیلے ہوئے ہیں، یہی تین مضمون ہیں، ہم ایک خواب دیکھ رہے ہیں، جس کا نام خوابِ غفلت ہے! ہمیں غفلت کا انجکشن لگادیا گیا ہے، ہوش نہیں آرہا، دیوانگی سی ہے، جو ہم پر طاری ہے، بھلے کو بھلا نہیں جانتے، برے کو برا نہیں جانتے، جو بھلائی کی بات کرے اس کو دشمن جانتے ہیں، اور جو تمہارے ساتھ دشمنی کررہا ہے اس کو دوست بناتے ہیں، لیکن یہ نشہ اُتر جائے گا، یہ خواب غفلت کا نشہ طاری ہے ہم پر

یہ عنقریب اُترنے والا ہے، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ وہ جب اُترے گا تو وقت جاتا رہے گا، پھر تدارک نہیں کرسکیں گے۔

میں ہمیشہ کہتا رہتا ہوں کہ جو بچپن میں ہیں، ابھی جوانی میں قدم رکھ رہے ہیں، سبحان اللہ! ان کے لئے تو گویا ساری زندگی پڑی ہے، وہ ابھی سے اپنا نقشہ درست کرلیں، وہ جو میں نے حدیث پڑھی ہے ناں! کہ سات آدمی ایسے ہوں گے جن کوعرشِ الٰہی کا سایہ نصیب ہوگا، ان میں سب سے پہلے نام ذکر فرمایا ہے: ''الامام العادل'' اور وہ جوان جس کی نشو ونما ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہوئی، ان کی تو بات ہی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ ان کو توفیق عطا فرمائے، تو ساری زندگی سونا (زرّیں) بن جائے، ہماری سونا بن گئی، ہماری زندگی ویسے ہی سونا بن گئی، یعنی ساری زندگی سوسو کر گزار دی، اللہ کرے ان کی زندگی سونا (زرّیں) بن جائے، ہم نے سوکر گزار دی، اور جو درمیان کی عمر میں ہیں، ان کے لئے بھی وقت ہے، اور جنہوں نے میری طرح دھوپ میں بال سفید کرلئے ہیں، ان کے لئے بھی ابھی وقت ہے، مرنے سے پہلے پہلے وقت ہے، غرغرے سے پہلے وقت ہے، غرغرہ کہتے ہیں یہ روح جہاں جاکے اٹک جاتی ہے، اس سے پہلے پہلے وقت ہے توبہ کرلیں، گناہوں کو چھوڑنے کا ارادہ کرلیں، اپنی زندگی کی لائن کو بدلنے کا ارادہ کرلیں، عزم کرلیں کہ آج سے مجھے غفلت کی زندگی نہیں گزارنی ہے، نفس کی خواہشات کی زندگی نہیں گزارنی ہے، دنیا کے دھوکے میں مبتلا ہوکر زندگی نہیں گزارنی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خیرخواہانہ ارشادات کی روشنی میں زندگی گزارنی ہے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!